تفسیر ترجمان القرآن

بلطائف البیان

تالیف

نواب سید محمد صدیق حسن خان رحمہ اللہ

(۱۸۳۲-۱۸۹۰ء)

تصحیح و تنقیح و نظرثانی

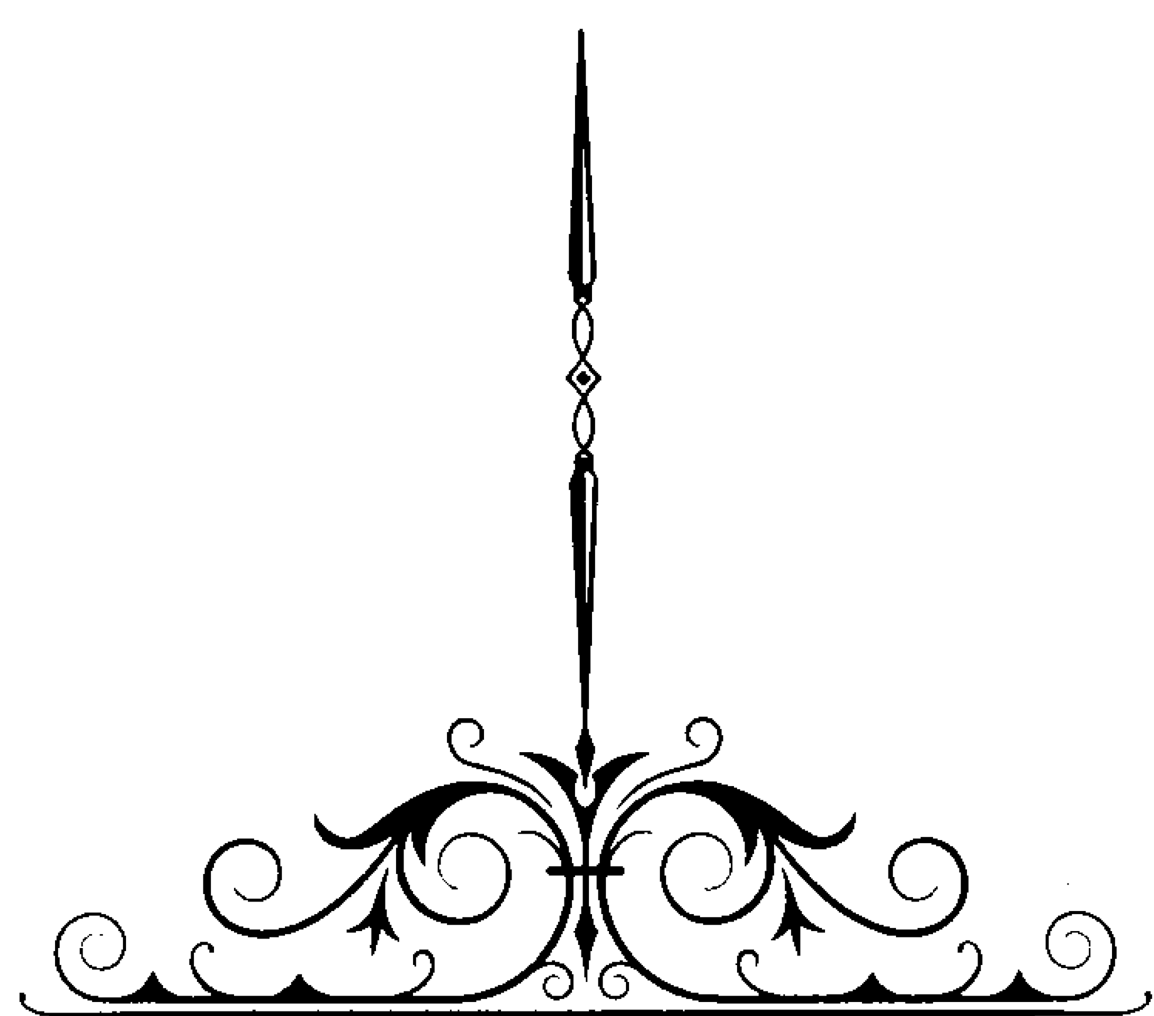
فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف | حافظ شاہد رفیق فاضل مدینہ یونیورسٹی

تسہیل: محمد یحیی قریشی تخریج: حافظ حامد مشتاق فاضل مدینہ یونیورسٹی

جلد چہارم

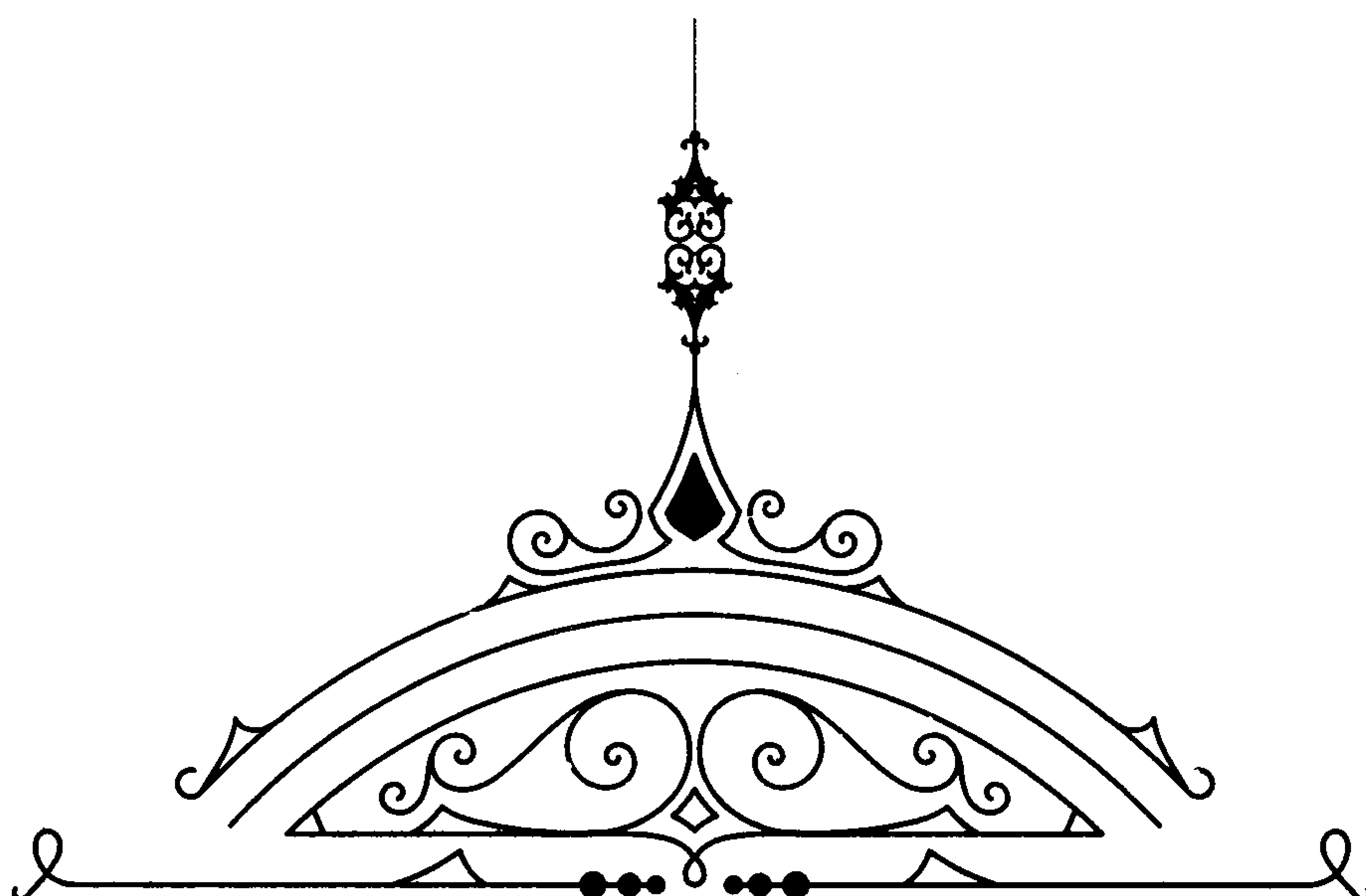
دار ابی الطیب للنشر والتوزیع

مکتبہ قدوسیہ

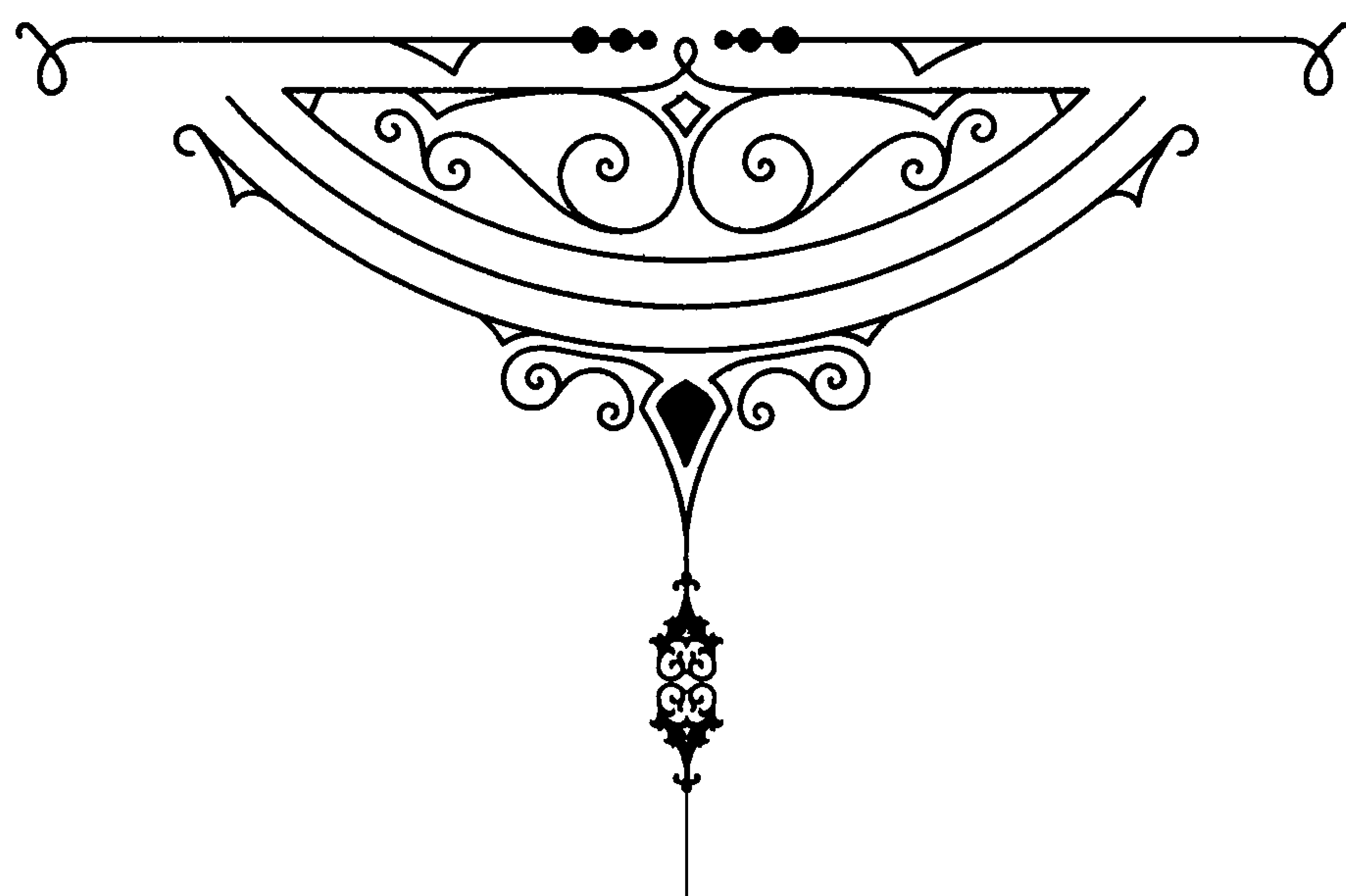


تفسیر ترجمان القرآن

بلطائف البیان



بسم الله الرحمن الرحيم





نام کتاب: ________ تفسیر ترجمان القرآن

تالیف: ________ نواب سید محمد صدیق حسن خان رحمہ اللہ

قیمت: ________

طبع اول: ________ نومبر 2019ء



دار ابی الطیب للنشر والتوزیع

گل روڈ، حمید کالونی گلی نمبر 5 گوجرانوالہ
055-3823990

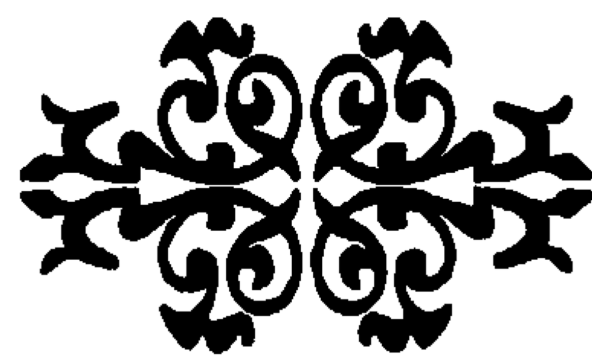
بیت السلام پرنٹنگ پریس

رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

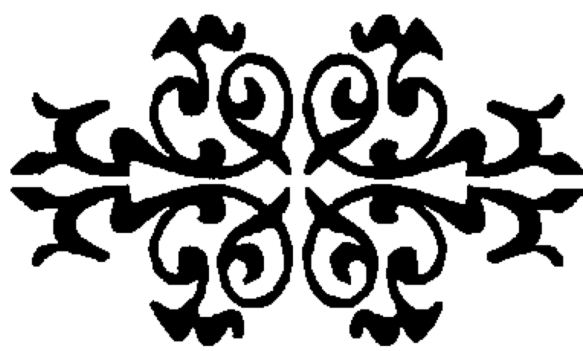
Tel: +92-42-37361371, 37320422 Mob: +92-321-9350001 , 0320-6666123

bait.us.salam1@gmail.com www.bait-us-salam.com facebook.com/baitussalambookstore

فہرست



فہرست مضامین



سُوْرَةُ يُوْسُفَ

یہ سورت مکی ہے۔ اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ « عَلِّمُوْا أَرِقَّائَكُمْ سُوْرَةَ يُوْسُفَ، فَإِنَّهُ أَيُّمَا مُسْلِمٍ تَلَاهَا، أَوْ عَلَّمَهَا أَهْلَهُ، أَوْ مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُهُ هَوَّنَ اللّٰهُ عَلَيْهِ سَكَرَاتِ الْمَوْتِ، وَأَعْطَاهُ مِنَ الْقُوَّةِ أَنْ لَّا يَحْسُدَ مُسْلِمًا » [1] (رواه الثعلبي وغيره) [اپنے غلاموں کو سورت یوسف کی تعلیم دو، جونسا مسلمان اس کی تلاوت کرے گا اور اپنے اہل وعیال اور اپنے مملوک غلام لونڈیوں کو اس کی تعلیم دے گا تو اللہ تعالیٰ اس پر موت کی بے ہوشیاں آسان کر دے گا اور اسے ایسی (روحانی) قوت دے گا کہ وہ کسی مسلمان سے حسد نہیں کرے گا] امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ اس کی اسناد بالکل ضعیف ہے۔ امام ابن عساکر رحمہ اللہ نے بھی اسی کے لگ بھگ روایت کیا ہے، لیکن وہ تمام طریق سے منکر ہے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے دلائل میں ذکر کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس سورت کی تلاوت کرتے تھے، ایک گروہ یہود نے سن کر اسلام اختیار کیا، اس لیے کہ یہ سورت ان کی کتاب کے مطابق تھی، لیکن یہ روایت سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بطریق کلبی عن ابی صالح آئی ہے۔ [2]

فتح البیان میں ہے کہ یہ سورت ساری مکی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ ہجرت کے وقت مکہ اور مدینہ کے درمیان اتری ہے۔ اس کی ایک سو گیارہ آیات ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: مگر چار آیتیں مکی نہیں ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ علما کا یہ مقولہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں پیغمبروں کے قصے دوبار، سہ بار ایک ہی معنی کے ساتھ وجوہ مختلف کے ساتھ درجہ بلاغت کے لحاظ سے مناسب الفاظ کے ساتھ ذکر کیے ہیں۔ مگر یوسف علیہ السلام کا قصہ کہ اس کا ذکر دوبارہ نہیں فرمایا۔ کسی مخالف کو دوبارہ ذکر کرنے یا نہ کرنے پر اعتراض کرنے کی قدرت حاصل نہیں ہوئی۔ [3] وللہ الحمد.

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ ۫ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۟۱ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۟۲ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَاۤ

---

[1] تفسیر القرطبي (۹/ ۱۱۸) فتح البیان (٦/ ۲۸۳)

[2] الکشف والبیان للثعلبي (٥/ ۱۹٦) اس کی سند میں ''ہارون بن کثیر'' مجہول اور ''سلام بن سلیم'' سخت ضعیف ہے۔

[3] دلائل النبوۃ (٦/ ۲۷٦) تفسیر ابن کثیر (۲/ ٦۰٦) اس کی سند میں ''محمد بن سائب کلبی'' اور ''محمد بن مروان'' سخت ضعیف راوی ہیں۔

اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝۳

الٓرٰ ، یہ واضح کتاب کی آیات ہیں ① بے شک ہم نے اسے عربی قرآن نازل کیا، تاکہ تم سمجھو ② (اے نبی!) آپ کی طرف یہ قرآن وحی کر کے ہم آپ کو ایک بہترین داستان سناتے ہیں، جبکہ یقیناً اس سے پہلے آپ بے خبروں میں سے تھے ③

اوصافِ قرآن:

حروفِ مقطعات پر اول سورت بقرہ میں گفتگو ہو چکی ہے۔ کتاب سے مراد قرآن روشن ہے جو مبہم اشیا کا نہایت وضاحت کے ساتھ بیان اور اس کی تفسیر کرتا ہے۔ قرآن پاک کو عربی زبان میں اتارا، کیونکہ لغتِ عرب سب لغتوں میں زیادہ فصیح اور روشن اور وسیع تر ہے اور معانی کے ادا کرنے میں جو کہ قائم بالنفوس ہوتے ہیں، سب سے بڑھ کر ہے، اسی لیے اس باعزت کتاب کو سب سے باعزت لغت میں نازل فرمایا۔ یہ کتاب سب سے زیادہ عزت والے رسول پر، سب سے زیادہ عزت والے فرشتے کی سفارت سے اور زمین کے سب سے باعزت حصوں میں نازل ہوئی اور اس نزول کی ابتدا بھی پورے سال میں سے سب سے باعزت مہینے یعنی رمضان میں ہوئی۔ چنانچہ یہ کتاب تمام وجوہ اور ہر لحاظ سے کامل ٹھہری، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس کو احسن قصص فرمایا۔

سببِ نزول:

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس سورت کے سببِ نزول کے بارے میں یوں روایت کیا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: اے اللہ کے رسول! کاش آپ ہم پر کوئی قصہ بیان فرماتے! اس پر یہ آیت آئی: ﴿نَحْنُ نَقُصُّ ... الخ﴾ اور اس کو دوسرے طریق سے مرسلاً بھی عمرو بن قیس رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے۔[1]

مصعب رحمہ اللہ اپنے باپ سعد رضی اللہ عنہ سے راوی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن مجید اترا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں پر اس کی تلاوت کی، انھوں نے کہا: اللہ کے رسول! "لَوْ قَصَصْتَ عَلَيْنَا" کاش آپ ہم کو کوئی قصہ سناتے! اس پر اللہ نے یہ آیت ﴿تَعْقِلُوْنَ﴾ تک نازل کی۔ پھر ایک زمانے تک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان پر اسی آیت کی تلاوت کرتے رہے، اس پر اللہ نے یہ آیت بھیجی: ﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ﴾ [الزمر: ۲۳] "اللہ نے بہترین کلام نازل کیا۔"[2] (رواہ ابن جریر والحاکم)

---

① تفسیر ابن کثیر (۱۵/ ۵۵۲) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ عمرو بن قیس ملائی کا سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے سماع ثابت نہیں ہے۔ نیز "ایوب بن سیار زہری" ضعیف راوی ہے۔

② تفسير الطبري (۱۵/ ۵۵۳) مستدرك الحاكم (۲/ ۳۷٦)

عون بن عبداللہ ﷫ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے اصحاب ﷢ ملول ہوئے، عرض کی کہ اے اللہ کے رسول! حدیث سے اوپر اور قرآن سے کم تر کوئی بات ہم سے کہیں۔ ان کی مراد قصص تھی، اس پر اللہ نے یہ آیت ﴿ الْغٰفِلِيْنَ ﴾ تک نازل کی۔ وہ طالبِ حدیث تھے، اللہ نے ان کو احسن الحدیث کی راہ دکھائی، انھوں نے ارادہ قصص کا کیا تھا، اللہ نے احسن القصص کی طرف ان کی راہنمائی کی۔[1]

اتباعِ رسول کا ترک نری گمراہی ہے:

اس آیتِ کریمہ کے پاس، جو قرآن کی تعریف پر مشتمل ہے اور قرآن کے کافی ہونے پر اس کے علاوہ ہر کتاب سے، ایک حدیث کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے، جس کو امام احمد نے جابر بن عبداللہ ﷠ سے روایت کیا ہے کہ عمر بن خطاب ﷜ کو بعض اہلِ کتاب کی ایک کتاب ہاتھ آئی، یہ اس کو لا کر نبی اکرم ﷺ کے سامنے پڑھنے لگے، نبیِ اکرم ﷺ نے غضب میں آ کر فرمایا: «أَمُتَهَوِّكُونَ فِيهَا يَا ابْنَ الْخَطَّابِ؟! وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ! لَقَدْ جِئْتُكُمْ بِهَا بَيْضَاءَ نَقِيَّةً، لَا تَسْأَلُوهُمْ عَنْ شَيْءٍ فَيُخْبِرُوكُمْ بِحَقٍّ وَتُكَذِّبُونَهُ، أَوْ بِبَاطِلٍ فَتُصَدِّقُونَهُ، وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوْ أَنَّ مُوسٰى كَانَ حَيًّا لَمَا وَسِعَهُ إِلَّا أَنْ يَتَّبِعَنِي »[2] [اے ابن خطاب! کیا تم اس کے بارے میں حیران ہو؟ قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! یقیناً میں تمھارے پاس صاف اور واضح دین لے کر آیا ہوں۔ ان سے کسی چیز کے بارے میں سوال نہ کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تمھیں اس کیبارے میں سچی خبر دیں اور تم اسے جھٹلا دو، یا وہ اس سے متعلق تمھیں غلط خبر دیں اور تم اس کے تصدیق کردو، قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر موسیٰ ﷤ بھی زندہ ہوتے ان کو بھی میری اتباع کے سوا کسی اور چیز کی اتباع جائز نہ تھی]

عبداللہ بن ثابت ﷜ سے دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ عمر ﷜ نے آ کر کہا: اے اللہ کے رسول! میرا گزر قریظہ میں سے میرے ایک بھائی پر ہوا تھا، اس نے جوامع تورات مجھ کو لکھ کر دیے ہیں، کیا میں ان کو آپ ﷺ پر عرض نہ کروں؟ آپ ﷺ کا چہرہ دگرگوں ہو گیا، عبداللہ بن ثابت ﷜ کہتے ہیں کہ میں نے کہا: اے عمر! تو نبی اکرم ﷺ کے چہرے کو نہیں دیکھتا کہ متغیر ہو گیا۔ سیدنا عمر ﷜ نے کہا: "رَضِينَا بِاللّٰهِ رَبًّا، وَبِالْإِسْلَامِ دِينًا، وَبِمُحَمَّدٍ رَسُولًا" [ہم اللہ کے رب ہونے، اسلام کے دین ہونے اور محمد ﷺ کے رسول ہونے پر راضی ہو گئے] تب رسول اللہ ﷺ کا غصہ گیا اور فرمایا: « وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ! لَوْ أَصْبَحَ فِيكُمْ مُوسٰى ثُمَّ اتَّبَعْتُمُوهُ وَتَرَكْتُمُونِي لَضَلَلْتُمْ، إِنَّكُمْ حَظِّي مِنَ الْأُمَمِ وَأَنَا حَظُّكُمْ مِنَ النَّبِيِّينَ »[3] (رواہ أحمد) [قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ

[1] تفسیر الطبري (١٥/ ٥٥٢) یہ روایت مرسل ہے۔

[2] مسند أحمد (٣/ ٣٨٧) امام البانی ﷫ نے اس کو حسن کہا ہے۔

[3] مسند أحمد (٣/ ٤٧٠) اس کی سند میں ''جابر جعفی'' ضعیف راوی ہے۔ (مجمع الزوائد: ١/ ٤٢٠)

میں محمد ﷺ کی جان ہے! اگر تمھارے اندر موسیٰ علیہ السلام آ جائیں، پھر تم ان کی اتباع کرو گے اور مجھے چھوڑ دو گے تو تم گمراہ ہو جاؤ گے، امتوں میں سے تم میرے حصے میں آئے ہو اور نبیوں میں سے تمھارے حصے میں آیا ہوں]

تقلید کی مذمت:

میں کہتا ہوں ان احادیث سے لوگوں کی رایوں کی تقلید کی جڑ کٹ گئی، تسمہ تک باقی نہ رہا، کیونکہ بالفرض اگر موسیٰ علیہ السلام جو کہ من جملہ اولوا العزم انبیائے کرام میں سے ہیں، اس امت میں آتے تو ان کو بھی خاتم الرسل ﷺ کی اتباع کے بغیر کوئی چارہ نہ ہوتا، جس طرح کہ عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے قریب زمانے میں جب آسمان سے زمین پر نازل ہوں گے تو اسی کتابِ عزیز اور سنتِ مطہرہ پر عمل کریں گے تو اب کسی اور عالم و درویش و مجتہد وصوفی اور ان جیسے اور لوگوں کی کیا ہستی ہے کہ باوجود نصِ قرآنی اور واضح حدیث کے دلائل ہونے کے اس کے قول یا فعل یا خالی رائے یا صرف اجتہاد یا کشف والہام یا خواب کی پیروی کی جائے اور اللہ اور رسول کے کلام مبارک پر کسی اور امتی کے کلام کو مقدم رکھا جائے۔ ایسا کام یا کلام صرف اسی شخص سے متصور اور متوقع ہوتا ہے جو ایمان کے معنی اور اسلام کی چاشنی اور احسان کی تر و تازگی سے بالکل فارغ البال اور خالی الذہن ہوتا ہے، یا معاند اور اپنے آپ کو بڑا سمجھنے والا اور جاہل اور جھگڑالو ہے اور فقط نام کا مسلمان اور کلمہ گو بنا ہوا ہے، ورنہ اللہ کی کتاب اور سنتِ مطہرہ کے ہوتے ہوئے یہ شیطانی طریقہ چہ معنی دارد!

خالد بن عرفطہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھا تھا کہ اتنے میں سوس کا رہنے والا قبیلہ عبدالقیس کا ایک شخص ان کے پاس لایا گیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: تُو فلاں بن فلاں ہے؟ کہا: ہاں، کہا: تُو ہی سوس میں رہتا ہے؟ کہا: ہاں۔ عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں ایک لاٹھی تھی، اس لاٹھی سے اس کو مارا، اس نے کہا: اے امیر المومنین! مجھے کیوں مارتے ہو؟ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: بیٹھ جا! وہ بیٹھ گیا، اس پر یہ آیت پڑھی: ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ... إلى قوله: لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴾ (آیتِ باب)

اس آیت کو تین بار پڑھا اور تین ہی بار اُس کو مارا، اس نے کہا: اے امیر المومنین! تم مجھے کیوں مارتے ہو؟ کہا: تُو نے ہی کتابِ دانیال لکھی ہے؟ کہا: آپ جو حکم دیں، میں ویسا ہی کروں گا، کہا: جا اور اس کتاب کو گرم پانی اور سفید صوف سے مٹا دے، پھر خبردار کبھی اس کو نہ پڑھنا اور نہ کسی کو پڑھانا، مجھ کو اگر یہ بات پہنچی کہ تُو نے اس کو پھر پڑھا یا کسی شخص کو پڑھایا تو میں تجھ کو سزا سے ہلاک کر دوں گا، پھر فرمایا: بیٹھ جا! وہ ان کے سامنے بیٹھ گیا، کہا: میں نے جا کر اہلِ کتاب سے ایک کتاب نقل کرائی تھی، پھر چمڑے میں اس کو لے کر آیا۔

نبی اکرم ﷺ نے مجھ سے پوچھا: اے عمر! تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ ایک کتاب ہے جس کو میں نے لکھوایا ہے، تا کہ اس کے سبب سے ہمارا علم زیادہ ہو۔ نبی اکرم ﷺ غصے میں آ گئے،

آپ ﷺ کی آنکھیں سرخ ہوگئیں، پھر ندا آئی کہ ''اَلصَّلَاةُ جَامِعَةٌ''انصار نے کہا کہ تمھارے نبی غصے میں لائے گئے، ہتھیار اٹھاؤ، پھر آ کر منبرِ نبوی کے ارد گرد حلقہ کر لیا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «يَأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي قَدْ أُوتِيتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ وَخَوَاتِيمَهُ، وَاخْتُصِرَ لِيَ اخْتِصَاراً، وَلَقَدْ أَتَيْتُكُمْ بِهَا بَيْضَاءَ نَقِيَّةً فَلَا تَتَهَوَّكُوا وَلَا يَغُرَّنَّكُمُ الْمُتَهَوِّكُونَ » [لوگو! میں جامع کلمات دیا گیا ہوں اور کلمات کے خاتم دیا گیا ہوں اور پھر میرے لیے بہت ہی اختصار کیا گیا ہے، میں اللہ کے دین کی باتیں بہت سفید اور نمایاں لایا ہوں۔ خبردار! تم بہک نہ جانا، گہرائی میں اترنے والے کہیں تمھیں بہکا نہ دیں] سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے کھڑے ہو کر کہا: ''رَضِيتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَّبِالْإِسْلَامِ دِيناً وَبِكَ رَسُولًا'' [میں اللہ کے رب ہونے پر، اسلام کے دین ہونے پر اور آپ ﷺ کے رسول ہونے پر راضی ہوں] تب آپ ﷺ منبر سے نیچے اترے۔[1] (رواه أبو يعلى ورواه ابن أبي حاتم في تفسيره مختصرا)
لیکن اس کی سند ضعیف ہے، مگر امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''وَرُوِيَ لَهُ شَاهِدٌ مِّنْ وَّجْهٍ آخَرَ'' [اس کا ایک شاہد اور سند سے مروی ہے]

وہ شاہد یہ ہے کہ حافظ ابوبکر احمد بن ابراہیم اسماعیلی نے اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ جبیر بن نفیر نے کہا ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے میں دو شخص حمص میں تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جہاں حمص کے لوگوں کو بلایا تھا، ان دونوں کو بھی طلب کیا تھا، انھوں نے یہود سے کچھ باتیں منتخب کر کے لکھی تھیں، یہ اس مجموعے کو اپنے ہمراہ لیتے آئے، تاکہ عمر رضی اللہ عنہ سے اس کے بارے میں استفسار کریں، اگر وہ راضی ہوں تو ہم اپنی رغبت زیادہ کریں اور اگر وہ ہم کو منع کریں تو ہم اس کو چھوڑ یں۔ جب وہ دونوں عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تو کہا: ہم اہلِ کتاب کی زمین میں رہتے ہیں، ہم ان سے ایسی باتیں سنتے ہیں جس سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، کیا ہم اس کلام کو ان سے لے لیں یا چھوڑ دیں؟ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: شاید تم دونوں نے اس کلام میں سے کچھ لکھا ہے؟ کہا: ہم نے نہیں لکھا، کہا: میں تم سے ایک ماجرا کہتا ہوں، میں نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں خیبر کی طرف گیا، وہاں مجھے ایک یہودی ملا، اس نے ایک ایسی بات کہی جو مجھے اچھی لگی، میں نے اس سے کہا: بھلا تُو مجھ کو یہ بات لکھ دے گا؟ اس نے کہا: ہاں، میں اس کے پاس ایک چمڑا لے گیا، اس نے مجھ پر لکھوانا شروع کیا، میں نے اکراع میں لکھا، جب میں پھر کر آیا تو میں نے یہ حال نبی اکرم ﷺ سے کہا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کو لے آ! میں لینے چلا اور چلنے میں راغب تھا، اس امید پر کہ نبی اکرم ﷺ کے پاس کچھ ایسی چیز لاؤں جو آپ ﷺ کو محبوب ہو، جب میں وہ مکتوب لے کر آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: بیٹھ جا، مجھ پر پڑھ! میں نے ایک دم پڑھا، دیکھا تو آپ ﷺ کا چہرہ دگرگوں ہونے لگا، میں ڈر کے مارے حیران رہ گیا، پھر ایک

[1] ''مسند أبي يعلىٰ'' میں ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے۔ تفسیر ابن أبي حاتم (۷/ ۲۱۰۰) اس کی سند میں ''عبدالرحمان بن اسحاق واسطی'' ضعیف راوی ہے۔ (مجمع الزوائد: ۱/ ۴۳۵)

حرف بھی نہ پڑھ سکا۔

جب نبی اکرم ﷺ نے میری یہ حالت دیکھی تو اس کو اٹھا کر ایک ایک لفظ کو اپنے آبِ دہن سے مٹانے لگے اور فرمایا: «لَا تَتَّبِعُوْا هٰؤُلَآءِ، فَإِنَّهُمْ قَدْ هَوَّكُوْا وَتَهَوَّكُوْا» [ان لوگوں کی پیروی نہ کرنا، یہ تو گمراہی کے گڑھے میں جا پڑے ہیں اور یہ تو دوسروں کو بھی بہکا رہے ہیں] یہاں تک کہ آخر تک حرف بحرف مٹا دیا۔ یہ کہہ کر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان دونوں لوگوں سے کہا: اگر میں جان لوں کہ تم نے کچھ بھی اسی کلام سے لکھا ہوتا تو میں تم کو اس طرح کی سزا دیتا جو اَوروں کے لیے عبرت ہو جائے، ان دونوں نے کہا: واللہ! ہم کبھی اس میں سے کچھ بھی نہ لکھیں گے، پھر اپنی تختیاں لے کر نکلے اور ایک خوب گہرا گڑھا کھودا اور اس میں اس کو دفن کر دیا، یہ ان تختیوں کا آخری زمانہ تھا۔[1] (وهكذا رواه الثوري عن عمر بن الخطاب بنحوه وروى أبو داود في المراسيل من حديث أبي قِلابة عن عمر نحوه)[2] والله أعلم.

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے انصاف اور حق گوئی کو دیکھنا چاہیے کہ کس طرح اپنا گزشتہ قصہ، جس پر نبی اکرم ﷺ نے غصہ کیا تھا، سب لوگوں کے سامنے بیان کر دیا اور وہ بھی اپنے زمانۂ خلافتِ علیا میں۔ نیز حمیتِ اسلام کو ملاحظہ کرنا چاہیے کہ امت میں سے کسی شخص کے لیے یہ روا نہ رکھا کہ وہ اہلِ کتاب کی کتاب کو دیکھے یا لکھے یا لکھوائے اور ایسا کام کرنے والے کو سزا اور تعزیز سے روکا۔ اگر مذاہب کی تقلید کا جمود عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں واقع ہوتا تو معلوم نہیں کہ خلیفہ عمر رضی اللہ عنہ ان مقلدین کو کیا سزا دیتے! اتنا تو ضرور ہوسکتا ہے کہ ایسے شخص کو جس نے اسلام میں رسمِ جاہلیت کو اختیار کیا ہے اور اتباع کو چھوڑ کر مقلد مذہب بنا ہے، اسے یقیناً اس امت کے لیے ایک نکال اور وبال بناتے، لیکن افسوس ہے کہ ان مفاسد کا ظہور ان کے زمانے کے بعد امت کے آخر میں ہوا اور امت کے اگلے لوگ اس بلادِ غربت سے عافیت میں رہے، ہمارا یہ زمانہ ایسے ہی شخص کے لائق ہے جو عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا مقتدی ہو، لیکن ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

''بہت سی آرزوئیں ہیں کہ پوری نہ ہوسکیں۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اس سورت میں یہ آیتیں جو تیری طرف نازل کی گئی ہیں، ایسی سورت کی آیتیں ہیں جس کا عجیب وغریب ہونا اور تبکیت (لاجواب کرنے) کا حال عرب میں واضح اور ظاہر ہے۔ مبین کے معنے ہیں ظاہر الامر۔

---

[1] مسند الشامیین (٣/ ٨٥) اس کی سند میں ''اسحاق بن ابراہیم بن علاء'' ضعیف راوی ہے۔

[2] المراسیل لأبي داود (١/ ٣٢١) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٦٠٨۔ ٦٠٩) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ابو قلابہ رحمہ اللہ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا ہے۔ نیز ثوری رحمہ اللہ کی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے مروی روایت زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے اور اس کی سند میں ''جابر جعفی'' ضعیف راوی ہے۔

یعنی اس بات میں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے پاس سے آئی ہیں اور لفظاً و معناً معجزہ ہیں بغیر کسی نشانی کے غیب کی خبر دینے میں۔ یا ان کے معانی عرب پر واضح ہیں، پڑھنے اور سننے والے پر ملتبس نہیں ہوتے (انھیں کوئی مغالطہ نہیں ہوتا)، کیونکہ انھی کی لغت اور زبان میں نازل ہوئی ہیں۔ یا ان میں احکام اور شریعت کا بیان ہے۔ یا ملک اور ملکوت کی پوشیدہ باتوں اور دونوں جہانوں کی تخلیق و ایجاد کے اسرار و رموز کا بیان ہے۔ یا ان میں پہلے لوگوں کے قصے اور ان کے حالات کی تشریح کی گئی ہے۔ یا یہودیوں کے یوسف علیہ السلام کے قصے کے بارے میں سوال کا بیان ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے اللہ نے اس کو اپنی برکت اور رشد سے بیان کیا ہے۔[1]

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حق کو باطل سے واضح کرنے کا بیان ہے اور حرام میں سے حلال کو واضح کیا گیا ہے۔[2] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے اس میں حلال و حرام کو بیان کیا ہے۔[3] سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اللہ نے اس میں وہ چھے حرف بیان کیے ہیں جو عجمی لوگوں کی زبان سے ساقط ہیں۔[4] قرآن کو عربی زبان والا فرمایا، اگرچہ اس میں بعض الفاظ غیر عربی کے بھی ہیں، مثلاً: سجیل، اِستبرق اور اسی طرح کے دوسرے الفاظ۔ (قاله ابن عباس و مجاهد و عكرمة) یہی بات صحیح ہے، لیکن ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے آیتِ باب کی دلیل سے اس بات کا انکار کیا ہے۔ دونوں اقوال کے درمیان جمع اس طرح سے ہے کہ جب عرب نے ان الفاظ کے ساتھ تکلم کیا تو یہ الفاظ انھی کی لغت ہو گئے۔[5]

بالجملہ اللہ نے فرمایا کہ ہم نے قرآن کو زبانِ عرب میں نازل کیا ہے، تاکہ تم سمجھو اور اس کے معنی بوجھو، اس لیے کہ یہ تمھاری بولی ہے۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ﴿ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا ﴾ پڑھ کر فرمایا: « أُلْهِمَ إِسْمَاعِيْلُ هَذَا اللِّسَانَ الْعَرَبِيَّ إِلْهَاماً » (رواه الحاكم) یعنی اس زبان عربی کا اسماعیل علیہ السلام کو الہام ہوا تھا۔[6] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قرآن قریش میں اترا ہے، یہ ان کا کلام ہے۔[7]

میں کہتا ہوں کہ اس زبان کی باقی ساری زبانوں پر فضیلت اور برتری ایسی ہے جیسے اللہ کے کلام کی فضیلت دوسرے کلاموں پر ہے اور اس زبان کی خصوصیات ایسی ہیں جو کسی دوسری زبان میں نہیں پائی جاتیں۔ یہی زبان ہمارے دین کی لغت ہے، اسی زبان میں اشرف کتبِ آسمانی کا نزول ہوا، یعنی قرآن کریم کا۔ یہی زبان اہلِ جنت کی زبان ہوگی۔ جس کسی کو اس زبان کی زیادہ معرفت ہے وہ قرآن و حدیث کا مطلب خوب سمجھتا ہے اور جو اس زبان

---

(1) تفسیر ابن أبي حاتم (۷/ ۲۰۹۹) (2) معاني القرآن (٤/ ١٣١) (3) تفسیر الطبري (١٥/ ٥٤٩)

(4) تفسیر الطبري (١٥/ ٥٥٠) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ خالد بن معدان رحمہ اللہ کا سماع سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔ نیز سند میں ''ولید بن سلمہ'' سخت ضعیف راوی ہے۔ (5) تفسیر الخازن (٣/ ٢٦٠۔ ٢٦١)

(6) مستدرك الحاكم (٢/ ٤٧٦) امام البانی رحمہ اللہ نے ''السلسلة الضعيفة'' (رقم الحديث: ٢٩١٩) میں بحث کرتے ہوئے مذکورہ روایت کو ذکر کرتے ہوئے اس میں ''ابراہیم بن اسحاق'' کو ضعیف کہا ہے۔ (7) تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٢٠٩٩)

سے محروم ہے وہ کتاب و سنت کے معانی سمجھنے سے قاصر ہے۔ اسی وجہ سے سلف کی تفسیر معتبر ہے، کیونکہ وہ لغت اور محاورۂ عرب کو پہچانتے تھے اور خلف میں عربی زبان کی کم فہمی کی وجہ سے تفسیر اور شرح حدیث میں اختلاف پیدا ہوا ہے۔ آیت باب سے یہی ظاہر ہے کہ یہ بیان اپنے باب میں احسن القصص ہے۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم تجھ پر حال بیان کرتے ہیں پہلی کتابوں اور زمانوں کا اور الٰہی احکام کا جو پہلی امتوں پر گزر چکے ہیں۔[1] اس سورت کو احسن القصص فرمایا ہے، کیونکہ اس سورت میں جو قصے ہیں ان میں ایسی عبرت اور نصیحت اور احکام ہیں جو دوسری سورتوں میں نہیں ہیں۔ یا اس میں حسنِ محاورہ ہے اور یوسف علیہ السلام کا اپنی ایذا پر صبر اور دوسروں کا قصور معاف کرنے کا ذکر ہے۔ یا اس سورت میں انبیا و صالحین کا اور ملائکہ اور شیاطین، جنوں اور انسانوں اور جانوروں اور پرندوں اور بادشاہوں اور ان کے غلاموں کی سیرت کا بیان ہے۔ یا تاجروں، عالموں، جاہلوں، مردوں اور عورتوں کا ذکر ہے، اور عورتوں کے حیلوں اور مکر کرنے کا ذکر ہے۔ یا اس میں حبیب اور محبوب کا ذکر ہے اور جو کچھ ان کے درمیان گزرا۔

بعض نے کہا ہے کہ اس جگہ احسن بہ معنی اعجب ہے، یا جس کسی کا ذکر اس میں آیا ہے اس کا انجام سعادت ہے۔ امام خالد بن معدان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہلِ جنت جنت میں سورت یوسف اور سورت مریم کے ساتھ تفکر کریں گے۔ امام عطا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سورت یوسف کو کوئی غم زدہ نہیں سنتا، مگر اس کو راحت حاصل ہوتی ہے۔[2] اللہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا ہے کہ ہم نے اس قرآن کو تیری طرف وحی کیا، ورنہ تُو اس وحی کرنے سے پہلے اس قصے سے غافل تھا، نہ تیرے دل میں اس کا خیال پیدا ہوا اور نہ ہی تیرے کانوں میں یہ داستان پہنچی۔[3]

اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ۝۴

جب یوسف نے اپنے باپ سے کہا: اے میرے ابا جان! بے شک میں نے (خواب میں) دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے، سورج، اور چاند ہیں، میں نے انھیں دیکھا کہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں (4)

قصہ یوسف علیہ السلام اور ان کی عظمت کا بیان:

اللہ پاک نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا کہ جہاں تم اور قصے اپنی قوم کو سناتے ہو، وہاں یہ قصہ یوسف علیہ السلام کا بھی ان سے بیان کرو کہ یوسف علیہ السلام نے اپنے باپ یعقوب بن اسحاق علیہما السلام سے اپنے خواب کا ذکر کیا۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے: «اِنَّ الْكَرِيْمَ بْنَ الْكَرِيْمِ بْنِ الْكَرِيْمِ بْنِ الْكَرِيْمِ يُوْسُفُ بْنُ

[1] تفسير الطبري (١٥/ ٥٥١_ ٥٥٢) [2] تفسير البغوي (٤/ ٢١٢) [3] فتح البيان (٦/ ٢٨٥_ ٢٨٦)

يَعْقُوْبَ بْنِ إِسْحَاقِ بْنِ إِبْرَاهِيْمَ » [1] (أخرجه أحمد وانفرد باخراجه البخاري) [بلاشبہ کریم بن کریم بن کریم بن کریم یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام ہیں]

صحیح بخاری کے دوسرے الفاظ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے یہ ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کون لوگ اکرم ہیں؟ فرمایا: « أَكْرَمُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاهُمْ » [اللہ تعالیٰ کے ہاں ان میں سے زیادہ بزرگ وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے] کہا: ہم یہ نہیں پوچھتے، فرمایا: « فَأَكْرَمُ النَّاسِ يُوْسُفُ نَبِيُّ اللّٰهِ ابْنُ نَبِيِّ اللّٰهِ بْنِ نَبِيِّ اللّٰهِ بْنِ نَبِيِّ اللّٰهِ ابْنِ خَلِيْلِ اللّٰهِ » [پھر سب لوگوں میں زیادہ بزرگ یوسف علیہ السلام ہیں جو خود نبی تھے، جن کے والد نبی تھے، جن کے دادا نبی تھے، جن کے پردادا نبی اللہ اور خلیل اللہ تھے] کہا: ہم یہ نہیں پوچھتے، کہا: کیا معادن عرب کا حال پوچھتے ہو؟ کہا: ہاں، فرمایا: « خِيَارُكُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُكُمْ فِي الْإِسْلَامِ إِذَا فَقُهُوْا » یعنی جو لوگ زمانہ کفر میں سردار اور نیک نام تھے وہ اسلام میں بھی عزت دار ہیں، لیکن جب کہ علم حاصل کر لیں۔ [2]

یوسف علیہ السلام کا خواب اور اس کی تعبیر:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ پیغمبروں کے خواب وحی ہوتے ہیں۔ [3] مفسرین نے اس خواب کی تفسیر پر کلام کیا ہے کہ ان گیارہ ستاروں سے یوسف علیہ السلام کے بھائی مراد ہیں، یہ گیارہ شخص تھے اور سورج و چاند عبارت ہیں ماں باپ سے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام ضحاک، قتادہ، سفیان ثوری اور عبدالرحمان بن زید رحمہم اللہ سے اسی طرح مروی ہے۔ [4] اس خواب کی تعبیر چالیس برس کے بعد واقع ہوئی، یا اسّی برس کے بعد، جبکہ یوسف علیہ السلام نے اپنے ماں باپ کو تخت کے اوپر بٹھایا اور بھائیوں نے سامنے کھڑے ہو کر سجدہ کیا۔ اس وقت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: ﴿ يَآبَتِ هٰذَا تَأْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ﴾ [يوسف: ١٠٠] ''اے میرے ابا جان! یہ میرے پہلے کے خواب کی تعبیر ہے۔ میرے رب نے اسے سچا کر دیا ہے۔''

ایک حدیث میں ان گیارہ ستاروں کا نام آیا ہے۔ امام عبدالرحمان بن سابط رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایک یہودی شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، اس کو بستانۃ الیہودی کہتے تھے۔ اس نے کہا: اے محمد! مجھے خبر دو کہ جن تاروں کو یوسف علیہ السلام نے سجدہ کرتے ہوئے دیکھا ہے ان کے کیا نام ہیں؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے، کچھ جواب نہ آیا، جبریل علیہ السلام نے آ کر خبر دی کہ ان کے نام یہ ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی شخص کو اُس یہودی کے پاس بھیجا اور کہا، بھلا اگر میں ان تاروں کے نام تجھ کو بتا دوں تو تُو ایمان لے آئے گا؟ کہا: ہاں، فرمایا: جریان، طارق، ذیال، ذوالکتفین،

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤١١) مسند أحمد (٢/ ٩٦) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤١٢)

[3] تفسير الطبري (١٥/ ٥٥٤) مستدرك الحاكم (٢/ ٤٦٨) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[4] تفسير الطبري (١٥/ ٥٥٦۔ ٥٥٧) الدر المنثور (٤/ ٤٩٩)

قابس، وثاب، عمودان، فلسیق، مصبح، ضروح، فرع۔ یہودی نے کہا: واللہ یہی ان کے نام ہیں۔[1] (رواه ابن جرير والبيهقي في الدلائل، وروى هذا الحديث الحافظان أبو يعلى الموصلي وأبو بكر البزار في مسنديهما وابن أبي حاتم في تفسيره)

امام ابو یعلیٰ رحمہ اللہ نے اس کو اپنے چار شیوخ سے روایت کیا ہے اور اتنا اور بڑھایا کہ جب یوسف علیہ السلام نے یہ خواب دیکھا تو اپنے باپ یعقوب علیہ السلام سے اس کا ذکر کیا، ان کے باپ نے کہا: "هَذَا أَمْرٌ مُتَشَتِّتٌ يَجْمَعُ اللّٰهُ مِنْ بَعْدُ" [یہ سچا خواب ہے، یہ پورا ہو کر رہے گا] اور شمس وقمر ان کے ماں باپ ہیں، لیکن ائمہ نے اس کو ضعیف کہا ہے اور اکثر نے ترک کر دیا۔

امام جوز جانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کا راوی حکم بن ظہیر فزاری ساقط ہے اور وہ صاحبِ حدیث حسن یوسف ہے۔ پھر وہ حدیث ذکر کی جو سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک یہودی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان ستاروں کا سوال کیا جو یوسف علیہ السلام نے دیکھے تھے کہ ان کے نام کیا ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جواب دیا۔ اس کے ساتھ بھی حکم بن ظہیر مذکور متفرد ہے، چاروں نے اس کو ضعیف کہا ہے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ﴿ يُوسُفَ ﴾ سین کی پیش کے ساتھ اور سین کی زیر کے ساتھ ہمزہ کے بجائے واؤ بھی پڑھا ہے۔ یہ عبرانی نام ہے اور علمیت اور عجمہ کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ عربی ہے، لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے بدلیل عدمِ صَرف۔ ان کے باپ یعقوب علیہ السلام تھے۔ یوسف علیہ السلام کی عمر ایک سو بیس (۱۲۰) سال کی ہوئی۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے تحبیر میں اسی طرح کہا ہے۔ انھوں نے یہ خواب جمعہ کی شب کو لیلۃ القدر میں دیکھا کہ گیارہ تارے آسمان سے اترے، ان کے ساتھ سورج اور چاند بھی ہے۔ یوسف علیہ السلام اس وقت بارہ برس کے تھے یا سترہ برس کے، جب کہ بعض نے کہا ہے کہ سات برس کے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے ان کے وہی نام ذکر کیے ہیں جو اوپر گزر چکے ہیں۔[3]

یہ وہ تارے ہیں جو مرصود (زیرِ نگرانی) نہیں ہوتے۔ ان ستاروں کی رویت کو خواب سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ یہ ستارے یوسف علیہ السلام کی نظروں سے اوجھل تھے۔[4] (قاله الشهاب) امام سیوطی رحمہ اللہ نے درِ منثور میں اسی طرح ذکر کیا ہے۔[5] لیکن حدیثِ مذکور کی سند میں ضعفاء اور متروک ہیں، بلکہ امام ابن الجوزی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو موضوع کہا ہے۔[6] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام قتادہ اور سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ گیارہ بھائی ہی ستارے ہیں اور سورج ماں اور

---

[1] تفسير الطبري (١٥/ ٥٥٥) دلائل النبوة (٦/ ٢٧٧) كشف الأستار عن زوائد البزار (٣/ ٥٣) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٠١۔ ٢١٠٢) اس کی سند میں "حکم بن ظہیر فزاری" سخت ضعیف راوی ہے۔

[2] تفسر ابن كثير (٢/ ٦١٠) [3] تفسير البيضاوي (٣/ ٢٧٣) [4] حاشية الشهاب علىٰ تفسير البيضاوي (٥/ ١٥٤)

[5] الدر المنثور (٤/ ٤٩٨۔ ٤٩٩) [6] الموضوعات (١/ ١٤٥۔ ١٤٦)

چاند باپ۔[1] گیارہ ستاروں کے بعد سورج اور چاند کا ذکر فضیلت اور بزرگی کے اظہار کے لیے کیا ہے، جس طرح کہ ملائکہ کے ساتھ جبریل علیہ السلام اور میکائیل علیہ السلام کا ذکر آیا ہے۔ یا واؤ مع کے معنی میں ہے۔ ضمیر مذکر اس لیے آئی ہے کہ ان کی توصیف عاقلانہ کی ہے، اس لیے کہ ان کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھا۔ امام خلیل اور سیبویہ رحمہما اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔[2]

اس جگہ مراد حقیقتِ سجود ہے، اس لیے کہ ان کی آپس میں تحیت (سلام) یہی تھی۔ یا سجدہ سے مراد تواضع اور حکم کے تحت آ جانا ہے، لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔ اکثر مفسرین کے نزدیک اس خواب کا ظہور چالیس سال کے بعد ہوا تھا اور امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اسّی سال کے بعد[3] کہ جب باپ اور بھائی ان کے پاس اکٹھے ہوئے اور ان کے سامنے سجدے میں گرے۔[4]

قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝

اس (یعقوب) نے کہا: میرے پیارے بیٹے! اپنا خواب اپنے بھائیوں کو نہ سنانا، ورنہ وہ تیرے لیے کوئی (بری) تدبیر کریں گے، بے شک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے (5)

خوابِ یوسف علیہ السلام کی تعبیر اور باپ کی اس سے متعلق ہدایات:

یعنی اس کی تعبیر ظاہر ہے سنتے ہی سمجھ لیں گے۔ گیارہ بھائی تھے اور ایک ماں، ایک باپ ان کی طرف محتاج ہوں گے، پھر شیطان ان کے دل میں حسد ڈال دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ یعقوب علیہ السلام نے اپنے فرزند یوسف علیہ السلام کو ان کا خواب سن کر اس کے اظہار سے منع کر دیا، کیونکہ اس خواب کی تعبیر یہ ہے کہ بھائی ان کے سامنے خاکساری اور معمول سے زیادہ ان کی تعظیم کریں، یعنی ان کے سامنے پست ہو کر ان کی عزت و احترام کے لیے سجدے میں گر پڑیں۔ ان کو اس ڈر سے منع کیا کہ کہیں وہ اپنا خواب بھائیوں سے بیان نہ کر دیں۔ پھر ان کے دل میں حسد پیدا ہو اور وہ مکر و فریب کریں اور ان کو ہلاک کرنے کے لیے کوئی حیلہ نکالیں۔

اسی لیے سنتِ مطہرہ میں مرفوعاً آیا ہے: «اِذَا رَأَى أَحَدُكُمْ مَا يُحِبُّ فَلْيُحَدِّثْ بِهِ، وَإِذَا رَأَى مَا يَكْرَهُ فَلْيَتَحَوَّلْ إِلٰى جَنْبِهِ الْآخَرِ، وَلْيَتْفُلْ عَنْ يَّسَارِهِ ثَلَاثًا، وَلْيَسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنْ شَرِّهَا، وَلَا يُحَدِّثْ بِهَا أَحَداً فَإِنَّهَا لَنْ تَضُرَّهُ» یعنی جو کوئی اچھا خواب دیکھے تو اسے بیان کرے اور برا خواب دیکھے تو کروٹ بدل دے اور بائیں طرف تھتکار دے اور اس کے شر سے اللہ کی پناہ مانگے اور کسی سے اس کا ذکر نہ کرے، یہ خواب اس کو نقصان

[1] تفسير الطبري (١٥/ ٥٥٦۔ ٥٥٧) الدر المنثور (٤/ ٤٩٩)
[2] فتح القدير (٣/ ٧)
[3] تفسير البغوي (٤/ ٢١٦)
[4] فتح البيان (٦/ ٢٨٧۔ ٢٨٨)

نہ دے گا۔[1] دوسری حدیث میں فرمایا ہے: «اَلرُّؤْيَا عَلٰى رِجْلِ طَآئِرٍ مَّا لَمْ تُعَبَّرْ، فَإِذَا عُبِّرَتْ وَقَعَتْ »[2] (رواہ أحمد عن معاویة القشیري) [جب تک خواب کی تعبیر نہ لی جائے وہ گویا پرندے کے پاؤں پر ہے، ہاں جب اس کی تعبیر بیان ہوگئی تو پھر وہ واقع ہو جاتا ہے] اسی جگہ سے یہ بات اخذ کی گئی ہے کہ نعمت کا اخفا کرے، یہاں تک کہ وہ ہاتھ آئے اور ظاہر ہو جائے جس طرح کہ حدیث میں آیا ہے: «اِسْتَعِيْنُوْا عَلٰى قَضَآءِ الْحَوَائِجِ بِكِتْمَانِهَا » [ضرورتوں کے پورا کرنے پر ان کے چھپانے سے بھی مدد لیا کرو] کیونکہ ہر ذی نعمت شخص سے حسد کیا جاتا ہے۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کو منع کیا کہ تم اپنا خواب اپنے بھائیوں سے بیان نہ کرنا، یہ اس لیے کہ یعقوب علیہ السلام اس خواب کی تعبیر جان گئے تھے، ان کو ڈر ہوا کہ کہیں بھائی بھی تعبیر نہ سمجھ لیں اور حسد کریں، کیونکہ شیطان ان کا کھلا دشمن ہے۔ احادیثِ صحیحہ میں رؤیائے صالحہ کا ذکر آیا ہے کہ ایسے خواب اللہ کی طرف سے ہوتے ہیں اور برے خواب شیطان کی طرف سے۔[4] مومن کا خواب نبوت کے چالیس حصوں میں سے ایک حصہ ہے،[5] لیکن ان احادیث کو اس آیت سے کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ یہ اخبار عام ہیں۔ جس شخص نے خوابوں کا انکار کیا ہے، یا ان پر کوئی اعتبار نہ ہونے کا بیان کیا ہے اس کی واضح تردید اس آیت اور خواب کے متعلق احادیث سے ہوتی ہے۔[6]

وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰۤى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَاۤ اَتَمَّهَا عَلٰۤى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۶

اور اسی طرح تیرا رب تجھے ممتاز (مقام عطا) کرے گا اور تجھے باتوں کی اصل حقیقت سمجھنے کی صلاحیت میں سے کچھ سکھائے گا، اور تجھ پر اور آلِ یعقوب پر اپنی نعمت پوری کرے گا، جس طرح اس نے اس سے پہلے اسے

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٦٣٧) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٢٦١)

[2] مسند احمد میں اور سنن میں ان الفاظ کے ساتھ روایت معاویہ قشیری رضی اللہ عنہ کے بجائے ابو رزین لقیط بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ دیکھیں: سنن أبي داود، رقم الحدیث (٥٠٢٠) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٢٢٧٨) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٣٩١٤) مسند أحمد (٤/ ١٠) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٣٥٣٥)

[3] المعجم الکبیر (٢٠/ ٩٤) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (١٤٥٣)

[4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣١١٨) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٢٦١)

[5] سنن الترمذي، رقم الحدیث (٢٢٧٨) مسند أحمد (٤/ ١٢) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٣٤٥٦)

[6] فتح البیان (٦/ ٢٨٨۔ ٢٨٩)

تیرے باپ، دادا ابراہیم اور اسحاق پر پورا کیا تھا، بے شک تیرا رب خوب جاننے والا، بڑی حکمت والا ہے ⑥

یعقوب علیہ السلام کی یوسف علیہ السلام کو نبوت وغیرہ کی بشارت:

اللہ کی نوازش سجدے سے سمجھی اور معاملہ فہمی کی، یعنی اس میں خوابوں کی تعبیر شامل ہے، ان کے ذہن کی رسائی سے اور لیاقت سے کہ ایسا موزوں خواب دیکھا چھوٹی عمر میں۔ ابراہیم اور اسحاق علیہما السلام کا نام لیا، اپنا نام نہ لیا، عاجزی کی وجہ سے۔ اللہ نے یعقوب علیہ السلام کی بات کا ذکر کیا جو انھوں نے اپنے بیٹے سے کہی تھی کہ جس طرح اللہ نے تجھ کو پسند کیا اور تجھے ان ستاروں کو سجدہ کرتے ہوئے دکھایا، اسی طرح تیرا رب تجھے نبوت کے لیے برگزیدہ اور چیدہ کرے گا اور معاملہ فہمی سکھائے گا کہ تو خواب کی اچھی تعبیر بیان کرے گا۔ یہی امام مجاہد رحمہ اللہ اور کئی ایک اہلِ علم کا قول ہے۔[1] نعمت سے مراد رسول بنانا اور وحی کرنا ہے۔ فرمایا: تیرا رب خوب جانتا ہے کہ رسالت کس جگہ رکھنا چاہیے: ﴿ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ﴾ [الأنعام: ١٢٤] ”اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کا کام کس کو سونپے۔“

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اِجْتِبَاء کے معنی اِصْطِفَاء کے ہیں۔ اللہ کا کسی بندے کو مجتبیٰ کرنا یہ ہے کہ اس کو فیضِ الٰہی کے ساتھ خاص کرے، جس سے بندے کی کوشش کے بغیر ہر طرح کی عزت اور تکریم حاصل ہو، اور یہ مقام انبیا کے ساتھ مختص ہے اور بعض صدیقین اور شہدا اور صالحین کے ساتھ بھی خاص ہے۔ اس میں یوسف علیہ السلام کی تعریف ہے اور ان پر اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا ہے۔ تاویلِ احادیث سے مراد تاویلِ رؤیا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رؤیا کی تعبیر۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ علم اور حلم کی تاویل۔ یوسف علیہ السلام لوگوں میں بڑے معبر (تعبیر بیان کرنے والے) تھے۔[1]

رؤیا کو احادیث کہا، اس لیے کہ اگر سچی ہو تو اللہ کی بات ہے اور اگر جھوٹی ہے تو شیطان کی بات ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہلِ علم کا اس بات پر اجماع ہے کہ یہ آیت تاویلِ رؤیا کے بارے میں ہے۔ یوسف علیہ السلام سب لوگوں سے زیادہ تاویلِ رؤیا کا علم رکھتے تھے۔[3] امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تاویلِ احادیث سے مراد پہلی امتوں اور پہلی مُنزل کتابوں کا علم ہے۔[4] بعض نے کہا ہے کہ بھائیوں کا یوسف علیہ السلام کا حاجت مند ہونا مراد ہے۔ یا اللہ کا یوسف علیہ السلام کو ہر مکروہ چیز سے نجات دینا ہے، یا خاص طور پر قتل سے بچانا ہے۔

لفظ احادیث حدیث کی جمع تکثیر ہے، جیسے اباطیل اور اس جیسے اور الفاظ ہیں۔ اتمامِ نعمت سے مراد نبوت اور

---

① تفسير الطبري (١٥/ ٥٦٠) ② تفسير الطبري (١٥/ ٥٦٠) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٠٣)
③ تفسير القرطبي (٩/ ١٢٩) ④ معاني القرآن (٣/ ٩٢)

حکومت کو جمع کرنا ہے، جس طرح کہ یہ خواب اس پر دلیل ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ہم دنیا اور آخرت کی بھلائی تیرے لیے جمع کر دیں گے۔ آلِ یعقوب سے یعقوب علیہ السلام کی قرابت مراد ہے، بھائی اور اولاد اور ان کے بعد والے۔ ایک جماعت نے کہا ہے کہ اللہ نے ان کو نبوت کے بعد بادشاہت دی۔ اکثر مفسرین نے اسی طرح کہا ہے۔ اس نعمت کے اتمام کو اپنے باپ دادا پر اتمامِ نعمت کی مثل فرمایا۔ ان کی نعمت نبوت تھی اور ابراہیم علیہ السلام کو اللہ نے اپنا خلیل بنایا تھا اور اسحاق علیہ السلام کو ذبح سے بچایا تھا۔ یہی امام عکرمہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔

اللہ نے ابوین سے پاک اولاد نکالی جو یعقوب علیہ السلام اور یوسف علیہ السلام اور اسباط ہیں۔ ان کو ابوین کہا، حالانکہ یہ دادا کے باپ اور باپ کے باپ تھے۔ اس میں انبیا علیہم السلام کے ساتھ جس کمال کے ساتھ انھیں ملایا ہے اس کا بیان ہے۔ اللہ خلق کی تمام مصلحتوں کو جاننے والا اور اپنے افعال کا حکیم ہے۔ اللہ نبوت کو صرف نفسِ قدسیہ ہی میں رکھتا ہے۔ یعقوب علیہ السلام کی یوسف علیہ السلام سے یہ گفتگو اجمالاً ان کے خواب کی تعبیر تھی۔ یا اس کا علم وحی کے ذریعے سے، یا ان کی فراست سے حاصل ہوا جو فضائل یوسفیہ کا تقاضا تھا۔[1]

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖۤ اٰيٰتٌ لِّلسَّآىِٕلِيْنَ ۝۷ اِذْ قَالُوْا
لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰۤى اَبِيْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ ؕ اِنَّ اَبَانَا
لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنِۚ ۝۸ اقْتُلُوْا يُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا يَّخْلُ
لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ ۝۹
قَالَ قَآىِٕلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ وَاَلْقُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ
الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ۝۱۰

البتہ تحقیق یوسف اور اس کے بھائیوں (کے واقعے) میں سائلوں کے لیے نشانیاں ہیں ⑦ جب انھوں نے (آپس میں) کہا: یوسف اور اس کا بھائی (بنیامین) تو ہمارے باپ کو ہم سے زیادہ پیارے ہیں، حالاں کہ ہم ایک (طاقتور) جماعت ہیں، بے شک ہمارا باپ البتہ واضح غلطی پر ہے ⑧ تم یوسف کو قتل کر دو یا اسے کسی زمین میں پھینک دو کہ تمھارے باپ کا چہرہ تمھارے لیے خالی (مخصوص) ہو جائے، اور اس کے بعد تم نیک لوگ بن جانا ⑨ ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا: تم یوسف کو قتل نہ کرو اور تم اسے کنویں کی تہ (گہرائی) میں ڈال دو کہ اسے کوئی مسافر اُٹھا لے (جائے)، اگر تم (کچھ) کرنے ہی والے ہو ⑩

یوسف علیہ السلام کا قصہ اور اس میں موجود نصیحت وعبرت:

نقل ہے کہ قریش نے یہود سے کہا کہ کچھ بتاؤ کہ ہم سچ آزمانے کے لیے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پوچھیں۔ کہا: پوچھو

[1] فتح البیان (٦/ ٢٩٠۔ ٢٩١)

کہ ابراہیم علیہ السلام کا وطن شام ہے، اس کی اولاد بنی اسرائیل مصر میں کیوں کر آئی کہ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون سے معاملہ ہوا؟ یہ سورت اتری، فرمایا کہ پوچھنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں، یعنی قریش کے لیے۔ یہ ایک بھائی سے حسد کیا، اطاعت قبول نہ کی، آخر اللہ نے اسی کی طرف محتاج کیا اور اسی طرح یہود حسد کر کے خراب ہوئے اور قریش نے بھائی کو وطن سے نکالا، وہی اس کا عروج ہوا۔

﴿ نَحْنُ عُصْبَةٌ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ ہم وقت پر کام آنے والے ہیں اور یہ لڑکے چھوٹے ہیں۔ ایک بھائی ان کا سگا تھا، باقی سب سوتیلے تھے۔ نشانیوں سے مراد ان لوگوں کے لیے عبرت و موعظت ہے، جو قصۂ یوسف علیہ السلام کا سوال کرتے ہیں، کیونکہ یہ ایک عجیب خبر ہے اور اس قابل ہے کہ اس کا حال دریافت کریں۔ ان کے بھائیوں نے کہا باہم اپنے خیال پر کہ یوسف علیہ السلام اور ان کا بھائی بنیامین ہماری نسبت ہمارے باپ کو زیادہ پیارے ہیں، حالانکہ ہم ایک قوت والی جماعت ہیں، پھر جماعت کے مقابلے میں دو کو زیادہ چاہنا چہ معنی دارد! ہمارے باپ اس مزید محبت میں واضح طور پر غلطی پر ہیں کہ ہم سے زیادہ ان دونوں کو دوست رکھتے ہیں۔

کیا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں میں سے بھی کوئی نبی بنا؟

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ برادرانِ یوسف علیہ السلام پر نبوت کی کوئی دلیل قائم نہیں ہے، یعنی وہ یا ان میں سے بعض نبی نہیں تھے اور اس واقعے کا ظاہر اس کے خلاف دلیل ہے۔ بعض لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اس ماجرا کے بعد ان پر بھی وحی آئی، لیکن اس میں نظر ہے، اس بات کا مدعی دلیل کا محتاج ہے اور سوا اس قول کے: ﴿ قُوْلُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ ﴾ [البقرة: ١٣٦] ”تم کہو: ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر (ایمان لائے) جو ہماری طرف نازل کیا گیا اور جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد کی طرف نازل کیا گیا۔“ اور کچھ ذکر نہیں کیا۔ سو اس میں احتمال ہے، کیونکہ بنی اسرائیل کے بطون (اولاد) کو اسباط کہتے ہیں جس طرح کہ عرب کو قبائل اور عجم کو شعوب۔ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ ہم نے انبیائے اسباط بنی اسرائیل کی طرف وحی کی سو یہ ذکر ان کا اجمالاً ہے، اس لیے کہ یہ بہت تھے، لیکن ہر سبط برادرانِ یوسف میں سے ایک مرد کی نسل تھی۔ اس پر کوئی دلیل قائم نہیں ہے کہ ان کی طرف بھی وحی آئی۔

یوسف علیہ السلام کو باپ سے دور کرنے کی سازش:

بالجملہ بھائیوں نے یہ کہا کہ یہ شخص جو باپ کی محبت میں تمھارے آڑے آ رہا ہے اس کو باپ کے سامنے سے غائب کر دینا چاہیے، خواہ قتل کر کے، خواہ اس طرح کہ اسے کسی اور زمین میں پھینک دیا جائے۔ پھر تم آرام میں ہو جاؤ اور باپ کے ساتھ ملے جلے رہو اور جب اس کو غائب کر چکو تب نیک ہو جاؤ۔ انھوں نے گناہ سے پہلے توبہ کو

اپنے دل میں ٹھہرایا۔ ایک بھائی جس کے بارے میں امام قتادہ اور محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ان کا بڑا بھائی تھا، اس کا نام روبیل تھا۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ یہوذا تھا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شمعون تھا۔[1]

بالجملہ کوئی ہو اس نے یہ کہا کہ تم یوسف علیہ السلام کو قتل نہ کرو، یعنی اس کی عداوت اور بغض میں گمراہ نہ ہو اور وہ کیوں کر قتل کر سکتے تھے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ کچھ اور ہی تھا، اللہ اس کو جاری کرنے والا تھا، یعنی یوسف علیہ السلام کو وحی کر کے نبی بنائے، بلادِ مصر پر متمکن وحکمران بنائے، لہٰذا روبیل کے کہنے پر ان کو قتل کرنے سے باز رکھا۔ اس نے کہا کہ قتل کے بجائے یوسف کو کسی کنویں کی تہ میں ڈال دو۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ کنواں بیت المقدس تھا،[2] جو کوئی مسافروں میں سے ادھر سے گزرے گا وہ اس کو اٹھا کر کسی اور ملک میں لے جائے گا، اس طرح تمھاری جان چھوٹ جائے گی اور تم سب راحت وآرام میں ہو جاؤ گے، مارنے کی کیا ضرورت ہے! اگر تم کو یہ کام کرنا ہے تو پھر اس طرح کرو۔

امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ایک امرِ عظیم پر اتفاق و اجتماع کیا، یعنی قطع رحمی اور والد کی نافرمانی اور قلتِ رأفت ایک چھوٹے بے گناہ پر اور ایک بڑے شخص کی، جو اللہ کے نزدیک ذی حق و حرمت اور فضیلت و مرتبہ کا حامل ہو، عزت وتوقیر نہ کرنا باوجود اس بات کے کہ باپ کا بیٹے پر حق ہوتا ہے جب کہ باپ بوڑھا دبلا پتلا ہو، اس کی ہڈیاں خشک ہوں اور اللہ کی طرف سے بلند مرتبے اور شان والا ہو اور جس سے اس کو محبت تھی وہ ایک چھوٹی عمر کا کمزور بچہ تھا، جو باپ کی نرمی اور لطف کا محتاج تھا اور اس قابل تھا کہ باپ کے پاس رہے اور چین پائے۔ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَهُمْ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ، فَقَدِ احْتَمَلُوْا أَمْرًا عَظِيمًا.[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یوسف علیہ السلام اور برادرانِ یوسف کے اس قصے میں ایسی علامات ہیں جو اللہ کی عظیم قدرت اور اس کے کارنامے پر دلیل ہیں۔ ان لوگوں کے لیے، جو اس قصے کا یا کسی اور امر کا حال پوچھتے ہیں، یہ قصہ کافی ہے۔ اہلِ مکہ کی قراءت ﴿ اٰیَۃٌ لِّلسَّآئِلِیْنَ ﴾ ہے، صیغہ واحد پر۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قراءت حسن ہے۔

یا اس قصے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر دلیل ہے۔ مکہ میں یہود کی ایک جماعت نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ ہمیں ایک پیغمبر کی خبر دو جو شام میں تھا اور اس کا بیٹا مصر کی طرف نکالا گیا، وہ اپنے بیٹے کے غم میں اتنا رویا کہ اندھا ہو گیا۔ مکے میں اہلِ کتاب میں سے کوئی نہیں تھا اور نہ کوئی ایسا آدمی جو انبیا کا حال پہچانے۔ یہود نے ایک آدمی مدینے سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہ سوال کرنے کے لیے بھیجا، اس پر اللہ نے سورت یوسف ایک ہی دفعہ نازل کی

---

[1] تفسير الطبري (١٥/ ٥٦٤۔ ٥٦٥) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٠٦) [2] تفسير الطبري (١٥/ ٥٦٦)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٠٦) تفسير ابن كثير (٢/ ٦١١)

جس طرح کہ تورات میں ہے۔[1] بعض نے کہا ہے کہ آیت سے مراد عجب ہے، یعنی یہ ایک عجیب قصہ ہے ؎

فریاد حافظ ایں ہمہ آخر بہرزہ نیست ہم قصہ عجیب و حدیث غریب ہست

''حافظ کی فریاد انجام کار یہ کوئی بے ہودہ ولغو نہیں ہے۔ یہ بھی عجیب کہانی اور نادر بات ہے۔''

اور بعض نے کہا ہے کہ آیت سے مراد بصیرت ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ عبرت ہے، اس لیے کہ اس بابرکت داستان میں طرح طرح کے مواعظ و عبرتیں و حِکَم ہیں، جیسے: یوسف علیہ السلام کے خواب، خوابوں کی تعبیر اور بھائیوں کا حسد اور ان کے امر کا انجام اور بھائیوں کی ایذا رسانی پر یوسف علیہ السلام کا صبر اور یوسف علیہ السلام کی جدائی اور گم ہو جانے پر یعقوب علیہ السلام کے حزن و ملال کا ذکر اور اس طرح کی دیگر باتیں۔

امام قرطبی رحمہ اللہ نے برادرانِ یوسف علیہ السلام کے یہ نام بتائے ہیں: روبیل، یہ سب سے بڑے تھے، شمعون، لاوی، یہوذا، زیالون اور یشجر، ان سب کی ماں لیا بنت لیان یعقوب علیہ السلام کے ماموں کی بیٹی تھی۔ زلفہ اور بلہہ دو کنیزوں سے چار بیٹے پیدا ہوئے: دان، نفتالی، جاد اور آشر۔ پھر لیا کا انتقال ہو گیا، تب یعقوب علیہ السلام نے اس کی بہن راحیل سے نکاح کیا، اس سے یوسف و بنیامین پیدا ہوئے، یہ سب یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہے، انھی کو اسباط کہتے ہیں، یہ سب بارہ نفر تھے۔ امام سہیلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یوسف علیہ السلام کی ماں کا نام وفقا تھا، اور راحیل وہ نفاسِ بنیامین میں مر گئیں۔[2]

بنیامین یوسف علیہ السلام سے چھوٹے تھے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کوئی تم سے یوسف علیہ السلام کا قصہ دریافت کرے تو وہ یہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے تم سے اس سورت میں بیان کیا ہے اور امام ضحاک رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح خبر دی ہے۔[3] امام ابن اسحاق رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ نے یوسف علیہ السلام کی خبر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بیان کی اور ان کے بھائیوں کی بغاوت کا ذکر کیا کہ خواب کی وجہ سے انھوں نے حسد کرنا شروع کیا، اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کی سرکشی اور حسد پر تسلی دی ہے، تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی پہلے انبیا کی اقتدا پر رہیں۔

بھائیوں نے کہا کہ یوسف علیہ السلام اور اس کا بھائی بنیامین ہمارے باپ کو ہم سے زیادہ محبوب ہیں۔ بنیامین باء کی زیر کے ساتھ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ زبر کے ساتھ صحیح ہے۔ یہ یوسف علیہ السلام سے چھوٹے تھے۔ ان کو یوسف علیہ السلام کا بھائی اس لیے کہا ہے کہ یہ دونوں ایک ماں باپ سے تھے، یعنی سگے بھائی، ورنہ یہ سب ہی ان کے بھائی تھے۔ یہ بات اس لیے کہی کہ ان کو یوسف علیہ السلام کے خواب کی خبر لگ گئی۔ پس سب نے کید (منصوبے) پر اتفاق کیا۔

---

[1] تفسير القرطبي (٩/ ١٢٩۔ ١٣٠)

[2] تفسير القرطبي (٩/ ١٣٠) فتح القدير (٣/ ١٠) تفسیر القرطبی میں امام سہیلی رحمہ اللہ کے قول میں ''یوسف'' کے بجائے ''یعقوب'' کا ذکر ہے۔ البتہ فتح القدیر میں مذکورہ قول میں ''یوسف'' کا ہی ذکر ہے۔

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٠٤) الدر المنثور (٤/ ٥٠٠)

﴿ عُصْبَةٌ ﴾ کہتے ہیں ایسی جماعت کو جو ایک سے دس تک کے افراد پر مشتمل ہو، یا تین اور دس کے درمیان، یا دس لوگوں کو، یا دس سے پندرہ تک کو، یا چھے سے یا نو یا دس سے چالیس تک کو۔[1] (قاله قتادة) انھوں نے کہا: ہمارے باپ کا یوسف اور اس کے بھائی کو ہم پر ترجیح دینا بغیر تدبیر کے ہے، کیونکہ جب ہم سب نسب میں برابر ہیں تو پھر اس ترجیح دینے سے کیا مطلب ہے؟ یہ مراد نہیں کہ معاذ اللہ وہ دین میں گمراہ ہیں، کیونکہ اگر ان کی مراد یہ ہوتی تو وہ سب کافر ہو جاتے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے: "أَيْ لَفِي خَطَأٍ مِّنْ رَأْيِهِ"[2] [یعنی اپنی رائے میں خطا کار ہے]

صلاح یہ ٹھہری کہ یوسف علیہ السلام کو مار ڈالنا چاہیے، یا کسی دور دراز ویران سی نامعلوم جگہ پر پھینک دینا چاہیے۔ ان دو کاموں میں سے ایک کام ضرور کرنا چاہیے۔ یہ بات ایک بھائی نے کہی اور باقی بھائی اس پر متفق ہوئے۔ یہ اس لیے کہ باپ کی ساری محبت ہمارے ساتھ رہے، اس کے بعد ہم اپنے امورِ دین میں صالح اور باپ کے مطیع رہیں گے، یا امورِ دنیا میں یوسف کی طرف سے فارغ البال ہو جائیں گے۔ صلاح سے مراد زمانۂ مستقبل میں توبہ ہے۔ ایک بھائی نے کہا، یعنی یہوذا یا روبیل یا شمعون نے، پہلا زیادہ صحیح ہے، کہ یوسف کو جان سے نہ مارو اور نہ کسی ویران جگہ پر پھینکو، بلکہ کسی ایسے کنویں میں ڈال دو جس سے لوگ پانی بھرتے ہوں کہ یہ خلاصی پانے کے لیے سب سے مؤثر اور بہتر طریقہ ہے۔ اس بھائی نے یہ ایک تیسری شکل بتائی جو پہلی دونوں شکلوں کی نسبت یوسف علیہ السلام کے حق میں زیادہ نرم تھی۔

﴿ غَيٰبَتِ ﴾ سے مراد شے غائب ہے، یعنی پانی کی جڑ میں پھینک دو، جہاں کسی کی نظر نہ پڑے، یا کنویں کے طاقچہ میں رکھ دو۔ امام ہروی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ غیابت کے معنی سدِ ماء طاقچہ (پانی کو روکنے کے لیے کوئی طاقچہ) ہے جو پانی کے قریب اور نظر سے دور ہو اور پوشیدہ ہو۔[3] امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ غیابت کنویں کے سب سے نیچے والا حصہ، یعنی کنویں کی گہرائی ہے، وہ کنویں کے اوپر والے حصے کی نسبت زیادہ وسیع ہوتا ہے، دیکھنے والا اس کے کناروں کی طرف نظر نہیں کر سکتا۔[4] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ کنواں بیت المقدس میں تھا۔[5] بعض نے کہا ہے کہ ایلیا کے گرد و نواح میں تھا۔ امام وہب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اردن میں تھا۔[6] کسی نے کہا ہے کہ شام میں تھا۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ طبریہ سے چند میل کے فاصلے پر۔[7] امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعقوب علیہ السلام کے گھر سے تین فرسخ کے فاصلے پر تھا۔[8]

﴿ اَلسَّيَّارَةِ ﴾ سے مراد وہ جماعت ہے جو راہ میں چلتی پھرتی ہے، جیسے ہند کے بنجارے، جمع سیار، مبالغہ ہے سیر میں۔ التقاط کہتے ہیں کسی پڑی ہوئی چیز کو راستے میں سے اٹھا لینا، جس کے ضائع ہونے کا احتمال ہو۔ مطلب یہ ہے کہ راہ گیر اس کو لے کر کسی دوسری جگہ لے جائیں گے، جہاں اس کو جاننے والا کوئی نہ ہوگا اور باپ سے مخفی رہے گا

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٠٥) [2] الدر المنثور (٤/ ٥٠٨) [3] تفسير القرطبي (٩/ ١٣٢)
[4] اللباب في علوم الكتاب (١١/ ٢٧) [5] تفسير الطبري (١٥/ ٥٦٦) [6] تفسير البغوي (٤/ ٢٢١)
[7] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٠٧) [8] تفسير البغوي (٤/ ٢٢١)

اور خود ہمیں اس کو کسی دور دراز مقام پر لے جانا نہیں پڑے گا، کیونکہ شاید باپ ہم کو دور دراز سفر کی اجازت نہ دیں۔ یہ ایک ایسا کنواں تھا جہاں اکثر مسافروں کا گزر ہوا کرتا تھا۔ اس بھائی نے زور دے کر یہ بات نہیں کہی، بلکہ یہ کہا کہ اگر تم کو یہ کام کرنا ہے تو اس طرح کرو۔ گویا صرف مشورہ دیا۔

اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ برادرانِ یوسف پیغمبر نہ تھے، اس لیے کہ انبیا کسی مسلم کو ظلم اور سرکشی کے طور پر قتل کرنے پر متفق نہیں ہو سکتے اور نہ ان کے لیے جائز ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ وہ انبیا تھے، ان کے دل میں حسد کی آگ بھڑکی اور سینے میں غصے کی چنگاری چمکی، اس وجہ سے ان کے قدم اس طریقے سے پھسلے، لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ انبیا ایسے کبیرہ گناہ سے جو حد سے بڑھا ہوا ہو، معصوم ہوتے ہیں، حالانکہ اس حرکت بے برکت میں قطع رحمی، باپ کی نافرمانی، جھوٹ باندھنا، چھوٹے پر مہربانی کا فقدان، امانت میں خیانت اور عہد کو توڑنا وغیرہا ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ انھوں نے تو قتل کا ارادہ کر ہی لیا تھا، مگر اللہ نے ان پر رحمت کر کے اس فعل سے محفوظ رکھا، وہ اگر یہ کام کرتے تو سب کے سب ہلاک ہو جاتے، بعض نے کہا ہے کہ وہ اس وقت انبیا نہ تھے، بلکہ اس کے بعد نبوت کو پہنچے اور یہ سب کچھ اللہ کے منع کرنے سے پہلے ہوا۔

بالجملہ جب یہ رائے قرار پا گئی کہ یوسف علیہ السلام کو کنویں کی تاریکی میں لے جا کر ڈال دیں تو سب مل کر باپ کے پاس آئے اور ان کو مہربانی کرنے کے لیے بلفظ "أَبُوَّة" سے خطاب کیا اور مطلب یوسف علیہ السلام کے ساتھ کید (فریب) کرنا تھا۔[1]

قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ وَ اِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ۝۱۱ اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَ يَلْعَبْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۝۱۲

انھوں نے کہا: اے ہمارے ابا جان! آپ کو کیا ہے کہ آپ ہم پر یوسف کی بابت اعتبار نہیں کرتے، حالاں کہ یقیناً ہم اس کے خیر خواہ ہی ہیں (11) آپ کل اسے ہمارے ساتھ بھیجیں کہ خوب (پھل) کھائے (پیے) اور کھیلے کودے اور ہم یقیناً اس کے محافظ ہیں (12)

برادرانِ یوسف کا سازش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے باپ سے اجازت مانگنا:

بکریاں چرانے کے لیے جنگل جاتے تھے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ روبیل کے کہنے پر یہ تمہید بنائی اور باپ سے آ کر گفتگو کی اور دل اس دعوے کے برخلاف تھا، کیونکہ دل میں حسد کی آگ بھڑک رہی تھی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿ يَرْتَعْ وَيَلْعَبْ ﴾ سے مراد "يَسْعىٰ وَيَنْشِطُ" ہے، یعنی دوڑے اور خوش ہو۔[2]

[1] فتح البيان (٦/ ٢٩١_ ٢٩٦) [2] تفسير الطبري (١٥/ ٥٧٠) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔

امام قتادہ اور سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے[1] اور ہم اس کی حفاظت کریں گے، آپ کی مزید محبت کی وجہ سے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ کل آپ اس کو ہمارے ساتھ بھیج دیں، یعنی صحرا کی طرف، یہ وہاں جا کر چرے گا، یعنی پھل وغیرہ خوب کھائے گا اور ہمارے ساتھ بکریاں چرائے گا اور کھیلے کودے گا۔ لعب سے مراد صرف خوشی اور سینے کی فراخی ہے یا وہ کھیل ہے جس سے جنگ کا طریقہ سیکھتے ہیں۔ اس وقت کا لعب یہی دوڑنا اور تیر چلانا تھا، دشمنوں سے جنگ کرنے کے لیے، جیسا کہ ان کے قول میں ہے: ﴿ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ ﴾ [یوسف: ١٧] ''بے شک ہم دوڑ کا مقابلہ کرنے لگے تھے۔'' نہ کھیل کود ممنوع کہ حق کے برخلاف ہو، اس لیے یعقوب علیہ السلام نے اس سے انکار نہ فرمایا۔ اسی جگہ سے یہ حدیث بھی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے کہا تھا: « فَهَلَّا بِكْرًا تُلَاعِبُهَا وَتُلَاعِبُكَ »[3] ''تو نے کنواری عورت سے شادی کیوں نہیں کی، تو اس کے ساتھ کھیلتا اور وہ تیرے ساتھ کھیلتی'' بالجملہ انھوں نے اس التماس کے ساتھ یوسف علیہ السلام کی حفاظت کا ذمہ بھی لیا۔[4]

قَالَ اِنِّيْ لَيَحْزُنُنِيْۤ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَ اَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَ اَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ۝۱۳ قَالُوْا لَىِٕنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّاۤ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ۝۱۴

اس (یعقوب) نے کہا: بے شک مجھے تو یہ بات غمگین کیے دیتی ہے کہ تم اسے لے جاؤ اور مجھے خوف آتا ہے کہ اسے بھیڑیا کھا جائے اور تم اس سے غافل ہو (13) انھوں نے کہا: اگر اسے بھیڑیا کھا جائے، جب کہ ہم ایک (طاقتور) جماعت ہیں تو بلاشبہہ ہم تو تب خسارہ پانے والے ہوئے (14)

یعقوب علیہ السلام کی طرف سے انجانے خدشے کا اظہار:

اللہ نے یعقوب علیہ السلام کے جواب کی خبر دی کہ انھوں نے یہ عذر کیا کہ جب تک یہ پھر کر آئے گا، مجھ کو اس کی جدائی رنج دے گی۔ یہ اس لیے کہ ان کو یوسف علیہ السلام کے ساتھ نہایت محبت تھی۔ وہ ان میں خیرِ عظیم کا نشان اور نبوت کی عادات کی پہچان اور خلق اور اخلاق کا کمال دیکھتے تھے۔ کہا: مجھے ڈر ہے کہ تم اپنی تیر اندازی اور بھاگ دوڑ میں مشغول رہو اور کوئی بھیڑیا آ کر اس کو کھا جائے اور تمھیں خبر تک نہ ہو۔ انھوں نے اسی بات کو جو باپ کی زبان سے نکلی اپنا ایک عذر بنا لیا اور اسی گھڑی میں یہ جواب دے دیا کہ اگر اس کو بھیڑیا کھا گیا اور ہم ایک جماعت تھے تو یہ ہمارا خسران اور زیان ہے۔

[1] تفسیر الطبري (١٥/ ٥٧٠۔ ٥٧١) [2] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٦١٢)
[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢١٨٥) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٧١٥) [4] فتح البیان (٦/ ٢٩٧)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے یہ بات یوسف علیہ السلام کے لیے ڈر محسوس کر کے کہی تھی۔ اس کو بھیڑیے کے لفظ سے کنایہ ظاہر کیا۔ بعض نے کہا ہے کہ نہیں بلکہ حقیقت میں اس جگہ پر بھیڑیے کثرت سے ہوتے تھے۔ اگر یہ ڈر ہوتا کہ بھائی اس کو مار ڈالیں گے تو حفاظت کے لیے کسی اور کو ان کے ہمراہ بھیج دیتے۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں آیا ہے: «لَا تُلَقِّنُوا النَّاسَ فَيَكْذِبُوا فَإِنَّ بَنِي يَعْقُوبَ لَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ الذِّئْبَ يَأْكُلُ النَّاسَ، فَلَمَّا لَقَّنَهُمْ أَبُوهُمْ كَذَبُوا فَقَالُوا: أَكَلَهُ الذِّئْبُ» [1] (أخرجه أبو الشيخ وابن مردويه والسلفي) [لوگوں کو کوئی ایسی بات نہ سکھاؤ کہ وہ اس کے ساتھ تم سے جھوٹ بول دیں، یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ بھیڑیے لوگوں کو کھا جاتے ہیں، جب ان کے باپ ہی نے ان کو یہ بیان کر دیا تو انھوں نے جھوٹ بولتے ہوئے کہہ دیا کہ یوسف علیہ السلام کی بھیڑیا کھا گیا ہے]

بالجملہ برادرانِ یوسف نے پہلے عذر کا تو کچھ جواب نہ دیا، اس لیے کہ لوٹنے میں ابھی کافی وقت تھا یا اس لیے کہ ان کی غرض یعقوب علیہ السلام کے غم اور فکر کو دور کرنا نہ تھا، بلکہ انھیں غم میں ڈالنا تھا۔ دوسرے عذر کا جواب دیا اور اپنے فریب کو مخفی رکھا اور یہ کہہ کر ٹالا کہ ہم دس لوگ ہیں، ہمارے ہوتے ہوئے اگر بھیڑیا اس کو کھا گیا تو ہم زیاں کار ہوئے۔[2]

فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهِ وَأَجْمَعُوا أَنْ يَجْعَلُوهُ فِي غَيَابَتِ الْجُبِّ ۚ وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِأَمْرِهِمْ هَٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿١٥﴾

پھر جب وہ اسے لے گئے اور انھوں نے طے کر لیا کہ اسے کنویں کی تہ میں ڈال دیں، تب ہم نے یوسف کی طرف وحی بھیجی کہ تو انھیں ان کا یہ کام ضرور بتائے گا، جب کہ وہ نہیں سمجھتے ہوں گے (15)

بھائیوں کا یوسف علیہ السلام کو کنویں میں گرانا:

پھر فرمایا: جب لے کر چلے، آگے نہ فرمایا کہ کیا ہوا، اس لیے کہ بھائیوں نے جو سلوک کیا وہ لائقِ بیان نہیں۔ راہ میں برا بھلا کہتے اور مارتے ہوئے لے گئے، ان کے رونے پر رحم کھایا نہ فریاد پر۔ کنویں میں ڈالا، وہ کنارے کو پکڑ کر رہ گئے، تب رسی سے باندھ کر لٹکایا، آدھی دور سے چھوڑ دیا۔ پانی میں گرے، چوٹ سے بچ گئے، کونے میں ایک پتھر پر بیٹھ رہے۔ بھائیوں نے کرتا اتار کر ننگا کر کے کنویں میں ڈالا، تب اللہ تعالیٰ کی بشارت پہنچی کہ ایک وقت تُو ان کو یاد دلائے گا ان کا یہ کام۔ اس کہنے میں کہ انھوں نے کنویں کے اندر ڈالنے پر اتفاق کیا، ان کے فعل کی تعظیم ہے کہ سب کا اتفاق ہوا کہ کنویں کی تہہ میں گرا دیں، حالانکہ جس وقت باپ کے پاس سے ان کو لیا تھا، تو ان کی عزت

---

[1] الدر المنثور (٤/ ٥١٠) [2] فتح البیان (٦/ ٢٩٨)

کرنے اور ان کو خوش کرنے کے ارادے کا اظہار کیا تھا۔

کہتے ہیں کہ یعقوب علیہ السلام نے جس وقت یوسف علیہ السلام کو ان کے ہمراہ کیا تھا تو گلے لگا کر پیار کیا اور دعا دی، یوسف کی عزت اور ایذا کے درمیان صرف اتنا فاصلہ ہوا کہ وہ باپ کی نگاہ سے غائب ہوئے اور چھپ گئے تو پھر قول وفعل سے ایذا دینے لگے۔ گالی دیتے اور مارتے، پھر اس کنویں پر لائے جس میں یوسف علیہ السلام کو ڈالنا تھا۔ ایک رسی سے باندھ کر لٹکایا، جیسے ڈول کو کنویں میں ڈالتے ہیں۔ جب وہ کسی بھائی کی طرف التجا کرتے تو وہ ان کو گالی دیتا اور طمانچہ مارتا اور جب وہ کسی جانب سے کنویں کو ہاتھ سے پکڑتے تو ان کے ہاتھوں کو مارتے۔ پھر جب آدھے راستے پر پہنچے تو رسی کاٹ دی اور وہ پانی میں گر گئے۔ کنویں کے درمیان ایک پتھر تھا، اس کو راغوفہ کہتے تھے، اس پر کھڑے ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس جگہ اپنے لطف وکرم کا ذکر کیا اور تکلیف کے اس وقت میں آسانی نازل فرمانے کا حال بیان فرمایا کہ ہم نے اس حالت میں یوسف علیہ السلام کی دل جوئی کے لیے یہ پیغام بھیجا، تاکہ دل ان کا خوش ہو جائے اور وہ ثابت قدم رہیں کہ تُو اس حال پر کچھ رنج نہ کر، تجھ کو ان شاء اللہ جلد اس غربت اور تکلیف سے کشادگی اور نجات حاصل ہو گی اور اللہ تجھ کو ان پر نصرت دے گا اور تجھ کو بلند مرتبہ اور بلند رتبے والا کرے گا اور تُو ان کو ان کے کردارِ ناہنجار پر آگاہ کرے گا اور وہ نہیں جانتے ہوں گے۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: یعنی ان کو اس وحی آنے کی کچھ خبر نہ ہو گی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یعنی وہ تجھ کو نہیں پہچانتے اور نہ ہی تیرے حال سے آگاہ ہیں۔[1] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے تھے کہ جب یوسف علیہ السلام کے بھائی ان کے پاس داخل ہوئے تو یوسف علیہ السلام نے ان کو پہچان لیا اور انھوں نے یوسف علیہ السلام کو نہ پہچانا۔ صاع کو لا کر یوسف علیہ السلام کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ پھر اس کو ٹھونکا تو اس نے آواز کی، یوسف علیہ السلام نے فرمایا: مجھ کو یہ جام خبر دیتا ہے کہ تمھارا ایک بھائی تھا، تمھارے باپ کی طرف سے، اس کو یوسف کہتے تھے، باپ اس کو تم سے الگ اپنے قریب رکھتا تھا اور تم اس کو لے گئے اور ایک گم نام کنویں میں ڈال آئے۔ پھر دوبارہ اس جام کو بجایا، اس نے پھر آواز کی، فرمایا: تم نے باپ کے پاس جا کر کہا: یوسف کو بھیڑیا کھا گیا اور اس کے کرتے پر جھوٹا خون لگا کر لائے، اس وقت بعض نے بعض سے کہا کہ یہ جام تو تمھارے حال کی خبر دیتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ آیت انہی بھائیوں کے حق میں نازل ہوئی ہے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جب یوسف علیہ السلام کو یعقوب علیہ السلام کے پاس سے لے گئے اور پکا ارادہ کر لیا کہ ان کو کنویں

[1] تفسير الطبري (١٥/ ٥٧٦) تفسير ابن كثير (٢/ ٦١٢۔ ٦١٣)

[2] تفسير الطبري (١٥/ ٥٧٦۔ ٥٧٧) یہ نصِ قرآنی کے مخالف ہے۔ مزید علامہ احمد شاکر رحمہ اللہ کا کلام دیکھیں۔

کی تہ میں ڈال دیں تو جو کچھ ایذا دینا تھی وہ دی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یوسف علیہ السلام کنویں میں تین دن رہے۔[1] باجود چھوٹی عمر ہونے کے اللہ تعالیٰ نے خوش خبری دینے کے لیے اور ان کی وحشت کو دور کرنے کے لیے ان کو وحی کی۔ بالجملہ یوسف علیہ السلام کو تکلیف دینے کے لیے ان کے دس بھائی اکٹھے ہوئے۔ اللہ نے ان کے سخت دلوں سے رحمت اور نرمی کو سلب کر لیا تھا، کیونکہ دین سے قطع نظر انسانی طبیعت بچے کے گناہ سے تجاوز کرتی ہے اور بچے کے عجز اور ضعف کے سبب ادنیٰ سی تکلیف کو دور کرنے سے بچے کا گناہ بخش دیتی ہے، چہ جائیکہ وہ بچہ بے گناہ ہو، بلکہ ایسا بچہ ہو جو اپنا بھائی بھی ہو اور اس کا باپ بھی یعقوب علیہ السلام کی طرح موجود ہو۔ جس نے یہ بات کہی کہ وہ بھائی انبیا تھے، وہ صحیح بات سے بہت دور نکل گیا، کیونکہ انبیا کا عمل اور صلحا کا فعل ایسا نہیں ہوتا۔

آیتِ باب اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ چاہے تو صغیر کو وحی کرے اور نبوت بخشے، جس طرح عیسیٰ بن مریم علیہما السلام اور یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کے ساتھ ایسا ہی کیا تھا۔ بعض نے کہا ہے کہ اس جگہ وحی سے مراد الہام ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ ﴾ [النحل: ٦٨] ''اور آپ کے رب نے شہد کی مکھی کو الہام کیا۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى ﴾ [القصص: ٧] ''اور ہم نے موسیٰ کی ماں کو الہام کیا۔'' لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ وہ اس وقت بالغ تھے، لیکن یہ نہایت بعید ہے، اس لیے کہ بالغ پر یہ خوف نہیں ہوتا کہ اس کو بھیڑیا کھا جائے گا۔ وہ وحی یہ تھی کہ اے یوسف! تُو ان کو ان کے فعل پر، یعنی فریب کاری پر جس کا انھوں نے ارادہ کیا ہے، اس حال سے رہائی کے بعد خبردار کرے گا اور اس وقت انھیں علم نہ ہوگا کہ تُو ان کا وہی بھائی ہے جس کے ساتھ انھوں نے یہ سب کچھ کیا تھا، اس لیے کہ ان کے اعتقاد میں یہ بات ہوگی کہ جب ہم نے کنویں میں ڈال دیا تو وہ ہلاک ہو گیا۔ نیز وہ ایک مدتِ دراز کے بعد تجھے دیکھیں گے اور تُو اس وقت اپنے حال سے مختلف اور ہی حال میں ہو گا۔ یوسف علیہ السلام نے ان سے جو کچھ مصر میں داخل ہونے کے وقت کہا تھا، اس کا ذکر آیندہ آئے گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس وحی نے ان پر اس مشکل حال کو آسان اور سہل کر دیا۔[2]

وَجَآءُوْٓ اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ ﴿١٦﴾ قَالُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ ﴿١٧﴾ وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ۭ قَالَ بَلْ

---

[1] ان الفاظ کے ساتھ روایت سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے بجائے ابوبکر بن عیاش رحمہ اللہ سے مروی ہے۔ دیکھیں: تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٠٧) الدر المنثور (٤/ ٥١٢)

[2] تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٠٩) فتح البیان (٦/ ٢٩٩۔ ٣٠٠)

سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ۝۱۸

اور وہ اپنے باپ کے پاس عشاء کے وقت روتے ہوئے آئے⑯ انھوں نے کہا: اے ہمارے ابا جان! بے شک ہم دوڑ کا مقابلہ کرنے لگے تھے اور یوسف کو اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا تھا تو اسے بھیڑیا کھا گیا اور آپ ہماری بات کا یقیناً کرنے والے نہیں، اگرچہ ہم سچے ہی ہوں⑰ اور وہ اس کی قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون بھی لگا لائے، اس (یعقوب) نے کہا: (حقیقت یہ نہیں) بلکہ تمھارے نفسوں نے تمھارے لیے ایک (بری) بات آراستہ کر دی ہے، لہٰذا صبر ہی بہتر ہے اور اس پر اللہ ہی سے مدد مطلوب ہے جو تم بیان کرتے ہو⑱

برادرانِ یوسف کی ملمع سازی اور عذر خواہی:

یعنی کرتے پر لہو، وہی ان کا جھوٹ تھا، بھیڑیا کھاتا تو کُرتا کب ثابت چھوڑ جاتا۔ اللہ نے خبر دی کہ برادرانِ یوسف علیہ السلام نے یہ بات بنائی۔ تاریکیِ شب میں روتے ہوئے آئے اور افسوس اور غم کا اظہار کیا اور باپ کے سامنے غمگین بنے اور یہ عذر بیان کیا کہ ہم تو تیر لگانے اور دوڑنے میں تھے اور یوسف ہمارے سامان اور متاع کے پاس تھا، بھیڑیا آیا اور وہ اس کو کھا گیا، یہ وہی اندیشہ تھا جس پر یعقوب علیہ السلام نے خوف کیا تھا۔ پھر انھوں نے اپنی تقریر میں بہت مہربانی کا اظہار کیا کہ ہم جانتے ہیں کہ آپ ہمیں سچا نہ سمجھیں گے اور حالت یہ ہے کہ اگرچہ ہم آپ کے نزدیک سچے ہوں، چہ جائیکہ آپ ہمیں اس امر میں متہم کرتے ہیں، کیونکہ آپ کو یہی ڈر تھا کہ اس کو بھیڑیا کھا جائے گا، سو اتفاقاً ویسا ہی ہوا کہ وہ بھیڑیے کا لقمہ بن گیا اور آپ ہمیں جھٹلانے میں معذور ہیں، کیونکہ یہ ایک عجیب وغریب معاملہ اور واقعہ ہو گیا ہے۔ کُرتے پر جھوٹا خون لگا کر لائے، یہ ایک دوسرا افترا کیا کہ جو فریب کرنا چاہا تھا اس کی تائید کے لیے یہ کام کیا۔

امام مجاہد اور سدی رحمہ اللہ اور بہت سے لوگوں نے کہا ہے کہ ایک بکری ذبح کر کے اُس کا خون کُرتے میں لگایا۔[1] اس وہم میں ڈالنے کے لیے کہ یہ وہی قمیص ہے جس میں بھیڑنے نے یوسف کو کھایا ہے اور یہ خون اس کپڑے میں لگ گیا ہے لیکن وہ اس کُرتے کو پھاڑنا بھول گئے، لہٰذا اللہ کے نبی یعقوب علیہ السلام کے سامنے ان کی یہ چالاکی نہ چلی، بلکہ یعقوب علیہ السلام نے ان کے کلام سے اعراض کیا اور اسے ان کا بات بنانا سمجھا اور فرمایا کہ تمھارے جی نے یہ بات بنائی ہے۔ اب میں سوائے اس کے کہ اس امر پر جس پر تم سب نے اتفاق کر لیا ہے سوائے صبر جمیل کے اور کیا کر سکتا ہوں، یہاں تک کہ اللہ ہی اپنی مدد اور لطف و کرم سے اس تکلیف کو دور فرمائے۔ تمھارے اس جھوٹ اور اس مشکل

---

[1] تفسير الطبري (١٥/ ٥٧٩۔ ٥٨٠)

وقت میں مَیں اسی سے مدد چاہتا ہوں پس بس۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ کُرتے پر جھوٹا خون لگا لائے، اگر درندہ کھاتا تو کُرتا پھٹ جاتا۔ یہی قول امام حسن، قتادہ اور شعبی رحمہم اللہ کا بھی ہے، بلکہ بہت سے اہلِ علم کا۔[1]

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صبرِ جمیل وہ ہے کہ جس میں جزع وفزع نہ ہو۔[2] امام حبان بن ابی جبلہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صبرِ جمیل کے بارے میں پوچھا، فرمایا: وہ صبر ہے جس میں شکوہ نہ ہو۔[3] یہ حدیث مرسل ہے۔ امام ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صبر میں تین چیزیں ہیں: ایک یہ کہ اپنا درد کسی سے بیان نہ کرے، دوسرے یہ کہ مصیبت کا اظہار نہ کرے اور تیسرے یہ کہ اپنے نفس کا تزکیہ نہ کرے (اپنی پاک بازی کا ڈھنڈورا نہ پیٹے)۔[4] اس جگہ بخاری شریف میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی واقعۂ افک کے بارے میں حدیث ذکر کی ہے اور ان کا یہ قول روایت کیا ہے: "وَاللّٰهِ لَا أَجِدُ لِيْ وَلَا لَكُمْ مَثَلًا إِلَّا كَمَا قَالَ أَبُوْ يُوْسُفَ: ﴿ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴾."[5] [اللہ کی قسم! مجھے اپنے اور آپ لوگوں کے لیے یوسف علیہ السلام کے والد (یعقوب علیہ السلام) کے قول کے علاوہ اور کوئی مثال نہیں ملتی: "لہٰذا صبر ہی بہتر ہے اور اس پر اللہ ہی سے مدد مطلوب ہے جو تم بیان کرتے ہو"]

میں کہتا ہوں کہ یہ آیت اس بات پر قطعی دلیل ہے کہ انبیا علیہم السلام کو علمِ غیب نہیں ہوتا، اگر یہ علم ہوتا تو یعقوب علیہ السلام فراقِ یوسف علیہ السلام پر اس قدر افسوس نہ کرتے اور جان لیتے کہ وہ زندہ موجود ہیں اور ان کو ان کے بھائیوں نے ایک گمنام کنویں میں ڈال دیا ہے، مگر یہ علم ان کو نہ ہوا اور نہ ہی یہ بات معلوم ہوسکی کہ کب اور کس جگہ اور کتنی تھوڑی یا زیادہ مدت کے بعد ان سے ملاقات دوبارہ ہوگی۔ سو جب انبیاء اللہ اس علم سے عاجز ہیں تو پھر کسی اور شخص کی خواہ وہ مومن ہو یا کافر، کیا ہستی ہے کہ وہ ایسا دعویٰ کرے، یا کسی کو کوئی غیب کی بات بتا سکے۔ لہٰذا حدیث میں فرمایا ہے کہ جس نے کاہن کی تصدیق کی، اس نے قرآن کا انکار کیا۔[6]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یوسف علیہ السلام کے بھائی عشا کے وقت، یعنی دن کے آخر میں یا رات کو روتے ہوئے اپنے باپ کے پاس آئے۔ تاریکیِ شب میں آنا اس لیے تھا کہ کذب بیانی کے ساتھ معذرت کرنے میں زیادہ جرأت ہو۔ رونے سے مراد یہ ہے کہ جھوٹ کی ترویج کے لیے تکلفاً رونے کی صورت بنا لی، تاکہ ان کا فریب اور عذر باپ کے سامنے چل جائے۔ جب باپ کے پاس آئے تو کہا: اے ابا جان! ہم دوڑنے میں یا تیر چلانے میں ایک دوسرے کا

---

[1] تفسیر الطبري (١٥/ ٥٨١۔ ٥٨٢) [2] تفسیر الطبري (١٥/ ٥٨٤) [3] تفسیر الطبري (١٥/ ٥٨٥) یہ روایت مرسل ہے۔
[4] تفسیر الطبري (١٥/ ٥٨٥) [5] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٤١٣) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٧٧٠)
[6] سنن أبي داود، رقم الحدیث (٣٩٠٤) سنن الترمذي، رقم الحدیث (١٣٥) سنن النسائي الکبریٰ (٥/ ٣٢٣) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٦٤٩) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٥٩٤٢)

مقابلہ کرتے تھے یا گھوڑے دوڑاتے تھے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پاؤں سے دوڑ کر ایک دوسرے سے آگے نکل جاتے تھے۔[1] ہم نے یوسف کو اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا تھا، تاکہ وہ اس کی حراست کرے، اتنے میں ایک کالا بھیڑیا آیا اور اس نے یوسف کو کھا لیا۔ آپ ہمیں اس عذر میں سچا نہ جانیں گے، اگرچہ ہم سچ مچ ہی کہیں یا آپ کے نزدیک سچے ہوں۔ یعقوب علیہ السلام نے ان کو جھوٹا جانا، اسی قمیص کی وجہ سے کہ بھیڑیا کیا تھا، کوئی حکیم تھا کہ یوسف علیہ السلام کو کھایا اور کپڑا نہ پھٹا، اس لیے فرمایا کہ یہ بات نہیں ہے جو تم کہتے ہو، بلکہ تمھارے جی نے ایک بات بنا کر اسے تمھاری آنکھوں میں زینت دی ہے اور آسان کر دیا ہے۔ اب یہی ہے کہ مجھ کو صبرِ جمیل کرنا ہے اور تمھارے اس جھوٹے بیان پر اللہ ہی سے مدد درکار ہے۔[2]

وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ ۭ قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ۭ وَاَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۝ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۢ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ ۚ وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ ۝

اور ایک قافلہ آیا، پھر انھوں نے اپنا پانی لانے والا بھیجا تو اس نے اپنا ڈول لٹکایا۔ وہ (دیکھتے ہی) پکار اُٹھا: واہ خوش خبری ہے! یہ تو لڑکا ہے۔ اور انھوں نے اسے پونجی سمجھ کر چھپا لیا، اور اللہ اسے خوب جانتا تھا جو وہ کر رہے تھے (19) اور انھوں نے اسے معمولی سی قیمت (یعنی) گنتی کے چند درہموں میں بیچ دیا، اور انھیں اس میں کوئی رغبت ہی نہ تھی (20)

یوسف علیہ السلام کا کنویں سے نکلنا اور معمولی قیمت پر بکنا:

کنویں میں سے یوسف علیہ السلام ڈول میں بیٹھے، کھینچنے والے نے ان کا حسن دیکھ کر خوشی سے پکارا کہ یہ بڑی قیمت پر بکے گا اور اللہ خوب جانتا ہے جو وہ کرتے ہیں۔ شاید یہ مراد ہو کہ یہود اس جگہ یہ قصہ بدلتے ہیں۔ تورات میں بدل ڈالا ہے، تاکہ اپنے باپ دادا پر عیب نہ آئے۔ اگلے دن بھائی گئے، کنویں میں نہ پایا، قافلے پر دعویٰ کیا، جب ثابت ہوا تو اٹھارہ درہم کو بیچ ڈالا، درہم ایک چوتھائی کے قریب ہے، یعنی چار آنے کے۔ نو بھائیوں نے دو دو درہم بانٹ لیے، ایک نے حصہ نہ لیا۔ پھر آگے قافلے والوں نے مصر میں جا کر بیچا، حق تعالیٰ نے پردہ پوشی کے لیے صریحاً ایک بیچنا فرمایا، لیکن اشارہ سے معلوم ہوا کہ سستے مول تو اسی جگہ بیچا ہے۔ اللہ نے یوسف علیہ السلام کا حال بیان کیا کہ جب ان کے بھائی ان کو کنویں میں ڈال آئے، وہ اکیلے تنہا تھے، امام ابوبکر بن عیاش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ تین دن کنویں میں رہے۔[3]

---

(1) تفسير البغوي (٤/ ٢٢٢) (2) فتح البيان (٦/ ٣٠٠ـ ٣٠٢) (3) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٠٧)

امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بھائیوں نے کنویں میں ڈال دیا اور اُس دن کنویں کے ارد گرد بیٹھے کہ دیکھیں وہ کیا کرتا ہے اور اس پر کیا گزرتی ہے۔ اتنے میں ایک قافلہ کنویں کے قریب آ کر اترا اور اپنا ایک آدمی بھیجا کہ کنویں سے پانی بھر لائے، اس نے جب آ کر ڈول ڈالا تو یوسف علیہ السلام اس کے ساتھ لٹک گئے، اس نے ڈول نکالا، ان کو دیکھ کر خوش ہوا اور کہا: ﴿ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ﴾ یعنی بڑی خوشی کی بات ہے کہ یہ لڑکا ہاتھ آیا۔ امام سدی رحمہ اللہ کا زعم یہ ہے کہ بُشریٰ ایک مرد کا نام تھا، اس کو پکار کر یہ بات کہی کہ مجھے ایک لڑکا ملا ہے۔ امام سُدی رحمہ اللہ کا یہ قول نہایت غریب ہے، اس تفسیر کی طرف ان سے پہلے کوئی نہیں گیا، مگر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ایک روایت میں۔ واللہ أعلم۔[1]

بالجملہ ان کو اہلِ قافلہ نے اپنے پاس چھپا رکھا اور کہا کہ ہم نے اسے پانی والوں سے خریدا ہے۔ یہ اس ڈر سے کہا کہ کہیں کوئی اس میں اپنی شرکت ظاہر نہ کرے اور خبر سن کر اس کا دعویٰ نہ کر دے۔ امام مجاہد، سدی اور ابن جریر رحمہم اللہ کا یہی قول ہے[2] اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ بھائیوں نے اس کو چھپا رکھا، یعنی یہ ظاہر نہ کیا کہ یہ ہمارا بھائی ہے اور یوسف علیہ السلام بھی اس ڈر سے خاموش رہے کہ کہیں بھائی ان کو قتل نہ کر ڈالیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنا بِک جانا اختیار کیا۔ بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کا ذکر واردِ قوم (پانی لانے والے) سے کیا، اس نے اپنے ساتھیوں کو پکار کر کہا کہ تمھیں خوشی ہو کہ یہ لڑکا فروخت کیا جاتا ہے، تب بھائیوں نے ان کو بیچ ڈالا۔[3]

اللہ نے کہا: ہم جانتے ہیں کہ جو کچھ اس کے بھائی کرتے اور چھپاتے ہیں، باوجود اس کے کہ ہم کو ان کے فریب کو دور کرنے پر قدرت حاصل ہے، لیکن حکمت اسی میں ہے جو ہو رہا ہے اور تقدیر اسی کے ساتھ سابق ہو چکی ہے، اس لیے ہم نے اسی طرح چھوڑ رکھا ہے، تاکہ قدر و قضا جاری ہو۔ ﴿ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾

اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا علم دیا گیا ہے کہ ہم تیری قوم کا تجھ کو ایذا دینا جانتے ہیں اور اس بات پر قادر ہیں کہ انکار کریں، لیکن ہم نے ان کو مہلت دی ہے اور انجام آپ ہی کے لیے رکھا ہے۔ تُو ہی ان پر حکم کرے گا جس طرح کہ یوسف علیہ السلام کو حکم دیا اور انجام کار وہ بھائیوں پر حکمران ہوئے۔ امام مجاہد اور عکرمہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ تھوڑے دام میں فروخت کیا۔[4] بخس بمعنی نقص ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا ﴾ [الجن: ١٣] ''نہ تو کسی نقصان کا خوف ہوگا اور نہ ظلم کا۔'' بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کو تھوڑے داموں پر فروخت کر دیا۔ معہذا وہ اس میں بے رغبت تھے، بلکہ اگر کوئی مفت میں بھی ان کو لیتا تو وہ دے ڈالتے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد اور ضحاک رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ لفظ ﴿ شَرَوْهُ ﴾ میں ضمیر برادرانِ یوسف کی طرف لوٹتی ہے اور امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ سَيَّارَةٌ ﴾ کی طرف اور اگر وہ یوسف علیہ السلام میں بے رغبت ہوتے تو

---

(1) تفسیر الطبري (١٦/ ١۔ ٣) تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٢١١٣) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٦١٤) (2) تفسیر الطبري (١٦/ ٥۔ ٧)
(3) تفسیر الطبري (١٦/ ٦) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔ (4) تفسیر الطبري (١٦/ ١٢) الدر المنثور (٤/ ٥١٦)

خرید نہ کرتے، اس لیے راجح یہ ہوا کہ ﴿ شَرَوْهُ ﴾ کی ضمیر بھائیوں کی طرف لوٹے۔[1] بعض نے کہا ہے کہ ﴿ بَخْسٍ ﴾ سے مراد حرام ہے اور بعض نے کہا ظلم۔ سو اگر چہ یہی بات ہو، لیکن اس جگہ یہ معنی مراد نہیں ہیں، اس لیے کہ اس کو ہر شخص جانتا ہے کہ یہ قیمت حرام تھی، ہر حال میں ہر شخص پر، کیونکہ یوسف علیہ السلام نبی بن نبی بن نبی بن خلیل تھے اور کریم بن کریم بن کریم بن کریم اور جب کہ کسی آزاد کا فروخت کرنا حرام ہوتا ہے تو پیغمبر کا فروخت کرنا حرام نہ ہوگا تو کیا ہوگا۔

بلکہ ﴿ بَخْسٍ ﴾ سے اس جگہ ناقص یا کھوٹا مراد ہے یا دونوں، یعنی کھوٹے اور کم دام پر یوسف علیہ السلام کو بیچ ڈالا، اس لیے فرمایا کہ چند درہم پر فروخت کر ڈالا۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ بیس درہم پر۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام نوف بکالی، سدی، قتادہ اور عطیہ عوفی رحمہم اللہ کا بھی ہے۔ امام عطیہ رحمہ اللہ نے یہ بھی کہا ہے کہ بھائیوں نے دو دو درہم آپس میں بانٹ لیے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بائیس درہم پر بیچا۔ محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ چالیس درہم پر۔[2]

امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ اس کے حق میں بے رغبت تھے، اس لیے کہ ان کو اللہ کے نزدیک یوسف علیہ السلام کی نبوت اور مقام کا علم نہ تھا۔[3] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب فروخت کیا تو کچھ دور تک خریداروں کے پیچھے چلے اور کہتے تھے کہ دیکھو اس کو خوب سا مضبوط باندھو، کہیں یہ بھاگ نہ جائے، یہاں تک کہ وہ لوگ مصر میں آئے اور کہا: کون اس کو خریدتا ہے، تب وہاں کے بادشاہ نے خرید لیا اور وہ مسلمان تھا۔[4]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ زمین میں سیر کرنے کی مناسبت سے ﴿ سَيَّارَةٌ ﴾ مسافروں کی جماعت کو کہتے ہیں۔ اس جگہ اس سے مراد دوستوں کا قافلہ ہے جو شام کی طرف سے چلا تھا، یا مدین کی طرف سے مصر کی طرف جا رہا تھا اور راستہ بھول کر اور بھٹک کر اس طرف آ نکلا اور کنویں کے نزدیک اترا۔ یہ کنواں آبادی سے بہت دور ایک ویران بیابان میں تھا۔ چرواہوں اور مسافروں کا ادھر سے گزر ہوتا تھا اور اس کا پانی نمکین تھا۔

وَارِدُ وہ ہے جو قوم کے لیے پانی لینے کو آئے۔ مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ اس کا نام مالک بن ذعر خزاعی تھا اور وہ عربِ عاربہ میں سے تھا۔ اس نے اپنا ڈول پانی بھرنے کے لیے لٹکایا۔ یوسف علیہ السلام ڈول کی رسی پکڑ کر لٹک گئے، جب ڈول باہر آیا اور اس نے دیکھا تو کہا: خوش خبری ہے۔ یا کسی بشریٰ نامی شخص کو پکارا، لیکن اس میں بُعد ہے۔

یوسف علیہ السلام بہت خوب صورت بچے تھے، ان کو نصف حسن دیا گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ اپنی دادی سارہ کا حسن لائے

---

[1] تفسير الطبري (١٦/ ٩۔ ١٠) تفسير ابن كثير (٢/ ٦١٤) [2] تفسير الطبري (١٦/ ١٣۔ ١٥)
[3] تفسير الطبري (١٦/ ١٦) [4] تفسير الطبري (١٦/ ٥)

تھے، ان کو حسن کا چھٹا حصہ ملا تھا، نہایت خوب صورت، پیچیدہ بال، بڑی بڑی آنکھیں، برابر قد، سفید رنگ، موٹے بازو اور کندھے، سخت پنڈلی، خمیص بطن، صغیر ناف تھے۔ جب مسکراتے تو ان کے دانتوں سے نور چمکتا اور جب بات کرتے تو چمکتے دانت ظاہر ہوتے۔ کوئی شخص ان کے حسن کی تعریف نہیں کر سکتا تھا کہ کیسا تھا۔

امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ لوگ خوش ہوئے کہ ایک لڑکا ہاتھ آیا، لیکن اللہ کے نزدیک ان کی جو قدر و منزلت تھی اس سے وہ ناآشنا تھے۔[1] امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب وارد نے ان کو بیت المقدس کے کنویں سے نکالا تو خوش ہوا[2] اور اس نے اپنے دوستوں سے مل کر باقی قافلے والوں کی نظروں سے چھپا رکھا کہ کوئی اور نہ لے جائے اور بعض نے کہا ہے کہ چھپایا نہیں، بلکہ اس بات کو مخفی رکھا کہ یہ ہم کو کنویں میں سے ملا ہے، بلکہ یہ ظاہر کیا کہ پانی والوں نے اسے ہمارے ہاتھ فروخت کر دیا ہے کہ ہم اس کو مصر لے جا کر بیچ ڈالیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بعض تاجروں نے بعض سے ان کو پوشیدہ رکھا،[3] یا ضمیر برادرانِ یوسف کی طرف پھرتی ہے۔

کہتے ہیں کہ ان کا بھائی یہوذا ان کے پاس ہر روز کھانا لاتا، جس دن یہ کنویں سے باہر نکلے اس دن یہوذا نے ان کو وہاں نہ پایا، بھائیوں کو خبر دی، وہ اس قافلے کے پاس آئے اور کہا کہ یہ غلام ہمارے پاس سے بھاگ آیا ہے، انھوں نے یوسف علیہ السلام کو خرید لیا۔ یوسف علیہ السلام خاموش تھے کہ اگر کچھ کہتا ہوں تو یہ مجھ کو لے کر قتل کر ڈالیں گے، لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔

﴿ بِضَاعَةً ﴾ سے مراد یہ ہے کہ ان کو ایک سرمایۂ تجارت سمجھا۔ ﴿ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ ان کے بظاہر برے عمل پر مرتب ہونے والے اسرار اور مخفی فوائد کو جانتا ہے، اس لیے کہ یہ عمل جو انھوں نے یوسف علیہ السلام کے ساتھ کیا، یہ ان کو مصر پہنچانے کا سبب بن گیا اور وہ مختلف اطوار و احوال سے گزر کر مصر کے بادشاہ بن گئے۔ اللہ نے ان (یوسف علیہ السلام) کے سبب سے شہروں اور لوگوں پر رحم فرمایا، خصوصاً قحط سالی میں۔ پھر ان لوگوں نے یوسف علیہ السلام کو ایک ناقص مول پر۔ جو گنتی کے چند دام تھے، فروخت کر دیا اور وہ ان میں بے رغبت تھے، اس لیے کہ لُقطہ کی چیز حقیر ہوتی ہے اور ان کا مقصد انھیں اپنے پاس سے دور کرنا تھا نہ کہ ان کی قیمت کا مال حاصل کرنا۔[4]

وَقَالَ الَّذِي اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖٓ اَكْرِمِيْ مَثْوٰىهُ عَسٰٓى
اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ؕ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي
الْاَرْضِ ؗ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ؕ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ

[1] تفسير الطبري (١٦/ ١٦)　[2] تفسير الطبري (١٦/ ٦)
[3] تفسير الطبري (١٦/ ٥_ ٦)　[4] فتح البيان (٦/ ٣٠٢_ ٣٠٤)

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۝۲۱ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ۝۲۲

اور وہ شخص جس نے یوسف کو مصر میں خریدا تھا، اس نے اپنی بیوی سے کہا: اس کی رہائش اچھی رکھ، امید ہے کہ یہ ہمیں نفع دے یا یہ کہ ہم اسے بیٹا بنا لیں، اور اسی طرح ہم نے یوسف کو زمین (مصر) میں جگہ دی، تاکہ ہم اسے باتوں کی تاویل (خوابوں کی تعبیر) سکھائیں اور اللہ اپنے (ہر) کام پر غالب ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے (21) اور جب یوسف اپنی جوانی کو پہنچا تو ہم نے اسے حکم اور علم دیا اور اسی طرح ہم نیکی کرنے والوں کو جزا دیتے ہیں (22)

یوسف علیہ السلام کا بازارِ مصر سے شاہی محل میں پہنچ کر ترقی کے زینے پر پہلا قدم رکھنا:

مصر میں عزیز نے خرید لیا۔ عزیز کہتے ہیں بادشاہ کے مختار کو۔ اس نے ہشیار دیکھ کر غلاموں کی طرح نہ رکھا، بیٹے کی طرح رکھا کہ کاروبار میں نائب ہوگا۔ اس طرح حق تعالیٰ نے اس ملک میں ان کا قدم جمایا، پھر ان کے سبب سے سارے بنی اسرائیل کو بسایا۔ یہ بھی منظور تھا کہ سرداروں کی صحبت دیکھیں، تاکہ رمز اور اشارہ سمجھنے کا سلیقہ حاصل ہو اور اللہ کا علم پورا پورا پائیں۔ اللہ جیت جاتا ہے، یعنی بھائیوں نے چاہا تھا کہ ان کو گرا دیں، اسی میں یہ چڑھ گئے۔ حُکم دیا، یعنی عقل سے مشکل باتیں حل کرتے اور عِلم اللہ کا دین۔ اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام پر اپنے لطف و کرم کی خبر دی کہ ہم نے اس شخص کو جس نے ان کو خرید کیا تھا، یوسف علیہ السلام پر مقرر کیا کہ وہ ان کے ساتھ اعتناء (اہتمام) کرے اور عزت سے رکھے، اس نے اپنے گھر والوں کو وصیت کی کہ تم ان کی خاطر داری کرو، یہ بات اس نے ان کے اندر خیر و صلاح دیکھ کر کہی۔ ان کا خریدار عزیزِ مصر تھا، وہ اس جگہ کا وزیر تھا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس کا نام قطفیر تھا۔[1] امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اطفیر بن روحیب تھا، یہ مصر کے خزانوں پر مقرر تھا، اس کو عزیز کہتے تھے۔ بادشاہ کا نام ریان بن الولید تھا، وہ عمالیق میں سے ایک شخص تھا، اس کی بیوی کا نام راعیل بنت رعائیل تھا[2] اور بعض نے زلیخا کہا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جس نے یوسف علیہ السلام کو مصر میں فروخت کیا وہ مالک بن ذعر بن قریب بن عفقان بن مدیان بن ابراہیم علیہ السلام تھا۔[3] واللہ أعلم.

تاریخِ عالم کے تین صاحبِ فراست اشخاص:

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ تین شخص بڑے صاحبِ فراست تھے: ایک عزیزِ مصر، اس نے اپنی

(1) تفسير الطبري (١٦/ ١٧) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔ (2) تفسير الطبري (١٦/ ١٧۔ ١٨)
(3) تفسير الطبري (١٦/ ١٨) اس کی سند میں ''محمد بن سائب کلبی'' ضعیف راوی ہے۔

بیوی سے کہا: ﴿ اَكْرِمِيْ مَثْوٰىهُ ﴾ دوسری وہ عورت جس نے اپنے باپ سے کہا: ﴿ يٰٓاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ﴾ [القصص: ٢٦] "اے ابا جان! اسے نوکر رکھ لیجیے، بلاشبہ بہترین شخص، جسے آپ ملازم رکھیں، وہی ہوسکتا ہے جو طاقتور ہو، امانت دار ہو۔" تیسرے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، انھوں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ نامزد کیا۔[1]

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس طرح ہم نے یوسف علیہ السلام کو بھائیوں کے ہاتھ سے رہائی دی، اسی طرح یوسف علیہ السلام کو زمین یعنی بلادِ مصر میں متمکن کیا اور بات کی کل بٹھانا سکھلایا۔ امام مجاہد اور سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد خوابوں کی تعبیر ہے۔[2] اللہ اپنے حکم میں غالب ہے، جب کسی شے کا ارادہ کرتا ہے تو کوئی اس کو پھیر نہیں سکتا اور نہ روک سکتا ہے اور نہ اس کے خلاف کر سکتا ہے، بلکہ اللہ ہی سب پر غالب رہتا ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے: یعنی "فَعَّالٌ لِّمَا يَشَآءُ"[3] لیکن اکثر لوگ خلق میں اس کی حکمت اور اس کے لطف و کرم اور اس کی اپنے ارادے کو پورا کرنے کی قدرت کو نہیں جانتے۔

بالجملہ جب یوسف علیہ السلام اپنی قوت کو پہنچے، یعنی ان کی عقل مکمل ہوئی تو ہم نے ان کو حکم اور علم دیا، یعنی ان اقوام کے اندر ان کو نبوت عطا کی۔ ہم اسی طرح ہر اس شخص کو جزا دیتے ہیں جو اچھے اعمال کرنے والا اور اللہ کی اطاعت اختیار کرنے والا ہوتا ہے۔ جس قدر مدت میں یوسف علیہ السلام اپنی قوت کو پہنچے اس مدت میں علما کا اختلاف ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تینتیس سال یا کچھ اوپر تیس سال۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بیس سال۔[4] امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ چالیس سال۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: پچیس برس۔ امام سُدی رحمہ اللہ نے کہا ہے: تیس برس۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے: اٹھارہ برس۔ امام مالک و ربیعہ و زید بن اسلم اور شعبی رحمہم اللہ نے کہا ہے ﴿ اَشُدَّهٗ ﴾ بہ معنی "حُلُم" ہے[5] اور اس کے علاوہ اور بھی اقوال ہیں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ بعض نے کہا ہے کہ اس وقت کا بادشاہ وہ فرعون تھا جو موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں تھا۔ مالک بن ذعر نے یوسف علیہ السلام کو بیس درہم پر فروخت کیا تھا اور بعض نے کہا ہے کہ ان کی قیمت میں اتنی زیادتی ہوئی کہ ان کے وزن سے دو چند تک پہنچی جو مسک وعنبر وسیم و جواہر سب کو ملا کر جس کا وزن چار سو رطل ہوا۔ جس وقت عزیز نے ان کو خریدا تھا اس وقت یہ سترہ برس کے تھے، تیرہ برس اُس کے گھر میں رہے، جب ریان نے ان کو وزیر بنایا تو یہ تیس برس کے تھے۔ جب اللہ نے ان کو حکم اور علم عطا کیا تو وہ تینتیس برس کے تھے، جب انتقال فرمایا تو ایک سو بیس برس کے تھے۔

---

[1] مستدرك الحاكم (٢/ ٣٧٦) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ [2] تفسير الطبري (١٦/ ٢٠)
[3] تفسير الطبري (١٦/ ٢١) [4] تفسير الطبري (١٦/ ٢٢۔ ٢٣) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢١١٨)
[5] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢١١٨۔ ٢١١٩)

بالجملہ جبکہ عزیز نے ان کو خریدا تو اپنی بیوی سے کہا کہ ان کے رہنے کی جگہ اچھی طرح درست کر دے، یعنی اچھی طرح کھلا پلا، خبر گیری رکھ، تاکہ ہمارے پاس رہنے سے ان کا جی خوش رہے۔ امام شعیب جبائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عزیز کی بیوی کا نام زلیخا تھا،[1] زا کی زبر اور لام کی زیر کے ساتھ۔ (كما في القاموس) یا زا کی پیش اور لام کی زبر کے ساتھ، تصغیر کی صورت میں۔[2] (كما قال الشهاب) بعض نے کہا ہے کہ راعیل۔ بعض نے کہا ہے کہ ان میں ایک نام تھا اور ایک لقب۔ عزیز نے کہا کہ قریب ہے کہ یہ لڑکا ہم کو کچھ نفع دے گا، یعنی بعض اہم کاموں کو انجام دے گا، یا اگر ہم اس کو فروخت کر دیں گے تو نفع ملے گا، یا ہم اس کو اپنا فرزند بنائیں گے۔

کہتے ہیں کہ عزیز حصور تھا، عورتوں کے پاس نہ جاتا تھا، یا عقیم تھا کہ اولاد نہ ہوتی تھی۔ قاضی اور اصفہانی رحمہما اللہ کشاف کی پیروی کرتے ہوئے اسی طرف گئے ہیں۔[3] کہتے ہیں عزیز نے یہ تصرف کیا تھا کہ یہ امورِ مملکت میں میری نیابت کی لیاقت رکھتا ہے، سو ہم نے یوسف علیہ السلام کو اس طرح مصر میں جگہ دی اور خواب کی تعبیر بتانا سکھایا۔ تاویل اسرارِ کتبِ الٰہیہ کو سمجھ لینے کو بھی کہتے ہیں اور پہلے انبیا کی سنت اور طریقوں کے سمجھنے بوجھنے کو بھی۔ سو ان تمام معانی پر اس کو محمول کرنے سے کوئی امر مانع نہیں، اس میں خواب کی تعبیر بھی آ گئی۔ اللہ کا امر غالب ہے، لیکن اکثر لوگ اللہ کے غیب اور بڑے بڑے بھیدوں اور حکمِ نافعہ کو نہیں پہچانتے۔ بعض نے کہا ہے کہ اکثر سے مراد سب ہیں، اس لیے کہ غیب کا علم سوائے اللہ کے کوئی نہیں رکھتا۔ یا مشرکین کو اللہ کے تمام امور پر غالب ہونے کا علم نہیں ہے اور تقدیر پر ایمان نہیں لاتے۔ یا وہ کیا جانیں کہ اللہ کی یوسف علیہ السلام کو یہ علم دینے سے کیا مراد ہے؟

بہر حال جب یوسف علیہ السلام ﴿ أَشُدَّهُ ﴾ کو پہنچے، ﴿ أَشُدَّهُ ﴾ سے مراد پوری طاقت حاصل کر لینا ہے، جس کے بعد طاقت کم ہونے لگے۔ امام راغب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ انسان جب عمر کی اس مقدار کو پہنچتا ہے تو اس کی خلقت قوی ہو جاتی ہے۔ اس جگہ استویٰ نہیں فرمایا جس طرح کہ موسیٰ علیہ السلام کے حق میں کہا تھا، اس لیے کہ موسیٰ علیہ السلام چالیس سال کے ہو گئے تھے، یہ مدتِ نبوت ہے۔ رہے یوسف علیہ السلام تو وہ ابھی اس عمر کو نہیں پہنچے تھے، اٹھارہ یا پچیس یا تیس یا تینتیس برس کے تھے۔ اللہ نے ان کو حکم دیا، ملکِ مصر میں بادشاہ کی طرف سے حکومت فرماتے اور اس حکومت کرنے کا علم عطا فرمایا، یا علم سے مراد عقل وفہم ونبوت وفقہ ہے۔[4] (قاله مجاهد)

یا حکم سے مراد نبوت اور علم سے مراد دین ہے، یا خوابوں کی تعبیر کا علم۔ بعض نے کہا ہے کہ اللہ نے ان کو بچپن میں نبوت دی تھی۔ سو اسی طرح کی عجیب جزا ہم اہلِ احسان کو دیا کرتے ہیں، ہر محسن فی العمل کو احسن جزا ملتی ہے۔

---

[1] فتح القدير (٣/ ٢١)
[2] حاشية الشهاب علىٰ تفسير البيضاوي (٥/ ١٦٤)
[3] الكشاف (٢/ ٤٢٨)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢١١٩)

اس میں یوسف علیہ السلام کی جزا علی الصبر بھی بدرجہ اولیٰ داخل ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ﴿ اَلْمُحْسِنِیْنَ ﴾ سے مومنین مراد ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ صابرین اور بعض نے کہا مہتدین۔[1]

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْۤ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۲۳

اور جس عورت کے گھر میں وہ (یوسف) تھا اس عورت نے اس کے جی سے پھسلایا، اور دروازے بند کر دیے اور بولی: لو آجاؤ، یوسف نے کہا: اللہ کی پناہ! وہ (عزیزِ مصر) تو میرا آقا ہے، اس نے مجھے اچھا ٹھکانا دیا، بے شک ظالم لوگ فلاح نہیں پاتے (23)

یوسف علیہ السلام کا سخت امتحان اور اس میں شاندار کامیابی:

اللہ پاک نے عزیز کی بیوی کے حال کی خبر دی جس کے گھر مصر میں یوسف علیہ السلام رہا کرتے تھے اور اس کے خاوند نے وصیت کی تھی کہ دیکھ ان کو اچھی طرح رکھنا۔ وہ عورت ان کے حسن و جمال پر شیفتہ ہوگئی۔ اس کا جی چاہا کہ میں ان سے ملوں، چنانچہ خوب بناؤ سنگھار کیا اور گھر کے دروازے بند کر دیے اور اپنی طرف بلایا۔ یہ سخت پریشان ہوئے اور کہا: بھلا یہ کیوں کر ہو، عزیز تو مجھ کو عزیز رکھے اور میں اس کے گھر میں خیانت کروں!۔ اس زمانے میں سید کو رب بولتے تھے، یعنی میں اپنے سردار کے احسان کا مقابلہ اس کے گھر میں اس حرکتِ فاحشہ سے کروں، میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا، اس لیے کہ ظالم کو کبھی فلاح نہیں ہوتی۔ امام مجاہد، سدی اور محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔[2]

لفظِ ﴿ هَيْتَ ﴾ کی تحقیق:

لفظ ﴿ هَيْتَ ﴾ کی قراءت میں قراء کا اختلاف ہے، کسی نے ہا کی زبر، یا کے سکون اور تا کی زبر کے ساتھ پڑھا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہما نے کہا ہے کہ اس کے یہ معنی ہیں کہ اس نے ان کو اپنے نفس کی طرف بلایا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس نے کہا: "هَلُمَّ لَكَ"، یہی قول امام زر بن حبیش، عکرمہ، حسن اور قتادہ رحمہ اللہ کا بھی ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ایک کلمۂ سریانیہ ہے، یعنی عَلَيْكَ۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "أَيْ هَلُمَّ لَكَ"، یہ لغتِ قبطیہ ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عربی لغت ہے، یہ لفظ کہہ کر اس عورت نے یوسف علیہ السلام کو بلایا۔[3]

---

[1] فتح البیان (٦/ ٣٠٥۔ ٣٠٩) [2] تفسیر الطبري (١٦/ ٣٣) [3] تفسیر الطبري (١٦/ ٢٥۔ ٢٧)

امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: ”أَيْ هَلُمَّ لَكَ“ لغتِ حورانیہ ہے، اسی طرح اس کو معلقاً ذکر کیا۔[1] امام کسائی رحمہ اللہ کہتے تھے کہ یہ لغتِ حوران ہے، اہلِ حجاز میں آ گئی، اس کے معنی تَعَالَ ہیں، یعنی آؤ۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نے اہلِ حوران میں سے ایک بوڑھے شخص سے پوچھا، وہ شخص عالم تھا، اس نے کہا: یہ ہماری لغت ہے، ہم اس کو پہچانتے ہیں۔ بعض نے کہا: ”هِئْتُ“ ہا کی زیر، ہمزہ کے سکون اور تا کی پیش کے ساتھ، جس کے معنی ہیں: ”تَهَيَّاتُ لَكَ“ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام ابو عبدالرحمان سلمی، ابو وائل، عکرمہ اور قتادہ رحمہم اللہ سب نے یہی تفسیر کی ہے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اس جگہ ﴿الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا﴾ فرمایا، ”امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ“ نہ فرمایا، یا زلیخا نہ کہا، یہ زیادتِ تقریر کے لیے فرمایا، اس لیے کہ یوسف علیہ السلام کا اس کے گھر میں ہونا اس طلب کا باعث ہوا۔

حکایت:

ایک عورت سے کہا تھا کہ تجھ کو اُس کام پر کس چیز نے اکسایا جس میں کوئی خیر نہیں ہے؟ اُس نے کہا: ”قُرْبُ الْوَسَادِ، وَطُوْلُ السَّوَادِ“ [اس کے بستر کے قریب ہونے اور رات کے لمبا ہونے نے] اس میں یوسف علیہ السلام کی کمال پاکیزگی کا بیان ہے، کیونکہ وہ ہمیشہ ان کے محاسن کا مشاہدہ کرتی تھی، اس کے باوجود وہ اس کی طرف مائل نہ ہوئے اور وہ بھی اس حال میں کہ اس کے مملوک تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ پاک دامنی اور پاکیزگی کی معراج میں تھے۔ وللہ الحمد. اس جگہ اس عورت کا نام نہ لیا، پردہ پوشی اور ذکر کرنے کو مکروہ سمجھتے ہوئے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ عورت عزیز کی تھی۔[3]

لفظ ابواب سے دروازوں کی کثرت معلوم ہوئی۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ سب سات دروازے تھے۔[4] شدتِ خوف سے ان کو بند کر دیا۔ اور کہا: ”هَيْتَ لَكَ، أَيْ هَلُمَّ وَتَعَالَ“ یوسف علیہ السلام نے دعوت قبول کرنے سے سخت انکار کیا اور انکار کی وجہ یہ فرمائی کہ عزیز نے مجھے پرورش کیا اور اچھی طرح مجھ کو پالا ہے۔ یہ وجہ زنِ عزیز کی سمجھ کے زیادہ قریب تھی۔ پھر دوسری علت یہ فرمائی کہ ظالم مراد کو نہیں پہنچتا۔ من جملہ ظلم کے ایک یہ معصیتِ زنا ہے۔ بعض نے کہا ہے: ”أَيْ لَا يَسْعَدُ الزُّنَاةُ“[5] [زانی سعادت مند نہیں ہوتے]

---

[1] صحيح البخاري (٤/ ١٧٣٠) [2] تفسير الطبري (١٦/ ٢٨۔ ٢٩) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٢٠)

[4] تفسير البيضاوي (٣/ ٢٨١) [5] فتح البيان (٦/ ٣١٠۔ ٣١٢)

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۭ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْۗءَ وَالْفَحْشَاۗءَ ۭ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ۝۲۴

اور البتہ اس (عورت) نے یوسف کا ارادہ کیا، اور وہ (یوسف) بھی اس کا ارادہ کر لیتا اگر وہ اپنے رب کی نشانی نہ دیکھ لیتا۔ اسی طرح (ہوا) تاکہ ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو پھیر دیں، بے شک وہ ہمارے خالص کیے ہوئے بندوں میں سے تھا⑳

یوسف علیہ السلام کی عفت و عصمت:

نقل ہے کہ انگلی دانت میں دابے ہوئے ان کو یعقوب علیہ السلام کی شکل نظر آئی۔ باقی خیال گناہ کا گناہ نہیں اور اگر گناہ ہے تو کمتر، اصل گناہ سے پیغمبر کو اللہ نے بچا لیا۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس مقام میں لوگوں کے اقوال اور عبارتیں مختلف ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ اور سلف کے ایک گروہ نے امام ابن جریر رحمہ اللہ وغیرہ کی روایت کے مطابق ۔واللہ أعلم۔ یوں کہا ہے کہ ﴿ هَمَّ ﴾ سے اس جگہ حدیثِ نفس مراد ہے۔[1]

امام بغوی رحمہ اللہ نے اس کو بعض اہلِ تحقیق سے بیان کیا ہے، پھر اپنی سند سے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث مرفوعاً روایت کی ہے: « يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى: إِذَا هَمَّ عَبْدِيْ بِحَسَنَةٍ فَاكْتُبُوْهَا لَهُ حَسَنَةً، فَإِنْ عَمِلَهَا فَاكْتُبُوْهَا بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا، وَإِنْ هَمَّ بِسَيِّئَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا فَاكْتُبُوْهَا حَسَنَةً فَإِنَّمَا تَرَكَهَا مِنْ جَرَّائِيْ فَإِنْ عَمِلَهَا فَاكْتُبُوْهَا بِمِثْلِهَا » [اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: جب میرا بندہ نیکی کا ارادہ کرے تو اسے اس کے حق میں ایک نیکی لکھ دو۔ پھر اگر وہ اس پر عمل بھی کر لے تو اسے دس گنا لکھو، اور اگر وہ گناہ کا ارادہ کرے مگر اسے عمل میں نہ لائے تو اسے ایک نیکی لکھو (کیونکہ) اس نے میری ہی خاطر اسے چھوڑا، پھر اگر وہ اسے عمل میں بھی لے آئے تو اسے اس کے برابر (ایک ہی گناہ) لکھو] یہ حدیث صحیحین میں بھی آئی ہے،[2] اس کے الفاظ بہت ہیں۔ ازاں جملہ ایک یہ لفظ ہے جو اس جگہ ذکر ہوا۔ بعض نے کہا ہے کہ ﴿ هَمَّ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ مارنے کا ارادہ کیا، کسی نے کہا: یہ تمنا کی کہ یہ میری زوجہ ہو، بعض نے کہا ہے کہ وہ "هَمَّ" کرتے اگر رب کی برہان نہ دیکھتے، یعنی انھوں نے "هَمَّ" نہیں کیا، لیکن اس قول میں "مِنْ حَيْثُ الْعَرَبِيَّةِ" نظر ہے۔[3] (حكاه ابن جرير وغيره)

---

[1] تفسیر الطبري (١٦/ ٣٤) امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے اس جگہ "هم" کا مذکورہ معنی ذکر کیا ہے اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ کے آثار ذکر نہیں کیے۔

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٦٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٩) تفسير البغوي (٤/ ٢٣١ـ ٢٣٢)

[3] تفسير الطبري (١٦/ ٣٨ـ ٣٠)

رہی برہان سو اس میں اختلاف ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام سعید، مجاہد، ابن سیرین، حسن، قتادہ، ابی صالح، ضحاک اور محمد بن اسحاق رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا ہے کہ اپنے باپ کی صورت دیکھی، وہ دانتوں میں انگلی دابے ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ یوسف علیہ السلام کے سینے پر ہاتھ مارا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اپنے مِلک، یعنی سید کو دیکھا۔ امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے بعض سے روایت کیا ہے کہ جب دروازے کے قریب پہنچے تو اطفیر کا خیال آیا۔

امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے چھت کی طرف سر اٹھایا، اچانک دیوارِ خانہ پر یہ لکھا ہوا دیکھا: ﴿ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ٣٢] ''اور تم زنا کے قریب مت جاؤ، یقیناً وہ بے حیائی اور بری راہ ہے۔'' یہ بھی امام قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جو برہان یوسف علیہ السلام نے دیکھی تھی اس کے بارے میں قرآن شریف کی تین آیتیں ہیں: ﴿ وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ﴾ [الإنفطار: ١٠] ''حالاں کہ تم پر نگران (فرشتے) مقرر ہیں۔'' نیز اس کا فرمان: ﴿ وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ ﴾ [يونس: ٦١] ''اور (اے نبی!) آپ جس حال میں بھی ہوتے ہیں۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿ اَفَمَنْ هُوَ قَاۗىِٕمٌ عَلٰي كُلِّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ ﴾ [الرعد: ٣٣] ''کیا پھر وہ (اللہ) جو ہر نفس (کے اعمال) پر نگران ہے جو اس نے کمائے۔''

ابو ہلال نے بھی امام قرطبی کے اس قول کے مثل کہا ہے اور چوتھی آیت: ﴿ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى ﴾ [بني إسرائيل: ٣٢] زیادہ کی۔ امام اوزاعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام نے اللہ کی کتاب کی ایک آیت دیوار پر لکھی ہوئی پائی جو ان کو اس کام سے روکتی تھی۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صورت یہ ہے کہ اللہ کی آیتوں میں سے کوئی آیت اس ''ھَمَّ'' سے ڈرانے والی دیکھی۔ اور جائز ہے کہ یعقوب علیہ السلام کی صورت دیکھی ہو اور یہ بھی روا ہے کہ کچھ لکھا ہوا دیکھا جس نے ان کو اس بات سے روکا۔ کسی خاص چیز کے تعین پر کوئی قطعی حجت نہیں ہے، اس لیے صحیح یہی ہے کہ بالکل چھوڑ دیا جائے۔[1]

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس طرح ہم نے یوسف علیہ السلام کو برہان دکھا کر اس حال سے پھیر دیا اسی طرح ہم ان کے سب امور میں ان کو برائی اور بے حیائی سے بچائیں گے، کیونکہ وہ ہمارا ایک خالص بندہ ہے جو متواضع ہے، پاک، مختار، برگزیدہ اور بہترین لوگوں میں سے ہے۔ صَلَوَاتُ اللّٰہِ وَسَلَامُهُ عَلَیْهِ.[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یوسف علیہ السلام نے مخالطت کا ارادہ کیا جس طرح کہ زلیخا نے ارادہ کیا تھا۔ ان دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کی طرف جھکا بمقتضائے طبیعتِ بشریہ کے۔ یوسف علیہ السلام کی طرف سے یہ قصد اختیاراً نہ تھا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے اللہ سے پناہ مانگی تھی اور اس کو ایک طرح کا ظلم سمجھا تھا، بلکہ ان کا یہ قصد بغیر عزم، رضا

---

[1] تفسير الطبري (١٦/ ٤١۔ ٤٩) [2] تفسير ابن كثير (٢/ ٦١٧۔ ٦١٨)

اور ارادے کے تھا۔ اس طرح کے قصد پر مؤاخذہ نہیں ہے۔ یوسف علیہ السلام فاحشہ کے مرتکب نہیں ہوئے ہیں، اس میں تو کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اختلاف اگر ہے تو وقوع "هَمَّ" میں ہے۔ چونکہ انبیا علیہم السلام "هَمَّ بِالْمَعْصِيَّة" سے بھی معصوم ہوتے ہیں اور معصیت کا قصد نہیں کرتے، اس لیے اہلِ علم نے اس آیت کی تفسیر میں تکلم کیا ہے، لیکن خالی تکلف سے نہیں ہے۔

امام ابو حاتم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں ابو عبیدہ پر قرآنِ مجید کی عجیب و غریب آیات کی تلاوت کرتا تھا، جب اس آیت پر پہنچا: ﴿ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا ﴾ تو کہا: یہاں تقدیم تاخیر ہے، گویا اصل عبارت یہ ہے: "وَ لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَلَوْ لَآ أَنْ رَّآ بُرْهَانَ رَبِّهٖ لَهَمَّ بِهَا" امام ثعلب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "هَمَّتْ زُلَيْخَا بِالْمَعْصِيَةِ وَكَانَتْ مُصِرَّةً، وَهَمَّ يُوْسُفُ وَلَمْ يَقَعْ مَا هَمَّ بِهٖ، فَبَيْنَ الْهَمَّيْنِ فَرْقٌ." [1] [زلیخا نے معصیت کا قصد کیا اور وہ اس پر مصر تھی، اور یوسف علیہ السلام نے قصد کیا مگر انھوں نے اس قصد کو عمل جامہ نہیں پہنایا، چنانچہ دونوں کے قصد میں بہت بڑا فرق ہے]

یہ فقط ایک حدیثِ نفس تھی، بغیر عزم کے، لیکن جمہور مفسرین سلف و خلف نے لفظ کو حقیقی معنی پر محمول کیا ہے، اللہ تعالیٰ کے اس قول کی دلیل سے: ﴿ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ ﴾ [یوسف: ٥٢] "(یوسف نے کہا:) یہ اس لیے کہ وہ (عزیز) جان لے کہ بے شک میں نے در پردہ اس کی خیانت نہیں کی تھی۔" اور اس آیت کی دلیل سے: ﴿ وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ ۢ بِالسُّوْٓءِ ﴾ [یوسف: ٥٣] "اور میں اپنے نفس کو بری نہیں کرتا، بے شک نفس تو برائی پر اُکساتا ہے۔" صرف "هَمَّ" کچھ عصمت کے منافی نہیں ہوتا، کیونکہ معصیت میں پڑ جانے سے بہر حال بچے رہے اور یہی مطلوب ہے۔

بالجملہ "هَمَّ" سے اس جگہ طبیعت کا میلان اور شہوت سے منازعت ہے، نہ کہ اختیاری ارادہ اور یہ تکلف کے تحت داخل نہیں ہے، بلکہ تعریف اور بہت بڑے اجر کے لائق ہے۔ تیرے اس قول کے مطابق: "قَتَلْتُهُ لَوْ لَمْ أَخَفِ اللّٰهَ" [اگر میں اللہ سے نہ ڈرتا تو اسے قتل کر دیتا] امام رازی رحمہ اللہ نے اس مقام میں بہت تفصیل بیان کی ہے۔[2] برہان میں اختلاف ہے۔ مفسرین نے بہت سے اقوال لکھے ہیں۔ علی بن حسین رحمہ اللہ یا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جب زلیخا نے یہ ارادہ کیا تو گھر کے ایک کنارے میں ایک بت تھا، اس کو کپڑے سے چھپا دیا۔ یوسف علیہ السلام نے کہا: تو کیا کرتی ہے؟ کہا: مجھ کو اپنے معبود سے شرم آتی ہے کہ وہ مجھ کو اس شکل پر دیکھے۔ یوسف علیہ السلام نے کہا کہ میں اس بات کا زیادہ مستحق ہوں کہ اپنے معبودِ برحق سے شرماؤں۔[3]

حاصل یہ ہے کہ کوئی ایسی شے دیکھی جو یوسف علیہ السلام اور اس "هَمَّ" کے درمیان حائل ہو گئی۔ اللہ ہی جانے کہ وہ کیا برہان تھی۔ اس بارے میں مفسرین کی تفصیل طویل بلا دلیل اور بے فائدہ اور صرف قیل و قال (سنی سنائی باتیں)

[1] فتح القدير (٣/ ٢٤۔ ٢٥) [2] تفسير الرازي (١٨/ ٩٢۔ ٩٧) [3] حلية الأولياء (٣/ ١٨١)

ہے۔ سنتِ مطہرہ میں اس برہان کی کوئی تعیین نہیں آئی ہے۔

رہے اقوال سو ان میں بہت اختلاف ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ یہ برہان کا دکھانا اسی لیے تھا کہ یوسف علیہ السلام کے "ھَمَّ" کو بے حیائی کی طرف سے رد کر دیں۔ بعض نے کہا ہے کہ برائی سے مراد خیانتِ عزیز ہے اس کے گھر میں، اور ﴿ اَلْفَحْشَآءَ ﴾ سے مراد زنا ہے، یا ﴿ اَلسُّوْٓءَ ﴾ سے مراد شہوت اور ﴿ اَلْفَحْشَآءَ ﴾ سے مراد مباشرت ہے۔ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس کو عام لفظ پر محمول کریں، اس میں ہر برائی اور بے شرمی داخل ہے۔

امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں اس بات پر ایک روشن نشانی اور قطعی دلیل ہے کہ یوسف علیہ السلام سے "ھَمَّ" بالمعصیت واقع نہیں ہوا اور نہ ہی انھوں نے کبھی معصیت کی طرف توجہ کی، ورنہ اللہ تعالیٰ یوں فرماتا: "لِنَصْرِفَهُ عَنِ السُّوْءِ وَالْفَحْشَآءِ" بلکہ اس امر کی توجہ باہر سے ان کی طرف ہوئی، اللہ نے موجباتِ عفت و عصمت کے ذریعے ان کو اس ارادے سے پھیر دیا۔[1] اور کہا کہ وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے ہیں۔ مخلصین کو لام کی زیر اور زبر کے ساتھ پڑھا ہے، اول کے معنی یہ ہیں کہ وہ اللہ کی طاعت میں مخلص تھے، دوسرے کے معنی یہ کہ اللہ نے ان کو رسالت کے لیے خاص کیا، وہ مخلِص و مستخلَص دونوں تھے۔

امام خفاجی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس شخص کو اس قصے میں دخل تھا، اس نے یوسف علیہ السلام کی براءت کی گواہی دی۔ اللہ نے یہ شہادت دی: ﴿ لِنَصْرِفَ ... الخ﴾ انھوں نے اپنے نفس پر خود یہ شہادت ادا کی: ﴿ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ ﴾ [یوسف: ٢٦] "اسی نے مجھے میرے جی سے پھسلایا۔" زلیخا نے کہا: ﴿ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ﴾ [یوسف: ٣٢] "اور میں نے ہی اسے اس کے جی سے پھسلایا تھا، لیکن اس نے (خود کو) بچا لیا۔" زلیخا کے سید نے کہا: ﴿ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ ﴾ [یوسف: ٢٩] "بے شک تو ہی خطا کار ہے۔" ابلیس نے کہا: ﴿ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴾ [الحجر: ٣٩۔ ٤٠] "میں ان سب کو گمراہ کروں گا۔ تیرے ان بندوں کے سوا جو ان میں سے چنے ہوئے ہیں۔" اس سے معلوم ہوا کہ شیطان کا اغوا ان پر نہ چلا، اس کے باوجود قصہ بنانے والوں نے ان کو بری نہ رکھا۔[2]

وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّاَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا
الْبَابِ ۭ قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْۗءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ
اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ ٢٥ قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ وَشَهِدَ شَاهِدٌ
مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ

[1] تفسير أبي السعود (٤/ ٢٦٧) [2] حاشية الشهاب علىٰ تفسير البيضاوي (٥/ ١٦٨) فتح البيان (٦/ ٣١٣۔ ٣١٦)

مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۶﴾ وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ
وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۷﴾ فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ
مِنْ كَيْدِكُنَّ ؕ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾ يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ
هٰذَا ٜ وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ۚۖ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ ﴿۲۹﴾

اور وہ دونوں دروازے کی طرف دوڑے، اور اس (عورت) نے اس (یوسف) کی قمیص پیچھے سے پھاڑ دی، اور دونوں نے اس کے خاوند کو دروازے کے پاس پایا، تو وہ (جھٹ سے) بولی: اس کی کیا سزا ہے جو تیری بیوی سے برائی کا ارادہ کرے، سوائے اس کے کہ اسے قید کیا جائے یا دردناک عذاب (دیا جائے) 25 یوسف نے کہا: اسی نے مجھے میرے جی سے پھسلایا۔ اور اس (عورت) کے خاندان میں سے ایک شاہد نے گواہی دی کہ اگر اس (یوسف) کی قمیص آگے سے پھٹی ہے تو وہ (عورت) سچی ہے اور وہ (یوسف) جھوٹوں میں سے ہے 26 اور اگر اس (یوسف) کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہے تو وہ (عورت) جھوٹی ہے اور وہ (یوسف) سچا ہے 27 پھر جب اس (عزیز) نے یوسف کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی دیکھی تو وہ کہنے لگا: بے شک یہ تم عورتوں کے مکر و فریب میں سے ہے، بے شک تمھارا مکر بہت بڑا (خطرناک) ہے 28 اے یوسف! اس (بات) سے درگزر کر، اور (بیوی سے کہا:) تو اپنے گناہ کی بخشش مانگ، بے شک تو ہی خطا کار ہے 29

یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی کی گواہی:

یوسف علیہ السلام نکل جانے کے لیے دوڑے، وہ ان کو پکڑنے کے لیے دوڑی، اس عورت کا ناتے دار ایک لڑکا دودھ پیتا بول اٹھا۔ اللہ نے یوسف و زلیخا کے حال کی خبر دی کہ دونوں دروازے کی طرف دوڑے۔ یوسف علیہ السلام بھاگے اور عورت ان کی طلب میں دوڑی کہ پکڑ کر گھر کے اندر لے آئے، اس اثنا میں اس نے یوسف علیہ السلام کی قمیص پکڑ کر کھینچی، وہ پھٹ گئی۔

کہتے ہیں کہ پشت کی جانب سے پھٹ کر علاحدہ ہوگئی اور یوسف علیہ السلام بھاگے چلے جاتے تھے، یہ ان کے پیچھے تھی، دروازے پر زلیخا کا خاوند مل گیا، تب اس نے اپنی صفائی کے لیے مکر بنایا اور خاوند سے کہا کہ اس نے میرے ساتھ برا ارادہ کیا تھا اور اپنا عیب ان پر لگا دیا اور کہا کہ ایسے شخص کی یہی سزا ہے کہ قید کیا جائے یا عذابِ الیم دیا جائے۔ یہاں عذاب سے مراد زور سے مارنا ہے، جس سے تکلیف اور درد ہو۔ اس وقت یوسف علیہ السلام نے انتصار بالحق کیا (بدلا لیا) اور اس خیانت سے اپنی براءت ظاہر فرمائی اور صاف سچی بات کہہ دی کہ خود اس نے مجھے پھانسنا چاہا تھا اور یہ میرے پیچھے لگی ہوئی چلی آئی، یہاں تک کہ میرا کرتا پھاڑ دیا۔ تب اس عورت کے گھر والوں میں سے ایک شاہد نے گواہی دی۔

اس شاہد کے بارے میں اختلاف ہے کہ کوئی چھوٹا تھا یا بڑا۔ علمائے سلف و خلف کے اس جگہ دو قول ہیں۔
سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ذولحیہ تھا، یعنی جوان ڈاڑھی والا تھا، جو بادشاہ کے خواص میں سے تھا۔[1] یہی قول امام مجاہد، عکرمہ، حسن، قتادہ، سدی اور محمد بن اسحاق رحمہم اللہ وغیرہم کا ہے۔[2] امام زید بن اسلم اور سدی رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ زلیخا کے چچا کا بیٹا تھا۔[3] امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زلیخا مَلک ریان بن ولید کی بہن کی بیٹی تھی۔[4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا دوسرا قول یہ ہے کہ ایک بچہ شیر خوار تھا۔[5] سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، امام ہلال بن یساف، حسن، سعید بن جبیر، ضحاک اور ابن مزاحم رحمہم اللہ بھی یہی کہتے ہیں کہ گھر ہی میں سے ایک لڑکا تھا۔[6] اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے۔[7]

اس بارے میں ایک مرفوع حدیث بھی آئی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے رفعاً کہا ہے کہ چار (بچوں) نے چھوٹی عمر میں کلام کیا ہے، ان میں سے ایک شاہدِ یوسف علیہ السلام ہے۔ (رواہ ابن جریر) دوسری روایت میں یہ ہے کہ ایک ابن ماشطہ بنت فرعون، دوم شاہدِ یوسف، سوم صاحبِ جریج، چہارم عیسیٰ بن مریم علیہما السلام۔[8] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ شاہد اللہ کا حکم تھا، کوئی انسان نہ تھا،[9] لیکن یہ قول غریب ہے۔

بہر حال جب زلیخا کے شوہر کو یوسف علیہ السلام کا صدق اور زلیخا کا کذب ثابت ہو گیا اور اس نے جان لیا کہ زلیخا نے یہ تہمت یوسف علیہ السلام پر لگائی ہے اس نے یوسف علیہ السلام سے کہا کہ اس سے درگزر کرو اور اس معاملے کو تم پوشیدہ رکھو، کسی سے اس کا چرچا نہ کرو اور زلیخا سے کہا کہ تُو اپنے گناہ سے توبہ کر۔ وہ ایک نرم دل اور سہل مزاج مرد تھا۔ یا اس نے زلیخا کو معذور رکھا، اس لیے کہ اس نے ایک ایسی بات دیکھی جس سے صبر نہ ہو سکا۔ گناہ سے مراد وہی برا ارادہ ہے جو زلیخا نے یوسف علیہ السلام سے کیا تھا اور ایک بے گناہ پر گناہ کی تہمت لگائی، اس لیے زلیخا سے یہ بات کہی کہ تُو ہی خطا وار ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ دونوں دروازے کی طرف دوڑے، یوسف علیہ السلام کا دوڑنا بچنے کے لیے تھا کہ

---

[1] تفسير الطبري (١٦/ ٥٦) یہ روایت دو سندوں کے ساتھ مروی ہے۔ پہلی سند میں "سماك عن عكرمة"، مضطرب راوی ہے۔ اور دوسری میں ''جابر جعفی'' ضعیف راوی ہے۔

[2] تفسير الطبري (١٦/ ٥٦۔ ٥٨) [3] تفسير الطبري (١٦/ ٥٧) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٢٩)

[4] تفسير ابن كثير (٢/ ٦١٨) [5] تفسير الطبري (١٦/ ٥٥۔ ٥٦) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔

[6] تفسير الطبري (١٦/ ٥٤۔ ٥٥) [7] تفسير الطبري (١٦/ ٥٩)

[8] تفسير الطبري (١٦/ ٥٤۔ ٥٥) اس کی سند میں ''عطاء بن سائب'' مختلط راوی ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٨٨٠)

[9] تفسير الطبري (١٦/ ٥٩)

دروازے سے نکل کر بچ جائیں اور زلیخا کا دوڑنا اس لیے تھا کہ کہیں دروازہ کھول کر یہ نکل نہ جائے۔ اس جگہ لفظ باب کہا اور پہلے لفظ ابواب فرمایا تھا، اس لیے کہ یہ دوڑ دھوپ بیرونی دروازے کی طرف تھی، جس سے باہر جاتے تھے۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے بھاگنے میں جلدی کی اور اس نے پکڑنے میں، یہاں تک کہ ان کا کپڑا پکڑ لیا اور کھینچا،[1] وہ پشت کی طرف سے نیچے تک پھٹ گیا۔

﴿ قُدَّ ﴾ بمعنی قطع ہے، طول میں قطع کو ''قدّ'' کہتے ہیں اور عرض میں ''قط'' کہتے ہیں۔ اس تطابق میں عزیز دروازے پر مل گیا۔ قبطی لغت میں زوج یعنی شوہر کو سَیِّد کہتے ہیں، سَیِّدَهُمَا نہ کہا، اس لیے کہ اُس کا یوسف علیہ السلام کے حق میں مالک ہونا صحیح نہیں تھا۔ ﴿ سُوْٓءًا ﴾ سے مراد زنا ہے، زلیخا نے اپنے بچاؤ کے لیے یہ حیلہ کیا، اور جو آپ ارادہ کیا تھا وہ یوسف علیہ السلام کی طرف لگا دیا۔ ''رَمَتْ بِدَآئِهَا وَانْسَلَّتْ'' [اپنا گناہ ان کے ذمے لگا دیا اور خود کھسک گئی] پھر خود ہی یہ کہا کہ ایسے شخص کی یہی سزا ہے کہ جیل خانے میں قید کیا جائے یا کوڑے مارے جائیں۔ پہلے قید کا نام لیا، اس لیے کہ محبت کرنے والا محبوب کو تکلیف دینا نہیں چاہتا۔ مطلب یہ کہ ایک دو دن میرے پاس قید رکھا جائے، لمبی قید مراد نہ تھا۔

امام خازن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''وَهٰذِهٖ لَطِيْفَةٌ فَافْهَمْهَا''[2] [یہ ایک نکتہ ہے، اسے سمجھ لو] امام ابن الخطیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حبسِ دائم (ہمیشہ کی قید) کو اس عبارت سے نہیں بولتے، بلکہ یوں بولتے ہیں کہ اس کا مسجونین میں ہونا واجب ہے، جس طرح فرعون نے کہا تھا: ﴿ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ﴾ [الشعراء: ۲۹] ''تو میں ضرور تجھے قیدیوں میں سے کر دوں گا۔'' (ذكره الكرخي) عذابِ الیم عام ہے کوڑے کی مار یا اس طرح کی اور مار سے۔ ابہامِ عذاب میں خوف دلانا ہے سزا کی شان کے لیے۔ اس لیے کہ قانون کے مطابق ہر ایک مطرد (بار بار خطا کرنے والے) کے لیے کوئی خوف ہونا چاہیے اور اپنے نفس کے لیے عزیز کا اہل ہونا ذکر کیا، تاکہ اس بات کا زیادہ اثر ہو اور وہ سن کر بھڑک اٹھے۔

یہ بات غضب اور حمیت کے طور پر کی اور یہ نہ کہا کہ یوسف علیہ السلام کو ان دو سزاؤں میں سے ایک سزا دینا واجب ہے، بلکہ محبوب کے حفظ کی خاطر ایک کلی ذکر کیا، یعنی یہ کہا کہ جو شر کا ارادہ کرے۔ جب یوسف علیہ السلام نے یہ بات سنی تو اپنی طرف کی ایک دلیل بیان کی اور کہا: اس نے خود مجھ کو اس کام کے لیے طلب کیا، میں نے نہ مانا اور میں بھاگا، یوسف علیہ السلام نہ چاہتے تھے کہ ایسی بات کہیں۔ جب زلیخا نے ان کی آبرو کا ازالہ چاہا تو چار و ناچار ان کو کہنا پڑا، پھر بھی بلفظ غیبت (ضمیر غائب) کہا نہ بلفظ حضور (ضمیر حاضر)، یہ ایک اچھا ادب تھا۔

اتنے میں اس کے گھر والوں میں سے ایک شاہد نے یہ گواہی دی، وہ زلیخا کا چچا زاد تھا یا ماموں زاد تھا۔ امام سہیلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ گود میں ایک بچہ تھا، جس طرح کہ حدیث میں آیا ہے۔[3] بعض نے کہا ہے کہ ایک

---

[1] تفسير الجلالين (١/ ٤٠٦) [2] تفسير الخازن (٣/ ٢٧٧) [3] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

دانا تھا، جس سے عزیز مشورہ لیا کرتا تھا اور وہ زلیخا کا رشتہ دار تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ گھر میں ایک بچہ تھا، اللہ نے اس کو زبان دے دی۔[1] امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک صاحبِ فہم وعلم مرد تھا۔[2] بہرحال شاہد کا عورت کے رشتے داروں میں سے ہونا یوسف علیہ السلام کو تہمت سے بچانے کے لیے زیادہ اہم تھا، حالانکہ اور بھی بہت سی نشانیاں تھیں، جن سے یوسف علیہ السلام کی سچائی کی دلیل مل جاتی۔

عزیز کو جب ان کی براءت کا اور زلیخا کا قصور ثابت ہوا تو اس نے تمام عورتوں کو مخاطب کر کے کہا کہ تمھارا مکر بڑا ہے، خاص زلیخا کو خطاب نہیں کیا، بلکہ جنس کو خطاب کیا، کیونکہ حیلے اور فریب کاریاں کچھ زلیخا کے ساتھ خاص نہیں تھیں۔ ان کے مکر کو عظیم کہا، اس لیے کہ ان کا مکر اپنی مراد حاصل کرنے میں تمام لوگوں سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ مردوں کو اس بارے میں ویسی قدرت نہیں ہوتی، کیونکہ عورتوں کا مکر نہایت لطیف اور دلوں کو زیادہ پھانسنے والا اور نفس کے لیے زیادہ مؤثر ہوا کرتا ہے، بعض علما نے کہا ہے کہ میں جتنا عورتوں سے ڈرتا ہوں، شیطان سے اتنا نہیں ڈرتا، اس لیے کہ اللہ نے شیطان کے مکر کو ضعیف کہا ہے اور عورتوں کے مکر کو عظیم فرمایا ہے، نیز شیطان چوری سے وسوسہ ڈالتا ہے اور یہ دو بدو وسوسہ انداز ہوتی ہے۔

امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کے مکر وفریب کا بڑا ہونا جماع اور شہوت کے معاملے میں ہے نہ علی الاطلاق، بلکہ حیلے اور مکر میں مرد زیادہ ہوتے ہیں۔ ہمارے ایک معاصر نے مذمتِ نسواں میں ایک خوب رسالہ لکھا ہے، جس کا نام ''اَللَّتَیَا وَالَّتِيْ'' رکھا۔

پھر عزیز نے یوسف علیہ السلام سے کہا کہ تم اس کا افشا نہ کرو اور زلیخا سے کہا کہ تُو استغفار کر۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عزیز قلیل الغیرت تھا، بلکہ بحر میں کہا ہے کہ مصر کی مٹی کا تقاضا یہی ہے، اس لیے مصر کی زمین میں شیر پیدا نہیں ہوتا اور اگر کہیں سے آ جاتا ہے تو زندہ نہیں رہتا۔[3]

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ
نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ۭ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝30
فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ
مُتَّكَاً وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا وَّقَالَتِ اخْرُجْ
عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗٓ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ۡ وَقُلْنَ حَاشَ
لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ۭ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ۝31 قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ

---

[1] فتح القدير (٣/ ٢٨) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٢٩) [3] فتح البيان (٦/ ٣١٦۔ ٣٢١)

الَّذِیْ لُمْتُنَّنِیْ فِیْهِ ؕ وَ لَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ؕ
وَ لَئِنْ لَّمْ یَفْعَلْ مَاۤ اٰمُرُهٗ لَیُسْجَنَنَّ وَ لَیَكُوْنًا مِّنَ
الصّٰغِرِیْنَ۝۳۲ قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ ۚ
وَ اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَ اَكُنْ مِّنَ
الْجٰهِلِیْنَ۝۳۳ فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَیْدَهُنَّ ؕ اِنَّهٗ هُوَ
السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۝۳۴

اور شہر میں عورتیں کہنے لگیں کہ عزیز کی بیوی اپنے غلام کو اس کے جی سے پھسلاتی ہے، اس کے دل میں (یوسف کی) محبت گھر کر گئی ہے۔ بے شک ہم اسے کھلی گمراہی میں دیکھتی ہیں (30) چناں چہ جب اس (عورت) نے ان کی پُرمکر باتیں سنیں تو اس نے ان کی طرف پیغام بھیجا اور ان کے لیے مسندیں تیار کیں، اور اس نے ان میں سے ہر ایک (عورت) کو ایک چھری دی اور (پھر یوسف سے) کہا: ان کے سامنے نکل آ۔ پھر جب انھوں نے اسے دیکھا تو انھوں نے اس (کی شان) کو بڑا خیال کیا اور اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے اور بولیں: [حَاشَ لِلّٰهِ] ''اللہ کی پناہ!'' یہ بشر نہیں، یہ تو نہایت معزز فرشتہ ہے (31) اس نے کہا: یہی تو ہے وہ شخص جس کے بارے میں تم مجھے ملامت کرتی تھیں اور میں نے ہی اسے اس کے جی سے پھسلایا تھا، لیکن اس نے (خود کو) بچا لیا، اب اگر اس نے وہ نہ کیا جو میں اس کو حکم دیتی ہوں تو اسے ضرور قید کیا جائے گا اور یقیناً وہ بے عزت ہونے والوں میں سے ہوگا (32) یوسف نے کہا: اے میرے رب! مجھے قید خانہ اس سے زیادہ پسند ہے جس کی طرف وہ (عورتیں) مجھے بلاتی ہیں اور اگر تو نے ان کا مکر مجھ سے دور نہ کیا تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں گا (33) چناں چہ اس کے رب نے اس کی دعا قبول کر لی، پھر اس نے اس سے ان (عورتوں) کا مکر دور کر دیا، بے شک وہی خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے (34)

زلیخا کی محبت کا چرچا اور مصر کی عورتوں کی مکاری:

چھریاں دیں تھیں پھل وغیرہ کھانے کو، ان کا حسن دیکھ کر بدحواس ہوگئیں، چھری سے ہاتھ کٹ گئے۔ زلیخا نے ان کے روبرو یہ بات کہی، تاکہ وہ بھی سمجھائیں اور یوسف علیہ السلام ڈر کر قبول کریں۔ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اپنے مانگے سے قید میں پڑے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اتنا ہی قبول فرمایا کہ ان کا فریب دفع کیا اور قید ہونا قسمت میں کیا۔ آدمی کو

چاہیے کہ گھبرا کر اپنے حق میں برائی نہ مانگے، پوری بھلائی مانگے، گو کہ وہی ہو گا جو کہ قسمت میں ہے۔

اللہ پاک نے خبر دی کہ یوسف علیہ السلام اور عزیز کی بیوی کی خبر پورے شہر، یعنی مصر میں پھیل گئی، لوگوں نے چرچا کیا، بڑی عورتوں اور امرا کی بیویوں نے یہ حال سن کر عزیز کی بیوی پر انکار کیا، عزیز مصر کا وزیر تھا۔ زلیخا پر اس بات کا عیب لگایا کہ وہ اپنے غلام سے ملنے کی تمنا کرتی ہے اور اس کی محبت میں پریشان حال اور شغف رکھتی ہے۔ شغف کہتے ہیں دل کے غلاف کو، یعنی غلام کی محبت اس کے دل کے اندر پہنچ گئی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ شغف کہتے ہیں قاتل محبت کو اور شعف اس سے کم درجہ ہے۔ شغاف پردۂ دل کو بولتے ہیں۔[1] ہم دیکھتے ہیں کہ یہ عورت سخت گمراہی میں پھنسی ہے، گمراہی کا اطلاق غلام کی محبت اور شغفِ دل پر کیا۔ زلیخا نے جب ان عورتوں کے مکر کا حال سنا اور بعض نے کہا کہ ان کی بات سنی۔

امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب ان مستورات کو یوسف علیہ السلام کے حسن کی خبر پہنچی تو انھوں نے چاہا کہ یوسف علیہ السلام کو دیکھیں، اس لیے یہ طعنہ کیا، تاکہ اس حیلے سے یوسف علیہ السلام کا دیدار نصیب ہو۔ تب زلیخا نے آدمی بھیج کر ان عورتوں کو اپنے گھر بلایا، ضیافت اور مہمانی کی اور ان کے لیے مجلس آراستہ کی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام سعید بن جبیر، مجاہد، حسن اور سدی رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا ہے کہ ﴿ مُتَّكَاً ﴾ سے مراد مجلس ہے، جس میں فرش، تکیہ، کھانا اور اس طرح کی اور چیزوں کا اہتمام ہوا ہو اور میوہ جات اور پھل موجود ہوں، جن کو چاقو چھری سے کاٹ کر کھائیں، جیسے: اترج وغیرہ۔[2]

اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ زلیخا نے ہر ایک عورت کے ہاتھ میں ایک چھری دی، یہ زلیخا کا ان عورتوں کے ساتھ ایک داؤ تھا اور ان کے اس حیلے کے مقابلے میں ایک حیلہ تھا جو انھوں نے یوسف علیہ السلام کو دیکھنے کے لیے کیا تھا۔ پھر یوسف علیہ السلام سے کہا کہ باہر آؤ، ان کو ایک علاحدہ جگہ میں پہلے سے چھپا رکھا تھا، جب یہ باہر آئے تو ان عورتوں نے ان کی شان کو عظیم جانا اور ان کی قدر و منزلت کو بہت بڑا سمجھا، مارے وہشت کے دیکھتے ہی اپنے ہاتھ کاٹنے لگیں، اس گمان پر کہ ہم اترج کو تراشتی ہیں۔ مراد یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے۔ (قاله غير واحد) امام مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ایسے ہاتھ کاٹے کہ زمین پر گر گئے۔[3] والله أعلم.

امام زید بن اسلم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ زلیخا نے یہ بات ان عورتوں سے اس وقت کہی جب وہ کھا پی چکیں اور ان کا دل خوش ہوا، تب ان کے ساتھ اترج لا کر رکھا اور ہر ایک کو ایک چھری دی کہ اس کو تراش کر نوشِ جان کرو، پھر ان سے کہا کہ تم یوسف علیہ السلام کو دیکھنا چاہتی ہو، انھوں نے کہا: ہاں۔ تب کسی کو بھیج کر حکم دیا کہ اے یوسف! باہر آؤ۔

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۷/ ۲۱۳۱) اس کی سند میں ''بشر بن عمارہ'' ضعیف راوی ہے۔
[2] تفسير الطبري (۱٦/ ٦٩۔ ۷۳) [3] تفسير الطبري (۱٦/ ۷۹)

رشک آیدم وگرنہ نقابت کشودمی　　　　دست ترا گرفتہ بناصح نمودمے

''مجھے غیرت آتی ہے، ورنہ تیرا نقاب کھول دیتا، تیرا ہاتھ پکڑ کر ناصح کو ظاہر کر دیتا۔''

پھر ان مستورات کی نظر یوسف علیہ السلام پر پڑی تو وہ اپنے ہاتھ کاٹنے لگیں، پھر حکم دیا کہ جاؤ، تاکہ چہرہ اور پشت دونوں دیکھ لیں۔ یوسف علیہ السلام اس جگہ سے پھرے اور وہ ہاتھ کاٹنے میں لگی تھیں، جب وہ چلے گئے تو درد کا احساس ہوا، لگیں ولولہ کرنے۔ زلیخا نے کہا: تم نے ایک ہی نظر میں یہ کام کیا، پھر مجھ پر کیا ملامت ہے؟ تب انھوں نے کہا: ﴿حٰشَ لِلّٰهِ﴾ یہ انسان کیسے ہوسکتا ہے، یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے، پھر کہا: اب تجھ پر اس کے بعد ہم کوئی ملامت نہیں کرتیں۔[1]

یہ اس لیے کہا کہ انھوں نے انسانوں میں اس جیسا بلکہ اس کے قریب قریب بھی نہیں دیکھا تھا، کیونکہ یوسف علیہ السلام کو نصف حسن دیا گیا تھا، جس طرح کہ صحیح حدیث جو اسراء کے متعلق ہے، اس میں رفعاً آیا ہے کہ تیسرے آسمان میں یوسف علیہ السلام پر گزر ہوا، «فَإِذَا هُوَ قَدْ أُعْطِيَ شَطْرَ الْحُسْنِ»[2] [کیا دیکھتے ہیں کہ انھیں نصف حسن دیا گیا ہے] سیدنا انس رضی اللہ عنہ رفعاً کہتے ہیں: «أُعْطِيَ يُوْسُفُ وَأُمُّهُ شَطْرَ الْحُسْنِ»[3] [یوسف علیہ السلام اور ان کی والدہ کو نصف حسن دیا گیا] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: ''أُعْطِيَ يُوْسُفُ وَأُمُّهُ ثُلُثَ الْحُسْنِ''[4] [یوسف علیہ السلام اور ان کی والدہ کو ایک تہائی حسن دیا گیا] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام کا چہرہ مثل برق کے تھا، کوئی عورت اگر ان کے پاس کسی کام کو آتی تو وہ اپنا منہ چھپا لیتے کہ مبادا ان کی وجہ سے وہ کسی فتنے میں پڑ جائے۔[5]

اس کو امام حسن بصری رحمہ اللہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرسلاً ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: «أُعْطِيَ يُوْسُفُ وَأُمُّهُ ثُلُثَ حُسْنِ أَهْلِ الدُّنْيَا وَأُعْطِيَ النَّاسُ ثُلُثَيْنِ» [یوسف علیہ السلام اور ان کی والدہ کو اہلِ دنیا کا ایک تہائی حسن دیا گیا اور باقی لوگوں کو دو تہائی حسن دیا گیا] یا یوں فرمایا کہ دو ثلث حسن یوسف علیہ السلام اور ان کی ماں کو دیا گیا تھا اور ایک ثلث سب لوگ شریک ہیں۔[6] ربیعہ جرشی کہتے ہیں کہ حسن کی تقسیم دو نصف پر ہوئی۔ یوسف علیہ السلام اور ان کی والدہ سارہ کو نصف حسن دیا گیا اور دوسرے نصف میں ساری مخلوق شریک ہے۔[7]

امام ابو القاسم سہیلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کے معنے یہ ہیں کہ یوسف علیہ السلام کو حسنِ آدم کا نصف عطا ہوا تھا، کیونکہ اللہ نے آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھ سے مکمل ترین اور حسین ترین صورت پر پیدا کیا تھا۔ آدم علیہ السلام کی اولاد میں حسن و جمال میں ان کے برابر کوئی نہ تھا، یوسف علیہ السلام کو نصف حسن ملا تھا،[8] لہٰذا ان عورتوں نے یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر ﴿حٰشَ لِلّٰهِ﴾ کہا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ اور کئی ایک اہلِ علم نے کہا ہے، یعنی معاذ اللہ کے یہ بشر ہو۔[9] بعض کی قراءت یہ ہے: ''مَا هٰذَا

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٣٧)　[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٦٢)
[3] مستدرك الحاکم (٢/ ٦٢٢) صحیح الجامع، رقم الحدیث (١٠٦٣)　[4] تفسیر الطبري (١٦/ ٧٩)
[5] تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٣٦)　[6] تفسیر الطبري (١٦/ ٨٠۔ ٨١) یہ روایت مرسل ہے۔
[7] تفسیر الطبري (١٦/ ٨١)　[8] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٦٢٠)　[9] تفسیر الطبري (١٦/ ٨٣)

بِشَرِيٍّ أَيِ: بِمُشْتَرىً بِشُرَآءٍ'' یعنی خرید کردہ غلام نہیں ہے، بلکہ ایک معزز فرشتہ ہے۔

زلیخا نے کہا کہ یہ وہی ہے جس کے پیچھے تم نے مجھ پر ملامت کی، یہ کہنا بطور معذرت کے تھا، یعنی یہ اس کے لائق ہے کہ اس سے محبت کی جائے، اس کے جمال اور کمال کے سبب سے۔ میں نے ہی اس کو اپنی طرف سے پھانسنا چاہا تھا مگر یہ نہ پھنسا، باز رہا۔ بعض نے کہا ہے کہ جب ان عورتوں نے یوسف علیہ السلام کے ظاہری جمال کو دیکھا تو زلیخا نے ان کے باطنی صفاتِ حسنہ کی بھی خبر کر دی جو کہ ان کی نظر سے مخفی تھیں، وہ باطنی حسن یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی اور پارسائی تھی۔

پھر زلیخا نے یوسف علیہ السلام کو یہ دھمکی دی کہ اگر وہ میرا کہنا نہ مانے گا اور جو حکم میں دیتی ہوں وہ بجا نہ لائے گا تو قید ہو کر ذلت اٹھائے گا، اس وقت یوسف علیہ السلام نے اللہ سے عورتوں کے شر اور مکر سے پناہ مانگی اور کہا کہ اے رب! مجھے قید ہونا پسند ہے، مگر زنا کرنا منظور نہیں ہے، اگر تُو مجھ سے ان کے مکر کو دور نہ کرے گا، بلکہ مجھ کو میرے نفس کے سپرد کر دے گا تو مجھ کو نفس پر کچھ قدرت نہیں اور نہ میں اس کے نفع و نقصان کا مالک ہوں، لیکن تیرے حول اور قوت سے تجھ سے مدد چاہتا ہوں اور تجھی پر بھروسا ہے، تو مجھ کو میرے حوالے نہ کر کہ میں گناہ میں پھنس کر جاہلوں میں سے ہو جاؤں۔ اللہ نے ان کی یہ دعا قبول کر لی اور یوسف علیہ السلام کو معصوم اور محفوظ رکھا۔ اللہ کی حمایت سے وہ اس گناہ سے باز رہے اور قید کو اختیار کیا۔ یہ کمال کے مقام کی انتہا ہے کہ باوجود اس کے کہ وہ جوان اور جمیل تھے اور ان کی مالکن نے جو کہ عزیزِ مصر کی بیوی تھی اور نہایت خوب صورت اور صاحبِ مال و ریاست تھی، ان کو اپنی طرف بلایا اور وہ باز رہے اور اللہ کے ڈر سے قید کو بے حیائی پر اختیار کیا۔

ان سے یہ کام آخرت کے ثواب کی امید سے ہوا، جیسے کہ صحیحین میں رفعاً آیا ہے کہ سات شخصوں کو اللہ اپنے سائے میں جگہ دے گا، جس دن اس کے سائے کے سوا کسی کا سایہ نہ ہوگا: ایک عادل امام۔ دوم جوان جو کہ اللہ کی عبادت میں ہی لگا ہوا ہے۔ سوم وہ شخص جس کا دل مسجد سے معلق ہے، جب مسجد سے باہر آتا ہے جب تک کہ پھر مسجد میں نہ جائے۔ چوتھے وہ دو شخص جو آپس میں اللہ کے لیے محبت و دوستی رکھتے ہیں، اسی محبت پر اکٹھے ہوتے ہیں اور اسی پر جدا ہوتے ہیں۔ پنجم وہ شخص جس نے صدقہ دیا اور اس کو مخفی رکھا، یہاں تک کہ اس کے بائیں ہاتھ نے نہ جانا کہ دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا۔ چھٹا وہ مرد جس کو کسی صاحبِ منصب و جمال عورت نے بلایا تو اس نے کہا کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور ساتواں وہ مرد جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا اور اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔[1] اس حدیث کی تشریح رسالہ ''تحصيل الكمال بالخصال الموجبة للظلال'' سے معلوم کرنا چاہیے۔ یہ رسالہ طبع ہو کر شائع ہو چکا ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٣١)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ لفظ ﴿ نِسۡوَةٌ ﴾ کو نون کی پیش کے ساتھ پڑھا ہے۔[1] (قاله أبو البقا) اور نون کی زیر کے ساتھ تو مشہور و معروف ہے۔ ﴿ نِسۡوَةٌ ﴾ کے بیان میں رسالہ ''حسن الأسوة'' (نواب صاحب کی تالیف) نہایت جامع ہے۔ مراد ﴿ نِسۡوَةٌ ﴾ سے عورتوں کی جماعت ہے۔ کہتے ہیں یہ سب پانچ عورتیں تھیں: ایک زنِ ساقیِ عزیز، دوم زنِ نان بر، سوم زنِ صاحبِ دواب، چہارم زنِ صاحبِ سجن، پنجم زنِ حاجب۔ مدینہ سے مراد مصر ہے یا مدینۃ الشمس۔ زنِ عزیز سے مراد زلیخا ہے۔ فتی کلامِ عرب میں جوان نوعمر کو کہتے ہیں اور فتاۃ جوان لڑکی کو۔

اس جگہ فتیً سے مراد غلام ہے۔ ان عورتوں نے کہا کہ زلیخا کو دیکھو کہ اپنے غلام کو اس کا جی چاہتا ہے، وہ اس پر فریفتہ اور شیفتہ ہو گئی ہے۔ یوسف علیہ السلام کی محبت اس کے دل پر اتنی غالب ہوئی کہ غلافِ دل میں پہنچ گئی۔ بعض نے کہا ہے کہ شِغَاف وسطِ قلب ہے۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے: ''شَغَفَهُ الْحُبُّ، أَحْرَقَ قَلْبَهُ'' امام ابو زید رحمہ اللہ نے کہا ہے: ''أَمْرَضَهُ''[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: ''شَغَفَهَا، غَلَبَهَا وَقَالَ: قَتَلَهَا حُبُّ يُوسُفَ''[3]

میر آزاد نے ''سبحة المرجان'' میں کہا ہے کہ عشق کے اظہار کے لیے عورت کی طرف سے کچھ استبعاد (ناممکن) نہیں ہے۔ تُو نے قرآن میں نہیں دیکھا کہ اللہ نے زنِ عزیز کے یوسف علیہ السلام کے ساتھ عشق کا ذکر کیا ہے۔ ہنود اپنی غزلوں میں عشق کا ذکر عورت ہی کی طرف کرتے ہیں، بخلاف فارسیوں کے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دینِ ہنود میں عورت ایک ہی خاوند کرتی ہے۔ اس کی عیش شوہر کی حیات کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے اور بس، لہٰذا جب وہ مر جاتا ہے تو یہ اپنی جان اس کے پیچھے جلا لیتی ہے۔ سو مرد اور عورت کے درمیان عشق کا وجود ایک وضعِ الٰہی ہے، کبھی دونوں جانب سے ہوتا ہے اور کبھی ایک طرف سے۔ اس وضعِ الٰہی میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت معشوقہ عاشقہ ہے اور مرد عاشق معشوق۔

اہلِ ہند تغزل بالنساء (شعروں میں عورتوں کی تعریف کرنا) میں عرب کے طریقے کے مطابق ہیں، ان کے برخلاف فارسی اور تُرک ہیں کہ ان کا تغزل نوعمر لڑکوں کے ساتھ ہوتا ہے، جن کی ابھی ڈاڑھی مونچھ نہ آئی ہو۔ ان کی غزل میں کہیں عورت کا ذکر نہیں ہے۔ ربِ محبت کی قسم ہے کہ یہ لوگ ظالم اور ستم گر ہیں، انھوں نے شے کو اس کی مناسب جگہ کے بجائے کسی اور جگہ پر رکھا ہے، جس طرح اللہ پاک نے قومِ لوط علیہ السلام کے حق میں فرمایا ہے: ﴿ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيۡنَ بِبَعِيۡدٍ ﴾ [هود: ٨٣] ''اور وہ (پتھر یا سزا یا بستی) ان ظالموں (قریش مکہ) سے دور نہیں۔'' اور متاخرین عرب، بلکہ عرب میں پیدا ہونے والے لوگ جنھوں نے نوجوان لڑکوں پر تغزل کیا ہے، وہ فارسی اور ترک کے

[1] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٥٢) [2] تفسير القرطبي (٩/ ١٧٦) [3] تفسير الطبري (١٦/ ٦٤) الدر المنثور (٤/ ٥٢٧)

مقلد ہیں، ورنہ اصل غزل خوانی ان کے حق میں عورتوں کے لیے تھی۔ رہے ہنود سو وہ بالکل تغزل بالامرد (نوخیز لڑکوں پر غزل کہنا) کو نہیں پہچانتے۔ میر صاحب وقبلہ نے کتابِ مذکور کی چوتھی فصل میں معشوقات اور عشاق کی اقسام کو بیان کیا ہے اور ہر قسم کے لیے عجیب وغریب اشعار اور ابیات مختلف جہتوں اور حیثیتوں کے اعتبار سے لکھے ہیں۔ إِنْ رَّآهَا السَّالِيُ تَذُوْبُ طَبِيْعَتُهُ الْجَامِدَةُ أَوِ الْعَاذِلُ تَشْعَلُ نَارُهُ الْخَامِدَةُ.[1] [اگر صابر اس کو دیکھ لے تو اس کی جامد طبیعت پگھل جائے یا عاذل دیکھ لے تو اس کی بجھی ہوئی آگ بھڑک اٹھے]

اس مقام پر حاصلِ کلام یہ ہے کہ عورت اور مرد کا عشق محل سے ہے اور عشق امرد (نوخیز لڑکا) بے محل۔ مرد و عورت کے عشق سے مراد شرعی طریقہ پر میاں بیوی کے درمیان محبت ہے نہ کہ اجنبی عورت اور اجنبی مرد کے درمیان محبت۔ لہٰذا لفظ عشق کا استعمال کتاب وسنت میں کسی جگہ نہیں آیا ہے اور جس کسی حدیث میں لفظ مذکور ہے، وہ حدیث ثابت نہیں۔ وہ فسق جس کو عرفِ عام میں عشق کہتے ہیں اور اس کے لیے سیکڑوں افسانے اور داستانیں نثر اور نظم میں ہر زبان میں بن گئے ہیں، وہ شرعی طور پر شرکِ جلی میں داخل ہیں، جس طرح کہ اس کی تحقیق شیخ محمد حیات سندھی رحمہ اللہ نے رسالہ "عشق المردان" میں اور حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے کتاب "الجواب الكافي" اور "إغاثة اللهفان" نامی کتاب اور اسی طرح کی دوسری تحریروں میں طیاً ونشراً بہت خوب کی ہے۔[2] اس عشقِ شوم نے انسانوں کے ایک بہت بڑے حصے کو ہدایت اور صحیح راستے سے گمراہ کر کے ہاویۂ نار میں پھینک دیا اور محبتِ الٰہی سے باز رہ کر بندوں کا بندہ بنا دیا۔ فَإِنَّا لِلّٰهِ.

قرآن پاک میں جو اس جگہ قصہ شغفِ زلیخا کا بیان ہوا ہے، یہ اس وقت کی حکایت ہے کہ زلیخا کفر میں گرفتار تھی اور اس کے گھر میں بت پرستی ہوتی تھی، یہ کچھ قصہ زلیخا کے اسلام کے زمانے کا نہیں ہے کہ کوئی اس کو شغف یا عشق کے جواز کی دلیل ٹھہرا لے۔

اس جگہ بہت بے ادبی ایک جماعت سے ہوئی ہے جو فقر اور ولایت کے مدعی ہیں کہ انھوں نے اس لفظ کا اطلاق اور استعمال رب العالمین اور خاتم المرسلین کے حق میں کیا ہے۔ کسی کو دعویٰ اللہ پاک سے عشق کا ہے اور کسی کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عشق کا دعویٰ ہے۔ ونعوذ بالله من الجهل وسوء الأدب. ہاں شارع علیہ السلام کے محاورے میں محبت کے لفظ کا استعمال ضرور ہوا ہے۔ مومن مخلص کو چاہیے کہ اس وصفِ محمود کو حاصل کرے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ﴾ [البقرة: ١٦٥] "اور ایمان والے اللہ کی محبت میں زیادہ سخت ہیں۔" لیکن اس محبت کے معنے وہ نہیں ہیں جو کسی شخص کو شخص کے ساتھ ہوتی ہے، بلکہ اس محبت کا پھل اور نشان اتباعِ سنت کا کمال ہے اور یہ کہ پورا تحفظ اور ادب کرنا ہے اللہ تعالیٰ اور جناب خاتم النبیین محمد ﷺ کا، یہ جگہ اس مسئلے کی زیادہ

[1] فتح البيان (٦/ ٣٢١۔ ٣٢٣) [2] الجواب الكافي (١/ ١٤٩۔ ١٧٠) إغاثة اللهفان (١/ ٥٩۔ ٦٣)

تفصیل کے لیے نہیں ہے، اس لیے سکوت کیا۔

بہر حال ان عورتوں نے یہ کہا کہ ہم دیکھتی ہیں کہ زلیخا صریح گمراہی میں پڑی ہوئی ہے۔ ان عورتوں نے بھی اس شغف اور عدمِ عفاف وتستر کو گمراہی کہا اور کیوں نہ کہتیں کہ وہ واقعی ضلال اور اضحلال (مضمحل ہونا) تھا۔ زلیخا نے جب یہ سنا کہ وہ میری غیبت کرتی ہیں اور مجھ پر عیب لگاتی ہیں تو اپنی معذرت کے لیے ایک ترکیب نکالی۔ اللہ نے ان عورتوں کی غیبت کا نام اس جگہ مکر رکھا، اس لیے کہ وہ اس حیلہ اور فریب سے یوسف علیہ السلام کو دیکھنا چاہتی تھیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ راز ان سے زلیخا نے کہہ دیا تھا، انھوں نے اس کو افشا کر دیا، اس لیے اس کا نام مکر فرمایا۔ امام سفیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مکر سے مراد عمل ہے۔ قرآن میں ہر مکر عمل کی جگہ آیا ہے۔[1] غرض کہ زلیخا نے کسی کو ان عورتوں کے پاس بھیجا کہ وہ آئیں اور یہ ان کے سامنے اپنا عذر بیان کرے اور وہ بھی یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر فتنے میں پڑیں، جس طرح کہ یہ فتنے میں پڑی تھی۔

کہتے ہیں کہ اشرافِ شہر کی چالیس عورتیں بلائیں، ان میں یہ عیب جُو عورتیں بھی تھیں اور ان کے لیے ایک مجلس آراستہ کی، فرش و قالین و غالیچے بچھائے، مسند تکیے لگائے اور ہر طرح کی زیبایش کی۔ ﴿مُتَّكَاً﴾ مخفف بغیر ہمزہ کے لغتِ قبط میں بمعنی اترج (ترنجبین) ہے۔[2] (قالہ مجاھد) امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو چیز چھری سے کاٹ کر کھائی جائے وہ ﴿مُتَّكَاً﴾ ہے۔[3] بعض نے کہا ہے کہ یہ لغت ازدشنوءہ کی ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿مُتَّكَاً﴾ عرقِ گلاب ہے۔[4]

لفظ ﴿مُتَّكَاً﴾ مشدد و مہموز بہ (ہمزہ کے ساتھ) مجلس کے معنی میں ہے اور بعض نے کہا ہے کہ بمعنی طعام۔ امام ابن جبیر اور حسن رحمہما اللہ کا یہی قول ہے۔[5] کسی نے کہا ہے کہ ﴿مُتَّكَاً﴾ وہ ہے کہ وقتِ طعام و شراب کے اس پر ٹیک لگائیں یا تکیہ لگا کر بات چیت کریں۔ زلیخا نے ہر عورت کو ایک چھری دی کہ جو طعام اس سے کاٹ کر کھانے کے قابل ہو، اس کو کاٹ کر کھائیں۔ کہتے ہیں ان کی عادت تھی کہ گوشت اور پھلوں کو کاٹ کر کھاتے تھے اور یہ چھری خنجر تھی۔ پھر یوسف علیہ السلام سے کہا کہ باہر آ! یعنی اس حال میں کہ وہ تکیہ لگائے ہوئے طعام کو کاٹ کاٹ کر کھا رہی تھیں اور جب ان عورتوں نے یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو عظیم الشان جانا، ہیبت اور دہشت اور احترام میں آ گئیں۔

شدتِ جمال سے ہوش وحواس جاتے رہے۔ بعض نے کہا ہے کہ منی یا مذی نکل پڑی۔ امام ازہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حیض آ گیا۔[6] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ فرح (خوشی) سے خونِ حیض جاری ہو گیا۔[7] یہ حالت ان

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٣٢) [2] تفسير القرطبي (٩/ ١٧٨) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٣٣)

[4] فتح القدير (٣/ ٣٠) [5] تفسير الطبري (١٦/ ٦٩۔ ٧٠)

[6] فتح القدير (٣/ ٣٠) [7] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٣٥)

کے اعلیٰ حسن و جمال کی دہشت کے سبب واقع ہوئی۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ کلامِ عرب میں یہ نہیں ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اِلْإِکْبَار بمعنی حیض نہیں آتا۔[1] اس بات کا احتمال ہے کہ انھوں نے نبوت اور رسالت کا نور اور چمک دیکھ کر یوسف علیہ السلام کو بڑی شان والا سمجھا ہو اور ان میں فرشتوں جیسی ہیبت دیکھی ہو اور ان کی کھانے اور عورتوں کی طرف عدمِ رغبتی کو دیکھ کر بڑے مرتبے والا سمجھا۔ آیت کو ان معانی پر محمول کرنا بہت بہتر ہے۔[2] (قاله الرازي)

"قَطَعَ اَیْدِیَ" سے مراد یہ ہے کہ ہاتھ زخمی کر ڈالے، نہ یہ کہ بالکل کٹ کر گر گئے ہوں، بلکہ چھل گئے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس جگہ ہاتھوں سے مراد انگلیوں کے پورے ہیں یا آستین۔ مطلب یہ ٹھہرا کہ اضطراب سے چھری ہاتھ پر لگ گئی اور وہ زخمی ہو گئیں۔ وہ اپنے شغل میں تھیں کہ یکا یک یہ سامنے آ گئے، ڈر کر عقل جاتی رہی۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب خون نکلا تب ان کو معلوم ہوا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہاتھ کٹ کر گر گئے،[3] لیکن پہلا زیادہ صحیح قول ہے۔

منبہ عن ابیہ کہتے ہیں کہ من جملہ ان کے انیس عورتیں غم و اندوہ سے مر گئیں۔[4] غرض کہ انھوں نے ان کو دیکھ کر کہا کہ اللہ پاک ہے! یہ بشر نہیں، کوئی عزت والا فرشتہ ہے، یہ اس لیے کہا کہ دل میں یہ بات ٹھہر چکی ہے کہ فرشتے کی شکل آدمی کی شکل سے ذات و صفات میں بلند تر ہوتی ہے اور فرشتے سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے اور فرشتے ہر چیز میں اعلیٰ اور بلند ہوتے ہیں، جس طرح کہ شیطانوں کو اس کے برعکس سمجھتے ہیں اور سب سے زیادہ قبیح اور بدصورت خیال کرتے ہیں۔ اس بات سے ان کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ یوسف علیہ السلام عظیم حسن کے حامل تھے، لیکن ان عورتوں کے اس قول سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ فرشتوں کی صورت آدمی کی صورت سے بہتر ہو، کیونکہ یہ بات انھوں نے کسی دلیل سے نہیں کہی تھی، بلکہ ایک خیالِ غیب کے بارے میں صرف اپنے اعتقاد کی بنا پر جو کہ ان کی طبیعتوں میں پہلے سے جاگزین تھا، ظاہر کر دیا تھا۔ اور یہ ٹھیک نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ﴾ [التين: ٤] "ہم نے انسان کو بہترین شکل وصورت میں پیدا کیا۔"

اس آیتِ شریفہ کا ظاہر یہ ہے کہ تمام مخلوقات میں سے کوئی چیز بناوٹ اور شکل وصورت کے لحاظ سے انسان کی مثل نہیں ہے۔ صاحبِ کشاف نے جو اس جگہ کہا ہے کہ فرشتہ انسان سے افضل ہے۔[5] یہ اس کا تعصب ہے جو کہ معتزلہ کے ذہنوں میں پختہ ہو چکا ہے، حالانکہ فرشتوں اور انسانوں کے درمیان یہ مسئلہ کہ کون زیادہ فضیلت والا ہے، کچھ مسائلِ دینیہ سے نہیں ہے۔ اللہ کے بندے اس سے کس قدر غنی ہیں اور مسائلِ تکلیف کے محتاج تر ہیں۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان عورتوں نے یوسف علیہ السلام کو ان کے انتہائی حسن اور جمال کی وجہ سے ایک فرشتہ

---

[1] تفسير القرطبي (٩/ ١٨٠) [2] تفسير الرازي (١٨/ ١٠٢) [3] تفسير البغوي (٤/ ٢٣٨)
[4] الدر المنثور (٤/ ٥٣١) [5] الكشاف (٢/ ٤٣٩۔ ٤٤٠)

ٹھہرایا۔[1] اس پر زلیخا نے کہا: یہ وہی شخص ہے جس کے بارے میں تم نے مجھ کو عار دلائی اور عیب لگایا۔ یہ گویا اپنی طرف سے عذر کیا، جبکہ ان کو خود یوسف علیہ السلام کی وجہ سے فتنے میں مبتلا دیکھا۔ یا ضمیر "حُبّ" کی طرف ہے کہ یہ وہی محبت ہے جس پر تم نے مجھ کو ملامت کی ہے، لیکن اول قول زیادہ صحیح ہے۔ اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ترجیح دی ہے۔[2] یا ان کے قول کی طرف اشارہ ہے کہ زلیخا ایک کنعانی غلام پر عاشق ہوئی ہے۔ اس پر زلیخا نے کہا کہ یہ وہی غلام ہے جس پر تم مجھ کو طعنہ دیتی ہو۔

امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زلیخا نے لفظ ﴿ فَذٰلِكُنَّ ﴾ کہا، لفظ "هٰذَا" نہ کہا، حالانکہ وہ حاضر تھے، یہ اشارہ بعید ان کے مقام کی بلندی اور ان کے حسن اور اپنی محبت کے سچا ہونے کے اظہار کے لیے کیا۔[3] پھر کہا کہ میں اپنے جی سے اس کی طالب ہوئی، لیکن اس نے پارسائی کی۔ یہ صراحت اس لیے کی کہ حبِ یوسف علیہ السلام میں جو حالت زلیخا کی ہوتی تھی، وہی حالت یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر ان کی عورتوں کی بھی ہوگئی تھی، تو اب زلیخا پر ملامت کا کیا جواز رہا۔

پھر شرم کی چادر اتار کر اور پاکدامنی کے پردہ کو چاک کر کے یہ کہا کہ اگر یہ میرا کہنا نہ مانے گا تو قید ہوگا یا بے عزت ہوگا۔ یوسف علیہ السلام نے جب اس کا یہ قول سنا اور معلوم کر لیا کہ اس کا عزم بالجزم ہے اور اس کی بات اس کے شوہر عزیز کے سامنے چلتی ہے تو اللہ پاک سے مناجات کی کہ اے رب! مجھ کو قید خانہ میں جانا زیادہ پسند ہے، اس سے کہ میں اس کا کہنا مانوں اور بدبختی میں پڑوں، جس سے دارین کی بھلائی سے محروم رہوں۔ اس جگہ دو شر جمع ہوئے تھے، ایک زنا کی آزمایش اور دوسرے قید خانے کو اختیار کر لینا۔ ان میں سب سے آسان برائی یہی قید خانہ تھی، اگرچہ ایک شر میں محنت مشقت اور دوسرے میں لذت تھی۔ بعض نے کہا ہے کہ اگر یوسف علیہ السلام یہ نہ کہتے تو قید خانہ میں نہ جاتے، اس لیے بندے کے حق میں زیادہ بہتر یہی ہے کہ اللہ سے عافیت مانگے، اسی لیے نبی اکرم ﷺ نے اس شخص پر رد کیا تھا جو اللہ سے صبر کا سوال کرتا تھا۔[4]

"دعوۃ" کی اسناد "نِسْوَۃ" کی طرف اس لیے کی کہ وہ سب عورتیں یوسف علیہ السلام کو زلیخا کی فرماں برداری کی رغبت دلاتی تھیں اور اس کی مخالفت سے ڈراتی تھیں۔ بعض نے کہا ہے کہ ان سب نے یوسف علیہ السلام کو اپنی اپنی طرف بلایا، وہ اس وقت ان سب کے سامنے حاضر تھے، لیکن پہلی بات صحیح ہے۔

پھر یوسف علیہ السلام نے کید (فریب) کی نسبت ان سب کی طرف کی اور کہا کہ اے رب! اگر تُو ان کا فریب مجھ سے نہ پھیرے گا تو میں ان کی طرف جھک جاؤں گا۔ ﴿ اَصْبُ ﴾ صَبَا یَصْبُوْ سے ہے، بمعنی مائل ہونا اور شوق پورا

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٣٧) [2] تفسیر الطبري (١٦/ ٨٥) [3] الكشاف (٢/ ٤٤٠)

[4] سنن الترمذي، رقم الحدیث (٣٥٢٧) اس کی سند میں "ابو الورد بن ثمامہ" مجہول راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم ٣٤١٦)

رنا اور اسی معنی میں شاعر کا یہ قول ہے ؏

إِلَىٰ هِنْدٍ صَبَا قَلْبِيُ وَهِنْدٌ حُبُّهَا يَصْبِيُ

[میرا دل ہند کی طرف مائل ہوا، ہند کی محبت مائل کرنے والی ہے]

''صَبْوَہ'' کہتے ہیں میلان اور شوق کو۔ عزیز کی بیوی کا کید تو وہی تھا جو اللہ نے ذکر کیا اور تمام عورتوں کا کید یہ تھا کہ وہ زلیخا کی اطاعت کی رغبت دلاتی تھیں اور اس کی مخالفت سے ڈراتی تھیں اور بعض نے کہا ہے کہ ہر عورت نے تخلیہ کر کے یوسف علیہ السلام سے کہا: ''اِقْضِ لِيُ حَاجَتِيُ فَأَنَا خَيْرٌ لَّكَ مِنِ امْرَأَةِ الْعَزِيْزِ'' [میری خواہش پوری کرو، میں تیرے لیے عزیز کی بیوی سے بہتر ہوں] یا یوسف علیہ السلام نے فقط زلیخا کو بصیغہ جمع تعظیم کے لیے مخاطب کیا۔

پھر کہا کہ اے رب! میں جاہل ٹھہروں گا، اگر کبھی اس حرکت کا مرتکب ہوا۔ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ گناہ کا ارتکاب جہالت سے ہوا کرتا ہے۔ اللہ نے یوسف علیہ السلام کی دعا قبول کر لی اور ان عورتوں کے مکر وفریب کو ان سے پھیر دیا اور انھیں معصیت میں پڑنے سے بچا لیا۔ اللہ دعاؤں کا سننے والا اور حالات کو جاننے والا ہے۔ معلوم ہوا کہ معصیت سے پھیرنا اللہ ہی کا کام ہے، کسی کو یہ قدرت نہیں ہے کہ وہ گناہ سے باز رہے، یہی معنی اس قول کے ہیں: ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ'' [نیکی کرنے اور گناہ سے بچنے کی قوت اللہ تعالیٰ کے بغیر نہیں ہے]

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۳۵﴾

پھر نشانیاں دیکھ لینے کے بعد ان لوگوں کو یہی سوجھا کہ وہ اس (یوسف) کو کچھ عرصے تک بہر حال قید رکھیں ﴿35﴾

بے گناہ ثابت ہونے کے باوجود یوسف علیہ السلام جیل میں ڈال دیے گئے:

اگرچہ نشانیاں سب دیکھ چکے کہ گناہ عورت کا ہے تو بھی ان کو قید کیا، تاکہ عورت پر سے بدنامی اترے یا اس لیے کہ اس کی نظر سے دور رہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان کی مصلحت اور رائے یہ ٹھہری کہ ایک مدت تک یوسف علیہ السلام کو قید رکھنا چاہیے۔ یہ صلاح ان کی بریت ظاہر ہونے کے بعد اور دوسری نشانیوں کے معلوم ہو جانے کے بعد ٹھہری۔ حالانکہ ان کی پاکدامنی، سچائی اور پاکیزگی کی دلیلیں ظاہر ہو چکی تھیں۔ گویا انھوں نے، واللہ أعلم، اس لیے قید کیا کہ یہ بات پھیل گئی تھی کہ زلیخا یوسف علیہ السلام کی طالب ہے، اس لیے تہمت کو دور کرنے کے لیے ان کو قید کیا کہ وہ (زلیخا) بری اور یہ (یوسف علیہ السلام) مجرم ٹھہریں۔ لہٰذا جب بادشاہ نے مدت کے اخیر میں ان کو بلایا تو انھوں نے قید سے باہر آنے سے انکار کر دیا جب تک کہ ان کی صفائی اور براءت ظاہر نہ ہو اور یہ اس تہمت اور خیانت سے پاک نہ ٹھہریں۔ جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ وہ بری ہیں، تب جیل خانے سے باہر نکلے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یوسف علیہ السلام کو اس لیے قید رکھا کہ جو چرچا زلیخا کا ہوا، وہ پھیل نہ جائے اور اس کی آبرو رہ جائے اور وہ بدنام نہ ہو۔[1]

[1] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۶۲۱)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ عزیز اور اصحابِ عزیز کو، جو مدبرِ امور اور مشیر تھے، یہ بات سمجھ میں آئی کہ یوسف علیہ السلام کو قید میں رکھنا چاہیے۔ یہ بات انھیں تمام نشانیاں دیکھ لینے کے بعد سوجھی، یعنی قمیص کے معائنہ، شاہد کی شہادت اور عورتوں کے ہاتھ کاٹ لینے کے بعد۔ یا آیات سے مراد وہ برکات ہیں جو اُن یوسف علیہ السلام کو پا لینے کے بعد ملیں، لیکن عورت اپنی رائے میں غالب رہی اور جو وعید اس نے یوسف علیہ السلام کو سنائی تھی وہ نافذ کر دی اور اپنے شوہر سے کہا کہ اگر تُو اس کو قید نہ کرے گا تو لوگ اسی کو سچا جانیں گے۔

امام مقریزی رحمہ اللہ نے خطط میں امام قضاعی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ یوسف علیہ السلام کا قید خانہ اعمالِ جیزہ میں سے بوصیر کے مقام پر تھا۔ مصری لوگوں میں سے اہلِ علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قید خانہ بوصیر میں تھا اور اس جگہ دو پیغمبروں کی یادگار ہے: ایک یوسف علیہ السلام کی کہ وہ ایک مدت تک وہاں قید رہے، جس کی تعداد سات سال ہے، دوسرے موسیٰ علیہ السلام کی، ان کی یادگار پر ایک مسجد بنائی گئی ہے اس کو مسجدِ موسیٰ کہتے ہیں۔[1] اس سجن سے مراد قصۂ زلیخا کو چھپانا تھا یا یوسف علیہ السلام اور زلیخا کے درمیان حیلولت (دوری ڈالنا)، اس لیے کہ یہ بات کھل چکی تھی کہ وہ یوسف علیہ السلام پر فریفتہ ہے۔ اکٹھے ہونے کی صورت میں وہ اپنے نفس کو یوسف علیہ السلام پر ہر ممکن طریقے سے حاوی کرے گی۔

﴿ حِيْنٍ ﴾ سے مراد ایک غیر معلوم مدت ہے۔ اکثر مفسرین نے اسی طرح کہا ہے یا اس قدر مدت کہ یہ بات دب جائے اور اس کا شیوع (اثر) باقی نہ رہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے سات برس کہے ہیں[2] اور کسی نے پانچ برس اور کسی نے چھے ماہ۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے اس قید کو یوسف علیہ السلام کے لیے اس تہمت سے پاک کرنا ٹھہرایا تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یوسف علیہ السلام تین بار معاقب ہوئے (سزا پائی): ایک بار قید میں پڑے، اس وجہ سے کہ زلیخا کا ارادہ کیا تھا، دوسری بار جب یہ کہا: ﴿ اُذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ ﴾ پھر کئی سال تک قید میں رہے، یہ قید طویل تھی، تیسری بار جبکہ یہ کہا: ﴿ اَيَّتُهَا الْعِيْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ ﴾ [یوسف: ۷۰] ''اے قافلے والو! یقیناً تم چور ہو۔'' تب ان کے منہ پر یہ جواب ملا: ﴿ اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ﴾ [یوسف: ۷۷] ''اگر اس نے چوری کی ہے تو اس سے پہلے اس کے ایک بھائی نے بھی چوری کی تھی۔''[3]

---

[1] المواعظ و الاعتبار (۱/ ۳۸۲) [2] فتح القدير (۳/ ۳۵)

[3] تفسير الطبري (۱٦/ ۹۲۔ ۹۳) فتح البيان (٦/ ۳۳۱۔ ۳۳۳)

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ؕ قَالَ اَحَدُهُمَاۤ اِنِّيْۤ اَرٰىنِيْۤ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّيْۤ اَرٰىنِيْۤ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ؕ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۶﴾

اور اس کے ساتھ قید خانے میں دو جوان بھی داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک نے کہا: بے شک میں خود کو دیکھتا ہوں کہ شراب نچوڑ رہا ہوں اور دوسرا بولا: بے شک میں خود کو دیکھتا ہوں کہ اپنے سر پر روٹیاں اُٹھائے ہوئے ہوں، ان میں سے پرندے کھا رہے ہیں، تو ہمیں ان کی تعبیر بتا، بے شک ہم تجھے نیک سمجھتے ہیں ﴿36﴾

جیل میں دو قیدیوں کا خواب کی تعبیر پوچھنا:

جس نے شراب دیکھی وہ بادشاہ کا شراب ساز تھا، دوسرا نان بائی تھا، لیکن خلافِ عادت دیکھا کہ سر پر سے جانور نوچتے ہیں۔ زہر کی تہمت میں دونوں قید تھے۔ آخر یہ تہمت نان بائی پر ثابت ہوئی۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ ایک دونوں میں سے بادشاہ کو شراب پلانے والا تھا اور دوسرا خباز (روٹی پکانے والا)۔ امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ساقی کا نام بنو تھا اور دوسرے کا نام مجلث۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بادشاہ نے ان دونوں کو اس لیے قید کیا کہ اس کو یہ وہم ہوا کہ یہ دونوں باہم ساز باز کر کے مجھ کو شراب اور طعام میں زہر دینا چاہتے ہیں۔[1]

یوسف علیہ السلام قید خانے میں سخاوت، امانت داری، سچائی اور حسنِ سیرت اور کثرتِ عبادت کے لیے مشہور تھے اور یہ بات عام معلوم تھی کہ خواب کی تعبیر اچھی کر لیتے ہیں۔ نیز وہ قیدیوں کے ساتھ احسان کرتے اور ان کے بیماروں کی عیادت فرماتے اور ان کے حقوق بجا لاتے۔ چنانچہ جب یہ دونوں جوان قید خانے میں داخل ہوئے تو ان کے ساتھ ان کو شدید محبت ہو گئی۔ انھوں نے ان سے کہا: واللہ! ہم تم کو بہت دوست رکھتے ہیں، یوسف علیہ السلام نے فرمایا: "بَارَكَ اللّٰهُ فِيْكُمَا" مجھ کو جو کوئی چاہتا ہے مجھ پر اس کی محبت کی وجہ سے نقصان آتا ہے۔ میری پھوپھی مجھے دوست رکھتی تھی، مجھ پر اس کے سبب سے نقصان آیا۔ میرے باپ نے مجھے چاہا، ان کے سبب سے مجھے ایذا پہنچی۔ زنِ عزیز نے مجھے چاہا، اس کا انجام یہ ہوا۔ انھوں نے کہا: واللہ! ہم کو تمھاری جدائی کی طاقت نہیں ہے۔

پھر ان دونوں نے خواب دیکھا۔ ساقی نے یہ دیکھا کہ وہ انگور نچوڑ رہا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت یوں ہے: "إِنِّيْ أَرَانِيْ أَعْصِرُ عِنَباً" امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خمر سے اس جگہ "عِنَبٌ" مراد ہے، یعنی انگور۔ اہلِ عمان انگور کو شراب کہتے ہیں۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس نے یہ خواب دیکھا تھا کہ انگور کا ایک درخت لگایا ہے، اس میں خوشے لگے ہیں، وہ ان کو نچوڑ کر بادشاہ کو پلاتا ہوں۔ یوسف علیہ السلام نے کہا: تُو قید خانے میں

[1] تفسير الطبري (١٦/ ٩٥)

تین دن رہے گا اور پھر رہا ہو کر نکلے گا اور بادشاہ کو شراب پلائے گا۔[1] دوسرے نے کہا: میرے سر پر سے چڑیاں روٹی کھاتی ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ان دونوں کو کوئی شے نظر نہیں آئی، ان کو خواب پریشان نظر آیا، تجربہ کے واسطے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ایک باورچی خانے کا داروغہ تھا اور دوسرا صاحبِ آبدارِ خانہ۔[3] انھوں نے بادشاہ کو زہر دینا چاہا تھا، اہلِ مصر نے ان کو اس حرکت کے عوض بہت سا مال دینے کو کہا تھا۔ پھر ساقی نے رجوع کیا اور بادشاہ سے کہہ دیا کہ تم یہ کھانا نہ کھانا اس میں زہر ہے اور خباز نے کہا کہ تم یہ پانی نہ پینا اس میں زہر ہے۔ بادشاہ نے ساقی سے کہا کہ تُو اس کو پی جا، وہ پی گیا، اس کو کچھ ضرر نہ ہوا۔ نانبائی سے کہا: تُو اس کو کھا، اس نے انکار کیا، تب اس طعام کا تجربہ ایک حیوان پر کیا، وہ اسی جگہ مر گیا۔ بادشاہ نے دونوں کو قید کر دیا۔ ان کا قید خانے میں داخلہ یوسف علیہ السلام کے ہمراہ ہوا۔ بعض نے کہ پہلے ہوا، لیکن پہلی بات زیادہ ظاہر ہے لفظ ﴿مَعَهُ﴾ کی دلیل سے۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ انھوں نے یوسف علیہ السلام سے ان کے علم کے بارے میں پوچھا، فرمایا: میں خواب کی تعبیر بتلاتا ہوں۔ تب انھوں نے اپنا اپنا خواب بیان کیا۔[4] اس ساقی نے یہ خواب قید ہونے کے پانچ برس کے بعد دیکھا تھا۔ دونوں نے اپنے اپنے خواب کی تعبیر چاہی اور کہا کہ ہم تم کو محسن دیکھتے ہیں، یعنی تم اچھی تعبیر بتلاتے ہو، یا تمھارا علم احسن ہے، یا تم قیدیوں کے ساتھ نیکی کرتے ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام نے اہلِ سجن کو دعا دی: "اَللّٰهُمَّ لَا تَعُمَّ عَلَيْهِمُ الْأَخْبَارُ، وَهَوِّنْ عَلَيْهِمْ مَرَّ الْأَيَّامِ" [اے اللہ! ان پر خبریں عام نہ کر اور ان کے قید کے ایام آسانی سے گزار دے]

قَالَ لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ؕ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ؕ اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ

[1] تفسير الطبري (١٦/ ٩٦۔ ٩٧)
[2] تفسير الطبري (١٦/ ١٠٨)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٤١)
[4] الدر المنثور (٤/ ٥٣٧) فتح البيان (٦/ ٣٣٣۔ ٣٣٤)

نُّشۡرِكَ بِاللّٰهِ مِنۡ شَیۡءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنۡ فَضۡلِ اللّٰهِ عَلَیۡنَا وَعَلَی النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا یَشۡكُرُوۡنَ ﴿۳۸﴾

یوسف نے کہا: جو کھانا تمھیں (یہاں) ملتا ہے اس کے آنے سے پہلے میں تمھیں ان کی تعبیر بتلا دوں گا۔ یہ ان چیزوں میں سے ہے، جو میرے رب نے مجھے سکھائیں۔ بے شک میں نے ان لوگوں کا دین چھوڑ دیا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور وہ آخرت کے بھی منکر ہیں (37) اور میں نے اتباع کی ہے اپنے باپ دادا ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کے دین کی۔ ہمارے لیے (جائز) نہیں کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرائیں، یہ اللہ کا ہم پر اور (سب) لوگوں پر فضل ہے، لیکن اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے (38)

تعبیر بتانے سے پہلے قیدیوں کو دعوتِ توحید:

حق تعالیٰ نے قید میں یہ حکمت رکھی کہ ان کا دل کافروں کی محبت سے ٹوٹا تو دل پر اللہ کا علم روشن ہوا۔ چاہا کہ اول ان کو دین کی بات سنائیں، بعد میں خواب کی تعبیر بیان کریں۔ اس واسطے تسلی کر دی، تاکہ گھبرائیں نہیں، کہا کہ کھانے کے وقت تک وہ بھی بتا دوں گا۔ پھر کہا کہ ہمارا اس دین پر رہنا سب خلق کے حق میں فضل ہے کہ ہم سے راہ سیکھیں۔ یوسف علیہ السلام نے ان دونوں شخصوں سے یہ بات کہی تھی کہ جب تم کوئی خواب دیکھو تو میں اس کی تعبیر کا عارف ہوں، خواب کی تاویل میں تم کو بتا دوں گا، وقوع سے قبل، لہٰذا فرمایا کہ معمول کے وقت پر تمھارا کھانا آنے سے پہلے تم کو اس کی خبر کر دوں گا۔ امام مجاہد اور سدی رحمہما اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ بات مجھ کو اللہ کی تعلیم سے حاصل ہوئی ہے، اس لیے کہ میں نے کافروں کی ملت سے جو کہ یومِ آخرت کے منکر ہیں اور ثواب اور سزا کی امید نہیں رکھتے، اجتناب کیا ہے اور کفر و شرک کے طریق کو چھوڑ کر اپنے آبا: ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کی پیروی اختیار کی ہے اور رسولوں کی راہ پر چلا ہوں۔ صلوات اللہ وسلامه عليهم أجمعين.

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہی حال اس شخص کا ہوتا ہے جو ہدایت کے راستے پر چلنے والا اور رسولوں کے راستے کا متبع ہو اور گمراہوں کے راستے سے منہ پھیرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کے دل کو سوجھ بوجھ دیتا ہے اور اس کو وہ سکھاتا ہے جو وہ جانتا نہ تھا اور اس کو خیر میں امام بنا دیتا ہے جس کی اقتدا کی جائے اور ہدایت کے راستے کی طرف دعوت دینے والا کر دیتا ہے۔ یوسف علیہ السلام نے کہا کہ ہم کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم کسی شے کو اللہ کا شریک کریں۔ یہ اللہ کا ہم پر اور سب لوگوں پر فضل ہے۔ یہ توحید یعنی اس بات کا اقرار کہ ”لا إله إلا الله وحده لا شريك له“

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٤٤)

اللہ کا ہم پر فضل ہے۔ اس نے اس توحید کی ہم کو وحی کی ہے اور ہم کو توحید کی طرف دعوت دینے والا بنایا ہے، لیکن اکثر لوگ اس نعمت کا شکر نہیں کرتے کہ اللہ نے رسول بھیجے، بلکہ اللہ کی نعمت کو کفر سے بدلتے ہیں اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھڑے میں داخل کرتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جد (دادا) کو باپ ٹھہراتے تھے اور کہتے تھے جس کا جی چاہے وہ مجھ سے حجر (بیت اللہ) کے نزدیک اس بات مباہلہ کر لے۔ اللہ نے جد اور جدہ کا ذکر نہیں کیا، بلکہ یوسف علیہ السلام کی یہ خبر دی کہ ﴿ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ﴾[1] (آیتِ باب)۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ تمھارے پاس تمھارا کھانا جو تم کو اللہ کی طرف سے یا بادشاہ کی طرف سے ملتا ہے نہ آ چکے گا کہ میں تم کو اس خواب کی تعبیر بیان کر دوں گا۔ یہ ارشاد یوسف علیہ السلام کا بطورِ تمہید کے تھا، تاکہ وہ کفر سے نکل کر ایمان میں آ جائیں۔ پھر کہا: یہ تعبیر مجھ کو اللہ نے سکھائی ہے، یعنی قبیلِ وحی و الہام سے ہے نہ قبیلِ کہانت وعلمِ نجوم سے۔ اللہ کی تعلیم میں خطا نہیں ہوتی ہے، جب کہ کہانت اور علمِ نجوم میں خطا ہو جاتی ہے۔

پھر یہ بیان کیا کہ یہ رتبۂ عالی اور علومِ کثیرہ مجھ کو اس سبب سے حاصل ہوئے ہیں کہ میں نے ملتِ کفر کو ترک کر دیا اور اپنے آبا انبیا علیہم السلام کی راہ اختیار کی۔ تَرَكْتُ سے مراد یہ ہے کہ میں سرے ہی سے شرک اور کفر میں ملوث نہیں ہوا اور اس کی طرف بالکل متوجہ نہیں ہوا، نہ ہی یہ بات ہے کہ میں پہلے تو اس میں ملوث تھا اور اب میں نے اس طریق کو چھوڑ دیا ہو، چنانچہ ان کا یہ قول: ﴿ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ ﴾ (آیتِ باب) اس پر دلیل ہے۔

پھر ان کا کفر میں تصلب (پکا ہونا) اس طرح بیان کیا کہ وہ آخرت کے منکر ہیں اور میں تابع ہوں ملتِ ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کا۔ ان سب کو اپنا باپ کہا ہے، اس لیے کہ اجداد آباء ہوتے ہیں۔ پہلے جدِ اعلیٰ کا نام لیا، پھر جدِ اقرب کا، پھر باپ کا، اس لیے کہ اصل اس ملتِ توحید کی ابراہیم علیہ السلام سے ہے، جس پر ان کی اولاد قائم ہے، ان سے اسحاق علیہ السلام نے اخذ کی، پھر ان سے یعقوب علیہ السلام نے لی۔

یہ ذکر یوسف علیہ السلام نے ان دونوں کو ایمان کی ترغیب دینے اور کفر و شرک اور گمراہی سے نفرت دلانے کے لیے کیا اور پہلے چھوڑنے کا ذکر کیا پھر اتباع کا، اس لیے کہ علاحدگی اختیار کرنا کسی کام میں مشغول ہونے پر متقدم ہوتا ہے۔ فرمایا: ہم انبیا کی جماعت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم کسی چیز کو اللہ کا شریک کریں، وہ فرشتہ ہو یا جن یا انسان، پھر بت اور آستانوں کا کیا، ذکر جو نہ سن سکتے ہیں، نہ دیکھ سکتے ہیں! یہ ایمان و توحید سے وابستگی اور شرک سے دوری اللہ کا ہم پر فضل ہے، بلکہ سب لوگوں پر کہ اس نے پیغمبر کو بھیج کر ان کو ہدایت فرمائی اور اللہ کی راہ سمجھائی اور حق کو ظاہر کیا، لیکن اکثر لوگ یعنی کفار اس نعمت پر اللہ کا شکر بجا نہیں لاتے اور توحیدِ خالص اختیار نہیں کرتے۔ یا وہ کھلی دلیلوں اور

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٤٤_ ٢١٤٥)

آیاتِ تنزیلیہ وکونیہ سے دلیل نہیں پکڑتے۔ یا ان قوتوں اور عقلوں کو اس کام میں نہیں لگاتے جس کے لیے یہ بنائے گئے ہیں اور توحید کے آفاقی دلائل کو، جو ان کی جانوں اور عقلوں میں موجود ہیں، استعمال نہیں کرتے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مومن اللہ کا شکر کرتا ہے اس نعمت پر جو اس کے پاس ہے یا لوگوں کے پاس ہے۔ سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے: "رُبَّ شَاكِرِ نِعْمَةٍ غَيْرُ مُنْعَمٍ عَلَيْهِ لَا يُدْرىٰ، وَ رُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ غَيْرُ فَقِيْهٍ" [1] [بعض اوقات نعمت پر شکر کرنے والا غیر منعم اور گمنام ہوتا ہے اور بسا اوقات فقہ کا حامل غیر فقیہ ہوتا ہے] پھر یوسف علیہ السلام نے ان کو صریحاً اسلام کی طرف دعوت دی اور فرمایا:

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۰﴾

میرے قید خانے کے دو ساتھیو! بھلا کئی جدا جدا معبود بہتر ہیں یا ایک زبردست اللہ؟ (39) تم اس کے سوا جن کی عبادت کرتے ہو، وہ نام ہی تو ہیں جو خود تم نے اور تمھارے باپ دادوں نے رکھ لیے ہیں، اللہ نے ان کی کوئی دلیل نازل نہیں کی۔ اللہ کے سوا کسی کا حکم نہیں۔ اس نے حکم دیا ہے کہ تم صرف اسی کی عبادت کرو، یہی سیدھا دین ہے، مگر اکثر لوگ علم نہیں رکھتے (40)

توحید کا اثبات اور شرک کی نفی اصل دین ہے:

یوسف علیہ السلام نے دونوں جوانوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ تم نِرے اللہ وحدہ لا شریک لہ کی عبادت کرو اور اوثان پرستی چھوڑ دو۔ بھلا بہت سے جدا جدا معبود بہتر ہیں یا ایک معبود زبردست، جس کی عزت وجلالت اور عظمت و شان کے سامنے ہر شے ذلیل وخوار ہے۔ پھر یہ بیان فرمایا کہ جن کو تم پوجتے ہو اور ان کا نام تم نے معبود رکھا ہے، یہ تمھارا ہی کیا دھرا ہے اور اپنی طرف سے تم نے یہ نام مقرر کر لیے ہیں۔ خلفاً عن سلفٍ اللہ کی طرف سے ان ناموں کی کوئی سند نہیں ہے۔ اللہ نے کوئی حجت اور دلیل اس بات پر نازل نہیں کی۔ حکم اور اختیار اور مشیت اللہ کے لیے ہے۔ اس نے اپنے سارے بندوں کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کریں، یہ دینِ توحید ہے اور یہی دینِ مستقیم پر اخلاصِ عمل ہے جس کا اللہ نے حکم دیا ہے اور اس پر حجت اور دلیل اتاری ہے۔ اسی دین کو وہ پسند کرتا

[1] فتح البیان (۶/ ۳۳۵۔ ۳۳۷)

ہے اور دوست رکھتا ہے، لیکن اکثر لوگ اس کو نہیں جانتے، اسی وجہ سے شرک و کفر کرتے ہیں۔ ﴿ وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [یوسف: ۱۰۳] ''اور اکثر لوگ، اگرچہ آپ حرص کریں، ایمان لانے والے نہیں۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ان دونوں شخصوں کو صاحبِ سجن کہا، ان کے قید خانے میں لمبے قیام کی وجہ سے جیسے اصحاب الجنۃ و اصحاب النار کہتے ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب یوسف علیہ السلام کو معلوم ہو گیا کہ ان میں سے ایک مقتول ہو گا تو ان کو توحید اور آخرت کے حصے کی طرف بلایا۔[1] اور استفہامِ انکار کے طریقے سے انھیں ڈانٹ اور سرزنش سے یہ فرمایا کہ کیا وہ معبودات جو اپنے وجود اور صفات اور تعداد میں مختلف ہیں، بہتر ہیں یا ایک ہی معبود برحق جو کہ اپنی ذات اور صفات میں اکیلا ہے، نہ کوئی اس کا مقابل ہے اور نہ کوئی شریک اور وہ سب پر غالب اور قاہر ہے۔ وہ دونوں شخص بتوں کو پوجنے والے تھے، کہتے ہیں کہ ان کے سامنے بت رکھے تھے، جن کو وہ پوجتے تھے، لہٰذا یوسف علیہ السلام نے ان کو یہ خطاب کیا کہ تم نہیں پوجتے ہو مگر ناموں کو جن کے لیے کوئی ہستی نہیں ہے۔ گو تمھارے اعتقاد میں وہ مسمیات ہوں، کیونکہ یہ معبودات جبکہ ان ناموں کے مستحق نہیں ہیں تو گویا یہ نام بلا مسمیات ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ خطاب تمام اہلِ سجن کو تھا نہ کہ خاص طور پر ان دو ساتھیوں کو اور یہی زیادہ ظاہر ہے۔ اسی طرح بعد میں آنے والی ضمیروں سے مقصود قید خانے کے سارے قیدی ہیں نہ کہ صرف یہ دو جوان۔ ان معبودوں کے نام تم نے اور تمھارے آبا نے اپنی طرف سے رکھے ہیں، محض جہالت اور گمراہی کے طریقے سے، ان میں الٰہیت کی کوئی علامت نہیں ہے، یہ صرف نام ہیں، کیونکہ یہ محض جمادات ہیں نہ سنتے ہیں اور نہ دیکھتے ہیں اور نہ نفع پہنچاتے ہیں اور نہ تکلیف دور کرتے ہیں، ان کا نام معبود تم نے رکھ لیا ہے۔ اللہ پاک نے اس نام کی کوئی سند نہیں اتاری اور نہ ان کے پوجنے کا حکم دیا ہے۔

سلطان سے مراد نام رکھنے کی صحت اور عبادت پر حجت ہے۔ حکم کسی کا نہیں ہے مگر اللہ کا، عَزَّ سُلْطَانُهُ، کیونکہ عبادت کا ذاتی طور پر مستحق وہی خالقِ کل ہے۔ یہ اصنام بھی اسی کے پیدا کیے ہیں جن کو تم نے معبود ٹھہرا لیا ہے بغیر کسی حجت اور دلیل کے۔ سو اُس معبود برحق اور خالقِ مطلق کا یہ حکم ہے کہ تم اللہ کے سوا کسی اور چیز کی پرستش نہ کرو۔ عقل کا فیصلہ بھی یہی ہے اور جان لو کہ یہی عبادت جو خالصتاً اللہ کی ہو، دینِ مستقیم اور ثابت اور انصاف کی بات ہے۔ عقلی اور نقلی دلیلیں بھی اسی کی تائید کرتی ہیں، لیکن اکثر لوگ اس کو دینِ قیم اور صراطِ مستقیم نہیں جانتے، حقائق سے دوری اور جہالت کی وجہ سے اور نہ ہی یہ جانتے ہیں کہ اس کا انجام عذاب ہو گا، اس لیے شرک کرتے ہیں۔ اس بات پر دلیل موجود ہے کہ اگر کوئی شخص باوجود علم حاصل کرنے کا طریقہ معلوم ہونے کے اس بات کو نہیں جانتا تو اس کے لیے سزا لازمی ہے۔[2]

---

[1] تفسیر الطبری (۱۶/ ۱۰۴۔ ۱۰۵)
[2] فتح البیان (٦/ ٣٣٧۔ ٣٣٩)

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ۭ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ﴿41﴾

میرے قید خانے کے دو ساتھیو! تم دونوں میں سے ایک اپنے مالک کو شراب پلائے گا، اور دوسرا سولی دیا جائے گا اور اس کے سر میں سے پرندے (گوشت) کھائیں گے۔ اس معاملے کا فیصلہ کیا جا چکا، جس کی بابت تم مجھ سے پوچھتے ہو ﴿41﴾

قیدیوں کے خواب کی تعبیر:

فرمایا کہ ایک مارا جائے گا، اس کو نہ کہا کہ تُو ہے، یہ خُلق نیک سے ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ اس کو اٹکلا کہ بچے گا۔ معلوم ہوا کہ خواب کی تعبیر یقین نہیں اٹکل ہے۔ مگر پیغمبر اٹکل کرے تو اس میں شک نہیں ہوتا۔ جس کو کہا تُو اپنے بادشاہ کو شراب پلائے گا، یہ وہی شخص تھا جس نے خواب میں انگور کا نچوڑنا دیکھا تھا، لیکن معین نہ فرمایا، تا کہ اس کو غم نہ ہو، بلکہ مبہم رکھا اور جس کو کہا کہ تُو سولی چڑھایا جائے گا، یہ دوسرا شخص ہے جس نے خواب میں دیکھا تھا کہ اس کے سر پر روٹی ہے اور چڑیاں کھاتی ہیں۔

پھر ان کو جتلا دیا کہ یہ بات ہو چکی اور ضرور واقع ہو گی، اس لیے کہ خواب پرندہ کے پاؤں پر ہوتا ہے، جب تک کہ اس کی تعبیر نہیں کی گئی ہے، جب تعبیر ہو گئی اب واقع ہو جائے گا۔ عبداللہ کہتے ہیں کہ انھوں نے یوسف علیہ السلام کا قول سن کر کہا: ہم نے خواب میں کچھ بھی نہیں دیکھا، فرمایا: اب کیا ہوتا ہے۔ ﴿ قُضِيَ الْاَمْرُ ... الخ﴾ امام مجاہد اور ابن زید رحمہما اللہ وغیرہما نے بھی اسی طرح کہا ہے۔[1]

حاصل یہ ٹھہرا کہ جس کو تحلم باطل (جھوٹا خواب) ہوا اور اس کی تفسیر کر دی گئی تو وہ تاویل اس کو لازم ہو جاتی ہے۔ واللہ أعلم. معاویہ بن حیدہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں رفعاً آیا ہے: «اَلرُّؤْيَا عَلٰی رِجْلِ طَائِرٍ مَّا لَمْ تُعَبَّرْ فَإِذَا عُبِّرَتْ وَقَعَتْ»[2] (رواہ أحمد) [خواب کی جب تک تعبیر بیان نہ کی جائے اس وقت تک وہ (گویا) پرندے کے پاؤں میں ہوتا ہے۔ جب تعبیر کر دی جائے تو واقع ہو جاتا ہے] سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں: «اَلرُّؤْيَا لِاَوَّلِ عَابِرٍ»[3] (رواہ أبو یعلی) [خواب پہلے تعبیر کرنے والے کے لیے ہے]

---

① تفسیر الطبري (١٦/ ١٠٨۔ ١٠٩) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٦٢٣)

② مسند احمد میں اور سنن میں ان الفاظ کے ساتھ روایت معاویہ بن حیدہ قشیری رضی اللہ عنہ کے بجائے ابو رزین لقیط بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ دیکھیں: سنن أبي داود، رقم الحدیث (٥٠٢٠) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٢٢٧٨) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٣٩١٤) مسند أحمد (٤/ ١٠) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٣٥٣٥)

③ سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٣٩١٥) مسند أبي یعلیٰ (٧/ ١٥٨) اس روایت کی سند میں ''یزید بن ابان رقاشی'' ضعیف راوی ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یوسف علیہ السلام نے ساقی سے کہا: تُو تین دن کے بعد رہا ہو جائے گا اور بادشاہ تجھ کو قید سے بلا کر چھوڑ دے گا اور نانبائی سے کہا کہ تُو تین دن کے بعد چھوٹ کر مارا جائے گا اور پرندے تیرے سر کو کھائیں گے۔ یہ خواب جو تم نے دیکھا، یہ ختم ہو چکا۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ان دونوں ساتھیوں نے کوئی چیز نہیں دیکھی تھی، بلکہ خواب بنایا تھا، تاکہ یوسف علیہ السلام کے علم کا تجربہ کریں، جب انھوں نے تعبیر کہہ دی تو کہنے لگے کہ ہم تو لعب (کھیل مذاق) کر رہے تھے۔ ہم نے کوئی شے نہیں دیکھی۔ اس پر یوسف علیہ السلام نے کہا: ﴿ قُضِيَ الْأَمْرُ ﴾[1] ایک قوم نے کہا: انھوں نے سچ مچ خواب دیکھا تھا۔ امام ابومجلز رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دونوں میں سے ایک جھوٹا تھا[2] اور یہ تعبیر وحی سے ہوئی، ﴿ قُضِيَ الْأَمْرُ ﴾ کے الفاظ کی دلیل سے اور بعض نے کہا ہے کہ اجتہاد سے۔[3]

وَقَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ ۡ فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ ﴿42﴾

اور یوسف نے ان دونوں میں سے جس کے متعلق سمجھا تھا کہ وہ نجات پانے والا ہے، اسے کہا: تو اپنے مالک سے میرا ذکر کرنا، پھر شیطان نے اسے اپنے مالک سے (یوسف کا) ذکر کرنا بھلا دیا، چناں چہ یوسف قید خانے میں کئی سال ٹھہرا رہا ﴿42﴾

یوسف علیہ السلام کی اپنے ساتھی کے ذریعے بادشاہ کو یاد دہانی:

یوسف علیہ السلام نے اس بات کی سعی کی کہ بادشاہ کے پاس میرا ذکر کرنا۔ وہ بھول گیا، تاکہ پیغمبر کا دل اس بات پر نہ ٹھہرے۔ کئی برس قید میں رہے۔ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ سات برس قید رہے۔ یوسف علیہ السلام نے یہ بات دوسرے سے چھپا کر رکھی تھی، تاکہ وہ نہ جانے کہ اسے سُولی دی جائے گی۔ رب سے مراد بادشاہ ہے۔ وہ ان کا ذکر کرنا بھول گیا، یہ شیطان کا ایک مکر تھا، تاکہ اللہ کے نبی قید خانے سے باہر نہ نکلیں۔ بہتر یہی ہے کہ ﴿ فَاَنْسٰىهُ ﴾ کی ضمیر اس بندے کی طرف لوٹے جو قید سے رہا ہوا تھا۔ (کما قال مجاھد) امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ وغیرہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[4] بعض نے کہا ہے کہ ضمیر یوسف علیہ السلام کی طرف ہی لوٹتی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد اور عکرمہ رحمہما اللہ سے اسی طرح مروی ہے۔[5]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما رفعاً کہتے ہیں: « لَوْ لَمْ يَقُلْ يُوْسُفُ الْكَلِمَةَ الَّتِيْ قَالَ مَا لَبِثَ فِي السِّجْنِ طُوْلَ مَا لَبِثَ حَيْثُ يَبْتَغِي الْفَرَجَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ » [اگر یوسف علیہ السلام نے (ساقی سے بادشاہ کے

[1] تفسير الطبري (١٦/ ١٠٨) [2] الدر المنثور (٤/ ٥٤٠) [3] فتح البيان (٦/ ٣٣٩۔ ٤٤٠)
[4] تفسير الطبري (١٦/ ١١٣) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٤٩) [5] تفسير الطبري (١٦/ ١١٢۔ ١١٣)

ہاں اپنی یاددہانی کی) وہ بات نہ کہی ہوتی جو انھوں نے کہی تو وہ اتنی لمبی مدت قید میں نہ رہتے، کیوں کہ انھوں نے غیر سے کشادگی (رہائی) چاہی تھی] اس کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے مسند کہا ہے،[1] لیکن یہ حدیث سخت ضعیف ہے۔ اس کی سند میں سفیان بن وکیع ضعیف ہے، اس سے زیادہ ابراہیم بن یزید خوزی ضعیف ہے۔ یہ روایت امام حسن اور قتادہ رحمہ اللہ سے بھی مرسلاً آئی ہے،[2] لیکن اس جگہ یہ مرسلات مقبول نہیں ہیں، گو کسی دوسری جگہ میں مرسل مقبول ہوتی ہے۔ واللہ أعلم. امام مجاہد اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ بِضۡعَ ﴾ تین اور نو کے درمیان ہے۔ امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایوب علیہ السلام آزمایش میں اور یوسف علیہ السلام قید خانے اور بخت نصر عذاب میں سات سات برس رہے۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یوسف علیہ السلام بارہ برس قید رہے۔[4] امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ چودہ برس۔[5]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یوسف علیہ السلام نے ساقی سے کہا تھا کہ تُو اپنے بادشاہ کو یہ بات یاد دلانا کہ قید خانے میں ایک غلام مظلوم پانچ برس سے محبوس ہے اور تعبیرِ خواب کا ذکر کرنا کہ وہ خواب کی بہت اچھی تعبیر کرتا ہے۔ مفسرین نے کہا ہے کہ شیطان نے یوسف علیہ السلام کو رب کا ذکر بھلا دیا۔ یوسف علیہ السلام سے یہ قول ازراہِ غفلت اور نسیان (بھول) ہوا۔ ﴿ فَأَنۡسَٰهُ ﴾ کی ضمیر یوسف علیہ السلام کی طرف لوٹتی ہے۔ اکثر مفسرین کا یہی قول ہے اور اس صورت میں ذکرِ رب سے مراد ذکر اللہ ہے کہ انھوں نے اس ساقی ناجی سے یہ کہا کہ تُو اپنے آقا کو میری یاد دلانا، کیونکہ وہ میری براءت کی نشانیاں دیکھ چکا ہے۔ یہ ایک غفلت تھی جس میں یوسف علیہ السلام مبتلا ہوئے، اس لیے کہ ضرر کو دور کرنے کے لیے اگرچہ مخلوق سے مدد مانگنا جائز ہے، لیکن چونکہ یوسف علیہ السلام کا مقام تمام مقامات سے اعلیٰ اور ان کا رتبہ تمام رتبوں سے بلند اور ان کا منصب نبوت اور رسالت کا منصب تھا، اس لیے اس قدر غفلت پر بھی ان کا مؤاخذہ ہوا۔ ”فَإِنَّ حَسَنَاتِ الْأَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِيْنَ“

مفسرین کی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے کہ شیطان نے اس ساقی کو یوسف علیہ السلام کا بادشاہ کے پاس تذکرہ کرنا بھلا دیا اور اس کو راجح کہا ہے، اس لیے کہ شیطان کو انبیا علیہم السلام پر کچھ تسلط نہیں ہوتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ نسیان یوسف علیہ السلام سے واقع ہوا اور اس نسیان کی نسبت شیطان کی طرف بطورِ مجاز ہے اور انبیا علیہم السلام نسیان سے معصوم نہیں ہیں مگر اسی معاملے میں جس کی خبر وہ اللہ کی طرف سے دیتے ہیں اور صحیح حدیث میں مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ أَنْسٰى كَمَا تَنْسَوْنَ فَإِذَا نَسِيْتُ فَذَكِّرُوْنِيْ »[6] [میں تمھاری طرح کا ایک بشر ہی ہوں،

---

[1] تفسير الطبري (١٦/ ١١٢) اس کی سند میں ”ابراہیم بن یزید“ اور ”سفیان بن وکیع“ ضعیف راوی ہیں۔
[2] تفسير الطبري (١٦/ ١١٢) یہ دونوں روایتیں مرسل ہیں۔
[3] تفسير الطبري (١٦/ ١١٤۔ ١١٥)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٥٠) اس کی سند میں ”بشر بن عمارہ“ ضعیف راوی ہے۔
[5] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٥٠)
[6] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٧٢)

میں بولتا ہوں جس طرح تم بھولتے ہو]

علاوہ اس کے نسیان کوئی گناہ نہیں ہے۔ شیطان نے اگر یوسف علیہ السلام کو رب کا ذکر فراموش کر دیا تو وہ کچھ اس بھول پر سزا کے مستحق نہیں ہیں کہ چند سال قید میں رہے، بلکہ یہ سزا انھیں غیر اللہ سے مدد مانگنے پر ہوئی تھی۔ ضمیر کا رجوع یوسف علیہ السلام کی طرف ﴿ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ ﴾ سے بھی نکلتا ہے، جب آیت کریمہ: ﴿ وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ ﴾ [یوسف: ٤٥] ''اسے (یوسف) مدت کے بعد یاد آیا۔'' اسی بات کی متقاضی ہے کہ ضمیر ساقی کی طرف ہو۔

بالجملہ یوسف علیہ السلام چند سال اس قول کی وجہ سے یا إِنْسَاء (بھول بھلانے) کی وجہ سے قید خانے میں رہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ اگر یوسف علیہ السلام یہ بات نہ کہتے تو اتنی مدت قید میں نہ رہتے، انھوں نے غیر اللہ سے کشادگی چاہی۔[1] (رواه ابن أبي الدنيا وابن جرير والطبراني وعن عكرمة نحوه مرسلا) قید کی مدت میں اختلاف ہے، سات برس سے چودہ برس تک۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اللہ نے یوسف علیہ السلام کو وحی کی کہ تجھ کو قتل سے کس نے بچایا، جبکہ تیرے بھائیوں نے تیرا قتل چاہا تھا؟ کہا: اے رب! تُو نے، کہا: کس نے تجھ کو کنویں سے نکالا، جبکہ انھوں نے کنویں میں ڈال دیا تھا؟ کہا: تُو نے اے رب! کہا: جب عورت نے تیرا قصد کیا تو کس نے تجھ کو اس کے ہاتھ سے چھڑایا؟ کہا: اے رب! تُو نے۔ فرمایا: پھر تُو کس طرح مجھ کو بھول گیا اور کسی اور آدمی کو یاد کیا؟ کہا: گھبراہٹ میں یہ بات میری زبان سے نکل گئی۔ فرمایا: مجھے قسم ہے اپنی عزت کی کہ میں چند سال تجھ کو قید خانے میں رکھوں گا۔ چنانچہ وہ سات سال قید میں رہے۔[2] (أخرجه ابن أبي شيبة و عبد الله بن أحمد وابن المنذر وابن أبي حاتم وأبو الشيخ) پس ﴿ بِضْعَ ﴾ سزا کی مدت ٹھہری نہ کہ مدتِ قید۔[3]

وَقَالَ الْمَلِكُ اِنِّيْٓ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ
عِجَافٌ وَّسَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ۭ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِيْ
فِيْ رُءْيَايَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ ﴿٤٣﴾ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ
وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ ﴿٤٤﴾ وَقَالَ الَّذِيْ نَجَا مِنْهُمَا
وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِيْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ ﴿٤٥﴾ يُوْسُفُ
اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ اَفْتِنَا فِيْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ

---

[1] العقوبات لابن أبي الدنيا (١/ ١٠٩) تفسير الطبري (٦/ ١١٢) المعجم الكبير (١١/ ٢٤٩) اس کی سند میں ''ابراہیم بن یزید خوزی'' ضعیف راوی ہے۔

[2] الدر المنثور (٤/ ٥٤١) [3] فتح البيان (٦/ ٣٤١۔ ٣٤٢)

وَّسَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ؕ لَّعَلِّيْۤ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ
لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۶﴾ قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا
حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖۤ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ﴿۴۷﴾ ثُمَّ يَاْتِيْ
مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا
قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ﴿۴۸﴾ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ
يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ ﴿۴۹﴾

اور بادشاہ نے کہا: بے شک میں (خواب میں) سات موٹی گائیں دیکھتا ہوں، جنھیں سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں، اور سات سبز بالیاں اور دوسری خشک۔ اے درباریو! اگر تم خواب کی تعبیر کر سکتے ہو تو مجھے میرے خواب کی تعبیر بتاؤ (43) انھوں نے کہا: یہ پریشان خواب ہیں اور ہم (ایسے) خوابوں کی تعبیر جاننے والے نہیں (44) اور وہ (شخص) جس نے دونوں (قیدیوں) میں سے نجات پائی تھی، اسے (یوسف) مدت کے بعد یاد آیا، بولا: میں تمھیں اس کی تعبیر بتاؤں گا، لہٰذا تم مجھے (یوسف کے پاس) بھیجو (45) (اس نے جا کر کہا:) اے یوسف! اے بہت ہی سچے! ہمیں (اس خواب کی تعبیر) بتلائیے کہ سات موٹی گائیں ہیں جنھیں سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں، اور سات ہری بالیاں ہیں اور دوسری خشک، تاکہ میں لوگوں کی طرف لوٹوں، تاکہ وہ جان لیں (46) یوسف نے کہا: تم سات سال لگاتار کاشت کرو گے، چناں چہ تم جو (فصل) کاٹو تو وہ اس کی بالیوں ہی میں رہنے دو، سوائے تھوڑی (مقدار) کے جو تم کھاؤ (47) پھر اس کے بعد سات سال سخت آئیں گے، وہ کھا جائیں گے اسے جو تم نے ان کے لیے ذخیرہ کیا ہوگا، سوائے تھوڑے سے غلے کے جو تم (بطور بیج) محفوظ رکھو گے (48) پھر اس (قحط سالی) کے بعد ایک سال آئے گا، اس میں لوگ بارش پائیں گے اور وہ اس میں رس نچوڑیں گے (49)

شاہِ مصر کا خواب اور یوسف علیہ السلام کی طرف سے اس کی تعبیر:

رس نچوڑنا شراب ساز کے لیے فرمایا اور سات برس کا ذخیرہ بالیوں میں رکھوایا، تاکہ زمین میں گل نہ جائے، سات برس قحط ہوگا، اس وقت یہ پورا پڑے گا۔ اس خواب کو جو مصر کے بادشاہ نے دیکھا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کو یوسف علیہ السلام کے قید سے باعزت و اکرام نکلنے کا سبب ٹھہرایا۔ بادشاہ نے اس خواب کو دیکھا اور ڈر گیا اور تعجب کیا کہ دیکھیے کیا ہوگا، اس کی تعبیر کیا ہے! کاہنوں کو اور اپنے بڑے بڑے امرا کو جمع کر کے یہ خواب بیان کیا اور کہا: اس کی تعبیر بتاؤ، ان کو اس کی کچھ تعبیر معلوم نہ ہوئی اور یہ عذر کیا کہ یہ خواب پریشان ہے جو تم کو نظر آیا اور ہم کو خوابوں کی تاویل

معلوم نہیں ہے، یعنی اگر سچا خواب بھی اغلاط سے صحیح اور صاف ہوتا، تب بھی ہم اس کی تاویل کو نہیں پہچانتے تھے۔

اس وقت اس شخص کو، جس نے نجات پائی تھی اور شیطان نے اس کو بھلا دیا تھا کہ وہ یوسف علیہ السلام کا ذکر اپنے آقا سے کرے، ایک مدت کے بعد یہ بات یاد آئی۔ بعض نے کہا ہے کہ ﴿ بَعْدَ أُمَّةٍ ﴾ یعنی بھول جانے کے بعد، تب اس نے بادشاہ سے اور دربار والوں سے کہا: تم مجھ کو بھیج دو، میں اس کی تاویل کی خبر دوں گا۔ انھوں نے کہا: اچھا تُو جا، اس نے کہا: اے یوسف صدیق علیہ السلام! تم مجھے بادشاہ کی اس خواب کی تعبیر بتاؤ۔ یوسف علیہ السلام نے اس بھول پر اسے کچھ نہیں ڈانٹا اور قید سے نکلنے کے انتظار میں ہو گئے اور تعبیر بتا دی کہ سات برس تک لگاتار ارزانی اور بارش رہے گی، گاؤں کی تفسیر سالوں کے ساتھ کی، کیونکہ بیلوں سے زمین کاشت کی جاتی ہے، پھر اس سے کھیتی اور پھل پیدا ہوتے ہیں، وہی سبز بالیں ہوتی ہیں۔

قحط سالی سے نپٹنے کی تدبیر:

پھر بتایا کہ جو پیداوار ان سالوں میں ہو، تم اس کو سنبل (بالیوں) میں چھوڑ دو، مگر تھوڑی سی اپنے کھانے کے لیے لو۔ فضول خرچی نہ کرو، تاکہ باقی ماندہ غلّہ قحط کے سالوں میں تمھارے کام آئے۔ پھر یہ بشارت دی کہ ان پے در پے قحط کے سالوں کے بعد ایک سال ایسا آئے گا کہ اس میں خوب پانی برسے گا اور شہروں کو نہلا دے گا، لوگ اپنی عادت کے مطابق تیل وشکر اور اسی طرح کی چیزیں نچوڑیں گے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس میں دودھ کا دوہنا بھی داخل ہے، لہٰذا سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿ يَعْصِرُوْنَ ﴾ بمعنی يَحْلِبُوْنَ ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جب یوسف علیہ السلام کی رہائی کا وقت قریب آیا تو ایان بن ولید مصر کے بادشاہ نے، جس کا وزیر عزیز تھا، خواب دیکھا اور اپنے ساحروں اور کاہنوں سے اس کی تعبیر پوچھی، سب نے اپنی لاعلمی بیان کی اور اس خواب کو اضغاثِ احلام (اڑتے اڑتے پریشان خواب) ٹھہرایا۔ حلم جھوٹے خواب کو کہتے ہیں اور ضغث ہر ملے جلے کو۔ سبزی اور خشک گھاس کے اختلاط سے اس کا اشارہ جھوٹے خواب کی طرف کیا، جیسے حدیثِ نفس اور وسوسۂ شیطان۔ بالجملہ انھوں نے یہ نہیں کہا کہ اس خواب کی کچھ تعبیر نہیں ہے، بلکہ اپنے علم کی نفی کی، تاکہ یہ خیال بادشاہ کے سینے سے نکل جائے اور اس طرف اس کا دل مشغول نہ رہے۔ اس وقت ساقی کو یوسف علیہ السلام کی بات یاد آئی، اس نے کہا: میں اس کی تعبیر لاؤں گا، مجھ کو یوسف علیہ السلام کے پاس بھیج دو۔

پھر قید خانے میں آ کر یوسف علیہ السلام سے اس کی تعبیر دریافت کی۔ ان کو صدیق اس لیے کہا کہ کبھی کسی بات میں

[1] تفسير الطبري (١٦/ ١٣٠)

ان کا جھوٹ نہ دیکھا تھا۔ صدیق کہتے ہیں زیادہ سچ بولنے والے کو، جو کبھی جھوٹی بات نہ کہے، یا اس لیے کہ وہ اس خواب کی تعبیر میں جو اس نے قید خانے میں دیکھی تھی، سچ نکلے تھے۔ قاصد کا قید خانے میں آنا چار بار ہوا تھا۔ یہ آنا پہلی بار کا ہے، اس دفعہ ساقی نے پہلے کی طرح: ﴿ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ﴾ نہ کہا، بلکہ ﴿ اَفْتِنَا ﴾ کہا، اس لیے کہ وہ خواب اس کا تھا اور یہ خواب دوسرے کا تھا، یعنی بادشاہ کا۔

یوسف علیہ السلام نے اس کی تعبیر بتلا دی اور تعبیر کے علاوہ نصیحت کے طور پر یہ بات فرمائی کہ ارزانی کے سالوں میں سے ہر سال جو کھیتی تم کاٹو اس کو جانوروں کے چارہ کے لیے بدستور بالیوں میں ہی چھوڑ دو اور غلہ کو بالیوں سے علاحدہ نہ کرو کہ کہیں گھن نہ لگ جائے، مصر اور اس کے گرد ونواح کے غلے کا یہی حال تھا کہ اس میں گھن لگ جاتا تھا، لیکن تھوڑا سا غلہ ضرورت کے مطابق اس میں سے الگ کر لو گے تو کچھ مضائقہ نہیں ہے، اس لیے کہ باقی ماندہ آیندہ قحط کے سالوں میں کام آئے گا۔ مگر تھوڑا سا جو بیج کھاد کے لیے تم روک رکھتے ہو، کیونکہ بیج کے استیفاء (باقی رکھنے) سے زیادہ غذاؤں کی حفاظت ہوتی ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «لَقَدْ عَجِبْتُ مِنْ يُّوْسُفَ وَكَرَمِهٖ وَصَبْرِهٖ وَاللّٰهُ يَغْفِرُ لَهٗ حِيْنَ سُئِلَ عَنِ الْبَقَرَاتِ الْعِجَافِ وَالسِّمَانِ وَلَوْ كُنْتُ مَكَانَهٗ مَآ أَخْبَرْتُهُمْ حَتّٰى أَشْتَرِطَ عَلَيْهِمْ أَنْ يُّخْرِجُوْنِيْ، وَلَقَدْ عَجِبْتُ مِنْ يُّوْسُفَ وَصَبْرِهٖ وَكَرَمِهٖ وَاللّٰهُ يَغْفِرُ لَهٗ حِيْنَ أَتَاهُ الرَّسُوْلُ وَلَوْ كُنْتُ مَكَانَهٗ لَبَادَرْتُهُمُ الْبَابَ وَلٰكِنَّهٗ أَرَادَ أَنْ يَّكُوْنَ لَهُ الْعُذْرُ »[1] (رواه عبد الرزاق وابن جرير وابن المنذر وابن أبي حاتم) [بلاشبہ یقیناً مجھے یوسف علیہ السلام، اللہ تعالیٰ ان کو بخشے!، کے کرم وصبر پر تعجب ہونا ہے جب کہ ان سے سات دبلی پتلی اور سات موٹی گائیوں کے متعلق دریافت کیا گیا، اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو میں ان سے رہائی کے شرط کے بغیر اس کی تعبیر نہ بتاتا، مجھے یوسف علیہ السلام۔ اللہ تعالیٰ ان کو بخش دے!، کے صبر وکرم پر تعجب ہوا جب کہ ان کے پاس ایلچی آیا، اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو جلدی سے قید خانے کے دروازے کی طرف لپکتا، لیکن انھوں نے اسے اپنا عذر بنانے کا ارادہ کیا]

پھر یوسف علیہ السلام نے یہ نوید سنائی کہ اس قحط کے بعد ایک ایسا سال آئے گا کہ اس میں لوگوں کو خوب بارش ملے گی اور لوگ انگور اور تِل اور زیتون نچوڑیں گے، یا دودھ دوہیں گے، یا قحط کی اس تکلیف سے نجات پائیں گے۔ عَصَرَت بمعنی منجاۃ ہے، یا بہ معنی ملتجا۔ یہ خبر بغیر سوال کے دی۔ اس سے مراد کثرتِ خیر وکثرتِ خصب (آسودگی) اور زروع (کھیتی) اور ثمار (پھل) ہے۔[2]



[1] تفسیر الصنعاني (٢/ ٣٢٣) تفسیر الطبري (١٦/ ١٣٦) تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٥٦) یہ روایت مرسل ہے۔

[2] فتح البیان (٦/ ٣٤٤۔ ٣٥٠)

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ
اِلٰى رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ؕ اِنَّ
رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ ﴿۵۰﴾ قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ
عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ قَالَتِ
امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ؗ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ
وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۵۱﴾ ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ
وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ﴿۵۲﴾ وَمَاۤ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ
النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۳﴾

اور بادشاہ نے کہا: تم اسے میرے پاس لے آؤ، پھر جب اس (یوسف) کے پاس قاصد آیا تو اس نے کہا: تو اپنے مالک کے پاس لوٹ جا اور اس سے پوچھ کہ ان عورتوں (کے معاملے) کی کیا حقیقت ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے۔ بے شک میرا رب ان کا مکر خوب جانتا ہے (50) بادشاہ نے (عورتوں سے) کہا: تمھارا معاملہ کیا ہے جب تم نے یوسف کو اس کے جی سے پھسلایا تھا؟ وہ بولیں: [حَاشَ لِلّٰہِ] ''اللہ کی پناہ!'' ہمیں اس (کی ذات) میں کوئی برائی معلوم نہیں۔ عزیز (مصر) کی بیوی نے کہا: اب حق واضح ہوگیا ہے، میں نے ہی اسے اس کے جی سے پھسلایا تھا اور بلاشبہ وہ سچوں میں سے ہے (51) (یوسف نے کہا:) یہ اس لیے کہ وہ (عزیز) جان لے کہ بے شک میں نے درپردہ اس کی خیانت نہیں کی تھی، اور یہ کہ بے شک اللہ خائنوں کا مکر نہیں چلنے دیتا (52) اور میں اپنے نفس کو بری نہیں کرتا، بے شک نفس تو برائی پر اُکساتا ہے، مگر جس پر میرا رب رحم کرے، بے شک میرا رب غفور (اور) رحیم ہے (53)

یوسف علیہ السلام کا اپنے معاملے کی تحقیق سے پہلے قید سے نکلنے سے انکار:

وہی قصہ یاد دلایا کہ وہ عورتیں گواہ ہیں، بادشاہ پوچھے تو وہ کھول دیں کہ قصور کس کا ہے؟ یوسف علیہ السلام نے سب کا فریب بتایا، اس لیے کہ ایک کا فریب تھا اور سب اس کی مددگار تھیں اور فریب والی کا نام حقِ پرورش کی وجہ سے نہ لیا۔ اور بادشاہ نے پوچھا کہ کیا تم نے پھسلایا تھا؟ اس لیے کہ وہ جان لیں کہ بادشاہ خبر رکھتا ہے، پھر جھوٹ نہ بولیں۔ اللہ نے بادشاہ کے حال کی خبر دی کہ جب اس کے پاس خواب کی تعبیر لے کر آئے تو اس کو وہ تعبیر پسند آئی اور یوسف علیہ السلام

کے فضل وعلم اور حسنِ اطلاع کو پہچان گیا اور جان لیا کہ یہ تمام رعایا کے ساتھ اچھے اخلاق والے ہیں۔ تب کہا کہ انھیں قید خانے سے نکال کر میرے پاس لے آؤ اور حاضر کرو۔ جب قاصد آیا تو یوسف علیہ السلام نے نکلنے سے انکار کر دیا، اس وقت تک جب تک کہ بادشاہ اپنی رعایا سے ان کی براءت اور اُن کی عزت و آبرو کی پاکیزگی کی تحقیق نہ کر لے، جس کی نسبت اور تہمت عزیز کی بیوی نے ان پر لگائی تھی اور یہ قید کسی معاملے کے فیصلے کی بنا پر نہیں، بلکہ ظلم و زیادتی کے طور پر ہوئی ہے۔

سنتِ مطہرہ میں اس بات پر یوسف علیہ السلام کی تعریف آئی ہے اور اُن کے فضل و بزرگی اور بلند قدر و منزلت اور صبر پر آگاہ فرمایا ہے۔ صَلَوٰتُ اللّٰہِ وَسَلَامُہٗ عَلَیْہِ۔ مسند وصحیحین میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے: «نَحْنُ أَحَقُّ بِالشَّكِّ مِنْ إِبْرَاهِيْمَ إِذْ قَالَ: رَبِّ أَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى اَلْآيَةُ، وَيَرْحَمُ اللّٰهُ لُوْطًا، لَقَدْ كَانَ يَأْوِيْ إِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ، وَلَوْ لَبِثْتُ فِي السِّجْنِ مَا لَبِثَ يُوْسُفُ لَأَجَبْتُ الدَّاعِيَ »[1] [ہم ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ شک کرنے کا حق رکھتے ہیں، جب انھوں نے کہا تھا: ''اے میرے رب! مجھے دکھا تو مردوں کو کیسے زندہ کرے گا؟'' اللہ تعالیٰ لوط علیہ السلام پر رحم فرمائے (وہ کسی سہارے کی تمنا کر رہے تھے) حالانکہ انھوں نے ایک مضبوط سہارے کی پناہ لی ہوئی تھی اور اگر میں قید خانے میں یوسف علیہ السلام جتنا طویل عرصہ ٹھہرتا تو (ہوسکتا ہے) بلانے والے کی بات مان لیتا] سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں: «لَوْ كُنْتُ اَنَا لَأَسْرَعْتُ الْإِجَابَةَ وَمَا ابْتَغَيْتُ الْعُذْرَ »[2] (رواہ أحمد) [اگر میں ہوتا تو میں جلدی سے بلانے والے کی بات مان لیتا اور کوئی عذر تلاش نہ کرتا] امام عکرمہ رحمہ اللہ سے مروی مرسل حدیث اوپر گزر چکی ہے۔[3]

پھر یوسف علیہ السلام نے ان عورتوں سے تحقیق کرنے کا مطالبہ کیا اور ان میں عزیزِ مصر کی بیوی بھی تھی۔ اس وقت سب عورتوں نے ان کی صفائی کی گواہی دی اور عزیزِ مصر کی بیوی نے بھی اپنی خطا کا اقرار کیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد رحمہ اللہ اور کئی ایک اہلِ علم نے کہا ہے کہ اب حق ظاہر ہوگیا اور سچی بات کھل گئی کہ یوسف علیہ السلام سچے ہیں اور میں ہی قصور وار تھی۔[4]

پھر کہا کہ یہ اقرار میں نے اس لیے کیا کہ میرا خاوند یہ بات جان لے کہ میں نے اس کے پیچھے اس کے معاملے میں کوئی خیانت نہیں کی ہے اور نہ ہی کوئی بڑا برا کام مجھ سے سرزد ہوا ہے، بلکہ میں نے اس جوان کو خود ہی پھانسنا چاہا تھا، لیکن وہ نہ پھنسا۔ لہٰذا میں نے اقرار کیا، تاکہ وہ جان لے کہ میں بری ہوں، اللہ تعالیٰ دغا بازوں کا

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٩٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥١) مسند أحمد (٢/ ٣٢٦)

[2] مسند أحمد (٢/ ٣٤٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣١٥٠)

[3] تفسير الطبري (١٦/ ١٣٦) یہ روایت مرسل ہے۔ [4] تفسير الطبري (١٦/ ١٣٨)

فریب نہیں چلنے دیتا۔ پھر زلیخا نے کہا کہ میں اپنے نفس کی براءت نہیں کرتی، کیونکہ نفس تو تحدث اور تمنا کرتا ہے۔ لہٰذا میں نے یوسف علیہ السلام کو اپنے دام میں لانا چاہا، اس لیے کہ نفس برائی کا حکم کرتا ہے، مگر جس جی پر اللہ رحم کرے، بے شک میرا رب غفور و رحیم ہے۔ یہی قول زیادہ مشہور اور لائق تر ہے اور قصے کے سیاق کے لحاظ سے بھی موزوں تر ہے اور کلام کے معانی پر بھی صحیح طور پر چسپاں ہوتا ہے۔

اس کو امام ماوردی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے[1] اور امام ابوالعباس ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس قول کی تائید میں ایک علاحدہ تفسیر کی ہے۔ بعض نے کہا کہ یہ قول یوسف علیہ السلام کا ہے کہ انھوں نے کہا: عزیز جان لے کہ میں نے اس کی پیٹھ پیچھے اس کی زوجہ میں خیانت نہیں کی۔ امام ابن جریر اور ابن ابی حاتم رحمہما اللہ نے اس کے سوا اور کوئی قول حکایت نہیں کیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: جب یوسف علیہ السلام نے کہا کہ میں نے غائبانہ کوئی خیانت نہیں کی تو جبریل علیہ السلام نے کہا کہ کیا اس دن بھی نہیں کی کہ جب عورت نے تیرا اور تو نے عورت کا ارادہ کیا، تب کہا: ﴿ وَمَآ أُبَرِّئُ نَفۡسِيٓ... الخ﴾ یہی قول امام مجاہد، سعید بن جبیر، عکرمہ، ابن ابی الہذیل، ضحاک، حسن، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ کا بھی ہے،[2] لیکن پہلا قول زیادہ قوی اور ظاہر ہے، کیوں کہ کلام کا انداز کلی طور پر بادشاہ کے سامنے عزیز کی بیوی کی طرف سے ہے اور یوسف علیہ السلام اس جگہ موجود نہ تھے، بلکہ بادشاہ نے ان کو اس گفتگو کے بعد بلایا تھا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جب ایلچی خواب کی تعبیر لے کر آیا، بادشاہ نے کہا کہ یوسف کو حاضر کرو، میں ان کو دیکھوں اور ان کے حالات سے واقفیت حاصل کروں۔ جب قاصد بلانے کے لیے آیا تو انھوں نے انکار کیا۔ قاصد کا اُن کے پاس قید خانے میں یہ آنا دوسری دفعہ تھا۔ یوسف علیہ السلام نے قید خانے سے نکلنے میں توقف کیا، تاکہ ان کی براءت اور پاکیزگی پوری طرح ظاہر ہو جائے اور سب لوگ جان لیں کہ ان پر عزیز کی بیوی کی طرف سے واضح ظلم ہوا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے قید خانے سے نکلنے سے پہلے اپنے عذر کا ارادہ کیا،[3] اللہ تعالیٰ نے ان کو وہ حوصلہ اور صبر و انارت بخشا تھا، جس کے تصور سے ذہن تنگی کرتا ہے۔[4] اس آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ تہمت کو دور کرنے کے لیے کوشش کرنا واجب ہے جس طرح کہ تہمت کی جگہوں پر ٹھہرنے سے بچنا واجب ہوتا ہے۔ ''اِتَّقُوا مِنۡ مَوَاضِعِ التُّھَمِ'' ''تہمتوں والی جگہوں سے بچو۔''

یوسف علیہ السلام نے ﴿ مَا بَالُ النِّسۡوَةِ ﴾ کہا اور عزیز کی بیوی کا بادشاہ کے ذمہ لینے یا زنِ مذکور کے شر اور قید

---

[1] تفسیر الماوردي (٣/ ٤٨) [2] تفسیر الطبري (١٦/ ١٤٣۔ ١٤٦) تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٥٧۔ ٢١٥٨)

[3] الدر المنثور (٤/ ٥٤٨) [4] فتح البیان (٦/ ٣٥١)

کے ڈر سے ذکر نہ کیا اور ہاتھوں کے کاٹنے کا ذکر فرمایا، پھسلانے کا ذکر نہ کیا۔ اس امرِ نامناسب سے کسی قسم کے تعلق سے اپنے آپ کو بچایا اور پہلے جو پھسلانے کا ذکر کیا تھا وہ اس وقت کیا تھا، جب زلیخا نے ان پر پھسلانے کی تہمت لگائی تھی۔ تب یہ مجبوراً کہنا پڑا کہ یہ بات اس کی طرف سے تھی نہ میری طرف سے۔ اس جگہ پر اجمالی اشارے پر کفایت کی اور کہا کہ میرا رب ان کے مکر وفریب سے آگاہ ہے۔ اس میں ان کے قید کی تعظیم ہے اور مکر وفریب پر وعید ہے۔ بادشاہ نے ان عورتوں سے یوسف علیہ السلام کا حال دریافت کیا۔ وہ سب چالیس عورتیں تھیں، ان سب نے یوسف علیہ السلام کی براءت کر دی۔ زلیخا نے کہا کہ یہ سارے مناظرات اور تفحصات (تفتیش کرنا، ڈھونڈنا) میرے ہی سبب سے ہے۔ اس وقت پردہ دری کر کے صاف صریحاً کہہ دیا کہ ٹھیک بات یہی ہے کہ قصور میرا ہی تھا نہ کہ یوسف علیہ السلام کا۔

یہ بات اس نے اس بنیاد پر کہی کہ یوسف علیہ السلام نے ﴿مَا بَالُ النِّسْوَةِ﴾ کہا اور زلیخا کا خاص طور پر ذکر نہ کیا، حالاں کہ سارے فتنے اسی کی طرف سے تھے۔ تب اپنے گناہ کا اعتراف کیا اور کہا کہ یوسف علیہ السلام اپنے نفس کی پاکی بیان کرنے میں سچے ہیں۔ رسول نے یوسف علیہ السلام کو خبر دی کہ ان عورتوں نے بادشاہ کے سوال کا یہ جواب دیا۔ قاصد کا یہ آنا یوسف علیہ السلام کے پاس تیسری بار تھا۔ یوسف علیہ السلام نے کہا: ﴿ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ ... الخ﴾ (آیت باب)۔ اکثر مفسرین کہتے ہیں کہ یہ کلام یوسف علیہ السلام کا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک انسان کے کلام کا دوسرے انسان کے کلام سے مل جانا کچھ دور نہیں ہے، جب کہ قرینہ صارفہ ہر ایک کی طرف دلالت کرتا ہو۔[1] یہ بات یوسف علیہ السلام نے قید خانے میں یا بادشاہ کے سامنے کہی تھی، لیکن پہلی بات زیادہ بہتر ہے اور تھوڑے سے مفسر اس طرف گئے ہیں کہ یہ کلام عزیز کی بیوی کا ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اسی کو راجح کہا ہے،[2] جس طرح اوپر گزرا، یعنی زلیخا کہتی ہے کہ میں نے جو بات یوسف علیہ السلام کی پاک بازی کے سلسلے میں اور اپنے نفس کی مراودت (پھسلانا) کے لیے کہی ہے، وہ اس لیے کہی ہے کہ یوسف علیہ السلام کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ میں نے یوسف علیہ السلام کی خیانت نہیں کی اور ان کے پسِ پشت وہ بات ان کی طرف منسوب نہیں کی، جو نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ خائنوں کے مکر وفریب کو چلنے نہیں دیتا۔ اگر یہ قول یوسف علیہ السلام کا ہے تو اس میں عزیز کی بیوی کی طرف اشارہ ہے کہ یہ مکر وفریب اور شوہر کی خیانت اس سے ہوئی اور خود عزیز کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اس نے باوجود میری براءت اور پاک دامنی کا علم ہو جانے کے مجھ کو قید رکھا۔ شاید مراد یہ ہوگی کہ اگر میں خائن ہوتا تو اللہ تعالیٰ مجھ کو اس ورطہ سے رہائی نہ دیتا اور جب کہ اس نے مجھے خلاصی دی تو اس مراودت (پھسلانے والے الزام) سے میری براءت ظاہر ہوگئی۔

پھر تواضع اور انکسار کے طور پر یہ فرمایا کہ میں اپنے جی کو پاک نہیں کہتا، حالاں کہ سب لوگ اور خود وہ جانتے تھے کہ وہ اس تہمت سے پاک صاف ہیں اور وہ عورت بھی ان کی صفائی کر چکی تھی، جس نے ان کو باطل کی طرف

---

[1] فتح القدير (٣/ ٤٧) [2] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٦٢٦)

دعوت دی تھی، لیکن اپنے نفس کو توڑنے اور عدمِ تزکیۂ نفس کے طور پر یہ بات فرمائی اور اگر یہ قول عزیز کی بیوی کا ہے تو وہ حقیقت پر مبنی ہے اور واقع کے مطابق ہے، کیوں کہ اس نے یوسف علیہ السلام پر اپنے افترا اور مراودت کا اعتراف کر لیا تھا اور بعض نے کہا کہ یہ قول عزیز کا ہے، لیکن یہ نہایت بعید ہے۔ اس کے معنی یہ کیے ہیں کہ میں اپنے نفس کو یوسف علیہ السلام کے ساتھ بدگمانی سے پاک نہیں بتاتا ہوں۔ میں نے براءت کا علم ہو جانے کے بعد جلدی سے انھیں قید میں ڈال دیا۔ انسان کا نفس بدی سکھانے والا ہوتا ہے، شہوات کی طرف مائل کرتا ہے، اس کی یہ تاثیر اس کا خاصہ ہے اور اس کا مقہور رکھنا (قابو میں رکھنا) سخت مشکل ہے۔ ہاں جس پر اللہ رحم کرے، وہ محفوظ رہ سکتا ہے، کیوں کہ اللہ کی شان بخشنا اور رحمت کرنا ہے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِي ۖ فَلَمَّا كَلَّمَهُ قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ ﴿٥٤﴾ قَالَ اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ ۖ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ ﴿٥٥﴾

اور بادشاہ نے کہا: اسے میرے پاس لاؤ، میں اسے اپنی ذات کے لیے مخصوص کروں گا، پھر جب اس نے یوسف سے گفتگو کی تو کہا: یقیناً آج تو ہمارے ہاں مرتبے والا، امین ہے (54) (یوسف نے) کہا: مجھے زمین کے خزانوں (پیداوار) پر (نگران) مقرر کر دیجیے، بے شک میں خوب نگہبانی کرنے والا، خوب جاننے والا ہوں (55)

بادشاہِ مصر کے ہاں یوسف علیہ السلام کی قدر افزائی:

بادشاہ نے اس کے بعد یوسف علیہ السلام کا تعلق عزیز سے ختم کیا اور اپنی صحبت میں رکھا۔ انھوں نے خود یہ صحبت طلب کی، تاکہ اہلِ دنیا کی صحبت سے دور رہیں اور خواب کی تعبیر اور کسی سے بن نہ آتی۔ اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ جب یوسف علیہ السلام کی براءت بادشاہ کے نزدیک حق ثابت ہوگئی اور وہ پاک آبرو ٹھہرے، اس تہمت سے جو اُن پر لگائی گئی تھی تو بادشاہ نے ان کو بلا کر اپنا خاص اور مشیر بنانا چاہا۔ جب یوسف علیہ السلام سے بات چیت ہوئی اور جب بادشاہ کو ان کا فضل اور فصاحت و بلاغت میں کمال، علم اور اخلاق اور کمال معلوم ہوا تو ان سے یہ بات کہی کہ تو آج کے دن ہمارے پاس صاحبِ عزت و مکانت و امانت ہے۔ اس پر یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ تم مجھے زمین کے خزانوں کا خزانچی مقرر کر دو، میں نگہبان دانش مند ہوں۔ اپنے شریف نفس کی تعریف فرمائی، آدمی کو جائز ہے کہ جب اس کا حال اور کام دوسرے کو معلوم نہ ہو تو اپنی صفت بیان کر دے۔

﴿حَفِيظٌ﴾ سے اس جگہ مراد خازنِ امین ہے اور ﴿عَلِيمٌ﴾ سے صاحبِ علم و بصیرت بہ امورِ ولایت۔

شیبہ بن نعامہ نے کہا کہ جو امانت میرے سپرد کی جائے، اس کا محافظ اور قحط کے سالوں کا علم رکھنے والا ہوں۔[1] سوال عمل کا کیا، اس لیے کہ اس عمل پر اپنی قدرت جانتے تھے اور اس کام میں لوگوں کی بہت سی مصلحتیں تھیں۔ زمین کے خزانوں پر اپنا مقرر ہونا چاہا۔ اس سے مراد وہ جگہیں ہیں، جہاں آیندہ سال کے لیے غلے جمع کیے جاتے تھے۔ جس کی خبر پہلے سے دے چکے تھے، تاکہ ان غلوں کو لوگوں پر بروجہ احوط و اسلم و ارشد خرچ کریں۔ بادشاہ نے ان کا یہ سوال بہ رضا و خوشی اور اُن کی عزت کی خاطر قبول کر لیا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اس جگہ بادشاہ سے مراد ریان بن ولید ہے نہ کہ عزیز۔ مطلب یہ ہوا کہ میں ان کو خالص اپنا مصاحب ہی کروں گا، کیوں کہ اس سے قبل وہ عزیز کے خالص تھے۔ استخلاص کہتے ہیں کسی چیز کے خلوص کو شرکت کے شوائب سے پاک طلب کرنا۔ بادشاہ نے یہ بات اس لیے کہی کہ یوسف علیہ السلام بہت زیادہ نفیس تھے اور بادشاہوں کی عادت یہ ہوتی ہے کہ نفیس چیزوں کو اپنے لیے خاص کر لیتے ہیں، غیر کے پاس نہیں چھوڑتے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: قاصد نے آکر یوسف علیہ السلام سے کہا کہ قید خانے کے یہ کپڑے اُتار ڈالو اور نیا لباس پہنو اور بادشاہ کے پاس چلو۔ اس وقت قیدیوں نے یوسف علیہ السلام کو دعا دی اور یوسف علیہ السلام نے ان کے لیے دعا کی، وہ اس وقت تیس برس کے تھے۔ جب بادشاہ کے پاس آئے، ان کو ایک نوخیز لڑکا دیکھ کر کہ اس نے میرے خواب کی تعبیر جان لی اور اُن ساحروں اور کاہنوں نے نہ جانی، تب ان کو سب کے آگے بٹھایا اور کہا کہ تو کچھ خوف نہ کر اور سونے کا ایک ہار اور لباس حریر پہنایا اور ایک سواری سجی ہوئی زین کسی ہوئی، جس طرح کہ بادشاہوں کی ہوتی ہے، عطا کی اور شہر میں اعلان کر دیا کہ یوسف علیہ السلام بادشاہ کا خلیفہ ہے[2] اور یوسف علیہ السلام سے کہا: میں چاہتا ہوں کہ تو ہر چیز میں میرا شریک رہ، سوائے میرے اہل کے، ہاں! میں تیرے ساتھ کھانے میں عار کرتا ہوں۔

یوسف علیہ السلام نے غصہ کیا اور کہا کہ میں اس عار کا زیادہ مستحق ہوں، اس لیے کہ میں ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کا بیٹا ہوں اور ابن اسحق ذبیح اللہ علیہ السلام ہوں اور پسرِ یعقوب نبی اللہ علیہ السلام ہوں۔ قاصد کا یوسف علیہ السلام کے پاس قید میں یہ آنا چوتھی بار تھا۔ بادشاہ نے کہا: تو اب ہمارے پاس مکین امین ہے، مکانت سے مراد جاہ و منزلت ہے، لیکن یہ ایک جامع کلمہ ہے، جس میں تمام فضائل و مناقب، جن کی امرِ دین و دنیا میں خواہش و حاجت ہوتی ہے، شامل ہوتے ہیں۔

﴿ اَلْيَوْمَ ﴾ سے مراد وہ وقت ہے، جس میں بادشاہ نے یوسف علیہ السلام سے بات چیت کی نہ یہ کہ ایک مدت کے بعد تم کو یہ رتبہ ملے گا۔ کہتے ہیں کہ جس وقت یوسف علیہ السلام آئے تھے، بادشاہ نے ان کو اپنے تخت پر بٹھایا اور کہا کہ میں اپنے خواب کی تعبیر تمھاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔ یوسف علیہ السلام نے وہ تاویل مکمل وضاحت اور تمام عبارت کے

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٦٠) [2] الدر المنثور (٤/ ٥٥٠_ ٥٥١)

ساتھ بیان کی۔ تب بادشاہ نے کہا: تو ہمارے پاس صاحبِ مکانت و امانت ہے۔ اس وقت یوسف علیہ السلام نے یہ درخواست کی کہ مجھ کو زمین کے خزانوں پر مامور کرو۔

زمین سے مراد مصر ہے، یعنی جن مکانات میں مال اور اجناس وغیرہ رکھتے ہیں، وہ میری سپردگی میں دے دو۔ خزائن جمع ہے خزینہ کی۔ خزینہ اسمِ مکان ہے، جس میں کوئی شے رکھی جائے۔ یوسف علیہ السلام نے یہ طلب اس لیے کی کہ اس وسیلے سے لوگوں میں عدل پھیلائیں اور ظلم کو دور کر دیں اور اس کو اہلِ مصر کے لیے اللہ پر ایمان لانے اور عبادتِ اوثان کو ترک کرنے کی دعوت کا ایک وسیلہ ٹھہرائیں۔ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ جس شخص کے لیے اپنے نفس پر بادشاہ کے امور میں سے کسی امر کا یقین اور اعتبار ہو تو اس کو جائز ہے کہ وہ منارِ حق (حق کے نشان) کو بلند کرے، باطل کو مٹائے اور اپنے لیے اس منصب کا طالب ہو اور اپنے نفس کا وصف بیان کرے، تا کہ سننے والے کو رغبت اور خوشی حاصل ہو اور وہ ان معاملات کی کنجیاں اس کے ہاتھ میں سونپے، لیکن احادیث میں کسی منصب کو طلب کرنے کی ممانعت آئی ہے اور جو اس کا طالب ہو اس کے سپرد وہ کام کرنے سے منع فرمایا ہے اور حریص کو عامل بنانے سے روکا ہے۔

سو یہ کچھ یوسف علیہ السلام کے اس طلب کرنے کے خلاف یا برعکس نہیں ہے، اس لیے کہ یوسف علیہ السلام کی طلب اللہ کی رضا کی جستجو کے لیے تھی، وہ پیغمبر عالی قدر تھے اور اس منصب کے طالب دنیا طلبی کے لیے نہیں ہوئے تھے۔ اس تقریر سے ان دونوں حالتوں کے درمیان جمع ہو جاتی ہے۔ ﴿حَفِيْظٌ﴾ سے مراد نگہبان ہے کہ مالوں کو محفوظ رکھے اور غیر مخارج (جہاں نکلنا نہ چاہیے) اور غیر مصارف (جہاں خرچ نہ کرنا چاہیے) میں خرچ نہ کرے۔ ﴿عَلِيْمٌ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جو جمع، تفریق، آنے والے مال اور جانے والے مال کا حساب کتاب اور اس کی مصلحتوں کو جانے، یا حساب کتاب کو جاننے والا اور اہلِ بلاد کی زبان کو جاننے والا ہے۔[1]

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝

اور اس طرح ہم نے یوسف کو زمین (مصر) میں اقتدار دیا، وہ اس میں جہاں چاہتا قیام کرتا، ہم اپنی رحمت سے جسے چاہیں نوازتے ہیں، اور ہم نیکوں کا اجر ضائع نہیں کرتے (56) اور یقیناً آخرت کا اجر بہتر ہے ان کے لیے جو ایمان لائے اور انھوں نے تقویٰ اختیار کیا (57)

یوسف علیہ السلام کی مصر پر حکومت:

یہ ان کے سوال کا جواب ہوا کہ اولادِ ابراہیم اس طرح شام سے مصر میں آئی اور بیان ہوا کہ بھائیوں نے

[1] فتح البیان (٦/ ٣٥٥۔ ٣٥٧)

یوسف علیہ السلام کو گھر سے دور پھینکا، تاکہ ذلیل ہو، اللہ تعالیٰ نے عزت دی اور ملک پر اختیار دیا۔ ہمارے نبی ﷺ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ زمین سے اس جگہ مراد سرزمینِ مصر ہے اور جگہ پکڑنے سے مراد اپنے دل کی خواہش کے مطابق خرچ کرنا ہے۔ یہی قول امام سدی اور ابن زید رحمہ اللہ کا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ مراد اتخاذِ منزل ہے کہ جہاں چاہیں تنگی اور قید کے بعد اچھے سے اچھا گھر بنائیں۔[1] اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کے اس صبر کو ہم نے برباد نہیں کیا، جو انھوں نے اپنے بھائیوں کی ایذا دہی پر کیا اور جو انھوں نے عزیز کی بیوی کی وجہ سے قید ہو کر کیا، یعنی دنیا میں۔ رہی آخرت سو وہاں کا اجر و ثواب اور بھی اعظم و اکثر و اجل و اتم ہے۔ دنیا میں اس اقتدار اور قوت کی نسبت جس طرح کہ سلیمان علیہ السلام کے حق میں فرمایا ہے: ﴿ هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴾ [صٓ: ٣٩۔ ٤٠] ”یہ ہماری بخشش ہے، لہٰذا (لوگوں پر) احسان کر یا روک رکھ، کوئی حساب نہیں ہوگا۔ اور بے شک اس کے لیے ہمارے پاس بڑا قرب اور اچھا ٹھکانا ہے۔“

غرض یہ کہ ریان بن ولید بادشاہِ مصر نے مصر کی وزارت یوسف صدیق علیہ السلام کے سپرد کر دی، بجائے اس شخص کے جس نے ان کو خرید لیا تھا اور اس عورت کا شوہر تھا، جس نے ان کو پھسلایا تھا اور ملک کا تصرف یوسف علیہ السلام کے ہاتھ میں دے دیا کہ جس طرح چاہو انتظام کرو اور بندوبست رکھو۔ (قالہ مجاھد) امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب یوسف علیہ السلام نے بادشاہ سے یہ درخواست کی کہ وہ ان کو خزائنِ ارض پر مقرر کر دے تو اس نے کہا: میں نے منظور کیا اور عملِ اطفیر یعنی عزیزِ مصر کا عہدہ ان کے حوالے کر دیا اور اطفیر کو اس کے منصب سے معزول کر دیا۔ یہ معنے ہیں تمکین کے۔

یوسف علیہ السلام کی عزیزِ مصر کی بیوہ سے شادی:

کہتے ہیں کہ اطفیر انہی راتوں میں ہلاک ہو گیا اور ریان بن ولید بادشاہِ مصر نے زنِ عزیز کو یوسف علیہ السلام کے ساتھ بیاہ دیا اس کا نام راعیل تھا۔ جب وہ یوسف علیہ السلام پر داخل ہوئی تو انھوں نے فرمایا: کیا یہ حالت اس حالت سے بہتر نہیں جو تو چاہتی تھی۔ لوگ خیال کرتے ہیں کہ اس نے کہا: اے صدیق! تو مجھ کو ملامت نہ کر، تو جانتا ہے کہ میں اس ملک اور دنیا میں ایک حسین و جمیل ناز و نعمت کی پلی ہوئی عورت تھی اور میرا صاحب، یعنی شوہر عورتوں کے پاس نہ جاتا تھا اور تو اس حسن و ہیئت میں تھا جو اللہ نے تجھ کو بخشا ہے۔ لوگ خیال کرتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام نے اسے عذرا، یعنی دوشیزہ پایا، پھر اس سے دو مرد پیدا ہوئے: افرائیم بن یوسف اور میشا بن یوسف۔[2] افرائیم کے فرزند نون ہیں جو یوشع کے والد تھے اور بیٹی رحمت تھی جو ایوب علیہ السلام کی زوجہ تھیں۔ فضیل بن عیاض رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ زنِ عزیز راستے کے کنارے پر کھڑی ہوئی، یوسف علیہ السلام اس طرف سے گزرے تو بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا: ”اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ

---

[1] تفسیر الطبري (١٦/ ١٥١۔ ١٥٢)
[2] تفسیر الطبري (١٦/ ١٥١۔ ١٥٢)

جَعَلَ الْعَبِيْدَ مُلُوْكًا بِطَاعَتِهٖ وَالْمُلُوْكَ عَبِيْدًا بِمَعْصِيَتِهٖ"[2] [سب تعریف اس اللہ کی جس نے اپنی فرمانبرداری کی وجہ سے غلاموں کو بادشاہی پر پہنچایا اور اپنی نافرمانی کی وجہ سے بادشاہوں کو غلامی پر لا اتارا]

۲۔ تفسير ابن أبي حاتم (۷/ ۲۱٦۲) تفسير ابن كثير (۲/ ٦۲۷)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ ہم نے یوسف علیہ السلام کو زمینِ مصر میں جگہ دی۔ کہتے ہیں کہ یہ زمین چالیس فرسخ تھی۔ چالیس فرسخ میں رہائش امر و نہی کے بارے میں احکام کو نافذ کرنے کی قدرت رکھنے سے عبارت ہے، جس میں کوئی رکاوٹ نہ ہو اور حاکم جو چاہے سو کرے، سب اسی کی رائے پر چلیں، اس پر کوئی اعتراض نہ ہو۔ ﴿ يَتَبَوَّاُ ﴾ سے مراد زمین میں تصرف ہے کہ جس طرح بادشاہ کا حکم اس کے شہر میں چلتا ہے، اسی طرح یوسف علیہ السلام کا حکم چلے اور جس طرح کوئی مرد اپنے گھر میں حکمران ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ بادشاہ نے ان کے سر پر تاج رکھا اور سر بہ مہر فرمان جاری کر کے عزیز کی جگہ پر مقرر کر دیا اور اس کو معزول کر دیا۔ وہ معزول ہونے کے بعد مر گیا۔ اس کی عورت ان کو بیاہ دی، اس سے دو لڑکے پیدا ہوئے، مصر میں عدل قائم ہوا، سب کی گردنیں ان کے سامنے جھک گئیں۔[3] (قاله السيوطي)

امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا کہ جب یوسف علیہ السلام نے زنِ عزیز سے بیاہ کیا تو اس کو کنواری پایا، کیوں کہ اس کا پہلا شوہر عِنّین (نامرد) تھا۔[2] اس آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ سلطان جائر، بلکہ ظالم کی طرف سے کسی منصب کا لینا جائز ہے، بشرطیکہ اس کو جس کو اپنی جان پر پورا اعتماد ہو کہ وہ حق کو قائم کر سکے گا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام ہمیشہ نرمی سے بادشاہ کو اسلام کی دعوت دیتے رہتے، یہاں تک کہ وہ مسلمان ہو گیا اور بہت سے لوگ اسلام لے آئے۔[3] اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم اپنی رحمت کو پہنچاتے ہیں اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں۔ دنیا میں اس پر انعام و احسان کرتے ہیں اور آخرت میں آگ سے بچا کر جنت میں لے جاتے ہیں اور اچھے کام کرنے والوں کا اجر برباد نہیں کرتے۔ آخرت کا اجر اہلِ ایمان و تقویٰ کے لیے بہتر ہے۔ اس میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ بہت زیادہ احسان ایمان اور تقوے سے عبارت ہے۔[4]

وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ۝۵۸
وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُوْنِيْ بِاَخٍ لَّكُمْ مِّنْ اَبِيْكُمْ اَلَا
تَرَوْنَ اَنِّيْۤ اُوْفِي الْكَيْلَ وَاَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ۝۵۹ فَاِنْ
لَّمْ تَاْتُوْنِيْ بِهٖ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِيْ وَلَا تَقْرَبُوْنِ ۝۶۰ قَالُوْا

① تفسير الجلالين (۱/ ۳۱۱) ② الدر المنثور (٤/ ۵۵۳) ③ تفسير البغوي (٦/ ۲۵۲) ④ فتح البيان (٦/ ۳۵۷۔ ۳۵۸)

سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ وَاِنَّا لَفٰعِلُوْنَ ﴿۶۱﴾ وَقَالَ لِفِتْيٰنِهِ اجْعَلُوْا
بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَآ اِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمْ
لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۶۲﴾

اور یوسف کے بھائی (غلہ لینے) آئے اور اس کے پاس پہنچے، تو اس نے انھیں پہچان لیا اور وہ اسے نہیں پہچانتے تھے 58 اور جب اس نے ان کا سامان تیار کروایا تو کہا: میرے پاس اپنا پدری بھائی (بنیامین) لانا، کیا تم دیکھتے نہیں کہ میں پورا ماپ (غلہ) دیتا ہوں اور میں بہترین مہمان نواز ہوں 59 پھر اگر تم اسے میرے پاس نہ لائے تو تمھارے لیے میرے پاس کوئی ماپ (غلہ) نہیں، اور نہ تم میرے قریب آنا 60 انھوں نے کہا: ہم عن قریب اس کے باپ کو اس کے بارے میں آمادہ کریں گے اور یقیناً ہم (یہ) کرنے والے ہیں 61 اور یوسف نے اپنے خادموں سے کہا: ان کی پونجی (نقدی) ان کے سامان میں رکھ دو، تاکہ جب وہ اپنے اہل وعیال کی طرف پلٹیں تو اسے پہچان لیں، شاید وہ واپس آئیں 62

قحط سالی کا دور دورہ اور برادرانِ یوسف کا غلے کے حصول کے لیے مصر میں آنا:

جب یوسف علیہ السلام ملکِ مصر پر مختار ہوئے تو خواب کے مطابق سات برس خوب آبادی کی اور ملک کا اناج بھرتے گئے۔ پھر سات برس کے قحط میں ایک میانہ بھاؤ مقرر کر کے بکوایا، اپنے ملک والوں اور پردیسیوں کو برابر، مگر پردیسی کو ایک اونٹ سے زیادہ نہ دیتے۔ اس طریقے سے مخلوق قحط سے بچی اور بادشاہ کا خزانہ بھر گیا۔ ہر طرف خبر تھی کہ مصر میں اناج سستا ہے۔ ان کے بھائی اناج خریدنے کے لیے آئے، سب سے چھوٹا بھائی یوسف علیہ السلام کا بھائی تھا، اس کو بلایا۔ وہ جو قیمت لائے تھے، وہ احسان کر کے اناج کے بوجھوں میں چھپا کر ڈال دی۔

امام سدی اور محمد بن اسحاق رحمہ اللہ وغیرہ مفسرین نے کہا ہے کہ برادرانِ یوسف علیہ السلام کا مصر میں آنے کا سبب یہ تھا کہ جب یوسف علیہ السلام وزیرِ سلطنت ہوئے اور سات برس ارزانی کے گزر گئے اور سات برس کا قحط پڑا اور سارے بلادِ مصر میں خشک سالی ہوئی۔ یہ خبر بلادِ کنعان میں پہنچی۔ وہاں یعقوب علیہ السلام اور اُن کی اولاد تھی اور یوسف علیہ السلام نے یہاں لوگوں کے غلوں میں احتیاط کی اور اچھی طرح غلہ جمع کیا، یہاں تک کہ بہت زیادہ ذخیرہ ہوگیا اور بہت سے راستے ویران اور سخت دشوار گزار ہوگئے۔ لوگ تمام اطراف سے آنے لگے اور غلہ کے معاملات اور بھرتی شروع ہوئی۔ وہ غلہ خرید کر لے جانے لگے، لیکن یوسف علیہ السلام کسی شخص کو ایک سال میں ایک اونٹ کے بوجھ سے زیادہ غلہ لے جانے نہ دیتے، خود بادشاہ اور اہلِ لشکر کے ساتھ دن کے وسط میں ایک بار کھانا کھاتے، تاکہ قحط کے یہ سات برس لوگوں پر

آسانی سے گزر جائیں۔[1]

اللہ تعالیٰ کی اہلِ مصر پر رحمت تھی۔ بعض مفسرین نے یہ جو ذکر کیا ہے کہ پہلے سال غلہ قیمت لے کر دیا، پھر دوسرے سال متاع لے کر، پھر تیسرے سال اس طرح اور چوتھے سال اس طرح، یہاں تک کہ پھر ان کی جانیں اور اولاد خرید کر، جبکہ ان کے پاس کچھ باقی نہ رہا، پھر اُن سب کو اللہ کے لیے آزاد کر دیا اور ان کے مال واپس فرمائے۔ سو اللہ ہی جانے کہ یہ روایت صحیح ہے یا نہیں یہ ان اسرائیلیات میں سے ہے، جن کی تصدیق و تکذیب نہیں کی جاتی۔

یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو فوراً پہچان لیا:

غرض یہ کہ من جملہ ان لوگوں کے جو غلہ بھرتی کرنے آتے تھے، برادرانِ یوسف علیہ السلام بھی باپ کے حکم سے آئے، کیوں کہ ان کو یہ خبر لگی تھی کہ عزیزِ مصر لوگوں کو قیمت لے کر غلہ دیتا ہے، اس لیے کچھ پونجی لے کر چلے کہ اس کے عوض غلہ بھر کر لائیں اور یہ دس نفر تھے۔ یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹے بنیامین کو جو کہ یوسف علیہ السلام کا برادرِ حقیقی تھا، اپنے پاس روک رکھا، اس لیے کہ وہ یوسف علیہ السلام کے بعد سب سے زیادہ اسی کو چاہتے تھے۔ جب وہ یوسف علیہ السلام کے پاس آئے تو یوسف علیہ السلام اپنی ریاست و سیاست میں بیٹھے تھے۔ انھوں نے بھائیوں کو پہچان لیا، مگر انھوں نے نہیں پہچانا، اس لیے کہ جب ان کو جدا کیا تھا تو یہ بہت چھوٹے تھے اور ان کو مسافروں کے ہاتھ بیچ ڈالا تھا اور کچھ نہیں جانتے تھے کہ وہ کدھر لے گئے اور نہ ان کے جی میں یہ بات آسکتی تھی کہ وہ اس رُتبے کو پہنچیں گے، لہٰذا کچھ شناخت نہ کر سکے۔ یوسف علیہ السلام نے نظر کرتے ہی ان کو پہچان لیا۔

برادرانِ یوسف کی غلط بیانی:

امام سدی رحمہ اللہ وغیرہ نے ذکر کیا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے ان سے باتیں کرنا شروع کیا اور بطورِ انکار کے یہ بات کہی کہ تم کس طرح ہمارے شہر میں آگئے؟ کہا: اے عزیز! ہم غلہ بھرنے آئے ہیں۔ فرمایا: شاید تم جاسوس ہو؟ انھوں نے کہا: معاذ اللہ! پوچھا: تم کہاں کے لوگ ہو؟ کہا: بلادِ کنعان کے، ہمارے باپ یعقوب نبی اللہ ہیں۔ پوچھا: تمھارے سوا ان کی اور بھی اولاد ہے؟ کہا: ہم بارہ بھائی تھے، ہمارا چھوٹا بھائی جنگل میں ہلاک ہوگیا، وہ ہمارے باپ کو سب سے زیادہ پیارا تھا۔ اس کا ایک بھائی اور ہے، باپ نے اس کو روک رکھا ہے، ہمارے ساتھ آنے نہ دیا، تاکہ اس سے اپنے جی کو تسلی دے۔

یوسف علیہ السلام کی اپنے بھائی کو بلوانے کے لیے ایک حسنِ تدبیر:

یوسف علیہ السلام نے کہا: ان کو اُتارو اور اچھی طرح جگہ دو۔[2] پھر جب ان کو غلہ کی بھرتی کرا دی تو یہ فرمایا کہ اب

---

[1] تفسیر الطبري (١٦/ ١٥٣۔ ١٥٤) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٦٢٨) [2] تفسیر الطبري (١٦/ ١٥٣۔ ١٥٤) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٦٢٨)

کے بار جو تم آؤ تو جس بھائی کا تم نے ذکر کیا ہے، اس کو بھی اپنے ساتھ لیتے آؤ، تا کہ میں جانوں کہ تم اس ذکر میں سچے ہو۔ دیکھو! میں بھرپور ماپ دیتا ہوں اور اچھی طرح مہمانی کرتا ہوں۔ ان کو دوبارہ آنے کی رغبت دلائی، پھر یوں ڈرایا کہ اگر تم اس کو نہ لاؤ گے تو نہ بھرتی پاؤ گے نہ میرے پاس آسکو گے۔ انھوں نے کہا: البتہ ہم اپنے باپ کو پھسلائیں گے اور جہاں تک بن سکے گا اس کو لے کر آئیں گے اور حتی الامکان اپنی بات کو سچا کر دکھائیں گے اور اس بارے میں کوئی ممکن دقیقہ فروگذاشت نہ کریں گے۔

امام سدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام نے ان سے کچھ رہن رکھے، اس بارے میں کہ وہ بھائی کے ساتھ آئیں گے،[1] مگر اس میں نظر ہے۔ اس لیے کہ یوسف علیہ السلام نے ان کے ساتھ احسان کیا تھا اور خوب سی رغبت دی تھی اور اُن کے دوبارہ آنے پر حریص تھے۔ لہٰذا اپنے غلاموں سے کہہ دیا کہ تم ان کی قیمت بھی ان کے اوزان اور بوجھ میں پوشیدہ طور پر رکھ دو کہ یہ نہ جانیں، شاید پھر دوبارہ آئیں۔ یوسف علیہ السلام کو یہ خوف ہوا کہ کہیں ان کے پاس اور بضاعت (مال اسباب) نہ ہو یا اسی قدر ہو تو پھر یہ غلہ کی بھرتی کے لیے نہ آئیں۔ بعض نے کہا کہ یوسف علیہ السلام نے یہ امر مذموم سمجھا کہ باپ اور بھائی سے طعام کا عوض لیں۔ بعض نے کہا: یوسف علیہ السلام نے یہ ارادہ کیا کہ جب وہ اپنی پونجی کو اپنے سامان میں پائیں گے تو براہِ تحرج و تورع (مال اپنے پاس رکھنے میں حرج محسوس کرتے ہوئے اور پرہیز گاری کے طور پر) واپس آئیں گے۔ ان کو بھائیوں کی یہ بات معلوم تھی۔ واللہ أعلم۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کے بھائی کنعان کی سرزمین سے مصر میں قحط سالی کی وجہ سے غلہ لینے کے لیے آئے۔ یہ دس لوگ تھے، ان کا مسکن سرزمینِ فلسطین کے عربات میں تھا۔ عربات شام کی سرحدوں کو کہتے ہیں۔ یہ اہلِ بادیہ (بدو) و گوسفند تھے۔ جس وقت کہ یوسف علیہ السلام مجلسِ ولایت میں بیٹھے ہوئے تھے، یعنی حکمرانی حاصل کر چکے تھے، یہ ان پر داخل ہوئے۔ اس وقت یوسف علیہ السلام نے اپنی قوتِ فہم اور سابقہ احوال کے عدمِ مباینت (نہ بدلنے) کی وجہ سے ان کو پہچان لیا۔ اس لیے کہ جب ان سے جدا ہوئے تو وہ سب پورے مرد تھے۔ کہتے ہیں کہ پہلی نظر میں ہی ان کو شناخت کر لیا اور بعض نے کہا کہ نہیں پہچانا، یہاں تک کہ انھوں نے پہچنوایا۔[3] (قاله الحسن) لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے اور قرآنی ترتیب سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام مجاہد رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[4] بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کو نہیں پہچانا، اس لیے کہ جب ان کو جدا کیا تھا تو وہ بہت کم عمر صغیر السن تھے۔ ان کو چند درہموں کے عوض قافلے کے ہاتھ فروخت

---

[1] تفسير الطبري (١٦/ ١٥٣۔ ١٥٤)
[2] تفسير ابن كثير (٢/ ٦٢٨۔ ٦٢٩)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٦٣)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٦٢)

کر ڈالا تھا، جب وہ چاہِ گمنام سے باہر نکلے تھے۔ اب جو اُن پر داخل ہوئے تو ان کو ایک جوان مرد بادشاہی شان و شوکت اور ریاست کی رونق میں پایا۔ ان کے پاس خدام اور نوکر چاکر حاضر تھے۔ بعض نے کہا: اس لیے نہیں پہچانا کہ وہ بادشاہِ مصر کی ہیئت میں تھے، سر پر تاج تھا اور بادشاہ کا طوق گردن میں تھا یا زیادہ عرصہ گزر جانے کی وجہ سے شناخت نہ کر سکے۔ کہا ہے کہ جس دن کنوئیں میں ڈالا تھا، تب سے اب تک چالیس برس گزر چکے تھے۔ اس لیے پہچان نہ سکے۔ بالجملہ مانع معرفت ان سب اسباب کے ہوتے ہوئے ان کا یوسف علیہ السلام کو ان کی موجودگی اور غیر موجودگی میں تسلیم نہ کرنا برابر تھا، اس لیے یوسف علیہ السلام کو نہ پہچان سکنے کے بارے میں جملہ اسمیہ فرمایا: ﴿ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴾

''جھاز'' سے مراد اس جگہ غلہ کی بھرتی کرا دینا اور سفر کے ساز و سامان کی درستی ہے، جس کی طرف مسافر محتاج ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک شخص کو ایک اونٹ کا بوجھ دیا اور انھیں اچھی طرح اُتارا اور ضیافت اور مہمانی کی۔ یہ سب کام ان کے ساتھ یوسف علیہ السلام نے وحیِ الٰہی سے کیے۔ بعض مفسرین نے اسی طرح کہا ہے۔ پھر یہ فرمایا کہ آیندہ بار جو تم آؤ تو اپنے بھائی کو جو تمھارے باپ کی طرف کا ہے، لیتے آؤ، یعنی بنیامین کو۔ وہ ان کا سگا بھائی ایک ماں باپ سے تھا۔ ﴿ بِاَخٍ لَّكُمْ ﴾ کہا، نہ کہ ''بِأَخِیكُم'' تاکہ عدمِ شناخت میں مبالغہ ہو۔ لہٰذا علماء نے: ''مَرَرْتُ بِغُلَامِكَ وَبِغُلَامٍ لَّكَ'' میں فرق کیا ہے کہ ترکیبِ اول مقتضیِ معرفتِ غلام ہے درمیان تیرے اور مخاطب کے ایک طرح عہد ہے اور دوسری ترکیب اس کی مقتضی نہیں۔ (قاله الكرخي)

یا لام اس لیے لائے کہ وہ باپ کی طرف سے ان کا بھائی تھا نہ کہ ماں کی طرف سے۔ ان کی یہ توجیہ پہلے قول سے زیادہ احسن ہے اور شاید یوسف علیہ السلام نے یہ بات اس لیے کہی ہو کہ جب انھوں نے اپنی تعداد سے زیادہ بنیامین کے لیے غلہ لینے کا سوال کیا تو یوسف علیہ السلام نے دے دیا، مگر اس شرط پر کہ اس کو لیتے آنا۔

کہتے ہیں کہ انھوں نے کہا: ہم ایک قوم ہیں، اہلِ شام سے چرواہے ہیں، ہم کو قحط پہنچا ہے، ہم غلہ لینے آئے ہیں۔ فرمایا: شاید تم عیون، یعنی جاسوس ہو، خبر لگانے کو آئے ہو؟ تب انھوں نے کہا: معاذ اللہ! ہم ایک باپ کے سب بھائی ہیں اور باپ ایک بہت بوڑھے آدمی اور انبیا میں سے سچے نبی ہیں۔ ان کا نام یعقوب ہے۔ پوچھا: تم کتنے آدمی ہو؟ کہا: ہم بارہ بھائی تھے، ایک بھائی ہمارا جنگل کی طرف نکل گیا، وہ ہلاک ہوگیا اور وہ ہمارے باپ کو بہت پیارا تھا۔ کہا: اب تم یہاں کتنے آدمی آئے ہو؟ کہا: دس۔ فرمایا: گیارھواں کہاں ہے؟ کہا: اپنے باپ کے پاس ہے، وہ ہلاک ہو جانے والے کی جگہ اُس سے تسلی کرتا ہے۔ فرمایا: کوئی گواہ ہے کہ تم جاسوس نہیں ہو اور جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ سچ ہے؟ کہا: ہم ایسے شہر میں اس جگہ ہیں کہ کوئی شخص ہم کو پہچانتا نہیں ہے کہ ہمارے لیے گواہی دے۔ کہا: تم بعض کو ہمارے پاس گروی رکھ دو اور اپنے بھائی کو جو باپ کی طرف سے ہے لے آؤ اور وہ تمھارے باپ کی طرف سے قاصد ہو کر آئے، تب میں تم کو سچا جانوں۔ تب انھوں نے قرعہ ڈالا۔ قرعہ شمعون کے نام کا نکلا، اس کو یوسف علیہ السلام کے پاس چھوڑ

گئے، لیکن اس میں تأمل ہے، کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو یہ ایک ایسی مصیبت تھی کہ اس کے سامنے ہر قیل و قال بھول جاتا۔ پھر یوسف علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ تم نہیں دیکھتے کہ میں پورا ماپ دیتا ہوں اور اچھی مہمانی کرتا ہوں؟

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: یوسف علیہ السلام نے یہ بات ان کو اپنے ہاں اچھی طرح اتارنے اور اُن کی اچھی طرح مہمانی کرنے کے وقت فرمائی تھی۔[1] امام رازی رحمہ اللہ نے کہا: یہ کلام بعض مفسرین کے قول کو ضعیف کرتا ہے۔ وہ قول یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام نے ان پر تہمت لگائی اور جاسوس کہا، اس کے ساتھ ان سے اس حسنِ مہمانی کا ذکر بالمشافہ کس طرح ہوسکتا ہے۔ یوسف علیہ السلام سے باوجود صدیق ہونے کے کب یہ بات ممکن تھی کہ اس تہمت سے ان کی لاتعلقی معلوم ہو جانے کے باوجود ایسا بہتان لگاتے، جو صدیق کے شایانِ شان نہیں ہے۔[2]

بالجملہ اس کہنے کے بعد پھر ان کو یہ دھمکی بھی دی کہ اگر دوسری مرتبہ کے آنے میں تم اپنے بھائی کو نہ لاؤ گے تو نہ تمھیں کوئی ماپ غلہ کا ملے گا اور نہ ہمارے بلاد میں آسکو گے، یا میں تم کو پھر اپنا مہمان نہ بناؤں گا۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ ہم باپ سے کہہ سن کر جہاں تک ہو سکے گا اس کو لائیں گے۔ تب یوسف علیہ السلام نے اپنے اتباع اور خادموں سے کہہ دیا کہ ان کی پونجی ان کے کجاووں میں رکھ دیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ وہ چاندی کے روپے تھے۔[3] یہ بات یوسف علیہ السلام نے فضل و کرم کے طور پر کی۔ یا اس لیے کی کہ جلدی سے دوبارہ طعام لینے کے لیے آئیں، کیوں کہ ان کو معلوم تھا کہ وہ طعام بغیر قیمت کے نہیں لیں گے یا یہ خیال کیا کہ باپ کے پاس قحط سالی کی وجہ سے شاید اور مال نہ ہو کہ یہ دوبارہ خریداری کے لیے آئیں۔ یا واپس کر دینے سے ان کو اپنا کرم اور احسان دکھانا منظور تھا کہ وہ واپس آئیں۔ کچھ ہو یہ تدبیر ان کے دوبارہ آنے کے لیے نکالی، خصوصاً خشک سالی کی وجہ سے۔ اس جگہ یہی مطلب نکلتا ہے۔[4]

فَلَمَّا رَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝۶۳ قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ۭ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۠ وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝۶۴

پھر جب وہ اپنے باپ کے پاس لوٹے تو بولے: اے ہمارے ابا جان! (آیندہ) ہمارے لیے ماپ (غلہ) ممنوع ٹھہرا ہے، لہٰذا تو ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیج کہ ہم ماپ (غلہ) لائیں اور

[1] معاني القرآن (٣/ ١١٧) [2] تفسیر الرازي (١٨/ ١٣٣۔ ١٣٤)
[3] ان الفاظ کے ساتھ روایت سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے بجائے امام قتادہ رحمہ اللہ سے مروی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: تفسیر الطبري (١٦/ ١٥٧) تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٦٥) [4] فتح البیان (٦/ ٣٥٨۔ ٣٦٤)

بے شک ہم اس کے محافظ ہیں (63) اس (یعقوب) نے کہا: کیا میں تمھیں اس کی بابت امین سمجھ لوں جیسے پہلے اس کے بھائی کی بابت میں نے تمھیں امین سمجھا تھا؟ چناں چہ اللہ ہی بہتر محافظ ہے اور وہ سب مہربانوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے (64)

برادرانِ یوسف علیہ السلام کا والد سے بنیامین کو مصر لے جانے کا مطالبہ:

یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے پھر کر باپ سے کہا: اب دوبارہ ہم کو بھرتی نہ ملے گی، اگر اب ہمارے بھائی بنیامین کو ہمارے ہمراہ نہ بھیجو گے۔ یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ کیا تم اس کے ساتھ بھی وہی کام کرو گے جو اس کے بھائی کے ساتھ کیا تھا کہ اس کو میرے پاس سے غائب کر دیا اور میرے اور اس کے درمیان حائل ہوئے۔ خیر اللہ حافظ ہے۔ اس کا رحم سب سے بڑھ کر ہے۔ وہ میرے اس بڑھاپے اور ضعف اور وجد بالولد (بیٹے کو پالینے کی تمنا) پر رحم کرے گا۔ مجھے اُمید ہے کہ اس کو میرے پاس پھیر لائے گا اور یکجا کر دے گا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اپنا سامان کھولنے سے پہلے بھائیوں نے باپ سے یہ بات کہی کہ ہم ایک نیک مرد کے پاس گئے تھے، اس نے ہم کو اچھی طرح اُتارا اور مہمانی کی۔ یعقوب علیہ السلام نے کہا کہ اب اگر پھر تم اس کے پاس جاؤ تو میری طرف سے سلام کہو اور یہ بات کہو کہ ہمارے باپ تمھارے لیے اس احسان اور اکرام کے عوض تمھارے لیے دعا کرتے ہیں۔ تب انھوں نے کہا کہ ہمارا جانا تب ہوگا کہ آپ بنیامین کو ہمارے ساتھ بھیج دیں، ورنہ اب ہم کو غلہ نہیں ملے گا، ہم بھائی کی حفاظت کریں گے۔

یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کی طرح کی خیانت کے خوف کا اظہار فرما کر حفاظت کو اللہ پر چھوڑ دیا۔ بنیامین کو ان کے ساتھ کر دینے کی وجہ یہ ہوئی کہ جیسا کینہ اور حسد اُن کو یوسف علیہ السلام کے ساتھ تھا، ویسا کینہ اور حسد بنیامین کے ساتھ دیکھنے میں نہیں آیا تھا، یا زمانے کی شدت، تنگی اور قحط نے اس روانگی کا محتاج کیا، مگر اس کے ساتھ ہی اللہ کو ارحم الراحمین جانا کہ وہ مجھ پر انعام کرے گا، وہ مصیبتوں کو جمع نہ فرمائے گا۔ کہتے ہیں کہ یعقوب علیہ السلام نے بنیامین کو اللہ کی حفظ و امان میں اور رحم میں دیا، اس لیے وہ پھر کر ان کے پاس آ گئے اور یوسف علیہ السلام کے بارے میں بھیڑیے کے کھا جانے کا خوف کیا تھا، اس لیے امتحان واقع ہوا۔ کعب احبار رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب یعقوب علیہ السلام نے یہ کہا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مجھے اپنی عزت کی اور جلال کی قسم ہے! میں ان دونوں کو تیرے پاس پھیر دوں گا،[1] چناں چہ ایسا ہی ہوا۔

---

(1) تفسير البغوي (٤/ ٢٥٨) فتح البيان (٦/ ٣٦٤۔ ٣٦٥)

وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ۭ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا نَبْغِيْ ۭ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ۭ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ ۝65 قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّآ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰي مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ۝66

اور جب انھوں نے اپنا سامان کھولا تو اپنی پونجی پائی جو انھیں لوٹا دی گئی تھی۔ وہ بولے: اے ہمارے ابا جان! ہمیں (اور) کیا چاہیے؟ یہ ہماری پونجی ہمیں لوٹا دی گئی ہے، اور ہم اپنے اہل وعیال کے لیے غلہ لائیں گے اور اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے، اور ہم ایک اونٹ کا ماپ (غلہ) زیادہ لائیں گے، یہ ماپ (غلہ ملنا) تو بہت آسان ہے (65) اس (یعقوب) نے کہا: میں اسے تمھارے ساتھ ہرگز نہیں بھیجوں گا، حتی کہ تم مجھے اللہ کا پختہ عہد دو کہ تم اسے ضرور میرے پاس لاؤ گے، سوائے اس کے کہ تم گھیر لیے جاؤ۔ پھر جب انھوں نے اسے اپنا پختہ عہد دیا تو وہ بولا: جو کچھ ہم کہتے ہیں اللہ اس پر ضامن ہے (66)

بھائی کو مصر لے جانے پر اصرار اور والد کی آمادگی:

ظاہر کا اسباب بھی پختہ کر لیا اور بھروسا اللہ پر رکھا۔ یہی ہر کسی کو حکم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ برادرانِ یوسف نے جب اپنا سامان کھولا تو دیکھا کہ ان کا سرمایہ واپس آ گیا ہے۔ یہ وہی سرمایہ تھا جو یوسف علیہ السلام کے حکم سے ان کے غلاموں نے ان کے سامان میں رکھ دیا تھا، تب انھوں نے یہ ذکر اپنے باپ سے کیا اور کہا کہ اگر ہمارے بھائی کو اس بار ہمارے ساتھ بھیج دو گے تو ہم پھر غلہ کی بھرتی اپنے گھر لائیں گے اور بھائی کی حفاظت رکھیں گے اور ایک اونٹ کا بوجھ غلے کا اور زیادہ لائیں گے، کیوں کہ یوسف علیہ السلام نے فی کس ایک اونٹ کا بوجھ مقرر کر رکھا تھا۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ بَعِيْرٍ ﴾ سے مراد "حِمَار" (گدھا) ہے۔ بعض لغات میں حمار کو "بعیر" بولتے ہیں،[1] لہٰذا اس کو ﴿ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ ﴾ کہا۔ تب یعقوب علیہ السلام نے اللہ کا عہد و پیمان مانگا اور کہا یہ اور بات ہے کہ تم سب کے سب خدانخواستہ مغلوب ہو جاؤ اور تم کو اس کے چھڑانے پر قدرت نہ ہو۔ جب انھوں نے عہد کیا تو فرمایا کہ اللہ اس بات پر وکیل ہے۔ محمد بن اسحاق رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ اس لیے کہا کہ ان کو غلہ کی دوبارہ بھرتی کے بغیر چارہ نہ تھا۔ ناچار بنیامین کو ان کے ساتھ کر دیا۔[2]

[1] تفسير الطبري (١٦/ ١٦٢)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٦٧)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ باپ کے سامنے اوعیۂ طعام (باردانے) کو کھولا، یا سب سامان کو کھولا، وہ طعام تھا یا غیر طعام اور غلے کی جو قیمت مصر کو لے گئے تھے، وہ واپس موجود پائی اور باپ سے کہا: اب ہم کیا چاہتے ہیں اس احسان کے بعد کہ جو بادشاہ نے ہمارے ساتھ کیا ہے کہ ہمارا سرمایہ ہم کو واپس کر دیا۔ اس بات سے باپ کا دل خوش کرنا چاہا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: یعنی ہم اس کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے، دیکھو ہماری پونجی ہم کو پھر کر ملی، اب ہم اپنے گھر والوں کے لیے غلے کی بھرتی لائیں گے اور بنیامین کی نگہبانی کریں گے اور اس کے سبب ایک اونٹ یا گدھے کا بوجھ اور زیادہ لائیں گے۔ ہمارے بھائی کے سبب یہ ایک بعیر کا بوجھ زیادہ ملنا بادشاہ کے لیے آسان بات ہے، وہ اس زیادتی سے ہم کو منع نہ کرے گا۔[1]

یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اس کو تمھارے ساتھ نہیں بھیجوں گا، جب تک کہ تم اللہ کی طرف کا اقرار نہ کرو، یعنی یہ حلف دو کہ تم اس کو میرے پاس لے آؤ گے، مگر یہ کہ تم سب گھر جاؤ اور مغلوب ہو جاؤ کہ اس صورت میں مجبوری ہے۔ انھوں نے عہد و میثاق دیا اور قسم اٹھائی۔ فرمایا: اس عہد کے طلب کرنے پر اللہ وکیل ہے، اس پر کوئی بات مخفی نہیں ہے، وہ عہد شکن کو سزا دے گا۔[2]

وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ۭ وَمَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿٦٧﴾ وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَيْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ۭ مَا كَانَ يُغْنِيْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِيْ نَفْسِ يَعْقُوْبَ قَضٰىهَا ۭ وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٦٨﴾

اور اس نے کہا: اے میرے بیٹو! تم ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا، بلکہ متفرق دروازوں سے داخل ہونا، اور میں تمھیں اللہ (کے حکم) سے ذرا بھی کفایت نہیں کر سکتا۔ حکم تو اللہ ہی کا ہے، اسی پر میں نے توکل کیا ہے اور توکل کرنے والوں کو اس پر توکل کرنا چاہیے (67) اور جب وہ داخل ہوئے جہاں سے ان کے باپ نے انھیں حکم دیا تھا، وہ انھیں اللہ (کے حکم) سے ذرا بھی نہیں بچا سکتا تھا،

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٦٦)
[2] فتح البيان (٦/ ٣٦٦۔ ٣٦٧)

مگر یعقوب کے دل میں ایک حاجت (خواہش) تھی، سو وہ پوری کر چکا، اور بلاشبہ ہمارے تعلیم دینے کی وجہ سے وہ صاحبِ علم تھا، لیکن اکثر لوگ علم نہیں رکھتے (68)

بیٹوں کو نظرِ بد سے بچانے کی ایک تدبیر:

یہ ٹوک (نظر گزر) کا بچاؤ بتایا۔ پھر بھروسا اللہ پر کیا۔ ٹوک (نظر) لگنی غلط نہیں اور اس کا بچاؤ کرنا جائز ہے۔ پھر جس طرح کہا تھا، داخل ہوئے تو اگرچہ ٹوک نہ لگی، لیکن تقدیر اور طرف سے آئی۔ تقدیر ٹل نہیں سکتی، سو جن کو علم ہے ان کو تقدیر کا یقین اور اسباب کا بچاؤ دونوں ہو سکتے ہیں اور بے علم سے ایک ہو تو دوسرا نہ ہو۔ اللہ نے خبر دی کہ جب برادرانِ یوسف نے سفر کی تیاری کی اور بنیامین کو لے کر مصر کی طرف چلے تو باپ نے یہ نصیحت کی کہ تم شہر کے ایک دروازے سے داخل نہ ہونا، بلکہ الگ الگ دروازوں سے شہر کے اندر جانا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، محمد بن کعب، ضحاک، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ اور کئی ایک نے کہا ہے کہ یعقوب علیہ السلام کو یہ خوف ہوا کہ کہیں ان کو نظر نہ لگ جائے،[1] اس لیے کہ وہ صاحبِ جمال و ہیئتِ حسنہ و منظر و بہار تھے، لوگ ان کو نظر نہ لگائیں، کیوں کہ نظر کا زخم حق ہے، سوار کو گھوڑے سے نیچے گرا دیتی ہے۔ پھر کہا کہ میں اللہ سے کچھ کام تمھارے نہیں آ سکتا ہوں۔ یہ اعتراض اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر کو رد نہیں کر سکتا، کیوں کہ جب اللہ کسی شے کا ارادہ کرتا ہے تو کوئی اس کی مخالفت نہیں کر سکتا اور نہ اس کو روک سکتا ہے۔ حکم اللہ ہی کا ہے، اسی پر میرا توکل ہے اور سب توکل کرنے والوں کو اسی پر توکل کرنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یعقوب علیہ السلام کا یہ کہنا کچھ کار آمد نہ تھا، جی میں ایک حاجت تھی، سو ہو چکی، یعنی نظرِ بد کا ان سے دور کرنا اور یعقوب ہمارے سکھانے کی وجہ سے جانتا تھا، لیکن اکثر لوگ یہ بات نہیں جانتے۔ یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ پیغمبر کسی کے مقدر کو نہیں پھیر سکتا اور اس کو علمِ غیب نہیں ہوتا۔ حکم کی یہ شان خاص اللہ کے لیے ہے۔ جاہل بد دین یہ اعتقاد کرتے ہیں کہ فلاں پیر فقیر کا مرید دوزخ میں نہ جائے گا، حالاں کہ یہاں پیغمبر اپنی اولاد کو اللہ کے کسی حکم سے نہیں بچا سکتے۔ فَأَيْنَ هٰذَا مِنْ ذٰلِكَ.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے کہا: اے بیٹو! تم ایک در سے داخل نہ ہونا، کیوں کہ وہ سب بہت خوبصورت، جوان اور ایک شخص کی اولاد تھے، مبادا کہیں ان کو کسی شخص کی نظرِ بد لگ جائے۔ اس لیے الگ الگ دروازوں سے داخل ہونے کو فرمایا، کیوں کہ نظر لگنا حق ہے۔ اس زمانے میں مصر کے چار دروازے تھے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: مراد

۱۔ تفسیر الطبري (۱٦/ ۱٦٥۔ ۱٦٧)

چار راہیں ہیں نہ چار دروازے۔[1] اور پہلی بار اُن کو اس طرح علاحدہ علاحدہ ہونے کا حکم نہیں دیا تھا، اس لیے کہ پہلی مرتبہ وہ سب مجہولین تھے اور اب کی مرتبہ لوگ ان کو پہچان گئے تھے۔ اس کہنے پر کہ ایک دروازے سے نہ جانا اکتفا نہ کیا، بلکہ یہ فرمایا کہ جدا جدا دروازوں سے جانا، یہ اس لیے کہ اگر مثلاً دو دروازوں سے داخل ہوں گے، تب بھی حکم کی بجا آوری ہو جائے گی، لیکن چوں کہ دو دروازوں سے داخل ہونے میں ایک طرح کا اجتماع تھا، نظر لگنے کا ڈر ہوا، اس لیے فرمایا کہ الگ الگ دروازوں سے شہر میں داخل ہونا۔

امام نخعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یعقوب علیہ السلام نے یہ چاہا کہ یوسف علیہ السلام اپنے بھائی بنیامین سے تنہا ملیں۔[2] بعض نے کہا: ان کو معلوم ہوگیا تھا کہ مصر کا بادشاہ ان کا فرزندِ ارجمند یوسف علیہ السلام ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ظاہر کرنے کی اجازت نہ دی۔ جب اپنے بیٹوں کو روانہ کرنے لگے، تب یہ بات کہہ دی، لیکن پہلی بات زیادہ بہتر ہے، یعنی نظر لگنے کے خوف سے یہ بات کہی تھی، نہ اس لیے کہ بھائی سے تنہا ملاقات ہو۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، قتادہ اور جمہور مفسرین کا ہے۔[3] جبائی معتزلی اور اس کے اتباع نظرِ بد کی تاثیر کے منکر ہیں اور اپنے انکار کے لیے کوئی شبہہ بھی بیان نہیں کیا، چہ جائیکہ کوئی حجت پیش کرتے۔ سو یہ حرکت بے برکت ان لوگوں سے کچھ دور نہیں ہے، اس لیے کہ ان کی عادت اور خصلت یہی ہے کہ کتاب و سنت کے دلائل کو صرف عقلی استبعادات سے رَد کرتے ہیں۔ اللہ کی تقدیر سے کون مانع ہے کہ کسی کو نظرِ بد لگ جائے۔ احادیثِ صحیحہ میں مروی ہے: «اَلْعَيْنُ حَقٌّ»[4] [نظر (کا لگ جانا) برحق ہے] اور عہدِ نبوت میں ایک جماعت کو نظرِ بد لگ چکی ہے، بلکہ خود نبی مکرم ﷺ کو بھی۔

بالجملہ ان معتزلہ کا قول، جن میں سے ایک صاحبِ کشاف زمخشری بھی ہے، بہت سے دلائل سے اور اس اُمت کے سلف اور خلف کے اجماع سے، جن کا اعتبار ہے، رد کیا گیا ہے۔ بہت سے انسان اور حیوان اس نظر سے مر گئے۔ پھر جو شخص نظرِ بد کے ساتھ مشہور ہو، علما نے کہا ہے کہ اس کو اس نقصان کی وجہ سے قید میں رکھیں، یعنی وہ اپنے گھر سے باہر نہ نکلا کرے۔ رہا اس کا قتل کرنا، سو بعید ہے، مگر یہ کہ وہ عملاً یہ کام کیا کرتا ہو اور نظر کا لگنا، اس کے ارادے اور اختیار سے ہو اور وہ اس کام سے باز نہ آئے تو اس صورت میں جب وہ کسی کو (نظر کے ذریعے سے) قتل کرے تو وہ قاتل کے حکم میں ہوگا۔

پھر یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد سے یہ کہا کہ میں نہ تم سے کوئی ضرر دور کر سکتا ہوں اور نہ تم کو کوئی نفع پہنچا سکتا ہوں۔ میری تدبیر کچھ کار آمد نہیں ہو سکتی۔ اللہ کی قضا و قدر لامحالہ واقع ہوتی ہے۔ امام زجاج اور ابن الانباری رحمہما اللہ نے کہا کہ اللہ کے علم میں یہ بات سابق ہوتی کہ ان کو نظر باوجود اجتماع کے ہلاک کرے گی تو ان کا علاحدہ علاحدہ ہونا بھی اجتماع

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٦٨)
[2] الدر المنثور (٤/ ٥٥٧)
[3] تفسير الطبري (١٦/ ١٦٥۔ ١٦٧)
[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٤٠٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٨٧)

کی طرح ہوتا،[1] کیوں کہ حکم صرف اللہ کا ہے۔ کوئی اس کے حکم میں شریک نہیں ہے۔ سب کو اسی پر بھروسا رکھنا چاہیے۔
بالجملہ جب وہ جدا جدا دروازوں سے داخل ہوئے اور ایک ساتھ ایک دروازے سے نہ آئے تو یعقوب علیہ السلام کی تدبیر کچھ کار آمد نہ ہوئی، بلکہ چوری کی بات ان کے ذمے لگائی گئی اور بنیامین چھین لیے گئے اور یعقوب علیہ السلام پر دوہری مصیبت آئی، کیوں کہ ڈر اور خوف تقدیر کو ٹال نہیں سکتا۔ لیکن یعقوب علیہ السلام کے دل میں ان کی شفقت اور سلامتی کی محبت تھی، اس لیے یہ بات ظاہر کر دی۔ کچھ وہ اس بات کا عقیدہ نہیں رکھتے تھے کہ اس تدبیر میں تقدیر کو دور کرنے کا کوئی اثر ہے۔ بعض نے کہا کہ یعقوب علیہ السلام کو دل میں یہ خطرہ ہوا کہ اگر بادشاہ ان کو اکٹھے دیکھے گا اور یہ ہر لحاظ سے مکمل اور مکمل شجاعت والے خوبصورت جوان ہیں تو کہیں اس کو حسد یا کینہ نہ ہو جائے، اس وجہ سے ان کو علاحدہ علاحدہ ہونے کا حکم دیا۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے اسی بات کو اختیار کیا ہے اور کہا ہے کہ اس جگہ نظر لگنے کے کچھ معنی نہیں ہیں۔ لیکن اس میں اتنی بات ہے کہ اگر الگ الگ ہونے کا حکم دینے کا سبب یہی ہوتا تو پھر اس حکم کو داخلے کے وقت اکٹھے ہونے سے خاص نہ کرتے۔ اس لیے کہ شہر کے اندر بھی ان کے اکٹھے ہونے پر حسد یا خوف حاصل ہو سکتا ہے، جس طرح کہ ایک دروازے سے اکٹھے داخل ہونے سے ہو سکتا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یعقوب علیہ السلام صاحبِ علم جلیل ہیں، یہ علم یعنی وحی ہم نے ان کو دیا ہے، لیکن بہت لوگ جو کہ مشرک ہیں، وہ اس بات کو جیسے جاننا چاہیے نہیں جانتے۔[2]

وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّيْٓ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۹﴾

اور جب وہ یوسف کے پاس پہنچے تو اس نے اپنے (سگے) بھائی (بنیامین) کو اپنے پاس جگہ دی (اور) کہا: بے شک میں تیرا بھائی ہوں، لہٰذا تو اس کا غم نہ کر جو کچھ وہ کرتے رہے (69)

یوسف علیہ السلام کی بنیامین سے ملاقات اور تسلی دینا:

اُس بھائی کو جو یوسف علیہ السلام نے آرزو سے بلایا اَوروں کو حسد لگا۔ اس سفر میں اس کو ہر بات پر جھڑکتے اور طعنے دیتے۔ اب یوسف علیہ السلام نے تسلی دے دی۔ یہ بھائی جب یوسف علیہ السلام کے پاس آئے تو ان کو یوسف علیہ السلام نے اچھی طرح اُتارا، عزت کی اور ضیافت کی اور صلہ رحمی و الطاف و احسان فرمایا اور اپنے بھائی سے تخلیہ کی ملاقات کی اور اس کو اپنے حال اور جو کچھ بیتی تھی، اس سے مطلع کر دیا اور کہہ دیا کہ میں تیرا بھائی ہوں، اب تو اس حال پر کچھ افسوس نہ کر، جو انھوں نے میرے اور تیرے ساتھ کیا ہے اور فرمایا کہ اس حال کو ان سے پوشیدہ رکھ اور ہرگز ان کو اس معاملے پر آگاہ

[1] معاني القرآن (۳/ ۱۱۹)
[2] فتح البیان (٦/ ۳٦٨۔ ۳۷۱)

نہ کر کہ میں تیرا بھائی ہوں اور باہم اس بات پر اتفاق کیا کہ بنیامین کے ٹھہر جانے کے لیے کوئی حیلہ کرنا چاہیے، تاکہ وہ عزت وتکریم وعظمت سے ان کے پاس رہ جائے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جب برادرانِ یوسف علیہ السلام ان کی حکومت کے محل میں یوسف علیہ السلام پر داخل ہوئے تو یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی بنیامین کو اپنے پاس جگہ دی۔ کہتے ہیں: دو دو شخصوں کو ایک ایک گھر میں اُتارا اور بنیامین تنہا رہ گئے، ان کو اپنی طرف لے لیا اور چپکے سے کہہ دیا کہ میں تیرا بھائی ہوں، اب تو کچھ ان بھائیوں کے اعمال پر جو انھوں نے کیے ہیں، رنج وغم نہ کر۔ بعض نے کہا کہ یوسف علیہ السلام نے یہ نہیں کہا کہ میں یوسف ہوں، بلکہ یہ کہا کہ میں بجائے تیرے بھائی کے ایک بھائی ہوں تو ان کے ظلم وحسد وبغی پر کچھ غم نہ کر۔ بعض نے کہا کہ یوسف علیہ السلام نے بنیامین کو خبر کر دی کہ میں یہ تدبیر کرتا ہوں کہ سقایہ (پانی پینے کا پیالہ) تیرے رحل میں رکھ دوں گا، انھوں نے کہا کہ کچھ پروا نہیں ہے۔ پھر صاع ان کے رحل (پالان) میں رکھوا دیا۔ آیندہ آیت میں سقایہ سے یہی مراد ہے۔[1]

فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ ثُمَّ
أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ أَيَّتُهَا الْعِيرُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ ﴿٧٠﴾ قَالُوا وَأَقْبَلُوا
عَلَيْهِمْ مَاذَا تَفْقِدُونَ ﴿٧١﴾ قَالُوا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ
جَاءَ بِهِ حِمْلُ بَعِيرٍ وَأَنَا بِهِ زَعِيمٌ ﴿٧٢﴾

پھر جب یوسف نے ان کا سامان تیار کر دیا تو اپنے بھائی کے سامان میں ایک پیالہ رکھ دیا، پھر ایک پکارنے والے نے پکارا: اے قافلے والو! یقیناً تم چور ہو (70) وہ ان کی طرف متوجہ ہو کر بولے: تم کیا چیز گم پاتے ہو؟ (71) انھوں نے کہا: ہم بادشاہ کا پیالہ گم پاتے ہیں اور جو شخص اسے لائے اس کے لیے اونٹ بھر (غلہ) ہے اور میں اس کا ضامن ہوں (72)

یوسف علیہ السلام نے بھائی بنیامین کو اپنے پاس کیسے رکھا؟

بادشاہ کے پینے کا چاندی کا کٹورا اس کی پیاس کے مطابق تھا۔ یا اناج ماپنے کا برتن اور گھوڑے اس میں پانی پیتے تھے۔ یوسف علیہ السلام نے ان کو چور کہلوایا یہ جھوٹ نہیں۔ یوسف علیہ السلام کو باپ سے چوری چوری بیچ ڈالا تھا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سقایہ چاندی کا ایک برتن تھا۔ اکثر کے قول کے مطابق چاندی کا تھا۔ بعض نے کہا: سونے کا تھا۔ ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: اس میں پانی پیا جاتا تھا اور لوگوں کو طعام کی عزت کے سبب سے اُس زمانے

[1] فتح البیان (٦/ ٣٧١۔ ٣٧٢)

میں اس پیمانے سے غلہ ماپ کر دیتے۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، قتادہ اور ضحاک رحمہم اللہ کا ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ﴿ صُوَاعَ الْمَلِكِ ﴾ ایک چاندی کا ساغر تھا، جس میں وہ پانی پیتا تھا اور تھال کی طرح تھا اور سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کے پاس جاہلیت میں اس کی مثل ایک برتن تھا۔[2]

بالجملہ اس صواع کو بنیامین کے سامان میں اس طرح رکھ دیا کہ کسی ایک نے نہ جانا۔ پھر ایک پکارنے والے نے پکارا کہ اے کارواں والو! تم چور ہو۔ انھوں نے منادی کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ تو کیا چیز تلاش کرتا ہے؟ اس نے کہا کہ شاہی پیمانہ، جس سے غلّہ ماپا جاتا ہے، جو کوئی اس کو لے کر آئے گا اس کو ایک اونٹ کا بوجھ دیا جائے گا، یہ بات ضمانت اور کفالت کے بارے میں تھی۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ سقایہ کی اصل وہ برتن ہے، جس میں بادشاہ پانی پیتا تھا، اس کو غلہ تولنے کے لیے ایک پیمانہ بنایا تھا اور بعض نے کہا کہ اس میں چوپایوں کو پانی پلاتے تھے۔ کسی نے کہا: سونے کا تھا۔ کسی نے کہا: چاندی کا تھا۔ کسی نے کہا: زبرجد کا تھا۔ کسی نے کہا: جواہر کا مرصع تھا اور کسی نے کچھ اور کہا۔ ﴿ رَحْلِ ﴾ ظرفِ طعام کو کہتے ہیں، جیسے خرجی اور اس طرح کی چیز۔ پھر ایک منادی نے بہ آواز بلند دوبارہ سہ بار پکارا، جبکہ وہ یوسف علیہ السلام کی مجلس سے جدا ہوئے اور آبادی سے باہر نکل گئے۔ ایک آدمی نے پیچھے سے جا کر اُن کو ٹھہرایا اور روکا۔ کہتے ہیں: وہ مقامِ بلبیس تک پہنچ گئے تھے۔ وہاں سے پھیر لائے گئے۔ ﴿ اَلْعِيْرُ ﴾ سے مراد اونٹوں والے ہیں۔ یہ مجاز مرسل ہے، علاقہ اس جگہ یہی مجاورت ہے۔ (قَالَهُ السَّمِيْنُ)

مصباح میں کہا ہے کہ عِیر ان اونٹوں کو کہتے ہیں جو غلہ لاد کر لاتے ہیں۔ پھر اس لفظ کا اطلاق ہر قافلے پر ہونے لگا،[3] خواہ غلہ اٹھانے والا اونٹ ہو یا گدھا یا خچر۔ بعض نے کہا: "عِیر" قافلۂ حمیر (گدھے) کو کہتے ہیں۔ ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا: "عِیر" وہ اونٹ ہیں جن پر کجاوہ ہو اور سواری کی جائے۔[4] پھر کثرتِ استعمال سے ہر کارواں کو عیر کہنے لگے۔ ان کی طرف چوری کی نسبت سچ تھی، اس لیے کہ منادی کو یوسف علیہ السلام کی تدبیر کا کچھ علم نہیں تھا۔ بعض نے کہا: اس کے معنے یہ ہیں کہ تمھارا حال چوروں کا سا حال ہے کہ بادشاہ کا صواع بغیر بادشاہ کی مرضی کے تمھارے پاس آ گیا۔ قرآن شریف میں اس پر دلالت نہیں ہے کہ انھوں نے یہ بات یوسف علیہ السلام کے حکم سے کہی ہو، یہی معنی صورتِ حال کے بہت قریب ہیں، اس لیے کہ انھوں نے صواعِ ملک کو تلاش کیا تو نہ پایا اور وہاں ان کے سوا اور کوئی نہ تھا، اس لیے غلبۂ ظن انھی پر ہوا کہ انھوں نے لیا ہے۔ اس کے سوا اور اقوال بھی ہیں، لیکن یہ زیادہ صحیح ہے۔

بالجملہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ندا سن کر پوچھا کہ کیا چیز گم ہوگئی ہے؟ کہا: بادشاہ کا صواع، یہی لفظ سقایہ

---

[1] تفسير الطبري (١٦/ ١٧٢۔ ١٧٣)
[2] تفسير ابن كثير (٢/ ٦٣٠)
[3] المصباح المنير (١/ ٢٢٧)
[4] تفسير القرطبي (٩/ ٢٣٠)

سے مراد ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جس چیز میں تو پانی پیے وہی صواع ہے۔[1] یا وہ چیز جس سے ماپ کریں، یعنی آلۂ کیل۔ پھر ندا دینے والے نے کہا کہ جو شخص اس کو لے آئے، اس کے لیے ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر طعام ہے اور میں اس کا ذمے دار ہوں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: زعیم اہلِ یمن کی لغت میں کفیل کے معنے میں ہے۔ امام سعید بن جبیر، مجاہد، قتادہ اور ضحاک رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں۔[2] قائل منادی تھا، لیکن نسبت جماعت کی طرف کی ہے۔ اس لیے کہ وہ ایک من جملہ اس جماعت کے تھا۔ یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ اس زمانے میں ان کی شریعت میں کفالت صحیح تھی۔[3]

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ ۝۷۳ قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ ۝۷۴ قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ۝۷۵ فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ ؕ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ۝۷۶

وہ بولے: اللہ کی قسم! یقیناً تمھیں علم ہے کہ ہم اس ملک میں فساد کرنے نہیں آئے اور نہ ہم چور ہیں (73) انھوں نے کہا: پھر اس (چور) کی کیا سزا ہے، اگر تم جھوٹے ہوئے؟ (74) وہ بولے: اس کی سزا یہ ہے (کہ) جس کے سامان میں وہ (پیالہ) پایا جائے، وہی شخص اس کا بدلہ ہے۔ ہم ظالموں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں (75) چناں چہ یوسف اپنے بھائی کے بورے سے پہلے ان کے بوروں کی تلاشی لینے لگا، پھر اس نے اپنے بھائی کے بورے سے وہ (پیالہ) نکال لیا، اسی طرح ہم نے یوسف کے لیے تدبیر کی، وہ اس بادشاہ کے قانون کی رو سے تو اپنے بھائی کو نہیں رکھ سکتا تھا، مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ ہم جس کے چاہیں درجے بلند کرتے ہیں۔ اور ہر صاحبِ علم کے اوپر ایک زیادہ علم والا ہے (76)

شریعتِ ابراہیم علیہ السلام میں چور کی سزا:

یعنی بھائیوں کی زبان سے خود ہی نکلا کہ چور کو غلام کرلو، اسی پر پکڑے گئے، ورنہ تو اس بادشاہ کا یہ حکم نہیں تھا۔

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۷/ ۲۱۷۱) اس کی سند میں ''بشر بن عمارۃ'' ضعیف راوی ہے۔

[2] تفسیر الطبري (۱٦/ ۱۷۸۔ ۱۷۹) [3] فتح البیان (٦/ ۳۷۲۔ ۳۷٤)

جب برادرانِ یوسف علیہ السلام کو چوری کی تہمت لگائی تو انھوں نے کہا کہ تم جانتے ہو کہ ہم زمین میں فساد کرنے کے لیے نہیں آئے اور نہ ہم چور ہیں۔ یہ اس لیے کہا کہ یوسف علیہ السلام کے خدام نے ان کی سیرتِ حسنہ کا مشاہدہ کیا تھا۔ اس پر خدام نے کہا کہ اگر تم جھوٹے ہو تو کیا سزا ہے؟ کہا: یہی سزا ہے کہ جس کے پاس چوری کی چیز نکلے، وہ گرفتار کیا جائے، ظالموں کی یہی سزا ہے۔ شریعتِ ابراہیم علیہ السلام میں یہ حکم تھا کہ چور کو اس کے حوالے کر دیتے تھے، جس کا سامان چوری کیا تھا۔ سو یوسف علیہ السلام کا مطلب بھی یہی تھا۔ اس لیے پہلے بھائیوں کے سامان میں بطورِ توریہ کے تلاش کیا، پھر اس کو اپنے بھائی کے سامان میں سے نکالا اور اُن کے اعتراف و التزام و الزام کے سبب، جس کے وہ معتقد تھے، بھائی کو اُن کے پاس سے لے لیا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے یوسف علیہ السلام کو اس طرح داؤ بتایا۔ یہ داؤ محبوب و مراد تھا، اس کو حکمت اور مصلحت کے سبب سے پسند فرمایا، ورنہ بادشاہِ مصر کے قانون میں یہ بات نہ تھی۔ امام ضحاک رحمہ اللہ وغیرہ نے اسی طرح کہا ہے۔[1]

اللہ تعالیٰ نے یہ امر مقرر کیا تھا کہ برادرانِ یوسف علیہ السلام نے اس بات کا التزام کیا اور یوسف علیہ السلام کو معلوم تھا کہ ان کی شریعت یہی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے مدح کی اور فرمایا کہ ہم جس کے درجے چاہتے ہیں بلند کرتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴾ [المجادلة: ١١] ”تم میں سے جو ایمان لائے ہیں اور جنھیں علم دیا گیا ہے، اللہ ان کے درجات بلند کرے گا، اور اللہ (اس سے) باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔“

امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ”لَيْسَ عَالِمٌ اِلَّا فَوْقَهُ عَالِمٌ حَتّٰى يُنْتَهٰى إِلَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ“ [ہر علم والے کے اوپر ایک علم والا ہے حتی کہ اس علم کی انتہا اللہ عزوجل پر ہوتی ہے] امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس تھے، انھوں نے ایک عجیب حدیث بیان کی۔ ایک شخص نے تعجب کیا، سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ”اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ“ [سب تعریف اللہ کے لیے ہے، ہر صاحبِ علم کے اوپر بھی صاحبِ علم ہے] پھر کہا: ”هٰذَا أَعْلَمُ مِنْ هٰذَا وَ هٰذَا أَعْلَمُ مِنْ هٰذَا“ [یہ اس سے زیادہ علم والا ہے اور یہ اس سے زیادہ علم رکھتا ہے]

اسی طرح امام عکرمہ رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کے لفظ یہ ہیں: ”وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ، حَتّٰى يَنْتَهِيَ الْعِلْمُ إِلَى اللّٰهِ، مِنْهُ بُدِئَ وَتَعَلَّمَتِ الْعُلَمَآءُ، وَإِلَيْهِ يَعُوْدُ“ [ہر علم والے کے اوپر ایک علم والا ہے، یہاں تک کہ اس علم کی انتہا اللہ تعالیٰ پر ہوتی ہے۔ اس سے اس علم کی ابتدا ہوتی اور علما نے سیکھا اور اس کی طرف یہ لوٹ جائے گا] عبداللہ رضی اللہ عنہ کی قراءت یوں ہے: ”وَفَوْقَ كُلِّ عَالِمٍ عَلِيْمٌ“[2] [ہر عالم کے اوپر ایک علم رکھنے والا ہے]

---

[1] تفسیر الطبري (١٦/ ١٨٨) [2] تفسیر الطبري (١٦/ ١٩٢۔ ١٩٣)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے: ﴿ تَاللّٰهِ ﴾ میں تاءِ قسم کے لیے ہے، اس میں تعجب کے معنے ہیں، یہ حرف سوا اللہ کے اسمِ شریف کے اور کسی اسم پر داخل نہیں ہوتا اور بطورِ ندرت کے رب اور رحمٰن پر آیا ہے۔ انھوں نے اس بات پر قسم کھائی کہ یوسف علیہ السلام اور اُن کے اصحاب کو اس بات کا علم ہے کہ ہم فساد فی الارض، جس میں چوری ایک بہت بڑی قسم ہے فساد کی، میں کسی طرح بھی ملوث نہیں ہیں اور اس تہمت سے بالکل پاک اور صاف ہیں۔ اس لیے کہ وہ اُن کے پہلی بار آنے اور دوسری بار آنے کے دوران ان کی پارسائی اور زہد کا مشاہدہ کر چکے تھے اور جان چکے تھے کہ یہ لوگ اس طرح کا فساد نہیں کرتے اور جو بضاعت (پونجی) ان کے سامان میں چلی گئی تھی، وہ انھوں نے لوٹا دی تھی۔ اسی قدر ان کی صفائی کے لیے بہت تھا۔ اس جگہ زمین سے مراد زمینِ مصر ہے۔ پھر اپنی زیادہ بریت اور صفائی کے لیے یہ بات کہی کہ ہم کبھی چور نہیں تھے کہ اس مرتبہ چوری کرتے۔ تب اصحابِ یوسف علیہ السلام نے کہا، یا ندا کرنے والے نے کہا کہ اگر چوری ثابت ہو جائے تو کیا جزا ہے اور تم جھوٹے ٹھہرو؟ انھوں نے کہا: اس کی یہی سزا ہے کہ چور کو پکڑ رکھیں۔

مفسرین کہتے ہیں کہ آلِ یعقوب علیہ السلام میں چور کا یہ حکم تھا کہ ایک سال تک غلام بنا کر رکھا جائے، پھر اس کو چھوڑ دیں۔ ''ظالموں کو سزا ہم اسی طرح دیتے ہیں۔'' یہ کلام برادرانِ یوسف علیہ السلام کا ہے یا اصحابِ یوسف علیہ السلام کا۔ جب چور کی سزا معلوم ہوگئی، تب متاع کی تلاشی شروع کی۔ سب سے پہلے بھائیوں کے سامان کی تفتیش کی بنیامین کے سامان سے پہلے۔ یہ تلاش کرنے والے یوسف علیہ السلام تھے یا ندا کرنے والے یا اصحابِ یوسف علیہ السلام۔ کسی قسم کے اعتراض کو دور کرنے کے لیے یہ کام کیا، پھر اس سقایہ یا صواع کو نکالا۔ تب برادرانِ یوسف علیہ السلام شرم سے سرنگوں ہوگئے اور بنیامین کو ملامت کر کے یوسف علیہ السلام کے حوالے کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ہم نے یوسف علیہ السلام کے لیے اس طرح تدبیر کی یعنی وحی کے ذریعے سے۔ ابن الاعرابی نے کہا کہ کید کہتے ہیں: تدبیر کرنے کو باطل اور حق کے ساتھ۔[1]

اس جگہ کید سے مراد کید کا بدلہ ہے، یعنی جس طرح انھوں نے ابتدا میں یوسف علیہ السلام کے ساتھ کیا تھا، ویسا ہی ہم نے ان کے ساتھ کیا، یہی زیادہ بہتر ہے۔ آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ صحیح مقصد کے لیے ایسی صورت میں کہ حیلہ اور تدبیر کرنا ضروری ہو تو جائز ہے، جبکہ وہ شریعت کے خلاف نہ ہو۔ یوسف علیہ السلام اپنے بھائی بنیامین کو بادشاہِ مصر کے قانون اور اس شریعت کے مطابق جس پر وہ تھا، نہیں لے سکتے تھے، کیوں کہ اس کا دین اور حکم یہ تھا کہ چور کو ماریں پیٹیں اور چوری کے سامان سے دوگنا بطورِ تاوان لیں نہ یہ کہ سال بھر اسے غلام بنا کر رکھیں کہ یہ بات تو یعقوب علیہ السلام کے دین اور شریعت میں تھی۔ حاصل یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام اپنے بھائی پر یعقوب علیہ السلام کا حکم جاری نہیں کر

[1] تفسیر الخازن (۳/ ۳۰۳)

سکتے تھے، کیوں کہ وہ بادشاہِ مصر کے دین اور شریعت کے خلاف تھا، اگر اللہ تعالیٰ یہ تدبیر ان کو نہ سکھاتا۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لیے ایک عمدہ راہ نکال دی کہ خود برادرانِ یوسف علیہ السلام کی زبان سے یہ الفاظ جاری ہوئے کہ چوری کی سزا اسی کی قید (غلامی) ہے۔ ان الفاظ کا ان کی زبان پر آنا اللہ کی مشیت اور تدبیر سے ہوا۔ بالجملہ یہ سب حالات اللہ تعالیٰ کے یوسف علیہ السلام کو الہام سے ہوئے اور کام خاطر خواہ ہوگیا۔ یہی معنے ہیں اللہ کی مشیت کے کہ یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی کو یعقوب علیہ السلام کی شریعت پر گرفتار کیا۔ اللہ جس کو چاہتا ہے رتبۂ بلند پر پہنچا دیتا ہے، علوم و معارف، عطایا اور کرامات دے کر، جس طرح کہ یوسف علیہ السلام کا درجہ بلند کر دیا۔ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ علم اشرف مقامات اور اعلیٰ درجات ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کی تعریف کی اور علم کی وجہ سے ان کا درجہ بھائیوں پر بلند کر دیا۔ ہر علم والے کے اوپر جس کو اللہ تعالیٰ نے مخلوق میں سے علم کی بدولت بلند درجہ والا کیا ہے، ایک اور زیادہ دانا موجود ہے۔ یعنی اس سے بھی بلند مرتبہ اور اعلیٰ درجے والا جس کی حد تک نہیں پہنچ سکتے ہیں۔ بعض نے کہا کہ علیم سے مراد اللہ تعالیٰ ہے، اس لیے کہ علم کی انتہا اسی تک پہنچتی ہے۔ وہ ہر عالم سے اعلم تر (زیادہ علم رکھنے والا) ہے۔

حکایت:

امام محمد بن کعب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ سے ایک مسئلہ پوچھا، آپ نے کچھ فرمایا۔ اس شخص نے کہا کہ یہ مسئلہ اس طرح پر نہیں ہے، بلکہ اس طرح پر ہے، کہا: "أَصَبْتَ وَأَخْطَأْتُ وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ" یعنی تو نے ٹھیک کہا اور میں نے خطا کی اور ہر عالم کے اوپر ایک اور عالم ہے۔[1] امام ابن الانباری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عالم پر واجب ہے کہ اپنے آپ کو متہم کرے اور اللہ کی بخشش اور عطا کے سامنے خاکساری بجا لائے۔ اس کا نفس غلبے کا طمع نہ کرے، اس لیے کہ کوئی عالم اس سے خالی نہیں ہے کہ اس کے اوپر اور کوئی عالم ہوتا ہے۔[2] آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ برادرانِ یوسف علیہ السلام علما تھے، لیکن یوسف علیہ السلام ان سے زیادہ علم رکھتے تھے۔[3]

قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ فَاَسَرَّهَا
يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ
وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ ﴿۷۷﴾

انھوں نے کہا: اگر اس نے چوری کی ہے تو اس سے پہلے اس کے ایک بھائی نے بھی چوری کی تھی، چناں چہ یوسف نے یہ (بات) اپنے دل میں چھپائی اور ان پر ظاہر نہ کی (اور دل میں) کہا: تم بدترین درجے پر ہو، اور اللہ خوب جانتا ہے جو تم بیان کرتے ہو (77)

---

[1] تفسير الطبري (١٦/ ١٩٢) [2] تفسير الخازن (٣/ ٣٠٣) [3] فتح البيان (٦/ ٣٧٤ـ ٣٧٨)

برادرانِ یوسف علیہ السلام کا ان پر چوری کا الزام:

یعنی تم نے ایسی چوری کی کہ بھائی کو باپ سے چرا کر بیچ ڈالا اور میری چوری کا حال اللہ کو معلوم ہے، اُن پر چوری کا طعن دیا۔ وہ قصہ یہ کہ یوسف علیہ السلام کو پھوپھی نے پالا تھا، جب بڑے ہوئے تو باپ نے چاہا کہ اپنے پاس رکھیں، پھوپھی کو محبت تھی، چھپا کر ایک پٹکا ان کی کمر سے باندھ دیا، پھر اس کو ڈھونڈنے لگیں، لوگوں میں چرچا ہوا، آخر ان کی کمر سے نکلا، اس دین کے موافق ایک سال پھوپھی کے پاس اور رہے۔ برادرانِ یوسف علیہ السلام نے جب دیکھا کہ باشاہ کا صواع بنیامین کے سامان میں سے نکلا ہے تو کہنے لگے کہ اگر اس نے چرایا ہے تو کچھ عجیب نہیں، اس سے پہلے اس کے بھائی نے بھی چوری کی تھی، یعنی یوسف نے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: یوسف علیہ السلام نے اپنے نانا کا ایک بت چرا کر توڑ ڈالا تھا اور بغرضِ تغییر منکر راہ میں ڈال دیا تھا، اس پر بھائیوں نے ان کو عار لگائی تھی۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کو مرفوعاً روایت کیا ہے۔[2] امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے بھی اس کے مثل مروی ہے[3] اور تابعین کی ایک جماعت سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: وہ بت سونے کا تھا[4] اور کسی نے کہا کہ چاندی کا تھا۔ امام عطیہ رحمہ اللہ نے کہا: بچپن میں دو سلائیاں سونے کی چرائی تھیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ خالہ کی ایک سرمہ دانی چرائی تھی۔[5] سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ نے کہا: گھر میں ایک مرغی تھی، وہ سائل کو دے دی۔ بعض نے کہا کہ دسترخوان سے کھانا لے کر فقرا کو دے دیتے۔

ابن الانباری رحمہ اللہ نے کہا کہ ان اقوال میں سے کوئی بھی ایسا نہیں کہ اسے سرقہ کہا جا سکے، لیکن مشابہ سرقہ ہے، اس لیے غصے میں آکر سرقہ کہا۔[6] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: جو آزمایش یوسف علیہ السلام پر سب سے پہلے آئی تھی، یہ تھی کہ یوسف علیہ السلام کی پھوپھی اسحاق علیہ السلام کی بیٹی جو اسحاق علیہ السلام کی ساری اولاد میں سے بڑی تھی اور اس کے پاس ایک کمر بند اسحاق علیہ السلام کا تھا اور وہ اس کے متوارث ہوتے تھے بڑائی میں، یعنی جو سب سے بڑا ہوتا، وہ اس کو لیتا اور جو کوئی اس کو چھپا رکھتا، وہی والی ہوتا، اس سے سب کی صلح رہتی، کوئی اس میں جھگڑا نہ کرتا، وہ جو چاہتا سو کرتا۔

جب یعقوب علیہ السلام کے گھر میں یوسف علیہ السلام پیدا ہوئے، پھوپھی نے ان کی پرورش کی اور یوسف علیہ السلام پر فریفتہ تھیں، اتنا کوئی یوسف علیہ السلام کو نہ چاہتا تھا، جتنا وہ چاہتی تھیں۔ جب یوسف علیہ السلام چند سال کے ہوگئے تو یعقوب علیہ السلام نے ان کی پھوپھی کے پاس آکر کہا کہ اے بہن! تم یوسف علیہ السلام کو مجھے دے دو۔ واللہ! میں ایک دم کے لیے بھی اس کا اپنے پاس سے جدا ہونا نہیں چاہتا۔ انھوں نے کہا: واللہ! میں اس کو نہیں چھوڑوں گی، تم چند روز اور اس کو میرے پاس

---

(1) تفسیر الطبري (١٦/ ١٩٥)　(2) الدر المنثور (٤/ ٥٦٤)　(3) تفسیر الطبري (١٦/ ١٩٥)
(4) معاني القرآن (٣/ ١٢٣)　(5) الدر المنثور (٤/ ٥٦٣_ ٥٦٤)　(6) تفسیر الخازن (٣/ ٣٠٤)

رہنے دو، میں اس کو دیکھوں گی اور تسکین پاؤں گی، شاید اس سے میرے دل کو تسلی رہے۔ جب یعقوب علیہ السلام بہن کے پاس سے باہر گئے، بہن نے اسحاق علیہ السلام کا کمر بند لے کر یوسف علیہ السلام کے زیرِ جامہ باندھ دیا، پھر کہا کہ منطقہ گم ہو گیا ہے، دیکھو کس نے لیا ہے اور کس کے پاس ہے۔ پھر تلاش کر کے کہا: گھر والوں کی جامہ تلاشی لو۔ جامہ تلاشی کی تو وہ یوسف علیہ السلام کے پاس پایا۔ عمہ (پھوپھی) نے کہا: یہ میرا ہے، میں جو چاہوں سو کروں۔

جب یعقوب علیہ السلام آئے تو یہ حال ان سے بیان کیا۔ انھوں نے فرمایا تو جان اور یہ جانے۔ اگر یہ منطقہ اس نے لیا ہے تو یہ تیرے سپرد ہے، میں کچھ نہیں کر سکتا۔ تب بہن نے یوسف علیہ السلام کو اپنے پاس روک رکھا۔ یعقوب علیہ السلام کو ان پر کچھ قدرت نہ ہوئی یہاں تک کہ بہن کا انتقال ہوا۔ اسی جگہ سے بھائیوں نے کہا کہ اگر بنیامین نے چوری کی ہے تو اس سے پہلے اس کے ایک بھائی نے چوری کی تھی۔[1] یوسف علیہ السلام نے اس بات کو اپنے جی میں رکھا اور ظاہر نہ کیا، یعنی دل میں یہ بات کہی کہ تم درجے میں بدتر ہو۔ الخ۔ یہ اضمار قبل الذکر (ذکر کرنے سے پہلے ضمیر لانا) کی قسم سے ہے، اس کے شواہد قرآن و حدیث اور لغت کے بہت نثر کیے ہوئے اور خبروں اور شعروں میں بہت ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی یہی کہا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے یہ بات کہ ﴿ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا... الخ﴾ دل میں رکھی زبان سے نہیں کہی۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ بھائیوں کے اس کہنے سے کہ اگر اس نے چرایا ہے تو اس سے پہلے اس کے بھائی نے بھی کچھ چرایا تھا۔ غرض یہ تھی کہ ہم اس کے طریقے اور سیرت پر نہیں ہیں، بلکہ یہ اور اس کا بھائی اس طریقے پر تھا، اس لیے کہ یہ دونوں دوسری ماں سے ہیں نہ کہ ہماری ماں سے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ ہی جانے کہ بنیامین کے بھائی نے چوری کی تھی یا نہیں۔[3] امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا کہ انھوں نے یوسف علیہ السلام کی طرف چوری کی جھوٹی نسبت کی تھی۔[4] یہی زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ یہ کوئی ان کا پہلا جھوٹ نہیں ہے، ایسے جھوٹ تو وہ بہت کہہ چکے تھے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ وہ انبیا میں سے نہ تھے۔

امام ابن منیر رحمہ اللہ نے بحر میں کہا ہے کہ مفسرین نے جو کچھ سرقہ کی تفسیر میں کہا ہے، تکلف ہے۔ اس کی نسبت نبوت کے اہلِ بیت کی طرف جائز نہیں ہے اور نہ ہی کسی اشراف کی طرف ایسی نسبت کرنا چاہیے۔ اس تفسیر کو ترک کرنا واجب ہے۔ مکی رحمہ اللہ بھی اسی طرف گئے ہیں۔ یا برادر سے مراد بنی آدم ہیں۔ اس کے نظائر حدیث میں مروی ہیں۔ امام خفاجی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ کلام قبول کرنے کے لائق ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ ﴿ فَاَسَرَّهَا ﴾ کی ضمیر کلمے کی طرف جاتی ہے یا جملے کی طرف اور کلمہ یہ تھا: ﴿ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ﴾[5] مگر ابو علی فارسی رحمہ اللہ نے اس کو رد کیا ہے۔ بعض نے کہا:

---

[1] تفسير الطبري (١٦/ ١٩٦۔ ١٩٧)
[2] تفسير الطبري (١٦/ ١٩٩)
[3] معاني القرآن (٣/ ١٢٣)
[4] تفسير القرطبي (٩/ ٢٣٩)
[5] معاني القرآن (٣/ ١٢٣)

ضمیر عائد ہے اجابت کی طرف۔ یعنی یوسف علیہ السلام نے اسی امر کی اجابت اس وقت نہ کی دوسرے وقت تک چھوڑا۔[1]

شرح ایں ہجراں و ایں سوز جگر ایں زماں بگزار تا وقت دگر

''اس ہجر اور جگر کی جلن کی شرح کسی اور وقت کے لیے اس وقت چھوڑ دے۔''

بعض نے کہا: یوسف علیہ السلام نے اس قول: ﴿ اِنْ يَّسْرِقْ... الخ﴾ کو اپنے جی میں رکھا۔ یہی زیادہ صحیح ہے، یعنی یہ جی کی بات ان پر ظاہر نہ کی اور اس کے صحیح یا غلط ہونے کا کچھ ذکر نہ فرمایا۔[2]

قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗۤ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۷۸ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ۝۷۹

انھوں نے کہا: اے عزیز! بے شک اس کا باپ بوڑھا بڑی عمر کا ہے، چناں چہ آپ اس کی جگہ ہم میں سے کسی کو پکڑ لیں۔ بے شک ہم آپ کو احسان کرنے والوں میں سے دیکھتے ہیں (78) یوسف نے کہا: اللہ پناہ دے کہ جس شخص کے پاس ہم نے اپنی چیز پائی، اس کے سوا کسی اور کو پکڑیں، تب تو بے شک ہم ظالم ہوئے (79)

برادرانِ یوسف کی بنیامین کو واگزار کرانے کے لیے ایک تجویز:

جب بنیامین کا لینا مقرر ہوگیا اور یہ بات ٹھہری کہ ان کو یوسف علیہ السلام کے پاس چھوڑ دیں اپنے شرعی اعتراف کی وجہ سے تو پھر عرض گزاری اور چاپلوسی کرنے لگے اور کہا: اس کا بوڑھا باپ اس کو بہت چاہتا ہے اور گم شدہ بیٹے کی جگہ پر اس سے تسلی حاصل کرتا ہے، اس کی جگہ تم ہم میں سے کسی شخص کو پکڑ رکھو، اس کو چھوڑ دو، ہم دیکھتے ہیں کہ تم اچھے آدمی ہو، یعنی عادل و منصف قابلِ خیر اور احسان کرنے کے لائق۔ یوسف علیہ السلام نے فرمایا: معاذ اللہ! ہم کسی کو پکڑیں، مگر اسی کو جس کے پاس سے ہماری چیز برآمد ہوئی اور تم نے اس کا اعتراف کرلیا ہے، ہم تو اگر ایسا کریں تو ظالم ٹھہریں کہ کسی بے قصور کو قصوروار کے بدلے میں گرفتار کریں۔ یہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ برادرانِ یوسف علیہ السلام نے کہا: اے عزیز! بنیامین کا ایک بوڑھا باپ ہے جس میں اس کے فراق کے صدمے کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے اور نہ اس کے پاس تک پہنچ سکتا ہے یا کبیر القدر ہے، اس لیے

---

[1] فتح القدیر (۳/ ۶۲) [2] فتح البیان (۶/ ۳۷۸۔ ۳۸۰)

کہ ایک پیغمبر ہے اور انبیاء کی اولاد میں سے ہے۔ اس قول میں بُعد ہے اور پہلی بات ہی زیادہ صحیح ہے۔ اس کے عوض ہم میں کسی ایک کو رکھ لو کہ ہماری جدائی کا اس کو اتنا رنج نہ ہوگا، جس قدر کہ اس کے فراق سے ہوگا ہم دیکھتے ہیں کہ تم سب لوگوں کے ساتھ احسان کرتے ہو۔ رحیم، کریم اور سلیم ہو ہماری یہ بات مان لو گے تو ہم پر تمھارا احسان ہوگا۔ یوسف علیہ السلام نے اللہ کی پناہ پکڑی اور کہا کہ ہم تو اسی کو روک رکھیں گے، جس کے سامان سے یہ صواع نکلا اور یوں نہ کہا کہ جس نے چرایا، اس لیے کہ جھوٹ کہنے سے بچیں، کیوں کہ انھیں معلوم تھا کہ بھائی نے چوری نہیں کی۔ اس میں صحیح اغراض کی خاطر حیلے سے توسل کرنے کا جواز ہے، جبکہ مخالف شرع و ہادم اصل نہ ہو۔

شاید اللہ نے یوسف علیہ السلام کو اس بات کا حکم دیا ہو کہ یعقوب علیہ السلام پر تشدیدِ محنت ہو اور معاف کر دینے اور بنیامین کے عوض کسی اور کو رکھنے سے منع فرما دیا ہو، جس طرح کہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی خضر علیہ السلام کو حکم دیا تھا کہ فلاں کو قتل کر ڈالو، کیوں کہ اگر وہ زندہ رہے گا تو سرکش اور کافر ہوگا۔ ابن عادل رحمہ اللہ نے "كتاب اللباب في علوم الكتاب" میں اسی طرح کہا ہے[1] اور صاحبِ کشاف نے جزم (یقین) کے ساتھ کہا کہ یہ واقعہ وحی کے مطابق تھا۔[2]

فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ؕ قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْۤا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَ مِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْۤ اَبِيْۤ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ ۚ وَ هُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ۝۸۰ اِرْجِعُوْۤا اِلٰۤى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰۤاَبَانَاۤ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَ مَا شَهِدْنَاۤ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَ مَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ۝۸۱ وَ سْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَ الْعِيْرَ الَّتِيْۤ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ؕ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ۝۸۲

پھر جب وہ اس سے نا اُمید ہو گئے تو الگ ہو کر مشورہ کیا۔ ان کے بڑے نے کہا: کیا تمھیں علم نہیں کہ بے شک تمھارے باپ نے تم سے اللہ کا پختہ عہد لیا ہے؟ اور اس سے پہلے یوسف کی بابت تم کوتاہی کر چکے ہو؟ چناں چہ میں تو اس سرزمین کو ہرگز نہیں چھوڑوں گا، حتی کہ میرا باپ مجھے حکم دے یا اللہ میرے لیے فیصلہ کر دے، اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے (80) تم اپنے باپ کے پاس واپس جاؤ اور کہو: اے ہمارے ابا جان! بے شک آپ کے بیٹے نے چوری کی، اور ہم نے وہی گواہی دی

[1] اللباب في علوم الكتاب (١١/ ١٧٧)
[2] الكشاف (٢/ ٤٦٥) فتح البيان (٦/ ٣٨١)

تھی جو ہمیں علم تھا، اور ہمیں غیب کی خبر نہ تھی (81) اور آپ اس بستی (والوں) سے پوچھ لیں، جس میں ہم رہے اور اس قافلے سے بھی جس میں ہم آئے ہیں اور بے شک ہم سچے ہیں (82)

برادرانِ یوسف کی بنیامین کی رہائی سے مایوسی کے بعد باہم مشاورت:

یعنی اور بھائیوں کو رخصت کیا، بڑا بھائی رہ گیا اس توقع پر کہ شاید مہربان ہو کر بنیامین کو چھوڑ دیں۔ کہا: باپ سے کہو کہ آپ کو ہم نے اپنی دانست پر قول دیا تھا اور چوری کی خبر نہ تھی اور ہم نے اپنے دین کے مطابق یہ بتایا کہ چوری کی سزا اس کو قید کر رکھنا ہے، ہمیں معلوم نہ تھا کہ ہمارا بھائی ہی چور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ جب برادرانِ یوسف علیہ السلام بنیامین کے رہا ہونے سے نا اُمید ہو گئے، جس کی بابت باپ سے عہد و پیمان کر کے آئے تھے تو سب لوگوں سے علاحدہ ہو کر باہم صلاح و مشورہ کرنے کو بیٹھے۔

پئے مصلحت مجلس آراستہ نشستند و گفتند و برخاستند

''بھلائی کے لیے انھوں نے ایک مجلس آراستہ کی، (لیکن) وہ بیٹھے، گفتگو کی اور اُٹھ کر چلے گئے، یعنی کوئی کام نہ کیا۔''

روبیل نے، جو سب سے بڑا تھا اور بعض نے کہا: یہوذا، جس نے یہ رائے دی تھی کہ یوسف علیہ السلام کو گم نام کنوئیں میں ڈال دو، قتل کرنا ضروری نہیں، ان سے کہا: سنو! تم سے تمھارے باپ نے عہد لیا ہے کہ تم بنیامین کو اُن کے پاس واپس پہنچا دو گے، اب تم پر اس کا پہنچانا مشکل ہو گیا ہے اور تم پہلے یوسف علیہ السلام کو ضائع کر چکے ہو، سو میں تو اس شہر سے ہلنے والا نہیں، جب تک مجھ کو میرے ابا جان لوٹنے کی اجازت نہ دیں اور مجھ سے راضی نہ ہوں، اللہ میرا فیصلہ کر دے، یعنی تلوار سے یا مجھ کو قدرت ہو کہ میں بھائی کو چھڑا سکوں، اللہ تعالیٰ سب میں بڑا حاکم ہے۔ تم جاؤ اور باپ کو اس ماجرے کی خبر دو کہ ان کے نزدیک یہ عذر ہو گا اور تم اپنے اقرار سے پاک صاف ٹھہرو گے۔

امام قتادہ اور عکرمہ رحمہما اللہ نے کہا: غیب سے مراد یہ ہے کہ ہمیں معلوم نہ تھا کہ تمھارا بیٹا چوری کرے گا۔ ابن زید رحمہ اللہ نے کہا کہ ہم نے نہ جانا غیب کی بات کو کہ اس نے کوئی چیز چرا لی ہے۔ ہم سے تو یہی پوچھا تھا کہ چوری کی کیا سزا ہے؟ تم اہلِ مصر سے پوچھ لو یا کسی اور شہر والوں سے۔[1] (قاله قتادة) اور ان اہلِ قافلہ سے معلوم کر لو کہ ہم صادق، امین، حافظ وحارس ہیں یا نہیں، جو کچھ ہم نے کہا ہے، اس میں ہم سچے ہیں، اس نے چوری کی اور وہ چوری کی علت میں پکڑا گیا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ انھوں نے جب دیکھا کہ یوسف علیہ السلام نے ہماری درخواست قبول نہیں کی اور یقین کر لیا

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٨٣)

کہ ہم کو بھائی اب نہیں ملے گا تو آپس میں صلاح مشورہ کرنے لگے۔ تب روبیل بڑے بھائی نے کہا: یہ عمر میں سب سے بڑے تھے۔ یہ قتادہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔[1] یا عقل وعلم میں زیادہ تھے نہ کہ سن و سال میں۔ یا مراد یہوذا ہیں کہ وہ عقل وافر رکھتے تھے۔ یا شمعون کہ وہ ان سب میں قافلے کے سردار تھے کہ تم جانتے ہو کہ باپ نے تم سے اللہ کا عہد لیا ہے کہ بنیامین کی حفاظت کرو گے اور اس سے پہلے جو کچھ تم یوسف علیہ السلام کے ساتھ کر چکے ہو، وہ تمھیں معلوم ہے۔ سو میں تو اس جگہ سے اس وقت تک نہیں سرکوں گا، جب تک کہ میرے والد بزرگوار حکم نہ دیں، یعنی میں اسی جگہ مصر میں مقیم رہوں گا۔ یہ بات انھوں نے باپ سے شرما کر کہی کہ ہم کس طرح بغیر بھائی کے ان کے پاس جائیں اور کیا منہ دکھائیں۔ یا اللہ حکم دے کہ میں اس جگہ کو چھوڑ دوں۔ یا میرا بھائی رہائی پائے کہ میں اس کو لے کر ابا جان کے پاس جاؤں۔ یا اللہ مجھ کو غلبہ دے اس پر جس نے میرے بھائی کو پکڑ رکھا ہے کہ میں اس کا بدلہ لوں اور اپنے بھائی کو واپس لے جاؤں۔ یا عاجز ہو کر منصرف ہوں (ٹل جاؤں)۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: معنے یہ ہیں کہ تلوار لے کر لڑوں، یہاں تک کہ مارا جاؤں۔ ابو صالح رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔[2] اللہ تعالیٰ بہتر حاکم ہے، اس کا حکم حق کے مطابق جاری ہوتا ہے اور صحیح ہوتا ہے۔ اس کلام سے مراد اللہ کی طرف التجا تھی، والد ماجد کی طرف عذر پیش کرنے کی۔ پھر اُن کے بڑے نے کہا: تم سب جاؤ اور باپ سے کہو کہ اے ہمارے باپ! تیرے فرزند نے چوری کی، یہ اس لیے کہ انھوں نے خود دیکھا کہ بھائی کے سامان میں سے صواع برآمد ہوا ہے۔

لفظ ﴿سَرَقَ﴾ کو اس جگہ بصیغۂ مجہول "سُرِقَ" بھی پڑھا ہے، یعنی اس سے چوری کا ہونا معلوم ہوا۔ یا اس پر چوری کی تہمت لگی۔ یہ بات اپنی جانوں سے تہمت کو دور کرنے کے لیے مبالغے کے طور پر کہی، اس لیے کہ وہ پہلے یوسف علیہ السلام کے واقعے کی وجہ سے متہم ٹھہر چکے تھے۔ ہم نے وہی کہا جو دیکھا، یعنی کہ صواع اس کے پالان سے نکلا، یا اپنی شریعت کے مطابق چور کی سزا بیان کر دی، ہم غیب کی بات کیا جانتے تھے کہ یہ چوری کرے گا، غیب کو جاننے والا اللہ ہے۔ شاید صواع اس کے پالان میں رکھ دیا گیا اور ہمیں خبر نہ ہوئی۔

بعض نے کہا: غیب سے مراد رات کا وقت ہے، یعنی ہم سوتے تھے، اُس وقت اس نے چوری کی، یا اس نے یہ کام ہماری غیر موجودگی میں کیا اور ہم سے اس کا یہ کام پوشیدہ رہا۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا یعنی ہم نہ جانتے تھے کہ تمہارا بیٹا چوری کرے گا۔ اسی طرح قتادہ رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ہم اس کے رات دن آنے جانے کے کچھ نگہبان نہ تھے، تم کو یقین نہ ہو تو بستی سے پوچھ لو، یعنی اہلِ مصر سے۔ یہی قول امام قتادہ رحمہ اللہ

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٨١) [2] تفسير الطبري (١٦/ ٢٠٩) الدر المنثور (٤/ ٥٦٥)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٨٣)

اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔[1] بعض نے کہا: یہ ایک بستی تھی، مصر کی بستیوں میں سے جہاں وہ اترے تھے اور وہاں سے غلہ کی بھرتی کی تھی اور اسی جگہ چوری کی تلاشی لی گئی تھی۔ قافلے والوں سے پوچھ لو، یہ ایک قوم تھی جو کنعان سے یعقوب علیہ السلام کی ہمسائی تھی۔ ہم اپنے اس بیان میں سچے ہیں، یہ آخری بات ہے، جو اُن کے بڑے نے ان کو سمجھائی تھی۔ جب انھوں نے واپس آ کر یعقوب علیہ السلام سے بات کہی تو[2]

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۭ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝ وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰٓاَسَفٰى عَلٰي يُوْسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ۝ قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ۝ قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

اس (یعقوب) نے کہا: (حقیقت یہ نہیں) بلکہ تمھارے لیے تمھارے دلوں نے ایک (بری) بات آراستہ کر دی ہے، چناں چہ صبر ہی بہتر ہے۔ شاید اللہ ان سب کو میرے پاس لے آئے، بے شک وہی علیم وحکیم ہے (83) اور وہ ان سے پھرا اور بولا: ہائے افسوس یوسف پر! اور اس کی آنکھیں غم سے سفید ہوگئیں، اور وہ غم سے بھرا ہوا تھا (84) بیٹے بولے: اللہ کی قسم! آپ یوسف کو سدا یاد کرتے رہیں گے، حتیٰ کہ آپ (غم سے) گھل کر مرنے کے قریب ہو جائیں یا ہلاک ہونے والوں میں سے ہو جائیں (85) اس نے کہا: میں تو اپنی پریشانی اور غم کا شکوہ اللہ ہی سے کرتا ہوں اور میں اللہ کی طرف سے جانتا ہوں، جو تم نہیں جانتے (86)

بنیامین کی جدائی پر یعقوب علیہ السلام کا غمگین ہونا اور صبر کا عزم کرنا:

پہلی بار کی بے اعتباری سے اب کے بھی یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں کا اعتبار نہ کیا، لیکن نبی کا کلام جھوٹ نہیں، بیٹوں کی بنائی ہوئی بات تھی۔ یوسف علیہ السلام بھی بیٹے تھے۔ یعقوب علیہ السلام غم کی بات منہ سے نہ نکالتے تھے، مگر اس وقت بے اختیار اتنا نکلا۔ ایسا درد اتنی مدت دبا رکھنا کس کا کام ہے سوائے پیغمبر کے۔ اس بیٹے کے جانے سے پھر یوسف علیہ السلام کا غم تازہ ہوا۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یعقوب علیہ السلام نے اس وقت وہی کہا، جو اس وقت کہا تھا: جب

[1] تفسير البغوي (٤/ ٢٦٦۔ ٢٦٧) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٨٣)
[2] فتح البيان (٦/ ٣٨٢۔ ٣٨٥)

یوسف علیہ السلام کی قمیص پر جھوٹا خون لگا کر لائے تھے کہ تم نے بات بنائی، میں صبر کروں گا۔ امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ برادرانِ یوسف علیہ السلام نے آکر جب یعقوب علیہ السلام سے یہ خبر کہی تو انھوں نے گمان کیا کہ یہ بھی ویسی ہی بات ہے، جیسی کہ یوسف علیہ السلام کے ساتھ کی تھی۔[1]

پھر اللہ تعالیٰ سے اُمیدوار ہوئے کہ ان کی اولاد سہ گانہ، یعنی یوسف علیہ السلام اور بنیامین اور روبیل ان پر لوٹا دے۔ روبیل جو دیارِ مصر میں رہ گئے تھے اور اس انتظار میں تھے کہ یا اللہ اُن سے راضی ہو کر لوٹ جانے کا حکم دے یا اپنے بھائی کو خفیہ طور پر نکال لے جائیں اور چوں کہ یعقوب علیہ السلام نے تینوں لڑکوں کے رجوع کی اُمید کی تھی، اس لیے یوں کہا کہ لگتا ہے کہ اللہ ان سب کو لے آئے، وہ میرے حال کو جانتا اور اپنے فعل اور فیصلے میں حکمت والا ہے۔ پھر یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے درگزر کیا اور اپنے پہلے اور پرانے غم کو جو یوسف علیہ السلام کا غم تھا، یاد کر کے کہا: افسوس ہے یوسف علیہ السلام کے فراق پر! ان کو دو غموں نے گھیرا۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس اُمت کے سوا کسی کو استرجاع (إنا للّٰه وإنا إليه راجعون پڑھنا) نہیں دیا گیا۔ تم یعقوب علیہ السلام کے قول کو نہیں سنتے کہ ﴿ یٰٓاَسَفٰی عَلٰی یُوْسُفَ ﴾ کہا۔[2]

﴿ کَظِیْمٌ ﴾ کہتے ہیں خاموش کو کہ جو اپنے معاملے کا شکوہ مخلوق کے سامنے نہ کرے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ اور ان کے علاوہ کا یہ قول ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ کَظِیْمٌ ﴾ بہ معنی کئیب غمزدہ ہے۔[3] بیٹوں نے کہا: ابا جان! اگر آپ کا یہی حال رہے گا تو آپ ہلاک اور تلف ہو جائیں گے۔ "حرض" کہتے ہیں: "ضعيف القوة" کو۔ تب یعقوب علیہ السلام نے یہ جواب دیا کہ میں تو اپنا دُکھ درد صرف اللہ کے سامنے رکھتا ہوں اور مجھے اس سے خیر کی اُمید ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ مراد یوسف علیہ السلام کا خواب ہے کہ وہ ضرور ظاہر ہوگا۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ میں جانتا ہوں کہ یوسف علیہ السلام کا خواب سچا ہے اور میں عن قریب اس کو سجدہ کروں گا۔[4]

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ یعقوب علیہ السلام کا ایک منہ بولا بھائی تھا، ایک دن اس نے کہا: تمھاری نظر کس چیز نے کھوئی اور تمھاری کمر ٹیڑھی کر دی۔ فرمایا یوسف علیہ السلام پر رونے سے آنکھ گئی، بنیامین پر غم کرنے سے کمر جھک گئی۔ جبریل علیہ السلام نے آکر کہا: اے یعقوب! اللہ تم کو سلام کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ تمھیں شرم نہیں آتی کہ تم میرے غیر کے سامنے شکوہ کرتے ہو، تب یعقوب علیہ السلام نے کہا: ﴿ اِنَّمَآ اَشْکُوْا بَثِّیْ وَحُزْنِیْٓ اِلَی اللّٰہِ ﴾ جبریل علیہ السلام نے کہا: "اَللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا تَشْكُوْا"[5] (رواه ابن أبي حاتم) [اللہ زیادہ جانتا ہے جو تو شکوہ کرتا ہے] یہ

---

[1] تفسير الطبري (١٦/ ٢١٤)
[2] تفسير الطبري (١٦/ ٢١٧)
[3] تفسير ابن كثير (٢/ ٦٣٣)
[4] تفسير الطبري (١٦/ ٢٢٧) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٨٩)
[5] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٨٨) اس کی سند میں "حفص بن عمر بن ابی الزبیر" ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٦٨٨٠)

حدیث غریب ہے، اس میں نکارت ہے۔ میں کہتا ہوں: اہلِ دل کا تجربہ ہے کہ جو شخص اپنی آزمایش کا ذکر کسی سے نہیں کرتا اور اللہ کی طرف دل سے رجوع لاتا ہے، اُس کی آزمایش آلاء (نعمتوں) سے بدل جاتی ہے۔ مجھ کو بھی اس کا تجربہ ہو چکا ہے، اگرچہ خاموشی بروجہ کمال میسر نہیں آتی، مگر صدیقین کو۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جب برادرانِ یوسف علیہ السلام نے یعقوب علیہ السلام سے یہ حال بیان کیا تو فرمایا کہ تمھارے جی نے یہ بات بنائی ہے، ورنہ اس کی کچھ اصل نہیں ہے۔ یعنی تم کہتے ہو کہ بنیامین نے چوری کی، حالاں کہ حقیقت میں اس نے چوری نہیں کی ہے یا مراد امر سے یہ ہے کہ تم بنیامین کو نکال کر مصر کی طرف لے گئے منفعت کی غرض سے اور منفعت کے بجائے مضرت (نقصان، تکلیف) حاصل ہوئی۔ یا امر سے یہ مراد ہے کہ تم نے یہ فتویٰ دیا کہ چور کو چوری کے عوض پکڑ رکھنا چاہیے۔ بالجملہ اضراب اس جگہ براءت کو تسلیم کرنے کے مصداق ہے نہ کہ اصل کلام کے اعتبار سے کہ وہ صحیح تھا۔ پھر فرمایا کہ صبر سب سے بہتر ہے میرے لیے۔ صبرِ جمیل اس صبر کو کہتے ہیں، جس میں شکوہ نہ ہو، بلکہ معاملے کو اللہ کے سپرد کرنا ہو اور استرجاع کرے، یعنی "إنا لله وإنا إليه راجعون" کہے۔ حدیث میں مروی ہے کہ «اَلصَّبْرُ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْأُوْلٰی» یعنی صبر وہ ہے جو صدمہ پہنچتے ہی کیا جائے نہ کہ جزع فزع کرنے کے بعد۔

پھر کہا کہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو میرے پاس لے آئے۔ یعنی بنیامین اور اس کے بڑے بھائی کو جو مصر میں ہے اور یوسف علیہ السلام کو۔ یعقوب علیہ السلام نے یہ بات اللہ پر حسنِ ظن رکھتے ہوئے کہی تھی، اس لیے کہ ان کے نزدیک یہ بات تھی کہ یوسف علیہ السلام مرے نہیں، بلکہ زندہ ہیں، اگرچہ اُن کی خبر نہیں لگتی۔ آزمایش جب بہت زیادہ سخت ہو جاتی ہے تو آسانی کی طرف تیزی سے لے جانے والی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا﴾ [الطلاق: ۷] ''اللہ تنگی کے بعد جلد آسانی فرما دے گا۔''

تا اُمیدت نہ شود یاس بدولت نرسی
''جب تک تجھے اُمید نہ ہو تو نا اُمیدی کے ساتھ اقبال حاصل نہیں کر سکتا۔''

اللہ تعالیٰ علیم اور حکیم ہے۔ پھر ان کی طرف سے روگراں ہو کر فرمایا: وائے دریغا! یوسف علیہ السلام پر۔ اسف کہتے ہیں گھبراہٹ کی شدت یا غم کی شدت کو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: "أَيْ حُزْنًا عَلٰی یُوْسُفَ" امام قتادہ رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: "أَيْ جَزَعًا" جب یوسف علیہ السلام کے فراق کا غم حد کو پہنچ گیا اور اس کے ساتھ بنیامین کا فراق بھی آلگا اور یہ سنا کہ وہ مصر کے بادشاہ کے پاس قید ہو گیا ہے تو اور دوگنا صدمہ ہوا اور پرانی کیفیت وجد، ہیجان اور جوش میں آئی، تب یہ کلمہ ان کی زبان شریف سے نکلا اور آنکھ کی سیاہی سفیدی میں

بدل گئی زیادہ رونے کی وجہ سے۔ کہتے ہیں کہ حاسہ بصر کا ادراک جاتا رہا، یعنی آنکھ میں دیکھنے کی صلاحیت ختم ہوگئی۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا کہ چھے سال تک کچھ نظر نہ آتا تھا۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ بات انبیا پر تبلیغ کے بعد جائز ہے۔ کسی نے کہا کہ کم نظر آتا تھا۔ بعض اہلِ لغت کہتے ہیں کہ حزن، پیش اور سکون کے ساتھ رونے کے معنے میں ہے اور دو زبروں کے ساتھ "حَزَن" خوشی کا عکس، یعنی غمی ہے۔ مگر اکثر اہلِ لغت کا قول یہ ہے کہ یہ دو لغت ہیں ایک معنی میں "بُكَاء" (مد کے ساتھ) آواز بلند کرکے رونا ہے اور زیر کے ساتھ "بِكَا" بغیر آواز کے آنسو بہانا ہے۔ یہی اس جگہ مناسب ہے۔ کہتے ہے کہ یہ شدید غم اس بات پر تھا کہ وہ جانتے تھے کہ یوسف علیہ السلام زندہ ہیں، ان کو ان کے مصر میں ہونے کی وجہ سے ان کے دین کا ڈر ہوا، کیوں کہ اہلِ مصر اس وقت کافر تھے۔ بعض نے کہا: صرف حزن کچھ حرام نہیں ہے۔ حرام وہ غم ہے، جس میں کپڑے پھاڑے، تڑپے، چیخے، چلائے اور نا ملائم بات کرے۔

امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا کہ اس آیت میں مصیبت کے وقت افسوس کرنے اور رونے کے جواز پر دلیل ہے، کیوں کہ اس سے باز رہنا تکلیف کے نیچے داخل نہیں ہے، کیوں کہ ایسے لوگ کم ہیں جو تکالیف کے وقت اپنے نفس کے مالک رہیں، یعنی اس پر قابو رکھیں۔[1] نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بیٹے ابراہیم پر گریہ کیا تھا اور فرمایا: "تَدْمَعُ الْعَيْنُ وَيَحْزُنُ الْقَلْبُ، وَلَا نَقُوْلُ مَا يَسْخَطُ الرَّبَّ، وَإِنَّا عَلَيْكَ يَآ إِبْرَاهِيْمُ لَمَحْزُوْنُوْنَ"[2] [آنکھیں آنسو بہا رہی ہیں، دل غمگین ہے، لیکن ہم کوئی ایسی بات نہیں کہیں گے جو رب تعالیٰ کو ناراض کرے، اے ابراہیم! یقیناً ہم تجھ پر سخت غمزدہ ہیں] اسی کی یہ لفظ ﴿ كَظِيْمٌ ﴾ بھی تائید کرتا ہے۔ ﴿ كَظِيْمٌ ﴾ وہ ہے جو غم سے بھر جائے اور غم کو روکنے والا ہو، زبان پر کچھ نہ لائے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ كَظِيْمٌ ﴾ بمعنی "مَحْزُوْن" ہے، یعنی غمگین۔[3]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: بمعنے حزین۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ كَظِيْمٌ ﴾ وہ ہے، جس کا غم اُس کے پیٹ میں ہو اور بجز خیر کے کچھ نہ کہے۔ امام عطا خراسانی رحمہ اللہ کہتے ہیں: بہ معنے "مَكْرُوْب" ہے، یعنی کرب اور تکلیف میں مبتلا۔ اسی طرح امام عکرمہ رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔ امام ضحاک اور مجاہد رحمہما اللہ نے کہا: ﴿ كَظِيْمٌ ﴾ بمعنی کمد (اندوہ گین) ہے۔[4] امام حسن رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب سے یوسف علیہ السلام یعقوب علیہ السلام کے پاس سے نکلے اور پھر ملے، فاصلہ اسّی (۸۰) برس کا تھا۔ ایک دن بھی یعقوب علیہ السلام کی آنکھ آنسو سے خشک نہ ہوئی، حالاں کہ روئے زمین پر اللہ کے نزدیک ان سے زیادہ باعزت انسان کوئی نہیں تھا۔[5] بیٹوں نے کہا کہ تم ہمیشہ یوسف علیہ السلام کو یاد کرتے ہو، یہاں تک

---

[1] تفسير أبي السعود (٤/ ٣٠٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٤١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣١٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٥٨٩)

[3] فتح القدير (٣/ ٦٦) [4] تفسير الطبري (١٦/ ٢١٧ـ ٢١٨) [5] تفسير الطبري (١٦/ ٢٣١ـ ٢٣٢)

کہ مرض سے لاغر ہو گئے ہو۔ (قاله ابن عباس)[1] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ بوڑھے ہو گئے۔[2] اصل حَرَض، جسم یا عقل میں فساد ہے حزن، یا عشق یا بڑھاپے سے۔ سیدنا ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ وغیرہ سے اسی طرح مروی ہے۔ بعض نے کہا: ''حَرَض'' موت سے کم کیفیت کو کہتے ہیں اور ''حَارِض'' بالی داڑ کو کہتے ہیں، یعنی خشک پرانی بالی۔ امام مورج رحمہ اللہ نے کہا: غم سے گھلنے کو۔[3] پھر کہا: یا تم ہلاک ہو جاؤ گے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ یعنی مر جاؤ گے۔[4]

ان کی غرض یعقوب علیہ السلام کو رونے، غم اور افسوس کرنے سے منع کرنا تھا شفقت کے طور پر، اگرچہ وہ خود ہی ان غموں اور اندوہ کا سبب تھے۔ یعقوب علیہ السلام نے کہا کہ میں اپنے رنج و غم اللہ سے کہتا ہوں نہ کہ کسی اور سے۔ مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ انسان جب نازل شدہ مصیبتوں کو چھپانے پر قادر ہوتا ہے تو یہ حزن و غم ہے، اگر قادر نہیں ہوتا اور دوسروں سے اس کا ذکر کرتا ہے تو یہ ''بَثّ'' ہے۔ اس صورت میں ''بَثّ''، حُزن و غم سے اور سخت ہوتا ہے۔ کسی نے کہا: ''بَثّ''، ''هَمّ'' ہے، یعنی فکر یا حاجت۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ''بَثّ'' بہ معنی ''هَمّ'' ہے۔[5]

امام مسلم بن یسار رحمہ اللہ نے مرفوعاً کہا ہے: ''مَنْ بَثَّ لَمْ يَصْبِرْ ثُمَّ قَرَأَ هٰذِهِ الْآيَةَ''[6] (رواه ابن جرير و عبد الرزاق) [جس نے غم کیا اس نے صبر نہیں کیا، پھر اس آیت کی تلاوت کی] پھر یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ جو بات میں اللہ کی طرف سے جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے ہو، یعنی مجھے اللہ کا لطف و احسان و ثواب مصیبت پر معلوم ہے اور وہ آزمائش کو اسی طرح دور کرتا ہے کہ گمان بھی نہ ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یعنی مجھے معلوم ہے کہ اللہ مضطرین کی دعا قبول فرماتا ہے۔[7]

يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۷﴾ فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ ﴿۸۸﴾

اے میرے بیٹو! تم جاؤ اور یوسف اور اس کے بھائی کو ڈھونڈو اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا، بے شک اللہ کی رحمت سے تو کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں (87) پھر جب وہ یوسف کے پاس پہنچے تو

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٨٧) [2] تفسير الطبري (١٦/ ٢٢٣) [3] فتح القدير (٣/ ٦٧)
[4] تفسير الطبري (١٦/ ٢٢٤) [5] تفسير الطبري (١٦/ ٢٢٦)
[6] تفسير الطبري (١٦/ ٢٣١) تفسير الصنعاني (٢/ ٣٢٧۔ ٣٢٨) یہ روایت مرسل ہے۔ [7] فتح البيان (٦/ ٣٨٥۔ ٣٨٩)

انھوں نے کہا: اے عزیز! ہمیں اور ہمارے اہل و عیال کو تکلیف پہنچی ہے اور ہم ناقص پونجی لائے ہیں، چناں چہ آپ ہمیں پورا ماپ دیں اور ہم پر صدقہ خیرات کریں، یقیناً اللہ صدقہ خیرات کرنے والوں کو جزا دیتا ہے (88)

باپ کی طرف سے یوسف اور بنیامین کو تلاش کرنے کا حکم:

قحط میں گھر کا سب اسباب بک گیا۔ اب کی بار اناج خریدنے کے لیے اون، پنیر اور ایسی چیزیں لائے تھے۔ یہ حال سن کر یوسف علیہ السلام کو رحم آیا، اپنے تئیں ظاہر کیا اور سارے گھر کو بلایا۔ اللہ تعالیٰ نے یعقوب علیہ السلام کے حال کی خبر دی کہ انھوں نے بیٹوں کو آمادہ کیا کہ تم زمین میں چل پھر کر یوسف علیہ السلام اور بنیامین کی خبر معلوم کرو۔ تحسس خیر میں اور تجسس شر میں ہوا کرتا ہے۔ نیز ان کو برانگیختہ کر کے بشارت دی اور حکم دیا کہ تم اپنی اُمید سے مایوس نہ ہو، کیوں کہ نا اُمیدی اور اللہ کی رحمت کی اُمید نہ رکھنا، کافروں کا کام ہے۔ سختی سے مراد جدب و قحط اور طعام کی قلت ہے۔

برادرانِ یوسف کھوٹی پونجی کے ساتھ یوسف علیہ السلام کے دربار میں:

﴿ بِبِضَٰعَةٍ مُّزۡجَىٰةٍ ﴾ سے مراد غلہ کی قیمت ہے۔ امام مجاہد، حسن اور غیر واحد نے کہا ہے کہ مراد تھوڑی قیمت ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ﴿ مُّزۡجَىٰةٍ ﴾ ردی، جو رواج نہ پا سکے، جیسے: رسّی، یا کھوٹے درہم، یا صنوبر، یا حبہ خضرا (کچا سبز دانہ)۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: یعنی کھوٹی غیر منفق چیز۔ ابو صالح رحمہ اللہ نے کہا کہ دانہ بطم اخضر و صنوبر لے کر آئے تھے۔[1]

مطلب یہ ہے کہ اس ناقص قیمت کے عوض ہم کو اسی قدر غلہ دو، جو پہلے دیتے تھے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت یہ ہے: "فَأَوْقِرْ رِكَابنَا وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا"[2] ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا: تصدق سے مراد "ہمارے بھائی کو واپس کر دو" ہے۔ امام سعید بن جبیر اور سدی رحمہما اللہ نے کہا کہ مراد یہ ہے کہ ناقص پونجی لے کر درگزر کرو اور پورا ماپ دو۔ سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ سے پوچھا تھا کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کسی اور نبی پر بھی صدقہ حرام تھا یا نہیں؟ کہا تو نے اللہ کا یہ قول نہیں سنا: ﴿ فَأَوۡفِ لَنَا ٱلۡكَيۡلَ وَتَصَدَّقۡ عَلَيۡنَآ ﴾ (رواہ ابن جریر) امام مجاہد رحمہ اللہ سے پوچھا کہ کیا یہ دعا کرنا مکروہ ہے: "اَللّٰهُمَّ تَصَدَّقْ عَلَيَّ" [اے اللہ! مجھ پر صدقہ کر] کہا: ہاں "إِنَّمَا الصَّدَقَةُ لِمَنْ يَبْتَغِي الثَّوَابَ"[3] [صدقہ تو وہ کرتا ہے جو ثواب کا متلاشی ہوتا ہے]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ "تَحَسُّس" کہتے ہیں: کسی شے کے طلب کرنے کو۔ حواس ماخوذ ہے جس سے یا

---

[1] تفسير الطبري (١٦/ ٢٣٥۔ ٢٤٠) [2] تفسير الطبري (١٦/ ٢٣٨) [3] تفسير الطبري (١٦/ ٢٤١۔ ٢٤٣)

احساس سے۔ یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے کہا: جاؤ یوسف علیہ السلام اور اس کے بھائی کی خبر لگاؤ حاسہ سے، یعنی حاسۂ بصر یا سمع سے اور اس کی جستجو کرو۔ اولاً اللہ تعالیٰ کی فراخی و نفاست و رحمت سے نا اُمید نہ ہو۔ امام اصمعی رحمہ اللہ نے کہا: رَوْح نسیم ہوا ہے، جس کو انسان پاتا ہے اور اس سے سکون حاصل کرتا ہے۔ یہ بھی کہا ہے کہ روح دل کی غم سے استراحت ہے۔ امام ابوعمرو رحمہ اللہ نے کہا: روح کشادگی ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: روح رحمت ہے۔[2] کافر جو اللہ کی رحمت سے نا اُمید ہوتے ہیں، یہ اس لیے کہ وہ اللہ کی قدرت اور عظم صنعت وخفیہ لطف و کرم کو نہیں جانتے اور مومن مصیبت کے وقت صبر کر کے کشادگی اور رحمت کا انتظار کرتا ہے، اس لیے خیر کو پہنچ جاتا ہے اور فراخی کے وقت اللہ کی حمد بجا لاتا ہے۔، کافر اس حال کے برخلاف ہوتا ہے۔

بالجملہ جب وہ اپنے والدِ محترم کے حکم کے مطابق چلے اور یوسف علیہ السلام اور بنیامین کی تلاش میں یوسف علیہ السلام کے پاس آئے تو انھوں نے یہ بات کہی کہ اے عزیزِ مصر! ہم کو اور ہمارے گھر والوں کو بھوک اور حاجت نے چھوا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: "ضُر" سے مراد معیشت کی تنگی ہے۔[3] اور شکوے کی طرف منہ پھیرا، کیوں کہ متلاشی اپنی مطلوبہ شے کے لیے ہر قسم کا وسیلہ پکڑتا ہے اور اعتراف کے تمام طریقے استعمال کرتا ہے، مثلاً: اپنی عاجزی، تنگدستی اور حاجت کی شدت کو بیان کرتا ہے۔ تاکہ مخاطب کا دل نرم پڑ جائے۔ انھوں نے چاہا کہ اس طریقے کا تجربہ کریں، اگر عزیز کا دل نرم پڑے تو اپنے مقصود کا ذکر کریں، ورنہ شکوہ کریں۔ آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ ضرورت کے وقت جب کہ اپنی جان پر خوف ہو، شکوہ کرنا درست ہے، جس طرح کہ بیمار کا طبیب کے سامنے اپنی بیماری کو بیان کرنا صحیح ہے۔

یوسف علیہ السلام کے پاس بھائیوں کا یہ آنا تیسری بار تھا۔ ابتدا ہی میں وہ بات نہ کہی، جس کا کہ ان کے باپ نے حکم دیا تھا، اس لیے کہ پہلے یوسف علیہ السلام کو نرمی اور رحمت کی طرف لائیں، پھر مطلب کا اظہار کریں۔ "بِضَاعَة" کہتے ہیں: ذرا سے مال کو، جس سے کوئی شے خرید لانا چاہیں۔ "مُزْجٰةٍ" ناقص اور غیر مکمل کو بولتے ہیں۔ ابوعبیدہ رحمہ اللہ نے کہا کہ کھوٹے روپے کو "مُزْجٰةٍ" کہتے ہیں، اس لیے کہ وہ مردود، مدفوع اور غیر مقبول ہوتا ہے۔[4]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ کھوٹے درہم ہیں، جیسے: پرانی رسیاں اور غرارہ اور کھوٹے دام جو بازار میں نہ چلیں۔[5] اس بضاعت میں اختلاف ہے۔ کسی نے کہا: خشک گوشت یا حیس تھا۔ کسی نے کہا: اون وگھی تھا۔ کسی نے کہا: حبۂ خضرا وصنوبر۔ کسی نے کہا: ردیہ زیوف درہم۔ کسی نے کہا: نعال وادم (چمڑا)۔ پھر یوسف علیہ السلام سے اس بات کے طالب ہوئے کہ ہم کو اس ناروا اور ناقص پونجی سے، جس کو وہ لائے تھے، ہم پر صدقہ (نوازش) کریں۔ اکثر مفسرین اسی کے قائل ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ صدقہ کا حرام ہونا ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے۔

---

[1] فتح القدير (٣/ ٦٨) [2] تفسير البغوي (٤/ ٢٧١) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٩٠)
[4] فتح القدير (٣/ ٦٨) [5] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٩١)

امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا کہ اس تصدق سے مراد یہ ہے کہ ہمارا بھائی ہمیں لوٹا دو۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔[1] امام ابن الانباری رحمہ اللہ نے کہا: وہ چشم پوشی اور آسانی کا سوال کر رہے تھے، جو صدقے کے مشابہ ہے نہ کہ صدقہ کے طالب تھے۔[2] اللہ صدقہ کرنے والوں کو ثوابِ اُخروی دیتا ہے اور اُن پر وسعت کرتا ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: انھوں نے یوں نہ کہا کہ اللہ تم کو جزائے خیر دے گا، اس لیے کہ ان کو یہ بات معلوم نہ تھی کہ وہ مومن ہیں۔[3] جب انھوں نے یہ بات کہی تو پھر یوسف علیہ السلام سے رہا نہیں گیا، اپنے آپ کو ان پر ظاہر کر دیا۔[4]

قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ﴿٨٩﴾ قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ؕ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَآ اَخِيْ ؗ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ؕ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٩٠﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ ﴿٩١﴾ قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ؕ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ؗ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿٩٢﴾

اس نے کہا: کیا تمھیں معلوم ہے کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا، جب تم نادان تھے؟ (89) وہ بولے: کیا واقعی تو یوسف ہی ہے؟ اس نے کہا: (ہاں) میں یوسف ہی ہوں، اور یہ میرا بھائی ہے۔ یقیناً اللہ نے ہم پر احسان کیا ہے۔ بے شک جو شخص تقویٰ اختیار کرے اور صبر کرے تو اللہ نیکوں کا اجر ضائع نہیں کرتا (90) انھوں نے کہا: اللہ کی قسم! یقیناً اللہ نے تجھے ہم پر فضیلت دی، اور بلاشبہ ہم ہی خطا کار تھے (91) یوسف نے کہا: تم پر آج کوئی ملامت نہیں، اللہ تمھاری مغفرت کرے اور وہ ارحم الراحمین ہے (92)

یوسف علیہ السلام کا بھائیوں کو اپنا تعارف کروانا:

جس پر تکلیف پڑے اور وہ شرع سے باہر نہ ہو اور گھبرائے نہیں تو آخر مصیبت سے زیادہ ملے اور عطا ہو۔ بھائیوں نے کہا کہ تیرا خواب سچ تھا اور ہمارا حسد غلط۔ اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کے حال کی خبر دی کہ جب بھائیوں نے اپنی تنگی، تکلیف، قلتِ طعام، عمومِ جدب اور قحط سالی کا ذکر کیا تو یوسف علیہ السلام کو اپنے باپ یاد آئے اور اُن کے غم کا خیال آیا جو انھیں اپنی گم شدگی اور بھائی کی جدائی کے سبب سے پہنچا کہ وہ اس تکلیف اور رنج میں ہیں اور میں اس

[1] تفسیر الطبري (١٦/ ٢٤٢) تفسیر البغوي (٤/ ٢٧٢) [2] تفسیر الخازن (٣/ ٣١١)
[3] تفسیر البغوي (٤/ ٢٧٢) [4] فتح البيان (٦/ ٣٩٠_ ٣٩٣)

شان وشوکت، ملک، غلبہ اور وسعت میں ہوں، اپنے باپ اور بھائیوں پر رقت، نرمی، رحمت اور شفقت کے جذبے نے جوش مارا اور رونا آ گیا، تب بھائیوں کو پہچان کروائی کہ میں ہی یوسف ہوں اور اپنے سر سے تاج اُٹھا کر دکھا دیا، ان کی پیشانی پر ایک تل تھا اور کہا کہ تم جانتے ہو کہ تم نے یوسف علیہ السلام اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے کہ باپ سے ان کو جدا کر دیا۔ تم کو تمھاری جہالت نے اس بات پر آمادہ کیا۔

بعض سلف نے کہا ہے: "کُلُّ مَنْ عَصَی اللّٰہَ فَھُوَ جَاھِلٌ" [ہر اللہ کا نافرمان جاہل ہوتا ہے] پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْٓا اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [النحل: ۱۱۹] "پھر بے شک آپ کا رب ان پر (مہربان ہے) جنھوں نے جہالت سے برے عمل کیے، پھر اس کے بعد انھوں نے توبہ کی اور اپنی اصلاح کر لی، بے شک اس کے بعد آپ کا رب (ان لوگوں کے لیے) البتہ بہت بخشنے والا، نہایت مہربان ہے۔" ظاہر - واللہ أعلم - یہ ہے کہ بھائیوں کے سامنے اپنے آپ کو اس طرح شناسا کرنا، اللہ کے اذن سے تھا، جس طرح کہ پہلی دو مرتبہ میں اللہ کے حکم سے اپنے آپ کو مخفی رکھا، لیکن جب حال تنگ ہوا اور امر سخت ہوا اللہ تعالیٰ نے اس تنگی سے کشادگی بخشی۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ﴾ [الإنشراح: ٥۔ ٦] "پھر بے شک ہر تنگی کے ساتھ آسانی ہے۔ بے شک ہر تنگی کے ساتھ آسانی ہے۔" اس دم بھائی بولے کہ کیا تو یوسف ہے؟

سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قراءت یہ ہے: "إِنَّكَ لَأَنْتَ يُوسُفُ" [1] یعنی انھوں نے تعجب کیا کہ ہم دو سال سے آتے جاتے ہیں اور ہم نے اب تک آپ کو نہ پہچانا اور انھوں نے ہم کو پہچان لیا اور اپنے آپ کو اب تک پوشیدہ رکھا، اس لیے سوالیہ انداز سے کہا گیا کہ کیا تو یوسف ہے؟ تب فرمایا: ہاں! میں یوسف ہوں اور وہ بنیامین میرا بھائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان کیا کہ جدائی کے بعد پھر بھائی سے ملایا اور ایک مدت دراز کے بعد اکٹھا کر دیا، جو کوئی اللہ سے ڈرتا ہے اور صبر کرتا ہے تو اللہ اس کا اجر برباد نہیں کرتا۔

عفو و درگزر کی ایک درخشندہ مثال:

تب یوسف علیہ السلام کی فضیلت کا اعتراف کیا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تجھ کو ہم پر اختیار کیا یعنی خلق، اخلاق، وسعت، بادشاہت، غلبہ اور نبوت میں اور اس بات کا اقرار کیا کہ ہم سے تیرے حق میں بدی اور خطا ہوئی۔ اس وقت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ آج کے دن تم پر کچھ عتاب اور ملامت نہیں ہے اور میں آج کے دن کے بعد تم کو تمھارا گناہ

[1] یہ قراءت سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے بجائے ابن محیصن رحمہ اللہ کی ہے اور سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قراءت کچھ یوں ہے: "أَوَ أَنْتَ يُوسُفُ"، تفصیل کے لیے دیکھیں: تفسیر الطبري (١٦/ ٢٤٥)

نہیں جتلاؤں گا۔ پھر ان کو دعائے مغفرت دی اور اللہ کو ارحم الراحمین فرمایا۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ بھائیوں نے معذرت کی، انھوں نے کہا کہ میں تمھارے گناہ کا ذکر نہ کروں گا۔ امام ابن اسحاق وثوری رحمہما اللہ نے کہا کہ ﴿ تَثْرِيْبَ ﴾ سے مراد ''تَأْنِیْبَ'' ہے،[1] یعنی جو کچھ تم نے کیا، سو کیا، اللہ تمھارا گناہ بخشے، وہ بڑا رحیم ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یوسف علیہ السلام کا بھائیوں سے یہ سوال کرنا کہ تم جانتے ہو کہ تم نے یوسف کے ساتھ کیا کیا، ڈانٹ اور سرزنش کے لیے تھا، کیوں کہ وہ تو اپنے قصور کو جانتے تھے، لیکن یوسف علیہ السلام کے اس ذکر سے مراد اس واقعے کی تعظیم تھی، گویا یہ بات جتلائی کہ ''مَا أَعْظَمَ الْأَمْرِ الَّذِيْ اِرْتَکَبْتُمْ مِنْ یُوْسُفُ وَأَخِیْهِ وَمَا أَقْبَحَ مَا أَقْدَمْتُمْ عَلَیْهِ'' [تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کسی قدر بڑی غلطی کا ارتکاب کیا اور تم نے کتنی قبیح حرکت کی] جس طرح کسی عاصی سے کہتے ہیں: ''هَلْ تَدْرِيْ مَا عَصَیْتَ'' [جانتے بھی ہو کہ تم نے کتنی بڑی نافرمانی کی ہے؟!] مفسرین نے کہا ہے کہ جو کچھ یوسف علیہ السلام کے ساتھ کیا تھا، اس کا ذکر اوپر گزر چکا اور بھائی کے ساتھ یہ کیا کہ یوسف علیہ السلام سے جدا کر کے غم میں ڈالا اور حقارت اور توہین کے ساتھ رکھا اور یعقوب علیہ السلام کی تکلیف کے بارے میں سوال نہ کیا، اس کی تعظیم اور رفعتِ قدر کی غرض سے، کیوں کہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ ایک ان کا اللہ کی طرف سے بلندیِ درجات کے لیے امتحان تھا۔

پھر یوسف علیہ السلام نے ان کو جاہل ٹھہرایا، اس لیے کہ انھوں نے علم کے تقاضوں پر عمل نہ کیا۔ یا عذر اور تخفیفِ امر کے لیے ایسا فرمایا، یعنی یہ برا کام تم سے اس لیے ہوا کہ تم اس کو گناہ نہ سمجھتے تھے اور انجام کے متعلق نہیں جانتے تھے۔ یا یہ مطلب تھا کہ تم اس وقت بچپن میں اور چھوٹی عمر میں تھے، تاکہ وہ شرمندہ نہ ہوں، حالاں کہ خوب معلوم تھا کہ وہ اس وقت بڑے تھے نہ کہ چھوٹے۔ یہ آیت اس قول کی تصدیق ہے: ﴿ وَاَوْحَیْنَاۤ اِلَیْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴾ [یوسف: ۱۵] ''تب ہم نے یوسف کی طرف وحی بھیجی کہ تو انھیں ان کا یہ کام ضرور بتائے گا، جب کہ وہ نہیں سمجھتے ہوں گے۔'' تب انھوں نے تعجب سے کہا کہ کیا تو یوسف ہے؟! وہ صرف کہنے سے کہ ﴿ مَا فَعَلْتُمْ بِیُوْسُفَ وَاَخِیْهِ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) پہچان گئے، کیوں کہ سمجھ گئے کہ ایسی بات سوائے یوسف کے اور کون کہہ سکتا ہے۔ بعض نے کہا کہ یوسف علیہ السلام نے سر سے تاج اُٹھا لیا اور بعض نے کہا: تبسم کیا، اس سے انھوں نے پہچان لیا۔ پھر فرمایا کہ ہاں میں یوسف ہوں۔

امام ابن الانباری رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ نہ کہا کہ ہاں میں وہی ہوں، بلکہ نام لیا کہ میں یوسف ہوں۔ اس سے

[1] تفسیر الطبري (١٦/ ٢٤٧) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٦٣٦)

مراد تعظیم تھی، یعنی میں وہی مظلوم ہوں، جس کے قتل کا تم نے ارادہ کیا تھا اور یہ میرا بھائی ہے کہ اس پر بھی ظلم ہوا ہے۔[1] اللہ کا ہم پر احسان ہے کہ اس نے ہم کو اس آزمایش سے نجات بخشی، یا خیرِ دارین عطا کی، یا تفرقے کے بعد اکٹھا کر دیا، یا دنیا اور دین میں سلامت رکھا اور اگر یہ سب معانی مراد ہوں تب بھی کوئی مانع نہیں ہے۔

بات یہ ہے کہ جو شخص اللہ سے ڈر کر ثابت رہتا ہے، یعنی گناہ سے بچتا اور آزمایش پر صبر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والے کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ بعض نے کہا کہ مراد زنا سے بچنا ہے اور بغیر عورت کے رہنے پر صبر کرنا، یا معصیت سے بچنا اور قید ہونے پر صبر کرنا، یا فرائض کو ادا کرنا اور حرام کردہ چیزوں پر صبر کرنا، یا بے حیائی سے بچنا اور اطاعت پر صبر کرنا، لیکن عمومیت زیادہ صحیح ہے۔ کسی خاص قسم کے عمل کو خاص کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ بھائیوں نے کہا کہ اللہ نے تجھ کو صفاتِ کمال یا علم یا عقل یا حکومت میں ہم پر اختیار کیا۔ (قاله الضحاك) یا صبر پر (قاله أبو صالح)[2] یا علم اور درگزر کرنے پر، یا حسن و جمال پر، یا نبوت پر، یا تمام فضائل پر۔ بالجملہ لفظ بہت وسیع مفہوم رکھتا ہے اور یہ تمام صفتیں جن کا ذکر کیا گیا ہے، بدرجہ اولیٰ اس میں داخل ہیں۔ یہ بھائیوں کا یوسف علیہ السلام کے فضل و عظمت اور قدر و منزلت کا اعتراف ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ انبیا نہ ہوں، کیوں کہ انبیا کے مرتبے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ﴾ [البقرة: ٢٥٣] ''یہ سب رسول ہیں، ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی۔''

غرض یہ کہ جب انھوں نے اپنی خطا کا اعتراف کر لیا تو یوسف علیہ السلام نے کہا کہ آج کے دن تم پر کوئی سرزنش، سزا، ڈانٹ ڈپٹ اور ملامت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ تمھارا قصور معاف کرے، اللہ بڑا رحیم ہے۔ امام ابن الانباری رحمہ اللہ نے کہا کہ یعنی جب تم نے اپنے گناہ کا اقرار کر لیا تو اب میری ڈانٹ ڈپٹ تم سے منقطع ہوگئی۔[3] عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے حدیث میں مروی ہے کہ جب مکہ فتح ہوا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کی طرف توجہ کر کے فرمایا: تم کیا کہتے ہو اور کیا گمان رکھتے ہو؟ کہا: تم ہمارے ابن عم کریم (چچا کے محترم بیٹے ہو) فرمایا: ﴿ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ﴾[4] (أخرجه أبو الشيخ)

امام عطا خراسانی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حالات کا جوانوں سے طلب کرنا، بوڑھوں کی نسبت آسان ہوتا ہے تو نے یوسف علیہ السلام کا قول نہیں سنا: ﴿ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ... الخ ﴾ اور یعقوب علیہ السلام نے کہا تھا: ﴿ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ﴾ [يوسف: ٩٨] ''عن قریب میں اپنے رب سے تمھارے لیے مغفرت مانگوں گا۔''[5] بعض نے کہا کہ اس کلام میں نظر ہے۔ امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب یہ ماجرا برادرانِ یوسف علیہ السلام کا گزرا تو یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام

---

[1] فتح القدير (٣/ ٧١) [2] تفسير الخازن (٣/ ٣١٣) [3] فتح القدير (٣/ ٧٢)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٩٥) [5] الدر المنثور (٤/ ٥٧٨)

کو لکھا، وہ نہ جانتے تھے کہ یوسف ہیں: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. مِنْ يَعْقُوبَ بْنِ إِسْحَاقَ ابْنِ إِبْرَاهِيْمَ إِلٰى عَزِيْزِ آلِ فِرْعَوْنَ سَلَامٌ عَلَيْكَ فَإِنِّي أَحْمَدُ إِلَيْكَ اللّٰهَ الَّذِيْ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ أَمَّا بَعْدُ! فَإِنَّا أَهْلُ بَيْتٍ مُوْلَعٌ بِنَا أَسْبَابُ الْبَلَا، كَانَ جَدِّيْ إِبْرَاهِيْمُ خَلِيْلُ اللّٰهِ أُلْقِيَ فِي النَّارِ فِيْ طَاعَةِ رَبِّهِ، فَجَعَلَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ بَرْدًا وَّسَلَامًا، وَ أَمَرَ اللّٰهُ جَدِّيْ أَنْ يَذْبَحَ لَهُ أَبِيْ، فَفَدَاهُ اللّٰهُ بِمَا فَدَاهُ، وَكَانَ لِيَ ابْنٌ وَكَانَ أَحَبَّ النَّاسِ إِلَيَّ فَفَقَدْتُهُ فَأَذْهَبَ حُزْنِيْ عَلَيْهِ نُوْرَ بَصَرِيْ، وَكَانَ لَهُ أَخٌ مِنْ أُمِّهِ كُنْتُ إِذَا ذَكَرْتُهُ ضَمَمْتُهُ إِلٰى صَدْرِيْ، فَأَذْهَبَ عَنِّيْ بَعْضَ وَجْدِيْ وَهُوَ الْمَحْبُوْسُ عِنْدَكَ فِي السَّرِقَةِ وَإِنِّيْ أُخْبِرُكَ لَمْ أَسْرِقْ وَلَمْ أَلِدْ سَارِقًا. جب یہ خط پہنچا تو یوسف علیہ السلام رونے لگے اور کہا:[1]

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹۳﴾ وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَاۤ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ ﴿۹۴﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ ﴿۹۵﴾

تم میری یہ قمیص لے جاؤ، اور اسے میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو، وہ بینا ہو جائیں گے، اور تم اپنے تمام اہل وعیال کو میرے پاس لے آؤ (93) اور جب قافلہ (مصر سے) چلا تو ان کے باپ نے کہا: بے شک میں یوسف کی مہک پاتا ہوں، اگر تم مجھے بہکا ہوا نہ کہو (94) (ان کے پاس موجود لوگ) بولے: اللہ کی قسم! بلاشبہ آپ اپنی قدیم غلطی پر ہیں (95)

یعقوب علیہ السلام کا یوسف علیہ السلام کی خوشبو محسوس کرنا:

اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر مرض کی دوا ہے۔ ایک شخص کی جدائی میں آنکھیں لے لیں تھیں، اسی کے بدن کی چیز ملنے سے چنگی بھلی ہوگئیں، یہ یوسف علیہ السلام کی کرامت تھی۔ یعقوب علیہ السلام زیادہ رونے کی وجہ سے نابینا ہوگئے تھے۔ جب قافلہ مصر سے روانہ ہوا، ہوا چلی، اس نے یوسف رضی اللہ عنہم کے پیراہن کی خوشبو یعقوب علیہ السلام کو پہنچائی، تب کہا کہ میں یوسف کی بو پاتا ہوں، اگر تم مجھ کو ملامت نہ کرو۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ آٹھ دن کی راہ سے یہ بو پائی۔ حسن وابن جریج رحمہ اللہ نے کہا کہ یعقوب علیہ السلام اور یوسف علیہ السلام کے درمیان اسّی (۸۰) فرسخ کا فاصلہ تھا اور جدا ہوئے بھی اسّی (۸۰) برس ہو چکے تھے۔[3]

---

[1] الدر المنثور (٤/ ٥٧٩) فتح البيان (٦/ ٣٩٣_٣٩٦)

[2] تفسير الطبري (١٦/ ٢٤٩) [3] تفسير ابن كثير (٢/ ٦٣٦)

امام مجاہد، عطا، قتادہ، سعید بن جبیر رحمہ اللہ اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: ﴿ تُفَنِّدُوْنِ ﴾ بمعنی "تَسْفَهُوْنِ" ہے، یعنی اگر تم مجھ کو بے وقوف نہ ٹھہراؤ۔ جس نے کہا: بمعنی "تُهْرِمُوْنَ"، یعنی بوڑھا بہک گیا۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: "ضلال" سے مراد خطا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: یعنی تو بسبب حُبّ یوسف علیہ السلام کو نہیں بھولتا اور تجھ کو کسی طرح تسلی نہیں ہوتی۔ یہ کلمۂ درشت ان کو اپنے باپ سے نہ کہنا چاہیے تھا اور نہ اللہ کے نبی سے۔ امام سدی رحمہ اللہ وغیرہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یوسف علیہ السلام نے بھائیوں سے کہا کہ تم میری یہ قمیص لے جاؤ، یہ وہ قمیص تھی، جس کو ابراہیم علیہ السلام اس وقت پہنے ہوئے تھے، جب آگ میں ڈالے گئے تھے اور ابراہیم علیہ السلام نے وہ قمیص اسحاق علیہ السلام کو پہنائی تھی اور اسحاق علیہ السلام نے یعقوب علیہ السلام کو اور یعقوب علیہ السلام نے اس قمیص کو لپیٹ کر ایک کانے (بانس) کے اندر رکھ کر یوسف علیہ السلام کی گردن میں لٹکا دیا تھا، اس ڈر سے کہ کہیں ان کو کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ جبریل علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کو خبر دی کہ اس قمیص کو تم یعقوب علیہ السلام کے پاس بھیج دو، وہ بینا ہو جائیں گے، اس لیے کہ اس قمیص میں جنت کی بو ہے، یہ جس بیمار پر گرے گی، اس سے شفا ہوگی اور جس مصیبت زدہ پر پڑے گی، وہ تندرست ہو جائے گا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اگر بھائیوں کو معلوم ہوتا تو یوسف علیہ السلام کو کنوئیں میں گراتے وقت اس کو لے لیتے۔ جب اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ یوسف علیہ السلام کو یعقوب علیہ السلام پر پھیر دے اور اُن کے خواب اور اس کی تعبیر کے درمیان چالیس برس کا فاصلہ تھا تو بشیر کو حکم دیا کہ آٹھ مرحلہ میں بشارت پہنچائے۔

یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کی خوشبو پائی۔ جنت کی کوئی شے جب دنیا کی آفتوں میں سے کسی آفت پر واقع ہوتی ہے تو وہ اللہ کے اذن سے اس کا دُکھ درد دور کر دیتی ہے۔[3] یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ تم اس قمیص کو لے جا کر میرے باپ کے منہ پر ڈال دو، وہ بینا ہو کر میرے پاس تشریف لے آئیں گے۔ یہ بات اللہ کے حکم سے کہی تھی۔ بعض نے کہا کہ قمیص اس لیے بھیجی کہ ان کا رونا بند ہو اور دل منشرح ہو (کھل جائے)۔ یہوذا نے کہا کہ میں اس قمیص کو شفا کے لیے لے جاؤں گا، جس طرح کہ قمیصِ جفا کو لے گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ ننگے پاؤں اور ننگے سر اس قمیص کو مصر سے کنعان تک لے گئے۔ یہ اسّی (۸۰) فرسخ کا راستہ تھا۔ پھر یوسف علیہ السلام نے کہا کہ تم اپنے سارے گھر والوں کو لیتے آؤ، یعنی عورتوں اور چھوٹے بچوں وغیرہم کو۔ کہتے ہیں کہ وہ سب ستر (۷۰) نفر تھے یا تہتر (۷۳) نفر۔ پھر جب قافلہ عریشِ مصر سے یا مصر سے شام کی طرف چلا تو یعقوب علیہ السلام نے جو اہلِ کنعان میں سے ان کے پاس تھے، ان سے

[1] تفسیر الطبري (١٦/ ٢٥٣۔ ٢٥٥) [2] تفسیر الطبري (١٦/ ٢٥٧) [3] الدر المنثور (٤/ ٥٨٠)

فرمایا کہ مجھے یوسف علیہ السلام کی بو آتی ہے، یعنی حاسۂ شم سے مراد جنت کی خوشبو ہے، یوسف کی قمیص سے یہ اضافت ملابست (تشبیہ) سے کی۔

کہتے ہیں کہ تیز ہوا چلی، قمیص کو لگی، اس سے جنت کی خوشبوئیں دنیا میں پھیلیں۔ ہوا اُس خوشبو کو باوجود اس طویل مسافت کے یعقوب علیہ السلام کے پاس لائی۔ اس پر انھوں نے خبر دی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ آٹھ دن کی راہ سے وہ بو آئی،[1] یا دس دن کی راہ سے، یا اسّی فرسخ سے۔ ''فَنَد'' کہتے ہیں: عقل کے چلے جانے کو بڑھاپے کی وجہ سے۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا: ''تفنید'' بمعنے ''لَوم'' ہے۔[2] کچھ ہوں مطلب سب معانی کا رائے کا عاجز اور ناقص ہونا ہے۔ کہتے ہیں کہ بادِ صبا نے اپنے رب سے اجازت چاہی کہ میں بشیر (خوش خبری دینے والا) کے پہنچنے سے پہلے ہی یعقوب علیہ السلام کو یوسف علیہ السلام کی خوشبو پہنچا دوں۔ اہلِ معانی نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کی خوشبو کو مدتِ محنت (آزمایش) کے پورا ہونے کے وقت دور دراز مقام سے پہنچا دیا اور باوجود دونوں مقام کے قریب ہونے کے ایک کی خبر کو دوسرے تک پہنچنے سے منع کیا اور اسّی (۸۰) برس کی مدت گزر گئی۔

یہ اس بات پر دلیل ہے کہ ہر تھوڑی مدت جس میں تکلیف ہو، وہ مشکل ہے اور ہر لمبی مدت جس میں اقبال (رضا مندی، آرام) ہو، وہ آسان ہے۔ جو لوگ اس وقت یعقوب علیہ السلام کے پاس حاضر تھے انھوں نے کہا: اللہ کی قسم! تم اپنی اسی قدیم غلطی میں پڑے ہو اور صحیح راستے سے دور ہو۔ یوسف علیہ السلام کی محبت کے جوش میں باوجود اتنی لمبی مدت گزر جانے کے اب تک ملنے کی اُمید رکھتے ہو اور کسی طرح اس کو بھولتے نہیں ہو اور نہ تھکتے ہو۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا: ضلال کہتے ہیں جنون کو[3] یا محبت کو۔ (قاله مجاهد)[4] یہ بات انھوں نے اس وجہ سے کہی کہ ان کو بشیر کے آنے کی خبر نہ تھی اور وہ یوسف علیہ السلام کو مردہ سمجھ چکے تھے۔[5]

فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ۚ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيْنَ ﴿۹۷﴾ قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۹۸﴾

پھر جب بشارت دینے والا آیا، اس نے وہ (قمیص) اس کے چہرے پر ڈالی تو وہ (یعقوب) پھر سے بینا ہوگیا، اس (یعقوب) نے کہا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ بے شک میں اللہ کی طرف سے وہ

[1] تفسير الطبري (١٦/ ٢٤٩) [2] فتح القدير (٣/ ٧٣) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٩٨)
[4] الدر المنثور (٤/ ٥٨٣) [5] فتح البيان (٦/ ٣٩٧۔ ٣٩٩)

جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے؟ 96 انھوں نے کہا: اے ہمارے ابا جان! ہمارے لیے ہمارے گناہوں کی مغفرت مانگیں، بے شک ہم ہی خطا کار تھے 97 اس (یعقوب) نے کہا: عن قریب میں اپنے رب سے تمھارے لیے مغفرت مانگوں گا، بے شک وہی خوب بخشنے والا (اور) خوب رحم کرنے والا ہے 98

یعقوب علیہ السلام کا بینا ہونا اور برادرانِ یوسف علیہ السلام کا اپنی سابقہ غلطی پر نادم ہو کر بخشش کا مطالبہ کرنا:

یوسف علیہ السلام نے کرتا اور سواری اور خرچ بھیجا، اپنے غلام کے ہاتھ، اس نے آکر کرتا منہ پر ڈال دیا اور خوش خبری دی۔ اسی وقت آنکھیں کھل گئیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ اَلْبَشِيْرُ ﴾ سے مراد برید (قاصد) ہے۔ امام مجاہد اور سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ بشیر یہوذا بن یعقوب تھا۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: یہ اس لیے قمیص کو لایا کہ پہلے بھی جھوٹا خون لگی ہوئی قمیص یہی یہوذا لے کر آیا تھا۔ چاہا کہ اس دھبے کو اس قمیص سے دھوئے۔[1] سو لاکر باپ کے منہ پر ڈال دیا، وہ بینا ہو گئے اور اپنے بیٹوں سے کہا کہ کیوں میں نے کہا نہیں تھا کہ میں اللہ کی طرف سے یہ بات جانتا ہوں کہ وہ یوسف علیہ السلام کو پھیر لائے گا اور میں نے نہ کہا تھا کہ میں یوسف کی ہوا پاتا ہوں، اگر تم مجھ کو ملامت نہ کرو۔ تب وہ باپ کے سامنے نرم پڑ کر کہنے لگے کہ ہم خطاوار ہیں، ہمارے گناہ بخشواؤ۔ تب انھوں نے وعدہ کیا، یعنی "مَنْ تَابَ إِلَيْهِ تَابَ عَلَيْهِ" [جو اس کی طرف رجوع کرے گا وہ اس کی توبہ قبول کرے گا] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، ابراہیم تیمی، عمرو بن قیس اور ابن جریج رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے سحر کے وقت تک ان کو تاخیر دی۔[2]

حکایت:

امام ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ مسجد میں آتے، ایک انسان کی آواز سنتے، وہ کہتا: "اَللّٰهُمَّ دَعَوْتَنِيْ فَأَجَبْتُ، وَأَمَرْتَنِيْ فَأَطَعْتُ، وَهٰذَا السَّحَرُ فَاغْفِرْ لِيْ" [اے اللہ! تو نے مجھے بلایا تو میں حاضر ہو گیا، تو نے مجھے حکم دیا تو میں نے مان لیا، یہ سحری کا وقت ہے مجھ کو بخش دے] اس آواز پر کان رکھے، وہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے گھر سے آتی تھی۔ ان سے پوچھا، کہا: یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد کی مغفرت کی دعا کو سحر کے وقت تک تاخیر دی اور کہا: ﴿ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ﴾[3] [یوسف: ۹۸] حدیث میں مروی ہے کہ یہ واقعہ جمعہ کی شب کو تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے مرفوعاً کہا ہے: "سَوْفَ أَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ، يَقُوْلُ: حَتّٰى تَأْتِيَ لَيْلَةُ الْجُمُعَةِ

[1] تفسیر الطبري (١٦/ ٢٥٨۔ ٢٥٩) [2] تفسیر الطبري (١٦/ ٢٦٢)

[3] تفسیر الطبري (١٦/ ٢٦١) تفسیر طبری میں "عمر رضی اللہ عنہ" کے بجائے "عم (چچا)" کے الفاظ مروی ہیں، البتہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر (٢/ ٦٣٧) میں "عمر" کے الفاظ ہی ذکر کیے ہیں۔

وَهُوَ قَوْلُ أَخِي يَعْقُوبَ لِبَنِيهِ"[1] [عن قریب میں اپنے رب تعالیٰ سے تمھارے لیے بخشش مانگوں گا۔ فرماتے تھے: یعنی حتی کہ جمعے کی رات آجائے، یہ بات یعقوب کے بھائی نے اپنے بیٹوں سے کہی] (رواه ابن جرير وهذا غريب من هذا الوجه وفي رفعه نظر، والله أعلم)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جب قافلے کے آگے آگے بشیر آیا اور اس نے وہ کرتا یعقوب کے منہ پر ڈالا تو وہ اسی وقت پہلے کی طرح بینا ہوگئے اور صحت وقوت ومسرت آگئی۔ امام حسن رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بشیر سے پوچھا: تو نے یوسف کو کس دین پر چھوڑا؟ کہا: اسلام پر۔ فرمایا: "أَلْآنَ تَمَّتِ النِّعْمَةُ"[2] [اب نعمت مکمل ہوگئی ہے] تب اپنے پاس کے لوگوں سے کہا: میں نے نہ کہا تھا کہ جو مجھ کو اللہ کی طرف سے معلوم ہے، وہ تم کو معلوم نہیں ہے۔ اس سے مراد وہ قول ہے جو پہلے گزر چکا ہے: ﴿ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ﴾ [یوسف: ٨٦] یعنی یوسف (علیہ السلام) زندہ ہے اور اللہ مجھ کو اس سے ملائے گا، تب بھائیوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کر کے مغفرت چاہی اور عذر کیا۔ اس پر وعدہ کیا کہ اچھا میں سحر کے وقت استغفار کروں گا کہ وہ وقت دعا کی قبولیت کا ہے نہ یہ کہ بخل کیا ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ صبح تک تاخیر کی، اس لیے کہ صبح کو نماز پڑھتے تھے اور سحر کی دعا مستجاب ہوتی ہے۔[3] اس لیے کہ یہ تمام اوقات سے زیادہ اچھا وقت ہوتا ہے۔ بعض نے کہا: یہ تاخیر اس لیے فرمائی کہ یوسف علیہ السلام سے معاف کرا لیں، کیوں کہ ان کو معلوم نہ تھا کہ یوسف علیہ السلام نے معاف کر دیا ہے یا نہیں، یا اس لیے کہ ان کا حال معلوم ہو جائے کہ توبہ سچی کی ہے یا نہیں۔[4]

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ﴿٩٩﴾ وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ يٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ ۡ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ۭ وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْٓ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿١٠٠﴾

چناں چہ جب وہ یوسف کے پاس پہنچے تو اس نے اپنے ماں باپ کو اپنے پاس جگہ دی اور کہا: تم مصر

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٧٠) تفسير الطبري (١٦/ ٢٦١۔ ٢٦٢) اس کی سند میں "ولید بن مسلم" مدلس راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٣٣٧٤)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢١٩٩) [3] الدر المنثور (٤/ ٥٨٤) [4] فتح البيان (٦/ ٤٠٠۔ ٤٠١)

میں داخل ہو جاؤ، دراں حالیکہ تم امن سے ہو، اگر اللہ نے چاہا (99) اور اس نے اپنے ماں باپ کو تخت پر اونچا بٹھایا اور سب اس کے آگے سجدے میں گر گئے اور یوسف نے کہا: اے میرے ابا جان! یہ میرے پہلے کے خواب کی تعبیر ہے۔ میرے رب نے اسے سچا کر دیا ہے، اور تحقیق اس نے مجھ پر احسان کیا جب اس نے مجھے قید سے نکالا اور تمھیں دیہات سے (یہاں) لے آیا، اس کے بعد کہ شیطان نے (ورغلا کر) میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان پھوٹ ڈال دی تھی، بے شک میرا رب نہایت باریک بینی سے جو چاہے تدبیر کرتا ہے، بے شک وہی علیم وحکیم ہے (100)

اہلِ کنعان مصر میں:

شہر سے باہر استقبال کو نکلے، وہاں یہ کہا، جو اللہ کے احسان تھے ان کا ذکر کیا اور شیطان کی وجہ سے جو تکلیف پہنچی تھی اس کو زبان پر نہ لائے۔ مجملاً حالات سنا دیے۔ پہلے وقتوں میں سجدۂ تعظیم آپس میں ہوتا تھا۔ فرشتوں نے آدم علیہ السلام کو کیا ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے وہ رواج موقوف کر دیا اور فرمایا: ﴿ وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴾ [الجن: ١٨] ''اور یہ کہ مسجدیں اللہ ہی کے لیے ہیں، لہٰذا اللہ کے ساتھ کسی کو بھی نہ پکارو۔'' اس وقت پہلے رواج پر چلنا ایسا ہے کہ کوئی بہن سے نکاح کرے کہ آدم علیہ السلام کے وقت میں ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یعقوب علیہ السلام کا یوسف علیہ السلام کے پاس وارد ہونے اور بلادِ مصر میں داخل ہونے کا ذکر فرمایا ہے۔ یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہہ دیا تھا کہ تم سب گھر والوں کو یہاں لے آؤ، اس لیے وہ سب کو سمیٹ کر از اول تا آخر لے آئے اور بلادِ کنعان سے بلادِ مصر کے لیے سفر اختیار کیا۔

یوسف علیہ السلام کی طرف سے اپنے والدین کا شاندار استقبال:

جب یوسف علیہ السلام کو خبر ہوئی کہ وہ سب کے سب آتے ہیں اور نزدیک آگئے ہیں تو ان کے استقبال کے لیے نکلے۔ بادشاہ نے اپنے امرا اور اکابرین کو حکم دیا کہ تم سب یوسف علیہ السلام کے ہمراہ جاؤ اور نبی یعقوب علیہ السلام کو لے آؤ۔ کہتے ہیں خود بادشاہ بھی ان کو لینے کے لیے باہر نکلا تھا، یہی اشبہ ہے۔ لیکن اکثر مفسرین پر ﴿ اٰوٰۤى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ ﴾ اور قولہ: ﴿ اُدْخُلُوْا مِصْرَ ﴾ مشکل ہوا۔ بعض نے کہا کہ یہ کلام آگے پیچھے کیا گیا ہے، یعنی یوں کہا کہ تم مصر میں داخل ہو۔ پھر اپنے ماں باپ کو جگہ دی اور تخت پر بٹھایا۔ لیکن امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کی تردید کی ہے اور ٹھیک تردید کی ہے۔

پھر امام سدی رحمہ اللہ کے قول کو اختیار کیا کہ یوسف علیہ السلام نے اپنے ماں باپ کو ملاقات کے وقت اپنے پاس بٹھایا۔ پھر جب شہر کے دروازے پر پہنچے تو کہا: ان شاء اللہ تعالیٰ خاطر جمع سے مصر میں داخل ہو جاؤ،[1] لیکن اس میں بھی

---

[1] تفسیر الطبري (١٦/ ٢٦٥۔ ٢٦٦)

نظر ہے۔ اس لیے کہ جگہ دینا گھر میں ہوتا ہے، اس قول کے مطابق: ﴿ اٰوٰۤى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ ﴾ [یوسف: ۹۹] ''اس نے اپنے ماں باپ کو اپنے پاس جگہ دی۔'' اور حدیث میں مروی ہے: « مَنْ آوٰی مُحْدِثًا » [1] [جو کوئی کسی بدعتی کو جگہ دے گا] اور اس سے کون مانع ہے کہ یوسف علیہ السلام نے یہ بات ان کے داخل ہونے کے بعد اور ان کو جگہ دینے کے بعد کہی ہو کہ « اُدْخُلُوْا مِصْرَ أَيِ اسْكُنُوْا مِصْرَ آمِنِيْنَ » یعنی تکلیف اور قحط سے امن میں ہوکر۔ واللّٰه تعالیٰ أعلم.

کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ مصر سے قحط اور گرانی کو باقی سالوں میں یعقوب علیہ السلام کی تشریف آوری کی برکت سے دور کر دیا۔ جس طرح کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے اہلِ مکہ سے سختی کے سالوں کو اُٹھا لیا تھا، جب کہ یہ کہا تھا: « اَللّٰهُمَّ أَعِنِّيْ عَلَيْهِمْ بِسَبْعٍ كَسَبْعِ يُوْسُفَ » [اے اللہ! یوسف علیہ السلام کے سات سالوں جیسے سالوں کے ساتھ ان کے خلاف میری مدد فرما] پھر جب انھوں نے آہ وزاری کی اور شفاعت کی درخواست کی اور ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو بھیج کر زاری کی تو نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی اور وہ آزمایش اُٹھا لی گئی۔ [2]

یوسف علیہ السلام کے خواب کی تعبیر کا ظہور:

امام سدی اور ابن زید رحمہما اللہ نے کہا: ابوین سے مراد باپ اور خالہ ہیں، اس لیے کہ یوسف علیہ السلام کی والدہ پہلے ہی وفات پا چکی تھیں۔ امام محمد بن اسحاق اور ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں: نہیں، بلکہ دونوں ماں باپ زندہ تھے۔ والدہ کی وفات پر کوئی دلیل قائم نہیں ہے۔ قرآن کا اندازِ بیان ظاہر طور پر ان کی حیات کی دلیل ہے اور یہ بات جس کی تائید حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کی ہے، یہی منصور ہے۔ اندازِ بیان اسی پر دلالت کرتا ہے۔ [3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد رحمہ اللہ اور کئی ایک اہلِ علم نے کہا ہے کہ عرش سے مراد تخت ہے۔ [4] ماں باپ کو اپنے ساتھ اسی تخت پر بٹھایا اور باپ اور بھائیوں نے جو گیارہ لوگ تھے سجدہ کیا۔ یوسف علیہ السلام نے فرمایا: ابا جان! یہ میرے خواب کی تعبیر ہے، جس کا ذکر میں نے پہلے آپ سے کیا تھا کہ میں نے گیارہ ستاروں کو سجدہ کرتے دیکھا ہے۔

سجدۂ تعظیمی کی شرعی حیثیت:

یہ بات ان کی شریعت میں جائز تھی کہ جب کسی کبیر (بلند مرتبے والے) پر سلام کریں تو اس کو سجدہ بھی کریں۔ یہ بات آدم علیہ السلام کے زمانے سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت تک جائز رہی۔ اس ملت پر حرام ہوگئی اور سجدہ کرنا صرف جنابِ باری تعالیٰ -عز اسمه- کے لیے ہی خاص ہوگیا۔ یہ قول امام قتادہ رحمہ اللہ وغیرہ کا مضمون ہے [5] اور

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۱۷۷۱) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۹۷۸)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٩٦) [3] تفسير الطبري (١٦/ ٢٦٧۔ ٢٦٩) تفسير ابن كثير (٢/ ٦٣٧)

[4] تفسير الطبري ١٦/ ٢٦٧۔ ٢٦٨) [5] تفسير الطبري (١٦/ ٢٦٩)

حدیث میں مروی ہے کہ معاذ رضی اللہ عنہ شام میں آئے، دیکھا کہ وہاں کے لوگ اپنے اساقفہ (پادری، راہب) کو سجدہ کرتے ہیں، جب واپس آئے تو نبی مکرم ﷺ کو سجدہ کیا۔ فرمایا: یہ کیا ہے اے معاذ!؟ کہا: میں نے ان لوگوں کو دیکھا کہ وہ اپنے اساقفہ کو سجدہ کرتے ہیں، سو آپ زیادہ لائق اور حق دار ہیں کہ آپ کو سجدہ کیا جائے اے اللہ کے رسول! آپ ﷺ نے فرمایا: میں اگر کسی کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو بیوی کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔ شوہر کے بیوی پر بڑے حق کے سبب سے۔[1] دوسری حدیث میں مروی ہے کہ سلمان رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کو مدینے کے کسی راستے پر ملے، سیدنا سلمان رضی اللہ عنہ نومسلم تھے، انھوں نے نبی اکرم ﷺ کو سجدہ کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: اے سلمان! تو مجھ کو سجدہ نہ کر، سجدہ اس کو کر جو حیّ (زندہ) ہے، مرتا نہیں ہے۔[2]

غرض یہ کہ یہ سجدہ ان کی شریعت میں جائز تھا، لہٰذا وہ سب سجدے میں گر پڑے۔ تب یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ ابا جان! یہ میرے پہلے خواب کی تعبیر ہے، جو میرے رب نے سچی کر دی۔ مراد تاویل سے انجامِ کار ہے، کیوں کہ تاویل کا اطلاق کسی کام کے انجام پر ہوتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ۭ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ﴾ [الأعراف: ٥٣] ''ان لوگوں کو اور کسی بات کا انتظار نہیں، صرف اس کے انجام (قیامت) کا انتظار ہے۔'' یعنی قیامت کے دن جو خیر و شر کا وعدہ کیا ہے، وہ سامنے آجائے گا۔ حق سے مراد صحیح ہونا ہے۔ اپنے اوپر اللہ کی نعمتوں کو یاد کیا۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا کہ برادرانِ یوسف اہلِ بادیہ و ماشیہ (خانہ بدوش) تھے۔ جو عربات ارضِ فلسطین سے لے کر غورِ شام (شام کی پست زمین) میں رہتے تھے۔ بعض نے کہا: اولاج میں گھاٹی کے کنارے سے لے کر اس کے نچلے حصے تک کے علاقے میں سکونت پذیر تھے، بکریاں رکھتے تھے، گاؤں میں بستے تھے۔[3] سلمان الفارسی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یوسف علیہ السلام کے خواب اور اس کی اس تاویل کے درمیان چالیس سال کا فاصلہ ہے۔

عبداللہ بن شداد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہیں تک خواب کی آخری حد ہوتی ہے۔ (رواہ ابن جریر) امام حسن رحمہ اللہ نے کہا: یوسف علیہ السلام کے فراق سے لے کر ان سے ملاقات تک اسّی (٨٠) برس گزرے تھے۔ ایک دم کے لیے بھی غم و اندوہ نے یعقوب علیہ السلام کو نہیں چھوڑا۔ رخسار پر آنسو جاری رہتے، حالاں کہ روئے زمین پر کوئی بندہ اللہ کے نزدیک یعقوب علیہ السلام سے زیادہ محبوب تر نہ تھا۔ حسن رحمہ اللہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ تراسی (٨٣) برس بعد ملے۔ سترہ برس کی عمر میں گمنام کنوئیں میں ڈالے گئے اور اسّی (٨٠) برس تک باپ سے غائب رہے۔ پھر تیئس برس جیے، ایک سو بیس برس کے ہو کر فوت ہوئے۔[4] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: پینتیس (٣٥) برس بعد ملے۔[5] محمد بن اسحاق رحمہ اللہ

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٥٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٢٩٥)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧١٣)

[3] تفسير الطبري (١٦/ ٢٧٥_ ٢٧٦)

[4] تفسير الطبري (١٦/ ٢٧١_ ٢٧٤)

[5] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٠٢)

نے کہا: واللہ اعلم، اٹھارہ برس بعد ملے۔

اہلِ کتاب کا یہ اعتقاد ہے کہ چالیس (۴۰) برس کے بعد ملاقات ہوئی یا اس کے قریب اور یعقوب علیہ السلام یوسف علیہ السلام کے ہمراہ قدوم مصر کے بعد سترہ برس رہے، پھر انتقال فرمایا۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل جب مصر میں آئے تھے تو تریسٹھ (۶۳) لوگ تھے، جب نکلے تو چھے لاکھ ستر ہزار لوگ تھے۔ امام مسروق رحمہ اللہ نے کہا کہ مصر میں داخل ہونے کے وقت تین سو نوے مرد و عورت تھے۔ ابن شداد رحمہ اللہ نے کہا: ستاسی (۸۷) انسان تھے بڑے، چھوٹے، مرد اور عورت، جب نکلے تو کچھ اوپر چھے لاکھ تھے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ وہ مصر میں داخل ہونے کے وقت بہتر (۷۲) لوگ تھے عورتیں اور مرد ملا کر۔ جس دن داخل ہوئے وہ عاشورے کا دن تھا اور جب موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ باہر نکلے اور مصر چھوڑا تو چھے لاکھ پانچ اور کچھ اوپر ستر لوگ تھے بچوں اور بوڑھوں کے سوا۔ بچے بارہ لاکھ تھے۔ یہ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[2] ان میں بڑی برکت ہوئی کہ موسیٰ علیہ السلام کی مدت میں اتنی گنتی ہوگئی، حالاں کہ یوسف علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کے درمیان صرف چار سو سال کا فاصلہ تھا، جیسا کہ تحبیر (کتاب) میں ہے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یعقوب علیہ السلام مصر میں آئے ایک سو تیس برس کے تھے، پھر تیس برس مصر میں زندہ رہے اور یوسف علیہ السلام ایک سو بیس برس کے ہو کر فوت ہوئے۔ ابراہیم علیہ السلام ایک سو پچانوے (۱۹۵) برس کے ہو کر فوت ہوئے۔[3]

مفسرین کہتے ہیں کہ ابوین سے مراد باپ اور خالہ ہیں، اس لیے کہ ان کی ماں بنیامین کی ولادت میں مر چکی تھیں۔ بعض نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ان کی ماں کو ان کے رؤیا کی تحقیق (سچ کر دکھانے) کے لیے زندہ کر دیا تھا، یہاں تک کہ انھوں نے سجدہ کیا۔ امام قتادہ اور سفیان بن عیینہ رحمہما اللہ اسی کے قائل ہیں۔ امام خازن رحمہ اللہ نے کہا کہ پہلا قول اعتماد کے قابل ہے۔[4] اس کی بنیاد اس پر ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے راحیل سے حیات خواہر راحیل لیا نام سے شادی کی تھی، لیکن یہ قول ضعیف ہے۔

راجح یہ ہے کہ لیا کا انتقال تزوجِ راحیل سے قبل ہو چکا تھا، اس بنا پر شاید وہ ان کی تیسری بہن تھی، جس کو یعقوب علیہ السلام نے ان کے بعد بیاہا اور اس نے اس معاملے کو جان لیا۔ بعض نے کہا کہ نہیں، بلکہ خود یوسف علیہ السلام کی ماں زندہ تھی۔ اس صورت میں تاویل کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ قرآنی اندازِ بیان کے مطابق یہی زیادہ درست ہے۔

---

[1] تفسير الطبري (١٦/ ٢٧٥۔ ٢٧٦)
[2] تفسير القرطبي (٩/ ٢٦٨)
[3] الدر المنثور (٤/ ٥٨٧)
[4] تفسير الخازن (٣/ ٣١٦)

یوسف علیہ السلام نے کہا کہ تم مصر میں داخل ہو جاؤ مستقل قیام کے لیے، اگر اللہ چاہے تو تمھیں قحط اور ناپسندیدہ کاموں سے امن حاصل ہوگا۔

پہلے یہ لوگ مصر کے بادشاہوں سے ڈرتے تھے اور قریب ہونے کے باوجود وہاں نہ آسکتے تھے۔ قرآن کا ظاہری انداز یہ بتا رہا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے ان سے یہ بات ان میں مصر میں داخل ہونے سے پہلے کہی تھی۔ کہتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام نے نکل کر ان کا استقبال کیا تھا، مصر سے باہر کسی مکان یا خیمہ میں ان کے استقبال کے لیے ٹھہرے ہوئے تھے، جب وہ آئے تو ماں باپ کو اپنے پاس جگہ دی اور کہا: مصر میں داخل ہو، تب وہ شہر کے اندر آئے اور دوبارہ اس مکان میں داخل ہوئے جو اُن کے رہنے کا تھا، پہلی دفعہ کے داخل ہونے کے علاوہ۔ ملکِ مصر کے فضائل بہت ہیں۔

امام مقریزی رحمہ اللہ نے ان فضائل کا ذکر خطط میں کیا ہے، ان سب میں سے ایک فضیلت یہ ہے کہ قرآن پاک میں مصر کا ذکر کہیں صراحتاً اور کہیں اشارتاً بیس سے زیادہ مقامات پر آیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ دس جگہ مصر کو قرآن پاک میں تمام زمین فرمایا ہے اور احادیث میں بھی فضیلت آئی ہے۔ جو شخص فردوس کا ذکر کرنا چاہے، یا فردوس کی مثل دنیا میں دیکھنا چاہے تو وہ سرزمینِ مصر کو کھیتوں کی سرسبزی اور پھلوں کی بہار میں دیکھے اور جو مصر کے واقعات اور حالات معلوم کرنا چاہتا ہو تو وہ کتاب خطط اور امام سیوطی رحمہ اللہ کی کتاب ”حسن المحاضرة“ کا مطالعہ کرے۔[1]

رفع ابوین سے مراد ہے کہ جس تخت پر خود نشست کرتے تھے اس پر اپنے ساتھ بٹھایا، جس طرح کہ بادشاہوں کی عادت ہوتی ہے۔ پھر سب نے ان کو سجدہ کیا۔ یہ ان کے دین میں درست تھا اور سلام کرنے کے طور پر تھا۔ بعض نے کہا کہ سجدہ نہیں تھا، صرف اشارہ کرنا اور جھکنا تھا اور یہی ان کے سلام کرنے کا طریقہ تھا، لیکن یہ ان الفاظ اور ان کے معانی کے خلاف ہے: ﴿ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ﴾ کسی نے کہا: ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹتی ہے اور یہ بھی بہت بعید ہے۔ سیدنا عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے اس آیت کے بیان میں کہا ہے کہ تم سے پہلے لوگوں کا سجدہ سلام کرنا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے اس کی جگہ تم کو سلام عطا کیا ہے۔ یہی قول امام قتادہ رحمہ اللہ کا بھی ہے۔ ابن زید نے کہا کہ یہ سجدہ کرنا تشرفہ (عزت و تکریم کرنا) تھا، جس طرح کہ ملائکہ نے آدم علیہ السلام کو بطورِ تشرفہ سجدہ کیا تھا، سجودِ عبادت نہ تھا۔[2] اور یہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے یوسف علیہ السلام کے خواب کو حقیقت کا روپ دھارنے کے لیے تھا۔ اسی لیے یوسف علیہ السلام نے کہا کہ اے ابا جان! یہ میرے خواب کی تاویل ہے، جو میں نے اس سے پہلے بچپن کے زمانے میں دیکھا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو سچا کر دیا اور اس کی تعبیر بیداری میں واقع ہوئی۔

اس خواب اور تاویل کے درمیان چالیس برس کا فاصلہ تھا، یا اسی سال، یا چھتیس (۳۶) سال، یا بائیس (۲۲)، یا

[1] المواعظ والاعتبار للمقريزي (١/ ٤٣۔ ٤٦)
[2] تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٠٢)

پینتیس (۳۵)، یا ستر (۷۰) سال، ان سب اقوال کو ابن جوزی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی جانے کہ کتنا عرصہ تھا۔ پھر اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کے انعامات کا ذکر کیا کہ اس نے مجھے قید سے نکالا، تم کو گاؤں سے یہاں لایا۔ کہتے ہیں کہ یعقوب علیہ السلام نبوت کے بعد بادیہ (جنگل، صحرا) میں جا بسے تھے، اس لیے کہ اللہ نے کوئی نبی بادیہ سے مبعوث نہیں کیا۔

پھر شیطان کا ذکر کیا کہ اس نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان جھگڑا ڈال دیا تھا۔ بھائیوں کے گناہ کا حوالہ ان کی عزت اور ادب کی خاطر شیطان پر کیا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر نرمی اور لطف فرماتا ہے۔ عمرو بن ابی عمرو رحمہ اللہ نے کہا کہ لطیف وہ ہے جو تجھ کو تیرے کام تک پہنچا دے۔ امام خطابی رحمہ اللہ نے کہا: وہ اس طرح بندے پر مہربانی کرے کہ معلوم نہ ہو کہ کدھر سے ہوئی اور ایسی جگہ ان کو مصالح (اچھی چیزیں) مہیا کر دے کہ گمان بھی نہ ہو۔[1] یا لطیف وہ ہے، جو تمام معاملات کی باریکیوں کو جاننے والا ہو۔ بالجملہ اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت یوسف علیہ السلام پر مکمل کی اور ان کو محنِ عظیمہ (بڑی مشکلات سے نکالا) بادشاہت دی، علم بخشا تو ان کا نفس آخرت کی بھلائیوں کا خواہشمند ہوا، جو ہمیشہ رہنے والی منقطع نہ ہونے والی ہیں۔ انھوں نے کہا:[2]

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۣ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ۝١٠١

اے میرے رب! تو نے مجھے کچھ حکومت دی ہے اور مجھے باتوں (خوابوں) کی تعبیر سکھائی ہے، اے آسمان اور زمین کے پیدا کرنے والے! تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا کارساز ہے، تو مجھے اسلام پر موت دے اور مجھے صالحین کے ساتھ ملا (101)

یوسف علیہ السلام کی اسلام پر موت کی آرزو:

علم کامل پایا، دولت کامل پائی، اب اپنے باپ دادا کے مراتب کا شوق ہوا۔ یعقوب علیہ السلام کی زندگی تک انھوں نے اپنے اختیار سے دنیا کے کام میں رغبت چھوڑ دی۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ یوسف علیہ السلام کی دعا ہے، جو انھوں نے اپنے رب سے مانگی تھی، جب کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی نعمت تمام کر دی، ماں باپ کو ان کے پاس جمع کر دیا، سب بھائی بھی ایک جگہ ہو گئے، نبوت بھی ملی، بادشاہت بھی حاصل ہوئی، اس جگہ سے ان کو شوق پیدا ہوا کہ جس طرح دنیا کی نعمتیں ملیں، اس طرح آخرت کی نعمتیں بھی ہمیشہ کے لیے ہاتھ آئیں، تب یہ تمنا کی کہ مسلمان مریں اور صالحین سے جا ملیں، یعنی انبیا اور مرسلین سے، جو کہ دینی بھائی ہوتے ہیں۔ صلوات اللہ وسلامہ علیهم أجمعين۔

[1] فتح القدیر (۳/ ۷۷) [2] فتح البیان (۶/ ۴۰۱۔ ۴۰۶)

اس بات کا احتمال ہے کہ یہ دعا یوسف علیہ السلام نے احتضار (موت کے حاضر ہونے) کے وقت کہی ہو، جس طرح صحیحین میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے موت کے وقت اپنی انگشت مبارک اُٹھا کر تین بار یہ فرمایا: «اَللّٰهُمَّ بِالرَّفِيْقِ الْأَعْلٰى»[1] [اے اللہ! مجھے رفیقِ اعلیٰ کے ساتھ ملا دے]

احتمال ہے کہ یوسف علیہ السلام کا اسلام پر فوت ہونے اور صالحین کا ساتھ نصیب ہونے کا سوال اس وقت کے لیے ہو کہ جب اجل آئے اور دنیاوی عمر مکمل ہو جائے نہ کہ یہ سوال بطورِ انجاز (وعدہ ایفا کرنے کو) کیا ہو، جس طرح دوسرے کو دعا دینے والا کہتا ہے: ''أَمَاتَكَ اللّٰهُ عَلَى الْإِسْلَامِ'' [اللہ تجھے اسلام پر موت دے] اور دعا کرنے والا کہتا ہے: ''اَللّٰهُمَّ أَمِتْنَا مُسْلِمِيْنَ، وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ، وَأَلْحِقْنَا بِالصَّالِحِيْنَ'' [اے اللہ! ہمیں مسلمان موت دے، ہم کو مسلمان فوت کر اور ہمیں صالحین کے ساتھ ملا دے] اور یہ احتمال ہے کہ یہ دعا بطورِ انجاز کے ہو اور ایسی دعا مانگنا، ان کی ملت میں جائز ہو، جس طرح کہ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے شملِ یوسف علیہ السلام (متفرق کام) کو جمع کر دیا اور اُن کی آنکھ ٹھنڈی کر دی اور وہ اس دن دنیا اور بادشاہت اور نضارتِ دنیا (دنیا کی سرسبزی و شادابی اور تازگی) سے معمور (بھرے ہوئے) تھے تو ان کو پہلے صالحین سے ملنے کا شوق پیدا ہوا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یوسف علیہ السلام سے پہلے کسی نبی نے موت کی تمنا نہیں کی۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔

امام سدی رحمہ اللہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے راوی ہیں کہ سب سے پہلے جس نبی نے یہ دعا کی وہ یوسف علیہ السلام ہیں۔[2] اس قول سے یہ احتمال ہے کہ اسلام پر وفات کا سوال سب سے پہلے یوسف علیہ السلام نے ہی کیا ہو۔ جس طرح کہ سب سے پہلے یہ دعا نوح علیہ السلام نے مانگی تھی: ﴿رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا﴾ [نوح: ۲۸] ''(اے) میرے رب! تو میری اور میرے والدین کی مغفرت فرما اور (ہر) اس شخص کی جو میرے گھر میں مومن ہو کر داخل ہو۔'' یہ بھی احتمال ہے کہ سب سے پہلے یوسف علیہ السلام ہی نے انجاز کا سوال کیا ہو۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کے بیان کا انداز یہی ہے، لیکن ہماری شریعت میں یہ بات جائز نہیں ہے۔

جب موت کی تمنا کرنا ناگزیر ہو تو کیا دعا کرے؟

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ کسی ضرر کے نازل ہونے پر تم میں سے کوئی موت کی تمنا نہ کرے اور اگر اس تمنا کے بغیر نہ چارہ ہو تو اس طرح کہے: «اَللّٰهُمَّ أَحْيِنِيْ مَا كَانَتِ الْحَيَاةُ خَيْرًا لِّيْ، وَتَوَفَّنِيْ إِذَا كَانَتِ الْوَفَاةُ خَيْرًا لِّيْ -رواه أحمد و أخرجاه و عندهما: لَا يَتَمَنَّيَنَّ أَحَدُكُمُ الْمَوْتَ لِضُرٍّ نَزَلَ بِهِ، إِنْ كَانَ مُحْسِنًا فَيَزْدَادُ، وَإِنْ كَانَ مُسِيْئًا فَلَعَلَّهُ يَسْتَعْتِبُ، وَلٰكِنْ لِيَقُلْ: اَللّٰهُمَّ إِلٰى آخِرِهِ»[3] [اے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤١٧٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٤٤)
[2] تفسير الطبري (١٦/ ٢٧٨_ ٢٨٠)
[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٣٤٩_ ٥٩٩٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٨٠) مسند أحمد (٣/ ١٠١)

اللہ! مجھے اس وقت تک زندہ رکھ جب تک زندگی میرے لیے بہتر ہو اور مجھے وفات دے جب موت میرے لیے بہتر ہو۔ اس کو امام احمد رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔ بخاری و مسلم میں الفاظ یہ ہیں: تم میں سے کوئی شخص موت کی تمنا نہ کرے کسی نقصان کی وجہ سے جو اسے پہنچا ہو۔ اگر وہ نیکی کر رہا ہو تو وہ اس میں بڑھ جائے گا اور اگر گناہ کرنے والا ہو تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس سے توبہ کر لے، لیکن وہ یوں کہے: اے اللہ!...] سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو نصیحت کی اور ہمارے دل نرم کیے۔ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ خوب روئے اور کہا: "يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ" "اے کاش! میں مرجاتا۔" نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے سعد! «أَعِنْدِيْ تَتَمَنَّى الْمَوْتَ» "کیا میرے سامنے موت کی تمنا کرتا ہے؟" تین دفعہ اسی طرح ارشاد فرمایا، پھر فرمایا: اے سعد! اگر تو جنت کے واسطے پیدا کیا گیا ہے تو جس قدر تیری عمر دراز ہوگی اور تیرا عمل بہتر ہوگا، وہ تیرے لیے بہتر ہوگا۔[1] (رواه أحمد)

موت کی آرزو کرنا کب کب جائز ہے؟

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ کوئی تم میں سے موت کی تمنا نہ کرے اور نہ موت کے آنے سے پہلے موت کی دعا مانگے، مگر یہ کہ اُس کو اپنے عمل پر وثوق یعنی اعتماد ہو، کیوں کہ تم میں سے جب کوئی مرجاتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے اور مومن کو اس کا عمل اس کی خیر میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔[2] (تفرد به أحمد) یہ اس وقت ہے کہ وہ تکلیفِ خاص اس کی ذات سے متعلق ہو اور اگر فتنہ دین میں ہے تو موت کا سوال کرنا جائز ہے، جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے جادوگروں کے حال سے خبر دی ہے کہ جب فرعون نے اِن کو ڈرایا، دھمکایا اور قتل کی دھمکی دی تو انھوں نے کہا: ﴿ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ﴾ [الأعراف: ١٢٦] "اے ہمارے رب! ہم پر صبر ڈال دے اور ہمیں اس حال میں فوت کر کہ ہم مسلمان ہوں۔" اور جب مریم علیہا السلام کو دردِ زہ شروع ہوا اور وہ کھجور کے ایک درخت کے نیچے آئیں تو کہا: ﴿ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴾ [مريم: ٢٣] "اے کاش! میں اس سے پہلے مرجاتی اور بھولی بھلائی ہوتی۔"

اس لیے کہ انھوں نے جان لیا کہ لوگ مجھ پر فاحشہ کی تہمت لگائیں گے، کیوں کہ وہ ایک بغیر شوہر والی عورت تھیں، ان کو حمل ہوا اور بچہ پیدا ہوا۔ چناں چہ لوگوں نے کہا: ﴿ يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا فَرِيًّا ﴿٢٧﴾ يٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ﴾ [مريم: ٢٧۔ ٢٨] "اے مریم! یقیناً تو نے بہت برا کام کیا ہے۔ اے ہارون کی بہن! نہ تو تیرا باپ برا آدمی تھا اور نہ تیری ماں ہی بدکار تھی۔" لیکن اللہ تعالیٰ نے مریم علیہا السلام کو اس حال سے

---

[1] مسند أحمد (٥/ ٢٦٦) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه علي بن يزيد الألهاني وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ١٠/ ٣٣٦)

[2] مسند أحمد (٢/ ٣٥٠) اس کی سند میں "ابن لہیعہ" ضعیف راوی ہے، البتہ صحیح (٢٦٨٢) میں ان الفاظ کے بغیر (مگر یہ کہ اس کو اپنے عمل پر وثوق ہو) روایت مروی ہے۔

کشادگی اور برآمدگی عطا کی اور عیسیٰ علیہ السلام مہد (پالنے) میں سے بول اُٹھے کہ میں اللہ کا بندہ اور رسول ہوں، یہ ایک بڑا روشن اور تاباں معجزہ ہوا۔ وللہ الحمد۔ اور سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ سے حدیث میں قصۂ منام و دعا کے تحت مروی ہے: «وَإِذَا أَرَدْتَ بِقَوْمٍ فِتْنَةً فَاقْبِضْنِيْ إِلَيْكَ غَيْرَ مَفْتُوْنٍ» [1] (رواه أحمد) [اور جب تو کسی قوم کو فتنے میں مبتلا کرنے کا ارادہ کرے تو مجھے فتنے میں مبتلا کیے بغیر اپنی طرف اٹھا لینا] اور حدیث محمود بن لبید میں فرمایا ہے: « إِثْنَتَانِ يَكْرَهُهُمَا ابْنُ آدَمَ: يَكْرَهُ الْمَوْتَ وَالْمَوْتُ خَيْرٌ لِلْمُؤْمِنِ مِنَ الْفِتَنِ، وَيَكْرَهُ قِلَّةَ الْمَالِ وَقِلَّةُ الْمَالِ أَقَلُّ لِلْحِسَابِ » [2] (رواه أحمد) [ابن آدم دو چیزوں کو ناپسند کرتا ہے: وہ موت کو ناپسند کرتا ہے، حالانکہ موت مومن کے لیے فتنوں سے بچنے کے لیے بہتر ہے۔ نیز وہ مال کی قلت کو ناپسند کرتا ہے، حالانکہ مال کی قلت کم حساب کا باعث ہے] بالجملہ دین میں فتنوں کے حلول کرنے کے وقت موت کا سوال کرنا جائز ہے۔

اس لیے سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ نے آخر خلافت میں جب یہ دیکھا کہ تمام امور پر ان کی گرفت نہیں ہے اور شدتِ امر بڑھتی جاتی ہے تو کہا: "اَللّٰهُمَّ خُذْنِيْ إِلَيْكَ فَقَدْ سَئِمْتُهُمْ وَسَامُوْنِيْ" [اے اللہ! مجھے اپنے پاس لے جا، یقیناً میں ان سے اور یہ مجھ سے اکتا گئے ہیں] اسی طرح جب امام بخاری رحمہ اللہ کے لیے فتنہ واقع ہوا اور امیرِ خراسان نے ان کو شہر سے خارج کر دیا، تب انھوں نے یہ دعا کی: "اَللّٰهُمَّ تَوَفَّنِيْ إِلَيْكَ" [3] [اے اللہ! مجھے اپنی طرف فوت کر لے] اور حدیث میں مروی ہے کہ کوئی شخص دجال کے زمانے میں کسی قبر پر گزرے گا اور کہے گا: کاش! میں اس کی جگہ ہوتا۔ [4] (رواه أحمد) یہ بات وہ فتنوں اور زلزلوں، سخت اندوہناک باتوں اور ہولناک امور کو دیکھ کر کہے گا کہ وہ فتنہ ہر مفتون کے لیے ہوگا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یعقوب علیہ السلام کی اولاد نے جو کچھ یوسف علیہ السلام کے ساتھ کیا تھا سو کیا، لیکن جب ان کے باپ نے ان کے لیے استغفار کیا، تب اللہ تعالیٰ نے ان سب بھائیوں کی توبہ قبول فرمائی اور ان کے گناہ بخش دیے۔

برادرانِ یوسف علیہ السلام کا باپ سے استغفار طلب کرنے پر اصرار کرنا:

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے یعقوب علیہ السلام کے لیے شمل کو جمع کیا، یعنی ان کی پریشانی دور ہو کر جمعیت خاطر حاصل ہوئی، تب ان کی اولاد نے مشورے کے لیے تخلیہ کیا۔ بعض نے بعض سے کہا کہ کیا تم نہیں جانتے ہو کہ تم نے کیا کیا ہے اور بوڑھے باپ نے کیسی تکلیف تمھارے ہاتھوں سے اٹھائی ہے اور یوسف علیہ السلام نے کیا کچھ ایذا پائی؟ کہا: ہاں۔ کہا: تم اسی دھوکے میں ہو کہ ان دونوں نے تم کو معاف کر دیا ہے۔ رب

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٣٥) مسند أحمد (٥/ ٢٤٣) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: إرواء الغليل (٣/ ١٤٧)
[2] مسند أحمد (٥/ ٤٢٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٣٩) [3] تفسير ابن كثير (٢/ ٦٤٠)
[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٩٨) صحيح مسلم، رقم (١٥٧) مسند أحمد (٢/ ٢٣٦)

کے سامنے تمھارا کیا حال ہوگا؟ تب سب کی صلاح یہ ہوئی کہ سب جمع ہو کر اپنے باپ کے پاس آئے اور ان کے سامنے بیٹھے اور یوسف علیہ السلام اپنے باپ کے پہلو میں بیٹھے تھے۔ کہا: ابا جان! ہم آپ کے پاس ایک ایسے کام کے لیے آئے ہیں کہ ویسے کام کے لیے کبھی آپ کے پاس نہیں آئے تھے اور ہم کو ایک ایسا امر پڑا ہے کہ ویسا کبھی نہیں پڑا تھا۔ غرض یہ کہ یعقوب علیہ السلام کو حرکت میں لائے اور انبیا علیہم السلام تمام مخلوق میں سب سے زیادہ رحم دل ہوتے ہیں۔ فرمایا: اے بیٹو! تم کو کیا مشکل پیش آئی ہے جو تم آئے ہو؟ کہا: آپ جانتے ہیں کہ جو کچھ ہم نے آپ کے ساتھ کیا اور اپنے بھائی یوسف علیہ السلام کے ساتھ کیا۔ فرمایا: ہاں۔ کہا: کیا آپ دونوں نے ہمارا قصور معاف نہیں کر دیا؟ فرمایا: ہاں۔ کہا: آپ دونوں کا معاف کرنا، ہمارے کچھ کام نہیں آئے گا، اگر اللہ تعالیٰ نے ہم کو معاف نہ فرمایا۔ فرمایا: پھر تم کیا چاہتے ہو؟ کہا: ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ ہمارا گناہ معاف فرمائے۔ جب آپ کو اللہ کی طرف سے وحی آئے گی کہ اس نے ہمارا قصور معاف فرما دیا ہے، تب ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی اور ہمارے دل اطمینان پکڑیں گے، ورنہ دنیا میں ہرگز ہمارے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک نہ ہوگی۔ تب یعقوب علیہ السلام قبلہ رو ہو کر کھڑے ہوئے، اُن کے پیچھے یوسف علیہ السلام تھے اور یہ سب بھائی یعقوب علیہ السلام اور یوسف علیہ السلام کے پیچھے ذلیل وخوار اور خاشع اور خاکسار بن کر کھڑے ہوئے، باپ نے دعا کی، بھائی نے آمین کہی، بیس برس تک دعا کی قبولیت کا کچھ حال معلوم نہ ہوا۔

صالح مری نے کہا کہ اتنی دیر تک دعا کا قبول نہ ہونا اس لیے تھا کہ وہ خوف کھائیں اور ڈریں۔ جب بیس برس گزرے، تب جبریل علیہ السلام یعقوب علیہ السلام پر نازل ہوئے اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ میں آپ کو خوش خبری سناتا ہوں کہ اللہ نے تمھاری دعا اولاد کے حق میں قبول فرما لی اور اللہ تعالیٰ نے ان کے فعل کو معاف کیا اور ان کے عہد و پیمان آپ کے بعد نبوت پر منعقد ہوئے۔[1] یہ اثر موقوف ہے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ پر اس کی سند میں یزید رقاشی اور صالح مری دونوں ضعیف ہیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ جب یعقوب علیہ السلام کو موت حاضر ہوئی تو یوسف علیہ السلام کو وصیت کی کہ ان کو ابراہیم اور اسحاق علیہما السلام کے پاس دفن کریں۔ جب انتقال ہوگا تو ان کی نعش مبارک کو شام بھیج کر ان دونوں کے نزدیک دفن کیا۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یوسف علیہ السلام نے فرمایا: اے میرے رب! تو نے مجھے بادشاہت دی۔ ﴿مِنْ﴾ اس جگہ تبعیض کے لیے ہے، یعنی بعض ملک، اس لیے کہ سارا ملک ان کو نہیں دیا گیا تھا، بلکہ ملک خاص مصر ایک خاص زمانہ میں ملا تھا۔ بعض نے کہا: ﴿مِنْ﴾ زائد ہے اور بعض نے کہا کہ بیانِ جنس کے لیے ہے۔ ملک سے مراد شے مقدور

---

[1] تفسیر الطبري (١٦/ ٢٨١) اس کی سند میں ''یزید رقاشی'' اور ''صالح مری'' سخت ضعیف راوی ہیں۔

[2] تفسیر الطبري (١٦/ ٢٨٢) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٦٤٠۔ ٦٤١)

میں وسعت اور فراخی ہے۔ پوری زمین میں سیاست اور تدبیر اور ملکیت کے لحاظ سے صرف چار شخص ہوئے ہیں: دو مسلمان سلیمان علیہ السلام اور سکندر اور دو کافر بخت نصر اور شداد بن عاد اور عن قریب ایک پانچواں شخص مالک ہوگا، یعنی عیسیٰ بن مریم علیہ السلام جب وہ آسمان سے زمین پر اُتریں گے۔ جس طرح کہ صحیح احادیث میں مروی ہے۔

پھر یوسف علیہ السلام نے تاویلِ احادیث کا ذکر کیا اس جگہ بھی ﴿ مِنْ ﴾ تبعیض کے لیے ہے کہ تاویل کا سارا علم ان کو نہیں دیا گیا، خواہ اس سے مراد صرف علم وفہم ہو یا خوابوں کی تعبیر۔ بعض نے کہا کہ ﴿ مِنْ ﴾ اس جگہ جنس کے واسطے ہے یا زائد ہے۔ ﴿ فَاطِرَ ﴾ بمعنی خالق ہے۔ اٹھانے والے اور اختراع کرنے والے اور ایجاد کرنے والے کو فاطر کہتے ہیں۔ ﴿ وَلِيّ ﴾ بمعنے ناصر اور معاملات کا متولی ہے، یعنی اے رب! تو دنیا اور آخرت دونوں جگہ میں میرا متولیِ امور ہے، تو مجھ کو اسلام پر موت دے، یعنی اسلام مجھ سے جدا نہ ہو، یہاں تک کہ میں مر جاؤں۔ بعض نے کہا ہے کہ انھوں نے یہ دعا کی، حالاں کہ وہ جانتے تھے کہ کوئی نبی نہیں مرتا مگر مسلمان ہی۔ اس دعا سے اس جگہ اظہارِ عبودیت و افتقار اور زندگی کے خاتمے کے وقت سعادت کی طلب کی شدید خواہش اور دوسروں کو تعلیم دینے کی خاطر یہ اسلام پر قائم رہنے کی حالتِ زائد ہے، جو کہ کفر کی ضد ہے، مطلوب ہے۔ یہی اسلام ہے۔

امام رازی، خطیب اور کرخی رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ کسی پیغمبر نے سوائے یوسف علیہ السلام کے وفات کا سوال نہیں کیا۔[1] یہ سوال اللہ سے ملاقات کے شوق میں تھا۔ انھوں نے چاہا کہ میں اپنے آبا سے جا ملوں۔ اس جگہ صالحین سے مراد انبیا اور آبا وغیرہم ہیں۔ یعنی مجھے بھی ان کا سا ثواب ملے اور میرا درجہ بھی تیرے نزدیک ان جیسا ہو۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا کہ صالحین سے مراد ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق علیہم السلام ہیں۔[2] امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: اہلِ جنت مراد ہیں۔[3]

کہتے ہیں: یوسف علیہ السلام نے جب یہ دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو وفات دی۔ اس دعا کے بعد ایک ہفتہ نہیں گزرا تھا کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ اس لفظ میں اس بات پر دلیل نہیں ہے کہ انھوں نے فی الحال وفات طلب کی تھی۔ لہٰذا جمہور کا مذہب یہ ہے کہ ان کی مراد اس دعا سے موت کی فی الحال تمنا نہیں تھی، بلکہ مطلب یہ تھا کہ جب سالہا سال بعد اجل حاضر ہو تو موت دینِ اسلام ہی پر آئے اور صالحین کا ساتھ میسر ہو۔ زنِ عزیز سے ان کے تین بچے ہوئے: افرائیم، میشا اور رحمت، جو زنِ ایوب علیہ السلام تھیں۔ جب یوسف علیہ السلام کا انتقال ہوگیا تو ان کو رخام یا سنگِ مرمر کے ایک صندوق میں رکھ کر نیل کے بلند حصے میں دفن کیا، تاکہ نیل کے ہر دو طرف برکت عام ہو۔ فَسُبْحٰنَ مَنْ لَا انْقِضَآءَ لِمُلْكِهٖ. وہ چار سو برس تک اس جگہ مدفون رہے، یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام نے ان کو نکالا اور اپنے ساتھ لے جا کر شام میں ان کے آبا کے نزدیک زمین مقدس میں دفن کیا، وہ اب تک اسی جگہ مدفون ہیں۔[4]

---

[1] تفسير الطبري (١٦/ ٢٧٩)
[2] الدر المنثور (٤/ ٥٩١)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٠٤)
[4] فتح البيان (٦/ ٤٠٦۔ ٤٠٧)

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ﴿١٠٢﴾ وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٣﴾ وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿١٠٤﴾

یہ غیب کی کچھ خبریں ہیں، یہ ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں اور آپ ان (برادرانِ یوسف) کے پاس نہیں تھے جب انھوں نے اپنی ایک بات پر اتفاق کیا تھا اور وہ مکر کر رہے تھے (102) اور اکثر لوگ، اگرچہ آپ حرص کریں، ایمان لانے والے نہیں (103) اور آپ اس (تبلیغ) پر ان (مشرکینِ مکہ) سے کوئی اجر نہیں مانگتے۔ یہ (قرآن) تو سارے عالم کے لیے نصیحت ہے (104)

یہ واقعات وحیِ الٰہی ہیں:

جب اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام اور برادرانِ یوسف علیہ السلام کا قصہ بیان کیا اور بھائیوں پر یوسف علیہ السلام کے درجے کو بلند کرنے اور ان کی نصرت کرنے، ملک عطا کرنے اور حکم عطا کرنے کا ذکر کیا اور بھائیوں کی برائی اور یوسف علیہ السلام کو ہلاک کرنے اور انھیں نیست و نابود کرنے کے ارادے کا ذکر کیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اے محمد! یہ غیب کی خبریں ہیں، جو ہم نے تم کو وحی کیں اور سکھائیں، اس میں تمھارے مخالفوں کے لیے عبرت اور نصیحت ہے۔ تم اس وقت جب کہ یہ واقعات گزرے حاضر نہ تھے اور نہ تم نے اپنی آنکھوں سے ان واقعات کو دیکھا تھا، جبکہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈال دیں اور وہ یوسف علیہ السلام کے ساتھ مکر و فریب کرتے تھے، لیکن ہم نے تم کو اس حال کی وحی و تعلیم کر دی، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ﴾ [آل عمران: ٤٤] ''اور آپ اس وقت ان کے پاس موجود نہ تھے جب وہ اپنے قلم ڈال رہے تھے۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ﴾ [القصص: ٤٤] ''اور (اے نبی!) جب ہم نے موسیٰ پر امرِ (خاص) کی وحی کی تو آپ (طور کی) مغربی جانب نہیں تھے۔'' نیز فرمایا: ﴿وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا﴾ [القصص: ٤٥] ''اور آپ اہلِ مدین میں نہیں رہتے تھے کہ ان پر ہماری آیات تلاوت کرتے۔'' نیز فرمایا: ﴿مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍ ۢ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰٓى اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿٦٩﴾ اِنْ يُّوْحٰٓى اِلَيَّ اِلَّآ اَنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ﴾ [صٓ: ٦٩۔ ٧٠] ''مجھے (فرشتوں کی) بلند پایہ جماعت کا کوئی علم نہیں تھا جب وہ باہم جھگڑ رہے تھے۔ میری طرف تو یہی وحی کی جاتی ہے کہ بس میں تو صرف ایک واضح (طور پر) ڈرانے والا ہوں۔''

واقعات کا بیان عبرت کے لیے ہے:

بالجملہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ محمد ﷺ رسول ہیں ہم نے ان کو پرانی خبروں کی اطلاع بخشی ہے لوگوں کے عبرت پکڑنے کے لیے اور اس لیے کہ وہ اپنے دین و دنیا میں نجات پائیں۔ لہٰذا اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے، اگرچہ پیغمبر کو ان کے ایمان لانے پر حرص ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ [الأنعام: ١١٦] ''اور اگر آپ اہلِ زمین کی اکثریت کی اطاعت کریں تو وہ آپ کو اللہ کی راہ سے بہکا دیں گے۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ [الشعراء: ٨] ''بلاشبہ اس میں عظیم نشانی ہے، اور ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں۔'' اس کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات میں یہی بات کہی گئی ہے۔

غیب دان صرف ایک اللہ ہے:

پھر کہا کہ اے پیغمبر! تم اس نصیحت اور دعوت الخیر و الرشد پر ان لوگوں سے کچھ مزدوری اور اُجرت نہیں مانگتے، بلکہ اللہ ہی کے لیے خلق کی خیر خواہی کرتے۔ ہو یہ تو سارے جہان کے لیے ایک یادگار ہے کہ اس سے عبرت اور نصیحت پکڑ کر دنیا اور آخرت میں راہ یاب ہوں اور نجات حاصل کریں۔ بالجملہ یہ آیت شریفہ اس بات پر واضح دلیل اور روشن حجت ہے، کہ آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الرسل محمد ﷺ تک کسی پیغمبر کو علمِ غیب نہیں ہے، یہ علم اللہ کا خاصا ہے۔ پیغمبر کی بزرگی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے غیب کی کوئی بات بتا دیتا ہے اور وہ پیغمبر اپنی اُمت کو وہ بات پہنچا دیتا ہے، لیکن ہر غیب کی بات اس کو بھی نہیں بتائی جاتی۔ جتنی بات کے بتانے میں وقت کی مصلحت ہوتی ہے، صرف اتنی بات کی وحی کی جاتی ہے، پھر اُس وحی کا آنا بھی کسی رسول و نبی کے اختیار میں نہیں ہے، بلکہ اللہ کے ارادہ اور مشیت پر موقوف ہے۔ سو جب انبیا اور رسول غیب دان نہیں ہیں تو پھر کسی پیر، شہید، فقیر، کاہن، ساحر، نجومی اور جوگی وغیرہم کی کیا ہستی ہے کہ وہ غیر کا حال بیان کریں، اپنے بارے میں یا دوسرے شخص کے بارے میں یا کسی بلا کو ٹال سکیں۔ یہ شان اسی معبودِ برحق کی ہے کہ تمام جہاں پر وہی ایک ذات نافع و ضار (نفع و نقصان پہنچانے والی) متصرف فی الخلق اور حاکم ہے: ﴿ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ﴾ [الأعراف: ٥٤] ''آگاہ رہو! پیدا کرنا اور حکم صادر کرنا اسی کے لیے روا ہے۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یوسف علیہ السلام کا یہ تمام قصہ من جملہ غیب کی خبروں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی وحی اپنے رسول کو کی۔ اس میں کفارِ قریش کو ایک واضح اشارہ ہے، کیوں کہ وہ نبی مکرم ﷺ کو جھٹلاتے تھے اور جھگڑا کرتے تھے، دشمنی رکھتے تھے، حسد اور بغض رکھتے تھے، حالاں کہ حقیقتِ حال کو جانتے تھے۔ اس میں ایک قطعی دلیل نبی اکرم ﷺ

کے صحیح ہونے اور آپ ﷺ کی نبوت کی بھی ہے۔ اس لیے کہ آپ اُمی تھے، نہ کبھی کتاب پڑھی اور نہ کسی عالم سے ملاقات کی اور نہ ہی اپنے شہر سے جہاں نشو ونما پائی کسی اور شہر کو گئے۔ اس کے باوجود یہ طویل قصۂ یوسف علیہ السلام کا اتنی اچھی ترکیب اور اتنی فصیح زبان میں لائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ صرف اللہ کی وحی سے خبر ملی، اس لیے فرمایا کہ جس وقت یوسف علیہ السلام کے ساتھ مکر کرنا چاہتے تھے تو آپ اُس وقت ان کے پاس نہیں تھے اور جب نبی کریم ﷺ کا اس وقت وہاں پر ہونا نہ پایا گیا تو آپ ﷺ کے علمِ مشاہدہ کی نفی ہوگئی اور خود نبی مکرم ﷺ ایسی قوم میں سے نہیں تھے، جن کو گزشتہ اُمتوں کے حالات کا کچھ علم ہو اور نہ علما سے آپ کا میل جول تھا، اس سے بطورِ روایت علم کی بھی نفی ثابت ہوئی۔ اب اس علم کا سوائے وحیِ الٰہی کے کوئی اور طریقہ باقی نہ رہا۔

اس لیے یہ بات لازم ہے کہ جو کچھ آپ ﷺ لائے ہیں، اس پر ایمان لانا چاہیے، لیکن جب آپ کے زمانے کے کفار ایمان نہ لائے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ گو تم ان کی ہدایت پر حریص ہو اور اُن کے ایمان لانے کے لیے پوری پوری کوشش کرتے ہو، لیکن ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں، یہ تو کفر پر، جو اُن کے آبا کا دین ہے، پکے ڈٹ چکے ہیں۔ یہ اس آیت کی طرح ہے: ﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ [القصص: ٥٦] ”(اے نبی!) بے شک جسے آپ چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے، بلکہ اللہ ہی جسے چاہے ہدایت دیتا ہے۔“

امام ابن الانباری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ قریش اور یہود نے نبی مکرم ﷺ سے یوسف علیہ السلام اور برادرانِ یوسف علیہ السلام کا قصہ پوچھا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے خوب تفصیل کے ساتھ یہ قصہ بیان کیا اور تورات کے مطابق یہ ذکر کیا۔ آپ ﷺ کو یہ اُمید تھی کہ وہ ایمان اور اسلام لے آئیں گے، لیکن وہ نبی اکرم ﷺ کے خیال کے برعکس اسلام نہ لائے۔ آپ ﷺ کو رنج ہوا، اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی دل جوئی اس آیت سے فرمائی۔[1] اور کہا: اے رسول! تم اس قرآن کی تلاوت پر یا ان کے ایمان لانے پر یا اس قصے کے بیان کرنے پر کچھ اُن لوگوں سے مزدوری نہیں مانگتے ہو، جس طرح کہ علمائے یہود مال لے کر مسئلہ بتاتے ہیں۔ یہ قرآن یا یوسف علیہ السلام کا قصہ سارے جہاں کے تمام لوگوں کے لیے ہے، کچھ خاص ان لوگوں کے لیے نہیں ہے۔[2]

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ۝١٠٥ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ۝١٠٦ اَفَاَمِنُوْٓا اَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝١٠٧

اور آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں کہ وہ ان پر سے گزرتے ہیں اور ان سے بے دھیانی

[1] فتح القدير (٣/ ٨٠) [2] فتح البيان (٦/ ٤٠٧۔ ٤٠٩)

کرتے ہیں (105) اور ان کے اکثر اللہ پر (اس طرح) ایمان لاتے ہیں کہ وہ مشرک ہی ہوتے ہیں (106)
کیا پھر وہ بے خوب ہو گئے ہیں کہ ان پر اللہ کے عذاب کی کوئی آفت آئے، یا اچانک ان پر قیامت
آ جائے، اور انھیں خبر بھی نہ ہو (107)

لوگ اللہ کی نشانیوں اور دلائلِ توحید پر غور نہیں کرتے:

یعنی منہ سے سب کہتے ہیں کہ خالق و مالک سب کا وہی ہے پھر اوروں کو پکڑتے ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ اکثر لوگ اللہ کی نشانیوں اور دلائلِ توحید میں غور وفکر کرنے سے غفلت میں پڑے ہوئے ہیں، وہ نشانیاں جو اُس نے آسمانوں اور زمین میں پیدا کی ہیں، جیسے: کوکب اور ستارے ایک جگہ رہنے والے، اور سیارے اور تمام افلاک، حالاں کہ یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کی مسخر کی ہوئی ہیں اور زمین میں بہت سے قطع مجاورات (مختلف ٹکڑے)، باغات اور جنات، بلند و بالا پہاڑ، بحار زاجرات (سمندر) وتلاطم میں آئی ہوئی موجیں اور دور تک پھیلے ہوئے خشک جنگل اور صحرا ہیں اور بہت سی زندہ اور مری ہوئی چیزیں، حیوانات اور سبزیاں اور ملتے جلتے پھل اور الگ الگ پھل، یعنی مختلف ذائقوں، خوشبوؤں اور رنگوں میں اور شکلوں میں ہیں۔ پس وہ پاک ذات ہے، جو واحد ہے، اَحد ہے، خالق ہے ہر قسم کی مخلوقات کا اور وہی اکیلا ہمیشہ اور باقی رہنے والا ہے، بے نیاز ہے۔ اپنے اسما اور صفات میں یکتا ہے۔ وغیر ذلك.

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ جب ان سے کہو کہ آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کا خالق کون ہے؟ تو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہے، حالاں کہ وہ اوروں کو اللہ کے ساتھ شریک کرتے ہیں۔ یہی قول امام مجاہد، عطا، عکرمہ، شعبی، قتادہ، ضحاک اور ابن زید رحمہم اللہ کا ہے۔[1] صحیحین میں مروی ہے کہ مشرکین اپنے تلبیے میں کہتے تھے: ”لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ إِلَّا شَرِيْكًا هُوَ لَكَ تَمْلِكُهُ وَمَا مَلَكَ“ صحیح مسلم میں مروی ہے کہ وہ جب ”لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ“ کہتے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کہتے: «قَدْ قَدْ» اے حسب حسب! یعنی بس بس! اسی پر رہو زیادہ نہ بڑھاؤ[2] اور اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴾ [لقمان: ١٣] ”بے شک شرک تو بہت بڑا ظلم ہے۔“

سو شرکِ اعظم یہی ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی اور کو پوجے جس طرح کہ صحیحین میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟ فرمایا: یہ کہ تو اللہ کے ساتھ ہمسر ٹھہرائے، حالاں کہ اس نے تجھ کو پیدا کیا۔[3] امام حسن بصری رحمہ اللہ نے آیت: ﴿ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ

---

(1) تفسير الطبري (١٦/ ٢٨٦۔ ٢٨٩) (2) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٨٥)

(3) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٠٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٦)

بِاللّٰهِ... الخ﴾ (آیت باب) کے بارے میں کہا ہے کہ یہ منافق ہی کام کرتا ہے لوگوں کے دکھاوے کے لیے، حالاں کہ وہ اپنے عمل میں مشرک ہے۔[1] اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ﴿ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْۤا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ یُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴾ [النسآء: ١٤٢] ''بے شک منافقین اللہ کو دھوکا دیتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے انھیں دھوکے میں ڈال رکھا ہے اور جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں دل سے نہ چاہتے ہوئے، لوگوں کو دکھانے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں اور وہ اللہ کو بس تھوڑا ہی یاد کرتے ہیں۔''

شرکِ خفی کی ایک صورت:

اس جگہ ایک اور شرکِ خفی ہے جس کو غالباً اس کا کرنے والا نہیں جانتا، جس طرح عروہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ ایک بیمار پر داخل ہوئے، اس کے بازو پر ایک تسمہ بندھا ہوا دیکھا، اس کو توڑ ڈالا یا نکال لیا، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَمَا یُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴾[2] (آیت باب) اور حدیث میں مروی ہے: « مَنْ حَلَفَ بِغَیْرِ اللّٰهِ فَقَدْ أَشْرَكَ »[3] (رواه الترمذي و حسنه من رواية ابن عمر) [جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی یقیناً اس نے شرک کیا] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی دوسری حدیث میں فرمایا ہے: « إِنَّ الرُّقٰى وَالتَّمَائِمَ وَالتِّوَلَةَ شِرْكٌ »[4] [بلاشبہ دم جھاڑ، گنڈے، منکے اور جادو کی چیزیں یا تحریریں شرک ہیں] (رواه أحمد و أبو داود وغيره وفي لفظ لهما: « وَمَا مِنَّا إِلَّا، وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يُذْهِبُهُ بِالتَّوَكُّلِ » [ہم میں سے ہر ایک کو کوئی نہ کوئی وہم ہو ہی جاتی ہے، مگر اللہ عزوجل اسے توکل کی برکت سے زائل کر دیتا ہے])[5]

عبداللہ رضی اللہ عنہ کی بی بی کہتی ہیں کہ جب عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کسی کام سے فارغ ہو کر گھر میں آتے اور گھر کے دروازے تک پہنچتے تو کھنکھار کر تھوکتے، اس کراہت سے کہ مبادا وہ ہمارے کسی مکروہ کام پر آجائیں۔ ایک دن وہ آئے اور کھنکھارا، میرے پاس ایک بڑھیا بیٹھی ہوئی حمرت کا منتر کر رہی تھی۔ میں نے اس کو چارپائی کے نیچے چھپا دیا، وہ آ کر میرے پاس بیٹھ گئے، میری گردن میں ایک دھاگا دیکھا، فرمایا: یہ کیسا دھاگا ہے؟ میں نے کہا: اس دھاگے میں میرے لیے رقیہ کیا گیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس دھاگے کو لے کر توڑ ڈالا اور فرمایا: "إِنَّ آلَ عَبْدِ

---

① تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٠٧۔ ٢٢٠٨) ② تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٠٨)

③ سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٥١) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٣٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٢٠٤)

④ مسند أحمد (١/ ٣٨١) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٨٨٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٥٣٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٣١)

⑤ مسند أحمد (١/ ٣٨٩) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٩١٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٦١٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٥٣٨) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٤٢٩)

اللّٰهِ لَأَغْنِيَاءُ عَنِ الشِّرْكِ، سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: « إِنَّ الرُّقٰى وَالتَّمَائِمَ وَالتِّوَلَةَ شِرْكٌ »" [بلاشبہ عبداللہ کے گھر والے شرک سے غنی ہیں، میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: "بلاشبہ جھاڑ پھونک، تعویذ گنڈے اور باہمی محبت پیدا کرنے کے لیے تعویذ وغیرہ لینا شرک ہے"]

میں نے کہا: تم یہ کس طرح کہتے ہو، میری آنکھ پھڑکتی تھی، میں فلاں یہودی کے پاس جاتی، وہ منتر کرتا، میری آنکھ ٹھہر جاتی۔ فرمایا: "إِنَّمَا ذٰلِكِ مِنَ الشَّيْطٰنِ، كَانَ يَنْخُسُهَا بِيَدِهِ، فَإِذَا رَقَاهَا كُفَّ عَنْهَا، إِنَّمَا كَانَ يَكْفِيْكِ أَنْ تَقُوْلِيْ كَمَا قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: « أَذْهِبِ الْبَأْسَ، رَبَّ النَّاسِ، اِشْفِ وَأَنْتَ الشَّافِيْ، لَا شِفَاءَ إِلَّا شِفَاؤُكَ، شِفَاءً لَّا يُغَادِرُ سَقَمًا »" ① (رواه أحمد) [یہ شیطان کی کارستانی ہوتی تھی، وہ تیری آنکھ میں انگلی مارتا تھا، تو جب وہ (یہودی) دم کرتا تو (شیطان) باز آجاتا تھا، حالانکہ تجھے یہی کچھ کہنا کافی تھا، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کہا کرتے تھے: « أَذْهِبِ الْبَأْسَ، رَبَّ النَّاسِ، اِشْفِ وَأَنْتَ الشَّافِيْ، لَا شِفَاءَ إِلَّا شِفَاؤُكَ، شِفَاءً لَّا يُغَادِرُ سَقَمًا » "اے لوگوں کے رب! دکھ دور کر دے، شفا عنایت فرما، تو ہی شفا دینے والا ہے، تیری شفا کے سوا کوئی شفا نہیں، ایسی شفا عنایت فرما جو کوئی دکھ باقی نہ رہنے دے]

دوسری حدیث میں مروی ہے کہ عیسیٰ بن عبدالرحمٰن نے کہا: عبداللہ بن عکیم بیمار تھے، میں ان کے پاس ان کی عیادت کرنے کے لیے گیا۔ کسی نے ان سے کہا: تم کوئی چیز لٹکا لو۔ فرمایا: میں کوئی شے نہ لٹکاؤں گا، کیوں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے: « مَنْ تَعَلَّقَ شَيْئًا وُكِّلَ إِلَيْهِ » ② (رواه الإمام أحمد والنسائي عن أبي هريرة رضي الله عنه) [جو کوئی چیز لٹکائے گا اسے اس کے سپرد کر دیا جائے گا] سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے: « مَنْ عَلَّقَ تَمِيْمَةً فَقَدْ أَشْرَكَ » ③ (رواه أحمد) [جس نے کوئی تعویذ گنڈا لٹکایا اس نے شرک کیا] وفي رواية: « مَنْ تَعَلَّقَ تَمِيْمَةً فَلَا أَتَمَّ اللّٰهُ لَهُ، وَمَنْ تَعَلَّقَ وَدْعَةً فَلَا وَدَعَ اللّٰهُ لَهُ » ④ (رواه أحمد) [جو شخص اپنے گلے میں تعویذ لٹکاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی خواہش کو پورا نہ کرے اور جو سیپی وغیرہ لٹکائے اللہ اسے آرام نہ دے]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں: « يَقُوْلُ اللّٰهُ: أَنَا أَغْنَى الشُّرَكَاءِ عَنِ الشِّرْكِ، مَنْ عَمِلَ عَمَلًا أَشْرَكَ فِيْهِ مَعِيَ غَيْرِيْ تَرَكْتُهُ وَشِرْكَهُ » ⑤ (رواه مسلم) [اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: شریک بنائے

① سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٨٨٣) مسند أحمد (١/ ٣٨١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٣١)

② مسند أحمد (٤/ ٣١٠) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٠٧٩) صحيح الترغيب والترهيب (٣/ ١٩٢)

③ مسند أحمد (٤/ ١٥٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٤٩٢)

④ مسند أحمد (٤/ ١٥٤) اس کی سند میں "خالد بن عبید" مجہول راوی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم (١٢٦٦)

⑤ صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٨٥)

جانے والوں میں سب سے زیادہ شراکت سے مستغنی میں ہوں، جس شخص نے بھی کوئی عمل کیا اور اس میں میرے ساتھ کسی اور کو شریک کیا تو میں اسے اس کے شرک کے ساتھ اکیلا چھوڑ دیتا ہوں] یہ حدیث قدسی ہے۔ سیدنا ابوسعید بن ابو فضالہ رضی اللہ عنہ سمعاً مرفوعاً کہتے ہیں کہ جب اللہ اس دن اولین و آخرین کو جمع کرے گا، جس میں کسی طرح کا شک نہیں ہے تو ایک منادی ندا کرے گا: "مَنْ كَانَ أَشْرَكَ فِيْ عَمَلٍ عَمِلَهُ لِلّٰهِ فَلْيَطْلُبْ ثَوَابَهُ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ فَإِنَّ اللّٰهَ أَغْنَى الشُّرَكَاءِ عَنِ الشِّرْكِ"[1] (رواہ أحمد) [جس نے اللہ کے لیے کیے ہوئے عمل میں (کسی کو شریک کیا، وہ اس کا ثواب غیر اللہ ہی سے مانگے، کیونکہ اللہ تعالیٰ دوسرے شریکوں کے مقابلے میں شراکت سے سب سے زیادہ بے نیاز ہے]

محمود بن لبید رضی اللہ عنہ کی روایت مرفوع کے الفاظ یہ ہیں: «إِنَّ أَخْوَفَ مَا أَخَافُ عَلَيْكُمُ الشِّرْكُ الْأَصْغَرُ، قَالُوْا: وَمَا الشِّرْكُ الْأَصْغَرُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: «الرِّيَاءُ، يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِذَا جَازَى النَّاسَ بِأَعْمَالِهِمْ: اِذْهَبُوْا إِلَى الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُرَآءُوْنَ فِي الدُّنْيَا، فَانْظُرُوْا هَلْ تَجِدُوْنَ عِنْدَهُمْ جَزَآءً»[2] (رواہ أحمد) ["یقیناً مجھے تمھارے متعلق شرکِ اصغر کا سب سے زیادہ اندیشہ ہے" انھوں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! شرکِ اصغر سے کیا مراد ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "ریا کاری" جس روز اللہ تعالیٰ بندوں کو ان کے اعمال کی جزا دے گا تو وہ ان (ریا کاروں) کو فرمائے گا: "انہی کی طرف چلے جاؤ جن کو تم دنیا میں (اپنے اعمال) دکھایا کرتے تھے، دیکھو کیا تم ان کے پاس جزا اور خیر و بھلائی پاتے ہو؟"]

سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے حدیث میں مروی ہے: «مَنْ رَدَّتْهُ الطِّيَرَةُ عَنْ حَاجَتِهِ فَقَدْ أَشْرَكَ، قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! مَا كَفَّارَةُ ذٰلِكَ؟ قَالَ: أَنْ يَقُوْلَ أَحَدُهُمْ: اَللّٰهُمَّ لَا خَيْرَ إِلَّا خَيْرُكَ، وَلَا طَيْرَ إِلَّا طَيْرُكَ، وَلَا إِلٰهَ غَيْرُكَ»[3] (رواہ أحمد) [جس شخص کو فالِ بد اپنے کام سے روک دے اس نے شرک کیا، انھوں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! اس کا کفارہ کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "ان میں سے کوئی یہ دعا پڑھے: «اَللّٰهُمَّ لَا خَيْرَ إِلَّا خَيْرُكَ، وَلَا طَيْرَ إِلَّا طَيْرُكَ، وَلَا إِلٰهَ غَيْرُكَ» تیری بھلائی کے سوا کوئی بھلائی نہیں، سب نیک شگون تیرے ہی ہاتھ میں ہیں اور تیرے سوا کوئی معبود نہیں] ابوعلی بنی کاہل کے ایک شخص تھے، وہ کہتے ہیں کہ ہمیں سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے ایک خطبہ دیا، پھر کہا: "أَيُّهَا النَّاسُ! اِتَّقُوْا هٰذَا الشِّرْكَ فَإِنَّهُ أَخْفَى مِنْ دَبِيْبِ النَّمْلِ" [اے لوگو! اس شرک سے بچو، یقیناً وہ چیونٹی کی رفتار سے پوشیدہ تر ہے] عبداللہ بن حزن اور قیس بن مضارب نے کہا

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٥٤) سنن ابن ماجه، رقم (٤٢٠٣) مسند أحمد (٣/ ٤٦٦) صحيح الجامع، رقم (٤٨٢)

[2] مسند أحمد (٤/ ٤٢٨) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٩٥١)

[3] مسند أحمد (٢/ ٢٢٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٠٦٥)

کہ واللہ! تم اس قول سے نکلو، ورنہ ہم سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جائیں گے، ہم کو اجازت ملے یا نہ ملے۔ کہا: میں نکلتا ہوں اس قول سے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن خطبہ دیا، پھر فرمایا: اے لوگو! بچو اس شرک سے کہ یہ پوشیدہ تر ہے چیونٹی کی رفتار سے۔ تب ایک شخص نے، جس کو اللہ نے چاہا، کہا: ہم کس طرح اس شرک سے بچیں یہ تو چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ مخفی ہے اے اللہ کے رسول!؟ فرمایا: کہو: « اَللّٰهُمَّ إِنَّا نَعُوْذُ بِكَ أَنْ نُشْرِكَ بِكَ شَيْئًا نَعْلَمُهُ وَنَسْتَغْفِرُكَ لِمَا لَا نَعْلَمُ »[1] (رواه أحمد) [اے اللہ! یقیناً ہم تجھ سے پناہ پکڑتے ہیں کہ ہم تیرے ساتھ ایسی چیز کو شریک بنائیں جسے ہم جانتے ہیں اور تجھ سے ایسی چیز (کے شریک بنانے) سے بخشش مانگتے ہیں جسے ہم نہیں جانتے]

یہ روایت دوسری طرح پر بھی مروی ہے، اس میں ذکر ہے کہ یہ سوال پوچھنے والے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ (كما رواه الحافظ أبو يعلىٰ الموصلي عن معقل بن يسار) ان کے الفاظ یہ ہیں کہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا، یا مجھ سے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: « اَلشِّرْكُ أَخْفَى فِيكُمْ مِنْ دَبِيبِ النَّمْلِ » [تم میں شرک چیونٹی کی رفتار سے بھی زیادہ پوشیدہ ہے] اس پر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ”وَهَلِ الشِّرْكُ إِلَّا مَنْ دَعَى مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا آخَرَ“ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: « اَلشِّرْكُ فِيكُمْ أَخْفَى مِنْ دَبِيبِ النَّمْلِ، ثُمَّ قَالَ: أَلَا أَدُلُّكَ عَلٰى مَا يُذْهِبُ عَنْكَ صَغِيرَ ذٰلِكَ وَكَبِيرَهُ؟ قُلْ: اللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ أَنْ أُشْرِكَ بِكَ وَأَنَا أَعْلَمُ، وَأَسْتَغْفِرُكَ مِمَّا لَا أَعْلَمُ »[2] [شرک تو صرف اس شخص نے کیا جس نے اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم میں شرک چیونٹی کی رفتار سے بھی زیادہ پوشیدہ ہے۔“ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کیا میں تمھاری راہنمائی ایک ایسی چیز کی طرف نہ کروں جس سے چھوٹا بڑا ہر قسم کا شرک جاتا رہے، کہو: « اللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ أَنْ أُشْرِكَ بِكَ وَأَنَا أَعْلَمُ، وَأَسْتَغْفِرُكَ مِمَّا لَا أَعْلَمُ » ”اے اللہ! میں جانتے بوجھتے ہوئے تیرے ساتھ شرک کرنے سے، تیری پناہ مانگتا ہوں اور تجھ سے ایسی چیز (کے شرک بنانے) سے بھی بخشش مانگتا ہوں جسے میں نہیں جانتا]

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں: « اَلشِّرْكُ أَخْفَى مِنْ أُمَّتِي مِنْ دَبِيبِ النَّمْلِ عَلَى الصَّفَا » [میری امت میں شرک صاف پتھر پر چیونٹی کی رفتار سے بھی زیادہ پوشیدہ ہے] اس وقت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! ”فَكَيْفَ النَّجَاةُ وَالْمَخْرَجُ مِنْ ذٰلِكَ؟“ فَقَالَ: « أَلَا أُخْبِرُكَ بِشَيْءٍ إِذَا قُلْتَهُ بَرِئْتَ مِنْ قَلِيلِهِ وَكَثِيرِهِ وَصَغِيرِهِ وَكَبِيرِهِ؟ » قَالَ: بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ: قُلْ « اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ أَنْ أُشْرِكَ بِكَ وَأَنَا أَعْلَمُ وَأَسْتَغْفِرُكَ لِمَا لَا أَعْلَمُ » (رواه الحافظ أبو القاسم البغوي) [اس سے نجات کا راستہ کیا

---

[1] مسند أحمد (٤/ ٤٠٣) صحيح الترغيب والترهيب (١/ ٩)

[2] مسند أبي يعلىٰ الموصلي (١/ ٦٢) اس کی سند میں ”ابومحمد“ مجہول اور ”لیث بن ابی سلیم“ ضعیف راوی ہے۔

ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا میں تجھے ایک ایسی چیز (دعا) نہ بتاؤں جس کی برکت سے تو تھوڑے اور زیادہ، چھوٹے اور بڑے (ہر قسم کے) شرک سے محفوظ ہو جائے؟ انھوں نے عرض کی: کیوں نہیں اے اللہ کے رسول! (ضرور بتایئے) آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہو: «اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ أَنْ أُشْرِكَ بِكَ وَأَنَا أَعْلَمُ وَأَسْتَغْفِرُكَ لِمَا لَا أَعْلَمُ» اے اللہ! میں جانتے ہوئے تیرے ساتھ شرک کرنے سے تیری پناہ میں آتا ہوں، اور میں اس (شرک) سے بھی تیری بخشش مانگتا ہوں جو میں نہیں جانتا] امام دارقطنی رحمہ اللہ نے کہا: اس کی سند میں یحییٰ بن کثیر، جس کو ابو النصر کہتے ہیں: متروک الحدیث ہے۔[1]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے کہا: اے اللہ کے رسول! مجھے ایسی چیز سکھا دیں، جس کو میں کہا کروں۔ فرمایا: صبح و شام بستر پر یوں کہا کر: «اَللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ رَبَّ كُلِّ شَيْءٍ وَمَلِيْكَهُ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ نَفْسِيْ وَمِنْ شَرِّ الشَّيْطٰنِ وَشِرْكِهِ»[2] (رواه أحمد و أبو داود و الترمذي وصححه والنسائي) [اے اللہ آسمانوں و زمین کے پیدا کرنے والے! پوشیدہ اور ظاہر کو جاننے والے! ہر چیز کے رب اور مالک! میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں ہے، میں اپنے نفس کے شر سے تیری پناہ میں آتا ہوں، نیز شیطان کے شر سے اور اس کے شرک سے تیری پناہ مانگتا ہوں] مسند احمد کی دوسری روایت میں اتنا اور زیادہ مروی ہے: «وَأَنْ أَقْتَرِفَ عَلٰى نَفْسِيْ سُوْءً أَوْ أَجُرَّهُ إِلٰى مُسْلِمٍ»[3] [(نیز اس بات سے پناہ میں آتا ہوں کہ) میں اپنے نفس کے خلاف کسی برائی کا ارتکاب کروں یا اسے کسی مسلمان کے ذمے لگا دوں] انتھی کلام ابن کثیر رحمہ اللہ۔

شرک فی النداء کے سوا شرک کی صورتیں:

اس بیان سے یہ بات ثابت ہوئی کہ غیر اللہ کی عبادت کے علاوہ یہ امور جن کا ذکر ہوا یہ بھی شرک ہیں، جیسے: گنڈا یا دھاگا بدن پر لٹکانا، یا رقیہ یا تمیمہ یا تولہ کرنا، یا تعلیق ودعہ کرنا، یا اللہ کے سوا کسی کی قسم اُٹھانا، یا ریا کاری کرنا۔ ان اشیا کا ذکر اس جگہ بطورِ نمونہ کیا ہے، ورنہ شرک کی قسمیں بہت ہیں۔ رسالہ ''تقویة الإیمان'' کے بعد جو آٹھ رسالے اُردو زبان میں لکھے گئے ہیں، وہ شرک کی اکثر قسموں کا احاطہ کرتے ہیں۔ جیسے ''إخلاص التوحید'' اور ''الانفکاك'' اور اسی طرح کے دوسرے رسائل میں توحید کا بیان بھی آ گیا ہے۔

[1] حلیة الأولیاء (٧/ ١١٢) العلل للدارقطني (١/ ١٩٢)

[2] مسند أحمد (١/ ٩) سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٠٦٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٣٩٢) سنن النسائي الكبرىٰ (٤/ ٤٠٨) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٧٥٣)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٢٩) مسند أحمد (١/ ٤١) السلسلة الصحيحة، رقم (٢٧٥٣) تفسير ابن كثير (٢/ ٦٤١۔ ٦٤٤)

جب شارع اللہ کے رسول ﷺ کے صریح فرمان کے مطابق شرک چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ مخفی ٹھہرا تو ظاہر ہے کہ اس کے اقسام سے بچنا بہت مشکل ہے، اس لیے اہلِ تحقیق اور علماے راسخین نے یہ ضابطہ مقرر کیا ہے کہ جس کسی قول وعمل وفعل و حالت میں اہلِ علم کا اختلاف ہو، کوئی کہے کہ یہ امر شرک ہے اور کوئی کہے کہ یہ شرک نہیں ہے تو اس جگہ خلاصی اور نجات کی یہی صورت ہے کہ اس کام سے بچے اور اس کا عامل، فاعل، قائل اور صاحبِ حال ہو کر شبہے میں گرفتار نہ ہو۔ یہ حکم شرکِ خفی کا ہے اور جو امور واضح طور پر اور جلی طور پر شرک ہیں، ان سے احتراز کرنا ہر حال میں فرضِ عین ہے۔ گو بالفرض علمائے رائے اور دنیا کے فضلا اس میں تاویل کریں، جیسے: وہ اشیا جن میں قبر پرست لوگ مبتلا ہیں اور گور پرست اور پیر پرست لوگ اپنے اولیا و مشائخ کے حق میں ایسا اعتقاد رکھتے ہیں، جو توحید کے مخالف ہے اور موت کے بعد اُن کے تصرفِ ظاہری و باطنی اور فیضِ روحانی کے قائل ہیں۔ یا تصورِ شیخ کرتے ہیں اور کسی قبر سے باطنی طور پر فیض پانے کے معتقد ہیں۔ یا غیر اللہ کی نذر و منت و نیاز بجا لاتے ہیں۔ یا اسمائے مشائخ کا وظیفہ کرتے ہیں اور اسی طرح کے دوسرے کام کرتے ہیں۔ ”مِمَّا لَا یَأْتِيْ عَلَیْهِ الْحَصْرُ“ کہ یہ سب امور شرکِ جلی میں داخل ہیں۔ ان کا حکم بھی بلا تفاوت و فرق مشرکین کا حکم ہے۔ جیسا کہ علمائے ربانی مثل حافظ ابن القیم رحمہ اللہ اور ان کے شیخ عالی مقام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور قاضی محمد بن علی شوکانی رحمہ اللہ نے تصریح فرمائی ہے۔ یہ بات بھی اسی آیتِ باب سے ثابت ہے جس طرح کہ پہلے اور موجودہ مشرکین اور پہلے اور آخری منافق اس آیت کے نیچے داخل ہیں۔

اسی طرح وہ مومنین اور مسلمین اس اُمت کے بھی داخل ہیں جو باوجود ایمان اور اسلام کا اقرار کر لینے کے کسی طرح کا شرکِ جلی یا خفی کرتے ہیں، کیوں کہ اس آیتِ شریفہ میں شرک کا ایمان کے ساتھ جمع ہونا معلوم ہوتا ہے اور یہ آیت غیب کی خبر دیتی ہے کہ جو بات خیر القرون کے بعد اس اُمت کے جاہلوں میں ہونے والی تھی، اس کی خبر پہلے سے اللہ پاک نے اپنی کتابِ معجز بیان میں اپنے پیغمبر کو اور ملتِ اسلام کے آخری دور کے علما کو دے دی۔ چناں چہ جیسا فرمایا تھا، ویسا ہی سالہا سال سے ہم سے اگلوں نے دیکھا اور اس کی تردید اور نفی میں رسائل لکھے اور ہم نے بھی اپنی آنکھوں سے اس ملک، بلکہ بلادِ عرب و حجاز میں قبر پرستی، پیر پرستی، تقلید پرستی و رسم پرستی کا بہ خوبی مشاہدہ کیا۔

کلمہ گو مشرکین:

یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ اکثر مومنین کا یہی حال ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان ایمان اور اسلام کے دعوے داروں میں شرک سے بچنے والے بہت تھوڑے لوگ ہیں: ﴿ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ﴾ [السبا: ١٣] ”اور میرے بندوں میں سے شکر گزار تھوڑے ہی ہیں۔“ عوام کالانعام کا اس جگہ ذکر کرنا بے فائدہ ہے کہ وہ ہمیشہ سے شرک ہی کو ایمان اور حسنِ اعتقاد جانتے ہیں اور منع کریں تو لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے ہیں اور اہلِ توحید کو کتے اور

خنزیر سے بھی بدتر سمجھتے ہیں۔ شکوہ تو ان لوگوں سے ہے جو اپنے آپ کو عالم، فاضل، متقی، شیخ، صوفی کہتے ہیں اور کہلاتے ہیں، اس کے باوجود شرک کے مددگار اور توحید کی نفی کرنے والے ہیں۔ ان لوگوں کے رسائل، مسائل وملفوظات دیکھنے سے ہمارا یہ دعویٰ بہ خوبی ثابت ہے، اس پر کسی دلیل کے قائم کرنے کی حاجت نہیں ہے، جیسا کہ کہا گیا ہے:

وَتُسْعِدُنِي ؛ غَمْرَةٍ بَعْدَ غَمْرَةٍ سَبُوْحٌ لَهَا مِنْهَا عَلَيْهَا شَوَاهِدُ

اللہ تعالیٰ نے یہ فرمانے کے بعد کہ اکثر ایمان لانے والے مشرک ہوتے ہیں، یہ فرمایا ہے کہ کیا یہ مشرکین اس بات سے امن میں ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب اچانک آکر ان کو ڈھانپ لے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَفَاَمِنَ الَّذِيْنَ مَكَرُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّخْسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۴۵﴾ اَوْ يَاْخُذَهُمْ فِيْ تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۴۶﴾ اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [النحل: ٤٥۔ ٤٧] ”کیا بے خوف ہوگئے ہیں وہ لوگ جنھوں نے برے مکر کیے کہ اللہ انھیں زمین میں دھنسا دے یا ان پر (وہاں سے) عذاب لے آئے، جہاں سے وہ شعور نہیں رکھتے۔ یا ان کے چلنے پھرنے کے دوران میں وہ انھیں پکڑ لے، پھر وہ اسے عاجز کرنے والے نہیں۔ یا انھیں حالتِ خوف میں مبتلا کر کے پکڑ لے، پھر بلاشبہ تمھارا رب بہت شفقت کرنے والا، بڑا رحم کرنے والا ہے۔“

نیز فرمایا: ﴿ اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ نَآىِٕمُوْنَ ﴿۹۷﴾ اَوَ اَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ ﴿۹۸﴾ اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴾ [الأعراف: ۹۷۔ ۹۹] ”کیا پھر بستیوں والے اس (بات) سے بے خوف ہوگئے ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب رات کو آجائے اور وہ سوئے ہوئے ہوں؟ یا بستیوں والے اس (بات) سے بے خوف ہوگئے ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب دن چڑھے آجائے اور وہ کھیل تماشے میں مصروف ہوں؟ کیا پھر وہ اللہ کی تدبیر سے بے خوف ہوگئے ہیں؟ اللہ کی تدبیر سے بے خوف تو وہی لوگ ہوتے ہیں جو خسارہ پانے والے ہوں۔“

اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ شرک کو امن نہیں ہے۔ آخرت کا عذاب تو ان کے لیے نصوصِ قرآنیہ اور احادیثِ صحیحہ سے خود مقرر ہے، یعنی کہ شرک کی سزا آگ میں ہمیشہ رہنا بغیر کسی وقفے اور رکاوٹ کے مقرر ہے۔ رہی دنیا کی سزا سو وہ بھی مومنین مشرکین میں دیکھی جا چکی ہے۔ ان قبر پرستوں اور پیر پرستوں کے طفیل دنیا کے کونوں سے اسلام کی سلطنت جاتی رہی۔ علمائے سُو کی دنیا پرستی نے اسلام کو غریب کر دیا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

وَمَا أَفْسَدَ الدِّيْنَ إِلَّا الْمُلُوْكُ وَأَحْبَارُ سَوْءٍ وَرُهْبَانُهَا

[دین میں بگاڑ پیدا کیا ہے تو بادشاہوں، عالموں اور درویشوں نے ہی پیدا کیا ہے]

اس کے علاوہ وباؤں کی کثرت، بارش کی قلت، فصلوں کی بربادی، قحطِ ایام، طرح طرح کی تکالیف اور

بیماریاں، فسق و فجور کی کثرت اور تقوے کی قلت، جہالت کی فراوانی اور علم کا اُٹھ جانا اور اسی طرح کی وبائیں، جو ہر سال ظاہر ہوتی رہتی ہے یہ سب اللہ تعالیٰ کی سزائیں ہیں۔ لیکن دیکھنے والی آنکھ اور سننے والے کان نہیں ہیں۔ اس لیے کسی مومن کی صورت میں مشرک کو اس سے کوئی تنبیہ نہیں ہوتی اور نہ ہی اس قسم کے شرکیہ کاموں میں ملوث رہتے ہوئے جو ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں ان کو امن نصیب ہوتا ہے۔ خصوصاً جان و مال اور آبرو کا امن۔ اس زمانے میں معروف کام منکر ہو گیا اور منکر معروف ٹھہرا ہے۔ سنت کو بدعتِ مذمومہ سمجھنے لگے ہیں اور بدعتِ محدثہ کو عین سنتِ ماثورہ اعتقاد کرتے ہیں۔ فإنا لله على عموم الشرك والفسق.

فتح البیان کا بیان:

اس موقع پر فتح البیان کا بیان فاتح یہ ہے کہ آسمان و زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں، مثلاً: آسمان بغیر ستون کے کھڑا ہے، چمکتے تاروں سے، جو ٹھہرے ہوئے ہیں یا چلتے پھرتے ہیں، پر رونق ہو رہا ہے۔ زمین میں پہاڑ، جنگل، دریا، نباتات، حیوانات ہیں، یہ سب اللہ واحد اَحد کی توحید خالص پر دلائل ہیں، ان سے اللہ پاک کا خالق، مالک، رازق، مُحیی و ممیت ہونا ثابت ہوتا ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا کہ آسمان کی نشانیاں سورج، چاند، تارے اور بادل ہیں اور زمین کی نشانیاں مخلوق، نہریں، سمندر، پہاڑ، شہر اور محلات ہیں۔[1]

اکثر لوگوں کا گزر ان آیات پر ہوتا ہے، لیکن ان میں کچھ غور و فکر نہیں کرتے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے وجود کی ان دلیلوں کی طرف توجہ کرتے ہیں اور اس کی توحید فی الالوہیت کو نہیں سوچتے، حالاں کہ یہ نشانیاں رات دن، بلکہ ہر دم آنکھ سے دیکھتے اور کان سے سنتے ہیں۔ اس بارے میں رسالہ "كشف الستر عن وجه الذكر والفكر" باوجود مختصر ہونے کے بہت ہی سادہ اور موثر ہے۔ مصحف عبداللہ رضی اللہ عنہ میں "يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا" کے بجائے "يَمْشُوْنَ عَلَيْهَا" مروی ہے۔[2] اس سے مراد ہلاک ہونے والی اُمتوں کی نشانیوں کا نظر آنا اور اُن سے عبرت اور نصیحت کا سامان ہونا ہے۔

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ آثار پدیدست صنادید عجم را

"ٹوٹے پھوٹے دروازوں اور دیواروں کے بیل بوٹوں سے عجمی بزرگوں کے نشانات واضح ہیں۔"

پھر ان آیات پر گزرنے اور چلنے کے باوجود ان سے روگرداں ہیں، یعنی اگرچہ آنکھوں سے دیکھتے ہیں، لیکن ثمرۂ نظر سے اعراض کرتے ہیں۔ وہ ثمرہ کیا ہے۔ تفکر و اعتبار و استدلال ہے۔ اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے اور تصدیق نہیں کرتے اللہ کی کہ وہ خالق و رازق، محی اور ممیت ہے، لیکن وہ شرک کرنے والے ہیں، یعنی اللہ کے ساتھ غیر کی عبادت بھی کرتے ہیں۔

---

[1] الدر المنثور (٤/ ٥٩٣) [2] تفسير الطبري (١٦/ ٢٨٥)

آیت زیرِ تفسیر کی تیرہ وجوہ سے وضاحت:

اس آیت کے مضمون کی وضاحت اس چیز کی وضاحت پر موقوف ہے، جس کو اہلِ تفسیر نے ذکر کیا ہے، وہ بارہ وجوہ ہیں اور ایک وجہ ہم نے شامل کی ہے۔ یہ سب تیرہ وجوہ ہوئے:

وجہ اوّل یہ کہ اہلِ جاہلیت اس بات کا اقرار کرتے تھے کہ ان کا خالق و رازق اللہ تعالیٰ ہے۔ اس کے ساتھ وہ غیر اللہ یعنی بتوں اور آستانوں کو پوجتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ﴾ [الزخرف: ۸۷] ''اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ انھیں کس نے پیدا کیا تو وہ ضرور کہیں گے: اللہ نے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ﴾ [لقمان: ۲۵] ''اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو وہ ضرور کہیں گے: اللہ نے۔'' لیکن اللہ کے لیے شرکا ثابت کرکے ان کی عبادت کرتے تھے، تاکہ وہ ان کی رسائی اللہ تک کرا دیں۔ جیسا کہ انھوں نے کہا: ﴿ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ﴾ [الزمر: ۳] ''(وہ کہتے ہیں:) ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کے زیادہ قریب کر دیں۔''

انھیں کی طرح وہ لوگ بھی ہیں، جنھوں نے اللہ کے سوا احبار اور رہبان، یعنی علما اور درویشوں کو اپنا رب ٹھہرا لیا ہے، یا وہ لوگ جو اموات کو ایسی چیز پر قدرت رکھنے کا اعتقاد کرتے ہیں، جس پر اللہ کے سوا کوئی قادر نہیں ہے۔ قبر پرستوں کے افعال معلوم و معروف ہیں، پس ان کا یہ اقرار کہ اللہ تعالیٰ ان کا خالق اور رازق ہے، ایمان کا مصداق ہے، بمعنی اعم، یعنی تصدیق نہ بمعنی اخص، یعنی مومنوں کا ایمان۔ اسی وجہ کی طرف جمہور مفسرین گئے ہیں، لیکن انھوں نے اس بات کا اظہار نہیں کیا، جو اس جگہ ہم نے بیان کی ہے کہ ان کا ایمان بہ معنے اعم ہے، حالاں کہ اس کا ذکر کرنا ضروری ہے، تاکہ کلام پختہ ہو جائے اور مسمائے ایمان اس پر صادق آئے۔

وجہ دوم یہ ہے کہ اس آیت سے مراد منافقین ہیں، وہ ظاہر میں مومن اور باطن میں مشرک تھے۔ یہ امام حسن بصری رحمہ اللہ سے مروی ہے۔[1]

وجہ سوم یہ ہے کہ مراد اہلِ کتاب ہیں کہ اپنی کتاب پر ایمان لاتے ہیں اور اس کے علاوہ کے ساتھ کفر کرنے میں اپنے علما کی تقلید کرتے ہیں اور مسیح علیہ السلام اور عزیر علیہ السلام کو ابن اللہ کہتے ہیں۔ پس ان کا اپنے انبیا پر ایمان لانا حالتِ شرک میں ہے۔

وجہ چہارم یہ ہے کہ اس سے مقصود وہ چیز ہے، جو عرب کے تلبیہ میں واقع ہوتی تھی: ''لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ، إِلَّا شَرِيْكًا هُوَ لَكَ'' سو وہ اس تلبیے میں اللہ پر ایمان لاتے، حالاں کہ مشرک تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح مروی ہے۔[2]

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (۷/ ۲۲۰۷۔ ۲۲۰۸) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۱۸۵)

وجہ پنجم یہ ہے کہ اس آیت سے مراد یہ اُمت ہے، کیوں کہ ریا شرکِ اصغر ہے، جس طرح کہ حدیث میں اس کی طرف اشارہ مروی ہے اور فرمایا: « اَلشِّرْكُ أَخْفَى مِنْ دَبِيْبِ النَّمْلِ »[1] [شرک چیونٹی کی رفتار سے بھی زیادہ پوشیدہ ہے] سو ریا کار اگرچہ ایمان لاتے ہیں، لیکن ریا کی وجہ سے مشرک ہیں۔

وجہ ششم یہ ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کو آسانی کی حالت میں بھول جاتے ہیں اور مشکل کے وقت یاد کرتے ہیں۔ یہ عطا رحمہ اللہ سے مروی ہے۔[2] لیکن اس صورت میں یہ بات صادق نہیں آتی کہ وہ اللہ پر مشرک ہونے کے وقت ایمان لاتے ہیں۔ مگر یہ کہ آسانی کے وقت میں اللہ کے ذکر اور دعا کو بھول جانے کو مجازاً شرک کہا جاتا ہے۔ گویا اس نے اس نسیان اور ترکِ دعا کی وجہ سے دوسرے معبود کو پوجا اور یہ بعید ہے، حالاں کہ ان دونوں باتوں کا اکٹھا ہونا ناممکن ہے، اس لیے کہ ذکر و دعا کے وقت میں بھول جانا ذکر کو ترک کرنا نہیں ہوتا اور یہ بات مقرر ہے کہ حال اپنے عامل میں قید ہے، مگر یہ کہ اس چیز کا اعتبار کیا جائے جس پر یہ خیال ہو کہ یہ علاقہ وہ ہے، جس پر تجاوز کیا گیا ہے اور اسی پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دلیل ہے: ﴿ فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ﴾ [العنكبوت: ٦٥] ''پھر جب وہ (مشرکین) کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو وہ اطاعت و فرماں برداری کو اسی (اللہ) کے لیے خاص کرتے ہوئے اللہ کو پکارتے ہیں، پھر جب وہ انھیں خشکی کی طرف نجات دیتا ہے تو فوراً وہ شرک کرنے لگتے ہیں۔''

وجہ ہفتم یہ ہے کہ مراد وہ مشرکین ہیں، جو اسلام لے آئے ہیں کہ وہ ایمان لانے سے پہلے مشرک تھے۔ امام حاکم رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں یوں ہی حکم کیا ہے۔ تقریر اس کی اس طرح پر ہے کہ ان میں کوئی اللہ پر ایمان نہیں لاتا، لیکن وہ ایمان لانے سے پہلے مشرک تھا، اس وجہ میں کلام ہے، جیسا کہ اس سے پہلی وجہ میں کلام ہے۔ والجواب الجواب۔

وجہ ہشتم یہ ہے کہ اس جگہ شرک سے مراد وہ خیالات اور حالات ہیں جو ایمان کی حالت میں پیش آتے ہیں۔ اس کو بقاعی نے واسطی رحمہ اللہ سے حکایت کیا ہے۔ اس میں یہ بات ہے کہ اگر اُن خیالات اور حالات پر شرکِ اکبر یا شرکِ اصغر صادق آتا ہے تو خیر۔ اور اگر وہ اس صدق سے باہر ہیں تو یہ وجہ فاسد ہے۔

وجہ نہم یہ ہے کہ مراد وہ لوگ ہیں، جو اللہ کے ساتھ اس کی مخلوق کو مشابہ کرتے ہیں۔[3] (رواه الكشاف عن ابن عباس) اس وجہ کی تقریر یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ پر ایمان لاتے ہیں، اللہ کو کسی ایسی شے سے تشبیہ دینے کے وقت جو کہ شرک ہے یا شرک کی طرف پھیرنے والی ہے۔

وجہ دہم یہ ہے کہ مراد قدریہ کا قول ہے، کیوں کہ وہ بندے کے لیے قدرت ثابت کرتے ہیں۔[4] (حكاه

---

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
[2] تفسير القرطبي (٩/ ٢٧٣)
[3] تفسير النسفي (٢/ ٣٤٣)
[4] الكشاف (٢/ ٤٧٩)

النسفي في مدارك التنزيل) اس کی تقریر یہ ہے کہ وہ اللہ پر ایمان لاتے ہیں، درحالیکہ وہ غیر اللہ کے لیے ایسی چیز ثابت کرتے ہیں یا مانتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہے اور یہ شرک ہے یا بمنزلہ شرک کے ہے۔

وجہ یازدہم ابن العربی نے اپنی تفسیر میں کہا ہے کہ اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے مگر غیر اللہ پر، اور ہمیشہ اللہ کے منکر ہیں۔ سو بعض اوقات اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں، اس معبود کے ساتھ جس پر ایمان لاتے ہیں۔ پس اللہ پر اکثر ایمان لانے والے حالتِ شرک میں ہوتے ہیں، لیکن قرآن کا ظاہر انداز یہ ہے ایمان باللہ اور شرک بہ تشریک غیر اللہ مع اللہ نہیں ہوتا، مگر اسی طرح کہ غیر اللہ کو اللہ کے ساتھ شریک ٹھیرائیں اور اُن دونوں معنوں کے درمیان فرق ہے۔

وجہ دوازدہم وہی ہے جو حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں ذکر کی ہے کہ ایک شرک خفی ہوتا ہے، جس کا شعور اکثر لوگوں کو نہیں ہے، جیسے: تسمہ، گنڈا وغیرہ باندھنا، غیر اللہ کی قسم کھانا، رتی تمائم کرنا،[1] جیسے پہلے گزرا۔ غرض یہ کہ تمام وجوہ جو مفسرین نے ذکر کیے ہیں، وہ یہی ہیں، جن کا ذکر اس جگہ ہوا اور یہ سارے اقوال سببِ نزول کے اختلاف پر مبنی ہیں۔

رہا نظمِ قرآنی سو وہ محمول ہے، ہر مصداق مسمائے ایمان پر مسمائے شرک کی وجوہ کے ساتھ اور اعتبار لفظ کے مفہوم کا ہے نہ کہ خصوصیتِ سبب کا، جس طرح کہ اصول میں مقرر ہے، مثلاً: اہلِ شرک کے بارے میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایمان نہیں لاتے اکثر اُن کے اس بات پر کہ اللہ خالق رازق ہے، لیکن وہ بتوں کی عبادت کے سبب سے مشرک باللہ ہیں۔ یا جو مسلمان شخص کسی شرک خفی میں گرفتار ہے تو کہہ سکتے ہیں کہ ایمان نہیں لاتا وہ اللہ پر، لیکن وہ اس شرک خفی کے سبب سے مشرک ہے۔ اسی طرح تمام وجوہ میں اس کے مثل تقریر کر سکتے ہیں اور یہ اس بات کے لائق ہے کہ ایک وجہ مستقل ہو اور یہی زیادہ راجح ہے ہمارے خیال میں اگرچہ کسی مفسر نے اس کا ذکر نہیں کیا۔

پس یہ کہنا درست ہے کہ ان کے اتصاف کا وجود ایمان کے ساتھ شرک میں ملوث ہونے کے وقت مشکل ہے، لیکن اس کا جواب اس سے معلوم ہو چکا جو پہلے بیان ہوا، مثلاً: اہلِ جاہلیت کا ایمان شرک کے ساتھ ملوث ہونے کا سبب صرف اس بات کا اقرار تھا کہ اللہ خالق ورازق ہے۔ سو یہ کوئی ان کے شرک کے منافی نہ تھا۔ اسی طرح کہہ سکتے ہیں کہ جو مسلمان شرکِ اصغر یا شرکِ خفی میں گرفتار ہے، سو وہ کچھ ایمان کے وجود کے منافی نہیں ہے۔ اس لیے کہ شرکِ اصغر یا خفی اپنے فاعل کو مسمائے ایمان سے خارج نہیں کرتا۔ لہٰذا اس کا کفارہ اللہ سے پناہ مانگنا وارد ہوا ہے، جیسے پہلے بیان ہوا۔ اب یہ بات صحیح ٹھہری کہ حقیقی ایمان اور شرکِ خفی بعض مومنین میں جمع ہو جاتا ہے۔ ایمان عمومیت کے معنے میں اور حقیقی شرک اہلِ جاہلیت میں بھی جمع تھا۔ اسی طرح اہلِ کتاب کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ ان میں ایمان بما انزل اللہ اور شرک اس بات کی بنا پر کہ وہ بعض مخلوق کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں مجتمع ہے۔ (وهكذا في بقية الوجوه)

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٦٤٢)

پھر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ کیا مومنین مشرکین اس بات پر امن وامان میں ہیں کہ عذاب کا کوئی غاشیہ ان کے پاس آئے۔ یہ سوالیہ انداز بطورِ انکار کے ہے۔ غاشیہ وہ چیز ہے جو ان کو ڈھانپ لے، جیسے: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ يَوْمَ يَغْشٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ﴾ [العنکبوت: ٥٥] ''اس دن، ان کے اوپر سے اور ان کے پاؤں کے نیچے سے، عذاب انھیں ڈھانپ لے گا۔'' بعض نے کہا: اس جگہ غاشیہ سے مراد ساعت ہے۔ کسی نے کہا: صاعقہ یا قوارع یا وقیعہ یا نقمتِ عامہ (عام سزا) اور اگر عمومیت پر محمول کریں، تب بھی کوئی مانع نہیں ہے۔ یا اچانک قیامت آجائے بغیر علامات کے پہلے آنے کے اور ان کو آگاہی تک نہ ہو کہ وہ آنے والی ہے، کیوں کہ لوگ بازاروں میں ہوں گے، اپنے کام کاج میں مصروف کہ یکا یک صیحہ کا جوش ہوگا، وہ اس نفخہ کے لیے تیار نہیں ہوں گے کہ قیامت سر پر آ کھڑی ہوگی۔[1]

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٠٨﴾

(اے نبی!) کہہ دیجیے: یہی میری راہ ہے، میں (تمھیں) اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں اور وہ لوگ جنھوں نے میری اتباع کی، بصیرت پر ہیں۔ اور اللہ پاک ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں (108)

نبوی منہج اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی طرف دعوت دینا ہے:

اللہ نے اپنے رسول الثقلین، یعنی جنوں اور انسانوں کے پیغمبر کو یہ حکم دیا کہ تم لوگوں کو اس بات کی خبر دو کہ میری راہ وسنت ہے دعوت دینا ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ'' کی شہادت دینے کی طرف۔ میں جو تم کو اس طرف بلاتا ہوں سو یقین اور برہان کی راہ سے اچھی طرح سمجھ بوجھ کر بلاتا ہوں۔ اسی طرح جو شخص نبی کریم ﷺ کا تابع ہے وہ بھی اسی طرف بلاتا ہے، جس طرف رسول اللہ ﷺ نے بلایا ہے، بصیرت ویقین و برہان عقلی و شرعی پر۔ اور میں اللہ کی پاکی بیان کرتا ہوں اور اس کو اعظم و اقدس جانتا ہوں، اس بات سے کہ کوئی اس کا شریک یا نظیر یا عدیل یا شریک یا ولد یا والد یا صاحبہ یا مشیر ہو، وہ بڑی برکت والا مقدس اور پاک ہے ان سب امور سے۔ ساتوں آسمانوں اور زمین والے اس کی تسبیح کرتے ہیں اور ہر شے اس کی پاکی بیان کرتی ہے، لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے، وہ حلیم اور غفور ہے۔

مرغان چمن بہ ہر صباح خوانند ترا باصطلاح

''باغ کے پرندے ہر صبح نور کے تڑکے اپنی اپنی اصطلاحوں میں تجھے یاد کرتے ہیں اور تیرے گیت گاتے ہیں۔''

---

[1] فتح البیان (٦/ ٤٠٩۔ ٤١٥)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اے پیغمبر! آپ مشرکوں سے کہہ دیں کہ یہ دعوت اور طریقہ جس پر میں ہوں ایک میری راہ ہے۔ میں اللہ کی طرف بصیرت پر بلاتا ہوں۔ بصیرت سے مراد واضح حجتیں اور حق و باطل میں تمیز کرنے والی معرفت ہے۔ میں بھی اسی صراطِ مستقیم کی طرف دعوت دینے والا ہوں اور میرے تابعین بھی میری ہی راہ پر چلتے اور بلاتے ہیں۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: "اَلْمَعْنَى وَمَنِ اتَّبَعَنِي يَدْعُوْ إِلَى اللّٰهِ كَمَا أَدْعُوْ" [مطلب یہ ہے کہ جس ین میرا اتباع کیا ہے وہ بھی اللہ ہی کی طرف بلاتا ہے جس طرح میں اس کی طرف بلاتا ہوں] اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ ہر متبع رسول پر یہ حق ہے کہ وہ اس دعائے الی اللہ میں، یعنی ایمان باللہ اور توحید وعمل باشرع کی طرف بلانے میں نبوت کے طریقے کی پیروی کرے اور رسالت کے طریق پر چلے۔[1] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ بصیرت سے مراد ہدایت ہے[2] اور سبحان اللہ سے مراد اللہ کی پاکیزگی بیان کرنا ہے، ہر نقص وعیب اور برائی سے جو کہ جلالِ الٰہی کے شایان شان نہیں ہیں، جیسے: شریک اور اضداد اور انداد وغیرہ۔ پھر نبی اکرم ﷺ نے اپنی ذات سے مشرک ہونے کی نفی فرمائی کہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں، جو کسی کو اللہ کا ہمسر ٹھہراتے ہیں۔[3]

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ۭ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ١٠٩

اور آپ سے پہلے ہم نے مرد ہی (رسول بنا کر) بھیجے، ان کی طرف ہم وحی کرتے تھے (اور) وہ بستیوں کے رہنے والوں میں سے تھے۔ کیا پھر وہ زمین میں نہیں چلے پھرے کہ دیکھتے ان لوگوں کا انجام کیا ہوا جو اُن سے پہلے تھے؟ اور پرہیز گاروں کے لیے آخرت کا گھر ہی بہتر ہے۔ کیا پھر تم سمجھتے نہیں؟ (109)

تمام انبیاء و رسل بشر اور مرد ہی تھے:

اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ ہم نے رسول مردوں کی جنس سے بھیجے ہیں نہ کہ عورتوں کی جنس سے۔ یہی قول ہے جمہور علما کا۔ آیت کا سیاق بھی یہی ہے اور اسی پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کی بیٹیوں میں سے کسی عورت پر وحی تشریع نہیں کی۔ بعض کا اعتقاد یہ ہے کہ سارہ ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی بیوی اور موسیٰ علیہ السلام کی ماں اور عیسیٰ علیہ السلام کی ماں نبیات تھیں، ان کی حجت یہ ہے کہ فرشتوں نے سارہ کو اسحاق علیہ السلام کی اور اسحق علیہ السلام کے پیچھے یعقوب علیہ السلام کی بشارت دی

[1] فتح القدير (٣/ ٨١) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٠٩) [3] فتح البيان (٦/ ٤١٥۔ ٤١٦)

تھی اور موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرف انھیں دودھ پلانے کی وحی ہوئی: ﴿ وَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوْسٰۤى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ [القصص: ۷] ''اور ہم نے موسیٰ کی ماں کو الہام کیا کہ تو اسے دودھ پلا، پھر جب تو اس کے بارے میں ڈرے تو اسے دریا میں ڈال دینا اور نہ ڈرنا اور نہ غم کھانا، بے شک ہم اسے تیری طرف لوٹانے والے ہیں اور اسے رسولوں میں سے بنانے والے ہیں۔''

اور فرشتے نے مریم کے پاس آکر عیسیٰ علیہ السلام کی خوش خبری دی تھی اور اللہ نے فرمایا ہے: ﴿ وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴾ [آل عمران: ٤٢۔ ٤٣] ''اور (یاد کرو) جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! بے شک اللہ نے تجھے چن لیا ہے اور تجھے پاکیزگی عطا کی ہے اور دنیا بھر کی عورتوں میں سے تجھے منتخب کیا ہے۔ اے مریم! اپنے رب کی فرماں برداری کر، سجدہ کر اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر۔'' سو اس قدر ان مستورات کو حاصل ہے، لیکن اس سے کچھ یہ لازم نہیں آتا کہ وہ نبیات ہوں۔ اگر اس کے قائل کی مراد ان عورتوں کی اسی قدر بزرگی ہے تو اس میں کچھ شک نہیں ہے۔

اس بات پر کلام باقی رہا کہ ان کا صرف یہ شرف نبوت کی لڑی میں پروئے ہوئے ہونے کے لیے کافی ہے یا نہیں؟ سو اہلِ سنت و جماعت کا مذہب شیخ ابو الحسن اشعری رحمہ اللہ کے نقل کیے ہوئے مسلک کے مطابق یہ ہے کہ عورتوں میں کوئی پیغمبر نہیں ہوئی۔ ہاں ان میں صدیقات ہوئی ہیں، جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمام عورتوں سے زیادہ عزت و شرف والی، یعنی مریم بنت عمران کے حال کی خبر دی ہے کہ ﴿ مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ۭ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ﴾ [المآئدۃ: ۷۵] ''مسیح ابن مریم نہیں ہیں مگر ایک رسول ہی۔ بلاشبہہ ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں اور ان کی ماں صدیقہ (نہایت راستباز) تھی، وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔'' اس جگہ مریم کا وصف اشرف مقامات میں صدیقیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اگر وہ نبیہ ہوتیں تو ذکر نبوت کا بھی آتا، کیوں کہ یہ جگہ تھی جہاں ان کا شرف اور عظمت بیان کی جاتی، لیکن مریم کا صدیقہ ہونا تو نصِ قرآن سے ثابت ہے۔ [1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے رجال کی تفسیر میں کہا ہے، یعنی وہ رسول آسمان والوں میں سے نہ تھے، جس طرح تم کہتے ہو، بلکہ زمین کے آدمی تھے۔ [2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے اس قول کی تائید اس آیت شریف سے ہوتی ہے: ﴿ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّاۤ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ﴾ [الفرقان: ۲۰] ''اور (اے نبی!) ہم نے آپ سے پہلے جتنے بھی رسول بھیجے، بلاشبہہ وہ کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے

---

[1] تفسير ابن كثير (٢/ ٦٤٥) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢١٠)

تھے۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ۝ ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنٰهُمْ وَمَنْ نَّشَآءُ وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ ﴾ [الأنبيآء: ۸۔ ۹] ''اور ہم نے ان (نبیوں) کے ایسے جسم نہیں بنائے تھے کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں، اور نہ وہ ہمیشہ رہنے والے تھے۔ پھر ہم نے ان (رسولوں) سے وعدہ سچا کر دکھایا، چناں چہ ہم نے ان کو اور جسے ہم نے چاہا نجات دی اور ہم نے حد سے گزرنے والوں کو ہلاک کر دیا۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ ﴾ [الأحقاف: ۹] ''کہہ دیجیے: میں رسولوں سے انوکھا نہیں۔''

﴿ اَلْقُرٰى ﴾ سے اس جگہ مراد شہر ہیں نہ یہ کہ وہ گاؤں کے لوگ تھے، جن کی طبیعتیں اور اخلاق جفا پیشہ ہوتے ہیں۔ یہی بات زیادہ معروف اور مشہور ہے۔ بر خلاف شہری لوگوں کے، کیوں کہ ان کی طبیعتیں بادیہ نشین جنگلیوں کے مقابلے میں زیادہ نرم و نازک ہوتی ہیں، جب کہ کھیتی باڑی کرنے والے لوگ اور شہروں کے گرد و نواح کے لوگ صحرائی لوگوں کے حال کے قریب ہوتے ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا ﴾ [التوبة: ۹۷] ''دیہاتی کفر اور منافقت میں زیادہ سخت ہیں۔'' امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: شہر والے اعلم و احلم (زیادہ علم اور حوصلے والے) ہوتے ہیں بہ نسبت اہلِ عمود کے۔[1]

حدیث میں مروی ہے کہ ایک اعرابی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدیہ بھیجا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے مکافات (ہدیے کا بدلہ دینے) میں یہاں تک زیادتی کی کہ وہ راضی ہو گیا، تب فرمایا: «لَقَدْ هَمَمْتُ أَنْ لَّا أَتَّهِبَ هِبَةً إِلَّا مِنْ قُرَشِيٍّ أَوْ أَنصَارِيٍّ أَوْ ثَقَفِيٍّ أَوْ دَوْسِيٍّ »[2] [بلاشبہ یقیناً میں نے یہ عزم کر لیا ہے کہ میں صرف کسی قریشی، انصاری، ثقفی یا دوسری شخص ہی کا ہدیہ قبول کروں گا] سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ « إِنَّ الْمُؤْمِنَ الَّذِيْ يُخَالِطُ النَّاسَ وَيَصْبِرُ عَلٰى أَذَاهُمْ خَيْرٌ مِّنَ الَّذِيْ لَا يُخَالِطُهُمْ وَلَا يَصْبِرُ عَلٰى أَذَاهُمْ »[3] [یقیناً جونسا مومن لوگوں سے ملتا جلتا ہے اور ان سے ملنے والی تکلیف پر صبر کرتا ہے وہ اس (مومن) سے بہتر ہے جو ان سے ملتا جلتا ہے اور نہ ہی ان کی تکلیف پر صبر کرتا ہے]

پھر فرمایا کہ یہ جھٹلانے والے کیا زمین میں نہیں چلے پھرے کہ اگلی ہلاک شدہ اُمتوں کا انجام دیکھتے، جیسے: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ ﴾ [الحج: ٤٦] ''کیا پھر وہ

---

① تفسیر ابن أبي حاتم (۸/ ۲۲۱۰)

② مسند أحمد (۱/ ۲۹۵) مسند الحمیدي (۲/ ٤٥۳) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔ مزید دیکھیں: إرواء الغلیل (٦/ ٤٧۔ ٤٨)

③ سنن الترمذي، رقم الحدیث (۲۵۰۷) سنن ابن ماجه، رقم (٤٠۳۲) مسند أحمد (۲/ ٤۳) صحیح الجامع، رقم (٦٦٥١)

زمین میں چلے پھرے نہیں کہ ان کے دل ہوتے جن سے وہ سمجھتے۔'' ان خبروں کو سن کر جان سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کو ہلاک کیا اور مومنوں کو نجات دی۔ اللہ تعالیٰ کی سنت اس کی مخلوق میں اسی طرح جاری وساری وطاری ہے۔ لہٰذا فرمایا کہ آخرت کا گھر بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔ یعنی جس طرح کہ ہم نے مومنوں کو اس دنیا میں نجات دی اسی طرح ہم نے ان کے لیے دارِ آخرت سے بھی نجات لکھ رکھی ہے، یہ ان کے لیے دنیا سے کہیں زیادہ بہتر ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ۝ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴾ [المؤمن: ٥١۔ ٥٢] ''بلاشبہ ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی مدد دنیاوی زندگی میں بھی کرتے ہیں اور اس دن بھی (کریں گے) جب گواہ کھڑے ہوں گے۔ اس دن ظالموں کو ان کی معذرت کوئی نفع نہیں دے گی اور ان کے لیے لعنت ہے اور ان کے لیے برا گھر ہے۔'' دار کو آخرت کی طرف مضاف کیا، جیسے: صلوۃ الاولی، مسجد الجامع، عامِ اول، بارحۃ الاولی اور یوم الخمیس۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں اس شخص کی تردید ہے جو یہ کہتا ہے کہ کوئی فرشتہ رسول بن کر کیوں نہ نازل ہوا، یعنی تجھ سے پہلے۔ ہم نے یہی مرد ہی رسول مقرر کیے نہ کہ آسمانوں کے فرشتے۔ آیتِ کریمہ اس بات پر دلیل ہے کہ کوئی فرشتوں سے، یا جنات میں سے مبعوث نہیں ہوا۔ بعض نے کہا ہے کہ چار عورتیں پیغمبر ہوئیں: آسیہ، موسیٰ علیہ السلام کی ماں، مریم اور حواء۔ حالاں کہ یہ بات عرب کے نزدیک مشہور تھی کہ انبیا مردوں میں سے ہوتے ہیں نہ کہ عورتوں میں سے۔ قریٰ سے مراد شہر ہیں نہ کہ صحرانشین، اس لیے کہ بادیہ نشین لوگوں پر جفا اور سختی غالب ہوتی ہے اور شہر والے تام العقل، کامل الحلم، احسن العمل اور اجل الفضل ہوا کرتے ہیں

مردود مرد را احمق کند ۔۔۔ عقل را بے نور و بے رونق کند

''مردود اور شیطان صفت آدمی سادہ لوح آدمی کو بیوقوف بنا دیتا ہے وہ اس کی سوچ اور سمجھ کو بالکل ضائع کر دیتا ہے۔''

امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بدووں، جنوں اور عورتوں میں سے کوئی نبی نہیں ہوا۔[1] کیا یہ مشرک جو نبوتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے منکر ہیں، انھوں نے زمین کی سیر نہیں کی کہ گزشتہ اُمتوں کے مقامات کو دیکھتے اور عبرت حاصل کرتے اور ان پر نازل ہونے والے عذاب کو یاد کر کے اس تکذیب سے باز آتے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا کہ یعنی دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے قومِ نوح، قومِ لوط اور قومِ صالح وغیرہ اُمتوں کو کس طرح عذاب کیا۔[2] دارِ آخرت یعنی جنت بہتر ہے دارِ دنیا سے اہلِ تقویٰ کے لیے۔ تم اس بات کو نہیں سمجھتے، یعنی اس میں غور وفکر نہیں کرتے کہ عبرت پکڑو اور ایمان لاؤ۔[3]

---

[1] تفسير البغوي (٤/ ٢٨٥) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢١٠) [3] فتح البيان (٦/ ٤١٦۔ ٤١٧)

حَتّٰۤى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ ؕ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ۝۱۱۰

حتیٰ کہ جب رسول مایوس ہوگئے اور وہ (لوگ) گمان کرنے لگے کہ انھیں خلافِ واقعہ خبر دی گئی ہے تو ان (انبیاء و رسل) کے پاس ہماری مدد آپہنچی، پھر نجات ملی، اسے جسے ہم نے چاہا اور مجرم قوم سے ہمارا عذاب ٹالا نہیں جاتا ۝۱۱۰

مشکل حالات میں رسولوں کے لیے نصرتِ الٰہی:

یعنی عذاب کے وعدے کو دیر لگی، یہاں تک کہ رسول نا اُمید ہونے لگے کہ شاید ہماری زندگی میں نہ آئے، بعد میں آئے گا اور ان کے یار خیال کرنے لگے کہ شاید وہ وعدہ خلاف تھا۔ اتنے خیال سے آدمی کافر نہیں ہوتا، اگر جانتا ہے کہ یہ خیالِ بد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے کہ ہماری مدد رسولوں پر ان کی تنگی کے حالات میں اور اللہ کی طرف سے آسانی کے انتظار میں اس وقت نازل ہوتی ہے جب اللہ کے نزدیک اُس ضرورت کا وقت آتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴾ [البقرة: ٢١٤] ''اور وہ ہلا ڈالے گئے، یہاں تک کہ رسول اور وہ لوگ جو ان پر ایمان لائے تھے، کہنے لگے: اللہ کی مدد کب (آئے گی؟) آگاہ رہو! بے شک اللہ کی مدد قریب ہے۔''

لفظ ﴿ كُذِبُوْا ﴾ میں دو قراءتیں ہیں، ایک تشدید کے ساتھ ''کُذِّبُوْا''، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اسی طرح پڑھتی تھیں، صحیح بخاری میں ان سے اسی طرح مروی ہے[1] اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بالتخفیف پڑھا ہے اور کہا ہے کہ وہ بشر تھے۔ پھر یہ آیتِ کریمہ پڑھی: ﴿ حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ... الخ ﴾ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بھی تخفیف کے قائل تھے، لیکن ان دونوں صاحبوں سے تشدید کے ساتھ قراءت بھی مروی ہے۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی قراءت کی تائید کی ہے اور کہا ہے کہ جمہور سے یوں ہی مشہور ہے اور دوسرے قول کو زیف وردی کہا ہے اور پسند نہیں کیا۔[2] واللہ أعلم.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جب رسول اپنی قوم کے کفر میں منہمک اور مشغول ہونے کی وجہ سے ان کے ایمان لانے سے نا اُمید ہوئے اور گمان کیا کہ انھوں نے جھوٹ کہا تھا۔ صحابہ و تابعین کی ایک جماعت اور کسائی اور فراء رحمہما اللہ نے ﴿ كُذِبُوْا ﴾ کا لفظ تخفیف کے ساتھ مجہول کے صیغے پر پڑھا ہے، یعنی قوم کو یہ گمان ہوا کہ ان رسولوں نے ہم سے جھوٹ کہا کہ عذاب آئے گا، وہ تو اب تک نہیں آیا اور ان کی تصدیق نہ کی۔ یا قوم نے یہ گمان کیا کہ رسولوں نے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤١٨)
[2] تفسير الطبري (١٦/ ٣٠٥۔ ٣١٠)

اللہ کی نصرت کے وعدے کے بارے میں ہم سے جھوٹ بولا، یا خود رسولوں کو یہ گمان ہوا کہ ہم نے جو یہ بات کہی تھی کہ ہم کو ان پر مدد ملے گی، اس میں ہم جھوٹے ہوئے۔[1]

دوسری جماعت نے اس لفظ کو تشدید کے ساتھ پڑھا ہے: ''كُذِّبُوْا'' اس کے معنے واضح ہیں۔ یعنی رسولوں کو یہ گمان ہوا کہ ان کی قوم نے عذاب آنے کے وعدے کے بارے میں ان کو جھٹلایا۔ بعض نے کہا: اس جگہ ظن بہ معنی یقین ہے، کیوں کہ رسولوں کو اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ قوم ان کو جھٹلا رہی ہے۔ امام خازن اور خفاجی رحمہ اللہ نے اس آیت کے بیان میں بہت طوالت کی ہے، اس جگہ اس کے ذکر کرنے میں کچھ زیادہ فائدہ نہیں ہے۔ بالجملہ جب یہ ظن ہوا یا یقین ہوا تو ان کو اللہ کی مدد آئی۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ مجھے تخفیف کی قراءت: ﴿كُذِبُوْا﴾ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محفوظ ہے، یعنی سورت یوسف میں۔[2]

سلف کا کلام اس جگہ صحابہ کے خلاف کی طرف راجح ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ جس کو اپنے بندوں میں سے چاہتا ہے کفار پر نزولِ عذاب کے وقت نجات دیتا ہے۔ رسول اور ان کے مومن متبعین نجات پاتے ہیں اور جھٹلانے والے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اللہ کا عذاب جب نازل ہو جاتا ہے تو مجرموں کی قوم سے واپس نہیں ہوتا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے رسول بھیجے، انھوں نے اپنی قوم کو خبر کر دی کہ اللہ کا مطیع نجات پانے والا ہے اور اس کی اطاعت سے منہ پھیرنے والا عذاب اور جہنم میں گرفتار ہونے والا ہے۔[3]

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ؕ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

البتہ یقیناً ان کے قصوں میں عقل والوں کے لیے عبرت ہے۔ یہ (قرآن) گھڑی ہوئی بات نہیں، بلکہ اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق اور ہر چیز کی تفصیل ہے اور ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے ﴿۱۱۱﴾

انبیاء کے واقعات عقل مندوں کے لیے عبرت و نصیحت ہیں:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان رسولوں کے قصے میں جو اُن کی قوموں کے ساتھ گزرا ہے کہ مومنوں کو ہم نے نجات دی اور کافروں کو ہلاک کیا، عقل مندوں کے لیے ایک بڑی عبرت و نصیحت و موعظت اور پندِ سود مند ہے۔ یہ قرآن

[1] تفسير القرطبي (٩/ ٢٧٥ـ ٢٧٦) [2] الدر المنثور (٤/ ٥٩٧)
[3] تفسير الطبري (١٦/ ٣١٢) فتح البيان (٦/ ٤١٨ـ ٤١٩)

کچھ بنائی ہوئی بات نہیں ہے کہ اللہ پر جوڑ دی ہو اور دروغ بندی اور افترا پردازی کی ہو، بلکہ جو کتابیں اس قرآن سے قبل آسمان سے اُتری ہیں، یہ ان کتابوں کی تصدیق، تحقیق وتوثیق کرتا ہے۔ صحیح کو علاحدہ کرتا ہے اور تحریف کی ہوئی اور تبدیل کی ہوئی بات کو علاحدہ بتاتا ہے اور ان سب پر منسوخ ہونے کا حکم جاری کرتا ہے۔ یا ان کی کسی بات کو قائم رہنے دیتا ہے۔ اس میں ہر حلال وحرام اور محبوب ومکروہ کی تفصیل ہے۔ اس کے علاوہ طاعات و واجبات ومستحبات کا حکم دیا ہے۔ محرمات ومنہیات ومکروہ اور اس جیسی دوسری چیزوں سے منع کیا ہے۔

واضح امور اور آنے والے معاملات جو پوشیدہ ہیں، ان کے بارے میں اجمالاً اور تفصیلاً اور اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور صفات اور مماثلتِ مخلوقات سے اس کی پاکیزگی کی معلومات کھول کر بیان کرتا ہے اور واضح کرتا ہے۔ اس لیے ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ٹھہرا ہے۔ ان کے دل سرکشی سے رشد وہدایت کی طرف اور گمراہی سے صحیح راستے کی طرف گامزن ہوتے ہیں اور پروردگار سے دنیا اور آخرت کی رحمت کے طلب گار ہیں۔

فَنَسْأَلُ اللّٰهَ الْعَظِيْمَ أَنْ يَّجْعَلَنَا مِنْهُمْ فِيْ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ يَوْمَ يَفُوْزُ بِالرِّبْحِ الْمُبَيَّضَةِ وُجُوْهُهُمْ وَيَرْجِعُ الْمُسْوَدَّةُ وُجُوْهُهُمْ بِالصَّفْقَةِ الْخَاسِرَةِ.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ البتہ ان کے قصوں میں، یعنی ان رسولوں کے جو پہلی اُمتوں میں مبعوث ہوئے یا اس قصۂ یوسف، زلیخا و برادران و پدرِ یوسف کے فکر وبصیرت ہے، جو جہالت وحیرت سے خلاصی دینے والی ہے۔ کسی نے کہا: عبرت ایک طرح کا اعتبار کرنا ہے، یعنی عبور کرنا ہے معلوم چیز کی طرف سے اس چیز کی طرف جو معلوم نہیں۔ یہ عبرت عقل مند لوگوں کے لیے ہے جو اپنی عقلِ سلیم سے دین کی جملہ مصلحتوں میں تدبر کرتے ہیں۔ ان قصوں کا عبرت ہونا اس لیے ہے کہ یہ ان خبروں پر مشتمل ہیں جو واقع کے مطابق ہیں، باوجود نبی مکرم ﷺ اور ان رسولوں کے درمیان، جن کی یہ کہانی ہے، ایک طویل مدت گزر چکی ہے۔ ان میں سے ایک یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائی اور اُن کے والد ماجد ہیں، حالاں کہ نبی مکرم ﷺ ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے اور نہ ان کی خبر آپ ﷺ تک پہنچی تھی۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا کہ اعتبار کی وجہ یہ ہے کہ شروع میں فرمایا تھا: ﴿ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ ﴾ [یوسف: ۳] ''ہم آپ کو ایک بہترین داستان سناتے ہیں۔''

اس جگہ یہ کہا: ﴿ لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) اس میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ اس داستان کی خوبی وحسن اسی عبرت حاصل ہونے کے لیے ہے، تاکہ اللہ کی حکمت اور قدرت کی شناخت ہاتھ آئے۔ یہ قصے یا یہ قرآن، جس کو ہم نے عربی زبان میں نازل کیا ہے، کوئی سخنِ ساختہ و پرداختہ نہیں ہے۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ بنایا ہوا اور جھوٹ نہیں ہے، بلکہ پہلی اُتاری ہوئی کتابوں کی تصدیق ہے، جیسے: تورات و زبور و انجیل، یا تمام آسمانی کتابوں اور صحیفوں کی تصدیق ہے۔ سب پر گواہی دیتا ہے کہ وہ حق ہیں اور اللہ کے پاس سے آئے ہیں[1] اور اس میں مجمل شریعتوں میں سے جو تشریح، بیان اور تفصیل کی محتاج ہیں، ان سب چیزوں کی تفصیل ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس پاک کتاب میں کوئی شے احکام و حدود و قصص و مواعظ و امثال و غیر ذلک سے باقی نہیں چھوڑی۔ یا ہر شے سے مراد قصہ یوسف علیہ السلام و برادران و والدِ یوسف علیہ السلام ہے۔ بعض نے کہا کہ عموم شے مراد نہیں، بلکہ مراد اصول وقوانین اور ہر شے کے ضابطے ہیں۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے حلال وحرام اور طاعت و معصیت کی تفصیل فرما دی ہے۔[2] کسی نے کہا کہ دینی امور میں سے ہر چیز کا ایک مستند قرآن میں ہے، بالواسطہ یا بلا واسطہ۔ یہ قرآن اس شخص کے لیے ہدایت ہے جو اس کا متلاشی ہے اور آخرت میں رحمت ہے۔ جو کوئی اس پر صحیح ایمان کی شرط سے عمل کرے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان پر رحم فرمائے گا۔ لہٰذا فرمایا کہ یہ نفع ایمان دار قوم کے لیے ہے، یعنی ان لوگوں کے لیے جو اللہ اور رسول، کتب، ملائکہ، شریعتوں اور تقدیر پر ایمان لاتے ہیں اور یوم الجزاء کے قائل ہیں اور جو لوگ اس وصف کے حامل نہیں ہیں ان کو نہ کچھ نفع ہو اور نہ ہدایت حاصل ہو، اسی لیے وہ اس جزائے خیر کے بھی مستحق نہیں ہیں۔[3] اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا مِنْ أَھْلِ الْھُدیٰ وَ الرَّحْمَةِ، آمِیْنَ یَا رَبَّ الْعَالَمِیْنَ!

آج روز یکشنبہ دہم جمادی الاولیٰ ۱۳۰۶ھ کو وقت نواخت (بمطابق) یک نیم ساعت روز یہ ترجمہ سورت یوسف کا بحمدہ تعالیٰ وعونہ ختم ہوا۔ خَتَمَ اللّٰهُ لَنَا بِالْحُسْنٰی وَزِيَادَةٍ، وَرَزَقَنَا بِرَحْمَتِهٖ وَعَفْوِهٖ وَمَنِّهٖ وَكَرَمِهٖ حُسْنَ الْعَاقِبَةِ فِيْ دَارِ السَّعَادَةِ، وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ وَهُوَ خَيْرُ مَنْ أَعَانَ.

---

[1] تفسیر الطبري (١٦/ ٣١٤) [2] تفسیر الطبري (١٦/ ٣١٤) [3] فتح البیان (٦/ ٤٢٠۔ ٤٢١)

سُوْرَةُ الرَّعْدِ

اس سورت میں ۴۳ یا ۴۴ یا ۴۵ یا ۴۶ آیات ہیں۔ اس کے مکی یا مدنی ہونے میں اختلاف ہے۔ امام سعید بن جبیر، حسن، عکرمہ، عطا اور جابر بن زید رحمہم اللہ مکی کہتے ہیں اور امام کلبی اور مقاتل رحمہما اللہ مدنی بتاتے ہیں۔ تیسرا قول یہ ہے کہ مدنی ہے، مگر دو آیتیں ایسی ہیں جو مکے میں اُتری ہیں: ﴿ وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ ﴾ [الرعد: ۳۰] ''اور اگر بلاشبہ (قرآن ایسا ہوتا) کہ اس کے ذریعے سے پہاڑ چلائے جاتے۔'' یا یہ آیت: ﴿ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ ﴾ [الرعد: ۳۱] ''اور جنھوں نے کفر کیا ان کے کرتوتوں پر انھیں آفت پہنچتی ہی رہے گی۔'' یا یہ آیت: ﴿ هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ ﴾ [الرعد: ۱۲] ''وہی ہے جو تمھیں بجلی دکھاتا ہے۔'' إلیٰ قوله: ﴿ لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ﴾ [الرعد: ۱۴] ''اسی کو پکارنا برحق ہے۔'' جابر بن زید رحمہ اللہ اس بات کو دوست رکھتے تھے کہ میت کے پاس احتضار (موت کے حاضر ہونے) کے وقت سورۃ الرعد پڑھی جائے،[1] اس سے مردے پر تخفیف ہوتی ہے اور اس کا پڑھنا مرنے کو آسان کرتا ہے۔[2] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ سورت مکی ہے۔[3]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓرٰ ۫ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ ؕ وَالَّذِيْۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۱

الٓمّٓرٰ (اے نبی!) یہ کتاب کی آیات ہیں، اور جو آپ کے رب کی جانب سے آپ کی طرف نازل کیا گیا وہی حق ہے، اور لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے ①

قرآن کی حقانیت میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے:

حروفِ مقطعہ پر کلام سورت بقرہ وغیرہا کے شروع میں گزر چکا ہے۔ جونسی سورت اِن حرفوں کے ساتھ شروع

[1] مصنف ابن أبي شيبة (۲/ ٤٤٥) [2] فتح القدير (۳/ ۸۷)

[3] تفسیر ابن کثیر کا جو مطبوعہ نسخہ ہمارے پاس ہے، اس میں حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کا یہ قول نہیں ہے۔ البتہ تفسیر ابن کثیر کا وہ نسخہ جو محقق سامی بن محمد سلامہ کی تحقیق سے چھپا ہے، اس میں یہ قول موجود ہے۔ دیکھیں: تفسير ابن كثير۔ ت سامي بن محمد سلامه (٤/ ٤٢٨)

کی جاتی ہے اس میں قرآن پاک کا انحصار اور اس امر کا اظہار ہوتا ہے کہ اس کا نزول اللہ تعالیٰ کے پاس سے ہے، اس میں کچھ شک وشبہ نہیں۔ اس لیے فرمایا کہ یہ کتاب یعنی قرآن کی آیتیں ہیں۔ یا کتاب سے مراد تورات اور انجیل ہے۔ امام مجاہد اور قتادہ رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے،[1] لیکن اس میں نظر ہے، بلکہ یہ بعید ہے۔ پھر اس کے بعد کا عطف بطور صفت کیا اور فرمایا کہ اے محمد! وہ چیز جو تجھ پر اُتری ہے، تیرے رب کی طرف سے ہے۔ یہ خبر ہے مبتدا کی جو پہلے ذکر کیا گیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ ... الخ﴾۔ یہی صحیح ہے اور امام مجاہد اور قتادہ رحمہ اللہ کی تفسیر کے مطابق ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ کا مختار یہ ہے کہ اس جگہ واؤ زائد ہے یا واؤ عاطفہ ہے کہ ایک صفت کو دوسری صفت پر عطف کیا ہے[1] اور یہ ارشاد کہ اکثر لوگ نہیں مانتے، اس آیت کی طرح ہے: ﴿وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ﴾ [یوسف: ۱۰۳] ''اور اکثر لوگ، اگرچہ آپ حرص کریں، ایمان لانے والے نہیں۔'' یعنی باوجود اس جلا و بیان و وضاحت کے شقاق وعناد و نفاق کے سبب اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: ﴿الٓمّٓرٰ﴾ کے معنے ہیں: ''أَنَا اللّٰهُ وَأَرٰى'' [میں اللہ ہوں اور میں دیکھتا ہوں] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فواتح ہیں۔[2] اللہ تعالیٰ اپنے کلام کو ان حروفِ مقطعہ سے شروع کرتا ہے۔ کسی نے کہا کہ یہ سورت کا نام ہے، لیکن راجح حق یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی جانے کہ اس کی ان حرفوں سے کیا مراد ہے۔ ہر چند کہ ان حروف کے بارے میں صحابہ کے آثار اور اُن کے بعد والوں کے اقوال آئے ہیں اور اُن کے ظاہری معانی کچھ آیاتِ محکمات کے خلاف نہیں ہوتے، لیکن جس چیز کی تکلیف ہمیں اللہ اور رسول نے نہیں دی اور جس کے معانی ہم کو نہیں بتائے گئے اور جو الفاظ متشابہات میں داخل ہیں، ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ہم اس میں غور وخوض کریں۔ میرا دل اس کارروائی سے، خواہ سلف کی ہو یا خلف کی، نہایت قلق میں ہے۔ عفا اللّٰہ عنا وعنھم.

اس سورت کی یہ آیات یا رسولوں کی یہ خبریں یا یہ نشانیاں اس قرآن پاک کی آیتیں ہیں اس سورتِ کاملہ عجیبۃ الشان کی اور یہ قرآن جو تجھ پر تیرے رب کی طرف سے اترا ہے، حق ہے۔ اس میں کسی طرح کا شک وشبہہ نہیں، لیکن اکثر لوگ یعنی مشرکینِ مکہ مکرمہ اس نازل شدہ حق پر ایمان نہیں لاتے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: جب اللہ تعالیٰ نے ان کے ایمان نہ لانے کا ذکر کیا تو ایسی دلیل ذکر کی، جو خالق کی تصدیق کرنے کو واجب کرتی ہے۔[3] چناں چہ فرمایا:

اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ

[1] تفسير الطبري (١٦/ ٣٢٠) [2] تفسير الطبري (١٦/ ٣٢٠) [3] معاني القرآن (٣/ ١٣٦) فتح البيان (٧/ ٩)

يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ۝۲

اللہ وہ ذات ہے جس نے ستونوں کے بغیر آسمان بلند کیے، تم انھیں دیکھتے ہو، پھر وہ عرش پر مستوی ہوا، اور سورج اور چاند کو کام پر لگایا، ہر ایک مقررہ مدت کے لیے چل رہا ہے۔ وہ کام کی تدبیر کرتا ہے، (اپنی) نشانیاں تفصیل سے بیان کرتا ہے، تاکہ تم اپنے رب سے ملاقات پر یقین کر لو ②

اللہ تعالیٰ کے کمالِ قدرت کا بیان:

میعادِ معین تک، یعنی قیامت تک۔ یا اپنے اپنے دور تک، سورج ایک برس تک اور چاند ایک مہینے تک، پھر نیا دور شروع کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کمالِ قدرت اور عظیم سلطان کی خبر دی کہ اللہ وہ ہے، جس کے اذن اور حکم سے آسمان بغیر ستون کے اونچے ہوئے، یعنی زمین سے اوپر اور بلندی کا اتنا فاصلہ اس کے اذن اور حکم اور تسخیر سے ہوا کہ اس کی انتہا تک کوئی نہیں پہنچ سکتا اور نہ ہی اس کے آخری کنارے کا ادراک کر سکتا ہے۔ دنیا کا آسمان ساری زمین کو گھیرے ہوئے ہے اور اس کو بھی جو کچھ زمین کے اردگرد ہے، جیسے پانی اور ہوا۔ اس کو تمام اطراف اور جہات سے گھیرے ہوئے ہے اور ہر طرف سے یکساں طور پر زمین سے بلند ہے اور آسمان اور زمین کے درمیان ہر جگہ اور کنارے سے پانچ سو برس کا فاصلہ ہے اور اس کا سمک یعنی موٹائی بھی پانچ سو سال کی مسافت کے برابر ہے۔ پھر دوسرا آسمان دنیا کے آسمان کو گھیرے ہوئے ہے، ان تمام چیزوں کے ساتھ جس کو وہ حاوی ہے اور دونوں آسمانوں کے درمیان پانچ سو سال کا راستہ ہے اور آسمان کی موٹائی پانچ سو برس کی۔

اسی طرح تیسرا، چوتھا، پانچواں، چھٹا اور ساتواں آسمان اپنے سے نیچے والے آسمان کو گھیرے ہوئے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ﴾ [الطلاق: ١٢] ”اللہ وہ ذات ہے جس نے سات آسمان پیدا کیے اور زمینیں بھی ان (آسمانوں) کی مثل۔“ حدیث میں مروی ہے: « مَا السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَمَا فِيهِنَّ وَمَا بَيْنَهُنَّ فِي الْكُرْسِيِّ إِلَّا كَحَلْقَةٍ مُلْقَاةٍ بِأَرْضٍ فَلَاةٍ وَالْكُرْسِيُّ فِي الْعَرْشِ كَتِلْكَ الْحَلْقَةِ فِي تِلْكَ الْفَلَاةِ » یعنی ساتوں آسمان کرسی کے سامنے ایسے ہیں، جیسے کسی صحرا کی زمین میں ایک چھلا ہو اور کرسی عرش کے سامنے اس صحرا میں اس چھلے کی طرح ہے۔[1] اس سے عرشِ عظیم کی عظمت غایت درجہ ثابت ہوئی، جس کے تصور سے ذہن تنگی کرتا ہے۔ دوسری روایت میں مروی ہے: « اَلْعَرْشُ لَا يَقْدِرُ قَدْرَهُ إِلَّا اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ »[2] [عرش کی مقدار و قدر کو اللہ عز وجل ہی جانتا ہے] اور بعض سلف نے کہا ہے کہ عرش اور زمین کے درمیان

① صحیح ابن حبان (٢/ ٧٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٠٩)

② مستدرك الحاكم (٢/ ٣٠١) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

کا فاصلہ پچاس ہزار سال کی راہ کا ہے اور عرش کے دونوں قطر (کناروں) کے درمیان فاصلہ پچاس ہزار سال ہے اور عرش ایک یاقوت سرخ ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، حسن، قتادہ اور غیر واحد رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ آسمانوں کے لیے ستون ہیں، لیکن دکھائی نہیں دیتے۔ ایاس بن معاویہ رحمہ اللہ نے کہا کہ آسمان زمین پر قبے کی طرح ہے، یعنی بغیر ستون اسی طرح امام قتادہ رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔[1] سیاق کے مطابق بھی یہی ہے اور اس آیت سے ظاہر ہے: ﴿ وَيُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ﴾ [الحج: ٦٥] ''اور وہ آسمان کو تھامے ہوئے ہے کہ اس کے اذن کے بغیر وہ زمین پر (نہ) گرے۔'' اس صورت میں یہ کہنا کہ تم اس کو دیکھتے ہو، اس نفی کی تاکید ہے، یعنی یہ آسمان اونچا ہے، بغیر ایسے ستون کے جس کو تم دیکھو۔ سو یہی بات قدرت میں کامل تر ہے۔

﴿ اِسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ﴾ کی تفسیر سورت اعراف میں گزر چکی ہے۔ یہ استوا جس طرح پر مروی ہے، اسی طرح پر اس کو سمجھنا چاہیے بغیر تشبیہ، کیفیت وتعطیل وتبدیل کے۔ تعالی اللّٰہ علواً کبیراً۔ اجلِ مسمی سے یہ مراد ہے کہ زمانے کے ختم ہونے تک، یعنی قیامت قائم ہونے تک سورج اور چاند نکلتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ﴾ [یٰس: ٣٨] ''اور سورج اپنے ٹھکانے (پر پہنچنے) کے لیے رواں دواں رہتا ہے۔''

بعض نے کہا: مراد اُن دونوں کا زیرِ عرش قرار پکڑنا ہے، دوسری طرف سے زمین کے شکم سے متصل رہتے ہوئے، کیوں کہ سورج اور چاند اور تمام ستارے جب اس جگہ پہنچتے ہیں تو عرش سے دور تر ہوتے ہیں۔ صحیح قول کے مطابق، جس پر بہت سی دلیلیں قائم ہیں، عرش ایک قبہ ہے، جو عالم سے متصل ہے، اس وجہ سے تمام افلاک کی طرح وہ گھیرنے والا نہیں ہے، کیوں کہ اس کے قائم کرنے والے ہیں اور اُٹھانے والے ہیں، جو اس کو اٹھائے ہوئے ہیں اور یہ بات گول فلک میں ثابت نہیں ہے۔ جس شخص نے آیات واحادیثِ صحیحہ میں تدبر کیا، اس پر یہ بات واضح اور غیر مخفی ہے۔ وللّٰہ الحمد والمنّة.

آفتاب اور ماہتاب کا ذکر خاص طور پر اس جگہ اس لیے فرمایا ہے کہ سیاروں میں سات کواکب میں یہ دونوں بہت بڑے ہیں۔ پس جب کہ یہ دونوں مسخر ٹھہرے تو تمام کواکب بہ طریقِ اولیٰ مسخر ہوئے، جس طرح دوسری آیت میں اس بات پر تنبیہ فرمائی ہے: ﴿ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴾ [حمٓ السجدة: ٣٧] ''تم لوگ نہ تو سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو، اگر واقعی تم اسی کی عبادت کرتے ہو تو تم اس اللہ کو سجدہ کرو جس نے ان (سب) کو پیدا کیا ہے۔'' حالاں کہ یہ تصریح اور جگہ بھی ہو چکی

[1] تفسیر الطبري (١٦/ ٣٢٣_ ٣٢٥)

ہے اللہ کے اس فرمان کے ساتھ: ﴿ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ ؕ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ؕ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [الأعراف: ٥٤] ''اور اس نے سورج، چاند اور تارے اس طرح پیدا کیے کہ وہ سب اس (اللہ) کے حکم کے پابند کر دیے گئے ہیں۔ آگاہ رہو! پیدا کرنا اور حکم صادر کرنا اسی کے لیے زوا ہے، اللہ رب العالمین بہت بابرکت ہے۔'' ان آیات کی تفصیل سے مراد توحید پر دلالت کرنے والی دلیلیں ہیں۔ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ، وَإِنَّهُ يُعِيْدُ الْخَلْقَ إِذَا شَآءَ كَمَا بَدَأَ.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ﴿ عَمَدٍ ﴾ سے مراد ستون ہیں۔ یعنی یہ آسمان بغیر ایسے ستون کے قائم ہیں جن پر معتمد ہوں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ عَمَدٍ ﴾ اللہ کی قدرت ہے، جس سے آسمان تھمے ہوئے ہیں۔ ہم کو یہ قدرت نظر نہیں آتی۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ تجھ کو کیا معلوم ہے شاید ستون ہوں، جن کو تو دیکھ نہیں سکتا۔ جمہور مفسرین اور امام حسن اور قتادہ رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ آسمان زمین کے اوپر ایک قبے کی طرح ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ آسمان چار فرشتوں پر ہے۔ ہر زاویے پر ایک فرشتہ ہے۔[3]

﴿ اِسْتَوٰى ﴾ سے وہ استواء مراد ہے جو اس کی ذات پاک کے لائق ہو۔ سلف کا یہی مذہب ہے۔ معتزلہ نے کہا کہ ﴿ اِسْتَوٰى ﴾ بمعنے استیلاء (غالب ہونا) ہے حفظ و تدبیر کے ساتھ، لیکن حق یہ ہے کہ عرش پر استواء اللہ سبحانہ کی ایک صفت ہے بلا کیف۔ اس بارے میں علمائے اُمت میں بڑے بڑے زلازل (زلزلے، ہنگامے) و بلابل (اضطراب وتشویش) و قلاقل (بے اطمینانی و پریشانی) ہو چکے ہیں اور اس سلسلے میں مستقل کتابیں اور رسائل تالیف ہوئے، جس کی اُمت کو ضرورت نہ تھی۔ سلف نے آیاتِ صفات کو بغیر تاویل و تشبیہ و تمثیل کے ان کے ظاہر پر جاری رکھا ہے اور اس بارے میں زیادہ غور و خوض نہیں کیا۔ معتزلہ اور علمائے کلام نے تاویل اختیار کی، یہ تاویل حقیقت میں تکذیب کی ایک شاخ ہے۔

ہمارے لیے اسی قدر کافی ہے کہ ہم آیاتِ کتابِ عزیز کے ظاہر پر اور سنتِ مطہرہ پر ایمان لائیں۔ یہ ایمان لانا تمام اہلِ اسلام پر واجب ہے اور تعطیل، تمثیل اور کیفیت بیان کرنے سے بچیں اور جو تشبیہ اور تجسیم الفاظِ دلائل سے ظاہر ہوتی ہے، اس کا علاج اس کلمۂ اجمالیہ سے کریں: ﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ﴾ [الشورى: ١١] ''اس جیسی کوئی چیز نہیں۔'' اور ﴿ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ﴾ [الإخلاص: ٤] ''اور کوئی ایک ہی اس کا ہمسر نہیں۔'' اور ہرگز تاویل اور خوض کی طرف التفات نہ کریں۔ ہم کیا اور ہماری تاویل کیا: "مَا لِلتُّرَابِ وَرَبِّ الْأَرْبَابِ" [کہاں مٹی کے پتلے اور کہاں رب الارباب] اللہ تعالیٰ نے سلف صالحین کو اس بلا سے عافیت میں رکھا تھا۔ جب سے وہ عافیت متاخرینِ

---

[1] معاني القرآن (٣/ ١٣٦) [2] تفسير الطبري (١٦/ ٣٢٤۔ ٣٢٥) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢١٥۔ ٢٢١٦)

اُمت پر سے اُٹھ گئی، عقائدِ باطلہ و مذاہب زائغہ (ٹیڑھے طریقے) اور بدع مضلہ (گمراہ کرنے والی بدعات) پیدا ہوگئے۔ دنیا مصداق ''كُلُّ نَفْسٍ وَدِيْنُهَا'' [ہر نفس کا علاحدہ دین] بن گئی۔ اسلام میں غربتِ عظمیٰ آگئی۔ یہ سب مفاسد اسی تعصب اور جہالت کے ہیں۔ فإنا للّٰہ۔

تسخیرِ شمس و قمر سے مراد تذلیل ہے، یعنی یہ دونوں مخلوق کے فائدے اور بندوں کی بہتری کی خاطر مطیع ہیں۔ ایک حد پر باقاعدگی سے حرکت کرتے رہتے ہیں گو کہ کائنات کے باقی رہنے میں نفع دینے والے ہیں، ان میں سے ہر ایک ایک وقت معلوم اور معین تک اسی طرح جاری و ساری ہے۔ وہ معین وقت دنیا کے فنا ہونے کا، یا عالم کے زائل ہو جانے کا، یا قیامت کے قائم ہونے کا وقت ہے۔ اس وقت سورج اور چاند لپیٹ دیے جائیں گے۔ چاند کو گہن لگ جائے گا، تارے بے نور ہو جائیں گے اور بکھر پڑیں گے۔ یا اجلِ مسمیٰ سے مراد سورج اور چاند کے درجات اور منازل ہیں کہ سورج ایک سال میں اور چاند ایک ماہ میں دورہ پورا کرتے ہیں۔ کسی کی چال اُن میں سے مختلف نہیں ہوتی۔ اس آیت کی تفسیر میں یہی بات صحیح ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام جہانوں کے امر کا تدبیر کرنے والا ہے، خواہ وہ جہاں عالمِ علوی ہو یا سفلی۔ یعنی وہ قاضی اور مُمضی ہے۔[1] (قالہ مجاهد)

مطلب یہ ہوا کہ جس طرح چاہتا ہے ملکوتیت اور ربوبیت کے امر کو اُلٹتا پلٹتا رہتا ہے۔ تمام حالات اور تمام افعال کی تدبیر کرتا ہے، کوئی حالت اس کو کسی حالت سے غافل نہیں کرتی۔ یا وہ معاملات کی تدبیر کرتا ہے، خواہ وہ معاملہ ایجاد کرنے کا ہو یا ختم کرنے کا، زندہ کرنے کا ہو یا موت دینے کا، کسی شے کو کسی دوسری شے سے خاص کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، کیوں کہ لفظ اس سے بھی زیادہ وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا کہ تدبیر کرنے کو عمومیت پر محمول کرنا زیادہ صحیح ہے بہ نسبت کسی خاص قسم پر احوالِ عالم میں سے محمول کرنے سے۔

مفسرین کی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے اور یہ تدبیرِ امر اور اس کا نفاذ اور امضا عرش کے اوپر سے ہوتا ہے۔ قرآن پاک کا ظاہری انداز اسی پر ہے، جو آیات اس کی کمالِ قدرت پر اور ربوبیت پر دلیل ہیں، ان کو کھول کھول کر بیان فرماتا ہے، جیسے: آسمان کا بغیر ستون کے اونچا کرنا اور سورج اور چاند کا مسخر کرنا اور ان کا ایک معین مدت تک جاری رکھنا۔ اس میں بندوں کو اس بات پر تنبیہ ہے کہ جس ذات پاک کو ان چیزوں پر قدرت ہے، وہ ان کے دوبارہ اٹھانے اور اعادہ کرنے کی بھی قدرت رکھتا ہے۔ لہٰذا فرمایا کہ تم ان آیات کے مشاہدے کے وقت اپنے رب کے ملنے پر یقین کرلو اور تم کو کسی طرح کا شک و شبہہ نہ رہے۔[2]

[1] تفسير الطبري (١٦/ ٣٢٧) [2] فتح البيان (٧/ ١٠-١١)

وَهُوَ الَّذِي مَدَّ الْأَرْضَ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْهَارًا ۖ وَمِن
كُلِّ الثَّمَرَاتِ جَعَلَ فِيهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ ۖ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ ۚ إِنَّ
فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴿٣﴾ وَفِي الْأَرْضِ قِطَعٌ
مُّتَجَاوِرَاتٌ وَجَنَّاتٌ مِّنْ أَعْنَابٍ وَزَرْعٌ وَنَخِيلٌ صِنْوَانٌ وَغَيْرُ
صِنْوَانٍ يُسْقَىٰ بِمَاءٍ وَاحِدٍ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الْأُكُلِ ۚ
إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿٤﴾

اور وہی ہے جس نے زمین پھیلائی اور اس میں پہاڑ اور نہریں بنائیں، اور اس میں ہر قسم کے پھلوں کے دو دو جوڑے بنائے، وہ دن کو رات سے ڈھانپتا ہے۔ بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً نشانیاں ہیں جو غور وفکر کرتے ہیں③ اور زمین میں باہم ملے ہوئے قطعات ہیں، اور انگوروں کے باغ اور کھیتیاں اور کھجور کے درخت ہیں، ایک جڑ سے کئی تنوں والے اور ایک تنے والے، جو ایک ہی پانی سے سیراب کیے جاتے ہیں اور ہم ان کے بعض کو بعض پر پھل میں فضیلت دیتے ہیں۔ بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے البتہ نشانیاں ہیں جو سمجھتے ہیں④

قدرتِ الٰہی کی نشانیاں:

ہر میوے کے جوڑے، یعنی ایک قسم کامل اور ایک قسم ناقص اور رات دن ایک اندھیرا ایک اُجالا رنگا رنگ چیزیں بنائیں، یہ اس بات کی علامت ہے کہ ان سب کو اپنی خوشی سے بنایا، اگر ہر چیز خاصیت سے ہوتی تو ایک جیسی ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے عالمِ علوی کے ذکر کے بعد عالمِ سفلی میں اپنی قدرت اور حکمت اور اِحکام کا ذکر کیا اور فرمایا کہ ہم نے زمین کو پھیلایا اور وسیع کیا، اسے دراز طول وعرض بخشا اور اس میں پہاڑوں کے بوجھ رکھے بڑے اونچے پہاڑ۔ نہریں، ندیاں اور چشمے بہائے، تاکہ زمین کے پھلوں کو پانی پہنچے۔ یہ پھل اور میوے طرح طرح کے رنگ اور شکل اور مزے اور بُو کے ہوتے ہیں ہر شکل کی دو قسمیں۔ رات دن کو دیکھو کہ ہر ایک ان میں سے دوسرے کو سرعت کے ساتھ طلب کرتا ہے، جہاں ایک گیا، فوراً دوسرا آیا، ایک اختتام کو پہنچا، دوسرا آ موجود ہوا۔ زمان میں اُس کا غلبہ جاری ہے، جس طرح کہ مکان اور سکان ساری میں ہے۔ جو لوگ اللہ کی نعمتوں، اس کے احکام اور دلائل میں غور وفکر کرتے ہیں، ان کے لیے ان امور میں قدرت اور توحیدِ خالص کی نشانیاں ہیں۔ زمین کو دیکھو کہ اس کا کوئی ٹکڑا دوسرے ٹکڑے کا ہمسایہ ہے، مثلاً: ایک کھیت پاکیزہ ہے، اس میں لوگوں کے فائدے کی چیزیں اُگتی ہیں، دوسرا ٹکڑا شور ہے، اس میں کچھ پیداوار

نہیں ہوتی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، سعید بن جبیر، ضحاک اور غیر واحد رحمہم اللہ سے اسی طرح مروی ہے۔[1]

اس آیت میں زمین کے مختلف حصوں کا الگ الگ خاصیت کا حامل ہونا داخل ہے کہ اس زمین کی مٹی سرخ ہے اور یہ سفید اور یہ زرد اور یہ سیاہ یہ پتھریلی اور یہ نرم اور یہ ریتلی اور یہ موٹی اونچی اور یہ پتلی اور نیچی، حالاں کہ زمین کے ٹکڑے ایک دوسرے سے ملے جلے ہیں۔ ایک نصف اس طرح کا ہے اور دوسرا نصف اُس طرح کا۔ یہ سب اللہ کے فاعل اور مختار ہونے پر دلیل ہیں۔ ”لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ وَلَا رَبَّ سِوَاهُ“ ”نہیں ہے کوئی الٰہ مگر وہی اور نہ ہی کوئی رب ہے اس کے علاوہ“۔ صنوان سے مراد ایک مبنت میں اصولِ مجتمعہ ہیں، جیسے رمان اور تین یعنی انار اور انجیر اور بعض نخیل یعنی کھجور۔ اور غیر صنوان سے مراد وہ ہے جو ایک ہی اصل پر ہو، جیسے سارے درخت۔ اسی جگہ سے آدمی کے چچا صنوابیہ کہتے ہیں، جس طرح کہ صحیح میں مروی ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: «أَمَا شَعَرْتَ أَنَّ عَمَّ الرَّجُلِ صِنْوُ أَبِيهِ»[2] [کیا تمھیں معلوم نہیں کہ انسان کا چچا اس کے باپ جیسا ہوتا ہے؟]

سیدنا براء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ صنوان وہ کھجوریں ہیں جو ایک جڑ سے نکلی ہیں اور غیر صنوان وہ ہیں جن کی جڑ جدا جدا ہو۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، ضحاک، قتادہ، ابن زید اور کئی ایک اہلِ علم رحمہم اللہ کا ہے۔[3] بعض کو بعض پر میوے میں فضیلت دی ہے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ مراد دقلی، فارسی، شیریں اور ترش ہے۔[4] (رواه الترمذي وحسنه) یعنی اجناس، پھلوں اور کھیتیوں کا یہ اختلاف شکلوں، رنگوں، ذائقوں، خوشبوؤں اوراق اور پھولوں میں ہوتا ہے۔ ایک انتہائی مٹھاس میں اور دوسری انتہائی ترشی میں ہے۔ یہ نہایت درجے کا تلخ ہے اور دوسرا سیٹھا (بے مزہ) پھیکا اور یہ شیریں اور وہ مٹھاس اور کڑواہٹ میں ملا جلا، یعنی میخوش جس کو کھٹ مٹھا کہتے ہیں۔

پھر کسی کا مزہ اللہ کے حکم سے بدل جاتا ہے اور کسی کا بدستور رہتا ہے۔ پھر کوئی زرد ہے اور کوئی سرخ ہے اور کوئی سفید اور کوئی سیاہ اور ازرق (نیلا)۔ یہی حال پھولوں کا ہے، یعنی پھولوں اور کلیوں کا کہ رنگ رنگ اور گونا گوں ہوتے ہیں، حالاں کہ ان سب کی استمداد (بڑھوتری) ایک ہی طبیعت سے ہے، یعنی پانی سے، باوجود اس کے کہ ان میں اتنا زیادہ اختلاف اور فرق ہے جو شمار نہیں کیا جاسکتا نہ تحریر میں لایا جاسکتا ہے۔ ان میں عقل مندوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں اور یہ ایک بہت بڑی دلیل ہے فاعل مختار کے وجود پر جس کی قدرت نے ان چیزوں کے درمیان یہ فرق رکھا ہے اور اپنے ارادے کے مطابق ان کو پیدا کیا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانی دلائل کا ذکر کرنے کے بعد ارضی دلائل کا ذکر کیا اور فرمایا کہ

[1] تفسير الطبري (١٦/ ٣٣١۔ ٣٣٣) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٨٣) [3] تفسير الطبري (١٦/ ٣٣٥۔ ٣٣٨)

[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١١٨) اس کی سند میں ”سیف بن محمد“ ضعیف راوی ہے۔

اللہ ہی نے زمین کو پانی پر پھیلایا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: یعنی طول وعرض میں، تاکہ اس پر پاؤں تھم سکیں اور حیوانات چلیں پھریں۔ اصم رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ مَدَّ الْاَرْضَ ﴾ سے مراد وہ فراخی اور کشادگی ہے جس کی انتہا نہ ملے۔[1]
امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ مَدَّ الْاَرْضَ ﴾ میں یہ سمجھایا گیا ہے کہ زمین کا حجم اتنا بڑا ہے کہ آنکھ اس کی انتہا پر نہیں پڑتی۔ بعض نے کہا: یہ ﴿ مَدَّ ﴾ ظاہر جو نظر آتا ہے وہ کچھ زمین کے کرہ (گول) ہونے کے منافی نہیں ہے۔ اس لیے کہ زمین کے کونے متباعد (ایک دوسرے سے بہت دور دور) ہیں، اہلِ ہیئت بھی اسی کے قائل ہیں اور اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ ہم نے زمین کو پھیلایا اور اس کو بچھایا اور کھولا اور بچھونا ٹھہرایا، یہ سب اس بات کی دلیل ہیں کہ زمین مسطح ہے، جیسے ہاتھ کی ہتھیلی۔ اور اللہ کی بات سب سے زیادہ سچی ہے اور ہیئت دانوں کے اقوال سے زیادہ روشن دلیل ہے۔

جامع صغیر میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث بیہقی کے نزدیک اس طرح ہے کہ زمین کا ٹکڑا جو سب سے پہلے وضع کیا گیا وہ بیت اللہ کی جگہ ہے۔ پھر وہاں سے زمین پھیلائی گئی۔ اور پہلا پہاڑ جس کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر رکھا، وہ ابوقبیس ہے، پھر اس سے اور پہاڑ کھینچے گئے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ دنیا پانچ سو برس کا راستہ ہے۔ اس کی چار سو سالہ راہ ویران ہے اور سو سالہ آباد۔ من جملہ اس کے مسلمانوں کے ہاتھ میں ایک سالہ راہ ہے۔[3] اس بارے میں سلف کی ایک جماعت سے تقریرات آئی ہیں جن پر کوئی ثابت دلیل نہیں ہے۔ ﴿ رَوَاسِيَ ﴾ سے مراد ثابت پہاڑ ہیں جو زمین کو اضطراب سے روکے ہوئے ہیں۔

زمین از تپ و لرزہ آمد ستوہ   فرو کوفت بر دامنش میخ کوہ

''زمین بخار و لڑکھڑاہٹ کی وجہ سے عاجز ہوگئی۔ (اللہ) نے اس کے دامن پر پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں۔''

﴿ اَنْهٰرًا ﴾ سے مراد وہ پانی ہے جو زمین میں جا بجا نالے، ندی اور دریا وغیرہ میں جاری رہتا ہے۔ پھر ہر میوے کا ایک دوہرا جوڑا بنایا سچ مچ، یعنی دنیا میں تمام پھلوں میں سے ہر پھل کو دو قسم کا ٹھہرایا، رنگ میں، جیسے: سفید، سیاہ اور اس جیسے اور رنگ، یا مزے میں، جیسے: کھٹا، میٹھا اور اس جیسے اور ذائقے، مقدار میں، جیسے: بڑا چھوٹا اور کیفیت میں، جیسے: گرم و سرد اور اس سے ملتی جلتی اور کیفیت۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''زوجین'' سے مراد ہر صنف کا نر و مادہ ہے۔[4] امام مجاہد رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں، لیکن پہلی بات اولیٰ ہے۔ رات دن کو ڈھانپ لیتی ہے، یا تو وہ سفید روشن تھا یا اب کالا بھرا ہو جاتا ہے۔ اگرچہ عبارت کی ترکیب سے یہ بھی احتمال ہوتا ہے کہ دن بھی رات کو ڈھانپ لیتا ہے، لیکن مناسب بات یہی ہے کہ رات کو ڈھانپنے والی کہا جائے۔ اس بات کو زمین کی بہت سی نشانیوں میں سے گنا ہے،

---

[1] فتح القدير (٣/ ٨٩)

[2] شعب الإيمان (٣/ ٤٣١) اس کی سند میں ''عبدالرحمٰن بن علی'' مجہول راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم (٥٨٨١)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢١٨) [4] تفسير القرطبي (٩/ ٢٨٠)

اگرچہ اس کا تعلق آیاتِ علویہ کے ساتھ ظاہر ہے اور ظہور کے اعتبار سے زمین میں ہے، کیوں کہ رات زمین کا سایہ ہے اور جو جگہ زمین کے سائے کی جگہ سے اوپر ہے، وہ سرے سے رات ہی نہیں ہوتی۔ علاوہ اس کے رات دن کو پھلوں کے ساتھ ان کے عقد اور پکانے کی حیثیت سے تعلق ہے، حالاں کہ یہ دونوں بھی ایک دوسرے کے مقابل دو قسمیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس زمین کے پھیلانے میں، پہاڑوں کے رکھنے میں اور مختلف قسم کے پھلوں کے پیدا کرنے میں اور روشنی اور اندھیرے کے آگے پیچھے آنے میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو سوچتے اور سمجھتے بوجھتے ہیں اور کسی صنعت (چیز) کو دیکھ کر اس کے بنانے والے کے وجود پر دلیل پکڑتے ہیں اور سبب سے اس سبب کے پیدا کرنے والے کا سراغ لگاتے ہیں۔ اور زمین میں کھیت ہیں، ملے ہوئے اور بے ملے ہوئے بھی۔ یا مراد آباد شہر اور غیر آباد جگہیں ہیں، یعنی صحرا۔ یا یہ مطلب ہے کہ یہ قطعات ایک دوسرے کے ہمسائے ہیں، سب کی مٹی ایک ہے اور پانی بھی ایک اور اس میں کھیتی اور باغ ہیں۔ اس کے ساتھ پھلوں اور میووں میں فرق ہے، کوئی شیریں ہے، کوئی ترش، کوئی طیب، کوئی غیر طیب، کوئی کسی طرح کا کوئی کسی اور طرح کا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس سے مراد پاکیزہ اور شیریں زمین ہے جو اپنی پیداوار کو اللہ تعالیٰ کے اذن سے اُگاتی ہے، اسی کے پاس زمین شور اور نجس ہوتی ہے جس سے کوئی پیداوار نہیں نکلتی، حالاں کہ یہ دونوں ایک زمین ہیں اور ایک ہی پانی شیریں یا شور اس کو پہنچا ہے، اس کے باوجود ایک کو دوسری پر فضیلت ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: متجاورات سے یہ مراد ہے کہ بعض قریب ہیں بعض سے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ایک زمین شیریں پیدا کرتی ہے، دوسری تلخ و ترش، یہ دونوں زمینیں ایک دوسرے کی ہمسائی ہیں اور ایک ہی پانی سے سیراب کی جاتی ہیں۔[1] یا متلاصقات، یعنی ایک ددوسرے سے ملی جلی ہوئی۔ کوئی طیب کوئی سبخ، کوئی قلیل الریع اور کوئی کثیر الاکل، سوان اشیا کے یہ تطورات اللہ تعالیٰ کی قدرت کی دلیل ہیں۔

جنات سے مراد باغات ہیں۔ جنت وہ باغ ہے جس میں کھجور اور انگور کے درخت ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے کھجور اور انگور کے درمیان کھیتی کا ذکر فرمایا، اس لیے کہ خارج میں اکثر اسی طرح ہوا کرتا ہے اور اس کی مثل اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا یہ قول ہے: ﴿ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ﴾ [الكهف: ٣٢] ''ہم ان میں سے ایک کو انگوروں کے دو باغ عطا کیے اور ان کے گرد کھجوروں کی باڑ لگا دی اور ان دونوں کے درمیان کھیتی اُگائی۔'' پھر فرمایا کہ ان درختوں میں کوئی ایک دوسرے سے ملتا جلتا ہوتا ہے اور کوئی نہیں ہوتا۔ سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے کہا: صنوان وہ ہیں جن کی اصل ایک ہو اور غیر صنوان وہ جو تنہا اُگیں۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ صنوان وہ نخلہ ہے جو نخلہ میں چسپاں ہو اور غیر صنوان متفرق ہو۔[2] کچھ بھی ہو یہ سب ایک ہی پانی سے سینچے جاتے ہیں، پانی

[1] تفسير الطبري (١٦/ ٣٣١_ ٣٣٣)   [2] تفسير الطبري (١٦/ ٣٣٥_ ٣٣٦)

ایک باریک جاری جسم ہے جس سے ہر نامی کی زندگی ہوتی ہے اور بعض نے یہ تعریف کی کہ پانی ایک بہنے والا جوہر ہے جس سے ارواح قائم ہیں۔

پھر فرمایا کہ ہم کھانے میں بعض کو بعض پر زیادہ کرتے ہیں، شیریں اور ترش ذائقے کے درمیان وغیر ذلک۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ مثال بنی آدم کی ہے کہ کوئی صالح ہے اور کوئی خبیث اور باپ سب کا ایک ہے۔[1] اور اکل سے مراد جس سے کھایا جائے، یعنی کھجور اور انگور کا پھل اور زراعت کا دانہ۔ بالجملہ بعض کو بعض پر ذائقے، شکل، خوشبو، قدر، مٹھاس و ترش پن اور غصاضت اور طعوم میں زیادتی بخشی ہے۔ اسی طرح رنگ اور فائدے اور نقصان میں بھی بعض کو بعض پر زیادتی دی ہے۔ اکل کا ذکر کرنے پر اکتفا اس لیے کیا کہ یہ سب فائدوں سے زیادہ فائدہ دیتا ہے۔ ان تمام باتوں میں اللہ تعالیٰ کی قدرتِ عظیم اور صنعتِ بدیع پر دلائل ہیں کہ یہ زمین کے مختلف ٹکڑے اور ایک دوسرے سے ملے ہوئے باغات، جن میں طرح طرح کی پیداوار ہوتی ہے، باوجودیکہ ایک ہی پانی سے ان کو سیراب کیا جاتا ہے، لیکن کھانے میں وہ ایک دوسرے سے مختلف اور کوئی کسی سے زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ کوئی کسی رنگ اور مزہ اور شکل کا اور کوئی کسی اور ہی شکل، رنگ اور ذائقے کا۔ کوئی نہایت عمدہ اور اعلیٰ اور کوئی نہایت ردی اور خراب۔ کوئی بہت ہی خوبصورت اور کوئی بہت ہی بدصورت۔

سو جو کوئی سمجھنے کی غرض سے تفکر اور نظر و اعتبار کرتا ہے وہ اس بات کا یقین کر لیتا ہے کہ ان چیزوں کے ایک دوسرے سے مختلف ہونے کا سبب سوائے اللہ جل سلطانہ و جل شانہ کی قدرت کے اور کچھ نہیں۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ایک مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کے دلوں کے لیے بیان فرمائی ہے کہ لوگ آدم علیہ السلام سے پیدا ہوئے ہیں، ان پر آسمان سے نصیحت نازل ہوتی ہے، ایک قوم کے دل نرم پڑ جاتے ہیں، وہ خشوع اور خضوع کرتے ہیں اور ایک قوم کے دل سخت ہو جاتے ہیں، وہ غفلت میں پڑے رہتے ہیں اور کچھ سنتے سمجھتے نہیں۔ یہ بھی کہا ہے کہ « مَا جَالَسَ الْقُرْآنَ أَحَدٌ إِلَّا قَامَ مِنْ عِنْدِهِ بِزِيَادَةٍ أَوْ نُقْصَانٍ » یعنی قرآن کی مجلس کوئی اختیار نہیں کرتا، مگر اس کا ایمان بڑھ جاتا ہے یا گھٹ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴾ [بني اسرائيل: ٨٢] ”اور ہم قرآن میں سے جو نازل کرتے ہیں وہ مومنوں کے لیے شفا اور رحمت ہے، اور وہ ظالموں کو خسارے ہی میں زیادہ کرتا ہے۔“[2]

وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۬ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ ۚ

---

[1] تفسیر الطبري (١٦/ ٣٤٢) [2] تفسیر الطبري (١٦/ ٣٤٠) فتح البيان (٧/ ١١۔ ١٧)

وَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

اور اگر آپ تعجب کریں تو ان کا یہ کہنا عجیب تر ہے کہ کیا جب ہم مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم البتہ نئی پیدائش میں ہوں گے؟ یہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا، اور یہی ہیں کہ ان کی گردنوں میں طوق ہوں گے، اور یہی دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ⑤

موت کے بعد زندگی کے انکار کا نظریہ عجیب ہے:

اللہ تعالیٰ اپنے رسول محمد ﷺ سے فرماتا ہے کہ اگر تم کو ان مشرکین کے قیامت کے دن کو جھٹلانے سے تعجب ہوتا ہے کہ یہ لوگ مخلوقِ الٰہی میں ان دلائل کا مشاہدہ کر لینے کے بعد کس طرح تکذیب کرتے ہیں، حالاں کہ اللہ کو ہر مشیت پر قادر جانتے ہیں اور اس بات کے معترف ہیں کہ ابتداءِ خلق کو اسی نے پیدا کیا ہے، اس سے پہلے یہ خلق کوئی قابلِ ذکر شے نہ تھی، پھر اس اقرار کے بعد وہ اللہ تعالیٰ کی اس خبر کی تکذیب کرتے ہیں کہ وہ عن قریب عالم کو دوبارہ نئی شکل میں پیدا کرے گا، حالاں کہ جو بات اس سے بھی زیادہ عجیب وغریب ہے اسے وہ دیکھ چکے ہیں اور اس کا اقرار بھی کرتے ہیں تو اس تعجب سے بھی زیادہ تعجب ان کی اس بات پر ہے کہ کیا ہم مٹی ہو جانے کے بعد پھر جی اٹھیں گے، حالانکہ ہر عالم اور عقل رکھنے والا اس بات کو بہ خوبی جانتا ہے کہ اس زمین و آسمان کا پیدا کرنا لوگوں کے پیدا کرنے سے بھی بہت بڑا کام ہے اور جس نے خلق کو پہلی دفعہ پیدا کیا ہے، اس کے لیے اس خلق کو دوبارہ پیدا کرنا، بہت آسان ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ۚ بَلٰٓى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ [الأحقاف: ٣٣] ''کیا وہ نہیں دیکھتے کہ جس اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور ان کے پیدا کرنے سے وہ نہ تھکا، وہ یقیناً مُردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے؟ کیوں نہ ہو؟ وہ یقیناً ہر چیز پر قادر ہے۔'' پھر اللہ تعالیٰ نے ان مکذبین کا انجام کار فرمایا کہ ان کے گلوں میں طوق ہوں گے اور وہ ہمیشہ کو دوزخ میں رہیں گے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اے پیغمبر! اگر تم ان کے جھٹلانے سے تعجب کرتے ہو، اس کے بعد کہ تم ان کے نزدیک سچے ٹھہرے ہوئے تھے تو اس سے بڑھ کر یہ بات تعجب کی ہے کہ وہ دوبارہ جی اُٹھنے اور قیامت اور حشر ونشر کا انکار کرتے ہیں، حالاں کہ آسمان و زمین کی پیدائش کو دیکھ کر دلیل پکڑ سکتے ہیں کہ دوبارہ جی اُٹھنا قادرِ مطلق اور صانع کی قدرت کے سامنے اس سے بھی زیادہ سہل اور آسان ہے اور یہ بات لوگ بھی جان چکے ہیں کہ کسی چیز کو دوبارہ بنانا اس کے پہلی دفعہ بنانے سے آسان ہوتا ہے۔ ع

نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول

"نقش بنانے والا دوسرا نقش پہلے نقش سے بہتر بناتا ہے۔"

تو تعجب کی جگہ یہ ہے نہ کہ وہ۔ کہتے ہیں کہ یہ آیت اللہ صانع کے منکرین کے بارے میں آئی ہے۔ ان واضح دلائل کے ہوتے ہوئے کہ کسی تبدیل ہونے والی چیز کے لیے اس کو تبدیل کرنے والا بھی ضرور ہوتا ہے، ان کا انکار کرنا نہایت تعجب کا مقام ہے، لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے، اس دلیل کے ساتھ کہ ان کا یہ قول کہ کیا ہم مٹی ہو کر پھر نئے سرے سے پیدا ہوں گے اولاً تو ان کا کلام ہی عجیب ہے اور ثانیاً اس لیے عجیب ہے کہ کیا وہ نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک نطفے سے پیدا کیا ہے۔ سو نطفے سے پیدا کرنا مٹی سے پیدا کرنے سے بھی زیادہ سخت اور مشکل ہے۔ پھر ان کو کافر فرمایا۔ اس میں اس شخص کے کفر کی دلیل ہے جو دوبارہ جی اُٹھنے کا منکر ہے اور کہا کہ قیامت کے دن ان کی گردنوں میں لوہے کے طوق ہوں گے، جس میں ہاتھ اور گردن جکڑے ہوئے ہوں گے، جس طرح کسی قیدی کو گردن میں طوق ڈال کر ذلیل کر کے لے جاتے ہیں۔ بعض نے کہا: ﴿ اَلْاَغْلٰلُ ﴾ سے مراد اعمالِ سیئہ ہیں جو طوق کی طرح ان کے گلوں کے ہار ہوں گے اور یہ ہمیشہ کے لیے آگ میں رہیں گے، کسی حال میں بھی دوزخ سے جدا نہ ہوں گے۔[1]

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ
الْمَثُلٰتُ ۭ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰي ظُلْمِهِمْ ۚ وَاِنَّ
رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝

اور وہ آپ سے بھلائی (رحمت) سے پہلے برائی (عذاب) جلدی چاہتے ہیں، حالاں کہ ان سے پہلے (عذاب کی) مثالیں گزر چکی ہیں، اور بے شک آپ کا رب لوگوں کے ظلم کے باوجود البتہ انھیں بخشنے والا ہے، اور یقیناً آپ کا رب البتہ سخت سزا دینے والا ہے ⑥

کافروں کا جلدی عذاب مانگنا:

یہ بھلائی سے پہلے برائی چاہتے ہیں، یعنی ایمان نہیں قبول کرتے کہ سب خوبیاں حاصل کر لیں، انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عذاب لے آؤ اور پہلے کہاوتیں ہو چکی ہیں، یعنی ویسے عذاب جن کی کہاوتیں بیان ہوئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ جھٹلانے والے جلدی کرتے ہیں برائی کے لیے بھلائی سے پہلے، یعنی عذاب کے طالب ہیں جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے: ﴿ وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۝ لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰۗىِٕكَةِ

[1] فتح البیان (۷/ ۱۸۔ ۲۰)

اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۞ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ﴾ [الحجر: ٦۔٨] ”اور انھوں نے کہا: اے وہ شخص! جس پر یہ ذکر (قرآن) نازل کیا گیا ہے، یقیناً تو تو مجنون ہے۔ تو ہمارے پاس فرشتے کیوں نہیں لے آتا، اگر تو سچوں میں سے ہے؟ فرشتے تو ہم صرف (عذاب) کے ساتھ نازل کرتے ہیں اور پھر اس وقت ان (کفار) کو ڈھیل نہیں دی جاتی۔“

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۭ وَلَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَاۗءَهُمُ الْعَذَابُ ۭ وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۞ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۭ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ﴾ [العنکبوت: ٥٣۔ ٥٤] ”اور یہ لوگ آپ سے جلد عذاب مانگ رہے ہیں اور اگر (عذاب کا) وقت مقرر نہ ہوتا تو انھیں عذاب ضرور آلیتا اور یقیناً وہ انھیں اچانک ہی آلے گا اور انھیں خبر تک نہ ہوگی۔ یہ لوگ آپ سے جلد عذاب مانگ رہے ہیں اور بلاشبہ جہنم کافروں کو گھیرے ہوئے ہے۔“ نیز فرمایا: ﴿يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ۚ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا ۙ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ﴾ [الشوریٰ: ١٨] ”جو لوگ اس (قیامت) پر ایمان نہیں رکھتے، وہ اس کے لیے جلدی مچاتے ہیں اور جو لوگ ایمان لائے وہ اس سے ڈرنے والے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ وہ برحق ہے۔“ نیز فرمایا: ﴿وَقَالُوْا رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ﴾ [صٓ: ١٦] ”اور انھوں نے کہا: اے ہمارے رب! ہمیں ہمارا (عذاب کا) حصہ یومِ حساب سے پہلے جلد دے دے۔“

”قِطَّ“ سے اس جگہ مراد سزا اور حساب ہے، جس طرح اللہ پاک نے ان کے حال کی خبر دی ہے: ﴿وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاۗءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ [الأنفال: ٣٢] ”اور جب انھوں نے کہا: اے اللہ! اگر یہ (قرآن) تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا ہم پر دردناک عذاب لے آ۔“ بالجملہ وہ جھٹلانے والے آپ کی تکذیب وعناد اور شدتِ کفر کے سبب سے اس بات کے خواہاں تھے کہ ان پر عذاب آجائے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ہم اپنا عذاب پہلی اُمتوں پر اس سے پہلے نازل کر چکے ہیں اور ان کو ہم نے نصیحت پکڑنے والوں کے لیے عبرت اور موعظت ٹھہرایا ہے۔

کفار کے مطالبہ عذاب کے باوجود عذاب نہ آنا اللہ تعالیٰ کے عفو و درگزر کا نتیجہ ہے:

پھر یہ خبر دی کہ اگر اللہ کا حوصلہ اور عفو و درگزر نہ ہوتا تو ان کے عذاب میں جلدی کرتا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰي ظَهْرِهَا مِنْ دَاۗبَّةٍ﴾ [الفاطر: ٤٥] ”اور اگر اللہ لوگوں کو اس وجہ سے پکڑتا جو انھوں نے کمایا تو وہ اس (زمین) کی پشت پر چلنے والا کوئی جاندار نہ چھوڑتا۔“ اور اس آیت میں یہ ارشاد کیا کہ تیرا رب مغفرت والا ہے، لوگوں کے لیے باوجود اُن کے ظالم ہونے کے کہ رات دن قصور کیا کرتے ہیں۔

ترغیب وترہیب:

پھر اس حکم کے ساتھ یہ بھی فرما دیا کہ اللہ سخت عذاب والا ہے، تاکہ اُمید اور خوف برابر رہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُو رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ وَّلَا يُرَدُّ بَأْسُهُ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴾ [الأنعام: ١٤٧] ''پھر اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو کہہ دیجیے: تمھارا رب وسیع رحمت والا ہے، اور اس کا عذاب مجرم قوم سے ٹالا نہیں جاتا۔'' نیز فرمایا: ﴿ إِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [الأعراف: ١٦٧] ''بے شک آپ کا رب بہت جلد سزا دینے والا ہے اور بے شک وہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ﴾ [الحجر: ٤٩۔٥٠] ''(اے نبی!) میرے بندوں کو خبر سنا دیجیے کہ یقیناً میں خوب بخشنے والا (اور) خوب رحم کرنے والا ہوں۔ اور بے شک میرا عذاب بھی بڑا دردناک عذاب ہے۔''

اُمید اور خوف کی ایسی آیات بہت ہی بیان ہوئی ہیں۔ سیدنا سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری: ﴿ وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) تو نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « لَوْلَا عَفْوُ اللّٰهِ وَتَجَاوُزُهُ مَا هَنَأَ أَحَدُ الْعَيْشَ وَلَوْ لَا وَعِيْدُهُ وَعِقَابُهُ لَاتَّكَلَ كُلُّ وَاحِدٍ » یعنی اگر اللہ کا عفو اور تجاوز نہ ہوتا تو کسی کو زندگی میں قرار نہ ہوتا اور اگر اس کا عقاب اور وعید نہ ہوتی تو ہر کوئی بھروسا کر بیٹھتا۔[1]

امام ابن عساکر رحمہ اللہ نے ترجمہ حسن بن عثمان بن زیادی رحمہ اللہ میں ذکر کیا ہے کہ انھوں نے رب العزت کو خواب میں دیکھا، ایسے حال میں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے سامنے کھڑے ہوئے اپنی امت میں سے ایک شخص کی شفاعت کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا تجھ کو اس قدر کافی نہیں ہے کہ میں نے سورۃ الرعد میں یہ آیت نازل کی ہے: ﴿ وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ﴾ (آیت باب)۔ پھر میری آنکھ کھل گئی۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ عذاب کی جلدی مچانے کے بارے میں آیتِ باب کا نزول بطورِ استہزا ہوا ہے۔ سیئہ سے مراد ایسا عذاب ہے جو ہلاک کرنے والا ہو اور حسنہ سے مراد عافیت اور سلامتی ہے۔ انھوں نے یہ بات انکار اور کفر پر جمے رہنے کے طور پر کی تھی۔ ''مَثُلَات'' جمع ہے مثلہ کی، یعنی رسوا کرنے والا عذاب۔ اب معنی یہ ہیں کہ یہ جلد عذاب کا نازل ہونا چاہتے ہیں، حالاں کہ ان سے پہلے ان جیسے عذاب نازل ہو چکے ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ یہ

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٢٤) یہ روایت مرسل ہے، نیز سند میں ''علی بن زید'' ضعیف راوی ہے، البتہ اس موضوع میں صحیح روایت بھی مروی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢١٦٧)

[2] تاریخ دمشق (١٣/ ١٣٦)

عبرت نہیں پکڑتے اور جس طرح پہلے مکذبین پر عذاب کا حلول ہوا تھا، یہ اس سے بچنا نہیں چاہتے؟! تیرا رب بہت تجاوز کرنے والا ہے، اس سے مراد عذاب میں دیر لگانا اور تاخیر کرنا ہے، باوجود اس کے کہ وہ گناہوں پر گناہ کیے جاتے ہیں۔ اگر توبہ کرکے اللہ کی طرف رجوع کریں تو اس آیت میں ایک بڑی خوش خبری ہے اور اُمید ہے، اس لیے کہ یہ بات معلوم ہے کہ انسان جب ظلم میں مصروف ہوتا ہے تو اس وقت توبہ نہیں کرتا۔ اس سے توبہ سے پہلے تجاوز اور عفو کا ہونا جائز ہے۔ لہٰذا یہ بات کہی گئی ہے کہ یہ آیت خاص کر موحدین گناہگاروں کے حق میں آئی ہے۔

پھر اس وعدے کے ساتھ یہ وعید فرمائی ہے کہ تیرا رب سخت عذاب والا ہے، وہ ان نافرمانوں اور جھٹلانے والوں میں سے جس کو چاہتا ہے سخت عذاب کرتا ہے، اپنی مشیت کے تقاضے کے تحت، پس یہ عذاب میں تاخیر کچھ اہمال (یوں ہی چھوڑ دینا) نہیں ہے۔[1]

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝

اور کافر لوگ کہتے ہیں: اس پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اُتاری گئی؟ (اے نبی!) آپ تو صرف ڈرانے والے ہیں، اور ہر قوم کے لیے ایک ہادی ہوتا ہے ⑦

مشرکین کی طرف سے کسی نشانی کا مطالبہ:

اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کا حال بیان کیا کہ وہ کفر وعناد کے طریقے سے یہ بات کہتے ہیں کہ جس طرح اگلے رسول نشانیاں لائے تھے، اس طرح تو بھی کوئی نشانی لاتا تو ہم تجھ کو مانتے، یہ اُن کا نبی کریم ﷺ پر عیب جوئی کرنا تھا، جس طرح یہ کہا تھا کہ کوہِ صفا کو سونے کا کر دے اور یہ پہاڑ اس جگہ سے دور ہو جائیں اور ان کی جگہ سبزہ زار اور نہریں ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ﴾ [بني إسرائيل: ٥٩] ''اور ہمیں نشانیاں بھیجنے سے صرف اس چیز نے روکا ہے کہ پہلے لوگوں نے ان کو جھٹلایا تھا۔'' پھر کہا کہ تجھ پر فقط اتنی ہی بات ہے کہ تو رسالت کو پہنچا دے، جس کا اللہ تعالیٰ نے تجھ کو حکم دیا ہے، کچھ ان کا ہدایت پر آنا تجھ پر لازم نہیں، کیوں کہ ہدایت اللہ کے اختیار میں ہے، جس کو وہ چاہتا ہے، راہِ راست پر لے آتا ہے۔ ہر قوم کے لیے ایک راہ نما ہوا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یعنی داعی۔

ان کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ تو اے محمد! (ﷺ) ڈرانے والا ہے اور میں ہر قوم کا ہادی ہوں یہی قول امام محمد، سعید بن جبیر، ضحاک، مجاہد اور کئی ایک اہلِ علم رحمہم اللہ کا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہادی سے مراد نبی ہے

---

[1] فتح البیان (۷/ ۲۰۔ ۲۱)

جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاِنۡ مِّنۡ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيۡهَا نَذِيۡرٌ ﴾ [الفاطر: ٢٤] ''اور کوئی امت ایسی نہیں ہوئی جس میں کوئی ڈرانے والا نہ گزرا (آیا) ہو۔'' امام قتادہ اور ابن زید رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام ابو صالح و یحییٰ بن رافع رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ ہر قوم کا ایک قائد ہے۔ امام ابو عالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہادی بہ معنی قائد ہے، قائد بہ معنی امام ہے، امام بہ معنی عمل ہے۔ امام عکرمہ اور ابوالضحیٰ رحمہ اللہ نے کہا کہ مراد ہادی سے محمد ﷺ ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ نے کہا: ہادی وہ ہے جو اُن کو اللہ عزوجل کی طرف بلائے۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جب یہ آیت اتری تو نبی کریم ﷺ نے اپنا ہاتھ اپنے سینے پر رکھا اور کہا: «أَنَا الْمُنْذِرُ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ» [میں ڈرانے والا ہوں اور ہر قوم کا ایک ہادی ہوتا ہے] اور سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے کندے کی طرف اشارہ کیا اور کہا: «أَنْتَ الْهَادِيْ يَا عَلِيُّ بِكَ يَهْتَدِيْ الْمُهْتَدُوْنَ مِنْ بَعْدِيْ»[2] (رواہ ابن جریر) [اے علی! تو ہادی ہے، میرے بعد ہدایت حاصل کرنے والے تجھ ہی سے ہدایت حاصل کریں گے] لیکن اس حدیث میں شدید نکارت ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ھادی بنی ہاشم میں سے ایک مرد ہے۔ (رواہ ابن أبي حاتم) امام جنید رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ مرد سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ ہیں۔ امام ابو جعفر محمد بن علی رحمہ اللہ سے ایک روایت میں بھی اسی طرح مروی ہے۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ کفارِ مکہ کہتے تھے کہ محمد ﷺ پر ان آیات کے علاوہ جو یہ لائے ہیں، ان کے رب کی کوئی نشانی کیوں نہیں آئی، جیسے عصا و ید بیضا و ناقہ۔ یہی لوگ عذاب کے آنے کی جلدی بھی کرتے تھے، حالاں کہ یہ ان کا مقابلہ اور عناد تھا، ورنہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر وہ آیات اتاری تھیں کہ بعض ان کا مغنی (بے نیاز کر دینے والا) ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ اس طرح کی نشانیاں چاہتے تھے، جیسا کہ موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام پر نازل ہوئی تھیں،[4] اس پر اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اے محمد! تو ان کو آگ سے ڈرانے والا ہے، تیرے اختیار میں کوئی نشانی نہیں ہے۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کی رغبت کا ازالہ کیا ہے، جو ان کی فرمائش پورا کرنے کے بارے میں تھی، کیوں کہ نبی اکرم ﷺ کو شدید رغبت تھی کہ ان کی خواہش پوری کی جائے، اس لیے کہ آپ چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح سے وہ ایمان لے آئیں۔

﴿ اِنَّمَآ ﴾ کا حرف بصیغہ حصر (گھیر لینا) اس لیے ہے کہ نبی کریم ﷺ کا رسول ہو کر آنا، لوگوں کو ڈرانے

---

① تفسیر الطبري (١٦/ ٣٥٣_ ٣٥٧)

② تفسیر الطبري (١٦/ ٣٥٧) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٤٨٩٩)

③ تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٢٥) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٦٥٢) ④ معاني القرآن (٣/ ١٤٠)

کے لیے تھا، تا کہ وہ برے انجام سے بچ جائیں۔ نبی کریم ﷺ پر اس کے سوا کوئی اور امر واجب اور لازم نہیں تھا۔ سو انھوں نے یہ کام کر دکھایا اور خوب ڈرا دیا اور کوئی چیز باقی نہ چھوڑی جو اچھی طرح بیان نہ کر دی اور دوبارہ اور سہ بارہ واضح کر کے پہنچا دی۔ جزاه الله عن أمته خيراً.

ہر قوم کے واسطے ایک ہادی ہوتا ہے جو اس قوم کو ان کی ہدایت اور ارشاد کی طرف بلاتا ہے، ان نشانیوں کے ذریعے سے جو اس کو عطا کی جاتی ہیں نہ کہ ان چیزوں سے جن کی وہ فرمایش کرتے ہیں، اگرچہ بالفعل وہ ہدایت واقع نہ ہو اور یہ لوگ اس کو قبول نہ کریں۔ رسولوں کی نشانیاں مختلف ہوتی تھیں، کوئی ایک آیت یا آیات لاتا اور دوسرا دوسری طرح کی نشانیاں لے کر آتا اور جس نے بعض سے ایسی چیز طلب کی، جو دوسرا لایا تھا تو اُس نے تعنت (ڈھٹائی کرنے) میں مبالغہ کیا۔

آیات سے مراد یہی نبوت کے لیے نشانیاں ہیں، کیوں کہ یہ ایک ایسا معجزہ ہے جو کہ بشری قدرت میں نہیں ہے اور کسی فرد یا افراد کے ساتھ مختص نہیں ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ نے کہا: اسی وجہ کو قاضی نے مقرر رکھا ہے اور یہی صحیح ہے، جس کے ساتھ منتظم کا کلام باقی رہتا ہے۔ بعض نے کہا: ہادی سے مراد اللہ تعالیٰ ہے کہ یہ قدرت اسی کو ہے۔ انبیا علیہم السلام پر صرف ڈرانا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما مرفوعاً کہتے ہیں: «هُوَ الْمُنْذِرُ وَهُوَ الْهَادِيْ»[1] (أخرجه ابن مردويه) [وہی ڈرانے والا اور وہی ہادی ہے] یا ہادی سے مراد عملِ صالح ہے۔ یا خیر کی طرف قیادت کرنے والا نہ کہ شر کی طرف۔ یہ رسولوں اور ان کے متبعین کے لیے آخر زمانے تک عام ہے۔[2]

اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ؕ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ۝۸ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ ۝۹

اللہ جانتا ہے ہر مادہ جو کچھ پیٹ میں اُٹھائے پھرتی ہے اور جو کچھ رحم کم کرتے ہیں اور جو کچھ زیادہ کرتے ہیں، اور اس کے ہاں ہر چیز کی ایک مقدار (مقرر) ہے ⑧ وہ غیب اور ظاہر کا جاننے والا، بہت بڑا، نہایت بلند ہے ⑨

ہر کھلی اور چھپی چیز کو جاننے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے:

اللہ تعالیٰ نے اپنے علمِ تام (مکمل) عام کی خبر دی کہ اس پر کوئی چیز مخفی نہیں رہتی ہے، اس کا علم ہر مادہ جانور کے پیٹ کے بوجھ کو گھیرے ہوئے ہے جیسے اس کا فرمان ہے: ﴿ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ﴾ [لقمان: ٣٤] ’’اور وہی جانتا

---

[1] فتح القدير (٣/ ٩٦)
[2] فتح البيان (٧/ ٢١۔ ٢٣)

ہے جو (ماؤں کے) پیٹوں میں ہے۔'' یعنی وہ جانتا ہے کہ ماں کے پیٹ میں کیا چیز ہے نر یا مادہ، خوب صورت یا بدصورت، شقی یا سعید، طویل العمر یا قلیل العمر جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ﴾ [النجم: ٣٢] ''وہ تمھیں (اس وقت سے) خوب جانتا ہے، جب اس نے تمھیں زمین سے پیدا کیا اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں بچے تھے۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ﴾ [الزمر: ٦] ''وہ تمھیں تمھاری ماؤں کے پیٹوں میں پیدا کرتا ہے، ایک پیدائش (مرحلے) کے بعد دوسری پیدائش میں، تین قسم کے اندھیروں (پردوں) میں۔'' یعنی تم کو پیدا کیا ہے ایک طور کے بعد ایک طور پر، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴾ [المؤمنون: ١٤] ''پھر ہم نے نطفے کو خون کی پھٹکی بنایا، پھر ہم نے پھٹکی کو لوتھڑے میں ڈالا، پھر ہم نے لوتھڑے سے ہڈیاں بنائیں، پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا، پھر ہم نے اسے ایک اور ہی صورت میں بنا دیا، چناں چہ بڑا بابرکت ہے اللہ جو سب سے عمدہ بنانے والا ہے۔''

صحیحین میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ تم میں ایک کی خلقت اس کی ماں کے پیٹ میں جمع کی جاتی ہے چالیس دن تک، پھر اتنے ہی دن میں وہ ایک پھٹکی ہوتی ہے، پھر اتنے ہی دن میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہو جاتا ہے، پھر اللہ ایک فرشتہ بھیجتا ہے، اُس کو حکم ہوتا ہے کہ چار باتیں لکھے: رزق و عمر و عمل اور بد بخت ہے یا نیک بخت۔[1] دوسری حدیث میں مروی ہے کہ فرشتہ کہتا ہے: اے رب! یہ نر ہے یا مادہ، اے رب! بد بخت ہے یا نیک بخت، رزق کتنا ہے، اجل کتنی ہے؟ اللہ فرماتا جاتا ہے اور فرشتہ لکھتا جاتا ہے۔[2] بالجملہ یہ آیت اور حدیث اللہ تعالیٰ کے علم کے کمال اور اس کی عمومیت اور وسعت پر دلیل ہے کہ وہ دانائے نہاں و آشکارا ہے۔ وللہ الحمد.

بر او علم یک ذرہ پوشیدہ نیست　　　　که پیدا و پنہاں نزدش یکے ست

''وہ ایک ذرے کی موجودگی سے بھی بے خبر نہیں، کیوں کہ ظاہر اور پوشیدہ اس کے نزدیک ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں۔''

صحیح بخاری میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ غیب کی کنجیاں پانچ ہیں، ان کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا: کوئی نہیں جانتا کہ کل کیا ہوگا مگر اللہ، اور اس چیز کو کوئی نہیں جانتا کہ جس کو پیٹ سکیڑتے ہیں مگر اللہ، اور کوئی نہیں جانتا کہ پانی کب برسے گا مگر اللہ، اور کسی جی کو معلوم نہیں کہ وہ کس سر زمین پر مرے گا، اور نہیں جانتا کہ قیامت کب قائم ہوگی مگر اللہ۔[3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٢١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٣)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٥)　[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٤٤)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ غیض ارحام سے مراد سقط (گر جانا) ہے اور زیادت سے مراد وہ چیز ہے جس کو رحم نے حمل میں زیادہ کیا ہے، اس کے عوض جو سکڑ گیا ہے، یہاں تک کہ بچہ کو پورا جنا، یہ اس لیے کہ بعض عورتیں دس مہینے تک حمل کا بوجھ اٹھائے رہتی ہیں اور کوئی نو مہینے تک اور کسی کا حمل اس مدت سے کم اور کسی کا حمل اس مقدار سے زیادہ ہوتا ہے، یہی ہے ارحام کی غیض اور زیادت جس کا اللہ پاک نے ذکر کیا ہے۔ یہ سارا کام اللہ کے علم اور حکم سے ہوتا ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ غیض اور زیادت سے مراد نو ماہ سے کم زیادہ ہونا ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میری ماں نے مجھ کو جنا، میں دو برس اس کے پیٹ میں رہا، جب میں پیدا ہوا میرے دانت اُگ آئے تھے۔[2]

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ حمل دو برس سے زیادہ نہیں ہوتا، مغزل (تکلے) کے سائے کے برابر۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: غیضِ حمل میں خون کا دیکھنا ہے اور زیادہ نو مہینے سے بڑھ جانا ہے۔ امام عطیہ عوفی، حسن بصری، قتادہ اور ضحاک رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے یہ بھی کہا ہے کہ عورت جب نو ماہ سے کم میں خون دیکھتی ہے تو حمل اس کا نو ماہ سے زیادہ ہو جاتا ہے مثل ایامِ حیض کے۔ امام عکرمہ، سعید بن جبیر اور ابن زید رحمہم اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ غیض بہانا ہے خون کا، تاکہ بچہ اچھا پیدا ہو۔ زیادت سے یہ مراد ہے کہ اگر خون جاری نہ ہو تو بچہ تمام و عظیم پیدا ہوتا ہے۔[3]

امام مکحول رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بچہ ماں کے پیٹ میں نہ کچھ مانگے نہ حزن و غم کرے، اُس کا رزق اس کے پاس اُس کی ماں کے پیٹ میں آتا ہے حیض کے خون سے، اسی سبب سے حاملہ کو حیض نہیں آتا۔ پھر جب وہ زمین پر گرتا ہے تو آواز کرتا ہے۔ اس کا یہ رونا اس کی جگہ تبدیل ہونے کے سبب سے ہوتا ہے۔ جب اُس کی ناف کاٹی جاتی ہے تو اللہ اُس کا رزق اس کی ماں کے پستان کے سپرد کر دیتا ہے، تاکہ اُس کو حزن، طلب اور غم نہ ہو۔ پھر وہ طفل ہو کر چیز کو اپنے ہاتھ میں لیتا ہے اور کھاتا ہے۔ جب بالغ ہوتا ہے تو کہتا ہے موت ہے یا قتل رزق میرا کہاں؟

امام مکحول رحمہ اللہ نے اس کے بعد کہا ہے: افسوس ہے تجھ کو اللہ تعالیٰ نے غذا دی اور تو ماں کے پیٹ میں تھا اور تو ایک چھوٹا بچہ تھا، یہاں تک کہ جب تو سخت و پختہ اور عقل و شعور والا ہوا تو یوں کہنے لگا: «هُوَ الْمَوْتُ أَوِ الْقَتْلُ أَنّٰى لِيْ بِالرِّزْقِ» ''وہ موت ہے یا قتل میرا رزق کہاں ہے؟'' پھر امام مکحول رحمہ اللہ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى ﴾ (آیت باب)۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ہر شے اللہ کے نزدیک ایک مقدار پر ہے۔ یعنی ایک مدت تک اپنی مخلوق کے رزق کا تحفظ کیا اور اُن کی عمر ایک معلوم مدت تک ٹھہرائی۔[4]

---

[1] تفسير الطبري (١٦/ ٣٥٩) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٢٦)
[3] تفسير الطبري (١٦/ ٣٦٠_ ٣٦٥)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٢٧_ ٢٢٢٨)

صحیح حدیث میں مروی ہے کہ نبی مکرم ﷺ کی ایک صاحب زادی نے کسی کو آپ ﷺ کے پاس بھیجا اور آپ ﷺ کو بلایا، اس لیے کہ ان کا بیٹا موت میں تھا۔ انھوں نے چاہا کہ اس وقت نبی کریم ﷺ موجود ہوں، اس لیے کسی کو بھیج کر آپ ﷺ کو بلایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ لِلّٰهِ مَا أَخَذَ، وَلَهُ مَا أَعْطٰى، وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِأَجَلٍ مُسَمًّى» [اللہ ہی کا ہے جو اس نے لے لیا اور اسی کا ہے جو اس نے دیا تھا اور اس کے ہاں ہر چیز کا وقت مقرر ہے] پھر کہا: اس کو کہو کہ صبر کرے اور ثواب کی اُمید رکھے۔[1] (الحديث بتمامه)

اللہ عالمِ غیب وشہادت ہے، وہ ہر چیز کو جانتا ہے جس کا مشاہدہ لوگ کرتے ہیں اور جو چیز اُن سے غائب ہے۔ اس سے کوئی شے مخفی نہیں ہے۔ کبیر وہ ہے جو ہر چیز سے اکبر ہو۔ متعال وہ ہے جس کے علم نے ہر شے کا احاطہ کر لیا ہو اور ہر شے اس کی مقہور ہو۔ اس کے سامنے گردنیں جھک جائیں، بندے اس کے سامنے طوعاً وکرہاً مطیع وفرماں بردار ہوں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اس آیت کا سیاق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شے اور امور کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ ماں کے پیٹ میں نر ہے یا مادہ۔ خوبصورت ہے یا بدصورت، خوش بخت ہے یا بدبخت، طویل ہے یا چھوٹا، مکمل ہے یا ناقص۔ اسی طرح غیض اور زیادت کو جانتا ہے۔ اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ غیض سے مراد نقص ہے۔ نقص اور زیادت حمل کے پیدا ہونے کا عالم ہے، جیسے ایک انگشت کا نقص وزیادت یا حمل کی کمی وبیشی نو ماہ سے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زیادہ سے زیادہ مدت حمل کی دو سال ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا کہ چار برس اور امام مالک رحمہ اللہ نے کہا کہ پانچ برس اور سب سے کم مدت حمل کی چھے ماہ ہے، چھے مہینے کا بچہ زندہ رہتا ہے۔ مقدار سے مراد ہر چیز کا اندازہ ہے۔ یہی مذہب ہے سلف کا کہ کوئی شے اپنے مقدار سے خارج نہیں ہوتی ہے۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ ہر شے کی کیفیت اور کمیت اور اس کی تفصیلی وجوہات کو جاننے والا ہے۔ یا مراد ہر شے کی تخصیص ہے، ایک وقتِ معین اور حالتِ معینہ کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادے سے ہے۔

اس آیت میں بندوں کے افعال اور احوال اور خیالات واعمال بھی داخل ہیں۔ یہ آیت قولِ معتزلہ کے باطل ہونے پر ایک بڑی دلیل ہے۔ غائب وہ ہے جو جس سے مخفی ہو، شہادت وہ ہے جو حاضر ہو یا غیب اور شہادت سے مراد معدوم اور موجود ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ پوشیدہ اور ظاہری حالت ہے۔[2] کوئی امر اس بات سے مانع نہیں کہ اس کو عام پر محمول کریں۔ کبیر وہ عظیم ہستی ہے کہ ہر شے اُس سے کمتر ہو۔ متعال ہے قولِ مشرکین سے یا

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٤٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٢٣) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٢٨)

قدرت وعظمت وقہر کے لحاظ سے ہر شے سے بلند ہے۔ یا عرش پر مستوی ہونے کی وجہ سے تمام مخلوق سے اوپر ہے اور مخلوق سے علاحدہ ہے یہی اعلیٰ و اولیٰ ہے۔[1]

سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۭ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ﴿۱۰﴾ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۗ وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ﴿۱۱﴾

(اللہ کے نزدیک) مساوی ہے تم میں سے جو کوئی آہستہ بات کہے یا بلند آواز سے کہے، اور جو رات (کی تاریکی) میں چھپنے والا ہو یا دن (کی روشنی) میں چلنے والا ہو ⑩ اس (انسان) کے لیے اس کے آگے سے اور اس کے پیچھے سے باری باری آنے والے (فرشتے) ہیں، وہ اللہ کے حکم سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ بے شک اللہ نہیں بدلتا جو کسی قوم میں ہے، حتی کہ وہ اسے بدل لیں جو ان کے نفسوں میں ہے۔ اور جب اللہ کسی قوم کے ساتھ برائی (عذاب) کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے لیے کوئی واپسی نہیں، اور ان کے لیے اس کے سوا کوئی کارساز نہیں ⑪

اللہ تعالیٰ کا علم ہر ظاہر اور مخفی چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے:

یعنی اللہ کسی قوم کو اپنی نگہبانی اور مہربانی سے محروم نہیں کرتا، جو ہمیشہ اس کی طرف رہی ہے، جب تک وہ اللہ کے ساتھ اپنی چال نہ بدلیں۔ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ اللہ کا علم تمام مخلوق کو گھیرے ہوئے ہے، ان میں خواہ کوئی چپکے سے بات کرے یا چلا کر وہ ہر بات کو سن لیتا ہے، اس پر کوئی شے مخفی نہیں ہے۔ جیسے اس کا فرمان ہے: ﴿ وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ﴾ [طٰہ: ۷] ''اور اگر آپ بلند آواز سے بات کریں تو بلاشبہہ وہ ہر راز اور (اس سے بھی) پوشیدہ تر بات کو جانتا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴾ [النمل: ۲۵] ''اور وہ (سب کچھ) جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو۔''

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: پاک ذات ہے وہ شخص جس کے سننے نے آوازوں کو سما لیا۔ واللہ! جھگڑنے والے آئے، عورت اپنے خاوند کی شکایت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کرتی تھی اور میں گھر میں تھی، مجھ پر اس کی بعض بات مخفی

---

[1] فتح البیان (۷/ ۲۳۔ ۲۵)

ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری: ﴿ قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴾ [المجادلة: ١] ''(اے نبی!) یقیناً اللہ نے اس عورت (خولہ بنت ثعلبہ) کی بات سن لی جو اپنے خاوند (اوس بن صامت) کے متعلق آپ سے جھگڑ رہی تھی اور وہ اللہ کی طرف شکایت کر رہی تھی اور اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا، بے شک اللہ خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا ہے۔''①

معلوم ہوا کہ اللہ کا علم جس طرح کلیات کو محیط ہے، اسی طرح جزئیات کو بھی۔ جو شخص تاریکیِ شب میں اپنے گھر کے تہ خانہ میں ہے اور جو شخص کھلم کھلا دن کی روشنی میں چلتا پھرتا ہے، دونوں کی بات چیت یکساں طور پر اللہ کے علم میں ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ ۙ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۚ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴾ [هود: ٥] ''آگاہ رہو! جب وہ اپنے کپڑے اوڑھتے ہیں (تب بھی) وہ (اللہ) جانتا ہے جو وہ چھپاتے اور ظاہر کرتے ہیں، بے شک اللہ سینوں کے راز خوب جانتا ہے۔''

نیز اس کا فرمان ہے: ﴿ وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ۭ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاۗءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴾ [يونس: ٦١] ''اور (اے نبی!) آپ جس حال میں بھی ہوتے ہیں اور اللہ کی طرف سے (نازل شدہ) قرآن میں سے جو کچھ بھی پڑھتے ہیں اور تم لوگ جو بھی عمل کرتے ہو، اس وقت ہم تمھیں دیکھ رہے ہوتے ہیں، جب تم اس میں مصروف ہوتے ہو۔ اور آپ کے رب سے ذرہ بھر کوئی چیز بھی چھپی نہیں ہوتی، زمین میں اور نہ آسمان میں اور نہ کوئی اس سے چھوٹی (چیز) اور نہ بڑی، مگر (وہ) واضح کتاب میں (درج) ہے۔''

بندے کے لیے فرشتے مقرر ہیں جو رات دن آتے جاتے رہتے ہیں، رات دن میں نگہبانی کرتے ہیں۔ برائیوں اور حادثات سے اس کے نگہبان ہیں، جس طرح کہ دوسرے فرشتے جو خیر و شر اعمال کے محافظ ہیں رات دن میں بدلتے رہتے ہیں، دو داہنے طرف اور دو بائیں طرف موجود رہتے ہیں۔ دائیں طرف والے نیکیاں لکھتے ہیں اور بائیں طرف والے برائیاں لکھتے ہیں اور دو فرشتے اور ہیں جو بندے کی حفاظت اور نگہبانی کرتے ہیں۔ ایک سامنے رہتا ہے اور ایک پیچھے کی طرف ہوتا ہے۔

غرض یہ کہ انسان چار فرشتوں کے درمیان دن میں ہوتا ہے اور چار کے درمیان رات کو ہوتا ہے۔ دو محافظ ہیں اور دو لکھنے والے، جس طرح کہ صحیح میں مروی ہے: « يَتَعَاقَبُوْنَ فِيكُمْ مَلَائِكَةٌ بِاللَّيْلِ، وَمَلَائِكَةٌ بِالنَّهَارِ، يَجْتَمِعُوْنَ فِيْ صَلَاةِ الصُّبْحِ وَصَلَاةِ الْعَصْرِ، فَيَصْعَدُ الَّذِيْنَ بَاتُوْا فِيكُمْ، فَيَسْأَلُهُمْ رَبُّهُمْ وَهُوَ أَعْلَمُ

① سنن النسائي، رقم الحديث (٣٤٦٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٨) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ مزید دیکھیں: إرواء الغليل (٧/ ١٧٥)

بِهِمْ: كَيْفَ تَرَكْتُمْ عِبَادِيْ؟ فَيَقُوْلُوْنَ: أَتَيْنَاهُمْ وَهُمْ يُصَلُّوْنَ، وَتَرَكْنَاهُمْ وَهُمْ يُصَلُّوْنَ ﴾ [1] [رات کے فرشتے اور دن کے فرشتے ایک دوسرے کے پیچھے تمھارے درمیان آتے ہیں اور فجر کی نماز اور عصر کی نماز کے وقت وہ اکٹھے ہو جاتے ہیں، پھر جنھوں نے تمھارے درمیان رات گزاری ہوتی ہے، وہ اوپر چلے جاتے ہیں، ان سے ان کا رب پوچھتا ہے، حالانکہ وہ ان سے زیادہ جانتا ہے: تم میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑ کر آئے ہو؟ وہ جواب دیتے ہیں: جب ہم ان کے پاس آئے تھے وہ نماز پڑھ رہے تھے اور ہم نے انھیں اس حالت میں چھوڑا ہے کہ وہ نماز پڑھ رہے تھے] دوسری حدیث میں مروی ہے کہ تمھارے ساتھ وہ ہیں، جو جدا نہیں ہوتے، تم سے مگر خلاء کے وقت اور جماع کے وقت، سو تم ان سے شرماؤ اور ان کا اکرام کرو۔[2]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ﴿ مُعَقِّبٰتٌ ﴾ اللہ کی طرف سے یہی فرشتے ہیں جو آگے پیچھے سے بندے کی حفاظت کرتے ہیں۔ جب اللہ کی تقدیر آتی ہے، اس سے الگ ہو جاتے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ کوئی بندہ نہیں ہے مگر ایک فرشتہ گماشتہ خواب اور بیداری میں جنوں، انسانوں اور حادثات اور دوسری مخلوق سے اس کی حفاظت کرتا ہے۔ ان میں سے جب بھی کوئی شے اس کے پاس اسے نقصان پہنچانے کے ارادے سے آتی ہے تو وہ فرشتہ اس سے کہتا ہے کہ تو الگ ہو جا، مگر وہ شے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں حکم دیا ہے وہ اس کو پہنچ جاتی ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ﴿ مُعَقِّبٰتٌ ﴾ سے مراد دنیا کے بادشاہوں میں سے کوئی بادشاہ ہے جس کے آگے پیچھے نگران و محافظ ہوتے ہیں۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ مراد ولی سلطان ہے کہ اس پر حرس، یعنی چوکی پہرہ دیتا رہتا ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ امرا ہیں کہ ان کے آگے پیچھے مواکب (سواروں کی جماعت) رہتے ہیں۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا کہ اس سے مراد سلطان محروس من امر اللہ ہے اور وہ اہلِ شرک ہیں۔[3] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ظاہر، واللّٰہ أعلم۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام عکرمہ اور ضحاک رحمہما اللہ کی اس تفسیر سے مراد یہ ہے کہ بندے کے لیے نگہبان فرشتے ان بادشاہوں اور امراء کے نگہبانوں کے مشابہ ہیں، یعنی بادشاہوں اور امیروں کے اردگرد چوکی پہرہ کے سپاہی اور اردلی کے لوگ حفاظت اور پیغام رسانی کے لیے رہتے ہیں، اسی طرح ہر بندہ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کی پہرہ چوکی مقرر ہے کہ وہ بلاؤں اور آفتوں سے اس کی نگہبانی کرتے ہیں۔[4]

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس جگہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث غریب بطولہ روایت کی ہے، جس میں یہ ہے کہ ہر بندے پر دس فرشتے موکل ہوتے ہیں۔[5] اور حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے: ﴿ مَا مِنْكُمْ مِنْ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٣٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٣٢)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٨٠٠) اس کی سند میں "لیث بن ابی سلیم" ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: إرواء الغليل (١/ ١٠٢)

[3] تفسير الطبري (١٦/ ٣٧١۔ ٣٧٤)

[4] تفسير ابن كثير (٢/ ٦٥٥)

[5] تفسير الطبري (١٦/ ٣٧٠) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ کیونکہ کنانہ عدوی رحمہ اللہ نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا۔ مزید تفسیر طبری میں علامہ احمد شاکر رحمہ اللہ کا کلام دیکھیں۔

أَحَدٍ إِلَّا وَقَدْ وُكِّلَ بِهِ قَرِينُهُ مِنَ الْجِنِّ وَقَرِينُهُ مِنَ الْمَلَائِكَةِ قَالُوا: وَإِيَّاكَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ! قَالَ: وَإِيَّايَ، وَلٰكِنَّ اللّٰهَ أَعَانَنِي عَلَيْهِ فَلَا يَأْمُرُنِي إِلَّا بِخَيْرٍ ﴾ [1] (رواہ أحمد و انفرد بإخراجه مسلم) ''ہر ایک پر دو قرین مقرر ہیں، ایک جن اور ایک فرشتہ، بولے اور آپ پر بھی؟ فرمایا: اور مجھ پر بھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے شیطان پر میری مدد کی ہے، وہ مجھے بھلائی ہی کا حکم کرتا ہے۔''

فرشتے انسان کی یہ حفاظت اللہ کے حکم سے کرتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، سعید بن جبیر اور ابراہیم نخعی رحمہ اللہ وغیرہم نے اسی طرح کہا ہے۔ امام قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اللہ کے حکم سے حفاظت کرتے ہیں اور بعض قراءت میں ''بِأَمْرِ اللّٰهِ'' آیا ہے۔ امام ابو امامہ رحمہ اللہ نے کہا کہ کوئی آدمی نہیں ہے، لیکن ایک فرشتہ اس سے آفات کو دور رکھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اسے تقدیر کے سپرد کر دیتا ہے۔

حکایت:

امام ابومجلز رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مراد قوم کا ایک شخص سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے پاس آیا، وہ نماز پڑھتے تھے، کہا: تم اپنی حراست کرو، قوم مراد کے کچھ لوگ تمھیں قتل کرنا چاہتے ہیں، کہا: ہر آدمی کے ساتھ دو فرشتے رہتے ہیں، وہ اس کی حفاظت کرتے ہیں، اس چیز سے جو مقدر نہیں ہے اور جب قدر و قضا آتی ہے تو وہ اس کو اور قدر کو تنہا چھوڑ دیتے ہیں۔ اجل ایک مضبوط ڈھال ہے۔ [2]

بعض نے کہا: ﴿ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ﴾ جس طرح حدیث میں مروی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ بتائیں کہ یہ رقی جس سے ہم منتر کرتے ہیں، کچھ اللہ کی تقدیر کو پھیر دیتے ہیں؟ فرمایا: ﴿ هِيَ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ ﴾ [3] ''یہ بھی اللہ کی تقدیر ہی کا حصہ ہے۔'' امام ابراہیم رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے نبی کو پیغام بھیجا کہ تو اپنی قوم سے کہہ دے کہ کوئی ایسا اہلِ قریہ اور اہلِ خانہ نہیں ہے کہ اللہ کی اطاعت پر ہو، پھر اطاعت سے معصیت کی طرف آ جائے، لیکن اللہ تعالیٰ اس سے وہ چیز بدل دیتا ہے، جس کو وہ دوست رکھتا ہے، اس چیز کی طرف جس کو وہ مکروہ سمجھتا ہے۔ پھر کہا: اس کی تصدیق اللہ کی کتاب میں ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ﴾ [4] (آیت باب)

یہ بات ایک حدیثِ مرفوع میں بھی مروی ہے۔ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے منبر پر خطبہ پڑھا اور کہا: ''كُنْتُ إِذَا أَسْكُتُ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ اِبْتَدَأَنِي، وَإِذَا سَأَلْتُهُ عَنِ الْخَبَرِ أَنْبَأَنِي، وَأَنَّهُ حَدَّثَنِي عَنْ رَبِّهِ عَزَّوَجَلَّ

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨١٤) مسند أحمد (١/ ٣٩٧) [2] تفسير الطبري (١٦/ ٣٧٥_ ٣٧٨)
[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٠٦٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٤٣٧) اس کی سند میں ''ابن ابی خزامہ'' مجہول راوی ہے۔
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٣٢_ ٢٢٣٣)

قَالَ: قَالَ الرَّبُّ: وَعِزَّتِيْ وَجَلَالِيْ وَارْتِفَاعِيْ فَوْقَ عَرْشِيْ مَا مِنْ قَرْيَةٍ وَلَا أَهْلِ بَيْتٍ كَانُوْا عَلٰى مَا كَرِهْتُ مِنْ مَعْصِيَتِيْ ثُمَّ تَحَوَّلُوْا عَنْهَا إِلٰى مَا أَحْبَبْتُ مِنْ طَاعَتِيْ إِلَّا تَحَوَّلْتُ لَهُمْ عَمَّا يَكْرَهُوْنَ مِنْ عَذَابِيْ إِلٰى مَا يُحِبُّوْنَ مِنْ رَّحْمَتِيْ" [جب میں خاموش رہتا تو آپ ﷺ مجھ سے بات شروع کرتے، اور جب میں پوچھتا تو آپ ﷺ مجھے جواب دیتے، ایک دن آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: مجھے قسم ہے اپنی عزت وجلال کی، اپنی بلندی کی جو عرش پر ہے کہ جس بستی کے جس گھر کے لوگ میری نافرمانیوں میں مبتلا ہوں، پھر وہ انھیں چھوڑ کر میری فرمانبرداری میں لگ جائیں تو میں بھی اپنے عذاب اور دکھ ان سے ہٹا کر اپنی رحمت اور سکھ انھیں عطا فرماتا ہوں] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: "وهذا غريب وفي إسناده من لا أعرفه"[1] [یہ حدیث غریب ہے اور اس کی سند میں ایک راوی غیر معروف ہے]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں یہ الفاظ ہیں کہ اللہ تعالیٰ انسان کی ہر پوشیدہ اور ظاہر بات کو جانتا ہے۔ رات کا چھپنے والا جو لوگوں کی آنکھوں سے مخفی ہے اور دن کا چلنے والا جو راہوں پر چلتا پھرتا ہے، ان دونوں کی حالت اللہ کے علم کے سامنے برابر ہے۔ بعض نے کہا: مستخف وہ ہے جو گناہوں میں خودسر ہے اور سارب وہ ہے جو علانیہ گناہ کرتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ وہ شخص ہے جو رات کو گناہ کرتا ہے اور دن کو لوگوں کے سامنے اس گناہ سے اپنی براءت ظاہر کرتا ہے۔[2]

بالجملہ ان سب کے لیے فرشتے مقرر ہیں جو بدل کر آتے جاتے ہیں۔ عام مفسرین کے قول کے مطابق یہ فرشتے حفاظت کرنے والے ہیں۔ بعض نے کہا کہ پانچ رات کے اور پانچ دن کے ہیں۔ امام خطیب رحمہ اللہ نے کہا کہ بیس ہیں، دس رات کے اور دس دن کے۔ سامنے اور پیچھے سے مراد تمام اطراف ہیں۔ ﴿ اَمْرِ اللّٰهِ ﴾ سے مراد اللہ کی سزا اور عذاب ہے۔ گناہ کرنے کے وقت فوراً نہیں پکڑتا، مہلت دیتا ہے، تاکہ توبہ و استغفار کر لیں۔ یا مراد برائیوں اور اچھائیوں کو یاد رکھنا ہے۔ یا مراد زمانے کی سختیاں ہیں جو روز و شب پہنچتی ہیں۔ یا مراد جنوں اور انسانوں سے حفاظت ہے۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ کا مختار یہ ہے کہ ﴿ مُعَقِّبٰتٌ ﴾ سے مراد وہ سوار، چوکیدار اور اردلی ہیں جو بادشاہوں اور امرا کے اردگرد ہوتے ہیں۔[3] یعنی یہ اس کی قضا و قدر کو ہٹا نہیں سکتے۔ سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہر بندے کے ساتھ فرشتے ہوتے ہیں، جو اس کی حفاظت کرتے ہیں کہ کہیں اس پر کوئی دیوار نہ گرے، یا وہ کسی کنویں میں نہ جا گرے، یا اس کو کوئی درندہ نہ پھاڑ کھائے، یا وہ کسی ندی نالے میں نہ ڈوب جائے، یا آگ میں نہ جل جائے، لیکن جب تقدیر آجاتی ہے تو اس کو اور قدر کو چھوڑ دیتے ہیں۔[4]

---

[1] كتاب العرش لابن أبي شيبة (١/ ٦١) تفسير ابن كثير (٢/ ٦٥٦) اس کی سند میں ایک سے زیادہ مجہول راوی ہیں۔
[2] تفسير الطبري (١٦/ ٣٦٧) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔ [3] تفسير الطبري (١٦/ ٣٦٧) [4] الدر المنثور (٤/ ٦١٥)

حفاظت کرنے والے فرشتوں کے بارے میں بہت سی احادیث مروی ہیں جو کتبِ احادیث وسنتِ مطہرہ میں موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی نعمت و عافیت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود ہی اللہ کی اطاعت اور اپنی اچھی حالت کو چھوڑ کر بری حالت اور اللہ کی نافرمانی سے بدل نہیں دیتے۔ مطلب یہ ٹھہرا کہ اللہ بندے پر اپنی سزا نازل نہیں کرتا جب تک کہ پہلے اس سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوتا، بلکہ کبھی دوسروں کے گناہوں سے بھی مصائب نازل ہوتے ہیں، جس طرح کہ حدیث میں مروی ہے کہ نبی مکرم ﷺ سے پوچھا گیا: ''أَنَهْلِكُ وَفِينَا الصَّالِحُونَ'' ''کیا ہم ہلاک ہوں گے اور ہم میں نیک لوگ ہوں گے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: « نَعَمْ، إِذَا كَثُرَ الْخَبَثُ »[1] ''ہاں، جب زنا کی کثرت ہوگی۔''

اور جب اللہ کسی قوم کو ہلاک کرنے یا اسے عذاب کرنے کا ارادہ کر لیتا ہے تو پھر اس بلا کو کوئی نہیں پھیر سکتا۔ بعض نے کہا کہ جب کسی قوم کے ساتھ برائی کا ارادہ ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس قوم کے دل اندھے کر دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ اسی بلا کو اختیار کرتے ہیں، پھر اللہ کے سوا کوئی ان کا مددگار نہیں ہوتا جو اللہ کی سزا کو ان سے ہٹا سکے، یا اس کے عذاب کو روک سکے۔ معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کو لوٹانے والا اور اس کے حکم کو منسوخ کرنے والا کوئی نہیں۔[2]

هُوَ الَّذِي يُرِيكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ﴿١٢﴾ وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ ۚ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ وَهُمْ يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ ۚ وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ ﴿١٣﴾

وہی ہے جو تمھیں ڈرانے اور امید دلانے کے لیے بجلی دکھاتا ہے اور بھاری بادل پیدا کرتا ہے (12) اور (بادل کی) گرج اس کی حمد کے ساتھ تسبیح پڑھتی ہے اور فرشتے (بھی) اس کے خوف سے (تسبیح پڑھتے ہیں)۔ اور وہی کڑکتی بجلیاں بھیجتا ہے، پھر انھیں جن پر چاہے گراتا ہے، جب کہ وہ اللہ کی بابت جھگڑ رہے ہوتے ہیں اور وہ شدید قوت والا ہے (13)

قدرتِ الٰہی کے کرشمے:

اللہ تعالیٰ نے برق (بجلی) کی تسخیر کا ذکر کیا، برق وہ تیز چمکتا ہوا نور ہے جو بادل کے درمیان سے چمکتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ابو الجلد کو اس کے اس سوال کے جواب میں کہ برق کیا چیز ہے؟ لکھا تھا کہ وہ پانی ہے۔[3] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: بجلی مسافر کے لیے ڈر ہے، وہ اس کی تکلیف اور سختی سے ڈرتا ہے اور مقیم کے لیے طمع

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٦٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٨٠)　(2) فتح البيان (٧/ ٢٦۔ ٢٩)

(3) تفسير الطبري (١٦/ ٣٨٧) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ''موسیٰ بن سالم'' کا سماع سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت نہیں ہے۔

ہے، وہ اس کی برکت اور فائدے کی اُمید رکھتا ہے اور اللہ کے رزق کا طمع رکھتا ہے۔[1] اللہ تعالیٰ بھاری بھاری بادل پیدا کرتا ہے، وہ پانی کی کثرت سے بوجھل ہو کر زمین کے قریب ہو جاتے ہیں۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: سحاب ثقال وہ ہے جس میں پانی ہو۔[2] اور رعد کا تسبیح کرنا اس آیت کے مثل ہے: ﴿ وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ ﴾ [بني إسرائيل: ٤٤] ''اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ تسبیح نہ کرتی ہو۔'' بنی غفار کے ایک شیخ نے مرفوعاً کہا ہے: ''إِنَّ اللّٰهَ يُنْشِيءُ السَّحَابَ فَيَنْطِقُ أَحْسَنَ النُّطْقِ وَيَضْحَكُ أَحْسَنَ الضِّحْكِ''[3] (رواه أحمد بطوله) ''اللہ بادل کو پیدا کرتا ہے، پھر وہ بولتا ہے اچھا بولنا اور ہنستا ہے اچھا ہنسنا۔''

اس سے مراد یہ ہے کہ ابر کا بولنا رعد ہے اور اس کا ہنسنا برق ہے۔ واللّٰه أعلم۔ سعد بن ابراہیم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ برسنے والے بادل کو بھیجتا ہے، اس سے بہتر کسی کی ہنسی اور مانوس تر نطق (آواز) نہیں ہے۔ اس کی ہنسی بجلی ہے اور بولنا اس کا رعد ہے۔[4] امام محمد بن مسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ بجلی ایک فرشتہ ہے، اس کے چار منہ ہیں: ایک انسان جیسا، دوسرا بیل کا، تیسرا گرگ (بھیڑیا) کا اور چوتھا شیر جیسا۔ پس جس وقت وہ اپنی دم ہلاتا ہے تو وہ بجلی ہے۔[5]

حدیث سالم عن ابیہ میں مرفوعاً مروی ہے کہ نبی مکرم ﷺ جب رعد وصواعق کی آواز سنتے تو فرماتے: « اَللّٰهُمَّ لَا تَقْتُلْنَا بِغَضَبِكَ، وَلَا تُهْلِكْنَا بِعَذَابِكَ، وَعَافِنَا قَبْلَ ذٰلِكَ »[6] (رواه أحمد والترمذي والبخاري في كتاب الأدب، والنسائي في اليوم والليلة، والحاكم في مستدركه) ''اے اللہ! نہ قتل کرنا ہمیں اپنے غصے سے اور نہ ہلاک کرنا ہمیں اپنے عذاب سے اور ہمیں اس سے پہلے عافیت دینا۔'' سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ نبی مکرم ﷺ جب رعد کی آواز سنتے تو کہتے: « سُبْحَانَ مَنْ يُّسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ »[7] (رواه ابن جرير) ''پاک ہے وہ جس کی پاکی حمد کے ساتھ رعد بولتے ہیں۔''

سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ رعد کی آواز سن کر کہتے: ''سُبْحَانَ مَنْ سَبَّحْتَ لَهٗ'' ''وہ پاک ہے جس کی تسبیح تو اے رعد! کرتے ہو۔''[8] اسی طرح سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام طاؤس اور اسود بن یزید رحمہم اللہ بھی کہتے تھے۔ امام اوزاعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابن ابی زکریا رحمہ اللہ کا قول ہے کہ جو کوئی رعد کی آواز سن کر یوں کہتا ہے: ''سُبْحَانَ اللّٰهِ

---

[1] تفسير الطبري (١٦/ ٣٨٧) [2] تفسير الطبري (١٦/ ٣٨٨) [3] مسند أحمد (٥/ ٤٣٥) صحيح الجامع، رقم (١٩٢٠)
[4] تفسير ابن كثير (٢/ ٦٥٦ـ ٦٥٧) [5] تفسير الطبري (١/ ٣٤٣)
[6] مسند أحمد (٢/ ١٠٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٤٥٠) الأدب المفرد (١/ ٢٥١) عمل اليوم والليلة (١/ ٥١٨) مستدرك الحاكم (٤/ ٣١٨) اس کی سند میں ''ابومطر'' مجہول راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٠٤٢)
[7] تفسير الطبري (١٦/ ٣٨٩) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔
[8] تفسير الطبري (١٦/ ٣٨٩) اس کی سند میں ''مسعدہ بن یسع باہلی'' ضعیف راوی ہے۔

وَبِحَمْدِهٖ“ تو اس پر بجلی نہیں گرتی۔[1] سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما جب گرج سنتے تو بات کرنا چھوڑ دیتے اور کہتے: ”سُبْحَانَ الَّذِيْ يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلاَئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ“ (رواه مالك في الموطأ والبخاري في كتاب الأدب) ”وہ پاک ہے جس کی تعریف رعد کرتا ہے اور فرشتے اس کے خوف سے۔“[2] نیز کہتے ہیں کہ یہ اہلِ زمین کے لیے ایک شدید وعید ہے۔

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ تمھارے رب عزوجل نے کہا ہے کہ اگر میرے بندے میری اطاعت کریں تو میں ان کو رات کو پانی دوں اور دن کو ان پر سورج نکالوں اور ان کو رعد کی آواز نہ سناؤں۔[3] (رواه أحمد) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب تم رعد کی آواز سنو تو اللہ کا ذکر کرو، کیوں کہ بجلی ذکر کرنے والے کو نہیں پہنچتی۔[4] (رواه الطبراني)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم کڑاکا بھیجتے ہیں، پھر جس پر چاہیں سزا کے طور پر اس پر ڈالتے ہیں۔ جس سے چاہتے ہیں انتقام لیتے ہیں۔ اسی لیے آخری زمانے میں یہ صواعق (بجلی کی کڑک اور چمک) کثرت سے ہوں گے۔ سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «تَكْثُرُ الصَّوَاعِقُ عِنْدَ اقْتِرَابِ السَّاعَةِ حَتّٰى يَأْتِيَ الرَّجُلُ الْقَوْمَ فَيَقُوْلُ: مَنْ صَعِقَ قَبْلَكُمُ الْغَدَاةَ؟ فَيَقُوْلُوْنَ: صَعِقَ فُلَانٌ وَفُلَانٌ وَفُلَانٌ»[5] (رواه أحمد) ”قیامت کے قریب بہت کڑکے ہوں گے، یہاں تک کہ ایک آدمی لوگوں کے پاس آئے گا، پھر کہے گا کہ کس کو کڑکا لگا تم سے پہلے کل؟ لوگ کہیں گے: فلانے اور فلانے اور فلانے پر۔“ یعنی جب قیامت قریب ہوگی تو بجلی کثرت سے گرا کرے گی، یہاں تک کہ کوئی شخص کسی قوم کے پاس آ کر کہے گا کہ تم سے پہلے صبح کو کس پر بجلی گری؟ وہ کہے گا: فلاں، فلاں اور فلاں پر۔

آیتِ کریمہ کا شانِ نزول:

حافظ ابو یعلیٰ موصلی رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے سببِ نزول کے بارے میں روایت کیا ہے کہ ایک دفعہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو فراعنۂ عرب میں سے کسی کے پاس بھیجا اور کہا کہ اس کو میرے پاس لاؤ۔ اس نے جا کر کہا تم کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بلاتے ہیں۔ اس نے کہا: رسول اللہ کون ہیں اور اللہ کون ہے، سونے کا ہے یا چاندی کا یا تانبے کا؟ وہ شخص نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس واپس آیا اور عرض کی: اے اللہ کے رسول! میں نے آپ کو بتا دیا ہے کہ وہ بے پروا ہے اس بات سے، اس نے مجھ کو ایسا ایسا کہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دوسری بار پھر اس کے پاس جا،

---

[1] تفسير الطبري (١٦/ ٣٨٩۔ ٣٩٠) [2] الموطأ (٢/ ٩٩٢) الأدب المفرد (١/ ٢٥٢) اس کی سند صحیح ہے۔
[3] مسند أحمد (٢/ ٣٥٩) اس کی سند میں ”صدقہ بن موسیٰ“ ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٨٨٣)
[4] المعجم الكبير (١١/ ١٦٤) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”وفيه يحيىٰ بن كثير وهو ضعيف“ (مجمع الزوائد: ١٠/ ١٩٥)
[5] مسند أحمد (٣/ ٦٤) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”رواه أحمد عن محمد بن مصعب وهو ضعيف“ (مجمع الزوائد: ٨/ ١٨)

وہ پھر گیا، اس نے پھر اسی طرح کہا، وہ نبی اکرم ﷺ کے پاس واپس آیا، عرض کی: اے اللہ کے رسول! میں نے آپ کو خبر کر دی کہ وہ اس بات سے بے نیاز ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: اس کے پاس پھر جا اور اس کو بلا لا۔ وہ پھر آیا اور اسی بات کو دہرایا، وہ یہی بات کرتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بادل بھیجا، اُس کے سر پر آ کر وہ بادل گرجا، اس سے بجلی گری اور اس شخص کے سر کی کھوپڑی اڑا کر لے گئی۔ اس پر یہ آیت اتری۔[1] (رواہ ابن جریر و البزار عن أنس نحوہ)

عبدالرحمٰن بن صحار عبدی رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک شخص کو ایک جبار کے پاس اسے بلانے کے لیے بھیجا۔ اس نے کہا: مجھے تم یہ بتاؤ کہ تمھارا رب سونا ہے یا چاندی یا موتی؟ وہ اس کے بارے میں مجادلہ (جھگڑا) کرتا تھا کہ اتنے میں اللہ تعالیٰ نے ایک بادل بھیجا، وہ گرجا، اس میں سے بجلی گری، اس کے سر کی کھوپڑی کو لے گئی، تب یہ آیت اتری۔[2] امام مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایک یہودی آیا، اُس نے کہا: اے محمد (ﷺ) مجھے اپنے رب کے متعلق بتاؤ، وہ کس چیز کا ہے، تانبے کا یا موتی کا یا یاقوت کا؟ اتنے میں ایک بجلی نے آ کر اس کو پکڑ لیا اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بھیجی۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم سے ذکر ہوا کہ ایک شخص نے قرآن کا انکار کیا اور نبی مکرم ﷺ کی تکذیب کی۔ اللہ تعالیٰ نے ایک صاعقہ (بجلی) بھیجی، اس نے اس شخص کو ہلاک کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بھیجی۔[3]

اس آیت کے سببِ نزول میں عامر بن طفیل اور اربد بن ربیعہ کے قصے کا ذکر کیا ہے کہ یہ دونوں مدینے میں نبی مکرم ﷺ کے پاس آئے اور سوال کیا کہ نصف امر ہمارے لیے ہو، نبی کریم ﷺ نے انکار کیا۔ عامر بن طفیل نے کہا: واللہ! میں تجھ پر حملے کے لیے اس وادی کو ٹڈی دل کی طرح گھوڑوں اور مردوں سے بھر دوں گا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تجھ پر اس بات کا انکار فرماتا ہے اور انصار بھی انکار کرتے ہیں۔ پھر ان دونوں نے نبی اکرم ﷺ کو اچانک مارنے کا ارادہ کیا، ایک باتیں کرنے لگا اور دوسرے نے پیچھے سے تلوار نکالی، تاکہ نبی مکرم ﷺ کو قتل کرے، اللہ تعالیٰ نے ان کے ارادۂ قتل سے آپ ﷺ کو بچا لیا۔ وہ دونوں مدینے سے نکل کر عرب کے کسی علاقے میں گئے تاکہ لوگوں کو نبی مکرم ﷺ سے جنگ کرنے کے لیے جمع کریں۔ اللہ تعالیٰ نے اربد پر ایک ابر بھیجا، اس میں بجلی تھی، اُس نے اربد کو جلا دیا۔ رہا عامر بن طفیل اس پر اللہ تعالیٰ نے طاعون بھیجا، اس کو ایک بڑا غدود نکلا۔ وہ کہنے لگا: اے آلِ عامر! یہ غدود ویسا ہے جیسا جوان اونٹ کا غدہ ہوتا ہے اور موت ہے گھر میں سلولیہ کے۔ یہاں تک کہ وہ دونوں مر گئے۔ لعنهما الله تعالیٰ۔ اور یہ آیت اتری۔ اس قصے کو پوری تفصیل کے ساتھ امام طبرانی رحمہ اللہ نے

---

[1] سنن النسائي الکبریٰ (٦/ ٣٧٠) تفسير الطبري (١٦/ ٣٩٢) مسند أبي يعلىٰ (٦/ ٨٧، ١٨٣) مسند البزار (١٣/ ٣٦١) اس کی سند میں "علی بن ابی سارہ" ضعیف راوی ہے، البتہ یہی روایت دوسری سند سے بھی مروی ہے جس کے بارے میں امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجال البزار رجال الصحيح غير ديلم بن غزوان وهو ثقة" (مجمع الزوائد: ٧/ ١٢٦)

[2] تفسير الطبري (١٦/ ٣٩١) یہ روایت مرسل ہے۔ [3] تفسير الطبري (١٦/ ٣٩١۔ ٣٩٣) یہ دونوں روایتیں مرسل ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔[1]

سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا: "شديد المحال" یعنی "شديد الأخذ" (سخت پکڑ والا) ہے۔[2] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: یہ معنی "شديد القوة" ہے۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ سرکش، حد سے تجاوز کرنے والے اور کفر میں بہت آگے بڑھ جانے والے کی سزا میں تدبیر کرتا ہے۔[3] یہ آیت اس آیت کے مشابہ ہے: ﴿ وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ ﴾ [النمل: ٥٠۔ ٥١] "اور انھوں نے ایک چال چلی اور ہم نے بھی تدبیر کی، اور وہ شعور بھی نہ رکھتے تھے۔ پھر آپ دیکھیں! ان کی چال کا انجام کیا ہوا، بلاشبہ ہم نے ان (نو سرغنوں) کو اور ان کی سب قوم کو تباہ و برباد کر دیا۔"

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ برق وہ لمعان (روشنی) ہے جو بادل کے اندر سے نمایاں ہوتا ہے۔ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ برق فرشتوں کے ہاتھ میں آگ کے کوڑے ہیں، وہ ان سے بادلوں کو زجر کرتے ہیں۔[4] سلف کی ایک جماعت سے بھی اسی کے مطابق روایت ہے اور بعض نے اس کے خلاف کہا ہے۔ خوف سے مراد وہ خوف ہے، جو صواعق (بجلی) سے حاصل ہوتا ہے۔ اور طمع سے مراد وہ طمع ہے جو بارش سے حاصل ہوتا ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا کہ اہلِ بحر (سمندر میں سفر کرنے والے) کو خوف ہوتا ہے اور اہلِ بر (خشکی کے مسافر) کو طمع۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: ڈر بجلی کا اور طمع بارش کی ہوتی ہے۔[5]

"سحاب" کی واحد "سحابة" ہے اور "ثقال" جمع ہے "ثقيلة" کی۔ سحاب اس بادل کو کہتے ہیں جو ہوا میں پھیلا ہوا ہو۔ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بادل کو پانی سے بوجھل کرتا ہے اور نفس رعد اللہ کی تسبیح بیان کرتا ہے۔ یہ بات کچھ بعید نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ اس کو زبان عطا کر دے، اس سے کوئی امر مانع نہیں۔ ﴿ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ﴾ [بني إسرائيل: ٤٤] "اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ تسبیح نہ کرتی ہو، لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔"

اگر رعد فرشتہ ہے تو پھر اس کی تسبیح میں کچھ بھی استبعاد (بُعد) نہیں ہے۔ رعد کا فرشتوں سے علاحدہ ذکر مزید خصوصیت اور عنایت کے لیے ہے۔ ہم کو رعد کی آواز سنائی دیتی ہے، جبکہ وہ تسبیح کرتا ہے اور بعض نے کہا کہ یہ آواز

[1] المعجم الكبير (١٠/ ٣١٢) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رواه الطبراني في الأوسط والكبير وفي إسنادهما عبد العزيز بن عمران وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ٧/ ١٢٤) البتہ اس کی اصل صحیح بخاری (رقم الحدیث: ٣٨٦٤) میں مروی ہے۔

[2] تفسير الطبري (١٦/ ٣٩٦) اس کی سند میں "سیف بن عمر تمیمی" ضعیف راوی ہے۔ [3] تفسير الطبري (١٦/ ٣٩٤۔ ٣٩٦)

[4] الدر المنثور (٤/ ٦١٩) [5] الدر المنثور (٤/ ٦١٨)

اس آلے کی ہے جس سے وہ ابر کو مارتا ہے۔ کسی نے کہا: رعد کی آواز سننے والے تسبیح کرتے ہیں، ''سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ'' کہتے ہیں، لیکن پہلی بات زیادہ مناسب ہے۔ سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ سحاب کا منشا کیا ہے؟ فرمایا: « إِنَّ مَلَكًا مُوَكَّلًا يَلُمُّ الْقَاصِيَةَ وَيُلْحِمُ الدَّانِيَةَ، بِيَدِهِ مِخْرَاقٌ، فَإِذَا رَفَعَتْ بَرَقَتْ، وَإِذَا زَجَرَ رَعَدَتْ، وَإِذَا ضَرَبَ صَعِقَتْ » [1] (رواه ابن مردويه) ''ایک فرشتہ موکل ہے، جو دور اور نزدیک کے بادلوں کو اکٹھا کرتا ہے، اس کے ہاتھ میں کوڑا ہے، جب اُٹھاتا ہے تو چمکتا ہے اور جب جھڑکی دیتا ہے تو گرجتا اور جب مارتا ہے تو کڑکتا ہے۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ یہودی نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ ہمیں بتائیں کہ یہ رعد کیا ہے؟ فرمایا کہ اللہ کے فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے جو بادل پر مقرر ہے، اُس کے ہاتھ میں آگ کا ایک کوڑا ہے، وہ اس سے بادل کو ڈانٹتا ہے، جہاں کا اللہ حکم کرتا ہے، اس کو وہاں ہانکتا ہے۔ کہا: یہ آواز کیا ہے جو سنی جاتی ہے؟ فرمایا: رعد کی آواز ہے۔ [2] (أخرجه الترمذي وغيره)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: رعد ایک فرشتہ ہے، وہ بادل کو آواز دیتا ہے، جس طرح کہ چرواہا گوسفند (بکری) کو آواز دیتا ہے۔ [3] یہ روایت کئی طریق سے مروی ہے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رعد فرشتے کی آواز ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رعد ایک فرشتہ ہے، اس کا نام رعد ہے اور یہ آواز اس کی تسبیح ہے، جب وہ زور سے زجر کرتا ہے تو آسمان پھٹ جاتا ہے اور اس کے خوف سے بھڑک اُٹھتا ہے، اس سے بجلی نکلتی ہے۔ [4] امام ابوعمران جونی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عرش کے نیچے آگ کے دریا ہیں۔ وہیں سے بجلیاں چمکتی ہیں۔

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صواعق آگ ہیں۔ [5] فرشتے اللہ کی ہیبت اور جلال سے تسبیح کرتے ہیں اور کسی نے کہا کہ رعد کے خوف سے۔ مفسرین کی ایک جماعت نے ذکر کیا ہے کہ یہ فرشتے رعد کے مددگار ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو رعد کی مدد کرنے کے لیے مقرر کیا ہے۔ صواعق جمع ہے صاعقہ کی۔ صاعقہ وہ عذاب ہے جو بجلی سے اترتا ہے۔ یا وہ سخت آواز ہے جو فضا سے نازل ہوتی ہے اور اس میں آگ یا موت ہوتی ہے اور یہ اپنی ذات میں ایک ہی شے ہے، یہ اشیاء اُس سے پیدا ہوتی ہیں۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا: صاعقہ کا عجیب حال ہے، یہ ایک آگ ہے جو کہ بادل میں پیدا ہوتی ہے اور جب بادل کے نیچے آتی ہے تو کبھی دریا میں گھس جاتی ہے اور مچھلیوں کو جلا دیتی ہے۔ امام محمد بن

---

[1] الدر المنثور (٤/ ٦٢٠)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١١٧) سنن النسائي الكبرىٰ (٥/ ٣٣٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٨٧٢)

[3] تفسير الطبري (١/ ٣٤١) [4] الدر المنثور (٤/ ٦٢٢) [5] الدر المنثور (٤/ ٦٢٦)

علی باقر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بجلی مسلمان اور غیر مسلمان پر گرتی ہے، لیکن اللہ کے ذکر کرنے والے کو نہیں پہنچتی۔ [1]

یہ کافر لوگ اللہ کی شان میں جھگڑتے ہیں، کبھی بعث کا انکار کرتے ہیں اور کبھی عذاب آنے کی جلدی کرتے ہیں۔ کبھی رسولوں کی تکذیب کرتے ہیں اور کبھی اللہ کی معصیت میں گرفتار۔ محال مشتق ہے مماحلہ سے بہ معنی مکایدہ باعداء (دشمنوں کے ساتھ مکر وفریب کرنا)۔ امام ابن الاعرابی رحمہ اللہ نے کہا: محال بہ معنی مکر ہے۔ اللہ کا مکر یہ ہے کہ سچی تدبیر کرتا ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا کہ مکر کے مستحق کی طرف اس طرح مکر کرتا ہے کہ وہ جان نہیں سکتا۔ امام ازہری رحمہ اللہ نے کہا کہ محال محل سے مشتق ہے، بہ معنے قوت وشدت اور میم اصلی ہے۔ ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا: محال بہ معنی سزا اور مکروہ ہے۔ [2] بالجملہ اس لفظ کے آٹھ معانی ہیں: عداوت وطاقت واخذ وحقد (کینہ وبغض) وقوت وغضب و ہلاک وحیلہ۔ [3]

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ۭ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَاۗءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ۭ وَمَا دُعَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿14﴾

اسی کو پکارنا برحق ہے، اور جو لوگ اس کے سوا دوسروں کو پکارتے ہیں، وہ انھیں کسی بات کا جواب نہیں دیتے، مگر جیسے کوئی شخص اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلائے، تاکہ پانی اس کے منہ میں آ پہنچے، جبکہ وہ اس (کے منہ) تک پہنچنے والا نہیں۔ اور کافروں کی پکار سراسر گمراہی میں ہے ⑭

معبودانِ باطلہ کی بے بسی:

کافر جن کو پکارتے ہیں بعضے صرف خیال ہیں، بعضے جن ہیں اور بعض چیزیں کہ ان میں کچھ خاصیتیں ہیں، لیکن اپنے خواص کے مالک نہیں۔ پھر ان کو پکارنے کا کیا فائدہ، جیسے: آگ یا پانی اور شاید ستارے بھی اسی قسم میں ہوں۔ یہ اس کی مثال فرمائی۔ سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ دعوۃ الحق توحید ہے۔ (رواہ ابن جریر) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام قتادہ اور محمد بن المنکدر رحمہ اللہ نے کہا کہ دعوۃ الحق "لا إله إلا الله" ہے۔ [4] اور اُن لوگوں کی مثال جو اللہ کے سوا اوروں کی پرستش کرتے ہیں، ایسی ہے جیسے کوئی شخص پانی کی طرف اپنا ہاتھ بڑھائے کہ پانی منہ میں آجائے، حالاں کہ ہاتھ تو کنوئیں کے اندر جا ہی نہیں سکتا، پھر پانی کس طرح منہ میں آجائے گا۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جیسا کہ کوئی زبان سے پانی کو پکارے اور ہاتھ سے اشارہ کرے کہ آجا، وہ ہرگز

① تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦١٨) ② فتح القدير (٣/ ١٠٠)
③ فتح البيان (٧/ ٢٩۔ ٣٣) ④ تفسير الطبري (١٦/ ٣٩٨) تفسير ابن كثير (٢/ ٦٥٩)

نہیں آسکتا۔① کسی نے کہا ہے کہ جیسے کوئی شخص پانی کو مٹھی میں لے کہ وہ ہرگز اس پر قادر نہیں ہوسکتا۔ جس طرح فارسی کی مثل ہے: ''باد بمشت پیمودن و آہن سرد کوفتن'' ''مٹھی سے ہوا کی پیمائش کرنا اور سرد لوہے کو کوٹنا۔'' آیت کے معنی یہ ٹھہرے کہ یہ شخص جو پانی لینے کے لیے ہاتھ بڑھاتا ہے یا مٹھی میں لینا چاہتا ہے یا دور سے متناول (لینے والا) ہے، سو جس طرح اس کو اس پانی سے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا، جو کہ اس کے منہ تک، جو پینے کی جگہ ہے، نہیں پہنچتا۔ اسی طرح یہ مشرکین جو اللہ کے ساتھ غیر کو پوجتے ہیں، ان معبودات سے دنیا اور آخرت میں کچھ فائدہ نہیں لے سکتے۔ اس لیے فرمایا کہ ان کفار کا پکارنا ضائع اور برباد ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ دعوة الحق سے مراد وہ دعوت ہے، جو حق کی دعوت ہے، باطل کا اس میں کچھ دخل نہیں کسی طرح پر بھی۔ یا معنی یہ ہیں: ''دعوة المدعو الحق'' یا اس سے مراد کلمۂ توحید ہے، یا اللہ کو خوف کے وقت پکارنا ہے، یا اس وقت اس کے سوا کسی دوسرے کو پکارا نہیں جاتا، یا دعوت بمعنی عبادت ہے، یعنی اللہ کی سچی عبادت ہے پس بس۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بت پرستوں کی مثال بیان کی۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا کہ پانی سے اس جگہ مراد کنوئیں کا پانی ہے، کیوں کہ کنواں پانی کا ذخیرہ ہوتا ہے۔②

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۩ ﴿۱۵﴾

اور اللہ ہی کو سجدہ کرتا ہے جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے، خوشی سے اور ناخوشی سے، اور ان کے سائے بھی صبح اور شام (سجدہ کرتے ہیں) (15)

آسمان وزمین کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہوتی ہے:

جو اللہ پر ایمان لایا وہ اس کے حکم پر خوشی سے سر رکھتا ہے اور جو ایمان نہ لایا آخر اس پر بھی اسی کا حکم جاری ہے اور ان کے سائے صبح وشام زمین پر لیٹ جاتے ہیں، یہی ان کا سجدہ ہے۔ اللہ بادشاہ نے اپنی عظمت اور سلطنت کی خبر دی ہے کہ وہ ہر شے پر قادر ہے اور ہر شے اس کی حکم بردار ہے۔ لہٰذا ہر چیز اس کو سجدہ کرتی ہے، مومنین خوشی سے اور کافرین ناخوشی سے۔ غدو سے مراد صبح ہے اور اصیل سے مراد دن کا اخیر، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ ﴾ [النحل: ٤٨]

① تفسير الطبري (١٦/ ٤٠٠) ② فتح القدير (٣/ ١٠١) فتح البيان (٧/ ٣٤ـ ٣٥)

"کیا یہ لوگ اللہ کی پیدا کی ہوئی ان چیزوں کو نہیں دیکھتے کہ ان کے سائے دائیں اور بائیں جانب سے ڈھلتے ہیں، اللہ کو سجدہ کرتے ہوئے، اور (اس کے سامنے) وہ سب عاجز ہیں۔"

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ سجود سے حقیقی معنی مراد ہیں کہ ماتھا زمین پر رکھے، عاجزی اور ذلت کے ساتھ تعظیم کرتے ہوئے تو یہ معنی مومنین اور فرشتوں اور جن مسلمانوں میں ظاہر ہیں۔ رہے کفار تو ان میں سجود کی تاویل نہیں بنتی، اس لیے ضروری ہے کہ مذکورہ سجدے کو اس معنی پر محمول کریں کہ: "حق للہ السجود و وجب" تاکہ وہ سجود بالفعل وغیرہ کو شامل ہو۔ یا سجود کی تفسیر اطاعت کے ساتھ کریں، اس لیے کہ کفار اگرچہ اللہ کو سجدہ نہیں کرتے، لیکن صحت و بیماری، زندگی اور موت فقیری اور غنا میں اللہ کے حکم کے منقاد (فرماں بردار) ہیں۔

اس معنے پر لفظ ﴿ طَوۡعًا وَّكَرۡهًا ﴾ بھی دلیل ہے، کیوں کہ جس طرح مومنین ﴿ طَوۡعًا ﴾ فرمانبردار ہیں، اسی طرح کفار ﴿ كَرۡهًا ﴾ فرماں بردار ہیں۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا کہ آیت مومنین کے ساتھ خاص ہے، اس لیے کہ وہ "طوعاً" ساجد ہیں اور بعض "کرھاً"، تلوار کے خوف سے سجدہ کرتے ہیں، اسی طرح منافقین۔ پس آیت ان پر محمول ہے۔[1] بعض نے کہا کہ یہ آیت مومنین کے حق میں آئی ہے، ان میں کوئی "طوعاً" سجدہ کرتا ہے، اس پر سجدہ کرنا گراں نہیں ہے اور کسی پر گراں ہے، کیوں کہ التزامِ تکلیف میں مشقت ہوتی ہے، لیکن وہ اس مشقت کا تحمل کرتے ہیں، اس لیے کہ اللہ پر ایمان لائے ہیں اور اخلاص رکھتے ہیں۔

یا سجود سے مراد آسمان و زمین میں اللہ کی عظمت اور اس کی عبودیت کا اعتراف ہے۔ جس قدر فرشتے اور جن اور انسان ہیں وہ سب عبودیت کے اقراری ہیں اور اللہ کی تعظیم کرتے ہیں۔ آیت: ﴿ وَلَئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ لَيَقُوۡلُنَّ اللّٰهُ ﴾ [لقمان: ٢٥] "اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو وہ ضرور کہیں گے: اللہ نے۔" اسی پر دلالت کرتی ہے، لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔

"ظلال" جمع ہے "ظل" کی، مراد وہ شخص ہے جو سایہ رکھتا ہے، مثلاً: انسان نہ کہ جن اور فرشتہ، کیوں کہ ان کا سایہ نہیں ہوتا۔ ظل کا سجدہ کرنا سائے والے کی طبیعت کے ساتھ ہوا کرتا ہے، کیوں کہ سایہ لازمی ہے جو جدا نہیں ہو سکتا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ کافر غیر اللہ کو سجدہ کیا کرتا ہے اور اس کا سایہ اللہ کو سجدہ کرتا ہے۔[2]

امام ابن الانباری رحمہ اللہ نے کہا: کچھ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ سایوں کے لیے عقل اور فہم پیدا کر دے، جس سے وہ اللہ تعالیٰ کو سجدہ کریں، جس طرح کہ پہاڑوں کو اللہ تعالیٰ نے فہم دیا ہے اور وہ تسبیح میں مشغول ہیں۔ سو مومن کا سایہ اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتا ہے خوشی کے ساتھ اور کافر کا سایہ کراہت کے ساتھ سجدہ کرتا ہے۔[3]

---

[1] فتح القدیر (٣/ ١٠١) [2] معاني القرآن (٣/ ١٤٤) [3] فتح القدیر (٣/ ١٠١)

بعض نے کہا: سجود سے مراد سایوں کا ایک طرف سے دوسری طرف کو جانا ہے اور کبھی سایہ طویل ہوتا ہے اور کبھی چھوٹا ہوتا ہے، سورج کے بلند ہونے اور نزول کے سبب سے، لیکن پہلی بات زیادہ مناسب ہے۔ صبح وشام کا خاص کر اس لیے ذکر کیا کہ ان اوقات میں سایہ بڑھتا ہے اور یہ اوقات سجدہ کرنے کے اوقات ہیں اور اسی وقت ان کے سائے بھی سجدہ کرتے ہیں یا اس لیے کہ یہ دن کی دو طرفیں ہیں، ان میں وسط بھی آ گیا۔ غدو (پیش کے ساتھ) طلوعِ فجر سے طلوعِ آفتاب تک ہوتا ہے، یا نصف النہار تک اور اصیل عصر سے لے کر غروبِ آفتاب تک۔ اسی آیت کے معنی میں یہ آیت بھی ہے: ﴿ اَوَ لَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ ﴾ [النحل: ٤٨] ''کیا یہ لوگ اللہ کی پیدا کی ہوئی ان چیزوں کو نہیں دیکھتے کہ ان کے سائے دائیں اور بائیں جانب سے ڈھلتے ہیں، اللہ کو سجدہ کرتے ہوئے، اور (اس کے سامنے) وہ سب عاجز ہیں۔'' کہتے ہیں کہ یہ سجدہ ضروری سجدۂ تلاوت ہے، تلاوت کرنے والے اور سننے والے کو سن کر سجدہ کرنا چاہیے، جب کہ اس آیتِ سجدہ کو پڑھے۔[1]

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قُلِ اللّٰهُ ۭ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ۭ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ڏ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ ڬ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَاۗءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ۭ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝۱۶

(اے نبی!) کہہ دیجیے: آسمانوں اور زمین کا رب کون ہے؟ کہہ دیجیے: اللہ! (اور) کہیے: پھر کیا تم نے اللہ کے سوا (ایسے) حمایتی بنا رکھے ہیں جو خود اپنے نفع نقصان کے بھی مالک نہیں۔ کہہ دیجیے: کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر ہو سکتے ہیں؟ یا کیا اندھیرے اور روشنی برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا انھوں نے اللہ کے لیے (ایسے) شریک ٹھہرا رکھے ہیں (کہ) انھوں نے اللہ کی مخلوق جیسی کوئی مخلوق بنائی ہے، پھر وہ مخلوق ان پر مشتبہ ہو گئی ہے؟ کہہ دیجیے: اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے اور وہ یکتا ہے، نہایت غالب ⑯

باری تعالیٰ کی توحید کے اثبات پر دلائل:

اللہ تعالیٰ نے یہ تقریر فرمائی کہ سوائے اللہ کے کوئی معبود نہیں ہے۔ یہ مشرک بھی اس بات کا اقرار کرتے ہیں

[1] فتح البیان (۷/ ۳۵۔ ۳۷)

کہ اللہ تعالیٰ ہی آسمانوں اور زمین کا خالق، رب اور تدبیر کرنے والا ہے۔ باوجود اس اعتراف کے اللہ تعالیٰ کے سوا اور معبود ٹھہرائے ہیں جن کی عبادت کرتے ہیں، حالاں کہ وہ معبود نہ اپنی جان کے مالک ہیں نہ ان پجاریوں کی جان کے مالک ہیں کہ کسی طرح کا بھلا برا کرسکیں۔ ان سے نہ کوئی فائدہ حاصل ہو اور نہ کوئی تکلیف دور ہو۔ سو کیا وہ شخص جو ان معبودانِ باطلہ کا عابد ہے اور وہ شخص جو صرف اللہ وحدہ لاشریک لہ کا عابد ہے اور اپنے رب کی طرف سے ایک نور ہے برابر ہوسکتا ہے؟ اس لیے فرمایا کہ کیا اندھا اور بینا برابر ہو سکتے ہیں؟ یا اندھیرا اور اُجالا برابر ہے؟ کیا ان مشرکوں نے اللہ کے ساتھ اور الٰہ ٹھہرا لیے ہیں، جو اللہ تعالیٰ سے مخلوق کی پیدایش میں مناظرہ اور برابری کرتے ہیں؟ یعنی یہ بات نہیں ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے مشابہ اور ملتی جلتی کوئی شے نہیں ہے۔ اس کا نہ کوئی ہمسر ہے۔ نہ برابر ہے، نہ کوئی وزیر ہے اور نہ اولاد اور نہ بیوی ہے۔ تعالیٰ عن ذلك علوا كبيرا.

یہ مشرک جن کو اللہ کے ہمراہ پوجتے ہیں یہ خوب پہچانتے ہیں کہ ہمارے معبودات بھی اللہ کی مخلوق اور غلام ہیں جس طرح کہ تلبیہ میں کہا کرتے تھے: "لَبَّيكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ إِلَّا شَرِيْكًا هُوَ لَكَ تَمْلِكُهُ وَمَا مَلَكَ" "حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں، مگر ایک شریک کہ تو اس کا مالک ہے اور وہ مالک نہیں۔" اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ﴾ [الزمر: ۳] "(وہ کہتے ہیں:) ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کے زیادہ قریب کر دیں۔"

اللہ نے مشرکین کے اس اعتقاد کا انکار کیا، کیوں کہ اللہ کے پاس کوئی سفارش نہ کرے گا، لیکن اس کے اذن سے، اور جس کے لیے اجازت ملے گی اسی کو اس شفاعت کا فائدہ پہنچے گا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى ﴾ [النجم: ۲۶] "اور آسمانوں میں کتنے ہی فرشتے ہیں جن کی سفارش کچھ بھی فائدہ نہیں دے گی، مگر بعد ازاں کہ اللہ اجازت دے، جس کے لیے چاہے اور پسند کرے۔" نیز فرمایا: ﴿ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّاۤ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ۝ لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ۝ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴾ [مریم: ۹۳۔ ۹۵] "آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہیں، وہ سب رحمان کے پاس غلام بن کر آئیں گے۔ بلاشبہ یقیناً اس (رحمان) نے ان کا شمار کر رکھا ہے اور انھیں خوب گن رکھا ہے۔ اور وہ سب یومِ قیامت اللہ کے پاس تنہا تنہا آئیں گے۔"

سو جب ساری مخلوق اللہ کی غلام ٹھہری تو پھر بعض کا بعض کو پوجنا چہ معنی دارد؟ حالاں کہ بعض کی اس عبادت پر نہ کوئی دلیل ہے نہ برہان، بلکہ یہ پرستش صرف کسی کی ذاتی رائے ہیں اور اختراع اور ابتداع (بدعت) ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام رسول اول سے آخر تک اسی لیے بھیجے ہیں کہ وہ لوگوں کو اللہ کے سوا عبادت سے ڈرائیں اور منع کریں،

لیکن یاروں نے ان رسولوں کی تکذیب اور مخالفت اختیار کی، اس لیے عذاب کا کلمہ ان پر لازمی طور پر ثابت ہوگیا۔ ﴿ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴾ [الكهف: ٤٩] ''اور آپ کا رب کسی پر بھی ظلم نہیں کرے گا۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ رب سے مراد خالق اور آسمانوں اور زمین کے امور کا متولی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو حکم دیا کہ کفار سے اقرار کرانے کے لیے سوال کریں، کیوں کہ وہ اس بات کے قائل تھے کہ آسمانوں اور زمین کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے اور بس۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ﴾ [الزخرف: ٩] ''اور اگر آپ ان سے سوال کریں: کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا؟ تو یقیناً وہ یہی کہیں گے کہ انھیں نہایت غالب، خوب جاننے والے نے پیدا کیا۔''

نیز فرمایا: ﴿ وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ﴾ [الزخرف: ٨٧] ''اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ انھیں کس نے پیدا کیا؟ تو وہ ضرور کہیں گے: اللہ نے۔'' سو جب اللہ خالقِ کل ٹھہرا تو کفار کے مقابلے میں استفہام انکاری کے طور سے یہ فرمایا کہ اے پیغمبر! تم ان ناکاروں سے کہو کہ کیا تم نے اللہ کے سوا اور اولیا ٹھہرائے ہیں جو اپنی جان کی بھلائی برائی نہیں کر سکتے تو دوسروں کو کیا فائدہ پہنچا سکیں گے۔ پس کیا اندھا اور بینا برابر ہیں، یا اندھیرے اور نور برابر ہیں؟ اندھے سے مراد کافر ہے اور بینا سے موحد، کیوں کہ پہلا اس چیز سے جاہل ہے جو اس پر واجب ہے اور دوسرا اس چیز کا عالم ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ مراد مومن اور کافر ہے۔[1] اندھیروں سے مراد کفر اور نور سے مراد ایمان ہے، یعنی یہ دونوں برابر نہیں ہوسکتے، ان کے درمیان وہی فرق ہے جو اندھے اور بینے کے درمیان اور اندھیروں اور نور کے درمیان ہے۔ نور کو صیغۂ واحد میں اور ظلمات (اندھیروں) کو صیغۂ جمع میں بیان کیا، اس لیے کہ حق کا راستہ ایک ہے اس میں اختلاف نہیں ہوتا اور باطل کے راستے بہت ہیں ان کا انحصار نہیں ہوسکتا۔ کیا ان لوگوں نے اللہ کے شریک ٹھہرائے ہیں تو انھوں نے اللہ کی مخلوق کی طرح کوئی مخلوق پیدا کی ہے، جیسے: آسمان، زمین، سورج، چاند، پہاڑ، دریا، جن اور انسان کہ ان کی مخلوق اللہ کی مخلوق کے ساتھ مل گئی ہو۔ یعنی یہ بات اس طرح پر نہیں کہ معاملہ مشتبہ ہو جائے، بلکہ جب اپنے عقول سے فکر کریں گے تو صرف اللہ اکیلے ہی کو خالق ہونے کے لائق پائیں گے اور باقی تمام شرکا کسی چیز کے خالق نہ ٹھہریں گے۔

مطلب یہ ہوا کہ انھوں نے اپنے شرکا کو اس وصفِ تخلیق کے ساتھ متصف نہیں کیا ہے کہ وہ بھی اللہ کی طرح

[1] الدر المنثور (٤/ ٦٣١)

کی پیدائش کرتے ہیں اور اس تخلیق کی وجہ سے دھوکا لگا ہو، یہاں تک کہ ان کو پوجنے لگے، بلکہ انھوں نے بتوں اور آستانوں کو جو شریک ٹھہرایا ہے تو یہ محض ان کی بیوقوفی اور حماقت ہے اور بے عقلی اور جہالت ہے اور وہ معبودانِ باطل یعنی طواغیت اس استحقاق سے برکراں ہیں، کیوں کہ ان سے نہ کوئی کام ہوا ہے اور نہ کوئی چیز پیدا ہوئی ہے اور نہ ہی کوئی اثر ان کا ہے۔ البتہ پھر یہ فرمایا کہ اے پیغمبر! تم ان سے کہہ دو کہ ہر شے کا خالق وہی ہے ایک اللہ، جو زبردست ہے اور جس کے سامنے کسی کی کچھ نہیں چلتی، سب اُس کے محتاج، مربوب، مغلوب اور محکوم ہیں۔[1] اللہ تعالیٰ نے ایک دوسری مثال اہلِ حق اور اہلِ باطل کی بیان فرمائی:

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ۭ وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاۗءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ۭ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ڛ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاۗءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ۭ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ۝۱۷

اس (اللہ) نے آسمان سے پانی نازل کیا، تو ندی نالے اپنی اپنی گنجایش کے مطابق بہہ نکلے، پھر سیلاب ابھرا ہوا جھاگ اوپر لے آیا۔ اور ان (دھاتوں) میں سے بھی جنھیں زیور یا سامان بنانے کے لیے آگ میں تپاتے ہیں، اسی طرح کا جھاگ (اُٹھتا) ہے۔ اللہ اسی طرح حق اور باطل (کی مثال) بیان کرتا ہے۔ چناں چہ جو جھاگ ہے وہ تو سوکھ کر زائل ہو جاتا ہے، اور جو چیز انسانوں کو فائدہ دیتی ہے، سو وہ زمین میں باقی رہتی ہے۔ اللہ اسی طرح مثالیں بیان کرتا ہے ⑰

حق باقی رہنے والا اور باطل بے ثبات ہے:

یعنی آسمان سے دینِ حق اترتا ہے تو ہر ایک اپنی استعداد کے مطابق فیض لیتا ہے، پھر حق و باطل ٹھہرتا ہے تو میل اُبھرتا ہے، جیسے بارش کا پانی زمین میں مل کر یا روپے تانبے کو ڈُہکا کر میل اُبھرتا ہے۔ آخر جھاگ کو بنیاد نہیں اور کام کی چیز کو بنیاد ہے۔ یہ حق و باطل ٹھہرنا دنیا کی لڑائی مراد ہے۔ آخر حق غالب ہے۔ یا ہر ایک کے دل میں حق اور باطل ٹھہرتا ہے، آخر حق اس باطل کو مٹا دیتا ہے اور پھر صاف حق رہ جاتا ہے۔ یہ آیتِ شریفہ دو مثالوں پر مشتمل ہے جو حق کے ثابت اور باقی رہنے اور باطل کے نیست و نابود اور فنا ہونے کے لیے بیان کی گئی ہیں۔ ایک پانی کا آسمان سے اتر[illegible] سے ہر وادی اپنی حیثیت کے مطابق پانی لیتی ہے۔ کوئی بڑا نالا ہے اس میں زیادہ پانی آتا ہے اور کوئی

[1] فتح البیان (۷/ ۳۷۔ ۳۹)

چھوٹی ندی ہے اس میں تھوڑا پانی بھرتا ہے۔

یہ دلوں کے فرق کی طرف اشارہ ہے کہ کسی دل میں علم کثیر کی گنجایش ہوتی ہے اور کسی دل میں کثیرِ علم کی وسعت نہیں ہوتی، بلکہ وہ ان سے تنگ ہوتا ہے۔ اس سے کہ نالہ جھاگ اُٹھاتا ہے مراد یہ ہے کہ جو پانی ان وادیوں کے ندی نالوں میں بہتا ہے اس میں جھاگ آجاتا ہے۔ یہ ایک مثل ہے اور زیور کو ڈھالنے کے لیے آگ جلانا دوسری مثل ہے۔ کبھی آگ میں سونا چاندی گلاتے ہیں اور کبھی تانبا اور لوہا، اس سے اسباب تیار کرتے ہیں، اس پر بھی جھاگ آجاتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ حق و باطل کو بیان کرتا ہے کہ جب یہ دونوں جمع ہوتے ہیں تو باطل کو ثبات اور دوام نہیں ہوتا جس طرح کہ جھاگ پانی اور زر اور زیور اور اس جیسی چیزوں کے ساتھ نہیں ٹھہرتا، بلکہ نیست و نابود ہوجاتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ اس لیے فرمایا ہے کہ جھاگ سوکھ کر دور ہو جاتا ہے، اس سے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوتا، بلکہ متفرق ہوکر اور بکھر کر کسی طرف وادی میں چلا جاتا ہے اور درختوں میں اُلجھ رہتا ہے اور ہواؤں میں اڑ جاتا ہے۔ اسی طرح حال سونے، چاندی اور تانبے کا ہے کہ ان کا میل کچیل نکل جاتا ہے اور اس میں سے کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔ یہی پانی اور اصل سیم و زر باقی رہ جاتا ہے اس سے لوگ مُنتفع ہوتے ہیں۔ لہٰذا فرمایا ہے کہ جس چیز سے لوگوں کو نفع حاصل ہوتا ہے وہ زمین میں باقی رہ جاتی ہے۔ یہ ارشاد کہ اللہ تعالیٰ اسی طرح کہاوتیں بیان فرماتا ہے، اس آیت کی طرح ہے: ﴿ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ﴾ [العنکبوت: ۴۳] ''اور یہ مثالیں ہم لوگوں (کو سمجھانے) کے لیے بیان کرتے ہیں اور انھیں بس علم والے ہی سمجھتے ہیں۔''

حکایت:

بعض سلف نے کہا کہ میں جب کوئی مثل قرآن مجید میں پڑھتا اور اس کو نہ سمجھتا تو اپنی جان پر روتا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ نہیں بوجھتے اس کو مگر عالم۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے آیتِ باب کے بارے میں کہا ہے کہ یہ ایک مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے بیان کی۔ دلوں نے اس کو بہ قدر یقین اور شک کے اُٹھایا۔ شک کے ساتھ کوئی عمل فائدہ نہیں دیتا۔ رہا یقین تو اللہ تعالیٰ یقین والوں کو اس سے فائدہ دیتا ہے اور یہ اُس کا فرمان ہے: ﴿ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى الْاَرْضِ ﴾. (آیتِ باب) یہ یقین ہے اور جس طرح زیور کو آگ میں تپاتے ہیں، پھر خالص کو لیتے ہیں اور خبث کو آگ میں چھوڑ دیتے ہیں، اسی طرح اللہ یقین کو قبول کرتا ہے اور شک کو چھوڑ دیتا ہے۔

ان کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ لکڑی اور اسی جیسی اور چیزیں جو وادی میں ہوتی ہیں، سیلاب اُس کو بہالے جاتا ہے، اسی طرح آگ میں سونے، چاندی، تانبے اور لوہے کا میل کچیل صاف ہو جاتا ہے۔ تانبے اور لوہے میں

میل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس ''خبث''، یعنی میل کو پانی کی جھاگ کے مثل ٹھہرایا ہے۔ زمین اس ندی نالے کا جتنا پانی پی لیتی ہے، اسی قدر اُگاتی ہے۔ یہ مثال ہے عملِ صالح کی کہ وہ عمل کرنے والے کے لیے باقی رہ جاتا ہے اور بُرے عمل کی مثال ہے کہ وہ نیست و نابود ہو جاتا ہے، جس طرح کہ یہ جھاگ اور میل کچیل دور ہو جاتا ہے۔ یہی حال ہدایت اور حق کا ہے جو اللہ کی طرف سے آیا ہے، جس نے حق پر عمل کیا وہ اس کے لیے باقی رہا، جس طرح کہ نفع کی چیز زمین میں باقی رہ جاتی ہے۔ اسی طرح لوہے سے چھری تلوار وغیرہ نہیں بنا سکتے، جب تک کہ اُس کو آگ میں نہ تپائیں اور وہ اس کا میل کچیل کھا نہ جائے اور جو خالص ہے وہ باقی رہ جائے۔ یہی حال باطل کا ہے کہ وہ مضمحل (نیست و نابود) ہو جاتا ہے۔ جب قیامت کا دن ہوگا اور لوگ کھڑے کیے جائیں گے اور اعمال پیش ہوں گے تب باطل اُٹھ جائے گا اور اہلِ حق، حق سے فائدہ حاصل کریں گے۔

اس آیت کی تفسیر میں امام مجاہد، حسن بصری، عطا، قتادہ رحمہم اللہ اور بہت سے سلف اور خلف سے اسی طرح مروی ہے۔[1] اللہ تعالیٰ نے سورت بقرہ کے شروع میں منافقین کے لیے دو کہاوتیں بیان کی ہیں: ایک ناری اور ایک آبی اور وہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہیں: ﴿ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ﴾ [البقرة: ١٧] ''ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی، پھر جب اس (آگ) نے اس کے اردگرد کو روشن کر دیا تو اللہ ان کی روشنی لے گیا اور انھیں اندھیروں میں چھوڑ دیا، پس وہ دیکھ نہیں پاتے۔''

پھر فرمایا: ﴿ اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ﴾ [البقرة: ١٩] ''یا (ان کی مثال) زور دار بارش کی سی ہے جو آسمان سے (آتی) ہے، اس میں اندھیرے، گرج اور بجلی ہوتی ہے۔'' اسی طرح سورت نور میں کافروں کے لیے دو مثالیں بیان کیں: ایک یہ ہے: ﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ ﴾ [النور: ٣٩] ''اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال چٹیل میدان میں ریت کی طرح ہیں۔'' یہ سراب گرمی کی شدت میں ہوتا ہے۔ لہٰذا صحیحین میں مروی ہے کہ قیامت کے دن یہود سے کہا جائے گا کہ تم کیا چاہتے ہو؟ وہ کہیں گے: اے رب! ہم پیاسے ہیں، ہم کو پانی پلا۔ کہیں گے: تم نہیں آتے، وہ آگ پر آئیں گے سراب کی طرح پُر ہوگی، بعض اس کا بعض کو توڑتا ہوگا۔[2] پھر دوسری مثال میں فرمایا: ﴿ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ ﴾ [النور: ٤٠] ''یا (کافروں کے اعمال) گہرے سمندر میں اندھیروں کی طرح ہیں۔''

صحیحین میں سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ اس ہدایت اور علم کی مثال جس کے ساتھ اللہ

[1] تفسير الطبري (١٦/ ٤١٠ ـ ٤١٤) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٠٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٣)

تعالیٰ نے مجھ کو مبعوث کیا ہے، مثال بارش کی ہے کہ وہ ایک زمین پر برسی زمین کے ایک حصے نے اس کو قبول کیا اور گھاس اور سبزہ اُگایا اور بعض زمین ناپیداوار تھی، اس نے پانی کو روک رکھا، اللہ تعالیٰ نے اس پانی سے لوگوں کو نفع بخشا، انھوں نے وہ پانی پیا اور جانور چرائے اور پلایا اور کھیتی کی۔ پھر وہ بارش ایک ایسے قطعۂ زمین کو پہنچی، جو چٹیل میدان تھا، نہ پانی کو روکے اور نہ سبزہ اُگائے۔ چنانچہ یہ مثال ہے اس شخص کی جو اللہ کے دین میں فقیہ ہوا ہے اور اللہ نے اُس کو اس چیز سے نفع دیا جو مجھ کو دے کر بھیجا، اس نے اس چیز سے نفع لیا اور وہ علم سیکھا سکھایا اور اس شخص کی مثال جس نے اس کی طرف سر نہ اُٹھایا اور اللہ کی ہدایت کو، جس کو میں لے کر آیا ہوں، قبول نہ کیا، سو یہ صاف پتھر کی طرح ہے۔[1]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ میری مثل اور تمھاری مثل اس شخص کی ہے، جس نے آگ جلائی، جب اس کا اردگرد روشن ہوا، تب کیڑے مکوڑے اور پتنگے اس آگ میں گرنے لگے اور وہ شخص ان کو روکنے لگا اور وہ زبردستی اس میں گھسنے لگے۔ سو یہی میری اور تمھاری کہاوت ہے کہ میں تو تمھاری کمر پکڑ کر آگ سے بچاتا ہوں اور کہتا ہوں کہ تم آگ سے ادھر آجاؤ، مگر تم مجھ پر غالب ہو کر اُس میں گھسے پڑتے ہو۔[2] (أخرجه أحمد، و أخرجاه أيضا في الصحيحين) سو یہ ایک آگ کی مثل ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حق و باطل اور اہلِ حق و اہلِ باطل کی ایک اور کہاوت بیان فرمائی ہے اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی اُتارا، اس سے ندی نالے بہہ نکلے۔ وادی کہتے ہیں اس کشادہ جگہ کو جو دو پہاڑوں کے درمیان ہوتی ہے۔ وادی کا یہ سیلاب اس کی وسعت کے مطابق ہوتا ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا کہ قدر کہتے ہیں کسی شے کی حد کو۔ چھوٹے ندی نالے میں تھوڑا پانی بہتا ہے اور بڑے ندی نالے میں بہت سا پانی بہتا ہے۔[3]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ وادیِ صغیر اپنی مقدار پر اور وادیِ کبیر اپنی مقدار پر۔[4] کشاف میں کہا ہے: یعنی اُس قدر جس کا فائدہ آب رسیدہ کے لیے اللہ کو معلوم ہے۔[5] ابن الانباری رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے نزولِ قرآن کی تشبیہ، جو جامع ہدایت اور بیان ہے، بارش کے نازل ہونے کے ساتھ دی ہے، اس لیے نزولِ قرآن کا نفع بارش کے اُترنے کی طرح عام ہے اور وادیوں کی تشبیہ دلوں سے دی، اس لیے وادی میں پانی تھمتا ہے جس طرح کہ قرآن اور ایمان مومنوں کے دل میں ساکن ہوتا ہے۔[6] جب نالہ بہتا ہے تو وہ جھاگ کو اُٹھا لیتا ہے۔ زبد کو "غثاء ورغوہ" بھی بولتے ہیں۔ اسی طرح وہ جو دیگ پر جوش کے وقت اُبال آتا ہے، اس کو بھی زبد کہتے ہیں یا زیور اور متاع

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٨٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١١٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٨٤) مسند أحمد (٢/ ٢٤٤)

[3] فتح القدير (٣/ ١٠٣) [4] فتح القدير (٣/ ١٠٧) [5] الكشاف (٢/ ٤٩٣) [6] فتح القدير (٣/ ١٠٣)

بنانے کے لیے سونے، چاندی، پیتل، تانبے اور سیسے کو آگ میں تپاتے ہیں، اس پر بھی زبد آتا ہے، یعنی میل کچیل۔

سو یہی مثال حق و باطل کی اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے۔ حق تو صاف پانی اور جوہرِ درخشاں کی طرح ثابت رہتا ہے اور باطل زبد طافی (تیرنے والی جھاگ) کی طرح بے کار جاتا ہے۔ یہ دونوں کہاوتیں اللہ تعالیٰ نے حق و باطل کے لیے بیان فرمائی ہیں، یعنی اگرچہ بعض حالات میں باطل حق پر غالب ہو جاتا ہے، لیکن عن قریب اس کو اللہ تعالیٰ مٹا دیتا ہے اور اچھا انجام حق اور اہلِ حق کے لیے ہی ہوتا ہے، جیسے جھاگ کہ پانی اُس کو اٹھا کر پھینک دیتا ہے اور وہ نیست و نابود ہو کر رہ جاتا ہے۔ یا جیسے ان چیزوں کا میل کچیل کہ اگرچہ وہ ان کے اوپر اور بلندی پر ہوتا ہے، لیکن بھٹی اس کو نکال پھینکتی ہے۔ یہ مثال ہے باطل کی۔

وہ پانی جو لوگوں کو نفع دیتا ہے اور چراگاہ اُگاتا ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتا ہے، اسی طرح ان چیزوں میں سے صاف اور خالص حصہ وہ بغیر ملاوٹ کے رہ جاتا ہے، یہ مثال ہے حق کی۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ مومن کی اور اس کے اعتقاد اور ایمان کے نفع کی مثال ایسی ہے جیسے زمین کی روئیدگی میں فائدہ دینے والا پانی اور ہر شے کی زندگی کے لیے فائدہ دینے والا اور جیسے سونے چاندی اور دوسرے جواہر کا نفع کہ یہ سب باقی رہتے ہیں اور ان سے فائدہ حاصل کیا جاتا ہے اور کفر اور کافر کی مثال ایسی ہے جیسے جھاگ کہ سوکھ کر جاتا رہتا ہے اور جیسے لوہے کا میل جو آگ میں نکلتا ہے اور اس سے کوئی نفع حاصل نہیں ہوتا۔[1] جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر کمال درجے کی عنایت فرماتا ہے اور ان کو رشد و ہدایت عطا فرماتا ہے اور اسی طرح کی مثالیں ہر بات میں بیان فرماتا ہے، اس میں اس تمثیل کی شان کی بڑائی ہے۔[2]

لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى ۭ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ سُوْۗءُ الْحِسَابِ ڏ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝ۧ18

جنھوں نے اپنے رب کا حکم مانا، ان کے لیے بھلائی ہے۔ اور جنھوں نے اس کا حکم نہ مانا، بلاشبہہ اگر ان کے پاس وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے اور اسی کی مثل اس کے ساتھ (اور بھی) تو وہ ضرور اسے فدیے میں دے دیں۔ یہی لوگ ہیں کہ ان کے لیے بُرا حساب ہے اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے (18)

نیک بخت کی جزا اور بد بخت کی سزا:

اللہ تعالیٰ نے نیک بخت اور بد بخت لوگوں کے انجام کی خبر دی ہے کہ جو لوگ اللہ کے مطیع اور اس کے

---

[1] معاني القرآن (۳/ ۱۴۵۔ ۱۴۶) [2] فتح البیان (۳/ ۴۰۔ ۴۳)

احکامات کے تابع اور رسولوں کے متبع اور پہلی قوموں کی خبروں کی تصدیق کرنے والے اور آیندہ کی خبروں کے اقراری ہیں، ان کے لیے "حسنیٰ" یعنی اچھی جزا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کی زبان سے خبر دی تھی کہ ﴿ قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ۝ وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءً الْحُسْنٰى ۚ وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ﴾ [الكهف: ٨٧۔ ٨٨] "اس نے کہا: رہا وہ جس نے ظلم کیا، تو اسے ہم عن قریب سزا دیں گے، پھر وہ اپنے رب کی طرف لوٹایا جائے گا، چناں چہ وہ اسے سخت ترین عذاب دے گا۔ اور رہا وہ جو ایمان لایا اور نیک عمل کیے تو اس کے لیے (اللہ کے ہاں) بدلے میں خوب تر بھلائی ہے، اور ہم لازماً اپنے کام میں سے اس کے لیے نہایت آسانی کا حکم دیں گے۔"

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ﴾ [يونس: ٢٦] "جن لوگوں نے نیک کام کیے ان کے لیے بھلائی ہے اور مزید (دیدارِ الٰہی) ہے۔" اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کے مطیع نہیں ہیں، ان کے پاس اگر دنیا بھر کے کچھ ہو، بلکہ دنیا سے دوگنا تو وہ اللہ کے عذاب سے چھوٹنے کے لیے فدیہ دیں، لیکن اللہ تعالیٰ تو اُن سے قیامت کے دن نہ فرض قبول کرے گا نہ نفل، بلکہ ان کا ذرا ذرا حسابِ نقیر (ذرا سی اصل)، قطمیر (قلیل، کھجور کی گٹھلی کے اوپر چھلکا) وجلیل وحقیر پر ہوگا اور جس کسی سے حساب کے بارے میں مناقشہ (چھان بین) ہوا، وہ عذاب میں پڑا۔ اس لیے فرمایا ہے کہ ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بری جگہ ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جن لوگوں نے اللہ کی بات مانی، یعنی توحیدِ خالص پر رہے اور انبیا کی تصدیق کی، ان کے لیے ایسی عظیم منفعت ہے جس میں کمی ہونے کا شائبہ تک نہ ہوگا اور جو کبھی منقطع اور ختم نہ ہوگی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ حسنیٰ سے مراد جنت ہے۔[1] یہی قول زیادہ مناسب ہے اور جن کافروں نے اللہ کی بات نہ مانی اور اس کے کہنے پر نہ چلے، بلکہ کفر و شرک میں گرفتار رہے، ان کا حال یہ ہے کہ اگر وہ ساری دنیا کے برابر یا دنیا سے دوگنا مال و منال خرچ کریں تب بھی ان کو عذابِ کبیر، ہولِ عظیم اور عقابِ الیم سے ہرگز خلاصی نہ ہوگی، بلکہ ان کا حساب بری طرح سے لیا جائے گا۔ ﴿ سُوْٓءُ الْحِسَابِ ﴾ یہ ہے کہ آدمی کے ہر گناہ کا محاسبہ کریں اور کسی ایک گناہ کو نہ بخشیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ اس لیے کہ ان کے کفر نے ان کے سارے اعمال ضائع کر دیے۔[2] غرض یہ کہ جب حساب کے سمجھنے میں کسی طرح کا جھگڑا ہوگا تو عذاب نقد وقت ہے، ان کی بازگشت جہنم کی طرف ہوگی، یہ بری جگہ پائیں گے۔[3]

---

[1] الدر المنثور (٤/ ٣٥٨) [2] معاني القرآن (٣/ ١٤٦) [3] فتح البيان (٧/ ٤٤)

اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ۭ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿19﴾

کیا پھر وہ شخص جو جانتا ہے کہ یقیناً جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے، وہی حق ہے، وہ اس شخص کے مانند (ہوسکتا) ہے جو اندھا ہے؟ بس عقل والے ہی نصیحت پکڑتے ہیں ⑲

حق بین مومن اور حق سے اندھا کافر برابر نہیں ہیں:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس بات کا عالم کہ یہ قرآن بلاشبہہ اللہ کا اُتارا ہوا ہے، اس میں کچھ ملاوٹ اور اختلاف نہیں، بلکہ یہ سب حق ہے اور اس کا بعض حصہ بعض کی تصدیق کرتا ہے، کوئی شے ایک دوسرے سے متضاد نہیں ہے، بلکہ اس بلند درجے والی کتاب کی ساری باتیں خواہ وہ احکامات ہوں یا ممانعت کے متعلق ہوں سراسر عدل و داد و انصاف ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ﴾ [الأنعام: ١١٥] ''اور آپ کے رب کی بات صدق اور عدل میں مکمل ہے۔''

یعنی خبروں میں سچائی اور طلب میں عدل تو یہ شخص اور وہ شخص جو خیر کی طرف راہ یاب نہیں ہوتا ہے اور اگر سمجھتا بھی ہے تو تابعداری نہیں کرتا اور اس کا تصدیق کرنے والا اور اتباع کرنے والا نہیں ہے، برابر نہیں ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۭ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ﴾ [الحشر: ٢٠] ''آگ والے (دوزخی) اور باغ والے (جنتی) کبھی برابر نہیں ہو سکتے، جنتی ہی کامیاب ہیں۔'' اور اس جگہ فرمایا کہ عالم اور اندھا یکساں نہیں ہیں۔ ﴿ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴾ وہ لوگ ہیں جو نصیحت حاصل کرنے والے، عبرت پکڑنے والے اور عقلِ سلیم والے ہیں۔ ''جَعَلَنَا اللّٰهُ تَعَالىٰ مِنْهُمْ'' ''اللہ تعالیٰ ہمیں ان میں سے کرے۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص پر انکار کیا، جو عالم اور اندھے کو ایک دوسرے کے برابر خیال کرتا ہے، کیوں کہ ان کا حال تو ایک دوسرے سے دوری کا ہے، جیسے کہ جھاگ اور پانی اور میل کچیل اور خالص چیز کے درمیان فرق ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ آیت حمزہ رضی اللہ عنہ اور ابوجہل کے حق میں اتری ہے۔ اس کے باوجود آیت کو عام مفہوم پر محمول کرنا زیادہ مناسب ہے، اگرچہ سبب خاص ہو۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: اس قوم نے اللہ کی کتاب سنی اور سمجھی اور یاد رکھی اور اس سے منتفع ہوئی اور اس قوم نے کچھ نہ دیکھا اور نہ سمجھا۔[1] سو ان دونوں کی منزلت اور مقام کے فرق کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کی عقل صحیح سلامت ہے۔[2]

---

[1] تفسير الطبري (١٦/ ٤١٨) [2] فتح البيان (٧/ ٤٥)

مردم اندر حسرتِ فہم درست ایں کہ میگویم بقدر فہم تست

''لوگ عمدہ سوچ کے افسوس وارمان میں ہیں۔ یہ جو میں کہہ رہا ہوں، یہ تمھاری سوچ کے عین مطابق ہے۔''

الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ﴿20﴾ وَالَّذِيْنَ
يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ
وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ﴿21﴾ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ
وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ
بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿22﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ
يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ
وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ﴿23﴾ سَلٰمٌ
عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴿24﴾

وہ جو اللہ کا عہد پورا کرتے ہیں اور پختہ وعدہ نہیں توڑتے ⑳ اور جو جوڑتے ہیں وہ چیز جسے اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا، اور وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور برے حساب سے گھبراتے ہیں ㉑ اور جنھوں نے اپنے رب کے چہرے کی طلب کے لیے صبر کیا اور نماز قائم کی اور ہمارے دیے رزق میں سے پوشیدہ اور ظاہر طور پر خرچ کیا اور وہ برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں، انھی لوگوں کے لیے آخرت کا گھر ہے ㉒ جو کہ ہمیشہ کے باغ ہیں جن میں وہ داخل ہوں گے، اور وہ بھی جو ان کے باپ دادا اور ان کی بیویوں اور ان کی اولاد میں سے صالح ہوئے۔ اور فرشتے (جنت کے) ہر دروازے سے ان کے پاس آئیں گے ㉓ (اور کہیں گے:) تم پر سلام ہو، اس لیے کہ تم نے صبر کیا، لہٰذا آخرت کا گھر بہت خوب ہے ㉔

سعادت مندوں کو جنتی بنانے والے اوصافِ حمیدہ:

اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ جو لوگ ان اوصافِ حمیدہ کے مالک ہیں، ان کے لیے حسنِ عاقبت اور دنیا میں نصرت ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کا عہد پورا کرتے ہیں اور اقرار کو نہیں توڑتے۔ یہ منافقوں کی طرح نہیں ہیں کہ جب عہد کریں تو توڑ ڈالیں اور جب جھگڑا کریں تو گالی گلوچ کریں اور جب بات کہیں تو جھوٹ بولیں اور جب ان کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کریں، بلکہ یہ وہ لوگ ہیں کہ جس بات کا اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا ہے کہ اس کو جوڑیں

جیسے صلۂ ارحام اور قرابت کے ساتھ احسان اور فقرا اور حاجت مندوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور بذل (بخشش) معروف، اس کو جوڑتے ہیں اور ہر عمل میں وہ کسی کام کا کرنا ہو یا چھوڑ دینا، اللہ سے ڈرتے ہیں۔ اللہ کا مراقبہ ہر کام میں رکھتے ہیں اور برے حساب سے خوف کھاتے ہیں، لہٰذا ان کا کام سداد (راست بازی) اور اس پر استقامت ہے، جو ان کی تمام حرکات وسکنات اور تمام حالات میں رہتی ہے، خواہ وہ حالاتِ قاصرہ (کمی کرنے والے ہوں) یا متعدیہ (حد سے بڑھنے والے)۔

اور جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کی تلاش میں صبر کیا اور اپنے آپ کو حرام کی ہوئی اور گناہ کی باتوں سے دور رکھا، تاکہ اللہ اُن سے راضی ہو اور ثوابِ جزیل دے اور جن لوگوں نے نماز کو مع اس کی حدود، اوقات، رکوع وسجود اور خشوع کو شرعی طریقے سے قائم رکھا اور جن لوگوں نے اپنا مال، جو اللہ نے ان کو دیا تھا، اس جگہ صَرف کیا جہاں خرچ کرنے کا حکم تھا، جیسے: اپنے اہل وعیال، قریبی رشتہ دار اور فقیر وحاجت مند اور کھلے اور چھپے خرچ کیا، ان کو اس بات سے دن اور رات کے کسی لمحے میں بھی کسی نے منع نہیں کیا اور برائی کے بدلے انھوں نے بھلائی کی۔ جب کسی نے ان کو ایذا دی اور ستایا تو انھوں نے اس کے مقابلے میں صبرِ جمیل اور تحمل کیا اور درگزر اور معاف کرنا اختیار کیا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۝ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴾ [حٰمٓ السجدة: ٣٤۔ ٣٥] ”آپ (برائی کو) ایسی بات سے ٹالیے جو احسن ہو تو (آپ دیکھیں گے) یکایک وہ شخص کہ آپ کے اور اس کے درمیان دشمنی ہے، (ایسا ہو جائے گا) جیسے گرم جوش جگری دوست ہو۔ اور یہ (خصلت) انھی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو صبر کرتے ہیں اور یہ اسی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے نصیب والا ہو۔“

جنتِ عدن کیا ہے؟

سو ایسے لوگوں کے متعلق اللہ نے خبر دی ہے کہ ان نیک بختوں کے لیے جو اِن صفات کے مالک ہیں، پچھلا گھر ہے۔ پھر اس گھر کی یہ علامتیں بتائیں کہ وہ گھر قیام کرنے کے باغات ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے کہا کہ جنت میں ایک محل ہے، اس کو عدن کہتے ہیں، اس کے اردگرد بروج اور بالا خانے ہیں۔ اس کے محل کے پانچ ہزار دروازے ہیں۔ ہر دروازے پر پانچ ہزار یمنی دھاری دار کپڑے کے پردے ہوں گے۔ ان میں سوائے نبی یا صدیق یا شہید کے اور کوئی داخل نہ ہوگا۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: عدن بہشت کا ایک شہر ہے، اس میں رسول نبی یا شہید اور ہدایت کے امام ہوں گے۔ باقی بہشتیں اور لوگ اُس شہر کے اردگرد بسیں گے۔[1] (رواهما ابن جرير)

[1] تفسير الطبري (١٦/ ٤٢٤۔ ٤٢٥)

جنت میں نچلے درجے کے مومنوں کو اوپر والے درجے پر فائز افراد کے ساتھ اکٹھا کرنا:

اور آبا اور بیویاں اور اولاد نیک بندوں کی، جو جنت میں داخل ہونے کے قابل ہیں، وہ اس جگہ جمع ہوں گے، تاکہ مومنوں کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں، یہاں تک کہ ان میں سے ادنیٰ درجے کا شخص اعلیٰ درجے کے شخص تک پہنچے گا، یہ اللہ کا ان کے حال پر احسان اور امتنان ہے اور اعلیٰ درجے والے کے درجے میں کمی نہیں ہوگی۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَاۤ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ كُلُّ امْرِئٍۭ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ﴾ [الطور: ۲۱] ''اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے بھی ایمان کے ساتھ ان کی پیروی کی، تو ہم ان کی اولاد کو (جنت میں) ان سے ملا دیں گے، اور ہم ان کے عمل میں سے کچھ بھی کم نہیں کریں گے۔ ہر شخص اس کے عوض جو اس نے کمایا گروی ہے۔'' پھر ہر طرف سے ان کے پاس فرشتے جنت میں داخل ہونے کی مبارک بادلے کر آئیں گے اور انھیں اس انعام اور دارالسلام میں صدیقین، انبیا اور رسولوں کے ہمسائے میں قیام ہونے پر مبارک باد دیں گے۔

سب سے پہلے جنت میں داخل ہونے والے خوش نصیب:

سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ تم جانتے ہو سب سے پہلے جنت میں کون داخل ہوگا؟ کہا: اللہ اور اُس کا رسول جانیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے پہلے اللہ کی مخلوق میں سے جو جنت میں داخل ہوں گے وہ فقرا مہاجرین ہیں، جن کی ذات سے سرحدات بند کیے جاتے ہیں اور اُن کے سبب مکارہ (ناپسندید چیزیں) سے بچا جاتا ہے، ان میں سے کوئی مرتا ہے اور اس کی حاجت اس کے سینے میں ہوتی ہے، وہ اس کو پورا نہیں کرسکتا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں میں سے جس کسی کو چاہے گا، اس سے کہے گا: ان کے پاس جا کر سلام کہو۔ وہ کہیں گے: ہم تیرے آسمان کے رہنے والے اور تیری مخلوق میں بہتر ہیں تو ہم کو فرماتا ہے کہ ہم ان کے پاس جا کر سلام کریں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: یہ وہ بندے ہیں جو مجھ کو پوجتے تھے اور کسی شے کو میرے ساتھ شریک نہ کرتے تھے، ان سے سرحدوں کی حفاظت کی جاتی تھی اور مکارہ سے بچا جاتا تھا اور اُن میں کوئی مرتا اور اس کی حاجت اس کے سینے میں رہتی، وہ اس کو پورا نہ کرسکتا۔ تب فرشتے ان کے نزدیک جائیں گے اور ہر دروازے سے داخل ہو کر کہیں گے: ﴿ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴾[1] (رواہ أحمد)

امام طبرانی رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ تین شخص جو پہلے بہشت میں جائیں گے ان میں ایک فقرا مہاجرین ہیں جن کی وجہ سے ناپسندیدہ چیزوں سے بچا جاتا ہے اور جب کوئی حکم ان کو دیا جاتا ہے تو اسے

[1] مسند أحمد (۲/ ۱٦۸) صحيح الترغيب والترهيب (۳/ ۱۳۱)

سنتے ہیں اور اطاعت بجا لاتے ہیں اور اُن میں سے کسی شخص کو اگر سلطان کی طرف کوئی حاجت ہوتی ہے تو وہ پوری نہیں ہوتی، وہ مرجاتا ہے اور وہ حاجت اس کے سینے میں رہ جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جنت کو بلائے گا، وہ اپنی رونق اوز بہار کے ساتھ آئے گی، تب فرمائے گا: کہاں ہیں میرے وہ بندے جنھوں نے میری راہ میں جنگ کی تھی اور میری راہ میں کوشش کی اور جہاد کیا! تم جنت میں بغیر عذاب اور حساب کے داخل ہو جاؤ۔ پھر فرشتے آ کر سجدہ کریں گے اور کہیں گے: اے ہمارے رب! ہم تیری تسبیح بیان کرتے ہیں اور دن رات تیری پاکی بیان کرتے ہیں، ان لوگوں سے زیادہ جن کو تونے ہم پر اختیار کیا ہے۔ رب عزوجل فرمائے گا: یہ میرے وہ بندے ہیں جنھوں نے میری راہ میں کوشش کی، جہاد کیا ان کو میری راہ میں تکالیف دی گئیں، تب ان پر فرشتے ہر دروازے سے داخل ہوکر کہیں گے: ﴿ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴾ [1].

سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مومن اپنے تخت پر تکیہ لگائے بیٹھا ہوگا، جب وہ جنت میں جائے گا، اس کے پاس خدام کی دو صفیں ہوں گی اور ان دونوں قطاروں کی طرف ایک بند دروازہ ہوگا۔ فرشتہ آ کر اجازت مانگے گا اور اس شخص سے، جو اس دروازے کے پاس ہوگا، اس طرح کہے گا کہ ایک فرشتہ اذن چاہتا ہے، یہ خبر اس مومن تک پہنچے گی، وہ کہے گا: اس کو اجازت دو۔ تب وہ شخص، جو مومن کے پاس ہے، کہے گا: اچھا اس کو آنے دو، یہاں تک کہ یہ پیغام اُس شخص تک پہنچے گا جو بہت دور اس دروازے کے قریب ہوگا، تب وہ دروازہ اس فرشتے کے لیے کھولا جائے گا، فرشتہ داخل ہوکر سلام کرے گا، پھر چلا جائے گا۔[2] (رواہ ابن جریر و ابن أبي حاتم نحوہ) حدیث میں مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال کے شروع میں شہدا کی قبروں کی زیارت کرتے اور کہتے: ﴿ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴾ (آیتِ باب)۔ اسی طرح سیدنا ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کیا کرتے تھے۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عہد سے مراد وہ عہد ہیں جو اُن کے اور اللہ کے درمیان ہوئے ہیں، یا ان کے اور بندوں کے درمیان ہیں۔ میثاق وہ ہے جس پر اپنے درمیان اقرار کیا ہے اور قسم اٹھائی ہے۔ تخصیص کے بعد یہ عمومیت ہے۔ نذر اور اس جیسی دوسری باتیں جس کو بندہ اپنی جان پر واجب کرلے، وہ میثاق میں داخل ہیں۔ اور جائز ہے اگر اس کے برعکس ہو۔ یعنی عمومیت کے بعد تخصیص ہو۔ عہد سے مراد اللہ کے ساتھ کیے گئے تمام عہد ہیں، یعنی وہ

---

[1] امام طبرانی رحمہ اللہ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے، البتہ امام ہیثمی رحمہ اللہ اس کی نسبت امام طبرانی رحمہ اللہ کی طرف کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "رجال الطبراني رجال الصحيح غير أبي عشانة وهو ثقة" (مجمع الزوائد: ١٠/ ٤٥٦)

[2] تفسير الطبري (١٦/ ٤٢٥۔ ٤٢٦) اس کی سند میں "ابو الحجاج" مجہول راوی ہے۔

[3] تفسير الطبري (١٦/ ٤٢٦۔ ٤٢٧) یہ روایت مرسل ہے۔

اوامر ونواہی جن کی اللہ تعالیٰ نے رسولوں کی زبانی اور اپنی کتابوں میں وصیت فرمائی ہے۔ اس میں وہ لازمی چیزیں بھی داخل ہیں جن کو بندے نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے اور میثاق سے مراد وہ عہد و پیمان ہے جو صلب آدم سے نکلنے کے وقت آدم علیہ السلام کی اولاد سے عالم ذر (عالم ارواح) میں لیا گیا ہے اور اس آیت میں مذکور ہے: ﴿ وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ ﴾ [الأعراف: ۱۷۲] ''اور (اے نبی! یاد کرو) جب آپ کے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو نکالا۔'' وہ پیمان یہی تھا کہ جب خارج میں موجود ہو تو ایمان لانا کفر نہ کرنا، موحد ہونا مشرک نہ بننا۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی بیس سے زیادہ آیات میں وفائے عہد و میثاق کا ذکر فرمایا ہے۔[1] ظاہر یہ ہے کہ ''وصل ما أمر به'' سے ہر وہ چیز مراد ہے جس کے جوڑنے کا حکم دیا ہے اور جس کے قطع کرنے سے منع فرمایا ہے، جیسے اللہ کے حقوق اور بندوں کے حقوق۔ ان سب میں ایک یہ ہے کہ ساری کتابوں اور رسولوں پر بلا تفریق ایمان لانا اور اس میں صلہ رحمی بھی بہ درجۂ اولیٰ داخل ہے اور قرابتِ رسول اور قرابتِ مومنین کے ساتھ وصل بھی داخل ہے جو صرف ایمان کی وجہ سے ثابت ہے۔ اللہ کے اس حکم کے تحت: ﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ ﴾ [الحجرات: ۱۰] ''مومن تو (ایک دوسرے کے) بھائی ہیں۔'' کہ حتی الامکان ان کے ساتھ نصرت و ذبّ (تکلیف کو رفع کرنا)، احسان و شفقت اور افشائے سلام اور عیادتِ مرضیٰ سے پیش آئے اور اپنے ساتھیوں، خادموں، ہمسایوں، سفر کے ساتھیوں وغیرہ کے حقوق کا خیال رکھے۔ اکثر مفسرین نے اس آیت کو فقط صلہ رحمی پر محدود کیا ہے، حالاں کہ لفظ وسیع تر مفہوم رکھتا ہے۔ اس سے حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما میں فرمایا ہے کہ بر و صلہ قیامت کے دن سُوئے حساب کو ہلکا کرتے ہیں۔ پھر نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ﴿ وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ﴾[2] (رواه الخطيب و ابن عساكر)

صلہ رحمی کرنے اور قطع رحمی کے حرام ہونے میں بہت سی احادیث مروی ہیں۔ رسالہ ''إيقاظ النيام لصلة الأرحام'' اس بارے میں ایک عمدہ رسالہ ہے جو عوام کے لیے مفید ہے۔ خشیت سے مراد وہ خوف ہے جو واجب کام کرائے اور حرام کام سے بچائے۔ خشیت اس ڈر کو کہتے ہیں جس میں تعظیم اور اجلال کی آمیزش ہو، یعنی اللہ کی عظمت اور جلالتِ شان بھی دل میں جاگزین ہو۔ اکثر ایسا خوف وہاں ہوتا ہے جہاں کہ اس شخص کا علم ہوتا ہے جس کا ڈر ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ﴾ [الفاطر: ۲۸] ''بس اللہ سے اس کے بندوں میں سے صرف علما ہی ڈرتے ہیں۔'' ﴿ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ﴾ یہ ہے کہ خوب ٹھونک بجا کر اور چھان بین کر کے پورا کامل طور پر حساب لیں۔ «وَمَنْ نُوْقِشَ فِي الْحِسَابِ عُذِّبَ»[3] ''جس سے حساب میں مناقشت کی

[1] تفسير الطبري (١٦/ ٤١٩)

[2] تاريخ دمشق (٣٦/ ٢٤٣) اس کی سند میں ''عبدالصمد بن علی'' ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم (٢٩٨٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٧١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٧٦)

جائے گی، اسے عذاب ہوگا۔'' اس خیفت (خوف) کا حق یہ ہے کہ لوگ محاسبے سے قبل اپنی جان کا خود حساب کر لیں۔

صبر سے مراد حکم کی بجا آوری پر صبر کرنا اور نہی سے اجتناب کرنا ہے۔ یا تکالیف اور مصائب پر، یا شہوات اور معصیت کے کاموں سے صبر کرنا اور اپنے آپ کو روک لینا ہے۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ اس کو عمومیت پر محمول کریں اور یہ صبر اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے ہو۔ یعنی خالص ہو اس میں کسی غیر کا شائبہ تک نہ ہو کہ کوئی یوں کہے کہ یہ شخص بڑا صابر ہے اور نازل ہونے والی مصیبتوں پر حوصلہ کی بڑی قوت رکھتا ہو۔ یا اس لیے کہ جزع فزع کرنے پر کوئی اس کو معیوب نہ سمجھے یا دشمن خوش نہ ہو۔ اقامتِ نماز سے یہ مراد ہے کہ ذکر اذکار اور نماز کے جملہ ارکان خشوع اور اخلاص کے ساتھ بجا لائے۔ نماز سے مراد پنج گانہ نماز ہے، یا فرض اور نفل نماز ہے۔ پوشیدہ خرچ کرنے سے مراد صدقۂ نفل ہے اور ﴿ عَلَانِيَةً ﴾ سے مراد صدقۂ فرض ہے یا ﴿ سِرًّا ﴾ سے وہ شخص مراد ہے جو مال دار مشہور ہے اور جس پر زکات نہ دینے کی تہمت ہے، لیکن عموم پر محمول کرنا زیادہ مناسب ہے۔ سیئہ کا حسنہ سے دور کرنا اس طرح ہوتا ہے کہ جو شخص اس کے ساتھ برائی کرے یہ اس کے ساتھ احسان کرے۔

بدی را بدی سہل باشد جزا   اگر مردی أَحْسِنْ إِلٰى مَنْ أَسَاءَ

''برائی کا برائی سے بدلہ لینا آسان ہوتا ہے اگر تو مرد (باہمت) ہے تو برائی کرنے والے سے بہت عمدہ سلوک کر۔''

یا عمل صالح کر کے عملِ بد کو دور کرتے ہیں، یا شرّ کو خیر سے دور کرتے ہیں، یا منکر کو معروف سے، ظلم کو عفو سے، یا گناہ کو توبہ سے، یا محرومی کو عطا کرنے سے، یا قطع کو وصل سے، یا ہرب (بھاگنا) کو انابت (رجوع کرنا) سے۔ بالجملہ آیت کو ان تمام معانی پر محمول کرنے سے کوئی امر مانع نہیں ہے سو جو لوگ ان اُوصاف کے ساتھ موصوف ہیں انھیں کے لیے پچھلا گھر ہے، یعنی بہشت۔ وہ گھر ہمیشہ رہنے کے باغات ہیں جن میں وہ داخل ہوں گے۔ عدن بہ معنی اقامت ہے، پھر جنت کا نام ہو گیا۔

امام قشیری رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ جَنّٰتُ عَدْنٍ ﴾ وسط اور قصبۂ جنت ہے، اس کی چھت رحمان کا عرش ہے، لیکن صحیح بخاری میں یوں فرمایا ہے کہ تم جب اللہ تعالیٰ سے مانگو تو فردوس مانگو کہ یہ اوسط اور اعلائے جنت ہے اور اس کی چھت رحمان کا عرش ہے۔ وہیں سے جنت کی نہریں پھوٹتی ہیں۔[1] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: ''جنات عدن'' بطنان یعنی وسطِ جنت ہیں۔[2] امام حسن رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کعب رضی اللہ عنہ سے کہا کہ عدن کیا چیز ہے؟ کہا: جنت میں ایک محل ہے، اس میں کوئی داخل نہ ہوگا سوائے پیغمبر یا صدیق یا شہید یا حاکمِ عادل کے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٣٧)   [2] مصنف ابن أبي شيبة (٧/ ٣٩)

سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں: « جَنَّةُ عَدْنٍ قَضِيبٌ غَرَسَهُ اللّٰهُ بِيَدِهِ، ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَكَانَ » [1] (رواه ابن مردويه) ''عدن کا باغ ایک لکڑی تھی، جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے گاڑا، پھر فرمایا اس کو کہ ہو جا اور وہ ہو گیا۔'' جنت کے بیان میں رسالہ ''هادي القلب السليم إلى درجات جنات النعيم'' اپنے باب میں بے مثل و بے مثال ہے در ینولا طبع ہوا ہے، وللّٰه الحمد۔ بالجملہ جناتِ عدن میں جس طرح مذکورہ صفتوں والے لوگ جائیں گے، اسی طرح جو کوئی ان کے باپ دادا اور بیویوں اور اولاد میں سے صالح ہوگا، وہ بھی وہاں جائے گا، اگرچہ ان ہر سہ فریقوں نے ان جیسے عمل نہ کیے ہوں گے۔ ان کے ساتھ یہ معاملہ بطورِ عزت و اکرام ہوگا۔ (قاله ابن عباس و رجحه الواحدي) امام رازی رحمہ اللہ نے کہا: اس میں بیوی اور خاوند کی تمیز کرنے کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے۔ شاید پہلے وہ جورو ہو جس کا خاوند مر گیا ہے، یا وہ مر گئی اور خاوند زندہ رہا۔[2]

نیکوکار کا ذکر اس بات پر دلیل ہے کہ ان لوگوں کے رشتہ داروں میں سے وہی شخص جنت میں داخل ہوگا جو کہ صالح ہے۔ صرف باپ یا بیوی یا اولاد ہونا بغیر نیکی کے کچھ فائدہ مند نہ ہوگا۔ پھر ایک رات دن کی مقدار کے مطابق ان پر فرشتے داخل ہوں گے، یعنی مبارک باد دینے کے لیے۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جنت میں داخلے کے وقت سب سے پہلے داخل ہوں گے۔ سلیمان جمل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قید ہم نے امام سیوطی رحمہ اللہ کے سوا اور کسی مفسر کے کلام میں نہیں دیکھی، بلکہ ان کے کلام میں اس قید کے نہ ہونے پر دلیل ہے۔ ان فرشتوں کا ان کے پاس آنا اور جانا ان محلوں اور منزلوں کے تمام دروازوں میں سے ہوگا، جن میں وہ بستے ہوں گے، یا جنت کے ہر دروازے سے، یا ہر بابِ تحفہ سے، جو اللہ کی طرف سے لائیں گے۔ بہرحال وہ داخل ہو کر کہیں گے: تم کو آفات سے سلامتی ہو، یا تم ہمیشہ سلامت رہو، یا یہ سلام فرشتوں کی طرف سے ان کے لیے دعا ہوگی کہ ''سَلَّمَكُمُ اللّٰهُ تَعَالیٰ'' ان کے لیے یہ سلام کلامِ دنیا میں آفات پر صبر کرنے کی وجہ سے ہوگا۔ سو کیا اچھا ہے یہ آخرت کا گھر، یعنی جنت!

تفسیر قرطبی میں عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور علی بن حسین رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ قیامت کے دن ایک منادی آواز دے گا کہ اہلِ صبر کہاں ہیں، وہ کھڑے ہو جائیں۔ کچھ لوگ کھڑے ہوں گے، ان سے کہا جائے گا کہ جنت کی طرف جاؤ، تب فرشتے ان کا استقبال کریں گے اور کہیں گے کدھر جا رہے ہو؟ وہ کہیں گے: جنت کی طرف۔ فرشتے کہیں گے: حساب سے پہلے؟ وہ کہیں گے: ہاں۔ فرشتے کہیں گے: تم کون لوگ ہو؟ وہ کہیں گے: ہم اہلِ صبر ہیں۔ فرشتے کہیں گے: تم نے کیا صبر کیا؟ وہ کہیں گے: ہم نے اپنی جانوں کو اللہ کی اطاعت پر صبر دیا اور اللہ کی معاصی سے صابر رہے اور آزمائشوں اور تکالیف پر دنیا میں شکیبا (صبر کرنے والے) ہوئے، فرشتے ان سے کہیں گے: ﴿ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ

---

[1] الدر المنثور (٤/ ٦٣٨۔ ٦٣٩) [2] تفسير الرازي (١٩/ ٣٦)

﴿ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴾ (آیت باب)۔ یعنی کیا اچھا ہے انجام اس گھر کا جس میں تم تھے، اور تم نے عمل کیا جس کا انجام یہ ہوا جس میں اب تم ہو! اس صورت میں عقبیٰ اسم ہے اور دار سے مراد دنیا ہے۔ ابو عمران جونی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یعنی صبر ہے دوزخ سے یا دنیا سے۔[1] بہر حال اللہ پاک نے یہ جملہ ﴿ عُقْبَى الدَّارِ ﴾ کا رغبت اور شوق دلانے کے لیے کیا ہے۔ پھر نیک بختوں کی حالت کے بعد بدبختوں کی حالت کا بیان فرمایا اور کہا:[2]

وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۙ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْۗءُ الدَّارِ ۝۲۵

اور جو لوگ اللہ کے عہد کو پختہ کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور وہ چیز قطع کرتے ہیں جسے اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا، اور وہ زمین میں فساد کرتے ہیں، انھی لوگوں کے لیے لعنت ہے اور ان کے لیے (آخرت کا) بہت برا گھر ہے (25)

بدبختوں کا حال اور انجام:

یہ بدبختوں کا حال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے انجام کی خبر دی کہ ان کی بازگشت مومنوں کی بازگشت کے خلاف ہوگی۔ جس طرح دنیا میں ان کی خصلتیں ان کے خلاف ہیں، کیوں کہ وہ عہد کو توڑتے ہیں اور قطع رحمی اور اس جیسی دوسری صفتوں کے مالک ہیں اور زمین میں فتنہ برپا کرتے ہیں، جس طرح کہ حدیث میں مروی ہے کہ منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بات کرے جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے، امانت رکھو تو خیانت کرے۔ دوسری روایت میں ہے کہ جب عہد کرے تو بدعہدی کرے اور جب جھگڑے تو گالی بکے۔[3] لہٰذا فرمایا کہ ان کے لیے لعنت ہے، یعنی رحمت سے دوری اور برا انجام ہے اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور بری جگہ۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے عہد توڑنے کے بارے میں کہا ہے کہ یہ منافقوں کی چھے خصلتیں ہیں، جب وہ لوگوں پر غالب ہوتے ہیں تو ان خصلتوں کو ظاہر کرتے ہیں: جھوٹ بولنا، وعدہ خلافی کرنا، امانت میں خیانت کرنا، عہد و پیمان کے بعد عہد شکنی کرنا، جس چیز کو ملانے کا اللہ نے حکم دیا ہے اس کو قطع کرنا، زمین میں فساد برپا کرنا اور جب مغلوب ہوتے ہیں تو تین خصلتیں ظاہر کرتے ہیں: غلط بیانی و دروغ گوئی، وعدہ خلافی، امانت میں خیانت۔[4]

---

[1] تفسير القرطبي (٩/ ٣١٣) [2] فتح البيان (٧/ ٤٥۔ ٥٠)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣۔ ٣٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٨۔ ٥٩) [4] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٧١)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ عہد توڑنے سے مراد یہ ہے کہ اعتراف اور قبول کر لینے کے بعد عہد شکنی کرتے ہیں، پہلے ہاں کہہ دیتے ہیں پھر کرتے نہیں۔ قاطع رحم اور قسموں کو توڑنے والے ہیں، زمین میں معصیت اور کفر کا ارتکاب کرتے ہیں اور لوگوں کی جانوں اور مال کا نقصان کرتے ہیں۔ یہ مذموم صفتیں ان میں پائی جاتی ہیں۔ سو ایسے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محرومی اور دوری ہے اور دنیا کے گھر کا برا انجام ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ان کے لیے دوزخ اور عذابِ الیم ہے کہ یہی ان لوگوں کا گھر ہوگا۔[1]

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ۝٢٦

اللہ جسے چاہے کھلا رزق دیتا ہے اور (جسے چاہے) تنگ کر دیتا ہے۔ اور وہ (کافر) دنیا کی زندگی پر اتراتے ہیں، حالاں کہ دنیا کی زندگی آخرت کی نسبت (حقیر) متاع ہی تو ہے (26)

رزق کی فراخی اور تنگی اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور یہ اس کی حکمت و عدل پر مبنی ہے:

اللہ تعالیٰ نے یہ ذکر کیا کہ رزق کی فراخی اور تنگی حکمت اور عدل کے طور پر ہے۔ یہ کافر اس دنیا کے جینے پر خوش ہیں، سو یہ ان کے لیے استدراج اور امہال (مہلت) ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ۝٥٥ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴾ [المؤمنون: ٥٥۔ ٥٦] ”کیا وہ سمجھتے ہیں کہ بے شک ہم جو بھی ان کے مال اور اولاد میں اضافہ کیے جا رہے ہیں۔ (تو) کیا ہم ان کے لیے بھلائیوں میں جلدی کر رہے ہیں (نہیں نہیں) بلکہ، وہ (اصل حقیقت کا) شعور نہیں رکھتے۔“

پھر حیاتِ دنیا کو اس ذخیرے کی نسبت جو مومنوں کے لیے دارِ آخرت میں مہیا کر رکھا ہے حقیر ٹھہرایا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴾ [النسآء: ٧٧] ”کہہ دیجیے: دنیا کا فائدہ تھوڑا ہے اور آخرت بہتر ہے اس شخص کے لیے جس نے پرہیز گاری اختیار کی اور تم پر کھجور کی گٹھلی کے دھاگے کے برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔“ نیز فرمایا: ﴿ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝١٦ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴾ [الأعلى: ١٦۔ ١٧] ”بلکہ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔ حالاں کہ آخرت بہت بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔“

حدیث مستورد اخی بنی فہر میں مرفوعاً مروی ہے کہ دنیا آخرت کے مقابلے میں ایسے ہے جیسے کوئی تم میں اپنی انگلی

---

[1] فتح البیان (٧/ ٥٠۔ ٥١)

دریا میں کرے، پھر دیکھے کہ وہ کتنا پانی لے کر آتی ہے اور سبابہ سے اشارہ کیا۔[1] (رواہ أحمد) دوسری حدیث جو امام مسلم رحمہ اللہ نے روایت کی ہے، اس میں مرفوعاً اس طرح مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا گزر ایک حاقیر سے کانوں والے مرے ہوئے مینڈھے پر ہوا فرمایا: «وَاللّٰهِ لَلدُّنْيَا أَهْوَنُ عَلَى اللّٰهِ مِنْ هٰذَا عَلٰى أَهْلِهِ حِيْنَ أَلْقَوْهُ»[2] ''اللہ کی قسم! جتنا اپنے مالکوں کے نزدیک یہ حقیر ہے، جب انھوں نے اسے پھینک دیا، اللہ تعالیٰ کے نزدیک دنیا اس سے بھی زیادہ حقیر ہے۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ جس کا رزق چاہے کشادہ کرتا ہے، کافر کے لیے استدراجاً اور مومن کے لیے روزی بطور آزمایش و امتحان تنگ کرتا ہے، تا کہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے۔ رزق کی فراخی کچھ اس کی عزت و توقیر کی دلیل نہیں اور نہ ہی رزق کی تنگی کسی کی توہین کی دلیل ہے۔ یہ مشرکینِ مکہ اس دنیا کی زندگی پر خوش ہوتے ہیں۔ فرح ایک ایسی خوشی ہے جو دل کو اس وقت حاصل ہوتی ہے جب اس کی پسندیدہ چیز اُس کو حاصل ہوتی ہے اور یہ اس چیز سے لاعلم اور جاہل ہے جو اللہ کے پاس ہے۔ آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ دنیا پر خوش ہونا اور دنیا کی طرف مائل ہونا حرام ہے اور دنیا کی یہ زندگی آخرت کے مقابلے میں ایک برتنے کی چیز ہے، یعنی قلیل چیز جس کو بقا نہ ہو اور جلد زائل ہو جائے جیسے سوار اور چرواہے کا زادِ راہ۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اگلے زمانے میں کوئی شخص اپنے اونٹوں یا بکریوں میں جاتا تو اپنے گھر والوں سے کہتا: مجھے کچھ متاع دے دو، وہ کھجور یا روٹی کا ایک ٹکڑا اس کو دے دیتے۔ سو یہ دنیا کی ایک مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے بیان کی۔[3] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ ایک دفعہ نبی اکرم ﷺ ایک بوریے پر سوئے، آپ ﷺ کے پہلو پر بوریے کا نقش پڑ گیا۔ ہم نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہم آپ کے لیے فرش بنائیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کہاں میں اور کہاں دنیا؟! میں دنیا میں ایک سوار کی طرح ہوں کہ وہ ایک درخت کے نیچے سائے میں بیٹھا، پھر چل دیا۔[4] (رواہ الترمذي وصححه)

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْۤ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ۝۲۷ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٨٥٨) مسند أحمد (٤/ ٢٢٨)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٩٥٧) [3] الدر المنثور (٤/ ٦٤١)

[4] سنن الترمذي، رقم الحدیث (٢٣٧٧) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٤١٠٩) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٥٦٦٨) فتح البیان (٧/ ٥١_ ٥٢)

الْقُلُوْبُ ﴿۲۸﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ﴿۲۹﴾

اور کافر کہتے ہیں: اس کے رب کی طرف سے اس پر کوئی (بڑی) نشانی کیوں نہیں نازل کی گئی؟ کہہ دیجیے: بے شک اللہ جسے چاہے گمراہ کرتا ہے اور اس شخص کو اپنی طرف ہدایت دیتا ہے جو رجوع کرے ﴿27﴾ جو لوگ ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کے ذکر سے اطمینان پاتے ہیں، آگاہ رہو! اللہ کے ذکر ہی سے دل اطمینان پاتے ہیں ﴿28﴾ جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے، ان کے لیے خوش حالی اور اچھا ٹھکانا ہے ﴿29﴾

مشرکوں کا نشانیاں طلب کرنا:

یعنی حق تعالیٰ کے لیے ضروری نہیں کہ سب کو راہِ راست پر لائے، یا نشانیاں بھیج کر ہر طرح ہدایت دے، بلکہ یہی منظور ہے کہ کوئی بچ جائے اور کوئی راہ پائے۔ سو جس دل میں رجوع کا خیال آیا تو یہ گویا علامت ہے کہ اللہ نے اُس کو سمجھانا چاہا۔ اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کی گفتگو کے متعلق بتایا کہ وہ اس طرح بکتے ہیں کہ اس پیغمبر پر اس کے اللہ کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اتری۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے ان کا قول نقل کیا ہے: ﴿ فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَاۤ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ٥] ''لہٰذا اسے ہمارے پاس کوئی (ایسی) نشانی لانی چاہیے جیسے پہلے رسول بھیجے گئے تھے۔'' اس بارے میں پہلے کلام گزر چکا ہے۔ اور اللہ کو اس بات پر قدرت ہے کہ وہ ان کے سوال کو قبول کرے۔

حدیث میں مروی ہے کہ جب انھوں نے یہ سوال کیا کہ کوہِ صفا ان کے لیے خالص سونے کا ہو جائے اور اس جگہ پانی کے چشمے بہنے لگیں اور مکہ کے آس پاس کے پہاڑ ہٹ جائیں اور کوہستان کے بجائے گل و گلزار ہو جائے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو وحی بھیجی کہ اے محمد (ﷺ)! اگر تم یہ بات چاہتے ہو تو میں یہ سب کچھ ان کو عطا کر دوں گا، لیکن اگر پھر بھی وہ کفر کریں گے تو میں ان کو ایسا عذاب دوں گا جو سارے جہاں میں کسی کو نہ دیا ہوگا اور اگر تم چاہو تو میں ان پر توبہ اور رحمت کا دروازہ کھول دوں۔ نبی مکرم ﷺ نے کہا: بلکہ یہی توبہ اور رحمت کا دروازہ کھول دینا چاہیے۔[1]

لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس جگہ اپنے رسول سے یہ بات کہی کہ اے نبی! تم کہہ دو کہ گمراہی اور ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہی گمراہ کرنے والا اور ہدایت دینے والا ہے، خواہ کوئی رسول ان کی خواہش کے مطابق کوئی نشانی لے کر آئے یا نہ آئے، کیوں کہ ہدایت اور گمراہی یا اس کا نہ ہونا کچھ اس سوال اور اقتراح (بلا سوچے سمجھے کوئی بات کہنا) سے بستہ نہیں ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ [يونس: ١٠١]

---

[1] مسند أحمد (١/ ٢٤٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٣٨٨)

''اور نشانیاں اور ڈراوے ان لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں دیتے جو ایمان نہیں لاتے۔''

نیز فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴾ [يونس: ٩٦ - ٩٧] ''بے شک جن لوگوں کے بارے میں آپ کے رب کا حکم (عذاب) صادر ہو چکا، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ خواہ ان کے پاس ساری نشانیاں آجائیں، حتی کہ وہ دردناک عذاب (بھی) دیکھ لیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴾ [الأنعام: ١١١] ''اور اگر بے شک ہم ان کی طرف فرشتے نازل کرتے اور ان سے مردے کلام کرتے، اور ہم (ان کی) ہر (مطلوبہ) شے ان کے سامنے پیش کر دیتے، تو بھی وہ ایمان نہ لاتے۔ ہاں اگر اللہ ایسا چاہتا (تو اور بات تھی) لیکن ان میں سے اکثر جہالت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔''

ذکرِ الٰہی مومن کے چین اور آنکھوں کی ٹھنڈک کا باعث ہے:

اس لیے اس جگہ ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ گمراہ کرتا ہے جس کو چاہے اور ہدایت دیتا ہے اپنی طرف رجوع کرنے والے کو، جو اس سے مدد مانگتا ہے اور اس کے سامنے تضرع کرتا ہے اور اللہ کے ذکر سے اس کا دل چین پکڑتا ہے اور وہ اللہ کی طرف جھکتا ہے اور اللہ کے مولیٰ اور مددگار ہونے پر راضی ہے، ایسے مومن اور عامل اور صالح کے لیے خوبی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ خوشی اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ان کے لیے کیا اچھا ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: ان کے لیے رشک ہے۔ امام نخعی رحمہ اللہ نے کہا: ان کے لیے خیر ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ عربی کا ایک کلمہ ہے جس کو آدمی کہتا ہے: ''طُوبىٰ لَكَ أَيْ أَصَبْتَ خَيْرًا'' دوسرے الفاظ یہ ہیں: ''حُسْنىٰ لَهُمْ''[1]

مومنوں کے لیے اچھا ٹھکانا جنت ہے:

﴿ مَاٰبٍ ﴾ سے مراد مرجع ہے۔ یہ سب اقوال ایک شے ہیں، ان میں کوئی منافات (تضاد) نہیں ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ طوبیٰ سے مراد حبشہ کی سرزمین ہے۔ سعید بن مسجوع نے کہا کہ طوبیٰ ہندی میں جنت کا نام ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: طوبیٰ سے مراد بہشت ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے جنت کو بنایا اور اس سے فارغ ہوا تو یوں فرمایا: ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ﴾ (آیتِ باب)۔

یہ اُس وقت کہا کہ جب جنت پسند آئی۔ شہر بن حوشب رحمہ اللہ نے کہا کہ طوبیٰ جنت میں ایک درخت ہے۔

[1] تفسير الطبري (١٦/ ٤٣٤ - ٤٣٦)

جنت میں جو بھی درخت ہے اُس کی شاخیں فصیلِ جنت کے نیچے سے اسی طوبیٰ کی ہیں۔ سیدنا ابو ہریرہ اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم، امام مغیث بن سلیمان اور ابو اسحاق سبیعی اور بہت سے سلف صالحین رحمہم اللہ نے اسی طرح کہا ہے کہ طوبیٰ جنت میں ایک درخت ہے، ہر گھر میں اس کی ایک شاخ ہے۔[1] بعض نے کہا کہ رحمان تبارک وتعالیٰ نے اس کو اپنے ہاتھ سے گوہر کے ایک دانے سے لگایا ہے اور اس کو حکم کیا کہ وہ دراز ہو جائے، جہاں تک اللہ تعالیٰ نے چاہا وہ دراز ہوا اور اس کی جڑ سے انہارِ جنت کے چشمے نکلے جو شہد، شراب، پانی اور دودھ کے تھے۔

سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ طوبیٰ جنت میں ایک درخت ہے جو ستر برس کی راہ گھیرے ہوئے ہے۔ اہلِ جنت کے کپڑے اسی کے شگوفوں سے نکلتے ہیں۔[2] سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ ایک شخص نے کہا: اے اللہ کے رسول! ”طُوبٰى لِمَنْ رَآكَ وَآمَنَ بِكَ، قَالَ: طُوبٰى لِمَنْ رَآنِي وَآمَنَ بِي، وَطُوبٰى ثُمَّ طُوبٰى ثُمَّ طُوبٰى لِمَنْ آمَنَ بِي وَلَمْ يَرَنِي“ ”جس نے آپ کو دیکھا اور آپ پر ایمان لایا اس کے لیے طوبیٰ ہے، فرمایا: جس نے مجھے دیکھا اور ایمان لایا اس کے لیے طوبیٰ ہے اور طوبیٰ ہے، پھر طوبیٰ ہے، پھر طوبیٰ ہے اس کے لیے جو میرے ساتھ ایمان لایا اور اس نے مجھے نہیں دیکھا۔“ ایک آدمی نے کہا: طوبیٰ کیا ہے؟ کہا: جنت میں ایک درخت ہے سو برس کی راہ تک، جنت والوں کے کپڑے اسی درخت کے شگوفوں سے نکلتے ہیں۔[3]

سہل بن سعد رضی اللہ عنہما کی روایت کے مرفوع الفاظ یہ ہیں کہ جنت میں ایک درخت ہے کہ سوار اس کے سائے میں سو برس چلے، تب بھی وہ منقطع نہ ہو۔ سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: «إِنَّ فِي الْجَنَّةِ شَجَرَةً يَسِيرُ الرَّاكِبُ الْجَوَادَ الْمُضَمَّرَ السَّرِيعَ مِائَةَ عَامٍ مَا يَقْطَعُهَا»[4] [بلاشبہ جنت میں ایک درخت ہے (جس کے سائے میں) ایک تیز رفتار چھریرے گھوڑے پر سوار شخص سو سال چلے تو بھی اسے قطع نہ کر سکے]

سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیتِ کریمہ اور ظلِ ممدود کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ جنت میں ایک درخت ہے جس کے سائے میں سوار سو برس چلے اور وہ ختم نہ ہو۔[5] (رواه البخاري) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ جنت میں ایک درخت ہے، سوار اس کے سائے میں سو برس چلے، تم چاہو تو یہ آیت پڑھ لو: ﴿وَظِلٍّ مَّمْدُودٍ﴾[6] (أخرجاه في الصحيحين) مسند احمد میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے الفاظ یہ ہیں کہ جنت میں ایک درخت ہے،

[1] تفسير الطبري (١٦/ ٤٣٦۔ ٤٣٨) تفسير ابن كثير (٢/ ٦٦٦)

[2] تفسير الطبري (١٦/ ٤٤٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٩٨٥)

[3] مسند أحمد (٣/ ٧١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٢٤١)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٨٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٢٧۔ ٢٨٢٨)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٧٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٩٣)

[6] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٨٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٨٢٦)

سوار اس کے سائے میں ستر یا سو برس چلے، یہ شجرۃ الخلد ہے۔[1] اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سدرۃ المنتہیٰ کا ذکر فرماتے ہوئے سنا فرمایا کہ اس کی ایک شاخ کے سائے میں سوار سو برس تک چلتا ہے، یا یوں کہا کہ اس کی ایک شاخ کے سائے میں سو سوار سایہ لے سکتے ہیں، اس میں سونے کے پتنگے ہیں، اس کے پھل سبوئے گل کے برابر ہیں۔[2] (رواہ الترمذي)

سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ تم میں سے جو کوئی جنت میں جائے گا اس کو طوبیٰ کے پاس لے جائیں گے، اس کے شگوفے کھل جائیں گے، وہ جس شگوفے سے چاہے گا لباس لے گا۔ خواہ سفید، خواہ سرخ، خواہ زرد، خواہ سیاہ، جیسے: گل لالہ، بلکہ اس سے بھی زیادہ باریک اور بہتر۔[3] (رواہ محمد بن إسحاق) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: طوبیٰ بہشت میں ایک درخت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے کہے گا کہ میرے بندے کے لیے پھٹ جا۔ اللہ تعالیٰ جس طرح چاہے گا، تب وہ پھٹ جائے گا، اس میں سے گھوڑے زین اور لگام کے ساتھ نکلیں گے اور اونٹ مع نکیل کے نکلیں گے اور جس قسم کی پوشاک وہ چاہے گا، وہ نکلے گی۔[4] امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اس جگہ امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ سے اپنی سند سے ایک طویل اثر جنت اور طوبیٰ کے متعلق روایت کیا ہے۔ چوں کہ یہ ایک سیاق غریب اور اثر عجیب ہے، اس لیے اس کا ذکر اس جگہ نہیں کیا گیا، اگرچہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے بیان کے مطابق اس کے بعض الفاظ کے شواہد صحیحین میں مروی ہیں۔[5]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ مشرکینِ مکہ کہتے تھے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی معجزہ موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کے معجزوں کی طرح نہیں اترا، جیسے عصا و یدِ بیضا و ناقۃ اللہ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم اس کا یہ جواب دو کہ گمراہی اللہ کی مشیت پر موقوف ہے، وہ جسے چاہے گمراہ کر دے، جس طرح تم کو گمراہ کر دیا ہے اور تم آیت (نشانی) کے طالب ہو۔ سو ایسا گمراہ شخص آیات کے نزول اور معجزات کی کثرت سے بھی ہدایت نہیں پاتا۔ گو ہر قسم کا معجزہ کیوں نہ آئے۔ ان کا یہ سوال اقصیٰ مراتب، مقابلہ، دشمنی اور طبیعت کی سختی اور فتنہ میں بڑھ جانے کی وجہ سے تھا، اب ان کے ہدایت پانے کا بھلا کون سا ذریعہ ہے۔ اسی طرح جس کو اللہ چاہتا ہے اسے وہ حق یا اسلام کی طرف لے آتا ہے اور وہ توبہ کر کے اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ نیشاپوری نے کہا کہ انابت کی اصل خیر و بھلائی کے دور میں داخل ہونا ہے۔ وہ لوگ ایمان لائے،

---

[1] مسند أحمد (٢/ ٤٥٥) تفسير الطبري (٢٣/ ١١٥)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٤١) صحيح الترغيب والترهيب (٣/ ٢٦٣)

[3] تفسير ابن كثير (٢/ ٦٦٧) اس کی سند میں ''سعید بن یوسف'' ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الترغيب والترهيب: ٢/ ٤٤٩)

[4] تفسير الطبري (١٦/ ٤٣٨) [5] تفسير الطبري (١٦/ ٤٣٩۔ ٤٤٠) تفسير ابن كثير (٢/ ٦٦٨۔ ٦٦٩)

یعنی جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی اور وہ اللہ کی طرف راجع ہوئے اور اُن کے دل اللہ کے ذکر سے آرام پاتے ہیں، یعنی بے چینی اور اضطراب سے سکون حاصل کرتے ہیں اور اللہ کے ذکر کے ساتھ مانوس ہوتے ہیں۔ زبان سے قرآن کی تلاوت اور تسبیح وتحمید وتکبیر وتوحید کرتے ہیں، یا ان باتوں کو دوسروں کی زبان سے سنتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کا نام ذکر رکھا ہے۔ فرمایا: ﴿ وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ﴾ [الأنبيآء: ٥٠] ''اور یہ (قرآن) بابرکت ذکر ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ ﴾ [الحجر: ٩] ''بے شک ہم ہی نے یہ ذکر (قرآن) نازل کیا۔'' امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ جب صرف اللہ کا ذکر ہوتا ہے تو بغیر شک کے ایمان لاتے ہیں،[1] برخلاف ان لوگوں کے جن کا وصف یہ ہے: ﴿ وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ﴾ [الزمر: ٤٥] ''اور جب تنہا اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان لوگوں کے دل تنگ ہوتے ہیں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔'' بعض نے کہا: اس جگہ ذکر سے مراد طاعت ہے اور کسی نے کہا کہ اللہ کا وعدہ ہے اور کسی نے کہا کہ اللہ کی قسم اٹھانا کہ جب مخالف اللہ کی قسم کھاتا ہے تو ان کا دل تھم جاتا ہے۔ یا مراد اللہ کی رحمت کا ذکر ہے، یا توحید کے دلائل۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اطمینان سے مراد ہشاش بشاش اور مستانس ہونا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ذکر اللہ سے مراد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ عنہم ہیں،[2] لیکن اگر آیت کو ان سب معانی پر محمول کریں تو کوئی ممانعت نہیں۔ ہاں ان دنیاوی امور سے جن کی طرف نفس جھکتا ہے، اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو آرام ملتا ہے۔ اگرچہ اللہ کی مخلوقات اور دوسری اللہ کی بنائی ہوئی چیزوں میں غور وفکر کرنے سے اطمینانِ قلب نصیب ہوتا ہے، لیکن یہ طمانینت اس طمانینت کی طرح نہیں ہے جو اللہ کے ذکر سے حاصل ہوتی ہے۔

اسی طرح ایسے معجزات میں نظر کرنا جو بشری طاقت سے باہر ہیں، طمانیت حاصل نہیں ہوتی جو طمانینت اللہ کے ذکر سے حاصل ہوتی ہے، اس آیت کی ترکیب کو ذکر اللہ کے ساتھ محدود کرنے کی یہی وجہ ہے۔ رہی سورت انفال کی یہ آیت: ﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ ﴾ [الأنفال: ٢] ''(سچے) مومن تو صرف وہ لوگ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں۔'' سو وجل (ڈرنا) اطمینان کی ضد ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ وہ لوگ جب اللہ کی عقوبات (سزاؤں) کو یاد کرتے ہیں تو ڈر جاتے ہیں اور جب مثوبات (ثواب) کو یاد کرتے ہیں تو ٹھہر جاتے ہیں۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ جب یہ آیت اتری تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے فرمایا: تم جانتے ہو اس کے کیا معنی ہیں؟ کہا: اللہ اور رسول جانیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « مَنْ أَحَبَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ وَ أَحَبَّ أَصْحَابِيْ » (أخرجه أبو الشيخ) [جو شخص اللہ، اس کے رسول اور میرے صحابہ سے محبت کرے]

---

[1] معاني القرآن (٣/ ١٤٧) [2] تفسير الطبري (١٦/ ٤٣٢۔ ٤٣٣)

سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « ذٰلِكَ مَنْ أَحَبَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ وَ أَحَبَّ أَهْلَ بَيْتِهِ صَادِقًا غَيْرَ كَاذِبٍ وَأَحَبَّ الْمُؤْمِنِيْنَ شَاهِدًا وَغَائِبًا أَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ يَتَحَابُّوْنَ »[1] ''اس آیت کا مصداق وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول اور اہلِ بیت کو سچے دل سے دوست رکھتے ہیں اور مومنوں کو دوست رکھتے ہیں، وہ حاضر ہوں یا غائب، سن لو! یہ اللہ کے ذکر سے محبت رکھتے ہیں۔'' طوبیٰ بعینہٖ ایک شے کا نام ہے۔ یا ''سلام عليك'' کے معنی کا نکرہ ہے، یا جنت میں ایک درخت ہے، یا خود جنت ہے، یا ہندی زبان میں باغ ہے، یا حبشہ کی زبان میں باغ ہے۔ اس کے علاوہ اور اقوال ہیں جو سلف سے مروی ہیں، لیکن طوبیٰ کی راجح تفسیر وہ ہے جو مرفوعاً ثابت ہے۔

سیدنا عتبہ بن عبد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک اعرابی نے آ کر کہا: اے اللہ کے رسول! جنت میں فاکہ (میوہ، پھل) ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں، اُس میں ایک درخت ہے، جس کو طوبیٰ کہتے ہیں۔[2] (رواه أحمد و ابن جرير و ابن أبي حاتم و الطبراني و ابن مردويه والبيهقي) اسی طرح ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے: « شَجَرَةٌ فِي الْجَنَّةِ مَسِيْرَةَ مِائَةَ عَامٍ... الحديث »[3] (رواه أحمد و أبو يعلىٰ وغيرهما) [جنت میں سو سال کی مسافت کے برابر ایک درخت ہے...] اس بارے میں بہت اخبارِ مرفوعہ اور آثارِ موقوفہ آئے ہیں۔ ﴿وَحُسْنُ مَاٰبٍ﴾ سے مراد حسنِ مرجع، یعنی دارِ آخرت ہے۔ ''وهي الجنة'' اور وہ جنت ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: یعنی حسنِ منقلب، اچھی لوٹ کر جانے والی جگہ۔[4]

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَاۡ عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ۭ قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَابِ ۝۳۰

(جیسے پہلے رسول بھیجے تھے) اسی طرح ہم نے آپ کو ایسی اُمت میں رسول بنا کر بھیجا، جس سے پہلے کئی امتیں گزر چکی ہیں، تاکہ آپ انھیں وہ پڑھ کر سنائیں، جو ہم نے آپ کی طرف وحی کی، اور وہ رحمان کا انکار کرتے ہیں، کہہ دیجیے: وہی میرا رب ہے، اس کے سوا کوئی معبود (برحق) نہیں، میں

---

[1] الدر المنثور (٤/ ٦٤٢)

[2] مسند أحمد (٤/ ١٨٣) تفسير الطبري (١٦/ ٤٤٢) المعجم الكبير (١٧/ ١٢٦) صحيح الترغيب والترهيب (٣/ ٢٦٣)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٨٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٢٨) مسند أحمد (٣/ ٧١) مسند أبي يعلىٰ (٢/ ٥١٩)

[4] تفسير الطبري (٢١/ ٢٢٠) فتح البيان (٧/ ٥٢۔ ٥٦)

نے اس پر توکل کیا ہے اور اسی کی طرف میرا لوٹنا ہے ⑳

رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا مقصد:

یعنی گناہوں سے چھوٹ کر وہ رحمان کے منکر ہوتے ہیں۔ عرب کے لوگ اللہ تعالیٰ کا نام رحمان نہیں بولتے تھے۔ جب قرآن میں یہ نام سنا تو کہنے لگے تو نے اپنا ایک معبود چھوڑ کر دوسرا پکڑا۔ فرمایا کہ وہی میرا ایک رب ہے، جس نام سے بھی پکاروں۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہ ارشاد کیا کہ اے پیغمبر! جس طرح ہم نے تجھ کو اس اُمت میں بھیجا، تاکہ تو ان کو ہمارا اُتارا ہوا کلام سنائے اور تبلیغِ رسالت کرے، اسی طرح گزشتہ اُمتوں میں جو اللہ کی کافر تھیں اور رسولوں کی تکذیب کرتی تھیں، ہم نے اپنے نبی بھیجے تھے۔ تجھ کو ان کی اقتدا کرنا چاہیے، اور جس طرح کہ ہم نے ان امتوں پر اپنی سزا اور تکلیف واقع کی اسی طرح ان لوگوں کو سزا کے آنے سے ڈرنا چاہیے، اس لیے کہ ان کا تجھ کو جھٹلانا اس سے زیادہ سخت ہے کہ کوئی غیر تیری تکذیب کرے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰۤى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ [النحل: ٦٣] ''اللہ کی قسم! البتہ تحقیق ہم نے آپ سے پہلی قوموں کی طرف رسول بھیجے تو شیطان نے ان کے (برے) اعمال ان کے لیے خوش نما کر دیے، چناں چہ آج وہی ان کا دوست ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

نیز فرمایا: ﴿ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَ اُوْذُوْا حَتّٰۤى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِی الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ [الأنعام: ٣٤] ''تو انھوں نے جھٹلائے جانے اور تکلیف دیے جانے پر صبر کیا، حتی کہ ان کے پاس ہماری مدد آپہنچی اور اللہ کے کلمات کو کوئی بدلنے والا نہیں، اور یقیناً آپ کے پاس رسولوں کی کچھ خبریں آچکی ہیں۔'' یعنی ہم نے ان رسولوں کی مدد کی اور ان کے لیے اچھا انجام رکھا۔ ان کے پیروکار دنیا اور آخرت میں کامیاب ہوئے۔

یہ اُمت جس میں ہم نے تجھ کو مبعوث کیا ہے، یہ رحمان کا انکار کرتے ہیں اور اس اسمِ مبارک کا اقرار نہیں کرتے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے وصف رحمان اور رحیم سے عار کرتے ہیں، اسی لیے حدیبیہ کے دن ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' کے لکھنے سے اظہارِ انفت (ناک منہ چڑھایا) کیا اور کہا کہ ہم نہیں جانتے کہ رحمان رحیم کیا ہے۔[1] (قالہ قتادۃ) یہ حدیث صحیح بخاری میں ہے۔[2] نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ﴾ [بني إسرائيل: ١١٠] ''کہہ دیجیے: (اللہ کو) ''اللہ'' کہہ کر پکارو یا ''رحمٰن'' کہہ کر، تم جس نام سے بھی پکارو تو اسی کے لیے اچھے سے اچھے نام ہیں۔'' اور صحیح مسلم میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً آیا ہے کہ « إِنَّ أَحَبَّ الْأَسْمَاءِ إِلَى اللّٰهِ عَبْدُ اللّٰهِ وَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ »[3] یہ دونوں نام اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہیں۔ تو کہہ میرا رب اللہ ہے جس کا تم انکار کرتے ہو، میں نے سب معاملات میں اسی پر بھروسا کیا ہے اور اسی کی

---

[1] تفسیر الطبري (١٦/ ٤٤٥۔ ٤٤٦) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٨١) [3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٣٢)

طرف لوٹنے والا اور متوجہ ہونے والا ہوں، کیوں کہ اس بات کا حق اس کے سوا کسی کو نہیں ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ رحمان وہ ہے، جو اپنے بندوں پر بہت زیادہ رحمت کرنے والا ہو۔ اللہ کی ایک رحمت یہ ہے کہ اس نے رسول بھیجے اور کتابیں اتاریں۔ جیسے اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ [الأنبیاء: ١٠٧] ''اور (اے نبی!) ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر ہی بھیجا ہے۔'' اہلِ جاہلیت ''بسم اللّٰہ'' کے بجائے ''باسمك اللّٰهم'' کہتے تھے۔ سورت فرقان میں فرمایا ہے: ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا﴾ [الفرقان: ٦٠] ''اور جب ان سے کہا جائے رحمان کو سجدہ کرو تو وہ کہتے ہیں: کیا ہے رحمان؟ کیا ہم اسے سجدہ کریں جس کا تو ہمیں حکم دیتا ہے؟ اور اس (تبلیغ) نے ان کو نفرت میں زیادہ کر دیا۔'' یہ آیت نازل ہونے کے لحاظ سے پہلے ہے، اگرچہ قرآن مجید میں بعد میں آتی ہے۔ آیاتِ باب میں کافروں کو اس بات کا اشارہ کیا گیا ہے اور انھیں برانگیختہ کیا گیا ہے کہ وہ اللہ کی طرف رجوع کریں، کفر سے توبہ کریں اور اسلام میں داخل ہو جائیں۔[1]

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ۭ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ۭ اَفَلَمْ يَايْـــَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ لَّوْ يَشَاۗءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿٣١﴾

اور اگر بلاشبہہ (قرآن ایسا ہوتا) کہ اس کے ذریعے سے پہاڑ چلائے جاتے یا اس سے زمین قطع کی جاتی یا اس سے مردے بلوائے جاتے (تو بھی کفار ایمان نہ لاتے) بلکہ سارا معاملہ (اختیار) اللہ ہی کے پاس ہے، کیا پھر ایمان والوں نے (ابھی تک) نہیں جانا کہ اگر اللہ چاہتا تو سب ہی لوگوں کو ہدایت دے دیتا؟ اور جنھوں نے کفر کیا ان کے کرتوتوں پر انھیں آفت پہنچتی ہی رہے گی، یا ان کے گھروں کے قریب اترے گی، حتی کہ اللہ کا وعدہ آ پہنچے۔ بے شک اللہ (اپنے) وعدے کے خلاف نہیں کرتا (31)

قرآنِ مجید کے فضائل اور صفات:

مسلمان چاہتے ہوں گے کہ ایک بڑی سی نشانی آئے تو کافر مسلمان ہو جائیں، اس لیے فرمایا کہ اگر کسی قرآن

[1] فتح البیان (٧/ ٥٧)

سے یہ کام ہوئے ہوتے تو البتہ اس سے پہلے ہوتے، لیکن اختیار اللہ کا ہے اور اسی پر خاطر جمع رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے یوں نہیں چاہا، اگر چاہتا تو حکم کافی تھا، لیکن کافر مسلمان یوں ہوں گے کہ ان پر آفت پڑتی رہے گی۔ ان پر پڑے یا ہمسائے پر جب تک سارے عرب ایمان میں آجائیں۔ وہ آفت یہی مسلمانوں کے ہاتھ سے جہاد کی تھی۔ جو قرآن محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کی تعریف کی اور جتنی کتابیں قرآن سے پہلے اتر چکی ہیں، ان سب پر اس کو فضیلت والا ٹھہرایا اور کہا کہ اگر پہلی کتابوں میں کوئی ایسی کتاب ہوتی، جس سے پہاڑ اپنی جگہ سے چل نکلے ہوتے اور زمین کے ٹکڑے ہو جاتے اور وہ پھٹ جاتی اور مردے اپنی قبروں میں بول اُٹھتے تو یہی قرآن اس قابل ٹھہرتا کہ اس وصف کے ساتھ متصف ہوتا نہ کوئی دوسری کتاب۔ یا یہ قرآن بطریقِ اولیٰ اس طرح کا ہوتا، اس لیے کہ اس میں وہ معجزہ ہے جس کی کسی انسان یا جن کو از اول تا آخر طاقت نہیں ہے۔ اگر وہ سب جمع بھی ہو جائیں، تب بھی اس طرح کا کلام، بلکہ اس جیسی ایک سورت نہیں لا سکتے۔ اس کے باوجود یہ مشرک اللہ کے ساتھ کفر کرتے اور اس کا انکار کرتے ہیں۔

سو تمام امور کا مرجع اللہ کی طرف ہے، وہ جو چاہتا ہے سو ہوتا ہے اور جو نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتا، جس کو اللہ نے گمراہ کیا اس کا کوئی ہادی نہیں ہے اور جس کو ہدایت دی اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں ہے۔ قرآن نام کا اطلاق کبھی ہر پہلی کتاب پر بھی ہوتا ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: « خُفِّفَ عَلٰى دَاوٗدَ الْقِرَاءَةُ فَكَانَ يَأْمُرُ بِدَابَّتِهِ أَنْ تُسْرَجَ، فَكَانَ يَقْرَأُ الْقُرْآنَ مِنْ قَبْلِ أَنْ تُسْرَجَ دَابَّتُهُ، وَكَانَ لَا يَأْكُلُ إِلَّا مِنْ عَمَلِ يَدَيْهِ »[1] (رواه أحمد وانفرد بإخراجه البخاري) ''داود علیہ السلام پر زبور کا پڑھنا آسان تھا۔ سواری پر زین ڈالنے کا حکم کرتے تو زین ڈالنے سے پہلے زبور پڑھ لیتے اور وہ نہیں کھاتے تھے، مگر اپنے ہاتھوں سے کام کر کے۔''

اس حدیث میں قرآن سے مراد زبور ہے کیا ایمان والے یہ بات نہیں سمجھتے کہ اگر اللہ چاہے تو ساری خلق اور تمام لوگوں کو ہدایت کی راہ پر لگا دے، کیوں کہ یہاں کوئی حجت اور معجزہ قرآن سے بڑھ کر موثر اور نفع بخش عقلوں اور جانوں کے لیے نہیں ہے کہ اگر اللہ اُس کو پہاڑ پر اُتارتا تو وہ اللہ کے ڈر سے خاکسار اور پارہ پارہ ہو جاتا۔ صحیح میں مروی ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: « مَا مِنْ نَبِيٍّ إِلَّا وَ قَدْ أُوتِيَ مَا آمَنَ عَلٰى مِثْلِهِ الْبَشَرُ، وَإِنَّمَا كَانَ الَّذِيْ أُوْتِيْتُهُ وَحْيًا أَوْحَاهُ اللّٰهُ إِلَيَّ فَأَرْجُوْ أَنْ أَكُوْنَ أَكْثَرَهُمْ تَابِعًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ »[2] ''ہر نبی کو وہ چیز دی گئی ہے جس پر لوگ ایمان لائیں اور مجھے وحی کی گئی ہے تو مجھے امید ہے کہ قیامت کے دن میرے تابعدار اُن سے زیادہ ہوں گے۔''

اس کا مطلب یہ ٹھہرا کہ ہر نبی کا معجزہ اس کے مرنے سے ختم ہو گیا اور یہ قرآن لوگوں پر ابد الآباد تک کے لیے باقی رہنے والی حجت ہے نہ اس کے عجائب ختم ہوں اور نہ یہ پڑھے جانے اور پیش کیے جانے کے سبب سے پرانا ہو اور

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٣٥) مسند أحمد (٢/ ٣١٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٩٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٢)

نہ علما کا دل اس سے بھرے۔ یہ ایسی مفصل کتاب ہے جس میں کوئی ہزل (فضول بات) نہیں ہے۔ جس جبار نے اس کو ترک کیا، اللہ تعالیٰ نے اُس کا سر توڑ پھوڑ دیا اور جس نے اس کے علاوہ کسی اور سے ہدایت پانے کی جستجو کی اس کو گمراہ کر دیا۔ امام عطیہ عوفی رحمہ اللہ نے کہا کہ لوگوں نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ کاش مکہ کے یہ پہاڑ اپنی جگہ سے سرک جاتے تو ہم یہاں کھیتی کرتے یا ہمارے لیے زمین کے ٹکڑے ہو جاتے جس طرح کہ سلیمان علیہ السلام اپنی قوم کے لیے ہوا سے قطع کرتے تھے یا ہمارے لیے مردے زندہ ہو جاتے جس طرح کہ عیسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے لیے مردوں کو زندہ کر دیتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری۔

عمر بن حسان رحمہ اللہ نے کہا کہ تم اس حدیث کی روایت کسی صحابی سے بھی رکھتے ہو؟ کہا: ہاں، سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ سے۔ انھوں نے اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام شعبی، قتادہ، ثوری اور غیر واحد رحمہم اللہ نے بھی اس آیت کا سببِ نزول اسی طرح بیان کیا ہے۔[2] واللہ أعلم۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ اگر یہ کام تمھارے قرآن کے سوا کسی اور قرآن کے ساتھ کیا گیا ہوتا تو تمھارے قرآن کے ساتھ بھی کیا جاتا۔[3] بلکہ سارا کام اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ جو چاہے سو کرے، جو نہ چاہے سو نہ کرے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔[4]

بہت سے سلف کہتے ہیں: "أفلم يايئس" "أفلم يعلم" کے معنے میں ہے۔ دوسروں کی قراءت یہ ہے: "أفلم تيئس"۔ امام ابوالعالیہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ایمان والے نااُمید ہوگئے، اس سے کہ یہ لوگ ایمان لائیں گے۔[5]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کفار کو تکذیب کے سبب سے ہمیشہ دنیا میں حادثات اور آفات پہنچتے رہتے ہیں یا ان کے آس پاس کے لوگوں پر آفات آتے رہتے ہیں، تاکہ یہ عبرت اور نصیحت پکڑیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴾ [الأحقاف: ٢٧] "اور البتہ تحقیق ہم نے تمھارے آس پاس کی بستیاں ہلاک کر دیں، اور ہم نے آیات پھیر پھیر کر بیان کیں، تاکہ وہ (ہماری طرف) رجوع کریں۔" نیز فرمایا: ﴿ اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ۚ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ٤٤] "کیا پھر وہ نہیں دیکھتے کہ بے شک ہم زمین کو اس کے اطراف سے گھٹاتے آتے ہیں (کفر سمٹ رہا ہے) کیا پھر بھی وہی غالب آنے والے ہیں۔"

امام حسن رحمہ اللہ نے کہا: قارعہ کے نازل ہونے سے مراد ہے کہ ان کے گھر کے قریب۔ ظاہر انداز یہی ہے اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: قارعہ سے مراد سریہ ہے اور نزول سے گھر کے نزدیک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں اور

---

[1] تفسیر ابن کثير (٢/ ٦٧٠) اس کی سند میں "عطیہ عوفی" ضعیف راوی ہے۔ [2] تفسیر ابن کثير (٢/ ٦٧٠)
[3] تفسير الطبري (١٦/ ٤٤٩) [4] تفسير ابن كثير (٢/ ٦٧٠) [5] تفسير ابن كثير (٢/ ٦٧١)

وعدۂ الٰہی سے فتح مکہ مراد ہے۔ امام عکرمہ، سعید بن جبیر اور مجاہد رحمہم اللہ بھی ایک روایت میں اسی کے قائل ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ قارعہ وہ عذاب ہے جو آسمان پر سے اُن پر اترے اور گھر کے پاس نازل ہونے سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نازل ہونا ہے اور اُن کا کفار اور مشرکین سے قتال کرنا ہے۔ امام مجاہد، قتادہ اور عکرمہ رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: قارعہ سے مراد نکبت (ذلت وخواری) ہے اور سب نے یہی کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وعدے سے مراد فتح مکہ ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا کہ قیامت کا دن ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول سے جو مدد کا وعدہ کیا ہے اور اپنے نبی کے متبعین سے دنیا اور آخرت میں وعدہ فرمایا ہے، وہ اس کے خلاف نہیں کرتا۔ ﴿ فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴾ [إبراهيم: ٤٧] ''چناں چہ آپ ہرگز خیال نہ کریں کہ اللہ اپنے رسولوں سے وعدہ خلافی کرے گا۔ بے شک اللہ غالب ہے، انتقام لینے والا۔''[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اگر کسی قرآن کے اترنے اور پڑھنے سے پہاڑ اپنی جگہ سے منتقل ہوتے ہوئے زمین پر سے سرک جاتے یا زمین پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتی اور نہریں اور چشمے جاری ہو جاتے یا مردے زندہ ہو کر بات چیت کرنے لگتے تو یہ قرآن بھی اسی طرح کا ہوتا، یا یہ لوگ تب بھی ایمان نہ لاتے، یا رحمان کے ساتھ کفر کرتے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ اگر یہی بات جو تم کہتے ہو، ٹھیک ہے تو ہمارے اشیاخ (بزرگوں) کو ہمیں دکھا دو، وہ زندہ ہو جائیں اور ہم ان سے کلام کریں اور مکے کے یہ پہاڑ پھیل جائیں، زمین برابر ہوجائے۔ اس پر یہ آیت اتری۔[2]

اللہ تعالیٰ نے اس سوال کے جواب میں یہ فرمایا کہ اس امر کا اختیار اللہ کو ہے، وہ چاہے تو سب ایمان لے آئیں، لیکن جس صورت میں وہ ان سب کا ایمان لانا نہیں چاہتا تو اگر پہاڑ بھی اپنی جگہ سے سرک جائیں، تب بھی ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ کیا ان مومنوں نے یہ بات معلوم نہیں کی ہے کہ اگر اللہ چاہے تو سارے لوگوں کو ہدایت نصیب کر دے، اس کے بغیر کہ یہ لوگ آیات کا مشاہدہ کریں، لیکن یہ بات اس لیے نہیں کی کہ اللہ کی مشیت کا تعلق ان کی راہ یابی کے ساتھ نہیں ہوا۔

یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نہیں چاہا کہ ساری مخلوق کو ہدایت مل جائے۔ پھر عموماً سب کفار کو اور خاص طور پر مکہ کے کفار کو یہ وعید سنائی کہ ان کو ان کے کفر اور رسولوں کی تکذیب کرنے اور خبیث اعمال بجا لانے کے سبب سے کوئی نہ کوئی بلا اور ناگہانی آفت آتی رہتی ہے اور ان کو ہلاک کرتی ہے اور جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک

[1] تفسير الطبري (١٦/ ٤٥٦۔ ٤٦٠) تفسير ابن كثير (٢/ ٦٧١)
[2] المعجم الكبير (١٢/ ١٠٩)

دیتی ہے۔ قارعہ زمانے کی سختی کو کہتے ہیں، اس سے مراد قتل یا گرفتاری یا خشک سالی یا جنگ یا وبا یا اسی طرح کی اور چیزیں ہیں۔ قارعہ عام ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ کسی بلا کو صبح کے وقت یا رات کے وقت آنے والی خاص کیا جائے، یا کسی خواری وخستگی کو خاص کیا جائے۔ پھر کبھی یہ بلا اگر خود اُن پر نہیں آتی تو ان کے گھر بار اور دیار و اطراف کے قریب آتی رہتی ہے۔ یہ اس سے گھبراتے ہیں اور اس کے اثرات دیکھ کر ان کے دل کانپنے لگتے ہیں، یا یہ مطلب ہے کہ اے پیغمبر! آپ ان کے گھروں کے قریب نازل ہو کر ان کا محاصرہ کرو گے، جس طرح کہ طائف کے دن اتفاق ہوا تھا، لیکن پہلی بات زیادہ ظاہر ہے۔

وعدے سے مراد موت ہے یا قیامت کا قائم ہونا۔ جب اللہ کا حتمی وعدہ آجائے گا اور اس کا عذاب نازل ہوگا تو انتہا درجے کی شدت اور عذاب ہوگا۔ یا وعدہ سے مراد قتال کرنے کی اجازت ہے کہ کافروں سے جنگ کرو اور رسول اللہ ﷺ کی مدد اور فتح اور غلبہ ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ فتح مکہ مراد ہے۔[1] یہ آٹھویں سال میں فتح ہوا تھا اور دسویں سال آپ ﷺ نے حج وداع کیا، اس کے سوا کوئی حج نہیں کیا، یعنی ہجرت کے بعد لیکن پہلی بات زیادہ مناسب ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کا خلاف نہیں کرتا۔ اس کا وعدہ لازمی طور پر جاری ہوتا ہے، وعدہ کم نہ زیادہ۔[2]

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَأَمْلَيْتُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا ثُمَّ
أَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ﴿٣٢﴾

اور (اے نبی!) بلاشبہ یقیناً آپ سے پہلے رسولوں کا مذاق اُڑایا گیا، تو میں نے کافروں کو ڈھیل دی، پھر میں نے انھیں پکڑ لیا، پھر میرا عذاب کیسا (عبرت ناک) تھا؟ (32)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو تسلی:

اللہ تعالیٰ نے کفارِ قریش کی تکذیب پر اپنے رسول کو تسلی دی کہ یہ کچھ نئی بات نہیں ہے، بلکہ جس طرح یہ تیرے ساتھ استہزاء کرتے ہیں، اس طرح تجھ سے پہلے کے کفار اگلے رسولوں کے ساتھ دل لگی اور مسخرا پن کر چکے ہیں۔ ہم نے ان کو مہلت اور تاخیر دی تھی، پھر یکا یک ان کو پکڑ لیا تھا۔ تو نے سنا ہوگا کہ ہم نے ان کے ساتھ کیا کیا اور ان کا انجامِ بد کیا ہوا: ﴿ وَكَأَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ أَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ أَخَذْتُهَا وَإِلَيَّ الْمَصِيرُ ﴾ [الحج: ٤٨] ''اور کتنی ہی بستیاں ہیں کہ میں نے انھیں ڈھیل دی جب کہ وہ ظالم تھیں، پھر میں نے انھیں پکڑ لیا اور میری ہی طرف (سب کی) واپسی ہے۔'' صحیحین میں مروی ہے: « إِنَّ اللّٰهَ لَيُمْلِي لِلظَّالِمِ، حَتّٰى إِذَا أَخَذَهُ لَمْ يُفْلِتْهُ » [اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت دے دیتا ہے اور جب اس کو پکڑ لیتا ہے تو پھر جانے نہیں دیتا] پھر نبی مکرم ﷺ نے یہ

[1] تفسير الطبري (١٦/ ٤٥٦) [2] فتح البيان (٧/ ٥٨-٦٠)

آیت پڑھی: ﴿ وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظٰلِمَةٌ ۭ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ﴾ [ھود: ۱۰۲] ’’اور (اے نبی!) آپ کے رب کی پکڑ ایسی ہی ہے جب وہ بستیوں کو پکڑتا ہے، جب کہ وہ ظالم ہوتی ہیں۔ بے شک اس کی پکڑ نہایت دردناک (اور) شدید ہے۔‘‘[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ املاء بہ معنی امہال ہے، یعنی ہم نے ان کو ایک مدت دراز تک عیش و آرام و امن میں چھوڑ دیا، پھر دنیا میں عذاب میں گرفتار کر لیا، جیسے: قحط و قتل اور آخرت میں آگ کا عذاب ہے۔ سو ہمارا عذاب کیسا تھا۔ یہ سوالیہ انداز ان کی سرزنش اور ڈانٹ ڈپٹ کے لیے ہے، یعنی یہ ہمارا پکڑنا ظلم تھا یا عدل ہے کہ اپنے موقع میں واقع ہوا۔ ایسا ہی کام ہم ان لوگوں کے ساتھ بھی کریں گے جو تجھ سے ٹھٹھا مذاق کرتے ہیں۔[2]

اَفَمَنْ هُوَ قَاۗىِٕمٌ عَلٰي كُلِّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ ۚ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَاۗءَ ۭ قُلْ سَمُّوْهُمْ ۭ اَمْ تُنَبِّــــُٔـوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ۭ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ۝۳۳

کیا پھر وہ (اللہ) جو ہر نفس (کے اعمال) پر نگران ہے جو اس نے کمائے، (اس کے مانند کوئی غیر اللہ ہو سکتا ہے؟) اور انھوں نے اللہ کے شریک ٹھہرائے ہیں۔ کہہ دیجیے: ان کے (کمالات اور) نام تو لو، کیا تم اللہ کو اس چیز کی خبر دیتے ہو جسے وہ زمین میں نہیں جانتا؟ بلکہ ظاہر لفظ (کے اعتبار) سے (تم شریک ٹھہراتے ہو)، بلکہ کافروں کے لیے ان کا مکر خوش نما بنا دیا گیا اور انھیں راہِ (حق) سے روک دیا گیا۔ اور جسے اللہ گمراہ کرے اس کے لیے کوئی ہادی نہیں (33)

کہاں اللہ تعالیٰ اور کہاں معبودانِ باطلہ!

یعنی اللہ تعالیٰ ہر جاندار کا نگہبان، جاننے والا اور محافظ ہے۔ اسے سب معلوم ہے جو کچھ یہ لوگ عمل کرتے ہیں، خیر کا عمل یا شر کا عمل۔ اس پر کوئی چھپ کر کیا جانے والا عمل بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ ﴿ وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ﴾ [یونس: ٦١] ’’اور (اے نبی!) آپ جس حال میں بھی ہوتے ہیں اور اللہ کی طرف سے (نازل شدہ) قرآن میں سے جو کچھ بھی پڑھتے

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٤٠٩) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٥٨٣) [2] فتح البیان (٧/ ٦١)

ہیں اورتم لوگ جو بھی عمل کرتے ہو، اس وقت ہم تمھیں دیکھ رہے ہوتے ہیں، جب تم اس میں مصروف ہوتے ہو۔‘‘
اور فرمایا: ﴿ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا ﴾ [الأنعام: ٥٩] ’’اور کوئی پتا ایسا نہیں گرتا جسے وہ جانتا نہ ہو۔‘‘

نیز فرمایا: ﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴾ [هود: ٦] ’’اور زمین پر چلنے والے ہر جاندار کا رزق اللہ کے ذمے ہے، اور وہ جانتا ہے اس کی قرار گاہ اور اس کے دفن ہونے کی جگہ کو۔ ہر چیز واضح کتاب میں (تحریر) ہے۔‘‘ نیز فرمایا: ﴿ سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۭ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ﴾ [الرعد: ١٠] ’’(اللہ کے نزدیک) مساوی ہے تم میں سے جو کوئی آہستہ بات کہے یا بلند آواز سے کہے، اور جو رات (کی تاریکی) میں چھپنے والا ہو یا دن (کی روشنی) میں چلنے والا ہو۔‘‘ نیز فرمایا: ﴿ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴾ [الحديد: ٤] ’’اور تم جہاں کہیں بھی ہو، وہ تمھارے ساتھ ہے۔ اور اللہ اسے خوب دیکھنے والا ہے جو تم عمل کرتے ہو۔‘‘

کیا ایسا شخص جس کا عام علم اس طرح پر ہے وہ مثل اصنام کے ہوسکتا ہے، جن کو یہ لوگ پوجتے ہیں اور وہ نہ سنیں، نہ دیکھیں، نہ سمجھیں، نہ کچھ جانیں اور نہ اپنے نفس کے نفع ونقصان کے مالک ہیں اور نہ اپنے عابدوں کے نفع ونقصان پر قادر ہیں اور نہ اپنی جان سے اور نہ اپنے پوجنے والوں کی جان سے ضرر کو دور کرسکیں۔ یہ جواب ان کی دلالت سیاق کے لیے کافی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ ﴾ یعنی انھوں نے اللہ کے ساتھ اصنام، انداد اور آستانوں کو بھی پوجا۔ اے بنی آدم! تم ان سے یہ بات کہو کہ ہمیں بھی تو بتاؤ کہ ان کے کیا نام ونشان ہیں کہ وہ پہچانے جائیں، کیوں کہ وہ تو محض بے حقیقت ہیں، ان کا وجود ہی نہیں ہے۔ اگر وہ زمین میں ہوتے تو اللہ بھی ان کو جانتا ہوتا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی راز پوشیدہ نہیں ہے۔ یا فقط یہ لوگ باتیں ہی بناتے ہیں۔ وگرنہ ان کی حقیقت کچھ بھی نہیں۔

امام ضحاک اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا کہ ظاہری قول سے مراد قولِ باطل ہے۔[1] یعنی تم نے ان بتوں کو اس گمان پر پوجا ہے کہ یہ کچھ نفع ونقصان پہنچا سکتے ہیں اور تم نے ان کا نام الٰہ رکھا ہے۔ یعنی معبودات: ﴿ اِنْ هِيَ اِلَّاۤ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ﴾ [النجم: ٢٣] ’’یہ تو محض چند نام ہی ہیں جو تم نے اور تمھارے باپ دادوں نے رکھ لیے ہیں، اللہ نے ان کی کوئی دلیل وبرہان نازل نہیں کی، وہ لوگ تو گمان ہی کی پیروی کرتے ہیں اور اس چیز کی جو اُن کے دل چاہتے ہیں، حالاں کہ ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس یقیناً ہدایت آچکی ہے۔‘‘

---

[1] تفسير الطبري (١٦/ ٤٦٦)

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: مکر سے مراد وہ گمراہی ہے، جس میں وہ گرفتار ہیں اور رات دن اس کی طرف بلاتے ہیں۔[1] جیسے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ فَزَيَّنُوْا لَهُمْ مَّا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ﴾ [حٰمٓ السجدۃ: ٢٥] ''اور ہم نے ان کے کچھ (بُرے) ہم نشین مقرر کر دیے تو انھوں نے ان کے اگلے اور پچھلے (تمام) اعمال خوش نما بنا کر ان کو دکھائے۔'' لفظ ﴿ صُدُّوْا ﴾ کو صاد کی زبر سے پڑھا ہے، یعنی اس تزئین کفر کے سبب سے لوگوں کو رسولوں کے صحیح راستے کی اتباع سے روکتے ہیں اور قراءت صاد کی پیش سے بھی ہے، یعنی اس تزئین کی وجہ سے اللہ کی راہ سے روکے گئے ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کرے، اس کو کون ہدایت کرے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ﴾ [المائدۃ: ٤١] ''اور جسے اللہ فتنے میں ڈالنا چاہے تو آپ اللہ کی طرف سے اس کے بارے میں قطعاً کچھ اختیار نہیں رکھتے۔'' نیز فرمایا: ﴿ اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰىهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴾ [النحل: ٣٧] ''(اے نبی!) خواہ آپ ان کی ہدایت کے لیے کتنی ہی حرص کریں تو بے شک اللہ جسے گمراہ کرے اسے ہدایت نہیں دیتا، اور ان (گمراہوں) کا مددگار کوئی بھی نہیں۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ قائم وہ ہے جو نگہبان اور امور کا متولی ہو، مراد اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے، کیوں کہ مخلوق کے تمام امور کا والی، تمام احوال کی تدبیر کرنے والا، اجلوں اور رزق کی تدبیر کرنے والا، ہر نفس کے اعمال کا حساب کرنے والا، وہ کہیں بھی ہو وہی اللہ وحدہ لا شریک لہ ہے اور کافروں کے معبود ان صفتوں کے مالک نہیں، نہ وہ کوئی نفع دے سکتے ہیں، نہ ضرر دے سکتے ہیں۔ آیت سے مراد اللہ اور معبودانِ باطل کے درمیان کسی قسم کی مماثلت کا انکار کرنا ہے۔ بعض نے کہا: قائم سے مراد وہ فرشتے ہیں جو بنی آدم پر مقرر ہیں، لیکن پہلی بات زیادہ مناسب ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام عطا رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ ہر نفس پر قسط اور انصاف کے ساتھ قائم ہے۔[2]

بھلا جن کو انھوں نے اللہ کا شریک ٹھہرایا ہے، یہ ان کے نام تو بتائیں کہ وہ کون ہیں، کہاں ہیں، کس جنس اور قسم سے تعلق رکھتے ہیں، کس صفت کے مالک ہیں؟ یہ ان کو سرزنش اور ڈانٹ ہے، کیوں کہ ایسی بات کسی حقیر چیز کے لیے کہتے ہیں۔ جو توجہ کے لائق نہیں ہے۔ یعنی "سَمِّه إِنْ شِئْتَ، لِأَنَّهُ أَحْقَرُ مِنْ أَنْ يُسَمّٰى" [آپ چاہیں تو اس کا نام لے لیں، جب کہ وہ تو اس سے حقیر ہے کہ اس کا نام لیا جائے] کیا یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو کسی ایسی چیز کی زمین میں موجودگی کی خبر دیتے ہیں، جس کو وہ نہیں جانتا۔ مراد شرکا ہیں، ورنہ غیر اُس کا کوئی شریک زمین میں بھی نہیں ہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٦٧٢) [2] تفسیر الطبري (١٦/ ٤٦٤) الدر المنثور (٤/ ٦٥٥)

یا بہ ظاہران کا نام شرکا رکھا ہے، اس کے بغیر کہ ان کی کوئی اصل یا حقیقت ہو، جس طرح زنگی کو کافور کہتے ہیں۔

بعض نے کہا کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ تم اللہ کو باطل نامعلوم بتاتے ہو یا ظاہر معلوم؟ اگر کہیں کہ ہم باطن نامعلوم بتاتے ہیں تو یہ دعویٰ بالکل باطل ہے اور اگر کہیں کہ ظاہر معلوم بتاتے ہیں تو پھر ان سے ان کے شرکاء کے نام معلوم کرنے چاہییں، اگر لات اور عزیٰ کا نام لیں تو یہ کہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنا کوئی شریک معلوم نہیں ہے۔ یا ظاہر بہ معنی زائل ہے، یعنی باطل۔[1] (قالہ مجاھد) یا جھوٹے قول یا ظنِ باطل بے حقیقت کے معنی میں ہے، جس کی باطن میں کچھ اصلیت نہیں ہے۔ یا ظاہر سے مراد حجت ہے کہ ان کے خیال میں یہ حجت غالب ہے۔

امام طیبی رحمہ اللہ نے اس آیت میں کئی فنِ علمِ بیان ذکر کیے ہیں، جن کا اس جگہ نقل کرنا ضروری نہیں۔ پھر کہا ہے کہ یہ آیت باوجود اتنی مختصر ہونے کے چھے طریقوں پر ہے تو یہ احتجاج منادی باعجاز ہے، پکار کر یہ بات کہتا ہے کہ یہ کلام کسی بشر کا نہیں ہے، بلکہ خالقِ بشر کا ہے۔ وللّٰہ الحمد۔ مزین سے مراد اللہ ہے یا شیطان وسوسہ کے ذریعے۔ مکر کا نام کفر رکھنا جائز ہے، اس لیے کہ جو مکر انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کیا تھا، وہ کفر تھا اور مکر کے حقیقی معنی کید یا ملمع سازی یا اباطیل ہیں، یعنی فریب دہی و ملمع سازی و دغابازی۔[2]

لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ
وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿٣٤﴾ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ اُكُلُهَا دَاۗىِٕمٌ وَّظِلُّهَا ۭ تِلْكَ عُقْبَى
الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ڰ وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ ﴿٣٥﴾

ان کے لیے دنیا کی زندگی میں عذاب ہے اور آخرت کا عذاب تو سخت ترین ہے، اور انھیں اللہ (کے عذاب) سے بچانے والا کوئی نہیں (34) جس جنت کا متقی لوگوں سے وعدہ کیا گیا، اس کی صفت یہ ہے کہ اس کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ اس کے پھل اور اس کے سائے دائمی ہیں۔ یہ ان لوگوں کا انجام ہے جو متقی ہوئے، اور کافروں کا انجام آگ ہے (35)

کافروں کے عذاب اور نیکوکاروں کے ثواب کا بیان:

اللہ نے کافروں کے عذاب اور نیکوکاروں کے ثواب کا ذکر کیا۔ پہلے مشرکوں اور اُن کے کفر و شرک کا حال بیان فرمایا کہ ان کے لیے دنیا کا عذاب ہے کہ ایمان دار لوگ ان کو قتل کرتے ہیں اور گرفتار کرتے ہیں اور جو عذاب ان کے لیے دنیا کی ذلت اور تباہی کے علاوہ آخرت میں ذخیرہ کیا گیا ہے، وہ اس عذاب سے کہیں زیادہ دشوار، سخت

---

[1] تفسیر الطبري (١٦/ ٤٦٦) [2] فتح البیان (٧/ ٦١۔ ٦٣)

اور درشت ہے۔ جس طرح کہ نبی مکرم ﷺ نے متلاعنین سے فرمایا تھا: « إِنَّ عَذَابَ الدُّنْيَا أَهْوَنُ مِنْ عَذَابِ الْآخِرَةِ »[1] [بلاشبہہ دنیا کا عذاب آخرت کے عذاب سے بہت ہلکا ہے]

اور یہ ٹھیک فرمایا، اس لیے کہ دنیا کا عذاب منقضی (ختم) ہو جاتا ہے اور آخرت کا عذاب دائمی اور ہمیشہ رہنے والا ہے، ایسی آگ میں جو دنیا کی آگ سے ستر گنا زیادہ سخت ہے اور ایک ایسی سخت قید میں کہ اس جیسی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهُ أَحَدٌ ﴿٢٥﴾ وَلَا يُوثِقُ وَثَاقَهُ أَحَدٌ ﴾ [الفجر: ۲۵۔ ۲۶] ”چنانچہ اس دن اس جیسا عذاب دینے والا اور کوئی نہیں ہوگا۔ اور اس جیسا جکڑنے والا بھی اور کوئی نہیں ہوگا۔“

نیز فرمایا: ﴿ وَأَعْتَدْنَا لِمَن كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيرًا ﴿١١﴾ إِذَا رَأَتْهُم مِّن مَّكَانٍ بَعِيدٍ سَمِعُوا لَهَا تَغَيُّظًا وَزَفِيرًا ﴿١٢﴾ وَإِذَا أُلْقُوا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِينَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُورًا ﴿١٣﴾ لَّا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُورًا وَاحِدًا وَادْعُوا ثُبُورًا كَثِيرًا ﴿١٤﴾ قُلْ أَذَٰلِكَ خَيْرٌ أَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ ۚ كَانَتْ لَهُمْ جَزَاءً وَمَصِيرًا ﴾ [الفرقان: ۱۱۔ ۱۵] ”لیکن انھوں نے قیامت کو جھٹلایا اور ہم نے اس شخص کے لیے جو قیامت کو جھٹلائے، بھڑکتی آگ تیار کر رکھی ہے۔ جب وہ ان (مجرموں) کو دور دراز جگہ سے دیکھے گی تو وہ اس کا غضب ناک ہونا اور چیخنا چلانا سنیں گے۔ اور جب وہ زنجیروں میں جکڑے اس کی کسی تنگ جگہ میں جھونکے جائیں گے تو وہ وہاں ہلاکت کو پکاریں گے۔ (کہا جائے گا:) تم آج ایک ہلاکت کو مت پکارو، بلکہ بہت سی ہلاکتوں کو پکارو۔ کہہ دیجیے: کیا یہ (عذاب) زیادہ بہتر ہے یا ابدی جنت، جس کا متقین کو وعدہ دیا گیا ہے؟ وہ ان کے لیے جزا اور واپسی کی جگہ ہے۔“

لہٰذا اس کو اس قول کے ساتھ پیوستہ کیا ہے کہ اس جنت کی مثال، یعنی صفت اور خاصیت یہ ہے کہ اس کے کناروں اور اطراف میں نہریں جاری ہیں، جنت والے جہاں چاہیں ان کو لے جائیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مَّثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ ۖ فِيهَا أَنْهَارٌ مِّن مَّاءٍ غَيْرِ آسِنٍ وَأَنْهَارٌ مِّن لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهُ وَأَنْهَارٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشَّارِبِينَ وَأَنْهَارٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ۖ وَلَهُمْ فِيهَا مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ ﴾ [محمد: ۱۵] ”اس جنت کی صفت جس کا متقین سے وعدہ کیا گیا ہے، یہ ہے کہ اس میں (ایسے) پانی کی نہریں ہیں، جو بدلنے والا نہیں، اور ایسے دودھ کی نہریں ہیں، جس کا ذائقہ (کبھی) تبدیل نہ ہوا ہوگا، اور ایسی شراب کی نہریں ہیں، جو پینے والوں کے لیے لذیذ ہے اور صاف شفاف شہد کی نہریں ہیں، اور وہاں ان (متقین) کے لیے ہر طرح کے پھل ہوں گے اور ان کے رب کی طرف سے مغفرت ہوگی۔“ پھر فرمایا کہ اس جنت کے میوے اور کھانے پینے کی چیزیں غیر منقطع ہیں ان کو فنا نہیں۔ صحیحین میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نمازِ کسوف کے قصے میں مروی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہم نے آپ کو دیکھا کہ آپ نے اس جگہ ہاتھ بڑھا کر کچھ لینا چاہا، پھر آپ ہٹ آئے اور رک

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۴۹۳)

گئے، آپ ﷺ نے فرمایا: میں نے بہشت دیکھی، یا مجھے بہشت دکھائی گئی۔ میں نے انگور کا ایک خوشہ لینا چاہا، اگر میں اس کو لے لیتا تو تم اس میں سے دنیا کے باقی رہنے تک کھایا کرتے۔[1]

یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ جنت کا میوہ اور خوارک دائمی ابدی اور غیر فانی ہے۔ وللّٰه الحمد، اللّٰهم ارزقنا بمنك وكرمك وفضلك آمين۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ہم نمازِ ظہر میں تھے کہ اتنے میں نبی اکرم ﷺ آگے بڑھے، پھر کسی شے کو لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا، پھر پیچھے ہٹے، جب نماز ہوچکی تو سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! آج کے دن آپ نے ایسی بات کی، جو ہم نے پہلے آپ کو کرتے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: مجھ پر جنت پیش کی گئی، اپنی رونق، تازگی اور بہار کے ساتھ میں نے اس میں سے انگور کا ایک خوشا لینا چاہا کہ تمھارے پاس لاؤں، لیکن میرے اور اس کے درمیان اوٹ ہوگئی، اگر میں اس کو تمھارے پاس لے آتا تو جتنے لوگ آسمان وزمین کے درمیان ہیں، اگر وہ سب اس میں سے کھاتے تو کم نہ کر سکتے۔[2] (رواه أبو يعلیٰ)

امام مسلم رحمہ اللہ نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کا بعض شاہد روایت کیا ہے۔[3] عتبہ بن عبد السلمی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ایک اعرابی نے نبی مکرم ﷺ سے پوچھا کہ جنت کیا ہے؟ اس میں انگور بھی ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔ کہا: انگور کا خوشا کتنا بڑا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: سفید کوے کا ایک ماہ کا راستہ جبکہ وہ نہ تھکے۔[4] (رواه أحمد)

سیدنا ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ جب کوئی مرد جنت کا پھل توڑے گا تو اس کی جگہ دوسرا پھل آجائے گا۔[5] (رواه الطبراني) سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما مرفوعاً کہتے ہیں کہ جنت والے کھائیں گے اور پئیں گے اور آب بینی و بول و براز کچھ نہ ہوگا۔ ان کا طعام ڈکار ہوگی، جیسے کستوری کی خوشبو، ان کو تسبیح اور تقدیس کا الہام کیا جائے گا جس طرح کہ سانس کا الہام ہوتا ہے۔[6] (رواه مسلم)

سیدنا زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اہلِ کتاب میں سے ایک آدمی آیا اور اس نے کہا: اے ابو القاسم! تم کو زعم ہے کہ اہلِ جنت کھائیں گے اور پئیں گے؟ کہا: ہاں، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد ﷺ کی جان ہے! ان میں سے ایک مرد کو سو مردوں کے برابر کھانے، پینے، جماع اور شہوت کی قوت دی جائے گی، اس نے کہا: جو شخص کھاتا پیتا ہے، اس کو حاجت ہوتی ہے اور جنت میں کوئی اذیت نہ ہوگی، آپ ﷺ نے فرمایا:

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٧١٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٠٧)

② مسند ابی یعلیٰ میں ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے۔ مسند أحمد (٣/ ٣٤٢) مستدرك الحاكم (٤/ ٦٤٧) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

③ صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٠٤) ④ مسند أحمد (٤/ ١٨٣) صحيح الترغيب والترهيب (٣/ ٢٦٣)

⑤ المعجم الكبير (٢/ ١٠٢) اس کی سند میں "عباد بن منصور" ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٣١٤٦)

⑥ صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٣٥)

ان میں سے ہر ایک کی حاجت پسینہ ہوگا، جو ان کی کھالوں سے بہے گا، جیسے کستوری کا نکلنا، اس کا پیٹ سمٹ سکڑ کر ہلکا ہو جائے گا۔[1] (رواه أحمد و النسائي) سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں: تو جنت میں کسی پرندے کی طرف نگاہ کرے گا، وہ بریان (تلا ہوا، بھنا ہوا) ہو کر تیرے سامنے گر پڑے گا۔[2] (رواه الحسن بن عرفة)

بعض احادیث میں مروی ہے کہ جب یہ شخص اس کے کھانے سے فارغ ہوگا تو وہ پھر اللہ کے حکم سے پرندہ ہو کر اڑ جائے گا۔[3] اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَّفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ ۝ لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ ﴾ [الواقعة: ٣٢۔ ٣٣] ''اور وافر پھلوں میں۔ جو نہ تو کبھی ختم ہوں گے اور نہ ممنوع۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا ﴾ [الدهر: ١٤] ''اور اس (جنت) کے سائے ان پر جھکے ہوں گے، اور اس کے (پھلوں کے) گچھے ان کے تابع فرمان بنا دیے جائیں گے۔''

اسی طرح اس کا سایہ نہ گھٹے نہ جائے، بلکہ یہ دستور بنا رہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ لَهُمْ فِيْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ؗ وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا ﴾ [النسآء: ٥٧] ''اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے انھیں ہم جلد ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، وہاں ان کے لیے پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور ہم انھیں گھنی چھاؤں میں داخل کریں گے۔''

اس سے پہلے صحیحین کے حوالے سے یہ بات گزر چکی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت میں ایک درخت ہے، جس کے سائے میں ایک سوار پتلے تیز رو گھوڑے پر سو برس تک چلے اور وہ ختم نہ ہو پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ﴾[4] جنت کے بیان میں حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کی تالیف ''كتاب حادي الأرواح إلى بلاد الأفراح'' ایک بہت اچھی تالیف ہے۔ اللہ تعالیٰ اکثر جنت اور جہنم کی صفت کو ایک دوسرے کے ساتھ بیان فرماتا ہے اور جنت میں رغبت دلاتا اور آگ سے ڈراتا ہے، اس لیے اس جگہ جنت کی تعریف کے بعد یوں فرمایا ہے کہ یہ جنت اہلِ تقویٰ کا انجام ہے۔ رہے کافر سو ان کا انجام آگ اور دوزخ ہے۔ ونعوذ بالله منها۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَا يَسْتَوِيْۤ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ؕ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴾ [الحشر: ٢٠] ''آگ والے (دوزخی) اور باغ والے (جنتی) کبھی برابر نہیں ہو سکتے، جنتی ہی کامیاب ہیں۔''

---

[1] مسند أحمد (٤/ ٣٦٧) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤٥٤) صحيح الترغيب والترهيب (٣/ ٢٦٦)

[2] مسند البزار (٥/ ٤٠١) اس کی سند میں ''حمید اعرج'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٦٧٨٤)

[3] الدر المنثور (٧/ ٣٩١) [4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٨٦۔ ٣٠٨٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٢٨)

حکایت:

بلال بن سعد خطیبِ دمشق نے ایک بار اپنے خطبے میں یہ کہا تھا: "عباد الله هل جاءكم مخبر يخبركم أن شيئا من عبادتكم تقبلت منكم، أو أن شيئا من خطاياكم غفرت لكم ﴿ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴾ والله لو عجل لكم الثواب في الدنيا لاستقللتم كلكم ما افترض عليكم، أو ترغبون في طاعة الله لتعجيل دنياكم ولا تنافسون في جنة ﴿ اُكُلُهَا دَآىِٕمٌ وَّظِلُّهَا ﴾ الاية"[1] (رواه ابن أبي حاتم) [اے اللہ کے بندو! کیا تمھارے کسی عمل کی قبولیت کا یا کسی گناہ کی معافی کا کوئی پروانہ تم میں سے کسی کو ملا؟ "کیا تم نے سمجھا تھا کہ ہم نے تمھیں بے فائدہ پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے۔" اللہ کی قسم! اگر اطاعتِ الٰہی کا بدلہ دنیا میں ہی ملتا تو تم تمام فرائض ادا کرنے پر جم جاتے اور اس جنت کی رغبت نہ کرتے جس کے بارے میں فرمانِ باری تعالیٰ ہے: "اس کے پھل اور اس کے سائے دائمی ہیں۔"]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ان کافروں اور مشرکوں کے لیے دنیا میں قتل، اسیری اور مختلف قسم کی تکالیف کا عذاب ہے اور آخرت کا عذاب اور بھی زیادہ سخت اور شدید ہے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ان کو بچانے والا کوئی نہیں ہے۔ جس جنت کا وعدہ اہلِ تقویٰ کے ساتھ ہے، اس کے نیچے ندیاں بہتی ہیں اور اس کے کھانے دائمی ہیں، جو کہ ختم نہیں ہوتے اور اسی طرح کا فرمان اللہ تعالیٰ کا ہے: ﴿ لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ ﴾ [الواقعة: ٣٣] "جو نہ تو کبھی ختم ہوں گے اور نہ ممنوع۔" ابراہیم تیمی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ان کھانوں کے مزے ہمیشہ منہ میں رہیں گے۔[2] اور بعضوں نے کہا کہ وہ میوہ اپنی قسم کے مطابق ہمیشہ قائم رہے گا۔ جو چیز کھائی جائے گی، اس کی جگہ دوسری چیز اسی طرح کی تر و تازہ آجائے گی۔ اس لیے کہ وہ چیز جو کھائی گئی، دوبارہ بعینہٖ نہیں آئے گی۔

اسی طرح بہشت کا سایہ نہ ختم ہوگا نہ کم۔ اس آیت میں جہم اور اصحابِ جہم کا رد ہے، جو یہ بات کہتے ہیں کہ جنت کی نعمتیں فانی اور منقطع ہونے والی ہیں۔ حالاں کہ یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ اہلِ جنت کی حرکات کبھی ہمیشہ کے سکون کی حالت سے منقطع نہ ہوں گی، جس طرح کہ ابو الہذیل کہتا ہے اور عبدالجبار معتزلی نے اس آیت سے اس امر پر استدلال کیا ہے کہ ابھی جنت پیدا نہیں ہوئی، لیکن اللہ تعالیٰ کا فرمان کہ: ﴿ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴾ وغیرہ آیاتِ بینات اور صحیح احادیث اس قول کو رد کرتی ہیں۔ سو وہ جنت جس کی یہ صفت ہے، اہلِ تقویٰ کا انجام اور نتیجہ اور انتہائے امر ہے، اور کافروں کا انجام یہی آگ ہے، جو دل آزار ہے اور بس۔[3]

---

[1] تفسير ابن كثير (٢/ ٦٧٣۔ ٦٧٤) [2] الدر المنثور (٤/ ٦٥٧) [3] فتح البيان (٧/ ٦٤۔ ٦٥)

وَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَفْرَحُوْنَ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ
وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ یُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ؕ قُلْ اِنَّمَاۤ اُمِرْتُ
اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَاۤ اُشْرِكَ بِهٖ ؕ اِلَیْهِ اَدْعُوْا وَاِلَیْهِ مَاٰبِ ﴿۳۶﴾
وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِیًّا ؕ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ
بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا
وَاقٍ ﴿۳۷﴾

اور جنھیں ہم نے کتاب دی، وہ اس (قرآن) سے خوش ہوتے ہیں جو آپ کی طرف نازل کیا گیا، اور کچھ گروہ ہیں جو اس کے بعض (احکام) کا انکار کرتے ہیں۔ کہہ دیجیے: مجھے تو صرف یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کی عبادت کروں اور اس کے ساتھ شرک نہ کروں۔ اسی کی طرف میں دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف میری واپسی ہے (36) اور اسی طرح ہم نے اس (قرآن) کو عربی (زبان) میں حکم (بنا کر) نازل کیا اور اگر واقعی آپ اس کے بعد بھی ان کی خواہشات کے پیچھے چلے کہ آپ کے پاس علم آچکا تو آپ کے لیے اللہ کے مقابلے میں نہ کوئی حمایتی ہوگا اور نہ کوئی بچانے والا (37)

بعض اہلِ کتاب کی نزولِ قرآن پر خوشی:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے اور وہ اس کتاب کے مقتضا پر قائم ہیں، وہ اس قرآن کے اترنے سے خوش ہوتے ہیں کہ ان کی کتاب میں قرآن پر شواہدِ صدق موجود ہیں اور نبی کریم ﷺ کی بشارت آچکی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓىِٕكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ یَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴾ [البقرة: ۱۲۱] ”جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جس طرح اس کی تلاوت کا حق ہے، وہی لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں اور جو کوئی اس کا انکار کرتا ہے تو وہی ہیں خسارہ پانے والے۔“

نیز فرمایا: ﴿ قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖۤ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ اِذَا یُتْلٰى عَلَیْهِمْ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ﴿۱۰۷﴾ وَّیَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ۱۰۷۔ ۱۰۸] ”کہہ دیجیے: اس پر ایمان لاؤ یا ایمان نہ لاؤ، بلاشبہ جنھیں اس سے پہلے علم دیا گیا، جب ان پر تلاوت کی جاتی ہے تو وہ اپنی ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں۔ اور وہ کہتے ہیں: پاک ہے ہمارا رب، بے شک ہمارے رب کا وعدہ ضرور پورا ہونا ہے۔“ یعنی محمد ﷺ کو بھیجنے کا جو وعدہ اللہ تعالیٰ نے ہماری کتابوں میں کیا ہے وہ حق اور سچا اور ہونے والا

ہے۔ لامحالہ۔ ﴿ وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ﴾ [بني إسرائيل: ۱۰۹] ''اور وہ روتے ہوئے اپنی ٹھوڑیوں کے بل گر پڑتے ہیں اور یہ (قرآن) ان کے خشوع کو زیادہ کرتا ہے۔''

پھر فرمایا کہ بعض گروہ اس چیز کی تکذیب کرتے ہیں جو تجھ پر اتری ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ احزاب سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں، یہی قول امام قتادہ اور ابن زید رحمہ اللہ کا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴾ [آل عمران: ۱۹۹] ''اور بے شک اہل کتاب میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو اللہ پر اور جو کچھ تمھاری طرف نازل کیا گیا اور جو کچھ ان کی طرف نازل کیا گیا، اس پر ایمان لاتے ہیں، وہ اللہ کے سامنے جھکنے والے ہیں، وہ اللہ کی آیتیں تھوڑی قیمت کے بدلے نہیں بیچتے، وہی ہیں جن کا اجر ان کے رب کے پاس ہے، بے شک اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔'' تو کہہ کہ میں اس لیے مبعوث ہوا ہوں کہ اللہ وحدہ لاشریک لہ کی خالص عبادت کروں، جس طرح کہ مجھ سے پہلے کے رسول بھی اسی توحید پر آئے تھے۔ میں اسی راہ راست کی طرف لوگوں کو بلاتا ہوں اور میری بازگشت اسی کی طرف ہے۔

اللہ تعالیٰ نے کہا کہ جس طرح ہم نے تجھ سے پہلے پیغمبر بھیجے اور ان پر کتابیں اتاریں، اسی طرح تجھ پر بھی قرآن نازل کیا ہے۔ یہ قرآن ایک کتاب محکم عربی زبان میں ہے، ہم نے تجھ کو اس قرآن سے شرف بخشا اور دوسروں پر فضیلت دی۔ یہ قرآن ایک روشن آشکار کتاب ہے، جس کے آگے پیچھے کوئی باطل نہیں آتا۔ یہ حکیم وحمید کی طرف سے نازل شدہ ہے، تو اگر ان کی آرا کی پیروی کرے گا، اس علم کے بعد جو اللہ کی طرف سے آیا ہے تو پھر تیرا کوئی دوست اور نگہدار نہیں ہوگا۔ اس آیتِ شریفہ میں ان اہلِ علم کے لیے وعید ہے جو عالم ہوکر گمراہ لوگوں کے راستوں کی پیروی کرتے ہیں باوجود سنتِ نبویہ اور محجتِ محمدیہ کے، جس کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ کتاب سے مراد تورات اور انجیل ہے۔ یعنی یہ کتاب والے قرآن کے اترنے سے خوش دل ہیں، خصوصاً وہ اہلِ کتاب جو مسلمان ہوگئے ہیں، کیوں کہ وہ اپنی کتابوں میں اس قرآن کی تصدیق پاتے ہیں اور بعض گروہ قرآن کے بعض حصوں کا انکار کرتے ہیں، یہ وہ ہیں جو اسلام نہیں لائے۔ یا ان بعض سے مراد کفارِ مکہ مشرکین ہیں۔ بعض نے کہا: کتاب سے مراد قرآن ہے اور اس سے خوش ہونے والے اہلِ اسلام ہیں اور احزاب سے مراد مشرکین اور یہود و نصاریٰ ہیں اور وہ بعض جس کا انکار کرتے ہیں، مراد اُس بعض سے وہ شے ہے، جو کہ ان کے اعتقاد کے مخالف ہے۔ اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور جو اہلِ کتاب ان کے ساتھ ایمان لے آئے

تھے، ان کو یہ بات بری لگی کہ قرآن میں رحمان کا ذکر کم آتا ہے، حالاں کہ تورات میں یہ ذکر بہت آیا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ﴾ [بني إسرائيل: ١١٠] ''کہہ دیجیے: (اللہ کو) ''اللہ'' کہہ کر پکارو یا ''رحمٰن'' کہہ کر، تم جس نام سے بھی پکارو تو اسی کے لیے اچھے سے اچھے نام ہیں۔''

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: خوش ہونے والے نبی مکرم ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم ہیں کہ قرآن سے خوش ہوئے اور اس کی تصدیق کی اور اس کے رسول کو مانا اور احزاب یہود و نصاریٰ اور مجوس ہیں۔ ابن زید رحمہ اللہ نے کہا کہ ان میں جو نبی مکرم ﷺ پر ایمان لائے وہ تو خوش ہوئے اور جو ایمان نہیں لائے، وہ بعض آیات کے منکر ہوئے۔[1] اللہ تعالیٰ نے کہا: اے پیغمبر! تم ان لوگوں سے یہ بات کہہ دو کہ مجھ کو یہ حکم ہے کہ میں صرف اللہ کی عبادت کروں اور کسی طرح پر بھی کسی شے کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤں۔ یہ وہ بات ہے جس پر تمام شریعتیں متفق ہیں اور جتنی ملتیں اور رسول جن کی اقتدا کی جاتی ہے، سب کے سب اس بات پر متفق ہیں کہ توحید کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ میری دعوت اللہ ہی کی عبادت کی طرف ہے نہ کہ غیر کی طرف، اور جزا کے دن میرا مرجع اللہ ہی کی طرف ہے نہ کہ کسی اور کی طرف۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ہر بندے کا لوٹنا اسی کی طرف ہے۔[2]

پھر اللہ تعالیٰ نے قرآن کے بعض فضائل بیان فرمائے اور قرآن سے منہ موڑنے پر وعید سنائی اور جن لوگوں نے قرآن مجید کو بعض دوسری شریعتوں کا ناسخ ہونا اچھا نہ سمجھا، ان کی تردید کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ ہم نے اس قرآن کو، جو اصول و فروع اور شرائعِ حقہ پر مشتمل ہے، اسی طرح پر اتارا ہے، جس طرح کہ پہلے رسولوں پر کتابیں ان کی لغت اور زبان میں اتاری تھیں۔ ویسے ہی یہ قرآن عربی زبان میں ایک مضبوط شے ہے۔ اس کی لغت عرب ہے، اس لغت کا سمجھنا بوجھنا آسان ہے۔ جو فروعی واقعات واقع ہوتے رہتے ہیں، یہ قرآن ان کے بارے میں فیصلہ کرتا ہے، اگرچہ وہ پہلی کتابوں کے مخالف ہو۔ اس لیے کہ تجھ پر کچھ یہ بات واجب نہیں ہے کہ تو ان کی شریعتوں کے مطابق کرے گا۔ اگر تو ایسا کرے گا اور ان کی خواہشات اور آرا کا تابع ہوگا، جیسا کہ وہ تجھ سے موافقت چاہتے ہیں اور اس بات کے طالب ہیں کہ تم ان کے قبلے ہی کی طرف قائم رہو، حالاں کہ تجھ کو اللہ کی طرف سے علم آچکا ہے تو پھر اللہ کے عذاب سے تجھے بچانے والا یا کوئی مددگار نہ ہوگا۔

یہ خطاب اگرچہ نبی مکرم ﷺ کو ہے، لیکن اشارہ اُمت کو ہے، اس لیے کہ جب نبی کریم ﷺ کی اپنی بلند منزلت و رتبہ اور عظیم قدر کے باوجود اس سے ڈرایا جا رہا ہے تو جو شخص رتبے میں آپ سے کم ہے، وہ بطریقِ اولیٰ اس ڈراوے اور اجتناب کا مستحق ہوگا۔[3]

---

[1] تفسیر الطبري (١٦/ ٤٧٣۔ ٤٧٤) [2] تفسیر الطبري (١٦/ ٤٧٤) [3] فتح البیان (٧/ ٦٥۔ ٦٧)

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ؕ
وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ لِكُلِّ اَجَلٍ
كِتَابٌ ﴿۳۸﴾ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۚۖ وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ﴿۳۹﴾

اور بے شک ہم نے آپ سے پہلے کئی رسول بھیجے، اور ہم نے انھیں بیوی بچوں والے بنایا۔ اور کسی رسول کو یہ اختیار نہ تھا کہ وہ کوئی نشانی (معجزہ) لائے مگر اللہ کے اذن سے۔ ہر مقررہ وقت کے لیے ایک کتاب (لکھا ہوا وقت) ہے (38) اللہ جسے چاہتا ہے مٹاتا ہے اور (جسے چاہے) ثابت رکھتا ہے، اور اسی کے پاس اصل کتاب ہے (39)

سارے رسول بشر اور بیوی بچوں والے تھے:

دنیا میں ہر چیز اسباب سے ہے، بعض اسباب ظاہر ہیں، بعض چھپے ہیں، اسباب کی تاثیر کا ایک انداز ہے، جب اللہ چاہے اس کی تاثیر اندازے سے کم یا زیادہ کر دے، جب چاہے ویسے ہی رکھے۔ آدمی کبھی کنکر سے مر جاتا ہے اور گولی سے بچ جاتا ہے اور ہر چیز کا ایک اندازہ اللہ کے علم میں ہے جو ہرگز نہیں بدلتا۔ اندازے کو تقدیر کہتے ہے۔ یہ دو تقدیریں ہیں: ایک بدلتی ہے اور ایک نہیں بدلتی۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں یہ فرماتا ہے کہ اے پیغمبر! ہم نے تجھ کو ایک رسول بشر بنایا ہے، اسی طرح تجھ سے پہلے جو رسول مبعوث کیے تھے، وہ بھی سب بشر تھے، کھانا کھاتے تھے، بازاروں میں چلتے تھے، بیویوں کے پاس آتے جاتے تھے، ان کی اولاد ہوتی۔ ہم نے ان کو بیویاں اور اولاد دی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اشرف رسل اور خاتم الانبیا ﷺ سے فرمایا: ﴿ قُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰۤى ﴾ [الكهف: ١١٠] ''(اے نبی!) کہہ دیجیے: میں تو بس تمھاری ہی طرح بشر ہوں، میری طرف وحی کی جاتی ہے۔''

صحیحین میں مروی ہے: «أَمَّا أَنَا فَأَصُوْمُ وَأُفْطِرُ، وَأَقُوْمُ وَأَنَامُ، وَآكُلُ اللَّحْمَ، وَ أَتَزَوَّجُ النِّسَآءَ، فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ »[1] ''اور میں تو روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں اور کھڑا ہوتا ہوں اور سوتا ہوں اور گوشت کھاتا ہوں اور عورتوں سے نکاح کرتا ہوں (یہ میرا طریق ہے) جس نے میرے طریق سے منہ پھیرا، وہ مجھ سے نہیں ہے۔'' سیدنا ابو ایوب رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا: «أَرْبَعٌ مِنْ سُنَنِ الْمُرْسَلِيْنَ: اَلتَّعَطُّرُ وَالنِّكَاحُ وَالسِّوَاكُ وَالْحِنَاءُ »[2] (رواه أحمد والترمذي أيضا وهو أصح) ''چار چیزیں پیغمبروں کی سنت میں سے ہیں: عطر لگانا، نکاح کرنا، مسواک کرنا اور منہدی لگانا۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٧٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٠١) صحیحین کی روایت میں ''وآكل اللحم'' کے الفاظ نہیں ہیں۔

[2] مسند أحمد (٥/ ٤٢١) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٠٨٠) مصنف ابن أبي شيبة (١/ ١٥٦) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: إرواء الغليل (١/ ١١٦)

کوئی رسول اپنی مرضی سے معجزہ لانے کا اختیار نہیں رکھتا:

کوئی رسول اپنی قوم کے پاس کوئی خارقِ عادت (کرامت، معجزہ) نہیں لاتا تھا، مگر اللہ کے اذن سے۔ یہ بات کچھ اس کے اختیار میں نہ تھی، بلکہ اس کا اختیار اللہ کو ہے۔ ''یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ وَیَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ'' ''جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو ارادہ کرتا ہے، حکم کرتا ہے۔'' جب پیغمبروں کو معجزہ لانے کا کوئی اختیار نہ ہوا تو پھر پیر، شہید، شیخ، صوفی اور اس جیسے کس قطار وشمار میں ہیں کہ وہ اپنی خود مختاری سے کوئی کرامت کر سکیں یا کسی کا بھلا یا برا کر دیں۔ ہر مدتِ مضروب کے لیے ایک کتاب مکتوب ہے اور ہر شے اللہ کے نزدیک ایک مقدار پر ہے: ﴿اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ فِیْ كِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیْرٌ﴾ [الحج: ۷۰] ''کیا آپ نہیں جانتے کہ بے شک اللہ ہی جانتا ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے، بلاشبہ یہ (سب کچھ) کتاب (لوحِ محفوظ) میں (درج) ہے، بے شک یہ اللہ پر بالکل آسان ہے۔'' امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر کتاب کے لیے، جو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے اتاری ہے، مدت رکھی گئی ہے اور مقدار معین ہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک، اس لیے اللہ اُس میں سے جو چاہتا ہے وہ مٹا دیتا ہے یا ثابت رکھتا ہے۔ یعنی یہاں تک کہ وہ سب کتابیں اس قرآن پاک سے منسوخ ہو گئیں۔[1]

کتاب میں مٹانے اور ثابت رکھنے کا مفہوم:

مفسرین نے اس مٹا دینے اور ثابت رکھنے میں اختلاف کیا ہے۔ امام ثوری، وکیع اور ہشیم وغیرہم رحمہم اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک سال کے کام کی تدبیر کرتا ہے، پھر جس طرح چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور ثابت رکھتا ہے، مگر بدبختی و نیک بختی اور زندگی اور موت، یعنی ان میں کوئی تغیر و تبدیل نہیں ہوتا، کیوں کہ وہ ان سے فارغ ہو چکا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ ماحی (مٹانے والا) ومثبت (ثابت رکھنے والا) ہے، مگر زندگی اور موت اور بدبختی اور نیک بختی کہ یہ متغیر نہیں ہوتے۔ امام منصور رحمہ اللہ نے کہا کہ میں نے امام مجاہد رحمہ اللہ سے سوال کیا کہ بھلا ہم میں کوئی یہ دعا کرتا ہے: ''اللّٰهم إن كان اسمي في السعدآء فأثبته فيهم، وإن كان في الأشقيآء فامحه عنهم، واجعله في السعدآء'' ''اے اللہ! اگر میرا نام نیکوں میں درج ہے تو ان میں ثابت رکھ اور اگر بدبختوں میں درج ہے تو ان سے کاٹ دے اور نیکوں میں درج کر۔'' کہا کہ یہ اچھی دعا ہے۔ پھر ایک سال یا اس سے زیادہ عرصے کے بعد ملاقات ہوئی، میں نے پھر یہی سوال کیا۔ کہا: ﴿اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ﴾ [الدخان: ۳] ''بلاشبہ ہم نے اسے ایک بابرکت رات میں نازل کیا۔'' آخر دو آیت تک۔ کہا حکم دیتا ہے شبِ قدر میں اس چیز کا جو سال بھر تک ہونے والی ہے، رزق و مصیبت میں سے۔ پھر جس شے کو چاہتا ہے

[1] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۶۷۵)

مقدم و موخر فرماتا ہے۔

رہی کتابِ سعادت و شقاوت، سو وہ ثابت ہے تبدیل نہیں ہوتی۔ شقیق بن سلمہ رحمہ اللہ اکثر یہ دعا کرتے تھے: "اللّٰهم إن كنت كتبتنا أشقيآء فامحه، واكتبنا سعدآء، وإن كنت كتبتنا سعدآء فأثبتنا، فإنك تمحو ما تشآء وتثبت وعندك أم الكتب" (رواه ابن جرير) "اے اللہ! اگر تو نے ہم کو بدبخت لکھا ہے تو اُس کو مٹا دے اور ہم کو نیکوں میں لکھ دے اور اگر تو نے ہم کو نیک بخت لکھا ہے تو ہم کو ثابت رکھ، کیونکہ تو جس چیز کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے اور تیرے ہی پاس اصل کتاب ہے۔" ابو عثمان نہدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عمر بن خطاب طواف کرتے تھے اور روتے تھے اور کہتے تھے کہ اے اللہ! اگر تو نے مجھ پر بدبختی لکھی ہو یا کوئی گناہ تو تو اس کو مٹا دے، کیوں کہ تو محو کرتا ہے جو چاہے اور ثابت رکھتا ہے جس کو چاہے۔ تیرے پاس ام الکتاب ہے تو اس کو سعادت و مغفرت کر دے۔ دعا کے الفاظ یہ ہیں: "اللّٰهم إن كنت كتبت علي شقوة أو ذنباً فامحه فإنك تمحو ما تشآء وتثبت، وعندك أم الكتب فاجعله سعادة ومغفرة" (رواه ابن جرير)

امام ابو قلابہ نے کہا کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بھی یہ دعا کرتے تھے۔ ایک دفعہ سیدنا کعب رضی اللہ عنہ نے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے کہا: اے امیر المومنین! اگر ایک آیت اللہ کی کتاب میں نہ ہوتی تو میں تم کو یومِ قیامت تک کی خبر دیتا، کہا: وہ کون سی آیت ہے؟ کہا: اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۖ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ ﴾[1] (آیتِ باب)۔ ان اقوال کے معنی یہ ہیں کہ تقدیروں میں سے جس کو اللہ چاہتا ہے منسوخ کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے۔ اس قول کو سیدنا ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے لیا گیا ہے، وہ مرفوعاً کہتے ہیں: « إِنَّ الرَّجُلَ لَيُحْرَمُ الرِّزْقَ بِالذَّنْبِ يُصِيبُهُ، وَلَا يَرُدُّ الْقَدَرَ إِلَّا الدُّعَاءَ، وَلَا يَزِيدُ فِي الْعُمُرِ إِلَّا الْبِرَّ »[2] (رواه أحمد و النسائي و ابن ماجه) "مرد اپنے گناہ کے سبب سے، جو وہ کر بیٹھتا ہے، رزق سے محروم رہ جاتا ہے اور تقدیر کو دعا کے سوا کوئی چیز نہیں پھیرتی اور عمر کو بھلائی بڑھاتی ہے۔" اور صحیح میں ثابت ہوا ہے: « إِنَّ صِلَةَ الرَّحِمِ تَزِيدُ فِي الْعُمُرِ »[3] [صلہ رحمی عمر میں برکت عطا کرتی ہے] نیز دوسری حدیث میں مروی ہے: « إِنَّ الدُّعَآءَ وَالْقَضَآءَ لَيَعْتَلِجَانِ بَيْنَ

---

[1] تفسير الطبري (١٦/ ٤٧٧۔٤٨٤)

[2] مسند أحمد (٥/ ٢٨٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٩٠) اس حدیث کا پہلا حصہ "مرد اپنے گناہ کے سبب سے جو وہ کر بیٹھتا ہے، رزق سے محروم رہ جاتا ہے۔" صحیح نہیں ہے، البتہ باقی حدیث صحیح ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٥٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٦١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٥٧) المعجم الكبير (٨/ ٢٦١) اس کی سند میں "زکریا بن منظور" ضعیف راوی ہے۔ (مجمع الزوائد: ١٠/ ٢١٩)

السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ ﴾[1] ''دعا اور تقدیر دونوں آسمان اور زمین کے درمیان مقابلہ کرتی ہیں۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اللہ کی ایک لوحِ محفوظ ہے، پانچ سو سال کی راہ تک وہ سفید موتی کی طرح ہے، اس کی دو دفتیاں ہیں یاقوت کی۔ یہ دو دفتیاں بھی دو تختیاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان میں ۶۳ بار نظر کرتا ہے، پھر جو چاہے مٹا دے اور جو چاہے ثابت رکھے، اُس کے پاس کتاب کی اصل ہے۔[2] سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «يُفْتَحُ الذِّكْرُ فِيْ ثَلَاثِ سَاعَاتٍ يَبْقَيْنَ مِنَ اللَّيْلِ فِي السَّاعَةِ الْأُوْلىٰ مِنْهَا يَنْظُرُ فِي الذِّكْرِ الَّذِيْ لَا يَنْظُرُ فِيْهِ أَحَدٌ غَيْرُهُ فَيَمْحُوْ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ. الحديث »[3] (رواه ابن جرير) ''جب رات کی تین گھڑی باقی رہ جاتی ہے تو لوح محفوظ کھولی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ پہلی ساعت میں لوحِ محفوظ میں نظر کرتا ہے، جس میں سے اس کے سوا کوئی نہیں دیکھتا تو جس کو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے، اسے رہنے دیتا ہے۔''

امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا کہ مٹانا اور ثابت رکھنا رزق اور اجل کی کمی بیشی ہے۔ کہا کہ تم سے یہ بات کس نے کہی ہے؟ کہا کہ ابو صالح رحمہ اللہ نے سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے اور سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ پھر اس کے بعد ان سے اس آیت کے بارے میں سوال کیا تو کہا: ہر بات لکھی جاتی ہے، یہاں تک کہ جمعرات کے دن ہر وہ چیز جس میں نہ کچھ ثواب ہے نہ سزا، نکال دی جاتی ہے، جیسے تیرا یہ قول: ''أكلت و شربت دخلت و خرجت'' ''میں نے کھایا اور پیا، میں داخل ہوا اور نکلا'' اور اسی طرح کا اور کلام جس میں وہ سچا ہے اور جس چیز میں ثواب ہے یا اس پر عذاب ہے، وہ ثابت رکھی جاتی ہے۔[4]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہ دو کتابیں ہیں: ایک کتاب میں اللہ محو کرتا ہے یا اثبات کرتا ہے، دوسری ام الکتاب ہے، وہ اللہ کے پاس ہے۔[5] اس کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ ایک شخص ایک زمانے تک اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے۔ پھر اللہ کی معصیت کرنے لگتا ہے اور اسی گمراہی پر مرجاتا ہے۔ سو یہ محو ہے اور کوئی آدمی اللہ کی معصیت کرتا ہے اور اس کے لیے خیر پہلے سے لکھی جا چکی ہے، یہاں تک کہ اللہ کی اطاعت میں مرتا ہے سو یہ اثبات ہے۔[6]

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیتِ باب اس آیت کے ہم معنی ہے: ﴿ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ [البقرة: ٢٨٤] ''پھر جسے وہ چاہے گا بخش دے گا اور جسے چاہے گا

---

[1] المعجم الأوسط (٣/ ٦٦) [2] تفسير الطبري (١٦/ ٤٨٩)

[3] كشف الأستار (٤/ ٨٣) تفسير الطبري (١٦/ ٤٨٩) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''وفيه زيادة بن محمد وهو ضعيف'' (مجمع الزوائد: ١٠/ ٧٦٠)

[4] تفسير الطبري (١٦/ ٤٨٤۔ ٤٨٥) اس کی سند میں ''محمد بن سائب کلبی'' سخت ضعیف راوی ہے۔

[5] تفسير الطبري (١٦/ ٤٨٠) [6] تفسير الطبري (١٦/ ٤٨٣)

عذاب دے گا اور اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔"[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: "يبدل ما يشآء فينسخه، ويثبت ما يشآء فلا يبدله، وعنده أم الكتب" "جس کی تبدیلی چاہتا ہے اُس کو مٹا دیتا ہے اور جس کو رکھنا چاہتا ہے اس کو نہیں مٹاتا اور اس کے پاس اصل کتاب ہے۔" یعنی یہ سب اس کے نزدیک ام الکتاب ناسخ میں ہے جو تبدیل واثبات ہوتا ہے وہ سب کتاب میں لکھا ہوا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ آیت اس قول کی طرح ہے: ﴿ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ۗ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ [البقرة: ١٠٦] "جو آیت ہم منسوخ کرتے ہیں یا اسے بھلوا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اسی کی مثل ہی لے آتے ہیں۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ بے شک اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے؟۔"

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ جب یہ آیت اتری: ﴿ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ (آیت باب) تو کفارِ قریش نے کہا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کسی شے کے مالک نہیں ہیں، یعنی ان کو کچھ بھی کسی چیز کا اختیار نہیں ہے کہ کچھ کر سکیں اور جو کچھ ہونا تھا، وہ ہو چکا۔ اس امر سے فراغت حاصل ہو گئی ہے۔ اس پر یہ آیت خوف دلانے اور وعید کے لیے نازل ہوئی۔ یعنی اگر ہم چاہیں تو کوئی امر جدید پیدا کریں۔ رمضان میں رزق کا محو اور اثبات، اسی طرح مصائب اور عطائے ربانی یا قسمت میں سے کچھ محو و اثبات ہوا کرتا ہے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا کہ جس کی اجل آتی ہے وہ چلا جاتا ہے اور جس کی زندگی باقی ہے وہ اپنی اجل تک باقی رہتا ہے۔ اسی قول کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔[2]

اور ام الکتاب سے مراد حلال حرام ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ جملة الکتاب اور اس کی اصل ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کتاب رب العالمین ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کعب رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ ام الکتاب کیا ہے؟ کہا کہ اللہ کا علم، وہ جانتا ہے کہ میں خالق ہوں اور میری خلق کیا کرتی ہے۔ پھر اپنے علم سے کہا کہ تو ایک کتاب بن جا، وہ کتاب ہو گیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اُم الکتاب سے مراد ذکر ہے۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ہم نے جتنے رسول تجھ سے پہلے بھیجے ہیں وہ سب آدمی تھے، جنس بشر سے تھے، ان کی بیبیاں تھیں، ان سے اولاد ہوتی تھی، کچھ وہ فرشتے نہ تھے کہ بیوی رکھیں اور نہ اولاد۔ اس آیت میں اس پر رد ہے جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر عورتوں سے نکاح کے بارے میں رد کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ سارے مرسلین کی یہی شان تھی، پھر خاتم الرسل پر انکار کرنے کی کیا وجہ ہے؟! سلیمان علیہ السلام کی تین سو بیویاں اور سات سو کنیزیں تھیں، اس سے ان کی

[1] تفسير ابن كثير (٢/ ٦٧٦) [2] تفسير الطبري (١٦/ ٤٨٥۔ ٤٨٨) [3] تفسير الطبري (١٦/ ٤٩٠۔ ٤٩١)

نبوت میں کچھ عیب نہیں ہے۔ ان کے باپ داود علیہ السلام کی سو بیبیاں تھیں۔ بالجملہ اللہ کے سارے رسل کھاتے پیتے اور نکاح کرتے تھے۔ پھر اس بات سے نبی مکرم ﷺ کی نبوت پر کیا عیب لگایا جاسکتا ہے۔ سیدنا سمرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے تبتل سے منع فرمایا ہے، یعنی عورتوں سے علاحدہ ہو جانا۔[1] (أخرجه ابن ماجة و الطبراني و ابن المنذر و ابن أبي حاتم و أبو الشيخ و ابن مردويه)

سعد بن ہشام رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس گیا اور میں نے کہا کہ میرا ارادہ ہے کہ میں نکاح نہ کروں متبتل رہوں۔ انھوں نے کہا: تو ایسا نہ کر، کیا تو نے اللہ کا فرمان نہیں سنا: ﴿ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا ... الخ ﴾[2] (أخرجه ابن أبي حاتم و ابن مردوية) تبتل کی ممانعت اور نکاح کی ترغیب میں احادیثِ معروفہ مروی ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کی سات عدد اولاد تھی: چار لڑکیاں اور تین لڑکے۔ ان کی ولادت کی ترتیب یہ ہے: قاسم، زینب، رقیہ، فاطمہ، اُم کلثوم، عبداللہ ملقب بہ طیب و طاہر اور ابراہیم رضی اللہ عنہم۔ یہ سب سوائے ابراہیم کے سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے تھے۔ ابراہیم رضی اللہ عنہ ماریہ قبطیہ سے پیدا ہوئے اور یہ سب اولاد نبی مکرم ﷺ کی حیات میں انتقال کر گئی، مگر فاطمہ رضی اللہ عنہا کہ یہ نبی کریم ﷺ کے بعد چھے ماہ تک زندہ رہیں اور بس۔

پھر اللہ تعالیٰ نے کہا کہ کسی رسول کا یہ کام اور اختیار نہیں ہے کہ وہ کوئی نشانی لائے، مگر اللہ کے اذن وحکم سے۔ اگر اللہ چاہے گا تو ظاہر ہوگی اور نہ چاہے گا تو ظاہر نہ ہوگی، کیوں کہ سارے رسول اللہ کے پرورش کنندہ، مقہور، مغلوب اور محکوم علیہم اور متصرف فیہم ہیں، وہ کچھ مختار اور صاحبِ تصرف نہیں ہیں کہ جو چاہیں کریں اور نشانی یعنی معجزہ و کرامت وخرق عادت کوئی چیز لے آئیں۔ یہ بات تو صرف اللہ تعالیٰ کے ارادے، اذن، مشیت و اجازت پر موقوف ہے۔ ہر اجل یعنی ہر امر کے لیے جو اللہ نے حکم دیا ہے، یا اوقات میں سے ہر وقت کے لیے جس میں اللہ تعالیٰ نے کسی امر کے واقع ہونے کا حکم دے رکھا ہے، ایک کتاب ہے، جس کو اللہ تعالیٰ بندوں پر لکھتا ہے اور ان کے بارے میں اس کے مطابق حکم فرماتا ہے۔

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا کہ اس جگہ تقدیم تاخیر ہے، یعنی "لكل كتاب أجل" یعنی ہر امر جس کو اللہ نے لکھ رکھا ہے اس کے لئے ایک اجل موجل اور ایک وقت معلوم ہے۔ جیسے اللہ سبحانہ کا فرمان ہے: ﴿ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ﴾ [الأنعام: ٦٧] "ہر ایک خبر کا وقت مقرر ہے۔" جہاں کا کاروبار کچھ کفار کے ارادے اور فرمائشوں پر نہیں چلتا ہے، بلکہ اللہ کی مشیت اور پسندیدگی پر چلتا ہے۔ اس میں ان کے اجل اور اعمال اور معجزات اور عذاب لانے کے لیے جلدی

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٠٨٢) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٢١٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٤٩) المعجم الكبير (٧/ ٢١٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٨٦٧)

[2] فتح القدير (٣/ ١٢١)

مچانے کی تردید ہے۔ نبی اکرم ﷺ جب ان کو ڈراتے تو وہ دشمنی کی راہ سے جلدی مچاتے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان پر رد کیا۔ اس جگہ اجل سے مراد موجود چیزوں کے لیے مقررہ مدت ہے۔ ہر موجود کے لیے ایک زمانہ ہے جس میں وہ محدود ہوکر پایا جاتا ہے، وہ وقت نہ بڑھتا ہے نہ گھٹتا ہے۔

کتاب سے مراد صحفِ ملائکہ ہیں جن کو وہ فرشتے لوحِ محفوظ سے نقل کرتے ہیں، یا خود لوح مراد ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس کتاب میں سے جو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جو چاہتا ہے وہ ثابت رکھتا ہے۔ ظاہر قرآن عام ہے ہر مٹانے اور ثابت رکھنے کو، سعادت ہو یا بدبختی، رزق ہو یا عمر، خیر ہو یا شر۔ ایک کی جگہ دوسری چیز بدل دیتا ہے۔ ﴿لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ﴾ [الأنبياء: ٢٣] ''وہ جو کچھ کرتا ہے اس کی بابت اس سے سوال نہیں کیا جا سکتا، جب کہ ان (لوگوں) سے باز پرس کی جائے گی۔'' سیدنا عمر، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم، امام ابو وائل، قتادہ، ضحاک اور ابن جریج رحمہ اللہ وغیرہم اسی طرف گئے ہیں، یعنی ظاہر نظمِ قرآنی کے مطابق آیتِ شریفہ کی عمومیت کے قائل ہیں[1] اور بعض نے کہا کہ آیت نیک بختی اور بدبختی کے ساتھ خاص ہے۔

یا مراد شریعتوں کا محو کرنا اور ثابت رکھنا ہے کہ کسی کو منسوخ فرماتا ہے اور کسی کو ثابت فرماتا ہے۔ یا مراد بندوں کے گناہ ہیں کہ توبہ سے محو ہو جاتے ہیں اور توبہ نہ کرنے سے ثابت رہتے ہیں۔ یا مراد آبا کو محو کرنا اور اولاد کو باقی رکھنا ہے۔ یا چاند کو محو کرنا اور سورج کو ثابت رکھنا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً﴾ [بني إسرائيل: ١٢] ''پھر ہم نے رات کی نشانی تو محو (بے نور) کر دی اور دن کی نشانی روشن بنائی۔'' یا محو سے مراد قبضِ روح ہے نیند کے وقت، اور اثبات سے مراد روح کا لوٹانا ہے۔ یا قرون کا مٹانا اور باقی رکھنا منظور ہے۔ یا دنیا کا محو کرنا اور آخرت کا ثابت رکھنا۔ اس کے سوا اور بہت سے اقوال ہیں جن کے ذکر کرنے کی کچھ ضرورت نہیں، لیکن پہلی بات زیادہ مناسب ہے، یعنی مٹانے اور ثابت رکھنے کو عام معنوں میں لینا۔

اُم الکتاب سے مراد لوحِ محفوظ ہے۔ اُمّ اصل شے کو کہتے ہیں، جیسے اُم الراس دماغ ہے اور اُم القریٰ مکہ مکرمہ۔ آیتِ شریفہ سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ چاہتا ہے وہ لوحِ محفوظ سے محو کرتا ہے، وہ کالعدم ہو جاتا ہے اور جو کچھ چاہتا ہے وہ ثابت رکھتا ہے، اسی میں اللہ کے ارادے اور مشیت کے تقاضے کے مطابق قضا و قدر جاری ہوتی ہے۔ اور یہ کچھ اس حدیث کے خلاف نہیں ہے: « جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا هُوَ كَائِنٌ »[2] ''جو کچھ ہونا تھا، وہ لکھ کر قلم خشک ہوگیا ہے۔'' کیوں کہ مٹانا اور ثابت رکھنا بھی من جملہ اللہ کی قضا و قدر کے ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ حذر قدر سے نہیں بچاتا، لیکن اللہ دعا سے قدر کو محو کر دیتا ہے۔[3] قیس بن

[1] فتح القدير (٣/ ١٢١)
[2] مسند أحمد (٢/ ١٩٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٠٧٦)
[3] مستدرك الحاكم (٢/ ٣٨٠) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

عباد رحمه اللہ نے کہا کہ دس رجب کو یہ محو و اثبات ہوا کرتا ہے۔[1] رافضہ نے اس آیت سے اپنے مذہب بَدَا پر استدلال کیا ہے، یعنی ایک شے کا اعتقاد کیا، پھر یہ بات ظاہر ہوئی کہ امر اس اعتقاد کے برخلاف تھا۔ وہ اس بَدَا کو اللہ تعالیٰ کے لیے جائز بتاتے ہیں۔ سوان کا یہ مذہب ظاہری فساد ہے، کیوں کہ اللہ کا علم ایک صفتِ قدیم ازلی ہے۔ اس میں تغیر و تبدل کی گنجایش نہیں اور محو اور اثبات من جملہ اس کے ازلی علم میں سے ہیں، کچھ بَدَا کے باب سے نہیں ہیں۔ اس کو اپنی خلق کا علم "ما کان و ما یکون" (جو کچھ تھا اور جو کچھ ہونے والا ہے) حاصل ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میری خلق کیا عمل کرتی ہے۔[2]

وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ﴿۴۰﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ ؕ وَهُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۴۱﴾

اور (اے نبی!) اگر ہم واقعی آپ کو اس (عذاب) کا کچھ حصہ دکھا دیں جس کا ہم ان سے وعدہ کرتے ہیں یا آپ کو وفات دے دیں، آپ کے ذمے تو صرف پہنچا دینا ہی ہے اور ہمارے ذمے حساب لینا ہے (40) کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ بلاشبہ ہم (کفر کی) زمین کو اس حال میں آتے ہیں کہ اسے اس کے اطراف سے گھٹاتے جاتے ہیں (یعنی اسلام پھیل رہا ہے) اور اللہ حکم کرتا ہے، کوئی اس کے حکم کو رد کرنے والا نہیں، اور وہ جلد حساب لینے والا ہے (41)

رسول کے ذمے تبلیغ اور اللہ کے ذمے حساب لینا ہے:

یعنی عرب کے ملک میں اسلام پھیلتا جاتا ہے اور کفر گھٹتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ سے یہ بات کہی کہ اگر اس غم اور سزا میں سے جس کا وعدہ ہم نے دنیا میں تیرے دشمنوں سے کیا ہے، کچھ ان کو دکھا دیں یا اس سے پہلے ہم تجھ کو دنیا سے اُٹھا لیں تو ہم نے تجھ کو فقط رسالت پہنچانے کے لیے بھیجا ہے، سو تو نے یہ تبلیغ کر دی، اب ان کا حساب کتاب اور جزا سزا ہمارے ذمے ہے۔ تجھ سے ان کے کفر اور تکذیب پر کچھ پکڑ نہیں ہو گی، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ﴿۲۱﴾ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ﴿۲۲﴾ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ ﴿۲۳﴾ فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ ﴿۲۴﴾ اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ﴿۲۵﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ﴾ [الغاشية: ۲۱۔ ۲٦] "چنانچہ آپ نصیحت کیجیے، آپ تو صرف نصیحت کرنے والے ہیں۔ آپ ان پر کوئی فوج دار نہیں۔ مگر جس نے منہ موڑا اور کفر کیا۔ تو اسے اللہ بہت بڑا عذاب دے گا۔ بے شک ہماری ہی طرف ان کی واپسی ہے۔ پھر بے شک ان کا حساب لینا ہمارے ہی ذمے ہے۔"

[1] تفسیر الطبري (١٦/ ٤٨٩) اس کی سند میں دو راوی مجہول ہیں۔ [2] فتح البیان (٧/ ٦٧۔ ٧١)

اطرافِ زمین کے گھٹنے کا مفہوم:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ان لوگوں نے نہیں دیکھا کہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو فتح دیتے رہتے ہیں۔ ایک زمین کے بعد دوسری زمین ان پر مفتوح ہوتی رہتی ہے۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ ایک گاؤں ویران ہو جاتا ہے اور آبادی کسی ایک کنارے میں رہ جاتی ہے۔ امام مجاہد اور عکرمہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ نقصِ اطراف سے مراد خرابی ہے یعنی ویرانی۔ امام حسن اور ضحاک رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ مراد کفار و مشرکین پر مسلمانوں کا غلبہ ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مراد اہل و عیال اور برکت کا نقصان ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جانوں اور پھلوں کا نقصان اور زمین کی بربادی ہے۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر زمین گھٹا کرتی تو تجھ پر یہ تیرا آشیانہ تنگ ہو جاتا۔ لیکن مراد جانوں اور پھلوں کا نقصان ہے۔ اسی طرح امام عکرمہ رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے کہ اگر زمین میں نقصان ہوتا تو کوئی جگہ تجھے بیٹھنے کو نہ ملتی۔ لیکن اس نقص سے مراد موت ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ مراد زمین کی ویرانی ہے، جو علما، فقہا اور اہلِ خیر کی موت سے آجاتی ہے۔ اسی طرح امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد علما کا مرجانا ہے۔[1] امام احمد بن غزالی رحمہ اللہ نے کیا خوب کہا ہے ؎

الأرض تحيا إذا ما عاش عالمها   متى يمت عالم منها يمت طرف

كالأرض تحيا إذا ما الغيث حل بها   وإن أبي عاد في اكنا فها تلف

[جب تک زمین میں عالم زندہ ہے تب تک وہ زمین زندہ ہے، جب وہ عالم فوت ہو جاتا ہے تو اس سے اس زمین کے حصے میں، جہاں وہ عالم تھا، ویرانی آ جاتی ہے۔ جیسے وہ سرزمین جس میں بارش برسے تو وہ لہلہانے لگتی ہے اور اگر بارش نہ برسے تو وہ سوکھ کر بنجر ہو جاتی ہے]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ پہلا قول زیادہ مناسب ہے، یعنی ایک بستی کے بعد دوسری بستی میں اسلام کا شرک پر غلبہ اور ظہور مراد ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴾ [الأحقاف: ٢٧] ”اور البتہ تحقیق ہم نے تمھارے آس پاس کی بستیاں ہلاک کر دیں، اور ہم نے آیات پھیر پھیر کر بیان کیں، تاکہ وہ (ہماری طرف) رجوع کریں۔“ اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اگر ہم تجھ کو ان کا بعض عذاب تیری حیات میں دکھلا دیں، جس کا ہم نے اس قول میں وعدہ کیا ہے: ﴿ لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ﴾ [الرعد: ٣٤] ”ان کے لیے دنیا کی زندگی میں عذاب ہے۔“ اور

[1] تفسير الطبري (١٦/ ٤٩٣۔ ٤٩٧)
[2] تفسير الطبري (١٦/ ٤٩٧۔ ٤٩٨) تفسير ابن كثير (٢/ ٦٧٧)

اس قول میں: ﴿وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا تُصِيبُهُمْ بِمَا صَنَعُوا قَارِعَةٌ﴾ [الرعد: ۳۱] ’’اور جنھوں نے کفر کیا ان کے کرتوتوں پر انھیں آفت پہنچتی ہی رہے گی۔‘‘ یا اس دکھلائی سے پہلے تجھ کو وفات دیں تو اس میں تیری کوئی خطا اور تجھ پر کوئی ملامت نہیں ہے، کیوں کہ تجھ پر کوئی امر واجب نہیں ہے، مگر یہی کہ تم رسالت پہنچا دو۔ لفظِ بلاغ تبلیغ کے قائم مقام ہے۔ رہا ان کا حساب کتاب، سو وہ ہمارے ذمے ہے، ہم قیامت کے دن ان کے اعمال کی جزا ان کو دیں گے۔ اس میں نبی اکرم ﷺ کو تسلی دی ہے کہ جو کام تمھارا تھا وہ تم نے کر دیا۔ اگر کوئی تمھاری دعوت قبول نہیں کرتا اور تمھاری نبوت کی تصدیق نہیں کرتا تو وہ جانے، اللہ تعالیٰ اس کے جرم پر اس کا حساب لینے والا ہے۔ کیا ان اہلِ مکہ وغیرہم نے نہیں دیکھا کہ ہم زمینِ کفر پر آتے ہیں اور اس کو اطراف سے گھٹا دیتے ہیں۔ شیئا فشیئا. اس طرح کہ مسلمانوں کو فتح نصیب ہوتی ہے اور مشرک شکست پاتے ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ ان کو عبرت حاصل نہیں ہوتی۔ یہی امام قتادہ اور مفسرین رحمہم اللہ کی ایک جماعت کا قول ہے۔[1]

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ نقصان علما اور صلحا کی موت سے ہوتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام قشیری رحمہ اللہ نے کہا کہ اس بنیاد پر اطراف سے مراد اشراف ہیں۔ ابن اعرابی رحمہ اللہ نے کہا کہ طرف باعزت شخص کو کہتے ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ قول بعید ہے، کیوں کہ آیت کا مقصود یہ ہے کہ ہم نے ان کو ان کے امر کا نقصان دکھلا دیا، تاکہ وہ یہ بات جان لیں کہ ان سے سزا کو موخر کرنا کچھ ہماری عاجزی کی وجہ سے نہیں ہے، مگر یہ کہ اس نقصان کو یہود و نصاریٰ کے احبار کی موت پر محمول کریں۔[2] امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا کہ تفسیر اول زیادہ مناسب ہے، اس لیے کہ یہ قول اگرچہ صحیح ہو، لیکن اس جگہ کے لائق نہیں ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[3] بعض نے کہا کہ اس آیت سے مراد آباد زمین کا ویران ہونا ہے کہ اکثر خراب ہو کر کسی کونے میں تھوڑی سی آبادی باقی رہ جاتی ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، عکرمہ، شعبی، عطاء اور مفسرین رحمہم اللہ کی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے: ’’أي نخربها ونهلك أهلها، أفلا تخافون أن يفعل بكم ذلك‘‘[4] [یعنی ہم اسے ویران کر دیتے ہیں اور وہاں کے رہنے والوں کو ہلاک کر دیتے ہیں، کیا تم اس بات سے ڈرتے نہیں ہو کہ تمھارے ساتھ بھی ایسے ہی کیا جائے] کسی نے کہا کہ ہلاک ہونے والی قوموں کی ہلاکت مراد ہے۔ کسی نے کہا کہ ملک کے والیان کا ظلم و ستم ہے، یہاں تک کہ زمین ویران ہو جائے۔ بالجملہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے حکم کرتا ہے، کسی کو بڑھاتا ہے، کسی کو گھٹاتا ہے۔ ایک کو زندہ رکھتا ہے، دوسرے کو مارتا ہے، ایک کو غنی کرتا ہے، دوسرے کو فقیر بناتا ہے، کوئی اس کے حکم کو پھیرنے والا نہیں ہے، جس طرح

[1] تفسير البغوي (٤/ ٣٢٦)
[2] تفسير القرطبي (٩/ ٣٣٣)
[3] تفسير الخازن (٤/ ٢٩۔ ٣٠)
[4] تفسير الطبري (١٦/ ٤٩٤۔ ٤٩٥)

کہ بعض اہلِ دنیا بعض کا حکم رد کر دیتے ہیں، بلکہ وہ جلد حساب لینے والا ہے۔ ایک قلیل زمانے کے بعد آخرت میں حساب لے گا اور اس دنیا کا عذاب قتل اور زمین سے نکال دیا جانا ہے۔ غرض یہ کہ اس کی سزا میں تاخیر نہیں ہوتی، وہ لامحالہ آنے والی ہے۔ وَكُلُّ اٰتٍ قَرِيبٌ. [1]

وَقَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا ۭ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ۭ وَسَيَعْلَمُ الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ ۝ ٤٢

اور بے شک وہ لوگ بُری تدبیریں کر چکے جو ان سے پہلے تھے، بس اللہ ہی کے لیے ساری تدبیریں ہیں۔ وہی جانتا ہے جو کچھ ہر نفس کماتا ہے اور جلد ہی کفار جان لیں گے کہ آخرت کا (اچھا) گھر کس کے لیے ہے (42)

کافروں کی چال اور اس کے خلاف اللہ تعالیٰ کی تدبیر:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو لوگ ان کفار و مشرکین سے پہلے تھے، وہ بھی اپنی رسولوں کے ساتھ مکاری، دغابازی اور بے ایمانی کر چکے ہیں اور چاہتے تھے کہ ان کو ان کے شہروں سے نکال دیں۔ سو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کفار کے ساتھ مکر کیا اور حسنِ انجام متقین کے لیے ہوا۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ۭ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴾ [الأنفال: ٣٠] ''اور (اے نبی! یاد کیجیے) جب وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا آپ کے بارے میں تدبیر کر رہے تھے، تاکہ وہ آپ کو قید کر دیں یا آپ کو قتل کر دیں یا آپ کو (مکہ سے) نکال دیں اور وہ تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ بھی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔''

نیز فرمایا: ﴿ وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ ٥٠ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ ٥١ فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ ٥٢ وَاَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴾ [النمل: ٥٠۔ ٥٣] ''اور انھوں نے ایک چال چلی اور ہم نے بھی تدبیر کی، اور وہ شعور بھی نہ رکھتے تھے۔ پھر آپ دیکھیں! ان کی چال کا انجام کیا ہوا، بلاشبہ ہم نے ان (نو سرغنوں) کو اور ان کی سب قوم کو تباہ و برباد کر دیا۔ چناں چہ یہ ہیں ان کے گھر خالی (اُجڑے اور ویران) پڑے ہوئے، اس لیے کہ انھوں نے ظلم کیا، بلاشبہ اس میں نشان (عبرت) ہے، ان لوگوں کے لیے جو جانتے ہیں۔ اور ہم نے انھیں نجات دی جو ایمان لائے اور وہ (اللہ سے) ڈرتے تھے۔'' اللہ تعالیٰ ہر نفس کے کسب کو جانتا ہے، وہ سارے بھیدوں اور دل کی باتوں کا جاننے والا ہے۔

---

[1] فتح البیان (٧/ ٧٢۔ ٧٤)

عن قریب ہر عامل کو اس کے عمل کی جزا دے گا اور یہ کافر جلد معلوم کر لیں گے کہ دائرہ اور عاقبت کس کے لیے ہے، ان کے لیے یا ان لوگوں کے لیے جو رسولوں کی اتباع کرتے ہیں۔ یہ تو دنیا اور آخرت میں انھیں رسولوں کے پیروکاروں کے لیے ہے۔ و للّٰہ الحمد و المنۃ.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ انسان کو کوئی مکروہ چیز پہنچانے کو مکر کہتے ہیں کہ وہ نہ جانے، جس طرح نمرود نے ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ، یا فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ، یا یہود نے عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مکر کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ یہ تو ان کفار کی ایک عادت زمانۂ قدیم سے ہے کہ وہ اللہ کے رسولوں کے ساتھ ایسا کرتے ہیں، لیکن ان کا یہ مکر کالعدم ہے، کچھ اثر نہیں کرتا۔ سارا مکر اللہ کا ہے، دوسرے کا مکر تو کسی قطار اور شمار میں نہیں ہے۔ لہٰذا فرمایا کہ سارا مکر، یعنی مکر کی جزا اللہ کے نزدیک ہے۔ اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے مکر سے تسلی اور امان دی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے کہا کہ تمام مکر کرنے والوں کے مکر اللہ کے لیے ہیں، اسی کی طرف سے ہیں، یعنی اس کی تخلیق اور ارادے سے ہیں تو سارا مکر اس کی مخلوق ٹھہرا۔ خیر اور شر اور نفع و نقصان اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ کسی کا مکر اللہ کی اجازت کے بغیر کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ مکر کا اثبات (ثابت ہونا) کفار کے کسب (کارستانیوں) کے اعتبار سے ہے اور مکر کا انکار یا نفی خلق کے اعتبار سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ہر نفس کا کسب، وہ اچھا ہو یا برا، معلوم ہے، وہ اس کی جزا دے گا اور کفار بھی عن قریب جان لیں گے کہ اچھا انجام دنیا اور آخرت میں کس کے لیے ہے؛ ان کے لیے یا مومنین کے لیے۔[1]

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ۭ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ﴿۴۳﴾

اور کافر کہتے ہیں: تم رسول نہیں ہو۔ آپ کہہ دیجیے: میرے اور تمھارے درمیان اللہ ہی گواہ کافی ہے، اور وہ شخص (بھی) جس کے پاس کتاب کا علم ہے (43)

منکرینِ رسالت کے خلاف اللہ تعالیٰ اور کتاب کا علم رکھنے والوں کی گواہی:

اللہ تعالیٰ یوں گواہ ہے کہ سچ کو بڑھا دے اور جھوٹ کو مٹا دے، اور پہلی کتاب جاننے والے گواہ ہیں کہ پہلے بھی کتاب اسی طرح اتری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ کفار تجھ کو جھٹلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تو اللہ کا رسول نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے تجھ کو نہیں بھیجا، سو تو اس کے جواب میں کہہ دے کہ میرے اور تمھارے درمیان اللہ تعالیٰ کافی ہے، وہ مجھ پر اس بات کا گواہ ہے کہ میں نے اس کی رسالت پہنچا دی اور تم پر اس بات کا گواہ ہے کہ تم افترا اور بہتان

[1] فتح البیان (۷/ ۷۴۔ ۷۵)

کرتے ہو اور رسالت کو جھٹلاتے ہو۔

فرستادۂ خاص پروردگار رسانندۂ حجت استوار

''پالنے والے، تربیت دینے والے کا مخصوص بھیجا ہوا (رسول)، آسمانی کتاب قرآن کا پہنچانے والا۔''

یہ آیت: ﴿ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ﴾ (آیتِ باب) عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے حق میں اتری ہے۔[1] (قالہ مجاھد) مگر یہ قول غریب ہے، اس لیے کہ آیت مکی ہے اور عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینے میں آنے کے بعد شروع میں اسلام لائے تھے، اس لیے زیادہ ظاہر قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے کہ اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ من جملہ اس کے ایک عبداللہ بن سلام، سلمان اور تمیم داری رضی اللہ عنہم ہیں۔ اور امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ کہتے تھے کہ اس سے مراد عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نہیں ہیں، یہ آیت تو مکی ہے۔ اور کہتے ہیں کہ مراد اللہ تعالیٰ ہے۔ امام مجاہد اور حسن بصری رحمہما اللہ بھی اسی طرف گئے ہیں۔[2]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحیح ۔ واللّٰه أعلم۔ اس جگہ یہ ہے کہ ﴿ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ﴾ سے اسم جنس مراد ہے، جو اہلِ کتاب کے علم کو شامل ہے، جو کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت اور تعریف اپنی کتابوں میں پہلے انبیا کی بشارت کی شکل میں پاتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۚ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾ [الأعراف: ١٥٦۔ ١٥٧] ''اور میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر رکھا ہے، چناں چہ جلد ہی میں اس (رحمت) کو ان لوگوں کے لیے لکھ دوں گا جو پرہیز گار ہیں اور زکات دیتے ہیں اور (ان کے لیے بھی) جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں۔ (یعنی) وہ لوگ جو اس رسول اُمی نبی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی کرتے ہیں جس کا ذکر وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں، وہ انھیں اچھے کاموں کا حکم دیتا ہے اور انھیں برے کاموں سے روکتا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴾ [الشعراء: ١٩٧] ''کیا ان کے لیے یہ ایک نشانی (کافی) نہیں کہ بنی اسرائیل کے علما بھی اس (قرآن یا صاحبِ قرآن) کو جانتے ہیں۔'' اس طرح کی اور بہت آیتیں ہیں جن میں علمائے بنی اسرائیل کے حال کی خبر دی ہے کہ ان کو یہ بات اپنی اگلی کتابوں سے معلوم ہے۔ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے مروی حدیثِ احبار سے ان کا اسلام لانا مکہ میں ہجرت سے پہلے مذکور ہے۔ اس حدیث کو حافظ ابو نعیم نے دلائلِ نبوت میں جو کہ ایک بہت جلیل القدر کتاب ہے بطولہ روایت کیا ہے، لیکن حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: ''هو غريب جداً'' اس لیے اس حدیث کا یہاں ذکر چھوڑ دیا گیا۔[3]

[1] تفسیر الطبري (١٦/ ٥٠٢) [2] تفسیر الطبري (١٦/ ٥٠٢۔ ٥٠٦) [3] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٦٧٨۔ ٦٧٩)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ مشرک یا تمام کفار کہتے ہیں کہ اے محمد! تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک سے تمام لوگوں کی طرف نہیں بھیجا گیا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ جواب فرمایا کہ اللہ گواہ ہے اور وہ جس کے پاس کتابِ سماوی کا علم ہے، جیسے: تورات و انجیل، کیوں کہ ان لوگوں کو نبی کریم ﷺ کی رسالت کا صحیح ہونا بہ خوبی معلوم تھا، چناں چہ ان میں سے جو شخص اسلام لایا، اس نے اس بات کی خبر دی، جیسے: سیدنا عبداللہ بن سلام، سلمان فارسی، تمیم داری رضی اللہ عنہم اور کعب احبار رحمہ اللہ وغیرہم اور عرب کے مشرک کہ اہلِ کتاب سے سوال کرتے تھے اور ان کی بات مانتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد کیا کہ تم اہلِ کتاب ہی سے پوچھ لو۔ بعض نے کہا کہ کتاب سے مراد قرآن ہے اور ﴿ مَنْ عِنْدَهٗ ﴾ سے مسلمان کہ وہ نبی مکرم ﷺ کی نبوت پر شاہد ہیں یا ﴿ مَنْ عِنْدَهٗ ﴾ سے مرادلوحِ محفوظ کا علم ہے، یعنی اللہ پاک کی ذات مقصود ہے۔ اسی کو امام زجاج رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔[1]

سیدنا جندب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ آئے، مسجد کے دروازے کے دونوں کواڑ پکڑ کر کھڑے ہوئے اور کہا کہ میں تم کو اللہ کی قسم دیتا ہوں، تم جانتے ہو کہ میرے ہی حق میں یہ آیت اتری ہے: ﴿ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ﴾؟ لوگوں نے کہا کہ ہاں۔ مگر امام شعبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے حق میں قرآن نہیں اترا۔[2] بعض نے کہا کہ مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔ اس سورت کا مدار جس طرح کہ کتابِ کشف میں کہا ہے، حقیت کتاب مجید پر ہے، اس لیے کہ وہ صلاحِ دارین پر مشتمل ہے اور سعید وہ ہے جو اس کی رسی کو پکڑے اور بدبخت وہ ہے جو اس سے منہ پھیرے۔[3] وباللّٰه التوفیق

روز پنج شنبہ ۲۸/ جمادی الاولیٰ ۱۳۰۶ھ کو سورۃ الرعد کا یہ ترجمہ تمام ہوا۔ وللّٰه الحمد والمنة.

---

[1] معاني القرآن (۳/ ۱۵۱۔ ۱۵۲) [2] الدر المنثور (٤/ ٦٦٨۔ ٦٦٩) [3] فتح البیان (۷/ ۷۵۔ ۷٦)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سُوْرَۃُ اِبْرٰهِیْمَ

سیدنا عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم، امام حسن، عکرمہ، جابر بن زید اور قتادہ رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ یہ سورت مکی ہے، مگر دو آیتیں یا تین آیتیں جو رسول اللہ ﷺ کے محاربین کے حق میں نازل ہوئی ہیں اور وہ یہ ہیں: ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿28﴾ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا ؕ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿29﴾ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ دو آیتیں وہ ہیں جو کشتگانِ بدر کے بارے میں اتری ہیں۔ یہ سورت ۵۲ آیات پر مشتمل ہے۔[1]

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
الٓرٰ ۫ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى
النُّوْرِ ۙ۬ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۙ﴿1﴾ اللّٰهِ الَّذِيْ
لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ
شَدِيْدِ ۙ﴿2﴾ الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ
وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ
بَعِيْدٍ ﴿3﴾

اللہ کے نام سے (شروع) جو نہایت مہربان بہت رحم کرنے والا ہے۔ الرٰ (اے نبی!) (یہ) عظیم الشان کتاب ہم نے اسے آپ کی طرف نازل کیا ہے، تاکہ آپ لوگوں کو ظلمتوں سے نور کی طرف نکال لائیں، ان کے رب کے اذن سے غالب (اور) لائق تعریف کے راستے کی طرف ① (یعنی) اللہ کی طرف جس کا وہ سب کچھ ہے جو آسمانوں میں اور زمین میں ہے، اور کافروں کے لیے شدید عذاب سے تباہی ہے ② جو آخرت پر دنیاوی زندگی کو محبوب رکھتے ہیں، اور اللہ کے راستے سے

[1] تفسير القرطبي (۹/ ۳۳۸) الدر المنثور (۵/ ۳)

روکتے ہیں، اور اس میں ٹیڑھا پن ڈھونڈتے ہیں، وہی دور کی گمراہی میں ہیں ③

تعارفِ قرآن:

اس کتاب سے مراد قرآنِ عظیم ہے۔ یہ کتاب آسمانوں سے اُتاری گئی کتابوں میں سے سب سے اشرف ہے اور یہ زمین میں بھیجے گئے سب سے اشرف رسول پر اتری ہے جو ساری زمین کے لوگوں، کیا عرب اور کیا عجم، کی طرف بھیجا گیا ہے۔ تاکہ ان کو اس کتاب کے ذریعے گمراہی اور سرکشی سے ہدایت اور رشد کی طرف لائے اور تاریکی سے روشنی میں پہنچائے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۬ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَوْلِيٰٓؤُهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۗ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾ [البقرة: ۲۵۷] ”اللہ ان لوگوں کا دوست ہے جو ایمان لائے، وہ ان کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ان کے دوست طاغوت ہیں، وہ انھیں روشنی سے نکال کر اندھیروں کی طرف لے جاتے ہیں، وہی لوگ دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔“ نیز فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖۤ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ﴾ [الحديد: ۹] ”وہی تو ہے جو اپنے بندے پر واضح آیات نازل کرتا ہے، تاکہ وہ تمھیں اندھیروں سے اُجالے کی طرف نکالے۔“

اذنِ رب سے یہ مراد ہے کہ اللہ ہی اس کا ہادی ہے جس کے لیے ہدایت کو مقدر کیا ہے، اپنے رسول کے ہاتھ پر جس کو اپنے حکم سے مبعوث فرمایا ہے، تاکہ ان کو عزیز حمید کا راستہ سمجھائے۔ عزیز وہ ہے جو مغلوب نہ ہو، بلکہ ہر ماسوا پر قاہر اور زبردست ہو۔ حمید وہ ہے جس کے سارے افعال و اقوال محمود ہوں اور اس کے لیے شریعت اور امر و نہی پسندیدہ ہو اور وہ اپنی خبر میں سچا پکا ہو۔ اللہ تعالیٰ وہ ہے کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کی ملکیت ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ا۟لَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ [الأعراف: ۱۵۸] ”کہہ دیجیے: اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں، جس کے پاس آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے۔“

کافروں کے لیے قیامت کے دن عذابِ شدید ہوگا، کیوں کہ انھوں نے اللہ کے رسول کی مخالفت اور تکذیب کی تھی۔ ان کافروں کا یہ حال ہے کہ یہ اس دنیا کے جینے کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں اور آخرت کی نسبت دنیا کو پسند کرتے ہیں اور دوست رکھتے ہیں۔ ان کا عمل اسی دنیا کے لیے ہوتا ہے۔ آخرت کو تو انھوں نے طاقِ نسیاں پر رکھا ہے اور پسِ پشت پھینک دیا ہے۔ اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہیں، یعنی رسول کی اُتباع کرنے سے منع کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ کی راہ ٹیڑھی، مائل (دنیا کی رنگینیوں کی طرف جھکنے والی) اور عائل (آخرت کے لیے تنگ دست

کرنے والی) ہو، حالاں کہ یہ ایک سیدھی راہ ہے۔ نفس الامر میں کوئی مخالف اس کو نقصان نہیں پہنچا سکتا اور نہ مدد سے اپنا ہاتھ کھینچ لینے سے کچھ بگاڑ سکتا ہے۔ ان کا اس کے ٹیڑھ پن کے لیے جستجو کرنا نری جہالت اور گمراہی ہے اور حق اور سیدھے راستے سے دور تر ہے۔ اس حالت میں ان کی اصلاح کی کیا اُمید ہو سکتی ہے؟!

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ یہ حروفِ مقطعہ بعض کے نزدیک متشابہہ ہیں اور بعض کے نزدیک غیر متشابہہ۔ پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔ قرآن اتباعِ توحید و ترکِ کفر اور شرک کی مذمت کے احکامات و ہدایات پر مشتمل ہے۔ ظلمات سے مراد کفر و جہالت اور گمراہی ہے۔ نور سے مراد ایمان اور علم اور ہدایت ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ نے کہا کہ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ کفر اور بدعت کی راہیں بہت سی ہیں اور حق کا راستہ صرف ایک ہے، کیوں کہ ظلمات جمع کا صیغہ اور نور مفرد کا صیغہ ہے۔ استعارہ کے ذریعے سے کفر کو ظلمات کے طور پر اور ایمان کو بمنزلۂ نور کے ٹھہرایا۔[1] یا ظلمت بدعت کے لیے مستعار (مانگا ہوا) ہے اور نور سنت کے لیے مستعار ہے۔ یا ظلمت سے مراد شک اور نور سے مراد یقین ہے۔ اگر یہ سب معانی مراد لیے جائیں تب بھی کوئی ممانعت نہیں۔ فعل کی اسناد نبی اکرم ﷺ کی طرف فرمائی، اس لیے کہ آپ داعی ڈرانے والے اور خوش خبری دینے والے ہیں۔

اذنِ رب سے مراد امر و علم اور اس کو اللہ تعالیٰ کا آسان اور سہل کر دینا ہے۔ صراط سے مراد واضح راستہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے مشروع کیا ہے اور اس پر چلنے کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مالک ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور کافروں کے لیے سخت عذاب کی تباہی و خرابی ہے۔ یہ دنیا کے دوست دار ہیں اور آخرت سے بے زار۔ نہ خود اللہ کے راستے پر چلیں نہ دوسروں کو چلنے دیں، بلکہ ان کو اس راہ سے روکتے ہیں۔ یہ راہ دین اور شریعت سے عبارت ہے، یہ چاہتے ہیں کہ اپنی خواہشات، اغراض اور حاجات کو پورا کرنے کی غرض سے اللہ تعالیٰ کی راہ کو ٹیڑھا کر دیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے دین اور شریعت کو حق سے پھیر کر اپنے دنیوی مقاصد حاصل کریں، سو یہ لوگ ایک دور دراز کی بڑی گمراہی میں پڑے ہیں۔[2]

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ؕ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿4﴾

اور ہم نے ہر رسول اس کی قوم کی زبان بولنے والا بھیجا، تا کہ ان کے لیے کھول کر بیان کرے۔ پھر اللہ جسے چاہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہے ہدایت دیتا ہے۔ اور وہ زبردست خوب حکمت والا ہے ④

---

[1] تفسير الرازي (١٩/ ٥٩) [2] فتح البيان (٧/ ٧٩۔٨١)

ہر نبی اور رسول اپنی قوم کی زبان بولتا تھا:

کافر کہتے تھے کہ کسی اور زبان میں قرآن اترتا تو ہم یقین کرتے۔ یہ تو اسی شخص کی زبان ہے، شاید یہ خود کہہ لاتا ہو۔ اس کا یہ جواب ہے کہ اللہ کی اپنی مخلوق پر ایک عنایت اور مہربانی یہ ہے کہ اس نے رسول انھیں میں سے بھیجے، انھیں کی لغت اور زبان میں، تاکہ وہ اللہ کی بات اور رسول کا بیان بہ خوبی سمجھ لیں اور رسالت کے مقصد کو پہنچ جائیں۔ سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «لَمْ يَبْعَثِ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ نَبِيًّا إِلَّا بِلُغَةِ قَوْمِه» [1] (رواه أحمد) [اللہ عزوجل نے ہر نبی کو اپنی قوم کی لغت و زبان بولنے والا بھیجا]

اس زمانے کے مذاہب کے مقلد حضرات کتاب وسنت پر ترکِ عمل پر ایک یہ عذر لنگ پیش کرتے ہیں کہ ہم کو قرآن و حدیث کا فہم نہیں ہے۔ اس کا مطلب ائمہ مجتہدین نے جو کچھ سمجھ بوجھ کر بتا دیا ہے، وہی ٹھیک ہے۔ حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو عرب کی فصیح زبان، جو لینے میں بہت آسان ہے، میں اُتارا ہے، اس غرض سے کہ ہر شخص اس کو سمجھ لے اور دوسرے کو سمجھا دے۔ ان کی عقل ان کافروں کی عقل سے بھی کم نکلی، کیوں کہ اگر قرآن کسی دوسری عجمی زبان میں نازل ہوتا تو اس کے سمجھنے میں سخت دشواری ہوتی، اس نعمتِ غیر مترقبہ کی یہ قدر ہوئی۔ لا حول ولا قوة.

غور کرو کہ مقلدین نے قرآن وسنت کو اپنے پُر خلل خیال میں دشوار فہم ٹھہرایا ہے تو اس کے سمجھنے میں کس قدر مشکل بیان کرتے ہیں۔ اس آسان عبارت اور آیاتِ بینات کے ہونے پر تو یہ پہلو تہی اور اپنی جہالت کا اقرار ہے۔ اگر یہ کتابِ مبین کسی دوسری زبان میں ہوتی تو شاید کوئی اس کی تلاوت تک بھی نہ کرتا، اس کے معانی کے حل اور اس کے بیانات کو سمجھنے کا تو ذکر ہی کیا۔ اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے کہ بیان اور اقامتِ حجت کے بعد اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے، : جیسے مقلدین، اور جس کو چاہتا ہے ہدایت فرماتا ہے، جیسے: متبعین۔ ما شآء کان و ما لم یشأ لم یکن۔ وہ اپنے افعال میں حکیم ہے گمراہی کے مستحق کو گمراہ کرتا ہے اور اہلِ ہدایت کو ہدایت یافتہ کرتا ہے۔

عالمگیر رسالت:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی سنت یعنی عادت اس کی مخلوق میں یہی ہے کہ جس کسی نبی کو اس کی اُمت میں بھیجا تو اس کی قوم کی زبان میں بھیجا۔ ہر نبی رسالت پہنچانے کے لیے صرف اپنی قوم کے لیے مخصوص تھا نہ کہ دوسری قوم کے لیے اور محمد بن عبداللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب لوگوں کو عام طور پر رسالت پہنچانے کے لیے مخصوص ہوئے، جس طرح کہ صحیحین میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «أُعْطِيتُ خَمْسًا لَمْ يُعْطَهُنَّ أَحَدٌ مِنَ الْأَنْبِيَآءِ قَبْلِي: نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيرَةَ شَهْرٍ، وَجُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِدًا

[1] مسند أحمد (٥/ ١٥٨) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٥٦١)

وَطَهُورًا وَ أُحِلَّتْ لِيَ الْغَنَائِمُ وَلَمْ تُحَلَّ لِأَحَدٍ قَبْلِيْ، وَأُعْطِيتُ الشَّفَاعَةَ وَكَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ إِلَى قَوْمِهِ وَبُعِثْتُ إِلَى النَّاسِ عَامَّةً »[1] [مجھے پانچ ایسی چیزیں عطا کی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو عطا نہیں کی گئی تھیں: مہینا بھر کی مسافت سے دشمنوں پر طاری ہو جانے والے رعب سے میری نصرت کی گئی، میرے لیے زمین کو پاک کرنے والی اور سجدہ گاہ بنایا گیا، میرے لیے اموالِ غنیمت حلال کر دیے گئے، مجھ سے پہلے وہ کسی کے حلال نہیں کیے گئے، مجھے شفاعت (کا منصب) عطا کیا گیا اور ہر نبی اپنی قوم ہی کی طرف بھیجا جاتا تھا اور مجھے تمام لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہے] اس حدیث کے بہت وجوہ سے شواہد ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ﴾ [الأعراف: ١٥٨] ”کہہ دیجیے: اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔“[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر رسول اپنی قوم کی زبان میں کلام کرنے والا آیا، تاکہ اس کی قوم اس کی بات کو سمجھ لے اور وہ آسانی سے ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دے سکے۔ اس کے برخلاف اگر کسی اور قوم کی زبان میں آتا تو وہ قوم کچھ نہ سمجھتی کہ وہ کیا کہتا ہے، جب تک کہ ایک طویل مدت تک اس زبان کو وہ نہ سیکھتے، اس کے ساتھ ساتھ اس زبان کا سمجھنا ان کے لیے مشکل ہوتا، اس لیے کہ دوسری زبان میں کماحقہ مہارت حاصل کرنا انتہائی مشکل ہوتا ہے اور محاورہ اور الفاظ کا صحیح استعمال نہیں ہوتا۔ اہلِ فارس اور فرنگی مردوں کو دیکھو کہ عمر دراز تک ہند میں رہتے اور ہندی زبان سیکھتے ہیں، لیکن ان کا کلام کرنا ہندی لوگوں کے کلام کی طرح نہیں ہوتا، ہمیشہ غلط سلط اور بدمحاورہ رہتے ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے یہ وجہ بیان کی کہ رسول اور اس کی قوم کی زبان کا ایک ہونا، اس لیے ضروری ہوا کہ رسول شریعتِ الٰہی کے امر و نہی کی وضاحت قوم کے لیے بہ خوبی کر سکے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو آسمان والوں پر اور تمام انبیاء علیہم السلام پر فضیلت دی ہے۔ کہا کہ آسمان والوں پر کیا فضیلت ہے؟ کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ سماء سے کہا: ﴿ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْۤ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [الأنبیآء: ٢٩] ”اور ان میں سے جو یہ کہے کہ بے شک اللہ کے سوا میں بھی معبود ہوں تو اسے ہم اس (بات) کا بدلہ جہنم دیں گے، ہم ظالموں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں۔“ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: ﴿ لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ ﴾ [الفتح: ٢] ”تاکہ اللہ آپ کے لیے آپ کی اگلی پچھلی ہر غلطی معاف کر دے۔“ گویا آپ کے لیے جہنم سے براءت لکھ دی۔

کہا کہ انبیاء علیہم السلام پر کیا فضیلت ہے؟ کہا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢١)
[2] تفسير ابن كثير (٢/ ٦٨٠)

قَوْمِہٖ ﴾ (آیتِ باب) اور نبی کریم ﷺ کو کہا ہے: ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ ﴾ [سبا: ۲۸] ''ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے واسطے بھیجا ہے۔'' تو نبی مکرم ﷺ کو جنوں اور انسانوں کی طرف بھیجا ہے۔ سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ قرآن قریش کی لغت میں اترا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[1]

اس آیت میں یہ اشکال کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ سارے لوگوں کی طرف بھیجے گئے ہیں، بلکہ جنوں اور انسانوں کی طرف اور ان کی زبانیں الگ الگ ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ نبی کریم ﷺ کو ثقلین (جنوں اور انسانوں) کی طرف بھیجا گیا ہے، لیکن جبکہ آپ کی قوم عرب ہے اور وہ آپ کے سب سے زیادہ قریبی اور خالص تھے تو آپ کو ان کی زبان میں بھیجنا زیادہ مناسب تھا۔ اس سے کہ آپ کو کسی اور کی زبان میں بھیجا جاتا اور وہ لوگ اس کا بیان غیرِ زبان دونوں کے لیے کرتے، یہاں تک کہ اُس کی سمجھ میں آئے۔ اگر قرآن کا نزول ان سب لوگوں کی زبان میں ہوتا جن کی طرف وہ بھیجے گئے تھے اور نبی اکرم ﷺ اس کا بیان ہر قوم کے لیے اس کی زبان میں کرتے تو اختلاف اور تنازع کا ایک دروازہ کھل جاتا، اس لیے کہ ہر اُمت اپنی زبان میں ایسے معانی کا دعویٰ کرتی ہے، جن کو دوسرے لوگ نہیں جانتے اور غالباً اس بات سے ان باطل دعووں کے سبب سے جن میں اہلِ تعصب اکثر گرفتار ہوتے ہیں، قرآن کی تحریف (بدل ڈالنا) اور تصحیف (لکھنے میں غلطی کرنا) کی نوبت آجاتی۔

میں کہتا ہوں کہ باوجود اس بات کے کہ نبی مکرم ﷺ کی رسالت عام ہے قرآن کے خاص کر لغتِ قریش میں نازل ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ عربی زبان اللہ کی مخلوق کی تمام زبانوں سے زیادہ شرف رکھتی ہے، جس طرح کہ نبی مکرم ﷺ اشرف الرسل ہیں، لہٰذا اشرف اور اعلیٰ کو اشرف اور اعلیٰ کے لیے اختیار کیا ہے اور یہ زبان مبارک اہلِ جنت کی زبان ہے اور ہر قوم کا شخص اگر ارادہ کرے تو اس زبان کو اپنی قدرت کے مطابق دوسری عجمی زبانوں کی نسبت جلد سمجھ اور سیکھ سکتا ہے۔ لہٰذا خود قرآن میں جابجا قرآن کا عربی زبان میں ہونا اس کی مدح اور وضاحت کے طور پر بیان فرمایا ہے اور جو لذتیں، مٹھاس اور خصوصیات اس واضح اور فصیح و بلیغ زبان کی ہیں، وہ روئے زمین میں کسی اور زبان میں نہیں پائی جاتیں۔

چنانچہ جس صورت میں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ قرآن کو ایک دائمی معجزے کے طور پر باقی رکھے تو اس کے لیے ایسی ہی لغت کو اختیار کرنے میں سراپائے حکمت و مصلحت ہے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کو یہ قدرت حاصل ہے کہ وہ اپنے کلام کو کسی بھی زبان میں نازل فرما دے۔ اس بات پر پہلی کتب جو انبیا پر نازل ہوئیں، دلیل اور شاہد ہیں، لیکن وہ کلام معجز نہ تھا اور نبی اکرم ﷺ کو بھی ہر زبان میں بات کرنے کی قدرت حاصل تھی، اگرچہ آپ نے ترکی زبان میں کبھی تکلم نہیں فرمایا، لیکن اگر کسی ترک کو مخاطب کرنے کا اتفاق ہوتا تو اس سے ترکی زبان میں بات کر سکتے

[1] الدر المنثور (۵/ ۵)

تھے، جس طرح کہ سلیمان جمل نے اس طرف اشارہ کیا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تکلم سے غیب کی طرف توجہ کی اور فرمایا کہ اللہ گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جسے چاہے، یعنی باوجود اس کے کہ ہر رسول اپنی قوم کی بولی بولتا تھا اور ان ہی کی زبان میں بیان شائع کرتا تھا، لیکن حقیقت میں گمراہ کرنے والا اور ہدایت دینے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے اور بس۔ کوئی بیان اس وقت تک ہدایت و ایمان کے حصول کا سبب نہیں ہوتا جب تک کہ اللہ تعالیٰ اس کو واسطہ اور سبب نہ ٹھہرائے۔ اضلال کو ہدایت سے پہلے اس لیے بیان کیا، کیوں کہ گمراہی پہلے ہے اور ہدایت بعد میں۔ کیوں کہ اضلال ابقاء علی الاصل ہے اور ہدایت انشاء مالم یکن ہے۔ اللہ عزیز ہے۔ کوئی اس کے ملک میں اس پر غالب نہیں ہے اور حکیم ہے اس کے افعال اس کی حکمت کا تقاضا ہوتے ہیں۔ [1]

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ
اِلَى النُّوْرِ ۙ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ
صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝

اور بلاشک وشبہہ ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیجا کہ اپنی قوم کو ظلمتوں سے نور کی طرف نکال اور انھیں اللہ کے ایام (احسان) یاد دلا۔ بے شک ان میں البتہ ہر صابر (اور) شاکر کے لیے نشانیاں ہیں (5)

موسیٰ علیہ السلام اور ان کو ملنے والی نشانیوں کا بیان:

ایام اللہ سے مراد اللہ کی ساکھی ہے، جو ہر قوم پر گزری ہے۔ اس آیت میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ جس طرح ہم نے تجھ کو بھیجا کہ تو ان کو تاریکی سے روشنی میں لا، اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کی طرف بھیجا تھا کہ وہ ان کو اندھیروں میں سے اُجالے میں نکالے اور شر سے خیر کی طرف بلائے۔ موسیٰ علیہ السلام کو نو نشانیاں دے کر بھیجا تھا۔ ظلمات سے مراد جہالت اور گمراہی ہے اور نور سے مراد ہدایت اور ایمان ہے۔ ایام اللہ سے مراد وہ انعامات اور احسانات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر کیے کہ ان کو فرعون کی قید سے باہر نکالا اور فرعون کو مقہور و مغلوب کیا۔ ان کو نجات دی۔ دریا کو ان کے لیے دو ٹکڑے کر دیا۔ بادلوں نے ان پر سایہ کیا اور من وسلویٰ اُترا، اس کے سوا اور بہت سی نعمتیں ہیں۔ امام مجاہد، قتادہ اور کئی ایک اہل علم رحمہم اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ [2] مرفوع حدیث میں مروی ہے: ﴿ذَكِّرْهُمْ بِأَيَّامِ اللّٰهِ أَيْ نِعَمِ اللّٰهِ﴾ [3] (رواہ أحمد رواہ ابن جرير موقوفا على أبي بن كعب وهو أشبه) [انھیں

---

[1] فتح البيان (۷/ ۸۱۔ ۸۳) [2] تفسير الطبري (۱۶/ ۵۲۰۔ ۵۲۱)

[3] مسند أحمد (۵/ ۱۲۲) تفسير الطبري (۱۶/ ۵۲۰۔ ۵۲۲) اس کی سند میں "محمد بن ابان جعفی" ضعیف راوی ہے۔ البتہ یہی معنی صحیح مسلم (رقم الحديث: ۲۳۸۰) کی روایت میں بھی مروی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ایام، یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی یاددہانی کرا]

ہماری اس کارروائی میں جو ہم نے اولیائے بنی اسرائیل کے ساتھ کی ہے کہ ان کو فرعون کے ہاتھ سے چھڑایا اور ذلت والے عذاب سے نجات دی، عبرت ونصیحت اور نشانی ہے، ہر تنگی ترشی میں صبر کرنے والے اور آسانی اور خوشی کے وقت شکر کرنے والے کے لیے۔ جس طرح کہ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: "نِعْمَ الْعَبْدُ عَبْدٌ إِذَا ابْتُلِيَ صَبَرَ، وَإِذَا أُعْطِيَ شَكَرَ"[1] [کتنا اچھا ہے وہ بندہ کہ جب اس کی آزمایش ہوئی تو اس نے صبر کا مظاہرہ کیا اور جب اس پر نوازش ہوئی تو وہ شکر بجالایا] صحیح میں مرفوعاً مروی ہے: «اِنَّ أَمْرَ الْمُؤْمِنِ كُلَّهُ عَجَبٌ، لَا يَقْضِي اللّٰهُ لَهُ قَضَاءً إِلَّا كَانَ خَيْرًا لَهُ، إِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْراً لَهُ، وَإِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ كَانَ خَيْراً لَهُ»[2] [بلاشبہ مومن کا سارا معاملہ عجب ہے، اللہ تعالیٰ اس کے حق میں جو بھی فیصلہ کرتا ہے وہ اس کے لیے بھلائی کا باعث ہے، اگر اسے کوئی نقصان پہنچے تو (اللہ کی رضا کے لیے) صبر کرتا ہے، یہ اس کے لیے بھلائی ہوتی ہے اور اگر اسے خوشی اور خوشحالی ملے تو شکر کرتا ہے اور یہ (بھی) اس کے لیے اچھا ہوتا ہے] یعنی چت بھی اپنی اور پٹ بھی اپنی۔ وللّٰه الحمد.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو نو نشانیاں دے کر بھیجا۔ یہ نو نشانیاں درج ذیل تھیں: ① طوفان ② وجراد (مکڑی) ③ قُمل (گھن کا کیڑا) ④ ضفادع (مینڈک) ⑥ دم (خون) ⑦ عصا و ید بیضا (چمکتا ہوا ہاتھ)، ⑧ سنین (قحط کے سال) ⑨ نقصِ ثمرات (پھلوں کا نقصان)۔ امام مجاہد، عطا اور عبید بن عمیر رحمہم اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔[3] ایام اللہ وہ دن ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کی قوم اور عاد وثمود سے انتقام لیا۔ امام ربیع رحمہ اللہ نے کہا کہ مراد قرونِ اولیٰ کے واقعات ہیں،[4] لیکن راجح یہ ہے کہ ایام اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی نعمتیں، تکالیف اور آزمایش ہیں۔ ایام اللہ کے حوالے سے نصیحت دینے میں یا خود ایام اللہ میں ہر صابر وشاکر کے لیے اللہ تعالیٰ کی توحید اور کمالِ قدرت پر عظیم دلائل ہیں۔[5]

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ
مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُوْنَ
اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ
عَظِيْمٌ ۝۶ وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَىِٕنْ

[1] تفسير الطبري (١٦/ ٥٢٣) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٩٩) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٣٥)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٣٥) [5] فتح البيان (٧/ ٨٤_ ٨٥)

كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ ۝۷ وَقَالَ مُوْسٰۤی اِنْ تَكْفُرُوْۤا اَنْتُمْ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِیٌّ حَمِیْدٌ ۝۸

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو جب اس نے تمھیں آلِ فرعون سے نجات دی، وہ تمھیں سخت عذاب دیتے تھے، تمھارے بیٹے ذبح کرتے اور تمھاری بیٹیاں زندہ چھوڑتے تھے، اور اس میں تمھارے رب کی طرف سے عظیم آزمایش تھی ⑥ اور جب تمھارے رب نے آگاہ کر دیا کہ اگر تم شکر کرو گے تو یقیناً میں تمھیں مزید دوں گا اور اگر تم کفر کرو گے تو بلاشبہہ میرا عذاب بہت شدید ہے ⑦ اور موسیٰ نے کہا: اگر تم کفر کرو گے اور وہ سب لوگ بھی جو زمین میں ہیں تو بے شک اللہ بے پروا اور لائقِ تعریف ہے ⑧

بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کے انعامات واحسانات کی یاد دہانی:

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے حال کی خبر دی، جب کہ انھوں نے اپنی قوم کو اللہ کے ایام یاد دلائے تھے کہ دیکھو اللہ نے تم پر کیا کیا انعام کیا: آلِ فرعون کے ہاتھ سے چھڑایا، وہ تم کو مارتے اور ذلیل کرتے تھے، تمھارے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اور عورتوں کو باقی رکھتے۔ یہ اللہ کی تم پر کیسی بڑی نعمت تھی جس کا شکر ادا کرنے سے تم عاجز ہو۔ یا فرعون کی قوم تمھارے ساتھ جو کچھ کرتی تھی اس میں تمھاری ایک بڑی آزمایش تھی۔ یا اس جگہ نعمتیں اور تکالیف دونوں مراد ہیں۔ واللہ أعلم۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّیِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴾ [الأعراف: ۱۶۸] ”اور ہم نے انھیں خوش حالی اور بدحالی کے ساتھ آزمایا، شاید کہ وہ (اللہ کی طرف) لوٹ آئیں۔“

تمھارے رب نے تم کو اپنا وعدہ جتلا دیا تھا، یا تمھارے رب نے اپنی عزت وجلال کی قسم اٹھائی۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَیَبْعَثَنَّ عَلَیْهِمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ مَنْ یَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ﴾ [الأعراف: ۱۶۷] ”اور (اے نبی! یاد کرو) جب آپ کے رب نے (یہود کو) خبردار کر دیا تھا کہ وہ قیامت تک ان پر ایسے شخص کو ضرور مسلط رکھے گا جو انھیں سخت عذاب (کا مزہ) چکھاتا رہے گا۔“ اور اگر تم شکر کرو گے تو میں تم کو زیادہ نعمت دوں گا اور اگر تم کفرانِ نعمت کرو گے اور انعامِ الٰہی کے منکر ہو جاؤ گے اور اسے چھپاؤ گے تو سمجھ لو کہ میرا عذاب سخت ہے۔ میں اپنی نعمت کو سلب کر لوں گا اور اس ناشکری پر سزا دوں گا۔ حدیث میں مروی ہے: « إِنَّ الْعَبْدَ لَیُحْرَمُ الرِّزْقَ بِالذَّنْبِ یُصِیْبُهُ »[1] [بلاشبہہ بندہ گناہ کے ارتکاب کا باعث رزق سے محروم ہوجاتا ہے] مسند میں ہے کہ نبی مکرم ﷺ کے پاس ایک سائل آیا، اُس کو آپ نے کھجور کا ایک دانہ دیا، وہ خفا ہوا اور نہ لیا۔ پھر ایک دوسرا سائل آیا، اس کو وہ دانہ دیا،

① مسند أحمد (۵/ ۲۷۷) اس کی سند میں ”عبداللہ بن الجعد“ مجہول راوی ہے۔ (ضعیف الجامع، رقم الحدیث: ۱۴۵۲)

اس نے لے لیا اور کہا کہ یہ ایک دانہ ہے اللہ کے رسول کی طرف سے۔ تب نبی مکرم ﷺ نے اُس کو چالیس درہم دلائے۔ أو كما قال.

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی مکرم ﷺ کے پاس ایک سائل آیا، اس کو ایک تمرہ (کھجور) دلایا، اس نے نہ لیا اور وحشت کی۔ اتنے میں ایک اور سائل آیا، اُس کو بھی ایک تمرہ دلائی، اس نے کہا: ''سبحان اللّٰه تمرة من رسول اللّٰه ﷺ'' [سبحان اللہ! رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ایک کھجور کا تحفہ اور ہدیہ!] نبی کریم ﷺ نے خادمہ سے کہا کہ اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس جا اور کہہ کہ وہ چالیس درہم جو تیرے پاس ہیں، اس سائل کو دے دے۔[1] (رواه أحمد وفيه ضعف)

موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہہ دیا کہ تم، بلکہ سارا جہان اگر کفر کرو گے تو اللہ غنی محمود ہے، اس کو تمھاری ناشکری کی کچھ پروا نہیں ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ ﴾ [الزمر: ۷] ''اگر تم کفر کرو گے تو اللہ یقیناً تم سے بے پروا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴾ [التغابن: ٦] ''پھر انھوں نے کفر کیا اور (حق سے) منہ موڑا اور اللہ نے (ان سے) بے پروائی کی، اور اللہ بے پروا بہت قابلِ تعریف ہے۔''

صحیح مسلم میں سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے ایک لمبی حدیث کے ذیل میں مروی ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے اپنے رب عزوجل سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: « يَا عِبَادِيْ! لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ، وَإِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ، قَامُوْا فِيْ صَعِيْدٍ وَّاحِدٍ، فَسَأَلُوْنِيْ فَأَعْطَيْتُ كُلَّ إِنْسَانٍ مَسْأَلَتَهُ، مَا نَقَصَ ذٰلِكَ مِمَّا عِنْدِيْ، إِلَّا كَمَا يَنْقُصُ الْمِخْيَطُ إِذَا دَخَلَ الْبَحْرَ »[2] [میرے بندو! اگر تمھارے پہلے والے اور تمھارے بعد والے اور تمھارے انسان اور تمھارے جن سب مل کر ایک کھلے میدان میں کھڑے ہو جائیں اور مجھ سے مانگیں اور میں ہر ایک کو اس کی مانگی ہوئی چیز عطا کر دوں تو اس سے، جو میرے پاس ہے، اس میں اتنا بھی کم نہ ہوگا جو اس سوئی سے (کم ہوگا) جو سمندر میں ڈالی (اور نکال لی) جائے]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو اللہ کی نعمتیں یاد دلائیں۔ اس یاد دلانے سے مراد نعمتوں کے ساتھ آزمانا ہے، یا عذاب کے ساتھ امتحان لینا ہے اور کہا کہ شکر صیدِ مزید وقید عبید ہوتا ہے اور کفرانِ نعمت عذابِ شدید کا موجب ہوتا ہے۔ تم سب سارے جہاں والے اگر اللہ کی نعتوں کا کفران کرنے والے ہو جاؤ تو اللہ کو کچھ پروا نہیں ہے، وہ تو ہر حال میں ممدوح و محمود ہے۔ شاید جناب موسیٰ علیہ السلام نے یہ ارشاد اس وقت کیا ہوگا جب انھوں نے لوگوں کی دشمنی اور غرور و تکبر اور کفر و فساد پر ان کی رغبت کو دیکھ لیا اور یقین کر لیا کہ کسی قسم کی ترغیب و تعریض اور

[1] مسند أحمد (٣/ ١٥٤) اس کی سند میں ''عمارہ بن زاذان'' ضعیف راوی ہے۔ [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٧٧)

ترہیب ان کو نفع نہ دے گی۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی حدیث میں ہے: « مَنْ أُلْهِمَ خَمْسَةً لَمْ يُحْرَمْ خَمْسَةً » [جسے پانچ چیزوں کا القا ہوا وہ پانچ چیزوں سے محروم نہیں ہوگا] من جملہ ان پانچ اشیا کے ایک یہ ہے: « مَنْ أُلْهِمَ الشُّكْرَ لَمْ يُحْرَمِ الزِّيَادَةَ »[1] (رواه البخاري في تاريخه والضياء في المختارة) [جس کو شکر ودیعت کیا گیا وہ زیادتی اور اضافے سے محروم نہیں ہوگا] سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں: « مَنْ أُعْطِيَ الشُّكْرَ لَمْ يُمْنَعِ الزِّيَادَةَ »[2] (أخرجه الحكيم الترمذي في النوادر) [جسے شکر کی توفیق مل گئی اس سے زیادتی اور برکت روکی نہیں جائے گی] ظاہر آیت عموم ہے، کیوں کہ زیادت کو شکر کی جزا ٹھہرایا ہے، سو جس نے رزق پر اللہ کا شکر کیا، اللہ تعالیٰ اس کے رزق میں توسیع فرماتا ہے اور جس نے اطاعت بجالانے کی توفیق پر کیا اس کو اطاعت میں زیادتی ہوتی ہے اور جس نے صحت پر شکر کیا، اس کی صحت بڑھ جاتی ہے۔[3]

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ ۛ۬ وَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۛؕ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ؕ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْۤا اَيْدِيَهُمْ فِيْۤ اَفْوَاهِهِمْ وَ قَالُوْۤا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَ اِنَّا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَاۤ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ۝۹

کیا تمھیں ان کی خبر نہیں پہنچی جو تم سے پہلے تھے، (یعنی) قومِ نوح اور عاد اور ثمود اور جو ان کے بعد ہوئے؟ جنھیں صرف اللہ جانتا ہے۔ ان کے پاس ان کے رسول کھلی نشانیاں لائے تو انھوں نے اپنے ہاتھ اپنے مونہوں میں لوٹا لیے اور بولے: بے شک ہم اسے نہیں مانتے جو تمھارے ہاتھ بھیجا گیا ہے اور جس چیز کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو اس میں ہمیں اضطراب میں ڈالنے والا شک ہے ⑨

رسولوں کو جھٹلانے والی کچھ سابقہ اقوام کا تذکرہ:

ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ تمام ہے قولِ موسیٰ علیہ السلام کا، یعنی موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کا اپنے رسولوں کو جھٹلانے والی قوموں سے انتقام لینا یاد دلایا۔[4] لیکن حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس قول میں نظر ہے اور ظاہر یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بالکل نئی خبر ہے اس اُمت کے لیے، کیوں کہ عاد اور ثمود کا قصہ تورات میں نہیں

① الأحاديث المختارة (٢/ ٣٤٥_ ٣٤٦) ② نوادر الأصول (٤/ ١٠٦_ ١٠٧)
③ فتح البيان (٧/ ٨٥_ ٨٩) ④ تفسير الطبري (١٦/ ٥٢٩)

ہے۔ پس اگر یہ کلام موسیٰ علیہ السلام کا ہوتا تو اس کا بیان بنی اسرائیل سے کرتے اور بے شک یہ دونوں قصے تورات میں آتے۔[1] واللہ أعلم۔ بالجملہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو قومِ نوح، عاد اور ثمود وغیرہم کی خبر سنائی اور ان اُمتوں کا ذکر فرمایا، جنھوں نے اپنے رسولوں کو جھٹلایا تھا، ان کی تعداد بے شمار ہے اللہ ہی جانے۔ ان کے پاس واضح دلائل اور قطعی حجتیں لے کر رسول آئے تھے۔ سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ نے آیت ﴿ لَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا اللّٰهُ ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے: "کذب النسابون" [نسب بیان کرنے والے جھوٹ بولتے ہیں]

عروہ بن زبیر رحمہ اللہ نے کہا کہ ہم نے کوئی ایسا شخص نہیں پایا جو معد بن عدنان کے بعد والوں کو پہچانتا ہو۔[2] اپنے ہاتھوں کو منہ میں دبانے کے معنے یہ ہیں کہ انھوں نے رسولوں کے مونہوں کی طرف اشارہ کیا کہ چپ رہو اور دعوت الی اللہ نہ کرو۔ بعض نے کہا کہ انھوں نے اپنے ہاتھ اپنے مونہوں پر رکھے رسولوں کی تکذیب کے لیے یا رسولوں کے جواب سے خاموش ہو گئے۔

امام مجاہد، محمد بن کعب اور قتادہ رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ انھوں نے رسولوں کو جھٹلایا اور ان کے قول کو اپنے مونہوں سے رد کیا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ اس کی توجیہ یہ ہے کہ حرف ﴿ فِيْ ﴾ اس جگہ حرفِ با کے معنی میں ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ہاتھوں کو منہ میں دبانے سے مراد ہے کہ غیظ وغضب سے اپنے ہاتھوں کو کاٹا۔ ابن زید رحمہ اللہ کا مختار بھی یہی ہے۔ اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی پسند کیا ہے اور اس کی توجیہ اس آیتِ کریمہ سے کی: ﴿ وَإِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْأَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ﴾ [آل عمران: ۱۱۹] "مگر جب تنہا ہوتے ہیں تو تم پر اپنی انگلیاں چباتے ہیں غصے کے مارے۔"[1] یہ آیت منافقین کے بارے میں ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اللہ کا کلام سن کر تعجب کیا اور اپنے ہاتھ منہ پر رکھ کر پھرے اور کہا کہ ہم اس رسالت میں تمھاری تصدیق نہیں کرتے، ہم کو تمھاری بات میں قوی شک ہے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ﴿ أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَؤُا... الخ ﴾ یا تو موسیٰ علیہ السلام کا اپنی قوم کو خطاب ہے۔ اس صورت میں یہ خطاب ﴿ أَيَّامِ اللّٰهِ ﴾ کے یاد کرانے میں داخل ہوگا۔ یا ابتداءً اللہ کا کلام ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو پہلے زمانے کی خبریں اور رسولوں کا آنا یاد دلایا۔ یا اللہ تعالیٰ کا اُمتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بطورِ تحذیر (ڈرانے کے لیے) خطاب ہے کہ تم خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت سے پرہیز کرو۔ جو اُمتیں قومِ نوح اور عاد اور ثمود کے بعد ہوئیں، ان کی گنتی اللہ ہی کو معلوم

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۲/ ٦٨٢) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٣٦)
[3] تفسیر ابن أبي حاتم (١٦/ ٥٣٣۔ ٥٣٦) [4] تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٣٦)

ہے کہ وہ کن صفتوں، حالات اور اخلاق کی مالک تھیں اور ان کی عمر کی مدت کتنی تھی، یا ان کی ذات کا حال کسی کو معلوم نہیں ہے۔ ہم کو اصلاً ان کی خبر نہیں پہنچی۔

عمرو بن میمون رحمہ اللہ اس آیت کو پڑھ کر کہتے کہ نسب بیان کرنے والے جھوٹے ہیں۔[1] امام ابومجلز رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ سے کہا: "أنا أنسب الناس" کہا: تو لوگوں کا نسب بیان نہیں کر سکتا۔ اس نے کہا: کر سکتا ہوں۔ کہا کہ بھلا تو نے اللہ تعالیٰ کا یہ قول سنا ہے: ﴿ وَّعَادًا وَّثَمُوْدَاۡ وَاَصْحٰبَ الرَّسِّ وَقُرُوْنًۢا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ﴾ [الفرقان: ۳۸] "اور قومِ عاد اور ثمود اور کنویں والے اور ان کے درمیان (دیگر) بہت سی قوموں کو بھی (ہم نے ہلاک کر دیا)۔" کہا کہ میں ان کثیر کا نسب بتا سکتا ہوں، کہا کہ بھلا اس آیت کو تو کیا کہتا ہے؟: ﴿ وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ﴾ وہ چپ ہو رہا کچھ جواب نہ دیا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ عدنان اور اسماعیل کے درمیان تیس باپ ایسے ہیں جو پہچانے نہیں جاتے۔[2] بالجملہ مذکورہ اُمتوں کے پاس ان کے رسول معجزاتِ قاہرہ اور دلالات وشرائع واضحہ لے کر آئے تھے، ان اُمتوں نے غصے کی وجہ سے اپنے ہاتھ اپنے مونہوں پر رکھے، تا کہ ہاتھ کاٹیں، اس لیے کہ رسولوں نے ان کی کم عقلی بیان کی اور ان کے اصنام واوثان کو بُرا بھلا کہا، اس وقت کہا کہ ہم تمھاری رسالت کے منکر ہیں اور ہم اس ایمان باللہ وتوحید آلہ میں جس کی طرف تم ہم کو بلاتے ہو، سخت شک میں ہیں۔

"رِیب" قلق کو کہتے ہیں اور عدمِ سکون کو، اور کسی چیز پر عدمِ اطمینان کو، جب کہ اس کے کفر کی تصریح کر دی جائے۔ شک کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ اگر ہم کفر کے اس مقام سے ہٹ بھی جائیں تو کم سے کم یہ بات ہے کہ ہمیں تمھاری نبوت میں شک ہے اور باوجود شک کے رسالت کا اعتراف کیسے کیا جا سکتا ہے۔ یا وہ لوگ دو فرقے تھے: ایک صریح کافر۔ دوسرے شک کرنے والے، یا ان کا کفر معجزات کے بارے میں تھا اور شک توحید میں تو اب باہم کچھ مخالفت نہ رہی۔[3]

قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ
يَدْعُوْكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ اِلٰۤى اَجَلٍ
مُّسَمًّى ؕ قَالُوْۤا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ؕ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا
عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝۱۰ قَالَتْ لَهُمْ
رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى

[1] تفسير الطبري (١٦/ ٥٢٩) [2] الدر المنثور (٥/ ٩-١٠) [3] فتح البيان (٧/ ٨٩-٩١)

مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا
بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝﴿11﴾ وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ
عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ؕ
وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝﴿12﴾

ان کے رسولوں نے کہا: کیا (تمھیں) اس اللہ کی بابت شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے؟ وہ تمھیں بلاتا ہے کہ تمھارے گناہ معاف کر دے اور تمھیں ایک مقرر وقت تک مہلت دے۔ وہ کہنے لگے: تم ہمارے جیسے بشر ہی تو ہو، تم چاہتے ہو کہ ہمیں ان (معبودوں) سے روک دو، جن کی ہمارے باپ دادا عبادت کرتے تھے، لہٰذا ہمارے پاس کھلی دلیل (معجزہ) لے آؤ ⑩ ان کے رسولوں نے ان سے کہا: واقعی ہم تمھارے جیسے بشر ہی ہیں اور لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس پر احسان کرتا ہے۔ اور ہمیں یہ اختیار نہیں کہ اللہ کے حکم کے بغیر ہم تمھارے پاس کوئی نشانی (یا دلیل) لا سکیں، اور مومنوں کو اللہ ہی پر توکل کرنا چاہیے ⑪ اور ہمارے پاس کیا عذر ہے کہ ہم اللہ پر توکل نہ کریں، جبکہ وہ ہمیں ہماری راہیں دکھا چکا ہے؟ اور ہم ان ایذاؤں پر ضرور صبر کریں گے جو تم ہمیں دیتے ہو۔ اور پس توکل کرنے والوں کو اللہ ہی پر توکل کرنا چاہیے ⑫

کفار اور رسولوں کے درمیان اختلاف:

جو جھگڑا کہ کفار اور رسولوں کے درمیان ہوا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کی خبر ہم کو دی۔ یہ قصہ اس طرح پر تھا کہ جب کفار نے اپنا شک اللہ وحدہ لا شریک لہ کی عبادت پر بیان کیا، تب رسولوں نے کہا کہ کیا اللہ میں شک ہے، یعنی اس کے وجود میں، کیوں کہ یہ آفرینش اس کی ہستی پر شاہد ہے اور اس اللہ کے اقرار کی طرف پھیرتی ہے۔ اللہ کی ہستی کا اعتراف کرنا فطرتِ سلیمہ میں ایک ضروری امر ہے۔ لیکن بعض فطرتوں میں کبھی شک اور بے چینی آجاتی ہے اور وہ نظر کی طرف دلیل کی محتاج ہوتی ہے، ایسی دلیل جو اس کے وجود تک پہنچا دے۔ اس لیے رسولوں نے اللہ وحدہ لا شریک لہ اور صانع کے وجود کی پہچان کی طرف لوگوں کو راہنمائی اور ہدایت کی کہ وہ آسمان اور زمین کا خالق، بلکہ کسی پہلی مثال کے بغیر ان کی ایجاد کرنے والا ہے، کیوں کہ ان دونوں کے نہ ہونے اور پھر پیدا ہونے اور ان کے مسخر ہونے پر شواہد ظاہر ہیں تو اب ضروری ہوا کہ ان کا بنانے والا بھی کوئی ہے: "وهو اللّٰه، لا إله إلا هو، خالق كل شيء وإلٰهه ومليكه.

قول: ﴿ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ ﴾ کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ کیا اللہ کی الوہیت اور توحید میں وجوبِ عبادت کے ساتھ کچھ شک وشبہ ہے۔ حالاں کہ جمیع موجودات کا خالق وہی ہے اور وہی وحدہ لا شریک لہ اس کا حق رکھتا ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔ اکثر امتوں کو اللہ کے صانع ہونے کا اقرار تھا، لیکن اس کے ہمراہ غیر کی عبادت بھی کرتے تھے، جن کو وسائط (درمیانی وسیلہ) ٹھہرایا تھا۔ ان کے بارے میں گمان تھا کہ وہ ان کو نفع دیتے ہیں یا اللہ سے نزدیک کر دیتے ہیں۔ رسولوں نے کہا کہ ہم تم کو توحیدِ خالص کی طرف اس لیے بلاتے ہیں کہ دارِ آخرت میں اللہ تعالیٰ تمھارے بعض گناہ بخش دے اور دنیا میں تمھیں ایک مدتِ معین تک ڈھیل دے کہ تم اچھی راہ اختیار کر کے فائدہ حاصل کر لو اور ہر فضل والے کو اس کا فضل عطا کرے۔

اُمتوں نے اس کے جواب میں پہلے مقام کو تسلیم کر لینے کے بعد رسالت کے بارے میں یہ حجت پیش کی جس کا حاصل کلام یہ تھا کہ تم ہماری طرح ایک بشر ہو، ہم صرف تمھارے کہنے پر اور اس معجزے کو دیکھ لینے پر کس طرح تمھاری پیروی کریں، جبکہ تم ہماری فرمایش کے مطابق کوئی سند بھی نہ لاؤ۔ رسولوں نے کہا کہ تمھاری یہ بات صحیح ہے کہ ہم اس مخلوق میں تمھاری طرح بشر ہیں، لیکن اللہ جس کو چاہے اس پر رسالت ونبوت کا احسان رکھے اور جس طرح کہ تم سند مانگتے ہو، ہم اس کو اللہ کے حکم کے بغیر نہیں لا سکتے۔ ایمانداروں کا بھروسا تمام کاموں میں اللہ پر ہوتا ہے۔ ہم کو اللہ پر توکل کرنے سے کون روک سکتا ہے؟ اللہ ہی نے تو ہم کو سیدھی واضح اور کھلی راہ دکھائی ہے۔ ہم تمھارے ستانے پر، یعنی بدکلامی پر اور تمھارے افعالِ سخیفہ (کم ظرفی کے کام) پر صبر کریں گے۔ توکل کرنے والے اللہ ہی پر توکل کیا کرتے ہیں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ کیا اللہ میں یعنی اس کی وحدانیت میں شک ہے۔ حالاں کہ یہ توحید پوری طرح واضح اور ظاہر ہے۔ یہ سوالیہ انداز ڈانٹ ڈپٹ اور انکار اور سرزنش کے طور پر تھا۔ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے، وہ تم کو اپنی خالص عبادت کی طرف اس لیے بلاتا ہے کہ تمھارے بعض گناہ بخش دے، اگر تم ایمان لے آؤ اور تصدیق کرو اور تم کو ایک مدت مقرر تک ڈھیل دیتا ہے، یعنی موت تک وہ دنیا میں تم کو عذاب نہ کرے گا۔

کفار نے کہا: تم ہیئت وصورت میں ہماری طرح ایک بشر ہو، کھاتے پیتے ہو، تم کو ہم پر کیا فضیلت ہے؟! تم کچھ فرشتے نہیں ہو۔ تم یہ چاہتے ہو کہ ہمارے آبا و اجداد کے جو معبود ہیں، جیسے: بت اور آستانے اور شریک ان کی عبادت سے تم ہم کو باز رکھو، سو اگر تم اس بات میں سچے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو بھیجا ہے تو اچھا تم کوئی حجتِ ظاہرہ لے آؤ جس سے ہم تم کو سچا جان لیں۔ حالاں کہ رسول ان کے پاس کھلی سند اور مضبوط دلیل لے کر آئے تھے، لیکن اس کے باوجود ان کا ایسا سوال کرنا ایک طرح کا عیب جوئی کرنا ہے اور من جملہ ان کے تلونات (رنگ بدلنا، طرح بطرح ہونا) کے ایک لون ہے۔

رسولوں نے کہا کہ تمھارا یہ کہنا ٹھیک ہے کہ ہم شکل وصورت میں تمھاری طرح کے بشر ہیں، بلکہ تمام صفاتِ بشریہ میں، جیسے: کھانا پینا، صحت اور بیماری اور اسی طرح کی دوسری باتوں میں، لیکن اس میں کسی کا کیا اجارہ ہے کہ اللہ جس کو چاہے رسول اور نبی بنا دے اور احسان فرمائے، ہدایت کی توفیق بخشے۔ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ نبوت امرِ وہبی ہے نہ کہ کسبی، جس طرح کہ فلسفی جاہلوں اور گمراہ حکما کا گمان ہے۔ بھلا ہم کہیں کوئی سند لا سکتے ہیں، مگر اللہ کے حکم سے، یہ بات ہماری قدرت میں نہیں ہے۔ مومنین دشمنوں کے شر کو دور کرنے اور آزمایشوں پر صبر کرنے کے لیے اللہ پر بھروسا کرتے ہیں۔ ہم کس طرح اللہ پر توکل نہ کریں، حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اپنی راہیں سمجھائی ہیں اور ہم تمھاری ایذا دہی پر صبر کریں گے، کیوں کہ توکل کرنے والے اللہ ہی پر توکل کرتے ہیں۔[1]

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ۭ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ ۝ وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ۝ مِّنْ وَّرَاۗىِٕهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّاۗءٍ صَدِيْدٍ ۝ يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ۭ وَمِنْ وَّرَاۗىِٕهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ ۝

اور کافروں نے اپنے رسولوں سے کہا: ہم تمھیں اپنی زمین سے ضرور نکال دیں گے یا تم ضرور بالضرور ہمارے دین میں لوٹ آؤ گے، چناں چہ ان کے رب نے ان کی طرف وحی کی کہ ہم ظالموں کو ضرور ہلاک کر دیں گے (13) اور ان کے بعد ہم ضرور تمھیں (اس) سرزمین میں آباد کریں گے، یہ (انعام) اس کے لیے ہے کہ جو میرے حضور کھڑا ہونے سے ڈرا اور میری وعید سے ڈرا (14) اور انھوں نے فتح مانگی اور ہر سرکش، عناد رکھنے والا ناکام ہوا (15) اس کے آگے جہنم ہے اور (وہاں) اسے پیپ کا پانی پلایا جائے گا (16) جسے وہ گھونٹ گھونٹ پیے گا، مگر حلق سے نہ اُتار سکے گا اور ہر طرف سے اس کو موت آئے گی، جب کہ وہ مرے گا نہیں۔ اور اس کے آگے نہایت سخت عذاب ہوگا (17)

سابقہ کافر امتوں کی اپنے رسولوں کو دھمکی:

اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ اگلی کافر اُمتوں نے اپنے رسولوں کو یہ وعید سنائی تھی کہ تم کو شہر بدر کر دیں گے اور

[1] فتح البیان (۷/ ۹۲۔ ۹٤)

اپنے ہاں سے نکال باہر کریں گے، جس طرح کہ قوم شعیب نے کہا تھا: ﴿ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ ﴾ [الأعراف: ۸۸] ''اے شعیب! ہم تجھے اور ان لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں، اپنی بستی سے ضرور نکال دیں گے۔'' اور جس طرح قوم لوط نے کہا تھا: ﴿ اَخْرِجُوْٓا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴾ [النمل: ٥٦] ''آلِ لوط کو اپنی بستی سے نکال دو، کیوں کہ یہ لوگ تو بڑے پاک صاف بنتے ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے مشرکینِ قریش کے حال سے خبر دی ہے: ﴿ وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ٧٦] ''اور بلاشبہ قریب تھا کہ وہ آپ کو اس زمین (مکہ) سے اُکھاڑ دیں، تاکہ آپ کو یہاں سے نکال دیں، اور تب آپ کے پیچھے وہ تھوڑا ہی ٹھہر پاتے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ۭ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴾ [الأنفال: ۳۰] ''اور (اے نبی! یاد کیجیے) جب وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا آپ کے بارے میں تدبیر کر رہے تھے، تاکہ وہ آپ کو قید کر دیں یا آپ کو قتل کر دیں یا آپ کو (مکہ سے) نکال دیں اور وہ تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ بھی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے رسولوں کے لیے فتح اور نصرت کی نوید:

اللہ کی کارروائی یہ ہوئی کہ اس نے اپنے رسول کو غلبہ دیا، نصرت فرمائی اور مکہ معظّمہ سے نکلنے کی وجہ سے انصار، اعوان اور لشکر مقرر کیے جو اس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں اور ہمیشہ ایک حال سے دوسرے حال پر ترقی بخشی، یہاں تک کہ مکہ مکرمہ، جہاں سے وہ نکالے گئے تھے، فتح ہوا اور اللہ تعالیٰ نے اُس جگہ ان کو متمکن کیا اور دشمنوں کی ناک خاک آلودہ کی اور تمام زمین والوں کو ذلیل کیا، یہاں تک کہ لوگ اللہ کے دین میں فوج در فوج اور جوق در جوق آنے لگے اور اللہ کا کلمہ اور دین تمام دینوں پر زمین کے مشرق اور مغرب میں تھوڑے سے زمانے کے اندر غالب آ گیا۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے ان رسولوں کی طرف وحی کی کہ ہم ستم گاروں کو برباد کریں گے اور ان کے بعد تم کو زمین میں آباد کریں گے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ۝۱۷۱ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ۝۱۷۲ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴾ [الصّٰفّٰت: ۱۷۱۔ ۱۷۳] ''اور درحقیقت ہمارا وعدہ پہلے ہی اپنے ان بندوں کے لیے صادر ہو چکا ہے جو رسول ہیں۔ کہ یقیناً انھی کی مدد کی جائے گی۔ اور بلاشبہ ہمارا لشکر ہی غالب رہے گا۔'' نیز فرمایا: ﴿ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴾ [المجادلة: ۲۱] ''اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ میں اور میرے رسول ضرور غالب آئیں گے، بے شک اللہ قوی، بڑا زبردست ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ﴾ [الأنبیآء: ۱۰۵] ''اور بلاشبہ ہم زبور میں نصیحت کے

بعد یہ لکھ چکے ہیں کہ بے شک میرے بندے زمین کے وارث ہوں گے۔“

موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا تھا: ﴿ اِسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَ اصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴾ [الأعراف: ١٢٨] ”تم اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو، بے شک زمین تو اللہ ہی کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے، اور (اچھا) انجام تو پرہیزگاروں ہی کے لیے ہے۔“ نیز فرمایا: ﴿ وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَ مَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬ بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَ دَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَ قَوْمُهٗ وَ مَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ﴾ [الأعراف: ١٣٧] ”اور ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے، اس زمین کے مشرق اور مغرب کا وارث بنا دیا، جس میں ہم نے برکت رکھی تھی۔ اور (اے نبی! اس طرح) بنی اسرائیل کے حق میں آپ کے رب کا اچھا وعدہ پورا ہوا، اس لیے کہ انھوں نے صبر کیا تھا۔ اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کا وہ سب کچھ تباہ کر دیا جو (کارخانے) وہ بناتے اور جو (محلات کی عمارتیں) وہ اٹھاتے تھے۔“

بالجملہ اللہ تعالیٰ نے کہا: میرا یہ وعدہ اس کے لیے ہے جو قیامت کے دن میرے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرے اور میرے عذاب اور سزا سے ڈرے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۙ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴾ [النازعات: ٤٠۔ ٤١] ”لیکن جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈر گیا اور اپنے نفس کو خواہش سے روکا۔ تو بے شک جنت ہی (اس کا) ٹھکانا ہے۔“ نیز فرمایا: ﴿ وَ لِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ﴾ [الرحمٰن: ٤٦] ”اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈر گیا، اس کے لیے دو باغ ہیں۔“

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ رسولوں نے اپنے رب سے فتح چاہی اپنی قوم پر۔ امام مجاہد اور قتادہ رحمہم اللہ کا قول بھی یہی ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا کہ امتوں نے اپنے نفس پر فتح طلب کی۔ جس طرح کہا تھا: ﴿ اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ [الأنفال: ٣٢] ”اور جب انھوں نے کہا: اے اللہ! اگر یہ (قرآن) تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا ہم پر دردناک عذاب لے آ۔“[1]

اور اس بات کا احتمال ہے کہ یہ دونوں معنی مراد ہوں۔ جس طرح کہ بدر کے دن انھوں نے اپنے نفس پر فتح چاہی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فتح اور نصرت طلب کی اور اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو خطاب کیا: ﴿ اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَ اِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ اِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ وَ لَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْـًٔا وَّ لَوْ كَثُرَتْ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [الأنفال: ١٩] ”(کافروں سے کہہ دیجیے:) اگر تم فیصلہ مانگتے تھے تو فیصلہ تمھارے سامنے آ گیا

[1] تفسير الطبري (١٦/ ٥٤٣۔ ٥٤٦)

اور اگر تم باز آ جاؤ تو وہ تمھارے حق میں بہتر ہے اور اگر تم دوبارہ (پہلے کی طرح) کرو گے تو ہم بھی پھر اسی طرح کریں گے (تمھیں سزا دیں گے) اور تمھاری جماعت اگرچہ زیادہ ہی ہو وہ تمھیں ہرگز کچھ فائدہ نہ دے گی اور بے شک اللہ مومنوں کے ساتھ ہے۔''

جبار وہ ہے جو اپنے جی میں تجبر کرے، عنید وہ ہے جو حق کا دشمن ہو۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ ۝ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيْبِ ۝ الَّذِيْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَاَلْقِيَاهُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيْدِ ﴾ [ق: ٢٤۔ ٢٦] ''(حکم ہوگا:) تم دونوں ہر کافر سرکش کو جہنم میں ڈال دو۔ بھلائی سے منع کرنے والے کو، حد سے نکلنے والے (اور دین میں) شک کرنے والے کو۔ وہ جس نے اللہ کے ساتھ دوسرا معبود بنا لیا تھا، لہٰذا تم دونوں اسے سخت عذاب میں ڈال دو۔'' اور حدیث میں مروی ہے: « يُؤْتٰى بِجَهَنَّمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَتَنَادَى الْخَلَائِقَ فَتَقُوْلُ: إِنِّيْ وُكِّلْتُ بِكُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ »[1] [قیامت کے دن جہنم کو لایا جائے گا، وہ تمام مخلوق کو ندا کر کے کہے گی کہ میں ہر ایک سرکش ضدی کے لیے مقرر کی گئی ہوں] خَيَّبَتْ بمعنی خسران ہے۔ ورآء اس جگہ بہ معنی امام (آگے) ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ﴾ [الكهف: ٧٩] ''جبکہ ان کے آگے ایک بادشاہ تھا جو ہر کشتی زبردستی لے لیتا تھا۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی قراءت یوں تھی: "وكان إمامهم ملك"[2] [ان کے آگے ایک بادشاہ تھا] غرض یہ کہ ان کے آگے جہنم ان کی تاک میں ہے۔ یہ قیامت کو اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور صبح و شام آگ پر ان کی پیشی رہے گی، قیامت تک پینے کو پیپ ملے گا، یعنی جہنم میں سوائے حمیم و غساق کے کوئی شراب نہیں ہے، ایک نہایت درجے کی حرارت میں اور دوسرا نہایت درجے کی ٹھنڈک میں ہے اور انتہا درجے کی بدبودار۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ هٰذَا فَلْيَذُوْقُوْهُ حَمِيْمٌ وَّغَسَّاقٌ ۝ وَّاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖٓ اَزْوَاجٌ ﴾ [صٓ: ٥٧۔ ٥٨] ''یہ ہے کھولتا ہوا پانی اور پیپ، اب وہ اس کو چکھیں۔ اور ان کے مانند کئی قسم کے دوسرے (عذاب) ہوں گے۔''

امام مجاہد اور عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: صدید پیپ اور خون کو کہتے ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: صدید وہ ہے جو گوشت اور کھال سے بہے۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ جو کافر کے پیٹ سے نکلے اور پیپ اور خون سے مخلوط ہو۔[3] سیدہ اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا سے حدیث میں مروی ہے کہ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! طینۃ الخبال کیا ہے؟ فرمایا: اہلِ نار کا زرد رنگ کا پانی۔[4] سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ یہ صدید ان کے منہ کے قریب کیا جائے گا، وہ

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٧٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٥١٢) [2] تفسير الطبري (١٨/ ٨٣)

[3] تفسير الطبري (١٦/ ٥٤٨) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٣٩)

[4] مسند أحمد (٦/ ٤٦٠) نيز [illegible] الحديث (٢٠٠) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٨٠)

چہرے کو بھون دے گا، چمڑا گل سڑ کر گر پڑے گا، جب اس کو پیے گا تو اس کی آنتیں کٹ پڑیں گی اور دُبر (پیٹھ) کے راہ سے نکلیں گیں۔'' جیسے فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ ﴾ [محمد: ١٥] ''اور انھیں گرم کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا، تو وہ اُن کی آنتیں ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا؟'' نیز اللہ فرماتا ہے: ﴿ وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ ؕ بِئْسَ الشَّرَابُ ؕ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا ﴾ [الكهف: ٢٩] ''اور اگر وہ پانی کے لیے فریاد کریں گے تو ایسے پانی کے ساتھ ان کی فریاد رسی کی جائے گی جو تیل کی تلچھٹ کے مانند ہوگا، وہ (ان کے) چہرے بھون ڈالے گا، وہ برا مشروب ہے اور وہ بری آرام گاہ ہے۔''[1] (رواه أحمد و ابن جرير و ابن أبي حاتم)

تجرع سے یہ مراد ہے کہ وہ صدید گلے میں پھنسے گا، گلے سے نیچے بہ مشکل اترے گا۔ یہ جبار عنید قہراً جبراً اس کو پیے گا، جب تک کہ فرشتہ ایک لوہے کے ہتھوڑے سے اس کو نہ مارے گا تب تک وہ اس کو اپنے منہ میں نہ لے گا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ﴾ [الحج: ٢١] ''اور ان (کو مارنے) کے لیے لوہے کے ہتھوڑے ہوں گے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ ﴾ (آیتِ باب)۔ یعنی اس کو گلے میں لوٹے پھیرے گا اس کی بدمزگی، بدرنگت، بدبو اور سخت گرم اور سخت ٹھنڈا ہونے کی وجہ سے جس کی اس کو طاقت نہ ہوگی اور ہر طرف سے اس کو موت آ گھیرے گی، یعنی موت کا دکھ درد سارے تن بدن، اعضا اور جوارح میں طاری وساری ہو جائے گا۔ میمون بن مہران رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر ہڈی اور رگ وپے میں سرایت کرے گا۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا کہ بدن کے بالوں کی جگہ سے۔ ابراہیم تیمی رحمہ اللہ نے کہا کہ ہر بال کی جڑ میں۔[1] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ ہر مکان سے مراد پیچھے اور آگے سے ہے۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ مراد دائیں اور بائیں ہے اور اوپر اور نیچے، بلکہ جسم کے تمام اعضا۔[2]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ مراد طرح طرح کا عذاب ہے جس کے ساتھ قیامت کے دن عذاب کیا جائے گا۔ اس عذاب کی ہر قسم ایسی ہوگی کہ اگر موت آنا ہوتو موت آجائے۔ لیکن وہ مرے گا نہیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا ﴾ [الفاطر: ٣٦] ''ان کے متعلق یہ فیصلہ نہیں کیا جائے گا کہ وہ مر جائیں اور نہ ان سے اس (جہنم) کا عذاب ہلکا کیا جائے گا۔''[4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا مطلب یہ ہے کہ عذاب کی ان قسموں میں سے ہر قسم ایسی ہے کہ جب اس پر وارد ہوگی تو موت لانے والی ہوگی، اگر وہ مرنے والا ہوتا، لیکن اسے کب موت آتی ہے، وہ تو ہمیشہ کے عذاب میں ابدا لآباد تک گرفتار رہے گا۔ اسے سزا

---

① سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٨٣) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٧١) مسند أحمد (٥/ ٢٦٥) تفسير الطبري (١٦/ ٥٤٩) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٣٩) اس کی سند میں ''عبیداللہ بن بسر'' مجہول راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٦٨٩٧)

② تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٣٩) تفسير ابن كثير (٢/ ٦٨٥)

③ تفسير الطبري (١٦/ ٥٥١_ ٥٥٢) ④ تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٣٩)

اور وبال ملتا رہے گا۔ لہٰذا فرمایا ہے کہ اُس کو ہر جگہ سے موت آئے گی، مگر وہ مرے گا نہیں۔ اس کے بعد اس کے لیے عذاب غلیظ ہے، یعنی پہلے عذاب سے بھی بڑھ کر اور سخت و دشوار تر اور تلخ و آفت رساننده تر اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق ہے: ﴿ اَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ ﴿62﴾ اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِيْنَ ﴿63﴾ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ ﴿64﴾ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ ﴿65﴾ فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴿66﴾ ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيْمٍ ﴿67﴾ ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ ﴾ [الصّٰفّٰت: ٦٢۔ ٦٨] ”کیا یہ مہمانی بہتر ہے یا (دوزخ میں) تھوہر کا درخت؟ بلاشبہ ہم نے اسے ظالموں کے لیے آزمائش بنایا ہے۔ بے شک وہ ایک درخت ہے جو دوزخ کی تہ میں اُگتا ہے۔ اس کا پھل گویا کہ وہ شیطانوں کے سر ہیں۔ تو بلاشبہ وہ (دوزخی) اس میں سے کھائیں گے، پھر اس سے (اپنے) پیٹ بھریں گے۔ پھر اس پر بے شک ان کے لیے (پینے کو) گرم کھولتے پانی کا آمیزہ ہوگا۔ پھر یقیناً ان کی واپسی بھڑکتی آگ کی طرف ہوگی۔“ اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ کبھی وہ زقوم کھائیں گے اور کبھی آبِ گرم پئیں گے اور کبھی جہنم میں داخل ہوں گے۔ عیاذا باللّٰہ من ذلك.

اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿43﴾ يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ﴾ [الرحمٰن: ٤٣۔ ٤٤] ”(انھیں کہا جائے گا:) یہی وہ جہنم ہے جسے مجرم لوگ جھٹلاتے تھے۔ وہ جہنم کے درمیان اور سخت گرم کھولتے پانی کے درمیان چکر لگائیں گے۔“ نیز فرمایا: ﴿ اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ﴿43﴾ طَعَامُ الْاَثِيْمِ ﴿44﴾ كَالْمُهْلِ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ ﴿45﴾ كَغَلْيِ الْحَمِيْمِ ﴿46﴾ خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ اِلٰى سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ﴿47﴾ ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَاْسِهٖ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيْمِ ﴿48﴾ ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ﴿49﴾ اِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ ﴾ [الدخان: ٤٣۔ ٥٠] ”بے شک تھوہر کا درخت گناہ گار کا کھانا ہے۔ پگھلے تانبے (یا تلچھٹ) کے مانند، وہ پیٹوں میں کھولے گا۔ تیز گرم پانی کے کھولنے کی طرح۔ (حکم ہوگا:) اسے پکڑو اور گھسیٹتے ہوئے جہنم کے درمیان لے جاؤ۔ پھر اس کے سر پر تیز گرم پانی کا عذاب انڈیلو۔ (مزہ) چکھ! بے شک تو بڑا عزت والا، بڑا تکریم والا (بنا پھرتا) تھا۔ بلاشبہ یہی وہ (عذاب) ہے جس میں تم شک کرتے تھے۔“

نیز فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ مَآ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ﴿41﴾ فِيْ سَمُوْمٍ وَّحَمِيْمٍ ﴿42﴾ وَّظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ ﴿43﴾ لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيْمٍ ﴾ [الواقعة: ٤١۔ ٤٤] ”اور بائیں (ہاتھ) والے، کیا (حقیر) ہیں بائیں ہاتھ والے! (وہ) سخت گرم ہوا اور کھولتے پانی میں (ہوں گے)۔ اور سیاہ ترین دھویں کے سائے میں۔ نہ (وہ) ٹھنڈا ہوگا اور نہ فرحت بخش۔“ نیز فرمایا: ﴿ هٰذَا ۭ وَاِنَّ لِلطّٰغِيْنَ لَشَرَّ مَاٰبٍ ﴿55﴾ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿56﴾ هٰذَا ۙ فَلْيَذُوْقُوْهُ حَمِيْمٌ وَّغَسَّاقٌ ﴿57﴾ وَّاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖٓ اَزْوَاجٌ ﴾ [صٓ: ٥٥۔ ٥٨] ”یہ (معاملہ اہلِ خیر کا) ہے اور بلاشبہ سرکشوں کے لیے

بہت برا ٹھکانا ہے۔ (یعنی) جہنم، وہ اس میں داخل ہوں گے، چناں چہ وہ آرام کرنے کی بری جگہ ہے۔ یہ ہے کھولتا ہوا پانی اور پیپ، اب وہ اس کو چکھیں۔ اور ان کے مانند کئی قسم کے دوسرے (عذاب) ہوں گے۔'' اس کے سوا اور بہت سی آیتیں ہیں، جن میں اس بات کی دلیلیں ہیں کہ طرح طرح کے عذاب ہوں گے، جو بار بار دیے جائیں گے، جن کا شمار اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔ ﴿جَزَآءً وِّفَاقًا﴾ [النبأ: ٢٦] ''(یہ ہے) بدلہ پورا۔'' نیز فرمایا: ﴿وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ﴾ [حٰمٓ السجدة: ٤٦] ''اور آپ کا رب بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جس گروہ نے رسولوں کی بات کو قبول کرنے سے سرکشی کی، اس نے اپنے رسولوں سے قسم کھا کر یہ بات کہی کہ ہم تم کو اپنی سرزمین سے نکال دیں گے یا تم ہماری ملت میں آجاؤ۔ ''عَوْد'' اس جگہ بہ معنی صیرورت ہے، یعنی طریقۂ شرک میں داخل ہو جاؤ۔ تب اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو پیغام بھیجا کہ ہم ان کفار کو ہلاک کر دیں گے اور تمھیں اس زمین میں سکونت دیں گے، چناں چہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ یہ وعدہ پورا کیا۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ دنیا میں مدد اور آخرت میں جنت کا وعدہ دیا،[1] مگر ان لوگوں کے لیے جن کو اللہ کے سامنے کھڑے ہونے کا اور وعید کا خوف ہے۔ پیغمبروں نے اللہ تعالیٰ سے اپنے دشمنوں پر اپنی فتح یابی کا سوال کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو فتح دی اور ہر تکبر کرنے والے دشمن کو نامراد اور زیاں کار کیا، ان کے سامنے دوزخ ہے اور ان کو زرد آب پلایا جائے گا۔ یہ اس کو ایک ایک گھونٹ کر کے پئیں گے، لیکن گلے سے نیچے اتار نہ سکیں گے، ہر طرف سے موت کے اسباب آئیں گے، اوپر نیچے اور دائیں بائیں سے، بلکہ بدن کی ہر جگہ سے۔

امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ موت سے مراد وہ آزمایشیں اور تکالیف ہیں جو کافر کو دوزخ میں پہنچیں گی۔[2] شدت کی وجہ سے ان کا نام موت رکھا ہے۔ لہٰذا فرمایا کہ وہ مرنے والا نہیں، یعنی موت کی سختیوں کی طوالت اور سکراتِ موت کی وجہ سے۔ یا اس کا دم حلق میں اٹک رہا ہے، نہ باہر نکلتا ہے کہ مرجائے اور نہ اندر اپنی جگہ میں جاتا ہے کہ زندہ سمجھا جائے۔ پھر اس کے پیچھے یا سامنے سخت عذاب ہے کہ ہر دم آگے آتا ہے۔ یا مراد دوزخ میں ہمیشگی اور جانوں کا حبس ہے۔[3]

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ اِشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ۝۱۸

جن لوگوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا ان کے (نیک) اعمال کی مثال راکھ کی سی ہے، جس پر

[1] تفسیر الطبري (١٦/ ٥٤١) [2] تفسیر القرطبي (٩/ ٣٥٢) [3] فتح البیان (٧/ ٩٥۔ ١٠٠)

آندھی کے دن زور کی ہوا چلی۔ جو کچھ انھوں نے کمایا، وہ اس پر کوئی قدرت نہیں رکھیں گے۔ یہی پرلے درجے کی گمراہی ہے ⑱

کفار کے اعمال کی مثال:

یہ ایک مثال ہے، جو اللہ تعالیٰ نے کفار کے اعمال کے واسطے بیان کی ہے، جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ غیر کو پوجا ہے اور پیغمبروں کو جھٹلایا اور اپنے اعمال کو ایسی بنیاد پر استوار کیا، جو صحیح نہ تھی، ان کی وہ بنیاد ڈھے گئی اور مٹ گئی، ایسے وقت میں جب کہ وہ اس کے سخت محتاج تھے۔ چنانچہ ان کفار کے اعمال کی مثال قیامت کے دن جبکہ وہ ان اعمال کے ثواب کے طالب ہوں گے اور ان کو یہ گمان ہوگا کہ ہم نے کچھ کام کیا ہے اور وہ کچھ بھی نہ پائیں گے اور نہ ہی کچھ حاصل ہوگا، ایسی مثال ہے جیسے راکھ کہ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، جس دن کہ آندھی کی تیز ہوا چلتی ہے اور وہ راکھ اڑ جاتی ہے، اسی طرح انھیں اپنے اعمال پر جو انھوں نے دنیا میں کیے تھے، کچھ قدرت حاصل نہ ہوگی۔ کیوں کہ آندھی کے دن راکھ کو کون جمع کر سکتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴾ [الفرقان: ٢٣] ''اور انھوں نے جو (بظاہر نیک) عمل کیے ہوں گے، ہم ان کی طرف متوجہ ہو کر ان کو اڑتا ہوا پراگندہ گرد و غبار بنا دیں گے۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ۭ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴾ [آل عمران: ١١٧] ''(کافر) اس دنیا میں جو کچھ خرچ کرتے ہیں، اس کی مثال ایسی آندھی کی سی ہے جس میں سخت پالا ہو، وہ ان لوگوں کی کھیتی پر چلے جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، تو وہ اسے تباہ کر ڈالے۔ اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا، بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔'' نیز فرمایا: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَاۗءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰي شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ [البقرۃ: ٢٦٤] ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور دکھ دے کر اس شخص کی طرح ضائع نہ کرو جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے اور وہ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا تو اس کی مثال چکنے پتھر کی سی ہے جس پر مٹی پڑی ہو، پھر اس پر زور کی بارش ہو تو (ساری مٹی بہہ جائے اور) صاف چٹان رہ جائے۔ وہ (ریاکار) جو نیکی کرتے ہیں، اس سے کچھ بھی ان کے ہاتھ نہیں آتا اور اللہ کافروں کو ہدایت نہیں دیتا۔'' اس آیت میں ضلال بعید فرمایا ہے، یعنی ان کی سعی اور عمل بے بنیاد ہے، انھوں نے ان اعمال کے ثواب کو گم کر دیا شدید حاجت کے وقت۔ سو یہ ایک دور دراز کی گمراہی ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جو لوگ اپنے رب کے منکر ہوئے ہیں، ان کے اعمالِ صالحہ، مثلاً: صدقہ، صلہ رحمی، قیدیوں کو چھڑانا، مہمانی کرنا، والدین کے ساتھ احسان کرنا اور اسی طرح کے دوسرے اعمال۔ یا ان کا بتوں اور آستانوں اور اللہ کے شریکوں کی عبادت کرنا جن کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یا وہ اعمال جن میں انھوں نے غیر اللہ کو شریک کیا ہے، یہ سب اعمال مثلِ خاکستر ہیں، یعنی باطل اور غیر مقبول ہیں۔ رَماد وہ ہے، جو لکڑی یا کوئلے سے جلنے کے بعد جھڑ پڑتی ہے، جس کو راکھ کہتے ہیں۔ جس دن آندھی چلتی ہے اور ہوا تیز ہوتی ہے تو وہ راکھ نہیں تھمتی، اسی طرح ان کفار کو اپنے اعمال میں کچھ دستگاہ نہ ہوگی، وہ سارے اعمال رماد کی طرح اڑ جائیں گے، سو یہ ایک ضلالِ بعید ہے، حق کے راستے سے اور صواب کے طریقے کے خلاف ہے۔[1]

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿۱۹﴾ وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴿۲۰﴾

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ بے شک اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا۔ اگر وہ چاہے تو تمھیں لے جائے اور نئی مخلوق لے آئے ⑲ اور اللہ کے لیے یہ (کام) کچھ بھی مشکل نہیں ⑳

مرنے کے بعد زندہ ہونے کے دلائل:

اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن جسموں کو دوبارہ لوٹانے کی خبر دی کہ ہم نے آسمان و زمین بنائے ہیں جن کی پیدایش انسان کی پیدایش سے بڑھ کر ہے کہ جس کو یہ قدرت ہے کہ اس نے ایسے بلند، وسیع اور عظیم آسمان بنائے اور ان میں کواکب وثوابت و سیارات ومختلف حرکات اور واضح نشانیاں رکھی ہیں اور یہ زمین پیدا کی ہے اور اس میں فرش، گڑھے، پہاڑ، جنگل، صحرا، بیابان، دریا، درخت، نباتات وحیوانات مختلف اقسام اور منافع اور اشکال اور رنگوں اور وضع قطع کے بنائے، وہ انسان کو دوبارہ نہیں پیدا کر سکتا: ﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰۤى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ؕ بَلٰۤى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ [الأحقاف: ۳۳] ''کیا انھوں نے دیکھا (جانا) نہیں کہ بے شک اللہ، جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور وہ ان کے پیدا کرنے سے اُکتایا نہیں، اس پر قادر ہے کہ مُردوں کو زندہ کرے۔ کیوں نہیں! بلاشبہہ وہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔''

نیز فرمایا: ﴿ اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۷﴾ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ

[1] فتح البیان (۷/ ۱۰۰۔ ۱۰۱)

خَلْقَهٗ ؕ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۝ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمُ ۝ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ۝ اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ؕ بَلٰى وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ۝ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ ﴾ [یٰسٓ: ۷۷۔۸۳] ’’کیا انسان نے نہیں دیکھا کہ بے شک ہم نے اسے نطفے سے پیدا کیا ہے؟ پھر یکایک وہ کھلا جھگڑالو ہو گیا۔ اور اس نے ہمارے لیے ایک مثال بیان کی اور وہ اپنی پیدائش کو بھول گیا، اس نے کہا: ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا، جب کہ وہ گلی سڑی ہوں گے؟ آپ کہہ دیجیے: انھیں وہی (اللہ) زندہ کرے گا جس نے انھیں پہلی بار پیدا کیا اور وہ ہر طرح کے پیدا کرنے کو خوب جانتا ہے۔ وہ (اللہ) جس نے تمھارے لیے سبز درخت سے آگ بنا دی، پھر یکایک تم اس سے آگ سلگا لیتے ہو۔ کیا وہ (اللہ) جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس بات پر قادر نہیں کہ وہ ان جیسے (انسان) پیدا کر دے؟ کیوں نہیں! وہی تو (سب کچھ) پیدا کرنے والا، خوب جاننے والا ہے۔ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو بس اس کا حکم صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اس سے کہتا ہے: ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔ چناں چہ پاک ہے وہ (اللہ) جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہی ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔‘‘

آیتِ باب میں فرمایا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو تم کو لے جائے اور ایک نئی مخلوق لے آئے، یہ کام اس پر کچھ مشکل نہیں ہے۔ اگر تم اللہ کے حکم کے خلاف کرو گے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ﴾ [محمد: ۳۸] ’’اور اگر تم پھرو گے تو اللہ تمھارے سوا دوسرے لوگ بدل لائے گا، پھر وہ تم جیسے (نافرمان) نہ ہوں گے۔‘‘ نیز فرمایا: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ﴾ [المآئدۃ: ۵۴] ’’اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے، تو پھر اللہ جلد ایسے لوگ لائے گا کہ وہ ان سے محبت کرتا ہوگا، اور وہ اس سے محبت کرتے ہوں گے۔‘‘ نیز فرمایا: ﴿ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا ﴾ [النسآء: ۱۳۳] ’’اے لوگو! اگر اللہ چاہے تو تمھیں ہٹا کر تمھاری جگہ دوسروں کو لے آئے اور اللہ اس بات کی پوری قدرت رکھتا ہے۔‘‘

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اس جگہ رویتِ قلبی ہے اور خطاب نبی مکرم ﷺ کو ہے، یا اُمت کو اشارہ ہے، یا یہ ہر شخص کو جو صالح خطاب ہے، یعنی تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کو حق سے صحیح وجہ پر پیدا کیا ہے، تا کہ اللہ کی کمال قدرت پر دلیل ہو، کچھ باطل اور بے فائدہ نہیں بنایا۔ وہ اگر چاہے تو اے لوگو! وہ تمھیں اس دنیا سے

لے جائے اور تمھیں نابود کر دے، تمھارا اَتا پتا نہ چلے اور ایک اور ہی مخلوق تمھارے علاوہ لے آئے۔ یعنی موجود کو معدوم کر دے اور معدوم کو موجود کر دے۔ نافرمان ہلاک ہو جائیں اور ان کے بجائے فرماں بردار آجائیں، کیوں کہ قادر پر کوئی امر مشکل نہیں ہوتا۔ اللہ کی قدرت لذاتہٖ کسی مقدور کے ساتھ مختص نہیں ہے، یعنی کسی خاص مخلوق کو ہی پیدا کر سکتا ہے اور یہ خلقِ جدید ہو سکتا ہے کہ نوعِ انسان ہو یا کوئی اور نوع ہو۔ یہ تمھارا لے جانا اور دوسروں کا لانا اللہ تعالیٰ کے لیے کچھ مشکل نہیں ہے۔ آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اس لائق ہے کہ اس سے ثواب کی اُمید رکھی جائے اور عذاب کا خوف رکھا جائے۔ لہٰذا اس کے بعد آخرت کے احوال کا ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے:[1]

وَ بَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِیْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْۤا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَیْنٰكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَیْنَاۤ اَجَزِعْنَاۤ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِیْصٍ ۝۲۱

اور وہ سب (لوگ) اللہ کے سامنے کھڑے ہوں گے تو کمزور لوگ ان لوگوں سے کہیں گے جو (دنیا میں) تکبر کرتے تھے: بے شک ہم تو تمھارے تابع تھے، پھر کیا تم ہم سے اللہ کا کچھ عذاب دور کر سکتے ہو؟ وہ کہیں گے: اگر اللہ ہمیں ہدایت دیتا تو ہم ضرور تمھیں بھی ہدایت کرتے۔ اب ہمارے لیے برابر ہے، خواہ ہم روئیں پیٹیں یا صبر کریں، ہمارے لیے بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں (21)

جہنم میں سرداروں اور ان کے پیروکاروں کا جھگڑا:

اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ساری مخلوق، کیا نیک کیا بد، ایک کھلی زمین میں اللہ کے سامنے کھڑی ہوگی، جہاں کوئی چیز کسی کو چھپا نہ سکے گی۔ ضعفا، یعنی اتباع کرنے والے اپنے سرداروں اور بڑوں سے جو اللہ وحدہ لا شریک لہ کی عبادت سے تکبر کرتے تھے اور رسولوں کی موافقت کرنے سے تکبر کرتے تھے، کہیں گے کہ ہم تو تمھارے حکم بردار اور پیروکار تھے، جو کچھ تم کہتے تھے ہم وہی کرتے تھے، اب تم کچھ اللہ کا عذاب ہم سے دور کر سکتے ہو تو کرو، جس طرح کہ دنیا میں تم نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور ہم کو اُمید دلائی تھی۔ وہ کہیں گے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہم کو ہدایت کرتا تو ہم تم کو ہدایت کرتے، لیکن ہم پر تو اللہ کا قول ثابت ہوگیا اور ہمارے تمھارے لیے اللہ کی قضا و قدر نے سبقت کی اور عذاب کا کلمہ کافروں پر متحقق ہوگیا، اب ہم گھبرائیں یا صبر کریں برابر ہے، کچھ فائدہ نہیں، ہم کو چھٹکارا نہ ہوگا۔

امام ابن زید رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بعض اہلِ نار بعض سے کہیں گے کہ جنت والوں نے روکر اور عاجزی کر کے اللہ

[1] فتح البیان (۷/ ۱۰۱۔ ۱۰۲)

سے جنت لے لی، آؤ ہم بھی گریہ وزاری کریں۔ جب دیکھیں گے کہ اس سے بھی کچھ کام نہ چلا تو کہیں گے کہ اہلِ جنت نے جنت صبر سے حاصل کی، آؤ ہم بھی صبر کریں۔ پھر ایسا صبر کریں گے کہ ویسا دیکھا نہ سنا ہوگا۔ یہ صبر بھی ان کے لیے کچھ کارآمد نہ ہوگا۔ اس وقت کہیں گے کہ ہمارا جزع کرنا اور صبر کرنا برابر ہے۔[1]

ظاہر یہ ہے کہ یہ گفتگو کی لوٹ پھیر دوزخ میں داخل ہونے کے بعد ہوگی، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِذْ يَتَحَآجُّوْنَ فِي النَّارِ فَيَقُوْلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا نَصِيْبًا مِّنَ النَّارِ ۝ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُلٌّ فِيْهَآ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ ﴾ [المؤمن: ٤٧۔ ٤٨] ''اور جب وہ جہنم میں باہم جھگڑیں گے تو جن لوگوں نے تکبر کیا تھا، ان سے کمزور لوگ کہیں گے: بلاشبہ ہم تو (دنیا میں) تمھارے تابع تھے، پھر کیا تم ہم سے آگ کا کچھ حصہ ہٹاؤ گے؟ جن لوگوں نے تکبر کیا تھا، وہ کہیں گے: بے شک ہم سب ہی اس (آگ) میں ہیں، بلاشبہ اللہ نے تو بندوں کے درمیان فیصلہ کر دیا ہے۔''

نیز فرمایا: ﴿ قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا حَتّٰٓي اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴾ [الأعراف: ٣٨۔ ٣٩] ''اللہ فرمائے گا: تم ان امتوں کے ساتھ آگ میں داخل ہو جاؤ، جو جنوں اور انسانوں میں سے تم سے پہلے گزر چکی ہیں، جب بھی ایک امت آگ میں داخل ہوگی تو وہ اپنی بہن (اپنے جیسی دوسری امت) پر لعنت کرے گی، یہاں تک کہ جب اس میں وہ سب اکٹھے ہوں گے تو ان کی دوسری جماعت ان کی پہلی جماعت کے بارے میں کہے گی: اے ہمارے رب! ان لوگوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا، لہٰذا تو انھیں آگ کا دوگنا عذاب دے۔ اللہ فرمائے گا: (تم میں سے) ہر ایک کے لیے دوگنا (عذاب) ہے، مگر تم نہیں جانتے۔ اور ان کی پہلی جماعت ان کی دوسری جماعت سے کہے گی: تمھیں ہم پر کوئی فضیلت حاصل نہیں، چناں چہ تم اس کے بدلے میں عذاب (کا مزہ) چکھو، جو کچھ تم کماتے رہے تھے۔'' نیز فرمایا: ﴿ رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ۝ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ﴾ [الأحزاب: ٦٧۔ ٦٨] ''اے ہمارے رب! بے شک ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی تو انھوں نے ہمیں گمراہ کر دیا۔ اے ہمارے رب! ان کو دوگنا عذاب دے اور ان پر بڑی سخت (اور زیادہ) لعنت کر۔''

رہی محشر میں ان کی مخاصمت، سو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَوْ تَرٰٓي اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ يَرْجِعُ

---

[1] تفسیر الطبري (١٦/ ٥٥٩۔ ٥٦٠)

بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ ِۨالْقَوْلَ ۚ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْ لَاۤ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ ۝ قَالَ الَّذِيْنَ
اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْۤا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ ۝ وَ قَالَ
الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَاۤ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَ نَجْعَلَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ
وَ اَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ؕ وَ جَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِيْۤ اَعْنَاقِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾

[سبا: ۳۱۔ ۳۳] ”اور (اے نبی!) کاش آپ دیکھیں! جب ظالم لوگ اپنے رب کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے، جبکہ ان کا بعض بعض کی بات رد کر رہا ہوگا تو جو لوگ (دنیا میں) کمزور سمجھے جاتے تھے، وہ ان لوگوں سے کہیں گے جو تکبر کرتے تھے: اگر تم نہ ہوتے تو یقیناً ہم مومن ہوتے۔ وہ لوگ جو تکبر کرتے تھے ان لوگوں سے کہیں گے جو کمزور سمجھے جاتے تھے: کیا ہم نے تمھیں ہدایت سے روکا تھا جب وہ تمھارے پاس آ گئی تھی؟ بلکہ تم (خود ہی) مجرم تھے۔ اور وہ لوگ جو کمزور سمجھے جاتے تھے ان لوگوں سے کہیں گے جو تکبر کرتے تھے: (نہیں!) بلکہ (تمھاری) رات اور دن کی چالوں ہی نے (ہمیں روکا تھا) جب تم ہمیں حکم دیتے تھے کہ ہم اللہ کے ساتھ کفر کریں اور اس کے لیے شریک ٹھہرائیں اور وہ (سب دل میں) ندامت چھپائیں گے جب عذاب دیکھیں گے، اور ہم ان لوگوں کی گردنوں میں طوق ڈال دیں گے جنھوں نے کفر کیا، انھیں صرف اسی کا بدلہ دیا جائے گا جو وہ عمل کرتے تھے۔“

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ﴿ بَرَزُوْا ﴾ بہ معنی ظہور ہے۔ بَرَاز (زبر کے ساتھ) جائے وسیع کو کہتے ہیں۔ ساری خلقت قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے آئے گی۔ یہ ارشاد ان کے اعتقاد کی بنیاد پر فرمایا ہے، ورنہ اللہ ان کے سارے احوال کا عالم ہے۔ ان کی کوئی شے اس پر مخفی نہیں ہے۔ یہ خواہ سامنے آ کر خود اعتراف کریں یا نہ کریں، کیونکہ وہ لوگوں کی آنکھوں سے اپنے معاصی چھپا کر رکھتے تھے۔ اور ان کو یہ گمان تھا کہ یہ حالت اللہ پر بھی مستور ہے۔

اس وقت یہ اتباع کرنے والے جو کمزور رائے کے مالک ہوتے تھے، اپنے سرداروں، طاقتوں اور متکبروں سے یہ بات کہیں گے کہ ہم دنیا میں دین اور اعتقاد میں تمھاری پیروی کرتے تھے۔ ہم نے تمھاری پیروی کی وجہ سے پیغمبروں کو جھٹلایا اور اللہ کا انکار کیا۔ آج کے دن اللہ کے عذاب سے کچھ تم ہمارے کام آؤ گے؟ وہ جواب دیں گے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہم کو دنیا میں ایمان کی ہدایت کرتا تو ہم تم کو بھی ایمان کی راہ پر لے آتے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے ہم کو گمراہ کیا اور ہم بہک گئے تو ہم نے بھی تم کو گمراہی کی طرف بلایا اور بہکایا اور جو بات ہم نے اپنے لیے اختیار کی تھی، وہی تمھارے لیے پسند کی۔ اب جزع کرنا یا صبر کرنا ہم پر برابر ہے۔

جزع یہ حزن سے بڑھ کر ہے، کیوں کہ انسان کو اس کام سے روک دیتی ہے، جس کے وہ درپے ہوتا ہے۔

اب کوئی جگہ ہمارے لیے گریز و رہائی اور نجات کی نہیں ہے۔ جائز ہے کہ یہ کلام فریقین کا ہو، اگرچہ ظاہراً یہ متکبرین کا کلام ہے۔ سیدنا کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی حدیث میں ہے کہ اہلِ نار کہیں گے: آؤ ہم صبر کریں۔ پس پانچ سو برس صبر کریں گے، پھر جب دیکھیں گے کہ اس سے کچھ فائدہ نہیں ہے تو کہیں گے: آؤ ہم جزع کریں، پھر پانچ سو برس تک روئیں گے جب دیکھیں گے کہ اس سے بھی کچھ نفع نہ ہوا، تب کہیں گے: ﴿ سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ ﴾[1] (رواه الطبراني و ابن أبي حاتم و ابن مردويه)

وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ
الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ
اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا
اَنْفُسَكُمْ ؕ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ؕ اِنِّيْ
كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ؕ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ
عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۞٢٢ وَاُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ؕ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا
سَلٰمٌ ۞٢٣

اور جب (جنت یا جہنم کے) معاملے کا فیصلہ کر دیا جائے گا تو شیطان کہے گا: بے شک اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے تم سے جو وعدہ کیا تھا، اس کی میں نے خلاف ورزی کی اور میرا تم پر کوئی زور نہ تھا، مگر یہ کہ میں نے تمھیں دعوت دی تو تم نے میری بات مان لی، چناں چہ تم مجھے ملامت نہ کرو اور اپنے آپ کو ملامت کرو۔ میں تمھارا فریاد رس نہیں اور نہ تم میرے فریاد رس ہو۔ بلاشبہ میں تو اس کا انکار کرتا ہوں جو تم اس سے پہلے مجھے (اللہ کا) شریک ٹھہراتے تھے۔ بے شک ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے (22) اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، وہ ایسی جنتوں میں داخل کیے جائیں گے، جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ اپنے رب کے اذن سے ہمیشہ وہاں رہیں گے۔ وہاں ان کی (ملاقات کی) دعا ''سلام'' ہوگی (23)

---

[1] المعجم الكبير (١٩/ ٨٤) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٤٠) اس کی سند میں ''انس بن ابی القاسم'' راوی کے نام میں اختلاف ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: مجمع الزوائد (٧/ ١٢٨) فتح البيان (٧/ ١٠٢۔ ١٠٤)

شیطان کا روزِ قیامت اپنے پیروکاروں سے خطاب:

شیطان کا انسان پر زور نہیں، مگر برا مشورہ دیتا ہے۔ وہ مان لینا اپنا گناہ ہے۔ دنیا میں سلام سلامتی مانگنے پر دعا ہے، وہاں سلام سلامتی پر مبارک باد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ حساب کتاب کے فیصلے کے بعد ابلیس اپنے تابعداروں سے، جب کہ مومن جنت میں اور کافر آگ کے طبقات میں جا بسیں گے، خطاب کرے گا، تاکہ ان کو غم پر غم اور غبن پر غبن اور حسرت پر حسرت زیادہ ہو۔ وہ کہے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کی زبان پر جو وعدہ تم کو دیا تھا، وہ سچا اور ٹھیک تھا کہ رسولوں کی اتباع کرنے والے سلامتی اور نجات پائیں گے اور میں نے جو وعدہ تم کو دیا تھا، اس میں خلاف تھا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ ۚ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴾ [النسآء: ۱۲۰] ”شیطان لوگوں سے وعدے کرتا ہے اور انھیں امیدیں دلاتا ہے، مگر شیطان کے سارے وعدے فریب کے سوا کچھ نہیں۔“ پھر کہے گا: سنو صاحب! میں نے جس طرف تمھیں بلایا میرے پاس اس وعدہ کی سچائی کی کوئی حجت نہ تھی اور نہ حکومت کہ میں نے زبردستی تم کو گمراہ کیا ہو، بلکہ بات یہ تھی کہ میں نے تم کو بلایا اور تم نے صرف میری دعوت کو قبول کر لیا اور مان لیا۔

ہاں رسولوں نے اپنی دعوت اور رسالت کی سچائی پر واضح حجتیں اور صحیح دلیلیں قائم کی تھیں، لیکن تم نے ان کی مخالفت کی اور تم اپنی اسی گمراہی پر جمے رہے، اب تم آج کے دن مجھ کو ملامت نہ کرو، بلکہ اپنی جانوں کو ملامت کرو، کیوں کہ یہ تمھارا ہی قصور ہے کہ تم نے اللہ تعالیٰ کی حجت کو نہ مانا اور میں نے جو تم کو باطل کی طرف بلایا تو تم نے جھٹ پٹ میری پیروی کر لی، اب نہ میں تم کو چھڑا سکوں اور نہ تم مجھ کو اس عذاب سے رہائی دلا سکو، میں اس شرک کا منکر ہوں، جو تم نے پہلے مجھے شریک کیا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: یعنی ”بِسَبَبِ مَآ أَشْرَكْتُمُونِ مِنْ قَبْلُ“[1]

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ کہے گا: میں اس بات سے انکار کرتا ہوں کہ اللہ عزوجل کا شریک بنوں۔[2] یہی قول راجح ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗۤ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآىِٕهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ﴾ [الأحقاف: ۵۔ ۶] ”اور اس سے زیادہ گمراہ کون شخص ہے، جو اللہ کے سوا اس کو پکارتا ہے جو اُسے قیامت تک جواب نہیں دے سکتا؟ جبکہ وہ ان کی پکار ہی سے غافل ہیں۔ اور جب لوگ اکٹھے کیے جائیں گے تو وہ (جھوٹے معبود) ان کے دشمن ہوں گے، اور وہ ان کی عبادت کے منکر ہوں گے۔“ نیز فرمایا: ﴿ كَلَّا ؕ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴾ [مریم: ۸۲] ”ہرگز نہیں! عنقریب وہ خود ان کی عبادت کا انکار کر دیں گے اور ان کے مخالف ہو جائیں گے۔“

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۲/ ٦٨٨) [2] تفسیر الطبري (١٦/ ٥٦١)

ظالموں کے لیے، جو حق سے روگرداں ہیں اور باطل کے پیروکار ہیں، درد دینے والا عذاب ہے۔ آیت کا ظاہری انداز یہ بتا رہا ہے کہ ابلیس ۔لعنه الله۔ کا یہ خطاب ان کے جہنم میں داخل ہونے کے بعد ہوگا، جیسا پہلے گزر چکا، لیکن سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی حدیث میں ہے کہ جب اللہ اولین اور آخرین کو جمع کرے گا اور ان کے درمیان حکم دے گا اور فیصلہ سے فارغ ہوگا تو مومنین کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان فیصلہ کر چکا، اب ہماری سفارش و شفاعت کون کرے گا؟ تب کہیں گے: آدم علیہ السلام کے پاس چلو، پھر نوح، ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کا ذکر کیا۔ عیسیٰ علیہ السلام کہیں گے: میں تم کو نبیِ اُمی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راستہ بتاتا ہوں، وہ سب میرے پاس آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ مجھ کو اذن دے گا کہ میں اللہ کے سامنے کھڑا ہوں۔ میری مجلس سے ایک ایسی پاکیزہ خوشبو اڑے گی جو کسی نے نہ سونگھی ہوگی، میں اپنے رب تعالیٰ کے پاس آؤں گا، وہ میری شفاعت قبول کرے گا اور میرے سر کے بالوں کو قدم کے ناخنوں تک روشن اور منور کر دے گا، یعنی میں سراپائے نور ہو جاؤں گا۔ پھر کفار کہیں گے کہ مومنوں نے تو اپنا شفیع پا لیا، ہماری شفاعت کون کرے گا؟ یہی ابلیس شفیع ہو کہ اسی نے ہم کو گمراہ کیا تھا، تب ابلیس کے پاس آ کر کہیں گے: مومنوں نے اپنا شفیع پا لیا، اب تم اٹھو اور ہماری شفاعت کرو، کیوں کہ تمھی نے ہم کو گمراہ کیا ہے، وہ اٹھے گا، اس کی مجلس سے ایک ایسی بدبو اڑے گی، کہ اس سے بری بدبو کسی نے نہ سونگھی ہوگی، اُس وقت ان کا آہ و زاری کرنا سخت ہوگا اور فیصلہ ہو جانے کے بعد شیطان کہے گا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ مَاۤ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ؕ اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَاۤ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ؕ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ [1] (رواه ابن أبي حاتم و هذا لفظه و ابن جرير و ابن المبارك)

محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب ابلیس سے یہ جواب سنیں گے تو اپنی جان کے آپ دشمن ہو جائیں گے تب یہ آواز آئے گی: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنَادَوْنَ لَمَقْتُ اللّٰهِ اَكْبَرُ مِنْ مَّقْتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ اِذْ تُدْعَوْنَ اِلَى الْاِيْمَانِ فَتَكْفُرُوْنَ ﴾ [المؤمن: ۱۰] ''بلاشبہ جن لوگوں نے کفر کیا، ان سے پکار کر کہا جائے گا: اللہ کی ناراضی و بیزاری (آج) تمھاری اپنے آپ پر ناراضی و بیزاری سے بڑھ کر تھی، جب (دنیا میں) تمھیں ایمان کی طرف بلایا جاتا تھا تو تم انکار کر دیتے تھے۔'' عامر شعبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس دن لوگوں کے سر پر دو خطیب کھڑے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام سے فرمائے گا: ﴿ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَاۤ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ

[1] المعجم الكبير (۱۷/ ۳۲۰) تفسير ابن أبي حاتم (۷/ ۲۲۴۰۔ ۲۲۴۱) تفسير الطبري (۱۶/ ۵۶۲۔ ۵۶۳) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''وفيه عبد الرحمن بن زياد بن أنعم وهو ضعيف'' (مجمع الزوائد: ۱۰/ ۶۸۲)

عَلّٰمُ الْغُيُوْبِ ﴿۱۱۶﴾ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖۤ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبَّكُمْ ۚ وَ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ؕ وَ اَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۱۱۷﴾ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَ اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۱۸﴾ قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ﴾ [المآئدة: ١١٦۔ ١١٩]

''کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا دو معبود بنا لو؟ تو وہ کہیں گے: تو پاک ہے، میرے لیے (جائز) نہیں کہ میں وہ بات کہوں جس کا مجھے حق نہیں۔ اگر میں نے یہ بات کہی ہو تو یقیناً تو اُسے جانتا ہے۔ تو اسے بھی جانتا ہے جو کچھ میرے دل میں ہے اور میں اسے نہیں جانتا، جو کچھ تیرے نفس میں ہے۔ بے شک تو ہی سب سے بڑھ کر غیب کو جاننے والا ہے۔ میں نے ان سے کچھ نہیں کہا تھا سوائے اس کے جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا، یہ کہ تم اللہ کی عبادت کرو جو میرا اور تمھارا رب ہے، اور میں ان پر نگران تھا، جب تک میں ان میں رہا، پھر جب تو نے مجھے اُٹھا لیا، تو تو ہی ان پر نگران تھا اور تو ہر چیز پر نگہبان ہے۔ اگر تو انھیں عذاب دے تو بے شک وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انھیں بخش دے تو بے شک تو ہی غالب ہے، بڑی حکمت والا ہے۔ اللہ فرمائے گا: یہ ایسا دن ہے کہ سچوں کو ان کا سچ نفع دے گا۔'' یہ ابلیس ۔لعنه اللّٰه۔ کھڑا ہو کر کہے گا: ﴿ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ ﴾ [1] (آیتِ باب)۔

اللہ تعالیٰ نے اس جگہ ان بدبختوں اور ان کی رسوائی اور سزا کا ذکر کیا جن کا خطیب ابلیس ۔لعنه اللّٰه۔ ہوگا تو پھر نیک بختوں کا ذکر کیا کہ وہ جنت میں جائیں گے۔ وہاں نہریں جاری ہوں گی، وہ جہاں کہیں چلیں پھریں گے، وہ ان کے ساتھ چلیں گی۔ وہ ہمیشہ کے لیے جنت میں رہیں گے، نہ ان کو ان نعمتوں سے نکالا جائے گا، نہ ان میں کچھ کمی ہوگی، وہاں ان کے صاحبِ سلامت یہی سلام ہوگا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْهَا وَ فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَ قَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ﴾ [الزمر: ٧٣] ''حتی کہ جب وہ اس کے پاس پہنچیں گے تو اس کے دروازے کھول دیے جائیں گے اور اس کے دربان ان سے کہیں گے: تم پر سلام ہو۔''

نیز فرمایا: ﴿ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ﴿۲۳﴾ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ﴾ [الرعد: ٢٣۔ ٢٤] ''اور فرشتے (جنت کے) ہر دروازے سے ان کے پاس آئیں گے۔ (اور کہیں گے:) تم پر سلام ہو۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّ سَلٰمًا ﴾ [الفرقان: ٧٥] ''اور وہاں دعا اور سلام کے ساتھ ان کا استقبال ہوگا۔'' نیز فرمایا: ﴿ دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [یونس: ١٠] ''اس (جنت) میں ان کی پکار ہوگی: اے اللہ! تو پاک ہے۔ اور اس میں ان کی دعا ہوگی: سلام۔ اور ان کی آخری پکار یہ ہوگی کہ تمام تعریفیں اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہیں۔''

[1] تفسير الطبري (١٦/ ٥٦١۔ ٥٦٤)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جب فیصلے کے بعد جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں جاچکیں ہوں گے، جس طرح کہ سورت مریم میں اس امر کا بیان آئے گا تو شیطان فریقین سے کہے گا کہ جو وعدہ مر کر اٹھائے جانے کا، اچھے اور برے عمل کرنے والوں کے حساب اور بدلے کا اللہ تعالیٰ نے کیا تھا، وہ سچا تھا اور جو وعدہ میں نے تم سے کیا تھا، وہ جھوٹا اور باطل تھا، وہ وعدہ یہ تھا کہ نہ مر کر دوبارہ اٹھنا ہے، نہ حساب کتاب ہے، نہ جنت ہے اور نہ دوزخ۔ سو میرا یہ وعدہ غلط ہوا۔ مجھ کو حجت کے اظہار کے طور پر تم پر کوئی غلبہ نہ تھا۔ فقط اتنی بات ہوئی کہ میں نے تم کو سرکشی اور گمراہی کی طرف بغیر کسی برہان اور دلیل کے بلایا، تم نے جلدی سے میری دعوت قبول کر لی، اب تم مجھ کو اس وعدہ خلافی پر الزام نہ دو، اس لیے کہ میری دشمنی کی تصریح کر دینے کے بعد اس سرزنش کی کوئی گنجایش نہیں ہے، بلکہ تم اپنی ہی جانوں کو ملامت کرو کہ تم نے بغیر دلیل میری بات مان لی، کیوں کہ جو شخص باطل وعدے وعید اور گمراہ کرنے والے دعوؤں کو قبول کرتا ہے وہ خود اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے اور اپنی ناک آپ کاٹتا ہے۔

اسی کے لگ بھگ وہ شخص ہے جو کتاب وسنت کے مفاہیم کے برخلاف لوگوں کی آراء کی پیروی کرتا ہے جس پر کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے: اَللّٰھُمَّ غفرًا۔ صراح فریاد رسی کو کہتے ہیں۔ ابلیس کہے گا: نہ میں تمھاری فریاد رسی کر سکتا ہوں اور نہ تم میری۔ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ شیطان بھی اسی حالت میں مبتلا ہوگا جس عذاب میں کہ اس کے اتباع گرفتار ہوں گے اور وہ بھی فریاد رسی کا خواہاں ہوگا کہ کوئی اس کو رہائی دلائے۔ وہ کہے گا کہ میں نے اس بات کا انکار کیا کہ تم نے پہلے سے مجھے اللہ کا شریک ٹھہرایا۔ سو ظالموں کے لیے دکھ کی مار ہے۔ ابلیس کے اس خطاب سے کفار کی کمر بالکل ٹوٹ جائے گی اور دل ٹکڑے ہو جائیں گے۔ اُمید نا اُمیدی میں بدل جائے گی۔ رہے ایمان دار صالح عمل کرنے والے، سو وہ ہمیشہ کے لیے جنت میں داخل کیے جائیں گے۔ فرشتے ان کو اللہ کے اذن سے سلام کریں گے۔[1]

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ﴿٢٤﴾ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ۗ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿٢٥﴾ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ۨ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿٢٦﴾

(اے نبی!) کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے کلمۂ طیبہ (اسلام) کی کیسی مثال بیان کی کہ وہ ایک

---

[1] فتح البیان (٧/ ١٠٤۔ ١٠٨)

پاکیزہ درخت کی طرح ہے، اس کی جڑ مضبوط ہے اور اس کی شاخیں آسمان میں ہیں (24) وہ ہر وقت اپنے رب کے حکم سے اپنا پھل لاتا ہے۔ اور اللہ لوگوں کے لیے مثالیں بیان کرتا ہے، تاکہ وہ نصیحت پکڑیں (25) اور کلمۂ خبیثہ (کفر و شرک) کی مثال ایک خبیث درخت کی سی ہے کہ اسے زمین پر سے اُکھاڑ دیا جاتا ہے، اس کے لیے کوئی قرار نہیں (26)

کلمۂ طیبہ (اسلام) اور کلمۂ خبیثہ (کفر و شرک) کی مثال:

مسلمانوں کا دعویٰ درست ہے، جس کی دلیل صحیح ہے اور دل میں اثر رکھتا ہے اور روز بروز چڑھتا ہے اور کافروں کا دعویٰ جڑ نہیں رکھتا، تھوڑا دھیان کرنے سے غلط معلوم ہونے لگے اور دل میں اس سے کچھ نور نہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ کی شہادت کی مثال ایسی ہے جیسے ایک پاک درخت، اس کی جڑ یعنی لا الٰہ الا اللہ مومن کے دل میں ثابت ہے اور اس کی شاخ یعنی عمل آسمان میں ہے، کیوں کہ مومن کے عمل آسمان پر چڑھتے رہتے ہیں۔

امام ضحاک، سعید بن جبیر، عکرمہ اور مجاہد رحمہم اللہ وغیرہم نے بھی اس طرح کہا ہے کہ اس سے مراد مومن کا عمل اور پاک قول اور فعلِ صالح ہے۔ مومن کھجور کے درخت کی طرح پر ہوتا ہے کہ ہمیشہ اس کا عمل صالح مرفوع ہوتا رہتا ہے، ہر وقت میں وہ صبح کا ہو یا شام کا۔[1] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ شجرۂ طیبہ نخل ہے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ کہتے ہیں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک خوشہ گدر کھجور کا لائے، آپ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ ﴾ (آیتِ باب) پھر فرمایا: "هي النخلة" [اس سے مراد کھجور ہے] یہ روایت سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے موقوفاً بھی اسی طرح مروی ہے۔

امام مسروق، مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، ضحاک اور قتادہ رحمہم اللہ وغیرہم نے اس پر نص کی ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ہم نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے خبر دو، اس درخت کی جو مشابہ ہے یا مثل ہے مردِ مسلمان کے۔ اس کے پتے گرمی سردی میں نہیں جھڑتے، ہر وقت اپنا پھل لاتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میرے جی میں یہ بات آئی کہ وہ کھجور کا درخت ہے۔ میں نے دیکھا کہ سیدنا ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما بات نہیں کرتے ہیں، اس لیے میں نے اپنا بولنا اچھا نہ سمجھا۔ جب انھوں نے کچھ جواب نہ دیا، تب نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ کھجور کا درخت ہے۔ جب ہم وہاں سے اُٹھے تو میں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: "يا أبتاه! واللّٰه! لقد كان وقع في نفسي أنها النخلة" [اے ابا جان! یقیناً میرے دل میں فوراً یہ آ گیا تھا کہ اس سے مراد کھجور کا درخت ہے] سیدنا

---

(1) تفسير الطبري (١٦/ ٥٦٧) تفسير ابن كثير (٢/ ٦٨٩)
(2) تفسير الطبري (١٦/ ٥٦٩_ ٥٧٢)

عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ پھر تو نے کیوں نہ کہا۔ میں نے کہا کہ میں نے آپ کو بولتے نہ دیکھا، اس لیے اپنا بولنا یا کچھ کہنا مکروہ سمجھا، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: "لأن تکون قلتها أحب إلي من کذا وکذا"[1] (رواہ البخاري) [اگر تم یہ بات کہہ دیتے تو مجھے یہ فلاں فلاں (سرخ اونٹوں) سے زیادہ پسند ہوتا]

امام احمد رحمہ اللہ نے مجاہد رحمہ اللہ کی روایت ان الفاظ سے بیان کی ہے کہ میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ہمراہ مدینے کو گیا، میں نے ان کو نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث روایت کرتے نہیں سنا مگر ایک حدیث۔ کہا کہ ہم نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے کہ اتنے میں ایک گابھا لایا گیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ درختوں میں ایک درخت ہے، جس کی مثال مسلمان مرد کی سی ہے۔ میں نے چاہا کہ میں کہہ دوں کہ وہ کھجور کا درخت ہے، دیکھا تو میں لوگوں میں سے سب سے چھوٹا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «هي النخلة»[2] (أخرجاه) [وہ کھجور کا درخت ہے]

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کے تیسرے الفاظ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک یہ ہیں کہ ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے کہا کہ درختوں میں ایک ایسا درخت ہے کہ اس کے پتے نہیں جھڑتے، وہ مومن کی طرح ہے۔ لوگ جنگل کے درختوں میں پڑے غور کرتے رہے، میرے دل میں آیا کہ وہ کھجور کا درخت ہے۔[3] (أخرجاہ أیضاً) امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! خوش حال لوگ اجر لے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا اگر کوئی دنیا کی بعض چیز کو بعض پر رکھے تو کیا وہ آسمان تک پہنچ جائے گا؟ میں تم کو ایسے عمل کی خبر نہ دوں جس کی جڑ زمین میں ہو اور شاخ آسمان پر؟ کہا: وہ کیا ہے؟ اے اللہ کے رسول! فرمایا: «لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَاللّٰهُ أَكْبَرُ، وَسُبْحَانَ اللّٰهِ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ» [اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے، اللہ تعالیٰ سب سے بڑا ہے، میں اللہ تعالیٰ کی پاکیزگی کرتا ہوں اور سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے] ہر نماز کے بعد دس دس بار کہہ۔ «فَذٰلِكَ أَصْلُهُ فِي الْأَرْضِ وَ فَرْعُهُ فِي السَّمَآءِ»[4] (رواہ ابن أبي حاتم) [یہ رہا وہ عمل جس کی جڑ زمین میں اور اس کی شاخ آسمان میں ہے] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہ شجرۂ طیبہ جنت میں ہے۔[5]

﴿كُلَّ حِيْنٍ﴾ سے مراد صبح اور شام ہے۔ بعض نے کہا کہ ہر ماہ ہے۔ کسی نے کہا کہ ہر دو ماہ۔ کسی نے کہا کہ چھے ماہ۔ کسی نے کہا کہ ہر سات ماہ۔ کسی نے کہا کہ ہر سال۔ ظاہر انداز یہ ہے کہ مومن کی مثال درخت کی ہے کہ ہر

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٢١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨١١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨١١) مسند أحمد (٢/ ١٢)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣١)

[4] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٤١) یہ روایت مرسل ہے، البتہ اس کی اصل "صحيح البخاري" (رقم الحديث: ٨٠٧) صحيح مسلم (رقم الحديث ٥٩٥) میں ہے۔

[5] تفسير الطبري (١٦/ ٥٧٣) اس کی سند میں ''قابوس بن ابی ظبیان'' ضعیف راوی ہے۔

وقت تابستان و زمستان میں یا رات دن میں ہمیشہ اس کا پھل ملے۔ اسی طرح مومن کا عملِ صالح رات اور دن کے کناروں میں ہر وقت اور ہر زمانے میں اللہ کے اذن سے اوپر اٹھایا جاتا ہے، یعنی وہ کامل، حسن، کثیر اور طیب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ مثالیں اس لیے بیان کی ہیں کہ شاید لوگ نصیحت پکڑیں۔ اور مثال کلمۂ ناپاک کی ایسے ہے، جیسے: ناپاک درخت، یہ کافر کی مثال ہے کہ اس کے لیے نہ جڑ ہے نہ ہی ثبات، جیسے: حنظل کا درخت کہ جس کو شریان کہتے ہیں۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ "هي الشريان" (رواه البزار) یہ لفظ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے موقوفاً بھی آئے ہیں۔[1] دوسرے الفاظ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً روایت کیے ہیں: « هي الحنظلة » (رواه ابن أبي حاتم) [اس سے مراد اندرائن ہے] امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "هكذا كنا نسمع"[2] [ہم ایسے ہی سنا کرتے تھے] ابو یعلی رحمہ اللہ کے نزدیک سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے تیسرے الفاظ یوں ہیں: « هي الحنظل » [اس سے مراد اندرائن ہے] فرمایا کہ یہ درخت زمین کے اوپر سے اُکھیڑا گیا اُس کو قرار نہیں ہے، یعنی بے اصل و ثبات ہے۔[3] یہی حال کفر کا ہوتا ہے کہ نہ اصل رکھے اور نہ فرع اور نہ کوئی عمل کافر کا اوپر چڑھے اور نہ اس کی کوئی شے قبول ہو۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ تو نے نہیں دیکھا، یعنی دل کی آنکھ سے کہ اللہ تعالیٰ نے کیا مثال بیان کی؟ کلمۂ طیبہ ایک شجرۂ طیبہ کی طرح ہے۔ جمہور نے کہا کہ اس سے مراد لا الہ الا اللہ ہے، یا ہر اچھا کلمہ، جیسے: تسبیح، تحمید، استغفار و توبہ و دعوت الی اللہ۔[4] (قاله الزمخشري) اس درخت کی جڑ راسخ (مضبوط) ہے۔ اُکھڑنے سے محفوظ ہے، اس لیے کہ اپنی رگوں سے زمین کو پکڑے ہوئے ہے اور اس کی شاخ زمین سے بلندی پر ہے۔ یعنی آسمان کی طرف ہوا میں اونچی ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس درخت کا پھل ہر وقت موجود ہے۔

﴿ حِيْنٍ ﴾ لغت میں وقت کے معنی میں ہے۔ اس لفظ کا اطلاق قلیل اور کثیر پر آتا ہے۔ یہ بات اللہ کے ارادے اور مشیت سے ہوتی ہے۔ اس درخت سے مراد کھجور کا پیڑ ہے۔ اسی طرح ایمان کا کلمہ مومن کے دل میں ہے اور مومن کا عمل آسمان پر چڑھتا ہے اور اس کی برکت ہر وقت حاصل ہوتی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے حدیث میں مروی ہے: « هی التي لا تنقص ورقها النخلة »[5] (رواه أحمد و ابن مردويه، قال السيوطي: بسند جيد) [یہ کھجور کا درخت ہے جس کے پتے نہیں گرتے] صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعینِ عظام رحمہم اللہ کی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے۔ بالجملہ ﴿ كُلَّ حِيْنٍ ﴾ سے مختلف اوقات مراد ہیں، بغیر تعیین کے۔ یا مراد ہر سال ہے، اس لیے کہ کھجور کا

---

[1] مسند البزار (١٣/ ٥٠٩) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٤٢)

[3] مسند أبي يعلیٰ (٧/ ١٨٢) اس کا اور گزشتہ دونوں روایتوں کا موقوف ہونا راجح ہے۔ [4] الكشاف (٢/ ٥١٩)

[5] مسند أحمد (٢/ ٣١) الدر المنثور (٥/ ٢٢) یہ روایت صحیحین میں بھی مروی ہے، جیسا کہ زیرِ تفسیر آیت کی تخریج میں گزر چکی ہے۔

درخت ہر سال میں ایک دفعہ پھلتا ہے۔ ﴿ حِيْنٍ ﴾ کے بارے میں سلف کے اقوال بہت ہیں۔

ایمان کی مثال درخت کے ساتھ بیان کرنے کی حکمت یہ ہے کہ درخت کو اسی وقت درخت کہتے ہیں جب اس میں تین چیزیں ہوں: ایک رگِ مضبوط، دوسری قائم جڑ اور تیسری اس کی شاخیں جو ثابت ہوں۔ اسی طرح ایمان مکمل نہیں ہوتا، مگر تین چیزوں سے: ایک تصدیقِ قلب، دوسرے زبان سے کلمۂ اقرار اور تیسرے جسم کو عمل میں لگانا۔ یہ مثال اللہ نے اس لیے بیان کی کہ لوگ مبدء و معاد (شروع ہونے اور لوٹ کر جانے کی جگہ) اور اللہ تعالیٰ کی ایجادات اور صنعت کاری کو، جو اس کی وحدانیت کی دلیل ہیں، یاد کریں۔

مثال کے بیان کرنے میں محسوس و موثر طریقے سے نصیحت ہوتی ہے اور بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے گویا اس کا نقشہ سامنے آجاتا ہے اور اس طرح نصیحت پکڑنے والے کو صحیح نصیحت حاصل ہوتی ہے۔ اور کلمۂ خبیث کی مثال درخت خبیث کی سی ہے، یہ درخت حنظل کا ہے، یا پیاز کا، یا کماۃ یا طحلبہ یا کشوث کا کہ نہ پتے ہیں اور نہ جڑ۔ اس کی جڑ زمین سے اُکھاڑ ڈالی گئی، اس کو قرار نہیں ہے، کیوں کہ اگر جڑ ہوتی یا رگیں ہوتیں تو کچھ تھمتا۔ اسی طرح کافر کا حال ہے۔ اس کے لیے نہ کوئی حجت ہے اور نہ ثبات اور نہ اس سے کوئی خیر حاصل ہو اور نہ کوئی اس کا قولِ طیب اور عملِ صالح اوپر چڑھے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ کلمۂ خبیثہ شرک ہے اور شجرۂ خبیثہ کافر، یعنی شرک کی کوئی جڑ نہیں ہے، جس سے وہ تھمے اور کافر کے پاس کوئی برہان نہیں ہے۔ اللہ شرک کے ہوتے ہوئے کوئی عمل قبول نہیں کرتا۔[1] تابعین رحمہم اللہ کی ایک جماعت اور ان سے بعد والوں سے اسی طرح مروی ہے۔[2]

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۙ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ﴿۲۷﴾

اللہ ایمان والوں کو قولِ ثابت (کلمۂ توحید) سے دنیا کی زندگی اور آخرت میں ثابت قدم رکھتا ہے اور اللہ ظالموں کو گمراہ کر دیتا ہے اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے (27)

دنیا و آخرت میں مومن کی قولِ ثابت کے ساتھ مضبوطی:

قبر میں جو کوئی مضبوط بات کہے گا وہ نیک ٹھکانا پائے گا اور جو نچلی بات کہے گا وہ خراب ہوگا۔ سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث میں مروی ہے کہ مسلمان سے جب قبر میں سوال ہوگا تو وہ اس بات کی گواہی دے گا کہ «لا إله إلا الله، وأن محمداً رسول الله، فذلك قوله يثبت الله... الخ»[3] (رواه البخاري و رواه مسلم

---

[1] تفسير الطبري (١٦/ ٥٨٨) اس کی سند حسن ہے۔ [2] فتح البيان (٧/ ٧/ ١٠٨۔ ١١٢)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٢٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٧١) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧٥٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٢٠) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٠٥٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٦٩)

أيضاً وبقية الجماعة كلهم) [اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں ہے اور یہ کہ محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، یہی معنی ہیں اللہ تعالیٰ کے اس قول کے: ﴿ يُثَبِّتُ اللّٰهُ ... ﴾] سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ ہم نبی مکرم ﷺ کے ساتھ ایک جنازے میں نکلے جو ایک انصاری مرد کا تھا۔ جب قبر تک پہنچے تو وہ تیار نہ تھی۔ نبی مکرم ﷺ کے ہاتھ میں ایک لکڑی تھی، آپ ﷺ اس سے زمین کریدنے لگے۔ پھر سر اٹھا کر فرمایا: « استعیذوا باللّٰہ من عذاب القبر » [اللہ تعالیٰ سے عذابِ قبر کی پناہ مانگو] دو بار یا تین بار اسی طرح کہا۔

پھر فرمایا کہ بندۂ مومن جب دنیا کے آخری لمحات اور آخرت کے شروع میں ہوتا ہے تو اس کے پاس آسمان سے فرشتے اترتے ہیں، سفید رنگ چہروں والے گویا ان کے چہرے آفتاب ہیں، ان کے پاس جنت کے کفنوں میں سے ایک کفن ہوتا ہے اور جنت کی خوشبوؤں میں سے خوشبو ہوتی ہے۔ وہ اس بندے کے پاس، جہاں اس کی نگاہ جاتی ہے، بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر ملک الموت آ کر اس کے سر کے قریب بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے: اے پاک جان! نکل مغفرت اور اللہ کی رضامندی کی طرف، وہ جان ایسے نکلتی ہے جیسے مشک میں سے پانی کی بوند ٹپکتی ہے۔ تب ملک الموت اس کو لے لیتا ہے۔ پھر فرشتے اس کے ہاتھ میں آنکھ جھپکنے کی دیر تک بھی نہیں چھوڑتے اور فوراً اس کو لے کر اس کفن میں رکھتے ہیں اور اس خوشبو میں۔ اس سے روئے زمین کی سب سے عمدہ خوشبو کستوری جیسی نکلتی ہے، پھر اُس جان کو لے کر اوپر چڑھتے ہیں۔ جب بھی ان کا فرشتوں کی کسی جماعت کے پاس سے گزر ہوتا ہے تو وہ پوچھتے ہیں کہ یہ کس کی روح ہے؟ یہ کہتے ہیں کہ یہ فلاں بن فلاں کی روح ہے، مثلاً: یوں کہتے ہیں کہ یہ صدیق بن حسن ہے۔ اس کے ناموں میں سے جو بہت اچھا نام ہوتا ہے، جس سے وہ دنیا میں پکارا جاتا تھا، وہ نام لیتے ہیں، یہاں تک کہ آسمانِ دنیا تک لے کر پہنچتے ہیں اور آسمان کا دروازہ کھلواتے ہیں، ہر آسمان کے مقرب فرشتے دروازہ کھول دیتے ہیں، اُس آسمان تک جو اس آسمان کے نزدیک ہے، یہاں تک کہ ساتویں آسمان پر پہنچ جاتے ہیں۔ تب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے کی کتاب کو علیین میں لکھ دو اور اس کی روح کو اس زمین میں پھیر دو، کیوں کہ میں نے اس کو اس مٹی سے پیدا کیا ہے اور اسی میں اس کو پھیر دوں گا اور اسی سے پھر دوبارہ ان کو نکالوں گا۔

پس وہ روح اپنے جسم میں پھیر دی جاتی ہے۔ تب دو فرشتے اس کے پاس آتے ہیں اور اس کو بٹھا لیتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں: « مَنْ رَّبُّكَ » تیرا رب کون ہے؟ وہ کہتا ہے: ”رَبِّیَ اللّٰهُ“ میرا رب اللہ ہے۔ کہتے ہیں: « مَا دِيْنُكَ » تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے: ”دِيْنِيَ الْإِسْلَامُ“ میرا دین اسلام ہے۔ کہتے ہیں: « مَاهٰذَا الرَّجُلُ الَّذِيْ بُعِثَ فِيْكُمْ » یہ کون مرد ہے جو تم میں مبعوث کیا گیا؟ وہ کہتا ہے: ”هو رسول اللّٰه“ وہ اللہ کے رسول ہیں۔ وہ کہتے ہیں: « وَمَا عِلْمُكَ » تو نے کس طرح جانا؟ وہ کہتا ہے کہ ”قَرَأْتُ كِتَابَ اللّٰهِ فَآمَنْتُ بِهٖ وَصَدَّقْتُ“، یعنی

میں نے قرآن پڑھا اور اس پر ایمان لایا اور اُس کو سچا جانا۔ ایک پکارنے والا آسمان سے پکارتا ہے: ''أَنْ صَدَقَ عَبْدِيْ'' میرے بندے نے سچ کہا۔ اس کے لیے جنت کا فرش بچھا دو، اس کو جنت کا لباس پہنا دو، اس کے لیے جنت کی طرف ایک دروازہ کھول دو۔

پھر فرمایا کہ اس کو جنت کی ہوا اور خوشبو آتی ہے اور اس کی قبر حدِ نگاہ تک کشادہ کر دی جاتی ہے اور ایک اچھی شکل کا مرد اچھے کپڑے پہنے ہوئے خوشبودار اس کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے: ''أبشر بالذي يسرك، هذا يومك الذي كنت توعد'' تجھے خوش خبری ہو اس کی جو تجھے خوش کر دے، یہ تیرا وہ دن ہے جس کا تجھ سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ یہ کہتا ہے: ''من أنت؟ فوجهك الوجه الذي يأتي بالخير'' تو کون ہے کہ تیری صورت اس شخص کی سی ہے جو خیر و خوبی لائے اور خوش خبری سنائے؟ وہ کہتا ہے: ''أنا عملك الصالح'' میں تیرا نیک عمل ہوں۔ یہ کہتا ہے: ''رب أقم الساعة! رب أقم الساعة، حتى أرجع إلى أهلي ومالي'' اے رب قیامت قائم کرتا کہ میں اپنے اہل اور مال کے پاس جاؤں۔

پھر فرمایا کہ کافر بندہ جب دنیا کے آخری لحات اور آخرت کے شروع کے لحات میں ہوتا ہے تو اس کے پاس آسمان سے فرشتے اترتے ہیں جن کے چہرے سیاہ ہوتے ہیں، ان کے پاس ایک ٹاٹ ہوتا ہے، وہ اس کے سامنے تا حدِ نگاہ بیٹھ جاتے ہیں، پھر ملک الموت آ کر اس کے سر کے نزدیک بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ اے ناپاک جان! اللہ کی خفگی اور ناراضی کی طرف نکل، وہ جان بدن میں پھیل جاتی ہے، یہ اس کو اس طرح کھینچتا ہے، جس طرح گرم سیخ گیلی صوف میں سے کھینچی جاتی ہے، پھر اس کو پکڑ لیتا ہے۔ جب اسے پکڑ لیا تو فرشتے اس کے ہاتھ میں پلک جھپکنے تک بھی نہیں چھوڑتے اور اس کو لے لیتے ہیں اور اس ٹاٹ میں رکھتے ہیں۔ اُس سے ایسی بدبو نکلتی ہے جیسی روئے زمین پر کسی مردار کی ہوتی ہے، پھر اس کو لے کر اوپر چڑھتے ہیں۔ ان کا گزر فرشتوں کی جس جماعت پر ہوتا ہے وہ پوچھتے ہیں کہ یہ کیسی ناپاک جان ہے؟ کہتے ہیں کہ فلاں بن فلاں کی، اُس کا وہ بہت برا نام لیتے ہیں جس سے وہ دنیا میں پکارا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اسے آسمانِ دنیا تک لے کر پہنچ جاتے ہیں اور دروازہ کھلواتے ہیں، وہ نہیں کھولا جاتا۔ پھر نبی مکرم ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ﴾ [الأعراف: ٤٠] ''ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور نہ وہ جنت میں داخل ہوں گے، یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں گھس جائے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لکھو اس کی کتاب کو سجین میں، جو زمین میں سب سے نیچے ہے، تب اس کی روح پھینک دی جاتی ہے۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ

بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ﴾ [الحج: ٣١] ''اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرے تو گویا وہ آسمان سے گر پڑا، پھر اسے پرندے اُچک لے جائیں یا ہوا کسی دور دراز جگہ لے جا پھینکے۔''

تب اس کی روح اس کے بدن میں پھیر دی جاتی ہے اور دو فرشتے اس کے پاس آ کر اسے بٹھا لیتے ہیں اور کہتے ہیں: تیرا رب کون ہے؟ وہ کہتا ہے: ''هاه هاه لا أدري'' ہائے ہائے! میں نہیں جانتا، کہتے ہیں: تیرا دین کیا ہے؟ کہتا ہے ''هاه هاه لا أدري'' کہتے ہیں کہ یہ کون مرد تھا جو تم میں بھیجا گیا؟ وہ کہتا ہے: ہائے ہائے میں نہیں جانتا۔ تب ایک ندا کرنے والا آسمان سے ندا کرتا ہے: ''أن كذب عبدي'' میرے بندے نے جھوٹ بولا۔ اس کے لیے آگ کا فرش بچھا دو اور ایک دروازہ دوزخ کی طرف سے کھول دو، اس کو گرمی اور دوزخ کی گرم ہوا آتی ہے اور قبر تنگ ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ اس کی پسلیاں اِدھر سے اُدھر ہو جاتی ہیں اور ایک مرد بدشکل اور بدلباس بدبودار اس کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے: ''أَبْشِر بالذي يسوءك، هذا يومك الذي كنت توعد'' یعنی تجھ کو مژدہ ہو ایسی شے کا جو تجھ کو بری لگے، یہ تیرا وہ دن ہے جس کا تجھ کو وعدہ دیا جاتا تھا۔ یہ کہتا ہے کہ ''من أنت'' تو کون ہے؟ ''فوجهك الوجه يجيء بالشر'' تیری صورت تو وہ ہے جو بدی لاتی ہے، وہ کہتا ہے: ''أنا عملك الخبيث'' میں تیرا ناپاک عمل ہوں، وہ کہتا ہے: ''رب لا تقم الساعة'' یعنی اے رب! اب قیامت قائم نہ کر۔ [1] (رواه الإمام أحمد و رواه أبو داود والنسائي و ابن ماجه)

اس حدیث کو امام احمد رحمہ اللہ نے دوسرے طریق سے بھی سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ کہا کہ ہم نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ایک جنازے پر نکلے۔ الیٰ قولہ۔ پھر جب اس کی روح نکل جاتی ہے تو اس پر ہر فرشتہ، جو آسمان و زمین کے درمیان ہے اور ہر فرشتہ جو آسمان پر ہے، اس کے لیے رحمت کی دعا کرتا ہے اور آسمان کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ کوئی دروازہ ایسا نہیں ہے جس کے لوگ اللہ تعالیٰ عزوجل سے یہ دعا نہ کرتے ہوں کہ وہ اس کی روح کو ان کے پاس سے گزار کر عروج بخشے۔ حدیث کے آخر میں یہ فرمایا ہے کہ اُس کافر پر ایک اندھا، بہرا اور گونگا مقرر کیا جاتا ہے، جس کے ہاتھ میں ایک ہتھوڑا ایسا ہوتا ہے کہ اگر اس کو پہاڑ پر مارے تو وہ خاک ہو جائے، پھر ایک ایسی ضرب لگاتا ہے کہ وہ کافر مٹی ہو جاتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اُس کو ویسے ہی کر دیتا ہے جیسا وہ پہلے تھا، پھر اُس کو دوسری ضرب لگاتا ہے جس سے وہ ایسی چیخ مارتا ہے جسے سوائے جنوں اور انسانوں کے ہر شے سنتی ہے۔ سیدنا براء رضی اللہ عنہ نے کہا کہ پھر اس کے لیے ایک دروازہ آگ کی طرف کھول دیا جاتا ہے۔ [2]

---

[1] مسند أحمد (٤/ ٢٨٧) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧٥٣) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٠٠١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٥٤٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٦٧٦)

[2] مسند أحمد (٤/ ٢٩٥) صحيح الترغيب والترهيب (٣/ ٢١٩)

سیدنا براء رضی اللہ عنہ نے آیتِ باب کی تفسیر میں کہا ہے کہ اس سے مراد عذابِ قبر ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مومن جب مرجاتا ہے تو اپنی قبر میں اٹھا کر بٹھایا جاتا ہے، اس سے کہا جاتا ہے: "ما ربك، ما دينك، من نبيك" تب اللہ اس کو ثابت قدم رکھتا ہے، وہ کہتا ہے: "رَبِّيَ اللّٰه، و ديني الإسلام، و نبي محمد ﷺ" پھر سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے آیتِ باب پڑھی۔[2] (رواه المسعودي)

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ بندہ جب قبر میں رکھا جاتا ہے اور اس کے اصحاب واپس پھرتے ہیں تو وہ ان کے جوتوں کی آواز سنتا ہے اور دو فرشتے آ کر اُس کو اٹھا کر بٹھاتے ہیں اور کہتے ہیں: "ما كنت تقول في هذا الرجل" تو اس شخص کے حق میں، یعنی رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کیا کہتا تھا؟ مومن کہتا ہے: "أشهد أنه عبد اللّٰه و رسوله" [میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں] اس سے کہا جاتا ہے، دیکھ اپنی نشست گاہ دوزخ میں، اللہ تعالیٰ نے اس کے عوض تیری جگہ جنت میں بدل دی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "فيراهما جميعا" یعنی وہ ان دونوں جگہوں کو ایک ساتھ دیکھتا ہے۔ (رواه الإمام عبد بن حميد في مسنده)

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ہم سے ذکر کیا گیا کہ قبر ستر گز کشادہ کر دی جاتی ہے اور سبزے سے بھر دی جاتی ہے قیامت تک۔[3] (رواه مسلم) ابو الزبیر رحمہ اللہ نے سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے قبر کی آزمائشوں کا حال پوچھا تھا۔ کہا کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو سنا، فرماتے تھے کہ یہ اُمت اپنی قبروں میں مبتلا ہوتی ہے۔ مومن جب قبر کے اندر داخل کیا جاتا ہے اور اس کے اصحاب پشت پھیرتے ہیں تو ایک بہت خوفناک فرشتہ آتا ہے اور کہتا ہے: "ما كنت تقول في هذا الرجل" تو اس مرد کے حق میں کیا کہتا تھا؟ مومن کہتا ہے: "أنه رسول اللّٰه ﷺ وعبده" [وہ اللہ کے رسول اور اس کے بندے ہیں] وہ فرشتہ کہتا ہے: "انظر إلى مقعدك الذي كان لك في النار، قد أنجاك اللّٰه منها و أبدلك بمقعدك الذي ترى من النار مقعدك الذي ترى من الجنة فيراهما كليهما" [دوزخ کی آگ میں اپنی نشست گاہ دیکھو، یقیناً اللہ تعالیٰ اس سے نجات دے دی ہے، اللہ تعالیٰ نے تیری اس آگ کی نشست گاہ کے عوض جسے تو دیکھتا ہے تیری جگہ جنت سے بدل دی ہے جسے تو دیکھتا ہے، پس وہ ان دونوں جگہوں کو دیکھتا ہے] تب مومن کہتا ہے: "دعوني أبشر أهلي" مجھے چھوڑ دو کہ میں اپنے گھر والوں کو نوید دوں، اُس سے کہتے ہیں: ٹھہر جا۔

رہا منافق، سو وہ اپنے اہل کی واپسی کے بعد اُٹھ بیٹھتا ہے، اس سے کہا جاتا ہے: "ما تقول في هذا

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٠٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٧١) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٠٥٦)

[2] المعجم الكبير (٩/ ٢٣٣) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "إسناده حسن" (مجمع الزوائد: ٣/ ١٧٨)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٧٠) مسند عبد بن حميد (١/ ٣٥٦)

الرجل“ [تو اس آدمی کے حق میں کیا کہتا ہے؟] وہ کہتا ہے: ”لا أدري، أقول كما يقول الناس“ یعنی میں کچھ نہیں جانتا، جو کچھ لوگ کہتے تھے وہی بات میں بھی کہتا تھا۔ اس سے کہتے ہیں: ”لا دريت، هذا مقعدك الذي كان لك في الجنة قد أبدلت مكانه مقعدك من النار“ [تو نے نہیں جانا، یہ رہی تیری جنت کی جگہ جس کے عوض تیری جگہ آگ میں بنا دی گئی ہے] سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، فرماتے تھے: «يبعث كل عبد في القبر على ما مات، المؤمن على إيمانه، والمنافق على نفاقه »[1] (رواه أحمد و إسناده صحيح على شرط مسلم ولم يخرجاه) [قبر میں ہر بندے کو اسی حالت پر اٹھایا جائے گا جس پر اس کی موت واقع ہوئی، مومن کو اپنے ایمان پر اور منافق کو اپنے نفاق پر]

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک جنازے پر حاضر ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے لوگو! یہ اُمت اپنی قبروں میں آزمائی جاتی ہے۔ انسان جب دفن ہوتا ہے اور اس کے ہمراہی اُس سے جدا ہو جاتے ہیں تو ایک فرشتہ آتا ہے، اُس کے ہاتھ میں لوہے کا ہتھوڑا ہوتا ہے، وہ اس کو بٹھا کر کہتا ہے تو اس مرد کے حق میں کیا کہتا تھا؟ اگر مومن ہے تو کہتا ہے: ”أشهد أن لا إله إلا الله، و أشهد أن محمداً عبده ورسوله“ فرشتہ کہتا ہے: تو نے سچ کہا۔ پھر اس کے لیے ایک دروازہ آگ کی طرف کھول دیا جاتا ہے، فرشتہ کہتا ہے: ”هذا منزلك لو كفرت بربك، فأما إذا آمنت فهذا منزلك“ یعنی یہ تیرا گھر تھا، اگر تو اپنے رب کے ساتھ کفر کرتا، لیکن جبکہ تو ایمان لے آیا تو اب تیرا گھر یہ ہے۔ پھر ایک دروازہ بہشت کی طرف کھول دیا جاتا ہے۔

وہ چاہتا ہے کہ اس طرف جائے، اس کو کہتے ہیں: ”اسکن“ یعنی ٹھہر جا، اور اس کی قبر کو کشادہ کر دیا جاتا ہے اور اگر کافر یا منافق ہوتا ہے تو اس سے کہتے ہیں: تو اس مرد کے حق میں کیا کہتا تھا؟ وہ کہتا ہے: ”لا أدري، سمعت الناس يقولون شيئا“ [میں نہیں جانتا، میں نے لوگوں کو کچھ کہتے سنا (سو میں نے بھی ایسے ہی کہہ دیا)] اس سے کہتے ہیں: ”لا دريت، ولا تليت، ولا اهتديت“ [نہ تو نے جانا، نہ کسی سے سیکھا اور نہ تو نے کسی سے ہدایت حاصل کی] پھر اس کے لیے ایک دروازہ جنت کی طرف کھول کر کہتے ہیں کہ یہ تیرا گھر تھا، اگر تو اپنے رب پر ایمان لاتا، لیکن جب کہ تو نے کفر کیا تو اب اللہ عزوجل نے یہ گھر اس کے عوض تجھ کو بدل کر دیا، پھر ایک دروازہ دوزخ کی طرف کھول دیا جاتا ہے، پھر ایک ہتھوڑے سے اس کو مارا جاتا ہے، وہ ایسا چلاّتا ہے، جس کو اللہ کی ساری مخلوق سنتی ہے، سوائے جنوں اور انسانوں کے۔ بعض لوگوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ اُس پر ایک فرشتہ ہتھوڑا ہاتھ میں لے کر کھڑا ہو، لیکن وہ اس دم چور ہو جائے گا، فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو قولِ ثابت

---

[1] مسند أحمد (٣/ ٣٤٦)

پر ثابت رکھتا ہے۔[1] (رواه أحمد وهذا أيضاً إسناد لا بأس به)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ میت کے پاس فرشتے حاضر ہوتے ہیں، جب مرد نیک ہوتا ہے تو فرشتہ کہتا ہے: نکل اے نفسِ مطمئنہ! تو ایک پاک جسم میں تھی، نکل محمود ہوکر اور بشارت لے راحت، خوشبودار پھول اور رب کی جو ناراض نہیں۔ اسی طرح وہ فرشتہ اس روح سے کہتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ باہر آتی ہے، پھر اس کو لے کر آسمان پر چڑھتے ہیں اور دروازہ کھلواتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ یہ کون ہے، کہتے ہیں کہ فلاں، جیسے مثلاً یہ کہیں کہ صدیق حسن ہے، وہ کہتے ہیں کہ "مرحبا بالروح الطيب كانت في الجسد الطيب، ادخلي حميدة وأبشري بروح و ريحان و رب غير غضبان" [مرحبا اس پاک روح کو جو پاک جسم میں تھی (جنت میں قابلِ تعریف حالت میں داخل ہو جاؤ اور راحت وخوشبو اور اس رب کی بشارت قبول کرو جو ناراض نہیں]

اسی طرح اس سے کہتے رہتے ہیں یہاں تک کہ اس آسمان تک پہنچتے ہیں جس میں اللہ عزوجل ہے۔ اور اگر برا آدمی ہوتا ہے تو فرشتہ کہتا ہے: نکل اے نفسِ خبیث! تو خبیث جسم میں تھی، نکل مذموم ہوکر اور بشارت لے کھولتے ہوئے پانی اور پیپ کی اور اسی طرح کی دوسری چیزیں، یعنی طرح طرح کے عذاب کی، اسی طرح کہتے رہتے ہیں یہاں تک کہ وہ روح باہر آتی ہے، پھر اس کو لے کر آسمان کی طرف چڑھتے ہیں اور دروازہ کھلواتے ہیں، تب کہا جاتا ہے کہ یہ کون ہے؟ کہتے ہیں: فلاں ہے۔ کہا جاتا ہے: "مرحبا بالنفس الخبيثة كانت في الجسد الخبيث ارجعي ذميمة" [مرحبا! اس خبیث جان کو جو خبیث جسم میں تھی، قابلِ مذمت حالت میں لوٹ جا] پھر اس کے لیے آسمان کے دروازے کھولے نہیں جاتے، بلکہ آسمان پر سے وہ روح چھوڑ دی جاتی ہے اور قبر میں آتی ہے۔ وہ مرد صحیح سالم اُٹھ بیٹھتا ہے، جس طرح پہلی حدیث میں گزر چکا ہے۔[2] (رواه أحمد والنسائي و ابن ماجه)

صحیح مسلم میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب مومن کی روح نکلتی ہے تو دو فرشتے آگے بڑھ کر اس کو لے لیتے ہیں اور اوپر چڑھتے ہیں۔ حماد نے کہا کہ پھر پاکیزہ خوشبو اور کستوری کا ذکر کیا اور کہا کہ آسمان والے کہتے ہیں: "روح خبيثة جاءت من قبل الأرض" [زمین کی طرف سے کتنی بری بدبو آ رہی ہے] پھر کہا جاتا ہے کہ اس کو لے جاؤ آخر اجل تک۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ناک پر کپڑا رکھ لیا۔[3]

اس طرح سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ مرفوعاً اس طرح مروی ہیں کہ مومن کی جب روح قبض ہوتی ہے تو اس کے پاس رحمت کے فرشتے آتے ہیں، ایک سفید ریشمی لباس لے کر اور کہتے ہیں کہ اے روح!

---

[1] مسند أحمد (٣/ ٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٣٩٤)

[2] مسند أحمد (٢/ ٣٦٤) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤٤٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٦٢) صحيح الجامع، رقم (١٩٦٨)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٧٢)

نکل اللہ کی روح کی طرف، وہ نکلتی ہے، جیسے بہت عمدہ مشک کی خوشبو ہوتی ہے، پھر اس کو ایک دوسرے کے ہاتھ سے لے لیتا ہے اس کا نام لے کر۔ یہاں تک کہ اس کو آسمان کے دروازے پر لاتے ہیں۔ فرشتے کہتے ہیں کہ یہ کون سی پاک روح ہے جو زمین کی طرف سے آئی ہے، پھر جس آسمان پر بھی جاتے ہیں اسی طرح کہا جاتا ہے، یہاں تک کے اسے مومنوں کی روحوں کے پاس لاتے ہیں، وہ اس سے بھی زیادہ خوش ہوتے ہیں جیسے کسی غائب کے اہل اس غائب کے آنے سے خوش ہوتے ہیں، وہ پوچھتے ہیں کہ فلاں نے کیا کیا؟ فرشتے کہتے ہیں کہ ذرا اس کو چھوڑ دو کہ یہ آرام کر لے، یہ غم میں تھا۔ وہ کہتا ہے کہ فلاں شخص مرگیا، کیا تمھارے پاس نہیں آیا؟ یہ کہتے ہیں کہ اس کو اس کی ماں ہاویہ (جہنم) کے پاس لے گئے۔

رہا کافر سو اس کے پاس عذاب کے فرشتے آتے ہیں ٹاٹ لے کر اور کہتے ہیں: اے روح! اللہ کے غضب کی طرف نکل، وہ نکلتی ہے، جیسے بہت بدبودار مردار ہو، اس کو زمین کے دروازے پر لے جاتے ہیں۔[1] (رواه ابن حبان في صحيحه) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے تیسرے الفاظ یہ ہیں کہ اس سے پوچھتے ہیں کہ "ما فعل فلان، ما فعلت فلانة" [فلاں مرد اور فلاں عورت کا کیا حال ہے؟] اور کافر کی روح جب قبض کر لی جاتی ہے اور اس کو زمین کے دروازے پر لے جاتے ہیں تو خازنانِ زمین کہتے ہیں کہ ہم نے اس سے بدتر کوئی بدبو نہیں پائی۔ پھر زمینِ زیریں تک اس کو پہنچا دیتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے کہا کہ مومنوں کی روحیں جابیہ میں جمع ہوتی ہیں اور کافروں کی برہوت میں، یہ ایک زمین سبخہ ہے حضر موت میں۔ پھر اس کی قبر تنگ کر دی جاتی ہے۔[2]

امام ترمذی رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً اس طرح روایت کیا ہے کہ جب مردہ قبر میں رکھا جاتا ہے، یا تم میں سے کوئی ایک شخص، تو اس کے پاس دو فرشتے سیاہ نیلی آنکھوں والے آتے ہیں ایک کو منکر دوسرے کو نکیر کہتے ہیں وہ دونوں اُس میت سے یہ پوچھتے ہیں کہ وہ اس شخص کے حق میں کیا کہتا ہے، وہ وہی کہتا ہے، جو کہا کرتا تھا: "هو عبد الله ورسوله، أشهد أن لا إله إلا الله، وأشهد أن محمداً عبده ورسوله" [وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں ہے اور میں گواہی دیتا ہوں ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں] فرشتے کہتے ہیں کہ ہمیں معلوم تھا کہ تو یہی کہے گا، پھر اس کی قبر کو ستر در ستر گز کشادہ کر دیتے ہیں، پھر اس سے کہتے ہیں: سو جا۔ وہ کہتا ہے کہ میں اپنے گھر والوں کے پاس جا کر خبر کروں؟ وہ کہتے ہیں: "نم كنومة العَروس الذي لا يوقظه إلا أحب أهله إليه" [دلہن کی طرح سو جا جسے اس کے اہل میں سے صرف اس کا سب سے پیارا ہی بیدار کرتا ہے] یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس خواب گاہ سے مبعوث کرے۔

---

[1] سنن النسائي، رقم الحديث (١٨٣٣) صحيح ابن حبان (٧/ ٢٨٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٣٠٩)

[2] صحيح ابن حبان (٧/ ٢٨٣)

اگر منافق ہے تو یوں کہتا ہے کہ میں نے لوگوں کو سنا، وہ کچھ کہتے تھے میں نے بھی اسی طرح کہا، میں کچھ نہیں جانتا۔ منکر نکیر کہتے ہیں کہ ہمیں معلوم تھا کہ وہ یہی کہے گا: پھر زمین کو حکم ہوتا ہے کہ اس پر یکجا ہو جا، وہ اس کو دبا لیتی ہے، یہاں تک کہ اس کی پسلیاں اِدھر سے اُدھر ہو جاتی ہیں، وہ ہمیشہ عذاب میں رہتا ہے، یہاں تک کہ اللہ اُس کو اس کی اس جگہ سے اُٹھائے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا: "هذا حديث حسن غريب"[1] سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے تفسیر آیت باب میں مرفوعاً کہا ہے کہ یہ تثبیت اس وقت ہوتی ہے کہ جب قبر میں اس سے یہ بات کہی جاتی ہے: "من ربك وما دينك ومن نبيك؟" [تیرا رب کون ہے، تیرا دین کیا ہے اور تیرا نبی کون ہے؟] وہ کہتا ہے کہ "ربي الله، و ديني الإسلام، و نبي محمد ﷺ، جاءنا بالبينات من عند الله فآمنت به وصدقت" [میرا رب اللہ ہے، میرا دین اسلام ہے اور میرے نبی محمد ﷺ ہیں، وہ اللہ کی طرف سے ہمارے پاس واضح نشانیاں لے کر آئے تو میں ان پر ایمان لے آیا اور ان کی تصدیق کی] اس سے کہا جاتا ہے تو نے سچ کہا۔ اسی پر تو زندہ رہا اور اسی پر تو مرا اور اسی پر مبعوث ہوگا۔[2] (رواه حماد بن سلمة بسنده)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! بے شک مردہ تمھارے جوتوں کی آواز سنتا ہے جس وقت کہ تم اُس سے پشت پھیرتے ہو۔ پھر اگر وہ مردہ مومن تھا تو نماز اس کے سر کے نزدیک ہوتی ہے اور زکات داہنے طرف اور روزہ بائیں طرف اور خیرات کے کام، جیسے: صدقہ وصلہ رحمی ومعروف واحسان الی الناس (لوگوں کے ساتھ نیکی اور حسنِ سلوک) دونوں پاؤں کے پاس۔ فرشتے اس کے سر کی طرف آتے ہیں تو نماز کہتی ہے، میری طرف آنے کا راستہ نہیں ہے۔ تب داہنی طرف سے آتے ہیں تو زکات کہتی ہے کہ میری طرف سے بھی راہ نہیں ہے۔ تب بائیں طرف سے آتے ہیں تو روزہ کہتا ہے کہ میری جانب سے بھی داخل ہونے کی جگہ نہیں ہے۔ تب پاؤں کی طرف سے آتے ہیں تو نیکی کے کام کہتے ہیں: ادھر سے راہ نہیں ہے۔ تب اس سے کہتے ہیں اٹھ بیٹھ، وہ اٹھ بیٹھتا ہے، اس کو یوں نظر آتا ہے کہ جیسے سورج ڈوبنے کو ہو۔ اس کو کہتے ہیں کہ ہمیں بتاؤ جو ہم تجھ سے پوچھیں۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے چھوڑ دو، میں نماز تو پڑھ لوں، کہتے ہیں کہ نماز تو تو پڑھ لے گا، ہم جو سوال تجھ سے کریں تو اس کی خبر ہم کو دے، تب وہ کہتا ہے کہ تم کیا پوچھنا چاہتے ہو، وہ اس سے کہتے ہیں تو بتا یہ مرد جو تمھارے درمیان تھا تو اس کے بارے میں کیا کہتا ہے اور تو اس پر کس بات کی گواہی دیتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ کیا محمد ﷺ کے بارے میں پوچھتے ہو؟ کہتے ہیں: ہاں۔ وہ کہتا ہے: "أشهد أنه رسول الله وأنه جاءنا بالبينات من عند الله فصدقناه" [میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں، وہ اللہ کی طرف سے ہمارے پر نشانیاں

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٠٧١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٣٩١)

[2] تفسير الطبري (١٦/ ٥٩٦) اس کی سند حسن ہے۔

لے کر آئے تو ہم نے ان کی تصدیق کی] تب اس سے کہا جاتا ہے: ”على ذلك حييت، وعلى ذلك مت، و عليه تبعث إن شآء الله“ [اسی پر تو زندہ رہا، اسی پر تو مرا اور ان شاء اللہ اسی پر تو مبعوث ہوگا] پھر اس کی قبر ستر گز تک کشادہ کر دیتے ہیں اور وہ منور ہو جاتی ہے اور ایک دروازہ جنت کی طرف کھول دیا جاتا ہے اور اس سے کہتے ہیں کہ دیکھ جو اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے اس میں تیار کر رکھا ہے، وہ رشک اور فخر میں بڑھ جاتا ہے، پھر اس کی جان پاک جانوں میں رکھی جاتی ہے، یہ سب پرندے ہیں، جنت کے درختوں میں چرتے ہیں اور جسم خاک کی طرف پھیر دیا جاتا ہے۔ ﴿ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ ﴾[1] (رواه ابن جرير و ابن حبان و ذكر جواب الكافر و عذابه)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ مومن پر موت نازل ہوتی ہے اور وہ اس کا معائنہ کرتا ہے جو نظر آتا ہے، تب چاہتا ہے کہ اس کی جان نکل جائے اور اللہ تعالیٰ اس کے ملنے کو دوست رکھتا ہے اور مومن کی روح آسمان پر لے جاتے ہیں، اس کے پاس مومنین کی روحیں آتی ہیں اور اس سے زمین والوں میں سے اپنے جان پہچان والوں کی خبریں پوچھتی ہیں۔ جب وہ کہتا ہے کہ میں فلاں کو زمین میں چھوڑ آیا ہوں تو ان کو اس بات سے خوشی حاصل ہوتی ہے اور اگر اس نے یہ کہا کہ وہ مر گیا ہے تو کہتے ہیں کہ ہمارے پاس نہیں آیا۔ اور بے شک مومن اپنی قبر میں اُٹھ بیٹھتا ہے اور اس سے اس کے رب کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے، وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے۔ کہتے ہیں کہ تیرا نبی کون ہے؟ وہ کہتا ہے: محمد صلی اللہ علیہ وسلم میرے نبی ہیں۔ کہتے ہیں کہ تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ میرا دین اسلام ہے۔

تب اس کی قبر میں ایک دروازہ کھول دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اپنی جگہ کی طرف دیکھ، پھر وہ قبر کو دیکھتا ہے، گویا ایک خواب گاہ ہے۔ اور جب کوئی اللہ کا دشمن ہوتا ہے اور اس پر موت نازل ہوتی ہے اور وہ معائنہ کرتا ہے جو نظر آتا ہے اور ہرگز نہیں چاہتا کہ اس کی روح نکلے اور اللہ اس کے ملنے کو ناپسند کرتا ہے، پھر جب وہ قبر میں بیٹھتا ہے یا بٹھایا جاتا ہے تو فرشتہ اس سے کہتا ہے: ”من ربك؟“ [تیرا رب کون ہے؟] وہ کہتا ہے: ”لا أدري“ [میں نہیں جانتا] پھر اس سے کہا جاتا ہے: ”لا دريت“ [تو نے نہ جانا] پھر ایک دروازہ دوزخ کی طرف کھول دیا جاتا ہے اور ایک ایسی مار پڑتی ہے جس کو ہر جاندار سنتا ہے، سوائے جن وانس کے۔ پھر اس سے کہتے ہیں کہ ”نم كما ينام المنهوش“ [منہوش کی طرح سو جا] میں نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے کہا: منہوش کیا ہے؟ کہا وہ شخص ہے جس کو دواب وحیات نوچیں کھسوٹیں، پھر اس پر قبر کو تنگ کر دیا جاتا ہے۔[2] (رواه البزار)

سیدہ اسماء بنت صدیق رضی اللہ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ جب انسان مومن ہو کر (قبر میں) داخل ہوتا ہے تو اس کا عمل نماز، روزہ اس کو گھیر لیتا ہے، روزہ اس کو پھیر دیتا ہے، تب وہ فرشتہ اس کو پکار کر کہتا ہے: بیٹھ جا، وہ بیٹھ

---

[1] تفسير الطبري (١٦/ ٥٩٦۔ ٥٩٧) صحيح ابن حبان (٧/ ٣٨٠) صحيح الترغيب والترهيب (٣/ ٢١٩)

[2] مسند البزار (١٧/ ١٥٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٦٢٨)

جاتا ہے۔ فرشتہ اس سے کہتا ہے: تو اس مرد کے حق میں کیا کہتا ہے؟ وہ پوچھتا ہے کہ کون مرد؟ یہ کہتا ہے کہ محمد ﷺ، وہ کہتا ہے کہ "أشهد أنه رسول الله" [میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں] فرشتہ کہتا ہے: "ما يدريك، أدركته؟" تونے کس طرح جانا، کیا ان کو پایا تھا؟ وہ کہتا ہے: "أشهد أنه رسول الله" [میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں] فرشتہ کہتا ہے: "على ذلك عشت، و عليه مت، وعليه تبعث" [اسی پر تو زندہ رہا، اسی پر تو فوت ہوا اور اسی پر تو مبعوث ہوگا] اور اگر فاجر یا کافر ہے تو جب فرشتہ آتا ہے تو اس کے اور کافر کے درمیان پھیرنے والی کوئی شے نہیں ہوتی۔ پھر یہ فرشتہ اس کو اٹھا کر بٹھا دیتا ہے اور کہتا ہے: "ما تقول في هذا الرجل؟" [تو اس مرد کے حق میں کیا کہتا ہے؟] وہ کہتا ہے کون سا مرد؟ یہ کہتا ہے کہ محمد ﷺ، وہ کہتا ہے: "والله ما أدري، سمعت الناس يقولون شيئا فقلته" [اللہ کی قسم! میں نہیں جانتا، میں نے لوگوں کو کچھ کہتے ہوئے سنا، تو میں نے بھی ویسے ہی کہہ دیا] فرشتہ کہتا ہے تو اسی پر جیا اور اسی پر مرا اور اسی پر اُٹھے گا۔ پھر قبر کے اندر اُس پر ایک جانور مسلط کیا جاتا ہے، اس کے ساتھ چنگارے کی طرح ایک تازیانہ ہوتا ہے، وہ اس سے اس میت کو مارتا ہے، وہ جانور بہرا ہے، اس کی آواز نہیں سنتا کہ رحم کرے۔[1] (رواه أحمد)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے آیتِ باب کی تفسیر میں کہا ہے کہ مومن کو جب موت آتی ہے تو فرشتے حاضر ہو کر اس پر سلام کرتے ہیں اور جنت کی بشارت دیتے ہیں، جب مرجاتا ہے تو اس کے جنازے کے ساتھ جاتے ہیں، پھر لوگوں کے ساتھ اس پر نمازِ جنازہ پڑھتے ہیں، جب وہ دفن ہو کر بیٹھتا ہے تو اس سے کہا جاتا ہے: "من ربك؟" [تیرا رب کون ہے؟] وہ کہتا ہے: "ربي الله" [میرا رب اللہ ہے] اس سے کہتے ہیں کہ تیری شہادت کیا ہے؟ وہ کہتا ہے: "أشهد أن لا إله إلا الله وأشهد أن محمداً رسول الله" [میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں] تب اس کی قبر حدِ نگاہ تک کشادہ کر دی جاتی ہے۔[2]

رہا کافر سو اُس پر فرشتے اترتے ہیں اور اپنے ہاتھ پھیلاتے ہیں، یہ پھیلانا موت کے وقت منہ اور پشت پر مارنا ہے، پھر جب قبر میں داخل کیا گیا اور بٹھایا گیا، تب کہا جاتا ہے: "من ربك؟" [تیرا رب کون ہے؟] وہ کچھ جواب نہیں دیتا اور اللہ کو بھلا دیتا ہے اور جب کہا جاتا ہے: "من الرسول الذي بعث إليكم" [تیری طرف آنے والا رسول کون ہے؟] تو کچھ جنبش نہیں کرتا اور نہ کچھ جواب دیتا ہے۔ اسی طرح اللہ ظالموں کو بہکا دیتا ہے۔[3]

سیدنا ابو قتادہ انصاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مومن جب مرجاتا ہے تو قبر کے اندر بٹھایا جاتا ہے۔ اس سے کہتے ہیں: تیرا رب کون ہے؟ وہ کہتا ہے اللہ ہے۔ کہتے ہیں: تیرا نبی کون ہے؟ کہتا ہے محمد ﷺ، ابن عبداللہ۔ کئی بار اسی طرح کہا جاتا ہے۔

---

[1] مسند أحمد (٦/ ٣٥٢) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجال أحمد رجال الصحيح" (مجمع الزوائد: ٣/ ١٧٣)

[2] تفسير الطبري (١٦/ ٥٩٩۔ ٥٠٠) [3] تفسير الطبري (١٦/ ٦٠٣) اس کی اور گزشتہ روایت کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔

پھر ایک دروازہ دوزخ کی طرف کھول کر کہتے ہیں: آگ میں اپنی منزل دیکھ، اگر تو بہک جاتا۔ پھر بہشت کی طرف ایک دروازہ کھول کر کہتے ہیں کہ دیکھ اپنی منزل جبکہ تو تائب ہوا۔[1] إلی آخرہ۔

اس روایت میں اصل نسخے میں کچھ سقوط ہوگیا ہے۔ کوئی صحیح نسخہ ملے تو تصحیح کر لی جائے۔ امام طاؤس رحمہ اللہ نے کہا کہ قولِ ثابت حیاتِ دنیا میں "لا إله إلا الله" ہے اور آخرت میں قبر میں سوالوں کے درست جواب۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ دنیا میں خیر وعملِ صالح پر ثابت رکھتا ہے اور آخرت میں قبر کے اندر۔[2] بہت سے سلف سے یوں ہی مروی ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس مقام پر اپنی تفسیر میں ایک طویل حدیث، جو عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً حکیم ترمذی کی کتاب نوادر الاصول میں لکھی ہے، بیان کی ہے، جس میں کئی دفعہ اس طرح فرمایا ہے کہ « رأيت رجلا من أمتي... الخ » [میں نے اپنی امت کے ایک شخص کو دیکھا...] کیوں کہ روایت مذکور علمِ حدیث کی کسی معتمد علیہ کتاب سے منقول نہیں ہے، اس لیے اس جگہ اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے حدیثِ مذکور کو وارد کرنے کے بعد یوں کہا ہے: "هذا حديث عظيم، ذكر فيه أعمالا خاصة تنجي من أهوال خاصة" [یہ ایک عظیم حدیث ہے، اس میں خاص اعمال کا ذکر کیا گیا ہے جو خاص ہولناکیوں سے نجات دیتے ہیں] پھر کتاب تذکرہ میں اس حدیث کو اسی طرح پر وارد کیا ہے۔[3] لیکن امام قرطبی اور حافظ ابن کثیر رحمہما اللہ دونوں حدیث کی روایت میں چشم پوشی کرتے ہیں۔ لہٰذا حدیث مذکور ترک کی گئی۔

اس حدیث سے زیادہ غریب تر دوسری حدیث تمیم داری سے مروی ہے، جس کو حافظ ابو یعلیٰ موصلی رحمہ اللہ نے اپنی سند سے بہ طریق سیدنا انس بن مالک عن تمیم داری رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے: "هذا حديث غريب جدا، و سياق عجيب، ويزيد الرقاشي راويه عن أنس، له غرائب و منكرات، وهو ضعيف الرواية عند الأئمة"[4] [یہ حدیث سخت غریب ہے، اس کا سیاق عجیب ہے، اسے یزید رکاشی انس رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں، یزید راوی بہت سی غریب اور منکر روایات بیان کرتا ہے اور وہ ائمہ حدیث کے نزدیک ضعیف الروایۃ ہے] سو اس حدیث کو بھی اس جگہ بہ سبب مزید غرابت کے چھوڑ دیا گیا۔ امام ابو داود رحمہ اللہ نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی شخص کے دفن سے فارغ ہوتے تو ٹھہر کر فرماتے: « استغفروا لأخيكم، واسألوا له التثبيت، فإنه الآن يسئل »[5] [اپنے بھائی کے لیے استغفار کرو، اس کے لیے ثابت قدمی کی دعا کرو، اس لیے کہ اس سے اب سوال ہوں گے] تفرد به أبو داود و أورده الحافظ أبو بكر بن مردويه عند قوله ﴿ وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓىِٕكَةُ بَاسِطُوْۤا اَيْدِيْهِمْ ﴾ حديثا طويلا من طرق غريبة عن الضحاك عن ابن عباس مرفوعا وفيه غرائب أيضا"[6]

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٤٤) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٤٦) [3] تفسير ابن كثير (٢/ ٦٩٧)

[4] تفسير ابن كثير (٢/ ٦٩٨۔ ٧٠٠) اس کی سند میں "یزید رقاشی" ضعیف راوی ہے۔

[5] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٢١) صحيح الترغيب والترهيب (٣/ ٢٠٧) [6] تفسير ابن كثير (٢/ ٧٠١)

میں کہتا ہوں کہ قبر اور قبروں میں دفن ہونے والوں کے حالات کے متعلق صحیح احادیث مروی ہیں، وہ ہمیں طرقِ غریبہ سے مستغنی کر دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ اسبابِ خاص، یعنی عالمِ برزخ کے بارے میں خاصی نفیس اور جامع کتابیں تالیف ہوچکی ہیں۔ عربی میں کتاب "شرح الصدور في أحوال الموتىٰ و القبور" اور "أبيات التثبيت"، ''شرح برزخ''، ''تذکرہ قرطبی'' اور ''تلخیص تذکرہ للشعرانی'' وغیرہا متداول (مروج) ہیں اور فارسی میں "ثمار التنكيت"، "قصر الآمال"، "تذكرة القبور" وغیرہ ہیں۔ اردو میں "قضية المقدور" اور "دواء القلب القاسي" تالیف: محرر سطور اور "طي الفراسخ" مطبوع ہیں

بعض معاصرین کی تالیفات بہت نافع اور جامع ہیں۔ اکثر لوگ جو اسلام لائے ہیں، اگرچہ نماز، روزہ اور حج ادا کرتے ہیں، لیکن عام اطلاع کے سبب سے قبروں کے احوال اور قیامت کی ہولناکیوں کے متعلق گناہوں اور معصیت میں گرفتار رہتے ہیں اور کمال جرأت سے گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں۔ قیامت کے آنے کا اعتقاد رکھتے ہیں، مگر عجلت کی وجہ سے اور جہالت کی وجہ سے عذابِ قبر کی مختلف شکلوں اور حشر ونشر کے عذاب سے ان کے دلوں میں اللہ کا خوف نہیں آتا، اس لیے موحد مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ جس طرح فرائض اور واجباتِ دین اور بڑے بڑے گناہوں کے بارے میں علم حاصل کرتا ہے، اسی طرح موت اور موت کے بعد کے حالات کے علم کو بھی اپنے نصب العین میں شامل کرے، کیوں کہ ان کے ذکر سے رقتِ قلت، طمانیتِ قلب اور اللہ عزوجل کا خوف موثر طریقے سے حاصل ہوتا ہے اور شہوات زائل ہوتی ہے۔ اس کے بغیر اسلام ناقص اور ایمان بے حلاوت اور احسان بے طلاوت (تروتازگی کے بغیر) باقی رہتا ہے۔ گناہوں میں بڑی دلیری اور گرفتاری اسی وجہ سے ہوتی ہے کہ ہر شخص کو کبیرہ گناہوں کی گنتی معلوم ہی نہیں، یا معلوم ہے، لیکن اس کی سزا یاد نہیں، ورنہ کون شخص ایسا ہے جو اپنے لیے ابدی ہلاکت کو پسند کرے، یا آگ میں داخل ہونے، یا اس میں ہمیشہ رہنے کو شرک، کفر، فسق اور فجور کے ذریعے سے روا رکھے۔
اللّٰهم أحسن عاقبتنا في الأمور كلها وأجرنا من خزي الدنيا و عذاب الآخرة.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ قولِ ثابت حجتِ واضحہ ہے اور کلمۂ طیبہ ہے اور صحیح میں ثابت ہو چکا ہے کہ وہ کلمہ شہادت ہے، جس کو مومن قبر میں بیٹھ کر کہے گا۔ بعض نے کہا: ﴿ يُثَبِّتُ اللّٰهُ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ دنیا کی زندگی میں ان کو دائم و ہمیشہ اس کلمۂ پاک کے لفظ اور معنی پر ثابت قدم اور راسخ دم رکھتا ہے، یہاں تک کہ اگر اپنے دین میں کسی آزمایش میں گرفتار ہوتے ہیں تو بھی متزلزل نہیں ہوتے، جس طرح کہ وہ لوگ جن کو اصحابِ اخدود نے فتنے میں ڈالا تھا، ثابت قدم رہے، لغزش نہ کی۔ وللّٰه الحمد.

اس جگہ آخرت سے مراد قبر ہے، یعنی وہاں جواب کی تلقین اور صحیح بات پر قائم رکھتا ہے۔ (قاله الجمهور) یا مراد قیامت کا دن ہے، دوبارہ جی اُٹھنے اور حساب کتاب کے وقت۔ یا حیاتِ دنیا سے مراد قبر میں سوالوں کا وقت ہے اور آخرت سے قیامت کے دن سوالوں کا وقت۔ مطلب یہ ٹھہرا کہ جب ان سے ان کے اعتقاد کا سوال کیا جائے گا، وہ اس کی وضاحت اپنے بیان کی لغزش کے باوجود قولِ ثابت سے کریں گے، ان کو کچھ تردد اور جہل نہ ہوگا جس طرح کہ ایک بے توفیق شخص "لا أدري" کہے گا اور فرشتے اس سے کہیں گے: "لا دريت ولا تليت" سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے نبی مکرم ﷺ سے کہا کہ یہ اُمت اپنی قبروں میں آزمائش میں پڑتی ہے میرا کیا حال ہوگا؟ میں ایک کمزور عورت ہوں۔ فرمایا: ﴿ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ (آیت باب)۔[1] (أخرجه البزار) فرشتوں کے سوال و جواب اور عذاب وفتنۂ قبر کے بارے میں بہت احادیث مروی ہیں، یہ جگہ ان کو تحریر کرنے کی نہیں ہے۔ نسأل الله التثبيت في القبر وحسن الجواب وتسهيله بفضله إنه على كل شيء قدير وبالإجابة جدير.

یہ آیتِ شریفہ پہلی مثال کے متعلق تھی یعنی شجرۂ طیبہ۔ پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ظالموں کو گمراہ کر دیتا ہے۔ یہ دوسری مثال کی طرف اشارہ ہے، یعنی شجرۂ خبیثہ کی طرف، یعنی وہ ظالم قولِ ثابت اور حجتِ باہرہ پر کلام کرنے کی قدرت نہیں رکھتے، نہ قبر میں اور نہ حساب کے وقت، جس طرح دنیا میں اتباعِ حق سے بہک گئے ہیں، اسی طرح قبر میں صحیح جواب دینے سے بہک جائیں گے۔ نسأل الله العافية۔ ظالمین سے اس جگہ مراد کفار نابکار ہیں، یا ہر ظالم ستم گار۔ اگرچہ اتنا ہی ہو کہ واضح دلائل سے اس نے منہ موڑا ہو اور انکار کیا ہو۔ وہ فتنے کی جگہوں پر ثابت قدم اور حق کی طرف راہ یاب نہ ہوگا، اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔ مومنوں کو ثابت رکھتا ہے اور ظالموں کو بے یار و مددگار چھوڑ دیتا ہے۔ کوئی اس کے حکم کو پھیرنے والا اور اُس پر اعتراض کرنے والا نہیں ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا کہ یعنی اس کی قدرت کا انکار نہیں ہوسکتا اور نہ اس کے فعل پر اس سے پوچھا جاسکتا ہے۔[2] دونوں جگہ پر اظہار محلِ اضمار میں تربیتِ ہیبت کے لیے ہے۔[3]

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿۲۸﴾ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا ۭ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿۲۹﴾ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ ﴿۳۰﴾

کیا آپ نے ان لوگوں کو دیکھا نہیں جنھوں نے اللہ کی نعمت (ایمان) کو کفر سے بدل ڈالا اور اپنی

---

[1] كشف الأستار عن زوائد البزار (۱/ ۴۱۰) صحيح الترغيب والترهيب (۳/ ۲۱۷)

[2] معاني القرآن للفراء (۳/ ۲۲) [3] فتح البيان (۷/ ۱۱۲۔ ۱۱۳)

قوم کو ہلاکت کے گھر میں لے جا اُتارا؟ 28 (یعنی) جہنم میں، وہ اس میں داخل ہوں گے اور وہ بد ترین ٹھکانا ہے 29 اور انھوں نے اللہ کے شریک بنائے، تاکہ وہ (لوگوں کو) اس کے راستے سے بھٹکا دیں، کہہ دیجیے: تم فائدہ اُٹھاؤ (دنیا میں) پھر یقیناً تمھاری واپسی آگ کی طرف ہے 30

کفرانِ نعمت کی سزا:

امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا کہ اس جگہ ﴿ اَلَمْ تَرَ ﴾ بہ معنی ﴿ اَلَمْ تَعْلَمْ ﴾ ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ﴾ یا ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا ﴾۔ بوار بہ معنی ہلاک ہے۔ ﴿ قَوْمًا بُوْرًا ﴾ أي هالكين! سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہ مکہ کے کفار ہیں۔[1] ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ جبلہ بن الایہم اپنے تابعین کے ساتھ ہے، جو روم کو چلے گئے تھے۔[2] لیکن مشہور اور صحیح وہی پہلی بات ہے، اگرچہ اس لفظ کے معنی تمام کفار کو شامل ہیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمت للعالمین اور نعمت للناس بنایا ہے، جس نے اس رحمت اور نعمت کو قبول کیا اور شکر کے ساتھ قائم ہوا وہ جنت میں جائے گا اور جس نے اس کو رد کیا اور کافر ہوا وہ دوزخ میں جائے گا۔ سیدنا علی مرتضی ۔کرم الله وجهه۔ نے آیتِ باب کی تفسیر میں کہا ہے کہ یہ کفارِ قریش ہیں بدر کے دن۔ ان کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ منافقینِ قریش ہیں۔ ان کا تیسرا قول یہ ہے کہ مشرکینِ قریش ہیں۔ ان کے پاس اللہ کی نعمت آئی، یعنی ایمان انھوں نے اس نعمت کو کفر سے بدل ڈالا اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں اتارا۔

چوتھا قول یہ ہے کہ یہ قریش کے دو بڑے فاجر ہیں: بنو اُمیہ و بنو مغیرہ۔ سو بنو مغیرہ نے بدر کے دن اپنی قوم کو دارالبوار میں نازل کیا اور بنو اُمیہ نے اُحد کے دن اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں اُتارا۔ بدر کے دن ابوجہل تھا اور اُحد کے دن ابوسفیان۔ دارالبوار سے جہنم مراد ہے۔ پانچواں قول یہ ہے کہ بنو اُمیہ ایک وقت تک متمتع رہے۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بھی سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے چوتھے قول کی طرح کہا ہے۔ اس طرح: "فأما بنو المغيرة فكفيتموهم يوم بدر، و أما بنو أمية فمتعوا إلى حين" [بنو مغیرہ تو بدر میں ہلاک ہوئے اور بنو امیہ کو کچھ دنوں کی مہلت مل گئی] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: اے امیر المومنین! یہ آیت کیا ہے؟ کہا: "هم الأفجران من قريش أخوالي وأعمامك، فأما أخوالي فاستأصلهم الله يوم بدر، وأما أعمامك فأملى الله لهم إلى حين" [یہ دونوں قریش کے بدکار ہیں، میرے ماموں اور تیرے چچا، میرے ممیال والے تو بدر کے دن ناپید ہوگئے اور تیرے چچا والوں کو اللہ نے ایک وقت تک مہلت دے رکھی ہے] امام مجاہد، سعید بن جبیر، ضحاک، قتادہ اور ابن زید رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ یہ وہ کفارِ قریش ہیں جو بدر کے دن مارے گئے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی اسی کے قائل ہیں۔[3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٢٣) [2] تفسير الطبري (١٧/ ١٠) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔

[3] تفسير الطبري (١٧/ ٥۔ ١١) تفسير ابن كثير (٢/ ٧٠١)

ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے شرکاء ٹھہرائے اور ان کو پوجا اور لوگوں کو ان کی پرستش کی طرف بلایا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کی زبان پر تہدید و وعید فرمائی اور کہا کہ اے رسول! تم کہہ دو کہ جو کچھ تم دنیا میں کرسکو وہ کرلو، تمھارا مرجع دوزخ کی طرف ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ نُمَتِّعُهُمْ قَلِيلًا ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ إِلَىٰ عَذَابٍ غَلِيظٍ ﴾ [لقمان: ۲٤] ''ہم انھیں تھوڑا سا فائدہ دیتے ہیں، پھر ہم انھیں سخت عذاب کی طرف مجبور کر دیں گے۔'' نیز فرمایا: ﴿ مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيدَ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴾ [یونس: ۷۰] ''دنیا میں تھوڑا سا فائدہ اُٹھانا ہے، پھر انھیں ہماری ہی طرف لوٹنا ہے، پھر ان کے کفر کرنے کی وجہ سے ہم انھیں شدید عذاب (کا مزہ) چکھائیں گے۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یہ خطاب ہے نبی مکرم ﷺ کو یا ہر صالح کو، تعجب کی راہ سے کہ ان کافروں اور باطل پرستوں سے ایسے برے کام سرزد ہوتے ہیں کہ جس کو ذرا سا بھی ادراک ہوگا وہ تعجب کرے گا، ان لوگوں نے شکر کے بدلے کفر کیا، یعنی اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم ﷺ کو مبعوث فرما کر اُن پر انعام کیا تھا، انھوں نے نبی اکرم ﷺ کی تکذیب کی۔ بعض نے کہا کہ انھوں نے نعمت کو کفر سے بدل ڈالا، نعمت کفر کے سبب سے زائل ہو جاتی ہے۔

جمہور مفسرین کہتے ہیں کہ یہ آیت تمام مشرکوں کے بارے میں عام ہے۔ بہر حال انھوں نے اپنی قوم کی نظر میں کفر کو رونق اور زینت دی اور جہنم میں ان کو جھونک دیا۔ یہ دوزخ میں گھسیں گے، وہ ٹھہرنے کی کیا بری جگہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے لیے ہمسر ٹھہرائے، یعنی ربوبیت میں، یا نام میں شرک کیا، یہ اصنام ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: انھوں نے شرک کیا اللہ کے ساتھ،[1] حالاں کہ اللہ کا نہ کوئی شریک ہے نہ ہمسر نہ شبیہ اور نہ برابر والا۔ تعالی عن ذلك علوا كبيرا۔ یہ کام اس لیے کیا کہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ سے گمراہ کریں، اس پر اللہ تعالیٰ نے کہا کہ تم دنیا میں شہوات و کفرانِ نعمت و اضلالِ مردم کو تھوڑے دن برت لو، تمھارا انجام آخرت میں دوزخ ہے۔[2]

قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِينَ آمَنُوا يُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً مِّنْ قَبْلِ أَنْ يَّأْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خِلَالٌ ﴿۳۱﴾

کہہ دیجیے: میرے ان بندوں سے جو ایمان لائے کہ وہ نماز قائم کریں اور ہم نے انھیں جو رزق دیا

[1] الدر المنثور (٥/ ٤٣)
[2] فتح البیان (٧/ ١١٣۔ ١١٥)

ہے، اس میں سے چھپا کر اور علانیہ خرچ کریں، اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں نہ سودا بازی ہوگی نہ دوستی (کام آئے گی) (31)

اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کو نیک کام کرنے کا حکم:

یعنی نیک عمل بکتے نہیں اور کوئی دوستی کی وجہ سے رعایت نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اطاعت کا حکم دیا کہ تم حق پر قائم رہو اور خلق کے ساتھ احسان کرو، نماز پڑھو، صرف اللہ وحدہ لا شریک لہ کی عبادت بجا لاؤ، زکات دو، قریبی رشتہ داروں پر خرچ کرو، اپنے ساتھ والوں کے ساتھ احسان بجا لاؤ۔ اقامتِ نماز سے مراد اس کی محافظت ہے، نماز کے وقت، حدود، رکوع، خشوع اور سجود پر سراً و علانیہ سے مراد چھپ کر اور کھل کر صدقہ دینا ہے، تاکہ قیامت کے دن سے پہلے تم اپنے نفس کو رہا کر لو، کیوں کہ وہاں نہ لین دین ہے اور نہ دوستی آشنائی۔ کسی سے فدیہ نہ لیا جائے گا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ۭ هِيَ مَوْلٰىكُمْ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴾ [الحديد: ١٥] ''لہٰذا آج تم سے کوئی فدیہ نہ لیا جائے گا اور نہ ان لوگوں سے جنھوں نے کفر کیا۔ تمھارا ٹھکانا آگ ہے، یہی تمھارے لیے زیادہ موزوں ہے اور وہ لوٹ جانے کی بہت بری جگہ ہے۔''

خلال سے مراد خلت ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ یعنی اس جگہ کوئی خلیل (جگری دوست) اپنی دوستی کے سبب سے کسی ایسے شخص سے درگزر نہ کرے گا، جس پر سزا واجب ہو چکی ہو، بلکہ وہاں عدل، انصاف و قسط ہوگا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے جانا کہ دنیا میں بیوع اور خلال ہیں، جس کو باہم برتتے ہیں، اب ہر شخص نظر کر لے کہ وہ کس سے دوستی پیدا کرتا ہے اور کس کا ہم نشیں بنتا ہے۔ اگر یہ کام اللہ کے لیے ہے تو اس پر مداومت کرے اور اگر غیر اللہ کے لیے ہے تو اسے جلد چھوڑ دے۔[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس سے یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ اس دن کسی کو کوئی بیع اور فدیہ کام نہ دے گا، اگر زمین بھر سونا بھی کیوں نہ خرچ کرے اور نہ کسی کی دوستی و شفاعت کچھ سودمند ہوگی، جبکہ اللہ تعالیٰ سے کافر ہو کر ملے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـــًٔـا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴾ [البقرة: ١٢٣] ''اور اس دن سے ڈرو جب کوئی شخص کسی شخص کے کچھ بھی کام نہیں آئے گا اور نہ اس سے کوئی بدل قبول کیا جائے گا اور نہ اسے کوئی سفارش نفع دے گی اور نہ ان کی مدد ہی کی جائے گی۔'' نیز فرمایا: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۭ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴾ [البقرة: ٢٥٤] ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ہم نے تمھیں جو

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ١٢۔ ١٣)

کچھ دیا اس میں سے خرچ کرو، اس سے پہلے کہ وہ دن آ جائے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی اور نہ کوئی دوستی اور نہ سفارش ہی کام آئے گی اور کفر کرنے والے ہی ظالم ہیں۔''[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اے نبی! تم میرے بندوں سے کہہ دو کہ تم فرض نماز کو قائم رکھو اور سارے ارکان پورے کرو اور فرض زکات ادا کرو۔ یا مراد تمام بھلائی کے کاموں میں خرچ کرنا ہے، یہی عمومیت زیادہ مناسب ہے، اس میں زکات بھی بہ درجۂ اولیٰ داخل ہے۔ سِرّ وہ ہے جو پوشیدہ ہو، علانیہ وہ ہے جو ظاہر ہے، یا سِرّ سے مراد نفلی خرچ یا عبادت ہے اور علانیہ سے مراد فرض ہے۔ اُس دن کے آنے سے پہلے جس میں نہ خرید و فروخت ہو نہ یاری دوستی۔ اس آیت میں دوستی کی نفی پر جو دلیل ہے، یہ اُس دوستی پر محمول ہے جو طبیعت کے میلان یا خواہشِ نفس کے سبب سے ہوتی ہے اور آیت ﴿ اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَىِٕذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ﴾ [الزخرف: ٦٧] ''اس دن متقین کے سوا تمام (جگری) دوست بھی ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے۔'' میں دوستی کا ثبوت اس دوستی پر محمول ہے جو اللہ کی محبت کے سبب سے ہو۔ لہٰذا اس کا اثبات فقط متقین کے لیے کیا ہے اور غیر متقین سے اس کی نفی کی ہے۔ بعض نے کہا کہ قیامت کے دن مختلف احوال ہوں گے۔ بعض حالات میں ہر خلیل اپنے خلیل سے مشغول ہو جائے گا اور بعض احوال میں بعض خلیل بعض پر مہربان ہوں گے، جبکہ ان کی وہ دوستی اللہ کے لیے ہوگی۔[2] وللہ الحمد.

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ۝۳۲ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآىِٕبَيْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۝۳۳ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ۭ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ۝۳۴

اللہ وہ ذات ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اور آسمان سے پانی نازل کیا، پھر اس نے اس (پانی) کے ذریعے سے تمھارے لیے بطور رزق پھل نکالے اور تمھارے لیے کشتیاں مسخر کیں، تاکہ سمندر میں اس کے حکم سے چلیں، اور تمھارے لیے دریا مسخر کیے (32) اور تمھارے لیے سورج اور چاند مسخر کیے، جو مسلسل چل رہے ہیں، اور تمھارے لیے رات اور دن کو مسخر کیا (33) اور اس نے تمھیں

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۷۰۲) [2] فتح البیان (۷/ ۱۱۶۔ ۱۱۷)

ہر وہ چیز دی، جو تم نے اس سے مانگی، اور اگر تم اللہ کی نعمتیں گنو تو انھیں شمار نہ کر سکو گے۔ بے شک انسان بڑا ظالم، نہایت ناشکرا ہے (34)

انعاماتِ الٰہیہ کا تذکرہ:

اللہ تعالیٰ نے اس جگہ مخلوق پر اپنی بعض نعمتیں بیان کیں۔ ایک یہ کہ ان کے لیے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنایا اور زمین کو فرش ٹھہرایا اور آسمان سے پانی اتارا اور طرح طرح کے مختلف رنگ وشکل و بو ومزے کے پھل اور کھیتیاں نکالیں، جن میں ہزاروں منافع اور فائدے ہیں۔ دوسرے یہ کہ کشتی کو مسخر کیا، وہ ایک موجزن دریا کے اوپر اللہ کے حکم سے چلتی پھرتی ہے۔ دریا کو مسخر کیا کہ وہ کشتی کو لادے اور اُٹھائے ہوئے ہے، تاکہ سفر کرنے والے ایک اقلیم سے دوسری اقلیم کو جاسکیں اور اس جگہ کی اشیاء اُس جگہ اور اُس جگہ کی چیزیں اِس جگہ لے آئیں۔ تیسرے یہ کہ نہروں کو مسخر کیا کہ وہ زمین کو پھاڑ کر ایک کنارے سے دوسرے کنارے کو جاتی ہیں، اس میں بندوں کا رزق ہے، کوئی پینے والا اور کوئی سیراب کرنے والا ہوتا ہے اور کہیں کچھ اور منافع حاصل ہوتے ہیں۔

چوتھے یہ کہ سورج اور چاند کو کام میں لگایا، وہ رات دن سیر وسفر میں رہتے ہیں اور کبھی تھکتے نہیں، نہ سورج چاند کو پاسکے، نہ رات دن کو، ہر ایک اپنے اپنے فلک میں تیرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ ۭ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ۭ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [الأعراف: ٥٤] ”وہ دن کو رات سے اس طرح ڈھانپتا ہے کہ وہ (رات) جلدی سے اس (دن) کو آلیتی ہے، اور اس نے سورج، چاند اور تارے اس طرح پیدا کیے کہ وہ سب اس (اللہ) کے حکم کے پابند کر دیے گئے ہیں۔ آگاہ رہو! پیدا کرنا اور حکم صادر کرنا اسی کے لیے روا ہے، اللہ رب العالمین بہت بابرکت ہے۔“

بالجملہ سورج اور چاند ایک دوسرے کے تعاقب میں آتے ہیں اور روز وشب متعارض (مخالف) ہوتے ہیں۔ کبھی رات دن سے پکڑتی ہے تو بڑھ جاتی ہے اور کبھی دن رات سے لیتا ہے تو رات گھٹ جاتی ہے: ﴿ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ﴾ [الزمر: ٥] ”وہ رات کو دن پر لپیٹتا ہے اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے اور اس نے سورج اور چاند کو کام پر لگا دیا ہے، ہر ایک مقرر وقت تک چل رہا ہے، سنو! وہ نہایت غالب، بہت بخشنے والا ہے۔“ پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے ہر وہ چیز مہیا کی ہے جس کے تم جمیع احوال میں محتاج ہو اور جس کا تم اپنے حال اور قال سے سوال کرتے ہو۔ بعض سلف نے کہا: ”من کل ما سألتموہ وما لم تسألوہ“ یعنی وہ بھی جو تم نے مانگا اور وہ بھی جو تم نے نہیں مانگا۔ پھر ذکر کیا کہ بندے تو اس کی نعمتوں کا شمار بھی نہیں کر سکتے، چہ جائیکہ وہ ان نعمتوں کا شکر ادا کر سکیں۔

طلق بن حبیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حق اس سے بھاری ہے کہ بندے اس پر قائم رہ سکیں اور اللہ کی نعمتیں اس سے زیادہ تر ہیں کہ بندے ان کو گن سکیں، لیکن تم لوگ صبح کو توبہ کرو اور شام کو توبہ کرو۔[1] صحیح بخاری میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کہتے تھے: «اللّٰهم لك الحمد غير مكفي ولا مودع ولا مستغنى عنه ربنا»[2] [اے اللہ! سب تعریف تیرے ہی لیے ہے۔ نہ (اس کھانے سے) کفایت کی جاسکتی ہے نہ اسے خیر باد کہا جا سکتا ہے اور نہ اس سے بے نیاز ہوا جا سکتا ہے، اے ہمارے پروردگار!] سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ابن آدم کے لیے قیامت کے دن تین دیوان نکالے جائیں گے: ایک دیوان میں عملِ صالح ہوگا، دوسرے دیوان میں گناہ ہوں گے، تیسرے دیوان میں اللہ کی نعمتیں ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ اپنی چھوٹی سی نعمت سے فرمائے گا: تو اپنی قیمت اس کے عمل صالح سے لے لے۔ وہ سارے عمل صالح لے لے گی، پھر الگ ہوجائے گی اور کہے گی: قسم ہے تیری عزت کی کہ میں نے اپنی پوری قیمت نہیں لی اور گناہ اور نعمتیں باقی رہ جائیں گی۔ پھر جب اللہ چاہے گا کہ رحمت کرے تو کہے گا: اے میرے بندے! میں نے تیری نیکیاں دوگنا کر دیں اور تیرے گناہوں سے درگزر کی اور اپنی نعمت تجھ کو بخشی۔[3]

(رواه أبوبكر البزار هذا حديث غريب وسنده ضعيف)

اثر میں مروی ہے کہ داود علیہ السلام نے کہا کہ اے رب! میں کس طرح تیرا شکر ادا کروں، میرا شکر ادا کرنا تیرا خود مجھ پر تیری ایک نعمت ہے: فرمایا اے داود! اب تو نے میرا شکر ادا کیا، جب کہ تو نے اپنے قصور کا اقرار نعمت کا شکر کر کے ادا کیا۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا ہے: "الحمد لله الذي لا نؤدي شكر نعمة من نعمه إلا بنعمة حادثة توجب على موديها بأدآئها نعمة حادثة توجب عليه شكره بها"[4] [اللہ ہی کے لیے تو حمد ہے جس کی بے شمار نعمتوں میں سے ایک نعمت کا شکر بھی بغیر ایک نئی نعمت کے ہم ادا نہیں کر سکتے کہ اس نئی نعمت پر ایک شکر واجب ہو جاتا ہے]

شیخ سعدی رحمہ اللہ نے کیا خوب لکھا ہے: ''منت خدائے راعز وجل کہ طاعتش موجب قربت ست، وبشکر اندرش مزید نعمت، ہر نفسی کہ فرد میرد ممد حیات ست، وچوں برمے آید مفرح ذات'' [احسان ہے اس اللہ عزوجل کا جس کی اطاعت بجالانے سے لازمی طور پر اس کا قرب حاصل ہوتا ہے، اس کا شکر ادا کرنے سے نعمتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہر سانس جب اندر جاتا ہے تو زندگی کا معاون ثابت ہوتا ہے اور جب باہر آتا ہے تو انسان کی خوشی کا باعث بنتا ہے]

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ١٦) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥١٤٢)

[3] مسند البزار (١٣/ ٩٩) اس کی سند میں ''صالح مری'' ضعیف اور ''داود بن محبر'' متروک راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٦٦٩٨)

[4] تفسير ابن كثير (٢/ ٧٠٣)

از دست و زبان کہ برآید ... کہ عہدہ شکرش بدر آید

''وہ کون ہے کہ جو اپنے ہاتھوں اور زبان سے اس (اللہ) کے شکر سے عہدہ برآ ہو سکے۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو ایجاد کیا اور بنایا پہلی کسی مثال کے بغیر اور اس میں اجرامِ علویہ وسفلیہ پیدا کیے اور سب سے پہلے یہی ذکر کیا، اس لیے کہ یہ تمام موجود مخلوقات میں سے سب سے بڑی مخلوق ہیں اور یہ وجودِ صانع، خالق، قادر اور مختار پر دلالت کرتے ہیں۔ آسمان سے، یعنی بلند چھت سے پانی اُتارا۔ اس لفظ میں فلک داخل ہے اس کے نزدیک جس نے یہ کہا کہ بارش کی ابتدا فلک سے ہوتی ہے اور بادل اس میں داخل ہے، اس کے نزدیک جس نے کہا کہ بارش کی ابتدا بادل سے ہوتی ہے اور وہ اسباب داخل ہیں جو بادل کو اٹھاتے ہیں، جیسے ہوائیں۔ کہتے ہیں کہ مینہ آسمان سے بادل پر اترتا ہے اور بادل سے ہوا پر اور ہوا سے زمین پر اترتا ہے۔ اس پانی سے بنی آدم کے کھانے کے لیے طرح طرح کے پھل پیدا ہوتے ہیں جس سے وہ زندگی بسر کریں۔

ثمر کا لفظ اس چیز پر واقع ہوتا ہے جو درخت سے حاصل ہوتی ہے اور کبھی اس پر بھی بولا جاتا ہے جو ﴿ زَرْعٌ ﴾ سے پیدا ہوتی ہے، جیسے: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ﴾ [الأنعام: ١٤١] ''ان کا پھل کھاؤ جب وہ پھل لائیں اور ان کی کٹائی اور چنائی کے دن اس (اللہ) کا حق دے دیا کرو۔'' اور بعض نے کہا ہے کہ ثمر سے مراد وہ شے ہے جو طعام اور لباس کو شامل ہے۔ پھر کشتی کا ذکر کیا کہ وہ پانی پر تمھارے ارادے کے مطابق ایک شہر سے دوسرے شہر کو چلتی پھرتی ہے، تم اس کو اپنی ضرورت کے مطابق استعمال کرتے ہو۔ یہ کشتی اور جہاز کا جاری ہونا اللہ کے حکم سے ہے۔ اسی طرح ندیوں کو تمھارے لیے مسخر کر دیا ہے کہ تم ان پر سوار ہوتے ہو اور جہاں چاہو اس کو لے جاؤ۔ یہ تم پر اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نعمت ہے۔ چاند سورج بھی تمھاری تسخیر میں ہیں، تاکہ تم ان سے نفع لو اور ان کی چمک سے فائدہ اٹھاؤ، یہ ہمیشہ اسی چکر میں رہتے ہیں، ان سے اصلاحِ نباتات وحیوانات ہوتی ہے اور اندھیرے دور ہوتے رہتے ہیں۔

آفتاب دن کا بادشاہ ہے، اسی سے سال بھر کے تمام موسم پہچانے جاتے ہیں۔ چاند رات کا بادشاہ ہے، اسی سے مہینوں کا ختم ہونا معلوم ہوتا ہے، یہ سب اللہ کی تسخیر سے ہے کہ اس نے بندوں پر یہ انعام کیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ان کا چکر مارنا اللہ کی اطاعت میں ہے،[1] یعنی قیامت تک اسی طرح چلیں گے اور سست نہ ہوں گے اور نہ ان کی چال منقطع ہوگی، سورج چوتھے آسمان پر ہے اور دنیا کا آسمان چاند کے لیے ہے۔ آخر دہر یعنی

---

[1] تفسیر الطبري (١٧/ ١٤) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے۔

دنیا کی عمر کے ختم ہونے تک یہی ماجرا رہے گا اور رات اور دن کو بھی مسخر کیا ہے کہ ایک کے پیچھے دوسرا چلا آتا ہے۔

دن اس لیے ہے کہ اس میں معاشی معاملات کے لیے تگ و دو کی جائے اور دنیا کے دھندے کے لیے نکلیں اور رات اس لیے ہے کہ لوگ اس میں آرام کریں، جیسے اللہ سبحانہ نے فرمایا: ﴿ وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ﴾ [القصص: ٧٣] ”اور اس نے اپنی رحمت ہی سے تمھارے لیے رات اور دن بنائے، تاکہ تم اس (رات) میں آرام کرو اور تاکہ تم (دن میں) اس کا فضل تلاش کرو۔“ پھر ان نعمتوں پر ہی اکتفا نہ کیا جن کا ذکر کیا، بلکہ جو کچھ تم نے مانگا سوال کیا وہ سب تم کو دیا، یعنی منافع اور مرادیں اتنی کہ جن کا کچھ شمار نہیں اور انتہا نہیں، تم اگر اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے، پھر ان نعمتوں کے شکر بجالانے کا کیا ذکر ہے ؎

ابرد و باد و مہ و خورشید و فلک درکارند — تا تو نانے بکف آری و بہ غفلت نخوری
ہمہ ازبہر تو سرگشتہ و فرمانبردار — شرطِ انصاف نہ باشد کہ تو فرماں نبری

”بادل، ہوا، چاند، سورج اور آسمان کام میں لگے ہوئے ہیں، تاکہ تو روزی حاصل کرے اور غفلت میں نہ کھائے۔ یہ تمام اشیا صرف تیری خاطر پریشان ہیں اور حکم بجا لا رہی ہیں، یہ انصاف کی بات نہ ہوگی کہ تو فرماں برداری نہ کرے۔“

اللہ تعالیٰ نے جو اعضاء سے ایک عضو کی خلقت میں، مثلاً یا حواس ظاہر و باطن سے ایک حاسہ میں، مثلاً انعام کیا ہے، ذکر کیا ہے کہ لوگوں میں سے کوئی ایک اس کا ادنیٰ شکر بجا لا سکے بلکہ اصلاً ممکن نہیں ہے۔ پھر ان انعامات کا کیا ذکر ہے جو سارے بدن میں عطا کیے ہیں، پھر ان نعمتوں کا کیا بیان ہے جو ہر وقت طرح طرح سے اور مختلف قسم سے پہنچتی رہتی ہیں،[1] کسی قائل نے کیا خوب کہا ہے ؎

لو كل جارحة مني لها لغة — تثني عليك بما أوليت من حسن
لكان ما زاد شكري إذ شكرت به — إليك أبلغ في الإحسان والمنن

[اگر میرے ہر عضو کی زبان ہوتی جو تیرے عطا کردہ احسانات کی ثنا کرتی تو تب بھی میرا شکر تیرے انعامات سے زیادہ نہیں ہوسکتا تھا]

اگر ہر موئے من گردد زبانے — ز تو رانم بہ ہر یک داستانے
نیارم گوہر شکر تو سفتن — سرموئے ز احسان تو گفتن

”اگر میرے بال بھی زبان بن جائیں تو میں اس ہر زبان سے ایک داستان بیان کروں۔ تیرے شکر کے

[1] فتح البیان (٧/ ١١٧۔ ١٢٠)

موتی پرونے بال بال سے تیرے احسانات کے بیان کرنے کی سیر میں لگا رہتا ہوں۔"

سلیمان تیمی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں پر انعام اپنی قدرت کے مطابق فرمایا ہے اور بندوں کو شکر کرنے کی تکلیف ان کی قدرت کے مطابق دی ہے۔ ① بکر بن عبداللہ مزنی رحمہ اللہ کہتے ہیں تو اگر چاہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کی قدر جانے تو اپنی آنکھیں بند کر۔ ابوالدرداء نے کہا کہ جس نے نہ پہچانی اللہ کی نعمت مگر اپنے کھانے پینے میں تو اس کا علم تھوڑا ہے اور اس کا عذاب آموجود ہوا۔ ② داود علیہ السلام نے کہا تھا کہ اے میرے رب! مجھے خبر دے کہ مجھ پر تیری ادنیٰ نعمت کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے وحی کی: اے داود! تو سانس لے، جب سانس لیا تو کہا کہ یہ میری تجھ پر ادنیٰ نعمت ہے۔ ③ میں اس جگہ کہتا ہوں: "اللّٰهم إنا نشكرك على كل نعمة أنعمت بها علينا، مما لا يعلمه إلا أنت، ومما علمناه، شكرا لا يحيط به حصر، ولا يحصره عدد، ما شكرك الشاكرون، بكل لسان في كل مكان" [اے اللہ! ہم تیری ہر اس نعمت پر تیرا شکریہ ادا کرتے ہیں جو تو نے ہم پر انعام کی ہے، وہ بھی جسے صرف تو ہی جانتا ہے اور وہ بھی جس کو ہم جانتے ہیں، ایسا شکر جسے کوئی حصر گھیر نہیں سکتا، کوئی عدد جس کا احاطہ نہیں کر سکتا، جب تک شکر کرنے والے تیرا شکر ادا کریں، ہر زبان میں اور ہر جگہ میں]

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بے شک انسان اپنی جان کے لیے سخت ظالم ہے۔ شکرِ نعمت سے غافل رہتا ہے۔ یا غیر کا شکر کرتا ہے نہ کہ منعم حقیقی کا، اس کفرانِ نعمت میں نہایت سخت ہے۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کہتے تھے: "اللّٰهم اغفرلي ظلمي وكفري" [اے اللہ! میرا ظلم اور ناشکری کو بخش دے] ایک شخص نے کہا کہ اے امیر المومنین! یہ ظلم تو ہے، کفر کیا ہے؟ فرمایا: ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ﴾ ④ (آیتِ باب)۔ بعض نے کہا ہے کہ ظلوم ہے شدت میں شکوے کرتا ہے اور جزع کفار ہے نعمت میں جمع و منع کرتا ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ﴿۳۵﴾ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۶﴾

اور جب ابراہیم نے کہا: اے میرے رب! اس شہر (مکہ) کو امن والا بنا دے، اور مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچائے رکھنا ﴿35﴾ اے میرے رب! بے شک انھوں نے بہت سے لوگ گمراہ کیے ہیں، پھر جو میری اتباع کرے، تو یقیناً وہ میرا ہے اور جو میری نافرمانی کرے، تو بلاشبہ تو غفور (اور) رحیم ہے ﴿36﴾

ابراہیم علیہ السلام کی مکہ شہر اور اپنی اولاد کے حق میں دعائیں:

اللہ پاک نے اس مقام پر مشرکینِ عرب پر حجت کے طور پر یہ بات ذکر کی کہ بلدِ حرام مکہ معظمہ سب سے پہلے

① شعب الإيمان (٤/ ١٣٨) ② شعب الإيمان (٤/ ١١٢۔ ١١٣) ③ شعب الإيمان (٤/ ١٥٢) ④ الدر المنثور (٥/ ٤٥)

جو بنا تو اسی لیے کہ اللہ وحدہ لا شریک لہ کی عبادت کی جائے اور ابراہیم علیہ السلام جن کے سبب سے یہ شہر اور گھر آباد ہوا، انھوں نے عبادت غیر اللہ سے اپنی بے زاری ظاہر کی اور مکہ کے لیے امن کی دعا مانگی اور کہا: اے رب! تو اس شہر کو امن کا شہر بنا دے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کی اور کہا: ﴿ اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ۚ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَكْفُرُوْنَ ﴾ [العنکبوت: ٦٧] ”کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ بے شک ہم نے حرم (مکہ) کو پُر امن بنایا ہے، جبکہ لوگ اس کے اِردگرد سے اُچک لیے جاتے ہیں۔ کیا پھر وہ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں۔“

نیز فرمایا: ﴿ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ فِيْهِ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ﴾ [آل عمران: ٩٦۔ ٩٧] ”بے شک (اللہ کا) پہلا گھر جو لوگوں کے لیے مقرر کیا گیا وہی ہے جو مکہ میں ہے۔ وہ تمام دنیا کے لیے بڑی برکت اور ہدایت والا ہے۔ اس میں واضح نشانیاں ہیں (اور) مقامِ ابراہیم ہے اور جو اس میں داخل ہو جائے، وہ امن والا ہو جاتا ہے۔“

اس جگہ یوں کہا: ﴿ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا ﴾ (آیتِ باب)۔ معرفہ کے ساتھ اس لیے کہا کہ یہ دعا کعبہ کی بنیاد رکھنے کے بعد کی تھی، لہٰذا کہا تھا: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ۚ ﴾ [ابراھیم: ٣٩] ”تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق عطا فرمائے۔“ اور یہ بات معلوم ہے کہ اسماعیل علیہ السلام اسحاق علیہ السلام سے تیرہ برس بڑے تھے اور جب خلیل علیہ السلام اسماعیل علیہ السلام اور اس کی ماں کو مکہ کی جگہ کی طرف لے گئے تھے اور یہ بچہ شیر خوار تھا تب یہی دعا کرتے تھے اور کہا تھا: ﴿ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا ﴾ (آیتِ باب)۔ جس طرح کہ سورت بقرہ کی تفسیر میں یہ قصہ مطولاً مکمل شکل میں گزر چکا ہے اور اس جگہ جو دعا کی ہے، اس میں اپنا اور اپنی اولاد کا ذکر کیا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ ہر داعی کو یہ چاہیے کہ اپنے لیے اور اپنے والدین کے لیے اور اپنی اولاد کے لیے دعا کرے۔

پھر یہ ذکر کیا کہ ان اصنام نے ایک جہان کو گمراہ کر رکھا ہے۔ اور وہ ان بتوں کے پجاریوں سے بے زار ہیں اور ان کے معاملے کو اللہ کے سپرد کیا کہ چاہے ان کو عذاب دے اور چاہے بخش دے، جیسے عیسیٰ علیہ السلام کا قول نقل کیا ہے: ﴿ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ [المائدۃ: ١١٨] ”اگر تو انھیں عذاب دے تو بے شک وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انھیں بخش دے تو بے شک تو ہی غالب ہے، بڑی حکمت والا ہے۔“ اس آیت میں اللہ کی مشیت کی طرف لوٹنے سے زیادہ اور کچھ نہیں یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس میں بخشش کرنے کی تجویز ہے، اس لیے کہ جو کوئی شرک و کفر پر مرے گا وہ ہرگز بخشا نہ جائے گا۔

سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابراہیم اور عیسیٰ علیہما السلام کا یہ قول پڑھا، پھر کہا: « اَللّٰھم

أمتي، اللّٰهم أمتي، اللّٰهم أمتي » [اے اللہ! میری امت، اے اللہ! میری امت، اے اللہ! میری امت] پھر روئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے جبریل! تو محمد ﷺ کے پاس جا، اور تیرا رب دانا تر ہے، اُس سے پوچھ تو کیوں روتا ہے؟ جبرئیل علیہ السلام نے آکر کہا کہ نبی مکرم ﷺ نے اپنی بات بتائی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے جبریل! تو محمد ﷺ کے پاس جا اور کہہ میں تجھ کو تیری امت کے بارے میں راضی کردوں گا اور تجھے رنجیدہ نہ کروں گا۔[1] (رواہ عبد اللہ بن وھب)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا گیا ہے کہ اس جگہ ابراہیم علیہ السلام کا یہ قصہ کلمہ طیبہ کی مثال کے لیے ہے یا توحید کی طرف دعوت اور بتوں کی عبادت سے منع کرنے کے لیے ہے۔ یہ قصہ ابراہیم علیہ السلام کے آگ میں ڈالے جانے کے بعد واقع ہوا تھا اور آگ کے اس واقعے میں نہ ابرہیم علیہ السلام نے کوئی دعا کی اور نہ ہی کچھ سوال کیا، بلکہ اپنے حال پر اللہ تعالیٰ کے علم کو کافی سمجھا اور اس جگہ دعا کی اور گڑ گڑائے۔ دعا کرنے کا مقام زیادہ اعلیٰ اور بڑا ہے بہ نسبت اس کے کہ دعا کو اس لیے چھوڑ دیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ہے اور وہ کافی ہے۔ عارفین نے اسی طرح کہا ہے۔

ابرہیم علیہ السلام کا ایک طریقے سے دوسرے طریقے کی طرف آنا بطور کمال کے تھا، وہ دعا یہ تھی کہ اے رب! تو اس شہر کو، یعنی مکہ کو امن والا کر دے قیامت کے قریب آنے اور دنیا کے ختم ہونے تک۔ تمام مطالب پر امن کو ترجیح دی، کیوں کہ اگر امن جاتا رہتا ہے تو انسان کسی اور کام کے لیے، وہ دنیا کا ہو یا دین کا، فارغ نہیں ہوتا۔ اس دعا میں اور اُس دعا میں، جو سورت بقرہ میں گزر چکی ہے، یہ فرق ہے کہ اس جگہ صرف اس شہر کا امن مطلوب ہے اور اُس جگہ اس شہر کا قائم رہنا اور امن بھی مقصود ہے۔

حاشیہ سلیمان جمل میں کہا کہ شارح علیہ السلام نے اس جگہ بلد کی تفسیر مکہ کی ہے اور وہاں مکان۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ دعا دو بار واقع ہوئی، ایک بار کعبہ کی تعمیر سے پہلے اور دوسری بار بیت اللہ کی تعمیر کے بعد۔ لہٰذا اُس جگہ لفظ بلا نکرہ آیا ہے اور اس جگہ معرفہ۔ بہر حال دعائے امن سے مراد یہ ہے کہ مکہ ویرانی سے محفوظ رہے خراب نہ ہو۔ سو یہ بات بحمد اللہ تعالیٰ ابھی تک لوگوں کو معلوم ہے کہ کسی کو اس کی تخریب پر آج تک قدرت نہیں ہوئی، اگرچہ ایک جماعت جبابرہ نے بارہا اس پر غارت گری کی اور اہلِ مکہ کو خوب ڈرایا۔ بعض نے کہا کہ یہ سال قصہ ذی السویقتین حبشی کے ساتھ مخصوص ہے، جس طرح کہ صحیحین میں مروی ہے۔[2] اس صورت میں ان دونوں نصوص کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔ مراد یہ ہے کہ اس شہر کے لوگ امن میں رہیں، اسی وجہ پر اکثر مفسرین وغیرہم قائم ہیں۔

---

(1) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٢) تفسير الطبري (١٧/ ١٨)

(2) صحيح البخاري، رقم الحديث (١٥١٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٠٩)

سو یہ امن بحمد اللہ تعالیٰ مکہ اور حرم کو اِس وقت تک حاصل ہے۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے کہا کہ ابراہیم علیہ السلام کی دعا اللہ نے قبول کی، مکہ کو حرم اور امن والا کر دیا، وہاں کسی انسان کا خون نہیں گرایا جاتا اور نہ کسی پر ظلم ہوتا ہے، نہ شکار ہوتا ہے، نہ کوئی کانٹا اکھیڑا جاتا ہے۔[1] اور یہ دعا بھی کی تھی کہ اے رب! تو مجھ کو اور میری اولاد کو اس بات سے بچا کہ ہم بت پوجیں، یعنی ہم کو ازراہِ لطف و کرم شرک کے خفیہ اسباب سے بچا کر رکھ۔ کہتے ہیں کہ اپنی صلبی اولاد مراد ہیں۔ یہ سب آٹھ لوگ تھے۔ یا وہ مراد ہیں جو اس دعا کے وقت موجود تھے؛ بیٹے اور پوتے، یا ساری اولاد مراد ہے، جب تک ان کی نسل چلے۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے کسی نے صنم پرستی نہیں کی۔

صنم وہ مورت ہے، جو جاہلیت والے پتھر وغیرہ سے بنا کر پوجتے تھے، یہ بات ہر دو قولِ اول پر ٹھیک ہوتی ہے اور تیسرے قول پر نہیں ہوتی، کیوں کہ قریش اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں اور یہ بلاشک بتوں کو پوجتے تھے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا کہ مراد وہ اولاد ہے جن کے لیے اللہ نے اذن دیا تھا کہ دعا کریں، ورنہ ان کی اولاد میں ایسے بھی ہوئے ہیں جنھوں نے مورت پوجی، اس صورت میں یہ دعا عام مخصوص ہے۔[2] بعض نے کہا کہ یہ دعا خاص ہے، ساتھ ایماندار اولاد کے آخرت کے آخری حصے کی رو سے: ﴿ فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ ﴾ (آیتِ باب)۔

اس سے ثابت ہوا کہ جو کوئی ان کے دین کا تابع نہیں ہوا وہ ان کا نہیں ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی دعا ان کی اولاد کے حق میں قبول کی، کسی نے ان کی اولاد میں سے مورت نہیں پوجی اس دعا کے بعد۔[3] یہ دعا اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی اور اس شہر کو با امن کر دیا اور اہلِ مکہ کو پھل دیے اور ابراہیم علیہ السلام کو پیشوا (امام) کیا اور ان کی اولاد میں سے نماز قائم کرنے والے ٹھہرائے اور دعا قبول کی اور مناسک دکھائے اور توبہ قبول فرمائی۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے یہ دعا اپنے لیے مقامِ خوف میں کی تھی اور اس دعا میں اپنے بیٹوں کو بھی جمع کر لیا تھا، تاکہ وہ بھی اس برکت میں شامل اور داخل رہیں۔ مراد توحیدِ خالص پر ثابت قدمی طلب کرنا ہے: "اللھم ارزقنا" اے اللہ! تیرا یہ گناہ گار بندہ تیرے خلیل جلیل کی ذریت میں ہے تو اس کو وہی توحیدِ محض الوہیت و ربوبیت اعتقاداً و عملاً و حالاً و قولاً عطا کر جو تو نے ابراہیم علیہ السلام اور خاتم الانبیاء علیہ السلام کو عطا کی تھی، اگرچہ وہ معصوم تھے اور میں جہول ظلوم ہوں، لیکن تیری رحمتِ وسیع، لطفِ عمیم، کرمِ جم، عطائے اتم کے سامنے یہ بات نہایت معمولی اور آسان ہے ؎

تو مگر از طرف رحمت خود نزدیکی ورنہ من از طرف خویش بغایت دورم

"تو تو اپنی رحمت کی بنا پر نزدیک ہے، ورنہ میں تو اپنی طرف سے (بوجہ گناہ) بہت دور ہوں۔"

ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا: اے رب! ان اصنام نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے۔ گمراہی کی سند اصنام کی

---

[1] تفسیر الجلالین (١/ ٣٣٤) [2] تفسیر الخازن (٤/ ٤٧) [3] تفسیر الطبري (١٧/ ١٧)

طرف فرمائی، حالاں کہ اصنام جمادات ہیں، کچھ عقل وشعور اور ادراک وفہم نہیں رکھتے، اس لیے کہ یہ گمراہی کا سبب ہیں، گویا انھوں نے ہی خلق کو گمراہ کر دیا ہے۔ یہ جملہ سبب ہے رب سے دعا کرنے کا اور دعا کا دہرانا تاکید اور اپنی درخواست اور آہ وزاری کی کثرت کے لیے ہے۔

پھر کہا کہ ان لوگوں میں جو کوئی میرے دین کی پیروی کرے گا اور مسلمان موحد ہو جائے گا، وہ میرے دین والوں سے ہے۔ اپنے اہلِ ملت کو اپنے نفس کی طرح ٹھہرایا مبالغے کے طور پر اور جو کوئی میری نافرمانی کرے گا اور میرے دین کا تابع نہ ہوگا اور میری ملت میں داخل نہ ہوگا، تو تُو قادر ہے اس پر کہ اگر چاہے تو اس کو بخش دے۔ خلیل جلیل علیہ السلام نے یہ بات اس بات کے معلوم کرنے سے پہلے کہی تھی: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ ﴾ [النساء: ٤٨] جس طرح کہ مشرک باپ کے لیے استغفار کی تھی۔[1] (قالہ ابن الأنباري) بعض نے کہا کہ عصیان سے اس جگہ شرک کے علاوہ مراد ہے۔ (قالہ مقاتل) بعض نے کہا کہ یہ مغفرت شرک سے توبہ کرنے کے ساتھ مشروط ہے۔[2] (قالہ السدي) بعض نے کہا کہ مغفرت سے مراد کفر سے ایمان کی طرف آنا ہے، لیکن پہلی بات زیادہ مناسب ہے۔[3]

رَبَّنَاۤ اِنِّيْۤ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْۤ اِلَيْهِمْ وَ ارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ۝۳۷

اے ہمارے رب! بے شک میں نے اپنی کچھ اولاد ایک بے زراعت وادی میں بسائی ہے، تیرے محترم گھر (کعبے) کے پاس، اے ہمارے رب! تاکہ وہ نماز قائم کریں، چناں چہ تو بعض لوگوں کے دل ان کی طرف مائل ہونے والے کر دے اور انھیں ہر قسم کے پھلوں سے رزق دے، تاکہ وہ (تیرا) شکر کریں (37)

دعائے ابراہیمی اور لوگوں کا کعبے کی سرزمین کی طرف رجحان:

ابراہیم علیہ السلام کا گھر شام میں تھا۔ ایک بیوی سے اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے، ان کو ان کی ماں کے ساتھ لاکر اس جنگل میں بٹھا کر چلے گئے، جہاں بعد میں شہرِ مکہ بسا۔ اللہ تعالیٰ نے زمزم کا چشمہ نکالا، اس سبب سے وہاں بستی پڑی اور زمین کھیتی کے لائق نہ تھی نہ میوے کے۔ اس کے نزدیک طائف کی زمین سنوار دی کہ وہاں بہتر سے بہتر میوے پیدا ہوں اور مکہ شہر میں پہنچیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ پہلی دعا کے بعد دوسری دعا تھی، جبکہ ہاجرہ اور اس کے فرزند کو چھوڑ کر چلے وہ دعا بیت اللہ کی تعمیر سے پہلے تھی اور یہ دعا بیت اللہ کی تعمیر کے بعد مانگی، اللہ عزوجل کی

[1] فتح القدير (٣/ ١٥٣) [2] تفسير البغوي (٤/ ٣٥٥) [3] فتح البيان (٧/ ١٢١۔ ١٢٣)

طرف رغبت اور تاکید کے طور پر، اس لیے ﴿ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ﴾ فرمایا۔[1]

امام ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یعنی میں نے اس کو محرم ادب والا اس لیے کہا ہے کہ یہاں کے لوگ اس کے نزدیک ہمیشہ نماز پڑھا کریں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ اگر ابراہیم علیہ السلام یوں کہتے: ''أفئدة الناس'' تو سارے فارس، روم، ہند، یہود اور نصاریٰ تو پورے جہاں کے آدمی اس گھر پر ازدحام کرتے، لیکن ﴿ مِنَ النَّاسِ ﴾ کہا اور مسلمانوں کو خاص کیا[2] اور ثمرات طلب کیے، تاکہ اللہ کی اطاعت پر مدد ملے اور جس طرح کہ یہ ایک ایسا میدان ہے، جہاں کھیتی نہیں ہوسکتی تو اب ان کے لیے کچھ پھل درکار ہیں جن کو یہ کھا کر عبادت کیا کریں۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا سن لی، جیسے فرمایا: ﴿ اَوَ لَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰۤى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ [القصص: ٥٧] ''کیا ہم نے انھیں پر امن حرم میں جگہ نہیں دی، جس کی طرف ہر قسم کے پھل ہماری طرف سے بطور رزق کھینچ کر لائے جاتے ہیں؟ لیکن ان کے اکثر نہیں جانتے۔'' یہ اللہ کا لطف وکرم اور رحمت و برکت کا نشان ہے کہ بلادِ حرام مکہ مکرمہ میں کوئی پھل دار درخت نہیں ہے، بلکہ مکہ کے اردگرد سے پھل، دانے اور میوہ جات آتے ہیں، یہ خلیل علیہ السلام کی دعا کی قبولیت کی نشانی ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ﴿ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ ﴾ سے مراد بعض اولاد ہے، کیوں کہ وہاں اسماعیل علیہ السلام رہے، یہ بعض ذریت ہیں اور ان کی والدہ شریفہ ہاجرہ وہاں سکونت پذیر رہیں۔ وادی اس پست جگہ کو کہتے ہیں جو دو پہاڑوں کے درمیان ہوتی ہے۔ یہ وادیِ مکہ ہے، جہاں نہ کھیتی ہے نہ کوئی پیداوار اُگنے کی صلاحیت، بلکہ ایک پتھریلی زمین ہے، جہاں کسی طرح کی پیداوار نہیں ہوتی۔ اس بات کی نفی کی کہ ان کا وہاں رکھنا زراعت کے لیے ہو۔ محرم سے مراد یہ ہے کہ یہ جگہ طوفان سے پہلے بھی ادب کا مقام تھی۔ لیکن دعا کے وقت نہ تھی، ایک ریت کا ٹیلہ تھا۔

رہا خانہ کعبہ تو وہ طوفان کے وقت سے آسمان پر اُٹھ گیا تھا اور اس کو انجام کار کے اعتبار سے مجاز کہیں تو بھی صحیح ہوسکتا ہے، یعنی عن قریب یہ گھر آباد اور با ادب ہوگا یا تیرے پہلے علم کے مطابق اس جگہ کا آباد ہونا مقرر ہو چکا ہے۔ اس کو محرم اس لیے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ تعرض کرنا (پیش آنا، ٹوکنا) حرام کر دیا۔ اس کی توہین کرنے سے منع کیا ہے اور اس کے آس پاس کو حرام ٹھہرایا ہے، یا وہ طوفان پر حرام رہا۔ اسی طرح اس کو عتیق بھی کہتے ہیں، اس لیے کہ طوفان سے آزاد رہا۔ یا جبابرہ پر حرام ہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٧٠٤) [2] تفسیر الطبري (١٧/ ٢٤۔ ٢٦)

عامر بن سعد عن ابیہ کہتے ہیں کہ سارہ ابراہیم علیہ السلام کے پاس تھیں، مدت تک ان کے تحت رہیں، کوئی بچہ نہ ہوا۔ جب یہ حال دیکھا تو ہاجرہ مادرِ اسماعیل کو ہبہ کر دیا، یہ قبطیہ تھیں، ان سے اسماعیل پیدا ہوئے۔ سارہ کو غیرت آئی اور اپنے جی میں غصہ کیا اور ہاجرہ پر عتاب فرمایا اور حلف کیا کہ میں اس کو تین طرف سے قطع کروں گی۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ بھلا تم اپنی قسم سے بَری ہو سکتی ہو، کہا میں کیا کروں؟ فرمایا کہ اس کے دونوں کانوں کو چھید دے اور اس کا ختنہ کر ڈال، سارہ نے اسی طرح کیا۔ تب ہاجرہ نے اپنے دونوں کانوں میں دو گوشوارہ پہنے، اس سے ان کا حسن اور بھی زیادہ ہو گیا۔ سارہ نے کہا کہ میں نے تو اس کو اور زیادہ خوبصورت بنا دیا اور اپنے پاس رہنے دینا نہ چاہا، ابراہیم علیہ السلام کو سخت وجد ہوا، وہ ہاجرہ کو مکے میں لائے اور ہر دن شام سے براق پر آ کر دیکھ جاتے، ہاجرہ سے کمال دل چسپی اور اس کے فراق پر قلتِ صبر کی وجہ سے۔[1]

پھر اللہ تعالیٰ کی جناب میں عرض کی کہ اے رب! میں نے اپنی ذریت اس وادی پر، جو کہ کسی آرام دہ چیز اور کھانے پینے کی چیز سے خالی ہے، ساکن کی ہے، اس لیے کہ اس جگہ نماز پڑھا کریں اور تیری طرف متوجہ رہیں اور اس گھر سے برکت حاصل کریں۔ تمام عبادات میں سے صرف نماز کا ذکر کیا، اس لیے کہ اس عبادت کو زیادہ فضیلت حاصل ہے اور شاید دعا کی تکرار اور توسیط اس عبادت کے ساتھ اپنی عنایت کاملہ کا اظہار کرنے کے لیے تھی اور اس میں اس امر کو ظاہر کیا گیا تھا کہ یہی عبادت ان کے اس جگہ آباد کرنے کا مقصد ہے اور دعا کا مقصد یہ ہے کہ ان کو نماز قائم کرنے کی توفیق عطا ہو۔ ''فؤاد'' کے معنی ہیں دل۔ جمیع بدن کی تعبیر دل سے کی، اس لیے کہ یہ تمام اعضا سے زیادہ اشرف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ﴿ اَفْـِٕدَةً ﴾ جمع ہے ''وفد'' کی، جو اصل میں اوفدہ تھا۔

بالجملہ اس میں مومنوں کے لیے دعا ہے کہ ان کو اس گھر کا حج نصیب ہو اور ساکنینِ مکہ کے لیے جو ان کی اولاد ہے، وہ ان آفاقیوں سے فائدہ اٹھائے جو خانہ کعبہ کی زیارت کے لیے آئیں۔ اس دعا نے خیرِ دارین کو جمع کر لیا اور اس کی برکت عام اور مکمل ہوئی۔ پھر یہ دعا کی کہ ان کو میوے اور پھل دے، جس طرح کہ ان لوگوں کو ملتے ہیں، جو ان بستیوں میں رہتے ہیں، جہاں پانی اور کھیتی ہوتی ہے۔ اس سے مراد ان دیہات کی آبادی ہے جو مکہ کے ارد گرد ہیں، تاکہ وہاں کے پھل اور میوے ان کے لیے آئیں۔ یا مراد ہر طرف سے پھل وغیرہ مکہ مکرمہ کی طرف تجارت و نقل مکانی کے لیے کھنچے چلے آئیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق: ﴿ يُجْبٰۤى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ [القصص: ۵۷] ''جس کی طرف ہر قسم کے پھل ہماری طرف سے بطور رزق کھنچ کر لائے جاتے ہیں۔'' اور یہی زیادہ مناسب ہے۔ شاید لوگ تیری اس نعمتِ فراواں اور رحمتِ شایاں اور انعام نمایاں کا شکر بجا لائیں۔

محمد بن اسلم رحمہ اللہ کہتے کہ ابراہیم علیہ السلام نے جب حرم کے لیے یہ دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ نے طائف کو فلسطین سے اس

[1] تاریخ دمشق (۶۹/ ۱۸۷۔ ۱۸۸) اس کی سند میں ''محمد بن عمر واقدی'' سخت ضعیف راوی ہے۔

جگہ منتقل کر دیا۔ امام زہری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے سبب شام کی بستیوں میں سے ایک بستی کو منتقل فرما کر طائف میں رکھ دیا۔[1] رہی دلوں کے میلان کی دعا سو جرہم قبیلے کی وجہ سے حاصل ہوئی اور ہمیشہ ہر سال آخر زمانے تک حاجی اور عمرہ کرنے والے اس بابرکت گھر کا طواف کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔[2]

رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ ؕ وَمَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ۝۳۸ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَآءِ ۝۳۹ رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۖۗ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ ۝۴۰ رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ۝۴۱

اے ہمارے رب! بے شک تو سب جانتا ہے جو کچھ ہم چھپاتے اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں۔ اور زمین اور آسمان میں کوئی چیز اللہ سے مخفی نہیں (38) تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق عطا فرمائے، بے شک میرا رب دعا خوب سننے والا ہے (39) اے میرے رب! مجھے اور میری اولاد کو بھی نماز قائم کرنے والا بنا۔ اے ہمارے رب! اور تو میری دعا قبول فرما (40) اے ہمارے رب! جس دن حساب قائم ہوگا اس دن مجھے، میرے والدین کو اور تمام مومنوں کو معاف فرمانا (41)

اللہ تعالیٰ تمام ظاہر اور پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے:

ظاہر میں سب اولاد کے لیے دعا کی اور دل میں پیغمبر آخر الزمان کے لیے منظور تھی۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے خلیل ابراہیم علیہ السلام کے حال کی خبر دیتا ہے کہ انھوں نے کہا کہ اے رب! تجھ کو اس دعا سے میرا مقصد معلوم ہے کہ میں نے جو اس شہر والوں کے لیے دعا کی ہے، اس سے کیا مراد ہے، وہ میرا مقصد یہی تیری رضا اور تیرے لیے اخلاص ہے، کیوں کہ تو جملہ ظاہر اور پوشیدہ باتوں کا عالم ہے۔ تجھ پر زمین و آسمان میں کوئی شے مخفی نہیں ہے۔ پھر اللہ کی حمد اس بات پر کی کہ بڑھاپے میں اولاد دی اور میری دعا سن لی۔ پھر نماز کی اقامت اور محافظت کی دعا کی، تمام حدود و ارکان کے ساتھ اور اس دعا میں بعض اولاد کو بھی شامل کر لیا اور اپنی اور والدین کی مغفرت چاہی۔ یہ درخواست باپ سے بے زاری سے پہلے تھی اور بے زار اس وقت ہوئے جب جان لیا کہ وہ اللہ عزوجل کا دشمن ہے۔

[1] تفسير ابن أبي حاتم (۷/ ۲۲٤۹) [2] فتح البيان (۷/ ۱۲۳۔ ۱۲٦)

پھر قیامت تک کے ایمان داروں کے لیے دعا کی، کیوں کہ حساب کے لیے ہر خیر و شر کو جزا اور سزا ملے گی۔[1] معلوم ہوا کہ معاد کا مسئلہ اہلِ اسلام کا پرانا اعتقاد ہے۔ وللہ الحمد.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ قرآنی نظم کا ظاہری انداز ہر قسم کی ظاہر اور پوشیدہ بات کو کسی معین چیز کے لیے بغیر کسی قید کے ظاہر کرتا ہے۔ لہٰذا جمع کی ضمیر لائے، تاکہ سارے بندے داخل رہیں۔ یہ قول کہ اللہ پر زمین و آسمان کی کوئی چیز مخفی نہیں ہے، جمہور مفسرین کے نزدیک اللہ کا قول ہے جو ابراہیم علیہ السلام کے قول کی تصدیق کے لیے ہے۔ زمین و آسمان کا ذکر اس لیے کیا کہ بندے اسی کو دیکھتے ہیں، ورنہ اللہ کا علم تو ہر اُس شے کو داخل ہے جو عالم میں داخل ہے یا خارج۔ اُس پر کوئی چیز مخفی نہیں ہے اور احتمال ہے کہ قولِ اول کو مزید پختہ اور محقق کرنے کے لیے یہ قول ابراہیم علیہ السلام کا ہو، تاکہ پہلے جو اس کو مخصوص رکھا تھا، وہ عام ہو جائے۔ پھر اپنی اور اپنی بیوی کی کبر سنی کے باوجود اسماعیل علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام کی عطا پر اللہ کا شکر ادا کیا۔ اسماعیل علیہ السلام ۹۹ سال میں پیدا ہوئے اور اسحاق علیہ السلام ۱۱۲ سال کی عمر میں پیدا ہوئے۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا کہ ایک سو سترہ ۱۱۷ برس کی عمر میں ابراہیم علیہ السلام کو بیٹا عطا ہونے کی بشارت دی گئی،[2] اس عمر اور سال میں اولاد کا ہونا، ایک بڑی نعمت و احسان ہے، کیوں کہ یہ سال نا اُمیدی کا سال ہے۔ لہٰذا اس احسان پر اللہ کی حمد ادا کی۔

یہ بات ابراہیم علیہ السلام نے دوسرے وقت میں کہی تھی نہ کہ مذکورہ دعا کے بعد۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا کہ دعا اور حمد کا زمانہ مختلف تھا، کیوں کہ دعا اسماعیل علیہ السلام کے زمانۂ طفولیت میں تھی، اس وقت اسحق علیہ السلام نہ تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ سے اپنا اور بعض ذریت کا نماز پر قائم رہنا اور دعا کا قبول ہونا مانگا اور اپنی اور والدین اور مومنوں کی بخشش طلب کی، یہ دعا اپنے ماں باپ کے کفر کے علم ہونے سے پہلے کی تھی یا بشرطِ اسلام تھی۔ بعض نے کہا کہ ان کی ماں مسلمان تھی، لیکن پہلی بات زیادہ مناسب ہے۔ یا والدین سے مراد آدم و حوا ہیں، لیکن اس میں بُعد ہے اور قراءت "وَلِوَلَدَيَّ" شاذ ہے، یعنی اسماعیل علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام مگر جحدری رحمہ اللہ نے اس قراءت کا انکار کیا ہے۔ اس لیے کہ مصحف میں "وَلِأَبَوَيَّ" آیا ہے۔

مومن سے مراد ہر ایمان دار ہے، خواہ ذریت میں ہو یا نہ ہو، فقط اپنی ذریت کے مومنین مراد ہیں، لیکن پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے خلیل کی دعا کو رد نہ کرے گا، اس میں جمیع مومنین اور مومنات کے لیے مغفرت کی ایک عظیم بشارت ہے۔ اللّٰهم اغفرلي مغفرة ظاهرة وباطنة لا تغادر ذنبا وإني من ذرية خليلك الجليل وذرية ابن خليلك إسماعيل فاغفرلي ولمن أخلفه من المؤمنين إن ربي لسميع الدعآء.[3]

---

[1] تفسیر الطبري (۱۷/ ۲۷_ ۲۸) [2] تفسیر الطبري (۱۷/ ۲۷) [3] فتح البیان (۷/ ۱۲۷_ ۱۲۹)

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۬ؕ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُۙ ﴿۴۲﴾ مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ ؕ﴿۴۳﴾

اور (اے نبی!) آپ مت خیال کریں کہ اللہ ان کاموں سے غافل ہے جو ظالم کرتے ہیں، وہ تو انھیں صرف اس دن تک مہلت دیتا ہے جس میں آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی (42) وہ اپنے سر اُٹھائے (محشر کی طرف) دوڑ رہے ہوں گے، ان کی نگاہ اپنی طرف بھی نہ پھر سکے گی، اور ان کے دل خالی ہوں گے (43)

کافروں کو ملنے والی مہلت میں حکمت:

قیامت کے دن آسمان کے دروازے کھول کر فرشتے اترنے لگیں گے اور لوگوں کو عذاب کرنے لگیں گے، اس ہول اور ڈر سے سب کی آنکھیں اوپر لگ جائیں گی اور نیچے دیکھنے کی فرصت نہ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو خطاب کیا کہ تم یہ نہ سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے جو ان ظالموں کو مہلت اور مدت اور فرصت دی ہے سو اللہ تعالیٰ ان سے غافل ہے اور ان کو یوں ہی چھوڑ رکھا ہے اور ان کو ان کے کرتوتوں پر عذاب نہیں کرتا، بلکہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال گنتا جاتا ہے، ان کو فقط اس دن تک کے لیے ڈھیل دے رکھی ہے جس دن کہ قیامت کی ہولناکی سے ان کی آنکھیں آسمان کی طرف لگ جائیں گی۔

پھر قبروں سے ان کے اُٹھنے کا اور محشر کی طرف جلدی کرنے کا ذکر کیا کہ یہ جلدی کریں گے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ مُّهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ ﴾ [القمر: ۸] ''درآں حالیکہ وہ بلانے والے کی طرف دوڑ رہے ہوں گے۔'' اور فرمایا: ﴿ يَوْمَئِذٍ يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهٗ ۚ وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ﴿۱۰۸﴾ يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا ﴿۱۰۹﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ﴿۱۱۰﴾ وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ ؕ وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ﴾ [طٰهٰ: ۱۰۸۔ ۱۱۱] ''اس دن سب لوگ پکارنے والے کے پیچھے چلیں گے، اس (کی اتباع) سے کوئی کجی نہیں ہوگی اور سب آوازیں رحمان کے سامنے پست ہو جائیں گی، پھر آپ آہٹ (اور خفی آواز) کے سوا کچھ نہ سنیں گے۔ اس دن سفارش کوئی نفع نہ دے گی، مگر صرف اس کی جسے رحمان اجازت دے گا اور اس کی بات پسند کرے گا۔ جو کچھ ان کے آگے اور ان کے پیچھے ہے، اسے اللہ ہی جانتا ہے، اور وہ (لوگ) اپنے علم سے اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ اور سب چہرے حَی قیوم (اللہ) کے آگے جھک جائیں گے اور یقیناً وہ ناکام ہوا جس نے ظلم (شرک) کا بوجھ اُٹھایا۔'' نیز فرمایا: ﴿ يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ مِنَ

الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ يُّوْفِضُوْنَ ﴾ [المعارج: ۴۳] ’’جس دن وہ قبروں سے دوڑتے نکلیں گے، جیسے وہ آستانوں کی طرف دوڑ رہے ہوں۔‘‘

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد رحمہ اللہ غیر واحد نے کہا کہ اقناع رؤس سے مراد سروں کو اٹھانا ہے، یعنی اپنے سر اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔[1] ان کی آنکھیں لگی ہوں گی، ایک لحظہ نہ جھپکیں گے، بلکہ اڑتی ہوئی ایک طرف ٹکٹکی باندھے ہوئے ہوں گی۔ ہول، ڈر، فکر، دہشت اور خوف کی وجہ سے پلک نہ جھپکیں گی۔ یہ ڈر اور خوف اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب اور سزا نظر آنے سے پیدا ہوگا۔ عیاذا باللّٰہ۔ لہٰذا فرمایا ہے کہ ان کے دل خالی ہوں گے، انتہائی خوف و دہشت کی وجہ سے ان میں کچھ نہ ہوگا۔

امام قتادہ رحمہ اللہ اور ایک جماعت نے کہا ہے کہ ان کے دلوں کی جگہ خالی ہوگی، اس لیے کہ دل گلوں میں آ گئے ہوں گے اور خوف کی وجہ سے اپنی جگہ سے سرک گئے ہوں گے۔[2] بعض نے کہا کہ دل ویران ہوں گے، ان کو کچھ یاد نہ ہوگا، اس حال کی شدت کی وجہ سے جس کی خبر اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یہ خطاب نبی مکرم ﷺ کو ہے اور اشارہ اُمت کو۔ گویا یوں کہا کہ اے محمد! تو، یعنی تیری اُمت یہ گمان نہ کرے کہ اللہ تعالیٰ ظالموں کے اعمال سے غافل ہے۔ یا یہ خطاب ہے بغیر اُمت کا نام لیے ہوئے مکلفین میں سے ہر صالح خطاب کو، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴾ [القصص: ۸۷] ’’اور مشرکوں میں سے ہرگز نہ ہوں۔‘‘ یا مراد یہ ہے کہ تو خیال نہ کر کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ غافل کا سا معاملہ کرے گا کہ ان کے عمل سے غفلت میں رہے۔ لیکن معاملہ رقیب کا سا کرے گا کہ ان کے عمل کا نگہبان ہے، یا گمان کرنے کی نہی سے، اس امر کا اظہار ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے تمام کاموں کا عالم ہے، اس پر کوئی شے مخفی نہیں ہے۔ میمون بن مہران رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت مظلوم کے لیے تعزیت (اظہارِ ہمدردی) اور ظالم کے لیے وعید ہے۔[3] سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔[4]

غفلت اس بات سے مانع نہیں ہے کہ انسان کو معاملات کی حقیقت سے واقفیت نہیں ہے۔ غفلت کی حقیقت سہو (بھول جانا) ہے، جو کہ انسان کو قلتِ تحفظ و تیقظ سے پیش آتا ہے۔ اس میں نبی مکرم ﷺ کو تسلی ہے اور مشرکین کو اس بات کی اطلاع ہے کہ ان سے عذاب کی تاخیر کچھ اس لیے نہیں کہ ان کے اعمال پسندیدہ ہیں، بلکہ اللہ کی عادت یہی ہے کہ وہ گناہ گاروں کو ڈھیل دیتا ہے اور باوجود ان کے ظلم کے ان کی جزا و سزا و گرفتاری میں تاخیر کرتا

---

[1] تفسير الطبري (۱۷/ ۳۱۔ ۳۲)
[2] تفسير ابن كثير (۲/ ۷۰۵)
[3] تفسير الطبري (۱۷/ ۲۸۔ ۲۹)
[4] تفسير الخازن (٤/ ٥١)

ہے، اس دن تک کہ جس میں آنکھیں اپنی جگہوں پر نہ ٹھہریں گی۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا کہ اہلِ موقف (میدانِ حشر میں کھڑے ہونے والوں) کی آنکھیں اس دن ڈر کی وجہ سے پلک نہ جھپکیں گی۔[1]

شخوصِ بصر کہتے ہیں حدتِ نظر کو اور نظر کے اپنی جگہ استقرار نہ کرنے کو۔ مراد یہ ہے کہ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔ شدتِ حیرت اور کثرتِ وحشت سے جنبش نہ کریں گی۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: "شخصت فيه والله أبصار هم فلا ترتد إليهم"[2] بعض نے کہا کہ اس جگہ اَل عہد کے واسطے ہے، لیکن اس کو خوف کی عمومی حالت پر محمول کرنا زیادہ درست ہے اور بار بار دھرانے سے بہتر ہے۔

﴿ مُهْطِعِيْنَ ﴾ بہ معنی "مسرعين" ہے، یعنی داعی کی طرف جلدی کریں گے۔ جمل میں ہے کہ اسرافیل علیہ السلام مراد ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ پکارنے والے جبریل علیہ السلام اور پھونکنے والے اسرافیل علیہ السلام ہیں۔ امام شہاب رحمہ اللہ نے کہا کہ یہی زیادہ صحیح ہے۔ آثار اسی پر دلالت کرتے ہیں۔ اقناع کہتے ہیں سر اٹھانے کو، یعنی آسمان کی طرف سر اٹھائے دیکھ رہے ہوں گے۔ گھبراہٹ اور خواری کی وجہ سے کوئی کسی کی طرف نظر نہ کرے گا۔ بعض نے کہا کہ اقناع سرنگوں ہونا ہے۔ ذلت اور عاجزی سے آیت دونوں معنوں کو محتمل ہے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا کہ پہلا قول زیادہ مشہور ہے لغت میں۔[3] ان کی نگاہ شدتِ خوف سے ان کی طرف نہ پھرے گی۔ "طرف" کے اصل معنی پلکوں کے حرکت کرنے کے ہیں، پھر آنکھ کو کہنے لگے، اس لیے کہ پلکیں آنکھ ہی میں ہوتی ہیں اور دل ان کے اُڑ گئے ہوں گے۔

﴿ هَوَآءٌ ﴾ خالی پیٹ کو کہتے ہیں، جس کو کوئی جسم مشغول نہ رکھے۔ مطلب یہ کہ گھبراہٹ، حیرت اور دہشت کو دیکھ لینے کی وجہ سیان کے دل عقل وفہم سے خالی ہوں گے۔ مبالغے کے طور پر خود دلوں کو ﴿ هَوَآءٌ ﴾ ٹھہرایا۔ اسی جگہ سے احمق اور بزدل کو کہتے ہیں کہ اس کا دل ہوا ہے، یعنی اس میں نہ رائے ہے نہ قوت، یعنی ﴿ هَوَآءٌ ﴾ بہ معنی تردد ہے۔ بعضوں نے کہا کہ کافروں کے دل دنیا میں خیر سے خالی ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یعنی ویرانے کی طرح ہیں۔ مرہ رحمہ اللہ نے کہا کہ یعنی منخرق ہیں کوئی چیز یاد نہیں رکھتے۔[4] حاصل یہ ہوا کہ اس دن قیامت کی ہولناکی اور شدت کی وجہ سے دل اپنی جگہوں سے ہلے ہوئے، آنکھیں ٹکٹکی باندے ہوئے اور سر آسمان کی طرف اُٹھے ہوئے ہوں گے۔[5]

وَاَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ
ظَلَمُوْا رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ
الرُّسُلَ ۭ اَوَلَمْ تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ۝44

---

[1] تفسير القرطبي (٩/ ٣٧٦) [2] تفسير الطبري (١٧/ ٢٩) [3] تفسير القرطبي (٩/ ٣٧٧)
[4] تفسير الطبري (١٧/ ٣٣) [5] فتح البيان (٧/ ١٣٠ـ ١٣٢)

وَّ سَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَ تَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَ ضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ۝۴۵ وَ قَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَ عِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ؕ وَ اِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ۝۴۶

اور (اے نبی!) لوگوں کو اس دن سے ڈرائیں جب انھیں عذاب آ لے گا تو ظالم کہیں گے: اے ہمارے رب! ہمیں تھوڑی مدت تک مہلت دے (تاکہ) ہم تیری دعوت قبول کریں اور رسولوں کی اتباع کریں۔ (ان سے کہا جائے گا:) کیا تم اس سے پہلے قسمیں نہیں کھاتے تھے کہ تمھارے لیے کوئی زوال نہیں؟ 44 اور تم ان لوگوں کے رہنے کی جگہوں میں آباد تھے، جنھوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا تھا اور تم پر واضح ہو چکا تھا کہ ہم نے ان سے کیا سلوک کیا تھا، اور ہم نے تمھارے لیے مثالیں بیان کی تھیں 45 اور یقیناً وہ اپنی چالیں چل چکے اور ان کی سب چالیں اللہ کے پاس ہیں اور ان کی چالیں ایسی نہ تھیں کہ ان کی وجہ سے پہاڑ ٹل جاتے 46

عذاب دیکھ کر ظالموں کی مہلت کی استدعا قبول نہ ہوگی:

مکے کے لوگوں نے کئی تدبیریں ٹھہرائی تھیں۔ نبی اکرم ﷺ کو سب مل کر قتل کریں، یا آپس سے نکال دیں، اسی کو فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ ظالم عذاب کو دیکھ کر کہیں گے کہ اے رب! ہم کو مہلت دے کہ ہم تیری دعوت قبول کریں، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴾ [المؤمنون: ۹۹] ”حتی کہ جب ان میں سے کسی کو موت آئے گی تو وہ کہے گا: اے میرے رب! مجھے واپس بھیج۔“ نیز فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴾ [المنفقون: ۹] ”اے ایمان والو! تمھارے مال اور تمھاری اولادیں تمھیں اللہ کے ذکر سے غافل نہ کر دیں اور جو کوئی یہ کام کرے تو وہی لوگ خسارہ پانے والے ہیں۔“

نیز فرمایا: ﴿ وَ لَوْ تَرٰۤى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ رَبَّنَاۤ اَبْصَرْنَا وَ سَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ﴾ [السجدۃ: ۱۲] ”کاش! آپ دیکھیں جب مجرم اپنے رب کے حضور سر جھکائے (پیش) ہوں گے، (وہ کہیں گے:) اے ہمارے رب! ہم نے دیکھ لیا اور ہم نے سن لیا، لہٰذا ہمیں واپس بھیج کہ ہم نیک عمل کریں، بے شک ہم یقین کرنے والے ہیں۔“ نیز فرمایا: ﴿ وَ لَوْ تَرٰۤى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَ لَا نُكَذِّبَ

بِاٰيٰتِ رَبِّنَا ﴾ [الأنعام: ٢٧] ''اور اگر آپ انھیں اس وقت دیکھیں جب وہ آتش پر کھڑے کیے جائیں گے تو وہ کہیں گے: کاش! ایک بار ہمیں دنیا میں واپس بھیج دیا جائے اور ہم اپنے رب کی آیات کو ہرگز نہ جھٹلائیں گے۔'' نیز فرمایا:
﴿ وَهُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا ﴾ [الفاطر: ٣٧] ''اور وہ اس (جہنم) میں چلائیں گے۔''

اس جگہ کہا کہ کیا تم یہ قسم نہ کھاتے تھے کہ تم کو اس حال سے، جس میں تم ہو، تم کو کچھ زوال نہ ہوگا اور نہ معاد ہے، نہ جزا، اب تم اس عذاب کا مزہ چکھو۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ زوال سے مراد دنیا سے آخرت کی طرف انتقال ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ ﴾ [النحل: ٣٨] ''اور وہ اللہ کی پختہ قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ جو مر جاتا ہے اللہ اسے دوبارہ نہیں اُٹھائے گا۔''[1] نیز فرمایا تم دیکھ سن چکے ہو جھٹلانے والی اُمتوں کا حال، جو تم سے پہلے تھے، اس کے باوجود تمھیں کچھ عبرت نہیں ہوئی اور جو بلا ان پر آئی تھی، اس سے تم کو کچھ افسوس نہ ہوا۔ ﴿ حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ﴾ [القمر: ٥] ''کمال کو پہنچی ہوئی حکمت، پھر (بھی) تنبیہات فائدہ نہیں دیتیں۔''

سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے ﴿ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ جس شخص نے ابراہیم علیہ السلام سے رب کے بارے میں حجت کی تھی، اس نے دو چھوٹے چھوٹے کرگس لے کر پالے، جب بڑے ہوگئے اور جوان ہوئے تو ہر ایک کا ایک پاؤں تابوت میں میخ سے باندھا اور ان کو بھوکا رکھا اور خود ایک اور شخص کے ساتھ دوسرے تابوت میں بیٹھا اور تابوت میں ایک عصا کھڑا کیا، اس عصا کے سر پر گوشت رکھا، وہ دونوں اڑے، اس نے اپنے ساتھی سے کہا: دیکھ تجھے کیا نظر آتا ہے؟ اُس نے کہا: یہ یہ چیزیں دیکھ رہا ہوں یہاں تک کہ اس نے کہا: مجھے ساری دنیا نظر آتی ہے، گویا مکھیاں ہیں۔ تب عصا کو نیچے جھکا لیا اور زمین پر اترا یہ اس اللہ عزوجل کا فرمان ہے: ﴿ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ﴾ (آیتِ باب) سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت بھی اسی طرح ہے۔ سیدنا ابی بن کعب اور سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما نے بھی ''اِنْ كَادَ مَكْرُهُمْ'' پڑھا ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔[2]

امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا کہ قصے کا سیاق نمرود کے لیے ہے۔ یہ کنعان کا بادشاہ تھا، اس نے آسمان کے اسباب کا ارادہ اس حیلے سے کیا، جس طرح کہ فرعون نے اس کے بعد فلک بوس محل بنوانے میں کیا تھا، لیکن یہ دونوں عاجز اور ضعیف رہے اور ذلت و خواری، پستی و تنزل کے ساتھ حقیر و ذلیل ہوئے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے یہ قصہ بخت نصر سے نقل کیا ہے کہ جب اس کی نظر زمین سے منقطع ہوگئی تو یہ ندا کی گئی کہ اے سرکش تو کہاں کا ارادہ کرتا ہے؟ تب وہ ڈر گیا، پھر اپنے اوپر سے ایک آواز سنی تب نیزے کو نیچے جھکایا اور کرگس زمین کی طرف اُترنے لگے، ان کی آواز سے

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٣٦۔ ٣٧)
[2] تفسير الطبري (١٧/ ٣٩۔ ٤٠) تفسير ابن كثير (٢/ ٧٠٦)

پہاڑ گھبرائے اور قریب تھا کہ اُن کرگسوں کی حس سے پہاڑ اپنی جگہ سے سرک جائیں۔ یہی اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ﴾ (آیتِ باب)۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ انھوں نے یہ کام کفر و شرک کے سبب سے کیا، اس سے پہاڑوں کو کچھ نقصان نہیں ہوا، بلکہ سارے کا سارا وبال خود انھیں پر پڑا۔ اسی سے مشابہ یہ آیت ہے: ﴿ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ٣٧] ''اور زمین پر اکڑ کر مت چل، بلاشبہہ تو نہ تو کبھی زمین پھاڑ سکتا ہے اور نہ کبھی لمبائی میں پہاڑوں تک پہنچ سکتا ہے۔'' دوسرا قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ ہے کہ اس مکر سے مراد شرک ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴾ [مریم: ٩٠] ''قریب ہیں کہ آسمان اس (بات) سے پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے، اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر گر پڑیں۔'' امام ضحاک اور قتادہ رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کیا کہ تم لوگوں کو عموماً ڈرا دو، یا مراد کفارِ مکہ ہیں، یا عام کافر، لیکن پہلی بات زیادہ بہتر ہے، کیوں کہ ڈرانا جس طرح کافر کے لیے ہوتا ہے، اسی طرح مسلمان کے لیے بھی ہے اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ ﴾ [یٰسٓ: ١١] ''بس آپ تو صرف اس شخص کو ڈراتے ہیں جو نصیحت کی پیروی کرے۔'' عذاب کے دن سے مراد قیامت کا دن ہے، اس جگہ عذاب کے ذکر پر اکتفا کیا، حالاں کہ اس دن ثواب بھی ہوگا۔ یہ اس لیے کہ یہ تہدید کا مقام ہے، یا مراد اُن کے مرنے کا دن ہے، کیوں کہ عذاب کی آمد کے اوقات کا وہ سب سے پہلا وقت ہے، یا ان کے عذاب عاجل سے ہلاک ہونے کا دن مراد ہے۔

اُس دن جن لوگوں نے دنیا میں اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، یہ بات کہیں گے: اے رب! ہم کو ایک ذرا سی مدت کے لیے مہلت دے کہ ہم تیری دعوتِ توحید کو قبول کریں اور تیرے رسولوں کی پیروی کریں۔ یہ گویا دنیا میں واپس جانے کا سوال ہے، جب کہ آخرت میں ان پر حق ظاہر ہو جائے گا۔ ﴿ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ ﴾ [الأنعام: ٢٨] ''اور اگر انھیں واپس (دنیا میں) بھیج دیا جائے تو بھی وہ وہی کام کریں گے جن سے انھیں روکا گیا تھا۔''

اللہ تعالیٰ نے اس سوال کے جواب میں فرمایا کہ تم نے کیا اس سے پہلے قسم نہ کھائی تھی کہ تم کو کچھ زوال نہ ہوگا اور تم موت کے بعد مبعوث نہ ہوگے۔ بعض نے کہا ہے کہ حقیقتاً انھوں نے یہ قسم نہ کھائی تھی، بلکہ زبانِ حال ان کے ساتھ یہی بات کہہ رہی تھی۔ اس لیے کہ وہ شہوات اور دنیا داری اور دوستیوں میں مستغرق تھے۔ بعض نے کہا کہ یہ قسم ہے جو دوسری آیت میں آئی ہے: ﴿ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ ﴾ [النحل: ٣٨]

---

[1] تفسیر الطبري (١٧/ ٤١۔ ٤٣) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٧٠٦)

"اور وہ اللہ کی پختہ قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ جو مر جاتا ہے اللہ اسے دوبارہ نہیں اُٹھائے گا۔" اور ظالموں کے مسکن سے مراد بلادِ ثمود اور اس جیسے دوسرے شہر ہیں۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا کہ یعنی تم نے کفار کے سے عمل کیے۔[1]

ان کے آثار کے مشاہدے اور متواتر خبروں سے یہ بات ظاہر ہو چکی ہے کہ ہم نے ان کفار اقوام کے ساتھ کیا کیا اور ان کے گناہوں کی وجہ سے کس طرح کی سخت سزا ان پر نازل کی اور تمھارے لیے مثالیں بیان کیں کہ تم سوچو سمجھو اور عبرت پکڑو۔ انھوں نے حق کی تردید اور باطل کو قائم رکھنے کے لیے ایک بڑا مکر کیا تھا۔ یا مراد کفارِ قریش ہیں کہ انھوں نے نبی مکرم ﷺ کے ساتھ مکر کیا اور چاہا کہ ان کو قتل کر ڈالیں، جس طرح کہ سورت انفال میں گزر چکا ہے، لیکن پہلی بات زیادہ مناسب ہے۔

سو ان کا یہ مکر اللہ کے پاس لکھا ہوا ہے، وہ اس مکر کی جزا ان کو دے گا۔ بعض نے کہا کہ یہ مکار نمرود تھا، اس نے آسمان پر چڑھنے کا قصد کیا تھا اور ایک تابوت بنایا، اس کے پاؤں سے چار کرگس باندھے کہ وہ اس کو لے کر آسمان کی طرف اڑیں۔ اس کو سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ سے مطولاً ذکر کیا ہے اور اسی طرح کا قصہ بختِ نصر سے بھی مروی ہے، لیکن بعض اہلِ علم نے اس کو بعید سمجھا ہے اور کہا ہے کہ اس میں ایک خطرِ عظیم ہے۔ عقل مند کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ ایسے امرِ عظیم پر اقدام کرے اور اس بارے میں کوئی خبر صحیح قابلِ اعتماد نہیں آئی ہے اور نہ ہی اس قصے کو اس آیت کے ساتھ کوئی مناسبت ہے۔ زوالِ جبال کو ان کے مکر کی شدت اور عظمت کی مثال کے طور پر بیان فرمایا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ یعنی ان کا مکر فریب دہی میں یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ پہاڑ کو اس کی جگہ سے زائل کر دے، لیکن اللہ تعالیٰ اپنے دین کا ناصر ہے۔[2] بعض نے کہا کہ مراد یہ ہے کہ ان کے مکر سے پہاڑ کا دور ہونا ایک امرِ محال ہے۔[3]

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ؕ﴿۴۷﴾ یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَ السَّمٰوٰتُ وَ بَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۴۸﴾

چناں چہ آپ ہرگز خیال نہ کریں کہ اللہ اپنے رسولوں سے وعدہ خلافی کرے گا۔ بے شک اللہ غالب ہے، انتقام لینے والا (47) جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی، اور آسمان بھی، اور لوگ اللہ، واحد، قہر والے کے سامنے (پیش) ہوں گے (48)

اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا:

اللہ نے اپنے وعدہ کو پختہ کیا اور تاکید فرمائی اور کہا کہ یہ خیال نہ کرنا کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کی اس دنیا

---

[1] الدر المنثور (٥/ ٥٢) [2] معاني القرآن (٣/ ١٦٧) [3] فتح البیان (٧/ ١٣٢۔ ١٣٥)

میں نصرت کا اور آخرت کی بابت کیا گیا وعدہ پورا نہ کرے گا، وہ تو کبھی وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔ وہ صاحبِ عزت اور غلبہ والا ہے، اس پر کوئی مشکل نہیں ہے۔ جو اس کے کافر اور منکر ہیں وہ ان سے بدلہ لیتا ہے۔ اس دن جھٹلانے والوں کی خرابی ہے۔ لہٰذا فرمایا کہ یہ وعدہ اس دن پورا ہوگا جس دن کہ اور ہی آسمان اور زمین ہوں گے اور زمین کسی اور ہی طرح کی ہو جائے گی، جو کہ غیر مالوف اور غیر معروف ہوگی۔ جس طرح صحیحین میں مروی ہے کہ سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے: «يُحْشَرُ النَّاسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلىٰ أَرْضٍ بَيْضَاءَ عَفْرَاءَ كَقُرْصَةِ النَّقِيِّ لَيْسَ فِيهَا مَعْلَمٌ لِأَحَدٍ »[1] [قیامت کے دن لوگوں کو ایک ایسی زمین میں اکٹھا کیا جائے گا جو سفیدہ سرخی مائل صاف گول روٹی کی طرح ہوگی اور اس میں کسی کے لیے کوئی نشان نہ ہوگا (بالکل ہموار ہوگی)]

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ سب سے پہلے میں نے نبی مکرم ﷺ سے اس آیت کے بارے میں سوال کیا تھا اور کہا کہ جب آسمان و زمین بدل دیے جائیں گے تو اس دن لوگ کہاں ہوں گے اے اللہ کے رسول؟! آپ ﷺ نے فرمایا کہ "صراط پر۔"[2] (رواه مسلم متفرداً به دون البخاري والترمذي وابن ماجه وقال الترمذي: حسن صحيح)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! لوگ اس دن کہاں ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تو نے مجھ سے وہ چیز پوچھی ہے جو میری اُمت میں سے کسی نے نہیں پوچھی۔ اس دن لوگ جہنم کے پل پر ہوں گے۔[3] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے تیسرے الفاظ یہ ہیں کہ انھوں نے نبی اکرم ﷺ سے اس آیت کا سوال کیا: ﴿ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ﴾ [الزمر: ٦٧] "اور قیامت کے دن ساری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان بھی اس کے دائیں ہاتھ میں لپٹے ہوں گے۔" اور کہا: لوگ اس دن کہاں ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ پشتِ جہنم پر ہوں گے۔[4] (رواه أحمد) اس حدیث کے چوتھے الفاظ یہ ہیں کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: "أين الناس يومئذ؟" [اس دن لوگ کہاں ہوں گے؟] آپ ﷺ نے فرمایا: یہ ایسی شے ہے کہ کسی نے مجھ سے نہیں پوچھی، وہ صراط پر ہوں گے اے عائشہ![5] (رواه ابن جرير و أحمد)

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٥٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٩٠)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٩١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٢١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٧٩)

[3] تفسير الطبري (١٧/ ٥١) اس کی سند میں "ولید بن مسلم" مدلس راوی ہے اور عنعنہ کے ساتھ بیان کر رہا ہے۔ نیز "سعید بن بشیر" ضعیف راوی ہے۔

[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٤١) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤٤٧) مسند أحمد (٦/ ١١٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٥٦١) نیز اس میں "متن: پشت" کے بجائے "جسر: پل" کے الفاظ ہیں، نیز حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے "تفسير ابن كثير" (٢/ ٧٠٧) میں "متن" کے الفاظ ذکر کیے ہیں۔

[5] تفسير الطبري (١٧/ ٥١) مسند أحمد (٦/ ١٠١) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ حسن بصری رحمہ اللہ کا سماع سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ثابت نہیں ہے۔

سیدنا ثوبان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھڑا تھا کہ اتنے میں یہود کا ایک عالم آیا اور اس نے کہا: ’’السلام عليك يا محمد‘‘ میں نے ایک ایسا دھکا دیا کہ قریب تھا کہ وہ پچھڑ جائے، اُس نے کہا: مجھے تو کیوں دھکیلتا ہے؟ میں نے کہا تو رسول اللہ نہیں کہتا۔ یہودی نے کہا کہ میں نے ان کو اسی نام سے پکارا ہے جو ان کے گھر والوں نے رکھا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرا نام محمد ہے، جو میرے گھر والوں نے رکھا ہے۔ یہودی نے کہا کہ میں کچھ پوچھنے آیا ہوں۔ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تجھے کچھ فائدہ ہوگا، اگر میں کچھ بات کہوں؟ اس نے کہا کہ میں کان رکھ کر سنوں گا۔ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ایک لکڑی تھی، اُس سے زمین کریدنے لگے اور فرمایا: پوچھ! اُس نے کہا کہ اس دن لوگ کہاں ہوں گے جس دن آسمان و زمین بدل دیے جائیں گے؟ فرمایا کہ تاریکی سے بھرے پُل میں۔ سب سے پہلے کون پار ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فقرا و مہاجرین۔ کہا کہ ان کا تحفہ کیا ہوگا، جب وہ جنت میں جائیں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مچھلی کی کلیجی۔ کہا کہ اس کے بعد ان کی غذا کیا ہوگی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت کا ایک بیل، جو اس کے اطراف میں چرتا ہوگا، وہ ان کے لیے ذبح کیا جائے گا۔ کہا کہ اس پر کیا پئیں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سلسبیل کے چشمے سے۔ اُس نے کہا کہ تم نے سچ کہا۔

کہا کہ میں ایک ایسی شے کا سوال کرنے آیا ہوں جس کو زمین والوں میں سے کوئی نہیں جانتا، مگر نبی یا ایک دو شخص۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بھلا تجھ کو کچھ فائدہ ہوگا اگر میں تجھ کو بتا دوں؟ کہا کہ میں اپنے کانوں سے سنوں گا، میں آیا ہوں کہ بچے کا حال پوچھوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مرد کا پانی یعنی منی سفید ہوتی ہے اور عورت کا پانی زرد۔ پھر جب یہ دونوں جمع ہوتے ہیں اور مرد کی منی عورت کی منی پر غالب ہوتی ہے تو نر ہوتا ہے اللہ کے اذن سے اور جب عورت کی منی مرد کی منی پر غالب ہوتی ہے تو اللہ کے اذن سے مادہ ہوتی ہے۔ یہودی نے کہا کہ تو نے سچ کہا اور بے شک تو نبی ہے۔ پھر وہ چلا گیا۔ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس نے مجھ سے یہ سوال کیا اور مجھ کو کچھ معلوم نہ تھا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو بتا دیا۔ [1] (رواہ مسلم)

سیدنا ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ایک یہودی عالم نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زمین اور آسمان کی تبدیلی کا سوال کیا اور کہا اللہ تعالیٰ اس طرح کہتا ہے، سو خلقت کہاں ہوگی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿أَضْيَافُ اللّٰهِ فَلَنْ يُعْجِزَهُمْ مَا لَدَيْهِ﴾ [2] (رواه ابن جرير الطبري) [وہ اللہ تعالیٰ کے مہمان ہوں گے تو اس کے پاس کی چیز ان سے عاجز نہ ہوگی] عمرو بن میمون رحمہ اللہ نے آیتِ باب کی تفسیر میں کہا ہے: ’’أرض كالفضة البيضاء نقية، لم يسفك فيها دم، ولم يعمل عليها خطيئة، ينفذهم البصر، ويسمعهم الداعي، حفاة عراة كما خلقوا،

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحديث (٣١٥)

[2] تفسير الطبري (١٧/ ٥١۔ ٥٢) اس کی سند میں ’’سعید بن ثوبان‘‘ مجہول اور ’’ابو بکر بن عبداللہ بن ابی مریم‘‘ ضعیف راوی ہے۔

قياما حتى يلجمهم العرق" [زمین سفید چاندی کی طرح صاف ہوگی جس میں نہ کوئی خون بہتا ہوگا جس پر نہ کوئی خطا ہوئی ہوگی، آنکھیں تیز ہوں گی، داعی کی آواز کانوں میں ہوگی، سب ننگے پاؤں ننگے بدن کھڑے ہوئے ہوں گے، یہاں تک کہ پسینہ مثل لگام کے ہو جائے گا] اسی کے لگ بھگ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔[1]

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کی روایت کے دوسرے الفاظ مرفوعاً یہ ہیں: "أرض بيضآء، لم يسقط عليها دم، ولم يعمل عليها خطيئة"[2] [زمین سفید رنگ کی ہوگی جس پر نہ خون گرا ہوگا اور نہ اس پر کسی گناہ کا عمل ہوا ہوگا] لیکن اس کا مرفوع ہونا قوی نہیں ہے۔ سیدنا زید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی یہود کے پاس بھیجا۔ پھر کہا کہ تم جانتے ہو کہ میں نے ان کے پاس آدمی کس لیے بھیجا؟ کہا کہ اللہ اور رسول جانیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس آیت کا حال پوچھنے کو بھیجا ہے: ﴿ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ ﴾ (آیت باب)۔

وہ اس دن سفید ہوگی چاندی کی طرح۔ جب یہود آئے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا، کہا کہ «تكون بيضآء مثل النقي»[3] [میدے کی طرح سفید ہوگی] سیدنا علی، ابن عباس، انس بن مالک رضی اللہ عنہم اور امام مجاہد رحمہ اللہ نے بھی یہی کہا ہے کہ قیامت کے دن زمین چاندی کی ہوگی۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ زمین چاندی کی اور آسمان سونے کا ہو جائے گا۔ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آسمان باغات ہو جائیں گے۔ محمد بن قیس رحمہ اللہ نے کہا کہ زمین روٹی ہو جائے گی، مومن اپنے پاؤں کے نیچے سے کھائیں گے۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں کہ زمین ایک سفید روٹی ہو جائے گی۔ مومن اپنے قدم کے نیچے سے کھائے گا۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ زمین قیامت کے دن سب کی سب آگ ہوگی اور جنت اس کے پیچھے ہوگی۔ جنت کی کنواری عورتیں اور آبخورے نظر آئیں گے اور لوگوں کے پسینے کی لگام لگ جائے گی، ابھی نوبت حساب کی نہ آئے گی۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں عبداللہ کی جان ہے! آدمی سے اتنا پسینہ نکلے گا کہ اس کے پاؤں کی زمین بھیگ جائے گی، پھر وہ پسینہ بلند ہو کر ناک تک پہنچے گا اور ابھی حساب نے چھوا تک نہ ہوگا۔ کہا یہ کس لیے ہوگا؟ کہا اللہ کو دیکھنے اور ملاقات کے خوف سے۔ سیدنا کعب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آسمان بہشت ہو جائیں گے اور دریا کے بجائے آگ ہوگی اور زمین بدل جائے گی۔[4] امام ابوداود رحمہ اللہ کے

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٤٦)

[2] مسند البزار (٥/ ٢٤٦) المعجم الكبير (١٠/ ١٦١) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه جرير بن أيوب البجلي وهو متروك" (مجمع الزوائد: ٧/ ١٣٠) البتہ اس کا موقوف ہونا صحیح ہے۔

[3] تفسير الطبري (١٧/ ٤٧) اس کی سند میں "جابر جعفی" ضعیف راوی ہے۔

[4] تفسير الطبري (١٧/ ٤٧-٤٩) تفسير ابن كثير (٢/ ٧٠٨-٧٠٩)

نزدیک حدیث میں مروی ہے کہ «لَا يَرْكَبُ الْبَحْرَ إِلَّا غَازٍ، أَوْ حَاجٌّ، أَوْ مُعْتَمِرٌ، فَإِنَّ تَحْتَ الْبَحْرِ نَارًا» [1] [سمندر کا سفر صرف نمازی یا حاجی یا عمرہ کرنے والے ہی کریں، کیوں کہ سمندر کے نیچے آگ ہے] اور مشہور حدیثِ صور میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ زمین و آسمان کو بدل دے گا، اس طرح پھیلا دے گا اور کھینچ دے گا جس طرح کہ عکاظی چمڑا ہوتا ہے۔ ﴿لَا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا﴾ [طٰہٰ: ۱۰۷] ''آپ اس میں نہ کوئی کجی دیکھیں گے اور نہ اُبھری جگہ۔'' پھر اللہ خلق کو ایک زجر کرے گا (ڈانٹ دے گا)، وہ اس زمین مبدل میں موجود ہوجائے گی اور ساری مخلوق اللہ کے لیے اپنی قبروں سے باہر نکل آئے گی۔ [2] قاہر وہ ہے، جو ہر شے کو مقہور اور مغلوب کرے اور گردنیں اس کے لیے جھک جائیں اور عقلیں عاجز ہو جائیں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ تبدیلی کبھی ذات میں ہوتی ہے اور کبھی صفات میں، آیت دونوں معنوں کو شامل ہے۔ اکثر اس سے دوسرے معنی کیے جاتے ہیں۔ زمین کی تبدیلی کو پہلے بیان فرمایا، اس لیے کہ یہ قریب ہے اور ہم پر اس کی تبدیلی کا اثر بہت زیادہ ہے۔ اس کی تبدیلی کا ذکر احادیثِ مرفوعہ و موقوفہ میں بھی مروی ہے۔ حاصل یہ ہے کہ آیتِ باب اور احادیث اس بات پر نص ہیں کہ زمین و آسمان بدل دیے جائیں گے اور اللہ ایک دوسری زمین پیدا کرے گا جس پر لوگ پل کے بعد ہوں گے، نہ کہ جس طرح بہت سے لوگوں نے کہا ہے کہ زمین کی تبدیلی عبارت ہے تغیرِ صفات و تسویۂ آکام و نسفِ جبال (پہاڑوں کا اکھڑ جانا) اور زمین کے پھیلائے جانے سے۔ بالجملہ اُس دن بندے یا ظالم اپنی قبروں سے نکل باہر ہوں گے، تاکہ اللہ واحد و قہار کے سامنے اپنے اعمال کی جزا لینے کے لیے پیش ہوں۔ [3]

وَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَىِٕذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ۝۴۹ سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ۝۵۰ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝۵۱

اور اس دن آپ تمام مجرم زنجیروں میں جکڑے ہوئے دیکھیں گے (49) ان کے کرتے گندھک کے

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٤٨٩) اس کی سند میں ''ابوعبداللہ'' اور ''بشر'' مجہول راوی ہیں۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٤٧٨)

[2] تفسير الطبري (١٧/ ٤٩۔ ٥٠) اس کی سند میں ''محمد بن یزید بن ابی زیاد'' اور دو راوی جن کا نام نہیں لیا گیا ہے مجہول ہیں، نیز ''اسماعیل بن رافع مدنی'' سخت ضعیف راوی ہے۔''

[3] فتح البيان (٧/ ١٣٦۔ ١٣٨)

ہوں گے، اور آگ ان کے چہروں کو ڈھانپتی ہوگی 50 تاکہ اللہ ہر نفس کو (اس عمل کی) جزا دے جو اس نے کمایا۔ بے شک اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے 51

قیامت کے دن مجرموں کا کیا حال ہوگا؟

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے پیغمبر! جس دن زمین و آسمان بدل جائیں گے، اس دن جن لوگوں نے کفر و فساد کیا ہے، وہ جمع کیے جائیں گے۔ بعض نظیریں اور شکلیں اپنی اپنی قسم کے ساتھ یکجا کریں گے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ ﴾ [الصافات: ٢٢] ''(اے فرشتو!) اکٹھا کرو ان لوگوں کو جنھوں نے ظلم کیا، اور ان کے جوڑوں کو۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ﴾ [التكوير: ٧] ''اور جب روحیں (جسموں سے) ملا دی جائیں گی۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَاِذَاۤ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ﴾ [الفرقان: ١٣] ''اور جب وہ زنجیروں میں جکڑے اس کی کسی تنگ جگہ میں جھونکے جائیں گے تو وہ وہاں ہلاکت کو پکاریں گے۔''

نیز فرمایا: ﴿ وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ ﴿37﴾ وَّاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ﴾ [صٓ: ٣٧۔ ٣٨] ''اور شیاطین (جنات) کو (بھی تابع کر دیا) ہر عمارت بنانے والے اور غوطہ لگانے والے کو۔ اور دوسروں کو (جو) زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔'' اصفاد کے معنی ہیں قیود۔ ان کے کپڑے، جو وہ پہنیں گے، گندھک کے ہوں گے، جو خارش والے اونٹوں کو ملا جاتا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ اس میں آگ خوب چپکتی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ﴿ قَطِرَانٍ ﴾ کہتے ہیں پگھلے ہوئے تانبے کو جو نہایت گرم ہو۔ امام مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، حسن اور قتادہ رحمہم اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔[1]

یہ آیت: ﴿ تَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ﴾ (آیتِ باب) اس آیت کی طرح ہے: ﴿ تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ ﴾ [المؤمنون: ١٠٤] ''آگ ان کے چہرے جھلس دے گی، اور وہ اس میں بدشکل ہوں گے۔'' سیدنا ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ میری اُمت میں چار چیزیں امرِ جاہلیت سے ہیں، جن کو یہ لوگ چھوڑیں گے نہیں: حسب کا فخر، نسب کا طعن، تاروں سے پانی مانگنا اور مُردے پر نوحہ کرنا۔ نوحہ کرنے والی، جبکہ توبہ نہیں کرتی تو وہ قیامت کے دن کھڑی کی جائے گی اور اس پر ایک لباس گندھک کا ہوگا اور ایک خارش کی قمیص ہوگی۔[2] (رواه أحمد وانفرد بإخراجه مسلم)

سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نوحہ کرنے والی نے جب توبہ نہ کی تو اس کو جنت اور دوزخ کے درمیان راہ میں کھڑا کریں گے، اس کا کرتا گندھک کا ہوگا اور اس کے منہ کو آگ ڈھانپے گی۔[3] اللہ ہر جان

[1] تفسیر الطبري (١٧/ ٥٥۔ ٥٦) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٧٠٩)۔ [2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٩٣٤) مسند أحمد (٥/ ٣٤٢)

[3] المعجم الکبیر (٨/ ٢٠١) اس کی سند میں ''علی بن یزید، عبیداللہ بن زحر اور مطرح بن یزید'' ضعیف راوی ہیں، البتہ گزشتہ روایت اس سے مستغنی کرتی ہے۔

کو اس کے کسب کی جزا دے گا۔ اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔ احتمال ہے کہ یہ آیت اس آیت کی طرح ہو: ﴿ اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ﴾ [الأنبيآء: ١] ''لوگوں کے حساب کا وقت قریب آ گیا ہے، جبکہ وہ غفلت میں پڑے اعراض کر رہے ہیں۔'' یا یہ مطلب ہو کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے حساب لیتے وقت سریع النجاز، یعنی جھٹ پٹ حساب کتاب کر کے فارغ ہو جاتا ہے، کیوں کہ وہ ہر چیز کو جانتا ہے، اس پر کوئی شے مخفی نہیں ہے اور ساری خلقت اس کی قدرت کی نسبت ایک چیز کی مثل ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ بَصِيْرٌ ﴾ [لقمان: ٢٨] ''تمھیں پیدا کرنا اور تمھیں (دوبارہ) اٹھانا (اللہ کے نزدیک) ایسا ہی ہے جیسے ایک نفس کو پیدا کرنا، بلاشبہہ اللہ خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا ہے۔'' امام مجاہد رحمہ اللہ کے قول کے یہی معنی ہیں کہ سریع الحساب سے مراد احصاء ہے اور احتمال ہے کہ یہ دونوں معنی مراد ہوں۔[1] واللہ أعلم.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے تو مشرکوں کو قیامت کے دن دیکھے گا کہ وہ زنجیروں میں جکڑ بند ہیں، بعض کو بعض کے ساتھ یکجا کر کے باندھا ہے۔[2] (قاله ابن قتيبة) یہ اکٹھا کر کے باندھنا عقائد اور اعمال کے مشترک ہونے کے مطابق ہوگا۔ جیسے ﴿ وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ﴾ [التكوير: ٧] ''اور جب روحیں (جسموں سے) ملا دی جائیں گی۔'' یا یہ باندھا جانا شیاطین کے ساتھ ہوگا، جیسے اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ہے: ﴿ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ﴾ [الزخرف: ٣٦] ''تو ہم اس کے لیے ایک شیطان کو مقرر کر دیتے ہیں، پھر وہ اس کا ساتھی بن جاتا ہے۔'' یا ٹیڑھے عقائد اور ملکاتِ باطلہ کے اکتساب کے ہمراہ یا ان کے ہاتھ پاؤں سے باندھ دیے جائیں گے۔[3] (قاله ابن زيد) مقرن وہ ہے جو رسی سے مربوط ہو۔ اصفاد بہ معنی اغلال و قیود ہے۔[4] (قاله قتادة) سرابیل سے مراد کرتے ہیں، یعنی قمیض۔ (قاله السدي) ابن زید رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[5] سربال کہتے ہیں: قمیص کو۔ قطران سے مراد وہ تیل ہے جو اونٹوں کو ملا جاتا ہے۔[6] (قاله الحسن)

ان کی کھالوں میں وہ روغن گندھک بطورِ طلاء استعمال کریں گے، وہ طلا پیراہن تن ہو جائے گا۔ قطران کو خاص طور پر اس لیے ذکر کیا کہ اس میں آگ جلد بھڑک اُٹھتی ہے۔ اور خوب جلاتی ہے اور یہ نہایت بدبودار اور بد رنگ ہوتا ہے۔ یہ ایک درخت سے نکلتا ہے اور خارشی اونٹ کو اس کی حدت کی وجہ سے لگاتے ہیں۔ یا یہ درخت ابہل وعرعر وتوت کا تیل ہے، جیسے زفت کہ وہ خارشی اونٹوں کو ملا جاتا ہے، اسی کو ہناء کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مبالغہ کرنا چاہتا تو ان کے جلانے میں کسی اور چیز کا ذکر کرتا، کیوں کہ وہ قادر ہے، لیکن اس نے اُسی شے سے ڈرایا جس کو وہ جانتے پہچانتے ہیں۔ اور ان کے چہروں پر آگ بھڑکے گی اور لپٹ مارے گی اور عالی ہوگی۔

---

[1] تفسير ابن كثير (٢/ ٧١٠) [2] تفسير الخازن (٤/ ٥٥) [3] تفسير الطبري (١٧/ ٥٤)
[4] تفسير الطبري (١٧/ ٥٣) [5] تفسير الطبري (١٧/ ٥٤) الدر المنثور (٥/ ٥٩) [6] تفسير الطبري (١٧/ ٥٥)

یہی حال ان کے دلوں کا بھی ہوگا، لیکن چہروں کا ذکر اس لیے فرمایا کہ یہ اعضائے بدن میں سے اشرف ہے، کسی چیز کو پانے کی حس اسی میں پیدا ہوتی ہے۔ یہ کام اس لیے ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ہر جان کو اس کی کمائی کی جزا دے، خیر یا شر۔ اللہ تعالیٰ کو کوئی شے وحساب شاغل نہیں ہوتا، وہ ایک دم میں ہر شخص کے حساب سے فارغ ہو جائے گا۔ تمام مخلوق کا حساب دنیا کے ایام میں سے نصف دن کے اندازے کے مطابق کر دے گا، جس طرح کہ حدیث میں مروی ہے۔[1]

هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَلِيَعْلَمُوْٓا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ۝۵۲

یہ (قرآن) لوگوں کے لیے ایک پیغام ہے، تاکہ اس کے ذریعے سے انھیں ڈرایا جائے، اور تاکہ انھیں معلوم ہو جائے کہ بے شک وہی (اللہ) معبود واحد ہے اور تاکہ عقل مند نصیحت حاصل کریں (52)

جامع الفوائد پیغام الٰہی:

یعنی جو کچھ تجھ پر نازل کیا ہے، یہ تبلیغ وکفایت وموعظت وتذکیر ہیں۔ یہ لوگوں کے لیے منزل، مبلغ اور اللہ کے ساتھ ملانے والا ہے اور سعادت کے مرتبوں تک پہنچانے والا ہے۔ بعض نے کہا کہ یہ اس آیت کی طرف اشارہ ہے: ﴿ وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غٰفِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ﴾ [إبراهيم: ٤٢] ''اور (اے نبی!) آپ مت خیال کریں کہ اللہ ان کاموں سے غافل ہے جو ظالم کرتے ہیں، وہ تو انھیں صرف اس دن تک مہلت دیتا ہے جس میں آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔'' یعنی سورت کے دوسرے مضامین سے قطع نظر یہی ایک آیت کافی ہے۔ یا ساری سورت کی طرف اشارہ ہے۔ یا قرآن کی طرف اشارہ ہے۔ ابن زید رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔[2] من جملہ محسنات کے اس آیت میں رد العجز علی الصدر ہے، کیوں کہ اس سورت کا شروع یہ تھا: ﴿ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ﴾ [إبراهيم: ١] ''(اے نبی!) (یہ) عظیم الشان کتاب ہم نے اسے آپ کی طرف نازل کیا ہے، تاکہ آپ لوگوں کو ظلمتوں سے نور کی طرف نکال لائیں۔''

''الناس'' سے مراد کفار ہیں، یا سب لوگ، کیوں کہ اس میں سارے آدمیوں کا فائدہ اور ہدایت ہے، وہ اگر ڈرنا چاہیں تو اس قرآن کے ذریعے سے ڈر سکتے ہیں اور دلائلِ تکوینیہ اور حججِ قرانیہ سے یہ بات معلوم کر سکتے ہیں کہ معبود برحق وحدہ لا شریک لہ ہے اور جو لوگ عقولِ سلیمہ اور افہامِ صحیحہ رکھتے ہیں، وہ اس قرآن اور بیان سے نصیحت حاصل کر سکتے ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قرآن لوگوں کے لیے بلاغ (پہنچانا) ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ﴾ [الأنعام: ١٩] ''تاکہ اس کے ذریعے سے میں تمھیں اور جس

[1] فتح البیان (۷/ ۱۳۸۔ ۱۳۹) [2] تفسیر الطبري (۱۷/ ۵۷)

جس کو یہ پہنچے (سب) کو ڈراؤں۔'' یعنی انسانوں اور جنوں کی تمام مخلوق کے لیے بلاغ ہے، جس طرح کہ اول سورت میں فرمایا تھا۔ اور ایک مطلب اس سے یہ ہے کہ لوگ نصیحت پکڑیں، اللہ کی وحدانیت جان لیں، یعنی ان براہین اور دلیلوں سے ان کو معلوم ہو جائے کہ ایک اللہ پاک کے سوا کوئی لائقِ عبادت نہیں ہے، پھر عقل والے اس سے نصیحت پکڑیں۔[1]

یہاں سورت ابراہیم علیہ السلام کی تفسیر مکمل ہوئی۔ والحمد لله الذي لا رب سواه، ولا معبود إلا إياه.

روز چہار شنبہ قریب نیمروز اس سورت مبارکہ کا ترجمہ ختم ہوا۔ ختم اللّٰه لنا بالحسنىٰ و زيادة، و رزقنا الحلول يوم المعاد في دار السعادة.

[1] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۷۱۰)

سُوْرَةُ الْحِجْرِ

الحمد لله وسلام علىٰ عباده الذي اصطفىٰ أما بعد.

یہ تفسیر ترجمان القرآن بلطائف البیان کا تکملہ ہے۔ تفسیر ترجمان القرآن کو مجدد دین امام المفسرین نواب صدیق حسن خان صاحب نے اہلِ علم و دین کی ایک جماعت کی درخواست پر اردو زبان میں رمضان ۱۳۰۳ھ میں شروع کیا۔ انھوں نے سورت فاتحہ سے سورت ابراہیم اور سورت ملک سے آخر تک تفسیر مکمل لکھی۔ باقی تفسیر نہ لکھنے کی وجہ یہ بنی کہ زندگی نے موقع ہی نہیں دیا اور وہ دنیا سے چلے گئے۔ تمام مسلمانوں کی یہی خواہش تھی کہ صاحب ممدوح ہی اس تفسیر کو مکمل کرتے، لیکن ''تدبیر را چہ مقابلہ بہ تقدیر''۔ اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا۔ ﴿عَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾

آرزو تھی کہ اللہ تعالیٰ کسی کے ہاتھ سے اس امرِ مہم کی تکمیل کروا دے۔ احقر العباد کا مدت سے یہی خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی توفیق اور اعانت سے مجھ ضعیف و ناتواں سے اس مبارک کام کی خدمت لے۔ اگرچہ میں اپنی قلت بضاعت علمی کے سبب اس ذی شان کام کا اہل نہ تھا، لیکن اس خیال سے کہ اللہ تعالیٰ میری مدد کرے گا اور جیسے حدیث قدسی میں ہے: «أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِيْ بِيْ»[1] [میرے بارے میں میرا بندہ جو گمان کرتا ہے میں (اس کو پورا کرنے کے لیے) اس کے پاس ہوتا ہوں] میں نے اسی پر بھروسا کر کے اس بڑے کام کو ہاتھ ڈالا۔ ﴿وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ﴾.

میں نے اسی منہج اور روش کو اختیار کیا جس کا نواب صاحب نے التزام کیا تھا، یعنی آیات کا ترجمہ مع فوائد موضح القرآن سے لیا اور باقی مطالب تفسیر ابن کثیر، تفسیر قاضی محمد بن علی شوکانی اور تفسیر فتح البیان سے لکھے۔ ہاں اتنی بات کی ہے کہ جیسے نواب صاحب مرحوم نے اپنی اس کتاب میں عربی الفاظ کو کثرت سے استعمال کیا ہے جن کے استعمال میں کم علموں کو چنداں فائدہ نہیں ہے۔ ہم نے ان الفاظِ عربیہ کو عام فہم اردو ترجمہ حاشیہ میں لکھا ہے۔ ہم نے ان کا ترجمہ کتاب میں ہی لکھ دیا ہے اور اُن احادیث کا ترجمہ بھی متن میں لکھ دیا ہے جو آیات کی تفسیر میں بیان کی گئی ہیں۔ وما توفيقي إلا بالله، عليه توكلت، وإليه أنيب، فها أنا أشرع في سورة الحجر من كلام الرب الرحيم الرحمن، وهو المستعان وعليه التكلان، فسبحانك اللهم وبحمدك أشهد أن لا إلٰه إلا أنت أستغفرك وأتوب إليك.

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٧٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٧٥)

یہ سورت مکہ میں اتری ہے اور اس میں ۹۹ آیات ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کے مکی ہونے پر اتفاق اور اجماع ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس اور سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم بھی اسی کے قائل ہیں۔[2] حجر مدینہ اور شام کے درمیان ایک وادی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿١﴾ رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ﴿٢﴾ ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿٣﴾

اللہ کے نام سے (شروع) جو نہایت مہربان بہت رحم کرنے والا ہے۔ الٓرٰ، یہ آیات ہیں کتاب اور قرآنِ مبین کی ① کسی وقت کافر چاہیں گے کاش کہ وہ مسلمان ہوتے ② (اے نبی!) انھیں چھوڑ دیجیے، وہ کھائیں (پئیں) اور فائدہ اُٹھائیں، اور (جھوٹی) امید انھیں غفلت میں ڈالے رکھے، پھر جلد ان کو معلوم ہو جائے گا ③

کفار کی مسلمان ہونے کی تمنا:

حروفِ مقطعات پر پہلے کلام گزر چکا ہے۔ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ عن قریب یہ لوگ اپنے کفر پر پشیمان ہوں گے اور تمنا کریں گے کہ کاش! ہم دنیا میں مسلمان ہوتے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے سیدنا عبداللہ بن عباس اور سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم وغیرہما نے یہ کہا ہے کہ بدر کے کفار جب آگ پر پیش کیے جائیں گے تو ان کو مسلمان ہونے کی تمنا ہوگی۔[3] بعض نے کہا کہ ہر کافر موت کی گھڑی آجانے کے وقت یہی آرزو کرتا ہے کہ کاش! وہ مومن ہوتا۔ کسی نے کہا کہ یہ روزِ قیامت کے متعلق خبروں میں سے ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [الأنعام: ٢٧] ''اور اگر آپ انھیں اس وقت دیکھیں جب وہ آتش پر کھڑے کیے جائیں گے تو وہ کہیں گے: کاش! ایک بار ہمیں دنیا میں واپس بھیج دیا جائے اور ہم اپنے رب کی آیات کو ہرگز نہ جھٹلائیں گے، اور ہم مومنوں میں سے ہوں گے۔''

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ آیت جہنمیوں کے حق میں ہے کہ وہ جب مسلمانوں کو آگ سے باہر نکلتے ہوئے دیکھیں گے، تب یہ تمنا کریں گے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس اور سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہم اس آیت کی تاویل اس طرح کرتے تھے کہ جس دن اللہ تعالیٰ مسلمین میں سے خطاکاروں کو مشرکین کے ہمراہ آگ میں بند کرے

[1] فتح القدير (٣/ ١٦٥) فتح البيان (٧/ ١٤١) [2] الدر المنثور (٥/ ٦١) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٥٥)

گا تو مشرکین یہ بات کہیں گے: "ما أغنى عنكم ما كنتم تعبدون في الدنيا" یعنی جو کچھ تم دنیا میں پوجتے تھے، وہ تمھارے کچھ کام نہ آیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خالص عبادت کرنے پر طعنہ ہوگا، تب اللہ تعالیٰ کو اُن مشرکین پر غصہ آئے گا اور وہ اپنی بے پایاں رحمت سے مومنوں کو آگ سے باہر نکالے گا، تب وہ مشرک یہ آرزو کریں گے کہ اے کاش! ہم بھی مسلمان ہوتے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ اہلِ نار موحدین سے کہیں گے: "ما أغنى عنكم أيمانكم" "تمھارا ایمان تمھارے لیے کچھ کار آمد نہیں ہوا۔" جب وہ یہ بات کہیں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اس شخص کو بھی دوزخ سے نکال لو جس کے دل میں ایک ذرے کے برابر بھی ایمان ہو۔ اس وقت کفار آرزو کریں گے، کاش! ہم بھی دنیا میں ایمان دار ہوتے۔ آیت باب سے یہی مراد ہے۔ امام ضحاک، قتادہ اور ابو العالیہ وغیرہم نے بھی اسی طرح کہا ہے۔[1]

اس بارے میں احادیثِ مرفوعہ بھی مروی ہیں۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «إِنَّ نَاسًا مِنْ أَهْلِ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهَ يَدْخُلُوْنَ النَّارَ بِذُنُوْبِهِمْ، فَيَقُوْلُ لَهُمْ أَهْلُ اللَّاتِ وَالْعُزّٰى: مَا أَغْنٰى عَنْكُمْ قَوْلُكُمْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهَ وَأَنْتُمْ مَعَنَا فِي النَّارِ، فَيَغْضَبُ اللّٰهُ لَهُمْ، فَيُخْرِجُهُمْ فَيُلْقِيهِمْ فِي نَهْرِ الْحَيَاةِ، فَيَبْرَؤُوْنَ مِنْ حَرْقِهِمْ كَمَا يَبْرَأُ الْقَمَرُ مِنْ كُسُوْفِهِ، يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ، وَيُسَمَّوْنَ فِيهَا الْجَهَنَّمِيُّوْنَ» یعنی کلمہ والے کچھ لوگ اپنے گناہوں کے سبب آگ میں جائیں گے، ان سے بت پرست کہیں گے کہ تم کو کلمہ توحید کہنا کچھ کام نہ آیا، تم ہمارے ہمراہ دوزخ میں ہو۔ تب اللہ تعالیٰ کو غصہ آئے گا، ان کو دوزخ سے نکال کر نہرِ حیات میں ڈال دے گا۔ وہ جلنے کی سیاہی سے ایسے پاک صاف ہو جائیں گے، جیسے چاند گہن سے نکل آتا ہے، پھر جنت میں جائیں گے، وہاں ان کا نام جہنمی ہوگا۔ ایک مرد نے کہا: اے انس! تم نے یہ حدیث نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے؟ کہا میں نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، فرماتے تھے: «مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ» [جس نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولا وہ اپنا ٹھکانا آگ بنا لے] ہاں میں نے سنا کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح فرماتے تھے۔[2] (رواه الحافظ أبو القاسم الطبراني) سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے:

« إذا اجتمع أهل النار في النار، ومعهم من شاء الله من أهل القبلة، قال الكفار للمسلمين: ألم تكونوا مسلمين؟ قالوا: بلىٰ، قالوا: فما أغنى عنكم الإسلام، فقد صرتم معنا في النار، قالوا: كانت لنا ذنوب فأخذنا بها، فسمع الله ما قالوا، فأمر بمن كان في النار من أهل القبلة فأخرجوا، فلما رأى ذلك من بقي من الكفار قالوا:

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٦٢۔ ٦٤)

[2] المعجم الأوسط (٧/ ٢٠٩) اس کی سند میں ایک سے زیادہ مجہول راوی ہیں، البتہ اس مفہوم کی روایت "مسند أحمد (٣/ ١٤٤)" میں مروی ہے۔ امام البانی رحمہ اللہ نے "ظلال الجنة (٢/ ١٠٠)" میں اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔

يٰليتنا كنا مسلمين فنخرج كما خرجوا، ثم قرأ رسول الله ﷺ: أعوذ بالله من الشيطن الرجيم ﴿الۤرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَ قُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ۝ رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ﴾» (رواه الطبراني و ابن أبي حاتم و زاد فيه بسم الله الرحمٰن الرحيم عوض الاستعاذة)

یعنی جب دوزخی دوزخ میں جمع ہو جائیں گے اور اُن کے ہمراہ جن کو اللہ تعالیٰ چاہے گا اہلِ قبلہ میں سے ہوں گے تو کافر مسلمانوں سے کہیں گے: کیا تم مسلمان نہ تھے۔ وہ کہیں گے: ہاں! یہ کہیں گے: اسلام تمھارے کچھ کام نہ آیا، تم ہمارے ہمراہ دوزخ میں آئے۔ وہ کہیں گے: ہم نے گناہ کیے تھے، ہم ان گناہوں میں گرفتار ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کفار کی بات سن کر حکم دے گا کہ جتنے اہلِ قبلہ دوزخ میں ہیں، ان کو آگ سے باہر نکالو، جب وہ کفار جو دوزخ میں باقی ہوں گے، یہ معاملہ دیکھیں گے تو کہیں گے: کاش! ہم بھی مسلمان ہوتے اور جس طرح یہ آگ سے باہر نکلے، ہم بھی باہر نکلتے۔ پھر نبی مکرم ﷺ نے یہ سورت پڑھی: ﴿الۤرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَ قُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ۝ رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ﴾[1]۔

تیسری حدیث سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ان سے صالح بن ابی طریف نے پوچھا کہ تم نے نبی ﷺ سے اس آیتِ باب کی تفسیر کے بارے میں کچھ سنا ہے؟ یعنی ﴿رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ کے بارے میں؟ انھوں نے کہا کہ میں نے آپ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

«يخرج الله ناسا من المومنين من النار بعد ما يأخذ نقمته منهم، وقال: لما أدخلهم الله النار مع المشركين، قال لهم المشركون: تزعمون أنكم أولياء الله في الدنيا، فما بالكم معنا في النار؟ فإذا سمع الله ذلك منهم أذن في الشفاعة لهم، فيشفع لهم الملكئة والنبيون، ويشفع المؤمنون حتى يخرجوا بإذن الله، فإذا رأى المشركون ذلك قالوا: يليتنا كنا مثلهم فتدركنا الشفاعة فنخرج معهم، قال: فذلك قول الله: ﴿رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ﴾ فيسمون في الجنة الجهنميين من أجل سواد في وجوهم، فيقولون: يا رب! اذهب عنا هذا الاسم، فيأمرهم فيغتسلون في نهر الجنة فيذهب ذلك الاسم عنهم»

یعنی اللہ تعالیٰ کچھ مومن لوگوں کو اُن سے اپنا انتقام لینے کے بعد آگ سے خارج کرے گا اور جب اللہ تعالیٰ نے ان کو مشرکوں کے ہمراہ آگ میں داخل کیا تھا تو مشرکوں نے ان سے کہا کہ تم کو یہ اعتقاد تھا کہ تم اللہ کے دوست ہو دنیا میں، اب تمھارا کیا حال ہے کہ تم ہمارے ساتھ آگ میں ہو؟ جب اللہ تعالیٰ یہ بات سنے گا تو شفاعت کا حکم دے گا۔ فرشتے اور پیغمبر اور مومنین شفاعت کریں گے، یہاں تک کہ دوزخ سے باہر نکلیں گے۔ مشرک یہ حال دیکھ کر

[1] مستدرك الحاكم (٢/ ٢٦٥) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٥٦) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: ظلال الجنة (٢/ ١٠٠)

کہیں گے: کاش! ہم بھی انھیں کی طرح کے ہوتے تو ہماری شفاعت ہوتی اور ہم بھی ان کے ساتھ باہر نکلتے۔ یہ مراد ہے اس آیت سے: ﴿ رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ﴾۔ ان کو جنت میں جہنمی کہا جائے گا، ان کے چہروں پر سیاہی کی وجہ سے، تب وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! ہم سے یہ نام دور کر، حکم ہوگا کہ نہرِ جنت میں نہاؤ، اس وقت یہ نام ان سے دور ہو جائے گا۔①

چوتھی مرفوعاً حدیث محمد بن علی عن ابیہ عن جدہ کی ہے کہ کسی کو آگ دونوں زانو تک پکڑے گی اور کسی کو کمر تک اور کسی کو گلے تک، ان کے گناہوں کی مقدار کے مطابق اور عملوں کے مطابق۔ کوئی ایک مہینا آگ میں رہے گا، پھر باہر آئے گا۔ دوزخ میں سب سے زیادہ رہ کر نکلنے والا وہ ہوگا جو دوزخ میں دنیا کی مدت جتنا رہے گا، یعنی جس دن سے کہ دنیا پیدا ہوئی ہے، یہاں تک کہ فنا ہوئی۔ پھر جب اللہ تعالیٰ ان کو نکالنا چاہے گا تو یہود و نصاریٰ اور وہ لوگ جو دوسرے دینوں اور بتوں والے ہوں گے، وہ اہلِ توحید میں سے دوزخ کی سزا بھگتنے والوں کو کہیں گے: "آمنتم باللہ وکتبه ورسله فنحن وأنتم اليوم في النار سواء" تم ایمان لائے اللہ پر اور اس کی کتابوں اور رسولوں پر، سو ہم اور تم آج کے دن آگ میں برابر ہیں۔ "فيغضب الله لهم غضبا لم يغضب لشيء فيما مضى، فيخرجهم إلى عين في الجنة وهو قوله: ﴿ رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ﴾" "اللہ کو ان پر ایسا غصہ آئے گا، جو اس سے پہلے کبھی کسی شے پر نہ آیا تھا، پھر ان کو جنت کے ایک چشمے کی طرف نکالے گا۔"②

اللہ تعالیٰ کا یہ قول کہ اے پیغمبر! تم ان کو چھوڑ دو، یہ کھائیں اور برتیں، ایک سخت قسم کی ڈانٹ ہے اور اُن کے لیے ایک پکی وعید ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ ﴾ [إبراهيم: ٣٠] "کہہ دیجیے: تم فائدہ اُٹھاؤ (دنیا میں)، پھر یقیناً تمھاری واپسی آگ کی طرف ہے۔" نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ ﴾ [المرسلات: ٤٦] "(اے جھٹلانے والو!) تم (دنیا میں) تھوڑا سا کھاؤ اور فائدہ اُٹھاؤ، بے شک تم مجرم ہو۔" لہٰذا فرمایا ہے کہ اُمید نے ان کو غافل کر دیا ہے، یعنی توبہ اور انابت الی اللہ سے، ابھی جلد اپنے کام کا انجام جان لیں گے۔ انتہیٰ ما قال الحافظ ابن كثير في تفسيره.③

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح اور اس کا بیانِ مبین یہ ہے کہ ﴿ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ ﴾ میں حرفِ تعریف (الف، لام)

---

① صحيح ابن حبان (١٦/ ٤٥٧) المعجم الأوسط (٨/ ١٠٦) یہ روایت صحیح ہے۔

② تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٥٥۔ ٢٢٥٦) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: العلل المتناهية لابن الجوزي (٢/ ٩٤٠۔ ٩٤١)

③ تفسير ابن كثير (٢/ ٧١٠۔ ٧١٢)

تعظیم کے لیے ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد جنس کتب منزلہ متقدمہ ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کتبِ منزلہ متقدمہ سے مراد تورات اور انجیل ہے۔[1] یا مراد خود یہی سورت ہے اور یہ اضافت بیانیہ ہے۔ یا مراد قرآن پاک ہے اور قرآن کا ذکر کتاب کے بعد جو فرمایا ہے تو یہ اس ارادے سے ہے کہ دو مختلف الفاظ کو حرفِ عطف سے جمع کیا ہو اور یہ کچھ معیوب نہیں ہے۔ قرآن کو مبین فرمایا، یعنی اس کامل کتاب کی رشد اور ہدایت ظاہر ہے اور اس کی بہترین نمایاں ہے۔ اور قرآن کو نکرہ کے طور پر جو بیان کیا تو یہ اس کی عظمت کے لیے ہے۔

﴿ رُبَمَا ﴾ تخفیف سے اور شدّ سے دو لغت ہیں۔ یہ لفظ کثرت اور قلت دونوں کے لیے آتا ہے، یعنی اکثر اوقات یا کسی وقت۔ کفار یہ چاہیں گے کہ کاش! وہ مسلمان ہوتے۔ اس جگہ ان کو خوف دلانے کے لیے قلت زیادہ موثر ہے، اس لیے کہ قیامت کی ہولناکیوں کی دہشت سے اتنا افاقہ کب ہوگا کہ یہ بات یاد آئے، مگر تھوڑے وقت کے لیے۔ بعض نے کہا: معنی یہ ہیں کہ اس فعل سے تھوڑی سی ندامت بھی تجھ کو خوف دلانے کے لیے کافی ہے، کثیر کا یہاں کیا ذکر۔ مسلمان ہونے سے مراد یہ ہے کہ تیرے حکم کے فرماں بردار ہوتے، اس پر کان دھرتے۔ ان کا یہ تمنا کرنا موت کے وقت ہوگا یا قیامت کے دن۔

مطلب یہ ٹھہرا کہ جب امر منکشف ہوگا اور کفر کا بطلان واضح ہو جائے گا اور یہ بات کھل جائے گی کہ ﴿ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ﴾ [آل عمران: ۱۹] ”بے شک اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین اسلام ہی ہے۔“ تب وہ ایسی آرزو کریں گے، لیکن یہ تمنا ان کی اس وقت بے سود ہوگی۔ ﴿ لَا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ ﴾ [الغاشية: ۷] ”جو نہ موٹا کرے گا نہ بھوک مٹائے گا۔“ بلکہ آرزو محض حسرت، ندامت اور اپنے نفس کی ملامت ہوگی، اس کمی پر جو انھوں نے دین کے بارے میں اختیار کی۔ یا یہ خواہش اپنے اور مسلمانوں کے حال کو دیکھنے کے وقت ہوگی۔ یا موحد خطا کاروں کے دوزخ سے نکلنے کے وقت ہوگی۔ ظاہر یہ ہے کہ ان کا یہ چاہنا ہر وقت اور ہر لحہ میں مستقل باقی رہے گا، معاملہ کے انکشاف کے بعد۔ اور ”لَوْ“ مصدریہ ہے یا امتناعیہ، اس صورت میں جزا محذوف ہوگی، یعنی اگر مسلمان ہوتے تو اسلام کے ساتھ خوش ہوتے، یا اس عذاب سے جس میں مبتلا اور گرفتار ہیں نجات پاتے اور ”لَوْ“ کا مصدریہ ہونا اولیٰ ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ”لا يزال الله يشفع و يدخل الجنة و يشفع و يرحم حتى يقول: من كان مسلما فليدخل الجنة فذلك قوله: ﴿ رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ﴾“[2] [اللہ تعالیٰ (جہنمی) لوگوں کے حق میں شفاعت قبول کرتے ہوئے انھیں جنت میں داخل کرتا رہے گا اور ان کی شفاعت قبول کر کے رحم کرتا رہے گا، یہاں تک کہ کہے گا: جو بھی مسلمان ہے وہ جنت میں داخل ہو جائے، اس وقت کے لیے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ﴾ (بابِ آیت)

[1] تفسير الطبري (۱۷/ ۵۹) [2] مستدرك الحاكم (۲/ ۳۸٤) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے اس آیت کے سببِ نزول متعین کرنے میں اسی مضمون کی احادیثِ صحیحہ مروی ہیں۔ پھر فرمایا کہ ان کفار کو چھوڑ دو کہ یہ کھا پی لیں اور فائدہ دنیا میں اٹھالیں، کیوں کہ یہ ہرگز ڈرنے والے اور باطل سے ہٹنے والے نہیں ہیں، یہ تو جانوروں اور چوپایوں کی طرح ہیں۔ ان کو سوائے کھانے پینے کے اور کچھ کام نہیں ہے، یہ بھلا کب حق کو قبول کریں گے، ان کو تو اُن کی لمبی چوڑی تمناؤں اور عمر اور جوانی اور اپنے حال میں گم رہنے نے ایمان لانے اور اطاعت کرنے سے باز رکھا۔ یہ ہمیشہ اپنی لمبی چوڑی اُمیدوں اور باطل تمناؤں میں گرفتار اور بادِ غرور میں سرشار ہیں، یہاں تک کہ صبح ہو اور امر منکشف ہو، یا قیامت کے عذاب کو دیکھیں، اس وقت اپنے کیے کا مزہ چکھیں گے اور اپنے کام کا انجام معلوم کرلیں گے۔

اس ارشاد میں ڈانٹ ڈپٹ ہے، جس کا اندازہ نہیں ہوسکتا اور اِس بات کی تنبیہ ہے کہ دنیا کی لذتوں اور نعمتوں اور عیش وعشرت اور لمبی چوڑی تمناؤں کو اختیار کرنا مومنوں کے اخلاق سے نہیں ہے۔ بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ ﴿ ذَرْهُمْ ﴾ دھمکی ہے اور ﴿ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴾ دوسری دھمکی ہے تو اب دو دھمکیوں کے درمیان کیا عیش خاک گوارا ہوگا۔ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "إنما أخشى عليكم الاثنتين: طول الأمل، واتباع الهوىٰ، فإن الأول ينسي الآخرة، والثاني يصد عن الحق" یعنی مجھ کو تم پر دو باتوں کا ڈر ہے: ایک درازیِ اُمید، دوسری خواہشاتِ نفس کی پیروی، کیوں کہ پہلی چیز آخرت کو بھلاتی ہے اور دوسری چیز حق سے روکتی اور باز رکھتی ہے۔[1]

وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ۝۴
مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ۝۵

اور ہم نے جس بستی کو بھی ہلاک کیا ہے، اس (کی تباہی) کے لیے لکھی ہوئی (میعاد) مقرر تھی ④
کوئی امت اپنے (مقرر) وقت سے نہ آگے نکل سکتی ہے اور نہ پیچھے رہ سکتی ہے ⑤

ہر بستی کا ایک وقت مقرر ہے:

اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ ہم نے جو گاؤں برباد کیا، وہ قیامِ حجت اور اس کی اجل کے انتہا کو پہنچنے کے بعد کیا۔ کوئی اُمت اپنی ہلاکت کے وقت سے دیر نہیں کرتی اور نہ ہی جلدی کرتی ہے۔ یہ اہلِ مکہ کو تنبیہ ہے اور ان کو ارشاد ہے کہ وہ شرک و الحاد اور عناد سے باز رہیں، جس کی وجہ سے وہ ہلاک ہونے کے مستحق ہیں۔

---

[1] مصنف ابن أبي شيبة (٧/ ١٠٠) یہ روایت مرفوعاً بھی مروی ہے، البتہ مرفوعاً اور موقوفاً دونوں ضعیف ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٢١٧٧) فتح البيان (٧/ ١٤٣۔ ١٤٦)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ہم نے کوئی بستی کسی حال میں بھی کسی عذاب سے ہلاک نہیں کی، لیکن اس بستی کی ہلاکت کے لیے ایک اجل اور وقت مقرر تھا جو نہ پہلے ہو سکے اور نہ موخر۔ وہ مقررہ وقت معلوم تھا اور بھولنے والا نہ تھا تو اب کسی بھی وجہ سے اس کے مقررہ وقت سے تاخیر کرنے کا تصور بھی نہیں ہوسکتا۔ کوئی اُمت اپنی مقررہ مدت سے، جو کہ لوحِ محفوظ میں لکھی ہوئی ہے، سبقت نہیں کر سکتی، یعنی وقت سے پہلے برباد نہیں ہوتی اور نہ اس معینہ مدت سے دیر کر سکتی ہے کہ وہ اپنی ہلاکت میں ذرا سی دیر کے لیے بھی توقف کر سکے۔ اہلِ علم کہتے ہیں کہ عقل مندوں کو اس مہلت دینے سے دھوکا نہ کھانا چاہیے، کیوں کہ ہر اُمت کے لیے عذاب آنے کے لیے ایک وقت معین ہے، جو نہ آگے بڑھے اور نہ پیچھے ہٹے۔ امام زہری رحمہ اللہ نے کہا کہ جب اجل حاضر ہوتی ہے تو ایک دم کی بھی دیر اور جلدی نہیں ہوتی اور جب تک اجل حاضر نہیں ہوتی، تب تک اللہ تعالیٰ جس کو جس طرح چاہتا ہے تاخیر و تقدیم فرماتا ہے،[1] لیکن امام زہری رحمہ اللہ کے اس قول کا کچھ حاصل اور فائدہ نہیں ہے۔[2]

وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۝۶ لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۷ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓىِٕكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ ۝۸ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝۹

اور انھوں نے کہا: اے وہ شخص! جس پر یہ ذکر (قرآن) نازل کیا گیا ہے، یقیناً تو تو مجنون ہے ⑥ تو ہمارے پاس فرشتے کیوں نہیں لے آتا، اگر تو سچوں میں سے ہے؟ ⑦ فرشتے تو ہم صرف (عذاب) کے ساتھ نازل کرتے ہیں اور پھر اس وقت ان (کفار) کو ڈھیل نہیں دی جاتی ⑧ بے شک ہم ہی نے یہ ذکر (قرآن) نازل کیا اور بے شک ہم ہی اس کے محافظ ہیں ⑨

کفار کی ہفوات اور ان کا جواب:

اللہ تعالیٰ نے کافروں کے کفر، زیادتی وعناد اور سرکشی کی خبر دی ہے کہ وہ یہ بات کہتے ہیں کہ اے پیغمبر! تجھ پر جو یہ ذکر نازل ہوا ہے، سو تو دیوانہ ہے کہ ہمیں اپنی پیروی کی طرف بلاتا ہے اور چاہتا ہے کہ جس راہ و رسم پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے، ہم اس کو چھوڑ دیں، سو یہ ایک بڑی دیوانگی کی بات ہے اگر تو سچا ہے تو اپنی تصدیق کے لیے

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٦٦) [2] فتح البيان (٧/ ١٤٦۔ ١٤٧)

فرشتے لے آ کہ وہ تیری رسالت کے سچا ہونے پر گواہی دیں۔ یہ ویسی بات ہے، جیسے فرعون نے کہا تھا: ﴿ فَلَوْلَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ ﴾ [الزخرف: ۵۳] ''پھر اس پر سونے کے کنگن کیوں نہیں اُتارے گئے، یا اس کے ساتھ فرشتے صفیں باندھے آتے؟''

نیز فرمایا: ﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓىِٕكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ۭ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ۝۲۱ يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓىِٕكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَىِٕذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴾ [الفرقان: ۲۱۔ ۲۲] ''اور ان لوگوں نے کہا جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے: ہم پر فرشتے کیوں نہیں نازل کیے گئے یا ہم اپنے رب کو دیکھتے؟ بلاشبہہ انھوں نے اپنے نفسوں میں تکبر کیا اور بہت بڑی سرکشی کی۔ جس دن وہ فرشتوں کو دیکھیں گے اس دن مجرموں کے لیے کوئی بشارت نہیں ہوگی، اور وہ (فرشتے) کہیں گے: (تم پر جنت) ممنوع وحرام کر دی گئی ہے۔'' اسی طرح اس جگہ فرمایا کہ ہم نہیں اتارتے فرشتے مگر حق کے ساتھ اور جب فرشتے اتریں گے تو پھر مہلت نہ ملے گی۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ حق سے مراد رسالت اور عذاب ہے۔[1]

پھر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ ہمیں نے یہ ذکر اُتارا ہے اور ہمیں اس کے نگہبان ہیں، کسی قسم کے تغیر وتبدیلی سے۔ بعض نے کہا کہ ضمیر نبی مکرم ﷺ کی طرف لوٹتی ہے، یعنی ہم نبی کے محافظ ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ﴾ [المائدۃ: ۶۷] ''اور اللہ آپ کو لوگوں (کے شر) سے بچائے گا'' لیکن پہلے معنی زیادہ صحیح ہیں اور ظاہر سیاق بھی یہی ہے۔ انتھیٰ ما في تفسیر ابن کثیر.[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ کفارِ مکہ نے نبی مکرم ﷺ کو مذاق اور استہزا کے طور پر یہ خطاب کیا اور ذکر کے نازل ہونے کو تسلیم کر لینے کے بعد، حالاں کہ حقیقتاً وہ اس نزول کے سخت منکر تھے، یہ کہا کہ اے شخص! تو جو رسالت اور تبلیغِ احکام کا دعویٰ کرتا ہے تو تو کم عقل ہے، کیوں کہ اس جیسا بڑا دعویٰ کرنا ان کے نزدیک کسی ذی عقل کا کام نہ تھا۔ سو ان کا نبی کریم ﷺ کو یہ کہنا ویسا ہے، جیسا کہ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے لیے کہا تھا: ﴿ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ﴾ [الشعراء: ۲۷] ''بلاشبہہ تمھارا یہ رسول، جو تمھاری طرف بھیجا گیا ہے، یقیناً دیوانہ ہے۔'' اور کفارِ مکہ کہنے لگے تو ہمارے پاس فرشتے کیوں نہیں لایا کہ وہ تیری سچائی کے لیے گواہی دیتے یا تیری تکذیب کرنے پر ہمیں سزا دیتے، اگر تو اپنے اس دعوے میں سچا ہے؟

غرض یہ کہ انھوں نے عیب جوئی کے طور پر دو باتیں کہیں: ایک یہ کہ ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ

---

[1] تفسیر الطبري (۱۷/ ۶۸)
[2] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۷۱۲۔ ۷۱۳)

﴿ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ﴾ میں تعریض کی کہ تیرا یہ دعویٰ کہ مجھ پر قرآن اترا ہے، اس میں تو دیوانہ ہے۔ اور دوسری ﴿ لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴾ میں فرشتوں کا اترنا مانگا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی دونوں باتوں کا جواب اگلی دونوں آیتوں میں فرما دیا، لیکن نہ لف ونشر مرتب کے طریق پر، بلکہ لف ونشر غیر مرتب کے طور پر۔ ان کے اس قول: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ﴾ کا جواب اپنے اس قول میں ارشاد فرمایا: ﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴾ یعنی یہ بات سمجھ لو کہ یہ قرآن جس کے تم منکر ہو اور جس کی وجہ سے تم پیغمبر کو دیوانہ بناتے ہو اور تمھارا یہ اعتقاد ہے کہ یہ کلام پیغمبر کا اختراع کیا ہوا ہے، اس کو ہم نے اتارا ہے اور ہم اس کے محافظ ہیں ہر قسم کے امر سے، جو اس کے شایان شان نہیں، جیسے اس کی تصحیف وتحریف اور اس میں کمی اور زیادتی اور اسی طرح کی اور باتیں۔ سو قرآنِ عظیم ان سب اشیا سے محفوظ ہے۔ تمام مخلوق یعنی جن وانس میں سے کسی کی قدرت نہیں کہ اس میں ایک لفظ بڑھا یا گھٹا سکے، یا اس میں ایک کلمے کی کمی وبیشی کر سکے۔ یہ خاصا اسی کتابِ عزیز کا ہے، بہ خلاف تمام کتبِ منزلہ کے کہ ان میں سے بعض پر یہ اشیا داخل ہوئیں، لیکن قرآنِ مجید، اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کا ضامن ہے، یہ تا ابد محفوظ رہے گا اور کمی بیشی سے نگہبانی کیا ہوا ہوگا۔

یہ اس بات پر دلیل ہے کہ یہ کلام اللہ پاک کی طرف سے اترا ہے۔ اگر کسی بشر کا قول ہوتا تو اس میں کمی بیشی داخل ہو سکتی تھی، جس طرح کہ سارے کلاموں میں داخل ہو جاتی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۝ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ﴾ [حم السجدة: ٤١۔ ٤٢] ”حالانکہ بلاشبہہ یہ تو ایک بہت بلند مرتبہ کتاب ہے۔ باطل اس کے پاس پھٹک بھی نہیں سکتا، اس کے آگے سے نہ اس کے پیچھے سے، یہ بڑی حکمت والے، تعریف کیے ہوئے کی طرف سے نازل کی گئی ہے۔“

بعض نے کہا ہے کہ مراد شیاطین سے حفاظت ہے۔ یا آخر زمانے تک اس کا معجزہ ہونا ہے۔ یا یہ معارضہ سے محفوظ ہے، یعنی تمام مخلوق میں سے کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، اگرچہ اس کی چھوٹی سے چھوٹی آیت ہی کیوں نہ ہو، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ٨٨] ”کہہ دیجیے: البتہ اگر تمام انسان اور جن اس (بات) پر جمع ہو جائیں کہ اس قرآن کی مثل لائیں تو وہ اس کی مثال نہ لا سکیں گے، اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں۔“ نیز فرمایا: ﴿ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ [يونس: ٣٨] ”(اے نبی!) کہہ دیجیے: تو تم اس جیسی ایک ہی سورت لے آؤ اور (اس میں مدد کے لیے) اللہ کے سوا جن کو بلا سکتے ہو بلا لو، اگر تم سچے ہو۔“

نیز فرمایا: ﴿ فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا ﴾ [البقرة: ٢٤] ''چناں چہ اگر تم (یہ کام) نہ کر سکو اور تم کر بھی نہیں سکو گے۔'' یا اللہ تعالیٰ نے خلق کو اس کے ابطال اور اس میں خرابی پیدا کرنے سے کسی بھی وجہ سے عاجز کر دیا ہے۔ علما اور راسخین مقرر کیے، آخر زمانے تک اس کی حفاظت کرتے رہیں گے اور اس سے روکتے رہیں گے، کیوں کہ ہر زمانے میں ملحدین اور یہود و نصاریٰ اور نیچریوں کی ایک جماعت اس کلامِ پاک کے ابطال اور اس کو بگاڑنے میں مصروف رہی ہے، اس کے باوجود کسی کو اس پر قدرت نہ ہوئی۔ ولله الحمد والمنة.

ہمارے اس زمانے میں بھی ملحدین کا بڑا زور وشور ہے، وہ بھی اس قرآن کو مٹانے کے درپے ہیں، لیکن وہ اللہ کے نور کو کب بجھا سکتے ہیں جس کو اسی نے روشن کیا ہے؟! ایسے لوگوں کے حق میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ [التوبة: ٣٢] ''وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے مونہوں سے بجھا دیں اور اللہ انکار کرتا ہے، مگر یہ کہ اپنا نور پورا کرے، خواہ کافروں کو برا ہی لگے۔'' اللہ اور اس کے سچے رسول کی پیشین گوئیوں کو کہ جن کا وقوع حقیقی طور پر ہونے والا ہے، اپنی ناقص عقل کے مخالف پا کر ان کی جھوٹی تاویلیں کرتے ہیں اور پیغمبروں کے معجزوں کا انکار کر دیتے ہیں، آسمان کے وجود کے منکر ہیں، فرشتوں کا زمین پر آنا تسلیم نہیں کرتے اور سیکڑوں مسائل کہ جن سے قرآن و حدیث بھرے پڑے ہیں، ان کا انکار کرتے ہیں اور پھر اپنے آپ کو پکے دین دار اور مسلمان قرار دیتے ہیں اور ''ہمچو ما دیگرے نیست'' ان کا تکیہ کلام ہے۔

سیدنا ابو سعید خدری اور سیدنا انس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت میں اختلاف و افتراق ہوگا، ایک قوم ایسی ہوگی کہ جو باتوں میں دوسروں سے بڑھ کر ہوگی، ان کے اعمال ان کے اقوال کے مطابق نہ ہوں گے، قرآن تو پڑھیں گے، لیکن قرآن ان کے حلقوں سے بھی نہ اترے گا، دین سے ایسے نکلیں گے، جیسے تیر شکار سے نکل جاتا ہے، دین کی طرف رجوع نہ کریں گے، جب تک کہ تیر واپس نہ آ جائے۔ وہ بدترین مخلوق ہے جو ان کو مارے یا جن کو یہ مار دیں ان کے لیے خوش خبری ہے، دین کی طرف بلائیں گے، لیکن ان کا ہمارے دین میں کچھ حصہ نہیں ہے۔[1] (رواه أبو داود) یہ اس مبحث کا محل نہ تھا۔ ؎

کجا بود اشہب کجا تاختیم

آمدم بر سر مطلب اور ان کی دوسری بات کا جواب اپنے اس قول میں ارشاد فرمایا: ﴿ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْۤا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ ﴾ [الحجر: ٨] یعنی ملائکہ کا نزول حکمتِ الٰہیہ و مشیتِ ربانیہ کے تحت حق کے ساتھ ہوتا ہے اور یہ جو تم نے فرمائش کی ہے، کچھ حق نہیں ہے کہ اس کے لیے فرشتے اتریں۔ حق سے مراد قرآن ہے، یا

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧٦٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٦٦٨)

رسالت، یا موت کا وقت ہے اور اس وقت ان کفار کو ڈھیل نہیں ملے گی۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر عذاب اتارا گیا تو پھر یہ نہیں ہوگا کہ ان کو عذاب نہ ہو اور تاخیر کی جائے۔

اس صورت میں یہ جملہ مذکورہ شرط محذوف کی جزا ہوگی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے کفار پر ان کے استہزا کا انکار کیا اور فرمایا: ﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴾ فتح البیان میں آیت ﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴾ میں وہی وجوہ جو ہم نے بیان کیں ہیں، ذکر کر کے کہا: اگر آیتِ شریفہ کو ان سب معانی پر محمول کریں تو بھی کوئی مانع نہیں۔ کتابِ عزیز کی حفاظت کے اسباب میں سے ایک علوم کثیرۂ الٰہیہ کی تدوین ہے، جو کہ افساد، ابطال، تحریف، تصحیف، کمی وبیشی، انتحال (دوسروں کا کلام اپنا ظاہر کرنا) مبلغین اور جاہلین کی تاویل کے دروازوں کو بند کر دیتی ہے۔ جیسا کہ علم صرف ونحو، معانی و بیان، اصولِ حدیث، اصولِ فقہ اور تفسیر، اور ان کے سوا اور علوم کہ جن کو اس شان میں بڑا دخل ہے۔

سیدنا عیاض رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب تعالیٰ سے روایت کیا ہے کہ « نزلت علیك قرآنا لا یغسله المآء »[1] ''میں نے اے محمد! تم پر ایسی کتاب اتاری ہے کہ جس کو پانی نہیں دھوتا ہے۔'' یعنی یہ ایسی کتاب نہیں ہے کہ ایک ہی دفعہ مٹ جائے اور پھر اس کا وجود نہ رہے، بلکہ اللہ نے اس کو لوگوں کے سینوں میں رکھا ہے اور دلوں میں لکھی ہوئی ہے، وہاں سے اس کو کوئی چیز نہیں مٹا سکتی اور اس آیت میں قرآن کو جھٹلانے والوں اور رسول کے ساتھ استہزا کرنے والوں کے لیے سخت وعید ہے۔

امام خطابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو مصحف میں اس لیے جمع نہیں کیا، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض احکام اور بعض آیات کی تلاوت کے منسوخ ہو جانے کے بارے میں احکام کا انتظار رہتا تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے سبب سے نزولِ قرآن کا سلسلہ ختم ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے خلفاے راشدین کو الہام کیا، تاکہ اپنا وہ وعدہ، جو قرآن کی حفاظت کی ضمانت کے سلسلے میں کیا تھا، پورا کرے۔ سو اس کی ابتدا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے مشورہ کر کے صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر ہوئی۔

اس کا ذکر امام سیوطی رحمہ اللہ نے ''الإتقان'' میں تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔[2] اور اس جمع و تدوین کا مفصل ذکر رسالہ ''إکسیر في أصول التفسیر'' میں بھی مروی ہے۔ یہ رسالہ اپنے باب میں بے نظیر اور بے مثال ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو تسلی دی اور فرمایا کہ کفارِ ماضیہ اور پہلے منکر بھی اپنے انبیا کے ساتھ یہی معاملہ کرتے تھے اور ان کا اپنے پیغمبروں اور رسولوں کے ساتھ یہی برتاؤ تھا تو فرمایا:[3]

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۸۶۵) [2] الإتقان (۱/ ۱۶۰۔ ۱۶۶) [3] فتح البیان (۱۴۷۔ ۱۵۰)

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿١٠﴾ وَمَا يَاْتِيْهِمْ
مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿١١﴾ كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ
قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿١٢﴾ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ
الْاَوَّلِيْنَ ﴿١٣﴾

اور یقیناً آپ سے پہلے ہم کئی گروہوں میں رسول بھیج چکے ہیں ⑩ اور ان کے پاس جو بھی رسول آیا، وہ اس سے مذاق کرتے تھے ⑪ ہم اسی طرح مجرموں کے دلوں میں ہنسی مذاق ڈالتے ہیں ⑫ وہ اس (قرآن) پر ایمان نہیں لاتے اور (یہی) پہلے لوگوں کا طریقہ گزر چکا ہے ⑬

پہلی امتوں کا اپنے رسولوں کے ساتھ استہزا اور مذاق کرنا:

یعنی قرآن کسی کے دل میں حق تعالیٰ اسی طرح سناتا ہے کہ اس کے ساتھ انکار چلا آئے۔ نیک راہی اور گمراہی اسی کے اختیار میں ہے۔ انتھیٰ ما في موضح القرآن. حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم ﷺ کو کفارِ قریش کے جھٹلانے پر تسلی دی کہ ان کا یہ تکذیب کرنا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ پہلی امتوں میں سے جتنے رسول آئے تھے، ان کی اُمتوں نے بھی ان کو جھٹلایا تھا اور ان سے ہنسی، مذاق اور دل لگی کیا کرتے تھے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو فرمایا: ﴿ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ﴾ [الأحقاف: ٣٥] ''تو (اے نبی!) آپ صبر کریں جس طرح عزم و ہمت والے رسولوں نے صبر کیا اور ان کے لیے جلدی (عذاب) طلب نہ کریں۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ﴿١٢٧﴾ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ﴾ [النحل: ١٢٧۔ ١٢٨] ''اور (اے نبی!) آپ صبر کریں، اور آپ کا صبر کرنا بھی اللہ ہی کی توفیق سے ہے اور ان (کفار) پر غم نہ کھائیں اور نہ آپ اس پر تنگی میں مبتلا ہوں، جو وہ مکر (سازشیں) کرتے ہیں۔ بلاشبہ اللہ ان کے ساتھ ہے جنھوں نے پرہیز گاری کی اور وہ احسان کرتے ہوں۔''

یہ تکذیب مجرموں کے دل میں جاری کی گئی ہے، جو حق کے مخالف ہیں اور ہدایات کی پیروی کرنے سے تکبر کرتے ہیں۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ اور حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴾ میں ﴿ نَسْلُكُهٗ ﴾ کی ضمیر شرک کی طرف لوٹتی ہے۔[1] اس سے مراد شرک ہے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت اسی طرح جاری ہے کہ رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کے ساتھ ہلاکت اور تباہی کا فعل کیا جاتا ہے اور انبیا اور ان کے متبعین کو دنیا و آخرت میں نجات عطا ہوتی ہے۔

① تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٥٨)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان جیسے کافروں کی انبیا ﷺ کے ساتھ عادت اسی طرح رہی ہے کہ آپ سے پہلے جن اُمتوں میں پیغمبر آئے، وہ ان کے ساتھ استہزا کرتے رہے، جس طرح کہ یہ کفار آپ کے ساتھ استہزا کرتے ہیں تو جیسے پہلے رسولوں سے ٹھٹھہ کرنے والوں کے دلوں میں ذکر کو چلایا، ایسا ہی ان مجرموں کے دلوں میں بھی ذکر کو چلایا، یعنی ان کا استہزا اور تمسخر ہم کو تجھ پر القائے وحی سے نہیں روکتا کہ ہم ان کے عناد، شرارت اور ضد کی وجہ سے تجھ پر قرآن ہی نہ اتاریں۔ تجھ سے پہلے رسولوں کی امتیں بھی ان سے استہزا کرتے رہے، لیکن ہم نے ذکر کے نزول کو بند نہ کیا، جیسے اللہ نے فرمایا: ﴿ اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ ۝ وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ ﴾ [الزخرف: ٥۔ ٦] ''کیا پھر ہم تم سے اس بنا پر منہ موڑ کر ذکر ونصیحت روک لیں گے کہ تم حد سے گزرنے والے لوگ ہو۔ اور ہم نے پہلے لوگوں میں کتنے ہی نبی بھیجے۔''

یہ آیت قدریہ اور معتزلہ پر رد ہے اور تقدیر کے ثبوت کے لیے اس شخص کے لیے روشن دلیل ہے جو حق کو تسلیم کرنے والا ہو اور مخالف نہ ہو۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کے دلوں میں کفر کو داخل کرنے کی نسبت اپنے نفسِ مقدس کی طرف کی ہے اور اس کو اچھا کہا ہے۔ پھر جس نے قرآن کو مان لیا وہ اس کو اچھا ہی سمجھے۔[1] امام رازی رحمہ اللہ نے کہا کہ اس آیت سے اس بات پر حجت پکڑی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ باطل اور گمراہی کو کفار کے دل میں پیدا کرتا ہے۔[2]

﴿ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ﴾ میں ضمیر مجرور ذکر کی طرف لوٹتی ہے جو رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا ہے۔ یا محمد ﷺ کی طرف لوٹتی ہے۔ پہلی صورت میں ﴿ نَسْلُكُهٗ ﴾ کی ضمیر سے حال ہوگا اور دوسری صورت میں جملہ مستانفہ ہوگا، پہلے جملے کا بیان اور بعض نے کہا ہے کہ ﴿ نَسْلُكُهٗ ﴾ میں ضمیر استہزا کی طرف لوٹتی ہے اور ﴿ بِهٖ ﴾ میں ذکر کی طرف لوٹتی ہے اور یہ بعید ہے۔ اولیٰ یہی ہے کہ دونوں ضمیریں ذکر کی طرف لوٹتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی سنت پہلے لوگوں کے حق میں اسی طرح چلی آتی ہے کہ جب وہ تکذیب اور استہزا کرتے ہیں تو ان کو ہلاکت میں ڈالتا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ اگلی اُمتوں کے واقعات گزر چکے ہیں،[3] تم کو ڈرنا چاہیے کہ کہیں ویسے ہی عذاب کے مستحق تم بھی نہ ہو جاؤ۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ کی سنت اور عادت پہلے لوگوں میں یہی ہے کہ ان کے دلوں میں کفر اور ضلال چلاتا ہے۔[4] پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر پر اصرار اور تکذیب واستہزاء پر جمے رہنے کی خبر دی اور فرمایا:[5]

---

[1] تفسیر الخازن (٤/ ٥٨) [2] تفسیر الرازي (١٩/ ١٢٩) [3] تفسیر الطبري (١٧/ ٧١)

[4] معاني القرآن (٣/ ١٧٤) [5] فتح البیان (٧/ ١٥٠۔ ١٥٢)

وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَاءِ فَظَلُّوا فِيهِ يَعْرُجُونَ ﴿١٤﴾ لَقَالُوا إِنَّمَا سُكِّرَتْ أَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُورُونَ ﴿١٥﴾

اور اگر ہم ان پر آسمان سے ایک دروازہ کھول دیں، پھر وہ اس پر چڑھنے لگیں (14) تب بھی وہ یہی کہیں گے کہ ہماری تو نظریں ہی بند کر دی گئی ہیں، بلکہ ہم لوگوں پر جادو ہوا ہے (15)

کفار کا نشانیاں دیکھ کر بھی ایمان نہ لانا:

اللہ تعالیٰ ان کے کفر کے قوی ہونے اور ان کے عناد اور ان کے حق کو نہ ماننے اور حق سے مکابرہ کرنے کی خبر دیتا ہے اور فرماتا ہے کہ اگر ان کے لیے آسمان کا کوئی دروازہ کھولا جائے اور وہ اس میں چڑھنا شروع کریں، تب بھی اس کی تصدیق نہ کریں، بلکہ کہیں گے کہ ہماری نظر بند کی ہے۔ امام مجاہد، ابن کثیر اور ضحاک رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ہماری آنکھیں بند کی گئی ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ہماری آنکھیں اُچک لی گئی ہیں۔ ان کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ ہم پر شبہہ ڈالا گیا ہے اور ہم پر جادو کیا گیا ہے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہماری آنکھیں اندھی ہو گئی ہیں۔ ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہماری آنکھوں کو ہوش نہیں ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہ اگر ہم رسول اللہ ﷺ کے اُن دشمنوں پر جو آپ ﷺ کی تکذیب کرتے ہیں اور مذاق اڑاتے ہیں، آسمان کے ان دروازوں میں سے جن کا وعدہ کیا گیا ہے، ایک دروازہ کھول دیں اور اُن کو اس کی طرف چڑھنے کی طاقت بھی دے دیں اور وہ اس پر کسی آلے سے یا آلے کے بغیر چڑھ بھی جائیں اور آسمان کے اندر موجود عجائباتِ ملکوت کا مشاہدہ بھی کر لیں، جن کا انکار کوئی منکر اور دشمن بھی نہیں کر سکتا، سو اگر ایسا بھی ہو تو یہ کافر اپنی دشمنی سے یہی کہیں گے کہ ہماری نظر بند کر دی گئی ہے، ہماری آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے، بلکہ ہم پر محمد ﷺ نے جادو کر دیا ہے، ہم مسحور ہو گئے ہیں۔ اس میں کفار کے عنادِ عظیم کا بیان ہے کہ کوئی شے بھی ان کو کفر سے جدا نہیں کر سکتی، وہ کسی نشانی کو دیکھ کر اللہ، فرشتوں اور رسولوں پر ایمان نہیں لاتے، بلکہ اپنی آنکھوں کی طرف حقیقت کے معلوم نہ ہونے کی نسبت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہماری نظر بندی ہو گئی ہے، یا ہماری عقلوں پر جادو کیا گیا ہے، اس لیے ادراک ہمارا صحیح نہیں رہا۔ لہٰذا جو کوئی عیب جوئی میں اس حد تک پہنچ جاتا ہے، اسے کوئی نصیحت نفع نہیں کرتی اور نہ وہ کسی نشانی سے راہ یاب ہوتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے کافروں کے کفر اور ان کے اور اُن کے اصنام کا عجز بیان کیا تو اپنی قدرتِ باہرہ اور اپنی بدیع مخلوقات کا ذکر کیا، تا کہ اس کی وحدانیت پر دلیل لی جائے اور فرمایا:[2]

---

(1) تفسير الطبري (١٧/ ٧٤ـ ٧٥) (2) فتح البيان (٧/ ١٥٢ـ ١٥٣)

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّاظِرِينَ ﴿١٦﴾ وَحَفِظْنَاهَا مِن كُلِّ شَيْطَانٍ رَّجِيمٍ ﴿١٧﴾ إِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ مُّبِينٌ ﴿١٨﴾ وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنبَتْنَا فِيهَا مِن كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُونٍ ﴿١٩﴾ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَن لَّسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِينَ ﴿٢٠﴾

اور یقیناً ہم نے آسمان میں ستارے بنائے اور اسے ناظرین کے لیے زینت دی⑯ اور ہم نے انھیں ہر شیطان مردود سے محفوظ رکھا⑰ مگر جو چوری چھپے سنے تو چمکتا شہاب (دہکتا شعلہ) اس کا پیچھا کرتا ہے⑱ اور ہم نے زمین پھیلا دی اور اس میں پہاڑ ڈال (گاڑ) دیے اور اس میں ہر چیز مناسب مقدار میں اُگائی⑲ اور ہم نے تمھارے لیے زمین میں معاش کے اسباب بنا دیے اور ان کے لیے بھی جن کے رازق تم نہیں ہو⑳

آسمان وزمین میں قدرتِ الٰہی کی نشانیاں:

حق تعالیٰ بندوں سے ایسا خطاب کرتا ہے جو یہ سمجھیں۔ ان کے خیال میں مشرق سے مغرب تک اور مغرب سے مشرق تک بارہ برج ہیں، وہ بارہ پھانگ کی طرح ہے، جیسے خربوزہ ہوتا ہے اور سورج پورے سال میں یہ سب طے کرتا ہے۔ گرمی اور سردی کا موسم اس سے بدلتا ہے اور گرمی سے مینہ آتا ہے اور مینہ سے دنیا بستی ہے، اور آسمان کی رونق ستارے ہیں اور بچا رکھا اس کو ہر شیطان مردود سے، مگر جو چوری سے سن گیا، پس اس کے پیچھے انگارہ پڑا چمکتا ہوا۔ فرشتوں کے مشورے سننے کے لیے شیطان آسمان کے قریب جا لگتے ہیں، اوپر سے انگارے پڑتے ہیں، جو کچھ سن کر بھاگا اسے دنیا میں آ کر ایک سچ میں سو جھوٹ ملا کر ظاہر کیا۔ ایک سچی بات دیکھی تو لوگ یقین کر لیتے ہیں، سو جھوٹ دیکھے تو ان سے غفلت برتی۔ زمین کو ہم نے پھیلایا اور ڈالے اس پر بوجھ اور اس میں ہر چیز اندازے کے ساتھ اگائی اور اس میں تمھارے لیے روزیاں بنا دیں اور ان کے لیے بھی جن کو تم روزی نہیں دیتے ہو، یعنی جانوروں کی روزیاں۔ انتہیٰ ما في موضح القرآن.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ غور وفکر کرنے والوں کے لیے اپنے آسمان اور اس کے اس قدر بلند ہونے کو بیان کرتا ہے اور ان کواکب کی طرف اس میں اشارہ کرتا ہے جن کے ساتھ آسمان کو مزین کیا۔ کواکب، ثوابت اور سیارے اس شخص کے لیے جو غور وفکر کرے اور ملکوت کے عجائبات اور واضح نشانیوں پر بار بار نظر کرے تو نظر حیران رہ جاتی ہے، فکر عاجز ہو جاتی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ

سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ۝ وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ ﴾ [الملك: ٣۔ ٥] ''وہ جس نے سات آسمان اوپر نیچے پیدا کیے۔ (اے انسان!) تو رحمٰن کی تخلیق میں کوئی فرق نہیں دیکھے گا، پھر نگاہ ڈال، کیا تو کوئی دراڑ دیکھتا ہے؟ پھر بار بار نگاہ دوڑا، (تیری) نگاہ ذلیل وخوار ہو کر تیری طرف لوٹ آئے گی، جبکہ وہ تھکی ماندی ہوگی۔ اور البتہ یقیناً ہم نے آسمانِ دنیا کو چراغوں سے زینت دی ہے اور انھیں شیطانوں کو مار بھگانے کا ذریعہ بنایا ہے، اور ہم نے ان کے لیے بھڑکتی آگ کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

ایسے مضامین سے قرآنِ مجید لبریز ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴾ [البقرة: ١٦٤] ''بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے بدل بدل کر آنے جانے میں اور ان کشتیوں میں جو سمندر میں ان چیزوں کو لیے چلتی ہیں جو لوگوں کو نفع دیتی ہیں اور اللہ کے نازل کردہ آسمانی پانی میں کہ پھر اس کے ذریعے سے زمین کو جو مردہ ہو چکی تھی زندہ کیا اور ان ہر قسم کے جانوروں میں جو اس نے زمین میں پھیلائے ہیں اور ہواؤں کے پھیرنے میں اور ان بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان پابند کر دیے گئے ہیں (ان سب میں) ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں، جو عقل رکھتے ہیں۔''

نیز فرمایا: ﴿ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴾ [آل عمران: ١٩٠۔ ١٩١] ''بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش، اور رات اور دن کے اختلاف میں عقلمندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ جو لوگ کھڑے، بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں سوچ بچار کرتے ہیں۔ (وہ کہتے ہیں:) اے ہمارے رب! تو نے یہ سب کچھ بے فائدہ پیدا نہیں کیا، تو پاک ہے، پس تو ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔'' اور یہ مخلوق علوی اور سفلی حقیقت میں ایک ایسی عجیب مخلوق ہے کہ جن کی کیفیت کی دریافت سے انسان کی عقل عاجز ہے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ بروج سے مراد کواکب ہیں۔[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اس آیت کی طرح ہے: ﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ﴾ [الفرقان: ٦١]

[1] تفسیر الطبري (١٧/ ٧٧)

''وہ ذات بڑی بابرکت ہے جس نے آسمان میں ستارے بنائے اور اس میں چراغ (سورج) اور روشن چاند بنایا۔'' بعض نے کہا کہ اس جگہ بروج سے مراد سورج اور چاند کی منزلیں ہیں۔ امام عطیہ عوفی رحمہ اللہ نے کہا کہ بروج وہ قصور (محلات) ہیں، جن میں چوکی پہرہ ہے۔[1] اللہ تعالیٰ نے انگاروں کو سرکش شیطانوں کے لیے نگہبان ٹھہرایا ہے، تاکہ ملائے اعلیٰ کی بات نہ سنیں، پھر اگر کوئی شیطان چوری سے سننے کے لیے آگے بڑھتا ہے تو ایک انگارا اسے پالیتا ہے اور اگر کبھی کوئی کلمہ انگارے کے پہنچنے سے پہلے سن کر بھاگ جاتا ہے تو دوسرا شیطان جو اس سے نیچے ہے، وہ اس کلمے کو لے کر اپنے دوست دار کے پاس آتا ہے (کاہنوں میں سے جو لوگوں کو آیندہ کی خبریں بتا کر گمراہ کرتے ہیں)۔

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آسمان میں جب کوئی حکم دیتا ہے تو اس پر فرشتے تواضع اور انکساری سے اپنے پر مارتے ہیں، اس کی آواز ایسے ہوتی ہے جیسے زنجیر کسی صاف پتھر پر گرے، پھر جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ تمھارے رب نے کیا کہا؟ وہ کہتے ہیں کہ حق کہا اور وہی برتر اور بڑا ہے، اس کو بات کے چرانے والے سن بھاگتے ہیں۔ یہ بات کو چوری چھپے سننے والے اس طرح ہوتے ہیں کہ ایک دوسرے کے اوپر ہوتا ہے۔ راوی نے ہاتھ سے اس طرح بتایا کہ داہنے ہاتھ کی انگلیاں کشادہ کیں اور بعض کو بعض کے اوپر نصب کیا۔ پھر کبھی انگارا بات سننے والے کو اس سے پہلے پالیتا ہے کہ وہ اپنے ساتھی سے اس بات کا ذکر کرے اور اس سننے والے کو جلا دیتا ہے اور کبھی وہ انگارا اس کو نہیں پاتا اور وہ اپنے پاس والے کو جو نیچے ہوتا ہے، وہ بات کہہ دیتا ہے اور وہ اس بات کو زمین پر لاتا ہے۔ راوی نے کبھی یوں کہا کہ وہ زمین تک پہنچتا ہے اور ساحر یا کاہن کے منہ پر القا کرتا ہے اور وہ اس ایک بات کے ساتھ سو جھوٹ ملاتا ہے۔ اس میں سے جو بات سچی نکلتی ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ اس نے فلاں اور فلاں دن ہم کو یہ خبر نہیں دی تھی کہ ایسے ایسے ہوگا، انھوں نے اس کا کہنا سچ پایا؟ یہ وہی کلمہ ہوتا ہے جو آسمان سے سنا گیا تھا۔[2] (رواه البخاري)

پھر اللہ تعالیٰ نے یہ ذکر کیا کہ ہم نے زمین پیدا کی اور اس کو پھیلایا اور بڑھایا اور وسیع کیا اور اس میں پہاڑ رکھے اور بیابان بنائے اور زمین اور ریت رکھی اور مناسب حال کھیتی اور پھل اُگائے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ﴿ مَّوْزُوْنٍ ﴾ سے مراد معلوم ہے۔ امام سعید بن جبیر، عکرمہ، ابومالک، مجاہد، حکم بن عیینہ، حسن بن محمد، ابوصالح اور قتادہ رحمہم اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے اور بعض نے کہا کہ ﴿ مَّوْزُوْنٍ ﴾ سے مراد تقدیر کے اندازے کے مطابق ہے۔ ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ موزوں وہ چیزیں ہیں کہ جن کو بازار والے تولتے ہیں۔[3]

﴿ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ﴾ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے طرح طرح کی معیشت میں لوگوں کو تصرف دے رکھا ہے۔ ''مَعَايِشَ'' ''معيشة'' کی جمع ہے۔ ﴿ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ ﴾ میں امام مجاہد رحمہ اللہ

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٥٩) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٢٤) [3] تفسير الطبري (١٧/ ٧٩ـ ٨١)

نے کہا ہے کہ یہ چوپائے اور جانور ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ لونڈی غلام، چوپائے اور جانور ہیں۔[1] مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر یہ احسان کیا ہے کہ ہم نے تمھارے کاروبار کے اسباب اور اُن اسباب کے وجود اور معاش کی مختلف اقسام کو تم پر آسان کر دیا ہے اور چوپایوں اور جانوروں کو تمھارا مسخر کر دیا ہے کہ تم ان پر سوار ہوتے ہو اور جانوروں کو کھاتے ہو اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں سے خدمت لیتے ہو اور اُن سب کا رزق ان کے خالق پر ہے نہ کہ تم پر۔ نفع اُٹھانا تمھارے لیے ہے اور رزق دینا اللہ تعالیٰ کے ذمے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ ﴿ وَلَقَدْ جَعَلْنَا ﴾ میں "جَعَل" بہ معنی "خلق" ہے، یعنی ہم نے آسمان میں برج پیدا کیے۔ لغت میں برج محل، راستے، منزل اور قصر کو کہتے ہیں۔ یہاں بروج سے مراد سورج اور چاند اور سات سیاروں کی منزلیں ہیں۔ یہ سب بارہ برج مشہور ہیں۔ تجربہ اس پر دلیل ہے اور عرب لوگ نجوم کے ان مواقع اور منازل کی معرفت کو بہت بڑا علم شمار کرتے ہیں اور تاروں سے راستوں، اوقات، گرانی و ارزانی کے لیے دلیل لیتے ہیں، کہتے ہیں کہ آسمان میں بارہ برج ہیں، جن کے نام یہ ہیں: حمل، ثور، جوزا، سرطان، اسد، سنبلہ، میزان، عقرب، قوس، جدی، دلو اور حوت۔ طبیعت کے لحاظ سے ان میں سے ہر تین برج عناصرِ اربع میں سے ایک عنصر پر ہیں۔ یعنی علمِ نجوم میں شغل رکھنے والے حمل و اسد و قوس کو مثلثہ ناریہ کہتے ہیں اور سنبلہ، ثور اور جدی کو مثلثہ ارضیہ اور جوزا، دلو اور میزان کو مثلثہ ہوائیہ اور سرطان، عقرب اور حوت کو مثلثہ مائیہ۔ ان بروج کی تقسیم اٹھائیس منزل پر ہے، ہر برج کی دو منزلیں اور ایک تہائی منزل ہیں اور یہ بروج کواکب سبع سیارہ کی منزلیں ہیں۔ مریخ کے لیے حمل اور عقرب ہے اور زہرہ کے لیے ثور اور میزان اور عطارد کے لیے جوزا اور سنبلہ اور قمر کے لیے سرطان اور شمس کے لیے اسد اور مشتری کے لیے قوس اور حوت اور زحل کے لیے جدی اور دلو۔[3] (ذكره السيوطي)

یہ تین سو ساٹھ درجے پر منقسم ہیں۔ ہر برج کے لیے تیس درجے ہیں، جن کو سورج پورے سال میں ایک بار قطع کرتا ہے اور اسی سے فلک کا دورہ تمام ہوتا ہے اور چاند اٹھائیس دن میں ان کو قطع کرتا ہے۔ بروج اصل میں ظہور کو کہتے ہیں اور اسی سے محاورہ ہے کہ جب عورت اپنی زینت ظاہر کرتی ہے تو کہتے ہیں: "تبرج المرأة"۔ امام حسن اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ بروج سے مراد نجوم ہیں۔[4] اور ان کو بروج اس لیے کہتے ہیں کہ یہ ظاہر اور بلند ہوتے ہیں۔ امام ابو صالح رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نجوم میں سے سات سیاروں کو بروج کہتے ہیں۔ امام عطیہ عوفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آسمان میں محل ہیں جن میں نگہبان ہیں۔[5] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بروج سے مراد کواکب ہیں۔[6]

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٨٢) [2] تفسير ابن كثير (٢/ ٧١٣۔ ٧١٤) [3] تفسير الجلالين (١/ ٣٣٩)
[4] تفسير الطبري (١٧/ ٧٧) [5] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٥٩) [6] تفسير الطبري (١٧/ ٧٧)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے زینت دی ہے آسمان کو سورج، چاند، تاروں اور برجوں سے دیکھنے والوں کے لیے، یا اُن لوگوں کے لیے جو عبرت پکڑنے والے ہیں اور توحید خالق پر دلیل لینے والے ہیں، یہ معنی اس صورت میں ہے اگر لفظِ ناظرین ماخوذ ہو نظر سے، جس کے معنی ہیں استدلال، یعنی آنکھوں سے اور بصیرت سے۔ سمین میں کہا ہے کہ یہ نظر آنکھ سے ہے، یا قلب سے۔ پھر ہم نے آسمان کو شہابوں سے محفوظ کیا ہے کہ کوئی راندہ شدہ شیطان اس میں داخل نہ ہو سکے۔ ابوعبیدہ نے کہا کہ رجیم وہ ہے جو نجوم یعنی شہاب سے رجم کیا جائے،[1] جیسے اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ہے: ﴿ رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ ﴾ [الملك: ٥] ''اور انھیں شیطانوں کو مار بھگانے کا ذریعہ بنایا ہے۔''

لغت میں رجم سنگسار کرنے، پھر دور کرنے، ہٹا دینے اور لعنت کرنے کے معنی میں آتا ہے، کیوں کہ پتھر مارنا اُن معانی کا موجب ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ رجیم ملعون کے معنی میں ہے۔[2] لیکن جو شیطان چوری سے کوئی بات بغیر داخل ہوئے سن بھاگے اور یہ اس طرح کہ بعض شیطان بعض پر سوار ہو کر آسمان تک پہنچ کر فرشتوں سے چوری چھپے سنتے ہیں۔ بعض نے کہا کہ یہ استثنا متصل ہے، لیکن اول اولیٰ ہے۔ سو اس کے پیچھے چمکتا ہوا انگارا پڑتا ہے اور معنی یہ ہیں کہ ہم نے آسمان کو شیطان سے محفوظ رکھا ہے، اس لیے کہ وہ وحی سے کچھ سن نہ پائے، مگر جو چوری سے سن لے تو اس کے پیچھے ایک چمکتا ہوا انگارا لگتا ہے جو اس کو مار ڈالتا ہے، یا زخمی کر دیتا ہے، یا جلا دیتا ہے۔

﴿ شِهَابٌ ﴾ سے مراد نفسِ کوکب ہے، یا مشتعل آگ جو اسی سے نکلتی ہے جیسا کہ اس کے فرمان میں ہے: ﴿ بِشِهَابٍ قَبَسٍ ﴾ [النمل: ٧] ''سلگتا ہوا انگارا'' امام بیضاوی رحمہ اللہ کی صنیع سے معلوم ہوتا ہے کہ ﴿ شِهَابٌ ﴾ اکثر حقیقی شعلہ کے معنی میں آتا ہے اور شعلے پر اس کا اطلاق اکثر ہوتا ہے۔ شہاب کوکب کے معنی میں تو قلیل ہے۔ کوکب کو شہاب اس کی چمک کی وجہ سے کہتے ہیں کہ گویا انگارے کی طرح پر ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا کہ شہاب کے بارے میں اختلاف ہے کہ قتل کرتا ہے یا نہیں۔ سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ زخمی کر دیتا ہے، جلا دیتا ہے اور دیوانہ بنا دیتا ہے، لیکن قتل نہیں کرتا۔ امام حسن رحمہ اللہ نے اور ایک گروہ نے کہا کہ بلکہ مار ڈالتا ہے، اس بنیاد پر کہ شیاطین کا قتل چوری چھپے سنی ہوئی بات کو دوسرے کی طرف ڈالنے سے پہلے ہوتا ہے۔ پس آسمان کی خبر سوائے انبیا کے اور کسی کو نہیں پہنچتی، لہٰذا کہانت منقطع ہوگئی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ دوسروں کی طرف منتقل کرنے کے بعد مارے جاتے ہیں، امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کو امام ماوردی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔ پھر کہا ہے کہ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔[3]

اس بات میں اختلاف ہے کہ شہاب کے ساتھ مارا جانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بھی تھا یا نہیں۔ اکثر کا قول یہ ہے کہ ہاں تھا اور بعض نے کہا کہ نہیں تھا، بلکہ بعثت کے بعد شروع ہوا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ رمی (مارا جانا) نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ہے اور یہ آپ کی پیدایش کے بعد شروع ہوا ہے، کیوں کہ پرانے شعرا

---

[1] فتح القدير (٣/ ١٧٢) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٥٩) [3] تفسير القرطبي (١٠/ ١١۔ ١٢)

نے اس کا ذکر اپنے اشعار میں نہیں کیا۔① دونوں اقوال کے درمیان جمع اس طرح پر ہے کہ بعثت سے پہلے انگاروں کا چلنا موجود تھا، لیکن جب بعثت ہوئی تو اس کا اہتمام بڑھ گیا اور شدت کے ساتھ ہونے لگا اور غیب کی خبروں کی حفاظت کی خاطر آسمان کی حفاظت اور نگہبانی میں اضافہ کر دیا گیا۔ صحیح میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے، جیسے کہ اوپر گزر چکا ہے۔② بہت سے اہلِ علم نے کہا ہے کہ ہم تو تارے کا ٹوٹنا ہی دیکھتے ہیں۔ جائز ہے کہ یہ اسی طرح پر ہو۔ پھر وہ شیطان کو پا کر آگ ہو جاتا ہو، یا ہوا کی آگ سے کوئی شعلہ ان کو مارتے ہوں اور ہمارے خیال میں یہ آتا ہے کہ تارہ چلا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ہم نے پانی کے اوپر زمین کو پھیلایا اور فرش بنایا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ہے: ﴿ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴾ [النازعات: ۳۰] ''اور اس کے بعد زمین کو بچھایا۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ﴾ [الذاریات: ۴۸] ''اور ہم نے زمین کو بچھایا، تو ہم کیا ہی خوب بچھانے والے ہیں!'' اس میں اس شخص کی تردید ہے جو زمین کو گیند کی طرح بتاتا ہے۔ پھر ہم نے زمین پر پہاڑ رکھے، تاکہ وہ جنبش نہ کرے اور زمین والے ہلچل میں نہ رہیں۔ اس کا بیان سورۃ الرعد میں گزر چکا ہے۔③ اور زمین میں ہر شے اندازے سے آ گائی اور تمھارے لیے کھانے پینے اور پہننے کے اسباب بنا دیے اور اس میں تم کو مدتِ حیات تک تصرف دے دیا۔

اور ہم ان کو بھی رزق دیتے ہیں جن کو تم نہیں دیتے ہو، جیسے: تمھارے ممالیک، غلام، خادم، چوپائے اور اولاد، جن کا رازق حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہے، گو بعض لوگ یہ گمان کریں کہ وہ ان کے رازق ہیں، اپنے کسبِ معاش کی وجہ سے اور یہ معاش کا استقلال ان کو کس نے دیا اور یہ انتہا درجے کا احسان ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد پرندے ہیں اور اسی سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا ﴾ [هود: ٦] ''اور زمین پر چلنے والے ہر جاندار کا رزق اللہ کے ذمے ہے۔'' انتهیٰ ما في فتح البیان.④

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآىِٕنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۱﴾ وَاَرْسَلْنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَیْنٰكُمُوْهُ وَمَاۤ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِیْنَ ﴿۲۲﴾ وَاِنَّا لَنَحْنُ نُحْیٖ وَنُمِیْتُ وَنَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِیْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِیْنَ ﴿۲۴﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ یَحْشُرُهُمْ اِنَّهٗ حَكِیْمٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۵﴾

اور ہر چیز کے خزانے ہمارے پاس ہی ہیں، اور ہم ہر چیز معلوم مقدار ہی میں اُتارتے ہیں (21) اور ہم

① معاني القرآن (۳/ ۱۷٦) ② اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
③ رقم الآیة (۳) ④ فتح البیان (۷/ ۱۵۳۔ ۱۵۸)

نے بوجھل (بار آور) ہوائیں بھیجیں، پھر آسمان سے پانی نازل کیا، پھر وہ تمھیں پلایا، اور اس (پانی) کا ذخیرہ کرنے والے تم نہیں ہو ﴿22﴾ اور بلاشبہ ہم ہی زندگی اور موت دیتے ہیں، اور بے شک ہم ہی (سب کے) وارث ہیں ﴿23﴾ اور یقیناً ہمیں ان کا علم ہے جو تم میں سے پہلے گزر چکے اور ان کا (بھی) علم ہے جو پیچھے رہنے والے ہیں ﴿24﴾ اور (اے نبی!) بے شک آپ کا رب ہی انھیں اکٹھا کرے گا۔ بے شک وہ حکیم و علیم ہے ﴿25﴾

ہر قسم کے خزانے اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہیں:

اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ وہ ہر چیز کا مالک ہے اور ہر شے اس پر آسان ہے، اس کے پاس ہر قسم کی اشیاء کے خزانے ہیں، وہ اپنی حکمتِ بالغہ سے جس طرح چاہتا ہے ان کو اتارتا ہے۔ یہ بندوں پر اس کی رحمت ہے، اس لیے کہ ان خزائن کا اتارنا اس پر کچھ واجب نہیں، بلکہ اس نے اپنے نفسِ مبارک پر رحمت کو لکھ رکھا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ کوئی سال ایسا نہیں کہ وہ دوسرے سال سے زیادہ بارش والا ہو، لیکن اللہ تعالیٰ جہاں چاہتا ہے وہاں اس کو تقسیم کرتا ہے، پھر آیت پڑھی: ﴿ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآىِٕنُهٗ ﴾[1] (رواہ ابن جریر)

حکم بن عتیبہ رحمہ اللہ نے اللہ تعالیٰ کے اس قول ﴿ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ کوئی سال دوسرے سال سے کم یا زیادہ بارش والا نہیں ہے اور لیکن ایک قوم پر بارش برسائی جاتی ہے اور دوسری قوم کو اس سے محروم رکھا جاتا ہے، اس چیز کے ساتھ جو دریا میں ہے۔ پھر کہا ہے کہ ہم کو یہ بات پہنچی ہے کہ مینہ کے مطابق فرشتے اترتے ہیں، جو ابلیس اور آدم کی اولاد سے زیادہ ہوتے ہیں، وہ ہر قطرے کو گنتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کہاں گرے گا اور کیا اُگائے گا۔[3] سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خزانے اللہ کا کلام ہے، جب وہ کسی شے کا ارادہ کرتا ہے، کہتا ہے: ہو جا، وہ ہو جاتی ہے۔[4] (رواہ البزار)

پھر کہا ہے کہ اس کو اغلب کے سوا کسی نے روایت نہیں کیا ہے اور وہ قوی نہیں ہے۔ اس سے متقدمین میں سے بہت ساروں نے روایت بیان کی ہے، مگر اس روایت کو اس کے بیٹے کے سوا کسی نے بیان نہیں کیا ہے۔

﴿ وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ ﴾ میں "لاقحہ" کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہوائیں بادلوں کو رس بھرے کر دیتی ہیں تو وہ پانی برساتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ کے اس قول ﴿ وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ ہوا چلتی ہے، وہ آسمان سے پانی اٹھاتی ہے اور بادل کی طرح گزر جاتی ہے۔ پھر پانی برستا ہے، جیسے کہ تھن

﴿1﴾ تفسیر الطبري (١٧/ ٨٤) اس کی سند میں "یزید بن ابی زیاد" ضعیف راوی ہے۔ ﴿2﴾ تفسیر الطبري (١٧/ ٨٤)

﴿3﴾ مسند البزار (١٧/ ٣١٤) اس کی سند میں "حبان بن اغلب" اور "اغلب بن تمیم" ضعیف راوی ہیں۔

سے دودھ گرتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام ابراہیم نخعی اور قتادہ رحمہم اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ اللہ ہواؤں کو بادل پر بھیجتا ہے، وہ اس کو باردار کرتی ہیں۔ بادل پانی سے لبریز ہو جاتا ہے۔ عبید بن عمیر لیثی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہوا کو بھیجتا ہے جو جھاڑو دے کر زمین کو خوب صاف کر دیتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس ہوا کو بھیجتا ہے جو بادل کو اٹھاتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس ہوا کو بھیجتا ہے جو ایک بادل کو دوسرے بادل سے ملا دیتی ہے، پھر ان ہواؤں کو بھیجتا ہے جو درختوں کو پھل دار کر دیتی ہیں، پھر انھوں نے استشہاداً اس آیت کو پڑھا: ﴿ وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ ﴾ [1]

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ بادِ جنوب جنت سے آئی ہے، اسی کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کیا ہے اور اس میں لوگوں کے لیے منافع ہیں۔[2] (رواه ابن جرير و إسناده ضعيف) سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ کے الفاظ مرفوعاً یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جنت میں ایک ہوا دوسری ہوا کے سات برس بعد پیدا کی ہے اس کے سامنے ایک بند دروازہ ہے، تم کو اسی دروازے سے ہوا آتی ہے، اگر وہ دروازہ کھول دیا جائے تو وہ آسمان اور زمین کے درمیان سب کچھ اڑا دے۔ یہ ہوا اللہ کے نزدیک ازیب ہے اور تمھارے درمیان جنوب۔[3] پھر فرمایا کہ تم کو وہ پلایا، یعنی تمھارے واسطے میٹھا پانی اتارا جس کو تم پی سکو اور اگر ہم چاہتے تو اس کو کڑوا بنا دیتے جس کو تم پی نہ سکتے۔

اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت میں اس پر تنبیہ کی ہے، چنانچہ سورت واقعہ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ﴿68﴾ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ﴿69﴾ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ﴾ [الواقعة: ٦٨۔ ٧٠] ''بھلا بتاؤ تو وہ پانی جو تم پیتے ہو۔ کیا وہ تم نے بادلوں سے نازل کیا ہے یا ہم نازل کرنے والے ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اسے کھارا کر دیں، پھر تم شکر کیوں نہیں کرتے؟'' نیز فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ ﴾ [النحل: ١٠] ''وہی ہے جس نے آسمان سے تمھارے لیے پانی نازل کیا، اسی سے پینا ہے اور اسی سے درخت (اُگتے) ہیں جن میں تم (جانور) چراتے ہو۔''

فرمانِ باری تعالیٰ: ﴿ وَمَآ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ ﴾ میں ''خازنین'' کے معنی سفیان رحمہ اللہ نے ''مانعین'' لیے ہیں۔[1] یا یہ مراد ہو کہ تم اس کے حافظ نہیں ہو، بلکہ ہم اس کو نازل کرتے ہیں اور تم پر محفوظ رکھتے ہیں اور اس کو آبِ شیریں بناتے ہیں اور زمین میں اس کے چشمے جاری کرتے ہیں اور اس کو زمین کی نہروں میں چلاتے ہیں اور ہم اگر چاہیں تو اس کو زمین کے اندر غائب کر دیں اور باقی نہ رکھیں، جیسے سورت ملک میں فرمایا: ﴿ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٨٦۔ ٨٨)

[2] تفسير الطبري (١٧/ ٨٨) اس کی سند میں ''ابو المہزم'' اور ''عبیس بن میمون'' متروک راوی ہیں۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٣٦٥٢)

[3] سنن البيهقي الكبرىٰ (٣/ ٣٦٤) اس کی سند میں ''یزید بن جعدبہ'' ضعیف راوی ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٣٠٧٤)

غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ﴾ [الملك: ٣٠] ''کہہ دیجیے: بھلا بتاؤ تو! اگر تمھارا (کنوؤں کا) پانی گہرا ہو جائے تو تمھارے پاس نتھرا (جاری) پانی کون لائے گا؟''

لیکن یہ محض ہماری رحمت ہے کہ ہم نے میٹھا پانی اتارا اور چشموں، نہروں اور کنوؤں میں محفوظ رکھا، تا کہ تم سال بھر اس کو پیتے رہو اور اپنے جانوروں اور چوپایوں اور کھیتیوں اور پھلوں کو پلایا کرو۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول: ﴿ وَاِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ ﴾ میں اس امر کی خبر دی ہے کہ ہماری قدرت خلق کو پہلی دفعہ پیدا کرنے اور اس کو دوبارہ پیدا کرنے میں یکساں ہے۔ ہم نے خلق کو عدم سے زندہ کیا، پھر ہم نے اس کو مارا، پھر ہم حشر کے دن سب کو جمع کر کے اٹھا کھڑا کریں گے۔ ہم ہی زمین کے اور جو کچھ اس پر ہے، اس کے وارث ہیں، ہماری طرف سب رجوع کریں گے۔ پھر اپنے مکمل علم کا ذکر کیا کہ ہم کو سارے اولین اور آخرین کی خبر ہے، ہمیں ان کے سب اگلے پچھلے اعمال معلوم ہیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ ﴾

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ متقدمین وہ ہیں، جو نسل آدم علیہ السلام کی نسل سے ہلاک ہو چکے ہیں۔ متاخرین وہ ہیں جو زندہ اور باقی ہیں اور قیامت کے دن تک آتے رہیں گے۔ امام عکرمہ، مجاہد، ضحاک، قتادہ، محمد بن کعب اور شعبی رحمہم اللہ وغیرہم سے بھی اسی کے لگ بھگ مروی ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ مروان بن حکم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ کچھ لوگ عورتوں کو دیکھنے کے لیے پچھلی صفوں میں رہ جاتے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بھیجی: ﴿ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ ﴾[1]

اس کے متعلق ایک نہایت غریب حدیث بھی مروی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ایک عورت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھا کرتی تھی۔ میں نے کبھی ویسی حسین عورت نہیں دیکھی اور بعض مسلمان جب نماز پڑھتے تو آگے بڑھ جاتے، تا کہ اس کو نہ دیکھیں اور بعض پیچھے ہٹ آتے، جب سجدہ کرتے تو اس کی طرف ہاتھوں کے نیچے سے دیکھتے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، لیکن اس کی سند میں شدید نکارت ہے۔ (رواہ ابن جریر وكذا رواه أحمد وابن أبي حاتم في تفسيره و رواه الترمذي والنسائي في كتاب التفسير من سننيهما و ابن ماجه عن نوح بن قيس الحداني، وقد وثقه أحمد و أبو داود وغيرهما و حكي عن ابن معين تضعيفه وأخرج له مسلم وأهل السنن) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس حدیث میں شدید نکارت ہے۔[2]

امام ابوالجوزاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آگے بڑھنے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو صفوں میں آگے بڑھتے ہیں اور

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٩٠۔ ٩٤)

[2] تفسير الطبري (١٧/ ٩٣) مسند أحمد (١/ ٣٠٥) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٦١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٢٢) سنن النسائي، رقم الحديث (٨٧٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٠٤٦) تفسير ابن كثير (٢/ ٧١٦) امام البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث پر مفصل بحث کرتے ہوئے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٤٧٢)

ایسے ہی پیچھے رہنے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو صفوں میں پیچھے رہتے ہیں۔[1] ظاہر یہ ہے کہ یہ امام ابو الجوزاء رحمہ اللہ کا کلام ہے، اس میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ذکر نہیں ہے۔ عون بن عبداللہ رحمہ اللہ نے محمد بن کعب کے پاس اس آیت ﴿ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَأْخِرِيْنَ ﴾ کو ذکر کیا اور کہا کہ یہ آیت صفوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ محمد بن کعب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے جان رکھا ہے جو تم میں سے مقتول ہوئے اور مر چکے ہیں اور ہم جانتے ہیں پیچھے رہنے والوں کو جو ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے اور تیرا رب ہی ان کو اکٹھا کرے گا، وہی حکمتوں والا خبر دار ہے۔ عون رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ (تجھے زیادہ) توفیق دے اور بہتر جزا دے![2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ آیت ﴿ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ ﴾ میں ﴿ اِنْ ﴾ نافیہ ہے اور ﴿ مِنْ ﴾ (جو شے پر، جو امورِ عامہ سے ہے، داخل ہوا ہے) میں زیادہ تاکید ہے اور یہ ترکیب زیادہ عام ہے، اس لیے کہ نکرہ نفی کے سیاق میں آیا ہے ﴿ مِنْ ﴾ کے زیادہ اور شے کے لفظ کے ساتھ جو موجودات کے ہر فرد کو شامل ہے تو اس ترکیب نے یہ فائدہ دیا کہ اللہ تعالیٰ کے پاس تمام اشیاء کے خزانے موجود ہیں، کوئی چیز اس سے خارج نہیں ہے۔ خزائن خزانہ کی جمع ہے اور خزانہ اس جگہ کا نام ہے جہاں پر تمام عمدہ چیزیں محفوظ ہوں اور خزائن کے ذکر میں اس کے ہر اندازہ کی ہوئی چیز پر قادر ہونے کی تمثیل ہے اور معنی یہ ہے کہ جمیع ممکنات اس کی قدرت اور ملکیت میں ہیں کہ جن کو وہ جب چاہے اپنی مرضی کے مابق عدم سے وجود میں لاتا ہے۔

جمہور مفسرین رحمہم اللہ نے کہا کہ آیت میں خزائن سے مراد بارش ہے کہ وہ رزق اور معیشت کا سبب ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ جب سے اللہ تعالیٰ نے بارش کو اتارا ہے، اس میں کمی نہیں آئی ہے، لیکن زمین کے ایک حصے پر دوسرے کی نسبت زیادہ بارش برستی ہے، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ ﴾[3] الآية.

امام ابن الخطیب رحمہ اللہ نے کہا کہ مطر (بارش) کا بالخصوص ذکر تحکم (زبردستی) محض ہے، کیوں کہ الفاظ: ﴿ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ ﴾ میں تمام اشیا شامل ہیں، مگر جس کو دلیل نے خاص کیا ہو۔[4]

بعض نے کہا کہ خزائن سے مراد مفاتیح (کنجیاں) ہیں، یعنی کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جس کی کنجیاں ہمارے پاس آسمان پر نہیں ہیں، لیکن زیادہ صحیح عمومیت ہے، یعنی ہر موجود شے کو شامل ہے، بلکہ بعض اوقات شے کا اطلاق معدوم پر بھی ہوتا ہے اور یہ مسئلہ اس اختلاف پر مبنی ہے جو اس میں مشہور و معروف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ عرش میں ہر اس چیز کی، جیسے اللہ تعالیٰ نے بر و بحر میں پیدا کیا ہے، تصویر ہے اور یہی اس آیت کے معنی ہیں۔ امام بزار اور ابو الشیخ رحمہما اللہ

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٩٣) [2] تفسير الطبري (١٧/ ٩٠)
[3] اللباب في علوم الكتاب (١١/ ٤٤٤) [4] تفسير الطبري (١٧/ ٨٣) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٦٠)

نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے خزانے اس کا کلام ہے، جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو کہتا ہے کہ ہو جا، وہ ہو جاتی ہے۔[1]

اور ہم اتارتے ہیں ٹھہرے ہوئے اندازے پر، معنی یہ ہے کہ ان اشیاء میں کوئی چیز نہیں ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے ایجاد کیا ہو مگر وہ ایجاد مقدارِ معین کے ساتھ ملتبس ہوتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی ارادت و مشیت بندوں کی حاجت کے مطابق چاہتی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ ﴾ [الشورىٰ: ٢٧] ''اور اگر اللہ اپنے (تمام) بندوں کے لیے رزق فراغ کر دیتا تو وہ زمین میں ضرور سرکشی کرتے، لیکن وہ اس اندازے سے (رزق) نازل کرتا ہے جتنا چاہتا ہے۔''

غرض یہ کہ ہر شے کا نزول بندوں کی ضرورت کے مطابق اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تقاضے کے تحت ہوتا ہے۔ انزال کی تفسیر اعطاء، انشاء اور ایجاد کے ساتھ بھی کی ہے۔ یہ سب معانی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ ریاح ریح کی جمع ہے۔ وہ ایک لطیف جسم ہے جو (خلاء میں) پھیلا ہوا ہے اور جلدی چلنے والا ہے۔

﴿ لَوَاقِحَ ﴾ کے معنی ہے حوامل (اٹھانے والی) اس لیے کہ وہ بادل کو اٹھاتی ہیں اور جا بجا لیے پھرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا ﴾ [الأعراف: ٥٧] ''حتی کہ جب وہ (ہوائیں) بھاری بادلوں کو اٹھاتی ہیں۔'' اور اسی طرح عرب کا قول ہے: "ناقة لاقح" یعنی ایسی اونٹنی کہ جس نے اپنے پیٹ میں بچے کو اٹھایا ہو۔ امام ازہری، فراء اور ابن قتیبہ رحمہم اللہ نے یوں ہی کہا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ ﴿ لَوَاقِحَ ﴾ کے معنی حامل کر دینے والیاں ہیں۔ امام ابن انباری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرب کہا کرتے ہیں: "أَبْقَلَ النَّبْتُ فَهُوَ بَاقِلٌ، أَيْ مُبْقِلٌ" معنی یہ ہیں کہ ہوائیں درختوں کو حمل دار اور قوی کر دیتی ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ ﴿ لَوَاقِحَ ﴾ مضاف الیہ ہے اور مضاف محذوف ہے اور معنی یہ ہے کہ ہم بھیجتے ہیں ہوائیں بوجھ والیاں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حمل والیاں، کیونکہ جب وہ بادلوں کو چوستی ہیں تو ان سے بارش نکلتی ہے، جیسے: دودھیلے جانور کا دودھ دوھا جاتا ہے۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے عرب بولتے ہیں: "رَامِحٌ" أَيْ ذُوْ رُمْحٍ یعنی برچھی والا۔ "لَابِنٌ" أَيْ ذو لبن. یعنی دودھ والا۔ "تَامِرٌ" أي ذو تمر. یعنی کھجور والا۔[2]

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہوا کو بھیجتا ہے، وہ پانی کو اٹھا لیتی ہے اور اس کے ساتھ بادل کو بوجھل کر دیتی ہے، پھر وہ برستا ہے، جیسے: دودھیلا جانور دودھ دیتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی ایسے ہی مروی ہے۔[3] عبید بن عمیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ بشارت دینے والی ہوا کو بھیجتا ہے، وہ زمین پر جھاڑو

---

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
[2] فتح القدير (٣/ ١٧٤)
[3] تفسير الطبري (١٧/ ٨٦) الدر المنثور (٥/ ٧٢)

دیتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ بادل اٹھانے والی ہوا کو بھیجتا ہے، وہ بادل اٹھاتی ہے اور ان کو تہہ بہ تہہ کر دیتی ہے۔ پھر اس ہوا کو بھیجتا ہے جو بادلوں کو ملاتی ہے اور تہہ بہ تہہ رکھتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ ﴿ لَوٰقِحَ ﴾ کو بھیجتا ہے، وہ بادل کو حامل کر دیتی ہیں، پھر بارش ہوتی ہے۔[1]

امام ابن جریر، ابن ابی الدنیا، ابو الشیخ اور دیلمی رحمہم اللہ نے ضعیف سند کے ساتھ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ جنوب کی ہوا جنت سے ہے اور یہ وہی ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں لواقح کے نام سے ذکر کیا ہے۔[2] امام ابوبکر بن عیاش رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ آسمان سے ایک بوند بھی نہیں ٹپکتی، جب تک کہ چار ہوائیں اس میں کام نہ کریں: صبا ابر کو اُبھارتی ہے، شمال اس کو یکجا فراہم کرتی ہے، جنوب اس کو برساتی ہے اور دبور اس کو متفرق کرتی ہے۔[3]

پھر اتارا ہم نے آسمان سے پانی، یعنی بادل سے۔ جو چیز تجھ سے اونچی ہو اور تجھ کو سایہ کرے وہ سماء ہے اور بعض نے کہا ہے کہ ''من جهة السماء'' مراد ہے، یعنی آسمان کی طرف سے پانی اتارا۔ پھر اس سے تم کو اور تمھارے مویشیوں اور زمین کو پلایا اور تم اس کو ذخیرہ نہیں کر سکتے، بلکہ ہم ہی اس کے خازن ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول ﴿ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآىِٕنُهٗ ﴾ میں اپنے بندوں سے اس چیز کی نفی کر دی جس کو اپنے آپ کے لیے ثابت کیا۔ بعض نے کہا ہے کہ ہمارے اتارنے کے بعد تم کو یہ قدرت کہاں ہے کہ تم پانی کو کنویں، تالاب، چشمے اور نہر میں محفوظ رکھ سکو، یہ حفاظت کرنا تو خاص ہمارا کام ہے کہ تمھاری ضرورت کے وقت کے لیے ذخیرہ رکھا ہے۔ مخلوقات میں حیات کا ایجاد کرنا اور اس سے زندگی کو سلب کر لینا ہمارا کام ہے، اور آیت: ﴿ وَاِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَنَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ ﴾ میں ''إِنَّ'' اور لام دونوں حصر کا فائدہ دے رہے ہیں۔ یعنی ہمارے سوا کسی کو یہ قدرت حاصل نہیں ہے۔ یہ زندہ کرنا اور مارنا ہمارے ہاتھ میں ہے۔

اس بیان سے غرض اللہ تعالیٰ کی اُن امور پر کمال قدرت کے بارے میں دلیل دینا ہے کہ وہ مارنے کے بعد زندہ کرنے اور اٹھا کر اکٹھا کرنے پر قادر ہے اور ہر بندے کو اس کے استحقاق اور اپنی مشیت کے تقاضے کے مطابق اس کے اعمال کی جزا دے گا۔ لہٰذا فرمایا کہ ہم ہی زمین اور جو کچھ اس پر ہے، اس کے وارث ہیں، کیوں کہ خلق کے فنا ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ ہی باقی رہے گا۔ وہ ایسا حی و قیوم ہے جس کو موت نہیں آتی اور نہ اس کی ہستی کو انقطاع لاحق ہے۔ سارے جہاں کی بازگشت اسی کی طرف ہے: ﴿ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ [آل عمران: ١٨٠] ''اور آسمانوں اور زمین کی ملکیت اللہ ہی کی ہے۔''

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٨٨) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٦١) [2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
[3] تفسير البغوي (٤/ ٣٧٥)

ہم کو علم ہے تمہارے اگلوں اور پچھلوں کا۔ بعض نے کہا ہے کہ مستقد مین سے مراد وہ لوگ ہیں کہ جن کی ولادت اور موت پہلے ہوگی اور مستاخرین سے مراد وہ کہ جن کی ولادت اور موت بعد میں ہوگی۔ بعض نے کہا ہے کہ مستقد مین سے مراد وہ لوگ ہیں کہ جو اطاعت میں متقدم ہے اور مستاخرین سے مراد وہ کہ جو اطاعت میں پیچھے ہٹتے ہیں۔ یا مستقد مین سے مراد وہ ہیں کہ جو قتال میں اگلی صفوں میں ہوتے ہیں اور مستاخرین سے مراد وہ ہیں کہ جو قتال میں پیچھے رہتے ہیں۔ یا مستقد مین سے وہ امتیں مراد ہیں کہ جو محمد ﷺ سے پہلے گزر چکی ہیں اور مستاخرین سے مراد امتِ محمدیہ ہے قیامت تک۔ یا مستقد مین سے مراد وہ ہیں کہ جو جہاد کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش کریں اور مستاخرین سے مراد وہ ہیں کہ جو غازی بنیں۔ یا مستقد مین سے مراد وہ ہیں کہ جو پیدا ہو چکے ہیں اور مستاخرین سے مراد جو ابھی پیدا نہیں ہوئے ہیں۔ یا مستقد مین سے مراد وہ ہیں کہ جو اسلام قبول کرنے میں پہل کرتے ہیں اور مستاخرین سے مراد جو اسلام قبول کرنے میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ بالجملہ لفظ مستقد مین اور مستاخرین نہایت وسیع مفہوم رکھتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی شانِ نزول میں روایت اوپر گزر چکی ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مستقد مین سے پہلی صفیں مراد ہیں اور مستاخرین سے پچھلی صفیں مراد ہیں۔[1] بہت سی احادیث میں مروی ہے کہ مردوں کی بہترین صف پہلی صف ہے اور بدترین صف آخری صف ہے اور عورتوں میں بہترین صف آخری صف ہے اور بدترین صف پہلی صف ہے۔[2] امام مقاتل اور عطا رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ آیت جنگ کی صفوں کے بارے میں نازل ہوئیں ہے۔[3]

امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیت میں تقدم سے مراد اطاعت میں پہل کرنا ہے اور تأخر سے مراد نافرمانی میں پیچھے رہنا ہے۔[4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مستقد مین سے وہ لوگ مراد ہیں کہ جو پہلے فوت ہو چکے ہیں اور مستاخرین سے مراد وہ جو ابھی زندہ ہیں اور فوت نہیں ہوئے۔ یہ بھی کہا ہے کہ مستقد مین سے آدم اور اس کی وہ والدہ مراد ہے جو فوت ہو چکی ہے اور مستاخرین سے مراد وہ اولاد ہے جو ابھی اپنے باپوں کی پشتوں میں ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ سے بھی ایسے ہی مروی ہے۔[5] اور جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے کہ لفظ کو ان سب معانی پر محمول کرنے میں کوئی مانع نہیں ہے۔ پھر فرمایا کہ تیرا رب ان کو گھیر لائے گا، یعنی وہی ان کو اکٹھا کرنے کا متولی ہے اور اس کے سوا کوئی اس پر قادر نہیں ہے۔

اس میں دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ محسن کو اس کے احسان کی جزا دے گا اور برائی کرنے والے کو اس کی برائی کی

---

[1] الدر المنثور (٥/ ٧٣)
[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٤٠)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٦١ـ ٢٢٦٢) فتح القدير (٣/ ١٧٧)
[4] تفسير الطبري (١٧/ ٩٣)
[5] تفسير الطبري (١٧/ ٩١) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٦٢)

سزا دے گا اور یہی اکٹھا کرنے سے مقصود ہے۔ وہی حکمتوں والا ہے، یعنی اس کی حکمتِ بالغہ کے مطابق امور جاری ہوتے ہیں۔ خبردار ہے، اس کا علم تمام اشیاء کو محیط ہے، کوئی چیز اس پر مخفی نہیں ہے اور جس کا حال یہ ہو تو جن چیزوں کو اس کے علم نے گھیر لیا ہے اور جن میں اس کا حکم جاری ہوتا ہے اُن پر اس کو کامل قدرت ہے۔ سبحانه لا إله إلا هو.[1]

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۶﴾
وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾

اور یقیناً ہم نے انسان کو سڑے گارے کی کھنکھناتی مٹی سے تخلیق کیا ہے (26) اور اس سے پہلے جنوں کو ہم نے سخت حرارت والی آگ سے تخلیق کیا (27)

انسانوں اور جنوں کی تخلیق کا تذکرہ:

مٹی کو پانی سے تر کیا اور خمیر کیا کہ کھن کھن بولنے لگی، وہی بدن ہوا انسان کا، اس کی خاصیتیں اس میں رہ گئیں، سختی اور بوجھ۔ اسی طرح گرم ہوا کی خاصیت رہی جن کی پیدایش میں، یعنی لطیف آگ ہوا ملی ہوئی۔ ابلیس بھی اسی قسم میں ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد اور قتادہ رحمہم اللہ نے کہا کہ اس جگہ ﴿ صَلْصٰلٍ ﴾ سے مراد سوکھی مٹی ہے۔[2] ظاہر یہ ہے کہ یہ آیت اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح ہے: ﴿ خَلَقَ الْاِنْسٰنَ مِنْ صَلْصٰلٍ كَالْفَخَّارِ ﴿۱۴﴾ وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ﴾ [الرحمن: ١٤۔ ١٥] ''اس نے انسان کو ٹھیکرے جیسی کھنکتی مٹی سے پیدا کیا۔ اور اس نے جن کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا۔'' امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ صَلْصٰلٍ ﴾ یعنی بدبودار۔[3] آیت کی تفسیر آیت کے ساتھ کرنا زیادہ صحیح ہے۔ ﴿ حَمَاٍ ﴾ بمعنی طین ہے اور ﴿ مَّسْنُوْنٍ ﴾ بہ معنی املس، یعنی چکنا صاف سنا ہوا گارا۔ اسی لیے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ مراد گیلی مٹی ہے۔

ان کا دوسرا اور امام مجاہد رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ ﴿ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴾ سے مراد بدبودار ہے۔[4] بعض نے کہا کہ ﴿ مَّسْنُوْنٍ ﴾ سے مراد مصبوب ہے۔ جن کو انسان سے پہلے گرم لو سے بنایا تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یعنی وہ لو جو مار ڈالتی ہے۔[5] بعض نے کہا کہ گرم ہوا، جو رات دن چلتی ہے۔ بعض نے کہا کہ جو رات کو چلے وہ سموم ہے اور جو دن میں چلے وہ حرور ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ سموم ستر اجزائے سموم سے ایک جز ہے جس سے جنوں کو پیدا کیا ہے۔ پھر آیت باب پڑھی۔ (رواه أبو داود الطيالسي)

---

(1) فتح البيان (٧/ ١٥٨۔ ١٦٢) (2) تفسير الطبري (١٧/ ٩٦) (3) تفسير الطبري (١٧/ ٩٧)
(4) تفسير الطبري (١٧/ ٨٨۔ ٩٨) (5) تفسير الطبري (١٧/ ٩٩)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جانّ کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا گیا ہے۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ عمدہ ترین آگ سے بنایا۔ عمرو بن دینار رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آتشِ شمس سے۔[1] صحیح میں مروی ہے کہ ملائکہ نور سے بنے ہیں اور جانّ مارج نار سے اور آدم اس سے جو تم سے بیان ہوا، یعنی مٹی سے۔[2] آیتِ شریف کا مقصد آدم علیہ السلام کے شرف اور بشر کی پیدائش میں شامل عناصر کی طہارت اور پاکیزگی کے متعلق آگاہ کرنا ہے۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ ہم نے انسان، یعنی آدم کو، جو اصل نوعِ بشر ہیں، صلصال سے بنایا، یعنی اس خشک خاک سے جو پانی پڑنے کے بعد سوکھ گئی ہو اور جب اس کو ہلاؤ تو کھن کھن ہو اور جب اس کو بجاؤ تو آواز کرے۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صلصال وہ مٹی ہے، جو ریت میں ملی ہو، وہ حرکت دینے سے کھنکھنائے، پھر جب اس کو آگ میں پکاؤ تو وہ ٹھیکرا ہو جائے۔ اکثر مفسرین کا یہی قول ہے۔[4] امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا کہ خاک بدبودار ہے۔ یہ خاصیت بنی آدم کی مٹی کی خاصیت ہے۔ اول ابتدا اس کی یہی تھی کہ وہ ایک مختلف اجزا والی خاک تھا، پھر اس کو پانی میں بھگویا تو وہ طین ہو گیا، پھر بدبودار ہو کر سیاہ پڑ گیا، اب ایک سنا ہوا گارا بنا، یعنی متغیر، پھر سوکھ گیا تو صلصال ہوا، انھیں اطوار و اعمال پر وہ آیات محمول ہوں گی جو آدم علیہ السلام کے اطوارِ طینہ کے حق میں وارد ہیں۔ جیسے آیت ﴿ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ﴾ [آل عمران: ٥٩] وقولہ ﴿ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ﴾ [صٓ: ٧١] یا جیسے یہ آیتِ باب کہ جس کی تفسیر الحمد للہ ہم کر رہے ہیں۔ پھر ﴿ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴾ کی تفسیر میں وہی اقوال ذکر کیے جو حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ذکر کیے ہیں۔

جمہور مفسرین کے نزدیک جانّ سے مراد جنوں کا باپ ہے۔ امام حسن، قتادہ، عطا اور مقاتل رحمہم اللہ نے کہا کہ یعنی جانّ شیطانوں کا باپ ہے اور اس کو جانّ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ آنکھوں سے پوشیدہ ہے۔[5] جنوں میں بنی آدم کی طرح مسلمان اور کافر دونوں ہوتے ہیں اور کھاتے پیتے اور جیتے اور مرتے ہیں۔ رہے شیاطین! ان میں کوئی مسلمان نہیں ہے اور نہ وہ مرتے ہیں، مگر جب ان کا باپ ابلیس مرے گا تو پھر وہ مریں گے۔[6] (ذکرہ الخازن) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ جانّ مسخ کیا ہوا جن ہے، جیسے بندر و سور مسخ کیے ہوئے انسان ہیں۔[7] یہ نارِ سموم سے پیدا ہوئے ہیں اور جن جنوں کا ذکر قرآن پاک میں ہے ان کی پیدائش مارجِ نار سے ہوئی اور ملائکہ نور سے پیدا کیے گئے ہیں۔ بالجملہ اللہ تعالیٰ نے جنوں کو آدم علیہ السلام کے پیدا کرنے سے پہلے ہوائے گرم سے پیدا کیا، جو اپنے بہت ہی باریک ہونے اور اپنی حرارت کی قوت کی وجہ سے مسام میں داخل ہو جاتی ہے۔ یہ ہوا دن کو چلتی ہے اور کبھی رات کو، ابو عبیدہ نے اسی طرح کہا ہے۔[8]

---

[1] تفسیر الطبري (١٧/ ١٠٠) تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٦٣۔ ٢٢٦٤)
[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٩٩٦)
[3] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٧١٦۔ ٧١٧)
[4] فتح القدیر (٣/ ١٧٧)
[5] فتح القدیر (٣/ ١٧٨)
[6] تفسیر الخازن (٤/ ٦٥)
[7] الدر المنثور (٥/ ٧٧)
[8] تفسیر القرطبي (١٠/ ٢٤)

امام ابو صالح رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سموم بغیر دھوئیں کے آگ ہوتی ہے، اسی سے صواعق نکلتے ہیں۔ صاعقہ آسمان اور حجاب کے درمیان ایک آگ ہے، اللہ تعالیٰ جب کوئی امر جاری کرتا ہے تو وہ آگ پردے کو پھاڑ کر جہاں حکم ہوتا ہے، وہاں گرتی ہے۔ یہ آواز جو تم سنتے ہو، اسی حجاب کا پھٹنا ہے۔[1] (قاله الخطيب) بعض نے کہ سموم نار جہنم ہے۔ یا جس سموم سے اللہ تعالیٰ نے جانّ کو پیدا کیا ہے، اس کے ستر حصے ہوں گے اور یہ دنیا والی اس کا ایک حصہ ہے، جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جو اوپر گزر چکا ہے۔ یہ دنیا کی لو ان اجزاء میں سے ایک جز ہے۔ سمین میں کہا کہ سموم وہ ہے جو زیادہ حرارت کی وجہ سے مار ڈالے، وہ گرمی سورج سے ہو یا ہوا سے یا آگ سے، کیوں کہ وہ مساموں میں گھس جاتی ہے۔ اس جگہ جنوں اور آدم کی پیدائش کا ذکر اللہ کی قدرت کے کمال کی دلیل کے طور پر ہے اور اس بات کا بیان ہے کہ جو پہلی دفعہ پیدا کرنے پر قادر ہے وہ دوسری دفعہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے۔[2]

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿٢٨﴾ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿٢٩﴾ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿٣٠﴾ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿٣١﴾ قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿٣٢﴾ قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿٣٣﴾

اور جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا: بے شک میں سڑے گارے کی کھنکھناتی مٹی سے ایک بشر تخلیق کرنے والا ہوں (28) پھر جب میں اسے درست کر لوں اور اپنی روح سے اس میں پھونک دوں تو اس کے آگے سجدہ کرتے گر پڑنا (29) پھر سارے فرشتوں نے اکٹھے سجدہ کیا (30) سوائے ابلیس کے، اس نے انکار کیا کہ سجدہ کرنے والوں کے ساتھ ہو (31) اللہ نے فرمایا: اے ابلیس! تجھے کیا ہے کہ تو سجدہ کرنے والوں کے ساتھ شامل نہ ہوا؟ (32) اس نے کہا: میں ایسا نہیں کہ ایک بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے سڑے گارے کی کھنکھناتی مٹی سے پیدا کیا (33)

تخلیقِ آدم، فرشتوں کو سجدے کا حکم اور ابلیس لعین کا انکار:

بشر وہ ہے جو بدن رکھے کہ ہاتھ سے پکڑا جائے اور ہوشیار روح رکھے۔ پہلی مخلوقات یا حیوان تھے جن کو ہوش

[1] تفسير البغوي (٤/ ٣٧٩) [2] فتح البيان (٧/ ١٦٢_ ١٦٤)

نہیں، یا فرشتے اور جن تھے جن کا بدن نہ پکڑا جائے۔ اپنی جان، یعنی خاص جس میں اللہ کی صفات کا نمونہ ہے، یعنی علم اور تدبیر اور یاد حق کی اور اللہ سے لگاؤ۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی پیدایش سے پہلے اس کا ذکر ملائکہ میں کیا اور ان کو یہ شرف بخشا کہ ملائکہ کو حکم دیا کہ ان کو سجدہ کریں۔ ابلیس نے اس سجدے سے انکار کیا۔ اس انکار کی وجہ اس کا حسد و کفر وعناد وتکبر باطل کے ساتھ فخر کرنا تھا۔ اس نے چاہا کہ سب تو سجدہ کریں اور وہ نہ کرے۔ اس نے صاف یہ کہہ دیا کہ بھلا میں اس بشر کو سجدہ کروں گا، جس کو تو نے ایک کھنکھناتے سنے ہوئے گارے سے بنایا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴾ [الأعراف: ١٢] ''وہ بولا: میں اس سے بہتر ہوں، مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا اور اسے تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔'' نیز فرمایا ﴿ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ لَىِٕنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ٦٢] ''بھلا دیکھ تو اسے جسے تو نے مجھ پر عزت دی ہے، اگر تو مجھے یومِ قیامت تک ڈھیل دے، تو تھوڑے لوگوں کے سوا میں اس کی تمام نسل کی جڑ کاٹ دوں گا۔''

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس مقام پر ایک عجیب وغریب اثر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ملائکہ پیدا کیے تو فرمایا: ﴿ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴾ [صٓ: ٧١۔ ٧٢] ''بے شک میں مٹی سے ایک انسان پیدا کرنے والا ہوں۔ چناں چہ جب میں اسے ٹھیک ٹھیک بنا دوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں، تو تم اس کے آگے سجدہ کرتے ہوئے گر پڑنا۔'' انھوں نے کہا ہم ایسا نہیں کریں گے، تب اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک آگ بھیجی، جس نے ان کو جلا دیا۔ پھر اور فرشتے پیدا کیے اور ان سے اسی طرح کہا۔ انھوں نے کہا: ﴿ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ﴾ [البقرة: ٢٨٥] ''ہم نے (حکم) سنا اور اطاعت کی۔'' مگر ابلیس نے نہ کہا کہ یہ اولینِ کفار میں سے تھا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس اثر کے ثبوت میں بُعد ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ اثر اسرائیلی ہے۔[1] واللہ أعلم.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدایش کا ذکر فرما کر وہ بیان کیا جو اس وقت واقع ہوا تھا۔ اس کی تفسیر سورت بقرہ میں گزر چکی ہے۔[2] ''نفخ'' کہتے ہیں ہوا کے جاری کرنے کو تجاوف (پیٹ) میں دوسرے جسم کو جو روکنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور ہوا سے پر ہو سکے۔ جس نے یہ کہا کہ روح ہوا کی طرح ایک لطیف جسم ہے تو اس کے

[1] تفسیر الطبري (١٧/ ١٠١) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٧١٧) [2] رقم الآیة (٣٠)

معنی ظاہر ہیں اور جس نے کہا کہ ایک جوہر مجرد ہے نہ متحیز ہے اور نہ متحیز میں اس کی حیلولت ہے۔ اس کے نزدیک ”نفخ“ کے معنی نفسِ ناطقہ کے تعلق کے لیے بدن کا تیار رہنا ہے۔ نیساپوری رحمہ اللہ نے کہا کہ اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ اس جگہ روح کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف اس کے شرف اور تکریم کے لیے ہے جیسے ناقۃ اللہ اور بیت اللہ میں ہے۔[1]

امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ روح ایک لطیف جسم ہے اور اللہ کی عادت جاری ہے کہ وہ بدن کے اندر حیات کو اس جسم کے ہمراہ پیدا کر دیتا ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ مخلوق خالق کی طرف منسوب اور مضاف ہوتا ہے، سو روح اللہ کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے، اس کو اپنے نفسِ مقدس کی طرف شرف اور تکریم کے لیے مضاف کیا ہے اور اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ﴿ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَ رُوْحٌ مِّنْهُ ﴾ [النساء: ١٧١] ”جسے اس نے مریم کی طرف ڈالا، اور وہ اس کی طرف سے ایک روح ہے۔“ اس کی تفسیر سورت نساء میں گزر چکی ہے۔[2]

امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا کہ وہاں نہ کوئی نفخ تھا اور نہ کوئی منفوخ فیہ، اور یہ تو اس چیز کے افاضے کی تمثیل ہے جس کے ساتھ بالفعل حیات ہے، اس مادہ پر جو اس حیات کو قبول کرنے والا ہے (گویا یوں فرمایا) جب میں اس کی مکمل تیاری کر لوں اور اس میں روح کا افاضہ کر دوں جس کے ساتھ حیات نصیب ہوتی ہے اور وہ روح میرا امر ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ ﴾ [بني إسرائيل: ٨٥] ”اور وہ آپ سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہیے: روح میرے رب کے حکم سے ہے۔“

﴿ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴾ میں حرفِ فا نے اس بات پر دلالت کی ہے کہ تسویہ اور نفخِ روح کے بعد بغیر تاخیر کے یہ سجدہ کرنا ان پر واجب تھا، اور اس بات پر دلیل ہے کہ جس کا حکم دیا گیا وہ حقیقی سجدہ تھا، یعنی ماتھے کا زمین پر رکھنا نہ کہ صرف جھکنا جس طرح کہ امام سیوطی رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[3] اور یہ سجدہ کرنا تحیت اور تکریم کے لیے سجدہ تھا نہ کہ سجدۂ عبادت۔ اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے کہ جس مخلوق کو چاہے اکرام کرے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ سجدہ اللہ کو تھا اور آدم علیہ السلام سجدہ کے لیے قبلہ تھا۔ یہ معنی اگرچہ صحیح ہو سکتے ہیں، لیکن ظاہر نظم قرآنی کے خلاف ہیں۔ اولیٰ وہی معنی ہیں جس پر ظاہر لفظ دلالت کرتا ہے تو پہلے معنی ہی اولیٰ ہیں۔ اور یہ خطاب ان فرشتوں سے ہے جن سے یہ فرمایا: ﴿ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا ﴾ الآية.

امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لفظِ ﴿ كُلُّهُمْ ﴾ نے اس احتمال کو زائل کر دیا کہ بعض ملائکہ نے سجدہ نہیں کیا، بلکہ ان سبھی نے سجدہ کیا، رہی یہ بات کہ یہ سجدہ ایک ہی دفعہ کیا یا ہر ایک نے ایک وقت میں کیا سو لفظِ ﴿ اَجْمَعُوْنَ ﴾ سے ظاہر ہوا کہ ایک ہی دفعہ میں یہ سجدہ واقع ہوا تھا۔ یہ سابق کلام کی وضاحت ہے۔ بعض نے کہا کہ ﴿ اَجْمَعُوْنَ ﴾ تاکید در تاکید ہے۔ اسی کو امام زجاج رحمہ اللہ نے راجح کہا ہے۔

امام نیسابوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اس لیے ہے کہ ”أَجْمع“ معرفہ ہے اور معرفہ حال واقع نہیں ہوتا ہے

---

[1] فتح القدير (٣/ ١٧٩) [2] تفسير القرطبي (١٠/ ٢٤) [3] تفسير الجلالين (١/ ٣٤٠)

اور اگر اس کا حال واقع ہونا صحیح ہو جائے تو یہ منصوب ہوتا۔[1] امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں دو تاکیدیں ہیں، تاکہ معنی ذہن میں زیادہ ثابت اور متمکن ہو جائیں اور یہ تحصیلِ حاصل نہیں ہے، اس لیے کہ ﴿ اَجْمَعُوْنَ ﴾ کی نسبت ﴿ كُلُّهُمْ ﴾ کی طرف ایسی ہے، جیسے ﴿ كُلُّهُمْ ﴾ کی نسبت اصل جملہ کی طرف۔ یا ﴿ اَجْمَعُوْنَ ﴾ اجتماع کے معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ دو تاکیدیں مبالغے اور زیادہ اہتمام کے لیے ہیں۔

پھر اللہ نے ملائکہ سے ابلیس کو مستثنیٰ کیا اور فرمایا: ﴿ اِلَّاۤ اِبْلِيْسَ ﴾۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ استثناء متصل ہے، اس لیے کہ وہ جنسِ ملائکہ سے تھا، لیکن اس نے غرور اور تکبر کی وجہ سے سجدہ نہ کیا اور آدم علیہ السلام پر حسد کیا تو اسی وجہ سے اس پر اللہ کا عذاب ثابت ہوا۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ جنس ملائکہ سے نہیں تھا، لیکن وہ ان کے ساتھ اور ان کے درمیان رہتا تھا اور اس پر ملائکہ کا نام غالب ہو گیا اور اسے بھی وہی حکم ہوا جو ملائکہ کو دیا گیا تھا تو اس اعتبار سے یہ استثناء متصل ہے۔

امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ جن تھا، ہزاروں فرشتوں کے اندر مغمور ہو گیا تھا، اس لیے تغلیباً انھیں میں گنا گیا، اس لیے کہ فرشتوں کی ایک جنس ایسی ہوتی ہے کہ جن سے اولاد ہوتی ہے، یہ ان میں سے تھا۔[3] بعض نے کہا ہے کہ یہ استثناء منقطع ہے، اس بنا پر کہ وہ نہ ملائکہ میں سے تھا اور نہ اس پر ملائکہ کا نام غالب آیا اور معنی یہ ہوئے کہ ابلیس نے سجدہ سے انکار کیا، اس پر سورت بقرہ میں کلام گزر چکا ہے۔ اس پر سورت کہف کی ایک آیت بھی دلالت کرتی ہے: ﴿ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ﴾ [الكهف: ٥٠] ''وہ جنوں میں سے تھا، چناں چہ اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔'' معنی اول کی صورت میں ﴿ اَبٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ ﴾ جملہ مستانفہ ہوگا۔ اس لیے کہ استثناء سے سجود کی کیفیت مفہوم نہیں ہے، کیوں کہ سجدہ نہ کرنا کبھی تردد کے ساتھ بھی ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے بیان کر دیا کہ شیطان کا سجدہ نہ کرنا انکار اور تکبر کی وجہ سے تھا۔

﴿ قَالَ يٰۤاِبْلِيْسُ ﴾ بھی جملہ مستانفہ ہے اور یہ خطاب شیطان کی تشریف اور تکریم کے لیے نہ تھا، بلکہ اس کی اہانت، اس کو ذلیل کرنے اور اس کو توبیخ کرنے کے لیے تھا۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اے ابلیس! تجھ کو کیا وجہ ہے کہ تو سجدہ کرنے والوں میں شامل نہیں ہوا؟ ظاہر الفاظ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے بلاواسطہ کلام کیا، کیوں کہ ابلیس نے جواب میں یہ کہا: ﴿ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ ﴾ (آیتِ باب) سو یہ قول کہ ﴿ خَلَقْتَهٗ ﴾ سامنے کا خطاب ہے نہ کہ غائبانہ۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض متکلمین کا یہ قول کہ اللہ تعالیٰ نے یہ خطاب ابلیس کو بعض رسل کی زبان پر پہنچایا ضعیف ہے۔

ساجدین سے مراد ملائکہ ہیں۔ یعنی تو جانتا ہے کہ ان ملائکہ کو کیسا شرف و درجہ و بلند مقام اور اللہ کا قرب

---

[1] فتح القدير (٣/ ١٧٩)
[2] تفسير أبي السعود (٥/ ٧٥)

حاصل ہے۔ سو جب انھوں نے سجدہ کیا تو پھر تیرا سجدہ نہ کرنا کس وجہ سے ہے؟ اس نے کہا کہ مجھے کب یہ بات لائق حال ہے کہ میں ایک بشر مخلوق کو سجدہ کروں، جس کو تو نے ایک کھنکھناتے اور سنے ہوئے گارے سے بنایا ہے۔ ابلیس کو یہ زعم ہوا کہ میں آگ کے عنصر سے پیدا کیا گیا ہوں، میرا عنصرِ اصلی اشرف ہے، کیونکہ آگ روشن ہوتی ہے، آدمی کے عنصر سے کہ وہ ایک سیاہ بدبودار مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔ اس میں اجمالی اشارہ ہے کہ شیطان آدم سے بہتر ہے۔

لٰہذا دوسری جگہ اس کی تصریح کی ہے: ﴿قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ﴾ [الأعراف: ۱۲] ''وہ بولا: میں اس سے بہتر ہوں، مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا اور اسے تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔'' تیسری جگہ کہا گیا ہے: ﴿ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا﴾ [بني إسرائيل: ٦١] ''کیا میں اسے سجدہ کروں جسے تو نے مٹی سے پیدا کیا؟'' اس خبیث ملعون نے یہ نہ جانا کہ فضیلت اسی کے لیے ہے جس کو اللہ تعالیٰ دے۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا کہ ابلیس کے کلام کا حاصل یہ تھا کہ آدمی کا بشر ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ ایک جسم کثیف (غلیظ، بھدا) ہے اور میں ایک روحِ لطیف ہوں۔ گویا اس نے یہ بات کہی کہ بشرِ جسمانی کثیف روحانی لطیف سے کم درجے اور کم رُتبے والا ہے۔ پھر اعلیٰ ادنیٰ کو کس طرح سجدہ کرے! علاوہ اس کے آدم کی پیدائش صلصال سے ہوئی ہے، جو سنے ہوئے گارے سے بنا ہے، یہ اصلیت انتہائی کمینی ہے اور ابلیس کی اصل آگ سے ہے، یہ تمام عناصر سے اشرف ہے تو ابلیس آدم سے اشرف ٹھہرا اور اشرف کے لیے یہ بات بہت قبیح ہے کہ اس کو حکم کریں کہ وہ ایک ادنیٰ کو سجدہ کرے، یہ ابلیس کے قول کا خلاصہ ہے۔ اللہ پاک نے ابلیس مردود کو یہ جواب دیا:[1]

﴿قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ۝ وَّاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْۤ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۝ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ۝﴾

اللہ نے فرمایا: پھر تو یہاں سے نکل جا، چناں چہ بلاشبہہ تو مردود ہے (34) اور بے شک تجھ پر یومِ جزا تک لعنت ہے (35) اس نے کہا: میرے رب! مجھے اس دن تک مہلت دے جب (لوگ) دوبارہ اُٹھائے جائیں (36) اللہ نے فرمایا: بے شک تو مہلت دیے جانے والوں میں سے ہے (37) مقرر وقت کے دن تک (38)

ابلیس لعین کو مہلت:

شاید یہی مراد ہو کہ انگارے پھینکتے ہیں اور زمین سے نکالا تاکہ انسان آباد ہوں۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس امر کا ذکر فرماتا ہے کہ اس نے ابلیس کو ملائے اعلیٰ سے نکلنے کا

---

[1] فتح البیان (۷/ ۱٦۵۔ ۱٦۸)

ایسا امر کیا جس کی مخالفت وممانعت محال تھی۔ اور فرمایا کہ وہ مرجوم ہوا اور اس کو لعنت لگی، جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کے ساتھ قیامت تک رہے گی، جو اس کے ساتھ متواتر چلتی جائے گی۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے ابلیس پر لعنت کی تو اس کی صورت ملائکہ کی صورت سے متغیر ہوگئی اور وہ چلا کر رویا، دنیا میں جو بھی اونچی آواز سے رونا ہے وہ اسی سے ہے۔ (رواہ ابن أبي حاتم)[1] اور جب اللہ کا غضب، جس کو کوئی پھیر نہیں سکتا پکا ہوگیا تو اس نے آدم علیہ السلام اور اُن کی اولاد کے ساتھ کمالِ حسد کی وجہ سے ''یوم البعث'' تک کی مہلت کا سوال کیا، اللہ تعالیٰ نے اس کا سوال بطورِ استدراج و امہال (مہلت دینے کے لیے) قبول فرمایا۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ﴿ فَاخْرُجْ مِنْهَا ﴾ میں ضمیر جنت، یا آسمان، یا ملائکہ کی جماعت کی طرف لوٹ رہی ہے۔ رجیم سے مراد شہابِ ثاقب کے ساتھ رجم کیا گیا، یا ملعون، مردود و مطرود ہے۔ قاموس میں ہے کہ رجم بہ معنی لعنت وشتم وطرد وہجران ہے۔[3] جزا کے دن سے مراد قیامت کا دن ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ آسمان اور زمین میں ملعون ہے اور قیامت کے دن تک اس کی لعنت کی غایت قرار دینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس وقت اس سے لعنت منقطع ہو جائے گی، بلکہ اس سے مراد ہمیشہ کے لیے بلا انقطاع لعنت ہے۔

﴿ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴾ کا ذکر مبالغہ کے لیے ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ہے: ﴿ مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ﴾ [هود: ۱۰۷] ''جب تک آسمان اور زمین (باقی) رہیں گے۔'' یا مراد یہ ہے کہ وہ جزا کے دن کے بعد ایسے عذابوں سے سزا دیا جائے گا، جو لعنت سے بھی زیادہ سخت ہوں گے، اس عذاب کے سامنے لعنت کو بھول جائے گا۔ تب ابلیس نے کہا کہ مجھ کو مہلت دے اور یوم البعث تک مجھے مت مار۔ یہ طلب اس نے اس لیے کی کہ وہ جان چکا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے عذاب کو آخرت کے دن تک موخر کر دیا ہے۔ گویا یہ دعا کی کہ وہ کبھی بھی نہ مرے، کیوں کہ جب اس کی موت قیامت تک ملتوی رہی اور یوم البعث تک مہلت دی گئی کہ وہ نفخۂ ثانیہ کا وقت ہے تو اس کے بعد نہیں مرے گا، کیوں کہ نفخۂ اولیٰ کے دن تک اگر اس کی موت منقطع رہی تو پھر اسے موت نہ آئے گی، کیوں کہ نفخۂ ثانیہ کے بعد موت نہیں ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا کہ اس سوال سے اس کا مطلب بنی آدم پر اس کے اغوا اور گمراہ کرنے کے لیے گنجایش حاصل کرنا تھا اور موت کے وقت نجات پانا تھا، کیوں کہ وقت بعث کے بعد موت نہ ہوگی۔ اللہ پاک نے پہلی بات مانی، دوسری نہ مانی۔[1]

بعض نے کہا ہے کہ اس نے عدمِ موت طلب نہیں کی، بلکہ عذاب کو قیامت تک موخر کیے جانے کی دعا کی،

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۷/ ۲۲٦٥)
[2] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۷۱۷)
[3] القاموس المحیط (۱/ ۱٤۳٥)
[4] تفسیر البیضاوي (۳/ ۳۷۰)

تاکہ دنیا میں عذاب نہ ہو۔ فرمایا: تجھ کو مہلت دی گئی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ وقت نفخۂ اولیٰ ہے، اس دن ابلیس مر جائے گا اور دونفخوں کے درمیان فاصلہ چالیس برس کا ہوگا، یہی مدت اس کے مرنے کی ہے۔ ①

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٣٩﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿٤٠﴾ قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ﴿٤١﴾ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿٤٢﴾ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٤٣﴾ لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ﴿٤٤﴾

اس نے کہا: میرے رب! مجھ کو تیرے گمراہ کرنے کے سبب یقیناً میں ان (لوگوں) کے لیے زمین میں (گناہ) خوش نما بنا دوں گا اور ان سب کو گمراہ کروں گا (39) تیرے ان بندوں کے سوا جو ان میں سے چنے ہوئے ہیں (40) اللہ نے فرمایا: یہی مجھ تک (پہنچانے والی) سیدھی راہ ہے (41) بے شک میرے بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں، مگر گمراہوں میں سے (تیرا زور اس پر چلے گا) جس نے تیری اتباع کی (42) اور یقیناً ان سب کے وعدے کی جگہ جہنم ہے (43) اس کے سات دروازے ہیں، ان (گمراہوں) میں سے ہر دروازے کے لیے ایک تقسیم شدہ حصہ ہے (44)

ابلیس کا بندوں کو گمراہ کرنے کا عزم اور عذاب کی وعید:

یعنی اللہ تعالیٰ کی بندگی سیدھی راہ ہے اور ان (اللہ تعالیٰ کی بندگی کرنے والوں) پر شیطان قابو نہیں رکھتا۔

اللہ تعالیٰ نے ابلیس کی سرکشی اور اس کے حد سے گزر جانے کی خبر دی ہے کہ اس نے کہا کہ اے رب! تو نے مجھ کو گمراہ کر دیا تو میں بھی زمین میں آدم کی اولاد کو بہاریں دکھاؤں گا، یعنی معاصی کو ان کا محبوب کر دوں گا اور گناہوں میں رغبت دلاؤں گا اور اُن کو ہر طرح پر دنیا کی طرف پھیر کر لاؤں گا اور آخرت سے غافل کر دوں گا، جس طرح کہ تو نے میرا گمراہ ہونا مقدر کر دیا ہے۔

ہاں مگر تیرے مخلص بندے کہ وہ میرے داؤں میں نہ آئیں گے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ لَىِٕنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ٦٢] ''بھلا دیکھ تو اسے جسے تو نے مجھ پر عزت دی ہے، اگر تو مجھے یومِ قیامت تک ڈھیل دے، تو تھوڑے لوگوں کے سوا

---

① تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٦٤) فتح البيان (٧/ ١٦٨۔ ١٦٩)

میں اس کی تمام نسل کی جڑ کاٹ دوں گا۔'' اللہ تعالیٰ نے اس کو ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہوئے اور وعید دیتے ہوئے فرمایا: ﴿ هٰذَا صِرٰطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴾ [آل عمران: ٥١] ''یہی سیدھا راستہ ہے۔'' یعنی تم سب کا مرجع میری طرف ہے، میں تمھارے اعمال کا بدلہ دوں گا، خیر کا خیر، شر کا شر، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ﴾ [الفجر: ١٤] ''بے شک آپ کا رب (مجرموں کی) گھات میں ہے۔''

بعض نے کہا ہے کہ اس راستے کا انجام اللہ کی طرف ہے اور اسی کی جانب اس کی انتہا ہے۔ یہی قول امام مجاہد، حسن اور قتادہ رحمہ اللہ کا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ ﴾ [النحل: ٩] ''اور سیدھی راہ اللہ ہی پر (جا پہنچتی) ہے۔'' قیس بن عبادہ، محمد بن سیرین اور قتادہ رحمہ اللہ کی آیتِ باب کی قراءت یوں ہے: ''هٰذَا صِرَاطٌ عَلِيٌّ مُسْتَقِيْمٌ'' یعنی یہ راہ ہے اونچی سیدھی، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاِنَّهٗ فِيْۤ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴾ [الزخرف: ٤] ''اور بلاشبہ وہ ہمارے پاس اصل کتاب (لوحِ محفوظ) میں، بہت بلند مرتبہ، نہایت حکمت والا ہے۔'' یعنی بلند۔ لیکن مشہور وہی پہلی قراءت ہے۔[1]

﴿ عِبَادِيْ ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے لیے ہدایت مقدر ہو چکی ہے، ان پر ابلیس کو کچھ راہ نہیں، وہ ان تک نہیں پہنچ سکتا کہ گمراہ کرے اور بہکائے۔ ہاں جو گمراہ لوگ اس کے پیرو ہوں گے، ان پر اس کا قابو چلے گا۔ یزید بن قسیط رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ پیغمبروں کی مسجدیں بستیوں سے باہر ہوتی تھیں، جب کوئی نبی چاہتا کہ اپنے رب سے کوئی بات دریافت کرے تو مسجد میں آتا اور جتنا اللہ نے لکھا ہوتا اتنی نماز پڑھتا، پھر جونسا سوال چاہتا کرتا۔ ایک نبی اپنی مسجد میں تھے، اللہ کا دشمن ابلیس آ کر ان کے اور قبلے کے درمیان بیٹھ گیا۔ نبی نے کہا: ''أعوذ باللّٰه من الشيطن الرجيم'' تین بار اسی طرح کہا، اللہ کے دشمن نے کہا: بھلا تو مجھ کو یہ تو بتا کہ تو کس طرح مجھ سے نجات پائے گا؟ نبی نے کہا: تو ہی بتا تو کس راہ سے بنی آدم پر غالب ہو جاتا ہے؟ دوبارہ یہی فرمایا اور جھگڑا شروع ہو گیا۔ نبی نے کہا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴾ (آیتِ باب)

اللہ کے دشمن نے کہا کہ یہ بات تو میں نے تیرے پیدا ہونے سے پہلے سنی ہے۔ نبی نے کہا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۚ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴾ [الأعراف: ٢٠٠] ''اور اگر آپ کو شیطان کا کوئی وسوسہ اُبھارے تو اللہ کی پناہ مانگیے، بے شک وہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔'' واللہ! میں نے جب کبھی تیری آہٹ پائی ہے تو تجھ سے اللہ کی پناہ مانگی ہے۔ اللہ کے دشمن نے کہا: تو نے سچ کہا تو اسی طرح مجھ سے نجات پاتا ہے۔ نبی نے کہا: اب تو بتا کہ تو کس طرح بنی آدم پر غالب ہوتا ہے؟ کہا میں غصے اور خواہشات کے وقت اس کو پکڑ لیتا ہوں۔[2] (رواہ ابن جریر) پھر فرمایا کہ ابلیس کے تمام متبعین کے لیے دوزخ کا وعدہ ہے، جس

[1] تفسیر الطبري (١٧/ ١٠٤) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٧١٨) [2] تفسیر الطبري (١٧/ ١٠٥)

طرح قرآن کے بارے میں کہا ہے: ﴿ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ﴾ [ھود: ۱۷] ’’اور ان گروہوں میں سے جو کوئی اس کا انکار کرے تو اس کا ٹھکانا آگ ہی ہے۔‘‘

جہنم کے سات دروازے ہیں:

پھر یہ خبر دی کہ جہنم کے سات دروازے ہیں۔ ہر دروازے کے لیے ایک حصہ ابلیس کے متبعین کے لیے تقسیم ہو چکا ہے، جس سے وہ آگ میں داخل ہوں گے، ان کو اس میں جانے کے سوا چارہ نہ ہوگا۔ أَجَارَنَا اللّٰهُ مِنْهَا. ہر کسی کا دروازے سے داخلہ اس کے عمل کے موافق ہوگا۔ وہ اپنے طبقے میں اپنے عمل کے مطابق قرار پائے گا۔ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جہنم کے دروازے اس طرح ہوں گے کہ طبقہ طبقہ اور بعض بعض کے اوپر ہوں گے۔ ان کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ جہنم کے سات دروازے ہیں، بعض بعض کے اوپر ہیں۔ پہلے بابِ اول پُر کیا جائے گا، پھر دوسرا، پھر تیسرا، یہاں تک کہ ساری جہنم بھر جائے گی۔

امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ اَبْوَابٍ ﴾ سے مراد اطباق ہیں، یعنی سات طبق اور سات منزل ایک دوسرے کے اوپر۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا کہ پہلا دروازہ جہنم ہے، پھر لظیٰ، پھر حطمہ، پھر سعیر، پھر سقر، پھر جحیم اور پھر ہاویہ۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام اعمش رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ واللہ! یہ دروازے ان کے اعمال کے مطابق ہیں۔ ان سب اقوال کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا کہ ایک دروازہ یہود کے لیے ہے اور ایک نصاریٰ کے لیے اور ایک صابئین کے لیے اور ایک مجوس کے لیے اور ایک ان لوگوں کے لیے جنھوں نے شرک کیا ہے، یہ کفارِ عرب ہیں اور ایک منافقین کے لیے اور ایک اہلِ توحید کے لیے، اہلِ توحید کے لیے اُمید ہے، یعنی نجات کی اور باقی سب کے لیے ہرگز اُمید نہیں، یعنی نجات کی۔[1] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ جہنم کے سات دروازے ہیں۔ ایک دروازہ اس کے لیے ہے جس نے میری اُمت پر تلوار اٹھائی، یا فرمایا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت پر تلوار اٹھائی۔[2] (رواہ الترمذي) سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اہلِ نار میں سے کسی کو آگ ٹخنوں تک پکڑے گی، کسی کو کمر تک اور کسی کو گلے تک، ان کے اعمال کے مطابق ان کی منازل ہوں گی تو یہی معنی ہے اللہ تعالیٰ کے اس قول کا ﴿ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ﴾[3] (رواه ابن أبي حاتم)

---

[1] تفسیر الطبري (۱۷/ ۱۰۶۔ ۱۰۷) تفسیر ابن أبي حاتم (۷/ ۲۲۶۵)

[2] سنن الترمذي، رقم الحدیث (۳۱۲۳) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ جنید رحمہ اللہ کا سماع سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ثابت نہیں ہے۔ (ضعیف الجامع، رقم الحدیث: ٤٦٦١)

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (۷/ ۲۲۶۵۔ ۲۲۶۶) تفسیر ابن کثیر (۲/ ۷۱۹) اس کی سند میں ’’سعید بن بشیر‘‘ ضعیف راوی ہے، البتہ آیت کے ذکر کے بغیر یہ روایت ’’صحیح مسلم‘‘ (رقم الحدیث: ۲۸٤٥) میں مروی ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ ﴿ بِمَآ اَغْوَیْتَنِیْ ﴾ میں حرفِ با قسم کے واسطے ہے اور ''ما'' مصدریہ ہے تو معنی یہ ہوئے کہ میں تیرے اضلال اور گمراہ کرنے کی قسم کھاتا ہوں جو تو نے مجھے گمراہ کیا۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے سورت اعراف میں اس کے سببیہ ہونے کو پسند کیا ہے اور اس کے قسمیہ ہونے کو تمریض کے صیغے کے ساتھ نقل کیا ہے۔[1] اس لیے کہ دوسرے مقام میں آیا ہے کہ اس نے اللہ کی عزت کی قسم کھائی، جیسے اللہ کا قول ہے: ﴿ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴾ [صٓ: ۸۲] ''اس نے کہا: تیری عزت کی قسم! میں ان سب کو ضرور گمراہ کروں گا۔'' فقہا رحمہم اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے ساتھ قسم کھانا صحیح ہے اور افعالِ صفات کے ساتھ قسم کھانا مختلف فیہ ہے۔ اور بعض نے ان دونوں کے درمیان فرق کیا ہے۔ حرفِ باء کے قسمیہ نہ ہونے کی علت بھی یہی ہے کہ اغواء (گمراہ کرنا) کو مقسم بہ بنانا، یعنی اغواء کے ساتھ قسم کھانا متعارف نہیں ہے۔ یہ امام کرخی رحمہ اللہ کا قول ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس جگہ شیطان کا اغواء کے ساتھ قسم کھانا، دوسری جگہ عزت کے ساتھ قسم کھانے کے منافی نہیں ہے، کیوں کہ اس کا گمراہ کرنا بھی من جملہ اللہ تعالیٰ کی عزت، غلبے اور قدرت کے ہے۔ اہلِ عراق کا قول ہے کہ صفتِ ذات، جیسے: قدرت، عظمت اور عزت کے ساتھ قسم کھانا تو یمین ہے اور صفتِ فعل جیسے رحمت، سخط کے ساتھ قسم کھانا یمین نہیں ہے۔ بعض نے کہا: اور صحیح مذہب یہ ہے کہ قسمیں عرف پر مبنی ہیں، پس جس چیز کے ساتھ لوگوں کے درمیان قسم کھانا متعارف ہو تو وہ یمین ہے اور جس کے ساتھ متعارف نہ ہو وہ یمین نہیں ہے۔

اور میں بہاریں دکھاؤں گا آخر تک جوابِ قسم ہے۔ آیتِ باب معتزلہ پر حجت ہے، ان کے عقیدہ خلقِ افعال میں۔ یعنی افعال اللہ تعالیٰ کے مخلوق نہیں ہیں، بلکہ بندے کے مخلوق ہیں۔ ان کا اس آیت کو سبب پر محمول کرنا ظاہر سے عدول (پھر جانا) ہے۔ مخلصین سے وہ لوگ مراد ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے بندوں میں سے چن لیا ہے، یا جنھوں نے خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت کی ہے اور اس عبادت سے کسی غیر کو خوش کرنے کا قصد نہیں کیا۔ یہ جو اس نے استثناء کیا اور کہا کہ تیرے چنے ہوئے بندوں پر میرا زور نہیں، یہ اس لیے کہ اس نے جان لیا کہ اس کا داؤ، وسوسہ، مکر اور حیلہ ایسے لوگوں میں کارگر نہ ہوگا اور نہ وہ اس کو اس سے قبول کریں گے۔ اخلاص کی حقیقت یہ ہے کہ کوئی شے خالص اللہ کے لیے بغیر کسی غیر کے شائبہ کے کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ یہ میری ایک سیدھی راہ ہے، اس میں کوئی کجی نہیں ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ مجھ پر حق ہے کہ میں اس راہ کی رعایت و حفاظت کروں، وہ یہ ہے کہ تجھ کو میرے بندوں پر کچھ قابو نہ ملے۔

اہلِ سنت کے نزدیک یہ کلام تشبیہ پر محمول ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا

---

[1] تفسير البيضاوي (۳/ ۹)

﴿ نَصۡرُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴾ [الروم: ٤٧] ''اور مومنوں کی مدد کرنا ہم پر لازم ہے۔'' امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ کلام وعید اور ڈانٹ ڈپٹ کے لیے ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالۡمِرۡصَادِ ﴾ [الفجر: ١٤] ''بے شک آپ کا رب (مجرموں کی) گھات میں ہے۔''[1] بعض نے کہا کہ اس کے یہ معنی ہیں کہ سیدھی راہ کا حجت اور بیان سے دکھا دینا ہمارے ذمے ہے۔ یا توفیق و ہدایت دینا۔ یا ضمیر کا لوٹنا اخلاص کی طرف ہے کہ اخلاص ایک راہ ہے میری طرف اور یہ اخلاص میری کرامت اور رحمت کی طرف پہنچا دیتا ہے۔ ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا کہ اظہر یہ ہے کہ آیتِ شریفہ ابلیس کے اس قول کا رد ہے: ﴿ لَاَقۡعُدَنَّ لَهُمۡ صِرَاطَكَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۞ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمۡ مِّنۡۢ بَيۡنِ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمِنۡ خَلۡفِهِمۡ ﴾ [الأعراف: ١٦۔ ١٧] ''تو میں ان (لوگوں کو گمراہ کرنے) کے لیے تیرے سیدھے راستے پر ضرور بیٹھوں گا۔ پھر میں ان کے سامنے سے اور ان کے پیچھے سے ان کے پاس ضرور آؤں گا۔''[2]

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تجھ کو میرے بندوں پر کچھ غلبہ نہیں ہے۔ اس جگہ بندوں سے مراد مخلصین ہیں، یعنی تو ان کو ایسے گناہوں میں نہیں ڈال سکتا کہ وہ ان معاصی کے سبب ہلاک ہو جائیں اور تائب نہ ہوں۔ آدم اور حوا علیہما السلام کا گناہ کچھ اس کے منافی نہیں ہے، اس لیے کہ توبہ کے سبب سے ان کا گناہ بخش دیا گیا تھا۔ سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ نے کہا کہ یعنی تجھ کو اِن بندوں پر ایسی قوت و قدرت نہیں ہے کہ تو ان کو ایسے گناہ میں ڈالے جس سے میرے ہاں درگزر کرنے کا امکان نہ ہو۔ یہ لوگ اللہ کے خاص بندے ہیں، جن کو اس نے ہدایت کی اور بندوں سے برگزیدہ کیا۔[3]

جہنم کے سات دروازے ہیں۔ امام خطیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس عدد کی تخصیص اس لیے کہ جہنم والے سات فرقے ہوں گے، یا سات طبقے اعضائے سبعہ کے موافق بنائے۔ اعضائے سبعہ سے آنکھ، کان، زبان، پیٹ، شرمگاہ، ہاتھ اور پاؤں مراد ہیں، کیونکہ یہی مصادرِ سیئات بھی ہیں، انہی سے اکثر خطائیں سرزد ہوتی ہیں اور یہی سات اعضاء نیت کی شرط کے ساتھ مصادرِ حسنات بھی ہیں اور نیت دل کے اعمال میں سے ہے تو ایک عضو زیادہ ہوا تو جنت کے آٹھ دروازے مقرر ہوئے۔

میں کہتا ہوں کہ اس عدد کی تخصیص کی حکمت اسی میں محصور نہیں ہے جو مذکور ہوا، لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کے علم کے سپرد کیا جائے۔ ہاں اگر کوئی صحیح حدیث اس بارے میں جنابِ رسالت مآب ﷺ سے آتی تو اس کی طرف رجوع کرنا واجب ہوتا۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ جہنم کے ابواب کا ایک حصہ وہ ہوں گے جنھوں نے اللہ کے ساتھ شرک کیا، ایک وہ جنھوں نے اللہ میں شک کیا اور ایک وہ جو اللہ سے غافل رہے۔[4] (رواه ابن مردويه و الخطيب في تاريخه) نار کی صفت اور اس کی ہولناکیوں کے بارے میں بہت سی احادیث مروی ہیں، لیکن ان کے بیان کی یہ جگہ نہیں ہے۔[5]

---

[1] تفسير البغوي (٤/ ٣٨٢) [2] تفسير أبي السعود (٥/ ٧٩) [3] تفسير البغوي (٤/ ٣٨٢)

[4] الدر المنثور (٥/ ٨٣) اس کی سند میں ''سلام'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: الموضوعات لابن الجوزي (٣/ ٢٦٥)

[5] فتح البيان (٧/ ١٦٩۔ ١٧٣)

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنّٰتٍ وَّعُيُونٍ ﴿٤٥﴾ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ ﴿٤٦﴾
وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ
مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴿٤٧﴾ لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ﴿٤٨﴾
نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿٤٩﴾ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ
الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ﴿٥٠﴾

بے شک متقی لوگ باغوں اور چشموں میں ہوں گے ﴿45﴾ (کہا جائے گا:) تم ان میں سلامتی سے با امن داخل ہو جاؤ ﴿46﴾ اور ان کے سینوں میں جو کینہ حسد ہوگا، ہم نکال دیں گے، (وہ) تختوں پر آمنے سامنے (بیٹھے) بھائی بھائی ہوں گے ﴿47﴾ انھیں نہ وہاں کوئی تھکاوٹ (تکلیف) پہنچے گی اور نہ وہاں سے نکالے جائیں گے ﴿48﴾ (اے نبی!) میرے بندوں کو خبر سنا دیجیے کہ یقیناً میں خوب بخشنے والا (اور) خوب رحم کرنے والا ہوں ﴿49﴾ اور بے شک میرا عذاب بھی بڑا دردناک عذاب ہے ﴿50﴾

اہلِ جنت کے حسد سے پاک ہو کر جنت میں جانے کا تذکرہ:

سلامتی سے داخل ہو جاؤ، یعنی کسی طرح کی بے آرامی نہیں یا سلام علیک سے کہ فرشتے ان سے کہیں گے۔ دنیا میں جو کچھ آپس میں خفگی تھی، جی صاف ہو گئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کبھی دو آدمیوں میں خفگی رہی ہے اور دونوں بہشتی ہیں، جیسے نبی ﷺ کے اصحاب۔ پھر اگلا قصہ فرمایا کہ ایک بار فرشتے اتارے، جو ایک جگہ پر خوش خبری دیتے اور دوسری جگہ پر پتھر مارتے، تاکہ معلوم ہو کہ اس کی دونوں صفتیں پوری ہیں، بندے نہ دلیر ہوں اور نہ آس توڑیں۔

اللہ تعالیٰ نے اہلِ جہنم کا ذکر کرنے کے بعد اہلِ جنت کا ذکر کیا کہ یہ لوگ باغات اور آبِ رواں کے چشموں میں ہوں گے۔ ان سے کہا جائے گا کہ تم یہاں پر آفات سے سالم ہو کر داخل ہو جاؤ، تم پر ہر قسم کے خوف سے سلامتی ہے، تم امن میں ہو تو ان نعمتوں کے منقطع ہو جانے یا اُن میں سے نکالے جانے یا اُن کے فنا ہو جانے کا ڈر نہ رکھو۔

سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اہلِ جنت بہشت میں داخل ہوں گے، دنیا کے اندر ان کے سینوں میں دشمنی اور کینہ تھا، یہاں تک کہ جب آمنے سامنے ہوں گے تو اللہ تعالیٰ اس کینے کو جو دنیا میں ان کے سینوں میں تھا نکال دے گا، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ ﴾ (آیتِ باب) [1] والقاسم بن عبدالرحمن في رواية أبي أمامة ضعيف.

ان کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ جنت میں کوئی مومن داخل نہ ہوگا، جب تک اللہ تعالیٰ اس کے

[1] تفسير الطبري (١٧/ ١٠٧) تفسير ابن كثير (٢/ ٧١٩)

سینے سے کینے کو اس طرح سے نہ نکالے، جیسے کوئی نقصان پہنچانے والا درندہ ہو۔[1] یہ اس حدیث کے موافق ہے، جو سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری میں مروی ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ ایمان والے آگ سے رہائی پائیں گے، پھر جنت اور دوزخ کے درمیان ایک پل پر روکے جائیں گے، بعض سے بعض پر کیے گئے ان مظالم کا قصاص لیا جائے گا، جو اُن کے آپس میں دنیا میں تھے، یہاں تک کہ جب وہ مہذب اور متقی بن جائیں گے، تب ان کو جنت میں داخل ہونے کا اذن دیا جائے گا۔[2]

امام محمد بن سیرین رحمہ اللہ نے کہا کہ اشتر نے سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ پر داخل ہونے کی اجازت چاہی، اس وقت ان کے پاس سیدنا طلحہ کا ایک بیٹا بیٹھا ہوا تھا، اس کو روک لیا، پھر اذن دیا۔ تو اشتر داخل ہوا۔ طلحہ کے بیٹے نے کہا: میں دیکھتا ہوں کہ تم نے مجھ کو اس شخص کے سبب سے روکا تھا، کہا: ہاں۔ کہا کہ میں خیال کرتا ہوں کہ اگر تمھارے پاس کوئی فرزندِ عثمان ہوتا تو بھی تم مجھ کو روکتے۔ کہا کہ ہاں، میں اُمید کرتا ہوں کہ میں اور عثمان رضی اللہ عنہ اُن لوگوں میں سے ہوں گے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴾[3] (رواہ ابن جریر)

ابو حبیبہ مولائے طلحہ نے کہا ہے کہ عمران بن طلحہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے، جب وہ اصحابِ جمل سے فارغ ہو چکے تھے تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ان کو مرحبا کہا اور کہا کہ میں اور تیرا باپ ان لوگوں میں سے ہوں گے کہ جن کے دلوں میں سے اللہ تعالیٰ خفگی نکال دے گا اور بھائی بھائی بنا کر تختوں پر بٹھا دے گا۔ دوسری روایت میں ہے کہ عمران بن طلحہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر اصحابِ جمل سے فارغ ہونے کے بعد داخل ہوئے تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے مرحبا کہا اور فرمایا کہ میں گمان کرتا ہوں کہ میرا اور تیرا باپ ان لوگوں میں سے ہیں کہ جن کے حق میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴾.

ابو حبیبہ نے کہا کہ دو آدمی کنارۂ بساط پر بیٹھے تھے، انھوں نے کہا ہے کہ اللہ اس سے زیادہ عادل ہے کہ کل آپ ان کو قتل کر رہے تھے اور پھر بھائی بن جاؤ۔[4] سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم یہاں سے اُٹھ جاؤ اور کسی دور دراز زمین میں چلے جاؤ۔ پھر کہا کہ وہ کون ہیں اگر میں اور طلحہ نہیں ہیں؟! ایک روایت میں اس طرح سے ہے کہ ایک ہمدانی مرد نے کھڑے ہو کر کہا: اللہ اس سے زیادہ عادل ہے۔ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے ایک ایسی چیخ ماری کہ مجھ کو گمان ہوا کہ گھر ڈھے جائے گا۔ پھر کہا: جب ہم نہیں ہیں تو پھر وہ کون ہیں؟![5] سیدنا ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یوں

---

[1] تفسیر الطبري (۱۷/ ۱۰۷) اس کی سند میں ''ابو فضالہ فرج بن فضالہ'' ضعیف راوی ہے۔

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲۳۰۸)

[3] تفسیر الطبري (۱۷/ ۱۰۹) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ محمد بن سیرین رحمہ اللہ کا سماع سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔

[4] تفسیر الطبري (۱۷/ ۱۰۸۔ ۱۰۹)

[5] تفسیر الطبري (۱۷/ ۱۰۸) مستدرك الحاكم (۲/ ۳۸۵) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

ہیں کہ یہ بات حارث اعور نے کہی تھی۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوگئے اور ایک چیز جو اُن کے ہاتھ میں تھی، اس سے اس کے سر پر مارا اور کہا: اے اعور! پھر وہ کون ہیں، اگر ہم نہیں ہیں؟![1]

امام ابراہیم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ابن جرموز قاتلِ زبیر آیا اور سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے پاس آنے کی اجازت مانگتا تھا تو علی رضی اللہ عنہ نے اس کو پہلے تو روکے رکھا، پھر اجازت دی۔ اس نے کہا: آپ اہلِ بلاد پر ظلم کرتے ہیں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا: تیرے منہ میں خاک! میں تو اُمید کرتا ہوں کہ میں، طلحہ اور زبیر ان لوگوں میں سے ہوں جن کے حق میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ ... الخ﴾'' اس کو امام ثوری رحمہ اللہ نے طریقِ جعفر بن محمد عن ابیہ عن علی سے بھی روایت کیا ہے۔[2] امام حسن بصری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اللہ کی قسم! ہم اہلِ بدر کے حق میں یہ آیت اتری: ﴿ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ ... الخ﴾[3]

کثیر نواء رحمہ اللہ نے کہا کہ میں محمد بن علی کے پاس گیا اور کہا کہ میرا دوست آپ کا دوست، میری صلح آپ کی صلح، میرا دشمن آپ کا دشمن، میری لڑائی آپ کی لڑائی ہے۔ میں تجھ کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تو ابوبکر اور عمر سے بیزار ہے؟ اس نے کہا کہ میں اس وقت بھٹک گیا تھا اور راہ پانے والوں میں سے نہ تھا۔ اے کثیر! تو دوستی کر ابوبکر اور عمر سے۔ پھر اگر اس دوستی میں تیرا کوئی نقصان ہوتا ہے تو میں اس کا ضامن ہوں۔ پھر یہ آیت پڑھی اور کہا کہ ابوبکر، عمر اور علی رضی اللہ عنہم تو تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔[4]

امام ابو صالح رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ اخوان دس شخص ہیں: سیدنا ابوبکر، عمر، عثمان، علی، طلحہ، زبیر، عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص، سعید بن زید اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم۔[5] ﴿ مُتَقٰبِلِيْنَ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ کوئی کسی کی طرف پشت پھیر کر نہ دیکھے گا۔ اس بارے میں ایک مرفوع حدیث بھی یوں مروی ہے: زید بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہم پر باہر آئے اور یہ آیت: ﴿ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴾ پڑھی اور کہا کہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہوں گے۔[6] (رواه ابن أبي حاتم)

﴿ لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ان کو بہشت میں کسی قسم کی مشقت اور ایذا نہ پہنچے گی، جیسے صحیحین میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں خدیجہ کو جنت میں ایک موتی کے

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۷۲۰)

[2] تفسیر الطبري (۱۷/ ۱۰۸) تفسیر ابن کثیر (۲/ ۷۲۰) ان دونوں سندوں میں انقطاع اور ضعف ہے۔ پہلی سند میں ''ابراہیم نخعی رحمہ اللہ''، دوسری سند میں ''جعفر بن محمد عن ابیہ'' کا سماع سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔ نیز دونوں اسناد میں ''سفیان بن وکیع'' ضعیف راوی ہے۔

[3] تفسیر الطبري (۱۷/ ۱۰۸) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ حسن بصری رحمہ اللہ کا سماع سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔

[4] تفسیر الطبري (۱۷/ ۱۱۰) اس کی سند میں ''کثیر نواء'' ضعیف راوی ہے۔ [5] الدر المنثور (۵/ ۸۵)

[6] تفسیر ابن أبي حاتم (۷/ ۲۲۶۷۔ ۲۲۶۸) المعجم الکبیر (۵/ ۲۲۰) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔

گھر کی بشارت دوں، جس میں شور ہے اور نہ تکلیف۔[1] اس جگہ سے نہ نکلنے کا ذکر تو حدیث میں مروی ہے کہ جنت والوں سے جنت میں داخلے کے بعد کہا جائے گا کہ اے اہلِ جنت! تم تندرست ہی رہو گے، بیمار نہ ہوگے، زندہ رہو گے، کبھی نہیں مرو گے، جوان رہو گے کبھی نہیں بوڑھے ہوگے، یہاں ہمیشہ رہو گے، کبھی یہاں سے نکالے نہ جاؤ گے۔[2] اللہ تعالیٰ نے سورت کہف کے آخری رکوع میں فرمایا: ﴿ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ﴾ [الكهف: ۱۰۸] ''اس حال میں کہ وہ ان میں ہمیشہ مقیم ہوں گے، وہاں سے جگہ بدلنا نہیں چاہیں گے۔''

اللہ تعالیٰ صاحبِ رحمت بھی ہے اور صاحبِ عقاب بھی:

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے صاحبِ رحمت اور صاحبِ عقاب ہونے کا ذکر کیا۔ اس آیت کے نظائر کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ یہ آیت مقامِ رجا و خوف پر دلیل ہے۔ اس کے سببِ نزول کے بارے میں مصعب بن ثابت رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ نبی مکرم ﷺ کا گزر کچھ لوگوں پر اپنے اصحاب میں سے ہوا، وہ ہنس رہے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: تم جنت و دوزخ کو یاد کرو۔ اس پر یہ آیت اتری: ﴿ نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ﴾[3] (رواه ابن أبي حاتم وهو مرسل)

ابن ابی رباح رحمہ اللہ نے ایک صحابی سے روایت کیا ہے کہ ہم پر رسول اللہ ﷺ اس دروازے سے تشریف لائے جس سے بنو شیبہ داخل ہوتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا میں تم کو نہیں دیکھتا ہوں کہ تم ہنس رہے ہو؟ پھر پشت پھیر کر چلے، یہاں تک کہ جب حطیم کے پاس پہنچے تو الٹے پاؤں لوٹے اور فرمایا: میں جب باہر نکلا تو جبریل آئے اور کہا: اے محمد! اللہ تعالیٰ تم سے کہتا ہے کہ تم میرے بندوں کو نا اُمید کرتے ہو۔ (اے نبی!) میرے بندوں کو خبر سنا دیجیے کہ یقیناً میں خوب بخشنے والا (اور) خوب رحم کرنے والا ہوں۔ اور بے شک میرا عذاب بھی بڑا دردناک عذاب ہے۔[4] (رواه ابن جرير) امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر بندہ اللہ تعالیٰ کے معاف کرنے کی مقدار کو جان جائے تو کبھی حرام سے نہ بچے اور اگر اللہ کے عذاب کی مقدار کو جان جائے تو اپنی جان کو ہلاک کر ڈالے۔[5]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جمہور صحابہ و تابعین کے قول کے مطابق متقی شخص وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی شے کو

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۳٦۰۹) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲٤۳۲) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۸۳۷)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (۷/ ۲۲٦۷) یہ روایت مرسل ہے، نیز سند میں ''موسیٰ بن عبیدہ'' ضعیف راوی ہے۔
[4] تفسير الطبري (۱۷/ ۱۱۱) اس کی سند میں ''عاصم بن عبید اللہ'' ضعیف راوی ہے۔
[5] تفسير الطبري (۱۷/ ۱۱۱) یہ روایت مرسل ہے۔

شریک کرنے سے بچتا ہے اور یہی صحیح ہے۔ بعض نے کہا کہ متقی وہ شخص ہے جو تمام گناہوں سے بچے۔ یہ جبائی اور جمہور معتزلہ کا قول ہے، لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔ ساری اُمت کا اس پر اجماع ہے کہ جنت میں داخلے کا پروانہ حاصل کرنا کفر سے بچنے کے ساتھ مشروط ہے۔

تقویٰ کے صحیح ہونے کی یہ شرط نہیں ہے کہ وہ شخص تقویٰ کی تمام قسموں کا عامل اور فاعل ہو، بلکہ جو شخص تقویٰ کے مختلف اعمال میں سے ایک عمل کو بھی بجا لاتا ہے، وہ بھی متقی ہے، جس طرح کہ ضارب وہ ہے جس نے ایک بار مارا ہے اور قاتل وہ ہے جس نے ایک بار قتل کیا ہے اور کسی چیز کے لیے اگر مختلف ذرائع اختیار کیے جاتے ہیں تو اُن ذرائع میں سے ایک ذریعے کو اختیار کرنا، اس چیز کو حاصل کرنا ہے۔ اسی تحقیق کی بنا پر یہ استدلال کیا ہے کہ امر مفیدِ تکرار نہیں ہوتا ہے۔ ہاں تقوے کے مراتب ہیں اور یہ اس کا ادنیٰ درجہ ہے، اسی لیے فرمایا ہے: ﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ [التغابن: ١٦] ''چناں چہ جہاں تک تمھاری استطاعت ہو تم اللہ سے ڈرو۔'' اور اعلیٰ درجہ یہ ہے: ﴿ اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ ﴾ [آل عمران: ١٠٢] ''اللہ سے اس طرح ڈرو جس طرح اس سے ڈرنے کا حق ہے۔''

﴿ جَنّٰتٍ ﴾ سے مراد باغات ہیں اور ﴿ عُيُوْنٍ ﴾ سے مراد نہریں۔ وہ لوگ اس عیش و آرام میں مستغرق رہیں گے۔ عبارت کی ترکیب سے یہ احتمال ہے کہ ان سب کے لیے جنات اور عیون ہیں، یا ہر ایک کے لیے چند باغ اور چشمے ہوں گے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ﴾ [الرحمن: ٤٦] ''اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈر گیا، اس کے لیے دو باغ ہیں۔'' یا ہر ایک کے لیے ایک ایک بہشت اور ایک ایک چشمہ ہو، جو اس کے محل اور سرا کے نیچے جاری ہو، جس سے وہ اور اس کے حور و غلمان اور خواصِ خانہ فائدہ اٹھائیں۔

امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ احتمال ہے کہ انھیں باغات میں سے ایک باغ ہو جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اس فرمان میں ذکر فرمایا ہے: ﴿ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ فِيْهَاۤ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ ۚ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ ۚ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ۚ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ؕ وَ لَهُمْ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَ مَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ؕ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَ سُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ ﴾ [محمد: ١٥] ''اس جنت کی صفت جس کا متقین سے وعدہ کیا گیا ہے، یہ ہے کہ اس میں (ایسے) پانی کی نہریں ہیں، جو بدلنے والا نہیں، اور ایسے دودھ کی نہریں ہیں، جس کا ذائقہ (کبھی) تبدیل نہ ہوا ہوگا، اور ایسی شراب کی نہریں ہیں، جو پینے والوں کے لیے لذیذ ہے اور صاف شفاف شہد کی نہریں ہیں، اور وہاں ان (متقین) کے لیے ہر طرح کے پھل ہوں گے اور ان کے رب کی طرف سے مغفرت ہوگی۔ (کیا یہ لوگ) ان لوگوں کے مانند ہو سکتے ہیں، جو آگ میں ہمیشہ رہنے والے ہیں اور انھیں گرم کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا، تو وہ اُن کی آنتیں ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا؟''

دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس آیت میں ﴿ عُيُوْنٍ ﴾ سے مراد چشمے ہوں جو ان نہروں کے سوا ہوں۔[1] یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ جنات اور عیون میں ہوں گے تو ان کو کس طرح کہا جائے گا کہ تم سلامتی کے ساتھ ان میں جاؤ؟ یہ سوال جمہور کی قراءت پر مبنی ہے، اس لیے کہ دخول کا امر خبر دے رہا ہے کہ وہ ان میں نہ ہوں گے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب وہ باغات میں ہوں گے تو کسی اور باغ میں جانا چاہیں گے تو جب اس کے قریب جائیں گے تو ان سے کہا جائے گا: تم اس میں امن اور سلامتی کے ساتھ جاؤ۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کہے گا، یا بعض فرشتے کہیں گے کہ تمام آفات سے سلامتی کے ساتھ اور تمام خوف والی چیزوں سے امن کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ، یہاں پر ان نعمتوں کو زوال نہیں ہوگا، یا وہ ایک دوسرے کو سلام کرتے ہوئے داخل ہوں گے، یا فرشتے ان پر سلام کریں گے، یا اللہ عزوجل سلام کرے گا۔

امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ موت سے امن میں ہوں گے، کبھی ان کو موت نہ آئے گی اور نہ وہ بوڑھے ہوں گے اور نہ وہ بیمار ہوں گے اور نہ ننگے اور بھوکے رہیں گے۔[2] جو کینہ اور عداوت اور بغض وحسد اور ہر مذموم چیز جو غل میں داخل ہے اور اُن کے دلوں میں پوشیدہ تھی، وہ ہم نکال لیں گے۔ اس کی تفسیر سورت اعراف میں گزر چکی ہے۔[3] سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اللہ کی قسم! ہم اہلِ جنت کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔[4] دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت عرب کے تین قبیلوں: بنو ہاشم، بنو تمیم اور بنو عدی اور ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے حق میں نازل ہوئی ہے۔[5]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب اہلِ جنت یکجا ہوں گے اور باہم ملاقات کریں گے، پھر جب واپس جانا چاہیں گے تو اُن میں سے ہر ایک کا تخت اس طرح گردش کرے گا کہ تخت کے سوار کا چہرہ اس شخص کے روبرو رہے گا جس کے پاس وہ تھا اور پشت اس طرف رہے گی، جدھر کو سریر چلے گا اور یہ معاملہ بہت زیادہ اُنس اور اکرام کو ظاہر کرتا ہے۔ زید بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہم پر باہر آئے اور یہ آیت پڑھ کر فرمایا کہ اہلِ جنت ایک دوسرے سے محبت کرنے والے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوں گے۔[6] (رواه الطبراني والبغوي و ابن أبي حاتم وغيرهم) اللہ تعالیٰ نے انعامات، مستلذات اور احسانات کو بیان کر کے، جن کو اپنے پاس متقین کے لیے تیار کر رکھا ہے، فرمایا: اے نبی! ان کو بتا دو کہ میں بخشنے والا مہربان ہوں۔

یا اللہ! ہم کو اپنے ان بندوں میں سے کر دے جن پر تو نے اپنی مغفرت کا فضل کیا اور تو نے ان کو اپنی وسیع

---

① تفسير الرازي (۱۹/ ۱۵۲۔ ۱۵۳) ② تفسير ابن أبي حاتم (۷/ ۲۲٦٦) ③ رقم الآية (٤٣)

④ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے "أهل الجنة" کے بجائے "أهل البدر" کے الفاظ مروی ہیں۔ دیکھیں: تفسير الطبري (۱۷/ ۱۰۸) الدر المنثور (٥/ ٨٤) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ حسن بصری رحمہ اللہ کا سماع سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔

⑤ الدر المنثور (٥/ ٨٤)

⑥ تفسير ابن أبي حاتم (۷/ ۲۲٦۷۔ ۲۲٦۸) المعجم الكبير (٥/ ۲۲۰) معجم الصحابة (۲/ ٥۳۱) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔

رحمت کے نیچے رکھا۔ آمین

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ « إِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ الرَّحْمَةَ يَوْمَ خَلَقَهَا مِائَةَ رَحْمَةٍ، فَأَمْسَكَ عِنْدَهُ تِسْعَةً وَّتِسْعِيْنَ رَحْمَةً، وَأَرْسَلَ فِيْ خَلْقِهِ كُلِّهِمْ رَحْمَةً وَاحِدَةً فَلَوْ يَعْلَمُ الْكَافِرُ كُلَّ الَّذِيْ عِنْدَ اللّٰهِ مِنْ رَّحْمَةٍ لَمْ يَيْأَسْ مِنَ الرَّحْمَةِ وَلَوْ يَعْلَمُ الْمُؤْمِنُ بِكُلِّ الَّذِيْ عِنْدَ اللّٰهِ مِنَ الْعَذَابِ لَمْ يَأْمَنْ مِنَ النَّارِ »[1] (أخرجه الشيخان وغيرهما) یعنی اللہ تعالیٰ نے سو رحمتیں پیدا کیں، ان میں سے ۹۹ رحمتیں اپنے پاس رکھیں اور ایک رحمت ساری خلق میں بھیج دی، اگر کافر جانے کہ اللہ تعالیٰ کی ساری رحمت کتنی ہے تو کبھی رحمت سے نا اُمید نہ ہو اور اگر مومن جانے کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب کتنا ہے تو دوزخ سے امن میں نہ ہو۔ اس بشارتِ عظیم کے بعد اللہ تعالیٰ نے خوف دلایا، تا کہ لوگ ڈرتے بھی رہیں یا بے خوف نہ ہو جائیں اور کہا کہ میرا عذاب دردناک ہے۔ اس خوش خبری اور ڈراوے کے جمع ہونے سے نا اُمیدی اور اُمید کی درمیانی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔

پھر اس کے بعد انبیا کے قصے بیان فرمائے، تا کہ ان قصوں کو سن کر ایسی عبادت کی طرف رغبت پیدا ہو جو کامیابی کا موجب ہے اور مصیبت سے ڈرانے کا سبب ہو۔ یہ چار قصے ہیں: ایک ابراہیم علیہ السلام کا، دوسرا لوط علیہ السلام کا، تیسرا شعیب علیہ السلام کا اور چوتھا صالح علیہ السلام کا۔ ان قصوں کی تفصیل عن قریب آئے گی، اس جگہ ابراہیم کا قصہ بیان فرمایا۔[2]

وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ ﴿51﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ ﴿52﴾ قَالُوْا لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿53﴾ قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰٓي اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ ﴿54﴾ قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ ﴿55﴾ قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّاۗلُّوْنَ ﴿56﴾

اور انھیں ابراہیم کے مہمانوں کی خبر سنا دیجیے (51) جب وہ اس کے پاس پہنچے تو انھوں نے سلام کیا، اس نے کہا: بے شک ہم تم سے ڈرتے ہیں (52) وہ بولے: ڈر مت، بے شک ہم تجھے ایک علم والے لڑکے کی بشارت دیتے ہیں (53) ابراہیم نے کہا: کیا تم مجھے بشارت دیتے ہو جب کہ مجھ پر بڑھاپا آ چکا؟ چناں چہ (اب) کس بنا پر بشارت دیتے ہو؟ (54) وہ بولے: ہم نے تجھے حق (امر واقعی) کی بشارت دی ہے، چناں چہ تو نا امیدوں میں سے نہ ہو (55) ابراہیم نے کہا: اور اپنے رب کی رحمت سے تو گمراہ لوگ ہی نا اُمید ہوتے ہیں (56)

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٠٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٥٢ـ ٢٧٥٥) [2] فتح البيان (٧/ ١٧٣ـ ١٧٨)

ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کی بشارت:

ظاہری طور پر ڈر کا کوئی سبب نہ تھا، لیکن ان کے ساتھ جو عذاب کا حکم تھا، ابراہیم علیہ السلام کے دل پر اس کا اثر ہوا، ایسا دل کی صفائی سے ہوتا ہے۔ ﴿ مَسَّنِيَ الْكِبَرُ ﴾ کہنے سے یہ معلوم ہوا کہ جو کامل انسان ہوتے ہیں وہ بھی ظاہری اسباب کے حساب سے بولتے ہیں۔ عذاب سے نڈر ہونا اور فضل سے نا اُمیدی دونوں کفر کی باتیں ہیں، یعنی آگے کی خبر اللہ کو ہے اور ایک بات پر یقین کر کے دعویٰ کرنا یہی کفر کی بات ہے، لیکن دل کے خیال پر پکڑ نہیں، جب منہ سے دعویٰ کرے تو گناہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ تم ان لوگوں کو ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کی خبر دو۔ لفظِ ﴿ ضَيْفِ ﴾ (مہمان) کا اطلاق واحد اور جمع دونوں پر آتا ہے، جیسے لفظِ زور وسفر۔ ﴿ تَوْجَلْ ﴾ کے معنی ہیں خوف کرنے والا۔ خوف کی وجہ یہ ہوئی کہ ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے کی طرف نہیں پہنچتے۔ فرشتوں نے ان کو تسلی دی اور اسحاق کی پیدائش کی بشارت دی، جس طرح کہ سورت ہود میں یہ ذکر آیا ہے۔ تب ابراہیم علیہ السلام کو تعجب ہوا کہ میں بوڑھا اور میری بیوی بڑھیا، یہ بشارت کیسی ہے؟! بشارت سنائی کہ ہم نے جو تجھ کو یہ خوش خبری دی ہے، سو ٹھیک ہے تو نا اُمید نہ ہو۔ اس وقت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ میں اللہ کی رحمت سے نا اُمید نہیں ہوتا ہوں، اگرچہ میری عمر بڑھاپے کی ہے اور میری بیوی بھی بانجھ ہوگئی ہے، کیوں کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی اس سے بھی بڑھ کر قدرت اور رحمت کا علم تھا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اس ذکر میں اُمید اور خوف جمع ہیں اور خوش خبری اور خوف کا اجتماع ہے، تا کہ لوگ جان لیں کہ اللہ تعالیٰ کی سنت اس کے بندوں میں اسی طرح جاری ہے اور چونکہ یہ قصہ مومنوں کی نجات اور کفار کی ہلاکت پر مشتمل ہے تو اس میں اللہ کے غفور و رحیم ہونے اور اس کے عذاب کا عذابِ الیم ہونے کا اثبات ہے۔ ضیف کے اصلی معنی میلان کے ہیں۔ کہا جاتا ہے: "أَضَفْتُ إِلَيْهِ" "میں اس کی طرف جھکا" اور ضیف وہ ہے جو تیرے اوپر اترے اور ضیف اصل میں مصدر ہے، اسی واسطے مفرد ہے، اگرچہ وہ فرشتے متعدد تھے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ جماعت بارہ یا دس یا تین فرشتوں کی تھی اور جبریل علیہ السلام ایک خوب صورت نوعمر لڑکے کی صورت میں تھے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے پاس اسحاق علیہ السلام اور ان کے بعد یعقوب علیہ السلام کی بشارت دے کر بھیجا اور اس لیے بھیجا کہ قومِ لوط کو ہلاک کریں۔ اس قصے کی تفصیل سورت ہود میں گزر چکی ہے۔ ضیف کو ضیف اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ مضیف کی طرف مضاف اور منسوب ہے اور اس کی جمع اضیاف، ضیوف، ضیفان ہے۔ جب فرشتے ابراہیم علیہ السلام کے گھر آئے اور سلام کہا، یعنی اسی لفظ کے ساتھ ابراہیم علیہ السلام کو دعا دی۔

شہاب میں ہے کہ احتمال ہے اس بات کا کہ سلام فعل مقدر کی وجہ سے منصوب ہو اور معنی یہ ہوں کہ ہم نے

سلام کیا سلام کرنا، یا ہم سلام کرتے ہیں سلام کرنا۔ اور ﴿ قَالُوْا ﴾ کے ساتھ بھی اس کا منصوب ہونا جائز ہے۔[1] یہاں ابراہیم علیہ السلام کا سلام کے جواب دینے کا ذکر نہیں ہے۔ اس کا ذکر سورت ہود میں اللہ تعالیٰ کے اس قول: ﴿ وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ سَلٰمٌ ﴾ [هود: ٦٩] ''اور البتہ تحقیق ہمارے قاصد (فرشتے) ابراہیم کے پاس خوش خبری لے کر آئے۔ انھوں نے کہا: (آپ پر) سلام ہو۔'' کے تحت آ چکا ہے۔ سورت ذاریات میں بھی اس کا ذکر ہے: ﴿ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ۝ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴾ [الذاریات: ٢٤۔ ٢٥] ''(اے نبی!) کیا آپ کے پاس ابراہیم کے گرامی قدر مہمانوں کی خبر آئی ہے۔ جب وہ اس کے پاس پہنچے تو انھوں نے سلام کہا، ابراہیم نے بھی کہا: (تم پر) سلام ہو، (پھر دل میں کہا تم) لوگ تو اجنبی ہو۔''

یہاں قصہ مختصر ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے گھی میں تلا ہوا بچھڑا ان کی مہمان نوازی کے لیے پیش کیا اور جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے کی طرف نہیں اٹھ رہے تو فرمایا کہ ہم کو تم سے ڈر لگتا ہے۔ اس کا ذکر سورت ہود میں گزر چکا ہے: ﴿ فَلَمَّا رَآٰ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ﴾ [هود: ٧٠] ''پھر جب اس نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ اس (بچھڑے) کی طرف نہیں پہنچے تو انھیں اجنبی سمجھا اور (دل میں) ان سے خوف محسوس کیا۔'' اور سورت ذاریات میں بھی آئے گا: ﴿ فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ۝ فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ۝ فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۭ قَالُوْا لَا تَخَفْ ۭ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴾ [الذاریات: ٢٦۔ ٢٨] ''پھر وہ اپنے اہل کی طرف بڑھا اور ایک موٹا تازہ بچھڑا (بھون کر) لے آیا۔ پھر وہ انھیں پیش کیا (اور) کہا: تم کھاتے کیوں نہیں؟ تب اس نے (دل میں) ان سے خوف محسوس کیا۔ انھوں نے کہا: تو نہ ڈر۔ اور انھوں نے اسے بڑے ذی علم بیٹے کی بشارت دی۔''

بعض نے کہا ہے کہ ان کا سلام کہنا یا بلا اجازت اندر چلے آنا ابراہیم علیہ السلام کو بُرا لگا۔ یہ دونوں قول بعید ہیں۔ پہلا اس لیے کہ ابراہیم علیہ السلام نے ان کے سلام کا جواب دیا، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے اور اگر ان کے بلاد میں سلام معروف نہ ہوتا تو ابراہیم علیہ السلام نے ان کو جواب کیوں دیا۔ اور دوسرا قول اس لیے بعید ہے کہ فرشتے ابراہیم علیہ السلام کے گھر تشریف نہیں لائے تھے، بلکہ جہاں ابراہیم علیہ السلام بیٹھا کرتے تھے وہاں آئے۔ اس بات پر سورت ذاریات کی آیت دلالت کرتی ہے: ﴿ فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ﴾ [الذاریات: ٢٦] ''پھر وہ اپنے اہل کی طرف بڑھا اور ایک موٹا تازہ بچھڑا (بھون کر) لے آیا۔'' یعنی ابراہیم علیہ السلام کا اپنے گھر کو دوڑنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اپنے گھر میں نہیں تھے اور آیت کی آیت کے ساتھ تفسیر بہتر ہے۔

فرشتوں نے کہا ہے کہ ہم سے نہ ڈر، ہم تو تجھے ایک ہوشیار لڑکے کی خوش خبری دیتے ہیں۔ یہ نہ ڈرنے کی وجہ

---

[1] حاشية الشهاب علىٰ تفسير البيضاوي (٥/ ٢٩٧)

ہے، کیوں کہ جو خوش خبری دیتا ہے، اس سے ڈرتے نہیں اور اس کا نام اسحاق علیہ السلام ہے۔ یہاں ان کا نام اور یعقوب علیہ السلام کی بشارت کا ذکر نہیں ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا: تم مجھے خوش خبری سناتے ہو، جب میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ اب کس بات کی خوش خبری دیتے ہو؟! یہ بات استفہام انکاری یا تعجب کے طور پر کہی۔ اس لیے کہ یوں ہی عادت ہے کہ جب کوئی شخص بوڑھا ہو جاتا ہے تو اس کے ہاں اولاد نہیں ہوتی ہے۔ فرشتوں نے کہا کہ ہم تجھے واقعی خوش خبری سناتے ہیں اور وہ لا محالہ ہونے والی ہے اور اس کے وقوع میں کوئی شبہہ نہیں ہے، کیوں کہ وہ اللہ کا وعدہ ہے اور وہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا ہے، اس پر کوئی چیز محال نہیں ہے۔

وہ ہر بات پر قادر ہے، آپ ہماری بشارت سے ناامید نہ ہوں، کیونکہ وہ مالک انسان کو بغیر ماں باپ کے پیدا کر سکتا ہے تو کیا بوڑھے فانی اور بڑھیا بانجھ سے پیدا نہیں کر سکتا! ابراہیم علیہ السلام کا تعجب عادت کے اعتبار سے تھا، ورنہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں کوئی شک وشبہہ نہ تھا، اسی لیے کہا ہے کہ اللہ کی رحمت سے ناامید ہونا گمراہوں کا کام ہے جو صحیح راہ سے منحرف، مکذب اور خطا کار ہیں اور اس کی رحمت کی وسعت کو نہیں پہچانتے اور نہ اس کی کمال قدرت سے واقفیت رکھتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے کہا: ﴿ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ [یوسف: ۸۷] ''بے شک اللہ کی رحمت سے تو کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں۔'' پھر ان سے پوچھا کہ اور کس کام سے آئے ہو؟[1]

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ۝۵۷ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ۝۵۸ اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ؕ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝۵۹ اِلَّا امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنَآ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝۶۰

ابراہیم نے کہا: پھر تمھارا مقصد کیا ہے؟ اے بھیجے ہوئے (فرشتو!) 57 انھوں نے کہا: بے شک ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں 58 سوائے آلِ لوط کے، بے شک ہم ان سب کو نجات دینے والے ہیں 59 سوائے اس کی بیوی کے، ہم نے مقدر کر دیا کہ بے شک وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہوگی 60

ملائکہ کی آمد کا مقصد:

وہ عورت (لوط علیہ السلام کی بیوی) دل سے منافق تھی، لیکن اللہ تعالیٰ قصور ظاہر کیے بغیر عذاب نہیں کرتا۔ ایک حکم ایسا بھیجا کہ اس سے نہ ہو سکا، وہ یہ کہ منہ پھیر کر نہ دیکھو، پھر اس گناہ پر عذاب میں پکڑا۔ اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ جب ابراہیم علیہ السلام کا ڈر جاتا رہا اور بیٹے کی خوش خبری ملی تو اب وہ باتیں پوچھنے لگے کہ تم اور کس کے لیے آئے ہو؟ انھوں نے قوم لوط کا ذکر کیا کہ ہم ان پر عذاب لے کر آئے ہیں، مگر آلِ لوط کو اُن کے درمیان میں سے بچا لیں گے، ہاں

[1] فتح البیان (۷/ ۱۷۸۔ ۱۸۰)

اس کی بیوی ہلاک ہوگی۔ اسی لیے انھوں نے کہا: ﴿ اِلَّا امْرَاَتَهٗ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴾ [الاعرف: ۸۳] ''سوائے اس کی بیوی کے وہ پیچھے رہنے (ہلاک ہونے) والوں میں شامل ہوگئی۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے سمجھ لیا تھا کہ ان کا آنا کچھ خوش خبری پہنچانے کے لیے ہی نہیں ہے، بلکہ کوئی اور مہم بھی ہے، جس کے لیے انھیں بھیجا گیا ہے، کیوں کہ وہ چند اشخاص تھے، جب کہ بشارت دینے کے لیے زیادہ تعداد کی ضرورت نہیں، لہٰذا زکریا اور مریم علیہما السلام کو بشارت دینے کے لیے ایک ہی خوش خبری دینے والا کافی سمجھا گیا۔ یا یہ بشارت انھوں نے ازالہ خوف کے لیے دی تھی۔ اگر مقصد صرف بشارت دینا ہوتا تو اسی خوش خبری سے اپنے کلام کی ابتدا کرتے۔ وہ بولے کہ ہم مجرم لوگوں کی طرف بھیجے گئے ہیں اور لفظِ جرم میں شرک اور اس کے علاوہ گناہ بھی شامل ہیں۔

ان مجرمین میں سے آلِ لوط کو مستثنیٰ کر دیا، کیوں کہ وہ مجرم نہ تھے۔ یہ استثناء متصل ہے، کیونکہ یہ اس ضمیر سے ہے جو ﴿ مُجْرِمِيْنَ ﴾ میں پوشیدہ ہے اور معنی یہ ہیں کہ ان سب نے جرم کیا، مگر لوط کے گھر والوں نے نہ کیا اور اگر ﴿ قَوْمٍ ﴾ سے استثناء ہو تو یہ استثناء منقطع ہوگا، کیونکہ قوم کی صفت مجرمین آئی ہے اور لوط علیہ السلام اور ان کے گھر والے مجرم نہ تھے تو اس صوت میں ﴿ اٰلَ ﴾ پر نصب واجب ہے۔ پھر اس کرامت کا ذکر کیا جس کے ساتھ لوط علیہ السلام کے گھر والے مختص ہوئے، کیوں کہ وہ قوم کے ساتھ جرم میں شریک نہ تھے، لہٰذا فرمایا کہ ہم ان سب کو بچا لیں گے اور آلِ لوط میں لوط علیہ السلام، ان کے اتباع، اہلِ بیت اور اہلِ دین کی نجات کی خبر ہے اور استثناء متصل ہونے کی صورت میں ارسال (فرشتوں کا بھیجا جانا) مجرمین اور آلِ لوط دونوں کو شامل ہوگا، مجرمین کی ہلاکت اور آلِ لوط کی نجات کے لیے۔ اور منقطع ہونے کی صورت میں یہ کلام خبر کے قائم مقام ہوگا اور معنی یہ ہوں گے کہ لیکن ہم آلِ لوط کو نجات دیں گے۔

پھر فرشتوں نے کہا کہ مگر ایک اس کی عورت کہ وہ اہلِ نجات سے نہ ہوگی، کیونکہ وہ کافرہ ہے اور یہ استثناء ﴿ لَمُنَجُّوْهُمْ ﴾ کی ضمیر سے ہے، یعنی وہ ہلاک ہونے والوں میں سے ہے۔ اس لیے کہ نفی سے استثناء اثبات کا فائدہ دیتا ہے اور اثبات سے استثناء نفی کا فائدہ دیتا ہے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے اس استثناء سے منع کیا ہے اور کہا کہ استثناء سے استثناء کیسے ہوسکتا ہے، حالاں کہ دونوں حکم مخالف ہیں۔[1] فرشتوں نے لوط علیہ السلام کی بیوی کو ہلاک ہونے والوں میں سے قرار دے کر فرمایا کہ ہم نے ٹھہرا لیا ہے کہ وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہوگی۔ یعنی ہم نے حکم کر دیا اور مقدر کر دیا کہ اس کو کافروں کے ساتھ عذاب ہوگا۔[2]

---

[1] الکشاف (۲/ ۵٤٤) [2] فتح البیان (۷/ ۱۸۰۔ ۱۸۱)

فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ ١لْمُرْسَلُوْنَ ﴿۶۱﴾ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿۶۲﴾
قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿۶۳﴾ وَ اَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ
وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۶۴﴾

پھر جب فرشتے آلِ لوط کے ہاں پہنچے (61) تو لوط نے کہا: بے شک تم لوگ تو اجنبی ہو (62) وہ بولے: بلکہ ہم تیرے پاس وہ (عذاب) لائے ہیں جس میں یہ (لوگ) شک کرتے تھے (63) اور ہم تیرے پاس حق (یقینی چیز) لائے ہیں اور بے شک ہم سچے ہیں (64)

فرشتے لوط علیہ السلام کے پاس:

یعنی ہم اوپرے آدمی نہیں ہیں، فرشتے ہیں، جو قوم پر عذاب لے کر آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ فرشتے لوط علیہ السلام کے پاس خوبصورت نوجوانوں کی شکل میں ان کے گھر میں داخل ہوئے۔ لوط علیہ السلام نے ان کو نا آشنا جانا۔ انھوں نے کہا کہ اس قوم کو ہلاک اور عذاب کرنے اور انھیں تباہ و برباد کرنے کے لیے آئے ہیں، جس کے واقع ہونے میں ان کو شک ہے اور تیرے پاس ٹھیک بات لے کر آئے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ ﴾ [الحجر: ۸] ''فرشتے تو ہم صرف (عذاب) کے ساتھ نازل کرتے ہیں۔'' اور ہم اس بات میں سچے ہیں کہ قوم ہلاک ہوگی اور تو نجات پائے گا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ ﴿ فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ ﴾ یہ جملہ مستانفہ ہے، اس میں ان لوگوں کی ہلاکت کا بیان ہے جو ہلاکت کے مستحق ہیں اور ان لوگوں کی نجات کا بیان ہے جو مستوجبِ نجات ہیں اور کلام میں حذف ہے اور وہ یہ ہے کہ ملائکہ قریۂ ابراہیم علیہ السلام سے چل کر قریۂ لوط علیہ السلام میں آئے، دونوں کے بیچ میں چار فرسخ (بارہ میل) کا فاصلہ تھا۔ لفظ ﴿ اٰلَ ﴾ زیادہ ہے، اس آیت کی روشنی میں: ﴿ وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا ﴾ [هود: ۷۷] ''اور جب ہمارے قاصد (فرشتے) لوط کے پاس آئے۔''[1]

فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَ لَا يَلْتَفِتْ
مِنْكُمْ اَحَدٌ وَّامْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۵﴾ وَ قَضَيْنَآ اِلَيْهِ ذٰلِكَ
الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ ﴿۶۶﴾

چناں چہ تو رات کے کسی حصے میں اپنے اہل و عیال کو لے کر نکل، اور تو ان کے پیچھے چل، اور تم میں

(1) فتح البیان (۷/ ۱۸۱)

سے کوئی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے اور چلے جاؤ جہاں تمھیں حکم دیا جاتا ہے (65) اور ہم نے اسے اس امر کا فیصلہ سنا دیا کہ بے شک صبح ہوتے ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جائے گی (66)

لوط علیہ السلام کو اپنی بستی سے نکل جانے کا حکم:

فرشتوں نے لوط علیہ السلام سے کہہ دیا کہ تم راتوں رات اس جگہ سے چل دو اور اپنے گھر والوں کو اپنے ساتھ نکال لے جاؤ اور تم ان کے پیچھے رہو کہ یہ بات تمھارے اہلِ خانہ کے لیے زیادہ محفوظ ہے۔ اسی طرح نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم غزوے میں چلتے تھے کہ لشکر کے پیچھے رہتے تھے اور ضعیف اور پیچھے رہ جانے والے کی خبر لیتے۔ پھر مڑ کر دیکھنے سے منع کر دیا کہ جب تم قوم پر چیخ کی آواز سنو تو ان کی طرف توجہ نہ دینا، اُن کو اُن کے حال پر عذاب اور سزا میں چھوڑ دینا اور جس طرف تمھیں جانے کا حکم ہے، سیدھے اسی طرف منہ کیے ہوئے چلے جانا، گویا ان کے ساتھ کوئی راستہ بتانے والا تھا اور یہ بات بتلا دی گئی کہ صبح کے وقت اس قوم کی جڑ کٹ جائے گی، یعنی عذاب آئے گا اور سب کے سب ہلاک ہو جائیں گے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ۚ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ﴾ [ھود: ۸۱] ''بے شک ان کے وعدے (عذاب) کا وقت صبح ہے۔ کیا صبح قریب نہیں؟''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ لوط علیہ السلام کے ہمراہ ان کی دو بیٹیاں تھیں، ان دو بیٹیوں کے علاوہ اس گاؤں سے اور کوئی باہر نہ نکلا۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے زمین کو لپیٹ دیا اور وہ نجات پا کر ابراہیم علیہ السلام کے پاس آ پہنچے۔[1] فرشتوں نے لوط علیہ السلام سے کہہ دیا تھا کہ تم اُن کے پیچھے چلنا ہانکتے ہوئے، تاکہ ان میں سے کوئی پیچھے نہ رہ جائے اور کہیں اس کو عذاب پہنچ جائے، یا اس لیے کہ تم کو ان پر اطمینان رہے اور تم جان لو کہ انھوں نے نجات پائی۔ تم میں سے کوئی عذاب کے نازل ہونے کو نہ دیکھے کہ وہ دیکھنے میں مشغول رہے اور چلنے کی رفتار کی تیزی میں کمی ہو جائے اور ظالموں کی بستی سے دور نہ ہو سکے، بلکہ اسی طرف چلے جاؤ، جدھر کا حکم ہے، وہ سمت شام کی، یا مصر کی، یا لوط علیہ السلام کی بستیوں میں سے کسی اور بستی کی تھی، یا خلیل جلیل علیہ السلام کے علاقے کی طرف، یا اُردن کی طرف تھی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے لوط علیہ السلام کی قوم کا ذکر کیا کہ جب فرشتے اس گاؤں پر پہنچے تو کیا ماجرا گزرا، چناں چہ فرمایا:[2]

وَجَآءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۝۶۷ قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِيْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ۝۶۸ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ۝۶۹ قَالُوْٓا اَوَلَمْ نَنْهَكَ

---

[1] تفسیر القرطبي (۹/ ۸۱) [2] فتح البیان (۷/ ۱۸۲۔ ۱۸۳)

عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝۷۰ قَالَ هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِيْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ۝۷۱ لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝۷۲

اور شہر (سدوم) والے خوشیاں مناتے ہوئے آئے (67) لوط نے کہا: بے شک یہ لوگ میرے مہمان ہیں، لہٰذا تم مجھے رسوا نہ کرو (68) اور اللہ سے ڈرو اور مجھے ذلیل نہ کرو (69) وہ بولے: کیا ہم نے تجھے دنیا والوں (کی حمایت) سے روکا نہیں تھا؟ (70) لوط نے کہا: یہ میری (قوم کی) بیٹیاں ہیں (ان سے نکاح کرلو) اگر تم (کچھ) کرنے والے ہو (71) (اے نبی!) آپ کی عمر کی قسم! بے شک وہ اپنی مستی (گمراہی) میں بھٹک رہے تھے (72)

اہلِ شہر حسین وجمیل نوجوانوں کو دیکھ کر دوڑے آئے:

یہ اللہ تعالیٰ نبی اکرم ﷺ کو فرماتا ہے کہ قسم ہے تیری جان کی! کہ لوط علیہ السلام کی قوم اپنی مستی میں ان کی بات نہ سنتی تھی۔ قومِ لوط نے جب یہ سنا کہ لوط کے گھر مہمان آئے ہیں اور بہت خوبصورت اور حسین وجمیل نوجوان ہیں تو خوش ہو کر دوڑے۔ لوط علیہ السلام نے ان سے کہا کہ یہ لوگ میرے مہمان ہیں، تم مجھ کو رسوا نہ کرو۔ یہ بات اس سے پہلے کہی کہ ان کا اللہ کا رسول ہونا معلوم ہوا، جس طرح کہ سورت ہود میں گزر چکا ہے اور اس جگہ ان مہمانوں کا اللہ کا رسول ہونا مذکور ہے۔ اور اس پر آپ کی قوم کے آنے اور اپنی حاجت طلب کرنے کا عطف ڈالا، لیکن واؤ ترتیب کی مقتضی نہیں ہے، خصوصاً جب اس کے خلاف دلیل ہو۔ قوم نے کہا: اے لوط! ہم نے تم کو منع کر دیا تھا کہ تم سارے جہاں کی حمایت اور طرف داری نہ کیا کرو، یعنی کسی کو مہمان نہ بناؤ۔ تب لوط علیہ السلام نے اپنی مستورات کا ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ نے مردوں کے لیے عورتیں بنائی ہیں اور ان کی شرم گاہوں کو مباح کیا ہے نہ کہ مردوں کو مردوں کے واسطے، جس طرح کہ سورت ہود میں بڑی وضاحت سے گزر چکا ہے۔ قوم کو اس بات کا بالکل علم نہیں تھا کہ اُن مہمانوں کے آنے کا مطلب کیا ہے اور اس آفت کی ان کو اطلاع نہ تھی جس نے ان کو گھیر لیا ہے اور ان کو کیا معلوم کہ ہم صبح کے وقت دائمی عذاب میں مبتلا ہونے والے ہیں۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم ﷺ سے کہا کہ یہ قوم اپنی مستی میں مدہوش ہو رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم ﷺ کی حیات کی قسم کھائی ہے، اس میں شرفِ عظیم اور بلند مقام اور نبی اکرم ﷺ کی بہت عزت ظاہر ہوتی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اللہ نے کوئی جان پیدا نہیں کی جو محمد ﷺ سے زیادہ عزت والی ہو اور میں نے اللہ تعالیٰ کو رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے علاوہ کسی اور کی زندگی کی قسم کھاتے نہیں سنا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴾ [بني إسرائيل: ۷۲] (رواہ ابن جریر)[1] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سکر سے مراد ضلالت

(1) تفسیر الطبري (۱۷/ ۱۱۸) اس کی سند حسن ہے۔

ہے اور "عَمَهُ" سے مراد لعب (کھیل کود) ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿ لَعَمْرُكَ ﴾ سے مراد "لَعَيْشُكَ" (تیری زندگی کی قسم) ہے اور ﴿ يَعْمَهُوْنَ ﴾ سے مراد "یترددون" (وہ حیران پھرتے ہیں) ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اہلِ مدینہ سے مراد قومِ لوط ہے، اس کا نام سذوم تھا، بروزن فعول ذال معجمہ کے ساتھ۔ جس نے دال مہملہ سے پڑھا، اس نے خطا کی۔ قوم کا آنا ملائکہ کے اس قول سے پہلے تھا کہ تم رات کو اس جگہ سے نکل جاؤ۔ جو سورت ہود میں قصہ مذکور ہوا ہے، وہ ترتیب واقعی پر محمول ہے اور یہاں ترتیب واقعی پر محمول نہیں ہے اور حرفِ واؤ ترتیب کا فائدہ نہیں دے رہا ہے۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سورت ہود میں لوط علیہ السلام کے قصے کی ترتیب واقعی ہے اور یہاں سورت حجر میں قوم کا آنا فرشتوں کے اس قول ﴿ بَلْ جِئْنٰكَ ﴾ کے بعد مذکور ہوا ہے، باوجود اس بات کے کہ لوگ پہلے آچکے تھے، کیونکہ سورت ہود میں صابرین کی مدد کی کیفیت بیان کرنا مقصود تھا اور اس سورت میں امم مکذبہ کی مساوات کا بیان ہے۔ بہرحال وہ لوگ فاحشہ کے ارتکاب کے طمع میں خوش ہو کر آئے۔ استبشار کہتے ہیں فرحت اور سرور کے اظہار کو۔ لوط علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ یہ میرے مہمان ہیں، کیوں کہ ان کو مہمانوں کی صورت میں دیکھا تھا، ابھی یہ معلوم نہ ہوا تھا کہ وہ اللہ کے بھیجے ہوئے ہیں۔ قوم نے ان کو نہایت حسین و جمیل دیکھ کر اپنے شہوانی طمع کو بھڑکایا۔

فضیحت سے مراد رسوائی ہے کہ اگر تم ان سے بے حیائی کے ساتھ پیش آؤ گے اور یہ جان لیں گے کہ میں ان کی حمایت سے عاجز ہوں تو میری بدنامی ہوگی، سو تم اس بے حیائی کے ارتکاب میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور مجھے ذلیل و خوار اور پشیمان اور رسوا نہ کرو۔ قوم نے جواب دیا کہ کیا ہم نے تم کو منع نہیں کیا تھا کہ تو کسی شخص کے بارے میں ہم سے گفتگو نہ کیا کر، جبکہ ہم اس کے ساتھ فاحشہ کا قصد کر لیں۔ یا تمھیں اجنبی لوگوں کی مہمان نوازی سے منع نہیں کیا تھا؟ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انھوں نے کہا: کیا ہم نے آپ کو کسی کو اپنے گھر مہمان بنانے سے، یا اس بستی میں جگہ دینے سے نہیں روکا تھا؟[2] اس آیت کو ان سب معانی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ تب لوط علیہ السلام نے کہا کہ یہ میری بیٹیاں موجود ہیں، تم ان کو حلال طور پر اسلام لا کر بیاہ لو اور حرام کے مرتکب نہ بنو۔ بعض نے کہا: بنات سے مراد قوم کی عورتیں ہیں، اس لیے کہ نبی باپ کی جگہ پر ہوتا ہے۔ یا ان کی شریعت میں کافر کا نکاح مسلمان عورت کے ساتھ جائز تھا، لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس ذکر کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی قسم کھائی۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہلِ تفسیر کا اتفاق ہے کہ یہ قسم مدتِ حیات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کھائی ہے۔ مفسرین کا اس امر پر یہ اجماع ابن العربی نے بھی بیان کیا ہے۔ تمام

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ١١٨۔ ١١٩) [2] تفسير الطبري (١٧/ ١١٧) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٦٩)

مفسرین یہ کہتے ہیں کہ یہ قسم نبی کریم ﷺ کا شرف ظاہر کرتی ہے۔[1] سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کی زندگی کی قسم نہیں کھائی، مگر محمد ﷺ کی زندگی کی۔ فرمایا: ﴿ لَعَمْرُكَ ﴾ الآية.[2] (أخرجه ابن مردويه، كذا في الدر المنثور)

امام ابن العربی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اگر یہ قسم حیاتِ لوط کی ہو تو بھی کوئی اس سے مانع نہیں، کیوں کہ جو شرف اللہ تعالیٰ نے لوط علیہ السلام کو دیا ہے، اس سے زیادہ ہمارے نبی اکرم ﷺ کو عطا فرمایا ہے، اس لیے کہ اللہ کے نزدیک نبی اکرم ﷺ لوط علیہ السلام سے زیادہ عزت و اکرام والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو خلت (خلیل بنانا) عطا کی۔ موسیٰ علیہ السلام کو ہم کلامی کا شرف بخشا۔ یہ دونوں نعمتیں محمد ﷺ پر پوری کر دیں۔ پس جب لوط علیہ السلام کی حیات کی قسم کھائی تو حیاتِ محمد ﷺ اُن کی حیات سے زیادہ ارفع یعنی بلند ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابن العربی کا یہ قول حسن ہے اور قصۂ لوط علیہ السلام میں یہ جملہ قسمیہ جملہ معترضہ کے طور پر آ گیا ہے۔ اگر کہا جائے کہ قسم کھانے میں کون سی بڑائی ہے، قسم تو اللہ نے تین، زیتون اور طور سینین وغیرہ کی بھی کھائی ہے تو اس میں ان چیزوں کی کون سی فضیلت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جس چیز کی اللہ تعالیٰ نے قسم کھائی ہے، اس کو اپنی جنس پر ضرور فضیلت ہوتی ہے۔[3]

بعض نے کہا ہے کہ اللہ نے تین، زیتون اور طورِ سینین وغیرہ کی جو قسم کھائی ہے تو یہ سب حذف مضاف پر محمول ہیں، یعنی تین کے خالق کی قسم! زیتون اور طورِ سینین کے خالق کی قسم! اور یہی معنی اللہ تعالیٰ کے اس قول ﴿ لَعَمْرُكَ ﴾ کے ہیں، یعنی تیری عمر کے خالق کی قسم! صاحبِ کشاف اور ان کے اتباع نے کہا کہ یہاں فرشتوں نے کہا ہے کہ اے لوط! تیری عمر کی قسم! بعض نے کہا ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کو خطاب ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی زندگی کی قسم کھائی ہے اور آپ کی زندگی کے علاوہ کسی اور کی زندگی کی قسم نہیں کھائی ہے، اس میں آپ ﷺ کے لیے عزت ہے۔[4] انتہیٰ.

اکثر علما نے غیر اللہ کی قسم کھانے کو مکروہ، یعنی حرام کہا ہے اور احادیثِ صحیحہ میں غیر اللہ کی قسم کھانے کی ممانعت مروی ہے،[5] بلکہ اس طرح کی قسم کو شرک ٹھہرایا ہے[6] اور یہی حق ہے۔ کسی شخص کے لیے یہ بات لائق نہیں کہ وہ غیر اللہ کی قسم کھائے، وہ کوئی شے کیوں نہ ہو، حیوان یا نباتات یا جمادات۔ ہاں اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے کہ اپنی جس مخلوق کی قسم کھانا چاہے کھائے۔ ﴿ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ٢٣] ''وہ جو کچھ کرتا ہے اس کی بابت اس سے سوال نہیں کیا جا سکتا، جب کہ ان (لوگوں) سے باز پرس کی جائے گی۔''[7]

---

(1) تفسير القرطبي (١٠/ ٣٩) (2) الدر المنثور (٥/ ٩٠) (3) تفسير القرطبي (١٠/ ٣٩۔ ٤٠)

(4) الكشاف (٢/ ٥٤٧) (5) صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٧٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٤٦)

(6) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٥١) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٣٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٢٠٤)

(7) فتح البيان (٧/ ١٨٣۔ ١٨٦)

فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ ﴿۷۳﴾ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ﴿۷۴﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ ﴿۷۵﴾ وَ اِنَّهَا لَبِسَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ ﴿۷۶﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۷﴾

پھر سورج نکلتے انھیں ایک چنگھاڑ نے آ پکڑا (73) پھر ہم نے اس (بستی) کے اوپر والے (حصے) کو اس کے نیچے والا (حصہ) کر دیا اور ان پر کھنگر کے پتھر برسائے (74) بے شک اس میں گہری نظر سے غور وفکر کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں (75) اور بے شک وہ بستی سیدھی راہ پر موجود ہے (76) اور بے شک اس میں مومنوں کے لیے یقیناً نشانی ہے (77)

قوم لوط کی تباہی:

مکے سے شام کو جاتے ہوئے وہ بستی راہ پر نظر آتی ہے۔ ﴿ اَلصَّيْحَةُ ﴾ سے مراد ایک زور کی آواز ہے۔ سورج نکلنے کے وقت ان کے شہر ابر آسمان تک اونچے کر کے زمین پر اُلٹے کر کے پٹخ دیے گئے، وہ اوپر تلے ہوگئے اور سجیل کی کنکریاں برسیں۔ سجیل پر سورت ہود میں کلام گزر چکا ہے۔ اس ظاہری عذاب کے آثار روشن اور واضح ہیں، اس شخص کے لیے جو غور وفکر کرتا ہے، جس میں فراست ہے اور جو ظاہری آنکھ اور بصیرت کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ متوسمین بہ معنی متفرسین ہے، یعنی عقل وفراست رکھنے والے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا کہ بہ معنی ناظرین۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ بہ معنی معتبرین، یعنی عبرت حاصل کرنے والے۔[1] بعض اہلِ مدینہ نے کہا کہ بہ معنی متاملین ہے، یعنی تامل کرنے والے۔

سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ مومن کی فراست سے ڈرو، کیوں کہ وہ اللہ کے نور کے ساتھ دیکھتا ہے۔ پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ ﴾[2] (رواه الترمذي و ابن جرير) سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً ایسے ہی مروی ہے۔[3] (رواه ابن جرير) سیدنا ثوبان رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ مرفوعاً یوں ہیں کہ مومن کی فراست سے ڈرو، کیونکہ وہ اللہ کے نور کے ساتھ دیکھتا ہے اور اس کی توفیق کے ساتھ بولتا

---

(1) تفسير الطبري (۱۷/ ۱۲۰۔ ۱۲۱)

(2) سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۱۲۷) تفسير الطبري (۱۷/ ۱۲۱) اس کی سند میں ''عطیہ عوفی'' ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (۱۸۲۱)

(3) تفسير الطبري (۱۷/ ۱۲۱) اس کی سند میں ''فرات بن سائب'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ۱۸۲۱)

ہے۔ (رواہ ابن جریر أیضا) سیدنا انس رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ اللہ کے جو بندے ہیں، وہ لوگوں کو فراست سے پہچان لیتے ہیں۔[2] (رواہ ابن جریر والبزار)

سدوم کا محلِ وقوع:

پھر فرمایا کہ قریہ سدوم، جو حقیقت میں مقلوب ہوئی اور اس پر پتھر برسے، یہاں تک کہ وہ ایک گڑھا ناپاک بدبودار ہو گیا، ایک سیدھے راستے پر واقع ہے کہ آج تک اس کے مسالک علی الاستمرار جاری وساری ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ ﴿١٣٧﴾ وَبِالَّيْلِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿١٣٨﴾ وَاِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ [الصافات: ١٣٧۔ ١٣٩] ''اور بلاشبہ تم صبح کو ان (کی تباہ شدہ بستیوں) پر سے گزرتے ہو۔ اور رات کو بھی، کیا پھر تم عقل نہیں رکھتے؟ اور بے شک یونس یقیناً رسولوں میں سے تھا۔''

امام مجاہد اور ضحاک رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ''سبیل مقیم'' سے مراد نشان دار راہ ہے اور امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ طریق واضح۔ وہ ایک ہموار زمین پر واقع ہے اور امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد کتابِ مبین ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق: ﴿ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴾ [یٰسٓ: ١٢] ''اور ہم نے ہر شے کو واضح کتاب میں محفوظ کر رکھا ہے۔'' لیکن یہ معنی اس جگہ صحیح نہیں ہے۔[3] واللّٰہ أعلم۔ پھر فرمایا کہ جو لوگ اللہ اور رسول پر ایمان لائے ان کے لیے قومِ لوط کی اس ہلاکت اور تباہی میں اور لوط علیہ السلام اور آلِ لوط کی نجات میں واضح دلیل ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ﴿ اَلصَّيْحَةُ ﴾ سے مراد چنگھاڑ ہے جبریل کی، یا عذاب کی چیخ۔ ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا کہ صیحہ مثلِ صاعقہ ہے، جس شے سے کوئی قوم ہلاک کی گئی، وہ صاعقہ اور صیحہ ہے۔[4] ﴿ مُشْرِقِيْنَ ﴾ میں شروق سے سورج کا طلوع ہونا مراد نہیں ہے، بلکہ فجر کا طلوع ہونا مراد ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ عذاب طلوعِ فجر سے طلوعِ شمس تک ہوتا رہا، اسی لیے سورۃ الحجر میں ﴿ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ ﴾ [الحجر: ٦٦] ''بے شک صبح ہوتے ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جائے گی۔'' فرمایا اور یہاں ﴿ مُشْرِقِيْنَ ﴾ فرمایا۔ جبریل علیہ السلام نے ان بستیوں کو زمین سے اکھاڑ کر آسمان تک اٹھایا، پھر اوندھا کر کے زمین پر پھینک دیا اور وہ چار بستیاں تھیں جن میں چار لاکھ خون خوار بہادر تھے اور جو لوگ اپنی بستیوں میں نہیں تھے سفر میں یا کسی اور حاجت کی وجہ سے اپنے گھروں میں نہیں تھے، ان پر کنکر والے پتھر

---

[1] تفسیر الطبري (١٧/ ١٢٢) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث (١٨٢١)

[2] تفسیر الطبري (١٧/ ١٢١) مسند البزار (١٣/ ٣٢٦) المعجم الأوسط (٣/ ٢٠٧) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (١٦٩٣)

[3] تفسیر الطبري (١٧/ ١٢٢۔ ١٢٣) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٧٢٣۔ ٧٢٤) [4] الدر المنثور (٥/ ٩٠)

برسائے۔ اس پر پورا کلام سورت ہود میں گزر چکا ہے۔

جو آفت ان پر نازل ہوئی اس کو بیان کرنے میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو انجام میں غور و فکر کرتے ہیں اور اس کے ساتھ اپنے خالق کے وجود پر دلیل لیتے ہیں۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں بصیرت والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔[1] بعض نے کہا ہے کہ فراست والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ اس میں سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت اوپر گزر چکی ہے۔

رہی فراست سو وہ دو طرح پر ہوتی ہے: ایک وہ جس کو اللہ تعالیٰ صلحا کے دل میں ڈال دیتا ہے، وہ لوگوں کے حالات کو اپنے تخمینے، نظر و ظن اور تثبت کی درستی سے جان لیتے ہیں۔ دوسری وہ فراست جو کہ تجربوں اور اخلاق کے ذریعے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس بارے میں لوگوں کی تصنیف قدیم اور حدیث موجود ہے۔ نواب صاحب رحمہ اللہ کا اس فن میں رسالہ "ضيافة الإخوان بقياقة الإنسان" بے نظیر اور بے مثال ہے۔ امام ثعلب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ واسم وہ ہے جو تجھ کو سر سے پاؤں تک دیکھے۔[2]

اور یہ جو فرمایا کہ اس میں یقین رکھنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں، یہ اس لیے کہ اللہ کے بندوں میں سے رسول، انبیا اور ان پر ایمان لانے والے ہی آثار کے مشاہدے اور معائنے سے عبرت لیتے ہیں اور پہچانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مخالفین سے کفر و عصیان اور مخالفت کی وجہ سے انتقام لیا ہے اور جو مومن نہیں ہیں وہ اس کو زمانے کے حادثات اور ستاروں کی تاثیر اور فلکی اتصالات پر محمول کرتے ہیں (جیسے آج کل اس عقیدے کو مرزا غلام احمد قادیانی نے ظاہر کیا ہے اور اس میں ایک مستقل رسالہ بھی لکھا ہے، جس میں اس نے ظاہر کیا ہے کہ دنیا کی کوئی ایسی حرکت نہیں ہے کہ جس میں ستاروں کی تاثیر نہ ہو۔ أعاذنا الله منها)

﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ ﴾ میں آیات کا صیغہ جمع کے ساتھ آنا تعددِ قصص کے اعتبار سے ہے اور وہ قصے یہ ہیں: لوط علیہ السلام کا قصہ، ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کا قصہ، لوط علیہ السلام کی قوم کا فرشتوں سے تعرض کرنا، ان کو ہلاک کرنا، ان کی بستیوں کو اوپر تلے کر دینا، جو لوگ بستیوں میں نہیں تھے ان پر پتھروں کا برسنا۔ ﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ میں آیت کا صیغہ مفرد کے ساتھ آنا لوط علیہ السلام کی بستی کی وحدت کے لحاظ سے ہے، جس کی طرف ﴿ وَاِنَّهَا ﴾ میں ضمیر لوٹ رہی ہے، تو اب یہ سوال پیدا نہیں ہوگا کہ پہلی آیت میں لفظ آیات جمع کے ساتھ آیا اور دوسری آیت میں مفرد کے ساتھ آیا، حالانکہ قصہ ایک ہے۔[3]

[1] تفسير القرطبي (١٠/ ٤٣)   [2] تفسير القرطبي (١٠/ ٤٣)   [3] فتح البيان (٧/ ١٨٧ ـ ١٨٩)

وَإِنْ كَانَ أَصْحٰبُ الْأَيْكَةِ لَظٰلِمِيْنَ ﴿۷۸﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ وَإِنَّهُمَا لَبِإِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴿۷۹﴾

اور بے شک اَیکہ (بستی) والے بھی البتہ ظالم تھے ⑱ چناں چہ ہم نے ان سے انتقام لیا اور بے شک وہ دونوں (تباہ شدہ بستیاں) کھلی شاہراہ پر ہیں ⑲

قومِ شعیب کی ہلاکت اور تباہی:

ایکہ (بَن) کے رہنے والے، یعنی قومِ شعیب مدین میں رہتے تھے اور اس شہر کے پاس درختوں کا بن تھا، وہاں بھی رہتے تھے۔ ایکہ والے شعیب علیہ السلام کی قوم تھے۔ امام ضحاک اور قتادہ رحمہما اللہ وغیرہما نے کہا ہے کہ ایکہ گھنے درختوں کو کہتے ہیں۔[1] ان کا ظلم یہ تھا کہ وہ اللہ کے ساتھ غیر کو شریک کرتے تھے اور راہ زن تھے اور ماپ تول میں کمی کرتے تھے، اللہ پاک نے چنگھاڑ، زلزلے اور آگ برسانے کے ساتھ ان سے انتقام لیا۔ یہ قومِ لوط سے قریب تھے اور اُن سے تھوڑے زمانہ بعد کے تھے، ان کی جگہ اُن کی جگہ کے لگ بھگ تھی، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ کھلے راستے پر تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد اور ضحاک رحمہما اللہ نے کہا کہ امام مبین سے مراد ظاہر راستہ ہے۔[2] اس لیے جب شعیب علیہ السلام نے ان کو ڈرایا تو یہ کہا: ﴿ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ﴾ [هود: ۸۹] ”اور لوط کی قوم (کا علاقہ بھی) تم سے کچھ دور نہیں۔“

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یہاں سے شعیب علیہ السلام کا قصہ شروع ہوا، لیکن یہاں مختصر بیان کیا ہے۔ اس کی تفصیل سورۃ الشعراء میں آئے گی۔[3] ایکہ غیضہ کو کہتے ہیں اور غیضہ درختوں کا جمع ہونا ہے اور شی کا اکٹھا ہونا ہے، ایکہ کی جمع ”اَیک“ ہے۔ اصل میں ایکہ ان درختوں کو کہتے ہیں جو ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوں، یہاں وہ مکان اور جگہ مراد ہے کہ جس میں وہ ملے جلے درخت تھے۔ پس کلام میں مجاز ہے، حال بول کر محل مراد لیا ہے۔ ان کے یہ درخت گوگل (جنگلی کھجور کا درخت) کے تھے۔ معنی یہ ہوئے کہ ایکہ کے رہنے والے گناہ گار تھے، اس لیے کہ انھوں نے شعیب علیہ السلام کی تکذیب کی۔ یہاں ان کے وصفِ ظلم ہی کو ذکر کیا۔ سورت ہود اور اعراف میں ان کے ظلم کی تفصیل آئی ہے۔ ﴿ لَظٰلِمِيْنَ ﴾ لام میں تاکید کے لیے ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ایکہ اس بستی کا نام جس میں وہ رہتے تھے۔

امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایکہ اور لیکہ ان کے شہر کا نام ہے، جیسے مکہ اور بکہ ہے۔[4] ایکہ کے رہنے والے شعیب علیہ السلام کی قوم تھی۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ مدین اور ایکہ والے دو گروہ تھے، ان کی طرف اللہ تعالیٰ نے شعیب علیہ السلام کو بھیجا۔[5] (أخرجه ابن مردويه و ابن عساكر) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا

---

[1] تفسير الطبري (۱۷/ ۱۲۴۔ ۱۲۵) [2] تفسير الطبري (۱۷/ ۱۲۵) [3] رقم الآية (۱۷٦) [4] تفسير القرطبي (۱۰/ ٤٥)

[5] تفسير ابن كثير (۳/ ٤٥٦) الدر المنثور (٥/ ۹۱) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ”ربیعہ بن سیف“ کا سماع سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے ثابت نہیں ہے۔ نیز سند میں ”محمد بن عثمان بن ابی شیبہ“ ضعیف راوی ہے۔

ہے کہ ایکہ والے شعیب علیہ السلام کی قوم ہیں اور ایکہ ان ٹیلوں اور درختوں کا نام ہے جن میں وہ رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قوم سے انتقام لیا اور عذاب بھیج کر ہلاک کر ڈالا۔ سات دن تک خوب گرمی رہی، ان کی سانس رک گئی، ہلاک ہونے کے قریب ہوگئے، اللہ تعالیٰ نے بادل کا ایک ٹکڑا ایک چھتری کی طرح بھیجا، ان کی طرف ملتجی ہوئے اور سب کے سب سایہ لینے کے لیے اس کے نیچے آگئے۔ راحت اور چین کے لیے التماس کر رہے تھے۔[1]

اللہ تعالیٰ نے اس بادل سے آگ برسائی، اس نے ان سب کو جلا کر رکھ دیا۔ ﴿ اِنَّهُمَا ﴾ میں ضمیر قومِ لوط کے شہر اور اصحابِ ایکہ کے مکان کی طرف لوٹ رہی ہے، یعنی وہ دونوں جگہیں کھلے راستے پر ہیں۔ یہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔[2] بعض نے کہا ہے کہ ضمیر دو خبروں کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یعنی قومِ لوط کی ہلاکت کی خبر۔ یا اصحابِ ایکہ اور اصحابِ مدین کی طرف لوٹ رہی ہے، اس لیے کہ شعیب علیہ السلام ان دونوں بستیوں کی طرف مبعوث ہوئے تھے تو ایک کا ذکر کرنا دوسری کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پہلا قول راجح ہے۔ امام وہ ہے کہ جس کی پیروی اور اتباع کی جائے۔ طریق (راستہ) کو بھی امام کہتے ہیں۔ امام فراء اور زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ طریق کو امام اس لیے کہتے ہیں کہ اس کی پیروی کی جاتی ہے۔ امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مسافر اس کی اقتدا کرتا ہے، جب تک منزلِ مقصود تک نہ پہنچ جائے۔[3] پھر اللہ تعالیٰ نے ان قصوں کو ثمود کے قصے پر ختم کیا اور فرمایا:[4]

وَ لَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ ۙ﴿۸۰﴾ وَ اٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ۙ﴿۸۱﴾ وَ كَانُوْا يَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا اٰمِنِيْنَ ﴿۸۲﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ ۙ﴿۸۳﴾ فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ؕ﴿۸۴﴾

اور یقیناً حجر والوں (ثمود) نے رسولوں کی تکذیب کی (80) اور ہم نے انھیں اپنی نشانیاں دیں، پھر وہ ان سے اعراض کرنے والے تھے (81) اور وہ پہاڑوں سے بے خوف ہو کر گھر تراشتے تھے (82) چناں چہ انھیں صبح ہوتے ہی چنگھاڑ نے آ پکڑا (83) پھر ان کے کام نہ آیا وہ (مال) جو وہ کماتے تھے (84)

حجر کے باشندے قومِ ثمود کی بربادی:

ثمود کو حجر والے فرمایا، ان کے ملک کا نام حجر تھا۔ انھوں نے صالح علیہ السلام کی تکذیب کی تھی اور جس نے ایک رسول کو جھٹلایا اس نے گویا سارے رسولوں کو جھٹلایا۔ لہٰذا ان پر تکذیبِ مرسلین کا اطلاق ہوا، حالاں کہ صالح ان کے

[1] تفسير الطبري (١٧/ ١٢٤) [2] تفسير الطبري (١٧/ ١٢٥)
[3] فتح القدير (٣/ ١٩٣) [4] فتح البيان (٧/ ١٨٩۔ ١٩٠)

پاس ایسی نشانیاں لے کر آئے تھے جو اُن کے صدق کی دلیل تھیں، جیسے ناقہ (اونٹنی) جو اُن کی دعا سے ایک ٹھوس پتھر کے اندر سے نکلی اور اُن کے بلاد میں چرتی پھرتی تھی۔ وہ جس جگہ بھی چرنے جاتی، یا تالاب پر پانی پینے جاتی تو وہاں سے باقی سارے مویشی بھاگ جاتے۔ تب یوں ٹھہرا دیا کہ ایک دن ان کے پینے کا اور ایک دن اس ناقہ کے پینے کا مقرر تھا۔ ایک بدکار عورت کے مویشی زیادہ تھے، چارے اور پانی سے تنگ آ کر اس نے اپنے ایک یار سے کہا کہ اس اونٹنی کی کھونچیں کاٹ ڈال۔ انھوں نے سرکشی کے طور پر اس کے پاؤں کاٹ ڈالے۔

صالح علیہ السلام نے کہا ہے کہ اب تم اپنے گھروں میں تین دن بسر کر لو، یہ وعدہ جھوٹا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى﴾ [حم السجدة: ١٧] ''اور جو ثمود تھے، تو ہم نے ان کی راہنمائی کی تو انھوں نے ہدایت پر اندھے پن کو پسند کیا۔'' اللہ تعالیٰ نے کہا: یہ لوگ سنگ تراشی کرتے تھے، بغیر کسی خوف و حاجت کے، بلکہ شرارت اور تکبر کی راہ سے۔ چناں چہ یہ بات وادیِ حجر، یا ان کے گھروں میں جو اب تک موجود ہیں، ان کی بنائی ہوئی چیزوں سے مشاہد ہوتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ جب تبوک کی طرف گئے تو آپ کا گزر اس وادی پر ہوا تھا، آپ نے سر مبارک پر چادر ڈال لی اور سواری تیز کر دی اور اپنے اصحاب سے فرمایا: عذاب دی گئی قوم کے گھروں میں نہ جاؤ، مگر روتے ہوئے، اگر رونا نہ آئے تو رونے والی شکل بناؤ، اس ڈر سے کہ کہیں تم کو بھی وہ عذاب پہنچ نہ جائے۔[1] (رواه البخاري)

معلوم ہوا کہ جس زمین پر عذابِ قدیم آیا ہے، وہاں نہیں جانا چاہیے اور اگر گزر ہو تو روئے یا رونے کی سی صورت بنائے، اس ڈر سے کہ کہیں ویسی ہی مصیبت اس پر نہ آئے، جیسی کہ ان پر آئی تھی۔ غرض یہ کہ جب چوتھا دن آیا تو صبح کے وقت ایک چنگھاڑ ہوئی، ان کا کاروبار کا شغل، یعنی کاشتکاری اور باغبانی میں مشغولیت ان کے لیے کچھ کام نہ آئی۔ انھوں نے ناقہ (اونٹنی) کو پانی پینے سے روکا تھا، تاکہ کھیتی اور باغ کے لیے پانی کی کمی نہ ہو، لیکن جب اللہ کا حکم آ گیا تو ان اموال نے ان کو کچھ نفع نہ دیا، سب کے سب ہلاک ہو کر رہ گئے۔

فتح البیان کا بیان:

لام فتح البیان میں ہے کہ امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اصحابِ حجر اصحابِ وادی تھے اور ثمود صالح علیہ السلام کی قوم ہے۔[2] حجر دیارِ ثمود کا نام ہے۔ (قاله الأزهري) یہ مکہ اور تبوک کے درمیان ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ حجاز اور شام کے درمیان ایک جگہ ہے،[3] اس کے آثار اب تک موجود ہیں۔ شام کا قافلہ جو حجاز کی طرف آتا ہے، اس کا گزر اس جگہ پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ان لوگوں نے رسولوں کی تکذیب کی تھی۔ ان کے پاس تو فقط صالح علیہ السلام آئے تھے، لیکن چوں کہ ایک رسول کو جھٹلانا سب رسولوں کو جھٹلانے کے برابر ہے، اس لیے جمع کا صیغہ فرمایا، اس کی

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٠٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٨٠)

[2] تفسير الطبري (١٧/ ١٢٦) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٧١) [3] فتح القدير (٣/ ١٩٣)

وجہ یہ ہے کہ تمام رسول دعوت الی اللہ پر متفق ہیں۔ یا مراد صالح علیہ السلام اور اُن سے پہلے کے رسولوں کی تکذیب ہے۔ یا صالح علیہ السلام جملہ مومنین کے ساتھ مراد ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو اپنی نشانیاں دی تھیں ازاں جملہ ایک ناقہ (اونٹنی) تھی، اس ناقہ میں چند نشانیاں تھیں، ایک اس کا ٹھوس پتھر میں سے نکلنا، دوسرے نکلنے کے وقت جلد ہی بچہ جننا، تیسرے ناقہ کے اس بچے کا جلد ہی بڑا ہو جانا او چوتھے اس کے دودھ کی کثرت۔ انھوں نے ان آیات سے اعراض کیا اور عبرت نہ پکڑی اور التفات نہ کیا، بلکہ اس کو ترک کر دیا اور ناقہ کو مار ڈالا اور نبی کے حکم کے خلاف کیا۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ غور وفکر اور استدلال واجب ہے اور تقلید مذموم ہے۔ صیحہ کا ذکر سورۃ الاعراف و ہود میں گزر چکا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک میں مقامِ حجر میں ثمود کے گھروں کے پاس اترے، لوگوں نے وہاں کے کنوؤں سے پانی بھر کر آٹا گوندھا، جن سے ثمود پانی پیتے تھے اور گوشت کی دیگچی پکائی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان دیگوں کو اوندھا کر دو اور آٹا اونٹوں کو کھلا دو، پھر وہاں سے کوچ کر کے اس کنویں پر اترے جس سے ناقہ پانی پیتی تھی اور لوگوں کو منع کیا کہ تم اس عذاب کی ہوئی قوم پر داخل نہ ہونا، مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہی بلا تمھیں بھی نہ آ لگے۔[1]

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ وَاِنَّ
السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ ۝٨٥ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ
الْعَلِيْمُ ۝٨٦

اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو ان کے مابین ہے حق ہی کے ساتھ تخلیق کیا ہے۔ اور یقیناً قیامت آنے والی ہے، تو (اے نبی!) آپ (کافروں سے) خوبصورت انداز سے درگزر کریں (85) بلاشبہہ آپ کا رب ہی سب کو تخلیق کرنے والا، خوب جاننے والا ہے (86)

کائنات کی تخلیق بے فائدہ نہیں ہے:

پہلی اُمتوں کا حال سنا کر فرمایا کہ یہ جہاں خالی نہیں پڑا، اس کے سر پر ایک تدبیر کرنے والا ہے، وہ ہر چیز کا پورا تدارک کرنے والا ہے۔ آخر کو قیامت ہے۔ درگزر کرنے کو فرمایا۔ جب حکم پہنچا چکے اور کافر ضد پر اڑے رہے، تب حکم ہوا کہ جھگڑے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وعدہ کی راہ دیکھو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے آسمان، زمین اور جو کچھ بھی اس میں ہے عدل کے ساتھ بنائے، تاکہ نیکی کا اچھا بدلہ اور برائی کا برا بدلہ دیں۔ نیز فرمایا: ﴿وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۚ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ﴾ [ص: ۲۷] ”اور ہم نے آسمان

[1] الدر المنثور (۵/ ۹۳) فتح البیان (۷/ ۱۹۰۔ ۱۹۲)

و زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، بیکار پیدا نہیں کیا، یہ ان لوگوں کا خیال ہے جنھوں نے کفر کیا، تو جن لوگوں نے کفر کیا ان کے لیے آگ کی ہلاکت ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ۞ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ﴾ [المؤمنون: ١١٥۔ ١١٦] ''کیا تم نے سمجھا تھا کہ ہم نے تمھیں بے فائدہ پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آ ؤ گے۔ چناں چہ بلند و بالا اللہ حقیقی بادشاہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ معزز و مکرم عرش کا رب ہے۔''

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو قیامت کے قائم ہونے کی خبر دی کہ اس کا آنا برحق ہے۔ پھر مشرکوں سے درگزر کرنے کا حکم دیا کہ یہ جو تم کو ایذا دیتے ہیں اور تمھاری تکذیب کرتے ہیں، تم ان سے صفح جمیل کرو، یعنی اچھے انداز سے درگزر کرو۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلٰمٌ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴾ [الزخرف: ٨٩] ''لہٰذا (اے نبی!) ان سے عفو و درگزر کیجیے اور کہہ دیجیے: سلام ہے، پھر عن قریب وہ جان لیں گے۔'' امام مجاہد اور قتادہ رحمہ اللہ وغیرہما نے کہا ہے کہ یہ حکم قتال سے پہلے تھا۔[1] اور یہی ٹھیک ہے۔ اس لیے کہ یہ آیت مکی ہے اور قتال ہجرت کے بعد شروع ہوا ہے۔ یہ ارشاد کہ تیرا رب خلاقِ علیم ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے قیامت کو ثابت کیا ہے اور یہ کہ وہ قیامت کے قائم کرنے پر قادر ہے، کیوں کہ وہ ایسا بنانے والا ہے جسے کسی چیز کی خلق اور پیدایش نے عاجز نہیں کیا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ۖ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ﴾ [قٓ: ٣٨] ''اور البتہ تحقیق ہم نے آسمانوں اور زمین کو، اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، چھے دنوں میں پیدا کیا، اور ہمیں کسی قسم کی تھکاوٹ نے چھوا تک نہیں۔''

یعنی اللہ تعالیٰ قیامت کو قائم کرنے پر قادر ہے۔ اس خلاق کو کسی چیز کا پیدا کرنا عاجز نہیں کرتا۔ اس کو تمام زمین میں موجود تمام فنا ہو جانے والی چیزوں کا علم حاصل ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ۚ بَلٰى ۗ وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ۞ اِنَّمَاۤ اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۞ فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ [یٰسٓ: ٨١۔ ٨٣] ''کیا وہ (اللہ) جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس بات پر قادر نہیں کہ وہ ان جیسے (انسان) پیدا کر دے؟ کیوں نہیں! وہی تو (سب کچھ) پیدا کرنے والا، خوب جاننے والا ہے۔ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو بس اس کا حکم صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اس سے کہتا ہے: ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔ چناں چہ پاک ہے وہ (اللہ) جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہی ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔'' انتهىٰ ما قال ابن كثير.[2]

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ١٢٨)
[2] تفسير ابن كثير (٢/ ٧٢٤۔ ٧٢٥)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ہم نے آسمان و زمین کو اور جو فوائد ان کے درمیان ہیں، ان کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے، لہٰذا حکمتِ الٰہیہ کا تقاضا یہ ہوا کہ ایسے لوگ ہلاک کر دیے جائیں، تاکہ فساد دور ہو اور صلاح باقی رہے۔ بعض نے کہا کہ حق سے مراد یہ ہے کہ اچھے کام کرنے والے کو اچھا بدلہ اور برے کام کرنے والوں کو برا بدلہ دیا جائے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى﴾ [النجم: ۳۱] ''اور اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے، تاکہ وہ ان لوگوں کو جنھوں نے برے کام کیے، ان کے اعمال کی سزا دے اور ان لوگوں کو جنھوں نے اچھائیاں کیں، اچھا بدلہ دے۔''

بعض نے کہا کہ حق سے مراد زوال ہے، یعنی آسمان و زمین اور جو کچھ اس کے بیچ ہے سب کو فنا کے لیے بنایا، کیوں کہ یہ اشیا مخلوق ہیں اور ہر مخلوق زائل ہے اور قیامت آنے والی ہے، جب آ جائے گی، اللہ انتقام لے گا، مستحقِ عذاب کو عذاب دے گا، مستحقِ احسان کے ساتھ بھلائی کرے گا۔ اس میں نافرمانوں کے لیے وعید ہے اور ڈانٹ ہے۔ پھر حکم دیا کہ اچھے طریقے سے ان سے درگزر کرو، یعنی ان کو معاف کرو۔ بعض نے کہا ہے کہ ان سے اعراض کرو اچھی طرح اعراض کرنا، انتقام میں جلدی نہ کرو، بلکہ معاملہ درگزر اور حوصلے کا کرو۔

سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ صفحِ جمیل بغیر سزا کے راضی ہو جانا ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی ایسے ہی مروی ہے۔[2] امام مجاہد اور عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت قتال سے پہلے کی ہے۔[3] مراد ان کی یہ ہے کہ آیتِ سیف کے ساتھ منسوخ ہے، لیکن یہ بعید ہے، اس لیے کہ اللہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حسنِ خلق کے اظہار کا ارشاد فرمایا اور فرمایا کہ ان کے ساتھ عفو اور صفح کے ساتھ معاملہ کرو جو ڈرانے اور جزع سے خالی ہو۔ اچھے درگزر کے ساتھ آپ کا مامور ہونا آپ کے قتال کے منافی نہیں ہے۔[4]

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ۝۸۷ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۸۸﴾

بے شک ہم نے آپ کو بار بار دوہرائی جانے والی سات آیات اور قرآنِ عظیم دیا ہے (87) اور ہم نے مختلف قسم کے لوگوں کو جو مال و متاع دیا ہے اس کی طرف آپ اپنی نظریں نہ اُٹھائیں اور نہ ان (کی

---

[1] الدر المنثور (۵/ ۹٤)
[2] شعب الإيمان (٦/ ۳۲۲)
[3] تفسير الطبري (۱۷/ ۱۲۸) فتح القدير (۳/ ۱۹٤)
[4] فتح البيان (۷/ ۱۹۲۔ ۱۹۳)

حالت) پر غم کھائیں اور اپنے (پُرشفقت) بازو مومنوں کے لیے جھکائے رکھیں ﴿۸۸﴾

سبع مثانی اور قرآنِ مجید اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتیں ہیں:

یعنی یہ نعمت بڑی دیکھ اور کافروں کی ضد سے خفا نہ ہو۔ سات آیتیں وظیفہ کہا سورۃ الفاتحہ کو اور بڑا قرآن بھی اسی کو کہا۔ ہر سورت قرآن ہے اور یہ سب سے بڑے درجے میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن دیا ہو، پھر کسی کی اور نعمت دیکھ کر ہوس کرے، اس نے قرآن کی قدر نہ جانی۔

اللہ پاک نے اپنے نبی ﷺ سے کہا کہ ہم نے تجھ کو قرآنِ عظیم دیا ہے تو اب دنیا اور زینتِ دنیا اور اس جہانِ بے بنیاد کی فانی رونق کی طرف نظر نہ کر، جس کو اہلِ دنیا برتتے ہیں۔ ہم تو ان لوگوں کا امتحان لیتے ہیں تو ان کے عیش و آرام پر رشک نہ کر اور اس بات پر غم نہ کھا کہ انھوں نے تیری تکذیب کی ہے، تو اپنی جان کو کیوں اس حسرت میں ضائع کرے۔ یہ اگر تیرے دین کی مخالفت کرتے ہیں تو کرتے رہیں، بلکہ تجھ کو تو یہ چاہیے کہ جو لوگ ایمان لے آئے ہیں تو اِن کے ساتھ نرمی اور تواضع سے پیش آئے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [التوبة: ۱۲۸] ”(لوگو!) یقیناً تمھارے پاس تمھی میں سے ایک رسول آ گیا ہے، اس پر تمھارا تکلیف میں مبتلا ہونا گراں (گزرتا) ہے، وہ تمھارے لیے (بھلائی کا) حریص ہے، مومنوں پر نہایت شفیق، بہت رحم کرنے والا ہے۔“

سبع مثانی میں اختلاف ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم، امام مجاہد، سعید بن جبیر اور ضحاک رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا کہ اس سے مراد سبع طوال (سات لمبی سورتیں) ہیں، یعنی سورت بقرہ، آلِ عمران، نساء، مائدہ، انعام، اعراف اور یونس۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے اسی پر نص کی ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا کہ ان سورتوں میں فرائض، حدود، قصص اور احکام کا بیان ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اس میں امثال، خبریں اور نصیحتیں بیان ہوئی ہیں۔ امام سفیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مثانی مئین (سو آیات والی سورتیں) ہیں: سورت بقرہ، آلِ عمران، نساء، مائدہ، انعام، اعراف اور انفال و براءت۔ انفال و براءت ایک سورت ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہ سورتیں کسی کو عطا نہیں ہوئیں، مگر نبی کریم ﷺ کو۔ موسیٰ کو ان میں سے فقط دو سورتیں دی گئیں۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو مثانی کی سات دراز سورتیں دی گئیں اور موسیٰ علیہ السلام کو چھ سورتیں دی گئیں۔ جب موسیٰ نے الواح کو زمین پر ڈال دیا تو دو سورتیں اٹھا لی گئیں اور چار باقی رہ گئیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہی قرآنِ عظیم ہے۔[1]

[1] تفسير الطبري (۱۷/ ۱۲۹۔ ۱۳۲) تفسير ابن أبي حاتم (۷/ ۲۲۷۲)

دوسرا قول یہ ہے کہ سبع مثانی سے مراد سورت فاتحہ ہے، یہ سات آیات ہیں۔ سیدنا علی، عمر، عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے اسی طرح مروی ہے، بسملہ ساتویں آیت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تم کو اس کے ساتھ خاص کیا ہے۔ امام ابراہیم نخعی، ابن عبید، ابن ابی ملیکہ، شہر بن حوشب، حسن بصری اور مجاہد رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ہم سے ذکر ہوا کہ سبع مثانی سورت فاتحہ ہے، یہ فرض اور نفل نماز کی ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے اور اس بارے میں جو احادیث مروی ہیں، ان سے حجت پکڑی ہے۔ فضائلِ سورت فاتحہ میں تفسیر کے شروع میں احادیث گزر چکی ہیں۔[1] وللہ الحمد.

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس جگہ دو حدیثیں روایت کی ہیں، ایک سیدنا ابوسعید بن المعلی رضی اللہ عنہ سے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس سے گزرے، میں نماز پڑھ رہا تھا، مجھ کو پکارا میں نہ آیا، یہاں تک کہ نماز سے فارغ ہو کر آیا، مجھ سے فرمایا: تجھ کو میرے پاس آنے سے کس چیز نے روکا؟ میں نے کہا کہ میں نماز پڑھ رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ ﴾ [الأنفال: ٢٤] ''اے ایمان والو! تم اللہ اور رسول (کی بات) کو قبول کرو جب وہ تمھیں اس (امر) کے لیے بلائے جو تمھیں زندگی بخشتا ہے۔'' کیا میں تجھ کو قرآن کی ایک سورت نہ سکھاؤں، اس سے پہلے کہ مسجد سے باہر نکلوں؟ پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد سے باہر جانے لگے تو میں نے یاد دلایا، فرمایا: ''الحمد لله رب العالمين'' وہ سبع مثانی ہے اور بڑے درجے کا قرآن ہے جس کو میں دیا گیا ہوں۔ دوسری حدیث سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ام القرآن (سورت فاتحہ) وہ سبع مثانی ہے اور بڑے درجے کا قرآن ہے۔''[2]

یہ سورت فاتحہ کے سبع مثانی اور قرآنِ عظیم ہونے پر نص ہے، لیکن یہ کچھ اس بات کے منافی نہیں ہے کہ سبع طوال کو بھی سبعِ مثانی کے ساتھ موصوف کیا گیا ہو، کیوں کہ یہ صفت ان میں بھی موجود ہے، بلکہ سارا قرآن سبع مثانی ہے، جس طرح فرمایا ہے: ﴿ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ﴾ [الزمر: ٢٣] ''اللہ نے بہترین کلام نازل کیا جو ایک کتاب ہے باہم ملتی جلتی، بار بار دہرائی جانے والی۔'' سو قرآن من وجہ مثانی اور من وجہ متشابہ ہے اور قرآن عظیم بھی ہے۔ چناں چہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مسجد موسس علی التقویٰ کے بارے میں سوال کیا گیا تو اپنی مسجد شریف کی طرف اشارہ فرمایا،[3] حالاں کہ آیت ﴿ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ﴾ [التوبة: ١٠٨] ''البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد اول روز ہی سے تقوے پر رکھی گئی ہے اس کی زیادہ حق دار ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں۔'' کا نزول مسجد قبا کے حق میں ہوا ہے۔ سو اس میں کوئی منافات (تضاد) نہیں ہے، کیوں کہ ایک

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ١٣٢- ١٣٧) تفسير ابن كثير (٢/ ٧٢٥- ٧٢٦) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٢٦- ٤٤٢٧)
[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٩٨)

شے کا ذکر اس کے علاوہ دوسری شے کے ذکر کی ممانعت نہیں کرتا، جبکہ اس صفت میں دونوں شریک ہوں۔ واللہ أعلم.

پھر فرمایا کہ جو کچھ ہم نے تجھ کو اس قرآنِ عظیم سے دیا ہے، اس کے ساتھ تو اس چیز سے بے پروا ہو جا، جس میں یہ دنیا دار لوگ گرفتار ہیں، جو کہ متاع فانی اور وہ رونق ہے جو زائل ہو جانے والی ہے۔ اسی جگہ سے ابن عیینہ رحمہ اللہ نے صحیح حدیث: «لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْآنِ»[1] [جو شخص خوب صورت آواز سے قرآنِ کریم کی تلاوت نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں] کی تفسیر اسی طرح کی ہے، یعنی قرآن کے علاوہ سے مستغنی ہو جاؤ۔[2] تو یہ تفسیر اگرچہ صحیح ہے، لیکن حدیث کا مقصود یہ نہیں ہے۔ ابو رافع رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص مہمان ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس کی مہمان نوازی کے لیے کچھ نہ تھا، آپ نے ایک آدمی کو ایک یہودی کے پاس بھیجا، اس نے جا کر کہا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں کہ رجب کے چاند تک ہم کو آٹا قرض دے۔ اس نے کہا: میں نہیں دیتا مگر رہن کے عوض۔ میں نے آ کر یہی بات نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خبردار! اللہ کی قسم! میں تو آسمان اور زمین والوں کا امین ہوں۔ اگر وہ مجھے ادھار دیتا یا میرے ساتھ معاملہ کرتا تو میں اس کو ضرور ادا کرتا۔[3] جب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے باہر نکلا تو یہ آیت اتری: ﴿ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴾ (آیتِ باب) گویا اللہ تعالیٰ نے آپ کی دنیا سے تعزیت کی۔[4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اس آیت میں آدمی کو منع کیا ہے کہ وہ اپنے ساتھی کے مال کی تمنا کرے۔ امام مجاہد نے کہا: ﴿ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ ﴾ سے مراد اغنیا ہیں۔[5] انتهىٰ ما قال ابن كثير.[6]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ اہلِ علم نے سبع مثانی کی تفسیر میں اختلاف کیا ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ اور جمہور مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد سورت فاتحہ ہے۔ یہی قول سیدنا عمر، علی اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم امام حسن، مجاہد، قتادہ، ربیع اور کلبی رحمہم اللہ کا ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور ابو العالیہ رحمہ اللہ کو زیادہ کیا ہے۔ امام نیسابوری رحمہ اللہ نے ضحاک اور سعید بن جبیر رحمہما اللہ کو زیادہ کیا ہے۔[7] اس میں ایک مرفوع روایت بھی مروی ہے جیسا کہ اوپر گزر چکی ہے تو اس کی طرف رجوع واجب ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ سبع مثانی سے مراد وہ سات لمبی سورتیں بقرہ، آلِ عمران، نساء، مائدہ، انعام، اعراف اور ساتویں انفال و توبہ اس لیے کہ دونوں ایک سورت کی طرح ہیں، کیوں کہ ان کے درمیان بسم اللہ نہیں ہے۔ یہ سیدنا

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٨٩) [2] تفسير الطبري (١٧/ ١٤١) [3] تفسير ابن كثير (٢/ ٧٢٦)

[4] المعجم الكبير (١/ ٣٣١) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه موسىٰ بن عبيدة وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ٤/ ٢٢٥)

[5] تفسير الطبري (١٧/ ١٤١) [6] تفسير ابن كثير (٢/ ٧٢٥۔ ٧٢٦) [7] تفسير القرطبي (١٠/ ٥٤) فتح القدير (٣/ ١٩٥)

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔[1] یا ساتویں سورت، سورت یونس ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ سبع مثانی سے مراد سات منزلیں ہیں، کیونکہ قرآن سات صحیفے ہیں۔ یا وہ سورتیں مراد ہیں جو طوال سے چھوٹی اور مفصل سے بڑی ہیں اور وہ مئین (سو آیات والی) ہیں۔ مثانی مثناۃ کی جمع ہے، تثنیہ سے مشتق ہے اور اس کے معنی تکریر ہیں۔ یا مثنیہ کی جمع ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قرآن اس چیز کے ساتھ دوہرایا جاتا ہے جو اس کے ساتھ اس کے بعد پڑھا جاتا ہے۔[2] تو پہلے قول کے مطابق سورت فاتحہ کا مثانی نام رکھنا اس لیے ہے کہ وہ ہر نماز میں دوہرائی جاتی ہے اور بار بار پڑھی جاتی ہے۔

دوسرے قول کے مطابق سبع طوال (سات لمبی سورتیں) کا مثانی نام رکھنا اس لیے ہے کہ ان میں عبرتیں، احکام اور حدود مکرر مذکور ہیں۔ تیسرے قول کے مطابق سات منزلوں کا مثانی نام رکھنا اس لیے ہے کہ سارے قرآن میں قصص کا بار بار مذکور ہیں۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام ضحاک، طاؤس اور ابو مالک رحمہم اللہ کا ہے، ان کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ﴿ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ﴾[3] بعض نے کہا ہے کہ سبع مثانی سے مراد اقسامِ قرآن ہیں اور وہ امر، نہی، خوش خبری دینا، ڈرانا، مثالیں بیان کرنا، نعمتوں کا ذکر اور پہلی امتوں کی خبریں بیان کرنا ہے۔ یہ زیاد بن ابی مریم رحمہ اللہ کا قول ہے۔[4] اور یہ بات مخفی نہیں ہے کہ سورت فاتحہ کا مثانی کے ساتھ مسمی ہونا سورت فاتحہ کے علاوہ کا مثانی کے ساتھ مسمی ہونے کی نفی کا مستلزم نہیں ہے۔ یہ بات بھی ثابت ہوگئی ہے کہ سبع مثانی سے مراد سورت فاتحہ ہی ہے اور مثانی کی صفت کا سورت فاتحہ کے علاوہ پر صادق آنا اس میں قادح نہیں ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ قرآنِ عظیم سے مراد سارا قرآن ہے۔[5]

اس صورت میں عام کا خاص پر عطف ہوگا، کیونکہ سورت فاتحہ قرآن کا ایک جزء ہے۔ اسی طرح اگر سبع مثانی سے سبع طوال (سات لمبی سورتیں) مراد ہیں تو بھی عام کا خاص پر عطف ہوگا، کیونکہ وہ بھی قرآن کا حصہ ہے، اگر ان سے مجموع شخصی مراد ہو۔ رہا سبعہ سے مراد سبعہ احزاب (سات منزلین) یا سارا قرآن یا قرآن کی اقسام کا ہونا تو ان تمام صورتوں میں ایک وصف کا عطف دوسرے وصف پر ہوگا۔

سورت حجر کا مکی ہونا سبع مثانی سے مراد سورت فاتحہ ہی ہونے کو تقویت دیتا ہے اور سبع طوال میں سے اکثر سورتیں اور ایسے ہی اکثر قرآن اور اکثر اقسامِ قرآن مدنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے قول ﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ﴾ کا ظاہر یہ ہے کہ سبع مثانی آپ کو اس آیت کے نزول سے پہلے عطا کر دیا گیا تھا۔ صحیح بخاری کی دو حدیثوں سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے۔

پھر جب اللہ تعالیٰ نے ان نعمتوں کو بیان کیا جو اپنے رسول کو عطا کی ہیں تو ان لذاتِ عاجلہ جو جلدی فنا ہونے

---

[1] تفسير القرطبي (١٠/ ٥٤) [2] معاني القرآن (٣/ ١٨٥) [3] تفسير الطبري (١٧/ ١٣٧)
[4] تفسير الطبري (١٧/ ١٣٦) [5] الدر المنثور (٥/ ٩٤)

والی ہیں، نفرت دلائی، یعنی دنیا کے زخارف اور مستلذات کی طرف اس طرح نہ دیکھ کہ تجھے ان میں رغبت پیدا ہو اور تو ان کی آرزو کرے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کسی چیز کی طرف مسلسل دیکھنا اس بات کی طرف دلالت کرتا ہے کہ دیکھنے والا اس کو عمدہ سمجھتا ہے اور اس کی تمنا اور آرزو کرتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد حسد کرنا ہے، لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے، کیوں کہ حسد سے مطلق نہی وارد ہو چکی ہے۔

﴿ اَزْوَاجًا ﴾ سے مراد ہم عصر ہیں یا یہود و نصاریٰ اور مجوس ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اغنیا و امثال اور اشباہ مراد ہیں۔[1] امام سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس کو قرآن دیا گیا تو پھر وہ کسی کی نعمت دیکھ کر اس کی خواہش کرے تو اس نے قرآن کی مخالفت کی ہے، کیا تو نے اللہ کا یہ قول نہیں سنا ہے: ﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ... الخ﴾ (آیتِ باب) اور اللہ کا یہ قول ﴿ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ۭ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴾ [طٰہٰ: ۱۳۱] ''اور (اے نبی!) ان چیزوں کی طرف آپ اپنی نگاہیں نہ اُٹھائیں جو چیزیں زندگانیِ دنیا کی آرایش کی ہم نے ان میں سے مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہیں، تاکہ ہم انھیں ان کے ذریعے سے آزمائیں، اور آپ کے رب کا رزق بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔''[2]

جب اللہ نے ان کے مال و اسباب پر نظر اور التفات کرنے سے منع کیا تو فرمایا کہ تو غم نہ کر ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے۔ بعض نے کہا ہے کہ ان کے دنیاوی اسباب پر غم نہ کر کہ ان کو کیوں ملا ہے اور مَیں اس میں ان کا شریک کیوں نہیں ہوں، اس لیے کہ تیرے لیے آخرت ہے۔ پہلا معنی زیادہ صحیح ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ فرمایا: تو کسی فاجر کی نعمت پر رشک نہ کر، کیوں کہ تو نہیں جانتا کہ وہ مرنے کے بعد کس آزمایش میں مبتلا ہونے والا ہے، اس لیے کہ اللہ کے پاس ایک ایسا قاتل ہے جو نہیں مرے گا۔ پوچھا گیا کہ وہ کیا ہے؟ فرمایا کہ وہ آگ ہے۔[3] (رواه البغوي)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ فرمایا: اس شخص کی طرف دیکھو جو تم سے نیچے ہے اور اس کی طرف نہ دیکھو جو تم سے اوپر ہے، یہ تو زیادہ لائق ہے کہ تم اللہ کی نعمتوں کو حقیر نہ سمجھو۔[4] (رواه مسلم) عوف رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں اغنیا کے پاس بیٹھتا تھا تو مجھ سے زیادہ کوئی غمگین نہیں ہوگا۔ ان کی سواری اور کپڑے اپنی سواری اور کپڑوں سے بہتر دیکھتا تھا۔ جب یہ حدیث سنی تو فقرا کی صحبت اختیار کی تو راحت پائی۔[5] پھر اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ایمان والوں کے لیے تواضع کریں اور اپنا بازو جھکائیں۔[6]

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ١٤١) [2] الدر المنثور (٥/ ٩٧) [3] تفسير البغوي (٤/ ٣٩٢)
[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٦٣) [5] سنن الترمذي، رقم الحديث (٤/ ٢٤٥) [6] فتح البيان (٧/ ١٩٣۔ ١٩٧)

وَ قُلْ اِنِّيْۤ اَنَا النَّذِيْرُ الْمُبِيْنُ ﴿۸۹﴾ كَمَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ ﴿۹۰﴾ الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ ﴿۹۱﴾ فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹۲﴾ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾

اور کہہ دیجیے: بے شک میں تو صاف صاف ڈرانے والا ہوں (89) (ایسے ہی عذاب سے) جیسا کہ ہم نے قسمیں کھانے والوں پر نازل کیا تھا (90) جنھوں نے (اپنے) قرآن (تورات) کو پارہ پارہ کر دیا (91) چنانچہ آپ کے رب کی قسم! ہم ان سب سے ضرور باز پرس کریں گے (92) ان عملوں کی جو وہ کرتے تھے (93)

رسول اللہ ﷺ صاف صاف ڈرانے والے ہیں:

یعنی تیرا کام دل پھیر دینا نہیں، یہ خدا تعالیٰ ہی سے ہو سکتا ہے، جو کوئی ایمان نہ لائے تو غم نہ کھا۔ کافر سورتوں کے نام سنتے تھے تو آپس میں ٹھٹھے سے بانٹتے، کوئی کہتا کہ میں بقرہ لوں گا یا مائدہ، تجھ کو عنکبوت دوں گا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے فرمایا کہ تم ان لوگوں سے یہ بات کہہ دو کہ میں تو ایک کھلا ڈرانے والا ہوں لوگوں کو عذابِ الیم سے کہ کہیں اس تکذیب پر وہ عذاب نہ آئے، جس طرح کہ اگلے پیغمبروں کی ایذا دہی اور جھٹلانے پر عذاب اُترا تھا۔

﴿ اَلْمُقْتَسِمِيْنَ ﴾ کی تفسیر:

﴿ اَلْمُقْتَسِمِيْنَ ﴾ کے معنی متحالفین ہیں، یعنی ان کفار کو اس عذاب سے ڈرا جو ان لوگوں پر اترا، جنھوں نے اپنے انبیا کی تکذیب، مخالفت اور ایذا دینے پر قسم کھائی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے قومِ صالح کی خبر دی: ﴿ وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴿۴۸﴾ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۰﴾ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۱﴾ فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴾ [النمل: ٤٨۔ ٥٢]

''اور اس شہر میں نو سرغنے تھے، وہ زمین میں فساد پھیلاتے رہتے تھے اور اصلاح نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے کہا: تم آپس میں اللہ کی قسم کھاؤ کہ ہم ضرور صالح اور اس کے اہلِ خانہ پر شب خون ماریں گے، پھر ہم اس کے وارث سے کہیں گے کہ ہم اس کے گھر والوں کی ہلاکت کے وقت موجود نہ تھے، اور بلاشبہ ہم سچے ہیں۔ اور انھوں نے ایک چال چلی اور ہم نے بھی تدبیر کی، اور وہ شعور بھی نہ رکھتے تھے۔ پھر آپ دیکھیں! ان کی چال کا انجام کیا ہوا، بلاشبہ ہم نے ان (نو سرغنوں) کو اور ان کی سب قوم کو تباہ و برباد کر دیا۔ چناں چہ یہ ہیں ان کے گھر خالی (اُجڑے اور ویران) پڑے

ہوئے، اس لیے کہ انھوں نے ظلم کیا، بلاشبہہ اس میں نشان (عبرت) ہے، ان لوگوں کے لیے جو جانتے ہیں۔''

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کفار آپس میں اللہ کی پکی قسمیں کھاتے[1] کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو دوبارہ زندہ نہیں کرے گا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ ۚ بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ [النحل: ٣٨] ''اور وہ اللہ کی پختہ قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ جو مر جاتا ہے اللہ اسے دوبارہ نہیں اُٹھائے گا۔ کیوں نہیں! (بلکہ وہ اُٹھائے گا) یہ اس کے ذمے سچا وعدہ ہے اور لیکن اکثر لوگ علم نہیں رکھتے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَاَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ۭ اَوَلَمْ تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ﴾ [إبراهيم: ٤٤] ''اور (اے نبی!) لوگوں کو اس دن سے ڈرائیں جب انھیں عذاب آلے گا تو ظالم کہیں گے: اے ہمارے رب! ہمیں تھوڑی مدت تک مہلت دے (تاکہ) ہم تیری دعوت قبول کریں اور رسولوں کی اتباع کریں۔ (ان سے کہا جائے گا:) کیا تم اس سے پہلے قسمیں نہیں کھاتے تھے کہ تمھارے لیے کوئی زوال نہیں؟'' کفار قسمیں کھاتے کہ اللہ کبھی مومنوں کو اپنی رحمت میں داخل نہیں کرے گا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَهٰٓؤُلَاۗءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ ۭ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴾ [الأعراف: ٤٩] ''کیا یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں تم قسمیں کھاتے تھے کہ اللہ ان پر رحمت نہیں کرے گا؟ (ان سے تو کہہ دیا گیا کہ) تم جنت میں داخل ہو جاؤ، تم پر کوئی خوف نہیں اور نہ تم غمگین ہوگے۔'' وہ دنیا میں کسی چیز کی تکذیب نہیں کرتے تھے، مگر اس پر قسم کھاتے، اسی لیے ان کا نام مقتسمین ٹھہرا۔

ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: مقتسمین اصحابِ صالح تھے، انھوں نے اللہ کی قسم کھائی تھی کہ ہم رات کو صالح اور اہلِ صالح کو مار ڈالیں گے۔[2] سیدنا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ میری اور اس چیز کی مثال جو اللہ نے مجھے دے کر بھیجا ہے، ایک آدمی کی طرح ہے جو اپنے لوگوں کے پاس آیا اور بولا کہ اے میری قوم! میں نے ایک لشکر کو اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھا ہے اور میں تم کو کھلا ڈرانے والا ہوں۔ بچ جاؤ، بچ جاؤ۔ ایک جماعت نے اس کی اطاعت کی اور پہلی ہی رات اس کے ساتھ چل پڑے تو وہ بچ گئے۔ دوسری جماعت نے اس کو جھٹلایا اور صبح تک وہاں ہی پڑے رہے، یہاں تک کہ لشکر نے آ کر ان کو ہلاک کر دیا۔ یہی میری مثال ہے اور اس کی جس نے میری اور جو کچھ میں لایا ہوں اس کی پیروی کی۔ اور اس کی مثال جس نے میری نافرمانی کی اور جس کو میں حق کے ساتھ لایا ہوں اس کو بھی جھٹلایا۔[3] (رواہ الشیخان)

قرآن کو عِضین کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جو کتابیں اُن پر نازل ہوئیں، ان کو جز جز کر ڈالا، بعض پر ایمان

---

[1] تفسير الطبري (١٩/ ٤٧٨) [2] تفسير الطبري (١٧/ ١٤٥)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٨٥٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٨٣)

لائے اور بعض کے منکر اور کافر ہوئے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہ اہلِ کتاب ہیں۔ انھوں نے کتاب کا جز جز کیا، بعض کو مانا اور بعض کو نہ مانا۔[1] (رواه البخاري) ان کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔[2] تیسرے الفاظ یہ ہیں کہ عضین سے مراد سحر ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا کہ عضہ قریش کی زبان میں جادو کو کہتے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ یعنی اس کو عضو عضو کر ڈالا۔ کبھی سحر کہا، جیسے اللہ نے کفار کی طرف سے فرمایا: ﴿ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ٣] ''کیا پھر تم دیکھتے بھالتے (اس کے) جادو میں پھنستے ہو؟''، کبھی کہانت ٹھہرایا، کبھی اساطیر الاولین بتایا، جیسے اللہ نے فرمایا: ﴿ حَتّٰۤی اِذَا جَآءُوْكَ یُجَادِلُوْنَكَ یَقُوْلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ﴾ [الأنعام: ٢٥] ''حتی کہ جب وہ آپ کے پاس آتے ہیں (اور) آپ سے جھگڑتے ہیں تو ان میں سے جن لوگوں نے کفر کیا وہ کہتے ہیں کہ یہ تو پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔''

امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا: بعض کہتے ہیں کہ ساحر ہے اور کوئی مجنون کہتا ہے اور کوئی کاہن بتاتا ہے۔ یہ عضین کا مطلب ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ سے بھی یوں ہی مروی ہے۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ولید بن مغیرہ کے پاس قریش کے کچھ لوگ جمع ہوئے۔ ولید اُن میں سے صاحبِ شرف تھا اور حج کا موسم بھی آ گیا تھا۔ کہا کہ اے گروہِ قریش! حج کا موسم آ گیا ہے اور عن قریب تمھارے پاس عرب کے وفود آئیں گے، انھوں نے تمھارے صاحب کا حال سن رکھا ہے۔ سو تم ایک رائے پر اتفاق کر لو اور مختلف باتیں نہ کہو کہ تم میں سے بعض دوسروں کی تکذیب کریں اور کوئی کسی کے قول کا رد کرے۔ انھوں نے کہا کہ اے ابا عبد شمس! تم کچھ فرماؤ اور ہمارے لیے ایک رائے قائم کرو اور مقرر کر دو کہ ہم وہی بات کہیں۔ کہا: نہیں، بلکہ تم ہی کچھ کہو، میں سنوں۔ انھوں نے کہا کہ ہم کہیں گے کہ یہ کاہن ہے، کہا: وہ کاہن نہیں ہے۔ کہا: دیوانہ بتائیں گے۔ کہا کہ وہ دیوانہ بھی نہیں ہے۔ کہا: ہم کہیں گے کہ یہ شاعر ہے۔ کہا کہ وہ شاعر بھی نہیں ہے۔ کہا کہ ساحر بتائیں گے۔ کہا کہ وہ ساحر بھی نہیں ہے۔ کہا کہ پھر ہم کیا کہیں؟ کہا کہ ''واللہ! أن لقوله لحلاوة''، یعنی قسم ہے اللہ کی کہ اس کی بات میں لذت ہے، تم جو کچھ بھی ان باتوں سے کہو گے، معلوم ہو جائے گا کہ یہ جھوٹ بولتے ہیں۔[4] سب سے قریبی بات یہی ہے کہ اسے ساحر کہا جائے، اس پر وہ سب لوگ متفق ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بھیجی: ﴿ الَّذِیْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِیْنَ ﴿۹۱﴾ فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۹۲﴾ عَمَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴾ (آیاتِ باب)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ﴿ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴾ سے مراد لا الٰہ الا اللہ کا سوال ہے۔[5] یہ ترمذی

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٧٢٩) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٢٩)
[3] تفسير الطبري (١٧/ ١٤٦۔ ١٤٨) تفسير ابن كثير (٢/ ٧٢٧) [4] دلائل النبوة للبيهقي (٢/ ٢٠٠)
[5] تفسير الطبري (١٧/ ١٥٠) اس کی سند میں ''عطیہ عوفی'' ضعیف راوی ہے۔

کے نزدیک سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً بھی مروی ہے۔[1] (رواہ أبو یعلی و ابن جریر و ابن أبي حاتم أیضا وروی موقوفا علی أنس) سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ قسم ہے اس کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے! تم میں سے کوئی شخص نہیں ہے، لیکن اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے ساتھ اکیلا ہوگا جس طرح تم میں سے کوئی ایک چودھویں رات کے چاند کے ساتھ اکیلا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اے ابن آدم! کس چیز نے تم کو مجھ سے بہکا دیا، اے ابن آدم! تو نے کیا عمل کیا، اے ابن آدم! تو نے رسولوں کو کیا جواب دیا؟ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سارے بندے قیامت کے دن دو خصلتوں کے بارے میں پوچھے جائیں گے: ایک یہ کہ کس چیز کی عبادت کرتے تھے، دوسرے یہ کہ مرسلین کو کیا جواب دیا؟[2] امام ابن عیینہ رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ سوال عمل و مال کے متعلق ہوگا۔[3]

سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا: اے معاذ! قیامت کے دن آدمی سے اس کے ہر کام کے بارے میں پوچھا جائے گا، یہاں تک کہ جو اس نے اپنی آنکھوں میں سرمہ لگایا، یا اپنی انگلیوں سے مٹی کو توڑا۔ پھر میں تجھ کو قیامت کے دن ایسی حالت میں نہ پاؤں کہ تیرا غیر تجھ سے زیادہ اس چیز کی سعادت حاصل کرے جو اللہ نے تجھے دی۔[4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اس دن یہ سوال نہ ہوگا کہ تم نے کیا کیا، بلکہ یہ سوال ہوگا کہ کس لیے کیا؟[5] انتهىٰ ما قال ابن كثير.[6]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ اے نبی! تم کہہ دو کہ میں ڈرانے والا ہوں اس طرح کے عذاب سے، جو انھیں پہنچے گا، جس طرح کہ ہم نے مقتسمین پر عذاب اُتارا تھا، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَثَمُودَ ﴾ [حم السجدة: ١٣] ”پھر اگر وہ اعراض کریں تو کہہ دیجیے: میں نے تمھیں ایسی چیخ (آسمانی عذاب) سے ڈرا دیا ہے جو عاد اور ثمود کی چیخ (عذاب) کے مانند ہوگی۔“

مقتسمین میں اختلاف ہے کہ یہ کون لوگ تھے۔ اس بارے میں سات اقوال ہیں۔ امام مقاتل و فراء رحمہما اللہ نے کہا کہ یہ سولہ شخص تھے جن کو ولید بن مغیرہ نے ایامِ موسم میں بھیجا تھا، ان لوگوں نے مکہ کے چاروں طرف سے آنے والے تنگ اور کھلے راستوں کو آپس میں تقسیم کر لیا اور ہر شخص کو جو مکہ میں داخل ہوتا، یہ کہتے تھے کہ تم لوگ اس شخص

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٢٦) مسند أبي يعلیٰ (٧/ ١١١) تفسير الطبري (١٧/ ١٥٠) اس کی سند میں ”لیث بن ابی سلیم“ ضعیف راوی ہے۔

[2] تفسير الطبري (١٧/ ١٥٠) [3] تفسير ابن كثير (٢/ ٧٢٨)

[4] حلية الأولياء: (١٠/ ٣١) اس کی سند میں ”ابو حمزہ شیبانی“ اور ”یونس حذاء“ مجہول راوی ہیں۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٥٦٨٥)

[5] تفسير الطبري (١٧/ ١٥٠) [6] تفسير ابن كثير (٢/ ٧٢٦۔ ٧٢٨)

کے دھوکے میں نہ آنا، جو ہمارے دین سے نکل گیا ہے، وہ دیوانہ ہے اور کبھی ساحر اور کبھی شاعر اور کبھی کاہن بتاتے، ان کا نام مقتسمین ٹھہرا۔ اس لیے کہ انھوں نے مکے کے گلی کوچے اور راستے آپس میں تقسیم کر لیے تھے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد قریش کی قوم تھی، انھوں نے اللہ کی کتاب کو تقسیم کر لیا۔ قرآن کے بعض کو شعر، بعض کو سحر، بعض کو کہانت اور بعض کو اساطیرِ اولین ٹھہرایا۔ یہ قول امام قتادہ رحمہ اللہ کا ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ مراد اہلِ کتاب ہیں، وہ قرآن سے استہزاء کرتے۔ بعض کہتے کہ یہ سورت ہمارے لیے ہے اور وہ سورت تیرے لیے ہے۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے کتاب کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ پانچواں قول یہ ہے کہ مراد قومِ صالح ہے جنھوں نے صالح علیہ السلام کو قتل کرنے پر قسمیں کھائیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ ﴾ [النمل: ٤٩] ''تم آپس میں اللہ کی قسم کھاؤ کہ ہم ضرور صالح اور اس کے اہلِ خانہ پر شب خون ماریں گے، پھر ہم اس کے وارث سے کہیں گے کہ ہم اس کے گھر والوں کی ہلاکت کے وقت موجود نہ تھے۔'' اس میں قسم اٹھانے کی حیثیت سے تو معنی قریب ہے، لیکن اس حیثیت سے کہ اللہ نے ان کے وصف میں قرآن کو ٹکڑے کرنا فرمایا یہ بعید ہے۔ باقی وجوہ مستقیم ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں قسمیں اٹھائیں۔ یہ امام اخفش رحمہ اللہ کا قول ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ مراد عاص بن وائل تھا اور عتبہ و شیبہ ربیعہ کے دونوں بیٹے اور ابو جہل، ابو البختری، نضر بن حارث، اُمیہ بن خلف اور شیبہ بن حجاج ہیں۔ اس کو امام ماوردی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔[1]

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نفسِ کریمہ اور ربوبیتِ عظیمہ کی قسم کھائی کہ ہم ان کفار سے دنیا میں وہ جو بھی کرتے ہیں، اس کے متعلق سوال کریں گے۔ بعض نے کہا ہے کہ سوال کرنے سے مراد کلمۂ توحید ہے، جیسا کہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں اوپر گزر چکا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس جگہ مسئولین سے سارے مومنین، گناہ گار اور کفار مراد ہیں۔

ان آیات کی روشنی میں ﴿ ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَىِٕذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ﴾ [التکاثر: ٨] ''پھر اس دن تم سے نعمتوں کی بابت ضرور سوال کیا جائے گا۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْـُٔوْلُوْنَ ﴾ [الصافات: ٢٤] ''اور انھیں ٹھہراؤ، بلاشبہہ ان سے باز پرس کی جائے گی۔'' نیز فرمایا: ﴿ اِنَّ اِلَيْنَاۤ اِيَابَهُمْ ۝ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ﴾ [الغاشية: ٢٥۔ ٢٦] ''بے شک ہماری ہی طرف ان کی واپسی ہے۔ پھر بے شک ان کا حساب لینا ہمارے ہی ذمے ہے۔'' اور ممکن ہے کہ کہا جائے کہ اس سوال کا ان پر مقصور کرنا جو سیاقِ آیت میں مذکور ہے اور عموم کا ان کی طرف پھیرنا ان کے غیر کے سوال کا منافی نہیں ہے۔ انتہیٰ ما قال أبو الطیب في تفسیرہ۔[2]

---

[1] تفسیر القرطبي (١٠/ ٥٨)

[2] فتح البیان (٧/ ١٩٧۔ ١٩٩)

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٩٤﴾ اِنَّا
كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ﴿٩٥﴾ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۚ
فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿٩٦﴾ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا
يَقُوْلُوْنَ ﴿٩٧﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿٩٨﴾
وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴿٩٩﴾

چناں چہ آپ کو جو حکم دیا جاتا ہے، کھول کر سنا دیں اور مشرکین سے بے رخی برتیں 94 بلاشبہ ہم ٹھٹھا کرنے والوں کے مقابل آپ کو کافی ہیں 95 وہ لوگ جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود بناتے ہیں، چناں چہ وہ (اپنا انجام) جلد جان لیں گے 96 اور یقیناً ہم جانتے ہیں کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں، اس سے آپ کا سینہ (دل) تنگ ہوتا ہے 97 آپ اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کریں اور سجدہ گزاروں میں ہو جائیں 98 اور آپ اپنے رب کی عبادت کریں، حتی کہ آپ کے پاس یقین (موت) آجائے 99

رسول اللہ ﷺ کو تبلیغِ رسالت کا حکم:

یقین، یعنی موت جو بے شک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ تم رسالت کی تبلیغ کر دو اور کھول کر سب کو پہنچا دو اور مشرکوں کے منہ پر دو بدو کہہ ڈالو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ ﴾ کے معنی ہیں کہ تو اپنا کام جاری رکھ۔ ایک روایت میں ہے کہ وہ کر جس کا تم کو حکم دیا گیا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ مراد نماز میں اونچی آواز سے قرآن کی تلاوت کرنا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی مکرم ﷺ چھپ کر عبادت کرتے تھے، یہاں تک کہ یہ آیت آئی۔ تب آپ ﷺ اور اصحاب باہر نکلے اور ظاہر ہو کر عبادت کرنے لگے۔[1]

مشرکین سے اعراض کا حکم اور استہزاء کرنے والوں سے کفایت کی ضمانت:

فرمایا: مشرکین سے اعراض کر، ہم تیری طرف سے استہزاء کرنے والوں کو کافی ہیں۔ یعنی جو چیز تیری طرف نازل ہوئی ہے تو اس کو لوگوں تک پہنچا اور مشرکین کی طرف التفات نہ کر۔ وہ تجھے اللہ کی آیات سے روکنا چاہتے ہیں اور کسی طرح تو ڈھیلا ہو تو وہ بھی ڈھیلے ہوں اور ان سے نہ ڈر۔ ان کی شرارت، عداوت اور مخالفت سے اللہ تعالیٰ ان کو کافی ہے اور تجھے ان سے بچانے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ﴾ [المائدة: ٦٧] ”اے رسول! آپ کے

[1] تفسیر الطبري (١٧/ ١٥١۔ ١٥٢) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٧٢٨)

رب کی طرف سے آپ پر جو نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دیجیے۔ اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو گویا آپ نے اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا، اور اللہ آپ کو لوگوں (کے شر) سے بچائے گا۔‘‘

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بعض لوگوں پر گزر ہوا تو بعض نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم چھیڑا، اتنے میں جبریل آئے، انھوں نے ان کو نشتر مارا کیا، وہ ان کے جسموں میں زخم کی طرح ہوگیا، وہ سب مر گئے۔[1] (رواہ البزار) محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا کہ استہزا کرنے والوں کے سردار پانچ لوگ تھے، جو اپنی قوم والوں کے سردار تھے: ① بنو اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی میں سے ابو زمعہ اسود بن مطلب تھا، مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کی ایذا اور استہزا کی خبر ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر بددعا کی اور فرمایا: اے اللہ! اس کی آنکھیں اندھی کر دے اور اس کے بیٹے گم کر دے۔ ② بنو زہرہ میں سے اسود بن عبد یغوث۔ ③ بنو مخزوم میں سے ولید بن مغیرہ۔ ④ بنو سہم میں سے عاص بن وائل۔ ⑤ خزاعہ قبیلے میں سے حارث بن طلاطلہ تھا۔ جب یہ شرارتوں میں حد سے بڑھ گئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کثرت سے استہزاء کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری: ﴿ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿94﴾ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ﴿95﴾ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴾ (آیاتِ باب)

محمد بن اسحاق رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جبریل علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس وقت حاضر خدمت ہوئے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم طواف کر رہے تھے۔ جبریل علیہ السلام کھڑے ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے پہلو میں کھڑے ہوگئے۔ اسود بن عبد یغوث گزرا تو اس کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا تو وہ پیٹ کے مرض میں مبتلا ہوگیا اور اسی عارضے میں مر گیا۔ ولید بن مغیرہ گزرا تو اس کے پاؤں کے زخم کی طرف اشارہ کیا جو اس کے پاؤں کے ٹخنے کے نیچے تھا، اس زخم کی وجہ یہ تھی کہ دو سال پہلے اپنی ازار لٹکاتا ہوا خزاعہ کے ایک آدمی کے پاس سے گزرا جو اپنے تیر کو پھل لگا رہا تھا۔ اس کی ازار اس تیر کے ساتھ اڑ گئی جس سے اس کا پاؤں زخمی ہوا اور یہ زخم دراصل کچھ بھی نہ تھا، آپ کے اشارہ کرنے پر وہ زخم پھوٹ پڑا اور یہ اسی زخم کی وجہ سے مر گیا۔ عاص بن وائل گزرا تو اس کے پاؤں کے تلوے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اپنے گدھے پر طائف جا رہا تھا کہ اس کا گدھا اس کو شبرقہ (ایک بوٹی کا نام، ہمارے ملک میں اس کو تھوہر کہتے ہیں، اس کا کانٹا بہت تیز ہوتا ہے) میں لے کر داخل ہوگیا، وہاں اس کے پاؤں میں کانٹا چبھ گیا اور وہ اسی سے مر گیا۔ حارث بن طلاطلہ گزرا تو اس کے سر کی طرف اشارہ کیا۔ وہ پیپ سے بھر گیا اور اسی عارضے سے مر گیا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ان کو جمع کرنے والا اور ان کا سردار ولید بن مغیرہ تھا۔[2] امام مجاہد، مقسم اور قتادہ رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ وہ پانچ آدمی تھے: اسود بن مطلب، اسود بن یغوث، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل اور حارث بن طلاطلہ۔ جب یہ شرارتوں میں حد سے بڑھ گئے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کثرت سے استہزا کرنے لگے،

① مسند البزار (۱۳/ ۵۱۹) ② تفسير الطبري (۱۷/ ۱۵۳۔ ۱۵٤)

تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری۔

امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ سات شخص تھے،[1] لیکن مشہور پہلا قول ہے۔ پھر مشرکین کے حق میں وعید اور ڈانٹ فرمائی کہ عن قریب یہ جان لیں گے کہ اس امر کا انجام کیا ہے۔ پھر نبی مکرم ﷺ کی تنگ دلی پر تسلی دی اور انھیں ذکر اور عبادت کرنے کا ارشاد فرمایا اور کہا ﴿ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴾ (آیتِ باب) نعیم بن ہمارہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے ابن آدم! تو دن کے شروع میں چار رکعات کی ادائیگی سے عاجز نہ ہو، میں دن کے آخر تک تجھے کفایت کروں گا۔[2] (رواه أحمد و أبو داود والنسائي) دوسری روایت میں ہے کہ جب نبی مکرم ﷺ کو کوئی امر غمگین کرتا تو آپ ﷺ نماز پڑھنے لگتے۔[3]

﴿ اَلْيَقِيْنُ ﴾ کی تفسیر:

امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا کہ سالم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یقین سے مراد موت ہے۔ یہی قول امام مجاہد، حسن، قتادہ اور ابن زید رحمہم اللہ وغیرہ کا ہے۔[4] اس پر دلیل وہ آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ نار کے بارے میں خبر دی ہے کہ وہ یہ بات کہیں گے: ﴿ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ۝ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ۝ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝ حَتّٰۤى اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ ﴾ [المدثر: ٤٣۔ ٤٧] ''وہ کہیں گے: ہم نمازیوں میں سے نہیں تھے۔ اور ہم مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔ اور ہم (باطل میں) مشغول ہونے والوں کے ساتھ مشغول ہوتے تھے۔ اور ہم روزِ جزا کی تکذیب کرتے تھے۔ حتی کہ ہمیں موت نے آلیا۔''

صحیح میں ام العلاء انصاریہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ سیدنا عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ پر داخل ہوئے اور وہ فوت ہو چکے تھے۔ ام العلاء رضی اللہ عنہا نے کہا کہ اے ابوسائب! اللہ تجھ پر رحمت کرے، میں گواہی دیتی ہوں کہ اللہ نے تیری عزت کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تجھے کیسے معلوم ہوا کہ اللہ نے اس کی عزت کی ہے؟ کہا: اے اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان! اگر اللہ نے اس کی عزت نہیں کی ہے تو پھر کس کی عزت کرے گا؟! آپ ﷺ نے فرمایا: اس کو یقین، یعنی موت آگئی، اور میں اس کے لیے خیر کی اُمید رکھتا ہوں۔[5]

اس آیت ﴿ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴾ (آیتِ باب) میں اس بات پر دلیل ہے کہ عبادت مثلِ نماز وغیرہ انسان پر واجب ہے، جب تک کہ اس کی عقل ثابت ہے، پس اپنے حال کے مطابق نماز روزہ کرتا

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ١٥٧) تفسير ابن كثير (٢/ ٧٢٩)

[2] مسند أحمد(٥/ ٢٨٦) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٢٨٩) سنن النسائي الكبرىٰ (١/ ١٧٧) صحيح الجامع، رقم (٤٣٤٢)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٣١٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٧٠٣)

[4] صحيح البخاري (٤/ ١٧٣٩) تفسير الطبري (١٧/ ١٦٠)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٨٦)

رہے۔ صحیح بخاری میں سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ فرمایا: کھڑے ہو کر نماز پڑھو، اگر طاقت نہ ہو تو بیٹھ کر، اگر طاقت نہ ہو تو پہلو پر۔[1]

یہ آیت مذہبِ ملاحدہ کی خطا پر دلیل ہے جو یہ کہتے ہیں کہ یقین سے مراد معرفت ہے۔ جب کوئی شخص معرفت تک پہنچ گیا تو اب تکلیف اس سے ساقط ہوگئی۔ سو یہ مذہب کفر و گمراہی و جہالت ہے، اس لیے کہ انبیا علیہم السلام اور ان کے اصحاب اللہ کی مخلوق میں سے سب سے زیادہ علم رکھنے والے اور سب سے زیادہ اللہ کی معرفت رکھنے والے تھے۔ اللہ کے حقوق و صفات کو خوب جانتے پہچانتے تھے اور تعظیم کے لیے اس کا استحقاق جانتے تھے، اس کے باوجود سب لوگوں سے زیادہ عابد و کثیر العبادت اور اپنی وفات تک اعمالِ صالح پر ہمیشگی کرنے والے تھے۔ سو اس جگہ یقین سے مراد موت ہے۔ ولله الحمد والمنة، والحمد لله على الهداية، وعليه الاستعانة والتوكل۔ وهو المسئول أن يتوفانا على أكمل الأحوال وأحسنها، فإنه جواد كريم!

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا کہ مفسرین کی جماعت کہتی ہے کہ اس جگہ یقین سے مراد موت ہے، کیوں کہ موت ایک حتمی امر اور یقینی طور پر واقع ہونے والی اور نازل ہونے والی ہے، کوئی اس میں شک نہیں کرتا۔[2] امام ابو حیان رحمہ اللہ نے کہا کہ موت کا ایک نام یقین بھی ہے اور اس کے نازل ہونے سے ہر شک زائل ہو جاتا ہے۔ عبادت کو بھی موت کے ساتھ مؤقت کیا ہے (وقت مقرر کیا ہے) یہ بتانے کے لیے کہ عبادت کی انتہا یہی موت ہے۔ اب یہ اعتراض نہیں آئے گا کہ اس توقیت کا کیا فائدہ ہے، کیوں کہ ہر کوئی جانتا ہے کہ انسان جب مر جاتا ہے تو اس سے عبادات ساقط ہو جاتی ہیں۔ یعنی تو اپنی زندگی کے ہر وقت اور ہر لحہ عبادت کر، عبادت سے کوئی طرفہ خالی نہ چھوڑ۔ واللہ أعلم.

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ تو ہمیشہ اللہ کی عبادت کر، کیوں کہ اگر بغیر توقیت کے کہا جاتا کہ تو عبادت کر تو جائز تھا کہ انسان ایک بار عبادت کر کے مطیع بن جائے۔ تو جب یہ فرمایا کہ موت تک عبادت کر تو عبادت پر زندگی بھر قائم رہنے کا ارشاد فرمایا۔ اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ﴾ [مریم: ۳۱] ”اور مجھے نماز اور زکات کی پابندی کا حکم دیا ہے، جب تک میں زندہ رہوں۔“ امام ابو مسلم خولانی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ نے مجھے مال جمع کرنے اور تاجر بننے کی وحی نہیں کی، بلکہ مجھے اپنے رب کی تسبیح اور سجدہ اور موت تک عبادت کرنے کی وحی کی گئی ہے۔ یہ حدیث بہت طرق سے مروی ہے۔[3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٦٦) [2] فتح القدير (٣/ ١٩٩)

[3] الدر المنثور (٥/ ١٠٥) یہ روایت مرسل ہے۔ فتح البيان (٧/ ١٩٩۔ ٢٠٢)

الحمد لله الذي بنعمته وبجلاله تتم الصالحات۔ سب تعریف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے جس نے اپنی توفیق سے ہم کو سیدھی راہ دکھائی اور اسی پر ہی ہمارا بھروسا ہے اور اسی سے سوال کرتے ہیں کہ ہم کو اکمل اور احسن احوال پر فوت کرے۔ بے شک وہ جواد اور کریم ہے۔ اس کی توفیق اور مدد سے آج جمعرات ۴ ذی الحجہ ۱۳۰۹ء دن چار بجے کے قریب اس سورت کی تفسیر مکمل ہوئی ہے۔ اور مجھے اپنے رب سے امید واثق ہے کہ وہ مجھ سے یہ کام مکمل کروائے گا اور اپنی مدد اور توفیق میرے شاملِ حال رکھے گا۔ و آخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين.



سُوْرَةُ النَّحْلِ

یہ سورت ایک سو اٹھائیس آیات پر مشتمل ہے اور مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ یہی قول امام حسن، عطا، عکرمہ اور جابر رحمہ اللہ کا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم نے کہا کہ یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی ہے، آخری تین آیتوں کے علاوہ اور وہ آخری تین آیتیں مکہ و مدینہ کے درمیان اُتری ہیں، جب نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اُحد سے لوٹے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وہ آیات یہ ہیں: ﴿ وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ اِنَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ۭ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ [النحل: ٩٥۔ ٩٦]

امام ابوقتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ مکی ہے، سوائے پانچ آیتوں کے، اور وہ یہ ہیں: ﴿ وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا... الآية ﴾ [النحل: ٤١] اور ﴿ ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا... الآية ﴾ [النحل: ١١٠] اور ﴿ وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ۭ وَلَىِٕنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ۝ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ﴾ [النحل: ١٢٦۔ ١٢٨] امام مقاتل رحمہ اللہ نے زیادہ کیا اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿ مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ... الآية ﴾ [النحل: ١٠٦] اور ﴿ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً... الآية ﴾ [النحل: ١١٢] یہ دو آیتیں بھی مکے میں نہیں اتریں۔ اصم رحمہ اللہ نے بعض سے حکایت کیا ہے کہ یہ ساری سورت مدنی ہے، لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔ اس سورت کا نام سورۃ النعم بھی ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی بہت سی نعمتوں کو اس میں شمار کیا ہے۔ [1]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَتٰٓى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ ١

اللہ کے نام سے (شروع) جو نہایت مہربان بہت رحم کرنے والا ہے۔ اللہ کا حکم آ پہنچا، لہٰذا تم اسے عجلت سے نہ مانگو۔ وہ پاک اور ان (معبودانِ باطلہ) سے برتر ہے جنھیں وہ شریک ٹھہراتے ہیں ①

---

[1] تفسير القرطبي (١٠/ ٦٥) فتح القدير (٣/ ٢٠٣) فتح البيان (٧/ ٢٠٣)

قیامت نزدیک ہے:

اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ قیامت نزدیک ہے اور قیامت کے قرب کو صیغۂ ماضی سے ذکر کیا، یہ اس کے حقیقی ہونے اور لازمی طور پر واقع ہونے کی دلیل ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ١] ''لوگوں کے حساب کا وقت قریب آ گیا ہے، جبکہ وہ غفلت میں پڑے اعراض کر رہے ہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ﴾ [القمر: ١] ''قیامت بہت قریب آ گئی اور چاند پھٹ گیا۔''

احتمال ہے کہ ﴿ تَسْتَعْجِلُوْهُ ﴾ کی ضمیر اللہ کی طرف لوٹ رہی ہے، یعنی اللہ سے جلدی مت مانگو۔ اور ضمیر کا عذاب کی طرف لوٹنا بھی ممکن ہے، یعنی اس کی جلدی مت کرو، اور دونوں میں تلازم ہے، جیسے اللہ نے فرمایا: ﴿ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۚ وَلَوْلَاۤ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (53) يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴾ [العنكبوت: ٥٣۔ ٥٤] ''اور یہ لوگ آپ سے جلد عذاب مانگ رہے ہیں اور اگر (عذاب کا) وقت مقرر نہ ہوتا تو انھیں عذاب ضرور آلیتا اور یقیناً وہ انھیں اچانک ہی آ لے گا اور انھیں خبر تک نہ ہوگی۔ یہ لوگ آپ سے جلد عذاب مانگ رہے ہیں اور بلاشبہ جہنم کافروں کو گھیرے ہوئے ہے۔''

امام ضحاک رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں ایک عجیب قول کہا ہے کہ امر اللہ سے مراد فرائض و حدود ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کو رد کرکے کہا ہے کہ ہم نہیں جانتے کہ کسی نے فرائض و شریعت کے آنے کی اس کے وجود سے قبل جلدی کی ہو، بخلاف عذاب کے کہ کفار تکذیب اور استبعاد (ناممکن سمجھنے) کے سبب سے اس کے آنے کی جلدی کرتے تھے۔[1] جس طرح فرمایا ہے: ﴿ يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ۚ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ ؕ اَلَاۤ اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍۭ بَعِيْدٍ ﴾ [الشورىٰ: ١٨] ''جو لوگ اس (قیامت) پر ایمان نہیں رکھتے، وہ اس کے لیے جلدی مچاتے ہیں اور جو لوگ ایمان لائے وہ اس سے ڈرنے والے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ وہ برحق ہے۔ آگاہ رہو! بلاشبہ جو لوگ قیامت کے بارے میں جھگڑتے ہیں، وہ دور کی گمراہی میں (مبتلا) ہیں۔''

مترجم کہتا ہے کہ فرائض کے وجود سے پہلے ان کا استعجال (جلدی طلب کرنا) قرآن میں ثابت ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کا ایک مدت تک کام بنا رہا، پھر جب ان کی نیت خراب ہوئی تو ان پر بادل مسلط ہوا، جالوت نے ان کے اطراف کے شہر چھین لیے اور وہاں سے لوٹا تو بہت قیدی کر کے لیا گیا۔ لوگ وہاں سے بھاگے اور شہر بیت المقدس میں جمع ہوئے اور شمویل علیہ السلام سے چاہا کہ کوئی با اقبال بادشاہ مقرر کرو، کیوں کہ بغیر بادشاہ کے ہم نہیں لڑ سکتے۔

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ١٦٢۔ ١٦٤)

ان کا قصہ سورت بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا ہے: ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا ؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴾ [البقرة: ٢٤٦] ''(اے نبی!) کیا آپ نے موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کی ایک جماعت نہیں دیکھی؟ جب انھوں نے اپنے نبی سے کہا: آپ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دیں، تاکہ ہم اللہ کی راہ میں لڑیں۔ اس نے کہا: ممکن ہے کہ اگر تم پر جہاد فرض کر دیا گیا تو تم جہاد نہ کرو، انھوں نے کہا: آخر ہمیں کیا ہوا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں نہ لڑیں، جب کہ ہمیں اپنے گھروں اور اپنے بیٹوں سے نکال دیا گیا ہے، پھر جب ان پر لڑنا فرض کر دیا گیا تو ان میں سے تھوڑے سے لوگوں کے سوا سب پھر گئے اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔''

یہ آیت صاف دلالت کرتی ہے کہ ان پر لڑائی فرض نہ تھی، انھوں نے اس کے وجود سے پہلے اس کا حکم مانگا۔ اور ایسا ہی ان مظلوم بے بس مسلمانوں نے، جو کفار کے ہاتھوں مکہ میں محصور تھے، قتال کی فرضیت کا حکم مانگا، جیسے اللہ نے فرمایا: ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ﴾ [النساء: ٧٧] ''(اے نبی!) کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ تم (لڑائی سے) اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکات دو؟ پھر جب ان پر جنگ فرض کی گئی تب ان میں سے ایک گروہ کا فر لوگوں سے اس طرح ڈرنے لگا جس طرح اللہ سے ڈرنا چاہیے یا اس سے بھی بڑھ کر خوف زدہ تھا۔''

ان دونوں قصوں سے صراحتاً معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے فرائض کے وجود سے پہلے ان کی فرضیت طلب کی ہے۔ ہاں البتہ امام ضحاک رحمہ اللہ کا معنی یہاں درست نہیں ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ہوسکتا ہے کہ حکم پہنچنے سے وہی قتال کا حکم پہنچنا مراد ہو، جس کے مستضعفین مظلوم بے بس مسلمان طالب تھے، کیوں کہ یہ سورت مکی ہے اور اس میں گویا بے بس مسلمانوں کو تسلی دینا منظور ہے اور سیاق و سباق اور نظم قرآن اس کے کچھ مخالف نہیں ہے۔ واللہ أعلم بحقیقة الحال و إلیه المرجع والمآل.

سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ قیامت کے نزدیک تم پر ڈھال کی طرح کا ایک سیاہ بادل مغرب کی طرف سے آئے گا، وہ آسمان میں اونچا ہوتا جائے گا، پھر اس میں سے ایک پکارنے والا پکارے گا: اے لوگو! بعض لوگ بعض کی طرف متوجہ ہوں گے اور کہیں گے کہ تم نے یہ آواز سنی؟ کوئی کہے گا: ہاں اور کوئی شک کرے گا، پھر دوسری ندا ہوگی: اے لوگو! لوگ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوں گے اور کہیں گے کہ تم نے یہ آواز سنی؟ تو وہ کہیں گے کہ ہاں سنی۔ پھر تیسری ندا ہوگی: اے لوگو! اللہ کا حکم آ گیا ہے تم جلدی مت کرو۔

نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! دو آدمی کپڑا پھیلائیں گے، اس کو تہہ نہ کر سکیں گے اور کوئی شخص اپنے حوض کو درست کرتا ہوگا، وہ اس سے پانی نہ پی سکے گا اور کوئی اپنی ناقہ کا دودھ دھوتا ہوگا، وہ اس کو پی نہ پائے گا۔ لوگ اپنے کاروبار میں مشغول ہوں گے کہ قیامت قائم ہو جائے گی۔[1] (رواه ابن أبي حاتم) پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نفسِ مقدس کی غیر کے شریک کرنے اور اوثان اور انداد کی عبادت سے تنزیہ کی، یعنی پاکیزگی بیان کی۔ یہی لوگ قیامت کی تکذیب کرتے ہیں۔ سو اللہ تعالیٰ ان کے شرک اور کفر سے بالاتر ہے۔ انتہیٰ ما قال ابن كثير في تفسيره.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ آیا حکم اللہ کا، یعنی مشرکین کے لیے تلوار سے قتل ہونے کا عذاب قریب اور نزدیک ہوا۔ مفسرین کی ایک جماعت نے کہا کہ ﴿ اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ ﴾ میں امر سے مراد قیامت ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ کفر کی جزا و سزا دینے کا وعدہ ہے۔[2] جب یہ آیت اتری تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: « بُعِثْتُ أَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ وَيُشِيْرُ بِإِصْبَعَيْهِ يَمُدُّهُمَا »[3] (أخرجاه في الصحيحين من حديث سهل بن سعد) [مجھے اور قیامت کو ان (شہادت اور بڑی انگلیوں) کی طرح (ساتھ ساتھ) مبعوث کیا گیا ہے (یہ کہتے ہوئے) آپ ﷺ اپنی شہادت کی اور بڑی) دونوں انگلیوں کو بلند کرتے ہوئے اشارہ فرما رہے تھے] بعض نے کہا ہے کہ امر سے مراد اللہ کا حکم ہے کہ وہ واقع ہوا۔ اگرچہ محکوم بہ کا وقوع بالفعل نہیں ہوا ہے۔

امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امر سے احکام، حدود اور فرائض مراد ہیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے واقع ہونے کا حکم ایک وقتِ معین میں دیا ہے، سو اس وقت کے آنے سے پہلے وجود میں نہ آئے گا۔ یا اس کے آنے سے مراد اس کے مبادی و مقدمات (نشانیوں) کا آنا ہے۔ سو وقت سے پہلے اس کو طلب نہیں کرنا چاہیے کہ وہ تو ضرور ہی واقع ہونے والا ہے۔ اس میں تمھارے لیے کچھ خیر نہیں ہے اور نہ تم کو اس سے رہائی نصیب ہوگی۔

مشرکین عذاب کے آنے کی جلدی کرتے تھے، جس طرح نضر بن حارث نے کہا تھا: ﴿ اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ [الأنفال: ٣٢] ''اے اللہ! اگر یہ (قرآن) تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا ہم پر دردناک عذاب لے آ۔'' ابوجہل جب مکہ سے نکلنے لگا تو اس نے بھی کعبے کے سامنے یہی دعا کی اور وہی اسے پیش آئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ ان کے شرک سے پاک اور برتر ہے۔ اس جگہ شرک سے مراد یہی ان کا عذاب اور قیامت کے قائم ہونے کی جلدی مچانا

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٧٥) [2] معاني القرآن (٣/ ١٨٩)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٣٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٥٠)

ہے، کیوں کہ ان کا یہ استہزا اور تکذیب یہ ظاہر کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس امر پر قادر نہیں ہے، بلکہ عاجز ہے اور عجز اور قدرت نہ رکھنا مخلوق کی صفات میں سے ہے نہ کہ خالق کی صفات سے۔ اس لیے یہ جلدی مچانا شرک ٹھہرا۔[1]

اس میں خطاب کے رتبے سے درجہ گرانے کے لیے خطاب سے غائب کی طرف التفات ہے۔ ان کی تحقیر اور سبعیہ کی قراءت میں "تشرکون" ہے، خطاب کے صیغے کے ساتھ۔ ﴿عَمَّا﴾ میں "ما" مصدریہ ہے اور اس کو کسی کی طرف لوٹانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جمہور کے نزدیک "ما" موصولہ ہے جیسے سمین نے کہا ہے، یعنی وہ پاک ہے اس چیز سے جس کو یہ شریک بتاتے ہیں۔ اور یہ ماہتوں سے عبارت ہے۔

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ۝۲

وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے اپنے حکم سے وحی دے کر فرشتے نازل کرتا ہے کہ تم (لوگوں کو) اس بات سے آگاہ کر دو کہ بلاشبہ میرے سوا کوئی الٰہ نہیں، لہٰذا تم مجھ ہی سے ڈرو ②

اللہ تعالیٰ جسے چاہے پیغام توحید کے ساتھ مبعوث کرے:

اللہ سبحانہ و تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ وحی دے کر فرشتے اتارتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۚ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ۚ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ [الشوریٰ: ٥٢] "اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف اپنے حکم سے ایک روح (قرآن) کی وحی کی۔ آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا اور ایمان کیا ہے؟ لیکن ہم نے اسے نور بنا دیا، ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہیں اس کے ذریعے سے ہدایت دیتے ہیں اور بلاشبہ آپ سیدھے راستے ہی کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔"

﴿مَنْ يَّشَآءُ﴾ سے مراد انبیا علیہم السلام ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ﴾ [الأنعام: ١٢٤] "اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کا کام کس کو سونپے۔" نیز فرمایا: ﴿اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ﴾ [الحج: ٧٥] "اللہ فرشتوں میں سے کچھ پیغام رساں چن لیتا ہے اور لوگوں میں سے (بھی)۔" نیز فرمایا: ﴿يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ۝١٥ يَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ ۚ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ۭ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۭ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ [المؤمن: ١٥۔ ١٦] "وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے اپنے حکم سے وحی نازل کرتا ہے، تاکہ وہ (لوگوں کو) ملاقات کے دن سے ڈرائے۔ جس دن وہ (قبروں سے) ظاہر و باہر

[1] فتح البیان (٧/ ٢٠٥۔ ٢٠٦)

ہوں گے، اللہ پر ان کی کوئی چیز چھپی نہ ہوگی۔ (اللہ پوچھے گا:) آج کس کی بادشاہی ہے؟ (پھر خود ہی فرمائے گا:) صرف اللہ واحد و قہار کی۔'' اور یہ جو فرمایا کہ خبر پہنچا دو کہ میرے سوا کسی کی بندگی نہیں ہے اور مجھ سے ڈرو۔ ڈر سے مراد یہ ہے کہ میرے عذاب سے ڈرو کہ اگر میرے حکم کے خلاف کرو گے اور غیر کو پوجو گے تو عذاب میں گرفتار ہوگے۔ انتہیٰ ما قال ابن كثير في تفسيره.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ مبین یہ ہے کہ ﴿ يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ ﴾ میں ملائکہ سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں اور جمع کے ساتھ تعبیر ان کی تعظیم کے لیے ہے اور روح بہ معنی وحی ہے۔[1] (قاله ابن عباس) وحی کو روح اس لیے کہا کہ مومنوں کے دلوں کو زندہ کرتی ہے۔ من جملہ وحی کے قرآن ہے، یہ دین میں اسی طرح ہے جیسے جسم میں روح ہوتی ہے۔ حسن رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔ سو روح کے ساتھ وحی کو تعبیر کرنے میں استعارہ تصریحیہ ہے، اس طرح کہ روح کے ساتھ بدن زندہ رہتا ہے اور وحی کے ساتھ دلوں کو جہالت وغیرہ سے زندگی نصیب ہوتی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ روح سے مراد ارواحِ خلائق ہیں، یا رحمت ہے، یا ہدایت ہے۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ روح جبریل ہیں اور ﴿ بِالرُّوْحِ ﴾ میں حرف ''با'' بہ معنی ''مع'' ہے، یعنی ساتھ۔[2]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ روح ایک امر ہے اللہ کا اور اللہ کی خلق میں سے ایک خلق ہے۔ ان ارواح کی صورتیں بنی آدم کی صورتوں کی طرح ہیں۔ آسمان سے جو فرشتہ اترتا ہے اس کے ساتھ ایک روح ہوتی ہے۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ﴾ [النبأ: ٣٨] ''جس دن جبریل اور (سب) فرشتے اس کے حضور صف بستہ کھڑے ہوں گے۔''[3] پھر فرمایا کہ جس پر چاہے اپنے بندوں میں سے، یعنی اس پر جس کو اپنے بندوں میں سے نبوت، رسالت اور تبلیغ کے لیے چن لے، وہ انبیا علیہم السلام ہیں اور اس جملے کے ماقبل سے اتصال کی وجہ یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی طرف سے اس کے امر کے قریب ہونے کی خبر دی اور ان کو اس کے جلدی مانگنے سے منع کیا تو انھوں نے اس طریق اور سبیل میں تردد کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا علم ہوا تو آپ نے ان کو خبر دی کہ یہ امر وحی کے ساتھ معلوم ہوا ہے جس کو فرشتے اللہ کی طرف سے رسولوں پر لے کر آئے ہیں۔

اس آیتِ شریفہ میں احکامِ علمیہ پر تنبیہ کرنے کے بعد احکامِ فرعیہ پر ان الفاظ سے تنبیہ کی ہے: ﴿ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا ﴾ اس صورت میں آیت میں احکامِ اصلیہ اور فرعیہ جمع ہوگئے ہیں، اس کے بعد دلائلِ توحید کا ذکر فرمایا اور کہا:[4]

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ١٦٥) [2] تفسير القرطبي (١٠/ ٦٧)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٧٦) [4] فتح البيان (٧/ ٢٠٦۔ ٢٠٧)

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ تَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ۝۳
خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ ۝۴

اس نے آسمان اور زمین حق کے ساتھ تخلیق کیے، وہ ان سے برتر ہے جنھیں وہ شریک ٹھہراتے ہیں ③
اس نے انسان کو نطفے سے تخلیق کیا تو یکایک وہ کھلا جھگڑالو ہو گیا ④

اللہ تعالیٰ ہی آسمان و زمین اور انسان کا خالق ہے:

اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ ہم نے عالمِ علوی بنایا، یعنی آسمان اور عالمِ سفلی پیدا کیا، یعنی زمین۔ تمام اشیا کے ساتھ ان کا پیدا کرنا حق سے ہے نہ کہ بے فائدہ، بلکہ اس لیے کہ بدوں کو بدی کی سزا دی جائے اور نیکوں کو اچھا بدلہ دیا جائے۔ پھر اپنے نفسِ مبارک کو معبوداتِ باطلہ کے شرک سے پاک کیا اور یہ بات بتائی کہ وہی مخلوق کے پیدا کرنے میں مستقل ہے، یعنی صرف اسی نے پیدا کیا ہے تو صرف اسی کی عبادت چاہیے۔ پھر انسان کی پیدایش کا ذکر کیا کہ اس کی پیدایش ایک کمزور اور ذلیل نطفے سے ہوئی ہے، لیکن جب وہ استقلال پکڑتا ہے اور درجہ بدرجہ چڑھتا ہے تو اپنے رب سے جھگڑنے لگا اور اس کی تکذیب کرنے لگا اور اللہ کے رسولوں سے لڑنے لگا، حالاں کہ وہ اس لیے پیدا کیا گیا تھا کہ وہ بندہ ہو نہ کہ اس لیے کہ وہ ضد کرے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ؕ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِیْرًا ۝۵۴ وَیَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُهُمْ وَلَا یَضُرُّهُمْ ؕ وَكَانَ الْكَافِرُ عَلٰی رَبِّهٖ ظَهِیْرًا ﴾ [الفرقان: ٥٤۔ ٥٥] ''اور وہی (اللہ) ہے جس نے پانی (منی) سے انسان کو پیدا کیا، پھر اس کے نسبی اور سسرالی رشتے ٹھہرائے اور آپ کا رب بڑی قدرت والا ہے۔ اور وہ اللہ کے علاوہ ان کی عبادت کرتے ہیں جو انھیں نہ نفع دے سکتے ہیں اور نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں اور کافر تو اپنے رب کے مقابل (شیطان کا) مددگار ہے۔''

نیز فرمایا: ﴿ اَوَلَمْ یَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ ۝۷۷ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِیَ خَلْقَهٗ ؕ قَالَ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَهِیَ رَمِیْمٌ ۝۷۸ قُلْ یُحْیِیْهَا الَّذِیْۤ اَنْشَاَهَاۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِیْمٌ ۝۷۹ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَاۤ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ۝۸۰ اَوَلَیْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ؕ بَلٰی ۗ وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ ۝۸۱ اِنَّمَاۤ اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ۝۸۲ فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَیْءٍ وَّاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ [یٰسٓ: ٧٧۔ ٨٣] ''کیا انسان نے نہیں دیکھا کہ بے شک ہم نے اسے نطفے سے پیدا کیا ہے؟ پھر یکایک وہ کھلا جھگڑالو ہو گیا۔ اور اس نے ہمارے لیے ایک مثال بیان کی اور وہ اپنی پیدایش کو بھول گیا، اس نے کہا: ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا، جب کہ وہ گلی سڑی ہوں گی؟ آپ کہہ دیجیے: انھیں وہی (اللہ) زندہ کرے گا جس نے انھیں پہلی بار پیدا کیا اور وہ ہر طرح کے پیدا کرنے کو خوب جانتا ہے۔ وہ

(اللہ) جس نے تمھارے لیے سبز درخت سے آگ بنا دی، پھر یکا یک تم اس سے آگ سلگا لیتے ہو۔ کیا وہ (اللہ) جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس بات پر قادر نہیں کہ وہ ان جیسے (انسان) پیدا کر دے؟ کیوں نہیں! وہی تو (سب کچھ) پیدا کرنے والا، خوب جاننے والا ہے۔ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو بس اس کا حکم صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اس سے کہتا ہے: ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔ چناں چہ پاک ہے وہ (اللہ) جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہی ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔‘‘

بسر بن جحاش رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے اپنے ہاتھ کی ہتھیلی پر اپنے منہ سے پانی (تھوک) ڈالا، پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے: اے ابن آدم! تو مجھے کس طرح عاجز سمجھتا ہے اور حال یہ ہے کہ میں نے تجھ کو اس تھوک جتنی چیز سے پیدا کیا، یہاں تک کہ جب ٹھیک کیا تجھ کو اور برابر کیا اور تو اپنی دو چادروں کے درمیان چلا اور زمین سے تیرے چلنے کی وجہ سے آواز آتی تھی تو نے (مال) اکٹھا کیا اور (بخیل بن کر خرچ کرنے سے) روکا۔ یہاں تک کہ جب جان حلق تک پہنچی تو کہنے لگا کہ میں خیرات کرلوں اور وہ وقت خیرات کا کہاں؟[1] (رواه أحمد و ابن ماجه)

مترجم کہتا ہے کہ اس کی تصدیق اللہ تعالیٰ کی کتاب میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ۚ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴾ [المنافقون: ۱۰۔ ۱۱] ’’اور تم اس میں سے خرچ کرو جو ہم نے تمھیں رزق دیا ہے، اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی ایک کو موت آئے، پھر وہ کہے: اے میرے رب! تو نے مجھے کچھ مدت تک اور کیوں نہ مہلت دی کہ میں صدقہ کرتا اور میں صالحین میں سے ہو جاتا۔ اور اللہ کسی کو ہرگز مہلت نہیں دیتا، جب اس کی اَجل آ جائے اور اللہ اس سے خوب باخبر ہے جو تم عمل کرتے ہو۔‘‘

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ آسمان و زمین کو اپنی قدرت اور وحدانیت کی دلیل کے طور پر اس طرح پر پیدا کیا، جس شکل میں وہ ہیں۔ بعض نے کہا کہ اس جگہ حق سے مراد فنا اور زوال ہے۔ اللہ تعالیٰ پاک ہے ان کے شرک سے۔ پھر انسان کا خاص طور سے ذکر کیا، کیوں کہ یہ تمام سفلی مخلوقات سے اشرف ہے، اس لیے اس کو مقدم کیا اور خاص طور پر ذکر کیا۔ پھر فرمایا کہ ہم نے انسان کو ایک نطفے سے پیدا کیا، یعنی جماد سے جو حیوان سے نکلتا ہے۔ نطفے سے مراد منی ہے، اس کو ہر طرح سے اُلٹ پلٹ کر کامل صورت کر کے اس میں روح پھونکی، ماں کے پیٹ سے اس گھر میں لائے، اس نے اس جگہ زندگی بسر کی۔ نطفہ کہتے ہیں پانی کی بوند کو۔ جب وہ آدمی بن گیا تو کثیر الخصومہ کثیر المجادلہ (بہت جھگڑا کرنے والا، بہت لڑائی کرنے والا) ہوگیا۔ گویا اللہ تعالیٰ کی قدرت میں جھگڑتا ہے، اس کا جھگڑا صاف ظاہر

[1] مسند أحمد (٤/ ٢١٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٧٠٧)

ہے۔ کہا ہے کہ اس آیت کا نزول ابی بن خلف کے بارے میں ہوا ہے، لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ عام ہے ہر جھگڑے کے لیے، خواہ وہ دنیاوی امور میں ہو یا اخروی امور میں۔ جب مقام عمومیت کا مقتضی ہو تو خصوصیت سبب کا اعتبار نہیں ہوتا۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کا ذکر تقریرِ استدلال کے لیے ہے، اس پر کہ ایک ایسی ہستی موجود ہے جو اُن سب چیزوں کو پیدا کرنے والی، تدبیر کرنے والی ہے اور وہ سب کا معبود ہے۔ یہ ذکر اس لیے نہیں کہ انسان کی گمراہی اور کفر کی انتہائی بے حیائی اور بے شرمی کو ظاہر کرے۔ اس کے بعد جانوروں کی پیدائش کا ذکر کیا، کیوں کہ اس میں اس نوع انسانی کے لیے فوائد ہیں، فرمایا:[1]

وَ الْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّ مَنَافِعُ وَ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝۵ وَ لَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَ حِيْنَ تَسْرَحُوْنَ ۝۶ وَ تَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ؕ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝۷

اور اس نے چوپائے بھی پیدا کیے، ان میں تمھارے لیے گرمی حاصل کرنے کا سامان اور دیگر منافع ہیں اور ان میں سے بعض کو تم کھاتے (بھی) ہو ⑤ اور ان میں تمھارے لیے خوبصورتی (بھی) ہے، جب تم انھیں شام کو چرا کر لاتے ہو اور صبح چرانے لے جاتے ہو ⑥ اور وہ تمھارے بوجھ اُٹھا کر ان شہروں تک لے جاتے ہیں، جہاں تم جسمانی مشقت کے بغیر نہیں پہنچ پاتے تھے۔ بے شک تمھارا رب بڑا شفقت والا، بہت رحمت والا ہے ⑦

چوپائے بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور نعمت ہیں:

اللہ تعالیٰ نے چوپایوں کے پیدا کرنے کا احسان اپنے بندوں پر رکھا، ان سے مراد اونٹ، گائے اور بکری ہیں، جس طرح کہ سورت انعام میں اس کی تفصیل کی اور آٹھ نر اور مادہ بیان کیے۔ اور اُن میں بہت سی مصلحتیں اور فوائد رکھے ہیں، جیسے: صوف اور وبر (اونٹ کی اون) اور بال، جن کو وہ پہنتے اور بچھاتے ہیں اور دودھ جس کو پیتے ہیں اور اُن کی اولاد کو کھاتے ہیں اور اُن کے پالنے میں بڑی رونق اور بہار ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ ﴾ (آیت باب)

رواح اس وقت کو کہتے ہیں کہ جب چوپائے پچھلے پہر چراگاہ سے چارہ چر کر اپنے تھانوں پر واپس آتے ہیں اور اُن کی کوکھیں چارے سے بھری ہوتی ہیں اور تھن دودھ سے لبریز ہوتے ہیں اور کوہان خوب اونچے معلوم ہوتے

[1] فتح البیان (۱۷/ ۲۰۷۔ ۲۰۸)

ہیں۔ اور سراح اس وقت کو کہتے ہیں کہ جب ان کو چرانے کے لیے چراگاہوں میں لے جاتے ہیں۔ اور اثقال سے مراد وہ بھاری بوجھ ہے جن کو تم اپنی پشت پر لاد کر ایک شہر سے دوسرے شہر کو لے جاتے ہو، جس کے لے جانے سے تم عاجز ہو اور اپنی جان کو توڑے بغیر اور سخت مشقت اٹھائے بغیر تم لے جا نہ سکتے تھے۔ اور یہ بوجھ حج وعمرہ اور غزوہ (جنگ) اور تجارت اور اسی طرح کے دوسرے کاموں میں ہوتا ہے اور بہت قسم کے استعمال میں لایا جاتا ہے، جیسے: سواری کے لیے اور بوجھ اٹھانے کے لیے جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿21﴾ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ﴾ [المؤمنون: ۲۱۔ ۲۲] ”اور بلاشبہ تمھارے لیے چوپایوں میں ضرور (سامان) عبرت ہے، ہم تمھیں اس میں سے پلاتے ہیں جو ان کے پیٹوں میں (دودھ) ہے، اور تمھارے لیے ان میں کثیر منافع ہیں، اور ان میں سے بعض کو تم کھاتے ہو۔ اور ان (چوپایوں) پر اور کشتیوں پر تم سوار بھی کیے جاتے ہو۔“

نیز فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿79﴾ وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَلِتَبْلُغُوْا عَلَيْهَا حَاجَةً فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ﴿80﴾ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ فَاَيَّ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُنْكِرُوْنَ ﴾ [المؤمن: ۷۹۔ ۸۱] ”اللہ وہ ہے جس نے تمھارے لیے چوپائے بنائے، تاکہ تم ان میں سے بعض پر سواری کرو اور ان میں سے بعض کو تم کھاتے ہو۔ اور تمھارے لیے ان میں (اور بھی) بہت سے فائدے ہیں اور تاکہ تم ان پر (سوار ہو کر اپنی) اس حاجت (منزلِ مقصود) کو پہنچو جو تمھارے دلوں میں ہو اور تم ان پر اور کشتیوں پر (بھی) سوار کیے جاتے ہو۔ اور اللہ تمھیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے، پھر تم اللہ کی کون کون سی نشانیوں کا انکار کرو گے؟“

لہٰذا اس جگہ ان نعمتوں کے گننے کے بعد یہ فرمایا ہے کہ تمھارا رب شفیق مہربان ہے، یعنی اس نے ان چوپایوں کو تمھارا مسخر کر دیا ہے جیسے اس کا قول ہے: ﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ﴿71﴾ وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَاْكُلُوْنَ ﴿72﴾ وَلَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴾ [یٰسٓ: ۷۱۔ ۷۳] ”کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اپنے ہاتھوں سے جو چیزیں بنائیں، ان میں یقیناً ہم نے ان کے لیے چوپائے بھی پیدا کیے؟ پھر وہ ان کے مالک (بن گئے) ہیں۔ اور ہم نے انھیں ان کے تابع کر دیا، چناں چہ ان میں سے کچھ ان کی سواریاں ہیں، اور ان میں سے کچھ کو وہ کھاتے ہیں۔ اور ان کے لیے ان (چوپایوں) میں (اور بھی) فائدے اور پینے کی چیزیں ہیں، کیا پھر وہ شکر نہیں کرتے؟“

نیز فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ ﴿12﴾ لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ﴿13﴾ وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ﴾ [الزخرف: ۱۲۔ ۱۴] ”اور وہ جس نے سب جوڑے پیدا کیے اور تمھارے لیے

کشتیاں اور چوپایے بنائے جن پر تم سوار ہوتے ہو۔ تاکہ تم ان کی پیٹھ پر جم کر بیٹھو، پھر جب ان پر متوازن ہو کر بیٹھ جاؤ تو تم اپنے رب کی نعمت یاد کرو اور تم کہو: وہ (اللہ) پاک ہے، جس نے اسے ہمارے تابع کر دیا، ورنہ ہم اسے قابو میں کر لینے والے نہیں تھے۔ اور یقیناً ہم اپنے رب ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ﴿ دِفْءٌ ﴾ سے مراد لباس ہے جو اُون کے بالوں سے اور کھالوں سے بنایا جاتا ہے۔ ﴿ مَنٰفِعُ ﴾ سواری اور گوشت اور دودھ ہے۔ دوسرا قول ہے کہ ﴿ دِفْءٌ وَّمَنٰفِعُ ﴾ سے ہر چوپائے کی نسل مراد ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ دِفْءٌ ﴾ سے مراد لباس ہے (جو اُون اور کھال سے بنایا جاتا ہے) اور ﴿ مَنٰفِعُ ﴾ سے مراد ان کی سواری، دودھ اور گوشت ہے۔ امام ابو قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ لباس و منفعت اور ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنا مراد ہے،[1] بہت سے مفسرین نے قریب قریب اسی کے کہا ہے۔ انتھیٰ ما قال ابن کثیر في تفسیرہ.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ نے چوپائے پیدا کیے اور وہ اونٹ، گائے اور بکری ہے۔ نعم اور انعام کا اکثر اطلاق اونٹ کے لیے آتا ہے اور ان سب کو بھی انعام کہتے ہیں، لیکن صرف بکری کے لیے انعام کا لفظ نہیں بولا جاتا۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انعام کا واحد نعم ہے اور اس کا اکثر اطلاق اونٹ پر ہوتا ہے۔ پھر جب اللہ نے خبر دی کہ ہم نے بنی آدم کے لیے اس کو بنایا ہے تو ان منافع کا ذکر بھی کیا جو ان چوپایوں میں رکھے ہیں۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ خَلَقَهَا ﴾ پر کلام ختم ہوا۔ پھر فرمایا کہ تمھارے لیے ان میں گرمی کے اسباب ہیں اور ہو سکتا ہے کہ کلام ﴿ لَكُمْ ﴾ پر تمام ہو، لیکن امام واحدی رحمہ اللہ کی بات اولیٰ اور احسن ہے۔ ﴿ دِفْءٌ ﴾ گرمی کو کہتے ہیں جو ان کی پشم، کھال اور بالوں سے حاصل ہوتی ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿ مَنٰفِعُ ﴾ سے مراد ان کا دودھ دینا، ان پر سواری کرنا، ان کا بچہ جننا، ان کے ساتھ کھیتی باڑی کرنا اور اس جیسے اور بہت سے فوائد ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ ﴿ دِفْءٌ ﴾ سے مراد دودھ اور بچہ جننا ہے۔ صحاح میں جوہری نے کہا ہے کہ ﴿ دِفْءٌ ﴾ سے مراد اونٹوں کا بچہ جننا، دودھ دینا اور ان کی وہ چیزیں جن سے فائدہ لیا جاتا ہے۔ پھر کہا کہ ﴿ دِفْءٌ ﴾ گرمی کو بھی کہتے ہیں۔ اگر ﴿ دِفْءٌ ﴾ سے پہلے معنی مراد ہیں تو منافع کو اور منافع پر اس کے سوا محمول کرنا ضروری ہے۔ اور اگر دوسرا معنی مراد ہے تو منافع کی تفسیر ان چیزوں کے ساتھ جن کو ہم نے ذکر کیا ہے واضح ہوگی۔ بعض نے کہا ہے کہ ﴿ مَنٰفِعُ ﴾ سے مراد بچہ جننا ہے، یا سواری کرنا ہے۔

پھر اللہ نے گوشت کی منفعت کو علاحدہ طور پر ذکر کیا، حالاں کہ منافع میں یہ بھی داخل ہے، کیوں کہ یہ منفعت

---

[1] تفسیر الطبري (۱۷/ ۱۶۸)

عظیم ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس نعمت کو خاص طور پر اس لیے ذکر کیا کہ ان کے گوشت اور چربی سے فائدہ اٹھاتے وقت ان کا وجود ہی نہیں رہتا، بخلاف اور منافع کے کہ ان میں وہ خود سالم رہتے ہیں اور ظرف کی تقدیم جو اختصاص کی خبر دے رہی ہے، اس میں اشارہ ہے کہ ان کا کھانا ہی مقصود بالذات ہے اور اس کے علاوہ نادر ہے تو ان کے غیر کا کھانا، جیسے: مرغی، بطخ اور مرغ آبی اور خشکی اور تری کا شکار تو مزہ لینے کے لیے ہوتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ظرف کی تقدیم وقف کے لیے ہے، نہ کہ حصر کے لیے۔ اور چوں کہ لباس کی منفعت کھانے کی منفعت سے زیادہ اور بڑی تھی، اسی لیے اس کو مقدم کیا۔ اور ان انعامات اور احسانات کے ساتھ ساتھ تمھارے لیے ان میں رونق اور زینت ہے جب شام کو واپس لاتے ہو اور جب ان کو چراتے ہو۔ ان کے واپس لانے کو ان کے لے جانے پر مقدم کیا، حالاں کہ یہ خلافِ واقع ہے، اس لیے کہ ان کو واپسی کے وقت دیکھنا اجمل اور احسن ہوتا ہے، کیوں کہ وہ اس وقت کھانے پینے کی حاجت سے بے پروا ہوتے ہیں، ان کے شکم کھانے اور پینے سے لبریز ہوتے ہیں اور ان کے تھن دودھ سے پھولے ہوئے ہوتے ہیں اور جانوروں والے اس وقت بہت خوش ہوتے ہیں، بخلاف ان کو لے جانے کے وقت کہ اس وقت وہ خالی شکم نکلتے ہیں اور ان کے تھن شکم سے لگے ہوئے ہوتے ہیں اور ان دونوں وقتوں کو خاص طور پر اس لیے ذکر کیا کہ دیکھنے والوں کے لیے یہی دو وقت ہیں۔ جب باڑے میں ہوتے ہیں ان کو کوئی نہیں دیکھتا اور جب چراگاہ میں ہوتے ہیں تو متفرق ہوتے ہیں، کوئی کسی طرف اور کوئی کسی طرف چر رہا ہوتا ہے اور یہ جمال اکثر موسم بہار میں ہوتا ہے، جب بارشیں ہوتی ہیں اور گھاس اُگتا ہے۔ عرب باہر چلے آتے ہیں اور چوپایوں کا اس وقت بہت عمدہ نظارہ ہوتا ہے۔ اونٹ، گائے اور بکری اپنی اپنی آواز نکالتے ہیں اور ایک دوسرے کو جواب دیتے ہیں۔

یہ جانور ایک شہر سے دوسرے شہر تک تمھارا بوجھ اٹھا کر جاتے ہیں کہ ان کے بغیر وہاں جانا ایک تکلیف دہ کام ہے۔ تمھارا رب بڑا رؤف اور رحیم ہے جو اس نے تمھارے بوجھ اٹھانے کے لیے چوپائے بنائے اور تمھاری مصالح کو آسان کر دیا۔ آیت میں ﴿ بَلَدٍ ﴾ سے بلاتعین ہر شہر مراد ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ﴿ بَلَدٍ ﴾ سے مکہ مراد ہے۔ یہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ﴿ بَلَدٍ ﴾ سے یمن، مصر اور شام مراد ہے، کیوں کہ یہ عرب کی تجارت کی جگہ تھیں۔

مترجم کہتا ہے کہ ﴿ بَلَدٍ ﴾ کا لفظ عام ہے اور ہر قریب اور دور والے شہر کو شامل ہے، کیوں کہ جب مقام عموم کا مقتضی ہو تو خصوصِ سبب کا اعتبار نہیں ہوتا۔

﴿ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ﴾ میں ''شق'' کا معنی مشقت ہے اور لفظ شین کی زبر اور زیر کے ساتھ دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے صحاح میں کہا کہ ''شق'' کا معنی مشقت ہے اور یہی معنی اللہ کے اس قول ﴿ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ﴾ میں مراد ہے اور احتمال ہے کہ مفتوح (شین کی زبر کے ساتھ) مصدر ہو اور مکسور (شین کی زیر کے ساتھ)

نصف کے معنی میں ہو، کہا جاتا ہے: ''أَخَذْتُ شِقَّ الشَّاةِ وَشِقَّةَ الشَّاةِ'' یعنی میں نے آدھی بکری لی۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ تم ان شہروں تک نہیں پہنچ سکتے، مگر آدھی جانوں کے ساتھ، یعنی تھکن کی وجہ سے تم اپنی اصلی حالت پر نہیں رہ سکتے ہو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر انعام کی پیدایش کا علی العموم احسان رکھا، پھر خاص اونٹ کا ذکر کیا، اس لیے کہ یہ بخلاف گائے اور بکری کے بوجھ اٹھانے کے ساتھ خاص ہے۔[1]

وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً ۭ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۸

اور (اسی نے) گھوڑے، خچر اور گدھے (پیدا کیے) تاکہ تم ان پر سواری کرو اور زینت کے لیے (انھیں پیدا کیا)، اور وہ پیدا کرتا ہے جو تم نہیں جانتے ⑧

گھوڑے، خچر اور گدھے پیدا کرنے کے فوائد:

یہ ایک دوسری قسم ہے جس کے پیدا کرنے کا احسان اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر رکھا ہے اور یہ گھوڑے، خچر اور گدھے ہیں۔ ان حیوانات کو سواری اور زینت کے لیے بنایا ہے، گویا ان کا بڑا مقصد یہی ہے۔ اور اُن کو جو انعام پر فضیلت دی ہے اور ان کا الگ سے اس جگہ ذکر کیا ہے، اس وجہ سے بعض علما نے گھوڑے کے گوشت کے حرام ہونے کی دلیل اس آیت سے لی ہے، چناں چہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب اور اُن فقہا کا مذہب جو اُن کے موافق ہیں، یہی ہے کہ گھوڑے کا گوشت حرام ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے گھوڑے کا ذکر خچر اور گدھے کے ساتھ کیا ہے اور یہ دونوں سنتِ نبویہ کی دلیل سے حرام ہیں۔ اسی طرف اکثر علما گئے ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما گھوڑے کے گوشت کو مکروہ رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ انعام کھانے کے لیے ہیں، جیسے فرمایا: ﴿ وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴾ [النحل: ٥] ''اور اس نے چوپائے بھی پیدا کیے، ان میں تمھارے لیے گرمی حاصل کرنے کا سامان اور دیگر منافع ہیں اور ان میں سے بعض کو تم کھاتے (بھی) ہو'' اور یہ سواری کے لیے ہیں۔ جیسے فرمایا: ﴿ وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا ﴾ (آیتِ باب) حکم بن عتیبہ رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں[1] اور سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گھوڑے، خچر اور گدھے کا گوشت کھانے سے منع فرمایا۔[2] (رواه أحمد و أبوداود والنسائي وابن ماجه من حديث صاحب بن المقدام وفيه كلام)

---

① فتح البیان (۷/ ۲۰۸۔ ۲۱۰) ② تفسیر الطبري (۱۷/ ۱۷۲۔ ۱۷۳)

③ مسند أحمد (٤/ ۸۹) سنن أبي داود، رقم الحديث (۳۷۹۰) سنن النسائي، رقم الحديث (٤۳۳۲) سنن ابن ماجه، رقم (۳۱۹۸)

اس حدیث کو امام احمد رحمہ اللہ نے دوسری وجہ سے مقدام بن معدی کرب سے زیادہ تفصیل سے روایت کیا ہے۔
اس کے الفاظ یہ ہیں: مقدام بن معدی کرب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہم نے خالد بن ولید کے ساتھ صائفہ کا جہاد کیا تو ہمارے ساتھی میرے پاس گوشت لائے اور مجھ سے ایک گھوڑی مانگی، میں نے دے دی، تو انھوں نے اس کو ذبح کرنے کے لیے باندھا تو میں نے کہا کہ ٹھہرو میں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے پوچھ کر آتا ہوں۔ میں نے ان سے آکر پوچھا تو انھوں نے کہا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوۂ خیبر میں تھے تو لوگوں نے یہود کے باغوں میں جلدی کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ میں منادی کروں کہ نماز کے لیے جمع ہو جاؤ اور صرف مسلمان ہی آئیں۔
پھر فرمایا: اے لوگو! تم نے یہود کے باغوں میں جلدی کی، سن لو تم پر ذمیوں کا مال حرام ہے، مگر حق کے ساتھ۔ تم پر گھریلو گدھے، گھوڑے اور خچر کا گوشت حرام ہے اور ہر کچلی والا درندہ (نوکیلے دانت والا درندہ) اور ہر پنجے والا پرندہ (یعنی جو پنجے سے شکار کرنے) حرام ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ فعل خیبر کے یہود کو عہد دینے اور ان کے ساتھ آدھا حصہ دینے کا معاملہ طے ہو جانے کے بعد واقع ہوا ہے۔ واللہ أعلم.
اگر یہ حدیث صحیح ہو تو گھوڑے کے گوشت کی حرمت میں نص ہے، لیکن یہ حدیث اس حدیث کا مقابلہ نہیں کر سکتی جو صحیحین میں سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھریلو گدھے کے گوشت سے منع فرمایا اور گھوڑوں کے گوشت کی اجازت دی۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے دوسری روایت ہے کہ ہم نے خیبر کے دن گھوڑے، خچر اور گدھے ذبح کیے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو خچر اور گدھے کے گوشت سے منع فرمایا اور گھوڑے کے گوشت سے منع نہ فرمایا۔ (رواہ أحمد و أبو داود) صحیح مسلم میں سیدہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں گھوڑا ذبح کیا اور ہم نے اس کو کھایا اور ہم مدینہ میں تھے۔ سو یہ حدیث زیادہ مدلل، قوی اور ثابت ہیں۔ جمہور علما اور امام مالک، شافعی، احمد اور اُن کے اصحاب اور اکثر سلف و خلف اسی طرف گئے ہیں۔ واللہ أعلم.
سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ گھوڑے وحشی (جنگلی) تھے، اللہ تعالیٰ نے اس کو اسماعیل بن ابراہیم علیہما السلام کے لیے مطیع اور فرماں بردار کر دیا۔[1] امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے اپنی اسرائیلیات میں ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے گھوڑے کو جنوبی ہوا سے پیدا کیا۔ بہر حال نص ان جانوروں پر سواری کے جائز ہونے کے لیے ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک خچر تحفے میں آیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر سوار ہوا کرتے تھے، حالاں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گدھوں کو گھوڑیوں پر جست کرانے سے منع کیا ہے، تاکہ نسل منقطع نہ ہو۔ دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! کیا میں آپ کے لیے ایک گدھا ایک گھوڑی پر نہ چھوڑ دوں کہ وہ خچر جنے اور آپ اس پر سوار ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ کام نادان کیا کرتے ہیں۔ انتہیٰ ما قال ابن کثیر.[2] (رواہ احمد)

---

[1] الدر المنثور (٥/ ١١١) [2] مسند أحمد (٤/ ٣١١) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٧٣٣۔ ٧٣٤)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ کاشف یہ ہے اور تمھارے لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ تین قسمیں بھی بنائیں اور گھوڑے کو خیل اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ ناز سے چلتا ہے اور خیل جمع ہے اور اس کا واحد خائل ہے، جیسے ضائن ضان کا واحد اور بعض نے کہا ہے کہ اسمِ جنس ہے، اس کا اس کے لفظ سے کوئی واحد نہیں ہے، بلکہ اس کے معنی سے ہے اور وہ فرس ہے اور بغال بغل کی جمع ہے اور وہ گھوڑے اور گدھے سے متولد ہوتا ہے اور حمیر حمار کی جمع ہے۔ پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان انواعِ ثلاثہ کی پیدایش کی معظم علت بیان کی اور فرمایا: ﴿ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً ﴾ ''تاکہ تم ان پر سواری کرو اور زینت کے لیے (انھیں پیدا کیا)۔'' اور یہ علت اس اعتبار سے ہے کہ سواری ان انواع کے بڑے مقاصد میں سے ہے اور سواری کے سوا ان انواع سے اور طرح کے انتفاع بھی معلوم ہیں، بوجھ لادنا وغیرہ اور ﴿ زِيْنَةً ﴾ کا ﴿ لِتَرْكَبُوْهَا ﴾ کے محل پر عطف ہے، کیوں کہ وہ نصب کے محل میں ہے اور یہ پیدایش کی بھی علت ہے اور ''لِتَتَزَيَّنُوْا'' نہ فرمایا، تاکہ معطوف علیہ کے مطابق ہو جاتا، کیونکہ رکوب مخاطبین کا فعل ہے اور زینت زائن کا اور وہ باری تعالیٰ ہے اور اصل بات یہ ہے کہ معتبر مقصود میں رکوب ہی ہے بخلاف زینت کے کہ اس کی طرف ہمت والے التفات بھی نہیں کرتے، کیوں کہ اس سے عجب پیدا ہوتا ہے تو گویا اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: میں نے ان کو اس لیے پیدا کیا کہ تم ان پر سوار ہو اور ان کے واسطے اور ذریعے سے اپنی جانوں سے تکان اور مشقت کو دور کرو۔ رہی زینت تو وہ اگرچہ فی نفس الامر حاصل ہے، لیکن مقصود بالذات نہیں ہے۔

گھوڑے کے گوشت کی حرمت کے قائلین نے اس آیت سے دلیل لی ہے، وہ اس طرح کہ ان کی خلق کی رکوب علت بیان کرنا دلالت کرتا ہے کہ یہ انواع اسی مصلحت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں نہ کسی اور مصلحت اور علت کے واسطے۔ کہتے ہیں اور ان انواعِ ثلاثہ کو علاحدہ بیان کرنا اور ان کو انعام سے نکالنا بھی اسی کا مؤید ہے، اب یہ مفید ہوگا کہ ان انواعِ ثلاثہ کا حکم تحریمِ اکل میں متحد اور متفق ہے۔ نیز کہتے ہیں کہ اگر گھوڑوں کا اکل جائز ہوتا تو اس کے اکل کے ذکر کے ساتھ احسان اس کے رکوب کے ذکر سے اولیٰ تھا، کیوں کہ اکل میں رکوب سے زیادہ فائدہ ہے۔ امام مالک اور امام ابو حنیفہ اور ان دونوں کے اصحاب اور اوزاعی اور مجاہد اور ابو عبید وغیرہم اسی طرف گئے ہیں، جب کہ جمہور فقہا اور محدثین وغیرہم گھوڑوں کے گوشت کی حلت کی طرف گئے ہیں اور یہی قول ہے امام حسن بصری، شریح، عطا اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ کا اور اسی طرف گئے ہیں امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور اسحاق رحمہم اللہ۔

پہلے قول والوں کے لیے ﴿ لِتَرْكَبُوْهَا ﴾ کے ساتھ علت بیان کرنے میں کوئی حجت نہیں ہے، کیوں کہ یہ اس کی عظیم منفعت کا ذکر ہے اور اس کے اغلب منافع کا ذکر کرنا اس کے غیر کا منافی نہیں۔ نیز ہم اس امر کو بھی تسلیم نہیں کرتے کہ اکل میں رکوب سے زیادہ فائدہ ہے، تاکہ اس کا ذکر کیا جاتا اور اس کا ذکر کرنا رکوب کے ذکر سے اقدم ہوتا

اور دوسرا یہ کہ اگر یہ آیت تحریمِ خیل پر دلالت کرتی تو گدھوں کے لحوم کی حرمت پر بھی دلالت کرتی اور اس وقت خیبر کے سال گدھوں کے گوشت کی تحریم کی تجدید کی حاجت نہ تھی اور ہم بیان کر چکے کہ یہ سورت مکی ہے اور حاصل یہ ہے کہ ادلہ صحیحہ گھوڑوں کے گوشت کی حلت پر دلالت کرتے ہیں۔ اگر ہم تسلیم کر لیں کہ اس آیت سے تحریم کے قائل تمسک کر سکتے ہیں تو سنتِ مطہرہ ثابتہ اس احتمال کے رافع اور اس استدلال کی دافع ہوگی۔ علامہ محمد بن علی شوکانی رحمہ اللہ نے اپنی مؤلفات میں اس مسئلے کو اس وضاحت سے بیان کیا ہے جن میں نظر کرنے والا غیر کا محتاج نہیں رہتا اور لحومِ خیل کی حلت میں احادیث وارد ہوئی ہیں۔

صحیحین وغیرہما میں اسما بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، کہا ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں گھوڑا قربانی کیا اور ہم نے اس کو کھایا اور امام ابوعبیدہ اور ابن ابی شیبہ اور ترمذی رحمہ اللہ نے نکالا اور صحیح کہا اور نسائی اور ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے جابر رضی اللہ عنہ سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو گھوڑوں کے گوشت کھانے کی اجازت دی اور گھر والے گدھوں کے گوشت کھانے سے منع فرمایا اور ابو داود نے اسی کی مثل جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی نکالا اور یہ دونوں حدیثیں مسلم کی شرط پر ہیں اور صحیحین میں جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھر والے گدھوں کے گوشت سے منع فرمایا اور گھوڑوں کے گوشت کھانے کی اجازت دی۔ رہی وہ حدیث جس کو امام ابو عبیدہ اور ابو داود اور نسائی رحمہ اللہ نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے نکالا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہر نوکیلے دانت والے درندے کے کھانے سے اور گھوڑوں اور خچروں اور گدھوں کے گوشت کھانے سے تو اس کی اسناد میں صالح بن یحییٰ بن ابی المقدام ہے اور اس میں مقال ہے۔ اگر ہم فرض کر لیں کہ یہ حدیث صحیح ہے تو بھی حلت کی حدیث کا معارضہ نہیں کر سکتی۔ اس کے علاوہ ممکن ہے کہ جس حدیث میں تحریم کی تصریح ہے، خیبر کے دن سے پہلے کی ہو تو یہ منسوخ ہوگی۔

پھر فرمایا کہ جن چیزوں کو یہاں شمار کیا، ان کے علاوہ وہ اشیا عجیبہ اور غریبہ اللہ تعالیٰ بناتا ہے اور بنائے گا، جن کے احاطے سے تمھارا علم عاجز ہے۔ اس آیت میں وہ سب چیزیں داخل ہیں اور آیتِ کریمہ ان سب اشیا کو شامل ہے جو قرآنِ کریم کے نزول کے وقت موجود نہ تھیں اور پیچھے حادث ہوئیں اور ریل اور پاؤں گھوڑے اور جتنی کلین اور مشینیں حادث ہوئیں، سب کو یہ آیت شامل ہے، بلکہ ان کا حدوث قرآنِ کریم کا ایک معجزہ ہے کہ اس پیش گوئی کے مطابق قرآن کے نزول کے بعد ہزارہا اشیا ظہور میں آئیں اور ان شاء اللہ تعالیٰ آئیں گی۔

اگر قرآن کریم کے نزول کے بعد کوئی چیز ایجاد نہ ہوتی تو یہ قرآن مجید پر ایک نوع اعتراض تھا کہ وہ کون سی اشیاء ہیں جن کی بابت اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ وہ چیزیں بنائے گا جن کا ابھی تم کو علم نہیں، جب ان اشیا کا ظہور ہوا تو یقیناً معلوم ہوا کہ قرآن کریم صدق ہے اور اس کا کلام ہے جس نے اپنے حق میں فرمایا: ﴿ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴾ [النساء: ۸۷] ”اور بات کہنے میں اللہ سے زیادہ کون سچا ہے؟“

نیز فرمایا: ﴿ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ﴾ [النساء: ١٢٢] ''اور اللہ سے بڑھ کر کون قول و قرار میں سچا ہے؟'' ؎

جَمِيْعُ الْعِلْمِ فِيْ الْقُرْآنِ لٰكِنْ تَقَاصَرَ عَنْهُ أَفْهَامُ الرِّجَال

[قرآنِ مجید میں سارا علم ہے، لیکن لوگوں کے افہام اس کے ادراک سے قاصر ہیں]

اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے: ﴿ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴾ [یوسف: ١١١] ''بلکہ اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق اور ہر چیز کی تفصیل ہے اور ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔'' یعنی یہ قرآن موافق اس کلام کے ہے جو اس سے پہلے ہے اور کھولنا ہر چیز کا اور راہ ہو جاتی اور مہربانی ان لوگوں کو جو یقین لاتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ مراد انواع حشرات اور ہوام ہیں جو زمین کے نیچے رہتے ہیں اور دریاؤں میں جن کو بشر نے نہیں دیکھا اور نہ سنا۔ بعض نے کہا کہ ان سے وہ انعامات مراد ہیں جن کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے بندوں کے لیے جنت میں پیدا کیا ہے اور وہ عذاب مراد ہیں جن کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے کفار کے لیے دوزخ میں مہیا کر رکھا ہے اور وہ انعامات اور عذاب وہ ہیں جن کو انھوں نے آنکھوں سے نہیں دیکھا اور کانوں نے نہیں سنا اور دلوں پر ان کا خیال نہیں آیا۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے سسری کا نبات میں اور کیڑی کا فواکہ میں پیدا کرنا مراد ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ عرش کے نیچے ایک چشمہ ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ نور کی ایک نہر ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ سفید زمین مراد ہے اور ان انواع میں سے کسی نوع پر اس آیت کو مقصور و محصور کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ وہ چیزیں پیدا کرتا ہے جن کا بندوں کو علم نہیں ہے۔ تو یہ آیت ہر اس شے کو شامل ہے جس کو بندے کا علم محیط نہیں ہے۔ امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نکالا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کی مخلوق میں سے ایک سفید موتی کی زمین ہے۔ پھر امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے اس کے اوصاف بیان کیے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث موضوع ہے، پھر اس کے آخر میں کہا، پھر یہی معنی ہیں اللہ تعالیٰ کے قول ﴿ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ کے۔

وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ ۚ وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٩﴾

اور سیدھی راہ اللہ ہی پر (جا پہنچتی) ہے، اور بعض (راہیں) ان میں سے ٹیڑھی ہیں، اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دیتا ⑨

دینی راستوں کا بیان:

یعنی اس کی قدرتیں دیکھ کر اس کی خوبیاں صاف معلوم ہوتی ہیں اور جس کی عقل سیدھی نہیں وہ بہکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے پہلے حیوانات کا ذکر کیا، جن پر لوگ صاف اور واضح نظر آنے والے راستوں پر چلتے ہیں۔ پھر معنوی اور دینی راستے سے آگاہ فرمایا۔ قرآن پاک میں امورِ حسیہ کے ذکر کے بعد امورِ معنویہ، نافعہ، دینیہ کو ذکر کیا جاتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ﴾ [البقرة: ١٩٧] ''اور (حج کے لیے) زادِ راہ لے لو، بے شک بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَ رِيْشًا ؕ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ ﴾ [الأعراف: ٢٦] ''اے بنی آدم! بے شک ہم نے تم پر ایسا لباس نازل کیا جو تمھاری شرم گاہیں چھپاتا ہے اور زینت کا باعث ہے، اور پرہیز گاری کا لباس بہت بہتر ہے۔''

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس جگہ چوپایوں وغیرہ کا ذکر کیا کہ لوگ اُن کی پشت پر سوار ہو کر اپنا کام نکالتے ہیں اور بوجھ لاد کر دور دراز شہروں کو لے جاتے ہیں اور تکلیف دہ سفر کرتے ہیں۔ پھر اُن راستوں کا ذکر شروع کیا جن پر لوگ چلتے ہیں اور فرمایا کہ جو سچا اور سیدھا راستہ ہے وہ چلنے والے کو اللہ تک پہنچا دیتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾ [الأنعام: ١٥٣] ''اور یقیناً یہ میرا راستہ سیدھا ہے، لہٰذا تم اسی کی پیروی کرو، اور تم دوسرے راستوں کی پیروی مت کرو، وہ تمھیں اللہ کے راستے سے الگ کر دیں گے۔ اللہ نے تمھیں اس کی تاکید کی ہے، تاکہ تم پرہیز گاری اختیار کرو۔'' نیز فرمایا: ﴿ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ﴾ [الحجر: ٤١] ''یہی مجھ تک (پہنچانے والی) سیدھی راہ ہے۔''

امام مجاہد رحمہ اللہ نے آیتِ باب کی تفسیر میں کہا ہے کہ ''طريق الحق على الله'' ''یعنی حق کا راستہ اللہ کی طرف پہنچتا ہے۔'' اور امام سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہاں سبیل سے مراد اسلام ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ''على الله البيان'' یعنی راہ یابی اور گمراہی کا بیان کر دینا اللہ پر ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا ﴾ [الشمس: ٨] ''پھر اس کی بدی اور اس کا تقویٰ اس پر الہام کیا۔'' نیز فرمایا: ﴿ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ﴾ [الدهر: ٣] ''بے شک ہم نے اسے راستے کی ہدایت دی، خواہ شکر گزار بنے یا ناشکرا۔''

امام قتادہ اور ضحاک رحمہما اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے،[1] لیکن امام مجاہد رحمہ اللہ کا قول سیاق کی حیثیت سے زیادہ قوی ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ راہیں جن پر چلا جاتا ہے بہت ہیں اور اُن میں اللہ کی طرف وہی راہ پہنچتی ہے جو حق ہے۔ یعنی شریعت کا راستہ جس کو اس نے پسند فرمایا ہے۔ باقی سارے طریقے مسدود ہیں اور اُن میں کیے گئے اعمال مردود ہیں، جیسے اللہ نے فرمایا: ﴿ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾ [آل عمران: ٨٥] ''اور جو اسلام کے سوا کوئی اور دین تلاش کرے گا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ١٧٥۔ ١٧٦)

﴿ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓىِٕكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ﴾ [النساء: ۱۲٤] ''اور جو کوئی نیک کام کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، جب کہ وہ مومن ہو تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے، اور ان پر ذرا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

نیز فرمایا: ﴿ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ﴾ [النحل: ۹۷] ''جس نے نیک عمل کیے، مرد ہو یا عورت، جب کہ وہ مومن ہو تو ہم ضرور اسے پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے۔'' نیز فرمایا: ﴿ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ﴾ [الأنبياء: ۹٤] ''چناں چہ جو بھی نیک عمل کرے اور وہ مومن (بھی) ہو تو اس کی کوشش کی ناقدری نہ ہوگی۔'' ان سب آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اعمال کی قبولیت میں ایمان شرط ہے، ایمان کے بغیر اعمال قبول نہیں ہوتے ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ ﴿ وَمِنْهَا جَآىِٕرٌ ﴾ یعنی ان میں سے کوئی راہ حق سے دور لے جانی والی ہے، سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہ مختلف طریقے اور متفرق آرا ہیں، جیسے: یہودیت ونصرانیت ومجوسیت۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت یہ ہے: ''ومنكم جائر''[1]

پھر اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ یہ سب باتیں اللہ کی قدرت ومشیت سے ہیں اور فرمایا: ﴿ وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴾ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ﴾ [یونس: ۹۹] ''اور اگر آپ کا رب چاہتا تو جو لوگ زمین میں ہیں، سب کے سب، سارے ہی ایمان لے آتے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ۝ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴾ [هود: ۱۱۸۔ ۱۱۹] ''اور اگر آپ کا رب چاہتا تو یقیناً تمام لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا، لیکن وہ ہمیشہ (باہم) اختلاف کرتے رہیں گے۔ سوائے ان لوگوں کے جن پر آپ کے رب نے رحم کیا، اور اسی لیے اس نے انھیں پیدا کیا، اور آپ کے رب کی بات پوری ہوئی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں، سب سے ضرور بھروں گا۔'' انتهىٰ ما قال ابن كثير بزيادة.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا کہ قصد فاعل کے معنی میں مصدر ہے، تو اس کے معنی یہ ہوئے: ''وَعَلَى اللّٰهُ هِدَايَةُ قَاصِدِ الطَّرِيْقِ الْمُسْتَقِيْمِ بِمُوْجِبِ وَعْدِهِ الْمَحْتُوْمِ وَتَفَضُّلِهِ الْوَاسِعِ'' یعنی اللہ پر ہے طریق مستقیم کی ہدایت اپنے حتمی وعدے اور وسیع فضل کے موجب۔ بعض نے کہا ہے کہ یہاں مضاف محذوف ہے اور تقدیر یوں ہے: ''وَعَلَى اللّٰهُ بَيَانُ قَصْدِ السَّبِيْلِ'' یعنی اللہ پر ہے سیدھی راہ کا بیان کرنا ہے۔ سبیل سے مراد اسلام ہے اور اس کا

[1] تفسير الطبري (۱۷/ ۱۷٦)

بیان کرنا اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو بھیجا اور کتابیں اتاریں اور حجج اور براہین اپنی توحید اور اپنے رسولوں کی رسالت پر قائم کیے اور سبیل میں قصد یہ ہے کہ وہ سبیل موصل الی المطلوب ہو تو حاصل معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے لے لیا ہے اور ان راہوں کا بیان کرنا جو مطلوب تک پہنچا دیتی ہیں۔ تو سیدھا راہ اسلام ہے اور کج راہیں یہودیت ہے اور نصرانیت اور مجوسیت ہے اور صابئیت اور کفر کی سب ملتیں۔ بعض نے کہا ہے کہ قصدِ سبیل سے سنتِ مطہرہ مراد ہے اور جائر سے بدعتِ محدثہ مضلہ مراد ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول ہے کہ اللہ پر ہے کہ ہدایت اور ضلالت کو بیان کرے اور جائر سے سبلِ متفرقہ مراد ہیں اور امام قتادہ رحمہ اللہ کا یہ قول ہے کہ اللہ پر ہے بیان کرنا اپنے حلالوں اور حراموں کا اور اپنی طاعت اور معصیت کا اور بعض راہیں کج ہیں، یعنی حق سے کج ہیں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ پڑھا کرتے: "ومنکم جائر" اور اگر اللہ چاہتا تو راہ دیتا تم سب کو، یعنی اگر چاہتا تو سب کو ایسا راہ دیتا کہ وہ طریق واضح صحیح تک پہنچا دیتا تو کر سکتا تھا، لیکن اس نے نہ چاہا، بلکہ اس کی مشیت و ارادہ طریق اور اس کی دلالت کی ہے مقتضی ہوئی جیسے فرمایا: ﴿ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ﴾ [البلد: ۱۰] "اور ہم نے اسے دونوں راستے سمجھا دیے۔" رہا بالفعل اس تک پہنچانا تو اس سے لازم آتا ہے کہ عباد میں کوئی کافر موجود نہ ہو اور نہ مسلمانوں میں کوئی مستحقِ نار ہو، حالاں کہ مشیت ربانی اس امر کی مقتضی ہے کہ بعض مومن ہوں اور بعض کافر جیسے قرآنِ کریم کی بہت سی آیات اس مضمون پر ناطق اور اس امر کی شاہد ہیں اور جب اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنے وجود باجود اور اپنی کمالِ قدرت اور اپنی بدیعِ صنعت پر حیوانات کے عجائب احوال بیان کرنے سے دلیل لی تو چاہا کہ مطلوب پر نباتات کے غرائب احوال کے ذکر کے ساتھ بھی استدلال بیان کرے تو فرمایا:[1]

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّ مِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ ۝۱۰ يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَ الزَّيْتُوْنَ وَ النَّخِيْلَ وَ الْاَعْنَابَ وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۱۱

وہی ہے جس نے آسمان سے تمھارے لیے پانی نازل کیا، اسی سے پینا ہے اور اسی سے درخت (اُگتے) ہیں جن میں تم (جانور) چراتے ہو ⑩ وہ اسی (پانی) سے تمھارے لیے کھیتی اُگاتا ہے اور زیتون اور کھجور اور انگور اور ہر قسم کے پھل۔ بے شک اس میں غور و فکر کرنے والے لوگوں کے لیے بہت بڑی نشانی ہے ⑪

[1] فتح البیان (۷/ ۲۱۴۔ ۲۱۵)

بارش سے حاصل ہونے والے فوائد کا بیان:

جب اللہ تعالیٰ نے ان چوپایوں اور جانوروں کا ذکر فرمایا کہ جن کے بنانے سے اس نے اپنے بندوں پر انعام کیا تو پھر اپنی اس نعمت کا ذکر شروع کیا جو اس نے بارش کے اتارنے میں اپنے بندوں پر کی ہے کہ اس میں ان کے لیے اور چوپایوں کے لیے فائدہ ہے اور فرمایا: ﴿ لَكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ ﴾ یعنی ہم نے آسمان کے پانی کو زلال (میٹھا، ٹھنڈا) شیریں اُتارا ہے، جس کا پینا تمھارے لیے آسان ہے، کچھ کھارا اور کڑوا نہیں کیا کہ تمھارے گلے میں پھنسے اور نیچے نہ اُترے، جیسے فرمایا: ﴿ اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ۞ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ۞ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ﴾ [الواقعة: ٦٨۔ ٧٠] ''بھلا بتاؤ تو وہ پانی جو تم پیتے ہو۔ کیا وہ تم نے بادلوں سے نازل کیا ہے یا ہم نازل کرنے والے ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اسے کھارا کر دیں، پھر تم شکر کیوں نہیں کرتے؟'' اور اسی پانی سے ایسے درخت پیدا کیے جو تمھارے جانوروں اور چوپایوں کے لیے غذا ہیں۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام عکرمہ، ضحاک، قتادہ اور ابن زید رحمہم اللہ کا ہے۔[1]

سنن ابن ماجہ میں مرفوع حدیث ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورج کے طلوع ہونے سے پہلے چرانے سے منع فرمایا ہے۔[2] پھر جب آسمان کا پانی زمین پر برستا ہے تو اسی ایک پانی سے طرح طرح کی اشیا پھل، میوے اور دانے جو مختلف ذائقے، رنگ، خوشبو اور شکل کے ہوتے ہیں، اُگتے ہیں۔ اس لیے فرمایا: ﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴾ یعنی اس میں واضح دلالت ہے اس بات پر کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ﴾ [النمل: ٦٠] ''(کیا یہ معبودانِ باطلہ بہتر ہیں) یا وہ (اللہ) جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمھارے لیے آسمان سے پانی اُتارا؟ پھر ہم نے اس سے ایسے پر رونق باغ اُگائے جن کے درخت اُگانے کی تمھیں قدرت نہ تھی، کیا اللہ کے ساتھ کوئی (اور) معبود ہے؟ بلکہ (یہ) وہ لوگ ہیں جو (غیر اللہ کو اللہ کے) برابر ٹھہراتے ہیں۔'' انتھیٰ ما قال ابن كثير بزيادة.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ پس پانی کے اس اُتارنے اور نباتات کے پیدا ہونے میں اس قوم کے لیے اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت اور وحدانیت کی دلیل ہے جو اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں غور و فکر کرتی ہے اور اُن سب مصنوعات میں نظر کو بے فائدہ طور پر نہیں ڈالتی۔

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ١٧٨) [2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٢٠٦)

اس سورت میں لفظِ آیت سات بار آیا ہے، پانچ جگہ مفرد اور دو جگہ جمع کے صیغے میں۔ امام کرمانی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جس جگہ مفرد آیا ہے وہاں اللہ کی وحدانیت کے لیے ہے۔ وھو اللہ تعالیٰ۔ اور جہاں جمع کے لفظ کے ساتھ آیا ہے وہاں مسخرات (تسخیر کی ہوئی چیزوں) کی مناسبت سے آیا ہے۔ اس فاصلے کو تفکر پر ختم کیا ہے، اس لیے کہ زمین سے اُگنے والی چیزوں اور سبزیوں پر نظر کرنا، جو کہ آسمان کے پانی کی محتاج ہیں، مزید غور وفکر کی متقاضی ہیں۔ تو نے نہیں دیکھا کہ زمین میں ایک دانہ رکھتے ہیں، جب اس پر زمین کی رطوبت کے ساتھ وقت کی ایک مقرر مقدار گزر جاتی ہے تو وہ پھول کر پھٹ جاتا ہے، اس کا اعلیٰ حصہ اوپر جاتا ہے اور درخت بنتا ہے اور نچلے حصے کی رگیں زمین میں گھستی ہیں، پھر اس کا اوپر والا حصہ بڑھ کر قوت پکڑتا ہے، اس سے پتے اور پھول اور کلیاں اور پھل نکلتے ہیں، جو ایسے اجسام پر مشتمل ہوتے ہیں، جن کی طبیعتیں، ذائقے، رنگ، خوشبو، شکلیں اور فائدے مختلف ہوتے ہیں۔ اس میں جو شخص غور وفکر کرتا ہے، وہ جان لیتا ہے کہ جس ہستی کے افعال اور آثار یہ ہیں، کسی اور شے کا صفاتِ کمال میں اس کا مشابہ ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ پھر کسی اور خسیس ترین چیز کا اس کے ان خاص ترین صفات میں شریک ہونے کا کیا ذکر ہے۔ وہ صفتِ خاص اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور استحقاقِ عبادت ہے۔ تعالى عن ذلك علوا كبيرا. ایسے ہی خازن اور ابو السعود میں ہے۔[1]

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ۙ۱۲ وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ۝۱۳

اور اس نے تمھارے لیے مسخر کیے، رات اور دن اور سورج اور چاند، اور تمام تارے بھی اسی کے حکم کے پابند ہیں۔ بے شک اس میں عقل مند لوگوں کے لیے البتہ کئی نشانیاں ہیں (12) اور رنگ برنگ کی وہ چیزیں بھی (تابع کر دیں) جو اس (اللہ) نے تمھارے لیے زمین میں پیدا کیں۔ بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے جو نصیحت پکڑتے ہیں، بہت بڑی نشانی ہے (13)

اللہ تعالیٰ کے انعامات اور قدرت کی نشانیاں:

چار چیزوں کے ساتھ بندوں کے کام کا صریح تعلق ہے، لیکن ستاروں سے بہ ظاہر اُن کو کچھ کام نہیں، ان کا الگ سے ذکر فرمایا۔ زمین میں جو چیزیں پھیلائیں، شاید اُن سے جانور مراد ہیں۔ اللہ پاک نے اپنی بڑی نشانیوں اور

---

[1] فتح البیان (۷/ ۲۱۵۔ ۲۱۶)

بڑے بڑے احسانات پر بندوں کو آگاہ کیا کہ دیکھو تمھارے لیے رات دن مسخر کر دیے ہیں، ایک کے پیچھے دوسرا چلا آتا ہے اور سورج اور چاند چکر مارتے رہتے ہیں (سورج تین سو ساٹھ دن اور چاند اٹھائیس دن میں ختم کرتا ہے) اور ستارے اور سیارے آسمان کے کناروں میں نور اور روشنی ہیں، ان سے راستوں کا اندھیروں میں بھی پتا لگتا ہے اور چاند سورج میں سے ہر ایک اپنے اپنے فلک میں تیرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ایک حرکت اندازے سے مقرر کی ہے، وہ نہ اس سے بڑھ سکتے ہیں نہ گھٹ سکتے ہیں، یہ سب اللہ تعالیٰ کی تسخیر، تقدیر اور تسہیل کے ماتحت ہیں اور اُن کے غلبے کے تحت اور زیر دست ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [الأعراف: ٥٤] ''بے شک تمھارا رب وہ اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھے دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر مستوی ہوگیا۔ وہ دن کو رات سے اس طرح ڈھانپتا ہے کہ وہ (رات) جلدی سے اس (دن) کو آلیتی ہے، اور اس نے سورج، چاند اور تارے اس طرح پیدا کیے کہ وہ سب اس (اللہ) کے حکم کے پابند کر دیے گئے ہیں۔ آگاہ رہو! پیدا کرنا اور حکم صادر کرنا اسی کے لیے روا ہے، اللہ رب العالمین بہت بابرکت ہے۔''

لہٰذا فرمایا کہ ان میں عقل مند قوم کے لیے نشانیاں ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کی قدرتِ درخشاں اور سلطانِ عظیم نمایاں پر دلائل ہیں۔ آسمانوں کے جہانوں کے بارے میں متنبہ فرمانے کے بعد زمین پر عجیب وغریب قسم کی مخلوقات اور مختلف اشیاء، یعنی حیوانات، معدنیات، نباتات اور جمادات جو کہ رنگ، روپ اور شکلوں میں مختلف ہیں اور جن میں بہت سے فائدے اور خاصیتیں ہیں، ان کے بارے میں متنبہ فرمایا، تاکہ نصیحت پکڑنے والے لوگ ان نعمتوں پر اللہ کا شکر ادا کریں۔ انتھیٰ ما قال ابن کثیر.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ تسخیر سے مراد یہ ہے کہ ان اشیا کو فائدہ مند ٹھہرایا۔ یہ انسانی مصلحتوں اور ضرورتوں کے تقاضوں کے تحت ایک دوسرے سے آگے پیچھے آتے ہیں جیسے کوئی غلام اپنے آقا کا مطیع ہوتا ہے اور اس کے حکم کے خلاف نہیں کرتا اور نہ ہی وہ اپنے آقا کے ارادے کے خلاف کچھ کرتا ہے اور نہ ہی اپنے آقا کے فائدے کے لیے کام کرنے میں کسی سستی اور کاہلی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ رہے ستارے تو وہ بھی اللہ کے حکم کے مطیع اور مغلوب ہیں۔ ایک ہی مقررہ راستے پر چلتے پھرتے ہیں۔ بندے ان سے اوقات کی مقدار معلوم کرتے ہیں اور اندھیروں میں راستہ پاتے ہیں اور اجزائے زمان کو پہچانتے ہیں۔ خود اُن کو اپنے نفس میں کوئی اختیار نہیں، چہ جائے کہ وہ کسی اور پر اختیار رکھیں۔ اس پر فلسفیوں اور نجومیوں کا رد ہے کہ وہ عالمِ سفلی میں ان نجوم کو کسی کام میں اختیار والا اعتقاد کرتے ہیں۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے خبر دی ہے کہ یہ ہمارے قہر اور ارادے کے تحت میں ذلیل ہیں اور ان کی تسخیر اور ان کے کام لگانے میں ان لوگوں کے لیے پتے اور نشانیاں ہیں جو اپنے عقول کو ان آیات میں خرچ کرتے ہیں جو صانع کے وجود اور اس کی تفردِ الوہیت اور ربوبیت پر دلیل ہیں اور دلیل ہیں کہ اس کے شریک کا وجود موجود نہیں ہے اور اس وقف اور فاصلے کو عقل کے ساتھ ختم کیا، کیوں کہ علوی آثار اور آیات کی دلالت قدرتِ باہرہ پر ظاہر ہے اور اس کی کبریائی اور عظمت پر ان کی شہادت بین ہے اور آیات کو جمع سے تعبیر کیا ﴿مُسَخَّرٰتٍ﴾ کی مطابقت کے لیے اور بعض نے کہا ہے کہ ہر ایک کی تسخیر رات کی تسخیر اور دن کی تسخیر اور آفتاب کی تسخیر اور چاند کی تسخیر اور نجوم کی تسخیر علاحدہ علاحدہ فی نفسہا ایک ایک آیت ہے اور بہتر یہ تقریر ہے کہ کہا جائے کہ جن مواضع میں سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آیت کو بعض میں مفرد سے تعبیر کیا اور بعض میں جمع سے، ان میں سے ہر ایک موضع ایک اعتبار سے آیت کے جمع کے ساتھ تعبیر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور ایک اعتبار سے افراد کے ساتھ تعبیر کرنے کی تو ایک طریق پر نہ رکھا، تاکہ دونوں امروں کے جواز پر تنبیہ ہو جائے اور ہر ایک کی عمدگی معلوم ہو جائے اور کام میں لگا دے تمھارے وہ سب دواب اور انعام اور اشجار اور ثمار جن کو زمین میں پھیلایا، یعنی اللہ تعالیٰ نے مخلوقاتِ سماویہ اور مخلوقاتِ ارضیہ سب کے سب کو بندوں کے کام میں لگا دیا اور ان کے الوان مختلف ہیں، ان اشیا کے بکھیرنے میں، ایسی حالت میں کہ ان کے رنگ مختلف ہیں اور اشکال جدا جدا، حالانکہ یہ سب طبیعت جسمیہ میں مساوی ہیں، آیتِ عظیمہ ہے جو اس پاک صانع کے وجود اور اس کے تفرد اور وحدانیت اور اکیلے ہونے پر دلیل ہے۔ ان امور کی تسخیر میں، باوجود اس کے کہ ان کے طبائع اور اشکال مختلف ہیں اور ان کا مادہ ایک ہے، ضرور آیتِ واضحہ ہے ان لوگوں کے لیے جو دھیان کرتے ہیں، کیوں کہ جو دھیان کرتا ہے وہ پند لیتا ہے اور عبرت، اور جو عبرت لیتا ہے وہ مطلوب پر دلیل لیتا ہے۔

بعض نے کہا: اول مقامِ تفکر کے ساتھ اس لیے مخصوص ہوا کہ وہاں ایرادِ شبہہ کا امکان تھا اور دوسرا مقامِ عقل کے ساتھ، اس لیے کہ اس کو شبہہ کے ازالے اور علت کے دور کرنے کے پیچھے بیان کیا۔ پھر جس نے اس کے پیچھے بھی وحدانیت کا اعتراف نہ کیا تو وہ عقل والا نہیں ہے، اور تیسرے کو تذکیر کے ساتھ زیادہ دلالت کے لیے جس نے اس کے بعد بھی شک کیا اس کی حس ہی نہیں ہے اور اس میں جو تکلف ہے وہ مخفی نہیں ہے۔ اور بہتر یہی ہے کہ اس جگہ بھی ویسی ہی تقریر کی جائے جیسے افراد آیت اور جمع آیت میں کی گئی، اس طرح کہ ان مواضع ثلاثہ میں سے ہر ایک موضع تفکر کے ذکر اور تعقل کے ذکر اور تذکر کے ذکر کی صلاحیت رکھتا ہے ان اعتباروں کے لحاظ سے جو ظاہر ہیں اور پوشیدہ نہیں ہیں تو ہر ایک موضوع میں ان میں سے جدا جدا لفظوں کے ساتھ تعبیر کرنے میں ایک عمدہ تفنن ہے جو مواضع ثلاثہ میں ایک لفظ کے تعبیر کرنے میں نہیں پایا جاتا۔ انتہیٰ قال ما أبو الطیب في تفسیره.[1]

---

[1] فتح البیان (۷/ ۲۱۷۔ ۲۱۸)

وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا
وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ
مَوَاخِرَ فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۴﴾ وَاَلْقٰى
فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَاَنْهٰرًا وَّسُبُلًا
لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵﴾ وَعَلٰمٰتٍ ۭ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۶﴾
اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَاِنْ
تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸﴾

اور وہی ہے جس نے سمندر مسخر کیا، تا کہ تم اس میں سے تر و تازہ (مچھلی کا) گوشت کھاؤ اور اس میں سے (زیور) موتی نکالو جو تم پہنتے ہو۔ اور تو کشتیاں دیکھتا ہے کہ پانی کو چیرتی چلی جاتی ہیں اور تا کہ تم اس (اللہ) کا فضل تلاش کرو، اور تا کہ تم شکر کرو⑭ اور اس نے زمین میں پہاڑ ڈال (گاڑ) دیے کہ وہ تمھیں لے کر جھک (نہ) پڑیں، اور نہریں اور راستے بنائے، تا کہ تم راہ پاؤ⑮ اور (دیگر) نشانیاں (بنائیں) اور تاروں سے بھی لوگ راہ پاتے ہیں⑯ بھلا جو (اللہ سب کچھ) تخلیق کرتا ہے، وہ اس جیسا ہوسکتا ہے جو (کچھ بھی) تخلیق نہیں کرتا؟ کیا پھر تم نصیحت نہیں پکڑتے؟⑰ اور اگر تم اللہ کی نعمتیں گننا چاہو تو انھیں گن نہ سکو۔ بے شک اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے⑱

سمندروں، پہاڑوں اور ستاروں میں قدرتِ الٰہی کی مزید نشانیاں:

تلاش کرو اس کے فضل سے، یعنی روزی کماؤ، دریا میں ایک ملک سے دوسرے ملک میں جا کر سوداگری کر سکو۔ راستے میں نشانیاں مقرر کر دیں تا کہ تم بھول نہ جاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ دریائے موجزن مسخر ہے، یہ احسان ہے ہمارا بندوں پر کہ ہم نے تلاطم والی لہروں کے سمندر کو ان کے لیے مسخر کر دیا اور اس پر سوار ہو کر چلنا آسان بنا دیا ہے اور دریا میں مچھلیاں پیدا کیں اور اُن کا گوشت بندوں کے لیے۔ وہ مچھلیاں زندہ ہوں، مردہ ہوں، حلال کر دیا اور بندے خواہ حِل میں ہوں یا احرام کی حالت میں اور جو موتی اور جواہرِ نفیسہ دریا میں پیدا ہوتے ہیں، ان کو پانی کی تہہ سے نکالنا آسان کر دیا ہے، لوگ ان جواہرات کا زیور پہنتے ہیں، پھر دریا کشتیوں اور سفینوں کو اُٹھاتا ہے۔ کشتی بان پانی کو پھاڑ کر چلتے ہیں اور بندوں کو اس کی صنعت بتائی اور ان کو یہ کاری گری اپنے نوح علیہ السلام سے ورثے میں ہاتھ آئی ہے، کیوں کہ سب سے پہلے کشتی پر وہی سوار ہوئے تھے اور اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے انہی کو اس صنعت کی تعلیم

فرمائی تھی۔ پھر اُن سے لوگوں نے قرنا بعد قرنٍ و جیلاً بعد جیلٍ سیکھی۔

ایک کنارے سے دوسرے کنارے کو اور ایک شہر سے دوسرے شہر کو اور ایک سمندر سے دوسرے سمندر کو اور اشیا کو ایک جگہ سے دوسری جگہ، یہاں کی چیز وہاں اور وہاں کی چیز یہاں لانے کے لیے ناؤ پر سفر کرنے لگے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ یعنی تلاش کرو اس کے فضل سے اور اس کے احسان مانو۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اللہ نے مغربی اور مشرقی سمندر سے کلام کیا۔ مغربی سمندر سے کہا کہ میں تجھ میں اپنے کچھ بندے سوار کرنے والا ہوں تو ان کے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟ اس نے کہا کہ میں ان کو غرق کر دوں گا۔ فرمایا کہ تیرا عذاب تیرے کناروں میں رہے گا اور میں ان کو اپنے ہاتھوں پر اٹھا لوں گا اور تو زیورات اور شکار سے محروم رہے گا۔ مشرقی سمندر سے کہا ہے کہ میں تجھ میں اپنے کچھ بندے سوار کرنے والا ہوں تو ان کے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟ اس نے کہا: میں ان کو اپنے ہاتھوں پر لے جاؤں گا اور میرا ان کے ساتھ معاملہ ایسے ہی ہوگا جیسے والدہ کا اپنے بچوں کے ساتھ ہوتا ہے تو اس کو بدلے میں زیورات اور شکار دیا۔ (رواه البزار و قال: لا نعلم من رواه عن سهيل غير عبد الرحمن بن عبدالله بن عمر، وهو منكر الحديث، وقد رواه سهيل عن النعمان بن أبي عياش عن عبدالله بن عمرو موقوفا)

پھر اللہ تعالیٰ نے زمین پر پہاڑوں کا بوجھ رکھنے کا ذکر کیا، تاکہ زمین قرار پکڑے اور مضطرب نہ ہو۔ اس کو جنبش ہوگی تو حیوانات زندہ نہ رہ سکیں گے، اس لیے فرمایا: ﴿ وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا ﴾ [النازعات: ٣٢] ''اور پہاڑوں کو مضبوط گاڑ دیا۔'' امام حسن رحمہ اللہ نے کہا کہ جب زمین پیدا ہوئی تو مضطرب تھی۔ فرشتوں نے کہا ہے کہ یہ کسی کو اپنی پیٹھ پر کیوں ٹھہرنے دے گی؟! صبح ہوتے ہوئے پہاڑ پیدا ہو گئے۔ فرشتوں کو پتا نہ لگا کہ یہ پہاڑ کس چیز سے پیدا ہوئے ہیں۔

قیس بن عبادہ رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جب زمین بنائی، وہ جُنبش کرنے لگی۔ ملائکہ نے کہا کہ یہ کسی کو اپنی پشت پر قرار پکڑنے نہ دے گی، صبح کو اس میں پہاڑوں کے بوجھ رکھے تھے۔[1] سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جب اللہ نے زمین کو پیدا کیا تو ہلنے لگی اور بولی: اے رب! تو مجھ پر بنی آدم کو خلیفہ بنائے گا اور وہ گناہ کے مرتکب ہوں گے اور مجھ پر زنا کریں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس پر پہاڑ بوجھ رکھ دیے جن کو تم دیکھتے ہو اور جن کو نہیں دیکھتے ہو۔ تو یہ اس کے ٹھہراؤ کی وجہ ہوئی، جیسے گوشت کانپتا ہے۔ (رواه ابن جرير)

پھر زمین میں ندیاں اور راہیں نکالیں۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ ندی بہتی ہے، اس میں بندوں کے لیے رزق ہے۔ یہ ندی جنگل، صحرا، بیابان، پہاڑ اور گھاٹیاں پھاڑ کر دوسری بستی تک جاتی ہے اور اس شہر والوں کے کام میں آتی ہے اور دائیں بائیں جنوب و شمال مشرق و مغرب میں بہتی ہے۔ کوئی نالہ ہے اور کوئی ندی ہے، کوئی وادی کا سیل ہے کہ کبھی جاری ہے اور کبھی بند، کہیں پانی جمع رہتا ہے اور کسی جگہ منبع نکلتا ہے اور کوئی ندی تیز بہتی ہے اور کوئی دیر میں۔

[1] تفسير الطبري (١٧/ ١٨٣۔ ١٨٤)

یہ سب اللہ تعالیٰ کی تقدیر، ارادہ اور تیسیر کے مطابق ہوتا ہے۔ فلا إلٰه إلا هو ولا رب سواه.

اسی طرح زمین میں راہیں رکھی ہیں کہ ایک شہر سے دوسرے شہر کو راستہ چلتا ہے، وہ راستہ کہیں پہاڑ میں سے ہو کر نکلتا ہے، جہاں پر نہ گزر گاہ ہے اور نہ کوئی راستہ ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَجَعَلْنَا فِيهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ ﴾ [الأنبياء: ٣١] ''اور ہم نے اس میں کھلی راہیں رکھیں، تاکہ وہ (لوگ) راہ پائیں۔'' اور زمین میں علامات ہیں، یعنی بڑے پہاڑوں اور چھوٹے ٹیلوں کے نشان ہیں، مسافر اُن سے خشکی اور سمندر کی راہ معلوم کرتے ہیں، جب راستہ بھول جاتے ہیں اور رات کو تاروں سے راہ یاب ہوتے ہیں۔[1] (قاله ابن عباس)

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی عظمت کے بارے میں آگاہ کیا کہ سوائے اس کے کسی کی عبادت نہ کرنی چاہیے، کیوں کہ یہ بت اور اوثان کوئی شے پیدا نہیں کر سکتے، بلکہ یہ خود پیدا کیے گئے ہیں۔ اس لیے فرمایا: ﴿ أَفَمَنْ يَخْلُقُ كَمَنْ لَا يَخْلُقُ ۗ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴾ (آیتِ باب) پھر اپنی نعمت اور احسان کی کثرت پر متنبہ فرمایا کہ اگر تم چاہو کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کر سکو تو نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ غفور ہے، تمھارے گناہوں سے تجاوز کرتا ہے، اگر تم سے اپنی ادنیٰ سی نعمت کا شکر طلب کرے تو تم عاجز ہو جاؤ اور کسی شے کا حکم دے تو تم کمزور ٹھہرو اور تم سے بجا نہ لایا جائے اور اگر وہ تم کو عذاب کرے تو وہ ہرگز ظالم نہ ہو، لیکن اس کی ذات پاک رحیم وغفور ہے، کثرت سے عفو کرتا ہے۔ تھوڑے سے عمل پر جزائے جزیل دیتا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ رحیم ہے تم سے شکر ادا کرنے میں جو قصور ہو جاتا ہے وہ اس کو بخش دیتا ہے اگر تم توبہ کرتے ہو اور رجوع کرتے ہو اور اس کی مرضی کے مطابق بن جاتے ہو۔ وہ رحیم ہے، توبہ کرنے اور اس کی طرف رجوع کرنے کے بعد تم کو عذاب نہیں کرتا ہے۔ انتهىٰ ما قال ابن كثير في تفسيره.[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تسخیرِ بحر کو بطور احسان ذکر کیا ہے۔ یہ تسخیر یہ ہے کہ تم دریا پر سوار ہوتے ہو اور جواہر نکالتے ہو اور اس میں شکار کرتے ہو، یہ تم پر کتنی بڑی نعمت ہے اور وحدانیت سبحانہ وتعالیٰ پر کیسی صریح دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس جگہ آیاتِ ارضیہ وسماویہ و بحریہ کو نصیحت کے لیے جمع کر دیا اور بندوں کو ارشاد فرمایا کہ وہ ان مختلف قسم کی آیات میں غور کریں اور توحید پر دلیل پکڑیں۔ یہ بات اس لیے فرمائی کہ اتمامِ حجت اور تکمیلِ انذار (ڈرانے کی تکمیل) ہو جائے۔

پھر بحر کو مسخر کرنے کی وجہ بیان کی اور فرمایا: ﴿ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا ﴾ کہ یہ اس لیے کہ تم اس دریا سے تازہ گوشت کھاؤ، یعنی مچھلی کا۔ اس مچھلی کی صفت طراوت (تروتازگی) کے ساتھ کی، تاکہ اس کی لطافت کا اظہار ہو۔

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ١٨٥) [2] تفسير الطبري (١٧/ ١٨٧)

یہ گوشت سرعت کے ساتھ کھانے میں آتا ہے، اس لیے کہ زیادہ دیر لگنے میں بگڑ جاتا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ لَحْمًا طَرِيًّا ﴾ سے مراد دریا کی مچھلیاں ہیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ دریا کے سارے جانور ہیں۔[1] ابتدا کھانے کے ذکر کے ساتھ کی، اس لیے کہ بڑا مقصد یہی چیز ہے، اسی سے بدن کا قوام ہوتا ہے۔ اور مچھلی کو لحم (گوشت) سے مسمی کرنا یہ مالکیہ کا مذہب ہے، بخلافِ شافعیہ وحنفیہ کے کہ ان کے نزدیک اگر کسی نے یہ قسم اُٹھائی ہے کہ وہ گوشت نہ کھائے گا، پھر اس نے مچھلی کھائی تو وہ حانث (قسم توڑنے والا) نہیں ہوگا۔

اس میں اللہ کی قدرت کا عجیب اظہار ہے کہ دریا سے زیور نکلتا ہے، یعنی کھارے پانی سے موتی اور مونگا پیدا ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ﴾ [الرحمٰن: ٢٢] ''ان دونوں سمندروں سے موتی اور مرجان (مونگے) نکلتے ہیں۔'' یہ جواہر آبدار اور گوہر شاہوار پہننے کے کام میں آتے ہیں اور جس طرح ان کا پہننا عورتوں کو جائز ہے، اسی طرح موتی اور مونگے کا مردوں کو پہننا بھی درست ہے۔ شریعت میں مردوں کو لولؤ اور مرجان پہننے کی ممانعت نہیں ہے، جب تک کہ خاص کر اُن جواہرات کا استعمال عورتوں کے استعمال کی طرح پر نہ کرے، کیوں کہ یہ شریعت میں عورتوں کی مشابہت کی وجہ سے منع ہے نہ کہ سببِ زیور ہونے کے۔ امام ابو جعفر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زیور میں زکات نہیں ہے، پھر یہ آیت پڑھی۔[2]

میں کہتا ہوں اصل براءتِ زکات ہے، یہاں تک کہ اس کے لیے کوئی دلیل ہو اور مال کی مختلف قسموں میں سے کسی قسم کی زکات کے لیے واجب کر دے۔ سو سونے چاندی میں دلیل آچکی ہے اور جواہر میں باوجود اُن کے مختلف جنس ہونے کے زکات کے واجب ہونے پر کوئی دلیل وارد نہیں ہوئی ہے۔ ﴿ وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيهِ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ پھر دریا میں کشتیاں پانی کو پھاڑتی ہوئی چلتی ہیں، اپنے سینے سے اس کو ہٹاتی ہیں، یہی قول ہے امام عکرمہ رحمہ اللہ کا۔[3]

''مخر'' کہتے ہیں پانی کو سینے سے شق کرنا۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے صحاح میں کہا ہے کہ ''مخر السابح إذا شق الماء بصدره'' یعنی جب تیرنے والا پانی کو اپنے سینے کے ساتھ پھاڑ کر چلے۔ نیز کہا جاتا ہے کہ ''مخر الأرض شقها للزراعة'' یعنی جب کوئی آدمی زمین کو کاشت کے لیے درست کرے۔ بعض نے کہا ہے کہ ﴿ مَوَاخِرَ ﴾ کے معنی ہیں جاری ہونے والیاں۔ یہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ اور مخر اصل میں جاری ہونے کو کہتے ہیں۔ مختار میں ہے کہ جب کشتی چلے اور اس کے چلنے سے آواز آئے تو کہا جاتا ہے ''مخرت السفينة''. بعض نے کہا ہے کہ ﴿ مَوَاخِرَ ﴾ کے معنی ''معترضة'' کے ہیں، یعنی تو کشتیوں کو پانی میں آمنے سامنے دیکھتا ہے۔ بعض نے کہا کہ ﴿ مَوَاخِرَ ﴾ سے کشتی کا آنا جانا مراد ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا کہ دو کشتیاں دریا میں ایک ہوا سے چلتی

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٧٨) [2] مصنف ابن أبي شيبة (٢/ ٣٨٤) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٧٩)

ہیں، ایک آتی ہے اور دوسری جاتی ہے۔[1] بعض نے کہا کہ وہ مال و متاع سے بھری ہوئی ہوتی ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ "مخر" لغت میں تیز ہوا کے وقت ہوا کی آواز کو کہتے ہیں اور اس کو پانی کے ساتھ مقید نہیں کیا۔[2]

پھر فرمایا: ﴿ وَلِتَبۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِهٖ ﴾ یعنی ان اشیائے مذکورہ سے نفع لو اور اس کا فضل مانگو۔ یا یہ معنی ہے کہ کشتی کی یہ آمد و رفت اس لیے ہے کہ لوگ اللہ کے فضل، یعنی رزق کی جستجو کریں اور تجارت سے نفع حاصل کریں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ فضل سے مراد تجارت ہے[3] اور شاید وہ اس عظیم نعمت کا کچھ شکر بجا لائیں اور اللہ کی قدرتِ کاملہ کا زبان سے یا ارکان سے یا جنان سے اعتراف کریں۔ اس نعمت کو خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں ایک دور دراز کا فاصلہ بہت سے بوجھوں کے ساتھ دوسرے اسبابِ سفر کی مزاولت (اکٹھا کرنے) کے بغیر، بلکہ بغیر حرکت آسانی سے طے ہوتا ہے۔ حالاں کہ کشتی بہت سے خطرات میں گھری ہوئی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کے درمیان میں سب سے پاکیزہ کھانے کی چیزیں اور سب سے نفیس پہننے والی اشیا اور بہت سی نعمتیں، بہت اچھے اور عمدہ مناظر اور مواقع کے ساتھ ہوتی ہیں اور یہ شکر کرنے کے لیے ایک بہت بڑا سبب ہے۔ وللہ الحمد.

پھر ان نعمتوں کے پیچھے جو توحید کے موجب ہیں اور مطلوب پر استدلال کے لیے مفید ہیں، ایک اور نعمت اور ایک بڑی نشانی بیان کی اور فرمایا: ﴿ وَاَلۡقٰى فِى الۡاَرۡضِ رَوَاسِىَ اَنۡ تَمِيۡدَ بِكُمۡ ﴾ یعنی زمین میں اللہ تعالیٰ نے بڑے بڑے بھاری پہاڑ ڈال دیے، تاکہ زمین حرکت نہ کرے۔ پہاڑوں کے بعد نہروں کا ذکر کیا ہے، کیوں کہ ان چشموں اور نہروں کے اصل انھیں پہاڑوں سے ہی برآمد ہوتے ہیں۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے کہا کہ جیسے نیل۔[4] اور نیل کے سوا کسی اور دریا کا نام مثال میں ذکر نہیں کیا، اس لیے کہ امام سیوطی رحمہ اللہ اہلِ مصر میں سے ہیں، وہاں کا دریا یہی نیل ہے۔ پھر نہروں کے علاوہ زمین میں راہیں بنائیں، تاکہ سفر کے وقت ایک شہر سے دوسرے شہر تک اور ایک مکان سے دوسرے مکان تک پہنچ جائیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ راستے ہیں پہاڑوں کے۔[5]

شاید اس سے لوگ اس قادر مطلق اور حکیم کی توحید کی طرف راہ یاب ہوں۔ پھر ان میں علامتیں رکھیں، یعنی راستے کے نشان ٹھہرائے، جو اس علامت سے راستے پر لگتے ہیں اور رات کے سفر میں تاروں سے راستہ پہچانتے ہیں۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا کہ اس جگہ نجم سے مراد جدی و فرقدان ہیں۔[6] بعض نے کہا ہے کہ ثریا اور بنات النعش۔ یا علامات سے مراد پہاڑ ہیں یا نجوم، کیوں کہ بعض تاروں سے راہ کا پتا چلتا ہے اور بعض سے نہیں چلتا۔ جمہور نے کہا کہ آیت سے مراد سفر میں راہ پانا ہے یا قبلہ کا پہچاننا، لیکن آیت کو عام معنی پر محمول کرنے سے کوئی مانع نہیں ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٧٩) [2] تفسير الطبري (١٧/ ١٨٢) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٧٩)
[4] تفسير الجلالين (١/ ٣٤٧) [5] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٧٩) [6] معاني القرآن للفراء (٣/ ٤٣)

کہا کہ دن کی علامات پہاڑ ہیں[1] اور رات کی علامات ستارے ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ دن کے وقت راستوں کی نشانیاں پہاڑ ہیں اور رات کو تاروں سے راہ پاتے ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے نجوم کو تین چیزوں کے لیے پیدا کیا ہے: ایک آسمان کی زینت کے لیے، دوسرے راستوں کی شناخت کے لیے، تیسرے شیاطین کو رجم کرنے کے لیے۔ جس نے اس کے سوا کچھ کہا، اس نے ایک نامعلوم امر کا تکلف۔[2] پھر جب ان آیات کو شمار کیا جو وجودِ صانع اور اس کی وحدانیت اور کمالِ قدرت کی دلیل ہیں۔ پھر چاہا کہ اہلِ شرک وعناد کو توبیخ کرے۔ فرمایا: ﴿ اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ ﴾ یعنی جو ان عجیب اور بڑی مخلوقات اور عجیب وغریب اور جلیل القدر مصنوعات کا خالق ہے اور ایسے ایسے کام کرتا ہے، جو آنکھ سے دکھائی دیتے ہیں، وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے، جو کچھ بھی پیدا نہیں کرتا اور کسی ایک شے کو ایجاد کرنے پر قادر نہیں ہے؟ مراد وہ بت ہیں، جن کی عبادت کی جاتی ہے، جن کو مشرکوں نے اللہ کا شریک ٹھہرایا ہے اور اپنے زعم میں الٰہ سمجھا ہے۔ یا ﴿ اَفَمَنْ يَّخْلُقُ ﴾ کی مشاکلت کے لیے، کیوں کہ ان کی صحبت میں واقع ہوئے ہیں، یا یہ عکسِ تشبیہ کے قبیل سے ہے۔

اس سوالیہ انداز میں کفار کو ڈانٹ ڈپٹ اور جھڑکی ہے، جو پوشیدہ نہیں ہے اور اس میں وہ ڈانٹ ڈپٹ ہے جس کے وہ لائق ہیں، کیوں کہ انھوں کے بعض مخلوقات کو اللہ تعالیٰ کا ہمسر بنایا۔ ﴿ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾ پھر فرمایا: ﴿ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴾ لیکن لوگ کچھ نہیں سوچتے، ورنہ جان لیتے کہ یہ ساری مخلوقات خالقِ حکیم کے وجود اور ربوبیت اور بدیع صنعت پر واضح دلائل ہیں اور اس سے اللہ تعالیٰ کی توحید کی دلیل لیتے ہیں، کیوں کہ کمال وضاحت سے اس کا ذکر کر دینا ہی استدلال کے لیے کافی ہے۔ اس میں گہری نظر ڈالنے اور غور وفکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

امام ابو قتادہ رحمہ اللہ نے اس آیت میں کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی خالق اور رازق ہے اور یہ اوثان، جن کی اللہ کے سوا پوجا کی جاتی ہے، یہ سب مخلوق ہیں اور کسی چیز کے خالق نہیں ہیں اور نہ ہی اپنے پجاریوں کے لیے کسی نفع اور نقصان کے مالک ہیں۔[3] پھر یہ ارشاد کیا کہ اگر اللہ کی نعمت کو گننا چاہو گے تو اس کو گن نہیں سکتے ہو، گو کیسی ہی جدوجہد کیوں نہ کرو اور اپنی جانوں کو مشقت میں ڈالو۔ تم کو ہرگز یہ قدرت حاصل نہ ہوگی کہ تم اللہ کا شکر ادا کر سکو۔ یہ ایک اجمالی نصیحت ہے۔ اس کی تفسیر سورت ابراہیم میں گزر چکی ہے۔

عقلا نے کہا ہے کہ انسان کے اجزاء میں سے ہر جز میں ایک معمولی سا خلل اور تھوڑا سا نقص ظاہر ہو جائے تو انسان پر جمیع نعمت بے مزہ ہو جاتی ہے، یعنی تلخ ہو جاتی ہے اور وہ تمنا کرتا ہے کہ اگر وہ ساری دنیا کا مالک ہوتا تو وہ اسے خرچ کر دیتا اور یہ خلل زائل کرتا۔ سو اللہ پاک انسان کے بدن کی تدبیر ایسی وجہِ ملائم پر کرتا ہے کہ اس کو خبر بھی نہیں ہوتی اور نہ وہ اس کے وجود کو جانتا ہے تو اب کس طرح اس کو اپنے اوپر اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنے کی طاقت ہو

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٧٩) [2] تفسير ابن أبي حاتم (١٧/ ١٨٥) [3] تفسير الطبري (١٧/ ١٨٧)

سکتی ہے۔ یا وہ ان نعمتوں کو گن سکتا ہے، یا کسی نعمت کا ادنیٰ شکر بجا لا سکتا ہے:

”یَا رَبَّنَا هٰذِهِ نَوَاصِيْنَا بِيَدِكَ، خَاضِعَةٌ لِعِظَمِ نِعَمِكَ، مُعْتَرِفَةٌ بِالْعَجْزِ عَنْ تَأْدِيَةِ الشُّكْرِ لِشَيْءٍ مِنْهَا، لَا نُحْصِيْ ثَنَآءً عَلَيْكَ، أَنْتَ كَمَا أَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ، وَلَا نُطِيْقُ التَّعْبِيْرَ بِالشُّكْرِ لَكَ، فَتَجَاوَزْ عَنَّا، وَاغْفِرْلَنَا، وَأَسْبِلْ ذُيُوْلَ سِتْرِكَ عَلٰى عَوْرَاتِنَا، فَإِنَّكَ إِنْ لَّا تَفْعَلْ نَهْلِكْ بِمُجَرَّدِ التَّقْصِيْرِ فِيْ شُكْرِ نِعَمِكَ، فَكَيْفَ بِمَا قَدْ فَرَطَ مِنَّا التَّسَاهُلُ فِيْ الْاِئْتِمَارِ بِأَوَامِرِكَ، وَالْاِنْتِهَاءِ عَنْ مَنَاهِيْكَ“

”اے ہمارے رب! یہ ہمارے ماتھے تیرے ہاتھ میں ہیں، تیری عظیم نعمتوں کے لیے ذلیل ہیں اور ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ ہم تیری نعمتوں میں سے ایک نعمت کا بھی شکر ادا نہیں کر سکتے، ہم تیری تعریف (کما حقہ وکما ینبغی) نہیں کر سکتے، تو ویسا ہی ہے جیسے تو نے اپنی آپ تعریف کی، ہم کو تو تیرے شکر کی تعبیر کی طاقت و مکنت نہیں ہے، تو ہم سے تجاوز کر اور ہم کو معاف کر اور ہمارے عیوب پر اپنے پردے کے ذیول ڈالے رکھ، اگر تو یہ کام نہ کرے گا تو ہم تیری نعمتوں کے شکر کے قصور ہی میں ہلاک ہو جائیں گے اور جو ہم سے تیرے اوامر کے قبول کرنے میں اور تیری مناہی سے رکنے میں قصور ہوا ہے، اس کا محاسبہ ہم پر رہے گا۔“

اور جس نے کہا ہے، کیا اچھا کہا ہے:

اَلْعَفْوُ يُرْجٰى مِنْ بَنِيْ آدَمَ   فَكَيْفَ لَا يُرْجٰى مِنَ الرَّبِّ

یعنی جب بنی آدم سے عفو کی امید ہے تو رب العالمین خالق کائنات سے عفو کی، کیوں کر امید نہ ہو؟! اور کیا احسن جملہ ہے، جس پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس امتنان کو ختم کیا جو انسان پر ملتبس نہیں ہے، جس میں اس کی عظیم غفران اور اس کی وسیع رحمت کی طرف اشارہ ہے۔

فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مغفرت اور رحمت کثیر ہے کہ تم کو اس غفلت میں نہیں پکڑتا جو تم نے اس کی نعمتوں کے شکر میں کی اور اس قصور میں اخذ نہیں کرتا جو تم نے ان نعمتوں کے احصا میں کیا اور تم ادنیٰ سے ادنیٰ نعمت کے شکر کے قیام سے عاجز رہے اور اپنی مہر اور رحمت سے تم پر ہمیشہ احسان کرتا ہے اور ہر لحظہ اور ہر ساعت تم پر اپنی نعمتیں متواتر اتارتا ہے اور ہر نفس کے ساتھ جس کے ساتھ تمھارا تنفس ہے اور حرکت کے ساتھ جس کے ساتھ تمھاری حرکت ہے، اس کا احسان اور انعام تم پر ہے۔ یا اللہ! میں تیرا شکر کرتا ہوں اس قدر جس قدر تیرا شاکروں نے ہر زبان کے ساتھ ہر زمان میں شکر کیا اور شکر کریں گے۔ تو نے مجھ ضعیف البیان نالائق نابکار کو ان نعمتوں سے مخصوص کیا جو میں نے تیری بہت مخلوق پر ان نعمتوں کو نہیں دیکھا، آدمیوں سے اور غیر آدمیوں سے اور اگر میں نے

ان نعمتوں میں سے کوئی نعمت کسی پر دیکھی بھی تو اس پر اس کا بقیہ نہ دیکھا، تو میں کیونکر تیرا شکر کر سکتا ہوں اور کس طرح تیری ادنیٰ سے ادنیٰ نعمت کے شکر کی طاقت رکھتا ہوں۔ جب ادنیٰ سے ادنیٰ نعمت کے شکر کے قیام سے میں عاجز ہوں تو اعلیٰ نعمت کے شکر کے قیام سے کیونکر عاجز نہ ہوں اور انواعِ نعم میں سے کسی نوع کے تادیۂ شکر میں میری کیا ہستی؟! پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بیان کیا کہ جو کچھ بندوں سے وقوع میں آتا ہے اور جن افعال کے وہ مرتکب ہوتے ہیں، ان سے وہ خبردار ہے، اس پر کوئی خافیہ مخفی نہیں ہے اور اس پر کوئی چھپی چیز جو مخلوق کی نظروں میں چھپی ہو، پوشیدہ نہیں ہے۔[1] فرمایا:

وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَ مَا تُعْلِنُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّ هُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿۲۰﴾ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ۚ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۲۱﴾

اور اللہ جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو تم ظاہر کرتے ہو (19) اور لوگ جنھیں اللہ کے سوا پکارتے ہیں، وہ کوئی چیز تخلیق نہیں کرتے، جب کہ وہ خود تخلیق کیے گئے ہیں (20) (وہ) مردے ہیں، زندہ نہیں اور وہ شعور نہیں رکھتے کہ وہ کب اُٹھائے جائیں گے (21)

اللہ تعالیٰ ہر ظاہر و باطن کا عالم ہے:

شاید اس جگہ یہ بات اس لیے فرمائی کہ بعض شخص بات میں لاجواب ہوتے ہیں پر دل میں بات نہیں بیٹھتی، سو اللہ دل پر پکڑتا ہے۔ ﴿ اَمْوٰتٌ ﴾ شاید ان کو فرمایا جو مرے ہوئے بزرگوں کو پوجتے ہیں۔ اللہ پاک نے اس آیت میں یہ خبر دی ہے کہ ہم کو دل کی باتوں اور خفیہ باتوں کا علم بھی ویسے ہی ہے جیسے ظاہری باتوں کا علم ہے اور عن قریب ہر عمل کرنے والا اپنے عمل کا بدلہ قیامت کے دن پائے گا۔ خیر کا اچھا بدلہ اور برائی کا برا بدلہ۔

معبودانِ باطلہ مخلوق ہیں، خالق نہیں:

پھر یہ خبر دی کہ جن بتوں اور غیر اللہ کو یہ لوگ پکارتے ہیں اور جن کو فائدہ اور نقصان پہنچانے والا سمجھتے ہیں۔ وہ کسی چیز کے خالق نہیں ہیں، بلکہ وہ تو خود مخلوق ہیں، جس طرح خلیل جلیل علیہ السلام نے کہا تھا: ﴿ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ﴿۹۵﴾ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ﴾ [الصّافات: ۹۵۔ ۹۶] ''کیا تم ان کی عبادت کرتے ہو جنھیں تم خود تراشتے ہو؟ حالاں کہ اللہ ہی نے تمھیں اور تمھارے اعمال کو پیدا کیا ہے۔''

﴿ اَمْوٰتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ﴾ سے مراد جمادات بغیر ارواح کے ہیں کہ نہ سنتے ہیں اور نہ دیکھتے اور نہ عقل رکھتے

---

[1] فتح البیان (۷/ ۲۱۸۔ ۲۲۴)

ہیں اور نہ یہ جانیں کہ قیامت کب ہوگی۔ سو ایسوں کے پاس نفع یا ثواب یا جزا کی کیا اُمید رکھنا چاہیے۔ یہ اُمید تو اس سے ہے جو ہر شے کا عالم اور ہر شے کا خالق ہے۔ انتہیٰ ما قال ابن كثير في تفسيره.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے عقائد اور اعمالِ مضمرہ کو اور اس چیز کو جس کو یہ ظاہر کرتے ہیں۔ اس آیت میں وعید و تعریض اور ڈانٹ ڈپٹ اور تنبیہ ہے، اس بات پر کہ معبود کو پوشیدہ باتوں اور ظاہر باتوں کا علم ہونا چاہیے نہ کہ معبود بتوں کو بنایا جائے، جو جمادات کے ہوتے ہیں اور انھیں کوئی شعور نہیں ہوتا، وہ کسی ظاہر شے کو بھی نہیں جانتے، چہ جائیکہ اس کے دل کی باتوں اور چھپی باتوں کے عالم ہوں، پھر ان کا پوجنا کیسا؟ پھر فرمایا کہ جو لوگ اللہ کے سوا غیر اللہ کو پکارتے ہیں، وہ مخلوقات میں سے کسی شے کو ہرگز پیدا نہیں کر سکتے، وہ بڑی ہو یا چھوٹی ہو، جلیل ہو یا حقیر، بلکہ وہ خود مخلوق ہیں۔ مخلوق کے پاس اتنی قدرت کہاں کہ کسی کو پیدا کر سکیں۔ اس آیت میں زیادہ بیان ہے، اس لیے کہ پہلے صفتِ کمال کو سلب کیا، پھر صفتِ نقصان کو ثابت فرمایا۔ بخلاف اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿ اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ ﴾ کے کہ اس میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان سے صرف کمال والی صفت کے سلب کرنے پر اکتفا کیا۔

پھر ان کی صفاتِ ثلاثہ میں سے دوسری وصف بیان کی اور فرمایا: ﴿ اَمْوَاتٌ ﴾ یعنی یہ اصنام ان کے اجساد پتھر مردے ہیں جن میں اصلاً حیات نہیں ہے۔ پھر اپنے قول ﴿ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ﴾ کے ساتھ زیادہ تاکید کی کہ یہ تو ان اجساد کی طرح بھی نہیں ہیں جن کو حیات کے بعد موت عارض ہوتی ہے، ان کے لیے تو اصلاً کبھی حیات ثابت ہی نہیں ہوئی تو یہ مشرک ان اصنام کی کیونکر عبادت کرتے ہیں، حالاں کہ یہ خود ان اصنام سے بہتر ہیں، کیوں کہ یہ زندے ہیں، ان میں حیات ہے اور ان اصنام کو خبر نہیں کہ یہ کفار مرنے کے بعد کب اٹھائے جائیں گے۔ ان پتھروں کو معلوم نہیں کہ ہمارے پوجاری کافر کب مبعوث ہوں گے اور اس میں ان پر تہکم ہے، اس لیے کہ جماد کا امورِ ظاہرہ کے ساتھ شعور محالات سے ہے، وہ ان امور سے تو کیا واقف ہوں گے جن کی اللہ کے سوا کسی کو خبر نہیں اور جن کا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی واقف نہیں اور بعض نے کہا کہ یہ اصنام کیا جانیں کہ کب اٹھائے جائیں گے اور ان کو ان کا رب کب اٹھائے گا اور انھیں معنی کے ساتھ قاضی بیضاوی نے تبعاً للکشاف ابتدا کیا اور اس کی تائید کرتا ہے وہ جو مروی ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ اصنام کو اٹھائے گا اور ان کے لیے ارواح پیدا کرے گا، ان کے ساتھ ان کے شیطان ہوں گے۔

پھر ان سب کو دوزخ میں ڈالنے کا ارشاد فرمائے گا اور اس پر دلالت کرتا ہے اللہ تبارک و تعالیٰ کا یہ قول: ﴿ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ٩٨] ”بے شک تم اور جن کی اللہ کے سوا تم عبادت کرتے ہو جہنم کا ایندھن ہیں، تم اس میں داخل ہونے والے ہو“ بعض کا یہ قول ہے کہ کلام ﴿ وَّهُمْ

﴿ يُخْلَقُوْنَ وَ هُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴾ پر ختم ہو جاتا ہے اور ﴿ اَمْوَاتٌ ﴾ جملہ مستانفہ ہے اور گویا یہ مشرکین کا وصف ہے کہ وہ مردے ہیں جن میں جی نہیں اور ان کو معلوم نہیں کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے۔ اس صورت میں ﴿ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴾ اور ﴿ يُبْعَثُوْنَ ﴾ میں دو ضمیریں کفار کے لیے ہوں گی۔ اور جس صورت میں دونوں ضمیریں اصنام کی طرف عائد ہوں یا ایک اصنام کی طرف راجع ہو۔ اصنام کا اس صیغے کے ساتھ تعبیر کرنا جو ذوی العقول کے لیے موضوع ہے، ان کے عابدین کے اعتقاد کے مطابق ہے کہ وہ ان کو عاقل تصور کرتے ہیں۔[1]

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّ هُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ۝ لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ۝

تمھارا معبود بس ایک ہی معبود ہے، چناں چہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ان کے دل منکر ہیں اور وہ تکبر کرنے والے ہیں (22) بلاشبہ یقیناً اللہ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں، بے شک وہ تکبر کرنے والوں کو قطعاً پسند نہیں کرتا (23)

معبودِ برحق صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے:

اللہ پاک نے خبر دی ہے کہ نہیں ہے کوئی معبود مگر وہ جو اَحد (اکیلا) ہے اور صمد (بے نیاز) ہے، لیکن کافروں کے دل اس بات سے انکار کرتے ہیں، چناں چہ بطورِ تعجب ان سے نقل کیا ہے: ﴿ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ﴾ [ص: ٥] ''کیا اس نے سارے معبودوں کو ایک کر دیا؟ بے شک یہ تو یقیناً ایک بڑی عجیب و غریب چیز ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴾ [الزمر: ٤٥] ''اور جب تنہا اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان لوگوں کے دل تنگ ہوتے ہیں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور جب اللہ کے سوا دوسروں کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس وقت وہ بڑے خوش ہوتے ہیں۔''

نیز فرمایا: ﴿ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ﴾ یعنی ان کے دل اللہ کی عبادت و توحیدِ خالص سے منکر ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ ﴾ [المؤمن: ٦٠] ''بلاشبہ جو لوگ میری عبادت سے سرکشی کرتے ہیں، وہ عن قریب ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔'' اور اس جگہ کہا: ﴿ لَا جَرَمَ ﴾ یعنی یقیناً اللہ تعالیٰ کو علم ہے پوشیدہ اور ظاہر بات کا، وہ ان کے عمل و عقیدہ کا پورا بدلہ دے گا۔ وہ تکبر کرنے

[1] فتح القدير (٣/ ٢١٦) فتح البيان (٧/ ٢٢٤۔ ٢٢٦)

والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ انتھیٰ ما قال الحافظ ابن کثیر في تفسیرہ.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ قیامت کے دن ایک ہی الٰہ ہوگا اور اس دن کوئی شخص ایامِ دنیا کے برعکس معبودوں کی تعداد کا دعویٰ نہ کرے گا۔ یہاں پر تو اس دعوے کے مدعی بہت ہیں۔ اس تقدیر پر اللہ کا کلام ﴿ يَشْعُرُوْنَ ﴾ پر مکمل ہوگا، مگر اس قول نے ﴿ اَيَّانَ ﴾ کو اس کے موضوع سے نکال دیا۔ یا محض ظرفیت کی طرف جو وقت کے معنی میں ہے اور اس جملے کی طرف مضاف ہے جو اس کے پیچھے ہے اور اس کا موضوع یا شرطیت ہے یا استفہام۔ اور ظاہر یہ ہے کہ اس کی تفسیر "متی" کے ساتھ کی جائے، جیسے کشاف وغیرہ میں ہے اور جب اللہ تعالیٰ نے ان بتوں کی عبادت کا کھوٹ ثابت کیا تو اس بات کی تصریح کی جو حقیقت، واقع اور نفس الامر میں درست اور مستوجبِ ثواب ہے اور وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی وحدانیت ہے اور یہی ما قبل کا نتیجہ ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے شرک پر کافروں کے جمے رہنے کی وجہ ظاہر کی اور کہا کہ جو لوگ آخرت کے دن پر ایمان نہیں لاتے، ان کے دل اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، انفرادیت اور صمدیت کے منکر ہیں، ان پر نہ کوئی وعظ اثر کرتا ہے اور نہ کوئی نصیحت تاثیر دکھاتی ہے، وہ تو حق کو قبول کرنے سے تکبر کرتے ہیں، صحیح بات کو سننا تک گوارا نہیں کرتے، انکار پر جمے ہوئے ہیں۔ سچ مچ اللہ تعالیٰ خفیہ اور ظاہر باتوں کا جاننے والا ہے، وہ تکبر کرنے والوں کو توحید کے لیے پسند نہیں کرتا۔ اور جملہ: ﴿ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ﴾ اس مضمون کی علت ہے جس کو گزشتہ کلام متضمن ہے۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ وہ شخص جنت میں داخل نہ ہوگا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہوگا۔ اور داخل نہ ہوگا آگ میں وہ شخص جس کے دل میں ایک ذرہ برابر ایمان ہوگا۔ ایک شخص نے کہا: اے اللہ کے رسول! کوئی شخص اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کا کپڑا اچھا ہو، اس کا جوتا اچھا ہو (کیا یہ بھی تکبر ہے؟)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جمیل ہے، جمال کو دوست رکھتا ہے، تکبر یہ ہے کہ حق کو رد کیا جائے اور لوگوں کو حقیر سمجھا جائے۔[1] (رواہ مسلم و أبو داود) تکبر کی مذمت اور انکساری کی تعریف میں بہت سی حدیثیں مروی ہیں۔ اسی طرح اس بارے میں کہ اچھے کپڑے اور اچھے جوتے کو پسند کرنا تکبر سے خارج ہے، احادیث وارد ہوئی ہیں۔

حکایت:

حسین بن علی رضی اللہ عنہما کا گزر ایک جماعتِ مساکین پر ہوا، وہ روٹی کے ٹکڑے کھا رہے تھے، کہا: اے ابا عبداللہ! آؤ کھانا کھاؤ، وہ اُتر کر اُن کے پاس بیٹھ گئے اور کہا: ﴿ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ﴾ پھر اُن کے ساتھ روٹی

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۹۱)

کھائی، جب وہ سب لوگ کھا چکے تو کہا میں نے تمھاری دعوت قبول کی، اب تم میری دعوت قبول کرو، وہ سب ان کے ساتھ اُن کے گھر پر آئے، ان کو کھانا کھلایا، پانی پلایا اور کچھ عطا کیا، پھر وہ واپس گئے۔ علما نے کہا کہ ہر گناہ کو چھپانا اور مخفی کرنا ممکن ہے سوائے تکبر کے۔ یہ ایسا فسق ہے کہ ظاہر ہو ہی جاتا ہے اور ساری نافرمانیوں کی جڑ ہے۔ صحیح حدیث میں مروی ہے کہ قیامت کے دن تکبر کرنے والے چیونٹیوں کی طرح ہوں گے، لوگ ان کے تکبر کی وجہ سے انھیں اپنے قدموں سے پامال کریں گے اور جیسا کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا کہ محشر میں ان کے جسم چھوٹے ہو جائیں گے، جہاں ان کا چھوٹا ہونا مضر ہے اور آگ میں ان کے جسم بڑے ہو جائیں گے جہاں ان کا بڑا ہونا نقصان دہ ہے۔[1] (ذکرہ القرطبي)

حاصل یہ ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے تکبر کی ماہیت بیان فرمائی کہ تکبر حق کو رد کرنا اور لوگوں کو حقیر جاننا ہے اور قابلِ مذمت تکبر یہی ہے۔ درمنثور میں اس جگہ بہت سی احادیث نقل کی ہیں۔[2] یہ مقام ان کو بیان کرنے کا نہیں ہے، بلکہ یہ مقام اس چیز کے ذکر کرنے کا ہے جس کو تفسیر کتابِ عزیز سے تعلق ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مشرکین کی کچھ قباحتیں ذکر فرمائی ہیں اور کہا ہے:[3]

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۙ قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۴﴾ لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا يَزِرُوْنَ ﴿۲۵﴾

اور جب ان سے کہا جائے کہ تمھارے رب نے کیا نازل کیا ہے؟ تو وہ کہتے ہیں: یہ پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں (24) تاکہ یومِ قیامت وہ اپنے کامل بوجھ اُٹھائیں اور کچھ ان کے بوجھ بھی، جنھیں وہ بغیر علم کے گمراہ کرتے ہیں، جان لو! برا بوجھ ہے جو وہ اُٹھاتے ہیں (25)

کفار کا وحیِ الٰہی سے اعراض:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب ان مکذبین سے کوئی پوچھتا ہے کہ تمھارے رب نے کیا اُتارا تو وہ صحیح جواب سے اعراض کر کے یہ بات کہتے ہیں کہ کچھ بھی نہیں اُتارا، یہ کلام جو تم پر پڑھا جاتا ہے، اگلی کتابوں سے ماخوذ ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝ قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ [الفرقان: ٥۔ ٦] ''اور انھوں نے کہا: یہ اگلوں کے افسانے ہیں (جو) اس نے اپنے لیے لکھوائے ہیں اور وہ صبح وشام اس پر پڑھے جاتے ہیں۔ کہہ دیجیے: اسے اس نے نازل کیا ہے جو آسمانوں اور زمین کے بھید جانتا ہے، بلاشبہ وہ غفور (اور) رحیم ہے۔'' یعنی رسول پر افترا کرتے ہیں

[1] تفسیر القرطبي (١٠/ ٩٥) [2] الدر المنثور (٥/ ١١٩۔ ١٢٥) [3] فتح البیان (٧/ ٢٢٤۔ ٢٢٨)

اور متضاد اور مختلف باتیں کہتے ہیں، جو بالکل باطل اور بے اصل ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ﴾ [الفرقان: ۹] ''دیکھیے! انھوں نے آپ کے لیے کیسی مثالیں بیان کی ہیں، وہ بہک گئے ہیں، لہٰذا وہ راہ نہیں پا سکتے۔'' بات یہ ہے کہ جو شخص حق سے باہر ہوتا ہے تو وہ جو بات کہتا ہے وہ خطا ہوتی ہے۔

کفار نبی مکرم ﷺ کو شاعر، ساحر، کاہن اور مجنون کہتے تھے، پھر اُن کے امر کا استقرار اس بات پر ہوا کہ جو اُن کے شیخ وحید ولید بن مغیرہ مخزومی نے اپنے فکر اور اندازے سے کہی تھی، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّهٗ فَكَّرَ وَ قَدَّرَ ۝۱۸ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝۱۹ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝۲۰ ثُمَّ نَظَرَ ۝۲۱ ثُمَّ عَبَسَ وَ بَسَرَ ۝۲۲ ثُمَّ اَدْبَرَ وَ اسْتَكْبَرَ ۝۲۳ فَقَالَ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ﴾ [المدثر: ۱۸۔ ۲٤] ''بے شک اس نے غور وفکر کیا اور اندازہ لگایا۔ تو وہ مارا جائے! کیسا اندازہ لگایا؟ پھر وہ مارا جائے! کیسا اندازہ لگایا؟ پھر اس نے دیکھا۔ پھر تیوری چڑھائی اور منہ بسورا۔ پھر پیٹھ پھیری اور تکبر کیا۔ پھر اس نے کہا: یہ (قرآن) تو صرف جادو ہے جو پہلے سے چلا آرہا ہے۔'' یعنی یہ ایک جادو ہے جو نقل کیا گیا ہے اور حکایت کی گئی ہے۔ پھر اس بات پر وہ سب لوگ متفرق ہو گئے۔ قبحهم الله تعالیٰ

گمراہ لوگ اپنے اور اپنے پیروکاروں کے بوجھ اٹھائیں گے:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لِيَحْمِلُوْۤا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ مِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ﴾ (آیتِ باب) ہم نے یہ بات اس لیے مقدر کی کہ وہ اپنے اور اپنے تابعین اور موافقین کے گناہوں کے بوجھ اٹھائیں، یعنی ایک خطا یہ کہ وہ خود گمراہ تھے، دوسری خطا یہ کہ دوسروں کو گمراہ کیا اور دوسروں نے ان کی اقتدا کی، جس طرح حدیث میں مروی ہے: « مَنْ دَعَا إِلَى هُدًى كَانَ لَهُ مِنَ الْأَجْرِ مِثْلَ أُجُورِ مَنِ اتَّبَعَهُ لَا يَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ أُجُورِهِمْ شَيْئًا، وَمَنْ دَعَا إِلَى ضَلَالَةٍ كَانَ عَلَيْهِ الْإِثْمُ مِثْلَ آثَامِ مَنِ اتَّبَعَهُ لَا يَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ آثَامِهِمْ شَيْئًا »[1] یعنی جس نے ہدایت کی طرف (لوگوں کو) بلایا تو اس کو بھی اسی قدر اجر ملتا ہے جس قدر اس کے تابعداروں کو اجر ملتا ہے اور اس کا اجر ان کے اجور سے کچھ کم نہیں کرتا اور جس نے (لوگوں کو) ضلالت کی طرف بلایا، اس پر اسی قدر گناہ ہوتا ہے جس قدر اس کے تابعداروں کو گناہ ہوتا ہے اور اس کا گناہ ان کے گناہوں سے کچھ کم نہیں کرتا۔

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ لَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَ اَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ١ٞ وَ لَيُسْـَٔلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴾ [العنکبوت: ۱۳] ''اور یقیناً وہ اپنے بوجھ اور اپنے بوجھوں کے ساتھ کئی اور بوجھ ضرور اُٹھائیں گے، اور جو کچھ وہ جھوٹ گھڑتے رہے، روزِ قیامت ان کے متعلق ان سے ضرور پوچھا جائے گا۔'' یعنی کوئی چاہے کہ شفقت کر کے کسی کے گناہ اپنے اوپر لے لے، یہ ہونا نہیں مگر جس کو گمراہ کیا اور اس کے بہکانے سے اس نے گناہ کیا، وہ

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲٦۷٤)

گناہ اُس پر بھی اور اس پر بھی ہے اور ایسا ہی عوفی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے آیت: ﴿ لِيَحْمِلُوٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا کہ یہ آیت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے قول: ﴿ وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ﴾ کی طرح ہے اور امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: اٹھائیں گے اپنے بوجھ اور اپنے گناہ اور ان کے گناہ جنھوں نے ان کی اطاعت کی اور جنھوں نے ان کی اطاعت کی ان کے عذاب سے کچھ تخفیف نہ ہوگی۔ انتہیٰ ما قال الحافظ ابن كثير في تفسيره.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جب کوئی کہنے والا اُن کفار منکرین متکبرین سے یہ بات کہتا ہے کہ تمھارے رب نے کیا چیز اُتاری ہے؟ تو کہتے: اے مسلمانو! جس کا تم دعویٰ کرتے ہو وہ تو پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ یہ کہنے والا النضر بن حارث تھا، اس کے پاس کتبِ تاریخ تھیں اور یہ زعم کرتا تھا کہ اس کی بات بہت زیادہ خوبصورت اور مکمل ہے اس کلام سے جو محمد ﷺ پر اترا ہے۔ سو اس آیت کا نزول افسوس اور مذاق کے طور پر اسی کے حق میں ہوا ہے۔ بعض نے کہا کہ قائل وہ تھا جو اُن کے پاس باہر سے آتا تھا، یا بعض بعض سے کہتے تھے۔ یا کہنے والے مسلمان تھے، بہر حال اس سوال کا جواب منکرین متکبرین یہ دیتے تھے کہ یہ باتیں اگلے لوگوں کی داستانیں ہیں، ان کی کہانیاں اور باطل قصے ہیں۔ یا مراد اس سے مشرکین کا مسخرا پن کرنا تھا مسلمین کے ساتھ کہ یہ جو کلام تم پر نازل ہوا ہے یہ ان کے اساطیر ہیں۔ ﴿ اَسَاطِيْرُ ﴾ کہتے ہیں باطل قصوں اور خرافات کو جن کی نقل لوگ پہلے زمانوں سے کرتے ہیں۔ یعنی یہ قرآن اللہ کا کلام نہیں ہے۔ یہ بات کہ یہ لوگ قیامت کے دن اپنے گناہ پورے طور پر اٹھائیں گے اس لیے کہی، کیوں کہ تکذیب کرنے اور اسلام نہ لانے کے سبب سے ان کے گناہ مٹے نہیں ہوئے۔

بعض نے کہا ہے کہ لام ﴿ لِيَحْمِلُوٓا ﴾ میں عاقبت کے لیے ہے تو اگرچہ انھوں نے قرآن کی صفت ﴿ اَسَاطِيْرُ ﴾ اس لیے بیان نہیں کی کہ وہ بوجھ اٹھائیں، لیکن جب کہ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے گھر والوں نے اٹھا لیا کہ ہو ان کا دشمن اور گھٹانے والا۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ امر کا لام ہے۔ امام رازی نے آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ مومنین کے بعض عقاب ساقط کر دیتا ہے، کیونکہ اگر یہ معنی جمیع لوگوں کے حق میں حاصل ہوتے تو اس تکمیل کے ساتھ ان کفار کی تخصیص میں کوئی فائدہ نہیں تھا اور تاکہ ان لوگوں کے بوجھ اٹھائیں، جن کو انھوں نے بہکایا اور گمراہ کیا، کیونکہ جس نے کوئی برا طریق جاری کیا تو اس پر اس کا بوجھ ہوتا ہے اور ان لوگوں کا بوجھ جو اس برائی کے ساتھ عمل کرتے ہیں، جیسے حدیث میں وارد ہوا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ مِنْ "مِنْ اَوْزَارِهِمْ" میں جنس کے لیے ہے نہ تبعیض کے لیے، یعنی جن کو انھوں نے بہکایا ہے، ان کے جمیع ذنوب کے حامل ہوں گے۔

یہ امام واحدی رحمہ اللہ کا قول ہے اور رؤسا لوگوں کو بہکاتے ہیں، حالاں کہ خود جاہل ہیں اور جس چیز کی طرف لوگوں کو بلاتے ہیں، اس کا ان کو علم نہیں ہے اور نہ وہ ان آثام سے خبردار ہیں جو ان کے ہم رکاب ہوں گے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کے یہ معنی ہیں کہ ان لوگوں کو جن کو ان کے گمراہ ہونے کا علم نہیں ہے۔ یہ امام زمخشری کا قول ہے اور اسی کے قاضی بیضاوی رحمہ اللہ تابع ہوا اور اس کا فائدہ اس امر پر دلالت ہے کہ ان کی جہالت ان کا قیامت کے دن عذر نہیں ہو سکے گا، کیوں کہ ان پر واجب تھا کہ وہ بحث کرتے اور حق اور باطل کے درمیان تمیز کرتے اور اس میں نری اندھا دھند تقلید پر قناعت نہ کرتے، لیکن اول معنی کو ترجیح ہے اور معنی یہ ہیں کہ وہ گمراہ کرنے پر اقدام کرتے ہیں اور اس عذابِ شدید سے بے خبر اور ناواقف ہیں جو ان کے لیے اس اضلال کے مقابلے میں تیار ہے، اور اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ﴿ وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ﴾ یعنی اور البتہ اٹھائیں گے اپنے بوجھ اور کتنے بوجھ ساتھ اپنے بوجھوں کے اور سورت انعام میں اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴾[الأنعام: ١٦٤] ”اور کوئی بوجھ اُٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا۔“ پر کلام گزر چکا اور اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک دوسرے کا وہ بوجھ نہیں اٹھائے گا جس میں اس کا دخل نہیں ہے اور نہ اس کے ساتھ اس کا تعلق ہے، تسبب وغیرہ کے ساتھ۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اپنے بوجھ کے ساتھ ان کے بوجھ بھی اٹھائیں گے، جن کو انھوں نے بلا تحقیق گمراہ کیا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ سے اسی کی مثل مروی ہے اور اس نے زیادہ کیا اور ان لوگوں کے عذاب سے کچھ تخفیف نہ ہوگی جنھوں نے ان کی اتباع کی۔ بُرا بوجھ ہے جو اٹھاتے ہیں اور اس میں کفار کے لیے وعید اور تہدید ہے۔[1] پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی امثال متقدمین سے حکایت بیان کی اور فرمایا:

قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝٢٦ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ وَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَاۗءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَاۗقُّوْنَ فِيْهِمْ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوْۗءَ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ ۝٢٧

تحقیق وہ لوگ مکر کر چکے ہیں جو ان سے پہلے تھے، پھر اللہ نے ان (کے مکر) کی عمارت کو بنیادوں سے آلیا، چنانچہ ان کے اوپر چھت گر پڑی اور ان پر عذاب آیا، جہاں سے وہ شعور نہ رکھتے تھے (26) پھر یومِ قیامت اللہ انھیں رسوا کرے گا اور کہے گا: میرے شریک کہاں ہیں جن کی بابت تم (مومنوں

[1] فتح البیان (۷/ ۲۲۸۔ ۲۳۰)

سے) جھگڑتے تھے؟ وہ لوگ کہیں گے جنھیں علم دیا گیا تھا: بے شک آج کا دن کافروں کے لیے رسوائی اور بدبختی ہے 27

نمرود اور بخت نصر جیسے لوگوں کی بداعمالیاں اور ان کی سزا:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ پہلے مکار سے مراد نمرود ہے، جس نے محل بنایا تھا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے، زید بن اسلم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ پہلا جبار جو زمین میں ہوا تھا، نمرود تھا، اللہ تعالیٰ نے ایک بعوضہ مچھر بھیجا، وہ اس کے نتھنے میں گھس گیا چار سو برس تک وہ اپنے سر کو مطارق (مارنے والی چیز) سے مارتا اور لوگوں میں بڑا مہربان وہ تھا، جو اپنے دونوں ہاتھ اکٹھے کر کے اس کے سر پر مارتا۔ اس نے چار سو سال تک ظلم اور ستم کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کو چار سو سال تک اس عذاب میں مبتلا رکھا، پھر اس کو موت دی۔ اسی نے ایک محل آسمان کی طرف بنایا تھا۔ اسی محل کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ ﴾ یعنی ہم نے اس کو جڑ سے اُکھیڑ کر پھینک دیا۔[1]

بعض نے کہا ہے کہ بخت نصر تھا، پھر اس کے مکر کا ذکر کیا جس کی حکایت اللہ تعالیٰ نے سورت ابراہیم میں کی ہے: ﴿ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ﴾ [إبراهيم: ٤٦] ''اور ان کی چالیں ایسی نہ تھیں کہ ان کی وجہ سے پہاڑ ٹل جاتے۔'' بعض نے کہا ہے کہ یہ کفار کی کارستانیوں کے باطل ہونے کی ایک مثال ہے، جو غیر کو اللہ کی عبادت میں شریک کرتے ہیں۔ جس طرح نوح علیہ السلام نے کہا تھا: ﴿ وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا ﴾ [نوح: ٢٢] ''اور انھوں نے بڑے بڑے مکر کیے۔'' یعنی لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے ہر طرح کا حیلہ نکالا اور ہر وسیلے سے ان کو شرک کی طرف مائل کیا، چناں چہ قیامت کے دن ان کے متبعین کہیں گے: ﴿ بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَاۤ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ؕ وَجَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِيْۤ اَعْنَاقِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ [سبا: ٣٣] ''بلکہ (تمھاری) رات اور دن کی چالوں ہی نے (ہمیں روکا تھا) جب تم ہمیں حکم دیتے تھے کہ ہم اللہ کے ساتھ کفر کریں اور اس کے لیے شریک ٹھہرائیں اور وہ (سب دل میں) ندامت چھپائیں گے جب عذاب دیکھیں گے، اور ہم ان لوگوں کی گردنوں میں طوق ڈال دیں گے جنھوں نے کفر کیا، انھیں صرف اسی کا بدلہ دیا جائے گا جو وہ عمل کرتے تھے۔''

﴿ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جڑ سے اُکھیڑ ڈالا اور اُن کا عمل باطل کر دیا۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ كُلَّمَاۤ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا ﴾ [المائدة: ٦٤] ''جب کبھی وہ لڑائی کی آگ بھڑکاتے ہیں تو اللہ اسے بجھا دیتا ہے اور وہ زمین میں فساد کرنے کو دوڑتے ہیں۔''

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ١٩٣۔ ١٩٤)

نیز فرمایا: ﴿ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ۗ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ فَاعْتَبِرُوْا يٰۤاُولِي الْاَبْصَارِ ﴾ [الحشر: ٢] ''پھر ان کے پاس اللہ (کا عذاب) آیا، جہاں سے انھوں نے گمان بھی نہیں کیا تھا، اور اس نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا، وہ اپنے گھر اپنے ہاتھوں اجاڑتے تھے اور مومنوں کے ہاتھوں بھی، تو اے آنکھوں والو! عبرت پکڑو۔''

اور یہاں فرمایا: ﴿ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴾ (آیتِ باب) بالجملہ ان کے فضائح و قبائح اور ضمائر و سرائر قیامت کے دن صاف ظاہر ہو جائیں گے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ﴾ [الطارق: ٩] ''جس دن راز ظاہر کر دیے جائیں گے۔'' یعنی ان کے راز اور پوشیدہ باتیں ظاہر کی جائیں گی اور مشتہر ہوں گی۔ صحیحین میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے: « يُنْصَبُ لِكُلِّ غَادِرٍ لِوَاءٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عِنْدَ اِسْتِهِ بِقَدَرِ غَدْرَتِهِ، فَيُقَالُ: هٰذِهِ غَدْرَةُ فُلَانِ بْنِ فُلَانٍ »[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر دغا باز کے لیے قیامت والے دن اس کی مقعد کے پاس جھنڈا ہوگا اس کے فریب اور دھوکے کے مطابق، اور کہا جائے گا کہ یہ فلاں بن فلاں کا فریب ہے۔''

اسی طرح یہ لوگ لوگوں کے لیے اپنا مخفی مکر ظاہر کریں گے اور اللہ تعالیٰ ان کو تمام مخلوق کے سامنے رسوا کرے گا اور زجر و توبیخ اور ڈانٹ کے طور پر فرمائے گا کہ وہ میرے شرکا کہاں ہیں جن کے لیے تم لڑتے تھے اور دشمنی کرتے تھے، اب وہ آ کر تمھاری مدد کیوں نہیں کرتے اور تم کو رہائی کیوں نہیں دلواتے؟! ﴿ هَلْ يَنْصُرُوْنَكُمْ اَوْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴾ [الشعراء: ٩٣] ''کیا وہ تمھاری مدد کر سکتے ہیں یا وہ بدلہ لے سکتے ہیں؟'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ﴾ [الطارق: ١٠] ''تو انسان کے پاس نہ کوئی قوت ہوگی اور نہ کوئی اس کا مددگار ہوگا۔''

پھر جب اُن پر حجت تمام ہو چکے گی اور دلالت قائم ہوگی اور کلمہ ثابت ہو جائے گا اور جب کوئی گریز کی جگہ باقی نہ رہے گی، وہ عذر معذرت کرنے سے خاموش ہو جائیں گے تو اہلِ علم جو کہ دنیا اور آخرت میں سردار تھے اور حق بات کی خبر دیتے تھے، یوں کہیں گے کہ آج کے دن کی رسوائی اور برائی کافروں پر ہے، یعنی کفار اور مشرکین کو اللہ تعالیٰ کے عذاب نے گھیر لیا ہے اور ہر طرف سے فضیحت نے گھیر لیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک بناتے تھے جو نہ ان کا برا کرتے تھے اور نہ بھلا کرتے تھے۔ انتہیٰ ما قال الحافظ ابن كثير في تفسيره.[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اکثر مفسرین کہتے ہیں کہ اگلے مکار سے مراد نمرود بن کنعان ہے۔ اس نے ایک عمارت

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠١٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٣٥) [2] تفسير ابن كثير (٢/ ٧٣٨۔ ٧٣٩)

بہت بڑی اور بلند بنائی تھی، وہ آسمان کی طرف پانچ ہزار گز بلند یا دو فرسخ تھی اور چاہا تھا کہ اس پر چڑھ کر آسمان والوں سے جنگ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے ہوا چلائی وہ ساری بنیاد اس پر اور اس کی قوم پر گر پڑی، وہ سب ہلاک ہو گئے۔ یہ ساری زمین والوں سے بڑھ کر زمانۂ ابراہیم میں متجبر تھا، لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ آیت سب باطل پرست اور مکر وفریب کرنے والے لوگوں کے لیے عام ہے جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ حق پرست مومنوں کو نقصان پہنچائیں۔ اس جگہ مکر سے مراد وہ فریب اور دغا بازی ہے جو حق کے مطابق نہ ہو۔ اس میں ان کفار کے لیے وعید ہے جو نبی مکرم ﷺ کے زمانے میں تھے کہ ان کا مکر عن قریب انھیں پر لوٹ آئے گا، جس طرح کہ پہلے مکاروں کا مکر اُن کی جانوں پر عائد ہوا تھا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اللہ کا حکم، یعنی تیز وتند ہوا آئی اور اس نے محل کے بالائی حصے کو دریا میں گرا دیا اور باقی نیچے کا حصہ اور بنیاد زلزلے سے گر پڑی، وہ سب اس کے نیچے دب کر مر گئے۔

بعض نے کہا ہے کہ اس محل کے گرنے سے گھبراہٹ کی وجہ سے لوگوں کی زبان متبلبل ہوگئی، اس دن لوگوں نے ۷۳ زبانوں میں بات کی، اس لیے اس کا نام بابل ٹھہرا، ورنہ اس سے پہلے لوگوں کی زبان سریانی تھی۔ امام بغوی رحمہ اللہ نے اسی طرح ذکر کیا ہے،[1] لیکن اس میں نظر ہے، کیوں کہ صالح علیہ السلام نمرود سے پہلے تھے، ان کی زبان عربی تھی اور اہلِ یمن بھی عرب تھے۔ من جملہ ان کے ایک قبیلہ جرہم تھا جس میں اسماعیل علیہ السلام نے نشو ونما پائی اور عربی زبان سیکھی، اسی طرح اور بہت سے قدیم قبائل عرب ہیں جو ابراہیم سے پہلے تھے۔ بالجملہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے حکم سے اس محل کی بنیادیں اُکھڑ گئیں، اوپر سے چھت گر پڑی، کیوں کہ جب کسی بنیاد کے پائے گر جاتے ہیں تو جو کچھ اس پر معتمد ہوتا ہے وہ بھی گر پڑتا ہے۔ ابن الاعرابی رحمہ اللہ نے کہا کہ "فوق" کا ذکر اس لیے کیا تاکہ یہ معلوم رہے کہ اس وقت وہ اس محل کے نیچے تھے۔[2]

عرب کہا کرتے ہیں: "خَرَّ عَلَيْنَا سَقْفٌ وَوَقَعَ عَلَيْنَا حَائِطٌ" یعنی ہم پر چھت گر پڑی اور ہم پر دیوار گر پڑی، جب ان کی ملکیت میں ہو، اگرچہ ان پر واقع نہ بھی ہو۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس شک کے ازالے کے لیے ﴿ مِنْ فَوْقِهِمْ ﴾ فرمایا، یعنی ان پر واقع ہوئی اور وہ اس کے نیچے تھے اور ہلاک ہوگئے۔ بعض نے کہا ہے کہ ﴿ مِنْ فَوْقِهِمْ ﴾ میں تاکید ہے، اس لیے کہ چھت اوپر سے گری تھی۔ بعض نے کہا ہے کہ اس جگہ "سقف" سے مراد آسمان ہے، یعنی آسمان کی طرف سے عذاب نازل ہوا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ جس پر یہ محل گرا وہ نمرود تھا۔[3] امام مجاہد رحمہ اللہ نے بھی ایسا ہی کہا ہے۔ بعض نے کہا کہ بخت نصر تھا۔ بعض نے کہا کہ مقتسمین تھے جن کا ذکر سورت حجر میں گزر چکا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ آیت کے معنی عام ہیں کہ جب انھوں نے اپنے مکر کو مرتب کیا اور انبیا و اہلِ حق کے ساتھ منصوبوں سے پیش آئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو برباد کر دیا، جس طرح مثلاً کوئی قوم ایک مضبوط بنیاد بنائے اور دعائم اور اساطین پر اس کو کھڑا

---

[1] تفسير البغوي (٥/ ١٦) [2] تفسير القرطبي (١٠/ ٩٧) [3] تفسير الطبري (١٧/ ١٩٣)

کرے، پھر وہ گھر گر پڑے اور سب اس کے نیچے دب کر تباہ ہو جائیں۔ سو یہ مکار کی ہلاکت کی ایک مثال بیان کی ہے، جو اپنے مکر کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوتا ہے۔ یہ مثال لوگوں کی زبان پر جاری ہے: "من حفَرَ بئرا لأخيه أوقعه الله فيه" "جس نے اپنے بھائی کے لیے کنواں کھودتا ہے، اللہ اسی کو اس میں گرا دیتا ہے۔" اسی تاویل کو قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے کشاف کی طرح اختیار کیا ہے،[1] لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔ لہٰذا خصوصیتِ سبب کے بجائے عمومیتِ لفظ کا اعتبار ہے۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کی عمارت پر اس کی جڑ سے اللہ کا عذاب آیا، تو ان کی چھت اوپر سے گری تو ان کے گھر الٹے ہو گئے اور اللہ نے ان کو ہلاک کر دیا۔ یہ عذاب ان کو اس طرح آیا کہ معلوم بھی نہ ہوا، کیوں کہ وہ امن میں تھے، ان کے دل میں عذاب کا خطرہ تک بھی نہ تھا، لیکن یہ عذاب صرف اسی دنیا پر ہی مقصور نہ ہوا، بلکہ قیامت کے دن اور زیادہ رسوا و بدنام و ذلیل و خوار ہوں گے اور اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا کہ کہاں ہیں اور کدھر گئے میرے شریک، جن کو تم پکارتے اور پوجتے تھے اور اُن کے عقیدت مند اور ارادت مند تھے اور اُن کی خاطر مومنوں سے، بلکہ انبیا اور رسولوں سے ضدم ضدا ہوتے تھے اور جھگڑا کرتے تھے؟ یعنی اب وہ کیوں تمھارے ساتھ حاضر نہیں ہوئے؟ تم ان کو بلاؤ کہ وہ اس عذاب کو، جو نازل ہوا، تم سے دور کریں۔ اس وقت اہلِ علم جو موقف میں ہوں گے، یعنی وہ علما جو اِن اُمتوں سے جن کو وعظ و نصیحت کیا کرتے تھے اور وہ اُن کے وعظ کی طرف توجہ بھی نہیں کرتے تھے، ان سے بہ طریق شماتت (دشمن کی بدحالی پر خوش ہونا) کے کہیں گے۔ بعض نے کہا کہ اس جگہ اہلِ علم سے مراد انبیا ہیں اور بعض نے کہا کہ ملائکہ ہیں۔

پہلا قول ظاہر ہے، کیوں کہ ان کا ذکر علم کے وصف کی وجہ سے اسی کو مفید ہے، اگرچہ انبیا و ملائکہ بھی اہلِ علم میں سے ہیں، بلکہ سب سے زیادہ علم رکھتے ہیں، لیکن ان کا ایک ایسا وصف بھی ہے کہ وہ اس وصف سے بھی اشرف ہوتا ہے، یعنی یوں کہا جاتا ہے کہ وہ پیغمبر ہیں، رسول ہیں، فرشتے ہیں۔ بہر حال وہ یہ بات کہیں گے کہ آج کے دن ذلت و خواری و رسوائی اور عذاب و سزا اور ہر طرح کی برائی کافروں کے لیے مخصوص ہے یہ ان کو غصہ دلانے کے لیے کہیں گے۔[2]

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۪ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۲۸ فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ۝۲۹

وہ لوگ جنھیں فرشتے اس حال میں فوت کرتے ہیں کہ وہ اپنے آپ پر ظلم کرنے والے تھے، تو وہ (یہ

[1] الکشاف (۲/ ۵۶۲۔ ۵۶۳) [2] فتح البیان (۷/ ۲۳۰۔ ۲۳۴)

کہتے ہوئے) سر تسلیم خم کر دیتے ہیں کہ ہم تو کوئی برا عمل نہیں کرتے تھے۔ (فرشتے کہتے ہیں:) کیوں نہیں! بے شک اللہ کو معلوم ہے جو تم عمل کرتے تھے ﴿28﴾ چناں چہ تم جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ، اس میں ہمیشہ رہو گے۔ سو کیسا برا ٹھکانا ہے تکبر کرنے والوں کا! ﴿29﴾

ظالم مشرکوں کی موت اور اس کے بعد کے حالات:

اللہ تعالیٰ نے مشرکین ظالمین کی اس وقت کی حالت کی خبر دی جب موت کے وقت فرشتے اُن کی روح قبض کرنے کے لیے آتے ہیں، وہ اس وقت سننے اور اطاعت اور فرماں برداری کرنے کا اظہار کریں گے اور کہیں گے کہ ہم تو کچھ بھی برائی نہیں کرتے تھے، جس طرح کہ قیامت کے دن کہیں گے: ﴿ وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴾ [الأنعام: ٢٣] ''ہمارے رب کی قسم! ہم مشرک نہیں تھے۔'' نیز فرمایا: ﴿ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ ﴾ [المجادلة: ١٨] ''جس دن اللہ ان سب کو دوبارہ اُٹھائے گا تو وہ اس کے سامنے قسمیں کھائیں گے، جیسے تمھارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے ان کے اس قول کی تکذیب فرمائی اور کہا: ﴿ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿28﴾ فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴾ (آیتِ باب) چنانچہ اللہ تعالیٰ کو تمھارے عمل کی خبر ہے۔ اب تم دوزخ میں جاؤ، یہ بُری جگہ ہے رہنے اور بسنے کے لیے متکبرین کے واسطے جو کہ اللہ تعالیٰ کی آیات اور رسولوں کی اتباع سے تکبر کرتے ہیں۔ سو یہ لوگ مرنے کے دن سے اپنی روحوں سمیت جہنم میں داخل ہوں گے اور اُن کے جسموں کو قبروں میں آگ کی گرمی اور تپش کی ہوا پہنچے گی۔

جب قیامت کا دن ہو گا تو اُن کی روحیں اُن کے بدنوں میں لوٹا دی جائیں گی اور یہ ہمیشہ کے لیے جہنم کی آگ میں داخل ہو جائیں گے، وہاں نہ تو انھیں موت آئے گی اور نہ ہی اُن کے عذاب کو ہلکا کیا جائے گا جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۣ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ﴾ [المؤمن: ٤٦] ''(وہ دوزخ کی) آگ ہے جس پر انھیں صبح و شام پیش کیا جاتا ہے اور جس دن قیامت قائم ہوگی (کہا جائے گا:) آلِ فرعون کو سخت ترین عذاب میں داخل کرو۔'' انتھیٰ ما قال ابن کثیر بزیادة.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ملائکہ سے مراد عزرائیل اور ملک الموت کے معاون فرشتے ہیں۔ ظلم سے مراد کفر اور شرک ہے اور اس کی تفسیر سورت نساء میں گزر چکی ہے۔ نیز فرمایا: آ کریں گے اطاعت، یعنی موت کے وقت ربوبیت کا اقرار کرتے ہیں اور گردن جھکا دیتے ہیں اور ''سلم'' کے معنی استسلام کے ہیں۔ یہ قطرب کا قول ہے۔ بعض نے کہا

ہے کہ مسالمہ کے معنی ہیں، یعنی وہ صلح کریں گے اور جھگڑا چھوڑ دیں گے۔ یہ امام اخفش رحمہ اللہ کا قول ہے۔ یا اسلام کے معنی میں ہیں، یعنی اس وقت اسلام لانے کا اور کفر کو چھوڑنے کا اقرار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے شرک نہیں کیا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ آیت میں لفظ سوء سے مراد شرک ہو اور ان کا یہ قول انکار کے طور پر ہو یا خوف کی شدت کی بنا پر ہو۔

اور جس نے اہلِ قیامت پر جھوٹ بولنے کو روا نہیں رکھا، اس نے کہا ہے کہ مراد اُن کی یہ ہے کہ ہم نے اپنے اعتقاد میں اپنے خیال کے مطابق کوئی برائی نہیں کی۔ جیسے اللہ نے فرمایا: ﴿ وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴾ [الأنعام: ٢٣] ''ہمارے رب کی قسم! ہم مشرک نہیں تھے۔'' اس وقت اہلِ علم ان کو یہ جواب دیں گے کہ اللہ کو معلوم ہے کہ تم کیا عمل کرتے تھے۔ تمھارا یہ جھوٹ بولنا کچھ فائدہ مند نہیں ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ بات اُن کو بدر کے دن حاصل ہوئی تھی۔[1] تب موت کے وقت اُن سے کہا جاتا ہے کہ تم جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ، کیوں کہ جہنم کے درجات ہیں، ایک کے اوپر ایک۔ ہر قسم ایک طبقے میں، جس کا اس سے وعدہ ہے، داخل ہوگی۔ یہ کہنا ان کی رسوائی اور مزید غم اور رنج کے لیے ہوگا۔ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ بعض کفار دوسروں کی نسبت زیادہ سخت عذاب میں ہوں گے۔ اس جگہ تکبر سے مراد ایمان لانے اور اللہ کی عبادت سے تکبر کرنا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّهُمْ كَانُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴾ [الصّافات: ٣٥] ''بے شک جب ان سے کہا جاتا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں تو وہ تکبر کرتے تھے۔''[2] پھر اللہ نے بدبخت لوگوں کے اوصاف بیان کرنے کے بعد نیک بخت لوگوں کے اوصاف بیان کیے اور فرمایا:

وَقِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ؕ قَالُوْا خَيْرًا ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ؕ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ۙ﴿۳۰﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ ؕ كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ ۙ﴿۳۱﴾ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۳۲﴾

اور (جب) پوچھا جاتا ہے متقی لوگوں سے کہ تمھارے رب نے کیا نازل کیا ہے؟ تو وہ کہتے ہیں: خیر ہی خیر۔ جن لوگوں نے بھلائی کی ان کے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے اور دارِ آخرت تو یقیناً بہترین ہے اور کیا خوب ہے متقی لوگوں کا گھر! (30) (یعنی) ہمیشہ کے باغات ہیں، وہ ان میں داخل ہوں گے،

[1] تفسير البغوي (٥/ ١٧) [2] فتح البيان (٧/ ٢٣٤_ ٢٣٥)

ان کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہاں ان کے لیے وہ ہوگا جو وہ چاہیں گے۔ اللہ اسی طرح متقی لوگوں کو جزا دیتا ہے ﴿31﴾ جن کو فرشتے اس حال میں فوت کرتے ہیں کہ وہ (کفر و شرک سے) پاک ہوتے ہیں تو (فرشتے) کہتے ہیں: تم پر سلام ہو، تم جنت میں داخل ہو جاؤ اس کے بدلے جو تم عمل کرتے تھے ﴿32﴾

متقی اور پرہیزگار لوگوں کے حالات:

اللہ تعالیٰ نے اشقیا (بدبختوں) کے برعکس اب نیک بخت لوگوں کے بارے میں خبر دی ہے کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تمھارے رب نے کیا اُتارا ہے؟ تو کہتے ہیں کہ ہمارے رب نے خیر، یعنی رحمت اور برکت اُتاری ہے، اس شخص کے لیے جو اس کا تابع ہو اور ایمان لائے۔ اس کے برعکس بدبخت لوگوں نے کہا تھا کہ یہ تو پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدے کی خبر دی، جو اپنے رسولوں کی زبان پر کیا ہے اور فرمایا: ﴿ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ﴾ جن لوگوں نے دنیا میں نیکی کی ہے، ان کے لیے بہتر بدلہ ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ [النحل: ٩٧] ”جس نے نیک عمل کیے، مرد ہو یا عورت، جب کہ وہ مومن ہو تو ہم ضرور اسے پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے، اور ہم انھیں ضرور ان کا اجر و ثواب ان بہترین اعمال کے بدلے میں دیں گے جو وہ کرتے تھے۔“ یعنی جس نے اپنا عمل دنیا میں اچھا کیا، اللہ اس کے عمل کو دنیا اور آخرت میں اچھا کرے گا۔

آخرت کا گھر دنیا کی زندگی سے بہتر ہے اور وہاں کی جزا یہاں کی جزا سے مکمل ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَلَا يُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ﴾ [القصص: ٨٠] ”اور جن لوگوں کو علم دیا گیا تھا، انھوں نے کہا: افسوس تم پر! اس شخص کے لیے اللہ کا ثواب بہتر ہے جو ایمان لایا اور اس نے نیک عمل کیے اور یہ بات صبر کرنے والوں ہی کو سکھائی جاتی ہے۔“ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴾ [آل عمران: ١٩٨] ”اور جو اللہ کے پاس ہے وہ نیک لوگوں کے لیے بہتر ہے۔“ نیز فرمایا: ﴿ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴾ [الأعلیٰ: ١٧] ”حالاں کہ آخرت بہت بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔“ نیز اپنے رسول سے فرمایا: ﴿ وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ﴾ [الضحیٰ: ٤] ”اور یقیناً آپ کے لیے آخرت، دنیا سے بہت بہتر ہے۔“

پھر دارِ آخرت کی صفت بیان کی اور فرمایا: ﴿ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ﴾ تقویٰ کرنے والوں کا گھر بہتر ہے اور اُن کے لیے آخرت میں جناتِ عدن ہیں، یعنی ایسا مقام ہے کہ اس کے درختوں اور حویلیوں کے بیچ میں نہریں جاری ہیں، وہاں جو کچھ چاہیں وہ موجود ملے گا جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ ۚ

﴿ وَاَنْتُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾ [الزخرف: ٧١] ''اور اس (جنت) میں جس شے کو ان کے دل چاہیں گے اور (ان کی) آنکھیں متلذذ ہوں گی (وہ موجود ہوگی) اور تم اس میں ہمیشہ رہو گے۔'' حدیث میں مروی ہے کہ ایک بادل اہلِ جنت کی ایک جماعت پر گزرے گا، وہ اپنی شراب پر بیٹھے ہوں گے، ان میں سے کوئی شخص کسی شے کا خواہاں نہ ہوگا مگر وہی شے بادل اس پر برسائے گا، یہاں تک کہ بعض ان میں سے یہ کہیں گے کہ ہم پر نوجوان کنواری ہم عمر عورتیں برسا، تب یوں ہی ہوگا۔[1] اسی طرح کا بدلہ اللہ تعالیٰ ان متقین کو دیتا ہے جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ سے ڈرتے ہیں اور اچھے عمل کرتے ہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے موت کے وقت کی اُن کی حالت کے متعلق خبر دی کہ وہ ستھرے ہیں، یعنی شرک اور ہر برائی سے پاک صاف ہیں۔ اور فرشتے ان پر سلام کرتے ہیں اور جنت کا مژدہ سناتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ﴾ [حم السجدة: ٣٠۔ ٣٢] ''بلاشبہ جن لوگوں نے کہا: ہمارا رب اللہ ہے، پھر اس پر قائم رہے، ان پر فرشتے (یہ کہتے ہوئے) اُترتے ہیں: نہ تم ڈرو اور نہ غم کھاؤ اور اس جنت سے خوش ہو جاؤ، جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ ہم دنیاوی زندگی میں بھی تمھارے دوست تھے اور آخرت میں بھی (رفیق ہیں) اور اس میں تمھارے لیے وہ (سب کچھ) ہے جو تمھارے جی چاہیں گے اور اس میں تمھارے لیے وہ (سب کچھ) ہے جو تم مانگو گے۔ (یہ) بڑے بخشن ہار، نہایت رحم کرنے والے کی طرف سے مہمان نوازی ہوگی۔''

اس سے پہلے زیرِ آیت کریمہ ﴿ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ﴾ [إبراهيم: ٢٧] ''اللہ ایمان والوں کو قولِ ثابت (کلمۂ توحید) سے دنیا کی زندگی اور آخرت میں ثابت قدم رکھتا ہے اور اللہ ظالموں کو گمراہ کر دیتا ہے اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔'' روح قبض کرنے کے بارے میں وارد ہونے والی احادیث گزر چکی ہیں۔ انتہیٰ ما قال الإمام الجليل الكبير الحافظ عماد الدين أبو الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير القرشي الدمشقي في تفسيره.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ﴿ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ﴾ سے مراد مومنین ہیں۔ ایمان کا اقرار کرنے والے اور انکار کرنے والے کے جواب میں فرق ہے۔ احسان و عمل سے مراد ایمان لانا ہے۔ دنیا میں ان کی اچھی جزا کئی گنا ہوگی ایک سے دس

[1] تفسیر ابن کثير (٢/ ٧٤٠) تفسير الطبري (٢١/ ٦٤٢)

تک، بلکہ سات سو تک، بلکہ کئی گنا تک۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ احسان ایمان لانا ہے اللہ پر اور اس کی کتابوں پر، اور عمل کرنا ہے اللہ کے اوامر ونواہی پر اور دوسروں کو اللہ کی اطاعت کا حکم کرنا اور اللہ کے بندوں کو خیر پر آمادہ کرنا اور ان کو حسنات کی طرف دعوت دینا ہے۔[1] امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حسنہ سے مراد نصر وفتح ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رزقِ حسن ہے۔[2] بعض نے کہا ہے کہ حیاتِ طیبہ ہے، یعنی استحقاقِ مدح وثنا یا مشاہدات ومکاشفات کے دروازے کھل جانا ہے۔ (قاله الكرخي) بہتر یہ ہے کہ آیت کو عمومیت پر محمول کریں۔ آیت ان سب معانی کو شامل ہے۔

دارِ آخرت سے مراد جنت ہے، یہ بہتر ہے اس سے جو دنیا میں ملا تھا۔ یہ گھر اہلِ تقویٰ کا کیا عمدہ کاشانۂ دولت و راحت ہے۔ ﴿ جَنّٰتُ عَدْنٍ ﴾ سے مراد رہایش والے باغات ہیں، ان باغوں میں داخل ہوں گے، کبھی وہاں سے خارج نہ ہوں گے، ان کے گھروں کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی۔ ہر خواہش کی چیز ملے گی۔ صرف مشیتِ ایزدی کے تحت انھیں درگز اور بخشش کی نعمت حاصل ہوگی۔ یہ وہ حالت ہے کہ سوائے جنت کے دستیاب نہیں ہوگی۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ دنیا میں ہر مراد کسی انسان کو نہیں مل سکتی، بلکہ اکثر ارادے اور عزائم کے خلاف ہی ہوتا ہے۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ "عَرَفْتُ رَبِّيْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ" یعنی مجھے اپنے رب کی معرفت اسی طرح ہوئی کہ میں کام کا ارادہ اور عزم کرتا ہوں، وہ ٹوٹ جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں جو میرے ارادے اور عزائم کو پورا نہیں ہونے دیتا، وہی میرا رب ہے۔ "وَيَأْبَى اللّٰهُ إِلَّا مَا أَرَادَ" [اللہ تعالیٰ نے اپنے ارادے اور مشیت کے سوا ہر چیز کا انکار کیا ہے] اللہ ایسی ہی جزا ان لوگوں کو دیتا ہے جو شرک سے بچتے ہیں اور آگ کو واجب کر دینے والے گناہوں سے ڈر کر چلتے ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ جب اُن کی روحیں قبض کی جاتی ہیں تو یہ شرک وکفر اور نفاق کے شائبے سے بھی پاک اور صاف ہوتے ہیں۔ یا صالحین ہیں، یا ان کے اقوال اور افعال پاکیزہ ہیں، یا گناہوں کے کے ساتھ اپنی جانوں پر ظلم نہیں کیا ہوتا۔ یا ان کے جی اللہ پر اعتماد رکھ کر خوش ہیں۔ یا اللہ کی طرف رجوع کرنے پر مسرور ہیں۔ یا اُن کو موت بغیر کسی تکلیف کے آسانی سے آجاتی ہے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ طیبین ہیں، زندگی میں بھی اور موت میں بھی، اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے امر مقرر کر رکھا ہے۔[3] یا فرشتوں کی بشارت دینے پر خوش دل ہیں۔ یا اپنی روح کے قبض ہونے پر مسرور ہیں، اس لیے کہ ان کی جانیں کلی طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہیں۔ بعض نے کہا کہ ﴿ طَيِّبِيْنَ ﴾ ایک جامع کلمہ ہے جو ہر اچھے معنی کو شامل ہے، اس میں مذکور امور بھی داخل ہیں۔ وہ فرشتے دنیا میں یا آخرت میں اُن سے یہ کہتے ہیں کہ تم پر سلامتی ہو، یہ موت سے ڈرانا ہے یا جنت کی بشارت دینا ہے، کیوں کہ سلام امان ہے۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا کہ موت کے وقت

[1] تفسير الطبري (١٧/ ١٩٧) [2] تفسير البغوي (٥/ ١٧)

[3] تفسير الطبري (١٧/ ١٩٨)

سلام علیکم کہتے ہیں، یعنی تم خاطر جمع رکھو، اب کوئی مکروہ تم کو لاحقِ حال نہ ہوگا۔

محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بندۂ مومن کے پاس جب موت کا پیغام آتا ہے تو فرشتہ آ کر کہتا ہے: ''اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا وَلِيَّ اللّٰهِ! يَقْرَأُ عَلَيْكَ السَّلَامَ'' یعنی اے اللہ کے دوست! تجھ پر سلامتی ہو، اللہ تجھ پر سلام کہتا ہے اور اس کو جنت کا مژدہ سناتا ہے۔[1] (أخرجه ابن جرير و مالك والبيهقي وغيرهم) امام ابوحیان رحمہ اللہ نے کہا کہ ظاہر یہ ہے کہ سلام آخرت میں ہوگا، لہٰذا اس کے بعد یہ کہا: ﴿ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ ﴾ تم جنت میں داخل ہو تو یہ قول جنت کے دربانوں کا ٹھہرا۔[2] پھر فرمایا کہ عمل کی وجہ سے بہشت میں جاؤ، یہ کچھ اس کے منافی نہیں ہے کہ جنت میں داخلہ اللہ کے فضل و کرم سے ہوگا، جس طرح صحیح حدیث میں مروی ہے: « سَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَاعْلَمُوْا أَنَّهُ لَنْ يَّدْخُلَ أَحَدُنِ الْجَنَّةَ بِعَمَلِهِ، قِيْلَ: وَلَا أَنْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟! قَالَ: وَلَا أَنَا أَنْ يَّتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ بِرَحْمَتِهِ » ''سیدھے چلو اور میانہ چال چلو اور جان لو کہ جنت میں کوئی شخص اپنے عمل سے داخل نہ ہوگا۔ کہا گیا کہ آپ بھی اے اللہ کے رسول؟! فرمایا: اور نہ میں، مگر یہ کہ اللہ مجھے اپنی رحمت میں ڈھک لے۔'' اور ہم اس کی بحث پہلے بیان کر چکے ہیں۔ انتھیٰ ما قال السيد الإمام أبو الطيب الصديق بن حسن القنوجي البخاري في تفسيره فتح البيان.[3]

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ
كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ
كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝۳۳ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا
وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۳۴

وہ (کافر) یہی انتظار تو کرتے ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا آپ کے رب کا حکم آئے۔ اسی طرح کیا تھا ان لوگوں نے جو اُن سے پہلے تھے۔ اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا، لیکن وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے (33) پھر انھوں نے جو کیا تھا اس کے بُرے نتائج انھیں پہنچے، اور انھیں اس (عذاب) نے گھیر لیا جس کا وہ مذاق اُڑاتے تھے (34)

کفار اور ایمان کے منکر دراصل عذاب کے منتظر ہیں:

اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کو ان کے باطل میں بہت بڑھ جانے پر اور دنیا کے ساتھ فریب کھانے پر دھمکی دی کہ کیا

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ١٩٨۔ ١٩٩) شعب الإيمان (١/ ٣٦١) الدر المنثور (٥/ ١٢٨)

[2] تفسير البحر المحيط (٥/ ٤٧٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٠٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨١٦۔ ٢٨١٨) فتح البيان (٧/ ٢٣٥۔ ٢٣٧)

ان کو اس بات کا انتظار ہے کہ فرشتے ان کی روح قبض کرنے کے لیے آئیں؟[1] (قاله قتادة) یا قیامت کا دن آ جائے اور یہ اس دن کی ہولناکیوں کا مشاہدہ کر لیں۔ پھر فرمایا کہ ان کے اسلاف ونظرا و اشباہ بھی، اسی طرح شرک میں متمادی (بڑھے ہوئے دور تک) تھے، یہاں تک کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے عذاب کا مزہ چکھا اور عذاب اور سزا میں گرفتار ہوئے۔ یہ کچھ ان پر اللہ کا ظلم نہ تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے تو حجت قائم کر دی تھی اور رسول بھیج دیے تھے اور کتابیں نازل فرما دی تھیں، لیکن وہ خود اپنی جانوں پر ستم کرتے تھے کہ رسولوں کو جھٹلاتے تھے، اس لیے اللہ کا عذاب ان پر آ پڑا اور ان کے رسولوں کے ساتھ تمسخر اور استہزا کرنے کے سبب سے عذابِ اَلیم نے ان کو گھیر لیا۔ لہٰذا قیامت کے دن ان سے کہا جائے گا: ﴿ هٰذِهِ النَّارُ الَّتِیْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴾ [الطور: ١٤] ''(کہا جائے گا:) یہی ہے وہ آگ جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔'' انتهى ما قال الحافظ عماد الدين بن كثير في تفسيره.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ ﴿ هَلْ یَنْظُرُوْنَ ﴾ میں منکرینِ نبوت کے دوسرے شبہے اور اعتراض کا جواب ہے جو انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس بات کی اقتراح کی اور کہا کہ ہم پر فرشتہ آسمان سے نازل ہو کر آپ کے ادعائے نبوت کی صداقت کی شہادت دے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تیری نبوت کی تصدیق میں کیا وہ اس بات کے منتظر ہیں کہ آئیں ان پر فرشتے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ جب انھوں نے قرآن میں اس طور پر طعن کیا کہ یہ تو پہلوں کی نقلیں ہیں تو ان کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے اس قول کے ساتھ ڈرایا:

﴿ هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَاْتِیَهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ ﴾ یعنی یہ تو اسی امر کا راہ دیکھتے ہیں کہ ان کے پاس فرشتے ان کی ارواح کے قبض کے لیے آ جائیں، یا دنیا میں اس کا عذاب آ جائے جو ان کی استیصال کر دے اور ان کو جڑ سے اکھیڑ مارے۔ یا امر اللہ سے مراد قیامت ہے اور ان کے راہ دیکھنے سے مراد یہ ہے کہ وہ فرشتوں کے آنے کے منتظر ہیں، یا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے امر کے آنے کے دوسری تفسیر پر اور وہ اس طرح کہ انھوں نے اس شخص کے سے کام کیے جس پر عذاب واجب ہو جاتا ہے اور وہ اس عذاب کا منتظر ہوتا ہے اور اس کی تاک میں ہوتا ہے اور یہ مراد نہیں ہے کہ وہ حقیقتاً اس امر کے منتظر ہیں، وہ تو قیامت اور عذاب کے ساتھ ایمان ہی نہیں لائے، وہ کیوں کہ اس کو باور کرتے ہیں اور اس کو سچا جانتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ ﴿ اَوْ ﴾ منع خلو کے لیے ہے، اس لیے کہ موت اور عذاب دونوں پاس آئیں گے، اگرچہ مختلف وقتوں میں آئیں اور ﴿ اَوْ ﴾ کے ساتھ اس لیے تعبیر کی، تاکہ اس طرف اشارہ ہو کہ ''أَمْرَيْن'' میں سے

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ١٩٩)

ہر ایک ان کی تعذیب میں کافی ہے۔ اسی طرح امام ابو السعود نے بیان کیا، جیسے ان کفار نے کفر اور تکذیب پر اصرار کیا ہے اور استہزا پر اڑے ہیں، اسی طرح ان سے پہلے کفار کفر پر اصرار کر چکے اور رسل اور کتبِ الٰہی کی تکذیب کر چکے اور اپنی روش سے باز نہ آئے۔ پھر ان پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا عذاب آیا اور اس نے ان کو ہلاک کر دیا اور ان کے ہلاک کرنے میں اللہ تعالیٰ نے ان پر کچھ ظلم نہیں کیا، بلکہ ان پر وہی عذاب اتارا جس کے وہ اپنے کفر کی وجہ سے مستحق اور مستوجب تھے، لیکن وہ آپ اپنا بُرا کرتے رہے، اس لیے کہ وہ قبائح کے مرتکب ہوئے۔ اس میں دلیل ہے کہ ان کا ظلم انھیں پر باعتبار انجام کار کے مقصور ہے۔ پھر پڑی ان پر ان کے برے کام کی جزا اور ان پر وہ عذاب الٹ پڑا، جس کا وہ ٹھٹھا کرتے تھے، یا ان کے ٹھٹھے کی جزا میں ان پر عذاب الٹ پڑا۔ انتہی[1] ما قال أبو الطيب الصديق بن حسن القنوجي البخاري في تفسيره.[1]

وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝۳۵ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ؕ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝۳۶ اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰىهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝۳۷

اور مشرک لوگوں نے کہا: اگر اللہ چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی چیز کی عبادت نہ کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا ہی، اور ہم اس (کے حکم) کے بغیر کوئی چیز حرام بھی نہ ٹھہراتے۔ اسی طرح ان لوگوں نے کیا تھا جو اُن سے پہلے تھے، چناں چہ رسولوں کے ذمے تو صرف صاف صاف پہنچا دینا ہے (35) اور یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو، پھر ان میں سے بعض کو اللہ نے ہدایت دی، اور ان میں سے بعض پر ضلالت ثابت ہوگئی، لہٰذا تم زمین میں چلو پھرو، پھر دیکھو (رسولوں کو) جھٹلانے والوں کا انجام کیسا (عبرت ناک) ہوا؟ (36) (اے نبی!) خواہ آپ ان

[1] فتح البیان (۷/ ۲۳۸)

کی ہدایت کے لیے کتنی ہی حرص کریں تو بے شک اللہ جسے گمراہ کرے اسے ہدایت نہیں دیتا، اور ان (گمراہوں) کا مددگار کوئی بھی نہیں ﴿37﴾

مشرکین کا شرک کے جواز پر تقدیر سے ایک غلط استدلال:

یہ نادانوں کے کلام ہیں کہ اللہ کو یہ کام برا لگتا تو کیوں کرنے دیتا؟! آخر ہر فرقے کے نزدیک بعض کام برے ہیں پھر وہ کیوں ہوتے ہیں؟ یہاں مجمل جواب فرمایا کہ ہمیشہ رسول اس سے منع کرتے آئے ہیں، جس کی قسمت تھی ہدایت پائی، جس کو خراب ہونا تھا وہ خراب ہوا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو یہی منظور ہے۔ طاغوت وہ ہے جو ناحق سرداری کا دعوی کرے، کچھ سند نہ رکھے۔ بت اور شیطان اور زبردست ظالم سب یہی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کے اپنے شرک پر فریفتہ ہونے اور تقدیر کی حجت کو اپنے عذر کے طور پر پیش کرنے کی خبر دی کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم نہ شرک کرتے اور نہ بحیرہ وسائبہ و وصیلہ کو حرام ٹھہراتی اور نہ ہی وہ اپنی طرف سے بدعات جاری کرتے اور مسائل کا اختراع کرتے، جس کی کوئی سند اللہ نے نہیں اتاری۔ مطلب یہ ٹھہرا کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمارے فعل سے ناخوش ہوتا تو ہم پر سزا بھیج کر اس کا انکار کرتا اور ہم کو اس کام کی قدرت نہ دیتا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس شبہے کی تردید کی اور فرمایا: ﴿فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ﴾ یعنی بات اس طرح نہیں ہے، جس طرح تم اعتقاد کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر ان افعال کا انکار نہیں کیا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے تو ان کاموں پر سخت انکار فرمایا ہے اور بڑی تاکید سے تم کو نہی کی ہے اور ہر قرن اور ہر طائفۂ مردم میں ایک رسول بھیجا ہے، وہ سب اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کی طرف بلاتے رہے اور اس کے سوا کسی اور کی پرستش سے منع کرتے رہے۔

سب یہی کہتے تھے کہ صرف اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔ سو اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے لوگوں کی طرف رسول بھیجتا رہا، جب سے کہ بنی آدم میں شرک رونما ہوا۔ اس شرک کی ابتدا نوح علیہ السلام کے زمانے سے ہوئی ہے۔ اسی پر اللہ تعالیٰ نے ان کو رسول بنا کر بھیجا۔ سب سے پہلے جو پیغمبر زمین والوں کی طرف آیا، وہ یہی نوح علیہ السلام تھے اور نبوت کا خاتمہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوا جن کی دعوت سارے انسانوں کو دنیا کے مشرق و مغرب اور تمام کونوں میں جاری ہوئی اور سارے رسولوں نے توحید کی طرف لوگوں کو بلایا جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ﴾ [الأنبياء: ٢٥] ”اور آپ سے پہلے ہم نے جو بھی رسول بھیجا اس کی طرف یہی وحی کرتے رہے کہ بے شک میرے سوا کوئی معبود نہیں، لہٰذا تم میری ہی عبادت کرو۔“

نیز فرمایا: ﴿وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ﴾ [الزخرف: ٤٥] ”اور ہم نے جو اپنے رسول آپ سے پہلے بھیجے تھے ان سے پوچھیے، کیا ہم نے رحمٰن کے سوا کوئی اور

معبود مقرر کیے تھے کہ اُن کی عبادت کی جائے۔'' اور اس جگہ یہ فرمایا کہ ہم نے ہر اُمت میں ایک پیغمبر بھیجا کہ اللہ کو پوجو اور طاغوت سے بچو، اب اس کے بعد مشرک کو کس طرح یہ بات کہنے کا حق پہنچتا ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی کی پوجا نہ کرتے؟!

سو مشیتِ شرعیہ ان سے منتفی ہے، یعنی انکاری ہے، کیوں کہ اللہ نے رسولوں کے ذریعے سے ان کو اس شرک و کفر و عصیان سے منع کر دیا ہے۔ رہی مشیتِ کونیہ کہ ان کو ان کاموں کی قدرت دی ہے اور تمکین بخشی ہے، سو اس میں ان کے لیے کوئی حجت نہیں ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے دوزخ اور دوزخ والے، یعنی شیاطین اور کافر پیدا کیے ہیں اور وہ کفر کو اپنے بندوں کے لیے پسند نہیں کرتا، اس بارے میں اللہ تعالیٰ ہی کے لیے حجتِ بالغہ وحکمتِ قاطعہ ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ ہم نے کفار پر ان افعال کا انکار اس وقت کیا جب رسولوں کے ڈرانے کے بعد ان کو دنیا میں عذاب کیا، لہٰذا فرمایا: ﴿فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ۚ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ﴾ (آیتِ باب) بعض کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی اور کوئی گمراہ ہوا، اب ذرا تم زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ ان مکذبین کا انجام کیا ہوا، جنھوں نے حق کو جھٹلایا اور رسولوں کی مخالفت کی۔ نیز فرمایا: ﴿كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۡ وَلِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا﴾ [محمد: ١٠] ''کیا پھر وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے ان لوگوں کا انجام کیسا ہوا جو اُن سے پہلے تھے؟ اللہ نے ان پر تباہی ڈال دی اور کافروں کے لیے اسی طرح کی سزائیں ہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ﴾ [الملك: ١٨] ''اور البتہ یقیناً تکذیب کر چکے وہ جو اُن سے پہلے تھے، چناں چہ (دیکھ لو) میرا عذاب کیسا تھا؟''

پھر اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ ان کے راہ یاب ہونے کے لیے تمھاری حرص کچھ کار آمد نہیں ہو سکتی، جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو گمراہ کرنے کا ارادہ کر لیا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا﴾ [المائدة: ٤١] ''اور جسے اللہ فتنے میں ڈالنا چاہے تو آپ اللہ کی طرف سے اس کے بارے میں قطعاً کچھ اختیار نہیں رکھتے۔'' اور نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا تھا: ﴿وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ﴾ [هود: ٣٤] ''اور تمھیں میری نصیحت نفع نہیں دے گی، اگر میں چاہوں کہ تمھیں نصیحت کروں، جب کہ اللہ تمھیں گمراہ کرنا چاہتا ہو۔''

اور اس جگہ یوں کہا کہ اگر تم ان کی ہدایت کے حریص ہو تو اللہ تعالیٰ جس کو گمراہ کرتا ہے وہ ہدایت نہیں پاتا، جس طرح فرمایا: ﴿مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ۭ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ﴾ [الأعراف: ١٨٦] ''جسے اللہ گمراہ کر دے تو اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں، اور وہ انھیں چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے

پھریں۔'' نیز فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴾ [یونس: ٩٦۔ ٩٧] ''بے شک جن لوگوں کے بارے میں آپ کے رب کا حکم (عذاب) صادر ہو چکا، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ خواہ ان کے پاس ساری نشانیاں آ جائیں، حتی کہ وہ دردناک عذاب (بھی) دیکھ لیں۔''

غرض یہ کہ اللہ پاک کی شان یہ ہے کہ وہ جو چاہتا ہے سو ہوتا ہے اور جو نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتا، اس لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ راہ نہیں دیتا جس کو گمراہ کرتا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کے بعد بھلا کون اس کو راہ پر لا سکتا ہے؟ اور نہ کوئی اس کا مددگار ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب اور وثاق سے چھڑا سکے۔ ﴿ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [الأعراف: ٥٤] ''آگاہ رہو! پیدا کرنا اور حکم صادر کرنا اسی کے لیے روا ہے، اللہ رب العالمین بہت بابرکت ہے۔''

انتهیٰ ما قال الحافظ ابن كثير في تفسيره.[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یہ ان کے کفر کی دوسری قسم ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ان سے حکایت کیا ہے اور ان مشرکین سے مراد اہلِ مکہ ہیں۔ اور بولے کہ اگر اللہ ہم سے اپنے غیر کی عبادت نہ چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی کی پوجا نہ کرتے، تو آتا یا نہ آتا اور اگر ہم سے کفر چاہیے، تو ہم ضرور کفر کریں گے، تو آتا یا نہ آتا اور جب معاملہ ایسا ہی ہے تو ہر ایک بات اللہ تعالیٰ کی جانب سے اور اسی کی طرف سے ہے۔ پھر امم کی جانب اور ان کی طرف رسولوں کے بھیجنے میں کیا فائدہ ہے؟ اور ہمارے باپ دادا اسی کفر اور شرک پر تھے جس پر ہم ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قولِ مذکور انھوں نے بطورِ استہزا کے کہا تھا، اگر بطورِ اعتقاد کہتے تو مومن ٹھہرتے۔[2] اور اس جیسی آیت پر سورت انعام میں کلام گزر چکا ہے اور ہم سائبوں اور بحیروں اور وصیلوں کو اپنی طرف سے حرام نہ کر لیتے۔

اس قول سے ان کا مقصد رسالت میں طعن کرنا تھا کہ اگر رسول کی بات غیر اللہ کی عبادت سے منع کرنے کی اور اللہ کی حرام کردہ چیزوں کے علاوہ اور چیزوں کو جن کو اس نے حرام نہیں کیا، انھیں حرام کرنے سے منع کرنے کی بات سچ ہوتی تو اللہ کے ارادے کے خلاف کیوں وقوع میں آتی۔ یہ بات جب اس نے چاہی، تب ہی ہم سے ہوئی اور جب ہوئی تو یہ دلیل ہے اس بات پر کہ اللہ تعالیٰ کے ارادے اور مشیت کے مطابق یہی ہے جو ہم کرتے ہیں، حالاں کہ وہ حقیقی طور پر اس کے معترف نہ تھے، ان کا مقصد فقط رسالت اور نبوت پر طعن کرنا تھا اور ظاہر یہ ہے کہ ﴿ مِنْ دُوْنِهٖ ﴾ میں لفظ ﴿ مِنْ ﴾ دونوں جگہ زائد ہے۔ (قاله الحفناوي)

اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں فرمایا کہ پہلے کافروں نے بھی ایسا ہی کیا ہے، کیوں کہ انھوں نے بھی اللہ

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٧٤١) [2] معاني القرآن (٣/ ١٩٧۔ ١٩٨)

کے ساتھ شریک بنائے اور جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام نہ کیا، ان اشیاء کو حرام کیا اور وہ بھی اپنے رسولوں کے ساتھ اسی طرح کی فضول بحث اور جھگڑا کیا کرتے تھے اور اُن کا مذاق اڑاتے تھے۔ پھر فرمایا: ﴿ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ إِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴾ (آیتِ باب) یعنی رسولوں پر جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی طرف شرائع دے کر بھیجا کہ جن کی جڑ توحید ہے اور شرک کا چھوڑنا ہے، ان کے ذمے اور کچھ نہیں، مگر پہنچا دینا ہے ان لوگوں تک جن کی طرف وہ بھیجے گئے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم ہر اُمت میں ایک رسول بھیج چکے ہیں، جس طرح کہ ہم نے تجھ کو اُن میں حجت قائم کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ ﴿ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ١٥] ''اور ہم اس وقت تک کسی کو عذاب نہیں دیتے، یہاں تک کہ ہم کوئی رسول بھیج دیں۔''

وہ سارے پیغمبر یہی کہتے رہے کہ صرف اللہ کی عبادت کرو اور ہر معبود غیر اللہ سے بچو، جیسے: شیطان و کاہن و صنم اور گمراہی کی طرف بلانے والے سے۔ اور طاغوت طغیان سے مشتق ہے۔ مذکر و مونث دونوں طرح آتا ہے۔ اور واحد پر بھی اس کا اطلاق آتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يُرِيْدُوْنَ أَنْ يَّتَحَاكَمُوْا إِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ أُمِرُوْا أَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ﴾ [النساء: ٦٠] ''وہ چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ شیطانی چیلوں سے کرائیں، حالاں کہ انھیں حکم دیا گیا ہے کہ ایسے شیطانوں کا انکار کریں۔'' اور اس کا اطلاق جمع پر بھی آتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ أَوْلِيٰٓؤُهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ إِلَى الظُّلُمٰتِ ﴾ [البقرة: ٢٥٧] یعنی وہ جو منکر ہیں ان کے دوست شیطان ہیں، ان کو اجالے سے اندھیروں کی طرف نکالتے ہیں۔ طاغوت کی جمع طواغیت ہے اور تقدیر یوں ہے کہ طاغوت کی عبادت سے بچو، تو کلام میں مضاف محذوف ہے۔

پھر اُن اُمتوں میں سے جن کے پاس رسول گئے، کسی کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی اور کوئی گمراہ رہا۔ ازل میں یہی ٹھہر چکا تھا کہ وہ کفر پر مصر رہے گا، ایمان نہ لائے گا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خبردار کیا ہے اور اس حکم کے ساتھ لوگوں کے کان کھول دیے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو عبادت کے حکم کے ساتھ بھیجا اور یہ ضلال اور ہدایت کے ماوراء ہے۔[1] اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَرِيْقًا هَدٰى وَفَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ ﴾ [الأعراف: ٣٠] ''ایک فریق کو اس نے ہدایت دی، اور دوسرے فریق پر گمراہی ثابت ہوگئی ہے۔''

اور اس آیت میں اس بات کی تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام بندوں کو اپنی عبادت کا حکم کیا اور شیطان اور ہر اس چیز سے جو گمراہی کی طرف بلانے والی ہو، اجتناب کا ارشاد فرمایا۔ تو یہ دلیل ہے اس بات پر کہ اللہ تعالیٰ کا حکم اس کے ارادے کی موافقت کا مستلزم نہیں ہے، کیوں کہ وہ سب کو ایمان کا حکم کرتا ہے اور نہیں چاہتا سیدھی راہ دینا مگر بعض کو، کیوں کہ اگر سب کی ہدایت کا ارادہ کرتا تو کوئی کافر نہ ہوتا۔ یہ دو معنی ہیں جن کو ہم نے یہاں پر

[1] معاني القرآن (٤/ ١٩٧)

زجاج رحمہ اللہ سے حکایت کیا ہے۔

اب تم زمین کی سیر کرو، جیسے عبرت پکڑنے والے اور غور وفکر کرنے والے سیر کیا کرتے ہیں، تاکہ تمھیں ان لوگوں کا انجام معلوم ہو جنھوں نے رسولوں کی تکذیب کی تھی اور اُن کے گھروں کو عذاب اور ہلاکت کی وجہ سے ویران دیکھو۔ جملہ ﴿ فَسِيْرُوْا ﴾ پر فا داخل ہوئی ہے، اس میں اشعار ہے ساتھ مبادرت کے نظر واستدلال کی طرف اور دیکھو کہ کس طرح مکذبین کا انجام ہوا، جنھوں نے امم سابقہ میں سے اپنے رسولوں کی تکذیب کی، جیسے: عاد وثمود۔ دیکھو ان کا مآل کار اور ان کے امر کا انجام کیا ہوا، دیار خراب ہوگئے اور ابدان ہلاک ہوگئے۔ پھر نبی اکرم ﷺ کو ما تقدم کی تاکید کے لیے خطاب کے ساتھ خاص کیا اور فرمایا: اے پیغمبر! اگر تو ان کی ہدایت کی طمع کرے، حالاں کہ اللہ نے ان کو بے راہ کر دیا ہے، تو تُو ان کو راہ پر لانے کی طاقت نہیں رکھتا اور یہ تیری مقدرت ومکنت نہیں ہے کہ اللہ کے گمراہ کردہ کو راہ پر لائے، کیوں کہ اللہ ہدایت نہیں دیتا جس کو گمراہ کرتا ہے اور اُن کا کوئی مددگار نہیں ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے قریش کے عناد کا ذکر کیا اور فرمایا کہ وہ دوبارہ جی اٹھنے کے منکر ہیں۔[2]

وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۳۸ لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِيْ يَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ وَ لِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰذِبِيْنَ ۝۳۹ اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ اِذَاۤ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝۴۰

اور وہ اللہ کی پختہ قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ جو مر جاتا ہے اللہ اسے دوبارہ نہیں اُٹھائے گا۔ کیوں نہیں! (بلکہ وہ اُٹھائے گا) یہ اس کے ذمے سچا وعدہ ہے اور لیکن اکثر لوگ علم نہیں رکھتے (38) تاکہ ان کے لیے وہ بات واضح کر دے جس میں وہ اختلاف کرتے تھے اور تاکہ معلوم ہو جائے کافروں کو کہ بے شک وہی جھوٹے تھے (39) جب ہم کسی چیز کا ارادہ کر لیں تو اس کے لیے ہمارا صرف یہی قول ہوتا ہے کہ ہم اس سے کہتے ہیں: ہو جا! تو وہ ہو جاتی ہے (40)

موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونا برحق ہے:

یعنی اس جہان میں بہت سی باتوں کا شبہہ رہا۔ کسی نے اللہ کو مانا، کوئی منکر رہا، تو دوسرا جہان ہونا لازمی ہے

---

(1) معاني القرآن (٤/ ١٩٧) (2) فتح البيان (٧/ ٢٣٩۔ ٢٤٢)

تا کہ جھگڑوں کی تحقیق ہو، سچ اور جھوٹ الگ الگ ہوں اور فرماں بردار اور منکرین اپنے اعمال کا بدلہ پائیں۔ پھر فرمایا کہ مردوں کو زندہ کرنا ہمارے لیے مشکل نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ مشرکوں نے بڑی مضبوطی سے یہ قسم کھائی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہرگز مردوں کو زندہ نہیں کرے گا، ان لوگوں کے مرنے کے بعد دوبارہ جی اُٹھنے کو بعید از امکان جانا اور رسولوں کی تکذیب اور حق کی مخالفت پر قسمیں کھائیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو جھٹلایا اور اُن کی بات کی تردید کی اور کہا کہ نہیں، بلکہ یہ وعدہ ضرور ہی پورا ہوگا، اگرچہ اکثر لوگ اپنی جہالت کی وجہ سے اس وعدے کو سچا نہیں جانتے اور رسولوں کی مخالفت کر کے کفر میں پڑتے ہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے قیامت کی حکمت بیان کی کہ قیامت کے دن جسموں کے زندہ کرنے میں یہ مصلحت اور فائدہ ہے کہ جس امر سے لوگ اختلاف کرتے تھے، وہ واضح ہو جائے، کھل جائے اور بدکار کو برا بدلہ اور نیکوکار کو اس کے عمل کا اچھا بدلہ ملے اور کافر لوگ جان لیں کہ وہ اپنے ایمان اور قسمیں کھانے میں جھوٹے تھے، لہٰذا قیامت کے دن زور سے آگ میں دھکیل دیے جائیں گے اور آگ کے دربان ان سے کہیں گے: ﴿هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ۝ اَفَسِحْرٌ هٰذَاۤ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ۝ اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْۤا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ ۚ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝﴾ [الطور: ١٤۔ ١٦] ''(کہا جائے گا:) یہی ہے وہ آگ جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔ کیا پھر یہ جادو ہے؟ یا تم دیکھتے ہی نہیں؟ تم اس (دوزخ) میں داخل ہو جاؤ، اب تم صبر کرو یا صبر نہ کرو تمھارے لیے برابر ہے، تمھیں بس اسی کی سزا دی جائے گی، جو تم عمل کیا کرتے تھے۔''

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی خبر دی کہ وہ ہر شے پر قادر ہے، آسمان و زمین میں کوئی شے اس کو عاجز نہیں کر سکتی۔ ایک حرفِ کن سے وہ شے، جس طرح پر وہ چاہتا ہے، موجود ہو جاتی ہے۔ یہی حال قیامت کا بھی ہوگا جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَمَاۤ اَمْرُنَاۤ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۭ بِالْبَصَرِ ۝﴾ [القمر: ٥٠] ''اور ہمارا حکم تو آنکھ جھپکنے کی طرح ایک (کلمہ) ہی ہوتا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ۝﴾ [لقمان: ٢٨] ''تمھیں پیدا کرنا اور تمھیں (دوبارہ) اُٹھانا (اللہ کے نزدیک) ایسا ہی ہے جیسے ایک نفس کو پیدا کرنا۔'' اور اس آیتِ کریمہ میں فرمایا: ﴿اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ اِذَاۤ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝﴾ (آیتِ باب) یعنی ہمارا کہنا کسی چیز کو جب ہم نے اس کو چاہا، یہی ہے کہ کہیں اس کو ہو جا، تو وہ ہو جائے، یعنی ایک بار ہی ارشاد فرمائیں تو وہ ہو پڑے۔ جیسے شاعر نے کہا: ع

إذا ما أراد الله أمراً فإنما يقول له كن قوله فيكون

یعنی اللہ تعالیٰ کو تاکیدِ امر کی حاجت نہیں، کیوں کہ امر اس کا مانع و مخالف نہیں ہے، وہ واحد قہار اور عظیم ہے، ہر شے اس کے غلبے و قہرِ جبروت و عزت کے سامنے مغلوب و مقہور ہے۔ فلا إله إلا هو ولا رب سواه. سیدنا

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے: «قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: شَتَمَنِي ابْنُ آدَمَ وَلَمْ يَكُنْ يَنْبَغِي لَهُ ذٰلِكَ، وَكَذَّبَنِي ابْنُ آدَمَ يَكُنْ يَنْبَغِي لَهُ ذٰلِكَ، فَإِمَّا تَكْذِيبُهُ إِيَّايَ فَقَالَ: ﴿ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ ﴾ قَالَ: قُلْتُ: ﴿ بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ وَأَمَّا شَتْمُهُ إِيَّايَ. فَقَالَ: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ﴾، وَقُلْتُ: هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ، اَللّٰهُ الصَّمَدُ، لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ، وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ»[1] (رواه ابن أبي حاتم هكذا موقوفا وهو في الصحيحين مرفوعا بلفظ آخر) [اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مجھے ابن آدم نے گالی دی، حالانکہ اس کے لیے یہ مناسب نہیں تھا اور مجھے ابن آدم نے جھٹلایا، حالانکہ اس کے لیے یہ مناسب نہیں تھا۔ اس کا مجھے جھٹلانا، فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ ﴾ جب کہ اللہ تعالیٰ نے کہا: ﴿ بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ اور اس کا مجھے گالی دینا تو اس کا یہ کہنا ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ﴾ جب کہ میں کہتا ہوں: وہ اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے، نہ اس نے جنم دیا اور نہ وہ جنم دیا گیا ہے اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہی ہے۔] انتهیٰ ما قال الحافظ عماد الدين بن كثير في تفسيره.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ حلف کو قسم کہا، اس لیے کہ آدمیوں کو جب تقسیم کیا جائے تو کوئی مصدق ہوتا ہے اور کوئی مکذب۔ ﴿ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ﴾ سے مراد انتہا درجے کی کوشش ہے، کیوں کہ وہ اپنے باپ دادا اور معبودوں کی قسم کھاتے تھے، جب کوئی بہت بڑا امر ہوتا تو اللہ کی قسم کھاتے۔ یہ قسم اس بات پر تھی کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ نہ کرے گا، ان کے اعتقاد میں یہ بات تھی کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو اُٹھانے سے عاجز ہے۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایک مسلمان کا کچھ قرض ایک مشرک پر تھا، اس نے آ کر اپنا قرض مانگا اور کہا: "والذي أرجوه بعد الموت إنه لكذا" [مجھے امید ہے کہ موت کے بعد دوبارہ جی اٹھنے پر تو مجھ کو ادا کرے گا] مشرک نے کہا: تجھ کو اعتقاد ہے کہ تو بعد موت کے پھر اٹھایا جائے گا، پھر اللہ کی پکی قسم کھائی کہ ﴿ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ ﴾ (آیتِ باب) اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اُتاری۔[2]

سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ یہ آیت میرے حق میں اُتری ہے۔[3] اللہ تعالیٰ نے کہا: ہاں یہ وعدہ سچ ہے کہ موت کے بعد پھر اُٹھنا ہوگا، ہرگز اس میں خلاف نہ ہوگا۔ اللہ کے لیے یہ کام آسان ہے، کچھ مشکل نہیں، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے، کیوں کہ ان کو پیدا کرنے والے کی حکمتوں کا علم نہیں یا ان کی نظر صرف اپنی پسندیدہ چیز کی طرف ہے، اس لیے وہ امتناعِ بعث کا وہم کرتے ہیں، یعنی یہ خیال کرتے ہیں کہ مر کر دوبارہ جینا نہیں ہوگا۔ اور یہ اُٹھایا جانا

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٢٠٤) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٩١) تفسير ابن كثير (٢/ ٧٤٢)

[2] تفسير الطبري (١٧/ ٢٠٣ـ ٢٠٤) [3] الدر المنثور (٥/ ١٣٠)

اس لیے ہوگا کہ اس تنازعے اور مختلف فیہ امر کو ظاہر کر دیا جائے، جس کے لیے رسول آئے اور کتابیں نازل ہوئیں اور کافر لوگ جان لیں کہ وہ اس جھگڑے میں دوبارہ زندہ ہونے سے انکار کرنے میں جھوٹے تھے۔ ہم جب کسی شے کا ارادہ کرتے ہیں تو ﴿ كُنْ ﴾ کہتے ہیں اور وہ چیز ہو جاتی ہے۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا کہ اس کے لیے چیزوں کو پیدا کرنا آسان ہے[1] اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ فَإِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴾ [المؤمن: ٦٨] ''پھر جب وہ کسی کام کا فیصلہ کر لیتا ہے تو وہ بس اسے کہتا ہے: ہو جا، تو وہ ہو جاتا ہے۔'' امام ابن الانباری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جو معلوم ہے، اس پر اس کے پیدا ہونے سے پہلے لفظ شے کا اطلاق کیا، اس لیے کہ وہ موجود اور مشہود کی طرح ہے۔[2]

بعض نے کہا ہے کہ یہ کلام، یعنی ﴿ كُنْ فَيَكُونُ ﴾ باب تمثیل سے ہے، وہاں نہ کوئی قول ہے اور نہ وہ جس سے وہ قول کہا جائے اور نہ حکم اور نہ وہ جس کو حکم کیا جائے اور نہ کاف اور نون کہ خطاب معدوم یا تحصیل حاصل لازم آئے۔ اکثر مفسرین اسی طرف گئے ہیں، لیکن یہ مذہب نظم قرآنی کے خلاف ہے۔ اہلِ علم اور راسخین کے نزدیک حق یہ ہے کہ یہ قول حقیقتاً ہے نہ کہ تمثیلاً۔ اللہ پاک کی عادت اسی طرح جاری ہے، اس کی تفصیل سورت بقرہ میں گزر چکی ہے۔[3] اس آیتِ کریمہ میں وہ عظمت اور مضبوطی ہے جس سے عقل حیران ہے۔[4]

وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللَّهِ مِن بَعْدِ مَا ظُلِمُوا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۖ وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿٤١﴾ الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿٤٢﴾

اور جن لوگوں نے ظلم وستم سہنے کے بعد اللہ کی راہ میں ہجرت کی، البتہ ہم انھیں دنیا میں ضرور اچھا ٹھکانا دیں گے، اور یقیناً آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے۔ کاش! وہ علم رکھتے (41) وہ لوگ جنھوں نے صبر کیا اور وہ اپنے رب ہی پر توکل کرتے ہیں (42)

اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کا بدلہ:

اللہ تعالیٰ نے اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کی جزا بیان کی، جنھوں نے اللہ کے لیے اور اس کی مرضی کی جستجو میں گھر چھوڑا اور اپنے بھائی بندوں، ہمسایوں، دوستوں اور اپنی بستیوں اور وطنوں سے جدائی اختیار کی، اس اُمید پر کہ اس کا بہت بڑا ثواب اور بہترین اجر اور جزائے نبیل ملے گی۔ احتمال ہے کہ آیت کا سببِ نزول مہاجرینِ حبشہ

(1) معاني القرآن (٣/ ١٩٩)
(2) تفسير القرطبي (١٠/ ١٠٦)
(3) سورة البقرة، رقم الآية (١١٧)
(4) فتح البيان (٧/ ٢٤٢۔ ٢٤٤)

ہوں اور جو لوگ قوم کی سخت ایذا دہی کی وجہ سے خود مکہ مکرمہ سے نکل کر بلادِ حبش میں چلے گئے تھے، تاکہ وہاں پر اپنے رب کی اچھی طرح عبادت کر سکیں۔ ان اشراف میں سے ایک عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ہیں، یہ اپنی بی بی رقیہ رضی اللہ عنہا بنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ہجرت کر گئے، دوسرے جعفر رضی اللہ عنہ بن ابی طالب ابن عم رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے، تیسرے ابو مسلمہ بن عبدالاسد رضی اللہ عنہ یہ مردوں اور عورتوں کی ایک جماعت جو تقریباً اسی افراد تھے، نکل گئے۔ ہر مرد صدیق اور ہر عورت صدیقہ تھی۔ رضي الله عنهم وأرضاهم۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ دنیا اور آخرت میں اچھے اجر کا وعدہ کیا اور دنیا میں ٹھکانا دیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام شعبی اور قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مراد مدینہ ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ طیب رزق ہے۔[1]

ان دونوں قولوں میں کچھ منافات نہیں، کیوں کہ انھوں نے اپنے مساکن اور اموال کو چھوڑ دیا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کے عوض اس سے بہتر دنیا میں دیا۔ جو کوئی اللہ کے لیے کسی شے کو ترک کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا عوض اس سے بہتر عطا فرماتا ہے، چناں چہ ایسا ہی ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بلاد میں متمکن کیا اور لوگوں پر حاکم بنایا اور وہ امرا اور حکام ہو گئے اور ان میں کا ہر ایک امام المتقین بنا رہا۔ ان مہاجرین کا دارِ آخرت میں ثواب یہاں دنیا کے اجر سے کہیں بڑھ کر ہے، اگر ان کو معلوم ہوتا، یعنی اگر ہجرت سے پیچھے رہ جانے والے جانتے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطیع اور متبع کے لیے کیا کچھ ذخیرہ کیا ہے۔

حکایت:

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جب کسی مہاجر مرد کو کچھ عطا کرتے تھے تو کہتے: "خذ بارك الله لك فيه هذا ما وعدك الله في الدنيا وما ادخر لك في الآخرة أفضل" [لے لو! اللہ تعالیٰ تجھے اس میں برکت دے، یہ تو وہ ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے تجھ سے دنیا میں وعدہ کیا ہے، رہی آخرت تو وہاں کا اجر و ثواب تیرے لیے افضل ہے] پھر یہ آیت باب پڑھتے۔[2] اللہ تعالیٰ نے ان کا یہ وصف بیان کیا کہ یہ لوگ قوم کی ایذا دہی پر صابر رہے اور انھوں نے اللہ پر بھروسا کیا، اللہ تعالیٰ نے ان کی دنیا اور آخرت سنوار دی۔ ولله الحمد

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ ہجرت کہتے ہیں اپنے اہل اور وطن کو چھوڑ دینا، اللہ تعالیٰ کے دین کی اقامت کے لیے مکہ سے مدینے چلے گئے، اس کے بعد کہ انھیں تکالیف دی گئیں اور اُن کی توہین کی گئی۔ کسی نے کہا کہ اس آیت کا نزول سیدنا صہیب، بلال، خباب اور عمار رضی اللہ عنہم کے حق میں ہوا ہے، لیکن یہ سورت مکی ہے اور آیت ﴿ وَالَّذِيْنَ

[1] تفسیر الطبري (١٧/ ٢٠٥۔ ٢٠٦)
[2] تفسیر الطبري (١٧/ ٢٠٦)

﴿هَاجَرُوْا﴾ اس کے مکی ہونے کے مخالف ہے، مگر ممکن ہے کہ یہ آیت ان آیات میں سے ہو جو مدینے میں نازل ہوئیں۔ بعض نے کہا کہ ابو جندل بن سہیل رضی اللہ عنہ کے حق میں اتری ہے اور بعض نے کہا کہ اصحاب رضی اللہ عنہم کے حق میں اتری، جبکہ اہلِ مکہ نے ان پر ظلم کیا اور اُن کو مکہ سے نکال دیا۔ ان میں سے ایک گروہ حبشہ چلا گیا، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو مدینے میں جگہ دی اور مدینے کو اُن کے لیے دارِ ہجرت کر دیا اور مومنین کو اُن کا انصار بنا دیا۔ فرمایا: البتہ ہم ان کو دنیا میں نیک ٹھکانا دیں گے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد صحابہ کا مدینہ میں اترنا ہے۔ (قاله ابن عباس رضی اللہ عنہما و الحسن والشعبي و قتادة رحمہم اللہ) بعض نے کہا ہے کہ ﴿حَسَنَةً﴾ سے مراد رزقِ حسن ہے۔ (قاله مجاهد) بعض نے کہا ہے کہ دشمن پر نصرت مراد ہے۔[1] (قاله الضحاك) بعض نے کہا ہے کہ حسنۂ دنیا سے مراد شہروں کو فتح کرنا ہے کہ ان کو وہاں ولایات (اقتدار، اختیار) حاصل ہوئے یا ایسی تعریف جو باقی رہے اور اولاد کا شرف۔

اس کے ساتھ ساتھ اس آیت کو ان تمام امور پر محمول کرنے سے بھی کوئی امر مانع نہیں ہے اور اجرِ آخرت، یعنی وہ نعمتیں، جو جنت میں ملیں گی، وہ اعظم تر ہے، یعنی سب سے بڑھ کر ہیں، اس سے کہ مخلوق اس کے مشاہدہ کرنے سے پہلے جان سکے اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿وَاِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا وَّ مُلْكًا كَبِيْرًا﴾ [الدهر: ٢٠] ''اور جب تو وہاں (کسی بھی طرف) دیکھے گا تو نعمتیں اور بہت بڑی سلطنت دیکھے گا۔'' اگر یہ ظالم جانتے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ ﴿يَعْلَمُوْنَ﴾ کی ضمیر مومنین مہاجرین کی طرف لوٹتی ہے، یعنی اگر آخرت کے ثواب کو دیکھیں اور اس کا مشاہدہ اور معاینہ کریں تو ضرور جانیں کہ یہ دنیا کے نیک اجر اور بھلائی سے بڑا ہے اور دنیا میں حسنہ سے مراد مدینہ میں بسنا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ان مہاجرین مومنین کی صفت بیان فرمائی اور فرمایا کہ جنھوں نے مشرکین کی ایذا دہی سے، یا وطن کی جدائی اور جانوں اور مال کے نقصان پر صبر کیا تھا، بلکہ الفاظ اس سے بھی عام تر ہیں اور اپنے رب پر بھروسا رکھتے تھے تمام امور میں اور اللہ کے سوا سب سے منہ پھیرتے تھے۔ صبر ابتدا ہے اللہ کی طرف سلوک کی اور توکل اس راستے کا اخیر اور انتہا ہے اور۔ واللہ أعلم۔ ظاہر تو ماضی کے معنی ہیں، لیکن مضارع کے صیغے سے تعبیر کرنا ان کے توکل کی صورتِ بدیعہ کے استحضار کے لیے ہے اور اس کے غیر کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں ترغیب ہے۔ یا یہ جملہ مستأنفہ ہے اور موصول کا جواب محذوف ہے۔ ''أي: فيرزقهم الله من حيث لا يحتسبون'' یعنی اللہ تعالیٰ ان کو وہاں سے روزی دیتا ہے، جہاں سے ان کو خیال تک نہیں ہوتا۔[2]

---

[1] تفسير القرطبي (١٠/ ١٠٧) [2] فتح البيان (٧/ ٢٤٤۔ ٢٤٥)

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۳﴾ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ ؕ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۴۴﴾

اور ہم نے آپ سے پہلے بھی مرد ہی (نبی) بھیجے تھے، ہم ان کی طرف وحی کرتے تھے، لہٰذا تم اہلِ ذکر (اہلِ کتاب) سے پوچھ لو، اگر تم علم نہیں رکھتے ﴿43﴾ (ہم نے انھیں) واضح دلائل اور کتابوں کے ساتھ (بھیجا تھا) اور ہم نے آپ پر یہ ذکر (قرآن) نازل کیا، تاکہ آپ لوگوں کے سامنے بیان کریں، جو کچھ ان کی طرف نازل کیا گیا، اور شاید کہ وہ غور وفکر کریں ﴿44﴾

تمام انبیاء و رسل علیہم السلام بشر ہی تھے:

یاد رکھنے والے (علم والے) اہلِ کتاب جو پہلے احوال جانتے تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے جب نبی کریم ﷺ کو رسول بنا کر بھیجا تو سب عرب نے انکار کیا یا بعض عرب نے اور کہا کہ اللہ اس سے بہت بڑا ہے کہ اس کا رسول بشر ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؔ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ﴾ [یونس: ۲] ”کیا لوگوں کے لیے یہ تعجب (کی بات) ہے کہ ہم نے ان میں سے ایک آدمی کی طرف وحی بھیجی کہ آپ لوگوں کو ڈرائیں اور ان لوگوں کو خوش خبری دیں، جو ایمان لائے کہ بے شک ان کے لیے ان کے رب کے ہاں سچائی کا مرتبہ ہے۔ کافروں نے کہا: بے شک یہ تو یقیناً صاف جادوگر ہے۔“ اور یہ آیت باب بھیجی، یعنی تم پہلے کے اہلِ کتاب سے پوچھو کہ اگلے رسول بشر تھے یا فرشتے؟ اگر فرشتے تھے تو تم انکار کرو اور اگر بشر تھے تو پھر یہ انکار کیسا؟! بے شک محمد ﷺ رسول ہیں۔ نیز فرمایا: ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ﴾ [یوسف: ۱۰۹] ”اور آپ سے پہلے ہم نے مرد ہی (رسول بنا کر) بھیجے، ان کی طرف ہم وحی کرتے تھے (اور) وہ بستیوں کے رہنے والوں میں سے تھے۔“ یعنی وہ لوگ کچھ اہلِ آسمان نہ تھے جس طرح تم کہتے ہو۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اس جگہ اہلِ ذکر سے مراد اہلِ کتاب ہیں۔ یہی قول امام مجاہد اور اعمش رحمہ اللہ کا بھی ہے۔ ابن زید رحمہ اللہ نے کہا کہ ذکر قرآن ہے اور انھوں نے اس پر اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴾ [الحجر: ۹] ”بے شک ہم ہی نے یہ ذکر (قرآن) نازل کیا اور بے شک ہم

ہی اس کے محافظ ہیں۔'' سے دلیل لی ہے۔[1] یہ قول اگرچہ صحیح ہے، لیکن اس جگہ مراد نہیں ہے، اس لیے کہ اس کے اثبات کا منکر انکار کے بعد اس کی طرف رجوع نہیں کرتا، اسی طرح ابوجعفر باقر کا جو قول ہے کہ ہم اہلِ ذکر ہیں۔

اس سے مراد یہ ہے کہ یہ اُمت اہلِ ذکر ہے، سو یہ بات صحیح ہے، کیوں کہ یہ اُمت ساری گزشتہ اُمتوں سے اعلیٰ تر ہے اور علمائے اہلِ بیتِ رسول اللہ ﷺ خیر العلما ہیں، جبکہ سنتِ مستقیمہ پر ہوں، جیسے: سیدنا علی، عبداللہ بن عباس، حسن وحسین رضی اللہ عنہم، محمد بن حنفیہ، علی بن حسین زین العابدین، علی بن عبداللہ بن عباس اور ابوجعفر باقر، یعنی محمد بن علی بن حسین اور اُن کے بیٹے جعفر اور اُن کے امثال واضراب واشکال جو اللہ تعالیٰ کی حبلِ متین اور صراطِ مستقیم کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں اور جنھوں نے ہر حق والے کا حق پہچانا اور ہر ایک کو اس مقام ومرتبے میں رکھا جس میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان کو اتارا اور جس پر اس کے مومن بندوں کے دل مجتمع ہوگئے۔

غرض یہ ہے کہ یہ آیتِ کریمہ خبر دیتی ہے کہ رسول جو پہلے گزر چکے ہیں، وہ سب بشر تھے، جس طرح کہ نبی اکرم ﷺ بشر ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ٩٣۔ ٩٤] ''کہیے: میرا رب پاک ہے، میں تو بس ایک بشر رسول ہوں۔ اور لوگوں کے پاس ہدایت آجانے کے بعد ان کو ایمان لانے سے صرف اس چیز نے روکا کہ انھوں نے کہا: کیا اللہ نے بشر رسول بھیجا ہے؟''

نیز فرمایا ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ۭ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا ﴾ [الفرقان: ٢٠] ''اور (اے نبی!) ہم نے آپ سے پہلے جتنے بھی رسول بھیجے، بلاشبہہ وہ کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے تھے اور ہم نے تمھیں ایک دوسرے کے لیے آزمایش بنایا، کیا تم صبر کرتے ہو؟ اور آپ کا رب (سب کچھ) خوب دیکھ رہا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ﴾ [الأنبياء: ٨] ''اور ہم نے ان (نبیوں) کے ایسے جسم نہیں بنائے تھے کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں، اور نہ وہ ہمیشہ رہنے والے تھے۔'' نیز فرمایا: ﴿ قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ ﴾ [الأحقاف: ٩] ''کہہ دیجیے: میں رسولوں سے انوکھا نہیں، اور میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ اور تمھارے ساتھ کیا کیا جائے گا۔'' نیز فرمایا: ﴿ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ ﴾ [الکھف: ١١٠] ''(اے نبی!) کہہ دیجیے: میں تو بس تمھاری ہی طرح بشر ہوں، میری طرف وحی کی جاتی ہے۔''

پھر اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو جو رسولوں کے بشر ہونے میں شک کرتا ہے، یہ ارشاد کیا کہ پہلی کتابوں کے

---

[1] تفسیر الطبري (١٧/ ٢٠٨۔ ٢٠٩)

اصحاب سے انبیاے سابقین کے بارے میں سوال کرو کہ وہ انبیا بشر تھے یا ملائکہ؟ پھر فرمایا کہ ہم نے ان کو بینات یعنی حجتیں اور دلیلیں اور کتابیں اور صحیفے دے کر بھیجا تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد اور ضحاک رحمہ اللہ وغیرہم نے اسی طرح کہا ہے۔[1] زبر جمع ہے زبور کی، عرب کتاب کو زبر کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوهُ فِي الزُّبُرِ ﴾ [القمر: ٥٢] ''جو کچھ انھوں نے (اعمال) کیے ہیں، سب نامۂ اعمال میں لکھے ہوئے ہیں۔''

نیز فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ﴾ [الأنبياء: ١٠٥] ''اور بلاشبہہ ہم زبور میں نصیحت کے بعد یہ لکھ چکے ہیں کہ بے شک میرے نیک بندے زمین کے وارث ہوں گے۔'' پھر کہا کہ ہم نے تجھ پر ذکر یعنی قرآن اُتارا کہ تو اس کو لوگوں کے لیے بیان کرے، اس لیے کہ تو اس کے معنی جانتا ہے اور تجھ کو اس کی حرص ہے اور تو ذکر مذکور کا تابع ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تو تمام مخلوق سے افضل اور تمام بنی آدم کا سردار ہے۔ لہٰذا تو اجمالِ قرآن کی تفصیل کر اور اس کی مشکل کو کھول کر بیان کر دے، شاید یہ لوگ کچھ سوچیں سمجھیں اور راہ پر آجائیں اور دارین میں نجات پائیں۔[2] انتہیٰ ما قال الحافظ عماد الدين بن كثير في تفسيره.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح وتقریرِ کاشف یہ ہے کہ آیتِ باب قریش کی تردید کرتی ہے، کیوں کہ ان کے زعم میں اللہ اس سے بہت جلیل القدر اور بلند تھا کہ وہ کسی بشر کو رسول بنائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہماری سنت و عادت اسی طرح جاری ہے کہ ہم کچھ مرد آدمیوں میں سے بطور رسول بھیجتے ہیں اور ان کی طرف وحی کرتے ہیں۔ کفارِ مکہ اس بات کے اقراری تھے کہ یہود و نصاریٰ اہلِ علم ہیں، جو کچھ تورات و انجیل میں اُترا ہے، اس کو جانتے بوجھتے ہیں، اس لیے ان کو ارشاد کیا کہ اچھا تم انھیں کتاب والوں سے پوچھ لو، اگر تم نہیں جانتے ہو کہ اگلے پیغمبر بشر تھے یا فرشتہ تھے، وہ تمھیں بتا دیں گے کہ سب کے سب بشر تھے۔ اس جگہ اہلِ کتاب کے ساتھ مومنین کی شرط نہیں لگائی، اس لیے کہ سارے اہلِ کتاب کو اس کا اعتراف تھا اور وہ اس بات کو چھپاتے نہیں تھے۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ آیت عبداللہ بن سلام اور اہلِ تورات کے چند لوگوں کے حق میں اتری ہے۔[3]

بعض نے کہا کہ ذکر سے مراد قرآن ہے۔ مقلدینِ مذاہب نے اس آیت سے ائمہ کی تقلید کے وجوب پر استدلال کیا ہے اور کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ جس کو علم نہ ہو وہ علم والے سے دریافت کر لے۔ اس کا یہ جواب ہے کہ اول تو یہ آیتِ شریفہ ایک خاص سوال کے بارے میں وارد ہوئی ہے، جو محلِ نزاع سے خارج ہے، چناں چہ مذکورہ سیاق وسباق سے یہ فائدہ ظاہر ہوتا ہے، لہٰذا ابن جریر و بغوی اسی کے قائل ہیں اور اکثر مفسرین کا قول بھی

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٢١١) [2] تفسير ابن كثير (٢/ ٧٤٣ـ ٧٤٤) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٨٩)

یہی ہے۔[1] امام سیوطی رحمہ اللہ نے ''در منثور'' میں اس پر مکمل بحث کی ہے۔[2] سیاق و سباق بھی اسی معنی کا فائدہ دیتے ہیں۔

دوسرے اگر فرض کریں کہ مراد عام سوال ہے تو بھی اس سوال کے ساتھ مامور بہ وہی اہلِ ذکر ہیں اور ذکر عبارت ہے قرآن سے اور قرآن میں سنتِ مطہرہ کو وحی ٹھہرایا ہے تو کتاب وسنت دونوں ذکر میں داخل ہوئے، ان دونوں کے سوا کچھ نہیں۔ ہم نہیں گمان کرتے کہ کوئی عالم باللہ اس میں مخالف ہوگا، کیوں کہ یہ شریعتِ مطہرہ یا تو اللہ کی طرف سے آئی ہے، اور وہ قرآنِ کریم وفرقانِ عظیم ہے، یا رسول اللہ ﷺ کی طرف سے آئی ہے اور وہ سنتِ مطہرہ ٹھہری، ان کے لیے اب کوئی تیسری حجت نہیں۔ پس جب مامور بہ مراد یہ ہے کہ تم اہلِ ذکر سے پوچھو، وہ تم کو تمھارے سوال کا جواب قرآن وحدیث سے دیں گے اور کہیں گے: ''قال اللہ کذا وقال رسول اللہ ﷺ کذا'' اب سوال کرنے والوں کو اُن کے جواب پر عمل کرنا چاہیے۔ سو یہ مقلدین کی مراد کے خلاف ہے، کیوں کہ ان کی مراد یہ تھی کہ وہ اقوالِ رجال کو بغیر دلیل کا سوال کیے ہوئے لے لیں۔

سو یہ بات اس سے حاصل نہیں ہوتی اور تقلید اسی کا نام ہے کہ کسی کی بات پر، بغیر دلیل کا علم ہوئے، چلے۔ لہٰذا تقلید کی تعریف یوں کی ہے: ''التقليد هو قبول قول الغير من دون مطالبة بحجة'' یعنی تقلید غیر کے قول کو بلا دلیل و بلا طلبِ حجت مان لینا ہے۔ سو تقلید کا حاصل یہ ٹھہرا کہ مقلد سوال کتابِ عزیز وسنتِ مطہرہ کا نہیں کرتا، بلکہ فقط اپنے امام کا مذہب پوچھتا ہے اور جب اس سے آگے بڑھ کر قرآن وحدیث کا سوال کرے گا تو مقلد نہ رہے گا۔ اس کو ہر مقلد تسلیم کرتا ہے، کوئی اس کا منکر نہیں ہے۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ اس سے مراد سوال شرعی ہے، یہ سوال شرعی حجت کا ٹھہرتا ہے اور عالم سے اس کا طلب کرنا، گویا روایت طلب کرنا ہے نہ رائے طلب کرنا، تو سائل روایت کا سوال کرنے والا ہوا نہ کہ رائے کا مقلد، بلکہ مقلد کو اپنے نفس پر اس بات کا اقرار ہے کہ وہ عالم کا قول قبول کرنے والا ہے نہ کہ مطالبِ حجت، پس یہ آیت دلیلِ اتباع ہے نہ کہ دلیلِ تقلید۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ یہ حجت جس سے مقلد نے احتجاج کیا ہے، ایک حجتِ واضحہ ہے: ''على فرض أن المراد المعنى الخاص وهي عليه لا له على فرض أن المراد المعنى العام''[3]

کتاب ''أعلام الموقعين''، ''القول المفيد'' اور کتاب ''الدين الخالص'' وغیرہا میں مقلدین کے اس استدلال کے حق میں خوب تفصیل کی ہے اور محلِ نزاع سے اس کو خارج ٹھہرایا ہے، بلکہ مقلدین نے اپنے زعمِ کاسد اور فہمِ فاسد میں تقلید کے وجوب یا جواز یا استحباب پر جتنی آیات و احادیث سے استدلال کیا ہے، ہر ایک دلیل کا جوابِ شافی، کافی اور وافی دیا ہے۔[4] ہم نے نہیں دیکھا کہ قرآن وحدیث میں ایک حرف بھی ایسا ہو جس میں

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٢٠٧۔ ٢٠٨) تفسير البغوي (٥/ ٢٠۔ ٢١) [2] الدر المنثور (٥/ ١٣٢۔ ١٣٣)

[3] فتح البيان (٧/ ٢٤٥۔ ٢٤٧) [4] أعلام الموقعين لابن القيم (٢/ ١٨٧۔ ٢٧٩) القول المفيد للشوكاني (١/ ١٨۔ ٦٢)

تقلید کے استحباب، جواز، بلکہ وجوب کے بارے میں دلیل ہو۔ اس کے بجائے کثیر تعداد میں آیات و احادیث تقلید کا رد کرتی ہیں، اس تقلیدِ شوم اور رائے مذموم کے صنادید (سردار) دراصل اہلِ کتاب اور مشرکین ضالین ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس قبیح کام کے مرتکبین کا ذکر جا بجا گمراہ اور گمراہ کن فرقوں کے ساتھ کیا ہے۔ ہر چند اس آخری زمانے میں اکثر مسلمانوں پر جو نام کے مسلمان ہیں، گو اپنے آپ کو علماے اسلام اور اکابرِ دین سمجھیں، ردِ تقلید کا حکم نیزے اور تلوار کا حکم لگتا ہے۔ لیکن قرآن کا ترجمان اگر قرآن کے معانی کو چھپائے تو پھر وہ منکرِ قرآن ٹھہرتا ہے، اس کو ہرگز اس سے مطلب نہیں کہ وہ اللہ اور رسول کے منشا کے مطابق سچی پکی بات اللہ کے بندوں کو پہنچا دے اور قیامت کے دن اپنے ذمے کو پاک کرے۔ پھر جس کو توفیق رفیقِ حال ہے، وہ اس پر یقین کرے گا اور اس کی اطاعت کرے گا اور جس کے دل میں طاغوت اور انداد اور اوثان آباد ہیں، وہ ہرگز حق کی طرف مائل نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی سنت اسی طرح آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیا تک جاری اور چلی آئی ہے۔ اللهم أمتنا على السنة، وجنبنا عن البدعة، نسأل الله العافية عن التقليد، والتحلي بخالص السنة والتوحيد!

بینات سے مراد واضح حجتیں اور روشن دلیلیں ہیں اور زبر سے مراد کتب و مصحف ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے رسول! ہم نے تم پر ذکر نازل کیا ہے۔ قرآن کا نام ذکر رکھا، کیوں کہ اس میں غافلین کے لیے مواعظ و نصائح و تنبیہات ہیں۔ پھر اس انزال کی غرض و غایت بیان کی، یعنی تم اس کا بیان لوگوں کے لیے کر دو اور جس قدر احکامِ شرعیہ اور وعد و وعید اس میں آئے ہیں، وہ کھول کر سنا دو۔ کتاب کا بیان سنت سے طلب کیا جاتا ہے اور اس کے بیان اور واضح کرنے والے رسول اللہ ﷺ ہیں۔ وہ اجمال کی تفصیل فرماتے ہیں، لہٰذا یہ بات کہی ہے کہ جب قرآن و حدیث میں کہیں تعارض ہو تو حدیث کو مقدم رکھنا واجب ہے، کیوں کہ قرآن مجمل ہے اور حدیث مبین ہے اور اس پر دلیل یہی آیت ہے۔ پس یہ آیت اس آیت پر محمول ہے جو مجمل ہے نہ کہ اس پر جو محکم مبین مفسر ہے، یہ تبیین اس غرض سے ہے کہ شاید یہ لوگ غور و فکر کریں اور فکر و تامل کر کے نصیحت حاصل کریں۔

اَفَاَمِنَ الَّذِيْنَ مَكَرُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّخْسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٤٥﴾ اَوْ يَاْخُذَهُمْ فِيْ تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿٤٦﴾ اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿٤٧﴾

کیا بے خوف ہوگئے ہیں وہ لوگ جنھوں نے برے مکر کیے کہ اللہ انھیں زمین میں دھنسا دے یا ان پر (وہاں سے) عذاب لے آئے، جہاں سے وہ شعور نہیں رکھتے (45) یا ان کے چلنے پھرنے کے

دوران میں وہ انھیں پکڑ لے، پھر وہ اسے عاجز کرنے والے نہیں ⑯ یا انھیں حالتِ خوف میں مبتلا کر کے پکڑ لے، پھر بلاشبہہ تمھارا رب بہت شفقت کرنے والا، بڑا رحم کرنے والا ہے ⑰

مجرم کبھی بے خوف نہیں ہو سکتے:

اللہ پاک نے اپنے حلم کی خبر دی کہ اس نے گنہگاروں کو، جو برے کام کرتے ہیں اور برائیوں کی طرف بلاتے ہیں اور اس بلانے میں لوگوں کے ساتھ مکر و فریب کرتے ہیں اور اُن کے برے کام کرنے کا باعث ہوتے ہیں، مہلت دے رکھی ہے، حالاں کہ اللہ تعالیٰ کو یہ قدرت حاصل ہے کہ وہ چاہے تو فی الفور اُن کو زمین میں دھنسا دے، یا ایسی جگہ سے ان پر عذاب لے آئے، جہاں کی ان کو خبر بھی نہ ہو جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ ءَاَمِنۡتُمۡ مَّنۡ فِی السَّمَآءِ اَنۡ یَّخۡسِفَ بِکُمُ الۡاَرۡضَ فَاِذَا ہِیَ تَمُوۡرُ ﴿۱۶﴾ اَمۡ اَمِنۡتُمۡ مَّنۡ فِی السَّمَآءِ اَنۡ یُّرۡسِلَ عَلَیۡکُمۡ حَاصِبًا ؕ فَسَتَعۡلَمُوۡنَ کَیۡفَ نَذِیۡرِ ﴾ [الملك: ١٦۔ ١٧] ''کیا تم اس (اللہ) سے بے خوف ہوگئے ہو جو آسمان میں ہے، یہ کہ وہ تمھیں زمین میں دھنسا دے تو ناگہاں وہ لرزنے لگے؟ یا تم اس (اللہ) سے بے خوب ہوگئے ہو جو آسمان میں ہے، یہ کہ وہ تم پر پتھراؤ کرنے والی آندھی بھیجے؟ پھر جلد تم جان لو گے کہ میرا ڈرانا کیسا ہے؟''

یا ان کو حالتِ تقلب میں پکڑے، یعنی اس حال میں کہ وہ معیشت کے لیے سفر کرتے ہوں اور مختلف قسم کے غافل کر دینے والے کاموں میں مشغول ہوں۔ امام قتادہ اور سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تقلب سے مراد سفر ہیں۔ امام مجاہد اور ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ تقلب رات اور دن میں ہوتا ہے[1] جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَفَاَمِنَ اَہۡلُ الۡقُرٰۤی اَنۡ یَّاۡتِیَہُمۡ بَاۡسُنَا بَیَاتًا وَّ ہُمۡ نَآئِمُوۡنَ ﴿ؕ۹۷﴾ اَوَ اَمِنَ اَہۡلُ الۡقُرٰۤی اَنۡ یَّاۡتِیَہُمۡ بَاۡسُنَا ضُحًی وَّ ہُمۡ یَلۡعَبُوۡنَ ﴾ [الأعراف: ٩٧۔ ٩٨] ''کیا پھر بستیوں والے اس (بات) سے بے خوف ہوگئے ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب رات کو آجائے اور وہ سوئے ہوئے ہوں؟ یا بستیوں والے اس (بات) سے بے خوف ہوگئے ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب دن چڑھے آجائے اور وہ کھیل تماشے میں مصروف ہوں؟''

یہ اللہ پاک کو کسی حال میں عاجز نہیں کر سکتے۔ یا اس حال میں ان کو پکڑ لے کہ یہ اللہ کی پکڑ سے ڈرتے ہوں، کیوں کہ یہ زیادہ موثر اور زیادہ سخت ہے، کیوں کہ حصولِ توقع خوف کے ساتھ مشکل ہوتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد اور ضحاک رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ تَخَوُّفٍ ﴾ سے یہ مراد ہے کہ اگر ہم چاہیں تو اس کے صاحب (بدترین داؤ پیچ کرنے والے) کو مرنے کے فوراً بعد پکڑ لیں،[2] لیکن اللہ کا یہ رحم ہے کہ وہ سزا میں جلدی نہیں کرتا۔

صحیحین میں مروی ہے: «لَا أَحَدَ أَصْبَرُ عَلَى أَذًى سَمِعَهُ مِنَ اللّٰهِ، إِنَّهُمْ يَجْعَلُوْنَ لَهُ وَلَدًا وَهُوَ

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٨٤۔ ٢٢٨٥) [2] تفسير الطبري (١٧/ ٢١٤)

يَرْزُقُهُمْ وَيُعَافِيهِمْ » [1] [تکلیف دہ بات سن کر اللہ سے زیادہ صبر کرنے والا کوئی نہیں، لوگ اس کی اولاد بناتے ہیں اور وہ (اس سب کے باوجود) انھیں رزق دیتا ہے اور عافیت بخشتا ہے] دوسرے الفاظ یہ ہیں: « إِنَّ اللّٰهَ يُمْلِي لِلظَّالِمِ حَتّٰى إِذَا أَخَذَهُ لَمْ يُفْلِتْهُ » [بلاشبہ اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت دے دیتا ہے اور جب اس کو پکڑ لیتا ہے تو پھر جانے نہیں دیتا] پھر نبی اکرم ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظٰلِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗۤ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ﴾ [هود: ١٠٢] ''اور (اے نبی!) آپ کے رب کی پکڑ ایسی ہی ہے جب وہ بستیوں کو پکڑتا ہے، جب کہ وہ ظالم ہوتی ہیں۔ بے شک اس کی پکڑ نہایت دردناک (اور) شدید ہے۔'' [2] نیز فرمایا: ﴿ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ۚ وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴾ [الحج: ٤٨] ''اور کتنی ہی بستیاں ہیں کہ میں نے انھیں ڈھیل دی جب کہ وہ ظالم تھیں، پھر میں نے انھیں پکڑ لیا اور میری ہی طرف (سب کی) واپسی ہے۔''

انتهٰی ما قال الحافظ ابن كثير في تفسيره. [3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح اور ذکرِ مبین یہ ہے کہ ﴿ اَفَاَمِنَ الَّذِيْنَ ﴾ میں استفہام توبیخ کے لیے ہے اور فا کے مقدر پر عطف ہے، جس پر نظم قرآنِ کریم اور سیاق وسباق فرقان منسحب ہے اور سیئات کا موصوف محذوف ہے اور وہ مکرات ہے اور امام زمخشری رحمہ اللہ نے اس کے سوا اور کوئی توجیہ ذکر نہیں کی ہے۔ یا یہ معنی ہیں: "عَمِلُوْا" یا یہ معنی ہے: "فعلوا السيئات" یعنی کیا بے ڈر ہیں جو برائیاں کرتے ہیں۔ یا یہ معنی ہے: "أَمِنَ الْمَاكِرُوْنَ العقوبات السيئات" یعنی کیا مکر کرنے والے بری سزاؤں سے نڈر ہیں۔ یا یہ معنی ہے: "مَكَرُوْا بِالسيئات" یعنی نڈر ہیں وہ لوگ جو برے مکر کرتے ہیں۔ (جیسے شاہ عبدالقادر صاحب نے ترجمہ کیا)۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان لوگوں سے مراد نمرود بن کنعان اور اس کی قوم ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کا مکر شرک ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کا مکر رسولوں کو جھٹلانا اور گناہ کرنا ہے۔ [4] یا مخفی طور پر کوشش کرنا کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کو تکلیف دیں اور اسلام کو باطل کرنے کے لیے حیلہ نکالنا اور مسلمانوں کے لیے مکر وفریب کرنا اور دار الندوہ میں بیٹھ کر مسلمانوں کے لیے برے برے مکر سوچنا ہے۔ یعنی کیا یہ کفارِ مکہ اس بات سے نڈر ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو زمین میں دھنسا دے، جیسے قارون اور قارون سے پہلے لوگوں کو دھنسا دیا۔ یا ان پر وہاں سے عذاب آئے جہاں سے ان کو خبر تک نہ ہو، جس طرح اللہ تعالیٰ نے لوط علیہ السلام کی قوم کے ساتھ کیا۔

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٤٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٠٤)

(2) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٠٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨٣)

(3) تفسير ابن كثير (٢/ ٧٤٤) (4) تفسير الطبري (١٧/ ٢١٢) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٨٩)

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد بدر کا دن ہے، کیوں کہ وہ اس دن ہلاک کیے گئے اور اس دن ہلاک ہونا ان کے خواب وخیال میں بھی نہ تھا۔ یا ان کے چلنے پھرنے میں ان کو پکڑ لے۔ اس کی تفسیر میں مفسرین نے کئی وجوہ بیان کی ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ ان کے اسفار اور متاجر میں ان کو پکڑ لے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے سفر میں ہلاک کر دینے میں قادر ہے جیسے حضر میں ان کو ہلاک کر دینے پر قادر ہے۔ اور وہ اس کو زمین میں سفر کرنے کی وجہ سے اور شہروں کی دوری کی وجہ سے تھکا نہیں سکتے۔ تقلب آنے جانے کی حرکت کا نام ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ پکڑ لے ان کو ان کے چلنے پھرنے میں قضائے حوائج کے لیے تو اللہ تعالیٰ ان کے اور ان کے مقاصد اور حیلوں کے درمیان حائل ہو جائے۔ بعض نے کہا ہے کہ پکڑ لے ان کو جب وہ رات کو اپنے بستر پر آتے جاتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مطلق آنا جانا مراد ہے، یعنی دن اور رات کے اندر چلنے پھرنے میں۔ پہلا معنی اس آیت سے ماخوذ ہے: ﴿ لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ﴾ [آل عمران: ۱۹۶] ''جن لوگوں نے کفر کیا، ان کا شہروں میں چلنا پھرنا آپ کو دھوکے میں نہ ڈال دے۔''

نیز دوسرا معنی اس آیت سے ماخوذ ہے: ﴿ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴾ [التوبة: ٤٨] ''اور آپ کے معاملات بگاڑنے کی کوشش کی تھی، یہاں تک کہ حق آ گیا اور اللہ کا حکم غالب ٹھہرا، جبکہ وہ ناپسند ہی کرتے رہے۔'' پھر وہ تھکانے والے اور عذاب سے روکنے والے نہیں ہیں اور نہ بڑھ جانے والے، یا پکڑ لے ان کو ڈر کی حالت میں اس طرح کہ ان کو عذاب کے آنے کی توقع اور امید ہو اور وہ اس سے ڈرنے والے ہوں غافل نہ ہوں تو یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول: ﴿ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ اَوْ يَاْخُذَهُمْ فِيْ تَقَلُّبِهِمْ ﴾ (آیتِ باب) کے خلاف ہے، اس لیے کہ اس میں عذاب کا آنا ان کی غفلت کی حالت میں مذکور ہے۔

امام ابن الاعرابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کو اس طرح پکڑ لے کہ ان کے مالوں اور جانوں اور پھلوں میں نقصان پہنچائے، یہاں تک کہ سب کو ہلاک کر دے۔[1] امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اکثر مفسرین کا قول یہ ہے کہ تخوف سے مراد قتل یا موت سے نقصان ہے، یعنی اردگرد کے لوگوں کو ایک کے بعد ایک کو پکڑ لے، یہاں تک کہ سب کو پکڑ لے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ٤٤] ''کیا پھر وہ نہیں دیکھتے کہ بے شک ہم زمین کو اس کے اطراف سے گھٹاتے آتے ہیں (کفر سمٹ رہا ہے) کیا پھر بھی وہی غالب آنے والے ہیں؟'' یعنی عرب میں اسلام پھیلنے لگا، کفر گھٹنے لگا۔ کہا اور ﴿ تَخَوُّفٍ ﴾ تنقص ہے، کہا جاتا ہے کہ ''هو يتخوف المال'' یعنی وہ شخص مال کو گھٹاتا ہے اور اطراف سے لیتا ہے۔[2] انتہیٰ

امام ہیثم بن عدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ تَخَوُّفٍ ﴾ فا کے ساتھ تنقص کے معنی میں ہے اور یہ ازدشنوءہ کی

[1] تفسير القرطبي (١٠/ ١١٠) [2] فتح القدير (٣/ ٢٢٩)

لغت میں ہے[1] جو عرب کا ایک بڑا قبیلہ ہے۔ اور امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ہذیل کی لغت ہے۔[2] امام لیث بن سعد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ تَخَوُّفٍ ﴾ جلدی کے معنی میں ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ان کو پکڑ لے تقریع پر ان گناہوں میں جو انھوں نے کیے۔ یہ معنی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں۔[3] بعض نے کہا ہے کہ عقاب اور تجاوز کا خوف دے کر ان کو پکڑ لے۔ (قاله قتادہ)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا: اس کے صاحب کی موت کے اثر پر اس کو پکڑ لے۔[4] دوسرے الفاظ مروی ہیں کہ ان کے اعمال گھٹا کر ان کو پکڑ لے۔[5] سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس آیت کی تفسیر پوچھی تو انھوں نے فرمایا کہ ہم نہیں خیال کرتے مگر یہی کہ اللہ تعالیٰ ان کو پکڑ لے اس بات پر کہ وہ اللہ کی آیات کی شان گھٹاتے ہیں۔ تو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نہیں خیال کرتا مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کو پکڑ لے اس بات پر کہ وہ گناہوں کو حقیر جانتے ہیں تو جو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس لوگ موجود تھے، ان میں سے ایک مرد باہر نکلا اور ایک اعرابی سے ملا اور بولا: اے فلاں! تیرے مالک نے کیا کیا؟ وہ بولا: ''قَدْ تَخَيَّفْتَهُ، أَيْ: تَنَقَّصْتَهُ'' یعنی میں نے اس کی عزت اتار دی تو وہ شخص عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور آپ کو خبر دی تو عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''قَدْ رَأَيْتُهُ ذٰلِكَ'' یعنی میں یہی خیال کرتا تھا۔[6]

امام بیضاوی رحمہ اللہ کی عبارت اس طرح ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے منبر پر فرمایا: اس آیت کی تفسیر کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟ تو سب کے سب خاموش رہے اور ہذیل کا ایک مرد کھڑا ہوا اور بولا: یہ ہماری لغت ہے۔ ﴿ تَخَوُّفٍ ﴾ تنقص کو کہتے ہیں تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا عرب اس کو اپنے اشعار میں پہچانتے ہیں؟ وہ بولا: ہاں! ہمارے شاعر ابوبکر نے اپنی اونٹنی کی صفت میں یہ شعر کہا:

تخوف الرحل منها تامكا قرداً كما تخوف عود النبعة السفن

یعنی پالان نے اونٹنی کی اونچی کوہان میں اثر کر دیا اور اس کو اس طرح کم کر دیا جیسے درخت نبعہ کی لکڑی کو ریتی اور تیشہ کم کر دیتا ہے۔''

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم اپنے دیوانوں میں غور کیا کرو، تم گمراہ نہیں ہوگے، وہ بولے: ہمارے دیوان کیا ہیں؟ فرمایا کہ جاہلیت کے اشعار، کیوں کہ ان میں تمھاری کتاب کی تفسیر ہے اور تمھارے کلام کے اس میں معانی ہیں۔[7] انتہیٰ۔ امام ضحاک اور کلبی رحمہما اللہ کا قول یہ ہے کہ ﴿ تَخَوُّفٍ ﴾ خوف سے مشتق ہے، یعنی اللہ تعالیٰ ایک جماعت کو ہلاک کرتا ہے اور دوسرے اس سے ڈرتے ہیں کہ کہیں ہمیں بھی وہ عذاب نہ پہنچے جو ان کو پہنچا۔[8] حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو

[1] تفسير القرطبي (١٠/ ١١٠) [2] تفسير الخازن (٤/ ٩٣) [3] تفسير القرطبي (١٠/ ١١١)
[4] تفسير الطبري (١٧/ ٢١٥۔ ٢١٤) [5] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٨٥) [6] تفسير الطبري (١٧/ ٢١٤)
[7] تفسير البيضاوي (٣/ ٤٠٠۔ ٤٠١) سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول صحیح سند سے مروی نہیں۔ [8] تفسير البغوي (٥/ ٢١)

خسف کے ساتھ ڈرایا ہے جو زمین میں ہوتا ہے، یا اس عذاب کے ساتھ جو آسمان سے اترے، یا ان آفات سے جو یکے بعد دیگرے واقع ہوں، یا ان آفات سے جو تھوڑی تھوڑی واقع ہوں، یہاں تک کہ وہ سب کے سب ہلاک ہو جائیں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ مبارکہ کو اپنے اس قول کے ساتھ ختم کیا: ﴿ فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ (آیتِ باب) یعنی تمھارا رب بڑا نرم اور مہربان ہے کہ جلد عذاب نہیں کرتا اور رحمت، رافت اور شفقت کی وجہ سے تم کو مہلت دیتا ہے، باوجود اس کے کہ تم عذاب کے مستحق ہو جیسے فرمایا: ﴿ وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴾ [النحل: ٦١]

''اور اگر اللہ لوگوں کے ظلم پر ان کا مواخذہ کرے تو اس (زمین) پر کوئی چلنے پھرنے والا نہ چھوڑے، لیکن وہ ایک مقرر وقت تک انھیں ڈھیل دیتا ہے، پھر جب ان کا مقرر وقت آ پہنچتا ہے تو وہ ایک گھڑی بھی آگے پیچھے نہیں ہو سکتے۔'' پھر جب اللہ نے ماکرین کو ان آفات سے ڈرایا جن کو بیان فرمایا تو اس کے ساتھ وہ آیات اتاریں جو عالم علوی اور سفلی کی تدبیر میں اس کی کمال قدرت پر دلالت کریں اور فرمایا:[1]

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ ۝ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝

کیا یہ لوگ اللہ کی پیدا کی ہوئی ان چیزوں کو نہیں دیکھتے کہ ان کے سائے دائیں اور بائیں جانب سے ڈھلتے ہیں، اللہ کو سجدہ کرتے ہوئے، اور (اس کے سامنے) وہ سب عاجز ہیں (48) اور آسمانوں اور زمین کے تمام جاندار اللہ کو سجدہ کرتے ہیں اور تمام فرشتے بھی، اور وہ تکبر نہیں کرتے (49) وہ اپنے اوپر سے اپنے رب سے ڈرتے ہیں، اور وہی کرتے ہیں جو انھیں حکم دیا جاتا ہے (50)

عرش سے فرش تک ہر چیز اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہوتی ہے:

ہر چیز ٹھیک دوپہر میں کھڑی ہے، اس کا سایہ بھی کھڑا ہے۔ جب دن ڈھلا سایہ جھکا، پھر جھکتے جھکتے شام تک زمین میں پڑ گیا، جیسے نماز میں کھڑے سے رکوع اور رکوع سے سجدہ۔ اسی طرح ہر چیز آپ کھڑی ہے اپنے سائے سے نماز ادا کرتی ہے۔ کسی ملک میں کسی موسم میں داہنی طرف جھکتا ہے، کہیں بائیں طرف۔ پہلے کھڑی چیزوں کا سجدہ بیان

[1] فتح البیان (۷/ ۲۴۸۔ ۳۵۱)

ہوا، پھر جانوروں اور فرشتوں کا ذکر کیا۔ مغرور لوگوں کو سر زمین پر رکھنا مشکل پڑتا ہے، وہ نہیں جانتے کہ بندے کی بڑائی اسی میں ہے۔ ہر بندے کے دل میں ہے کہ میرے اوپر اللہ ہے، وہ اپنے آپ کو نیچے سمجھتا ہے۔ یہ سجدہ فرشتوں کا بھی ہے اور سب کا۔ انتهىٰ ما في موضح القرآن.

اللہ تعالیٰ نے اپنی عظمت و جلال اور کبریائی کی خبر دی، جس کے لیے ہر شے عاجزی کرتی ہے اور ساری اشیا مخلوقات، جمادات، حیوانات اور مکلفین انس، جنس اور ملائکہ اس کے فرماں بردار ہیں۔ ہر چیز جس کا سایہ ہے، وہ دائیں بائیں ڈھلتی ہے، یعنی صبح اور شام اور اس کا سایہ اللہ کو سجدہ کرتا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ جب سورج ڈھلتا ہے تو ہر شے اللہ عزوجل کو سجدہ کرتی ہے۔ امام قتادہ اور ضحاک رحمہما اللہ وغیرہم کا قول بھی یہی ہے۔[1]

پھر فرمایا کہ وہ سب ذلیل ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ ہر شے کا سجدہ اس کا سایہ ہے۔ اسی طرح پہاڑوں کا سایہ بھی سجدہ ہے۔[2] غالب شیبانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دریا کی موجیں دریا کی نماز ہیں۔[3] ان کو عقلا کے برابر ٹھہرایا اور اُن کے لیے سجود کی اسناد کی اور کہا کہ جو دابہ آسمان و زمین میں ہے، وہ اللہ کے لیے سجدہ کرتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴾ [الرعد: ۱۵] ''اور اللہ ہی کو سجدہ کرتا ہے جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے، خوشی سے اور ناخوشی سے، اور ان کے سائے بھی صبح اور شام (سجدہ کرتے ہیں)۔'' پھر کہا کہ فرشتے بھی اللہ کو سجدہ کرتے ہیں اور اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے، بلکہ اپنے رب سے، جو اُن کے اوپر ہے، ڈرتے ہیں اور جیسا اُن کو حکم کرتا ہے ویسا کرتے ہیں، اور حکم کی بجا آوری میں مستعد رہتے ہیں اور جس سے منع کیا جائے، یا جس سے اللہ کی خفگی کا ڈر ہو، اس سے باز رہتے ہیں۔[4] انتهىٰ ما قال الحافظ عماد الدين بن كثير.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ ﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا ﴾ کے یاءِ تحتیہ کے ساتھ ہونے کی صورت میں ﴿ يَرَوْا ﴾ کی ضمیر ماکر السیئات کی طرف لوٹ رہی ہے اور خطاب کی حالت میں سب لوگ مخاطب ہیں۔ چوں کہ یہ رؤیت نظر کے معنی میں ہے، اسی لیے اس کا صلہ ﴿ اِلٰى ﴾ واقع ہوا ہے، کیوں کہ اس سے مراد اعتبار ہے اور عبرت لینا نہیں ہو سکتا، مگر اسی رؤیت کے ساتھ، جس کے ساتھ شے کی طرف نظر بھی کی جائے، تاکہ اس کے احوال میں غور کیا جائے اور اس سے عبرت لی جائے۔ فرمایا: کیا نہیں دیکھتے وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز بنائی ہے جس کے لیے سایہ ہو اور وہ اجسام ہیں۔ اس جگہ شے کا لفظ تو عام ہے، لیکن اس سے مراد خاص ہے۔ اس سے فرشتے اور جن خارج ہیں۔ ان کا

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٢١٧)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٤٧٩)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٨٥)
[4] تفسير ابن كثير (٢/ ٧٤٥)

سایہ ایک طرف سے دوسری طرف مائل اور منتقل ہوتا ہے۔ شروع دن میں ایک حالت پر ہوتا ہے، پھر دن کے آخر میں دوسری حالت میں ہو جاتا ہے۔

امام ازہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سایوں کا ڈھلنا دوپہر کے بعد ان کا واپس آنا ہے۔ ''توفی'' کا اطلاق پچھلے پہر کے سایے پر ہوتا ہے اور تفیو وہ ہے کہ جس سے سورج اور چاند پھریں۔ اور جو پہلے پہر سایہ ہوتا ہے اس کو ظِل کہتے ہیں اور یہ وہ سایہ ہے کہ جس کو سورج نہ پہنچے۔ امام ثعلب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں ابو عبیدہ بغوی سے خبر دیا گیا ہوں کہ رؤبہ نے کہا ہے کہ ہر وہ سایہ جس پر سورج ہو اور وہ ڈھل جائے تو وہ فَے ہے اور جس پر سورج نہ آئے وہ ظِل ہے۔[1]

سمین میں ہے: ''تَفَيُّؤُ'' ''فَآءَ يَفِيءُ'' کا تفعل ہے اور ''فَآءَ'' کا معنی ہے: ''رَجَعَ'' یعنی لوٹنا اور یہ ہمزہ افعال سے متعدی بن جاتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ﴾ یعنی اللہ جو اپنے رسول کے ہاتھ لگا دے۔ یا تضعیف کے ساتھ جیسے: ''فَيَّأَ اللّٰهُ الظِّلَّ فَتَفَيَّأَ'' یعنی جس ظِل کو اللہ نے فَے کیا تو وہ فَے ہو گیا۔ اور ''تَفَيَّأَ، فَيَّأَ'' کا مطاوع ہے تو ''تَفَيَّأَ'' فعل لازم ہے۔

اب فَے میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ مطلق سایے کا نام ہے، خواہ زوال کے پہلے ہو یا بعد میں۔ اور یہ آیت کے معنی کے مطابق ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ جو سایہ زوال سے پہلے ہو وہ فقط ظل ہے اور جو زوال کے بعد ہو، اس کو ظل بھی اور فَے بھی کہتے ہیں، تو ظِل زیادہ عام ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ظِل جو زوال سے پہلے ہو اور فَے جو زوال کے بعد ہو۔ ظِلال ظِل کی جمع ہے اور یہ واحد کی طرف مضاف ہے، کیوں کہ وہ ایسا واحد ہے کہ جس سے کثرت مراد ہوتی ہے۔ یہ سایے ڈھلتے ہیں دائیں اور بائیں جانب، یعنی ہر طرف اور ہر جانب، یہ استعارہ ہے یا مجاز ہے کہ مقید بول کر مطلق مراد لیا گیا ہے۔

امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان دونوں جہتوں سے انسان کی دائیں اور بائیں جانب مراد ہے۔[2] بعض نے کہا ہے کہ دائیں جانب سے فلک کی دائیں جانب مراد ہے، یعنی مشرق کی سمت ہے، کیوں کہ ستاروں کا ظہور اسی جانب سے ہوتا ہے۔ اور بائیں جانب سے فلک کی بائیں جانب مراد ہے، یعنی مغرب کی سمت ہے، کیوں کہ سایے دن کے شروع میں مشرق سے شروع ہو کر زمین کے ربع غربی پر پڑتے ہیں اور زوال کے بعد مغرب سے شروع ہو کر زمین کے ربع شرقی پر پڑتے ہیں۔

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یمین کو مفرد سے تعبیر کیا ہے، اس لیے کہ ذوات اظلال کو واحد قرار دیا اور شمائل کو جمع سے تعبیر کیا، اس لیے کہ ذواتِ اظلال سے کل ذوات اظلال مراد لیے، کیوں کہ ﴿ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ﴾ مفرد لفظ ہے

[1] فتح القدير (٣/ ٢٢٩) [2] تفسير أبي السعود (٥/ ١١٨)

اور اس کے معنی جمع کے ہیں۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یمین اگرچہ مفرد لفظ ہے، لیکن اس سے مجازاً جمع مراد ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ ﴾ [القمر: ٤٥] ''اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔''[1] اور امام زمخشری رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔[2]

لفظ شمائل جو یمین کے مقابلے میں آیا ہے، یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یمین سے مراد بھی جمع ہی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ عرب لوگوں نے جب دو جمع کے صیغے استعمال کرنے ہوں تو ان میں سے ایک کو واحد کے صیغے کے ساتھ استعمال کرتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ﴾ [الأنعام: ١] ''اور اندھیروں اور روشنی کو بنایا۔'' نیز فرمایا: ﴿ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ﴾ [البقرۃ: ٧] ''اللہ نے ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے۔''

بعض نے کہا ہے کہ یمین سے وہ نقطہ مراد ہے جو سورج کے طلوع ہونے کی جگہ ہے اور وہ واحد ہے اور شمائل عبارت ہے ان سایوں کے انحراف سے جو زمین پر واقع ہوتے ہیں اور وہ بہت زیادہ ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ جب سورج نکلا اور تو قبلے کی طرف چلا تو تیرا سایہ دائیں طرف ہوگا اور جب وسطِ آسمان میں برابر ہوا تو تیرا سایہ تیرے پیچھے ہوگا۔ پھر جب سورج غروب ہونے کی طرف مائل ہوا تو تیرا سایہ بائیں طرف ہوگا۔ امام قتادہ اور ضحاک رحمہما اللہ کا قول یہ ہے کہ یمین دن کا شروع ہے اور شمائل ہمیشہ دن کا آخر ہے۔[3]

مشرق کی تعبیر یمین کے ساتھ اس لیے کی کہ یمین انسان کی دو جانبوں سے زیادہ قوی جانب ہے اور اسی سے حرکتِ قویہ ظاہر ہوتی ہے۔ ''شمائل'' ''شمال'' کی جمع ہے علی خلاف القیاس اور قیاس چاہتا ہے کہ اشمل ہو، جیسے: ذراع کی جمع اذرع ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اللہ اکیلے کے لیے نہ اس کے غیر کے لیے۔ اور اس کے فرماں بردار ہیں ہر جان دار جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور سجود دو طرح کا ہوتا ہے: سجودِ طاعت و عبادت، جیسے: انسان کا سجود۔ اور دوسرا سجود اِنقیاد اور خضوع، جیسے: سجودِ ظلال۔ اور آیت میں دونوں قسموں کا احتمال ہے۔ آیت میں دابہ سے ہر حیوانِ جسمانی اور ذی روح چیز مراد ہے، جو زمین پر متحرک اور چلتی پھرتی ہے اور مراد اس سے ہر دابہ ہے۔

امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: ''مَا أَتَانِيْ مِنْ رَجُلٍ مِثْلَهُ وَمَا أَتَانِيْ مِنْ رِجَالٍ مِثْلَهُ'' اور ''مَا فِي السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ'' کے عموم میں تمام اشیا جو ان دونوں میں موجود ہیں، داخل ہیں۔[4] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق سے کوئی چیز نہیں چھوڑی، مگر وہ اس کی عبادت کرتی ہے، خوشی سے کرے یا زبردستی کرے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ طَوْعًا وَمَنْ فِي

---

[1] فتح القدير (٣/ ٢٣٠) [2] الكشاف (٢/ ٥٦٩)
[3] تفسير الطبري (١٧/ ٢١٦) تفسير البغوي (٥/ ٢٢) [4] فتح القدير (٣/ ٢٣٠)

الْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا‘‘ یعنی جو کوئی آسمان میں ہے وہ اس کو خوشی سے سجدہ کرتا ہے اور جو زمین میں ہے وہ خوشی سے کرے یا زبردستی سے۔[2] اللہ تعالیٰ کا یہ قول اسی کی تائید کرتا ہے: ﴿ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴾ [الرعد: ١٥] ’’اور اللہ ہی کو سجدہ کرتا ہے جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے، خوشی سے اور ناخوشی سے، اور ان کے سائے بھی صبح اور شام (سجدہ کرتے ہیں)۔‘‘ یعنی جو اللہ پر یقین لایا وہ اس کے حکم پر خوشی سے سر رکھتا ہے اور جو یقین نہ لایا تو اس پر بھی اسی کا حکم جاری ہے اور ان کے سایے زمین پر صبح و شام پھیل جاتے ہیں اور یہی ان کا سجدہ ہے اور ﴿ دَآبَّةٍ ﴾ کا اس لیے خاص ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول ﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا ﴾ سے جمادات کی بھی فرماں برداری معلوم ہوتی ہے اور فرشتے کا ذکر یہ خاص کا عام پر عطف ہے ان کی تعظیم اور تشریف کے لیے ہے اور وہ تو معطوف علیہ میں بھی داخل ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ فرشتوں کا اس لیے علاحدہ ذکر کیا ہے کہ وہ پروں والے ہیں جن سے وہ اڑتے ہیں، یا آسمان میں بھی ایسی مخلوق ہوگی جو کہ چلتی پھرتی ہوگی۔ اور حال یہ ہے کہ اللہ کی عبادت سے غرور نہیں کرتے۔ اس سے مراد فرشتے ہیں اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ جملہ مستانفہ ہے اور اس میں قریش پر رد ہے، اس لیے کہ وہ گمان رکھتے تھے کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں اور معنی یہ ہیں کہ فرشتے اور آسمان و زمین میں جو بھی ہے سب اسی کو سجدہ کرتے ہیں اور وہ اس سے انکار نہیں کرتے۔ اور اپنے اوپر اپنے رب کا ڈر رکھتے ہیں۔ یہ حال ہے یا جملہ مستانفہ ہے اور اس میں ان کے استکبار کی نفی ہے اور استکبار کا نہ ہونا خوف کے آثار اور نشانیوں میں سے ہے، یعنی اپنے اوپر اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ یا یہ کہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ حال یہ ہے کہ ان کا رب ان کے اوپر ہے، رتبے اور درجے میں ان سے بلند ہے اور قدرت میں استواء علی العرش کے ساتھ ان سے بائن ہے۔

یا یہ معنی ہیں کہ لوگ ملائکہ سے ڈرتے ہیں تو اس وقت مضاف محذوف ہوگا، یعنی اپنے رب کے ملائکہ سے ڈرتے ہیں۔ حال یہ ہے کہ ملائکہ ان کے اوپر ہیں تو یہ تکلف ہے کہ جس کی ضرورت نہیں ہے اور ان تاویلاتِ بعیدہ اور معانی رکیکہ کی ان مذاہب کی حمایت مقتضی ہے جو ذہنوں میں راسخ ہو گئے ہیں اور دل میں ثابت ہو گئے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ خوف اجلال کا خوف ہے۔ اس کو امام زجاج رحمہ اللہ نے پسند کیا ہے۔[2] اور اس معنی کی صحت پر اللہ تعالیٰ کا یہ قول دلالت کرتا ہے: ﴿ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ﴾ [الأنعام: ١٨] ’’اور وہ اپنے بندوں پر زور آور و غالب ہے۔‘‘ یعنی وہی اپنے بندوں پر غالب ہے۔

نیز اللہ تعالیٰ کا یہ قول فرعون کی طرف سے خبر دیتے ہوئے: ﴿ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ﴾ [الأعراف: ١٢٧] ’’اور بے شک ہم ان پر پورا غلبہ رکھتے ہیں۔‘‘ وہ کرتے ہیں جو حکم دیے جاتے ہیں، یعنی ملائکہ اللہ کی اطاعت اور عبادت

---

[1] تفسیر الطبري (١٧/ ٢٢٢) تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٨٥) [2] معاني القرآن (٣/ ٢٠٣)

میں کوتاہی نہیں کرتے۔ یا وہ سب کہ جن کا اس آیت میں ذکر ہوا ہے، لیکن اس جملے کو ملائکہ پر محمول کرنا زیادہ بہتر ہے، کیونکہ اللہ کی مخلوق میں ایسے بھی ہیں جو نہ اس کی عبادت کرتے ہیں اور نہ ہی اس سے ڈرتے اور نہ ہی اس کے احکامات کو مانتے ہیں، جیسے کافر اور اللہ کے نافرمان لوگ جو آیت میں ذکر کردہ صفات کے حامل نہیں ہیں اور ابلیس اور اس کا لشکر۔

یہ سجدہ قرآنِ مجید اور فرقانِ حمید کے ان سجود میں سے ہے جو واجب ہیں۔ لہٰذا قاری اور مستمع دونوں پر ضروری ہے کہ اس آیت کو پڑھتے اور سنتے وقت سجدہ کریں۔ جب اللہ تعالیٰ نے بیان کیا کہ اس کی آسمانوں زمین کی مخلوقات اس کی فرماں بردار ہے اور اس کے جلال کے آگے جھکی ہوئی ہے تو اس کے بعد شرک سے روکا اور فرمایا:[1]

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۵۱﴾ وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا ۭ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْـَٔرُوْنَ ﴿۵۳﴾ ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۭ فَتَمَتَّعُوْا ۣ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾

اور اللہ نے فرمایا: دو الٰہ مت بناؤ، بس وہ اکیلا الٰہ ہے، لہٰذا تم مجھی سے ڈرو (51) اور اسی کے لیے ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے، اور اسی کی اطاعت دائمی ہے۔ کیا پھر تم غیر اللہ سے ڈرتے ہو؟ (52) اور تمھارے پاس جو بھی نعمت ہے وہ تو اللہ ہی کی طرف سے ہے، پھر جب تمھیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اسی سے تم آہ و فغان کرتے ہو (53) پھر جب وہ تم سے تکلیف ہٹا دیتا ہے تو تم میں سے ایک فریق اپنے رب کے ساتھ شرک کرنے لگتا ہے (54) تاکہ ان (نعمتوں) کی ناشکری کریں، جو ہم نے انھیں دیں، چناں چہ تم فائدہ اُٹھا لو، پھر جلد تم جان لو گے (55)

اللہ تعالیٰ اکیلا ہی عبادت کے لائق ہے:

اللہ پاک نے خبر دی کہ سوا اللہ کے کوئی لائقِ عبادت نہیں اور نہ کسی کی عبادت اس کے سوا کرنی چاہیے۔ وحدہ لا شریک لہ وہی ہے، جو ہر چیز کا خالق و مالک و رب ہے اور ہمیشہ انصاف کرتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، عکرمہ، میمون بن مہران، سدی اور قتادہ رحمہم اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ ﴿ وَاصِبًا ﴾ بہ معنی دائما ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما

---

[1] فتح البیان (۷/ ۲۵۱۔ ۲۵۵)

نے کہا ہے کہ یہ معنی واجباً ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی خالص اسی کی عبادت چاہیے،[1] جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَ لَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴾ [آل عمران: ٨٣] ''کیا وہ اللہ تعالیٰ کے دین کے سوا اور دین کی تلاش میں ہیں؟ حالاں کہ تمام آسمانوں والے اور سب زمین والے اللہ تعالیٰ ہی کے فرماں بردار ہیں خوشی سے ہوں یا ناخوشی سے، سب اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔''

یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام عکرمہ پر بابِ خبر سے ہے اور قولِ مجاہد پر بابِ طلب سے، یعنی ڈرو اس بات سے کہ کسی شے کو میرا شریک کرو، بلکہ خالص میری ہی اطاعت کرو۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح: ﴿ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ﴾ [الزمر: ٣] ''سنو! خالص اطاعت و بندگی اللہ ہی کے لیے ہے۔''

اللہ تعالیٰ ہی نفع ونقصان کا مالک ہے:

پھر یہ خبر دی کہ نفع اور نقصان کا میں ہی مالک ہوں اور بندوں کے پاس جو نصر و رزق ونعمت و عافیت ہے، وہ اُن پر میرا ہی فضل و احسان ہے۔ تم کو جب کوئی نقصان چھوتا ہے تو تم میری ہی طرف فریاد کرتے ہو، اس لیے کہ تم جانتے ہو کہ یہ تکلیف دور کرنے پر میرے سوا کسی اور کو قدرت نہیں ہے۔

غرض یہ کہ ضرورت کے وقت تمھاری التجا اور سوال کرنا اور الحاح و زاری کرنا اور بطورِ استغاثہ کے رغبت کرنا میری ہی طرف ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّاۤ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ۚ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ٦٧] ''اور جب سمندر میں تمھیں کوئی تکلیف پہنچے تو وہ جنھیں تم اس (اللہ) کے سوا پکارتے ہو، گم جاتے ہیں، پھر جب وہ (اللہ) تمھیں خشکی کی طرف نجات دیتا ہے تو تم منہ موڑ لیتے ہو اور انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔''

نیز یہاں فرمایا: ﴿ ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ۝ لِيَكْفُرُوْا بِمَاۤ اٰتَيْنٰهُمْ ۚ فَتَمَتَّعُوْا فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴾ (آیاتِ باب) بعض نے کہا ہے کہ ﴿ لِيَكْفُرُوْا ﴾ میں لام، لامِ عاقبت ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ لامِ تعلیل ہے اور معنی یہ ہیں کہ ہم نے ان پر یہ لگا دیا، تاکہ وہ منکر ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ کے ان انعامات کے بھی منکر ہو جائیں جو ان پر ہیں، حالاں کہ وہی ہے جو ایک طرف نعمتوں کو چلانے والا ہے اور دکھ درد کو دور کرنے والا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ﴿ فَتَمَتَّعُوْا ﴾ کہہ کر وعید سنائی کہ تمھارے جو دل میں آئے کر لو اور جو تم پر انعامات کیے گئے ہیں ان سے فائدہ اٹھا لو، آخر تھوڑی مدت کے بعد اس کا انجام کار، برا نتیجہ اور برا اثر معلوم کر لو گے جیسے اللہ تعالیٰ

[1] تفسیر الطبري (١٧/ ٢٢٢_ ٢٢٣)

نے فرمایا: ﴿ قُلۡ تَمَتَّعُوۡا فَاِنَّ مَصِيۡرَكُمۡ اِلَى النَّارِ ﴾ [إبراهيم: ٣٠] ''کہہ دیجیے: تم فائدہ اُٹھاؤ (دنیا میں) پھر یقیناً تمھاری واپسی آگ کی طرف ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ قُلۡ تَمَتَّعۡ بِكُفۡرِكَ قَلِيۡلًا اِنَّكَ مِنۡ اَصۡحٰبِ النَّارِ ﴾ [الزمر: ٨] ''آپ کہہ دیجیے: تو اپنے کفر کے ساتھ کچھ (دنیاوی) فائدہ اُٹھا لے، بلاشبہہ تو دوزخیوں میں سے ہے۔'' انتھیٰ ما قال الحافظ عماد الدين بن كثير في تفسيره بزيادة.[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح اور تقریر کاشف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ کریمہ میں دو خدا مقرر کرنے سے منع فرمایا۔ پھر ثابت کیا کہ الٰہیت ﴿ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ﴾ میں منحصر ہے اور وہ اللہ تعالیٰ ہے۔ کہا گیا کہ ﴿ اِلٰهَيۡنِ ﴾ کا تثنیہ ہونا لفظِ ﴿ اِلٰهَيۡنِ ﴾ میں اثنینیہ پر دلالت کرتا ہے اور الٰہ کا مفرد ہونا لفظ الٰہ میں وحدت پر دلالت کرتا ہے تو ﴿ اِلٰهَيۡنِ ﴾ کا ﴿ اثۡنَيۡنِ ﴾ کے ساتھ موصوف کرنا اور ﴿ اِلٰهٌ ﴾ کو واحد کے ساتھ موصوف کرنے کی کیا وجہ ہے؟ اس کے جواب میں کہا گیا ہے کہ کلام میں تقدیم و تاخیر ہے اور تقدیرِ عبارت یوں ہے: "لَا تَتَّخِذُوۡٓا اثۡنَيۡنِ اِلٰهَيۡنِ" اور اس میں بُعد ہے۔

امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ دوسرا مفعول ہے۔[2] اور یہ غلط ہے، کیوں کہ اس کا کوئی معنی نہیں ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ﴿ اثۡنَيۡنِ ﴾ ﴿ اِلٰهَيۡنِ ﴾ کی تاکید ہے اور اس پر اکثر لوگ ہیں۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے جو یہاں کلام بیان کیا ہے، اس سے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ تاکید نہیں ہے۔[3] بعض نے کہا ہے کہ ﴿ اثۡنَيۡنِ ﴾ کے زیادہ ہونے کا فائدہ یہ ہے کہ معلوم ہو کہ نہی تعدد کی طرف لوٹ رہی ہے نہ کہ جنسیت کی طرف اور واحد کے زیادہ ہونے کا فائدہ اس وہم کو دور کرنے کے لیے ہے کہ مراد اثباتِ الٰہیت ہے سوا وحدانیت کے، اس کے باوجود کہ الٰہیت اللہ تعالیٰ کے لیے فی نفسہا مسلّم ہے اور مشرکین کا اختلاف تو صرف وحدانیت میں ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے التفات کے طریق پر کلام کو غائب سے متکلم کی طرف پھیرا زیادہ ڈرانے کے لیے اور فرمایا: مجھ ہی سے ڈرو۔ یعنی اگر تم کسی چیز سے ڈرتے ہو تو مجھ ہی سے ڈرو نہ کہ میرے علاوہ کسی اور سے، یہ ترکیب حصر کا فائدہ دے رہی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ تقدیر یوں ہے: "إِيَّايَ ارهبوا فارهبون" مجھ ہی سے ڈرنا، پھر مجھ ہی سے ڈرو۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "إرهبوا فإياي فارهبون"۔[4] شیخ نے کہا ہے کہ یہ نحو کے قاعدہ سے غفلت برتنا ہے۔ اس کا جواب دیا گیا ہے کہ رہب حزن و اضطراب کے ساتھ ڈرنا ہے اور اس کا معنی سورۃ البقرہ کے شروع میں گزر چکا ہے۔[5]

پھر جب اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت کو ثابت کیا اور ثابت کیا کہ اسی سے ڈرنا واجب ہے اور اسی کی طرف منافع و مضار میں رغبت رکھنی چاہیے، ہر چیز اسی کے تصرف اور ملکیت میں ہے، تمام چیزیں اسی کے غلبہ اور قہر کے تحت

---

[1] تفسير ابن كثير (٢/ ٧٤٥۔ ٧٤٦)
[2] التبيان في إعراب القرآن (٢/ ٨٢)
[3] الكشاف (٢/ ٥٧٠)
[4] روح المعاني (١٤/ ١٦٣)
[5] سورة البقرة، رقم الآية (٤٠)

مغلوب ومقہور ہیں۔ اسی کا ہے جو آسمانوں وزمین میں ہے مِلْکًا وَ خَلْقًا و عَبِیْدًا، یعنی سب اسی کے مملوک، مخلوق اور بندے ہیں اور اس جملے میں ﴿ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ ﴾ کی تقریر ہے۔ فرمایا کہ اسی کا انصاف ہمیشہ ہے۔ دین کے معنی اطاعت اور اخلاص کے ہیں۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ وَاصِبًا ﴾ بہ معنی "دائماً" ہے اور ان سے واصب کے معنی خالص بھی مروی ہیں۔[1] لیکن پہلا قول زیادہ بہتر ہے اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ﴾ [الصافات: ۹] "اور ان کے لیے دائمی عذاب ہے۔" یعنی ان کو ہمیشہ آگ کا عذاب ہوگا۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "طاعته واجِبَةٌ أبداً"، یعنی ہمیشہ اس کی طاعت واجب ہے۔[2] گویا اس نے واصب کی تفسیر واجب کے ساتھ کی ہے۔ امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کوئی نہیں جس کی فرماں برداری کی جائے مگر وہ زوال یا ہلاکت کے ساتھ منقطع ہو جاتی ہے اللہ تعالیٰ کے سوا کہ اس کے اطاعت ہمیشہ ہے، گویا اس نے واصب کی تفسیر دائم کے ساتھ کی ہے اور جب کوئی چیز دائم ہو جو منقطع نہ ہو تو وہ واجب اور ثابت ہوگی۔[3] کہا جاتا ہے کہ "وَصَبَ الشَّيْءُ يَصِبُ وُصُوْبًا فَهُوَ وَاصِبٌ إِذَا دَامَ، وَ وَصَبَ الرَّجُلُ عَلَى الْأَمْرِ إِذَا دَامَ وَ وَاظَبَ عَلَيْهِ" یعنی جب کوئی چیز دائم ہو تو کہا جاتا ہے کہ "وصب الشيء" اور جب کوئی آدمی کسی بات پر مداومت، مواظبت اور ہمیشگی کرے تو کہا جاتا ہے: "وصب الرجل عليه"

بعض نے کہا ہے کہ وصب کے معنی تعب اور اعیاء کے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت بندے پر واجب ہے، اگرچہ وہ اس میں تھک جائے۔ یہ آیت کے معنی کے مناسب نہیں ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دین اخلاص ہے اور وصب دائم کے معنی میں ہے۔ امام ابو صالح رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دین سے مراد لا إله إلا الله ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ واصب واجب اور دائم کے معنی میں ہے۔[4] تفسیر بیضاوی میں واصب کا معنی لازم کیا ہے۔[5] شہاب میں ہے کہ واصب عرب کے کلام میں لزوم اور دوام کے معنی میں ہے۔[6] قاموس میں ہے: "وَصَبَ يَصِبُ دَامَ وَثَبَتَ كَأَوْصَبَ وَعَلَى الْأَمْرِ وَاظَبَ وَأَحْسَنَ الْقِيَامَ عَلَيْهِ" یعنی جب کسی بات پر کوئی آدمی مداومت کرے اور اس پر اچھا قیام کرے تو ان محاورات کا استعمال ہوتا ہے۔[7] مصباح میں ہے کہ "وَصَبَ الشَّيْءُ وُصُوْبًا دَامَ، وَوَصَبَ الدِّيْنُ وَجَبَ" یعنی جب کوئی چیز دائم ہو تو کہا کرتے ہیں: "وصب الشيء" اور کہا کرتے ہیں: "وصب الدين" یعنی دین واجب ہوگیا۔[8]

﴿ أَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ﴾ میں استفہام تقریع اور توبیخ کے لیے ہے، یا تعجب اور انکار کے لیے ہے اور فاء

---

[1] معاني القرآن للفراء (۳/ ۴۹) [2] معاني القرآن للزجاج (۳/ ۲۰۳) [3] فتح القدير (۳/ ۲۳۳)
[4] تفسير الطبري (۱۷/ ۲۲۲۔ ۲۲۳) تفسير ابن أبي حاتم (۷/ ۲۲۸۵۔ ۲۲۸۶) [5] تفسير البيضاوي (۳/ ۴۰۳)
[6] هاشية الشهاب علىٰ تفسير البيضاوي (۵/ ۳۳۸) [7] القاموس المحيط (۱/ ۱۸۱) [8] المصباح المنير (۲/ ۶۶۱)

تعقیب کے لیے ہے اور معنی یہ ہیں کہ جب اس کی اطاعت واجب اور دائم ہوئی کہ جس کا انقطاع متصور نہیں تو تخصیص تقویٰ کی بھی اسی کے ساتھ مناسب ہے اور لائق ہے کہ کسی اور سے نہ ڈرے۔ پھر کیسے معقول ہے کہ انسان کی رغبت اور رہبت اللہ کے سوا کسی اور میں ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے جتلا دیا کہ جن انعامات اور احسانات میں یہ لوگ پھر رہے ہیں، یہ اسی کے عطا کردہ ہیں نہ کہ کسی اور کے۔ نیز فرمایا: جو کوئی بھی نعمت تمھارے پاس ہے، وہ اللہ کی طرف سے ہے یعنی تمھارے پاس جتنی بھی طرح طرح کی نعمتیں ہیں، وہ سب اسی کی طرف سے ہیں۔ اور انعام یا تو دینی ہوتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کی معرفت ہے اور نیکی کی معرفت ہے، تاکہ اس پر عمل کرے۔ یا انعام دنیاوی ہوتا ہے وہ نفسانی ہو یا بدنی یا خارجی ہو، جیسے: مالی سعادتیں اور اس کے علاوہ اور۔ ان میں سے ہر ایک جنس ہے کہ جس کے تحت اتنی اقسام ہیں کہ جن کا شمار ہی نہیں ہے۔ اور یہ تمام کی تمام اللہ کی طرف سے ہیں اور ہر عاقل پر واجب اور لازم ہے کہ اسی کا شکر ادا کرے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے انسان کے تلون (غرور گھمنڈ) کا ذکر فرمایا، جو اس میں نعمتوں کے سمندر میں غرق ہو جانے کے بعد پیدا ہوتا ہے کہ جب تم کو کوئی سختی یا بیماری یا مصیبت لاحق ہوتی ہے تو اسی طرف چلاتے ہو اور اسی کی طرف پناہ ڈھونڈتے ہو اور اسی کی طرف خشوع و خضوع اور استغاثہ و فریاد کرتے ہو کہ اس مصیبت کو دور کر دے، کیوں کہ اس کے سوا کوئی اس مصیبت کو دور کرنے والا نہیں ہے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ اس کو دور کر دیتا ہے تو تم میں سے ایک جماعت اللہ کے ساتھ شرک کرنے لگ جاتی ہے اور اللہ کے ساتھ دوسرے معبود ٹھہراتے ہو، جیسے: بت وغیرہ۔ تاکہ اس نعمت کی ناشکری کریں جو ہم نے ان کو دی تھی۔ یہ چند روز فائدہ حاصل کر لو آخر تم جان لو گے اپنے معاملے کے انجام کو اور کیا کچھ اس جہاں سے بلا اترتی ہے اور آخرت میں کس چیز کی طرف لوٹتے ہو۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ وعید ہے۔[1] پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمالِ قبیحہ کی دوسری قسم بیان کی اور فرمایا:[2]

وَيَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ نَصِيْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ ؕ تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ ۝٥٦ وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ ۙ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ ۝٥٧ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۝٥٨ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٨٦) [2] فتح البیان (٧/ ٢٥٥_ ٢٥٩)

يَحْكُمُوْنَ ۝۵۹ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ۚ وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۶۰

اور ہم نے انھیں جو رزق دیا ہے اس میں سے ان (باطل معبودوں) کا حصہ ٹھہراتے ہیں جنھیں یہ جانتے بھی نہیں، اللہ کی قسم! تم سے تمھاری افترا پردازیوں کا ضرور سوال ہوگا 56 اور وہ اللہ کی بیٹیاں ٹھہراتے ہیں، وہ (اولاد سے) پاک ہے، اور ان کے لیے ہے جو وہ چاہیں (یعنی بیٹے) 57 اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی بشارت دی جائے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ غم و غصے سے بھرا ہوتا ہے 58 وہ اس عار کے باعث لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے، جس کی اسے بشارت دی گئی ہے، (سوچتا ہے) کیا (اپنی) توہین کے باوجود اسے باقی رکھے یا اسے مٹی میں دبا دے؟ آگاہ رہو! بہت برا ہے جو وہ فیصلہ کرتے ہیں 59 جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ان کے لیے بری مثال ہے، اور اللہ کے لیے اعلیٰ مثال ہے، اور وہ غالب، خوب حکمت والا ہے 60

مشرکوں کا باطل معبودوں کے لیے اللہ کے دیے ہوئے مال سے نذر و نیاز نکالنے کا بیان:

یہ ان کو فرمایا جو اپنے کھیت میں، مویشیوں میں اور تجارت میں اللہ کے سوا کسی کی نیاز ٹھہراتے۔ سب مال اللہ کا ہے اور کسی کو یہ حق نہیں۔ ہاں ثواب کی خاطر اللہ کے نام اللہ کی راہ میں دے، پھر اپنے بدلے ثواب کسی اور کو دلوا دے۔ پھر اپنے لیے بیٹا مانگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کی قبیح باتوں کا بیان کیا کہ یہ لوگ اللہ کے ساتھ بتوں اور اوثان و انداد کو بغیر علم کے پوجتے ہیں اور اللہ کے رزق میں اوثان کا حصہ ٹھہراتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ۭ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴾ [الأنعام: ١٣٦] ''اور انھوں نے اس میں سے اللہ کے لیے ایک حصہ ٹھہرایا جو اس نے کھیتی اور چوپایوں کی شکل میں پیدا کیا، پھر اپنے خیال کے مطابق کہنے لگے: یہ (حصہ) اللہ کے لیے ہے اور یہ ہمارے دیوتاؤں کے لیے ہے، پھر ان کے دیوتاؤں کا جو حصہ ہے وہ تو اللہ کے پاس نہیں پہنچتا اور جو اللہ کا حصہ ہے، وہ ان کے دیوتاؤں کے پاس پہنچ جاتا ہے، کس قدر برا ہے جو وہ فیصلہ کرتے ہیں۔''

یعنی کافر اپنی کھیتی اور مویشیوں کے بچوں میں سے اللہ کی نیاز نکالتے اور اپنے بتوں کے لیے نیاز نکالتے، پھر جب اللہ کے نام کا بہتر دیکھتے تو اس کو بتوں کی طرف کر دیتے، لیکن بتوں کی جانب سے اللہ کی طرف ایسے نہ کرتے اور بتوں سے زیادہ ڈرتے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے نفسِ کریم کی قسم کھائی ہے کہ وہ اس افترا کا اُن سے سوال

کرے گا جو انھوں نے باندھ لیا ہے اور ضرور ان کا مقابلہ اس پر کرے گا اور اس بہتان کی بھرپور سزا ان کو دے گا، یعنی جہنم کی آگ میں۔ نیز فرمایا: ﴿ تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ ﴾ (آیتِ باب)

مشرکوں کا اللہ تعالیٰ کے لیے بیٹیوں کو پسند کرنا اور خود ان سے نفرت کرنا:

پھر یہ ذکر کیا کہ انھوں نے فرشتوں کو، جو اللہ کے فرماں بردار بندے ہیں، مونث ٹھہرایا ہے اور اُن کو اللہ کی بیٹیاں بتاتے ہیں اور اللہ کے ساتھ اُن کی عبادت بھی کرتے ہیں، ان تینوں مقامات میں وہ سخت غلطی پر ہیں کہ اللہ کے لیے اولاد ٹھہرائی، حالاں کہ اس کے لیے اولاد نہیں ہے۔ پھر جو سب اقسام سے زیادہ گھٹیا تھی وہ مقرر کی، یعنی یہ کہا کہ فرشتے بیٹیاں ہیں، حالاں کہ اپنے لیے بیٹیوں کا ہونا پسند نہیں کرتے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ﴿٢١﴾ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ﴾ [النجم: ٢١۔ ٢٢] ''کیا تمھارے لیے بیٹے ہیں اور اللہ کے لیے بیٹیاں؟ یہ تو پھر بڑی ہی بے انصافی کی تقسیم ہے۔'' اور یہاں فرمایا: ﴿ وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ ﴾ (آیتِ باب) یعنی اللہ تعالیٰ ان کے بہتان اور اس بے ہودہ قول سے پاک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ ﴿١٤٩﴾ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ ﴿١٥٠﴾ اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ﴿١٥١﴾ وَلَدَ اللّٰهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿١٥٢﴾ اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ ﴿١٥٣﴾ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴾ [الصافات: ١٤٩۔ ١٥٤] ''پھر ان (اہلِ مکہ) سے پوچھیے: کیا آپ کے رب کے لیے تو بیٹیاں ہیں اور ان کے لیے بیٹے؟ یا ہم نے فرشتوں کو مؤنث پیدا کیا اور وہ حاضر تھے؟ خبردار! بلاشبہ وہ اپنی طرف سے جھوٹ گھڑ کر کہتے ہیں۔ کہ ''اللہ نے اولاد جنی'' اور یقیناً وہ جھوٹے ہیں۔ کیا اس نے بیٹوں پر بیٹیوں کو پسند کیا (ترجیح دی) ہے؟ کیا ہوگیا ہے تمھیں، تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟''

اور یہ جو فرمایا: ﴿ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ ﴾ اپنے لیے جو جی چاہتا ہے، وہ پسند کرتے ہیں، یعنی لڑکوں کو، اور لڑکیوں کو اپنے لیے عار سمجھتے ہیں، لیکن اللہ کی طرف نسبت لڑکیوں کی لگاتے ہیں۔ تعالیٰ اللہ عن قولهم علواً كبيراً. اللہ تعالیٰ ان کے بے ہودہ قول سے برتر اور اعلیٰ ہے۔

ان سے اگر کوئی کہتا ہے کہ تمھارے گھر بیٹی پیدا ہوئی ہے تو ان کا منہ سیاہ پڑ جاتا ہے، اس کا سینہ غم سے بھرا رہتا ہے۔ اور اس رنج کی شدت سے جو اس کو پہنچا، خاموش رہتا ہے۔ لوگوں کے دیکھنے کو برا جانتا ہے، قوم سے چھپتا پھرتا ہے، کیوں کہ بُری خبر ملی۔ پھر اگر اس کو باقی رکھتے ہیں تو ذلت کے ساتھ نہ اس کو وراثت میں حصہ دیں نہ اس کی طرف توجہ کریں، بلکہ بیٹوں کو اس پر فضیلت بخشیں یا اس کو زندہ مٹی میں گاڑ دیتے ہیں، جس طرح جاہلیت والے کرتے تھے۔ سو جس قسم سے اس طرح کی کراہت کرتے ہیں اور اسے اپنے لیے عار سمجھتے ہیں، وہ اللہ کے لیے ٹھہراتے ہیں۔ یہ کیا بری بات ہے، جس کا حکم لگاتے ہیں کہ اپنے لیے تو بیٹا چاہیں اور اللہ کی طرف بیٹی کی نسبت کریں، جیسے اللہ تعالیٰ

کا فرمان ہے: ﴿ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ﴾ [الزخرف: ١٧] ''اور جب ان میں سے کسی کو اس (بیٹی پیدا ہونے) کی بشارت دی جاتی ہے جس کی اس نے رحمٰن کے لیے مثال بیان کی، تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے، جبکہ وہ غم سے بھرا ہوتا ہے۔''

نیز فرمایا: ﴿ اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ ۝ وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ۭ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ۭ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْـَٔــلُوْنَ ﴾ [الزخرف: ١٨۔ ١٩] ''کیا (وہ اللہ کی اولاد ہے؟) جس کی زیور میں پرورش کی جاتی ہے اور وہ جھگڑے میں اپنی بات واضح نہیں کر پاتی۔ اور انھوں نے فرشتوں کو، جو رحمٰن کے بندے ہیں، (رحمٰن کی) بیٹیاں ٹھہرایا ہے۔ کیا وہ ان کی پیدایش کے وقت حاضر تھے؟ ان کی شہادت ضرور لکھی جائے گی اور ان سے (اس چیز کی) پوچھ گچھ ہوگی۔'' اور اس جگہ یہ فرمایا: ﴿ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ﴾ (آیتِ باب) یعنی جو لوگ آخرت کا یقین نہیں رکھتے ہیں، ان کی بری مثل ہے، یعنی نقصان ان کی طرف منسوب ہے اور اللہ کے لیے اعلیٰ مثال ہے، یعنی ہر وجہ سے کمال مطلق اور اللہ تعالیٰ غالب وحکمت والا ہے۔[1] انتھیٰ ما قال ابن کثیر بزیادة.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح اور تقریرِ کاشف یہ ہے کہ مشرکین سے اس جوار اور پناہ جوئی کے بعد جو مذکور ہوا، ایسا ہی وقوع میں آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ آزمایشوں، مصیبتوں اور بیماریوں کو ان سے دور کرتا ہے جو ان کو لاحق ہوتی ہیں اور اس تکلیف کو ان سے دور کرتا ہے کہ جس میں وہ مبتلا تھے، تو اس کے شکریے میں ان سے ایسی ہی ناشکریاں سرزد ہوا کرتی ہیں اور اس کے باوجود ان جمادات اور شیاطین کے لیے جن کی حقیقت سے ان کو اطلاع نہیں ہے اور جن کی ماہیت سے بے خبر ہیں، ہمارے عطا کردہ مال سے ان کا حصہ مقرر کرتے ہیں، جس سے ان کا تقرب تلاش کرتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ ﴿ يَعْلَمُوْنَ ﴾ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کے اس قول ﴿ وَيَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ نَصِيْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ ۭ تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔــلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ ﴾ (آیتِ باب) میں ''ما'' کی طرف لوٹ رہی ہے، یعنی کفار بتوں کے نام کی نذر و نیاز دیتے ہیں اور ان بتوں کو اس کا کچھ علم نہیں ہوتا، کیوں کہ وہ جمادات ہیں اور ان کو ذوی العقول کے قائم مقام رکھنا، کفار کے اعتقاد کے مطابق ہے۔ حاصل معنی یہ ہے کہ یہ کفار ان بتوں کے لیے کہ جن کو کسی چیز کا ادراک اور شعور ہی نہیں ہے، اللہ کے عطا کردہ مال میں سے حصہ مقرر کرتے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ اللہ نے ان کو پیدا کیا ہے اور وہی نفع و نقصان دینے والا ہے، پھر جن کے نفع و نقصان کے بارے میں جانتے تک نہیں ہیں، ان کے لیے ہمارے عطا کردہ مال سے حصہ مقرر کرتے ہیں۔

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٧٤٦)

امام قتادہ رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ ان سے مراد مشرکینِ عرب ہیں کہ انھوں نے اپنے بتوں اور شیطانوں کے لیے حصہ مقرر کیا اور اپنے مالوں کو حصوں میں تقسیم کیا اور ایک حصہ ان کے لیے بھی مقرر کیا۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد ان کا یہ قول ہے: ﴿ فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَ هٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ﴾ [الأنعام: ١٣٦] ''پھر اپنے خیال کے مطابق کہنے لگے: یہ (حصہ) اللہ کے لیے ہے اور یہ ہمارے دیوتاؤں کے لیے ہے۔'' [1] اس آیت کی طرف ہم ابن کثیر رحمہ اللہ کی تقریر میں اشارہ کر چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نفسِ کریمہ کی قسم کھا کر فرمایا کہ قیامت کے دن وہ ان سے اس بے ہودہ کام کے بارے میں ضرور پوچھے گا اور اس پر مواخذہ کرے گا اور یہ سوال تقریع اور توبیخ کا سوال ہوگا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے فضیح کام، قبیح امر اور شنیع فعل کی دوسری قسم بیان کی اور فرمایا: ﴿ وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ ﴾ یعنی وہ اللہ کے لیے بیٹیاں ٹھہراتے ہیں۔ عرب کے دو بڑے قبیلے خزاعہ اور کنانہ کا اعتقاد تھا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی تنزیہ بیان کی اور فرمایا: ﴿ سُبْحٰنَهٗ ﴾ یعنی وہ ذات ان ظالموں کی بُری نسبت سے پاک ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر میں فرمایا: ''تَجْعَلُوْنَ لِيَ الْبَنَاتِ، تَرْضَوْنَهُنَّ لِي وَلَا تَرْضَوْنَهُنَّ لِأَنْفُسِكُمْ'' یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ظالمو! میرے لیے بیٹیاں ٹھہراتے ہو، میرے لیے ان کو پسند کرتے ہو، اپنے لیے ان کو پسند نہیں کرتے ہو۔ اور یہ اس لیے تھا کہ جاہلیت میں جب کسی شخص کے ہاں بیٹی پیدا ہوتی تو یا وہ ذلت قبول کر کے اس کو زندہ رہنے دیتا، یا پھر مٹی میں زندہ ہی اس کو دفن کر دیتا۔ [2] یہ کفار جانور ہیں، بلکہ جانوروں سے بھی بدتر ہیں۔ اس تنزیہ میں ان کی حالت پر تعجب ہے۔ پھر فرمایا: ﴿ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ ﴾ یعنی اپنے لیے بیٹے پسند کرتے ہیں اور یہ جملہ مستانفہ ہے یا ﴿ يَجْعَلُوْنَ ﴾ کی ضمیر سے حال ہے، اس صورت میں کہ یہ جملہ نصب کے محل میں ہوگا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے بیان کیا کہ جن بیٹیوں کو اللہ کے لیے پسند کرتے ہیں، ان کا اپنے گھروں میں ہونا پسند نہیں کرتے اور فرمایا: ﴿ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ﴾ (آیتِ باب) یہاں سیاہی سے مراد وہ سیاہی نہیں ہے کہ جو سفیدی کے مقابلے میں ہے، بلکہ اس سے مراد انکسار اور تغیر ہے کہ جو اس کو بیٹی کے پیدا ہونے پر غم، حزن اور غصے سے لاحق ہوا ہے۔ عرب کا محاورہ ہے کہ جب کسی کو کوئی کراہت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں: ''قَدِ اسْوَدَّ وَجْهُهٗ غَمًّا وَحُزْنًا'' یعنی فلاں کا منہ غم اور حزن کے مارے کالا ہو گیا۔ یہ امام زجاج رحمہ اللہ کا قول ہے۔ [3]

امام ماوردی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے حقیقتاً رنگ کا کالا ہونا مراد ہے اور اس کو جمہور کا قول بتلایا ہے۔ [4] پہلا معنی زیادہ بہتر ہے، کیوں کہ تجربے سے معلوم ہو چکا ہے کہ جب کوئی شخص غصے میں یا غمگین ہوتا ہے تو اس کی رنگت

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٢٢٦) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٨٦)
[2] تفسير الطبري (١٧/ ٢٢٧۔ ٢٢٨)
[3] معاني القرآن (٣/ ٢٠٦)
[4] النكت والعيون للماوردي (٣/ ١٩٤)

میں کوئی فرق نہیں آتا، بلکہ اس کے چہرے پر غصے اور غمگین ہونے کے آثار ہوتے ہیں، لیکن حقیقت میں رنگت کے بدلنے کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ فرمایا: ﴿ وَهُوَ كَظِيْمٌ ﴾ یعنی جس شخص کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خبر دی جاتی ہے، وہ دل ہی دل میں گھٹتا اور پچھتاتا ہے۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ كَظِيْمٌ ﴾ وہ شخص ہے کہ جو غصے کو پی جائے اور اس کو ظاہر نہ کرے۔ بعض نے کہا ہے کہ ﴿ كَظِيْمٌ ﴾ مغموم ہے، یعنی جس کا منہ مارے غم کے بند ہی ہو جاتا ہے اور یہ کظامت سے مشتق ہے اور کظامت کنویں کے منہ کے بند کرنے کو کہتے ہیں۔ یہ علی بن عیسیٰ رحمہ اللہ کا قول ہے۔ اس لفظ پر سورت یوسف میں کلام گزر چکا ہے۔[1]

پھر فرمایا کہ وہ چھپتا پھرے لوگوں سے مارے بری خبر کے جو اس نے سنی ہے، عار اور حیا کے مارے جو اس کو بیٹی کے پیدا ہونے سے لگی ہے۔ لوگوں سے کان چراتا ہے اور کہتا ہے کہ کیا میں اس ذلت کو قبول کروں یا اس کو زندہ درگور کر دوں۔ امام یزیدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ هُوْنٍ ﴾ اور ”ھوان“ قریش کی لغت ہے اور ایسے ہی امام کسائی رحمہ اللہ سے حکایت کیا گیا ہے اور ان سے ﴿ هُوْنٍ ﴾ کے معنی آزمایش اور مشقت بھی منقول ہے۔

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بنو تمیم کی لغت میں قلیل کو کہتے ہیں۔ امام اعمش رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ وہ اس آیت کو یوں پڑھا کرتے تھے: ”أَيُمْسِكُهُ عَلٰى سُوْءٍ“[2] اور ”دَسٌّ“ کے معنی ہیں: کسی چیز کو کسی چیز میں چھپا دینا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴾ یعنی برا فیصلہ کرتے ہیں کہ بیٹیاں جن کو خود پسند نہیں کرتے، ان کی نسبت اللہ کی طرف کرتے ہیں اور بیٹے جن کو خود پسند کرتے ہیں ان کی نسبت اپنی طرف کرتے ہیں اور اسی کی مثل اللہ کا یہ قول ہے: ﴿ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ۝ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ﴾ [النجم: ٢١۔ ٢٢] ”کیا تمھارے لیے بیٹے ہیں اور اللہ کے لیے بیٹیاں؟ یہ تو پھر بڑی ہی بے انصافی کی تقسیم ہے۔“

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس کو اپنے لیے پسند نہیں کرتے، اس کو کیسے میرے لیے پسند کرتے ہیں۔ یہ برا فیصلہ ہے۔[3] جو لوگ اللہ تعالیٰ کو قبائح قطعیہ جیسی صفت کے ساتھ موصوف کرتے ہیں، ان کے لیے بُری مثال ہے کہ وہ جاہل ہیں اور اللہ کے ساتھ کفر کرتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ ان کا اللہ تعالیٰ کے لیے بیوی اور اولاد کا ہونا بیان کرنا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ سوء ان کا اولاد کی طرف محتاج ہونا ہے، تاکہ ان کے بعد ان کے قائم مقام ہوں اور زندہ درگور کرنا عار کو دور کرنے یا تنگ دستی کے ڈر سے ہوتا تھا۔[4]

---

[1] تفسیر القرطبي (١٠/ ١١٦) سورت یوسف، رقم الآیة (٨٤)
[2] تفسیر القرطبي (١٠/ ١١٧)
[3] تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٨٧)
[4] فتح البیان (٧/ ٢٥٩۔ ٢٦٢)

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿٦١﴾ وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ وَتَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى ۭ لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَاَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ ﴿٦٢﴾

اور اگر اللہ لوگوں کے ظلم پر ان کا مواخذہ کرے تو اس (زمین) پر کوئی چلنے پھرنے والا نہ چھوڑے، لیکن وہ ایک مقرر وقت تک انھیں ڈھیل دیتا ہے، پھر جب ان کا مقرر وقت آ پہنچتا ہے تو وہ ایک گھڑی بھی آگے پیچھے نہیں ہو سکتے (61) اور وہ اللہ کے لیے وہ چیز ٹھہراتے ہیں جس سے خود کراہت کرتے ہیں، اور ان کی زبانیں جھوٹ کہتی ہیں کہ بے شک ان کے لیے بھلائی ہے۔ بلاشبہ یقیناً ان کے لیے آگ ہے اور بے شک وہ (اس میں) سب سے آگے بھیجے جائیں گے (62)

اللہ تعالیٰ گناہوں پر فوری گرفت نہیں کرتا:

یعنی لوگوں کو سزا دے تو بارش بند کرے، اس میں جانور بھی مریں۔ ﴿ مُّفْرَطُوْنَ ﴾ ان کو فرمایا جو ناکارہ چیزیں اللہ کے نام دیں اور اس پر یقین کریں کہ ہم کو بہشت ملے اور وہ روز بروز دوزخ میں بڑھتے ہیں۔

اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے خبر دی کہ باوجود ظلم کے ہم مخلوق کے ساتھ حلم کرتے ہیں، اگر اُن کے اعمال پر فی الفور پکڑ لیں تو پشتِ زمین پر کوئی جاندار باقی نہ رہے۔ سارے زمین کے جانداروں کو ہلاک کر دیں بہ تبعیت اہلاکِ بشر، لیکن اللہ تعالیٰ حلیم اور پردہ پوش ہے وہ مدت مقرر تک مہلت دیتا ہے، سزا میں جلدی نہیں کرتا، کیوں کہ اگر ایسا کرتا تو کسی ایک کو باقی نہ چھوڑتا۔ امام ابو الاحوص رحمہ اللہ نے کہا: لگتا ہے کہ جُعل (براز کا کیڑا) بنی آدم کے گناہ کی وجہ سے عذاب میں گرفتار ہو، پھر یہ آیت پڑھی۔ عبد اللہ رضی اللہ عنہ کے الفاظ یہ ہیں: ”وَالْجُعَلُ أَنْ يَّهْلِكَ فِيْ جُحْرِهِ بِخَطِيْئَةِ بَنِيْ آدَمَ“ یعنی قریب ہے کہ براز کا کیڑا اپنے سوراخ میں بنی آدم کے گناہ کے سبب سے ہلاک ہو جائے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو سنا، وہ کہتا ہے: ”إِنَّ الظَّالِمَ لَا يَضُرُّ إِلَّا نَفْسَهٗ“ یعنی تحقیق ظالم نہیں ضرر کرتا مگر اپنی جان کو، اس کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”بَلٰى وَاللّٰهِ حَتَّى الْحُبَارٰى لَتَمُوْتُ فِيْ وَكْرِهَا بِظُلْمِ الظَّالِمِ“[1] یعنی بے شک اللہ کی قسم! حباری (ایک پرندہ) تک ظالم کے ظلم کی وجہ سے اپنے آشیانے میں مر جاتا ہے۔

[1] تفسیر الطبري (١٧/ ٢٣٠۔ ٢٣١)

سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے نبی مکرم ﷺ سے کچھ ذکر کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: « إِنَّ اللّٰهَ لَا يُؤَخِّرُ شَيْئًا إِذَا جَاءَ أَجَلُهُ، وَإِنَّمَا زِيَادَةُ الْعُمُرِ بِالذُّرِّيَّةِ الصَّالِحَةِ، يَرْزُقُهَا اللّٰهُ الْعَبْدَ فَيَدْعُوْنَ لَهُ مِنْ بَعْدِهِ فَيَلْحَقُهُ دُعَاءُ هُمْ فِيْ قَبْرِهِ فَذٰلِكَ زِيَادَةُ الْعُمُرِ » (رواه ابن أبي حاتم) بے شک اللہ تعالیٰ نہیں ڈھیل دیتا کسی چیز کو جب اس کی موت آ جائے اور عمر کی زیادتی نیک اولاد کے ساتھ ہوتی ہے، جو اللہ پاک بندے کو دیتا ہے تو وہ اس کے لیے پیچھے سے دعا کرتے ہیں تو اُن کی دعا اس کو پہنچتی ہے، پس یہ معنی ہیں عمر کی زیادتی کے۔[1]

پھر یہ فرمایا کہ جو اپنے آپ کو بُری لگے، وہ اللہ تعالیٰ کے لیے ٹھہرانا چاہیں، یعنی بیٹیاں اور شرکا جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے عبید ہیں، حالاں کہ خود اس سے عار کرتے ہیں کہ کوئی شخص اُن کے مال میں اُن کا شریک ہو اور اپنے لیے دنیا میں خوبی کا دعویٰ کرتے ہیں اور اگر معاد ہوا تو وہاں بھی وہ اچھے رہیں گے، سو یہ باتیں ان کی سراسر جھوٹ اور دروغ ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَىِٕنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِيْ وَمَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآىِٕمَةً وَّلَىِٕنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْۤ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴾ [حم السجدة: ٥٠] ”اور جو تکلیف اسے پہنچی ہے، اس کے بعد اگر ہم اسے اپنی رحمت (کا مزہ) چکھائیں تو وہ یقیناً کہتا ہے: یہ تو میرے ہی لیے ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ قیامت آنے والی ہے اور اگر مجھے میرے رب کی طرف لوٹایا گیا تو بلاشبہ اس کے پاس میرے لیے بھلائی ہی ہوگی، چناں چہ ہم ان کافروں کو ضرور بتائیں گے جو کچھ وہ کرتے رہے اور ہم انھیں سخت عذاب (کا مزہ) ضرور چکھائیں گے۔“

نیز فرمایا: ﴿ اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَقَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ﴾ [مريم: ٧٧] ”پھر آپ اس شخص کے بارے میں بتلایئے جس نے ہماری آیات کا انکار کیا اور کہا: مجھے ضرور مال اور اولاد دی جائے گی۔“ اور ایک شخص کے حال سے خبر دی: ﴿ وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ قَالَ مَاۤ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا ۝ وَّمَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآىِٕمَةً وَّلَىِٕنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ﴾ [الكهف: ٣٥۔ ٣٦] ”اور وہ اپنے باغ میں داخل ہوا، جب کہ وہ اپنی جان کے لیے ظالم تھا، اس نے کہا: میں گمان نہیں کرتا کہ یہ (باغ) کبھی تباہ ہوگا۔ اور میں گمان نہیں کرتا کہ قیامت قائم ہونے والی ہے، اور اگر (بالفرض) واقعی مجھے اپنے رب کی طرف لوٹایا گیا تو یقیناً ضرور میں وہاں ان (باغوں) سے بہتر لوٹنے کی جگہ پاؤں گا۔“ غرض یہ کہ اُن لوگوں نے عملِ سوء اور باطل تمناؤں کو جمع کیا اور سمجھا کہ اس پر اچھی خبر ملے گی جیسے کہا گیا:

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/ ١٧٤) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٥٣٢٣)

خطا کردہ ام و چشم آفریں دارم

''میں نے غلطی کی ہے اور شاباش و دعا کی اُمید رکھتا ہوں۔''

حالاں کہ یہ محال ہے، چناں چہ ابن اسحاق رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ جس وقت بنیاد کو تجدید کے لیے کھودا تھا تو کعبے کی بنیاد میں ایک پتھر ملا، اس پر کچھ حکم اور نصیحتیں لکھی تھیں، ازاں جملہ ایک بات یہ بھی لکھی تھی: ''تَعْمَلُوْنَ السَّيِّئَاتِ وَتُجْزَوْنَ الْحَسَنَاتِ، أَجَلْ كُمَا يُجْتَنىٰ مِنَ الشَّوْكِ الْعِنَبُ'' یعنی کرتے ہو برائیاں اور جزا دیے جاؤ نیکیوں کی اس کی تو ایسی مثال ہے، جیسے کانٹوں سے انگور کی اُمید کی جائے۔[1] امام قتادہ اور مجاہد رحمہما اللہ نے کہا کہ حسنیٰ سے مراد غلمان ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ حسن عاقبت مراد ہے، یہی درست ہے۔ وللہ الحمد۔[2]

لہٰذا اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ان کی تمنا پر رد کیا اور کہا کہ اُن کے لیے قیامت کے دن آگ ہے اور یہ اس دن بھلائے گئے اور ضائع ہوں گے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ فَالْيَوْمَ نَنْسٰهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ﴾ [الأعراف: ۵۱] ''چناں چہ آج ہم انھیں اسی طرح بھلا دیں گے جس طرح انھوں نے اپنی اس دن کی ملاقات کو بھلا دیا تھا۔'' امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ جلدی سے آگ کی طرف بھیجے جائیں گے۔[3] ﴿ مُفْرَطُوْنَ ﴾ ماخوذ ہے فرط سے۔ فرط وہ ہے جو سب سے پہلے پانی پر جا پہنچے، اس میں کچھ منافات نہیں ہے، کیوں کہ جلدی سے دوزخ میں بھیج کر بھلا دیے جائیں گے۔ یعنی ہمیشہ اسی میں رہیں گے، یاد ہی نہ آئیں گے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اس جگہ لوگوں سے مراد کفار اور سارے گنہگار ہیں۔ اگر اللہ سبحانہ و تعالیٰ ان کو اُن کے ظلم پر پکڑے تو پشتِ زمین پر ظلم کی بدفالی کے سبب سے کوئی جاندار بھی باقی نہ رہے، اس لیے کہ یہ سب اسی زمین پر قرار پکڑے ہوئے ہیں۔ ﴿ دَآبَّةٍ ﴾ سے مراد کافر ہے، یا ہر چلنے اور رینگنے والا۔ کوئی کہے کہ اس عام ہلاکت میں بے گناہ بھی آ گئے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ظالم کا ہلاک کرنا بطورِ انتقام کے ہے اور غیر ظالم کا اگر مکلّف ہے تو توفیرِ اجر (اجر کا پورا دیا جانا) کے واسطے ہے اور اگر مکلّف نہیں ہے تو یہ ظالمین کے ظلم کی بدفالی اور نحوست کی وجہ سے۔ ''وَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ وَالْحِكْمَةُ السَّابِغَةُ لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ'' یعنی اللہ کے لیے ہے حجت پوری اور حکمتِ کامل، اس سے اس کے کیے کے بارے میں پوچھا نہ جائے اور دوسرے سب پوچھے جائیں گے۔ اسی کے مثل یہ آیت ہے: ﴿ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ﴾ [الأنفال: ۲۵] ''اور اس فتنے سے ڈرو جو تم میں سے خاص طور پر (صرف) ان لوگوں کو نہیں پہنچے گا جنھوں نے ظلم کیا۔''

[1] السيرة النبوية لابن هشام (۲/ ۱۸)
[2] تفسير الطبري (۱۷/ ۲۳۲) تفسير ابن كثير (۲/ ۷٤۷)
[3] تفسير الطبري (۱۷/ ۲۳٤)

اس بارے میں بہت سی حدیثیں مروی ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما مرفوعاً کہتے ہیں: « إِذَا أَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ عَذَابًا أَصَابَ الْعَذَابُ مَنْ كَانَ فِيهِمْ، ثُمَّ بُعِثُوا عَلَى أَعْمَالِهِمْ » (رواہ مسلم) یعنی اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کے عذاب کا ارادہ کرتا ہے تو عذاب میں ان سب کو شامل کرتا ہے جو اُن میں ہوتے ہیں، پھر وہ اپنے اعمال کے مطابق اُٹھائے جائیں گے۔[1] اسی طرح اس حدیث کے آخر میں آیا ہے، جو خسف جیش فی البیداء کے بارے میں ہے: « إِنَّهُمْ يُبْعَثُونَ عَلٰى نِيَّاتِهِمْ »[2] ''وہ اپنی نیتوں کے مطابق اُٹھائے جائیں گے۔''

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ بارش نہ برسے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ یعنی ان کے ظلم کے سبب سے بارش روک لی جائے اور بارش منقطع ہو جانے سے نسل منقطع ہو جاتی ہے،[3] یا اگر بہ سبب کفرِ آبا ہلاک ہو جائیں تو پھر اُن کی اولاد نہ ہو اور جب اولاد نہ ہوگی تو پورے جہان میں کوئی باقی نہ رہے گا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ واقعہ نوح علیہ السلام کے زمانے میں ہو چکا ہے کہ پشتِ زمین پر کوئی دابہ باقی نہ رہا، سوائے ان کے جو کشتی میں تھے۔[4]

اس میں اس بات کی خبر ہے کہ جو قبیح اعمال انھوں نے کیے، وہ اس حد تک پہنچے ہیں، جس کی کوئی انتہا نہیں ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک مدتِ معین تک چھوڑ رکھا ہے، اس سے مراد زندگی کا اخیر اور عمروں کا گزر جانا ہے۔ اس تاخیرِ عذاب میں ایک حکمتِ بالغہ ہے جیسے ان کی طرف سے عذر اور اِرخائے عنان (باگ کو ڈھیلا چھوڑ دینا) ان کے ساتھ، یا جیسے اولاد کا حصول جن کا علم سابق ہو چکا ہے، پھر جب اَجل آ گئی تو اب کچھ اس سے جلدی اور دیر نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد ڈانٹ ڈپٹ کے طور پر فرمایا کہ جو چیز خود کو بُری لگتی ہے وہ اللہ کے لیے ٹھہراتے ہیں، جیسے: اپنی طرف بیٹیوں کی نسبت یا ریاست میں کسی کو شریک کرنا، یا رسولوں کی اہانت کرنا۔ ان کی زبان جھوٹ بولتی ہے کہ اُن کے لیے عاقبت اچھی ہوگی جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ وَلَىِٕنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِيْ وَمَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآىِٕمَةً وَّلَىِٕنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْۤ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى ﴾ [حم السجدة: ٥٠] ''اور جو تکلیف اسے پہنچی ہے، اس کے بعد اگر ہم اسے اپنی رحمت (کا مزہ) چکھائیں تو وہ یقیناً کہتا ہے: یہ تو میرے ہی لیے ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ قیامت آنے والی ہے اور اگر مجھے میرے رب کی طرف لوٹایا گیا تو بلاشبہہ اس کے پاس میرے لیے بھلائی ہی ہوگی۔''

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ کفارِ قریش کہتے تھے: ''لَنَا الْبَنُونُ وَلَهُ الْبَنَاتُ'' یعنی ہمارے واسطے بیٹے ہیں اور اللہ کے لیے بیٹیاں۔[5] اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ان پر رد کیا اور فرمایا کہ ان کے لیے دوزخ ہے سچ مچ اور یہ آگ کی طرف مقدم ہوں گے۔ امام ابن الاعرابی رحمہ اللہ اور ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ''أَيْ مَتْرُوكُونَ مَنْسِيُّونَ فِي النَّارِ''، یعنی آگ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٩١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٧٩) مسند أبي يعلىٰ (١٠/ ٦١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٠١٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٨٤) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٨٧)

[4] الدر المنثور (٥/ ١٤٠) [5] تفسير الطبري (١٧/ ٢٣٢)

میں ڈال کر بھلا دیے جائیں گے اور چھوڑے جائیں گے۔[1] اس ارشاد میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے رسول کو تسلی دی ہے اس غم سے، جو قوم کی جہالتوں کے سبب، ان کو لاحق ہوتا تھا:[2]

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۶۳ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝۶۴ وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ۝۶۵

اللہ کی قسم! البتہ تحقیق ہم نے آپ سے پہلی قوموں کی طرف رسول بھیجے تو شیطان نے ان کے (برے) اعمال ان کے لیے خوش نما کر دیے، چناں چہ آج وہی ان کا دوست ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے (63) اور ہم نے آپ پر کتاب صرف اس لیے نازل کی ہے، تاکہ آپ ان پر وہ چیز واضح کر دیں جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں اور وہ ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے (64) اور اللہ نے آسمان سے پانی نازل کیا، پھر اس کے ساتھ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کیا، بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے البتہ نشانی ہے جو سنتے ہیں (65)

رسول اللہ ﷺ کو سابقہ لوگوں کے حالات سے تسلی:

یعنی اسی طرح قرآن سے جاہلوں کو عالم بنا دے گا، اگر دل سے سنیں گے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ذکر کیا ہے کہ ہم نے گزشتہ اُمتوں میں رسول بھیجے تھے، وہ رسول جھٹلائے گئے، تمھارے لیے اپنے ان بھائی رسولوں میں نمونہ اور پیشوائی ہے، تم کو تمھاری قوم کی تکذیب رنجیدہ نہ کرے۔ جن مشرکوں نے پیغمبروں کو جھٹلایا، وہ اس لیے کہ شیطان نے ان کی نظروں میں اس امر کو رونق دی تھی، وہ آج کے دن اُن کا یار و مددگار ہے، یہ سزا اور عذاب کے تحت ہوں گے اور شیطان اُن کو رہائی نہ دلا سکے گا۔

نزولِ قرآن کا مقصد:

اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اے پیغمبر! ہم نے جو یہ قرآن تم پر اُتارا ہے، سو اس لیے کہ تم لوگوں سے اُن چیزوں کا

---

[1] تفسیر القرطبي (۱۰/ ۱۲۱) [2] فتح البیان (۷/ ۲۶۳۔ ۲۶۶)

بیان کرو جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں، یہ قرآن ہر متنازعہ معاملے میں فیصلہ کرنے والا ہے اور دلوں کے لیے ہدایت اور تمسک کرنے والوں کے لیے، جو ایمان رکھتے ہیں، رحمت ہے۔ جس طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قرآن کو کفر کے ساتھ مردہ ہو جانے والے دلوں کے لیے حیات فرمایا ہے، اسی طرح وہ مردہ زمین کو آسمان سے پانی اُتار کر زندہ کرتا ہے۔ اس میں اس قوم کے لیے نشانی ہے، جو بات کا مطلب سمجھتی ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ شیطان کے ولی ہونے سے یہ مراد ہے کہ وہ دنیا میں ان کفار کا ساتھی ہے، لیکن آخرت میں اُن کے لیے کچھ بھی کار آمد نہ ہوگا، بلکہ یہ عذابِ الیم میں گرفتار ہوں گے۔ مختلف فیہ سے مراد توحید و شرک و جبر و قدر و احوالِ بعث و قیامت کا حق ہونا اور تمام شرعی امور میں قرآن پاک اُن امور کا فیصلہ اور بیان کرتا ہے اور مومنوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔ وہی رسولوں کی تصدیق کرتے ہیں، کتابوں پر ایمان لاتے ہیں اور اُن سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ پھر زمین کو پانی سے زندہ کرنے کو آسمان کی ایک نشانی کہا، اس قوم کے لیے جو اللہ کا کلام سنتی ہے اور وہ آسمانوں اور زمین کی پیدایش میں غور وفکر کرتے ہیں۔ سننے سے دل کا سننا مراد لیا ہے نہ کہ کانوں کا سننا۔[1]

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۭ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَاۗىِٕغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ۝ وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝

اور بے شک تمھارے لیے چوپایوں میں بھی عبرت (غور وفکر کا سامان) ہے۔ ہم تمھیں پلاتے ہیں اس سے جو ان کے پیٹوں میں ہے، گوبر اور لہو کے بیچ سے خالص دودھ، پینے والوں کے لیے آسانی سے (حلق میں) اُتر جانے والا ہے (66) اور کھجوروں اور انگوروں کے کچھ پھل وہ ہیں جن سے تم نشہ (آور شراب) اور اچھا رزق حاصل کرتے ہو۔ بے شک اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں (67)

چوپاؤں، کھجوروں اور انگوروں میں عبرت:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے لوگو! تم کو انعام میں یعنی اونٹ، گائے اور بکری میں ایک نشانی اور دلالت ہے خالق کی حکمت پر، اس کی قدرت، رحمت اور لطف و کرم پر کہ اس کے پیٹ سے ہم تم کو پلاتے ہیں۔ ضمیر کا واحد ہونا باعتبار نعم

[1] فتح البیان (٧/ ٢٦٦۔ ٢٦٧)

ہے، یا حیوان پر عائد ہے، کیوں کہ انعام حیوانات ہیں۔ دوسری آیت میں ﴿ مِمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا ﴾ کہا ہے، دونوں طرح پر جائز ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے: ﴿ كَلَّاۤ اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ ۞ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴾ [المدثر: ٥٤۔ ٥٥، عبس: ١١۔ ١٢] ''ہرگز نہیں! یقیناً یہ (قرآن) ایک نصیحت ہے۔ تو جو کوئی چاہے اسے یاد کرے۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاِنِّيْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ۞ فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ ﴾ [النمل: ٣٥۔ ٣٦] أي: المال. ''اور بے شک میں ان کی طرف کوئی ہدیہ بھیجتی ہوں، پھر دیکھتی ہوں قاصد کیا (جواب) لے کر لوٹتے ہیں؟ چناں چہ جب قاصد سلیمان کے پاس پہنچا۔''

پھر دودھ کی سفیدی اور مزہ اور حلاوت گوبر اور خون کے بیچ میں سے، جو حیوان کے شکم میں ہے، خالص ہو کر نکلتا ہے اور ہر چیز اپنے موطن کی طرف جاتی ہے، معدہ میں غذا کے پھیل جانے کے بعد وہاں سے خون رگوں میں جاتا ہے اور دودھ تھن میں آتا ہے اور بول مثانہ میں اور گوبر مخرج میں اور اُن میں سے ہر ایک چیز دوسری سے نہیں ملتی اور اپنی جگہ سے نکلنے کے بعد دوسری شے سے مل کر دگرگوں نہیں ہوتی۔ ﴿ سَآئِغًا ﴾ سے مراد ہے کہ گلے میں نہیں پھنستا، سہولت سے اُتر جاتا ہے۔

دودھ کے ذکر کے بعد اُن مشروبات کا ذکر کیا، جن کو لوگ پھلوں، یعنی کھجور اور انگور سے بناتے ہیں اور اس سے نبیذ مسکر اس کی حرام ہونے سے پہلے بناتے ہیں، لہٰذا اس بات کا احسان لوگوں پر رکھا، اس سے نبیذ کا مباح ہونا شرعاً ثابت ہوا تحریم سے قبل۔ اس میں دلیل ہے اس بات کی کہ ہر مُسکِر (نشہ آور) حرام ہے، وہ بھی جو کھجور سے بنایا گیا ہو اور وہ بھی جس کو انگور سے بنایا گیا ہو اور یہ مذہب ہے امام مالک، شافعی، احمد اور جمہور علما رحمہم اللہ کا اور یہی حکم ہے ان تمام مشروبات کا جو کہ گندم، جو، جوار اور شہد سے بنائے جاتے ہیں، سنت میں اس کی تفصیل آئی ہے۔ یہ جگہ اس مسئلے کی تفصیل کی نہیں ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ مُسکِر وہ ہے، جو اِن دونوں کے ثمرات سے بنائے گئے ہوں اور وہ حرام ہے اور رزقِ حسن وہ ہے[1] جو حلال ہے، یعنی تمر و زبیب خشک اور وہ طلا جو اُن سے بنائی گئی ہے، جس کو دبس وخل و نبیذ کہتے ہیں، ان کا سخت ہو جانے کے بعد پینا حلال ہے، جس طرح کہ سنت میں آیا ہے۔ عقل کا ذکر اس جگہ مناسب تھا، اس لیے کہ انسان میں یہی اشرف چیز ہے۔ لہٰذا اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اس اُمت پر عقل کی حفاظت کے لیے ایسے مشروبات کو حرام کر دیا ہے جو نشہ دیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ ۞ لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ۞ سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ [یٰس: ٣٤۔ ٣٦] ''اور ہم نے اس (زمین) میں کھجوروں اور

[1] تفسیر الطبري (١٧/ ٢٤١)

انگوروں کے باغات پیدا کیے اور ہم نے ان میں چشمے جاری کیے۔ تا کہ وہ اس کے پھلوں سے کھائیں اور وہ (پھل) ان کے ہاتھوں نے نہیں بنائے، پھر کیا وہ شکر نہیں کرتے؟ پاک ہے وہ ذات جس نے سب کے سب جوڑے پیدا کیے، ان چیزوں کے بھی جنھیں زمین اُگاتی ہے اور خود ان (انسانوں) کے اپنے بھی اور اُن کے بھی جنھیں وہ نہیں جانتے۔“

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ لفظ جمع مذکر و مونث آتا ہے: ”هُوَ الْأَنْعَامُ“ اور ”هِيَ الْأَنْعَامُ“ کہتے ہیں، اس وجہ سے مذکر ضمیر کا آنا جائز ہے۔[1] امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا کہ قرآن میں یہ محاورہ بہت استعمال ہوا ہے اللہ تعالیٰ کے سورج کے بارے میں اس فرمان کی طرح: ”﴿هَذَا رَبِّي﴾ یعنی ”هٰذَا الطَّالِعُ“، یعنی جیسے اللہ سبحانہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے قول سے بیان کیا کہ انھوں نے سورج کو دیکھ کر فرمایا: ﴿هَذَا رَبِّي﴾ حالاں کہ شمس مونث ہے اور اُن کی غرض یہ تھی کہ یہ چڑھنے والی چیز میرا رب ہے۔[2] فرث سے مراد زبل ہے، یعنی گوبر۔ جو چیز اُوجھڑی میں اترتی ہے، اس کے نیچے والے حصے کو فرث اور اوپر والے حصے کو دم (خون) اور درمیان والے حصے کو لبن (دودھ) کہتے ہیں۔ خون رگوں میں، دودھ پستان میں اور گوبر اُوجھڑی میں جاری ہوتا ہے۔ ”فَسُبْحَانَ مَنْ هٰذِهٖ بَعْضُ حِكْمَتِهٖ“ دودھ، خون کی سرخی اور گوبر کی پلیدی سے خالص ہوتا ہے، یعنی اس میں ان دونوں کی آمیزش نہیں ہوتی، حالاں کہ یہ ایک ہی جگہ پر جمع تھا۔

حاصل یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے دودھ کو گوبر اور خون کے درمیان والی جگہ میں پیدا کیا ہے، یہ پینے والوں کے لیے خوش گوار اور آسانی سے تناول کیا جانے والا ہے۔ آسانی سے حلق میں اُتر جاتا ہے۔ رہے کھجور اور انگور کے پھل تو اُن سے لوگ نشہ اور خورش بناتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ نشہ حرام ہے اور رزق، یعنی زبیب (کشمش) اور خل (سرکہ) اور عنب (انگور) حلال ہے۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ سکر نبیذ ہے اور رزق زبیب۔ آیت ﴿اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ﴾ [المائدة: ۹۰] نے اس کو منسوخ کر دیا۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد سکر کو خمر کے حرام کرنے کے ساتھ ہی حرام کر دیا اور رزقِ حسن سرکہ، کشمش اور نبیذ کو فرمایا، یہ حلال ہے۔[3] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ سکر بعینہٖ خمر ہے۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا بھی ہے۔[4]

بالجملہ اس آیت کا نزول شراب کے حرام ہونے سے پہلے ہوا تھا۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے اسی کے ساتھ جزم کیا ہے،[5] اس اعتماد پر کہ یہ سورت مکی ہے سوائے تین آیات کے اور سورۃ المائدہ مدنی ہے، اس میں شراب کی حرمت آئی ہے اور یہ نازل ہونے کے لحاظ سے قرآن کا آخری حصہ ہے، جس طرح کہ حدیث میں مروی ہے۔[6] بعض نے کہا کہ

---

[1] معاني القرآن (۳/ ۲۰۹) [2] فتح القدير (۳/ ۲٤۱) [3] تفسير ابن أبي حاتم (۷/ ۲۲۸۸)

[4] فتح القدير (۳/ ۲٤٤) مصنف ابن أبي شيبة (٥/ ۷٥) [5] تفسير الجلالين (۱/ ۳٥٤)

[6] سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۰٦۳) مستدرك الحاكم (۲/ ۳٤۰) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

سکر لغتِ حبشہ میں خل، یعنی سر کے کو کہتے ہیں اور رزق سے مراد دو درختوں کا کھانا ہے، لیکن پہلا قول زیادہ قابلِ قبول ہے۔ جمہور بھی اسی پر ہیں۔ اہلِ لغت نے تصریح کی ہے کہ سکر خمر کا نام ہے، اس میں ابو عبیدہ رحمہ اللہ کے علاوہ کوئی مخالف نہیں ہے، وہ سکر کو طعم بتاتے ہیں۔ اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ترجیح دی ہے اور کہا ہے کہ سکر وہ طعام ہے جو کھایا جائے اور اس کا پینا کھجور اور انگور سے درست ہو۔[1]

رزقِ حسن یہی ہے۔ لفظ مختلف ہیں، معنی ایک ہیں، جیسے: ﴿ قَالَ اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَ حُزْنِيْۤ اِلَى اللّٰهِ ﴾ [یوسف: ۸۶] ''اس نے کہا: میں تو اپنی پریشانی اور غم کا شکوہ اللہ ہی سے کرتا ہوں۔'' امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابو عبیدہ رحمہ اللہ کا یہ قول معروف نہیں اور اہلِ تفسیر اس کے خلاف ہیں۔[2] ایک جماعتِ حنفیہ نے سکر کو محمول ایسی نبیذ پر کیا ہے، جس سے نشہ نہ آئے اور اس پر جس کو پکانے سے اس کا دو تہائی نشہ جاتا رہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر حلال کا احسان رکھتا ہے نہ کہ اس چیز کا جو اُن پر حرام کی ہے، لیکن یہ قول احادیثِ صحیحہ متواترہ سے مردود ہے، اگر یہ فرض کر لیں کہ یہ آیت تحریمِ خمر کے بعد کی ہے۔ بالجملہ دودھ کے اس طرح نکالنے اور سکر بنانے اور رزقِ حسن میں اس قوم کے لیے دلالت ہے جو عقل کو استعمال میں لا کر اپنے غور و فکر کے تقاضوں کے مطابق عمل کرتے ہیں۔[3]

وَ اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا يَعْرِشُوْنَ ۝۶۸ ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۶۹

اور آپ کے رب نے شہد کی مکھی کو الہام کیا کہ تو پہاڑوں میں گھر (چھتے) بنا اور درختوں میں اور ان میں، جو لوگ چھپر بناتے ہیں (68) پھر ہر قسم کے پھلوں (اور پھولوں) سے کھا (رس چوس)، پھر اپنے رب کی آسان کی ہوئی راہوں پر چل۔ ان کے پیٹوں سے مختلف رنگوں کا مشروب (شہد) نکلتا ہے، اس میں لوگوں کے لیے شفا ہے، بے شک اس میں بھی غور و فکر کرنے والوں کے لیے بہت بڑی نشانی ہے (69)

شہد کی مکھی اور شہد میں عبرت:

ٹٹیوں (چھتریوں) سے مراد انگور کی بیل چڑھانا ہے۔ بُری چیز میں سے اچھی چیز نکلنے کے تین پتے بتائے: جانور کے پیٹ میں سے دودھ، نشہ کی انگور کھجور سے پاک روزی اور مکھی کے پیٹ سے شہد۔ یعنی اس قرآن سے

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٢٤٦۔ ٢٤٧) [2] تفسير القرطبي (١٠/ ١٢٩) [3] فتح البيان (٧/ ٢٦٨۔ ٢٧١)

جاہلوں کی اولاد عالم نکلے گی۔ نبی اکرم ﷺ کے وقت میں یہی ہوا، کافروں کی اولاد کامل ہوئی۔ اس جگہ وحی سے مراد الہام ہے کہ شہد کی مکھی کو یہ ہدایت کی اور ارشاد فرمایا کہ اِن تین جگہوں میں اپنا گھر بنا۔ یہ مکھی اس کام میں انتہا درجے کی پختگی رکھتی ہے اور اپنے گھر کی تسدیس (چھے حصوں میں تقسیم کرنا) اور رص (مضبوطی) میں محکم ہے، کیا مجال ہے کہ اس کے گھر میں کوئی خلل یا دراڑ ہو، پھر اس کو اس بات کی اجازت اور قدرت اور تسخیر دی کہ وہ سب میووں میں سے کھائے اور اُن راستوں میں چلے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے سہل و آسان کر دیے ہیں۔ اس عظیم فضا اور بیابان میں اور دور دراز کی وادیوں میں اور بلند و بالا کوہستانوں میں جہاں چاہے، چلے پھرے، پھر وہاں سے اپنے گھر کی طرف آئے اور راستہ نہ بھولے اور دائیں بائیں نہ بھٹکے، بلکہ اسی گھر میں آ کر اپنے بچوں اور شہد کے پاس آرام حاصل کرے اور اپنے پروں سے موم بنائے اور اپنے منہ سے شہد اگلے اور دبر سے انڈے بچے دے، پھر صبح کو اپنی چراگاہ میں چلی جائے۔

امام قتادہ اور ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ ذُلُلًا ﴾ یعنی مطیعۃ (فرماں بردار) جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَاْكُلُوْنَ ﴾ [یٰس: ۷۲] ''اور ہم نے انھیں ان کے تابع کر دیا، چناں چہ ان میں سے کچھ ان کی سواریاں ہیں، اور ان میں سے کچھ کو وہ کھاتے ہیں۔'' تو نے نہیں دیکھا کہ یہ لوگ شہد کی مکھی کو اِن کے گھروں کے ساتھ ایک شہر سے دوسرے شہر کو منتقل کر کے لے جاتے ہیں اور وہ اُن کے ہمراہ چلی جاتی ہے، لیکن پہلا قول زیادہ ظاہر ہے کہ لفظ ﴿ ذُلُلًا ﴾ راستے سے متعلق ہے نہ کہ اس پر چلنے والی کے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے اسی پر نص کی ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ دونوں قول صحیح ہیں۔[1] سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے: "عُمُرُ الذُّبَابِ أَرْبَعُوْنَ يَوْمًا، وَالذُّبَابُ كُلُّهُ فِي النَّارِ إِلَّا النَّحْلُ" یعنی مکھی کی زندگی چالیس دن کی ہوتی ہے، سب مکھیاں دوزخ میں جائیں گی، مگر شہد کی مکھی۔[2]

اختلافِ رنگ سے یہ مراد ہے کہ کوئی شہد سفید ہوتا ہے اور کوئی زرد اور سرخ وغیرہ۔ یہ اختلاف چراگاہ کا ہے۔ شہد میں بیماریوں کی شفا ہے۔ بعض متکلمین طبِ نبوی نے کہا ہے، اگر یوں ارشاد ہوتا: "فيه الشفاء للناس" یعنی شہد میں لوگوں کے لیے شفا ہے تو شہد ہر بیماری کی دوا ہوتا، لیکن ﴿ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ﴾ کہا ہے، یعنی کچھ شفا ہے، مطلب ہے کہ بعض بیماریوں اور اسقامِ باردہ (سرد) کے لیے اچھا ہے، کیوں کہ شہد گرم تاثیر رکھتا ہے اور دوا ضد (اُلٹ) کے ساتھ کی جاتی ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ یعنی قرآن شفا ہے۔[3] امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ قول فی نفسہٖ صحیح ہے، لیکن اس جگہ سیاقِ آیت سے یہی ظاہر ہے، کیوں کہ سیاق میں شہد کا ذکر ہے۔

اس جگہ امام مجاہد کے اس قول کا کوئی تابع نہیں ہے، بلکہ ان کا یہ قول اس آیتِ کریمہ کے ذیل میں درج کیا

---

(1) تفسير الطبري (١٧/ ٢٤٩) (2) مسند أبي يعلىٰ (٧/ ٢٣٠) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله ثقات" (مجمع الزوائد: ٤/ ٦٠)
(3) تفسير الطبري (١٧/ ٢٤٩_ ٢٥٠)

ہے: ﴿ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [بني إسرائيل: ٨٢] ''اور ہم قرآن میں سے جو نازل کرتے ہیں وہ مومنوں کے لیے شفا اور رحمت ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [یونس: ٥٧] ''اے لوگو! یقیناً تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے نصیحت اور شفا، ان (بیماریوں) کے لیے جو سینوں میں ہیں اور مومنوں کے لیے ہدایت اور رحمت آ گئی ہے۔''

اس بات پر کہ یہاں شہد مراد ہے سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث دلیل ہے جس کو شیخین نے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے آ کر کہا: اے اللہ کے رسول! میرے بھائی کا پیٹ چلتا ہے، یعنی اس کو دست آتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کو شہد پلا، اس نے جا کر شہد پلایا اور آ کر کہا: اے اللہ کے رسول! میں نے اس کو شہد پلایا تھا، اس کو اور زیادہ دست آنے لگے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جا شہد پلا، اس نے جا کر شہد پلایا اور آ کر عرض کی کہ میں نے شہد پلایا استطلاق (دست کی تکلیف) اور بڑھ گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ سچا ہے اور تیرے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے، جا اس کو شہد پلا۔ وہ گیا اور شہد پلایا، وہ اچھا ہو گیا۔[1]

بعض علمائے طب نے کہا ہے کہ اس شخص کے پیٹ میں فضلات تھے، جب اس کو شہد پلایا گیا اور شہد گرم ہوتا ہے تو وہ فضلات تحلیل ہو کر جلد مندفع ہوئے اور اسہال بڑھ گیا۔ اس اعرابی نے اعتقاد کیا کہ شہد مضر ہے، حالاں کہ وہ اس کے بھائی کے لیے صحیح تھا، پھر جب دوبارہ اس کو پلایا تو اور بھی تحلیل ہوئے اور دست چھوٹے۔ جب تیسری بار پلایا تو رہے سہے فضلات جو فاسد تھے اور بدن کے لیے مضر تھے، نکل گئے اور دست آنا بند ہو گیا اور مزاج اصلاح پر آ گیا اور بیماری اور درد جناب رسالت مآب علیہ الصلاۃ والسلام کی اشارتِ پُر بشارت کی برکت سے دور ہو گئے۔[2]

مترجم کہتا ہے کہ جو وجہ اس جگہ مذکور ہوئی، یہی وجہ اجمالاً اس پر بھی آیتِ باب کی تفسیر تحریر کرنے کے دوران میں پیش آ چکی ہے، حالاں کہ اس وقت اس توجیہ کا اسے علم نہیں تھا۔ فنعم الاتفاق وحبذا الوفاق ولله الحمد۔ بلکہ میرے اعتقاد میں یہ بات ہے کہ آیتِ کریمہ کے مطابق شہد ہر مرض کی شفا ہے، خواہ وہ گرمی کی وجہ سے ہو یا سردی کی وجہ سے۔ اس فرق کرنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ آیتِ کریمہ مطلق شفا پر دلیل ہے۔ رہی یہ بات کہ مرضِ حار (گرم) میں شفا ظاہر نہیں ہوتی تو اس کی بنیاد مخلوق کے ضعفِ اعتقاد پر ہے، لوگ اپنی کم فہمی سے طبیبوں کے فہم کو اللہ تعالیٰ کے حکم اور خبر پر مقدم کرتے ہیں، لہٰذا اُن سب کے پیٹ جھوٹے ہیں اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا کلام سچا ہے۔ اگر قوتِ ایمان ہو اور قاعدۂ طبیہ کا وہم خارج اور حائل نہ ہو تو یقیناً شہد صافی ہر مرض کو کافی وافی اور شافی ہو جائے۔ والله أعلم وعلمه أتم و أحكم۔ لہٰذا سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے حدیث میں مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٣٦٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢١٧)

[2] تفسير ابن كثير (٢/ ٧٤٩۔ ٧٥٠)

شیرینی اور شہد کو دوست رکھتے تھے۔[1] (رواه الشيخان واللفظ للبخاري) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں: شفا تین چیزوں میں ہے: سینگی کے زخم ہیں، یا شہد پینے میں یا آگ کے ساتھ داغنے میں۔[2] (رواه البخاري)

سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے مرفوعاً کہا ہے کہ تمھاری دواؤں میں سے اگر کسی شے میں کچھ بہتری اور خیر ہے تو سینگی کے زخم یا شہد پینے یا آگ سے داغنے میں ہے، جو بیماری کے موافق پڑے، لیکن میں داغ دینے کو دوست نہیں رکھتا ہوں۔[3] (رواه البخاري و مسلم) سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں: تین چیزیں ہیں اگر کسی شے میں شفا ہو: ایک پچھنے لگانا، دوسرے شہد پینا اور تیسرے درد کی جگہ آگ کا داغ دینا، لیکن میں داغ دینے کو مکروہ رکھتا ہوں اور دوست نہیں رکھتا۔ (رواه أحمد و رواه الطبراني بلفظ "إِنْ كَانَ فِي شَيْءٍ شِفَاءٌ فَشَرْطَةُ مِحْجَمٍ" و ذكره وهذا إسناد صحيح ولم يخرجوه) یعنی اس کو امام احمد نے روایت کیا ہے اور طبرانی نے اس طرح روایت کیا کہ اگر کسی شے میں شفا ہے تو سینگیوں کے پچھنوں میں ہے۔[4] اور باقی حدیث کو ویسا ہی ذکر کیا اور یہ اسناد صحیح ہے اور انھوں نے اس کو نہیں نکالا۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے: "عَلَيْكُمْ بِالشِّفَائَيْنِ الْعَسَلُ وَالْقُرْآنُ" یعنی لازم پکڑو دو دواؤں کو (کہ وہ ہر مرض کی دوا ہیں) شہد اور قرآن کو۔[5] (رواه ابن ماجه وهذا إسناد جيد تفرد به ابن ماجه مرفوعاً)

ان احادیث میں بھی شہد کو سرد اور گرم مزاج کی تفریق کے بغیر شفا فرمایا ہے۔ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ تم میں جو کوئی شفا چاہے تو ایک کاغذ پر کتاب اللہ کی آیت لکھے اور آسمان کے پانی سے اس کو دھوئے اور اپنی بی بی سے اس کی خوشی اور رضا مندی سے ایک درہم لے اور شہد خریدے اور اس کو پی جائے کہ یہ کئی وجہ سے شفا ہے۔[6] اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [بني إسرائيل: ٨٢] "اور ہم قرآن میں سے جو نازل کرتے ہیں وہ مومنوں کے لیے شفا اور رحمت ہے۔" نیز فرمایا: ﴿ وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا ﴾ [ق: ٩] "اور ہم نے آسمان سے بابرکت پانی نازل کیا۔" نیز فرمایا: ﴿ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا ﴾ [النساء: ٤] "پھر اگر وہ اپنی مرضی سے تمھیں کچھ مہر چھوڑ دیں تو تم اسے شوق سے کھا سکتے ہو۔" اور شہد کے حق میں فرمایا: ﴿ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ﴾ (آیتِ باب) "اس میں لوگوں کے لیے شفا ہے۔"

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے، جس نے ہر ماہ میں تین صبح شہد چاٹا، اس کو بڑی بلا نہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥١١٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٧٤) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٣٥٦)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٣٥٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٠٥)

[4] مسند أحمد (٤/ ١٤٦) المعجم الكبير (١٧/ ٢٨٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٠٢٦)

[5] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٤٥٢) اس کی سند میں "ابو اسحاق" مدلس راوی ہے اور عنعنہ کے ساتھ بیان کر رہا ہے۔ البتہ اس کا موقوف ہونا صحیح ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٥١٤)

[6] تفسير ابن كثير (٢/ ٧٥٠)

پہنچے گی۔[1] (رواہ ابن ماجہ) اس کی سند میں زبیر بن سعید متروک ہے۔ ابو ابی بن ام حرام رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں: "عَلَيْكُمْ بِالسَّنَا وَالسَّنُّوْتِ فَإِنَّ فِيْهِمَا شِفَاءً مِنْ كُلِّ دَاءٍ إِلَّا السَّامُ" یعنی لازم پکڑو سنا (مکی) اور شہد کو کہ اِن دونوں میں ہر مرض کی دوا ہے سوائے موت کے۔[2] (رواہ ابن ماجہ) بعض نے کہا کہ سنوت سے مراد شہد ہے۔ بہرحال اس الہام میں جو خالق اَنام نے شہد کی مکھی کو کیا ہے اور وہ کمزور سی مخلوق ہے اور وہ بادیہ پیمائی کر کے تمام پھلوں سے رَس چوستی ہے، پھر موم اور شہد بناتی ہے، جو کہ تمام اشیا سے زیادہ پاکیزہ ہے، اس قوم کے لیے ایک نشانی ہے جو اس کے خالق و مقدر اور مسخر اور میسر کی عظمت میں غور وفکر کرتے ہیں اور اس سے اس ذاتِ باری کی دلیل پکڑتے ہیں جو قادر ہے، حکیم و علیم و کریم و رحیم ہے۔

وَفِيْ كُلِّ شَيْءٍ لَهُ آيَةٌ تَدُلُّ عَلٰى أَنَّهُ وَاحِدٌ

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ الہام وہ چیز ہے جو دل میں ابتداءً بغیر کسی ظاہری سبب کے پیدا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَأَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا﴾ [الشمس: ٨] "پھر اس کی بدی اور اس کا تقویٰ اس پر الہام کیا" اسی طرح جانوروں اور چوپایوں کو ان کے نفع اور نقصان کا الہام ہوتا ہے۔ آیتِ باب میں خطاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے، یا اصحابِ عقل وفکر میں سے ہر فرد کو جو اللہ پاک کی قدرت و وحدانیت پر استدلال کرتے ہیں اور اس کو تمام اشیا کا خالق اور مدبر جانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے شہد کی مکھی کو مسخر کیا ہے اور رُشد کا الہام فرمایا اور اُس میں یہ اعمالِ عجیبہ جس سے تمام عقل مند انسان عاجز ہیں، اس اندازے سے رکھے ہیں کہ وہ اپنا گھر چھ کونوں کی شکل کا، جس کے اضلاع برابر ہوتے ہیں، بناتی ہے۔ اس گھر کا کوئی خانہ کسی خانے سے بڑا نہیں ہوتا، اگر اس کے گھر گول یا مثلث یا مربع وغیرہ اشکال پر ہوتے تو اُن میں دراڑ ہوتی اور جگہ خالی رہتی، وہ ضائع ہو جاتی اور مقصد حاصل نہ ہوتا۔ اس لیے اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اس کو اس شکل مسدس کا الہام کیا کہ کوئی خلل پیدا نہ ہو اور کوئی خانہ خالی نہ رہ جائے۔

دوسرا الہام یہ کیا کہ اپنے اوپر ایک امیرِ کبیر مقرر کرے، جس کا حکم نافذ ہو اور یہ سب مکھیاں اس کی مطیع ہوں اور اس کا حکم بجا لائیں، یہ امیر اُن سب میں بڑے وجود والا اور اعظم الخلقہ ہوتا ہے، اس کا نام یعسوب النحل ہے، یعنی شہد کی مکھیوں کا بادشاہ۔[3] (کذا حکاہ الجوهري) تیسرا الہام یہ کیا کہ خانے کے ہر دروازے پر ایک دربان رہتا ہے۔ کیا مجال ہے کہ کوئی غیر مکھی اس طرف سے گھس آئے۔ چوتھا الہام یہ ہے کہ وہ اپنے گھر سے نکل کر چکر مارتی ہے اور

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٤٥٠) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ عبدالحمید بن سالم کا سماع سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٧٦٢)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٤٥٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٧٩٨)

[3] الصحاح للجوهري (٢/ ٢٠٠)

چرتی ہے، پھر اپنے گھر واپس آتی ہے، راہ نہیں بھولتی۔ اس کمزور سی جان کا ان عجیب خاصیتوں کا حامل ہونا اس کی مزید سمجھ داری اور دانائی کی دلیل ہے اور یہ الہامِ الٰہی پر دلیل ہے، جس طرح یہ مکھی پہاڑوں میں گھر بناتی ہے، اسی طرح درختوں چھتوں اور دیواروں میں گھر تیار کرتی ہے۔

تعریش کا اکثر استعمال لکڑی کے گھر پر ہوتا ہے۔ جنگلی مکھی کے گھر پہاڑوں اور درختوں پر ہوتے ہیں اور گھریلو مکھی کے گھر مکانوں اور اس جیسی دوسری جگہوں میں ہوتے ہیں۔ یہ درختوں کی کلیاں کھاتی ہیں اور اپنے رب کی راہوں میں داخل ہوتی ہیں، یہ راہیں اس کے لیے آسان کر دی گئی ہیں۔ ان مکھیوں کے پیٹ سے طرح طرح کے رنگ کا شہد نکلتا ہے۔ یہ اختلاف مکھیوں کی مختلف قسموں اور جہاں سے وہ کھاتی ہیں، اُن کے مختلف ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے اور پھر اُن کے پھلوں اور رنگوں کو کھانے کی وجہ سے بھی ہوتا ہے۔ پھر اس کے پیٹ میں جا کر شہد بن جاتا ہے۔ یہ قدرتِ الٰہی کے کمال پر دلیل ہے۔

امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا کہ شہد کے رنگ میں اختلاف مکھی کی عمر اور فصل کے سبب سے ہوتا ہے۔[1] امام شہاب رحمہ اللہ نے کہا کہ سفید رنگ جوان مکھی کا اور زرد رنگ اُدھیڑ عمر کی مکھی کا اور سرخ رنگ زیادہ عمر کی مکھی کا ہوتا ہے، لیکن اس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔[2] جمہور مفسرین رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ شہد مکھی کے منہ سے لعاب کی طرح بہتا ہے اور بعض نے کہا کہ اس کے نیچے سے نکلتا ہے اور کسی نے کہا کہ معلوم نہیں کہاں سے نکلتا ہے۔ اس شہد میں لوگوں کے لیے شفا ہے، یہی جمہور کا مذہب ہے۔ امام فراء، ابن کیسان رحمہ اللہ اور سلف کی ایک جماعت نے کہا کہ ضمیر قرآن کی طرف پھرتی ہے،[3] لیکن ظاہر سے عدول کی کوئی وجہ نہیں ہے اور اس سے مرجع و سیاق کی مخالفت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اہلِ علم نے اس بات میں اختلاف کیا ہے کہ یہ شفا اصل میں ہر بیماری کے لیے عام ہے یا خاص ہے۔ ایک گروہ نے کہا کہ عام ہے، ہر حال میں ہر ایک کے لیے۔ دوسرے گروہ نے کہا کہ بعض امراض کے ساتھ خاص ہے اور مقتضی عموم کو ہر علت اور ہر انسان میں نہیں ہے۔ یہ کوئی پہلا لفظ نہیں ہے جسے خاص کیا گیا ہے، بلکہ قرآن اس طرح کی تخصیص سے بھرا پڑا ہے۔

لغتِ عرب میں عام بہ معنی خاص بہت آتا ہے اور خاص بہ معنی عام۔ چناں چہ شفا کا نکرہ ہونا سیاقِ اثبات میں خصوص پر دلیل ہے تو باتفاق اہلِ زبان عام نہ ہوگا۔ محققین اہلِ اصول کا قول بھی یہی ہے۔ اگر اس عمومیت کو تعظیم کے واسطے ٹھہرائیں، تب بھی عموم کے لیے مفید نہیں ہے اور علمِ طب سے تجربہ اور قوانین کے تحت یہ بات ظاہر اور ثابت ہے کہ جب شہد کا استعمال مفرداً ہوتا ہے تو خاص امراض کی دوا ٹھہرتا ہے اور اگر دوسری چیزوں کے ساتھ ملا کر استعمال ہو، جیسے: معجونیں یا اسی جیسی اور چیزیں تو پھر بہت سی بیماریوں کی دوا ہوتا ہے۔ لیکن صحیح بخاری جس میں استطلاقِ بطن کا

---

[1] تفسیر البیضاوي (٣/ ٤٠٩) [2] حاشیة الشهاب علیٰ تفسیر البیضاوي (٥/ ٣٤٨) [3] تفسیر القرطبي (١٠/ ١٣٦)

ذکر آیا ہے[1] وہ اس مذاہب کی واضح دلیل ہے، جو کہتے ہیں کہ شہد میں عام شفا ہے، کیوں کہ نبی اکرم ﷺ کا یہ فرمان کہ "صَدَقَ اللّٰہُ" اگر کسی خاص بات کے لیے ہوتا تو شہد پلانے کا حکم دوبارہ نہ فرماتے۔

بعض ملحدین نے، جن کے دل میں بیماری ہے، اس حدیث پر اعتراض کیا ہے کہ یہ اطبا کے اجماع کے خلاف ہے، کیوں کہ عسل کو وہ دست آور بتاتے ہیں، پھر دست والے کو اس کا پلانا چہ معنی دارد؟! اس کا جواب امام خازن رحمہ اللہ نے طبی طریقے پر دیا ہے جس کو شیخ سلیمان جمل نے نقل کیا ہے۔ پھر کہا ہے: "وَلَسْنَا نَقْصِدُ الْإِسْتِظْهَارَ لِتَصْدِيْقِ الْحَدِيْثِ بِقَوْلِ الْأَطِبَّاءِ، بَلْ لَوْ كَذَّبُوْهُ لَكَذَّبْنَاهُمْ، وَكَفَّرْنَاهُمْ بِذٰلِكَ" انتہی یعنی ہماری یہ غرض نہیں کہ ہم اطباء کے قول کے ساتھ حدیث کو تقویت دیں، نہیں بلکہ اگر وہ حدیث کی تکذیب کریں گے تو ہم ان کی تکذیب کریں گے اور ہم اس سبب سے ان کو کافر کہیں گے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب کوئی پھوڑا پھنسی یا اور کوئی چیز ہوتی، یہاں تک کہ دمل، تو وہ اس پر شہد ملتے اور ابو وجرہ شہد کا سرمہ لگاتے اور سونگھتے، یعنی ناس لیتے اور دوا کرتے۔[3] (ذکرہ القرطبي)

اسباب میں سلف کی ایک جماعت سے آثار مروی ہیں۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا کہ شہد امراضِ بلغمیہ میں لوگوں کے لیے بہ نفسہٖ شفا ہے یا دوسری چیزوں کے ساتھ ملنے سے تمام بیماریوں میں شفا ہے۔ اس لیے کہ بہت کم کوئی ایسی معجون ہے کہ شہد اس کا جز نہ ہو۔[4] بالجملہ شہد کی مکھی کے اس امر میں اس قوم کے لیے نشانی ہے جو اللہ تعالیٰ کی کاریگری میں غور وفکر سے کام لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کے عجائب میں غور کرتے ہیں، کیوں کہ شہد کی مکھی کا معاملہ عجیب وغریب اور دقیق اور اہم امور میں سے ہے اور جو کوئی ان علومِ دقیقہ اور شہد کی مکھی کے افعالِ عجیبہ پر پوری طرح سے تدبر کرے گا تو وہ جان لے گا کہ ضرور کوئی خالق قادرِ مطلق اور حکیم ہے جو شہد کی مکھی کو ان اشیا کا الہام کرتا ہے اور اُن سے اِن عجیب وغریب حالات کے پیدا ہونے کا سبب بنتا ہے۔[5]

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰىكُمْ ۙ۫ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝۷۰

اور اللہ نے تمھیں پیدا کیا، پھر وہی تمھیں وفات دیتا ہے اور تم میں سے کوئی ناکارہ عمر تک پہنچا دیا جاتا ہے، تاکہ وہ علم کے بعد کچھ نہ جانے، بے شک اللہ خوب جاننے والا، خوب قدرت والا ہے (70)

انسانی زندگی کے مختلف مراحل:

یعنی اس اُمت میں کامل پیدا ہو کر پھر ناقص ہونے لگیں گے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے بندوں میں اپنے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٣٦٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢١٧)
[2] تفسير الخازن (٤/ ١٠٢)
[3] تفسير القرطبي (١٠/ ١٣٦)
[4] تفسير البيضاوي (٣/ ٤٠٩)
[5] فتح البيان (٧/ ٢٧١۔ ٢٧٧)

تصرف کی خبر دی کہ اس نے ان کو عدم سے وجود بخشا، پھر اس کے بعد موت دے گا۔ بعض کو ان میں اتنا چھوڑ دیتا ہے کہ اس کو پیری وضعیفی پا لیتی ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَيْبَةً ۚ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ ﴾ [الروم: ٥٤] ''اللہ وہ ذات ہے جس نے تمھیں کمزوری (کی حالت) سے پیدا کیا، پھر اس نے کمزوری کے بعد قوت دی، پھر اس نے قوت کے بعد کمزوری اور بڑھاپا دیا، وہ جو چاہے پیدا کرتا ہے، اور وہ خوب جاننے والا، بڑا قدرت والا ہے۔''

سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ارذلِ عمر پچھتر سال ہے۔[1] اس سن میں ضعفِ قوت اور عقل کی کمی اور حافظے کی خرابی اور علم میں کمی آ جاتی ہے، اس لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا کہ عالم ہونے کے بعد اب بڑھاپے کی وجہ سے عقل کی کمی کی وجہ سے کچھ نہیں جانتا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دعا کیا کرتے تھے: «أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْبُخْلِ وَالْكَسَلِ وَالْهَرَمِ وَ أَرْذَلِ الْعُمُرِ وَعَذَابِ الْقَبْرِ وَفِتْنَةِ الدَّجَّالِ وَفِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ» یعنی میں پناہ مانگتا ہوں بخل اور سستی اور بڑھاپے اور نکمی عمر اور قبر کے عذاب اور دجال کے فتنے اور جینے اور مرنے کے فتنے سے۔[2] زہیر بن ابی سلمیٰ نے اپنے معلقۂ مشہورہ میں کہا ہے ؎

سَمِئْتُ تَكَالِيْفَ الْحَيَاةِ وَمَنْ يَّعِشْ ثَمَانِيْنَ عَامًا لَا أَبَا لَكَ يَسْأَمِ

[میں زندگی کی تکلیفوں سے اکتا گیا ہوں اور جو بھی (میری طرح) اسی 80 سال زندہ رہے گا، تیرا باپ نہ رہے، وہ لازماً اکتا ہی جاتا ہے]

رَأَيْتُ الْمَنَايَا خَبْطَ عَشْوَاءَ مَنْ تُصِبْ تُمِتْهُ وَمَنْ تُخْطِئْ يُعَمَّرْ فَيَهْرَمِ[3]

[میں موت کو اندھی موت کی طرح دیکھتا ہوں کہ جس کو وہ پالے اسے مار دیتی ہے اور جس سے وہ چوک جائے اس کی عمر بڑھا دیتی ہے اور وہ نہایت بوڑھا ہو جاتا ہے]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تم کو بنایا ہے تم کچھ چیز نہ تھے، پھر جب تمھاری آجال (مدتِ مقررہ) بچپن یا جوانی یا کہولت میں منقضی ہو جاتے ہیں تو تم کو وہ موت دیتا ہے اور تم میں سے کسی کو ضعیف وخسیس اور ردی تر عمر کی طرف پھیرتا ہے، یہ بڑھاپا ہے۔ امام نیسابوری رحمہ اللہ نے کہا کہ اہلِ عقل نے انسان کی عمر کے چار مراتب ذکر کیے ہیں: اول سن نشو ونما کا ہے، یہ اول عمر سے ۳۳ سال تک ہوتا ہے۔ یہی جوانی کی انتہا ہے، اسی کو

[1] تفسیر الطبري (١٧/ ٢٥١) اس کی سند میں ''اصبغ بن نباتہ'' اور سعد بن طریف'' سخت ضعیف راوی ہیں۔

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٤٣٠۔ ٢٦٦٨) [3] دیوان زهیر بن أبي سلمیٰ (١/ ٥)

﴿ يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ﴾ [الأنعام: ۱۵۲] کہتے ہیں۔ دوم سن وقوف ہے، یہ ۳۳ سال سے چالیس ۴۰ تک ہوتا ہے، یہ قوت کی انتہا اور عقل کے مکمل ہونے کا وقت ہے۔ تیسرا سنِ کہولت چالیس سے ساٹھ برس تک ہے، اس مرتبے میں انسان کمی کی طرف جلدی کرتا ہے، لیکن یہ کمی چھپی ہوتی ہے، ظاہر نہیں ہوتی۔ چوتھا سنِ شیخوخت و انحطاط ہے، ساٹھ برس سے آخر عمر تک اس مرتبے میں نقص کھل جاتا ہے، بڑھاپا ہوتا ہے اور عقل میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔[1] سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ۷۵، [2] بعض نے ۸۰۔ اور امام قتادہ رحمہ اللہ نے ۹۰ برس کہے ہیں۔[3]

اور اس آیت کی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ﴿ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْۤ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ﴾ [التين: ٤۔ ٥] ''ہم نے انسان کو بہترین شکل وصورت میں پیدا کیا۔ پھر ہم نے اسے نیچوں سے نیچے پھینک دیا۔'' امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ سٹھیا جانا ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ لَمْ يُرَدَّ إِلٰى أَرْذَلِ الْعُمُرِ'' یعنی قاریِ قرآن سٹھیاتا نہیں،[4] یہ قرآن کریم کی دائمی تلاوت کی برکت ہے۔ وللہ الحمد۔ امام طاؤس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''العالم لا يخرف''، یعنی عالم باللہ سٹھیاتا نہیں۔[5]

صحیح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارذل عمر سے پناہ مانگنا آیا ہے۔[6] یہ رذالتِ عمر اس لیے ہوتی ہے کہ علم وعقل کے بعد پھر کچھ جاننا بوجھنا نہیں، نہ تھوڑا نہ بہت۔ یا اس جگہ علم سے مراد معلوم ہے یا عقل۔ بعض نے کہا کہ مراد یہ ہے کہ جتنا علم حاصل ہو چکا ہے، اب اس سے زیادہ حاصل نہیں ہوتا۔ بعض نے کہا کہ بچے کی طرح بے عقل ہو جاتا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ تم میں سے کوئی اتنا بڑا ہوتا ہے کہ اس کی عقل جاتی رہتی ہے اور وہ سٹھیا جاتا ہے، اس کے بعد کہ وہ عالم تھا۔[7] اللہ اپنی قدرت دکھاتا ہے کہ جس طرح وہ مارنے اور زندہ کرنے پر قادر ہے، اسی طرح علم سے جہالت کی طرف منتقل بھی کر دیتا ہے۔ یہی دلیل ہے اس بات پر کہ مرنے کے بعد اُٹھایا جانا درست ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو اکمل سے ارذل کی طرف لوٹائے جانے اور زندگی سے فنا کی طرف منتقل کیے جانے کا علم ہے اور وہ قادر ہے کہ جس چیز کو چاہے اور جس طرح چاہے بدل دے۔[8]

وَ اللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ؕ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝۷۱

اور اللہ نے رزق میں تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی، پھر جن لوگوں کو فضیلت دی گئی وہ اپنا

[1] فتح القدير (۳/ ۲۴۵۔ ۲۴۶) [2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [3] تفسير البغوي (۵/ ۳۰)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (۷/ ۲۲۹۰) فتح القدير (۳/ ۲۴۸) [5] مصنف ابن أبي شيبة (۷/ ۲۴۲)
[6] صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۶۶۷) [7] معاني القرآن (۳/ ۲۱۱) [8] فتح البيان (۷/ ۲۷۷۔ ۲۷۸)

رزق ان لوگوں کی طرف نہیں لوٹانے والے جو ان کے دائیں ہاتھ کی ملکیت میں (غلام) ہیں کہ وہ اس (رزق) میں برابر ہوں۔ کیا پھر وہ اللہ کی نعمتوں ہی کے منکر ہیں؟ (71)

امورِ معیشت، ایک نعمت اور نشانی:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب کسی کا غلام کھانا پکا لائے، گرمی اور دھواں آپ اُٹھائے اور تحفۂ مال اس کو پہنچائے تو لازم ہے کہ اس کو ساتھ بٹھا کر کھلائے، اگر یہ نہ ہو سکے تو دو ایک نوالے اس کے ہاتھ میں رکھ دے۔[1] اللہ نے اس جگہ مشرکوں کی جہالت اور کفر کا حال بیان کیا کہ یہ لوگ اپنے اعتقاد میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے شرکا رکھتے ہیں، حالاں کہ اس بات کے معترف ہیں کہ یہ سب اللہ کے بندے ہیں، جس طرح کہ حج کے وقت اپنے تلبیے میں کہتے تھے: "لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ، إِلَّا شَرِيْكًا هُوَ لَكَ، تَمْلِكُهُ وَمَا مَلَكَ" یعنی ہم تیری جناب میں حاضر ہیں، تیرا کوئی شریک نہیں ہے، مگر ایک شریک کہ تو اس کا مالک ہے اور وہ کسی چیز کا مالک نہیں ہے۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے مشرکوں پر انکار کیا کہ تم تو اس بات پر راضی ہی نہیں ہوتے کہ اپنے غلاموں اور مملوکوں کو رزق میں برابر رکھو۔ پھر اللہ تعالیٰ کس طرح اس بات کو پسند کر سکتا ہے کہ الوہیت وتعظیم میں اس کے بندے اس کے برابر ہوں۔ جس طرح کہ دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ؕ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ﴾ [الروم: ٢٨] "اس نے تمھارے (سمجھانے کے) لیے خود تمھی میں سے ایک مثال بیان کی ہے کہ ہم نے تمھیں جو رزق دیا ہے، کیا اس میں جس کے تمھارے دائیں ہاتھ مالک ہوئے ہیں شریک ہو سکتے ہیں کہ تم اس میں برابر ہو جاؤ۔ تم ان سے ایسے ڈرتے ہو جیسے اپنے (ہمسر) لوگوں سے۔ اسی طرح ہم (اپنی) آیات ان لوگوں کے لیے کھول کھول کر بیان کرتے ہیں جو عقل کرتے ہیں۔"

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ وہ اپنے مالوں اور عورتوں میں اپنے غلاموں کی شرکت نہیں کرتے تھے تو پھر میرے بندوں کو کس طرح میری سلطنت میں شریک کرتے ہیں۔ فذلك قوله ﴿اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ﴾ ان کے دوسرے الفاظ یہ مروی ہیں: «فَكَيْفَ تَرْضَوْنَ لِيْ مَا لَا تَرْضَوْنَ لِأَنْفُسِكُمْ»[2] [تو تم میرے لیے وہ چیز کیوں پسند کرتے ہو جو اپنے لیے پسند نہیں کرتے] اسی جگہ سے یہ مثل مشہور ہے کہ "آنچہ برخود نہ پسندی بر دیگرے مپسند" (جو تو خود اپنے لیے پسند نہیں کرتا، دوسرے کے لیے بھی وہ پسند نہ کر) امام مجاہد رحمہ اللہ نے اس آیت میں کہا ہے کہ یہ الٰہِ باطلہ کی مثال ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ ایک مثال بیان کی ہے کہ تم میں کوئی ایسا شخص

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٥١٤٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٦٣)
(2) تفسير الطبري (١٧/ ٢٥٢)

ہے، جس نے اپنے مملوک کو اپنی زوجہ اور بچھونے میں شریک کیا ہو۔ تم اللہ کی مخلوق اور بندوں کو اللہ کے برابر کرتے ہو۔ سو اگر تم اپنے لیے اس بات کو پسند نہیں کرتے ہو تو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اس تنزیہ کا زیادہ تر مستحق ہے۔[1]

پھر فرمایا کہ کیا اللہ کی نعمت کے منکر ہیں کہ کھیتی باڑی اور چوپایوں میں جو اللہ تبارک وتعالیٰ کے پیدا کیے ہوئے ہیں، شرکا کا ایک حصہ ٹھہراتے ہیں اور کفرانِ نعمت کر کے غیر کو اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو خط لکھا تھا: "اِقْنَعْ بِرِزْقِكَ مِنَ الدُّنْيَا، فَإِنَّ الرَّحْمٰنَ فَضَّلَ بَعْضَ عِبَادِهٖ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ، بَلَاءٌ يَبْتَلِي بِهٖ كُلًّا، فَيَبْتَلِي مَنْ بُسِطَ لَهٗ كَيْفَ شُكْرُهٗ لِلّٰهِ، وَأَدَاءُهُ الْحَقَّ الَّذِيْ افْتَرَضَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ وَخَوَّلَهٗ؟" (رواہ ابن أبي حاتم) یعنی تو اپنے رزق پر جو دنیا میں تجھ کو ملا ہے قناعت کر، کیوں کہ رحمان نے اپنے بعض بندوں کو بعض پر رزق میں زیادتی دی ہے، یہ ایک آزمایش ہے، جس میں سب کے سب مبتلا ہیں، سو جس کے لیے رزق کی فراخی ہوئی ہے، دیکھا جاتا ہے کہ وہ کس طرح اللہ کا شکر بجا لاتا ہے اور جو حق کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس مال میں فرض کیا تھا، اسے کیوں کر ادا کیا؟[2] معلوم ہوا کہ دولت مند سے شکر اور حق کا ادا کرنا مطلوب ہے اور مفلس قانع سے صبر، شکر اور قناعت ؎

شکوۂ رزق مکن ہمچو تنگ حوصلگان | در گلو گریہ گرہ چون شودت دانہ شمر

"کم حوصلہ لوگوں کی طرح رزق کی شکایت مت کر، جب رونا تیرے گلے میں گرہ بن کر اٹک جائے تو تسبیح بیان کر۔"

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بعض کو غنی اور مال دار کیا ہے اور بعض کو فقیر و مسکین، کوئی مالک ہے اور کوئی مملوک۔ غرض یہ کہ بنی آدم کو ایک دوسرے سے مختلف پیدا کیا ہے، کسی پر رزق کھول دیا اور وسیع کر دیا ہے اور اتنا مال دیا ہے کہ ہزاروں بنی آدم کو نہیں دیا اور کسی شخص پر رزق کی اتنی تنگی فرمائی کہ بغیر سوال کیے ہوئے اس کو زندہ رہنے کے لیے روزی بھی میسر نہیں ہے اور وہ گدائی کرتا ہے، ہاتھ پھیلا کر سوال کرتا ہے۔ غرض یہ کہ ایک پر مال کی کثرت کی ہے اور دوسرے پر قلت، اس میں حکمتِ بالغہ ہے، جس کے سمجھنے سے بندوں کی عقلیں قاصر ہیں اور جس کے اسباب کا سمجھ میں آنا مشکل ہے۔ جس طرح یہ فرق مال میں رکھا ہے، اسی طرح عقل و علم و فہم و پیدایش و اخلاق و جہالت و قوت و بدن کی کمزوری، حسن اور بدصورتی و صحت اور بیماری وغیرہ تمام حالات میں بھی فرق رکھا ہے، سو جن کو زیادہ رزق ملا ہے، وہ کچھ اس رزق کو اپنے مملوکوں پر برابر تقسیم نہیں کرتے، بلکہ ان کو تھوڑا سا دیتے ہیں۔

---

[1] تفسیر الطبري (١٧/ ٢٥٢۔ ٢٥٣)
[2] تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٩١)

اسی کی مثال اللہ تعالیٰ نے بت پرستوں کی بیان کی ہے، یعنی جب تمھارے لونڈی غلام تمھارے برابر نہیں ہیں اور تم اس پر راضی بھی نہیں ہو کہ ان کو اپنے برابر کرو یا وہ تمھاری برابری کریں تو پھر وہ تم سے برابر نہیں۔ ان کو تو تم نے اپنے مالوں میں شریک ہی نہیں کیا، پھر اللہ کے بعض بندوں کو اللہ کا شریک ٹھہرا کر کس طرح پوجتے ہو یا بعض مخلوقات کو جیسے اصنام اور اوثان ہیں، کس طرح عبادت میں شریک کرتے ہو؟ یہ معنی امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ذکر کیے ہیں۔[1] کیا یہ لوگ اللہ کی نعمتوں کے منکر ہیں کہ شرک کرتے ہیں۔ نعمت یہ تھی کہ مالکوں کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مملوکوں پر فضیلت بخشی ہے۔ صیغۂ غیب کی قراءت زیادہ مناسب ہے بہ سببِ قربِ مخبر عنہ کے۔ نیز اگر یہ خطاب ہوتا تو اس کے مخاطب مسلمان ٹھہرتے، حالاں کہ یہ سوالیہ انداز انکار اور ڈانٹ ڈپٹ کے لیے ہے اور قراءتِ خطاب پر آیت کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ مالک اپنے مملوکوں کو رزق نہیں دیتے، بلکہ تمھارے اور اُن کے رازق ہم ہیں، تم یہ گمان نہ کرو کہ تم کچھ ان کو عطا کرتے ہو، بلکہ یہ تو میرا رزق ہے جس کو میں نے ان کو دینے کے لیے تمھارے ہاتھوں پر جاری کیا ہے، سو تم اور وہ ممالیک برابر ہو۔ کچھ تم کو ان پر فضیلت نہیں ہے، کیا تم یہ بات نہیں سمجھتے ہو کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی نعمت کا انکار کرتے ہو؟[2]

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ؕ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ﴿٧٢﴾

اور اللہ نے تمھارے لیے تمھی میں سے بیویاں بنائیں اور اسی نے تمھارے لیے تمھاری بیویوں سے بیٹے اور پوتے بنائے اور تمھیں پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا۔ کیا پھر بھی وہ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کرتے ہیں؟ (72)

بیویاں، بیٹے اور پوتے اللہ تعالیٰ کی نعمت ہیں:

یعنی بتوں کا احسان مانتے ہیں کہ بیماری سے چنگا کیا یا بیٹا دیا یا روزی دی اور یہ سب جھوٹ۔ اور وہ اللہ جو سچ مچ دینے والا ہے، اس کے شکر گزار نہیں۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے بندوں پر اپنی نعمت کا ذکر کیا کہ اس نے انھیں کی جنس اور شکل کی بیبیاں ان کو دیں، اگر یہ بیبیاں کسی دوسری قسم کی ہوتیں تو باہم اُلفت ومحبت اور رحمت حاصل نہ ہوتی۔ یہ اس کا رحم ہے کہ اس نے بنی آدم کو مرد اور عورتیں پیدا کیا اور عورتوں کو مردوں کی بیویاں ٹھہرایا، پھر اُن بیویوں سے بیٹے اور پوتے عنایت کیے۔ ﴿حَفَدَةً﴾ بیٹوں کی اولاد کو کہتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام عکرمہ، حسن، ضحاک اور ابن زید رحمہ اللہ کا

---

[1] تفسیر الطبري (۱۷/ ۲۵۱۔ ۲۵۲) [2] فتح البیان (۷/ ۲۷۹۔ ۲۸۰)

یہی قول ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ حَفَدَةً ﴾ سے مراد انصار و اعوان اور خدام ہیں۔ امام طاؤس رحمہ اللہ اور کئی ایک اہلِ علم نے کہا کہ یعنی خدام۔ یہی قول امام قتادہ، ابو مالک اور حسن بصری رحمہم اللہ کا بھی ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا کہ "الحفدة من خدمك من ولدك وولد ولدك"، یعنی حفدہ وہ ہیں جو تیری اولاد میں سے اور تیری اولاد کی اولاد میں سے تیرے خادم ہوں۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا کہ عرب کی خدمت ان کی اولاد کرتی تھی۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا دوسرا قول یہ ہے کہ ﴿ حَفَدَةً ﴾ زن و مرد کی اولاد ہے، جو اس شخص سے نہ ہو۔ بعض نے کہا کہ ﴿ حَفَدَةً ﴾ وہ آدمی ہے جو ایک آدمی کے سامنے کام کرے۔ کسی نے کہا: ﴿ حَفَدَةً ﴾ آدمی کی بہنیں ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، امام مسروق، ابو الضحیٰ، ابراہیم نخعی، سعید بن جبیر، مجاہد اور قرظی رحمہم اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے ایک الفاظ یہ ہیں کہ حفدہ سسرال ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ سارے اقوال ﴿ حَفَدَةً ﴾ کے معنی میں داخل ہیں، یعنی خدمت کے معنی میں۔ اسی جگہ سے قنوت میں آیا ہے: "إِلَيْكَ نَسْعٰى وَنَحْفِدُ" یعنی ہم تیری ہی طرف دوڑتے ہیں اور تیرے ہی خادم ہیں[1] جو خدمت اولاد، خادموں اور سسرال سب سے حاصل ہوتی ہے، اس لیے نعمت ان سب میں ہے۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جس نے حفدہ کو بیویوں سے متعلق ٹھہرایا ہے تو اس سے مراد یہی اولاد اور اولاد کی اولاد اور سسرال ہیں، کیوں کہ وہ بیٹیوں کے شوہر ہیں یا بیوی کی اولاد ہیں۔ امام شعبی اور ضحاک رحمہما اللہ نے کہا کہ یہ لوگ غالباً مرد کے زیرِ پناہ اور خدمت گزار ہوتے ہیں۔ سیدنا بصرہ بن اکثم رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے: « الولد عبد لك » یعنی اولاد تیری غلام ہے۔[2] (رواه أبو داود) جس نے حفدہ کو خادم کے معنی میں کہا ہے، اس کے نزدیک یہ اس قول پر معطوف ہے: ﴿ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا ﴾ (آیتِ باب) یعنی اللہ نے تمھارے لیے اولاد و ازواج کو خادم مقرر کیا اور کھانے اور پینے کی اشیا دیں۔[3]

پھر جو لوگ منعم حقیقی کی عبادت میں غیر کو اللہ کا شریک کرتے ہیں، ان پر انکار فرمایا اور کہا کہ کیا تم باطل پر، یعنی بتوں اور شریکوں پر ایمان لاتے ہو اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار کرتے ہو اور اُن کو چھپاتے ہو اور ان کو غیر کی طرف منسوب کرتے ہو۔ صحیح حدیث میں مروی ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ قیامت کے دن اپنے بندے سے بطورِ احسان رکھنے کے فرمائے گا: "ألم أزوجك، ألم أكرمك، ألم أسخرلَكَ الخيل والأبل، وَ أَذَرْكَ تَرْأَسُ وَتَرْبَعُ"

---

[1] صحيح ابن خزيمة (٢/ ١٥٥) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے، دیکھیں: قيام رمضان للألباني (١/ ٢٣)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٣١) اس کی سند میں "ابن جریج" مدلس راوی ہے اور عنعنہ کے ساتھ بیان کر رہا ہے۔ مزید دیکھیں: ضعيف أبي داود للألباني (٢/ ٢١٩)

[3] تفسير الطبري (١٧/ ٢٥٣۔ ٢٥٨) تفسير ابن كثير (٢/ ٧٥٢۔ ٧٥٣)

یعنی کیا میں نے تجھ کو بیوی نہیں دی؟ تجھے عزت نہیں دی تھی؟ گھوڑے اور اونٹ کو تیرے مسخر نہیں کیا تھا؟ کیا تجھ کو چھوڑے نہیں رکھا کہ تو سرداری کرتا اور تو (لوگوں کے مالوں سے) چوتھا حصہ نہیں لیتا تھا؟"[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تمھاری جانوں میں سے تمھارے ازواج مقرر کیے۔ مفسرین کہتے ہیں یعنی عورتیں کیوں کہ حوا آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا ہوئی ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ آدم علیہ السلام پیدا ہوئے، پھر اُن کی زوجہ ان سے پیدا ہوئیں۔[2] یہ اس لیے کہ جنس جنس کی طرف مائل ہوتی ہے اور غیر جنس سے وحشت کرتی ہے۔ یہی انسیت جو مرد اور عورت کے درمیان ہے، نسل کا سبب ہے، یہی نسل مرد و زن کی قسموں کا مقصود ہے۔ بیٹیوں کا ذکر نہیں کیا، اس لیے کہ لوگ بیٹیوں سے کراہت کرتے ہیں، لہٰذا جو چیز پسند تھی، اسی کا ان پر احسان رکھا۔

﴿حَفَدَةً﴾ حافد کی جمع ہے۔ حافد وہ ہے جو خدمت کرنے میں جلدی کرے۔ ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حفد بہ معنی عمل اور خدمت ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ حفید پوتے اور پوتی اور نواسی کو کہتے ہیں۔[3] بعض نے کہا ہے کہ حفدہ بیٹیاں ہیں جو باپ کی خدمت کرتی ہیں۔ یہ سب اقوال ایک دوسرے کے قریب ہیں اور لفظ مشترک معانی کے حساب سے ان سب کو شامل ہے۔ بہت سے علما نے کہا ہے کہ حفدہ اولاد کی اولاد ہے اور اسی کو ترجیح بھی دی ہے۔

"طیبات" سے مراد طرح طرح کے پھل اور اَناج اور حیوان اور حلال اور پاکیزہ مشروبات ہیں۔ من تبعیض کا اسی لیے ہے کہ ساری پاکیزہ چیزیں جنت میں مجتمع ہوں گی۔ دنیا میں جو رزق ہے وہ اس کا ایک نمونہ ہے۔ باطل سے مراد بتوں کے بارے میں یہ اعتقاد رکھنا ہے کہ وہ نفع اور نقصان پہنچا سکتے ہیں یا بحیرہ، سائبہ وغیرہ اور اس جیسے دوسرے جانوروں کو حرام کرنا ہے۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا کہ باطل شیطان ہے اور اللہ کی نعمت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔[4]

وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ شَيْـًٔا وَّ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۝۷۳ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۷۴

اور وہ اللہ کے سوا ان کی عبادت کرتے ہیں جنھیں آسمانوں اور زمین سے ان کے لیے کسی رزق کا کوئی اختیار نہیں اور نہ وہ (اس کی) استطاعت ہی رکھتے ہیں (73) چناں چہ تم اللہ کی مثالیں نہ بیان کرو۔ بے شک اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے (74)

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٦٨) [2] تفسير الطبري (١٧/ ٢٥٣)
[3] تفسير القرطبي (١٠/ ١٤٣) [4] الدر المنثور (٥/ ١٤٩) فتح البيان (٧/ ٢٨١ ـ ٢٨٢)

غیر اللہ کی عبادت سے انکار اور اللہ تعالیٰ کے لیے مثالیں بیان کرنے کی ممانعت:

یعنی نہ آسمان سے مینہ برسائیں نہ زمین سے اناج نکالیں۔ مشرک کہتے ہیں کہ مالک اللہ ہی ہے یہ لوگ اس کی سرکار میں مختار ہیں، اس واسطے ان کو پوجیے۔ سو یہ غلط مثال ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہر چیز آپ کرتا ہے، کسی کے سپرد نہیں کر رکھا اور اگر صحیح مثال چاہو تو آگے دو مثالیں فرمائیں۔

اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کے حال کی خبر دی ہے جو اس کے ساتھ غیر کو پوجتے ہیں، حالاں کہ منعم حقیقی اور فضل وکرم کرنے والا، خالق اور رازق وحدہ لاشریک لہ وہی ہے۔ خبر دی ہے کہ یہ لوگ بتوں، شریکوں اور اوثان کے عبادت گزار ہیں، جو آسمان اور زمین میں کسی طرح کی ملکیت نہیں رکھتے، نہ پانی اُتار سکیں، نہ کھیتی اور درخت اُگا سکیں، ان کو ہرگز ان کاموں پر قدرت نہیں ہے، گو وہ ارادہ کیوں نہ کریں۔ لہٰذا شریک اور ساجھے مقرر کرنے سے منع کیا ہے کہ تم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے مثالیں نہ ٹھہراؤ۔ اللہ تعالیٰ اس امر کا عالم و شاہد ہے کہ لا الہ الا اللہ ھو اور تم اپنی کم عقلی اور جہالت سے غیر کو اس کی عبادت میں شریک کرتے ہو اور برابر ٹھہراتے ہو۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ﴿ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ سے مراد بت اور اس جیسی اور چیزیں ہیں، جو نہ کچھ نفع دے سکیں اور نہ نقصان پہنچا سکیں اور نہ آسمانوں اور زمین میں سے کچھ رزق اور تسکین اُتار سکیں اور نہ خیر اور زندگی اور موت کے بعد زندہ کرکے اُٹھانے کی ملکیت رکھتے ہیں، بلکہ محض عاجز ہیں، کسی طرح کی طاقت نہیں رکھتے۔ اب تم اللہ کے لیے مثال مت بیان کرو، کیوں کہ وہ اَحد، صمد، لم یلد اور لم یولد، ولم یکن لہ کفوا اَحد ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی مثل نہیں ہے۔[1] کفار کہتے تھے کہ معبود عالم کا رُتبہ اس سے زیادہ ہے کہ ہم میں سے کوئی اس کو پوجے، اس لیے وہ بتوں اور ستاروں کو اپنا وسیلہ ٹھہراتے تھے، جس طرح کہ چھوٹے (حقیر) آدمی بڑے حضرات (سرداروں) کی خدمت بجا لاتے ہیں اور وہ بڑے بادشاہوں کی خدمت کرتے ہیں، کیوں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو معلوم ہے کہ تم پر کیا عبادت فرض ہے اور تم نہیں جانتے کہ اس شرکیہ عبادت کا انجام کتنا برا ہے۔ اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے عذاب کے سامنے آنا کچھ اچھی بات نہیں ہے، اللہ کو سب باتوں کا علم ہے اور تم کو نہیں، بلکہ تمھارا یہ فعل فاسد، وہم باطل اور پر خلل خیال ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ مراد بتوں کو معبود بنانا ہے،[2] میں کہتا ہوں کہ الفاظ ﴿ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ عام ہیں، اللہ کے سوا ہر ایک کو شامل ہیں، خواہ بُت ہوں، اصنام، یا اوثان ہوں، یا شریک، یا مردے، یا طاغوت، یا تمام جمادات ہوں۔ کائنات میں سے جس کسی کو کوئی شخص اللہ کی عبادت اور دعا اور استعانت اور استغاثے میں شریک کرتا ہے وہ مشرک ہو جاتا ہے۔ توحید اور ردِ شرک میں لکھے جانے والے رسائل میں اس مقام کی تفصیل موجود ہے۔

---

[1] معاني القرآن (۳/ ۲۱۳)
[2] تفسير الطبري (۱۷/ ۲۶۰) فتح البيان (۷/ ۲۸۳۔ ۲۸٤)

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّ مَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّ جَهْرًا ۭ هَلْ يَسْتَوٗنَ ۭ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾

اللہ نے مثال بیان کی ایک غلام مملوک کی جو کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا، اور (دوسرا) وہ جسے ہم نے اپنی طرف سے اچھا رزق دیا، چنانچہ وہ اس میں سے خفیہ اور علانیہ خرچ کرتا ہے۔ کیا وہ دونوں برابر ہیں؟ تمام حمد اللہ ہی کے لیے ہے، بلکہ ان کے اکثر لوگ (یہ حقیقت بھی) نہیں جانتے (75)

کافر اور مومن کی ایک مثال:

یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہر چیز کا مالک ہے، جس کو جو چاہے سو دے اور بت کسی چیز کا مالک نہیں، بلکہ وہ خود پرایا مال ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہ کافر اور مومن کی ایک مثال ہے، جو اللہ تعالیٰ نے بیان کی ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کا قول بھی یہی ہے۔ اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے۔ بندۂ مملوک کسی شے پر قادر نہیں ہوتا، یہ کافر کی مثال ہے اور جس کو اچھا رزق ملا ہے اور وہ اس کو کھلے اور چھپے خرچ کرتا ہے، یہ مومن کی مثال ہے۔[1] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ ایک مثال بیان کی گئی ہے وثن اور حق تعالیٰ کی۔[2] کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں، کوئی نہیں بلکہ ان کے درمیان فرق بالکل ظاہر، واضح اور روشن ہے، جس کو کوئی کند ذہن بھی مجہول نہیں کہے گا۔ اسی لیے الحمد للہ فرمایا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی بات کہی جس سے خالق حق تعالیٰ سبحانہ اور اُن بتوں کے درمیان جنھیں اللہ کا شریک بناتے ہیں، استدلال کیا جائے۔ ایک تو بندہ (غلام) مملوک ہے، اس کو کسی چیز کی قدرت نہیں۔ غلام کی قید سے مکاتَب (وہ غلام جس کو لکھ کر دیا جائے کہ اتنا مال دے دے تو تو آزاد ہے) اور ماذون (جن کو کسی چیز کا اذن دیا گیا ہو) نکل گئے، اس لیے کہ ان کو بعض معاملات میں اختیار ہوتا ہے، یہ وصف ان کو علاحدہ کرنے کے لیے ہے۔ اسی جگہ سے فقہا نے اس بات کی دلیل لی ہے کہ بندہ کسی شے کا مالک نہیں ہوتا۔ دوسرا وہ شخص ہے جس کو ہم نے اچھا رزق دیا ہے، یعنی آزاد صاحبِ اموال ہے، جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے اور اس کا خرچ کرنا عام ہے، بھلا کہیں یہ بندہ غلام اور وہ آزاد مال دار برابر ہو سکتے ہیں، حالاں کہ دونوں من جملہ بشر کے اللہ کی مخلوق ہیں۔ پھر جب یہ بات معلوم ہے کہ ان دونوں میں برابری نہیں ہے تو پھر کوئی کس طرح اللہ کا شریک ہوسکتا ہے، جس کو نہ نفع پہنچانے کی اور نقصان پہنچانے کی قدرت اور طاقت ہے اور نہ وہ کسی چیز کا مالک ہے۔ اس کو عبادت کا استحقاق کہاں سے آ گیا؟!

---

[1] تفسير الطبري (۱۷/ ۲٦۰۔ ۲٦۱)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (۷/ ۲۲۹۳)

حاصل معنی یہ ہیں کہ جس طرح غلام اور آزاد برابر نہیں ہیں، اسی طرح رب جو خالق اور رازق ہے اور جمادات، جیسے: بت معبود، جو نہ دیکھ سکیں، نہ سن سکیں، نہ نفع ونقصان پہنچا سکیں، برابر نہیں ہو سکتے۔ بعض نے کہا کہ عبد مملوک سے مراد کافر ہے، جو کہ اطاعت اور عبودیت سے محروم ہے اور دوسرے سے مراد مومن ہے۔ بالجملہ یہ دونوں رُتبے اور شرف میں برابر نہیں ہو سکتے۔ امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ دونوں ابو جہل بن ہشام اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ بعض نے کہا کہ پہلا عبدِ صنم ہے اور دوسرا عابدِ صنم یہ دونوں قدرت اور تصرف میں ایک جیسے نہیں، کیونکہ پہلا جماد (پتھر) اور دوسرا انسان۔ ساری تعریف صرف اللہ کو ہے وہی تمام تعریفوں کا مستحق ہے، اس کے علاوہ کوئی کسی چیز کا استحقاق نہیں رکھتا۔ یا یہ حمد ہے توحید کی اس نعمت پر جو اُس نے اپنے اولیا کو عطا فرمائی ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے کہ کس کی عبادت کرنا چاہیے اور کس کی نہیں۔

وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَاۤ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّ هُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ ۙ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ ؕ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَ مَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَ هُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۷۶﴾

اور اللہ نے دو شخصوں کی (ایک اور) مثال بیان کی، ان میں سے ایک گونگا (اور بہرا) ہے، وہ کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا، جب کہ وہ اپنے آقا پر ایک بوجھ ہے، جہاں کہیں بھی وہ اسے بھیجے وہ کوئی خیر اور بھلائی نہیں لاتا۔ کیا وہ اس شخص کے برابر ہوسکتا ہے جو عدل کا حکم دیتا ہے اور وہ صراطِ مستقیم پر ہے؟ (76)

کافر اور مومن کی ایک اور مثال:

یعنی اللہ کے دو بندے ایک بت نکما نہ ہل سکے نہ چل سکے، جیسے: گونگا غلام، دوسرا رسول جو ہزاروں کو اللہ کی راہ بتائے اور آپ بندگی پر قائم ہے، اس کے تابع بہتر یا اس کے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ مراد وثن ہے، یعنی بت گونگا ہے نہ بولے نہ کچھ کر سکتے۔ فلا مقال ولا فعال یعنی نہ بولے نہ کوئی کام کرے۔ لہٰذا وہ اپنے مولیٰ پر بوجھ ہے، اس کا مالک اس کو جدھر بھیجتا ہے، وہ کوئی خیر نہیں لاتا اور نہ اس کی کوشش سے کوئی کام نکلتا ہے۔ سو کیا وہ شخص، جس کے یہ صفات ہیں اور ایسا شخص جو انصاف کا حکم دیتا ہے اور اس کا قول حق اور فعل مستقیم ہے اور خود بھی وہ راہِ راست پر ہے، برابر ہو سکتا ہے؟ بعض نے کہا کہ ﴿ اَبْكَمُ ﴾ ایک غلام تھا سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا۔ امام سدی، قتادہ اور خراسانی رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہ کافر اور مومن کی مثال ہے۔ اس آیت کا نزول ایک قریشی مرد

اور اس کے غلام کے حق میں ہوا ہے، یعنی سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور اُن کے غلام ابکم کے بارے میں۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اس کو خرچ دیتے اور اس کا بار اُٹھاتے اور دوسرا اسلام کو مکروہ سمجھتا اور صدقہ اور معروف سے منع کرتا۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ﴿ اَبْكَمُ ﴾ وہ ہے جو بات نہ کر سکے۔ یا جس کی زبان کٹی ہوئی ہو، اچھی طرح کلام نہ کرے، یا وہ جو گونگا پیدا ہوا ہے۔ ہر ابکم اخرس (گونگا) ہوتا ہے اور ہر اخرس ابکم نہیں ہوتا۔ امام ابن الاعرابی رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ اَبْكَمُ ﴾ وہ ہے جو نہ سنے اور نہ دیکھے۔[2] اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ابکم کی صفت میں یہ کہا کہ وہ کسی شے پر ان اشیا میں سے جو اِس کی ذات سے یا غیر سے متعلق ہیں، قدرت نہیں رکھتا، اس وجہ سے کہ وہ بول نہیں سکتا اور نہ ہی سمجھ سکتا ہے۔ یہ اشارہ ہے اس کی مکمل عاجزی اور نقصان کی طرف۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے آقا پر بوجھ ہے، آقا جس کام کے لیے اس کو کہیں بھیجتا ہے، وہ کوئی خیر لے کر نہیں آتا، کیوں کہ وہ عاجز اور گونگا ہے نہ فہم رکھتا ہے نہ عقل اور نہ کچھ بات کر سکے۔ کیا ایسا شخص اور وہ شخص جو عدل کا حکم کرتا ہے اور وہ شخص جو بول سکتا ہے، ذی فہم ہے، ہر شے پر تصرف رکھتا ہے اور صحیح ہوش وحواس والا، کفایت و ہدایت و دیانت والا ہے، نفع بخش ہے اور خود راہِ راست پر چلنے والا ہے، یعنی دینِ قیم اور سیرتِ صالحہ پر اور دین میں افراط وتفریط کی طرف مائل نہیں ہے، برابر ہو سکتا ہے؟ یعنی نہیں ہو سکتا۔

اس مثال سے اس بات کا استدلال کرنا ہے کہ ربِ کائنات اور جس کو اس کا شریک ٹھہرایا ہے، مساوی نہیں ہیں۔ یہ مثال اعمال کے بارے میں ہے اور آیت ہر مومن اور کافر کے حق میں عام ہے۔ یا خاص ہے کہ ابکم ابوجہل تھا اور آمر بالعدل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ یا ابکم ابی بن خلف اور آمر حمزہ وعثمان بن مظعون رضی اللہ عنہما تھے۔ یا ابکم اسید بن ابی العیص تھا، جو عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا غلام تھا، یہ اسلام کو مکروہ سمجھتا تھا اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اس کے رنج اور تکلیف میں کفایت کرنے والے تھے۔[3]

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (۷۷) وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـــًٔـا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْــِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (۷۸) اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِيْ جَوِّ السَّمَاۗءِ ۭ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ۭ

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٢٦٣۔ ٢٦٤) تفسير ابن كثير (٢/ ٧٥٤) [2] فتح القدير (٣/ ٢٥١) [3] فتح البيان (٧/ ٦ ٢٨)

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۷۹﴾

اور اللہ ہی کے پاس آسمانوں اور زمین کا غیب ہے، اور قیامت کا معاملہ تو بس آنکھ جھپکنے کی طرح ہے، بلکہ اس سے بھی قریب تر، بے شک اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے ﴿77﴾ اور اللہ نے تمھیں تمھاری ماؤں کے پیٹوں سے اس حال میں نکالا کہ تم کچھ علم نہیں رکھتے تھے، اور اسی نے تمھارے کان، آنکھیں اور دل بنائے، تاکہ تم شکر کرو ﴿78﴾ کیا انھوں نے پرندوں کی طرف نہیں دیکھا، وہ آسمانی فضا میں مسخر (تابع فرمان) ہیں۔ اللہ کے سوا، انھیں (فضا میں) کوئی نہیں تھام رہا۔ بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے البتہ نشانیاں ہیں جو ایمان لاتے ہیں ﴿79﴾

صرف اللہ تعالیٰ ہی غیب اور قیامت کا علم رکھتا ہے:

یعنی بعض ایمان لانے میں معاش کی فکر سے اٹکتے ہیں۔ سو فرمایا کہ ماں کے پیٹ سے کوئی کچھ نہیں لاتا۔ کمائی کے اسباب آنکھ، کان اور دل اللہ تعالیٰ ہی دیتا ہے اور اُڑتے جانور فضا میں کس کے بھروسے پر رہتے ہیں۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اشیا پر اپنے کمالِ علم اور کمالِ قدرت کی اور علمِ غیب کے ساتھ مختص ہونے کی خبر دی۔ کسی کو غیب کی بات کا علم نہیں سوائے اس کے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس کو مطلع کر دے۔ اس کی قدرتِ تامہ میں کوئی مخالف اور رکاوٹ ڈالنے والا نہیں ہے۔ وہ جب کسی شے کا ارادہ کرتا ہے تو کُن کہتا ہے اور وہ چیز ہو جاتی ہے، جیسے فرمایا: ﴿ وَمَاۤ اَمۡرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمۡحِ الۡبَصَرِ ﴾ (آیتِ باب) یعنی ہمارا قیامت کا امر تو یہی ایک دم کی بات ہے، جیسے ایک جھپک نگاہ کی، یعنی اس کا ارادہ ایک دم میں موجود ہو جاتا ہے، بلکہ اس سے بھی قریب تر زمانے میں۔ اس کو ہر شے پر قدرت حاصل ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مَا خَلۡقُكُمۡ وَلَا بَعۡثُكُمۡ اِلَّا كَنَفۡسٍ وَّاحِدَةٍ ﴾ [لقمان: ۲۸] ''تمھیں پیدا کرنا اور تمھیں (دوبارہ) اُٹھانا (اللہ کے نزدیک) ایسا ہی ہے جیسے ایک نفس کو پیدا کرنا۔''

کان، آنکھیں اور دل اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمتیں ہیں:

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے احسان کا ذکر کیا کہ اس نے لوگوں کو ماؤں کے پیٹوں سے نکالا، یہ کچھ بھی نہ جانتے تھے، پھر ان کو کان دیے جس سے آوازوں کو پہچانتے ہیں، آنکھیں دیں جس سے موجود چیزوں کا احساس کرتے ہیں، دل دیے، یعنی عقلیں جن کا صحیح مرکز دل ہے اور بعض نے کہا کہ دماغ۔ اسی عقل سے نقصان اور نفع دینے والی چیزوں کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ یہ قوتیں اور حواس انسان کو بتدریج تھوڑے تھوڑے حاصل ہوتے ہیں۔ جتنا بڑا ہوتا جاتا ہے اس کی سماعت، بصارت اور عقل میں زیادتی ہوتی جاتی ہے، یہاں تک کہ اپنی جوانی اور مکمل قوت کو پہنچتا ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انسان میں یہ اوصاف اس لیے رکھے ہیں کہ اُن سے اپنے رب کی عبادت پر قادر ہو اور ہر عضو اور قوت سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت بجالانے کے لیے مدد لے، جس طرح صحیح بخاری میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے: « يقول تعالىٰ: مَنْ عَادَى لِي وَلِيًا فَقَدْ بَارَزَنِي بِالْحَرْبِ، وَمَا تَقَرَّبَ إِلَيَّ عَبْدِي بِشَيْءٍ أَفْضَلَ مِنْ أَدَاءِ مَا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ، وَلَا يَزَالُ عَبْدِي يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى أُحِبَّهُ، فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ، وَبَصَرَهُ الَّذِي يَبْصُرُ بِهِ، وَيَدَهُ الَّتِي يَبْطِشُ بِهَا، وَرِجْلَهُ الَّتِي يَمْشِي بِهَا، وَلَئِنْ سَأَلَنِي لَأُعْطِيَنَّهُ، وَلَئِنْ دَعَانِي لَأُجِيبَنَّهُ، وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِي لَأُعِيذَنَّهُ، وَمَا تَرَدَّدْتُ فِي شَيْءٍ أَنَا فَاعِلُهُ تَرَدُّدِي فِي قَبْضِ نَفْسِ عَبْدِيَ الْمُؤْمِنِ يَكْرَهُ الْمَوْتَ، وَأَكْرَهُ مَسَاءَتَهُ وَلَا بُدَّ لَهُ مِنْهُ »[1] [اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: جس نے میرے کسی ولی سے دشمنی کی اس کے خلاف میری طرف سے اعلانِ جنگ ہے اور میرا بندہ جن جن عبادتوں کے ذریعے سے میرا قرب حاصل کرتا ہے، ان میں سے کوئی عبادت اتنی افضل نہیں ہے جس قدر وہ عبادت افضل ہے جو میں نے اس پر فرض کی ہے۔ میرا بندہ نوافل کے ذریعے سے بھی مجھ سے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ میں اس سے محبت کرنے لگ جاتا ہوں، جب میں اس سے محبت کرنے لگ جاتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے، اگر وہ مجھ سے مانگے تو میں اسے دیتا ہوں۔ اگر وہ مجھ سے پناہ کا طالب ہو تو اسے پناہ دیتا ہوں، میں کسی چیز میں تردد نہیں کرتا، جس کو میں کرنے والا ہوتا ہوں جو مجھے مومن کی جان نکالتے وقت ہوتا ہے، وہ موت کی بوجہ تکلیف پسند نہیں کرتا اور مجھے بھی اسے تکلیف دینا اچھا نہیں لگتا ہے]

اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ بندہ جب اخلاصِ طاعت کرتا ہے تو اس کے سارے افعال اللہ عزوجل کے لیے ہو جاتے ہیں، سنتا نہیں مگر اللہ کے لیے، دیکھتا نہیں مگر اللہ کے لیے، یعنی جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس کے لیے مشروع کیا ہے اور نہ کچھ پکڑتا ہے اور نہ لیتا ہے اور نہ چلتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں۔ اُن سب امور میں وہ اللہ تعالیٰ سے مدد چاہتا ہے۔ لہٰذا صحیح کے علاوہ بعض روایات میں مروی ہے: « فَبِي يَسْمَعُ، وَبِي يُبْصِرُ، وَبِي يَبْطِشُ، وَبِي يَمْشِي »[2] [وہ میرے ساتھ ہی سنتا، میرے ساتھ ہی دیکھتا، میرے ساتھ ہی پکڑتا اور میرے ساتھ ہی چلتا ہے] ''لہٰذا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم کو کان، آنکھ اور عقل دی ہے کہ شاید تم شکر کرو جس طرح دوسری آیت میں کہا ہے: ﴿ قُلْ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝ قُلْ هُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴾ [الملك: ٢٣۔ ٢٤] ''کہہ دیجیے: وہی ہے جس نے تمھیں پیدا کیا اور تمھارے کان اور آنکھیں اور دل بنائے۔ تم کم ہی شکر ادا کرتے ہو۔ کہہ دیجیے: وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں پھیلایا، اور اسی کے حضور تم اکٹھے کیے جاؤ گے۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٣٧)
[2] تفسير ابن كثير (٢/ ٧٥٥)

فضا میں پرندوں کی تسخیر بھی قدرتِ الٰہ کی ایک نشانی ہے:

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو آگاہ کیا کہ تم ذرا پرندوں کی طرف تو نظر کرو جو آسمان اور زمین کے درمیان مسخر ہیں کہ ان کو کیوں کر دو پر دیے ہیں جن سے وہ آسمان میں اُڑتے پھرتے ہیں، ان کا روکنے والا کوئی نہیں سوائے اللہ کے۔ اس نے اپنی قدرت سے ان کو ایسے قویٰ دیے ہیں جن سے یہ کام ہوتا ہے اور ہوا کو مسخر کر دیا ہے کہ وہ اُن کو اُٹھائے پھرتی ہے اور پرندے سیر کرتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّيَقْبِضْنَ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍۭ بَصِيْرٌ ﴾ [الملك: ١٩] ''کیا انھوں نے اپنے اوپر پر پھیلاتے اور سکیڑتے ہوئے پرندے نہیں دیکھے۔ انھیں (اللہ) رحمٰن کے سوا کوئی نہیں تھامتا، بے شک وہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ علمِ غیب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ساتھ مختص ہے، کوئی غیر اس کا اس میں شریک نہیں اور نہ استقلال رکھتا ہے۔ غیب سے وہ چیز مراد ہے جو بندوں سے غائب ہے آسمانوں اور زمین میں۔ یا مراد قیامت ہے کہ اس کا علم بندوں سے غائب ہے۔ اس میں مشرکین کو ڈانٹ ڈپٹ ہے۔ یعنی عبادت کا استحقاق اس کو ہے جو یہ غیب دانی کی صفت رکھتا ہے، نہ کہ اس کو جو جاہل اور عاجز ہے۔ نہ نقصان دے سکتا ہے نہ نفع اور علم کی کوئی قسم نہیں جانتا ہے۔ ساعت یعنی قیامت واقعات میں سے سب سے بڑا واقعہ ہے اور یہ وہ غائب چیز ہے جس کے بارے میں اکثر بحث ومباحثہ ہوا کرتا ہے، یعنی زندوں کا مارنا اور اولین اور آخرین میں سے مردوں کا زندہ کرنا اور ساری مخلوقات کی صورتیں بدل دینا، یہ ایک پلک مارنے کے وقت میں واقع ہو جائے گا۔ ﴿ كَلَمْحِ الْبَصَرِ ﴾ نگاہ کے اوپر والے حلقے کے نیچے والے حلقے کی طرف آنے کو کہتے ہیں۔

لمح بصر کی مثال اس لیے دی کہ وقت کی اس سے زیادہ کم تر مقدار معلوم نہیں۔ لمح کہتے ہیں تیزی سے نظر کرنے کو اور ضرور ہے کہ اتنا وقت ہو کہ اس میں آنکھ کی پتلی کسی نظر آنے والی چیز کی طرف پھر سکے اور ہر زمان تجزیہ کے قابل ہے۔ لہٰذا فرمایا کہ بلکہ اس سے بھی قریب تر زمانے میں قیامت قائم ہو جائے گی، یعنی اس حرکت سے آدھے وقت میں، بلکہ ایک آن میں جس میں حرکت کی ابتدا ہوگی، کیوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ خلق کو ایک ہی وقت پیدا کرے گا اور جو چیز یکبارگی پیدا ہوگی، وہ ایک آن میں ہو سکتی ہے، یعنی اس آن کے جزو غیر منقسم ہیں اور یہ کچھ مبالغہ نہیں ہے، بلکہ ایک کلام ہے جو بالکل سچا ہے، کیوں کہ اس خطاب اور قیامت کے قائم ہونے کے درمیان ایک لامتناہی مدت ہے اور اس سے ابد تک غیر متناہی اور متناہی کو غیر متناہی کے ساتھ کچھ نسبت نہیں ہے۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ مراد نہیں ہے کہ قیامت لمح بصر میں آ جائے گی، بلکہ قیامت کے لانے میں

سرعتِ قدرت کا بیان فرمایا ہے۔[1] اللہ تعالیٰ شے سے کہتا ہے: ہو جا، وہ ہو جاتی ہے۔ بعض نے کہا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے نزدیک یہ لمحِ بصر ہے، گو مخلوقات کے نزدیک اس صفت سے نہ ہو اور اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ﴿ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۝ وَّ نَرٰىهُ قَرِيْبًا ﴾ [المعارج: ٦۔ ٧] ''بے شک وہ (لوگ) اس کو دور دیکھتے ہیں۔ اور ہم اسے قریب دیکھتے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر قدرت ہے، اگرچہ وہ ہمارے نزدیک کیسی ہی مشکل ہو۔ دیکھو اللہ تعالیٰ نے تم کو تمھاری ماؤں کے پیٹوں سے اطفال بنا کر نکالا، تم کو کسی شے کا علم نہ تھا اور نہ تم کو اس میثاق کے بارے میں معلوم ہے جو تم سے لیا گیا تھا، یا تم کو اپنی نیک بختی اور بدبختی کا علم نہیں ہے، یا اپنے منافع اور فوائد کا علم نہیں۔ آیت کا عام ہونا زیادہ مناسب ہے، تاکہ یہ تمام امور کو شامل رہے، اس لیے کہ لفظ کی عمومیت کا اعتبار ہوتا ہے۔ لفظ ﴿ شَيْـًٔا ﴾ اس جگہ نکرہ ہے اور سیاقِ نفی میں آیا ہے۔ پھر تم میں آنکھ، کان اور دل رکھے اور ان اشیا کو ترکیب دی، تاکہ جو علم تم سے چھینا گیا تھا، وہ حاصل ہو اور تم اس علم کی وجہ سے منعمِ حقیقی کا شکر بجا لاؤ اور اُس کی عبادت کرو اور حقوقِ الٰہی کو قائم کرنے والے رہو۔ ان لوگوں نے زمین و آسمان کے درمیان ہوا میں پرندوں کے مسخر ہونے میں غور نہیں کیا کہ یہ ہوا پر پَر پھیلائے ایسے اُڑتے پھرتے ہیں جیسے کوئی پانی پر تیرتا ہے۔

﴿ جَوِّ ﴾ اس ہوا کو کہتے ہیں جو زمین سے دور بلندی کی طرف ہوتی ہے اور اس کی نسبت آسمان کی طرف اس لیے ہے کہ یہ ہوا فلک کی جانب ہے۔ کعب احبار رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پرندہ فضا میں بارہ میل تک بلند ہوتا ہے، اس سے زیادہ بلند نہیں ہوتا۔[2] فضا میں اُن کو روکنے والا اور تھامنے والا قبض و بسط اور وقوف میں سوائے اللہ سبحانہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں، کیوں کہ ان کے جسموں کا وزن اور ہوا کی نرمی اس بات کے مقتضی ہیں کہ یہ پرندے گر پڑیں، کیوں کہ یہ کسی ایسی چیز کے ساتھ متعلق اور منسلک نہیں ہیں جو اُن سے اوپر ہو اور نہ ہی کسی ایسی چیز پر معتمد (سہارا لیے ہوئے) ہیں، جو اُن کے نیچے ہے۔ اس تسخیر میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور واضح قدرت کی نشانیاں ہیں، مگر اُن لوگوں کے لیے جو شریعتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور قیامت کے قائم ہونے کو برحق جانتے ہیں۔[3]

وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ
جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَ يَوْمَ
اِقَامَتِكُمْ ۙ وَ مِنْ اَصْوَافِهَا وَ اَوْبَارِهَا وَ اَشْعَارِهَاۤ اَثَاثًا
وَّ مَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ۝۸۰ وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا

[1] معاني القرآن (٣/ ٢١٤) [2] تفسير البغوي (٥/ ٣٥) [3] فتح البيان (٧/ ٢٨٨۔ ٢٩٠)

وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ
تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ ۚ كَذٰلِكَ
يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ﴿٨١﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا
عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿٨٢﴾ يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ
يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿٨٣﴾

اور اللہ نے تمھارے لیے تمھارے گھر جائے سکونت بنائے اور تمھارے لیے چوپایوں کی کھالوں سے ایسے گھر (خیمے) بنائے، جنھیں تم ہلکا سمجھتے ہو اپنے کوچ کے دن اور اپنے قیام کے دن اور ان (بھیڑوں) کی اُون سے اور اُن (اونٹوں) کی پشم سے اور ان (بکریوں) کے بالوں سے (گھریلو) اثاثے اور ایک مدت تک برتنے کی چیزیں (بنائیں)﴿80﴾ اور اللہ نے اپنی تخلیق کردہ چیزوں سے تمھارے لیے سائے بنائے، اور تمھارے لیے پہاڑوں میں چھپنے کے مقام (غار) بنائے، اور تمھارے لیے کُرتے بنائے جو تمھیں گرمی سے بچاتے ہیں اور کُرتے (زرہ بکتر) جو تمھاری لڑائی میں تمھیں بچاتے ہیں۔ اسی طرح وہ تم پر اپنی نعمتیں تمام کرتا ہے، تاکہ تم مطیع ہو جاؤ﴿81﴾ پھر اگر وہ پھریں تو آپ کے ذمے تو صرف صاف صاف پہنچا دینا ہے﴿82﴾ وہ اللہ کی نعمت کو پہچانتے ہیں، پھر اس کا انکار کرتے ہیں اور ان میں اکثر ناشکرے ہیں﴿83﴾

گھر، لباس اور دیگر اسباب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں:

رُوؤں سے مراد اونٹ کی پشم ہے۔ جن کُرتوں میں گرمی کا بچاؤ ہے، سردی کا بھی بچاؤ ہے، لیکن اس ملک میں گرمی بہت ہے، اسی کا ذکر فرمایا اور لڑائی کا بچاؤ زرہیں ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی تمام نعمتوں کا ذکر اپنے بندوں پر کیا کہ ہم نے اُن کے بسنے کے لیے گھر بنا دیے ہیں، جن میں وہ رہتے ہیں اور چھپتے ہیں اور طرح طرح کے آرام پاتے ہیں، یہ گھر تو پتھروں اور اینٹوں اور لکڑی اور ان جیسی دوسری چیزوں کے بنے ہوئے ہیں، دوسرے گھر جانوروں کی کھال کے ہیں، ان کو سفر میں ہلکا ہونے کی وجہ سے ہمراہ لے جاتے ہیں، جہاں چاہا وہاں خیمہ ڈیرہ لگایا اور آرام کر لیا اور چاہا تو یہ خیمے حضر میں لگائے۔ بھیڑ کے بالوں کو صوف اور اُونٹ کے بالوں کو وبر کہتے ہیں۔ ان بالوں سے اثاث، یعنی مال ومتاع یا جامہ بناتے ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ لفظ ان سب سے زیادہ عام ہے، کیوں کہ اثاث سے بچھونے اور لباس وکپڑے تیار کیے جاتے ہیں وغیرہ ذلک اور مال وتجارت کا سرمایہ لیا جاتا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اثاث بہ معنی متاع ہے۔ یہی قول ہے امام مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، حسن، عطیہ، عطا، ضحاک اور قتادہ رحمہم اللہ کا۔[1] ﴿ حِيْنٍ ﴾ سے مراد اجل مسمّٰی ہے۔ ﴿ ظِلٰلًا ﴾ سے مراد درخت ہیں۔ ﴿ اَكْنَانًا ﴾ سے مراد پناہ گاہیں اور چھپنے کی جگہیں ہیں۔ ﴿ اَكْنَانًا ﴾ سے مراد روئی، کتان اور اُون کے کپڑے ہیں۔ ان سے گرمی سے بچاؤ ہوتا ہے۔ وقایہ بأس (جنگ سے بچاؤ) سے مراد لوہے کی چوڑی چوڑی زرہیں وغیرہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں طرح کے لباس کو نعمت ٹھہرایا ہے، اس سے اطاعت اور عبادت پر مدد ملتی ہے۔ شاید کہ تم لوگ اسلام لے آؤ یا زخم سے سلامت رہو۔

جمہور نے ﴿ تُسْلِمُوْنَ ﴾ لام کی زیر سے پڑھا ہے (فرماں برداری اختیار کرو) اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے "تُسْلَمُوْنَ" لام کی زبر کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی زخموں سے سلامتی ہو۔ امام عطا خراسانی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ قرآن کا نزول عرب کی معرفت کے مطابق ہوا ہے۔ تو نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا یہ قول نہیں دیکھا: ﴿ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا ﴾ (آیتِ باب) یعنی اللہ تعالیٰ نے بنا دیں تم کو اپنی بنائی ہوئی چیزوں کی چھائیں اور بنا دیں تم کو پہاڑوں میں چھپنے کی جگہیں جو چیز اللہ تعالیٰ نے سہل سے بنائی ہے، وہ کہیں اعظم اور اکثر ہے پہاڑوں سے، لیکن وہ لوگ اصحابِ جبل تھے۔ تُو نے یہ قول اللہ کا نہیں دیکھا: ﴿ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَآ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴾ (آیتِ باب) اور اُن کی اُون سے اور روؤں سے اور بالوں سے کتنے اسباب اور برتنے کی چیز ایک وقت تک۔ اور جو چیز اس کے سوا بنائی، وہ اعظم اور اکثر ہے اس سے، لیکن وہ لوگ اصحابِ وبر (روئیں) اور شعر (بال) تھے تو نے اللہ تعالیٰ کا یہ قول نہیں دیکھا: ﴿ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ ﴾ [النور: ٤٣] "اور وہ اس آسمان کے اندر کے پہاڑوں سے اولے برساتا ہے۔"

یہ اُن کے تعجب کے سبب سے کہا اور جو چیز برف سے اُتاری ہے، وہ بہت بڑی اور بہت زیادہ ہے اس سے، لیکن وہ اس کو پہچانتے نہ تھے، تُو نے اللہ کے اس قول کو نہیں دیکھا: ﴿ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ ﴾ (آیتِ باب) یعنی کرتے جو گرمی سے بچاؤ ہیں، حالاں کہ جو برد کے لیے باقی ہے وہ اعظم اور اکثر ہے حر سے، لیکن وہ لوگ اصحابِ حر تھے۔[2] پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر یہ لوگ پھر جائیں، یعنی اس بیان اور احسان جتانے کے بعد تو اے پیغمبر! تجھ پر کچھ الزام نہیں ہے، کیوں کہ تیرے ذمے فقط کھول کر بیان کر دینا ہے سو تو نے بیان کر دیا اور پہنچا دیا۔ یہ لوگ جانتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ احسان کرنے والا اور اُن پر اپنا فضل و کرم کرنے والا ہے۔ اس کے باوجود وہ اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں اور غیر کی عبادت بجا لاتے ہیں اور نصرت اور رزق کے ملنے کی اسناد غیر کی طرف کرتے ہیں اور اکثر کافر ہیں۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک اعرابی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر سوال کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر یہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٧٥٥) [2] تفسیر الطبري (١٧/ ٢٧٠۔ ٢٧١)

آیت پڑھی: ﴿ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا ﴾ (آیتِ باب) یعنی اللہ نے بنا دیے تم کو تمھارے گھر بسنے کی جگہ۔ اس نے کہا: ہاں، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا ﴾[الآیۃ] کہا ہاں، پھر ساری آیتِ باب پڑھی، وہ یہی ''ہاں'' کہتا رہا۔ جب نبی اکرم ﷺ یہاں پر پہنچے۔ ﴿ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ﴾ (یعنی اسی طرح پورا کرتا ہے اپنا احسان تم پر شاید تم فرماں بردار ہو جاؤ، تو وہ پھر کر چل دیا، اس پر اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے یہ آیت بھیجی: ﴿ يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا ﴾ [الآیۃ] یعنی پہچانتے ہیں اللہ کا احسان، پھر منکر ہو جاتے ہیں اور اُن میں سے بہت ناشکرے ہیں۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تمھارے رہنے کے لیے پتھر اور مٹی کے گھر بنائے رہنے کے لیے کہ تم ان گھروں میں رہو بسو اور تمھارے اعضا حرکت سے آرام اور سکون پائیں۔ یہ اللہ پاک کی ایک نعمت ہے، اگر وہ چاہتا تو بندے کو دائمی بے چین پیدا کر دیتا، جیسے افلاک۔ یا ساکن پیدا کرتا ہے جیسے زمین۔ ان گھروں کے علاوہ، جو زیادہ دیر کے قیام کے لیے ہیں، چوپایوں کی کھال کے گھر بنائے۔ یہ گھر سفری گھر اور عارضی لوگوں کے گھر ہیں، جیسے سوڈانی کہ وہ اپنے ڈیرے چمڑوں کے بناتے ہیں اور ہوسکتا ہے کہ مراد اُون، پشم اور بالوں کے گھر ہوں کہ ان پر بھی چمڑے کا نام صادق آتا ہے۔ اس لیے یہ بال اور اُون کھال ہی سے پیدا ہوتے ہیں اور اُن گھروں کا سفر میں اُٹھائے پھرنا اور لے جانا آسان اور ہلکا ہے۔

''ظعن'' ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف کوچ کرنے کو کہتے ہیں، اور ہودج کو بھی ''ظعن'' کہتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ سیر کرنے والوں کے بعض گھر ایک دم بن جاتے ہیں۔[3] میں کہتا ہوں: جیسے سرکی کے گھر اور اس طرح کے اور گھر۔ پھر یہ چمڑوں کے گھر حضر اور وطن میں بھی کام آتے ہیں۔ انعام سے مراد اونٹ، گائے اور بکری ہیں، ان کے کھالوں اور چمڑوں سے گھر بناتے ہیں، بھیڑ کے بالوں کو اصواف، اونٹ کے بالوں کو اوبار (روئیں) اور بکری کے بالوں کو اشعار کہا۔ بھیڑ، بکری کی ایک قسم ہے۔ روئی اور سُوت کا ذکر نہ کیا، کیوں کہ یہ دونوں عرب میں نہیں ہوتے۔

اثاث متاعِ خانہ کو کہتے ہیں، اصل میں یہ زیادہ اور مختلف چیزوں کے جمع ہونے کو کہتے ہیں۔ مال جب زیادہ ہو جاتا ہے تو اس کو اثاث کہتے ہیں۔ متاع برتنے کی چیز کو کہتے ہیں۔ خلیل نے کہا: اثاث اور متاع ایک چیز ہے، لفظ کے مختلف ہونے کی وجہ سے دونوں کو جمع کر دیا ہے۔ ابو زید انصاری نے کہا کہ اثاث سارا مال ہے: اونٹ، بھیڑ

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۷/ ۲۲۹٦) تفسیر ابن کثیر (۲/ ۷۵٦) یہ روایت مرسل ہے۔ [2] تفسیر ابن أبي حاتم (۷/ ۲۲۹۵)

بکریاں اور غلام، اس پر متاع کا عطف گویا خاص کا عام پر عطف ہے۔[1] بعض نے کہا: اثاث وہ ہے، جو انسان کے پہننے اور اوڑھنے میں آتا ہے اور متاع وہ جو گھروں میں موجود ہوتا ہے۔ حین سے مراد موت ہے، یا قیامت، یا ضرورت کے پورا ہونے تک کا زمانہ یہاں تک کہ وہ پرانا ہو جائے یا فنا ہو جائے۔ پھر کبھی انسان کے لیے فقیری یا کسی اور وجہ سے کوئی خیمہ یا گھر نہیں ہوتا جس میں سایہ لے اور اس کو حاجت ہوتی ہے کہ کسی درخت یا دیوار یا بادل وغیرہ کا سایہ لے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس حال پر متنبہ فرمایا کہ ہم نے تمھارے لیے ظلال بنائے ہیں، یعنی ایسی اشیا کہ شدتِ گرمی و سردی میں تم ان سے سایہ لو، جیسے گھر یا دیوار کا سایہ، یا درخت کا سایہ۔ الحاصل لفظِ ظلال ان سب چیزوں کو شامل ہے جن کا سایہ ہو۔ پھر کبھی مسافر کو ایسے گوشے کی حاجت ہوتی ہے جہاں وہ ٹھہرے اور گرمی اور سردی کی آفات کو اپنی جان سے دور کرے، اس لیے فرمایا کہ ہم نے تمھارے لیے پہاڑوں میں چھپنے کی جگہیں بنائی ہیں۔

اکنان جمع ہے کنّ کی، کنّ وہ جگہ ہے جہاں بارش اور سخت گرمی و سردی سے آدمی چھپے، اس جگہ مراد پہاڑوں کے غار ہیں اور تہہ خانے۔ امیر آدمی سفر میں ڈیرہ، خیمہ، راوٹی اور برجہ وغیرہ رکھتا ہے اور اُن میں ٹھہر کر آرام کر لیتا ہے۔ رہا فقیر، غریب اور مسکین تو وہ دیوار اور درخت کے سائے میں، یا غاروں میں جگہ پکڑتا ہے۔ عرب کے بلاد گرم سیر ہیں، ان کو گرمی سے بچنے کے لیے سائے کی سخت ضرورت تھی، اس لیے اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے یہ معانی احسان جتلانے کے طور پر ذکر کیے، کیوں کہ یہ کھلی ہوئی نعمت ہے۔ سرابیل جمع ہے سربال کی، اس سے مراد قمیص، جامۂ صوف، پنبہ، کتان اور درختوں کی چھال وغیرہ ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس چیز کو تو پہنے وہی سربال ہے۔[2]

یہ سرابیل تم سے گرمی و سردی کی تکلیف کو دور رکھتے ہیں، اسی پر اکثر مفسرین ہیں۔ دوسرے وہ سرابیل ہیں جو زرہ، جوشن اور سارے ہتھیارِ جنگ میں ہوتے ہیں، ان کے سبب سے نیزے کے وار، جنگی حملے اور تیر سے بچاؤ ہوتا ہے، اس طریقے سے اللہ تعالیٰ نے تم پر اپنی نعمت تمام کی کہ شاید تم اسلام لانے کا ارادہ کرو، کیوں کہ جو شخص ان نعمتوں پر غور کرے گا، اس کو اسلام لائے اور اطاعت اختیار کیے بغیر کوئی چارہ نہ ہوگا۔ یا تم زخموں سے سلامت رہو۔ پہلے معنی زیادہ قابلِ قبول ہیں۔ بعض نے کہا کہ یہ اہلِ مکہ کو خطاب ہے کہ تم اللہ کے واسطے اخلاصِ ربوبیت کرو، لیکن اس آیت کو عمومیت پر محمول کرنا زیادہ بہتر ہے اور اگر اسلام سے منہ موڑ لو گے تو رسول پر تو صرف واضح طور پر پہنچا دینا ہے نہ اور کچھ الزام۔ یہ خطاب رسول اللہ ﷺ کے لیے تسلی ہے۔

پھر فرمایا کہ یہ لوگ اللہ کی نعمتوں کو، جن کا اس سورت میں ذکر ہوا ہے، بہ خوبی جانتے پہچانتے ہیں، اس کے باوجود اپنے اعمالِ قبیحہ کے ساتھ ساتھ غیر اللہ کی عبادت کے سبب ان نعمتوں کا انکار کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ نعمتیں اللہ کی طرف سے ہیں، مگر بتوں کی شفاعت کی وجہ سے ہیں۔ اسی طرح پیر پرست اور گور پرست ان نعمتوں کو مرے

---

[1] فتح القدير (٣/ ٢٥٥) [2] معاني القرآن (٣/ ٢١٥)

ہوئے لوگوں اور اولیا کا تصرف اور عطیہ سمجھتے ہیں۔ یا اپنے آبا و اجداد کی طرف سے بہ طورِ وراثت ملنے والی چیزیں سمجھتے ہیں اور اُن نعمتوں کا استعمال اللہ کی رضا کی جگہوں پر نہیں کرتے اور نہ ہی خیر کی وجوہ میں صَرف کرتے ہیں۔ بعض نے کہا کہ اللہ کی نعمت نبی اکرم ﷺ کی نبوت ہے۔ نبی اکرم ﷺ کو پہچان کر انکار کرتے ہیں۔ یا نعمت سے مراد اسلام ہے۔

غرض یہ کہ ان میں سے اکثر کافر ہیں۔ کسی نے اپنی جہالت سے انکار کیا اور کسی نے ربوبیتِ الٰہی کے اعتراف کے باوجود رسول کی تکذیب کی خاطر انکار کیا جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا ۚ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ﴾ [النمل: ١٤] ''اور انھوں نے ظلم اور تکبر کی وجہ سے ان کا انکار کر دیا، جب کہ ان کے دلوں نے ان کا یقین کر لیا تھا۔ پھر دیکھیے فسادیوں کا انجام کیسا ہوا؟'' یعنی ان سے منکر ہو گئے، جب کہ اپنے جی میں ان کو یقین جان چکے تھے، سو تو دیکھ کہ بگاڑنے والوں کا انجام کیسا ہوا۔[1]

وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِن كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ ﴿٨٤﴾ وَإِذَا رَأَى الَّذِينَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿٨٥﴾ وَإِذَا رَأَى الَّذِينَ أَشْرَكُوا شُرَكَاءَهُمْ قَالُوا رَبَّنَا هَٰؤُلَاءِ شُرَكَاؤُنَا الَّذِينَ كُنَّا نَدْعُو مِن دُونِكَ ۖ فَأَلْقَوْا إِلَيْهِمُ الْقَوْلَ إِنَّكُمْ لَكَاذِبُونَ ﴿٨٦﴾ وَأَلْقَوْا إِلَى اللَّهِ يَوْمَئِذٍ السَّلَمَ ۖ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٨٧﴾ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ زِدْنَاهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوا يُفْسِدُونَ ﴿٨٨﴾

اور (یاد کرو) جس دن ہم ہر امت میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے، پھر جنھوں نے کفر کیا، انھیں اجازت نہیں دی جائے گی اور نہ ان سے توبہ ہی کا مطالبہ کیا جائے گا (84) اور جن لوگوں نے ظلم کیا جب وہ عذاب دیکھ لیں گے تو نہ ان سے (عذاب میں) تخفیف کی جائے گی اور نہ ان کو ڈھیل دی جائے گی (85) اور جن لوگوں نے شرک کیا جب وہ اپنے (خود ساختہ) شریکوں کو دیکھیں گے تو کہیں گے: اے ہمارے رب! یہی ہمارے شریک ہیں جنھیں ہم تیرے سوا پکارتے تھے۔ تب وہ (شریک) ان کی بات ان کی طرف پھینک ماریں گے (اور کہیں گے:) بلاشبہ تم تو یقیناً جھوٹے ہو (86) اور اس دن وہ اللہ کے حضور میں اپنی فرماں برداری (عاجزی) پیش کریں گے، اور ان سے وہ سب کچھ گم ہو

[1] فتح البیان (۷/ ۲۹۱۔ ۲۹۵)

جائے گا، جو وہ جھوٹ گھڑتے تھے (87) جنھوں نے کفر کیا اور (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے روکا، ہم انھیں عذاب پر عذاب زیادہ دیں گے، اس لیے کہ وہ فساد کرتے تھے (88)

قیامت کے دن مشرکین کی حالت:

جو لوگ بزرگوں کو پوجتے ہیں، وہ بزرگ بے گناہ ہیں۔ ایک شیطان اپنا وہی نام رکھ کے اپنے آپ کو پجواتا ہے، اسی لیے ان کو کہیں گے کہ تم جھوٹے ہو۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے قیامت کے دن دارِ آخرت میں مشرکوں کا حال بیان کیا ہے کہ ہر اُمت میں سے ایک شاہد، یعنی اس کا پیغمبر کھڑا ہوگا، وہ اُن پر اس بات کی گواہی دے گا کہ انھوں نے اللہ کی رسالت پہنچانے پر کیا جواب دیا۔ پھر اُن کافروں کو عذر پیش کرنے کا موقع نہ ملے گا، کیوں کہ ان کو خود اپنی معذرت کا جھوٹ ہونا معلوم ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿35﴾ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ﴾ [المرسلات: ۳۵۔ ۳۶] ''یہ (وہ) دن ہے کہ (لوگ) بول نہیں سکیں گے۔ اور نہ انھیں اذن ملے گا کہ وہ معذرت کر سکیں۔''

اور جب یہ مشرک عذاب کو دیکھیں گے تو وہ عذاب ایک دم اُن سے ہلکا نہ کیا جائے اور نہ اُن کو مہلت اور فرصت دی جائے گی، بلکہ جلد ہی موقف (کھڑے ہونے کی جگہ) میں بغیر حساب پکڑ لیے جائیں گے، کیوں کہ جہنم لائی جائے گی، اس کو ستر ہزار باگ سے کھینچتے ہوئے لائیں گے، ہر باگ کو ستر ہزار فرشتے کھینچتے ہوں گے۔ آگ میں سے ایک گردن نکلے گی، ساری مخلوق اس کو دیکھتی ہوگی اور آگ ایک ایسی چیخ مارے گی کہ کوئی شخص باقی نہ رہے گا، مگر گھٹنے کے بل پڑ جائے گا، وہ کہے گی: میں مقرر ہوئی ہوں ہر ظالم سرکش پر، جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود ٹھہرایا تھا۔ وکذا وکذا.

پھر آدمیوں کی قِسموں کا ذکر کیا، جس طرح کہ حدیث میں مروی ہے،[1] پھر اُن پر لپٹ جائے گی اور موقف سے لوگوں کو چن لے گی، جس طرح کہ پرندہ اپنی چونچ سے دانے کو چن لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا ﴿12﴾ وَاِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ﴿13﴾ لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا ﴾ [الفرقان: ۱۲۔ ۱۴] ''جب وہ ان (مجرموں) کو دور دراز جگہ سے دیکھے گی تو وہ اس کا غضب ناک ہونا اور چیخنا چلانا سنیں گے۔ اور جب وہ زنجیروں میں جکڑے اس کی کسی تنگ جگہ میں جھونکے جائیں گے تو وہ وہاں ہلاکت کو پکاریں گے۔ (کہا جائے گا:) تم آج ایک ہلاکت کو مت پکارو، بلکہ بہت سی ہلاکتوں کو پکارو۔''

نیز فرمایا: ﴿ وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا ﴾ [الکہف: ۵۳] ''اور

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۸۴۲)

مجرم آگ کو دیکھیں گے تو یقین کریں گے کہ بے شک وہ اس میں گرنے والے ہیں، اور وہ اس سے پھرنے کی کوئی جگہ نہ پائیں گے۔'' نیز فرمایا: ﴿ لَوْ يَعْلَمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا حِيْنَ لَا يَكُفُّوْنَ عَنْ وُّجُوْهِهِمُ النَّارَ وَلَا عَنْ ظُهُوْرِهِمْ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿39﴾ بَلْ تَاْتِيْهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ رَدَّهَا وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ٣٩۔ ٤٠] ''کاش! کافر اس وقت کو جان لیں جب وہ اپنے چہروں سے آگ نہیں ہٹا سکیں گے اور نہ اپنی پشتوں سے، اور نہ ان کی مدد ہی کی جائے گی۔ بلکہ وہ (قیامت) اچانک ہی انھیں آلے گی، وہ ان کے ہوش کھو دے گی، پھر وہ اسے ٹال نہ سکیں گے اور نہ انھیں مہلت ہی دی جائے گی۔''

مشرکوں کے معبودوں کا ان سے اظہارِ براءت:

پھر اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ ان کے معبودات خود اُن سے بے زاری ظاہر کریں گے، حالاں کہ وہ وقت ان کی مزید حاجت کا ان کی طرف ہوگا۔ چناں چہ فرمایا کہ جب یہ مشرک ان شرکا کو جن کی دنیا میں عبادت کرتے تھے، دیکھیں گے تو کہیں گے کہ اے رب! یہ ہمارے شرکا ہیں، جن کو ہم تیرے سوا پکارتے اور پوجتے تھے۔ وہ شرکا یہ بات سن کر کہیں گے کہ تم جھوٹے ہو، ہم نے کب تم کو حکم دیا تھا کہ تم ہم کو پوجو، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗۤ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآىِٕهِمْ غٰفِلُوْنَ ﴿5﴾ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ﴾ [الأحقاف: ٥۔ ٦] ''اور اس سے زیادہ گمراہ کون شخص ہے، جو اللہ کے سوا اس کو پکارتا ہے جو اُسے قیامت تک جواب نہیں دے سکتا؟ جبکہ وہ ان کی پکار ہی سے غافل ہیں۔ اور جب لوگ اکٹھے کیے جائیں گے تو وہ (جھوٹے معبود) ان کے دشمن ہوں گے، اور وہ ان کی عبادت کے منکر ہوں گے۔''

نیز فرمایا: ﴿ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ﴿81﴾ كَلَّا ؕ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴾ [مريم: ٨١۔ ٨٢] ''اور انھوں نے اللہ کے سوا معبود بنا لیے ہیں، تاکہ وہ ان کے مددگار ہوں۔ ہرگز نہیں! عنقریب وہ خود ان کی عبادت کا انکار کر دیں گے اور ان کے مخالف ہو جائیں گے۔'' خلیل جلیل علیہ السلام نے کہا تھا: ﴿ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ ﴾ [العنكبوت: ٢٥] ''پھر روزِ قیامت تم میں سے ایک دوسرے کا انکار کرے گا۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَقِيْلَ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ﴾ [القصص: ٦٤] ''اور (ان سے) کہا جائے گا: تم اپنے شریکوں کو بلاؤ۔''

قیامت کے دن ہر کوئی اللہ تعالیٰ کا مطیع بن جائے گا:

اس بارے میں بہت آیتیں ہیں۔ امام قتادہ اور عکرمہ رحمہما اللہ نے کہا کہ اس دن اللہ کے سامنے ذلیل (عاجز) اور فرمان بردار ہوں گے۔[1] یعنی ہر کوئی بات سننے والا اور مطیع بنے گا، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَسْمِعْ بِهِمْ

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٢٧٦) تفسير ابن كثير (٢/ ٧٥٧)

وَاَبْصِرْ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا ﴾ [مريم: ٣٨] ''وہ لوگ کیا ہی خوب سننے والے اور کیا ہی خوب دیکھنے والے ہوں گے۔'' یعنی اس دن اُن کے کان اور آنکھ خوب کھل جائیں گے اور فرمایا: ﴿ وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ رَبَّنَاۤ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا ﴾ [السجدة: ١٢] ''کاش! آپ دیکھیں جب مجرم اپنے رب کے حضور سر جھکائے (پیش) ہوں گے، (وہ کہیں گے:) اے ہمارے رب! ہم نے دیکھ لیا اور ہم نے سن لیا۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ﴾ [طٰهٰ: ١١١] ''اور سب چہرے حَی قیوم (اللہ) کے آگے جھک جائیں گے اور یقیناً وہ ناکام ہوا جس نے ظلم (شرک) کا بوجھ اُٹھایا۔'' أي خَضَعَتْ وَذَلَّتْ وَاسْتَكَانَتْ وَأَنَابَتْ وَاسْتَسْلَمَتْ.

فسادیوں کے عذاب میں اضافہ:

اس دن اُن کا افترا جاتا رہے گا اور جس کو پوجتے تھے، وہ مضمحل ہوگا، کوئی ناصر و معین و مجیر نہیں ہوگا۔ اس کفر اور اللہ کے راستے سے روکنے کی وجہ سے عذاب پر عذاب بڑھے گا، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْـَٔوْنَ عَنْهُ ﴾ [الأنعام: ٢٦] ''اور وہ دوسروں کو اس (ہدایت) سے روکتے ہیں اور خود بھی اس سے دور رہتے ہیں۔''

یعنی حق کے اتباع سے منع کرتے ہیں اور خود بھی اس سے دوری چاہتے ہیں اور ہلاک نہیں کرتے، مگر اپنی جانوں کو اور جانتے نہیں، یہ دلیل ہے کافروں کے عذاب اور سزا میں تفاوت کی، جس طرح کہ مومنین بھی جنت کے منازل میں مختلف درجوں میں ہوں گے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ﴾ [الأعراف: ٣٨] ''(تم میں سے) ہر ایک کے لیے دوگنا (عذاب) ہے، مگر تم نہیں جانتے۔'' سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ﴿ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے، کچھ بچھو زیادہ کیے جائیں گے، جن کے دانت اتنے لمبے ہیں جتنے کھجور کے درخت ہوتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہ عرش کے نیچے پانچ نہریں ہیں، بعض سے رات کو اور بعض سے دن میں عذاب کیا جائے گا۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ہر اُمت کا شہید (گواہ) اس اُمت کا نبی ہوگا جو اہلِ ایمان کے لیے ایمان اور تصدیق کی گواہی دے گا اور کافروں پر کفر، انکار اور تکذیب کی شہادت دے گا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ شہید ہر اُمت کا نبی ہے، اس اُمت کو تبلیغِ رسالت پر گواہی دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴾ [النساء: ٤١] ''اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس امت پر گواہ بنائیں گے؟'' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب یہ آیت پڑھتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ سے آنسو بہتے۔[2] یہ قیامت کا دن ہوگا، کفار کو عذر پیش کرنے کی اجازت نہ ملے گی، اس لیے کہ ان کے لیے کوئی

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٢٧٦) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٩٧)

[2] یہ الفاظ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے بجائے امام قتادہ رحمہ اللہ سے مروی ہیں۔ دیکھیں: تفسير الطبري (١٧/ ٢٧٤) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٩٦) الدر المنثور (٥/ ١٥٦)

حجت اور عذر نہیں ہے۔ یا زیادہ کلام کرنے یا دنیا کی طرف رجوع کرنے کا یا تکلیف کے وقت یا شہادتِ شہود کے وقت انھیں اجازت نہ ملے گی، بلکہ اہلِ جمع سب کے سب خاموش ہوں گے، تاکہ شہود شہادت دیں اور شہود کے ساتھ جھگڑا کرنے اور معذرت پیش کرنے کی اجازت نہ دی جائے گی، بلکہ وہ شہادت دے کر اُن سے اس بات کا اقرار کرا لیں گے، جس کی وہ گواہی دیں گے اور اُن سے رجوع طلب نہ کیا جائے گا، یعنی اس بات کی تکلیف نہ دی جائے گی کہ تم اپنے رب کو راضی کرو۔

یہ کافر مشرک جب عذاب دیکھ لیں گے تو پھر نہ عذاب میں تخفیف ہوگی اور نہ مہلت دی جائے گی کہ توبہ کریں، اس لیے کہ وہاں توبہ نہ ہوگی اور اپنے اصنام، اوثان اور انداد کو جنھیں اللہ کی عبادت میں شریک کرتے تھے، دیکھ کر کہیں گے کہ اے رب! یہ وہی ہیں، جن کو ہم نے تیرے سوا پوجا اور شریک کیا تھا، شاید یہ کہنا اس لیے ہوگا کہ عذاب تقسیم ہو جائے۔ ابو مسلم اصبہانی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ قول ان اصنام پر گناہ ڈالنے کے لیے ہوگا بہانے کے طور پر یا اپنے جی کو تسلی دینے کے لیے، حالاں کہ وہ جانتے ہوں گے کہ اُن پر عذاب لامحالہ واقع ہونے والا ہے، لیکن ڈوبنے والا جہاں تک ممکن ہو، ہر چیز کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔[1]

وہ شرکا جو اصنام و اوثان و شیاطین تھے، وہ مشرکین کو یہ جواب دیں گے کہ تم جھوٹے ہو اور ہم پر گناہ کا حوالہ جھوٹا کرتے ہو۔ ہم نے تم سے کب کہا تھا کہ ہم اللہ کے شریک ہیں۔ دنیا میں یہ اصنام بول نہیں سکتے تھے، اس دن اللہ تعالیٰ مشرکوں کو پشیمان کرنے کے لیے اُن کو زبان دے دے گا۔ یہ ملائکہ کے اس قول کی طرح ہے: ﴿ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ﴾ [سبا: ٤١] ”بلکہ وہ تو جنوں کی عبادت کرتے تھے۔“ یعنی جن ان کی عبادت سے راضی تھے۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بولنا مشرکین کے دعوائے عبادت کی تکذیب کے لیے ہوگا۔

سورت کہف میں جو بولنے کی نفی آئی ہے، وہ شفاعت کے قبول ہونے اور عذاب کے دور ہونے کے بارے میں ہے۔ پھر اس دن مشرک صلح کرنا چاہیں گے، یعنی اللہ کے عذاب کے آگے فرماں بردار اور رب العزت کے سامنے عاجزی کریں گے، یا عابد اور معبود دونوں حکم مانیں گے، لیکن اس دن کی فرماں برداری کچھ نفع نہ دے گی، اس لیے کہ تکلیف (عمل) منقطع ہوگی اور اُن کا افترا ضائع اور باطل اور زائل ہو جائے گا اور جس اعتقادِ شفاعت اور تقرب الی اللہ پر غیر اللہ کی عبادت کرتے تھے، وہ سب بے کار ثابت ہوگا۔ یہ کم بخت آپ بھی کافر ہوئے اور دوسروں کو بھی اللہ کی راہ سے روکتے تھے کہ تم اسلام اور ایمان کے حق راستے کو اختیار نہ کرو، بلکہ اسی کفر و شرک پر باقی رہو۔ یا مراد مسجد الحرام سے روکنا ہے، لیکن عمومیت زیادہ مناسب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ہم ان کو عذاب پر عذاب دیں گے، ایک ان کے کفر پر، دوسرا اوروں کے کافر رکھنے پر، یا ان کے رؤساء کو دوگنا عذاب ہوگا، بہ نسبت متبعین کے، یا یہ زیادتی جہنم کی گرمی سے نکال

---

[1] فتح القدير (٣/ ٢٥٨)

کر سردی اور زمہریر کی طرف لے جاتا ہے۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا کہ سانپ ہیں، جیسے: بختی نسل کے اونٹ اور بچھو، جیسے: خچر، اُن کے ڈسنے کا درد چالیس برس تک محسوس کریں گے،[1] عذاب کی یہ زیادتی ان کے مفسد ہونے کی وجہ سے ہوگی۔[2]

وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ ؕ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿۸۹﴾

اور (اے نبی! یاد کرو) جس دن ہم ہر امت میں ان پر انھی میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے، اور آپ کو ان لوگوں پر گواہ لائیں گے۔ اور ہم نے آپ پر ہر چیز کو کھول کر بیان کرنے والی یہ کتاب نازل کی ہے، جو مسلمانوں کے لیے ہدایت، رحمت اور خوش خبری ہے (89)

ہر نبی و رسول قیامت کے دن اپنی امت پر گواہ ہوگا:

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے عبد اور رسول کو یہ خطاب کیا کہ ہم تم کو تمھاری اُمت کا گواہ بنا کر لائیں گے، یعنی تم اس دن کو یاد کرو کہ اس میں کیا کچھ بزرگی اور بلند مقام تم کو ملے گا۔ یہ آیت اس آیت کے مشابہ ہے کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے سورۂ نساء کا ابتدائی حصہ پڑھا، جب اس آیت پر پہنچے: ﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا﴾ [النساء: ٤١] ”پھر ان کا کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور آپ (ﷺ) کو اس امت پر گواہ بنائیں گے؟“

نبی اکرم ﷺ نے کہا: «حَسْبُكَ» یعنی بس۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے مڑ کر دیکھا تو دونوں آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔[3] پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کہا کہ یہ قرآن ہر شے کو بیان کرنے والا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے اس قرآن میں ہر علم اور ہر شے بیان کر دی ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی ہر حلال اور ہر حرام،[4] لیکن سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول زیادہ عام اور اشمل ہے، کیوں کہ قرآن ہر علم نافع پر مشتمل ہے، وہ گزرے ہوئے زمانے کا علم ہو یا آیندہ زمانے کا اور کیا حرام و حلال ہو اور لوگوں کی حاجت کے مطابق امر دین و دنیا و معاش اور معاد کے لیے ضروری علم ہو اور دلوں کی ہدایت ہے اور لوگوں کے لیے رحمت اور مسلمان کے لیے نوید اور خوش خبری ہے۔ امام اوزاعی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ کتاب ہر شے کو بیان کرتی ہے یعنی بالسنة۔[5]

---

(1) تفسير البغوي (٥/ ٣٧) (2) فتح البيان (٧/ ٢٩٦۔ ٢٩٩)
(3) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٦٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٠٠)
(4) تفسير الطبري (١٧/ ٢٧٨۔ ٢٧٩) (5) الدر المنثور (٥/ ١٥٨)

اس آیت ﴿ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ ﴾ کو جو اس آیت ﴿ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴾ [النساء: ٤١] کے ساتھ ملایا ہے تو (واللہ أعلم) یہ مراد ہے کہ جس نے تجھ پر کتاب کا پہنچانا فرض کیا ہے، وہ تجھ سے قیامت کے دن اس تبلیغ کے متعلق سوال کرے گا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ [الأعراف: ٦] ''چناں چہ ہم ان لوگوں سے ضرور سوال کریں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے تھے اور ہم رسولوں سے بھی ضرور سوال کریں گے۔'' نیز فرمایا: ﴿ فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴾ [الحجر: ٩٢] ''چنانچہ آپ کے رب کی قسم! ہم ان سب سے ضرور باز پرس کریں گے۔''

نیز فرمایا: ﴿ يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ۭ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴾ [المائدة: ١٠٩] ''اس دن (کو یاد کرو) جب اللہ رسولوں کو جمع کرے گا، پھر (ان سے) کہے گا کہ تمھیں کیا جواب دیا گیا تھا؟ تو وہ کہیں گے: ہمیں کوئی علم نہیں، بے شک تو ہی غیب کی باتوں کو جاننے والا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَاۗدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ ﴾ [القصص: ٨٥] ''بلاشبہ وہ (اللہ) جس نے آپ پر قرآن نازل کیا، یقیناً وہ آپ کو (اچھے) انجام تک پہنچانے والا ہے۔'' یعنی جس نے تم پر قرآن کا پہنچانا واجب کیا ہے، وہ تجھ کو معاد کے دن پھیر لائے گا اور تجھ سے مذکورہ فرض کے ادا کرنے کے بارے میں سوال ہوگا۔ هٰذَا أَحَدُ الْأَقْوَالِ وَهُوَ مُتَّجِهٌ حَسَنٌ.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ہم ہر اُمت میں ایک شہید یعنی گواہ کھڑا کریں گے، انھی کی جنس کا، یعنی اتمامِ حجت اور عذر کو توڑنے کے لیے۔ یہ بہت زیادہ انصاف والا گواہ ہوگا، اس اُمت کے روبرو یہ گواہی دی جائے گی اور اے پیغمبر! ہم تجھ کو بھی لائیں گے تو اُن سب اُمتوں پر گواہ ہوگا یا اپنی اُمت اور قوم پر۔ ہم نے تجھ پر یہ کتاب ہر چیز کے بیان کرنے کے لیے اُتاری ہے۔ مراد یہ ہے کہ قرآن میں بیان بلیغ ہے بہت سے احکام کا اور باقی احکام سنتِ مطہرہ کے حوالے پر ہیں اور رسول کی اتباع کرنے کا حکم ہے، جس طرح کہ آیاتِ قرآنیہ اس پر دلیل ہیں۔ حدیث میں فرمایا ہے: «إِنِّي أُوتِيتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ» یعنی میں قرآن اور قرآن جتنا اور دیا گیا ہوں۔[1]

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ قرآن میں تو ہر شے کا بیان ہے، لیکن ہمارے علم اس سے قاصر ہیں۔[2] ان کے دوسرے الفاظ یہ ہیں: ''من أراد العلم فليثور القرآن، فإن فيه علم الأولين والآخرين'' یعنی جو علم چاہے تو قرآن کو کھولے، کیوں کہ اس میں پہلوں اور پچھلوں کا علم ہے۔[3] امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ بیان نفسِ قرآن میں ہے، یہ سنت پر محمول ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۤ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ

---

[1] مسند أحمد (٤/ ١٣٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٦٤٣)

[2] فتح القدير (٣/ ٢٦١) [3] المعجم الكبير (٩/ ١٣٦) شعب الإيمان (٢/ ٣٣١)

﴿فَانْتَهُوْا﴾ [الحشر: ۷] ''اور اللہ کا رسول تمھیں جو کچھ دے تو وہ لے لو اور جس سے منع کرے تو اسے چھوڑ دو۔''

یہ حوالہ ہے اجماع کا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [النساء: ۱۱۵] ''اور مسلمانوں کا راستہ چھوڑ کر دوسرے راستے کی پیروی کرے۔'' یا قیاس پر جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَاعْتَبِرُوْا يٰۤاُولِي الْاَبْصَارِ﴾ [الحشر: ۲] ''تو اے آنکھوں والو! عبرت پکڑو۔'' اعتبار سے مراد نظر اور استدلال ہے، جن سے قیاس حاصل ہوتا ہے۔ سو یہ چار طریق ہیں، احکامِ شریعت کی کوئی شے اُن سے خارج نہیں اور یہ سب طریقے قرآن میں آئے ہیں۔ لہٰذا قرآن ہر شے کا بیان ہے، اب کوئی شخص یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ ہم شریعت کے بہت سے احکام قرآن میں صریحاً نہیں پاتے، جیسے نماز کی رکعات کی تعداد، مسح کی مدت، حیض، حدِ شراب کی مقدار، چوری کا نصاب اور اس جیسے دوسرے احکام۔ پھر اُمت نے بہت سارے احکام میں اختلاف کیا ہے۔[1]

میں کہتا ہوں احکام کا کتاب و سنت پر احالہ تو بالاتفاق صحیح ہے۔ رہا اجماع سو نفس الامر میں، یعنی حقیقی طور پر ممکن اور خارج میں معدوم یا مشکل ہے اور قیاسِ جلی معتبر ہے نہ غیر جلی، سو اس کی ضرورت اس شخص کو ہوتی ہے جو کتابِ عزیز اور سنتِ مطہرہ کے علم سے قاصر ہے اور اُن پر خصوصی مشق و عبور اور علم نہیں رکھتا، ورنہ قرآن و حدیث کے عالم کو اجماع و قیاس کی طرف رجوع کرنے کی کوئی حاجت نہیں ہوتی، علاوہ اس کے اصل شریعت یہی دو چیزیں ہیں کتاب و سنت اور بس۔ لہٰذا امام اہلِ سنت و الجماعۃ احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اجماع کے وجود کا انکار کیا ہے۔ اس کی بحث "إرشاد الفحول" و "حصول المأمول" وغیرہ میں دی گئی ہے۔[2] رہا قیاس سو شہاب خفاجی حنفی رحمہ اللہ نے امام بیضاوی و شافعی رحمہما اللہ کے اس قول: "بالإحالة إلى السنة والقياس" پر کہا ہے: "فيه تأمل"[3] یہ تامل یہی ہے کہ قیاس سے حلال اور حرام وغیرہ کا کوئی حکم یقیناً نص کی طرح ثابت نہیں ہوتا۔

اس لیے امامِ جماعتِ سنت داود ظاہری اور ابن حزم رحمہما اللہ وغیرہما نے قیاس سے بالکل انکار کیا ہے[4] اور اعتبار سے کیا ضروری ہے کہ نظر اور استدلال ہی مراد ہو۔ ظاہر یہ ہے کہ اعتبار سے مراد موعظت اور پند و نصیحت پکڑنا ہے، بلکہ اکثر آیتِ شریفہ کا سیاق و سباق اسی پر دلیل ہے، اگرچہ علمائے محققین اجماع کو، اگر تمام شرطوں کے ساتھ ثابت ہو، اور قیاسِ جلی کو اس کے لوازمات کے ساتھ قبول رکھتے ہیں اور یہی زیادہ مناسب اور اعلیٰ ہے۔ واللّٰه أعلم۔ بلکہ اہلِ علم کی ایک جماعت نے آیتِ باب سے استدلال کیا ہے کہ تقلید ممنوع ہے، کیوں کہ جب کتاب ہر شے کا تبیان (واضح بیان) ٹھہری اور سنت کتاب ہی کے حکم میں ہے بدلیل: ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾ [النجم: ۳۔ ٤] ''اور

---

[1] فتح البيان (۷/ ۳۰۰۔ ۳۰۱) [2] إرشاد الفحول (۱/ ۱۹۳۔ ۲۳۸)

[3] حاشية الشهاب علىٰ تفسير البيضاوي (٥/ ٣٦١۔ ٣٦٢)

[4] مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: ابن حزم رحمہ اللہ کی کتاب "الإحكام في أصول الأحكام"

وہ (اپنی) خواہش سے نہیں بولتا۔ وہ وحی ہی تو ہے جو (اس کی طرف) بھیجی جاتی ہے۔"

اور حدیث «بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ آيَةً»[1] میں آیت کا اطلاق سنت پر کیا ہے تو پھر تقلیدِ رجال اور لوگوں کے قیل اور قال کی کیا حاجت ہے کہ "اَلصَّبَاحُ يُغْنِيْ عَنِ الْمِصْبَاحِ" اللہ تعالیٰ نے اس کتابِ مستطاب معلّی القاب کو آیتِ باب میں ﴿ وَهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴾ فرمایا ہے، ان اوصافِ جمیلہ نافعہ کے بعد غیر کتاب و سنتِ صحیحہ کی طرف رجوع کرنا ایسا ہے جیسے آفتاب کی روشنی میں دن کو کوئی مشعل لے کر چلے۔ پھر اس بیان کے بعد کہ قرآن تبیان ہر شے ہے، ایک آیت جو جامع اصول تکلیف ہے، وہ تبیانِ مذکور کی تصدیق کے لیے بیان فرمائی اور کہا:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝۹۰

بے شک اللہ عدل اور احسان اور قرابت داروں کو (امداد) دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی، برے کام اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے۔ وہ تمھیں وعظ کرتا ہے، تاکہ تم نصیحت پکڑو (90)

عدل و احسان اور صلہ رحمی کا حکم اور برائی و بے حیائی کی ممانعت:

غیر کے مقدمے میں انصاف چاہیے، یعنی برابر رکھنا اور اپنی طرف سے بھلائی کرنا۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ اپنے بندوں کو انصاف اور برابری کا حکم اور احسان کرنے کی ترغیب دیتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ﴾ [النحل: ١٢٦] "اور اگر تم بدلہ لو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنی تمھیں تکلیف دی گئی ہو، اور اگر تم صبر کرو تو وہ صابرین کے لیے بہت بہتر ہے۔" نیز فرمایا: ﴿ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ﴾ [الشوریٰ: ٤٠] "اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے، پھر جو معاف کر دے اور صلح کر لے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔"

نیز فرمایا: ﴿ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ﴾ [المائدة: ٤٥] "اور تمام زخموں کا قصاص ہے، پھر جو شخص اسے معاف کر دے تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے۔" اس کے سوا اور بہت آیتیں ہیں، جو عدل کے مشروع ہونے اور فضل و احسان کی ترغیب دینے کے بارے میں دلیل ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ عدل سے مراد "لا إله إلا الله" کی شہادت دینا ہے۔ امام سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ نے کہا کہ اس جگہ عدل کے معنی ہیں کہ ہر عامل للہ ظاہری طور پر اور پوشیدہ جہاں تک اس کا اختیار ہے، وہ انصاف کرے اور احسان یہ ہے کہ پوشیدہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٧٤)

حالت ظاہری حالت سے بہتر ہو اور فحشاء و منکر یہ ہے کہ ظاہری حالت پوشیدہ حالت سے بدتر ہو۔ [1]

قولہ تعالیٰ: ﴿ وَإِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى ﴾ سے مراد صلہ رحمی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ٢٦] ''اور قرابت دار کو اس کا حق دے اور مسکین اور مسافر کو بھی، اور فضول خرچی سے مال نہ اُڑا۔'' فواحش حرام کردہ ہیں اور منکرات جو کرنے والے سے ظاہر ہوں۔ اس لیے دوسری جگہ کہا ہے: ﴿ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ﴾ [الأعراف: ٣٣] ''کہہ دیجیے: بے شک میرے رب نے بے حیائی کی باتوں کو حرام ٹھہرایا ہے، چاہے وہ ظاہر ہوں یا چھپی ہوئی۔'' یعنی لوگوں پر زیادتی کرنا۔

حدیث میں مروی ہے: «مَا مِنْ ذَنْبٍ أَجْدَرُ أَنْ يُّعَجِّلَ اللّٰهُ عُقُوْبَتَهُ فِي الدُّنْيَا مَا يَدَّخِرُ لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْبَغْيِ وَ قَطِيْعَةِ الرَّحِمِ» یعنی کوئی گناہ ایسا نہیں ہے، جس کے فاعل کو دنیا میں بھی عذاب کیا جائے، آخرت کے عذاب کے ساتھ مگر بغاوت اور قطع رحمی۔ [2] اللہ سبحانہ و تعالیٰ تم کو وعظ کرتا ہے، یعنی خیر کا حکم دیتا ہے اور شر سے منع فرماتا ہے، شاید تم یاد رکھو۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے تھے: "أَجْمَعُ آيَةٍ فِي الْقُرْآنِ فِيْ سُوْرَةِ النَّحْلِ: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ ﴾ [الآية]" قرآن میں جامع آیت وہ ہے، جو سورت نحل میں ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ ﴾۔'' امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نہیں ہے کوئی خلقِ حسن جس کو اہلِ جاہلیت کرتے تھے اور اچھا سمجھتے تھے، لیکن اس نے اس کا حکم کیا ہے اور نہیں ہے کوئی خلقِ بد جس کو وہ اپنے درمیان بجا لاتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا، چناں چہ بد اخلاقی سے منع کیا ہے۔ [3] اس لیے حدیث میں مروی ہے کہ اللہ دوست رکھتا ہے بلند اخلاق کو اور ناپسند کرتا ہے سفاسف اخلاق کو۔ [4]

عبدالملک بن عمیر نے کہا کہ اکثم بن صیفی کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت کی خبر پہنچی، چاہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو قوم نے ان کو آنے نہ دیا اور کہا تم ہمارے بڑے ہو، تمھارا جانا اچھا نہیں، کہا کہ پھر کوئی ایسا شخص چاہیے جو اُن کے پاس آئے اور میری بات اُن کو اور اُن کی بات مجھ کو پہنچا دے۔ دو آدمی اُٹھ کھڑے ہوئے کہ ہم جاتے ہیں۔ وہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ ہم اکثم بن صیفی کے قاصد ہیں، وہ آپ سے یہ سوال کرتا ہے کہ "من أنت، وما أنت؟" یعنی آپ کون ہیں اور کیا ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «أما من أنا فأنا محمد

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٢٧٩۔ ٢٨٠)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٠٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥١١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢١١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٧٠٤)

[3] تفسير الطبري (١٧/ ٢٨٠۔ ٢٨١)

[4] المعجم الكبير (٦/ ١٨١) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٨٠١)

بن عبد الله، وأما ما أنا فأنا عبد الله ورسوله» یعنی میں کون ہوں تو میں محمد، عبداللہ کا بیٹا ہوں اور میں کیا ہوں تو میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسٰنِ ﴾ (آیتِ باب) انھوں نے کہا کہ یہ آیت ہم پر دوبارہ پڑھیں۔ نبی کریم ﷺ نے یہ آیت ان پر بار بار پڑھی، یہاں تک کہ انھوں نے یاد کر لی۔ پھر اکثم کے پاس آئے اور کہا کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے نسب کو بلند کرنے سے انکار کیا، ہم نے ان کے نسب کا سوال کیا تو آپ کو مضر کے درمیان میں زکیُّ النسب پایا، یعنی شریف النسب اور کچھ کلمات ہماری طرف پھینکے، جن کو ہم نے سنا۔ اکثم نے کلماتِ مذکور سن کر کہا کہ میں دیکھتا ہوں کہ وہ مکارمِ اخلاق کا حکم کرتے ہیں اور قابلِ ملامت اخلاق سے منع کرتے ہیں، تم لوگ اس امر میں رؤسا ہو اور اذناب مت بنو۔[1] (رواه أبو يعلٰى)

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ اپنے گھر کے صحن میں بیٹھے تھے کہ اتنے میں سیدنا عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کا گزر ہوا۔ الحدیث بطولہ۔ اس میں یہ ذکر مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کا رسول (فرشتہ جبریل) ابھی آیا تھا، وہ یہ آیت لایا۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہ قصہ اس وقت کا ہے کہ جب ایمان میرے دل میں ٹھہر چکا تھا اور میں محبِّ رسول اللہ ﷺ تھا۔[2] اس کی اسناد متصل حسن ہے۔ سیدنا عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نبی اکرم ﷺ کے پاس بیٹھا تھا کہ اتنے میں نظر اُٹھا کر فرمایا کہ جبریل میرے پاس آئے اور کہا کہ اس آیت کو اس سورت میں اس جگہ رکھو۔[3] (رواه أحمد وهذا إسناد لا بأس به)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ من جملہ تبیان قرآن کے ایک یہ بات ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے حکم دیا ہے عدل و احسان کرنے کا۔ اہلِ علم کا عدل و احسان کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا کہ عدل کلمہ طیبہ کی شہادت ہے اور احسان فرائض کا ادا کرنا ہے۔ کسی نے کہا کہ عدل فرض ہے اور احسان نفل۔ بعض نے کہا کہ عدل پوشیدہ اور ظاہر کا ایک جیسا ہونا ہے اور احسان یہ ہے کہ پوشیدہ افضل ہو ظاہر سے، یا عدل توحید ہے اور احسان تفضّل۔ یا عدل معبودانِ باطلہ کو چھوڑنا ہے اور احسان یہ ہے: "تَعْبُدُ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ" یا عدل توحید ہے اور احسان اخلاص میں سے ہے۔ یا عدل افعال میں سے ہے اور احسان اقوال میں سے، جو کچھ کرے، وہ عدل ہو اور جو کچھ کہے وہ احسان ہو۔ اس کے سوا اور بہت سے اقوال ہیں جن کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔ عدل ہر شے میں بلا کم و بیش برابری کرنے سے عبارت ہے۔ زیادہ مناسب تفسیر عدل کی لغوی معنی کے ساتھ ہے کہ عدل درمیانی جگہ ہے، دونوں اطراف کی، یعنی افراط و تفریط کی۔

---

[1] تفسير ابن كثير (٢/ ٧٥٩) الدر المنثور (٥/ ١٥٩) یہ روایت مرسل ہے۔ [2] مسند أحمد (١/ ٣١٨)

[3] مسند أحمد (٤/ ٢١٨) اس کی سند میں "لیث بن ابی سلیم" ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١٧٥٣)

مطلب یہ ٹھہرا کہ بندوں کو دین میں حالتِ متوسط پر رہنا چاہیے نہ افراط کی طرف جھکیں نہ تفریط کی طرف مائل ہوں، اعتقاداً، جیسے: توحید کہ وہ تعطیل اور تشریک کے درمیان ہے اور جیسے قول بہ کسب کہ متوسط ہے محض جبر اور قدر کے درمیان اور عملاً، جیسے: واجبات کو ادا کرنے کے ساتھ عبادت کہ وہ درمیانی راستہ ہے بطالت اور ترہب کے اور خلقاً، جیسے: سخاوت کہ متوسط ہے بخیلی اور فضول خرچی کے درمیان۔ رہا احسان تو اس کے لغوی معنی تو اس چیز کے ساتھ تفضّل کرنا ہے جو واجب نہیں ہے، جیسے: نفلی صدقہ۔ من جملہ احسان کے ثواب کا ایسا کام کرنا جو عبادت میں واجب نہیں۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے عدل و احسان اور بغی کے متعلقات کا ذکر نہیں کیا، تاکہ تمام چیزیں ان قسموں میں شامل رہیں۔ احسان کی تفسیر صحیحین میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے یوں مروی ہے: « أَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَأَنَّکَ تَرَاہُ، فَإِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَإِنَّہٗ یَرَاکَ » یعنی تو اللہ کی عبادت کرے، گویا تو اُسے دیکھ رہا ہے، اگر ایسا نہ ہو سکے تو یہ کہ وہ تجھے دیکھتا ہے۔[1] شرعی احسان کے معنی یہی ہیں۔

قرابت والوں کو دینے کا مطلب یہ ہے کہ صلہ اقارب و ارحام کرے اور اُن پر تصدق و خیرات کرے۔ ناتے (رشتے) والوں کو خاص طور پر اس لیے بیان کیا کہ ان کا حق مؤکد تر ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے رحم کا اشتقاق اپنے اسمِ شریف سے کیا ہے اور صلہ رحم کو اپنا صلہ اور قطع رحم کو اپنی قطعیت ٹھہرایا ہے۔ صلہ ارحام کرنا فاضل مال سے مستحب ہے، اگر فاضل نہ ہو تو اچھی دعا اور محبت سے۔ ''فحشاء'' کہتے ہیں ایسی خصلت کو جو بہت زیادہ قبیح ہو، قول ہو یا فعل ہو۔ بعض نے کہا کہ زنا ہے اور بعض نے کہا کہ بخل ہے۔ منکر وہ ہے جس سے شریعت نے روکا ہے، یہ تمام معاصی کو ان کی مختلف قسموں پر شامل ہے۔ بعض نے کہا کہ شرک ہے۔ ''بغي'' سے مراد تکبر ہے، یا ظلم یا کینہ یا تعدی (زیادتی)۔ حقیقت اس کی تجاوز کرنا ہے حد سے۔ سو ''بغي'' ان تمام مذکورہ امور کو شامل ہے تمام اقسام کے ساتھ۔ ذکر کی تخصیص اہتمام کے ساتھ ان چیزوں کے سخت نقصان اور انجام کے وبال کی وجہ سے ہے۔ یعنی ان گناہوں میں سے ہیں، جو اپنے فاعل پر راجع ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے قول کے مطابق: ﴿ اِنَّمَا بَغْیُکُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ ﴾ [یونس: ۲۳] ''تمھاری سرکشی (کا وبال) تمھاری (اپنی ہی) جانوں پر ہے۔''

یہ آیت اُن آیات میں سے ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر دلالت کرتی ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ کتاب اللہ میں اعظم آیت ﴿ اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ﴾ [البقرۃ: ۲۵۵] ''وہ اللہ ہے، اس کے سوا کوئی (سچا) معبود نہیں، وہ زندہ ہے سب کو سنبھالے ہوئے ہے۔'' ہے اور کتاب اللہ میں خیر و شر کے لیے سب سے جامع آیت سورت نحل کی یہ آیت ہے اور کتاب اللہ میں تفویض کے بارے میں یہ سب سے بہتر آیت ہے: ﴿ وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا ﴾ [الطلاق: ۲] ''اور جو شخص اللہ سے ڈرے تو وہ اس کے لیے

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۸)

ڈرے تو وہ اس کے لیے (مشکلات سے) نکلنے کا راستہ بنا دیتا ہے۔'' اور کتاب اللہ میں اُمید کے بارے میں سب سے شدید آیت یہ ہے: ﴿ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ﴾ [الزمر: ۵۳] ''آپ کہہ دیجیے: (اللہ فرماتا ہے:) اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم و زیادتی کی ہے! تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔''[1]

امام عکرمہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت ولید بن مغیرہ پر پڑھی۔ اس نے کہا کہ اے بھتیجے! پھر مجھ پر پڑھو، آپ نے اعادہ کیا، اس نے کہا: ''وَاللّٰهِ إِنَّ لَهُ لَحَلَاوَةً، وَإِنَّ عَلَيْهِ لَطَلَاوَةً، وَإِنَّ أَعْلَاهُ وَاللّٰه لَمُثْمِرٌ، وَإِنَّ أَسْفَلَهُ لَمُغْدِقٌ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ الْبَشَرِ'' یعنی اللہ کی قسم! اس کی حلاوت ہے اور اس پر طلاوت ہے اور اس کے اوپر کا جانب مثمر ہے اور اس کا اسفل پانی سے لبریز ہے اور یہ بشر کا کلام نہیں۔[2]

امام حسن رحمہ اللہ نے اس آیت کو آخر تک پڑھ کر کہا: ''إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ جَمَعَ لَكُمُ الْخَيْرَ كُلَّهُ وَالشَّرَّ كُلَّهُ فِيْ آيَةٍ وَاحِدَةٍ، فَوَاللّٰهِ مَا تَرَكَ الْعَدْلَ وَالْإِحْسَانَ مِنْ طَاعَةِ اللّٰهِ شَيْئًا إِلَّا جَمَعَهُ وَأَمَرَ بِهِ، وَلَا تَرَكَ الْفَحْشَاءَ وَالْمُنْكَرَ وَالْبَغْيَ مِنْ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ شَيْئًا إِلَّا جَمَعَهُ وَزَجَرَ عَنْهُ'' یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تمھارے لیے ایک آیت میں سب بھلائیوں اور برائیوں کو جمع کر دیا۔ اللہ کی قسم! نہیں چھوڑا عدل اور احسان کو اللہ کی اطاعت سے، مگر اس کو اس نے اس آیت میں جمع کر دیا اور اس کا حکم دیا ہے اور نہیں چھوڑی بے حیائی اور برے کام سے کوئی چیز اللہ کی معصیت سے مگر اس نے اس سے روک دیا ہے۔[3] مستدرک میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہ آیت قرآن میں سے خیر اور شر کی سب سے زیادہ جامع آیت ہے۔[4]

امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اسی آیت کی وجہ سے عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ اسلام لائے تھے۔ اگر قرآن میں اس کے سوا کوئی اور آیت نہ ہوتی، تب بھی اس پر یہ آیت صادق آتی: ''أَنَّهُ تِبْيَانٌ لِكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً'' یعنی اس میں ہر چیز کی شرح ہے اور ہدایت اور رحمت ہے، شاید اس کا آیت کا وارد کرنا، اس قول کے بعد ﴿ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ ﴾ یعنی تجھ پر کتاب اُتاری، شاید اس تنبیہ کے لیے ہے۔[5] پھر اس کو یوں ختم کیا: ﴿ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴾ یعنی تم کو نصیحت کرتا ہے، تاکہ تم یاد رکھو، یعنی یہ امر و نہی جو نصیحت کے لیے ذکر کیا گیا، اس ارادے سے کہ تم اس کو یاد کر کے نصیحت پذیر اور پندگزیں ہو، کیوں کہ وعظ و نصیحت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ وعظ کافی، وافی، شافی اور صافی ہے۔[6]

---

[1] ان الفاظ کے ساتھ روایت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بجائے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ دیکھیں: المعجم الكبير (۹/ ۱۳۳) الدر المنثور (۵/ ۱٦٠)

[2] تفسير البغوي (۵/ ۳۹) [3] شعب الإيمان (۱/ ۱٦۱) [4] مستدرك الحاكم (۲/ ۳۸۸)

[5] تفسير البيضاوي (۳/ ۴۱۷) [6] فتح البيان (۷/ ۳۰۲۔ ۳۰۴)

وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَ لَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا
وَ قَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۹۱﴾
وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ؕ
تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ
اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ؕ اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ؕ وَ لَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ
الْقِيٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۲﴾

اور اللہ کا عہد پورا کرو جب تم آپس میں عہد کرلو اور قسمیں پکی کرنے کے بعد نہ توڑو، جب کہ تم نے اللہ کو اپنا کفیل بنایا ہو۔ بے شک اللہ جانتا ہے جو تم کرتے ہو (91) اور تم اس عورت کی طرح نہ ہو جاؤ جس نے اپنا سوت محنت سے کاتنے کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، تم اپنی قسموں کو باہم فریب کا ذریعہ بناتے ہو کہ ایک جماعت دوسری جماعت سے (مالِ وافر میں) بڑھ جائے۔ بے شک اللہ اس (عہد و پیماں) سے تمھیں آزماتا ہے۔ اور یومِ قیامت وہ تم پر ضرور واضح کر دے گا، جس میں تم اختلاف کرتے تھے (92)

عہد و پیمان کی حفاظت کا حکم:

کوئی قول دے کر دغا کرتا ہے اس واسطے کہ زبردست کو گرا دے اور کمزور کو چڑھا دے، یہ اللہ تعالیٰ نے آزمانے کے لیے رکھا ہے، کسی کے بدلے سے بدلا نہیں جاتا۔ ادبار (منہ پھیرنے) سے اقبال (سامنے آنا) وہی لائے تو آئے اور بدقولی کا خیال تب ہی آتا ہے جب ادبار آتا ہوتا ہے۔ دوسرا گرایا نہ گرا اول آپ گرتا ہے، اپنے بنے کام کو خراب کرتا ہے، جیسے ایک مالدار دیوانی عورت تھی، سارا سال سوت کتواتی کہ اقرباء کو دوں گی، جب جاڑا آتا تو سوت کو کاٹ کاٹ کر سب کو بانٹتی۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس آیت میں حکم دیا کہ قول وقرار پورا کرو اور میثاق اور قسم پر جمے رہو، قسم کو مضبوط کر دینے کے بعد نہ توڑو۔ اس آیت میں اور آیت: ﴿ وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمٰنِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَ تَتَّقُوْا وَ تُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ﴾ [البقرۃ: ٢٢٤] ''اور تم اللہ کا نام اپنی قسموں کے لیے استعمال نہ کرو، یہ کہ تم نیکی (نہیں) کرو گے اور تقویٰ (نہیں) اپناؤ گے اور لوگوں کے درمیان صلح (نہیں) کراؤ گے۔'' میں کچھ تعارض نہیں ہے اور نہ اس آیت میں: ﴿ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمٰنِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ﴾ [المائدۃ: ٨٩] ''یہ تمھاری قسموں کا کفارہ ہے جب تم قسم کھا (کر توڑ) بیٹھو'' اور نہ اس حدیث میں جو صحیحین میں مروی ہے: « إِنِّيْ وَاللّٰهِ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ لَا أَحْلِفُ عَلٰى

يَمِيْنٍ فَأَرَى غَيْرَهَا خَيْرًا مِنْهَا إِلَّا أَتَيْتُ الَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ وَتَحَلَّلْتُهَا ﴾ یعنی میں اللہ تعالیٰ کی قسم! اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا، کسی بات پر قسم نہیں کھاتا، پھر اس کے سوا کسی اور بات کو بہتر دیکھوں گا، مگر وہ کام کر لیتا ہوں جو بہتر ہوتا ہے اور قسم کا کفارہ دے دیتا ہوں۔[1]

دوسری روایت میں یوں ہے: ﴿ وَكَفَّرْتُ عَنْ يَمِيْنِيْ ﴾[2] سو اُن میں اور آیت میں کچھ تعارض نہیں ہے، اس لیے کہ ان قسموں سے مراد وہ قسمیں ہیں جو عہد و پیمان اور میثاق میں داخل ہیں نہ وہ قسمیں جو رغبت دلانے اور منع پر وارد ہوتی ہیں۔ لہٰذا امام مجاہد رحمہ اللہ نے آیتِ باب کے متعلق کہا ہے کہ مراد جاہلیت کی قسمیں ہیں۔[3] سیدنا جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: ''اسلام میں ایک دوسرے کو حلیف بنانے کی ضرورت نہیں، جس شخص کا جاہلیت میں جو حلف تھا، اسلام نے اس کی مضبوطی میں اور اضافہ کیا۔''[4] (رواه أحمد و مسلم)

معنی یہ ٹھہرے کہ اسلام کے ہوتے ہوئے اس حلف کی کوئی حاجت نہیں ہے جس کو اہلِ جاہلیت کیا کرتے تھے، کیوں کہ اسلام کے ساتھ تمسک کرنے سے جاہلیت کے کسی کام کی ضرورت نہیں رہتی۔ رہی سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے گھر میں مہاجرین اور انصار کے درمیان مخالفت[5] عہد و پیمان کرائے اس کے معنی یہ ہیں کہ آپس میں بھائی چارہ کرا دیا، ایک دوسرے کے وارث ہوتے تھے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس امر کو منسوخ کر دیا۔ واللہ أعلم۔ سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جو شخص اسلام لاتا، وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام پر بیعت کرتا، اس پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ آیت بھیجی کہ ﴿ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ... الخ ﴾ (آیتِ باب)

اس عہد سے مراد بیعت ہے، یعنی جب اسلام پر بیعت کر چکے تو اب اس کو نبھاؤ اور بیعت کو نہ توڑو، تم کو مسلمانوں کی قلت اور مشرکین کی کثرت کہیں اس بات پر نہ اُکسا دے اور اس کا باعث نہ بنے کہ تم بیعتِ اسلامیہ کو توڑ ڈالو۔[6] امام احمد رحمہ اللہ نے امام نافع رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ جب بعض لوگوں نے یزید بن معاویہ کی بیعت توڑ دی تو سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے بیٹوں اور گھر والوں کو جمع کر کے تشہد پڑھا۔ پھر کہا: ''أَمَّا بَعْدُ فَإِنَّا قَدْ بَايَعْنَا هٰذَا الرَّجُلَ عَلٰى بَيْعَةِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ، وَإِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُوْلُ: إِنَّ الْغَادِرَ يُنْصَبُ لَهُ لِوَاءٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، فَيُقَالُ: هٰذِهِ غَدْرَةُ فُلَانٍ، وَإِنَّ مِنْ أَعْظَمِ الْغَدْرِ، إِلَّا أَنْ يَكُوْنَ الْإِشْرَاكُ بِاللّٰهِ، أَنْ يُبَايِعَ رَجُلٌ رَجُلًا عَلٰى بَيْعَةِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ ثُمَّ يَنْكُثُ بَيْعَتَهُ، فَلَا يَخْلُوْ أَحَدٌ مِّنْكُمْ يَدًا وَلَا يُسْرِفَنَّ أَحَدٌ

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٩٦٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٤٩) (2) صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٤٩)

(3) تفسير الطبري (١٧/ ٢٨٢) (4) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٣٠) مسند أحمد (٤/ ٨٣)

(5) صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٧٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٢٩)

(6) تفسير الطبري (١٧/ ٢٨١)

مِنْكُمْ فِيْ هٰذَا الْأَمْرِ فَيَكُوْنُ فَصْلٌ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُ''، یعنی حمد وصلاۃ کے بعد کہا کہ پس ہم نے اس شخص (یزید بن معاویہ) کے ہاتھ پر اللہ اور اس کے رسول کی بیعت کی اور میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، فرماتے تھے کہ دغا باز کے لیے قیامت کے دن ایک جھنڈا کھڑا کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ فلاں کا فریب ہے اور شرک کے بعد یہ بڑا فریب ہے کہ ایک مرد دوسرے مرد کے ہاتھ پر اللہ اور اس کے رسول کی بیعت کرے اور پھر اس کی بیعت توڑ دے تو تم میں سے کوئی شخص (اس کی بیعت سے) ہاتھ نہ نکالے اور نہ اس کام میں زیادتی کرے اور اگر کسی نے یہ کام کیا تو میرے اور اس کے درمیان جدائی ہے۔[1]

اس روایت میں جس قدر مرفوع ہے، وہ صحیحین میں ہے۔[2] سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے: «مَنْ شَرَطَ لِأَخِيْهِ شَرْطًا لَا يُرِيْدُ أَنْ يَفِيَ لَهُ بِهِ فَهُوَ كَالْمُدْلِيْ جَارَهُ إِلٰى غَيْرِ مَنْعَةٍ» یعنی جس نے اپنے بھائی سے شرط کی اور وہ اسے پورا کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تو اس کی مثال ایسی ہے، جیسے کسی نے اپنے ہمسائے کو غیر محکم چیز کی طرف لٹکایا۔[3] اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا یہ کہنا کہ اللہ جانتا ہے جو تم کرتے ہو، عہد اور قسم توڑنے والے کے لیے سرزنش اور وعید ہے۔ امام عبداللہ بن کثیر اور سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ زنِ خرقا مکہ میں تھی۔ جب سوت کاتتی تو اسے پکا کرنے کے بعد توڑ ڈالتی۔ امام مجاہد وقتادہ اور ابن زید رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ اس کی مثال ہے جس نے اپنا عہد مضبوطی کے بعد اور پکا کرنے کے بعد توڑ ڈالا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ قول بہت راجح اور بہت ظاہر ہے، خواہ مکے میں کوئی عورت سوت کو کاٹنے والی تھی یا نہ تھی۔[4]

﴿ أَنْكَاثًا ﴾ سے مراد ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہے۔ ﴿ دَخَلًا ﴾ سے مراد مکر وفریب ہے، یعنی لوگ جب تعداد میں اور تیاری میں تم سے زیادہ ہوتے ہیں تو تم ان کے لیے حلف کرتے ہو، تاکہ وہ تمھاری طرف سے مطمئن ہو جائیں، پھر جب تم کو عہد شکنی کا حوصلہ ملتا ہے تو تم عہد شکنی کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا اور ادنیٰ سے اعلیٰ پر تنبیہ کی، یعنی جب کمزوری کی حالت میں اللہ تعالیٰ نے غداری اور عہد شکنی سے منع فرما دیا تو غلبہ اور قدرت کے وقت تو یہ بالا دنیٰ منع ہوگا۔ سورۃ الانفال میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا قصہ گزر چکا ہے[5] کہ ان کے اور بادشاہِ روم کے درمیان ایک مدت طے تھی، مدت کے آخر میں معاویہ اس کی طرف چلے، تاکہ جب وہ مدت گزر جائے اور یہ اُن کے شہروں کے قریب ہوں تو اُن پر شبخون ماریں اور وہ اس حال سے غافل ہوں۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٩٤) مسند أحمد (٢/ ٤٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠١٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٣٥)

[3] مسند أحمد (٥/ ٤٠٤) اس کی سند میں ''حجاج بن ارطاۃ'' مدلس راوی ہے اور عنعنہ کے ساتھ بیان کر رہا ہے۔

[4] تفسير الطبري (١٧/ ٢٨٣۔ ٢٨٤) تفسير ابن كثير (٢/ ٧٦١) [5] سورة الأنفال، رقم الآية (٥٨)

سیدنا عمرو بن عتبہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اللہ اکبر، اے معاویہ! وفا کرو، غدر نہ کرو، میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: «مَنْ كَانَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ قَوْمٍ أَجَلٌ فَلَا يَحُلَّنَّ عُقْدَةً حَتّٰى يَنْقَضِيَ أَمَدُهَا» [جس قوم سے عہد و پیمان ہو جائے تو جب تک مدتِ صلح ختم نہ ہو جائے کوئی گرہ کھولنے کی بھی اجازت نہیں] سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اپنا لشکر لے کر چلے آئے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ﴿ أَرْبٰى ﴾ سے مراد اکثر ہے۔[2] سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ تمھاری آزمایش کرتا ہے، یعنی اس کثرت سے۔[3] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ لیکن وفائے عہد کا حکم دے کر، تاکہ قیامت کے دن اختلاف کو دور کر دے اور ہر عامل کو اس کے خیر و شر عمل کی جزا دے۔[4]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ان تمام احکامات کے ساتھ، جن کو اس سے پہلی آیت ﴿ إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسٰنِ ... الخ﴾ میں بیان کیا ہے جو ایفائے عہد کو متضمن ہے، خاص طور پر بیان کیا، لیکن ظاہر اس کا ہر عہد کی عمومیت ہے، جو انسان سے وقوع میں آتا ہے، بغیر کسی فرق کے عہد بیعت وغیرہ کے درمیان۔ بعض مفسرین نے اس عہد کو بیعتِ اسلام کے ساتھ خاص کیا ہے، لیکن یہ نظمِ قرآنی کے افادہ کے خلاف ہے، کیوں کہ عہد اللہ تعالیٰ کے اسم مبارک کے ساتھ مضاف ہے، اور یہ اضافت اللہ کے تمام عہدوں کو شامل اور عام ہے اور اگر فرض کریں کہ سبب ان تمام عہود میں سے کسی ایک عہد کے ساتھ خاص ہے، تب بھی یہ کچھ اس سبب کو دور کرنے والا نہیں ہے، اس لیے کہ اعتبار عمومیتِ لفظ کا ہے نہ کہ خصوصیتِ سبب کا۔ پھر قسم توڑنے سے اس کا پختہ اور پکا ہونے کے بعد منع کیا۔ بعض نے کہا کہ تاکیدِ یمین انسان کا بار بار ایک شے پر قسم کھانا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ تاکید یہ ہے کہ دو بار قسم کھائے، اگر یہ ایک ہی بار حلف کیا ہے تو کچھ کفارہ نہیں[5] (مگر یہ ظاہر کے خلاف ہے، کیوں کہ اس جگہ کفارہ کا بیان نہیں اور جس آیت میں کفارہ کا بیان ہے، وہاں تاکید کی قید نہیں)۔

قیدِ تاکید سے یہ غرض نہیں ہے کہ بغیر تاکید تحریم نہ ہو، بلکہ یہ حکم ہر قسم کو شامل ہے، خواہ وہ تاکیدی ہو یا غیر تاکیدی۔ لیکن تاکیدی قسم کو توڑنے کا گناہ غیر مؤکد قسم سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ حدیث میں فرمایا ہے: «مَنْ حَلَفَ عَلٰى يَمِينٍ فَرَأَىٰ غَيْرَهَا خَيْرًا فَلْيَأْتِ الَّذِي هُوَ خَيْرٌ وَلْيُكَفِّرْ عَنْ يَمِينِهٖ» جس نے کسی بات پر قسم کھائی، پھر اس کے سوا دوسری بات کو اس سے بہتر دیکھا تو وہ کام کرے جو پہلے سے بہتر ہے اور اپنی قسم کا کفارہ دے دے۔[6]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٧٥٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٨٠) سنن النسائي الكبرىٰ (٥/ ٢٢٣) مسند أحمد (٤/ ١١١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٣٥٧)

[2] تفسير الطبري (١٧/ ٢٨٦) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٤٣٠٠) [4] تفسير الطبري (١٧/ ٢٨٧)

[5] تفسير القرطبي (١٠/ ١٧٠) [6] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٥٠)

اس عموم سے یمینِ لغو مستثنیٰ ہے، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق: ﴿ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ ﴾ [البقرة: ٢٢٥] ''اللہ تمھاری لغو قسموں پر تمھیں نہیں پکڑے گا۔'' تمھارے کفیل سے مراد حافظ یا ضامن یا رقیب ہے، کیونکہ کفیل جس کی کفالت کرتا ہے، اس کا محافظ ہوتا ہے۔ اللہ کو تمھارے کرتوت کی خبر ہے کہ تم نے عہد پورا کیا ہے، یا توڑا ہے، وہ تمھارے فعل کے مطابق تم کو اچھی یا بری جزا سزا دے گا۔ آیت میں ترغیب اور ترہیب ہے۔

پھر اس عورت کی مثال بیان کی جو اپنا سوت کات کر توڑ ڈالتی تھی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ سعیدہ اسدیہ بال اور چھال جمع کرتی تھی، اس کے حق میں یہ آیت آئی۔[1] ابوبکر بن حفص نے بھی اسی طرح کہا ہے کہ ان دونوں روایات میں فرمایا ہے کہ وہ ایک دیوانی عورت تھی۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مکے میں ایک عورت تھی، اس کا نام خرقاء تھا، وہ سوت کاتتی، جب کت جاتا تو اس کو توڑ ڈالتی۔[2] بعض نے کہا ہے کہ یہ ایک احمق عورت تھی، اس کا نام ریطہ بنت سعد بن تیم قرشیہ تھا، اس صورت میں مشبہ بہ معین ہے۔ امام کرخی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مراد اس سے تشبیہ ناقض (توڑنے والے) کی ایسے شخص کے ساتھ ہے، جس کا حال بغیر تعیین کے اس طرح پر ہو۔ اس لیے کہ مثال کا مقصد یہ ہے کہ جن کو احکام دیے جا رہے ہیں، انھیں برے اور غلط کام سے ہٹانا ہے اور ایسے کام کی طرف بلانا ہے جو اچھا ہو اور یہ تشبیہ بغیر تعیین کے بھی پوری ہو جاتی ہے، اس لیے کہ تشبیہ میں یہ ضروری نہیں کہ جس کے ساتھ تشبیہ دی جا رہی ہے وہ واقعی موجود بھی ہو۔

''أنکاث'' جمع ہے ''نکث'' کی نون کی زیر کے ساتھ۔ ''نکث'' کہتے ہیں کسی شے کو دوسری بار کاتنے کے لیے اس کا بل کھولنے کو۔ اس جگہ ''أنکاث'' سے مراد ٹکڑے ٹکڑے اور جز جز کر دینا ہے۔ امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو عمل صحیح نہیں ہے وہ دَخَل ہے۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا کہ دَخَل مکر و فریب ہے۔[3] امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ غش و غل (دھوکا و کینہ) ہے۔[4] دَخَل کا اصل عیب ہے۔ عیب اس شے سے نہیں ہوتا، جس میں دَخَل ہوتا ہے۔ اُمت سے مراد جماعت ہے۔ ﴿ اَرْبٰى ﴾ سے مراد اکثر اور وافر ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تم کسی قوم کے ساتھ عہد شکنی نہ کرو، اس لیے کہ وہ قوم تھوڑی ہے اور تم بہت ہو اور یا تم تھوڑے ہو اور وہ قوم بہت ہے۔[5] قریش کی عادت تھی کہ جب اپنے حلیفوں کے دشمنوں میں شوکت دیکھتے تو اُن کا عہد توڑ ڈالتے اور اُن کی مخالفت کر لیتے۔[6] (قاله مجاهد)

یہ مومنین کو اس بات سے ڈرایا گیا ہے کہ قریش کی کثرت اور اُن کے مال کی فراوانی پر دھوکا نہ کھائیں اور اس فریب میں آ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت نہ توڑ دیں، یہ تو اللہ کی ایک آزمایش ہے، وہ دیکھتا ہے کہ تم وفا کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھتے ہو یا کفار پر دھوکا کھا کر عہد شکنی کرتے ہو۔ اس اختلاف کا حال قیامت کے دن واضح ہو جائے گا اور حق

---

[1] الدر المنثور (٥/ ١٦٢) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٠٠) [3] فتح القدير (٣/ ٢٤٦)
[4] معاني القرآن (٣/ ٢١٧) [5] معاني القرآن للفراء (٣/ ٥٨) [6] تفسير الطبري (١٧/ ٢٨٦)

اور حق پر چلنے والے اور باطل اور باطل کا ساتھ دینے والے علاحدہ معلوم ہو جائیں گے، جو جس بات کا مستحق ہے، یعنی ثواب کا یا عذاب کا، وہ اس پر نازل ہوگا۔ اس آیت میں حق کی مخالفت سے اور باطل کی طرف جانے سے ڈرایا گیا ہے۔[1]

وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝۹۳ وَ لَا تَتَّخِذُوْۤا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا وَ تَذُوْقُوا السُّوْٓءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَ لَكُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۝۹۴ وَ لَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ اِنَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝۹۵ مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ؕ وَ لَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْۤا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝۹۶

اور اگر اللہ چاہتا تو تمھیں ایک ہی امت بنا دیتا، لیکن وہ جسے چاہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہے ہدایت دیتا ہے۔ اور تم سے ضرور اس کا سوال ہوگا جو تم عمل کرتے تھے (93) اور تم اپنی قسموں کو باہم فریب دینے کا ذریعہ نہ بناؤ کہ (اسلام پر کسی کا) قدم جمنے کے بعد ڈگمگا جائے، اور تم (دنیا میں) اس کی سزا بھگتو کہ تم نے (اسے) اللہ کی راہ سے روکا، اور (آخرت میں) تمھارے لیے بہت بڑا عذاب ہوگا (94) اور اللہ کے عہد کے بدلے میں تھوڑی قیمت (دنیوی فائدے) نہ خریدو، بے شک جو اللہ کے ہاں (اجر) ہے، وہی تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم علم رکھتے ہو (95) جو کچھ تمھارے پاس ہے، وہ فنا ہو جائے گا، اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے، وہ (ہمیشہ) باقی رہنے والا ہے۔ اور جن لوگوں نے صبر کیا ہم ضرور انھیں ان کا اجر و ثواب ان بہترین اعمال کے بدلے میں دیں گے جو وہ کرتے تھے (96)

اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی جماعت بنا دیتا:

اس سے معلوم ہوا کہ کافر کو بدقولی سے نہ مارے، اِن باتوں سے کفر مٹتا نہیں اور اپنے اوپر وبال آتا ہے۔ مسلمانی کو بدنام نہ کرو کہ ایمان لانے والے شک میں پڑیں اور تم پر یہ گناہ چڑھے۔ پہلے آپس کے قول و قرار توڑنے کا ذکر تھا، اب ذکر ہے اللہ سے کیے جانے والے قول و قرار کو توڑنے کا۔ یعنی مال کے طمع سے خلاف شرع حکم نہ کرو،

[1] فتح البیان (۷/ ۳۰۵۔ ۳۰۸)

وہ مال وبال لائے گا۔ جو مال شرع کے مطابق ہاتھ لگے، وہی تمھارے حق میں بہتر ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کہا کہ اگر اللہ چاہتا کہ تم سب لوگ ایک طریقے پر ہو جاؤ تو اسی طرح ہو جاتا، چناں چہ فرمایا: ﴿ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ﴾ [یونس: ۹۹] ''اور اگر آپ کا رب چاہتا تو جو لوگ زمین میں ہیں، سب کے سب، سارے ہی ایمان لے آتے۔'' یعنی تمھارے درمیان موافقت ہوتی، اختلاف نہ پڑتا اور نہ کسی طرح کا بغض اور کینہ ہوتا۔

نیز فرمایا: ﴿ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ۝ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ﴾ [هود: ۱۱۸۔ ۱۱۹] ''اور اگر آپ کا رب چاہتا تو یقیناً تمام لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا، لیکن وہ ہمیشہ (باہم) اختلاف کرتے رہیں گے۔ سوائے ان لوگوں کے جن پر آپ کے رب نے رحم کیا، اور اسی لیے اس نے انھیں پیدا کیا۔'' اسی طرح اس جگہ فرمایا ہے کہ جس کو چاہتا ہے، ہدایت کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے، گمراہ فرماتا ہے۔ پھر قیامت کے دن تمھارے سارے اعمال کا سوال کرے گا اور ایک ایک ذرا ذرا سی حقیر سی چیز یہاں تک کہ کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کے برابر عمل پر بھی جزا دے گا۔

دھوکا دہی کے لیے قسم کھانے اور توڑنے کی ممانعت:

پھر بندوں کو مکر و فریب سے ڈرایا ہے، تاکہ جمے پاؤں ڈگمگا نہ جائیں۔ یہ کہاوت ہے اس شخص کی کہ استقامت پر ہو کر، پھر ہدایت کے راستے سے قسموں کو توڑنے کی وجہ سے جو اللہ کے راستے سے روکنے پر مشتمل ہوں، دور نہ جا گرے، کیوں کہ جب کافر یہ بات دیکھے گا کہ مومن نے عہد کو توڑ ڈالا تو اس کو دینِ اسلام پر کچھ بھروسا اور اعتماد نہ رہے گا، بلکہ وہ اس وجہ سے اسلام میں داخل ہونے سے باز رہے گا۔ اس لیے فرمایا کہ تم چکھو برائی اس پر کہ تم نے اللہ کے راستے سے روکا اور تمھارے لیے عذابِ عظیم ہے۔ پھر اس ایمان کے عوض میں زندگی کا تھوڑا سا نفع اور دنیا کی زینت لینے کو منع فرمایا، کیوں کہ یہ دنیا کا فائدہ تھوڑا ہے اور اگر ابن آدم کے لیے ساری دنیا جمع ہو جائے، تب بھی جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے پاس ہے، وہ اس سے بہتر ہے، یعنی اللہ کا ثواب، اُمید رکھنے والے، طلبگار اور عہد و پیمان کی حفاظت کرنے والے مومن کے لیے بہتر ہے۔ لہٰذا فرمایا کہ اگر تم اس بات کو جانتے کہ جو کچھ تمھارے پاس ہے، وہ ہو چکتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے، کیوں کہ اس کی مدت نہایت تھوڑی مقرر کی ہوئی اور ختم ہونے والی ہے اور اللہ کا ثواب تمھارے لیے جنت میں بلا انقطاع دائم اور ہمیشہ رہے گا۔ ''لَا يَحُوْلُ وَلَا يَزُوْلُ'' پھر قسم کھا کر فرمایا، کیوں کہ لام قسمیہ ہے، کہ صبر والوں کو بہت ہی بہتر بدلہ ملتا ہے اور اُن کی برائیوں سے درگزر کیا جاتا ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تم کو حق پر متفق کر دیتا، تمھاری آپس میں کوئی مخالفت نہ ہوتی اور نہ کوئی بغض ہوتا، لیکن وہ کسی کو ہدایت دیتا ہے اور کسی کو گمراہ کر دیتا ہے، اس کی حکمتِ بالغہ کا یہی تقاضا ہے۔ ''لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ'' یعنی اس سے پوچھا نہ جائے جو وہ کرے اور اُن سے پوچھا جائے، ہاں تمھارے اعمال کے بارے میں تم سے اس دن سوال ہوگا۔ تم اپنی قسموں کو مکر و فریب اور دھوکے کا ذریعہ نہ بناؤ۔ یہ عام ہے ہر قسم کے دھوکے اور فریب کو، اس میں مالی حقوق غصب کرنا وغیرہ سب شامل ہیں۔

مفسرین کہتے ہیں کہ یہ ممانعت اُن لوگوں کو ہے جنھوں نے نبی اکرم ﷺ سے بیعت کی تھی کہ تم اسلام اور نصرتِ دین پر کیے جانے والے عہد کو نہ توڑو، لیکن اگرچہ نزول کا سبب یہی ہو، لیکن اعتبار عمومیتِ لفظ کا ہے نہ کہ خصوصیتِ سبب کا۔ اس دخل (دغا بازی) سے ایک قوم کے پاؤں جم جانے کے بعد اُکھڑ جائیں گے اور تم اس روک ٹوک کی وجہ سے عذاب کا مزہ چکھو گے، خواہ دنیا میں خواہ آخرت میں۔ اللہ کے عہد کے عوض دنیا کا تھوڑا سا مول نہ لو، اگرچہ ظاہر میں وہ بہت زیادہ ہو، کیوں کہ وہ چلا جانے والا اور زائل ہو جانے والا ہے اور جو ثواب اور اجر اللہ کے پاس ہے وہ بہتر ہے، اگر تم اس بات کو مانو، کیوں کہ تمھارے پاس کی چیز فنا ہونے والی ہے اور اللہ کے پاس والی چیز باقی ہے، وہ کبھی زائل نہ ہوگی۔

و آنچہ دیر نہ پاید دلبستگی را نہ شاید

[جو چیز ناپائیدار ہے وہ دل لگی کے لائق نہیں ہے]

ہر عقل مند اور ہوشمند اس بات کو جانتا ہے کہ زوال پذیر، گو کسی حد تک زیادہ ہو، وہ حقیر ہے تھوڑی سے اور جو باقی اور ہمیشہ رہنے والی ہے، وہ بڑی ہے۔ آخرت کی نعمت کا باقی رہنا تو ظاہر ہے، رہیں دنیا کی نعمتیں، جن کا مومنین پر انعام کیا ہے، وہ اگرچہ زائل ہونے والی ہیں، لیکن چوں کہ آخرت کی نعمتوں کے ساتھ متصل ہیں، اس حیثیت سے وہ بھی باقی رہنے والی نعمتوں کی طرح ہیں۔ پھر صبر والوں کا اجر اُن کے عمل پر بہتر سے بہتر ہوگا، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا﴾ [الأنعام: ١٦٠] ''جو شخص (وہاں) ایک نیکی لے کر آئے گا تو اس کے لیے دس گنا (ثواب) ہوگا، اور جو شخص ایک برائی لے کر آئے گا تو اسے بس اس کے برابر ہی سزا دی جائے گی۔'' پھر سات سو گنا تک، بلکہ اس سے بھی زیادہ تر اجر ملے گا۔[1]

[1] فتح البیان (٧/ ٣٠٨۔ ٣١١)

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٩٧﴾

جس نے نیک عمل کیے، مرد ہو یا عورت، جب کہ وہ مومن ہو تو ہم ضرور اسے پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے، اور ہم انھیں ضرور ان کا اجر وثواب ان بہترین اعمال کے بدلے میں دیں گے جو وہ کرتے تھے (97)

اعمالِ صالحہ بجالانے والے کا بدلہ:

اچھی زندگی قیامت میں دیں گے یا دنیا میں اللہ کی محبت میں اور لذت میں اضافہ کریں گے۔ یہ عملِ صالح کرنے والے کے لیے اللہ تعالیٰ کا ایک وعدہ ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ "وَهُوَ الْعَمَلُ الْمُتَابِعُ لِكِتَابِ اللّٰهِ وَسُنَّةِ نَبِيِّهٖ ﷺ"، یعنی اس عمل سے مراد جو آیت میں مذکور ہے، وہ عمل ہے، جو قرآن وحدیث کے مطابق ہو، یہ عمل کرنے والا شخص مرد ہو یا عورت اور دل اس کا اللہ اور رسول پر ایمان رکھتا ہو اور یہ عمل اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے مشروع کیا گیا ہو اور مامور بہ ہو، ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ دنیا میں پاکیزہ زندگی کے ساتھ زندہ رکھے گا اور آخرت کے گھر میں عمل کی اچھی جزا دے گا۔ حیاتِ طیبہ چین وراحت کے وجوہ پر مشتمل ہے، خواہ وہ کسی طرف سے ہی حاصل کیوں نہ ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور ایک جماعت نے حیاتِ طیبہ کی تفسیر حلال اور طیب رزق کے ساتھ کی ہے اور سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے قناعت کے ساتھ کی ہے۔ امام عکرمہ اور وہب بن منبہ رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول یہ ہے کہ مراد سعادت ہے۔ امام حسن، مجاہد اور قتادہ رحمہم اللہ نے کہا کہ طیبِ حیات کسی کو نہیں ہوتا، مگر جنت میں۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا کہ مراد دنیا میں رزقِ حلال اور عبادت ہے، یا اطاعت پر عمل کرنا اور اطاعت پر سینہ کھل جانا ہے۔[1]

صحیح یہ ہے کہ حیاتِ طیبہ ان تمام اُمور کو شامل ہے، جس طرح کہ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے حدیث میں مروی ہے: «قَدْ أَفْلَحَ مَنْ أَسْلَمَ وَرُزِقَ كَفَافًا، وَقَنَّعَهُ اللّٰهُ بِمَا أَتَاهُ» یعنی وہ شخص مراد یاب ہے، جو مسلمان ہوا اور اس کو اتنا رزق، جس سے وہ زندہ رہے مل گیا اور جو اس کو اللہ تعالیٰ نے دیا، اس میں اس نے قناعت کی۔[2] (رواه أحمد و مسلم) ترمذی اور نسائی کے الفاظ سیدنا فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً یہ ہیں: «قَدْ أَفْلَحَ مَنْ هُدِيَ لِلْإِسْلَامِ وَكَانَ عَيْشُهُ كَفَافًا وَقَنَعَ بِهٖ» یعنی اس نے مراد پائی جس کو اسلام کی ہدایت کی گئی اور اس کا عیش قوت لا یموت ہے اور اُس نے اس پر قناعت کی۔[3] (قال الترمذي هذا حديث صحيح)

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٢٩٠_ ٢٩١) [2] مسند أحمد (٢/ ١٦٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٥٤)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣٤٩) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٥٠٦)

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں: «إِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ الْمُؤْمِنَ حَسَنَةً، يُعْطٰى بِهَا فِي الدُّنْيَا وَيُثَابُ عَلَيْهَا فِي الْآخِرَةِ، وَأَمَّا الْكَافِرُ فَيُطْعَمُ بِحَسَنَاتِهِ فِي الدُّنْيَا حَتّٰى إِذَا أَفْضٰى إِلَى الْآخِرَةِ لَمْ تَكُنْ لَهُ حَسَنَةٌ يُعْطٰى بِهَا خَيْرًا» یعنی اللہ حق نہیں رکھتا کسی مومن کا ایک نیکی میں، جس پر دنیا میں بھی دیا جاتا ہے اور آخرت میں بھی اس پر ثواب دیا جائے گا اور رہا کافر تو اپنی نیکیوں کے بدلے دنیا میں کھلایا جاتا ہے، جب آخرت میں جائے گا تو اس کی کوئی نیکی باقی نہ ہوگی جس پر اُسے بھلائی دی جائے۔[1] (تفرد باخراجه مسلم)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ حیاتِ طیبہ میں اختلاف ہے کہ کس طرح ہوتی ہے۔ پھر اقوالِ مذکورہ ذکر کیے، پھر جعفر صادق رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ معرفت باللہ ہے۔ اور ابوبکر وراق رحمہ اللہ نے کہا کہ اطاعت کی حلاوت ہے۔[2] امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "عَيْشٌ فِي الطَّاعَةِ"[3] بعض نے کہا ہے کہ رزق ہے جو دن بہ دن ملتا ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ حیات قبر میں حاصل ہوتی ہے، کیوں کہ مومن موت کے سبب سے دنیا کی سختی اور رنج سے نجات پاتا ہے اور آرام پاتا ہے۔[4] سہل تستری رحمہ اللہ نے کہا کہ حیاتِ طیبہ یہ ہے کہ بندہ اپنی تدبیر نفس سے جدا کر لیا جائے اور اس کی تدبیر حق تعالیٰ کے حوالے ہو[5] یا مراد مخلوق سے استغنا ہے اور افتقار طرف حق کے۔ اکثر مفسرین اس پر ہیں کہ یہ حیاتِ طیبہ دنیا میں ہے نہ کہ آخرت میں، کیوں کہ حیاتِ آخرت کا ذکر اس کے بعد فرمایا کہ ہم اُن کے عمل کی اچھی جزا دیں گے۔[6]

فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿٩٨﴾ إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿٩٩﴾ إِنَّمَا سُلْطٰنُهُ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهُ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهِ مُشْرِكُوْنَ ﴿١٠٠﴾

پھر جب آپ قرآن پڑھنے لگیں تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگیں (98) بے شک ان لوگوں پر اس کا کوئی زور نہیں (چلتا) جو ایمان لائے اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں (99) بس اس کا زور تو ان لوگوں پر چلتا ہے جو اسے دوست بناتے ہیں اور (ان پر) جو اس (اللہ) کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں (100)

تلاوتِ قرآن سے قبل استعاذہ کی تلقین:

دنیا میں کسی آدمی کو کوئی شیطان یعنی جن ستانے لگے تو اس کی طرف متوجہ نہ ہو کہ وہ اور اُس کے سر چڑھتا

---

(1) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٠٨) مسند أحمد (٣/ ١٢٣) تفسير ابن كثير (٢/ ٧٦٢۔ ٧٦٣)
(2) تفسير القرطبي (١٠/ ١٧٤) (3) تفسير البغوي (٥/ ٤٢) (4) تفسير الخازن (٤/ ١١٣)
(5) تفسير القرطبي (١٠/ ١٧٤) (6) فتح البيان (٧/ ٣١٢۔ ٣١٣)

ہے، بلکہ اللہ کی پناہ کی طرف دوڑے۔ اس کام کے لیے اس کا کلام ہے اور اس کے نام ہیں۔

یہ پیغمبر کی زبانی اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ جب لوگ قرآن کے پڑھنے کا ارادہ کریں تو شیطانِ رجیم سے اللہ کی پناہ چاہیں، یہ امر مستحب ہے، کچھ واجب نہیں ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے اور ائمہ بھی اسی طرف گئے ہیں۔[1]

قرآن کی قراءت کے وقت اس استعاذہ (اللہ کی پناہ مانگنے کا) مطلب یہ ہے کہ قاری پر قراءت ملتبس (مشتبہ) نہ ہو اور وہ تدبر و تفکر سے باز نہ رہے۔ اس لیے جمہور کا مذہب یہ ہے کہ استعاذہ تلاوت سے پہلے ہو، لیکن حمزہ اور ابو حاتم سجستانی رحمہ اللہ آیتِ باب کی دلیل سے تلاوت کے بعد بتاتے ہیں۔ امام نووی رحمہ اللہ نے بھی "شرح مہذب" میں اسی طرح نقل کیا ہے، جو سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور امام ابن سیرین اور نخعی رحمہ اللہ سے ہے۔[2] لیکن صحیح پہلی بات ہے، کیوں کہ احادیث میں استعاذے کا تلاوت سے پہلے ہونے کا ذکر مروی ہے۔

امام ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شیطان کے لیے ایسا زور نہیں ہے کہ انھیں گناہ میں گرفتار کرے کہ اس سے وہ توبہ نہ کریں۔[3] اوروں نے کہا ہے کہ شیطان کو اُن پر کچھ حجت نہیں ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ﴾ [الحجر: ٤٠] اور ﴿ إِنَّمَا سُلْطَانُهُ عَلَى الَّذِينَ يَتَوَلَّوْنَهُ ﴾ (آیتِ باب) امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ مراد اطاعت ہے۔[4] دوسروں نے کہا کہ یعنی اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر شیطان کو اپنا ولی ٹھہرایا ہے اور اس کو اللہ کی عبادت میں شریک کیا۔ یا شیطان کی اطاعت کی وجہ سے اللہ کے ساتھ شرک کرنے والے ہوتے ہیں۔ یا یہ مطلب کہ شیطان اموال اور اولاد میں ان کا شریک بنا ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ امام زجاج رحمہ اللہ وغیرہ ائمہ لغت کہتے ہیں کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ جب تو قرآن پڑھنا چاہے تو اللہ کی پناہ لے لے۔[5] اکثر فقہا اور محدثین کا یہی مذہب ہے کہ استعاذہ قراءت سے پہلے چاہیے نہ یہ کہ قراءت کے بعد مستعیذ ہو، جیسے: "وَإِذَا أَكَلْتَ فَقُلْ بِسْمِ اللّٰهِ" یعنی جب تو کھائے تو اللہ کا نام لے کر کھا۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فقہا کا اجماع ہے کہ استعاذہ پڑھنے سے پہلے ہوتا ہے، مگر کچھ صحابہ و تابعین اور اُن کے بعد کی ایک جماعت اور داود ظاہری رحمہ اللہ قراءت کے بعد استعاذے کے قائل ہیں، لیکن اکثر صحابہ و تابعین اور اُن کے بعد والے لوگوں اور ائمہ اور فقہائے امصار کا مذہب یہی ہے کہ استعاذہ قراءت سے پہلے کرے۔[6]

استعاذے سے مراد شیطانی وسوسوں سے پناہ مانگنا ہے کہ وہ قراءت میں وسوسہ نہ ڈالے۔ آیت اس بات کی

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٢٩٣۔ ٢٩٤)
[2] المجموع شرح المهذب (٣/ ٣٢٥)
[3] تفسير الطبري (١٧/ ٢٩٤)
[4] تفسير الطبري (١٧/ ٢٩٤)
[5] معاني القرآن (٣/ ٢١٨)
[6] فتح القدير (٣/ ٢٦٧۔ ٢٦٨)

دلیل ہے کہ نمازی ہر رکعت میں استعاذہ کیا کرے، اس لیے کہ جو حکم کسی شرط پر لگایا جاتا ہے، وہ قیاساً اس شرط کے بار بار آنے پر بار بار لاگو ہوتا ہے، شیطان کا تسلط ایمان داروں پر نہیں ہوتا، جو اپنے رب پر متوکل ہیں اور وہ اُن کو اغوا کر کے گمراہی کی طرف نہیں بلا سکتا۔ معلوم ہوا کہ ایمان اور توکل شیطانی وسوسے اور تسلط کو روکتے ہیں اور اگر وہ اُن میں سے کسی کو وسوسہ ڈالتا بھی ہے تو اس کا اثر نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں کے حق میں فرمایا ہے: ﴿ إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَٰنٌ إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِينَ ﴾ [الحجر: ٤٢] ”بے شک میرے بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں، مگر گمراہوں میں سے (تیرا زور اس پر چلے گا) جس نے تیری اتباع کی۔“ پھر شیطان کے تسلط کو اُن لوگوں میں منحصر کیا ہے جو شیطان کے دوست دار ہیں اور اس کے وسوسوں کی اطاعت کیا کرتے ہیں اور اس کے وسوسوں کے سبب سے شرک میں گرفتار ہوتے ہیں۔ [1]

وَإِذَا بَدَّلْنَا آيَةً مَّكَانَ آيَةٍ ۙ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوا إِنَّمَا أَنتَ مُفْتَرٍ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٠١﴾ قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ مِن رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِينَ آمَنُوا وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ ﴿١٠٢﴾

اور جب ہم ایک آیت کی جگہ بدل کر دوسری آیت لائیں، اور اللہ اسے خوب جانتا ہے، جو کچھ وہ نازل کرتا ہے، تو وہ (کافر) کہتے ہیں: یقیناً تو گھڑ لانے والا ہے، لیکن ان میں اکثر علم نہیں رکھتے (101) کہہ دیجیے: اس (قرآن) کو روح القدس (جبریل) نے آپ کے رب کی طرف سے حق کے ساتھ نازل کیا ہے، تاکہ اللہ ایمان والوں کو ثابت قدم رکھے اور مسلمانوں کے لیے ہدایت اور بشارت ہو (102)

مشرکوں کے ایک شبہے کا ازالہ:

اس کلام میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے بعض جگہ نسخ فرمایا ہے تو کافر شبہہ کرتے، اس کا جواب سمجھا دیا یعنی ہر وقت پر اس وقت کے مطابق حکم بھیجے تو ایمان لانے والوں کا دل مضبوط ہو اور ہمارا رب ہر حال سے خبردار ہے۔ ہر حال میں اس کے موافق راہ سمجھا دی اور ہر کام پر ویسی خوش خبری سنا دی۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اس جگہ اس بات کی خبر دی کہ مشرکوں کی عقل کمزور ہے اور اُن کا یقین اور ثبات تھوڑا ہے، ان کا ایمان لانا متصور نہیں ہوتا، ان پر تو بدبختی لکھ دی گئی ہے۔ انھوں نے احکام کی تبدیلی اور ناسخ و منسوخ کو دیکھ کر رسول سے یہ بات کہی کہ تو مفتری ہے یعنی کذاب۔ حالاں کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور اپنے ارادے کے مطابق حکم دیتا ہے۔

[1] فتح البیان (۷/ ۳۱۴۔ ۳۱۵)

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تبدیلی سے مراد یہ ہے کہ ایک آیت اُٹھالی اور اس کی جگہ دوسری ثابت کر دی۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی مثل ہے: ﴿مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَآ اَوۡ مِثۡلِهَا ؕ اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ﴾ [البقرة: ۱۰۶] ''جو آیت ہم منسوخ کرتے ہیں یا اسے بھلوا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اسی کی مثل ہی لے آتے ہیں۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ بے شک اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے؟''[1] اللہ تعالیٰ نے اس اعتراض کے جواب میں یہ ارشاد فرمایا کہ اس کلام کا لانے والا روح القدس ہے، یعنی جبریل علیہ السلام، وہ سچ مچ اس کو اپنے رب کے پاس سے لاتا ہے صدق و عدل کے ساتھ، تاکہ ایمان دار لوگ ثابت قدم اور راسخ دم (پختہ) رہیں اور اُتارے ہوئے کلام کی تصدیق کریں، اولاً و ثانیاً اور اُن کے دل عاجزی اختیار کریں۔ یہ کلام مسلمین کے لیے جو کہ اللہ اور رسول پر ایمان لائے ہیں ہدایت اور نوید ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ قریش کسی آیت کے منسوخ ہونے پر اعتراض کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کے اعتراض کا جواب دیا اور کہا کہ یہ لوگ جاہل ہیں کچھ نہیں جانتے اور نزولِ قرآن کی حقیقت کو نہیں پہچانتے کہ اس کی ہر سورت بلکہ ہر آیت معجزہ ہے یا وہ منسوخی کی حکمت کو نہیں جانتے کہ اُس نسخ کی بنیاد ایسی مصلحتوں پر ہے، جن کو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے۔ کسی شے کے مشروع کرنے میں کوئی وقتی مصلحت ہوتی ہے۔ پھر دوسرے وقت دوسرے کام کی مصلحت ہوتی ہے، اس میں بندوں پر آسانی ہے، اگر پردہ اُٹھالیا جائے تو یہ کفار اس نسخ کے جواز کی وجہ اور منہجِ عدل اور رفق و لطف کو معلوم کر لیں۔ یہ قرآن تو روح القدس نے اُتارا ہے اور اللہ کی طرف سے وہ اس کو لائے ہیں، ناسخ ہو یا منسوخ سب اسی اللہ کی طرف سے ہے۔ مومنوں کے دل اس پر ثابت رہتے ہیں اور یہ اہلِ اسلام کی ہدایت اور بشارت کا باعث ہے۔ ان خصلتوں کے اُلٹ خصلتیں غیر مومنین کے اندر ہوتی ہیں۔[2]

وَلَقَدۡ نَعۡلَمُ اَنَّهُمۡ يَقُوۡلُوۡنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِىۡ يُلۡحِدُوۡنَ اِلَيۡهِ اَعۡجَمِىٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِىٌّ مُّبِيۡنٌ ۝۱۰۳

اور ہمیں بخوبی علم ہے کہ وہ کہتے ہیں: یقیناً اس (نبی) کو ایک آدمی سکھاتا ہے۔ اس شخص کی زبان عجمی ہے جس کی طرف یہ غلط نسبت کرتے ہیں، جبکہ یہ (قرآن تو) فصیح عربی زبان ہے (103)

مشرکوں کا ایک اور بہتان اور اس کا رد:

ایک شخص کا رومی نصرانی غلام مکہ میں تھا، محبت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا پیغام سننے اور پیغمبر کا حال سننے کو نبی

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٢٩٧) [2] فتح البيان (٧/ ٣١٦ـ ٣١٧)

اکرم ﷺ کے پاس آ کر بیٹھتا تھا۔ کافر کہتے تھے کہ وہی سکھا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ مشرک لوگ جھوٹ، افترا پردازی اور بہتان کے طریقے سے یہ بات کہتے ہیں کہ محمد ﷺ جو قرآن ہم پر تلاوت کرتے ہیں، ایک بشر اُن کو سکھاتا ہے اور ایک عجمی کی طرف اشارہ کرتے تھے، جو کسی قریشی شخص کا غلام تھا۔ وہ غلام بیوپاری تھا، صفا کے نزدیک بیع کرتا، کبھی کبھی نبی اکرم ﷺ اس کے پاس بیٹھ جاتے اور بات کرتے، اس کی زبان عجمی تھی، وہ عربی نہ جانتا تھا یا بہت کم جانتا تھا، اتنی کہ فقط بات کا ضروری جواب دے سکے اور بس۔ سو اللہ تعالیٰ نے ان کی اس افترا پردازی کا رد کیا اور فرمایا کہ اس شخص کی تو زبان ہی عجمی ہے اور قرآن عربی زبان میں اترا ہے۔ پھر جو شخص اس فصیح و بلیغ قرآن کو لایا ہے جس کے معانی مکمل ہیں اور بنی اسرائیل پر نازل ہونے والی ہر کتاب سے زیادہ مکمل ہیں، اس کا ایک عجمی مرد سے سیکھنا کیسے ہوسکتا ہے۔ جس کو ذرّہ بھی عقل ہوگی، وہ ایسی بات نہ کہے گا۔

محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے سیرت میں کہا ہے کہ ہم کو یہ بات پہنچی ہے کہ نبی اکرم ﷺ اکثر مروہ کے پاس نصرانی غلام سبیعہ کے پاس بیٹھتے تھے، اس کا لقب جبر تھا، وہ بنی الحضرمی میں سے کسی کا غلام تھا۔ اس پر یہ آیت اتری۔[1] عبداللہ بن کثیر رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ امام عکرمہ اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا کہ اس کا نام یعیش تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ مکے میں ایک آہن گر کو کچھ سکھاتے تھے، اس کا نام بلعام تھا، اس کی زبان عجمی تھی، مشرک نبی اکرم ﷺ کو اس کے پاس آتے جاتے دیکھتے تھے، اس پر کہنے لگے کہ بلعام اُن کو تعلیم دیتا ہے۔ اس پر یہ آیت اتری۔

امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا کہ مراد سلمان فارسی ہیں،[2] لیکن یہ قول ضعیف ہے، کیوں کہ آیتِ باب مکی ہے اور سلمان مدینے میں ایمان لائے تھے۔ عبداللہ بن مسلم کہتے ہیں کہ ہمارے دو غلام رومی تھے، وہ اپنی کتابیں اپنی زبان میں پڑھا کرتے تھے، نبی اکرم ﷺ کا گزر اس طرف سے ہوتا تو آپ کھڑے ہو کر سنتے۔ مشرکوں نے کہا کہ یہ تو اُن دونوں سے سیکھتے ہیں، اس پر اللہ پاک نے یہ آیت نازل کی۔ سعید بن مسیّب رحمہ اللہ نے کہا کہ ایک شخص نبی اکرم ﷺ کے پاس کاتبِ وحی تھا، وہ اسلام سے پھر گیا اور مشرکوں میں جا ملا، اس نے یہ افترا باندھا۔[3] قبحه الله تعالى.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کا ایک دوسرا شبہہ ذکر کیا کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کا اس کلام کا معلم کوئی بشر ہے، یہ کلام کوئی اللہ کے پاس سے نہیں آیا، جس طرح کہ ان کا زعم ہے۔ اس بشر کی تعیین میں اہلِ علم کا اختلاف ہے۔ کسی نے کہا کہ فاکہ بن مغیرہ کا غلام تھا جس کا نام جبر تھا اور وہ رومی نصرانی آہنگر تھا، وہ مسلمان ہو گیا۔

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٢٩٩) [2] تفسير الطبري (١٧/ ٢٩٩۔ ٣٠٠) [3] تفسير الطبري (١٧/ ٣٠٠۔ ٣٠١)

قریش جب نبی اکرم ﷺ سے پہلی قوموں کے حالات سنتے اور آپ اُمی تھے تو کہتے کہ جبران کو سکھاتا ہے۔ کسی نے کہا کہ اس کا نام عائش یا یعیش تھا، جو بنی حضرمی کا غلام تھا، وہ عجمی کتابیں پڑھا کرتا تھا۔

بعض نے کہا ہے کہ بنی عامر بن لوی کا غلام تھا، یا بلعام مراد ہے، وہ تورات پڑھا کرتا، یا ایک نصرانی مرد ابا میسرہ نامی تھا، وہ رومی زبان میں بات کرتا تھا۔ کسی نے کہا کہ اس کا نام عداس تھا، یا بشر سے مراد دو غلام تھے، ایک کا نام یسار، دوسرے کا نام جبر تھا، یہ دونوں صیقل گر تھے، تلواریں بنایا کرتے تھے، مکے میں رہتے تھے، ان کی ایک کتاب تھی اس کو پڑھا کرتے تھے، یا تورات وانجیل کے قاری تھے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ اقوال متناقض نہیں ہیں۔ جائز ہے کہ مشرکین نے یہ زعم کیا ہو کہ یہ سب لوگ سکھاتے ہیں۔[1] ہاں جس نے سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا نام لیا ہے، اس کے قول پر جمع ناممکن ہے، اس لیے کہ آیت مکہ مکرمہ میں اتری ہے اور یہ نبی اکرم ﷺ کے پاس مدینہ منورہ میں آئے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے اس افترا کا یہ جواب دیا کہ جس بشر کو یہ مُعلّم بناتے ہیں، اس کی زبان ولغت وگفتگو عجمی ہے، یعنی غیر فصیح اور یہ قرآن واضح طور پر عربی زبان اور کلام ہے۔ قرآن کا نام لسان رکھا، اس لیے کہ عرب قصیدے اور بیت کو لسان کہتے ہیں۔ یا لسان سے مراد بلاغت ہے۔ تو پھر عجمی کا عربی سکھانا کیسے ہو سکتا ہے، کہاں قرآن کی فصاحت اور بلاغت اور کہاں عجمی اس مرد کی زبان جس کی طرف اشارہ کرتے ہیں، حالاں کہ عربی زبان والے لوگ بھی ایک چھوٹی سی سورت، بلکہ ایک مختصر آیت پیش کرنے سے عاجز ہوگئے، باوجود اس کے کہ وہ لوگ فصاحت اور بلاغت کے استاد تھے۔ اس سے ثابت ہوا کہ جو کلام محمد ﷺ لائے ہیں، وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی وحی ہے نہ کہ تعلیمِ بشری اور نہ اپنی طرف سے اس کو بنایا ہے، بلکہ عین وحی ربانی اور تنزیلِ سبحانی ہے۔[2]

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۙ لَا يَهْدِيْهِمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿١٠٤﴾ اِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿١٠٥﴾

بلاشبہ جو لوگ اللہ کی آیات پر ایمان نہیں لاتے، اللہ انھیں ہدایت نہیں دیتا، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے (104) جھوٹ تو صرف وہ لوگ گھڑتے ہیں جو اللہ کی آیات پر ایمان نہیں لاتے اور وہی لوگ جھوٹے ہیں (105)

آیاتِ الٰہی سے اعراض کرنے والے اور انھیں جھٹلانے والے کو اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا:

یعنی جتنا سمجھائیں، وہ نہیں سمجھتے، بے یقین آدمی محروم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ جو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے

[1] معاني القرآن للنحاس (٤/ ١٠٧)
[2] فتح البيان (٧/ ٣١٧۔ ٣١٨)

منہ پھیرتا ہے اور قرآن منزل من اللہ سے غفلت کرتا ہے اور اس چیز پر جو اللہ کے پاس سے آئی ہے، ایمان لانے کا ارادہ نہیں رکھتا، سو اس طرح کے لوگوں کو اللہ ایمان کی طرف راہ یاب نہیں کرتا، بلکہ اُن کے لیے آخرت میں دُکھ کی مار ہے۔ پھر یہ خبر دی کہ پیغمبر نہ مفتری ہے نہ کذاب، کیوں کہ اللہ اور رسول پر کذب کا افترا کرنا بدترین لوگوں کا کام ہے، جو اللہ کی آیتوں پر ایمان نہیں لاتے۔ لوگوں کے نزدیک کافر، ملحد اور جھوٹے مشہور ہیں اور نبی اکرم ﷺ تو راست گوئی اور نیکوکاری اور علم و عمل اور ایمان اور یقین میں سب لوگوں سے کامل تر تھے اور آپ کا سچا ہونا مشہور و معروف تھا، کسی کو اس امر میں شک نہ تھا، یہاں تک کہ اُن میں امین کہلاتے تھے۔ اس لیے جب روم کے بادشاہ ہرقل نے ابوسفیان سے صفاتِ نبویہ کا سوال کیا اور کہا کہ کیا تم اس کو جھوٹ کی تہمت لگاتے ہو؟ تو کہا کہ نہیں، اس پر ہرقل نے کہا: یہ کہاں ہوسکتا ہے کہ لوگوں سے تو جھوٹ نہ بولے اور اللہ پر جھوٹ بولنے لگے؟![1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جو لوگ اللہ کی آیات کی تصدیق علم الٰہی میں نہیں کرتے ہیں، انھیں کو اللہ نجات اور حق کی راہ نہیں دکھاتا، کیوں کہ ان کی بدبختی وہ پہلے سے جان چکا ہے۔ رہی آخرت تو وہاں اس کفر اور تکذیب پر عذابِ اَلیم ہوگا۔ یہ جھوٹ گھڑنا انھیں لوگوں کا کام ہے جو اللہ کی آیتوں پر ایمان اور یقین نہیں لاتے۔ پھر رسول اللہ ﷺ سے، جو مومنوں کے سردار اور اللہ کی طرف دعوت دینے والے ہیں، اللہ تعالیٰ کے حق میں یہ افترا کس طرح واقع ہوسکتا ہے؟! یہ کفار ایمان نہیں لاتے اس لیے دروغ بافی کیا کرتے ہیں۔ یہ بڑے کذاب ہیں۔[2]

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَىِٕنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۰۸﴾ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

جو شخص اپنے ایمان کے بعد اللہ سے کفر کرے، سوائے اس کے جس پر جبر کیا گیا اور اس کا دل ایمان پر مطمئن تھا، لیکن جس نے کفر کے لیے (اپنا) سینہ کھول دیا (راضی خوشی کفر کیا) تو ایسے لوگوں پر اللہ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۷۸۲) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۷۷۳)
[2] فتح البيان (۷/ ۳۱۹)

کا غضب ہے، اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے ﴿106﴾ یہ اس لیے کہ انھوں نے دنیاوی زندگی کو آخرت کے مقابلے میں (زیادہ) محبوب رکھا، اور بے شک اللہ کافر قوم کو ہدایت نہیں دیتا ﴿107﴾ یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں، کانوں اور آنکھوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے اور یہی لوگ غافل ہیں ﴿108﴾ بلاشبہ یقیناً آخرت میں یہی لوگ خسارہ پانے والے ہیں ﴿109﴾

مرتد پر اللہ تعالیٰ کا غضب:

پہلے کافروں کے شبہے مذکور ہوئے، اب فرمایا کہ جو کوئی شبہے سن کر ایمان سے پھر جائے، اس کا یہ حال ہے، مگر ظالم زبردستی سے اگر منہ سے کفر کا لفظ کہلوا دے اور دل میں ایمان برقرار رہے تو اس کو گناہ نہیں۔ لیکن اگر مرنا قبول کرے اور لفظ بھی منہ سے نہ کہے تو شہیدِ اکبر ہے۔ جو کوئی ایمان سے پھرا ہے تو دنیا کی غرض سے، یا جان کے ڈر سے، یا برادری کی خاطر سے، یا زر کے لالچ سے، جس نے دنیا عزیز رکھی، اس کو آخرت کہاں۔ اگر جان کے ڈر سے لفظ کہے تو چاہیے کہ جب ڈر کا وقت نکل جائے تو یہ توبہ واستغفار کر کے ایمان پر ثابت قدم ہو جائے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس شخص کے حال کی خبر دی جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کیا اس کے بعد کہ وہ اللہ پر ایمان لایا تھا اور متبصر ہوا تھا۔ پھر اس کا سینہ کفر کے ساتھ کھل گیا اور وہ کفر پر مطمئن ہو گیا تو ایسے شخص پر اللہ کا غضب ہے، اس لیے کہ اس نے ایمان کو جان لیا تھا، پھر اس سے پھر گیا، سو ایسے آدمی کے لیے دارِ آخرت میں عذابِ الیم ہے، کیوں کہ اس نے دنیا کی زندگی کو آخرت کے مقابلے میں دوست رکھا اور دنیا کی خاطر ارتداد کی طرف پیش قدمی کی۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے شخص کے دل کو ہدایت نہیں کی اور اس کو حق پر ثابت نہ رکھا، بلکہ اس کے دل پر مہر لگا دی، اب وہ کوئی شے، جو اس کو نفع دے، نہیں سمجھتا اور اس کے کان اور آنکھ پر مہر لگا دی، وہ کچھ اِن چیزوں سے نفع نہیں لیتا اور نہ اشیا اس کے لیے کچھ کارآمد ہوتی ہیں، بلکہ وہ اس چیز سے غافل ہے جو اس سے مقصود ومطلوب ہے۔ پس لا محالہ ایسا شخص آخرت میں من جملہ خاسرین کے ہے، جنھوں نے اپنی جان اور اپنے گھر والوں کو قیامت کے دن نقصان اور زیان دیا۔

مجبوراً کفر کرنے والا مومن ہی رہتا ہے:

پھر اُن میں سے اس شخص کو مستثنیٰ کیا، جو زبان سے کافر ہوا اور الفاظ میں مشرکین کا موافق بنا بہ سبب ان مشرکین کے ہاتھوں سے مار پیٹ اور ایذا پانے کے، لیکن اس کا دل ایمان باللہ و بالرسول پر مطمئن ہے اور دل سے کلمۂ کفر نہیں کہتا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہ آیت سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ مشرک ان کو عذاب کرتے تھے کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کرے۔ ناچار اکراہ کے ساتھ ان کی موافقت کی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر عذر کیا، اس پر یہ آیت اتری۔ امام شعبی، قتادہ اور ابو مالک رحمہم اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ محمد بن عمار بن یاسر رحمہ اللہ

نے کہا کہ مشرکوں نے سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کو پکڑ لیا اور عذاب دیا، یہاں تک کہ عمار نے مشرکین کے بعض ارادوں میں مقاربت کی۔ یہ شکایت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «كَيْفَ تَجِدُ قَلْبَكَ» یعنی تو اپنے دل کو کیسا پاتا ہے؟ کہا: "مُطْمَئِنًّا بِالْإِيْمَانِ" یعنی ایمان کے ساتھ مطمئن۔ فرمایا: «إِنْ عَادُوْا فَعُدْ» اگر وہ عود کریں تو تُو بھی عود کر۔[1] (رواه ابن جرير ورواه البيهقي بأبسط من ذلك)

اس روایت میں یوں مروی ہے کہ سیدنا عمار رضی اللہ عنہ نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو برا کہا اور اُن کے معبودوں کو خیر سے یاد کیا۔ پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے شکوہ کیا اور کہا: "مَا تُرِكْتُ حَتّٰى سَبَبْتُكَ وَذَكَرْتُ آلِهَتَهُمْ بِخَيْرٍ" یعنی مجھے چھوڑا نہیں گیا، یہاں تک کہ میں نے آپ کو گالیاں دیں اور اُن کے معبودوں کو میں نے اچھا کہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو اپنے دل کو کیسا پاتا ہے؟ کہا: ایمان کے ساتھ مطمئن۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ عود کریں تو تُو بھی عود کر۔ اس بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَىِٕنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ ﴾[2] (آیتِ باب)

لہٰذا علما نے اتفاق کیا ہے کہ کفر کرنے کے لیے تکلیف دیے جانے والے کو جائز ہے کہ جان بچانے کے لیے ان کی موافقت کرے اور یہ بھی جائز ہے کہ نہ مانے، جس طرح کہ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ نے نہ مانا تھا اور وہ بلال کو طرح طرح کے کاموں سے تکلیف دیتے تھے، یہاں تک کہ سخت گرمی میں ایک بھاری پتھر اُن کے سینے پر رکھا اور کہا کہ اللہ کے ساتھ شرک کر۔ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ نے انکار کیا اور اَحد اَحد کہتے رہے اور کہا: واللہ! اگر مجھے کوئی اور ایسا کلمہ معلوم ہوتا جس سے تمھیں زیادہ دُکھ اور غصہ پہنچتا تو وہی کلمہ کہتا۔ رضي الله عنه وأرضاه۔ اسی طرح حبیب بن زید انصاری رضی اللہ عنہ سے مسیلمہ کذاب نے کہا تھا کہ کیا تو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں؟ کہا: ہاں۔ کہا: کیا تو اس کی گواہی دیتا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟ کہا: میں یہ بات نہیں سنتا، اس نے ان کا ایک ایک عضو کاٹا اور وہ اسی بات پر ثابت قدم رہے۔

امام عکرمہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کچھ لوگوں کو، جو اسلام سے مرتد ہو گئے تھے، آگ میں جلا دیا۔ یہ بات سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو پہنچی، کہا: میں ان کو آگ میں نہ جلاتا، اس لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "لَا تُعَذِّبُوْا بِعَذَابِ اللّٰهِ" [اللہ کے عذاب کے ساتھ (کسی کو) عذاب نہ دو] بلکہ ان کو قتل کرتا، کیوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهٗ فَاقْتُلُوْهُ» یعنی جو شخص دین کو بدلے (مرتد ہو جائے)، اس کو مار ڈالو۔ یہ خبر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو پہنچی، کہا: "وَيْحَ أُمِّ ابْنِ عَبَّاسٍ"[3] (رواه البخاري و أحمد)

---

[1] تفسير الطبري (۱۷/ ۳۰۴۔ ۳۰۵)

[2] مستدرك الحاكم (۲/ ۳۸۹) سنن البيهقي الكبرىٰ (۸/ ۲۰۸) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۸۵٤) مسند أحمد (۱/ ۲۱۷)

سیدنا ابو بردہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کے پاس یمن میں سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ آئے۔ ان کے پاس ایک مرد تھا۔ کہا یہ کون ہے؟ کہا: یہ یہودی تھا، پھر مسلمان ہوگیا، اب پھر یہودی ہوگیا ہے اور ہم کئی دن سے اس کو مسلمان کرنا چاہتے ہیں، میں گمان کرتا ہوں کہ انھوں نے دو ماہ بتائے۔ سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا: واللہ! میں نہ بیٹھوں گا، یہاں تک کہ تم اس کی گردن مارو، اللہ اور رسول کا یہی حکم ہے کہ جو اپنے دین سے پھر جائے، اس کو قتل کرو یا یہ لفظ کہا کہ جو اپنے دین کو بدل ڈالے۔ (رواہ أحمد) یہ قصہ صحیحین میں دوسرے الفاظ سے مروی ہے۔[1] افضل اور اولیٰ یہی ہے کہ مسلمان اپنے دین پر ثابت رہے، اگرچہ نوبت اس کے قتل کی آجائے۔

رخصت کے بجائے عزیمت بہتر ہے:

حافظ ابن عساکر رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ سہمی صحابی کے ترجمے میں لکھا ہے کہ ان کو رومیوں نے قید کر لیا اور اپنے بادشاہ کے پاس لائے، بادشاہ نے کہا کہ تو نصرانی ہو جا میں تجھ کو اپنی بادشاہت میں شریک کرلوں گا اور اپنی بیٹی تجھ کو بیاہ دوں گا۔ انھوں نے کہا کہ اگر تو مجھ کو اپنا سارا ملک اور مال اور سارا ملکِ عرب دے دے گا تو بھی میں دینِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک پلک جھپکنے کے لیے نصرانی نہ ہوں گا۔ بادشاہ نے کہا تو اب میں تجھ کو قتل کر دوں گا، کہا بہتر ہے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو سولی دو اور تیراندازوں سے کہا کہ اس کے ہاتھ پاؤں میں تیر مارو اور اُن سے کہتا تھا کہ تم دینِ نصرانیت میں آجاؤ، وہ انکار کرتے تھے، پھر ان کو سولی پر سے اتار کر ایک تانبے کی دیگ کو گرم کر کے لائے اور ایک مسلمان قیدی کو اس میں ڈالا اور یہ دیکھ رہے تھے۔ اس کی ہڈیاں نظر آنے لگیں۔ ان پر پھر دینِ نصرانیت کو پیش کیا، انھوں نے انکار کیا۔

پھر حکم دیا کہ ان کو اس دیگ کے اندر ڈالو، اُن کو اُٹھا کر ڈالنا چاہا، یہ رونے لگے، بادشاہ کو طمع ہوئی، ان کو بلایا، انھوں نے کہا کہ میں اس لیے رویا کہ میری جان ایک جان ہے، یکبارگی اس دیگ میں ڈال دی جائے گی، میں یہ چاہتا تھا کہ میرے جسم کے ہر بال کی تعداد کے برابر میری جانیں ہوتیں، جن کو تو اللہ کی راہ میں یہ عذاب کرتا۔ بعض روایات میں مروی ہے کہ بادشاہ نے ان کو قید کیا اور چند روز تک ان کا کھانا پینا بند کر دیا، پھر اُن کے پاس شراب اور سور کا گوشت بھیجا، یہ اس کے پاس نہ پھٹکے۔ پھر ان کو بلا کر کہا کہ تجھ کو اِس کے کھانے سے کس نے منع کیا؟ کہا یہ کھانا مجھ کو حلال ہو گیا تھا، لیکن میں نے نہ چاہا کہ میں تجھ کو اپنے بارے میں خوش کروں، بادشاہ نے کہا: اچھا میرے سر پر بوسہ دو، میں تجھ کو اور سارے مسلمان قیدیوں کو چھوڑ دوں گا۔ انھوں نے اس کے سر پر بوسہ دیا، اس نے ان کو اور سارے قیدی مسلمانوں کو چھوڑ دیا جو اس کے پاس تھے، جب یہ لوٹ کر آئے تو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہر مسلمان پر حق ہے کہ عبداللہ بن حذافہ کے سر کو بوسہ دے اور میں اس کی ابتدا کرتا ہوں، پھر کھڑے ہو کر ان کے سر کو بوسہ دیا۔[2]

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٥٢٥) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٧٣٣) مسند أحمد (٥/ ٢٣١)

[2] تاریخ دمشق (٢٧/ ٣٥٨۔ ٣٦٠)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جس نے کلمۂ کفر کے ساتھ تلفظ اور تکلم کیا یا کوئی کفر کا کام کیا، برابر ہے، اگر وہ باختیار تھا، یا اس کو مکروہ سمجھتا تھا، مگر وہ شخص جس پر زبردستی کی گئی اور اس کا ایمان کے ساتھ دل مطمئن ہے۔ یہ استثنیٰ متصل ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا کہ مفسرین اور اہلِ علم کا اس بات پر اجماع ہے کہ جس پر کفر کے لیے زبردستی کی گئی، یہاں تک کہ وہ اپنی جان پر قتل سے ڈرا تو اس پر کچھ گناہ نہیں، اگر اس نے کفر کیا اور دل اس کا ایمان پر مطمئن تھا تو اس کی بیوی اس سے بائن اور جدا نہیں ہوتی اور اس پر کفر کا حکم نہیں لگایا جاتا۔ محمد بن حسن رحمہ اللہ نے کہا کہ جب کفر ظاہر ہوا تو وہ ظاہر میں مرتد ہوگیا اور اپنے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان اسلام پر ہے۔ اس کی بیوی اس سے جدا ہوگئی، اگر مر گیا ہے تو اس پر جنازے کی نماز نہ پڑھی جائے، اور اپنے باپ کا وارث نہ ہوگا، اگر وہ مسلمان ہے، لیکن قائل کا یہ قول مردود ہے اور کتاب وسنت کے خلاف ہے۔ امام حسن بصری، اوزاعی اور شافعی سحنون رحمہم اللہ کا مذہب یہ ہے کہ یہ وصف فقط قول میں مروی ہے (یعنی زبان سے کفر کا لفظ کہہ دینا)۔

رہا کفریہ فعل تو اس میں رخصت نہیں ہے، مثلاً: غیر اللہ کو سجدہ کرنے کے لیے زبردستی کی جائے، لیکن ظاہر آیت اس کو بھی رد کرتی ہے، کیوں کہ وہ مکرہ میں بغیر فرق کے عام ہے قول اور فعل کے درمیان۔[1] اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ جس پر زبردستی کی گئی کفر کرنے پر اور حال یہ ہے کہ اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہے، یعنی اس کا عقیدہ نہیں بدلا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے کی طرف ہجرت کا ارادہ کیا، اپنے اصحاب سے کہا کہ تم میرے پاس سے متفرق ہو جاؤ، جس کو قوت ہو وہ آخر شب تک دیر کرے اور جس کو قوت نہ ہو وہ اول شب میں چلا جائے، جب تم سنو کہ زمین میرے لیے مستقر ہوگئی ہے تو مجھ سے آملو۔ صبح کو مشرکوں اور ابوجہل نے سیدنا بلال موذن، خباب اور عمار رضی اللہ عنہم اور قریش کی ایک لونڈی کو جو اسلام لائے تھے، پکڑ لیا۔

سیدنا بلال رضی اللہ عنہ سے کہا تو کافر ہو جا، انھوں نے انکار کیا، لوہے کی ایک زرہ دھوپ میں رکھی، پھر وہ بلال کو پہنائی، جب پہنا چکے، سیدنا بلال رضی اللہ عنہ اَحد اَحد کہنے لگے۔ سیدنا خباب رضی اللہ عنہ کو کانٹوں میں گھسیٹا۔ سیدنا عمار رضی اللہ عنہ نے تقیہ سے ایک ایسی بات کہی جو انھیں اچھی لگی۔ رہی لونڈی اس کو ابوجہل نے چار کیلیں ٹھونکیں، پھر اس کو کھینچ کر اس کی پیش گاہ میں حربہ داخل کیا، یہاں تک کہ اس کو مار ڈالا۔ پھر سیدنا بلال، خباب اور عمار رضی اللہ عنہم کو چھوڑ دیا، یہ لوگ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے آملے اور اپنا حال بیان کیا اور سیدنا عمار رضی اللہ عنہ پر اپنا وہ کلمہ کہنا سخت ناگوار گزرا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس وقت تو نے یہ کلمہ کہا تھا، تیرے دل کا کیا حال تھا؟ اس کہنے کے ساتھ منشرح تھا یا نہیں؟ کہا: نہیں۔ اس پر

[1] تفسیر القرطبي (١٠/ ١٨٢) فتح القدير (٣/ ٢٧٢)

اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بھیجی۔[1] (رواه ابن المنذر و ابن أبي حاتم و ابن مردويه)

بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت بعض اہلِ مکہ کے حق میں اُتری ہے۔ بعض نے کہا کہ یہ جبر مولیٰ عامر بن الحضرمی کے بارے میں اتری ہے، اس کے آقا نے اس پر کفر اختیار کرنے کے بارے میں سختی کی تھی، لیکن پہلی بات زیادہ قابلِ قبول ہے اور حق یہ ہے کہ آیت ہر مکروہ علی الکفر کے حق میں عام ہے، جبکہ اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو۔ اگرچہ سببِ نزول خاص ہے۔ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ ایمان کی جگہ دل ہے۔ لیکن جس کا سینہ کفر پر منشرح ہوا اور اس نے کفر کو اختیار کیا اور راضی بالکفر ہوا اور کفر پر جی خوش رہا، پس ایسے لوگوں پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا غضب ہے اور آخرت میں عذابِ عظیم ہے۔ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح اسی طرح کا تھا، اس آیت کا نزول اسی کے حق میں ہوا۔ امام ابن سیرین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عیاش بن ابی ربیعہ رضی اللہ عنہ کے حق میں اتری ہے۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ابن ابی سرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کاتب تھا۔ شیطان نے اس کو پھسلا دیا اور وہ کفار میں جا ملا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن اس کے قتل کا حکم دیا۔ سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے اس کے لیے پناہ چاہی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ دی۔ امام حسن اور عکرمہ رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔[3] مرتدین کے لیے غضب اور عذابِ عظیم جمع کیا ہے، اس سے بڑھ کر اور کیا وعید ہو گی۔ یہ کفر بعد ایمان کے، یا یہ غضب اور عذاب اس لیے ہے کہ ان لوگوں نے دنیا کی زندگی کو جو ایک فانی شے ہے آخرت پر جو کہ باقی اور دائمی ہے دوست رکھا۔

اللہ اس قوم کو، جو اس کے علم کے مطابق کافر ہے، ہدایت نہیں کرتا، بلکہ اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں اور آنکھوں پر مہر لگا دی، وہ نصیحت کو نہیں سمجھتے اور آیاتِ حقہ کو نہیں سنتے دیکھتے، یہ اس عذاب سے غافل ہیں جو انھیں آخرت میں ہو گا۔ ضمیر فصل اس کو مفید ہے کہ ان کی غفلت انتہا کو پہنچ گئی ہے، اس لیے کہ کوئی غفلت اس غفلت سے بڑھ کر نہیں ہے۔ لا محالہ اور لا جرم وہ آخرت میں زیاں کار ہیں۔ اس سے زیادہ اور کیا خسران ہو گا کہ ان کا انجام آگ ہے جس میں یہ نابکار ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اس جگہ چھے وصف بیان کیے: ایک اللہ کا حقدار ہونا، دوسرے عذابِ عظیم کا استحقاق، تیسرے حیاتِ دنیا کو پسند کرنا، چوتھے اللہ کی ہدایت سے محروم رہنا، پانچویں دل، کان اور آنکھ پر مہر لگنا اور چھٹے من جملہ غافلین کے ہونا۔[3]

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١١٠﴾

---

① تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٠٣_ ٢٣٠٤)
② تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٠٤)
③ تفسير الطبري (١٧/ ٣٠٨) الدر المنثور (٥/ ١٧١_ ١٧٢)
④ فتح البيان (٧/ ٣١٩_ ٣٢٣)

يَوْمَ تَاْتِيْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿١١١﴾

پھر بے شک آپ کا رب ان لوگوں کے لیے (مہربان ہے) جنھوں نے آزمایش میں پڑنے کے بعد ہجرت کی، پھر جہاد کیا اور صبر کیا، بے شک آپ کا رب ان (آزمایشوں) کے بعد (ان لوگوں کے لیے) البتہ بہت بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿١١٠﴾ جس دن ہر نفس اپنی طرف سے جھگڑتا ہوا آئے گا اور ہر کسی نے جو عمل کیے ان کا اسے پورا پورا بدلہ دیا جائے گا، اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا ﴿١١١﴾

مجبور شخص قابلِ معافی ہے:

مکے میں بعض لوگ کافروں کے ظلم سے آزمائے گئے تھے، یا زبانی لفظ کہہ لیا تھا، اس کے بعد جب اتنے کام ایمان کے کیے تو وہ تقصیر بخشی گئی۔ ایک بزرگ تھے سیدنا عمار رضی اللہ عنہ، اُن کے باپ یاسر رضی اللہ عنہ اور ماں سمیہ رضی اللہ عنہا ظلم اُٹھاتی مرگئی، مگر کفریہ لفظ منہ سے نہ نکالا۔ بیٹے نے جان کے خوف سے لفظ کہہ دیا، پھر روتے ہوئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، تب یہ آیتیں اتریں۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اس دن کوئی کسی کی طرف سے نہ بولے گا اور نہ ظلم چل سکے گا۔

یہ مستضعفین (کمزور) کی ایک دوسری صنف ہے، جو اپنی قوم میں خوار اور حقیر تھے، وہ فتنے میں ان کے موافق ہو گئے، پھر ان کو رہائی کا اختیار ملا۔ انھوں نے اپنے شہر چھوڑ کر اور شہر والوں اور اپنے اموال سے منہ موڑ کر اللہ کی رضا اور مغفرت کے لیے ہجرت کی اور مومنین کے راستے میں منتظم ہوئے اور کافروں کے ساتھ جہاد کیا اور صبر اختیار کیا۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے خبر دی کہ وہ اس فتنے کو قبول کرنے کے بعد قیامت کے دن ان کو بخش دے گا اور ان پر رحم کرے گا، جس دن کہ ہر نفس اپنی طرف سے حجت لائے گا، کوئی کسی طرف سے نہ بولے گا۔ نہ باپ، نہ بیٹا، نہ بھائی، نہ بی بی، اور ہر جان کو جو کچھ اس نے خیر وشر سے کمایا ہے، بھرپور ملے گا اور کسی پر ایسا ظلم نہیں ہوگا کہ ان کے خیر کا ثواب کم کیا جائے، یا اس کے شر کی سزا زیادہ دی جائے۔ ﴿ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ﴾ [النساء: ١٢٤] ''اور ان پر ذرا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جن لوگوں نے دار الکفر سے دار الاسلام کی طرف ہجرت کی ہے، جیسے: سیدنا عمار رضی اللہ عنہ اور اُن کے ساتھی، اس کے بعد کفار نے ان کو فتنے میں ڈالا تھا، پھر انھوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور کفار کی ایذا دہی اور تکلیفوں کے تختۂ مشق بننے پر صابر رہے، اللہ تعالیٰ ان کا بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔ ''مجادلہ'' سے مراد عذرِ لنگ ہے جو قابلِ قبول نہ ہوگا، جیسے یہ کہنا: ﴿ وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴾ [الأنعام: ٢٣] ''ہمارے رب کی قسم! ہم مشرک نہیں تھے۔''[1]

[1] فتح البیان (٧/ ٣٢٣۔ ٣٢٤)

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا
رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ
لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿112﴾ وَلَقَدْ
جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ
ظٰلِمُوْنَ ﴿113﴾

اور اللہ نے ایک بستی کی مثال بیان کی ہے جو امن و اطمینان سے (آباد) تھی، اس کا رزق اسے ہر جگہ سے وافر (میسر) آتا تھا، پر اس (کے باشندوں) نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی تو اللہ نے انھیں ان کے کرتوتوں کی وجہ سے بھوک چکھائی اور خوف کا لباس (پہنایا)﴿112﴾ اور یقیناً ان کے پاس ایک رسول انھی میں سے آیا تو انھوں نے اس کی تکذیب کی، تب انھیں عذاب نے آ پکڑا اور وہ ہی ظالم تھے﴿113﴾

شہرِ مکہ کی ایک مثال:

ایسے بہت شخص ہوتے ہیں، پھر یہ مکے کی حالت بیان کی۔ تن کے کپڑے، بھوک اور ڈر یعنی ایک دم کے لیے بھی بھوک اور ڈر سے خالی نہ رہنے لگے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ ایک مثال ہے، اس سے مراد اہلِ مکہ ہیں۔ یہ شہر امن اور چین میں تھا، بڑا اطمینان اور قرار تھا، اس کے آس پاس سے لوگ اُچک لیے جاتے تھے، جو کوئی اس کے اندر آ جاتا وہ امن میں ہو جاتا، اس کو کوئی ڈر نہ ہوتا، جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ؕ اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا ﴾ [القصص: ٥٧] ”وہ (مشرکینِ مکہ) کہتے ہیں: اگر ہم نے تیرے ساتھ ہدایت کی پیروی کی تو ہمیں ہماری زمین سے اُچک لیا جائے گا، کیا ہم نے انھیں پر امن حرم میں جگہ نہیں دی، جس کی طرف ہر قسم کے پھل ہماری طرف سے بطور رزق کھینچ کر لائے جاتے ہیں؟“

اسی طرح اس جگہ کہا کہ اس بستی کا رزق فراغت سے آتا ہے، یعنی سہل اور آسان طریقے سے حاصل ہوتا تھا، یہ آمد ہر طرف سے تھی۔ اس بستی نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کی۔ سب سے بڑی نعمت رسول اللہ ﷺ کا مبعوث ہونا تھا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿28﴾ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا ؕ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴾ [إبراهيم: ٢٨۔ ٢٩] ”کیا آپ نے ان لوگوں کو دیکھا نہیں جنھوں نے . کی نعمت (ایمان) کو کفر سے بدل ڈالا اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں لے جا اُتارا؟ (یعنی) جہنم میں، وہ . میں داخل ہو گے اور وہ بدترین ٹھکانا ہے۔“

رسولوں کی نافرمانی کے نتیجے میں بھوک اور خوف کا عذاب:

لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کے دونوں حال بدل دیے، چناں چہ فرمایا کہ چکھایا اُن کو لباس بھوک اور خوف کا اس کے بعد کہ ہر شے کے پھل وہاں لائے جاتے تھے اور ہر جگہ سے رزق چلا آتا تھا۔ یہ اس لیے کہ انھوں نے رسول کی نافرمانی کی اور مخالفت اختیار کی، رسول نے ان پر بد دعا کی، یوسف علیہ السلام کے زمانے کی طرح سات سال تک اُن پر قحط رہا۔ اس خشک سالی میں جو کچھ اُن کے پاس تھا، وہ سب جاتا رہا۔ انھوں نے اونٹوں کی خون آلودہ اون کھائی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے خوف سے جو مدینہ کو ہجرت کر گئے تھے، امن کو بھول گئے۔

لشکروں کے حملوں اور لڑائیوں سے ان کا سارا مال برباد ہو گیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مکہ کو مفتوح کیا۔ یہ تکلیف ان پر اپنے کرتوتوں اور سرکشی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی وجہ سے آئیں، کون سے رسول؟ وہ جو خود انھیں میں سے مبعوث ہوئے تھے، یا جس کا احسان ان پر رکھا تھا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴾ [آل عمران: ١٦٤] ”بے شک اللہ نے مومنوں پر احسان کیا، جب ان میں انھی میں سے ایک رسول بھیجا، وہ انھیں اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور انھیں پاک کرتا ہے اور انھیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور بے شک وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔“

نیز فرمایا: ﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ ۚ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۝ رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۚ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا ﴾ [الطلاق: ١٠۔ ١١] ”لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اے عقل والو جو ایمان لائے ہو! تحقیق اللہ نے تمھاری طرف ذکر (قرآن) نازل کیا ہے۔ (اور) ایک رسول جو تم پر اللہ کی واضح آیات تلاوت کرتا ہے، تاکہ وہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے اندھیروں سے روشنی کی طرف نکال لائے، اور جو شخص اللہ پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے، وہ اسے ان جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ ان میں ابد تک ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ نے اسے خوب رزق دیا ہے۔“ نیز فرمایا: ﴿ كَمَاۤ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ﴾ [البقرة: ١٥١] ”جیسے ہم نے تمھارے لیے تمھی میں سے ایک رسول بھیجا، وہ تم پر ہماری آیتیں تلاوت کرتا ہے اور تمھیں پاک کرتا ہے اور تمھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔“

جس طرح کافروں پر اُن کا حال منعکس ہوا کہ امن کے بعد خوف زدہ ہوئے اور عیش و عشرت کے بعد تنگ

دست ہوئے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مومنین کا حال بھی بدل دیا کہ خوف کے بعد اُن کو امن ملا اور محتاجی کے بعد فارغ البالی حاصل ہوئی اور وہ لوگوں کے امرا اور حاکم اور سردار اور قائد اور امام ہوگئے۔ ہمارا یہ قول کہ یہ مثال اہل مکہ کے حق میں ہے، یہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ امام مجاہد، قتادہ، ابن زید اور زہری رحمہم اللہ بھی اسی طرف گئے ہیں۔ سلیم بن میر کہتے ہیں کہ ہم حج سے سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا زوجۂ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ پھرے اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ مدینے میں محصور تھے۔ سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا ان کا حال پوچھتی تھیں، اتنے میں دو سوار دیکھے، آدمی کو بھیج کر حال دریافت کیا، انھوں نے کہا کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ مارے گئے۔ سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! یہ وہی قریہ ہے جس کے حق میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً ﴾ (آیتِ باب)۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ قریہ مدینہ ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اس قریے میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ اس سے مراد کوئی معین قریہ ہے یا غیر معین۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا کہ ہر قوم جس پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا ہے اور نعمت نے اس قوم کو سرکش کر دیا، اس نے کفرانِ نعمت کیا اور پھر گئے۔ اللہ عزوجل نے اپنا عذاب نازل کیا۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے بھی اسی کے لگ بھگ کہا ہے۔[2] امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ ایک مثال ہے، تمام قریوں میں سے کوئی سا بھی ہو، جو اس صفت پر ہے۔[3] پس یہ بھی صحیح ہے کہ مراد کوئی مقررہ قریہ ہو اس صفت پر اور یہ بھی صحیح ہے کہ پہلے قریوں میں سے اس حال پر کوئی بھی قریہ ہو جس کی مثال اللہ تعالیٰ نے مکے کے لیے بیان فرمائی، ڈرانے کے لیے کہ اے اہلِ مکہ! کہیں تمھارا بھی انجام اسی گاؤں اور بستی جیسا نہ ہو۔ اکثر لوگوں نے کہا کہ نہیں، بلکہ مراد مکہ ہے، لیکن دوسری بات زیادہ قابلِ ترجیح ہے، کیوں کہ قریہ اس جگہ نکرہ واقع ہوا ہے اور مکہ اس عمومیت میں بہ درجہ اولیٰ داخل ہے۔

نیز اس صورت میں وعید ابلغ و اکمل ہے اور غیر مکہ مثل مکے کے ہے، اور اگر فرض کریں کہ مکہ ہی مراد ہے تو مثل ہذا دوسروں کو ڈرایا جا رہا ہے کہ انجام مکے کا سا نہ ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ مکہ مراد ہے۔[4] امام عطیہ رحمہ اللہ نے کہا تو نہیں دیکھتا کہ اللہ تعالیٰ نے کہا: ﴿ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ ﴾ (آیتِ باب) ”اور یقیناً ان کے پاس ایک رسول انھی میں سے آیا تو انھوں نے اس کی تکذیب کی۔“ یعنی اس سے مکہ ہی مراد ٹھہرتا ہے۔[5] امام واقدی رحمہ اللہ نے کہا کہ مشبہ بہ کا ذکر کیا، مشبہ کا ذکر نہیں کیا، اس لیے کہ وہ مخاطبین کے نزدیک واضح ہے

---

(1) تفسیر الطبري (١٧/ ٣٠٩۔ ٣١٠) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٧٦٧۔ ٧٦٨) (2) الكشاف (٢/ ٥٩٦) تفسیر البیضاوي (٣/ ٤٢٣)
(3) تفسیر القرطبي (١٠/ ١٩٤) (4) تفسیر الطبري (١٧/ ٣٠٩۔ ٣١٠) (5) تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٠٥)

اور عام مفسرین کے نزدیک یہ آیت اہلِ مکہ کے حق میں اتری ہے، ان کا امتحان خوف اور بھوک سے لیا گیا تھا، امن و نعمت کے بعد، جبکہ انھوں نے نبی اکرم ﷺ کی تکذیب کی۔[1]

امام ابن شہاب رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ قریہ مدینہ ہے۔[1] لیکن معلوم نہیں کہ اس تعیین پر کیا دلیل ہے اور اس پر کونسا قرینہ قائم ہوا ہے۔ دارالہجرۃ نے جو انصار کا مسکن تھا، کب کفرانِ نعمت کیا اور کس وقت اللہ تعالیٰ نے اس کو لباسِ خوف اور جوع پہنایا۔ بلکہ مدینہ تو وہ جگہ ہے کہ جس طرح بھٹی لوہے کا میل نکال دیتی ہے، اسی طرح مدینہ اپنا میل کچیل نکال دیتا ہے، جس طرح کہ حدیث میں مروی ہے اور فرمایا ہے: «اَلْمَدِيْنَةُ خَيْرٌ لَّهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ»[2] [مدینہ ان کے لیے بہتر ہے، کاش وہ جانتے ہوتے!] رغد سے مراد سعت ہے، یعنی رزق کی فراوانی۔ ہر مکان سے مراد بحر و بر ہے کہ مکہ و مدینہ میں ہر شہر کا غلہ اور میوہ وغیرہ آتا ہے۔ کفرانِ نعمت سے مراد اللہ کا انکار اور رسول اللہ ﷺ کی تکذیب ہے۔ جوع اور خوف کے لیے لباس کا استعارہ کیا کہ جس طرح کپڑا بدن پر ظاہر ہوتا ہے، اسی طرح ان پر کمزوری اور برے حال اور سیاہی ظاہر ہوئی۔

حکایت:

ابن راوندی زندیق نے ابن الاعرابی سے کہا کہ کیا لباس بھی چکھا جاتا ہے؟ ابن الاعرابی نے کہا: "لا بأس أيها النسناس" یعنی اے نسناس! کوئی حرج نہیں ہے۔ مانا کہ محمد ﷺ نبی نہ تھے، کیا عربی بھی نہ تھے۔ گویا اس نے آیت میں طعن کیا تھا، کہ مناسب "كساها الله لباس الجوع" تھا نہ کہ "أذاقها الله"۔ ابن الاعرابی نے اس پر رد کیا۔[4] علمائے بیان نے کہا ہے کہ اس صنعت کو تجریدِ استعارہ کہتے ہیں، استعارہ سے یہ ترشح مبالغہ کی طرف مستحسن تر ہے۔

اس کی تفصیل فتح البیان میں ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ساری صفتیں قریہ پر جاری کی گئیں، مگر ﴿يَصْنَعُوْنَ﴾۔ اس میں اس بات پر متنبہ کیا گیا ہے کہ مراد حقیقت میں اہلِ قریہ ہیں۔[5] واللہ أعلم۔ اہلِ مکہ کے پاس ان کی جنس کا رسول آیا، جس کے نسب کو وہ جانتے پہچانتے تھے، اس نے اس کام کا حکم دیا، جس میں ان کا نفع ہے اور منع کیا اس کام سے جس میں ان کا نقصان تھا۔ انھوں نے اس رسول کو جھٹلایا اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب اترا اور حال یہ ہے کہ وہ افاعیل اور مفاعیل میں اپنی جانوں پر ظلم و ستم گر تھے کہ اپنے آپ کو ابدی عذاب کا مستحق ٹھہرا لیا۔[6]

---

[1] امام خازن رحمہ اللہ نے ان الفاظ کو واقدی کے بجائے امام واحدی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے۔ دیکھیں: تفسير الخازن (٤/ ١١٩)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٠٥) [3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٧٧٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٨٨)

[4] فتح القدير (٣/ ٢٧٦) [5] فتح القدير (٣/ ٢٧٧) [6] فتح البيان (٧/ ٣٢٤۔ ٣٢٧)

فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪ وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ
اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ
وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَاۤ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ
غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾ وَلَا تَقُوْلُوْا
لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ
لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ
الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ؕ﴿۱۱۶﴾ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۪ وَّلَهُمْ عَذَابٌ
اَلِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾

چناں چہ اس میں سے کھاؤ (پیو) جو اللہ نے تمھیں حلال پاکیزہ رزق دیا ہے اور اگر تم واقعی اسی کی عبادت کرتے ہو تو اللہ کی نعمت کا شکر کرو﴿114﴾ اللہ نے تو بس تم پر حرام کیا ہے: مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو، پھر جو شخص مجبور ہو جائے، جبکہ نہ وہ باغی ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا، تو بے شک اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے﴿115﴾ اور اپنی زبانوں کے جھوٹ بیان کرنے کی وجہ سے مت کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے، تاکہ تم اللہ پر جھوٹ باندھو۔ تاکہ بے شک وہ لوگ جو اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں، وہ فلاح نہیں پائیں گے﴿116﴾ (ان کے لیے) تھوڑا سا فائدہ ہے اور (آخرت میں) ان کے لیے دردناک عذاب ہے﴿117﴾

حلال و حرام کا بیان:

اللہ تعالیٰ نے اپنے ایمان دار بندوں کو حلال طیب رزق کھانے کا حکم دیا اور اپنا شکر بجالانے کا، کیوں کہ جو ابتدا ہی سے انعام کرنے والا اور فضل و کرم کرنے والا ہے، وہ ہی سب سے پہلے عبادت کا مستحق ہے، وہ وحدہ لا شریک لہ ہے۔ پھر حرام چیزوں کا ذکر کیا، جس میں ان کے دین و دنیا کا نقصان ہے، جیسے: مردار اور خون اور سور کا گوشت اور جو غیر اللہ کے نام پر ذبح ہو۔ ہاں بے بس شخص کو سد رمق (سسکتی جان کو سہارا دینے کے لیے) کے مطابق لینا درست ہے، بشرطیکہ اس میں بغی اور زیاتی نہ ہو۔ اس مقام کی تفسیر سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔[1]

پھر اللہ تعالیٰ نے منع کیا کہ تم مشرکوں کی راہ پر نہ چلو، جنھوں نے صرف اپنی رائے سے نام رکھ کر کچھ چیزوں کو

---

[1] رقم الآیۃ (۱۷۳)

حرام حلال ٹھہرا لیا ہے، جیسے: بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام وغیرہ ذلک کہ یہ کام اور احکام جاہلیت میں نکالے تھے، سو تم اپنی زبان سے اس طرح جھوٹ حلال اور حرام نہ کرو کہ اللہ پر افترا پردازی ہو۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ”وَيَدْخُلُ فِيْ هٰذَا مَنِ ابْتَدَعَ بِدْعَةً لَيْسَ لَهُ فِيْهَا مُسْتَنَدٌ شَرْعِيٌّ، أَوْ حَلَّلَ شَيْئًا مِمَّا حَرَّمَ اللّٰهُ أَوْ حَرَّمَ شَيْئًا مِمَّا أَبَاحَ اللّٰهُ بِمُجَرَّدِ رَأْيِهِ وَتَشَهِّيْهِ“ یعنی اس میں ہر وہ شخص داخل ہے جس نے کوئی بدعت نکالی اور اس کی اس میں کوئی شرعی سند نہ ہو، یا جن چیزوں کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حرام کیا ہے ان میں سے کسی چیز کو حلال کرے، یا جن چیزوں کو اللہ نے مباح کیا ہے، ان میں سے کسی چیز کو حرام کرے مجرد رائے اور خواہش کے ساتھ۔

پھر ان لوگوں پر وعید فرمائی جو اللہ پر بہتان اور طوفان باندھتے ہیں کہ اُن کو کبھی فلاح نہ ہوگی نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں۔ دنیا میں اس لیے کہ دنیا ایک متاعِ قلیل ہے اور آخرت میں اس لیے کہ وہاں عذابِ الیم ہوگا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ نُمَتِّعُهُمْ قَلِيْلًا ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ اِلٰى عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴾ [لقمان: ٢٤] ”ہم انھیں تھوڑا سا فائدہ دیتے ہیں، پھر ہم انھیں سخت عذاب کی طرف مجبور کر دیں گے۔“ نیز فرمایا: ﴿ قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ۝ مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ﴾ [یونس: ٦٩۔ ٧٠] ”(اے نبی!) کہہ دیجیے: بلاشبہہ جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں، وہ فلاح نہیں پائیں گے۔ دنیا میں تھوڑا سا فائدہ اُٹھانا ہے، پھر انھیں ہماری ہی طرف لوٹنا ہے، پھر ان کے کفر کرنے کی وجہ سے ہم انھیں شدید عذاب (کا مزہ) چکھائیں گے۔“[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ آیت کے معنی یہ ہوئے کہ جب تم ایمان لے آئے اور تم نے کفر کو چھوڑ دیا تو اب تم حلال اور پاک چیزیں کھاؤ، مراد غنیمتیں ہیں۔ اور خبائث کو چھوڑ دو اور وہ مردار اور خون ہے۔ یہ مسلمانوں کو خطاب ہے۔ جمہور مفسرین رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں، یا مشرکین کو خطاب ہے جو اہلِ مکہ تھے۔ (حكاه الواحدي) یعنی پہلی بات زیادہ مناسب ہے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی نعمت کا شکر بجا لاؤ، اگر تم اللہ کا حکم جانتے ہو اور اسی وحدہ لاشریک لہ کو پوجتے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تم پر مردار اور خون اور سور کا گوشت اور جس پر غیر اللہ کا نام پکارا جائے، خواہ وہ صنم ہو یا وثن یا نصب یا کوئی روح کسی خبیث جن کی یا کوئی روح کسی پاکیزہ انسان کی، جیسے: نبی و ولی و صالح زندہ ہو یا مردہ یا نام کسی بادشاہ وزیر و امیر کا کہ اس کے لیے یہ جانور ذبح کیا جاتا ہے تو وہ شے حرام ہے۔

حدیث میں مروی ہے: « مَلْعُوْنٌ مَنْ ذَبَحَ لِغَيْرِ اللّٰهِ » یعنی جو شخص اللہ کے سوا کسی اور کے لیے ذبح

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٧٦٨)

کرے، وہ ملعون ہے،[1] یعنی خواہ اس پر ذبح کے وقت اس غیر کا نام لے یا نہ لے، بلکہ اللہ ہی کا نام لے، مگر وہ غیر کے نام سے مشہور ہو چکا ہے اور نیت اسی غیر کی ہے تو اب اللہ کے نام کا ذکر کرنا کچھ فائدہ مند نہیں ہوتا، اس لیے کہ یہ حیوان غیر اللہ کی طرف منسوب ہے اور اس میں ایسی خباثت آ گئی، جو مردار میں بھی نہ تھی، کیوں کہ وہ مردار اسی وجہ سے حرام ہوا کہ اس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا تھا اور اس حیوان کی روح تو غیر اللہ تعالیٰ کے لیے معین ہو چکی ہے، جو اس حیوان کا خالق نہیں ہے۔

پھر اس کے لیے اس کا ذبح کرنا بعینہٖ ایک دوسرا شرک ہے، اور جب اس ناپاکی نے اس میں سرایت کی تو وہ کسی حال میں بھی حلال نہ ہوگا۔ اس مسئلے کا بھید یہ ہے کہ روح کی نذر اس روح کے خالق کے سوا کسی اور کے لیے جائز نہیں، اگرچہ تمام کھانے پینے کی چیزوں اور سوال اور نذروں کا حکم جو غیر اللہ کے تقرب کے لیے ہیں، یہی ہے کہ وہ سب شرک اور حرام ہیں۔ لیکن اس طرح نذر کرنا جائز ہے کہ اس کا ثواب کسی اور کو پہنچا دیا جائے (مگر ذبح وہ صرف اللہ کے نام پر ہی کیا جائے گا اور وہ منسوب غیر اللہ کی طرف نہ ہوگا) جس طرح انسان کو یہ بات درست ہے کہ وہ اپنا مال کسی شخص کو دے دے، بہ خلاف کسی حیوان کی روح کے، کیوں کہ وہ روح انسان کی ملکیت نہیں ہے کہ کسی کو عطا کرے۔ مال خرچ کرنے میں اس لیے اجر واجب ہے کہ مال ایک ایسی چیز ہے جس سے فی الحال نفع لیا جاتا ہے اور مردے عین مال سے منتفع نہیں ہوتے لہٰذا ان کو نفع پہنچانے کے لیے یہ طریقہ نکالا گیا کہ مال کسی مستحق کو دیا جائے، تاکہ اس کا ثواب اس کی طرف عائد ہو رہے۔ روحِ حیوان وہ اس لائق نہیں کہ حیاتِ انسان میں اس سے نفع لیا جائے، چہ جائے کہ مر جانے اور ایک مدت گزر جانے کے بعد اس سے منتفع ہوں۔ رہا مردوں کی طرف سے قربانی کرنا، جس کا ذکر حدیث میں مروی ہے، سو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اجر جو ازہاق روح للہ میں ثابت ہے، وہ اس مردے کو دیا جائے یہ کہ اس مردے کے لیے کوئی حیوان ذبح کیا جائے اور اس کے نام پر اس کو پکاریں، تاکہ اس میت کا تقرب اس نذر ماننے والے کو ملے۔

یہ آیت شریفہ قرآن پاک میں چار جگہ آئی ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ جس کے لیے غیر اللہ کا نام مشہور کیا جائے نہ یہ کہ جس کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے، اگرچہ جو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے، وہ بہ درجہ اولیٰ اس میں داخل ہے۔ اب جو کوئی کسی جانور کے حق میں غیر اللہ کا نام مشہور کرے، پھر ذبح کے وقت اللہ کا نام لے گا تو یہ نام لینا کچھ سود مند نہ ہوگا اور اس سے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ اس جانور کا کھانا ہرگز حلال نہیں ہے، جس طرح اگر کوئی شخص کسی حرام جانور کو بسم اللہ کہہ کر ذبح کرے، وہ حیوان صرف اللہ کا نام لینے سے حلال نہیں ہو سکتا۔ یا بسم اللہ کہہ کر شراب پیے تو شراب حلال نہ ہو جائے گی، بلکہ ایسا شخص جو اس حرکت کا مرتکب ہوگا، وہ فقہائے اسلام کے

[1] مسند أحمد (١/ ٢١٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٤٦٢)

نزدیک کافر ہو جاتا ہے، لہٰذا علمائے تفسیر نے ایسے عذر ماننے والے کو جو غیر اللہ کے نام پر ذبح کرے، مرتد کہا ہے اور اس کے ذبیحہ کو حرام بتایا ہے۔

اہلال کے معنی لغت میں رفع صوت (آواز بلند کرنا) کے ہیں نہ کہ ذبح کرنے کے۔ اس معنی میں نہ کوئی عرف آیا ہے اور نہ یہ معنی کسی شعر میں آئے ہیں۔ زبانِ عرب کی کتابیں موجود ہیں اور تمام روایت کی جانے والی لغات کے دفاتر موجود ہیں۔ کسی ایک کتاب اور لغت میں اہلال کو ذبح کے معنی میں نہیں لکھا ہے۔ ہاں رویتِ ہلال اور بچے کے رونے کو بھی اہلال کہتے ہیں اور تلبیہ حج کو اہلال بولتے ہیں نہ کہ ذبح کو اور اگر مان بھی لیں کہ اہلال ذبح کے معنی میں ہے تو بھی غیر اللہ کے نام کے ساتھ ذبح کہاں سے ثابت ہوگا، بلکہ اس کے معنی "مَا ذُبِحَ بِهِ لِغَيْرِ اللّٰهِ" ہوں گے۔ اس صورت میں رفع صوت کے معنی لینے سے کوئی ممانعت نہیں ہوتی ہے۔ لہٰذا نظام نیساپوری رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اہلِ علم کا اجماع نقل کیا ہے۔ اس بات پر کہ کسی مسلم کا ایسا ذبیحہ جس کے ذبح کرنے سے مقصد غیر اللہ کا تقرب حاصل کرنا ہے، مرتد کا ذبیحہ ہے، وہ خود بھی مرتد ہوگیا۔[1]

کفارِ جاہلیت اپنے گھروں سے باہر نکلتے تھے تو بتوں کے نام راستوں اور راہوں اور سڑکوں میں پکار کر لیتے اور جب مکے میں پہنچتے تو کعبے کا طواف کرتے، حالاں کہ ان کا یہ طواف اللہ کے نزدیک قبول نہ تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری: ﴿فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا﴾ [التوبة: ٢٨] "لہٰذا وہ اپنے اس برس کے بعد مسجدِ حرام کے قریب نہ آنے پائیں۔" اسی طرح جب کوئی شخص کسی حیوان کے حق میں آواز بلند کرے گا کہ یہ حیوان فلاں کے واسطے ہے یا اس کو واسطے اس فلاں کے ذبح کرے گا، پھر ذبح کے وقت اللہ کا نام لے گا تو اس پر ہرگز حلال ہونا مترتب نہ ہوگا، ہاں اگر توبہ کر کے اصلاح کی نیت کرلے گا اور یہ آواز بلند کرنا چھوڑ دے گا اور غیر اللہ کا تقرب حاصل کرنے کا قصد باقی نہ رہے گا اور پکار کر کہہ دے گا کہ یہ جانور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی نذر اور تقرب کے لیے ہے اور بسم اللہ کہہ کر ذبح کرے گا اور کہے گا کہ میں نے اس معصیت کی نذر اور شرک کے ارادے سے توبہ کر لی ہے تو اس حیوان کے گوشت کا کھانا درست ہو جائے گا۔

رہی یہ بات کہ بعض یا اکثر مفسرین نے ﴿وَمَآ أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ﴾ کی تفسیر ذبح کے ساتھ کی ہے، سو اس کی وجہ یہ ہے کہ جس وقت یہ نازل ہوئی تھی اور جن کے حق میں اتری تھی، وہ نالائق غیر اللہ کے نام پر آواز بلند کرنے کے علاوہ ذبح کے وقت بھی اس غیر اللہ کا نام لیتے تھے، جس کا تقرب ان کو منظور ہوتا یا جس کی نیت ہوتی تھی۔ لہٰذا تفسیر واقع کے مطابق ظاہر ہوئی۔ یہ علمِ غیب عام مفسرین کو نہ تھا کہ اس اُمت کے جہلا قیامت کے آخر زمانے میں صرف رفع صوت پر قناعت کریں گے، لیکن جب دنیا میں اس شرک کا وقوع عموماً اور سر زمین ہندوستان میں خصوصاً ہوا

[1] تفسير النيسابوري (١/ ٤٧١)

تو علما دین دار اور راسخین ابرار نے اپنی تفسیر میں اس مسئلے کو بیان کر دیا۔ تفسیر فتح العزیز اس پر شاہدِ عدل ہے۔ اس کے علاوہ اصولِ تفسیر اور فقہ کا قاعدہ ہے کہ اعتبار عمومیتِ لفظ کا ہے نہ کہ خصوصیتِ سبب کا۔ اس قاعدے پر علما معانی و بیان کا اتفاق ہے، اگر یہ قاعدہ قرآن و حدیث میں مطرد (عام اور کثیر الاستعمال) نہ ٹھہرایا جائے تو کتاب وسنت کے بے حساب احکام کا اہمال ہو جائے (یونہی چھوڑ دیا جائے) اور دینِ کامل اور نعمتِ تمام نہ ٹھہرے۔ اکالین بطالین جن کو علم و دین سے واقفیت نہیں ہے، وہ ایسی جگہوں میں ہذیانات بک کر اللہ اور رسول کی مراد کے خلاف صرف اپنی رائے سے حرام کو حلال کر لیتے ہیں۔ سو ایسے لوگ لائقِ خطاب و التفات نہیں ہیں، وہ جو چاہیں کہتے رہیں۔

إذا رضيت عني كرام عشيرتي فلا زال غضبان علي لئامها

[جب میرے قبیلے کے معززین مجھ سے راضی ہو جائیں گے تو اس کے ذلیل اور کمینے لوگ مجھ سے نالاں ہی رہیں گے]

پھر اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا کہ جس شخص کو ضرورت ہو کہ اِن محرمات میں سے کسی کو ضرورتِ مخمصہ (بھوک) کے تحت کھائے یا کوئی اور دوسرا بے بس شخص، پر باغی نہ ہو اور نہ ہی وہ ضرورت اور سدِ رمق (سسکتی جان کو بچانے) سے زیادہ لینے والا ہو تو اللہ غفور و رحیم ہے، اس کو اس حرام کے کھانے پر نہ پکڑے گا۔ بعض نے کہا کہ اس کے یہ معنی ہیں کہ والی پر باغی اور لوگوں پر راہ زنی کی خاطر نکلنے والا نہ ہو، اس صورت میں کسی حرام چیز کا کھانا معصیت کے سفر میں جائز نہ ہوگا۔ پھر کفار کے طریقے کی جو ان محرمات کو زیادہ کرتے تھے، جیسے: وصیلہ، سائبہ اور بحیرہ ہیں اور اس نقصان کی تزئیف فرمائی، جیسے: مردار اور خون کو حلال کرنا اور کہا کہ اپنی زبان کے جھوٹ سے یہ نہ کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام۔

امام ابو نضرہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب سے میں نے یہ آیت سورت نحل میں پڑھی ہے، تب سے آج کے دن تک میں فتویٰ دینے سے ڈرتا ہوں۔[1] یہ بات انھوں نے سچ کہی، کیوں کہ آیتِ شریفہ بہ عموم خود ہر فتوے کو متناول ہے، جو کتاب وسنت کے خلاف ہے، جس طرح کہ اکثر اختیار کرنے والے رائے کو روایت پر، یا قرآن و حدیث سے جاہل لوگ، مثلاً: مذاہب کے مقلدین کیا کرتے ہیں، یہ لوگ اس لائق ہیں کہ اُن کے اور اُن کے فتاویٰ کے درمیان حائل ہونا چاہیے اور اُن کو اُن جہالات سے روکا جانا چاہیے، اس لیے کہ یہ فتویٰ اُن کی طرف سے اللہ کے علم اور ہدایت اور کتابِ منیر کے بغیر ہوتا ہے، ان سے فتویٰ مانگنے والے اور یہ فتویٰ دینے والے گمراہ اور گمراہ کرنے والے ہیں، جس طرح کہا ہے ؎

كبهيمة عمياء قاد زمامها أعمى على عوج الطريق الحائر

[جیسے اندھے چوپائے کو اندھا قائد ٹیڑھے راستے پر لے چلتا ہے]

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٠٦)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ قریب ہے کہ ایک آدمی کہے گا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ حکم دیا، اس سے منع کیا، اللہ تعالیٰ کہے گا تو جھوٹا ہے۔ یا وہ آدمی کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حلال کیا، وہ حرام کیا۔ اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ تو جھوٹا ہے۔[1] حاصل یہ ہے کہ حلال اور حرام کرنے اور فتویٰ دینے میں آیتِ کتاب اللہ یا حدیثِ مستطاب (پاک) کی پابندی چاہیے۔ رائے اور تقلیدِ رجال کا معاملہ امورِ شرعیہ میں نہ ہو۔ اسلام کی غربت اسی آرائے رجال اور قیل وقال کی تقلیدات سے ظاہر ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی کارروائی کا نام ''افتراء کذب علی اللہ'' رکھا ہے اور فرمایا ہے کہ ایسے مفتری اپنی مراد حاصل نہیں کر سکتے، دنیا کا فائدہ تھوڑا ہے اور آخرت کا عذاب دردناک ہے۔[2]

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ ۖ وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلَٰكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿١١٨﴾ ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ عَمِلُوا السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوا إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١١٩﴾

اور جو لوگ یہودی ہوئے ان پر ہم نے وہ چیزیں حرام کی تھیں، جو ہم پہلے آپ سے بیان کر چکے ہیں۔ اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا، لیکن وہ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے (118) پھر بے شک آپ کا رب ان پر (مہربان ہے) جنھوں نے جہالت سے برے عمل کیے، پھر اس کے بعد انھوں نے توبہ کی اور اپنی اصلاح کر لی، بے شک اس کے بعد آپ کا رب (ان لوگوں کے لیے) البتہ بہت بخشنے والا، نہایت مہربان ہے (119)

یہود پر بعض حلال چیزوں کی حرمت:

سورت انعام میں یہود کی محرمات کا ذکر ہو چکا ہے۔[3] حلال وحرام میں جھوٹ بنایا تھا، جب مسلمان ہوئے، تب بخشے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے جب یہ ذکر کیا کہ اس نے ہم پر مردار، خون اور سور کا گوشت اور ﴿مَآ أُهِلَّ لِغَيْرِ اللهِ بِهٖ﴾ کو حرام کیا ہے اور ضرورت کے وقت اس کو مباح رکھا اور اس میں توسیع ہے اُمت پر، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ساتھ آسانی کا ارادہ کیا ہے نہ کہ مشکل کا تو جو چیز یہودیت کے منسوخ ہونے سے قبل یہود کی شریعت میں حرام تھی اور جس تنگی اور اِصر، اغلال اور حرج میں وہ تھے، اس کا ذکر فرمایا، جیسے اللہ تعالیٰ نے کہا: ﴿وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا

---

[1] المعجم الكبير (٩/ ٢٠٤) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔
[2] فتح البيان (٧/ ٣٢٨ـ ٣٣٣) [3] رقم الآية (١٤٦)

كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۚ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴾ [الأنعام: ١٤٦] ''اور جو لوگ یہودی ہوئے ان پر ہم نے ہر ناخن والا (جانور) حرام کیا تھا، اور گائے اور بکری میں سے ان پر ان کی چربی حرام کی تھی، سوائے اس چربی کے جو ان کی پیٹھوں یا آنتوں کے ساتھ لگی ہو یا ہڈی کے ساتھ ملی ہوئی ہو، یہ سزا ہم نے انھیں ان کی سرکشی کے باعث دی تھی اور بے شک ہم سچے ہیں۔''

اس جگہ یہ کہا کہ ہم نے اُن پر کوئی ظلم نہیں کیا اور اُن کو کسی طرح کی تنگی میں نہیں لیا، بلکہ خود انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم روا رکھا اور مستحقِ عذاب ٹھہرے، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ﴾ [النساء: ١٦٠] ''پھر جو لوگ یہودی ہوئے ان کے ظلم کی وجہ سے اور ان کے، اکثر لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکنے کی وجہ سے ہم نے ان پر کچھ پاک چیزیں حرام کر دیں، جو پہلے ان کے لیے حلال تھیں۔'' پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مومنین گناہ گاروں پر احسان کرتے ہوئے اور اُن کی عزت کے لیے یہ خبر دی کہ جو کوئی اُن میں سے توبہ کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمائے گا۔ بعض سلف نے کہا کہ ''كُلُّ مَنْ عَصَى اللّٰهَ فَهُوَ جَاهِلٌ'' [ہر اللہ کی نافرمانی کرنے والا جاہل ہے] اصلاح سے مراد معصیت کے کاموں سے روک دینا ہے اور اطاعت کے کاموں کی طرف بڑھا دینا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس فعل اور زلّت (پھسل جانا) کے بعد بخش دیتا ہے، رحم کرتا ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ کسی شے کی تحریم یا تو اس لیے ہوتی ہے کہ اس میں ضرر ہے یا اس لیے کہ جن پر حرام ہے، وہ بغی کرنے لگتے ہیں، یعنی سرکش ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہود پر وہ اشیا بطورِ عذاب کے حرام کر دی تھیں، پھر جن لوگوں نے جہالت کی راہ سے کوئی برا کام کیا اور انجام کار میں اپنی خواہشات کے غلبے کی وجہ سے غور وفکر نہ کرتے تھے، جب وہ توبہ کر لیتے ہیں اور اپنے احوال کی اصلاح کر لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس توبہ اور اصلاح کے بعد اُن کا قصور معاف کر دیتا ہے، کیوں کہ وہ غفور ورحیم ہے۔ برا کام اس شخص سے صادر ہوا کرتا ہے جو عاقبت سے جاہل ہے، کیوں کہ عقل مند آدمی ہرگز برا کام کرنے پر راضی نہیں ہوتا۔ اس آیت میں لفظ ﴿ السُّوْٓءَ ﴾ ہر فعلِ قبیح پر منطبق ہوتا ہے، اس کے نیچے کفر اور سارے معاصی داخل ہیں اور اُس میں اللہ کی رحمت اور غفران کی وسعت کا بیان ہے۔ اس آیت کی تفسیر سورت نساء میں گزر چکی ہے۔[1]

[1] رقم الآية (١٧) فتح البيان (٧/ ٣٣٣۔ ٣٣٤)

إِنَّ إِبْرَٰهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِّلَّهِ حَنِيفًا وَلَمْ يَكُ
مِنَ ٱلْمُشْرِكِينَ ﴿١٢٠﴾ شَاكِرًا لِّأَنْعُمِهِ ٱجْتَبَىٰهُ وَهَدَىٰهُ إِلَىٰ
صِرَٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿١٢١﴾ وَءَاتَيْنَٰهُ فِى ٱلدُّنْيَا حَسَنَةً وَإِنَّهُۥ فِى
ٱلْءَاخِرَةِ لَمِنَ ٱلصَّٰلِحِينَ ﴿١٢٢﴾ ثُمَّ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ أَنِ
ٱتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَٰهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ ٱلْمُشْرِكِينَ ﴿١٢٣﴾

بلاشبہ ابراہیم ایک امت تھا، اللہ کا فرماں بردار اور اس کی طرف یکسو، اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا﴿120﴾ وہ اللہ کی نعمتوں کا شکر کرنے والا تھا، اس (اللہ) نے اسے چن لیا اور اس کو صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت دی﴿121﴾ اور ہم نے اسے دنیا میں بھلائی دی، اور بلاشبہ وہ آخرت میں ضرور صالحین میں سے ہوگا﴿122﴾ (اے نبی!) پھر ہم نے آپ کی طرف وحی کی کہ ملتِ ابراہیم کی اتباع کریں جو (اللہ کی طرف) یکسو تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا﴿123﴾

جد الانبیاء ابراہیم خلیل علیہ السلام کا تذکرہ:

یعنی حلال وحرام میں اور دین کی باتوں میں اصل ملتِ ابراہیم ہے۔ اورعرب کے لوگ اپنے آپ کو حنیف کہتے ہیں اور شرک کرتے ہیں، وہ اس کی راہ پر نہیں ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو سارے جہان میں دنیا کی خوبی اور آسودگی اور قبولیت دی تھی۔ درمیان میں یہود ونصاریٰ کو اِن کے حالات کے مطابق اور حکم بھی ہوئے۔ آخری پیغمبر پھراسی ملتِ ابراہیمی پر آئے۔ آخر باوّل نسبتے دارد۔

توحیدِ خالص کی ابتدا دنیا میں ابراہیم خلیل جلیل علیہ الصلاۃ والسلام سے ہوئی۔ اس حقِ مبین کے اصل بانیِ کار وہ تھے، اور اسی توحیدِ کامل کی وجہ سے دنیا اور آخرت میں اچھے رہے اور نبوت اور توحیدِ حق کا انجام آخری پیغمبر پر ہوا اور اب خاتم المرسلین، سید الانبیا علیہ الصلاۃ والسلام کے بعد کوئی فردِ بشر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہتر توحید اور ملتِ حقہ حنیفیہ کو بیان نہیں کرسکتا، لیکن جس طرح عرب اپنے آپ کو حنیف کہتے تھے اور قول وفعل وعمل وحال میں خلیل حنیف علیہ السلام کے برخلاف تھے، اسی طرح اس اُمتِ اسلام کے جاہل اپنے آپ کو مسلمان موحد کہتے ہیں، لیکن عمل، فعل، قول اور حال دیکھو تو خاصے مشرک اور بدعتی ہیں۔ فَمَا أَشْبَهَ اللَّيْلَةَ بِالْبَارِحَةِ.

عرب اگر سچے حنیف ہوتے اور توحیدِ خالص پر قائم رہتے تو پیغمبر کے آنے کی اور قرآن کے نازل ہونے کی کچھ ضرورت نہ ہوتی، لیکن چوں کہ فعل اُن کا اُن کے قول کے مخالف تھا اور وہ درحقیقت شرک اور معاصی کی گندگی سے آلودہ ہوگئے تھے اور نام کے حنیف تھے، نہ کہ کام کے، ضرورت ہوئی کہ نبی آئے اور کتاب لائے اور ملتِ ابراہیم کو

زندہ کرنے اور جاہلیت کے افاعیل اور مفاعیل کو مٹائے۔ اسی طرح اس زمانہ غربتِ اسلام میں اشد ضرورت ہوئی کہ بعض عالم باللہ ہر زمانے میں توحیدِ خالص سمجھانے کے لیے مضامین شائع کریں اور جاہل مسلمانوں کو بتلائیں کہ جس کام میں تم پڑے ہو، یہ شرک ہے یا بدعتِ ضالہ اور تمام ان اعمال اور افعال کے ساتھ تم مسلمان نہیں ہو، بلکہ مشرک اور مبتدع ہو۔ چناں چہ نبی اکرم ﷺ کے ہجرت کے زمانے سے اس زمانے تک ہر قرن میں ایک طائفہ اہلِ حق نے یہ کام زبان و سیف و سنان سے کر دکھایا اور عمدہ اور مدلل تصنیفات و تالیفات چھوڑ گئے اور اُن کے سچے جان نشینوں نے سلف صالح کی اقتدا میں اِن رسائل اور مسائل کی تبلیغ کے لیے ہمیشہ کوششیں جاری رکھیں اور کچھ نہ کچھ کسی قدر لوگ جو اللہ کے علم ازلی کے مطابق موفق اور سعید ٹھہرے تھے، انھوں نے ہدایت پائی اور کتاب و سنت کی راہِ مستقیم پر چلے اور عقیدے اور عمل میں موحد پاک اور صاف متقی ہوگئے اور جن کے لیے بدبختی لکھی جا چکی تھی، انھوں نے نہ نبی مکرم ﷺ کے زمانے میں حق قبول کیا اور نہ نبی اکرم ﷺ کے زمانے کے بعد اور نہ اب تک راہِ سنت و تقویۃ الایمان اور دینِ خالص اور رسائلِ ہشت گانہ توحید پر کان رکھتے ہیں اور نہ سنتے اور نہ سمجھتے ہیں۔ فإنا للہ۔ علما کے ذمے اسی قدر ہے کہ وہ تبلیغِ حق کر دیں۔ ماننا نہ ماننا اُن کا کام ہے جنھیں تبلیغ کی جاتی ہے۔ واللہ الموفق.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے بندے اور رسول و خلیل ابراہیم امام الحنفاء و والد الانبیا کی مدح فرمائی اور اُن کو یہودیت و نصرانیت سے بَری کیا اور فرمایا کہ وہ ایک امام مقتدیٰ تھے، پیروی کرنے کے لائق اور قانت تھے، یعنی خشوع کرنے والے مطیع اور حنیف تھے، یعنی شرک سے قصداً منحرف اور توحید کی طرف متوجہ۔ لہٰذا فرمایا کہ وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اُمت سے مراد معلم الخیر ہے، اور قانت سے مراد اللہ اور رسول کا مطیع۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اُمت وہ ہے جو لوگوں کو ان کا دین سکھائے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ "إِنَّ مُعَاذًا كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلّٰهِ حَنِيفًا"، یعنی معاذ راستے پر ڈالنے والا ایک طرف ہو کر اللہ کا حکم ماننے والا تھا۔

امام فروہ بن نوفل رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے جی میں کہا کہ ابو عبدالرحمن نے اس قول میں غلطی کی، پھر کہا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ إِنَّ إِبْرٰهِيْمَ كَانَ أُمَّةً ﴾ (آیتِ باب) راہ ڈالنے والا اصل ابراہیم تھا۔ تو جانتا ہے کہ اُمت کیا ہے اور قانت کیا؟ میں نے کہا کہ اللہ جانے۔ کہا: اُمت وہ ہے جو لوگوں کو خیر سکھائے، یعنی علمِ دین اور قانت وہ ہے، جو اللہ اور رسول کا مطیع ہو، سو معاذ رضی اللہ عنہ اسی طرح کے تھے۔ یہ روایت سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کئی طرح سے مروی ہے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ تنہا ایک اُمت تھے اور قانت بہ معنی مطیع ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کا دوسرا قول یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام تنہا ایک گروہ مومن تھے اور سارے لوگ اس وقت کفار تھے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ابراہیم علیہ السلام اُمت،

یعنی امام ہدیٰ اور مطیع تھے۔[1] پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا کہ وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی نعمتوں کا شکر بجا لایا کرتے تھے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰۤى ﴾ [النجم: ۳۷] ''اور ابراہیم جس نے (صحیفوں میں جو باتیں تھیں، انھیں) ٹھیک ٹھیک پہنچا دیا؟'' یعنی ابراہیم علیہ السلام نے ہمارے حکم کی پوری بجا آوری کی۔ اجتباء سے مراد اختیار و اصطفیٰ ہے، یعنی چن لینا، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَاۤ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ﴾ [الأنبياء: ۵۱] ''یقیناً ہم نے اس سے پہلے ابراہیم کو اس کی سمجھ بوجھ بخشی تھی اور ہم اس کے احوال سے بہ خوبی واقف تھے۔''

صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت سے یہ مراد ہے کہ وہ اللہ وحدہ لا شریک لہ کی عبادت پسندیدہ شریعت کے مطابق کرتے تھے نہ کہ کسی اور کے مطابق۔ اسی امر کے طلب کرنے کی ہدایت سورت فاتحہ میں فرمائی ہے کہ ہر بندہ ہر رکعت میں ﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴾ کہا کرے، کیوں کہ اس سے بڑھ کر کوئی سعادتِ دارین نہیں ہے۔ لہٰذا اللہ کا علم رکھنے والوں نے کہا ہے کہ موحد فاسق، مشرک متقی سے بہتر ہے اور سنت پر چلنے والا گناہ گار، صالح بدعتی سے بہتر ہے۔ رسالہ ''تذکیر الکل'' میں اس اجمال کی، یعنی اثباتِ توحید کی پوری تفصیل دی گئی ہے۔ سورت فاتحہ اور چاروں قل میں اسی طرح کہا گیا ہے۔ پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کہا کہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو دنیا میں خوبی دی، یعنی وہ سب چیزیں جن کا اکمالِ حیاتِ طیبہ میں مومن محتاج ہوتا ہے، وہ سب ان کے لیے جمع کر دیں۔

رہی آخرت، سو اس میں وہ من جملہ صلحا کے ہیں۔ صلاح بندے کی اُخروی سعادت میں انتہائی ترقی ہے، اسی لیے یوسف علیہ السلام نے دعا کی تھی: ﴿ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴾ [یوسف: ۱۰۱] ''تو مجھے اسلام پر موت دے اور مجھے صالحین کے ساتھ ملا۔'' امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ حسنۂ دنیا سے مراد سچی زبان ہے۔[2] پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کی کہ تم ملتِ ابراہیم حنیف پر چلو، کیوں کہ وہ ملت کامل، عظیم، صحیح اور طریق توحید اور دین خالص پر ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کچھ مشرک نہ تھے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴾ [الأنعام: ۱۶۱] ''(اے نبی!) کہہ دیجیے: بے شک مجھے میرے رب نے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دی ہے، صحیح اعلیٰ اقدار کے حامل دین کی، ایک رب کے پرستار ابراہیم کے طریقے کی، اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھا۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ ابن الاعرابی کہتے ہیں کہ مرد عالم کو اُمت بولتے ہیں، جو مرد جامع خیر ہے وہ اُمت ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا کہ اکثر مفسرین کا قول ہے کہ اُمت خیر کی تعلیم دینے والا ہے۔[3] نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن عمرو

---

[1] تفسیر الطبري (۱۷/ ۳۱۶۔ ۳۱۸) تفسیر ابن کثیر (۲/ ۷۶۹) [2] تفسیر الطبري (۱۷/ ۳۱۹) [3] فتح القدیر (۳/ ۲۸۰)

بن نُفیل رضی اللہ عنہ کے حق میں فرمایا ہے: «يَبْعَثُهُ اللّٰهُ أُمَّةً وَحْدَه» اللہ سبحانہ وتعالیٰ اُٹھائے گا اس ایک ہی کو جماعت۔[1] اس لیے کہ اس نے جاہلیت سے علاحدگی اختیار کی تھی۔[2] (قاله مجاهد) اسی طرح جو شخص عالم ہو کر اس زمانے میں اہلِ شرک و بدعت کے طریقے سے علاحدگی اختیار کرنے والا ہے، وہ ان شاء اللہ تعالیٰ بجائے خود ایک اُمت مبعوث ہوگا، کیوں کہ یہ وہ غربتِ اسلام کا زمانہ ہے کہ اسلام کا دعویٰ کرنے والوں سے بھرا ہے اور موحد مخلص کو تلاش کرو تو لاکھ میں سو اور سو میں ایک بھی خاطر خواہ کتاب وسنت کے موافق نہیں ملتا اور اگر زبانی دین خالص حنیف کا دعویٰ کرتا ہے تو عمل اس کا اس کے قول کی تصدیق نہیں کرتا، یہاں تک کہ رسائل میں حق کا اظہار ہوتا ہے، لیکن خارج میں اس کا وجود معلوم نہیں ہوتا۔ والله أعلم بالسرائر.

بہر حال مسلم حنیف کی شان یہ ہے کہ اگر تمام دنیا کافر ہو جائے تو یہ ایمان باللہ اور توحیدِ خالص سے متزلزل نہ ہو اور اگر تمام روئے زمین کی سلطنت کوئی اس کو دینے کا کہے تب بھی شرک و کفر کو اختیار نہ کرے اور کسی بلا اور آزمایش میں غیر اللہ سے مدد کا طلب گار نہ ہو۔ خلیلِ جلیل علیہ السلام کے قصے کو یاد کرے کہ جب اُن کو آگ میں ڈالا گیا تو جبریل علیہ السلام نے آ کر کہا کہ کچھ مدد چاہتے ہو؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا: تم سے تو کچھ مدد نہیں چاہتا اور جس کی مدد کی حاجت ہے وہ خود میرے حال کو جانتا ہے۔ چنانچہ اس استقلالِ توحید کا نتیجہ یہ ہوا کہ نار گلزار ہوگئی، آگ ٹھنڈی پڑ گئی، ایک بال بھی بیکا نہ ہوا۔ توحیدِ خالص یہ ہے اور انجام توحید کا یہ اور توحید پر اللہ کی مدد اسی طرح ہوتی ہے۔ یہ جو ماجرا ابراہیم کے ساتھ گزرا، اگر اللہ تعالیٰ لفظ ﴿سَلٰمًا﴾ نہ فرماتا تو آگ کی سردی شاید مہلک ہو جاتی۔

اسی جگہ سے حدیث میں مروی ہے کہ دوزخ کہے گی: اے مومن! یعنی موحد تو جا تیرے نورِ ایمان نے میری لپٹ کو بجھا دیا۔[3] اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے اُمید ہے کہ وہ اس دن موحدین پر رحم کرے گا اور اُن کے معاصی معاف فرما کر آگ سے بچائے گا اور اگر کوئی کثرتِ عصیان کے سبب سے نار کے طبقہ اولیٰ میں جائے گا تو توحیدِ کامل، صادق خالص کی برکت سے ایک نہ ایک دن نجات حاصل کرے گا اور مومن مشرک اگر سارے جہاں کی نیکیاں لے کر آئے گا تو وہ سب اڑتے ہوئے غبار ہو جائیں گی اور وہ سیدھا دوزخ میں ہمیشہ کے لیے چلا جائے گا، اس کے لیے چھٹکارے کی کوئی اُمید نہیں ہے۔ قرآن میں دو جگہ صاف کہہ دیا ہے کہ شرک بخشا نہیں جائے گا۔ شرک نہایت مخفی چیز ہے، اکثر علمائے عامہ پر پوشیدہ رہتا ہے، خصوصاً جاہل یا کم علم پر فقرا و مشائخ۔ اس کو راسخین (پختہ) علما کے سوا کم علما جانتے پہچانتے ہیں۔

---

[1] سنن النسائي الكبرىٰ (٥/ ٥٤) حافظ عراقی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو "جید" کہا ہے۔ دیکھیں: تخريج أحاديث الإحياء (١/ ٢٣٦)

[2] تفسير الراقي (٢٠/ ١٠٨) فتح البيان (٧/ ٣٣٤۔ ٣٣٥)

[3] المعجم الكبير (٢٢/ ٢٥٨) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجوہِ ضعف ہیں۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٣٤١٣)

اس فن کے ائمہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ و حافظ ابن قیم و امام ربانی قاضی محمد بن علی شوکانی رحمہم اللہ اور اُن کے امثال اور اقران تھے اور اُن سے پہلے سارے علمائے مجتہدین اور سلف صالحین اور خلف میں صاحبِ ''تقوية الإيمان'' و صاحبِ رسالہ ''راہِ سنت'' ونحوہما ﴿ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴾ [الواقعة: ١٣۔ ١٤] ''بہت بڑی جماعت پہلوں میں سے۔ اور تھوڑے سے پچھلوں میں سے۔'' ہم اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے اُمید رکھتے ہیں کہ ہمارے قصور عمل کی وجہ سے ہمارا ایمان اور ہماری توحید موت کے وقت اور روح قبض کیے جانے کے بعد ہم سے سلب نہ کرے اور دنیا سے ہم کو ایمانِ کامل اور توحیدِ خالص پر اُٹھائے۔ اللهم آمين.

مذاهب شتّٰى للمحبين في الهوى ولي مذهب واحد أعيش به وحدي

[عشق میں عاشقوں کے طریقے مختلف ہیں، میرا ایک ہی طریقہ ہے جس پر میں اکیلا زندگی بسر کر رہا ہوں]

بعض نے کہا کہ اُمت بہ معنی ماموم ہے، یعنی وہ شخص جس کی لوگ اقتدا کریں اور اخذِ خیر میں اس کو پیشوا بنائیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ﴾ [البقرة: ١٢٤] ''بے شک میں تجھے سب لوگوں کے لیے امام بنانے والا ہوں۔'' امام ابن الانباری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ محاورہ کہ ''ابراہیم کو اُمت فرمایا'' قولِ عرب کی طرح ہے کہ ''فُلَانٌ رَحْمَةٌ، وَ فُلَانٌ عَلَّامَةٌ، وَنَسَّابَةٌ'' اس تانیث سے مقصود تناہی فی المعنی ہے۔[1] ابراہیم کو اُمت اس لیے کہا کہ ان میں ساری صفاتِ فضل وسماتِ خیر و اخلاقِ حمیدہ جمع تھی، جیسے ایک اُمت میں ہوتے ہیں ؎

ليس على الله بمستنكر أن يجمع العالم في واحد

[اللہ تعالیٰ کے لیے کسی ایک شخص میں ایک عالم کو جمع کر دینا کوئی مشکل کام نہیں ہے]

ہمارے رسول ﷺ کو دیکھو کہ جو کمالات سارے انبیا کو ملے تھے اور جس قدر فضائل تمام اُمتوں میں تھے، وہ سب اس جگہ ایک ذات پاک خاتم الرسل میں جمع ہو گئے تھے۔ گویا آپ تمام عالَم تھے اور سارے عالم کے لیے رحمتِ عامہ تھے: ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴾ [الأنبياء: ١٠٧] ''اور (اے نبی!) ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر ہی بھیجا ہے۔'' دوسری مدح ابراہیم علیہ السلام کی یہ فرمائی کہ وہ قانت تھے، یعنی مطیع قائم بامر اللہ۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ابراہیم علیہ السلام اسلام پر تھے۔ ان کے زمانے میں اُن کی قوم میں سے کوئی مسلمان نہ تھا۔ یہی ہے جو اللہ نے فرمایا: ﴿ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ ﴾[2] (آیتِ باب)

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «مَا مِنْ عَبْدٍ تَشْهَدُ لَهُ أُمَّةٌ إِلَّا قَبِلَ اللّٰهُ شَهَادَتَهُمْ، وَالْأُمَّةُ الرَّجُلُ فَمَا فَوْقَه، إِنَّ اللّٰهَ يَقُوْلُ: إِنَّ إِبْرَاهِيْمَ كَانَ أُمَّةً» یعنی کوئی بندہ ایسا نہیں جس کے لیے ایک جماعت گواہی دے، مگر اللہ تعالیٰ ان کی شہادت قبول کرتا ہے اور اُمت کا ایک آدمی یا اس سے زیادہ پر

[1] زاد المسير لابن الجوزي (٤/ ٥٠٣) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٠٦)

اطلاق ہوتا ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے حق میں فرمایا: ﴿ اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ ﴾ [1]
(أخرجه ابن مردويه) حنیف وہ ہوتا ہے جو ادیانِ باطلہ سے دینِ حق کی طرف مائل ہو، یعنی مسلم مقیم دینِ اسلام پر سب گمراہ ملتوں کو چھوڑ کر اور سب سے رشتہ توڑ کر صرف اللہ وحدہ لاشریک لہ کی طرف آ جائے۔

ترکت هوى سعدى وليلىٰ بمعزل   وعدت إلىٰ تصحيح أول منزل
ونادت بي الأشواق مهلا فهذه   منازل من تهوى رويدك فأنزل

[میں نے سعدیٰ اور لیلیٰ کے عشق سے علاحدگی اختیار کر لی اور پہلی منزل درست کرنے لوٹ آیا۔ بڑے شوق سے مجھے بلانے لگے کہ ٹھہر جاؤ یہی وہ منزلیں ہیں جن کو تو چاہتا ہے، ادھر ہے اتر آ]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابراہیم مشرک نہ تھے، جس طرح کہ کفارِ قریش اعتقاد رکھتے تھے کہ وہ دینِ باطل پر تھے، بلکہ وہ تو اپنے بچپن سے بڑھاپے تک موحد خالص تھے۔ یہ ویسی بات ہے کہ اس وقت کے بدعتی اور مشرک اور گور پرست اور پیر پرست یہ زعم کرتے تھے کہ سارے پہلے بزرگ اس دینِ اسلام کے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے اب تک معاذ اللہ ایسے ہی تھے جیسے کہ یہ ہیں اور ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ اور سارے علماء و مشائخ سلف انھیں کی طرح اپنے آبا اور اہلِ رائے کے مقلد اور بدعتوں پر عمل کرنے والے اور اشراک باللہ کے قائل تھے۔ سو یہ محض ان کا خیالِ باطل ہے۔ وہ لوگ اگر آج موجود ہوتے تو اِن پیر پرستوں، قبر پرستوں کی صورت سے بے زار ہو جاتے، بلکہ ان پر جہاد کرنے کا حکم دیتے اور اُن کو کافر اور مرتد جانتے اور اُن کے جنازے پر نماز نہ پڑھتے اور مسلمانوں کے قبرستان میں انھیں دفن نہ ہونے دیتے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کہا کہ ابراہیم علیہ السلام ہماری نعمتوں کے شکر گزار تھے۔ ہم نے ان کو نبوت کے لیے چن لیا تھا اور سیدھی راہ دکھائی تھی۔

صراطِ مستقیم سے مراد ملتِ اسلام اور دینِ حق ہے اور حسنۂ دنیا سے مراد خصلتِ حسنہ یا حالتِ حسنہ، یا نیک اولاد، یا ثنائے جمیل، یا نبوت، یا تشہد میں درود کا پڑھا جانا، یا تمام اُمتوں میں عام مقبولیت ہے، کیوں کہ سارے دین والے اُن کو دوست رکھتے ہیں اور اُن پر ثنا کرتے ہیں، کوئی ان کا انکار نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اولادِ طیبہ دی اور سعت اور عمرِ طویل میں دی اور کوئی اس سے مانع نہیں کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے ان کو دیا تھا وہ اُن سب اُمور کو شامل ہے، بلکہ اُن کے علاوہ اور بہت سے خصالِ خیر اُن میں تھے۔ اس آیت میں اللہ کی طرف سے شانِ خلیل جلیل علیہ السلام کو اور زیادہ کرنے کے لیے غیبت سے حاضر کی طرف التفات ہے۔

رہی آخرت سو وہ جنت کے اعلیٰ مقامات میں ہوں گے۔ اس جگہ حرف ﴿ مِنْ ﴾ "مع" کے معنی میں ہے،

---

[1] الدر المنثور (٥/ ١٧٦)

کیوں کہ انھوں نے یہ سوال کیا تھا: ﴿ وَ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ﴿83﴾ وَ اجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ ﴿84﴾ وَ اجْعَلْنِیْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِیْمِ ﴾ [الشعراء: ۸۳۔ ۸۵] ''اور مجھے صالحین کے ساتھ ملا۔ اور بعد والوں میں میرا ذکرِ خیر جاری رکھ۔ اور مجھے نعمتوں والی جنت کے وارثوں میں سے کر دے۔'' میں کہتا ہوں کہ اے اللہ! مجھے بھی اُن لوگوں میں سے کر دے جن پر یہ دعا صادق آتی ہے، میں تیرے خلیل جلیل علیہ السلام کی ذریت میں سے ہوں اور مجھ کو بھی دنیا اور آخرت میں حسنات عطا فرما، تو توّاب و رحیم اور غفور و کریم ہے۔

یہ سب خصلتیں جو اس جگہ ذکر ہوئیں، نو عدد ہیں بلکہ دس، کیوں کہ یہ قول کہ پھر وحی کی ہم نے تیری طرف کہ اے ختم الرسل! تو ملتِ ابراہیم کا تابع ہو، دسویں خصلت ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے باوجود اس بات کے کہ آپ بلند مرتبہ و منزلت ہیں کہ تمام بنی آدم کے سردار ہیں، یہ پیغام بھیجا۔ یہ بھی ابراہیم کی صفت اور تعظیم کی طرف اشارہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسی ہستی کو ابراہیم علیہ السلام کی اتباع کا حکم کیا جائے، وللہ الحمد۔ ملت اصل اس شریعت کے معنی میں ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے کسی نبی و پیغمبر کی زبان پر بھیجی ہے۔ تحقیق یہ ہے کہ یہ وضع الٰہی جب اس شخص کی طرف منسوب ہوتی ہے جس کو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی جاتی ہے تو اس کا نام ملت ہوتا ہے اور جب وہ اس کی طرف منسوب ہوتی ہے جو اس کو قائم کرنے والا ہوتا ہے تو نام اس کا دین ہوتا ہے۔ اس جگہ ملت سے مراد دینِ اسلام ہے جس کی تعبیر صراطِ مستقیم کے ساتھ کی گئی ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع سے مراد ملتِ ابراہیم کی توحید اور دعوت الی التوحید میں اتباع ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد اوثان سے بے زاری اور دینِ اسلام کو اختیار کرنا ہے[1]، مناسکِ حج یا اُصول میں نہ کہ فروع میں۔ ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی اصول اور عقائد میں اور اکثر فروع میں اور نہ کہ ان شریعتوں میں جو بعد کے زمانوں میں تبدیل ہوتی رہیں۔[2] بعض نے کہا ہے کہ ساری شریعتوں میں بہ جز اُن کے جو منسوخ ہوئیں اور یہ بات ظاہر ہے۔

امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ افضل کو مفضول کا اتباع جائز ہے، اس لیے کہ قول و عمل میں مفضول سابق ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا کہ اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ افضل کو مفضول کی اس کے اس کام میں اتباع جائز ہے جو صحیح راستے کی طرف پہنچائے۔ اس میں فاضل کو درک نہیں ہے، کیوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم افضل انبیا ہیں اور اُن کو حکم ہوا ہے کہ تم انبیا کی اقتدا کرو، اس کے باوجود کہ وہ سید الانبیا ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ﴾ [الأنعام: ۹۰] ''لہٰذا (اے نبی) آپ بھی ان کے طریقے کی پیروی کریں۔''[3] یہ اتباع و اقتدا اور بات ہے اور آرائے رجال کی تقلید، جن سے ممانعت آئی ہے، اور بات ہے۔ پھر ابراہیم علیہ السلام کو حنیف فرمایا اور شرک کی اُن سے نفی کی، مشرکین کے زعم پر کہ وہ اپنے آپ کو دینِ ابراہیم پر خیال کرتے تھے۔ جس طرح مقلد حضرات کا یہ خیال ہے کہ ہم ائمہ اربعہ مجتہدین کے

[1] تفسیر الطبري (۱۷/ ۳۱۹۔ ۳۲۰) [2] تفسیر أبي السعود (۵/ ۱۵۰) [3] تفسیر القرطبي (۱۰/ ۱۹۹)

مذہب پر ہیں، حالاں کہ عالی مقام چاروں اماموں ﷭ نے اپنی رائے اور غیر کی رائے کی تقلید سے منع فرمایا ہے۔

ان کے اقوال کتاب ''قولِ مفید'' اور کتاب ''میزانِ خضریہ'' میں امام شوکانی و شعرانی ﷮ نے نقل کیے ہیں اور شیخ فلانی نے بھی ''إیقاظ الھمم'' میں بحوالہ کتبِ فقہ ذکر کیے ہیں۔ لیکن تعصب اور جہالت کی خرابیاں لاتعداد ہیں اور اہلِ جہاں سے انصاف بالکل مفقود ہو گیا ہے۔ ''كُلُّ نَفْسٍ وَدِيْنُهَا'' کا زمانہ آ گیا ہے۔ ﴿ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا ﴾ [الأحزاب: ٣٨] ''اور اللہ کا حکم ایک طے شدہ فیصلہ ہوتا ہے۔'' اس تقلیدِ شوم کی اصل اہلِ کتاب اور مشرکین کے یہاں سے نکلی ہے، تمام قرآن مجید گویا اُن کے رد پر مشتمل ہے۔

إِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۭ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿١٢٤﴾

ہفتے کے دن (کی تعظیم) کو تو صرف ان لوگوں پر ضروری قرار دیا گیا تھا جنھوں نے اس میں اختلاف کیا۔ اور بے شک آپ کا رب ان کے مابین قیامت کے دن اس امر کا فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کرتے تھے (124)

یہودیوں کے لیے ہفتے کے دن کی تقرری:

یعنی اصل ملتِ ابراہیم میں ہفتے کا کچھ حکم نہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ہر ملت میں ہفتے کے دنوں میں سے ایک دن لوگ کے عبادت کے لیے اکٹھا ہونے کے لیے مشروع کیا تھا۔ اس اُمت کے لیے جمعہ کا دن مقرر کیا اس لیے کہ یہ چھٹا دن ہے جس دن میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے خلقت کو مکمل اور تمام کیا اور بندوں پر نعمت تمام ہوئی۔ کہتے ہیں کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لیے موسیٰ ﵇ کی زبان سے اس کو مشروع کیا، لیکن انھوں نے اس دن کو چھوڑ کر سینچر کا دن پکڑا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دن کوئی مخلوق پیدا نہیں کی، بلکہ جمعے کے دن تک وہ تمام مخلوقات کی پیدایش کر چکا تھا، اس دن فارغ ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے بھی شریعتِ موسوی میں یہی دن اُن کے گلے باندھ دیا اور وصیت کی کہ تم اس دن کو پکڑے رہو اور اس کی نگہبانی رکھو اور جب محمد ﷺ مبعوث ہوں تو اُن کی پیروی کرو اور متابعت کرو۔ اس وصیت پر بنی اسرائیل سے عہد و پیمان اور قول و قرار لیا تھا۔ لہٰذا فرمایا: ﴿ اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ﴾ (آیتِ باب) یعنی ہفتے کا دن جو ٹھہرایا تھا تو انھیں پر جو اس میں پھوٹ گئے۔

امام مجاہد ﷫ نے کہا: انھوں نے سینچر کو لے کر جمعے کو ترک کیا،[1] پھر اس کو پکڑے رہے، یہاں تک کہ عیسیٰ بن مریم ﵉

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٣٢٠)

مبعوث ہوئے۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے اس دن کو اتوار کے دن سے بدل دیا۔ بعض کا یہ قول ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے شریعتِ تورات کو ترک نہیں کیا، مگر وہی بعض احکام جو منسوخ ہو گئے تھے اور وہ ہمیشہ اس دن کی مخالفت کرتے رہے، یہاں تک کہ آسمان پر اُٹھا لیے گئے، لیکن نصاریٰ نے اُن کے اُٹھ جانے کے بعد قسطنطین میں یہودیوں کی مخالفت کے لیے سنیچر کو اتوار سے بدل دیا اور صخرہ کی طرف سے اپنا قبلہ مشرق کی طرف مقرر کیا۔ واللہ أعلم.

صحیحین میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « نَحْنُ الْآخِرُوْنَ السَّابِقُوْنَ إِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ، بَیْدَ أَنَّهُمَا أُوْتُوا الْکِتَابَ مِنْ قَبْلِنَا، فَهٰذَا یَوْمُهُمُ الَّذِيْ فَرَضَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ، فَاخْتَلَفُوْا فِیْهِ فَهَدَانَا اللّٰهُ لَهُ، فَالنَّاسُ فِیْهِ لَنَا تَبَعٌ، اَلْیَهُوْدُ غَدًا وَالنَّصَارٰی بَعْدَ غَدٍ » (هذا لفظ البخاري) یعنی ہم سب سے پیچھے آنے والے اور قیامت میں سب سے پہلے ہوں گے، مگر اتنی بات ہے کہ ان کو ہم سے پہلے کتاب ملی ہے، پس یہی دن ہے جو اُن پر فرض ہوا تھا اور انھوں نے اُس میں اختلاف کیا تھا تو ہم کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے سمجھا دیا تو لوگ یعنی یہود ونصاریٰ اس میں ہمارے تابع ہیں، یہود نے ہفتہ کو اختیار کیا اور نصاریٰ نے اتوار کو۔ یہ بخاری کے الفاظ ہیں۔[1]

سیدنا حذیفہ اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہما کی مرفوع روایت کے یہ الفاظ ہیں: « أَضَلَّ اللّٰهُ عَنِ الْجُمُعَةِ مَنْ کَانَ قَبْلَنَا، فَکَانَ لِلْیَهُوْدِ یَوْمُ السَّبْتِ، وَکَانَ لِلنَّصَارٰی یَوْمُ الْأَحَدِ، فَجَاءَ اللّٰهُ بِنَا فَهَدَانَا اللّٰهُ لِیَوْمِ الْجُمُعَةِ، فَجَعَلَ الْجُمُعَةَ وَالسَّبْتَ وَالْأَحَدَ، وَکَذٰلِكَ هُمْ تَبَعٌ لَنَا یَوْمَ الْقِیَامَةِ، نَحْنُ الْآخِرُوْنَ مِنْ أَهْلِ الدُّنْیَا، وَالْأَوَّلُوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ، وَالْمَقْضِيُّ بَیْنَهُمْ قَبْلَ الْخَلَائِقِ » یعنی اللہ تعالیٰ نے ہم سے پہلوں کو جمعے کے دن سے بہکا دیا تو یہود نے ہفتہ اختیار کیا اور نصاریٰ نے اتوار، پھر ہم کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ لایا اور ہم کو اس نے جمعے کے لیے سوجھ دی تو تین دن مقرر ہوئے جمعہ، ہفتہ اور اتوار، اور اسی طرح وہ قیامت کے دن ہمارے پیچھے ہوں گے (جس طرح دنیا میں اُن کے دن ہمارے دن کے پیچھے ہیں) ہم دنیا میں تو سب سے پیچھے آئے ہیں، لیکن قیامت کے دن سب سے اول ہوں گے اور ہمارا ہی سب سے پہلے فیصلہ ہوگا۔[2] (رواہ مسلم)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ہفتے کے دن کے وبال سے مراد مسخ ہے جو داود علیہ السلام کے زمانے میں ہوا تھا، یا روزِ شنبہ (ہفتہ) کی عظمت ہونا اور اس دن میں یہود کو شکار کی ممانعت ہے نہ کسی اور اُمت کو۔ جنھوں نے اس دن میں اختلاف کیا تھا۔ اس اختلاف کرنے میں علما کا اختلاف ہے۔ ایک گروہ نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام نے جمعے کے دن کا حکم دیا تھا اور اس دن کو مقرر کر دیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ یہ دن دوسرے ایام پر فضیلت رکھتا ہے، لیکن انھوں نے اس کے خلاف کیا اور کہا کہ نہیں، بلکہ سنیچر کا دن افضل ہے۔

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۸۳۶) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۸۵۵) [2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۸۵٦)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے موسیٰ! تم ان کو چھوڑ دو اور سنیچر ہی کو اختیار کرنے دو۔ بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہود کو حکم دیا تھا کہ ہفتے میں ایک دن کی تعظیم کیا کرو، اُن کے اجتہاد میں اختلاف ہوا۔ یہود نے سنیچر کا دن مقرر کر لیا، اس لیے کہ اس دن اللہ سبحانہ وتعالیٰ خلق کے پیدا کرنے سے فارغ ہوا۔ نصاریٰ نے اتوار کا دن اختیار کیا، اس لیے کہ اس دن میں اللہ تعالیٰ نے پیدا کرنے کی ابتدا کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ہر فرقے کو وہی لازم کر دیا، جو دن اُن کے اجتہاد سے قائم ہوا اور اس اُمت کے لیے جمعے کا دن پسند فرمایا اور اُن کے اجتہاد پر نہ چھوڑا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور احسان ہے۔

آیتِ باب کے پہلی آیت کے ساتھ متصل اور متعلق ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہود کا اعتقاد یہ تھا کہ ہفتے کے دن کی عزت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت میں سے ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے خبر دی کہ یہ تو اُن پر مقرر کیا گیا ہے۔ جنھوں نے اس دن میں اختلاف کیا ہے۔ یہ دن کچھ ابراہیم علیہ السلام کے لیے مقرر نہ تھا اور نہ کسی اور کے لیے، بلکہ اس کو ایک مدتِ دراز کے بعد بنی اسرائیل پر مشروع کیا گیا۔ پھر ایک مدتِ دراز کے بعد نصاریٰ نے اتوار کا دن مقرر کیا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ ارادہ جمعے کے دن کا کیا اور اس کے بجائے سنیچر کا دن پکڑا۔[1] بہر حال قیامت کے دن اس اختلاف کا فیصلہ ہو جائے گا، ہر ایک کو وہ جزا ملے گی جس کا وہ مستحق ٹھہرے گا، ثواب ہو یا عذاب۔ چناں چہ ایک گروہ کو اللہ تعالیٰ نے مسخ کر دیا اور دوسرے گروہ کو نجات دی۔ اس کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو حکم دیا کہ تم اپنی اُمت کو اسلام کی طرف بلاؤ اور فرمایا:[2]

﴿ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۱۲۵ ﴾

(اے نبی!) اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھے وعظ کے ساتھ دعوت دیجیے اور ان سے احسن طریقے سے بحث کیجیے۔ بے شک آپ کا رب ہی اس شخص کو خوب جانتا ہے جو اس کی راہ سے بھٹکا اور وہی ہدایت پانے والوں کو خوب جانتا ہے (125)

حکمت وموعظتِ حسنہ کے ساتھ دین کی طرف دعوت دینے کا حکم:

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ حکمت سے مراد کتاب وسنت ہے اور موعظتِ حسنہ لوگوں کو ڈرانا دھمکانا ہے۔[3] یعنی ان کا ذکر اُن لوگوں سے کر، تاکہ وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے عذاب سے ڈریں۔ پھر جو کوئی اُن لوگوں میں سے مناظرہ اور جھگڑا کرنا چاہتا ہو تو اس کے ساتھ احسن طریقے سے اور نرمی سے اور اچھے الفاظ سے مناظرہ کر، جیسے

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۷/ ۲۳۰۷) [2] فتح البیان (۷/ ۳۳۸۔ ۳۳۹) [3] تفسیر الطبري (۱۷/ ۳۲۱)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴾ [العنكبوت: ٤٦] ''اور تم اہلِ کتاب سے احسن انداز ہی سے بحث وتکرار کرو، سوائے ان لوگوں کے جو ان میں سے ظالم ہیں، اور تم (ان سے) کہو: ہم اس (کتاب) پر ایمان لائے ہیں جو ہماری طرف نازل کی گئی اور (جو) تمھاری طرف نازل کی گئی، اور ہمارا معبود اور تمھارا معبود ایک ہی ہے اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں۔''

غرض کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے نرمی کا حکم دیا ہے جس طرح موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو جب فرعون لعین کی طرف بھیجا تھا تو یہ ارشاد کیا تھا: ﴿ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴾ [طٰهٰ: ٤٤] ''چناں چہ تم دونوں اس سے نرم بات کہنا، شاید کہ وہ نصیحت پکڑے یا ڈرے۔'' اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ فرعون ہرگز نصیحت نہیں پکڑے گا اور نہ ہی ڈرنے والا ہوگا اس کے باوجود نرم بات کرنے کا حکم دیا۔ اُمتِ اسلام کو بھی جھگڑے اور مناظرے کے وقت اسی طرح کا شیوہ اختیار کرنا اتباعِ کتاب وسنت میں داخل ہے۔ ہم جب نصاریٰ سے مذہبی جھگڑا کریں یا اسلام کے کسی گمراہ فرقے سے مناظرہ کریں تو حکمت اور موعظہ حسنہ کو ہاتھ سے نہ چھوڑیں، خواہ وہ راہِ راست پر آئے یا نہ آئے۔

حکایت:

خلیفہ ہارون رشید کو ایک شخص نے سخت الفاظ سے نصیحت کی اور درشت کلام کیا تھا۔ ہارون نے اس نصیحت کرنے والے سے کہا کہ نہ تو موسیٰ سے بہتر ہے اور نہ میں فرعون سے بدتر ہوں، کیوں کہ مومن ہوں، پھر نصیحت میں یہ سختی اور درشتی کیسی؟!

حکایت:

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ حاکمِ مصر کے پاس، جو ایک دنیا دار فاسق شخص تھا، نصیحت کرنے جایا کرتے تھے، ایک دن اس نے ان سے کہا کہ تم ایک دین دار عالم ہو کر دنیا دار کے گھر پر آیا کرتے ہو، یہ کب درست ہے؟! انھوں نے کہا: مجھ کو اس میں کوئی عار نہیں لگتی، اس لیے کہ موسیٰ علیہ السلام پیغمبر تھے اور فرعون کے گھر پر ایک دن میں دو بار جاتے تھے، اس سے نہ موسیٰ علیہ السلام کا کوئی رتبہ کم ہوا اور نہ اس لعین کا مرتبہ بڑھا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی وسعتِ علم کا ذکر کیا کہ ہم نیک بخت اور بد بخت کو جانتے ہیں اور ہمارے پاس لکھا ہوا رکھا ہے کہ فلاں سعادت مند ہے اور فلاں بد بخت، ہم اس کام سے فارغ ہو چکے ہیں۔ سوائے پیغمبر! تم اُن لوگوں کو ہماری طرف بلاؤ اور جو کوئی اُن میں سے گمراہ ہے اس پر حسرت کر کے اپنی جان کو تکلیف نہ دو۔ ان کو ہدایت کرنا کچھ تم پر لازم نہیں ہے، تم تو صرف ایک ڈرانے والے ہو، تمھارا کام فقط پیغام کا پہنچا دینا ہے۔ حساب لینا ہم پر ہے: ﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ [القصص: ٥٦] ''(اے نبی!) بے شک جسے آپ چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے، بلکہ اللہ ہی جسے چاہے ہدایت دیتا ہے۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ حکمت سے مراد ایسی بات ہے جو محکم، مضبوط اور صحیح ہو، حق کو واضح کرنے والی اور شکوک وشبہات کو دور کرنے والی ہو، جس میں ایسی قطعی حجتیں ہوں جو ایمان لانے اور قرآن ونبوت پر یقین کرنے کے لیے مدد ومعاون اور مفید ہوں۔ موعظہ حسنہ وہ وعظ ونصیحت و پند ہے، جو سننے والے کو اچھا معلوم ہو اور فی نفسہٖ بھی مستحسن ہو جن سے سننے والا فائدہ حاصل کرے۔ یا وہ ایسی ظنی دلیلیں ہوں جو مقدماتِ مقبولہ میں تصدیق کی موجب ہوں۔ دعوت کے لیے یہی دو طریقے ہیں اور بس۔ لیکن دعوت دینے والے کو کبھی کبھی جھگڑالو قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے جن کے ساتھ اسے بھی جوابی طور پر معارضہ اور مناقضہ کرنا پڑتا ہے، لہٰذا یہ بھی فرما دیا کہ مجادلہ حسنہ کرو، یعنی نرم گفتگو کے ساتھ، جس میں درشتی اور سختی نہ ہو اور آسان طریقہ اختیار کرو، ایسے معاملات میں جو بہت مشہور ہیں کہ یہ ان کی تسکینِ شر میں نفع دینے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مجادلہ حسنہ کا حکم اس لیے دیا کہ داعی محق ہے اور غرض اس کی صحیح اور خصم اس کا مبطل اور غرض اس کی فاسد۔ بعض نے کہا کہ لوگ تین طرح کے ہوتے ہیں: ایک علما اُن کی طرف یہ اشارہ ہے: ﴿ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ ﴾ (آیتِ باب) یعنی بلا اپنے رب کی راہ پر پکی باتیں سمجھا کر۔ دوسرے وہ لوگ جو صاحبِ نظرِ سلیم ہیں اور جن کی طبیعت میں خلقتِ اصلیہ پائی جاتی ہے، غالب لوگ اسی طرح کے ہیں، ان کی طرف موعظۂ حسنہ کا اشارہ ہے۔ تیسرے وہ لوگ ہیں جو لڑنے والے جھگڑالو قسم کے ہیں، ان کی طرف اُن الفاظ میں اشارہ ہے: ﴿ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾ اور الزام دے ان کو جس طرح بہتر ہو۔

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ۚ وَلَىِٕنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ۝۱۲۶ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ۝۱۲۷ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ۝۱۲۸

اور اگر تم بدلہ لو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنی تمھیں تکلیف دی گئی ہو، اور اگر تم صبر کرو تو وہ صابرین کے لیے بہت بہتر ہے (126) اور (اے نبی!) آپ صبر کریں، اور آپ کا صبر کرنا بھی اللہ ہی کی توفیق سے ہے اور ان (کفار) پر غم نہ کھائیں اور نہ آپ اس پر تنگی میں مبتلا ہوں، جو وہ مکر (سازشیں) کرتے ہیں (127) بلاشبہ اللہ ان کے ساتھ ہے جنھوں نے پرہیز گاری کی اور وہ احسان کرتے ہوں (128)

قصاص اور بدلے میں مساوات کا حکم:

پہلے جو فرمایا کہ سمجھاؤ بھلی طرح تو اس میں رخصت دی کہ بدی کے بدلے میں بدی بری نہیں، لیکن صبر بہتر ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قصاص میں عدل کا حکم دیا اور استیفائے حق میں مماثلت کا حکم دیا ہے۔ امام ابن سیرین رحمہ اللہ نے آیتِ باب کے بارے میں کہا ہے کہ اگر کوئی شخص تم سے کوئی چیز لے لے تو تم بھی اس کی ویسی ہی چیز لے لو۔ یہی قول امام مجاہد، ابراہیم اور حسن بصری رحمہم اللہ کا بھی ہے۔ اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا کہ ان کو حکم تھا کہ مشرکوں سے درگزر کرو۔ کچھ صاحبِ اثر و رسوخ لوگ اسلام لائے اور کہا: اے اللہ کے رسول! اگر اللہ تعالیٰ ہم کو اجازت دے تو ہم اُن کتوں کو سمجھ لیں، اس پر یہ آیت اتری۔ پھر جہاد فرض ہوا تو یہ حکم منسوخ ہو گیا۔[1]

امام عطاء بن یسار رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ساری سورت نحل مکے میں اُتری، مگر آخری تین آیتیں، یہ مدینے میں غزوۂ اُحد کے بعد آئیں، جبکہ سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ مقتول ہوئے اور اُن کا مثلہ کیا گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ مجھ کو اُن پر غلبہ دے گا تو میں اُن میں سے تیس آدمیوں کا مثلہ کروں گا۔ جب مسلمانوں نے یہ بات سنی تو کہا: واللہ! اگر ہم اُن پر غالب ہوئے تو ان کا ایسا مثلہ کریں گے جیسا مثلہ کسی عرب نے کسی شخص کا نہ کیا ہوگا۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں آخر سورت تک۔[2] یہ روایت مرسل ہے اور اُس میں ایک راوی مبہم ہے، جس کا نام معلوم نہیں اور دوسرے طریق سے متصلاً بھی مروی ہے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ پر جب وہ شہید ہوئے، کھڑے ہوئے، اور ایسا منظر دیکھا جس جیسا دل کے لیے درد ناک منظر اس سے پہلے نہ دیکھا تھا، ان کا مثلہ کر ڈالا گیا تھا۔ فرمایا: ”رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْكَ، إِنْ كُنْتَ لِمَا عَلِمْتُ لَوَصُولًا لِلرَّحِمِ، فَعُولًا لِلْخَيْرَاتِ، وَاللّٰهِ لَوْ لَا حُزْنُ مَنْ بَعْدَكَ عَلَيْكَ لَسَرَّنِي أَنْ أَتْرُكَكَ حَتّٰى يَحْشُرَكَ اللّٰهُ مِنْ بُطُوْنِ السِّبَاعِ“ یعنی تجھ پر اللہ کی رحمت! میری دانست میں تو تو ذی ارحام سے اچھا سلوک کرنے والا تھا اور بہت نیکیاں کرنے والا تھا۔ اللہ کی قسم! اگر تیرے پچھلوں کے غم کا خوف نہ ہوتو مجھے یہ بات پسند ہے کہ میں تجھے یوں ہی چھوڑ دوں، تاکہ تجھ کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ درندوں کے پیٹ سے اُٹھائے یا کوئی اور کلمہ اس طرح کا کہا: ”أَمَا وَاللّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ لَأُمَثِّلَنَّ بِسَبْعِيْنَ كَمُثْلَتِكَ“ ”خبردار! اللہ کی قسم! میں تیرے بدلے میں ستر آدمیوں کا مثلہ کروں گا“ تب جبریل علیہ السلام یہ سورت لے کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور یہ آیت پڑھی: ﴿وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ﴾ (آیتِ باب) یعنی اگر بدلہ لو تو بدلہ لو اس قدر جتنی تم کو تکلیف پہنچی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قسم کا کفارہ دیا اور مثلہ کرنے سے رک گئے۔

اس کی اسناد میں ضعف ہے، اس لیے کہ ابو بشر صالح بن بشیر مری نزدیک ائمہ کے ضعیف ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا کہ منکر الحدیث ہے۔[3] امام شعبی اور ابن جریج رحمہما اللہ نے کہا کہ اس آیت کا نزول اُحد کے دن مسلمانوں کے اس

---

[1] تفسیر الطبري (١٧/ ٣٢٤۔ ٣٢٥) [2] تفسیر الطبري (١٧/ ٣٢٣) یہ روایت مرسل ہے۔

[3] مسند البزار (١٧/ ٢١) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٧٧١) اس کی سند میں ”صالح مری“ ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحدیث (٥٥٠)

کہنے پر ہوا ہے کہ جس نے ان کا مثلہ کیا ہے، ہم بھی اس کا مثلہ کریں گے، تب یہ اُتری۔[1] سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اُحد کے دن انصار کے ستر مرد اور چھے مہاجرین کے مارے گئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے کہا کہ اگر ہم کو بھی مشرکوں کے ساتھ کوئی ایسا دن ملا تو ہم بھی اُن کا مثلہ کریں گے۔ جب فتح مکہ کا دن آیا تو ایک مرد نے کہا کہ آج کے دن کے بعد قریش پہچانے نہ جائیں گے۔ اتنے میں اعلان ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسود و ابیض کو امن دیا ہے، مگر فلاں اور فلاں کو، کچھ لوگوں کے نام لیے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیاتِ باب تا آخر سورت اتاریں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم صبر کریں گے عقاب نہ کریں گے۔[2]

اس آیتِ کریمہ کی اور مثالیں بھی قرآن مجید میں موجود ہیں، کیوں کہ ان میں عدل و انصاف اور ندب الی الفضل کی مشروعیت بیان کی گئی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ﴾ [الشوریٰ: ٤٠] ''اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔'' پھر فرمایا: ﴿ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [الشوریٰ: ٤٠] ''پھر جو معاف کر دے اور صلح کر لے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے، بلاشبہ اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ﴾ [المائدۃ: ٤٥] ''اور تمام زخموں کا قصاص ہے۔'' پھر فرمایا: ﴿ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ﴾ [المائدۃ: ٤٥] ''پھر جو شخص اسے معاف کر دے تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے۔'' اور جو اُس جگہ فرمایا ہے، وہ گزر چکا۔

اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں اور پرہیز گاروں کے ساتھ ہے:

پھر امر بالصبر کی تاکید کی اور یہ خبر دی کہ اللہ کی مرضی اور اس کی دی ہوئی مدد، توفیق اور قوت کے بغیر یہ صبر ہاتھ نہیں آتا۔ پھر فرمایا کہ جو کوئی تیرے خلاف کرتا ہے تو اس پر کچھ رنج نہ کرو، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اسی طرح مقدر کیا ہے اور تو اُن کے مکر کی وجہ سے غمگین نہ رہ کہ یہ تیری عداوت میں کوشش کرتے ہیں اور تجھ کو تکلیف پہنچانا چاہتے ہیں، کیوں کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ تجھ کو کافی ہے، وہ تیری مدد اور تائید کرے گا اور تجھے غلبہ بخشے گا اور مظفر و منصور اور کامیاب فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ ان کے ہمراہ ہے جو اللہ تبارک و تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اور احسان کرتے ہیں۔ اللہ کا یہ ساتھ تائید، نصرت، مدد، ہدایت اور سعی کا ہے اور یہ ایک معیتِ خاصہ ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰۗىِٕكَةِ اَنِّىْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ [الأنفال: ١٢] ''(اے نبی!) جب آپ کا رب فرشتوں کی طرف وحی کر رہا تھا کہ بے شک میں تمھارے ساتھ ہوں، چناں چہ تم ان کو ثابت (قدم) رکھو جو ایمان لائے ہیں۔''

---

[1] تفسیر الطبري (١٧/ ٣٢٣)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٢٩) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٧٦) مسند أحمد (٥/ ١٣٥) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٣٧٧)

اور موسیٰ اور ہارون علیہما السلام سے فرمایا تھا: ﴿ لَا تَخَافَاۤ اِنَّنِيْ مَعَكُمَاۤ اَسْمَعُ وَاَرٰى ﴾ [طٰه: ٤٦] ”تم دونوں مت ڈرو، بلاشبہ میں تم دونوں کے ساتھ ہوں، میں سنتا اور دیکھتا ہوں۔“ اور جناب رسول اللہ ﷺ نے صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ سے غار میں کہا تھا: ﴿ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ﴾ [التوبة: ٤٠] ”غم نہ کر، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔“[1]

رہی معیتِ عامہ سو وہ سمع و بصر و علم سے ہوتی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴾ [الحديد: ٤] ”اور تم جہاں کہیں بھی ہو، وہ تمھارے ساتھ ہے۔ اور اللہ اسے خوب دیکھنے والا ہے جو تم عمل کرتے ہو۔“ نیز اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح: ﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَاۤ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَاۤ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ﴾ [المجادلة: ٧] ”(اے نبی!) کیا آپ نے نہیں دیکھا، بے شک اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ تین (افراد) کی کوئی سرگوشی نہیں ہوتی، مگر وہ ان میں چوتھا ہوتا ہے اور نہ پانچ آدمیوں کی، مگر وہ ان میں چھٹا ہوتا ہے اور نہ اس سے کم اور نہ زیادہ، مگر وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے، جہاں کہیں بھی وہ ہوں۔“ یا جس طرح فرمایا: ﴿ وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَاۤ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَاۤ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴾ [يونس: ٦١] ”اور (اے نبی!) آپ جس حال میں بھی ہوتے ہیں اور اللہ کی طرف سے (نازل شدہ) قرآن میں سے جو کچھ بھی پڑھتے ہیں اور تم لوگ جو بھی عمل کرتے ہو، اس وقت ہم تمھیں دیکھ رہے ہوتے ہیں، جب تم اس میں مصروف ہوتے ہو۔ اور آپ کے رب سے ذرہ بھر کوئی چیز بھی چھپی نہیں ہوتی، زمین میں اور نہ آسمان میں اور نہ کوئی اس سے چھوٹی (چیز) اور نہ بڑی، مگر (وہ) واضح کتاب میں (درج) ہے۔“

تقوے سے مراد محرمات کا چھوڑ دینا ہے اور احسان سے اطاعت اور فرماں برداری کے کام کرنا۔ ایسے لوگوں کا اللہ حافظ و نگہبان اور مددگار ہوتا ہے اور دشمنوں پر اُن کو کامیابی عطا فرماتا ہے۔ محمد بن حاطب رحمہ اللہ نے کہا: ”كَانَ عُثْمَانُ رضي الله عنه مِنَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَالَّذِيْنَ هُمْ مُحْسِنُوْنَ“ یعنی سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے تھے، جو ایمان لائے اور ڈرتے رہے اور وہ نیک ہیں۔[2] یعنی سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اس آیت شریفہ کے مصداق تھے اور ہر وہ شخص جس میں یہ صفتیں پائی جائیں وہ۔ ان شاء اللہ۔ اس آیت کا مصداق ہوسکتا ہے اور بشارت کا مستحق ہوسکتا ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤١٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٠٩)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٠٧) تفسير ابن كثير (٢/ ٧٧٢)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ امام ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ آیت اس شخص کے حق میں اُتری ہے جو مظلوم ہے، وہ اگر ظالم پر قدرت پائے تو صرف اپنے پر کیے گئے ظلم کا بدلہ لے، مگر اس سے تجاوز نہ کرے۔ اسی طرح تفسیر بیضاوی میں بھی ہے۔[1] اور یہی صحیح بھی ہے، کیوں کہ گو سببِ نزول خاص ہو، مگر اعتبار عمومیتِ لفظ کا ہوتا ہے۔ اس کے باوجود صبر کرنا اور باطل انتقام نہ لینا اہلِ صبر کے لیے بدلہ لینے سے بہتر ہے۔ جمہور نے کہا کہ یہ آیت محکم ہے، جو بدلہ لینے سے صبر کرنے کے بارے میں ہے اور عموماً اس میں صبر کی تعریف ہے اور حقوق پورے وصول کرنے اور قصاص کی کیفیت کے بارے میں حسنِ ادب سکھایا ہے اور زیادتی سے روکا ہے۔ بعض نے کہا کہ منسوخ ہے، مگر پہلی بات زیادہ قابلِ قبول ہے۔

پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے خاص نبی اکرم ﷺ کو صبر کرنے کا حکم دیا اور کافروں پر رنج کرنے سے منع فرمایا کہ اگر وہ تجھ سے منہ موڑتے ہیں تو موڑتے رہیں، تیری بلا اس کا رنج کرے، کیوں کہ یہ تو عذابِ الیم کے مستحق ہو چکے ہیں۔ یا تو اُحد کے شہیدوں پر غم نہ کر، کیوں کہ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت کو پہنچ گئے اور اُن کفار کے مکر سے دل تنگ نہ ہو، جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں اور معاصی سے بچتے ہیں باوجود مختلف قسم کے اختلاف کے اور تمام گناہوں سے بچتے ہیں، اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان کے ساتھ ہے، اپنی مدد، فضل وکرم اور رحمت کے ہمراہ۔ اسی طرح وہ لوگ جو کہ محسن ہیں، یعنی اطاعت کے بجا لانے والے اور قصور وار کا قصور معاف کرنے والے اور انتقام میں احسان کرنے والے، ان کے ساتھ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ ہے یا ﴿ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ﴾ اشارہ ہے، اللہ کے امر کی تعظیم کرنے کا اور ﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ﴾ اشارہ ہے اللہ کے بندوں پر شفقت اور مہربانی کرنے کا۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا کہ متقی ہیں (بچنے والے) محرمات سے اور محسن ہیں فرائض میں،[2] لیکن عمومیت زیادہ بہتر ہے۔

حکایت:

ہرم بن حیان رحمہ اللہ سے نزع کے وقت کہا گیا کہ وصیت کرو۔ کہا وصیت مال میں ہوتی ہے اور میرے پاس مال نہیں ہے، لیکن میں خواتیمِ سورت نحل کی وصیت کرتا ہوں۔[3]

آج روز شنبہ وقت عصر چھے رجب ۱۳۰۶ ہجری قدسی کو اس سورت کا ترجمہ بعون اللہ وصونہ ختم ہوا۔ خَتَمَ اللّٰهُ لِيْ بِالسَّعَادَةِ، وَأَدْخَلَنِيْ فِيْ دَارِ السَّيَادَةِ، إِنَّهُ عَلٰى مَا يَشَاءُ قَدِيْرٌ، وَبِالْإِجَابَةِ جَدِيْرٌ، وَآخِرُ دَعْوَيَ أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ.

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٣٢٢) تفسير البيضاوي (٣/ ٤٢٧)
[2] تفسير الطبري (١٧/ ٣٢٧)
[3] تفسير الطبري (١٧/ ٣٢٧) فتح البيان (٧/ ٣٤١۔ ٣٤٣)

سُوْرَةُ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ

اس سورت کو سورت سبحان بھی کہتے ہیں اور سورت اسراء بھی۔ یہ ایک سو گیارہ آیات ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم اس کو مکی بتاتے ہیں، مگر تین آیتیں: ایک ﴿ وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ ﴾ یہ آیتِ کریمہ اس وقت اُتری، جب کہ قبیلۂ ثقیف کے ایلچی رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور یہود نے کہا کہ یہ سرزمین انبیا کی نہیں ہے۔ دوسری ﴿ رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ ﴾ اور تیسری ﴿ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ﴾۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے ایک اور چوتھی آیت بھی شامل کی: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ ﴾[1] بعض نے کہا: آٹھ آیات مدنی ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس سورت اور سورت کہف اور سورت مریم کے بارے میں کہا ہے: "إِنَّهُنَّ مِنَ الْعِتَاقِ الْأُوَلِ وَهُنَّ مِنْ تِلَادِيْ"[2] [یہ اول درجے کی عمدہ سورتوں میں سے ہیں اور یہ میری پرانی یاد کی ہوئی ہیں] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ ہر رات سورت بنی اسرائیل اور سورۃ الزمر پڑھا کرتے تھے۔[3] (رواہ أحمد)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى
الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهٗ هُوَ
السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ①

پاک ہے وہ (اللہ) جو اپنے بندے کو رات کے ایک حصے میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا، جس کے ماحول کو ہم نے برکت دی ہے، تاکہ ہم اسے اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ بے شک وہی خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا ہے ①

اسراء و معراج کا بیان:

حق تعالیٰ اپنے رسول کو معراج کی رات براق پر مکہ سے بیت المقدس اور آگے آسمانوں پر لے گیا۔ یہاں اتنا

① الدر المنثور (٥/ ١٨١) فتح القدير (٣/ ٢٨٥) ② صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٣١)
③ سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩٢٠) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ١٧٩) مسند أحمد (٦/ ٦٨) السلسلة الصحيحة، رقم (٦٤١)

ذکر ہے، باقی سورۃ النجم میں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نفسِ مقدس کی تمجید اور اپنی قدرت کی عظیم شان بیان کی، جس پر اس کے سوا کوئی اور قادر نہیں۔ فلا إلٰه غيره ولا رب سواه۔ عبد سے مراد محمد ﷺ ہیں اور لیل سے مراد رات کا ایک حصہ ہے۔ مسجد الحرام سے مراد مسجد مکہ ہے اور مسجد اقصیٰ سے مراد بیت المقدس ہے، جو ایلیا میں واقع ہے اور زمانۂ ابراہیم خلیل جلیل علیہ السلام سے معدن انبیا ہے۔ لہٰذا اس جگہ سارے انبیا علیہم السلام آپ کے لیے جمع کر دیے گئے۔ نبی اکرم ﷺ نے اسی جگہ اُن کے محلے اور گھر میں اُن کی امامت کی۔ یہ اس پر دلیل ہے کہ نبی اکرم ﷺ ہی امامِ اعظم اور رئیسِ مقدم ہیں۔ صلوات الله وسلامه عليه وعليهم أجعمين.

وہاں کی کھیتیوں اور پھلوں میں اللہ تعالیٰ نے برکت رکھی ہے۔ اس برکت کا مشاہدہ اب تک موجود ہے۔ اس لے جانے سے مطلب رسول اللہ ﷺ کو بڑی بڑی نشانیاں دکھانا تھا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ﴾ [النجم: ۱۸] ''البتہ تحقیق اس (رسول) نے اپنے رب کی بعض بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔'' اس بارے میں جو احادیث مروی ہیں، ان کا ذکر آئے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے اقوال سنتا ہے، خواہ مومن ہوں یا کافر، پھر اُن کی تصدیق یا تکذیب کرتا ہے اور اُن کو دیکھتا ہے اور ہر کسی کو جس کا وہ مستحق ہے دنیا اور آخرت میں دیتا ہے۔

اسراء کے بارے میں وارد ہونے والی احادیث:

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جس شب نبی ﷺ کو مسجد حرام سے لے گئے اس رات تین لوگ آئے، اس سے پہلے نبی ﷺ کو وحی ہوئی۔ آپ ﷺ مسجد میں سوئے ہوئے تھے۔ پہلے نے کہا کہ اُن میں وہ کون ہے؟ درمیانے نے کہا: وہ ان کا بہترین ہے، آخری نے کہا: ان کے بہترین کو لو۔ اس رات اتنا ہی گزرا۔ نبی اکرم ﷺ نے ان کو نہیں دیکھا، یہاں تک کہ دوسری رات کو آئے، ایسی حالت میں کہ نبی اکرم ﷺ کا دل دیکھتا تھا اور آنکھ سوتی تھی اور دل نہ سوتا تھا۔ انبیا کا یہی حال ہوتا ہے کہ اُن کی آنکھیں سوتی ہیں اور دل نہیں سوتے۔ انھوں نے نبی اکرم ﷺ سے کچھ بات نہ کی، یہاں تک کہ آپ کو اُٹھا کر چاہِ زمزم کے پاس رکھ دیا، پھر اُن میں سے جبریل علیہ السلام متولی ہوئے اور گلے اور لبہ کے درمیانی حصے کو چیر ڈالا، یہاں تک کہ سینہ اور پیٹ سے فارغ ہوئے۔ پھر آبِ زمزم کے ساتھ اپنے ہاتھ سے دھویا، یہاں تک کہ پیٹ خوب پاک صاف ہوگیا۔ پھر سونے کا ایک طشت لائے، اس میں سونے کا نور تھا، وہ ایمان وحکمت سے پُر تھا، اس سے سینے کو اور حلق کی تمام رگوں کو پُر کیا، پھر اس کو ٹانک دیا۔ پھر اُن کو لے کر آسمانِ دنیا پر چڑھے اور آسمان کے دروازوں میں سے ایک دروازے کو کھٹکھٹایا۔ آسمان والوں نے پوچھا: یہ کون ہے؟ جبریل علیہ السلام نے کہا: میں جبریل ہوں، کہا: تیرے ساتھ کون ہے؟ کہا: میرے ساتھ محمد ﷺ ہیں۔ کہا: کیا تو اُن کی

طرف بھیجا گیا تھا؟ کہا: ہاں! کہا: ''مرحبا به و أهلا'' آسمان والے خوش ہوئے۔ اہلِ سما نہ جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا اُن کے ساتھ زمین میں کیا ارادہ ہے، یہاں تک کہ اللہ بتائے۔

نبی کریم ﷺ نے آسمانِ دنیا پر آدم علیہ السلام کو پایا، جبریل علیہ السلام نے کہا: یہ تیرا باپ ہے، اس پر سلام کر، نبی کریم ﷺ نے ان کو سلام کیا، آدم علیہ السلام نے سلام کا جواب دیا اور کہا: ''مَرْحَبًا وَ أَهْلًا یَا بُنَيَّ نِعْمَ الْاِبْنُ أَنْتَ'' آسمانِ دنیا میں دو نہریں جاری تھیں۔ نبی اکرم ﷺ نے کہا: اے جبریل! یہ نہریں کیسی ہیں؟ کہا: یہ نیل وفرات ہیں۔ یہ عنصر ہے ان دونوں نہروں کا۔ پھر اُن کو آسمان میں لے گئے، وہاں ایک دوسری نہر تھی، اس پر موتی اور زبرجد کا ایک محل تھا، اس میں ہاتھ مارا وہ مسک خالص (کستوری) تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اے جبریل! یہ کیا ہے؟ کہا: یہ کوثر ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے چھپا رکھا ہے۔

پھر آپ ﷺ کو لے کر دوسرے آسمان پر چڑھے۔ اس جگہ کے فرشتوں نے اسی طرح کہا جس طرح کہ پہلے آسمان کے فرشتوں نے کہا تھا: یہ کون ہے؟ کہا: جبریل ہوں، کہا: تیرے ساتھ کون ہے؟ کہا: محمد ﷺ۔ کہا: کیا تو اُن کی طرف بھیجا گیا تھا؟ کہا: ہاں! کہا: ''مرحبا به و أهلا''۔ پھر نبی اکرم ﷺ کو لے کر آسمانِ سوم پر چڑھے، وہاں کے فرشتوں نے پہلے اور دوسرے آسمان کے فرشتوں کی طرح سوال و جواب کیے، پھر چوتھے آسمان پر لے گئے، وہاں کے فرشتوں نے بھی پہلے فرشتوں کی طرح کہا۔ پھر پانچویں آسمان پر لے گئے، وہاں بھی اسی طرح کے سوال و جواب ہوئے۔ پھر چھٹے آسمان پر لے چڑھے، یہاں بھی اسی طرح کہا۔ پھر ساتویں آسمان پر لے گئے، وہاں بھی اسی طرح کہا۔ ہر آسمان میں پیغمبر تھے، اُن کے نام لیے۔ من جملہ اُن کے میں نے یہ نام یاد کر لیے، ادریس دوسرے آسمان میں، ہارون چوتھے آسمان میں اور ایک پانچویں آسمان میں جن کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام چھٹے آسمان میں، موسیٰ علیہ السلام ساتویں آسمان میں اللہ کے ساتھ کلام کرنے کی فضیلت کے سبب۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اے رب! مجھ کو گمان نہ تھا کہ تو کسی کو مجھ پر بلند کرے گا۔ پھر نبی اکرم ﷺ کو اس سے بھی اوپر لے گئے، جس کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، یہاں تک کہ سدرۃ المنتہیٰ تک آئے اور نزدیک ہوا جبار رب العزت، پھر لٹکا، یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ سے اندازاً دو کمان کے فاصلے پر تھا، یا اس سے بھی زیادہ نزدیک، پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی کی۔

من جملہ اس کے یہ تھا کہ تیری اُمت پر ہر رات اور دن میں پچاس نمازیں ہیں۔ پھر نبی اکرم ﷺ کو اُتارا، یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچے۔ موسیٰ علیہ السلام نے نبی اکرم ﷺ کو روک لیا اور کہا: اے محمد! تیرے رب نے تجھ سے کیا عہد کیا؟ کہا: رات دن میں پچاس نمازوں کا۔ کہا: تیری اُمت اس کی استطاعت نہیں رکھتی ہے، پھر جا، تیرا رب تجھ سے اور اُن سے بھی تخفیف کرے گا۔ نبی اکرم ﷺ نے جبریل علیہ السلام کی طرف توجہ کی، گویا ان سے مشورہ لیتے تھے۔ جبریل علیہ السلام نے اشارہ کیا کہ ہاں اگر آپ چاہیں۔ پھر جبریل علیہ السلام نبی مکرم ﷺ کو اوپر کی طرف جبارِ تعالیٰ و تقدس کے

پاس لے گئے اور وہ اپنی جگہ میں تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے کہا: اے رب! تخفیف کر ہم سے، بے شک میری اُمت یہ نہ کر سکے گی، تب اللہ تعالیٰ نے دس نمازیں کم کر دیں۔ پھر نبی مکرم ﷺ موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے، موسیٰ علیہ السلام نے آپ کو روک لیا اور رب کی طرف پھیرتے رہے، یہاں تک کہ پانچ نمازیں رہ گئیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے پانچ نماز پر بھی روکا اور کہا: اے محمد! واللہ! میں نے بنی اسرائیل اپنی قوم کو اس سے بھی کم پر قصد کیا تھا، وہ ضعیف نکلی اور انھوں نے نماز ترک کر دی، سو تمھاری اُمت جسموں، دلوں، بدنوں، آنکھوں اور کانوں کے لحاظ سے اور بھی زیادہ ضعیف ہے، تو پھر جا، رب تجھ سے تخفیف کر دے گا۔ ہر بار نبی مکرم ﷺ جبریل علیہ السلام کی طرف التفات کرتے تا کہ مشورہ دیں اور جبریل علیہ السلام اس کو ناپسند نہ کرتے، چناں چہ پانچویں بار پھر اوپر لے گئے۔ نبی کریم ﷺ نے کہا: اے رب! میری اُمت جسموں، دلوں، کانوں، آنکھوں اور بدنوں میں کمزور ہے، تو ہم سے تخفیف کر۔ جبار تبارک وتعالیٰ نے کہا: اے محمد! کہا: لبیك وسعدیك۔ فرمایا: میرے پاس بات نہیں بدلتی، جس طرح میں نے تجھ پر اُم الکتاب (لوح محفوظ) میں یہ بات فرض کی ہے کہ ہر نیکی دس گنا ہوگی، سو یہ نمازیں اُم الکتاب میں پچاس ہیں اور تجھ پر پانچ ہیں۔ نبی کریم ﷺ پھر کر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: کیا کر آئے؟ کہا: ہم سے تخفیف کی، ہم کو ہر نیکی پر دس نیکی کے برابر عطا کیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: "قَدْ وَاللّٰهِ! رَاوَدْتُّ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ عَلٰى أَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ فَتَرَكُوْهُ، اِرْجِعْ إِلٰى رَبِّكَ فَلْيُخَفِّفْ عَنْكَ أَيْضاً، قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: «يَا مُوْسٰى! قَدْ وَاللّٰهِ! اِسْتَحْيَيْتُ مِنْ رَبِّيْ عَزَّوَجَلَّ مِمَّا اخْتَلَفْتُ إِلَيْهِ» [اللہ کی قسم! میں نے بنی اسرائیل کا اس سے کم نمازوں کا تجربہ کیا ہے، انھوں نے اسے بھی چھوڑ دیا تھا۔ آپ اپنے رب کی طرف واپس جائیں اور ان میں مزید کمی کی درخواست کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے موسیٰ! اللہ کی قسم! اب مجھے اپنے رب سے حیا آتی ہے کہ بار بار ایک کام کے لیے اس کی طرف جاؤں''] کہا: پس اترو اللہ کا نام لے کر اور نبی اکرم ﷺ جاگ اُٹھے اور آپ مسجد حرام میں تھے۔[1] (هكذا ساقه البخاري في كتاب التوحيد و رواه مسلم فزاد و نقص و قدم و أخر)

امام مسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شریک بن عبداللہ بن ابی نمر نے اس حدیث میں اضطراب کیا ہے اور وہ حفظ و ضبط میں اچھا نہیں ہے۔ بعض نے اس کو خواب ٹھہرایا ہے بطور تمہید کے جو اس کے بعد واقع ہوا۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حدیثِ شریک میں کچھ زیادتی ہے جس کے ساتھ وہ متفرد ہے۔ اس شخص کے اعتقاد پر جس نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے رب عزوجل کو دیکھا۔ پھر کہا کہ سیدہ عائشہ، سیدنا عبداللہ بن مسعود اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم کا قول زیادہ صحیح ہے، جس میں انھوں نے رؤیت کو جبریل علیہ السلام کی رؤیت پر محمول کیا ہے، یعنی معراج میں نبی اکرم ﷺ نے جبریل علیہ السلام کو دیکھا تھا۔[2]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٧٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٢)
[2] دلائل النبوة للبيهقي (٢/ ٣٨٥)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام بیہقی رحمہ اللہ کا قول اس مسئلے میں زیادہ صحیح ہے، کیوں کہ ابو ذر رضی اللہ عنہ نے کہا تھا: اے اللہ کے رسول! آپ نے اپنے رب کو دیکھا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «نُوْرٌ أَنّٰى أَرَاهُ» [اللہ تعالیٰ کی ذات تو نور ہے، میں اسے کیسے دیکھ سکتا ہوں؟] دوسری روایت میں ہے: «رَأَيْتُ نُوْرًا»[1] (أخرجه مسلم)[میں نے نور دیکھا] اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى﴾ [النجم: ٨] ''پھر وہ قریب ہوا اور اتر آیا۔'' سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔ جس طرح صحیحین میں ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔[2] اسی طرح صحیح مسلم میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے۔[3] اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں اس امرِ معروف کا کوئی مخالف نہیں۔[4]

اس آیت کی تفسیر میں سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے پاس ایک براق لایا گیا، یہ ایک سفید جانور ہے، گدھے سے بڑا اور خچر سے چھوٹا، وہ اپنے قدم حدِ نگاہ پر رکھتا ہے۔ میں اس پر سوار ہوا اور وہ مجھ کو لے کر چلا، میں بیت المقدس میں آیا، میں نے اس جانور کو اس حلقے سے باندھ دیا جس سے انبیا علیہم السلام باندھتے تھے، پھر میں نے داخل ہو کر دو رکعت نماز ادا کی اور باہر نکلا، پھر جبریل علیہ السلام میرے پاس شراب اور دودھ کا ایک ایک برتن لے کر آئے، میں نے دودھ پسند کیا۔ جبریل علیہ السلام نے مجھ سے کہا: "أَصَبْتَ الْفِطْرَةَ". [آپ نے فطرت کو اختیار کیا ہے] پھر مجھ کو لے کر آسمانِ دنیا پر چڑھے اور دروازہ کھلوانا چاہا، ان سے کہا گیا کہ تو کون ہے؟ کہا: جبریل ہوں، کہا: تیرے ہمراہ کون ہے؟ کہا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، کہا: کیا تو اس کے پاس بھیجا گیا تھا؟ کہا: ہاں بھیجا گیا تھا، تب ہمارے لیے دروازہ کھولا گیا۔ اتنے میں آدم علیہ السلام ملے، انھوں نے مرحبا کہا اور میرے لیے دعائے خیر کی۔ پھر مجھ کو دوسرے آسمان پر چڑھا لے گئے۔ جبریل علیہ السلام نے دروازہ کھلوانا چاہا، کہا: تو کون ہے؟ کہا: میں جبریل ہوں، کہا: تیرے ساتھ کون ہے؟ کہا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، کہا: کیا ان کے پاس بھیجا گیا تھا؟ کہا: ہاں بھیجا گیا تھا، تب ہمارے لیے دروازہ کھولا گیا، وہاں دو خالہ زاد بھائی: یحییٰ و عیسیٰ علیہما السلام ملے، انھوں نے مرحبا کہا اور دعاے خیر کی۔ پھر تیسرے آسمان پر چڑھا لے گئے، دروازہ کھٹکھٹایا، کہا تو کون ہے؟ کہا: جبریل ہوں، کہا: تیرے ساتھ کون ہے؟ کہا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ کہا: کیا ان کی طرف پیغام بھیجا گیا تھا؟ کہا: ہاں، ان کی طرف پیغام بھیجا گیا ہے۔ پھر دروازہ کھول دیا، وہاں یوسف علیہ السلام تھے، ان کو نصف حسن عطا ہوا تھا۔ انھوں نے مرحباً کہا اور دعائے خیر کی۔ پھر چوتھے آسمان پر لے گئے، دروازہ کھلوایا، کہا: تو کون ہے؟ کہا: جبریل علیہ السلام ہوں، کہا: تیرے ساتھ کون ہے؟ کہا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، کہا: کیا اُن کے پاس بھیجا گیا تھا؟ کہا ہاں بھیجا گیا تھا، پھر دروازہ کھول دیا، وہاں ادریس علیہ السلام تھے، انھوں نے مجھ کو مرحبا کہا اور دعاے خیر دی۔ اللہ تعالیٰ

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٦٣، ٣٠٦٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٧، ١٧٤)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٥) [4] تفسير ابن كثير (٣/ ٧)

فرماتا ہے: ﴿ وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ﴾ [مریم: ٥٧] ”اور ہم نے اسے بہت بلند مقام پر اُٹھایا۔“ پھر پانچویں آسمان پر لے گئے، دروازہ کھلوانا چاہا، کہا تو کون ہے، کہا جبریل ہوں۔ کہا: تیرے ہمراہ کون ہے؟ کہا: محمد ﷺ ہیں، کہا: کیا ان کی طرف پیغام بھیجا گیا تھا؟ کہا: ہاں، ان کی طرف پیغام بھیجا گیا ہے۔ پھر دروازہ کھول دیا، وہاں ہارون علیہ السلام تھے، انھوں نے مرحبا کہا اور دعاے خیر دی۔ پھر چھٹے آسمان پر لے گئے اور دروازہ کھلوایا، کہا تو کون ہے؟ کہا: میں جبریل ہوں، کہا: تیرے ساتھ کون ہے؟ کہا: محمد ﷺ ہیں؟ کہا: کیا ان کی طرف پیغام بھیجا گیا ہے۔ کہا: ہاں! پھر دروازہ کھول دیا۔ وہاں موسیٰ علیہ السلام تھے، انھوں نے مرحبا کہا اور دعائے خیر دی۔

پھر ساتویں آسمان پر لے گئے، دروازہ کھلوایا، کہا: تو کون ہے؟ کہا: جبریل ہوں، کہا: تیرے ہمراہ کون ہے؟ کہا: محمد ﷺ ہیں، کہا: کیا تو اس کی طرف بھیجا گیا تھا؟ کہا: ہاں! تب دروازہ کھول دیا۔ وہاں ابراہیم علیہ السلام تھے، بیت المعمور سے ٹیک لگائے ہوئے اور اس گھر میں ہر دن ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے تھے، پھر دوبارہ وہاں نہ آتے۔ پھر مجھ کو سدرۃ المنتہیٰ تک لے گئے، اس کے پتے جیسے ہاتھیوں کے کان اور اس کے پھل جیسے مٹکے۔ جب اللہ کے حکم سے اس کو ڈھانپ لیا، جس شے نے کہ ڈھانپ لیا تو وہ دگرگوں ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے کوئی اس کے حسن کی تعریف نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے جو چاہا وہ مجھ کو پیغام بھیجا اور ہر رات دن میں مجھ پر پچاس نمازیں فرض کیں۔ میں وہاں سے اترا اور موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچا، مجھ سے موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ تیرے رب نے تیری اُمت پر کیا فرض کیا؟ میں نے کہا: پچاس نمازیں ہر دن رات میں۔ کہا: اپنے رب کے پاس پھر جا اور اُمت کے لیے اس میں تخفیف کا سوال کر، تیری اُمت کو اتنی نمازوں کی طاقت نہ ہوگی، میں نے بنی اسرائیل کو آزمایا اور اُن کا امتحان لیا ہے۔ میں اپنے رب کے پاس گیا اور کہا: اے رب! میری اُمت سے تخفیف کر۔ پس پانچ نمازیں کم کر دیں، میں اترا اور موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچا، مجھ سے پوچھا: تو نے کیا کیا؟ میں نے کہا: پانچ نمازیں کم کر دیں، کہا کہ تیری اُمت کو اس کی طاقت نہ ہوگی، اپنے رب کے پاس پھر جا اور اپنی اُمت کے لیے تخفیف مانگ۔ میں اپنے رب اور موسیٰ علیہ السلام کے درمیان آتا جاتا رہا اور پانچ پانچ نمازیں کم ہوتی رہیں، یہاں تک کہ فرمایا: اے محمد! یہ پانچ نمازیں ہیں ہر دن رات میں، ہر نماز دس کے برابر ہے، یہ پچاس نمازیں ہوئیں۔ اور جس نے ارادہ کیا نیکی کا، پھر وہ نیکی نہ کی، اس کے لیے ایک نیکی لکھی گئی اور اگر وہ نیکی کر گزرا تو دس نیکیاں لکھی گئیں اور جس نے قصد کیا بدی کا، پھر وہ بدی نہ کی تو وہ لکھی نہ گئی اور اگر بدی کی تو ایک بدی لکھی گئی۔ میں وہاں سے اترا اور موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا اور اُن کو اس حال کی خبر دی۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ”اِرْجِعْ إِلٰى رَبِّكَ فَاسْأَلْهُ التَّخْفِيفَ لِأُمَّتِكَ فَإِنَّ أُمَّتَكَ لَا تُطِيقُ ذٰلِكَ“ [اپنے رب تعالیٰ کے پاس جائیں اور تخفیف کے لیے سوال کریں، کیوں کہ آپ کی امت کو اس کی بھی طاقت نہ ہوگی] نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: « لَقَدْ

رَجَعْتُ إِلَى رَبِّي حَتَّى اسْتَحْيَيْتُ[1]» (رواه أحمد و رواه مسلم بهذا السياق وهو أصح من سياق شريك) [میں نے بار بار اپنے رب تعالیٰ کی طرف رجوع کیا اور اب مجھے حیا دامن گیر ہے] امام بیہقی رحمہ اللہ نے کہا کہ اس سیاق میں اس بات پر دلیل ہے کہ معراج اسی رات کو ہوئی تھی، جس رات نبی اکرم ﷺ کو مکے سے بیت المقدس لے گئے تھے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ”وهذا الذي قاله هو الحق الذي لا شك فيه ولا مرية“[2] [انھوں نے جو کہا ہے وہی حق ہے جس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے]

سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے: لایا گیا براق اس رات جس رات مجھ کو لے گئے زین ولگام لگا ہوا، تاکہ میں اس پر سوار ہوں، اس نے شوخی کی، جبریل علیہ السلام نے اس سے کہا: تو یہ شوخی کیوں کرتا ہے؟ اللہ کی قسم! تجھ پر کبھی اُن سے زیادہ اللہ کا کوئی بزرگ سوار نہیں ہوا، تب اس کو پسینہ آ گیا۔[3] (رواه أحمد والترمذي) سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ جب مجھ کو چڑھا کر میرے رب کی طرف لے گئے، میں ایک قوم پر گزرا، جن کے ناخن تانبے کے تھے، وہ اُن سے اپنے چہرے اور سینے کو نوچتے تھے، میں نے کہا: اے جبریل! یہ کون ہیں؟ کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے ہیں اور اُن کی آبروریزی کرتے ہیں۔[4] (رواه أحمد و رواه أبو داود من وجه آخر ليس فيه أنس).

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے تیسرے الفاظ یہ ہیں کہ میں معراج کی شب موسیٰ علیہ السلام پر گزرا تو وہ اپنی قبر میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔[5] (رواه أحمد و مسلم) امام نسائی رحمہ اللہ نے کہا: ”هذا أصح“ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے چوتھے الفاظ یہ ہیں کہ مجھ کو بعض اصحابِ نبی ﷺ نے خبر دی کہ آپ ﷺ کا گزر شبِ معراج میں موسیٰ علیہ السلام پر ہوا، وہ اپنی قبر میں نماز پڑھ رہے تھے۔[6] (رواه أبو يعلىٰ) سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے پانچویں الفاظ یہ ہیں کہ «أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَيْلَةَ أُسْرِيَ بِهِ مَرَّ بِمُوسىٰ وَهُوَ يُصَلِّيْ فِيْ قَبْرِهِ» [معراج کی رات نبی مکرم ﷺ کا گزر موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے ہوا تو وہ اپنی قبر میں کھڑے نماز ادا کر رہے تھے]

پھر کہا کہ نبی اکرم ﷺ کو براق پر سوار کیا، پھر دابہ کو باندھا، یا کہا گھوڑے کو۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ مجھ سے اس کا حال کہو، نبی اکرم ﷺ نے ایک کلمہ ذکر کیا، سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ”أشهد أنك رسول الله“ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس براق کو دیکھا تھا۔[7] (رواه أبو يعلىٰ) سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے چھٹے الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم ﷺ

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٢) مسند أحمد (٣/ ١٤٨) [2] دلائل النبوة (٢/ ٣٨٥) تفسير ابن كثير (٣/ ٨)

[3] مسند أحمد (٣/ ١٦٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٣١) اس کی سند صحیح ہے۔

[4] مسند أحمد (٣/ ٢٢٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٨٧٨) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٥٣٣)

[5] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٧٥) مسند أحمد (٣/ ١٢٠) سنن النسائي الكبرىٰ (١/ ٤١٩)

[6] مسند أبي يعلىٰ (٧/ ١١٧) اس کی سند صحیح ہے۔ [7] مسند أبي يعلىٰ (٧/ ١٢٦) اس کی سند صحیح ہے۔

نے فرمایا: میں سوتا تھا کہ اتنے میں جبریل علیہ السلام آئے اور میرے دونوں کندھوں کے درمیان ایک مکا مارا، میں ایک درخت کی طرف کھڑا ہوگیا، اس میں پرندوں کے دو گھونسلے تھے، ایک میں وہ بیٹھ گئے اور ایک میں مَیں بیٹھ گیا، وہ اونچا اور بلند ہوا، یہاں تک کہ خافقین (شمال وجنوب، مشرق ومغرب) غائب ہوگئے اور میں اپنی نظر کو پھیرتا تھا۔ اگر میں چاہتا کہ آسمان کو چھولوں تو چھو لیتا۔ میں نے جبریل علیہ السلام کی طرف توجہ کی، گویا وہ حلس لاط ہیں۔ پھر میں نے اللہ کے علم کے بارے میں اُن کی فضیلت کو اپنے اوپر پہچانا اور میرے لیے آسمان کے دروازوں میں سے ایک دروازہ کھل گیا، میں نے ایک بہت بڑا نور دیکھا اور پردے کے اُدھر رفرف (قالین)، در (موتی) اور یاقوت تھا اور اللہ تعالیٰ نے جو چاہا وہ مجھ کو وحی کی۔[1] (رواہ البزار في مسندہ و رواہ البیهقي في الدلائل فذکرہ بسندہ مثله)

محمد بن عمیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے گروہ میں بیٹھے تھے کہ اتنے میں جبریل علیہ السلام نے آ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت میں ایک کھونچا دیا اور اُن کو ایک درخت کی طرف لے گئے، اس میں پرندوں کے آشیانوں کی طرح دو آشیانے تھے، ایک میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے اور ایک میں جبریل علیہ السلام، وہ لے کر اونچا ہوا، یہاں تک کہ اُفق تک پہنچا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ اگر میں اپنا ہاتھ آسمان کی طرف بڑھاتا تو اس کو چھو لیتا۔ پھر ایک رسی کو پکڑ کر نور کی طرف اترا۔ جبریل علیہ السلام بے ہوش ہوگئے، گویا حلس ہیں۔ میں نے ان کی خشیت کی فضیلت اپنی خشیت پر معلوم کی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مجھ کو وحی کی کہ تو نبی بادشاہ بنے گا یا نبی عبد اور جنتی؟ یعنی تو کیا ہونا چاہتا ہے؟ جبریل نے مجھ کو اشارہ کیا اور وہ خاکساری کے طریقے پر لیٹے تھے کہ عاجزی اختیار کرو۔ میں نے کہا کہ بلکہ میں نبی عبد ہوں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اگر یہ روایت صحیح ہو تو یہ اس امر کو مقتضی ہے کہ یہ واقعہ شبِ معراج کے علاوہ کسی اور شب کا ہے، کیوں کہ اس میں نہ بیت المقدس کا ذکر ہے اور نہ آسمان پر چڑھنے کا ذکر ہے تو یہ اس کے علاوہ کوئی واقعہ ہے، جس میں ہم بحث کرتے ہیں۔[2] واللہ أعلم.

امام بزار رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب عزوجل کو دیکھا۔[3] یہ روایت غریب ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے راوی ہیں کہ جب جبریل علیہ السلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس براق لائے، اس نے اپنی دُم ہلائی، جبریل علیہ السلام نے کہا: تھم جا اے براق! "فو اللہ ما رکبك مثله" [اللہ کی قسم! اس جیسا کوئی تجھ پر سوار نہیں ہوا] اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چلے، یہاں تک کہ راستے کے کنارے پر ایک بڑھیا ملی، کہا: اے

[1] مسند البزار (۱۴/ ۱۰) دلائل النبوۃ (۲/ ۳۶۸۔ ۳۶۹) اس کی سند میں ''حارث بن عبید'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: السلسلۃ الضعیفۃ، رقم الحدیث (۵۴۴۴)

[2] دلائل النبوۃ (۲/ ۳۶۹) تفسیر ابن کثیر (۳/ ۹) یہ روایت مرسل ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلۃ الضعیفۃ، رقم الحدیث (۵۴۴۴)

[3] مسند البزار (۱۳/ ۴۲۶) اس کی سند میں ''ابوبحر بکراوی'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: ظلال الجنۃ (۱/ ۲۰۹۔ ۲۱۰)

جبریل! یہ کون ہے؟ کہا: اے محمد! چلو چلو، پھر چلے جتنا اللہ نے چاہا کہ چلیں، اتنے میں راستے کے کنارے پر ایک شے پکارتی تھی کہ اے محمد! آؤ۔ پھر آگے چلے، جتنا اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ چلیں، اللہ کی مخلوق میں سے ایک مخلوق ملی، اس نے کہا: "السلام عليك يا أول، السلام عليك يا آخر، السلام عليك يا حاشر" [اے اول! آپ پر سلام، اے آخر! آپ پر سلام، اے حاشر! آپ پر سلام] جبریل علیہ السلام نے کہا: اے محمد! سلام کا جواب دو، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کا جواب دیا۔ پھر دوسری بار وہ مخلوق ملی اور پہلی بار کی طرح کہا۔ پھر تیسری بار ملے، اسی طرح یہاں تک کہ بیت المقدس پہنچے، وہاں پانی اور شراب اور دودھ سامنے آیا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ پیا، جبریل علیہ السلام نے کہا: "أَصَبْتَ الفطرة" [آپ فطرت کو پہنچے] اگر تو پانی پیتا تو ڈوب جاتا اور تیری اُمت بھی ڈوب جاتی اور اگر شراب پیتا تو تُو اور تیری اُمت بہک جاتی۔ پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے آدم علیہ السلام اور اُن کے سوا جو پیغمبر تھے، وہ اُٹھائے گئے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رات اُن سب کی امامت کی۔ پھر جبریل علیہ السلام نے کہا کہ وہ بڑھیا جو تو نے راستے کے کنارے پر دیکھی تھی، تو دنیا کی عمر اسی قدر باقی ہے، جس قدر اس بڑھیا کی عمر باقی ہے اور وہ شخص جس نے تیرا اپنی طرف جھکنا چاہا تھا، وہ اللہ کا دشمن ابلیس ہے، اس نے چاہا کہ تو اس کی طرف مائل ہو اور وہ لوگ جنھوں نے تجھ پر سلام کیا، وہ ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام ہیں۔[1] (وهكذا رواه البيهقي في دلائل النبوة من حديث ابن وهب وفي بعض ألفاظه نكارة وغرابة)

اس حدیث کا دوسرا طریق سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے "سنن مجتبیٰ للنسائي" میں مروی ہے، اس میں بھی غرابت اور نکارت ہے، لیکن نسائی کی سنن کبریٰ میں اس کو نہیں دیکھا۔ وہ طریق یہ ہے کہ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے پاس ایک جانور لایا گیا گدھے سے بڑا خچر سے چھوٹا، اس کا قدم وہاں پڑتا جہاں پر نگاہ کی انتہا ہوتی، میں اس پر سوار ہوا اور میرے ہمراہ جبریل علیہ السلام تھے۔ میں چلا مجھ سے کہا: اتر اور نماز پڑھ، میں نے نماز پڑھی، مجھ کو کہا کہ کیا تجھ کو معلوم ہے کہ تو نے کہاں نماز پڑھی؟ تو نے طیبہ میں نماز پڑھی ہے، اسی کی طرف ہجرت ہوگی۔ پھر کہا: اتر نماز پڑھ، میں نے نماز پڑھی، کہا تو جانتا ہے کہ تو نے کہاں نماز پڑھی؟ طورِ سینا میں نماز پڑھی ہے، جہاں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے بات کی تھی۔ پھر کہا: اُتر نماز پڑھ، میں نے نماز پڑھی، کہا تو جانتا ہے کہ تو نے کہاں نماز پڑھی ہے؟ تو نے بیتِ لحم میں نماز پڑھی، جہاں عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔ پھر میں بیت المقدس میں داخل ہوا، میرے لیے انبیا علیہم السلام جمع کیے گئے، جبریل علیہ السلام نے مجھ کو آگے کر دیا، میں نے اُن کی امامت کی۔ پھر مجھ کو آسمانِ دنیا پر چڑھا لے گئے، وہاں آدم علیہ السلام تھے۔ پھر دوسرے آسمان پر لے گئے، وہاں دو خالہ زاد بھائی عیسیٰ و یحییٰ علیہما السلام تھے۔ پھر تیسرے آسمان پر لے چڑھے، وہاں یوسف علیہ السلام تھے۔ پھر چوتھے آسمان پر لے گئے، وہاں ہارون علیہ السلام تھے۔

---

[1] تفسیر الطبري (۱۷/ ۳۳٦) دلائل النبوة (۲/ ۳٦۲) اس کی سند میں "عبدالرحمٰن بن ہاشم" راوی کا ترجمہ نہیں ملا ہے۔ البتہ اس کے بعض الفاظ میں نکارت اور غرابت ہے، جیسا کہ مولف رحمہ اللہ نے واضح کیا ہے۔ مزید دیکھیں: الإسراء والمعراج للألباني رحمہ اللہ (۱/ ۳۹۔۴۱)

پھر پانچویں آسمان پر لے چڑھے، وہاں ادریس علیہ السلام تھے۔ پھر چھٹے آسمان پر لے گئے، وہاں موسیٰ علیہ السلام تھے۔ پھر ساتویں آسمان پر لے چڑھے وہاں ابراہیم علیہ السلام تھے۔ پھر ساتویں آسمان سے اوپر چڑھے، پھر میں سدرۃ المنتہیٰ پر آیا، مجھ کو ایک ضبابہ (دھند) نے ڈھانپ لیا، میں سجدے میں گر پڑا، مجھ سے یہ بات کہی گئی کہ میں نے جس دن آسمان و زمین پیدا کیے، تجھ پر اور تیری اُمت پر پچاس نمازیں فرض کیں، اب تو اور تیری اُمت ان نمازوں کے ساتھ قیام کرے۔

جب موسیٰ علیہ السلام سے یہ ذکر ہوا تو انھوں نے کہا: یہ نہ تجھ سے بنے اور نہ تیری اُمت سے بنے، اپنے رب کے پاس جا اور تخفیف مانگ، میں اپنے رب کے پاس پھر گیا، مجھ سے دس نمازیں تخفیف کی، پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا، مجھے پھر رجوع کا حکم دیا، مَیں پھر گیا، مجھ سے دس نمازیں اور کم کر لی گئیں، پھر پانچ نمازیں ٹھہریں۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: پھر اپنے رب کے پاس جا اور تخفیف مانگ۔ بنی اسرائیل پر دو نمازیں فرض ہوئی تھیں، وہ ان کو بھی قائم نہ رکھ سکے۔ میں پھر اپنے رب عزوجل کے پاس گیا اور تخفیف کا سوال کیا۔ فرمایا: میں نے جس دن آسمان و زمین پیدا کیے تھے، تجھ پر اور تیری اُمت پر پچاس نمازیں فرض کی تھیں، سو یہ پانچ اُن پچاس کے بدلے میں ہیں، اب تو اور تیری اُمت ان کے ساتھ قیام کرے۔ تب میں نے پہچانا کہ یہ نمازیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حتمی حکم ہیں۔ میں پھر کر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا، کہا: پھر جا، میں نے پہچان لیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حتمی حکم (واجب) ہیں، اس لیے پھر میں نہ گیا۔[1]

طریق دیگر:

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں جس رات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بیت المقدس لے گئے تھے، اس رات جبریل علیہ السلام ایک جانور لائے، گدھے سے بڑا اور خچر سے چھوٹا، اس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سوار کرایا، اس کا سم وہاں پڑتا تھا جہاں اس کی نگاہ پڑتی تھی، جب بیت القدس میں اس جگہ پہنچے جس کو بابِ محمد کہتے ہیں تو اس پتھر کے پاس آئے جو وہاں پر ہے، جبریل علیہ السلام نے اپنی انگلی مار کر اس میں سوراخ کیا اور جانور کو اس سے باندھا، پھر چڑھے۔ پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور وہ دونوں مسجد کے صحن میں مستوی ہوئے تو جبریل علیہ السلام نے کہا: اے محمد! تم نے اپنے رب سے یہ سوال کیا تھا کہ وہ تم کو حورِ عین دکھائے؟ کہا: ہاں! کہا: چلو اُن عورتوں کے پاس اور انھیں سلام کرو، وہ صخرہ (پتھر) کے بائیں طرف بیٹھی تھیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: میں اُن کے پاس گیا اور اُن کو سلام کیا، انھوں نے مجھ کو سلام کا جواب دیا، میں نے کہا: تم کون ہو؟ کہا: ''نحن خيرات حسان، نساء قوم أبرار، نقوا فلم يدرنوا، وأقاموا فلم يظعنوا، وخلدوا فلم يموتوا'' [ہم نیک سیرت خوب صورت حوریں ہیں، ہم اللہ کے ان پرہیزگار بندوں کی بیویاں ہیں جو نیکوکار ہیں، جو گناہوں کے میل کچیل سے دور ہیں، جو پاک کر کے ان کے پاس لائے جائیں گے، پھر نہ نکالے جائیں گے،

---

[1] سنن النسائي، رقم الحديث (٤٥٠) اس کی سند میں ''سعید بن عبدالعزیز'' مختلط راوی ہے، البتہ اس میں بھی نکارت اور غرابت ہے۔ مزید دیکھیں: الإسراء والمعراج (١/ ٤٢۔ ٤٤)

ہمارے پاس ہی رہیں گے، کبھی جدا نہ ہوں گے، ہمیشہ زندہ رہیں گے کبھی نہ مریں گے]

پھر میں وہاں سے پھرا اور نہ ٹھہرا مگر ذرا سا کہ اتنے میں بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ پھر ایک مؤذن نے اذان دی اور نماز قائم ہوئی، ہم صفیں باندھ کر کھڑے ہوئے، منتظر تھے کہ کون ہماری امامت کرے گا، جبریل علیہ السلام نے میرا ہاتھ پکڑ کر آگے کر دیا، میں نے اُن سب کو نماز پڑھائی۔ جبریل علیہ السلام نے کہا: اے محمد! تم جانتے ہو کہ تمھارے پیچھے کن لوگوں نے نماز پڑھی؟ میں نے کہا: نہیں۔ کہا: تمھارے پیچھے ہر نبی نے، جس کو اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے، نماز پڑھی۔ پھر جبریل علیہ السلام میرا ہاتھ پکڑ کر آسمان پر چڑھے، جب ہم دروازے تک پہنچے، دروازہ کھلوانا چاہا، کہا تو کون ہے؟ کہا میں جبریل ہوں! کہا: تیرے ہمراہ کون ہے؟ کہا: محمد ﷺ، کہا: کیا تو اُن کے پاس بھیجا گیا تھا؟ کہا: ہاں! تب اُن کے لیے دروازہ کھول دیا اور کہا: تم کو اور جو تمھارے ساتھ ہے اسے مرحبا۔ پھر جب آسمان پر مستوی ہوا، وہاں آدم علیہ السلام تھے، جبریل علیہ السلام نے مجھ سے کہا تو اپنے باپ پر سلام نہیں کرتا؟ میں نے کہا: ہاں! میں نے آ کر اُن کو سلام کیا، مجھ کو سلام کا جواب دیا اور کہا: اے میرے بیٹے اور نیک نبی تجھے مرحبا!۔

پھر مجھ کو دوسرے آسمان پر لے گئے اور دروازہ کھلوایا، کہا: تو کون ہے؟ کہا: جبریل ہوں، کہا: تیرے ہمراہ کون ہے؟ کہا: محمد ﷺ ہیں۔ کہا: کیا ان کی طرف پیغام بھیجا گیا ہے؟ کہا: ہاں! دروازہ کھول دیا اور کہا: تم کو اور جو تمھارے ساتھ ہے اسے مرحبا۔ وہاں عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کی خالہ کے بیٹے یحییٰ علیہ السلام تھے۔ پھر مجھ کو تیسرے آسمان پر چڑھا لے گئے، دروازہ کھلوانا چاہا، کہا: تو کون ہے؟ کہا میں جبریل ہوں، کہا: تیرے ساتھ کون ہے؟ کہا: محمد ﷺ ہیں۔ کہا: کیا اُن کے پاس بھیجا گیا تھا؟ کہا: ہاں، تب دروازہ کھول دیا اور کہا: تم کو اور جو تمھارے ساتھ ہے اسے مرحبا۔ وہاں یوسف علیہ السلام تھے۔ پھر چوتھے آسمان پر لے گئے، دروازہ کھلوانا چاہا، کہا: تو کون ہے؟ کہا: میں جبریل ہوں! کہا: تیرے ساتھ کون ہے؟ کہا: محمد ﷺ ہیں! کہا: کیا ان کی طرف پیغام بھیجا گیا ہے؟ کہا: ہاں! دروازہ کھول دیا اور کہا: تم کو اور جو تمھارے ساتھ ہے اسے مرحبا۔ وہاں ادریس علیہ السلام تھے۔ پھر مجھ کو پانچویں آسمان پر چڑھا لے گئے، دروازہ کھلوانا چاہا، کہا: تو کون ہے؟ کہا: جبریل، کہا: آپ کے ساتھ کون ہے؟ کہا: محمد ﷺ، کہا: کیا ان کی طرف پیغام بھیجا گیا ہے؟ کہا: ہاں، دروازہ کھول دیا اور کہا: تم کو اور جو تمھارے ساتھ ہے اسے مرحبا۔ وہاں ہارون علیہ السلام تھے، پھر چھٹے آسمان پر لے گئے، دروازہ کھلوانا چاہا، کہا: تو کون ہے؟ کہا: جبریل ہوں، کہا: تیرے ساتھ کون ہے؟ کہا: محمد ﷺ ہیں، کہا: کیا اُن کے پاس بھیجا گیا تھا؟ کہا: ہاں! دروازہ کھول دیا گیا اور کہا: مرحبا ہے تجھ کو اور اس کو جو تیرے ساتھ ہے۔ وہاں موسیٰ علیہ السلام تھے۔ پھر ساتویں آسمان پر چڑھا لے گئے اور دروازہ کھلوانا چاہا، کہا: تو کون ہے؟ کہا: میں جبریل ہوں، کہا: تمھارے ساتھ کون ہے؟ کہا: محمد ﷺ ہیں۔ کہا: کیا ان کی طرف پیغام بھیجا گیا ہے؟ کہا: ہاں! تب دروازہ کھول دیا اور کہا: تم کو اور جو تمھارے ساتھ ہے اسے مرحبا۔ وہاں ابراہیم علیہ السلام تھے۔ جبریل نے کہا: اے محمد! تم سلام نہیں کرتے اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام پر؟ میں

نے کہا: ہاں! پھر میں نے آ کر اُن کو سلام کیا، مجھ کو سلام کا جواب دیا اور کہا: اے میرے بیٹے اور نیک نبی! تجھے مرحبا۔

پھر جبریل علیہ السلام مجھ کو ساتویں آسمان کی پشت پر لے گئے، یہاں تک کہ ایک نہر پر پہنچے جس کے جام گوہر و یاقوت و زبرجد کے تھے اور اُس پر سبز پرندے تھے، بہتر سے بہتر پرندے جو میں نے دیکھے تھے، میں نے کہا: اے جبریل! یہ پرندے بہت بہتر ہیں، کہا: اے محمد! ان کو کھانے والا اُن سے بھی بہت اچھا ہے، پھر کہا: اے محمد! تو جانتا ہے کہ یہ کون سی نہر ہے؟ کہا: نہیں! کہا کہ یہ کوثر ہے، جو اللہ تعالیٰ نے تجھ کو دی ہے، اس میں سونے چاندی کے برتن تھے، وہ نہر یاقوت و زمرد کی کنکریوں پر جاری تھی، پانی اس کا دودھ سے زیادہ سفید تھا۔ میں نے سونے کا ایک پیالہ اٹھا کر اس میں سے پانی پیا، وہ شہد سے زیادہ میٹھا تھا اور کستوری سے زیادہ خوشبو دار۔ پھر مجھ کو لے کر چلے اور ایک درخت تک پہنچے، وہاں ایک بادل نے مجھ کو ڈھانپ لیا، اس میں ہر رنگ تھا، جبریل نے مجھ کو چھوڑ دیا، میں اللہ عزوجل کے لیے سجدے میں گرا، اللہ تعالیٰ نے مجھ سے کہا: اے محمد! میں نے جس دن آسمان اور زمین پیدا کیے تجھ پر اور تیری اُمت پر پچاس نمازیں فرض کیں، اب تو اور تیری اُمت اُن کے ساتھ قیام کرے۔ پھر وہ بادل مجھ سے کھل گیا، جبریل نے میرا ہاتھ پکڑا، میں جلدی سے پھرا اور ابراہیم علیہ السلام کے پاس آیا، انھوں نے کچھ نہ کہا، پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا، انھوں نے کہا: اے محمد! تم کیا کر آئے؟ میں نے کہا: مجھ پر اور میری اُمت پر پچاس نمازیں فرض ہوئی ہیں، کہا: تم اور تمھاری امت اس کی استطاعت نہ رکھے گی۔ تو اپنے رب کے پاس جا اور تخفیف کا سوال کر، میں جلد پھر کر درخت کے پاس پہنچا، ایک ابر نے مجھ کو ڈھانپ لیا، جبریل علیہ السلام نے مجھے چھوڑ دیا، میں سجدے میں گرا اور میں نے کہا: اے رب! تو نے مجھ پر اور میری اُمت پر پچاس نمازیں فرض کی ہیں، سو نہ میں کر سکوں اور نہ میری اُمت، تو اُن کو ہلکا فرما دے۔ فرمایا: میں نے تم سے دس نمازیں موقوف کر دیں، پھر وہ بادل کھل گیا، جبریل علیہ السلام نے میرا ہاتھ پکڑا، میں جلد پھر کر ابراہیم علیہ السلام کے پاس آیا، انھوں نے مجھ سے کچھ نہ فرمایا، جب موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچا تو انھوں نے کہا: اے محمد! تم کیا کر آئے؟ میں نے کہا: مجھ سے میرے رب نے دس نمازیں کم کر دیں، اب چالیس نمازیں ہیں، کہا نہ تجھ سے ہو سکیں اور نہ تیری اُمت سے۔ تو اپنے رب کے پاس جا اور تخفیف کا سوال کر۔ پھر ذکر کیا حدیث کو اسی طرح پانچ نماز تک، اور یہ پانچ پچاس ٹھہریں۔ موسیٰ علیہ السلام نے پھر کہا کہ پھر واپس جا کر اور تخفیف چاہو، میں نے کہا: مجھے اللہ تعالیٰ سے شرم آتی ہے۔ پھر میں نیچے اترا اور جبریل علیہ السلام سے کہا: یہ کیا بات ہے کہ میں جس آسمان والوں کے پاس آیا، سب نے مجھے مرحبا کہا اور ہنسے سوا ایک مرد کے کہ جب میں نے اس کو سلام کیا تو اس نے میرے سلام کا جواب دیا اور مرحبا کہا اور مجھے دیکھ کر ہنسا نہیں؟ کہا: اے محمد! یہ مالک جہنم کا خازن ہے، وہ جس دن سے پیدا ہوا ہے کبھی نہیں ہنسا اور اگر وہ کسی کے لیے ہنستا تو تم کو دیکھ کر ہنستا۔

پھر میں واپس آنے کے لیے سوار ہوا، بعض راستوں میں سے گزرا، ایک قافلہ قریش پر گزر ہوا جو طعام لادے ہوئے تھے، اُن میں ایک اونٹ پر غرارہ تھے، ایک سیاہ اور ایک سفید، جب اس اونٹ کا سامنا ہوا تو وہ بدک کر چکر مار کر گر پڑا اور ٹوٹ گیا۔ پھر نبی اکرم ﷺ وہاں سے چل دیے اور صبح ہوئی اور اس حال کی خبر دی۔ مشرکوں نے سنا اور ابوبکر کے پاس آئے اور کہا: اے ابوبکر! تجھے کچھ اپنے صاحب کی بھی خبر ہے کہ وہ کیا خبر دیتا ہے؟ کہتا ہے کہ وہ آج کی رات ایک ماہ کے راستے پر جا کر اسی رات میں واپس آیا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: اگر اس نے یہ بات کہی ہے تو وہ سچا ہے اور ہم تو اس کی اس بات میں بھی تصدیق کرتے ہیں، جو اس سے بھی زیادہ دور تر امر ہے۔ ہم اس کی تصدیق آسمانی خبر پر بھی کرتے ہیں۔ مشرکوں نے نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ تم جو کہتے ہو اس کی علامت کیا ہے؟ کہا: میرا گزر قریش کے ایک قافلے پر ہوا، فلاں فلاں جگہ اس قافلے کے اُونٹ ہم سے بھاگے اور چکر مارا، اُن میں سے ایک اونٹ پر دو غرارہ تھے، ایک سیاہ اور ایک سفید، وہ گر کر ٹوٹ گیا، جب قافلہ آیا تو لوگوں نے اُن سے حال پوچھا، انھوں نے اسی کے مطابق خبر دی جو بات نبی کریم ﷺ نے بیان کی تھی۔ اسی جگہ سے ابوبکر رضی اللہ عنہ کا نام صدیق ہوا۔ پھر نبی مکرم ﷺ سے سوال کیا کہ آیا اُن لوگوں میں سے جو تمھارے ساتھ حاضر ہوئے، موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام بھی تھے؟ کہا: ہاں! کہا: بھلا اُن کی صفت تو بیان کرو کہ کس شکل کے ہیں؟ کہا: اچھا موسیٰ علیہ السلام ایک گندم گوں مرد تھے، جیسے مرد ازدعمان کے اور عیسیٰ علیہ السلام ایک درمیانہ قد کے مرد سیدھے بال، جن پر سرخی چڑھی آتی تھی، گویا ان کے بالوں میں سے مونگے جھڑے پڑتے ہیں۔[1] (رواه ابن أبي حاتم وهذا سياق فيه غرائب عجيبة)

طریقِ دیگر:

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم کو مالک بن صعصعہ رضی اللہ عنہ نے حدیث بیان کی کہ نبی اکرم ﷺ نے شبِ اسراء کا قصہ لوگوں سے کہا اور فرمایا کہ میں حطیم میں تھا اور کبھی قتادہ رحمہ اللہ (راوی) نے کہا کہ حجر (حطیم) میں لیٹا ہوا تھا کہ اتنے میں ایک آنے والا آیا اور تین میں سے اپنے درمیان والے ساتھی سے کہنے لگا، کہا: وہ آیا اور اُس نے یہاں سے یہاں تک پھاڑ دیا یا چیر ڈالا۔ قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے جارود سے کہا اور میرے پہلو کے پاس تھے، اس کا کیا مطلب؟ کہا: کہ اس سے مراد یہ ہے کہ سینے کے کنارے سے لے کر زیرِ ناف تک اور میں نے ان کو یہ بھی کہتے ہوئے سنا ہے کہ سینے کی ہڈی سے لے کر پیٹ تک کا حصہ چاک کیا۔ پھر میرا دل نکالا اور سونے کا ایک طشت ایمان اور حکمت سے پر لا کر میرے دل کو دھویا، پھر اس کو ایمان و حکمت سے بھر کر ویسے ہی کر دیا جیسے پہلے تھا۔ پھر ایک سفید رنگ کا جانور لایا گیا جو خچر سے چھوٹا اور گدھے سے بڑا تھا۔ جارود نے کہا: وہ براق تھا، اے ابوحمزہ! کہا:

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۱۰۔ ۱۲) اس کی سند میں ''خالد بن یزید بن ابی مالک'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: الإسراء والمعراج (۱/ ٤٤۔ ٤٨)

ہاں اس کا قدم حدِ نگاہ تک پڑتا تھا، مجھ کو اس پر سوار کیا اور جبریل لے کر چلے، یہاں تک کہ آسمانِ دنیا پر پہنچے، دروازہ کھلوانا چاہا۔ کہا گیا: یہ کون ہے؟ کہا: جبریل! کہا: تیرے ساتھ کون ہے؟ کہا: محمد، کہا: کیا اس کی طرف بھیجا گیا تھا؟ کہا: ہاں! کہا: آپ کو خوش آمدید ہو۔ پھر دروازہ کھول دیا۔ جب میں پہنچا تو وہاں آدم علیہ السلام تھے، کہا: یہ تیرے باپ آدم ہیں، ان کو سلام کر، میں نے سلام کیا، انھوں نے سلام کا جواب دیا، پھر کہا: خوش آمدید اے صالح بیٹے اور صالح نبی!

پھر دوسرے آسمان پر چڑھ کر دروازہ کھلوانا چاہا، کہا: یہ کون ہے؟ کہا: جبریل! کہا: تیرے ساتھ کون ہے؟ کہا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم، کہا: کیا ان کی طرف پیغام بھیجا گیا ہے؟ کہا: ہاں! کہا: آپ کو خوش آمدید ہو۔ پھر دروازہ کھول دیا۔ جب ہم اندر پہنچے، وہاں عیسیٰ اور یحییٰ علیہما السلام تھے، یہ دونوں خالہ زاد بھائی ہیں۔ جبریل علیہ السلام نے کہا: یہ یحییٰ و عیسیٰ علیہما السلام ہیں، ان کو سلام کرو، میں نے سلام کیا، انھوں نے جواب دیا، پھر کہا: خوش آمدید اے نیک بھائی اور صالح نبی! پھر تیسرے آسمان پر چڑھے اور دروازہ کھلوانا چاہا، کہا: یہ کون ہے؟ کہا: جبریل ہے، کہا: تمھارے ہمراہ کون ہے؟ کہا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ کہا: کیا اُن کے پاس بھیجا گیا تھا؟ کہا: ہاں! کہا: آپ کو خوش آمدید ہو۔ پھر دروازہ کھول دیا، جب میں وہاں پہنچا تو وہاں یوسف علیہ السلام تھے، کہا: یہ یوسف علیہ السلام ہیں، ان کو سلام کرو، میں نے سلام کیا، انھوں نے سلام کا جواب دیا پھر کہا: خوش آمدید اے نیک بھائی اور صالح نبی! پھر چوتھے آسمان پر چڑھے اور دروازہ کھلوانا چاہا، کہا: یہ کون ہے؟ کہا: جبریل، کہا: تیرے ہمراہ کون ہے؟ کہا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، کہا: کیا ان کی طرف پیغام بھیجا گیا ہے؟ کہا: ہاں، کہا: آپ کو خوش آمدید ہو۔ پھر ہمارے لیے دروازہ کھول دیا، جب میں وہاں پہنچا، دیکھا ادریس علیہ السلام ہیں، کہا: یہ ادریس علیہ السلام ہیں، ان کو سلام کر، میں نے سلام کیا، انھوں نے جواب دیا اور کہا: خوش آمدید اے نیک بھائی اور صالح نبی! پھر اوپر چڑھے، یہاں تک کہ پانچویں آسمان تک پہنچے اور دروازہ کھلوانا چاہا، کہا: کون ہے؟ کہا: جبریل! کہا: تیرے ہمراہ کون ہے؟ کہا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم، کہا: کیا ان کے پاس بھیجا گیا تھا؟ کہا: ہاں! کہا: آپ کو خوش آمدید ہو۔ پھر ہمارے لیے دروازہ کھول دیا گیا، جب ہم وہاں پہنچے تو ہارون علیہ السلام تھے۔ کہا: یہ ہارون علیہ السلام ہیں، ان کو سلام کرو، میں نے سلام کیا، انھوں نے جواب دیا، پھر کہا: خوش آمدید اے نیک بھائی اور صالح نبی! پھر چھٹے آسمان پر چڑھے، دروازہ کھلوانا چاہا، کہا: کون ہے؟ کہا: جبریل ہے، کہا: تیرے ہمراہ کون ہے؟ کہا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ کہا: کیا ان کی طرف پیغام بھیجا گیا ہے؟ کہا: ہاں! کہا: آپ کو خوش آمدید ہو۔ اور دروازہ کھول دیا، جب میں وہاں پہنچا، موسیٰ علیہ السلام تھے۔ کہا: یہ موسیٰ علیہ السلام ہیں، ان کو سلام کرو، میں نے سلام کیا، انھوں نے جواب دیا اور پھر کہا: خوش آمدید اے نیک بھائی اور صالح نبی! جب میں اُن کو چھوڑ کر آگے بڑھا، وہ رونے لگے، کہا گیا: کیوں روتے ہو؟ کہا: اس لیے روتا ہوں کہ ایک لڑکا، جو میرے بعد مبعوث ہوا، اس کی اُمت میری اُمت سے زیادہ تر جنت میں داخل ہوگی۔

پھر ساتویں آسمان پر چڑھے اور دروازہ کھلوانا چاہا، کہا: یہ کون ہے؟ کہا: جبریل ہوں، کہا: تیرے ہمراہ کون ہے؟ کہا: محمد ﷺ ہیں، کہا: کیا ان کی طرف پیغام بھیجا گیا ہے؟ کہا: ہاں! کہا گیا: آپ کو خوش آمدید ہو۔ اور دروازہ کھول دیا، جب میں وہاں پہنچا ابراہیم علیہ السلام تھے۔ کہا: یہ ابراہیم علیہ السلام ہیں، ان کو سلام کرو، میں نے سلام کیا، انھوں نے جواب دیا، پھر کہا: خوش آمدید اے نیک بیٹے اور صالح نبی! پھر میں سدرۃ المنتہیٰ کی طرف اُٹھایا گیا، اس کے بیر ایسے تھے جیسے ہجر کے گھڑے، یعنی بہت بڑے بڑے اور اس کے پتے جیسے ہاتھیوں کے کان۔ کہا: یہ سدرۃ المنتہیٰ ہے، وہاں چار نہریں تھیں، دو باطن اور دو ظاہر، میں نے کہا: اے جبریل! یہ کیا ہیں؟ کہا: دو نہریں باطن کی جنت میں ہیں اور دو ظاہر کی نیل اور فرات ہیں۔ پھر بیت المعمور کو میرے پاس لایا گیا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم کو امام حسن رحمہ اللہ نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً حدیث بیان کی کہ نبی کریم ﷺ نے بیت المعمور کو دیکھا، اس میں ہر دن ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں، پھر اس میں لوٹ کر نہیں آتے۔

پھر قتادہ رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ حدیث کی طرف رجوع کیا اور کہا کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا کہ پھر میرے پاس ایک برتن شراب کا اور ایک دودھ کا اور ایک شہد کا لایا گیا، میں نے دودھ لیا۔ جبریل علیہ السلام نے مجھ سے کہا: یہ فطرت ہے، اس پر تو اور تیری اُمت ہے۔ پھر مجھ پر ہر دن میں پچاس نمازیں فرض ہوئیں، میں وہاں سے نیچے اترا اور موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا، موسیٰ نے کہا: تیرے رب نے تیری اُمت پر کیا فرض کیا؟ میں نے کہا: پچاس نمازیں ہر دن میں، کہا: تیری اُمت کو پچاس نماز کی استطاعت نہیں ہوگی اور میں نے تجھ سے پہلے لوگوں کو آزمایا ہے اور بنی اسرائیل کو خوب جانچا پرکھا ہے۔ تم اپنے رب کے پاس پھر جاؤ اور اپنی اُمت کے لیے تخفیف مانگو، میں پھر گیا، مجھ سے دس نمازیں کم کر دیں، پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا، انھوں نے پھر پوچھا: اب تجھ کو کیا حکم ہوا؟ میں نے کہا: ہر دن میں چالیس نمازیں رہ گئیں، کہا: آپ کی امت کو روزانہ چالیس نمازوں کی استطاعت نہ ہوگی، میں نے آپ سے پہلے لوگوں کو آزمایا اور بنی اسرائیل کو خوب جانچا پرکھا ہے۔ تو اپنے رب کی طرف رجوع کر اور اپنی اُمت کے لیے تخفیف مانگ۔ میں پھر گیا، مجھ سے دس نمازیں اور کم کر دیں، پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا، کہا: کیا حکم ملا ہے؟ میں نے کہا: مجھ کو تیس نماز کا حکم ہوا ہے، کہا: تیری اُمت تیس نمازیں ہر دن میں نہیں پڑھ سکتی اور میں نے تجھ سے پہلے لوگوں کی آزمایش کی ہے اور بنی اسرائیل کو خوب جانچا اور پرکھا ہے۔ لہٰذا اپنے رب کے پاس جائیں اور اپنی امت کے لیے تخفیف کا سوال کریں۔ میں پھر واپس گیا، دس نمازیں اور مجھ سے کم کیں۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا، کہا: اب تجھ کو کیا حکم ملا؟ میں نے کہا: ہر دن میں بیس نماز کا، کہا: آپ کی امت کو روزانہ بیس نمازوں کی بھی استطاعت نہ ہوگی، میں نے آپ سے پہلے لوگوں کو آزمایا اور بنی اسرائیل کو خوب جانچا پرکھا ہے۔ اپنے رب کے پاس پھر جاؤ اور اپنی

اُمت کے لیے تخفیف مانگو، میں پھر گیا۔ دس نمازیں اور کم کیں، پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا، کہا: کیا حکم ملا ہے؟ میں نے کہا: ہر دن میں دس نمازوں کا حکم ہوا ہے، کہا: تیری اُمت ہر دن دس نمازیں نہ پڑھ سکے گی، میں نے تجھ سے قبل لوگوں کا امتحان لیا تھا اور بنی اسرائیل کو خوب جانچا پرکھا ہے۔ تو اپنے رب کے پاس جا اور اپنی اُمت کے لیے تخفیف کا سوال کر، میں پھر گیا، مجھ کو ہر دن میں پانچ نمازوں کا حکم ہوا، میں پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا، کہا: تجھ کو کیا حکم ہوا؟ میں نے کہا: ہر دن میں پانچ نمازوں کا، کہا: آپ کی امت کو روزانہ پانچ نمازوں کی بھی استطاعت نہ ہوگی، میں نے آپ سے پہلے لوگوں کو آزمایا اور بنی اسرائیل کو خوب جانچا پرکھا ہے، لہٰذا آپ اپنے رب کے پاس جائیں اور اپنی امت کے لیے تخفیف کا سوال کریں۔ میں نے کہا: « قَدْ سَأَلْتُ رَبِّيْ حَتّٰى اسْتَحْيَيْتُ » [میں نے اپنے رب تعالیٰ سے بار بار سوال کیا ہے، حتی کہ اب مجھے شرم آتی ہے] لہٰذا میں اس پر راضی ہوں اور تسلیم کرتا ہوں، پھر ان کا نفاذ ہوا، ایک منادی نے مجھ کو ندا کی: « قَدْ أَمْضَيْتُ فَرِيْضَتِيْ وَ خَفَّفْتُ عَنْ عِبَادِيْ »[1] (رواه أحمد و أخرجاه في الصحيحين من حديث قتادة بنحوه) [میں نے اپنے فرض کو عائد کر دیا اور اپنے بندوں سے تخفیف کر دی]

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت:

اس روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ابوذر رضی اللہ عنہ حدیث بیان کرتے تھے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے گھر کی چھت کھول دی گئی جب کہ میں مکہ میں تھا، جبریل علیہ السلام اترے، میرا سینہ چاک کیا، پھر اس کو آبِ زمزم سے دھویا، پھر سونے کا ایک طشت لائے، جو حکمت اور ایمان سے بھرا ہوا تھا، وہ میرے سینے میں ڈال دیا، پھر سینے کو جوڑ دیا، پھر میرا ہاتھ پکڑ کر آسمانِ دنیا پر چڑھے، جب میں آسمان پر آیا تو جبریل علیہ السلام نے آسمان کے خازن سے کہا کہ دروازہ کھول، اس نے کہا: یہ کون ہے؟ کہا: میں جبریل ہوں، کہا: تیرے ہمراہ کوئی اور ہے؟ کہا: ہاں! میرے ہمراہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، کہا: کیا اُن کے پاس بھیجا گیا تھا؟ کہا: ہاں، جب دروازہ کھلا، ہم آسمانِ دنیا پر چڑھے، وہاں ایک مرد بیٹھا تھا، اس کی داہنی طرف کچھ بہت زیادہ تعداد تھی اور بائیں طرف کچھ بہت زیادہ تعداد، جب دائیں طرف دیکھتا تو ہنستا اور جب بائیں طرف نظر کرتا تو روتا۔ اس نے کہا: خوش آمدید اے صالح نبی اور صالح بیٹے! میں نے جبریل علیہ السلام سے کہا: یہ کون ہے؟ کہا: آدم علیہ السلام ہیں اور یہ دائیں اور بائیں بیٹھے ہوئے لوگ اُن کی اولاد کی روحیں ہیں۔ دائیں طرف والے اہلِ جنت میں سے ہیں اور بائیں طرف والے اہلِ نار۔ جب داہنی طرف نظر کرتے تو ہنستے ہیں اور جب بائیں طرف نگاہ کرتے ہیں تو روتے ہیں۔ پھر مجھ کو لے کر دوسرے آسمان پر چڑھے۔ خازنِ آسمان سے کہا: دروازہ کھول، خازن نے اسی طرح کہا: جس طرح پہلے خازن نے کہا تھا، پھر دروازہ کھول دیا۔

[1] مسند أحمد (٤/ ٢٠٨) صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٣٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٤)

سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے ذکر کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آسمانوں میں آدم، ادریس، موسیٰ، عیسیٰ، ابراہیم علیہم السلام کو پایا اور یہ بات ثابت نہیں کہ اُن کے منازل کس طرح پر تھے، ہاں یہ ذکر کیا کہ آدم علیہ السلام کو آسمانِ دنیا پر پایا اور ابراہیم علیہ السلام کو چھٹے آسمان پر۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب جبریل علیہ السلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر ادریس علیہ السلام پر سے گزرے، کہا: خوش آمدید اے صالح نبی اور صالح بھائی! میں نے کہا: یہ کون ہیں؟ کہا: ادریس علیہ السلام ہیں، پھر میرا گزر موسیٰ علیہ السلام پر ہوا، انھوں نے کہا: خوش آمدید اے صالح نبی اور صالح بھائی! میں نے کہا: یہ کون ہیں؟ کہا: یہ موسیٰ علیہ السلام ہیں، پھر میں عیسیٰ علیہ السلام پر سے گزرا، کہا: خوش آمدید اے صالح نبی اور صالح بھائی! میں نے کہا: یہ کون ہے؟ کہا: یہ عیسیٰ علیہ السلام ہیں، پھر ابراہیم علیہ السلام پر گزر ہوا، انھوں نے کہا: خوش آمدید اے صالح نبی اور صالح بیٹے! میں نے کہا: یہ کون ہیں؟ کہا ابراہیم علیہ السلام ہیں۔

امام زہری رحمہ اللہ نے کہا: مجھے ابن حزم رحمہ اللہ نے خبر دی کہ ابن عباس و ابوحبہ انصاری رضی اللہ عنہم یہ دونوں کہتے تھے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر مجھ کو اوپر لے گئے، یہاں تک کہ میں ایک برابر جگہ پر پہنچا، جہاں قلموں کی آواز سنتا تھا۔ ابن حزم رحمہ اللہ اور انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے میری اُمت پر پچاس نمازیں فرض کیں، میں وہاں سے واپس آیا، یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام پر سے گزرا، مجھ سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے تیری اُمت پر کیا فرض کیا؟ میں نے کہا: پچاس نمازیں فرض کیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اپنے رب کی طرف پھر جا، تیری اُمت اس کی طاقت نہیں رکھتی، میں نے مراجعت کی تو نصف نمازیں کم کر دیں، میں پھر کر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا اور کہا: نصف کم ہوگئیں، انھوں نے کہا: اپنے رب کی طرف پھر جا، تیری امت اس کی طاقت نہیں رکھتی۔ میں پھر گیا، فرمایا: نمازیں پانچ ہیں اور یہ پچاس کے بقدر ہیں۔ میں پھر کر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا، انھوں نے کہا: تم پھر اپنے رب کے پاس جاؤ، کہا: مجھے اپنے رب سے شرم آتی ہے۔ پھر مجھ کو جبریل علیہ السلام لے کر چلے اور سدرۃ المنتہیٰ پہنچے، اس کو طرح طرح کے رنگ ڈھانپے ہوئے تھے، میں نہیں جانتا کہ وہ رنگ کیا تھے، پھر میں جنت میں داخل کیا گیا، وہاں موتیوں کے گنبد تھے، اس کی مٹی مشک (کستوری) تھی۔[1] (هذا لفظ البخاري في كتاب الصلاة، ورواه في ذكر بني إسرائيل وفي الحج وفي أحاديث الأنبياء من طريق آخر عن يونس به، و رواه مسلم في صحيحه في كتاب الإيمان منه عن يونس به نحوه)

امام احمد رحمہ اللہ نے عبداللہ بن شقیق رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے ابو ذر رضی اللہ عنہ سے کہا: اگر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتا تو اُن سے سوال کرتا، کہا: تو کیا سوال کرتا؟ کہا: میں یہ پوچھتا کہ کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا؟ سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے یہ بات نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھی تھی، فرمایا: «قَدْ رَأَيْتُهُ نُوراً أَنَّى أَرَاهُ» [میں نے اس کا نور دیکھا ہے، میں اسے کیسے دیکھ سکتا ہوں؟] امام احمد رحمہ اللہ کی روایت میں اسی طرح مروی ہے۔ صحیح مسلم میں سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یوں ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ ''هَلْ رَأَيْتَ رَبَّكَ؟'' [کیا آپ نے اپنے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٢، ١٥٥٥، ٣١٦٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٣)

رب تعالیٰ کو دیکھا ہے؟] فرمایا: « نُورٌ أَنّٰى أَرَاهُ » [اللہ تعالیٰ کی ذات تو نور ہے، میں اسے کیسے دیکھ سکتا ہوں؟] محمد بن بشار رحمہ اللہ نے سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ روایت کیے ہیں: ''سَأَلْتُ فَقَالَ: « رَأَيْتُ نُورًا »'' [1] [میں نے نور دیکھا تھا]

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے گھر کی چھت کشادہ ہوگئی جب کہ میں مکے میں تھا۔ جبریل علیہ السلام آئے اور میرا سینہ شگاف کیا، پھر اس کو آبِ زمزم سے دھویا، پھر سونے کا ایک طشت لائے، جو حکمت اور ایمان سے پر تھا، اسے میرے سینے میں خالی کیا، پھر سینے کو جوڑ دیا۔ پھر میرا ہاتھ پکڑ کر آسمان پر لے گئے۔ جب آسمانِ دنیا پر آئے، ایک مرد تھا، اس کی دائیں طرف بہت سے لوگ تھے اور بائیں طرف بہت سے لوگ تھے۔ وہ جب دائیں طرف نظر کرتا تو مسکراتا اور جب بائیں طرف نظر کرتا تو روتا۔ اس نے کہا: خوش آمدید اے صالح نبی اور صالح بیٹے! میں نے جبریل علیہ السلام سے کہا: یہ کون ہیں؟ کہا: آدم علیہ السلام ہیں اور یہ لوگ، جو اُن کی دائیں اور بائیں طرف ہیں، ان کی اولاد کی روحیں ہیں۔ دائیں طرف والے اہلِ جنت ہیں اور بائیں طرف والے اہلِ نار۔ یہ جب دائیں طرف دیکھتے ہیں تو ہنستے ہیں اور جب بائیں طرف دیکھتے ہیں تو روتے ہیں۔ پھر مجھے جبریل علیہ السلام دوسرے آسمان پر چڑھا لے گئے اور خازن سے کہا: دروازہ کھول، اس نے وہی کہا جو آسمانِ دنیا کے خازن نے کہا تھا، پھر دروازہ کھول دیا گیا۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے ذکر کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آسمانوں میں آدم، ادریس، موسیٰ اور ابراہیم علیہم السلام کو پایا اور مجھ کو تحقیقی طور پر نہ بتلایا کہ اُن کے منازل کس طرح پر ہیں، سوائے اس کے کہ یہ ذکر کیا کہ آدم علیہ السلام کو آسمانِ دنیا پر پایا اور ابراہیم علیہ السلام کو چھٹے آسمان پر۔ جب جبریل علیہ السلام اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ادریس علیہ السلام پر سے ہوا تو انھوں نے کہا: خوش آمدید اے صالح نبی اور صالح بھائی! میں نے کہا: اے جبریل! یہ کون ہیں؟ کہا: یہ ادریس علیہ السلام ہیں، پھر میرا گزر موسیٰ علیہ السلام پر سے ہوا، انھوں نے کہا: خوش آمدید اے صالح نبی اور صالح بھائی! میں نے کہا: یہ کون ہیں؟ کہا: موسیٰ علیہ السلام ہیں، پھر عیسیٰ علیہ السلام پر سے گزر ہوا، کہا: خوش آمدید اے صالح نبی اور صالح بھائی! میں نے کہا: یہ کون ہیں: کہا: عیسیٰ بن مریم ہیں، پھر ابراہیم علیہ السلام پر سے گزرا، کہا: خوش آمدید اے صالح نبی اور صالح بیٹے! میں نے کہا: یہ کون ہیں؟ کہا: ابراہیم علیہ السلام ہیں۔

ابن شہاب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مجھے خبر دی ابن حزم نے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ابوحبہ انصاری رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: « ثُمَّ عُرِجَ بِي حَتّٰى ظَهَرْتُ لِمُسْتَوًى أَسْمَعُ صَرِيفَ الْأَقْلَامِ » [پھر مجھے اور اوپر لے جایا گیا حتی کہ میں ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں میں قلموں کی آوازیں سن رہا تھا] ابن حزم رحمہ اللہ اور سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میری اُمت پر پچاس نمازیں فرض کیں۔ میں یہ حکم لے کر واپس لوٹا تو میرا گزر موسیٰ علیہ السلام پر سے ہوا، موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ''ماذا فرض ربك على أمتك؟'' [اللہ تعالیٰ نے

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٨) مسند أحمد (٥/ ١٤٧)

آپ کی امت پر کیا فرض کیا ہے؟] میں نے کہا: ان پر پچاس نمازیں فرض کی ہیں، موسیٰ علیہ السلام نے مجھ سے کہا: ”ارجع إلىٰ ربك فإن أمتك لا تطيق ذلك“ [اپنے رب تعالیٰ کے پاس جا کر تخفیف کا سوال کرو، آپ کی امت اس کی استطاعت نہ رکھے گی] میں نے اپنے رب تعالیٰ سے مراجعت کی، نصف نمازیں کم کر دی گئیں، میں موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا اور یہ خبر دی، کہا: پھر اپنے رب کے پاس جاؤ، تمھاری اُمت کو اس کی طاقت نہیں ہے، میں پھر گیا، فرمایا: یہ پانچ ہیں اور یہی پچاس ہیں، میرے پاس بات نہیں بدلتی، میں پھر کر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا، کہا: پھر اپنے رب کے پاس جاؤ، میں نے کہا: مجھے اپنے رب سے شرم آتی ہے۔ پھر جبریل علیہ السلام مجھ کو لے کر چلے، میں سدرۃ المنتہیٰ تک آیا، اس کو مختلف رنگوں نے ڈھانپا ہوا تھا، میں نہیں جانتا کہ وہ کیا تھے، پھر میں جنت میں داخل ہوا، وہاں موتی کے گنبد تھے، اس کی مٹی مشک تھی۔[1] (هكذا رواه عبد الله بن أحمد في مسند أبيه وليس هو في شيئ من الكتب الستة وقد تقدم في الصحيحين عن أنس عن أبي ذر مثل هذا السياق سواه. فالله أعلم) سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس رات مجھ کو لے گئے، اس رات جبریل نے صخرہ بیت المقدس پر اپنی انگلی رکھی، اس میں سوراخ ہو گیا، اس سے براق کو باندھا۔[2] (رواه الحافظ أبوبكر البزار وقال: لا نعلم هذا الحديث إلا عن بريدة وقد رواه الترمذي في التفسير من جامعه وقال: غريب)

سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا، فرماتے تھے کہ جب قریش نے مجھ کو جھٹلایا جب کہ مجھے راتوں رات بیت المقدس کو لے گئے، میں حجر میں کھڑا ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے میرے لیے بیت المقدس کو ظاہر کر دیا، میں ان کو خبر دینے لگا اور میں بیت المقدس کی طرف نظر کرتا تھا۔[3] (رواه أحمد و أخرجاه في الصحيحين من طريق الزهري به)

سعید بن المسیب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب بیت المقدس کو پہنچے، وہاں ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کو دیکھا اور دو پیالے آپ کے پاس لائے گئے، ایک ساغر شراب کا اور دوسرا ساغر دودھ کا، آپ نے دونوں کی طرف نظر کی، پھر دودھ کا پیالہ لے لیا۔ جبریل علیہ السلام نے کہا: آپ نے درست کام کیا اور فطرت کی طرف آپ کی راہنمائی کی گئی، اگر تو شراب کا پیالہ لیتا تو تیری اُمت بہک جاتی، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کو پھر آئے اور خبر دی کہ مجھے رات کو لے گئے تھے، بہت سے لوگ فتنے میں پڑ گئے، جنھوں نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی تھی۔ ابن شہاب رحمہ اللہ نے کہا کہ ابوسلمہ بن عبد الرحمٰن کہتے تھے کہ قریش کے کچھ لوگوں نے تیاری کی یا سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف جا کر کوئی اس طرح کا کلمہ کہا، چنانچہ کہنے لگے: کیا آپ اپنے ساتھی کی اس بات کو کبھی سچ مانیں گے کہ وہ کہتے ہیں کہ وہ ایک ہی

---

[1] مسند أحمد (٥/ ١٤٣) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”رجاله رجال الصحيح“ (مجمع الزوائد: ١/ ٢٣٤)

[2] مسند البزار (١٠/ ٢٨٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٣٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٤٨٧)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٧٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٠) مسند أحمد (٣/ ٣٧٧)

رات میں بیت المقدس جا کر مکہ میں واپس بھی آ گئے ہیں؟ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا انھوں نے یہ بات کہی ہے؟ کہا: ہاں! کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات فرمائی ہے تو سچ فرمایا ہے۔ کہا: کیا تو اس کی تصدیق کرتا ہے کہ وہ ایک رات میں شام کو گیا اور پھر صبح سے پہلے مکے میں پھر کر آ گیا؟ کہا: ہاں، میں تو آپ کی اس سے بھی بڑی بات کی تصدیق کرتا ہوں، یعنی میں اس بات کی تصدیق کرتا ہوں کہ آپ کے پاس آسمان سے وحی آتی ہے۔ ابوسلمہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اسی وجہ سے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو صدیق کے نام سے موسوم کیا گیا۔ ابوسلمہ رحمہ اللہ نے کہا: میں نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کو سنا، وہ کہتے تھے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا فرماتے تھے: «لَمَّا كَذَّبَتْنِي قُرَيْشٌ حِيْنَ أُسْرِيَ بِيْ إِلَى بَيْتِ الْمَقْدِسِ، قُمْتُ فِي الْحِجْرِ فَجَلَى اللّٰهُ لِيَ الْبَيْتَ الْمَقْدَسَ، فَطَفِقْتُ أُخْبِرُهُمْ عَنْ آيَاتِهِ وَأَنَا أَنْظُرُ إِلَيْهِ»[1] (رواه البيهقي بسنده) [جب مجھے بیت المقدس کی سیر کرائی گئی تو قریش نے میری تکذیب کی، میں حجر میں کھڑا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے بیت المقدس دکھا دیا، میں اس وقت بیت المقدس کو دیکھ رہا تھا اور قریش کو اس کی نشانیوں کے بارے میں بتا رہا تھا]

زر بن حبیش رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کے پاس آیا جب کہ وہ اسرا کا ذکر کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم چلے یہاں تک کہ بیت المقدس میں آئے۔ (یہ مقولہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے) پس دونوں اس جگہ داخل نہ ہوئے، (یہ مقولہ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کا ہے) میں نے کہا: بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وہاں اس شب داخل ہوئے اور نماز پڑھی، کہا: اے اصلع! تیرا کیا نام ہے کہ میں تیری صورت پہچانتا ہوں، لیکن یہ نہیں جانتا کہ تیرا نام کیا ہے، میں نے کہا: زر بن حبیش ہوں، کہا: تو نے کس طرح جانا کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رات وہاں نماز پڑھی؟ میں نے کہا: قرآن مجھ کو اس بات کی خبر دیتا ہے، کہا: جس نے تکلم کیا قرآن کے ساتھ وہ رستگار ہوا، پڑھ۔ میں نے کہا: ﴿ سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا ﴾ [بني إسرائيل: ١] ''پاک ہے وہ (اللہ) جو اپنے بندے کو رات کے ایک حصے میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا۔'' کہا: اے اصلع! کیا تو اس میں یہ بات پاتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں نماز پڑھی۔ میں نے کہا: نہیں، کہا: واللہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رات وہاں نماز نہیں پڑھی اور اگر پڑھتے تو تم پر وہاں کا نماز پڑھنا فرض ہو جاتا، جس طرح کہ بیتِ عتیق میں تم پر نماز پڑھنا لکھا گیا ہے۔ اللہ کی قسم! وہ دونوں براق پر ہی رہے، یہاں تک کہ آسمان کے دروازے ان کے لیے کھل گئے اور انھوں نے جنت اور جہنم دیکھ لی اور آخرت کے وعدے کی اور تمام چیزیں بھی۔ پھر ویسے کے ویسے ہی لوٹ آئے۔ پھر ہنسے، یہاں تک کہ میں نے ان کے دانت دیکھے، کہا: کہتے ہیں کہ براق کو باندھ دیا تھا کہ کہیں بھاگ نہ جائے، حالاں کہ مسخر نہیں کیا تھا اس کو مگر عالمِ غیب و شہادۃ نے۔ میں نے کہا: اے عبداللہ! براق کیسا دابہ ہے؟ کہا: ایک دراز سفید جانور ہے، اس کا

[1] دلائل النبوة (٢/ ٣٥٩۔ ٣٦٠) یہ روایت مرسل ہے۔

قدم حدِ نگاہ پر پڑتا ہے۔[1] (رواه أحمد و رواه أبو داود الطيالسي و الترمذي و حسنه و النسائي) اور یہ قول حذیفہ رضی اللہ عنہ کا ہے اور جس کو غیر حذیفہ رضی اللہ عنہ نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت کیا ہے کہ دابہ کو حلقے سے مربوط کیا اور بیت المقدس میں نماز پڑھی اور وہ جو گزر چکا اور جو آئے گا، وہ ان کے قول پر مقدم ہے۔ والله أعلم بالصواب.

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کے اصحاب نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہم کو شبِ اسراء کے بارے میں خبر دیں، جس میں آپ کو لے گئے تھے، فرمایا: "قال الله عزوجل ﴿ سُبْحٰنَ الَّذِيْۤ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ ... ﴾" پھر یہ خبر دی کہ میں مسجد حرام میں عشا کے وقت سو رہا تھا کہ اتنے میں ایک آنے والا آیا، اس نے مجھ کو جگایا، میں جاگ اُٹھا اور کوئی چیز نہ دیکھی، مگر اچانک ایک خیالی شکل نظر آئی، میں نے اس کے پیچھے اپنی نگاہ لگائی، یہاں تک کہ مسجد سے باہر نکلا، پھر یکا یک ایک جانور دیکھا، جو تمھارے جانوروں میں سے خچر کے تقریباً برابر تھا، اس کے دونوں کان مضطرب تھے، اس کو براق کہتے ہیں، مجھ سے پہلے انبیا علیہم السلام اسی پر سوار ہوتے تھے، اس کا سم اس کے حدِ نگاہ پر پڑتا ہے، میں اس پر سوار ہوا اور چلا کہ اتنے میں ایک پکارنے والے نے میرے دائیں طرف سے پکارا کہ اے محمد! مجھے مہلت دے کہ میں تجھ سے کچھ پوچھوں اے محمد! مجھے مہلت دے کہ میں تجھ سے کچھ پوچھوں۔ میں نے کچھ جواب نہ دیا اور نہ میں کھڑا ہوا۔ اس دوران کہ میں چلا جاتا تھا کہ ایک پکارنے والے نے میرے بائیں طرف سے پکارا: اے محمد! مجھے مہلت دے کہ میں تجھ سے کچھ پوچھوں۔ میں نے جواب نہ دیا اور نہ میں پھرا۔ میں رواں تھا کہ اتنے میں ایک عورت ملی، دونوں بازوں ننگے اور اس پر ہر طرح کی زینت تھی جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے، اس نے کہا: اے محمد! مجھے مہلت دے کہ میں تجھ سے کچھ پوچھوں۔ میں نے اس کی طرف کچھ توجہ نہ کی اور نہ ہی اس پر ٹھہرا، یہاں تک کہ بیت المقدس میں آیا، میں نے اپنے دابہ کو اس حلقے سے باندھا جس سے انبیا باندھتے تھے۔ جبریل علیہ السلام میرے پاس دو برتن لائے: ایک شراب کا، دوسرا دودھ کا۔ میں نے دودھ پیا اور شراب سے انکار کیا، جبریل علیہ السلام نے کہا: آپ نے فطرت پالی، میں نے کہا: "الله أكبر، الله أكبر!"

جبریل علیہ السلام نے کہا کہ آپ نے اپنی اس حالت میں کیا دیکھا؟ میں نے کہا: میں چلا جاتا تھا کہ اتنے میں میرے دائیں طرف سے ایک پکارنے والے نے کہا کہ "يا محمد أنظرني أسألك" یعنی مجھے مہلت دے کہ تجھ سے میں کچھ پوچھوں، میں نے اس کو کوئی جواب نہ دیا اور نہ ہی اس کے پاس ٹھہرا، کہا یہ داعی الیہود تھا، اگر تو کچھ جواب دیتا یا اس کے پاس ٹھہرتا تو تیری اُمت یہودی ہو جاتی۔ پھر کہا کہ میں چلا جا رہا تھا کہ ایک پکارنے والے نے بائیں طرف سے مجھ کو پکارا: اے محمد! مجھے مہلت دے کہ میں تجھ سے کچھ پوچھوں۔ میں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ

---

[1] مسند أحمد (٥/ ٣٨٧) مسند الطيالسي (١/ ٥٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٤٧) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٧٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٨٧٤)

کی اور نہ ہی اس کے پاس ٹھہرا، کہا: یہ داعی نصاریٰ تھا، اگر تو اس کو جواب دیتا تو تیری اُمت نصرانی ہو جاتی۔ کہا: پھر میں راہ پر جا رہا تھا کہ اتنے میں ایک عورت دونوں بازو کھولے ہوئے ملی، اس پر ہر زینت تھی، جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے، وہ کہنے لگی: اے محمد! مجھے مہلت دے کہ میں تجھ سے کچھ پوچھوں۔ میں نے کچھ جواب نہ دیا اور نہ ہی اس کے پاس ٹھہرا۔ کہا: یہ دنیا تھی، اگر تو اس کو جواب دیتا یا رُکتا تو تیری اُمت دنیا کو آخرت پر اختیار کر لیتی۔

آپ ﷺ نے فرمایا: پھر میں اور جبریل دونوں بیت المقدس میں داخل ہوئے، ہم میں سے ہر ایک نے دو رکعت نماز پڑھی، پھر میرے پاس وہ معراج، یعنی سیڑھی لائی گئی جس پر بنی آدم کی روحیں اوپر چڑھتی ہیں۔ خلائق نے اس سے بہتر کوئی سیڑھی نہیں دیکھی۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ جب مردے کی نظر شق ہوتی ہے تو وہ آسمان کی طرف لگ جاتی ہے، یہ نگاہ کا پھٹ کر آسمان کی طرف لگ جانا، اس سیڑھی کے حسن اور عجب کی وجہ سے ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: پھر میں اور جبریل دونوں چڑھے، مجھ کو ایک فرشتہ ملا جس کو اسماعیل کہتے تھے، وہ آسمانِ دنیا کا صاحب تھا، اس کے ساتھ ستر ہزار فرشتے تھے اور ہر فرشتے کے ساتھ ایک لاکھ فرشتوں کا لشکر تھا، کہا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ﴾ [المدثر: ۳۱] ''اور آپ کے رب کے لشکروں کو بس وہی جانتا ہے۔''

جبریل علیہ السلام نے آسمان کا دروازہ کھلوانا چاہا، کہا گیا: کون ہے؟ کہا: جبریل ہوں! کہا گیا: تیرے ساتھ کون ہے؟ کہا: محمد ﷺ ہیں، کہا گیا: کیا ان کی طرف پیغام بھیجا گیا ہے؟ کہا: ہاں! یکا یک مجھے آدم علیہ السلام ملے، اسی ہیئت پر جس دن کہ اللہ عزوجل نے ان کو ان کی صورت پر پیدا کیا تھا، اُن پر اُن کی مومن اولاد کی روحیں پیش کی جاتی تھیں، وہ کہتے تھے یہ روحِ طیب و نفسِ طیب ہے، اس کو لے جا کر علیین میں رکھو، پھر فاجر اولاد کی روحیں پیش کی جاتی تھیں، وہ کہتے یہ روحِ خبیث اور نفسِ خبیث ہے، اس کو سجین میں رکھو۔ میں وہاں سے ذرا سا چلا کہ اتنے میں کچھ خوان ملے، ان پر گوشت کے ٹکڑے تھے، کوئی ان کے پاس نہ جاتا۔ پھر دوسرے خوان ملے، جن پر بدبودار گوشت تھا، اس کے پاس کچھ لوگ تھے جو اُس میں سے کھاتے تھے۔ میں نے کہا: اے جبریل! یہ کون لوگ ہیں؟ کہا کہ یہ تیری اُمت کے وہ لوگ ہیں جو حرام کھاتے ہیں اور حلال کو چھوڑ دیتے ہیں۔ فرمایا پھر میں ذرا سا چلا، کچھ لوگ دیکھے جن کے مسافر ایسے تھے جیسے اونٹ کے مسافر، ان کے منہ پھاڑ کر اُن میں اس گوشت کا لقمہ دیا جاتا تھا، وہ ان کی نیچے کی جگہ سے باہر نکلتا تھا۔ میں نے ان کا چیخنا اور اللہ عزوجل کی طرف فریاد کرنا سنا اور جبریل علیہ السلام سے کہا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ کہا یہ تیری اُمت کے وہ لوگ ہیں جو ظلم کے ساتھ یتیموں کا مال کھاتے ہیں: ﴿ اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۭ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ﴾ [النساء: ۱۰] ''وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں اور وہ جلد دہکتی آگ میں داخل ہوں گے۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: پھر میں وہاں سے چلا کہ مجھے عورتیں ملیں، جو چھاتی کے بل لٹک رہی تھیں، میں نے اللہ

عزوجل کی طرف اُن کی فریاد سنی اور جبریل علیہ السلام سے پوچھا: یہ کون عورتیں ہیں؟ کہا: یہ تیری اُمت کی زنا کار ہیں۔ پھر ذرا سا چلا کہ کچھ لوگ ملے، جن کے پیٹ گھروں کی طرح تھے، ان میں جب کوئی کھڑا ہوتا تو گر پڑتا اور کہتا اے اللہ! تو قیامت قائم نہ کر، فرمایا وہ سابلہ (جانور) آلِ فرعون پر تھے، سابلہ آتا اور اُن کو روندتا۔ میں نے ان کو سنا کہ وہ اللہ کی طرف فریاد کرتے ہیں۔ میں نے کہا: اے جبریل! یہ کون لوگ ہیں؟ کہا: یہ تیری اُمت کے وہ لوگ ہیں جو سود کھاتے ہیں۔ ﴿ لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ﴾ [البقرۃ: ۲۷۵] ''وہ (قیامت کے دن) اس شخص کی طرح کھڑے ہوں گے جسے شیطان نے چھو کر بدحواس کر دیا ہو۔'' پھر ذرا سا آگے چلا تو کچھ قومیں دیکھیں کہ اُن کے پہلوؤں سے گوشت کا ٹکڑا ان کو لقمہ دیتے اور کہا جاتا ہے کہ اس کو کھا جس طرح کہ تو اپنے بھائی کا گوشت کھاتا تھا۔ میں نے کہا: اے جبریل! یہ کون لوگ ہیں؟ کہا: تیری اُمت کے عیب جو اور غیبت کرنے والے ہیں۔

پھر ہم دوسرے آسمان پر چڑھے، وہاں اللہ عزوجل کی بہترین مخلوق میں سے ایک مرد تھا، وہ لوگوں پر حسن میں اس طرح بڑھا ہوا تھا جس طرح چودھویں رات کا چاند دوسرے ستاروں سے زیادہ چمک دار ہوتا ہے۔ میں نے کہا: اے جبریل! یہ کون ہیں؟ کہا: یہ تیرا بھائی یوسف علیہ السلام ہے اور اُن کے ساتھ اُن کی قوم کے کچھ لوگ تھے، میں نے ان کو سلام کیا، انھوں نے مجھ کو سلام کا جواب دیا۔ پھر میں تیسرے آسمان پر چڑھا اور دروازہ کھلوایا، وہاں یحییٰ اور عیسیٰ علیہما السلام ملے، اُن کے ساتھ کچھ اُن کی قوم کے لوگ تھے، میں نے ان کو سلام کیا، انھوں نے مجھ کو جواب دیا۔ پھر میں چوتھے آسمان پر چڑھا، وہاں ادریس علیہ السلام ملے۔ قد رفعه الله مكانا عليا۔ میں نے ان کو سلام کیا، انھوں نے مجھے جواب دیا۔ پھر میں پانچویں آسمان پر چڑھا، وہاں ہارون علیہ السلام تھے، ان کی نصف ڈاڑھی سفید اور نصف سیاہ تھی، اتنی لمبی تھی لگتا تھا کہ ان کی ڈاڑھی ناف پر جا لگے، میں نے کہا: اے جبریل! یہ کون ہیں؟ کہا: یہ اپنی قوم کے دوست دار ہارون بن عمران علیہ السلام ہیں اور اُن کے ساتھ کچھ لوگ اُن کی قوم کے تھے، میں نے ان پر سلام کیا، انھوں نے جواب دیا۔

پھر میں چھٹے آسمان پر چڑھا، وہاں موسیٰ بن عمران علیہ السلام ملے، ایک مرد گندمی رنگ زیادہ بالوں والے، اگر اُن پر دو قمیص ہوتے، تب بھی بال ان کی قمیص میں گھس جاتے۔ وہ کہنے لگے: لوگ خیال کرتے ہیں کہ میں اللہ تعالیٰ کے ہاں ان سے بڑے مرتبے کا ہوں، حالانکہ یہ مجھ سے بڑے رتبے کے ہیں۔ میں نے جبریل علیہ السلام سے کہا: یہ کون ہیں؟ کہا: یہ تیرا بھائی موسیٰ بن عمران علیہ السلام ہے۔ ان کے ساتھ اُن کی قوم کے کچھ لوگ تھے، میں نے ان کو سلام کیا، انھوں نے جواب دیا۔ پھر میں ساتویں آسمان پر چڑھا، وہاں میرے باپ ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام تھے جو اپنی پشت سے بیت المعمور کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے تھے، بہت اچھے مرد۔ میں نے کہا: اے جبریل! یہ کون ہیں؟ کہا: یہ تمھارے باپ ابراہیم خلیل الرحمٰن علیہ السلام ہیں اور اُن کے ہمراہ اُن کی قوم کے کچھ لوگ تھے، میں نے ان کو سلام کیا، انھوں نے سلام کا جواب دیا۔ اتنے میں مَیں نے اپنی اُمت کو دو حصوں میں دیکھا: ایک حصے پر سفید کپڑے، گویا وہ کاغذ ہیں، دوسرے

حصے پر سیاہ کپڑے تھے۔ پھر میں بیت المعمور میں داخل ہوا اور میرے ہمراہ وہ لوگ داخل ہوئے جن پر سفید کپڑے تھے اور دوسرے لوگ جن پر سیاہ کپڑے تھے وہ پردے میں رہے اور وہ بھی خیر پر تھے۔

پھر میں نے اور جو لوگ میرے ساتھ تھے انھوں نے بیت المعمور میں نماز پڑھی، پھر میں اور وہ لوگ باہر آئے۔ فرمایا: بیت المعمور میں ہر روز ستر ہزار فرشتے نماز پڑھتے ہیں اور قیامت کے دن تک وہ دوبارہ نہیں آتے۔ پھر میں سدرۃ المنتہیٰ کی طرف اُٹھا لیا گیا۔ اس کا ہر پتا قریب تھا کہ اس اُمت کو چھپا لے۔ اس میں ایک چشمہ جاری تھا جس کو سلسبیل کہتے ہیں، اس سے پھوٹ کر دو نہریں نکلی ہیں: ایک کوثر اور دوسری نہر رحمت۔ میں اس میں نہایا، میرے اگلے پچھلے گناہ بخش دیے گئے۔ پھر میں جنت کی طرف اُٹھا لیا گیا، میرے سامنے ایک جاریہ آئی، میں نے کہا: اے جاریہ! تو کس کے لیے ہے؟ کہا: زید بن حارثہ کے لیے۔ وہاں پانی کی نہریں تھیں جو بدبودار نہ تھا اور دودھ کی نہریں تھیں جن کا مزہ نہ بدلا تھا اور شراب کی نہریں تھیں جو پینے والوں کے لیے لذت دار تھیں اور صاف شہد کی نہریں تھیں، وہاں کے انار جیسے بڑا ڈول اور پرندے جیسے بختی اونٹ۔

یہ ذکر کر کے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ اللّٰهَ قَدْ أَعَدَّ لِعِبَادِهِ الصَّالِحِيْنَ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ» [بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ نعمتیں تیار کی ہیں جو نہ کسی آنکھ نے دیکھیں، نہ کسی کان نے سنیں اور نہ کسی انسان کے دل پر ان کا خیال تک گزرا] پھر کہا: مجھ پر دوزخ پیش کی گئی، اس میں اللہ کا غضب، غصہ اور عذاب تھا۔ اس میں اگر پتھر اور لوہا ڈالا جائے تو وہ آگ اس کو کھا لے، وہ پھر بند کر دی گئی۔ پھر میں سدرۃ المنتہیٰ کی طرف بلند کیا گیا، اس نے مجھ کو ڈھانپ لیا، میرے اور اس کے درمیان دو کمان کے برابر یا اس سے بھی کم فاصلہ تھا، فرمایا: اس کے ہر پتا پر ایک فرشتہ نازل تھا۔ فرمایا: اور مجھ پر پچاس نمازیں فرض ہوئیں اور کہا کہ تجھ کو ہر نیکی دس گنی ہے، جب تو نے نیکی کا ارادہ کیا اور وہ نیکی نہ کی تو تیرے لیے ایک نیکی لکھی گئی اور جب تو نے وہ نیکی کی تو دس نیکیاں لکھی گئیں اور جب تو نے بدی کا ارادہ کیا اور وہ بدی نہ کی تو وہ تجھ پر نہ لکھی گئی اور اگر وہ بدی کی تو تجھ پر ایک بدی لکھی گئی۔ پھر میں موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا، انھوں نے کہا: ”فَبِمَا أَمَرَكَ رَبُّكَ؟“ ”تجھے تیرے رب نے کیا حکم کیا؟“ میں نے کہا: پچاس نمازیں۔ کہا: پھر اپنے رب کے پاس جا اور اپنی اُمت کے لیے تخفیف مانگ، تیری اُمت اس کی طاقت نہیں رکھتی ہے اور وہ کب انکار نہ کرے گی۔ میں اپنے رب کے پاس گیا، میں نے کہا: اے رب! میری اُمت سے تخفیف کر کہ وہ تمام اُمتوں میں سے سب سے زیادہ ضعیف ہے، مجھ سے دس نمازیں کم کیں اور چالیس ٹھہرائیں، میں ہمیشہ موسیٰ علیہ السلام اور اپنے رب کے درمیان آتا جاتا رہا، جب میں اُن کے پاس آتا تو مجھ سے ویسی ہی بات کہتے، یہاں تک کہ جب میں لوٹ کر اُن کے پاس آیا، مجھ سے کہا: ”بما أمرت“ ”تجھے کس چیز کا حکم ہوا“ میں نے کہا: دس نمازوں کا حکم ہوا ہے، کہا: اپنے رب کے پاس جا اور اپنی

اُمت کے لیے تخفیف کا سوال کر، میں اپنے رب کے پاس گیا اور میں نے کہا: اے رب! میری اُمت سے تخفیف کر، وہ کمزور ترین اُمت ہے، مجھ سے پانچ نمازیں کم کر لی گئیں اور پانچ رکھیں، اس وقت ایک فرشتے نے مجھے پکار کر کہا: میرا فریضہ پورا ہوگیا، میں نے اپنے بندوں پر تخفیف کر دی اور انھیں ہر نیکی کے بدلے اس جیسی دس نیکیاں دیں۔ پھر میں موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا، مجھ سے پوچھا: تم کو کیا حکم ملا؟ میں نے کہا: پانچ نمازوں کا۔ کہا: پھر اپنے رب کے پاس جا اور اپنی امت کے لیے تخفیف مانگ، تیری امت اس کی طاقت نہیں رکھتی ہے۔ میں نے کہا: میں اپنے رب تعالیٰ کے پاس بار بار گیا اب تو جاتے ہوئے مجھے کچھ شرم سے محسوس ہوتی ہے۔

پھر نبی مکرم ﷺ نے مکے میں صبح کی، اُن کو اُن عجیب وغریب باتوں کی خبر دی کہ میں آج کی رات بیت المقدس گیا اور مجھ کو آسمان پر لے گئے اور میں نے یہ دیکھا۔ ابو جہل بن ہشام نے کہا: تم لوگ تعجب نہیں کرتے کہ محمد کیا کہتے ہیں کہ ان کا یہ اعتقاد ہے کہ وہ آج کی رات بیت المقدس گئے اور پھر صبح ہمارے پاس کی۔ اپنی سواری کو ایک ماہ کے جانے کے راستے پر اور ایک ماہ کے واپسی کے راستے پر لے گئے اور یہ دو ماہ کا راستہ ایک رات میں طے کر لیا۔ نبی کریم ﷺ نے خبر دی کہ انھوں نے قریش کا ایک قافلہ فلاں فلاں جگہ پر دیکھا تھا اور اُن کا اونٹ بدکا تھا، جب میں واپس آ رہا تھا تو میں نے اس قافلے کو عقبہ کے پاس پایا تھا۔ پھر ہر شخص اور اس کے اونٹ کا حال بیان کیا، وہ اس طرح تھا اور اس کا سرمایہ یہ یہ تھا۔ ابو جہل نے کہا: یہ ہم کو بہت سی چیزوں کی خبر دیتے ہیں، ان میں سے ایک شخص نے کہا کہ میں بیت المقدس کے بارے میں سب سے زیادہ علم رکھتا ہوں کہ اس کی بنیاد کیسی ہے، اس کی ہیئت کیسی ہے، اس کے پاس پہاڑ کیسے ہیں۔ تب نبی مکرم ﷺ کے لیے بیت المقدس اسی نشست کی جگہ پر بلند کر دیا گیا۔ نبی اکرم ﷺ نے اس کی طرف نظر کی جیسے کوئی ہم میں سے دیکھتا ہے اور فرمایا: اس کی بنیاد اس طرح ہے اور اس کی ہیئت اس طرح ہے اور اُس کے پاس فلاں فلاں پہاڑ ہیں۔ اس مرد نے کہا: آپ نے سچ کہا، پھر وہ اُن کے پاس لیا اور کہا محمد ﷺ اپنی بات میں سچے ہیں، یا ایسا ہی کچھ کہا۔ (رواه البيهقي في كتاب دلائل النبوة، و كذا رواه الإمام أبو جعفر بن جرير بطوله بطريقين، و رواه ابن حاتم فذكره بسياق طويل حسن أنيق أجود مما ساقه غيره على غرابته وما فيه من النكارة، ثم ذكره البيهقي أيضا من طريق عمارة بن جوين وهو مضعف عند الأئمة) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ہم نے باوجود اس کی غربت اور نکارت اور ضعف کے اس لیے بیان کیا ہے کہ اس میں اور احادیث کے بہت سے شواہد ہیں۔[1]

اور جس کو امام بیہقی رحمہ اللہ نے یزید بن ابی الحکیم سے روایت کیا ہے کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کو خواب میں

[1] دلائل النبوة (٢/ ٣٩٠۔ ٣٩٦) تفسير الطبري (١٧/ ١٣٤٤۔ ٣٤٦) تفسير ابن كثير (٣/ ١٨۔ ٢١) اس کی سند میں ''ابو ہارون عمارہ بن جوین'' سخت ضعیف راوی ہے۔

دیکھا اور کہا: اے اللہ کے رسول! ایک شخص آپ کی اُمت کا ہے، اس کو سفیان ثوری کہتے ہیں۔ اس میں کوئی حرج تو نہیں ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس نے ہم کو حدیث بیان کی ہے ابو ہارون عبدی سے، اس نے ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے، اس نے آپ سے جس رات کہ آپ کو لے گئے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ میں نے آسمان میں دیکھا، پھر ساری حدیث بیان کی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: ہاں! میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! آپ کی اُمت کے کچھ لوگ اس رات کے جانے میں عجیب وغریب باتیں بیان کرتے ہیں۔ فرمایا: ہاں، وہ قصہ گولوگوں کی باتیں ہیں۔[1]

سیدنا شداد بن اوس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے کہا: اے اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ آپ کو راتوں رات کس طرح لے گیا؟ فرمایا: میں نے عشا کی نماز مکے میں اپنے اصحاب کے ساتھ تاخیر سے ادا کی۔ جبریل علیہ السلام ایک سفید دابہ لے کر آئے، جو گدھے سے بڑا اور خچر سے چھوٹا تھا اور مجھ سے کہا: سوار ہو، اس نے شوخی کی، اس کا کان مروڑا، پھر مجھ کو اس پر سوار کیا، وہ مجھ کو لے کر چلا، اس کا سم وہاں پر پڑتا تھا جہاں اس کی نگاہ پہنچتی تھی، یہاں تک کہ ہم ایک نخل دار زمین پر پہنچے، مجھ کو اُتار کر کہا، نماز پڑھ، میں نے نماز پڑھی، کہا: تجھے معلوم ہے کہ تو نے کہاں نماز پڑھی؟ میں نے کہا: "الله أعلم". کہا: یثرب میں نماز پڑھی، طیبہ میں نماز پڑھی، پھر وہ دابہ مجھ کو لے کر چلا، اس کا سم وہاں پڑتا تھا جہاں اس کی نظر منتہی ہوتی۔ پھر ہم ایک زمین پر پہنچے، کہا: اتر، پھر کہا: نماز پڑھ، میں نے نماز پڑھی، کہا: تجھے معلوم ہے کہ تو نے کس جگہ نماز پڑھی؟ میں نے کہا: اللہ جانے۔ کہا: مدین میں نماز پڑھی، شجرۂ موسیٰ کے نزدیک۔ پھر وہ دابہ مجھ کو لے کر چلا، اس کا سم وہاں پڑتا جہاں نگاہ پڑتی، پھر ہم ایک زمین پر پہنچے، وہاں کے محل ظاہر ہوئے، کہا: اُتر، میں اترا، کہا: نماز پڑھ، میں نے نماز پڑھی، کہا تجھے معلوم ہے کہ تو نے کہاں نماز پڑھی ہے؟ میں نے کہا: اللہ جانے، کہا یہ نماز بطنِ لحم میں پڑھی ہے، جہاں عیسیٰ مسیح بن مریم علیہما السلام پیدا ہوئے تھے۔

پھر مجھ کو لے چلے یہاں تک کہ شہر میں اس کے بابِ یمانی سے داخل ہوئے، پھر مسجد کے قبلے کے پاس آ کر دابہ کو اس سے باندھ دیا اور ہم مسجد میں داخل ہوئے، اس دروازے سے جس میں سورج اور چاند جھکتا ہے۔ پھر میں نے مسجد میں نماز پڑھی، جہاں اللہ تعالیٰ نے چاہا اور مجھ کو سخت پیاس لگی۔ میرے پاس دو پیالے لائے گئے: ایک دودھ کا دوسرا شہد کا، یہ دونوں میرے پاس اکٹھے بھیجے گئے، میں نے دونوں میں برابری کی، پھر اللہ عزوجل نے مجھے ہدایت دی، میں نے دودھ والا پیالہ لے لیا اور اُسے پیا، میرے ماتھے پر پسینہ آ گیا، میرے سامنے ایک بوڑھا آدمی ایک جگہ پر اپنا تکیہ لگائے بیٹھا تھا، اس نے کہا: تیرے صاحب نے فطرت کو لیا، وہ راہ یاب ہوگیا۔ پھر مجھ کو لے کر چلے، یہاں تک کہ ہم ایک وادی میں پہنچے، وہاں جہنم تھی جو سخت دہکتے ہوئے انگارے کی طرح تھی۔ میں نے کہا: اے

---

[1] دلائل النبوۃ (۲/ ٤٠٥) اس کی سند میں ''ابو ہارون عبدی'' سخت ضعیف راوی ہے۔

اللہ کے رسول! آپ نے اس کو کیسا پایا؟ کہا: میں نے اسے ایک گرم ڈنک کی طرح پایا۔ پھر ہم کو لے کر چلا، پھر ہمارا گزر فلاں جگہ میں قریش کے ایک قافلے پر سے ہوا، انھوں نے اپنا اونٹ گم کر دیا تھا، اس کو فلاں نے جمع کیا، میں نے اس کو سلام کیا۔ بعض نے کہا: یہ محمد ﷺ کی آواز ہے۔

پھر میں صبح کو اپنے اصحاب کے پاس آ گیا مکہ میں۔ میرے پاس سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے اور کہا کہ اے اللہ کے رسول! آج رات آپ کہاں تھے؟ میں نے آپ کو آپ کی ممکنہ جگہوں میں تلاش کیا۔ فرمایا: کیا تجھے معلوم ہے کہ میں آج کی رات بیت المقدس گیا تھا؟ کہا: اے اللہ کے رسول! وہ تو ایک ماہ کا راستہ ہے، مجھ سے آپ وہاں کا وصف بیان کریں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میرے لیے ایک راستہ کھول دیا گیا، گویا میں اس کی طرف دیکھتا ہوں، مجھ سے کسی شے کا سوال نہیں کیا، لیکن میں نے اس کی خبر دی۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں۔ مشرکوں نے کہا کہ ابن ابی کبشہ کی طرف دیکھو کہ یہ کہتا پھرتا ہے کہ آج کی رات بیت المقدس گیا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کی ایک نشانی، جو میں تم سے کہتا ہوں، یہ ہے کہ میرا گزر تمھارے ایک قافلے پر سے فلاں فلاں جگہ ہوا اور ان کے اونٹ کھو گئے تھے، فلاں نے اُن کو جمع کیا اور وہ راستے سے فلاں فلاں جگہ پر اُتریں گے اور فلاں فلاں دن تمھارے پاس آئیں گے، ان کے آگے ایک اونٹ گندم گوں ہوگا، اس پر سیاہ ٹاٹ ہے اور سیاہ رنگ کے غرارے ہیں، جب وہ دن آیا لوگ جھانکنے تاکنے لگے، جب دوپہر قریب ہوئی، قافلہ آیا اُن کے آگے وہی اُونٹ تھا، جس کا ذکر کیا تھا۔ (هكذا رواه البيهقي من طريقين عن أبي إسماعيل الترمذي، ثم قال بعد تمامه: هذا إسناد صحيح، وروى ذلك مفرقا من أحاديث غيره، ونحن نذكر من ذلك إن شاء الله تعالىٰ ما حضرنا ـ ثم ساق أحاديث كثيرة في الإسراء كالشاهد لهذا الحديث، وقد روى هذا الحديث عن شداد بن أوس بطوله الإمام أبو محمد عبد الرحمن بن أبي حاتم في تفسيره عن أبيه عن إسحاق بن إبراهيم بن العلاء الزبيدي، ولا شك أن هذا الحديث أعني الحديث المروي عن شداد بن أوس مشتمل على أشياء، منها ما هو صحيح كما ذكره البيهقي، و منها ما هو منكر كالصلاة في بيت لحم و سؤال الصديق عن نعت بيت القدس و غير ذلك. والله أعلم)[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جس رات نبی مکرم ﷺ کو لے گئے، آپ ﷺ جنت میں گئے، اس کی ایک جانب کچھ آواز سنی۔ کہا: اے جبریل! یہ کیا ہے؟ کہا: یہ آواز بلال رضی اللہ عنہ مؤذن کی ہے، جب نبی مکرم ﷺ لوگوں کے پاس آئے تو کہا: بلال کامیاب ہوگیا، میں نے اسے اس اس طرح دیکھا ہے۔ پھر نبی کریم ﷺ کو موسیٰ علیہ السلام ملے، انھوں نے کہا: نبی امی کو مرحبا ہو۔ فرمایا: وہ ایک گندمی آدمی، دراز قد، سر کے بال سیدھے اور اُن کے کانوں تک تھے، یا کانوں کے اوپر۔ میں نے کہا: جبریل! یہ کون ہیں؟ کہا: موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ پھر چلے ایک شیخ جلیل رعب دار سے ملے، انھوں نے خوش آمدید کہا اور اُن پر سلام کیا اور سب پر نبی اکرم ﷺ سوال کرتے تھے۔ کہا: اے جبریل! یہ

[1] دلائل النبوة (٢/ ٣٥٥۔ ٣٥٧)

کون ہیں؟ کہا: یہ آپ کے باپ ابراہیم ہیں۔ پھر دوزخ میں نظر کی کہ ایک قوم مردار کھا رہی تھی۔ کہا: اے جبریل! یہ کون ہیں؟ کہا: یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے ہیں۔ ایک مرد دیکھا سخت سرخ اور ازرق نیلا۔ کہا: اے جبریل! یہ کون ہے؟ کہا: یہ صالح علیہ السلام کی اونٹنی کی کھونچیں کاٹنے والا ہے۔

جب نبی مکرم ﷺ مسجد اقصیٰ میں آئے، کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگے، وہاں سارے پیغمبروں نے آپ کے ساتھ نماز پڑھی۔ جب پھرے تو دو پیالے لائے گئے: ایک دائیں طرف سے اور دوسرا بائیں طرف سے، ایک میں دودھ اور دوسرے میں شہد تھا۔ آپ ﷺ نے دودھ لے کر پیا۔ اس شخص نے، جس کے ہاتھ میں وہ پیالہ تھا، کہا: آپ نے فطرت کو اختیار فرمایا ہے۔[1] (رواه أحمد و إسناده صحيح و لم يخرجوه)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو راتوں رات بیت المقدس لے گئے، پھر اسی رات آ کر اپنے جانے کا اور بیت المقدس کی نشانیوں اور قافلے کا ذکر کیا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ ہم محمد ﷺ کی تصدیق نہیں کرتے، اس قول میں وہ مرتد ہو کر کافر ہو گئے، اللہ نے ان سب کی گردنیں ابوجہل کے ہمراہ (غزوۂ بدر میں) ماریں۔ ابوجہل نے کہا تھا: محمد ہم کو زقوم کے درخت سے ڈراتے ہیں، تم کھجور اور مکھن ملا کر زقوم بناؤ۔ نبی مکرم ﷺ نے دجال کو اس کی صورت میں اپنی آنکھ سے دیکھا، یہ دیکھنا خواب میں نہ تھا۔ اسی طرح عیسیٰ، موسیٰ اور ابراہیم علیہم السلام کو دیکھا۔ نبی کریم ﷺ سے دجال کے بارے میں یہ سوال کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: میں نے اسے دیکھا کہ وہ بہت بھاری بھرکم عظیم الجثہ، چاند کی طرح روشن رو تھا، ایک آنکھ اس کی قائم تھی جیسے چمک دار تارا ہو، گویا بال اس کے سر کے جیسے درخت کی شاخیں۔ میں نے عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ سفید رنگ کے نوجوان تھے، ان کے سر کے بال گھنگریالے، نظر بہت تیز اور پیٹ کے دبلے پتلے تھے۔ میں نے موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ لحیم و شحیم، گندمی رنگ اور زیادہ بالوں والے اور خوب صورت بالوں والے مضبوط جسم کے مالک تھے۔ اور نظر کی میں نے ابراہیم علیہ السلام کی طرف۔ میں نے اُن کے کسی عضو کو نہ دیکھا، مگر ایسے لگا، جیسے میں خود ہوں، یہاں تک کہ وہ تمھارے اس صاحب (نبی) کی طرح ہیں۔ جبریل علیہ السلام نے کہا کہ سلام کرو اپنے باپ کو، میں نے ان کو سلام کیا۔[2] (رواه أحمد والنسائي وهو إسناد صحيح)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میں نے شبِ اسراء میں موسیٰ بن عمران علیہ السلام کو دیکھا، وہ ایک دراز قد اور گھنگھریالے بالوں والے تھے، گویا وہ ازدشنوءہ کے لوگوں جیسے ایک شخص ہیں اور دیکھا

---

[1] مسند أحمد (١/ ٢٥٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٣٧٢)

[2] مسند أحمد (١/ ٣٧٤) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤٥٦) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: الإسراء والمعراج (١/ ٧٤۔ ٧٦)

میں نے عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو میانہ خلق سرخ وسفید، سیدھے بالوں والے تھے۔ جہنم کے داروغہ مالک اور دجال کو ان نشانیوں کے ساتھ دیکھا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول محمد ﷺ کو دکھائیں۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ فَلَا تَكُن فِي مِرْيَةٍ مِّن لِّقَائِهِ ﴾ [السجدة: ۲۳] ''لہٰذا (اے نبی!) آپ اس کی ملاقات کے متعلق شک میں نہ رہیں۔'' امام قتادہ رحمہ اللہ اس کی یہ تفسیر کرتے تھے کہ نبی کریم ﷺ نے موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا۔ ﴿ وَجَعَلْنَاهُ هُدًى لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ ﴾ [السجدة: ۲۳] ''اور ہم نے اسے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا۔''[1] (رواہ البیهقي و رواہ مسلم مختصراً)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے مرفوعاً کہا ہے کہ جب رات گئے مجھے لے گئے تو ایک خوشبو کا گزر مجھ پر سے ہوا، میں نے کہا: یہ خوشبو کیسی ہے؟ کہا: یہ فرعون کی بیٹی کی ماشطہ (کنگھی کرنے والی) اور اس کی اولاد کی جگہ تھی۔ اس کے ہاتھ سے کنگھی گر گئی تھی، اس نے کہا: ''بسم اللہ'' بنتِ فرعون نے کہا: اللہ تو میرا باپ ہی ہے؟ وہ بولی: میرا رب اور تیرا رب اور تیرے باپ کا رب اللہ ہے۔ فرعون نے اس کو بلا کر کہا: ''أَلَكِ رَبٌّ غَيْرِيْ؟'' ''کیا میرے علاوہ تیرا کوئی اور رب ہے؟'' اس نے کہا: ہاں، میرا اور تیرا رب اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ فرعون نے حکم دیا کہ تانبے کی گاؤ گرم کرو، پھر حکم دیا کہ اس کو اس میں ڈال دو۔ ماشطہ نے کہا: مجھے تجھ سے کچھ حاجت ہے، کہا: کیا؟ کہا: تو میری ہڈیاں اور میری اولاد کی ہڈیاں ایک جگہ کر دینا۔ اس نے کہا: خیر اسی طرح ہوگا، تیرا ہم پر حق ہے، پھر حکم دیا، ایک ایک کو اس میں ڈالا، یہاں تک کہ ایک شیر خوار کی نوبت آئی جو اُن میں تھا، اس نے کہا: گر پڑ، رُک مت، تو حق پر ہے۔ فرمایا: بات کی چار لڑکوں نے مہد میں اور وہ صغیر تھے: ایک یہ، دوسرے شاہدِ یوسف، تیرے صاحبِ جریج اور چوتھے عیسیٰ بن مریم علیہما السلام نے۔[2] (رواہ البیهقي و إسنادہ لا بأس به ولم یخرجوہ)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: رات مجھ کو لے گئے، میں نے صبح مکہ میں کی، میں گھبرایا اور میں نے جانا کہ لوگ مجھ کو جھٹلائیں گے، پھر کنارہ کر کے غمگین بیٹھے۔ اللہ کے دشمن ابوجہل کا گزر ہوا، وہ آ کر نبی اکرم ﷺ کے پاس بیٹھا اور استہزا کے طور پر کہا کہ کچھ شے ہے؟ کہا: ہاں! کہا: کیا ہے؟ کہا: آج کی رات مجھ کو یہاں سے لے گئے، کہا: کہاں؟ فرمایا: بیت المقدس کی طرف، کہا: پھر تم نے ہمارے درمیان صبح کی؟ کہا: ہاں! اس نے نہ دیکھا کہ نبی اکرم ﷺ کو جھٹلائے اس ڈر سے کہ کہیں وہ قوم کے سامنے اس بات کا انکار نہ کر جائیں، کہا: اگر میں تیری قوم کو بلاؤں تو تُو اُن سے بھی یہی بات کہے گا جو مجھ سے کہی ہے؟ فرمایا: ہاں! کہا: اے گروہ بنی کعب بن لوی! آؤ، لوگ اپنی اپنی مجلسوں سے اُٹھ کر آئے اور اُن دونوں کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ ابوجہل نے کہا: اب ان سے وہی ذکر کرو جو مجھ سے کیا ہے، فرمایا: آج کی رات مجھے یہاں سے لے گئے، کہا: کدھر؟ فرمایا: بیت المقدس کی

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۶۵) دلائل النبوۃ (۲/ ۳۸۶)

[2] شعب الإیمان (۲/ ۲۴۳) اس کی سند میں ''عطاء بن سائب'' مختلط راوی ہے۔ ضعیف الجامع، رقم الحدیث (۴۷۷۲)

طرف، کہا: پھر تم صبح کو ہمارے درمیان میں آ گئے؟ کہا: ہاں! کسی نے تالی بجائی اور کسی نے تعجب سے اپنے سر پر ہاتھ رکھا اور آپ ﷺ کو جھوٹا سمجھا۔ کہا: بھلا تم ہم سے مسجد اقصیٰ کا حال بیان کر سکتے ہو؟ ان میں ایک ایسا شخص بھی تھا جس نے اس شہر کا سفر کیا تھا اور مسجد دیکھی تھی۔ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: میں حال بیان کرنے لگا، یہاں تک کہ مسجد کے بعض اوصاف مجھے یاد نہیں رہے تھے۔ فرمایا: مسجد کو لے آئے، میں اس کی طرف دیکھتا تھا، یہاں تک کہ اس مسجد کو عقیل یا عقال کے گھر سے بھی زیادہ قریب رکھ دیا۔ میں نے اس کا حال بیان کیا اور مسجد کو دیکھتا جاتا تھا، فرمایا: اس کے ہمراہ وہ بیان بھی تھا جو مجھ کو یاد نہ تھا، قوم نے کہا: آپ نے اوصاف تو صاف صاف اور ٹھیک ٹھیک بتائے۔[1] (رواه أحمد وأخرجه النسائي والبيهقي)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جب نبی کریم ﷺ کو راتوں رات لے گئے اور سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے، یہ چھٹے آسمان پر ہے، اسی تک وہ چیز منتہی ہوتی ہے جو اس طرف چڑھتی ہے، یہاں تک کہ اس سے لے لی جاتی ہے اور یہیں پر وہ چیز نہایت پذیر ہوتی ہے جو اُترتی ہے اس کے اوپر سے، یہاں تک کہ لے لی جائے۔ ﴿ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ﴾ [النجم: ١٦] ''اس وقت بیری پر چھا رہا تھا جو کچھ چھا رہا تھا۔'' سونے کے پتنگے اس کو ڈھانپے ہوئے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کو وہاں پانچ نمازیں دی گئیں اور خواتیم سورت بقرہ اور جو شخص اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا اس کے کبیرہ گناہ بخشے گئے۔[2] (رواه البيهقي، و رواه مسلم في صحيحه) امام بیہقی رحمہ اللہ نے کہا: ''هذا الذي ذكره ابن مسعود طرف من حديث المعراج، و قد رواه أنس بن مالك عن مالك بن صعصعة عن النبي ﷺ، ثم عن أبي ذر عن النبي، ثم رواه مرة مرسلا من دون ذكرهما، ثم إن البيهقي ساق الأحاديث الثلاثة كما تقدم، وقد روي عن ابن مسعود بأبسط من هذا وفيه غرابة، و ذلك فيما رواه الحسن بن عرفة في جزئه المشهور'' [سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جو یہ روایت ذکر کی ہے، یہ معراج کی حدیث کا ایک ٹکڑا ہے، اسے انس بن مالک نے مالک بن صعصعہ عن النبی سے بیان کیا ہے، پھر ابو ذر عن النبی سے اور پھر ایک دفعہ ان دونوں کا ذکر کیے بغیر اسے مرسل بھی روایت کیا ہے۔ پھر امام بیہقی رحمہ اللہ نے ان تینوں احادیث کو ذکر کیا ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس سے زیادہ تفصیلی روایت بھی مروی ہے، لیکن اس میں غرابت ہے۔ حسن بن عرفہ نے اپنے مشہور جزء میں اسے وارد کیا ہے]

اس روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ابو ظبیان جنبی رحمہ اللہ نے کہا کہ ہم ابو عبیدہ بن عبداللہ بن مسعود اور محمد بن سعد بن ابی وقاص رحمہ اللہ کے پاس بیٹھے تھے۔ محمد بن سعد رحمہ اللہ نے ابو عبیدہ رحمہ اللہ سے کہا: تم ہم کو اپنے باپ سے اس شب

---

[1] مسند أحمد (١/ ٣٠٩) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٧٧) دلائل النبوة (٢/ ٣٦٣۔ ٣٦٤) السلسلة الصحيحة، رقم (٣٠٢١)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٣) دلائل النبوة (٢/ ٣٧٢۔ ٣٧٣)

کے بارے میں حدیث ذکر کرو جس میں نبی مکرم ﷺ کو لے گئے تھے۔ ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا: نہیں بلکہ تم حدیث بیان کرو ہم کو اپنے باپ سے۔ محمد رحمہ اللہ نے کہا کہ اگر تم مجھ سے میرے سوال کرنے سے پہلے کہتے تو میں ہی بیان کرتا۔ تب ابو عبیدہ رحمہ اللہ اپنے باپ سے حدیث بیان کرنے لگے، جس طرح کہ اُن سے سوال کیا گیا تھا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میرے پاس جبریل علیہ السلام ایک دابہ لائے، جو گدھے سے بڑا اور خچر سے چھوٹا تھا، پھر مجھ کو اس پر سوار کیا، پھر مجھے لے چلے۔ وہ دابہ جس گھاٹی پر چڑھتا، اس کے دونوں پاؤں دونوں ہاتھوں کے ساتھ برابر ہو جاتے اور جب نیچے اترتا تو بھی دونوں پاؤں دونوں ہاتھوں کے ساتھ برابر ہو جاتے اور مل جاتے، یہاں تک کہ ہم ایک دراز قد سیدھے بالوں والے گندم گوں رنگ والے مرد کے پاس سے گزرے، گویا وہ از دِشنوءہ کے مردوں کی طرح ہے۔ وہ بلند آواز سے کہتا تھا: تو نے اسکا اکرام کیا اور اسے فضیلت عطا فرمائی۔ ہم کو اس کی طرف بھیجا، ہم نے اس کو سلام کیا، اس نے سلام کا جواب دیا، کہا: تیرے ساتھ کون ہے اے جبریل!؟ کہا: یہ احمد ﷺ ہیں، کہا: نبی امی عربی کو مرحبا ہو، جس نے اپنے رب کی رسالت پہنچائی اور اپنی امت کی خیر خواہی کی۔ کہا: پھر ہم وہاں سے چلے، میں نے کہا: اے جبریل! یہ کون تھے؟ کہا: یہ موسیٰ بن عمران علیہ السلام تھے۔ میں نے کہا: یہ ایسے لفظوں میں کس سے باتیں کر رہے تھے؟ کہا: اپنے رب سے آپ کے بارے میں۔ میں نے کہا: کیا اپنی آواز اپنے رب پر اونچی کرتے تھے؟ کہا: اللہ تعالیٰ کو ان کی تیزی معلوم ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: پھر ہم وہاں سے چلے، یہاں تک کہ ایک درخت پر سے گزرے، گویا اس کے پھل چراغ تھے، اس کے نیچے ایک بزرگ شیخ اور ان کے عیال تھے، جبریل نے کہا: جاؤ اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کے پاس اور اُن کو سلام کرو، ہم نے اُن کو سلام کیا اور انھوں نے سلام کا جواب دیا۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا: اے جبریل! یہ تیرے ساتھ کون ہے؟ کہا: کہا: یہ آپ کے لڑکے احمد علیہ السلام ہیں، تب کہا: نبی امی کو مرحبا ہو، جس نے اپنے رب کی رسالت پہنچائی اور اپنی امت کی خیر خواہی کی۔ اے میرے بیٹے! تو آج کی رات اپنے رب سے ملنے والا ہے اور تیری اُمت آخری اور کمزور ترین اُمت ہے۔ خیال رکھنا ایسے ہی کام ہوں جو ان پر آسان رہیں۔ (هكذا في ابن كثير) فرمایا: پھر ہم وہاں سے چلے، یہاں تک کہ مسجد اقصیٰ پہنچے، میں نے اتر کر دابہ کو بابِ مسجد کے حلقے سے باندھا، جس سے انبیا باندھا کرتے تھے اور مسجد میں داخل ہوا، پیغمبروں کو پہچانا، کوئی قیام کی حالت میں تھا، کوئی رکوع کی اور کوئی سجدے کی حالت میں تھا۔ پھر میرے پاس دو پیالے لائے گئے: ایک شہد کا، ایک دودھ کا، میں نے دودھ کا پیالہ لے لیا۔ جبریل علیہ السلام نے میرے کندھے پر مارا اور کہا: رب محمد کی قسم! تو فطرت کو پہنچ گیا۔ پھر نماز قائم ہوئی، میں نے اُن سب کی امامت کی، پھر ہم وہاں سے لوٹ آئے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: یہ اسناد غریب ہے، انھوں نے اس کی تخریج نہیں کی۔ اس میں غرائب ہیں، جیسے:

انبیا کا ابتداً نبی کریم ﷺ سے سوال کرنا، پھر نبی اکرم ﷺ کا ان کے حال کے بارے میں لوٹ جانے کے بعد سوال کرنا۔ مشہور یہ ہے جس طرح کہ صحاح میں گزر چکا ہے کہ نبی مکرم ﷺ کو پہلے جبریل علیہ السلام بتا دیتے تھے، تاکہ نبی کریم ﷺ اُن کو پہچان کر سلام کریں۔ اس میں مسجد اقصیٰ میں داخل ہونے سے پہلے انبیا علیہم السلام کے ساتھ اکٹھا ہونا آیا ہے اور صحیح یہ ہے کہ اُن کے ساتھ اجتماع آسمان میں ہوا تھا۔ پھر ثانیاً بیت المقدس میں آئے اور وہ سب نبی مکرم ﷺ کے ہمراہ تھے، ان کو نماز پڑھائی، پھر براق پر سوار ہو کر مکہ کی طرف رجوع کیا۔ واللہ أعلم.[1]

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ میں نے شبِ معراج میں ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کو دیکھا، انھوں نے قیامت کے قائم ہونے کے خاص وقت کی بابت مذاکرہ کیا، پھر سب نے اپنے معاملے کو ابراہیم علیہ السلام کی طرف لوٹایا اور ابراہیم علیہ السلام نے کہا: مجھے اس کا کچھ علم نہیں ہے اور موسیٰ علیہ السلام کے حوالے کیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: مجھے اس کا کچھ علم نہیں۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام کی طرف لوٹایا، عیسیٰ علیہ السلام نے کہا: اس کے صحیح وقت کا علم تو بجز اللہ کے کسی کو نہیں۔ ہاں میرے رب نے مجھ سے عہد کیا ہے کہ دجال نکلے گا اور میرے ساتھ دو قضیب (درخت کی ٹہنی) ہوں گی، جب وہ مجھ کو دیکھے گا تو جیسے سیسہ پگھلتا ہے اس طرح وہ پگھل جائے گا، اللہ اس کو ہلاک کر دے گا جب کہ وہ مجھے دیکھے گا، یہاں تک کہ شجر اور حجر کہے گا: اے مسلمان! میرے نیچے کافر ہے، آ اُسے قتل کر۔ اللہ تعالیٰ اُن سب کو ہلاک کر دے گا، پھر لوگ اپنے شہروں اور وطنوں کی طرف چلے جائیں گے۔ اس وقت یاجوج ماجوج نکلیں گے ﴿وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ﴾ [الأنبياء: ٩٦] ''اور وہ ہر بلندی سے تیزی سے (دوڑتے) آئیں گے۔'' وہ اُن کے شہروں کو پامال کر ڈالیں گے اور جس شے پر اُن کا آنا ہوگا، اس کو برباد کر دیں گے اور کسی پانی پر نہیں گزریں گے، مگر اس کو پی جائیں گے، پھر لوگ میرے پاس آ کر شکایت کریں گے، میں اُن پر بد دعا کروں گا اور اللہ اُن کو ہلاک کر دے گا اور مار ڈالے گا، یہاں تک کہ زمین اُن کی بدبو سے بھر جائے گی، تب اللہ تعالیٰ بارش بھیجے گا، وہ اُن کے جسموں کو بہا کر دریا میں پھینک دے گا، اس بارے میں میرے رب نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ جب ایسا حال ہو تو قیامت پورے دنوں کی حاملہ کے مثل ہوگی، لوگ نہ جانیں گے کہ کب قیامت اُن کو رات کو یا دن کو ناگہاں آ جائے گی۔[2] (رواه أحمد و ابن ماجه)

سیدنا عبدالرحمٰن بن قرط رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جس رات نبی اکرم ﷺ کو مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف زم زم و مقامِ ابراہیم کے درمیان سے لے گئے۔ جبریل علیہ السلام دائیں طرف اور میکائیل علیہ السلام بائیں طرف پر تھے۔ یہ دونوں ان کو لے اُڑے، یہاں تک کہ آسمان کی بلندیوں پر پہنچے، جب لوٹ کر آئے تو فرمایا: میں نے ان کی تسبیحیں بہت سی

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٢٥)

[2] مسند أحمد (١/ ٣٧٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٨١) اس کی سند میں ''مؤثر بن عفازة'' ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٤٣١٨)

تسبیحوں کے ساتھ سنیں۔ سمٰوات علیٰ نے صاحبِ علیٰ کی تسبیح اس کی ہیبت اور خوف سے کی، سبحان العلی الاعلی سبحانہ وتعالیٰ (رواہ سعید بن منصور)۔[1] اس حدیث کی یاد یہ آیت دلاتی ہے، جو اسی سورت میں ہے: ﴿ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ٤٤] ''ساتوں آسمان اور زمین اور جو (مخلوق) ان میں ہے اس (اللہ) کی تسبیح کرتے ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ تسبیح نہ کرتی ہو، لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے، بے شک وہ نہایت حوصلے والا، بہت بخشنے والا ہے۔''

امام احمد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جابیہ میں تھے، فتح بیت المقدس کا ذکر آیا، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سیدنا کعب رضی اللہ عنہ سے کہا تمھارے خیال میں مجھے وہاں کس جگہ نماز پڑھنی چاہیے؟ کہا: اگر مجھ سے پوچھتے ہو تو تم صخرہ کے پیچھے نماز پڑھو، سارا قدس تمھارے سامنے ہوگا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: تو نے یہودیت کی مشابہت بتائی، لیکن میں وہاں نماز پڑھوں گا جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھی تھی، پھر قبلے کی طرف بڑھ کر نماز پڑھی۔ پھر آ کر اپنی چادر بچھائی اور سارا کوڑا اپنی چادر میں لیا اور لوگوں نے بہت جاروب کشی کی۔ صخرہ کی جو تعظیم تھی، وہ نہ کی کہ اس کے پیچھے نماز پڑھتے اور قدس سامنے ہوتا، جس طرح کہ کعب احبار رحمہ اللہ نے اشارہ کیا تھا۔ امام کعب رحمہ اللہ اس قوم میں سے تھے جو صخرہ کی تعظیم کرتی تھی، یہاں تک کہ صخرہ ہی کو اپنا قبلہ ٹھہرا لیا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے احسان رکھا کعب پر اور اُن کو حق کی طرف ہدایت کی۔ لہٰذا جب کعب رحمہ اللہ نے اشارہ کیا کہ عقب صخرہ نماز پڑھو تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: تم نے یہودیت کی مشابہت اختیار کر لی ہے اور اس کی ویسی اہانت نہ کی جیسی نصاریٰ نے کی تھی کہ صخرہ کو کوڑا پھینکنے کی جگہ ٹھہرایا، اس لیے کہ قبلۂ یہود ہے، لیکن سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے گندگی کو اس سے دور کیا اور اس کا خس و خاشاک اپنی چادر سے جھاڑا۔[2] یہ اس کے مشابہ ہے، جو کہ صحیح مسلم میں ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے: «لَا تَجْلِسُوْا عَلَى الْقُبُوْرِ وَلَا تُصَلُّوْا إِلَيْهَا»[3] [قبروں پر نہ بیٹھو اور نہ ان کی طرف (رخ کر کے) نماز پڑھو]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جبریل علیہ السلام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، ان کے ہمراہ میکائیل علیہ السلام تھے۔ جبریل علیہ السلام نے میکائیل علیہ السلام سے کہا: میرے پاس آبِ زمزم کا ایک طشت لاؤ، تاکہ میں اس کا دل پاک کروں اور سینہ

---

[1] امام طبرانی رحمہ اللہ نے اس روایت کو سعید بن منصور رحمہ اللہ کی سند سے روایت کیا ہے۔ دیکھیں: المعجم الأوسط (٤/ ١١١) اس کی سند میں ''مسکین بن میمون'' ضعیف راوی ہے۔

[2] مسند أحمد (١/ ٣٨) تفسیر ابن کثیر (٣/ ٢٦) اس کی سند میں ''ابو سنان عیسیٰ بن سنان'' ضعیف راوی ہے۔ الإسراء والمعراج (١/ ١٠٦)

[3] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٩٧٢)

کشادہ کروں، پھر پیٹ کو چیر کر تین بار دل کو دھویا اور میکائیل آبِ زمزم کے تین طشت لے کر گئے، سینہ کھول کر اس میں جو کچھ غِل تھا، اس سے وہ نکال کر علم وحلم و ایمان و یقین اور اسلام سے بھر دیا اور دونوں کندھوں کے درمیان خاتمِ نبوت کی مہر لگا دی۔ پھر ایک گھوڑا لا کر اس پر سوار کیا، اس کا ہر قدم حدِ نگاہ یا اقصیٰ بصر پر پڑتا تھا۔ نبی اکرم ﷺ چلے اور جبریل علیہ السلام اُن کے ہمراہ تھے، ایک قوم پر آئے، جو ایک دن میں بوتے اور ایک دن میں کاٹتے تھے، جب کاٹ چکتے تو پھر پہلے کی طرح ہو جاتا۔ نبی کریم ﷺ نے کہا: اے جبریل! یہ کیا ہے؟ کہا: یہ اللہ کی راہ کے مجاہد ہیں، اُن کی ایک نیکی سات سو گنا ہوتی ہے: ﴿ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴾ [سبا: ۳۹] ”اور تم کوئی چیز بھی خرچ کرتے ہو تو وہ اس کا عوض دیتا ہے اور وہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے۔“

پھر ایک ایسی قوم پر آئے جن کے سر پتھر سے پھوڑے جاتے تھے، جب پھوٹ جاتے تو پھر پہلے کی طرح ہو جاتے، اس میں سے کوئی شے کم نہ ہوتی۔ کہا: اے جبریل! یہ کون ہیں؟ فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جن کے سر فرض نماز سے گرانی محسوس کرتے تھے۔ پھر ایک قوم پر آئے جن کے اگلے حصوں اور پیٹھوں پر دھجیاں لٹک رہی تھیں، وہ یوں چرتے تھے جیسے اونٹ اور چوپائے چرتے ہیں اور کانٹے دار بدبودار گھاس، تھوہر اور جہنم کے پتھر اور انگارے کھاتے تھے۔ کہا: اے جبریل! یہ کون ہیں؟ کہا: یہ وہ لوگ ہیں، جو اپنے مالوں کے صدقات نہیں دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر کچھ ظلم نہیں کیا: ﴿ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴾ [حمٓ السجدة: ٤٦] ”اور آپ کا رب بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔“ پھر ایک قوم کے پاس آئے جن کے پاس پکا ہوا صاف ستھرا گوشت رکھا تھا اور دوسرا گوشت ایک ناپاک ہانڈی میں تھا، وہ کچا ناپاک گوشت کھاتے اور پکا ہوا پاک چھوڑتے تھے، کہا: اے جبریل! یہ کون لوگ ہیں؟ کہا: یہ تیری اُمت کا وہ آدمی ہے، جس کے پاس حلال پاک عورت ہے اور وہ کسی ناپاک عورت کے پاس جا کر شب باشی کرتا ہے اور کوئی عورت اپنے حلال پاک شوہر کے پاس سے اُٹھ کر کسی خبیث مرد کے پاس جا کر اس کے ہمراہ شب بسر کرتی ہے، یہاں تک کہ صبح ہو۔

پھر ایک لکڑی سی راستے میں آئی، اس پر جو کپڑا لگتا وہ اس کو پھاڑ ڈالتی، اسی طرح ہر چیز کو چاک کر دیتی۔ کہا: اے جبریل یہ کیا ہے؟ کہا: یہ تیری اُمت میں کچھ لوگوں کی مثال ہے کہ راہ میں بیٹھ کر راہ زنی کرتے ہیں، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ﴾ [الأعراف: ٨٦] ”اور تم ہر ایک راستے پر مت بیٹھو، تم اس شخص کو ڈراتے اور اللہ کے راستے سے روکتے ہو جو اس پر ایمان لے آئے، اور تم اس راہ میں ٹیڑھ تلاش کرتے ہو۔“ پھر ایک مرد پر آئے جو لکڑیوں کا ایک بڑا گٹھا جمع کرتا تھا جس کو اُٹھا نہ سکتا تھا اور اس پر زیادہ کرتا جاتا تھا، کہا: اے جبریل! یہ کون ہے؟ کہا یہ تیری اُمت کا ایک مرد ہے، اس کے پاس

لوگوں کی امانتیں تھیں، وہ ان کو ادا نہیں کر سکتا، تاہم وہ اور حقوق چڑھا رہا ہے اور امانتیں لے رہا ہے۔ پھر ایک قوم پر آئے جن کی زبانیں اور ہونٹ لوہے کی قینچیوں سے کترے جاتے تھے، جب کتر جاتے تو پھر بدستور ہو جاتے، ان سے کوئی شئے سست نہ ہوتی۔ کہا: اے جبریل! یہ کون ہیں؟ کہا: یہ فتنہ پرداز خطیب ہیں۔

پھر ایک چھوٹے سے پتھر پر آئے جس سے ایک بڑا بیل نکلتا تھا، وہ بیل چاہتا تھا کہ میں پھر وہیں جاؤں جہاں سے نکلا ہوں، لیکن اس کو اس کی استطاعت نہ تھی۔ کہا: اے جبریل! یہ کیا ہے؟ کہا: یہ شخص ایک کلمہ عظیمہ کہتا، پھر اس پر نادم ہوتا، پھر اس کو رد نہ کر سکتا۔ پھر ایک وادی پر آئے اور ایک ٹھنڈی خوشبو دار ہوا پائی، جس میں مشک کی خوشبو تھی اور ایک آواز سنی، کہا: اے جبریل! یہ ٹھنڈی ہوا اور یہ خوشبو اور یہ آواز کیا ہے؟ کہا: یہ جنت کی آواز ہے، جو کہتی ہے: اے میرے رب! مجھ سے اپنا وعدہ پورا کر۔ میرے بالا خانے، ریشم، موتی، مونگے، سونا، چاندی، جام، کٹورے اور پانی، دودھ اور شراب وغیرہ وغیرہ نعمتیں بہت زیادہ ہوگئیں۔ اے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ملا کر ہر ایک مسلمان مومن مرد و عورت جو مجھے اور میرے رسولوں کو مانتا ہو، نیک عمل کرتا ہو، میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا ہو، میرے برابر کسی کو نہ سمجھتا ہو، وہ سب تجھ میں داخل ہوں گے۔ سن! جس کے دل میں میرا ڈر ہے، وہ ہر خوف سے محفوظ ہے جو مجھ سے سوال کرتا ہے، وہ محروم نہیں رہتا، جو مجھے قرض دیتا ہے، میں اسے بدلہ دیتا ہوں، جو مجھ پر توکل کرتا ہے میں اسے کفایت کرتا ہوں۔ میں سچا معبود ہوں میرے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ میرے وعدے خلاف نہیں ہوتے۔ مومن نجات یافتہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ بابرکت ہے جو سب سے بہتر خالق ہے۔ یہ سن کر جنت نے کہا: بس میں راضی ہوگئی۔

پھر ایک اور وادی پر آئے، ایک بری اور بھیانک آواز سنی اور ناپاک بدبودار ہوا پائی۔ کہا: یہ کیسی ہوا ہے جبریل! اور یہ آواز کیا ہے؟ کہا: یہ جہنم کی آواز ہے، یہ کہتی ہے: اے میرے رب! مجھ سے اپنا وعدہ پورا کر اور مجھے وہ دے۔ میرے طوق و زنجیر، میرے شعلے اور گرمائی، میرا تھور اور لہو پیپ، میرے عذاب اور سزا کے سامان بہت وافر ہوگئے ہیں، میرا گہراؤ بہت زیادہ ہے، میری آگ بہت تیز ہے۔ مجھے وہ دے جس کا مجھ سے وعدہ ہوا ہے۔ مشرک و کافر، خبیث و منکر بے ایمان مرد و عورت تیرے لیے ہیں۔ نیز ہر وہ جبار جو قیامت پر ایمان نہیں لاتا۔ اس نے کہا: ”قد رضیت“ یعنی میں راضی ہوئی۔ پھر چلے، یہاں تک کہ بیت المقدس آئے، پھر اُتر کر اپنا جانور صخرہ سے باندھا اور داخل ہو کر ملائکہ کے ساتھ نماز پڑھی۔ جب نماز ہو چکی تو انھوں نے کہا: اے جبریل! تیرے ساتھ یہ کون ہے؟ کہا: محمد ﷺ ہیں۔ کہا کیا اُن کی طرف بھیجا گیا تھا؟ کہا: ہاں! کہا: سب نے مرحبا کہا کہ بہترین بھائی اور بہت ہی اچھے خلیفہ ہیں اور بہت اچھائی اور عزت سے آئے ہیں۔

پھر ارواحِ انبیا سے ملاقات ہوئی، انھوں نے اپنے رب پر ثنا کی، ابراہیم علیہ السلام نے کہا: اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے خلیل بنایا اور مجھے بہت بڑا ملک دیا اور میری امت کو ایسا فرمانبردار بنایا کہ ان کی اقتدا کی جاتی ہے۔ اسی نے مجھے

آگ سے بچا لیا اور اسے میرے لیے ٹھنڈک اور سلامتی بنا دی۔ پھر موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب کی ثنا کی اور کہا: اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ اس نے مجھ سے کلام کیا، میرے دشمنوں کو، آلِ فرعون کو ہلاک کیا، بنی اسرائیل کو میرے ہاتھوں نجات دی، میری امت میں ایسی جماعت رکھی جو حق کی ہادی اور حق کے ساتھ عدل کرنے والی تھی۔ پھر داود علیہ السلام نے اپنے رب پر ثنا کی اور کہا: سب تعریف اس اللہ کی ہے جس نے مجھے عظیم الشان ملک دیا، مجھے زبور کا علم دیا، میرے لیے لوہا نرم کر دیا، پہاڑوں کو مسخر کر دیا اور پرندوں کو بھی جو میرے ساتھ اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتے تھے۔ نیز مجھے حکمت اور پرزور کلام عطا فرمایا۔ پھر سلیمان علیہ السلام نے اپنے رب کی ثنا کی اور کہا: اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے ہواؤں کو میرے تابع کر دیا اور شیاطین کو بھی کہ وہ میرے فرمان کے تحت بڑے بڑے محلات اور نقشے اور برتن وغیرہ بناتے تھے۔ اس نے مجھے جانوروں کی گفتگو کے سمجھنے کا علم فرمایا، ہر چیز میں مجھے فضیلت دی، انسانوں کے، جنوں کے، پرندوں کے لشکر میرے ماتحت کر دیے اور اپنے بہت سے مومن بندوں پر مجھے فضیلت دی اور مجھے وہ سلطنت دی جو میرے بعد کسی کے لائق نہیں اور وہ بھی ایسی جس میں پاکیزگی ہی پاکیزگی تھی اور کوئی حساب نہیں تھا۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب پر ثنا کی اور کہا: سب تعریف اس اللہ تعالیٰ کی جس نے مجھے اپنا کلمہ بنایا اور میری مثال آدم علیہ السلام کی سی کی جسے مٹی سے پیدا کر کے کہہ دیا تھا کہ ہو جا تو وہ ہو گئے تھے، اس نے مجھے کتاب و حکمت، تورات و انجیل سکھائی۔ میں مٹی کا پرندہ بناتا، پھر اس میں پھونک مارتا تو وہ بحکم الٰہی زندہ پرندہ بن کر اڑ جاتا۔ میں بچپن کے اندھوں کو اور جذامیوں کو بحکم الٰہی اچھا کر دیتا تھا۔ مردے اللہ تعالیٰ کی اجازت سے زندہ ہو جاتے تھے، مجھے اس نے اٹھا لیا، مجھے پاک صاف کر دیا، مجھے اور میری والدہ کو شیطان سے بچا لیا، ہم پر شیطان کا کچھ دخل نہ تھا۔ پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب عزوجل پر ثنا کی اور کہا: تم سب نے اپنے پروردگار کی ثنا کی، اب میں اپنے رب کی ثنا کرتا ہوں، پھر کہا: اللہ ہی کے لیے حمد و ثنا ہے جس نے مجھے رحمت للعالمین بنا کر اپنی تمام مخلوق کے لیے ڈرانے اور خوش خبری دینے والا بنا کر بھیجا، مجھ پر قرآنِ کریم نازل فرمایا جس میں ہر چیز کا بیان ہے میری امت کو تمام اور امتوں سے افضل بنایا جو اوروں کی بھلائی کے لیے بنائی گئی ہے۔ اسے بہترین امت بنایا۔ انھی کو اول کی اور آخر کی امت بنایا۔ میرا سینہ کھول دینا، میرے بوجھ دور کر دیے، میرا ذکر بلند کر دیا، اور مجھے شروع کرنے والا اور ختم کرنے والا بنایا۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا: انھی وجوہ سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم سب سے افضل ہیں۔ امام ابوجعفر رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ آپ ختم نبوت کے سالار ہیں اور قیامت کے دن شفاعت آپ ہی سے شروع ہوگی۔

پھر نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تین برتن لائے گئے جن کے منہ چھپے ہوئے تھے، اُن میں سے ایک برتن میں پانی تھا، کہا: پیو، ذرا سا پیا، دوسرا برتن دیا، اس میں دودھ تھا، کہا: پیو، اس کو خوب سیر ہو کر پیا، پھر تیسرا برتن دیا، اس میں شراب تھی، کہا: پیو، کہا: میں اس کو پینا نہیں چاہتا، سیراب ہو چکا ہوں۔ جبریل علیہ السلام نے کہا: سن لو! یہ شراب عن قریب

تمھاری اُمت پر حرام ہوگی اور اگر تم اس کو پی لیتے تو تمھاری پیروی نہ کرتے تمھاری اُمت میں سے مگر تھوڑے لوگ۔
پھر جبریل علیہ السلام نبی کریم ﷺ کو لے کر آسمان پر چڑھے، دروازہ کھلوایا، کہا: اے جبریل! یہ کون ہے؟ کہا: محمد ﷺ ہیں۔ کہا: کیا ان کی طرف پیغام بھیجا گیا ہے؟ کہا: ہاں! کہا: اللہ تعالیٰ اس بھائی اور خلیفہ کو خوش رکھے، یہ بڑے اچھے بھائی اور نہایت عمدہ خلیفہ ہیں۔ پھر دروازہ کھول دیا، نبی کریم ﷺ داخل ہوئے، ایک مرد کو دیکھا ''تام الخلق'' جس کی پیدائش میں کوئی کمی نہ تھی، جس طرح کہ لوگوں کی خلقت میں نقصان ہوتا ہے، اس کے دائیں طرف ایک دروازہ تھا جس سے خوشبو آتی تھی اور بائیں طرف ایک دروازہ تھا جس سے بدبو آتی تھی، جب دائیں دروازے کی طرف دیکھتا تو ہنستا اور خوش ہوتا اور جب بائیں دروازے کی طرف نظر کرتا تو روتا اور غمگین ہوتا۔ میں نے کہا: اے جبریل! یہ کون شیخ ہے، جو ہر لحاظ سے مکمل ہے جس کی خلقت میں کوئی شے ناقص نہیں ہے اور یہ دونوں دروازے کیا ہیں؟ کہا: یہ تیرے باپ آدم علیہ السلام ہیں اور یہ دروازہ دائیں طرف کا بہشت کا دروازہ ہے، جب وہ ان کو دیکھتا ہے جو اس کی اولاد میں سے بہشت میں جاتے ہیں تو ہنستا ہے اور خوش ہوتا ہے اور بائیں طرف کا دروازہ جہنم کا دروازہ ہے جب ان کو دیکھتا ہے جو اس کی اولاد میں سے جہنم میں داخل ہوتے ہیں تو روتا اور غمگین ہوتا ہے۔

پھر جبریل علیہ السلام نبی مکرم ﷺ کو دوسرے آسمان پر لے گئے اور دروازہ کھلوانا چاہا۔ کہا: تیرے ساتھ کون ہے؟ کہا: محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ کہا: کیا اُن کے پاس بھیجا گیا تھا؟ کہا: ہاں! کہا: اللہ تعالیٰ اس بھائی اور خلیفہ کو خوش رکھے، یہ بڑے اچھے بھائی اور نہایت عمدہ خلیفہ ہیں۔ پھر داخل ہوتے دو جوان دیکھے، کہا: اے جبریل! یہ کون ہیں؟ کہا: یہ عیسیٰ بن مریم اور یحییٰ بن زکریا علیہما السلام خالہ زاد بھائی ہیں۔ پھر تیسرے آسمان پر لے چڑھے، دروازہ کھلوایا، کہا: یہ کون ہے؟ کہا: جبریل ہوں! کہا: تیرے ہمراہ کون ہے؟ کہا: محمد ﷺ ہیں، کہا: کیا اُن کے پاس بھیجا گیا تھا؟ کہا: ہاں! کہا: اللہ تعالیٰ اس بھائی اور خلیفہ کو خوش رکھے، یہ بڑے اچھے بھائی اور نہایت عمدہ خلیفہ ہیں۔ پھر داخل ہوئے، ایک مرد ملے، جنھیں حسن میں اور لوگوں پر وہی فضیلت تھی جو چاند کو باقی ستاروں پر۔ کہا: اے جبریل! یہ کون ہیں جو سب لوگوں پر حسن میں زیادہ ہیں؟ کہا: تیرا بھائی یوسف ہے۔ پھر لے کر چوتھے آسمان پر چڑھے، دروازہ کھلوایا، کہا: کون ہے: کہا: جبرائیل ہوں۔ کہا: تیرے ہمراہ کون ہے؟ کہا: محمد ﷺ ہیں۔ کہا: کیا ان کے پاس پیغام بھیجا گیا تھا؟ کہا: ہاں۔ کہا: اللہ تعالیٰ اس بھائی اور خلیفہ کو خوش رکھے، یہ بڑے اچھے بھائی اور نہایت عمدہ خلیفہ ہیں۔ پھر داخل ہوئے۔ کہا: اے جبریل! یہ کون ہیں؟ کہا: یہ ادریس علیہ السلام ہیں، ﴿ وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ﴾ [مریم: ۵۷] ''اور ہم نے اسے بہت بلند مقام پر اُٹھایا۔''

پھر پانچویں آسمان پر لے چڑھے، دروازہ کھلوایا، کہا: کون ہے؟ کہا: جبریل ہوں! کہا: تیرے ہمراہ کون ہے؟ کہا: محمد ﷺ ہیں۔ کہا: کیا ان کی طرف پیغام بھیجا گیا ہے؟ کہا: ہاں! کہا: اللہ تعالیٰ اس بھائی اور خلیفہ کو خوش رکھے، یہ

بڑے اچھے بھائی اور نہایت عمدہ خلیفہ ہیں۔ پھر داخل ہوئے، ایک مرد بیٹھا ہوا ملا، اس کے گرد قوم تھی، وہ ان کو وعظ کرتا تھا، کہا: اے جبریل! یہ مرد اور یہ قوم کون ہیں؟ کہا: ہارون ہے اور یہ بنی اسرائیل ہیں۔ پھر چھٹے آسمان پر لے گئے، دروازہ کھلوایا، کہا: کون ہے؟ کہا: جبریل ہوں، کہا: تیرے ساتھ کون ہے؟ کہا: محمد ﷺ ہیں، کہا: کیا ان کی طرف پیغام بھیجا گیا ہے؟ کہا: ہاں! کہا: اللہ تعالیٰ اس بھائی اور خلیفہ کو خوش رکھے، یہ بڑے اچھے بھائی اور نہایت عمدہ خلیفہ ہیں۔ پھر داخل ہوئے، ایک مرد بیٹھا ہوا دیکھا، جب اس کو چھوڑ کر آگے بڑھے، وہ رویا، کہا: اے جبریل! یہ کون ہے؟ کہا: موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ کہا: یہ کس لیے روتے ہیں؟ کہا: بنی اسرائیل میری نسبت یہ سمجھتے تھے کہ تمام اولادِ آدم میں اللہ کے پاس سب سے زیادہ بزرگ میں ہوں، لیکن یہ ہیں میرے خلیفہ جو دنیا میں ہیں اور میں آخرت میں ہوں، خیر صرف یہی ہوتے تو بھی چنداں مضائقہ نہ تھا، لیکن ہر نبی کے ساتھ اس کی اُمت ہے۔

پھر جبریل علیہ السلام نبی اکرم ﷺ کو لے کر ساتویں آسمان پر چڑھے اور دروازہ کھلوایا، کہا: کون ہے؟ کہا: جبریل ہوں، کہا: تیرے ساتھ کون ہے؟ کہا: محمد ﷺ ہیں، کہا: کیا ان کی طرف پیغام بھیجا گیا ہے؟ کہا: ہاں! کہا: اللہ تعالیٰ اس بھائی اور خلیفہ کو خوش رکھے، یہ بڑے اچھے بھائی اور نہایت عمدہ خلیفہ ہیں۔ پھر داخل ہوئے ایک اُدھیڑ عمر کے آدمی پر جس کے کچھ بال سفید اور کچھ سیاہ تھے، وہ بہشت کے دروازے کے پاس کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، اس کے پاس ایک قوم بیٹھی ہوئی تھی سفید چہروں والے جیسے کاغذ اور ایک قوم جن کے رنگوں میں کچھ اور بھی تھا۔ یہ لوگ جن کے رنگوں میں کچھ تھا کھڑے ہوگئے اور ایک نہر میں داخل ہو کر نہائے، پھر نکلے ان کا کچھ رنگ صاف ہوا، پھر دوسری نہر میں گھسے، غسل کیا، پھر باہر نکلے، ان کے رنگ کچھ اور نکھرے، پھر ایک اور نہر میں داخل ہوئے اور نہائے اور باہر نکلے ان کی رنگت بالکل صاف ہوگئی، ان کا رنگ بھی اپنے ساتھیوں کی طرح ہوگیا اور وہ آکر اپنے یاروں کے پاس بیٹھ گئے۔ کہا: اے جبریل! یہ سیاہ اور سفید بالوں والے کون ہیں اور یہ سفید رو لوگ کون ہیں اور یہ لوگ جن کے رنگوں میں کچھ ہے، کون ہیں اور یہ انہار کیا ہیں، جن میں یہ لوگ داخل ہوئے اور جب آئے تو اُن کے رنگ صاف ہوگئے؟ کہا یہ تمھارے باپ ابراہیم علیہ السلام ہیں، سب سے پہلے روئے زمین پر اُن ہی کے بال سفید ہوئے اور یہ سفید چہروں والے وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے ایمان کو ظلم سے نہیں ملایا اور جن لوگوں کے رنگوں میں کچھ ہے، یہ وہ لوگ ہیں، جنھوں نے عملِ صالح اور دوسرے اعمال ملائے، پھر توبہ کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی، رہی نہریں سو پہلی نہر اللہ کی رحمت کی نہر ہے اور دوسری اللہ کی نعمت کی اور تیسری شرابِ طہور کی نہر ہے، جیسے فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ﴾ [الدھر: ۲۱] ''اور اُن کا رب انھیں شراب طہور پلائے گا۔'' پھر سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے، کہا گیا کہ یہ سدرۃ المنتہیٰ ہے، اسی تک تیری اُمت کا ہر شخص جو تیری سنت پر ہے، منتہی ہوتا ہے۔ یہ ایک درخت تھا، جس کی جڑ سے نہریں نکلتی ہیں: ایک ﴿ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ ﴾ کی دوسری ﴿ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ ﴾

[محمد: ۱۵] ''اس میں (ایسے) پانی کی نہریں ہیں، جو بدلنے والا نہیں، اور ایسے دودھ کی نہریں ہیں، جس کا ذائقہ (کبھی) تبدیل نہ ہوا ہوگا۔'' تیسری ﴿ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ﴾ اور چوتھی ﴿ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ﴾ [محمد: ۱۵] ''اور ایسی شراب کی نہریں ہیں، جو پینے والوں کے لیے لذیذ ہے اور صاف شفاف شہد کی نہریں ہیں۔'' یہ ایک ایسا درخت ہے، جس کے سائے تلے سوار ستر برس تک چلتا رہے۔ پھر بھی سایہ ختم نہ ہو، اس کا ایک پتا ساری اُمت کو ڈھانپ لیتا ہے، اس درخت کو اللہ عزوجل کا نور ڈھانپے ہوئے تھا اور پرند کی شکل کے فرشتے اسے چھپائے ہوئے تھے، جبکہ درخت پر اللہ تعالیٰ کا کوئی حب (دانہ) گرتا۔ اس درخت کے پاس اللہ تعالیٰ نے کلام کیا اور کہا: مانگ! عرض کی: تو نے ابراہیم علیہ السلام کو خلیل ٹھہرایا اور اُن کو ملکِ عظیم دیا اور موسیٰ علیہ السلام سے بات کی اور داود علیہ السلام کو ملکِ عظیم عطا کیا اور لوہا اُن کے لیے نرم کر دیا اور سلیمان علیہ السلام کو بادشاہی دی اور جنوں اور انسانوں کو اُن کا مسخر کیا اور ہوائیں اُن کی تسخیر میں دیں اور ایسا ملک دیا کہ ویسا ملک اُن کے بعد کسی کو زیبا نہیں ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کو تورات اور انجیل سکھائی، وہ اندھے اور کوڑھی کو اچھا کر دیتے تھے اور مردے کو تیرے اذن سے جلا دیتے تھے، اور اُن کو اور اُن کی ماں کو شیطان مردود سے پناہ دی، شیطان کو اُن پر کوئی راستہ نہیں تھا۔ رب عزوجل نے فرمایا: میں نے تجھ کو اپنا خلیل کیا ہے اور تورات میں حبیب الرحمٰن لکھا ہوا ہے اور میں نے تجھ کو تمام لوگوں کی طرف خوش خبری سنانے کے لیے اور ڈرانے کے لیے بھیجا ہے اور میں نے تیرا سینہ کھول دیا اور تیرا بوجھ اُتار دیا اور تیرا ذکر بلند کر دیا۔ جہاں میرا ذکر آئے، وہاں تیرا ذکر بھی ہوتا ہے۔

تیری اُمت کو خیرِ اُمت ٹھہرایا، جو لوگوں کے لیے نکالی گئی اور اُس کو اُمتِ وسط کیا اور یہی تیری اُمت اولین و آخرین ہے اور تیری اُمت کے لیے خطبہ جائز نہیں ہے جب تک کہ گواہی نہ دیں کہ تو میرا بندہ اور رسول ہے۔ اور میں نے تیری اُمت میں ایسے لوگ بنائے، ہیں جن کے دل میں الکتاب ہے اور تجھ کو ازروئے پیدایش سب سے اول کیا اور ازروئے بعثت کے سب سے آخر کیا۔ سب سے پہلے اسی اُمت کا حساب کتاب ہوگا اور تجھ کو سبع مثانی دی ہے، جو تجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئی اور تجھ کو عرش کے نیچے کے خزانوں سے خواتیم سورت بقرہ دیے ہیں، جو میں نے تجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دیے اور تجھ کو کوثر دی ہے اور تجھے اسلام کے آٹھ حصے عطا کیے ہیں۔ اسلام، ہجرت، جہاد، نماز، صدقہ، رمضان کے روزے، امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور میں نے تجھے شروع کرنے والا اور ختم کرنے والا بنایا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ کو میرے رب نے چھ چیزوں میں فضیلت دی ہے، جو مجھ کو عطا کی ہیں۔ کلام کی ابتدا اور اس کی انتہا دی، جامع باتیں دیں، اور مجھے بشیر اور نذیر بنا کر تمام لوگوں کی طرف بھیجا ہے اور میرے دشمنوں کے دل میں ایک ماہ کے راستے کا رعب ڈالا ہے اور مجھ کو غنیمتیں حلال کر دی ہیں اور مجھ سے پہلے کسی کے لیے حلال نہ تھیں اور میرے لیے ساری زمین پاک اور مسجد کر دی ہے۔

نبی اکرم ﷺ پر پچاس نمازیں فرض کی گئی تھیں، جب لوٹ کر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے تو انھوں نے کہا: اے محمد! آپ کو کس چیز کا حکم دیا گیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: پچاس نمازوں کا۔ کہا: اپنے رب تعالیٰ کے پاس جاؤ اور اس سے تخفیف کا سوال کرو۔ آپ کی امت کمزور ترین امت، جب کہ میں نے بنی اسرائیل کو خوب جانچا پرکھا ہے۔ نبی اکرم ﷺ اپنے رب کے پاس آئے اور تخفیف کا سوال کیا، دس نمازیں کم کر دی گئیں، پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے، کہا: تجھ کو کیا حکم ملا؟ کہا: چالیس نمازوں کا، کہا: پھر اپنے رب کے پاس جاؤ اور تخفیف مانگو، تمھاری اُمت ضعیف ترین اُمت ہے، میں نے بنی اسرائیل سے بہت شدت و تکلیف پائی۔ نبی کریم ﷺ پھر کر اپنے رب کے پاس آئے اور تخفیف کا سوال کیا، دس نمازیں کم کیں، پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے، کہا: تم کو کیا حکم ملا؟ کہا: اب تیس نمازوں کا حکم ملا ہے، کہا: اپنے رب کے پاس جا کر آسانی مانگو، تمھاری اُمت سب اُمتوں میں ناتواں ہے اور میں بنی اسرائیل سے شدت دیکھ چکا ہو۔ نبی مکرم اپنے رب کے پاس گئے اور تخفیف چاہی، دس نمازیں کم کیں، پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے، کہا: تم کو کیا حکم ملا؟ کہا: بیس نمازوں کا، کہا: اپنے رب تعالیٰ کے پاس جا کر تخفیف کا سوال کرو، آپ کی امت کمزور ترین امت ہے، جب میں نے بنی اسرائیل کو خوب جانچا پرکھا ہے۔ نبی اکرم ﷺ اپنے رب کے پاس آئے، تخفیف کا سوال کیا، دس نمازیں اور کم ہوئیں، موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے، انھوں نے پوچھا: اب کتنی نمازوں کا تم کو حکم ہوا ہے؟ کہا: دس نمازوں کا، کہا: اپنے رب کے پاس پھر جاؤ اور تخفیف چاہو، تمھاری اُمت اضعفِ اُمت ہے اور میں بنی اسرائیل سے شدت دیکھ چکا ہو۔ نبی اکرم ﷺ نے رب کے پاس آ کر تخفیف کا سوال کیا، پانچ نمازین کم کیں، پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے، پوچھا: کیا حکم ہوا؟ کہا: پانچ نمازیں رہیں، کہا: پھر اپنے رب کے پاس جاؤ اور تخفیف کا سوال کرو کہ تمھاری اُمت ضعیف ترین اُمت ہے اور میں بنی اسرائیل سے سختی دیکھ چکا ہوں، کہا: میں اپنے رب تعالیٰ کے پاس بار بار گیا، اب مجھے شرم محسوس ہوتی ہے، لہٰذا اب میں اس کے پاس جانے والا نہیں ہوں۔ تب یہ بات کہی گئی: آپ نے پانچ نمازوں پر صبر کیا، ان پانچ نمازوں کا ثواب پچاس کے برابر ہوگا، کیوں کہ ہر نیکی کا اجر دس گنا ہوتا ہے۔ تب نبی اکرم ﷺ بالکل خوش ہو گئے۔ کہا: جاتے وقت موسیٰ علیہ السلام سخت تھے اور آتے وقت نہایت نرم اور سب سے بہتر۔[1] (رواه ابن جرير بطوله وفيها غرابة، و رواه البيهقي فذكر مثل ما رواه ابن جرير، و ذكر أن الحاكم أبا عبد الله رواه عن أبي هريرة عن النبي ﷺ فذكره، وقال ابن أبي حاتم: ذكره أبو زرعة عن أبي هريرة رفعا قال في قول الله: ﴿ سُبْحٰنَ الَّذِيْۤ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ﴾ فذكر الحديث بطوله كنحو مما سقناه۔ قلت: و أبو جعفر الرازي، قال فيه الحافظ أبو زرعة الرازي: يهم في الحديث كثيراً، وقد ضعفه غيره أيضا، و وثقه بعضهم، والظاهر أنه سيئ الحفظ، ففيما تفرد به نظر، وهذا الحديث في بعض ألفاظه غرابة ونكارة شديدة، وفيه شيء من حديث المنام من رواية سمرة بن جندب في المنام الطويل عند البخاري، ويشبه أن يكون مجموعا من أحاديث شتى أو منام أو قصة أخرى غير الإسراء. والله أعلم)

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٣٣٦۔ ٣٤٤) دلائل النبوة (٢/ ٣٩٧۔ ٤٠٣) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٠٩۔ ٢٣١٥) تفسير ابن كثير (٣/ ٢٦۔ ٣٢)

صحیحین میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جس رات مجھ کو لے گئے، میں نے موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا، پھر اُن کی صفت بیان کی کہ وہ ایک مرد ہیں، میں گمان کرتا ہوں سر کے مضطرب، سیدھے بال جیسے شنوءہ کے لوگوں کے ہوتے ہیں اور میں نے عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھا، پھر اُن کی صفت بیان کی کہ وہ میانہ قد، سرخ رنگ ہیں، گویا حمام سے باہر نکل کر آئے ہیں اور دیکھا میں نے ابراہیم علیہ السلام کو اور میں ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے سب سے زیادہ اُن سے مشابہت رکھتا ہوں اور میرے پاس دو برتن لائے گئے: ایک دودھ کا، دوسرا شراب کا، مجھ سے کہا: جون سا تو چاہے لے لے، میں نے دودھ لے کر پیا، مجھ سے کہا گیا: فطرت کی طرف آپ کی راہنمائی کی گئی اور آپ نے فطرت کو اختیار کیا۔ اگر تو شراب لیتا تو تیری اُمت بہک جاتی۔[1] (وأخرجاه من وجه آخر عن الزهري بنحوه)

صحیح مسلم کے الفاظ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً اس طرح ہیں کہ میں نے دیکھا اپنے آپ کو اور قریش مجھے میرے رات کو جانے کے بارے میں سوال کرتے تھے، مجھ سے بیت المقدس کی بعض اشیا کے بارے میں پوچھا، جس کو میں نے اچھی طرح جانا نہ تھا، مجھ کو ایسی تکلیف ہوئی کہ کبھی ویسی نہ ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو میری طرف بلند کر دیا اور میں اس کو دیکھتا اور جس چیز کا وہ سوال کرتے تھے، اس چیز کی ان کو خبر دیتا۔ میں نے اپنے آپ کو انبیا کی ایک جماعت میں دیکھا، موسیٰ علیہ السلام کھڑے نماز پڑھتے تھے، وہ کھڑے بالوں والے ایک شخص تھے، جیسے شنوءہ کے لوگ ہوتے ہیں۔ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام بھی کھڑے نماز پڑھتے تھے، لوگوں میں سے اُن کے ساتھ سب سے زیادہ مشابہت رکھنے والے عروہ بن مسعود ثقفی ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام بھی کھڑے ہوئے نماز پڑھتے تھے، لوگوں میں اُن کے ساتھ سب سے زیادہ مشابہت رکھنے والا تمھارا صاحب ہے یعنی محمد ﷺ۔ اتنے میں نماز کا وقت آیا، میں اُن کا امام بنا، جب نماز پڑھ چکا تو کہنے والے نے کہا: اے محمد! یہ مالک ہے داروغۂ جہنم، میں نے اس کی طرف توجہ کی، اس نے سلام سے ابتدا کی۔[2]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت مرفوعاً ان الفاظ سے بیان کی ہے کہ میں نے شبِ معراج میں جب کہ میں ساتویں آسمان پر پہنچا، دیکھا کہ میں نے اوپر کو نظر کی، رعد، برق اور صواعق تھے اور میں ایک قوم کے پاس آیا، جن کے پیٹ ایسے تھے جیسے گھر، اُن میں سانپ تھے جو پیٹوں کے باہر سے دکھائی دیتے تھے۔ میں نے کہا: اے جبریل! یہ کون ہیں؟ کہا: یہ سود کھانے والے ہیں، جب میں دنیا میں اترا تو نیچے کی طرف دیکھا، یکا یک رہج، دخان اور اصوات تھے۔ میں نے کہا: اے جبریل! یہ کون ہیں؟ کہا یہ شیاطین ہیں، بنی آدم کی آنکھوں کے اردگرد پھرتے ہیں، ملکوتِ ارض و سماوات میں فکر نہیں کرتے، اگر یہ بات نہ ہوتی تو یہ لوگ عجائب دیکھتے۔[3] (رواه أحمد عن حماد بن سلمة و ابن ماجه)

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢١٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٨) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٢)

[3] مسند أحمد (٢/ ٣٥٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٢٧٣) اس کی سند میں ''ابو الصلت'' مجہول اور ''علی بن زید'' ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ١٣٣)

امام بیہقی رحمہ اللہ نے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور ضحاک بن مزاحم رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ اُن سب نے کہا کہ نبی اکرم ﷺ اُم ہانی کے گھر میں سو رہے تھے اور نمازِ عشا پڑھ چکے تھے۔ حاکم ابو عبداللہ نے یہ طویل حدیث نسخہ مسموعہ سے روایت کی ہے، اس میں برجوں کی تعداد اور ملائکہ وغیرہ کا ذکر ہے، جس کا اللہ کی قدرت کے سامنے انکار نہیں ہوسکتا، اگر روایت صحت کو پہنچے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے کہا: مکے سے بیت المقدس جانے اور معراج کے بارے میں ابو ہارون کی حدیث میں پوری کفایت ہے، وباللّٰہ التوفیق۔[1]

اس حدیث کو بہت سے تابعین اور ائمہ مفسرین نے مرسلاً روایت کیا ہے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ کے الفاظ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس طرح ہیں کہ جس رات نبی اکرم ﷺ مسجد اقصیٰ کو گئے، صبح کو لوگوں سے ذکر کیا، کچھ لوگ جو ایمان لائے اور تصدیق کر چکے تھے، وہ مرتد ہو گئے اور سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس بھاگے ہوئے آئے اور کہا کہ تم کو کچھ خبر ہے کہ تمھارے صاحب یہ زعم کرتے ہیں کہ وہ آج کی رات بیت المقدس گئے تھے۔ کہا: کیا اُنھوں نے اس طرح کہا ہے؟ کہا: ہاں! کہا: اگر آپ نے یہ بات فرمائی ہے تو سچ فرمایا ہے۔ کہا: کیا تم اس بات کی تصدیق کرتے ہو کہ وہ آج کی شب بیت المقدس جا کر صبح سے پہلے آ گئے؟ کہا: ہاں! میں اُن کی تصدیق اس سے بھی دور تر اَمر میں کرتا ہوں صبح یا شام، جو خبر آسمان کی دیتے ہیں، میں اس کی تصدیق کرتا ہوں۔ اسی وجہ سے سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کا نام صدیق ہوا۔[2]

ام ہانی رضی اللہ عنہا بنت ابی طالب کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو وقتِ شب نہیں لے گئے مگر وہ میرے گھر میں اس رات میرے نزدیک سوتے تھے۔ نمازِ عشا پڑھ کر سو رہے اور ہم بھی سو رہے۔ صبح سے پہلے نبی اکرم ﷺ نے ہم کو جگایا، جب صبح کی نماز پڑھی اور ہم نے بھی آپ کے ہمراہ صبح کی نماز پڑھی، کہا: اُم ہانی میں نے تمھارے ساتھ نماز پڑھی تھی، جس طرح تو نے دیکھا اس وادی میں۔ پھر میں بیت القدس کو گیا اور وہاں نماز پڑھی، پھر میں نے صبح کی نماز تمھارے ساتھ پڑھی، اس وقت جس طرح کہ تو دیکھتی ہے۔[3] (رواه محمد بن إسحاق)

اس روایت میں کلبی نامی راوی متروک اور ساقط ہے۔ لیکن ابو یعلیٰ رحمہ اللہ نے اس کو اُم ہانی رضی اللہ عنہا سے اس سے مبسوط تر سیاق میں اس سے روایت کیا ہے، وہ اس جگہ لکھنا چاہیے۔ امام طبرانی رحمہ اللہ کے الفاظ اُم ہانی رضی اللہ عنہا کی روایت کے یہ ہیں کہ جس شب نبی اکرم ﷺ کو لے گئے، اس رات نبی کریم ﷺ میرے گھر میں سوئے ہوئے تھے، میں نے ان کو رات کے وقت نہ پایا، مجھ کو اس ڈر سے نیند نہ آئی کہ کہیں کوئی قریشی ان سے متعرض نہ ہوا ہو، یعنی جھگڑنے نہ لگا ہو، نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جبریل علیہ السلام آئے اور میرا ہاتھ پکڑ کر باہر لے گئے، دروازے پر ایک دابہ تھا، خچر سے چھوٹا اور گدھے سے بڑا، مجھ کو اس پر سوار کر کے لے چلے، یہاں تک کہ بیت المقدس پہنچے، مجھے ابراہیم علیہ السلام کو

---

(1) دلائل النبوة (۲/ ٤٠٤۔ ٤٠٥) (2) دلائل النبوة (۲/ ۳٦۱)

(3) تفسیر الطبري (۱۷/ ۳۳۱) اس کی سند میں "محمد بن سائب کلبی" سخت ضعیف راوی ہے۔

دکھایا، اُن کی شکل و صورت میری شکل و صورت کی طرح تھی اور موسیٰ علیہ السلام کو دکھایا، وہ ایک مرد گندم گوں دراز قد سیدھے بالوں والے ازدشنوءہ کے لوگوں کے مشابہ تھے۔ عیسیٰ علیہ السلام کو دکھایا، وہ درمیانہ قد سفید رنگ کے تھے، جو سرخی مائل ہو، عروہ بن مسعود کے مشابہ تھے۔ دجال کو دکھایا، اس کی ایک آنکھ بالکل مٹی ہوئی تھی، قطن بن عبدالعزیٰ کے مشابہ۔ میں چاہتا ہوں کہ جو کچھ میں نے دیکھا ہے نکل کر وہ قریش کو بتا دوں۔

میں نے نبی اکرم ﷺ کا کپڑا پکڑا اور کہا کہ میں آپ کو اللہ کی یاد دلاتی ہوں کہ تم اگر اپنی قوم کے پاس جاؤ گے تو وہ تم کو جھٹلائیں گے اور تمھاری بات کا انکار کریں گے، مجھے ڈر ہے کہیں تم پر حملہ نہ کر دیں۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنا کپڑا میرے ہاتھ سے چھڑا لیا، پھر اُن کے پاس گئے، وہ بیٹھے تھے، اُن کو خبر دی۔ جبیر بن مطعم نے کہا: اے محمد! اگر تمھاری شان ہوتی جیسے کہ تم تھے تو جو بات تم نے کہی ہے وہ نہ کہتے اور تم ہمارے درمیان ہو۔ قوم میں سے ایک مرد نے کہا: اے محمد! تمھارا گزر ہمارے اونٹوں پر بھی ہوا، فلاں فلاں جگہ؟ کہا: ہاں، واللہ! میں نے اُن کو پایا کہ اُن کا ایک اونٹ گم ہو گیا تھا اور وہ اس کی تلاش کرتے تھے۔ کہا: بنی فلاں کے اونٹوں پر بھی تم گزرے تھے؟ کہا: ہاں! میں نے اُن کو فلاں فلاں جگہ دیکھا تھا، اُن کا ایک سرخ ناقہ کا پاؤں ٹوٹ گیا تھا، اُن کے پاس ایک بڑا پیالہ پانی کا تھا، میں نے اس میں سے پانی پیا، کہا: بھلا اُن کی گنتی اور جو چرواہے اُن کے ساتھ ہیں، ان کی تعداد بتاؤ، کہا میں اُن کی گنتی سے مشغول تھا، پھر نبی کریم ﷺ کھڑے ہو گئے اور اُونٹ لائے گئے، اُن کو اور اُن کے چرواہوں کو گن لیا۔ پھر قریش کے پاس آئے اور فرمایا: تم نے مجھ سے بنی فلاں کے اونٹوں کا حال پوچھا تھا، وہ اتنے اتنے ہیں اور اُن میں فلاں فلاں چرواہا ہے اور تم نے مجھ سے بنی فلاں کے اونٹوں کا حال دریافت کیا، وہ اتنے ہیں اور اُن چرواہوں میں ایک ابن ابی قحافہ اور فلاں فلاں ہے اور یہ کل صبح کو ثنیہ پر آ جائیں گے۔ لوگ اس گھاٹی پر انتظار کرنے کے لیے بیٹھے کہ دیکھیں سچ کہا ہے یا نہیں۔ اتنے میں سامنے سے اونٹ آئے، اُن سے پوچھا کہ تمھارا کوئی اونٹ گم گیا تھا؟ کہا: ہاں، دوسروں سے پوچھا کہ کیا تمھارے کسی اونٹ کا پاؤں ٹوٹ گیا تھا؟ کہا: ہاں! کہا تمھارے پاس کوئی قصعہ (تانبے کا بڑا پیالہ) تھا؟ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: واللہ! میں نے وہ قصعہ رکھ دیا تھا، کسی نے اس کو نہیں پیا اور نہ زمین پر بہایا۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اُن کی تصدیق کی اور ایمان لائے۔ اس دن سے ان کا نام صدیق ہو گیا۔[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب اُن تمام احادیث کو جمع کیا گیا، جو صحیح، حسن اور ضعیف ہیں اور اُن پر غور کیا تو متفق علیہ مضمون ثابت ہوا کہ نبی اکرم ﷺ راتوں رات مکہ سے بیت المقدس کو گئے اور یہ جانا ایک ہی بار ہوا تھا۔ اگرچہ مضمون کو ادا کرنے کے لیے راویوں کی عبارتیں مختلف ہیں اور الفاظ کی کمی بیشی ہے، کیوں کہ انبیا کے علاوہ

---

[1] المعجم الكبير (٢٤/ ٤٣٢) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''وفيه عبد الأعلىٰ بن أبي المساور متروك كذاب'' (مجمع الزوائد: ١/ ٢٤٥)

لوگوں پر خطا جائز ہے اور جس نے ہر اُس روایت کو کہ دوسری روایت کے مخالف ہے، علاحدہ ٹھہرا کر متعدد اسراء ات (معراج) قرار دیے ہیں، وہ بہت بعید اور بہت غریب ہے اور نہ جانے کی جگہ چلا گیا ہے، اس کو مطلب ہاتھ نہ آیا۔ بعض متاخرین نے صراحت کی ہے کہ مکے سے بیت المقدس کو جانا ایک بار ہوا تھا، صرف اور صرف ایک بار۔ مکے سے آسمان تک فقط ایک بار، یعنی مکہ سے بیت المقدس، پھر وہاں سے آسمان پر اور یہ آخری شخص اس مسلک سے خوش ہوا اور اس نے جانا کہ اس کے ہاتھ ایک ایسی چیز لگی، جس سے تمام اشکالات دور ہو جائیں، حالاں کہ یہ نہایت بعید ہے اور سلف میں سے کسی ایک سے بھی یہ بات منقول نہیں ہوئی اور اگر یہ معراج متعدد ہوتی تو خود نبی اکرم ﷺ خبر دیتے اور لوگ اس تعداد اور بار بار اسراء کو نقل کرتے۔[1]

موسیٰ بن عقبہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام زہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اسراء ہجرت سے ایک سال قبل ہوا تھا۔ عروہ رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ ہجرت سے سولہ ماہ قبل ہوا تھا۔[2] حق یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کا اسراء بیداری میں تھا نہ کہ خواب میں۔ مکہ سے بیت المقدس براق پر سوار ہو کر گئے، جب مسجد کے دروازے پر پہنچے تو براق کو دروازے کے نزدیک باندھ کر مسجد میں آئے اور قبلۂ مسجد میں دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھیں، پھر معراج لگائی گئی، وہ سیڑھی کی طرح درجوں والی تھی۔ اس سے آپ آسمانِ دنیا پر چڑھائے گئے، پھر باقی آسمانوں میں گئے۔ ہر آسمان کے مقربین نے استقبال کیا اور نبی اکرم ﷺ نے ان پیغمبروں کو جو آسمان میں تھے، سلام کیا، انبیا کے منازل اور درجات کے حساب سے، یہاں تک کہ موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام پر سے چھٹے آسمان میں گزرے اور ابراہیم خلیل اللہ پر ساتویں آسمان میں، پھر اُن دونوں انبیا کی منزلت سے بھی آگے بڑھ گئے، یہاں تک کہ مستوی تک پہنچے، وہاں قضا و قدر کی قلموں کی آواز سنی، اور سدرۃ المنتہیٰ دیکھا، اللہ تعالیٰ کا امر اس کو ڈھانپے ہوئے تھا، یہ ایک عظمت عظیم تھی، سونے کے پتنگے اور متعدد رنگ اور فرشتے اس کو ڈھانپے ہوئے تھے، وہاں جبریل علیہ السلام کو اُن کی اصل صورت پر دیکھا، چھے سو پر تھے اور سبز رنگ کے رف رف کو دیکھا، وہ اُفق کو گھیرے ہوئے تھا اور بیتِ معمور دیکھا جو زمین کے کعبے کے، جس کو ابراہیم خلیل نے بنایا تھا، مقابل میں ہے۔ ابراہیم علیہ السلام اپنی پشت اس سے لگائے ہوئے بیٹھے تھے، اس لیے کہ وہ کعبۂ سماویہ ہے، اس میں ہر دن ستر ہزار فرشتے داخل ہو کر عبادت کرتے ہیں، پھر قیامت کے دن تک اس کی طرف دوبارہ ان کی باری نہیں آتی اور جنت اور نار کو دیکھا، وہاں اللہ تعالیٰ نے پچاس نمازیں فرض کیں، پھر تخفیف فرما کر بندوں پر رحمت اور لطف و کرم کے طور پر پانچ رکھیں، اس میں نماز کے شرف و عظمت کے ساتھ ایک اعتبارِ عظیم ہے۔

پھر نبی اکرم ﷺ بیت المقدس پر اُترے اور اُن کے ہمراہ انبیا علیہم السلام بھی اُترے، اُن کے ہمراہ نماز پڑھی، جبکہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٣٤) [2] دلائل النبوۃ (٢/ ٣٥٤_ ٣٥٥)

نماز کا وقت آیا۔ احتمال یہ ہے کہ وہ اس دن صبح کی نماز ہو۔ بعض لوگ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ نماز کی امامت آسمان پر کی تھی، لیکن روایات سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نماز بیت المقدس میں تھی، لیکن بعض روایات میں یوں ہے کہ پہلی دفعہ داخل ہونے کے وقت تھی۔ ظاہر یہ ہے کہ آسمان سے واپس لوٹ کر تھی، اس لیے جب نبی اکرم ﷺ کا گزر انبیا کے مقامات پر ہوا تو آپ جبریل علیہ السلام سے ایک ایک کے بارے میں پوچھتے گئے اور وہ ہر ایک کے بارے میں بتاتے رہے اور یہی لائق بھی ہے، اس لیے کہ نبی مکرم ﷺ اولاً تو اللہ تعالیٰ کو مطلوب تھے، تاکہ اللہ تعالیٰ آپ پر اور آپ کی اُمت پر جو چاہے وہ فرض کرے، پھر جب اس مراد سے فارغ ہوئے، تب تمام اخوانِ انبیا کے ساتھ اجتماع ہوا، پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کا شرف و فضل اُن پر امامت کرا کے ظاہر کرایا اور اس امامت کا اشارہ جبریل علیہ السلام نے کیا تھا۔ پھر بیت المقدس سے نکل کر براق پر سوار ہوئے اور غلس تاریکیِ شب میں مکہ میں پھر کر آ گئے۔ واللّٰه سبحانه و تعالىٰ أعلم.

رہا دودھ اور شہد کا یا دودھ اور شراب کا یا دودھ اور پانی کا برتن یا اُن سب برتنوں کا پیش کرنا، وہ بیت المقدس میں تھا یا آسمان میں؟ تو احتمال ہے کہ یہاں اور وہاں دونوں جگہ ہو، کیوں کہ یہ آنے والے کے لیے ضیافت کے مثل تھا۔ واللّٰه أعلم۔ لوگوں نے اس بات میں اختلاف کیا ہے کہ اسراء بدن و روح دونوں کے ساتھ ہوا تھا یا فقط روح کے ساتھ؟ اس میں دو قول ہیں۔ اکثر علما کا موقف یہ ہے کہ روح اور بدن دونوں کے ساتھ بیداری میں ہوا نہ کہ خواب میں۔ اس امر کا انکار نہیں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اس سے پہلے خواب میں دیکھا ہو، پھر اس کے بعد بیداری میں اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ جو خواب دیکھتے تھے وہ صبح صادق کی طرح ظاہر ہوتا تھا، اس پر کتابِ عزیز کی یہ آیت ہے: ﴿ سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ ﴾ (آیتِ باب)

اللہ کی تسبیح بڑے عظیم امور کے وقت ہوتی ہے، اگر نیند کا واقعہ ہوتا تو کچھ بڑی بات نہ تھی اور اُس کی کچھ عظمت نہ تھی اور قریش کے کفار اس کا انکار کرنے پر جلدی نہ کرتے اور ایک جماعتِ مسلمین اسلام لا کر مرتد نہ ہو جاتی۔ نیز عبد روح اور جسم کے مجموعے کو کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا ﴾ اور فرمایا: ﴿ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ ﴾ [بني إسرائيل: ٦٠] ''اور ہم نے آپ کو (معراج میں) جو مشاہدہ کرایا، اسے لوگوں کے لیے بس ایک آزمایش ہی بنا دیا۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہ رویا عین تھی، جو نبی اکرم ﷺ کو دکھائی گئی۔[1] (رواہ البخاري) اور فرمایا: ﴿ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ﴾ [النجم: ١٧] ''نگاہ نہ تو بہکی اور نہ حد سے بڑھی۔'' اور آلات کو دیکھنا ذات سے ہے نہ کہ روح سے۔ نیز نبی اکرم ﷺ براق پر بٹھائے گئے، یہ سفید رنگ کا چمک دار ایک جانور ہے، یہ بات بدن کے لیے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٧٥)

ہوتی ہے نہ کہ روح کے لیے۔ اس لیے کہ روح اپنی حرکت کے لیے کسی سواری پر سوار ہونے کی محتاج نہیں ہوتی۔ واللہ أعلم.

دوسرے گروہ نے کہا کہ اسراء روح سے تھی نہ کہ جسم سے۔ محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے سیرت میں کہا ہے کہ معاویہ بن ابی سفیان سے جب کوئی نبی اکرم ﷺ کے اسراء کا سوال کرتا تو کہتے: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک سچا خواب تھا۔[1] اور مجھ سے بعض آلِ ابی بکر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی تھیں: رسول اللہ ﷺ کا جسم غائب نہیں ہوا تھا، بلکہ روحانی معراج تھا۔[2]

امام ابن اسحاق رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس قول کا انکار نہیں کیا گیا حسن رحمہ اللہ کے اس قول کے سبب سے کہ یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ ﴾ [بني إسرائيل: ٦٠] ”اور ہم نے آپ کو (معراج میں) جو مشاہدہ کرایا، اسے لوگوں کے لیے بس ایک آزمائش ہی بنا دیا“ اور اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے متعلق خبر دی ہے: ﴿ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَا ذَا تَرٰى ﴾ [الصافات: ١٠٢] ”بے شک میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے یقیناً ذبح کر رہا ہوں، اب تو دیکھ تیری کیا رائے ہے؟“ پھر انھوں نے اس خواب پر عمل کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انبیا کو وحی بیداری اور خواب دونوں میں آتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ فرمایا کرتے تھے: «تَنَامُ عَيْنِيْ وَقَلْبِيْ يَقْظَانُ» میری آنکھ سو جاتی ہے، جب کہ دل جاگتا رہتا ہے۔ واللہ أعلم. اُن میں کونسی وحی آئی اور یہ سب ماجرا دیکھا، کون سی حالت تھی بیداری یا خواب۔ یہ سب حق و صدق ہے۔[3] انتھی کلام ابن إسحاق۔ اس کلام کا ردّ ابن جریر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں کیا ہے اور اس کا انکار کیا ہے اور اُسے برا بھلا کہا ہے اور کہا ہے کہ یہ ظاہر سیاقِ آیتِ قرآن کے خلاف ہے اور اس کے رد پر دلائل ذکر کیے ہیں[4]، جن میں کے بعض گزر چکے ہیں۔

حافظ ابونعیم اصبہانی رحمہ اللہ نے کتاب "دلائل النبوة" میں بہ طریقِ واقدی محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے دحیہ بن خلیفہ کلبی رضی اللہ عنہ کو قیصر کے پاس بھیجا، پھر اُن کے قیصر پر داخل ہونے اور واپس آنے کا ذکر کیا۔ سیاقِ مذکور میں ہرقل کے وفورِ عقل پر عظیم دلیل ہے کہ اس نے شام کے تاجروں کو بلایا، ابو سفیان صخر بن حرب اور ان کے ساتھیوں کو لائے، اس نے مشہور مسائل کے متعلق سوال کیا۔ رواها البخاري ومسلم كما سيأتي بيانه. ابوسفیان نے کوشش کی کہ قیصر کے نزدیک نبی ﷺ کے معاملے میں تحقیر اور تصغیر کرے۔ اس سیاق میں ابوسفیان نے کہا ہے: اللہ کی قسم! مجھے آپ کو ہرقل کی نگاہوں میں حقیر وصغیر پیش کرنے سے صرف اس بات نے روکا کہ میں اس بات کو پسند کرتا تھا کہ ہرقل کے پاس جھوٹ بولوں، وہ میرے جھوٹ کو پکڑے

---

[1] تفسیر الطبري (١٧/ ٣٤٩) اس کی سند میں ”یعقوب بن عتبہ“ کا سماع سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔

[2] تفسیر الطبري (١٧/ ٣٥٠) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔

[3] تفسیر الطبري (١٧/ ٣٤٩۔ ٣٥٠) [4] تفسیر الطبري (١٧/ ٣٥٠۔ ٣٥١)

اور پھر میری کسی بات کو بھی سچ نہ جانے۔ کہا: یہاں تک کہ ان کے اسراء کے بارے میں قول کا ذکر کیا، میں نے کہا: بادشاہ سلامت! میں آپ کو ایک بات بتاتا ہوں جس سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس شخص نے جھوٹ بولا ہے۔ ہرقل نے پوچھا: وہ کیا بات ہے؟ میں نے کہا کہ ان کا خیال ہے کہ وہ ایک رات ہمارے علاقے سرزمین حرم سے نکلے اور تمھاری اس مسجد، مسجد ایلیا میں آ گئے، پھر صبح سے پہلے پہلے ہمارے ہاں واپس بھی پہنچ گئے۔ ابوسفیان کی بات سن کر ایلیا کے بطریق (پادری) نے کہا جو اس وقت قیصر کے سر کے پاس کھڑا تھا کہ میں اس رات کو جانتا ہوں۔ یعنی عالم بیت المقدس نے کہا: مجھے وہ رات معلوم ہے، قیصر نے اس کی طرف دیکھا، کہا: تجھے کیسے معلوم ہوا؟ کہا: میں کسی رات سوتا نہ تھا، جب تک کہ مسجد کے سارے دروازے بند نہ کر دیتا، جب وہ رات ہوئی، میں نے مسجد کے سارے دروازے بند کر دیے مگر ایک دروازہ جو مجھ سے بند نہ ہوا۔ میں نے اپنے عمال سے مدد لی اور جتنے لوگ میرے پاس حاضر تھے، سب نے مدد کی، ہر چند اس کو بند کرنا چاہا، مگر وہ بند نہ ہوا، بلکہ ہم اس کو ہلا بھی نہ سکے، گویا ہم ایک پہاڑ کو سرکاتے تھے۔ میں نے بڑھئی لوگوں کو بلایا، انھوں نے اس کو دیکھا، کہا: اس دروازے پر تو چھت گری ہوئی ہے، ہم اس کو ہلا نہیں سکتے، صبح ہو تو دیکھیں گے کہ یہ کیا ہوا ہے، میں دونوں دروازے کھلے ہوئے چھوڑ آیا۔ صبح کو وہاں گیا، وہ پتھر جو مسجد کے کونے میں ہے، اس میں سوراخ ہو گیا ہے، اس میں ایک جانور کو باندھنے کا نشان تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ آج کی رات یہ دروازہ کسی نبی پر روکا گیا ہے اور اس نے آج کی رات ہماری اس مسجد میں نماز پڑھی ہے۔ وذكر تمام الحديث۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس فائدے کو فائدۂ حسنہ جلیلہ کہا ہے۔[1]

حافظ ابو الخطاب عمر بن دحیہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "التنوير في مولد السراج المنير" میں طریقِ انس سے حدیثِ اسراء کا ذکر کر کے اس پر احسن انداز میں کلام کیا ہے، پھر کہا ہے کہ حدیثِ اسراء میں روایاتِ متواترہ آئی ہیں اور یہ عمر بن خطاب، علی، عبداللہ بن مسعود، ابوذر، مالک بن صعصعہ، ابو ہریرہ ابوسعید، عبداللہ بن عباس، شداد بن اوس، ابی بن کعب، عبدالرحمن بن قرط، ابوحبہ، ابولیلیٰ، عبداللہ بن عمرو، جابر، حذیفہ، بریدہ، ابو ایوب، ابو امامہ، سمرہ بن جندب، ابوالحمراء، صہیب رومی، ام ہانی، عائشہ اور اسماء بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں۔ کسی نے ان روایات کو مفصل اور کسی نے مختصر روایت کیا ہے، جس طرح کہ مسانید میں واقع ہے۔ اگرچہ بعض کی روایت شرطِ صحت پر نہ ہو۔ تاہم حدیثِ معراج پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے، صرف زندیق اور ملحد لوگ ہی اس کا انکار کرتے ہیں۔ ﴿ يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ [الصف: ۸] "وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کا نور (دین اسلام) اپنے مونہوں سے بجھا دیں، جبکہ اللہ اپنا نور پورا کرنے والا ہے اگرچہ کافر ناپسند ہی کریں۔"

تفسیر آیت ﴿ سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ ﴾ کے شروع سے لے کر اس جگہ تک جو کچھ لکھا گیا ہے، یہ سب حافظ

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۳٦) یہ روایت مرسل ہے۔ نیز سند میں "محمد بن عمر واقدی" سخت ضعیف راوی ہے۔

ابن کثیر رحمہ اللہ کے کلام کا ان کی تفسیر شریف میں سے ترجمہ ہے [1] ۔وللہ الحمد والمنة۔ اس جگہ مقصد اسراء کا ثابت کرنے والی روایات کو وارد کرنا ہے نہ کہ فوائد وفقہ و استنباطِ معانی و الفاظ کا، ورنہ اسراء کے بارے میں ہر حدیث کے الفاظ اورطرق کے اختلاف میں بے شمار فوائد اور منافع اور لطائفِ نفیس ہیں۔

فتح البیان کا بیان اس جگہ یہ ہے کہ سبحان مصدر سماعی ہے، ''سَبَّحَ'' مشدد کا، یا اسم مصدر ہے، یا مصدر قیاسی ہے ''سَبَحَ''، مخفف کا۔ اس کے معنی ہر نقص اور برائی سے تنزیہ و بعد و براءت کے ہیں۔ بہرحال یہ واسطے تنزیہ و تقدیس کے علم جنس ہے یا علم تسبیح ہے، جو تسبیحِ بلیغ اور تنزیہ کامل پر دلیل ہے، لہٰذا اس کا استعمال اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے لیے نہیں آتا۔ عبد الواسع ہانسوی نے شرح بوستان سعدی میں کیا خوب کہا ہے: ''در لفظ سبحان عقل حیرت ست کہ اسم ست یا مصدر تا بکنہ حقیقت سبحان چہ رسد۔'' [لفظ ''سبحان'' کے بارے میں عقل حیران ہے کہ یہ اسم ہے یا مصدر، وہ سبحان کی حقیقت کی کنہ تک کب رسائی حاصل کر سکتی ہے] اسراء کہتے ہیں رات میں سیر کرنے کو، یعنی راتوں رات راہ چلنا اور بعض نے کہا: رات کے پہلے حصے میں سیر کو کہتے ہیں۔ خاصۃً پھر جب اسراء خاص ٹھہرا، رات کے سیر کے ساتھ تو لفظ لیل کے ذکر کرنے کا مطلب شب کی تھوڑی مدت کو ظاہر کرنا ہوا۔ بعض شب کے ایک حصے میں مکہ سے شام گئے، جو چالیس رات تک کی مسافت ہے اور رات کی تھوڑی مدت کا انکار ہی اس دلیل کا سبب ہے۔ یہ انکار دلالت کرتا ہے بعض پر بہ خلاف ''سریت اللیل'' کہ یہ پوری رات سیر کرنے کو ظاہر کرتا ہے۔ زمخشری نے قلتِ سیر پر لفظِ ﴿ لَيۡلًا ﴾ سے استدلال کیا ہے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حذیفہ رضی اللہ عنہ کی قراءت کے ساتھ، انھوں نے ''من اللیل'' پڑھا ہے: ''أي في جزء قليل من الليل'' [2] بعض نے کہا کہ بہ قدرِ چار ساعت کے اور کسی نے کہا ہے کہ تین ساعت اور کسی نے کہا ہے کہ اس سے بھی کم اور تقلیل و تبعیض قریب قریب ہیں، تبعیض کی جگہ تقلیل کا استعمال کیا گیا۔

مفسرین اور علما اور متکلمین کا اس بات پر اجماع ہے کہ اس جگہ عبد سے مراد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اُمت میں سے کسی کا اس بارے میں اختلاف نہیں ہے۔ لفظِ ''عبد'' کہا، نبی و رسول نہ کہا یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نہ لیا، اس سے مقصد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و تکریم اور بزرگی ہے۔ اہلِ علم نے کہا ہے کہ ''عبد'' کی جگہ کوئی اور نام اس سے زیادہ باعزت ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس مقام پر وہی نام ذکر کرتا۔

أصم إذا نوديت باسمي وإنني إذا قيل لي يا عبدها لسميع
لا تدعني إلا بياعبدها فإنه أشرف أسمائي

[جب مجھے میرے نام کے ساتھ آواز دی جاتی ہے تو میں بہرا ہوتا ہوں اور جب مجھے کہا جاتا ہے: اے اللہ کے بندے! تو میں خوب سننے والا ہوتا ہوں۔ مجھے بس ''اے اس کے بندے'' ہی کہہ کر پکارا کرو،

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٥۔ ٣٧) [2] الکشاف (٢/ ٦٠٤)

اس لیے کہ یہ میرا سب سے زیادہ باعزت نام ہے]

عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو ۱۷ ربیع الاول کو ہجرت سے ایک سال پہلے رات کے وقت لے گئے۔[1] ابن شہاب وعروہ رحمہ اللہ کا لفظ یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا اسراء بیت المقدس کی طرف مدینہ کو ہجرت کرنے سے ایک سال پہلے ہوا تھا اور امام سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ سولہ ماہ قبل۔[2] امام حسن اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ مسجد الحرام سے مراد نفسِ مسجد ہے۔[3] ظاہر قرآن یہی ہے اور ائمۂ مفسرین رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اسراء اُم ہانی رضی اللہ عنہا کے گھر سے ہوا تھا۔ مسجد الحرام محمول ہے مکہ یا حرم پر، اس لیے کہ یہ دونوں مسجد الحرام کو گھیرے ہوئے ہیں یا اس لیے کہ سارا حرم مسجد ہے۔

سیدنا مالک بن صعصعہ رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «بَيْنَا أَنَا فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فِي الْحِجْرِ» [اسی دوران میں کہ میں مسجدِ حرام میں حطیم میں تھا] پھر ساری حدیث معراج کی ذکر کی۔[4] مسجد اقصیٰ سے مراد بیت المقدس ہے، اس کا نام اقصیٰ اس لیے ہوا کہ مسجد الحرام سے دور کی مسافت پر واقع ہے۔ جو لوگ حجاز میں ہیں اُن سے بہت دور ہے۔ تاریخ قدس میں اقصیٰ ہونے کی یہ وجہ لکھی ہے کہ جن مساجد کی زیارت کی جاتی ہے، ان سب میں وہ زیادہ دور والی مسجد ہے، یا وہ پلیدیوں اور خباثتوں سے دور ہے، یا جس وقت وہ بنائی گئی تھی اس وقت اس کے سوا کوئی مسجد نہ تھی۔ اس میں ایک معنی تنزیہ وتعجب کے ہیں۔ سب سے پہلے اس کو آدم نے کعبے کے چالیس برس بعد بنایا تھا۔ كما في المواهب.

چنانچہ مسجد اقصیٰ روئے زمین پر پہلی مسجد ہے جو کعبہ کے بعد بنائی گئی ہے۔ اس مسجد کا پورا حال کتاب "لقطة العجلان مما تمس إلى معرفته حاجة الإنسان" میں لکھا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا اسراء بدن کے ساتھ اور بیداری کی حالت میں ہوا تھا اور اس سے پہلے نیند میں جس طرح کہ فتح مکہ کو ۶ ہجری میں دیکھا تھا، پھر ۸ ہجری میں اس کا تحقق ہوا۔ بیت المقدس کی طرف اسراء میں اور مکہ مکرمہ سے ہی آسمان پر نہ جانے میں حکمت یہ ہے کہ ایلیا زمینِ محشر ہے۔ منظور یہ ہوا کہ اس زمین پر رسول اللہ ﷺ کے قدم مبارک پڑیں، تاکہ آپ کے قدموں کے اثر کی وجہ سے قیامت کے دن آپ کی اُمت پر اس جگہ ٹھہرنا سہل اور آسان ہو جائے، یا اس لیے کہ وہ جگہ انبیا علیہم السلام کی روحوں کے اکٹھا ہونے کی جگہ ہے، اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ ان کو نبی اکرم ﷺ کی زیارت کا شرف بخشے، اس لیے کہ نبی اکرم لوگوں کو اس کی صفات بتائیں، تاکہ باقی امور میں وہ نبی اکرم ﷺ کی تصدیق کریں۔ (قاله الكرخي)

اور آخری وجہ زیادہ ظاہر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے اس مسجد کے گرد کو برکت دی ہے۔ مراد برکت دنیویہ ہے۔ یہ برکت نہیں ہے مگر اقصیٰ کے اردگرد میں، اُور اندر کی برکت تو دونوں مسجدوں میں ہے، بلکہ یہ برکت مسجد الحرام میں زیادہ مکمل ہے، یعنی کثرتِ ثواب۔ خازن نے کہا: برکت سے مراد پھل نہریں اور درخت ہیں یا انبیا اور صالحین کا

[1] الدر المنثور (٥/ ٢١٠)
[2] دلائل النبوة للبيهقي (٢/ ٣٥٤_ ٣٥٥)
[3] فتح القدير (٣/ ٢٨٦)
[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٧٤)

وجود، کیوں کہ یہ مسجد اُن کا قبلہ تھا ہمارے نبی ﷺ سے پہلے۔ اس کا نام مبارک رکھا، اس لیے کہ انبیا کے قرار کی جگہ اور وحی اور ملائکہ کی آمد و رفت کی جگہ اور قیامت کے دن تمام مخلوقات کا حشر اسی طرف ہوگا۔[1]

اللہ تعالیٰ نے مسجد اقصیٰ کے اردگرد کے برکات دنیا اور آخرت کے لیے رکھے ہیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ یعنی ہم نے اس کے گرد درخت اُگائے ہیں۔[2] اور اسراء کا اس کی طرف ہونا آسمان کی طرف چڑھنے کی تمہید تھا۔ پھر اسراء کی وجہ بیان کی کہ اس سے مراد اس رات میں اپنی نشانیوں اور عجائبات کا دکھانا تھا۔ ازاں جملہ ایک تو رات کے ایک حصے میں ایک طویل مسافت کو طے کرنا تھا اور ﴿ مِنْ ﴾ واسطے تبعیض کے ہے۔ اس سے مراد آیاتِ الٰہی کی تعظیم ہے، کیوں کہ جو کچھ نبی اکرم ﷺ نے دیکھا تھا، اگرچہ عظیم اور جلیل تھا، لیکن اللہ کی قدرت کے عجائبات اور اس کی حکمت کی عظمت اور اللہ کی آیات کے مقابلے میں وہ بعض تھا، یعنی کچھ حصہ تھا۔ (قاله أبو شامة)

رؤیت اس جگہ بصریہ ہے اور ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا کہ قلبیہ مگر پہلی بات زیادہ درست ہے۔ اللہ ہر مسموع کا سامع اور ہر مبصر کا بصیر ہے، من جملہ اس کے قول اور ذاتِ رسول ہے۔ اس آیتِ شریفہ میں چار یا پانچ التفاتات ہیں۔ معظم سلف اور خلف کا مذہب یہ ہے کہ اسراء جسم اور روح دونوں سے تھا اور ایک گروہ نے کہا کہ فقط روح سے تھا۔ تیسرے گروہ نے کہا کہ اسراء جسم سے بیداری کی حالت میں تھا بیت المقدس تک اور آسمان تک روح سے تھا۔ اگر بیت المقدس سے آسمان تک بذاتہ واقع ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس کا ذکر کرتا، لیکن احادیثِ صحیحہ بہت سی اسی بات پر دلیل ہے کہ قابلِ قبول و تعظیم وہی مذہبِ سلف و خلف ہے کہ اسراء جسم اور روح دونوں سے بیداری میں بیت المقدس تک، پھر آسمانوں تک تھا، اس میں تاویل اور صرف نظمِ قرآنی کی کوئی حاجت نہیں ہے اور نہ صرف الفاظِ حدیث کا فرق کوئی حقیقت رکھتا ہے۔ اس کا مقصد حقیقت سے دور لے جانے کے سوا اور کچھ نہیں، بلکہ یہ محض ناقص عقلوں کو قابو کرنا ہے۔ اور نہ ہی اللہ کو کسی حیلے کی ضرورت ہے۔ اگر یہ اسراء صرف خواب ہی ہوتا، جس طرح بعض نے کہا ہے کہ فقط روح سے تھی اور انبیا کے خواب حق ہوتے ہیں تو کفار اس خبر پر نبی اکرم ﷺ کی تکذیب نہ کرتے اور نہ ہی بعض مسلمان مرتد ہوتے، اس لیے کہ انسان خواب میں ایسی چیز دیکھتا ہے، جو مستبعد بلکہ محال ہوتی ہے اور کوئی اس کا انکار نہیں کرتا۔

رہا استدلال اسراء بالروح پر آیتِ کریمہ: ﴿ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ ... الخ ﴾ [بني إسرائيل: ٦٠] سے سو اگر تسلیم بھی کیا جائے کہ اس رویا سے مراد اسراء ہے، تب بھی وہ تصریح، جو اس جگہ ﴿ سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا ﴾ سے واقع ہے اور وہ صراحت جو احادیثِ صحیحہ کثیرہ میں مروی ہے کہ نبی مکرم ﷺ کو راتوں رات لے گئے، اس بات پر استدلال سے قاصر نہیں ہے کہ یہ رویا حقیقی رویت کا ابتدا ہو، کیوں کہ رویتِ عین کو بھی کبھی رویا بولتے ہیں اور کس طرح صحیح طور پر اس اسراء کو رویا پر محمول کیا جا سکتا ہے، حالاں کہ صحیح احادیث میں اس

[1] تفسير الخازن (٤/ ١٢٧) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٠٩)

امر کی تصریح مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ براق پر سوار ہو کر گئے اور خود آپ ﷺ نے یہ صراحت کی ہے کہ جب اسراء ہوا تو نبی کریم ﷺ "بین النائم والیقضان" (نیند اور بیداری کے درمیان کی حالت میں لیٹے ہوئے) تھے۔[1]

پس زیادہ صحیح وہی مذہبِ جمہور ہے، کیوں کہ کچھ فضیلت واسطے نائم کے اور کوئی فضیلت واسطے سونے والے کے نہیں ہے اور اس اختلاف کی وجہ کہ اسراء کی تاریخ مدینہ کی طرف ہجرت کرنے سے ایک سال قبل تھی یا سالہا سال یہ ہے کہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے نبی مکرم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی اور وہ ہجرت سے پانچ سال پہلے انتقال کر چکی تھیں، یا تین برس، یا چار برس قبل اور نماز فرض نہیں ہوئی مگر شبِ اسراء میں۔ اسی سے ابن عبد البر رحمہ اللہ نے استدلال کیا ہے۔

امام زہری رحمہ اللہ نے کہا کہ اسراء ہجرت سے ایک سال قبل تھا۔ امام حربی رحمہ اللہ نے کہا ۲۷ شب ربیع الاول کو ہجرت سے ایک سال قبل تھا۔ ابن القاسم رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ میں کہا ہے کہ اسراء مبعث (نبوت) سے ۱۸ ماہ بعد ہوا تھا۔ ابن عبدالبر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ سیرت نگاروں میں سے کسی نے یہ بات کہی ہو۔ امام زہری رحمہ اللہ نے کہا کہ اسراء مبعث سے سات برس پہلے ہوا تھا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ مبعث سے پانچ برس پہلے ہوا تھا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات فرضیتِ نماز سے قبل ہوئی تھی۔[2]

بہت سے مفسرین نے جیسے کہ حافظ ابن کثیر و امام سیوطی رحمہما اللہ وغیرہما ہیں، اس جگہ ذکرِ احادیث میں طوالت اختیار کی ہے جو اسراء کے بارے میں مروی ہیں۔ انھوں نے اسراء سے متعلق مختلف الفاظ اور احکام اور اہلِ علم کے اقوال ذکر کیے ہیں اور اُن نشانیوں کا ذکر کیا ہے جو معراج کے بعد ظاہر ہوئی ہیں اور معراج کے سچا ہونے پر دلیل ہیں۔ سو اس میں کچھ زیادہ فائدہ نہیں ہے، اس لیے کہ یہ احادیث اپنے مواضع میں کتبِ حدیث سے معروف و مشہور ہیں۔ اسی طرح مسجد الحرام اور مسجد اقصیٰ کے فضائل ذکر کرنے میں طوالت اختیار کی ہے، حالاں کہ یہ ایک دوسری بحث ہے۔ کتبِ تفسیر میں وہ چیز مقصود ہوتی ہے جس کا تعلق کتابِ عزیز کے الفاظ سے ہے، یا اسبابِ نزول سے، یا اُن مسائلِ شرعیہ سے جو الفاظ کتاب سے ماخوذ ہیں، اس کے سوا جو کچھ ہے وہ فالتو ہے، جس کی طرف داعی کو کوئی حاجت نہیں ہے۔[3] واللہ أعلم.[4]

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٣٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٤)

(2) التمهيد لابن عبد البر (٨/ ٤٨۔ ٥٢) (3) فتح البيان (٧/ ٣٤٧۔ ٣٥٣)

(4) نواب صاحب رحمہ اللہ نے واقعۂ معراج سے متعلق حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کی متابعت میں صحیح اور ضعیف دونوں قسم کی روایات بیان کر دی ہیں، تاہم صحیح موقف بھی ساتھ ساتھ بیان کر دیا ہے اور ضعیف روایات کے مختلف پہلوؤں کو بھی واضح کر دیا ہے۔ ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ اسراء و معراج کے یہ دونوں حصے عالم بیداری میں بجسدہ العنصری ظہور پذیر ہوئے ہیں، یہ خواب کا واقعہ نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ معراج کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب کو نہیں دیکھا ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ قریب ہونے والی بات کا تعلق جبریل علیہ السلام سے ہے نہ کہ رب تعالیٰ سے۔ چوتھی بات یہ ہے کہ آپ صرف سدرۃ المنتہیٰ تک گئے ہیں۔ اس سے آگے جانے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ پانچویں بات یہ ہے کہ جن چیزوں کا مشاہدہ آپ نے کیا، ان میں سے صرف وہی صحیح ہیں جو صحیح روایات میں بیان ہوئے ہیں۔ اس کی مزید تفصیل اور تنقیح و توضیح کے لیے ملاحظہ ہو، راقم کی کتاب "واقعہ معراج اور اس کے مشاہدات"۔ [ص۔ ی]

وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ﴿٢﴾ ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ﴿٣﴾

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب (تورات) دی اور ہم نے اسے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا (اور انھیں حکم دیا) کہ تم میرے سوا کسی کو کارساز نہ ٹھہراؤ② اے ان لوگوں کی اولاد جنھیں ہم نے نوح کے ساتھ (کشتی میں) سوار کیا تھا! بے شک وہ شکر گزار بندہ تھا③

موسیٰ علیہ السلام اور ان پر نازل شدہ کتاب تورات کا تذکرہ:

اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسراء کے ذکر کے بعد اپنے عبد و رسول وکلیم کا ذکر کیا۔ اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر اور تورات وقرآن کا ذکر اکثر ایک دوسرے کے نزدیک نزدیک فرماتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کو کتاب تورات دی تھی، اس کتاب کو بنی اسرائیل کے لیے ہادی اور راہنما ٹھہرایا تھا اور کہا تھا کہ تم میرے سوا کسی کو وکیل یعنی ولی ونصیر ومعبود نہ ٹھہرانا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی مرسل پر یہ بات نازل کی تھی کہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کرو۔ پھر فرمایا کہ تم اُن کی اولاد ہو جن کو ہم نے نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار کیا تھا۔ اس میں اپنا احسان یاد کرایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنے باپ کے مشابہ بنو، وہ ایک شکر گزار بندے تھے اور اپنے اوپر میری نعمت کو یاد کرو کہ میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمھاری طرف بھیجا۔

سلف سے حدیث اور آثار میں مروی ہے کہ نوح علیہ السلام طعام، شراب، لباس اور ہر شان اور حال میں اللہ کی حمد کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا نام عبد شکور رکھا۔ سعد بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نوح بندۂ شکر گزار ٹھہرے، اس لیے کہ وہ جب کھاتے اور پیتے تو اللہ کی حمد کرتے۔[1] (رواه الطبراني) سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے اللہ بندے سے اس بات پر راضی ہوتا ہے کہ ایک لقمہ کھائے یا ایک گھونٹ پیے، پھر اس پر اللہ کی حمد کرے۔[2] (رواه أحمد و هكذا رواه مسلم والترمذي والنسائي) زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا کہ نوح علیہ السلام اللہ کی ہر حال میں حمد کرتے تھے۔[3] سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً طویل حدیث میں مروی ہے کہ لوگ قیامت کے دن نوح علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور کہیں گے: اے نوح! تو سب سے پہلا رسول ہے اہلِ ارض کی طرف، اللہ تعالیٰ نے تیرا نام عبدِ شکور رکھا ہے، تم اپنے رب کی طرف ہماری سفارش کرو۔[4] (الحديث بكماله رواه البخاري)

---

① المعجم الكبير (٦/ ٣٢)

② صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٣٤) مسند أحمد (٣/ ١١٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٨١٦) سنن النسائي الكبرىٰ (٤/ ٢٠٢)

③ تفسير ابن كثير (٣/ ٣٧) ④ صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٦٢)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ تم عبودیت اور فرماں برداری میں اور فعلِ طاعات کے ساتھ اللہ کا شکر کثرت سے ادا کرنے میں نوح علیہ السلام کی طرح ہو جاؤ۔ ذریت سے اس جگہ زمین کے سارے لوگ مراد ہیں، کیوں کہ یہ انھی لوگوں کی اولاد ہیں جو کشتی میں تھے۔ یا مراد موسیٰ علیہ السلام اور قومِ موسیٰ ہے۔ عبداللہ بن زید انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ نوح علیہ السلام کے ساتھ صرف چار بیٹے تھے: حام، سام، یافت اور کوش۔ انھی چار بیٹوں سے نسل نوح علیہ السلام چلی۔[1] تکلیف اور آسانی میں بہت زیادہ شکر کرنے والے تھے۔ جب کھاتے، پیتے اور پہنتے تو الحمد للہ کہتے۔ شکر اعظم اسبابِ خیر اور افضلِ طاعات ہے۔ ذریت کو ادائے شکر کی ترغیب دلائی ہے۔[2]

وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝۴ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ۭ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ۝۵ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ۝۶ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۣ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ۭ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْۗءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ۝۷ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۝۸

اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب (تورات) میں فیصلہ سنا دیا کہ تم زمین میں دو بار ضرور فساد کرو گے اور ضرور بہت بڑی سرکشی کرو گے ④ پھر جب دونوں میں سے پہلا وعدہ آیا تو ہم نے تم پر اپنے سخت جنگجو بندے بھیج دیے، چناں چہ وہ (فساد انگیزی کے لیے) شہروں کے درمیان گھس (پھیل) گئے اور یہ وعدہ (پورا) کیا ہوا تھا⑤ پھر ہم نے پھیر کر تمھیں ان پر غلبہ دیا اور تمھیں مال اور بیٹوں کے ساتھ مدد دی اور ہم نے تمھیں نفری میں خوب زیادہ کر دیا⑥ اگر تم بھلائی کرو گے تو اپنے ہی نفس کے لیے کرو گے اور اگر برائی کرو گے تو (وہ بھی) اسی کے لیے ہوگی، پھر جب آخری بار کا وعدہ آیا (تو ایک اور قوم تم پر غالب

[1] الدر المنثور (٥/ ٢٣٦) [2] فتح البیان (٧/ ٣٥٤)

آئی) تاکہ وہ تمھارے چہرے بگاڑ دیں اور مسجد (اقصیٰ) میں داخل ہو جائیں، جیسے پہلی بار اس میں داخل ہوئے تھے، اور تاکہ وہ جس پر غلبہ پائیں اسے یکسر تباہ کر دیں ⑦ قریب ہے کہ تمھارا رب تم پر رحم کرے اور اگر تم پھر دوبارہ (سرکشی) کرو گے تو ہم بھی دوبارہ (وہی معاملہ) کریں گے اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لیے قید خانہ بنایا ہے ⑧

بنی اسرائیل کا دوبار زمین میں فساد کرنا:

تورات میں کہہ دیا تھا کہ دوبارہ بنی اسرائیل شرارت کریں گے، اس کی سزا میں دشمن اُن کے ملک پر غالب آ جائیں گے۔ اسی طرح ہوا ہے، ایک بار جالوت غالب ہوا، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو داود علیہ السلام کے ہاتھ سے ہلاک کیا، بعد میں بنی اسرائیل کو اور زیادہ قوت دی۔ سلیمان علیہ السلام کی سلطنت میں دوسری بار فارسی لوگوں میں بخت نصر غالب ہوا، تب سے ان کی سلطنت نے قوت نہ پکڑی۔ اب فرمایا کہ اللہ مہربانی پر آیا ہے، اگر اس نبی کے تابع ہو تو وہی سلطنت اور غلبہ پھر عطا کر دے اور اگر پھر وہی شرارت کرو گے تو ہم وہی کریں گے۔ یعنی مسلمانوں کو اُن پر غالب کر دیں گے اور آخرت میں دوزخ تیار ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تورات میں یہ خبر دی تھی کہ بنی اسرائیل دو بار زمین میں فساد کریں گے اور زبردست اور سرکش اور عالی ہو کر لوگوں میں فجور کریں گے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَقَضَيْنَآ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ ﴾ [الحجر: ٦٦] ''اور ہم نے اسے اس امر کا فیصلہ سنا دیا کہ بے شک صبح ہوتے ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جائے گی۔'' یعنی یہ بات ہم نے پہلے سے اُن کو جتا رکھی تھی۔

یہودیوں کا پہلا فساد اور اس کی سزا:

جب پہلا وعدہ آیا، یعنی پہلی دفعہ فساد مچایا تو ہم نے اپنی مخلوق میں سے ایک لشکر، جو کہ قوت والے تھے اور تعداد کافی تھی اور وہ لشکر سرکشی اور سلطنت میں بہت سخت تھا، تم پر مسلط کر دیا، وہ گھروں کے درمیان، یعنی تمھارے شہروں میں گھس پڑے اور شہروں اور گھروں کے مالک بن بیٹھے اور آنے جانے لگے، ان کو کسی کا ڈر خوف نہ تھا۔ یہ وعدہ تو ہونے والا ہی تھا سو ہوا۔ مفسرین سلف و خلف کا اس بات میں اختلاف ہے کہ یہ مسلط کیے جانے والے کون تھے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ جالوت جزری اور اس کی فوج تھی۔ پہلے بنی اسرائیل پر یہ لشکر مسلط ہوا، پھر بنی اسرائیل اس پر غالب آئے۔ داود علیہ السلام نے جالوت کو قتل کیا، لہٰذا فرمایا: ﴿ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ ﴾ (آیتِ باب) اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا کہ موصل شہر پر بادشاہ سنجاریب اور اس کا لشکر مسلط ہوا۔[1]

---

① تفسير الطبري (١٧/ ٣٦٦۔ ٣٦٧)

اور بعض نے کہا کہ بابل کا بادشاہ بخت نصر تھا۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ایک عجیب قصہ بختِ نصر کا ذکر کیا ہے جس میں نام بردہ کا ایک حال سے دوسرے حال کی طرف بڑھنا، یہاں تک کہ ان کے شہروں پر قبضہ کرنے کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ ایک فقیر اپاہج اور ضعیف تھا، لوگوں سے کھانا اور دوسری چیزیں مانگتا، پھر اس کا جو انجام ہوا سو ہوا، یعنی بلاد بیت المقدس تک گیا اور بنی اسرائیل میں سے ایک بہت بڑی تعداد میں لوگوں کو اس نے قتل کر ڈالا۔[1]

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس جگہ ایک حدیث بہ سندِ حذیفہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً مطولاً روایت کی ہے۔[2] وہ حدیث موضوع ہے، جس کو حدیث کی ذرا بھی پہچان ہوگی، وہ ضرور اس کے وضع میں شک نہ کرے گا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: تعجب ہے کہ اس قدر وافر علم کے حضرت امام صاحب نے یہ حدیث وارد کر دی۔ ہمارے استاد شیخ حافظ علامہ ابو الحجاج مزی رحمہ اللہ نے اس کے موضوع ہونے کی تصریح کی ہے اور کتاب کے حاشیے پر لکھ بھی دیا ہے۔ اس بارے میں آثارِ کثیرہ اسرائیلیہ آئے ہیں، ہم ان کا ذکر کر کے کتاب کو طویل نہیں کرتے، کیوں کہ اُن میں بعض آثار زندیقوں کے بنائے اور گھڑے ہوئے ہیں اور بعض میں صحیح ہونے کا احتمال ہے، ہم بحمد اللہ اُن سے بے نیاز ہیں۔ کتاب اللہ نے ہمیں ان چیزوں کا محتاج نہیں رکھا۔[3]

اللہ تعالیٰ نے ہم کو خبر دی کہ جب بنی اسرائیل سرکش اور باغی ہوگئے تو اللہ تعالیٰ نے اُن پر اُن کے دشمن کو مسلط کر دیا، اس دشمن نے ان کی عورتوں کو مباح کر لیا اور اُن کے گھروں میں گھس گئے اور اُن کو خوب ذلیل وخوار اور مقہور کیا۔ ﴿ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ ﴾ [حم السجدة: ٤٦] ''اور آپ کا رب بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔'' کیوں کہ بنی اسرائیل نے سرکشی اختیار کی اور انبیا وعلما میں سے ایک کثیر تعداد کو قتل کر دیا تھا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ سعید بن المسیب سے راوی ہیں کہ بختِ نصر نے شام پر غالب ہو کر بیت المقدس کو ویران کر دیا اور بنی اسرائیل کو قتل کیا، پھر دمشق میں آیا، وہاں خون کو کوڑا خانے پر جوش مارتے ہوئے دیکھا، پوچھا: یہ خون کیسا ہے؟ کہا: ہم نے اپنے آبا کو اسی حال پر پایا ہے اور جب کوڑا اس پر غالب ہوتا ہے تو یہ خون ظاہر ہوتا ہے۔ بختِ نصر نے اس خون پر ستر ہزار مسلمان وغیرہم مار ڈالے، تب وہ خون ساکن ہوا۔[4]

یہ روایت سعید بن المسیب رحمہ اللہ تک صحیح ہے اور یہی مشہور ہے۔ اس نے اشراف اور علما کو اتنا قتل کیا کہ تورات کا کوئی حافظ باقی نہ رہا اور انبیا کے بیٹوں وغیرہم میں سے ایک کثیر تعداد کو گرفتار اور قید کر لیا اور بہت سے اُمور

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٣١٥۔ ٢٣١٧)

[2] تفسیر الطبري (١٧/ ٣٥٧۔ ٣٥٨) اس کی سند میں ''رواد بن جراح عن سفیان الثوري'' ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث (٦٥٥١)

[3] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٣٨) [4] تفسیر الطبري (١٧/ ٣٦٨)

اور احکامات جاری ہوئے، جن کے ذکر کرنے میں طوالت ہے۔ اگر ہم صحیح بات یا جو صحیح کے قریب ہے پاتے، تو اس کی کتابت اور روایت جائز ہوتی۔ واللہ أعلم.

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تم اچھا کرو گے تو وہ بہتری تمھارے لیے ہے اور اگر تم برا کرو گے تو اس کا وبال تمھارے ہی اوپر ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مَنْ عَمِلَ صٰلِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ﴾ [حم السجدة: ٤٦] ''جس نے نیک عمل کیا تو اس کے اپنے ہی لیے ہے اور جس نے برا کیا تو (اس کا) وبال اسی پر ہے۔'' اور جب دوبارہ فساد کرو گے اور تمھارے دشمن آ جائیں گے تو تمھارے چہرے اداس پڑ جائیں گے، یعنی وہ تمھاری توہین کریں گے اور تم مقہور ہو جاؤ گے اور وہ مسجد، یعنی بیت المقدس میں اسی طرح داخل ہوں گے، جس طرح کہ پہلی بار وہ تمھارے گھروں میں گھس گئے تھے اور جن پر ان کو غلبہ ہوگا، ان کو خاک سیاہ کر ڈالیں گے اور ویران و برباد کر دیں گے۔ قریب ہے کہ تمھارا رب تم پر رحم کرے اور اُن کو تم سے پھیر دے اور جب فساد کی طرف لوٹ آؤ گے تو ہم بھی دنیا میں ان کو تم پر مسلط کر دیں گے اور یہ آخرت کے عذاب کے علاوہ ہوگا۔ لہٰذا فرمایا ہے کہ ہم نے جہنم کو کافروں کے لیے حصیر یعنی ٹھکانا و محصر و قید خانہ ٹھہرایا ہے۔ اس سے بچت ہرگز نہیں ہوگی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ حصیر سجن ہے، یعنی قید خانہ۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ اس میں بند کیے جائیں گے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا کہ حصیر ہے، یعنی فراش (بچھونا) ومہاد (بستر)۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ بنی اسرائیل نے فساد کی طرف عود کیا (لوٹے)، اللہ تعالیٰ نے ان پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے اصحاب کو مسلط کر دیا۔ اب یہ اُن سے دست بدست جزیہ لیتے ہیں اور وہ ذلیل ہو کر دیتے ہیں۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ اس جگہ قضا سے مراد اطلاع دینا اور خبر دینا ہے۔[2] (قاله ابن عباس) یا حکم اور اصل کو مکمل کرنا، معنی قضا کے کسی چیز کے محکم کرنے سے فارغ ہونا ہے یا "قضینا" سے مراد "أوحینا" ہے۔ کتاب سے مراد تورات ہے، وہ ان کے نبی موسیٰ علیہ السلام پر اُتری تھی یا مراد لوحِ محفوظ ہے۔ "فساد في الأرض" سے مراد تورات میں دی گئی شریعت کی مخالفت ہے اور زمین سے مراد شام کی زمین اور بیت المقدس یا زمینِ مصر ہے۔ پہلی بار کا فساد شعیا کا قتل، ارمیا کا قید کرنا اور احکامِ تورات کی مخالفت تھی اور دوسری بار کا فساد یحییٰ بن زکریا علیہ السلام کا قتل اور عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کا ارادہ یا پہلے زکریا علیہ السلام کا قتل، پھر یحییٰ علیہ السلام کا قتل ہے۔ امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے ذکر کیا کہ بعض علما نے خبر دی ہے کہ زکریا علیہ السلام اپنی موت سے مرے اور مقتول نہیں ہوئے۔[3] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: اول فسادِ قتلِ زکریا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن پر بادشاہِ نبط کو بھیجا، بنی اسرائیل نے نبط کے ساتھ جنگ کی تیاری کی اور اُن کو مارا۔[4]

---

[1] تفسیر الطبري (٣٨٩-٣٩٠)
[2] تفسیر الطبري (١٧/ ٣٥٦) تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣١٧)
[3] تفسیر الطبري (١٧/ ٣٦٥)
[4] تفسیر الطبري (١٧/ ٣٥٧)

﴿ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ ﴾ (آیتِ باب)۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی بار جالوت کو اٹھایا، اور دوسری بار بخت نصر کو۔ پھر بنی اسرائیل فساد کی طرف لوٹے۔ تب اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو اُن پر مسلط فرمایا۔[1] ﴿ عُلُوًّا كَبِيرًا ﴾ سے مراد اطاعت اللہ سے تکبر ہے اور لوگوں پر ظلم تکبر اور سرکشی کے ساتھ غلبہ ہے۔ جب پہلے وعدے کا وقت آیا، یعنی وعید کا عذاب نازل ہوا تو ہم نے تم پر اپنے ایسے بندے بھیجے، جو کہ سخت تکلیف دینے والے تھے، یعنی قوتِ جنگ رکھتے تھے اور دشمن کے سامنے کے وقت سخت گیری کرتے تھے۔ مراد بختِ نصر کا لشکر ہے اور بعض نے کہا کہ جالوت یا فارس کی فوج یا بابل کا لشکر سنجاریب اہلِ نینویٰ۔ انھوں نے علما کو قتل کر ڈالا اور تورات آگ میں پھونک دی اور مسجد ویران کر دی اور ستر ہزار لوگ قید کر لیے اور گھروں، محلوں اور شہروں میں گھس کر فساد اور قتل کیا۔

امام ابن عزیز اور قتیبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ”جاسوا وھاسوا و داسوا“ کے ایک معنی ہیں: یعنی ”عاثوا وترددوا“[2] امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ یعنی طواف کیا کہ کوئی قتل سے بچا ہے یا نہیں۔ جوس کہتے ہیں کہ کسی چیز کو تلاش کرنا اس کی انتہا کو پہنچانے کے لیے۔[3] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ یعنی گھروں میں گھومتے پھرتے تھے اور گھر گھر کو تلاش کرتے اور ڈھونڈھ کر آتے جاتے قتل کرتے۔[4] امام فراء رحمہ اللہ نے کہا کہ اُن کو اُن کے گھروں کے اندر قتل کیا۔ امام قطرب رحمہ اللہ نے کہا کہ ”جاسوا“ بہ معنی ”نزلوا“ ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ”حاسوا“ پڑھا ہے۔ ابو زید نے کہا کہ حوس، جوس، عوس، ہوس بہ معنی رات کے وقت پھرنا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ”جاسوا“ بہ معنی ”مشوا“ ہے۔[5]

خلالِ دیار بہ معنی وسطِ دیار ہے۔ اللہ کا یہ وعدہ لا محالہ ہونے والا تھا، اس میں مخالفت کی گنجایش نہ تھی۔ پھر اے بنی اسرائیل! اللہ تعالیٰ نے تم کو ان دشمنوں پر دوبارہ غلبہ اور حکومت عطا کی، جب کہ تم نے اپنی بدافعالی سے توبہ کی، یہ غلبہ ان کو داود علیہ السلام کے جالوت کو قتل کرنے کے وقت حاصل ہوا، یا اس وقت کہ بختِ نصر مارا گیا اور اس غلبے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے مال و اولاد سے بھی مدد دی، حالاں کہ پہلے سارا مال تباہ و برباد ہو گیا تھا اور اولاد قتل ہو گئی تھی۔ اب پھر وہی ساز و سامان حسبِ سابق حاصل ہوا اور کثرتِ نفر و انفار (لوگوں کی کثیر تعداد) ہاتھ آئی اور مقدار میں دشمنوں سے بڑھ گئے۔ لہٰذا فرمایا کہ اب اس ترقی کے بعد اگر تمھارے افعال و اقوال اچھے اور اس طرح کے ہوں گے، جیسے تم سے مطالبہ کیا جاتا ہے تو اُن کا ثواب تمھیں پہنچے گا اور اگر تمھارے اعمال برے ہوئے اور تم نے اُن کو اس کے خلاف کیا، جس کا مطالبہ ہے تو اُن کی برائی تم پر ہے۔

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٣٨٩) [2] تفسير القرطبي (١٠/ ٢١٦) [3] معاني القرآن (٣/ ٢٢٧)
[4] تفسير الطبري (١٧/ ٣٦٥_٣٦٦) [5] تفسير القرطبي (١٠/ ٢١٦)

حرف لام کے ساتھ تعبیر مشاکلت کے لیے ہے۔ (قاله الكرماني) امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا: لام بہ معنی الیٰ ہے؛ ”أي فإليها ترجع الإساءة“[1] یعنی برائی اس کی طرف لوٹ جائے گی۔ بعض نے کہا کہ معنی یہ ہیں: ”فله الجزاء والعقاب“ تو اس کے لیے جزا و سزا ہے۔ حسین بن فضل رحمہ اللہ نے کہا: ”أي فلها رب يغفر الإساءة“[2] یعنی اس کا رب ہے جو برائی کو بخشتا ہے۔ یہ خطاب یا تو اگلے بنی اسرائیل کو ہے یا نبی اکرم ﷺ کے زمانے کے بنی اسرائیل کو ہے کہ تمھارے سلف پر یہ گزر چکا ہے، تم ایسا نہ کرو، یا یہ خطاب مشرکینِ قریش کو ہے۔ اب جب دوسرا وعدہ آئے گا، مراد اس وعدے سے یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کا قتل ہے، ان کے قتل کا قصہ انجیل میں بطورِ استیفاء (مکمل شکل میں) آیا ہے۔ انجیل میں اُن کا نام یوحنا ہے، ان کو ایک بنی اسرائیل کے بادشاہ نے ایک عورت کی فرمایش پر قتل کر ڈالا تھا۔ اس بادشاہ کا نام لاخت تھا۔ (قاله ابن قتيبة) امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ ہیر دوس تھا۔[3] تب فارس اور رومی اُن پر مسلط ہوئے اور قتل کیا اور کچھ قید کر لیے۔ بعض نے کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کا ارادہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو رہائی دی اور اپنی طرف اُٹھا لیا۔ بالجملہ اس دوسرے وعدے سے اُن کی صورتوں پر برائی ظاہر ہوئی اور چہروں پر کاب (بدحالی اور پریشانی) نمودار ہوئی۔ بعض نے کہا کہ وجوہ سے مراد اُن کے سردار ہیں اور انھوں نے پہلی بار کی طرح مسجد میں داخل ہو کر ویرانی کی اور جس شے پر قابو پایا، اسے تباہ و برباد کر دیا۔ جب تک اُن کا غلبہ رہا، یہی برتاؤ کرتے رہے۔

اللہ تعالیٰ نے کہا: اے بنی اسرائیل! اللہ تعالیٰ عن قریب تم پر اس انتقام کے بعد دوسری دفعہ رحم کرنا چاہتا ہے، وہ تمھاری دولت تم کو پھیر دے گا۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ رحمت، جس کا وعدہ کیا تھا، محمد ﷺ کی بعثت ہے[4] اور یہ بھی کہہ دیا کہ اگر اب تم تیسری بار وہی پہلے والے کام کرو گے تو ہم بھی تیسری بار تمھیں عذاب کریں گے۔ اہلِ سیر نے کہا کہ انھوں نے اس چیز کی طرف عود کیا، جو اُن کو لائق نہ تھی، یعنی محمد ﷺ کی تکذیب اور خاتم الانبیا کی جو صفت تورات و انجیل میں آ چکی تھی، اس کو چھپانا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے بھی اُن کے عذاب و عتاب کی طرف عود فرمایا۔ عرب کے ہاتھ پر بنی قریظہ، بنی نضیر، بنی قینقاع، خیبر پر قتل اور غارت گری، گرفتاری، جلا وطنی اور مار دھاڑ اور جزیہ کا نفاذ اور ذلت اور مسکینی کی بلا آئی۔ مفسرین نے دونوں واقعات کے تعین کے بارے اور دو دفعہ جو لوگ ان پر مسلط کیے گئے، اُن کی تعیین کے بارے میں اور انتقام کی کیفیت کے بارے میں جو اختلاف کیا ہے، اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے دوزخ کو منکروں کے لیے ایک مجلس اور قید خانہ ٹھہرایا، وہ ہمیشہ جہنم میں محبوس رہیں گے، کبھی رہائی نہ پائیں گے۔ سجن کو محصر و حصیر کہتے ہیں۔[5]

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٣٧١) [2] تفسير القرطبي (١٠/ ٢١٧) [3] فتح القدير (٣/ ٢٩١)

[4] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣١٩) [5] فتح البيان (٧/ ٣٥٥_ ٣٥٩)

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ وَ یُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِیْرًا ۙ﴿۹﴾ وَّ اَنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ﴿۱۰﴾

بے شک یہ قرآن وہ راہ بتاتا ہے جو سب سے سیدھی ہے اور مومنوں کو بشارت دیتا ہے جو نیک کام کرتے ہیں کہ یقیناً ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے (9) اور یہ کہ بلاشبہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے لیے ہم نے نہایت دردناک عذاب تیار کیا ہے (10)

قرآنِ مجید ایک بہترین راہنما ہے:

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ عزیز کی، جو اپنے رسولِ مقبول پر اُتاری ہے، مدح فرمائی کہ یہ قرآن سب سے سیدھے واضح اور مضبوط راستے کی طرف ان مومنوں کے لیے، جو عملِ صالح کرنے والے ہیں، راہنمائی کرتا ہے، بشارت دیتا ہے کہ قیامت میں اُن کو بڑا اجر ملے گا اور جو لوگ آخرت کے منکر ہیں، ان کو عذابِ اَلیم کا مژدہ دیتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴾ [آل عمران: ۲۱] ''تو آپ انھیں دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دیجیے۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ﴿ اَقْوَمُ ﴾ سے مراد ''أصوب'' ہے اس طریق سے مراد ملتِ اسلام ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ ایسے حالات کی طرف راہنمائی کرتا ہے جو تمام حالات سے اَقوم ہے (زیادہ سیدھا مضبوط ہے) وہ اللہ کی توحید اور ایمان والوں کو جو اچھے کام کرتے ہیں، یعنی فاعل طاعات اور تارکِ سیئات ہیں[2]، ان کو جنت کی خوش خبری دیتا ہے اور جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے، اُن کے لیے دردناک عذاب تیار کیا گیا ہے۔ یہ ایک دوسری خوش خبری ہے ایمان داروں کے لیے کہ اُن کے دشمنوں کو عتاب ہوگا اور بے شک دشمنوں کی مصیبت خوشی کا سبب بنتی ہے۔

وَ یَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَیْرِ ؕ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ﴿۱۱﴾

اور انسان برائی کی دعا ایسے مانگتا ہے جیسے اس کی بھلائی کی دعا ہو۔ اور انسان بہت عجلت والا ہے (11)

انسان کا جلد بازی کرتے ہوئے اپنے لیے بد دعا کرنا:

یعنی گھبراتا ہے کہ میری دعا فوراً کیوں نہیں قبول ہوتی اور اس کی بعض دعا اس کے حق میں بُری ہوتی ہے، اگر قبول ہو تو انسان خراب ہو، سو ہر طرح اللہ بہتر اور دانا ہے، اسی کی رضا پر شاکر رہنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی جلدی کرنے

---

[1] معاني القرآن (۳/ ۲۲۹) [2] فتح البیان (۷/ ۳۶۰)

کی خبر دی کہ بعض اوقات وہ اپنی جان اور اولاد اور مال پر بد دعا کرتا ہے اور موت یا ہلاکت و تباہی ولعنت اور ایسی ہی اور چیزیں مانگتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اس کی یہ دعا قبول کر لے تو وہ ہلاک ہو جائے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ ۭ فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَاۗءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴾ [یونس: ۱۱] ''اور اگر اللہ لوگوں کو برائی پہنچانے میں جلدی کرتا، جیسے وہ بھلائی مانگنے میں جلدی کرتے ہیں تو ان کی میعاد پوری ہو چکی ہوتی، چناں چہ ہم ان لوگوں کو جو ہماری ملاقات کی اُمید نہیں رکھتے، چھوڑ دیتے ہیں کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں۔'' سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد اور قتادہ رحمہ اللہ نے اسی طرح تفسیر کی ہے۔[1]

حدیث میں مروی ہے: «لَا تَدْعُوا عَلَى أَنْفُسِكُمْ وَلَا عَلٰى أَمْوَالِكُمْ أَنْ تُوَافِقُوْا مِنَ اللّٰهِ سَاعَةً يَسْتَجِيْبُ فِيْهَا»[2] [تم اپنے لیے اور اپنے مال کے لیے بد دعا نہ کرو، کیوں کہ ہو سکا ہے کہ قبولیتِ دعا کی گھڑی ہو اور اللہ تعالیٰ تمھاری بد دعا کو قبول فرما لے] ابن آدم کو اس دعائے شر کے لیے اس کا قلق اور جلد بازی اُکساتے ہیں، لہٰذا فرمایا کہ انسان جلد بازی کرنے والا ہے۔ سیدنا سلمان فارسی اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم نے اس جگہ آدم علیہ السلام کے قصے کا ذکر کیا ہے کہ جب اُن میں سر کی طرف سے روح پھونکی گئی اور جان دماغ تک پہنچی، چھینک آئی، کہا: ''الحمد للہ'' اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''یرحمك ربك یا آدم'' [اے آدم! اللہ تم پر رحم کرے] جب روح دونوں آنکھوں تک پہنچی، آنکھیں کھول دیں، جب اعضا میں آئی اور بدن میں پھیلی تو دیکھنے لگے اور خوش ہوئے اور چاہا کہ اُٹھ کھڑے ہوں، اس سے پہلے کہ جان پاؤں تک پہنچے، لیکن کھڑے نہ ہو سکے اور کہا: اے رب! جلدی کر رات سے پہلے۔ سو انسان جلد باز پیدا ہوا ہے۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ انسان سے مراد جنس ہے، اس لیے کہ یہ دعا بعض انسانوں سے واقع ہوتی ہے، آدمی کسی وقت تنگ دل ہو کر اپنی جان یا اولاد کو کوسنے لگتا ہے، جو لائق قبول کے نہیں ہے، جیسے: ''اللهم أهلكه، اللهم العنه ونحو ذلك'' [اے اللہ! اسے ہلاک کر دے، اے اللہ! اس پر لعنت فرما وغیرہ] اس کا یہ بد دعا کرنا ویسا ہی ہے، جیسے کہ اپنے لیے دعائے خیر اپنے رب سے مانگتا ہے، مثل عافیت اور رزق کے، سو اگر اللہ تعالیٰ بد دعا اس کی اس کے حق میں قبول کر لے تو وہ برباد ہو جائے، لیکن اپنے فضل و کرم اور رحمت سے قبول نہیں کرتا۔ سورت یونس سے مفہوم نکلتا ہے کہ اللہ دعائے خیر کو مستجاب کرتا ہے اور دعائے بد کو قبول نہیں فرماتا۔[4] بعض نے کہا کہ اس جگہ انسان

[1] تفسیر الطبري (۱۷/ ۳۹۳۔ ۳۹٤)
[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۳۰۰۹)
[3] تفسیر الطبري (۱۷/ ۳۹٤۔ ۳۹۵) تفسیر ابن کثیر (۳/ ۳۹)
[4] رقم الآیة [۱۱]

سے مراد کافر ہے۔ وہ اپنے لیے دعاے شر مانگتا ہے، یعنی عذاب کے آنے کی جلدی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا قول نقل فرمایا ہے: ﴿ اللّٰهُمَّ اِنۡ كَانَ هٰذَا هُوَ الۡحَقَّ مِنۡ عِنۡدِكَ فَاَمۡطِرۡ عَلَيۡنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائۡتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ ﴾ [الأنفال: ٣٢] ''اے اللہ! اگر یہ (قرآن) تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا ہم پر دردناک عذاب لے آ۔''

بعض نے کہا کہ مراد ممنوع کام کی خواہش میں دعا کرنا ہے، جس طرح کہ طلبِ مباح میں انسان کو جلد بازی کی طبیعت دی گئی ہے، جو بھی خیال اس کے دل میں آتا ہے، اس کے لیے جلدی کرتا ہے اور انجام کار کی طرف نظر نہیں کرتا۔ من جملہ اس کی عجلت کے ایک یہ بات ہے کہ شر کا سوال بھی خیر کے سوال کی طرح کرتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ آدمی تنگ دل بنا ہے، نہ تکلیف میں صبر کرے اور نہ خوشی میں۔[1] یا مراد انسان سے جنس ہے، اس لیے کوئی آدمی عجلت سے عاری نہیں ہے۔ اگر وہ اس کو چھوڑ دیتا تو یہ چھوڑنا اس کے لیے دونوں جہانوں میں بہت اچھا ہوتا۔ بعض نے کہا کہ اس جگہ انسان سے مراد آدم علیہ السلام ہیں، لیکن مناسب سیاق وہی پہلا قول ہے۔[2]

وَجَعَلۡنَا الَّيۡلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيۡنِ فَمَحَوۡنَاۤ اٰيَةَ الَّيۡلِ وَجَعَلۡنَاۤ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبۡصِرَةً لِّتَبۡتَغُوۡا فَضۡلًا مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَلِتَعۡلَمُوۡا عَدَدَ السِّنِيۡنَ وَالۡحِسَابَ ؕ وَكُلَّ شَىۡءٍ فَصَّلۡنٰهُ تَفۡصِيۡلًا ﴿۱۲﴾

اور ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا، پھر ہم نے رات کی نشانی تو محو (بے نور) کر دی اور دن کی نشانی روشن بنائی، تا کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو، اور تا کہ تم برسوں کی گنتی اور حساب جان لو۔ اور ہم نے ہر چیز خوب تفصیل سے بیان کر دی ہے ⑫

رات دن اللہ تعالیٰ کی عظیم نشانیاں ہیں:

یعنی گھبرانے سے کچھ فائدہ نہیں، ہر چیز کا وقت اور اندازہ مقرر ہے، جیسے رات اور دن۔ کسی کے گھبرانے سے اور دعا سے رات کم نہیں ہو جاتی، اپنے وقت پر آپ صبح ہوتی ہے اور دونوں اس کی قدرت کے نمونے ہیں۔

رات دن گردش میں ہیں ہفت آسمان ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

اللہ تعالیٰ نے اپنی خلق پر اپنی بڑی نشانیوں کا احسان رکھا۔ ایک نشانی رات اور دن کے درمیان اختلاف ہے، تا کہ رات میں سکون حاصل ہو اور دن میں روزی کمانے اور کام کاج میں مصروف ہو اور کام کرنے کی فرصت ہو اور خشکی اور تری کا سفر کیا جا سکے اور دنوں، مہینوں اور سالوں کی گنتی معلوم ہو اور جو مدتیں قرض کو ادا کرنے، عبادات و

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٣٩٥) [2] فتح البيان (٧/ ٣٦٠۔ ٣٦١)

معاملات و اجارات وغیرہ کے لیے مقرر کی گئی ہیں، ان کی شناخت حاصل ہو۔ لہٰذا فرمایا ہے کہ یہ بندوبست اس لیے کیا گیا ہے کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو، یعنی معایش وسفروں میں اور برسوں اور حساب کی گنتی جان لو، کیوں کہ اگر سارا زمانہ ایک ہی طریقے پر ہوتا اور اسلوب متساوی رہتا تو اشیائے مذکورہ میں سے کوئی شے معلوم نہ ہوتی، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ۭ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ۝ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ [القصص: ٧١۔ ٧٣] ''(اے نبی!) کہہ دیجیے: دیکھو تو! اگر اللہ تم پر قیامت تک ہمیشہ کے لیے رات ہی (طاری) کر دے تو اللہ کے سوا کون الٰہ ہے جو تمھیں روشنی (دن) لا دے؟ کیا پھر تم سنتے نہیں؟ کہہ دیجیے: بتلاؤ! اگر اللہ تم پر قیامت تک ہمیشہ کے لیے دن ہی (طاری) کر دے تو اللہ کے سوا کون الٰہ ہے جو تمھیں رات لا دے کہ تم اس میں آرام کر سکو؟ کیا پھر تم دیکھتے نہیں؟ اور اس نے اپنی رحمت ہی سے تمھارے لیے رات اور دن بنائے، تاکہ تم اس (رات) میں آرام کرو اور تاکہ تم (دن میں) اس کا فضل تلاش کرو، اور شاید کہ تم شکر کرو۔''

نیز فرمایا: ﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ۝ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ﴾ [الفرقان: ٦١۔ ٦٢] ''وہ ذات بڑی بابرکت ہے جس نے آسمان میں ستارے بنائے اور اس میں چراغ (سورج) اور روشن چاند بنایا۔ اور وہی (اللہ) ہے جس نے ایک دوسرے کے پیچھے آنے والے رات اور دن بنائے، اس شخص (کی نصیحت) کے لیے جو نصیحت پکڑنا چاہے یا شکر کرنا چاہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَلَهُ اخْتِلَافُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ﴾ [المؤمنون: ٨٠] ''اور رات اور دن کا اختلاف اسی کا (پیدا کیا ہوا) ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ﴾ [الزمر: ٥] ''اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا، وہ رات کو دن پر لپیٹتا ہے اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے اور اس نے سورج اور چاند کو کام پر لگا دیا ہے، ہر ایک مقرر وقت تک چلا رہا ہے، سنو! وہ نہایت غالب، بہت بخشنے والا ہے۔''

نیز فرمایا: ﴿ فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴾ [الأنعام: ٩٦] ''وہ صبح کی سپیدی نکالتا ہے اور اس نے رات کو سکون کا باعث بنایا اور سورج اور چاند کو اپنے حساب سے چلنے والا (بنایا)، یہ سب بہت زبردست، خوب علم رکھنے والے کا اندازہ ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ ښ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ۝ وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴾ [یٰس: ٣٧۔ ٣٨] ''اور ان کے لیے ایک نشانی رات ہے، ہم اس سے دن کو کھینچ نکالتے ہیں، پھر (دن ختم ہونے پر) یکایک وہ اندھیرے میں

ڈوب جاتے ہیں۔ اور سورج اپنے ٹھکانے (پر پہنچنے) کے لیے رواں دواں رہتا ہے، یہ نہایت غالب، خوب جاننے والے (اللہ) کا اندازہ ہے۔''

پھر اللہ تعالیٰ نے رات کو ایک نشانی ٹھہرایا، یعنی علامت جس کو پہچانتے ہیں، وہ علامت تاریکی شب کی اور چاند کا نکلنا ہے اور دن کی علامت روشنی اور سورج کا نکلنا ہے۔ چاند اور سورج کی روشنی میں فرق رکھا ہے، تاکہ ہر ایک کی علاحدہ علاحدہ شناخت رہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۝۵ اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ ﴾ [یونس: ٥۔ ٦] ''وہی ہے (اللہ) جس نے سورج کو نہایت روشن بنایا اور چاند کو نور اور اس کی منزلیں مقرر کیں، تاکہ تم سالوں کی گنتی اور حساب معلوم کر سکو۔ یہ (سب کچھ) اللہ نے حق ہی کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ وہ اپنی آیتیں تفصیل سے ان لوگوں کے لیے بیان کرتا ہے جو جانتے ہیں۔ بے شک رات اور دن کے (بدل بدل کر) آنے جانے میں اور جو کچھ اللہ نے آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا ہے (اس میں بھی)، البتہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ڈرتے ہیں۔''

نیز فرمایا: ﴿ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَ الْحَجِّ ؕ وَ لَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰی ۚ وَ اْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾ [البقرة: ١٨٩] ''(اے نبی!) آپ سے چاند (کے احوال) کے متعلق سوال کرتے ہیں کہہ دیجیے: وہ لوگوں کے لیے اور حج کے لیے اوقات مقررہ ہیں اور نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے گھروں میں ان کے پچھواڑوں کی طرف سے آؤ، بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی پرہیز گاری اختیار کرے، اور تم اپنے گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ، اور تم اللہ سے ڈرو، تاکہ تم فلاح پاؤ۔''

عبداللہ بن کثیر رحمہ اللہ نے محو اور ابصار کی تفسیر میں کہا ہے کہ مراد ظلمتِ لیل اور سدفِ (تاریکی اور روشنی کی آمیزش) نہار ہے۔ اور امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ سورج دن کی علامت اور چاند رات کی علامت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو اسی طرح پیدا کیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ چاند سورج کی طرح چمکتا ہے۔ چاند رات کی علامت اور سورج دن کی علامت ہے۔ رات کی نشانی کو یعنی اس سیاہی کو جو چاند میں ہے مٹا دیا ہے۔ ابن الکواء نے سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے پوچھا تھا کہ یہ لطخہ یعنی دھبہ جو چاند میں ہے کیا ہے؟ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا: تجھ پر افسوس ہے تو قرآن نہیں پڑھتا ہے: ﴿ فَمَحَوْنَاۤ اٰیَةَ الَّیْلِ ﴾ (آیتِ باب) یہ اس آیت کا محو ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم سنتے تھے کہ رات کی علامت کا مٹانا یہی سیاہی ہے، جو چاند میں ہوتی ہے اور دن کی نشانی کو بینا کیا ہے اور سورج کو چاند سے زیادہ تر درخشاں اور اعظم کیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے رات دن اسی طرح بنائے ہیں۔ [1]

[1] تفسیر الطبري (١٧/ ٣٩٥۔ ٣٩٦) تفسیر ابن کثیر (٣/ ٤٠)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ شب و روز دو نشانیاں ہیں، ایک میں اندھیرا ہے، دوسری میں انارت (روشنی) ہے اور ایک، دوسرے کے پیچھے لگا چلا آتا ہے۔ اُن میں وہ عجائب ہیں جن کے بیان کرنے میں عقلوں کو حیرانی ہوتی ہے۔ ان کو آیت اس لیے فرمایا کہ یہ دونوں اُن دونوں کے پیدا کرنے والے کے وجود اور خالق کی قدرت کی دلیل ہیں۔ ان کے ایک ہی ترتیب پر ایک دوسرے کا تعاقب کرنے کا حکم ہے، اگرچہ کوئی اور ترتیب بھی ممکن تھی۔ رات کو دن سے پہلے اس لیے رکھا کہ اصل یہی رات ہے۔ اس جگہ آیتین بہ لفظِ تثنیہ کہا ہے اور آیتِ کریمہ: ﴿ وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴾ [الأنبياء: ٩١] ''اور اسے اور اس کے بیٹے (عیسیٰ) کو اہلِ عالم کے لیے (عظیم) نشانی بنا دیا۔'' میں آیت کو مفرد لیا، اس لیے کہ دن اور رات میں تباین (آپس میں فرق) ہے ہر وجہ سے اور یہ دونوں بار بار آتے جاتے رہتے ہیں، اس لیے اس جگہ تثنیہ مناسب ٹھہرا، بہ خلاف عیسیٰ و مریم علیہما السلام کے، عیسیٰ علیہ السلام اپنی ماں کا ایک جز تھے، اُن میں کچھ تکرر نہ تھا، لہٰذا وہاں آیت کو مفرد لانا مناسب ہوا۔ (قاله الكرخي)

''محو'' سے مراد مٹانا ہے نورِ شب کا۔ چاند انارت اور روشنی میں سورج کی طرح تھا، لیکن اس میں سیاہی رکھی گئی۔ یہی معاملہ محو کے آثار میں سے ہے۔ بعض نے کہا کہ ''محو'' سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رات کو اندھیرا اور کالا اور تیرہ و تار پیدا کیا ہے، اس میں کوئی شے نمودار نہیں ہوتی ہے، یہ مراد نہیں ہے کہ پہلے ایسے نہ تھے، اب اس کو محو کر دیا ہے۔ سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا: "هو السواد الذي في القمر"[1] [مراد وہ سیاہی ہے جو چاند میں ہے] سیدنا عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا کہ چاند کی یہ سیاہی کیا ہے؟ کہا کہ یہ دونوں دو سورج تھے اور یہ سیاہی جو تو نے دیکھی، محو ہے۔[2] (أخرجه البيهقي و ابن عساكر و أخرج ابن مردويه عن ابن عباس رضی اللہ عنہما نحوه مرفوعا بأطول منه) امام سیوطی رحمہ اللہ نے کہا کہ اسناد اس کی واہی ہے۔[3]

پھر فرمایا کہ ہم نے دن کی آیت کو بینا کر دیا، یعنی سورج کی روشنی میں ہر شے اچھی طرح نظر آتی ہے، اس لیے کہ تم دن کی روشنی سے ذریعہ معاش کو حاصل کرنے کے لیے توصل کرو۔ فضل سے مراد رزق ہے، کیوں کہ غالب یہی ہے کہ دن رزق حاصل کرنے کے لیے اور ضروریات پوری کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ اس جگہ رات میں سکون کا ذکر نہیں فرمایا۔ دوسری جگہ پر اس ذکر پر اکتفا کیا: ﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ﴾ [المؤمن: ٦١] ''اللہ وہ ہے جس نے تمھارے لیے رات (تاریک) بنائی، تاکہ تم اس میں آرام کرو اور دن کو دکھلانے والا (روشن) بنایا۔''

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٣٩٦) اس کی سند میں ''عبداللہ بن کواء'' ضعیف راوی ہے۔

[2] دلائل النبوة للبيهقي (٦/ ٢٦١۔ ٢٦٢) تاريخ دمشق لابن عساكر (٢٩/ ١١٠۔ ١١١) اس کی سند میں ''احمد بن عبدالجبار'' ضعیف راوی ہے۔

[3] الدر المنثور (٥/ ٢٤٧)

پھر اس طرح کرنے کی ایک دوسری مصلحت بیان فرمائی، وہ سالوں کی گنتی کا علم ہے اور حساب کا، کیوں کہ یہ علم بغیر اختلاف جدیدین ہے اور اس سے دنوں، ہفتوں، مہینوں اور سالوں کے بارے میں علم حاصل ہونا ایک مانی ہوئی بات ہے۔ عدد اور حساب کے درمیان فرق یہ ہے کہ عدد اس چیز کے گننے کو کہتے ہیں، جس کی (کمیت) مقدار ہو، مثال کے تکرار کے ذریعے سے بغیر اس کے کہ اس سے کوئی چیز حاصل ہو اور حساب اس چیز کے گننے کو کہتے ہیں، جو کمیت رکھتی ہے مثال کے تکرار کے ذریعے سے، اس طرح پر کہ اس کے ایک طائفۂ معینہ اور حصۂ مقررہ سے ایک حد معین ہوتی ہے اور اس کے لیے ایک خاص نام ہے، مثلاً اگر سال پر بہ حیثیت عدد ایام نظر پڑتی ہے تو یہ عدد ہے اور اگر بہ حیثیت تحقق و تحصل کے شہور عدیدہ سے پڑتی ہے اور ہر ماہ چند ایام سے حاصل ہوتا ہے، ہر یوم چند ساعت اور ہر ساعت چند دقائق سے تو یہ حساب ہوا اور اگر رات دن یکساں ہوتے اور ایک دوسرے کی طرح ہوتے تو رات کی دن سے شناخت نہ ہوتی اور نہ حراص، مکتسبین (نوکری کرنے والے) اور تاجر لوگ آرام حاصل کرتے، بلکہ اکثر اُمور معطل ہو جاتے اور روزہ دار نہ جانتا کہ میں کب افطار کروں اور حج، روزہ، نماز، زراعت اور مقررہ اجتماعات کے اوقات معلوم نہ ہوتے۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا کہ لفظِ عدد و حساب میں کچھ تکرار نہیں ہے، اس لیے کہ عدد موضوع حساب ہے۔

پھر فرمایا کہ ہم نے ہر شے کی بہ خوبی تفصیل بیان کر دی ہے، جس کی تم کو دین و دنیا میں ضرورت ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ﴾ [الأنعام: ٣٨] ''ہم نے کتاب میں کوئی چیز نہیں چھوڑی (جس کا ذکر نہ کیا ہو)۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ﴾ [النحل: ٨٩] ''اور ہم نے آپ پر ہر چیز کو کھول کر بیان کرنے والی یہ کتاب نازل کی ہے۔''

لفظِ ﴿ تَفْصِيْلًا ﴾ کا ذکر تاکید اور تقریرِ کلام کے لیے ہے، گویا یوں ارشاد کیا ہے کہ ''فصلناه حقا على الوجه الذي لا مزيد عليه'' [ہم نے اسے اس طرح سے واضح کر دیا ہے جس پر مزید کسی بیان کی گنجایش نہیں ہے] اس مقام پر تمام علتیں دور ہو جاتی ہیں اور تمام عذر زائل۔ اب جو کوئی ہلاک ہوگا، وہ بینہ سے ہلاک ہوگا۔[1] کتابِ عزیز کے کلیات اور عمومات اور اسی طرح سنتِ مطہرہ کے قواعد احکام حوادث کے لیے قیامت کے دن تک کے لیے کافی ہیں۔

ان دو اصل اصیل کے ہوتے ہوئے فقہی تفریعات و عقلی مجادلات و خیالی قیاسات اور فضول اجتہادات کی کچھ ضرورت نہیں پڑتی، لیکن کتاب و سنت پر عبور حاصل کرنا اور ہمیشہ اس کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔ وہ بھی اسی قدر جتنا کہ فقہا اور اہلِ رائے کو اپنے کتب قیل و قال و اغلوطات مسائل و تفاریع و تفاریق رسائل میں ہے نہ زیادہ۔ بلکہ اس سے بھی کم خصوصاً اس موجودہ دور میں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی مدد اور حمد سے سنتِ مطہرہ کو سمجھنے کے لیے کتابیں ہر زبان میں مروج و مدون ہوگئی ہیں۔ کیا عبادات کے مسائل ہوں اور کیا معاملات کے بارے میں احکام ہوں اور وہ

---

[1] فتح البیان (٧/ ٣٦١۔ ٣٦٣)

بھی اس دعوے کی شہادت کے لیے دلیل اور قابلِ قبول حجت کے ساتھ مختلف رسالوں کی شکل میں موجود ہیں۔

ان میں سے بعض رسائل یہ ہیں: "عرف الجادي من جنان هدي الهادي" و "النهج المقبول من شرائع الرسول" و "الروضة الندية في شرح الدرر البهية" و "بدور الأهلة من ربط المسائل بالأدلة"، جس کی ہمت زیادہ تر جولانی کرے اور وہ یہ چاہے کہ میں براہین اور قطعی حجتوں سے واقفیت حاصل کروں، وہ کتاب "نيل الأوطار" و "فتح العلام" و "مسك الختام" و "بل الغمام" و " السيل الجرار" کا مطالعہ کرے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ شرح صدر نصیب ہوگا اور اجتہاد کرنے کا طریقہ آسان ہو جائے گا اور مختلف مذہب کے مسائل میں تنقید کی قوت میسر آئے گی اور حقِ صریح اور صاحبِ رجیح منکشف ہوگا اور ایمان کی حلاوت حاصل ہوگی اور سلف وخلف کے اصول اور مآخذ پر آگاہی حاصل ہوگی۔ لیکن یہ توفیق اسی کو حاصل ہوتی ہے جو صدقِ دل سے اللہ کا بندہ اور رسول مصطفیٰ و نبی مجتبیٰ کا اُمتی ہے، نہ کہ ہر ملبوس دنیا دار اور عالم بدکردار اور فقیر ناہموار اور جاہل گنوار کو۔

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

"یہ خوش قسمتی کسی کے بازوؤں کی طاقت یعنی کوشش کا نتیجہ نہیں، جب تک عطا کرنے والا اللہ تعالیٰ نہ عطا کرے۔"

وَكُلَّ إِنسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ ۖ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنشُورًا ﴿١٣﴾ اقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا ﴿١٤﴾

اور ہم نے ہر انسان کا عمل (نامہ) اس کی گردن سے لگا دیا ہے اور قیامت کے دن ہم اس کے لیے ایک کتاب نکالیں گے جس سے وہ ملے گا، جب کہ وہ کھلی ہوگی (13) (کہا جائے گا:) اپنا اعمال نامہ پڑھ، آج تیرا نفس ہی تیرا حساب لینے والا کافی ہے (14)

ہر انسان قیامت کے دن اپنے اعمال نامے کے ساتھ پیش ہوگا:

یعنی بری قسمت کے ساتھ برے عمل ہیں کہ چھوٹ نہیں سکتے قیامت میں وہی نظر آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے زمانے کا ذکر کرنے کے بعد اور بنی آدم کے اعمال کا جو کہ زمانے میں واقع ہوتے ہیں الزامِ طائر کا ذکر کیا۔ طائر سے مراد وہ عمل ہے جو انسان کرتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہما نے اسی طرح کہا ہے،[1] یعنی خیر اور شر، کہ یہ ہر انسان کو لازم حال ہوگا اور اُسی کے مطابق سزا و جزا ملے گی۔ ﴿فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٣٩٨)

یَّرَهٗ ۞ وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ ﴾ [الزلزال: ۷۔ ۸] ''لہٰذا جس نے ذرہ بھر بھلائی کی، وہ اسے دیکھ لے گا۔ اور جس نے ذرہ بھر برائی کی، وہ بھی اسے دیکھ لے گا۔''

نیز فرمایا: ﴿ عَنِ الۡیَمِیۡنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِیۡدٌ ۞ مَا یَلۡفِظُ مِنۡ قَوۡلٍ اِلَّا لَدَیۡهِ رَقِیۡبٌ عَتِیۡدٌ ﴾ [ق: ۱۷۔ ۱۸] ''اس کے دائیں طرف اور بائیں طرف بیٹھے ہوئے۔ (انسان) جو بات بھی (منہ سے) نکالتا ہے (وہ لکھنے کو) اس کے پاس ایک نگران (فرشتہ) تیار ہوتا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَاِنَّ عَلَیۡكُمۡ لَحٰفِظِیۡنَ ۞ كِرَامًا كَاتِبِیۡنَ ۞ یَعۡلَمُوۡنَ مَا تَفۡعَلُوۡنَ ﴾ [الانفطار: ۱۰۔ ۱۲] ''حالاں کہ تم پر نگران (فرشتے) مقرر ہیں۔ معزز لکھنے والے۔ وہ جانتے ہیں جو تم کرتے ہو۔'' نیز فرمایا: ﴿ اِنَّمَا تُجۡزَوۡنَ مَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴾ [الطور: ۱٦] ''تمھیں بس اسی کی سزا دی جائے گی، جو تم عمل کیا کرتے تھے۔'' نیز فرمایا: ﴿ مَنۡ یَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا یُّجۡزَ بِهٖ ﴾ [النساء: ۱۲۳] ''بلکہ جو کوئی برا عمل کرے گا، اس کا اسے بدلہ دیا جائے گا۔''

مقصود یہ ہے کہ ابن آدم کا عمل محفوظ رہتا ہے قلیل ہو یا کثیر اور رات دن اس پر لکھا جاتا ہے اور صبح و شام۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے: « طَائِرُ كُلِّ إِنْسَانٍ فِيْ عُنُقِهِ » [ہر انسان کی شامتِ عمل اس کی گردن میں ہے] ابن لہیعہ نے کہا ہے: "حتی الطيرة"[1] (رواه أحمد) [یہاں تک کہ شگون لینا بھی] یہ حدیث سخت غریب ہے۔ پھر جب قیامت کا دن آئے گا تو سارے اعمال کا مجموعہ ایک کتاب میں دے دیا جائے گا، اس کے دائیں ہاتھ میں اگر نیک بخت ہے اور بائیں ہاتھ میں اگر بدبخت ہے۔ وہ کتابِ منشور یعنی کھلی ہوئی ہوگی۔ ہر کوئی اس کو پڑھے گا، خود یہ اور دوسرے لوگ بھی۔ اس میں اول عمر سے لے کر آخر عمر تک کے سارے اعمال لکھے ہوئے ہوں گے: ﴿ یُنَبَّؤُا الۡاِنۡسَانُ یَوۡمَئِذٍۭ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ۞ بَلِ الۡاِنۡسَانُ عَلٰی نَفۡسِهٖ بَصِیۡرَةٌ ۞ وَّلَوۡ اَلۡقٰی ﴾ [القیامة: ۱۳۔ ۱۵] ''اس دن انسان کو بتا دیا جائے گا جو اس نے آگے بھیجا اور پیچھے چھوڑا۔ بلکہ انسان خود اپنے نفس پر خوب شاہد ہے۔ اگرچہ وہ اپنی (کتنی ہی) معذرتیں پیش کرے۔''

لہٰذا فرمایا ہے کہ تو خود اپنی کتاب پڑھ لے تو ہی اپنی جان کا حساب لینے والا کافی ہے۔ تجھ کو اس کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہو جائے گا کہ تجھ پر کوئی ظلم نہیں کیا گیا اور وہی لکھا گیا جو تو نے کیا تھا۔ تجھ کو جو کچھ تجھ سے ہوا یاد ہوگا، کیوں کہ کوئی شخص قیامت کے دن اپنے کیے کو نہیں بھولتا، اس دن ہر کوئی اپنی کتاب آپ پڑھ لے گا اُمی ہو یا کاتب۔ گردن کا ذکر اس لیے کیا کہ یہ ایک ایسا عضو ہے اعضا میں سے، جس کی مثال سارے بدن میں نہیں ہے، اب جس کی گردن میں کوئی چیز باندھ دی جائے گی، وہ اس سے گریز نہیں کر سکتا۔ جیسے شاعر نے کہا:

---

[1] مسند أحمد (۳/ ۳٦۰) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (۱۹۰۷)

إذهب بها اذهب بها طوقتها طوق الحمامة

[اسے لے جاؤ، اسے لے جاؤ، اسے تیری گردن میں اسی طرح لٹکا دیا گیا جس طرح کبوتر کی گردن میں کوئی چیز لٹکائی جاتی ہے]

سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے حدیث میں مروی ہے: «لَا عَدْوَى وَلَا طِيَرَةَ وَ كُلُّ إِنْسَانٍ أَلْزَمْنٰهُ طَائِرَهُ فِيْ عُنُقِهِ»[1] (كذا رواه ابن جرير) [بیماری کا متعدی ہونا کوئی چیز نہیں، فال کوئی چیز نہیں، ہر انسان کا عمل اس کے گلے کا ہار ہے] عبد بن حمید رحمہ اللہ نے مسند میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے متصلاً، سمعاً، مرفوعاً ان الفاظ کو روایت کیا ہے: «طَيْرُ كُلِّ عَبْدٍ فِيْ عُنُقِهِ»[2] [ہر انسان کا شگون اس کے گلے کا ہار ہے] عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث میں آیا ہے: «لَيْسَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا هُوَ يُخْتَمُ عَلَيْهِ فَإِذَا مَرِضَ الْمُؤْمِنُ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَا رَبَّنَا عَبْدَكَ فُلَانٌ قَدْ جَلَّسْتَهُ فَيَقُوْلُ الرَّبُّ جَلَّ جَلَالُهُ: اِخْتَمُوْا لَهُ عَلَى مِثْلِ عَمَلِهِ حَتّٰى يَبْرَأَ أَوْ يَمُوْتَ»[3] (رواه أحمد و إسناده جيد قوي ولم يخرجوه) [ہر دن کے عمل پر مہر لگ جاتی ہے، جب مومن بیمار پڑتا ہے تو فرشتے کہتے ہیں: اے اللہ! تو نے فلاں کو تو روک لیا ہے، اللہ جل جلالہ فرماتا ہے: اس کے جو عمل تھے وہ برابر لکھتے جاؤ، یہاں تک کہ میں اسے تندرست کر دوں یا فوت کر دوں] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ''طائر'' سے مراد عمل ہیں، وہی عمل قیامت کے دن ایک مکتوب مفتوح ہو جائے گا۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے ﴿عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ﴾ [ق: ١٧] پڑھ کر کہا کہ اے ابن آدم! تیرے لیے صحیفہ کھولا گیا اور تجھ پر دو بزرگ فرشتے مقرر ہیں، ایک دائیں طرف اور دوسرا بائیں طرف۔ جو دائیں طرف ہے وہ تیری نیکیاں لکھتا ہے اور جو بائیں طرف ہے وہ تیری برائیاں لکھتا ہے، اب جو تیرے جی میں آئے سو تو کر، کم یا زیادہ، یہاں تک کہ جب تو مر جائے گا تو تیرا صحیفہ لپیٹ کر تیری گردن میں لٹکا دیا جائے گا اور وہ تیرے ساتھ قبر میں رہے گا، یہاں تک کہ قیامت کے دن ایک کتاب بن کر نکلے گا، تو اس کو کھلا ہوا پائے گا، تو اپنی کتاب آپ پڑھ لے۔ واللہ! جس نے تجھ کو محاسب تیرے نفس کا مقرر کیا ہے، اس نے بڑا انصاف کیا۔[4] هذا من حسن كلام الحسن رحمه الله.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ابو عبیدہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عرب کے نزدیک ''طائر'' خط کو کہتے ہیں اور اس کو بخت بھی بولتے ہیں۔ پس ''طائر'' وہ چیز ہے جو کسی شخص کے لیے ازل میں واقع ہو چکی ہے اور عقل و فہم و عمل و عمر و رزق و

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٣٩٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٩٠٧)

[2] مسند عبد بن حميد (١/ ٣٢١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٩٣٨)

[3] مسند أحمد (٤/ ١٤٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢١٩٣)

[4] تفسير الطبري (١٧/ ٤٠٠)

سعادت و شقاوت سے نصیب میں لکھ دی گئی ہے، گویا کہ ایک پرندہ آشیانۂ ازل سے اور عالمِ غیب کی تاریکیوں سے اُڑتا ہے، اس اُڑنے کی کوئی انتہا اور حد نہیں ہے، یہاں تک کہ وقت مقدر میں بغیر خلاص و مناص (بھاگنے کی جگہ) اس شخص تک پہنچ جاتا ہے۔

امام ازہری رحمہ اللہ نے کہا کہ اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو جان لیا کہ اس کی اولاد میں سے مطیع کون ہے اور عاصی کون، پھر اپنے اس علم کو سب کے حق میں لکھ دیا، جس کو مطیع جانا اس پر سعادت کا حکم لگایا اور جس کو عاصی جانا، اس کو بدبخت ٹھہرایا۔ ان میں سے ہر ایک کے لیے وہ چیز اُڑی، جس کی طرف وہ پھرنے والا ہے، پیدائش کے وقت اور دوبارہ پیدا ہونے کے وقت اور یہ ہی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَكُلَّ اِنْسٰنٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓىِٕرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ﴾ یعنی اللہ کے علم میں جو اس کے مقدر ہے۔[1]

بعض نے کہا کہ عرب جب کوئی کام کرنا چاہتے اور یہ معلوم کرنے کا ارادہ کرتے کہ یہ عمل خیر کی طرف جائے گا یا شر کی طرف تو احوالِ طائر سے عبرت پکڑتے، جب یہ رسم اُن میں کثرت سے جاری ہوگئی تو نفس خیر و شر کو طائر کہنے لگے، جو نام لازم شے کا تھا، وہ خود اس شے کا نام رکھ دیا۔ ﴿ فِيْ عُنُقِهٖ ﴾ عبارت ہے شدتِ لزوم اور کمالِ ارتباط (تعلق جڑنے) سے، جیسے گلے کا ہار۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ کوئی بچہ پیدا نہیں ہوتا مگر اس کے گلے میں ایک ورقہ لکھا ہوا ہوتا ہے کہ یہ بدبخت ہے یا نیک بخت۔[2]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ''طائر'' سے مراد سعادت و شقاوت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اس کے لیے مقدر کر رکھا ہے، اچھا یا برا، وہ اس کو لازم ہے، کہیں جائے[3] گلے کا ہار ہے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ''طائر'' کتاب ہے۔[4] غرض یہ کہ طائر کی دو تفسیریں ہیں: ایک عمل و مقدر، دوم کتاب حقیقی۔ یہی ''طائر'' قیامت کے دن اس کے لیے کتاب ہو کر نکلے گا، یعنی اس میں سارے اعمال اس کے لکھے ہوں گے نہ چھوٹا عمل بچے گا اور نہ بڑا عمل۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ﴾ اس میں خوش خبری ہے نیک انجام کی اور ڈانٹ ڈپٹ ہے برے کام پر۔

ضمیر انسان کی طرف ہے یا نامۂ اعمال کی طرف۔ اس دن اعمال کی اس کتاب کو ہر شخص پڑھ لے گا، خواہ وہ دنیا میں پڑھ سکتا تھا یا نہیں۔ ''حسیب'' سے مراد حاسب یا کافی یا محاسب ہے۔[5] یہ انتہائی درجے کا انصاف ہے کہ اس کا حساب خود اسی کے حوالے کیا کہ تو ہی اپنے ایمان سے کہہ دے کہ جو کچھ اس میں لکھا ہے یہ سچ ہے یا نہیں؟ اگر سچ ہے اور حقیقت میں سچ ہے تو پھر جو بدلا اس کا تجھ کو ملے گا، وہ ظلم میں داخل نہیں ہوگا۔

---

[1] فتح القدير (٣/ ٢٩٥) [2] تفسير الطبري (١٧/ ٣٩٨) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٢٠)
[4] مصنف ابن أبي شيبة (٧/ ١٣٤) [5] فتح البيان (٧/ ٣٦٤_ ٣٦٥)

مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۭ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۭ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾

جس نے ہدایت پائی تو بس وہ اپنے نفس کے لیے ہدایت پاتا ہے اور جو گمراہ ہوا تو بس وہ اپنے نفس ہی پر گمراہ ہوتا ہے اور کوئی بوجھ اُٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا اور ہم اس وقت تک کسی کو عذاب نہیں دیتے، یہاں تک کہ ہم کوئی رسول بھیج دیں ⑮

اچھے یا برے اعمال انسان کے اپنے لیے ہیں:

یعنی برے عمل آفت لاتے ہیں، لیکن حق تعالیٰ بغیر سمجھائے نہیں پکڑتا، اسی لیے رسول بھیجتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ جو شخص راہ یاب ہوا اور تابعِ حق بنا اور اثرِ نبوت پر شروع سے چلتا رہا، اس نے اپنی جان کے لیے اچھی عاقبت حاصل کرلی اور جو حق سے گمراہ ہوگیا اور ہدایت کے راستے سے بہک گیا تو اس کا وبال خود اسی کی جان پر ہے، کوئی کسی کا بوجھ نہیں اُٹھاتا اور قصور وار اپنی ہی جان پر قصور کرتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ ﴾ [الفاطر: ۱۸] ''اور اگر کوئی بوجھ لدا شخص اپنا بوجھ اُٹھانے کو بلائے گا تو اس (کے بوجھ میں) سے کچھ بھی اُٹھایا نہ جائے گا۔''

اس آیت میں اور آیت: ﴿ وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ﴾ [العنکبوت: ۱۳] ''اور یقیناً وہ اپنے بوجھ اور اپنے بوجھوں کے ساتھ کئی اور بوجھ ضرور اُٹھائیں گے۔'' میں کچھ منافات نہیں ہے۔ اسی طرح اس آیت میں ﴿ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ﴾ [النحل: ۲۵] ''کچھ ان کے بوجھ بھی، جنھیں وہ بغیر علم کے گمراہ کرتے ہیں۔'' کیوں کہ دعوت دینے والوں پر اُن کی گمراہی کا گناہ فی نفسہٖ اور دوسروں کو گمراہ کرنے کا گناہ بھی ہے، بغیر اس کے کہ اُن کے گناہوں میں سے کچھ کم ہو۔ اور یہ اللہ کا عدل و رحم ہے اپنے بندوں پر۔

پھر یہ خبر دی کہ ہم کسی قوم کو عذاب نہیں کرتے، جب تک کہ رسول کو نہ بھیجیں۔ یہ کمال انصاف پروری ہے خالقِ عدل و داد کی کہ جس کسی کو عذاب کرتا ہے، قیامِ حجت اور اتمامِ دلیل کے بعد کرتا ہے۔ پہلے اس کے پاس رسول بھیجتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ۝ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ﴾ [الملك: ۸۔ ۹] ''جب بھی کوئی گروہ اس میں ڈالا جائے گا، اس کے داروغے ان سے پوچھیں گے: کیا تمھارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا؟ وہ کہیں گے: کیوں نہیں! یقیناً ڈرانے والا ہمارے پاس آیا تھا، چناں چہ ہم نے (اس ڈرانے والے کی) تکذیب

کی اور ہم نے کہا کہ اللہ نے (کسی پر) کچھ بھی نہیں اُتارا، تم تو بہت بڑی گمراہی میں ہو۔‘‘

نیز فرمایا: ﴿ وَسِيقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ زُمَرًا ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا فُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَتْلُونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِ رَبِّكُمْ وَيُنذِرُونَكُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَٰذَا ۚ قَالُوا بَلَىٰ وَلَٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكَافِرِينَ ﴾ [الزمر: ٧١] ’’اور جن لوگوں نے کفر کیا، وہ جہنم کی طرف گروہ در گروہ ہانکے جائیں گے، حتی کہ جب وہ اس کے پاس پہنچیں گے تو اس کے دروازے کھول دیے جائیں گے اور اس کے دربان ان سے کہیں گے: کیا تمھارے پاس تمھی میں سے رسول نہیں آئے تھے جو تم پر تمھارے رب کی آیتیں پڑھتے تھے اور تمھیں تمھاری اس دن کی ملاقات سے ڈراتے تھے؟ وہ کہیں گے: کیوں نہیں! لیکن کافروں پر عذاب کا فیصلہ ثابت ہو چکا۔‘‘

نیز فرمایا: ﴿ وَهُمْ يَصْطَرِخُونَ فِيهَا رَبَّنَا أَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِي كُنَّا نَعْمَلُ ۚ أَوَلَمْ نُعَمِّرْكُم مَّا يَتَذَكَّرُ فِيهِ مَن تَذَكَّرَ وَجَاءَكُمُ النَّذِيرُ ۖ فَذُوقُوا فَمَا لِلظَّالِمِينَ مِن نَّصِيرٍ ﴾ [الفاطر: ٣٧] ’’اور وہ اس (جہنم) میں چلّائیں گے (اور کہیں گے:) اے ہمارے رب! تو ہمیں (اس سے) نکال، (اب) ہم نیک عمل کریں گے نہ کہ وہ جو (پہلے) کرتے تھے، (اللہ فرمائے گا:) کیا ہم نے تمھیں اتنی عمر نہیں دی تھی کہ اس میں جو شخص نصیحت حاصل کرنا چاہتا تو نصیحت حاصل کر لیتا؟ اور تمھارے پاس ڈرانے والا بھی آیا، اب تم (عذاب کا مزہ) چکھو، پس ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں۔‘‘

اس کے سوا اور بہت سی آیتیں ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ کوئی دوزخ میں نہیں جاتا، مگر رسولوں کے بھیجے جانے کے بعد۔ اس جگہ سے علما کی ایک جماعت نے اس سیاقِ کلام سے ہٹے ہوئے لفظ میں جو صحیح بخاری میں اللہ تعالیٰ کے اس قول کے تحت آیا ہے: ﴿ إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ ﴾ [الأعراف: ٥٦] ’’بے شک اللہ کی رحمت احسان کرنے والوں کے قریب ہے۔‘‘ طعن کیا ہے یعنی سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ جنت اور نار میں جھگڑا ہوا الحدیث الیٰ قولہ: « وَأَمَّا الْجَنَّةُ فَلَا يَظْلِمُ اللّٰهُ مِنْ خَلْقِهِ أَحَدًا، وَإِنَّهُ يُنْشِئُ لِلنَّارِ خَلْقًا فَيُلْقَوْنَ فِيهَا، فَتَقُوْلُ: هَلْ مِنْ مَزِيْدٍ... الخ »[1] [یہ جنت تو اللہ اپنی مخلوق میں سے کسی پر ظلم نہ کرے گا، وہ جہنم کے لیے ایک نئی مخلوق پیدا کرے گا جو اس میں ڈال دی جائے گی، جہنم کہتی رہے گی کہ کیا ابھی اور زیادہ ہے؟] سو یہ جنت کے حق میں ہے، کیوں کہ جنت دارِ فضل اور اللہ تعالیٰ کا دولت خانہ ہے۔

رہی نار، سو وہ انصاف کا گھر ہے اس میں کوئی نہ جائے گا، مگر بعد اعذار اور قیامِ حجت کے۔ حفاظ کی ایک جماعت نے اس لفظ میں تکلم کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ لفظ راوی پر منقلب ہو گئے ہیں۔ صحیحین کی دوسری حدیث کی دلیل سے، چناں چہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کو بخاری نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: « تَحَاجَّتِ الْجَنَّةُ وَالنَّارُ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠١١)

إِلیٰ قوله فَأَمَّا النَّارُ فَلَا تَمْتَلِئُ حَتّٰى يَضَعَ فِيهَا قَدَمَهُ فَتَقُوْلُ: قَطِ، فَهُنَالِكَ تَمْتَلِئُ وَيَزْوِيْ بَعْضُهَا إِلَى بَعْضٍ وَلَا يَظْلِمُ اللّٰهُ مِنْ خَلْقِهِ أَحَدًا وَأَمَّا الْجَنَّةُ فَإِنَّ اللّٰهَ يُنْشِئُ لَهَا خَلْقًا ﴾[1] [جنت اور جہنم نے باہم جھگڑا کیا، ... دوزخ پر نہ ہوگی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس میں اپنا قدم رکھ دے گا، تب وہ کہے گی: بس بس اس وقت وہ بھر جائے گی اور چاروں طرف سے سمٹ جائے گی۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔ ہاں جنت کے لیے ایک نئی مخلوق پیدا کرے گا]

چھوٹی عمر میں فوت ہونے والے بچوں کا مسئلہ:

باقی رہا اس جگہ ایک مسئلہ، جس میں قدیماً وحدیثاً ائمہ رحمہم اللہ کا اختلاف ہے، وہ مسئلہ یہ ہے کہ جو بچے چھوٹی عمر میں مر گئے اور اُن کے آبا کافر تھے اُن کا حکم کیا ہے؟ اسی طرح مجنون اور بہرے اور بوڑھے کا جو سٹھیا گیا ہے اور وہ شخص جو کہ فترت (دو پیغمبروں کے درمیانی زمانہ) میں مر گیا اور اس کو رسول کی دعوت نہیں پہنچی، سو ان کے بارے میں احادیث مروی ہیں، ہم اُن کا اس جگہ بعون اللہ و توفیقہ ذکر کرتے ہیں، پھر ایک فصل میں ائمہ کے کلام کا خلاصہ ذکر کریں گے۔ واللہ المستعان.

حدیثِ اول:

اسود بن سریع رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ قیامت کے دن چار شخص گفتگو کریں گے: ایک مرد بہرا جو کچھ نہیں سنتا، دوسرا مرد احمق، تیسرا مرد ہرم (بہت بوڑھا)، چوتھا وہ مرد جو فترت میں مر گیا۔ بہرا کہے گا: اے رب! اسلام آیا میں کچھ سنتا نہ تھا۔ احمق کہے گا: اے رب! اسلام آیا اور بچے مجھ کو مینگنیاں مارتے تھے، بوڑھا کہے گا: اے رب! اسلام آیا اور میں کچھ سمجھتا نہ تھا اور جو فترت میں مرا ہے، وہ کہے گا: اے رب! تیرا کوئی رسول میرے پاس نہیں آیا۔ اللہ تعالیٰ اُن سے عہد لے گا کہ وہ اس کی اطاعت کریں، پھر اُن کو حکم دے گا کہ دوزخ میں جاؤ۔ سو قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے! اگر وہ دوزخ میں جاتے تو وہ اُن پر ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جاتی۔[2] (رواہ أحمد)

دوسری اسناد میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے آخر میں یہ لفظ مروی ہے کہ اُن میں سے جو کوئی آگ میں داخل ہوگا، آگ اس پر ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جائے گی اور جو داخل نہ ہوگا وہ آگ کی طرف گھسیٹا جائے گا۔[3] (وكذا رواه إسحق بن راهويه، و رواه البيهقي في كتاب الاعتقاد بسنده وقال: هذا إسناد صحيح، وكذا رواه حماد بن سلمة عنه رفعا بلفظ «أَرْبَعَةٌ كُلُّهُمْ يُدْلِيْ عَلَى اللّٰهِ بِحَجَّتِهِ» فذكر نحوه، و رواه ابن جرير وقال: ثم قال: أبوهريرة رضی اللہ عنہ «اِقْرَءُوْا إِنْ شِئْتُمْ ﴿ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴾» وكذا رواه معمر عنه موقوفا)

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٦٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٤٦)

[2] مسند أحمد (٤/ ٢٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٤٣٤)

[3] مسند أحمد (٤/ ٢٤) مسند إسحاق بن راهويه (١/ ١٢٣۔ ٤٤٥) كتاب الاعتقاد (١/ ١٦٩) تفسير الطبري (١٧/ ٤٠٢۔ ٤٠٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٤٣٤)

حدیثِ دوم:

یزید بن ابان رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم نے سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اے ابوحمزہ! تم مشرکین کے بچوں کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ کہا: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ان کے لیے سیئات نہیں کہ انھیں عذاب کیا جائے اور اہلِ نار میں ہوں اور نہ اُن کے لیے حسنات ہیں کہ اُن کو بدلہ ملے اور اہلِ جنت میں ہوں۔'' [1] (رواہ أبو داود الطیالسي)

حدیثِ سوم:

سیدنا انس رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ قیامت کے دن چار اشخاص لائے جائیں گے، مولود اور مجنون اور وہ شخص جو فترت پر مرا ہے اور شیخ فانی (بہت زیادہ بوڑھا) کو۔ ہر ایک اپنی حجت کے بارے میں بات کرے گا۔ اللہ تعالیٰ آگ کی گردن سے فرمائے گا، ظاہر ہو اور اُن سے فرمائے گا کہ میں اپنے بندوں کی طرف رسول بھیجتا تھا اُن ہی میں سے، اور اب میں خود اپنا رسول ہوں تمھاری طرف، تم اس آگ میں داخل ہو جاؤ۔ پس جس پر بدبختی لکھی گئی ہے، وہ کہے گا: میں کیوں کر داخل ہوں، میں تو اس سے بھاگتا تھا اور جس پر نیک بختی لکھی گئی ہے، وہ جلدی سے چل کر آگ میں گھس جائے گا۔ اللہ تعالیٰ پہلوں کو فرمائے گا: تم میرے رسولوں کی سخت تکذیب اور نافرمانی کرتے تھے، پھر اُن کو جہنم میں اور دوسروں کو جنت میں داخل کرے گا۔ [2] (رواہ أبو یعلیٰ و ھکذا رواہ البزار بإسنادہ مثلہ)

حدیثِ چہارم:

سیدنا براء رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلمانوں کے بچوں کے بارے میں سوال کیا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «هُمْ مَعَ آبَائِهِمْ» [وہ اپنے آباء و اجداد کے ساتھ ہوں گے] پھر مشرکین کی اُولاد کے بارے میں سوال کیا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «هُمْ مَعَ آبَائِهِمْ» [وہ اپنے آباء و اجداد کے ساتھ ہوں گے] کہا: اے اللہ کے رسول! وہ کیا کرتے تھے؟ فرمایا: «اَللّٰهُ أَعْلَمُ بِهِمْ» [3] (رواہ أبو یعلی و رواہ عمر بن ذر عن عائشہ رضی اللہ عنہا فذکرہ) [اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں زیادہ جانتا ہے]

حدیثِ پنجم:

سیدنا ثوبان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کی سنگینی کو بیان کیا اور فرمایا: جب قیامت کا دن ہوگا، اہلِ

---

[1] مسند الطیالسي (۱/ ۲۸۲) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (۱٤٦۸)

[2] مسند أبي یعلیٰ (۷/ ۲۲۵) مسند البزار (۱٤/ ۱۰٤) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (۲٤٦۸)

[3] تفسیر ابن کثیر (۳/ ٤۳) اس کی سند میں ''یزید بن امیہ'' مجہول راوی ہے۔ البتہ مسند ابی یعلیٰ میں ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے۔

جاہلیت آئیں گے، اپنے بوجھ اپنی پشت پر اُٹھائے ہوئے، اُن کا رب اُن سے سوال کرے گا، وہ کہیں گے: اے رب! تو نے ہمارے پاس کوئی رسول نہیں بھیجا اور نہ کوئی حکم ہمارے پاس آیا، اگر تو ہمارے پاس رسول بھیجتا تو ہم سب بندوں سے زیادہ تیرے مطیع ہوتے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: بھلا اگر اب میں تم کو حکم کروں تو تم میری اطاعت کرو گے؟ وہ کہیں گے: ہاں! اللہ تعالیٰ اُن کو حکم دے گا کہ تم جا کر جہنم میں داخل ہو جاؤ، وہ روانہ ہوں گے، جب جہنم کے قریب جائیں گے، اس کا غیظ وغضب اور چلانا سنیں گے، رب کے پاس واپس آ کر کہیں گے: اے رب! تو ہم کو اس سے نکال یا پناہ دے۔ اللہ تعالیٰ کہے گا: کیا تم نے یہ زعم نہیں کیا تھا کہ اگر میں تم کو کوئی حکم دوں گا تو تم میری اطاعت کرو گے، پھر اُس پر اُن سے عہد لے گا اور فرمائے گا: جاؤ داخل ہو آگ میں، وہ چلیں گے، یہاں تک کہ جب اس کو دیکھیں گے تو ڈریں گے اور واپس آ کر کہیں گے: اے رب! ہم اس سے ڈرے، ہم کو اس میں داخل ہونے کی طاقت نہیں، تب اللہ تعالیٰ فرمائے گا، جاؤ اس میں ذلیل ہو کر۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اگر پہلی بار داخل ہو جاتے تو دوزخ اُن پر برد اور سلام ہو جاتی۔[1] (رواه البزار وقال: متن هذا الحديث غير معروف إلا من هذا الوجه)

حدیثِ ششم:

سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ ہالکِ فترت، مجنون اور بچے کے بارے میں رفعاً کہتے ہیں، ہالک کہے گا کہ میرے پاس کوئی کتاب نہیں آئی۔ مجنون کہے گا: اے رب! تو نے مجھے عقل نہیں دی تھی جس سے میں خیر وشر کو سمجھتا۔ بچہ کہے گا: میں نے عقل کا ادراک نہیں کیا۔ اُن کو آگ دکھائی جائے گی اور کہا جائے گا: اس میں جاؤ، سو جو شخص اللہ کے علم میں نیک بخت ہوتا، اگر وہ عمل کرتا تو وہ اس میں جائے گا اور جو اللہ تعالیٰ کے علم میں بدبخت ہوتا، اگر عمل کرتا تو وہ رک جائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تم نے میری نافرمانی کی، اگر میرے رسول تمہارے پاس آتے تو تم کیا کرتے۔ (رواه محمد بن يحيىٰ الذهلي وكذا رواه البزار، ثم قال: لا يعرف من حديث أبي سعيد إلا من طريقه عن عطية عنه) اور حدیث کے آخر میں یوں کہا ہے: "فيقول الله : إياي عصيتم فكيف برسلي بالغيب"[2] [جب تم میری ہی براہ راست نہیں مانتے تو میرے پیغمبروں کی کیا مانتے؟]

حدیثِ ہفتم:

سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ قیامت کے دن مجنون کو اور ہالک فی الفترۃ کو اور ہالک فی الصغر کو لائیں گے۔ مجنون کہے گا: اے رب! اگر تو مجھ کو عقل دیتا تو جس کو تو نے عقل دی ہے، وہ مجھ سے زیادہ نیک نہ ہوتا،

---

[1] مسند البزار (۱۰/ ۱۰۷۔ ۱۰۸)

[2] كشف الأستار عن زوائد البزار (۳/ ۳۴) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رواه البزار وفيه عطية وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ۷/ ۴۳۸)

اسی طرح ہالکِ فترت اور صغیر کے بارے میں کہا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میں تم کو ایک حکم کرتا ہوں، تم میری اطاعت کرو گے؟ وہ کہیں گے: ہاں، فرمائے گا: جاؤ نار میں داخل ہو جاؤ، اگر وہ داخل ہوتے تو آگ اُن کو کچھ نقصان نہ پہنچاتی، پھر اُن پر ایسے شعلے نکلیں گے کہ وہ گمان کریں گے کہ یہ ہلاک کر دیں گے ہر وہ چیز جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے اور جلد واپس آئیں گے، پھر دوبارہ اُن کو یہی حکم ہوگا، وہ اسی طرح پھر آئیں گے، تب اللہ عزوجل فرمائے گا: قبل اس کے کہ میں تم کو پیدا کروں، میں نے جان لیا تھا کہ تم کیا عمل کرو گے اور میں نے اپنے علم پر تم کو پیدا کیا تھا اور اب تم میرے علم کے مطابق ہی ہو، پھر آگ اُن کو پکڑ لے گی۔[1] (رواه هشام بن عمار و محمد بن المبارك)

حدیثِ ہشتم:

یہ حدیث اسود بن سریع رضی اللہ عنہ کی روایت کے ساتھ مندرج ہے اور گزر چکی ہے[2] اور صحیحین میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا لیتے ہیں، جس طرح کہ جانور پورا بچہ جنتا ہے، تم اُن میں کوئی کان کٹا ہوا دیکھتے ہو؟ یعنی نہیں۔[3] دوسری روایت میں مروی ہے کہ اے اللہ کے رسول! بتائیں چھوٹی عمر میں فوت ہونے والے بچے کا کیا حال ہے؟ فرمایا: « اَللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا عَامِلِيْنَ »[4] [اللہ تعالیٰ کو ان کے اعمال کی صحیح اور پوری خبر تھی] سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے بچے جنت میں ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام ان کی کفالت کرتے ہیں۔[5] (رواه أحمد) صحیح مسلم میں سیدنا عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: « إِنِّيْ خَلَقْتُ عِبَادِيْ حُنَفَاءَ »[6] [میں نے اپنے بندوں کو موحد، یکسو مخلص بنایا ہے] اور صحیح مسلم کے علاوہ دوسری کتب کی روایت میں مسلمان کا لفظ بھی مروی ہے۔

حدیثِ نہم:

سیدنا سمرہ رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ لوگوں نے پکار کر کہا: اے اللہ کے رسول! اور مشرکوں کی اولاد؟ فرمایا: اولادِ مشرکین بھی۔[7] (رواه الحافظ أبوبكر البرقاني في كتابه المستخرج على البخاري) امام طبرانی رحمہ اللہ نے سیدنا سمرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ان الفاظ میں بیان کی کہ ہم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرکین کے بچوں کے بارے میں سوال کیا، فرمایا: « هُمْ خَدَمُ أَهْلِ الْجَنَّةِ » یعنی وہ بہشتیوں کے خدمت گار ہوں گے۔[8]

---

[1] المعجم الكبير (٢٠/ ٨٣) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه عمر بن واقد وهو متروك" (مجمع الزوائد: ٧/ ٤٣٨)
[2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٩٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٥٨)
[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٢٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٥٨)
[5] مسند أحمد (٢/ ٣٢٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٠٢٣)
[6] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٦٥) [7] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٤٠)
[8] المعجم الكبير (٧/ ٢٤٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٤٦٨)

حدیثِ دہم:

خنساء بنت معاویہ کہتی ہیں کہ مجھ سے میرے چچا نے کہا کہ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! جنت میں کون جائے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: «اَلنَّبِيُّ فِي الْجَنَّةِ وَالشَّهِيْدُ فِي الْجَنَّةِ وَالْمَوْلُوْدُ فِي الْجَنَّةِ وَالْوَئِيْدُ فِي الْجَنَّةِ» [1] (رواه أحمد) [نبی، شہید، بچے اور زندہ درگور کیے ہوئے بچے جنت میں جائیں گے] بعض علما کا مذہب اس جگہ بہ سبب اس حدیث کے توقف کرنا ہے۔ اور بعض نے جزم کیا ہے جنت کے ساتھ، اُن کی دلیل سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی وہ حدیث ہے جو صحیح بخاری میں ہے کہ اس خواب کے بارے میں یہ کہا ہے کہ میں ایک شیخ کے پاس سے گزرا، درخت کے نیچے اس کے گرد بچے تھے۔ جبریل علیہ السلام نے کہا کہ یہ ابراہیم علیہ السلام ہیں اور یہ اولادِ مسلمین ہے اور اولادِ مشرکین، کہا: اے اللہ کے رسول! اولادِ مشرکین بھی؟ فرمایا: ہاں اولادِ مشرکین بھی۔[2] اور بعض نے جزم بالنار کہا ہے بہ دلیل حدیث: «هُمْ مَعَ آبَائِهِمْ» [3] [وہ اپنے باپوں کے ساتھ ہوں گے] اور بعض کا مذہب یہ ہے کہ قیامت کے دن کے میدانوں میں اُن کا امتحان لیا جائے گا، جو اطاعت کرے گا، وہ بہشت میں جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کا علم اُن کے بارے میں اُن کی پہلے سے لکھی گئی سعادت مندی کے بارے میں ظاہر ہوگا اور جو نافرمانی کرے گا وہ ذلیل ہو کر داخلِ نار ہوگا۔ اللہ کا علم اُن کے بارے میں پہلے سے طے شدہ بدبختی کے مطابق ظاہر ہوگا۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس مذہب سے تمام حدیثیں اور مختلف دلیلیں جمع ہو جاتی ہیں اور پہلے کی حدیثیں جو ایک دوسری کو تقویت پہنچاتی ہیں، اس معنی کی کئی ایک ہیں۔ پھر کہا ہے کہ اسی قول کو شیخ ابو الحسن اشعری نے اہلِ سنت والجماعت سے حکایت کیا ہے اور اسی قول کی نصرت حافظ ابوبکر بیہقی رحمہ اللہ نے کتاب الاعتقاد میں کی ہے[4] اور محققین علما اور حفاظِ نقاد نے بھی یوں ہی کہا ہے اور شیخ ابن عبد البر رحمہ اللہ نے بعض احادیثِ امتحان کا ذکر کر کے کہا ہے: اس بارے کی حدیثیں قوی نہیں ہیں اور ان سے حجت ثابت نہیں ہوتی، اور اہلِ علم ان کا انکار کرتے ہیں، اس لیے کہ آخرت دارِ جزا ہے دارِ عمل نہیں ہے اور نہ دارِ امتحان ہے اور جہنم میں جانے کا حکم بھی تو انسانی طاقت سے باہر کا حکم ہے اور کسی نفس کو اس کی وسعت و طاقت کے مطابق ہی مکلّف ٹھہراتا ہے۔[5] سو جواب اس بات کا یہ ہے کہ احادیثِ باب میں بعض صحیح ہیں۔ بہت سے ائمہ علما نے ان پر نص کی ہے اور بعض احادیث حسن ہیں اور بعض ضعیف جو صحیح و حسن سے قوی ہو جاتی ہیں اور جب احادیث بابِ واحد آپس میں مل جائیں اور ایک دوسرے کی تائید کریں تو ناظر احادیث کے لیے افادۂ حجت کریں گی۔

---

[1] سنن أبي داود، رقم (٢٥٢١) مسند أحمد (٥/ ٥٨) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو ''صحیح'' کہا ہے۔ دیکھیں: صحیح أبي داود (٧/ ٢٨٠)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٤٠) [3] مسند أحمد (٦/ ٨٤)

[4] كتاب الاعتقاد (١/ ١٦٤ـ ١٧٠) [5] الاستذكار لابن عبد البر (٣/ ١١٤)

رہی یہ بات کہ آخرت دارِ جزا ہے، سو اس میں کچھ شک نہیں ہے، لیکن دخولِ جنت یا نار سے پہلے میدانوں کی پیشیوں میں آزمایش کا ہونا کچھ اس کے منافی نہیں ہے، جس طرح کہ شیخ ابو الحسن اشعری نے امتحانِ اطفال کو مذہبِ اہل سنت و الجماعت سے حکایت کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴾ [القلم: ٤٢] ''جس دن پنڈلی کھول دی جائے گی اور انھیں سجدے کے لیے بلایا جائے گا تو وہ (سجدہ) نہ کرسکیں گے۔'' اور صحاح وغیرھا میں ثابت ہو چکا ہے کہ مومنین قیامت کے دن اللہ پاک کو سجدہ کریں گے اور منافقین سجدہ نہ کرسکیں گے، اُن کی پشت ایک صفحے کی طرح ایک ہی طبق ہو جائے گی، جب سجدہ کرنے کا ارادہ کریں گے تو پشت کے بل گر پڑیں گے۔[1] صحیحین میں مروی ہے کہ سب سے بعد میں جو شخص اہلِ نار میں سے نار سے باہر نکلے گا، اللہ تعالیٰ اس سے عہد و پیمان لے گا کہ اب پھر اور کچھ اس کے سوا نہ مانگنا اور یہ امر بار بار متکرر ہوگا، یعنی وہ بار بار عہد توڑے گا۔ اور اللہ تعالیٰ فرمائے گا: «يَا ابْنَ آدَمَ! مَا أَغْدَرَكَ» [اے ابن آدم! تو بڑا ہی عہد شکن ہے] پھر اس کو جنت میں داخل ہونے کی اجازت دے گا۔[2]

ابن عبد البر رحمہ اللہ کا یہ قول کہ دخولِ نار اُن کی طاقت میں نہیں ہے، پھر اس کی تکلیف دینا چہ معنی دارد؟! سو یہ کچھ صحتِ حدیث سے مانع نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے بندوں کو پل صراط سے پار ہونے کا حکم دے گا۔ یہ ایک پل ہے پشتِ جہنم پر (بقول بعض صحابہ)، تلوار سے زیادہ تیز، بال سے زیادہ باریک۔ ایمان دار لوگ اس پل پر سے اپنے اعمال کے مطابق خود گزریں گے، کوئی بجلی کی طرح، کوئی ہوا کی طرح، کوئی تیز رفتار گھوڑے کی طرح، کوئی اونٹ سوار کی طرح، کوئی دوڑتا ہوا، کوئی چلتا اور کوئی سینے کے بل اور کسی کا چہرہ آگ میں جھلس جائے گا، سو جو کچھ اُن بچوں کے بارے میں آیا ہے، وہ کچھ اس حال سے بڑھ کر نہیں، بلکہ یہ اسے بڑا اور بہت بھاری ہے۔ نیز سنت سے یہ بات ثابت ہے کہ دجال کے ہمراہ بہشت اور دوزخ ہوگی[3] اور شارع علیہ السلام نے مومنین کو حکم دیا ہے کہ ان میں سے جو کوئی دجال کو پائے تو اس میں سے پیے، جس کو آگ دیکھتا ہے وہ اس پر ٹھنڈک اور سلامتی ہو جائے گی، سو یہ اس کی نظیر ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنی جانوں کو قتل کریں، چناں چہ بعض نے بعض کو قتل کیا، یہاں تک کہ کہتے ہیں کہ ایک صبح ستر ہزار کو مارا۔ مرد نے اپنے باپ بھائی کو قتل کیا اور وہ ایک سفید بادل کے سائے میں تھے جس کو اللہ نے ان پر بھیجا تھا، یہ ان کی سزا تھی گوسالہ کے پوجنے پر، اور جانوں پر یہ بات بھی بہت شاق اور گراں ہے، کچھ مضمون حدیث مذکور سے متقاصر نہیں ہے۔ والله أعلم.[4]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٣٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٧٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٢)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٣٤) [5] تفسير ابن كثير (٣/ ٤٥۔ ٤٦)

جب یہ بات مقرر ہوگئی تو لوگوں نے مشرکین کی اولاد کے بارے میں کئی باتوں میں اختلاف کیا۔ ایک یہ کہ وہ جنت میں ہیں، بہ دلیل اس حدیث کے جو سیدنا سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابراہیم علیہ السلام کے ہمراہ مسلمین اور مشرکین کی اولاد کو دیکھا[1] اور بہ دلیل اس حدیث کہ جو خنساء کے چچا سے مروی ہے کہ مولود جنت میں ہیں[2]، اور یہ استدلال صحیح ہے۔ لیکن وہ احادیث جن میں اُن کے امتحان کا ذکر ہے، وہ اس سے خاص ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جس کو مطیع جان لیا ہے، اس کی روح برزخ میں ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ہے اور مسلمین کی اولاد جو فطرت پر مری اور جس کو اللہ تعالیٰ نے جان لیا ہے کہ وہ فطرت کو قبول نہ کرے گا، اس کا اختیار اللہ کو ہے، وہ قیامت کے دن آگ میں ہوگا۔ احادیثِ امتحان اس کی دلیل ہے۔ اہلِ سنت میں سے اشعری اس کو نقل کرنے والے ہیں۔ پھر جو لوگ اُن کے جنت میں ہونے کے قائل ہیں، اُن میں کوئی اُن کو مستقل فی الجنۃ کہتا ہے اور کوئی اہلِ جنت کے خدام بتاتا ہے، جس طرح کہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ابو داود طیالسی کے نزدیک آیا ہے[3] لیکن وہ حدیث ضعیف ہے۔ والله أعلم.

دوسرا قول یہ ہے کہ وہ اپنے آبا کے ساتھ آگ میں ہوں گے، اس پر دلیل وہ روایت ہے جو امام احمد رحمہ اللہ نے عبد اللہ بن ابی قیس رحمہ اللہ سے کی ہے کہ انھوں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے کفار کی اولاد کے بارے میں سوال کیا، کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: «هُمْ تَبَعٌ لِآبَائِهِمْ» ''وہ اپنے باپوں کے تابع ہیں۔'' میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! بغیر اعمال کے؟ فرمایا: «اَللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا عَامِلِيْنَ» [اللہ تعالیٰ انھیں بخوبی جانتا ہے] اس کو ابو داود رحمہ اللہ نے بھی عبداللہ بن ابی قیس رحمہ اللہ سے ان الفاظ سے روایت کیا ہے کہ میں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو سنا، وہ کہتی تھیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مومنین کی اولاد کے بارے میں سوال کیا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ اپنے باپوں کے ساتھ ہوں گے۔ میں نے کہا: مشرکین کی اولاد؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «هُمْ مَعَ آبَائِهِمْ» ''وہ بھی اپنے باپوں کے ساتھ ہوں گے۔'' میں نے کہا: بغیر عمل کے؟ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ کیا کرتے تھے۔[4]

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ان الفاظ میں بیان کی ہے کہ انھوں نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرکین کے بچوں کا ذکر کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِنْ شِئْتِ أَسْمَعْتُكِ تَضَاغِيَهُمْ فِيْ النَّارِ»[5] [اگر تو چاہے تو میں ان کا رونا پیٹنا اور چیخنا چلانا بھی تجھے سنا دوں] اس کی سند میں یحییٰ بن متوکل متروک ہے۔ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے ان دو بچوں کا پوچھا جو جاہلیت میں مر گئے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «هُمَا فِيْ النَّارِ» [وہ دونوں دوزخ میں ہیں] جب ان کے چہرے پر کراہت دیکھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
[2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
[3] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
[4] مسند أحمد (٦/ ٨٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧١٢)
[5] مسند أحمد (٦/ ٢٠٨) اس کی سند میں ''یحییٰ بن متوکل'' سخت ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٣٨٩٨)

«لَوْ رَأَیْتِ مَكَانَهُمَا لَأَبْغَضْتِهِمَا» [اگر تم ان کی جگہ دیکھ لیتیں تو تم خود ان سے بیزار ہو جاتیں] کہا: میری اولاد آپ سے؟ فرمایا: «إِنَّ الْمُؤْمِنِیْنَ وَأَوْلَادَهُمْ فِي الْجَنَّةِ وَ إِنَّ الْمُشْرِكِیْنَ وَأَوْلَادَهُمْ فِي النَّارِ» [مومن اور ان کی اولاد جنتی ہیں، اور مشرک اور ان کی اولاد جہنمی ہیں] پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّیَّتُهُمْ بِاِیْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ ﴾ [الطور: ۲۱] ''اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے بھی ایمان کے ساتھ ان کی پیروی کی، تو ہم ان کی اولاد کو (جنت میں) ان سے ملا دیں گے۔''① (رواه أحمد، وهذا حديث غريب، وإن في إسناده محمد بن عثمان مجهول الحال، وشيخه زاذان لم يدرك عليا، والله أعلم) امام شعبی رحمہ اللہ نے مرفوعاً کہا ہے: «اَلْوَائِدَةُ وَالْمَوْؤُدَةُ فِي النَّارِ» [زندہ درگور کرنے والی اور زندہ درگور کی جانے والی دونوں جہنمی ہیں] پھر اس کو سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف مسند کیا۔② (رواه أبو داود)

امام شعبی رحمہ اللہ کی روایت کے سیدنا سلمہ بن قیس اشجعی رضی اللہ عنہ سے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ میں اور میرا بھائی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، ہم نے کہا: ہماری ماں جاہلیت میں مرگئی، وہ مہمان کو کھلاتی اور صلہ رحمی کرتی تھی، اس نے جاہلیت میں ہماری ایک بہن کو زندہ درگور کر دیا تھا، وہ بلوغ کو نہیں پہنچی تھی۔ فرمایا: زندہ درگور کرنے والی اور زندہ درگور ہونے والی دونوں جہنمی ہیں، مگر یہ کہ وہ اسلام کو پا کر مسلمان ہو جائے۔③ (رواه الجماعة وهذا إسناد حسن)

تیسرا قول توقف کا ہے، اس قول کا اعتماد حدیث کے ان الفاظ پر ہے: «اَللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا عَامِلِیْنَ» [اللہ تعالیٰ انھیں بخوبی جانتا ہے] اور یہ الفاظ صحیحین میں مروی ہیں۔ سیدنا عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرکین کی اولاد کے بارے میں سوال کیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «اَللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا عَامِلِیْنَ»④ [اللہ تعالیٰ انھیں بخوبی جانتا ہے] اسی طرح صحیحین میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرکین کے بچوں کے بارے میں سوال کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «اَللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا عَامِلِیْنَ»⑤ [اللہ تعالیٰ انھیں بخوبی جانتا ہے] اور بعض نے ان کو اہلِ اعراف ٹھہرایا ہے۔ یہ قول اس شخص کے قول کے مطابق ہے جو اُن کو اہلِ جنت کہتا ہے، جس طرح کہ اس مسئلے کے بارے میں تقریر سورت اعراف میں گزر چکی ہے۔⑥

معلوم رکھنا چاہیے کہ یہ اختلاف مشرکین کے بچوں کے بارے میں مخصوص ہے۔ رہے مومنین کے بچے، سو علما

---

① مسند أحمد (۱/ ۱۳٤) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٥٧٩١)

② سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧١٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧١٤٢)

③ ان الفاظ کے ساتھ روایت سیدنا سلمہ بن قیس اشجعی رضی اللہ عنہ کے بجائے سیدنا سلمہ بن یزید جعفی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ دیکھیں: سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٥٠٧) مسند أحمد (٣/ ٤٧٨)

④ صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣١٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٦٠)

⑤ صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣١٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٥٩) ⑥ رقم الآية (٤٦۔ ٤٩)

کے درمیان کچھ اختلاف نہیں ہے، جس طرح کہ قاضی ابو یعلی بن الفراء الحنبلی نے امام احمد رحمہ اللہ سے حکایت کیا ہے کہ انھوں نے کہا: ان کے بارے میں بلا اختلاف یہی موقف ہے کہ وہ جنتی ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہی موقف لوگوں میں مشہور بھی ہے اور ان شاء اللہ عزوجل ہمیں بھی یہی امید ہے۔ اور وہ جو شیخ ابو عمر بن عبدالبر رحمہ اللہ نے بعض علما سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے اس میں توقف کیا ہے اور کہا ہے کہ سارے بچے اللہ کی مرضی اور اس کی چاہت کے ماتحت ہیں۔ پھر کہا ہے کہ اہلِ فقہ و حدیث کی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے۔ ازاں جملہ حماد بن زید، حماد بن سلمہ، ابن مبارک اور ابن راہویہ رحمہم اللہ وغیرہم ہیں، پھر کہا: امام مالک رحمہ اللہ نے اپنی کتاب موطا کے ابواب القدر کی حدیثوں میں بھی کچھ اسی جیسا موقف اختیار کیا ہے اور یہی ان کے اکثر اصحاب کا موقف ہے۔ گو امام مالک رحمہ اللہ کا کوئی فیصلہ اس میں نہیں، لیکن ان کے بعض متاخرین اصحاب کا قول ہے کہ مسلمان بچے تو جنتی ہیں اور مشرکوں کے بچے مشیتِ الٰہی کے ماتحت ہیں۔ انتهى كلامه. سو یہ کلام ان کا سخت غریب ہے۔[1]

اور امام قرطبی رحمہ اللہ نے بھی اپنی کتاب "التذكرة" میں اسی کے لگ بھگ ذکر کیا ہے[2] ۔ والله أعلم۔ اور اس بارے میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث ذکر کی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو انصار میں سے ایک بچے کے جنازے پر بلایا گیا۔ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! اس بچے کو مرحبا ہو، یہ تو جنت کی چڑیوں میں سے ایک چڑیا ہے؛ نہ اس نے برائی کا کوئی کام کیا اور نہ اس زمانے کو پہنچا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «أَوْ غَيْرَ ذٰلِكَ يَا عَائِشَةُ! إِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ الْجَنَّةَ وَخَلَقَ لَهَا أَهْلًا وَ هُمْ فِيْ أَصْلَابِ آبَائِهِمْ، وَخَلَقَ النَّارَ وَخَلَقَ لَهَا أَهْلًا وَهُمْ فِيْ أَصْلَابِ آبَائِهِمْ»[3] (رواه مسلم و مسند أحمد و أبو داود والنسائي و ابن ماجه) [اس کے سوا کچھ اور بھی اے عائشہ؟! سنو! اللہ تبارک و تعالیٰ نے جنت اور جنتیوں کو مقرر کر دیا ہے، حالانکہ وہ اپنے باپوں کی پشتوں میں تھے، اسی طرح اس نے جہنم کو پیدا کیا ہے اور اس میں جلنے والے پیدا کیے ہیں، حالانکہ وہ ابھی اپنے باپوں کی پشتوں میں تھے]

اس مسئلے میں کلام کرنا دلائلِ صحیحہ جیدہ کا محتاج ہے اور کبھی ایسا شخص اس کے بارے میں گفتگو کرنے لگتا ہے، جس کے پاس مکمل شریعت کا علم نہیں، اس لیے علما کی ایک جماعت نے اس مسئلے میں کلام کرنا مکروہ خیال کیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، قاسم بن محمد بن ابی بکر صدیق و محمد بن حنیفہ رحمہم اللہ وغیرہم سے اسی طرح مروی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے منبر پر کہا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: «لَا يَزَالُ أَمْرُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ مُوَاتِيًا أَوْ مُقَارِبًا مَا لَمْ يَتَكَلَّمُوْا فِي الْوِلْدَانِ وَالْقَدَرِ»[4] (رواه ابن حبان وقال: يعني أطفال المشركين، وهكذا رواه البزار وقال:

---

[1] التمهيد لابن عبد البر (١٨/ ١١١_ ١١٢) تفسير ابن كثير (٣/ ٤٧) [2] التذكرة (١/ ٥٩١_ ٥٩٧)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٦٢) مسند أحمد (٦/ ٢٠٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧١٣) سنن النسائي، رقم الحديث (١٩٤٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٨٢)

[4] صحيح ابن حبان (١٥/ ١١٨) مسند البزار (١١/ ٤٩) تفسير ابن كثير (٣/ ٤٧_ ٤٨) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٥١٥)

وقد رواه جماعة عن ابن عباس موقوفا) [اس امت کا معاملہ اس وقت تک صحیح رہے گا جب تک وہ چھوٹے بچوں اور تقدیر کے بارے میں گفتگو نہیں کریں گے]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیان کیا کہ عملِ صالح کا ثواب اور عملِ بد کی سزا فاعل کے ساتھ مخصوص ہے۔ وہ متعدی اِلی الغیر نہیں ہوتا، پس جو کوئی شخص اللہ کا حکم بجا لا کر راہ یاب ہوا اور اللہ کے منع کردہ کاموں کو چھوڑا، اور جو احکام اُن کے تضاعیف (کئی کئی گنا والے) میں ہیں، وہ اس نے کیے تو اس کا فائدہ اسی کے نفس کو پہنچتا ہے، ایسے شخص کو فائدہ نہیں پہنچتا جو راہ یاب نہیں ہے اور جو شخص سیدھے راستے، یعنی حق کے راستے سے گمراہ ہوا اور حکم کو ماننے والا اور نہی کو چھوڑنے والا نہیں ہے تو اس کی گمراہی کا وبال اسی کی جان پر ہے، اس سے تجاوز نہیں کرتا۔ ہر ایک اپنے نفس کا محاسب ہے، اپنی اطاعت کی جزا حاصل کرنے والا اور اپنی معصیت پر سزا پانے والا ہے۔ یہ حاصل کلام ہے اس کا جو پہلے بیان ہوا کہ قرآن سیدھے اور مضبوط راستے کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور اعمال اپنے کرنے والے کو لازمِ حال ہیں۔ پھر اس کلام کی سخت تاکید ہے اور فرمایا کہ کسی کا بوجھ کوئی دوسرا نہیں اُٹھاتا کہ یہ رہا ہو جائے اور دوسرا پکڑا جائے۔ اس کی مثل سورت انعام میں بھی گزر چکی ہے۔[1]

امام زجاج رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے: بلاشبہ گناہ گار سے دوسرے کے گناہ کا مؤاخذہ نہ ہوگا، یہی معنی ہیں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے: ﴿وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓىِٕرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ﴾ [الإسراء: ١٣] رہی آیت ﴿مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا﴾ [النساء: ٨٥] ''جو کوئی اچھی سفارش کرے گا، اسے بھی اس کا کچھ حصہ ملے گا، اور جو کوئی بری سفارش کرے گا، اسے بھی اس کا کچھ حصہ ملے گا۔'' اور یہ آیت: ﴿لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ [النحل: ٢٥] ''تا کہ یومِ قیامت وہ اپنے کامل بوجھ اُٹھائیں اور کچھ ان کے بوجھ بھی، جنھیں وہ بغیر علم کے گمراہ کرتے ہیں۔''[2]

یعنی غیر کا بوجھ اُٹھانا اور نیکی سے فائدہ اُٹھانا اور بدی سے نقصان اُٹھانا۔ سو یہ فی الحقیقت اپنی ہی نیکی اور بدی سے فائدہ اور نقصان اُٹھانا ہے۔ نیکی اور بدی کا بدلہ نیکی اور بدی کرنے والے کو تو لازمی ملے گا اور سفارش کرنے والے کو سفارش کی جزا و سزا ملتی ہے نہ کہ اصل نیکی اور بدی کی۔ اسی طرح گمراہی کی جزا بھی گمراہوں ہی کے لیے مخصوص ہے اور جس چیز کی سزا اُن گمراہ کرنے والوں کو ملے گی، وہ اُن کے گمراہ کرنے کا عمل ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم کسی کو رسول بھیجے بغیر عذاب نہیں کرتے، یعنی نہ دنیا میں نہ آخرت میں۔ جمہور رحمہ اللہ نے کہا کہ منفی عذاب

[1] رقم الآية [١٦٤] [2] معاني القرآن (٣/ ٢٣١)

کی نفی کا تعلق دنیا کے عذاب سے ہے نہ کہ عذابِ آخرت سے۔ اس بات پر دلیل ہے کہ جو کچھ واجب ہوا، اس کا وجوب سمعی ہے (یعنی دلائلِ شرعیہ پر) نہ کہ عقلی (عقل میں آنے پر)۔[1]

وَإِذَآ أَرَدۡنَآ أَن نُّهۡلِكَ قَرۡيَةً أَمَرۡنَا مُتۡرَفِيهَا فَفَسَقُواْ فِيهَا فَحَقَّ عَلَيۡهَا ٱلۡقَوۡلُ فَدَمَّرۡنَٰهَا تَدۡمِيرٗا ﴿١٦﴾

اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے متکبر امراء کو حکم دیتے ہیں، پھر وہ اس میں نافرمانی کرنے لگتے ہیں، چناں چہ اس بستی پر (عذاب کی) بات ثابت ہو جاتی ہے، تب ہم اسے مکمل طور پر تباہ کر ڈالتے ہیں (16)

﴿أَمَرۡنَا مُتۡرَفِيهَا﴾ کا مطلب:

﴿أَمَرۡنَا﴾ کو مخفف پڑھا ہے، اس سے مراد امرِ قدری ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿أَتَىٰهَآ أَمۡرُنَا لَيۡلًا أَوۡ نَهَارٗا﴾ [یونس: ٢٤] ”ہمارا حکم (عذاب) رات یا دن کو (اچانک) آ گیا۔“ کیوں کہ اللہ فحشاء کا حکم نہیں کرتا۔ بعض نے کہا کہ ان کو فعلِ فواحش کا مسخر کیا اس لیے وہ عذاب کے مستحق ٹھہرے۔ یا ہم نے اُن کو اطاعت کا حکم دیا تھا، مگر انھوں نے فواحشات کیے اور سزا کے مستحق ٹھہرے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اسی طرح کہا ہے۔ سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ احتمال ہے کہ معنی یوں ہوں کہ ہم نے ان کو امراء بنایا،[2] لیکن یہ معنی اس صورت میں بنتے ہیں کہ ”اَمَرۡنَا“ کے بجائے ”أَمَّرۡنَا“ ہو۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ہم نے ان شریروں کو مسلط کیا، انھوں نے عصیان کیا۔ جب وہ عاصی ہوئے، تب اللہ تعالیٰ نے اُن کو عذاب سے ہلاک کر ڈالا۔ یہ اس کا فرمان ہے: ﴿وَكَذَٰلِكَ جَعَلۡنَا فِي كُلِّ قَرۡيَةٍ أَكَٰبِرَ مُجۡرِمِيهَا لِيَمۡكُرُواْ فِيهَاۖ وَمَا يَمۡكُرُونَ إِلَّا بِأَنفُسِهِمۡ وَمَا يَشۡعُرُونَ﴾ [الأنعام: ١٢٣] ”اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں اس کے بڑے بڑے مجرموں کو لگا دیا کہ وہ اس (بستی) میں اپنے مکر وفریب کا جال پھیلائیں، اور وہ اپنے آپ ہی سے مکر وفریب کرتے ہیں اور وہ شعور نہیں رکھتے۔“

امام ابو العالیہ، مجاہد اور ربیع بن انس رحمہم اللہ کا قول یہی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول یہ ہے کہ ہم نے ان کی تعداد زیادہ کر دی۔ امام عکرمہ، حسن، ضحاک اور قتادہ رحمہم اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام زہری رحمہ اللہ نے کہا: ﴿أَمَرۡنَا مُتۡرَفِيهَا﴾ أي أكثرنا یعنی ہم نے زیادہ کر دیا۔[3] بعض نے اس جگہ اس حدیث سے استشہاد کیا ہے جو سیدنا سوید بن ہبیرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے: «خَيۡرُ مَالِ امۡرِئٍ لَهُ مُهۡرَةٌ مَأۡمُورَةٌ، أَوۡ سِكَّةٌ مَأۡمُورَةٌ»[4] (رواه أحمد)

---

(1) فتح البيان (٧/ ٣٦٦۔ ٣٦٧) (2) تفسير الطبري (١٧/ ٤٠٣) (3) تفسير الطبري (١٧/ ٤٠٤۔ ٤٠٥) تفسير ابن كثير (٣/ ٤٨)

(4) مسند أحمد (٣/ ٤٦٨) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”رجال أحمد ثقات“ مجمع الزوائد (٥/ ٤٧٠)

[آدمی کا بہتر مال وہ جانور ہے جو زیادہ بچے دینے والا ہو، یا راستہ ہے جو کھجور کے درختوں سے گھرا ہوا ہو] ابو عبید نے کتاب الغریب میں کہا ہے: "مامورة" کے معنی ہیں زیادہ نسل والا۔ اور "السكة" کھجوروں سے گھرے ہوئے راستے کو کہتے ہیں اور "المابورة" تابیر سے ہے۔ بعض نے کہا کہ یہ کلام بہ طورِ تناسب آیا ہے، جیسے مازورات غیر ماجورات (گناہ والیاں نہ کہ اجر پانے والیاں)۔ ①

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ امر سے مراد نہی کو توڑنا ہے اور اکثر کے نزدیک جس کا حکم دیا گیا وہ اطاعت اور خیر ہے۔ کشاف میں کہا ہے: "أمرناهم بالفسق" ② [ہم نے انھیں نافرمانی کا حکم دیا] لیکن اس میں نظر ہے۔ بعض نے کہا: "أمرنا" سے مراد "أكثرنا" ہے۔ مترفین سے مراد آسودہ لوگ ہیں، جن کو نعمت اور عیش کی فراوانی اترانے کا سبب ہوتی ہے۔ مفسرین نے مترفین کی تفسیر ایسے لوگ جو جابر ہوں اور مسلط ہو جائیں اور ظالم بادشاہوں کے ساتھ کی ہے۔ اُن کو خاص طور پر اس لیے ذکر کیا ہے کہ جو لوگ ان کے علاوہ ہیں وہ اُن کے اتباع ہیں۔ قاموس میں کہا ہے کہ ترفہ پیش کے ساتھ نعمت اور پاکیزہ کھانا اور نادر شے کے معنی میں ہے۔ ③

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ﴿۱۷﴾

اور ہم نے نوح کے بعد کتنی ہی قومیں ہلاک کر دیں اور آپ کا رب کافی ہے اپنے بندوں کے گناہوں کی خوب خبر رکھنے والا، (انھیں) خوب دیکھنے والا ⑰

قریش سے خطاب اور ان کی سرزنش:

اللہ تعالیٰ نے کفارِ قریش کو نبی اکرم ﷺ کی تکذیب کی بابت ڈرایا کہ ہم نے نوح علیہ السلام کے بعد بہت سی اُمتوں کو، جنھوں نے رسولوں کی تکذیب کی تھی، ہلاک کر ڈالا۔ یہ اس پر دلیل ہے کہ جو قرون آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کے درمیان گزرے ہیں، جیسے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ دس قرن تھے، وہ سب اسلام پر تھے۔ ④ معنی یہ ہوئے کہ اے جھٹلانے والو! تم اللہ کے نزدیک کچھ ان اُمتوں سے زیادہ عزت والے نہیں ہو کہ وہ تو رسولوں کی تکذیب پر عذاب پائیں اور ہلاک ہوں اور تم نہ ہو، بلکہ تم نے تو سب سے زیادہ بزرگ رسول کی تکذیب کی ہے، جو کہ تمام مخلوقات سے زیادہ باعزت ہے، پس تمھاری سزا اور عذاب اولیٰ اور زیادہ لائق ہے۔ اللہ تعالیٰ کو بندوں کے تمام اعمال کی، وہ خیر ہوں یا شر، خبر رہتی ہے، اس پر کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔

---

① تفسیر ابن کثیر (۳/ ٤٨) ② الکشاف (۲/ ٦١١)
③ القاموس المحیط (۱/ ۱۰۲٦) فتح البیان (۷/ ۳٦۷۔ ۳٦۹) ④ مستدرک الحاکم (۲/ ٤٨٠)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ مراد بہت سے قرون ہیں، جیسے: عاد وثمود وغیرہ گذشتہ امتیں، جن پر نوح علیہ السلام کے بعد ہلاکت نازل ہوئی اور عذاب کا کوڑا برسا۔ اس میں کفارِ مکہ کو خوف دلایا گیا ہے۔ نوح علیہ السلام کا نام اس لیے لیا کہ سب سے پہلے انھی کی قوم نے تکذیب کی تھی، لہٰذا "من بعد آدم" نہ کہا۔ پھر نبی کریم ﷺ کو خطاب کیا کہ تیرا رب بندوں کے گناہوں کا واقف کار ہے۔ حقائقِ اشیا کو، وہ ظاہر ہوں یا باطن، گھیرنے والا ہے۔ تمام معلومات کا عالم ہے اور تمام مرئیات (نظر آنے والا) کا دیکھنے والا ہے۔ آیت میں اطاعت گزاروں کو عظیم بشارت ہے اور اہلِ معصیت کو بہت زیادہ خوف دلایا گیا ہے، کیوں کہ مکمل علم اور خبر ہونا اور بصیرت نافذہ ہونا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ مستحق لوگوں کو اُن کے حق تفضّل کے منافی کے مطابق جزا دی جائے اور یہ اہلِ تفضّل پر مزید نہیں ہے۔[1]

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۱۸﴾ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۱۹﴾

جو کوئی جلدی والی (دنیا) چاہے تو ہم اسی (دنیا) میں جس کے لیے چاہیں جس قدر چاہیں جلد عطا کرتے ہیں، پھر اس کے لیے ہم جہنم ٹھہرا دیتے ہیں، وہ اس میں مذموم اور دھتکارا ہوا داخل ہوگا ⑱ اور جو آخرت چاہے اور اس کے لیے پوری سعی کرے، جب کہ وہ مومن ہو، تو یہی لوگ ہیں جن کی سعی قابلِ قدر ہے ⑲

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ عاجلہ سے مراد منفعتِ عاجلہ یا دارِ عاجلہ ہے، یعنی جو کوئی اعمالِ نیک یا اعمالِ آخرت سے ارادہ اس گھر کا یعنی دنیا کا کرتا ہے، اس میں کافر وفساق وریاکار ومنافق سب داخل ہیں تو ہم ایسے شخص کو جلدی سے اس کی مراد دے دیتے ہیں، پھر اس شتابی کے ساتھ دو قیدیں لگائیں: ایک ﴿مَا نَشَآءُ﴾ یعنی جس کی شتابی ہم چاہتے ہیں نہ کہ جس کو ارادہ کرنے والے چاہیں۔ لہٰذا بہت سے ارادہ کرنے والے نظر آتے ہیں کہ اُن کی تمنا پوری نہیں ہوتی اور وہ اپنے ارادے تک نہیں پہنچتے۔ دوسری قید ﴿لِمَنْ نُّرِيْدُ﴾ یعنی جس کو دینا ہم چاہتے ہیں بہ اقتضائے مشیت نہ یہ کہ وہ دنیا ہر کسی شخص کو اس کی مراد کے مطابق ہاتھ آتی ہے۔ بعض نے کہا کہ یہ آیت منافقین کے حق میں آئی ہے، وہ دکھاوے کے لیے مسلمانوں کے ہمراہ ہو کر لڑتے تھے، اُن کی غرض صرف مالِ غنیمت میں شرکت کرنا ہوتی

[1] فتح البیان (۷/ ۳۶۹)

تھی۔ یہ آیت ان آیاتِ مطلقہ کے لیے قید ہے: ﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ﴾ [الشوریٰ: ۲۰] ''جو شخص آخرت کی کھیتی چاہتا ہے، ہم اس کے لیے اس کی کھیتی میں اضافہ کرتے ہیں۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ﴾ [هود: ۱۵] ''جو شخص دنیاوی زندگی اور اس کی زینت چاہتا ہے تو ہم انھیں ان کے اعمال کا پورا بدلہ اسی (دنیا) میں دے دیتے ہیں اور اس میں ان کی حق تلفی نہیں کی جاتی۔''

لیکن اس طلب کے بعد، جو تاثیر سے فارغ ہے اور دو شرطوں کے ساتھ مشروط ہے، عذابِ آخرت ہے۔ اس لیے فرمایا کہ پھر ہم نے اس کے لیے آخرت کا عمل چھوڑنے کے سبب سے، جس کا اس کو حکم تھا اور اخلاص کو ترک کر دینے کے سبب سے مختلف قسم کے جہنم کے عذاب مقرر کیے ہیں، وہ اس جہنم میں ملامت زدہ ہو کر اور اللہ کی رحمت سے مردود ہو کر داخل ہوگا۔ یہ اس کی آخرت میں سزا ہے، حالاں کہ اس کو دنیا بھی صرف اتنی ہی ملتی ہے، جتنی اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے مقدر کی ہے۔ کہاں اس بدبخت کا حال اور کہاں اس مومن متقی کا حال۔ اس کو دنیا بھی اس کے مقدر کے مطابق بغیر بے صبری اور آہ و زاری کے سکونِ نفس اور اطمینانِ قلب کے ساتھ ملتی ہے اور وہ اس کے ساتھ آخرت کے لیے عمل کرتا ہے اور اللہ پاک کی جزا کا منتظر ہے اور وہ جزا جنت ہے۔ اس لیے فرمایا ہے کہ جو کوئی اپنے اعمال سے آخرت کا ارادہ کرتا ہے اور اس کے لیے کوشش کرتا ہے اور اچھی نیت اور اخلاص رکھتا ہے اور اچھی کوشش بجا لاتا ہے اور امر و نہی کا پابند ہے اور بغیر ریا کاری وغیرہ کی آمیزش سے خالص اللہ کے لیے کام کرتا ہے اور قانونِ شریعت پر چلتا ہے، بدعتوں اور خواہشات کا تابع نہیں ہے اور اللہ پر ایمان بھی رکھتا ہے، کیوں کہ عملِ صالح کی جزا کا مستحق وہی شخص ہوتا ہے جو مومن بھی ہے۔ ﴿ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴾ [المائدة: ۲۷] ''اللہ صرف پرہیزگاروں سے (قربانی) قبول کرتا ہے۔''

تو ایسے شخص کی سعی اللہ کے نزدیک مقبول ہوتی ہے اور رد نہیں کی جاتی، بلکہ کئی گنا تک پہنچ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سعی کے مشکور ہونے کے لیے تین قیدیں رکھیں، ایک آخرت کے ارادے سے کرنا، دوسرے پوری سعی کرنا، تیسرے ایمان کے ساتھ کرنا۔ بعض سلف صالح نے کہا ہے کہ جس کے پاس تین چیزیں نہیں ہیں، اس کو عمل کوئی نفع نہیں دیتا: ایمانِ ثابت، سچی نیت اور صحیح عمل، پھر یہ آیتِ باب پڑھی۔[1]

دنیا و آخرت کے طلب گاروں کا بدلہ:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جو شخص دنیا اور اس کی نعمتوں کا طلب گار ہو تو ضروری نہیں کہ اسے یہ سب

[1] فتح البیان (۷/ ۳۷۰۔ ۳۷۲)

کچھ مل جائے، بلکہ دنیا تو اسے ہی حاصل ہوتی ہے، جس کے لیے اللہ چاہے اور اتنی ہی حاصل ہوتی ہے جتنی اللہ تعالیٰ چاہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں فرمایا: «اَلدُّنْیَا دَارُ مَنْ لَّا دَارَ لَهُ، وَ مَالُ مَنْ لَّا مَالَ لَهُ، وَلَهَا یَجْمَعُ مَنْ لَّا عَقْلَ لَهُ»[1] (رواہ أحمد) [دنیا اس کا گھر ہے جس کا (آخرت میں) گھر نہ ہو، یہ اس کا مال ہے جس کا (آخرت میں) مال نہ ہو اور اسے وہی جمع کرتا رہتا ہے جس کے پاس اپنی گرہ کی عقل بالکل نہ ہو] اور جو شخص آخرت کی نعمتوں اور سرور کا خواہش مند ہو اور اس کی طلب ایمان کے ساتھ اور رسول کی اتباع کے ساتھ کرتا ہے اور ثواب و جزا کا یقین رکھتا ہے تو اس کی کوشش ٹھکانے لگتی ہے۔[2]

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَ هٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۝۲۰ اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّ اَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ۝۲۱

ہم ہر ایک کو آپ کے رب کی عطا سے نوازتے ہیں، اُن کو بھی اور اِن کو بھی، اور تیرے رب کی عطا (کسی سے) روکی ہوئی نہیں ⑳ دیکھیے! کس طرح ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی؟ اور یقیناً آخرت درجوں میں بڑھ کر ہے اور فضیلت دینے میں (بھی) بڑھ کر ہے ㉑

ہر حق دار کو حق دیا جاتا ہے:

اللہ تعالیٰ نے کہا کہ دونوں فریق میں سے ہر ایک کو خواہ وہ دنیا کا ارادہ کرنے والا ہو یا آخرت کا، ہم اپنی عطا اس کو پہنچاتے ہیں، یعنی اللہ احکم الحاکمین جو تمام معاملات کا اختیار رکھتا ہے، وہ ظلم نہیں کرتا، ہر کسی کو، جس کا وہ مستحق ہے، سعادت و شقاوت سے دیے جاتا ہے۔ کوئی اس کے حکم کا پھیرنے والا اور کوئی اس کی عطا کو روکنے والا اور کوئی اس کے ارادے کا بدلنے والا نہیں۔ لہٰذا فرمایا کہ رب کی عطا ممنوع نہیں، اس کو کوئی روک نہیں سکتا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ محظور یعنی منقوص (کم کیا گیا)۔[3] امام حسن رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا کہ یعنی ممنوع۔[4]

پھر دنیا کی فضیلت کا ذکر فرمایا کہ کوئی یہاں غنی ہے اور کوئی فقیر اور کوئی غنا اور فقیری کے درمیان، اور کوئی خوبصورت اور کوئی بدصورت اور کوئی اس کے درمیان اور کوئی چھوٹی عمر میں مر جاتا ہے اور کوئی لمبی عمر پاتا ہے، یہاں تک کہ بہت بوڑھا ہو جاتا ہے اور کوئی اس کے درمیان رہتا ہے۔ اسی طرح دارِ آخرت کا فرق دنیا کے فرق سے بھی

---

① مسند أحمد (٦/ ٧١) شعب الإيمان (٧/ ٣٧٥) اس کی سند میں ''ابو اسحاق'' مدلس راوی ہے اور عنعنہ کے ساتھ بیان کر رہا ہے۔
مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٩٣٣)

② تفسير ابن كثير (٣/ ٤٨۔ ٤٩) ③ تفسير الطبري (١٧/ ٤١١) ④ تفسير ابن كثير (٣/ ٤٩)

بڑا ہے، کوئی جہنم کے طبقوں میں ہوگا اور زنجیروں اور طوقوں میں جکڑا ہوا ہوگا اور کوئی بلند درجات اور جنتوں کی نعمتوں اور سرور میں ہوگا۔ پھر جہنم کے طبقوں والوں میں بھی عذاب میں فرق ہوگا، جس طرح کہ جنت کے درجات والے ثواب میں متفرق ہوں گے، کیوں کہ جنت کے سو درجے ہیں، ہر دو درجوں کے درمیان اتنا فرق ہے، جتنا کہ آسمان و زمین کے درمیان ہے۔ صحیح میں مروی ہے کہ بلند درجوں والے اہلِ علیین کو اس طرح دیکھیں گے جس طرح ڈوبتے تارے کو آسمان کے کنارے میں دیکھتے ہیں،[1] لہٰذا آخرت کو اکبرِ درجات اور اکبرِ تفضیل فرمایا ہے۔ سیدنا سلمان رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں: «مَا مِنْ عَبْدٍ يُرِيْدُ أَنْ يَرْتَفِعَ فِيْ الدُّنْيَا دَرَجَةً فَارْتَفَعَ إِلَّا وَضَعَهُ فِيْ الْآخِرَةِ أَكْبَرَ مِنْهَا»[2] [جو بندہ دنیا میں جو درجہ چڑھنا چاہے گا اور اپنی خواہش میں کامیاب ہو جائے گا، وہ آخرت کا درجہ گھٹا دے گا جو اس سے بہت بڑا ہے] پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّ اَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ﴾[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ آیت میں لف ونشر مرتب ہے، یعنی ہم کفار اور مومنین اور اہلِ معصیت و اہلِ طاعت دونوں کو دیتے ہیں۔ نافرمانی کی وجہ سے ان کے رزق میں کوئی کمی نہیں ہے۔ امداد سے مراد وہ چیز ہے جو دنیا کا ارادہ کرنے والوں کو اس دنیا میں شتابی سے ملتی ہے اور وہ جو آخرت کا ارادہ کرنے والے کو دنیا اور آخرت میں ملے گی۔ ﴿ عَطَآءِ ﴾ سے مراد تفضّل محض ہے۔ یہ عطا کسی کے روکنے سے نہیں رکتی۔ "حظر" حائے مہملہ اور ظائے معجمہ کے ساتھ، منع کے معنی میں ہے۔ عطائے دنیا سے مراد رزق اور جاہ وجلال ہے، کیوں کہ کافر کا آخرت میں کوئی حصہ نہ ہوگا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات بتا دی کہ ہم مسلمان اور کافر دونوں کو دیتے ہیں اور اُن سب کے رازق ہیں۔[4]

خدائے راست مسلم بزرگی و الطاف کہ جرم بیند و نان برقرار میدارد

"بزرگی و مہربانی اللہ ہی کے لیے یقینی وتسلیم شدہ ہے کہ وہ جرم و گناہ دیکھتا ہے، لیکن پھر بھی روزی دیتا رہتا ہے۔"

حسن رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں سب کو رزق دیتا ہے، نیک ہو یا بد۔[5]

ولا کن خداوندِ بالا و پست بعصیان در رزق برکس نہ بست

"لیکن ہر بلندی و پستی کے مالک اللہ نے گناہ کی وجہ سے کسی پر اپنے رزق کا دروازہ بند نہیں کیا۔"

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اللہ رزق دیتا ہے، اس کو جو طالبِ دنیا ہے اور اس کو بھی جو آخرت کا

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٨٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٣١) مسند الحميدي (٢/ ٣٣٣)

(2) یہ روایت موضوع ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة (٣٤٤)

(3) المعجم الكبير (٦/ ٢٣٩) اس کی سند میں "عبدالغفور" سخت ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٣٤٤)

(4) معاني القرآن (٣/ ٢٣٣) (5) تفسير الطبري (١٧/ ٤١١)

ارادہ رکھتا ہے۔[1] دیکھ اے پیغمبر! یا یہ خطاب ہے ہر مخاطب کو کہ ہم نے عطایائے عاجلہ میں کس طرح بعض بندوں کو بعض پر زیادتی بخشی ہے، کوئی تونگر ہے تو کوئی محتاج، کوئی تندرست ہے تو کوئی بیمار، کوئی عقل مند ہے اور کوئی احمق۔ اس میں وہ حکمتِ بالغہ ہے جس کے ادراک سے عقلیں قاصر ہیں۔ رہی آخرت سو وہاں کے درجے اور زیادتی دنیا سے کہیں زیادہ بڑی ہے، کیوں کہ آخرت کے درجات میں بڑھنا دنیا کے درجات میں بڑھنے کی نسبت ایسے ہے، جیسے آخرت کی نسبت دنیا سے ہے اور دنیا آخرت کی نسبت کچھ مقدار نہیں رکھتی۔ لہٰذا آخرت درجات اور تفاضل میں اکبر و اعظم و اعلیٰ ٹھہری۔ بعض نے کہا کہ مراد یہ ہے کہ مومنین جنت میں داخل ہوں گے اور کافر نار میں داخل ہوں گے۔ اس وقت اہلِ ایمان کی فضیلت کفار پر ظاہر ہوگی۔ حاصل یہ ہے کہ آخرت میں درجات کی زیادتی دنیا کی زیادتی اور مرتبوں سے بہت زیادہ بڑھ کر ہے۔[2]

لَا تَجۡعَلۡ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقۡعُدَ مَذۡمُوۡمًا مَّخۡذُوۡلًا ﴿۲۲﴾

آپ اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ ٹھہرائیں، (ورنہ) پھر آپ مذمت کیے ہوئے اور بے کس ہو کر بیٹھے رہیں گے ﴿22﴾

کسی کو اللہ تعالیٰ کا شریک نہ بناؤ، ورنہ ملامت زدہ بے کس ہو جاؤ گے:

یہ اس اُمت کے ہر مکلّف کو خطاب ہے کہ تجھ کو عبادت کی جو تکلیف دی گئی ہے تو اس میں کسی کو اپنے رب کا شریک نہ کر، اس لیے کہ اس اشراک کی وجہ سے تو برے حال میں اور بے یار و مددگار رہے گا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ پھر تیری مدد نہ کرے گا، بلکہ تجھ کو تیرے اسی معبودِ باطل کے سپرد کر دے گا، جو نہ نقصان کا مالک ہے نہ نفع کا، کیوں کہ نفع ونقصان کی ملکیت اللہ وحدہ لاشریک لہ کے پاس ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «مَنْ أَصَابَتْهُ فَاقَةٌ فَأَنْزَلَهَا بِالنَّاسِ لَمْ تَسُدَّ فَاقَتُهُ، وَمَنْ أَنْزَلَهَا بِاللّٰهِ أَوْشَكَ اللّٰهُ لَهُ بِالْغِنَى إِمَّا أَجَلٍ عَاجِلٍ وَإِمَّا غِنًى عَاجِلًا»[3] (رواه أحمد و رواه أبو داود، الترمذي وقال حسن صحيح غريب) [جس شخص کو فقہ پہنچے اور وہ اسے لوگوں پر ڈال دے تو اس کا فاقہ دور نہ ہوگا اور جو اسے اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دے تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے غنی کر دے یا تو جلد موت دے کر یا جلد دولت عطا فرما کر]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ یہ خطاب نبی اکرم ﷺ کو ہے اور مراد اُمت ہے۔ یا یہ ہر مکلّف اور خطاب

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٤١١) [2] فتح البيان (٧/ ٣٧٢۔ ٣٧٣)

[3] مسند أحمد (١/ ٤٠٧) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٦٤٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣٢٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٧٨٧)

کے اہل کو خطاب ہے۔ اس آیت میں شرک سے منع فرمایا ہے اور ۲۵ قسمیں تکلیف کی بیان فرمائیں، جن میں کوئی اصلی ہے اور کوئی فرعی۔ اصلی کی ابتدا اس آیت سے کی ہے۔ پھر تمام اعمال کا ذکر کیا کہ اُن اعمال کے کرنے والا گویا آخرت کے لیے سعی کرنے والا ہے۔[1]

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَاۤ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَاۤ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴿۲۳﴾ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ؕ ﴿۲۴﴾

اور آپ کے رب نے فیصلہ کر دیا کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، اور والدین سے اچھا سلوک کرو، اگر ان دونوں میں سے ایک یا دونوں تیرے ہاں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو تُو ان سے ''اُف'' تک نہ کہہ اور انھیں مت جھڑک، اور ان سے نرم (لہجے میں ادب و احترام سے) بات کر (23) اور ان کے لیے رحم دلی سے عاجزی کے ساتھ اپنا بازو (پہلو) جھکائے رکھ اور کہہ: میرے رب! ان دونوں پر رحم فرما جیسے انھوں نے بچپن میں میری پرورش کی (24)

توحید اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم:

اللہ تعالیٰ نے حکم کیا اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادتِ خالص کا، کیوں کہ ﴿ قَضٰى ﴾ اس جگہ بہ معنی ''حکم'' ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ ''قضی'' بہ معنی ''وصی'' ہے۔ سیدنا ابی بن کعب، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما اور امام ضحاک نے ''وصّٰی'' پڑھا ہے،[2] لہٰذا اپنی عبادت کے ساتھ والدین کے ساتھ نیکی کا ذکر کیا کہ ماں باپ کے ساتھ نیکی اور حسنِ سلوک کرو، جس طرح دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ؕ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴾ [لقمان: ١٤] ''یہ کہ تو میرا اور اپنے والدین کا شکر کر (بالآخر) میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔'' اُف سے مراد ایسی بات سنانا ہے جو بری ہو، یہاں تک کہ تافیف بھی نہ کرے کہ یہ برے قول میں سے سب سے ادنیٰ مرتبے کا قول ہے اور اُس سے اُن کے بارے میں کوئی برا کام صادر نہ ہو۔ عطا بن ابی رباح نے کہا ہے: ﴿ لَا تَنْهَرْهُمَا ﴾ أي لا تنفض يدك عليهما[3] [یعنی ان پر ہاتھ بھی نہ اٹھاؤ]

پھر قولِ قبیح اور فعلِ قبیح سے منع کرنے کے بعد قولِ حسن اور فعلِ حسن کا حکم کیا اور فرمایا کہ اچھی پاکیزہ نرم بات

---

(1) فتح البیان (۷/ ۳۷۳۔ ۳۷۴) (2) تفسير الطبري (۱۷/ ۴۱۳۔ ۴۱۴) (3) تفسير الطبري (۱۷/ ۴۱۷)

کہو، وہ بھی نہایت ادب، عزت و احترام اور تعظیم کے ساتھ اور اُن کے لیے جھک جا اور خاکساری کر اپنے فعل کے ساتھ، رحمت اور شفقت کی خاطر اور اُن کے لیے اللہ تعالیٰ سے رحمت کی دعا مانگ، یعنی اُن کے بڑھاپے کے زمانے میں اور وفات کے وقت۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ﴾ [التوبة: ١١٣] ''نبی اور ایمان والوں کے لائق نہیں کہ وہ مشرکوں کے لیے بخشش کی دعا کریں۔''[1] والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کے بارے میں بہت سی احادیث مروی ہیں۔

ازاں جملہ ایک حدیث سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر چڑھ کر تین بار آمین کہی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: اے اللہ کے رسول! آپ نے کس چیز پر آمین کہی ہے؟ فرمایا: میرے پاس جبریل علیہ السلام آئے، کہا: اے محمد! إلیٰ قوله «رَغِمَ أَنْفُ رَجُلٍ أَدْرَكَ وَالِدَيْهِ أَوْ أَحَدَهُمَا فَلَا يُدْخِلَاهُ الْجَنَّةَ قُلْ: آمِيْن، فَقُلْتُ: آمِيْنَ»[2] [اس شخص کی ناک خاک آلو ہو جائے جس نے اپنے والدین کو یا ان میں سے کسی ایک کو پایا، پھر وہ اسے جنت میں داخل نہ کرا سکے، (ان کی خدمت کر کے یہ جنت میں داخل نہ ہو سکا) آپ آمین کہیں! تو میں نے آمین کہی] یہ حدیث کئی طریق سے مروی ہے۔

دوسری روایت کے الفاظ مالک یا ابن مالک کے یہ ہیں: «مَنْ أَدْرَكَ وَالِدَيْهِ أَوْ أَحَدَهُمَا فَدَخَلَ النَّارَ فَأَبْعَدَهُ اللّٰهُ»[3] (رواه أحمد) [جس نے اپنے والدین کو یا ان میں سے کسی ایک کو پایا، پھر بھی جہنم میں گیا، اللہ اسے اپنی رحمت سے دور کرے] تیسری روایت مالک بن عمرو قشیری کی یہ ہے: «مَنْ أَدْرَكَ أَحَدَ وَالِدَيْهِ ثُمَّ لَمْ يُغْفَرْ لَهُ فَأَبْعَدَهُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ»[4] (رواه أحمد) [جس نے اپنے والدین میں سے کسی ایک کو پایا، پھر بھی اس کی بخشش نہ ہو سکی، اللہ عزوجل اسے اپنی رحمت سے دور کرے]

چوتھی روایت اُن کی یہ ہے: «مَنْ أَدْرَكَ وَالِدَيْهِ أَوْ أَحَدَهُمَا ثُمَّ دَخَلَ النَّارَ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَأَبْعَدَهُ اللّٰهُ وَأَسْحَقَهُ»[5] (رواه أحمد و أبو داود الطيالسي) [جس نے اپنے والدین کو یا ان میں سے کسی ایک کو پایا، پھر بھی وہ اس کے بعد جہنم میں گیا اللہ اسے اپنی رحمت سے دور کرے اور اسے برباد کرے] سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت مرفوعاً اس طرح ہے: «رَغِمَ أَنْفُ، ثُمَّ رَغِمَ أُنْفُ، ثُمَّ رَغِمَ أَنْفُ رَجُلٍ أَدْرَكَ أَحَدَ أَبَوَيْهِ أَوْ كِلَيْهِمَا عِنْدَ الْكِبَرِ

---

(1) تفسير الطبري (١٧/ ٤٢١)

(2) مسند البزار (١٢/ ٣٥٤) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه سلمة بن وردان وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ١٠/ ٢٥٨)

(3) مسند أحمد (٤/ ٣٤٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٥١٥)

(4) مسند أحمد (٤/ ٣٤٤) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ٣٢٩)

(5) مسند أحمد (٤/ ٣٤٤) مسند الطيالسي (١/ ١٨٧) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ٣٢٩)

لَمْ يَدْخُلِ الْجَنَّةَ ﴾[1] (رواه أحمد وهو صحيح من هذا الوجه ولم يخرجوه سوا مسلم) [اس شخص کی ناک آلود ہو جائے، پھر اس شخص کی ناک خاک آلود ہو جائے، پھر اس شخص کی ناک خاک آلود ہو جائے، جس نے اپنے والدین میں سے کسی ایک کو یا دونوں کو بڑھاپے میں پایا اور پھر بھی وہ جنت میں داخل نہ ہوا] اُن کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں: « رَغِمَ أَنْفُ رَجُلٍ أَدْرَكَ عِنْدَهُ أَبَوَاهُ الْكِبَرَ فَلَمْ يُدْخِلَاهُ الْجَنَّةَ ﴾[2] (رواه أحمد بطوله و رواه الترمذي و استغربه) [اس شخص کی ناک خاک آلود ہو جائے جس کے پاس اس کے والدین بوڑھے ہو گئے، پھر بھی وہ اسے جنت میں داخل نہ کرا سکے]

مالک بن ربیعہ ساعدی کہتے ہیں کہ ہم نبی اکرم ﷺ کے پاس بیٹھے تھے، اتنے میں ایک انصاری مرد آیا، اس نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! ”هَلْ بَقِيَ عَلَيَّ مِنْ بِرِّ أَبَوَيَّ شَيْءٌ بَعْدَ مَوْتِهِمَا أَبَرُّهُمَا بِهِ؟ قَالَ: « نَعَمْ، خِصَالٌ أَرْبَعٌ: الصَّلَاةُ عَلَيْهِمَا، وَالْإِسْتِغْفَارُ لَهُمَا، وَإِنْفَاذُ عَهْدِهِمَا، وَ إِكْرَامُ صَدِيقِهِمَا، وَصِلَةُ الرَّحِمِ الَّتِي لَا رَحِمَ لَكَ إِلَّا مِنْ قِبَلِهِمَا، فَهُوَ الَّذِي بَقِيَ عَلَيْكَ مِنْ بِرِّهِمَا بَعْدَ مَوْتِهِمَا ﴾[3] (رواه أحمد و أبو داود و ابن ماجه) [کیا میں اپنے والدین کے انتقال کے بعد بھی ان کے ساتھ کوئی سلوک کر سکتا ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”ہاں، چار قسم کے سلوک کر سکتا ہے: ان کے جنازے کی نماز، ان کے لیے دعا و استغفار کرنا، ان کے وعدوں کو پورا کرنا، ان کے دوستوں کی عزت کرنا اور وہ صلہ رحمی جو صرف ان کی وجہ سے ہو۔ یہ ہے وہ سلوک جو ان کی موت کے بعد بھی تو ان کے ساتھ کر سکتا ہے] معاویہ بن جاہمہ سلمی کہتے ہیں کہ جاہمہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کے پاس آیا اور کہا کہ اے اللہ کے رسول! میں نے غزوہ یعنی جہاد کا ارادہ کیا ہے اور آپ سے مشورہ لینے آیا ہوں، فرمایا: تیری ماں ہے؟ کہا: ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: « فَالْزَمْهَا فَإِنَّ الْجَنَّةَ عِنْدَ رِجْلَيْهَا » [بس اس کی خدمت میں لگ جاؤ، جنت اس کے قدموں کے پاس ہے] پھر دوسری بار اور تیسری بار مختلف موقعوں پر آیا، نبی کریم ﷺ نے اپنے پہلے فرمان کی طرح کہا۔[4] (رواه أحمد والنسائي و ابن ماجه)

سیدنا مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں: « إِنَّ اللّٰهَ يُوصِيكُمْ بِآبَاءِ كُمْ، إِنَّ اللّٰهَ يُوصِيكُمْ بِأُمَّهَاتِكُمْ، إِنَّ اللّٰهَ يُوصِيكُمْ بِأُمَّهَاتِكُمْ إِنَّ اللّٰهَ يُوصِيكُمْ بِأُمَّهَاتِكُمْ، إِنَّ اللّٰهَ يُوصِيكُمْ بِالْأَقْرَبِ

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحديث (٢٥٥١) مسند أحمد (٢/ ٣٤٦)

[2] مسند أحمد (٢/ ٢٥٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٤٥) صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٥١٠)

[3] مسند أحمد (٣/ ٣٩٧) سنن أبي داود، رقم الحديث (٥١٤٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٦٦٤) اس کی سند میں ”علی بن عبید“ مجہول راوی ہے۔

[4] مسند أحمد (٣/ ٤٢٩) سنن النسائي، رقم الحديث (٣١٠٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٧٨١) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ٣٢٧)

فَالْأَقْرَبِ» [1] (أخرجه أحمد و ابن ماجه) [بے شک اللہ تعالیٰ تمھیں تمھارے باپوں کے بارے میں وصیت فرماتا ہے، بے شک اللہ تعالیٰ تمھیں تمھاری ماؤں کے بارے میں وصیت فرماتا ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمھیں تمھاری ماؤں کے بارے میں وصیت فرماتا ہے، یقیناً اللہ تعالیٰ تمھیں تمھاری ماؤں کے بارے میں وصیت فرماتا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ تمھیں تمھارے قریبی رشتے داروں کے بارے میں وصیت فرماتا ہے] یعنی باپ کے بارے میں ایک بار وصیت کی اور ماں کے بارے میں تین بار وصیت فرمائی۔ یربوع کے ایک شخص نے کہا ہے کہ میں نبی اکرم ﷺ کے پاس آیا، میں نے سنا، آپ ﷺ لوگوں سے بات چیت کر رہے تھے، کہتے تھے: «يَدُ الْمُعْطِي الْعُلْيَا أُمَّكَ وَأَبَاكَ وَأُخْتَكَ وَأَخَاكَ ثُمَّ أَدْنَاكَ فَأَدْنَاكَ» [2] (رواه أحمد) [دینے والے کا ہاتھ اونچا ہے، پہلے اپنی ماں اور باپ کو دو، بہن بھائیوں کو دو، پھر جو شخص تم سے زیادہ قریب ہے، اسے دو] سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ایک مرد طواف میں اپنی ماں کو اُٹھائے ہوئے طواف کرتا تھا، اس نے نبی اکرم ﷺ سے پوچھا: "هَلْ أَدَّيْتُ حَقَّهَا؟" [کیا میں نے اس کا حق ادا کر دیا] آپ ﷺ نے فرمایا: «لَا وَلَا بِزَفْرَةٍ وَّاحِدَةً» أو كما قال [3] (رواه البزار) [ایک شمہ بھی نہیں] یا جیسے آپ ﷺ نے فرمایا۔ اس کی سند میں حسن بن ابی جعفر ضعیف ہے۔ واللہ أعلم.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ "قضیٰ" کے معنی ہیں کہ امر کیا ہے، پکا امر، قطعی حکم اور مضبوط اور حتمی حکم۔ بعض نے کہا کہ اس جگہ قضیٰ بہ معنی "أَوْجَبَ" ہے اور امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا "عهد ربك" [4] بہرحال حکم یہ کیا کہ تم اللہ کے سوا کسی کو نہ پوجو۔ یہ آیت اللہ کی عبادت کے واجب ہونے پر دلیل ہے اور غیر اللہ کی عبادت کی ممانعت پر بھی دلیل ہے اور یہی حق ہے۔ پھر اپنے حق کے بعد ماں باپ کے حق کا ذکر کیا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ماں باپ کے ساتھ احسان کرو۔ اس ذکر کی وجہ یہ ہے کہ والدین اولاد کے وجود میں آنے کی وجہ ہیں، اُن کے ساتھ احسان کرنے کو اپنی توحید اور عبادت کے ساتھ رکھا۔ اس میں والدین کے حق کی تاکید ہے اور والدین کے حال پر مزید عنایت ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت میں ماں باپ کا شکر اپنے شکر کے ساتھ مقرر رکھا ہے، پھر بڑھاپے کی حالت کو خاص طور پر ذکر کیا، کیوں کہ اس حالت میں اُن کو اولاد کی طرف مزید حاجت ہوتی ہے۔ چناں چہ فرمایا کہ اگر اُن میں سے ایک یا دونوں تمھارے پاس بڑھاپے کو پہنچ جائیں، یعنی تیری کنف یا کفایت میں ہوں تو تُو اُن

---

[1] مسند أحمد (٤/ ١٣٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٦٦١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٦٦٦)

[2] مسند أحمد (٤/ ٦٤) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله رجال الصحيح" (مجمع الزوائد: ٦/ ٤٤١)

[3] مسند البزار (١٠/ ٢٧٦) اس کی سند میں "حسن بن ابو جعفر" ضعیف راوی ہے۔ (مجمع الزوائد: ٨/ ٢٥٤)

[4] الدر المنثور (٥/ ٢٥٨)

دونوں سے اُف بھی مت کہہ۔

یہ شرط لگانا خارج مخرج غالب ہے، اس لیے کہ اولاد ماں باپ کے بڑھاپے میں ان کی توہین کا ارتکاب کرتی ہے، ورنہ یہ تافیف کچھ بڑھاپے کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ ہر حال میں وہ دونوں ہوں یا اُن میں سے ایک ہو، اُن کی اُدھیڑ عمری ہو یا بڑھاپا یا جوانی اُن کے ساتھ اہانت کا سلوک ممنوع ہے۔ فقط اُن کے اکٹھے ہونے ہی کا مقصد نہیں۔ حسین بن علی رضی اللہ عنہما نے مرفوعاً کہا ہے: «لَوْ عَلِمَ اللّٰهُ شَيْئًا مِنَ الْعُقُوقِ أَدْنَى مِنْ أُفٍّ لَحَرَّمَهُ»[1] [اگر تم اللہ تعالیٰ اف سے بھی چھوٹی نافرمانی کو جانتا ہوتا تو اسے بھی حرام قرار دیتا] یعنی ''ہوں'' کہنا بھی داخلِ عقوق ہے، پھر اس سے زیادہ کہنے کا کیا ذکر ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ یعنی اُن کے بول و براز کے اُٹھانے اور خلا اور بول کی ایذا کے دور کرنے پر اف نہ کہے، جس طرح کہ وہ اس کے بچپن کے زمانے میں اس کے ہگنے موتنے پر کچھ نہ کہتے تھے۔[2]

اُف میں چالیس لغت ہیں۔ (قاله السمين)

ازاں جملہ تین لغتیں متواتر اور چار شواذ ہیں۔ غرض یہ کہ اُف اسمِ فعل ہے تضجر (دل کا تنگ ہونا) اور استثقال (دل کا بوجھل ہونا) ظاہر کرتا ہے، اولاد کو منع فرمایا ہے کہ ایسی بات ظاہر نہ ہو، جو تنگ دلی اور بوجھ کی دلیل ہو، پھر فرمایا کہ اُن کو مت گھُڑک اور جھڑک، بلکہ ایسی بات کہہ جو نرم اور لطیف اور آسان ہو، وہ بھی نہایت ادب اور حیا اور احتشام (عزت) کے ساتھ۔ محمد بن زبیر رحمہ اللہ نے کہا کہ یعنی جب تجھ کو پکاریں تو "لبيك و سعديك"[3] کہہ کر اور "يا أماه يا أبتاه" کہہ اور نام لے کر مت پکار اور اُن کی کنیت بھی نہ پکار، بلکہ ذلت وخواری سے اُن کے سامنے جھک جا۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ خاکساری کر کہ جس طرح کہ غلام اپنے تندمزاج اور سخت دل آقا کی کرتا ہے۔[4]

قفال نے کہا: خفض جناح اشارہ ہے حسنِ تدبیر کی طرف، گویا اولاد سے کہا ہے کہ تو اپنے والدین کا کفیل ہو، اُن کے بڑھاپے اور فقر کے سبب سے، جس طرح کہ وہ بچپن میں تیرے کفیل تھے اور تو اُن کا محتاج تھا، نیز کنایۂ بلیغ ہے اُن کے سامنے تواضع کرنے اور اپنی بڑائی کو ترک کرنے کا۔[5] یہ خفض جناح دونوں صورتوں میں اُن پر زیادہ شفقت اور مہربانی کی وجہ سے ہو، کیوں کہ آج کے دن وہ محتاج ہیں، جس طرح کہ اپنے بچپن میں اللہ کی تمام مخلوق سے زیادہ تو اُن کی طرف فقیر اور حاجت مند تھا اور صرف اس رحم و کرم پر اکتفا نہ کر، بلکہ اللہ تعالیٰ کو پکار، اگرچہ رات دن میں

---

[1] الفردوس للديلمي (٣/ ٣٥٣) یہ روایت ضعیف ہے۔ [2] تفسير الطبري (١٧/ ٤١٥)

[3] ان الفاظ کو امام سیوطی رحمہ اللہ نے "الدر المنثور" میں اور امام شوکانی رحمہ اللہ نے "فتح القدير" میں ابن ابی حاتم رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہوئے زہیر بن محمد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے۔ جبکہ تفسیر ابن ابی حاتم میں یہ الفاظ عروہ رحمہ اللہ سے مروی ہیں۔ دیکھیں: الدر المنثور (٥/ ٢٥٩) فتح القدير (٣/ ٣٠٥) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٢٤)

[4] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٢٤) [5] فتح القدير (٣/ ٣٠٣)

پانچ ہی بار ہو، کہ اے رب! تو اُن دونوں پر ہمیشہ رحمت فرما۔ یہ جب ہے کہ ماں باپ مسلمان ہوں، جس طرح کہ اُن دونوں نے مجھے چھوٹی عمر میں پالا، یعنی جیسی مہربانی انھوں نے بچپن اور لڑکپن میں مجھ پر کی تھی، ویسی مہربانی اور فضل و کرم تو اُن کے حال پر کر۔ اللہ تعالیٰ نے والدین کے ساتھ سلوک کی وصیت کرنے میں ایسا مبالغہ کیا، جس سے بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور نافرمانی کرنے والے ڈر جاتے ہیں اور آغاز اپنی توحید وعبادت سے کیا، پھر اس کے ساتھ احسانِ والدین کو ملایا۔

پھر ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کے معاملے کو اس قدر اہمیت دی کہ اُن کے حق میں ادنیٰ سا کلمہ کہنا، جس سے دل کی تنگی اور بوجھ کا اظہار ہو، جائز نہ رکھا، پھر اُن کے سامنے ذلت اور عاجزی اختیار کرنے کا حکم دیا، پھر اُن کے لیے دعا کرنے اور رحمت طلب کرنے پر کلام کا اختتام کیا۔ یہ پانچ چیزیں ہیں، جس کی حقِ والدین میں تکلیف دی ہے۔ احادیثِ صحیحین وغیرہما میں حقوقِ والدین کے بارے میں مشہور ومعروف ہیں۔[1] اس بارے میں رسالہ ''إسعاد العباد بحقوق الوالدین والأولاد'' (نواب صاحب کی تالیف) کافی وشافی ووافی ہے۔

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ۭ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ۝۲۵

تمھارا رب خوب جانتا ہے جو کچھ تمھارے نفسوں میں ہے، اگر تم صالح ہو گے تو بلاشبہ وہ (اپنی طرف) رجوع کرنے والوں کو بہت بخشنے والا ہے (25)

والدین کے حق میں کوتاہی اور اس کی معافی کا بیان:

یعنی دل میں آئے کہ بوڑھے ماں باپ سے یہ معاملات نبھانے مشکل ہیں تو فرما دیا کہ جس کی نیت نیکی پر ہے، اگر خفا کرے، پھر رجوع کرے تو اللہ بخشنے والا ہے۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا یہ وہ آدمی ہے کہ اس سے والدین کے حق میں کوئی بادرہ (خطا، گستاخی) ہوگئی ہے اور دل میں اس کی نیت یہ ہے کہ اس پر اس کی پکڑ نہ ہو۔ دوسری روایت میں ہے کہ اس کا ارادہ خیر ہی کا تھا تو اللہ غفور ہے۔[2]

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ''أَوَّابِیْنَ'' سے مراد مطیعین اہلِ نماز ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ''مُسَبِّحِیْنَ'' ہیں۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ اہلِ طاعت واحسان ہیں۔[3] بعض نے کہا کہ وہ لوگ ہیں جو مغرب اور عشا کے درمیان نماز پڑھتے ہیں۔ بعض نے کہا کہ چاشت گزار ہیں۔ سعید بن المسیب رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ لوگ ہیں کہ جن سے گناہ ہو جاتا ہے، پھر وہ تائب ہوتے ہیں اور اگر پھر گناہ کر بیٹھتے ہیں تو پھر توبہ کر لیتے ہیں۔ امام ثوری رحمہ اللہ

[1] فتح البیان (۷/ ۳۷٤۔ ۳۷۸) [2] تفسیر الطبري (۱۷/ ٤۲۲) تفسیر ابن کثیر (۳/ ۵۲) [3] تفسیر الطبري (۱۷/ ٤۲۲)

بھی اسی کے قائل ہیں۔ عطا بن یسار و سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا کہ مراد خیر کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ عبید بن عمیر رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ وہ شخص ہے جو تنہائی میں اپنے گناہ یاد کر کے اُن گناہوں سے استغفار کرتا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔

ابن عمیر رحمہ اللہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ ہم اواب حفیظ کو گنتے تھے، جو یوں کہتا ہے: اے اللہ! اس مجلس میں مجھ سے جو گناہ سرزد ہو گیا، وہ بخش دے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ اس بارے میں زیادہ مناسب اس شخص کا قول ہے جس نے یہ کہا کہ اواب گناہ سے توبہ کرنے والا اور معصیت سے اطاعت کی طرف رجوع کرنے والا ہے۔ اللہ کے مکروہ کو چھوڑ کر اس کے پسندیدہ اور پیارے اَمر کی طرف پھرتا ہے۔ پھر کہا درست یہی ہے، اس لیے کہ اَوْب بہ معنی رجوع ہے۔[1] صحیح حدیث میں مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ جب سفر سے واپس ہوتے تو کہتے: « آئِبُوْنَ تَائِبُوْنَ عَابِدُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ »[2] [ہم سفر سے لوٹنے والے ہیں، توبہ کرنے والے ہیں، عبادت کرنے والے ہیں اور اپنے رب کی تعریف کرنے والے ہیں]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ تمھارے رب کو تمھارے ضمائر کا علم ہے کہ دل میں اخلاص ہے کہ نہیں ہے طاعات میں اور گناہ سے توبہ کرنے میں جو تم سے ہو گیا ہے یا جس پر تم نے اصرار کیا ہے۔ اس عمومیت میں حسنِ سلوک کرنا اور ماں باپ کی نافرمانی کرنا بہ درجۂ اولیٰ شامل ہے۔ یعنی ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کیا جائے اور ان کی نافرمانی سے اجتناب کیا جائے۔ بعض نے کہا کہ یہ آیت بر و عقوقِ والدین کے بارے میں خاص ہے، لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے، کیوں کہ عمومیتِ لفظ کا اعتبار ہوتا ہے نہ کہ خصوصیتِ سبب کا۔ سیاق کی دلیل لینا اس تخصیص و تقید کو ثابت نہیں کرتا۔ اگر تم ابرار، مطیع اور اصلاح کا قصد کرنے والے اور نیکی اور توبہ کا ارادہ رکھتے ہو اور اخلاصِ طاعت کے حامل ہو تو اللہ گناہ سے رجوع کرنے والوں اور برائی سے نیکیوں کی طرف، نافرمانی سے نیکی اور احسان کی طرف، اور عدمِ اخلاص سے محض اخلاص کی طرف لوٹنے والوں کو بخش دیتا ہے، خواہ تم سے کوئی قول یا فعل یا اعتقاد صادر ہوا ہو۔ پس جس گناہ سے تم نے توبہ کر لی ہے، وہ گناہ تم کو ضرر نہ پہنچائے گا، کیوں کہ « مَنْ تَابَ تَابَ اللّٰهُ عَلَیْهِ، وَمَنْ رَجَعَ رَجَعَ اللّٰهُ إِلَیْهِ » [جو توبہ کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کر لے گا، اور جو رجوع کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کی طرف رجوع کرے گا] ابن المسیب رحمہ اللہ نے کہا کہ "هو العبد یتوب ثم یذنب، ثم یتوب ثم یذنب"[3] [اس سے مراد وہ

---

[1] تفسیر الطبري (۱۷/ ۴۲۳۔ ۴۲۵) تفسیر ابن کثیر (۳/ ۵۲)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۷۰۳) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۳۴۴)

[3] تفسیر الطبري (۱۷/ ۴۲۳) فتح البیان (۷/ ۳۷۸۔ ۳۷۹)

بندہ ہے جو توبہ کرتا ہے اور پھر گناہ کرتا ہے، پھر توبہ کرتا ہے اور گناہ کا مرتکب ہوتا ہے] یعنی اوّاب صیغہ مبالغہ کا ہے، اس سے بار بار تائب ہونا مراد ہے۔

باز آ باز آ ہر آنچہ کر دی باز آ　　　گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ

ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست　　　صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

''توبہ کر لے، توبہ کر لے، جو کچھ بھی تو نے کیا توبہ کر لے۔ اگر تو کافر ہے، آتش پرست ہے، بت پرست ہے توبہ کر لے۔ یہ بارگاہ جو ہماری بارگاہ ہے، یہاں کسی کو مایوسی نہیں ہوتی۔ اگر تو نے سو بار بھی توبہ توڑی ہے، پھر بھی توبہ کر لے۔''

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴿۲۶﴾ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْۤا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ؕ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿۲۷﴾ وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ﴿۲۸﴾

اور قرابت دار کو اس کا حق دے اور مسکین اور مسافر کو بھی، اور فضول خرچی سے مال نہ اُڑا ﴿26﴾ بے شک فضول خرچ شیاطین کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا سخت ناشکرا ہے ﴿27﴾ اور اگر تو اپنے رب کی رحمت تلاش کرنے کے لیے، جس کی تو اُمید رکھتا ہے، ان (عزیز و اقارب) سے اعراض ہی کرے تو تُو ان سے ایسی بات کہہ جس میں آسانی ہو ﴿28﴾

صلہ رحمی کا حکم:

یعنی جو کوئی ہمیشہ سخاوت کرتا ہے اور ایک وقت ایسا ہوتا ہے کہ اس کے پاس کچھ نہیں ہوتا تو اللہ کے ہاں اُمید والے کا محروم ہو جانا اچھا نہیں لگتا۔ اس محتاج کی قسمت سے اللہ سخیوں کو دیتا رہتا ہے، سو اس لیے اگر ایک وقت تو نہ دے سکے تو میٹھا جواب دے، تاکہ پہلی سب خیراتیں برباد نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے والدین کے ذکر کے بعد قرابت والوں کے ساتھ احسان کرنے کا ذکر کیا اور صلہ رحمی کا ذکر کیا۔ حدیث میں مروی ہے: «أُمَّكَ ثُمَّ أَبَاكَ ثُمَّ أَدْنَاكَ أَدْنَاكَ »[1] [اپنی ماں سے حسنِ سلوک کرو، پھر اپنے باپ سے اور پھر جو شخص جس قدر زیادہ قرابت دار ہو اس سے اس قدر زیادہ اچھا سلوک کرو] یعنی پہلے ماں ہے، پھر باپ، پھر جو زیادہ قریب ہو، پھر اُس کے بعد جو قرابت میں قریب ہو۔

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۵۴۸)

دوسری روایت میں ہے: «اَلْأَقْرَبُ فَالْأَقْرَبُ»[1] [پھر اس کے بعد قریبی، پھر اس کے بعد قریبی] حدیث میں فرمایا ہے: «مَنْ أَحَبَّ أَنْ يُّبْسَطَ لَهُ فِيْ رِزْقِهِ وَيُنْسَأَ لَهُ فِيْ أَجَلِهِ فَلْيَصِلْ رَحِمَهُ»[2] [جو شخص اس بات کو پسند کرے کہ اس کے رزق میں کشادگی اور اس کی عمر میں اضافہ ہو تو اسے صلہ رحمی سے کام لینا چاہیے] سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری: ﴿ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ ﴾ (آیتِ باب) تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بلایا اور اُن کو باغ فدک عطا کیا۔[3] (رواہ البزار) یہ حدیث اگرچہ اس کی اسناد صحیح ہو تو مشکل ہے، اس لیے کہ آیت مکی ہے اور فدک فتح خیبر کے ساتھ ۷ ہجری میں مفتوح ہوا تھا۔ پھر اس آیت سے ملنا کس طرح ہوسکتا ہے۔ سورت براءت میں مساکین اور مسافروں کے بارے میں کلام گزر چکا ہے،[4] اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔

فضول خرچی سے ممانعت:

پھر انفاق کے بعد فضول خرچی سے منع فرمایا اور اسراف سے منع کیا، یعنی میانہ روی اختیار کرو، افراط وتفریط کی طرف جانا چھوڑ دو۔ ؏

كلا جانبي قصد الأمور ذميم

[میانہ روی کے سوا دونوں راہیں (افراط وتفریط) مذموم ہیں]

جس طرح دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴾ [الفرقان: ٦٧] ''اور وہ لوگ کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ تنگی (بخیلی) ہی، اور ان کا خرچ اس کے درمیان معتدل ہوتا ہے۔'' پھر تبذیر سے نفرت دلانے کے لیے یہ فرمایا کہ فضول خرچی کرنے والے شیاطین کے بھائی ہیں، یعنی اُن کے مشابہ ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تبذیر ایسی جگہ پر خرچ کرنا ہے جو حق نہ ہو۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بھی ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ اگر کوئی انسان اپنا سارا مال حق میں خرچ کر دے تو وہ مبذر نہ ہوگا اور اگر غیر حق میں خرچ کرے تو مبذر ٹھہرے گا، یعنی گو تھوڑا خرچ کرے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ تبذیر اللہ کی نافرمانی اور فساد اور غیر حق میں خرچ کرنا ہے۔[5]

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ بنی تمیم کا ایک شخص آیا اور کہا: اے اللہ کے رسول! میں بڑا مال دار ہوں اور اہل و اولاد والا ہوں، مجھے بتائیں کہ میں کیوں کر خرچ کروں؟ فرمایا: اپنے مال میں سے زکات نکال کہ یہ طہارت

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥١٣٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٨٩٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٣٩٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦٤٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٥٧)

[3] كشف الأستار عن زوائد البزار (٣/ ٥٥) اس کی سند میں ''عطیہ العوفی'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٦٥٧٠)

[4] سورة التوبة: رقم الآية [٦٠]

[5] تفسير الطبري (١٧/ ٤٢٨۔ ٤٢٩)

ہے، تجھ کو پاک کر دے گی اور اپنے ناتے والوں سے صلہ کر، سائل کا، ہمسائے کا اور مسکین کا حق پہچان۔ کہا: اے اللہ کے رسول! میرے لیے کم بات بتاؤ۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴾ (آیتِ باب) اس نے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ بات مجھے کافی ہے۔ جب میں نے آپ کے قاصد کو زکات دے دی، اب میں اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے زکات سے بَری ہو گیا۔ فرمایا: ہاں جب تو نے زکات ادا کر دی تو اب تو بَری ہو گیا، تجھ کو تیرا اجر ملے گا اور گناہ اس پر ہے، جو اس کو بدل ڈالے۔[1]

مبذرین کو تبذیر و نادانی اور اللہ کی اطاعت کو ترک کرنے اور معصیت کا ارتکاب کرنے میں اخوان شیاطین فرمایا۔ لہٰذا یہ کہا: شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے، یعنی اللہ کی نعمت کا ناشکرا ہے، اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر عمل نہیں کیا، بلکہ اللہ کی معصیت اور مخالفت کی طرف متوجہ ہوا۔ میں کہتا ہوں کہ اکثر مبذرین فاسق و فاجر ہیں اور نیک لوگوں میں جو لوگ ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے اور قرض لے کر سخاوت اور بخشش کرتے ہیں، اگر اس میں ریا اور ناموری مقصود نہیں ہے تو مبذر ہیں اور اگر ہے تو یہ تبذیر گناہوں کا مجموعہ ہے اور اگر یہ کچھ نہیں ہے اور فہمائش کرنے سے بھی اس اسراف اور بے جا خرچ سے باز نہیں آتے تو محض نادانی اور حماقت ہے گناہ اور تبذیر کے علاوہ۔ واللہ الهادي. پھر فرمایا کہ جب تجھ سے تیرے اقارب سوال کریں یا وہ لوگ جن کو دینے کا ہم نے حکم کیا ہے اور تیرے پاس کچھ دینے کو نہیں اور تو اُن سے نفقہ بند کر دینے کے سبب سے منہ پھیرے تو ایسی صورت میں ان سے سہل اور نرم بات کر، مثلاً یہ کہہ دے کہ جب اللہ کا رزق آئے گا تو میں تم کو بھی دوں گا ان شاء اللہ۔ امام مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، حسن اور قتادہ رحمہم اللہ وغیرہم نے قولِ میسور کی تفسیر اسی طرح کی ہے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ آیتِ باب میں خطاب نبی اکرم ﷺ کو ہے، تاکہ اُمت کے دوسرے لوگوں کو ترغیب دیں اور اُبھاریں۔ یا مکلفین میں سے ہر اُس شخص کو خطاب ہے جو اس کا اہل ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک یہ امر وجوب کے لیے ہے، اُن کے صاحبِ توفیق کے لیے اپنے قریبی رشتہ داروں کی غم خواری، دل جوئی واجب ہے، جبکہ وہ محروم ہوں، جیسے بھائی بہن۔ اور دوسرے کے نزدیک مواسات مستحب ہے، وہ کہتا ہے کہ سوائے اس نفقہ کے جو اصولی اور فرعی طور پر مقرر ہے، اقارب میں سے اور کسی کا نفقہ واجب نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ذوی القربیٰ سے مراد اہلِ قرابت ہیں اور اُن کا حق یہی صلہ رحم ہے، جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے

[1] مسند أحمد (۳/ ۱۳٦) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ سعید بن ابی ہلال کا سماع سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (۲۱۹۰)

[2] تفسير الطبري (۱۷/ ٤٣١۔ ٤٣٢)

کیا ہے۔ یا اُن سے محبت کرنا اور اُن کے پاس جانا اور فراخی اور تنگی میں حسنِ معاشرت اور اُلفت کرنا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس وصیت کو دہرایا۔ اہلِ علم کا قرابت داروں کے نفقہ کے وجوب میں اختلاف ہے۔ یا بعض قریبی رشتہ داروں کے لیے، مثلاً: نفقہ والدین کا اولاد پر اور اولاد کا والدین پر۔ اور یہ بات معروف اور لائقِ اعتماد ہے کہ ان کا صلہ واجب ہے، جہاں تک ممکن ہو سکے اور اس کا حال اس کا مقتضی ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ”أمره بأحق الحقوق وعلمه كيف يصنع إذا كان عنده وكيف يصنع إذا لم يكن“ [1] [سب سے بڑے حق کا حکم دیا اور اسے سکھایا کہ اگر اس کے پاس مال ہو تو کیا کرے اور اگر نہ ہو تو کیا کرے]

رہے مسکین اور مسافر تو اُن کا حق زکات میں ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ”إيتاء ذي القربىٰ“ سے تعہد (ذمے لینا) مال کے ساتھ ہے۔ سفیان رحمہ اللہ نے اس آیت کے متعلق کہا ہے کہ اہلِ قرابت کو دے، مسکین کو کھانا کھلائے، مسافر کے ساتھ احسان کرے۔ [2] امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: ”قربیٰ“ سے مراد قربیٰ بنی مطلب کے ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت۔ [3]

میں کہتا ہوں کہ سیاقِ آیت میں اس تخصیص کی کوئی دلیل نہیں ہے اور نظمِ قرآنی کے معنی واضح ہیں۔ اگر خطاب اُمت کے ہر صالح خطاب کو ہے، یعنی جس مکلّف کو صلہ رحم کی قدرت ہے، وہ اُن کا حق ادا کرے، وہ حق یہی صلہ رحمی ہے، جس کا حکم دیا گیا ہے اور اگر خطاب نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے، تاکہ وہ اُمت کو بتائیں تو وہی پہلی بات ہوئی اور اگر خاص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے بلا تعریض (بغیر کسی طرف اشارہ کیے) تو اُمت آپ کی پیرو ہے، گویا نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم کرنا قرابت داروں کا حق ادا کرنے کا یہ حکم ہے اُمت میں سے ہر فرد کو۔ اور ظاہر یہی ہے کہ یہ خطاب خاص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں۔ اس کی دلیل آیتِ باب سے پہلے احکام یعنی ﴿ وَقَضٰى رَبُّكَ ﴾ اور آیتِ باب کے آخر کا حکم یعنی ﴿ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴾ ہے۔

تبذیر سے مراد مال کا پریشان کرنا ہے، جیسے بذر، یعنی بیج پھیلا دیتے ہیں، جہاں پر بھی وہ جائے، بغیر کسی خاص جگہ کے اور یہ اسراف قابلِ مذمت ہے، اس انفاق میں شرعی مستحسن حد سے تجاوز کرنا ہے، یا غیر حق میں خرچ کرنا ہے اگرچہ تھوڑا ہی ہو۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: غیر حق میں مال خرچ کرنا تبذیر ہے، جب کہ عملِ خیر میں خرچ کرنا تبذیر نہیں ہے۔ ایک شخص نے کہا تھا: اسراف میں کوئی خیر نہیں ہے۔ اس کا جواب دیا: خیر میں کوئی اسراف نہیں

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٢٥)

[2] امام ابن جریر طبری اور ابن ابی حاتم رحمہما اللہ نے ان الفاظ کو سفیان رحمہ اللہ کے بجائے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ دیکھیں:
تفسير الطبري (١٧/ ٤٢٦) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٢٥)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٢٥)

ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا کہ جمہور کا قول بھی وہی ہے جو امام شافعی رحمہ اللہ نے فرما دیا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں: تبذیر یہ ہے کہ مال کو حق کے ساتھ حاصل کیا جائے اور غیر حق میں صَرف کیا جائے اور یہ اسراف ہے اور یہ حرام ہے، کیوں کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ﴾ [بني إسرائيل: ۲۷][1] [بے شک فضول خرچ شیاطین کے بھائی ہیں] یہ جملہ تبذیر سے ممانعت کی وجہ ہے۔

اخوت سے مراد مکمل طور پر مماثلت ہے اور شیطان کی مماثلت سے اجتناب، اگرچہ اس کی ایک ہی خصلت میں ہو، واجب ہے۔ پھر اس کا کیا کہنا جو کہ اس سے بھی عام ہے، جس طرح کہ اطلاقِ مماثلت اس پر دلیل ہے۔ انفاق میں اسراف شیطانی عمل ہے، پھر جب یہ کام کسی بنی آدم نے کیا تو وہ شیطان کا مطیع اور اس لعین کا مقتدی بنا اور یہ انتہا درجے کی مذمت ہے، کیوں کہ شیطان سے بدتر کوئی نہیں۔ جو شخص کسی قوم کی راہ و رسم و عادت و طریقہ و سنت کا ملازم ہوتا ہے، عرب اس کو اس قوم کا بھائی کہتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب آپس میں چرچا کیا کرتے تھے کہ تبذیر غیر حق میں خرچ کرنا ہے۔[2]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں، جو بے جا مال صَرف کیا کرتے ہیں۔ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے تو جو کچھ اپنی جان اور اپنے گھر والوں پر بغیر اسراف و تبذیر کے خرچ کرتا ہے اور صدقہ دیتا ہے، وہ تیرے لیے ہے اور جو کچھ تو ریا اور سمعہ، یعنی ناموری کے لیے خرچ کرتا ہے، وہ شیطان کا حصہ ہے۔[3] بعض نے کہا کہ مراد عمارت میں بطورِ اسراف خرچ کرنا ہے۔[4] یہ مرض امرا اور رؤسا کو اور بعض جاہل مال داروں کو زیادہ تر ہوتا ہے، ان کا مال غالباً محل سرا، حویلی و باغات اور اس طرح کی چیزوں کی تیاری میں خرچ ہوتا ہے یا شہرت اور ناموری کے لیے ان کا خرچ اٹھتا ہے۔ حالانکہ ضرورت سے زیادہ گھر بنانا بنانے والے پر وبال ہے اور تعریف اور ناموری کے لیے خرچ کرنا کفرانِ نعمت ہے۔

یہ تبذیر وہ بلا ہے جس نے اکثر درمیانے درجے کے لوگوں کو محتاج کر رکھا ہے۔ اگر وہ انفاق میں شریعت کی پابندی کریں اور حقوقِ واجبہ پر مقتصر ہوں (اکتفا کریں) تو افلاس اور بے وقاری اور دوسروں سے سوال کرنے کی نوبت نہ آئے۔ ہم نے ہزاروں آدمی ایسے دیکھے ہیں کہ ان کو اللہ نے بہ قدرِ کفایتِ نفس و اہل و عیال کے دیا ہے، لیکن وہ اپنے بے جا خرچ اور ناجائز فضول خرچی اور سوئے تدبیر سے ہمیشہ محتاج اور لوگوں کی نظروں میں ذلیل و خوار رہتے ہیں۔ یہ حال ان کا ہے جو فی الجملہ مسائل سے آگاہ ہیں۔

رہے فاسق و فاجر لوگ اُن کا اس جگہ ذکر کرنا ہی فضول ہے، کیوں کہ ان کا سارا مال خواہ زیادہ ہو یا تھوڑا اللہ

[1] تفسير القرطبي (۱۰/ ۲٤۷)
[2] تفسير الطبري (۱۷/ ٤۲۹)
[3] شعب الإيمان (٥/ ۲٥۰۔ ۲٥۱)
[4] فتح البيان (۷/ ۳۷۹۔ ۳۸۱)

کی نافرمانی اور نفسانی لذت اور خواہشات کی اتباع میں اور پیٹوں اور شرم گاہوں کی خواہشات پورا کرنے میں ضائع ہوا کرتا ہے۔ إلا ما شاء الله۔ اس زمانے میں جو کہ اسلام کی غربت اور ایمان کی ندرت کا زمانہ ہے، اکثر لوگ اسبابِ معیشت میں بہترین زمانے (خیر القرون) کی نسبت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مقدرت کی نسبت کئی سو گنا زیادہ ہیں، بلکہ جس کو دیکھو، وہ بادشاہ کی تعریف میں آتا ہے، لیکن اس کے باوجود معاشی تنگی کا شاکی اور اللہ سے ناراض اور مخلوق سے سوال کرنے والا اور قناعت سے دور، کفایت سے بے زار اور تہ دل سے حلال وحرام کی تمیز کے بغیر مال کا طالب اور پرلے درجے کا فضول خرچ ہے۔ فإنا لله علی هذه الحال، نسأل الله العافية.

اہلِ حق نے کہا ہے کہ آدمی اگر ساری دولت اپنے حق میں خرچ کر دے تو وہ مبذر نہ ہوگا اور اگر ایک پیسا یا ایک پاؤ غلہ باطل میں خرچ کرے گا تو مبذر ہوگا۔ اب ہر شخص اپنے خرچ کا حساب بھی دیکھے کہ وہ مبذر و مسرف ہے یا نہیں، بلاشبہہ وہ مبذر ہی نکلے گا۔ اس کا نفقہ خواہ قلیل تھا یا کثیر، جائز کام میں کم خرچ ہوا ہوگا اور ناجائز میں بہت۔ اور جس جگہ جائز خرچ ہوا ہوگا، مثلاً: اپنی جان یا اہل و اولاد اور اس طرح کی اور ضرورتوں میں وہاں غالباً صحیح نیت ساتھ نہیں ہوگی تو ایسا عمدہ خرچ بھی آخر برباد گیا، کیوں کہ اکثر لوگ راہ و رسمِ زمانہ یا برادری اور رشتہ داری کے قواعد و ضوابط کے پابند ہوتے ہیں، ان کو معاملات کو پورا کرنے کے لیے شریعتِ قدیم اور صراطِ مستقیم کی مطابقت اور موافقت کی توفیق نہیں ملتی اور نہ ہی نیتِ خالصہ ہمراہ ہوتی ہے۔ تو وہ نفقہ عبث واقع ہوتا ہے اور یہ کام شیطان کے کام کی طرح وقوع میں آتا ہے اور شیطان تو کافرِ نعمت اور رب کریم کے احسانات کا منکر اور حق سے سرکشی کرنے والا ہے، اس سے شر کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا۔

ہمیشہ دست بسر میزنی چہ شد فیضی مگر زِ دستِ تو کارِ دگر نمی آید

''فیضی ہمیشہ بھرا رہنے والا ہاتھ کس کام کا ہوا۔ شاید تیرے ہاتھ سے اب کوئی دوسرا کام نہیں ہوگا۔''

اس آیتِ شریفہ میں مبذرین پر شیاطین کی مماثلت کی تسجیل ہے، پھر شیطان پر ناشکرا ہونے کی تسجیل ہے، اس کا مقصد یہ ہوا کہ مبذر شیطان کی طرح ہے اور ہر مماثلِ شیطان پر شیطان ہی کی طرح کا حکم ہے اور ہر شیطان کفور ہے تو مبذر کفور ہوا۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے: اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جس شخص کو مال و جان سے نوازا ہے اور اس نے اسے اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف صَرف کیا تو وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کا ناشکرا تصور ہوگا، اس لیے کہ وہ صفت و عمل میں شیطان کے موافق ہوگیا۔ اس زمانۂ پرآشوب کے آسودہ حال اور آبرو دار لوگ اسی قول کے مصداق ہیں، خصوصاً سلاطین کہ عینِ شیاطین ہیں اور اُن کے انصار اور اعوان ازواجِ شیاطین۔

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تو ذی القربی اور مسکین اور مسافر سے کسی امر کے اضطرار کے سبب سے اعراض

کرے، مثلاً دینے کے لیے کچھ موجود نہیں اور تہی دستی نے اعراض کی طرف مجبور کر رکھا ہے اور تو چاہتا ہے کہ اللہ دے تو میں بھی دوں، تو ایسی صورت میں یہ چاہیے کہ تو اُن سے کوئی نرم اور لطیف بات کہہ دے، مثلاً وعدۂ جمیل کر یا کوئی عذر مقبول پیش کر دے، مثلاً یہ کہہ دے: ''رزقنا الله و إياكم من فضله'' اس جگہ اس اعراض سے مراد روگردانی نہیں، بلکہ عجز ہے۔

صائبا خجلت سائل بزمینم درکرد | بی زری کرد بہ من آنچہ بقارون زرکرد

''مانگنے والے کی انتہائی شرمندگی نے مجھے زمین میں دھنسا دیا۔ بے دولتی نے میرے ساتھ وہی کیا جو دولت نے قارون کے ساتھ کیا۔''

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بندوں کو اچھا ادب سکھایا ہے کہ جب کوئی سائل اُن سے مانگے اور اُن کے پاس دینے کو کچھ نہ ہو تو وہ اس کو کیا کہیں اور کس طرح پھیریں۔

إن لم يكن ورق يوما أَجُودُ بها | للسائلين فإني لين العود

لا يعدم السائلون الخيرَ من خلقي | إما نوالي و إما حسن مردودي

[اگر کسی دن سائل کو مجھ سے مال نہ ملے تو میں نرم خو ہوں، وہ میرے اخلاق سے خیر معدوم نہیں پائے گا۔ اسے میں کچھ دوں گا یا اچھی طرح انکار کروں گا]

لیکن یہ ادب طویل عرصے سے منسوخ شریعت کی طرح ہو گیا ہے۔ نہ سائل ادب کرنے والا ہے اور نہ دینے والا با ادب۔ جب سائل کو دیکھو تو وہ لپٹ لپٹ کر مانگنے والا ہے، اس میں سوال کے حلال ہونے کی صورت مفقود ہے۔ اور نہ دینے پر گالی گلوچ کرنے والا اور بد دعا دینے والا اور معطی کا نام رہ گیا ہے یا عطائے دشنام۔

بہ خستی کہ لازم ارباب دولت ست | دشنام نمی دہند لِسائل غنیمت ست

''اس بخیلی و کمینگی کی بدولت جو صاحبِ مال لوگوں میں لازمی ہوتی ہے، سوالی کو گالی بھی نہ دیں تو یہی غنیمت ہے۔''

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا ﴿٢٩﴾ إِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا ﴿٣٠﴾

اور اپنا ہاتھ اپنی گردن کے ساتھ بندھا نہ رکھ اور نہ اسے پوری طرح کھول دے کہ پھر ملامت زدہ، تھکا ہارا

ہو کر بیٹھ رہے (29) بلاشبہ آپ کا رب جس کے لیے چاہے رزق کھول دیتا ہے اور تنگ (بھی) کر دیتا ہے، بے شک وہ اپنے بندوں کی خوب خبر رکھنے والا، خوب دیکھنے والا ہے (30)

خرچ میں میانہ روی اختیار کرنے کا حکم:

یعنی محتاج کو دیکھ کر بے تاب نہ ہو جاؤ، اس کی حاجت تیرے ذمے پر نہیں ہے، اللہ کے ذمے پر ہے، لیکن یہ باتیں پیغمبر کو فرمائی ہیں، جو بے حد سخی تھے، جس کے جی سے مال نہ نکل سکے، اس کو دینے کا تقید (پابندی) ہے۔ حکیم بھی گرم مزاج والے کو سرد دوا دیتا ہے اور سرد مزاج والے کو گرم۔ اللہ تعالیٰ نے میانہ روی کا حکم دیا ہے۔ عیش و زیست کرنے میں بخل کی مذمت کی، اسراف سے نہی فرمائی، کہا کہ تو بخیل اور مانع نہ ہو کہ کسی کو کچھ نہ دے جس طرح کہ یہود نے "عليهم لعائن الله" کہا تھا۔ ﴿ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ﴾ [المائدة: ٦٤] ''اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے۔'' یعنی اللہ کو بخل کی طرف منسوب کیا۔ تعالیٰ و تقدس الكريم الوهاب.

پھر تمام بسط سے منع فرمایا، یعنی انفاق میں زیادتی نہ کر کہ طاقت سے زیادہ دے اور آمدنی سے خرچ زیادہ ہو جائے، کیوں کہ ایسا کرنے میں تو ملامت زدہ ہو جائے گا اور تھک کر بیٹھ جائے گا۔ یہ لف و نشر مرتب ہے۔ یعنی بخل کرنے میں لوگ تجھ کو ملامت کریں گے اور برا کہیں گے اور تجھ سے بے پروائی کریں گے اور اگر تو ہاتھ کو طاقت سے زیادہ کشادہ کر دے گا تو پھر تیرے پاس کچھ نہ ہوگا کہ تو خرچ کرے اور تو مثلِ حسیر (یعنی ایسا جانور جو چلنے پھرنے سے عاجز ہو) ہو جائے گا، جو بڑھاپے اور کمزوری کی وجہ سے تھک کر کھڑا ہو جاتا ہے، ایسے جانور کو حسیر کہتے ہیں۔ یہ ماخوذ ہے کلال سے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ﴾ [الملك: ٤] ''(تیری) نگاہ ذلیل و خوار ہو کر تیری طرف لوٹ آئے گی، جبکہ وہ تھکی ماندی ہوگی۔'' یعنی وہ تھک جائے گی مگر آسمان میں کوئی عیب نہ دیکھ سکے گی۔

آیتِ باب کی تفسیر اسی طرح کی گئی ہے کہ اس سے مراد بخل و اسراف ہے اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام حسن، قتادہ، ابن جریج اور ابن زید رحمہم اللہ وغیرہم نے اسی طرح کہا ہے۔[1] سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے: « مَثَلُ الْبَخِيْلِ وَالْمُنْفِقِ كَمَثَلِ رَجُلَيْنِ عَلَيْهِمَا جُبَّتَانِ مِنْ حَدِيْدٍ مِنْ ثُدِيِّهِمَا إِلٰى تَرَاقِيْهِمَا فَأَمَّا الْمُنْفِقُ فَلَا يُنْفِقُ إِلَّا سَبَغَتْ أَوْ وَفَرَتْ عَلٰى جِلْدِهِ حَتّٰى يُخْفِيَ بَنَانَهُ أَوْ تَعْفُوَا أَثَرَهُ وَأَمَّا الْبَخِيْلُ فَلَا يُرِيْدُ أَنْ يُّنْفِقَ شَيْئًا إِلَّا لَزِقَتْ كُلُّ حَلْقَةٍ مِنْهَا مَكَانَهَا فَهُوَ يُوَسِّعُهَا فَلَا تَتَّسِعُ »[2] (هذا لفظ البخاري في الزكاة و رواه مسلم أيضا) [بخیل اور خرچ کرنے والے کی مثال ان دو آدمیوں کی طرح ہے جنھوں نے لوہے کے دو ایسے جبے

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٤٣٤ـ ٤٣٥) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٧٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٢١)

پہن رکھے ہوں جو سینے سے لے کر گلے تک ہوں، خرچ کرنے والا جب بھی خرچ کرتا ہے تو جبہ کشادہ ہو جاتا ہے، حتی کہ وہ اس کے پاؤں کی انگلیوں کو چھپا لیتا ہے اور اس کے قدموں کے نشانات کو مٹا دیتا ہے اور بخیل کچھ بھی خرچ کرنا نہیں چاہتا، اس لیے جبے کا ہر حلقہ اپنی جگہ چمٹ جاتا ہے وہ اسے ڈھیلا کرنا چاہتا ہے مگر وہ ڈھیلا نہیں ہوتا] سیدہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما سے فرمایا تھا: « أَنْفِقِيْ هٰكَذَا وَهٰكَذَا وَلَا تُوْعِيْ فَيُوْعِيَ اللّٰهُ عَلَيْكِ وَلَا تُوْكِيْ فَيُوْكِيَ اللّٰهُ عَلَيْكِ »[1] [اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتی رہ، جمع نہ رکھا کر ورنہ اللہ تعالیٰ بھی روک لے گا، بند باندھ کر روک نہ لیا کر ورنہ پھر اللہ بھی رزق کا منہ بند کر لے گا] (رواه الشيخان وفي لفظ: « وَلَا تُحْصِيْ فَيُحْصِيَ اللّٰهُ عَلَيْكِ » [شمار کر کے نہ رکھا کر ورنہ اللہ تعالیٰ بھی گنتی کر کے روک لے گا]) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت مرفوعاً یوں ہے: اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ تو نفقہ کر، میں تجھ پر نفقہ کروں گا۔[2] (رواه مسلم)

ان کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں: « مَا مِنْ يَوْمٍ يُّصْبِحُ الْعَبْدُ فِيْهِ إِلَّا وَمَلَكَانِ يَنْزِلَانِ مِنَ السَّمَاءِ يَقُوْلُ أَحَدُهُمَا: اَللّٰهُمَّ أَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا وَيَقُوْلُ الْآخَرُ: اَللّٰهُمَّ أَعْطِ مُمْسِكًا تَلَفًا »[3] (رواه الشيخان) [ہر دن جس میں بندے صبح کرتے ہیں، دو فرشتے آسمان سے اترتے ہیں: ان میں سے ایک یہ کہتا ہے: اے اللہ! خرچ کرنے والے کو بدلہ عطا فرما اور دوسرا یہ کہتا ہے کہ اے اللہ! روک رکھنے والے کو ہلاکت و بربادی دے] اُن کی تیسری روایت کے الفاظ یہ ہیں: مال صدقہ دینے سے کم نہیں ہوتا اور اللہ انفاق کرنے سے بندے کی عزت بڑھاتا ہے اور جو کوئی تواضع کرتا ہے اللہ اس کو بلند رُتبہ دیتا ہے۔[4] (رواه مسلم) حدیث مروی عن ابن عمرو رضی اللہ عنہما میں فرمایا: بچو تم شح یعنی حرص سے کہ تم سے اگلوں کو اسی حرص نے ہلاک کیا ہے۔ اسی نے لوگوں کو بخل کا حکم کیا، وہ بخیل ہو گئے اور حکم قطعیت کا کیا (قطع تعلق کا) انھوں نے قطعیت کی اور حکم فجور کا دیا، وہ فاجر ہو گئے۔[5]

امام اعمش رحمہ اللہ ابن بریدہ وہ اپنے باپ سے مرفوعاً کہتے ہیں: « مَا يُخْرِجُ رَجُلٌ صَدَقَةً حَتّٰى يَفُكَّ لَحْيَيْ سَبْعِيْنَ شَيْطَانًا » [جب انسان خیرات کرتا ہے ستر شیطانوں کے جبڑے ٹوٹ جاتے ہیں] یعنی صدقہ ستر شیطانوں کی کلہ شکنی کرتا ہے۔[6] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا: « مَا عَالَ مَنِ اقْتَصَدَ » یعنی میانہ رو محتاج نہیں ہوتا۔[7] (رواه أحمد) پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنی خلق میں رازق، قابض، باسط اور متصرف ہے اور جس

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٦٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٢٩) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٩٣)
[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٧٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠١٠) [4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨٨)
[5] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٦٩٨) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤٨٦) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ٣٥٥)
[6] مسند أحمد (٥/ ٣٥٠) سنن البيهقي الكبرىٰ (٤/ ١٨٧) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٦٨٢٣)
[7] مسند أحمد (١/ ٤٤٧) اس کی سند میں ''ابراہیم ہجری'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٤٤٥٩)

طرح چاہتا ہے کسی کو غنی اور کسی کو فقیر کر دیتا ہے، اس کی حکمت وہی جانتا ہے اور اپنے بندوں میں سے جو غنا اور فقر کا مستحق ہے، اسے پہچانتا ہے۔ حدیث میں مروی ہے: « إِنَّ مِنْ عِبَادِي مَنْ لَّا يُصْلِحُهُ إِلَّا الْفَقْرُ، وَلَوْ أَغْنَيْتُهُ لَأَفْسَدْتُ عَلَيْهِ دِينَهُ، وَإِنَّ مِنْ عِبَادِي مَنْ لَّا يُصْلِحُهُ إِلَّا الْغِنٰى، وَلَوْ أَفْقَرْتُهُ لَأَفْسَدْتُ عَلَيْهِ دِينَهُ »[1]

[میرے بعض بندے وہ ہیں کہ فقیری ہی کے قابل ہیں، اگر میں انھیں امیر بنا دوں تو ان کا دین تباہ ہو جائے اور میرے بعض بندے ایسے بھی ہیں جو امیری کے لائق ہیں، اگر میں انھیں فقیر بنا دوں تو ان کا دین بگڑ جائے] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس حدیث کی تخریج ذکر نہیں کی ہے۔ پھر کبھی بعض لوگوں کے حق میں غنا (تونگری) استدراج ہوتی ہے اور فقر عقوبت۔ عیاذا باللہ من هذا وهذا۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ تو اپنے ہاتھ کو گردن سے مت باندھ اور نہ بالکل کھول، یہ نہی ہر مکلّف کے لیے ہے، خواہ یہ خطاب اُمت کو سمجھانے اور بتانے کے لیے ہو یا مکلفین میں سے ہر صالح خطاب کو۔ انسان کو ایسے امساک سے منع کیا ہے جس سے وہ اپنی جان پر تنگی کرے اور اہل و عیال کو تنگی میں رکھے اور نہ ہی انفاق میں اس قدر توسیع کرے جس کی حاجت نہیں ہے اور مسرف (فضول خرچ) کہلائے۔ غرض یہ کہ افراط و تفریط دونوں سے منع کیا ہے۔ اس سے میانہ روی کی مشروعیت ثابت ہوتی ہے، یہی وہ عدل ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے ترغیب دی ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے:

ولا تك فيها مفرطا أو مفرطا ... كلا طرفي قصد الأمور ذميم

[اس (مال خرچ کرنے) میں افراط و تفریط کا مظاہرہ نہ کر میانہ روی کے دونوں کنارے قابلِ مذمت ہیں]

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بخیل کے حال کی مثال اس شخص کے حال سے دی ہے جس کا ہاتھ گلے سے بندھا ہو، وہ کچھ تصرف نہیں کر سکتا اور جو شخص خرچ کرنے میں حد سے متجاوز ہے، اس کی مثال اس شخص کے حال سے دی ہے جس نے اپنا ہاتھ کھول دیا ہے، اس کے ہاتھ میں کوئی شے نہیں رکتی۔ اس تصویر کشی میں مبالغۂ عظیم بلیغ ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اُن دونوں حالتوں کا نتیجہ بیان کیا اور کہا کہ اگر تو بخل کرے گا یا فضول خرچی تو لوگوں کے نزدیک مذموم ہو کر، یا اللہ کے نزدیک اپنے بخل کی وجہ سے جو اللہ کی رضا کے خلاف ہے، ملامت زدہ ہو کر بیٹھے گا، یا خود اپنے نزدیک، یا اپنے دوستوں کے نزدیک بھی مذموم ہوگا۔ یا تیرے سائل تجھے عدمِ عطا کی وجہ سے تجھے برا بھلا کہیں گے اور اگر تو فضول خرچی کرے گا تو فقر و حاجت کی وجہ سے اپنے مقاصد حاصل نہیں کر سکے گا۔

پھر نبی اکرم ﷺ کی تسلی کے لیے فرمایا کہ تیرا رب کسی پر رزق کی فراوانی کرتا ہے اور کسی پر تنگی۔ اس میں

---

[1] حلية الأولياء (٨/ ٣١٨۔ ٣١٩) اس کی سند میں ''ہشام کنانی'' مجہول اور ''صدقہ دمشقی'' ضعیف راوی ہے۔

[2] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٥٤۔ ٥٥)

حکمتِ بالغہ ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ جس پر رزق کی توسیع کی، وہ اللہ کے نزدیک عزت والا ہوا اور جس پر رزق کو تنگ کیا ہے، وہ اس کے لیے ذلیل وحقیر ہو۔ بعض نے کہا کہ یہ تنگی اور فراوانی اللہ ہی کو زیبا ہے کہ اس کے خزائن خالی نہیں ہوتے۔ رہے بندے سو اُن پر میانہ روی واجب ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ نظر کرتا ہے، اگر کسی کے لیے تونگری کو بہتر جانتا ہے تو اسے تونگر کر دیتا ہے اور اگر فقیری کو بہتر جانتا ہے تو فقیر رکھتا ہے۔[1] کیوں کہ وہ اپنے بندوں کے پوشیدہ اور کھلے سب حالات جانتا ہے اور دیکھتا ہے، اس کے علم سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے، اسے اپنے بندوں کی تدبیر اور ان کے رزق کے طریقوں کا پوری طرح علم ہے۔ آیتِ باب اس بات پر دلیل ہے کہ بندوں کے رزق کا کفیل وہی وحدہ لاشریک لہ ہے۔[2] وللہ الحمد.

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ﴿٣١﴾

اور تم اپنی اولاد کو غریبی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم انھیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمھیں بھی، بے شک ان کا قتل کبیرہ گناہ ہے ﴿31﴾

اولاد کو قتل کرنے کی ممانعت:

کافر بیٹیاں مار دیتے تھے کہ اُن کا خرچ کہاں سے لائیں گے۔ یہ آیتِ کریمہ اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر رحم اپنے والد کے رحم سے زیادہ ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے، جس طرح کہ باپوں کو اولاد کی میراث کے بارے میں وصیت کی ہے۔ اہلِ جاہلیت بیٹیوں کو وارث نہ ٹھہراتے تھے، بلکہ کوئی اُن میں سے اپنی بیٹی کو مار ڈالتا تھا کہ اس کو پالنا پوسنا نہ پڑے۔ اللہ تعالیٰ نے اس حرکت بے برکت سے منع فرمایا اور کہا کہ تم محتاجی کے ڈر سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو، لہٰذا اُن کے لیے رزق کا اہتمام کرنے کو مقدم کیا کہ اُن کے اور تمھارے رازق ہم ہیں۔ سورۃ الانعام میں اس طرح کہا ہے: ﴿ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ﴾ [الأنعام: ١٥١] ''اور اپنی اولاد کو تنگ دستی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم تمھیں بھی اور انھیں بھی رزق دیتے ہیں۔'' پھر فرمایا کہ ان کا مار ڈالنا ایک بڑا گناہ ہے۔

صحیحین میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟ فرمایا یہ کہ تو اللہ کے لیے ہمسر ٹھہرائے، حالاں کہ اس نے تجھ کو پیدا کیا ہے۔ میں نے کہا کہ پھر کون سا گناہ اعظم ہے؟ کہا: « أَنْ تَقْتُلَ وَلَدَكَ خَشْيَةَ أَنْ يَّطْعَمَ مَعَكَ » [یہ کہ تم اپنے بچے کو اس خوف سے قتل کرو کہ وہ

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٢٧)
[2] فتح البیان (٧/ ٣٨٢_ ٣٨٤)

بھی تمھارے ساتھ کھائے گا] میں نے کہا: پھر کون سا گناہ؟ فرمایا: «أَنْ تُزَانِيَ بِحَلِيْلَةِ جَارِكَ»[1] [یہ کہ تم اپنے پڑوسی کی بیوی سے زنا کرو]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے: ''مت قتل کرو تم اپنی اولاد کو'' یہ آسودہ حال لوگوں کو خطاب ہے کہ فقر و فاقہ کے خوف سے کہ کہیں تم محتاج ہو جاؤ، تم اپنی اولاد کو قتل نہ کرنا۔ جاہلیت میں اسی طرح کرتے تھے اور سورت انعام میں تنگ دستوں کو اس سے منع کیا ہے۔[2] امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا کہ حاصل یہ ہے کہ اگر اولاد کا قتل فقر کے ڈر سے ہے تو یہ اللہ کے ساتھ بدگمانی ہے اور اگر بیٹیوں پر غیرت کی وجہ سے ہے تو یہ تخریب جہاں کی کوشش ہے۔ اول اللہ کے امر کی تعظیم کی ضد ہے اور دوسرا اللہ کی مخلوق پر شفقت کی ضد ہے اور یہ دونوں مذموم ہیں۔

پھر یہ بیان کیا کہ ان کا فقر سے ڈرنا یہاں تک کہ نوبت قتلِ اولاد تک پہنچے، بے وجہ ہے، کیوں کہ بندوں کا رازق اور اولاد اور اُن کے آبا کا رازق اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہے۔ وہی اُن سب کو رزق دیتا ہے۔ کچھ تم اُن کے رازق نہیں ہو کہ تم اُن کے ساتھ یہ کام کرو۔ پھر فرمایا کہ یہ قتل ایک خطائے کبیر، یعنی گناہِ کبیرہ اور ذنبِ عظیم ہے۔[3]

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۳۲﴾

اور تم زنا کے قریب مت جاؤ، یقیناً وہ بے حیائی اور بری راہ ہے (32)

زنا اور اس کے اسباب سے بچنے کا حکم:

یعنی اگر یہ راہ پر نکلے تو ایک دوسرے کی عورت پر نظر کرے، کوئی اس کی عورت پر نظر کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو زنا سے منع فرمایا، بلکہ یہ کہا کہ اس کے پاس نہ پھٹکو اور اس کے اسباب اور اس کی طرف متوجہ کرنے والی چیزوں کے ساتھ مخالطت (اختیار) نہ کرو۔ یہ زنا ایک فاحشہ، یعنی کبیرہ گناہ ہے اور برا طریقہ و مسلک ہے۔ سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک جوان نے آ کر کہا: اے اللہ کے رسول! مجھے زنا کی اجازت دو، قوم نے اس کی طرف متوجہ ہو کر اس کو ڈانٹا اور کہا: چپ چپ! نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے پاس آ، وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہوا، فرمایا بیٹھ جا، وہ بیٹھ گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو اپنی ماں کے ساتھ زنا کرنا پسند کرتا ہے؟ کہا: اللہ کی قسم! ہرگز نہیں، اللہ تعالیٰ مجھے آپ پر قربان کر دے۔ فرمایا: لوگ بھی اس کام کو اپنی ماؤں کے ساتھ کرنا پسند نہیں کرتے۔ فرمایا: کیا تو اپنی بیٹی سے زنا کرنا پسند کرتا ہے؟ کہا: نہیں! فرمایا: لوگ بھی اس کو اپنی بیٹیوں سے پسند نہیں کرتے۔ فرمایا: کیا تو اپنی بہن سے کرنا پسند کرتا ہے؟ کہا: نہیں، اللہ تعالیٰ مجھے آپ پر قربان کر دے۔ فرمایا: لوگ بھی اپنی بہنوں سے اس کام کا کرنا پسند

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٨٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٦)

[2] رقم الآية [١٥١] [3] فتح البيان (٧/ ٣٨٤۔ ٣٨٥)

نہیں کرتے، کہا: کیا تو اپنی پھوپھی سے یہ کام کرنا پسند کرتا ہے؟ کہا: اللہ کی قسم! ہرگز نہیں، اللہ تعالیٰ مجھے آپ پر قربان کر دے۔ فرمایا: لوگ بھی اپنی پھوپھیوں سے ایسا کام کرنا دوست نہیں رکھتے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تو اپنی خالہ سے ایسی بات کرنا دوست رکھتا ہے؟ کہا: اللہ کی قسم! ہرگز نہیں، اللہ تعالیٰ مجھے آپ پر قربان کر دے۔ کہا: لوگ بھی اپنی خالاؤں سے اس کو دوست نہیں رکھتے، پھر نبی کریم ﷺ نے اپنا ہاتھ اس پر رکھ کر کہا: «اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ ذَنْبَهُ، وَطَهِّرْ قَلْبَهُ وَأَحْصِنْ فَرْجَهُ». [اے اللہ! اس کے گناہ کو صاف فرما دے، اس کے دل کو پاک کر دے اور اس کی شرم گاہ کو محفوظ کر دے] راوی نے کہا کہ اس کے بعد وہ جوان کسی شے کی طرف توجہ نہ کرتا۔[1] (رواہ أحمد) ہیثم بن مالک طائی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «مَا مِنْ ذَنْبٍ بَعْدَ الشِّرْكِ أَعْظَمُ عِنْدَ اللّٰهِ مِنْ نُطْفَةٍ وَضَعَهَا رَجُلٌ فِيْ رَحِمٍ لَا يَحِلُّ لَهُ»[2] (رواہ ابن أبي الدنیا) [شرک کے بعد زنا کاری سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں کہ آدمی اپنا نطفہ کسی ایسے رحم میں ڈالے جو اس کے لیے حلال نہیں]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ زنا کے قریب جانے کی ممانعت، تاکہ زنا کی طرف لے جانے والے کام کے ساتھ ملوث ہو، بدرجہ اولیٰ زنا کی ممانعت ہے، کیوں کہ جب کسی شے کی طرف وسیلہ حرام ٹھہرا تو وہ کام جس کی طرف وسیلہ لیا جائے بہ فحوائے خطاب حرام ہوا۔ اس زنا کی برائی شرعاً وعقلاً حد سے بڑھنا اور قباحت میں بہت زیادہ پڑ جانا ہے۔ اس راہ کو بری راہ فرمایا، کیوں کہ یہ راہ زانی کو آگ کی طرف پہنچا دیتی ہے۔ زنا کے کبیرہ گناہ ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں۔ اس کی قباحت اور اُس سے نفرت دلانے کے لیے بہت سی دلیلیں مروی ہیں۔ یہ زنا بہت سے مفاسد پر مشتمل ہے، جیسے: معصیت اور نفس پر حد کا لگایا جانا اور نسب کا اختلاط، کوئی نہیں جانتا کہ یہ لڑکا کس کا ہے اور کون اس کی تربیت کرے۔ اس سے اولاد کا ضیاع ہوتا ہے اور نسل منقطع ہو جاتی ہے اور نسل کا انقطاع دنیا جہاں کی خرابی ہے۔

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ جب یہ آیت اتری، تب تک حدود کے احکام نہیں آئے تھے، اس کے بعد سورت نور میں حدود آئے۔[3] ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا: "ساء سبیلا إلا من تاب فإن اللّٰه کان غفورا رحیما" [یہ بری راہ ہے مگر جس نے توبہ کی تو یقیناً اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا اور نہایت رحم کرنے والا ہے] اس کا ذکر عمر رضی اللہ عنہ سے ہوا، انھوں نے اُبی رضی اللہ عنہ سے پوچھا، کہا: میں نے یہ آیت نبی مکرم ﷺ کے منہ سے اَخذ کی ہے اور تم کچھ کام نہ کرتے تھے، مگر بقیع میں لین دین۔[4]

---

[1] مسند أحمد (۵/ ۲۵۶) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (۳۷۰)

[2] الورع لابن أبي الدنیا (۱/ ۹۴) یہ روایت مرسل ہے۔ نیز سند میں ''ابوبکر بن عبداللہ بن ابی مریم'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث: ۱۵۸۰)

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (۷/ ۲۳۲۸)

[4] الدر المنثور (۵/ ۲۸۰) فتح البیان (۷/ ۳۸۵)

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا یُسْرِفْ فِّی الْقَتْلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ﴿۳۳﴾

اور تم اس جان کو قتل نہ کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہے، سوائے حق کے۔ اور جو ظلم سے قتل کیا جائے تو ہم نے اس کے وارث کو غلبہ دیا ہے، چناں چہ وہ قتل (قصاص) میں زیادتی نہ کرے، بے شک وہ مدد کیا ہوا ہے ﴿33﴾

قتلِ ناحق کی ممانعت:

یعنی ہر کسی کو لازم ہے کہ خون کا بدلہ دلانے میں مدد کرے، نہ کہ اُلٹا قاتل کی حمایت کرے۔ اور وارث کو بھی چاہیے کہ ایک کے بدلے دو نہ مارے، یا قاتل ہاتھ نہ لگا تو اس کے بیٹے یا بھائی کو نہ مارے۔

اللہ تعالیٰ نے قتلِ ناحق سے منع فرمایا ہے کہ کوئی کسی شخص کو بغیر حق شرعی قتل نہ کرے۔ صحیحین میں مرفوعاً مروی ہے: «لَا يَحِلُّ دَمُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ يَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰهِ إِلَّا بِإِحْدٰی ثَلٰثٍ: اَلنَّفْسُ بِالنَّفْسِ، وَالزَّانِيُ الْمُحْصِنُ، وَالتَّارِكُ لِدِيْنِهِ الْمُفَارِقُ لِلْجَمَاعَةِ »[1] [کسی مسلمان کا خون حلال نہیں ہے جو اس بات کی گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود حقیقی نہیں ہے اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، البتہ تین میں سے ایک صورت ہو تو حلال ہے: جان کے بدلے جان، شادہ شدہ ہو کر زنا کرے اور دین کو ترک کرتے ہوئے مسلمانوں کی جماعت کو چھوڑنے والا ہو] اور سنن میں مروی ہے: «لَزَوَالُ الدُّنْيَا عِنْدَ اللّٰهِ أَهْوَنُ مِنْ قَتْلِ مُسْلِمٍ »[2] [ایک مسلمان کے قتل کی نسبت ساری دنیا کا ختم ہو جانا اللہ تعالیٰ کے ہاں کم تر ہے]

پھر فرمایا کہ ولیِ مقتول کو غلبہ ہے قاتل پر، اس کو اختیار ہے چاہے اس کو بہ طورِ قصاص قتل کرے، یا دیت لے کر معاف کر دے اور چاہے یوں ہی مفت میں معاف کر دے، سنتِ مطہرہ میں اسی طرح ثابت ہے۔ امام عالی مقام سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیتِ کریمہ کے عموم سے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی سلطنت کی ولایت اَخذ کی تھی کہ وہ عن قریب مالکِ سلطنت ہو جائیں گے، کیوں کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے ولی تھی اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ مظلوم مارے گئے تھے اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مطالبہ کرتے تھے کہ قاتلین کو ہمارے سپرد کر دو، تاکہ ہم اُن سے قصاص لیں، کیوں کہ سیدنا معاویہ اموی تھے اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ استمہالِ امر کرتے تھے، یہاں تک کہ متمکن (سلطنت پر مستحکم) ہوں اور قصاص لیں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ معاویہ رضی اللہ عنہ سے کہتے تھے کہ تم ملکِ شام میرے حوالے کر دو، سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اس بات

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٤٨٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٧٦)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٣٩٥) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٩٨٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٦١٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٠٧٧)

کو نہ مانتے تھے اور کہتے تھے کہ پہلے آپ قاتلینِ عثمان کو میرے حوالے کریں اور بیعتِ علی رضی اللہ عنہ سے انکار کیا اور اہلِ شام بھی منکر ہوئے۔ پھر جب طویل بحث ہوئی تو معاویہ رضی اللہ عنہ متمکن ہوئے اور امیرِ شام بن گئے۔ (كما قاله ابن عباس رضی اللہ عنہما و استنبطه من هذه الآية الكريمة وهذا من الأمر العجيب)

اس کو امام طبرانی رحمہ اللہ نے اپنی معجم میں ان الفاظ میں ذکر کیا ہے کہ زہدم جرمی نے کہا ہم عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے افسانہ گوئی کرتے تھے، انھوں نے کہا: ہم تم سے ایک بات کا ذکر کرتے ہیں جو نہ چھپی ہے نہ کھلی کہ جب اس مرد کا ماجرا ہوا، یعنی عثمان رضی اللہ عنہ کا، میں نے علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تم کنارہ کش ہو جاؤ، اگر تم کسی سوراخ میں بھی ہو گے تب بھی وہ تمھیں ڈھونڈ نکالیں گے، یہاں تک کہ تم کو باہر نکلنا ہوگا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے میرا کہنا نہ مانا۔ اب ایک اور بات قسم اللہ کی! معاویہ تم پر امیر ہو جائیں گے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا﴾ (آیتِ باب) اور قریش تم کو فارس اور روم کے طریقوں پر آمادہ کریں گے اور نصاریٰ اور یہود اور مجوس کو تم پر قائم کریں گے، تم میں سے جو کوئی اس دن معروف پر چلے گا، وہ نجات پائے گا اور جو کوئی ترک کرے گا اور افسوس کہ تم بھی تارک ہوگے تو مثل ایک قرن کے قرونِ ہالکہ میں سے ہو جاؤ گے۔[1] قتل میں حد سے تجاوز سے منع کرنے سے یہ مراد ہے کہ قاتل کا مثلہ نہ کرے، یا غیرِ قاتل سے قصاص نہ لے، کیوں کہ مقتول کا ولی قاتل پر شرعاً و غالباً وقدراً منصور ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ جو نفس عصمتِ دین یا عصمتِ عہد کی وجہ سے معصوم ہے، اس کو قتل نہ کرنا چاہیے۔ اصل قتل میں سخت قسم کی حرمت ہے اور قتل کسی عارض کے سبب سے حلال ہوتا ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے قتل سے اپنے اصل حکم میں نہی فرمائی، پھر اس حالت کو جس میں قتل حلال ہو جاتا ہے مستثنیٰ کیا، وہ حالت اسبابِ عارضہ ہیں، جیسے: اسلام سے مرتد ہو جانا اور شادی شدہ کا زنا کرنا یا قاتلِ عمد سے قصاص لینا۔ سورت انعام میں اس کا ذکر ہو چکا ہے۔[2]

یہ آیتِ کریمہ مکہ میں اتری ہے۔ نبی اکرم ﷺ وہیں تشریف رکھتے تھے، قتل کے بارے میں سب سے پہلے اسی آیت کا نزول ہوا ہے، اہلِ مکہ مشرکین نبی اکرم ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو دھوکے میں مار ڈالتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ جو مشرک تم کو قتل کرے تو تم اس کے باپ بھائی کو مت مارو اور نہ اس کے کنبے میں سے کسی اور شخص کو مارو، بلکہ خاص اسی مشرک قاتل کو قتل کرو۔ یہ حکم نزولِ براءت اور مشرکین کے ساتھ جنگ کرنے کے حکم سے پہلے تھا اور اسراف فی القتل سے منع کیا، اس لیے کہ مقتول کا ولی منصور ہے۔ یہ حکم اب بھی مسلمانوں کے حق میں باقی ہے کہ ان

[1] المعجم الكبير (١٠/ ٢٦٣) اس کی سند میں "مطر وراق" ضعیف راوی ہے۔ [2] رقم الآية [١٥١]

کو قصاص میں قاتل کے سوا کسی اور کا قتل کرنا حلال نہیں۔

پھر فرمایا کہ جو کوئی مظلوم مارا گیا، یعنی کسی شرعی جواز کے سبب کے بغیر اور وہ تین امر (اسبابِ قتل) ہیں: ایمان لانے کے بعد کفر کرنا، شادی شدہ ہونے کے بعد زنا اور معصوم مومن کو عملاً قتل کرنا، تو ہم نے مقتول کے ولی کو جو کہ اس کا وارث ہے یا حاکم جو وارث نہیں، قاتل پر تسلط دیا ہے، چاہے مار ڈالے، چاہے عفو کرے، چاہے دیت لے لے۔ اب ولی کو چاہیے کہ قاتل کے قتل میں زیادتی نہ کرے، یعنی حد سے آگے نہ بڑھے کہ ایک کے بدلے میں دو کو، یا ایک جماعت کو مار ڈالے، یا قاتل کا مثلہ کرے، یا عذاب دے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے اور آپ ﷺ کے بعد اُمت کو۔[1]

زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا کہ لوگ جاہلیت میں فقط قتلِ قاتل پر راضی نہ ہوتے تھے، جب تک کہ کسی مرد شریف کو قتل نہ کر لیں اور اگر وہ قاتل شریف نہ ہوتا تو صرف قاتل کو قتل نہ کرتے، بلکہ اس کے ہمراہ کسی اور کو بھی مار ڈالتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں یہ نصیحت کی اور قتل میں زیادتی سے منع فرمایا اور ولیِ مقتول کو منصور ٹھہرایا، یعنی وہ اللہ کی طرف سے تائید کیا گیا اور معاونت کیا گیا ہے۔[2]

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۠ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ﴿۳۴﴾ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۳۵﴾

اور تم یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ، سوائے اس کے جو احسن طریقہ ہو، حتی کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے اور تم عہد پورا کرو، بے شک عہد کی بابت سوال کیا جائے گا (34) اور جب ماپ کر دو تو تم ماپ پورا کرو اور سیدھی ترازو سے تولو، یہ بہترین اور انجام کار کے لحاظ سے بہت اچھا ہے (35)

یتیم کے مال میں بہتر تصرف اور پورا ماپ تول کرنے کا حکم:

یعنی دغا بازی ایک ہی دفعہ چلتی ہے، پھر لوگ خبردار ہو کر اس سے معاملہ نہیں کرتے اور پورا حق دینے والا سب کو اچھا لگتا ہے، اللہ اس کی تجارت خوب چلاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یتیم کے مال میں تصرف کرنے سے منع کیا، مگر ایسے طریقے سے جو قابلِ رشک ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ۭ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٤٤٠) [2] سنن البيهقي الكبرىٰ (٨/ ٢٥) فتح البيان (٧/ ٣٨٦ـ ٣٨٨)

﴿ فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ﴾ [النساء: ٦] ''اور تم ان کے مال حد سے بڑھ کر اور جلدی کرتے ہوئے اس خیال سے نہ کھا جاؤ کہ وہ بڑے ہو جائیں گے (اور اپنا حق مانگیں گے)۔ اور جو (سرپرست) مال دار ہو، وہ (یتیم کا مال کھانے سے) بچے، اور جو غریب ہو وہ جائز طریقے سے (اس کا مال) کھا سکتا ہے۔''

صحیح مسلم میں مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ابوذر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اے ابوذر! میں تجھ کو ضعیف دیکھتا ہوں اور میں تیرے لیے وہی بات پسند کرتا ہوں، جو اپنے لیے پسند کرتا ہوں، تو حکم نہ کر دو آدمیوں پر بھی اور مالِ یتیم کا متولی مت ہو۔[1] اور جو عہد تم لوگوں سے کرو اور اُن سے اگر عقود کا معاملہ رکھو، اس کو پورا کرو، کیوں کہ عمر اور عقد کا سوال ہوگا کرنے والے سے اور جب ماپ کر دو تو کم نہ دو اور لوگوں کا نقصان نہ کرو اور سیدھے ترازو سے تول کر دو، جس میں کچھ کجی و انحراف و اضطراب نہ ہو۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: قسطاس رومی زبان میں عدل کو کہتے ہیں۔[2]

یہ کارروائی تمھارے معاش اور معاد کے لیے بہتر ہے۔ اس کا انجام آخرت میں بہتر ہوگا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: یہ طریقہ ثواب کے اعتبار سے بہت بہتر اور انجام کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے تھے: اے تاجروں کے گروہ! تم کو دو امر کا والی کیا گیا ہے، جن سے تمھارے اگلے لوگ ہلاک ہوگئے، ایک یہ مکیال، دوسرے یہ میزان، یعنی ماپ اور تول۔ ہم سے ذکر ہوا ہے کہ نبی اکرم ﷺ فرماتے تھے: « لَا يَقْدِرُ رَجُلٌ عَلٰى حَرَامٍ ثُمَّ يَدَعُهُ، لَيْسَ بِهِ إِلَّا مَخَافَةُ اللّٰهِ، إِلَّا أَبْدَلَهُ اللّٰهُ بِهِ فِيْ عَاجِلِ الدُّنْيَا قَبْلَ الْآخِرَةِ مَا هُوَ خَيْرٌ لَهُ مِنْ ذٰلِكَ »[3] [جو شخص کسی حرام پر قدرت رکھتے ہوئے صرف خوفِ الٰہی سے اسے چھوڑ دے تو اللہ تعالیٰ اسی دنیا میں اسے اس سے بہتر چیز عطا فرمائے گا]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یہ خطاب اولیاے یتیم کو ہے اور قریب جانے سے منع کرنے میں مال کو استعمال میں لانے یا ضائع کرنے کی ممانعت میں مبالغہ ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ لوگ یتیم کے مال کو کھانے اور اس کو اپنے مال کے ساتھ ملانے سے بچتے تھے، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ﴾ [البقرة: ٢٢٠] ''اور اگر تم اپنا اور ان کا خرچ اور رہن سہن اکٹھا رکھو تو وہ تمھارے بھائی ہی ہیں۔''[4]

اس اَمر کی بھی اجازت دی کہ جس قربت کا مقصد مالِ یتیم کی اصلاح ہو، اس کا مضائقہ نہیں ہے، جیسے: حفاظت، یا طلبِ ربح، یا اس کے زیادہ کرنے کی کوشش، یا دستور کے مطابق خرچ کرنا۔ پھر جب وہ جوان ہو جائے تو اس کا مال اس کے حوالے کر دے۔ پھر ایفائے عہد کا حکم دیا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ ہر امر و نہی عہد میں داخل ہے،[5]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٢٦) [2] تفسير الطبري (١٧/ ٤٤٥) [3] تفسير الطبري (١٧/ ٤٤٤)
[4] تفسير الطبري (١٧/ ٤٤٦) یہ روایت مرسل ہے۔ [5] تفسير القرطبي (١٠/ ٢٥٦)

اس میں اللہ کے ساتھ اور بندوں کے ساتھ عہد سب شامل ہیں۔ عہد کو پورا کرنے کا مطلب ہے؛ شرعی اور قانونی طور پر عہد کی حفاظت کرنا، سوائے اس کے کہ عہد کو توڑنے کے لیے کوئی خاص دلیل ہو۔ عہد کے بارے میں عہد کرنے والے سے سوال ہوگا۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ عہد شکن سے عہد کا سوال کرے گا۔[1]

ایفائے کیل سے مراد ماپ کو مکمل کرنا ہے اور یہ خطاب بیچنے والے کو ہے کہ جب تم ماپ کرو تو پورے کرو۔ بعض نے اس جگہ سے یہ اُخذ کیا ہے کہ کیل کی اُجرت بائع (بیچنے والے) پر ہے، کیوں کہ یہ اُجرت تمام تسلیم ہے، اسی طرح قیمت پرکھنے والے کی اُجرت بھی بائع کے ذمے ہے۔ قسطاسِ مستقیم سے مراد میزانِ عدل ہے۔ بڑی ترازو ہو یا چھوٹی، خواہ میزان دراہم ہوں یا اور کچھ۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا کہ بڑا ترازو مراد ہے جس کو قرسطون بھی کہا جاتا ہے۔[2] بعض نے کہا ہے کہ مراد نفسِ عدل ہے۔ بعض نے کہا کہ قسطاس سریانی لغت ہے۔ کسی نے کہا کہ لغتِ روم۔ اس سے قرآن کی عربیت پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔ جب عرب لوگ کسی عجمی لفظ کا اعراب و تعریف و تنکیر میں استعمال کرتے ہیں تو وہ لفظ عربی ٹھہر جاتا ہے۔

زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ لفظ عربی ہے، ''قسط'' سے ماخوذ ہے، جس کا معنی عدل ہے، جو فرق ماپ اور وزن میں کمی کر کے حاصل ہوتا ہے، وہ قلیل ہے اور جو وعید اس پر حاصل ہوتی ہے وہ شدید عظیم ہے۔ لہٰذا احتراز کرنا واجب ہے۔ وعید کے عظیم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ سب لوگ خرید و فروخت میں معاوضہ ادا کرنے کے محتاج ہیں، اس لیے شارع نے مالوں کی بقا کی خاطر مال والوں پر ماپ تول میں کمی کو روکنے کے لیے سعیِ بلیغ فرمائی ہے اور کہا کہ یہ ماپ اور تول کا پورا کرنا تمھارے لیے اللہ کے نزدیک اور لوگوں کے نزدیک بہتر ہے اور اس کا انجام بہت اچھا ہے۔[3]

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْــــُٔوْلًا ۝

اور جس بات کا آپ کو علم ہی نہیں اس کے پیچھے نہ لگیں، بے شک کان، آنکھ اور دل، ان میں سے ہر ایک کی بابت سوال کیا جائے گا (36)

بغیر علم کے بات کرنے والے کی سرزنش:

یعنی جو بات حقیقی معلوم نہ ہو، اس کی بابت دعویٰ کر کے نہ کہے کہ یوں ہے، اور ایسی ہی گواہی نہیں دینی چاہیے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ﴿ وَلَا تَقْفُ ﴾ کے معنی ہیں: ''نہ کہو''۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ کسی پر اس بات کی تہمت نہ لگا جو تجھ کو معلوم نہیں۔ امام محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ نے کہا کہ مراد جھوٹی گواہی ہے۔ امام ابو قتادہ رحمہ اللہ نے

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٣٠) [2] الدر المنثور (٥/ ٢٨٥) [3] فتح البيان (٧/ ٣٨٨_ ٣٩٠)

کہا: یہ نہ کہو کہ میں نے دیکھا ہے، حالانکہ تم نے دیکھا نہ ہو، میں نے سنا ہے، حالانکہ تم نے سنا نہ ہو، میں جانتا ہوں، حالانکہ تم جانتے نہ ہو، کیوں کہ ان سب باتوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ پرسش فرمائے گا۔[1] اس کا مضمون یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بلاعلم بات کہنے سے منع فرمایا ہے، بلکہ اس ظن سے بھی جو صرف وہم اور خیال ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ﴾ [الحجرات: ۱۲] ''بہت سی بدگمانیوں سے بچو، بلاشبہہ بعض بدگمانیاں گناہ ہیں۔''

حدیث میں مروی ہے: «إِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ فَإِنَّ الظَّنَّ أَكْذَبُ الْحَدِيثِ»[2] [اپنے آپ کو بدگمانی سے بچاؤ، کیوں کہ بدگمانی بہت جھوٹی بات ہے] اور سنن ابی داود میں ہے: «بِئْسَ مَطِيَّةُ الرَّجُلِ: زَعَمُوْا»[3] [انھوں نے ایسا خیال کیا، یہ آدمی کی بہت بری سواری ہے] دوسری حدیث میں ہے: «إِنَّ أَفْرَى الْفِرَى أَنْ يُرِيَ الرَّجُلُ عَيْنَيْهِ مَا لَمْ تَرَيَا»[4] [سب سے بڑی افترا پردازی یہ ہے کہ آدمی اپنی آنکھوں کو خواب دکھائے جو انھوں نے دیکھا نہ ہو] یا صحیح میں مروی ہے: «مَنْ تَحَلَّمَ حُلُمًا كُلِّفَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَنْ يَعْقِدَ بَيْنَ شَعِيْرَتَيْنِ وَلَيْسَ بِفَاعِلٍ»[5] [جس شخص نے کوئی جھوٹا خواب بیان کیا تو اسے قیامت کے دن یہ حکم دیا جائے گا کہ وہ جو کے دانوں کی گرہ لگائے، لیکن وہ ایسا کر نہیں سکے گا] بالجملہ اُن سب صفات کا سوال ان اعضا سے ہوگا۔ ﴿اُولٰٓئِكَ﴾ کا استعمال بجائے ''تِلْكَ'' کے درست ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

ذم المنازل بعد منزلة اللوى والعيش بعد أولئك الأيام

[لویٰ کے ٹھکانے اور وہاں گزرے وقت کے بعد کسی جگہ کی تعریف مت کرو۔ زندگی کے یادگار دن وہی تھے]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ انسان وہ بات نہ کہے جو جانتا نہیں ہے اور وہ کام نہ کرے جس کا علم نہیں ہے۔ یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے، اس کو مفسرین کی جماعت نے بعض اُمور کے ساتھ خاص کیا ہے۔ امام قتیبی نے کہا: آیت کا مطلب ہے کہ اٹکلوں اور گمانوں کے پیچھے نہ لگو۔[6] اور یہ ٹھیک ہے، کیوں کہ اس کے سوا جو کچھ ہے وہ علم ہے۔ بعض نے کہا: مراد علم سے اس جگہ علم سے مراد وہ راجح اعتقاد ہے جو کسی مستند دلیل سے اخذ کیا گیا ہو، وہ دلیل قطعی ہو یا ظنی۔

---

(1) تفسير الطبري (١٧/ ٤٤٦۔ ٤٤٧) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٣١)

(2) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨٤٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٦٣)

(3) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٧٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٨٤٦)

(4) صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٣٦) (5) صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٣٥) (6) فتح القدير (٣/ ٣١٤)

میں کہتا ہوں: یہ آیت دلیل ہے اس پر کہ کسی ایسی بات پر عمل کرنا جائز نہیں جس کا علم نہ ہو۔ لیکن یہ عمومیت اُن دلیلوں کے ساتھ خاص ہے جو عملِ بالظن کے جواز کے بارے میں مروی ہے۔ جیسے عمل کرنا عام پر یا خبرِ واحد پر، یا گواہی پر عمل کرنا، یا قبلے اور شکار کی سزا کے بارے میں اجتہاد کرنا وغیرہ۔ پس یہ اس عموم اور عموم ﴿ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ﴾ [یونس: ۳۶] ''بے شک گمان حق کے مقابلے میں کچھ بھی فائدہ نہیں دیتا۔'' سے خارج نہ ہوگا، مگر وہی امر جس کے عمل کے جواز پر دلیل قائم ہے۔ پس اگر مسائلِ شرعیہ میں رائے پر عمل کرنا اگر اس وجہ سے ہے کہ اس کے عدمِ جواز میں کتاب و سنت میں کوئی دلیل نہیں تو نبی اکرم ﷺ نے اس کی رخصت دی ہے اور وہ حدیث اس پر دلیل ہے جو معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے قضا کے بارے میں ہے۔[1]

رہا رائے پر نسبت کرنا باوجود قرآن و حدیث کے، سو وہ اس نہی میں بدرجۂ اولیٰ داخل ہے، کیوں کہ یہ اللہ کی شریعت میں محض رائے کو داخل کرنا ہے اور لوگ اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت کے سبب سے اس سے بے نیاز ہیں اور انھیں رائے کی طرف دعوت دینے والے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ حالاں کہ رائے کے بارے میں دلیل کے نہ ہونے کی صورت میں مجتہد کو رخصت ہے کہ وہ اپنی رائے پر عمل کر سکتا ہے۔ اس پر کوئی دلیل نہیں ہے کہ دوسروں کو اس کی رائے پر عمل کرنا جائز ہو اور وہ رائے مسائلِ شرعی کے مقام و مرتبے میں اتار جائے۔

اس سے یہ بات بہ خوبی واضح ہوگئی کہ یہ آرا جو کتبِ فروعیہ میں دی گئی ہیں، شرع نہیں ہے اور اُن پر عمل کرنے والا ایک گرنے والی گھاٹی کے کنارے پر ہے۔ ایسا مجتہد جو کثرت سے رائے کی جستجو کرنے والا اور اس کا طالب ہے تو وہ عامل ہے، اس چیز پر جس کا علم اس کو نہیں ہے اور بیچارا مقلد جو اس مجتہد کی رائے پر عامل ہے تو وہ ایک نامعلوم چیز پر عمل کرنے والا ہے۔ اس مسکین کے لیے یہ تقلید اندھیروں پر اندھیرے کے مترادف ہے۔ بعض نے کہا کہ یہ آیت خاص ہے عقائد کے ساتھ، لیکن اس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے کسی نامعلوم چیز پر عمل کرنے کی ممانعت کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ کان، آنکھ اور دل میں سے ہر ایک سے سوال کیا جائے گا، اُن جوارح سے سوال کا مطلب یہ ہے کہ ان جوارح کے صاحب سے پوچھا جائے گا کہ اس نے ان آلات کو کس جگہ استعمال کیا اور اُن کو استعمال کرنے والی روحِ انسانی ہے۔ اگر ان کا استعمال بھلائی کے لیے کیا ہے تو مستحقِ ثواب ہوگا اور اگر برائی میں کیا ہے تو مستحقِ عذاب ٹھہرے گا۔ اسی کو امام زمخشری رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ بعض نے کہا کہ اللہ تعالیٰ سوال کے وقت اُن اعضا کو زبان عطا کر دے گا، یہ اپنے صاحب کے فعل کی خبر دیں گے۔ امام قاضی رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے اور یہ سوال اُن جوارح کے صاحب سے بہ طورِ زجر و توبیخ ہوگا۔ یہ پہلے قول

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٩٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٣٢٧) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٨٨١)

سے زیادہ بلیغ اور اعلیٰ درجے کا ہے۔ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ بندے کو معصیت کے ارادے پر پکڑا جائے گا۔[1]

وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۖ إِنَّكَ لَن تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَن تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا ﴿٣٧﴾ كُلُّ ذَٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهُ عِندَ رَبِّكَ مَكْرُوهًا ﴿٣٨﴾

اور زمین پر اکڑ کر مت چل، بلاشبہ تُو نہ تو کبھی زمین پھاڑ سکتا ہے اور نہ کبھی لمبائی میں پہاڑوں تک پہنچ سکتا ہے (37) یہ سارے (مذکورہ) کام، ان کی برائی آپ کے رب کے نزدیک ناپسندیدہ ہے (38)

اِتراتے اور اکڑتے ہوئے چلنے کی ممانعت و مذمت:

جن باتوں سے منع کیا، ان میں رب کی ناپسندیدگی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو رفتار میں تجبر اور تکبر سے منع فرمایا اور کہا کہ تم زمین میں اِترا کر اور جبارین کی طرح اتراتے ہوئے نہ چلو، کچھ تم اس چال سے زمین کو پھاڑ نہ ڈالو گے اور اس اترانے اور فخر کرنے سے کچھ پہاڑوں کے برابر لمبے نہیں ہو جاؤ گے، بلکہ اس کا فاعل اپنے ارادے اور نیت کے مطابق جزا پائے گا، جس طرح صحیح میں مروی ہے کہ تم سے پہلے ایک شخص تھا، دو چادریں پہنے ہوئے ناز نخرے سے چلا جا رہا تھا کہ اچانک زمین میں دھنس گیا، وہ قیامت تک دھنستا چلا جاتا ہے۔[2]

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قارون کے بارے میں خبر دی ہے کہ وہ آراستہ و پیراستہ ہو کر اپنی قوم میں نکلا تھا، اللہ تعالیٰ نے اُس کو اور اُس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا۔ حدیث میں مروی ہے: «مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ، فِي نَفْسِهِ حَقِيْرٌ وَ عِنْدَ النَّاسِ كَبِيْرٌ، وَمَنِ اسْتَكْبَرَ وَضَعَهُ اللّٰهُ فَهُوَ فِي نَفْسِهِ كَبِيْرٌ وَعِنْدَ النَّاسِ حَقِيْرٌ حَتّٰى لَهُوَ أَبْغَضُ إِلَيْهِمْ مِنَ الْكَلْبِ وَالْخِنْزِيْرِ »[3] [تواضع، نرمی، فروتنی اور عاجزی کرنے والے کو اللہ تعالیٰ بلند کرتا ہے، وہ اپنے آپ کو حقیر سمجھتا ہے اور لوگ اسے جلیل القدر سمجھتے ہیں۔ اور تکبر کرنے والا اپنے آپ کو بڑا آدمی سمجھتا ہے اور لوگوں کی نگاہ میں وہ ذلیل و خوار ہوتا ہے، یہاں تک کہ وہ اسے کتوں اور سوروں سے بھی زیادہ حقیر جانتے ہیں] ابوبکر بن ابی الدنیا نے ”کتاب الخمول والتواضع“ میں اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ ابوبکر ہذلی نے کہا کہ ہم حسن بصری رحمہ اللہ کے ہمراہ تھے کہ اتنے میں ابن الاہیم کا گزر ہوا اور وہ ریشم کا جبہ پہنے ہوئے تھا، جس کو اس نے پنڈلی پر دوہرا سلوایا تھا کہ نیچے سے قبا بھی دکھائی دیتی تھی، جو کشادہ تر تھی، وہ ناز سے چلتا تھا، حسن رحمہ اللہ نے اس کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھا اور کہا: افوہ نک چڑھا، بل کھایا، رخساروں پھولا، اپنے ڈنڈ بازو دیکھتا، اپنے آپ کو تولتا، سمتوں

[1] فتح البیان (۷/ ۳۹۰_ ۳۹۲) [2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۵۴۵۲) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۰۸۸)

[3] المعجم الأوسط (۸/ ۱۷۲) شعب الإیمان (٦/ ۲۷٦) اس کی سند میں ”سعید بن سلام عطار“ ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث: ۱۲۹۵) البتہ اس کا ابتدائی حصہ ”من تواضع ... اللّٰہ“ ”صحیح مسلم“ (رقم الحدیث: ۲۵۸۸) اور دیگر کتب میں مروی ہے۔

کے ذکر و شکر کو بھولا، رب کے احکام کو چھوڑے ہوئے، حق اللہ کو توڑا، دیوانوں کی چال چلتا، عضو عضو میں کسی کی دی ہوئی نعمت رکھتا اور شیطان کی لعنت کا مارا ہوا دیکھو جا رہا ہے۔ ابن الاہیم نے یہ سن کر رجوع کیا اور معذرت کرنے لگا۔ حسن رحمہ اللہ نے کہا: مجھ سے معذرت کیا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ سے توبہ کر، کیا تو نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نہیں سنا: ﴿ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ﴾ (آیت باب)[1]

حکایت:

۱۔ عابد بختری نے آلِ علی رضی اللہ عنہ سے ایک مرد کو دیکھا، وہ ناز سے چلتا تھا اور اپنی رفتار میں اِتراتا تھا، کہا: اے شخص! جس نے تجھے یہ اکرام دیا ہے اس کی روش ایسی نہ تھی۔ اس شخص نے اس دن سے وہ چال چھوڑ دی۔[2]

۲۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک مرد کو دیکھا کہ وہ اِترا کر چلتا ہے، کہا کہ "إن للشياطين إخوانا"[3] حدیثِ حسن میں فرمایا ہے: « إِذَا مَشَتْ أُمَّتِي الْمُطَيْطَاءَ وَخَدَمَتْهُمْ فَارِسُ وَالرُّوْمُ سَلَّطَ بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ »[4] (رواه ابن أبي الدنيا) [جب میری امت غرور اور تکبر کی چال چلنے لگے گی اور فارسیوں اور رومیوں کو اپنی خدمت میں لگائے گی تو اللہ تعالیٰ ایک کو ایک پر مسلط کر دے گا] پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ سب یعنی قتلِ اولاد کے ذکر سے یہاں تک جو مذکور ہوا اس پر مواخذہ ہوگا اور یہ کام اللہ کے نزدیک سخت مکروہ ہے، وہ اُن کو دوست نہیں رکھتا اور پسند نہیں فرماتا۔ آیت کے یہ معنی قراءتِ سیئہ پر بغیر اضافت کے ہیں اور جس نے اضافت سے پڑھا ہے، اس کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ ﴿ وَقَضٰى رَبُّكَ ﴾ سے یہاں تک اس کا سیئہ اللہ کے نزدیک مکروہ و قبیح ہے۔ هكذا وجه ذلك ابن جرير.[5]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ "مرح" شدتِ فرح کے معنی میں ہے، یا چال میں تکبر، یا انسان کا اپنی قدر سے تجاوز کرنا، یا رفتار میں اِترانا، یا اکڑنا اور مغرور ہونا، یا نشاط، ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد گھمنڈ اور تنگ دلی ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ نہ چل تو زمین میں مختال و فخور ہو کر۔ زمین کا ذکر، حالاں کہ چلنا زمین ہی پر ہوتا ہے، تاکید کے لیے ہے۔[6]

ولا تمش فوق الأرض إلا تواضعا فكم تحتها قوم هم منك أرفع
وإن كنت في عز و حرز ومنعة فكم بات من قوم هم منك أمنع

[زمین پر عاجزی ہی سے چل، اس کے نیچے کتنی ہی ایسی قومیں ہیں جو تجھ سے زیادہ سر بلند ہیں، اگر تو عزت و

---

(1) الخمول والتواضع (١/ ٢٨٣) (2) الخمول والتواضع (١/ ٢٨٨) (3) الدر المنثور (٥/ ٢٨٧)

(4) الخمول والتواضع (١/ ٢٩٤) یہ روایت مرسل ہے، البتہ مرفوعاً بھی مروی ہے۔ دیکھیں: سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٢٦١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٩٥٦)

(5) تفسير الطبري (١٧/ ٤٥٠۔ ٤٥١) (6) فتح القدير (٣/ ٣١٦)

آبرو اور طاقت و غلبے کے ساتھ کسی محفوظ مقام میں ہے تو کتنی ہی ایسی قومیں ہیں جو تجھ سے زیادہ طاقت ور ہیں]

خرق کہتے ہیں کپڑے پھاڑ ڈالنے کو، یعنی اس چال سے تو کوئی زمین کو شق یا قطع نہ کرے گا کہ آخر زمین تک پہنچ جائے۔ اس میں اترانے والے متکبر پر سخت ناراضی کا اظہار ہے۔ یا خرق سے مراد زمین میں نقب لگانا ہے نہ کہ مسافت طے کرنا۔ امام ازہری رحمہ اللہ نے کہا کہ خرق قطع ہے۔[1] اور نہ تجھ کو یہ قدرت ہے کہ تو اتنا لمبا ہو اور تیرا جثہ اتنا بڑھ جائے کہ تو پہاڑوں کی برابری کرے، پھر یہ مرح اور اکڑ کس لیے؟! تو تو بہت حقیر اور صغیر یہ ان دونوں جمادات (یعنی زمین اور پہاڑ) سے بھی، تجھ کو یہی تکبر اور ... ب زیبا ہے۔ یہ سب پچیس اوامر و نواہی یا صرف نواہی اللہ تعالیٰ کے نزدیک مکروہ ہیں۔[2]

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ۭ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِيْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝۳۹

یہ وہ حکمت کی باتیں ہیں جو آپ کے رب نے آپ کی طرف وحی کی ہیں۔ اور اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود نہ ٹھہراؤ، ورنہ جہنم میں ملامت زدہ، دھتکارے ہوئے ڈالے جاؤ گے (39)

وحی اور حکمت:

اللہ تعالیٰ نے کہا کہ یہ اخلاقِ جمیلہ جن کا ہم نے حکم دیا اور یہ صفاتِ رذیلہ جن سے ہم نے منع کیا، من جملہ وحی کے ہیں تو اُن کا حکم لوگوں کو دے اور کسی کو اللہ کا شریک نہ کر کہ جہنم میں ملامت زدہ ہو کر پڑے۔ اللہ اور خلق دونوں تجھ کو ملامت کریں اور تو ہر خیر سے دور جا پڑے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ مدحور بہ معنی مطرود ہے۔[3] یہ اُمت کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے خطاب ہے، کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو معصوم ہیں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یہ سب مذکورات جنس وحی سے ہیں یا بعض وحی ہیں۔ یہ اٹھارہ آیتیں ہیں، جن کی ابتدا ﴿ لَا تَجْعَلْ ﴾ سے ہے اور تورات میں صرف دس آیات ذکر کی ہیں۔ ان کو حکمت فرمایا، یعنی کلامِ محکم ہے، جس کی طرف نسخ اور فساد کو راہ نہیں ملتی۔ حکما کے نزدیک حکمت کے معنی حق تعالیٰ کی ذات کی معرفت ہے، سو توحید پہلی قسم سے ہے اور باقی تکالیف قسم ثانی سے۔

اللہ تعالیٰ نے شرک سے دوبارہ منع فرمایا، یہ تاکید اور تقریر کے لیے اور اس بات پر تنبیہ کے لیے ہے کہ یہ دین کی اصل، شرع مبین کی ابتدا و انتہا اور حکمت و یقین کی اصل ہے، اس تاکید میں ایک دقیقے (باریک نکتے) کی رعایت فرمائی ہے۔ اول پر مذموم اور مخذول ہونے کو مرتب کیا (آیت: ۲۲) اور یہ اشارہ ہے دنیا میں شرک کی

[1] فتح القدير (۳/ ۳۱٦) [2] فتح البيان (۷/ ۳۹۲۔ ۳۹۳) [3] تفسير الطبري (۱۷/ ٤٥۲)

حالت کی طرف اور ثانی پر ترتیب آخرت کی فرمائی اور کہا کہ جہنم میں ملوم اور مدحور ہوگا (آیتِ باب) یعنی اللہ کی رحمت سے دور۔ پہلی دفعہ قعود کہا اور دوسری دفعہ میں القاء۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ انسان کے لیے دنیا میں صورت اختیار کی ہے، بہ خلاف آخرت کے۔[1]

اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنَاثًا ؕ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ۠﴿۴۰﴾

کیا پھر تمھارے رب نے تمھیں بیٹوں کے لیے چن لیا اور (اپنے لیے) فرشتوں میں سے بیٹیاں بنا لیں؟ بلاشبہہ تم بہت بڑی (نازیبا اور خطرناک) بات کہتے ہو ﴿40﴾

فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں نہیں ہیں:

اللہ تعالیٰ نے مشرکین کا ذہین پر رد کیا، جن کو یہ زعم ہے کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں، اس لیے فرشتوں کو، جو رحمٰن کے بندے ہیں، مؤنث ٹھہرایا ہے، پھر اُن کو اللہ کی بیٹیاں بتایا، پھر اُن کو پوجا، سو ان تینوں مقامات میں وہ چوک گئے اور سخت غلطی پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُن پر انکار کیا کہ تمھیں بیٹوں کے لیے خاص کر لیا ہے اور لڑکیاں میرے لیے ہیں۔

پھر اس انکار میں سختی کی اور فرمایا کہ تمھارا یہ اعتقاد کہ اللہ اولاد والا ہے اور اس کی اولاد لڑکیاں ہیں، جس سے تم خود عار کرتے ہو اور اکثر اُن کو زندہ درگور کر دیتے ہو، ایک سخت بات ہے، یعنی بڑی بے انصافی کی تقسیم اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿۸۸﴾ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْـًٔا اِدًّا ﴿۸۹﴾ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿۹۰﴾ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿۹۱﴾ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴿۹۲﴾ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّاۤ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴿۹۳﴾ لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ﴿۹۴﴾ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴾ [مریم: ۸۸۔ ۹۵] ''اور انھوں نے کہا: رحمٰن اولاد رکھتا ہے۔ البتہ یقیناً تم ایک بہت بھاری بات (گناہ) تک آ پہنچے ہو۔ قریب ہیں کہ آسمان اس (بات) سے پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے، اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر گر پڑیں۔ اس (بات) پر کہ انھوں نے رحمٰن کے لیے اولاد کا دعویٰ کیا۔ اور رحمٰن کے لائق نہیں کہ وہ کسی کو اولاد بنائے۔ آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہیں، وہ سب رحمٰن کے پاس غلام بن کر آئیں گے۔ بلاشبہہ یقیناً اس (رحمٰن) نے ان کا شمار کر رکھا ہے اور انھیں خوب گن رکھا ہے۔ اور وہ سب یومِ قیامت اللہ کے پاس تنہا تنہا آئیں گے۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یہ خطاب کفار کو ہے جو اس بات کے قائل تھے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں، اس میں

[1] فتح البیان (۷/ ۳۹۴)

سخت ڈانٹ اور تقریرِ بالغ ہے اور اُس کو قولِ عظیم یعنی اللہ تعالیٰ پر کمال جرأت ٹھہرایا ہے، جس کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔[1]

وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِیَذَّكَّرُوْا ؕ وَ مَا یَزِیْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ﴿۴۱﴾

اور ہم نے اس قرآن میں پھیر پھیر کر (حقائق کو) بیان کیا ہے، تاکہ وہ نصیحت پکڑیں، لیکن (یہ چیز) ان کو نفرت ہی میں زیادہ کرتی ہے ﴿41﴾

قرآنِ مجید میں ایک ہی بات کا مختلف انداز میں بیان:

یعنی ہم نے اس کتابِ مستطاب میں ہر قسم کی وعید بار بار ذکر کی ہے کہ شاید یہ لوگ حجتوں اور روشن دلیلوں اور دھمکیوں کو سوچ کر باز آ جائیں اور شرک اور ظلم اور بہتان بازیوں کو چھوڑ دیں، لیکن اُن ظالموں کی نفرت بڑھتی جاتی ہے اور یہ حق سے دور ہوتے جاتے ہیں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ ہم نے قرآن میں ضرب الامثال اور عبرت انگیز واقعات اور حکمت اور نصیحت کی باتیں اور قصے اور خبریں اور اوامر ونواہی وغیرہ بیان کیے ہیں، اس غرض سے کہ یہ لوگ نصیحت پکڑیں اور عبرت گیر ہوں اور اپنی عقل سے غور وفکر کریں اور اپنے قول کے باطل ہونے پر آگاہ ہوں، لیکن اُن کو ان اشیا سے جن کا اشارہ کیا گیا، نفرت بڑھتی جاتی ہے، کیوں کہ قرآن شریف کے حق میں اُن کا اعتقاد یہ ہے کہ یہ قرآن حیلہ ومکر و جادو وشعر اور کہانت ہے اور وہ اس انتہا سے باز نہیں آتے اور نہ کوئی مانع ہے جو اُن کو ہدایت کی طرف لائے۔ امام سفیان ثوری رحمہ اللہ جب اس آیت کو پڑھتے تو کہتے: اے اللہ! جس چیز نے تیرے دشمنوں کو نفرت میں بڑھا دیا، اس نے مجھے تیرے سامنے عاجزی کرنے میں بڑھا دیا۔[2]

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا یَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِی الْعَرْشِ سَبِیْلًا ﴿۴۲﴾ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا یَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِیْرًا ﴿۴۳﴾

کہہ دیجیے: اگر اس کے ساتھ اور معبود ہوتے، جیسا کہ وہ (مشرک) کہتے ہیں، تو وہ صاحبِ عرش (اللہ) تک پہنچنے کے لیے ضرور کوئی راہ تلاش کرتے ﴿42﴾ وہ پاک ہے اور وہ (مشرک) جو کچھ کہتے ہیں اس سے کہیں زیادہ اعلیٰ و بلند تر ہے ﴿43﴾

---

[1] فتح البیان (٧/ ٣٩٥)
[2] تفسیر القرطبي (١٣/ ٦٤) فتح البیان (٧/ ٣٩٥)

تقربِ الٰہی کے لیے کسی واسطے کی ضرورت نہیں:

اللہ پاک نے نبی کریم ﷺ سے کہا کہ تم اُن مشرکوں سے، جن کا یہ اعتقاد ہے کہ اللہ کی مخلوق میں سے کوئی اس کا شریک ہے اور یہ اس غیر کو اللہ کے ساتھ اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے پوجتے ہیں، کہہ دو کہ اگر یہی بات ہوتی جو تم کہہ رہے ہو کہ اللہ کے سوا اور معبود بھی ہیں، جن کی پوجا سے تم کو اللہ کا تقرب حاصل ہوتا ہے اور وہ اللہ کے نزدیک تمھاری شفاعت کریں گے تو وہ معبودین بھی اللہ ہی کی عبادت کرتے اور اس کا تقرب چاہتے ہیں اور اُس کی طرف وسیلے کی جستجو کرتے ہیں، سو تم صرف اللہ ہی کی عبادت کرو، جس طرح کہ یہ اغیار، یعنی تمھارے معبودین اسی اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں، تم کو اور کسی معبود کی کچھ حاجت نہیں کہ وہ تمھارے اور معبودِ برحق کے درمیان واسطہ ٹھہرے کہ یہ بات اللہ کو نامحبوب اور ناپسند ہے، بلکہ اس نے تو تمام رسولوں اور نبیوں کی زبان پر اس بات سے منع فرمایا ہے۔ پھر اپنے نفسِ کریم کی پاکیزگی بیان فرمائی اور کہا کہ اللہ پاک ہے، اس بات سے جو یہ حد سے بڑھنے والے ظالم اور سرکش مشرک اپنے زعم میں کہتے ہیں کہ اللہ کے ساتھ اور بھی معبودات ہیں، بلکہ اللہ واحد، احد صمد، لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفوا اَحد ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اے پیغمبر! تم اُن لوگوں سے اُن کے بدعقیدہ، کہ اللہ کے سوا کئی معبود ہیں، کے ابطال اور توحید کو ثابت کرنے کے لیے استدلال کے طور پر کہہ دو کہ اگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور معبود بھی ہوتے، جس طرح کہ تم بکتے ہو تو وہ ضرور ذوالعرش کی طرف کوئی راستہ نکالتے، یعنی اس پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے اس سے جنگ کرنے کے لیے اور اُس کی ممانعت کے لیے، تاکہ اللہ تعالیٰ کا ملک زائل کر دیں، جس طرح کہ بعض بادشاہ دوسرے بادشاہوں کے ہمراہ قتال اور جنگ اور حملہ کرتے ہیں۔ ایک معنی یہ بھی ہیں کہ وہ معبودین غیر اللہ بھی معبود برحق کی طرف تقرب و توسل کا کوئی راستہ پیدا کرتے، کیوں کہ وہ اللہ کے سوا ہیں اور مشرکوں کا یہ اعتقاد ہے کہ وہ اپنے پجاریوں کو اللہ کا مقرب بنا دیتے ہیں، لیکن ظاہر وہی پہلے معنی ہیں اور اسی معنی کی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ﴾ [الأنبياء: ٢٢] ''اگر ان دونوں (زمین و آسمان) میں اللہ کے سوا اور معبود ہوتے تو ضرور یہ دونوں تباہ ہو جاتے۔'' ان کے اقوالِ شنیعہ و فریۂ عظیم سے اللہ تعالیٰ کا رُتبہ کہیں بڑھ کر عالی ہے۔[1]

---

[1] فتح البیان (٧/ ٣٩٥۔ ٣٩٦)

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴿۴۴﴾

ساتوں آسمان اور زمین اور جو (مخلوق) ان میں ہے اس (اللہ) کی تسبیح کرتے ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ تسبیح نہ کرتی ہو، لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے، بے شک وہ نہایت حوصلے والا، بہت بخشنے والا ہے (44)

ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتی ہے:

یعنی ایسی بری باتوں پر تم کو جلدی سے نہیں پکڑتا اور توبہ کرو تو بخش دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ سارے آسمان اور زمین اور اُن کے درمیان جتنی مخلوقات ہے، وہ سب اللہ کی تقدیس پاکیزگی اور تعظیم وتکبیر بیان کرتی ہے اس قول سے جو یہ مشرکین کہتے ہیں اور اُس کی وحدانیت اور ربوبیت اور الٰہیت کی شاہد ہے ؎

ففي كل شيء له آية تدل على أنه واحد
ولله في كل تحريكة وتسكينة أبدا شاهد

[ہر چیز میں اس کے لیے ایک نشانی ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ (اللہ تعالیٰ) ایک ہے۔ تمام حرکات وسکنات میں اس کا گواہ موجود ہے]

جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿۹۰﴾ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴾ [مریم: ۹۰۔ ۹۱] ''قریب ہیں کہ آسمان اس (بات) سے پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے، اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر گر پڑیں۔ اس (بات) پر کہ انھوں نے رحمٰن کے لیے اولاد کا دعویٰ کیا۔'' عبدالرحمٰن بن قرط کہتے ہیں کہ جس رات نبی اکرم ﷺ مسجد اقصیٰ کو گئے، پھر جبریل ان کو بلند آسمانوں پر لے گئے، وہاں سے پھر کر آئے فرمایا: میں نے بلند آسمانوں میں بہت سی تسبیحوں کے ساتھ یہ تسبیح سنی: « سَبَّحَتِ السَّمٰوٰتُ الْعُلٰى مِنْ ذِي الْمُهَابَةِ مُشْفِقَاتٍ لِذِي الْعُلُوِّ بِمَا عَلَا سُبْحٰنَ الْعَلِيِّ الْأَعْلٰى سُبْحَانَهُ وَتَعَالٰى »[1] (رواه الطبراني) پھر فرمایا کہ نہیں ہے کوئی شے مخلوقات میں سے، لیکن وہ اللہ کی حمد سے تسبیح کرتی ہے، لیکن اے لوگو! تم اس کی تسبیح کو نہیں سمجھتے ہو، اس لیے کہ وہ تمھاری زبان کے خلاف ہے اور یہ عام ہے حیوانات، جمادات اور نباتات میں، تمام اقوال سے زیادہ مشہور یہی قول ہے جس طرح کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری میں آیا ہے: « كُنَّا نَسْمَعُ تَسْبِيْحَ الطَّعَامِ وَهُوَ

[1] المعجم الأوسط (٤/ ١١١) اس کی سند میں ''مسکین بن میمون'' ضعیف راوی ہے۔ (مجمع الزوائد: ١/ ٢٤٩)

يُؤْكَلُ ﴾[1] اور سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے کچھ کنکریاں ہاتھ میں لیں اور اُن کی تسبیح سنی، جیسے شہد کی مکھی کی بھنبھناہٹ۔ اسی طرح سیدنا ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے ہاتھ میں تسبیح کی۔[2]

یہ حدیث مسانید میں مشہور ہے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی مکرم ﷺ ایک قوم پر داخل ہوئے، وہ اپنے جانوروں اور سواریوں پر کھڑے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: «اِرْكَبُوْهَا سَالِمَةً، وَدَعُوْهَا سَالِمَةً، وَلَا تَتَّخِذُوْهَا كَرَاسِيَّ لِأَحَادِيْثِكُمْ فِي الطُّرُقِ وَالْأَسْوَاقِ، فَرُبَّ مَرْكُوْبَةٍ خَيْرٌ مِنْ رَّاكِبِهَا وَأَكْثَرُهُ ذِكْرًا لِلّٰهِ مِنْهُ »[3] (رواه أحمد) [ان پر سواری کرو جب کہ یہ صحیح سلامت ہوں اور صحت و سلامتی کی حالت میں انھیں چھوڑ دو، راستوں اور بازاروں میں اپنی باتوں کے لیے انھیں کرسیاں نہ بناؤ، کیوں کہ ہوسکتا ہے کہ سواری اپنے سوار سے بڑھ کر اور اس سے بہتر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والی ہو] سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مینڈک کو قتل کرنے سے منع فرمایا کیوں کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتا ہے۔[4] (رواه النسائي)

ان کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ آدمی جب "لا إله الا الله" کہتا ہے تو یہ کلمہ اخلاص ہے۔ اللہ کسی کا عمل قبول نہیں کرتا، یہاں تک کہ یہ کلمہ کہے اور جب الحمد للہ کہتا ہے تو یہ کلمہ شکر ہے، کوئی بندہ اللہ کا شکر ادا نہیں کرتا، جب تک یہ کلمہ نہ کہے اور جب اللہ اکبر کہتا ہے تو یہ آسمان اور زمین کے درمیان کو پُر کر دیتا ہے اور جب سبحان اللہ کہتا ہے تو یہ خلائق کی نماز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو نہیں چھوڑا، لیکن مقرر کیا اس کو نماز اور تسبیح کے ساتھ اور جب کہا: "لا حول ولا قوة إلا بالله" تو فرماتا ہے: میرا بندہ مطیع ہوا اور اس نے اپنا آپ مجھے سونپا۔[5]

امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک اُن کی روایت کے تیسرے الفاظ یہ ہیں کہ ایک دیہاتی آیا، وہ طیالسی جبہ پہنے ہوئے تھا، جس کی جیب یا گھنڈی دیباج کی تھی، اس نے کہا کہ تمھارے صاحب چاہتے ہیں کہ ہر چرواہے کے بیٹے کو بلند درجہ دیں اور ہر سردار کے بیٹے کو پست کر دیں۔ نبی اکرم ﷺ غضب میں آ کر کھڑے ہوگئے اور اُس کا جبہ پکڑ کر کھینچا اور فرمایا: تجھے میں جانوروں کا لباس پہنے ہوئے تو نہیں دیکھتا؟ پھر آپ ﷺ واپس چلے آئے اور بیٹھ گئے اور فرمایا: جب نوح علیہ السلام کی موت کا وقت آیا تو انھوں نے اپنے دونوں فرزندوں کو بلایا اور کہا: میں تم کو وصیت بیان کرتا ہوں اور تم کو دو باتوں کا حکم دیتا ہوں اور دو باتوں سے منع کرتا ہوں: ایک شرک باللہ اور تکبر سے اور حکم کرتا ہوں لا الہ الا اللہ کا۔ سارے آسمان و زمین اور جو کچھ اُن میں ہے اگر ترازو کے ایک پلڑے میں رکھ دیے جائیں اور لا الہ الا اللہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣٨٦)

[2] مسند الشاميين (٤/ ٢٤٦) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔

[3] مسند أحمد (٣/ ٤٣٩) اس کا آخری حصہ "فرب مركوبة... منه" ضعیف ہے، البتہ باقی روایت صحیح ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢١)

[4] المعجم الأوسط (٤/ ١٠٤) [5] تفسير الطبري (١٧/ ٤٥٦)

دوسرے پلڑے میں تو یہی راجح ہوگا اور اگر سب آسمان اور زمین ایک حلقہ ہوں اور اُن پر لا الٰہ الا اللہ رکھ دیا جائے تو یہ اُن کو توڑ دے اور تم کو حکم کرتا ہوں "سبحان الله وبحمده" پڑھنے کا، یہ ہر شے کی نماز ہے اور اسی سے ہر شے کو رزق ملتا ہے۔[1] (ورواه أحمد بأطول من هذا و تفرد به)

امام ابن جریر رحمہ اللہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے راوی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِشَيْءٍ أَمَرَ بِهِ نُوحٌ ابْنَهُ؟ أَنَّ نُوحًا عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ لِابْنِهِ: يَا بُنَيَّ! آمُرُكَ أَنْ تَقُولَ: سُبْحَانَ اللّٰهِ فَإِنَّهَا صَلَاةُ الْخَلْقِ وَ تَسْبِيحُ الْخَلْقِ وَ بِهَا يُرْزَقُ الْخَلْقُ قَالَ تَعَالٰى: ﴿ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ ﴾»[2] [آؤ میں تمھیں بتلاؤں کہ نوح علیہ السلام نے اپنے لڑکے کو کیا حکم دیا۔ فرمایا: پیارے بچے! میں تمھیں حکم دیتا ہوں کہ سبحان اللہ! کہا کرو، یہ کل مخلوق کی تسبیح ہے اور اسی سے مخلوق کو روزی دی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ ﴾] اس کی اسناد میں ضعف ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: ستون تسبیح کرتا ہے، شجرہ تسبیح کرتا ہے۔[3] بعض سلف نے کہا ہے کہ دروازے کی آواز دروازے کی تسبیح ہے اور پانی کی آواز پانی کی تسبیح ہے آیتِ باب کی دلیل سے کہ ہر شے اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہے اس کی حمد کے ساتھ۔ ابراہیم نخعی رحمہ اللہ نے کہا: طعام تسبیح کرتا ہے۔[4]

اس کی شاہد سورت حج میں آیتِ سجدہ ہے۔[5] بعض نے کہا کہ تسبیح وہ چیز کرتی ہے جس میں روح ہے، یعنی حیوان ونبات۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر شے جس میں جان ہے تسبیح کرتی ہے، شجر ہو یا کوئی اور شے۔ امام حسن اور ضحاک رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ہر شے میں روح ہے۔ ابو الخطاب نے کہا کہ ہم یزید رقاشی کے ہمراہ تھے اور اُن کے ہمراہ حسن تھے طعام میں، اتنے میں خوان لائے، یزید رقاشی نے کہا: اے ابوسعید! یہ خوان تسبیح کرتا ہے، کہا: ہاں، ایک مرتبہ تسبیح کرتا ہے۔[6] خوان کہتے ہیں مائدۂ چوبی کو، گویا جس نے یہ کہا کہ جب تک یہ لکڑی زندہ تھی، اس میں سبزی تھی، یہ تسبیح کرتی تھی، جب کاٹ لی گئی اور لکڑی خشک ہوگئی تو اب تسبیح اس کی منقطع ہوگئی۔

اس قول کا اثبات سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث سے ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا گزر دو قبروں پر ہوا، فرمایا: اُن کو عذاب ہوتا ہے اور کچھ بڑی بات پر نہیں ہوتا، ایک ان میں پیشاب کے وقت پردے کا خیال نہیں کرتا تھا۔ اور دوسرا چغل خوری کرتا تھا۔ پھر ایک تازہ شاخ لے کر اُس کے دو ٹکڑے کیے اور ہر ایک ٹکڑا ایک قبر میں گاڑھ دیا، پھر فرمایا: «لَعَلَّهُ يُخَفَّفُ عَنْهُمَا مَا لَمْ يَيْبَسَا»[7] (أخرجاه في الصحيحين) [شاید جب تک خشک نہ

---

[1] مسند أحمد (٢/ ٢٢٥) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجال أحمد ثقات" (مجمع الزوائد: ٤/ ٣٩٨)

[2] تفسير الطبري (١٧/ ٤٥٥) اس کی سند میں "موسیٰ بن عبیدۃ" اور "محمد بن یعلی" ضعیف راوی ہیں۔

[3] تفسير الطبري (١٧/ ٤٥٥) [4] تفسير الطبري (١٧/ ٤٥٦) [5] رقم الآية [١٨]

[6] تفسير الطبري (١٧/ ٤٥٥۔ ٤٥٦) [7] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٢)

ہوں ان کے عذاب میں تخفیف رہے] بعض علما نے اس حدیث پر تکلم کیا ہے اور کہا ہے کہ "ما لم ییبسا". اس لیے فرمایا کہ جب تک یہ تر رہیں گی تسبیح پڑھتی رہیں گی، جب خشک ہو جائیں گی تو تسبیح بند ہو جائے گی۔ واللہ أعلم.

اللہ حلیم وغفور ہے، یعنی نافرمانوں کو جلد ہی سزا نہیں دیتا، بلکہ تاخیر کرتا ہے، اگر پھر بھی اس نے اپنے کفر وعناد پر ہمیشگی کی تو عزیز مقتدر کی طرح پکڑ لیتا ہے، جس طرح کہ صحیح میں مروی ہے: « إِنَّ اللّٰهَ لَيُمْلِيْ لِلظَّالِمِ حَتّٰى إِذَا أَخَذَهُ لَمْ يُفْلِتْهُ » [اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت دیے رکھتا ہے حتی کہ جب اسے پکڑتا ہے تو پھر اسے نہیں چھوڑتا] پھر نبی اکرم ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ ۚ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ﴾ [هود: ۱۰۲] "اور (اے نبی!) آپ کے رب کی پکڑ ایسی ہی ہے جب وہ بستیوں کو پکڑتا ہے، جب کہ وہ ظالم ہوتی ہیں۔ بے شک اس کی پکڑ نہایت دردناک (اور) شدید ہے۔"[1]

نیز فرمایا: ﴿ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ﴾ [الحج: ٤٨] "اور کتنی ہی بستیاں ہیں کہ میں نے انھیں ڈھیل دی جب کہ وہ ظالم تھیں، پھر میں نے انھیں پکڑ لیا۔" نیز فرمایا: ﴿ فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ﴾ [الحج: ٤٥] "چناں چہ کتنی ہی بستیاں ہیں کہ ہم نے انھیں ہلاک کر دیا، جبکہ وہ ظالم تھیں۔"

اور جو کوئی اپنے کفر اور عصیان کو چھوڑ کر اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے اور توبہ کرتا ہے تو اللہ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ [النساء: ١١] "اور جو شخص برا عمل کرے یا اپنی جان پر ظلم کرے، پھر وہ اللہ سے بخشش مانگے تو وہ اللہ کو بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا پائے گا۔" اور اس جگہ حلیم غفور فرمایا، جس طرح کہ سورۃ الفاطر کے آخر میں فرمایا ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۚ وَلَىِٕنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴾ [الفاطر: ٤١] "بلاشبہہ اللہ ہی آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے (کہیں) وہ دونوں (اپنی جگہ سے) ہٹ نہ جائیں اور فی الواقع اگر وہ ہٹ جائیں تو اس کے بعد انھیں کوئی بھی تھام نہیں سکے گا، بلاشبہہ وہ بڑا حلم والا، بہت بخشنے والا ہے۔"

نیز فرمایا: ﴿ وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا ﴾ [الفاطر:٤٥] "اور اگر اللہ لوگوں کو اس وجہ سے پکڑتا جو انھوں نے کمایا تو وہ اس (زمین) کی پشت پر چلنے والا کوئی جاندار نہ چھوڑتا، لیکن وہ انھیں ایک مقررہ وقت تک ڈھیل دیتا ہے، پھر جب ان کا مقررہ وقت آ جائے گا (تو وہی انھیں سزا دے گا) یقیناً اللہ اپنے بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے۔"

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کے حال سے خبر دی ہے کہ وہ اللہ کی تسبیح کرتے ہیں، ایسے

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٤٠٩) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٥٨٣)

ہی وہ مخلوقات، جو اُن کے درمیان ہیں، جیسے: ملائکہ، جن اور انسان وغیرہ غیر عاقل اشیا۔ اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ ساری کائنات اللہ تعالیٰ کی اس پاکیزگی کی شاہد ہے، لیکن مشرکین اس تسبیح کو نہیں سمجھتے بوجھتے۔ مقصود اس ذکر سے اُن لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ ہے، جو اللہ کے شرکا کے متبعین ہیں، حالاں کہ اُن کے علاوہ ہر شے اللہ کی ہر نقص سے پاکیزگی بیان کرتی ہے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ بیٹھے تھے، اتنے میں ایک آواز سنی، فرمایا: آسمان چرچراتا ہے اور اسے چرچرانا ہی چاہیے، قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں ہے جان محمد کی! آسمان میں ایک بالشت بھی ایسی جگہ نہیں ہے، لیکن اس میں ایک فرشتے کی پیشانی سجدہ کرتی ہے۔ وہ تسبیح کرتا ہے اللہ کی حمد کے ساتھ۔[1] (أخرجه ابن مردويه)

پھر اس مضمون کی مزید تعمیم و تاکید فرمائی اور کہا: کوئی شے نہیں ہے، لیکن وہ اللہ تعالیٰ کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح بیان کرتی ہے۔ یہ ہر چیز کو شامل ہے، جس کا نام شے ہے، کوئی چیز کیوں نہ ہو، یہاں تک کہ دروازے کی آواز اور چھت کی نقیض۔ اس کی تسبیح یہی "سبحان الله وبحمده" ہے۔ بعض نے کہا: ﴿مَنْ فِيْهِنَّ﴾ محمول ہے فرشتوں اور ثقلین (انسان و جن) پر اور ﴿اِنْ مِّنْ شَيْءٍ﴾ باقی مخلوقات پر جو اُن کے سوا ہیں۔ اہلِ علم نے اختلاف کیا ہے کہ یہ عموم مخصوص ہے یا نہیں؟ ایک گروہ نے کہا: مخصوص نہیں ہے اور تسبیح کو محمول کیا ہے تسبیحِ دلالت پر، اس لیے کہ ہر مخلوق اپنے نفس پر شاہد ہے اور اس کا غیر دلیل ہے اس بات پر کہ اللہ خالق و قادر ہے۔ دوسرے گروہ نے کہا کہ یہ تسبیح حقیقتاً ہے اور عموم اپنے ظاہر پر ہے۔ مطلب یہ ٹھہرا کہ ساری مخلوقات اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتی ہیں اور تسبیح کے معنی پاکیزگی بیان کرنا ہے۔ اگرچہ انسان اس تسبیح کو نہیں سنتے، کیوں کہ وہ سننے سے محجوب (پردے میں) ہیں اور نہ اس کو سمجھتے ہیں، اس لیے کہ یہ تسبیح اُن کی زبان میں نہیں ہے۔ اس کا مقتضیٰ یہ ہوا کہ جمادات کی تسبیح بلسان مقال ہوتی ہے، یعنی اس کی آواز ہوتی ہے۔ اسی کو خازن نے اختیار کیا ہے[2] اور احادیث متعددہ سے ثبوت دیے ہیں۔ جمل میں کہا: یہ درستی کے بہت قریب موقف ہے۔ اسی کی تائید یہ فرمان کرتا ہے: ﴿وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ (آیتِ باب) کیوں کہ اگر مراد تسبیحِ دلالت ہوتی تو ہر کوئی اس کو سمجھ سکتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ﴿لَا تَفْقَهُوْنَ﴾ سے مراد کفار ہیں جو اعتبار (عبرت حاصل کرنے) سے منہ موڑتے ہیں۔ دوسرے گروہ نے کہا: یہ عموم ملائکہ اور ثقلین کے ساتھ مخصوص ہے، اس میں جمادات داخل نہیں ہیں۔ بعض نے کہا کہ خاص ہے ساتھ تسبیحِ نباتات کے، ان کے نمو کے نہ کہ ان کو قطع کرنے کے بعد، لیکن آیت کو عموم پر محمول کرنے میں اس قول کی تائید ہے: ﴿اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ﴾ [ص: ١٨] "بے شک ہم نے

---

[1] الدر المنثور (٥/ ٢٨٩) [2] تفسير الخازن (٤/ ١٥٦١۔ ١٦٢)

پہاڑ اس کے تابع کر دیے تھے، جبکہ وہ (اس کے ساتھ) صبح و شام تسبیح کرتے رہتے تھے۔'' اور یہ قول: ﴿ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ﴾ [البقرة: ٧٤] ''اور بے شک ان میں سے کچھ وہ ہیں کہ اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں۔'' اور یہ قول: ﴿ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴾ [مريم: ٩٠] ''اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر گر پڑیں۔'' اور اس کی مثل بہت سی آیتیں ہیں۔

صحیح بخاری میں مروی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم طعام کی تسبیح سنتے تھے اور وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ کھانا کھاتے ہوتے۔[1]

اسی طرح کھجور کے تنے کے رونے کے متعلق حدیث[2] اور وہ حدیث جس میں مکہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک پتھر کے سلام کرنے کے بارے میں مروی ہے،[3] یہ سب صحیح وارد ہے۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی مبارک میں کنکریوں کی تسبیح ہے۔[4] اس آیت کے عموم کی مدافعت محض استبعادات سے ہے، اس شخص کی عادت سے نہیں ہے، جو اللہ سبحانہ و تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہے اور اس چیز کی تصدیق کرتا ہے، جو نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: ''ما اصطيد حوت في البحر ولا طائر يطير إلا بما يضيع من تسبيح الله تعالى'' یعنی مچھلی اور پرندے کا شکار ہونا بہ سبب ضائع کرنے تسبیحِ الٰہی کے ہوتا ہے۔

بے شک اللہ حلم والا اور بخشنے والا ہے، اس کا حلم یہ ہے کہ اس نے تم کو چھوڑ رکھا ہے اور باوجود تمھاری غفلت اور سوئے نظر و جہل بالتسبیح کے تم پر سزا نازل نہیں کرتا۔ مغفرت یہ ہے کہ جو کوئی تم میں تائب ہو جاتا ہے، اس سے مؤاخذہ نہیں فرماتا۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رفعاً کہتے ہیں کہ ایک چیونٹی نے انبیا میں سے ایک نبی کو کاٹ لیا، اس نے حکم دیا کہ چیونٹیوں کے قریہ کو جلا دو، چناں چہ جلا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی کہ تو نے ایک چیونٹی کے لیے ایک اُمت کو تسبیح کرنے والی اُمتوں میں سے جلا دیا۔[5] (رواه الشيخان)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ کھیتی تسبیح کرتی ہے اور اس کا اجر کھیتی والے کو ملتا ہے اور کپڑا تسبیح کرتا ہے اور میل کچیل کہتا ہے کہ اگر تو مومن ہے تو مجھ کو دھو ڈال۔ ان کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ ہر شے تسبیح کرتی ہے مگر کتا اور گدھا۔[6] (أخرجه أبو الشيخ) امام حسن رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ آیت تورات کی ایک ہزار آیت کے برابر ہے، یعنی ﴿ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ ﴾ (آیتِ باب) تورات میں کہا ہے کہ پہاڑ اور درخت اور کذا و کذا تسبیح کرتے ہیں۔[7] سلف سے اس بارے میں احادیث اور روایات مروی ہیں، اُن میں تمام مخلوقات کی تسبیح کی صراحت ہے۔[8]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣٨٦)
[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣٩٠)
[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٧٧)
[4] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٥٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٤١)
[6] الدر المنثور (٥/ ٢٩٠۔ ٢٩١)
[7] الدر المنثور (٥/ ٢٩٣)
[8] فتح البيان (٧/ ٣٩٦۔ ٣٩٩)

وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ﴿45﴾ وَّجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓي اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ﴿46﴾

اور جب آپ قرآن پڑھتے ہیں تو ہم آپ کے اور اُن لوگوں کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے، ایک مخفی پردہ ڈال دیتے ہیں ⑮ اور ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال رکھے ہیں، اس سے کہ وہ اس کو سمجھیں، اور ان کے کانوں میں گرانی ڈال دیتے ہیں۔ اور جب آپ قرآن میں اپنے اکیلے رب کا ذکر کرتے ہیں تو وہ نفرت سے اپنی پیٹھوں کے بل پھر جاتے ہیں ⑯

کفار و مشرکین کے دلوں پر پردہ ہے:

یعنی اس قرآن میں تاثیر تو ہے لیکن کافروں پر اثر نہیں ہوتا، اس لیے کہ اوٹ میں ہیں۔ آفتاب سے جہان روشن ہے اور جس کی اس طرف پیٹھ ہے، اس کے حساب میں کہیں نہیں۔

امام قتادہ اور ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حجابِ مستور سے مراد اُن کے دلوں پر پردے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ ﴾ [حم السجدة: ٥] ”اور انھوں نے کہا: جس کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے، اس سے ہمارے دل پردوں میں ہیں اور ہمارے کانوں میں ڈاٹ ہیں اور ہمارے اور تیرے درمیان ایک پردہ ہے۔“[1] یعنی ایک مانع حائل ہے، جس کی وجہ سے کوئی بات ہم تک نہیں پہنچتی ہے۔ مستور اس جگہ بہ معنی ساتر ہے، جیسے میمون ومشئون بہ معنی یامن وشائم، یا مستور ہے ابصار سے کہ آنکھیں اس کو نہیں دیکھتی ہیں اور اس کے علاوہ ان کے اور ہدایت کے درمیان ایک پردہ ہے۔ ابن جریر رحمہ اللہ کا رجحان اسی کی ترجیح کی طرف ہے۔

اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما کہتی ہیں کہ جب آیت ﴿ تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ﴾ ”ٹوٹ جائیں دونوں ہاتھ ابو لہب کے اور وہ ہلاک ہو گیا۔“ اتری، عوراء اُم جمیل آئی، اسے ایک ولولہ تھا اور اُس کے ہاتھ میں ایک پتھر دھار دار تھا، وہ کہتی تھی: ”مذمما أبينا أو أتينا“ [ہم نے (ان کا) انکار کیا یا یہ کہا کہ مذمم ہمارے پاس آئے] سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ شک میری طرف سے ہے: ”دينه قلينا، وأمره عصينا“ [اس کے دین سے ہم بے زار و متنفر ہیں اور اس کے حکم کی نافرمانی کرتے ہیں] اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے تھے اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ کے پاس تھے۔

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٤٥٧)

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ عورت آئی ہے ہم کو ڈر ہے کہ وہ آپ کو دیکھ نہ لے، فرمایا: وہ مجھ کو نہ دیکھے گی اور کچھ قرآن پڑھا، یہ آیت آئی، وہ آ کر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس کھڑی ہوئی، اس نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھا، کہا: اے ابوبکر! مجھ کو یہ بات پہنچی ہے کہ تیرے صاحب نے میری ہجو کی ہے، سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: قسم ہے اس گھر کے رب کی! تیری ہجو نہیں کی ہے، تب وہ پھر کر چل دی اور کہتی جاتی تھی: ''لقد علمت قریش أني بنت سیدھا''، یعنی قریش جانتے ہیں کہ میں اُن کے سردار کی بیٹی ہوں۔[1] اکنہ جمع ہے کنان کی، کنان وہ جھلی ہے جو دل کو چھپائے ہوتی ہے۔

﴿ وَقْرًا ﴾ سے مراد بوجھ ہے، جو سننے میں رکاوٹ ہو، مراد اس سے سمعِ رضا ہے۔ پھر جب قرآن میں یہ ذکر آتا ہے لا الہ الا اللہ تو وہ پشت پھیر کر راستہ پکڑتی۔ نفور جمع ہے نافر کی، جیسے قعود جمع قاعد کی یا مصدر ہے غیر فعل سے، واللہ أعلم. اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ﴾ [الزمر: ٤٥] ''اور جب تنہا اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان لوگوں کے دل تنگ ہوتے ہیں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔''

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ جب مسلمانوں نے لا الہ الا اللہ کہا تو مشرکوں نے اس سے انکار کیا اور یہ کلمہ اُن پر گراں گزرا۔ ابلیس اور اس کے لشکری تنگ دل ہوئے، لیکن اللہ تعالیٰ نے نہ مانا اور اس کلمے کو جاری و عالی کیا اور اس کو دشمنوں پر نصرت اور غلبہ دیا۔ یہ وہ کلمہ ہے کہ جو کوئی اس کے ساتھ کسی سے جھگڑا کرے، وہ فلاح پائے اور جو کوئی اس کے ساتھ جنگ کرے، اس کی مدد کی جائے۔ اس کلمے کو اس جزیرے کے مسلمان پہچانتے ہیں، جس کو سوار چند راتوں اور تھوڑے زمانے میں عبور کر سکتا ہے اور اگر وہ زمانہ بھر لوگوں کے گروہوں میں گھومتا رہے تو نہ وہ اس کلمے کو پہچانیں گے اور نہ اس کا اقرار ہی کریں گے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہ پشت پھیر کر چل دینے والے شیطان ہیں۔[2] (وهذا غريب جدا) ورنہ شیاطین تو قرآن کی قراءت کے وقت اور اذان کی آواز اور اللہ کے ذکر کے وقت پھر جاتے ہیں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ حجابِ مستور سے مراد حجاب بالائے حجاب ہے یا مستور بالغیر ہے یا مراد طبع وختم (مہر) ہے۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ آیت اُن کے حق میں اتری ہے، جنھوں نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا تھا،[3] جیسے: ابوجہل اور ابولہب کی بیوی اُمِ جمیل۔ اس جگہ قرآن سے مراد مطلق قرآن ہے، یا تین مشہور آیات جو سورۃ النحل، سورۃ الجاثیہ اور سورۃ الکہف میں ہیں۔ سورۃ النحل میں یہ آیت ہے: ﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴾ [النحل: ١٠٨] ''یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں، کانوں اور آنکھوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے اور یہی لوگ غافل ہیں۔'' سورت کہف میں یہ آیت ہے: ﴿ جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ

---

[1] مسند أبي یعلی (١/ ٥٣) مستدرك الحاكم (٢/ ٣٩٣) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔
[2] تفسیر الطبري (١٧/ ٤٥٨۔ ٤٥٩)
[3] تفسیر الجلالین (١/ ٣٧٠)

أَكِنَّةً أَنْ يَّفْقَهُوْهُ ﴾ [الأنعام: ٢٥] ''جب کہ ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں کہ وہ اس کو سمجھ ہی نہ سکیں۔'' سورت جاثیہ میں یہ آیت ہے: ﴿ أَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَأَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ ﴾ [الجاثية: ٢٣] ''کیا پھر آپ نے اسے دیکھا جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنا لیا اور اللہ نے اسے گمراہ کر دیا، جبکہ اسے (حق کا) علم تھا۔''

اللہ تعالیٰ ان آیات کی برکت سے نبی مکرم ﷺ کو مشرکین کی آنکھوں سے اوٹ رکھتا۔ (ذکرہ الخطیب) امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اُن کے ساتھ سورت یٰسین کے شروع کی آیات کو اِلٰی قولہ: ﴿ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴾ [يٰس: ٩] ''لہٰذا وہ دیکھ نہیں سکتے۔'' کو بھی زیادہ کرنا چاہیے۔ سیرت میں مروی ہے کہ جب نبی مکرم ﷺ نے ہجرت کی اور اُن کی جگہ بستر پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ سو رہے اور نبی مکرم ﷺ باہر نکلے تو ایک مٹھی بھر مٹی اپنے ہاتھ میں لی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھیں لے لیں، وہ نبی کریم ﷺ کو نہ دیکھتے تھے۔ نبی مکرم ﷺ نے وہ مٹی اُن کے سروں پر ڈال دی اور آپ سورت یٰسین کی یہ آیات پڑھتے جاتے تھے، جب فارغ ہوئے تو کوئی شخص نہ بچا، جس کے سر پر خاک نہ ہو۔ پھر جدھر اس نے چاہا، پھر گیا۔[1] اکنہ سے مراد اغطیہ ہیں، یہ دراصل انہی کے قول کو بیان کیا ہے: ﴿ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ﴾ [البقرة: ٨٨] ''ہمارے دل غلافوں میں ہیں۔''

نیز فرمایا: ﴿ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ ﴾ [حم السجدة: ٥] ''اور ہمارے کانوں میں ڈاٹ ہیں اور ہمارے اور تیرے درمیان ایک پردہ ہے۔'' وقر سے مراد کان کا بہرا پن اور بوجھ ہے۔ مشرکین چاہتے تھے کہ جس طرح اللہ کا نام لیا جاتا ہے اور ذکر کیا جاتا ہے، اسی طرح ہمارے آلہہ کا بھی نام لیا جائے اور ذکر کیا جائے، لیکن جب صرف اللہ کا نام سنتے نہ کہ ذکر آلہہ تو مجلس سے بھاگ جاتے، جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب تو صرف اللہ کا ذکر قرآن میں کرتا ہے تو یہ پشت پھیر کر چل دیتے ہیں۔[2]

نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖٓ إِذْ يَسْتَمِعُوْنَ إِلَيْكَ وَإِذْ هُمْ نَجْوٰٓى إِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ إِنْ تَتَّبِعُوْنَ إِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴿٤٧﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْأَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ﴿٤٨﴾

ہم خوب جانتے ہیں جس (غرض) سے وہ اس (قرآن) کو سنتے ہیں، جب وہ آپ کی طرف کان لگاتے ہیں اور جب وہ خفیہ مشورے کرتے ہیں (تب بھی) جب کہ ظالم کہتے ہیں: تم جس کی اتباع کرتے ہو وہ تو جادو مارا شخص ہے (47) دیکھیے! انھوں نے آپ کے لیے کس طرح مثالیں بیان کیں؟ وہ گمراہ ہو گئے، لہٰذا وہ راستہ نہیں پا سکتے (48)

---

[1] تفسیر القرطبي (١٠/ ٢٧٠) [2] فتح البیان (٧/ ٤٠٠۔ ٤٠١)

قرآن سننے کے بعد کفارِ قریش کی سرگوشیاں:

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو کفارِ قریش کی سرگوشی پر، جب کہ وہ اپنی قوم کی نظریں بچا کر قراءت سننے کے لیے آئے تھے، خبر دی کہ انھوں نے کہا کہ یہ شخص جادو زدہ ہے، جس طرح کہ بعض نے کاہن اور بعض نے مجنون کہا تھا۔ اس لیے فرمایا کہ تو دیکھ یہ کس طرح کی کہاوتیں بیان کرتے ہیں اور حق بات اُن کے ہاتھ نہیں آتی اور کوئی راستہ نہیں پاتے۔ محمد بن مسلم بن شہاب زہری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ابوسفیان بن حرب، ابوجہل بن ہشام اور اخنس بن شریق ثقفی حلیف بنی زہرہ ایک رات نکلے کہ نبی اکرم ﷺ سے قرآن سنیں۔ نبی اکرم ﷺ رات کو اپنے گھر میں نماز پڑھتے تھے، ہر ایک اُن میں سے اپنی اپنی جگہ بیٹھ کر سننے لگا، ایک کو دوسرے کی جگہ معلوم نہ تھی۔ ساری رات بیٹھے ہوئے سنتے رہے، یہاں تک کہ فجر ہوگئی، پھر متفرق ہوئے، یہاں تک کہ راستے میں جمع ہوئے، آپس میں ایک نے دوسرے کو ملامت کی اور بعض نے بعض سے کہا: اب پھر نہ آنا، اگر تمھارے بعض بے وقوف لوگ دیکھ لیں گے تو ان کے دلوں میں طرح طرح کے خیالات آنے لگیں گے۔ پھر اپنے گھروں کو چلے گئے۔ جب دوسری رات ہوئی تو ہر شخص اپنی جگہ پر پھر آیا اور سب نے طلوعِ فجر تک آپ ﷺ کی قراءت سنی، پھر متفرق ہو گئے۔ بعض نے بعض سے اسی طرح کہا جس طرح کہ پہلی بار کہا تھا۔ جب تیسری شب ہوئی، پھر ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر آ بیٹھا اور سنتا رہا، یہاں تک کہ صبح ہوئی، پھر جدا جدا ہوگئے اور راستے میں ملے، بعض نے بعض سے کہا: اب ہم نہ ہلیں گے جب تک باہم یہ عہد نہ کر لیں کہ پھر نہ آئیں گے، اس پر معاہدہ ہوا، پھر متفرق ہو گئے۔ صبح کو اخنس بن شریق نے اپنا عصا لیا اور ابوسفیان کے گھر آیا اور کہا: اے ابوحنظلہ! تم مجھے اپنی رائے بتاؤ، اس بارے میں جو تم نے محمد ﷺ سے سن لیا ہے، کہا: اے ابوثعلبہ! میں نے ایسی چیزیں سنیں، جن کو میں پہچانتا ہوں اور اس سے جو مراد ہے، وہ بھی پہچانتا ہوں اور ایسی چیزیں بھی سنیں، جن کے معنی نہیں پہچانتا اور نہ اُن کی مراد جانتا ہوں۔ اخنس نے کہا: واللہ! میرا بھی یہی حال ہے، پھر وہاں سے نکل کر ابوجہل کے پاس آیا اور اُس کے گھر میں داخل ہو کر کہا: ابو الحکم! محمد سے رات کو تم نے جو کچھ سنا ہے اس کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟ اس نے کہا: میں نے کیا سنا تھا۔ بات یہ ہے کہ ہم نے اور بنو عبدِ مناف نے شرف و برتری کے حصول، کھانے کھلانے، مسافروں کو سواریاں دینے اور مال و دولت خرچ کرنے میں ہمیشہ باہم تنازع کیا۔ یہاں تک کہ جب ہم گھڑ دوڑ کے دونوں گھوڑوں کی طرح ہوئے تو انھوں نے کہا ہم میں ایک پیغمبر ہے، جس کو آسمان سے وحی آتی ہے سو تو کب اس کو پا سکے گا، واللہ! میں کبھی اس پر ایمان نہ لاؤں گا اور نہ اس کی تصدیق کروں گا، اخنس اُٹھ کھڑا ہوا اور چھوڑ کر چل دیا۔[1]

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام (٢/ ١٥٦۔ ١٥٧) دلائل النبوة للبيهقي (٢/ ٢٠٦۔ ٢٠٧)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ہم جانتے ہیں اس حال کو جب کہ قرآن سنتے ہیں، یعنی ہمراہ استخفاف (حقیر سمجھنا) استہزا اور لغو کے اور وہ باہم سرگوشی کرتے ہیں، یعنی اس کی تکذیب اور استہزا کے بارے میں اور تجھ کو مخلط العقل ٹھہراتے ہیں۔ ابن الاعرابی نے کہا کہ مسحور سے مراد وہ ہے جس کی عقل نہ ہو،[1] یا مخدوع (دھوکا زدہ) ہو، کیوں کہ سحر حیلہ اور خدیعت (دھوکا) ہے۔ اُن کو یہ بھی زعم تھا کہ محمد ﷺ بعض لوگوں سے تعلیم پاتے ہیں۔ بعض لوگوں نے کہا کہ مسحور کے یہ معنی ہیں کہ وہ طعام وشراب سے بے نیاز نہیں ہے تو تمھارے مثل ٹھہرا۔ ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے اس تفسیر کو مستکرہ کہا ہے۔[2] امثال سے مراد یہ ہے کہ کبھی کاہن کہتے ہیں اور کبھی شاعر اور کبھی ساحر اور کبھی مجنون۔ اس ضربِ امثال میں گمراہ ہو گئے ہیں۔ ان کو حق کی طرف راہ نہیں ملتی۔ یا ایسا طعن ہاتھ نہیں آتا جس کو عقلِ سلیم قبول کرے۔ یا ان کو خلاص کا کوئی راستہ ہاتھ نہیں آتا، ان کا کلام متناقض ہے۔[3]

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿٤٩﴾ قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ﴿٥٠﴾ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ۭ قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ ۭ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا ﴿٥١﴾ يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿٥٢﴾

اور انھوں نے کہا: کیا جب ہم ہڈیاں اور چورا ہو جائیں گے تو کیا ہم دوبارہ از سرِ نو پیدا کر کے اُٹھائے جانے والے ہیں؟ (49) کہیے: تم پتھر یا لوہا ہو جاؤ (50) یا کوئی مخلوق جو تمھارے سینوں میں بڑی معلوم ہوتی ہو۔ پھر وہ کہیں گے: کون ہمیں دوبارہ لوٹائے (پیدا کرے) گا؟ کہیے: وہی جس نے تمھیں پہلی بار پیدا کیا، پھر وہ آپ کی طرف (تعجب سے) اپنے سر ہلائیں گے اور کہیں گے: وہ کب ہوگا؟ کہہ دیجیے: اُمید ہے کہ وہ قریب ہو (51) جس دن وہ (اللہ) تمھیں بلائے گا تو تم اس کی حمد کرتے ہوئے تعمیلِ ارشاد کرو گے اور تم خیال کرو گے کہ بس تھوڑا عرصہ ٹھہرے ہو (52)

موت کے بعد کی زندگی پر ایمان نہ لانے والوں کا رد:

یہ اب جلدی کرتے ہو تب جانو گے کہ دنیا میں کچھ دیر نہ رہے تھے۔ پچاس سو برس ان ہزاروں برس کے

---

[1] فتح القدیر (۳/ ۳۲۲) [2] فتح القدیر (۳/ ۳۲۲) [3] فتح البیان (۷/ ۴۰۱۔ ۴۰۲)

سامنے کیا معلوم ہوں گے۔ جو کفار قیامت کے قائم ہونے کو بعید جانتے تھے اور استفہامِ انکاری کی طرح مذکورہ بات کہتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کے حال کے بارے میں خبر دی۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: رفات سے مراد خاک ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ غبار ہے،[1] یعنی کیا ہم قیامت کے روز بوسیدہ اور عدم ہو کر پھر جی اُٹھیں گے؟! جس طرح دوسری جگہ کہا ہے: ﴿ يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ ۝ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ۝ قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ﴾ [النازعات: ١٠۔ ١٢] ''وہ (کافر) کہتے ہیں: کیا ہم یقیناً پہلی حالت میں لوٹائے جائیں گے؟ کیا جب ہم گلی سڑی ہڈیاں ہو جائیں گے؟ کہتے ہیں کہ اس وقت لوٹنا تو خسارے والا ہے۔''

نیز فرمایا: ﴿ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ۭ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۝ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمُ ﴾ [يٰسٓ ٧٨۔ ٧٩] ''اور اس نے ہمارے لیے ایک مثال بیان کی اور وہ اپنی پیدائش کو بھول گیا، اس نے کہا: ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا، جب کہ وہ گلی سڑی ہوں گے؟ آپ کہہ دیجیے: انھیں وہی (اللہ) زندہ کرے گا جس نے انھیں پہلی بار پیدا کیا اور وہ ہر طرح کے پیدا کرنے کو خوب جانتا ہے۔'' اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو کہا کہ تم یہ جواب دو کہ تم پتھر یا لوہا ہو جاؤ کہ یہ ہڈیوں اور مٹی سے امتناع میں سخت تر ہیں۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ میں نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ کہا مراد موت ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: یعنی اگر تم مٹی ہو گے، تب بھی میں تم کو زندہ کروں گا۔ یہی قول سعید بن جبیر رحمہ اللہ کا ہے۔ امام ابو صالح، حسن، قتادہ اور ضحاک رحمہم اللہ وغیرہم اسی کے قائل ہیں، معنی یہ ہوئے تم فرض کر لو کہ اگر تم مردہ ہو جاؤ، جو حیات کی ضد ہے، تب بھی اللہ تم کو زندہ کرے گا، جب چاہے گا، کیوں کہ اس پر کوئی شے مشکل نہیں، جبکہ وہ کسی شے کا ارادہ کر لے۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ اس جگہ حدیث موت کو ذبح کرنے کی ذکر کی ہے کہ اس کو جنت اور دوزخ کے درمیان ذبح کر کے کہیں گے: اے اہلِ جنت! اب ہمیشہ کی زندگی ہے بلا موت کے اور اے اہلِ نار! ہمیشہ کی زندگی ہے بغیر موت کے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ خلقِ کبیر سے مراد آسمان و زمین ہے اور پہاڑ ہیں۔ دوسری روایت میں ہے کہ تم جو چاہو ہو جاؤ، اللہ عن قریب تمھیں موت کے بعد دوبارہ زندہ کرے گا۔ امام زہری رحمہ اللہ نے کہا: کہتے ہیں کہ یہ موت ہے۔[2]

کہتے ہیں کہ اگر ہم پتھر یا لوہا ہو گئے تو پھر ہمیں دوبارہ کون زندہ کرے گا؟ اس کا جواب یہی ہے کہ وہی کرے گا جس نے پہلی بار تم کو بنایا اور تم کوئی شے مذکور نہ تھے، پھر تم بشر ہو گئے اور پھیل گئے، وہی قادر ہے کہ پھر تمھارا اعادہ کرے، اگرچہ تم کسی حال پر کیوں نہ ہو جاؤ: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ۭ وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ [الروم: ٢٧] ''اور وہی (اللہ) ہے جو مخلوق پہلی بار

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٤٦٢) [2] تفسير الطبري (١٧/ ٤٦٤۔ ٤٦٥) تفسير ابن كثير (٣/ ٦٣۔ ٦٤)

پیدا کرتا ہے، پھر وہی اسے لوٹائے گا، اور یہ اس کے لیے زیادہ آسان ہے اور آسمانوں اور زمین میں اسی کی صفت اعلیٰ ہے، اور وہی نہایت غالب، خوب حکمت والا ہے۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ''نغضِ رأس'' سے مراد استہزا کے لیے سر ہلانا ہے۔[1] عرب کی لغت میں اسی طرح آیا ہے، کیوں کہ انغاض بہ معنی تحریک کے ہے نیچے سے اوپر کی طرف، یا اوپر سے نیچے کی طرف اور یہ کہنا کہ قیامت کب ہوگی، ایک طرح کا اس کے وقوع کو بعید از قیاس سمجھنا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴾ [الملك: ٢٥] ''اور وہ (کافر) کہتے ہیں: یہ (قیامت کا) وعدہ کب (پورا) ہوگا، اگر تم سچے ہو؟'' نیز فرمایا: ﴿ يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِهَا ﴾ [الشوریٰ: ١٨] ''جو لوگ اس (قیامت) پر ایمان نہیں رکھتے، وہ اس کے لیے جلدی مچاتے ہیں۔''

اور یہ جو کہا کہ کہہ دے اے پیغمبر! شاید وہ قریب ہو، اس کے معنی یہ ہیں کہ تم اس کے قرب سے حذر کرو (ڈرو) کہ وہ لامحالہ جلد آئے گی، کیوں کہ جو چیز آنے والی ہو وہ قریب ہی ہوتی ہے۔ پکارنے کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت وہ تم کو زمین میں سے نکلنے کا حکم دے گا تو تم فی الفور نکل پڑو گے، کیوں کہ کوئی اس کا مخالف اور مانع نہیں ہے، بلکہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے کہا ہے اسی طرح پر ہوگا ﴿ وَمَا أَمْرُنَا إِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ ﴾ [القمر: ٥٠] ''اور ہمارا حکم تو آنکھ جھپکنے کی طرح ایک (کلمہ) ہی ہوتا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَاهُ أَن نَّقُولَ لَهُ كُن فَيَكُونُ ﴾ [النحل: ٤٠] ''جب ہم کسی چیز کا ارادہ کر لیں تو اس کے لیے ہمارا صرف یہی قول ہوتا ہے کہ ہم اس سے کہتے ہیں: ہو جا! تو وہ ہو جاتی ہے۔''

نیز فرمایا: ﴿ فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَاحِدَةٌ ۝ فَإِذَا هُم بِالسَّاهِرَةِ ﴾ [النازعات: ١٣۔ ١٤] ''چنانچہ وہ (قیامت) تو صرف ایک (خوفناک) ڈانٹ ہوگی۔ تب لوگ ایک دم کھلے میدان میں (جمع) ہوں گے۔'' جس طرح اس جگہ فرمایا ہے کہ جس دن تم کو پکارے گا، تم اس کا حکم بجا لاؤ گے اور اس کے ارادے کی اطاعت کرو گے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ''استجابت بالحمد'' سے مراد حکم ماننا ہے۔

امام ابن جریج رحمہ اللہ سے اسی طرح مروی ہے اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ معرفت اور طاعت ہے۔[2] بعض نے کہا: ہر حال میں اسی کی تعریف کرنا مراد ہے۔ حدیث میں مروی ہے: «لَيْسَ عَلَى أَهْلِ "لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰه" وَحْشَةٌ فِي قُبُورِهِمْ، وَكَأَنِّي بِأَهْلِ "لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ" يَقُومُونَ مِنْ قُبُورِهِمْ يَنْفُضُونَ التُّرَابَ عَنْ رُؤُوسِهِمْ، يَقُولُونَ: لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ» [''لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰه'' کہنے والوں پر ان کی قبروں میں کوئی وحشت نہیں ہوگی، گویا کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ اپنے سروں سے مٹی جھاڑتے ہوئے قبروں سے اٹھ رہے ہیں، وہ ''لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰه'' کہتے ہوئے

[1] تفسیر الطبري (١٧/ ٤٦٧) [2] تفسیر الطبري (١٧/ ٤٦٨۔ ٤٦٩)

اٹھ کھڑے ہوں گے] دوسری روایت میں یوں ہے کہ یہ کہیں گے: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ﴾ [الفاطر: ٣٤] ''تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جس نے ہم سے غم دور کر دیا۔''[1] اس کا ذکر سورت فاطر میں آئے گا۔[2]

جس دن تم اپنی قبروں سے اُٹھ کھڑے ہو گے، تم کو یہ گمان ہوگا کہ نہیں ٹھہرے ہم دنیا میں مگر تھوڑے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰىهَا ﴾ [النازعات: ٤٦] ''جس روز وہ قیامت کو دیکھیں گے (تو سمجھیں گے) کہ گویا وہ دنیا میں بس ایک شام یا صبح ہی ٹھہرے ہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَىِٕذٍ زُرْقًا ۝ يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا ۝ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا ﴾ [طٰہٰ: ١٠٢۔ ١٠٤] ''جس دن صور میں پھونکا جائے گا، اور ہم اس دن مجرم اکٹھے کریں گے اس حال میں کہ نیلی آنکھوں والے ہوں گے۔ وہ باہم چپکے چپکے کہتے ہوں گے: تم (دنیا میں) نہیں ٹھہرے، مگر صرف دس دن۔ ہم کو خوب معلوم ہے جو وہ کہیں گے، جب کہ ان میں بہترین رائے والا کہے گا: تم تو صرف ایک دن ٹھہرے تھے۔''

نیز فرمایا: ﴿ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ كَذٰلِكَ كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ ﴾ [الروم: ٥٥] ''اور جس دن قیامت قائم ہوگی، مجرم قسمیں کھائیں گے کہ وہ (دنیا میں) گھڑی بھر کے سوا نہیں ٹھہرے، اسی طرح وہ (دنیا میں) بہکے رہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ ۝ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْـَٔلِ الْعَآدِّيْنَ ۝ قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ [المؤمنون: ١١٢۔ ١١٤] ''اللہ فرمائے گا: زمین میں تم کتنے سال رہے؟ وہ کہیں گے: ہم ایک دن یا دن کا بھی کچھ حصہ رہے، گنتی کرنے والوں سے پوچھ لیجیے۔ اللہ فرمائے گا: واقعی تم (وہاں) تھوڑا سا وقت ہی رہے، کاش! تم (یہ بات دنیا میں) جانتے ہوتے۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امر نبوت میں قوم کے شبہہ کا ذکر کرنے کے بعد قیامت کے بارے میں ان کے شبہات کا ذکر فرمایا کہ انھوں نے استفہامِ انکاری کے طور پر اور استبعاد کے طور پر کہا کہ کیا ہم ہڈی اور مٹی ہو جانے کے بعد پھر جی اُٹھیں گے، یہ اس لیے کہا کہ زندہ کی تروتازگی اور ہڈیوں کی خشکی میں بہت دوری اور فرق ہے۔ اس شبہے کی تقریر یہ ہے کہ جب انسان مر جاتا ہے تو اس کی ہڈیاں خشک ہو جاتی ہیں اور بکھر جاتی ہیں اور چاروں طرف متفرق اور پریشان ہو جاتی ہیں اور اُس کے ذرات عناصر کے ساتھ، جو اس کی طرح ہیں، مل جاتی ہیں۔ پھر اس کے بعد اُن کا اپنے تمام اجزاء کے ساتھ اکٹھے ہونا عقل میں نہیں آ سکتا، پھر اس مجموعے کی طرف زندگی کا لوٹ کر آنا بھی ناقابلِ فہم ہے۔

[1] المعجم الأوسط (٩/ ١٨١) تفسیر ابن کثیر (٣/ ٦٤) اس کی سند میں ''عبدالرحمان بن زید'' اور ''یحییٰ حمانی'' ضعیف راوی ہیں۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٣٨٥٣)

[2] رقم الآية [٣٤]

اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب دیا کہ میت کے بدن کا اس کی حالتِ حیات کی طرف آنا ایک ممکن چیز ہے اور اگر تم فرض کرو کہ میت کا بدن حیات سے بہت دور ہو گیا ہے اور اس سے زندگی کی تروتازگی جاتی رہی اور وہ ایسے ہو گیا، جیسے پتھر یا لوہا، تب بھی تم مبعوث ہو گے، جیسے کوئی کہے کہ "أتطمع فيّ و أنا ابن فلان" [کیا تو مجھ سے اس کا طمع رکھتا ہے جب کہ میں فلاں کا بیٹا ہوں] دوسرا کہے تو بادشاہ کا بیٹا ہو یا جس کسی کا تو چاہے، لیکن میں اپنا حق تجھ سے پورا لوں گا۔ رفات کے معنی ہیں: ریزہ ریزہ اور بوسیدہ ہو جانا یا غبار اور مٹی ہو جانا۔ قرآن میں بار بار آیا ہے: ﴿ تُرَابًا وَّعِظَامًا ﴾ [المؤمنون: ۳۵] ''مٹی اور ہڈیاں ہو گئے۔'' یا رُفات وہ ہے جو چورا چورا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ یعنی اگر تم کو اس بات سے تعجب ہے کہ اللہ تم کو پھر ہڈیاں اور گوشت پوست دے گا تو تم شدت میں پتھر ہو جاؤ یا قوت میں لوہا ہو جاؤ اگر ہو سکتے ہو۔[1]

علی بن عیسیٰ رحمہ اللہ نے کہا کہ یعنی اگر تم سنگ و آہن بھی ہو جاؤ گے تب بھی اللہ سے فوت (دور) نہیں ہو سکتے، وہ جب ارادہ کرے گا تو تم کو اُٹھا کھڑا کرے گا۔ یہ جملہ امر کے قائم مقام ہے اور الزام میں ابلغ ہے۔[2] بعض نے کہا کہ اس کے یہ معنی ہیں کہ اگر تم پتھر و لوہا بھی بن جاؤ گے، تب بھی وہ تمھیں دوبارہ لے آئے گا، جس طرح اس نے ابتداءً تم کو بنایا تھا اور تم کو مار کر پھر زندہ کرے گا۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ قول حسن ہے، اس لیے کہ وہ پتھر اور لوہا نہیں بن سکتے۔ معنی یہ ہوئے کہ وہ باوجود اقرارِ خالق انکار کرتے ہیں۔[3] یا کوئی اور مخلوق بن جاؤ، جو تمھارے نزدیک پتھر اور لوہے سے بھی بڑی ہو اور مبائن حیات ہو تو تم لامحالہ مبعوث ہو گے۔

مفسرین کی ایک جماعت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعینِ عظام رحمہم اللہ کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ مراد موت ہے، اس لیے کہ نفس ابن آدم میں کوئی شے موت سے بڑی نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا اعادہ کون کرے گا؟ آپ کہیں کہ وہی کرے گا جس نے پہلی بار تم کو پیدا کیا ہے، جب کہ کوئی مثال سابق اور پہلے کی کوئی صورت و شکل نہیں تھی۔ پھر جو شخص پہلی دفعہ پیدا کر کے اُٹھانے پر قادر ہے، کیا وہ دوبارہ پیدا کرنے پر قدرت نہیں رکھتا؟ بلکہ دوبارہ پیدا کرنا پہلی دفعہ کے پیدا کرنے سے کہیں زیادہ سہل اور آسان ہے۔

نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول

[نقش بنانے والا دوسرا نقش پہلے نقش سے بہتر بناتا ہے]

یہ لوگ استہزا سے سر ہلا کر کہتے ہیں کہ بعث و اعادہ کب ہو گا؟ آپ کہیں: جلد ہو گا، جس دن وہ تم کو پکارے گا، تم اس کے حکم کی تعمیل کرو گے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کفار قبروں سے نکلنے کے وقت کہیں گے:

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٤٦٣) [2] تفسير القرطبي (١٠/ ٢٧٤) [3] معاني القرآن للنحاس (٤/ ١٦٣)

"سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ"[1] یا یہ خطاب ہے مومنین کو کہ وہ حمد کہتے ہوئے اُٹھیں گے اور اس وقت تم یہ گمان کرو گے کہ تم دنیا میں یا قبر میں بہت کم رہے۔ یا مراد ہے بین النفختین (دو دفعہ صور پھونکنے کا درمیانی وقفہ) ہے، اس لیے کہ ہر دو نفخہ کے درمیان عذاب روک دیا جائے گا اور یہ فاصلہ چالیس برس کا ہوگا۔ اس مدت میں سوتے رہیں گے، پھر کہیں گے کہ ہم کو ہماری خواب گاہ سے کس نے اُٹھایا ہے۔ یا دنیا اُن کی آنکھوں میں حقیر نظر آئے گی، روزِ قیامت کی ہولنا کی دیکھ کر۔[2] (قاله قتادة)

وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ۝53

اور میرے بندوں سے کہہ دیجیے کہ وہ بات کہیں جو احسن ہو، بے شک شیطان ان کے درمیان فساد ڈالتا ہے، بلاشبہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے (53)

حسنِ ادب کے ساتھ گفتگو کرنے کا حکم:

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے اور رسول کو حکم دیا کہ وہ ایمان داروں سے کہہ دیں کہ تم اپنے مخاطبات اور محاورات میں اچھا کلام اور پاکیزہ کلمہ کہا کرو، اگر ایسا نہ کرو گے تو شیطان تمھارے درمیان ناراضی پیدا کر دے گا اور قول سے فعل کی نوبت آ جائے گی اور شر و فساد اور جنگ واقع ہوگی، کیوں کہ شیطان آدم اور اس کی اولاد کا ظاہر دشمن ہے، لہٰذا منع فرمایا ہے کہ کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کی طرف کسی لوہے کی چیز سے اشارہ کرے، کیوں کہ شیطان اس کے ہاتھ میں نزغ (ورغلانا) کرتا ہے، یعنی مبادا کہیں وہ ہتھیار اس مسلم بھائی کو لگ جائے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں: « لَا يُشِيْرُ أَحَدُكُمْ إِلَى أَخِيْهِ بِالسَّلَاحِ، فَإِنَّهُ لَا يَدْرِيْ أَحَدُكُمْ لَعَلَّ الشَّيْطَانَ أَنْ يَنْزِعَ فِيْ يَدِهِ فَيَقَعَ فِيْ حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ »[3] (رواه أحمد و الشيخان) [تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی کی طرف ہتھیار سے اشارہ نہ کرے، کیوں کہ وہ نہیں جانتا کہ شاید شیطان اس کے ہاتھ سے چلوا دے اور وہ جہنم کے گڑھے میں جا گرے] امام حسن رحمہ اللہ نے کہا کہ مجھے بنی سلیط میں سے ایک مرد نے بیان کیا کہ میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا، آپ لوگوں کی ایک جماعت میں تھے، میں نے سنا فرماتے تھے: « اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ، لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يَخْذُلُهُ، اَلتَّقْوٰى هَاهُنَا »[4] (رواه أحمد بطوله) [مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، کوئی کسی پر ظلم و ستم نہ کرے، کوئی کسی کو بے عزت نہ کرے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سینے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: تقویٰ یہاں ہے]

---

(1) تفسیر ابن أبي حاتم (۷/ ۲۳۳٤) (2) تفسیر الطبري (۱۷/ ٤٦۹) فتح البیان (۷/ ٤۰۲۔ ٤۰۵)

(3) صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٦٦١) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲٦۱۷) مسند أحمد (۲/ ۳۱۷)

(4) مسند أحمد (۵/ ۷۱) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رواه أحمد بأسانید و إسناده حسن" (مجمع الزوائد: ۸/ ۳۳۷)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ احسن کلام وہ ہے جو سخت نہ ہو، مثلاً: یوں نہ کہے کہ تم دوزخی ہو کہ اس سے شر اُٹھتا ہے، حالاں کہ انجام اُن کا ہم سے غائب ہے اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾ [العنكبوت: ٤٦] ''اور تم اہلِ کتاب سے احسن انداز ہی سے بحث و تکرار کرو۔'' نیز فرمایا: ﴿ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا ﴾ [طه: ٤٤] ''چناں چہ تم دونوں اس سے نرم بات کہنا۔'' درشتی اور سختی اکثر بات مان لینے کے بجائے نفرت کا سبب بنتی ہے، یا گالی گلوچ کی طرف اُکساتی ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ ﴾ [الأنعام: ١٠٨] ''اور مشرکین اللہ کو چھوڑ کر جنھیں پکارتے ہیں، تم انھیں گالی مت دو، پھر وہ بھی جہالت میں حد سے گزرتے ہوئے اللہ کو گالی دیں گے۔''

یہ حکم آیتِ سیف کے نزول سے پہلے تھا۔ بعض نے کہا کہ معنی یہ ہیں کہ جس بات کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، تم بھی اسی کا حکم دو اور جس بات سے نہی فرمائی ہے، تم بھی اس سے منع کرو اور کسی نے کہا کہ یہ آیت مومنین کے لیے ہے، خاص ان کے آپس کے برتاؤ کے بارے میں، لیکن پہلی بات زیادہ مناسب ہے۔ سببِ نزول بھی اسی کا شاہد ہے۔ امام ابن سیرین رحمہ اللہ نے کہا کہ کلامِ احسن سے مراد لا الہ الا اللہ ہے۔[1]

امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا: یعنی سیئہ معاف کرتے ہیں۔[2] امام حسن رحمہ اللہ نے کہا کہ یوں کہے: ''يرحمك الله، يغفر الله لك''[3] [اللہ تجھ پر رحم فرمائے، اللہ تجھے بخش دے] نزغِ شیطان سے مراد فساد اور دشمنی ڈالنا اور بھڑکانا ہے۔ سخت گوئی دشمنی پیدا کرتی ہے اور فساد زیادہ کرتی ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ نزغ تحریش ہے۔[4] بعض نے کہا کہ اغراء (اُبھارنا، اُکسانا) ہے۔ بعض نے کہا کہ نزغ سے مراد اغوا اور وسوسہ ڈالنا ہے۔ بنی آدم کے ساتھ شیطان کی دشمنی کھلی ہوئی ہے۔[5]

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ۭ اِنْ يَّشَاْ يَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ يَّشَاْ يُعَذِّبْكُمْ ۭ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ۝ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰي بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۝

تمھارا رب تمھیں بہتر جانتا ہے، اگر وہ چاہے تو تم پر رحم کرے اور اگر چاہے تو تمھیں عذاب دے اور ہم

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٣٤) [2] الدر المنثور (٥/ ٣٠١) [3] تفسير الطبري (١٧/ ٤٦٩)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٣٤) [5] فتح البيان (٧/ ٤٠٥۔ ٤٠٦)

نے آپ کو ان پر ذمے دار بنا کر نہیں بھیجا (54) اور آپ کا رب انھیں خوب جانتا ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور یقیناً ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت دی اور ہم نے داود کو زبور دی (55)

اللہ ہی علیم و حکیم اور وہی غفور و رحیم ہے:

مذاکرہ میں حق والا جھنجھلاتا ہے کہ دوسرا واضح حق کو نہیں مانتا، سو فرمایا کہ تم پر ان کا ذمہ نہیں، اللہ تعالیٰ بہتر جانے، جس کو چاہے راہ سجھائے۔ بعض نبی تھے کہ جھنجھلا گئے، تیرا حوصلہ اُن سے زیادہ رکھا ہے اور داود علیہ السلام کا ذکر کیا کہ دونوں باتیں رکھتے تھے: جہاد بھی اور زبور بھی۔ سمجھانے کو وہی دونوں باتیں یہاں بھی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اللہ ہی جانتا ہے کہ کون ہدایت کا مستحق ہے اور کون نہیں، وہ چاہے تو تم پر رحم کرے، اس طرح کہ تم کو اطاعت کی توفیق دے اور انابت بخشے اور اگر چاہے عذاب کرے۔ ہم نے تجھ کو فقط ڈرانے کے لیے بھیجا ہے۔ جو کوئی تیری اطاعت کرے گا، بہشت میں جائے گا اور جو تیری نافرمانی کرے گا وہ داخلِ نار ہو گا۔

انبیائے کرام علیہم السلام کی ایک دوسرے پر فضیلت کا بیان:

آسمان و زمین میں جو لوگ ہیں، اللہ اُن کی اطاعت اور نافرمانی کے مراتب سے بہ خوبی آگاہ ہے۔ ہم نے بعض پیغمبروں کو بعض پر فضیلت دی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ﴾ [البقرة: ٢٥٣] ''یہ سب رسول ہیں، ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی، ان میں سے کچھ ایسے ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا اور ان میں سے بعض کے درجے بلند کیے۔''

اور یہ کوئی اس کے منافی نہیں ہے کہ صحیحین میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: « لَا تُفَضِّلُوْا بَيْنَ الْأَنْبِيَاءِ »[1] [اللہ کے نبیوں کے مابین (انھیں ایک دوسرے پر) فضیلت نہ دیا کرو] کیوں کہ اس سے مراد وہ فضیلت ہے، جو محض عصبیت کے طور پر دی جائے نہ کہ دلیل کے اقتضا کے تحت اور جب دلیل کسی شے پر دلالت کرے تو دلیل کو ماننا واجب ہے۔

اس بارے میں خلاف نہیں کہ رسول ﷺ باقی انبیا سے افضل ہیں اور اُن میں جو اُولو العزم ہیں وہ افضل ہیں اور یہ پانچ نبی ہیں، جن کا سورۃ الاحزاب کی دو آیتوں میں صریحاً ذکر آیا ہے: ﴿ وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ﴾ [الأحزاب: ٧] ''اور (اے نبی! یاد کریں) جب ہم نے تمام نبیوں سے ان کا عہد لیا اور آپ سے بھی اور نوح اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ ابن مریم سے بھی۔'' نیز سورۃ الشوریٰ میں کہا ہے: ﴿ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ﴾ [الشورىٰ: ١٣] ''اس نے تمھارے لیے وہی دین مقرر کیا

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٣٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٧٣)

ہے، جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا اور جو ہم نے (اے نبی!) آپ کی طرف وحی کیا ہے اور جس کا (تاکیدی) حکم ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا تھا کہ تم اس دین کو قائم رکھو اور تم اس میں فرقہ فرقہ نہ ہو جاؤ۔''

اور اس میں خلاف نہیں کہ تمام اولو العزم رسولوں سے افضل ہمارے نبی ﷺ ہیں، پھر ابراہیم علیہ السلام، پھر موسیٰ علیہ السلام مشہور ہیں، ہم نے اس مسئلے کو دوسری جگہ تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس ارشاد میں کہ ہم نے داود علیہ السلام کو زبور دی، اُن کی بزرگی کے بارے میں آگاہ فرمایا ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: « خُفِّفَ عَلَى دَاوُدَ الْقُرْآنُ فَكَانَ يَأْمُرُ بِدَابَّتِهِ لِتُسْرَجَ فَكَانَ يَقْرَأُ قَبْلَ أَنْ يَفْرُغَ » يعني القرآن[1] (رواه البخاري) [داؤد علیہ السلام پر (زبور کی) قراءت آسان کر دی گئی تھی، چنانچہ وہ اپنے (سواری کے) جانوروں پر زین ڈالنے کا حکم دیتے تو اس کام سے فراغت سے پہلے اسے پڑھ لیا کرتے تھے، یعنی اس کی قراءت کر لیتے تھے]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ آیتِ باب میں مشرکین کو خطاب ہے، یعنی اگر اللہ چاہے تو تم کو اسلام کی توفیق دے اور رحم کرے۔ یا شرک پر مارے اور عذاب کرے۔ یا مومنین کو خطاب ہے کہ اگر چاہے تو تم پر رحم کرے اور کفار سے تم کو محفوظ رکھے۔ یا توفیقِ توبہ و ایمان دے اور چاہے تم کو عذاب کرے اور کفار کو تم پر مسلط کر دے۔ بعض نے کہا کہ یہ آیت کلمہ احسن کی تفسیر ہے۔ ہم نے تجھ کو اس لیے نہیں بھیجا ہے کہ تو اُن کو کفر سے روک دے، یا ایمان پر مجبور کر دے، اللہ کو علم ہے ان کا، جو آسمان و زمین میں ہیں ذاتاً و حالاً و استحقاقاً۔ ان میں سے جس کو چاہتا ہے، نبوت کے لیے اختیار کرتا ہے۔ اس میں رد ہے قریش پر کہ وہ ایک یتیم ابو طالب کا نبی ہونا بعید جانتے تھے اور ننگے بھوکے لوگ اس کے ساتھی ہوں۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔[2]

میں کہتا ہوں اس عبارت کے ساتھ تعبیر بطورِ حکایت ہے کفار کی طرف سے۔ نقل کفر کفر نہ باشد، ورنہ اس کا اطلاق نبی اکرم ﷺ پر جائز نہیں۔ یہاں تک کہ بعض مالکیہ نے اس قول کے کہنے والے کو قتل کرنے کا فتویٰ دیا ہے۔ (كما في الشفاء) امام بیضاوی رحمہ اللہ کو چاہیے تھا کہ اس عبارت کو چھوڑ دیتے۔ پھر جو فضیلت ایک نبی کو دوسرے نبی پر ہے، اس کی بنیاد اللہ تعالیٰ کے علم پر ہے، وہ جانتا ہے کہ کس کا رُتبہ بلند اور کون اس سے کم ہے اور کس کو مزید خصوصیت کا استحقاق ہے بوجہ تکثیرِ فضائل و فواضل۔ لہٰذا ہر کسی کو اس کے حال کے اندازے سے خاص کرتا ہے، مراد فضائلِ نفسانیہ ہے اور علائقِ جسمانیہ سے پاکیزگی ہے، نہ کہ مال اور متبعین کی کثرت، حتیٰ کہ داود علیہ السلام کی بزرگی اور شرفِ وحی کتاب کی وجہ سے ہے نہ کہ بادشاہی حاصل ہونے کی وجہ سے۔ یا اس میں اشارہ ہے نبی اکرم ﷺ کی فضیلت کا۔

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٣٦)
[2] تفسير البيضاوي (٣/ ٤٥٢)

نبی مکرم ﷺ جب اپنے ارتفاعِ درجات کا ذکر کرتے تو کافر منکر ہوتے، اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اُن کے انکار کو دفع کیا ہے اور یہ بات ثابت کی کہ تم نبی مکرم ﷺ کی فضیلت کا انکار کرتے رہو، جس طرح ہم نے اُن کو قرآن دیا ہے، داود علیہ السلام کو زبور دی تھی۔ اس میں فضیلت کی وجہ کی دلیل ہے کہ آپ خاتم الانبیا ہیں اور آپ کی اُمت خیرِ اُمم ہے، کیوں کہ یہ بات زبور میں لکھی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ﴾ [الأنبياء: ١٠٥] ''اور بلاشبہ ہم زبور میں نصیحت کے بعد یہ لکھ چکے ہیں کہ بے شک میرے بندے زمین کے وارث ہوں گے۔''

پس اس سے مراد نبی مکرم ﷺ اور آپ کی اُمت ہے۔ تخصیصِ کتاب داود علیہ السلام کے ساتھ ذکر کی، اس لیے کہ یہود یہ اعتقاد کرتے تھے کہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد نہ کوئی نبی ہے اور نہ تورات کے بعد کوئی کتاب۔ اللہ تعالیٰ نے زبور کا ذکر کر کے ان کو جھٹلایا۔ لفظِ زبور کسی جگہ ~~معرفہ آیا ہے~~ اور کہی جگہ نکرہ۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: ہم اسی طرح یہ کہا کرتے ہیں کہ زبور ایک دعا ہے جو اللہ تعالیٰ نے داود علیہ السلام کو سکھائی اور یہ اللہ تعالیٰ کی تحمید و تمجید ہے۔ اس میں حلال و حرام کا بیان نہیں ہے اور نہ فرائض ہی کا بیان ہے اور نہ حدود و احکام کا ذکر ہے۔ امام ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا: زبور ثنا ہے اللہ پر اور دعا اور تسبیح ہے۔[1]

بات تو یہی ہے جو قتادہ اور ربیع رحمہ اللہ نے کہی۔ ہم نے بھی زبور کا مطالعہ کیا، اس کو مختلف خطبوں پر مشتمل پایا۔ داود علیہ السلام کنیسہ میں داخل ہوتے وقت اُن خطب سے اپنے رب کو مخاطب کرتے تھے۔ سب ایک سو پچاس خطبے ہیں، ہر خطبے کا نام مزمور ہے۔ بعض خطابوں میں داود علیہ السلام نے اپنے رب سے اپنے دشمنوں کی شکایت کی ہے اور اُن پر مدد چاہی ہے اور بعض میں اللہ تعالیٰ کی بزرگی، ثنا اور حمد ہے، اس بات پر کہ دشمنوں پر مدد ملی اور غلبہ حاصل ہوا۔ خطبہ پڑھتے وقت قیثارہ بجاتے تھے، یہ آلاتِ ملاہی میں سے ایک آلہ ہے۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے اس جگہ درِ منثور میں ایک جماعتِ سلف سے روایات نقل کی ہیں، اُن میں الفاظِ زبور کا ذکر ہے،[2] جس پر اُن کو وقوف حاصل ہوا۔ ان کے ذکر کا کوئی زیادہ فائدہ نہیں ہے، چنانچہ قرآنِ مجید میں موجود مواعظ و زواجر نے ان الفاظ وغیرہ سے مستغنی کر دیا ہے۔[3]

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ۝٥٦ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ۭ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ۝٥٧

کہہ دیجیے: انھیں پکارو جنھیں تم اس کے سوا (معبود) سمجھتے ہو، نہ تو وہ تم سے کسی تکلیف کو ہٹانے کا کوئی

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٣٥) [2] الدر المنثور (٥/ ٣٠٣۔ ٣٠٥) [3] فتح البيان (٧/ ٤٠٦۔ ٤٠٩)

اختیار رکھتے ہیں اور نہ (اسے) بدلنے ہی کا⑮ جنھیں یہ (مشرک) لوگ پکارتے ہیں وہ تو خود اپنے رب تک پہنچنے کا وسیلہ ڈھونڈتے ہیں کہ ان میں سے کون (اللہ سے) قریب تک (ہوسکتا) ہے، اور وہ اس کی رحمت کی اُمید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ بلاشبہہ آپ کے رب کا عذاب ڈرنے کی چیز ہے⑰

مشرکوں کے معبود نفع ونقصان کی قدرت نہیں رکھتے:

یعنی جن کو کافر پوجتے ہیں، وہ آپ ہی اللہ کی جناب میں وسیلہ ڈھونڈتے ہیں کہ جو بندہ بہت نزدیک ہو، اسی کا وسیلہ پکڑیں اور وسیلہ سب کا پیغمبر ہے، آخرت میں انھی کی شفاعت ہوگی۔

اللہ کے علاوہ سے مراد بت اور شریک ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم اُن کی طرف رغبت کرو، اُن کو تکلیف دور کرنے کا بالکل کچھ اختیار نہیں ہے اور نہ یہ تمھاری بلا کسی اور کے حوالے کر سکتے ہیں۔ معنی یہ ہوئے کہ وہ شخص جس کو یہ قدرت ہے، وہ اللہ وحدہ لا شریک ہے، اسی کی مخلوق ہے اور اسی کا حکم ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اہلِ شرک کہتے تھے کہ ہم فرشتوں، مسیح علیہ السلام اور عزیر علیہ السلام کی عبادت کرتے ہیں۔[1]

اللہ تعالیٰ نے کہا کہ یہ کسی شے کے مالک نہیں ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس اُمت کے مشرک نام کے مسلمان بھی اس کام میں اہلِ شرک کے ہم صفیر ہیں۔ یہ اولیا اور صلحا کو پوجتے ہیں اور مردوں کی نذر و نیاز و منت مانتے ہیں اور جیسا عقیدہ ملائکہ، مسیح علیہ السلام، عزیر علیہ السلام، اصنام، انداد اور اوثان کے بارے میں مشرکین کا تھا، ویسا ہی ان کا عقیدہ پیر، فقیر، شہید، ولی وغیرہم کے حق میں ہے، یعنی ان کو نفع دینے والا، نقصان دینے والا، متصرف (بااختیار) اور تکلیف دور کرنے والا، بھلائی دینے والا، مطلب پورا کرنے والا اور مراد برلانے والا اعتقاد کرتے ہیں۔ فما أشبه الليلة بالبارحة.

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ کچھ لوگ، جو جنوں کو پوجتے تھے، اسلام لے آئے، متبعینِ وسیلہ سے وہی مراد ہیں۔ دوسری روایت میں ہے کہ وہ جن جن کو یہ لوگ پوجتے ہیں، اُن میں سے کچھ مسلمان ہو گئے تھے اور اُن لوگوں نے اُن کے دین کے ساتھ تمسک کیا۔ تیسری روایت ہے کہ یہ آیت عرب کے کچھ لوگوں کے حق میں اُتری، وہ جنوں کے عابد تھے۔ وہ جن مسلمان ہو گئے اور اُن کے یہ عابد اُن کے اسلام سے بے خبر تھے۔ روایت کے چوتھے الفاظ یہ ہیں کہ یہ جن فرشتوں کی ایک صنف تھے، لوگ ان کی عبادت کرتے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ مراد عیسیٰ، مریم اور عزیر علیہم السلام ہیں۔

دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ عیسیٰ اور عزیر علیہما السلام مہر و ماہ ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ اور ملائکہ ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول اختیار کیا ہے، بدلیل ﴿ يَبْتَغُونَ إِلَىٰ رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ ﴾ اور اس کی تعبیر ماضی سے

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٤٧١)

نہیں ہوتی تو اس میں عیسیٰ اور عزیر علیہم السلام و ملائکہ داخل نہیں ہیں۔ پھر کہا: وسیلہ سے مراد قربت ہے۔ یہی امام قتادہ رحمہ اللہ کا بھی قول ہے،[1] لہٰذا فرمایا: ﴿ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ ﴾ رحمت کی اُمید اور عذاب کے خوف کا ذکر اس لیے کیا کہ عبادت بغیر خوف اور اُمید کے مکمل نہیں ہوتی۔ خوف کی وجہ سے آدمی ممنوعہ چیزوں سے باز رہتا ہے اور اُمید کی وجہ سے کثرتِ اطاعت کرتا ہے۔ اللہ کا عذاب اس لائق ہے کہ اس سے ڈرا جائے اور خوف کھایا جائے کہ کہیں واقع نہ ہو جائے۔ عیاذا باللّٰہ.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ آیتِ باب مشرکین کے ایک گروہ کا رد کرتی ہے جو تماثیل کے عابد تھے، یعنی ملائکہ کی صورتوں کی پوجا کرتے تھے اور اہلِ کتاب کے ایک گروہ کا رد ہے جو عیسیٰ، مریم اور عزیر علیہم السلام کی اُلوہیت کے قائل تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا کہ تم اُن لوگوں سے کہہ دو کہ جن کو تم اللہ کے سوا معبود اعتقاد کرتے ہو، اُن کو بلاؤ۔ بعض نے کہا کہ جنوں کے کچھ نفر مراد ہیں جن کی عبادت کرتے تھے، لیکن ہم نے آیت کی تخصیص اُن کے ساتھ کی جن کا ذکر کیا گیا اللہ کے اس قول کی دلیل سے: ﴿ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ ﴾ (آیتِ باب) کیوں کہ یہ بات جمادات کے لائق نہیں ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔[2]

پھر فرمایا کہ ان معبودات کو نقصان دور کرنے اور بلا کو کسی اور طرف منتقل کرنے کا کچھ اختیار نہیں ہے، یہ کیا کر سکتے ہیں۔ وہ معبودِ برحق جو تکلیف کو دور کرنے والا اور تکلیف کو ایک حال سے دوسرے حال کی طرف پھیرنے والا ہے وہ اللہ تعالیٰ ہے۔ اب واجب ہے کہ ان معبودین کو الٰہ نہ سمجھا جائے اور ان کی پرستش عمل میں نہ آئے پھر ان کا منتقل کرنے کا کچھ اختیار نہیں ہے، یہ کیا کر سکتے ہیں۔ وہ معبودِ برحق کی طرف مفتقر (محتاج) ہونا بہ طورِ تاکید ذکر فرمایا کہ یہ خود وسیلہ کی تلاش میں ہیں، وہ وسیلۂ اطاعت اور عبادت کے ذریعے قرب حاصل کرنا ہے، یعنی اللہ کی طرف تضرع کرنے والے ہیں ایسی شے کی طلب کے لیے جو اُن کو اُن کے رب سے نزدیک کر دے، اس صورت میں وہ دوسروں کے نفع اور ضر پر کب قادر ہو سکتے ہیں۔ ؎

پیر خود درماندہ شفاعت کجا

[پیر خود ہی عاجز ہے، شفاعت کس طرح کر سکتا ہے؟!]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: « سَلُوا اللّٰهَ لِيَ الْوَسِيْلَةَ، قَالُوْا: وَمَا الْوَسِيْلَةُ؟ قَالَ: اَلْقُرْبُ مِنَ اللّٰهِ » [اللہ تعالیٰ سے میرے لیے وسیلے کا سوال کرو، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: وسیلہ کیا چیز ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا قرب] پھر یہ آیت پڑھی۔[3] وہ معبودین اس تلاش میں ہیں کہ اُن میں کون شخص

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٤٧٢۔ ٤٧٥) [2] تفسير الطبري (١٧/ ٤٧٢) [3] الدر المنثور (٥/ ٣٠٦)

اللہ کی طرف اقرب باوسیلہ ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ کی طرف عملِ صالح سے تقرب کرتے ہیں،[1] یا کسی ایسی چیز کی جستجو میں ہیں جو اقرب الوسیلہ ہو۔ پھر اُن کا ذکر کیا ہے جو درجے میں ان سے کم ہیں۔ بعض نے کہا کہ "ابتغاء" سے مراد حرص ہے، یعنی اطاعت اور عبادت کے ذریعے تقرب حاصل کرنے کے حریص ہیں اور اللہ کی رحمت کے اُمیدوار اور اس کے عذاب سے ترساں ولرزاں (خوف زدہ) جس طرح کہ اور سب لوگ عذاب کا ڈر رکھتے ہیں تو پھر اُن کے بارے میں یہ گمان کرنا کہ وہ آلہ ہیں کیا معنی رکھتا ہے۔ معبود کی شان تو یہ ہوتی ہے کہ وہ بالکل غنی ہوتا ہے اور یہ تو تمام لوگوں کی طرح قربت کے محتاج ہیں۔ جیسی حاجت رب العالمین کی طرف ان کے عابدین کو ہے، ویسی ہی حاجت ان معبودین کو ہے کہ ہر دم اُمید اور خوف لگا رہتا ہے اور کیوں نہ لگا رہے کہ رب کا عذاب ڈرنے ہی کے لائق ہے، ملائکہ اور انبیا وغیرہم سب اللہ سے ڈرتے ہیں۔[2]

دراں دم کہ از فعل پرسند و قول — اولو العزم را تن بلرزد ز ہول
بجائے کہ دہشت خورند انبیا — تو عذر گنہ ہاں چہ داری بیا

[انسان کے اعمال و اقوال کے متعلق جب سوال ہوگا تو اس وقت عالی ہمت لوگ بھی خوف کی وجہ سے کانپنے لگیں گے، جس جگہ نبی بھی خوف زدہ ہوں تو گناہوں کے لیے کیا بہانہ پیش کرے گا، لا پیش کر]

وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ﴿۵۸﴾

اور کوئی بستی ایسی نہیں جسے ہم یومِ قیامت سے پہلے ہلاک نہ کریں یا اسے شدید عذاب نہ دیں، یہ کتاب (لوحِ محفوظ) میں لکھا ہوا ہے (58)

قیامت سے پہلے کفار کی تمام بستیاں ہلاک ہو کر رہیں گی:

یعنی تقدیر میں لکھ چکے ہیں۔ ہر شہر کے لوگ ایک کو بزرگ ٹھہرا کر پوجتے ہیں کہ ہم اس کی رعیت ہیں اور اس کی پناہ میں ہیں۔ سو وقت آنے پر کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔

اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ لوحِ محفوظ میں یہ بات حتمی طور پر لکھی جا چکی ہے اور واجب ہو چکا ہے کہ ہر قریہ عن قریب ہلاک ہوگا اور برباد ہوگا، اس کے سارے لوگ ہلاک ہو جائیں گے اور اُن پر عذابِ شدید نازل ہوگا، جیسے: قتل یا ابتلا اور اُن کی یہ ہلاکت اور عذاب اُن کے گناہوں اور خطاؤں کے سبب سے ہوگا جس طرح کہ گذشتہ اُمتوں کے

[1] معاني القرآن (٣/ ٢٤٦) [2] فتح البيان (٧/ ٤٠٩۔ ٤١٠)

حالات بیان فرمائے ہیں: ﴿ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ﴾ [هود: ١٠١] ''اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا، لیکن انھوں نے (خود ہی) اپنے آپ پر ظلم کیا تھا۔'' نیز فرمایا: ﴿ فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا ﴾ [الطلاق: ٩] ''بالآخر (ان بستیوں نے) اپنے کرتوتوں کا وبال چکھا اور اُن کے کرتوتوں کا انجام خسارہ ہی تھا۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ ﴾ [الطلاق: ٨] ''اور کتنی ہی بستیاں ہیں جنھوں نے اپنے رب اور اس کے رسولوں کے حکم سے سرکشی کی۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ہر کافر بستی کو ہم قیامت سے قبل موت سے یا ویرانی سے یا عذاب سے ہلاک کریں گے، جو اُن کا قیامت سے پہلے استیصال کر دے گا۔ اس لیے کہ جو قیامت کے دن کی ہلاکت ہوگی وہ کچھ کافر بستی کے لیے خاص نہیں ہوگی، بلکہ دنیا کی عمر ختم ہو جانے کے سبب سے ہر بستی کو شامل ہے۔ عذابِ شدید سے مراد قتل اور طرح طرح کے عذاب ہیں، اُن کے کفر اور نافرمانی پر، یا ہلاک ہونا قریہ صالحہ کے لیے ہے اور طالحہ (بد کردار) کے حق میں عذاب۔ لیکن پہلی بات زیادہ مناسب ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے پیشِ نظر: ﴿ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ﴾ [القصص: ٥٩] ''اور ہم بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہیں، مگر (اسی وقت) جب کہ ان کے باشندے ظالم ہوں۔''

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جب کسی بستی میں زنا ظاہر ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی ہلاکت کا حکم دے دیتا ہے۔[1] تفسیر مدارک میں امام ضحاک رحمہ اللہ سے ہر مخصوص بستی اور معین شہر کی بربادی کا ایک خاص قسم کے عذاب اور مخصوص قسم کی ہلاکت کے سبب سے ہونا نقل کیا ہے۔[2] وہ کچھ مرفوع نہیں ہے کہ اس پر اعتماد کیا جائے۔ قرآنی نظم اُن واقعات کی، جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، تفصیل بیان کرنے سے مستغنی ہے۔ واللہ أعلم۔ یہ ہلاکت اور بستیوں کا عذاب لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔[3] (قاله إبراهيم التيمي)

سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: « إِنَّ أَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمَ فَقَالَ لَهُ: اُكْتُبْ فَقَالَ: مَا أَكْتُبُ؟ قَالَ: أُكْتُبِ الْقَدَرَ وَمَا هُوَ كَائِنٌ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ إِلَى الْأَبَدِ »[4] (أخرجه الترمذي) [اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا تو اسے حکم دیا کہ لکھو، اس نے عرض کی: کیا لکھوں؟ فرمایا: تقدیر لکھو اور ہر وہ چیز لکھو جو قیامت تک ہونے والی ہے] اور یہ بات تو تجربہ اور کتبِ تاریخ سے بہ خوبی ثابت ہے کہ آدم ابو البشر علیہ السلام کے زمانے سے جتنے قریے وقتاً فوقتاً آباد ہوئے وہ وقتاً فوقتاً مشیتِ الٰہی اور اللہ کی حکمتِ بالغہ کے سبب سے زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ہلاک ہوتے رہے، ہر زمانے میں اُجڑی ہوئی بستیوں کا نشان پایا جاتا ہے اور جن اُمتوں نے انبیا اور رسولوں

---

[1] تفسير البغوي (٥/ ١٠١) [2] تفسير النسفي (٢/ ٤٥٨۔ ٤٥٩) [3] الدر المنثور (٥/ ٣٠٦)

[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٥٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٠١٧) فتح البيان (٧/ ٤١٠۔ ٤١١)

کی تکذیب کی وہ طرح طرح کے عذاب میں مبتلا ہوکر برباد ہوگئیں اور ہر صدی پر ایک طرح کی بڑی تبدیلی امورِ دین و دنیا میں ہوتی رہی ہے اور ہر ہزار برس کے بعد دنیا کی حالت بدل جاتی ہے، پھر کبھی یہ تبدیلی اس طرح پر ہوتی ہے کہ ہر شخص اس کو جان لیتا ہے اور کبھی یہ تبدیلی اس طرح پر ہوتی ہے کہ عقل مند لوگوں کے علاوہ اور لوگ اس کو نہیں سمجھ سکتے۔

اس وقت ہجرت کی تیرھویں صدی ختم ہو کر چھے برس سے چودھویں صدی شروع ہوئی ہے، اہلِ علم و عقل سمجھ سکتے ہیں کہ گذشتہ حالت کی نسبت موجودہ حالت میں کس قدر بڑی تبدیلی پیدا ہوگئی ہے، اسلام گرچہ ایک عرصۂ دراز سے غربت کا ہم دست و گریبان تھا اور ہجرت کے ایک ہزار سال بعد اس میں نہایت درجے کا ضعف آ گیا ہے، لیکن کسی قدر راہ و رسمِ اسلام اور شرعی صورت، جو اہلِ اسلام میں تیرھویں صدی میں باقی تھی، وہ بھی اب ناپید ہوگئی ہے۔ اب تجربہ شناسوں کو معلوم ہوگیا ہے کہ نام کا اسلام بھی زوال پذیر ہوگیا ہے اور اسی میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا ہے۔ کام کا اسلام تو گذشتہ صدی میں بھی بہت کم ایک عجوبہ کے طور پر تھا۔

قیامت کی چھوٹی نشانیاں تو ایک مدتِ دراز سے ظاہر ہو چکی ہیں، اب بڑی نشانیوں کے ابتدائی آثار نظر آتے ہیں، یہ وہ وقت ہے کہ صحیح عقیدہ و عمل پر قائم رہنا انگارے کو ہاتھ میں لینا ہے۔ غیروں اور کفار کا ذکر نہیں، خود مسلمانوں کے اندر اس قدر دوری، اختلاف، حسد، نفاق اور اخلاقِ ذمیمہ گھس آئے ہیں، جو احاطۂ ضبط و تحریر و اصلاح سے خارج ہے۔ "کل نفس و دینها" کا مصداق ظاہر ہوگیا ہے۔ اصل دین جو اتباعِ کتاب و سنت و اقتداے سلف صالح اور عدمِ اختلاف، اجتماعیت اور باہمی اُلفت و محبت تھا، بالکل روپوش ہوگیا۔ کفر و نفاق کا اظہار کرنا اظہارِ اسلام کی طرح محمود اور ممدوح ٹھہر گیا ہے۔ تقویٰ و طہارت کا اختیار کرنا اور علومِ شریعت سے آگاہی حاصل کرنا، ناپسندیدہ عیب سمجھا جانے لگا ہے۔ مدارس بے حساب جاری ہیں اور تحصیلِ علوم سے عاری مساجد کثرت سے آباد ہیں اور ہدایت سے ویران نکاح ہوتے ہیں، لیکن حرام کاری کی گرم بازاری اور تجارت کا زور و شور ہے، مگر اموال کے حلال و حرام سے کچھ واسطہ نہیں۔

فروعی مسائل پر تالیفات اور مسائل پر رسائل بہ کثرت ہیں، لیکن حق کو حق کہنے اور سچائی کا اختیار کرنے سے کچھ سروکار نہیں۔ بالجملہ مفاسدِ جہل و تعصب اور مصائبِ غربتِ دین اور ندرتِ مسلمین اس قدر ہیں کہ ان کا شمار نہیں ہوسکتا۔ ﴿ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا ﴾ [الأحزاب: ٣٨] "اور اللہ کا حکم ایک شدہ فیصلہ ہوتا ہے۔" اسلام لوگوں کے لیے مضحکہ ٹھہرا ہے، اسلام کی عزت و ناموس کو ترک کر دینا، حرام کھانا، فسق و فجور اختیار کرنا اور گناہوں میں ملوث رہنا، ہر خاص و عام کا شیوہ ہوگیا ہے۔ آفات کا اس قدر ہجوم ہے کہ اگر کوئی غریب صحیح الاعتقاد مسلمان یا مومن یہ چاہے کہ صحبتِ بد سے بچے اور فاسقوں اور فاجروں کے خلفشار اور زبان درازی سے محفوظ رہے تو ممکن نہیں، بلکہ یہ امر محال ہوگیا ہے۔ جلوت کجا خلوت و عزلت بھی نہیں بنتی اور نہ کوئی کسی کو خاموش ہو کر بیٹھنے دیتا ہے۔ فإنا لله و إنا إليه راجعون۔

ایسی حالت میں جس میں ملال ہی ملال ہے، مومن کے لیے زمین کا بطن اس کی پشت سے بہتر ہے۔ نسأل اللہ العافیة هاهنا وهناك.

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ؕ
وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ؕ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ
اِلَّا تَخْوِيْفًا ﴿۵۹﴾

اور ہمیں نشانیاں بھیجنے سے صرف اس چیز نے روکا ہے کہ پہلے لوگوں نے ان کو جھٹلایا تھا اور ہم نے ثمود کو ایک اونٹنی (بطور) واضح نشانی دی تھی، پھر انھوں نے اس پر ظلم کیا اور ہم تو صرف ڈرانے کے لیے نشانیاں بھیجتے ہیں ﴿59﴾

منہ مانگی نشانیاں نہ بھیجنے کا سبب:

یعنی ہدایت صرف نشانی پر ہی موقوف نہیں۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مشرکین نے کہا تھا کہ اے محمد! تم کو یہ زعم ہے کہ تم سے پہلے پیغمبر آئے تھے، اُن میں کسی کے لیے ہوا مسخر تھی اور کوئی مردے کو زندہ کرتا تھا۔ اگر تم کو یہ بات پسند ہے کہ ہم تم پر ایمان لائیں اور تمھاری تصدیق کریں تو تم اپنے رب سے دعا کرو کہ یہ صفا کا پہاڑ ہمارے لیے سونے کا ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے وحی کی کہ ہم نے اُن کی بات سنی، اگر تم چاہو کہ ہم ایسا ہی کر دیں جیسا کہ یہ لوگ چاہتے ہیں تو کر دیں گے، لیکن اگر اس پر بھی یہ ایمان نہ لائے تو عذاب نازل ہوگا۔ آیت کے نزول کے بعد پھر کوئی مناظرہ نہ رہے گا اور اگر تم چاہو کہ میں تمھاری قوم کے حق میں دیر کروں تو دیر کروں گا۔ کہا: اے رب! میں اُن کے لیے دیر چاہتا ہوں۔ امام قتادہ اور ابن جریج رحمہما اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ مکہ والوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ تم کوہِ صفا کو سونے کا کر دو اور یہاں کے پہاڑ سرک جائیں، ہم اس جگہ کھیتی کریں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا: اگر تم چاہو تو اُن کے لیے تاخیر کی جائے اور اگر چاہو تو اُن کا سوال اُن کو مل جائے، لیکن اگر پھر بھی کفر کیا تو جس طرح اگلی اُمتیں ہلاک ہوگئی ہیں، اسی طرح یہ بھی ہلاک کر دیے جائیں گے۔ کہا: نہیں، بلکہ میں اُن کے لیے تاخیر چاہتا ہوں، اس پر یہ آیت اُتری۔[2] (رواه أحمد و النسائي)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے دوسرے الفاظ ہیں کہ قریش نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کرو کہ وہ کوہِ صفا کو ہمارے لیے سونے کا بنا دے، ہم تجھ پر ایمان لے آئیں گے۔ فرمایا: کیا تم ایسا کرو

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٤٧٧)

[2] مسند أحمد (١/ ٢٥٨) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٨٠) مستدرك الحاكم (٢/ ٣٩٤) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

گے؟ کہا: ہاں! نبی اکرم ﷺ نے دعا کی، جبریل علیہ السلام نے آ کر کہا: تیرا رب تجھ کو سلام کہتا ہے اور فرماتا ہے کہ اگر تو چاہے تو صفا اُن کے لیے سونے کا ہو جائے، لیکن اس کے بعد اُن میں سے جو کافر ہوگا، اس کو وہ عذاب کروں گا، جو سارے جہان میں کسی کو نہ کیا ہوگا اور اگر تو چاہے تو اُن کے لیے توبہ اور رحمت کے دروازے کھول دوں۔ کہا: بلکہ یہی دروازے توبہ اور رحمت کے کھول دے۔[1]

سیدنا زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت اُتری: ﴿ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴾ [الشعراء: ۲۱۴] ''اور آپ اپنی قریبی رشتے داروں کو ڈرائیں۔'' تو نبی اکرم ﷺ نے کوہِ ابوقبیس پر چڑھ کر پکارا، اے آلِ عبد مناف! میں ڈرانے والا ہوں، قریش آئے، اُن کو تحذیر کی اور ڈرایا، انھوں نے کہا: تجھ کو زعم ہے کہ تجھے وحی آتی ہے، سلیمان علیہ السلام کے لیے ہوا اور پہاڑ مسخر تھے، موسیٰ علیہ السلام کے لیے دریا مسخر ہو گیا تھا اور عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ سے دعا کر کہ اُن پہاڑوں کو یہاں سے سرکا دے اور زمین میں ہمارے لیے نہریں جاری کر دے، ہم زراعت کریں اور کھائیں، ورنہ یہ دعا کر کہ ہمارے مردوں کو زندہ کر دے، ہم اُن سے بات کریں اور وہ ہم سے بات کریں، ورنہ یہ دعا کر کہ یہ پتھر جو تیرے نیچے ہے، سونے کا ہو جائے، ہم اس میں سے سونا تراش لیا کریں اور تو ہم کو سردیوں اور گرمیوں کے سفر سے بے نیاز کر دے۔ اتنے میں نبی اکرم ﷺ پر وحی آئی، فرمایا: « وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ لَقَدْ أَعْطَانِيْ مَا سَأَلْتُمْ، وَلَوْ شِئْتُ لَكَانَ، وَلٰكِنَّهُ خَيَّرَنِيْ بَيْنَ أَنْ تَدْخُلُوْا بَابَ الرَّحْمَةِ فَيُؤْمِنُ مُؤْمِنُكُمْ وَبَيْنَ أَنْ يَّكِلَكُمْ إِلٰى مَا اخْتَرْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ، فَتَضِلُّوْا عَنْ بَابِ الرَّحْمَةِ فَلَا يُؤْمِنَ مِنْكُمْ أَحَدٌ، فَاخْتَرْتُ بَابَ الرَّحْمَةِ، فَيُؤْمِنُ مُؤْمِنُكُمْ وَأَخْبَرَنِيْ أَنَّهُ إِنْ أَعْطَاكُمْ ذٰلِكَ ثُمَّ كَفَرْتُمْ، أَنَّهُ يُعَذِّبُكُمْ عَذَابًا لَا يُعَذِّبُهُ أَحَدًا مِنَ الْعَالَمِيْنَ » [اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ تم نے جو کچھ مجھ سے طلب کیا تھا، مجھے اس کے ہو جانے میں اور اس بات میں کہ دروازۂ رحمت میں چلے جاؤ اختیار دیا گیا کہ ایمان و اسلام کے بعد تم رحمتِ الٰہی سمیٹ لو یا تم یہ نشانات دیکھ لو، لیکن پھر نہ مانو تو گمراہ ہو جاؤ اور رحمت کے دروازے تم پر بند ہو جائیں۔ تو میں تو ڈر گیا اور میں نے درِ رحمت کا کھلا ہونا ہی پسند کیا، کیوں کہ دوسری صورت میں تمھارے ایمان نہ لانے پر تم پر وہ عذاب اترتے جو تم سے پہلے کسی پر نہ اترے ہوں] اور یہ آیتِ باب نازل ہوئی، پھر تین آیتیں پڑھیں اور یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی: ﴿ وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ﴾ [الرعد: ۳۱] ''اور اگر بلاشبہ (قرآن ایسا ہوتا) کہ اس کے ذریعے سے پہاڑ چلائے جاتے یا اس سے زمین قطع کی جاتی یا اس سے مردے بلوائے جاتے (تو بھی کفار ایمان نہ لاتے) بلکہ سارا معاملہ (اختیار) اللہ

[1] مسند أحمد (۱/ ۲۴۲) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (۳۳۸۸)

ہی کے پاس ہے۔“[1]

لہٰذا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نشانیاں اُن کی فرمایش کے مطابق بھیج سکتے ہیں، یہ بات ہم پر سہل اور آسان ہے، لیکن اسی طرح اگلوں نے نشانیاں مانگی تھیں، جب وہ نشانیاں آئیں تو انھوں نے جھٹلایا۔ ہماری عادت ایسے معاملات میں یوں جاری ہے کہ جو کوئی نشانی مانگ کر، پھر وہ نشانی آ جانے کے بعد ایمان نہیں لاتا تو ہم اُن کے عذاب میں تاخیر نہیں کرتے، ہماری یہی عادت اُن کے حق میں تھی اور جو لوگ اُن جیسے ہیں، اُن کے حق میں بھی جاری رہے گی، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [المائدة: ١١٥] ”اللہ نے فرمایا: بے شک میں وہ دسترخوان تم پر نازل کروں گا، پھر اس کے بعد تم میں سے جو شخص کفر کرے گا تو میں یقیناً اسے ایسا عذاب دوں گا کہ ویسا عذاب دنیا بھر میں کسی اور کو نہیں دوں گا۔“

اسی طرح ثمود نے ناقہ (اونٹنی) کا سوال کیا تھا کہ خاص اس پتھر سے ایک اونٹنی نکلے۔ صالح علیہ السلام نے دعا کی اللہ تعالیٰ نے ناقہ کو اس پتھر سے نکالا، ان کا سوال پورا ہوا، لیکن جب انھوں نے کفر نہ چھوڑا اور رسول کی تکذیب کی اور ناقے کو مار ڈالا، تب اللہ تعالیٰ نے کہا: ﴿ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ﴾ [هود: ٦٥] ”تم اپنے گھروں میں تین دن فائدہ اُٹھا لو۔ یہ ایسا وعدہ ہے جس میں جھوٹ نہیں بولا گیا۔“ غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ نے وہ ناقہ اس لیے نکالا تھا کہ اللہ کی وحدانیت اور خالق کی اُلوہیت و ربوبیت، رسول کی صدقِ رسالت اور قبولِ دعائے نبی پر دلیل ہو، لیکن جب ثمود نے انکار کیا اور ناقہ کو پانی سے روکا اور اس کی کھونچیں کاٹ ڈالیں تو اللہ تعالیٰ نے اول سے آخر تک اس قوم کو نیست و نابود کر دیا اور عزیز مقتدر کا سا پکڑنا پکڑ لیا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نشانی بھیج کر لوگوں کو ڈراتا ہے کہ شاید عبرت پکڑیں اور کچھ سوچیں سمجھیں اور لوٹ جائیں۔

حکایت:

۱۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے عہد میں کوفے میں زلزلہ آیا، کہا: ”أيها الناس! إن ربكم يستعتبكم“، یعنی اے لوگو! تمھارا رب تم سے رجوع اور توبہ کروانا چاہتا ہے، تم تائب و معتذر بنو۔[2] اللهم غفرا.

۲۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مدینہ منورہ میں کئی بار بھونچال آیا، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”أحدثتم والله لئن عادت لأفعلن ولأفعلن“، یعنی تم نے کوئی بدعت نکالی ہے، جس کی وجہ سے یہ زلزلہ ہوا، اگر پھر زلزلہ آیا تو میں تم کو سمجھ لوں گا، یعنی تمھارے احداث پر تم کو تعزیر کروں گا۔[3]

غرض یہ کہ زلزلے کا آنا احداث (بدعت) وعصیان کی وجہ سے ٹھہرایا، یہ کامل قوتِ ایمانی ہے۔ اسی طرح

[1] مسند أبي يعلىٰ (٢/ ٤٠) اس کی سند میں ”عبدالجبار بن عمر“ ضعیف راوی ہے۔

[2] تفسير الطبري (١٧/ ٤٧٨) [3] تفسير ابن كثير (٣/ ٦٨)

نبی مکرم ﷺ نے متفق علیہ حدیث میں چاند اور سورج کے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں، کسی کے مرنے جینے کے لیے اُن کو گرہن نہیں لگتا، لیکن اُن سے اللہ عزوجل اپنے بندوں کو ڈراتا ہے کہ تم جب گرہن دیکھو تو اللہ کا ذکر کرو، دعا اور استغفار میں مشغول ہو جاؤ۔ پھر فرمایا: اے اُمتِ محمد! اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی غیرت دار نہیں ہے، یہ کہ کوئی بندہ یا کنیز اس کی حرام کاری کرے۔ اے اُمت محمد! اگر تم جان لو، جو میں جانتا ہوں تو تم ہنسو تھوڑا اور روؤ بہت۔ [1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ربیع بن انس رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ لوگوں نے نبی مکرم ﷺ سے کہا: کاش! تم بھی کوئی نشانی لاتے، جس طرح کہ صالح علیہ السلام اور دوسرے نبی لائے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تم چاہو تو میں اللہ سے دعا کروں، وہ تم پر اپنی کوئی نشانی اُتارے، لیکن اگر پھر تم نافرمانی کرو گے تو ہلاک ہو جاؤ گے۔ کہا: ہم نہیں چاہتے۔ [2] (أخرجه البيهقي في الدلائل)

حاصل معنی یہ ٹھہرے کہ اس آیت سے جس کی یہ فرمایش کرتے ہیں، یہ بات مانع ہے کہ فرمایش کے ساتھ اگر تکذیب ہو تو وہ سب کو کلی طور پر ہلاک کرنے کا موجب ہوتی ہے، یعنی پھر استیصال (بالکلیہ خاتمہ) ہو جاتا ہے اور ہم نے یہ عزم کیا ہے کہ ہم اُمتِ محمد ﷺ کو قیامت کے دن تک باقی رکھیں۔ بعض نے کہا کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ کفارِ قریش اور اُن جیسے دوسرے لوگ اپنے آبا کے مقلد ہیں۔ یہ البتہ ایمان نہیں لائیں گے، جس طرح کہ وہ ایمان نہیں لائے تو نشانیوں کا بھیجنا ضائع ہوگا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس پر صالح علیہ السلام کے ناقہ کے قصے سے استشہاد کیا کہ انھوں نے اس ناقہ کی فرمایش کی تھی، جب اللہ تعالیٰ نے اس کو ظاہر کر دیا تو ایمان نہ لائے اور عذاب سے نیست و نابود ہوگئے۔ قومِ صالح علیہ السلام کی اس جگہ تخصیص اس لیے فرمائی کہ بلادِ عرب میں اُن کی ہلاکت کے آثار قریش سے قریب تر تھے۔ اُن میں سے ہر آنے جانے والا اپنی آنکھ سے اُن آثار کو دیکھتا تھا۔ ناقۂ مذکور کو مبصر فرمایا، یعنی وہ ذاتِ ابصار تھا، لوگ اس کو آنکھوں سے دیکھتے تھے۔

قومِ ثمود نے اس نشانی کی تکذیب کی اور انکار کرنے والے کافر اور منکر ہوئے، تب اللہ تعالیٰ نے اُن کی سزا میں جلدی کی اور اس جگہ کہا کہ نشانیوں کو بھیجنے سے غرض خوف دلانا ہے، اس عذاب کے نازل ہونے سے جو نیست و نابود کرنے والا ہے کہ اگر نشانی دیکھ کر بھی نہ ڈریں گے تو عذاب اُترے گا، خواہ وہ نشانی وہ ہو، جس کی فرمایش کی گئی ہو یا فرمایش نہ کی گئی ہو، جیسے معجزات اور آیاتِ قرآن۔ بعض نے کہا: "آیٰت" سے مراد عبرتیں اور معجزات ہیں، جو اللہ نے رسولوں کے ہاتھ پر ڈرانے کی خاطر دلیل کے طور پر ظاہر کی تھیں کذّابین کو خوف دلانے کے لیے۔ بعض نے کہا کہ مراد آیاتِ انتقام ہیں، اس میں گناہوں پر ڈرانا ہے۔ بعض نے کہا کہ مراد حالات کو پھیرنا ہے کہ بچپن سے جوانی اور

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٩٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٠١)

[2] دلائل النبوة (٢/ ٢٧٣) یہ روایت مرسل ہے۔

جوانی سے بڑھاپا آتا ہے، تاکہ انسان حالات کی تبدیلی دیکھ کر عبرت پکڑے اور انجامِ اَمر سے ڈرے۔ کسی نے کہا کہ موتِ ذریع، یعنی مرگِ عام مراد ہے، مگر تفسیر کے مقام کی مناسبت سے لفظ آیات کی تفسیر آیاتِ مقترحہ ہے۔ واللہ أعلم۔ پھر جب اللہ نے فرمایشی نشانیوں کے بھیجنے کے انکار کا ذکر کیا تو اپنے نبی اکرم ﷺ کو نصرت اور غلبہ کا وعدہ دے کر قوی دل بنایا اور فرمایا:[1]

وَ اِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ؕ وَ مَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا
الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَ الشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ
فِي الْقُرْاٰنِ ؕ وَ نُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا ۰۶۰

اور (یاد کریں) جب ہم نے آپ سے کہا: بے شک آپ کے رب نے لوگوں کا احاطہ کر رکھا ہے اور ہم نے آپ کو (معراج میں) جو مشاہدہ کرایا، اسے لوگوں کے لیے بس ایک آزمایش ہی بنا دیا اور اس درخت (زقوم) کو بھی جس پر قرآن میں لعنت کی گئی اور ہم انھیں ڈراتے ہیں تو یہ (ڈرانا) ان کی بڑی سرکشی ہی کو زیادہ کرتا ہے (60)

معراج کا مقصد لوگوں کی آزمایش ہے:

یعنی جب کہہ دیا کہ رب نے سب لوگوں کو گھیر لیا تو آخر سب مسلمان ہوں گے، پھر تو نشانی کیوں مانگے اور وہ معراج دکھائی، اس سے لوگ جانچے گئے، بچوں نے تسلیم کیا اور کچھ نے جھوٹ جانا اور درخت پھٹکارا ہوا، یعنی درخت زقوم۔ قرآن میں فرمایا کہ دوزخ والے اُسے کھائیں گے۔ ایمان والے یقین لائے اور منکروں نے کہا کہ دوزخ کی آگ میں سبز درخت کیسے ہوگا، یہ بھی جانچنا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے تحریض کی (ترغیب دی) نبی اکرم ﷺ کے ابلاغِ رسالت پر اور خبر دی کہ ہم نے تجھ کو لوگوں سے محفوظ رکھا ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ اُن سب پر قادر ہے اور وہ اللہ کے قبضے میں ہیں اور اس کے قہر اور غلبے کے نیچے ہیں۔ امام مجاہد، عروہ بن زبیر، حسن اور قتادہ رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا ہے کہ ﴿ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ﴾ سے مراد "عصمك منهم" یعنی تجھ کو اُن سے محفوظ رکھا۔[2]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہ رؤیا آنکھ کی تھی، جو معراج کی رات نبی مکرم ﷺ کو دکھائی گئی اور شجرۂ ملعونہ زقوم ہے۔[3] (رواه البخاري و أحمد و عبد الرزاق) امام مجاہد، سعید بن جبیر، حسن، مسروق، ابراہیم، قتادہ اور ابن زید رحمہم اللہ وغیرہم نے "رؤیا" کی تفسیر شبِ معراج کے ساتھ کی ہے۔[4] احادیثِ معراج شروع سورت میں تفصیل

---

(1) فتح البيان (۷/ ۴۱۱۔ ۴۱۳) (2) تفسير الطبري (۱۷/ ۴۷۹۔ ۴۸۰)

(3) صحيح البخاري، رقم الحديث (۳۶۷۵) مسند أحمد (۱/ ۲۲۱) تفسير الصنعاني (۲/ ۳۸۰)

(4) تفسير الطبري (۱۷/ ۴۸۰۔ ۴۸۳)

سے گزر چکی ہیں۔ وللہ الحمد والمنة.

یہ بات بھی گزر چکی ہے کہ کچھ لوگ اپنے دین سے پھر گئے، اس سے پہلے وہ حق پر ہی تھے، ان کے دل اور عقلیں معراج کی تصدیق کے متحمل نہ ہو سکے۔ اس بات کو بعید جان کر تکذیب کرنے لگے۔ اور دوسروں کے لیے اللہ پاک نے واقعۂ شبِ معراج کو یقین اور ثابت قدمی کا ذریعہ کر دیا۔ لہٰذا فرمایا کہ یہ رؤیا ایک طرح کی آزمایش اور امتحان ہے۔

رہا لعنت زدہ درخت! سو نبی اکرم ﷺ نے خبر دی ہے کہ آپ نے جنت اور جہنم کو دیکھا اور تھوہر کے درخت کو دیکھا۔ لوگوں نے اس امر کو جھٹلایا، یہاں تک کہ ابوجہل ۔لعنه الله۔ نے کہا: میرے پاس کھجور اور پنیر لاؤ۔ پھر ایک کو دوسرے کے ساتھ ملا کر کھانے لگا اور کہنے لگا: کھاؤ! کہ ہم اس کے سوا کسی زقوم کو نہیں جانتے۔ اس کو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اور امام مسروق، ابو مالک، حسن بصری اور غیر واحد رحمہم اللہ نے حکایت کیا ہے۔[1] جس کسی نے رؤیا کی تفسیر شبِ معراج کے ساتھ کی ہے، اس نے شجرہ کی تفسیر تھوہر کی ہے اور بعض نے کہا کہ شجرۂ ملعونہ سے مراد بنی اُمیہ ہیں۔ یہ قول غریب اور ضعیف ہے (بلکہ محض غلط و بے اعتبار ہے اور کیا عجب ہے کہ اصل میں یہ قول روافض سے نکلا ہوا ہو۔ بنی اُمیہ میں بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم، صلحا اور تابعین ہوئے ہیں، اُن کی نسبت ایسا کلمہ سخت مکروہ ہے)۔

سہل بن سعید کہتے ہیں کہ نبی مکرم ﷺ نے دیکھا کہ بنی فلاں میرے منبر پر بندروں کی طرح جست کرتے ہیں، یہ بات نبی اکرم ﷺ کو بُری لگی، پھر مرتے وقت تک اچھی طرح نہ ہنسے اور اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے آیتِ باب اتاری۔[2] (رواہ ابن جریر و ھذا السند ضعیف جدا) اس کی سند میں محمد بن حسن بن زبالہ متروک ہے اور اس کا شیخ بالکل ضعیف ہے۔ لہٰذا ابن جریر رحمہ اللہ نے یہی بات اختیار کی ہے کہ اس رؤیا سے مراد شبِ اسراء و معراج ہے اور درخت ملعون سے تھوہر مراد ہے، کیوں کہ مفسرین کا اس پر اتفاق ہے۔[3] ﴿نُخَوِّفُهُمْ﴾ سے مراد کفار کا ڈرانا ہے، وعید و عذاب و نکال سے، لیکن جتنا ان کو ڈرایا جاتا ہے، اتنا ہی ان کا طغیان بڑھتا ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ہم نے تجھ سے کہہ دیا ہے کہ تیرا رب لوگوں کو گھیرے ہوئے ہے، یعنی سب لوگ اس کے قبضے میں اور زیرِ قدرت ہیں۔ اُن کے لیے ارادۂ الٰہی سے نکل جانے کا کوئی راستہ نہیں ہے، کیوں کہ اللہ کے احاطہ میں پڑے ہیں۔ اس جگہ ناس سے مراد اہلِ مکہ ہیں اور احاطہ سے مراد اُن کا ہلاک کرنا ہے۔ اللہ جلد اُن کو تباہ کر دے گا۔ ماضی کا صیغہ اس امر کے واقع ہونے کی حقیقت ظاہر کرنے کے لیے ہے۔ چناں چہ بدر کے دن اور فتح مکہ کے

---

[1] تفسیر الطبري (۱۷/ ۴۸۴۔ ۴۸۵)

[2] تفسیر الطبري (۱۷/ ۴۸۳) اس کی سند میں ''محمد بن حسن بن زبالہ'' اور ''عبدالمهين بن عباس'' ضعیف راوی ہیں۔

[3] تفسیر الطبري (۱۷/ ۴۸۷)

دن ایسا ہی ہوا۔ یا مراد آپ کو لوگوں کے ارادۂ قتل سے بچا لینا ہے کہ کوئی آپ کو مار نہ سکے گا اور آپ بہر حال اللہ کی رسالت پہنچا دیں گے۔ اسراء کو رؤیا اس لیے کہا کہ رات کو جانا ہوا تھا، یا اس لیے کہ کفار نے کہا کہ شاید یہ خواب ہوگا۔

فتنے سے مراد بعض مسلمین کا مرتد ہو جانا ہے، جب انھیں معراج کی خبر ملی۔ بعض نے کہا کہ یہ خواب تھا۔ نبی کریم ﷺ نے دیکھا کہ میں اپنے اصحاب کے ہمراہ مکے میں داخل ہوا ہوں، حالاں کہ اس دن مدینے میں تھے، پھر قبلِ اجل کے مکہ کو چلے، مشرکوں نے نبی مکرم ﷺ کو پھیر دیا، جانے نہ دیا۔ لوگوں نے کہا کہ نبی اکرم ﷺ پھر گئے، حالاں کہ ہم سے کہتے تھے کہ ہم مکہ میں داخل ہوں گے، پس یہ واپسی فتنے کی سبب بنی۔ کچھ مسلمان اس فتنے میں پھنس گئے۔ جب اللہ تعالیٰ نے مکہ فتح کرا دیا تو یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ﴾ [الفتح: ۲۷] ''یقیناً اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو خواب سچا دکھایا۔''

اس کا تعقب کیا ہے اس طرح پر کہ یہ آیت مکی ہے اور رؤیا مدینے میں ہوئی تھی۔ اس کا جواب دیا ہے کہ اگر یہ خواب مکہ میں دیکھا اور حقیقتاً مدینہ میں ہوا تو کچھ دور نہیں ہے، لیکن اس میں تکلف ہے۔ امام خفاجی رحمہ اللہ نے کہا کہ بعید ہے، بہ سبب قلتِ نفع کے۔[1] اور اس کو بنو اُمیہ پر محمول کرنا اور بھی زیادہ ضعیف ہے۔ بعض نے کہا کہ خواب میں مصارع (جائے قتل) قریش کو دیکھا تھا، یہاں تک کہ آپ ﷺ نے فرمایا: « وَاللّٰهِ لَكَأَنِّيْ أَنْظُرُ إِلٰى مَصَارِعِ الْقَوْمِ » [اللہ کی قسم! میں اس قوم (کے قتل ہونے والوں) کی گرنے کی جگہیں دیکھ رہا ہوں] اور آپ زمین کی طرف اشارہ کرتے تھے اور کہتے تھے: « هذا مصرع فلان هذا مصرع فلان »[2] جب قریش نے یہ بات سنی تو اس رؤیا کو مذاق ٹھہرایا۔ بالجملہ اسبابِ نزول متعارض ہیں اور جمع ناممکن ہے، اس لیے ترجیح کی طرف جانا واجب ٹھہرا اس لیے راجح براہِ کثرت وصحت یہی ہے کہ اس کا سببِ نزول قصۂ اسراء ہے اور یہی متعین ہونا چاہیے۔

جمہور مفسرین کہتے ہیں کہ شجرہ سے مراد تھوہر کا درخت ہے اور لعن سے مراد اس کے کھانے والے کا ملعون ہونا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ۝ طَعَامُ الْاَثِيْمِ ﴾ [الدخان: ۴۳۔ ۴۴] ''بے شک تھوہر کا درخت۔ گناہ گار کا کھانا ہے۔'' امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ عرب ہر ناپسندیدہ طعام کو ملعون کہتے ہیں[3] اور لعن رحمت سے دور ہونا ہے اور اس درخت کی جڑ جحیم میں ہے، جو کہ رحمت سے بہت ہی بعید کی جگہ ہے۔ فتنے کے معنی یہ ہیں کہ ابو جہل وغیرہ نے کہا کہ تمھارے صاحب کو یہ زعم ہے کہ جہنم کی آگ پتھر کو جلا دیتی ہے، اس کے ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ دوزخ میں ایک درخت ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ ﴾ [الأنعام: ۹۱] ''اور انھوں

---

[1] حاشية الشهاب علىٰ تفسير البيضاوي (٦/ ٤٣)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٧٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٦٨١) المعجم الكبير (١٠/ ١٤٧)

[3] معاني القرآن (٣/ ٢٤٨)

نے اللہ کی قدر نہیں کی جس طرح اس کی قدر کرنے کا حق ہے۔'' کیوں کہ اللہ تعالیٰ پر یہ بات کچھ مشکل نہیں ہے کہ ایسا درخت پیدا کرے، جس کو آگ نہ کھائے۔ بلادِ ترک میں سمندر نام ایک کیڑا ہوتا ہے، اس سے منادیل (رومال) بناتے ہیں۔ جب وہ مندیل میلی ہو جاتا ہے، اس کو آگ میں ڈال دیتے ہیں، اس کا میل دور ہو جاتا ہے اور مندیل سالم رہتا ہے، آگ اس میں کچھ اثر نہیں کرتی۔ نعامہ (شتر مرغ) آگ کی چنگاری نگل جاتا ہے اور اس سے اسے کچھ نقصان نہیں پہنچتا، بلکہ ہر درخت میں آگ پیدا کی ہے۔ وہ آگ اس درخت کو نہیں جلاتی، پس یہ جائز ہے کہ جہنم کی آگ میں کوئی ایسا درخت ہو، جس کو آگ نہ جلائے۔

امام ابن زبعری رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے کثرت سے تمھارے گھر میں زقوم کا ذکر کیا ہے، یہ کھجور اور مکھن ہے لغتِ یمن میں۔[1] بعض نے کہا کہ کشوث کا درخت ہے کہ جس درخت پر لپٹ جاتا ہے اس کو جلا دیتا ہے۔ بعض نے کہا کہ اس درخت سے مراد شیطان ہے۔ کسی نے کہا کہ یہود ہیں۔ بعض نے کہا کہ بنی اُمیہ ہیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے مروان بن الحکم سے کہا تھا کہ میں نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ تیرے باپ اور دادا سے کہتے تھے: قرآنِ مجید میں مذکورہ شجرۂ ملعونہ سے تمھی مراد ہو۔[2] لیکن اس میں نکارت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ہم ان کو آیات اور نظائرِ آیات سے ڈراتے ہیں، صیغہ استقبال کا تجدد و استمرار پر دلالت کے لیے ہے، لیکن یہ اس ڈرانے سے اور زیادہ سرکش ہوتے ہیں اور حد سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ نشانیاں بھیجنے کا ان کو کچھ فائدہ نہیں ہوتا، سوائے اس کے کہ کفر میں اور بڑھ جاتے ہیں، تب ہم اُن کے ساتھ وہی کام کرتے ہیں جو اگلے کفار کے ساتھ کیا تھا۔ یعنی ایسا عذاب بھیجتے ہیں، جو جڑوں کو اُکھاڑ دیتا ہے، لیکن ہم نے سزا کی تاخیر کا حکم دے رکھا ہے، سو یہ اُن کے لیے ذلت و رسوائی ہے۔[3]

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ۚ﴿۶۱﴾ قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ ۫ لَىِٕنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۶۲﴾

اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا: آدم کو سجدہ کرو، تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا، وہ بولا: کیا میں اسے سجدہ کروں جسے تو نے مٹی سے پیدا کیا؟(61) کہنے لگا: بھلا دیکھ تو اسے جسے تو نے مجھ پر عزت دی ہے، اگر تو مجھے یومِ قیامت تک ڈھیل دے، تو تھوڑے لوگوں کے سوا میں اس کی تمام نسل کی جڑ کاٹ دوں گا(62)

---

[1] تفسير القرطبي (١٠/ ٢٨٣) [2] الدر المنثور (٥/ ٣٠١) [3] فتح البيان (٧/ ٤١٣۔ ٤١٦)

آدم و ابلیس کے قصے کا بیان:

یعنی اللہ کے حکم میں شبہے پیدا کرتے۔ کافروں کی وہی چال ہے۔ اپنے بس میں کر لینے سے ابلیس کی مراد یہ ہے کہ اپنا مسخر کرلوں گا، جیسے گھوڑے کو لگام دی جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام اور اُن کی اولاد کے ساتھ ابلیس کی عداوت کا ذکر کیا ہے، یہ عداوت قدیم ہے، جب سے آدم علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو حکم دیا تھا کہ تم آدم کو سجدہ کرو، سب فرشتوں نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے تکبر کیا اور انکار کیا، اپنے آپ کو قابلِ فخر جانا اور آدم کو حقیر ٹھہرایا اور کہا: کیا میں اس مٹی کے پتلے کو سجدہ کروں؟! جس طرح دوسری آیت میں نقل کیا ہے: ﴿ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴾ [ص: ٧٦] ''میں اس سے بہتر ہوں، مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا اور اسے تو نے مٹی سے پیدا کیا۔'' اور اس جگہ ﴿ اَرَءَيْتَكَ ﴾ کہا۔ یہ کہنا رب سے جرأت اور کفر ہے اور رب نے حکم کیا اور مہلت دی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یعنی میں متولی ہوں گا، آدم علیہ السلام کی اولاد پر، مگر تھوڑے سے لوگوں پر میرا تسلط نہ ہوگا، یعنی میرا زور نہ چلے گا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں اُن پر محتوی ہو جاؤں گا۔ ابن زید رحمہ اللہ نے کہا کہ میں ان کو گمراہ کر دوں گا اور یہ سب معانی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔[1] مطلب یہ ہوا کہ اگر تو مجھے مہلت دے گا تو میں اس شخص کی اولاد کو جس کو تو نے مجھ پر بزرگی دی ہے، گمراہ کر دوں گا، مگر تھوڑے لوگ اُن میں سے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب ذکر کیا کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کے ہاتھ سے ایک بلیۂ عظیمہ ومحنتِ شدیدہ میں ہیں تو چاہا کہ یہ بات بھی بیان کر دے کہ سارے انبیا علیہم السلام بھی اسی طرح پر مبتلائے آزمایش رہے، یہاں تک کہ یہ ایک عادتِ قدیمہ ہے، جس کو ابلیسِ لعین نے پہلے انبیا کے ساتھ شروع کیا ہے۔ پھر فرمایا کہ ہم نے فرشتوں سے کہا تھا کہ تم آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو، اللہ تعالیٰ نے اس قصے کو قرآن میں سات جگہ ذکر کیا ہے۔ سورت بقرہ، اعراف، حجر اور یہ سورت، کہف، طٰہٰ اور ص میں۔ اس کی تفسیر مبسوطاً گزر چکی ہے۔ غرض یہ کہ سب ملائکہ نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے کہا: کیا میں اس خاکی کو سجدہ کروں۔ آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے خاکِ زمین سے بنایا تھا، جس خاک میں شیریں بھی تھی اور تلخ بھی۔ سو جس کو خاکِ شیریں سے بنایا ہے وہ نیک بخت ہے اور جس کو خاکِ تلخ سے بنایا ہے وہ بد بخت ہے۔ ابلیس نے کہا کہ تو مجھے خبر دے کہ یہ شخص جس کو تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے اور مجھ کو حکم دیا کہ میں اس کے سامنے اپنا سر رکھوں، اس کو کس لیے یہ بزرگی دی؟! حالاں کہ تو نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور یہ خاک سے بنا ہے۔

آگ کا جوہر لطیف ہوتا ہے اور خاک کا عنصر کثیف ہوتا ہے، پھر لطیف کا کثیف کو سجدہ کیسا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٤٨٩)

اس سوال کا جواب بہ غرض اہمال وتحقیر کچھ نہیں دیا، کیوں کہ اس لعین نے اپنے مولیٰ پر اعتراض کیا اور بہ حرف ''لِمَ'' سوال کیا۔ ﴿ لَاَحْتَنِكَنَّ ﴾ کے معنی ''لَأَسْتَوْلِيَنَّ'' ہیں، یعنی میں بنی آدم کو اغوا اور گمراہ کروں گا اور اُن پر غالب رہوں گا۔ لام بہ معنی قسم ہے، یہ قسم اس لیے کھائی کہ بہ طورِ استراق سمع (چوری چھپے باتیں سننا) اس کا علم پیشتر سے اس کو ہو چکا تھا یا اس نے ملائکہ کے اس قول سے استدلال کیا: ﴿ اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا ﴾ [البقرہ: ۳۰] ''کیا تو زمین میں اس کو بنائے گا جو اس میں فساد کرے گا۔'' یا یہ بات طبع بشر سے معلوم کی، کیوں کہ اُن میں شہوات رکھی گئی ہیں، یا یہ گمان اس کو اس لیے ہوا کہ آدم نے اس کا وسوسہ قبول کر لیا تھا اور عزم نہ کیا۔ یا اس نے گمان کیا کہ میرا کید (مکر وفریب) ان میں بہ خوبی نافذ ہو جائے گا اور وہ خون کی طرح اُن کے اندر دوڑتا پھرے گا، مگر جس کو اللہ بچائے، جیسے اس اُمت کے صلحا اور انبیا۔ یہی مراد ہے ﴿ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾ سے۔ کہا ہے کہ ہزار میں سے ایک ایسا ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ﴾ [بني إسرائيل: ٦٥] ''بے شک میرے بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں۔'' اسی کی تائید یہ آیت بھی کرتی ہے: ﴿ وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ ﴾ [سبا: ٢٠] ''اور ابلیس نے ان پر اپنا خیال یقیناً سچ کر دکھایا۔'' اس سے معلوم ہوا کہ اس کے اس دعوے کی بنیاد ظن پر تھی، اسی ظن پر اعتماد کر کے اس نے گمراہ کرنے کا ارادہ کیا اور کامیاب رہا۔[1]

قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ﴿۶۳﴾ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ؕ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۶۴﴾ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ﴿۶۵﴾

اللہ نے فرمایا: جا! پھر ان میں سے جو تیری اتباع کرے گا تو بلاشبہ تمھاری سزا جہنم ہے، پوری پوری سزا (63) اور ان میں سے جن پر بھی تیرا بس چل سکے انھیں اپنی آواز سے بہکا لے اور ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لا، اور مال اور اولاد میں ان کا شریک بن جا، اور انھیں (جھوٹے) وعدے دے، اور شیطان تو انھیں بس فریب ہی کا وعدہ دیتا ہے (64) بے شک میرے بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں، اور آپ کا رب کارساز کافی ہے (65)

شیطان اور اس کے متبعین کا ٹھکانا:

مال میں ساجھا یہ کہ بتوں کی نیاز اپنے مال میں فرض سمجھتے ہیں۔ اولاد میں یہ کہ ایک کو بتاتے ہیں کہ یہ فلاں کا

[1] فتح البيان (٧/ ٤١٦۔ ٤١٨)

بخشا ہوا ہے اور دوسرا فلاں کا بخشا ہوا۔

ابلیس نے جب مہلت مانگی تو اللہ تعالیٰ نے اس کو مہلت دی، جس طرح کہ دوسری آیت میں فرمایا ہے:
﴿ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۝ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴾ [الحجر: ۳۷۔ ۳۸] ''اللہ نے فرمایا: بے شک تو مہلت دیے جانے والوں میں سے ہے۔ مقرر وقت کے دن تک۔'' پھر ابلیس کو اور بنی آدم میں سے اس کے تابعین کو یہ وعید سنائی کہ تم سب کے لیے جہنم ہے، یہ تمھارے اعمال کی پوری جزا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: موفور بہ معنی وافر ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ یعنی تم کو یہ بدلا بھرپور دیا جائے گا، کچھ کمی نہ ہوگی۔ صوت (آواز) سے مراد غنا (گانا وغیرہ) ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ یعنی لغویات اور گانے بجانے میں اُن کو پھانسوں گا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ مراد ہر ایسا داعی ہے، جو اللہ کی معصیت کی طرف پکارے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے بھی یوں ہی کہا ہے۔ اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے۔[1]

ابلیس کے ہتھکنڈوں کا بیان:

''رَجِلٌ'' جمع ''راجل'' ہے، یعنی پیادہ۔ مطلب یہ ٹھہرا کہ تم اُن پر مسلط ہو، جہاں تک تجھ سے بن سکے یہ امرِ قدر ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّاۤ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ﴾ [مریم: ۸۳] ''کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ بے شک ہم نے کافروں پر شیطان چھوڑ رکھے ہیں، وہ انھیں خوب خوب (گناہوں پر) اُبھارتے ہیں؟۔''

یعنی یہ شیاطین کفار کو معاصی کی طرف ہانکتے ہیں اور کج روی کرتے ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ مراد معصیتِ الٰہی میں ہر سوار اور پیدل چلنے والا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ شیطان کے لیے جنوں اور انسانوں میں سے سوار اور پیادے ہیں۔ یہ وہی جو اس کے مطیع ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ شرکتِ مال سے یہ مراد ہے کہ مالوں کو اللہ کی نافرمانی میں خرچ کریں گے۔ امام عطا رحمہ اللہ نے کہا کہ مراد ربا ہے، یعنی سود خواری۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا کہ مراد جمع کرنا ہے ناپاک مال کا اور اس کو حرام کاموں میں خرچ کرنا ہے۔ یہی قول امام قتادہ رحمہ اللہ کا بھی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ مال میں شرکت یہ ہے کہ بحائر، سوائب اور اسی طرح اور کو حرام کر لیا۔ امام ضحاک اور قتادہ رحمہما اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ آیت ان سب قسموں کے لیے عام ہے۔[2]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد اور ضحاک رحمہما اللہ نے کہا کہ شرکتِ اولاد سے مراد اولادِ زنا ہے۔ سیدنا

---

[1] تفسیر الطبري (۱۷/ ۴۹۰۔ ۴۹۱)
[2] تفسیر الطبري (۱۷/ ۴۹۱۔ ۴۹٤) تفسیر ابن کثیر (۳/ ۷۰)

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ وہ اولاد جس کو بغیر علم کے بے وقوفی سے قتل کیا ہے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا کہ واللہ! ابلیس اُن کے اموال اور اولاد میں شرکت دار ہو گیا، کوئی مجوسی ہو گیا، کوئی یہودی اور کوئی نصرانی۔ اسلام کے سوا اور رنگ روپ لیا اور اپنے مالوں میں سے ایک حصہ شیطان کے لیے مقرر کیا تھا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ سواء بسواء.

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اپنی اولاد کا نام عبدالحارث، عبدالشمس یا عبد فلاں رکھتے ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ اول قول یہ ہے کہ جو بچہ جس عورت کا پیدا ہوا، اس میں ایسا نام رکھ کر اللہ کی نافرمانی کی، جس کو اللہ ناپسند کرتا ہے۔ یا اس کو ایسے دین میں داخل کیا جو اللہ کو ناپسند ہے۔ یا اس کی ماں سے زنا کیا، اس کو مار ڈالا۔ یا زندہ درگور کر دیا۔ یا ایسے اور کام کیے جن میں اللہ کی نافرمانی ہے، ان سب میں ابلیس کی شرکت ہوئی۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے شرکت کے معنی کی کوئی تخصیص نہیں کی کہ فلاں طرح کی شرکت ہے اور فلاں طرح کی نہیں ہے۔ چنانچہ ہر شے جس میں اللہ کی نافرمانی کی، یا اس کے ساتھ اللہ کا نافرمان ہوا، یا شیطان کی اطاعت کی، وہ مشارکت ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ابن عباس کا یہ قول بہت مناسب ہے، چنانچہ اسلاف میں سے ہر ایک نے اس مشارکت کی کوئی نہ کوئی تفسیر کی ہے۔[1] صحیح مسلم میں سیدنا عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے: « يَقُولُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ: إِنِّي خَلَقْتُ عِبَادِي حُنَفَاءَ فَجَائَتْهُمُ الشَّيَاطِيْنُ فَاجْتَالَتْهُمْ عَنْ دِيْنِهِمْ وَحَرَّمَتْ عَلَيْهِمْ مَا أَحْلَلْتُ لَهُمْ » یعنی میں نے اپنے بندوں کو موحد بنایا تھا، شیطانوں نے آ کر اُن کو اُن کے دین سے پھسلا دیا، جو چیز میں نے اُن کے لیے حلال کی تھی، انھوں نے وہ اُن پر حرام کر دی۔[2]

صحیحین میں مروی ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر کوئی اپنے اہلِ خانہ کے پاس آئے اور یوں کہے: «بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطٰنَ وَجَنِّبِ الشَّيْطٰنَ مَا رَزَقْتَنَا » [اللہ کے نام سے، اے اللہ! تو ہم کو شیطان سے بچا اور جو اولاد تو ہم کو عطا فرماتے، اسے بھی شیطان سے بچا] تو اگر اُن دونوں کے درمیان کوئی بچہ مقدر ہوگا تو شیطان کبھی اس کو نقصان نہ پہنچائے گا۔''[3] پھر اللہ تعالیٰ نے شیطان کے وعدے کو فریب بتایا، جس طرح دوسری آیت میں خبر دی ہے کہ جس دن اللہ تعالیٰ سچا فیصلہ کرے گا، اس دن ابلیس کہے گا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ﴾ [إبراهيم: ٢٢] ''بے شک اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے تم سے جو وعدہ کیا تھا، اس کی میں نے خلاف ورزی کی۔'' پھر خبر دی کہ ہم اپنے ایمان دار بندوں کی حفاظت کرتے ہیں اور شیطانِ رجیم سے ان کو نگہبانی میں رکھتے ہیں۔ لہٰذا فرمایا کہ تیرا رب کارساز ہے، یعنی حافظ و مؤید و مددگار۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی

---

[1] تفسیر الطبري (١٧/ ٤٩٤۔ ٤٩٥) تفسیر ابن كثیر (٣/ ٧٠)
[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٨٦٥)
[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٤١) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٤٣٤)

حدیث میں فرمایا ہے: « إِنَّ الْمُؤْمِنَ لَيُنْضِي شَيَاطِينَهُ كَمَا يُنْضِي أَحَدُكُمْ بَعِيرَهُ فِي السَّفَرِ » (رواه أحمد) یعنی مومن اپنے شیطانوں کو چوٹی پکڑ کر زیر کرتا ہے، جیسے تم میں سے کوئی اپنے اونٹ کی چوٹی سفر میں پکڑتا ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے کہا: جا اور نفخہ اولیٰ تک منتظر رہ، جب کہ اس کی غرض یہ تھی کہ نفخہ ثانیہ تک مہلت حاصل ہو۔ مطلب اس سے یہ تھا کہ اصلاً موت نہ آئے، کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ نفخۂ ثانیہ کے بعد کوئی نہیں مرے گا۔ پھر ابلیس اور اس کے پیروکاروں اور متبعین کو جہنم میں پوری پوری جزا کی بشارت دی اور کہہ دیا کہ جہاں تک تیرا بس چلے تو جلدی کر اور لوگوں کو کج رو بنا اور انھیں لغزش دے اور اُن کو اپنی آواز سے گھیر لے، یعنی ان کو اللہ کی نافرمانی کی طرف بلا، یا آواز سے مراد غنا (گانا بجانا) وسوسہ ولہو ولعب و معازف و مزامیر (ساز، ڈھول ڈھمکے) ہیں اور اپنے سواروں اور پیادوں کو ان پر چڑھا لا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ یعنی جتنی قدرت ہو اُن کے مکر و فریب اور جہالتیں جمع کر[2] اور اُن کو سرکشی پر آمادہ کر اور اُن میں جس قدر تجھے طاقت ہو اپنا تصرف کر۔ یہ حکم ڈانٹ کے طور پر ہے جس طرح کہتے ہیں کہ اچھا جا جو کچھ تجھ سے بن سکے کر گزر، عن قریب تجھ کو اس کا انجام معلوم ہو جائے گا۔

خیل سے مراد گھوڑے ہیں، یعنی سواروں کا رسالہ جیسے نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: « يَا خَيْلَ اللّٰهِ ارْكَبِي »[3] [اے اللہ کے شہسوارو! سوار ہو جاؤ] رجل سے مراد رجمنٹ اور کمپنی کے پیادے ہیں اور فرمایا: جا شریک ہو اُن کے مال اور اولاد میں۔ مال میں شرکت ہر وہ تصرف ہے جس میں شریعت کی مخالفت ہے، خواہ وہ مال غیر حق طریقے سے لیا ہے یا غیر حق میں رکھا (خرچ کیا) ہے جیسے غصب و چوری اور سود۔ اسی میں جانوروں کے کانوں کا پھاڑنا اور اُن کا بحیرہ و سائبہ و وصیلہ بنانا بھی داخل ہے۔ اولاد میں شرکت یہ ہے کہ یہ دعویٰ کیا جائے کہ وہ کسی غیر شرعی سبب سے حاصل ہوئی اور اولاد کا زنا سے حاصل کرنا اور عبد اللات و العزیٰ نام رکھنا اور اُن کی تربیت بری عادتوں پر کرنا اور اسی میں اولاد کو قتل کرنا اور زندہ درگور کرنا بھی شامل ہے اور مجوسی اور یہودی اور نصرانی بنانا، یا کسی اور دین کو کفر میں شامل کرنا، یا حرفتِ ذمیمہ (بُرے پیشے) پر لگانا اور افعالِ قبیحہ کرانا اور من جملہ اُن کے سلطان مجامع کو مشارکت شامل ہے، جب بسم اللہ نہیں کہتا تو شیطان جماع میں شریک ہو جاتا ہے۔

حکایت:

ایک شخص نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا کہ میری بیوی جاگ اُٹھی، اس کی شرم گاہ میں آگ کا ایک

---

(1) مسند أحمد (٢/ ٣٨٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٥٨٦) (2) معاني القرآن (٣/ ٢٥٠)

(3) مستدرك الحاكم (٢/ ٣٩٧) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

شعلہ تھا، کہا: یہ وطی ہے شیطان کی۔[1] پھر فرمایا کہ تو اُن کو وعدہ دے، یعنی اس بات کا کہ وہ مبعوث نہ ہوں گے۔[2] (قالہ الزجاج) امام فراء نے کہا کہ یہ کہہ دے کہ نہ جنت ہے اور نہ دوزخ۔[3] بعض نے کہا کہ جھوٹے اور باطل وعدے ہیں کہ تم کو اپنے مخالف پر نصرت حاصل ہوگی اور تمھارے معبودان تمھاری سفارش کریں گے اور تم اپنے شریف النسب ہونے کی وجہ سے اللہ کے ہاں عزت والے ہو اور تم اللہ کی کرامت پر بھروسا رکھو اور توبہ میں دیر کرو، لمبی اُمیدوں اور انجام کار کو جلدی کے فائدے پر قربان کر دینے کے سبب سے، اور اسی طرح کے دوسرے فریب ہیں اور یہ حکم دھمکی کے طور پر ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ﴾ [حم السجدة: ٤٠] ”تم جو چاہو عمل کرو۔“ شیطان کا وعدہ محض دھوکا ہے، جو ہمارے بندے ہیں، اُن پر کچھ تسلط اس کو نہیں ہے اور نہ وہ اس کے دھوکے میں آتے ہیں۔

قرآن پاک میں جس جگہ عباد کی اضافت یاءِ متکلم کی طرف آئی ہے، وہاں مراد مومنین ہیں، کیوں کہ اس اضافت میں شرف ہوتا ہے۔ یا اس جگہ عباد سے مراد انبیا و صلحا اور اہلِ فضل ہیں کہ شیطان اُن کے اغوا پر قادر نہیں ہے۔ یا مراد جمیع عباد ہیں، اس استثنا کی دلیل سے جو دوسری جگہ آئی ہے: ﴿ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴾ [الحجر: ٤٢] ”مگر گمراہوں میں سے (تیرا زور اس پر چلے گا) جس نے تیری اتباع کی۔“ سلطان سے مراد تسلط ہے، اللہ کی وکالت، یعنی حفاظت شیطان کے مکر و فریب کو دور کرنے کے لیے اور اس کے اغوا سے بچنے میں کفایت کرتی ہے۔ محققین نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچنے کی طاقت اس کے بچانے سے اور اس کی اطاعت بجا لانے کی قدرت اسی کی دی ہوئی قدرت کے ساتھ ممکن ہے۔[4]

رَبُّكُمُ الَّذِيْ يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۝۶۶

تمھارا رب وہی تو ہے جو تمھارے لیے سمندر میں کشتی چلاتا ہے، تاکہ تم اس کے فضل میں سے تلاش کرو، بے شک وہ تم پر بڑا رحم کرنے والا ہے (66)

سامانِ تجارت کے ساتھ چلنے والی کشتیاں قدرتِ الٰہی کی نشانیاں ہیں:

روزی کو قرآن میں اکثر فضل فرمایا ہے، فضل کے معنی ہیں زیادتی۔ سو مسلمان کی بندگی آخرت کے لیے ہے اور دنیا تو اضافے میں ملتی ہے، دریا میں اپنا زور نہیں چلتا، ہوا اسی کے اختیار میں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مخلوق پر اپنی مہربانی اور لطف و کرم کا ذکر کیا کہ ہم نے کشتی کو دریا میں اُن کے لیے مسخر کر دیا ہے اور

---

[1] تفسیر البغوي (٥/ ١٠٦)
[2] معاني القرآن (٣/ ٢٥٠)
[3] معاني القرآن للفراء (٣/ ٧٥)
[4] فتح البيان (٧/ ٤١٨۔ ٤٢٠)

اس کی مصلحتیں بندوں کے لیے سہل و آسان کر دی ہیں، تاکہ وہ ایک سمندر سے دوسرے سمندر کی طرف تجارت وغیرہ کے لیے سفر کر سکیں، لہٰذا فرمایا کہ اللہ تم پر مہربان ہے۔ اس کا تمھارے ساتھ یہ فعل محض اللہ تعالیٰ کا فضل اور رحمت ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ازجاء، بہ معنی سوق و دفع (ہنکانا، چلانا) ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُزْجِیْ سَحَابًا ﴾ [النور: ٤٣] ''کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ بے شک اللہ ہی بادل چلاتا ہے۔'' یہ تعلیل ہے اللہ کی کفایت کی اور بیان ہے اس کی قدرت کا کہ جو کوئی اپنے معاملات میں اس پر توکل کرتا ہے، وہ اس کو محفوظ رکھتا ہے اور شروع میں بعض نعمتوں کا یاد دلانا اس لیے ہے کہ اُن کو ایمان پر آمادہ کرے کہ سوائے اللہ کے کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اللہ کا شریک نہ ٹھہرائیں۔ اس جگہ لفظ فلک جمع ہے بہ معنی کشتیاں۔ اور ''بحر'' وافر پانی کو کہتے ہیں، خواہ میٹھا پانی ہو یا تلخ۔ کشتیوں کا دریا میں چلانا رزق کی تلاش کے لیے ہوتا ہے کہ تجارت سے نفع اُٹھائیں، یہ اللہ کی رحمت ہے کہ اس نے دنیا کی تمام مصلحتوں کی طرف راہنمائی کی۔[1]

وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِی الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّاۤ اِیَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَی الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ﴿۶۷﴾

اور جب سمندر میں تمھیں کوئی تکلیف پہنچے تو وہ جنھیں تم اس (اللہ) کے سوا پکارتے ہو، گم جاتے ہیں، پھر جب وہ (اللہ) تمھیں خشکی کی طرف نجات دیتا ہے تو تم منہ موڑ لیتے ہو اور انسان بڑا ہی ناشکرا ہے (67)

کفار و مشرکین مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ ہی کو پکارتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ لوگوں کو جب کوئی زیان و نقصان پہنچتا ہے تو وہ اللہ کی طرف رجوع کر کے اور دین کو خالص کر کے اسی کو پکارتے ہیں اور غیر اللہ کا خیال جس کی وہ عبادت کرتے تھے، اُن کے دلوں سے دور ہو جاتا ہے، یعنی دریا میں مصیبت کے وقت اللہ کے سوا کوئی یاد نہیں آتا۔ اللہ کے سوا سب کو بھول جاتے ہیں، جس طرح کہ عکرمہ بن ابی جہل کو اتفاق ہوا تھا کہ جب وہ فتح مکہ کے دن نبی مکرم ﷺ سے ڈر کر بھاگا تو دریا پر سوار ہوا کہ ملک حبشہ میں چلا جائے، ایک تیز ہوا آئی۔ قوم میں سے کسی نے کہا کہ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ صرف اللہ کو پکارو، عکرمہ نے اپنے دل میں کہا کہ اگر دریا میں اللہ کے سوا کوئی نفع نہیں دیتا تو خشکی میں بھی اس کے سوا کوئی نافع نہیں ہے:
''اللهم لك علي عهد، لئن أخرجتني منه لأذهبن فلأضعن يدي في يد محمد فلأجدنه رؤفا رحيما'' [الٰہی! میں نذر مانتا ہوں کہ اگر تو نے مجھے اس آفت سے بچا لیا تو میں سیدھا جا کر محمد ﷺ کے ہاتھ میں

---

[1] فتح البیان (۷/ ٤٢١)

ہاتھ دے دوں گا اور یقیناً وہ مجھ پر مہربانی اور رحم و کرم فرمائیں گے] وہ لوگ دریا پار ہو گئے۔ عکرمہ نبی مکرم ﷺ کے پاس لوٹ آیا اور مسلمان ہو گیا اور اچھا مسلمان ہو گیا۔[1] لیکن جب اللہ کشتی والوں کو دریا سے نجات دے کر خشکی میں لاتا ہے تو وہ اس توحید کو، جس کا ذکر دریا میں کرتے تھے، بھول کر اللہ وحدہ لاشریک لہ کو پکارنا چھوڑ دیتے ہیں۔ انسان کی خصلت اسی طرح پر ہے کہ وہ نعمتوں کو بھول کر منکرِ نعم ہو جاتا ہے، مگر جس کو اللہ بچائے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ "مَسّ ضُرّ" سے غرق ہونے کا خوف مراد ہے۔ دریا میں جب ڈوبنے سے ڈرتے ہیں تو اُن معبودوں کو جن کو پہلے پکارتے تھے، یعنی آلہہ باطلہ کو بھول جاتے ہیں اور اُن کے دل و دماغ سے وہ بت، جن، ملک، بشر اور حجر جن سے حادثات کے وقت استغاثہ کیا کرتے تھے، نکل جاتے ہیں، سوائے اللہ کے کہ اس وقت اسی کی رحمت اور فریاد رسی کی اُمید کرتے ہیں۔ یہ استثنا متصل ہے، اگر من سے مراد سارے آلہہ ہیں۔ اور منقطع ہے، اگر اس سے مراد غیر اللہ ہے۔ آیت کے معنی یہ ہوئے کہ کفار کا اپنے بتوں اور تمام معبودان کے بارے میں یہ اعتقاد ہے کہ وہ اس حالت کے علاوہ نافع ہیں۔ رہی یہ حالت سو اُن میں سے ہر ایک جانتا ہے کہ بت وغیرہ یہاں کچھ کام نہیں دے سکتے۔ یہ علم ان کو فطرتاً حاصل ہے، اس علم کی مدافعت پر وہ قادر نہیں۔ پھر جب اللہ تعالیٰ اُن کو غرق ہونے سے بچا کر خشکی میں لے آتا ہے تو اخلاصِ توحید سے منہ موڑ کر صرف بتوں کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اُن سے فریاد رسی چاہتے ہیں۔ انسان اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا سخت ناشکرا ہے۔ یعنی سختیوں کے دن اللہ کی رحمت کے ساتھ متمسک ہوتے ہیں اور آسانی کی حالت میں اللہ تعالیٰ سے روگردانی کرتے ہیں۔[2]

یہ حال نبی مکرم ﷺ کے زمانے کا تھا، اب تو نام کے مسلمان دریا میں بھی غرق کے خوف کے وقت اولیا و صلحا مردوں اور زندوں کو پکارتے ہیں، اس حالتِ راہنہ (سمندر میں موجود ہونا) میں بھی اُن کو اللہ یاد نہیں آتا، مردوں کا نام لے کر یہ دعا اور آواز کا بلند کرنا، خود ہم نے اپنے کانوں سے سنا ہے۔ فإنا للہ۔ اُن کا شرک اس زمانے میں پہلے کفار کے کفر سے بھی بڑھ گیا ہے۔

اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًا ﴿٦٨﴾

کیا پھر تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو کہ وہ تمھیں خشکی کی جانب (زمین میں) دھنسا دے یا تم پر سنگریزوں والی سخت آندھی بھیج دے، پھر تم اپنے لیے کوئی کارساز نہ پاسکو (68)

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٧١)
[2] فتح البیان (٧/ ٤٢١۔ ٤٢٢)

خشکی میں بھی عذابِ الٰہی تمھیں پکڑ سکتا ہے:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کیا تم خشکی میں آ کر اللہ کے انتقام و عذاب سے امن میں ہو گئے ہو، وہ چاہے تو اسی خشکی میں تم کو زیرِ زمین کر دے، یا تم پر ایسی بارش بھیجے جس میں پتھر ہوں۔ امام مجاہد وغیرہ نے اسی طرح کہا ہے،[1] جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ حَاصِبًا اِلَّاۤ اٰلَ لُوْطٍ نَجَّیْنٰهُمْ بِسَحَرٍ ۝ نِّعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا ﴾ [القمر: ۳٤۔ ۳۵] ''اور بلاشبہہ یقیناً ہم نے ان پر پتھر برسانے والی ہوا بھیجی سوائے آلِ لوط کے، ہم نے انھیں بوقت سحر نجات دی۔ اپنے خاص فضل سے۔'' اور دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ لِنُرْسِلَ عَلَیْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِیْنٍ ﴾ [الذاریات: ۳۳] ''تاکہ ہم ان پر مٹی کے پتھر (کھنگر) برسائیں۔''

نیز فرمایا: ﴿ ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِیَ تَمُوْرُ ۝ اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یُّرْسِلَ عَلَیْكُمْ حَاصِبًا فَسَتَعْلَمُوْنَ كَیْفَ نَذِیْرِ ۝ وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَیْفَ كَانَ نَكِیْرِ ﴾ [الملك: ١٦۔ ١٧] ''کیا تم اس (اللہ) سے بے خوف ہو گئے ہو جو آسمان میں ہے، یہ کہ وہ تمھیں زمین میں دھنسا دے تو ناگہاں وہ لرزنے لگے؟ یا تم اس (اللہ) سے بے خوف ہو گئے ہو جو آسمان میں ہے، یہ کہ وہ تم پر پتھراؤ کرنے والی آندھی بھیجے؟ پھر جلد تم جان لو گے کہ میرا ڈرانا کیسا ہے؟'' وکیل سے مراد ناصر ہے، جو خسف اور حاصب کے عذاب کو پھیر دے اور ان کو اس بلا میں گرفتار ہونے سے بچا لے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ہمزہ (سوالیہ انداز) اس جگہ انکار اور ڈانٹ ڈپٹ کے لیے ہے، یعنی اگر تم غرق ہونے سے بچ گئے تو کیا امن میں ہو گئے اور تمھارا یہ امن تمھارے منہ موڑنے کا باعث بن گیا، بلکہ اللہ تعالیٰ تو تمھیں خشکی پر بھی ہلاک کرنے پر قادر ہے، اگرچہ دریا سے تم صحیح سلامت نکلے، کیوں کہ ساری جہتیں اللہ کی ہیں۔ خشکی اور تری سب اسی کی قدرت میں ہیں، یعنی اگر دریا میں غرق ہوتا ہے تو خشکی میں اس عذاب کی طرح دھنسنے کا عذاب ہے، کیوں کہ دھنسنے سے انسان زمین کے نیچے غائب ہو جاتا ہے، جس طرح کہ غرق ہونے سے پانی کے نیچے غائب ہو جاتا ہے۔ خسف کی اصل یہ ہے کہ زمین نیچے کو دھنس جائے۔

جانبِ ارض سے مراد زمین کا کنارہ ہے، اس کا نام جانب رکھا، اس لیے کہ خسف کے بعد ایک کنارہ ہو جاتا ہے۔ نیز دریا ایک جانب ہے اور خشکی ایک جانب۔ بعض نے کہا کہ وہ لوگ ساحلِ بحر پر تھے اور ساحل خشکی کی جانب ہے، وہ اس جگہ سمندر کے خوف سے امن میں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس امن سے ان کو ڈرایا جس طرح کہ بحر کے خوف

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۷۱)

سے ڈرایا۔ سمین نے کہا کہ یعنی وہ جانبِ بحر جس میں تم ہو کہ اس میں خسف ہونے میں تمھاری ہلاکت ہے، اگر یہ تقدیر نہ ہو تو اس ڈراوے میں کچھ فائدہ نہیں ہے۔

"حصب" کے معنی ہیں رمی (پتھر مارنا)، یعنی بادِ تند جس میں سنگریزے ہوں۔[1] امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ حاصب وہ مٹی ہے جس میں سنگریزے ہوں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ حاصب آسمان سے سنگباری ہے،[2] جس طرح کہ لوط علیہ السلام کی قوم پر پتھر برسے تھے اور وہ بادل جو اولے برسائے اس کو بھی حاصب کہتے ہیں۔ وکیل سے مراد حافظ اور نصیر ہے جو اللہ کے عذاب سے بچائے۔[3]

اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ تَارَةً اُخْرٰى فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ
قَاصِفًا مِّنَ الرِّيْحِ فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ
عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًا ﴿٦٩﴾

کیا تم بے خوف ہو گئے ہو کہ وہ تمھیں دوبارہ اس (سمندر) میں لوٹا دے، پھر تم پر توڑ دینے والی طوفانی ہوا بھیجے، تو وہ تمھارے کفر کے سبب تمھیں غرق کر دے، پھر تم اپنے لیے ہمارے خلاف اس پر کوئی ہمارا پیچھا کرنے والا بھی نہ پاؤ (69)

وہ تمھیں دوبارہ دریا میں غرق کر سکتا ہے:

اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے کہ اے اعراض کرنے والو! ہم سے دریا میں توحید کا اعتراف کرنے کے بعد کیا تم کو اس بات سے امن وسکون مل گیا ہے کہ جب تم دریا سے خشکی میں نکل کر آتے ہو کہ ہم تم کو دوبارہ دریا میں لے جا کر ایک ایسا جھونکا ہوا کا بھیجیں تم پر کہ وہ جہاز اور کشتی اور ناؤ کو پانی میں غرق کر دے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ قاصف وہ ہے جو دریا میں چلتی ہے اور سواروں کو شکستہ کر دیتی ہے اور ڈبو دیتی ہے اور یہ ڈبونا اس کا تم کو تمھارے اللہ کے ساتھ کفر و اعراض کی وجہ سے ہے۔ پھر تم کوئی تبیع، یعنی مددگار نہ پاؤ۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کے معنی ایسے مددگار کے ہیں جو بعد میں انتقام لینے والا ہو۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم کسی سے نہیں ڈرتے کہ وہ ان میں سے کسی چیز کی وجہ سے ہمارا پیچھا کر سکے۔[4]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ قاصف وہ سخت ہوا ہے جو زور سے توڑ دے اور اس میں آواز ہو۔ ابن عمرو نے کہا کہ بادِ قاصف و عاصف دریا میں ہوتی ہے۔[5] تبیع سے مراد یہ ہے کہ ہم سے تمھاری مدد کے لیے مطالبہ کرے۔[6]

---

[1] معاني القرآن (٣/ ٢٥١) [2] تفسير الطبري (١٧/ ٤٩٨) [3] فتح البيان (٧/ ٤٢٢۔ ٤٢٣)

[4] تفسير ابن كثير (٣/ ٧٢) تفسير الطبري (١٧/ ٥٠٠) [5] الدر المنثور (٥/ ٣١٤) [6] فتح البيان (٧/ ٤٢٣)

وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْۤ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ﴿۷۰﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے بنی آدم کو عزت دی ہے اور انھیں بر و بحر میں سواریاں دیں، اور انھیں پاکیزہ چیزوں میں سے رزق دیا اور انھیں اپنی کثیر مخلوقات پر جنھیں ہم نے پیدا کیا، فضیلت دی (70)

انسان کے شرف وفضل کا بیان:

جانوروں کو سواری نہیں، زمین پر نہ دریا پر، آدمی کو دی ہے اور ستھری روزی یہ کہ میوے کا چھلکا دور کرنا اور اناج کی بھوسی اور پینا اور پکا کر کھانا اسی کو سکھایا۔

اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی اور عزت بخشی ہے، ان کو بہترین اور مکمل ترین ہیئت پر پیدا کیا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْۤ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ﴾ [التين: ٤] ''ہم نے انسان کو بہترین شکل وصورت میں پیدا کیا۔'' یعنی انسان سیدھا کھڑا ہو کر اپنے پاؤں پر چلتا ہے اور ہاتھ سے کھاتا ہے، اس کے سوا جو اور حیوانات ہیں وہ چار پاؤں پر چلتے ہیں اور منہ سے کھاتے ہیں۔ آدمی کے لیے کان، آنکھ اور دل ہیں، وہ اُن سب سے سوچ اور سمجھ کرتا ہے اور فائدہ حاصل کرتا ہے اور چیزوں کے درمیان فرق معلوم کرتا ہے اور امورِ دینی و دنیوی میں نفع اور نقصان دینے والی چیزوں کو پہچانتا ہے۔ خشکی میں اس کو چوپاؤں پر سواری عنایت کی ہے۔ وہ چوپایوں پر اور گھوڑوں، اونٹوں، خچروں اور گدھوں پر اور گاڑی و ریل اور بیل اور اسی طرح کی اور چیزوں پر سوار ہو کر چلتا ہے۔ دریا میں جہاز وکشتی و ہوڑی و بغلہ ڈونگے پر بیٹھ کر سیر کرتے ہیں۔ کھیتی و پھل اور گوشت اور دودھ اور طرح طرح کے پسندیدہ رنگوں اور ذائقوں والے اور لذیذ کھانے اس کی بھوک اور اشتہا مٹانے کو دیے ہیں۔

مختلف قسم کے اچھے مناظر اور عمدہ لباس جن کی مختلف قسمیں، رنگ اور شکلیں ہیں، انھیں پہننے کو عطا فرمائے ہیں، اپنے لیے اُن چیزوں کو بناتا ہے اور گرد و نواح کے سمندروں اور خشکی سے لوگ اس کے لیے لے کر آتے ہیں اور تمام حیوانوں اور دوسری قسم کی مخلوقات پر اس کو فضیلت دی ہے۔ اس آیت سے اہلِ علم نے فرشتوں پر جنسِ بشر کی افضلیت کی دلیل لی ہے۔ زید بن اسلم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ فرشتوں نے کہا کہ اے رب! تو نے بنی آدم کو دنیا دی، وہ کھاتے ہیں اور چین کرتے ہیں اور ہم کو دنیا نہیں دی، اب آخرت دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مجھے قسم ہے اپنی عزت اور جلال کی، میں اس شخص کی ذریتِ صالحہ کو، جس کو میں نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے، اس کی طرح نہ کروں گا، جو فقط کن کہنے سے موجود ہو گیا ہے۔[1] (رواه عبد الرزاق مرسلا وقد روي من وجه آخر متصلا)

---

[1] تفس[illegible] (٢/ ٣٨٢) یہ روایت مرسل ہے۔ [illegible]

سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کے الفاظ مرفوعاً و اتصالاً یہ ہیں کہ ملائکہ نے کہا: اے رب! تو نے بنی آدم کو دنیا دی ہے اور وہ کھاتے، پیتے اور پہنتے ہیں اور ہم تیری حمد کی تسبیح کرتے ہیں، نہ کھائیں، نہ پئیں اور نہ کھیلیں، سو جس طرح اُن کے لیے دنیا مقرر کی ہے، ہمارے لیے آخرت مقرر فرما۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: « لَا أَجْعَلُ صَالِحَ ذُرِّيَّةِ مَنْ خَلَقْتُ بِيَدِيْ كَمَنْ قُلْتُ لَهُ: كُنْ، فَكَانَ »[1] (رواه الطبراني) [اس کی نیک اولاد کو جسے میں نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا، اس کے برابر میں ہرگز نہ کروں گا جسے میں نے کلمہ ''کن'' سے پیدا کیا ہے] سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ میں مرفوعاً مروی ہے: « إِنَّ الْمَلَائِكَةَ قَالُوْا: رَبَّنَا، خَلَقْتَنَا وَخَلَقْتَ بَنِيْ آدَمَ، وَجَعَلْتَهُمْ يَأْكُلُوْنَ الطَّعَامَ، وَيَشْرَبُوْنَ الشَّرَابَ، وَيَلْبَسُوْنَ الثِّيَابَ، وَيَتَزَوَّجُوْنَ النِّسَاءَ، وَيَرْكَبُوْنَ الدَّوَابَّ، يَنَامُوْنَ وَيَسْتَرِيْحُوْنَ، وَلَمْ تَجْعَلْ لَنَا مِنْ ذَاكَ شَيْئًا، فَاجْعَلْ لَهُمُ الدُّنْيَا وَلَنَا الْآخِرَةَ، فَقَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ: لَا أَجْعَلُ مَنْ خَلَقْتُهُ بِيَدِيْ، وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُوْحِيْ، كَمَنْ قُلْتُ لَهُ: كُنْ، فَكَانَ »[2] (رواه ابن عساكر) [بلاشبہ فرشتوں نے کہا: اے ہمارے پروردگار! ہمیں بھی تو نے پیدا کیا اور بنو آدم کا خالق بھی تو ہی ہے، انھیں تو کھانا پانی دے رہا ہے، کپڑے لتے وہ پہنتے ہیں، نکاح شادیاں وہ کرتے ہیں، سواریاں ان کے لیے ہیں، راحت آرام انھیں حاصل ہے، ان میں سے کسی چیز کے حصے دار ہم نہیں، خیر یہ اگر دنیا میں ان کے لیے ہے تو یہ چیزیں آخرت میں تو ہمارے لیے کر دے۔ اس کے جواب میں جناب باری تعالیٰ نے فرمایا: جسے میں نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور اپنی روح جس میں مَیں نے پھونکی ہے، اسے میں اس جیسا نہ کروں گا جسے میں نے کہہ دیا کہ ہو جا تو وہ ہو گیا]

سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما مرفوعاً کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک قیامت کے دن کوئی چیز ابن آدم سے زیادہ ذی عزت نہیں ہوگی۔ پوچھا گیا کہ فرشتے بھی نہیں؟ فرمایا: فرشتے بھی نہیں، وہ تو سورج چاند کی طرح مجبور ہیں۔[3] (رواه الطبراني و هذا حديث غريب)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو یہ کرامت بنی آدم کو بخشی ہے، اس میں یہ چیزیں شامل ہیں: اس خوبصورت اور معتدل ہیئت پر پیدا ہونا اور موت کے بعد طہارت، اس کے کھانوں، مشروبات اور لباس کی اس طرز پر خصوصیات جو دوسری تمام قسموں کے حیوانات کے لیے نہیں پائی جاتیں۔ ایک جماعت نے کہا کہ یہ تکریم ہاتھ سے

---

[1] المعجم الأوسط (٦/ ١٩٦) اس کی سند میں ''طلحہ بن زید'' سخت ضعیف راوی ہے۔ (مجمع الزوائد: ١/ ٢٥٥)

[2] تاریخ دمشق (٥٢/ ١٣٩) اس کی سند میں ''ابوعلی اہوازی'' ضعیف راوی ہے۔

[3] شعب الإيمان (١/ ١٧٤) اس کی سند میں ''عبید اللہ بن تمام'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٤٩٨١)

کھانا ہے، جب کہ جانور مُنہ سے کھاتے ہیں۔[1] (حکاہ ابن جریر والنحاس) بعض نے کہا کہ ان کو امتیاز بخشا ہے زبان، عقل اور تمیز کے ساتھ۔ کسی نے کہا کہ اس کے قد و قامت میں اعتدال اور امتداد (دراز ہونا) ہے۔ بعض نے کہا کہ حسنِ تقویم و تصویر ہے۔ بعض نے کہا کہ مردوں کی عزت افزائی ہے ڈاڑھی اور مونچھ سے اور عورتوں کا اکرام گیسو اور زلف سے ہے۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ تکریم اُن کو تمام مخلوق پر مسلط کرنا ہے کہ سارا جہان اُن کا مسخر ہے۔[2] یا یہ اکرام کلام و خط و فہم کے ساتھ ہے، یا امرِ معاش و معاد میں ان کی حسنِ تدبیر سے ہے۔ یا اُن میں ایک اُمت ایسی ہے جو لوگوں کے لیے نکالی گئی ہے، لیکن اگر تکریم کو اُن سب اشیا پر محمول کریں تو کوئی ممانعت نہیں ہے۔ تکریم کی سب سے بڑی خصلت عقلِ سلیم ہے کہ اسی کی وجہ سے تمام حیوانوں پر غلبہ حاصل ہے اور اچھائی اور برائی کی تمیز کرتے ہیں اور کھانے اور پینے کی اشیا حاصل کرتے ہیں اور اموال کی کمائی کرتے ہیں، جس کی وجہ سے حصولِ معاملات میں جو قدرت دوسرے حیوانوں کو نہیں، وہ اُن کو حاصل ہے اور مال خرچ کر کے ایسی بنیادیں بناتے ہیں جو خوف سے مانع ہوں اور ایسے لباس اور کپڑے تیار کرتے کراتے ہیں جو گرمی اور سردی سے بچائیں۔ بعض نے کہا کہ تکریم یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو اُن میں سے کیا۔ پھر تکریم کی بعض قسموں کو خاص طور پر بیان کیا، جیسے: جانوروں پر، جیسے: اونٹ، گھوڑے خچر اور گدھے، خشکی و صحرا و بیابان و جنگل میں سامان لاد کر لے جانا، دریا، ندی اور پانی کے دوسرے ذخیروں میں کشتیوں، ناؤ اور جہازوں میں سامان لاد کر لے جانا، وہ بھی اس طرح کہ نہ زمین میں خسف ہوں اور نہ دریا میں غرق۔ معنی یہ ہوئے کہ ہم نے اُن کو قرار دیا ہے خشکی اور تری میں بالواسطہ یا بلا واسطہ، جیسے: پانی میں تیرنا۔

طیبات سے مراد کھانے پینے کی لذیذ چیزیں ہیں اور دوسری تمام چیزیں جن سے لذت حاصل ہوتی ہے اور فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ کسی نے کہا کہ مراد مکھن، کھجور اور مٹھائی ہے اور جو رزق اُن کے علاوہ کا ہے وہ مخفی نہیں ہے۔ بعض نے کہا کہ ساری غذائیں یا تو نباتات ہیں، جیسے: پھل اور تمام غلوں کے دانے، یا حیوان ہیں، جیسے: گوشت، گھی اور دودھ۔ اور انسان غذا نہیں لیتا مگر پاکیزہ قسم کی اشیا سے اور پوری طرح پکانے اور نضج تام (پانی سے ملا کر مکمل کرنا) کے بعد اور یہ بات انسان کے سوا کسی اور حیوان کو حاصل نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کو بہت سی مخلوق پر فضیلت دی ہے۔ تکریم اور تفضیل میں فرق کرنے کے سلسلے میں سب سے زیادہ قابلِ ترجیح یہ قول ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے حیوان پر مکرم کیا ہے، امورِ خلقیہ طبعیہ ذاتیہ کے ساتھ مثل عقل کے، پھر عقل کے ذریعے اس کو ذریعہ معاش اور عقائدِ صحیحہ و اخلاقِ فاضلہ کی پہچان دی۔ پہلی بات تکریم ہے اور دوسری تفضیل۔

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٥٠١) معاني القرآن للنحاس (٤/ ١٧٦) [2] تفسير الطبري (١٧/ ٥٠١)

پھر اللہ تعالیٰ نے بہت سی باتوں کو مجمل رکھا، ان کی قسمیں بیان نہ فرمائیں، اس سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کو اکثر مخلوقات پر، نہ کل پر، فضیلت دی ہے۔ بہت سے اہلِ علم نے اس جگہ اپنے آپ کو ایسی چیزوں میں مشغول کیا ہے جس کی کچھ حاجت نہیں تھی اور نہ ہی کوئی فائدہ اس سے متعلق ہے، جیسے: ملائکہ کی تفضیل انبیا پر اور انبیا کا ملائکہ پر۔ اور من جملہ اُن کی دلیلوں کے جو ملائکہ پر انبیا کو فضیلت دیتے ہیں، ایک آیتِ باب ہے، حالاں کہ اس کو مطلوب بہ مقصد پر کوئی دلالت حاصل نہیں ہے، کیوں کہ کثیر کا ذکر اجمالاً آیا ہے، اس مجمل کا کچھ بیان نہیں ہوا اور مسئلہ ہذا کے تعصب نے بعض اشاعرہ کو اس پر حمل کیا کہ انھوں نے کثیر کی تفسیر بہ لفظِ جمیع کی ہے، تاکہ تفضیل ملائکہ پر بہ خوبی ثابت ہو جائے اور یہ تکلف ہے، اس کی کچھ حاجت نہیں اور بعض معتزلہ نے اس آیت کو ملائکہ کی انبیا پر فضیلت کے لیے دلیل ٹھہرایا ہے۔ سو یہ آیت اس پر بھی دلیل نہیں ہے، کیوں کہ اس پر کوئی حجت قائم نہیں ہے کہ ملائکہ من جملہ اس قلیل کے ہیں، جو کثیر سے خارج ہے اور مانا کہ یوں ہی ہو، تب بھی جو اس کثیر سے خارج ہو وہ اس بات کو مفید نہیں ہے کہ افضل ہے۔

بنی آدم سے غایت مافیہ یہ ہے کہ انسان کو اس پر فضیلت نہ ہو، اس صورت میں احتمال ہے کہ وہ شے مساوی انسان ہو، یا انسان سے افضل ہو۔ جب کہ احتمال کے ساتھ استدلال نہیں ہوتا۔ اور لفظِ ﴿ تَفْضِيْلًا ﴾ کے ساتھ جو تاکید کی گئی ہے، وہ اس تفضیل کے عظم پر کوئی دلیل نہیں ہے اور نہ اس پر کہ وہ ایک مکان میں مکین ہے۔ بنی آدم پر لازم ہے کہ اس تکریم اور تفضیل پر شکر ادا کریں اور اللہ کی ذات جو منعم حقیقی ہے، اس کی نعمت کا کفران کرنے سے بچیں۔[1]

يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ ۚ فَمَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَاُولٰٓىِٕكَ يَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝۷۱ وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا ۝۷۲

جس دن ہم تمام انسانوں کو ان کے امام کے ساتھ بلائیں گے، پھر جسے اس کا اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں دیا گیا تو وہ اپنا اعمال نامہ پڑھیں گے، اور ان پر (گٹھلی کے) دھاگے برابر (بھی) ظلم نہ کیا جائے گا (71) اور جو اس دنیا میں اندھا رہا، وہ آخرت میں بھی اندھا اور راہ سے بہت زیادہ بھٹکا ہوا رہے گا (72)

قیامت کے دن ہر شخص اپنے پیشوا کے ساتھ بلایا جائے گا:

اس دن عمل کا کاغذ اُڑائیں گے، نیکوں کے ہاتھ میں دائیں طرف سے آئے گا اور بدوں کے ہاتھ میں بائیں طرف سے اور پیچھے سے، یہ نشانی دیکھ کر نیک خوشی سے پڑھنے لگیں گے، پھر جو کوئی اس جگہ ہدایت سے اندھا رہا، ویسا

[1] فتح البیان (۷/ ۴۲۴۔ ۴۲۶)

ہی آخرت میں بہشت کی راہ سے اندھا ہے اور دور جا پڑا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ حساب کتاب کے دن ہر اُمت کا حساب اس اُمت کے پیشوا کے ساتھ ہوگا۔ امام میں اختلاف ہے۔ امام مجاہد اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ مراد نبی ہے ہر اُمت کا۔[1] اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے مطابق ہے: ﴿ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ﴾ [یونس: ٤٧] ''اور ہر ایک امت کا ایک رسول ہے، پھر جب ان کا رسول آ گیا تو ان میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا گیا۔'' بعض سلف نے کہا ہے: کہ اہلِ حدیث کے لیے یہ بہت بڑے شرف کی بات ہے، کیوں کہ ان کے امام نبی اکرم ﷺ ہیں۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا کہ امام سے مراد وہ کتاب ہے جو اُن کے نبی پر تشریعاً اُتری ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ اس سے مراد لوگوں کی طرف نازل ہونے والی کتابیں ہیں۔ اس قول سے احتمال ہے کہ مراد اس سے یہی کتاب ہو، یا جس طرح سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ مراد کتابِ اعمال ہے۔

امام ابو العالیہ، حسن اور ضحاک رحمہم اللہ بھی اسی کے قائل ہیں[2] اور یہی قول زیادہ راجح ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے تحت: ﴿ وَ كُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴾ [یٰسٓ: ١٢] ''اور ہم نے ہر شے کو واضح کتاب میں محفوظ کر رکھا ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ ﴾ [الکھف: ٤٩] ''اور (ہر ایک کا) اعمال نامہ (سامنے) رکھ دیا جائے گا، پھر آپ مجرموں کو دیکھیں گے کہ وہ اس کے مندرجات (تحریر) سے ڈر رہے ہوں گے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۫ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا ۭ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿28﴾ هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ [الجاثیة: ٢٨۔ ٢٩] ''اور آپ ہر امت کو گھٹنوں کے بل (گری) دیکھیں گے، ہر اُمت اپنے نامۂ اعمال کی طرف بلائی جائے گی (انھیں کہا جائے گا:) آج تمھیں ان (اعمال) کا بدلہ دیا جائے گا جو عمل تم کرتے رہے تھے۔ (کہا جائے گا:) یہ ہماری کتاب ہے، یہ تمھارے متعلق سچ سچ بولتی ہے۔ بلاشبہ ہم لکھواتے تھے جو تم عمل کرتے رہے تھے۔''

یہ اس بات کے منافی نہیں ہے کہ جب اللہ کسی اُمت میں فیصلہ کرنا چاہے تو اس اُمت کے پیغمبر کو بھی بلائے، بلکہ ضروری ہے کہ اُمت کے اعمال کا ایک شاہدِ عدل موجود ہو، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتٰبُ وَجِايْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ ﴾ [الزمر: ٦٩] ''اور زمین اپنے رب کے نور سے چمک اُٹھے گی، اور (عملوں کی) کتاب رکھی جائے گی اور انبیاء اور گواہ لائے جائیں گے۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَاۗءِ شَهِيْدًا ﴾ [النساء: ٤١] ''پھر ان کا کیا حال ہوگا جب ہم

[1] تفسیر الطبري (١٧/ ٥٠٢) [2] تفسیر الطبري (١٧/ ٥٠٢۔ ٥٠٣)

ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور آپ (ﷺ) کو اس امت پر گواہ بنائیں گے؟''

لیکن امام سے اس جگہ مراد کتابِ اعمال ہے، لہٰذا اس کے بعد ذکر وصولِ کتاب کا کیا ہے کہ جس کو دائیں جانب سے وہ اعمال نامہ ملے گا وہ خوشی سے اس کو پڑھے گا، اس لیے کہ اس کتاب میں عملِ صالح اور حسنِ اطاعت کا ذکر ہوگا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ فَیَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِیَهْ ﴿19﴾ اِنِّیْ ظَنَنْتُ اَنِّیْ مُلٰقٍ حِسَابِیَهْ ﴿20﴾ فَهُوَ فِیْ عِیْشَةٍ رَّاضِیَةٍ ﴿21﴾ فِیْ جَنَّةٍ عَالِیَةٍ ﴿22﴾ قُطُوْفُهَا دَانِیَةٌ ﴿23﴾ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِیْٓـًٔا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِی الْاَیَّامِ الْخَالِیَةِ ﴿24﴾ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ فَیَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِیَهْ ﴾ [الحاقة: ١٩ و ٢٥] ''پھر جسے اس کا اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں دیا گیا تو وہ کہے گا: لو! میرا اعمال نامہ پڑھو۔ بے شک مجھے یقین تھا کہ مجھے اپنے حساب کو ملنا ہے۔ چنانچہ وہ پسندیدہ زندگی میں ہوگا۔ بہشت بریں میں۔ اس کے پھل قریب جھکے ہوں گے۔ (کہا جائے گا:) مزے سے کھاؤ اور پیو ان (اعمال) کے بدلے جو تم نے گزرے دنوں میں آگے بھیجے۔ اور جسے اس کا اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں دیا گیا تو وہ کہے گا: کاش! مجھے میرا اعمال نامہ نہ دیا جاتا۔''

فتیل کہتے ہیں لمبے دھاگے کو، جو گٹھلی کے شگاف میں ہوتا ہے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: « يُدْعَى أَحَدُهُمْ، فَيُعْطَى كِتَابَهُ بِيَمِيْنِهِ، وَيُمَدُّ لَهُ فِيْ جِسْمِهِ وَيُبَيَّضُ وَجْهُهُ، وَيُجْعَلُ عَلَى رَأْسِهِ تَاجٌ مِّنْ لُّؤْلُؤٍ يَتَلَأْلَأُ، فَيَنْطَلِقُ إِلَى أَصْحَابِهِ، فَيَرَوْنَهُ مِنْ بُعْدٍ، فَيَقُوْلُوْنَ: اَللّٰهُمَّ! آتِنَا بِهٰذَا وَبَارِكْ لَنَا فِيْ هَذَا، فَيَأْتِيْهِمْ، فَيَقُوْلُ لَهُمْ: أَبْشِرُوْا فَإِنَّ لِكُلِّ رَجُلٍ مِّنْكُمْ مِّثْلَ هَذَا، وَأَمَّا الْكَافِرُ فَيُسَوَّدُ وَجْهُهُ، وَيُمَدُّ لَهُ فِيْ جِسْمِهِ، وَيَرَاهُ أَصْحَابُهُ، فَيَقُوْلُوْنَ: نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ هٰذَا أَوْ مِنْ شَرِّ هَذَا، اَللّٰهُمَّ! لَا تَأْتِنَا بِهِ، فَيَأْتِيْهِمْ، فَيَقُوْلُوْنَ: اَللّٰهُمَّ أَخْزِهِ، فَيَقُوْلُ: أَبْعَدَكُمُ اللّٰهُ فَإِنَّ لِكُلِّ رَجُلٍ مِّنْكُمْ مِّثْلَ هَذَا »[1] (رواه البزار وقال: لا يروى إلا من هذا الوجه) [ایک شخص کو بلایا جائے گا اور اس کا نامۂ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، اس کے جسم کو بڑھا دیا جائے گا، اس کے چہرے کو منور کر دیا جائے گا اور اس کے سر پر چمک دار موتیوں کا تاج رکھ دیا جائے گا، وہ اپنے ساتھیوں کی طرف جائے گا اور وہ اسے دور ہی سے دیکھ لیں گے اور کہیں گے کہ اے اللہ! اسے ہمارے پاس لے آ اور اس کے بارے میں ہمیں برکت عطا فرما، وہ ان کے پاس آ جائے گا اور ان سے کہے گا کہ تم خوش ہو جاؤ، تم میں سے ہر شخص کے لیے اسی طرح عزت افزائی ہے اور جو کافر ہوگا تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جائے گا، اس کے جسم کو بڑھا دیا جائے گا، چنانچہ اس کے ساتھی جب اسے دیکھیں گے تو کہیں گے: ہم اس سے یا اس کے شر سے پناہ چاہتے ہیں، اے اللہ! اسے ہمارے پاس نہ لانا مگر وہ ان کے پاس آ جائے گا تو یہ کہیں گے کہ

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٣٦) مسند البزار (١٧/ ١٣١) اس کی سند میں ''عبدالرحمٰن بن ابی کریمہ'' مجہول راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٤٨٢٧)

اے اللہ! اسے ذلیل و رسوا کر دے، وہ کہے گا کہ اللہ تعالیٰ تمھیں (اپنی رحمت سے) دور کر دے تم میں سے ہر شخص کو اسی طرح ذلت و رسوائی حاصل ہونے والی ہے] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، قتادہ اور ابن زید رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ هٰذِهٖٓ ﴾ سے مراد حیاتِ دنیا ہے۔[1] ﴿ اَعْمٰى ﴾ سے مراد اندھا ہے۔ اللہ کی حجت اور آیاتِ بینات سے۔ ایسا شخص آخرت میں بھی نابینا ہوگا، بلکہ دنیا میں جتنا گمراہ تھا، اس سے بھی زیادہ گمراہ۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ اس جگہ یوم سے مراد قیامت کا دن ہے۔[2] لغت میں امام وہ ہے جس کی اقتدا کریں، خواہ پیغمبر ہو یا اور کوئی مقدم فی الدین، یا کتاب۔ امام کی تعیین میں مفسرین کا اختلاف ہے، ایک جماعت صحابہ اور تابعین نے کہا کہ مراد کتاب ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا کہ اہلِ تورات، تورات سمیت بلائے جائیں گے اور انجیل والے انجیل سمیت اور قرآن والے قرآن سمیت۔ پھر اُن کو کہا جائے گا: اے اہلِ تورات! اے اہلِ انجیل! اے اہلِ قرآن!۔ بعض تابعین نے کہا کہ امام سے مراد پیغمبر ہے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ بھی اسی کے قائل ہیں، مثلاً: یوں کہا جائے گا: "هاتوا متبعي إبراهيم، هاتوا متبعي موسى، هاتوا متبعي عيسىٰ، هاتوا متبعي محمد ﷺ" یعنی لے آؤ متبعینِ ابراہیم علیہ السلام کو، لے آؤ متبعینِ موسیٰ علیہ السلام کو، لے آؤ متبعینِ عیسیٰ علیہ السلام کو اور لے آؤ متبعینِ محمد ﷺ کو۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے بھی یوں ہی کہا ہے اور یہ مضمون سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً بھی مروی ہے، لیکن اس کی سند میں دیکھنا چاہیے کہ کیسی ہے۔

علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ امام سے مراد ہم عصر ہے۔ ہر زمانے کے لوگ اپنے اس امام کے ہمراہ بلائے جائیں گے، جس کے امر و نہی پر چلتے تھے۔ بعض نے کہا کہ امام سے مراد عمل ہے، مثلاً یوں کہیں گے: کہ مجاہد، صابر، روزے دار، نمازی اور دیگر لوگ کہاں ہیں؟ امام حسن رحمہ اللہ، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور ابو العالیہ رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔ ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امام سے مراد صاحبِ مذہب ہے، مثلاً یوں کہا جائے گا کہ فلاں بن فلاں عالم متبعین کہاں ہیں؟ لیکن یہ قول بعید از امکان ہے، اس سے زیادہ ابعد قول محمد بن کعب کا ہے کہ امام جمع ام کی ہے، بہ معنی امہات۔[3]

نیز اس قول میں نظر ہے، کیوں کہ حدیث صحیح میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے: « إِذَا جَمَعَ اللّٰهُ الْأَوَّلِيْنَ وَالْآخِرِيْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، رُفِعَ لِكُلِّ غَادِرٍ لِوَاءٌ فَيُقَالُ: هٰذِهِ غَدْرَةُ فُلَانِ بْنِ فُلَانٍ »[4] (أخرجه الشيخان) [جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اول و آخر سب لوگوں کو جمع کرے گا تو بدعہدی کرنے والے ہر شخص کے لیے ایک جھنڈا بلند کیا جائے گا اور کہا جائے گا: یہ فلاں بن فلاں کی بدعہدی (کا نشان) ہے] یہ اس بات

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٥٠٤۔ ٥٠٥) [2] معاني القرآن (٣/ ٢٥٢) [3] فتح القدير (٣/ ٣٤١۔ ٣٤٢)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠١٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٣٥)

پر دلیل ہے کہ لوگوں کو اُن کے نام اور اُن کے باپوں کے نام سے پکارا جائے گا اور جس نے کہا کہ ماں باپ دونوں کے نام سے پکارے جائیں گے، اس کی یہ حدیث تردید کرتی ہے۔ لہٰذا امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ تفسیر کہ امام اُم کی جمع ہے اور وہ لوگ اپنی ماؤں کے نام سے پکارے جائیں گے، من جملہ بدعتی تفاسیر کے ہے اور اس میں حکمت ان کے نزدیک یہ ہے کہ عیسیٰ کے حق کی رعایت اور سیدنا حسن وحسین رضی اللہ عنہما کے شرف کا اظہار ہے اور اس لیے کہ اولادِ زنا کی رسوائی نہ ہو،[1] تاہم یہ قول مردود ہے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا: بعض نے کہا کہ یہ پکار مذہب کے ساتھ ہوگی جس کے ساتھ دنیا میں پکارے جاتے تھے اور اُس مذہب کے مقلد تھے، مثلاً: یوں کہیں گے: اے حنفی! اے شافعی! اے معتزلی! اے قدری! اور اسی طرح کے اور نام۔[2] یہ قول پہلے قول کی طرح ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ بعید۔ بعض نے کہا ہے کہ انسان سے جون سا خلق حسن ظاہر ہوتا ہے، جیسے: حلم و کرم و شجاعت، یا قبیح خلق، جیسے: اُن کے اُلٹ۔ سو اُن افعال کی طرف دعوت دینے والا خلق باطن ہے اور وہ امام کی طرح ہے۔[3] (ذكره الرازي في تفسيره)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ مراد امامِ ہدیٰ و امامِ ضلالت ہے۔[4] یا امامِ زمان، یا کتاب رب وسنتِ نبی، یا ہر اُمت کا معبود۔ پھر جس کسی کو وہ کتاب دائیں طرف سے ملے گی اور وہی نیک بخت اور صاحبِ بصیرت ہے تو وہ اپنی کتاب پڑھ لے گا اور ایک چھلکے برابر اس پر ظلم نہ ہوگا اور اُن مدعوین میں سے جو کوئی اس دنیا میں اندھا اور ناقد البصیرت ہے اور یہ وہ شخص ہے، جس کو کتاب بائیں طرف سے ملے گی، سو وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا اور مراد دل کا اندھا ہے اور احتمال ہے کہ آنکھ سے بھی اندھا ہو، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ۝۱۲۴ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ﴾ [طٰه: ١٢٤۔ ١٢٥] ”اور روزِ قیامت ہم اسے اندھا کر کے اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا: اے میرے رب! تو نے مجھے اندھا کیوں اٹھایا؟ جبکہ میں تو (دنیا میں) دیکھنے والا تھا۔“ اور اس میں زیادہ عقوبت ہے۔

بعض نے کہا کہ آخرت سے مراد عملِ آخرت ہے، یعنی وہ عملِ آخرت اور اس کے بارے میں نابینا ہے۔ یا دنیا اور آخرت کی نعمتوں سے اندھا ہے۔ یا جو کوئی اس دنیا میں ایسے عمل کے بارے میں اندھا ہے جس سے توبہ قبول ہوتی ہے تو وہ آخرت میں جہاں توبہ نہیں ہے اور زیادہ اندھا ہوگا۔ یا جو اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی حجتوں سے اندھا ہے، وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا اور سخت گمراہ، کیوں کہ اس کو ہدایت کی طرف کوئی راستہ نہ ملے گا، برعکس آنکھوں کے اندھے کے کہ بعض حالات میں وہ راہ یاب ہو جاتا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ جو کوئی اس دنیا میں اللہ کی قدرت سے اندھا ہے کہ اس اللہ نے آسمان،

---

[1] الكشاف (٢/ ٦٣٧) [2] تفسير القرطبي (١٠/ ٢٩٧) [3] تفسير الرازي (٢١/ ١٥) [4] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٣٩)

زمین، پہاڑ، دریا، آدمی، جانور اور دوسری چیزیں بنائیں تو وہ اوصاف آخرت سے جن کو اس نے دیکھا نہیں ہے زیادہ اندھا اور حجت و دلیل سے بہت دور ہوگا۔[1] بعض نے کہا: ﴿ أَعْمَىٰ ﴾ افعل تفضیل ہے، یعنی بہت زیادہ اندھا، لیکن یہ اسی صورت میں ہے کہ مراد دل کا اندھا ہو، کیوں کہ آنکھ کے اندھے کو اس طرح نہیں کہا جاتا۔[2]

وَإِنْ كَادُوا لَيَفْتِنُونَكَ عَنِ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهُ ۖ وَإِذًا لَّاتَّخَذُوكَ خَلِيلًا ﴿٧٣﴾ وَلَوْلَا أَن ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كِدتَّ تَرْكَنُ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا ﴿٧٤﴾ إِذًا لَّأَذَقْنَاكَ ضِعْفَ الْحَيَاةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيرًا ﴿٧٥﴾

اور بلاشبہ قریب تھا کہ ہم نے آپ کی طرف جو وحی کی ہے، کافر آپ کو اس سے پھسلا دیتے، تاکہ آپ ہم پر اس کے علاوہ کچھ اور گھڑ لیں اور تب وہ ضرور آپ کو اپنا دلی دوست بنا لیتے (73) اور اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو بلاشبہ قریب تھا کہ آپ ان کی طرف تھوڑا سا جھک جاتے (74) (اگر ایسا ہوتا) تو ہم آپ کو زندگی میں بھی اور موت کے بعد بھی دوگنا (عذاب) چکھاتے، پھر آپ اپنے لیے ہمارے خلاف کوئی مددگار نہ پاتے (75)

وحی الٰہی میں تبدیلی کی سزا:

کافر کہتے تھے کہ اس کلام میں نصیحت کی باتیں اچھی ہیں، مگر ہر جگہ شرک کو برا کہا ہے، یہ بدل ڈالیں تو ہم سب آپ کو مان لیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ ہم نے اپنے رسول کی تائید کی اور اُن کو ثابت قدم رکھا اور شریروں کے شر اور فاجروں کے مکر و فریب سے آپ کو معصوم اور سالم رکھا اور ہم اُن کے معاملے اور مدد میں اُن کے متولی ہوئے اور ہم نے اُن کو کسی مخلوق کے سپرد نہیں کیا، بلکہ خود اُن کے ولی و نگہبان و مددگار و تائید کرنے والے اور مظفر اور دشمنوں کے اور مخالفوں کے دین پر غالب رہے، خواہ وہ دشمن مشارقِ ارض میں ہوں یا مغاربِ ارض میں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے قریب تھا کہ یہ کفار تجھ کو اس وحی سے دھوکے میں ڈال کر مفتری بنا لیں اور تو ہمارے امر و نہی اور وعدہ وعید کو بدل ڈالے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اُمیہ بن خلف، ابوجہل بن ہشام اور قریش کے کچھ اشخاص نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر کہا کہ آؤ! ہمارے معبودوں کو مسح کرو، ہم تمھارے دین میں داخل ہو جائیں

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٤٠)
[2] فتح البيان (٧/ ٤٢٦۔ ٤٣٠)

گے اور نبی اکرم ﷺ پر اپنی قوم کی جدائی سخت گزرتی تھی، آپ ﷺ چاہتے تھے کہ کسی طرح قوم مسلمان ہو جائے۔ نبی اکرم ﷺ نے اُن کے لیے نرمی کی، اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بھیجی۔ سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ نبی مکرم ﷺ حجرِ اسود کو بوسہ دے رہے تھے تو کفارِ قریش نے کہا کہ ہم تم کو استلام نہ کرنے دیں گے، جب تک کہ تم ہمارے معبودوں کا بھی استلام نہ کرو گے، نبی مکرم ﷺ نے اپنے دل میں کہا کہ اگر میں اُن کے معبودوں کو چھولوں تو کیا نقصان ہے، اللہ تو جانتا ہے کہ میں اُن کے خلاف ہوں، اس پر یہ آیت اُتری۔

ابن شہاب رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ جبیر بن نفیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ قریش نبی مکرم ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ اگر تو رسول ہو کر ہمارے پاس آیا ہے تو اُن لوگوں کو جو غلام اور نیچ ذات کے تیرے تابع ہوئے ہیں، اپنے پاس سے بھگا دے اور دور کر دے تو ہم تیرے ساتھی بنیں گے۔ نبی اکرم ﷺ کو ان کی طرف میلان کا خیال آیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بھیجی۔[1]

امام سیوطی رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ ثقیف نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا کہ اُن کی وادی کو حرام کر دیں تو اس پر یہ آیت آئی۔[2] اور فرمایا کہ اگر تو اُن کی خواہشات کا تابع ہوا تو وہ تجھ کو اپنا دوست ٹھہرا لیں گے، لیکن اگر ہم تجھ کو حق پر ثابت قدم نہ رکھتے اور اُن کی موافقت سے بچا نہ لیتے تو قریب تھا کہ تو اُن کی طرف کچھ جھک جاتا۔ رکون کہتے ہیں تھوڑے سے میلان کو، لیکن اللہ کی عصمت نے نبی مکرم ﷺ کو رکون کے ادنیٰ سے مرتبے سے بھی محفوظ رکھا، نفس رکون کا کیا ذکر ہے۔ یہ دلیل ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اُن کی طرف میلان کا ذرا سا بھی ارادہ نہ کیا۔ امام قشیری رحمہ اللہ نے یہ ذکر کیا ہے[3] اور نظم قرآنی بھی عدمِ رکون میں بالکل واضح ہے اور اگر تو کبھی اس رکون کے لگ بھگ جاتا تو ہم تجھ کو دُگنا مزہ زندگی اور موت کا چکھاتے، یعنی جو عذاب دوسروں کو اس فعل پر ہوتا، اس کا دوگنا عذاب تجھ کو دنیا اور آخرت میں کرتے، اس لیے کہ بڑے شخص کی خطا بڑی ہوتی ہے، جیسے اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿ يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ﴾ [الأحزاب: ٣٠] ’’اے نبی کی بیویو! تم میں سے جو کوئی کھلی بے حیائی کا ارتکاب کرے، اسے دوہرا عذاب دیا جائے گا۔‘‘

امام رازی رحمہ اللہ نے کہا کہ حاصل کلام یہ ہے کہ اگر تو اپنے دل میں شیطانی خیالات کو جگہ دیتا ہے اور رکون پر ہمت باندھتا ہے تو دنیا اور آخرت میں دوہرے عذاب کا مستحق ہو جاتا ہے اور تیرا عذاب دنیا اور آخرت میں مشرک کے عذاب سے دوگنا ہو جاتا ہے،[4] پھر تو اپنے لیے ہم پر مدد کرنے والا کوئی نہ پاتا جو تجھ کو ہمارے عذاب سے بچاتا۔ نیساپوری نے کہا کہ فتنے کا قرب اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ کوئی فتنے میں پڑ گیا اور معصیت سے ڈرانا اس بات کی دلیل نہیں کہ کوئی معصیت کا اقدام کر بیٹھا ہے۔ لہٰذا اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کی معصومیت پر کوئی حرف نہیں آتا۔[5]

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٤٠) الدر المنثور (٥/ ٣١٨)
[2] تفسیر الجلالین (١/ ٣٧٤)
[3] فتح القدیر (٣/ ٣٤٣)
[4] تفسیر الرازي (٢١/ ١٨)
[5] فتح القدیر (٣/ ٣٤٣) فتح البیان (٧/ ٤٣٠-٤٣٢)

وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۷۶ سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ۝۷۷

اور بلاشبہ قریب تھا کہ وہ آپ کو اس زمین (مکہ) سے اُکھاڑ دیں، تاکہ آپ کو یہاں سے نکال دیں، اور تب آپ کے پیچھے وہ تھوڑا ہی ٹھہر پاتے (76) ان رسولوں کے طریقے کی مانند جنھیں ہم نے آپ سے پہلے اپنے رسولوں میں سے بھیجا، اور آپ ہمارے طریقے (قانون) میں کوئی تبدیلی نہ پائیں گے (77)

یہودیوں کی وطنی عصبیت کا بیان:

کہا ہے کہ یہ آیت یہود کے حق میں اُتری ہے۔ انھوں نے نبی مکرم ﷺ کو اشارہ کیا تھا کہ تم شام میں جا کر رہو، شام نبیوں کا علاقہ ہے اور مدینہ میں رہنا چھوڑ دو۔ لیکن یہ قول ضعیف ہے، اس لیے کہ یہ آیت مکی ہے اور مدینہ کی سکونت اس کے بعد ہوئی تھی۔ بعض نے کہا کہ یہ آیت تبوک میں اُتری تھی، لیکن اس کی صحت میں نظر ہے۔ عبد الرحمٰن بن غنم کہتے ہیں کہ ایک دن یہود نے آ کر نبی مکرم ﷺ سے کہا: اے ابو قاسم! اگر تم اس بات میں سچے ہو کہ تم نبی ہو تو تم شام کو چلے جاؤ، کیوں کہ شام زمینِ محشر ہے اور پیغمبروں کی زمین ہے، نبی اکرم ﷺ نے اُن کی تصدیق کی اور بہ ارادۂ شام تبوک کا غزوہ کیا، جب تبوک میں پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی سورت کی کچھ آیات نازل فرمائیں، ختم سورت کے بعد: ﴿ وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ ... الخ﴾ اور اللہ تعالیٰ نے مدینہ میں واپسی کا حکم دیا اور کہا کہ تمھارا جینا اور مرنا اسی مدینہ میں ہوگا اور تم اسی جگہ سے مبعوث ہوگے۔[1] (رواہ البیهقي) لیکن اس اسناد میں نظر ہے اور زیادہ ظاہر یہی ہے کہ یہ اسناد صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ نبی مکرم ﷺ نے کچھ یہود کے کہنے سے تبوک کا غزوہ نہیں کیا تھا، بلکہ اللہ کے حکم کی بجا آوری میں کیا تھا جیسے فرمانِ الٰہی ہے: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ ﴾ [التوبة: ۱۲۳] ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم ان کافروں سے لڑو جو تمھارے قرب و جوار میں ہیں۔''

نیز فرمایا: ﴿ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴾ [التوبة: ۲۹] ''ان لوگوں سے لڑو جو اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور اس چیز کو حرام نہیں ٹھہراتے جسے اللہ نے اور اس کے رسول نے حرام ٹھہرایا ہے اور دینِ حق کو قبول نہیں کرتے، وہ جو اہلِ کتاب میں سے ہیں، (ان سے

[1] دلائل النبوة (۵/ ۲۵٤) اس کی سند میں ''احمد بن عبدالجبار'' ضعیف راوی ہے۔ نیز ''عبدالرحمان بن غنم رضی اللہ عنہ'' کے صحابی ہونے میں اختلاف ہے۔

لڑو) یہاں تک کہ وہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں۔''

اس غزوے سے یہ بھی مقصود تھا کہ جو اصحاب غزوۂ موتہ میں گئے ہیں ان کا قصاص اور انتقام لیں اور اگر یہ بات صحیح ٹھہری تو ابو اُمامہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث اسی پر محمول ہوگی کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «أُنْزِلَ الْقُرْآنُ فِيْ ثَلَاثَةِ أَمْكِنَةٍ: مَكَّةَ وَالْمَدِيْنَةِ وَالشَّامِ»[1] ولید بن مسلم نے کہا: شام سے مراد بیت المقدس ہے، لیکن شام کی تفسیر تبوک کے ساتھ کرنا ولید کے قول سے بہتر ہے۔ واللہ أعلم۔ بعض نے کہا کہ یہ آیت کفارِ قریش کے حق میں اُتری ہے، انھوں نے قصد کیا تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے درمیان میں سے نکال دیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ آیت بھیج کر وعید کی اور فرمایا کہ اگر پیغمبر کو نکال دیں گے تو اس اخراج کے بعد خود بھی مکہ میں زیادہ نہ رہیں گے۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا کہ جب سخت تکلیف اُٹھانے کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے ہجرت کی تو ڈیڑھ برس سے زیادہ وقفہ نہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بغیر کسی معیاد کے بدر کے مقام پر جمع کر کے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پر برتری اور غلبہ دیا اور کامیاب کر دیا، یہاں تک کہ قریش کے شرفا مارے گئے اور اُن کے سردار قیدی ہوگئے۔

لٰہذا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کے حق میں ہماری عادت یہی ہے کہ جب وہ رسولوں کو ایذا دیتے ہیں تو رسول اُن کے درمیان سے باہر نکل جاتا ہے اور اُن پر اللہ کا عذاب آتا ہے اور اس کا غضب ٹوٹ پڑتا ہے۔ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رسولِ رحمت نہ ہوتے تو ایسا انتقام دنیا میں آتا کہ کوئی اس کا سامنا نہ کر سکتا۔ لٰہذا اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ﴾ [الأنفال: ۳۳] ''اور (اے نبی!) اللہ ایسا نہیں کہ انھیں عذاب دے، جب کہ آپ بھی ان کے درمیان (موجود) ہوں۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ کفارِ مکہ نے چاہا تھا کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی دشمنی اور مکر و فریب سے تھکا کر مکہ کی سرزمین سے باہر نکال دیں، لیکن یہ بات اُن سے نہ بنی، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو اس امر سے باز رکھا، حتیٰ کہ خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے اپنے رب کے حکم سے ہجرت کی۔ استفزاز کے معنی ہیں ازعاج کے (یعنی بے قرار کرنا، جڑ سے اُکھاڑ دینا)۔ ارادۂ اخراج پر اخراج کا اطلاق بطورِ تجویز ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ تھوڑا ٹھہرنے سے مراد یومِ بدر ہے۔

امام ابن الانباری نے کہا کہ خلاف بہ معنی مخالفت ہے۔[3] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ مراد اہلِ مکہ ہیں۔ انھوں نے ارادہ کیا تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے خارج کر دیں، اس پر اللہ تعالیٰ نے بدر کے دن اُن کو ہلاک کر دیا اور پھر

---

[1] المعجم الکبیر (۸/ ۱۷۱) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه عفير بن معدان وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ۷/ ۳۲۷)

[2] تفسیر الطبري (۱۷/ ۵۱۱) [3] تفسیر القرطبي (۱۰/ ۳۰۲)

زیادہ نہ ٹھہرے برباد ہوگئے۔ اللہ کا طریقہ رسولوں کے بارے میں یہی ہے[1] اور اسی طرح جاری وساری ہے کہ جب قوم پیغمبر کے ساتھ اس طرح پیش آتی ہے تو اللہ اس کو برباد کر دیتا ہے۔ اللہ کی اس سنت میں تغیر وتبدل اور رد و بدل کا کوئی اختیار کسی کو نہیں۔[2]

سازشوں کا ذکر:

مترجم ۱۲۷۰ ہجری سے اس جگہ ریاست کی ملازمت کے سلسلے میں مقیم تھا۔ ۱۲۸۵ ہجری میں ملازمت رئیس کے ساتھ قرابت داری میں بدل گئی۔ تیرہ سال تک اس جگہ کا انتظام و التیام و انصرام والیِ ملک کی اتباع میں میری وساطت سے ہوتا تھا اور عروسِ مملکت اپنے شباب پر تھی کہ اتنے میں اخوانِ شیاطین اور ارکانِ ضلال کی نظرِ بد نے دین و دنیا کا سارا کارخانہ ۱۳۰۲ ہجری سے درہم برہم کر دیا اور مجھ کو اور والیِ ریاست کو ایک چشمِ زخم پہنچا، اس ہنگامے کی وجہ اس کے سوا اور کوئی نہ تھی کہ بعض ظالموں نے برخلاف عقل ونقل اپنا مختار ہونا چاہا اور ایسے ارکان نے داخلے کے اور نکلنے کے تمام دروازوں پر قبضہ کرنا چاہا، جو نمک حرامی کی آغوش کے پروردہ، محسن کش، احسان فراموش، خائن، مرتشی و راشی تھے اور اشاعتِ توحیدِ خالص اور ایثارِ دین علی الدنیا سے سخت بے زار تھے۔ جب یہ مدعا اُن کو حاصل ہوا تو اُن کی کوششوں اور جدوجہد اور جہاد کی انتہا یہ ہوئی کہ بہتری کے کاموں میں فتور آ گیا اور مملکت کی رسوم اور آئین بدل گئے اور مملکت کے رئیس اور اس کے ماتحتوں کو بہت زیادہ نقصان اور جان و مال میں بہت تنگی پہنچی، جو اُن تخت کے خواہش مند مگس طینت جانوروں نے ان اُمورِ عظام میں قدم جمانے اور احکامِ شرعِ عالیِ مقام کے چلانے اور اس سرگشتہ مسکین کو تیرِ ملامت کا ہدف بنانے کے لیے اپنے ذہن نافرجام میں یقین کر رکھا تھا، جب دیکھا کہ ہمارے مکروفریب اور عزائم کماحقہ پورے نہیں ہوتے، اگرچہ ریاست کے نظم ونسق کی بنیاد میں خلل آ گیا ہے اور قوت بازوئے تقویٰ میں لغزش آ گئی ہے۔

تب بہ پابندیِ شیوۂ لئام وایثارِ طریقہ طغام اس قدر گھبرانا اور بہ اشاعت جرائب بے اصل ڈرانا شروع کیا کہ اگر کوئی دوسرا غیر مستقل مزاج اور غیر معتمد علی رحمۃ اللہ ہوتا تو ہرگز اس کا قدم اس صفوانِ ابلس پر نہ جمتا۔ میں نے اُن کی اس تدبیرِ اخراج وقید وقرقی جائیداد، جو میرے لیے کر رہے تھے اور جس کے لیے انھوں نے کثیر مال خرچ کر کے آسمان زمین کے قلابے ملا دیے تھے، اللہ تعالیٰ کے عظیم لطف وکرم اور عنایت وحمایتِ اعظم پر چھوڑ دیا، جس طرح کہ میرے جدِ اعلیٰ و اولیٰ و اکرم رسول اللہ ﷺ نے اہلِ مکہ اور اصحابِ جاہلیت کی ایذا دہی پر صبر وتحمل کیا۔ میں نے اس تلاطم وطوفان میں کسی بے دم گدھے اور کسی بڑے چھوٹے نفر کی آشائی نہیں کی اور نہ ہی کسی حاکم وفرماں روا کے

---

[1] تفسیر الطبري (١٧/ ٥٠١) [2] فتح البیان (٧/ ٤٣٣۔ ٤٣٤)

سامنے عجز و انکسار و عفو و استغفار کا اظہار کیا، بلکہ محض رحمت ارحم الراحمین اور کرامت اکرم الاکرمین پر ہی اعتماد کرتا رہا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے میرے حال پر ایسا رحم و کرم فرمایا، جس کا ادنیٰ شکر ایک بڑی عمر میں بھی مجھ سے ادا نہیں ہو سکتا، اگرچہ میرے جسم کا ہر رواں اور بال ایک الگ زبان ہی نہ ہو جائے۔ وکیف وقد قیل ؎

لو الثقلان الجن والإنس أجمعوا — يريدون إيلاما لأصغر نملة

يكون لها رب السموت ناصرا — لما ظفروا منها بأدنىٰ مضرة

[اگر جن و انس اکٹھے ہو کر ایک چھوٹی سی چیونٹی کو کوئی تکلیف پہنچانا چاہیں، جب کہ آسمانوں کا رب اس چیونٹی کا حامی و ناصر ہو تو وہ سب مل کر اس چیونٹی کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے]

بالجملہ اس جگہ حکایت اور شکایت سے میرا مقصد بحکم "الشيء بالشيء يذكر" صرف اسی قدر ہے کہ بفحوائے "الولد سر لأبيه" اللہ تعالیٰ نے بہ اتباع سیرت الانام بعض دنیاوی اذیتوں اور تکالیف میں مجھ کو بھی اپنے کلام بلاغتِ نظام کا مصداق بنایا اور میری ممکنہ قدرت کے مطابق مجھے صبر و شکر کے درجے سے محروم نہ رکھا۔ وللہ الحمد والمنة. میرے لیے سید الانبیاء علیہ السلام کے ساتھ اتنی ادنیٰ سی مناسبت بھی کافی، وافی اور شافی ہے اور جب میں اس آیت کا مصداق ہوا: ﴿ وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا ﴾ (آیتِ باب) تو میرے غالب دشمن بھی اس کے بعد اس آیت کے مصداق ہو گئے: ﴿ وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾ (آیتِ باب)۔

فتح البیان میں اِن الفاظ کے نیچے لکھا ہے کہ وہ آپ کو وہاں سے نکالنے کے بعد تھوڑا عرصہ ہی وہاں ٹھہر سکیں گے، حتی کہ وہ ہلاک ہو جائیں گے، پھر ان کو پر ایسا عذاب آئے گا جو ان کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکے گا۔[1] انتهى

چناں چہ جو لوگ اس واقعے کے طالب تھے وہ اس جگہ سے نکال دیے گئے اور عمدہ معاش و خدمات سے محروم رہے، جو اس ارادے اور نیت سے پہلے اُن کو حاصل تھی۔ ﴿ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ۝ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ﴾ [الحج: ٧٣۔ ٧٤] "طالب و مطلوب (عابد و معبود دونوں) کمزور ہیں۔ انھوں نے اللہ کی قدر (اس طرح) نہیں کی، جس طرح اس کی قدر کرنے کا حق ہے۔" اور پھر اُن کا وہاں ٹھہرنا بہت کم مدت ہوا ایک دو سال ہی کے اندر اکثر معزول و برطرف ہو کر خارج ہو گئے اور بعض کو اُن میں سے موت بھی آ گئی اور بعض قید ہوئے اور اس فساد کے بعض سرکردہ لوگ ذلیل و خوار ہیں اور بعض کے لیے عقوبتِ عاجلہ و آجلہ کا انتظار ہو رہا ہے۔ ؎

از مکافات عمل غافل مشو — گندم از گندم بروید جو ز جو

"اپنے عمل کی پاداش سے غافل نہ رہ (کیوں کہ) گندم ہمیشہ گندم ہی سے اُگتی ہے اور جو سے جو پیدا ہوتا ہے۔"

[1] فتح البيان (٧/ ٤٣٣)

الحمد للہ تعالیٰ کہ جو بلندی مجھ کو اس جگہ حاصل ہوئی تھی، اس کے لیے میری کوئی کوشش شروع میں یا آخر میں شامل نہ تھی، بلکہ میں اپنے دل میں اُن اضافی انعامات پر رنجیدہ خاطر ہی رہا کرتا ہوں اور اُن معاملات کو اپنے حق میں ازلی مقدمات کا ظہور سمجھ کر چار و ناچار خاموش ہوں۔ ؎

آنچہ نصیب ست بہم می رسد ورنہ ستانی بہ ستم می رسد

''جو قسمت میں ہے ضرور ملتا ہے اور اگر تو نہیں لے گا تو دوسری جگہ پہنچ جائے گا۔''

اور جب سے یہ حیص بیص پیش ہوا ہے، تب سے تو اور بھی دل کو اِن مراعات اور انتسابات سے ایک نفرت کلی حاصل ہوگئی ہے، جس کے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ ''لا یقادر قدرہ ولا یبلغ مداہ'' میری آرزو دنیا میں ہرگز یہ نہ تھی کہ حکومت و دولت و رفعِ منزلت وعلوِ مرتبت حاصل کروں، بلکہ میں تہہ دل سے اس بات کا خواہاں ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرے دشمنوں کو مدارجِ عمر اور دولت میں کمال درجے کی ترقی نصیب کرے اور اپنی ذات کے لیے، بلکہ اپنے اخلاف کے لیے بھی صرف یہ خواہش ہے کہ اس قدر دولت ملے جو زندہ رہنے کے لیے ضروری ہو اور جس میں کسی کے سامنے التجا کرنے کی نوبت نہ آئے اور سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کے در اور گھر پر کمر بستہ نہ جانا پڑے اور یہ دنیائے فانی کی حیاتِ مستعار دینی اور دنیاوی عزت و آبرو کے ساتھ کٹ جائے اور اخلاصِ توحید رب العباد نصیب ہو، وہ توحید جس میں انابت اور رجوع الی اللہ ہو اور ظاہری اور معنوی معصیت اور ظاہری اور پوشیدہ گناہوں اور شرک وکفر و بدعت وفتنوں سے داعیِ اجل کو لبیک کہنے سے قبل توبہ نصیب ہو جائے۔ اللھم آمین۔ اور اب باقی عمر اس جھک جھک اور بک بک ابنائے دنیا اور مخلوق کے معاملات اور رعایا کے جھگڑوں کے فیصلے کرنے اور قضائے برایا اور دیگر خبایائے زوایا ظاہر و پوشیدہ سے مکمل نجات اور عافیت حاصل رہے، کیوں کہ اس مدتِ دراز میں سب طرح کے احوال اور مصیبتیں گزر گئیں اور دنیائے ناپائیدار کے حقائق کا تجربہ حاصل ہوا اور دوستوں اور دشمنوں کی بہ خوبی آزمائش ہوگئی۔

بہار دیدم و گل دیدم و خزاں دیدم

''میں نے بہار دیکھی، پھول دیکھے اور خزاں دیکھی۔''

اور بہت اچھا ہے جو کہا گیا ہے:

دنیا بہ نہر طالوت می ماند غرفۂ ازاں حلال ست زیادہ حرام

''دنیا طالوت کی نہر کی مانند ہے، اس میں سے ایک چلو حلال ہے باقی حرام ہے۔''

دریں دیار کہ شاہی بہر گدا بخشند غنیمت ست کہ مارا ہمیں بما بخشند

''اس ملک میں کہ جہاں پر گداگر کو بادشاہی دے دیتے ہیں۔ غنیمت ہے کہ ہمیں اسی حال میں بخش دیں۔''

اب عمر ستاون (۵۷) سال کو پہنچی موت کا سایہ سر پر آیا، اللہ تعالیٰ دنیا طلبی و بدکرداری اور جملہ مذموم اخلاق سے مکمل طہارت فرما کر اپنے رحم و کرم اور عفو و غفران کے لائق کر دے۔ وما ذلك عليه بعزيز. ؎

رقم سپید و سیاہ من بزمین شکستہ نگاہ من　　　چہ من وچہ قدر گناہ من خجلم زنام غفور تو

''میری نیکیوں اور برائیوں نے میری آنکھیں نیچی کر دی ہیں، میں کیا اور میرے گناہ کس قدر میں تو تیرے غفور نام سے ہی شرمندہ ہوں۔''

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ۝۷۸ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖۗ عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۝۷۹

سورج ڈھلنے سے لے کر رات کے اندھیرے تک نماز قائم کیجیے اور نمازِ فجر بھی، بے شک فجر کی نماز (فرشتوں کے) حاضر ہونے کا وقت ہے 78 اور رات کے کچھ حصے میں بھی آپ اس (قرآن) کے ساتھ تہجد پڑھیں، (یہ) آپ کے لیے زائد ہے، امید ہے کہ آپ کا رب آپ کو مقامِ محمود پر کھڑا کرے گا 79

نمازوں کو ان کے اوقات میں ادا کرنے کا حکم:

یعنی نیند سے جاگ کر قرآن پڑھا کر، یہ حکم سب سے زیادہ تجھ پر کیا ہے کہ تجھ کو مرتبہ بڑا دینا ہے۔ مقامِ محمود تعریف کا مقام ہے شفاعت کا، جب کوئی پیغمبر بھی نہ بول سکے گا، تب نبی اکرم ﷺ اللہ تعالیٰ سے عرض کر کے خلق کو تکلیف سے چھڑائیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم ﷺ کو حکم دیا کہ تم پانچ وقت کی فرض نمازوں کو ان کے اوقات میں قائم کرو۔ ''دلوكِ شمس'' سے مراد غروبِ آفتاب ہے۔ یہی قول ہے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا۔ امام مجاہد و ابن زید رحمہما اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ دلوک سے مراد آفتاب کا زوال ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی اسی کے قائل ہیں، بلکہ ایک روایت میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، امام مجاہد، حسن، ضحاک، ابوجعفر باقر اور قتادہ رحمہ اللہ کا قول بھی یہی ہے۔ اسی کو ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے۔[1] سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث اس کی شاہد ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی مکرم ﷺ کی اور جس کو اُن کے اصحاب رضی اللہ عنہم سے چاہا دعوت کی۔ سب نے میرے ساتھ کھانا کھایا، پھر باہر نکلے، جبکہ سورج ڈھل گیا۔ نبی کریم ﷺ نے باہر آ کر فرمایا: باہر نکلو اے ابوبکر! یہ وقت دلوکِ شمس کا ہے۔[2]

---

[1] تفسیر الطبري (۱۷/ ۵۱۳۔ ۵۱۶)　[2] تفسیر الطبري (۱۷/ ۵۱۸) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔

اس صورت میں نماز کے پانچوں اوقات اس آیت میں شامل رہیں گے، دلوک سے تا غسق، یعنی تاریکیِ شب۔ بعض نے کہا کہ غروبِ شمس سے نمازِ ظہر وعصر ومغرب وعشا لی گئی ہے اور قرآنِ فجر سے نمازِ صبح اور سنتِ مطہرہ نے ان اوقات کی متواتر تفاصیل بیان کر دی ہیں، جس پر کہ آج کے دن اہلِ اسلام ہیں اور خلف نے سلف سے اِن اوقات کو قرناً بعد قرنٍ لیا ہے۔ كما هو مقرر في مواضعه ولله الحمد والمنة۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ نمازِ فجر میں رات کے اور دن کے فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔[1] ان کی مرفوع روایت کو امام بخاری رحمہ اللہ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ اکیلے نماز پڑھنے پر جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کی فضیلت ۲۵ درجے ہیں اور رات کے اور دن کے فرشتے صبح کی نماز میں حاضر (جمع) ہوتے ہیں۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تمھارا جی چاہے تو تم یہ آیت پڑھو: ﴿ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ۭ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ﴾[2] (آیتِ باب)

ان کی روایت کے تیسرے الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: « تَشْهَدُهُ مَلَائِكَةُ اللَّيْلِ وَمَلَائِكَةُ النَّهَارِ »[3] (رواه أحمد والترمذي والنسائي و ابن ماجه وقال الترمذي حسن صحيح) [اس (صبح کی نماز) میں رات اور دن کے فرشتے حاضر ہوتے ہیں] صحیحین میں ایک روایت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً یوں مروی ہے: « يَتَعَاقَبُونَ فِيكُمْ مَلَائِكَةٌ بِاللَّيْلِ وَمَلَائِكَةٌ بِالنَّهَارِ، وَيَجْتَمِعُونَ فِي صَلَاةِ الصُّبْحِ وَفِي صَلَاةِ الْعَصْرِ، فَيَعْرُجُ الَّذِينَ بَاتُوا فِيكُمْ فَيَسْأَلُهُمْ رَبُّهُمْ، وَهُوَ أَعْلَمُ بِكُمْ، كَيْفَ تَرَكْتُمْ عِبَادِي؟ فَيَقُولُونَ: أَتَيْنَاهُمْ وَهُمْ يُصَلُّونَ وَتَرَكْنَاهُمْ وَهُمْ يُصَلُّونَ »[4] [تم میں رات اور دن کے فرشتے یکے بعد دیگرے آتے جاتے رہتے ہیں اور نمازِ فجر اور نمازِ عصر میں اکٹھے ہو جاتے ہیں، پھر وہ فرشتے آسمان پر چڑھ جاتے ہیں جنھوں نے رات تمھارے پاس بسر کی ہوتی ہے تو ان کا رب ان سے پوچھتا ہے، حالانکہ تمھارے بارے میں وہ خوب جانتا ہے کہ تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا؟ فرشتے کہتے ہیں کہ جب ہم ان کے پاس گئے تو وہ نماز پڑھ رہے تھے اور ان کو اس حال میں چھوڑ کر آئے ہیں کہ وہ نماز پڑھ رہے تھے] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ دو پہرہ دینے والے (فرشتے) نمازِ فجر میں جمع ہوتے ہیں، ایک اوپر چڑھتا ہے اور دوسرا قائم رہتا ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں یہی قول ہے ابراہیم نخعی، مجاہد، قتادہ اور کئی ایک اہلِ علم کا۔[5]

رہی وہ حدیث جس کو اس جگہ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے سو وہ حدیثِ نزول

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦٧٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٢١٦) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢١)

[3] مسند أحمد (٢/ ٤٧٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٣٥) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٨١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦٧٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٦١٨)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٣٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٣٢) [5] تفسير الطبري (١٧/ ٥٢٠_ ٥٢٢)

ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر رات آسمانِ دنیا پر نزول فرماتا ہے اور کہتا ہے کوئی ہے استغفار کرنے والا کہ استغفار کرے اور میں اس کو بخش دوں، اور مجھ سے سوال کرے میں اس کو عطا کر دوں، مجھے پکارے میں اس کو جواب دوں، طلوعِ فجر تک یہی ہوا کرتا ہے۔ لہٰذا قرآنِ فجر کو مشہود کہا ہے، کیوں کہ اس میں رات اور دن کے فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔ اس حدیث میں اس اضافے کے ساتھ تفرد ہے اور اسی سند سے یہ حدیث سنن ابی داود میں بھی مروی ہے۔[1]

نمازِ تہجد کا حکم:

پھر اللہ نے نماز فرض کے قائم کرنے کے بعد نبی مکرم ﷺ کو قیامِ لیل کا حکم دیا، جس طرح کہ صحیح مسلم میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ نبی مکرم ﷺ سے پوچھا کہ فرض نماز کے بعد کون سی نماز افضل ہے؟ فرمایا: نمازِ شب۔[2] لہٰذا نبی اکرم ﷺ کو اس نماز کا حکم دیا گیا، کیوں کہ بقول علقمہ، اسود، ابراہیم نخعی اور غیر واحد تہجد وہ ہے جو نیند کے بعد ہو۔ لغتِ عرب میں بھی اسی طرح معروف ہے اور احادیث سے بھی یہی ثابت ہے کہ نبی اکرم ﷺ تہجد نیند کے بعد پڑھتے تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہم و غیر واحد نے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے اسی طرح کہا ہے۔ كما هو مبسوط فى موضعه ولله الحمد۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا کہ تہجد وہ ہے جو عشا کے بعد ہو یہ محمول ہے ما بعد نوم پر۔[3]

﴿ نَافِلَةً لَّكَ ﴾ کے معنی میں اختلاف ہے، بعض نے کہا کہ یعنی تم اے پیغمبر! اکیلے اس نماز کے واجب ہونے کے ساتھ مخصوص ہو، پس یہ قیامِ لیل نبی مکرم ﷺ کے لیے واجب تھا نہ کہ اُمت کے لیے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام شافعی رحمہ اللہ اور علما کے ایک قول میں یوں ہی ہے۔ اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے۔ بعض نے کہا کہ یہ قیامِ لیل نبی مکرم ﷺ کے حق میں نافذ تھا، خاص طور پر اس لیے کہ آپ کے سارے اگلے پچھلے گناہ بخش دیے گئے تھے۔ رہی آپ ﷺ کی اُمت، سو نفل نماز اُن کے گناہوں کو مٹانے والی ہوتی ہے۔ یہی قول ہے امام مجاہد کا ہے اور اسی طرح مسند احمد میں ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔[4]

اس فعل کے کرنے پر اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم ﷺ سے یہ وعدہ کیا کہ ہم تم کو مقامِ محمود میں کھڑا کریں گے، جس

---

1. تفسير الطبري (١٧/ ٥٢٠) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٨٩٢) اس کی سند میں ''زیادہ بن محمد انصاری'' ضعیف راوی ہے۔
2. صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٦٣)
3. تفسير الطبري (١٧/ ٥٢٤) تفسير ابن كثير (٣/ ٧٦) یہ رائے بظاہر صحیح نہیں، کیوں کہ رمضان میں عشاء کی نماز کے ساتھ ہی تراویح کی نماز پڑھ لی جاتی ہے جو تہجد ہی کی نماز ہے۔ اگر تہجد کے لیے سونا ضروری ہو تو پھر رمضان میں بغیر سوئے تراویح کا پڑھنا کس طرح جائز ہوسکتا ہے؟ نبی کریم ﷺ کا کوئی فرمان بھی ایسا نہیں جس میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہو۔ رہا آپ کے عمل سے استدلال؟ وہ بھی محلِ نظر ہے، کیا کسی نے آپ کی عمر بھر کی نمازِ تہجد کا استقصاء کیا ہے؟ [ص۔ي]
4. تفسير الطبري (١٧/ ٥٢٥) مسند أحمد (٥/ ٢٥٦)

جگہ تمام مخلوق تمھاری تعریف کرے گی اور تمام مخلوق کا خالق تبارک و تعالیٰ بھی تعریف کرے گا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اکثر اہلِ تاویل نے کہا ہے کہ مقامِ محمود وہ جگہ ہے جہاں قیامت کے دن نبی مکرم ﷺ کھڑے ہوں گے اور لوگوں کی شفاعت کریں گے، تاکہ اُن کا رب اُن کو اس دن کی شدت سے آرام دے۔ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ لوگ ایک زمین میں لائے جائیں گے، پکارنے والا اُن کو سنائے گا اور نگاہ اثر کرے گی، سب ننگے پاؤں، ننگے بدن ہوں گے، جس طرح کہ پیدا ہوئے تھے۔ یہ قیام اس طرح ہوگا کہ کوئی نفس اللہ کی اجازت کے بغیر بات نہ کرے گا، اللہ تعالیٰ ندا کرے گا کہ اے محمد! آپ ﷺ کہیں گے: «لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ فِي يَدَيْكَ، وَالشَّرُّ لَيْسَ إِلَيْكَ وَالْمَهْدِيُ مَنْ هَدَيْتَ، وَعَبْدُكَ بَيْنَ يَدَيْكَ، وَبِكَ وَإِلَيْكَ، لَا مَلْجَأَ وَلَا مَنْجَأَ مِنْكَ إِلَّا إِلَيْكَ، تَبَارَكْتَ وَتَعَالَيْتَ، سُبْحَانَكَ هَذَا رَبَّ الْبَيْتِ» [میں حاضر ہوں اور تیری فرماں برداری کے لیے تیار ہوں، ہر طرح کی بھلائی تیرے ہاتھوں میں ہے اور شر و برائی کی تیری نسبت نہیں ہے، ہدایت یافتہ وہ ہے جسے تو ہدایت عطا فرمائے، تیرا بندہ تیرے سامنے حاضر ہے، تیری توفیق سے اور تیری ہی طرف، اور تیری پکڑی سے بچنے کا تیری رحمت کے سوا کوئی ٹھکانا اور جائے پناہ نہیں ہے، تو ہی برکت والا ہے۔ اے پروردگار! اور تو سب سے بلند و برتر ہے اور تیری ذات پاک ہے، اے اس گھر کے مالک!] سو یہی ہے وہ مقامِ محمود جس کا ذکر اللہ نے کیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ مقامِ محمود مقامِ شفاعت ہے۔ یہی قول ہے امام مجاہد اور حسن بصری رحمہما اللہ کا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ سب سے پہلے زمین قیامت کے دن نبی مکرم ﷺ ہی سے منشق ہوگی اور آپ پہلے شافع ہیں۔ اہلِ علم کا یہ اعتقاد ہے کہ یہی وہ مقام ہے، جس کے بارے میں فرمایا ہے: ﴿ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴾[1] (آیتِ باب)۔

قیامت کے روز نبی مکرم ﷺ پر اللہ تعالیٰ کی خصوصی نوازشیں:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کو قیامت کے دن بہت سے ایسے شرف حاصل ہوں گے جن میں آپ کا کوئی شریک و سہیم نہیں ہوگا، مثلاً: سب سے پہلے آپ ﷺ ہی زمین سے باہر تشریف لائیں گے، آپ ﷺ میدانِ محشر کی طرف سواری پر سوار ہو کر تشریف لے جائیں گے، جھنڈا آپ ﷺ کے پاس ہوگا اور آدم علیہ السلام اور سب اولادِ آدم آپ ہی کے جھنڈے کے نیچے ہوں گے، حوض بھی آپ ﷺ ہی کا ہوگا اور سب سے زیادہ لوگ اسی جگہ پر آنے والے ہوں گے، شفاعتِ عظمیٰ بھی آپ ﷺ ہی کو نصیب ہوگی جس کے مطابق آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے عرض کریں گے کہ وہ مالک اپنی مخلوق میں فیصلے کے لیے جلوہ افروز ہو، آپ ﷺ سے پہلے لوگ آدم، نوح، ابراہیم، موسیٰ اور پھر عیسیٰ علیہم السلام سے باری باری یہ درخواست کر چکے ہوں گے، مگر ان میں سے ہر پیغمبر یہ جواب دے گا

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٥٢٦ـ ٥٢٨)

کہ میں اس قابل نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں شفاعت کرسکوں، حتیٰ کہ جب سب لوگ محمد ﷺ کے پاس آئیں گے تو آپ ﷺ فرمائیں گے: ہاں، میں یہ شفاعت کروں گا، میں یہ شفاعت کروں گا۔ اس کی تفصیل ہم ان شاء اللہ ابھی بیان کریں گے۔ آپ ﷺ کی شفاعت اُن اقوام کے حق میں ہوگی، جن کو دوزخ کا حکم ہو چکا ہوگا، وہ دوزخ سے پھیر لائے جائیں گے اور سب پیغمبروں سے پہلے آپ ہی کی اُمت کا فیصلہ ہوگا اور سب سے پہلے آپ ہی اُمت کے ساتھ پل صراط سے گزریں گے اور سب سے پہلے آپ ہی جنت کے بارے میں شفیع ہوں گے، جس طرح کہ صحیح مسلم سے ثابت ہے۔[1]

حدیث صور میں مروی ہے کہ سارے مومنین جنت میں داخل نہ ہوں گے مگر آپ ہی کی شفاعت اور سفارش سے اور سب سے پہلے نبی مکرم ﷺ اور آپ ﷺ کی اُمت سب اُمتوں سے اول بہشت میں جائے گی اور بعض اقوام کے حق میں درجات کی بلندی کی شفاعت فرمائیں گے، جن کو وہ اپنے اعمال کے سبب سے نہ پا سکتے تھے۔ آپ ﷺ صاحبِ وسیلہ ہیں۔ یہ وسیلہ جنت میں ایک اعلیٰ مقام ہے، جو سوائے نبی مکرم ﷺ کے کسی کو لائق نہیں اور جب اللہ تعالیٰ گناہ گاروں کے لیے شفاعت کا اذن دے گا تو پھر فرشتے اور نبی اور مومنین سب ہی شفاعت کرنے لگیں گے۔ نبی اکرم ﷺ کی شفاعت ایک خلائق کے لیے ہوگی، جن کی گنتی اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ غرض یہ کہ آپ کے برابر یا آپ کی طرح کوئی شفاعت نہ کرے گا۔ میں نے آپ ﷺ کی ان تمام خصوصیات کو تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب ''السیرۃ'' کے آخر میں ''باب الخصائص'' میں بیان کیا ہے۔ وللّٰه الحمد والمنة.[2]

مقام محمود:

اب ہم مقامِ محمود کے بارے میں احادیث کا ذکر کرتے ہیں، باللّٰه المستعان۔ اور اللہ سے اُمید کرتے ہیں کہ وہ ہم کو زمرۂ شفاعت سید الشافعین و خاتم النبیین میں داخل کر کے بخش دے گا۔

نماند بعصیان کسے در گرو   کہ دارد چنیں سیدی پیش رو

''کوئی اپنے گناہوں کی وجہ سے گروی (قیدی) نہ ہوا اور پکڑا نہ گیا، جبکہ وہ ایسا سردار راہنما و پیشوا رکھتا ہے۔''

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ لوگ قیامت کے دن گھٹنوں کے بل ہوں گے، ہر اُمت اپنے نبی کے پیچھے چلے گی اور کہے گی: اے فلاں! شفاعت کر، اے فلاں! شفاعت کر، یہاں تک کہ شفاعت کا معاملہ نبی مکرم ﷺ تک پہنچ جائے گا۔ یہی وہ مقام محمود ہے جہاں اللہ تعالیٰ نبی اکرم ﷺ کو اُٹھائے گا۔[3] (رواہ البخاري) امام ابن جریر رحمہ اللہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ سورج نزدیک آ جائے گا، یہاں تک کہ پسینہ نصف کان تک پہنچے گا، اس درمیان میں لوگ آدم علیہ السلام سے فریاد رسی چاہیں گے، وہ کہیں گے: میں یہ نہیں کر سکتا۔ پھر موسیٰ علیہ السلام

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۹۶) [2] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۷۷) [3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٤٤١)

سے، وہ بھی اسی طرح کہیں گے۔ پھر نبی اکرم ﷺ سے، تب آپ ﷺ مخلوق کی شفاعت کریں گے اور کشاں کشاں چلتے ہوئے بہشت کے دروازے کے کنڈے کو پکڑیں گے، اس دن اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو مقامِ محمود پر فائز کرے گا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس روایت کو کتاب الزکاۃ میں بیان فرمایا ہے اور اس میں ان الفاظ کا اضافہ بھی ہے: میدانِ حشر میں جمع ہونے والے سب لوگ آپ ﷺ کی تعریف کریں گے۔[1]

امام بخاری رحمہ اللہ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ جو کوئی اذان سننے کے وقت اس طرح کہے گا: «اَللّٰهُمَّ رَبَّ هٰذِهِ الدَّعْوَةِ التَّامَّةِ وَالصَّلَاةِ الْقَائِمَةِ، آتِ مُحَمَّدَنِ الْوَسِيْلَةَ وَالْفَضِيْلَةَ وَابْعَثْهُ مَقَامًا مَحْمُوْدَانِ الَّذِيْ وَعَدْتَّهُ» [اے اللہ! اس مکمل دعوت اور قائم نماز کے پروردگار! سیدنا محمد ﷺ کو خاص قرب اور خاص فضیلت عطا فرما اور اسے مقامِ محمود (تعریف کیے ہوئے مقام) پر کھڑا کر جس کا تو نے اس سے وعدہ کیا ہے] تو اس کے لیے قیامت کے دن میری شفاعت ہوگی۔[2] انفرد به دون مسلم.

سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ نبی مکرم ﷺ سے یوں ہیں کہ جب قیامت کا دن ہوگا، تو میں امام وخطیب وصاحبِ شفاعت نبی ہوں گا بغیر فخر کے۔[3] (أخرجه أحمد والترمذي وقال حسن صحيح و ابن ماجه) دوسری روایت میں آیا ہے کہ اس دن نبی مکرم ﷺ یہ کہیں گے: «اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِأُمَّتِيْ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِأُمَّتِيْ» [اے اللہ! میری امت کو بخش دے، اے اللہ! میری امت کو بخش دے] اور فرمایا: دیر کی میں نے تیسری مرتبہ میں اس دن کے لیے جس میں تمام مخلوق میری طرف راغب ہوگی، حتیٰ کہ ابراہیم علیہ السلام۔[4]

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن لوگ جمع ہوں گے، ان کو الہام ہوگا، وہ کہیں گے: کاش! ہم اپنے رب پر سفارش چاہتے تو وہ ہم کو اس جگہ سے آرام بخشتا، پھر آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور کہیں گے: اے آدم! آپ ابو البشر ہیں، آپ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور آپ کے لیے اپنے فرشتوں سے سجدہ کرایا اور آپ کو ہر شے کا نام سکھایا، آپ ہماری شفاعت اپنے رب کے پاس کریں، یہاں تک کہ ہم کو اس جگہ سے راحت ملے۔ آدم علیہ السلام اُن سے کہیں گے: ''لست هناكم'' یعنی میں اس کام کو نہیں کر سکتا اور اپنے گناہ کا ذکر کریں گے جو اُن سے ہو گیا تھا اور رب عزوجل سے شرمائیں گے اور کہیں گے: لیکن نوح علیہ السلام کے پاس جاؤ کہ وہ پہلے رسول ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے زمین والوں کی طرف بھیجا تھا، تب وہ نوح علیہ السلام کے پاس آئیں گے، وہ بھی ''لست هناكم'' کہیں گے اور اپنی خطا کا ذکر کریں گے کہ بغیر جانے اپنے رب سے سوال کیا تھا اور شرمائیں گے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٠٥) تفسير الطبري (١٧/ ٥٢٩) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨٩)

[3] مسند أحمد (٥/ ١٣٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦١٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٣١٤) صحيح الجامع، رقم (٧٨١)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٢٠) مسند أحمد (٥/ ١٢٧۔ ١٢٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٠٧١)

اور کہیں گے: لیکن تم ابراہیم علیہ السلام کے پاس جاؤ، تب ان کے پاس آئیں گے، وہ بھی یہی کہیں گے کہ میں تمھارے اس کام کا نہیں ہوں، تم موسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ، وہ ایک ایسے بندے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے بات چیت کی ہے اور اُن کو تورات دی ہے، تب وہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے، موسیٰ علیہ السلام کہیں گے: ''لست هناكم'' اور ذکر اس نفس کا کریں گے جس کو بغیر نفس کے مار ڈالا تھا اور اپنے رب سے شرمائیں گے اور کہیں گے: لیکن تم عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ، وہ اللہ کے بندے اور رسول اور کلمہ اور روح ہیں، تب وہ عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے، وہ کہیں گے: ''لست هناكم'' لیکن تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ، یہ ایسے بندے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے سارے اگلے پچھلے گناہ بخش دیے ہیں۔

تب وہ سب لوگ میرے پاس آئیں گے، تب میں اُٹھ کر مومنوں کی دو صفوں کے درمیان چلوں گا اور اپنے رب سے اذن چاہوں گا۔ جب اپنے رب کو دیکھوں گا، سجدے میں گر پڑوں گا، جب تک اللہ چاہے گا مجھ کو سجدے میں پڑا رہنے دے گا، پھر کہے گا: اے محمد! سر اٹھا، بات کر تیری بات سنی جائے گی، شفاعت کر، تیری شفاعت قبول ہوگی، مانگ تجھ کو ملے گا، میں سر اُٹھا کر وہ حمد کروں گا جو وہ مجھ کو سکھائے گا، پھر شفاعت کروں گا: میرے لیے ایک حد مقرر کر دی جائے گی، میں ان کو بہشت میں داخل کروں گا، پھر دوبارہ اس کے پاس جاؤں گا اور اپنے رب کو دیکھ کر سجدے میں گر پڑوں گا، مجھ کو جب تک چاہے گا سجدے میں رہنے دے گا، پھر فرمائے گا: اے محمد! سر اُٹھا، بات کر تیری بات سنی جائے گی، سفارش کر تیری سفارش قبول ہوگی، مانگ تجھے دیا جائے گا۔ میں سر اُٹھا کر حمد و ثنا کروں گا جو وہ مجھ کو سکھا دے گا، پھر شفاعت کروں گا تو میرے لیے ایک حد مقرر کر دی جائے گی۔ میں ان کو بہشت میں داخل کروں گا۔ پھر تیسری بار اس کے پاس جاؤں گا اور اپنے رب کو سجدہ کروں گا، وہ مجھ کو چھوڑ دے گا جب تک کہ چاہے گا، پھر کہا جائے گا: اے محمد! اپنے سر کو اٹھائیں، کہیں آپ کی بات سنی جائے گی، مانگیں آپ کو دیا جائے گا اور سفارش کریں آپ کی سفارش قبول کی جائے گی۔ میں سر اُٹھا کر اس کی وہ حمد کروں گا جو وہ مجھ کو تعلیم دے گا، پھر میں شفاعت کروں گا، تو میرے ایک حد مقرر کر دی جائے گی۔ پھر میں ان کو بہشت میں لے جاؤں گا۔ پھر چوتھی بار اپنے رب کے پاس آؤں گا اور کہوں گا: اے رب! اب باقی نہیں رہا مگر صرف وہ شخص جس کو قرآن نے روک رکھا ہے۔ فرمایا: پھر نکلے گا آگ سے وہ شخص جس نے ''لا إله إلا الله'' کہا ہے اور اس کے دل میں ایک جو کے دانے کے برابر خیر ہوگی۔ پھر آگ سے وہ شخص باہر ہوگا جس نے ''لا إله إلا الله'' کہا ہے اور اس کے دل میں گندم کے دانے کے برابر خیر ہوگی، پھر وہ شخص آگ سے نکلے گا جس نے ''لا إله إلا الله'' کہا ہے اور اس کے دل میں ایک ذرہ برابر خیر ہوگی۔[1] (رواه أحمد و أخرجاه وهكذا رواه أحمد أيضا من طريق حماد بن سلمة عن ثابت عن أنس بطوله)

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٧٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٣) مسند أحمد (٣/ ١١٦، ٢٤٤)

اس حدیث کے فوائد بے شمار ہیں، ازاں جملہ ایک تمام مخلوق پر خاتم الانبیا ﷺ کے شرف کا اظہار ہے اور یہ آپ ﷺ کے سید المرسلین ہونے پر دلیل ہے۔ دوسرے شرط ہے اذن (اجازت) کی شفاعت میں۔ معلوم ہوا کہ بغیر اجازت کے شفاعت نہ ہوگی۔ تیسرے، شفاعت میں تحدید ہے (حد مقرر کی گئی)۔ چوتھے، بخشش کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ ذرہ برابر ایمان خالص، یعنی توحید دل میں ہو، شرک نہ ہو، کیوں کہ مشرک کی شفاعت اور بخشش نہ ہوگی اگرچہ وہ دنیا بھر کی عبادت لے کر کیوں نہ آئے۔ پانچویں، معلوم ہوا کہ انبیا ﷺ سے بھی زلات (لغزشیں) ہو جاتے ہیں، لیکن ہمارے نبی مکرم ﷺ اس دن ہر خطا سے معصوم و مغفور نکلیں گے، چھٹے، یہ کہ شفاعت اسی کی ہوگی جو کچھ ایمان رکھتا ہے نہ کہ ساری شرک اور بدعات میں مبتلا اُمت کی اگرچہ کلمہ گو تھے۔ ساتویں، قول ''لا إله إلا الله'' سے ثابت ہوا کہ مراد یہ ہے کہ اس کا کہنے والا موحد خالص گناہ گار ہو، نہ کہ صرف کہنے والا اور مشرک۔ والله أعلم.

سیدنا انس رضی اللہ عنہ مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ میں کھڑا ہوا اپنی اُمت کا انتظار کرتا ہوں گا کہ اتنے میں عیسیٰ علیہ السلام میرے پاس آ کر کہیں گے کہ یہ انبیا تمھارے پاس آئے ہیں، اے محمد! سوال کرتے ہیں یا تمھارے پاس جمع ہوئے ہیں اور اللہ کو پکارتے ہیں کہ وہ ساری اُمتوں کو جہاں بھی چاہے الگ الگ کر دے، اس وقت وہ سخت غم میں ہے، مخلوق کو پسینے کی لگام لگ گئی ہے، مومن پر یہ پسینہ زکام کی طرح ہوگا اور کافر کو موت کی سی بے ہوشی ہوگی۔ میں کہوں گا: تم انتظار کرو، یہاں تک کہ میں پھر کر آؤں، پھر نبی مکرم ﷺ عرش کے نیچے جا کر کھڑے ہوں گے اور وہ چیز دیکھیں گے جو کسی برگزیدہ فرشتے اور نبی مرسل نے نہیں دیکھی ہے۔ اللہ عزوجل جبریل علیہ السلام کو وحی کرے گا کہ تم محمد ﷺ کے پاس جاؤ اور اُن سے کہو: آپ اپنا سر اٹھائیے، مانگیے ملے گا، سفارش کیجیے قبول ہوگی۔ میں اپنی اُمت میں شفاعت کروں گا، یہاں تک کہ ہر ننانوے انسان میں سے ایک کو باہر لاؤں گا اور اپنے رب عزوجل کی طرف آتا جاتا کھڑا نہ ہوں گا، لیکن شفاعت کروں گا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو یہ بات عطا کرے گا: «يَا مُحَمَّدُ! أَدْخِلْ مِنْ خَلْقِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ مَنْ شَهِدَ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ يَوْمًا وَاحِدًا مُخْلِصًا وَمَاتَ عَلٰى ذٰلِكَ» [1] (رواه أحمد) [اے محمد! جاؤ مخلوقِ الٰہی میں سے جس نے ایک دن بھی خلوص کے ساتھ ''لا إله إلا الله'' کی گواہی دی ہو اور اس پر مرا ہو، اسے بھی جنت میں پہنچا دو] یہ اس بات پر دلیل ہے کہ جس کی موت خالص توحید پر ہوئی ہے، وہ بخشا جائے گا، اگرچہ عمل میں قاصر رہا۔ اس قید سے اہلِ شرک نکل گئے، اُن کی شفاعت و مغفرت نہیں ہوگی۔ سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً و سمعاً مروی ہے: «إِنِّي لَأَرْجُوْا أَنْ أَشْفَعَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَدَدَ مَا عَلَى الْأَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ وَّ مَدَرَةٍ» [2] (رواه أحمد) [مجھے اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ زمین پر جتنے درخت اور کنکریاں ہیں، ان کی گنتی کے برابر لوگوں کی شفاعت میں کروں

---

[1] مسند أحمد (۳/ ۱۷۸) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رجاله رجال الصحيح'' (مجمع الزوائد: ۱۰/ ۶۷۸)

[2] مسند أحمد (۵/ ۳۴۷) اس کی سند میں ''ابو اسرائیل'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ۳۲۳۱)

گا] یہ حدیث نہایت عام وتام ہے، لیکن یہ اطلاق توحیدِ خالص کے ساتھ مقید ہے، جیسے اوپر گزر چکا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ملیکہ کے دونوں بیٹے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا: ہماری ماں اپنے شوہر کا اکرام کرتی تھی اور اولاد پر مہربان تھی، پھر اس کی مہمانداری کا ذکر کیا، پھر کہا: اتنی بات تھی کہ اس نے جاہلیت میں بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیا تھا، فرمایا: تمھاری ماں آگ میں ہے۔ وہ دونوں پشت پھیر کر چل دیے اور اُن کے چہروں پر رنج نظر آتا تھا، فرمایا: اُن کو بلالو، وہ پھر کر آئے، اُن کے چہروں پر خوشی معلوم ہوتی تھی، اس اُمید پر کہ شاید کوئی نیا حکم آیا ہوا ہو، فرمایا: میری ماں تمھاری ماں کے ہمراہ ہے، ایک منافق شخص نے کہا، یہ شخص کچھ اپنی ماں کے کام نہ آیا اور ہم اس کے پیچھے چلتے ہیں۔ ایک انصاری مرد نے کہا اور اس سے زیادہ کوئی شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال نہیں کرتا تھا، اے اللہ کے رسول! آپ کے رب نے آپ کی ماں کے بارے میں کوئی وعدہ کیا ہے یا اُن کی ماں کے بارے میں؟ آپ سمجھ گئے کہ اس نے کچھ سنا ہے، فرمانے لگے: نہ میرے رب نے چاہا نہ اس نے اس بارے میں مجھے کوئی طمع دی۔ سنو! میں قیامت کے دن مقامِ محمود پر کھڑا ہوں گا۔ انصاری نے کہا: اے اللہ کے رسول! مقامِ محمود کیا ہے؟ فرمایا: یہ وہ مقام ہے کہ جب تم برہنہ پا، برہنہ بدن، بے ختنے آؤ گے تو سب سے پہلے ابراہیم علیہ السلام کو لباس پہنایا جائے گا۔ اللہ فرمائے گا: میرے خلیل کو لباس پہناؤ، دو سفید چادریں لائیں گے، وہ اُن کو پہن کر عرش کے روبرو بیٹھیں گے، پھر میرا جامہ لایا جائے گا، میں اس کو پہنوں گا اور عرش کے دائیں طرف ایسی جگہ کھڑا ہوں گا کہ وہاں کوئی کھڑا نہ ہوگا، اس پر اولین اور آخرین مجھ پر رشک کریں گے، پھر اُن کے لیے کوثر سے لے کر حوض تک ایک نہر کھول دی جائے گی۔

منافقین نے کہا کہ پانی مٹی اور کنکروں کے بغیر جاری نہیں ہوتا۔ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کی مٹی مسک ہے اور سنگریزے اس کے موتی ہیں۔ منافق نے کہا: آج کے دن کی سی بات میں نے کبھی نہیں سنی۔ پانی جب کیچڑ اور کنکریوں پر بہتا ہے تو کچھ گھاس پھوس اُگتی ہے۔ انصاری نے کہا: اے اللہ کے رسول! کیا وہاں درخت بھی ہوں گے؟ فرمایا: ہاں! ان کی شاخیں سونے کی ہوں گی۔ منافق نے کہا: میں نے آج جیسی بات تو کبھی نہیں سنی۔ اچھا درختوں میں پتے اور پھل بھی ہونے چاہییں۔ انصاری نے کہا: اے اللہ کے رسول! کیا اس کے لیے پھل ہوگا؟ فرمایا: ہاں! طرح طرح کے جوہر ہوں گے اور اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہوگا، جو کوئی ایک بار اس میں سے پیے گا وہ پھر اس کے بعد کبھی پیاسا نہ ہوگا اور جو کوئی اس سے محروم رہا وہ پھر اس کے بعد کبھی سیراب نہیں ہوگا۔[1] (رواه أحمد)

عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ پھر اللہ تعالیٰ شفاعت کی اجازت دے گا۔ روح القدس جبریل علیہ السلام کھڑے ہوں گے، پھر ابراہیم علیہ السلام، پھر عیسیٰ علیہ السلام، یا موسیٰ علیہ السلام (یہ راوی کا شک ہے) پھر چوتھے تمھارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوں

[1] مسند أحمد (۱/ ۳۹۸) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رواه أحمد والبزار والطبراني وفي أسانيدهم كلهم عثمان بن عمير وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ۱۰/ ۶۵۶)

گے اور شفاعت کریں گے، آپ کے بعد آپ سے زیادہ کوئی شفاعت نہ کرے گا، یہی وہ مقامِ محمود ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے کیا ہے: ﴿عَسٰۤى اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا﴾ (آیتِ باب) (رواه أبو داود الطيالسي)[1]

اجازت کی شرط شفاعت کے ساتھ ہر جگہ لگی ہے۔ اس قید کا فائدہ یہ ہے کہ جس کے لیے اللہ کی مرضی ہوگی کہ اسے بخشے اس کے لیے اجازت دے گا، یہ بات نہیں ہے کہ پیغمبر اپنی خوشی سے جس کو چاہیں بخشوا لیں، خواہ اللہ کی مرضی ہو یا نہ ہو۔ شفاعت اور اقسامِ شفاعت کا مسئلہ کتاب "تقوية الإيمان" اور اس جیسی اور کتابوں میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔ ہر گور پرست، پیر پرست، امام پرست، پیغمبر پرست، بت پرست، جن پرست، ستارہ پرست اور غیر اللہ پرست کا یہ خیال کہ ہم کو ہمارے اولیا و مشائخ و ائمہ ہدیٰ بخشوا لیں گے، ایک تمنائے باطل اور بے کار اُمید اور پُرخلل خیال اور فہمِ مختل ہے۔

نبی مکرم ﷺ کی شفاعت اہلِ توحید خالص کے لیے مخصوص ہے، جن سے کبیرہ گناہوں کا ارتکاب ہوا ہے، نہ کہ شرکیہ کاموں اور بدعاتِ مکفرہ کے مرتکب کے لیے کہ اُن کی شفاعت اختیارِ نبوت کی حد سے باہر ہے اور جس صورت میں اللہ تعالیٰ خاتم النبیین سید المرسلین کو اُمتِ مشرکہ کی شفاعت کی اجازت نہ دے گا تو پھر کسی اور پیر فقیر دستگیر اور اُن جیسے کی کیا ہستی ہے کہ اُن کے مرید معتقد کھڑے کھڑے بہشت میں چلے جائیں اور محض کسی مردِ صالح کی مریدی اختیار کرنے سے ان کی نجات ہو جائے۔ لیکن بات یہ ہے کہ یہ جاہلانہ عقیدہ عام ہو گیا ہے اور اسلام غریب اور ایمان ناپید اور اخلاص نایاب ہوگیا ہے اور علم کتابوں میں رہ گیا ہے اور سینوں اور دلوں سے اُٹھا لیا گیا ہے اور شیطان کے لشکریوں نے ہر طرف سے ایک جہان کو اپنے فریب، سرکشی اور گمراہی کے جال میں پھانس لیا ہے، یہاں تک کہ اب یہ شیطان اور ابلیس لعین کے شاگرد اُن کے استاد ہو گئے ہیں۔

سیدنا کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ قیامت کے دن لوگ اُٹھیں گے، میں اور میری اُمت ایک ٹیلے پر ہوگی اور میرا رب عزوجل مجھ کو ایک سبز رنگ کا لباس پہنائے گا، پھر مجھ کو اجازت دے گا۔ میں وہ کہوں گا جو اللہ چاہے گا۔ یہ ہے مقامِ محمود۔ (رواه أحمد)[2]

سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں وہ سب سے پہلا شخص ہوں گا جس کو قیامت کے دن سجدہ کرنے کی اجازت دی جائے گی اور اُن لوگوں میں سے میں وہ پہلا شخص ہوں گا، جس کو سجدے سے سر اُٹھانے کی اجازت ملے گی۔ میں اپنے سامنے نظر کروں گا اور تمام اُمتوں کے درمیان میں اپنی اُمت کو پہچان لوں گا۔ اسی طرح اپنے پیچھے اور دائیں اور بائیں جانب نظر کروں گا اور اُمت کو پہچانوں گا۔ ایک مرد نے کہا: اے اللہ کے

---

[1] مسند الطيالسي (١/ ٥١) اس کی سند میں "یحییٰ بن سلمہ بن کہیل" ضعیف راوی ہے۔

[2] مسند أحمد (٣/ ٤٥٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٣٧٠)

رسول! آپ اپنی اُمت کو کیسے پہچانیں گے اور اُمتوں میں سے جو نوح علیہ السلام کی اُمت سے لے کر آپ کی اُمت تک ہوں گی؟ فرمایا: وضو کے اثر سے ان کے ہاتھ پاؤں اور چہرے چمک رہے ہوں گے۔ ان کے سوا کوئی اور ایسا نہ ہوگا اور میں اُن کو اس طرح پہچانوں گا کہ اُن کے نامہ اعمال اُن کو دائیں ہاتھ میں دیے جائیں گے اور اس طرح پہچانوں گا کہ ان کی اولاد اُن کے سامنے دوڑتی ہوگی۔[1] (رواہ أحمد)

صحیحین میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گوشت لایا گیا۔ اور گوشت دستی کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار اس کو دانتوں سے نوچ کر کھایا۔ پھر فرمایا کہ میں قیامت کے دن تمام انسانوں کا سردار ہوں، تم جانتے ہو کہ یہ کس لیے ہے؟ اللہ تعالیٰ ایک جگہ پر سارے اگلے پچھلوں کو جمع کرے گا۔ ایک پکارنے والا ان کو سنائے گا اور نگاہیں اوپر چڑھ جائیں گی اور سورج نزدیک آ جائے گا، لوگ غم اور تکلیف سے وہاں تک پہنچیں گے جس کی اُن کو طاقت نہ ہوگی اور نہ اُس کو اُٹھا سکیں گے، کہیں گے: تم نہیں دیکھتے، جس حال میں تم ہو اور تمھاری تکلیف کہاں تک پہنچ گئی ہے، تم ایسے شخص کی طرف نظر نہیں دوڑاتے جو تمھارے رب کے پاس تمھاری شفاعت کرے؟ تب کچھ لوگ دوسروں سے کہیں گے کہ آدم علیہ السلام کے پاس چلو، پھر آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور کہیں گے: اے آدم! تم تمام انسانوں کے باپ ہو، اللہ تعالیٰ نے تم کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور تم میں اپنی روح پھونکی اور فرشتوں کو حکم دیا کہ انھوں نے تم کو سجدہ کیا، اب تم اپنے رب کے پاس ہماری سفارش کرو، تم نہیں دیکھتے کہ ہم کس حال میں ہیں اور نہیں دیکھتے کہ ہماری نوبت کہاں تک پہنچی؟

آدم علیہ السلام کہیں گے کہ میرا رب آج کے دن ایسے غیظ و غضب میں ہے کہ اس سے پہلے کبھی اتنا غصہ نہیں کیا اور نہ ہی اس کے بعد پھر کبھی ایسا غصہ کرے گا اور اس نے مجھے ایک درخت سے منع کیا تھا، میں نے اس کی نافرمانی کی۔ آج تو مجھے خود اپنا خیال لگا ہوا ہے، نفسا نفسی لگی ہوئی ہے۔ تم کسی اور کے پاس جاؤ، نوح علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ تب لوگ نوح علیہ السلام کے پاس آ کر کہیں گے: اے نوح! تم سب سے پہلے زمین والوں کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے اور اللہ نے تمھارا نام عبدِ شکور رکھا ہے، تم اپنے رب کے پاس ہماری شفاعت کرو، تم نہیں دیکھتے کہ ہم کس حال میں ہیں اور ہماری نوبت کہاں تک پہنچ چکی ہے؟ نوح علیہ السلام کہیں گے: بے شک میرا رب آج اس قدر غصے میں ہے کہ آج سے پہلے کبھی اس طرح غصے نہیں ہوا اور نہ اس طرح آیندہ کبھی غصے میں ہوگا، بلاشبہہ مجھے ایک دعا کا اختیار تھا جو میں نے اپنی قوم کے خلاف مانگ لی۔ مجھے تو اپنی فکر ہے، مجھے تو اپنی فکر ہے، مجھے تو اپنی فکر ہے، تم میرے سوا کسی اور کے پاس جاؤ، ابراہیم علیہ السلام کے پاس جاؤ۔

تب وہ ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور کہیں گے: اے ابراہیم! تو اللہ کا نبی اور اہلِ زمین میں اس کا خلیل

[1] مسند أحمد (٥/ ١٩٩) صحيح الترغيب والترهيب (١/ ٤٣)

ہے۔ ألا ترى ما نحن فيه ألا ترى ما قد بلغنا. وہ کہیں گے: بلاشبہ میرا رب آج اس قدر غصے میں ہے کہ ان سے پہلے کبھی اس طرح غصے نہیں ہوا اور نہ اس طرح آئندہ کبھی غصے میں ہوگا، پھر وہ اپنے خلاف واقعہ (کہی ہوئی) باتوں کو یاد کریں گے، مجھے تو اپنی فکر ہے، مجھے تو اپنی فکر ہے، مجھے تو اپنی فکر ہے۔ جاؤ میرے سوا کسی اور کے پاس چلے جاؤ۔ جاؤ موسیٰ علیہ السلام کے پاس۔

تب موسیٰ علیہ السلام کے پاس آ کر کہیں گے: اے موسیٰ! تو اللہ کا رسول ہے، اللہ تعالیٰ نے تجھ کو اپنی رسالت کے لیے اور اپنے ساتھ کلام کے لیے لوگوں میں سے چن لیا، تم نہیں دیکھتے کہ ہم کس بلا میں ہیں اور ہم کو کیا تکلیف پہنچی ہے؟ موسیٰ کہیں گے کہ میرے رب کو آج کے دن وہ غصہ ہے کہ پہلے اس سے کبھی ویسا غصہ نہ تھا اور نہ ہی اس کے بعد ویسا غصہ کرے گا اور میں نے ایک نفس کو مار ڈالا تھا، جس کے مارنے کا مجھ کو حکم نہ تھا، ”نفسي نفسي“ یعنی مجھے اپنی ہی جان کی پڑی ہے تم کسی اور کے پاس جاؤ، عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ۔

وہ عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آ کر کہیں گے: اے عیسیٰ! تم اللہ کے رسول اور اس کا کلمہ ہو جو مریم کی طرف ڈالا تھا اور اُس کی روح ہو اور تم نے پنگوڑے میں، جب تم بچے تھے، لوگوں سے بات کی تھی، اب تم ہماری شفاعت اپنے رب کے پاس کرو، آپ دیکھ نہیں رہے کہ ہم کس مشکل میں ہیں؟ عیسیٰ علیہ السلام کہیں گے: بلاشبہ میرا رب آج اس قدر غصے میں ہے کہ آج سے پہلے کبھی اس طرح غصے نہیں ہوا اور نہ اس طرح آیندہ کبھی غصے میں ہوگا۔ اور کسی گناہ کا ذکر نہ کریں گے اور کہیں گے: مجھے تو اپنی فکر ہے، مجھے تو اپنی فکر ہے، مجھے تو اپنی فکر ہے۔ کسی اور کے پاس جاؤ، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ۔

تب لوگ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں گے اور کہیں گے: اے محمد! تم اللہ کے رسول ہو اور خاتم الانبیا، اللہ تعالیٰ نے تمھارے اگلے پچھلے گناہ بخش دیے، اپنے رب کے پاس وہ ہماری سفارش فرمائیں، آپ دیکھ نہیں رہے کہ ہم کس مشکل میں ہیں؟ تب میں اُٹھ کر عرش کے نیچے آؤں گا اور اپنے رب کے لیے سجدے میں گر پڑوں گا، پھر اللہ تعالیٰ مجھ پر اپنی حمد وثنا کھول دے گا کہ مجھ سے پہلے اس طرح کا کھولنا کسی اور کے لیے نہیں کیا ہوگا، تب کہا جائے گا: اے محمد! اپنا سر اونچا کر اور مانگ تجھ کو ملے گا اور شفاعت کر تیری شفاعت قبول ہوگی، میں سر اُٹھا کر کہوں گا: «أُمَّتِيْ يَا رَبِّ! أُمَّتِيْ يَا رَبِّ! أُمَّتِيْ يَا رَبِّ!» [میری امت یارب! میری امت یا رب! میری امت یا رب!]

تب کہا جائے گا: اے محمد! اپنی اُمت میں سے اس شخص کو جنت میں داخل کر جس پر حساب نہیں ہے، جنت کے دائیں طرف کے دروازوں میں سے ایک دروازے سے اور وہ اس دروازے کے علاوہ دوسرے دروازوں سے داخل ہونے والوں کے ساتھ بھی داخل ہو سکتے ہیں۔ پھر فرمایا قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے کہ جنت کے دروازوں میں سے دو دروازوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے، جتنا فاصلہ مکہ اور حجر کے درمیان یا جتنا فاصلہ مکہ

اور بصرہ کے درمیان ہے۔[1] (أخرجه في الصحيحين)

صحیح مسلم میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یوں ہیں کہ میں قیامت کے دن آدم علیہ السلام کی اولاد کا سردار ہوں اور اُن میں سے سب سے پہلا ہوں جس کی قبر قیامت کے دن پھٹے گی اور سب سے پہلا سفارش کرنے والا ہوں اور سب سے پہلا شخص ہوں جس کی سفارش قبول کی جائے گی۔[2]

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مقامِ محمود کا سوال کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ شفاعت ہے۔[3] (ورواه أحمد عنه رفعا: « هُوَ الْمُقَامُ الَّذِيْ أَشْفَعُ لِأُمَّتِيْ فِيْهِ »)۔ عبدالرزاق معمر سے اور وہ امام زہری رحمہ اللہ سے اور زہری علی بن حسین رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہیں کہ جب قیامت کا دن ہوگا اللہ زمین کو پھیلائے گا، جس طرح کہ چمڑے کو پھیلاتے ہیں، یہاں تک کہ کسی بشر کے لیے سوائے دو قدم کے کوئی جگہ نہ ہوگی۔ پھر فرمایا: سب سے پہلے میں بلایا جاؤں گا۔ جبریل رحمٰن کے دائیں طرف ہوں گے تبارك و تعالى۔ واللہ! انھوں نے وہ جگہ اس سے پہلے نہیں دیکھی ہے۔ میں عرض کروں گا: اے رب! اس شخص نے مجھ کو خبر دی تھی کہ تو نے اس کو میرے پاس بھیجا تھا، اللہ عزوجل فرمائے گا: یہ سچا ہے، پھر میں شفاعت کروں گا اور کہوں گا: اے رب! تیرے بندوں نے تجھ کو زمین کے چاروں طرف میں پوجا تھا، فرمایا: یہی ہے مقامِ محمود۔[4] (وهذا حديث مرسل)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان فاتح اس جگہ یہ ہے کہ اللہ پاک نے اپنی توحید اور قیامت اور جزا کا ذکر کیا تو اس کے بعد سب سے زیادہ اشرف اطاعت کا ذکر فرمایا اور وہ نماز ہے۔ مفسرین کا اجماع ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں جس نماز کے قائم کرنے کا حکم ہے اس سے مراد فرض نماز ہے۔ "دلوك" میں فقط دو قول ہیں: ایک یہ کہ مراد سورج کا زوال ہے آسمان کے درمیان سے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اور اکثر تابعین اور باقر رحمہ اللہ اسی طرف گئے ہیں۔ اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ دلوک بہ معنی غروب ہے۔ بعض صحابہ، امام نخعی، مقاتل اور سدی رحمہم اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[5]

امام فرا رحمہ اللہ نے کہا کہ "دلوك" زوال سے غروب تک ہوتا ہے۔ امام ازہری رحمہ اللہ نے کہا کہ دلوک کلامِ عرب میں زوالِ آفتاب کو کہتے ہیں۔ میرے نزدیک آفتاب کا نصف نہار سے زوال ہے، تاکہ آیت نماز پنج گانہ کے لیے جامع

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٣٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٤) مسند أحمد (٢/ ٤٣٥)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٧٨)

[3] تفسير الطبري (١٧/ ٥٢٩) مسند أحمد (٢/ ٤٤١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٣٦٩)

[4] تفسير الصنعاني (٢/ ٣٨٧) مستدرك الحاكم (٤/ ٦١٤) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[5] تفسير الطبري (١٧/ ٥١٢۔ ٥١٦) تفسير البغوي (٥/ ١١٤)

رہے۔ سیدنا ابو عبید نے کہا کہ دلوک بہ معنی غریب ہے۔[1] عقبہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے، فرمایا کہ میرے پاس جبریل دلوکِ شمس کے وقت آئے، جبکہ وہ ڈھل گیا اور میرے ساتھ ظہر کی نماز پڑھی۔ (الحديث أخرجه ابن جرير)

ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ ظہر زوالِ آفتاب کے وقت پڑھتے تھے۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ ﴾[2] (آیتِ باب)۔ حاصل یہ ہے کہ لفظ دلوک دونوں معانی کا جامع ہے، کیوں کہ دلوک کی اصل، میل (جھکنا) ہے۔ سورج ڈھلتا ہے یا ڈوبتا ہے تو مائل ہوتا ہے اور جھکتا ہے، لیکن اس کا زوال پر محمول کرنا زیادہ مناسب ہے۔ اس لیے کہ اس کے قائل بہت ہیں اور اس صورت میں آیت نماز کے تمام اوقات کو جامع ٹھہرتی ہے اور دوسرے قول پر نمازِ ظہر وعصر خارج رہتی ہے۔ "غسق" سے مراد اندھیروں کا جمع ہو جانا ہے۔[3] (قاله ابن عباس) یا شفق کا غائب ہو جانا، یہ لفظ مغرب اور عشا دونوں کو سمو لیتا ہے۔ لغت میں "غسق" رات کی ابتدا کا داخل ہو جانا اور بعض نے کہا کہ رات کا اندھیرا اور رات کی سیاہی۔

بعض نے اس غایت سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ نمازِ ظہر کا وقت زوال سے لے کر غروبِ آفتاب تک پھیلا ہوتا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ سے اس کا جواز اور امام شافعی رحمہ اللہ نے حالتِ ضرورت میں اور اوزاعی اور ابو حنیفہ رحمہما اللہ سے یہ جواز مروی ہے، لیکن احادیثِ صحیحہ متواترہ اوقاتِ نماز کے متعین کرنے میں وارد ہیں۔ اس لیے اس آیت کے اجمال کو سنتِ مطہرہ پر محمول کرنا واجب ہے۔ اس جگہ اس ذکر کو طویل کرنے کی کچھ حاجت نہیں۔ آیت کے معنی یہ ہوئے کہ نماز قائم کرو دلوکِ آفتاب کے وقت سے غسقِ شب تک۔ اس میں ظہر اور عصر کی نماز آ گئی اور غسق میں مغرب اور عشا داخل ہیں، یہ چار نمازیں ہوئیں، پانچویں نماز قرآن فجر میں آ گئی۔ مفسرین رحمہم اللہ نے کہا: اس سے مراد نمازِ صبح ہے، اس کی تعبیر بعض ارکانِ نماز کے ساتھ فرمائی۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ اس میں ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ لفظ اس بات پر دلیل ہے کہ بغیر قراءت کے نماز نہیں ہوتی۔[4] یہاں تک کہ نماز کا نام قرآن رکھا اور یہ حجت ہے اصم پر، کیوں کہ اس کو یہ زعم ہے کہ قراءت نماز کا رکن نہیں ہے، حالاں کہ احادیثِ صحیحہ اس بات پر دلیل ہیں کہ نماز فاتحۃ الکتاب کے بغیر نہیں ہوتی۔[5] (مگر اس آیت میں اگر دلیل ہے تو صرف قراءتِ قرآن کے رکن نماز ہونے پر ہے نہ کہ سورت فاتحہ کے رکن یا شرط ہونے پر) اور بعض احادیثِ حسنہ میں مروی ہے کہ فاتحہ کے ہمراہ اور قرآن بھی ہو۔[6]

---

[1] فتح القدير (٣/ ٣٤٦ـ ٣٤٧) [2] تفسير الطبري (١٧/ ٥١٧ـ ٥١٨) [3] الدر المنثور (٥/ ٣٢٢)

[4] معاني القرآن (٣/ ٢٥٥ـ ٢٥٦) [5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٢٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٩٤)

[6] سنن أبي داود، رقم الحديث (٨١٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣٨) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ (صحيح أبي داود: ٣/ ٤٠١)

وجوبِ فاتحہ پر دلیل ہر رکعتِ نماز میں موجود ہے۔ نمازِ صبح کا نام طولِ قراءت کی وجہ سے قرآن رکھا۔ اس مسئلے کو امامِ ربانی قاضی محمد بن علی شوکانی رحمہ اللہ نے اپنے مولفات میں بہت عمدگی کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ فجر کے قرآن کو مشہود فرمایا، کیوں کہ اس وقت رات اور دن کے فرشتے حاضر ہوتے ہیں، جس طرح کہ صحیح حدیث میں مروی ہے۔ جمہور بھی اسی کے قائل ہیں، فرشتوں کی ایک جماعت اُترتی ہے اور دوسری اوپر چڑھتی ہے، یہ اُتار چڑھاؤ، آخرِ دیوانِ لیل اور اول دیوانِ نہار میں ہوتا ہے۔ امام شہاب رحمہ اللہ نے کہا کہ لکھنے والے اور حفاظت کرنے والے فرشتے حاضر ہوتے ہیں،[1] یا حسبِ عادت بہت سے نماز پڑھنے والے جمع ہو جاتے ہیں، لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔

صحیحین میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے: « يَجْتَمِعُ مَلَائِكَةُ اللَّيْلِ وَمَلَائِكَةُ النَّهَارِ فِي صَلَاةِ الْفَجْرِ » [فجر کی نماز کے وقت رات اور دن کے فرشتے اکٹھے ہوتے ہیں] پھر سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے آیتِ باب پڑھی۔[2] امام رازی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ اس بات پر دلیلِ قاطع ہے کہ اندھیرا افضل ہے روشنی سے اس لیے کہ جب آدمی اول صبح میں نماز شروع کرتا ہے تو اس وقت رات کی تاریکی باقی ہوتی ہے اور رات کے فرشتے موجود ہوتے ہیں، پھر جب نماز ترتیلِ قراءت کی وجہ سے لمبی ہوتی ہے اور رات کا اندھیرا زائل ہو کر صبح کا اُجالا ظاہر ہوتا ہے تو دن کے فرشتے حاضر ہوتے ہیں اور اگر نماز روشنی کے وقت شروع کرے گا تو اس وقت رات کے فرشتوں میں سے کوئی بھی موجود نہ ہوگا کہ حاضر ہو۔ چنانچہ یہ بات جس کا ذکر آیتِ شریفہ میں ہے حاصل نہ ہوگی، اس سے ثابت ہوا کہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ اول وقت کی نماز افضل ہوتی ہے۔[3]

پھر اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ تم رات کے کچھ حصے میں تہجد پڑھا کرو۔ یہ اصل پر اضافہ ہے، یعنی فرائض کے علاوہ تہجد کا حکم اگرچہ ظاہر میں وجوب کے لیے ہے، لیکن اس کے نفل ہونے کی تصریح قرینہ صارفۃ الامر ہے۔ بعض نے کہا کہ اس جگہ ﴿ نَافِلَةً ﴾ سے مراد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں پانچ نمازوں پر اضافی فرض ہے، لیکن لفظ ﴿ نَافِلَةً ﴾ کی صراحت اس خیال کو دور کرتی ہے۔ بعض نے کہا کہ رات کی نماز نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر فرض تھی، پھر اس کا وجوب منسوخ ہو کر شب کا قیام نفلی رہ گیا، اسی پر یہ حدیث محمول ہے کہ یہ نماز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر فرض ہے اور اُمت کے لیے نفل۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا کہ نمازِ شب خاص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے زیادہ کی گئی، رفع درجات کے لیے نہ کہ کفارات کے لیے، اس لیے کہ آپ کے سارے گناہ اگلے اور پچھلے بخشے جا چکے تھے اور ہمارے لیے کثرتِ ذنوب کی وجہ سے نافلہ نہیں ہے، بلکہ اس نماز کو کفارے کے لیے پڑھتے ہیں۔ یہی جمیع مفسرین کا قول ہے۔[4]

---

[1] حاشية الشهاب علىٰ تفسير البيضاوي (٦/ ٥٣)
[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢١) صحيح مسلم، رقم (٦٤٩)
[3] تفسير الرازي (٢١/ ٦٣۔ ٦٤)
[4] فتح القدير (٣/ ٣٤٨)

حاصل یہ ہے کہ اگرچہ اس آیت میں خاص طور پر نبی اکرم ﷺ کو خطاب ہے، لیکن جو حکم آپ کے لیے ہے وہی حکم اُمت کے لیے ہے۔ پس یہ شرع عام ہے۔ اسی جگہ سے رات کی نماز کی ترغیب دی ہے کہ یہ ساری اُمت کے لیے عام ہے اور نافلہ ہونے کا صریحاً ذکر کرنا، اس بات کی دلیل ہے کہ یہ واجب نہیں۔ غرض یہ کہ رات کو تہجد کا ادا کرنا ہر مکلف کو مستحب ومشروع ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ تین چیزیں ہیں جو مجھ پر فرض ہیں اور تمھارے لیے سنت ہیں: وتر ومسواک وقیامِ لیل۔[1] (أخرجه البيهقي في سننه والطبراني)

پھر اللہ تعالیٰ نے فرائض اور نوافل کے قائم کرنے پر نبی مکرم ﷺ کو مقامِ محمود پر فائز کرنے کا وعدہ فرمایا، یعنی جو کوئی اس مقام کو معلوم کر لے گا، وہ اس کی تعریف کرے گا۔ اس مقام کی تعیین میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ وہ مقام ہے جس میں نبی اکرم ﷺ قیامت کے دن شفاعت کے لیے کھڑے ہوں گے، تاکہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو تکلیف سے راحت دے۔

اسی قول پر تفسیرِ آیت کے تحت دی جانے والی ادلہ صحیحہ دلیل ہیں۔ اس کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اکثر اہلِ تاویل سے بیان کیا ہے۔[2] امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا کہ مفسرین کا اس بات پر اجماع ہے کہ مقامِ محمود مقامِ شفاعت ہے فصلِ قضا میں۔[3] دوسرا قول یہ ہے کہ مقامِ محمود وہ جگہ ہے جہاں نبی اکرم ﷺ کو قیامت کے دن حمد کا جھنڈا عطا ہوگا۔ لیکن یہ کچھ پہلے قول کے خلاف نہیں ہے، ممکن ہے کہ مقامِ شفاعت میں حمد کا جھنڈا ہاتھ میں لے کر کھڑے ہوں۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ کو اپنے ساتھ کرسی پر بٹھائے گا۔ (رواہ ابن جریر) ایک فرقہ جن میں امام مجاہد رحمہ اللہ بھی ہیں، اسی قول کا قائل ہے[4] اور یہ مضمون ایک حدیث میں بھی مروی ہے۔

امام نقاش رحمہ اللہ نے امام ابو داود سجستانی رحمہ اللہ سے حکایت کیا ہے کہ جو کوئی اس حدیث کا انکار کرے وہ ہمارے نزدیک مُتّہم ہے۔ ہمیشہ اہلِ علم اس حدیث کو بیان کرتے رہے ہیں۔[5] امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے کہا کہ امام مجاہد رحمہ اللہ اگرچہ ایک امامِ تاویل ہیں، لیکن ان کے دو قول اہلِ علم کے نزدیک چھوڑے ہوئے ہیں: ایک یہی قول اور دوسرا جو قول اس آیتِ کریمہ کی تاویل میں کہا ہے: ﴿ وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴾ [القيامة: ٢٢۔ ٢٣] ''اس دن (کئی) چہرے تر وتازہ ہوں گے۔ اپنے رب کی طرف دیکھتے ہوں گے۔'' اس کے معنی یہ ہیں کہ ثواب کا انتظار کریں گے اور یہ نظر سے مشتق نہیں ہے۔[6] انتہیٰ۔

---

[1] سنن البيهقي الكبرىٰ (٧/ ٣٩) المعجم الأوسط (٣/ ٣١٥) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه موسىٰ بن عبدالرحمن الصنعاني وهو كذاب" (مجمع الزوائد: ٨/ ٤٧٣)

[2] تفسير الطبري (١٧/ ٥٢٦) [3] فتح القدير (٣/ ٣٤٩) [4] تفسير الطبري (١٧/ ٥٢٩)

[5] تفسير القرطبي (١٠/ ٣١١) [6] التمهيد لابن عبد البر (٧/ ١٥٧۔ ١٥٨)

بہر حال یہ قول کچھ پہلے قول کے خلاف نہیں ہے، اس لیے کہ یہ بات ممکن ہے کہ اللہ آپ کو اس جگہ بٹھائے اور نبی کریم ﷺ شفاعت کریں۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «يُجْلِسُنِيْ مَعَهُ عَلَى السَّرِيْرِ »[1] (رواه الديلمي) [مجھے اپنے ساتھ تخت پر بٹھائے گا] لیکن اس حدیث کی اسناد کا کشف کرنا چاہیے۔[2] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: «يُقْعِدُهُ عَلَى الْعَرْشِ » (رواه أبو وائل) [وہ آپ ﷺ کو عرش پر بٹھائے گا] سیدنا عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے کہا: «يُقْعِدُ عَلَى الْكُرْسِيِّ »[3] [وہ آپ ﷺ کو کرسی پر بٹھائے گا]

شفاعت کے اثبات کے بارے میں بہت سی احادیث مروی ہیں اور سب سے پہلے جس نے ان حدیثوں کا انکار کیا وہ عمرو بن عبید ہے، وہ اہلِ سنت کے نزدیک متفقہ طور پر مبتدع (بدعتی) تھا۔ چوتھا قول یہ ہے کہ مقامِ محمود ہر وہ مقام ہے جو کرامات میں حمد کھینچنے والا ہو۔ اس کو امام زمخشری رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے[4] اور اُن لوگوں نے جو امام زمخشری رحمہ اللہ کے مقتدی ہیں، سو اس کا جواب یہ ہے کہ احادیثِ صحیحہ اس مقام کی تعیین میں وارد ہیں اور متواتر آئی ہیں، اس لیے ان احادیث کی طرف رجوع کرنا متعین ہے اور آیت میں اس لفظ کے اندر کوئی عمومیت نہیں ہے۔[5]

وَ قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ﴿۸۰﴾ وَ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴿۸۱﴾

اور کہیے: اے میرے رب! داخل کر مجھے سچا داخل کرنا اور نکال مجھے سچا نکالنا اور مجھے اپنے پاس سے مدد دینے والا غلبہ (عطا) کر (80) اور کہیے: حق آ گیا اور باطل مٹ گیا، بے شک باطل تو مٹنے ہی والا ہے (81)

ہجرت کا حکم:

یعنی اس شہر سے نکال آبرو سے اور کسی جگہ بٹھا آبرو سے۔ اللہ تعالیٰ نے مدینہ میں بٹھایا اور وہاں کے لوگ ماتحت کر دیے جن سے دین کو مدد ہوئی، دین کا غلبہ آیا، کفر مکہ سے اور تمام عرب سے نکل بھاگا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی مکرم ﷺ مکہ میں تھے، ہجرت کا حکم ہوا، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ

---

(1) الفردوس للديلمي (۳/ ۵۸)

(2) امام البانی رحمہ اللہ نے "السلسلة الضعيفة" (رقم الحديث: ٦٤٦٥) میں اس روایت کو امام دیلمی رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہوئے باطل کہا ہے اور مفصل بحث کی ہے۔

(3) امام ذہبی رحمہ اللہ نے ان دونوں روایتوں کو اپنی کتاب "العلو" میں ذکر کرتے ہوئے ضعیف کہا ہے۔ دیکھیں: العلو (۱/ ۹۳)

(4) الكشاف (۲/ ٦٤٢) (5) فتح البيان (۷/ ۳٤۳۔ ٤٤١)

آیت بھیجی کہ تم یوں کہو۔[1] (رواه أحمد و الترمذي، وقال: حسن صحيح)

امام حسن بصری رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ جب اہلِ مکہ نے مشورہ کیا کہ نبی اکرم ﷺ کو قتل کر ڈالیں یا نکال دیں یا قید کر لیں اور اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ اہلِ مکہ سے قتال کیا جائے تو نبی اکرم ﷺ کو حکم دیا کہ تم یہاں سے مدینہ چلے جاؤ اور یوں کہو: ﴿ رَبِّ اَدْخِلْنِیْ ... الخ﴾ امام قتادہ نے کہا: ﴿ مُدْخَلَ صِدْقٍ ﴾ مدینہ ہے اور ﴿ مُخْرَجَ صِدْقٍ ﴾ مکہ ہے۔ امام ابن زید کا بھی یہی قول ہے۔ (وهو أشهر الأقوال) عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ﴿ مُدْخَلَ صِدْقٍ ﴾ موت ہے اور ﴿ مُخْرَجَ صِدْقٍ ﴾ حیات بعد موت ہے، اس کے سوا اور اقوال بھی ہیں، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے۔

امام حسن بصری رحمہ اللہ نے ﴿ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ایران اور روم سے عزت اور بادشاہت کو چھین کر تمھیں عطا فرمائے گا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ نبی کریم ﷺ نے جانا کہ آپ کو زور و قوت کے بغیر اس کی طاقت نہیں ہے۔ اس لیے سوال زور و قوت کا کیا کہ وہ نصیر کتاب اللہ اور اللہ کے حدود اور فرائض میں معاون و مددگار رہوں اور اللہ کے دین کو قائم کرے، کیوں کہ زور و قوت کا ہونا اللہ کی طرف سے ایک رحمت ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے درمیان رکھا ہے۔ اگر یہ تسلط نہ ہو تو بعض کو بعض نوچ کھسوٹ لیں اور طاقتور کمزور کو کھا جائے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ یعنی حجتِ بینہ، مگر امام ابن جریر رحمہ اللہ نے قولِ امام حسن و قتادہ رحمہما اللہ کو اختیار کیا ہے[2] اور یہی راجح بھی ہے، اس لیے کہ حق کے ساتھ ایک ایسا شخص بھی چاہیے جو دشمن کو مقہور کرے، اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ﴾ [الحديد: ٢٥] ''البتہ تحقیق ہم نے اپنے رسول واضح نشانیوں کے ساتھ بھیجے اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی، تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں اور ہم نے لوہا اتارا، اس میں سخت لڑائی (کا سامان) اور لوگوں کے لیے فائدے ہیں۔'' اور حدیث میں مروی ہے: « إِنَّ اللّٰهَ لَيَزَعُ بِالسُّلْطَانِ مَا لَا يَزَعُ بِالْقُرْآنِ »[3] [بلاشبہ اللہ تعالیٰ سلطنت کی وجہ سے بہت سی ان برائیوں کو روک دیتا ہے جو صرف قرآن سے نہیں رک سکتی تھیں] باوجود اس بات کے کہ قرآن میں پکی وعید اور سخت قسم کی تہدید (ڈر) ہے۔

---

[1] مسند أحمد (١/ ٢٢٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٣٩) اس کی سند میں ''قابوس بن ابی ظبیان'' ضعیف راوی ہے۔

[2] تفسير الطبري (١٧/ ٥٣٣۔ ٥٣٦)

[3] ان الفاظ کے ساتھ مرفوع روایت نہیں ملی، البتہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے موقوفاً مروی ہے۔ دیکھیں: تاریخ بغداد (٤/ ١٠٧) الدر المنثور (٥/ ٣٢٩)

کفارِ قریش کے لیے وعید:

پھر اس ارشاد میں کہ حق آیا باطل گیا، کفارِ قریش کے لیے ڈر اور وعید ہے کہ اُن کے پاس وہ حق آیا جس میں کچھ شک و شبہہ نہیں ہے اور نہ ہی اس حق کا سامنا کر سکتے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے قرآن بھیجا اور علم کو نفع بخش اور باطل کو ختم ہونے والا اور ہلاک ہونے والا کیا۔ حق کے سامنے باطل کے لیے کوئی قرار اور بقا نہیں ہے، دروغ را فروغ نہ باشد، یعنی جھوٹ کو فروغ نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ حق کو باطل پر پھینک مارتا ہے، وہ حق اس باطل کا سر توڑ دیتا ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ مکہ میں داخل ہوئے، بیت اللہ کے اردگرد تین سو ساٹھ بت کھڑے تھے، آپ ان کو ایک لکڑی کے ساتھ جو آپ کے ہاتھ میں تھی مارنے لگے اور فرماتے تھے: ﴿جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبٰطِلُ ۚ اِنَّ الْبٰطِلَ كَانَ زَهُوْقًا﴾ (آیتِ باب) اور ﴿قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبٰطِلُ وَمَا يُعِيْدُ﴾ [سبا: ٤٩] ''آپ کہہ دیجیے: حق آ گیا اور باطل نہ پہلی بار اُبھرا نہ دوبارہ اُبھرے گا۔''[1]

(وكذا رواه البخاري أيضا في غير هذا الموضع، ومسلم والترمذي والنسائي و عبد الرزاق)

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نبی اکرم ﷺ کے ہمراہ مکہ میں داخل ہوئے۔ خانہ کعبہ کے پاس تین سو ساٹھ بت تھے، جو اللہ کے سوا پوجے جاتے تھے، نبی ﷺ نے حکم دیا، ان کو اُن کے چہروں کے بل اوندھا کر دیا گیا۔ آپ نے فرمایا: ﴿جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبٰطِلُ ۚ اِنَّ الْبٰطِلَ كَانَ زَهُوْقًا﴾[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ مدخل اور مخرج کی اضافت صدق کی طرف ان دونوں جگہوں کی تعریف ہے اور ہر شے جس کی اضافت صدق کی طرف کی جائے وہ اس کی تعریف ہوتی ہے۔ یہ آیت مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کے وقت نازل ہوئی، اس کا تقاضا یہ ہے کہ آیت مکی ہے، حالاں کہ یہ آٹھ مدنی آیات میں سے آخری آیت ہے، لیکن امام بیضاوی رحمہ اللہ ساری سورت کو مکی بتاتے ہیں۔[3] یہ بات معلوم ہے کہ مدینہ میں داخلہ مکہ سے نکلنے کے بعد ہی ہوا تھا۔ داخل ہونے کو خارج ہونے سے پہلے اس لیے ذکر کیا، تاکہ داخل ہونے کا خاص اہتمام ہو سکے، کیوں کہ مقصود یہی ہے۔ بعض نے کہا کہ معنی یہ ہیں کہ مار مجھے مارنا صدق کا اور اُٹھا مجھے قیامت کے دن اُٹھانا صدق کا۔ یا مجھ کو اُمر میں داخل کر اور نہی سے باہر نکال۔ یا مراد عزت میں داخل کر اور نصرت کے ساتھ اخراج کر۔ یا میرا داخل ہونا اور

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣٤٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٨١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٣٨) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٨٢) تفسير الصنعاني (٢/ ٣٨٨)

[2] مصنف ابن أبي شيبة (٧/ ٤٠٣) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔ (المطالب العالية: ١٧/ ٤٦٩)

[3] تفسير البيضاوي (٣/ ٤٢٩)

خارج ہونا، ہر کام میں صدق پر مبنی ہو۔ بعض نے کہا کہ یہ آیت تمام اُمور کے لیے ہے اور دعا ہے۔

''سلطان نصیر'' سے مراد ایسی حجت ہے جو ظاہر اور سخت ہو، جس سے ہر مخالف پر نصرت حاصل ہو۔ یا مجھ کو ایسا ملک اور عزت دے کہ میں تیرے دین کو قائم کر سکوں۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کی یہ دعا قبول کی اور فرمایا: ﴿ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ﴾ [المائدۃ: ٦٧] ''اور اللہ آپ کو لوگوں (کے شر) سے بچائے گا۔'' نیز فرمایا: ﴿ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ﴾ [التوبۃ: ٣٣] ''تا کہ اسے سب دینوں پر غالب کرے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ﴾ [النور: ٥٥] ''جو تم میں سے ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، اللہ نے ان لوگوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ انھیں زمین میں ضرور خلافت دے گا، جیسے اس نے ان سے پہلے لوگوں کو خلافت دی تھی۔'' سو یہ وعدہ پورا ہوا۔ وللہ الحمد.

حق سے مراد اسلام ہے، یا قرآن، یا جہاد اور اگر اُن سب پر لفظ کا اطلاق کریں تب بھی کوئی مانع نہیں۔ بلکہ کوئی سا بھی حق کیوں نہ ہو، لفظ سب کو شامل ہے۔ باطل سے مراد شرک ہے، یا شیطان، یا ہر وہ چیز جو حق کے مقابل ہو، بغیر کسی فرق کے باطل میں۔ ''زھوق'' کے معنی مٹ جانے اور بطلان کے ہیں۔ فرمایا کہ باطل کی شان یہی ہوتی ہے کہ وہ زائل اور نیست و نابود ہو جاتا ہے اور حق ثابت اور قائم رہتا ہے۔ باطل کو اگرچہ کسی وقت حکومت اور غلبہ ہو، لیکن وہ جلد ہی زائل ہو جاتا ہے، ٹھہرتا نہیں۔[1]

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴿٨٢﴾

اور ہم قرآن میں سے جو نازل کرتے ہیں وہ مومنوں کے لیے شفا اور رحمت ہے، اور وہ ظالموں کو خسارے ہی میں زیادہ کرتا ہے (82)

قرآنِ مجید شفا اور رحمت ہے:

روگ دور ہوں، یعنی دل کے شبہات اور شک مٹیں اور اس کی برکت سے بدن کے روگ بھی دور ہوں۔

اللہ نے اپنی کتاب کے بارے میں وہ کتاب جو اپنے نبی پر اتاری ہے اور جس کے سامنے اور پیچھے باطل نہیں آتا، یعنی قرآن خبر دی ہے، کہ یہ کتاب جو دانا اور خوبیوں والے اللہ کی اتاری ہوئی ہے، مومنین کے لیے شفا اور رحمت ہے، یعنی جو بیماریاں شک و نفاق و شرک اور دلوں کی میل اور کجی ہوتی ہیں، قرآن اُن سب امراض سے شفا بخشتا ہے اور نیز یہ قرآن ایک رحمت ہے، جس میں ایمان و حکمت و طلبِ خیر اور رغبت ہے۔ اس کتاب کے یہ فوائد اس شخص

[1] فتح البیان (٧/ ٤٤١۔ ٤٤٣)

کے لیے ہیں جو اس پر ایمان لاتا ہے اور جو کچھ قرآن میں ہے، اس کی تصدیق کرتا ہے اور اس پاکیزہ کتاب کا پیرو ہے۔ ایسے شخص کے حق میں یہ قرآن شفا اور رحمت ہے۔ رہا کافر اور اپنی جان پر ظلم کرنے والا، سو اس کو قرآن کے سننے سے سوائے دوری اور کفر کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

یہ آفت اسی کافر کی طرف سے ہوتی ہے نہ کہ قرآن کی طرف سے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّ شِفَآءٌ ۭ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ﴾ [حم السجدة: ٤٤] ''وہ ان کے لیے، جو ایمان لائے، ہدایت اور شفا ہے اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں بوجھ ہے اور وہ اُن کے حق میں اندھا پن ہے، یہ لوگ (جو حق بات نہیں سنتے گویا) دور دراز جگہ سے پکارے جا رہے ہوں۔'' نیز فرمایا: ﴿وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِيْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۝ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ﴾ [التوبة: ١٢٤۔ ١٢٥] ''اور جب کوئی سورت نازل کی جاتی ہے تو ان (منافقین) میں سے بعض ایسے ہیں جو (طنزاً) کہتے ہیں: تم میں سے کس کو اس (سورت) نے ایمان میں زیادہ کیا ہے؟ چناں چہ جو لوگ ایمان لائے ہیں، اس (سورت) نے ان کو ایمان میں زیادہ کیا ہے اور وہ خوش ہوتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کے دلوں میں روگ ہے، تو اس (سورت) نے ان کی (پہلی) پلیدی پر مزید پلیدی کا اضافہ کر دیا اور وہ مرتے دم تک کافر ہی رہے۔'' اس بارے میں اور بہت آیتیں ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ایماندار جب قرآن کو سنتا ہے اور اس سے منتفع ہوتا ہے اور اس کو یاد رکھتا ہے اور ظالم نہ منتفع ہو نہ یاد رکھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قرآن کو مومنین کے لیے شفا اور رحمت بنایا ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ مِنْ واسطے بیان کے ہے، یعنی بعض قرآن شفا ہے، لیکن امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے اس کا رد کیا ہے کہ مبعض انزالِ قرآن ہے۔[2] شفا کے دو معنی ہیں: ایک یہ کہ شافیِ قلوب ہے، جہالت اور شک کو دور کرنے سے اور اللہ پر دلالت کرنے سے اور اللہ پر دلالت کرنے والے اُمور کی وضاحت کرنے سے۔ دوسرے یہ کہ ظاہری امراض سے شفا ہے کہ اس کی قراءت سے برکت اور پناہ اور دم کرنا حاصل ہوتا ہے، جس طرح یہ حدیث اس پر دلیل ہے: «وَمَا يُدْرِيكَ أَنَّهَا رُقْيَةٌ»[3] [تمھیں کیسے پتا چلا کہ وہ دم (بھی) ہے]

اور اگر اس شفا کو دونوں معنی پر محمول کریں، عمومیت کے مجاز یا مشترکہ چیزوں پر حمل کریں ہر دو معنی پر، تب بھی کوئی مانع نہیں ہے۔ اس کو رحمت اس لیے فرمایا ہے کہ اس میں علومِ نافعہ ہیں، جن میں دنیا اور دین کی بہتری ہے اور

---

1. تفسير الطبري (١٧/ ٥٣٩) 2. تفسير القرطبي (١٠/ ٣١٦)

3. صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٥٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٠١)

اس کی تلاوت کرنے اور اس میں غور وفکر کرنے میں بڑا اجر ہے اور وہ مغفرت اور اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کا سبب ہے۔ حاصل یہ ہے کہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس میں مذہبِ حق کے دلائل ہیں اور مذاہبِ فاسدہ کو جھٹلاتی ہے اور دلوں کی بیماریوں کے لیے شفا ہے اور گناہوں کو مٹانے اور تکالیف کو دور کرنے اور عیبوں سے پاک کرنے کے لیے نسخۂ کیمیا ہے۔ حدیث میں مروی ہے: «مَنْ لَّمْ يَسْتَشْفِ بِالْقُرْآنِ فَلَا شَفَاهُ اللّٰهُ»[1] [جس نے قرآن سے شفا طلب نہ کی، اللہ اسے شفا نہ دے!] ہاں ظالموں کو اس قرآن سے اور اُن کے خسارے میں زیادہ زیادتی ہوتی ہے اور وہ سرکشی اور دشمنی اور قبیح چیزوں کا ارتکاب کرنے میں بڑھ جاتے ہیں۔[2]

وَ اِذَاۤ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَ نَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوْسًا ﴿۸۳﴾ قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ؕ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ﴿۸۴﴾

اور جب ہم انسان پر انعام کریں تو وہ منہ موڑ لیتا ہے اور اپنا پہلو دور کر لیتا ہے، اور جب اسے تکلیف پہنچے تو بہت مایوس ہو جاتا ہے (83) کہہ دیجیے: ہر کوئی اپنے طریقے پر عمل کرتا ہے، چناں چہ تمھارا رب خوب جانتا ہے کہ کون زیادہ سیدھے راستے پر ہے (84)

خوشی اور غمی میں انسان کی عادت:

اللہ تعالیٰ نے انسان کی کمزوری کی خبر دی کہ جہاں بھی حالتِ نعمت و مال و عافیت و فتح و رزق و نصر میں ہو اور اس کی مرادیں پوری ہو رہی ہوں، وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے منہ موڑتا اور اس کی عبادت سے کنارہ کش رہتا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ﴾ یعنی "بَعُدَ عَنَّا"[3] [وہ ہم سے دو ہو جاتا ہے] یہ اس قول کی طرح ہے: ﴿ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَاۤ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ﴾ [یونس: ١٢] ''پھر جب ہم اس کی تکلیف دور کر دیتے ہیں تو وہ (یوں) گزر جاتا ہے، جیسے اس نے خود کو تکلیف پہنچنے پر ہمیں پکارا ہی نہ تھا'' اور اس قول کی طرح: ﴿ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ﴾ [بني إسرائيل: ٦٧] ''پھر جب وہ (اللہ) تمھیں خشکی کی طرف نجات دیتا ہے تو تم منہ موڑ لیتے ہو۔''

اور جب مصائب و حوادث اور مشکلات میں پھنس جاتا ہے تو بھلائی ملنے سے نا اُمید ہو جاتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ وَلَىِٕنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَـُٔوْسٌ كَفُوْرٌ ﴿۹﴾ وَلَىِٕنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ؕ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ﴿۱۰﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ

[1] كنز العمال (١٠/ ١٥) [2] فتح البيان (٧/ ٤٤٤۔ ٤٤٥) [3] تفسير الطبري (١٧/ ٥٣٩)

﴿مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ﴾ [هود: ۹۔ ۱۱] ''اور اگر ہم انسان کو اپنی رحمت (کا مزہ) چکھائیں، پھر وہ اس سے چھین لیں، تو بے شک البتہ وہ بڑا نا اُمید، بہت ناشکرا ہو جاتا ہے۔ اور اگر ہم اسے تکلیف پہنچنے کے بعد نعمتیں چکھائیں تو وہ ضرور کہے گا: مجھ سے سختیاں دور ہوگئیں، بے شک وہ (اس وقت) اترانے والا اور فخر جتانے والا ہو جاتا ہے۔ مگر جن لوگوں نے صبر کیا اور نیک عمل کیے، انھی کے لیے بخشش اور بہت بڑا اجر ہے۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ''شاکلہ'' بہ معنی ناحیہ (کنارہ، کونا) ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ بہ معنی عادت وطبیعت۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ یعنی نیت۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا کہ یعنی دین۔[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ معنی کے لحاظ سے یہ سب اقوال ایک دوسرے کے قریب ہیں اور یہ آیت۔ واللّٰہ أعلم۔ مشرکین کے لیے ڈانٹ اور وعید ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنَّا عٰمِلُوْنَ﴾ [هود: ۱۲۱] ''اور آپ ان لوگوں سے کہہ دیجیے جو ایمان نہیں لاتے: تم اپنی جگہ عمل کرو، بے شک ہم بھی عمل کرنے والے ہیں۔'' اور اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا﴾ (آیتِ باب) اور عن قریب ہر عامل اپنے عمل کی جزا پائے گا، اللہ پر کوئی چیز مخفی نہیں۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم جب کسی انسان پر انعام کرتے ہیں، جس کا شکر واجب ہوتا ہے، جیسے: صحت، فراخی، غنا اور فراغت تو وہ ہمارے ذکر اور شکر سے روگرداں ہو کر پہلو پھیر کر ناز سے چلتا ہے یا اس جگہ اعراض سے مراد دعا اور خشوع وخضوع سے منہ موڑ لینا ہے، جو کہ مصیبت اور تکلیف کے وقت کرتا تھا اور جب کوئی سختی، بیماری اور محتاجی یا دیگر آزمایشوں میں سے کسی آزمایش میں مبتلا ہوتا ہے تو سخت مایوس اور نا اُمید ہو جاتا ہے۔ یہ بعض افراد کی مناسبت سے انسانی خصلت ہے، جو اس صفت کے حامل ہیں۔ معنی یہ ٹھہرے کہ جب دنیاوی مطلب اور مقصد حاصل ہوتا ہے تو معبودِ حقیقی کو بھول جاتا ہے اور اگر کوئی شے اُن میں سے اس سے چھن جاتی ہے اور دعا کے قبول ہونے میں دیر لگتی ہے تو اس پر رنج طاری ہو جاتا ہے اور نا اُمیدی غلبہ کرتی ہے، حالاں کہ یہ دونوں خصلتیں بری ہیں اور یہ آیت کچھ دوسری آیت کے خلاف نہیں ہے، جس میں کہا ہے: ﴿وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ﴾ [حم السجدة: ۵۱] ''اور جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو لمبی چوڑی دعائیں کرنے والا بن جاتا ہے۔'' کیوں کہ یہ شان دوسروں کی ہے، ان کے سوا کسی کا یہ حال ہے اور کسی کا۔ وہ یا باوجود سخت تکلیف اور بہت نا اُمیدی کے زبان سے کثیر الدعا رہتا ہے۔ اے پیغمبر! تم کہہ دو کہ ہر کوئی اپنی جبلت پر عمل کرتا ہے۔

---

[1] تفسیر الطبري (۱۷/ ۵٤۱) [2] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۸٤)

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا کہ ''شاکلہ'' طریقہ ہے۔[1] امام بخاری نے ''کتاب التفسیر'' میں ''شاکلہ'' کی تفسیر نیت کے ساتھ کی ہے۔[2] امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا: ''شاکلہ'' سے مراد اس کا مذہب ہے، جو کہ اس کے حال کے مطابق ہوتا ہے ہدایت اور گمراہی میں۔[3] یعنی ہر انسان اپنے اخلاق کے مطابق عمل کرتا ہے۔ یا اپنے نفس کی خاصیت کے مطابق۔ اگر اس کا نفس شریف اور نیک ہے تو اس سے اچھے افعال اور پاکیزہ اخلاق صادر ہوتے ہیں اور اگر اس کا نفس گندہ اور خبیث ہے تو پھر ویسے ہی خبیث اور فاسد افعال وقوع میں آتے ہیں، اس میں کافر کی مذمت ہے اور مومن کی تعریف ہے۔ تیرا رب ہی جانے کہ کون زیادہ راہ یاب ہے، کیوں کہ وہ خالق ہے، اس کو سب کی جبلت اور طبیعت کا علم ہے۔[4]

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۸۵

اور وہ آپ سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہیے: روح میرے رب کے حکم سے ہے، اور تمھیں تو بہت ہی تھوڑا علم دیا گیا ہے (85)

روح کا ذکر:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آزمانے کے لیے یہود نے پوچھا، سو اللہ تعالیٰ نے نہ بتایا کہ اُن کو سمجھنے کا حوصلہ نہ تھا، پہلے پیغمبروں نے بھی خلق سے باریک باتیں نہیں کیں، اتنا جاننا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک چیز بدن میں آ داخل ہوئی، وہ جی اُٹھا جب نکل گئی، وہ مر گیا۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ مدینے کے کھیت میں چلا جا رہا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھجور کی ایک ٹہنی کا سہارا لیے ہوئے تھے۔ یہود کی ایک قوم پر آپ کا گزر ہوا، بعض یہود نے بعض سے کہا: ان سے روح کے بارے میں پوچھو، بعض نے کہا: یہ سوال نہ کرو، لیکن انھوں نے سوال کیا، کہا: اے محمد! روح کیا ہے؟ آپ اسی طرح ٹیک لگائے رہے، مجھے گمان ہوا کہ وحی آتی ہے، فرمایا: ﴿ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ﴾ (آیتِ باب)۔ بعض نے بعض سے کہا: ہم نے نہ کہا تھا کہ تم اُن سے سوال نہ کرو۔ (رواه أحمد وهكذا رواه البخاري و مسلم)

امام بخاری رحمہ اللہ کے الفاظ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ ہیں کہ ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک کھیت میں

---

[1] معاني القرآن (٣/ ٧٩_ ٨٠)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١/ ٢٩) امام بخاری رحمہ اللہ کی یہ تفسیر کتاب التفسیر کے بجائے کتاب الایمان میں ہے۔

[3] الکشاف (٢/ ٦٤٥) [4] فتح البيان (٧/ ٤٤٥_ ٤٤٦)

تھے اور آپ کھجور کی اک ٹہنی پر ٹیک لگائے ہوئے تھے، اتنے میں یہود کا گزر ہوا، بعض نے بعض سے کہا: آپ سے روح کے بارے میں پوچھو تو اس نے کہا کہ تمھاری اس کے بارے میں کیا رائے ہے؟ بعض نے بعض سے کہا: ایسا نہ ہو کہ تمھیں کسی ایسی بات کا سامنا کرنا پڑے جو تمھیں ناپسند ہو۔ کہنے لگے: پوچھو۔ پس روح کے بارے میں پوچھا، نبی اکرم ﷺ رک گئے، کچھ جواب نہ دیا۔ میں نے جان لیا کہ آپ ﷺ پر وحی آ رہی ہے، میں اپنی جگہ ٹھہرا رہا، اتنے میں وحی آئی اور آیتِ باب اُتری۔[1]

یہ سیاق اس بات کا مقتضی ہے کہ بادی الرائے میں ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت مدنی ہے اور اس وقت اُتری جب یہود نے یہ سوال مدینے میں کیا تھا، حالاں کہ یہ ساری سورت مکی ہے۔ اس کا جواب یہ دیا ہے کہ دوبارہ مدینے میں بھی اُتری ہوگی، جس طرح کہ اس سے پہلے مکہ میں نازل ہوئی تھی اور اس وقت یہ وحی آئی ہو کہ تم اُن کے سوال کا جواب اس آیت سے دو، جو اس سوال سے قبل اُتر چکی ہے۔ اس بات پر کہ یہ آیت مکہ میں اُتر چکی ہے، دلیل یہ ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ قریش نے یہود سے کہا کہ ہم کو کوئی ایسی شے دو جس کا سوال ہم اس شخص سے کریں، کہا: تم روح کا حال پوچھو، تب انھوں نے یہ سوال کیا، اس پر یہ آیت آئی۔ اس پر انھوں نے کہا کہ ہم کو تو بہت سا علم ہو گیا ہے، ہم کو تورات دی گئی ہے اور جس کو تورات دی گئی اس کو خیرِ کثیر دی گئی۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: ﴿قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا﴾ [الکھف: ۱۰۹] ''کہہ دیجیے: اگر میرے رب کی باتوں (کے لکھنے) کے لیے سمندر روشنائی ہو تو یقیناً میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائے گا اور اگرچہ ہم اس کے مثل (اور سمندر) بطور مدد لے آئیں۔''[2]

امام ابن جریر رحمہ اللہ امام عکرمہ رحمہ اللہ سے راوی ہیں کہ اہلِ کتاب نے نبی مکرم ﷺ سے روح کا سوال کیا، اللہ تعالیٰ نے آیتِ باب اُتاری، کہا: تجھ کو یہ اعتقاد ہے کہ ہم کو تھوڑا علم دیا گیا ہے، ہم کو تو تورات دی گئی، اس پر یہ وحی آئی: ﴿وَلَوْ اَنَّمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ [لقمان: ۲۷] ''اور بلاشبہہ اگر زمین میں جتنے درخت ہیں، سب قلم بن جائیں اور سمندر کی روشنائی بن جائے اور اس کے بعد سات سمندر (اس میں مزید روشنائی شامل کریں) تو بھی اللہ کے کلمات ختم نہ ہوں، بے شک اللہ نہایت غالب، بہت حکمت والا ہے۔'' کہا جو علم تم کو دیا گیا تھا، پھر اس کے سبب سے تم آگ سے بچے، وہ کثیر

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٤٤٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٧٩٤) مسند أحمد (١/ ٣٨٩)

[2] سنن الترمذي، رقم الحدیث (٣١٤٠) سنن النسائي الکبریٰ (٦/ ٣٩٢) مسند أحمد (١/ ٢٥٥) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: ظلال الجنة (١/ ٣٢٢)

اور طیب ہے، مگر اللہ کے علم کے مقابلے میں قلیل ہے۔[1]

امام عطاء بن یسار رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا ﴾ (آیتِ باب) مکہ میں نازل ہوئی۔ جب نبی مکرم ﷺ نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو احبار، یعنی علمائے یہود نے آ کر کہا: اے محمد! ہم کو یہ بات پہنچی ہے کہ تم کہتے ہو: ﴿ وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا ﴾ اس سے مراد ہم ہیں یا تمھاری قوم؟ کہا: تم اور وہ سب مراد ہو، کہا: تم پڑھتے ہو کہ ہم کو تورات دی گئی ہے اور اس میں ہر شے کا بیان ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «هِيَ فِي عِلْمِ اللّٰهِ قَلِيلٌ وَقَدْ آتَاكُمُ اللّٰهُ مَا إِنْ عَمِلْتُمْ بِهِ اسْتَقَمْتُمْ» پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بھیجی: ﴿ وَلَوْ اَنَّمَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ یَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴾[2] [لقمان: ۲۷] ”اور بلاشبہ اگر زمین میں جتنے درخت ہیں، سب قلم بن جائیں اور سمندر کی روشنائی بن جائے اور اس کے بعد سات سمندر (اس میں مزید روشنائی شامل کریں) تو بھی اللہ کے کلمات ختم نہ ہوں، بے شک اللہ نہایت غالب، بہت حکمت والا ہے۔“

مفسرین کا روح کے بارے میں اختلاف ہے اور اس میں کئی اقوال ہیں، ایک یہ کہ مراد ارواحِ بنی آدم ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہود نے نبی اکرم ﷺ سے کہا: ہمیں روح کے بارے میں بتاؤ، یہ روح جو بدن میں ہے، اس کو کس طرح عذاب ہو گا؟ روح اگرچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، لیکن نبی اکرم ﷺ پر اس بارے میں کوئی شے نازل نہیں ہوئی تھی، اس لیے آپ ﷺ نے کچھ نہ کہا۔ جبریل علیہ السلام آئے اور کہا: ﴿ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا ﴾ ۔ نبی مکرم ﷺ نے اس کی خبر اُن کو دی، کہا: تمھارے پاس اس کو کون لایا ہے؟ فرمایا: جبریل علیہ السلام اللہ کے پاس سے لائے ہیں۔ کہا: واللہ! یہ بات تم سے نہیں کہی مگر ہمارے دشمن نے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بھیجی: ﴿ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِیْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ ﴾ [البقرۃ: ۹۷] ”جو کوئی جبریل کا دشمن ہے، تو اُسی نے اِس قرآن کو اللہ کے حکم سے آپ کے دل پر نازل کیا ہے، یہ اس (کتاب) کی تصدیق کرتا ہے جو اس سے پہلے نازل ہوئی۔“[3]

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ اس جگہ روح سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس کو چھپاتے تھے۔[4] بعض نے کہا کہ روح سے مراد ایک عظیم فرشتہ ہے جو ساری مخلوقات کے برابر ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ روح ایک فرشتہ ہے، میں نے نبی اکرم ﷺ کو سنا، فرماتے تھے: اللہ کا ایک فرشتہ ہے، اگر اس سے کہا

---

[1] تفسیر الطبري (۱۷/ ۵۴۲) یہ روایت مرسل ہے۔
[2] تفسیر الطبري (۱۷/ ۵۴۴۔ ۵۴۵) یہ روایت مرسل ہے۔
[3] تفسیر الطبري (۱۷/ ۵۴۳) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔
[4] تفسیر الطبري (۱۷/ ۵۴۴)

جائے کہ تو ساتوں آسمانوں اور زمین کو ایک لقمہ کر جا تو وہ لقمہ کر جائے، اس کی تسبیح یہ ہے: ''سُبْحٰنَكَ حَيْثُ كُنْتَ''[1] (رواه الطبراني) [الٰہی تو پاک ہے جہاں بھی ہے] یہ حدیث غریب ہے، بلکہ منکر ہے۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ روح فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے، اس کے ستر ہزار چہرے ہیں، ہر چہرے میں ستر ہزار زبانیں ہیں، ہر زبان کی ستر ہزار بولیاں ہیں، ان سب بولیوں سے اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی ہر تسبیح سے ایک فرشتہ پیدا کرتا ہے، وہ فرشتہ اللہ کی عبادت میں قیامت تک دوسرے فرشتوں کے ساتھ اُڑا کرتا ہے۔[2] (رواه ابن جرير) یہ اثر عجیب وغریب ہے۔ والله أعلم.

سہیلی رحمہ اللہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ روایت کیے ہیں کہ روح ایک فرشتہ ہے، اس کے ایک لاکھ سر ہیں، ہر سر میں ایک لاکھ چہرے ہیں، ہر چہرے میں ایک لاکھ منہ ہیں، ہر منہ میں ایک لاکھ زبانیں ہیں، جو مختلف لغات میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہیں۔ سہیلی رحمہ اللہ نے کہا کہ اس سے مراد فرشتوں کا ایک گروہ ہے، جن کی شکلیں بنی آدم جیسی ہیں۔ بعض نے کہا کہ یہ وہ فرشتے ہیں کہ اور فرشتوں کو تو وہ دیکھتے ہیں، لیکن اور فرشتے انھیں نہیں دیکھتے۔ چنانچہ وہ فرشتوں کے لیے ایسے ہی ہیں جیسے ہمارے لیے یہ فرشتے۔[3]

روح کو امرِ رب فرمایا، یعنی رب کی شان ہے، خاص اللہ ہی کو اس کا علم ہے نہ کہ تم کو۔ اس لیے فرمایا ہے کہ تم کو تھوڑا سا علم دیا گیا ہے، کوئی شخص اللہ کے علم کا محیط نہیں ہوسکتا، مگر جتنا وہ چاہے۔ یہ موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے قصے میں آئے گا کہ خضر علیہ السلام نے دیکھا کہ ایک چڑیا کشتی کے کنارے پر آ بیٹھی اور اس نے ایک چونچ دریا میں ماری، یعنی چونچ سے پانی پیا، خضر علیہ السلام نے کہا: اے موسیٰ! میرا اور تیرا اور خلائق کا علم اللہ کے علم کے مقابلے میں اتنا ہے جتنا اس چڑیا نے اس دریا میں سے لیا۔ امام سہیلی رحمہ اللہ نے کہا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سوال کا جواب نہ دیا، اس لیے کہ وہ سوال بطورِ عیب جوئی تھا اور بعض نے کہا کہ جواب دے دیا۔ امام سہیلی رحمہ اللہ کا اعتماد اس پر ہے کہ امرِ رب سے مراد شرع رب ہے، یعنی اس کی شرع میں داخل ہو اور تم جانتے ہو کہ طبیعت اور فلسفے سے اس کی شناخت نہیں ہوسکتی، بلکہ صرف شرع کے ذریعے سے ہوسکتی ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس مسلک پر جس پر امام سہیلی رحمہ اللہ چلے ہیں، نظر ہے۔ والله أعلم.

پھر امام سہیلی رحمہ اللہ نے یہ ذکر کیا کہ علما کا اس بات میں اختلاف ہے کہ روح نفس ہے یا اور کچھ۔ پھر یہ مقرر کیا کہ روح ایک ذاتِ لطیف ہے، جیسے ہوا بدن میں سیر کرتی ہے، جیسے درخت کی رگوں میں پانی جاتا ہے اور وہ روح

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٥٤٤) المعجم الكبير (١١/ ١٩٥) اس کی سند میں ''وہب اللہ بن رزق'' ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ١٩٥٦)

[2] تفسير الطبري (١٧/ ٥٤٤) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔ [3] الروض الأنف (٢/ ٧٠)

جس کو فرشتہ جنین میں پھونکتا ہے وہ نفس ہے، بشرطیکہ اس کا بدن کے ساتھ اتصال ہو اور اسی کے سبب سے نفس اچھی اور مذموم صفات حاصل کرتا ہے۔ پھر یا تو وہ نفسِ مطمئنہ ہے یا امارۃ بالسوء (برائیوں کا حکم کرنے والا)، جس طرح کہ پانی حیاتِ شجر ہے، پھر پانی کے ملنے سے اپنی خاصیت کے مطابق پھل دیتا ہے۔ جب انگور کے درخت سے متصل ہوتا ہے اور اسے نچوڑا جاتا ہے تو وہ مصطار یا خمر ہو جاتا ہے اور اس کو پانی نہیں کہتے، مگر مجاز کے طور پر۔ اسی طرح نفس کو روح نہیں کہیں گے مگر بروجہ تجوز۔ اسی طرح روح کو نفس نہیں کہتے مگر باعتبار انجام۔ اصل قول یہ ہے کہ روح اصل اور مادۂ نفس ہے اور نفس مرکب ہے روح سے اور روح متصل ہے بدن سے۔ پس روح نفس ہے، لیکن ایک وجہ سے نہ کہ تمام وجوہ سے۔ واللہ أعلم. میں کہتا ہوں کہ لوگوں نے ماہیت و احکامِ روح میں کلام کیا ہے اور اس بارے میں کتابیں تالیف کی ہیں، بہترین کلام اس بارے میں حافظ ابن مندہ رحمہ اللہ کا کلام ہے جو کتاب الروح میں ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ لوگوں کا روح مسئول عنہ کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا کہ روح مدبر بدن ہے، بدن اسی کے سبب سے زندہ رہتا ہے۔ اکثر مفسرین کا یہی قول ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ روح جس سے انسان کی زندگی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کی خبر اپنی مخلوق میں سے کسی کو نہیں دی اور بندوں میں سے کسی کو اس کا علم عطا نہیں کیا۔[2] کسی نے کہا کہ روح جبریل علیہ السلام ہیں۔ کسی نے کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ کسی نے کہا کہ قرآن ہے۔ کسی نے کہا کہ ایک فرشتہ عظیم الخلق ہے۔ کسی نے کہا کہ بنی آدم کی مثل ایک مخلوق ہے۔ کسی نے کہا کہ خون ہے، انسان جب مر جاتا ہے سوائے خون کے اور کوئی چیز اس سے کم نہیں ہوتی، یعنی فوت نہیں ہوتی۔ ایک قوم نے کہا کہ نفس حیوان ہے، اس لیے کہ سانس کے رُکنے سے مر جاتا ہے۔ ایک قوم نے کہا کہ عرض ہے۔ دوسری قوم نے کہا کہ جسمِ لطیف ہے، انسان اس کے سبب سے زندہ رہتا ہے۔ بعض نے کہا کہ روح ایک معنی ہے، جس میں نور و طیب و علم و علو و بقا جمع ہیں، ظاہر وہی پہلا قول ہے۔ پھر ظاہر سیاق یہ ہے کہ یہ سوال حقیقتِ روح سے تھا، کیوں کہ حقیقتِ شے کی معرفت بہت زیادہ اور اہم اور مقدم ہوتی ہے حال شے کی معرفت سے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے اس سوال کا جواب دیا اور مقامِ اضمار میں اظہار کے لیے کمال اعتنا کے ساتھ روح کی حالت کے متعلق اظہار فرمایا اور مِن بیانیہ لا کر روح کو ایک امرِ رب بتایا۔ یا امر بہ معنی شان ہے اور اضافت اختصاص علمی کے لیے ہے نہ کہ ایجادی کے لیے، اس لیے کہ اس میں سب مشترک ہیں اور اس میں مضاف ایک بڑی بزرگی ہے، جس طرح کہ دوسری اضافت میں مضاف الیہ کی بزرگی ہے، یعنی یہ روح اس جنس سے ہے جس کے علم کے ساتھ

[1] الروض الأنف (۲/ ۷۱۔ ۷۵) تفسیر ابن کثیر (۳/ ۸۶)
[2] فتح القدير (۳/ ۳۵۱۔ ۳۵۲)

اللہ پاک مستاثر و خاص ہے اور کسی بندے کو اس کا علم نہیں ہے۔ غرض یہ کہ امرِ روح کو مبہم رکھا، اسی طرح تورات میں بھی مبہم رکھا ہے۔ بعض نے کہا کہ امر سے مراد وحی و کلام ہے نہ کہ کلامِ بشر۔ اس آیت میں روح کی حالت کے بارے میں زیادہ غور کرنے والوں کو سرزنش ہے، جو کہ روح کی حقیقت کے بارے میں تکلف کرتے ہیں اور حقیقت کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں۔ اس بحث میں طویل گفتگو ہوئی ہے، جس کے لیے اس جگہ میں گنجایش نہیں ہے اور کلامِ مذکور کا زیادہ تر حصہ فضول ہے، جس کا نہ دنیا میں کوئی فائدہ ہے نہ دین میں۔

بعض محققین نے کہا ہے کہ روح میں اٹھارہ سو قول ہیں، ذرا اس فضول فارغ اور بے فائدہ تکلیف کی طرف نظر کرنا چاہیے کہ یہ بات معلوم کر لینے کے بعد کہ اس علم کے ساتھ صرف اللہ تعالیٰ ہی مستاثر ہے اور اس نے اپنے انبیا علیہم السلام تک کو اس پر مطلع نہیں کیا اور نہ اس کی شکل اور حقیقت کے بارے میں سوال کرنے کی اجازت دی ہے، نہ اس کی حقیقت پر بحث کرنے کو فرمایا، چہ جائے کہ انبیا علیہم السلام کی اُمتیں جو انبیا کی مقتدی ہیں، وہ اس بارے میں غور کریں۔ پھر ہر کس و ناکس کا اس موشگافی کے درپے ہونا ایک بے فائدہ فعل اور لا حاصل حرکت کے سوا اور کیا ہے۔

بڑا تعجب ہے کہ اس قسم کی فضول بحثوں میں پڑنے والے اور منقول کے مقابلے میں اپنی عقلوں پر قناعت کرنے والے اس حد تک پہنچ گئے، جہاں تک بلکہ اس کی بعض حد تک سوا اس مسئلے کے، جس میں اللہ نے کلام کرنے کی اجازت دی اور خود اس کے علم کے ساتھ مستاثر نہیں ہیں، نہیں پہنچے، حالاں کہ اس کی شکل کا ذرا سا ادراک کرنے سے باوجود اس طویل غور و خوض کے عاجز ہو چکے ہیں۔ اس کے ادراک سے عقل کو عاجز کرنے کی یہی حکمت ہے کہ ایک مخلوق جو بدن کے اندر رہتی ہے، جب اسی کی حقیقت کی شناخت ہاتھ نہیں آتی تو اس خالق کی حقیقت جاننے سے عقلا کی عقل بہ درجۂ اولیٰ عاجز تر ہے۔ لہٰذا روح کی حد اور حقیقت کے بارے میں جو کچھ قدیماً و حدیثاً کہا گیا ہے، وہ سب قابلِ ردّ ہے۔ لہٰذا اللہ پاک نے اس آیت پاک کو اس قول پر ختم کیا کہ تم کو تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

یہ خطاب تمام مخلوق کو عام ہے اور انھی میں سے ایک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، پھر کسی اور کی کیا ہستی ہے؟ اور بعض نے کہا کہ یہ خطاب یہود کو خاص ہے، لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے اور اس میں یہود بھی بہ درجہ اولیٰ داخل ہیں۔ معنی یہ ہوئے کہ جو علم اللہ تعالیٰ نے تم کو دیا ہے، وہ ایک تھوڑی سے مقدار ہے بہ نسبت خالق سبحانہ وتعالیٰ کے علم کے، اگرچہ تم کو علم سے ایک وافر حصہ حاصل کیوں نہ ہو۔ بلکہ انبیا علیہم السلام کا علم اللہ کے علم کی نسبت اتنا ہے، جتنا کوئی پرندہ اپنی چونچ سے دریا میں سے لے لے، جس طرح کہ حدیث موسیٰ و خضر علیہما السلام میں آیا ہے۔[1]

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اور بعض اہلِ سلوک نے روح کے بیان میں کچھ گفتگو کی ہے، اُن کی اس کوشش سے دل نہایت قلق میں ہے کہ انھوں نے باوجود اس کے کہ اس کا علم اللہ کے ساتھ مستاثر (مخصوص) ہے ایسا کیوں

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٢٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٠)

کیا۔ عفا اللہ عنا وعنھم أجمعین۔ جس طرح کہ یہ ایک روح کا مسئلہ ہے، اسی طرح اور بھی چند مسائل ہیں، جن پر سکوت کیا گیا ہے اور جن کے بارے میں شارع سے کلام کرنے کی اجازت معلوم نہیں ہے، لیکن اللہ تعالیٰ علما اور راسخینِ اُمت پر رحم فرمائے کہ انھوں نے اللہ جانے کیوں اور کس لیے ایسے امور پر بحث کی اور کاغذ سیاہ کیے!! اس میں شک نہیں کہ جن اہلِ علم نے ایسے مواقع میں اتباع کو ابتداع پر مقدم رکھ کر خاموشی اختیار کی ہے، اُن کا مرتبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اعلیٰ و اولیٰ ہے، اس فریق سے جنھوں نے اس بارے میں کلام کیا۔ اس لذتِ اتباع کا صحیح طریقے سے وہی مزہ اُٹھاتا ہے، جو کہ سنتِ مطہرہ و کتابِ مقدس کی حلاوت کا آشنا ہے۔ ورنہ اکثر خلق اس آیت کی مصداق ہے: ﴿ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ﴾ [المدثر: ٤٥] ”اور ہم (باطل میں) مشغول ہونے والوں کے ساتھ مشغول ہوتے تھے۔“

فنونِ تصوف اور علومِ باطن میں ایسی فضولیات بہت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب و حدیث کو مراتبِ کشف و کرامات و طاعات و شطحیاتِ فقرا سے بچا رکھا ہے۔ سب سے بہتر راہِ نجات سلف صلحائے امت و ائمہ ملت جو خیر القرون میں ہوئے ہیں، ان کے راستے پر چلنا ہے۔ جس قوی الایمان، صادق الاذعان، کامل العرفان سے ہو سکے وہ اس دور میں کہ جو قیامتِ عظمیٰ کے قریب کا زمانہ ہے، پوری ہمت اور ارادے کے ساتھ اپنے آپ کو اس امر میں لگا دے کہ اس کی صورت اور سیرت توحیدِ خالص کے میزانِ عدل اور سنتِ مطہرہ و شریعتِ حقہ کی اتباع میں موزون نکلے۔ بحث مباحثے اور جھگڑے اور قیل و قال کے معرکے اس جگہ پھینک دے، جہاں عقل کے کتے بھونکتے ہیں اور خود دائرۂ امن و امان و عافیت و حسنِ عاقبت میں مگن ہو جائے، لیکن نجات کی یہ معراج خالقِ ارض و سمٰوٰت کی توفیق کے بغیر ہر خودسر، شوریدہ مغز، بدعت دوست اور آرا کو پسند کرنے والے کو میسر نہیں آتی۔ وباللہ المستعان.

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ﴿٨٦﴾ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۭ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ﴿٨٧﴾ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓي اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴿٨٨﴾ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۡ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿٨٩﴾

اور البتہ اگر ہم چاہیں تو اسے ضرور لے جائیں جو کچھ ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے، پھر آپ اس پر ہمارے مقابلے میں اپنا کوئی حمایتی نہ پائیں گے (86) سوائے آپ کے رب کی رحمت کے، بے شک آپ پر اس کا فضل بہت زیادہ ہے (87) کہہ دیجیے: البتہ اگر تمام انسان اور جن اس (بات) پر جمع ہو جائیں کہ اس

قرآن کی مثل لائیں تو وہ اس کی مثال نہ لاسکیں گے، اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں (88)
اور بلاشبہ ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر مثال پھیر پھیر کر بیان کی ہے، پھر بھی اکثر لوگوں نے
انکار کیا، مگر کفر کرنے سے (انکار نہیں کیا) (89)

اگر اللہ چاہے تو قرآن کو لے جائے:

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے اور رسول کریم پر اپنی نعمت اور فضلِ عظیم کا ذکر کیا کہ ہم نے اس پر قرآن مجید اُتارا جس کے آگے پیچھے سے کوئی باطل نہیں آ سکتا۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آخری زمانے میں شام کی طرف سے ہوا چلے گی تو اس کے بعد کسی انسان کے مصحف اور دل میں کوئی ایک آیت بھی باقی نہ رہے گی۔ (هكذا في ابن كثير) پھر سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ وَلَىِٕنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ﴾[1] (آیتِ باب) معلوم ہوا کہ قیامت سے پہلے قرآن مرفوع ہو جائے گا، ایک ایسی ہوا چلے گی جو مصحف سے اور دل سے اللہ کی آیاتِ بینات کو بالکل مٹا دے گی۔

قرآن کا چیلنج:

پھر اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ اگر سارے انسان اور جن جمع ہو جائیں اور اکٹھے کوشش کریں کہ ایسا قرآن لائیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اُترا ہے تو ہرگز وہ نہیں لا سکتے، اگرچہ ایک دوسرے کے معاون و مددگار کیوں نہ ہوں، کیوں کہ یہ ایک ایسا امر ہے جس کی کسی کو استطاعت اور طاقت نہیں اور مخلوق کا کلام کس طرح خالق کے کلام کے مشابہ ہوسکتا ہے، جس کا نہ کوئی نظیر ہے اور نہ کوئی مثال و عدیل۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اس آیت کا نزول یہود کے چند لوگوں کے حق میں ہوا ہے۔ یہود نے آ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ ہم بھی اسی جیسا کلام بنا لاتے ہیں جس طرح کا آپ لائے ہیں، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بھیجی۔[2] لیکن اس میں نظر ہے، اس لیے کہ سورت مکی ہے اور اس کا سیاق بالکل ساتھ قریش کے ہے اور یہود کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اجتماع مدینے میں ہوا تھا۔ واللہ أعلم۔ مثل سے مراد حجج و براہینِ قاطعہ کا بیان اور اُن کی تشریح اور حق پھیلانا ہے، اس کے باوجود اکثر لوگ نہیں مانتے اور حق سے انکار اور صحیح بات کو رد کرتے رہتے ہیں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ ''اذہابِ وحی'' سے مراد یہ ہے کہ ہم اس کو دلوں اور کتابوں سے مٹا دیں، یہاں تک کہ اس کا کچھ اثر باقی نہ رہے۔[3] قرآن کو موصول سے تعبیر اس لیے کیا کہ اس کی بلند شان ظاہر

---

[1] تفسير الطبري (۱۷/ ۵٤٦) تفسير ابن كثير (۳/ ۸٦) [2] تفسير الطبري (۱۷/ ۵٤۷) [3] معاني القرآن (۳/ ۲۵۸)

ہو، پھر اگر ہم ایسا کریں تو کوئی اس کو تمھارے لیے اس کو محو کرنے کے بعد پھیر لانے والا نہ ہوگا۔ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اسے دوبارہ لے آئے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ بلاشبہہ عن قریب یہ قرآن اٹھا لیا جائے گا، ان سے کہا گیا: یہ کیوں کر اٹھایا جائے گا جب کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ہمارے دلوں میں جاگزیں کر دیا ہے اور ہم نے اسے مصاحف میں لکھ کر محفوظ کر دیا ہے؟ انھوں نے فرمایا: ایک رات اس پر ایسی ہوا چلے گی جو دل اور مصحف میں کوئی آیت نہیں چھوڑے گی، تم اس حال میں صبح کرو گے کہ تم اس میں سے کوئی چیز نہ ہوگی، پھر انھوں نے اس آیتِ (باب) کی تلاوت فرمائی۔[1] (رواہ سعید بن منصور والحاکم وصححه والطبراني والبیهقي وغیرهم و قد روی هذا عنه وعن جمع من الصحابة موقوفا و مرفوعا) اللہ کا فضل تجھ پر بہت بڑا ہے کہ تجھ کو اپنا رسول مقرر کیا اور کتاب اُتاری اور قرآن کا القا کیا اور علم دیا اور سید ولدِ آدم ٹھہرایا اور خاتم النبیین بنایا اور مقامِ محمود عطا کیا، وغیر ذلك.

پھر اللہ نے مشرکین پر اعجازِ قرآن کی حجت قائم کی اور فرمایا کہ اگر جن اور انسان، بلکہ اسی طرح ملائکہ متفق ہو کر یہ چاہیں کہ قرآن جیسی کتاب بنا لائیں، جو کہ اللہ کی طرف سے اُتری ہے اور صفاتِ جلیلہ کی حامل ہے، جیسے: کمال کی فصاحت اور انتہا درجے کی بلاغت اور حسنِ نظم اور جزالتِ لفظ' تو ہرگز نہیں لا سکتے۔ ملائکہ کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ اُن کے ساتھ تحدی نہیں تھی اور اُن کے ساتھ معارضہ پیش آنا ملائکہ کے شایانِ شان نہیں ہے، پھر خواہ یہ سارے اکٹھے ہوں یا الگ الگ کسی طرح بھی قرآن کے مثل بنانا ممکن نہیں ہے۔ اس میں کفار کے اس قول کا رد ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم چاہیں تو ایسا ہی لکھ لائیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو کاذب کہا اور اُن کی اس بات کا رد کیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ محمود بن سیحان ونعیمان بن آصی و بحری بن عمرو اور سلام بن مشکم نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر کہا: اے محمد! ہمیں خبر دو کہ یہ جو تم لائے ہو، کیا سچ مچ اللہ کے پاس سے ہے؟ ہم اس کو تورات کی طرح ترتیب دیا ہوا نہیں دیکھتے، فرمایا: واللہ! تم خوب پہچانتے ہو کہ یہ اللہ کے پاس سے ہے، کہا ہم بھی ایسا کلام لا سکتے ہیں جیسا تم لائے ہو، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی۔[2]

غرض یہ کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور اعلیٰ قسم کی بلاغت اور فصاحت میں واقع ہوا ہے، مخلوق کا کلام خالق کے کلام کے برابر نہیں ہوتا، یہ غیر مخلوق ہے، اگر مخلوق ہوتا تو کفار بھی اسی کے مثل بنا لاتے۔ یہ تو اپنے نظم اور تالیف میں اور غیب کی خبریں دینے میں معجزہ ہے۔ اس قرآن میں اللہ پاک نے اُن کے قول کی مختلف وجوہ سے زیادتِ تقریر اور بیان کی خاطر بار بار تردید کی ہے اور ہر مثال کو دو دو بار اور تین تین بار بیان کیا ہے، جو کہ موجبِ عبرت ہے، جیسے:

---

[1] سنن سعید بن منصور (۲/ ۳۳۵) مستدرك الحاكم (٤/ ٥٤٩) المعجم الكبير (۹/ ۱٤۱) شعب الإیمان (۲/ ۳٥٦) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[2] تفسیر الطبري (۱۷/ ٥٤۷)

نشانیوں کا بیان، عبرتوں، ترغیب و ترہیب و اوامر و نہی اور قصے پہلے لوگوں کے اور جنت و دوزخ اور قیامت۔ یا ہر وہ چیز جو کہ غرابت اور حسن اور لوگوں میں وقعت کے لحاظ سے مثالی ہیں، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اہلِ مکہ اور اُن کی طرح دوسرے منکرین قیامِ حجت کے بعد آیات کا انکار کرتے ہیں اور اُن کے بارے میں بے سوچے سمجھے اعتراضات کرتے ہیں اور قرآن کا کلام اللہ ہونا نہیں مانتے۔[1]

وَ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ﴿۹۰﴾ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ﴿۹۱﴾ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ قَبِيْلًا ﴿۹۲﴾ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ؕ وَ لَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۳﴾

اور وہ بولے: ہم تجھ پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے، حتی کہ تو ہمارے لیے زمین سے چشمہ جاری کر دے (90) یا تیرے لیے کھجوروں اور انگور کا ایک باغ ہو، پھر تو اس (باغ) کے درمیان (جگہ جگہ) نہریں جاری کر دے (91) یا تو آسمان ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر گرا دے جیسے تو کہا کرتا ہے، یا اللہ کو اور فرشتوں کو سامنے لے آ (92) یا تیرے لیے سونے کا گھر ہو، یا تو آسمان میں چڑھ جائے، اور ہم تیرے چڑھنے پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے، حتی کہ تو ہم پر ایک کتاب اُتار لائے جسے ہم پڑھیں۔ کہیے: میرا رب پاک ہے، میں تو بس ایک بشر رسول ہوں (93)

قریش کی طرف سے بعض مخصوص نشانیوں کا مطالبہ:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ عتبہ و شیبہ جو ربیعہ کے بیٹے تھے، ابوسفیان بن حرب، بنی عبدالدار کا ایک شخص، ابو البختر ی بنی اسد کا بھائی، اسود بن مطلب بن اسد، زمعہ بن اسود و ولید بن مغیرہ، ابوجہل بن ہشام، عبداللہ بن ابی امیہ، امیہ بن خلف، عاص بن وائل اور اس کے بیٹے اور منبعین جو حجاج میں سے تھے، غروبِ آفتاب کے بعد پشتِ کعبہ کے پاس جمع ہوئے۔ بعض نے بعض سے کہا کہ محمد کو بلا کر باتیں کرو اور جھگڑو، یہاں تک کہ تم اس پر غالب آ جاؤ۔ آدمی بھیج کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا اور کہلا بھیجا کہ تمھاری قوم کے اشراف جمع ہیں تا کہ تم سے گفتگو

[1] فتح البیان (۷/ ۴۴۹۔ ۴۵۲)

کریں۔ نبی اکرم ﷺ جلد تشریف لائے، اس گمان پر کہ اُن کو میرے بارے میں کوئی بات ظاہر ہوئی ہے، کیوں کہ آپ اُن پر حریص تھے، اُن کی ہدایت آپ کو محبوب تھی اور اُن کی عیب جوئی ناپسند تھی۔ جب آ کر بیٹھے، انھوں نے کہا: اے محمد! ہم نے تم کو آدمی بھیج کر بلایا، تاکہ ہم تمھارے بارے میں حجت پوری کر دیں اور واللہ! ہم عرب میں سے کسی شخص کو نہیں جانتے کہ اس نے اپنی قوم پر وہ چیز داخل کی ہو جو تم نے اپنی قوم پر داخل کی ہے، تم نے باپ دادا کو گالی دی، برا کہا اور اُن کے دین کو عیب لگایا اور اُن کی عقلوں کو نادان ٹھہرایا اور معبودوں کو برا کہا اور جماعت میں تفرقہ ڈال دیا، کوئی ایسی قباحت نہیں ہے جو تم ہمارے اور اپنے درمیان نہیں لائے۔ سو اگر یہ بات تم نے اس لیے کی ہے کہ مال طلب کرو تو ہم اپنے مالوں میں سے تمھارے لیے مال جمع کر دیں گے، یہاں تک کہ تم ہم سب سے زیادہ مال دار ہو جاؤ اور اگر تم اپنے لیے ہمارے درمیان شرف کے طالب ہو تو ہم تم کو اپنے اوپر سردار بنا لیں گے اور اگر ملک چاہتے ہو تو ہم اپنا بادشاہ ٹھہرا لیں گے اور یہ جو تمھارے پاس آتا جاتا ہے، یہ کوئی تابع جن ہے، جو تم پر غالب ہو گیا ہے تو ہم اپنا مال تمھارے علاج میں خرچ کریں، یہاں تک کہ تم صحت یاب ہو جاؤ، یا ہم تمھاری بات میں عاجز و لاچار ہو جائیں۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ مجھ کو ایسی کوئی بات نہیں جو تم کہتے ہو، میں جو کچھ تمھارے پاس لایا ہوں وہ کچھ مال یا شرف یا حکومت کی طلب کے لیے نہیں لایا، لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھ کو تمھاری طرف رسول بنا کر بھیجا ہے اور مجھ پر کتاب نازل فرمائی ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ میں تم کو خوش خبری سناؤں اور ڈراؤں، سو میں نے اپنے رب کے پیغامات تم کو پہنچا دیے ہیں اور تمھاری خیر خواہی کی، اگر تم مجھ سے اس بات کو قبول کرو گے جو میں تمھارے پاس لایا ہوں تو یہ دنیا اور آخرت میں تمھاری نصیب وری ہے اور اگر تم اس رسالت کو مجھ پر رد کرو گے تو میں اللہ کے حکم پر صبر کروں گا، یہاں تک کہ اللہ میرے اور تمھارے درمیان فیصلہ کر دے۔ یا جیسے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ انھوں نے کہا: اے محمد! اگر تم ہماری اس بات کو قبول نہیں کرتے تو تم جانتے ہو کہ لوگوں میں سے کوئی شخص شہروں میں ہم سے زیادہ تنگ دست اور مال میں کم تر اور زندگی میں زیادہ تنگدست نہیں ہے، سو تم اپنے رب سے، جس نے تم کو یہ شریعت دے کر بھیجا ہے، سوال کرو کہ ہمارے یہ پہاڑ جن کے سبب سے ہم پر تنگی ہے ہمارے پاس سے ہٹ جائیں اور ہمارے شہر کشادہ ہو جائیں اور اُن میں پانی کی نہریں بہنے لگیں، جیسے کہ شام اور عراق میں بہتی ہیں اور ہمارے جو باپ دادا گزر چکے ہیں، وہ پھر جی اُٹھیں اور اُن میں سے ایک قصی بن کلاب ہو، کیوں کہ وہ ایک راست باز شیخ تھے، ہم اُن سے پوچھیں جائیں گے اور اللہ کے نزدیک تمھارا مقام پہچانیں گے اور جان لیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے واقعی تم کو رسول بنا کر بھیجا ہے، جس طرح کہ تم کہتے ہو۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں کچھ اس لیے مبعوث نہیں ہوا ہوں، میں تو تمھارے پاس وہ چیز لے کر آیا ہوں، جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مجھے مبعوث کیا ہے، سو میں نے اللہ کی رسالت تم کو پہنچا دی، تم اگر اس کو قبول کرو گے تو

یہ دنیا اور آخرت میں تمھاری نصیب وری ہے اور اگر تم اس کو رد کرو گے تو میں اللہ کے حکم پر صبر کروں گا، جب تک کہ اللہ میرے اور تمھارے درمیان فیصلہ کرے۔ وہ بولے: اچھا اگر تم ایسا نہ کرو گے تو تم جانو اور اپنے رب سے سوال کرو کہ تمھاری تصدیق کرنے کے لیے ایک فرشتہ بھیج دے، وہ تمھاری طرف سے جواب سوال کرے اور تم یہ سوال کرو کہ وہ تمھارے لیے باغستان اور خزانے اور چاندی سونے کے محل بنا دے، جس کے سبب سے تم ہم سے بے نیاز ہو، کیوں کہ تم بازاروں میں کھڑے ہو کر معاش کی تلاش کرتے ہو، جس طرح کہ ہم تلاش کرتے ہیں، یہاں تک کہ ہم تمھارے رب کے نزدیک تمھارے درجے کی بلندی پہچانیں، اگر تم رسول ہو جس طرح تم کہتے ہو۔ نبی اکرم ﷺ نے کہا کہ میں یہ نہیں کرتا اور نہ میں اپنے رب سے اس قسم کا سوال کروں گا اور میں تمھاری طرف کچھ اس لیے مبعوث نہیں ہوا ہوں، لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھ کو بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے، اگر تم اس بات کو جو میں تمھارے پاس لایا ہوں قبول کرو گے تو یہ تمھارا دنیا اور آخرت میں نصیب ہے اور اگر مجھ پر رد کرو گے تو میں اللہ تعالیٰ کے امر پر صبر کروں گا، یہاں تک کہ اللہ میرے اور تمھارے درمیان فیصلہ کرے۔ انھوں نے کہا: اچھا آسمان کو گرا دو، جس طرح تم کو زعم ہے کہ تمھارا رب اگر چاہے گا کرے گا، ہم تم پر ایمان نہ لائیں گے، جب تک کہ تم ایسا نہ کرو گے۔

نبی مکرم ﷺ نے فرمایا کہ یہ اللہ کا اختیار ہے، چاہے وہ تمھارے ساتھ ایسا کرے۔ کہا: اے محمد! کیا تمھارے رب نے یہ نہیں جانا کہ ہم تمھارے پاس بیٹھ کر یہ سوال کریں گے اور تم سے اُن اُمور کا مطالبہ کریں گے، وہ تم کو ہمارے سوالوں کے جواب بتا دے گا اور جو کچھ وہ کرنے والا ہے، تم کو اس کی خبر دے دے گا، جبکہ ہم اس اَمر کو قبول نہ کریں گے، جو تم ہمارے پاس لائے ہو، کیوں کہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تم کو یہ سب کچھ یمامہ کا ایک شخص تم کو سکھاتا ہے، جس کو رحمٰن کہتے ہیں اور ہم واللہ! ہرگز رحمٰن پر ایمان نہ لائیں گے۔ اے محمد! ہم نے ہر طرح سے تمھارے عذر کو ختم کر دیا اور واللہ! ہم تم کو ہرگز نہ چھوڑیں گے اور نہ تمھارے اس فعل کو یہاں تک کہ ہم تم کو ہلاک کریں یا تم ہم کو ہلاک کر دو۔ ان میں سے ایک نے کہا: ہم ملائکہ کو پوجتے ہیں، یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ ایک اور نے کہا کہ ہم تو آپ پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک تو اللہ اور فرشتوں کو ہمارے سامنے کھلم کھلا نہ لائے۔

جب انھوں نے یہ گفتگو کی تو نبی اکرم ﷺ اُٹھ کھڑے ہوئے اور آپ کے ساتھ ہی عبد اللہ بن ابی، اُمیہ بن مغیرہ بن عبد اللہ بن عمر بن مخزوم، جو آپ ﷺ کی پھوپھی عاتکہ بنت عبدالمطلب کا بیٹا تھا، بھی اُٹھ کھڑا ہوا اور کہا: اے محمد! تمھاری قوم نے تم کو پیشکش کی، تم نے ان کی عرض قبول نہ کی، پھر انھوں نے تم سے اپنے لیے چند اُمور کا سوال کیا، تاکہ وہ تمھارے رب کے نزدیک تمھاری قدر و منزلت پہچانیں، وہ بھی تم نے نہ کیا، پھر یہ چاہا کہ تم اُن کے لیے عذاب کی جلدی کرو، جس سے تم انھیں ڈراتے رہتے ہو، وہ بھی نہ کیا، فواللہ! میں کبھی تم پر ایمان نہیں لانے کا،

یہاں تک کہ تم آسمان تک ایک سیڑھی لگا کر اس پر چڑھ جاؤ اور ہم دیکھیں کہ تم آسمان پر گئے اور وہاں سے تم ایک صحیفہ منشور لے کر آؤ اور تمھارے ساتھ چار فرشتے ہوں، جو تمھارے لیے گواہی دیں کہ تم جو کہتے ہو وہی ٹھیک ہے۔ اللہ کی قسم! اگر تم ایسا کرو گے تب بھی مجھے یہ گمان ہے کہ میں تمھاری تصدیق نہ کروں گا، پھر وہ نبی اکرم ﷺ کا ساتھ چھوڑ کر چلا گیا اور نبی اکرم ﷺ رنجیدہ اور غمگین ہو کر گھر چلے گئے، اس لیے کہ قوم کی ہدایت کا جو طمع تھا وہ فوت ہو گیا اور اُن کا ایمان سے دور ہونا دیکھ لیا۔[1] (رواه ابن جرير وهكذا رواه زياد بن عبد الله البكائي بسنده عن ابن عباس مثله سواه)

مشرکوں کے مطالبات پورے نہ کرنے کا سبب:

یہ مجلس جس میں یہ سب لوگ فراہم ہوئے تھے، اگر اللہ تعالیٰ جانتا کہ وہ یہ سوال ہدایت حاصل کرنے کے لیے کر رہے ہیں تو اُن کی بات کو قبول کرتا، لیکن اللہ کو معلوم تھا کہ ان کے یہ مطالبات کفر اور عناد کے طور پر تھے، اس لیے نبی اکرم ﷺ سے کہا گیا کہ اگر تم چاہو تو ان کا سوال پورا کر دیں، لیکن اگر یہ کفر کریں گے تو میں ان کو ایسا عذاب کروں گا جو کسی کو سارے جہاں سے نہ کیا ہوگا اور اگر تم چاہو تو میں ان پر توبہ اور رحمت کا دروازہ کھول دوں۔ آپ ﷺ نے کہا: اے رب! تو اُن پر یہی توبہ اور رحمت کا دروازہ کھول دے۔ چناں چہ یہ مضمون سیدنا عبداللہ بن عباس اور زبیر بن عوام رضی اللہ عنہم سے مروی حدیث میں گزر چکا ہے، جب اس آیت کی تفسیر بیان ہوئی: ﴿ وَمَا مَنَعَنَآ اَنۡ نُّرۡسِلَ بِالۡاٰيٰتِ اِلَّاۤ اَنۡ كَذَّبَ بِهَا الۡاَوَّلُوۡنَ ﴾ [بني إسرائيل: ٥٩] ''اور ہمیں نشانیاں بھیجنے سے صرف اس چیز نے روکا ہے کہ پہلے لوگوں نے ان کو جھٹلایا تھا۔''

نیز فرمایا: ﴿ وَقَالُوۡا مَالِ هٰذَا الرَّسُوۡلِ يَاۡكُلُ الطَّعَامَ وَيَمۡشِىۡ فِى الۡاَسۡوَاقِ‌ؕ لَوۡلَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡهِ مَلَكٌ فَيَكُوۡنَ مَعَهٗ نَذِيۡرًا ۞ اَوۡ يُلۡقٰٓى اِلَيۡهِ كَنۡزٌ اَوۡ تَكُوۡنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاۡكُلُ مِنۡهَا‌ ؕ وَقَالَ الظّٰلِمُوۡنَ اِنۡ تَتَّبِعُوۡنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسۡحُوۡرًا ۞ اُنۡظُرۡ كَيۡفَ ضَرَبُوۡا لَكَ الۡاَمۡثَالَ فَضَلُّوۡا فَلَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ سَبِيۡلًا ۞ تَبٰرَكَ الَّذِىۡۤ اِنۡ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيۡرًا مِّنۡ ذٰ لِكَ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُۙ وَيَجۡعَلْ لَّكَ قُصُوۡرًا ۞ بَلۡ كَذَّبُوۡا بِالسَّاعَةِ‌ وَاَعۡتَدۡنَا لِمَنۡ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيۡرًا ﴾ [الفرقان: ٧۔ ١١] ''اور انھوں نے کہا: اس رسول کو کیا ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا ہے؟ اس کی طرف فرشتہ کیوں نہ اُتارا گیا جو اس کے ہمراہ (لوگوں کو) ڈرانے والا ہوتا؟ یا اس کی طرف کوئی خزانہ ڈالا جاتا، یا اس کا کوئی باغ ہوتا جس میں سے وہ (پھل) کھاتا اور ظالموں نے (مومنوں سے) کہا: تم تو بس ایک جادو زدہ شخص ہی کی اتباع کرتے ہو۔ دیکھیے! انھوں نے آپ کے لیے کیسی مثالیں بیان کی ہیں، وہ بہک گئے ہیں، لہٰذا وہ راہ نہیں پا سکتے۔ وہ ذات بڑی ہی بابرکت ہے جو اگر چاہے تو آپ کے لیے اس سے بہتر (چیزیں) بنا دے، (یعنی)

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٥٥٥۔ ٥٥٧)

ایسے باغ جن کے نیچے نہریں جاری ہوں اور آپ کے لیے محلات بنا دے۔ لیکن انھوں نے قیامت کو جھٹلایا اور ہم نے اس شخص کے لیے جو قیامت کو جھٹلائے، بھڑکتی آگ تیار کر رکھی ہے۔‘‘

’’ینبوع‘‘ کہتے ہیں چشمۂ جاری کو، انھوں نے یہ سوال کیا کہ اُن کے لیے سرزمینِ حجاز میں یہاں وہاں میٹھے پانی کے چشمے جاری ہو جائیں۔ یہ بات اللہ کے لیے آسان ہے، وہ چاہے تو ایسا ہی کر دے، بلکہ ان کے سارے سوالات قبول فرما لے، لیکن اللہ کو معلوم ہے کہ وہ ہرگز راہ پر نہ آئیں گے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴾ [یونس: ۹۶-۹۷] ’’بے شک جن لوگوں کے بارے میں آپ کے رب کا حکم (عذاب) صادر ہو چکا، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ خواہ ان کے پاس ساری نشانیاں آ جائیں، حتی کہ وہ دردناک عذاب (بھی) دیکھ لیں۔‘‘ نیز فرمایا: ﴿ وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴾ [الأنعام: ۱۱۱] ’’اور اگر بے شک ہم ان کی طرف فرشتے نازل کرتے اور ان سے مردے کلام کرتے، اور ہم (ان کی) ہر (مطلوبہ) شے ان کے سامنے پیش کر دیتے، تو بھی وہ ایمان نہ لاتے۔ ہاں اگر اللہ ایسا چاہتا (تو اور بات تھی) لیکن ان میں سے اکثر جہالت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔‘‘

پھر کفار نے یہ کہا کہ تم نے وعدہ کیا ہے کہ قیامت کے دن آسمان پھٹ جائے گا اور اس کے اطراف گر پڑیں گے، سو اسی دنیا میں اس کی جلدی کرو اور اپنے زعم کے مطابق آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے گرا دو، جیسے اللہ تعالیٰ نے ان کا قول نقل کیا ہے: ﴿ اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ ﴾ [الأنفال: ۳۲] ’’اور جب انھوں نے کہا: اے اللہ! اگر یہ (قرآن) تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا ہم پر دردناک عذاب لے آ۔‘‘

اسی طرح قومِ شعیب نے یہی سوال کیا تھا اور کہا تھا: ﴿ فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴾ [الشعراء: ۱۸۷] ’’لہٰذا اگر تو سچوں میں سے ہے تو ہم پر آسمان سے ایک ٹکڑا گرا دے۔‘‘ اللہ تعالیٰ نے ان پر سائبان کی صورت کا عذاب اُتارا، یہ ایک بڑا عذاب تھا۔ رہے نبی التوبہ اور نبی الرحمۃ جو رحمۃ للعالمین ہیں، سو انھوں نے اللہ سے اُن کے لیے مہلت و تاخیر مانگی کہ شاید اللہ اُن کی پشتوں سے ایسے لوگ پیدا کر دے جو صرف اللہ کی پرستش کریں اور کسی شے کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں، چناں چہ ایسا ہی ہوا کہ ان لوگوں میں سے بعض اچھے خاصے مسلمان ہو گئے، یہاں تک کہ عبد اللہ بن ابی اُمیہ جو نبی اکرم ﷺ کے ساتھ مجلس سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور جو کچھ اس نے کہا سو کہا اور اس کا کہا اوپر گزر چکا، مکمل طور پر اسلام لے آیا اور اللہ کی طرف رجوع کرنے والا ہو گیا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ''زخرف'' سے مراد سونا ہے، بلکہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت بھی یہی ہے: ''أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ ذَهَبٍ''۔ یا سیڑھی لگا کر تو آسمان پر چڑھ جا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ مراد ''كِتَابٍ مَقْرُوْء'' سے یہ ہے کہ ہر ایک شخص کے نام پر ایک صحیفہ لکھا ہوا لے آ جس میں یہ لکھا ہو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ کتاب فلاں بن فلاں کے لیے ہے اور یہ کتاب صبح کو ہر شخص کے سر کے پاس رکھی ہوئی ملے۔[1]

اللہ تعالیٰ نے کہا: اے پیغمبر! تم کہہ دو کہ اللہ تعالیٰ اس بات سے برتر و پاک ہے کہ کوئی شخص اللہ کے امورِ سلطان اور ملکوت میں سے کسی معاملے میں پیش قدمی کرے، بلکہ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، خواہ تمھارے سوال کو قبول کرے یا نہ کرے، میں تو فقط اس کا پیغمبر ہوں اور تمھاری طرف اپنے رب کے پیغام تم کو پہنچاتا ہوں اور تمھاری خیر خواہی کرتا ہوں، سو یہ کام میں نے کیا۔ رہا تمھارے سوال کا قبول کرنا، سو یہ اللہ کے بس میں ہے نہ کہ میرے بس میں۔

سیدنا ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ مجھ پر میرے رب نے یہ بات پیش کی کہ میرے لیے بطحائے مکہ کو سونا کر دے، میں نے کہا: نہیں اے رب! لیکن ایک دن پیٹ بھر کر رہوں گا اور ایک دن خالی پیٹ رہوں گا یا اس کے مانند۔ جب میں بھوکا ہوں گا تو تیری طرف زاری کروں گا اور تجھ کو یاد کروں گا اور جب سیر شکم ہوں گا تو تیری حمد کروں گا اور تیرا شکر ادا کروں گا۔[2] (رواه أحمد والترمذي في الزهد، وقال: هذا حديث حسن و علي بن يزيد يضعف في الحديث)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ مکہ کے سرداروں نے مبہوت (حیران) مجوج (مغلوب) اور متحیر ہو کر کہا کہ ہم تم پر ایمان نہ لائیں گے، یہاں تک کہ مکہ کی زمین سے چشمے جاری ہوں یا تمھارے لیے ایک باغ ہو، یعنی اگر ہمارے لیے زمین سے چشمے نہیں بہاتے تو اپنے لیے بہاؤ اور ایک باغ لگاؤ، جس میں کھجور اور انگور ہوں اور اس باغ میں نہریں بہتی ہوں۔ اگر یہ بھی نہیں ہو سکتا تو آسمان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کو گرا دو اپنے زعم کے مطابق، یا اللہ اور فرشتے کھلم کھلا آئیں۔ قبیل بہ معنی معائنہ ہے، یا بہ معنی کفیل، یا شہید۔ یہ بھی نہ ہو سکے تو ایک گھر سونے کا ہو۔

''زخرف'' کہتے ہیں زینت کو، مزخرف بہ معنی مزین ہے۔ یہ بھی نہ کر سکو تو سیڑھی لگا کر آسمان پر چڑھ جاؤ، لیکن ہم اس چڑھنے پر بھی تم پر ایمان نہ لائیں گے، جب تک کہ تم آسمان پر جا کر وہاں سے ایک کتاب نہ لاؤ، جس کو ہم پڑھیں، یعنی ہر شخص اس کو پڑھ سکے، یا ہم میں سے ہر ایک کو ایک کتاب ملے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ بَلْ يُرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَنْ يُؤْتَىٰ صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ﴾ [المدثر: ٥٢] ''بلکہ ان میں سے ہر آدمی چاہتا ہے کہ اسے کھلے

---

[1] تفسیر الطبري (١٧/ ٥٥٣_ ٥٥٤)

[2] مسند أحمد (٥/ ٢٥٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣٤٧) اس کی سند میں ''عبید اللہ بن زحر'' اور ''علی بن یزید'' ضعیف راوی ہیں۔ (ضعیف الترغیب والترهیب: ٢/ ١٧٥)

صحیفے دیے جائیں۔'' اللہ تعالیٰ نے کہا: اے پیغمبر ﷺ! تم ان فرمایشوں کے جواب میں یہ کہہ دو کہ میں تو ایک رسول بشر ہوں، جیسے سارے رسول تھے۔ اور اللہ کی طرف سے مامور ہو کر رسالت پہنچانے کے لیے آیا ہوں، تم نے کبھی سنا یا دیکھا ہے کہ کوئی بشر ایسے کام کر سکتا ہے۔ اور اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میں ان اشیا کو اللہ تعالیٰ سے طلب کروں اور یہ اشیا میرے ہاتھ پر ظاہر ہوں تو رسول جب کوئی ایک معجزہ لے آیا تو اسی قدر اس کی سچائی ظاہر کرنے کے لیے کافی و وافی ہے، کچھ زیادہ طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

میں ایک عبدِ مامور ہوں، مجھ کو یہ بات جائز نہیں کہ اپنے رب پر ایک غیر ضروری اَمر کے لیے تحکم کروں اور نہ ہی اس کی کوئی حاجت ہے اور اگر مجھ کو ہر عیب جو کی بات ماننا اسی طرح لازم ہوگا تو ہر معاند ہر وقت طرح طرح کی فرمایشیں کیا کرے گا اور اپنے لیے اللہ کی آیات کا طالب ہوا کرے گا۔ فتعالی اللہ عما یقول الظلمون علوا کبیرا۔ حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو ایسے معجزے اور آیات عطا کی تھیں، جو کہ ان فرمایشوں سے بے نیاز کرنے والی ہیں، جیسے قرآن اور انشقاقِ قمر (چاند کا دو ٹکڑے ہو جانا) اور انگلیوں کے بیچ میں سے پانی کا جاری ہونا اور اس طرح کی دوسری آیات۔ یہ نشانیاں اور معجزے کچھ اِن کی فرمایشوں اور مطالبوں سے کم تر نہیں ہیں، بلکہ اُن سے اعظم تر ہیں، لیکن اُن کا مقصد یہ نہ تھا کہ دلیل طلب کریں، وہ تو عیب کے متلاشی تھے۔[1]

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓی اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا
اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝۹۴ قُلْ لَّوْ كَانَ فِی الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ
یَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّیْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَیْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا
رَّسُوْلًا ۝۹۵

اور لوگوں کے پاس ہدایت آجانے کے بعد ان کو ایمان لانے سے صرف اس چیز نے روکا کہ انھوں نے کہا: کیا اللہ نے بشر رسول بھیجا ہے؟ (94) کہہ دیجیے: اگر زمین میں فرشتے ہوتے جو یہاں مطمئن ہو کر چلتے پھرتے تو ہم ان پر آسمان سے کوئی فرشتہ ہی رسول بنا کر نازل کرتے (95)

مشرکین کا بشر رسول ماننے سے انکار:

اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اکثر لوگ جو رسولوں کے تابع نہیں ہوتے، وجہ اس کی یہی ہے کہ ان کو بشر کا رسول ہو کر آنا تعجب معلوم ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے کہا: ﴿ اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَیْنَآ اِلٰی رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ﴾ [یونس: ۲] ''کیا لوگوں کے لیے یہ تعجب

[1] فتح البیان (۷/ ۴۵۲۔ ۴۵۵)

(کی بات) ہے کہ ہم نے ان میں سے ایک آدمی کی طرف وحی بھیجی کہ آپ لوگوں کو ڈرائیں اور ان لوگوں کو خوش خبری دیں جو ایمان لائے کہ بے شک ان کے لیے ان کے رب کے ہاں سچائی کا مرتبہ ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالُوْۤا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا ﴾ [التغابن: ٦] ''یہ اس لیے کہ بے شک ان کے رسول ان کے پاس کھلی نشانیاں لاتے تھے تو انھوں نے کہا: کیا بشر ہمیں راہ دکھائیں گے؟''

نیز فرعون کے گروہ نے کہا تھا: ﴿ فَقَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَ قَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ﴾ [المؤمنون: ٤٧] ''چناں چہ وہ کہنے لگے: کیا ہم اپنی ہی طرح کے دو انسانوں پر ایمان لائیں، جبکہ ان دونوں کی قوم ہماری غلام (ماتحت) ہے۔'' اسی طرح اور اُمتوں نے بھی اپنے رسولوں سے یہی بات کہی تھی: ﴿ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴾ [إبراهيم: ١٠] ''تم ہمارے جیسے بشر ہی تو ہو، تم چاہتے ہو کہ ہمیں ان (معبودوں) سے روک دو، جن کی ہمارے باپ دادا عبادت کرتے تھے، لہٰذا ہمارے پاس کھلی دلیل (معجزہ) لے آؤ۔'' اس بارے میں بہت آیات آئی ہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر اپنے لطف اور رحمت سے آگاہ کیا کہ ہم نے رسول جنسِ بشر ہی سے بھیجے، تاکہ لوگ اُن کی بات سمجھیں اور مطلب پوچھیں، کیوں کہ بشر بشر سے بہ خوبی بات چیت کر سکتا ہے، اگر کوئی فرشتہ بشر کی طرف رسول بنا کر بھیجا جاتا تو وہ اس کا سامنا نہ کر سکتے اور نہ اس سے کچھ اَخذ کرتے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ ﴾ [آل عمران: ١٦٤] ''بے شک اللہ نے مومنوں پر احسان کیا، جب ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا۔'' نیز فرمایا: ﴿ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ﴾ [التوبة: ١٢٨] ''(لوگو!) یقیناً تمھارے پاس تمھی میں سے ایک رسول آ گیا ہے۔''

نیز فرمایا: ﴿ كَمَاۤ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَ يُزَكِّيْكُمْ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ۝۱۵۱ فَاذْكُرُوْنِيْۤ اَذْكُرْكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِيْ وَ لَا تَكْفُرُوْنِ ﴾ [البقرة: ١٥١۔ ١٥٢] ''جیسے ہم نے تمھارے لیے تمھی میں سے ایک رسول بھیجا، وہ تم پر ہماری آیتیں تلاوت کرتا ہے اور تمھیں پاک کرتا ہے اور تمھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمھیں وہ (باتیں) سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔ چناں چہ تم مجھے یاد کرو، میں تمھیں یاد کروں گا اور تم میرا شکر کرو اور میری ناشکری نہ کرو۔'' لہٰذا اس جگہ یہ فرمایا کہ اگر روئے زمین پر فرشتے چلتے پھرتے ہوتے اور چین سے بستے، جس طرح کہ تم رہتے بستے ہو تو ہم آسمان سے فرشتے ہی بھیجتے، اُن ہی کی جنس میں سے، لیکن چوں کہ تم لوگ بشر ہو، اس لیے ہم نے اپنے لطف و کرم اور رحمت کی وجہ سے تم میں رسول بشر بھیجا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ''ناس'' سے مراد سب لوگ ہیں، یا خاص طور پر اہلِ مکہ ہیں کہ اُن کو ہدایت۔ یعنی وحی پر

ایمان لانے سے یہی بات مانع ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول بشر کیوں بھیجا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب یہ دیا کہ اگر زمین میں ملائکہ ہوتے تو رسول بھی فرشتہ آتا، لیکن تم آدمی ہو، اس لیے رسول بھی تمھاری جنس کا آیا۔[1]

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ۝96

کہہ دیجیے: میرے اور تمھارے درمیان اللہ (بطور) گواہ کافی ہے۔ بے شک وہ اپنے بندوں سے خوب باخبر اور (انھیں) خوب دیکھنے والا ہے (96)

اللہ ہی گواہ کافی ہے:

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو حجت سکھائی کہ تم اپنی قوم سے اپنی رسالت کی سچائی کے بارے میں خود یہ کہہ دو کہ مجھ پر اور تم پر اس بات کا اللہ شاہد ہے اور وہ جانتا ہے کہ جو کچھ میں تمھارے پاس لایا ہوں، وہ سچ ہے۔ اگر اللہ پر جھوٹ بولوں گا تو وہ مجھ سے سخت انتقام لے گا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۝44 لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۝45 ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ﴾ [الحاقة: ٤٤۔ ٤٦] ''اور اگر یہ ہم پر کوئی بات گھڑ کر لگاتا۔ تو یقیناً ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے۔ پھر البتہ ہم اس کی شہ رگ کاٹ ڈالتے۔'' خبیر سے مراد علیم ہے، یعنی وہ جانتا ہے کہ بندوں میں کون سا شخص انعام اور احسان اور ہدایت کا مستحق ہے اور کون سا شخص بدبختی، گمراہی اور کج روی کا مستحق ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ کو صدقِ رسالت پر گواہ کیا۔ بعض نے کہا کہ نبی کے دعوے کے مطابق معجزے کا اظہار اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی سچائی پر شہادت ہے اور یہ شہادت اسی وجہ سے ہے کہ اللہ کا علم تمام حالاتِ ظاہرہ اور باطنہ کو گھیرے ہوئے ہے، وہ ہر گذشتہ چیز اور آیندہ وقوع پذیر ہونے والی چیز کو دیکھنے والا ہے۔ اس میں جھٹلانے والوں کے لیے ڈانٹ ڈپٹ ہے اور نبی اکرم ﷺ کو تسلی ہے،[2] لہٰذا فرمایا ہے:

وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِهٖ ۭ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰي وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ۭ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ۝97

اور جسے اللہ ہدایت دے تو وہی ہدایت یافتہ ہے اور جسے وہ گمراہ کرے تو آپ ان کے لیے اس (اللہ) کے

[1] فتح البیان (٧/ ٤٥٥)
[2] فتح البیان (٧/ ٤٥٦)

سوا کوئی دوست ہرگز نہ پائیں گے۔ اور ہم انھیں یومِ قیامت چہرے کے بل، اندھے، گونگے اور بہرے اٹھائیں گے، ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ جب بھی وہ بجھنے لگے گی تو ہم ان کے لیے اور بھڑکا دیں گے (97)

ہدایت وگمراہی اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے:

اللہ تعالیٰ نے خلق کے اندر اور بندوں میں اپنے تصرف اور نفوذِ حکم کی خبر دی ہے کہ ہمارے حکم کو کوئی ٹالنے والا نہیں، جس کو ہم گمراہ کریں، اس کو ہمارے سوا کون ایسا ہے جو راہِ راست پر لائے؟ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ﴾ [الكهف: ١٧] ''جسے اللہ ہدایت دے تو وہی ہدایت یافتہ ہے اور جسے وہ گمراہ کر دے تو آپ اس کے لیے ہرگز کوئی راہنما دوست نہیں پائیں گے۔'' سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ عرض کی گئی: اے اللہ کے رسول! لوگ اوندھے منہ کس طرح اکٹھے ہوں گے؟ فرمایا: جس نے ان کو پاؤں پر چلایا ہے، وہ قادر ہے کہ منہ کے بل چلائے۔[1] (رواه أحمد وأخرجاه في الصحيحين)

سیدنا حذیفہ بن اسید کہتے ہیں کہ سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر کہا: اے بنی غفار! بات کہو، قسم نہ کھاؤ، کیوں کہ صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے بیان کیا ہے کہ لوگ تین قسم کے ہو کر اکٹھے ہوں گے: ایک قسم سوار ہوگی جو کھا پی رہی ہوگی اور ایک قسم پا پیادہ دوڑتی ہوگی اور ایک قسم کو فرشتے اُن کے منہ پر گھسیٹیں گے اور آگ کی طرف لے جائیں گے۔ ایک کہنے والے نے کہا: اِن دونوں کو تو ہم نے پہچانا، لیکن اُن کا کیا حال ہے جو پیادہ چلیں گے؟ فرمایا: اللہ سواریوں پر آفت ڈال دے گا، یہاں تک کہ کوئی پشت، یعنی سواری باقی نہ رہے گی، تا آنکہ ایک مرد کا ایک عمدہ باغ ہوگا، وہ اس کو ایک مادہ اونٹ، جس پر کجاوہ کسا ہوا ہوگا، کے عوض دے گا، تب بھی اس پر قادر نہ ہوگا اور اندھا بہرا گونگا ہونا تو اُن کی حالت کے ساتھ ہوگا، یہ اُن کی جزا ہوگی، جس طرح وہ دنیا میں حق سے گونگے اندھے اور بہرے تھے، اسی طرح کی جزا اُن کو محشر میں ملے گی، جس وقت کہ وہ سخت محتاج ہوں گے۔[2] ''ماویٰ'' سے مراد پھرنا اور جانا ہے جہنم میں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ''خبت'' بہ معنی ''سکنت'' ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ بہ معنی ''طفئت'' ہے۔[3] سعیر سے مراد لہب و وہج ہے، یعنی بھڑکنا اور چنگاری کا اُڑنا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا ﴾ [النبأ: ٣٠] ''لہٰذا اب تم (اپنے کیے کا مزہ) چکھو، ہم تمھارا عذاب بڑھاتے ہی رہیں گے۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو ہدایت کرنا چاہتا ہے، وہی راہِ حق پاتا ہے، یا ہر مطلوب کو پہنچ جاتا ہے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٨٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٠٦) مسند أحمد (٣/ ٢٢٩)

[2] سنن النسائي، رقم الحديث (٢٠٨٦) مسند أحمد (٥/ ١٦٤)

[3] تفسير الطبري (١٧/ ٥٦١) الدر المنثور (٥/ ٣٤٢)

اور جس کو گمراہ کرتا ہے، اس کے لیے کوئی مددگار نہیں ملتا۔ اور قیامت کے دن یہ گمراہ لوگ اندھے، بہرے اور گونگے اُٹھیں گے، اُن کی پھرنے کی جگہ جہنم ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہ دوزخ کے ایندھن ہوں گے،[1] جب اس آگ کی آنچ تھمے گی، یعنی گوشت پوست کھا کر تو اللہ تعالیٰ اس کی بھڑک اور زیادہ کر دے گا۔ یہ اس لیے کہ انھوں نے مر جانے کے بعد دوبارہ لوٹائے جانے کو جھٹلایا تھا، اللہ تعالیٰ نے اُن کی جزا یہی رکھی کہ ہمیشہ اعادہ اور افنا (لوٹائے جانے کے بعد فنا کیا جانا) ہوا کرے۔

حشر سے مراد یہ ہے کہ ان کو جہنم کی طرف جلدی سے ہانکیں گے، دوسرے یہ کہ سچ مچ منہ کے بل گھسیٹے جائیں گے، جس طرح دنیا میں جب کسی کو زیادہ ذلیل کرنا اور تکلیف دینا ہو تو اس کو منہ کے بل گھسیٹتے ہیں اور یہی صحیح ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ﴾ [القمر: ٤٨] ''جس دن وہ آگ میں اپنے چہروں کے بل گھسیٹے جائیں گے۔'' اور احادیثِ مذکورہ کی رو سے ''اَبْکَم'' وہ ہے جو گونگا ہو، بات نہ کر سکے، ''أَصَمّ'' وہ ہے جو بہرا ہو کچھ سن نہ سکے، ''أَعْمیٰ'' وہ ہے جو اندھا ہو کچھ نہ دیکھ سکے۔ غرض یہ کہ کفار و مشرکین اور مکذبینِ انبیا و آخرت اس خاص شکل میں، جو کہ سب سے زیادہ قبیح صورت اور شنیع منظر ہے، مبعوث ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ''سَحب'' کے ساتھ اُن کے لیے یہ تین اوصاف بھی جمع کر دیے ہیں۔ نسأل اللّٰه العافية.

اور یہ کچھ اُن کی رویت و کلام و سمع کے مخالف نہیں ہے، جس کا ذکر اور آیتوں میں آیا ہے، جیسے ﴿ وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ ﴾ [الكهف: ٥٣] ''اور مجرم آگ کو دیکھیں گے۔'' نیز اللہ کا فرمان ہے: ﴿ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ﴾ [الفرقان: ١٣] ''تو وہ وہاں ہلاکت کو پکاریں گے۔'' کیوں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایسی شے نہ دیکھیں گے، جس سے ان کو سرور حاصل ہو اور حجت کے ساتھ بول نہ سکیں گے اور نہ ایسی بات سنیں گے جس سے کان کو کچھ لذت ہو۔ بعض نے کہا کہ یہ اس وقت ہوگا جب اُن سے یہ بات کہی جائے گی: ﴿ اِخْسَئُوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ﴾ [المؤمنون: ١٠٨] ''اسی (جہنم) میں ذلیل و خوار (پڑے رہو) اور مجھ سے کلام نہ کرو۔'' بعض نے کہا کہ حشر کے وقت اسی طرح پر ہوں گے، پھر اللہ تعالیٰ حشر کے بعد اُن چیزوں کو لوٹا دے گا۔[2]

ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ قَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا
عِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿٩٨﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا
اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٥٦٠) [2] فتح البيان (١٧/ ٤٥٧۔ ٤٥٨)

مِثْلَهُمْ وَ جَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَیْبَ فِیْهِ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۹۹﴾

یہ ان کی سزا ہے، کیوں کہ انھوں نے ہماری آیات کا انکار کیا اور کہا: کیا جب ہم ہڈیاں اور چورا ہو جائیں گے تو کیا یقیناً ہم دوبارہ از سر نو پیدا کر کے اُٹھائے جانے والے ہیں؟ ﴿98﴾ کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ بے شک جس اللہ نے آسمان اور زمین تخلیق کیے، وہ اس پر قادر ہے کہ ان جیسے پھر تخلیق کر دے، اور اس (اللہ) نے ان کے لیے ایک وقت مقرر کیا ہے جس میں کوئی شک نہیں، پھر ان ظالموں نے انکار کیا، مگر کفر کرنے سے (انکار نہ کیا) ﴿99﴾

بوسیدہ ہڈیاں پھر صحیح وسالم اور توانا ہو جائیں گی:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ جزا ہم نے اُن کو دی ہے کہ وہ اندھے، بہرے اور گونگے اُٹھیں گے، یہی جزا اُن کے لائقِ حال ہے، کیوں کہ انھوں نے ہماری نشانیاں، یعنی دلیلیں اور حجتیں نہ مانی تھیں، بلکہ اُن کو جھٹلایا تھا اور اس بات کو مُستبعد (ناممکن) جانا کہ وہ دوبارہ زندہ ہوں گے، اس کے بعد کہ مر جانے کے بعد اُن کی ہڈیاں تک بوسیدہ اور پراگندہ ہو جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ نے اُن پر حجت قائم کی اور اپنی قدرت پر اُن کو آگاہ کیا کہ دیکھو جس نے آسمان و زمین بنائے ہیں اور اُن کا پیدا کرنا، انسان کے پیدا کرنے سے اعظم تر ہے، وہ دوبارہ لوٹانے پر بھی قادر ہے، بلکہ تمھارا یہ دوبارہ زندہ کرنا اس پر زیادہ آسان ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ ﴾ [المؤمن: ٥٧] ''آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنا لوگوں کو پیدا کرنے سے کہیں زیادہ بڑا (کام) ہے۔''

نیز فرمایا: ﴿ اَوَ لَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ لَمْ یَعْیَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰۤى اَنْ یُّحْیِ الْمَوْتٰى بَلٰۤى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴾ [الأحقاف: ٣٣] ''کیا انھوں نے دیکھا (جانا) نہیں کہ بے شک اللہ، جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور وہ ان کے پیدا کرنے سے اُکتایا نہیں، اس پر قادر ہے کہ مُردوں کو زندہ کرے۔ کیوں نہیں! بلاشبہ وہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ اَوَ لَیْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤى اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَلٰى وَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ ﴿۸۱﴾ اِنَّمَاۤ اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ﴿۸۲﴾ فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَیْءٍ وَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ [یٰسٓ: ٨١۔ ٨٣] ''کیا وہ (اللہ) جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس بات پر قادر نہیں کہ وہ ان جیسے (انسان) پیدا کر دے؟ کیوں نہیں! وہی تو (سب کچھ) پیدا کرنے والا، خوب جاننے والا ہے۔ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو بس اس کا حکم صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اس سے کہتا ہے: ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔ چناں چہ پاک ہے وہ (اللہ) جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہی ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔''

اور یہاں یوں کہا: ﴿ قَادِرٌ عَلٰۤی اَنۡ یَّخۡلُقَ مِثۡلَهُمۡ ﴾ (آیتِ باب) یعنی قیامت کے دن ان کے بدنوں کا اعادہ کرے گا اور ایک دوسری پیدائش ہوگی اور جس طرح پہلی بار پیدا کیا تھا، پھر دوبارہ اسی طرح اُٹھا کھڑا کرے گا۔ اس اعادے اور قبروں میں سے اُٹھ کر کھڑے ہونے کے لیے ایک مدت اور وقت معین کر دیا کہ وہ ضرور ہوگا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا نُؤَخِّرُهٗۤ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعۡدُوۡدٍ ﴾ [ھود: ۱۰۴] ''اور صرف ہم ایک مقرر وقت تک ہی اس میں تاخیر کر رہے ہیں۔'' لیکن ظالموں کا حال یہ ہے کہ اگرچہ حجت قائم ہو جائے، وہ سوائے کفران کے اور کچھ نہیں مانتے، اُن کی انتہائی کوششیں خیالِ باطل اور گمراہی میں چلی جاتی ہیں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جو آسمان و زمین کو پیدا کرنے پر قادر ہے، باوجود اس کے کہ یہ کام بہت بڑا اور سخت ہے، وہ اس سے کم چیز کے اعادے پر زیادہ قدرت رکھتا ہے، کیوں کہ وہ چیز چھوٹے ہونے میں اور کمزور ہونے میں اس سے بڑھ کر ہے۔ بعض نے کہا کہ مراد یہ ہے کہ چاہے ان کو فنا کر دے اور دوسرے لوگ ایجاد کر دے۔ امام کرخی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ان کی مثل سے مراد خود یہی ہے۔ ان کے پیدا کرنے کو مثل کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، جس طرح کہ متکلمین نے کہا کہ اعادہ کرنا، پہلی دفعہ کے پیدا کرنے کے مثل ہے، کیوں کہ کسی شے کا مثل اس شے کے حال کا مساوی ہوتا ہے تو اس شے کے نفس سے تعبیر کرنا جائز ہوا۔ ''يقال مثلك لا يفعل كذا''، یعنی تجھ سا آدمی کب ایسا کام کرتا ہے۔ یا معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ ایسے بندے پیدا کرے جو اس کی توحید کریں اور اس کی کمال حکمت اور ضرورت کے اقرار کرنے والے ہوں اور ان شبہاتِ فاسدہ کو ترک کر دیں۔

اس صورت میں آیتِ باب اس قول کی مثل ہے: ﴿ وَیَاۡتِ بِخَلۡقٍ جَدِیۡدٍ ﴾ [إبراهيم: ۱۹] ''اور نئی مخلوق لے آئے۔'' نیز فرمایا: ﴿ یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَكُمۡ ﴾ [محمد: ۳۸] ''تو اللہ تمھارے سوا دوسرے لوگ بدل لائے گا۔'' اور پہلے قول پر خلق دوبارہ پیدا کرنے کے معنی میں ہے اور اس قول پر اپنی حقیقت پر ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا کہ پہلی بات زیادہ مشابہ ہے۔ ''أجل'' سے مراد وہ اصل وقت عذاب کا ہے جس میں کسی طرح کا شک و شبہ نہیں ہے۔ اس سے مراد موت یا قیامت ہے، مگر مشرک باوجود دلیل واضح ہونے کے ناشکری کیے بغیر نہیں رہتے۔[1]

﴿ قُلۡ لَّوۡ اَنۡتُمۡ تَمۡلِكُوۡنَ خَزَآئِنَ رَحۡمَةِ رَبِّیۡۤ اِذًا لَّاَمۡسَكۡتُمۡ خَشۡیَةَ الۡاِنۡفَاقِ ؕ وَكَانَ الۡاِنۡسَانُ قَتُوۡرًا ﴾ ۱۰۰

کہہ دیجیے: اگر تم میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے مالک ہوتے تو اس وقت تم انھیں خرچ ہو جانے

[1] فتح البیان (۷/ ۴۵۹۔ ۴۶۰)

کے ڈر سے ضرور روک لیتے۔ اور انسان نہایت ہی بخیل ہے ﴿۱۰۰﴾

انسانی فطرت کا نفسیاتی تجزیہ کہ وہ بخیل ہے:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ انفاق کے خوف سے مراد فقر ہے،[1] یعنی اس ڈر سے خرچ نہ کرتے کہ مبادا یہ خزانے خالی ہو جائیں، حالاں کہ وہ کبھی ہرگز ختم ہو چکنے والے نہیں ہیں، لیکن تمھاری طبیعت اور خصلت اسی طرح پر ٹھہری ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ''قتور'' سے مراد بخیل اور کنجوس ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[2] اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا ﴾ [النساء: ۵۳] ''کیا (وہ سمجھتے ہیں کہ) انھیں بادشاہی کا کچھ حصہ ملا ہے؟ پھر تو وہ اس میں سے لوگوں کو تل برابر بھی نہیں دیں گے۔''

یہ وصف انسان کا اللہ تعالیٰ نے اس کی حیثیت کے مطابق رکھا ہے، مگر جس کو وہ توفیق دے اور اس صفتِ ذمیمہ سے محفوظ رکھے، بخل سے کام لینا، جزع وفزع اور گھبراہٹ کا اظہار کرنا بشر کی صفت ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ﴿۱۹﴾ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ﴿۲۰﴾ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ﴿۲۱﴾ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ﴾ [المعارج: ۱۹۔ ۲۲] ''بے شک انسان کو بے صبر (تھڑ دلا) پیدا کیا گیا۔ جب اسے شر پہنچے تو گھبرا جاتا ہے۔ اور جب اسے خیر ملے تو نہایت روکنے والا (کنجوس) بن جاتا ہے۔ مگر وہ نمازی۔'' اس آیت کی نظیریں قرآن مجید میں بہت ہیں، یہ اللہ کے کرم وسخاوت واحسانِ عام اور لطفِ تام پر دلیل ہے۔

صحیحین میں مروی ہے: «يَدُ اللّٰهِ مَلْآى لَمَا يَغِيضُهَا نَفَقَةٌ، سَحَّاءُ اللَّيْلِ وَ النَّهَارِ، أَرَأَيْتُمْ مَا أَنْفَقَ مُنْذُ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فَإِنَّهُ لَمْ يَغِضْ مَا فِيْ يَمِيْنِهِ » یعنی اللہ پاک کا ہاتھ لبریز ہے، نفقہ اس کو کم نہیں کرتا۔ رات دن وہ خرچ کر رہا ہے تم دیکھتے ہو، جب سے آسمان وزمین بنائے، اب تک کتنا خرچ کیا ہوگا، لیکن اس کا ہاتھ خالی نہیں ہوا۔[3] وللہ الحمد.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ خزائنِ رحمت سے مراد رزق ہے اور امساک سے مراد بخل اور دارِ دنیا میں مال کو خرچ ہو جانے کے ڈر سے روک لینا ہے، مراد محتاجی ہے۔ قتر سے مراد بخل ہے۔ بعض نے کہا: قتور تھوڑے مال والے کو کہتے ہیں۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ انسان کی صفت میں مبالغہ ہے بخل کے ساتھ۔ بعض نے کہا کہ اس آیت کا نزول خاص طور پر

[1] تفسیر الطبري (۱۸/ ۵۶۳) [2] تفسیر الطبري (۱۷/ ۵۶۳)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۶۹۷۶) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۹۹۳)

مشرکین کے حق میں ہوا ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں اور بعض نے کہا کہ یہ آیت عام ہے، جمہور کا قول یہی ہے۔ وحکاه الماوردي.[1]

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ﴿۱۰۱﴾ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآىِٕرَ ۚ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ﴿۱۰۲﴾ فَاَرَادَ اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِيْعًا ﴿۱۰۳﴾ وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا ﴿۱۰۴﴾

اور ہم نے موسیٰ کو نو کھلی نشانیاں دیں، چناں چہ آپ بنی اسرائیل سے پوچھیں، جب وہ ان کے پاس آیا تو فرعون نے اس سے کہا: اے موسیٰ! بے شک میں تجھے سحر زدہ سمجھتا ہوں ﴿101﴾ اس (موسیٰ) نے کہا: تو یقیناً جان چکا ہے کہ یہ چیزیں آسمانوں اور زمین کے رب ہی نے واضح دلائل بنا کر (غور کرنے کے لیے) نازل کی ہیں اور اے فرعون! میں تو تجھے ہلاک کیا ہوا سمجھتا ہوں ﴿102﴾ پھر اس (فرعون) نے ارادہ کیا کہ انھیں اس زمین سے اُکھاڑ دے تو ہم نے اسے اور اس کے سب ساتھیوں کو غرق کر دیا ﴿103﴾ اور اس کے بعد ہم نے بنی اسرائیل سے کہا کہ اس زمین میں رہو، پھر جب آخرت کا وعدہ آئے گا تو ہم تم کو سمیٹ لائیں گے ﴿104﴾

موسیٰ علیہ السلام کے نو معجزے:

شاید یہ نو نشانیاں نو معجزے ہوں، وہ جو فرعون کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے بھیجے اور شاید وہ نو حکم ہوں جو تورات میں لکھے ہوئے ہوں، وہ یہی کہ کبیرہ گناہوں سے ممانعت تھی۔

اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو نو نشانیاں دے کر بھیجا تھا، نو نشانیاں اُن کی نبوت کی صحت اور اخبار رسالت کی صداقت پر قطعی دلیلیں تھیں، جو فرعون کی طرف بھیجی تھیں، وہ نو آیات یہ تھیں: ① عصا ② ید بیضا ③ قحط سالی ④ دریا کا پھٹنا ⑤ طوفان ⑥ ٹڈیوں کا عذاب ⑦ جوؤں کا عذاب ⑧ مینڈکوں کا عذاب اور ⑨ خون کا عذاب۔ کھلی کھلی نشانیاں ہیں۔ (قاله ابن عباس) محمد بن کعب رحمہ اللہ نے کہا کہ ان نو نشانیوں سے مراد ید بیضا، عصا، پانچ وہ جو سورۃ الاعراف میں مذکور ہیں: طوفان، ٹڈی دل، جوئیں، مینڈک، خون، موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے فرعون اور اس کے

---

[1] تفسير الماوردي (٣/ ٢٧٦) فتح البيان (٧/ ٤٦١۔ ٤٦٢)

سرداروں کے مال کو برباد کرنا اور پتھر سے پانی کے چشموں کا جاری ہونا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، عکرمہ، شعبی اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ان سے مراد ید بیضاء، عصا، خشک سالی، پھلوں کا نقصان، طوفان، ٹڈی، جوئیں، مینڈک اور خون ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ قول ظاہر، واضح اور قوی ہے۔ اور امام حسن بصری رحمہ اللہ نے خشک سالی اور پھلوں کے نقصان کو ایک ہی ٹھہرایا ہے اور نویں چیز عصا کا جادوگروں کے جادو کو چٹ کر جانا ہے۔[1] لیکن وہ ان آیات کے باوجود کفر اور انکار ہی کرتے رہے اور اُن کے لوگوں کو اپنے ظلم اور تکبر کی وجہ سے یہی یقین رہا کہ موسیٰ علیہ السلام سچے نہیں ہیں اور ان آیات کا اُن پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اسی طرح اگر ہم ان لوگوں کے سوالات کو قبول کر لیں، جو مکہ میں نہریں جاری کرنے اور دوسرے مطالبے کرتے ہیں، تب بھی رسالت کو قبول کر کے ایمان لانے والے نہیں ہیں، مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ جس طرح فرعون نے باوجود آیات کے مشاہدہ کے کہا تھا: ﴿ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰمُوْسٰی مَسْحُوْرًا ﴾ (آیتِ باب) واللہ أعلم.

بالجملہ یہ نو آیات جن کا ذکر ان ائمہ نے اس جگہ کیا ہے، یہی اس جگہ مراد ہیں اور یہی جو اس آیت میں ہے:

﴿ وَاَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ یُعَقِّبْ ۚ یٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ۫ اِنِّیْ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ ۝ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ وَاَدْخِلْ یَدَكَ فِیْ جَیْبِكَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ ۫ فِیْ تِسْعِ اٰیٰتٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ ۚ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ﴾ [النمل: ۱۰۔ ۱۲] ''اور اپنا عصا ڈال دے، چناں چہ جب (موسیٰ نے عصا ڈالا اور) اسے دیکھا کہ وہ حرکت کر رہا ہے، گویا کہ وہ سانپ ہے تو پیٹھ پھیر کر پلٹا اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھا، (اللہ نے فرمایا:) اے موسیٰ! مت ڈر، بلاشبہ میرے حضور میں رسول ڈرا نہیں کرتے۔ مگر جس نے ظلم کیا، پھر اس نے برائی کے بعد (برے اعمال کو) بدل کر نیکی کی، تو بلاشبہ میں بڑا بخشن ہار، نہایت مہربان ہوں۔ اور اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں داخل کر، وہ سفید (چمکتا ہوا) بے عیب نکلے گا، یہ ان نو نشانیوں (معجزات) میں سے ہے (جن کے ساتھ تمھیں) فرعون اور اس کی قوم کی طرف (بھیجا گیا ہے۔) بے شک وہ نافرمان لوگ ہیں۔'' مراد ہیں۔ اس جگہ صرف دو آیات کا ذکر کیا عصا اور ید بیضا۔

رہیں باقی آیتیں سو ان کا بیان اور تفصیل سورت اعراف میں آئی ہے اور موسیٰ علیہ السلام کو اُن کے سوا بھی بہت سی نشانیاں دی تھیں۔ جیسے پتھر پر لاٹھی کو مارنا اور اس پتھر میں سے بارہ چشموں کا پھوٹ پڑنا اور بنی اسرائیل پر اَبر کا سایہ کرنا اور من وسلویٰ کا نازل کرنا اور اس کے علاوہ اور نشانیاں جو بلادِ مصر سے علاحدہ ہونے کے بعد اُن کو عطا ہوئی تھیں، لیکن اس جگہ انہی نو نشانیوں کا ذکر کیا، جن کا مشاہدہ فرعون لعین نے کیا تھا اور قومِ فرعون نے اہلِ مصر میں سے دیکھا تھا، اس لیے یہی آیات ان پر حجت تھیں۔ اہلِ فرعون نے مخالفت کی اور کفر اور انکار کی وجہ سے مذکورہ آیات کے ساتھ عناد کیا۔ صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ایک یہودی نے اپنے ایک یار سے کہا کہ ہمارے ساتھ اس نبی کے

---

[1] تفسیر الطبري (١٧/ ٥٦٤۔ ٥٦٦) تفسیر ابن کثیر (٣/ ٩٢)

پاس چلو، ہم اس سے اس آیت کا سوال کریں: ﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ﴾ کہا تو اُن کو نبی نہ کہہ، اگر وہ یہ بات سنے گا تو اس کی چار آنکھیں ہو جائیں گی۔ پھر اُن دونوں نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: « لَا تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ شَيْئًا وَّلَا تَسْرِقُوْا وَلَا تَزْنُوْا وَلَا تَقْتُلُوْا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا تَسْحَرُوْا وَلَا تَأْكُلُوْا الرِّبَا وَلَا تَمْشُوْا بِبَرِيْءٍ إِلَى ذِيْ سُلْطَانٍ لِيَقْتُلَهُ وَلَا تَقْذِفُوْا مُحْصَنَةً أَوْ قَالَ لَا تَفِرُّوْا مِنَ الزَّحْفِ ـ شُعْبَةُ الشَّاكُّ ـ وَأَنْتُمْ يَهُوْدُ عَلَيْكُمْ خَاصَّةً أَنْ لَّا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ » [اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، چوری نہ کرو، زنا نہ کرو، کسی جان کو ناحق قتل نہ کرو، جادو نہ کرو، سود نہ کھاؤ، بے گناہ لوگوں کو پکڑ کر بادشاہ کے دربار میں نہ لے جاؤ کہ اسے قتل کرا دو اور پاک دامن عورتوں پر بہتان نہ باندھو یا فرمایا: جہاد سے نہ بھاگو، شعبہ کو اس بارے میں شک ہے، اور اے یہودیو! تم پر خاص کر یہ حکم بھی تھا کہ ہفتے کے دن زیادتی نہ کرو] ان دونوں نے نبی اکرم ﷺ کے ہاتھ پاؤں چومے اور کہا کہ ہم اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ تم نبی ہو۔ فرمایا: پھر تم کو کون اس سے مانع ہے کہ تم میری تابعداری کرو؟ کہا: داود علیہ السلام نے دعا کی تھی کہ نبی ہمیشہ انھی کی ذریت سے ہوا کرے اور ہم کو ڈر ہے کہ اگر ہم اسلام لے آئیں گے تو یہود ہم کو قتل کر ڈالیں گے۔[1] (رواه أحمد والترمذي والنسائي و ابن ماجه و ابن جرير و قال الترمذي حسن صحيح) یہ حدیث مشکل ہے اور عبداللہ بن سلمہ کے حفظ میں کچھ خلل ہے۔ اہلِ علم نے اس میں کلام کیا ہے، شاید انھیں نو کلمات کا دس آیات کے ساتھ شبہہ ہو گیا ہو۔ کہا، کیوں کہ یہ کلمات تورات کے احکام ہیں، ان کا فرعون پر حجت قائم کرنے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ والله أعلم.

لہٰذا موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان آیات کو بصائر، یعنی مجھ پر سچی حجتیں اور دلائل کے طور پر اُتارا ہے اور میں تجھ کو تباہ ہونے والا گمان کرتا ہوں۔ (قاله مجاهد و قتادة) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: "مَثْبُوراً" بہ معنی ملعون ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا کہ بہ معنی مغلوب ہے یا ہلاک ہونے والا۔[2] (قاله مجاهد) بالجملہ یہ سب اس پر دلیل ہیں کہ نو آیات یہی ہیں جن کا ذکر کیا گیا، اُن میں فرعون اور اس کی قوم پر حجتیں اور براہین تھیں اور موسیٰ علیہ السلام کے صدق پر دلائل تھے اور اللہ تعالیٰ فاعل اور مختار کے وجود پر بھی دلائل تھے، جس نے موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا تھا اور جو کلمات حدیث میں مذکور ہوئے، وہ مراد نہیں ہیں، کیوں کہ وہ تو وصیتیں تھیں، اُن میں فرعون پر اور اُس کی قوم پر کوئی حجت نہیں تھی اور نہ ہی اس کی قوم پر اور اُن کے اور اقامتِ برہان کے درمیان کوئی مناسبت ہے۔ یہ وہم عبداللہ بن سلمہ کی طرف سے آیا ہے، ان کی بعض روایات منکر ہیں۔ (والله أعلم) اور شاید اُن دو یہودیوں نے دس کلمات کے بارے میں سوال کیا ہو اور راوی کو نو آیات کا شبہہ ہوا ہو اور یہاں سے یہ وہم ہو گیا ہو۔ والله أعلم.

---

[1] مسند أحمد (٤/ ٢٣٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧٣٣) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٠٧٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٧٠٥)

[2] تفسير الطبري (١٧/ ٥٧٠ ـ ٥٧١)

فرعون نے چاہا تھا کہ بنی اسرائیل کو مصر کی سرزمین سے جلا وطن کر دے اور وہاں سے نکال دے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے ساتھیوں سمیت ڈبو دیا اور پھر بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ تم اس زمین میں رہو۔ اس میں نبی اکرم ﷺ کو فتح مکہ کی بشارت ہے۔ حالاں کہ یہ سورت مکی ہے اور ہجرت سے پہلے نازل ہوئی تھی، چناں چہ ایسا ہی ہوا کہ اہلِ مکہ نے ارادہ کیا کہ نبی مکرم ﷺ کو مکہ سے نکال دیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ٧٦۔ ٧٧] ”اور بلاشبہ قریب تھا کہ وہ آپ کو اس زمین (مکہ) سے اُکھاڑ دیں، تاکہ آپ کو یہاں سے نکال دیں، اور تب آپ کے پیچھے وہ تھوڑا ہی ٹھہر پاتے۔ ان رسولوں کے طریقے کی مانند جنھیں ہم نے آپ سے پہلے اپنے رسولوں میں سے بھیجا، اور آپ ہمارے طریقے (قانون) میں کوئی تبدیلی نہ پائیں گے۔“

لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو مکہ کا وارث کر دیا اور نبی اکرم ﷺ وہاں غلبہ و قوت سے، مشہور قول کے مطابق، داخل ہوئے اور اہلِ مکہ مغلوب اور مقہور ہو گئے۔ پھر نبی مکرم ﷺ نے اپنے حلم اور کرم کی وجہ سے اُن کو چھوڑ دیا، جس طرح کہ اللہ پاک نے ان لوگوں کو جو بنی اسرائیل میں سے کمزور تھے، زمین کے مشارق و مغارب کا وارث کر دیا تھا اور فرعون کے بلاد و اموال اور کھیتوں اور پھلوں اور خزانوں کا مالک بنا دیا تھا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كَذٰلِكَ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴾ [الشعراء: ٥٩] ”اسی طرح ہوا، اور ہم نے بنی اسرائیل کو ان چیزوں کا وارث بنایا۔“ اور اس جگہ یوں کہا: ﴿ وَقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ ﴾ (آیتِ باب)۔ ”لفیف“ سے مراد جمیع ہے، یعنی جب قیامت آئے گی، ہم تم کو اور تمھارے دشمنوں کو سب کو جمع کر کے لے آئیں گے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، قتادہ اور ضحاک رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ”لفیفا“ سے ”جمیعا“ مراد ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ آیاتِ بینات سے مراد موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے صحیح ہونے پر واضح علامات اور ظاہر دلائل ہیں۔ آیتِ باب کی اس سے پہلی والی آیت کے ساتھ ربط کی وجہ یہ ہے کہ مذکورہ معجزات گویا کفارِ قریش کی فرمائشوں کے مساوی تھے، بلکہ ان سے بھی بڑے تھے۔ سو اِن کے مطالبات کو قبول نہ کرنا اس لیے تھا کہ اس میں اُن کو نیست و نابود نہ کرنے کی مصلحت تھی، جو اُن کے ایمان نہ لانے کی صورت میں ضروری ہو جاتا۔ اکثر مفسرین کا نو آیات کے شمار کے بارے میں قول وہی ہے، جو گزر چکا ہے اور اگر حدیثِ مذکور صحیح ٹھہرے تو آیات سے مراد گویا عام احکام ہیں، جو تمام شریعتوں میں موجود ہیں۔ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو جادو زدہ ٹھہرایا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا تو جانتا ہے کہ یہ آیات اللہ تعالیٰ

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٥٧٢۔ ٥٧٣)

نے بصائر کے طور پر نازل کی ہیں، اُن سے اللہ کی قدرت اور وحدانیت پر دلیل ہو سکتی ہے اور اے فرعون! تو تباہ ہونے والا، مطبوع علی الشر (شر پر مہر کیا گیا) یا ناقص العقل یا مصروف عن الخیر (بھلائی سے پھیر دیا گیا) ہے۔ پھر فرعون نے یہ چاہا کہ موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کے ساتھ مصر کی سرزمین سے نکال دے، یا قتل کر دے، یا جڑ سے اُکھیڑ کر پھینک دے، اس صورت میں صرف زمین مراد ہوگی۔ سو جب اس کا یہ ارادہ ہم کو معلوم ہوا تو ہم نے اُسی پر اس معاملے کو لوٹا دیا کہ وہ اپنی ساری قوم کے ساتھ ہلاک ہو گیا اور کوئی باقی نہ بچا۔ موسیٰ علیہ السلام اور اُن کی قوم نے نجات پائی۔ وللّٰہ الحمد.

ہم نے فرعون وغیرہ کے غرق کرنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام کی قوم سے کہہ دیا کہ اب تم زمینِ شام و مصر میں جہاں سے وہ تمھیں نکالنا چاہتا تھا، اچھی طرح سے رہو۔ پھر جب آخرت کا وعدہ آئے گا، یعنی قیامت آئے گی، یا دوسری نوبت، یا دوسری ساعت جس سے نفخۂ ثانیہ (دوسری دفعہ صور کا پھونکا جانا) مراد ہے۔ یا عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے نازل ہونا مراد ہے، تو ہم تم سب کو موقف (کھڑے ہونے کا مقام) میں قیامت کے دن جمع کریں گے۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا: "لفیف" مختلف قبیلوں کے جمع ہونے کو کہتے ہیں: "يقال: جاء القوم بلفهم ولفيفهم أي بأخلاطهم"[1] یعنی قوم کے سب لوگ مل کر جمع ہوئے۔ مراد یہ ہے کہ ہم قبروں میں سے تم سب کو ہر جگہ سے نکال کر اکٹھا کر کے لے آئیں گے، مومن کافر کے ساتھ اور بد بخت نیک بخت کے ساتھ ملا جلا آئے گا۔ امام اصمعی رحمہ اللہ نے کہا کہ "لفیف" جمع ہے اس کے لیے واحد نہیں ہے۔[2]

وَ بِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَ بِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ۟ۘ وَ قُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّ نَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ۟

اور ہم نے اس (قرآن) کو حق ہی کے ساتھ نازل کیا ہے اور یہ حق ہی کے ساتھ نازل ہوا، اور ہم نے آپ کو صرف بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے (105) اور قرآن کو ہم نے جدا جدا کر کے (نازل) کیا، تاکہ آپ اسے لوگوں کو ٹھہر ٹھہر کر سنائیں، اور ہم نے اسے بتدریج ہی نازل کیا ہے (106)

قرآنِ مجید کا حق کے ساتھ تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہونا:

سچ کے ساتھ اترا، یعنی بیچ میں بدلا نہیں گیا۔ بعض کتاب سے فقط معنی مطلب لیتے ہیں اور اس کے لفظ بھی پڑھنے سے غرض ہے کہ نور اور برکت اُترتی ہے۔ اسی لیے سورتیں اور آیتیں الگ الگ رکھیں اور تھوڑا تھوڑا ہر وقت کی مناسبت سے اُتارا۔

[1] الصحاح للجوهري (٤/ ١١٣) [2] تفسير القرطبي (١٠/ ٣٣٨) فتح البيان (٧/ ٤٦٢ـ ٤٦٤)

اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ قرآن متضمنِ (شامل کرنے والا) حق ہو کر اُترا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ۚ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا﴾ [النساء: ١٦٦] ''لیکن اللہ نے آپ پر جو نازل کیا ہے، وہ اس کی بابت گواہی دیتا ہے کہ اس نے اپنے علم کے ساتھ نازل کیا ہے۔ اور فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں اور اللہ بطور گواہ کافی ہے۔'' یعنی یہ اس علم پر مشتمل ہے، جس پر اللہ تعالیٰ نے تم کو اطلاع دی، جیسے: امر و نہی کے احکام۔ اور حق سے اُترا، یعنی ہر طرح سے محفوظ اور نگرانی کیا ہوا، کسی قسم کی آمیزش، اضافے اور کمی کے بغیر اور حق کے ساتھ اترا، بلکہ اس کو تیرے پاس سچ مچ وہ شخص لایا جو بہت مضبوط قویٰ والا، امانت دار، مکین، ملاءِ اعلیٰ کا مطاع ہے۔ جو ایمان دار تیرے مطیع ہیں تو اُن کے لیے بشیر ہے اور جو کافر تیرے نافرمان ہیں تو اُن کے لیے نذیر ہے۔ ہم نے اس قرآن کو مفصل کیا کہ پہلے لوحِ محفوظ سے بیت العزت، یعنی آسمانِ دنیا پر اترا، پھر موقع کے مطابق تھوڑا تھوڑا ہو کر تیئیس (٢٣) برس میں نبی اکرم ﷺ پر آتا رہا۔ یہ معنی ہیں ''فرقناہ'' مخفف (جس میں شد کا استعمال نہیں) کے اور شد کی قراءت کے ساتھ معنی یہ ہیں کہ ایک ایک آیت کر کے مبین اور مفسرا اتارا ہے۔ لہٰذا فرمایا کہ تاکہ تو اس کو لوگوں پر پڑھے وقفے وقفے سے۔ تنزیل سے مراد یہ ہے کہ شیئاً بعد شيءٍ اُتارا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ہم نے قرآن وحی کیا حق کے ساتھ ملتبس کر کے اور وہ شیاطین سے محفوظ ہو کر اترا ہے۔ ان دونوں جگہوں میں حق سے مراد باطل کی ضد ہے، لیکن پہلے حق سے مراد حکمتِ الٰہیہ ہے، جو اس کو نازل کرنے کی مقتضی ہے اور دوسرے حق سے مراد اس کا عقائد اور احکام وغیرہ پر مشتمل ہونا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کو مطیع کے لیے جنت کی خوش خبری دینے والا اور نافرمان کے لیے آگ سے ڈرانے والا ٹھہرایا اور قرآن کو حق اور باطل کے درمیان فرق کو واضح کرنے والا ٹھہرایا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ اُتارنے کو علاحدہ ذکر کیا، تاکہ لوگ بہ خوبی سمجھیں۔[1]

ابو عبید نے کہا کہ مجھے تخفیف (فَرَقْنَاهُ) بہت زیادہ پسند ہے، اس لیے کہ اس کے معنی یہ ہیں: ''بَيَّنَّاهُ'' اور تشدید (فَرَّقْنَاهُ) کے معنی فقط یہ ہیں کہ وہ فرق کرنے والا نازل ہوا ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ قرآن شبِ قدر میں ماہِ رمضان میں ایک ہی دفعہ آسمانِ دنیا پر نازل ہوا۔[3] مشرک جب کوئی شے نئی نکالتے تو اللہ تعالیٰ اُن کا جواب بھیجتا رہتا، غرض یہ کہ ٢٣ سال میں اللہ تعالیٰ نے اس کو الگ الگ کر کے اُتارا۔ ﴿مُكْثٍ﴾ سے مراد مدت کا طول ہے۔[4]

---

(1) معاني القرآن (٣/ ٢٦٤)
(2) فتح القدير (٣/ ٣٦٥)
(3) تفسير الطبري (١٧/ ٥٧٤)
(4) فتح البيان (٧/ ٤٦٥۔ ٤٦٦)

قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖٓ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ
اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۙ﴿۱۰۷﴾ وَّيَقُوْلُوْنَ
سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ﴿۱۰۸﴾ وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ
يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ﴿۱۰۹﴾

کہہ دیجیے: اس پر ایمان لاؤ یا ایمان نہ لاؤ، بلاشبہ جنھیں اس سے پہلے علم دیا گیا، جب ان پر تلاوت کی جاتی ہے تو وہ اپنی ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں (107) اور وہ کہتے ہیں: پاک ہے ہمارا رب، بے شک ہمارے رب کا وعدہ ضرور پورا ہونا ہے (108) اور وہ روتے ہوئے اپنی ٹھوڑیوں کے بل گر پڑتے ہیں اور یہ (قرآن) ان کے خشوع کو زیادہ کرتا ہے (109)

سابقہ اہلِ علم بھی قرآن کی حقانیت کے معترف ہیں:

یعنی اگلے کلام پہچاننے والے اس کو پہچانتے ہیں اور وعدہ جو تھا کہ آخر زمانے میں ایک کلام اُترے گا، اس کو صحیح پاتے ہیں۔ نماز میں سجدہ دوبار ہوتا ہے، اس لیے دوبار فرمایا، پہلی بار اس کلام کی تاثیر سے تعجب کا اظہار ہے اور دوسری بار عاجزی کا اظہار۔

اللہ پاک نے نبی اکرم ﷺ کو حکم دیا کہ تم اِن کافروں سے کہہ دو کہ میں جو یہ قرآن لایا ہوں تم خواہ اس پر ایمان لاؤ یا نہ لاؤ، مگر یہ فی نفسہٖ حق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو مجھ پر اُتارا ہے اور اس کا ذکر گزرے ہوئے زمانوں میں پہلی اُتاری گئی کتابوں میں کیا ہے۔ لہٰذا اُن صالح اہلِ کتاب کا حوالہ دیا ہے جو خود اللہ کی کتاب کے ساتھ تمسک کرنے والے اور سابقہ شریعت پر ان کو تبدیل اور تحریف کیے بغیر قائم ہیں کہ وہ اس کو اللہ ہی کا کلام جانتے ہیں، لہٰذا وہ اس کو سن کر سجدے میں گرتے ہیں۔

''ذقن'' کہتے چہرے کے نچلے حصے کو۔ ان کا یہ گرنا بہ طورِ سجدہ شکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس لائق کیا کہ ہم نے اس رسول کو پایا جس پر یہ کتاب اُتری۔ لہٰذا کہتے ہیں کہ ہمارا رب پاک ہے، یعنی براہِ تعظیم و توقیر و قدرتِ تامہ کے، اس کا وعدہ جو اس نے پہلے انبیا کی زبان پر نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے بارے میں کیا تھا، اس کے خلاف نہیں ہوا اور ایمان اور تصدیق کے طور پر ٹھوڑی کے بل خشوع میں گرتے ہیں اور اس کلام پاک کو تسلیم کرتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ ﴾ [محمد: ۱۷] ''اور جن لوگوں نے ہدایت پائی ہے، اللہ نے انھیں ہدایت میں زیادہ کیا اور انھیں ان کا تقویٰ عطا فرمایا۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اے محمد! تم ان کفار سے، جو تم سے طرح طرح کی فرمایش کرتے ہیں، کہہ دو کہ تم چاہو قرآن کو مانو یا نہ مانو، لیکن وہ لوگ اس کو مانتے ہیں، جن کو پہلے سے علم مل چکا ہے اور اگلی کتابیں پڑھ چکے ہیں اور وحی کی حقیقت سے شناسا ہیں اور اماراتِ نبوت کو جانتے ہیں، جیسے: زید بن عمرو بن نفیل، ورقہ بن نوفل، عبداللہ بن سلام، سلمان فارسی اور ابو ذر، اُن پر جب یہ قرآن پڑھا جاتا ہے تو وہ اپنے منہ کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں۔ اس میں نبی اکرم ﷺ کو تسلی ہے کہ اگر یہ جاہل بے علم جن کو قرآن کی کچھ پہچان نہیں ہے اور نہ یہ انبیا کو پہچانتے ہیں، ایمان نہیں لاتے اور نہ قرآن کو مانتے ہیں تو بے شک نہ مانیں، تم بھی اُن کی کچھ پروا نہ کرو کہ یہ کسی قطار وشمار میں نہیں ہیں۔ اہلِ علم جن کا اعتبار ہے، وہ بہر حال اس معجزانہ کلام کے سامنے سر جھکاتے ہیں اور اسے تسلیم کرتے ہیں اور خشوع وخضوع سے پیش آتے ہیں اور اللہ کے وعدے کو سچا پا کر تسبیح کرتے ہیں اور اُن کو قرآن سن کر رونا آ جاتا ہے اور اُن کی عاجزی بڑھ جاتی ہے۔

خشوع سے مراد دل کی نرمی اور آنکھوں کا نم ہو جانا ہے۔ معلوم ہوا کہ رونا قرآن کی قراءت کے وقت مستحب ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «لَا يَلِجُ النَّارَ رَجُلٌ بَكَى مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ حَتَّى يَعُوْدَ اللَّبَنُ فِي الضَّرْعِ، وَلَا يَجْتَمِعُ عَلَى عَبْدٍ غُبَارٌ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ وَدُخَانُ جَهَنَّمَ»[1] (أخرجه الترمذي والنسائي) [جو شخص اللہ کے ڈر سے روئے وہ جہنم میں نہیں جائے گا، حتی کہ دودھ تھن میں واپس چلا جائے۔ کسی بندے پر اللہ کی راہ میں پڑنے والا غبار اور جہنم کا دھواں اکٹھے نہیں ہوں گے] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں: «عَيْنَانِ لَا تَمَسُّهُمَا النَّارُ عَيْنٌ بَكَتْ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ وَعَيْنٌ بَاتَتْ تَحْرُسُ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ»[2] (أخرجه الترمذي) [دو آنکھیں ہیں جنھیں جہنم کی آگ نہیں چھوئے گی: ایک وہ آنکھ جو اللہ کے ڈر سے روئی اور دوسری وہ آنکھ جو رات کے وقت اللہ کی راہ میں پہرہ دیتی ہے]

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ۚ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَیْنَ ذٰلِكَ سَبِیْلًا ﴿۱۱۰﴾ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (۱٦۳۳) سنن النسائي، رقم الحديث (۳۱۰۸) صحيح الجامع، رقم الحديث (۷۷۷۸)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (۱٦۳۹) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤۱۱۲) فتح البيان (۷/ ٤٦٦۔ ٤٦۸)

لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ﴿۱۱۱﴾

کہہ دیجیے: (اللہ کو) ''اللہ'' کہہ کر پکارو یا ''رحمٰن'' کہہ کر، تم جس نام سے بھی پکارو تو اسی کے لیے اچھے سے اچھے نام ہیں، اور اپنی نماز نہ بلند آواز سے پڑھیں نہ بالکل پست آواز سے، بلکہ اس کے بین بین راستہ اختیار کریں ﴿۱۱۰﴾ اور کہہ دیجیے: ساری حمد اللہ ہی کے لیے ہے جس نے (اپنے لیے) کوئی اولاد نہیں بنائی اور نہ بادشاہی میں اس کے لیے کوئی شریک ہے اور نہ اسے ناتوانی (وکمزوری) کی وجہ سے کوئی حمایتی درکار ہے اور آپ اس (اللہ) کی بڑائی بیان کریں، کمال درجے کی بڑائی ﴿۱۱۱﴾

اللہ تعالیٰ کے تمام نام اچھے ہیں:

اللہ کا نام رحمٰن عرب کے لوگ نہیں جانتے تھے، اس پر یہ فرمایا کہ نام بہتر یہی ہیں۔ اللہ وہی ایک ہے اور پکارنے کی نماز (جہری نماز) میں بہت چلانا بھی نہیں اور بہت دبی آواز بھی نہیں، بیچ کی چال پسند ہے۔ پھر کہا کہ اس پر کبھی ذلت ہی نہیں کہ اس کو مددگار کی ضرورت پڑے۔ بادشاہوں کے ہاں امیر زیر پڑ جاتے ہیں، اس سے کہ برے وقت میں اُن کی رفاقت کیے ہوتے ہیں وہاں یہ مذکور ہی نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے پیغمبر! تم ان مشرکوں سے، جو کہ اللہ کی رحمت کی صفت کے منکر ہیں اور اللہ کا نام رحمٰن ہونے کا انکار کرتے ہیں، کہہ دو کہ اس میں کچھ نہیں ہے کہ تم اللہ کا نام لے کر پکارو یا رحمٰن کا، اس کے تو اچھے اچھے نام ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۲۲﴾ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۚ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۲۳﴾ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ [الحشر: ۲۲۔ ۲۴] ''وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ غیب اور حاضر کا جاننے والا ہے، وہ رحمٰن ہے، رحیم ہے۔ اللہ وہ ہستی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ بادشاہ ہے، نہایت پاک، سلامتی والا، امن دینے والا، نگہبان، زبردست، زور آور، بڑائی والا، پاک ہے اللہ اس سے جو وہ شرک کرتے ہیں۔ وہ اللہ ہے، خالق ہے، موجد، صورت گر، اسی کے لیے ہیں اسمائے حسنیٰ، اسی کی تسبیح پڑھتی ہے جو چیز آسمانوں اور زمین میں ہے، اور وہ غالب ہے، خوب حکمت والا۔'' امام مکحول رحمہ اللہ نے کہا کہ ایک مشرک نے نبی مکرم ﷺ کو سنا، سجدے میں کہتے ہیں: یا رحمٰن یا رحیم، بولا اُن کا تو عقیدہ ہے کہ ہم ایک ہی کو پکارتے ہیں، حالاں کہ یہ دو کو پکارتے ہیں، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اُتاری۔

قراءتِ قرآن نہ بلند نہ آہستہ:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی اسی طرح کہا ہے[1] اور کہا کہ جب یہ آیت اُتری: ﴿ وَلَا تَجۡهَرۡ بِصَلَاتِكَ ﴾ (آیتِ باب) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں پوشیدہ تھے، جب اپنے اصحاب کو لے کر نماز پڑھتے تو قرآن کو آواز سے قراءت کرتے، جب اس کو مشرکوں نے سنا تو قرآن کو گالی دینا شروع کیا اور جس نے قرآن اُتارا اور جو قرآن کو لایا اس کو بھی گالی دی، تب اللہ نے کہا کہ زیادہ اونچی آواز سے نہ پڑھو کہ مشرکین سن کر قرآن کو گالی دیں یا برا کہیں اور نہ اتنا پست پڑھو کہ تمھاری آواز تمھارے اصحاب کو بھی سنائی نہ دے، یہاں تک کہ وہ قرآن کو تم سے اُخذ کریں، تم بیچ کی راہ تلاش کرو۔[2] (أخرجاه في الصحيحين) جب مدینے کی طرف ہجرت فرمائی تو یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ اب جس طرح چاہیں پڑھیں زور سے یا چپکے سے۔[3] (قاله أيضا ابن عباس رضی اللہ عنہما)

ان کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب قرآن جہر سے پڑھتے اور نماز میں ہوتے تو لوگ آپ کے پاس سے جدا ہو جاتے اور سننے سے انکار کرتے۔ کوئی آدمی چاہتا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض تلاوت کو سنے جبکہ آپ نماز پڑھتے ہوتے تو چوری سے کان رکھ کر سنتا مشرکوں کے ڈر کی وجہ سے۔ اور جب دیکھتا کہ انھوں نے مجھے سنتے ہوئے دیکھ لیا ہے تو ڈر کے مارے وہاں سے چل دیتا کہ کہیں اسے تکلیف نہ پہنچائیں اور سننا بند کر دیتا اور جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چپکے پڑھتے تو جو لوگ سنتے تھے ان کو کچھ سنائی نہ دیتا، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بھیجی کہ تم نہ اتنا زور سے پڑھو کہ لوگ تمھارے پاس سے متفرق ہو جائیں اور نہ اتنا چپکے سے کہ سننے والے بھی نہ سن پائیں یا چوری سے سنیں، شاید انھیں سن کر کچھ فائدہ ہو۔ امام عکرمہ، حسن بصری اور قتادہ رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ اس آیت کا نزول نماز کے بارے میں ہوا ہے۔[4]

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یعنی اتنا مخفی بھی نہ پڑھو کہ کسی کو سنائی نہ دے، بلکہ کانوں والا سن لے۔[5]

امام محمد بن سیرین رحمہ اللہ نے کہا کہ مجھے خبر ملی ہے کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نماز میں آواز آہستہ رکھتے اور عمر رضی اللہ عنہ آوازِ بلند پڑھتے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا: تم یہ کیوں کرتے ہو؟ کہا: میں اپنے رب عزوجل سے مناجات اور سرگوشی کرتا ہوں اور وہ میری حاجت کو جانتا ہے۔ کہا: "أحسنت" (ٹھیک ہے)۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: تم یہ کیوں کرتے ہو؟ کہا: "أطرد الشيطن وأوقظ الوسنان" یعنی شیطان کو بھگاتا اور سوتے کو جگاتا ہوں، کہا: "أحسنت" (تم بھی ٹھیک ہو) جب یہ آیت آئی تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا: ﴿ اِرۡفَعۡ شَيۡئًا ﴾ یعنی ذرا آواز کو اونچا کر اور عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: ﴿ اِخۡفَضۡ شَيۡئًا ﴾ یعنی ذرا آواز کو پست کر۔[6] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اس آیت کا نزول دعا کے بارے میں ہوا۔

---

① تفسير الطبري (١٧/ ٥٨٠) ② صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٤٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٤٦)
③ تفسير الطبري (١٧/ ٥٨٤) ④ تفسير الطبري (١٧/ ٥٨٥۔ ٥٨٧) ⑤ تفسير الطبري (١٧/ ٥٨٩)
⑥ تفسير الطبري (١٧/ ٥٨٦) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ محمد بن سیرین رحمہ اللہ نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا ہے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بھی اسی کی قائل ہیں۔ امام مجاہد، سعید بن جبیر، ابو عیاض، مکحول اور عروہ بن زبیر رحمہم اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ عبداللہ بن شداد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بنی تمیم کا ایک دیہاتی تھا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب سلام پھیرتے، وہ کہتا: "اللهم ارزقني إبلا وولدا" [اے اللہ! مجھے اونٹ اور اولاد عطا فرما] اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[1]

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے دوسری روایت یہ ہے کہ اس آیت کا نزول تشہد کے بارے میں ہوا ہے۔ امام ابن سیرین رحمہ اللہ کا بھی ایک قول یہی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی تیسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اونچی آواز اور آہستہ سے پڑھنے کی ممانعت اس لیے ہے کہ لوگوں کو دکھانے کے لیے نماز نہ پڑھ اور نہ لوگوں کے ڈر سے نماز چھوڑ دے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا: "لا تحسن علانيتها وتسيئ سريرتها"، یعنی ظاہر میں اچھی طرح پڑھے اور باطن میں بری طرح۔ چوتھا قول یہ ہے کہ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا کہ اہلِ کتاب چپکے پڑھتے، پھر کوئی اُن میں چلا کر پڑھتا اور اس کے ساتھ سب چلاتے۔ اس لیے منع فرمایا کہ تم اُن کی طرح نہ چلاؤ، بلکہ جس طرح اُن کے بعض چپکے پڑھتے ہیں، اسی طرح تم بھی پست آواز سے پڑھو، پھر درمیان کی راہ وہی ہے جو جبریل علیہ السلام نے جاری کر دی۔[2]

توحید کا بیان:

اللہ تعالیٰ نے اپنے نفسِ کریم کے لیے اسمائے حسنیٰ ثابت کر کے نقائص سے پاکیزگی بیان فرمائی اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے کوئی اولاد اختیار نہیں کی اور نہ ہی کوئی ملک میں اس کا شریک ہے، بلکہ وہ اَحد، صمد، لم یلد، ولم یولد، ولم یکن لہ کفوا اَحد ہے۔ اور نہ وہ ذلیل ہے کہ کسی ولی اور ناصر کا محتاج ہو، بلکہ وہ ہر چیز کا خالق ہے، وحدہ لا شریک لہ ہے، تمام اُمور اور اشیا کی تدبیر اور تقدیر اسی کی مشیت سے ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ نہ کسی کا حلیف ہے اور نہ کسی کی مدد کا طلب گار۔[3] پھر حکم دیا کہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور عزت کر کہ وہ اس بات سے پاک ہے جو یہ ظالم اور سرکش کہتے ہیں۔

امام قرظی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہود و نصاریٰ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے بیٹا بنایا ہے۔ عرب کہتے تھے: "لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ، لَا شَرِيْكَ لَكَ إِلَّا شَرِيْكًا هُوَ لَكَ تَمْلِكُهُ وَمَا مَلَكَ" صابئین اور مجوسی نے کہا: "لَوْلَا أَوْلِيَاءُ اللّٰهِ لَذَلَّ"، یعنی اگر اللہ کے مددگار نہ ہوتے تو وہ عاجز و ناتواں ہو جاتا، اس پر یہ آیت آئی۔[4] امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم سے ذکر ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ آیت اپنے گھر والوں کو سکھاتے تھے، کیا بڑے اور کیا چھوٹے۔[5] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حدیث میں مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کا نام آیت العزر کھا ہے۔[6] بعض آثار میں مروی ہے کہ یہ آیت جس گھر میں شب کے وقت پڑھی جاتی ہے اس گھر میں چوری نہیں ہوتی اور نہ کوئی آفت آتی ہے۔[7]

---

[1] تفسير الطبري (۱۷/ ۵۸۱۔ ۵۸۳)
[2] تفسير الطبري (۱۷/ ۵۸۷۔ ۵۸۸)
[3] تفسير الطبري (۱۷/ ۵۹۰)
[4] تفسير الطبري (۱۷/ ۵۹۰)
[5] تفسير الطبري (۱۷/ ۵۹۰) یہ روایت مرسل ہے۔
[6] مسند أحمد (۳/ ۴۳۹) اس کی سند میں "رشدین زبان" اور "سہل" ضعیف راوی ہیں۔
[7] مصنف عبد الرزاق (۵/ ۱۶۷)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں اور نبی اکرم ﷺ باہر نکلے، آپ کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا یا میرا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں تھا، ایک خستہ حال مرد پر گزر ہوا، فرمایا: اے فلاں! تیرا یہ کیا حال ہے، جو میں دیکھتا ہوں؟ کہا: بیماری اور تکلیف ہے، اے اللہ کے رسول! فرمایا: کیا میں تجھ کو ایسے کلمات نہ سکھا دوں جو تجھ سے بیماری اور تکلیف کو دور کر دیں؟ کہا: ہاں! مجھ کو ان کلمات کے بدلے آپ کے ساتھ بدر یا اُحد میں حاضر ہونا بھی اچھا نہیں لگتا۔ نبی مکرم ﷺ ہنسے اور فرمایا: « هَلْ يُدْرِكُ أَهْلُ بَدْرٍ وَّ أَهْلُ أُحُدٍ مَّا يُدْرِكُ الْفَقِيْرُ الْقَانِعُ » [تو بدری اور احدی صحابہ کے مرتبے کو کہاں سے پا سکتا ہے تو ان کے مقابلے میں محض خالی ہاتھ اور بے سرمایہ ہے] سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ مجھے سکھا دیں۔ فرمایا اے ابوہریرہ! کہہ: « تَوَكَّلْتُ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا، وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ، وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ وَلِيٌّ مِنَ الذُّلِّ، وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا » [میں نے اس زندہ پر بھروسا کیا جو موت سے ہمکنار نہ ہوگا، سب تعریف اس اللہ کے لیے جس نے اولاد نہیں بنائی ہے، بادشاہی میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے، نہ اسے ناتوانی کی وجہ سے کوئی حمایتی درکار ہے اور اسی کی بڑائی بیان کرو کمال درجے کی بڑائی] کہا، پھر نبی اکرم ﷺ میرے پاس آئے اور میرا حال اچھا ہوگیا تھا، مجھ سے فرمایا: « مَهْيَمْ! » ''یہ کیا ہے؟'' میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ان کلمات کی وجہ سے اللہ کی طرف سے برکت ہے جو آپ نے مجھے سکھائے تھے۔[1]
اس کی اسناد ضعیف ہے اور اس کے متن میں نکارت ہے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ حسنِ اسما کے معنی یہ ہیں کہ وہ اسما مستقل ہیں، نعوتِ جلال و اکرام کے ساتھ۔ ابوالسعود نے نیساپوری کی اتباع کرتے ہوئے یہی معنی کہے ہیں۔[3] امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بتا دیا کہ اللہ کہہ کر پکارنا یا رحمٰن کہہ کر، دونوں کا مرجع ایک ہی قول کی طرف ہے۔[4] امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہود نے نبی مکرم ﷺ سے رحمٰن کا حال پوچھا۔ یمامہ میں ایک کاہن تھا، اس کا نام رحمٰن تھا۔ اس پر یہ آیت اتری۔[5] یہ حدیث مرسل ہے۔

امام مکحول رحمہ اللہ نے کہا کہ نبی اکرم ﷺ ایک رات مکہ میں تہجد پڑھتے تھے، سجدے میں یا رحمٰن یا رحیم کہتے، ایک مشرک مرد نے سنا، صبح کو اپنے یاروں سے کہا کہ ابن ابی کبشہ رحمٰن کو پکارتا ہے، جو یمن میں ہے، یمن میں ایک مرد کا نام رحمٰن تھا، اس پر یہ آیت آئی۔[6] اونچی آواز اور پست آواز کے درمیان قراءت کرنے کا یہ مطلب ہے کہ نہ ہی بہت اونچی آواز ہو اور نہ ہی پست آواز۔ یا سب نمازوں میں جہر کی ممانعت ہے، یا سب نمازوں میں آہستگی کی

---

[1] مسند أبي يعلىٰ (١٢/ ٢٣) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''وفيه موسىٰ بن عبيدة الربذي وهو ضعيف'' (مجمع الزوائد: ٧/ ١٤٤)

[2] تفسير ابن كثير (٣/ ٩٦) [3] تفسير أبي السعود (٥/ ٢٠٠) [4] معاني القرآن (٣/ ٢٦٤)

[5] الدر المنثور (٥/ ٣٤٨) [6] تفسير الطبري (١٧/ ٥٨٠) یہ روایت مرسل ہے۔

ممانعت ہے، بلکہ بعض میں جہر کرے اور بعض میں اخفا۔ ایک قوم نے کہا کہ یہ آیت منسوخ ہے اس آیت کے ساتھ:
﴿ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ﴾ [الأعراف: ٥٥] ”تم اپنے رب کو آہ وزاری کرتے ہوئے اور چپکے چپکے پکارو۔“

پھر کلمات مابعد کے کہنے کا حکم دیا، ان کلمات میں یہود و نصاریٰ کا رد ہے جو اللہ کی اولاد مانتے ہیں اور مشرکین کا رد ہے کہ وہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے ہیں اور ثنویہ کا رد ہے جو ملک میں شرکت کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ بہت سے معبود ہیں۔ پھر کسی قسم کے ولی اور ناصر سے اپنی بے نیازی بیان فرمائی۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ کسی غیر کی مدد کا محتاج نہیں ہے۔[1] عبد الکریم ابو اُمیہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ بنی ہاشم کے بچے کو جب وہ بولنے لگتا، یہ کلمات آخر سورت تک سات بار پڑھنے کی تعلیم فرماتے۔[2] (رواه عبد الرزاق) امام احمد رحمہ اللہ نے معاذ جہنی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ فرماتے: « آيَةُ الْعِزِّ: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ... إِلٰى آخِرِ السُّوْرَةِ »[3] [عزت والی آیت یہ آیت ہے: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ ... ﴾ آخر سورت تک]

---

① معاني القرآن (٣/ ٢٦٥) ② مصنف عبدالرزاق (٤/ ٣٣٤) یہ روایت مرسل ہے، نیز ”عبدالکریم ابوامیہ“ ضعیف راوی ہے۔
③ اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ فتح البيان (٧/ ٤٦٨۔ ٤٧١)

سُوْرَةُ الكَهْف

اس سورت مبارکہ میں ایک سو گیارہ آیات ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ سورت مکی ہے اور جمیع مفسرین کا یہی قول ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم بھی اسی کے قائل ہیں۔[2] ایک فرقہ کہتا ہے کہ شروع سورت سے لے کر اللہ کے قول ﴿ جُرُزًا ﴾ تک مدینے میں اُتری ہے۔

فضیلت و اہمیت:

اس سورت کی فضیلت میں کئی حدیثیں آئی ہیں۔ سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ جس نے سورت کہف کی ابتدائی دس آیتیں یاد کر لیں، وہ فتنۂ دجال سے محفوظ رہا۔[3] (أخرجه أحمد و مسلم و أبو داود والترمذي والنسائي وغيرهم)

سیدنا براء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے سورت کہف پڑھی، گھر میں ایک جانور تھا وہ بدکنے لگا، اس نے جو نظر کی تو ایک ابر کو دیکھا کہ اس نے سایہ کر لیا ہے، یعنی چھپا لیا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ذکر کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پڑھ اے فلاں کہ یہ سکینہ قرآن کے لیے اُترا ہے۔ یہ قاری اُسید بن حضیر تھے جس طرح کہ امام طبرانی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے، اس حدیث کو شیخین نے روایت کیا ہے۔[4] یہ احادیث سورت کہف دس آیات کے بارے میں ہیں، سورت کی ابتدائی اور آخری دونوں آیات کے بارے میں ہیں۔ سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ جس نے سورت کہف پڑھی، اس کے لیے نور ہوگا اس کے مقام سے مکہ تک اور جس نے اس کے آخر کی دس آیتیں پڑھیں، پھر دجال نکلا تو اس کو کچھ ضرر نہ ہوگا۔[5] (أخرجه الطبراني و الحاكم و صححه والبيهقي)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما مرفوعاً کہتے ہیں کہ جس نے جمعہ کے دن سورت کہف پڑھی، اس کے لیے ایک نور چمکتا ہے، اس کے نیچے سے ابرِ آسمان تک، جو قیامت کے دن اس کے لیے روشن ہوگا اور اس کے لیے ہر دو جمعہ کے مابین

---

[1] تفسير القرطبي (١٠/ ٣٤٦) [2] الدر المنثور (٥/ ٣٥٤)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٠٩) مسند أحمد (٦/ ٤٤٩) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٣٢٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٨٨٦) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٢٣٦)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤١٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٩٥) المعجم الكبير (١/ ٢٠٨)

[5] المعجم الأوسط (٢/ ١٢٣) مستدرك الحاكم (١/ ٧٥٢) شعب الإيمان (٣/ ١١٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٦٥١)

بخش دیا جاتا ہے۔ (رواه ابن مردويه) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ کیا میں خبر نہ دوں تم کو ایسی سورت کی جس نے آسمان اور زمین کے درمیان کو پُر کر دیا ہے اور اس کے کاتب کو بھی اتنا ہی اجر ہوتا ہے۔ جو کوئی اس کو جمعہ کے دن پڑھے، اس جمعے سے دوسرے جمعے تک جو کچھ ہوا ہو اور تین اور زیادہ تک بخش دیا جائے گا اور جو کوئی اس کے آخر کی پانچ آیتیں پڑھے سوتے وقت تو اس کو اللہ رات میں سے جس وقت چاہے اُٹھائے گا۔ کہا: ہاں اے اللہ کے رسول! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سورت اصحابِ کہف۔ (أخرجه ابن مردويه)

سیدنا عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جس گھر میں سورت کہف پڑھی جاتی ہے، اس رات شیطان اس کے گھر میں داخل نہیں ہوتا۔[1] سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ جس نے دن جمعہ کے سورت کہف پڑھی، وہ آٹھ دن تک ہر فتنے سے معصوم یعنی محفوظ ہے اور اگر دجال نکلے گا تو اس سے بھی محفوظ رہے گا۔[2] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس جگہ ان کے علاوہ اور بھی چند حدیثیں لکھیں ہیں۔[3]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۝۱ قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۝۲ مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا ۝۳ وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۝۴ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآىِٕهِمْ ۭ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۭ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۝۵

ساری حمد اللہ ہی کے لیے ہے جس نے اپنے بندے پر کتاب نازل کی اور اس میں کوئی کجی نہیں رکھی (1) نہایت سیدھی (بغیر افراط وتفریط کے اتاری) تاکہ وہ اس (اللہ) کی طرف سے سخت عذاب سے ڈرائے اور مومنوں کو بشارت دے جو نیک عمل کرتے ہیں کہ بے شک ان کے لیے اچھا اجر ہے (2) اس میں وہ ہمیشہ رہنے والے ہوں گے (3) لوگوں کو ڈرائے جنھوں نے کہا کہ اللہ نے کوئی اولاد بنائی ہے (4) نہ انھیں اس (بات) کا کوئی علم ہے اور نہ ان کے باپ دادا کو، بڑی (ہی خطرناک) بات ہے جو ان کے مونہوں سے نکلتی ہے، وہ تو سراسر جھوٹ ہی بکتے ہیں (5)

---

(1) الدر المنثور (٥/ ٣٥٦)

(2) الأحاديث المختارة للمقدسي (٤٢٩) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم (٢٠١٣)

(3) تفسير ابن كثير (٣/ ٩٦۔ ٩٧)

قرآنِ مجید بحیثیتِ بشیر ونذیر:

اللہ پاک کی سنت ہے کہ اُمور کے شروع میں اور اختتام میں اپنے نفسِ مقدس کی حمد کرتا ہے، کیوں کہ وہ ہر حال میں محمود ہے اور اسی کے لیے شروع میں اور آخر میں حمد ہے۔ لہٰذا کتابِ عزیز کے نازل کرنے پر اپنے نفس کی حمد فرمائی۔ اس لیے کہ یہ ایک نعمتِ عظمیٰ ہے جو زمین والوں پر ہوئی اور اس کتاب کی وجہ سے ان کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالا۔ یہ ایک سیدھی کتاب ہے جس میں کوئی ٹیڑھا پن اور کجی نہیں ہے، بلکہ یہ صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت کرنے والی ہے اور واضح اور روشن ہے۔ کافروں کو ڈراتی ہے، ایمان والوں کو خوش خبری سناتی ہے۔ لہٰذا فرمایا کہ اس میں کسی طرح کا ٹیڑھا پن، کجی اور جھول نہیں ہے، بلکہ یہ کتاب بہت اچھی انتہا درجے کی معتدل اور سچ بیان کرنے والی ہے۔ لہٰذا مخالف اور جھٹلانے والے کے لیے اللہ کی طرف سے ایک سخت تکلیف اور عذاب ہے۔ ”بَاْسَ“ سے مراد جلد ملنے والی سزا ہے دنیا میں اور بعد میں ایک مقررہ وقت کے آجانے پر آخرت میں ایسا عذاب کرے گا، جو کسی کو نہ کیا ہوگا اور اس کو اس طرح بیڑیوں میں رکھے گا کہ کسی کو اس طرح باندھ کر نہ رکھا ہوگا اور جو لوگ اس قرآن پر ایمان لاتے ہیں اور عمل صالح سے اس کی تصدیق کرتے ہیں، ان کے لیے یہ کتاب خوش خبری اور مژدہ سنانے والی ہے کہ اُن کے لیے اللہ کے نزدیک اچھا اجر ہے۔ وہ اس ثواب میں جو کہ جنت ہی ہے ہمیشہ رہیں گے اور انھیں کبھی زوال نہیں آئے گا اور نہ ہی اُن کی نعمتیں ہی ختم ہوں گی۔

امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا کہ ان لوگوں سے، جنھوں نے یہ بات کہی کہ اللہ نے اولاد اختیار کی، مشرکینِ عرب مراد ہیں، وہ کہتے تھے: ہم فرشتوں کی عبادت کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں[1] اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ان کو اس افترا کا کچھ علم نہیں ہے اور نہ اُن کے باپ دادا کو کچھ علم تھا، یہ بہت بڑا شرک اور گستاخی کا کلمہ ہے، جو اُن کے منہ سے نکلتا ہے، اس کی کوئی سند نہیں، بجز اُن کے قول کے اور نہ ہی کوئی اس پر دلیل ہے بجز اُن کے کذب کے۔ لہٰذا فرمایا کہ یہ جھوٹ بولتے ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ قریش نے نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط کو یہود کے علماء کے پاس مدینے بھیجا اور کہا: ان سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا حال پوچھو اور ان کی صفت بیان کرو اور اپنے قول کی ان کو خبر دو۔ وہ اول اہلِ کتاب ہے اور انبیا کا جو علم اُن کے پاس ہے وہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ وہ دونوں مدینے میں آئے اور احبارِ یہود سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان کیا اور کہا تم اہلِ تورات ہو، ہم تمھارے پاس آئے ہیں، تم ہم کو ہمارے صاحب کے حال کی خبر دو۔ یہود نے کہا تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے تین سوال کرو جو ہم بتاتے ہیں۔ اگر وہ تم کو اِن سوالات کے صحیح جواب دے تو

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٥٩٥)

وہ نبی مرسل ہے، ورنہ ایک آدمی ہے باتیں بنانے والا۔ پھر تم اس کے بارے میں اپنی رائے قائم کرو۔ ایک سوال اُن جوانوں کا کرو جو اول زمانے میں مفقود ہو گئے تھے کہ ان کا ماجرا کیا ہے؟ کیوں کہ ان کا قصہ ایک عجیب بات ہے۔ دوسرا سوال اس سیاح کے بارے میں کرو جو زمین کے مشارق و مغارب میں پہنچا تھا کہ اس کی کیا خبر ہے۔ تیسرا سوال روح کے بارے میں کرو کہ روح کیا چیز ہے؟ اگر وہ تم کو ان اُمور کی خبر دے تو وہ پیغمبر ہے، تم اس کی تابعداری کرو اور اگر خبر نہ دے تو وہ ایک مرد ہے (باتیں بنانے والا) تم اس کے معاملے میں جو مناسب سمجھو ویسا کرو۔

نضر و عقبہ لوٹ کر قریش کے پاس آئے اور کہا: اے گروہِ قریش! ہم تمھارے اور محمد ﷺ کے درمیان ایک قولِ فصل لائے ہیں، ہم کو علمائے یہود نے خبر دی ہے کہ ہم محمد ﷺ سے چند اُمور کا سوال کریں، پھر اُن سوالات کے بارے میں قریش کو بتایا، وہ نبی اکرم ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ اے محمد! ہم کو خبر دو اور وہ سوالات، جو یہود نے ان کو سکھائے تھے، پیش کیے۔ نبی اکرم ﷺ نے کہا کہ میں کل تم کو اُن اُمور کی خبر دوں گا اور ان شاء اللہ نہ کہا۔ وہ لوگ پھر کر چلے آئے اور نبی اکرم ﷺ پندرہ دن تک ٹھہرے رہے، اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں کوئی وحی نہ بھیجی اور نہ ہی جبریل علیہ السلام آئے۔ اہلِ مکہ نے کہا کہ محمد ﷺ نے ہم سے کل کا وعدہ کیا تھا، آج پندرھواں دن ہے اور ہم کو ہمارے سوالوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا اور نبی اکرم ﷺ وحی کے رک جانے کی وجہ سے بہت اندوہگیں ہوئے اور اہلِ مکہ کی باتیں آپ پر بہت شاق گزریں، پھر جبریل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پاس سے سورت کہف لے کر آئے۔ اس میں نبی اکرم ﷺ پر ناراضی کا اظہار تھا اُن کے اس حزن و ملال پر جو انھیں کافروں کے ایمان نہ لانے پر ہوتا تھا اور ان کے اس سوال کا جواب تھا جو جوانوں اور سیاح کے بارے میں تھا اور یہ آیت بھی لائے: ﴿ قُلِ الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ ﴾ [بني إسرائيل: ٨٥]

یہ اثر محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے اس سورت کے سببِ نزول میں ذکر کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: "حدثني شيخ من أهل مصر قدم علينا منذ بضع و أربعين سنة عن عكرمة عن ابن عباس رضی اللہ عنہما... الخ"[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یہ کہنے سے کہ حمد ہے اس کی جس نے اپنے بندے پر کتاب اُتاری، یہ خبر ہے کہ یہ کتاب اس لیے نازل کر رہا ہوں، تاکہ لوگ اس پر ایمان لائیں۔ عوج سے یہ مراد ہے کہ اس کتاب میں کسی طرح کا خلل اور زلل لفظ اور معنی میں نہیں ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ یعنی اختلاف نہیں ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے کہا: ﴿ وَلَوۡ كَانَ مِنۡ عِنۡدِ غَيۡرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوۡا فِيۡهِ اخۡتِلَافًا كَثِيۡرًا ﴾ [النساء: ٨٢] "اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ یقیناً اس میں بہت کچھ اختلاف پاتے۔"[2] مراد معانی سے اختلاف اور تضاد کی نفی ہے۔ بعض نے کہا کہ عوج

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٥٩٢۔ ٥٩٣) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔ [2] معاني القرآن (٣/ ٢٦٧)

سے مراد یہ ہے کہ یہ مخلوق کا کلام نہیں ہے۔

﴿ قَيِّمًا ﴾ سے مراد مستقیم ہے، یعنی افراط وتفریط کے بغیر۔ یا دارین میں بندوں کی بہتری کو قائم رکھنے والا ہے۔ یا پہلے کی آسمانی کتابوں کو قائم رکھنے والا ہے، ان کے صحیح ہونے پر گواہ ہے۔ یا سراپائے عدل ہے، اس میں کسی طرح کی کجی نہیں ہے۔ بہرحال کفار کو اللہ کے سخت عذاب سے ڈراتا ہے اور اہلِ ایمان کو جو عملِ صالح کرتے ہیں، خوش خبری سناتا ہے، یعنی اس بات کی کہ اُن کے لیے جنت ہے، وہ اس میں ہمیشہ بغیر انقطاع رہا کریں گے۔ انذار کو تبشیر سے پہلے کمال عنایت کے اظہار کے طور پر بیان فرمایا، جو کافروں کو زجر وتوبیخ کے لیے ہے۔

پھر خاص طور سے ان کو ڈرایا ہے جو اللہ کے لیے اولاد ثابت کرتے ہیں، جیسے: یہود ونصاریٰ اور بعض قریش جو ملائکہ کو اللہ کی بیٹیاں بتاتے ہیں، ان کو بالخصوص یہ کتاب ڈراتی ہے۔ اللہ کی طرف اولاد کی یہ نسبت کفر کی سب سے بدترین قسم ہے، ان کو کچھ علم نہیں۔ یہ لوگ اس راستے سے بالکل ناواقف ہیں جو اُن کو اللہ تک پہنچادے، بلکہ ان کے اسلاف کو بھی کچھ علم نہ تھا، بلکہ اپنے اس زعم میں گمراہی پر تھے۔ ابناء نے آباء کی تقلید اختیار کی، سب کے سب گمراہ ہو گئے۔ یہ اس قول کے فاسد اور باطل ہونے میں مبالغہ ہے، اس لیے فرمایا: ﴿ اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ﴾ (آیتِ باب) بڑا سخت کلمہ ہے جو اِن جاہلوں کے منہ سے نکلتا ہے۔ شیطان اکثر انسانوں کے دلوں میں اس قسم کے منکرات کا وسوسہ ڈالتا ہے، جس کے کہنے سے وہ رک نہیں سکتے، ان کا یہ کہنا جھوٹ ہے، کسی حال میں بھی اس بنائی ہوئی بات میں سچائی کا شائبہ تک نہیں ہے۔ یہ صرف ان کی خلل والی عقل کی بات ہے یا اُن کے بیمار ذہن کی سوچ ہے اور فساد اور بطلان کی انتہا ہے۔[1]

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۝۶ اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝۷ وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا ۝۸

پھر شاید آپ تو خود کو ان کے پیچھے غم سے ہلاک کرنے والے ہیں، اگر یہ (کافر) اس بات (قرآن) پر ایمان نہ لائیں ⑥ بلاشبہ ہم نے جو کچھ روئے زمین پر ہے، اسے اس کی زینت بنایا ہے، تاکہ ہم انھیں آزمائیں کہ ان میں عمل کے لحاظ سے کون زیادہ اچھا ہے ⑦ اور جو کچھ اس (زمین) پر ہے، بلاشبہ یقیناً ہم اسے چٹیل میدان بنا دینے والے ہیں ⑧

مشرکوں کے ایمان نہ لانے پر غم نہ کریں:

اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو مشرکین پر غم کرنے میں کہ وہ ایمان چھوڑ کر دور جاتے ہیں، تسلی دی، جیسے اللہ تعالیٰ

[1] فتح البیان (۸/ ۹۔ ۱۲)

نے فرمایا: ﴿ فَلَا تَذۡهَبۡ نَفۡسُكَ عَلَيۡهِمۡ حَسَرٰتٍ ﴾ [الفاطر: ۸] ''لہٰذا آپ کی جان ان پر افسوس کرتے ہوئے نہ جاتی رہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَلَا تَحۡزَنۡ عَلَيۡهِمۡ ﴾ [النحل: ۱۲۷، النمل: ۷۰] ''اور ان (کفار) پر غم نہ کھائیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ لَعَلَّكَ بَٰخِعٞ نَّفۡسَكَ أَلَّا يَكُونُواْ مُؤۡمِنِينَ ﴾ [الشعراء: ۳] ''(اے نبی!) شاید اس (غم) سے کہ وہ لوگ ایمان نہیں لاتے، آپ خود کو ہلاک ہی کر لیں گے۔''

﴿ بَٰخِعٞ ﴾ کے معنی ہیں غم سے جان کو ہلاک کرنے والا۔ حدیث سے اس جگہ مراد قرآن ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ کیا تو غضب اور حزن میں اپنی جان کا قاتل ہوگا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: "اسف" بہ معنی جزع ہے۔[1] یعنی تو اُن پر تاسف نہ کر، بلکہ اللہ کی رسالت کو پہنچا دے کہ جو کوئی ہدایت یاب ہوگا تو اس کا بھلا ہے اور جو کوئی گمراہ ہوگا اس کے لیے بُرا ہے، تو اپنی جان کو اِن حسرتوں میں کیوں تباہ کرتا ہے؟!

پھر اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ دنیا ایک دارِ فانی ہے، جو کہ زائل ہو جانے والی زیب و زینت کے ساتھ مزین ہے۔ ہم نے اس کو آزمایش کا گھر ٹھہرایا ہے نہ کہ قرار کا گھر، تاکہ ہم آزمایش کر لیں کہ کون شخص اچھا کام کرتا ہے اور کون برا۔ سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے: « إِنَّ الدُّنْيَا حُلْوَةٌ خَضِرَةٌ، وَإِنَّ اللّٰهَ مُسْتَخْلِفُكُمْ فِيهَا، فَنَاظِرٌ مَا ذَا تَعْمَلُونَ، فَاتَّقُوا الدُّنْيَا وَاتَّقُوا النِّسَاءَ، فَإِنَّ أَوَّلَ فِتْنَةِ بَنِي إِسْرَائِيلَ كَانَتْ فِي النِّسَاءِ »[2] [بے شک دنیا شیریں اور سرسبز و شاداب ہے اور بے شک اللہ تعالیٰ تمھیں اس میں جانشین بنانے والا ہے، تاکہ وہ دیکھے کہ تم اس میں کس طرح کے عمل کرتے ہو، پس دنیا سے بچو اور عورتوں سے بھی ڈرو، بنی اسرائیل میں سب سے پہلا فتنہ جو رونما ہوا وہ عورتوں ہی کی وجہ سے تھا] پھر اللہ تعالیٰ نے دنیا کے زوال اور فنا کی خبر دی کہ یہ جگہ ویران ہو جائے گی اور ہم اس گھر کو اس رونق کے بعد ویران کر دیں گے۔ جو چیز روئے زمین پر ہے وہ ہلاک ہو جائے گی اور زمین ایک بے کاہ و گیاہ میدان رہ جائے گا، جس سے کچھ نفع حاصل نہ ہو سکے گا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ روئے زمین کی ہر چیز تباہ و برباد ہو جائے گی۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے یہ کہا کہ ﴿ صَعِيدٗا جُرُزًا ﴾ اس میدان کو کہتے ہیں جو ہر چیز سے خالی ہو۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ صَعِيدٗا ﴾ وہ زمین ہے جس میں کوئی درخت اور سبزہ نہ ہو۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا کہ صعید وہ زمین ہے جس میں کوئی شے نہ ہو، تُو نے اللہ کا یہ فرمان نہیں دیکھا: ﴿ أَوَلَمۡ يَرَوۡاْ أَنَّا نَسُوقُ ٱلۡمَآءَ إِلَى ٱلۡأَرۡضِ ٱلۡجُرُزِ فَنُخۡرِجُ بِهِۦ زَرۡعٗا تَأۡكُلُ مِنۡهُ أَنۡعَٰمُهُمۡ وَأَنفُسُهُمۡۚ أَفَلَا يُبۡصِرُونَ ﴾ [السجدة: ۲۷] ''کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ بے شک ہم پانی کو بنجر زمین کی طرف بہالے جاتے ہیں، پھر ہم اس کے ذریعے سے کھیتی نکالتے ہیں، اس سے ان کے چوپائے اور وہ

---

[1] تفسیر الطبري (۱۷/ ۵۹۷۔ ۵۹۸)
[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۷۴۲)

خود بھی کھاتے ہیں، کیا پھر وہ غور نہیں کرتے؟'' امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا: معنی یہ ہیں کہ جو کچھ زمین پر ہے فنا کے گھاٹ میں اترنے والا ہے اور مرجع اللہ کی طرف ہے پھر تو اس پر افسوس نہ کر جو تو ان سے سنتا اور دیکھتا ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ "بخع" بہ معنی جہد ہے، "أسف" بہ معنی غصہ اور غم کے ہے۔ اور ﴿ مَا عَلَى الْأَرْضِ ﴾ سے مراد حیوانات، نباتات، درخت، نہریں اور جمادات وغیرہ ہیں، جیسے: سونا چاندی اور معدنیات، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ﴾ [البقرۃ: ۲۹] ''وہی ہے (اللہ) جس نے تمھارے لیے پیدا کیا سب کا سب جو کچھ زمین میں ہے۔'' سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یعنی رجال اور علما زینتِ ارض ہیں۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے بھی یہی کہا ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا کہ اس سے مراد وہ عبادت گزار مرد ہیں جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں اعمال بجا لانے والے ہیں۔[2]

ابتلاء سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کے ساتھ ایسا معاملہ کرتا ہے کہ اگر وہ معاملہ غیر کی طرف سے ہوتا تو وہ امتحان اور آزمایش کے قبیل سے ٹھہرتا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ یعنی تا کہ ہم امتحان لیں کہ یہ شخص عمل میں اچھا ہے یا وہ شخص۔[3] امام حسن رحمہ اللہ نے کہا کہ یعنی کون اُن میں زیادہ زاہد اور تارکِ دنیا ہے۔ امام ثوری رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[4] امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا کہ کون اُن میں مال کے بارے میں زیادہ صالح ہے۔[5] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ کون کامل العقل ہے۔[6]

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے حدیث میں مروی ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کو پڑھا۔ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! اس کے کیا معنی ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « لِیَبْلُوَكُمْ أَیُّكُمْ أَحْسَنُ عَقْلًا، وَأَوْرَعُ عَنْ مَحَارِمِ اللّٰهِ وَأَسْرَعُكُمْ فِيْ طَاعَةِ اللّٰهِ »[7] (رواه ابن جرير و ابن أبي حاتم و الحاكم في التاريخ و ابن مردويه) [تا کہ وہ تمھیں آزمائے کہ تم میں عقل کے لحاظ سے کون زیادہ اچھا ہے، اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں سے زیادہ بچنے والا ہے اور تم میں سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں جلدی کرنے والا ہے] یہ حدیث اگر ثابت ہے تو پھر اس کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے، پھر اللہ پاک نے فرمایا کہ جو زینت، رونق اور بہار زمین کے اوپر ہے، ہم اس کو خاک خشک کر دیں گے، یعنی دنیا کی عمر کے ختم ہونے کے وقت۔ صعید کے معنی ہیں خاک۔ ابو عبیدہ نے کہا کہ صعید ہموار زمین کو کہتے ہیں۔[8]

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٥٩٩۔ ٦٠٠) [2] الدر المنثور (٥/ ٣٦١) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٤٥) [3] معاني القرآن (٣/ ٢٦٩)

[4] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٤٥) [5] فتح القدير (٣/ ٣٧٥) [6] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٤٥)

[7] تفسير الطبري (١٥/ ٢٥٠۔ ٢٥١) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٤٥) اس کی سند میں ''داود بن محبر'' سخت ضعیف راوی ہے۔

[8] فتح القدير (٣/ ٣٧٥)

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ صعید وہ راستہ ہے جس میں کوئی گھاس نہ ہو[1] اس کے بعد کہ وہ سرسبز تھا، یعنی چکنی زمین۔ بعض نے کہا کہ یعنی جو ریزہ ریزہ ہو، ایسے مضمحل ہو جائے، نہ خشک جو جم جائے۔ اس آیت کی مثل یہ فرمان ہے: ﴿ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴾ [الرحمن: ٢٦] ''ہر چیز، جو اس (زمین) پر ہے، فنا ہونے والی ہے۔'' اور یہ فرمان: ﴿ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ۝ لَا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا ﴾ [طه: ١٠٦۔ ١٠٧] ''پھر وہ اس (زمین) کو چٹیل میدان (بنا) چھوڑے گا۔ آپ اس میں نہ کوئی کجی دیکھیں گے اور نہ اُبھری جگہ۔'' یعنی ان چیزوں کو جو زمین پر ہیں فنا کرنے کے بعد ضروری ہے کہ جزا سزا بھی ہو۔ ہلاکت کے لیے صرف انھی چیزوں کو مخصوص کرنے میں جو زمین کے اوپر ہیں یہ خیال آتا ہے کہ زمین باقی رہے گی۔ لیکن تمام آیات اس بات پر دلیل ہیں کہ زمین باقی نہ رہے گی اور یہی اللہ تعالیٰ کا فرمان بھی ہے: ﴿ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ ﴾ [إبراهيم: ٤٨] ''جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی۔''

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ صعید وہ پہاڑ ہیں جن میں کھیتی نہیں ہوتی۔ جرز سے مراد خشک ہے، یعنی وہ زمین جس میں کوئی روئیدگی نہ ہو۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا کہ یعنی ویران زمین۔[2] مطلب یہ ہے کہ یعنی ہم زمین کو اس کے آباد ہونے کے بعد ویران کر دیں گے، حیوانات مر جائیں گے، نباتات سوکھ جائیں گی اور درخت خشک ہو جائیں گے۔ نظم قرانی کے معنی یہ ہیں کہ اے پیغمبر! تم کچھ غم و اندوہ نہ کرو اس تکذیب پر جو اُن کفار سے واقع ہوتی ہے، کیوں کہ دنیا کی یہ رونق ہم نے ان کی آزمایش کے لیے بنائی ہے اور یہ رونق دنیا کی عمر کے ختم ہونے کے ساتھ ہی جاتی رہے گی۔ اس وقت ہر شخص اپنے عمل کی جزا پائے گا، خیر والا خیر اور شر والا شر۔[3]

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ ۙ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۝ اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۝ فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ۝ ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا ۝

کیا آپ نے خیال کیا ہے کہ غار اور کتبے والے ہماری نشانیوں میں سے ایک عجیب (نشانی) تھے؟ ⑨

---

① معاني القرآن (٣/ ٢٦٩)

② امام شوکانی رحمہ اللہ نے ان دونوں اقوال کو اپنی تفسیر فتح القدیر میں ابن ابی حاتم سے نقل کیا ہے اور تفسیر ابن ابی حاتم میں، نیز امام سیوطی رحمہ اللہ نے ''الدر المنثور'' میں ان دونوں اقوال کو ابن ابی حاتم سے نقل کیا ہے، لیکن الفاظ کچھ یوں ہیں: صعید سے مراد مٹی ہے اور جرز سے مراد کہ جس میں کھیتی نہیں ہوتی۔ اور دوسرا قول امام حسن رحمہ اللہ کے بجائے سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: فتح القدیر (٣/ ٣٧٦) تفسیر ابن أبي حاتم (٧// ٢٣٤٥۔ ٢٣٤٦) الدر المنثور (٥/ ٣٦١)

③ فتح البيان (٨/ ١٢۔ ١٤)

جب ان نوجوانوں نے غار کی طرف پناہ لی، تو انھوں نے کہا: اے ہمارے رب! ہمیں اپنے پاس سے رحمت دے اور ہمارے لیے ہمارے معاملے میں صحیح راہنمائی مہیا فرما⑩ پھر ہم نے غار میں ان کے کانوں پر گنتی کے کئی برس تھپک دیے⑪ پھر ہم نے انھیں اُٹھایا، تاکہ ہم معلوم کریں کہ دو گروہوں میں سے کون اس مدت کو زیادہ یاد رکھنے والا ہے، جو انھوں نے گزاری⑫

قصۂ اصحابِ کہف:

دو فرقے تاریخ لکھنے والوں میں ہیں کہ کوئی کتنے برس لکھتے ہیں کوئی کتنے۔ یا وہی اصحابِ کہف جاگ کر بعض تجویز کرنے لگے کہ ہم ایک دن سوئے، بعض کہنے لگے کہ اس سے کم۔

اللہ تعالیٰ نے اس جگہ اصحابِ کہف کے قصے کی اجمالی طور پر اور مختصر خبر دی۔ پھر بعد میں اس کو تفصیل سے بیان فرمایا۔ کہا: اے پیغمبر! غار والوں کی کہانی ہماری قدرت اور سلطنت کے سامنے کوئی عجیب معاملہ نہیں ہے، کیوں کہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور رات اور دن کا مختلف ہونا اور سورج اور چاند کی تسخیر اور اس کے علاوہ اور بڑی بڑی نشانیاں ہیں جو ہماری قدرت پر دلیل ہیں اور ہمیں کوئی چیز عاجز نہیں کرتی، وہ اصحابِ کہف کے قصے سے بھی زیادہ عجیب ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ ہماری قدرت کی بہت سی ایسی نشانیاں ہیں جو اس قصے سے زیادہ تعجب انگیز ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو علم، سنت اور کتاب ہم نے تم کو دیا ہے، وہ اصحابِ کہف و رقیم کی حالت سے بھی افضل ہے۔ امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا کہ جو حجتیں ہم نے ظاہر کی ہیں، اپنے بندوں پر وہ کہف والوں کے حال سے بھی زیادہ عجیب و غریب ہیں۔[1]

"کہف" کہتے ہیں غار کو جو پہاڑ میں ہو۔ یہ جوان لوگ پہاڑ کے غار میں جا چھپے تھے۔ رہا رقیم سو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ایک وادی ہے ایلہ کے قریب۔ یہی قول امام عطیہ عوفی اور امام قتادہ رحمہ اللہ کا بھی ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا کہ کہف وادی کا غار ہے اور رقیم وادی کا نام ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ رقیم ان کی ایک عمارت تھی اور بعض نے کہا کہ رقیم وہ وادی تھی جس میں وہ غار واقع ہوا تھا۔ کعب کا زعم یہ ہے کہ رقیم بستی تھی۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ پہاڑ تھا جس میں غار تھا، اس پہاڑ کا نام بنجلوس تھا۔ شعیب جبائی کہتے ہیں کہ کہف کے پہاڑ کا نام بنجلوس تھا اور کہف کا نام حیزم تھا اور کتے کا نام حمران تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں قرآن کو جانتا ہوں سوائے "حنان" و "اَوّاہ" و "رقیم" کے۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا کہ رقیم پتھر کی ایک تختی ہے جس میں اصحابِ کہف کے قصے کو لکھ کر کہف کے دروازے پر رکھ دیا گیا تھا۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا کہ رقیم بہ معنی کتاب ہے۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ﴾ [المطففين: ٩، ٢٠] "ایک کتاب ہے لکھی ہوئی۔" آیت

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٦٠١) تفسير ابن كثير (٣/ ١٠٠)

سے بھی یہی ظاہر ہے۔ اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے اور کہا کہ رقیم فعیل ہے مرقوم سے جس طرح مقتول کو قتیل اور مجروح کو جریح کہتے ہیں۔ [1]

اصحابِ کہف کا غار میں داخلہ:

اصحابِ کہف کچھ نوجوان لوگ تھے، وہ اپنا دین لے کر اپنی قوم کے پاس سے بھاگ کھڑے ہوئے، تاکہ قوم ان کو فتنے میں نہ ڈال دے، وہ بھاگ کر ایک پہاڑ کی غار میں روپوش ہو گئے، غار میں داخل ہوتے وقت اللہ تعالیٰ سے اس کی رحمت اور لطف و کرم کا سوال کیا اور کہا: اے ہمارے رب! ہم کو اپنے پاس سے رحمت دے اور ہمیں ہماری قوم سے پوشیدہ رکھ اور ہمارے اس کام کا انجام اچھا کر۔ جس طرح حدیث میں مروی ہے: «وَمَا قَضَيْتَ لَنَا مِنْ قَضَاءٍ فَاجْعَلْ عَاقِبَتَهُ رَشَدًا» [2] [اور میرے بارے میں تو جو فیصلہ بھی فرمائے اس کے انجام کو درست فرما دے]

مسند امام احمد میں بسر بن ارطاۃ رضی اللہ عنہ سے آیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا کیا کرتے تھے: «اَللّٰهُمَّ أَحْسِنْ عَاقِبَتَنَا فِي الْأُمُوْرِ كُلِّهَا وَأَجِرْنَا مِنْ خِزْيِ الدُّنْيَا وَعَذَابِ الْآخِرَةِ» [3] [اے اللہ! ہمارے تمام کاموں کا انجام اچھا کر اور ہمیں دنیا کی رسوائی اور آخرت کے عذابوں سے بچا]

اصحابِ کہف پر نیند کا غلبہ:

جب وہ جوان غار میں گھسے اللہ تعالیٰ نے ان پر سال ہا سال تک کے لیے نیند مسلط کر دی، پھر اس نیند سے ان کو ایک بار جگایا، ان میں سے ایک جوان ایک درہم لے کر باہر نکلا کہ بازار سے اُن کے لیے کھانا وغیرہ مول لائے اور وہ اس کو کھائیں۔ چناں چہ اس آمد و رفت کا ذکر آئے گا۔ لہٰذا فرمایا کہ ہم نے ان کو جگایا، تاکہ ہم یہ بات معلوم کر لیں کہ جو لوگ اُن کے بارے میں اختلاف کر رہے ہیں، اُن میں کس کو اُن کی نیند کے سالوں کی گنتی معلوم ہے۔

''امد'' سے مراد عدد ہے یا انتہا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ قوم نے جب اصحابِ کہف کے قصے سے تعجب کیا اور یہ قصہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہ طور امتحان کے پوچھا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے پیغمبر! کیا تم کو یہ گمان ہے کہ یہ غار والوں کا قصہ ہی عجیب ہے، بلکہ ہماری ساری نشانیاں اسی طرح عجیب ہیں، کیوں کہ جس کو یہ قدرت ہے کہ وہ زمین کی ساری رونق کو خاک میں ملا کر ایک ویران جگہ کر دے گویا وہ زمین کبھی آباد ہی نہ تھی تو پھر اس مخصوص گروہ کی نسبت اس کی قدرت، حفاظت اور رحمت کون

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٦٠٢۔ ٦٠٤) [2] الأدب المفرد (١/ ٢٢٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٠٤٧)

[3] مسند أحمد (٤/ ١٨١) اس کی سند میں ''ایوب بن میسرہ'' متکلم فیہ راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٢٩٠٧)

سے تعجب کی بات ہے۔ اگرچہ ان کا قصہ خارقِ عادت ہے (عام عادت کو توڑنے والا، عجیب وغریب معجزہ)۔

اللہ تعالیٰ کی ساری نشانیاں اسی طرح کی ہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ بڑی ہوتی ہیں۔ عجب کے معنی ذاتِ عجب کے ہیں، جو غار پہاڑ کا وسیع ہوتا ہے اس کو کہف کہتے ہیں اور اگر چھوٹا ہو تو اس کو غار بولتے ہیں۔ اس کی جمع کثرت ''کہوف'' اور جمع قلت ''اکہف'' ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا کہ ایک پتھر کی لوح پر یا تانبے کی تختی پر اصحابِ کہف کے نام لکھ کر کہف کے دروازے پر لٹکا دی تھی،[1] اس میں لکھا تھا کہ فلاں بن فلاں، فلاں شہر کا ہے، فلاں سال کے فلاں وقت میں وہ نکلا تھا، اس کو رقیم کہا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: اس لیے کہ اس لوح پر ان کے نام رقم تھے۔[2] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ رقیم سے مراد وہ درہم ہیں، جو اُن کے ساتھ تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ رقیم ایک کتاب تھی جس میں اُن کی شریعت، جس کے ساتھ عیسیٰ علیہ السلام کے دین سے چمٹے ہوئے تھے، لکھی تھی۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رقیم اُن کے کتے کا نام تھا۔[3] بالجملہ کہف والوں نے پہاڑ کے ایک بڑے غار میں جگہ پکڑی۔

''فتیہ'' جمع ہے فتیٰ کی، فتیٰ تروتازہ نوجوان کو کہتے ہیں۔ اس میں اس بات کا اشارہ ہے کہ وہ لوگ جوان تھے، عین جوانی کے آغاز میں بغیر ڈاڑھی مونچھ کے تھے اور سب سات شخص تھے۔ اپنے شہر سے اپنے ایمان پر ڈر کر نکل کھڑے ہوئے۔ ان کی قوم کافر تھی۔ قوم نے کہا تھا کہ تم غیر اللہ کو پوجو۔ شہر کے بادشاہ نے بھی اُن کو یہی حکم دیا تھا۔ اس شہر یار کا نام دقیانوس تھا اور شہر کا نام اہلِ روم کے نزدیک افسوس تھا، اس لیے کہ یہ شہر انہی کے شہروں میں سے تھا اور عرب کے نزدیک اس کا نام طرسوس ہے۔ جب اُن سات نوجوانوں کو یہ حکم دیا کہ تم غیر اللہ کی عبادت کرو تو اُن میں سے ہر ایک اپنے باپ کے گھر میں گیا اور کچھ زادِ راہ اور نفقہ لے کر نکلا۔ پھر سب نے متفق ہو کر راستہ لیا اور شہر کے قریب ایک پہاڑ تھا، اس میں جا کر چھپ گئے اور اللہ کی عبادت کرنے لگے۔ وہ کھاتے پیتے تھے اور ایک کو خفیہ طور پر شہر سے کھانا خرید کر کے لانے کو بھیج دیتے تھے اور اپنے بارے میں ڈرتے تھے کہ کہیں شہر والوں کو ہماری خبر نہ ہو جائے اور وہ اُن کو کفر اور شرک میں داخل نہ ہونے پر قتل نہ کر دیں۔

ایک دن غروبِ آفتاب کے بعد بیٹھ کر باتیں کرنے لگے، اللہ تعالیٰ نے اُن پر نیند مسلط کر دی، جیسے اس کی تفصیل آئے گی۔ یہی مراد ہے ''ضرب علی الأذان'' سے۔ جب وہ نکلے تھے تو انھوں نے یہ دعا کی تھی کہ اے رب! تو ہم کو اپنے پاس سے رحمت دے۔ اس رحمت سے مراد آخرت میں بخشش ہے اور دشمنوں سے امن اور دنیا میں رزق، اور یہ کہ ہمارا کام درست کر دے اور وہ کام یہی کفار سے علاحدگی تھی، تاکہ ہمیں پھر اُن سے ملنے جلنے کی ضرورت نہ پڑے۔ رشد ضلال کی ضد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ہم نے اُن کے کان تھپک دیے، یعنی ان کو سلا دیا اور ان کے کان خواب سے بند کر دیے۔ نیند کے غلبے میں آواز سنائی نہیں دیتی۔ یہ نیند اُن رحمتوں میں سے تھی جن کے

---

[1] فتح القدير (٣/ ٣٧٧) [2] فتح القدير (٣/ ٣٧٧) [3] تفسير القرطبي (١٠/ ٣٥٧)

لیے دعا کی گئی تھی۔ گویا یہ فرمایا کہ ہم نے ان کی دعا قبول کرلی۔ من جملہ استجابت (قبولیت) کے ایک یہ تھا کہ اُن کو سلا دیا اور نیند کی حالت میں کئی کروٹیں دائیں اور بائیں اسی غار میں چند سال تک بدلتے رہے۔ آیت میں عدد کو سنین کے بعد ذکر کرنے کی وجہ سے سالوں کی گنتی زیادہ ہونا مناسب ہے اور بعض نے کہا کہ مراد تھوڑی مدت ہے، اس لیے کہ اللہ کے نزدیک کثیر بھی قلیل ہے: ﴿ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴾ [الحج: ٤٧] ''اور بلاشبہ آپ کے رب کے ہاں ایک دن تمھاری گنتی کے حساب سے ایک ہزار برس کی طرح ہے۔''

پھر ہم نے ان کو اس خواب سے جگایا، اس لیے کہ ہمارا علم ظاہر ہو۔ علم سے اس جگہ مراد آزمائش ہے کہ قوم میں سے کہف کے ہر دو گروہوں میں سے کون زیادہ ضابط ہے، ان کے غار میں ٹھہرنے کی مدت کے بارے میں۔ ہدایت یافتہ لوگ اور گمراہ لوگ، یعنی مومن اور کافر ان کے غار میں ٹھہرنے کی مدت کے بارے میں اختلاف رکھتے ہیں۔ بعض نے کہا کہ مراد صرف اصحابِ کہف ہیں نہ کہ شہر کے لوگ، وہ جب خواب سے بیدار ہوئے تو خود اُن میں اختلاف پڑا کہ ہم اس جگہ کتنی مدت رہے یا ان دو گروہوں سے مراد وہ شہر کے بادشاہ ہیں، جو کہ یکے بعد دیگرے آتے رہے اور اصحابِ کہف۔

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا کہ مسلمین کے دو گروہوں نے اصحابِ کہف کے زمانۂ غار کے بارے میں اختلاف کیا کہ اُن کی ٹھہرنے کی مدت کتنی ہے۔[1] اس لیے اللہ تعالیٰ نے اُن کو بیدار کر دیا کہ حقیقتِ حال ظاہر ہو جائے اور جس کو حساب کرنا نہیں آتا وہ حساب کو ضبط کر لے۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا کہ انھوں نے اس دن اور ماہ و سال کو جس میں وہ نکلے تھے لکھ رکھا تھا۔[2]

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ
وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ۝ۤ۱۳ وَّرَبَطْنَا عَلٰي قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا
رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا۟ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰـهًا
لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا ۝۱۴ هٰٓؤُلَاۗءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ
اٰلِهَةً ۭ لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۢ بَيِّنٍ ۭ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ
افْتَرٰى عَلَي اللّٰهِ كَذِبًا ۝ۭ۱۵ وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ
اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ
لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ۝۱۶

ہم ان کا حال ٹھیک ٹھیک آپ سے بیان کرتے ہیں، بے شک وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان

[1] فتح القدير (٣/ ٣٧٨) [2] الدر المنثور (٥/ ٣٧٠) فتح البيان (٨/ ١٤۔ ١٨)

لائے اور ہم نے انھیں ہدایت میں زیادہ کیا⑬ اور ہم نے ان کے دل مضبوط کر دیے، جب وہ کھڑے ہوئے تو بولے: ہمارا رب تو آسمانوں اور زمین کا رب ہے، ہم اس کے سوا کسی معبود کو ہرگز نہیں پکاریں گے، (اگر پکارا) تو یقیناً اس وقت ہم نے ظلم و زیادتی والی بات کہی⑭ یہ ہماری قوم ہے، انھوں نے اللہ کے سوا کئی الٰہ بنا رکھے ہیں، وہ ان (کی عبادت) پر واضح دلیل کیوں نہیں لاتے؟ پھر اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے، جس نے اللہ پر جھوٹ گھڑا⑮ اور جب تم ان (لوگوں) سے اور جن کی وہ اللہ کے سوا عبادت کرتے ہیں ان سے الگ ہو گئے ہو تو غار میں پناہ لو، کہ تمھارا رب اپنی رحمت (میں سے) تم پر پھیلا دے گا اور تمھارے لیے تمھارے کام میں آسانی پیدا کر دے گا⑯

اصحابِ کہف کا اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا اور اپنی قوم سے علاحدہ ہونا:

ایک شہر کا بادشاہ ظالم تھا، جو اُس کے بتوں کو نہ پوجتا اس کو عذاب سے مارتا یا بت پجواتا۔ یہ کئی جوان اس کے نوکروں کے بیٹے تھے، کوئی نان بائی کا تو کوئی باورچی کا۔ اسی طرح کسی نے ان کی چغلی کی، اس نے روبرو بلا کر پوچھا، اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کے دل پر گرہ دی، یعنی ثابت رکھا کہ اپنی بات صاف کہہ دی، اس وقت بادشاہ نے موقوف رکھا کہ اور شہر سے پھر آؤں تو اُن سے بت پوجنا قبول کراؤں یا عذاب کروں۔ وہ شہر میں گیا اور یہ چھپ کر نکل گئے، شہر سے نکل کر پاس ہی پہاڑ میں ایک غار تھا، آپس میں مشورہ کر کے اس میں جا بیٹھے۔ نیند غالب ہوئی سو گئے، کسی کو معلوم نہ تھا کہ اس وقت سے اب تک سوتے ہیں۔ بیچ میں ایک بار اللہ تعالیٰ نے جگا دیا تھا، جس سے لوگوں پر خبر کھلی، پھر سو رہے۔ اللہ پاک نے اس جگہ سے قصہ کا بیان شروع کیا اور اس کی وضاحت فرمائی کہ اصحابِ کہف نوخیز جوان تھے اور حق کو قبول کرنے والے اور اُن بوڑھوں کی نسبت زیادہ راہ یاب تھے، جو سرکش تھے اور دینِ باطل میں ڈوبے ہوئے تھے۔ لہٰذا اللہ اور رسول کی بات اور دین کو قبول کرنے والے اکثر یہی جوان لوگ تھے۔ رہے مشائخِ قریش سو عموماً اپنے دینِ باطل پر جمے رہے اور مسلمان نہ ہوئے مگر تھوڑے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اصحابِ کہف کے بارے میں خبر دی کہ وہ سب جوان اور نوعمر تھے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ مجھ کو یہ بات پہنچی ہے کہ اُن میں سے بعض کے کانوں میں گوشوارہ پڑا تھا، یعنی حلقہ بگوش تھے۔[1] اللہ تعالیٰ نے اُن کو رشد و ہدایت کا الہام دیا اور تقویٰ دیا۔ وہ اللہ کی وحدانیت پر ایمان لے آئے اور لا اِلٰہ الا ھو کی شہادت دی۔ اللہ نے ان کو ہدایت میں زیادہ کر دیا۔ اس آیت سے اور جو آیت اس جیسی ہے، اس سے بہت سے ائمہ نے، جیسے: امام بخاری رحمہ اللہ وغیرہ ہیں، جو ایمان کے زیادہ اور افضل ہونے کی طرف گئے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایمان زیادہ اور کم ہوتا ہے، ایمان کی کمی بیشی پر یہ استدلال کیا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ﴾ (آیتِ باب) نیز فرمایا:

---

① تفسیر ابن کثیر (۳/ ۱۰۱)

﴿ وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ ﴾ [محمد: ١٧] ''اور جن لوگوں نے ہدایت پائی ہے، اللہ نے انھیں ہدایت میں زیادہ کیا اور انھیں ان کا تقویٰ عطا فرمایا۔''

نیز فرمایا: ﴿ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴾ [التوبة: ١٢٤] ''چناں چہ جو لوگ ایمان لائے ہیں، اس (سورت) نے ان کو ایمان میں زیادہ کیا ہے اور وہ خوش ہوتے ہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ ﴾ [الفتح: ٤] ''تاکہ ان کے ایمان میں اور ایمان کا اضافہ ہو۔'' اس کے سوا اور بھی بہت سی آیتیں ہیں جن میں ایمان کے زیادہ ہونے کی دلیل ہے۔[1] وللّٰه الحمد۔ یہ جوان مسیح علیہ السلام کے دین پر تھے۔ واللّٰه أعلم۔ ظاہر یہ ہے کہ وہ ملتِ نصرانیہ سے بالکل قبل تھے، کیوں کہ اگر دینِ نصرانیت پر ہوتے تو احبارِ یہود اُن کے بارے میں خبر معلوم کرنے کے لیے نہ کہتے، کیوں کہ یہود نصاریٰ سے پہلے ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے گزر چکا ہے کہ قریش نے کچھ لوگ علمائے یہود کے پاس مدینہ میں بھیجے تھے، ان سے چند ایسی اشیا کا سوال کیا تھا جس سے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا امتحان لیں۔ انھوں نے کہا کہ اصحابِ کہف اور ذوالقرنین کا حال معلوم کرو اور روح کے بارے میں سوال کرو۔[2] یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اصحابِ کہف کا معاملہ کتبِ یہود میں تحریر تھا اور یہ معاملہ دینِ نصرانیت سے پہلے کا ہے۔ واللّٰه أعلم۔ ربطِ علی القلب سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو قوم کی مخالفت اور شہر کو ترک کرنے اور عیش و عشرت اور فراوانی کی جدائی اور دنیا کی سعادت اور نعمت کے چھن جانے پر صبر عطا فرمایا، کیوں کہ بہت سے مفسرین نے سلفاً وخلفاً ذکر کیا ہے کہ وہ روم کے بادشاہوں کی اولاد اور ساداتِ قوم میں سے تھے۔ ایک دن وہ قوم کی عیدوں میں سے کسی میں باہر نکلے، پورے سال میں شہر کے باہر اجتماع ہوتا تھا۔ اُن کی قوم جو بتوں اور طاغوتوں کی عبادت کرتی تھی، وہ اُن بتوں کے لیے جانور ذبح کرتے تھے، ان کا ایک ظالم بادشاہ تھا جو بہت جابر اور سرکش تھا، اس کا نام دقیانوس تھا، وہ لوگوں کو اس بت پرستی کا حکم دیتا تھا اور غیر اللہ کی عبادت پر آمادہ کرتا تھا اور شرک و کفر کی طرف دعوت دیتا تھا، جب لوگ اس اجتماع کے لیے گھروں سے باہر نکلے اور یہ جوان بھی اپنے آبا اور قوم کے ہمراہ باہر آئے اور چشمِ بصیرت سے قوم کی حرکتوں کی طرف نظر کی تو جان لیا کہ قوم کو یہ بتوں کو سجدہ کرنا اور ان بتوں کے لیے جانوروں کا ذبح کرنا ہرگز نہ چاہیے، یہ بات تو صرف اللہ ہی کے لیے زیبا اور لائق ہے، جس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے۔ پھر اُن میں سے ہر ایک شخص اپنی قوم سے جدا ہو کر کنارہ کش ہونے لگا۔ سب سے پہلے اُن میں سے ایک شخص ایک درخت کے سائے کے نیچے الگ ہو کر جا بیٹھا، پھر دوسرا بھی وہیں آ کر بیٹھ گیا، پھر تیسرا اُن کے پاس آیا اور بیٹھ گیا، پھر چوتھا آیا تو وہ بھی ان تینوں کے پاس بیٹھ گیا، پھر پانچواں آیا اور ایک دوسرے کو پہچانتا نہ تھا، ان کو ایک جگہ اسی شخص نے بٹھایا جس نے اُن کے دلوں کو ایمان پر جمع کیا تھا، یعنی اللہ تعالیٰ

[1] صحيح البخاري (١/ ٧) [2] تفسير الطبري (١٧/ ٥٩٢۔ ٥٩٣)

نے جس طرح کہ صحیح بخاری میں عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً مروی ہے: «اَلْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُجَنَّدَةٌ، فَمَا تَعَارَفَ مِنْهَا ائْتَلَفَ وَمَا تَنَاكَرَ مِنْهَا اخْتَلَفَ» [1] (رواه مسلم أيضا عن أبي هريرة يرفعه) [روحیں جمع کیے گئے لشکر ہیں، ان میں سے جو ایک دوسرے سے متعارف ہوتی ہیں وہ اکٹھی ہو جاتی ہیں اور جو ایک دوسرے سے اجنبی ہوتی ہیں، وہ الگ الگ ہو جاتی ہیں] لوگ کہتے ہیں کہ جنسیت ضم ہونے کی علت ہوتی ہے، یعنی ایک جیسی چیزیں اکٹھی ہو جاتی ہیں۔

دل را بدل رہیست دریں گنبد سپهر — از کینہ سوئے کینہ و از مہر سوئے مہر

[دل کو دل کا راہ ہوتا ہے، کینے کو کینے کی طرف اور محبت کو محبت کی طرف]

غرض یہ کہ ہر ایک اپنے اصحاب کے ڈر سے دل کی بات چھپاتا تھا اور یہ نہ جانتا تھا کہ وہ بھی ہماری ہی طرح ہے، یہاں تک کہ اُن میں سے ایک نے کہا کہ واللہ! تم جانتے ہو کہ جس چیز نے تم کو تمھاری قوم میں سے باہر نکالا ہے اور اکیلا اس جگہ لا کر بٹھایا، آخر کوئی بات ہے۔ تم میں ہر ایک اپنا معاملہ ظاہر کرے۔ دوسرے نے کہا کہ میرا حال یہ ہے کہ واللہ! میں نے وہ دیکھا کہ جس پر میری قوم ہے، میں نے جان لیا کہ یہ باطل ہے اور عبادت کا مستحق اللہ وحدہ لا شریک لہ ہے، جس نے آسمان و زمین اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے پیدا کیا۔ تیسرے نے کہا: واللہ! یہی بات میرے دل میں بھی آئی۔ چوتھے نے کہا کہ میرا حال بھی اسی طرح ہے۔ غرض یہ کہ سب نے ایک بات پر اتفاق کیا اور اخوانِ صدق ہوئے اور اپنے لیے ایک معبد بنایا، وہاں اللہ کی عبادت کرتے۔ قوم نے جب یہ صورت حال دیکھی تو اُن کی چغلی بادشاہ کے پاس کھائی۔ بادشاہ نے اُن کو اپنے سامنے بلایا اور اُن کا حال دریافت کیا، جو بات حق تھی وہ انھوں نے کہہ دی اور بادشاہ کو اللہ عزوجل کی طرف دعوت دی۔ یہی مطلب ہے: "ربط علی القلب" کا۔ غرض یہ کہ انھوں نے کہہ دیا کہ ہم سے شرک ہرگز نہ ہوگا، اگر ہم ایسا کریں تو یہ باطل کام ہوگا۔

"شطط" سے مراد باطل، جھوٹ اور بہتان ہے۔ ہماری قوم نے جو اللہ کو چھوڑ کر اور معبود ٹھہرائے ہیں تو پھر یہ لوگ اس کے صحیح ہونے پر کوئی دلیل بتائیں۔ آخر اس دعوے کو سچا ہونے کے لیے کوئی کھلی برہان اور واضح حجت چاہیے، ورنہ جو شخص اللہ پر افترا باندھتا ہے اور جھوٹ بولتا ہے اس سے بڑھ کر ظالم، ستم گر، سرکش اور نابکار کوئی نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ بادشاہ نے ان کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اُلٹا انھیں خود دھمکایا، ڈرایا، دبایا اور حکم دیا کہ اُن کے بدن پر جو لباس ہے کہ قوم کی زینت سے ہے، وہ اُن سے اُتار لو اور اُن کو مہلت دے کر دیکھو کہ شاید یہ اپنے اس دینِ خالص سے، جس پر جمے ہوئے ہیں، رجوع کریں۔ یہ ان کے حال پر اللہ کا لطف و کرم تھا کہ اس مہلت میں اُن کو الگ ہونے، بھاگنے اور ایک جگہ قرار پانے کا موقع مل گیا۔ وہ اپنا دین لے کر فتنے سے بھاگ نکلے۔ فتنے کے واقع ہو جانے کے وقت لوگوں میں یہی امر مشروع ہے کہ بندہ دین کے خوف سے بھاگ اُٹھے، جس

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳۱۵۸) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲٦۳۸)

طرح کہ حدیث میں مروی ہے: «يُوشِكُ أَنْ يَكُوْنَ خَيْرَ مَالِ أَحَدِكُمْ غَنَمًا يَتَّبِعُ بِهَا شَعَفَ الْجِبَالِ، وَمَوَاقِعَ الْقَطْرِ، يَفِرُّ بِدِيْنِهِ مِنَ الْفِتَنِ»[1] [ممکن ہے کہ (ایسا وقت آئے جب) تم میں سے کسی کا سب سے بہتر مال بکریاں ہو کہ وہ انھیں لے کر پہاڑوں کی چوٹیوں اور بارش کی جگہوں پر چلا جائے اور اپنے دین کو فتنوں سے بچانے کے لیے بھاگ جائے] سو ایسے حال میں لوگوں سے علاحدگی اور گوشہ نشینی اور گھر میں بیٹھ رہنا مشروع ہے۔ اس حالت کے سوا اور حالت میں مشروع نہیں ہے، کیوں کہ پھر جمعہ اور جماعات کا ترک کرنا پڑے گا۔

بالجملہ جب ان کا وہاں سے نکل بھاگنے کا پکا ارادہ ہوگیا اور اللہ تعالیٰ نے بھی اُن کے لیے یہی امر پسند فرمایا اور اُن کو یہ خبر دی کہ جب تم نے اپنی قوم کو چھوڑ دیا اور دین میں جو کہ غیر اللہ کی عبادت تھی، قوم کی مخالفت اختیار کی اور تن من دونوں سے جدا ہو گئے تو اب تم اس غار میں جا بیٹھو، اللہ تم پر اپنی رحمت کا پھیلاؤ کر دے گا اور تمھیں قوم کی نظروں سے پوشیدہ رکھے گا اور تمھارے اس کام میں فائدے کی بات مہیا فرمائے گا۔ تب وہ اس غار کی طرف بھاگے اور وہاں جگہ پکڑی اور چھپ رہے، قوم نے اُن کو اپنے درمیان نہ پایا اور بادشاہ نے بھی جستجو کی، مگر وہ ہاتھ نہ آئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی خبر مخفی کر دی، جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اور اُن کے غار کے ساتھی صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا کہ جب وہ غارِ ثور میں جا چھپے اور مشرکینِ قریش نے اُن کی تلاش کی تو راہ نہ پائی، حالاں کہ ان کا گزر اس غار پر ہوتا تھا اور وہ غار اُن کے نزدیک تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی گھبراہٹ دیکھی اور اُن کا یہ کلمہ سنا: "يا رسول الله! لو أن أحدهم نظر إلى موضع قدميه لأبصرنا" [اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)! اگر ان میں سے کسی نے اپنے پاؤں کی طرف دیکھا تو وہ ہمیں دیکھ لے گا] تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا: «يَا أَبَا بَكْرٍ: مَا ظَنُّكَ بِاثْنَيْنِ اللّٰهُ ثَالِثُهُمَا»[2] [اے ابوبکر! ان دونوں کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے جن کے ساتھ تو تیسرا اللہ ہے] اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ [التوبة: ٤٠] "اگر تم اس (نبی) کی مدد نہیں کرو گے تو تحقیق اللہ نے اس کی (اس وقت) مدد کی (تھی) جب کافروں نے اس کو (مکہ سے) نکال دیا تھا، (وہ) دو میں دوسرا تھا، جب کہ وہ دونوں غار (ثور) میں تھے، جب وہ (نبی) اپنے ساتھی (ابوبکر) سے کہہ رہا تھا: غم نہ کر، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے، پھر اللہ نے اس پر اپنی سکینت نازل کی اور ایسے لشکروں سے اس کی مدد کی جنھیں تم نے نہیں دیکھا، اور اس نے کافروں کی بات کو پست کر دیا، اور بات تو اللہ ہی کی بلند ہے۔ اور اللہ بہت زبردست ہے، خوب حکمت والا ہے۔"

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٥٣) صحيح مسلم، رقم (٢٣٨١)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ غارِ ثور کا یہ قصہ اصحابِ کہف کے قصے سے اشرف، افضل، اعظم اور زیادہ عجیب ہے، حالاں کہ بعض نے کہا ہے کہ اُن کی قوم نے ان کو پا لیا تھا اور غار کے دروازے پر، جس میں وہ داخل ہوئے تھے، کھڑے ہوئے، لیکن یہ کہا کہ جو کچھ انھوں نے اپنی جان کے ساتھ کیا ہے، ہم اس سے زیادہ سزا انھیں نہیں دینا چاہتے تھے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اس غار کا دروازہ بند کر دو تا کہ یہ اسی جگہ ہلاک ہو جائیں۔ چناں چہ ایسا ہی کیا، لیکن اس میں نظر ہے۔ واللہ أعلم۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ سورج اس غار میں صبح شام اُن پر داخل ہوتا ہے،[1] جیسے اس کا بیان عن قریب آئے گا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ نبأ کہتے ہیں شاندار خبر کو۔ فتیہ سے مراد نوجوان ہیں۔ ان میں سے ایک دقیانوس کا وزیر تھا اور یہ لوگ شہر کے اشراف اور بڑے لوگوں میں سے تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئے تھے، یعنی موحد خالص تھے، اس ایمان پر ان کو اور زیادہ ثابت قدمی کی توفیق دی گئی تھی۔ امام ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا کہ ہدیٰ سے مراد اخلاص ہے،[2] یا ایمان وبصیرت، یا یقین۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر گرہ لگا دی، یعنی اپنے اہل اور وطن سے ہجرت، اپنے دوستوں اور بھائی بندوں سے جدائی پر دل کو تقویت بخشی، وہ بھاگ کر اس غارِ کوہ میں آ گئے اور ہم نے ان کو کلمۂ حق اور اسلام کے ظاہر کرنے پر جرأت اور مردانگی عطا کی، چناں چہ انھوں نے بادشاہ سے کہہ دیا: ﴿ رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاْ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا ﴾ (آیتِ باب) اور اللہ کی راہ میں کچھ رعب حاصل نہ ہوا۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ دل کو ایمان سے باندھا[3] اور ایمان کو مضبوط کیا۔ صبر و تثبیت سے قیام سے یہ مراد ہے کہ وہ شہر کے باہر بغیر میعاد پر جمع ہوئے، ایک مرد نے جو قوم کا بڑا تھا، کہا: میں اپنے جی میں ایک شے پاتا ہوں کہ میرا رب وہی آسمانوں اور زمین کا رب ہے، دوسروں نے کہا کہ ہم بھی اپنے دلوں یہی بات پاتے ہیں۔ پھر سب اکٹھے ہوئے اور کہنے لگے: ﴿ رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ (آیتِ باب)۔ (قاله مجاهد)[4]

اکثر مفسرین کا قول یہ ہے کہ ان کا ایک بادشاہ تھا دقیانوس نام کا، وہ لوگوں کو طاغوتوں کی عبادت کی طرف بلاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اُن جوانوں کو ثابت قدم رکھا اور غیر اللہ کی عبادت سے بچایا، یہ اس بادشاہ کے سامنے کھڑے ہوئے، اس نے کہا کہ تم بتوں کو سجدہ کرو، کہا: ہمارا رب تو وہ ہے جس نے آسمان و زمین بنائے ہیں۔ یہ چھے جملے ہیں تین بادشاہ کے سامنے کہے، ﴿ شَطَطًا ﴾ تک اور تین اس مجلس سے لوٹنے کے بعد اپنی قوم کی مذمت میں کہے، ﴿ كَذِبًا ﴾ تک۔ امام عطا و مقاتل رحمہما اللہ نے کہا کہ یہ کلمات انھوں نے اس وقت کہے کہ جب نیند سے اُٹھے۔[5]

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ١٠٣) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٥١) [3] تفسیر الطبري (١٧/ ٦١٥)
[4] فتح القدیر (٣/ ٣٧٩) [5] فتح القدیر (٣/ ٣٧٩)

بالجملہ انھوں نے یہ بات کہی کہ ہم اللہ کے سوا کسی دوسرے معبود کی عبادت اور اس سے دعا نہ کریں گے، نہ اشتراکاً نہ استقلالاً۔ اگر ہم ایسا کہیں گے تو ہمارا کفر میں اور بڑھ جانا ہوگا، یعنی اگر ہم غیر اللہ کو فرضاً پکاریں تو یہ قول شطط ہوگا۔ شطط غلو اور ہر شے میں حدِ مقرر سے آگے بڑھ جانے کو کہتے ہیں۔ ہماری اس قوم نے اللہ کے سوا اور معبود یعنی بت ٹھہرائے ہیں کہ ان کو پوجتے ہیں۔ اس اخبار میں انکار کے معنی اور قوم کی تحقیر کی طرف اشارہ ہے۔ یہ لوگ اُن بتوں کی عبادت پر کوئی روشن دلیل اور نمایاں حجت کیوں نہیں لاتے، جس کو مضبوطی سے تھاما جا سکے۔ یعنی ان کا جمع خرچ سارا زبانی ہے، اپنے قول و فعل پر کوئی برہان اور دلیل قطعی نہیں رکھتے۔ اس میں قوم کی سرزنش ہے، کیوں کہ بتوں کی عبادت پر کوئی حجت لانا ایک مشکل کام ہے۔

امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ آیت فسادِ تقلید پر اور اس بات پر دلیل ہے کہ دین میں حجت کا ہونا ضروری ہے، تاکہ حق واضح اور ثابت ہو جائے[1] اور کون شخص اس سے بڑا ظالم ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے اور شریک کی نسبت اس کی طرف کرے اور یہ زعم رکھے کہ کوئی اور بھی اس کی عبادت میں شریک ہے۔

بعض نے بعض سے اس کنارہ کشی کے وقت یہ بات کہی کہ جب تم نے قوم کو اُن کے شرکیہ عقیدے میں چھوڑ دیا اور اُن سے جسمانی طور پر علاحدہ ہونے کا ارادہ کر لیا اور بت پرستوں سے کنارہ کش ہو گئے اور اُن کے معبودات کو دھتکار دیا اور صرف اللہ پاک کی عبادت اختیار کی تو اب تم ایک غار میں جا بیٹھو، اسی کو اپنی جگہ ٹھہراؤ، اُن سے اب کچھ غرض اور واسطہ نہ رکھو، یہ جانیں اور اُن کی بت پرستی، تمھارا رب تمھارے لیے اپنی رحمت کو پھیلا دے گا اور وسیع کر دے گا، یعنی دونوں جہانوں میں اور تمھاری مشکل آسان فرما دے گا۔ یہ بات انھوں نے اللہ تعالیٰ کے فضل پر اعتماد کرتے ہوئے، اللہ تعالیٰ پر توکل اور اُس سے اُمید سے حاصل ہونے والی تقویت کی بنا پر کہی تھی۔ یا اُن کے زمانے کے پیغمبر نے ان کو یہ خبر دی تھی۔[2]

وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَت تَّزَاوَرُ عَن كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِينِ
وَإِذَا غَرَبَت تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِي فَجْوَةٍ مِّنْهُ ۚ
ذَٰلِكَ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ ۗ مَن يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۖ وَمَن يُضْلِلْ
فَلَن تَجِدَ لَهُ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ﴿١٧﴾

اور آپ سورج کو دیکھیں گے جب وہ طلوع ہوتا ہے تو ان کے غار سے دائیں طرف ہٹ جاتا ہے اور جب غروب ہوتا ہے تو ان کے بائیں طرف کترا (کر نکل) جاتا ہے اور وہ اس (غار) کی کھلی جگہ میں

---

[1] الکشاف (۲/ ٦٦١) [2] فتح البیان (۸/ ۱۸۔ ۲۱)

ہیں۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔ جسے اللہ ہدایت دے تو وہی ہدایت یافتہ ہے اور جسے وہ گمراہ کر دے تو آپ اس کے لیے ہرگز کوئی راہنما دوست نہیں پائیں گے ⑰

غار کا محلِ وقوع:

حق تعالیٰ کی قدرت سے نہ اس جگہ میں اُن پر دھوپ آئے نہ بارش نہ برف اور کھلی جگہ ہے تنگ خفا نہیں۔

یہ اس بات پر دلیل ہے کہ اس غار کا دروازہ شمال کی طرف ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ جب سورج وقت طلوع کے اس پر داخل ہوتا ہے تو اس کی دھوپ دائیں طرف سمٹ جاتی ہے۔ (كما قال ابن عباس رضی اللہ عنہما و سعيد بن جبير و قتادة: تزاور، أي تميل)[1] یہ بات اس طرح ہوتی ہے کہ آفتاب جتنا اُفق میں اُونچا ہوتا جاتا ہے اسی قدر اس کی شعاع بلندی کی وجہ سے متقلص ہوتی جاتی ہیں، یعنی سمٹتی رہتی ہیں، یہاں تک کہ زوال کے وقت اس جیسے مکان میں ذرا سی دھوپ بھی باقی نہیں رہتی، لہٰذا فرمایا کہ جب سورج ڈوبتا ہے تو بائیں طرف کترا جاتا ہے، یعنی ان کے غار میں دروازے کے شمال سے داخل ہوتا ہے اور وہ مشرقی کنارے میں ہے۔

یہ ہمارے قول کی صحت پر دلیل ہے اور غور کرنے والے پر یہ بات روشن ہے۔ جس کو سورج چاند اور ستاروں کی ہیئت اور چلنے کے بارے میں علم ہے اس کا بیان یہ ہے کہ اگر غار کا دروازہ مشرق کے کنارے ہوتا تو غروب کے وقت اس میں ذرا سی دھوپ بھی داخل نہ ہوتی اور اگر قبلہ کے کنارہ کی طرف ہوتا تو طلوع اور غروب کے وقت کچھ بھی دھوپ نہ آتی اور نہ ہی سایہ دائیں اور بائیں طرف مائل ہوتا اور اگر غروب کی طرف ہوتا تو طلوع کے وقت دھوپ داخل نہ ہوتی، بلکہ زوال کے بعد غروب ہونے تک بدستور باقی رہتی۔ فتعين ما ذكرناه ولله الحمد.

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما امام مجاہد اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ اس جگہ قرض سے مراد ترک ہے[2] اور اللہ تعالیٰ نے اس کی خبر دی ہے اور ہم سے سوچنے اور غور کرنے کا ارادہ فرمایا ہے اور ہم کو اس کہف کی جگہ نہیں بتائی کہ یہ زمین کس شہر میں ہے، کیوں کہ اس میں ہمارا کچھ فائدہ نہیں ہے اور نہ ہی کوئی قصدِ شرعی ہے۔ بعض مفسرین نے اس جگہ کتنے ہی اقوال ذکر کیے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ایلہ کے قریب ہے۔ امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا کہ نینوا کے پاس ہے۔[3] کسی نے کہا کہ بلادِ روم میں ہے۔ کسی نے کہا کہ بلادِ بلقاء میں۔ اللہ ہی جانے کس شہر میں اور کہاں ہے، اگر اس علم میں ہمارے لیے کوئی دینی مصلحت ہوتی تو اللہ اور رسول ہمارے لیے ضرور اس کے بارے میں ارشاد فرماتے، کیوں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے: «مَا تَرَكْتُ شَيْئًا يُقَرِّبُكُمْ إِلَى الْجَنَّةِ وَيُبَاعِدُكُمْ مِنَ النَّارِ إِلَّا وَقَدْ أَعْلَمْتُكُمْ بِهِ»[4] [میں نے کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی جو تمھیں جنت کے قریب کر دے اور جہنم سے دور کر دے

---

① تفسير الطبري (١٧/ ٦٢٠) ② تفسير الطبري (١٧/ ٦٢١ ـ ٦٢٢) ③ تفسير الطبري (١٧/ ٦٠٢) تفسير ابن كثير (٣/ ١٠٣)

④ مصنف عبد الرزاق (١١/ ١٢٥) المعجم الكبير (٢/ ١٥٥) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٨٠٣)

مگر تمھارے لیے میں نے اسے بیان کر دیا ہے]

سو اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس غار کی صفت بتا دی اور اس کی جگہ نہیں بتائی، اتنا کہہ دیا کہ تو دیکھے دھوپ کو جب نکلتی ہے تو اُن کے غار سے بچ جاتی ہے۔ امام زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا کہ یعنی دائیں جانب جھک جاتی ہے اور غروب کے وقت بائیں طرف کترا جاتی ہے اور وہ ایک گنجایش اور کشادہ جگہ میں ہیں، اس غار سے اس طرح پر کہ دھوپ اُن کو نہیں پہنچتی، کیوں کہ اگر اُن کو دھوپ پہنچتی تو اُن کے بدن اور کپڑے جل جاتے۔[1] (قاله ابن عباس)

یہ اللہ کی ایک نشانی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس غار کا راستہ بتا دیا اور اُن کو اس غار میں زندہ رکھا اور سورج اور ہوا اُن پر داخل ہوتی ہیں، تاکہ اُن کے بدن باقی رہیں۔ لہٰذا فرمایا: ﴿ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ﴾ (آیتِ باب)۔ پھر کہا کہ جس کو اللہ ہدایت کرے وہی راہ یاب ہے، یعنی اسی نے ان جوانوں کو اس گمراہ قوم میں سے ہدایت پر لگایا، ورنہ جس کو اللہ گمراہ کر دیتا ہے تو پھر اس کو ہدایت دینے والا کوئی نہیں ہوتا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ سورج نکلتے وقت اُن کے غار سے مائل و عادل اور ایک طرف دائیں کنارے کی طرف ہو جاتا ہے اور غروب کے وقت اُن کو چھوڑ کر بائیں طرف کو جاتا ہے، یعنی غار کی شمالی جانب۔ نہ دن کے شروع میں اُن پر دھوپ پڑی اور نہ دن کے آخر میں، بلکہ کہف کی سمت سے ہر دو مذکور جہتوں کی سمت سے ہر دو مذکور جہتوں پر عدول کرتا ہے، یعنی پھر جاتا ہے اور وہ ایک کشادہ جگہ میں ہیں۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا کہ "فجوہ" کہتے ہیں زمین کے کنارے کو۔[2]

مفسرین کے اس جگہ دو قول ہیں: ایک یہ کہ باوجود یہ کہ وہ ایک کھلی اور وسیع جگہ میں ہیں، لیکن سارا دن زیرِ سایہ رہتے ہیں، سورج نکلنے اور ڈوبتے وقت ان کو نہیں پہنچتا۔ اللہ تعالیٰ نے سورج کو بہ طورِ کرامت ان سے محجوب (پردے میں) رکھا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس غار کا دروازہ شمال کی طرف بنات النعش کے عین سامنے روم کی زمین میں کھلا ہوا تھا۔ طلوع کے وقت سورج غار کی دائیں جانب اور غروب کے وقت بائیں جانب ہوتا ہے، اس کی دھوپ اُن پر نہیں پڑتی نہ نکلتے وقت اور نہ غروب ہوتے وقت اور نہ ہی استوا کے وقت۔ اگر ان پر دھوپ پڑا کرتی تو آفتاب کی گرمی انھیں تکلیف دیتی، رنگ روپ بدل جاتا، کپڑے پرانے ہو جاتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن کے لیے خواب گاہ ایک کشادہ جگہ میں رکھ دی، جہاں ریح و نسیم کی ٹھنڈک پہنچتی ہے اور غار کا کرب و غم دور رہتا ہے۔

پہلی بات کی تائید اس قول سے ہوتی ہے: ﴿ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ﴾ (آیتِ باب)، کیوں کہ اُن سے سورج

---

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ١٠٤)   [2] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٥٢)

کا پھیر دینا باوجود اس کے کہ اس کا رخ ایسے مکان کی طرف ہوتا ہے، جہاں عادتاً دھوپ پہنچتی ہے، انسب ہے کہ اسے ایک نشانی کہا جائے۔ نیز اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اس پر فجوہ کا اطلاق ہے اور اس کو کسی سمت کے ساتھ مقید نہیں کیا گیا۔ دوسرے قول کے مطابق یہ معنی ہیں کہ اصحابِ کہف کا واقعہ اور اُن کی حالت اللہ کی آیات میں سے ہے۔ لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔ بعض نے کہا کہ اُن کے غار کے لیے ایک حاجب جنوب کی طرف سے اور ایک حاجب (دربان) دبور (پیچھے) کی طرف سے ہے اور وہ اس کے زاویے میں ہیں۔

امام زجاج رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ سورج کا فعل اللہ کی ایک نشانی ہے، اس کے بغیر کہ غار کا دروازہ ایسی جانب ہو کہ جو دھوپ نہ آنے کو واجب کرے۔[1] آیت یہ ٹھہری کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسے کہف کی طرف جگہ نہ دی کہ وہاں دھوپ رہنے سے تکلیف ہو، یہ اس بنیاد پر ممکن ہے کہ سورج بادل کے سائے یا کسی اور سبب سے تکلیف نہ دے۔ اس ذکر سے مقصد اُن کی حفاظت کا بیان ہے، جو اُن کو مختلف تکالیف سے، مثلاً: بدنوں کی تبدیلی، رنگوں کی تبدیلی اور گرمی اور سردی کی اذیت سے محفوظ رکھے۔[2]

وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ ۖ وَّ نُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ
وَ ذَاتَ الشِّمَالِ ۖ وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ ۭ
لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ۝18

اور آپ انھیں جاگتے ہوئے خیال کریں گے، حالاں کہ وہ سوئے ہوئے ہیں اور ہم ان کی دائیں طرف اور بائیں طرف کروٹیں بدلتے ہیں اور ان کا کتا (غار کے) دہانے پر اپنے دونوں بازو پھیلائے ہوئے ہے، اگر آپ انھیں جھانک کر دیکھیں تو ان سے ضرور بھاگتے ہوئے پیٹھ پھیر لیں اور آپ ضرور ان سے رُعب میں بھر دیے جائیں (18)

ان کا غار میں سونا:

کہتے ہیں سوتے ہیں، اُن کی آنکھیں کھلی ہیں، اس سے کوئی یہ سمجھے کہ جاگتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اس جگہ میں دہشت رکھی ہے، تاکہ لوگ تماشا نہ پکڑیں کہ وہ بے آرام ہوں۔ اُن کے ساتھ کتا بھی لگ گیا تھا، وہ بھی زندہ رہ گیا، اگرچہ کتا رکھنا برا ہے، لیکن لاکھ بروں میں ایک بھلا بھی ہے۔ بعض اہلِ علم نے ذکر کیا کہ جب اللہ تعالیٰ نے نیند کو اُن پر غالب کیا تو اُن کی آنکھیں بند نہ ہوئیں، تاکہ اُن کی طرف بوسیدگی جلدی نہ کرے اور جب ہوا کے لیے کھلی رہیں گی تو باقی بھی رہیں گے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تو اُن کو جاگتا ہوا سمجھے اور وہ سوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بھیڑیا

[1] معاني القرآن (٣/ ٢٧٤) تفسير القرطبي (١٠/ ٣٦٩) [2] فتح البيان (٨/ ٢١۔ ٢٣)

جب سوتا ہے تو ایک آنکھ بند کرتا ہے اور دوسری کھولے رہتا ہے، پھر اس بند آنکھ کو کھولتا ہے اور کھلی آنکھ کو بند کرتا ہے اور وہ سو رہا ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

ينام بإحدى مقلتيه ويتقي بأخرى الرزايا فهو يقظان نائم

[وہ ایک آنکھ سے سوتا ہے اور دوسری (کو کھلا رکھ کر اس) سے مصائب سے بچتا ہے، چنانچہ وہ سویا ہوا بھی ہے اور بیدار بھی]

بعض سلف نے کہا ہے کہ سال بھر میں دو بار کروٹ بدلتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اگر کروٹ نہ بدلیں تو زمین اُن کو کھا جائے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، سعید بن جبیر اور قتادہ رحمہم اللہ نے کہا کہ وصید بہ معنی صحن ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ بہ معنی دروازہ ہے۔[1] اُن کا کتا، جس طرح کہ کتوں کی عادت ہے، غار کے دروازے پر بیٹھا رہا، اس دروازے کی اُن پر حفاظت کرتا رہا۔ یہ بات کتے کی فطرت اور طبیعت ہوتی ہے کہ وہ دروازے کے قریب بیٹھ رہتا ہے، گویا حراست کرتا ہے۔ کتے کی نشست دروازے کے باہر تھی، اس لیے کہ جس گھر میں کتا ہوتا ہے، وہاں فرشتے نہیں آتے، جس طرح کہ صحیح میں مروی ہے[2] «وَلَا صُورَةٌ وَلَا جُنُبٌ وَلَا كَافِرٌ»[3] [(اسی طرح فرشتے اس گھر میں بھی داخل نہیں ہوتے) جس میں تصویر، جنبی اور کافر ہو] یہ مضمون ایک حدیث حسن کا ہے۔ اُن کی برکت کتے کو بھی شامل رہی اور وہ بھی انھی کی طرح اسی حال پر سو گیا اور یہی نیک لوگوں کی صحبت کا فائدہ ہے کہ ان کی وجہ سے اس کتے کو بھی اہمیت حاصل ہوگئی۔

پسرِ نوح بابدان بنشست خاندانِ نبوتش گم شد
سگِ اصحاب کہف روزے چند پی نیکان گرفت و مردم شد

’نوح کا بیٹا بروں کا ساتھی بنا تو اس کی نبوت کی نسل ضائع ہوگئی۔ اصحابِ کہف کا کتا چند روز نیکوں کے پیچھے چلتا رہا تو اس کا شمار نیک آدمیوں کے ساتھ ہوا۔‘‘

کہتے ہیں کہ وہ کتا شکاری تھا اور یہی بات قرینِ قیاس ہے اور بعض نے کہا کہ وہ کتا بادشاہ کے نان بائی کا تھا، نان بائی نے دین میں اُن کا ساتھ دیا۔ اس کا کتا اس کے ہمراہ آیا۔ واللہ أعلم۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا کہ ابراہیم علیہ السلام کے مینڈھے کا نام حریر تھا اور سلیمان علیہ السلام کے ہدہد کا نام عنقر اور اصحابِ کہف کے کتے کا نام قطمیر تھا اور بنی اسرائیل کے بچھڑے کا نام، جس کی پرستش کی گئی تھی، بہموت تھا اور آدم علیہ السلام ہند میں، حوا جدہ میں اُتریں اور ابلیس

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٦٢٤_ ٦٢٥) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠١٦)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٢٧) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٦١) اس کی سند میں ’’نجی حضرمی‘‘ متکلم فیہ راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٦٢٠٣) نیز ’’ولا كافرا‘‘ کے الفاظ نہیں ملے ہیں۔

دست بیسان میں اور سانپ اصفہان میں۔[1] شعیب جبائی نے کتے کا نام حمران بتایا ہے،[2] اس کے رنگ میں کئی قول پر اختلاف ہے، لیکن اس فضول بحث کا کوئی فائدہ اور حاصل نہیں ہے اور نہ کوئی اس پر دلیل ہے اور نہ اس کی طرف کسی طرح کی حاجت ہے، بلکہ ایسے غور سے منع کیا گیا ہے، کیوں کہ اس کا سہارا غیب میں پتھر مارنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اصحابِ کہف پر ایک ہیبت ڈال دی ہے کہ جو کوئی اُن کی طرف نظر کرتا ہے وہ دہشت میں آ جاتا ہے، تاکہ کسی کا گزر اُن کے پاس نہ ہو اور کوئی اُن کو ہاتھ نہ لگائے۔ یہاں تک کہ کتاب اپنی اجل کو پہنچے اور اُن کے خواب کا زمانہ ختم ہو، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس نیند کی طوالت میں حکمتِ کاملہ اور حجتِ بالغہ اور رحمتِ واسعہ رکھی ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ آیت خطاب ہے نبی اکرم ﷺ کو، یا ہر ایک کو کہ تو اُن کو جاگتا خیال کرتا ہے، حالاں کہ وہ سو رہے ہیں، اس گمان کا سبب یہ ہے کہ اُن کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور وہ پڑے سوتے ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ یعنی ''کثرتِ تقلب'' (لوٹنا۔ پھرنا) کے سبب سے ہم اُن کو دائیں بائیں پلٹتے رہتے ہیں،[3] یعنی تاکہ زمین اُن کے جسموں اور گوشت کو نہ کھا جائے۔ یہی قول ہے امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ کا،[4] لیکن امام رازی رحمہ اللہ نے اس قول پر تعجب کیا ہے اور کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ بغیر تقلب کے اُن کی حفاظت پر قادر ہے۔[5] اس کا جواب کوئی شخص یہ دے سکتا ہے کہ اللہ کی قدرت میں کچھ شک نہیں ہے، لیکن اس نے اغلب احوال میں ہر شے کے لیے ایک سبب رکھا ہے۔ (قاله الكرخي)

میں کہتا ہوں کہ جس صورت میں اللہ تعالیٰ نے خود اُن کے تقلب کا ذکر فرمایا ہے تو پھر اس پر باوجود نص کے تعجب کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ بعض نے کہا کہ سال بھر میں دن عاشور کے ایک تقلب ہوتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ چھے ماہ دائیں کروٹ پر اور چھے ماہ بائیں کروٹ پر رہتے ہیں۔[6] اس بنیاد پر ایک سال میں دو بار تقلب ہوتا ہے اور بعض نے کہا کہ ہر نو (۹) برس میں۔ بعض نے کہا کہ یہ تقلب آخری نو سالوں میں ہوا تھا۔ رہے تین سو سال تو اُن میں نہ تھا۔ مفسرین کا ظاہری کلام یہ ہے کہ تقلیب اللہ کا فعل ہے اور جائز ہے کہ کوئی فرشتہ اللہ کے حکم سے کروٹ بدل دیتا ہو، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ اصحابِ کہف اپنے ملک سے رات کو بھاگے اور ایک چرواہے پر گزر ہوا، اس کے ساتھ ایک کتا تھا، وہ اُن کے پیچھے لگ گیا اور بعض نے کہا کہ خود انہی میں سے ایک شخص کا کتا تھا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ اس کا نام قطمور تھا[7] اور کسی نے کہا کہ ریان اور بعض نے کہا صہبان۔ یہ کتا سفید پیشانی تھا اور بعض نے کہا

---

[1] مختصر تاريخ دمشق لابن منظور (۲۷/ ۱۴۳) [2] تفسير الطبري (۱۷/ ۶۰۳) [3] معاني القرآن (۳/ ۲۷۴)

[4] مذکورہ قول کو امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں۔ دیکھیں: تفسير الطبري (۱۷/ ۶۲۴)

[5] تفسير الرازي (۲۱/ ۸۶) [6] تفسير ابن أبي حاتم (۷/ ۲۳۵۲) [7] تفسير ابن أبي حاتم (۷/ ۲۳۵۲)

قلطے سے بڑا اور گرزی سے چھوٹا تھا، قلطی چینی کتے کو کہتے ہیں اور بعض نے کہا کہ زرد تھا۔ کسی نے کہا کہ گندم گوں تھا۔ کسی نے کہا کہ سرخی مائل تھا اور بعض نے کہا کہ آسمان کے رنگ کا تھا۔ کہتے ہیں جنت میں دواب (چوپائے) نہ ہوں گے، مگر اصحابِ کہف کا کتا اور بلعم کا گدھا۔ ہم نہیں جانتے کہ اس تفسیر اور تدقیق کو کتاب اللہ کی تفسیر سے کیا تعلق ہے اور کون سا امر اس فضول اور غیر مستند بات کا حامل ہے، جس کو نہ کان تسلیم کریں نہ عقل والے۔

وصید کہتے ہیں فنائے باب کو، مفسرین کا یہی قول ہے۔ بعض نے کہا کہ عتبہ، یعنی چوکھٹ کو، لیکن کہف کے لیے نہ چوکھٹ ہوتی ہے اور نہ دروازہ۔ مراد یہ ہے کہ کلب عتبہ کی جگہ مکان اور گھر سے تھا یا وصید سے مراد صعید ہے، یعنی مٹی۔ بعض نے کہا کہ کتے نے ایک قوم کو دوست رکھا، اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر اس قوم کے ساتھ کیا، پھر ہمارا کیا حال ہے کہ ہمارے پاس تو عقیدہ، ایمان، کلمۂ اسلام، حبِ نبی و آل اور اصحاب ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ٧٠] ''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے بنی آدم کو عزت دی ہے اور انھیں بر و بحر میں سواریاں دیں، اور انھیں پاکیزہ چیزوں میں سے رزق دیا اور انھیں اپنی کثیر مخلوقات پر جنھیں ہم نے پیدا کیا، فضیلت دی۔''

اس میں گناہ گار مومنوں کے لیے تسلی اور تانیس ہے درجاتِ کمال کے لیے، جو کہ صالحین، انبیا اور علما سے محبت کرتے ہیں اور اولیاء اللہ اور برگزیدہ سے ملتے جلتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اے پیغمبر! یا اے مخاطب! اگر تو اُن کو اس حالت پر دیکھے تو پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑا ہو اور خوف اور رعب سے بھر جائے۔ اس رعب کا سبب وہ ہیبت ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کو پہنا دی ہے اور بعض نے کہا کہ مراد اُن کے ناخنوں اور بالوں اور جسم کی ہڈیوں کا طول اور جگہ کی وحشت ہے۔ اس کو امام مہدوی، نحاس، زجاج اور قشیری رحمہم اللہ نے ذکر کیا ہے،[1] لیکن اللہ تعالیٰ کا قول: ﴿ لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ﴾ [الكهف: ١٩] ''ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرے ہیں۔'' اس کو دفع کرتا ہے، کیوں کہ یہ قول اس بات پر دلیل ہے کہ اُن کے حال میں کچھ تبدیلی منکر نہیں ہوئی تھی اور نہ اُن کے ناخن بڑھے اور نہ بال لمبے ہوئے، جس سے مدت کی لمبائی پر دلالت ہوتی۔ کسی نے کہا کہ یہ رعب اس لیے ہے کہ اُن کی آنکھیں کھلی ہیں جیسے بیدار ہوں۔ کسی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اس رعب کی وجہ سے اُن کو کسی کے دیکھنے سے محفوظ رکھا ہے۔

امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا کہ اُن کے بارے میں صحیح بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس حالت کو جس پر وہ سو گئے تھے محفوظ رکھا، تاکہ اُن کے لیے اور دوسروں کے لیے اللہ کی قدرت کی نشانی ہو۔ لہٰذا نہ اُن کا کپڑا پرانا ہوا، نہ کوئی حالت بدلی اور وہ شخص جو اُن میں سے شہر میں آیا تھا، اس نے بھی کسی شے کا انکار نہیں کیا، سوائے اس کے کہ اس نے اس سرزمین کی نشانیوں کو دوسری طرح پر پایا اور اگر فی نفسہٖ کوئی حالت ہوتی جس کو وہ منکر جانتا تو ان کے لیے اہم ہوتی۔[2] (ذكره القرطبي)

---

[1] تفسير القرطبي (١٠/ ٣٧٣)
[2] تفسير القرطبي (١٠/ ٣٧٣۔ ٣٧٤) فتح البيان (٨/ ٢٤۔ ٢٦)

وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ؕ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ
كَمْ لَبِثْتُمْ ؕ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالُوْا رَبُّكُمْ
اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ؕ فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ
فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ
وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ﴿١٩﴾ اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ
يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿٢٠﴾

اور اسی طرح ہم نے انھیں جگایا، تا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے سے سوال کریں، ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا: تم کتنا (عرصہ) ٹھہرے ہو؟ وہ بولے: ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرے ہیں۔ پھر بولے: تمھارا رب خوب جانتا ہے جتنی دیر تم ٹھہرے، چناں چہ اب تم اپنی یہ چاندی (کے سکے) دے کر اپنا ایک آدمی شہر کی طرف بھیجو، پھر وہ دیکھے کہ اس (شہر) کا کون سا شخص طعام کے لحاظ سے پاکیزہ تر ہے، تو وہ اس میں سے تمھارے لیے کچھ کھانا لے آئے، اور وہ خوب نرمی (سے بات) کرے، اور تمھارے متعلق بالکل کسی کو نہ بتائے 19 بلاشبہ اگر وہ تم پر مطلع ہو گئے تو تمھیں رجم کر دیں گے یا تمھیں اپنے دین میں لوٹا لیں گے اور پھر اس وقت تم ہرگز فلاح نہیں پا سکو گے کبھی بھی 20

کھانا خریدنے کے لیے شہر کی طرف جانا:

سیکڑوں برس رہنا ان کو ایک دن معلوم ہوا۔ مردہ اور سوتا ہوا برابر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس طرح ہم نے ان کو سلا دیا تھا، اسی طرح ان کو جگا دیا، اُن کے بدن اور بال اور کھال سب صحیح تھے، ان کی کوئی چیز یا حالت گم نہ ہوئی تھی، وہی ہیئت اور شکل وصورت باقی تھی۔ ان کا یہ جاگنا تین سو نو برس کے بعد ہوا تھا، لہٰذا انھوں نے آپس میں پوچھا کہ کہو ہم تم کتنا وقت سوئے؟ کہا: ایک دن یا ایک دن سے کچھ کم۔ گویا کہف میں داخل ہونا دن کے شروع میں ہوا تھا اور جاگنا آخر دن میں، لہٰذا بطورِ استدراک بعض یوم کہا۔ پھر ٹھہرنے کی مدت کے علم کو اللہ پر چھوڑا، گویا کہ اُن کو نیند کی کثرت کے بارے میں ایک طرح کا تردد حاصل ہوا تھا، اس لیے اس کو اللہ کے علم کے حوالے کیا اور اس تحقیق کو چھوڑ کر اہم معاملے کی طرف متوجہ ہوئے اور وہ معاملہ یہی کھانے اور پینے کی ضرورت تھی۔ کہا تم میں سے ایک کو چاندی کا یہ ٹکڑا دے کر بھیجو، کیوں کہ جب وہ اپنے گھروں سے نکل کر چلے تھے تو اپنے ساتھ کچھ درہم لے لیے تھے، کچھ راستے میں خیرات کر آئے اور کچھ باقی رہ گئے تھے۔ مدینہ سے اُن کی مراد وہی ان کا اپنا شہر تھا، جہاں سے نکلے تھے۔ الف لام عہد کے واسطے ہے۔

﴿ أَزْكَىٰ ﴾ سے مراد پاکیزہ کھانا ہے، یعنی حلال طیب، خواہ کثیر ہو یا قلیل۔ ''تلطف'' سے مراد ہر معاملے میں نرمی ہے، یعنی نکلنے میں اور جانے میں اور خریداری اور چلنے پھرنے میں۔ مطلب یہ ہوا کہ چپکے سے جا کر روٹی خرید لاؤ، کسی کو معلوم نہ ہو کہ تم کون ہو، کیوں کہ اگر اُن کو یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ تم کون ہو اور فلاں جگہ میں روپوش ہو تو وہ تم کو سنگسار کر ڈالیں گے، یا اپنے دین اور مذہب میں پھیر لائیں گے۔ مراد دقیانوس کے اصحاب ہیں۔ ان سے ڈرتے تھے کہ کہیں انھیں ہماری اس جائے پناہ کا علم نہ ہو جائے تو ہم کو طرح طرح کے عذاب میں پھانس کر اپنی ملت میں ملائیں یا مار ڈالیں اور اگر تم اُن کے دین میں لوٹنے کے لیے اُن کی موافقت کرو گے تو دین و دنیا میں کبھی اپنی مراد کو نہ پہنچو گے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جس طرح ہم نے اُن کے ساتھ یہ کرامات برتیں کہ کہف میں سلا دیا اور اُن کے جسموں کو باوجود طویل مدت کے بوسیدگی سے محفوظ رکھا، اسی طرح ان کو اس خوابِ راحت سے پھر ایک بار جگایا۔ اُن کا یہ جاگنا دوسری کرامت اور آیت (نشانی) ہے۔ امام زجاج اور زمخشری رحمہما اللہ نے کہا کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی یاد دہانی فرمائی ہے کہ وہ مارنے اور دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے۔ پھر جس غرض کے لیے ان کو جگایا وہ یہ تھی کہ باہم سوال کریں اور اُن کے وہاں ٹھہرنے کی مدت کے بارے میں اختلاف اور تنازع ظاہر ہو، کیوں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت باہرہ کا ظہور ہوگا۔ اُن میں سے ایک شخص نے کہا کہ وہ اُن سب میں سے بڑا اور سردار تھا مکسلمینا نام تھا کہ کہو تم کتنا سوئے؟ یہ اس لیے کہ انھوں نے اپنے آپ میں اس سونے کو خلافِ عادت پایا۔ بعض نے یا باقی چھے اشخاص نے کہا کہ ہم ایک دن ٹھہرے۔

مفسرین نے کہا کہ وہ صبح کے وقت داخل ہوئے تھے اور آخر دن میں جاگے، اس لیے یہ گمان کیا کہ سورج ڈوبنے کو ہے۔ جب دیکھا کہ سورج ابھی نہیں ڈوبا تو کہا کہ ہم دن کا کچھ حصہ ٹھہرے، اس لیے کہ اس وقت کچھ دن باقی تھا۔ اس میں جوازِ اجتہاد پر دلیل ہے اور قول بہ ظنِ غالب پر۔ پھر ٹھہرنے کی مدت میں توقف کیا اور اللہ کے علم پر رکھا۔ یا استدلال کے طور پر، یا اللہ کی طرف سے الہام کے طور پر۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ وہ سات شخص تھے، اس لیے کہ اللہ نے یوں فرمایا ہے: ﴿ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ ﴾ یہ ایک شخص ہوا۔ اس کے جواب میں انھوں نے ''لبثنا'' کہا، یہ جمع کا صیغہ ہے۔ سب سے تھوڑے جمع تین ہوتے ہیں۔ پھر کہا: ﴿ قَالُوْا ﴾ اور یہ قول دوسری جمع کا ہے، یہ سب سات ہوئے۔[1] یہ قائل یملیخا تھا، اس نے کہا: تم یہ جھگڑا جانے دو کہ ہم کتنا سوئے، جو معاملہ زیادہ اہم اور ضروری ہے اس کو

[1] تفسیر النسفي (٣/ ٧)

کرو، کسی کو شہر کی طرف بھیجو کہ وہ یہ سکہ یا چاندی لے جائے اور اچھا یا سستا کھانا لے آئے۔ شہر کا نام افسوس تھا۔

آیت اس بات پر دلیل ہے کہ کسی حاجت والی چیز کو لینے کے لیے کوشش اللہ تعالیٰ پر توکل کے خلاف نہیں ہے۔

امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا کہ آج اس شہر کا نام طرسوس ہے۔[1] اور جس شہر سے نکلے تھے وہ اور تھا اور یہ شہر جہاں کھانا خریدنے کے لیے بھیجا اور تھا۔ ﴿ اَزْكٰى طَعَامًا ﴾ اس لیے کہا کہ وہ لوگ طاغوت کے نام پر جانور ذبح کرتے تھے، لہٰذا حلال اور پاکیزہ کی شرط لگا دی کہ کہیں دھوکے میں کسی نذر و نیاز اور غیر اللہ کے نام کا منت کیا ہوا کھانا مول نہ لے آنا۔ اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ اہلِ کتاب کے ذبیحے حلال ہیں، کیوں کہ شہر کے عام لوگ کفار تھے اور اُن میں ایک قوم ایسی بھی تھی جو اپنے ایمان کو مخفی رکھتی تھی۔ اس استدلال کی وجہ یہ ہے کہ طعام میں گوشت شامل ہے جس طرح کہ گوشت کے علاوہ چیزیں بھی شامل ہیں۔

"تلطف" سے مراد گہری نظر کرنا ہے، تاکہ کوئی نہ پہچانے یا کسی کا دماغ نہ پھر جائے، لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے، کیوں کہ اگر کوئی شخص جان لے گا کہ یہ فلاں شخص ہے تو شہر والے رجم کریں گے اور اس طرح کا مارنا سب سے زیادہ تکلیف دہ طریقۂ قتل ہے۔ اس جگہ کے کفار کی عادت یہی تھی کہ رجم کرتے تھے۔ یا رجم سے مراد گالی دینا اور ایذا دینا ہے، لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔ یا تم کو اپنی ملت میں پھیر لیں گے۔ سو اگر ایسا ہوا تو پھر کبھی تم کو فلاح نہ ہوگی، نہ دنیا میں نہ آخرت میں۔[2]

وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚ اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ؕ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ﴿۲۱﴾

اور اسی طرح ہم نے (لوگوں کو) ان پر مطلع کر دیا، تاکہ وہ جان لیں کہ بے شک اللہ کا وعدہ حق ہے اور یقیناً قیامت، اس میں کوئی شک نہیں۔ جب (لوگ) ان کے معاملے میں باہم جھگڑ رہے تھے، تو انھوں نے کہا: ان پر ایک عمارت بنا دو، ان کا رب انھیں بہتر جانتا ہے۔ جو ان کے معاملے پر غالب ہوگئے تھے، وہ بولے: ہم ان پر ضرور ضرور ایک عبادت گاہ بنائیں گے (21)

اہلِ شہر کا مطلع ہونا:

ان میں سے ایک شخص درہم لے کر شہر میں گیا، وہاں سب چیز اوپری دیکھی، اس مدت میں کئی قرن بدل گئے،

[1] فتح القدير (٣/ ٣٨٢) [2] فتح البيان (٨/ ٢٦۔ ٢٨)

شہر کے لوگ اس روپیہ کا سکہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ کس بادشاہ کا نام ہے اور کس عہد کا ہے، جانا کہ اس شخص نے کوئی گڑھا ہوا پرانا مال پایا ہے۔ آخر بادشاہ تک پہنچا، اس نے پوچھ کر سب حالات معلوم کیے، اس وقت اس شہر میں دو مذہب کے لوگ تھے: ایک آخرت میں جی اُٹھنے کے قائل اور دوسرے اس کے منکر۔ جھگڑا پڑ رہا تھا، بادشاہ کوئی منصف چاہتا تھا کہ ایک طرف کی کوئی سند ہاتھ آئے تو دوسروں کو سمجھا دے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ سند بھیج دی، بادشاہ خود جا کر سب کو غار میں دیکھ کر آیا، ہر ایک سے حال سن کر آیا۔ اس شہر کے سب لوگ آخرت پر یقین کرنے لگے کہ یہ قصہ بھی دوسری بار جینے سے کم نہیں۔ اصحابِ کہف کا دین اور مذہب اللہ کو معلوم ہے کہ فقط توحید پر قائم تھے اور کسی نبی کی شریعت پکڑنے نہیں پائے تھے، مگر جو لوگ اُن کی خبر پا کر معتقد ہوئے اور اُن کے پاس زیارت کا ایک مکان بنایا، وہ نصاریٰ تھے۔ اصحابِ کہف سب لوگوں کو رخصت کر کے پھر سو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے اُن کے قصے کی لوگوں کو اطلاع دی، تا کہ لوگ یہ بات جان لیں کہ اللہ کا وعدہ حق ہے اور قیامت بے شک آئے گی۔

بہت سے سلف نے ذکر کیا ہے کہ اس وقت کے لوگوں کو مرنے کے بعد دوبارہ جی اُٹھنے کے بارے میں شک پڑا تھا۔ قیامت کے ہونے کے بارے میں شبہہ کرتے تھے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ایک گروہ کہتا تھا کہ روحیں مبعوث ہوں گی نہ کہ جسم۔[1] اللہ تعالیٰ نے اصحابِ کہف کو بطورِ حجت و دلالت و نشانی کے اُٹھا کھڑا کیا۔ کہتے ہیں کہ جب اُن میں سے ایک شخص نے غار میں سے نکلنے کا ارادہ کیا، تا کہ شہر میں جا کر کچھ خرید کر لائے اور یہ لوگ اس طعام کو کھائیں تو اس نے اپنی صورت بدلی اور راستہ چھوڑ کر شہر میں آیا۔ اس شہر کا نام افسوس تھا، اس کو یہ گمان تھا کہ میں اس شہر سے قریبی زمانے کا ہوں، حالاں کہ وہاں کے لوگ قرناً بعد قرن۔ قوماً بعد قومٍ اور امۃً بعد امۃٍ بدل گئے تھے اور بلاد اور اہلِ بلاد میں تبدیلی بھی آ گئی تھی، جس طرح کہ کسی شاعر نے کہا ہے:

أما الديار فإنها كديارهم　　　و أرى رجال الحي غير رجاله

[گھر گو انہی کے گھروں جیسے ہیں، لیکن قبیلے کے لوگ تو سب اور ہی ہیں]

وہ معالم (نشانات) شہر کو دیکھنے لگا اور پہچانتا، لیکن وہاں لوگوں کو نہ پہچانتا نہ خواص کو اور نہ عوام کو۔ اپنے جی میں سخت حیران تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ کہتا شاید مجھ کو جنون ہے، یا کسی آسیب نے چھو لیا ہے، یا میں خواب دیکھ رہا ہوں، پھر کہتا: واللہ! مجھ میں تو یہ کوئی شے نہیں ہے اور کل تیسرے پہر ہی کو تو میں نے اس شہر کو چھوڑا ہے، وہ اس طرح کا نہ تھا۔ پھر کہا کہ یہاں سے میرے لیے جلد ہی واپس نکل جانا زیادہ بہتر ہے۔ پھر ایک غلہ فروش کے پاس آ کر درہم دیا اور طعام خریدنا چاہا، اس مرد نے وہ روپیہ دیکھ کر انکار کیا اور اس کے سکے کو نہ پہچانا، اپنے ہمسائے کو دے دیا، وہ اس کو آپس میں تداول (دست بدست لینا) کرنے لگے اور بولے کہ شاید اس مرد نے کوئی خزانہ پایا ہے، اس سے

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٦٢٨)

اس کا اور اس روپے کا حال پوچھا کہ شاید تو نے کسی خزانے میں سے یہ سکہ پایا ہے اور تو کس قوم کا آدمی ہے؟ اس نے کہا کہ میں اسی شہر کا رہنے والا ہوں اور کل ہی تیسرے پہر کو میں نے یہ شہر چھوڑا ہے اور اس شہر میں دقیانوس ہے، لوگوں نے اس کو دیوانہ ٹھہرایا اور والیِ امر کے پاس لے گئے، اس نے اس کا حال پوچھا، اس نے اپنا حال بیان کیا اور وہ اپنے طور پر حیران تھا کہ میں کس حال میں ہوں، جب وہ یہ قصہ کہہ چکا تو اس کے ہمراہ اور شہر کے لوگوں اور بادشاہ کے ہمراہ لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہف کی طرف گئے، اس نے کہا کہ تم مجھ کو چھوڑ دو کہ میں اپنے یاروں کو آگے جا کر خبر دوں۔ پھر وہ کہف میں داخل ہوا، انھوں نے کچھ نہ جانا کہ کس طرح اس کے اندر گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں پر اُن کی خبر مخفی رکھی۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ لوگ اُن پر داخل ہوئے اور بادشاہ نے ان کو دیکھا اور سلام کیا اور معانقہ کیا۔ یہ بادشاہ مسلمان تھا، اس کا نام تندوسیس تھا۔ اصحابِ کہف اس سے مل کر خوش ہوئے اور باتیں کیں، پھر اس کو رخصت کیا اور سلام کہا اور اپنی خواب گاہوں میں آ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو وفات دی۔ واللہ أعلم.

حکایت:

امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے حبیب بن مسلمہ کے ہمراہ جنگ کی، اُن کا گزر بلادِ روم میں کہف پر ہوا، اس میں ہڈیاں دیکھیں تو ایک کہنے والے نے کہا: یہ ہڈیاں اصحابِ کہف کی ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ان کی ہڈیاں تو تین سو برس سے پیشتر بوسیدہ ہو چکی ہیں۔[1] (رواہ ابن جریر) اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ہم نے اس زمانے کے لوگوں کو اُن کے حال پر اس لیے مطلع کیا کہ وہ اللہ کے وعدے کو سچا جانیں اور قیامت کے آنے میں کچھ شک وشبہہ نہ کریں، کیوں کہ وہ قیامت کے معاملے میں جھگڑا کرتے تھے، کوئی قیامت کو سچا جانتا تھا اور کوئی اس کا منکر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اصحابِ کہف کو اُن پر ظاہر کر دیا۔ دوبارہ زندہ ہو کر اُٹھنے اور قیامت قائم ہونے کی حجت قائم ہوگئی۔ لوگوں نے کہا: اُن پر ایک عمارت بنا دینا چاہیے، یعنی اُن کے غار کا دروازہ بند کر دو اور اُن کو اُس کے حال پر چھوڑ دو۔ غلبہ رکھنے والے لوگوں نے کہا کہ ہم تو اس جگہ ایک عبادت خانہ بنا دیں گے اور بس۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ ان قائلین میں دو قول ہیں: ایک یہ کہ وہ مسلمان تھے۔ دوسرے یہ کہ مشرک تھے۔[2] واللہ أعلم۔ ظاہر یہ ہے کہ اس قول کے کہنے والے اصحابِ کلمہ ونفوذ تھے۔

رہی یہ بات کہ وہ محمود تھے یا نہیں؟ سو اس میں نظر ہے، اس لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: «لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارَى اتَّخَذُوْا قُبُوْرَ أَنْبِيَائِهِمْ وَصَالِحِيهِمْ مَسَاجِدَ»[3] [اللہ تعالیٰ یہود ونصاریٰ پر لعنت فرمائے انھوں نے اپنے انبیا وصالحین کی قبروں کو مسجدیں بنا لیا تھا] آپ ان کے فعل سے تحذیر فرماتے تھے (ڈراتے تھے) اور

---

[1] تفسیر الطبري (۱۷/ ٦٢٨۔ ٦٢٩) [2] تفسیر الطبري (۱۷/ ٦٤٠)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۲٦٥) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٥٢٩۔ ٥٣٢)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب دانیال کی قبر اُن کے زمانے میں عراق میں برآمد ہوئی تو حکم دیا کہ اس کو لوگوں سے مخفی کر دو اور اس رقعہ کو جو اُن کے پاس پایا گیا ہے اور اس میں بعض ملاحم کا ذکر ہے، دفن کر دو۔[4]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جس طرح ہم نے ان کو سلایا پھر جگایا، اسی طرح ہم نے لوگوں کو اُن کے حال کی اطلاع دی، تاکہ وہ لوگ جان لیں کہ مر کر دوبارہ زندہ ہونا حق ہے۔ ان کے زمانے کا بادشاہ بعث کا منکر تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ نشانی دکھائی۔ اس اطلاع کا سبب وہ مرد بنا جو دقیانوس کی شکل والا روپیہ لے کر گیا تھا، اس کو بازار والوں نے تہمت لگائی کہ اس نے کوئی خزانہ پایا ہے اور اُسے پکڑ کر بادشاہ کے پاس لے گئے۔ بادشاہ نے کہا کہ تو نے یہ درہم کہاں سے پائے؟ اس نے کہا: کل کے روز کچھ کھجور فروخت کی تھی اور ہم بادشاہ دقیانوس کے خوف سے نکل بھاگے تھے۔ بادشاہ نے جان لیا کہ یہ سچا ہے، پھر اس مرد نے سارا قصہ بیان کیا، تب بادشاہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ سوار ہوا اور کہف میں آیا۔ اس اطلاع سے یہ علم بھی ہوا کہ قیامت کے ہونے میں کچھ شک نہیں ہے، جس نے اہلِ کہف کے حال کا مشاہدہ کیا ہے، وہ روحوں اور جسموں کے دوبارہ اُٹھائے جانے اور اکٹھے کیے جانے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے وعدے کو سچ جانتا ہے۔

اہلِ شہر کو اصحابِ کہف کے بارے میں اطلاع اس وقت ہوئی جب کہ اُن کے درمیان بعث کے بارے میں تنازع اور اختلاف ہو رہا تھا، یا اصحابِ کہف کے ٹھہرنے کی مدت، یا اُن کی تعداد کے بارے میں۔ بعض کا قول ہے کہ وہ ہمارے دین پر تھے، ہم اُن پر ایک مسجد بنائیں گے، لوگ اس میں نماز پڑھا کریں۔ مشرکوں نے کہا کہ ہم گرجا بنائیں گے، کیوں کہ وہ ہماری ملت پر تھے۔ بالجملہ یہ بات ٹھہری کہ ایک عمارت بنانی چاہیے، تاکہ لوگوں کو اُن تک راستہ نہ ملے، جس طرح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی حفاظت چار دیوار سے کی گئی ہے۔ یہ اس طرح پر ہوا کہ جب بادشاہ اور اس کے ساتھی کہف پر جا کر کھڑے ہوئے تو اصحابِ کہف زندہ تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اُن کو موت دی، بعض نے کہا کہ اُن پر ایک عمارت بنا دو کہ یہ لوگوں کی آنکھوں سے چھپے رہیں، پھر بادشاہِ وقت نے کہا: ہم اُن پر ایک مسجد بنائیں گے۔ یہ بادشاہ مسلمان تھا اور وہ بادشاہ جس کے وقت میں وہ نکلے تھے، اُن کی نیند کے دوران مر چکا تھا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ جب اصحابِ کہف کا حال کھلا تو مسلمان جو کہ بعث اور نشور کے قائل تھے، غالب آئے، اس لیے کہ مساجد مومنین ہی بناتے ہیں۔[2]

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۱۰۶) [2] معاني القرآن (۳/ ۲۷۷) فتح البیان (۸/ ۲۹۔ ۳۰)

سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۭ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ڢ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَاۗءً ظَاهِرًا ۠ وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ﴿٢٢﴾

عن قریب (کچھ لوگ) کہیں گے: وہ تین ہیں ان کا چوتھا ان کا کتا ہے۔ اور (کچھ دوسرے) کہیں گے: وہ پانچ ہیں، ان کا چھٹا ان کا کتا ہے، بن دیکھے پتھر مارتے ہوئے، اور (کچھ لوگ یہ بھی) کہیں گے: وہ سات ہیں، ان کا آٹھواں ان کا کتا ہے۔ آپ کہہ دیجیے: میرا رب ہی ان کی گنتی سے خوب واقف ہے، بہت تھوڑے لوگ ہی ان (کے حال) کو جانتے ہیں، لہٰذا آپ ان کی بابت بحث نہ کریں، سوائے سرسری بحث کے۔ اور آپ ان کی بابت ان میں سے کسی سے بھی نہ پوچھیں ﴿22﴾

اصحابِ کہف کی تعداد کا بیان:

یعنی اُن باتوں میں جھگڑنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ وہ سات ہیں[1] کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی دو باتوں کو بغیر دیکھے کا نشانہ کہا اور اس کو ایسا نہیں کہا۔

یہ بیان ہے لوگوں کے گنتی کے بارے میں اختلاف کا۔ تین قول بیان کیے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس بارے میں کوئی چوتھا قول نہیں ہے۔ پہلے دو قول کو ضعیف ٹھہرایا، رجماً بالغیب کہہ کر، یعنی یہ قول بلا علم ہے۔ جیسے کوئی نامعلوم جگہ پر پتھر چلائے کہ وہ اس جگہ پر نہیں پہنچے گا اور اگر پہنچے گا تو بلا قصد۔

پھر تیسرا قول بیان فرما کر سکوت کیا یا اس کو ﴿ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ﴾ کہہ کر مقرر رکھا، یہ اس قول کی صحت پر دلیل ہے کہ نفس الامر میں یوں ہی واقع ہوا تھا اور اُن کی گنتی کو اللہ تعالیٰ کے علم کے حوالے کرنے سے مراد اس بات کا ارشاد کرنا ہے کہ ایسے مواقع پر احسن طریقہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم کی طرف بات لوٹا دی جائے۔ ایسے امور جن کا علم نہ ہو اُن میں زیادہ غور و فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے، ہاں اگر اللہ تعالیٰ ہم کو مطلع کر دے تو ہم کہہ سکتے ہیں، ورنہ توقف کریں گے۔ پھر یہ فرمایا کہ تھوڑے لوگ جانتے ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ میں انہی تھوڑوں میں سے میں ہوں، جن کو اللہ نے مستثنیٰ کیا ہے، وہ سات شخص تھے۔ اسی طرح عطا خراسانی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جنھیں اللہ عزوجل نے مستثنیٰ کیا

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٦٤٢)

ہے۔ اُن کی گنتی سات شخص ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا دوسرا قول یہ ہے کہ ان کو تھوڑے لوگ ہی جانتے ہیں، میں بھی انہی تھوڑوں میں سے ہوں، وہ سات شخص تھے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما تک یہ ساری اسانید صحیح ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ مجھے بیان کیا گیا کہ ان میں سے بعض تو بہت ہی کم عمر تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ وہ رات دن اللہ کی عبادت کرتے، روتے اور اللہ سے فریاد رسی چاہتے، وہ آٹھ نفر تھے۔ مکسلمینا یہ سب میں بڑا تھا، بادشاہ نے اس سے بات چیت کی تھی، مجسیملینیا، یملیخا، مرطوس، کشوطوش، بیرونس، دینموس، دینموس، یطونس اور قالوس۔[2] اس آیت میں یوں ہی آیا ہے۔ اور احتمال ہے کہ یہ کلام محمد بن اسحاق کا اور درمیانی راویوں کا ہو، کیونکہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح روایت یہ ہے کہ وہ سات شخص تھے اور یہی ظاہر آیت ہے۔ شاید لفظِ سبعہ کے بجائے تسعہ ہو گیا ہوگا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ان کے ناموں اور ان کے کتے کے نام میں نظر ہے، واللّٰہ أعلم، ان میں سے بہت سی چیزیں اہلِ کتاب سے لی ہوئی ہیں۔[3]

﴿ مِرَآءً ظَاهِرًا ﴾ سے مراد سہل ونرم و آسان ہے، اس لیے کہ اس امر کی معرفت میں کچھ بڑا فائدہ نہیں ہے اور استفتا کرنے سے اس لیے منع فرمایا کہ اہلِ کتاب کو خود اُن کا علم حاصل نہیں ہے، اپنے جی سے جو چاہتے ہیں رجماً بالغیب کے طور پر کہہ دیتے ہیں۔ کسی معصوم پیغمبر کے کلام کی سند نہیں ہے۔ اور اے پیغمبر! تمھارے پاس اللہ تعالیٰ وہ حق بات لایا ہے جس میں کسی طرح کا شک وشبہہ نہیں ہے۔ تو یہی حق پہلی تمام کتابوں اور اقوال پر مقدم و حاکم ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ قریب ہے کہ یہ لوگ کہیں گے کہ کہف والے تین ہیں یا پانچ ہیں یا سات۔ یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اصحابِ کہف کی تعداد کے بارے میں تنازع کیا، ان میں اہلِ کتاب اور کچھ مسلمان لوگ تھے۔ بعض نے کہا خاص اہلِ کتاب تھے اور بس۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہود تھے۔[4] بہر حال یہ مراد نہیں ہے کہ اُن سب نے یہی ایک بات بالاتفاق کہی، بلکہ مطلب یہ ہے کہ بعض نے یوں کہا اور بعض نے وہ۔

غرض یہ کہ اس جگہ تین قول ہیں، دو قول نصاریٰ کے اور ایک قول مومنوں کا۔ بعض نے کہا کہ دوسرا قول یہود کا ہے اور تیسرا قول مومنوں کا، یہی زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ اس قول پر رجم بالغیب کا حکم نہیں لگایا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے پیغمبر! تم کہہ دو کہ اللہ ہی اُن کی گنتی کو جانے کہ وہ کتنے شخص ہیں، کیوں کہ یقین کے مرتبے مختلف ہوتے ہیں

---

(1) تفسیر الطبري (١٧/ ٦٤٢)

(2) تفسیر الطبري (١٧/ ٦٠٧) اصحابِ کہف کے ناموں میں اختلاف ہے۔ دیکھیں: تفسیر ابن کثیر (٣/ ١٠٧) تفسیر البغوي (٥/ ١٦٢) روح المعاني (١٥/ ٢٤٦) تفسیر القرطبي (١٠/ ٣٦٠)

(3) تفسیر ابن کثیر (٣/ ١٠٧)

(4) تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٥٤)

قوت کے لحاظ سے اور جہان کی تمام تفاصیل کا علم ہونا اللہ کی شان ہے، ہاں تھوڑے آدمی ایسے ہیں، جو اُن کی ذات کو یا ان کی تعداد کو جانتے ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کہتے تھے کہ ہم من جملہ ان قلیل کے ہیں، یہ سات شخص تھے۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے اُن کے نام ذکر کیے ہیں[1] اور بعض مفسرین نے اُن کے ناموں کے خواص اور فائدے ذکر کیے ہیں۔ اس ذکر کو تفسیر سے کچھ تعلق نہیں ہے اور بعض مشائخ بعض آفات کو دور کرنے کے لیے اُن کے ناموں سے کام لیتے ہیں اور مجرب بتاتے ہیں، لیکن ہمارے نزدیک یہ کام ٹھیک نہیں ہے، اگر اُن کے ناموں کے بجائے اُن کے رب کا نام لیں اور اس سے کام نکالیں تو عین اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی منشا کے مطابق ہے۔ افضل کے ہوتے ہوئے فاضل کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اسمائے حسنیٰ، اسمائے ملائکہ، انبیا اور صلحا کا نعم البدل ہیں اور اگر ان اسما کے ساتھ حرفِ ندا یا استغاثہ ہے تو پھر محض شرک ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو منع کر دیا کہ تم اصحابِ کہف کے بارے میں اہلِ کتاب سے جھگڑا نہ کرو اور اگر کرو تو فقط سرسری طور پر نہ کہ تعمق و دقت کے ساتھ (گہرائی اور باریکی کے ساتھ)، ان کی تکذیب نہ کرو، بلکہ یوں کہو کہ اس تعیین پر کچھ دلیل نہیں ہے۔ اس لیے توقف کرنا واجب ہے۔ پھر اس سے بھی منع کیا کہ تم ان کا حال ان سے دریافت کرو، کیونکہ مفتی کو مستفتی سے زیادہ عالم ہونا چاہیے اور یہاں یہ بات اُلٹی ہے، خصوصاً اہلِ کہف کے واقعہ میں اس جگہ تو جتنا حال اللہ نے بیان کر دیا ہے اسی قدر کافی ہے، لاعلم سے سوال کرنے کا حاصل؟ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ مراد یہودی ہیں۔[2] امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نصاریٰ ہیں[3]، یہی اولیٰ ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا کہ یعنی اُن سے نہ تو صحیح بات معلوم کرنے کے طور پر سوال کر نہ عیب جوئی کے طور پر جس سے مراد مسئول عنہ کو رسوا کرنا اور اس کے مسئلہ وقول کی تزییف مراد ہو کہ یہ بات مکارمِ اخلاق میں مخل ہوتی ہے۔[4] آیت مسلمانوں کو کسی شے کے علم کے بارے میں اہلِ کتاب سے رجوع کرنے کی ممانعت کی دلیل ہے۔[5]

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَاْیْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ۫ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِیْتَ وَقُلْ عَسٰۤی اَنْ یَّهْدِیَنِ رَبِّیْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿۲۴﴾

اور آپ کسی شے کے متعلق کبھی یہ نہ کہیں: بے شک میں اسے کل کرنے والا ہوں (23) مگر یہ کہ اللہ چاہے۔

---

(1) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٥٤) تفسير الطبري (١٧/ ٦٤٣) الدر المنثور (٥/ ٣٧٥۔ ٣٧٦)

(2) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٥٥)
(3) تفسير القرطبي (١٠/ ٣٨٤)

(4) تفسير البيضاوي (٣/ ٤٨٩)
(5) فتح البيان (٨/ ٣١۔ ٣٣)

اور جب آپ بھول جائیں تو اپنے رب کو یاد کریں اور کہیں: امید ہے کہ میرا رب اس معاملے میں رشد و بھلائی سے قریب تر بات کی طرف میری راہنمائی کرے گا ﴿24﴾

کسی کام کا ارادہ کرتے وقت "إن شاء الله" کہنا:

اصحابِ کہف کا قصہ تاریخ کی کتابوں میں نادرات میں لکھا تھا، ہر کسی کو کہاں خبر ہو سکتی تھی۔ کافروں نے یہود کے کہنے سے نبی اکرم ﷺ سے آپ کو آزمانے کے لیے پوچھا۔ آپ ﷺ نے وعدہ کیا کہ کل بتا دوں گا، اس بھروسے پر کہ جبریل علیہ السلام آئیں گے تو پوچھ لوں گا۔ جبریل علیہ السلام اٹھارہ دن تک نہ آئے، نبی اکرم ﷺ نہایت غمگین ہوئے، آخر یہ قصہ لے کر آئے اور آخر میں یہ نصیحت کی اگلی بات پر بغیر ان شاء اللہ تعالیٰ کہے ہوئے وعدہ نہ کریں، اگر ایک وقت بھول جائیں تو یاد آنے پر کہہ لیں اور فرمایا کہ اُمید رکھ کہ تیرا درجہ اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ کرے، یعنی کبھی نہ بھولے۔

اللہ پاک نے اس آیت پاک میں اپنے رسول کو ایک ادب سکھایا کہ جب کسی شے کے کرنے کا ارادہ زمانۂ مستقبل میں ہو تو اس عزم کو اللہ کی مشیت کی طرف لوٹا دو، کیوں کہ وہ علام الغیوب ہی جانتا ہے جو ہوا، جو ہوگا اور جو نہیں ہوا، جس طرح کہ صحیحین میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ سلیمان بن داود علیہما السلام نے کہا تھا کہ آج رات میں ستر عورتوں پر طواف کروں گا اور دوسری روایت میں نوے عورتیں آئی ہیں اور تیسری روایت میں سو عورتیں ہیں، ہر ایک عورت اُن میں سے ایک بچہ جنے گی، جو اللہ کی راہ میں جنگ کرے گا، اُن سے کہا گیا اور دوسری روایت میں ہے کہ فرشتے نے اُن سے کہا کہ ان شاء اللہ کہو، انھوں نے نہ کہا اور ان سے ازدواجی تعلق قائم کیا، اُن میں سے سوائے ایک عورت کے کسی نے بچہ نہ جنا اور ایک نے جو جنا وہ بھی نصف انسان۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر وہ ان شاء اللہ کہتے تو قسم توڑنے والے نہ ہوتے اور اپنی حاجت پا لیتے۔ دوسری روایت میں ہے کہ وہ سب اللہ کی راہ میں سوار ہو کر لڑتے۔[1] سورت کے شروع میں سببِ نزول کا ذکر گزر چکا ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ نے سوال کا جواب دینے کے لیے کل کے دن کا وعدہ کیا تو پندرہ دن تک وحی نہ آئی۔[2]

پھر فرمایا کہ جب تو ان شاء اللہ کہنا بھول جائے اور بعد میں یاد آئے تو وقت یاد آنے کے کہہ لے۔ امام ابو العالیہ اور حسن بصری رحمہ اللہ کا قول یہی ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ قسم کھانے والے کے لیے لازمی ہے کہ وہ ان شاء اللہ کہے، اگرچہ ایک سال بعد یاد آئے اور اسی بارے میں اس آیت کو کہتے تھے: ﴿ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ إِذَا نَسِيْتَ ﴾ (آیتِ باب) مطلب اس قول کا یہ ہے کہ جب قسم میں یا کلام میں ان شاء اللہ کہنا بھول گیا اور پھر یاد آ گیا

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٤٢، ٦٢٦٣، ٤٩٤٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٥٤)

[2] تفسير الطبري (١٧/ ٥٩٢۔ ٥٩٣) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔

گو ایک سال کے بعد ہو تو سنت یہ ہے کہ یوں یوں کہہ لے، تا کہ وہ ان شاء اللہ کہنے کی سنت پر عمل کر سکے۔ اگرچہ قسم کے ٹوٹنے کے بعد ہی کیوں نہ ہو۔ (قاله ابن جرير و نص على ذلك) نہ یہ کہ قسم ٹوٹنے کے نقصان کو رفع کرنے کے لیے یا کفارہ کو ساقط کرنے کے لیے یہ استثنا کرے، یعنی ان شاء اللہ کہے۔ ابن جریر کا قول ہی صحیح ہے۔ اور یہی لائق تر ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے کلام کو بھی اسی پر محمول کیا جائے۔ واللہ أعلم.[1]

لیکن اس آخر زمانے میں لفظ ان شاء اللہ جھوٹ بولنے والوں کا معمول بن گیا۔ فإنا لله۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ذکرِ رب سے مراد بھولنے کے وقت ان شاء اللہ کہنا ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی اسی کے قائل ہیں کہ جب یاد آئے تو ان شاء اللہ کہہ لیا کرو۔ اور کہا کہ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص ہے اور ہم میں کسی کو یہ بات نہیں پہنچتی کہ استثنا کریں، مگر قسم کے ساتھ ہی۔[3] آیتِ شریف میں ایک دوسری وجہ کا احتمال ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد کیا ہو اس شخص کو جو اپنے کلام میں اللہ کے ذکر میں سے کچھ بھول گیا ہے، کیوں کہ بھلا دینا شیطان کا منشا ہے، جیسے اللہ نے فرمایا: ﴿ وَمَآ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ ﴾ [الكهف: ٦٣] ''اور مجھے وہ نہیں بھلائی، مگر شیطان ہی نے کہ میں اسے یاد رکھوں۔'' اور اللہ کا ذکر یاد آنے کا سبب ہے، لہٰذا فرمایا کہ ﴿ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ ﴾ (آیتِ باب)۔

میں کہتا ہوں کہ اللہ کے ذکر اور رسول اللہ پر درود دونوں کا یہ اثر ہے کہ بھولی چیز یاد آ جاتی ہے۔ درود شریف کا تجربہ تو بارہا ہو چکا ہے اور اللہ کا ذکر خود تمام اذکار سے اعلیٰ و اولیٰ ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے کہا کہ جب تجھ سے ایسی بات پوچھی جائے جس کو تو نہیں جانتا تو اللہ تعالیٰ سے تو سوال کر اور اس کی طرف متوجہ ہو کہ وہ جواب میں تجھ کو توفیق صواب دے گا، اس کے سوا اور بھی تفسیر کی ہے۔ واللہ أعلم.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہود نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اصحابِ کہف کے جوانوں کے بارے میں سوال کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ میں تم کو کل خبر دوں گا اور ان شاء اللہ نہ کہا، وحی رک گئی، یہاں تک کہ آپ پر شاق ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بھیجی اور ان شاء اللہ کہنے کا حکم استثنا دیا کہ جب تو یوں کہے کہ میں فلاں کام کل کروں گا تو ان شاء اللہ کہہ۔[4]

---

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٦٤٥۔ ٦٤٦) تفسير ابن كثير (٣/ ١٠٨)

[2] امام عکرمہ رحمہ اللہ سے اس آیت کی تفسیر میں ان الفاظ کے بجائے یہ الفاظ مروی ہیں: "واذكر ربك إذا نسيت" قال: إذا غضبت" جیسا کہ نواب صاحب نے آگے خود ہی اس کی وضاحت کر دی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٥٥) تفسير ابن كثير (٣/ ١٠٨) الدر المنثور (٥/ ٣٧٨)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٥٥) [4] فتح القدير (٣/ ٣٨٥)

یہ استثنا مفرغ ہے، یعنی ہر وقت ہر حال میں کرے اور یاد کر اپنے رب کو جب کہ بھول گیا ہو، خواہ تھوڑی مدت ہو یا زیادہ۔ بعض نے کہا کہ یہ یاد کرنا اس طرح ہے کہ استغفار کر یا اللہ تعالیٰ کے عقاب کو یاد کر جب کہ اس کے کسی امر کو ترک کر دیا ہو، تاکہ یہ یاد تجھ کو جو کچھ ہو چکا ہے اس کے تدارک کا باعث ہو جائے۔ یا جس وقت تجھ کو نسیان ہو تو اللہ کو یاد کر، وہ بھولی ہوئی چیز یاد آ جائے گی۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ استثنا موصول (بات کے ساتھ ہی ان شاء اللہ کہنے) میں کوئی حنث صاحبِ استثنا پر نہیں ہے، ہاں اگر موصول نہیں ہے تو حانث ہے۔[1]

امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ إِذَا نَسِيتَ ﴾ کے معنی یہ ہیں: "إذا غضبت"۔[2] امام حسن رحمہ اللہ نے کہا کہ مطلب یہ ہے کہ جب تو نے ان شاء اللہ نہ کہا۔[3] بعض نے کہا کہ یہ آیت نماز کے حق میں آئی ہے اور سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث مرفوعاً اس پر دلیل ہے: «مَنْ نَسِيَ صَلَاةً فَلْيُصَلِّهَا إِذَا ذَكَرَهَا وَ أَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِيْ»[4] (متفق عليه) [جو شخص کوئی نماز بھول جائے تو جیسے ہی وہ اسے یاد آئے وہ نماز پڑھ لے، (قتادہ نے پڑھا) اور میری یاد کے وقت نماز قائم کریں] لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے اور کہہ اے نبی! عن قریب ہے کہ میرا رب مجھ کو توفیق دے گا رشد و ہدایت کی، یعنی آیات و دلالاتِ نبوت عطا فرمائے گا، جو رشد میں اہلِ کہف کے قصے سے بھی زیادہ تر قریب اور اول ہوں گے۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا کہ اگلے رسولوں کے احوالِ غائبہ اور قیامت تک نازل ہونے والے حوادثِ زمانہ کی اطلاع بخشی۔[5]

وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ۝۲۵ قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ ۭ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ ۡ وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ۝۲۶

اور وہ اپنے غار میں تین سو سال رہے اور مزید نو (سال) (25) کہہ دیجیے: اللہ ہی خوب جاننے والا ہے اس مدت کو جتنا (عرصہ) وہ رہے، آسمانوں اور زمین کا غیب اسی کے لیے ہے۔ وہ کیا ہی خوب ہے دیکھنے والا اور کیا ہی خوب سننے والا! ان کے لیے اس (اللہ) کے سوا کوئی بھی مددگار نہیں، اور وہ اپنے حکم میں کسی کو بھی شریک نہیں کرتا (26)

غار میں اصحابِ کہف کی مدتِ قیام:

جتنی مدت وہ سو کر جاگے تھے تاریخ والے کئی طرح بتاتے تھے۔ سب سے ٹھیک وہی ہے جو اللہ تعالیٰ بتا

---

(1) الدر المنثور (٥/ ٣٧٨) (2) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٥٥) (3) الأسماء والصفات للبيهقي (١/ ٤٤٥)
(4) صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٨٤) (5) فتح البيان (٨/ ٣٤-٣٦)

دے۔ یہاں تک قصہ ہو چکا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو اصحابِ کہف کی غار میں ٹھہرنے کی مدت کی خبر کر دی کہ جب سے ان کو سلایا اور جب تک جگایا اور زمانے کے لوگوں کو اُن کے حال پر اطلاع کی، تب تک چاند کے حساب سے تین سو نو برس ہوتے ہیں اور سورج کے حساب سے پورے تین سو سال، کیوں کہ قمری سو سالوں اور شمسی سو سالوں میں تین سال کا فرق ہوتا ہے، اس لیے تین سو سال پر نو برس کا اضافہ فرمایا، پھر فرمایا کہ اے نبی! اگر وہ تجھ سے سوال کریں کہ وہ کتنے دن سوئے رہے اور تجھے معلوم نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ نے تجھے اُن کے ٹھہرنے کی مدت نہیں بتائی ہے تو تو اپنے جواب میں جلدی نہ کر، بلکہ ایسے موقع میں یہ کہہ کہ اللہ ہی جانے وہ کتنی مدت رہے، کیوں کہ اللہ کو آسمانوں اور زمین کے غیبوں کا علم ہے، یا اپنی مخلوق میں سے جس کو وہ بتا دے۔ اکثر علمائے تفسیر اسی قول کی طرف گئے ہیں، جیسے: امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ سلف و خلف۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ تین سو برس کی مدت بتانا اہلِ کتاب کا قول ہے، اللہ نے اس قول کو ﴿ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ﴾ (آیتِ باب) کہہ کر رد کر دیا، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے تین سو برس پر نو برس زیادہ کیے تو معلوم ہوا کہ یہ قول یہود کی حکایت نہیں ہے، بلکہ اللہ کی طرف سے اطلاع ہے، اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت "وقالوا: ولبثوا" [یعنی لوگوں نے یہ کہا کہ وہ اپنے غار میں تین سو سال رہے] شاذ ہے، بہ نسبت قراءتِ جمہور کے لائقِ حجت نہیں ہے۔ امام ابن جریر کہتے ہیں: "أبصر به وأسمع" میں ایک طرح کا مدح میں مبالغہ ہے، یعنی اللہ بڑا دیکھنے والا ہر موجود کا اور بڑا سننے والا ہر مسموع (سنائی دینے والا) کا ہے۔ اس پر کوئی شے مخفی نہیں ہے[1] اور وہی صاحبِ خلق و اَمر ہے، کوئی اس کے حکم کو پیچھے ڈالنے والا نہیں اور نہ کوئی اس کا وزیر و نصیر و شریک و مشیر ہے۔ تعالیٰ و تقدس.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ شمسی تین سو سال قمری حساب سے تین سو نو برس ہوتے ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اہلِ کتاب میں اختلاف تھا۔ کسی نے تین سو سال اور کسی نے تین سو نو سال کہے۔ اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ یہ مدت تو اُن کے سونے کی ہے، اس کے بعد کی مدت مجہول ہے، وہ کسی بشر کو معلوم نہیں۔ لہٰذا حکم دیا کہ اس کا علم اللہ کی طرف پھیر دو کہ وہی جانے کہ اصحابِ کہف کتنی مدت رہے، یا اُن کی موت کے بعد نزولِ قرآن تک کتنا زمانہ گزرا بقول امام مجاہد رحمہ اللہ۔ یا مرنے تک کتنا زمانہ گزرے گا بقول امام ضحاک رحمہ اللہ۔ یا اس وقت تک کہ وہ بوسیدہ ہو کر متغیر ہو جائیں بقول بعض۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا کہ لوگ نہیں جانتے کہ نو زیادہ ہونے سے نو دن مراد ہیں یا نو جمعہ یا نو

[1] تفسير الطبري (١٧/ ٦٤٧۔ ٦٥٠) تفسير ابن كثير (٣/ ١٠٨۔ ١٠٩)

ماہ یا نو سال۔ بنی اسرائیل کا اختلاف اسی جگہ سے ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے نو کے علم کو اپنی طرف لوٹا دیا، یہ نو کا عدد مبہم ہے، لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے، کیوں کہ ظاہر کلام عرب سے اُن کے محاورے اور لغت کے حساب سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ مراد نو برس ہیں۔ امام قشیری رحمہ اللہ نے کہا کہ یعنی سنین کے لفظ کی وجہ سے۔[1] امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ تین سو سال شمسی ہوئے اور تین سو نو سال قمری۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ایک شخص کسی آیتِ کریمہ کی تفسیر کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ ایسے ہے، جب کہ وہ ایسے ہے، جب کہ وہ آسمان و زمین کے درمیان فاصلے سے بھی دور کی تفسیر کر رہا ہوتا ہے۔ پھر انھوں نے یہ آیتِ کریمہ تلاوت فرمائی: ﴿ وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ﴾ الآية'' پھر کہا: قوم کتنی مدت کہف میں رہی؟ بولے: تین سو نو برس۔ کہا: اگر اتنی مدت رہتے تو اللہ یوں نہ فرماتا: ﴿ قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ﴾ [کہہ دیجیے کہ اللہ ہی زیادہ جانتا ہے کہ وہ کتنی دیر ٹھہرے] لیکن اللہ تعالیٰ نے قوم کا قول بیان کیا اور کہا: ﴿ سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ ﴾ [الكهف: ٢٢] ''عن قریب (کچھ لوگ) کہیں گے: وہ تین ہیں ان کا چوتھا ان کا کتا ہے۔ اور (کچھ دوسرے) کہیں گے: وہ پانچ ہیں، ان کا چھٹا ان کا کتا ہے، بن دیکھے پتھر مارتے ہوئے۔'' پھر کہا کہ عن قریب وہ کہیں گے: ﴿ وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ إلى قوله: تِسْعًا ﴾ (آیتِ بات)۔[3]

امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا کہ اصحابِ کہف کے بارے میں اختلاف ہے کہ مرکر فنا ہو گئے یا اب تک خوابِ راحت میں ہیں اور اُن کے جسم محفوظ ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہ لوگ فنا ہو کر مدتِ طویل سے عدم کے گھاٹ میں اتر چکے ہیں۔ اُن کے بعض لوگ ان کے ساتھ شام کی جنگوں میں گئے تھے موضع کہف تک، وہاں کچھ ہڈیاں پائیں۔ ایک فرقہ کہتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام حج کریں گے ان کے ساتھ اصحابِ کہف ہوں گے، کیوں کہ انھوں نے حج نہیں کیا ہے، اس کا ذکر امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کیا ہے۔ تورات و انجیل میں بھی اسی طرح پر ہے اور یہ پوری حدیث تذکرے میں لکھی ہے۔[4] اس صورت میں وہ سوتے ہیں مرے نہیں اور نہ قیامت تک مریں گے۔ ہاں قیامِ ساعت سے پہلے اُن کو موت آئے گی۔[5]

میں کہتا ہوں کہ بعض تواریخ اسلام میں ذکر کیا ہے کہ عباسی دور کے بعض خلفا کے زمانے میں کچھ لوگ اصحابِ کہف کی تلاش میں گئے تھے۔ لمبے سفر اور سخت تکلیف اُٹھانے کے بعد موقعِ کہف میں پہنچے تو اُن کو زندہ شکل میں سوتا ہوا پایا اور لوٹ کر خلیفۂ وقت کو سارا قصہ بیان کیا، بہرحال یا تو وہ زندہ ہیں، یا بحکم ''نَمْ كنومة العروس'' باوجود موت

---

[1] تفسير القرطبي (١٠/ ٣٨٦۔ ٣٨٧) [2] فتح القدير (٣/ ٣٨٧) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٣٥٥)

[4] التذكرة للقرطبي (١/ ٧٧٣۔ ٧٧٤) اس کی سند میں ''کثیر بن عبداللہ'' ضعیف راوی ہے۔

[5] تفسير القرطبي (١٠/ ٣٨٨) فتح البيان (٨/ ٣٦۔ ٣٨)

کے اُن کے جسم محفوظ ہیں، جس طرح کہ بعض اولیا اور صلحا کے جسم بھی محفوظ رہتے ہیں۔

صاحبِ دلائل الخیرات اور شیخ علی متقی مکی رحمہ اللہ کی قبروں کو بعض دوسرے مردوں کو دفن کرنے کی غرض سے کھودا گیا تو اُن کے جسم کو ایسا تروتازہ پایا جیسا کہ اسی دن مرے ہیں، نہ ناخن بڑھے اور نہ بال اور نہ ہی کوئی اور چیز بدلی۔ اور شہدا کے جسم تو غالباً محفوظ ہی رہتے ہیں اور انبیا علیہم السلام تو سرے ہی سے معصوم ہیں اور زمین پر اُن کے جسموں کو کھانا حرام ہے، وہ اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور بہ حفاظتِ الٰہی مشرکوں کے شرک اور بدعتیوں کی بدعات سے محفوظ ہیں۔ گور پرستوں، پیر پرستوں نے سب کی قبروں کو پوجا، مگر انبیا اور رسولوں کی قبروں کو اللہ تعالیٰ نے بچا لیا۔ وللّٰہ الحمد.

پھر جب اللہ تعالیٰ نے اہلِ کہف کے غار میں ٹھہرنے کے علم کو اپنے ساتھ مخصوص کر لیا تو اس کی تاکید میں یہ ارشاد کیا کہ اللہ ہی کو آسمانوں اور زمین کے غیب کا علم ہے، وہ سب سے بڑھ کر سنتا دیکھتا ہے، اہل سما و ارض کے لیے، یا اصحابِ کہف کے لیے، یا نبی ﷺ کے زمانے کے کفار کے لیے سوائے اللہ کے کوئی دوستدار و متولی الامر (حاکم) اور مددگار نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی انتہائی قدرت کا بیان ہے کہ سب اسی کے مقہور ہیں، وہ کسی کو اپنے حکم میں شریک نہیں کرتا۔

وَاتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۖ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُونِهِ مُلْتَحَدًا ﴿٢٧﴾ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ ۖ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا ﴿٢٨﴾

اور آپ اس کی تلاوت کیجیے جو کچھ آپ کے رب کی کتاب میں سے آپ کی طرف وحی کیا گیا ہے، اس کے کلمات کو کوئی بدلنے والا نہیں، اور آپ اس کے سوا کوئی جائے پناہ ہرگز نہیں پائیں گے (27) اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ روک رکھیں، جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں، وہ اس کا چہرہ چاہتے ہیں اور آپ کی آنکھیں ان سے تجاوز نہ کریں کہ دنیاوی زندگی کی زینت چاہنے لگیں اور اس شخص کی اطاعت نہ کریں، جس کا دل ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا، اور وہ اپنی خواہش کے پیچھے چلا، اور اس کا معاملہ حد سے بڑھا ہوا ہے (28)

تلاوت و تبلیغ اور مومنوں کے ساتھ صبر کرنے کا حکم:

ایک کافر نبی اکرم ﷺ کو سمجھانے لگا کہ اپنے پاس رذیلوں کو نہ بیٹھنے دو تاکہ سردار لوگ تمہارے پاس

بیٹھیں۔ رذیل غریب مسلمانوں کو کہا اور سردار دولت مند کافروں کو۔ اسی پر یہ آیت آئی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو حکم دیا کہ تم قرآن کی تلاوت کرو اور لوگوں کو یہ کلام پہنچا دو، کوئی اس کلام کو تبدیل کرنے والا، تحریف کرنے والا اور زائل کرنے والا نہیں ہے، ملتحد سے مراد جائے نجات ہے۔ یعنی اگر تو قرآن کی تلاوت اور تبلیغ نہ کرے گا تو تیرے لیے اللہ کے نزدیک نجات کی کوئی جگہ نہیں ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ﴾ [المائدة: ٦٧] ''اے رسول! آپ کے رب کی طرف سے آپ پر جو نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دیجیے۔ اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو گویا آپ نے اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا، اور اللہ آپ کو لوگوں (کے شر) سے بچائے گا۔''

نیز فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ ﴾ [القصص: ٨٥] ''بلاشبہ وہ (اللہ) جس نے آپ پر قرآن نازل کیا، یقیناً وہ آپ کو (اچھے) انجام تک پہنچانے والا ہے۔'' یعنی تجھ سے ابلاغِ رسالت کا سوال کیا جائے گا تو اُن لوگوں کے پاس بیٹھا کر جو صبح و شام اللہ کا ذکر کرتے ہیں، یعنی تہلیل و تحمید و تسبیح و تکبیر بجا لاتے ہیں، خواہ فقیر ہوں یا غنی، یا طاقتور یا کمزور۔

کہتے ہیں کہ اس آیت کا نزول اشرافِ قریش کے بارے میں ہوا ہے، جب کہ انھوں نے نبی ﷺ سے کہا تھا کہ تم اکیلے ہمارے پاس بیٹھا کرو اور اپنے کمزور یاروں میں نہ بیٹھو، جیسے: سیدنا بلال، عمار، صہیب، خباب اور سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم، اُن کی مجلس ہم سے علاحدہ ہوا کرے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم ﷺ کو اس کام سے منع کیا کہ تم ہرگز ایسی بات نہ کرنا، بلکہ تم انہی لوگوں کے پاس بیٹھا کرو اور اپنے نفس کو اس مجالست پر مجبور کرو۔ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نبی مکرم ﷺ کے ہمراہ چھے لوگ تھے، مشرکوں نے نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ اُن لوگوں کو اپنے پاس سے ہٹا دے، یہ ہم پر جرأت نہ کیا کریں۔ میں تھا اور سیدنا عبداللہ بن مسعود اور ایک مرد ہذیل کا اور بلال اور دو اور مرد جن کا نام میں بھول گیا۔ نبی اکرم ﷺ کے جی میں، جو اللہ نے چاہا، واقع ہوا اور دل میں گزرا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بھیجی۔[1] (انفرد بإخراجه مسلم دون البخاري) سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ایک واعظ پر آئے، جو وعظ کہہ رہا تھا، وہ رک گیا، فرمایا: وعظ کہہ۔ اگر میں صبح سے سورج نکلنے تک بیٹھوں تو یہ مجھ کو زیادہ پسند ہے چار غلام آزاد کرنے سے۔[2] (رواه أحمد)

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اگر میں ایسی قوم کے پاس بیٹھوں جو نمازِ صبح سے طلوعِ آفتاب تک اللہ کی یاد کرتے ہیں تو یہ مجھے اس چیز سے زیادہ محبوب ہے جس پر سورج نکلتا ہے اور اگر میں نمازِ عصر سے سورج غروب ہونے تک اللہ کا ذکر کروں تو یہ مجھے اولادِ اسماعیل میں سے آٹھ گردنیں آزاد کرنے سے زیادہ محبوب ہے، اس میں

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٤١٣) [2] مسند أحمد (٥/ ٢٦١)

سے ہر گردن کی دیت بارہ ہزار ہے۔ ہم نے اُن کی دیت کا حساب لگایا اور ہم سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی مجلس میں تھے تو وہ چھیانوے ہزار تک پہنچے اور اس جگہ کوئی شخص اولادِ اسماعیل کی چار گردن کہتا ہے۔ واللہ! نبی کریم ﷺ نے نہیں کہا، مگر آٹھ گردن اُن میں سے ہر ایک کی دیت بارہ ہزار ہو۔[1] (رواه أحمد) امام ابو مسلم کوفی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کا گزر ایک مرد پر ہوا، وہ سورت کہف پڑھ رہا تھا۔ نبی مکرم ﷺ کو دیکھ کر چپ ہو گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہی مجلس ہے وہ جس کے بارے میں مجھ کو یہ حکم ہوا ہے کہ میں اپنے نفس کو اُن کے ساتھ رکھوں۔ (رواه البزار وروى أيضاً مرسلا)

سیدنا ابو ہریرہ اور ابو سعید رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم ﷺ تشریف لائے، ایک شخص سورت حجر یا سورت کہف پڑھ رہا تھا، وہ چپ ہو گیا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «هَذَا الْمَجْلِسُ الَّذِيْ أُمِرْتُ أَنْ أَصْبِرَ نَفْسِيْ مَعَهُمْ»[2] (رواه يحيىٰ بن المعلى) [یہی وہ مجلس ہے جہاں اپنے نفس کو روک کر رکھنے کا مجھے حکمِ الٰہی ہوا ہے] سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «مَا مِنْ قَوْمٍ نِ اجْتَمَعُوْا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ لَا يُرِيْدُوْنَ بِذٰلِكَ إِلَّا وَجْهَهُ إِلَّا نَادَاهُمْ مُنَادٍ مِّنَ السَّمَآءِ أَنْ قُوْمُوْا مَغْفُوْرًا لَّكُمْ قَدْ بُدِّلَتْ سَيِّآتُكُمْ حَسَنَاتٍ»[3] (تفرد به أحمد) [ذکر اللہ کے لیے جو قوم جمع ہو، نیت بھی ان کی بخیر ہو تو آسمان سے منادی ندا کرتا ہے کہ اٹھو اللہ نے تمھیں بخش دیا ہے، تمھاری برائیاں بھلائیوں سے بدل دیں] عبدالرحمٰن بن سہل بن حنیف نے کہا ہے کہ نبی مکرم ﷺ پر جب یہ آیت اتری تو آپ ﷺ اپنے کسی گھر میں تھے: ﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ﴾ (آیتِ باب) نبی اکرم ﷺ گھروں سے باہر نکل کر جستجو کرنے لگے، ایک قوم کو پایا کہ وہ اللہ کا ذکر کرتے تھے، ان میں سے کوئی پریشان بال تھا اور کوئی سخت کھال ایک ہی کپڑے پہنے ہوئے، جب ان کو دیکھا اُن کے پاس بیٹھ گئے اور کہا: «اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ جَعَلَ فِيْ أُمَّتِيْ مَنْ أَمَرَنِيْ أَنْ أُصَبِّرَ نَفْسِيْ مَعَهُمْ»[4] (رواه الطبراني) [سب تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے میری امت میں ایسے لوگ رکھے ہیں جن کے ساتھ بیٹھنے کا مجھے حکم ہوا ہے]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ﴿لَا تَعْدُ عَيْنَاكَ﴾ سے یہ مراد ہے کہ تو اُن لوگوں کو چھوڑ کر اُن کے غیر کی طرف تجاوز نہ کر،[5] یعنی ان کے بدلے میں اہلِ ثروت و شرف کا طالب نہ ہو اور جس کے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے، یعنی دینِ الٰہی و عبادتِ رب سے اس دنیا میں مشغول کر دیا ہے اور اس کے اعمال اور افعال کمینگی اور ضائع اور کمی

---

[1] مسند الطيالسي (١/ ٢٨١) اس کی سند میں ''یزید بن ابان'' ضعیف راوی ہے۔
[2] مسند البزار (١٨/ ٨٩) ان دونوں روایتوں کی سند میں ''عمرو بن ثابت ابو المقدام'' متروک راوی ہے۔ نیز پہلی روایت مرسل بھی ہے۔
[3] مسند أحمد (٣/ ١٤٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٢١٠)
[4] تفسير الطبري (١٨/ ٦) اس کی سند میں ''اسامہ بن زید بن اسلم'' ضعیف راوی ہے۔ نیز امام طبرانی رحمہ اللہ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے۔
[5] تفسير الطبري (١٨/ ٦)

کے ہیں تو اس کا مطیع نہ ہو اور نہ اس کے طریقے کو دوست رکھ اور نہ اس کی دولت وحشمت وغیرہ پر رشک کر، جیسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ۚ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ﴾ [طٰہٰ: ۱۳۱] ''اور (اے نبی!) ان چیزوں کی طرف آپ اپنی نگاہیں نہ اُٹھائیں جو چیزیں زندگانیِ دنیا کی آرایش کی ہم نے ان میں سے مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہیں، تاکہ ہم انھیں ان کے ذریعے سے آزمائیں، اور آپ کے رب کا رزق بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو کتابِ عزیز، جو اُن کی طرف وحی کی گئی ہے، کی تلاوت میں ہمیشگی کرنے کا حکم کیا اور فرمایا کہ ان کلمات کا کوئی بدلنے والا نہیں ہے۔ کس کی قدرت ہے کہ اس کو تبدیل کر سکے، یا اس میں تغیر یا تحریف کر سکے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے جس کی خبر دی اور جو حکم کیا اس کا بدلنے والا کوئی نہیں ہے۔[1] ملتحد سے مراد ملجا (جائے پناہ) ہے، یعنی اگر تو قرآن کا اتباع نہ کرے گا اور اس کو پڑھتا نہ رہے گا اور اس کے احکام پر عمل نہ کرے گا تو تجھ کو راہِ راست سے پھر جانے اور مائل ہونے کی کوئی جگہ نہ ملے گی۔ یہ آیت اہلِ کہف کے قصے کی آخری آیت ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے دوسری طرح کا بیان شروع کیا ہے اور کہا کہ جو لوگ اللہ کے داعی یعنی عابد ہیں، جیسے: فقرا مومنین، تو اُن کی مجلس میں بیٹھنے پر اپنے نفس کو مجبور کر۔

یہ آیت سورت انعام کی آیت سے ابلغ ہے، اس لیے کہ اس آیت میں نبی اکرم ﷺ کو اُن کے طرد (دور کرنا) سے منع کیا ہے[2] اور اس آیت میں اُن کے ساتھ نشست کرنے کا اور صابر رہنے کا حکم ہے۔ ''غداۃ وعشی'' سے مراد ہمیشگی ہے دعا کرنے کی تمام اوقات میں۔ بعض نے کہا کہ دن میں ہر دو طرف، یا مراد نمازِ عصر و فجر ہے۔ غرض یہ کہ مطلب اُن کا اس دعا سے اللہ کی رضا ہے نہ کہ دنیا کی عزت۔ سیدنا سلمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مؤلفۃ القلوب آئے، یعنی عیینہ بن بدر اور اقرع بن حابس۔ کہا: اے اللہ کے رسول! کاش! آپ صدرِ مجلس میں بیٹھتے اور اُن لوگوں سے اور ارواحِ جباب سے غائب ہوتے، یعنی سلمان، ابو ذر اور فقرا مسلمین سے۔ یہ لوگ بالوں کے جبے پہنے ہوئے تھے تو ہم آپ کے پاس بیٹھتے، بات چیت کیا کرتے اور علم حاصل کرتے۔ اس پر اللہ نے یہ آیت بھیجی: ﴿ وَاتْلُ مَآ أُوحِىَ إِلَيْكَ ﴾ الی قولہ: ﴿ إِنَّآ أَعْتَدْنَا لِلظَّٰلِمِينَ نَارًا ﴾[3] (آیتِ باب و ۲۹) (أخرجه البيهقي)

ابو الشیخ سیدنا سلمان رضی اللہ عنہ سے راوی ہیں کہ نبی مکرم ﷺ کھڑے ہوگئے اور اُن لوگوں کو تلاش کرنے لگے جن کے ساتھ مصابرت کا حکم ہے، یہاں تک کہ ان کو مسجد کے آخر میں ذکر کرتے ہوئے پایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] معاني القرآن (۳/ ۲۸۰) [2] رقم الآية [۵۲]

[3] شعب الإيمان (۷/ ۳۳۶) اس کی سند میں ''سلیمان بن عطاء حرانی'' ضعیف راوی ہے۔

«اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يُمِتْنِيْ حَتّٰى أَمَرَنِيْ أَنْ أَصْبِرَ نَفْسِيْ مَعَ رِجَالٍ مِّنْ أُمَّتِيْ، مَعَكُمُ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتُ »[1] [سب تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے اس وقت تک مجھ کو موت نہیں دی، جب تک مجھے یہ حکم نہیں دے لیا کہ میں اپنی امت کے کچھ مردوں کے ساتھ بیٹھوں، میرا جینا اور مرنا تمھارے انھی لوگوں کے ساتھ ہو]

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو نمازِ پنج گانہ میں حاضر ہوتے ہیں۔ (وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما مثلہ)[2] بعض نے کہا کہ یہ آیت نمازِ صبح وعصر کے حق میں نازل ہوئی۔

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تو اُن کو چھوڑ کر غیر کی جانب نگاہ نہ کر، یعنی صاحبِ حیثیت و صاحبِ زینت کی طرف اس ارادے سے مائل نہ ہو کہ دنیا کی زندگی رونق دار ہے، یعنی اہلِ ترف (ناز ونعمت والے خوشحال) وشرف و غنی وصحبتِ اہلِ دنیا سے اور جو لوگ ایسے ہیں کہ اُن کے دل ہماری یاد سے غافل ہیں، جیسے یہ فقرا مومنین سے منع کرنے والے اور اپنی خواہشاتِ نفس کے تابع اور اُن کا کام حدِ اعتدال سے تجاوز کرنا ہے، اُن کی اطاعت نہ کر۔ اتباع ہوائے نفسانی سے مراد باطل کو حق پر اختیار کرنا اور شرک کو توحید پر اختیار کرنا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہ آیت اُمیہ بن خلف کے بارے میں اُتری ہے، کیوں کہ اس نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ تم ان غریبوں اور بے حیثیت لوگوں کی صحبت کو چھوڑ دو اور اہلِ مکہ کے سرداروں کو اپنا مقرب بناؤ، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اُتاری۔[3] ابن بریدہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عیینہ بن حصن نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، دن گرم تھا، آپ کے پاس سیدنا سلمان رضی اللہ عنہ جبہ صوف پہنے ہوئے بیٹھے تھے، ان کے پسینے کی بو اُن سے نکلی، عیینہ نے کہا: اے محمد! جب ہم تمھارے پاس آئیں تو تم اس کو اور اس جیسے اور لوگوں کو اپنے پاس سے نکال دیا، کرو کہ ہم کو ایذا نہ دیں، جب ہم چلے جائیں تو تم جانو اور یہ، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا﴾[4] (آیتِ باب)

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ۭ وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ ۭ بِئْسَ الشَّرَابُ ۭ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا ﴿٢٩﴾

اور کہہ دیجیے: حق تو تمھارے رب کی طرف سے ہے، پھر جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے، بلاشبہ ہم نے ظالموں کے لیے ایسی آگ تیار کر رکھی ہے، جس کی قناتوں نے ان کا احاطہ کر رکھا ہے اور

---

[1] الدر المنثور (٥/ ٣٨٠) [2] تفسير الطبري (١١/ ٣٨٣) الدر المنثور (٥/ ٣٨٢)
[3] الدر المنثور (٥/ ٣٨٢۔ ٣٨٣) [4] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٥٧) فتح البيان (٨/ ٣٩۔ ٤٢)

اگر وہ پانی کے لیے فریاد کریں گے تو ایسے پانی کے ساتھ ان کی فریاد رسی کی جائے گی جو تیل کی تلچھٹ کے مانند ہوگا، وہ (ان کے) چہرے بھون ڈالے گا، وہ برا مشروب ہے اور وہ بری آرام گاہ ہے (29)

حق سے انکار کرنے والوں کا انجام:

اللہ تعالیٰ اپنے رسول پاک کو فرماتا ہے کہ اے محمد! تم لوگوں سے کہہ دو کہ یہ جو تمھارے رب کی طرف سے میں تمھارے پاس لایا ہوں یہ حق ہے، اس میں کچھ شک و شبہہ نہیں ہے، اب جس کا جی چاہے وہ اس کو مانے اور جس کا جی چاہے نہ مانے۔ یہ ارشاد بطورِ تہدید (جھڑکی) اور وعیدِ شدید ہے، لہٰذا فرمایا کہ ہم نے ظالموں کے لیے، یعنی اللہ اور رسول اور قرآن کے منکروں کے لیے ایک ایسی آگ تیار کر رکھی ہے، جس کی فصیل نے ان کو گھیر رکھا ہے۔ ''سرادق'' سے مراد شہر کی دیوار (فصیل) ہے۔ سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا: سرادق نار کے لیے چار دیواریں ہیں، ہر دیوار کا موٹاپا چالیس سال کی مسافت جتنا ہے۔[1] (أخرجه أحمد و الترمذي في صفة النار و ابن جرير في تفسيره نسأل الله العافية)

احوالِ نار کے بیان میں رسالہ ''النذير العريان من دركات النيران'' آگ کے جملہ ابواب کا احاطہ کرتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ سرادق آگ کی ایک دیوار ہے۔[2] یعلی بن اُمیہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ مرفوعاً یہ ہیں: « اَلْبَحْرُ هُوَ جَهَنَّمُ » [سمندر بھی جہنم ہے] پھر یہ آیت باب پڑھی۔ پھر کہا: « وَاللّٰهِ لَا أَدْخُلُهَا أَبَدًا، أَوْ مَا دُمْتُ حَيًّا وَّلَا يُصِيبُنِي مِنْهَا قَطْرَةٌ »[3] (رواه ابن جرير) [اللہ کی قسم! میں اس میں کبھی نہ جاؤں گا جب تک زندہ رہوں اور نہ اس کا کوئی قطرہ مجھے پہنچے]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ مُہل آبِ غلیظ ہے، جیسے: تیل کی تلچھٹ۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ مُہل خون اور پیپ ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ شے ہے جس کی گرمی حد کو پہنچ گئی ہو۔ بعض نے کہا کہ ہر پگھلی ہوئی چیز ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کچھ سونا ایک گڑھی میں گھلایا، جب وہ پگھل کر جوش مارنے لگا تو کہا کہ یہ شے مُہل کے بہت مشابہ ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جہنم کا پانی کالا ہے اور خود جہنم اور اس کے اہل سیاہ ہیں۔[4] ان اقوال میں سے کوئی شے دوسروں کے خلاف نہیں ہے، کیوں کہ مُہل ان اُوصافِ رذیلہ کا

---

[1] مسند أحمد (۳/ ۲۹) سنن الترمذي، رقم الحديث (۲۵۸٤) تفسير الطبري (۱۸/ ۱۲) اس کی سند میں ''دراج عن ابی الہیثم'' ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٤٦٧٥)

[2] تفسير الطبري (۱۸/ ۱۱)

[3] تفسير الطبري (۱۸/ ۱۲) مسند أحمد (٤/ ۲۲۳) اس کی سند میں ''محمد بن حيي'' مجہول راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ۱۰۲۳)

[4] تفسير الطبري (۱۸/ ۱۲۔ ۱۳) تفسير ابن كثير (۳/ ۱۱۱)

جامع ہے اور سیاہ بدبودار گاڑھا اور گرم ہے۔ لہٰذا فرمایا کہ منہ کو گرمی سے بھون ڈالتا ہے۔ جب کہ کافر اس کو پیے گا تو منہ سے لگتے ہی چہرے کی کھال گر جائے گی، جس طرح کہ امام احمد کے نزدیک سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ پانی مہل کی طرح ہوگا، یعنی تیل کی گاد (تلچھٹ) جب منہ سے قریب کرے گا، چہرے کا چمڑا گل کر اس میں گر پڑے گا۔[1] (رواه الترمذي من حديث رشدين وقد تكلم فيه من قبل حفظه)

ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے آیتِ کریمہ: ﴿ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ ۝ يَّتَجَرَّعُهٗ ﴾ [إبراهيم: ١٦۔ ١٧] ''اس کے آگے جہنم ہے اور (وہاں) اسے پیپ کا پانی پلایا جائے گا۔ جسے وہ گھونٹ گھونٹ پیے گا۔'' کی تفسیر میں مرفوعاً کہا ہے کہ جب نزدیک لایا جائے گا تو اس کو مکروہ رکھے گا، جب منہ سے لگے گا تو منہ کو بھون ڈالے گا اور سر کی کھوپڑی کا چمڑا گر پڑے گا، جب اس کو پی لے گا تو اس کی آنتیں کٹ جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ ۭ بِئْسَ الشَّرَابُ ۭ وَسَاۗءَتْ مُرْتَفَقًا ﴾[2] (آیتِ باب)۔

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ دوزخیوں کو جب بھوک لگے گی فریاد کریں گے، تب درختِ زقوم سے اُن کی فریاد رسی کی جائے گی، جب اس کو کھائیں گے تو جبڑوں کا چمڑا گل کر گر پڑے گا، اگر کوئی گزرنے والا اُن پر گزرے گا، جو اُن کو پہچانتا تھا تو اُن کے چہروں کی کھال کو پہچان لے گا، پھر اُن پر پیاس ڈالی جائے گی، وہ فریاد کریں گے، تب پانی دیں گے، جیسے مہل، یعنی انتہا درجے کا گرم، جب وہ اس پانی کو اپنے منہ کے قریب لائیں گے، اس کی گرمی سے اُن کے چہروں کا گوشت ساقط ہو جائے گا۔[3]

لہٰذا مذکورہ پانی کے وصف کے بعد جو اِن تمام صفاتِ ذمیمہ وقبیحہ کا حامل ہوگا، بئس الشراب فرمایا ہے۔ جس طرح دوسری آیت میں کہا ہے: ﴿ وَسُقُوْا مَاۗءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَاۗءَهُمْ ﴾ [محمد: ١٥] ''اور انھیں گرم کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا، تو وہ اُن کی آنتیں ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا؟'' نیز فرمایا: ﴿ تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ﴾ [الغاشية: ٥] [انھیں گرم کھولتے چشمے کا پانی پلایا جائے گا] أي حَارَّةٍ یعنی گرم جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ﴾ [الرحمن: ٤٤] ''اور وہ جہنم کے درمیان اور سخت گرم کھولتے پانی کے درمیان چکر لگائیں گے۔'' ''مُرتفق'' سے مراد منزل اور سونے کی جگہ، اور اکٹھے ہونے کی جگہ اور آرام کرنے کی جگہ یعنی انتفاع ہے، جس طرح کہ دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ اِنَّهَا سَاۗءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴾ [الفرقان: ٦٦] ''بے شک وہ (جہنم) ٹھہرنے اور قیام کرنے کی بری جگہ ہے۔''

---

[1] مسند أحمد (٣/ ٧٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٨١) اس کی سند میں ''دراج عن ابی الہیثم'' ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الترغيب والترهيب: ٢/ ٢٣٥)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٨٣) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٧١) اس کی سند میں ''عبید اللہ بن بسر'' مجہول راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٦٨٩٧)

[3] تفسیر الطبري (١٨/ ١٤۔ ١٥) تفسير ابن كثير (٣/ ١١٢)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ نبی تم ان غافلوں سے کہہ دو کہ یہ وحی جو مجھ پر آئی ہے، یہ تمھارے رب کی طرف سے حق ہے یا یہ فقرا کے ہمراہ صبر کرنا حق ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ حق قرآن ہے،[1] اب جو کوئی چاہے ایمان لائے اور جو کوئی چاہے وہ ایمان نہ لائے۔ اس میں سخت ڈانٹ اور ڈراوا اور خوف ہے نہ کہ تخییر اور اباحت۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایمان چاہا، وہ ایمان لایا اور جس کے لیے کفر چاہا، وہ کافر ہوا اور یہ اللہ تعالیٰ کا فرمان بھی ہے: ﴿ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [التکویر: ۲۹] ”اور اللہ رب العالمین کے چاہے بغیر تم (کچھ بھی) نہیں چاہ سکتے۔“[2]

امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا کہ سرادق وہ ہے جو صحنِ خانہ کے اوپر کھینچا جاتا ہے، یعنی شامیانہ۔ اور ہر روئی کے گھر کو سرادق کہتے ہیں۔[3] ابن الاعرابی نے کہا کہ مراد سور (فصیل۔ دیوار) ہے۔ امام قتیبی نے کہا کہ سرادق وہ حجرہ ہے جو خیمہ کے گرد ہوتا ہے،[4] یعنی قنات۔ مھل کہتے ہیں پگھلے ہوئے لوہے کو یا تانبے کو یا سیسے کو یا پیتل کو یا تیل کے تلچھٹ کو جو برتن کی تہہ میں رہ جاتی ہے، مشابہت کی وجہ گرمی اور رداءت ہے۔ بعض نے کہا کہ ایک قسم ہے قطران (گندھک) کی۔ ”مرتفق“ سے مراد مجلس ہے۔[5]

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ
مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ۚ﴿۳۰﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ
تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّيَلْبَسُوْنَ
ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا
عَلَى الْاَرَآئِكِ ؕ نِعْمَ الثَّوَابُ ؕ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ۚ﴿۳۱﴾

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، یقیناً ہم اس کا اجر ضائع نہیں کرتے جس نے اچھا عمل کیا (30) انھی لوگوں کے لیے ابدی باغات ہیں، جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہاں انھیں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے اور وہ باریک اور موٹے ریشم کے سبز کپڑے پہنیں گے، وہاں تختوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے۔ کیا اچھا بدلہ ہے اور وہ اچھی آرام گاہ ہے! (31)

ایمان اور اعمالِ صالحہ کا بدلہ:

نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مردوں کو سونا اور ریشمی کپڑا جنت میں ملنا ہے، جو کوئی یہ چیزیں یہاں پہنے گا، اسے

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٥٨) [2] تفسير الطبري (١٨/ ١٠) [3] الصحاح للجوهري (٤/ ١٨٢)
[4] فتح القدير (٣/ ٣٩٠) [5] فتح البيان (٨/ ٤٣_ ٤٥)

یہ وہاں نہیں ملیں گی۔[1]

اللہ تعالیٰ نے بد بختوں کا ذکر کرنے کے بعد نیک بختوں کا ذکر کیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ پر ایمان لائے اور رسولوں کی تصدیق کی اور جن اعمالِ صالحہ کا حکم تھا وہ بجا لائے، اُن کے رہنے بسنے کے لیے بہشت ہے۔ عدن کے معنی ہیں اقامت کے۔ اُن کے کمروں اور منزلوں کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی۔ فرعون نے کہا تھا: ﴿ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴾ [الزخرف: ٥١] ''اور کیا یہ نہریں نہیں جو میرے (محلات کے) نیچے بہتی ہیں؟ کیا پھر تم دیکھتے نہیں؟'' اُن کا زیور سونے کے کنگن ہوں گے، دوسری جگہ فرمایا ہے: ﴿ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۚ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴾ [الحج: ٢٣، الفاطر: ٣٣] ''وہاں انھیں سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے اور وہاں ان کا لباس ریشم کا ہوگا۔'' اور اس جگہ سبز لباس کا ذکر کیا ہے۔ ﴿ سُنْدُسٍ ﴾ باریک عمدہ قیمتی کپڑے ہیں، جیسے: قمیص اور اس جیسا لباس۔ ﴿ اِسْتَبْرَقٍ ﴾ کہتے ہیں موٹے دیباج کو، اس میں ایک طرح کی چمک ہوتی ہے۔

''اتکاء'' سے مراد لیٹنا ہے یا مربع بیٹھنا، یعنی ٹیک لگا کر بیٹھنا۔ یہ مراد کے زیادہ مشابہ ہے۔ اس جگہ حدیثِ صحیح میں مروی ہے: «أَمَّا أَنَا فَلَا آكُلُ مُتَّكِئًا»[2]۔ ''أریکه'' کہتے ہیں اس مسہری کو جو حجلۂ عروس کے نیسے ہوتی ہے اور حجلہ وہ ہے جسے لوگ ہمارے زمانے میں شبخانہ بولتے ہیں، یعنی چھپر کھٹ یا مسہری۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ''أرائك'' حجلے ہیں، معمر رحمہ اللہ نے کہا: ''سرر في الحجال''[3] [حجلوں میں تخت] ہیں۔ یہ کیا اچھا بدلہ ہے اور کیا اچھی آرام گاہ ہے۔ جیسا کہ جہنم کے بارے میں فرمایا تھا: ﴿ بِئْسَ الشَّرَابُ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا ﴾ [الکہف: ٢٩] ''وہ برا مشروب ہے اور وہ بری آرام گاہ ہے۔'' اسی طرح سورت فرقان میں دونوں کا تقابل کرتے ہوئے جہنم کے حق میں کہا ہے: ﴿ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴾ [الفرقان: ٦٦] ''بے شک وہ (جہنم) ٹھہرنے اور قیام کرنے کی بری جگہ ہے۔''

پھر مومنین کی صفات کا ذکر کیا اور فرمایا: ﴿ اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴾ [الفرقان: ٧٥۔ ٧٦] ''انھی لوگوں کو ان کے صبر کے بدلے میں (جنت کے) بالاخانے جزا میں دیے جائیں گے، اور وہاں دعا اور سلام کے ساتھ ان کا استقبال ہوگا۔ وہ ہمیشہ وہاں رہیں گے، وہ (بہشت) بہت اچھا مستقر اور مقام ہوگا۔'' نسأل اللّٰہ الجنة ونعوذ به من النار.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اہلِ ایمان کے اعمالِ صالحہ کے اجر ضائع نہیں کرتے، بلکہ ان کے لیے باغات اقامت گاہ

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٥١١٠) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٠٦٧)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٥٠٨٣) سنن الترمذي، رقم الحدیث (١٨٣٠) [3] تفسیر الطبري (١٨/ ١٨)

ہیں اور بہترین رہائش گاہیں وہی ہوتی ہیں جن کے نیچے نہریں بہیں۔ کنگن ایک زینت ہے، جو پہنچی میں پہنی جاتی ہے اور بادشاہ لوگ پہنا کرتے ہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ سارے کنگن سونے کے ہوں گے۔ دوسری آیت میں چاندی کا بھی ذکر آیا ہے اور تیسری آیت میں موتیوں کا۔ معلوم ہوا کہ سب قسم کے زیور ہوں گے کسی کے ہاتھ میں سونے کا کنگن اور کسی کے ہاتھ میں چاندی کا اور کسی کے ہاتھ میں موتیوں کا، احتمال ہے کہ کبھی ایک قسم کا کنگن اور کبھی دوسری قسم کا کنگن ہو۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «تَبْلُغُ الْحِلْيَةُ مِنَ الْمُؤْمِنِ حَيْثُ يَبْلُغُ الْوَضُوءُ»[1] (رواه الشيخان) [مومن کا زیور وہاں پہنچے گا جہاں اس کے وضو کا پانی پہنچے گا] زیور کے ذکر کے بعد لباس کا ذکر کیا، اس لیے کہ یہ نفس کے لیے بہت پسندیدہ ہے اور سبز رنگ کا لباس آنکھ کو بہت اچھا لگتا ہے اور تمام رنگوں سے اچھا ہوتا ہے۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿سُنْدُسٍ﴾ پتلے باریک ریشم کو کہتے ہیں اور ﴿اِسْتَبْرَقٍ﴾ موٹے کو۔ یا استبرق وہ دیباج ہے جس کو سونے سے بنایا ہو۔ امام قتیبی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ لفظ فارسی معرب ہے،[2] اس کی تصغیر ابیرق ہے۔ مرثد بن عبداللہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جنت میں ایک درخت ہے، اس سے سندس اُگتا ہے، وہی اہلِ جنت کا لباس ہوگا۔[3] ﴿اِسْتَبْرَقٍ﴾ استر ہوگا اور ﴿سُنْدُسٍ﴾ ابرہ۔ ہیثم بن مالک طائی رحمہ اللہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ آدمی چہل سالہ راہ پر تکیہ لگا کر بیٹھے گا نہ پہلو بدلے اور نہ ملول ہو۔ اس کے پاس وہ چیزیں آئیں گی جن کو اس کا جی چاہے گا اور آنکھ کو مزہ ملے گا۔[4] (رواه ابن أبي حاتم)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: "أريكة" وہی سریر (پلنگ) ہوتا ہے جو حجلہ کے اندر ہو۔[5] یہ جنت اچھا نیگ اور یہ "أرائك" اچھی نشست گاہ ہے۔ اس جگہ پانچ طرح کا ثواب مذکور ہوا: ایک جنّاتِ عدن، دوم نہروں کا جاری ہونا جنات کے نیچے، سوم کنگن کا پہنایا جانا، چہارم سندس اور استبرق کا لباس اور پنجم تکیہ لگانا۔[6] وللہ الحمد، اللهم ارزقنا بمنك وكرمك وعفوك عنا.

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّ حَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّ جَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ﴿۳۲﴾ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا ۙ وَّ فَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ﴿۳۳﴾ وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٠) [2] فتح القدير (٣/ ٣٩١) [3] الدر المنثور (٥/ ٣٨٧)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٦٠) یہ روایت مرسل ہے۔ [5] الدر المنثور (٥/ ٣٨٨) [6] فتح البيان (٨/ ٤٥۔ ٤٨)

مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ﴿٣٤﴾ وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ
مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا ﴿٣٥﴾ وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ
وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ﴿٣٦﴾

اور (اے نبی!) ان کے لیے ایک مثال بیان کیجیے، دو آدمی ہیں، ہم نے ان میں سے ایک کو انگوروں کے دو باغ عطا کیے اور ان کے گرد کھجوروں کی باڑ لگا دی اور ان دونوں کے درمیان کھیتی اُگائی (32) دونوں باغوں نے اپنا پھل دیا، اور اس میں سے کچھ بھی کم نہ کیا اور ان کے درمیان ہم نے ایک نہر بہائی (33) اور اس کے لیے پھل تھے تو وہ اپنے ساتھی سے کہنے لگا، جبکہ اس سے بحث کر رہا تھا: میں تجھ سے مال میں زیادہ ہوں اور جتھے میں (بھی) زیادہ معزز ہوں (34) اور وہ اپنے باغ میں داخل ہوا، جب کہ وہ اپنی جان کے لیے ظالم تھا، اس نے کہا: میں گمان نہیں کرتا کہ یہ (باغ) کبھی تباہ ہوگا (35) اور میں گمان نہیں کرتا کہ قیامت قائم ہونے والی ہے، اور اگر (بالفرض) واقعی مجھے اپنے رب کی طرف لوٹایا گیا تو یقیناً ضرور میں وہاں ان (باغوں) سے بہتر لوٹنے کی جگہ پاؤں گا (36)

مشرک دولت مند اور فقیر مسلمان کی مثال:

پہلے وقت میں ایک شخص مال دار مر گیا، دو بیٹے تھے، برابر مال بانٹ لیا۔ ایک نے زمین خرید کی، دو طرف میووں کے باغ لگائے، درمیان میں کھیتی اور ندی کاٹ لا کر اُن میں ڈالی کہ مینہ نہ ہو تو بھی نقصان نہ آئے اور عمدہ جگہ بیاہ کیا، اولاد ہوئی، نوکر رکھے، تدبیرِ دنیا درست کر کے آسودہ زندگی بسر کرنے لگا۔ دوسرے نے سب مال اللہ کی راہ میں خرچ کیا، آپ قناعت سے بیٹھ رہا۔ دوسرے نے اس پر فخر کیا۔ مال تو اللہ کی نعمت تھی، لیکن اِترانے سے اور کفر بکنے سے آفت آئی۔ منکر لوگ جانتے ہیں کہ جیسے دنیا میں گناہوں کے ساتھ عیش کرتے ہیں، وہی بات ہوگی آخرت میں بھی۔ سو ایسا ہرگز نہیں ہونا۔

اللہ تعالیٰ نے پہلے مشرکین تکبر کرنے والے لوگوں کا ضعیف اور مسکین مسلمین کی ہم نشینی کا ذکر کیا کہ اُن کو اپنے مالوں اور حسب و نسب کا غربائے اہلِ دین پر فخر ہے۔ پھر اُن دونوں فریق کے لیے ایک مثال بیان کی کہ دو مرد تھے، ایک مرد کے انگور اور کھجور سے لدے ہوئے دو باغ تھے، اُن کے درمیان میں کھیتی ہوتی تھی، ہر قسم کے درخت اور کھیتی اور پھل پھول نہایت خوبی کے ساتھ ہوتے تھے۔ کسی طرح کا نقصان اس کی پیداوار میں نہیں تھا۔ اُن باغوں اور کھیتوں میں مختلف نہریں جاری تھیں، یعنی نالے ندی بہتے تھے اور پھل، یعنی مال حاصل ہوتا تھا۔ یہی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد اور قتادہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔[1] بعض نے کہا کہ یعنی پھل اور میوے پیدا ہوتے تھے۔

[1] تفسیر الطبري (١٨/ ٢١) تفسیر ابن کثیر (٣/ ١١٣)

ثمر کے یہی معنی اس جگہ زیادہ ظاہر ہیں۔ اس باغات والے نے اپنے اس دوسرے بھائی سے لڑائی اور فخر کے طور پر اور اپنی سرداری کے غرور میں یہ بات کہی کہ میں مال اور نوکروں چاکروں میں تجھ سے بڑھ کر ہوں۔ نفر سے مراد خدام، نوکر چاکر اور اولاد ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ کی قسم! ایک فاجر و فاسق انسان کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے پاس مال و دولت کی کثرت ہو اور پارٹی کے اعتبار سے اسے عزت حاصل ہو۔[1] بالجملہ وہ شخص اپنے باغ میں آیا اور وہ اپنے اس کفر و سرکشی تکبر و تجبر اور آخرت کے انکار کی وجہ سے اپنے نفس پر ظلم کرنے والا تھا۔ کہنے لگا: مجھے گمان نہیں ہے کہ یہ آمدنی اور جائیداد کبھی جاتی رہے گی، یہ کلمہ اس نے غرور کی راہ سے کہا تھا۔ کھیتی اور پھلوں اور درختوں اور ندی نالوں کو باغات کے چاروں طرف دیکھ کر اس نے خیال کیا کہ یہ اتنا زیادہ مال و متاع بھلا کس طرح فنا اور ہلاک اور ضائع ہو جائے گا؟ یہ اس کی کم عقلی اور یقین کی کمزوری تھی، اللہ کے ساتھ اور دنیا کی زندگی اور زیب و زینت پر تعجب کرنے اور آخرت کا انکار کرنے کا سبب تھا۔ لہٰذا کہا کہ مجھے گمان نہیں آتا کہ قیامت قائم ہوگی اور اگر فرضاً ہوئی اور میں رب کے پاس لے جایا گیا تو اس سے بہتر حصہ مجھ کو ملے گا۔ اگر میں رب کے نزدیک عزت والا نہ ہوتا تو وہ مجھے یہ ساز و سامان اور برگ و بارکیوں کر دیتا، جیسے دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ وَلَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْٓ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى ﴾ [حم السجدة: ٥٠] ''اور اگر مجھے میرے رب کی طرف لوٹایا گیا تو بلاشبہ اس کے پاس میرے لیے بھلائی ہی ہوگی۔'' نیز فرمایا ﴿ اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَقَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ﴾ [مريم: ٧٧] ''پھر آپ اس شخص کے بارے میں بتلایئے جس نے ہماری آیات کا انکار کیا اور کہا: مجھے ضرور مال اور اولاد دی جائے گی۔'' اس آیت کے نزول کا سبب سیدنا عاص بن وائل رضی اللہ عنہ کے حق میں تھا، جیسا کہ اپنے مقام پر اس کا ذکر آئے گا۔ إن شاء الله تعالىٰ.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یہ آیت اس شخص کی کہاوت ہے جو دنیا کے غرور میں ہے اور فقرا کے ساتھ مجلس کرنے سے عار رکھتا ہے۔ بعض مفسرین نے کہا کہ یہ دونوں شخص مقدر ہیں اور بعض نے کہا کہ محقق۔ پھر اُن کی تعیین میں اختلاف ہے۔ کسی نے کہا کہ یہ بنی اسرائیل میں سے دونوں بھائی تھے، ایک مومن تھا، جس کا نام یہوذا تھا، سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق[2] اور بعض نے کہا کہ اس کا نام تملیخا تھا۔ دوسرا کافر تھا اور قیطوس نام تھا۔ انہی دونوں کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۃ الصافات میں کیا ہے: ﴿ قَالَ قَآىِٕلٌ مِّنْهُمْ اِنِّيْ كَانَ لِيْ قَرِيْنٌ ﴾ [الصّافات: ٥١] ''ان میں سے ایک کہنے والا کہے گا: بے شک میں (اور دنیا میں) میرا ایک ہم نشین تھا۔'' اور بعض نے کہا کہ یہ دونوں بھائی مخزومی تھے، اہلِ مکہ میں سے۔ مومن کا نام ابوسلمہ عبداللہ بن عبدالاسد بن عبد یالیل تھا اور کافر کا نام اسود بن عبد الاسد۔

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٢٢) [2] تفسير البغوي (٥/ ١٧٠)

بعض نے کہا کہ یہ ایک مثال ہے عیینہ بن حصن اور اصحابِ عیینہ کے ساتھ سلمان اور اصحابِ سلمان کی، جو کافر تھا، اُن دونوں میں اس کے پاس ایک باغ تھا، جس کی دیوار بھی تھی، اس کے بیچ میں ایک ندی تھی، اس لیے اس کو دو باغ فرمایا۔

امام یحییٰ شیبانی رحمہ اللہ کہتے تھے کہ نہر ابی فرطس نہر جنتین ہے، یہ رملہ میں ایک مشہور نہر ہے،[1] وہ باغ انگور کا تھا، اس کے اردگرد کھجور کے درخت تھے۔ دہقان لوگ ایسا ہی کیا کرتے ہیں کہ انگور کے گرد اور پھل دار درخت لگا دیتے ہیں۔ ان دونوں باغوں کے درمیان کھیتی ہوتی تھی، تا کہ ہر ایک باغ پیداوار اور پھلوں کی شکل حسن اور ترکیب کے لحاظ سے بہت عمدہ ہو اور متواصل العمارۃ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ وہ دونوں باغ خوب پھل لاتے تھے، ان کے میووں میں کسی طرح کی کمی نہیں ہوتی تھی، بلکہ ہر سال بھرپور میوہ کافی وافی آتا تھا۔ ہر دو باغ کا یہ وصف اس لیے بیان کیا کہ اس باغ کی عادت دوسرے تمام باغوں کے برخلاف تھی، کیوں کہ غالب خیال یہ ہے کہ اکثر باغات ایک سال زیادہ پھل دیتے ہیں اور دوسرے سال کم پھل دیتے ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اس باغ کا ہر درخت اپنے پھل میں کم نہ تھا،[2] اُن دونوں باغوں کے بیچ میں ایک نہر جاری تھی۔ ثمر میں ایک قراءت بالفتح ہے اور ایک قراءت ثمر بضم اول وسکون ثانی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی قراءت ہے، یعنی انواعِ مال۔[3] اس کافر نے اپنے صاحب مومن سے بات چیت میں یہ کہا کہ میں مال میں تجھ سے زیادہ اور نفر میں غالب تر ہوں، پھر وہ اپنے باغ میں گیا۔ مفسرین کہتے ہیں کہ اپنے برادر مومن کا ہاتھ پکڑ باغ میں لے جا کر پھرایا اور وہاں کے عجائب و آثار اور حسن اور پھل دکھائے اور اُن مالوں اور املاک پر فخر کیا، حالاں کہ وہ اس کفر اور فخر کی وجہ سے اپنی جان پر ظلم کرنے والا اور ستم گر اور ناشکرا تھا، پھر اپنے فرطِ غفلت اور لمبی لمبی تمناؤں اور خواہشات کے ساتھ یہ بات کہی کہ مجھے گمان نہیں ہے کہ میرا یہ باغ اُجڑے اور میں قیامت قائم ہونے کا خیال نہیں کرتا ہوں۔ یہ دوبارہ جی اُٹھنے کا انکار تھا، اس کے بعد کہ وہ باغ کے فنا ہونے کے امکان سے پہلے انکار کر چکا تھا۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ اس نے اپنے بھائی کو اپنے کفر کی خبر دی کہ نہ دنیا فنا ہو نہ قیامت آئے[4] اور اگر بالفرض والتقدیر ایسا ہی ہوا کہ قیامت آئی تو میرا انجام وہاں پر اس آغاز سے بھی بہتر ہوگا۔ اس لیے کہ بقول تیرے یہ دنیا فانی ہے اور وہ باقی ہے۔ یہ بات غائب کو حاضر پر قیاس کر کے کہی، یعنی جس طرح میں دنیا میں دولت مند اور مال دار ہوں، اسی طرح آخرت میں بھی غنی اور دولت مند رہوں گا۔ یہ نہ جانا کہ اس جگہ کی یہ تونگری تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک استدراج (ڈھیل، مہلت) ہے۔[5]

---

[1] الدر المنثور (٥/ ٣٩٠) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٦١) [3] تفسير الطبري (١٨/ ٢١)
[4] معاني القرآن (٣/ ٢٨٥) [5] فتح البيان (٨/ ٤٨۔ ٥٢)

قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ
مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ۟ؕ۳۷ لٰكِنَّا۠
هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَاۤ اُشْرِكُ بِرَبِّيْۤ اَحَدًا ۟۳۸ وَلَوْلَاۤ اِذْ دَخَلْتَ
جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنْ تَرَنِ
اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّ وَلَدًا ۟ۚ۳۹ فَعَسٰى رَبِّيْۤ اَنْ يُّؤْتِيَنِ
خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ
صَعِيْدًا زَلَقًا ۟ۙ۴۰ اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ
طَلَبًا ۟۴۱

اس کے (مومن) ساتھی نے اس سے کہا، جبکہ اسے جواب دے رہا تھا: کیا تو اس (ذات) کے ساتھ کفر کرتا ہے جس نے تجھے مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفے سے، پھر تجھے ٹھیک پورا مرد بنا دیا؟ 37 لیکن (میں تو عقیدہ رکھتا ہوں کہ) وہ اللہ ہی میرا رب ہے، اور میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہیں کرتا 38 اور جب تو اپنے باغ میں داخل ہوا تو کیوں نہ کہا: ما شاء اللہ، لا قوۃ الا باللہ (جو اللہ نے چاہا، کوئی قوت نہیں مگر اللہ کی مدد سے)؟ اگر تو مجھے مال اور اولاد میں کمتر دیکھتا ہے 39 تو اُمید ہے کہ میرا رب مجھے تیرے باغ سے بہتر دے اور اس (تیرے باغ) پر آسمان سے کوئی عذاب بھیجے تو وہ (باغ) چٹیل پھسلنا میدان ہو جائے 40 یا اس کا پانی گہرا ہو جائے، پھر تو ہرگز اسے تلاش کرنے کی استطاعت نہیں رکھے گا 41

فقیر مسلمان کا جواب کہ احسان فراموشی کفر کے مترادف ہے:

رسول ﷺ نے فرمایا کہ جب آدمی کو اپنے گھر بار میں آسودگی نظر آئے تو یہی لفظ کہے: ”ماشاء اللہ لا قوۃ إلا باللہ“ کہ ٹوک نہ لگے۔

اللہ تعالیٰ نے اس دوسرے شخص مومن کے حال کی خبر دی جس نے کافر کو اس کے کفر اور غرور پر وعظ کیا اور ڈانٹا اور کہا کہ تیری اصل تو یہی ہے کہ تو مٹی سے بنا ہے، یعنی آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا کیے گئے ہیں، پھر اُن کی نسل ایک حقیر پانی کے قطرے سے چلی، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ﴾ [السجدة: ۷۔ ۸] ”جس نے ہر چیز کو اچھے طریقے سے پیدا کیا، اور اس نے تخلیقِ انسان کی ابتدا مٹی سے کی۔ پھر اس کی نسل ایک حقیر پانی کے جوہر (نطفے) سے چلائی۔“

نیز فرمایا: ﴿ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ [البقرة: ٢٨] ''تم اللہ کے ساتھ کیسے کفر کرتے ہو؟ حالاں کہ تم مردے تھے، پھر اس نے تمھیں زندہ کیا، پھر تمھیں موت دے گا، پھر وہی تمھیں زندہ کرے گا، پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔'' یعنی تم کس طرح اپنے رب کا انکار کرتے ہو، حالاں کہ رب کی دلالت تم پر ظاہر اور نمایاں ہے۔ ہر کوئی اپنے دل میں جانتا ہے کہ میں پہلے کچھ نہیں تھا، پھر موجود ہوا اور اس کا یہ وجود خود اس کی طرف سے نہیں ہے کہ آپ ہی آپ ہو گیا ہو اور نہ کسی اور مخلوق کی طرف اس کی نسبت ہے، کیوں کہ تمام مخلوقات تو خود اس کے مانند ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایجاد کی نسبت، یعنی اسناد فقط خالق کی طرف ہے: ﴿ هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴾ [الأنعام: ١٠٢] ''وہی ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے، چناں چہ تم اسی کی عبادت کرو اور وہ ہر چیز پر نگران ہے۔'' لہٰذا اس مومن نے کہا: میں تو یہی کہوں گا کہ اللہ واحد وہی میرا رب ہے اور کسی کو اس کا شریک نہیں کروں گا اور تیرا ہمنوا نہیں بنوں گا، بلکہ اپنا معبود اسی وحدہ لاشریک لہ کو مانوں گا۔

کوئی اچھی چیز دیکھ کر کیا کہنا چاہیے؟

پھر اس کو یوں وعظ کیا کہ اگر تم کو یہ زمین اور باغ کا سلسلہ اچھا لگا تھا تو تو نے اس باغ میں داخل ہوتے وقت اللہ تعالیٰ کی اس کے انعام ونعمت اور مال و اولاد پر حمد وثنا کی ہوتی، جو اس نے تجھ کو دیا اور دوسروں کو نہ دیا اور ''ماشاء الله لا قوة إلا بالله'' کہا ہوتا۔

اسی جگہ سے بعض سلف نے کہا ہے کہ جس کسی کو اپنے حال، مال یا اولاد میں سے کوئی چیز بہت ہی انوکھی معلوم ہو تو اسے یہ کلمات: ''ماشاء الله لا قوة إلا بالله'' پڑھ لینے چاہییں۔ یہ قول اسی آیتِ کریمہ سے ماخوذ ہے۔ اس بارے میں ایک مرفوع حدیث بھی مروی ہے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: « مَا أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَى عَبْدٍ مِّنْ نِعْمَةٍ مِنْ أَهْلٍ أَوْ مَالٍ أَوْ وَلَدٍ فَيَقُوْلُ: مَا شَاءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ فَيَرَى فِيْهِ آفَةً دُوْنَ الْمَوْتِ » وكان يتأول هذه الآية: ﴿ وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ﴾ [1] (رواه أبو يعلى الموصلي) [جس بندے پر اللہ تعالیٰ اپنی کوئی نعمت انعام فرمائے، اہل وعیال ہوں، دولت مندی ہو، فرزند ہوں، پھر وہ اس کلمے کو کہہ لے تو اس پر، سوائے موت کے کوئی آنچ نہ آئے گی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت (آیتِ باب) کی تلاوت فرمائی] لیکن اس کی سند میں عیسیٰ بن عون ہے۔ حافظ ابو الفتح ازدی رحمہ اللہ نے کہا کہ اس کی روایت سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔ [2]

---

[1] المعجم الأوسط (٦/ ١٢٦) اس کی سند میں ''عبدالملک بن زرارہ'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٢٠١٢) نیز مسند ابی یعلیٰ میں ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے۔

[2] تفسير ابن كثير (٣/ ١١٤)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ مرفوعاً یوں ہیں: «أَلَا أَدُلُّكَ عَلَى كَنْزٍ مِّنْ كُنُوْزِ الْجَنَّةِ لَا حَوْلَ قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ »[1] (تفرد به أحمد) [کیا میں تمھیں جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانے کے بارے میں نہ بتاؤں؟ (وہ یہ ہے) ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ'' ''اللہ تعالیٰ کی حفاظت کے بغیر کسی شخص کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی (اور گناہ) سے بچنے کی قدرت نہیں اور اللہ کی مدد (اور توفیق) کے بغیر کسی شخص کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی طاقت نہیں] لیکن صحیح میں سیدنا ابوموسیٰ سے مرفوعاً یہ الفاظ آئے ہیں: ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ''[2] سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے کہا: اے ابوہریرہ! کیا میں نہ بتاؤں تجھ کو عرش کے نیچے بہشت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ۔ میں نے کہا: ہاں، میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں! فرمایا: تو یوں کہا کر: « لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ » ابو بلج کہتے ہیں کہ مجھے گمان ہے کہ پھر یوں کہا: اللہ کہتا ہے: « أَسْلَمَ عَبْدِيْ وَاسْتَسْلَمَ » [میرے بندے نے سرِ تسلیم خم کیا] کہا: میں نے سیدنا عمرو سے کہا کہ ابو بلج نے یوں کہا ہے کہ سیدنا عمرو نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے کہا: ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ''؟ کہا: نہیں وہ تو سورت کہف میں ہے: ﴿ وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ ... الخ ﴾[3] (رواه أحمد)

حکایت:

دارالہجرت کے امام مالک بن انس رحمہ اللہ صاحبِ موطا کے ترجمہ میں آیا ہے کہ انھوں نے اپنے گھر کے دروازے پر یہ لکھ رکھا تھا: ''مَا شَاءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ'' کسی نے پوچھا: تم نے یہ کیوں لکھا ہے، کہا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ﴾ اور میری جنت یہی میرا گھر ہے۔ پھر مومن نے اس کافر کو کہا کہ مجھے اُمید ہے کہ میرا رب آخرت میں مجھے تیری اس جنت سے بہتر دے گا اور تیرے اس باغ پر جس کو تو سمجھتا ہے کہ یہ برباد نہیں ہوگا، کوئی آفت آسمان سے بھیج دے گا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام ضحاک، قتادہ اور زہری رحمہم اللہ نے کہا کہ ''حسبان'' سے مراد عذاب ہے[4] اور ظاہر یہ ہے کہ مراد زور دار بارش ہے، جو کھیتی اور درختوں کو تباہ و برباد کر دے اور اُن کا قلع قمع کر دے۔ یعنی ایسا موسلا دار پانی برسے جو کھیتی اور درختوں کا ستیاناس کر دے، خاک میں ملا دے۔ لہٰذا فرمایا کہ وہ باغ ایک صاف خاک کا میدان ہو جائے، اس میں کوئی پیداوار نہ ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یعنی پیڑ زمین کی طرح ہو جائے کہ

---

[1] مسند أحمد (٢/ ٤٦٩) اس کی سند میں ''عاصم بن عبید اللہ'' ضعیف راوی ہے۔

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٩٦٨) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٧٠٤)

[3] مسند أحمد (٢/ ٣٣٥) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (١٥٢٨)

[4] تفسیر الطبري (١٨/ ٢٥) تفسیر ابن کثیر (٣/ ١١٤)۔

کچھ نہ اُگائے[2] یا اُس چشمہ اور نہر کا پانی زمین کے اندر چلا جائے اور خشک ہو جائے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ﴾ [الملك: ۳۰] ''کہہ دیجیے: بھلا بتاؤ تو! اگر تمھارا (کنووں کا) پانی گہرا ہو جائے تو تمھارے پاس نتھرا (جاری) پانی کون لائے گا؟'' یعنی جاری اور بہنے والا غور مصدر ہے، بہ معنی غائر جو نابع (نکلنے اور جاری ہونے والا) کی ضد ہے۔ غائر زمین کے نیچے کے حصے کی طرف جاتا ہے اور نابع زمین کے اوپر آنا چاہتا ہے، مصدر فاعل سے زیادہ بلیغ ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ بشر کا اصل مادہ مٹی سے ہے۔ ہر فرد بشر کو اس سے ایک حظ (حصہ) ہے اور نطفہ مادۂ قریب ہے۔ تسویہ سے مراد اعضا کا برابر اور مکمل کرنا ہے۔ اس میں دوبارہ جی اُٹھنے کی دلیل کی طرف اشارہ ہے کہ جس کو پہلی دفعہ پیدا کرنے کی قدرت ہے، اس کو دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قدرت ہے۔ یہ کہنے میں کہ لیکن میں تو کسی کو اپنے رب کا شریک نہ کروں گا، اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کا بھائی مشرک تھا۔ پھر اس بھائی کو دوسرے معاملے پر ملامت کی کہ تو نے جنت میں داخل ہوتے وقت اللہ کی مشیت اور قوت کا ذکر کیوں نہ کیا؟! اس میں اس کافر کو برانگیختہ کیا ہے اس بات پر کہ وہ اللہ کی مشیت کا اعتراف کرے کہ بقا و فنا ہر شے کی اس کے ارادے پر ہے اور اپنی عاجزی کا اقرار کیا جائے اور جان لے کہ یہ ساری عمارت و حسن اور تروتازگی اللہ کی مدد و قوت و قدرت سے ہے۔ یہ مومن کی کافر کو نصیحت ہے اور یہ بات کہنے پر جھڑکی ہے کہ مجھے یہ خیال ہے کہ یہ باغ اور کھیتی کبھی ہلاک نہ ہوگا۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ کسی کو طاقت نہیں ہے کہ جو ملک و نعمت اس کے ہاتھ میں ہے وہ اس کو تھام سکے، مگر اللہ کی مشیت سے۔[1] اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے حدیث میں مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مجھے یہ کلمات سکھائے کہ تکلیف کے وقت اُن کو کہا کروں: «اللّٰه اللّٰه ربي لا أشرك به شيئا»[2] (أخرجه ابن أبي حاتم) [اللہ، اللہ، وہ میرا رب ہے، میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا] کلمہ ''لا حول ولا قوة إلا باللّٰه'' کی فضیلت میں احادیث اور آثارِ سلف کثرت سے آئے ہیں۔ مومن نے کہا کہ میں تجھ سے مال و اولاد میں کم ہوں اور اس لیے تو تکبر کرتا ہے اور مجھ پر اپنی عظمت سمجھتا ہے، سو مجھے اُمید ہے کہ میرا رب مجھ کو تیرے باغ سے بہتر باغ دے گا، دنیا میں یا آخرت میں، یا دونوں جگہ اور تیرے باغ پر کوئی عذاب یا آگ آسمان سے بھیج دے گا، پھر وہ تیرا باغ ایک چٹیل میدان ہو جائے گا اور اس نہر کا پانی سوکھ کر رہ جائے گا۔ تو چاہے کہ پھر اس کو پانی بہم پہنچائے تو ہرگز نہ کر سکے گا۔[4]

---

[1] تفسير الطبري (۱۸/ ۲٦) تفسير ابن كثير (۳/ ۱۱٤) [2] فتح القدير (۳/ ۳۹۷)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (۷/ ۲۳٦۲) [4] فتح البيان (۸/ ۵۲۔ ۵۵)

وَ اُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَاۤ اَنْفَقَ فِيْهَا وَ هِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْۤ اَحَدًا ۝۴۲ وَ لَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ مَا كَانَ مُنْتَصِرًا ۝۴۳ هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ عُقْبًا ۝۴۴

اور اس کا پھل گھیر لیا (تباہ کر دیا) گیا، پھر وہ (ایسے) ہوگیا کہ اس (مال) پر اپنی ہتھیلیاں ملتا تھا جو اس نے اس میں خرچ کیا تھا، جبکہ وہ (باغ) اپنی چھتریوں پر گرا ہوا تھا، اور وہ کہتا تھا: اے کاش! میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ کرتا (42) اور اس کے لیے کوئی ایسا گروہ نہیں تھا، جو اللہ کے سوا اس کی مدد کرتے اور نہ وہ (خود ہم سے) بدلہ لینے والا تھا (43) وہاں تو تمام اختیار اللہ سچے ہی کے لیے ہے، وہ ثواب (دینے) میں بہتر اور انجام کے لحاظ سے زیادہ اچھا ہے (44)

کفر کا بدترین انجام:

آخر اس کے باغ پر وہی ہوا جو اس نیک کی زبان سے نکلا۔ رات کو آسمان سے آ کر آگ لگ گئی، سب جل کر ڈھیر ہوگیا، مال خرچ کیا پونجی بڑھانے کو وہ اصل بھی کھو بیٹھا۔

''ثمر'' سے ایک قول کے مطابق مراد مال ہے اور دوسرے قول کے مطاق پھل، مقصود یہ ہے کہ جس بلا سے مومن نے اس کافر کو ڈرایا تھا، کہیں تیرے اس باغ پر آسمان سے کوئی عذاب نہ آ جائے، اس باغ میں پر وہی ماجرا گزرا۔ وہ اتراتا تھا اور اللہ سے غافل ہو گیا تھا، صبح کو کفِ افسوس ملنے لگا کہ ہائے سارا مال جو میں نے اس کی درستی میں خرچ کیا تھا، وہ برباد ہو کر خاک میں مل گیا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ افسوس اور غم سے جو اُسے مال کے ضائع ہونے پر ہوا تھا ہاتھ ملنے لگا اور کہنے لگا کہ کاش! میں اللہ کے ساتھ شرک نہ کرتا۔[1]

اس کا قبیلہ اور اس کی اولاد جن پر وہ فخر کرتا تھا اور آپ کو عزت والا سمجھتا تھا، اس کی کچھ مدد نہ کر سکے۔ نزولِ عذاب اور سزا ملنے کی اس جگہ میں کسی نے اس کو نہ چھڑایا۔ بات یہ ہے کہ مومن ہو یا کافر اختیار سب کا اللہ کو ہے۔ عذاب کے اُترنے پر ہر کوئی اللہ کی طرف رجوع اور خشوع اور خضوع کرتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ﴾ [المؤمن: ٨٤] ''چناں چہ جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھا تو کہا: ہم اللہ واحد پر ایمان لائے اور ہم ان چیزوں کا انکار کرتے ہیں جنھیں ہم اللہ کے ساتھ شریک

---

(1) تفسیر الطبري (١٨/ ٢٧)

ٹھہراتے تھے۔'' فرعون نے بھی ڈوبتے وقت کہا تھا: ﴿ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۞ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴾ [یونس: ٩٠۔ ٩١] ''میں ایمان لاتا ہوں کہ بے شک اس ذات کے سوا کوئی معبود نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے، اور میں مسلمانوں میں سے ہوں۔ (اللہ نے فرمایا:) کیا اب (ایمان لاتا ہے؟) جب کہ تو پہلے نافرمان تھا اور تو فساد کرنے والوں میں سے تھا۔''

ولایت کے یہ معنی واؤ کی زبر کے ساتھ ہیں (اَلْوَلَايَةُ) اور اگر واو کی زیر کے ساتھ پڑھیں (اَلْوِلَايَةُ) تو یہ معنی ہیں کہ سچا حکم اللہ کا حکم ہے۔ پھر کسی نے لفظِ حق کو مرفوع (پیش کے ساتھ) پڑھا ہے، اس لیے کہ ولایت کی صفت ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ﴾ [الفرقان: ٢٦] ''اس دن حقیقی بادشاہی رحمٰن ہی کی ہوگی۔'' اور کسی نے قاف کی زیر کے ساتھ پڑھا ہے، اس لیے کہ نعتِ الٰہی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ ثُمَّ رُدُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ﴾ [الأنعام: ٦٢] ''پھر وہ اللہ کی طرف لوٹائے جاتے ہیں جو ان کا سچا مالک ہے۔'' لہٰذا فرمایا ہے کہ جو اعمال اللہ کے لیے ہوتے ہیں ان کا ثواب بہتر اور اُن کی عاقبت اچھی ہوتی ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ احاطۂ ثمر سے مراد اموال ہیں، جیسے: نقد اور مواشی، یہ عبارت ہے اہلاک و افنا سے، غرض یہ ہے کہ بجلی سے تو باغ جل کر اُجڑ گیا اور نہر کا پانی زمین میں گھس گیا، ندی نالے خشک ہوگئے، وہ کافر صبح کو ہاتھ پر ہاتھ مارنے لگا۔ ہتھیلی کو ہتھیلی پر مارنے سے آواز نکلتی ہے، یہ اشارہ ہے ندامت اور حسرت کی طرف۔ اور وہ باغ اپنے چھپروں پر اُوندھا ہوگیا، یعنی انگور کی ٹٹیاں سب گر پڑیں اور اس نے افسوس کے طور پر کہا کہ کاش میں اپنے رب کا کسی کو شریک نہ ٹھہراتا، یعنی مومن بھائی کی نصیحت یاد آئی کہ اگر میں اس کے کہے پر چلتا تو آج کیوں میرا یہ نقصان عظیم ہوتا؟! اس کا یہ کہنا یا تو حسرت کی وجہ سے تھا، یا حقیقتاً اس نے شرک سے توبہ کا قصد کیا، لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔ اللہ نے کہا کہ اس کے گروہ نے اس کی کچھ مدد نہ کی اور نہ ہی اس کی مدد کی گئی اس جگہ پر یا قیامت کے دن۔ ساری ولایت یا نصرت، اگر ولایت واؤ کی زبر کے ساتھ ہے، یا قہر و سلطنت، اگر واؤ کی زیر کے ساتھ ہے، نرے اللہ ہی کے لیے ہے۔ اللہ اپنے دوستوں کو اچھا بدلہ اور بہتر انجام عطا کرتا ہے۔[1]

آیتِ باب اس بات پر دلیل ہے کہ شرک باللہ منحوس شے ہے قطع نظر آخرت کے کہ وہاں نار میں ہمیشہ کے لیے بغیر کسی وقفے کے رہنے کا موجب ہوگا۔ دنیا میں بھی اہلِ شرک کو تنبیہاً و تحذیراً کبھی اس کفر اور کافری کا نقصان پہنچ جاتا ہے، پھر کبھی وہ کافر متنبہ ہو جاتا ہے اور کبھی اس کو زمانے کے حادثات پر محمول کرتا ہے۔ غرض کہ مشرک خسر الدنیا والآخرة

[1] فتح البیان (٨/ ٥٦۔ ٥٨)

ہو جاتے ہیں اور موحد کے لیے آخرت میں یقیناً ثوابِ خیر اور عاقبت قابلِ تعریف ہوتی ہے، اور دنیا میں اگر کوئی نقصان پہنچ جاتا ہے تو وہ گناہوں کے کفارے یا درجات کی بلندی کا سبب بن جاتا ہے، بہ خلاف مشرک کے کہ اس کا نقصان حقیقی ہوتا ہے، کسی طرح کا فائدہ عاجلاً (جلدی) یا آجلاً (تاخیر کے ساتھ) اس کے ہاتھ نہیں آتا۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ﴿۴۵﴾ اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا ﴿۴۶﴾

اور ان کے لیے دنیاوی زندگی کی مثال بیان کیجیے: جیسے پانی (مینہ)، جسے ہم نے آسمان سے نازل کیا، پھر اس سے زمین کی نباتات خوب مل جل گئی، پھر وہ چورا چورا ہوگئی، جسے ہوائیں اُڑا لے جاتی ہیں اور اللہ ہر شے پر بہت قدرت رکھنے والا ہے (45) مال اور بیٹے تو دنیاوی زندگی کی زینت ہیں، اور آپ کے رب کے ہاں باقی رہنے والی نیکیاں ہی ثواب میں بہتر ہیں اور اُمید لگانے کے اعتبار سے (بھی) بہتر ہیں (46)

دنیاوی زندگی کی مثال:

باقی رہنے والی نیکیاں یہ ہیں کہ علم سکھایا جائے جو جاری رہے، یا نیک رسم چلا کر جائے، یا مسجد، کنوں، سرائے، باغ اور کھیت وقف کر جائے، یا اولاد کو تربیت کر کے صالح چھوڑ جائے۔

اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ تم لوگوں کے لیے دنیا کی ایک مثال اس کے زوال وفنا وختم ہونے کے بارے میں بیان کر دو کہ جیسے پانی آسمان سے اُترتا ہے، جو زمین میں دانے بوئے جاتے ہیں، وہ سرسبز وحسین اور پُر رونق ہو جاتے ہیں، کسی میں پھول لگتا ہے، کسی میں پھل، کسی میں پتوں کی بہار ہوتی ہے، کسی کی بیل لہراتی ہے، کسی کا سبزہ بہار دکھاتا ہے، اس کے بعد یہ سب ساز و برگ اور بہار سوکھ کر رہ جاتی ہے، ہوائیں اس کو ہر جانب دائیں بائیں اُڑا لے جاتی ہیں، موسمِ بہار پتوں کو گرانے والے موسم خزاں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

سو اللہ تعالیٰ کو اِس حال پر اور اُس حال پر قدرت حاصل ہے۔ اللہ پاک اکثر دنیا کی زندگی کی مثال اسی طرح بیان فرماتا ہے، جس طرح کہ سورت یونس میں کہا ہے: ﴿اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا﴾ [يونس: ٢٤]

”بے شک دنیاوی زندگی کی مثال تو اس پانی کی سی ہے جسے ہم نے آسمان سے اُتارا، پھر اس کے ساتھ زمین کی

نباتات مل جل گئیں جس میں سے انسان اور چوپائے کھاتے ہیں، حتی کہ جب زمین نے اپنی رونق پکڑی اور مزین ہوگئی۔'' اور سورۃ الزمر میں کہا ہے: ﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ﴾ [الزمر: ۲۱] ''کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ بے شک اللہ نے آسمان سے پانی نازل کیا، پھر اسے زمینی چشموں سے جاری کیا، پھر وہ اس کے ذریعے سے کھیتی نکالتا ہے، جبکہ اس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں، پھر وہ (پک کر) خشک ہوجاتی ہے۔''

سورۃ الحدید میں فرمایا ہے: ﴿ اِعْلَمُوْۤا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ﴾ [الحدید: ۲۰] ''تم جان لو کہ دنیاوی زندگی محض کھیل تماشا اور زینت ہے اور آپس میں فخر کرنا اور ایک دوسرے پر اموال و اولاد میں کثرت جتانا ہے۔ (اس کی مثال یوں ہے) جیسے بارش کہ اس سے (پیدا شدہ) نباتات کسانوں کو خوش کرتی ہیں۔''

عبادتِ الٰہی اموال و اولاد سے بہتر ہے:

حدیثِ صحیح میں فرمایا: «اَلدُّنْيَا خَضِرَةٌ حُلْوَةٌ»[1] [دنیا شیریں و شاداب ہے] پھر مال اور بنون (بیٹوں) کو حیاتِ دنیا کی زینت فرمایا، یہ اس آیت کی طرح ہے: ﴿ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ ﴾ [آل عمران: ۱۴] ''لوگوں کے لیے خواہشاتِ نفس کی محبت مزین (پرکشش) کر دی گئی ہے، یعنی عورتوں کی، بیٹوں کی، سونے اور چاندی کے جمع کیے ہوئے ڈھیروں کی۔'' نیز فرمایا: ﴿ اِنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴾ [التغابن: ۱۵] ''بلاشبہ تمھارے مال اور تمھاری اولاد فتنہ (آزمائش) ہیں، اور اللہ ہی کے پاس اجرِ عظیم ہے۔'' یعنی اللہ کی طرف متوجہ ہونا اور اُس کی عبادت کے لیے فراغت حاصل کرنا بہتر ہے، مال کو جمع کرنے یا اولاد کے ساتھ مشغول ہونے اور اُن پر حد سے زیادہ شفقت کرنے سے۔ لہٰذا باقیاتِ صالحات کو ثواب اور اُمید کے لحاظ سے بہتر ٹھہرایا ہے۔

﴿ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ ﴾ سے کیا مراد ہے؟

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ اور بہت سے سلف و خلف نے کہا ہے کہ باقیات صالحات نمازِ پنج گانہ ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا دوسرا قول یہ ہے کہ ''سبحان الله و الحمد لله ولا إله إلا الله والله اکبر'' باقیات صالحات ہیں۔ امیر المومنین سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا تھا کہ الباقیات الصالحات کیا ہے؟ انھوں نے کہا: ''لا إله إلا الله وسبحان الله والحمد لله والله اکبر، ولا حول ولا قوة إلا بالله

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۷٤۲)

العلي العظيم“[1] سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے مولیٰ حارث نے کہا ہے کہ ایک دن سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے اور ہم بھی اُن کے ساتھ بیٹھے تھے، اتنے میں موذن آیا۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے برتن میں پانی مانگا، میں گمان کرتا ہوں کہ ایک مد ہوگا، پھر وضو کیا، پھر کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، اسی طرح وضو لیا میرے وضو کی طرح۔ پھر کہا: جس نے میرے وضو کی طرح وضو کیا، پھر کھڑے ہو کر ظہر کی نماز پڑھی تو جو کچھ اس سے صبح کی نماز اور ظہر کی نماز کے درمیان ہوا تھا، وہ بخشا گیا۔ پھر اس نے عصر کی نماز پڑھی تو جو کچھ ظہر اور عصر کے درمیان ہوا تھا، وہ بخشا گیا، پھر مغرب کی نماز پڑھی تو عصر اور مغرب کے درمیان جو ہوا تھا، وہ بخشا گیا، پھر عشا کی نماز پڑھی تو جو کچھ مغرب اور عشا کے درمیان ہوا تھا، وہ بخشا گیا۔ پھر شاید وہ سو رہا، رات بھر کروٹیں لیتا رہا، پھر کھڑا ہوا اور وضو کیا اور صبح کی نماز پڑھی تو عشا اور صبح کے درمیان جو ہوا تھا، وہ بخشا گیا، تو یہی ہیں وہ نیکیاں جو برائیوں کو دور کرتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ پانچ وقت کی نماز صغیرہ گناہوں کو مٹا دیتی ہے۔ لوگوں نے کہا: یہ تو حسنات ہوئے باقیات صالحات کیا ہیں؟ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: ”هي لا إله إلا الله“[2] (الحديث تفرد به أحمد)

معلوم ہوا کہ اللہ کا ذکر باقیاتِ صالحات ہے۔ وللہ الحمد۔ سعید بن المسیب رحمہ اللہ نے بھی انھیں کلمات کو باقیاتِ صالحات کہا ہے، مگر الفاظ ”العلي العظيم“ کے بغیر۔ عمارہ کہتے ہی کہ ابن المسیب رحمہ اللہ نے مجھ سے پوچھا کہ باقیات صالحات کیا ہیں؟ میں نے کہا: نماز و روزہ۔ کہا: تو نے ٹھیک نہیں کہا۔ میں نے کہا: زکات و حج۔ کہا: اب بھی ٹھیک نہیں کہا، لیکن باقیاتِ صالحات کلماتِ پنج گانہ ہیں۔[3] نافع بن سرجس نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا تھا کہ باقیاتِ صالحات کیا ہے؟ انھوں نے یہی پانچ کلمات بتائے۔ عطا بن ابی رباح بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے بھی انھیں پانچ کلمات کی نشاندہی کی ہے۔ امام حسن اور قتادہ رحمہما اللہ بھی اسی طرف گئے ہیں۔[4]

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ ”هن الباقيات الصالحات“[5] (رواه ابن جرير) یعنی ”سبحان الله و الحمد لله ولا إله إلا الله والله أكبر“ یہ چار ہی کلمے ہوئے۔ سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں: «اِسْتَكْثِرُوْا مِنَ الْبَاقِيَاتِ الصَّالِحَاتِ، قِيْلَ: وَمَا هِيَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ!؟ قَالَ: اَلْمِلَّةُ قِيْلَ: وَمَا هِيَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: اَلتَّكْبِيْرُ وَالتَّهْلِيْلُ وَالتَّسْبِيْحُ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ »[6] (رواه ابن جرير و هكذا رواه أحمد) [باقیات صالحات کی کثرت کرو، پوچھا گیا کہ وہ کیا ہیں اے

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٣٢_ ٣٣)
[2] مسند أحمد (١/ ٧١) صحيح الترغيب والترهيب (١/ ٨٨)
[3] تفسير الطبري (١٨/ ٣٥)
[4] تفسير الطبري (١٨/ ٣٣_ ٣٤)
[5] تفسير الطبري (١٨/ ٣٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٢٦٤)
[6] تفسير الطبري (١٨/ ٣٤_ ٣٥) مسند أحمد (٣/ ٧٥) اس کی سند میں ”دراج عن ابی الہیثم“ ضعیف راوی ہے۔

اللہ کے رسول!؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ملت، پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول! وہ کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تکبیر، تہلیل، تسبیح، اور الحمد للہ اور لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ]

سالم و محمد بن کعب قرظی سے اس بارے میں گفتگو ہوئی تھی کہ "لا حول ولا قوة... الخ" ان کلمات باقیات میں شامل ہیں کہ نہیں؟ آخر سالم نے کہا کہ ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے مجھ سے حدیث بیان کی ہے کہ نبی مکرم ﷺ کو جب معراج میں لے گئے تو آپ ﷺ نے ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا: اے جبریل! یہ تمھارے ہمراہ کون ہے؟ کہا: محمد ﷺ ہیں۔ ان پر اہلاً و سہلاً و مرحبا کہا، پھر مجھ سے کہا کہ اپنی امت سے فرما دیجیے کہ وہ جنت میں اپنے بہت کچھ باغات لگا لیں، اس کی مٹی پاک ہے اور اس کی زمین کشادہ ہے۔ میں نے کہا: وہاں باغ لگانے کی کیا صورت ہے؟ کہا: "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ" [1] بہ کثرت پڑھیں۔ (رواہ ابن وهب بطوله) سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے مروی طویل حدیث میں ان چار کلمات کے بارے میں آیا ہے کہ یہی باقیات صالحات ہیں۔[2]

اس روایت میں حوقلہ (لا حول ولا قوة إلا بالله) نہیں ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے ایک غلام نے کہا ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: «بَخٍ بَخٍ لِّخَمْسٍ مَا أَثْقَلَهُنَّ فِي الْمِيزَانِ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ وَ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ، وَالْوَلَدُ الصَّالِحُ يُتَوَفّٰى فَيَحْتَسِبُهُ وَالِدُهُ، وَقَالَ: بَخٍ بَخٍ لِّخَمْسٍ مَنْ لَقِيَ اللّٰهَ مُسْتَيْقِنًا بِهِنَّ دَخَلَ الْجَنَّةَ: يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ، وَ بِالْجَنَّةِ وَ بِالنَّارِ وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ، وَبِالْحِسَابِ» [3] (رواہ أحمد) [بہت خوب بہت خوب! یہ پانچ چیزیں میزان میں کس قدر بھاری ہوں گی: (1) لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ (2) وَاللّٰهُ أَكْبَرُ (3) وَ سُبْحَانَ اللّٰهِ (4) وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ (5) اور وہ نیک بچہ جو فوت ہو جائے اور اس کا والد اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھے۔ نیز آپ ﷺ نے فرمایا: (حسبِ ذیل) پانچیں بہت خوب ہیں جو ان کے ساتھ یقین رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے گا تو جنت میں داخل ہو جائے گا: وہ (1) اللہ (2) یومِ آخرت (3) جنت و جہنم (4) بعث بعد الموت اور (5) حساب پر ایمان رکھتا ہو]

سیدنا شداد بن اوس رضی اللہ عنہ کی روایت مرفوع کے الفاظ یہ ہیں: «إِذَا كَنَزَ النَّاسُ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ فَاكْنِزُوا أَنْتُمْ هٰؤُلَاءِ الْكَلِمَاتِ: اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ الثَّبَاتَ فِي الْأَمْرِ، وَالْعَزِيمَةَ عَلَى الرُّشْدِ، وَ أَسْأَلُكَ شُكْرَ نِعْمَتِكَ، وَأَسْأَلُكَ حُسْنَ عِبَادَتِكَ، وَأَسْأَلُكَ قَلْبًا سَلِيمًا، وَأَسْأَلُكَ لِسَانًا صَادِقًا، وَأَسْأَلُكَ مِنْ خَيْرِ مَا تَعْلَمُ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا تَعْلَمُ، وَأَسْتَغْفِرُكَ لِمَا تَعْلَمُ، إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ» [4] (رواہ أحمد

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٣٤)

[2] مسند أحمد (٤/ ٢٦٧) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔ البتہ گذشتہ روایات اس کی تائید کرتی ہیں۔

[3] مسند أحمد (٤/ ٢٣٧) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رواہ أحمد و رجاله ثقات" (مجمع الزوائد: ١/ ٢٠٧)

[4] مسند أحمد (٤/ ١٢٣) سنن النسائي، رقم الحديث (١٣٠٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٢٢٨)

بطوله و النسائي من وجه آخر بنحوه) [جب لوگ سونے چاندی کے خزانے جمع کرنے میں لگ جائیں تو اس وقت تم ان کلمات کو کثرت سے پڑھا کرو: ''اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ الثَّبَاتَ فِي الْأَمْرِ، وَالْعَزِيمَةَ عَلَى الرُّشْدِ، وَ أَسْأَلُكَ شُكْرَ نِعْمَتِكَ، وَأَسْأَلُكَ حُسْنَ عِبَادَتِكَ، وَأَسْأَلُكَ قَلْبًا سَلِيمًا، وَأَسْأَلُكَ لِسَانًا صَادِقًا، وَأَسْأَلُكَ مِنْ خَيْرِ مَا تَعْلَمُ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا تَعْلَمُ، وَأَسْتَغْفِرُكَ لِمَا تَعْلَمُ، إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ'' ''اے اللہ! میں تجھ سے اپنے کام کی ثابت قدمی اور نیکی کے کام کا پورا قصہ اور تیری نعمتوں کی شکر گزاری اور تیری اچھی عبادت کی توفیق طلب کرتا ہوں اور تجھ سے دعا ہے کہ مجھے سلامتی والا دل اور سچی زبان عطا فرما، تیرے علم میں جو بھلائی ہے میں اس کا خواستگار ہوں اور تیرے علم میں جو برائی ہے، میں اس سے تیری پناہ چاہتا ہوں، پروردگار! ہر اس برائی سے میری توبہ ہے جو تیرے علم میں ہو، بے شک غیب دان صرف تُو ہی ہے] لیکن اس روایت میں یہ نہیں ہے کہ یہ دعا باقیات صالحات میں ہے۔ معلوم نہیں اس روایت کو حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کس قرینے سے اس جگہ وارد کیا ہے۔[1]

سیدنا سعد بن جنادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں اسلام لایا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ اور ﴿ اِذَا زُلْزِلَتِ ﴾ سکھائی اور یہ کلمات تعلیم کیے: ''سبحان الله، الحمد لله ولا إله إلا الله والله أكبر'' اور فرمایا کہ یہ باقیات صالحات ہیں۔[2] (رواه الطبراني) امام طبرانی رحمہ اللہ کی دوسری روایت اسی سند سے اس طرح ہے کہ جو شخص رات کو اُٹھا اور وضو کیا اور کلی کی، پھر کہا: ''سبحان الله'' (سو بار) اور ''الحمد لله'' (سو بار) اور ''الله أكبر'' (سو بار) اور ''لا إله إلا الله'' (سو بار) تو اس کے گناہ بخش دیے گئے، سوائے خون ریزی کے کہ یہ معاف نہیں ہوتی۔[3]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ صالحات باقیات یہی اللہ کا ذکر ہے، پھر پانچ کلمات پر ''تبارك الله و أستغفر الله وصلى الله على رسول الله'' زیادہ کیا اور کہا کہ روزہ، نماز، حج، صدقہ، غلام آزاد کرنا، صلہ رحمی اور تمام اعمالِ حسنات ہیں۔ پھر کہا کہ یہ باقیات صالحات ہیں جن کا ثواب جنت والوں کو جب تک آسمان و زمین ہیں ملتا رہتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ ان سے مراد پاکیزہ کلام ہے۔ ابن زید رحمہ اللہ نے کہا کہ اس سے تمام نیک اعمال مراد ہیں۔ اسی کو ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے۔[4]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی مثال بیان کرنے کے بعد مال اور بیٹوں کو حیاتِ دنیا کی رونق

---

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ١١٧۔ ١١٨)

[2] المعجم الكبير (٦/ ٥١) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''وفيه الحسين بن الحسن العوفي وهو ضعيف'' (مجمع الزوائد: ٧/ ٣٤٥)

[3] المعجم الكبير (٦/ ٥٢) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''وفيه الحسين بن الحسن العوفي وهو ضعيف'' (مجمع الزوائد: ٢/ ٥٤٠)

[4] تفسير الطبري (١٨/ ٣٥)

فرمایا۔ یعنی لوگ اُن چیزوں سے زینت کرتے ہیں۔ اس میں رد ہے ان رؤسا پر جو مال اور اولاد اور غِنا پر فخر کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کہا: یہ ساری آرایش اسی دنیا میں ہے۔ اس کا نفع آخرت میں کچھ نہیں ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴾ [التغابن: ١٥] ''بلاشبہہ تمھارے مال اور تمھاری اولاد فتنہ (آزمایش) ہیں، اور اللہ ہی کے پاس اجرِ عظیم ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ﴾ [التغابن: ١٤] ''بے شک تمھاری بیویوں اور تمھاری اولاد میں سے بعض تمھارے دشمن ہیں، لہٰذا تم ان سے محتاط رہو۔''

نیز فرمایا: ﴿ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴾ [الشعراء: ٨٨] ''جس دن نہ مال کوئی نفع دے گا اور نہ اولاد۔'' باقیات صالحات کے برعکس کہ اُن کا پھل ہمیشہ کا ہوگا۔ یہ وہ طاعات ہیں جو فقرائے مسلمین بجا لاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان باقیات کو بہتر ثواب اور بہتر اُمید ٹھہرایا۔ دنیا کی رونق میں کچھ خیر وخوبی نہیں ہے کہ آخرت پر اس کو فضیلت دیں، لیکن جنت کی یہ فضیلت اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے نکلتی ہے: ﴿ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَىِٕذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا ﴾ [الفرقان: ٢٤] ''جنتی لوگ اس دن بہترین ٹھکانے میں ہوں گے۔''

ظاہر یہ ہے کہ باقیات صالحات ہر عملِ خیر ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس کو صرف نماز تک محدود کیا جائے جس طرح کہ بعض مفسرین نے کہا ہے اور نہ ہی کوئی وجہ ہے کہ اس کو اذکار میں سے کسی خاص ذکر کے ساتھ محدود کیا جائے جس طرح اوروں نے کہا ہے، نہ اسے اس کام پر محدود کیا جائے جس کو سببِ نزول کی وجہ سے فقرائے مہاجرین کیا کرتے تھے، کیوں کہ اعتبار لفظ کی عمومیت کا ہے، خصوصیتِ سبب کا نہیں ہے۔ اس جگہ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ احادیث میں دی گئی باقیات صالحات کی تفسیر کچھ اس بات کے منافی نہیں ہے کہ اس لفظ کا اطلاق ان اعمال پر کیا جائے جو احادیث میں وارد نہیں ہوئے۔ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ مال اور بیٹے دنیا کی کھیتی ہے اور عملِ صالح آخرت کی کھیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بعض اقوام کے لیے ان دونوں کو جمع کر دیا ہے:[1]

ما أحسن الدين و الدنيا إذا اجتمعا لا بارك الله في الدنيا بلا دين

[دین و دنیا کا جمع ہو جانا کس قدر اچھا ہے، اللہ تعالیٰ بلا دین دنیا میں برکت نہ کرے]

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: « خُذُوا جُنَّتَكُمْ » قِيلَ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ! أَمِنْ عَدُوٍّ قَدْ حَضَرَ؟ قَالَ: « بَلْ جُنَّتَكُمْ مِنَ النَّارِ قَوْلُ سُبْحَانَ اللّٰهِ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ، فَإِنَّهُنَّ يَأْتِينَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مُقَدِّمَاتٍ مُعَقِّبَاتٍ مُجَنِّبَاتٍ، وَهِيَ الْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ »[2] [اپنا دفاع کرو، کہا گیا: اے اللہ کے رسول! کیا کوئی دشمن آ موجود ہوا ہے جس سے دفاع کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلکہ جہنم سے

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٦٤) [2] سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٢١٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٢١٤)

اپنا دفاع کرو اور وہ سُبْحَانَ اللّٰهِ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ کہنا ہے۔ یہ کلمات قیامت کے دن مقدمات، معقبات اور مجنبات بن کر آئیں گے اور یہی کلمات باقیات صالحات ہیں] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ" بھی زیادہ کیا ہے۔[1] ان کلمات کے فضائل میں بغیر اس قید کے کہ اس جگہ یہی کلمات مراد ہیں، بہت حدیثیں آئی ہیں، اس جگہ ان کے ذکر کرنے میں کچھ فائدہ نہیں ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی ہر شے باقیات صالحات میں شامل ہے۔[2] اب اس میں ہر عمل جن کا اوپر ذکر ہوا، بدرجہ اولیٰ اس میں شامل ہے، مثلاً فرائض واذکار واورادِ صحیحہ ماثورہ۔[3] رسالہ "غراس الجنة" صحیح ترین اور مختصر ترین اذکارِ مسنونہ پر مشتمل ہے اور وہ اذکار باقیات صالحات ہیں۔ إن شاء اللّٰه تعالى.

وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْأَرْضَ بَارِزَةً وَّحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ أَحَدًا ﴿٤٧﴾ وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍۭ بَلْ زَعَمْتُمْ أَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا ﴿٤٨﴾ وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً إِلَّا أَحْصٰهَا وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا ﴿٤٩﴾

اور جس دن ہم پہاڑوں کو چلائیں گے اور آپ زمین کو صاف کھلی (میدان کی طرح) دیکھیں گے، اور ہم ان کو اکٹھا کریں گے، چناں چہ ہم ان میں سے کسی کو بھی نہیں چھوڑیں گے (47) اور وہ آپ کے رب کے سامنے صف بستہ پیش کیے جائیں گے (کہا جائے گا:) یقیناً تم ہمارے پاس (ایسے) آئے ہو، جیسے ہم نے تمھیں پہلی بار پیدا کیا تھا، بلکہ تم سمجھتے تھے کہ ہم تمھارے لیے وعدے کا کوئی وقت مقرر نہیں کریں گے (48) اور (ہر ایک کا) اعمال نامہ (سامنے) رکھ دیا جائے گا، پھر آپ مجرموں کو دیکھیں گے کہ وہ اس کے مندرجات (تحریر) سے ڈر رہے ہوں گے اور کہیں گے: ہائے ہماری کم بختی! کیسا ہے یہ اعمال نامہ جو نہیں چھوڑ رہا کسی چھوٹے اور نہ بڑے (عمل) کو مگر اس نے اسے شمار کر رکھا ہے۔ اور انھوں نے جو عمل کیے تھے حاضر پائیں گے۔ اور آپ کا رب کسی پر بھی ظلم نہیں کرے گا (49)

میدانِ حشر کی پیشی اور قیامت کی ہولناکیاں:

رب جو کرے سو ظلم نہیں، سب اسی کا مال ہے، پر ظاہر میں جو ظلم نظر آئے وہ بھی نہیں کرتا۔ بے گناہ کسی کو

[1] الدر المنثور (٥/ ٣٩٧) [2] الدر المنثور (٥/ ٣٩٩) [3] فتح البيان (٨/ ٥٨۔ ٦١)

دوزخ میں نہیں ڈالتا اور نیکی ضائع نہیں کرتا۔ اور جو کوئی گناہ میں گھسے ہمارا کیا اختیار، اپنے دل سے پوچھ لے، جب گناہ پر دوڑتا ہے، اپنے ارادے سے دوڑا ہے اور جو کوئی گناہ میں گھسے قصد بھی اس نے کیا تو قصد دونوں طرف لگ سکتا ہے اور جو گھسے اس نے ایک طرف لگا دیا۔ سو بندے کی دریافت سے باہر ہے۔ اگر بندے سے معاملہ ہے، اس کی سمجھ پر بندہ بھی پکڑے گا، اسی کو جو اس سے بدی کرے گا، یہ نہ کہے گا کہ اس کا کیا قصور اللہ نے کروایا۔

اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن کی ہولناکیوں کی خبر دی اور اس دن جو بڑے بڑے اُمور ہوں گے، ان کی نشان دہی کی، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا ۝ وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ﴾ [الطور: ۹۔ ۱۰] ''(وہ واقع ہوگا) جس دن آسمان زور سے حرکت کرنے لگے گا۔ اور پہاڑ تیزی سے چلنے لگ جائیں گے۔''

سیر سے یہ مراد ہے کہ پہاڑ اپنی جگہ سے سرک جائیں گے اور فرمایا: ﴿ وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ﴾ [النمل: ۸۸] ''اور آپ پہاڑوں کو دیکھیں گے تو ان کو جامد (اپنی جگہ جمے ہوئے) سمجھیں گے، جبکہ وہ بادلوں کے چلنے کی طرح چل رہے ہوں گے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ﴾ [القارعة: ۵] ''اور پہاڑ دھنکی ہوئی رنگین اُون جیسے ہو جائیں گے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ۝ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ۝ لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا ﴾ [طٰہٰ: ۱۰۵۔ ۱۰۷] ''اور وہ آپ سے پہاڑوں کی بابت سوال کرتے ہیں تو آپ کہہ دیجیے: میرا رب انھیں اُڑا کر بکھیر دے گا۔ پھر وہ اس (زمین) کو چٹیل میدان (بنا) چھوڑے گا۔ آپ اس میں نہ کوئی کجی دیکھیں گے اور نہ اُبھری جگہ۔''

اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا کہ پہاڑ ختم ہو جائیں گے اور زمین ہموار ہو جائے گی۔ یعنی سطح مستوی (ہموار) نہ کوئی وادی ہوگی اور نہ کوئی پہاڑ۔ اس لیے فرمایا ہے کہ تو زمین کو کھلی ہوئی ظاہر دیکھے گا، نہ اس میں کسی کے لیے کوئی نشانی ہے اور نہ کوئی مکان جو کسی کو چھپا لے، بلکہ ساری مخلوق ظاہر ہوگی اپنے رب کے لیے، کوئی پوشیدہ چیز بھی اللہ پر مخفی نہ رہے گی۔

امام مجاہد اور قتادہ نے کہا کہ زمین کے ''بارز'' ہونے سے یہ مراد ہے کہ اس میں چھپنے اور غیائب ہونے کی کوئی جگہ نہ ہوگی، کوئی عمارت ہوگی اور نہ درخت۔[1] ہم پہلوں اور پچھلوں سب کو لے آئیں گے اور کسی کو نہ چھوڑیں گے، نہ بڑے کو اور نہ چھوٹے کو، جس طرح فرمایا: ﴿ قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ ۝ لَمَجْمُوْعُوْنَ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴾ [الواقعة: ۴۹۔ ۵۰] ''(اے نبی!) آپ کہہ دیجیے: بلاشبہ پہلے بھی اور پچھلے بھی۔ یقیناً ایک معلوم دن کے مقرر وقت پر (سب) جمع کیے جائیں گے۔'' نیز فرمایا: ﴿ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ﴾ [هود: ۱۰۳] ''وہ (یومِ آخرت) ایسا دن ہے جس میں سب لوگ جمع کیے جائیں گے اور وہ ایسا دن ہے جب (سب) حاضر کیے جائیں گے۔''

---

[1] تفسیر الطبري (۱۸/ ۳۶)

فرشتوں سمیت ساری مخلوق حضور ایزدی میں قطار اندر قطار کھڑے ہوں گے:

نیز فرمایا: ﴿ وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا ﴾ (آیتِ باب) اس سے یہ احتمال ہے کہ ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کے سامنے ایک صف میں کھڑی ہو، جس طرح فرمایا: ﴿ يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓىِٕكَةُ صَفًّا ۙۗ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴾ [النبأ: ٣٨] ''جس دن جبریل اور (سب) فرشتے اس کے حضور صف بستہ کھڑے ہوں گے، اس سے صرف وہی کلام کر سکے گا جسے رحمٰن اجازت دے گا اور وہ درست بات کہے گا۔''

دوسرا احتمال یہ ہے کہ صفیں صفیں ہو کر کھڑے ہوں، جیسے فرمایا: ﴿ وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴾ [الفجر: ٢٢] ''اور آپ کا رب اور فرشتے صف در صف آئیں گے۔'' اور یہ ارشاد کہ تم ہمارے پاس آؤ گے جس طرح کہ ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا منکرین آخرت کے لیے ملامت اور دھمکی ہے اور مشرکین کو ڈانٹ ہے تمام گواہوں کے سامنے۔ لہٰذا فرمایا ہے کہ تم کو یہ گمان تھا کہ یہ امر واقع نہ ہوگا اور تمھارے لیے کوئی وعدہ یا وعدہ کی جگہ نہیں۔

قیامت کے دن سربستہ رازوں کا کھلنا:

کتاب سے مراد نامۂ اعمال ہے، جس میں ہر جلیل القدر عمل اور حقیر عمل اور تل برابر یا کھجور کی گٹھلی کے سوارخ میں چھلکے کے برابر ہر چھوٹا اور بڑا عمل درج ہوگا۔ اس وقت مجرم لوگ اپنے ان برے اعمال اور افعال کو دیکھ کر ڈریں گے اور کہیں گے: ہائے افسوس اور حسرت اس کوتاہی پر جو ہم نے اپنی زندگی میں کی تھی۔ یہ کیسی کتاب ہے جس نے نہ چھوٹی بات چھوڑی ہے اور نہ بڑی، اس سے کوئی گناہ صغیرہ و کبیرہ نہیں بچا۔ جس عمل کو دیکھو وہ اس میں لکھا ہوا اور محفوظ ہے۔

طبرانی نے اس سے پہلی آیت کے بارے میں سیدنا سعد بن جنادہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ حنین سے فارغ ہوئے، ہم ایک ویران زمین میں اُترے، جس میں کوئی شے نہ تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جاؤ جسے کوئی لکڑی، کوئی کوڑا، کوئی گھاس پھوس مل جائے لے آؤ، ایک گھڑی نہ گزری کہ ہم نے ایک ڈھیر لگا دیا۔ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اس کو دیکھتے ہو، اسی طرح تم میں سے ایک شخص کے گناہ جمع ہوتے ہیں، جس طرح تم نے یہ ڈھیر جمع کیا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ اللہ سے ڈرے اور کوئی صغیرہ یا کبیرہ گناہ نہ کرے کہ وہ اس کے لیے محفوظ کر لیا جاتا ہے۔[1]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لوگ اپنے کیے کو موجود پائیں گے خیر ہو یا شر، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۖۚ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ﴾ [آلِ عمران: ٣٠] ''جس دن ہر شخص اپنے کیے ہوئے اچھے عمل کو اور اپنے کیے ہوئے بُرے عمل کو اپنے سامنے پائے گا۔'' نیز فرمایا: ﴿ يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَىِٕذٍۢ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ﴾ [القیامة: ١٣] ''اس دن انسان کو بتا دیا جائے گا جو اس نے آگے بھیجا اور پیچھے چھوڑا۔'' نیز فرمایا:

---

[1] المعجم الکبیر (٦/ ٥٢) اس کی سند میں ''حسین بن حسن عوفی'' ضعیف راوی ہے۔

﴿ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ﴾ [الطارق: ٩] ''جس دن راز ظاہر کر دیے جائیں گے۔'' یعنی اس دن تمام بھید اور دل کی باتیں ظاہر ہو جائیں گی۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ ہر غادر (دھوکے باز) کے لیے قیامت کے دن ایک نشان (جھنڈا) ہوگا جس سے وہ پہچانا جائے گا۔[1] (رواه أحمد و الشيخان)

روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ ہر غدر کرنے والے کے لیے، یعنی جس نے عہد شکنی کی، اس کے لیے قیامت کے دن اس کی پیٹھ کے حلقے کے نزدیک ایک نشان ہوگا جو اس کی غداری کے مطابق ہوگا، کہا جائے گا کہ یہ فلاں بن فلاں کی غداری ہے۔[2] اللہ جب اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ کرے گا تو اپنی مخلوق میں سے کسی ایک پر ظلم روا نہ رکھے گا، بلکہ معافی، درگزر، بخشش اور رحمت کرے گا اور اپنی قدرت وحکمت وعدل سے جس کو چاہے گا عذاب دے گا اور دوزخ کو کافروں اور گناہ گاروں سے بھر دے گا، پھر گناہ گاروں کو نجات دے گا اور کافروں کو ہمیشہ کے لیے آگ میں رکھے گا۔ اللہ تعالیٰ ایک ایسا حاکم ہے جو ظالم اور جابر نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَإِنْ تَكُ حَسَنَةً يُضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ أَجْرًا عَظِيْمًا ﴾ [النساء: ٤٠] ''بے شک اللہ ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا، اور اگر (کسی کی) کوئی نیکی ہو تو وہ اسے دُگنی کر دیتا ہے۔''

نیز فرمایا ہے: ﴿ وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ۚ وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا ۗ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ﴾ [الأنبياء: ٤٧] ''اور ہم قیامت کے دن انصاف کے ترازو رکھیں گے، پھر کسی شخص پر کچھ ظلم نہ ہوگا، اور اگر رائی کے دانے کے برابر بھی (عمل) ہوگا تو ہم اسے (تولنے کے لیے) لے آئیں گے، اور ہم حساب کرنے والے کافی ہیں۔''

کتاب اللہ کی آیات اس بارے میں بہت ہیں۔ سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ مجھ کو ایک شخص سے ایک حدیث پہنچی جس نے وہ حدیث نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے لی تھی۔ میں نے ایک اونٹ خریدا اور اس پر کجاوہ کس کر ایک ماہ تک چلا، یہاں تک کہ شام میں آیا، وہاں سیدنا عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ ملے، میں نے دربان سے کہا: اس سے کہو کہ جابر دروازہ پر حاضر ہے، کہا: ابن عبداللہ؟ میں نے کہا: ہاں، وہ اپنا کپڑا پہنتے ہوئے نکلے اور میرے گلے ملے اور میں اُن کے گلے لگا۔ میں نے کہا: مجھے ایک حدیث پہنچی ہے جو تم نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قصاص کے بارے میں سنی ہے، میں ڈرا کہ کہیں تم مر جاؤ یا میں مر جاؤں اس سے پہلے کہ اس حدیث کو سنوں۔ کہا: میں نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، فرماتے تھے کہ اللہ عزوجل لوگوں کو قیامت کے دن اکٹھا کرے گا، یا کہا: بندوں کو برہنہ بدن، بے ختنہ اور بہم۔ میں نے کہا: بہم کیا ہے؟ کہا: اُن کے ساتھ کوئی چیز نہ ہوگی۔ پھر ان کو ایسی آواز سے پکارے گا جس کو ہر شخص دور سے بھی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠١٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٣٧) مسند أحمد (٣/ ١٤٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠١٦۔ ٥٨٢٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٣٥) صحيح ابن حبان (١٦/ ٣٣٨)

ایسے سنے گا جیسے قریب والا شخص۔ کہے گا: میں ہوں بادشاہ، میں ہوں دیّان (زبردست، بدلہ دینے والا)۔

اہلِ نار میں سے کسی کو لائق نہیں کہ دوزخ میں جائے اور اس کا اہلِ جنت میں سے کسی پر کوئی حق ہو، جب تک کہ میں قصاص، یعنی اس کا اس شخص سے بدلہ نہ دلا دوں اور نہ کسی اہلِ جنت کو حق پہنچتا ہے کہ جنت میں جائے اور اہلِ نار میں سے کسی پر اس کا حق ہو، جب تک کہ میں اس کا بدلہ نہ دلا دوں، یہاں تک کہ ایک طمانچہ مارنے کا۔ ہم نے کہا: ایسا کیسے ہوگا، جب کہ ہم تو اللہ تعالیٰ کے پاس برہنہ پاؤں، برہنہ بدن بے ختنہ محض نادار آئیں گے؟ فرمایا: حسنات اور سیئات لے کر آؤ گے۔[1] (رواه أحمد) سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً روایت کیا کہ بے سینگ جانور کا قصاص سینگ والے سے قیامت کے دن لیا جائے گا۔[2] (رواه عبد الله بن الإمام أحمد وله شواهد من وجوه آخر)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم نے ان شواہد کا ذکر آیتِ کریمہ: ﴿ وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ ﴾ [الأنبياء: ٤٧] ”اور ہم قیامت کے دن انصاف کے ترازو رکھیں گے۔“ نیز اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ﴾ [الأنعام: ٣٨] ”جو تمھاری طرح (الگ) امت نہ ہو، ہم نے کتاب میں کوئی چیز نہیں چھوڑی (جس کا ذکر نہ کیا ہو)، پھر وہ سب اپنے رب کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے۔“ کے تحت کیا ہے۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان اس جگہ یہ ہے کہ ”تسییر جبال“ کے معنی یہ ہیں کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں گے، جس طرح بادل چلتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۝ فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا ﴾ [الواقعة: ٥۔ ٦] ”اور پہاڑ (پھوڑ کر) بالکل ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے۔ تب وہ پراگندہ غبار (جیسے) ہو جائیں گے۔“ بُروزِ ارض سے مراد ظہورِ زمین ہے، یعنی جو زمین پہاڑوں اور مکانوں اور درختوں سے چھپی ہوئی ہے، وہ کھل جائے گی۔ یا اس کے خزانے اور مردے نمایاں ہو پڑیں گے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ ﴾ [الانشقاق: ٤] ”اور اس کے اندر جو کچھ ہے، وہ اُسے پھینک دے گی اور خالی ہو جائے گی۔“

نیز فرمایا: ﴿ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ﴾ [الزلزال: ٢] ”اور زمین اپنے بوجھ باہر نکال دے گی۔“ یعنی جو کچھ زمین کے پیٹ میں ہے وہ سب ظاہر ہونے لگے گا۔ امام قتادہ و مجاہد رحمہما اللہ نے کہا: روئے زمین پر نہ کوئی گھر ہوگا، نہ بنیاد ہوگی اور نہ درخت وسمندر وحیوان ہوں گے۔[4] حشر کے معنی ہیں جمع کرنا، ہر جگہ سے سب کو جمع کرکے موقف

[1] مسند أحمد (٣/ ٤٩٥) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”رواه أحمد و رجاله وثقوا“ (مجمع الزوائد: ١٠/ ٦٢٥)

[2] مسند أحمد (١/ ٧٢) السلسلة الصحيحة، رقم (١٥٨٨) [3] تفسير ابن كثير (٣/ ١٢٠) [4] تفسير الطبري (١٨/ ٣٦)

میں (کھڑے ہونے کی جگہ، میدانِ محشر) لایا جائے گا۔ کیا مجال کہ کوئی ایک جاندار باقی رہ جائے۔ ہر اُمت و زمرہ کی ایک صف اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑی ہوگی، یا سب کی ایک ہی صف ہوگی، جس طرح کہ فرمایا ہے: ﴿ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ﴾ [طٰهٰ: ٦٤] ''پھر صف باندھ کر آ جاؤ۔'' یعنی سارے یہ اللہ کی قدرت میں بالکل ممکن ہے۔

آیت میں ان کے حال کی تشبیہ ہے اس لشکر کے ساتھ جو بادشاہ کے سامنے حاضر ہوتا ہے کہ اُن میں اپنا حکم جاری کرے اور اُن کو پہچان لے۔ (قاله الكرخي) یعنی تمام بندوں کی حاضری ایک ہی دفعہ میں ہوگی، آدم علیہ السلام سے لے کر آخری بشر تک سب انسانوں کی۔ سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ بہ آواز بلند ایسی آواز سے پکارے گا جو خوفناک نہ ہوگی اور فرمائے گا کہ اے میرے بندو! آج کے دن تم پر خوف بالکل نہیں ہے اور نہ تم کچھ غم کرو، اپنی حجت کے پاس حاضر ہو اور اپنا جواب پیش کرو، تم سے سوال و جواب کیا جائے گا۔ اے میرے فرشتو! میرے بندوں کو ان کے قدموں کی انگلیوں کے بل حساب کے لیے کھڑا کرو۔[1] (رواه ابن مندة في كتاب التوحيد) امام قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث اس آیت کی مکمل تفسیر ہے۔ اس کو بہت سے مفسروں نے ذکر نہیں کیا، لیکن ہم نے اس کو ''كتاب التذكرة'' میں لکھا ہے۔[2]

پھر اِن لوگوں سے جھڑکی اور دھمکی کے طور پر یہ بات کہی جائے گی کہ تم ہمارے پاس آئے، اسی طرح جس طرح ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا، یعنی ننگے پاؤں، ننگے بدن، بے مال و اولاد، جس طرح کہ اس حدیث میں مروی ہے۔ تمھارا عقیدہ تو یہ تھا کہ ہم تمھارے لیے کوئی جگہ وعدہ کی مقرر نہ کریں گے اور تم کو تمھارے اعمال کی جزا نہ دیں گے اور بعث و عذاب کچھ نہ ہوگا۔ پھر جب نامۂ اعمال ہر کسی کے ہاتھ میں رکھا جائے گا تو گناہ گار اور مجرم اس کو پڑھ کر اور ڈر کر اپنے حال پر حسرت اور افسوس کریں گے اور کہیں گے کہ اس کتاب کو کیا ہوا ہے کہ اس نے کسی چھوٹے یا بڑے گناہ کو بغیر شمار میں لائے اور تحریر کیے باقی نہیں چھوڑا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ صغیرہ مسکرانا ہے اور کبیرہ ہنسنا، یعنی ایمان داروں کے ساتھ مذاق کے طور پر۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا کہ صغیرہ کسی غیر محرم کو چھونا اور بوسہ لینا ہے اور کبیرہ زنا ہے۔[3] میں کہتا ہوں کہ یہ دونوں نکرہ استعمال ہوئے ہیں اور نفی میں آئے ہیں، اُن میں ہر گناہ شامل ہے، خواہ صغیرہ ہو یا کبیرہ۔ کوئی گناہ ایسا نہیں ہے جس کو اس کتاب نے شمار نہ کیا ہو اور جن گناہوں میں شبہہ ہے کہ یہ صغیرہ ہیں یا کبیرہ۔ سو یہ بات بندوں کے لیے ہے نہ کہ بندوں کے خالق کے لیے۔

رہی یہ آیت: ﴿ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ ﴾ [النساء: ٣١] ''اگر تم بڑے

---

[1] الدر المنثور (٥/ ٤٠٠) [2] تفسير القرطبي (١٠/ ٤١٧) التذكرة للقرطبي (١/ ٢٨٩)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٦٥) تفسير البغوي (٥/ ١٧٧)

گناہوں سے بچو گے جن سے تمھیں روکا جاتا ہے تو ہم تمھاری (چھوٹی چھوٹی) برائیاں تم سے دور کر دیں گے۔'' سو یہ کچھ آیتِ باب کے منافی نہیں ہے۔ اس لیے کہ گنتی اور شمار کرنے سے عدمِ تکفیر لازم نہیں آتی۔ جائز ہے کہ صغیرہ گناہوں کو اس لیے لکھ رکھیں کہ قیامت کے دن بندے کو دکھائے جائیں، پھر اُن کو مٹا دیں، تاکہ وہ اللہ کی نعمت معافی کی قدر جانے۔ (قاله الكرخي) پھر سب لوگ اپنے اعمال کو حاضر پائیں گے، یا اعمالِ بد کی جزا کو۔ تیرا رب کسی پر ظلم نہ کرے گا، یعنی بغیر گناہ و جرم کے کسی کو سزا نہیں دیتا۔

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے، لوگ قیامت کے دن تین دفعہ پیش کیے جائیں گے: دو پیشیاں جھگڑوں اور عذر پیش کرنے کے لیے ہوں گی اور تیسری پیشی میں نامۂ اعمال اُڑ کر ہاتھوں میں آئیں گے، کوئی سیدھے ہاتھ سے لے گا اور کوئی بائیں ہاتھ سے۔[1] (رواه الترمذي) لیکن یہ حدیث طریقِ حسن رحمہ اللہ سے آئی ہے اور حسن رحمہ اللہ کا سماع سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔ ہاں بعض نے اس کو حسن رحمہ اللہ سے بطریق ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد قریش کے مغرور لوگوں کے رد کرنے کی طرف توجہ دی اور آدم علیہ السلام اور ابلیس کے قصے کا ذکر فرمایا:[2]

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ۝۵۰

اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا: تم آدم کو سجدہ کرو، تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا، وہ جنوں میں سے تھا، چناں چہ اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی، کیا پھر (بھی) تم مجھے چھوڑ کر اسے اور اس کی اولاد کو دوست بناتے ہو، جبکہ وہ تمھارے دشمن ہیں؟ وہ (شیطان) ظالموں کے لیے بطور بدل برا ہے (50)

آدم و ابلیس کا قصہ:

یعنی اللہ کے بدلے شیطان کو پکڑا۔ جتنے بت پوجے جاتے ہیں، یہ سب اس (شیطان) کی اولاد ہی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کو شیطان کی دشمنی سے آگاہ کیا کہ یہ تمھارا اور پہلے سے تمھارے باپ کا دشمن ہے اور جو لوگ ابلیس کے تابع اور اللہ کے مخالف ہیں، ان کو ڈرایا دھمکایا ہے کہ ہم نے تو ابتداءً تجھ کو پیدا کیا اور ازراہِ لطف و کرم تجھے غذا دی، پالا پوسا اور تیری پرورش کی، پھر تو اس کے بعد ابلیس کا دوست اور اللہ کا دشمن بدکردار بن گیا۔ ہم نے

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٢٥) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ حسن رحمہ اللہ کا سماع سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٦٤٣٢)

[2] فتح البيان (٨/ ٦١۔ ٦٥)

ملائکہ سے کہا تھا کہ تم آدم کو سجدہ کرو، سب فرشتوں نے حکم کی تعمیل کی اور سجدہ کیا، جس طرح کہ سورت بقرہ کے شروع میں گزر چکا ہے[1] یہ سجدہ بزرگی، عزت اور تعظیم کا تھا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴾ [الحجر: ٢٨۔ ٢٩] ''اور جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا: بے شک میں سڑے گارے کی کھنکھناتی مٹی سے ایک بشر تخلیق کرنے والا ہوں۔ پھر جب میں اسے درست کرلوں اور اپنی روح سے اس میں پھونک دوں تو اس کے آگے سجدہ کرتے گر پڑنا۔''

ایک ابلیس تھا جنوں میں سے، جس نے سجدہ نہ کیا، اس کی اصلیت نے اس کی مخالفت کی اور اسے دھوکا دیا، کیوں کہ وہ ایک شعلۂ نار سے پیدا ہوا ہے اور ملائکہ کی اصل پیدایش نور سے ہے، جس طرح صحیح مسلم میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « خُلِقَتِ الْمَلَائِكَةُ مِنْ نُوْرٍ، وَّخُلِقَ إِبْلِيْسُ مِنْ مَارِجٍ مِّنْ نَّارٍ، وَّخُلِقَ آدَمُ مِمَّا وُصِفَ لَكُمْ »[2] [فرشتوں کو نور سے پیدا کیا گیا، ابلیس کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا گیا اور آدم کو اس چیز سے پیدا کیا گیا جسے تمھارے سامنے بیان کیا جا چکا (یعنی مٹی سے)] سو ضرورت کے وقت ہر برتن سے وہی چیز نکلتی ہے جو اس کے اندر ہوتی ہے، چنانچہ حاجت کے وقت ابلیس کی طبیعت نے خیانت کی۔ وہ متوسم بافعالِ ملائکہ تھا، یعنی اس سے ملائکہ جیسے اعمال ظاہر ہوتے تھے، اور خوب سا عابد متنسک (قربانی کرنے والا عبادت گزار) ٹھہرا تھا، لہٰذا فرشتوں سے خطاب میں داخل ہوا اور مخالفت کرکے گناہ گار بنا۔ اللہ تعالیٰ نے اس جگہ ابلیس کا جن ہونا فرمایا، حالاں کہ وہ نار سے پیدا کیا گیا ہے، جس طرح خود اس نے کہا: ﴿ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴾ [الأعراف: ١٢ و صٓ: ٧٦] ''مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا اور اسے تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔'' امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا کہ ابلیس ایک پلک جھپکنے کے برابر بھی کبھی فرشتوں میں سے نہ تھا، وہ تو جن کی اصل ہے، جس طرح آدم اصل ہیں بشر کی۔[3] (رواه ابن جرير بسند صحيح عنه)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ابلیس ایک قبیلہ ملائکہ سے ہے جن کو جن کہتے ہیں، ملائکہ کے درمیان ان کی پیدایش آگ کی لَو سے ہے اور اس کا نام حارث تھا، یہ جنت کے خزانچیوں میں سے ایک خزانچی تھا۔ ملائکہ نور سے بنے ہیں، وہ اس قبیلے سے غیر ہیں اور وہ جن جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے وہ مارج من نار سے پیدا ہوئے ہیں۔ مارج آتش کی زبان ہے، جو بھڑکنے کے وقت اس کے کنارے میں ہوتی ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ ابلیس نارِ مسموم سے بنا ہے اور باقی جن شعلۂ آتش سے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ ابلیس اشرف ملائکہ میں سے تھا اور اپنے قبیلے میں سے سب سے زیادہ عزت والا اور بہشت کا ایک داروغہ تھا اور آسمانِ دنیا اور زمین پر سلطنت رکھتا

---

[1] رقم الآية [٣٤] [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٩٦) [3] تفسير الطبري (١٨/ ٤١)

تھا۔ اللہ کی قضا و قدر سے اس کے نفس میں یہ بات آئی کہ مجھ کو اہلِ آسمان پر شرف حاصل ہے، اس جگہ سے اس کے دل میں تکبر آیا جس کو اللہ ہی جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے اس کبر کو نکالنا چاہا۔ اس کو حکم دیا کہ وہ آدم خاکی کو سجدہ کرے۔ اس نے تکبر کیا اور کافر ہو گیا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ فرمانِ باری تعالیٰ: ﴿ كَانَ مِنَ الْجِنِّ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ وہ جنت کا خازن تھا، جیسے لوگوں کی شہروں کی طرف نسبت ہوتی ہے اور کہا جاتا ہے: مکی، مدنی، بصری اور کوفی۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ خازن جنت تھا، آسمانِ دنیا کی تدبیر کرتا تھا۔ سعید بن مسیّب رحمہ اللہ نے کہا کہ آسمانِ دنیا کے فرشتوں کا سردار تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ابلیس نافرمانی کا ارتکاب کرنے سے پہلے ملائکہ میں سے تھا، اس کا نام عزازیل تھا اور زمین میں سکونت کرنے والوں میں سے تھا اور تمام ملائکہ میں سے سب سے زیادہ جدوجہد کرنے والا اور زیادہ علم والا تھا، یعنی بڑا عالم و عابد تھا، چنانچہ علم اور عبادت نے اس کو تکبر کی طرف بلایا اور اس قبیلے سے تھا جس کو جن کہتے ہیں۔

تکبر عزازیل را خوار کرد — بہ زندانِ لعنت گرفتار کرد

''تکبر نے عزازیل (ابلیس) کو رسوا کر کے لعنت کے قید خانے میں بند کر دیا۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ملائکہ میں ایک قبیلہ ہے جنوں کا، ابلیس اسی قبیلے میں سے تھا۔ آسمان اور زمین کے درمیان وسوسہ ڈالتا۔ اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔ اللہ نے اس پر غصہ فرمایا اور مسخ کر کے شیطان رجیم بنا دیا۔ لعنه الله۔ پھر کہا کہ متکبر شخص سے توبہ کی امید نہیں ہو سکتی، ہاں تکبر نہ ہو اور کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اس سے نا اُمید نہ ہونا چاہیے۔ یعنی سب سے پہلے کبر و حسد کا ظہور و وقوع اسی مسخ شدہ ابلیس سے ہوا ہے۔ اسی لیے وہ شخص جو متکبر اور حاسد ہو وہ شیطان یا ابلیس کی اولاد سمجھا جاتا ہے۔ نسأل الله العافية. سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا کہ ابلیس ان خزانچیوں میں تھا جو جنت میں کام کاج کرتے تھے۔[1]

اس بارے میں سلف سے کثیر تعداد میں آثار ہیں، زیادہ تر ان اسرائیلیات میں سے ہیں جو منقول ہوتے ہیں اور اس لائق ہیں کہ اُن میں نظر کی جائے۔ اکثر کا حال اللہ کو معلوم ہے اور بعض کا جھوٹا ہونا قطعی یقینی ہے، بسبب اس حق کی مخالفت کے جو ہمارے پاس ہے اور قرآن میں بے نیازی ہے ان تمام چیزوں سے جو اس کے علاوہ ہیں، کیوں کہ پہلے کی باتیں تبدیلی اور کمی بیشی سے خالی نہیں ہیں اور اُن میں بہت سی اشیا گھڑی گئی ہیں اور اُن کی کوئی سند نہیں ہے ان حفاظ متقنین سے جن کا کام غلو کرنے والوں کی تحریف کی نفی اور باطل پرست لوگوں کے انتحال کا ابطال ہے، جس طرح کہ اس اُمت میں ائمہ اور علما اور سردار اور متقی اور نیک اور شریف اور نقاد اور جید حفاظ، جو علومِ حدیث کی تدوین کرنے والے اور سنت کے احکام کو قلم بند کرنے والے اور روایات میں سے صحیح، حسن، ضعیف، منکر، موضوع،

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٣٩۔ ٤٢) تفسير ابن كثير (٣/ ١٢٠۔ ١٢١)

متروک اور مکذوب کو واضح کرنے والے ہیں اور وہ لوگوں کی مختلف قسموں میں سے حدیثیں وضع کرنے والے، جھوٹ بولنے والے اور مجہولین وغیرہ کی قسم کے لوگوں کو خوب جانتے پہچانتے ہیں۔ یہ سب نبی اکرم ﷺ کی احادیث اور مقامِ محمدی خاتم الرسل سید البشر ﷺ کے مقام کی حفاظت کے لیے ہیں، تاکہ اُن کی طرف کسی جھوٹ بات کی نسبت نہ ہو، یا جو بات انھوں نے نہیں کہی وہ اُن کی طرف سے بیان نہ کی جائے۔ فرضي الله عنهم ورضوا عنه و جعل جنة الفردوس مأواهم وقد فعل.

اگر اس آخری اُمت میں اہلِ حدیث کا گروہ نہ ہوتا تو اس اُمت کی حالت بھی بالکل پہلی اُمت کی طرح ہو جاتی۔ دیکھو زندیقوں نے چودہ ہزار حدیثیں وضع کر ڈالیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ جہلا صوفیہ اور فقہا اُن کے دام میں آ گئے اور اُن کو احادیثِ نبوی سمجھ کر ان سے استدلال اور استنباط کرنے لگے۔ بعض اشخاص اور اقوام کے جہل کو ابلیس نے اتنی ترقی دی کہ وہ ان روایات کو صوفیہ اور فقہا کے طریق سے بعض نقادِ فنِ حدیث اب تک صحیح روایات کی طرح تسلیم کرتے ہیں۔ حالاں کہ آثارِ ماثورہ سے ان مذکورہ موضوع حدیثوں کے معانی اور بنیادوں کی مخالفت بخوبی ثابت ہے۔ اسی جگہ سے بدعات اور محدثات کی ولادت بھی شریعتِ مطہرہ کے دائرے میں ہوگئی اور ایک بہت بڑی تعداد لوگوں کی کتاب و سنت کے صراطِ مستقیم سے منحرف ہوگئی اور توبہ سے محروم رہی اور بعض نے اسرائیلی روایات پر اعتبار و اعتماد کیا اور اُن کو سچ سمجھ لیا، حالاں کہ قرآن عزیز جیسی بے قیاس نعمت حاصل ہو جانے کے بعد اُن کی تصدیق کی ضرورت نہیں رہی اور نہ ہی ہم کو اُن کی تکذیب کی کچھ حاجت ہے، جس طرح کہ حدیث میں آ چکا ہے: «لَا تُكَذِّبُوهُمْ وَلَا تُصَدِّقُوهُمْ» [1] [ان کی تکذیب کرو نہ تصدیق]

اس بارے میں بڑے سعادت مند وہ لوگ ہیں جنھوں نے کمال قوتِ ایمانی اور اخلاص و احسان سے عقائد اور اعمال اور کشوفات و مقامات میں صرف قرآن و حدیث ہی پر اکتفا کیا ہے اور کسی اور چیز کا ذکر اُن کے دل و زبان پر نہیں ہے اور کیوں کر ہو کہ ''الصباح يغني عن المصباح'' [صبح کا طلوع ہو جانا چراغ سے مستغنی کر دیتا ہے]

بالجملہ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ابلیس اپنے رب کے حکم سے باہر ہو گیا۔ فسق کہتے ہیں اطاعت سے نکل جانے کو۔ پھر ابلیس کے تابعین کو ڈانٹ دی اور جھڑکا کہ تم لوگ اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو اور اس کی ذریت کو اپنا دوست پکڑتے ہو، لہٰذا فرمایا کہ ظالموں کا بدلہ برا ہے۔ یہ مقام ویسا ہے، جیسا کہ قیامت کی ہولناکیوں کے ذکر کے بعد اور ہر نیک بخت اور بد بخت کا ذکر کرنے کے بعد سورۂ یٰسین میں فرمایا ہے: ﴿ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ ﴿59﴾ أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَا بَنِي آدَمَ أَنْ لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ﴿60﴾ وَأَنِ اعْبُدُونِي هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ﴿61﴾ وَلَقَدْ أَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيرًا أَفَلَمْ تَكُونُوا تَعْقِلُونَ ﴾ [يٰسين: ٥٩۔ ٦٢] ''اے مجرمو! آج الگ ہو جاؤ۔ اے بنی آدم! کیا میں نے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢١٥)

تمھیں (اس بات کی) تاکید نہیں کی تھی کہ تم شیطان کی عبادت نہ کرنا، بلاشبہہ وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔ اور یہ کہ تم میری ہی عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔ اور بلاشبہہ اس نے تم میں سے بہت سی مخلوق کو گمراہ کر دیا، کیا پھر بھی تم نہیں سمجھتے؟"

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ بطورِ تحیت و تکریم (عزت و تعظیم) تھا۔ زمین پر گر کر، یعنی عبادت کے لیے نہ تھا۔ سوائے ابلیس کے کہ وہ جن تھا، سب نے سجدہ کیا۔ اس کو جن اس لیے کہا کہ اس نے نافرمانی کی، ورنہ فرشتے نافرمان نہیں ہوتے۔ ابلیس ابوالجن ہے، کچھ فرشتوں میں سے نہ تھا۔ اس کی اولاد ہے جس کا ذکر بعد میں کیا ہے۔ ملائکہ اولاد نہیں رکھتے۔ کہتے ہیں کہ فرشتوں میں ایک قوم ایسی ہے جو جن کہلاتی ہے۔ وہ نارِ سموم، یعنی لُو سے پیدا ہوئی ہے اور یہ نوع متولد ہوتی ہے، معصوم نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ تم لوگ ابلیس کو اور اُس کی اولاد کو اللہ کے سوا اپنے اولیا ٹھہراتے ہو۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ان میں بنی آدم کی طرح توالد (اولاد ہونا) ہوتا ہے۔[1] یا مراد اتباعِ ابلیس ہے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: من جملہ ذریت ابلیس کے لاقیس و ولہان ہیں، یہ دونوں طہارت اور نماز میں وسوسہ انداز ہوتے ہیں اور اس کی اولاد میں سے مرہ بھی ہے، اسی وجہ سے اس کو ابو مرہ بھی کہتے ہیں، اور زلنبور و بتر و اعور و مطروس و داسم ہیں[2] ۔علیھم لعائن اللہ تعالیٰ۔ اور یہ ابلیس بنی آدم کا دشمن ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ہے: ﴿ فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيٓ إِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [الشعراء: ٧٧] "تو بلاشبہہ وہ میرے دشمن ہیں، سوائے رب العالمین کے۔" یعنی باوجود ان انعامات و فیوضِ الٰہی کے جو تم پر مبذول ہیں، تم کس طرح ایسے آبائی دشمن کے دوست دار بنتے ہو اور اللہ کی ناشکری کا بہت برا بدلہ ہے، جو تم نے اختیار کیا ہے[3] ؎

بقول دشمناں پیمان دوستی بشکستی | ببیں کہ از کہ بریدی و با کہ پیوستی

"دشمن کے کہنے پر تو نے دوست کا عہد و پیمان توڑ دیا۔ ذرا غور تو کر کہ تو کس سے کٹ گیا اور کس کے ساتھ مل گیا؟!"

﴿ مَآ أَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَلَا خَلْقَ أَنْفُسِهِمْ ۖ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ﴿٥١﴾ ﴾

میں نے انھیں نہ آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں گواہ حاضر کیا اور نہ خود ان کے پیدا کرنے میں، اور میں گمراہ کرنے والوں کو بازو (مددگار) بنانے والا نہیں (51)

مشرک جن کو پکارتے ہیں وہ ایک ذرے کے بھی مالک نہیں ہیں:

اللہ فرماتا ہے کہ یہ لوگ جن کو تم نے میرے سوا اولیا ٹھہرا لیا ہے یہ سب تمھاری طرح میرے غلام اور بندے

---

[1] تفسیر الطبري (١/ ٥٠٦) [2] تفسیر البغوي (٥/ ١٧٩) [3] فتح البیان (٨/ ٦٥۔ ٦٧)

ہیں اور کسی چیز کے مالک نہیں اور نہ ہی میں نے آسمان وزمین کے پیدا کرتے وقت اُن کو حاضر کیا تھا۔ مطلب یہ ہوا کہ میں ساری اشیا کے پیدا کرنے اور اُن کی تدبیر وتقدیر میں اکیلا اپنی ذات سے مستقل ہوں، اس کام میں میرا کوئی شریک و وزیر و مشیر ونظیر نہیں ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ﴿٢٢﴾ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ حَتّٰٓى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ قَالُوا الْحَقَّ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ﴾ [سبا: ٢٢۔ ٢٣] ''(اے نبی!) آپ کہہ دیجیے: انھیں پکارو جنھیں تم نے اللہ کے سوا (معبود) خیال کیا تھا، وہ آسمانوں میں اور زمینوں میں ذرہ برابر اختیار نہیں رکھتے، اور نہ ان کا ان دونوں میں کوئی حصہ ہے اور نہ ان میں سے کوئی اس (اللہ) کا مددگار ہی ہے۔ اور اس کے ہاں صرف اس شخص کی سفارش نفع دے گی جسے اللہ اجازت دے گا، حتی کہ جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور کر دی جاتی ہے تو (باہم) کہتے ہیں: تمھارے رب نے کیا کہا ہے؟ وہ کہتے ہیں: حق (سچ کہا) اور وہ بہت بلند، بہت بڑا ہے۔'' لہٰذا فرمایا کہ میں وہ نہیں ہوں کہ گمراہوں کو اپنا مددگار ٹھہراؤں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اکثر مفسرین کا قول یہی ہے کہ ضمیر شرکا کی طرف لوٹتی ہے، یعنی اگر آسمان وزمین کی پیدائش یا خود اپنی پیدائش میں یہ میرے شریک ہوتے تو انھوں نے ضرور اس پیدا ہونے کو دیکھا ہوتا اور یہ پیدائش میں شریک رہتے، لیکن انھوں نے اس پیدائش کو نہیں دیکھا اور نہ ہی میں نے اس وقت ان کو حاضر اور موجود رکھا۔ اور میں انھیں کیوں اپنا مددگار ٹھہراتا یہ تو خود دوسری تمام مخلوق کی طرح عاجز اور بے خبر ہیں، یعنی کہاں شیاطین اور کفار اور کہاں آفرینش آفرید گار (پیدا کرنے والے کا پیدا کرنا)۔ بعض نے ''وما کنت'' زبر کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی یہ خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے کہ تم ایسا نہ کرو۔[1]

وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا ﴿٥٢﴾ وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا ﴿٥٣﴾

اور جس دن وہ (اللہ) کہے گا: پکارو میرے ان شریکوں کو جنھیں تم (میرا شریک) سمجھتے تھے، پھر وہ انھیں پکاریں گے، مگر وہ انھیں کوئی جواب نہ دیں گے، اور ہم ان کے درمیان ہلاکت گاہ بنا دیں گے (52) اور مجرم

[1] فتح البیان (٨/ ٦٧۔ ٦٨)

آ گ کو دیکھیں گے تو یقین کریں گے کہ بے شک وہ اس میں گرنے والے ہیں، اور وہ اس سے پھرنے کی کوئی جگہ نہ پائیں گے ﴿53﴾

شرکاء کی جواب سے عاجزی اور مجرموں کی آ گ پر حاضری:

اللہ تعالیٰ نے اس خطاب کی خبر دی جو گواہوں کی موجودگی میں مشرکوں سے کیا جائے گا، یہ خطاب ان کو ڈانٹ ڈپٹ اور توبیخ کے طور پر ہوگا کہ اچھا جن کو تم دنیا میں میرا شریک اعتقاد کرتے تھے، اب ان کو بلاؤ، وہ آ کر تمھیں اس عذاب سے چھڑائیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ؕ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴾ [الأنعام: ٩٤] ''اور یقیناً تم ہمارے پاس اکیلے آئے ہو جس طرح کہ ہم نے تمھیں پہلی بار پیدا کیا، اور ہم نے تمھیں جو کچھ عطا کیا تھا وہ تم اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہو، اور اب ہمیں تمھارے ساتھ تمھارے وہ سفارشی نظر نہیں آتے، جن کے بارے میں تم دعویٰ کرتے تھے کہ بے شک وہ (تمھاری بندگی میں) اللہ کے شریک ہیں۔ ان سے تمھارا تعلق یقیناً ٹوٹ گیا ہے اور وہ تم سے کھو گئے ہیں، جنھیں تم (اپنے معبود) خیال کرتے تھے۔''

لیکن وہ شرکا اُن کے پکارنے پر بھی نہ آئیں گے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَقِيْلَ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَرَاَوُا الْعَذَابَ ۚ لَوْ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَهْتَدُوْنَ ﴾ [القصص: ٦٤] ''اور (ان سے) کہا جائے گا: تم اپنے شریکوں کو بلاؤ، چناں چہ وہ انھیں پکاریں گے تو وہ انھیں جواب نہیں دیں گے، اور وہ (سب) عذاب دیکھ لیں گے، کاش! وہ ہدایت پر چلتے ہوتے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗۤ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآىِٕهِمْ غٰفِلُوْنَ ﴿5﴾ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ﴾ [الأحقاف: ٥۔ ٦] ''اور اس سے زیادہ گمراہ کون شخص ہے، جو اللہ کے سوا اس کو پکارتا ہے جو اُسے قیامت تک جواب نہیں دے سکتا؟ جبکہ وہ ان کی پکار ہی سے غافل ہیں۔ اور جب لوگ اکٹھے کیے جائیں گے تو وہ (جھوٹے معبود) ان کے دشمن ہوں گے، اور وہ ان کی عبادت کے منکر ہوں گے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ﴿81﴾ كَلَّا ؕ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴾ [مریم: ٨١۔ ٨٢] ''اور انھوں نے اللہ کے سوا معبود بنا لیے ہیں، تاکہ وہ ان کے مددگار ہوں۔ ہرگز نہیں! عنقریب وہ خود ان کی عبادت کا انکار کر دیں گے اور ان کے مخالف ہو جائیں گے۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، قتادہ اور کئی ایک اہلِ علم نے کہا کہ موبق بمعنی مہلک ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما

نے کہا کہ ایک گہری وادی ہے، قیامت کے دن اس سے اہلِ ضلالت اور اہلِ ہدایت کے درمیان فرق کیا جائے گا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ایک میدان ہے جہنم میں۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ جہنم میں خون اور پیپ کی ایک وادی ہے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا: موبق سے مراد عداوت ہے،[1] لیکن ظاہر سیاق سے اس جگہ یہ ہے کہ مراد مہلک ہے، اگرچہ جائز ہے کہ دوزخ میں کوئی وادی ہو یا اور کچھ۔ آیت کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات بیان کر دی کہ ان مشرکوں کو کوئی راستہ نہ ملے گا جس سے یہ اپنے ان معبودوں کے پاس پہنچ سکیں جن کو دنیا میں یہ اللہ کا شریک اور اپنا حامی اعتقاد کرتے تھے۔ ان کے اور اُن کے معبودوں کے درمیان تفرقہ پڑ جائے گا۔

کیا ذکر ہے کہ ایک فریق دوسرے فریق سے مل تو سکے مگر دونوں کے بیچ میں ایک ہلاک کرنے والی چیز ہوگی، یعنی خندق اور عظیم ہولناکی اور بہت بڑا امر۔ اور اگر ضمیر کو کفار اور مومنین کی طرف لے جائیں تو اس آیت کی طرح ہوگا: ﴿ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَىِٕذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ ﴾ [الروم: ١٤] ''اور جس دن قیامت قائم ہوگی اس دن لوگ (مومن اور کافر) الگ الگ ہو جائیں گے۔''

نیز فرمایا: ﴿ يَوْمَىِٕذٍ يَّصَّدَّعُوْنَ ﴾ [الروم: ٤٣] ''اس دن وہ (مومن اور کافر) الگ الگ ہو جائیں گے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴾ [یٰسین: ٥٩] ''اے مجرمو! آج الگ ہو جاؤ۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَشُرَكَآؤُكُمْ ۚ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ ۝ فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ ۝ هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ وَرُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴾ [یونس: ٢٨۔ ٣٠] ''اور جس دن ہم ان سب کو جمع کریں گے، پھر ہم ان لوگوں سے، جنھوں نے شرک کیا، کہیں گے: تم اور تمھارے شریک اپنی اپنی جگہ ٹھہرے رہو، پھر ہم ان کے درمیان جدائی ڈال دیں گے اور ان کے شریک کہیں گے: تم ہماری عبادت تو کرتے ہی نہیں تھے۔ چناں چہ ہمارے اور تمھارے درمیان اللہ کافی گواہ ہے، بے شک ہم تمھاری عبادت سے بالکل غافل تھے۔ وہاں ہر نفس (شخص) جانچ لے گا جو کچھ اس نے آگے بھیجا تھا اور وہ اللہ کی طرف لوٹائے جائیں گے جو ان کا حقیقی مالک ہے، اور (وہ سب کچھ) ان سے گم ہو جائے گا جو وہ جھوٹ گھڑا کرتے تھے۔''

پھر جب جہنم کو دیکھیں گے اور وہ ستر ہزار باگ سے لائی جائے گی اور ہر باگ کے ساتھ ستر ہزار فرشتے ہوں گے تو یہ بات ان کو تحقیق ہو جائے گی کہ وہ لامحالہ اس میں گرنے والے ہیں، تاکہ اُن کے غم و اندوہ میں تعجیل ہو، کیوں کہ عذاب کے واقع ہونے سے پہلے اس کی توقع اور خوف بجائے خود ایک عذاب ہے۔ مصرف سے مراد طریقِ عدول ہے، یعنی بچاؤ کا کوئی راستہ نہ ملے گا، حالاں کہ اس سے چارہ نہیں۔ سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں

---

[1] تفسیر الطبري (١٨/ ٤٦۔ ٤٧) تفسیر ابن کثیر (٣/ ١٢٢)

فرمایا ہے: «إِنَّ الْكَافِرَ لَيَرَى جَهَنَّمَ، فَيَظُنُّ أَنَّهَا مُوَاقِعَتُهُ مِنْ مَسِيرَةِ أَرْبَعِينَ سَنَةً »[1] (رواہ ابن جریر) [بلاشبہ کافر جہنم کو دیکھے گا تو وہ چالیس سال کی مسافت ہی سے یہ گمان کرے گا کہ وہ اس پر مسلط ہونے والی ہے] ان کی دوسری روایت کے الفاظ مرفوعاً یہ ہیں: « يُنْصَبُ الْكَافِرُ مِقْدَارَ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ، كَمَا لَمْ يَعْمَلْ فِي الدُّنْيَا، وَإِنَّ الْكَافِرَ لَيَرَى جَهَنَّمَ، وَيَظُنُّ أَنَّهَا مُوَاقِعَتُهُ مِنْ مَسِيرَةِ أَرْبَعِينَ سَنَةً »[2] (رواہ أحمد)[کافر کو جہنم سے پچاس ہزار سال کی مسافت ہی سے غمگین کر دیا جائے گا، اس لیے کہ وہ دنیا میں بے عملی کا شکار تھا اور یقیناً کافر جہنم کو دیکھے گا اور چالیس سال کی مسافت ہی سے یہ گمان کرے گا کہ وہ اس میں داخل ہونے والا ہے]

فتح البیان میں ہے کہ یاد کر اس دن کو، جس دن اللہ تعالیٰ کفار سے بطورِ سرزنش اور ڈانٹ ڈپٹ کے کہے گا، میرے ان شریکوں کو بلاؤ، جن کے بارے میں تم اعتقاد رکھتے تھے کہ وہ تم کو نفع دیں گے اور تمھاری شفاعت کریں گے۔ شرکا کی نسبت اپنے نفس مقدس کی طرف اہلِ شرک کے اعتقاد کی وجہ سے ہے، ورنہ کہاں اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات اور کہاں وہ شریک۔ تب وہ کافر ان شرکاء کو پکاریں گے، وہ کچھ جواب نہ دیں گے اور نہ مدد کریں گے۔ چہ جائیکہ وہ ان مشرکوں کے کسی کام آسکیں اور ہم اُن مشرکین وشرکا کے درمیان یا مومنین اور کفار کے درمیان ایک موبق بنا دیں گے۔

مفسرین کی ایک جماعت نے کہا کہ موبق جہنم میں ایک گہری وادی کا نام ہے۔ بعض نے کہا کہ یہ ایک نہر ہے جس سے آگ بہتی ہے، اس کے کناروں پر اتنے بڑے سانپ ہیں جیسے سیاہ خچر۔ یا موبق ایک برزخ بعید ہے، کیوں کہ کفار جہنم کی تہہ میں ہوں گے اور اہلِ ایمان اعلیٰ جنتوں میں۔ اس بنا پر موبق اسم مکان ہے۔ ابن الاعرابی نے کہا کہ دو چیزوں کے درمیان ہر حاجز (پردہ، رکاوٹ) موبق ہے۔

امام فراء نے کہا کہ مہلک ہے۔[3] معنی یہ ہوئے کہ ہم نے دنیا میں اس کے تواصل (ملنے) کو اُن کے لیے آخرت میں ایک مہلک بنا دیا ہے۔ مہلک سے مراد آتش ناک عذاب ہے، لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ من جملہ ان لوگوں کے جن کو انھوں نے اپنے اعتقاد کے مطابق شریک ٹھہرایا تھا، ملائکہ اور عزیر اور مسیح علیہم السلام بھی ہیں تو موبق ایک ایسی جگہ ٹھہری جو حاصل ہے۔ پھر مجرم لوگ چالیس سال کے راستے سے آگ کو دیکھیں گے اور یقین کریں گے کہ وہ اس میں داخل ہونے والے ہیں۔ مواقعت کے معنی مخالطت بالوقوع کے ہیں۔ اور اس آگ سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ پائیں گے۔[4]

---

[1] تفسیر الطبري (١٨/ ٣٨) اس کی سند میں ''دراج عن ابی الہیثم'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٦٤٩٠)

[2] مسند أحمد (٣/ ٧٥) اس کی سند میں ''دراج عن ابی الہیثم'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٦٤٩٠)

[3] فتح القدير (٣/ ٤٠٦) [4] فتح البيان (٨/ ٦٨۔ ٦٩)

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴿۵۴﴾

اور ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لیے پھیر پھیر کر ہر قسم کی مثال بیان کی ہے اور انسان تمام چیزوں سے زیادہ جھگڑالو ہے ﴿54﴾

قرآن میں بیان کردہ ہر قسم کی مثالیں:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے اس قرآن میں ہر ایک امر کا بیان اور وضاحت کر دی ہے اور ہر بات تفصیل وار ذکر کی، تاکہ لوگ حق سے گمراہ نہ ہوں اور راہِ ہدایت سے باہر نہ جائیں، لیکن باوجود اس بیان اور اس قرآن کے انسان بڑا جھگڑالو ہے۔ حق بات میں باطل کے ساتھ لڑائی جھگڑا اور مقابلہ کیا کرتا ہے، مگر جس کو اللہ نے ہدایت کی اور نجات کا راستہ سمجھا دیا۔ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات میرے پاس اور فاطمہ کے پاس آئے اور کہا: تم دونوں نماز نہیں پڑھتے؟ یعنی تہجد کی اور پڑے سویا کرتے ہو۔ ہم نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہمارے نفس اللہ کے ہاتھ میں ہیں، جب وہ چاہتا ہے کہ ہم اُٹھیں تو ہمیں اُٹھا دیتا ہے۔ جب میں نے یہ بات کہی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوگئے اور کچھ جواب نہ دیا، میں نے سنا کہ پھرتے وقت اپنے زانوں پر ہاتھ مارتے تھے اور کہتے تھے: ﴿وَكَانَ الْاِنْسٰنُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا﴾ (آیتِ باب)۔[1] (أخرجاه في الصحيحين)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ تصریف سے اس جگہ مراد بار بار بیان کرنا اور لوٹانا اور وضاحت کرنا ہے، یعنی لوگوں کی رعایت، اصلاح اور فائدے کے لیے ہم نے اس قرآن میں ہر مثال بیان کر دی ہے، تاکہ لوگ نصیحت پکڑیں۔ اس آیت کی تفسیر سورت بنی اسرائیل میں گزر چکی ہے اور جب کفار باطل کے ذریعے جھگڑا کرنے سے باز نہ آئے تو فرمایا کہ انسان سب سے بڑھ کر جھگڑالو ہے، یعنی باطل طریقے سے جھگڑا کرنے میں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ اس جگہ انسان سے مراد کافر ہے، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی رو سے: ﴿وَيُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ﴾[2] [الكهف: ٥٦] ''اور کافر لوگ تو باطل طریقے سے جھگڑتے ہیں۔'' بعض نے کہا: مراد نضر بن حارث یا ابی بن خلف ہے، لیکن ظاہر یہ ہوتا ہے کہ آیت عام ہے۔ یہی اکثر جھگڑوں کی قسم ہے۔[3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٧٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٧٥)

[2] معاني القرآن (٣/ ٢٩٦) [3] فتح البيان (٨/ ٧٠)

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْۤا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى وَيَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّاۤ اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ﴿۵۵﴾ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ وَيُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ وَاتَّخَذُوْۤا اٰيٰتِيْ وَمَاۤ اُنْذِرُوْا هُزُوًا ﴿۵۶﴾

اور لوگوں کو ایمان لانے سے نہیں روکا جب ان کے پاس ہدایت آ گئی اور اپنے رب سے استغفار کرنے سے مگر (اس بات نے) کہ (وہ چاہتے ہیں) انھیں پہلے لوگوں کا (سا) معاملہ پیش آئے، یا ان پر عذاب بالکل سامنے آ جائے (55) اور ہم رسولوں کو نہیں بھیجتے مگر (لوگوں کو) خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے، اور کافر لوگ تو باطل طریقے سے جھگڑتے ہیں، تاکہ اس کے ساتھ حق کو باطل کر دیں اور انھوں نے ہماری آیات کو اور جس چیز سے ڈرائے گئے اس کو استہزا بنا لیا (56)

عذابِ الٰہی کے منتظر سرکش کفار:

یعنی کچھ اور انتظار نہیں رہا مگر یہی کہ پہلوں کی طرح ہلاک ہوں۔ قیامت کے دن کا عذاب آنکھوں سے دیکھیں۔

اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ زمانۂ قدیم و حدیث میں کفار سرکشی کرتے رہے اور واضح حق کو جھٹلاتے رہے، باوجود اس کے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی نشانیوں اور واضح دلیلوں کا مشاہدہ کیا۔ ان کو رسولوں کے اتباع سے کوئی چیز مانع نہ تھی مگر ان کا مطالبہ یہ تھا کہ وہ اللہ کے عذاب کو، جس کا وہ وعدہ کیے جاتے تھے، اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴾ [الشعراء: ١٨٧] ”لہٰذا اگر تو سچوں میں سے ہے تو ہم پر آسمان سے ایک ٹکڑا گرا دے۔“

نیز فرمایا: ﴿ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴾ [العنکبوت: ٢٩] ”انھوں نے کہا: اگر تو سچوں میں سے ہے تو اللہ کا عذاب لے آ۔“ اور قریش نے کہا تھا: ﴿ اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ [الأنفال: ٣٢] ”اے اللہ! اگر یہ (قرآن) تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا ہم پر دردناک عذاب لے آ۔“ نیز فرمایا: ﴿ وَقَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۝ لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴾ [الحجر: ٦۔ ٧] ”اور انھوں نے کہا: اے وہ شخص! جس پر یہ ذکر (قرآن) نازل کیا گیا ہے، یقیناً تو تو مجنون ہے۔ تو ہمارے پاس فرشتے کیوں نہیں لے آتا، اگر تو سچوں میں سے ہے؟“

اس کے سوا اور بہت سی آیتیں ہیں جو اس مدعا پر دلالت کرتی ہیں۔ پہلوں سے ہی یہ طریقہ ہے کہ عذاب

آ کر ڈھانپ لے اور شروع سے لے کر آخر تک سب کو پکڑ لے، یا آنکھوں کے سامنے آ جائے۔ عذاب کے آنے سے پہلے رسول آ کر تصدیق کرنے والوں اور مومنین کو خوش خبری سناتے اور جھٹلانے والوں اور مخالفین کو ڈراتے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے کافروں کا شیوہ بتایا کہ اُن کی یہ عادت ہے کہ یہ باطل کے ذریعے سے جھگڑا کرتے ہیں حق کو کمزور کرنے کے لیے، حالاں کہ ان کو اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ انھوں نے اللہ کی حجتوں اور برہانوں اور خوارقِ عادت (کرامات اور معجزے) کو جو رسول لے کر آئے تھے اور جس عذاب اور سزا سے، انھوں نے ان کو ڈرایا ہے، ایک مذاق بنا لیا ہے۔ یہ مذاق بنانا جھٹلانے کی ایک سخت قسم ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اس جگہ ناس سے مراد اہلِ مکہ ہیں اور ہدیٰ سے مراد قرآن یا محمد ﷺ۔ اگلوں کی سنت یہ ہے کہ ایمان نہ لانے پر ایسا عذاب آتا تھا جو نیست و نابود کر دیتا تھا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ مراد پہلوں کی سزا ہے۔[1] قبل سے مراد عیان (آنکھیں) ہے۔ حاصل معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے اور نہ استغفار کریں گے مگر اسی وقت کہ یا تو ایسا عذاب آئے کہ ان کو جڑ سے اکھیڑ کر پھینک دے یا یہ لوگ طرح طرح کے آخرت کے عذاب کا معائنہ اپنی آنکھوں سے کر لیں۔ رسل کا کام یہی ہے کہ وہ مومنوں کے لیے خوش خبری دینے والے اور کفار کو خوف دلانے والے ہوتے ہیں اور کفار کی عادت یہ ہے کہ وہ حق کو کمزور کرنے کے لیے باطل کی وساطت سے جھگڑا کرتے ہیں، جیسے یہ کہنا: ﴿مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا﴾ [یٰس: ۱۵] ''تم ہم جیسے بشر ہی تو ہو۔'' انہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات اور ڈرانے کو ایک مذاق ٹھہرا لیا ہے۔[2]

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْۤا اِذًا اَبَدًا ۝۵۷ وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ؕ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْىِٕلًا ۝۵۸ وَتِلْكَ الْقُرٰۤى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ۝۵۹

اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے جسے اس کے رب کی آیات سے نصیحت کی جائے تو وہ ان سے منہ موڑ لے اور جو کچھ اس کے دونوں ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے اسے بھول جائے، بے شک ہم نے ان کے دلوں پر

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۷/ ۲۳٦۸) [2] فتح البیان (۸/ ۷۱۔ ۷۲)

پردے ڈال دیے ہیں، اس سے کہ وہ اس (قرآن) کو سمجھیں اور ان کے کانوں میں گرانی (ڈال دی)۔ اور اگر آپ انھیں ہدایت کی طرف بلائیں تو تب وہ ہرگز ہدایت نہ پائیں گے کبھی بھی (57) اور آپ کا رب خوب بخشنے والا، رحمت والا ہے۔ اگر وہ ان کے کیے پر انھیں پکڑے تو یقیناً ان کے لیے عذاب جلدی لائے، بلکہ ان کے لیے وعدے کا (مقرر) وقت ہے، وہ ہرگز اس سے (بچنے کی) کوئی جائے پناہ نہیں پائیں گے (58) اور یہ بستیاں ہم نے انھیں ہلاک کیا جب انھوں نے ظلم کیا، اور ہم نے ان کی ہلاکت کے لیے ایک مقرر وقت طے کیا تھا (59)

نصیحت سننے کے بعد اعراض کرنے والا سب سے بڑا ظالم ہے:

اوپر ذکر ہوا تھا کہ کافر اپنی دنیا میں مغرور ہو کر غریب مسلمانوں کو ذلیل سمجھ کر نبی اکرم ﷺ سے چاہتے تھے کہ ان کو اپنے پاس نہ بٹھاؤ تو ہم آپ کے پاس بیٹھیں۔ اسی پر دو بھائیوں کی مثال بیان کی اور دنیا کی مثال بیان کی اور ابلیس کا اپنے غرور سے خراب ہونا بیان کیا۔ اب موسیٰ اور خضر کا قصہ بیان کیا کہ اللہ کے لوگ اگر بہتر بھی ہوں تو بھی اپنے آپ کو کسی سے بہتر نہیں کہتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم میں نصیحت فرماتے تھے، ایک شخص نے پوچھا کہ اے موسیٰ! آپ سے زیادہ بھی کسی کو علم ہے؟ کہا: مجھ کو معلوم نہیں۔ یہ بات حقیقت تھی، لیکن اللہ کی رضا اس میں تھی کہ یوں کہتے کہ میرے جیسے بندے اللہ کے بہت ہیں، سب کی خبر اسی کو ہے۔ تب وحی آئی کہ ہمارا ایک بندہ ہے، دو دریاؤں کے ملاپ پر، اس کو تجھ سے زیادہ علم ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی کہ مجھ کو اس کی ملاقات نصیب ہو، حکم ہوا کہ ایک مچھلی تل کر ساتھ لو، تو جہاں مچھلی گم ہو، وہاں وہ اللہ کا بندہ ملے گا۔[1]

موضح قرآن میں آیتِ باب کے تحت یہ توضیح لکھی ہے، لیکن اس کی جگہ اصل میں بعد والی آیت ہے، کیوں کہ اس آیت میں اس قصے کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے، بلکہ موسیٰ کا قصہ اس سے بعد والی آیت سے شروع ہوتا ہے۔ یا ترجمہ کے کاتب نے غلطی سے فائدہ کا نشان (ف) اس آیت کے نیچے لگا دیا ہے اور اصل نسخہ میں یہ فائدہ زیر آیت: ﴿وَإِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ﴾ ہوگا۔ واللّٰہ أعلم.

بالجملہ اللہ پاک نے اس جگہ یہ فرمایا ہے کہ سب بندوں میں بڑا ستم گر اور ظالم وہ بندہ ہے جس کو اللہ کی نشانیاں یاد دلائی گئیں اور وہ اُن کو بھول گیا اور منہ پھیر لیا اور اس نے اپنا کان ان پر نہ رکھا اور ان آیات کی کچھ پروا نہ کی اور جو اعمالِ سیئہ اور افعالِ قبیحہ پہلے کر چکا ہے، ان کو فراموش کر دیا۔ سو ہم نے ایسے لوگوں کے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں، وہ اس قرآن اور بیان کو نہیں سمجھتے اور اُن کے کانوں میں ہدایت کی بات سننے کے لیے گرانی ہے۔ اگر

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۲۲) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۳۸۰)

ان کو ہدایت کی طرف بلایا جاتا ہے تو وہ راہ یاب نہیں ہوتے۔ اے نبی! تمھارا رب بخشنے والا اور وسیع رحمت والا ہے، اگر لوگوں کو ان کے اعمال پر پکڑنا شروع کر دے تو جلدی عذاب کر دے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ ﴾ [الفاطر: ٤٥] ''اور اگر اللہ لوگوں کو اس وجہ سے پکڑتا جو انھوں نے کمایا تو وہ اس (زمین) کی پشت پر چلنے والا کوئی جاندار نہ چھوڑتا۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ۚ وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴾ [الرعد: ٦] ''اور بے شک آپ کا رب لوگوں کے ظلم کے باوجود البتہ انھیں بخشنے والا ہے، اور یقیناً آپ کا رب البتہ سخت سزا دینے والا ہے۔''

اس بارے میں آیات بہت آئی ہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ میں بردبار ہوں، پردہ پوشی کرنے والا اور بخشنے والا ہوں۔ جب کبھی کوئی شخص سرکشی سے ہدایت کی طرف آتا ہے اور جو سرکشی پر ڈٹا رہتا ہے اس کے لیے ایک ایسا دن ہے، جس میں بچہ بوڑھا ہو جائے گا اور ہر حاملہ عورت اپنا بوجھ ڈال دے گی۔ لہٰذا فرمایا کہ ان کے لیے وعدے کا ایک وقت ہے جس سے نجات اور رہائی اور چھٹکارے کا کوئی راستہ نہ پائیں گے۔ ہم نے پہلی اُمتوں اور گزری ہوئی قوموں کو اُن کے ظلم کی وجہ سے ہلاک کر دیا اور اُن کی ہلاکت کے لیے ایک وعدے کا وقت مقرر کیا، یعنی مدتِ معلوم اور وقتِ معین جو نہ بڑھے اور نہ گھٹے۔ اسی طرح اے مشرکو! تمھارا حال ہے۔ تم ڈرتے رہو کہ کہیں ویسی مصیبت جو اُن پر آئی تھی تم پر بھی نہ آ جائے۔ اس لیے کہ تم نے سب سے زیادہ بزرگ رسول اور سب سے بڑے نبی کو جھٹلایا ہے۔ تم ہم کو کچھ اُن لوگوں سے زیادہ عزیز نہیں ہو، تم کو چاہیے کہ تم میرے عذاب اور میرے ڈرانے سے ڈر جاؤ۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ وہ بڑا ظالم ہے جس کو ہماری آیاتِ تنزیلیہ وتکوینیہ کا وعظ کیا گیا، یا دونوں کا، پھر اس نے قبول نہ کیا، بلکہ حقارت سے تدبر اور تفکر کو ترک کر دیا اور ایمان نہ لایا اور اپنے کفر اور نافرمانی کو بھول گیا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ اپنے پہلے بہت زیادہ گناہوں کو فراموش کر دیا۔[1] نسیان سے اس جگہ اپنے پہلے کفر سے مشغولیت اور غفلت مراد ہے، یا سچ مچ بھول جانا ہی مراد ہے۔ سو ہم نے ایسے لوگوں کے دلوں پر غلاف ڈال دیے ہیں، وہ کچھ نہیں سمجھتے اور اُن کے کانوں میں بوجھ رکھا ہے کہ وہ کچھ سنتے ہی نہیں ہیں۔ اے نبی! اگر تو اُن کو ہدایت کی طرف بلائے تو وہ کبھی راہ پر نہ آئیں، اس لیے کہ اللہ نے کفر اور نافرمانیوں کی وجہ سے اُن کے دلوں پر مہر لگا دی ہے، مگر تیرا رب غفور اور رحمت والا ہے، اس لیے ان کی سزا میں جلدی نہیں کی۔ اگر وہ گناہ گاروں کو ان کے گناہوں پر، جن میں سے ایک کفر اور حق سے جھگڑنا اور منہ موڑنا ہے، پکڑ لے تو اُن کے لیے جڑ سے اُکھیڑنے والے عذاب کی اسی دنیا میں

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٦٩)

جلدی کرے، کیوں کہ وہ اس کے مستحق ہیں، بلکہ اُن کے عذاب کے لیے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے۔ مراد آخرت کا عذاب یا بدر کا دن ہے۔

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ مراد قیامت کا دن ہے،[1] وہ اس دن کے عذاب سے کوئی پناہ گاہ اور نجات دہندہ نہ پائیں گے۔ ان کے سامنے عاد و ثمود و لوط کی بستیاں اور اُن کی مثالیں موجود ہیں، جن کو ہم نے اسی دنیا میں ہلاک کر دیا، جب ان سے ظلم، یعنی کفر اور حق سے دشمنی اور نافرمانیاں صادر ہوئیں۔ اُن کی تباہی و بربادی کے لیے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے، یعنی قیامت کا دن۔[2]

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا ﴿٦٠﴾ فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوْتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ﴿٦١﴾ فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا ۡ لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ﴿٦٢﴾ قَالَ اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَآ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ ۡ وَمَآ اَنْسٰىنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ ۚ وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ ۖ عَجَبًا ﴿٦٣﴾ قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۖ فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ﴿٦٤﴾ فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿٦٥﴾

اور جب موسیٰ نے اپنے جوان (یوشع بن نون) سے کہا: میں تو چلتا ہی رہوں گا، حتیٰ کہ [مَجْمَعُ الْبَحْرَين] ''دو دریاؤں کے سنگم'' پر پہنچ جاؤں، یا میں مدت ہائے دراز گزاروں (چلتا رہوں) ﴿60﴾ پھر جب وہ دونوں ان دونوں (دریاؤں) کی آپس میں ملنے کی جگہ پر پہنچے، (تو) وہ اپنی مچھلی بھول گئے، سو اس نے دریا میں سرنگ نما اپنا راستہ بنا لیا ﴿61﴾ پھر جب وہ دونوں آگے گزر گئے تو اس (موسیٰ) نے اپنے جوان سے کہا کہ ہمیں ہمارا ناشتہ دے، بلاشبہ یقیناً اپنے اس سفر سے ہم تھکاوٹ سے دوچار ہوئے ہیں ﴿62﴾ وہ بولا: بھلا آپ نے دیکھا جب ہم چٹان کے پاس ٹھہرے تھے تو بے شک میں مچھلی بھول گیا، اور مجھے وہ نہیں بھلائی، مگر شیطان ہی نے کہ میں اسے یاد رکھوں، اور اس نے عجیب طرح دریا میں اپنا راستہ بنایا ﴿63﴾ اس نے کہا: یہی تو ہے جو ہم تلاش کر رہے تھے، پھر وہ اپنے قدموں کے نشانات کی اتباع کرتے ہوئے لوٹے ﴿64﴾

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٦٩) [2] فتح البيان (٨/ ٧٢_٧٤)

چناں چہ ان دونوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے (خضر) کو پایا، جسے ہم نے اپنی طرف سے رحمت دی تھی اور ہم نے اسے اپنے پاس سے (خاص) علم سکھایا تھا 65

موسیٰ وخضر علیہما السلام کا واقعہ:

وہاں پہنچ کر موسیٰ علیہ السلام سوئے رہے اور یوشع دریا سے وضو کرنے لگے اور وہ تلی ہوئی مچھلی زندہ ہو کر دریا میں چلی گئی اور پانی میں بیٹھ گئی، وہاں ایک طاق سا کھلا رہ گیا۔ ان کو دیکھ کر تعجب آیا، چاہا کہ جب موسیٰ علیہ السلام جاگیں تو اُن سے کہوں، وہ جاگے تو دونوں آگے چل کھڑے ہوئے، ان سے کہنا بھول گئے۔ موسیٰ علیہ السلام پہلے نہیں تھکے، جب ان کی مطلوبہ جگہ چھوٹ گئی تو پھر چلنے سے تھکاوٹ ہوئی۔ وہ بندہ جس کو موسیٰ علیہ السلام نے پایا خضر علیہ السلام تھے، مل کر آنے کا سبب پوچھا تو موسیٰ علیہ السلام نے سبب بتایا۔ خضر نے کہا کہ تمھاری اللہ تعالیٰ نے تربیت فرمائی ہے۔ بات یوں ہے کہ اللہ کا ایک علم مجھ کو ہے تم کو نہیں ہے، ایک مجھ کو نہیں ہے اور تم کو ہے۔ ایک چڑیا دریا میں پانی پیتی ہوئی دکھائی دی اور کہا: اللہ کی تمام مخلوق کا علم اللہ کے علم میں سے اتنا ہے جتنا دریا میں سے چڑیا کے منہ میں پانی ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کے یوشع بن نون سے یہ بات کہنے کا سبب یہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام سے ذکر کیا گیا تھا کہ اللہ کے بندوں میں سے ایک بندہ دو دریاؤں کے سنگم میں ہے، اس کے پاس وہ علم ہے جو موسیٰ علیہ السلام کو نہیں ہے، انھوں نے چاہا کہ میں سفر کر کے اس بندے کو دیکھوں۔ اپنے جوان یوشع بن نون سے کہا کہ میں سفر کروں گا، یہاں تک کہ میں مجمع البحرین تک پہنچوں، یعنی ایسی جگہ جہاں دو دریا آپس میں ملتے ہیں۔ قتادہ وغیر واحد نے کہا ہے کہ یہ دونوں دریا ایک بحرِ فارس ہے، مشرق سے متصل اور دوسرا بحرِ روم مغرب سے متصل۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا کہ مجمع البحرین طنجہ کے نزدیک ہے،[1] یعنی اقصی بلادِ مغرب میں۔ واللہ أعلم.

"حَقَب" سے مراد یہ ہے کہ مدتوں تک یعنی ایک زمانۂ دراز تک میں سفر کروں گا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بعض علمائے کلامِ عرب نے کہا ہے کہ لغتِ قیس میں "حَقَب" ایک سال ہے اور سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اسی سال۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ستر برس۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: "حَقَب" سے مراد دہر (زمانہ) ہے۔ یہی قول قتادہ اور ابن زید رحمہ اللہ کا ہے۔[2]

غرض کہ جب موسیٰ علیہ السلام چلے تو حکم دیا کہ ایک مچھلی نمکین تلی ہوئی اپنے ساتھ لے لو۔ اُن سے یہ کہا گیا تھا کہ جب مچھلی گم ہو جائے تو وہی جگہ خضر علیہ السلام کی ہے۔ دونوں مجمع البحرین تک پہنچے، وہاں ایک چشمہ تھا جس کو عین الحیاۃ کہتے ہیں، وہاں پہنچ کر سو گئے۔ اس مچھلی کو اس پانی کی کچھ تری اور نمی پہنچی، اس نے اضطراب کیا۔ وہ یوشع علیہ السلام کے

---

[1] تفسیر الطبري (١٨/ ٥٥۔ ٥٦) [2] تفسیر الطبري (١٨/ ٥٦۔ ٥٧)

پاس ایک تھیلے میں تھی، یوشع علیہ السلام کے تھیلے سے کود کر دریا میں جا پڑی۔ یوشع علیہ السلام جاگ پڑے اور مچھلی دریا میں گر پڑی اور پانی میں چلنے لگی۔ پانی طاق کی طرح ہو گیا، باہم ملا نہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دریا میں اس کا نشان اس طرح رہ گیا جس طرح زمین میں کوئی سرنگ ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ پانی میں مچھلی کا نشان پتھر کی طرح کا ہو گیا۔ مچھلی جہاں تک پانی میں گئی وہ جگہ ایک پتھر کی طرح خشک ہو کر رہ گئی۔

سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قصے کا ذکر فرمایا تو کہا کہ جب سے لوگ ہیں کبھی پانی اس طرح جدا نہیں ہوا تھا، سوائے مچھلی کے راستے کے کہ جب وہ دریا میں گھسی تو ایک سوراخ سا رہ گیا[1] یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام نے پھر کر اُس کے راستے کو دیکھا اور کہا کہ اسی کی تو ہم کو تلاش تھی۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ مچھلی گرم جگہ سے چل کر دریا میں پہنچی، پھر پانی میں جس طرف چلی وہاں ایک راستہ بن گیا اور اس جگہ کا پانی جم گیا۔ اللہ تعالیٰ نے نسیان (بھول جانا) کی نسبت دونوں کی طرف کی، حالاں کہ بھولنے والے صرف یوشع علیہ السلام تھے۔ یہ اس آیت کی مثل ہے: ﴿ يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ﴾ [الرحمٰن: ٢٢] ''ان دونوں سمندروں سے موتی اور مرجان (مونگے) نکلتے ہیں۔'' حالاں کہ ایک ہی دریائے شور سے یہ چیزیں نکلتی ہیں۔

بالجملہ جب اس بھولنے والی جگہ سے آگے ایک مرحلے پر پہنچے تو موسیٰ علیہ السلام نے کھانا مانگا اور سفر سے اپنی تھکاوٹ کا ذکر کیا۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت ''أَنْ أَذْكُرَهُ''[2] ہے لہٰذا کہا کہ مچھلی عجیب طرح سے دریا میں گئی، اس پر وہ دونوں اپنے قدموں کے نشان پر واپس پھرے، وہاں ایک بندے کو پایا جس کا علم لدنی تھا۔ اس بندے سے مراد خضر علیہ السلام ہیں، جس طرح کہ احادیثِ صحیحہ اس پر دلیل ہیں۔

صحیح بخاری میں سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا کہ میں نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا کہ نوف بکالی کا یہ اعتقاد ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جو خضر علیہ السلام کے پاس گئے وہ وہ موسیٰ نہیں تھے جو بنی اسرائیل کے نبی ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہ اللہ کا دشمن جھوٹا ہے۔ مجھے سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ فرماتے تھے کہ موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے، ان سے پوچھا گیا کہ کون آدمی بڑا عالم ہے؟ کہا: میں۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر عتاب کیا، اس لیے کہ علم کو اللہ کی طرف نہ پھیرا۔

پھر اللہ نے اُن کو وحی کی کہ میرا ایک بندہ مجمع البحرین میں ہے، وہ تم سے زیادہ عالم ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اے اللہ! میں اس سے کس طرح ملوں؟ فرمایا: تو ایک مچھلی اپنے ساتھ تھیلے میں لے، پھر جس جگہ وہ مچھلی گم ہو جائے، وہ بندہ اسی جگہ ملے گا۔ انھوں نے ایک مچھلی تھیلے میں لی اور اپنے جوان یوشع بن نون علیہ السلام کو اپنے ہمراہ لے کر چلے، جب صخرے کے پاس آئے، دونوں سر رکھ کر سو گئے، مچھلی نے تھیلے میں جنبش کی اور نکل کر دریا میں جا پڑی اور ایک

---

[1] تفسیر الطبري (١٨/ ٥٨۔ ٥٩) [2] تفسیر الطبري (١٨/ ٦٠)

راستہ بنا لیا۔ اللہ نے اس جگہ کا پانی بہنے سے روک دیا، اس جگہ ایک طاق سا باقی رہ گیا۔ موسیٰ علیہ السلام جب جاگے تو اُن کے ساتھی مچھلی کا ذکر کرنا بھول گئے۔ وہ رات اور دن دونوں برابر چلتے رہے۔ جب دوسرا دن ہوا تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ہمارا کھانا لاؤ، ہم اس سفر میں تھک گئے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کو اس وقت تک تھکاوٹ محسوس نہ ہوئی جب تک کہ وہ اس جگہ سے آگے نہ بڑھے جس کا اللہ نے ان کو حکم دیا تھا۔ اس جوان ساتھی نے کہا: تم نے دیکھا ہوگا کہ جب ہم اس صخرے کے پاس آئے تھے، مجھے مچھلی یاد نہ رہی۔ مچھلی کا ذکر کرنا مجھے شیطان نے بھلا دیا اور وہ عجب طرح دریا میں راستہ بناتی ہوئی چلی گئی۔ مچھلی کے لیے ایک سرنگ ہوا اور موسیٰ علیہ السلام اور اُن کے نوجوان کے لیے ایک عجیب چیز کہا، ہم تو اسی جگہ کی تلاش میں تھے۔ پھر وہ دونوں اپنے قدموں کے نشان پر واپس پلٹے، یہاں تک کہ صخرے کے نزدیک آئے، وہاں ایک شخص کو کپڑے میں لپٹا ہوا دیکھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اسے سلام کیا۔ خضر علیہ السلام نے کہا کہ تیری زمین میں سلام کہاں ہے؟ کہا: میں موسیٰ ہوں، کہا: موسیٰ بنی اسرائیل؟ کہا: ہاں۔ کہا: میں تیرے پاس آیا ہوں کہ تو مجھ کو اس رُشد کی تعلیم دے جو تجھ کو سکھایا گیا ہے۔ کہا تو میرے ساتھ صبر نہیں کر سکے گا۔ اے موسیٰ! مجھے ایک علم ہے اللہ کے علم میں سے جو تو نہیں جانتا اور تجھ کو ایک علم ہے اللہ کے علم میں سے جو میں نہیں جانتا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا تو مجھ کو ان شاء اللہ صابر پائے گا اور میں تیرے حکم کے خلاف نہ کروں گا۔

خضر علیہ السلام نے کہا: اچھا اگر تو میری پیروی کرے گا تو پھر تو مجھ سے کسی شے کا سوال نہ کرنا جب تک کہ میں خود ہی اس کا ذکر تجھ سے نہ کروں۔ پھر دونوں چلے۔ دریا کے کنارہ پر آئے، ایک کشتی آئی، کشتی والوں سے سوار ہونے کے لیے بات چیت کی۔ انھوں نے حضرت خضر علیہ السلام کو پہچان کر سوار کر لیا اور کچھ کرایہ نہ لیا، یعنی بغیر اُجرت سوار کر لیا۔ جب دونوں کشتی میں بیٹھے تو اچانک خضر علیہ السلام نے کشتی کا ایک تختہ ایک ہتھوڑی سے اُکھیڑ لیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: انھوں نے تو بغیر اُجرت لیے آپ کو سوار کر لیا تھا اور آپ نے اُن کی کشتی میں سوراخ کر دیا کہ کشتی والے ڈوب جائیں تم نے یہ ایک انوکھا کام کیا۔ خضر علیہ السلام نے کہا: میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ تم میرے ہمراہ صبر نہ کر سکو گے۔ کہا: تم مجھ کو میری بھول پر نہ پکڑو اور میرے کام کو مجھ پر مشکل نہ کرو۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ بات موسیٰ علیہ السلام سے بطورِ نسیان کے ہوئی تھی۔

اتنے میں ایک چڑیا کشتی کے کنارے پر آ بیٹھی اور دریا میں ایک چونچ ماری، خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ میرا اور تیرا علم اللہ کے علم کے مقابلے میں اس کی مثل ہے جو اس چڑیا نے اس دریا کے پانی میں سے کم کیا۔ پھر وہ دونوں کشتی سے باہر نکلے، ساحلِ دریا پر چلے جاتے تھے کہ اتنے میں خضر علیہ السلام نے ایک لڑکا دیکھا اور وہ اور لڑکوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ خضر علیہ السلام نے اس کا سر پکڑ کر اُکھاڑ دیا اور اس کو مار ڈالا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: تو نے ایک پاک جان بغیر کسی عوض کے مار ڈالی، یہ ایک برا کام کیا۔ خضر علیہ السلام نے کہا: میں نے تجھ سے کہہ دیا تھا کہ تو میرے ہمراہ صبر نہیں کر سکے گا اور یہ اعتراض پہلے اعتراض سے بھی سخت تر تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اگر میں اس کے بعد تم سے کچھ پوچھوں تو تم

مجھ کو اپنے ہمراہ نہ رکھنا، تم میری طرف سے عذر (کے قبول کرنے میں غایت) کو پہنچ گئے۔

پھر دونوں چلے، یہاں تک کہ ایک گاؤں کے لوگوں کے پاس پہنچے، ان سے کھانا مانگا۔ انھوں نے ان کی مہمان داری سے انکار کیا۔ وہاں ایک دیوار تھی جو گرنے والی تھی، خضر علیہ السلام نے اپنے آپ اس دیوار کو سیدھا کیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ہم اس قوم کے پاس آئے، انھوں نے ہم کو کھانا نہ دیا اور نہ ہماری مہمانی کی، تم اگر چاہتے تو اُن سے کچھ اُجرت لیتے۔ خضر علیہ السلام نے کہا: یہ جدائی ہے میرے اور تیرے درمیان۔ اب میں تجھ کو اس بات کا مطلب بتاتا ہوں جس پر تو صبر نہ کر سکا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم نے چاہا موسیٰ علیہ السلام کچھ اور صبر کرتے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان دونوں کا قصہ ہم سے بیان فرماتا۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی قراءت یہ تھی: "وَكَانَ أَمَامَهُمْ مَلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ صَالِحَةٍ غَصْبًا" [اور ان کے آگے ایک بادشاہ تھا جو ہر صحیح کشتی غصب کر لیتا تھا] اور وہ یوں پڑھتے تھے: "وَأَمَّا الْغُلَامُ فَكَانَ كَافِرًا وَكَانَ أَبَوَاهُ مُؤْمِنَيْنِ"[1] [اور غلام (بچہ) کافر تھا اور اس کے والدین مومن تھے]

پھر امام بخاری رحمہ اللہ نے سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ سے اسی طرح روایت کیا ہے، اس میں یوں ہے کہ پھر موسیٰ علیہ السلام باہر نکلے، ان کے ہمراہ یوشع بن نون تھے اور اُن کے پاس مچھلی تھی، یہاں تک کہ صخرے کے پاس پہنچے اور وہاں اُترے، موسیٰ علیہ السلام نے اپنا سر رکھا اور سو گئے۔ سفیان نے کہا کہ عمرو رضی اللہ عنہ سے حدیث میں یوں مروی ہے کہ اس پتھر کی جڑ میں ایک چشمہ تھا، جس کو حیات کہتے تھے، اس کا پانی جس چیز کو لگ جاتا وہ زندہ ہو جاتی اور چشمے کا پانی اس مچھلی کو پہنچا، وہ حرکت میں آئی اور تھیلے سے اُچھل کر دریا میں جا پہنچی۔ موسیٰ علیہ السلام نے جاگ کر اپنے ہمراہی جوان سے کہا کہ ہمارا فلاں کھانا لاؤ، پھر حدیث بیان کی اور کہا کہ ایک چڑیا کشتی کے کنارے پر آ بیٹھی اور اپنی چونچ دریا میں ڈبوئی، خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا: میرا علم، آپ کے علم اور تمام مخلوقات کا علم اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلے میں اس طرح ہے جس طرح چونچ کا وہ حصہ جو دریا کے مقابلے میں ہے جسے چڑیا نے پانی میں ڈبویا تھا، پھر باقی حدیث اسی طرح ذکر کی۔[2]

امام بخاری رحمہ اللہ نے یعلیٰ بن مسلم اور عمرو بن دینار سے ان الفاظ میں روایت کیا ہے کہ ان دونوں نے سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے یوں روایت کیا ہے اور ایک نے دوسرے پر زیادت (اضافہ) کی ہے اور ان دونوں کے علاوہ دوسروں نے یوں کہا ہے کہ میں نے سنا، سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا کہ ہم عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس ان کے گھر میں تھے۔ اتنے میں انھوں نے مجھ سے کہا کہ مجھ سے کچھ پوچھو۔ میں نے کہا کہ اے ابا عباس! اللہ تعالیٰ مجھے آپ پر فدا کرے! کوفے میں ایک قصہ گو مرد، یعنی وعظ کہنے والا ہے، اس کو نوف کہتے ہیں، وہ یہ گمان کرتا ہے کہ یہ بنی اسرائیل والے موسیٰ نہ تھے۔ عمرو بن دینار رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ کے دشمن نے جھوٹ کہا ہے۔ یعلی کے الفاظ یہ ہیں کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا:

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٤٨) (2) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٥٠)

سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''حضرت موسیٰ رسول اللہ علیہ السلام نے ایک دن لوگوں کو ایسا وعظ کیا کہ لوگوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور دل پسیج گئے۔ جب آپ واپس جانے لگے تو ایک شخص نے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول! کیا دنیا میں آپ سے بڑا کوئی عالم ہے؟ انھوں نے فرمایا: نہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق اظہارِ خفگی فرمایا کیونکہ انھوں نے علم کی نسبت اللہ کی طرف نہیں کی تھی۔ ان سے کہا گیا: کیوں نہیں؟ بلکہ آپ سے بڑھ کر ایک عالم ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: اے میرے رب! وہ کہاں ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: دو دریاؤں کے سنگم پر۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: اے پروردگار! میرے لیے کوئی نشانی مقرر فرما دے جس کے ذریعے سے میں اسے معلوم کر سکوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جہاں تم سے مچھلی جدا ہو جائے، یعنی ایک مردہ مچھلی لو، جہاں اس مچھلی میں جان پڑ جائے وہ اس جگہ ہوں گے، چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے ایک مچھلی ساتھ لے لی اور اسے اپنی زنبیل میں رکھ لیا۔ آپ نے اپنے خادم (یوشع) سے فرمایا: میں تمھیں بس اتنی تکلیف دیتا ہوں کہ جب یہ مچھلی زنبیل سے نکل کر چل دے تو مجھے مطلع کرنا۔ خادم نے کہا: یہ کون سی بڑی تکلیف ہے، اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ ﴾ میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے...... یہ خادم رفیق سفر حضرت یوشع بن نون تھے۔ سعید بن جبیر نے اس کا نام نہیں لیا...... پھر موسیٰ علیہ السلام ایک چٹان کے سائے میں ٹھہر گئے جہاں نمی اور ٹھنڈک تھی۔ اس وقت مچھلی نے حرکت کی اور دریا میں کود گئی جب کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس وقت سو رہے تھے۔ خادم نے کہا: اس وقت آپ کو جگانا مناسب نہیں لیکن جب موسیٰ علیہ السلام بیدار ہوئے تو وہ انھیں مچھلی کا حال کہنا بھول گئے۔ اس دوران میں مچھلی حرکت کر کے دریا میں کود گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے مچھلی کے کودنے کی جگہ پانی کا بہاؤ روک دیا اور مچھلی کا نشان اس پتھر پر بن گیا جس کے اوپر سے گزر کر گئی تھی...... عمرو بن دینار نے مجھ (ابن جریج) سے بیان کیا کہ اس کا نشان پتھر پہ بن گیا۔ اور انھوں نے دونوں انگوٹھوں اور شہادت کی انگلیوں کو جوڑ کر ایک حلقے کی طرح پتھر پر پڑے ہوئے نشان کو نمایاں کیا......

(بیدار ہونے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام باقی دن اور پوری رات چلتے رہے۔) آخر کہنے لگے: ''ہمیں اس سفر میں تھکن ہو رہی ہے۔'' ان کے خادم نے کہا: اللہ تعالیٰ نے آپ کی تھکن کو دور کر دیا ہے...... یہ الفاظ سعید بن جبیر کی روایت میں نہیں ہیں...... اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام اور ان کے خادم دونوں واپس لوٹے اور وہاں حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ہو گئی جو دریا کے درمیان میں ایک چھوٹے سے سبز زین پوش پر تشریف رکھتے تھے۔ حضرت سعید بن جبیر نے اپنی روایت میں یوں بیان کیا کہ وہ اپنے کپڑے سے تمام جسم لپیٹے ہوئے تھے۔ کپڑے کا ایک کنارہ ان کے پاؤں کے نیچے تھا اور دوسرا سر کے تلے تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وہاں پہنچ کر سلام کیا تو حضرت خضر علیہ السلام نے اپنے چہرے سے کپڑا اٹھایا اور فرمایا: میری اس سرزمین میں سلام کا رواج کہاں سے آ گیا؟ آپ کون ہیں؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: میں موسیٰ ہوں۔ انھوں نے پوچھا: بنی اسرائیل کے موسیٰ؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ انھوں نے پوچھا: آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟

موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: میرے آنے کا مقصد یہ ہے کہ جو ہدایت کا علم اللہ تعالیٰ نے آپ کو دیا ہے وہ مجھے بھی سکھا دیں۔ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا: کیا آپ کو یہ کافی نہیں کہ تورات آپ کے پاس ہے اور آپ کے پاس وحی آتی ہے؟ اے موسیٰ! میرے پاس علم ہے، آپ کے لیے اس کو پورا جاننا مناسب نہیں اور آپ کے پاس علم ہے، میرے لیے مناسب نہیں کہ وہ سارا سیکھوں۔ اس دوران میں ایک چڑیا نے اپنی چونچ سے دریا کا پانی لیا تو حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا: اللہ کی قسم! میرا اور آپ کا علم اللہ کے علم کے مقابلے میں اس سے زیادہ نہیں جتنا اس چڑیا نے دریا کا پانی اپنی چونچ میں لیا ہے۔ بہرحال کشتی پر چڑھتے وقت انھوں نے چھوٹی چھوٹی کشتیاں دیکھیں جو ایک کنارے والوں کو دوسرے کنارے پر لے جا کر چھوڑ آتی تھیں۔ ملاحوں نے حضرت خضر علیہ السلام کو پہچان لیا اور کہا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے ہیں۔ ہم نے سعید بن جبیر سے کہا: انھوں نے حضرت خصر علیہ السلام کو پہچانا تھا؟ انھوں نے کہا: ہاں، کشتی والوں نے کہا: ہم ان سے کرایہ نہیں لیں گے، لیکن حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی کا تختہ توڑ دیا اور اس کی جگہ میخیں گاڑ دیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: آپ نے کشتی کا تختہ اس لیے نکالا ہے، تاکہ کشتی میں سوار لوگوں کو غرق کر دیں۔ بلاشبہ آپ نے بڑا ناگوار کام کیا ہے۔'' مجاہد نے کہا: ''اِمْرًا'' کے معنی ہیں: ''مُنْكَرًا'' یہ سن کر حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا: میں نے پہلے ہی نہ کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکیں گے۔'' موسیٰ کا پہلا سوال بھولنے کی وجہ سے تھا لیکن دوسرا بطور شرط اور تیسرا قصداً بطور اعتراض تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ''جو میں بھول گیا ہوں اس کے بارے میں مجھ سے مواخذہ نہ کریں اور میرے معاملے میں مجھے تنگی میں نہ ڈالیں۔ پھر انھیں ایک بچہ ملا تو (حضرت خضر علیہ السلام نے) اسے قتل کر دیا۔''

حضرت سعید بن جبیر نے اس کی تفصیل بیان کی کہ حضرت خضر علیہ السلام کو چند بچے ملے جو کھیل رہے تھے۔ انھوں نے ان بچوں میں سے ایک بچے کو پکڑا جو کافر اور چالاک تھا اور اسے لٹا کر چھری سے ذبح کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ''آپ نے بلا وجہ ایک بے گناہ بچے کو قتل کر دیا۔'' حالانکہ اس نے کوئی برا کام نہیں کیا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس مقام پر لفظ ''زَكِيَّةً'' کو ''زَاكِيَة'' پڑھا کرتے تھے۔ اس کے معنی مسلمان کے ہیں، جیسا کہ ''غُلَامًا زَكِيًّا'' کو نفس زکیہ کہا جاتا ہے۔ پھر وہ دونوں بزرگ آگے بڑھے تو ایک دیوار پر نظر پڑی ''جو بس گرنے ہی والی تھی۔ خضر (علیہ السلام) نے اسے درست کر دیا۔'' حضرت سعید بن جبیر نے اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا ''اس طرح'' یعنی حضرت خضر علیہ السلام نے دیوار پر ہاتھ پھیر کر اسے ٹھیک کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ''اگر آپ چاہتے تو اس پر اجرت لے سکتے تھے۔'' سعید بن جبیر نے اس کی تشریح کی کہ اجرت جسے ہم کھا سکتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ''وَكَانَ وَرَاءَ هُم مَّلِكٌ'' کو ''وَكَانَ أَمَامَهُم...'' پڑھا ہے، یعنی ان کے آگے ایک بادشاہ تھا۔ سعید بن جبیر کے علاوہ دوسروں کی روایت میں اس بادشاہ کا نام ہدد بن بدد ہے اور جس بچے کو حضرت خضر علیہ السلام نے قتل کیا تھا، اس کا نام لوگ 'حَيْسُور' بیان کرتے ہیں۔ ''وہ بادشاہ ہر (نئی) کشتی کو زبردستی چھین لیا کرتا تھا'' اس لیے میں نے چاہا کہ جب یہ

کشتی اس کے سامنے سے گزرے تو اس کے اس عیب کی وجہ سے اسے نہ چھینے۔ پھر جب کشتی والے اس بادشاہ کی سلطنت سے گزر جائیں گے تو وہ خود اسے ٹھیک کر لیں گے اور اسے کام میں لاتے رہیں۔ بعض نے کہا: انھوں نے کشتی کو پھر سیسہ پگھلا کر جوڑ لیا تھا اور کچھ کہتے ہیں کہ تارکول سے سوراخ بند کر لیا تھا۔ (اور جس بچے کو قتل کر دیا تھا تو) ''اس کے والدین مومن تھے'' جبکہ بچہ کافر تھا، اس لیے ہمیں ڈر تھا کہ کہیں وہ انھیں بھی کفر میں مبتلا نہ کر دے، اس طرح کہ وہ لڑکے کی محبت میں گرفتار ہو کر اس کے دین کی پیروی کر لیں گے'' اس لیے ہم نے یہ ارادہ کیا کہ ان کا رب اس سے بہتر بچہ ان کو عنایت کر دے جو پاکباز (اور صلہ رحمی کرنے والا ہو)۔ (یہ جواب ہے اس کا کہ) ''تو نے ایک بے قصور جان کو قتل کر دیا۔ ''وَأَقْرَبَ رُحْمًا'' کے معنی ہیں کہ اس کے والدین اس بچے پر جواب اللہ انھیں دے گا، پہلے بچے سے زیادہ مہربان ہوں گے جسے حضرت خضر علیہ السلام نے قتل کر دیا تھا۔'' حضرت سعید بن جبیر نے کہا کہ اس کے والدین کو اس بچے کے بدلے ایک لڑکی دی گئی تھی۔ داود بن عاصم، کئی ایک راویوں سے نقل کرتے ہیں کہ وہ لڑکی ہی تھی۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو خطبہ دیا اور کہا کہ اللہ کو اور اس کے امر کو مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا، اس پر اُن کو حکم ہوا کہ اس شخص سے ملاقات کریں۔ پھر کچھ کمی و بیشی کے ساتھ اوپر دی گئی روایت کے مثل بیان کیا۔ والله أعلم.[2] (رواه عبد الرزاق) سعید بن جبیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس بیٹھا تھا، اُن کے پاس اہلِ کتاب میں سے کچھ لوگ تھے۔ بعض نے کہا: اے ابا العباس! نوف جو زنِ کعب کا بیٹا ہے، اس کا یہ اعتقاد ہے کہ کعب نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نبی جو طلبِ علم میں نکلے تھے، موسیٰ بن میشا تھے۔ سعید نے کہا سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بولے کہ اے سعید! کیا نوف یوں کہتا ہے؟ میں نے کہا: ہاں، میں نے نوف کو سنا، وہ یوں ہی کہتا ہے۔ کہا: کیا تو نے سنا؟ سعید نے کہا: ہاں۔ کہا: نوف نے جھوٹ کہا، مجھ سے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث بیان کی ہے کہ موسیٰ بنی اسرائیل علیہ السلام نے اپنے رب سے سوال کیا کہ اے رب! اگر تیرے بندوں میں کوئی مجھ سے زیادہ عالم ہو تو مجھے اس کے بارے میں بتا۔ فرمایا: ہاں میرے بندوں میں سے ایک ایسا شخص ہے جو تجھ سے زیادہ عالم ہے، پھر اس کی جگہ بتلائی اور اس سے ملاقات کا اذن دیا۔ موسیٰ علیہ السلام نکلے، ان کے ہمراہ ان کا جوانِ تھا اور جوان کے ساتھ ایک نمکین مچھلی تھی۔ ان سے کہا گیا تھا کہ جب یہ مچھلی کسی جگہ جی اُٹھے تو اسی جگہ وہ شخص ہوگا اور تو اپنی حاجت پا لے گا۔ موسیٰ علیہ السلام جوان کے ہمراہ نکلے اور دونوں نے مچھلی لے لی تھی، اتنا چلے کہ تھک گئے، صخرے تک پہنچے اور اس پانی کے پاس آئے، وہ آبِ حیات تھا، جو کوئی اس کو پیتا وہ ہمیشہ رہتا اور کوئی مردہ شے اس کے نزدیک نہ ہوتی، لیکن وہ زندہ ہو جاتی۔ جب وہ دونوں اُترے اور مچھلی کو پانی لگا تو وہ جی اُٹھی اور دریا میں اس نے ایک راستہ سرنگ کی طرح کا پکڑا۔ یہ دونوں آگے چلے، جب اس جگہ سے آگے نکل گئے تو

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٤٩) [2] تفسير الصنعاني (٢/ ٤٠٥)

موسیٰ علیہ السلام نے اپنے جوان سے کہا: ہمارا کھانا لاؤ، ہم نے اس سفر سے تکلیف پائی۔ جوان نے کہا کہ آپ کو یاد ہوگا کہ جب ہم صخرے کے پاس ٹھہرے تھے، تب میں مچھلی کا ذکر کرنا بھول گیا، مجھے شیطان نے اس کا ذکر کرنا بھلا دیا اور وہ عجیب طرح پر دریا میں راستہ نکال کر چل دی۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام صخرے پر ظاہر ہوئے اور یہ دونوں اس تک پہنچے، وہاں ایک آدمی کمبل میں لپٹا ہوا ملا۔ موسیٰ علیہ السلام نے سوال کیا، اس نے جواب دیا، پھر کہا: تو کس لیے آیا؟ تجھ کو تیری قوم میں شغل تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: میں اس لیے آیا ہوں کہ آپ مجھے کچھ رُشد کی تعلیم دیں جو آپ کو معلوم ہے۔ کہا: تو میرے ساتھ صبر نہ کر سکے گا اور وہ ایک شخص تھے جن کو چھپی ہوئی باتیں معلوم کرائی جاتی تھیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ہاں۔ کہا: جس بات کی تجھ کو خبر نہیں ہے تو اس پر کیسے صبر کرے گا، یعنی تو اس عدلِ ظاہر کا عالم ہے، علم غیب جو میں جانتا ہوں تو اس کا محیط نہیں ہے۔ کہا: ان شاء اللہ تو مجھ کو صابر پائے گا اور میں کسی معاملے میں تیری نافرمانی نہ کروں گا، اگرچہ میں کوئی بات اپنے خلاف ہی پاؤں۔ کہا: اچھا! اگر میرے ساتھ آتے ہو تو مجھ سے کسی شے کا سوال نہ کرنا، اگرچہ وہ تجھ کو برا معلوم ہو، جب تک کہ میں خود ہی تجھ سے اس کا ذکر نہ کروں۔

پھر دونوں دریا کے کنارے چلنے لگے، لوگوں کے پاس آ کر سوار کر لینے کا سوال کرتے، یہاں تک کہ ایک کشتی جدید اور مضبوط اُن کے سامنے سے گزری کہ اس سے بہتر کوئی کشتی اُن کے سامنے نہ نکلی تھی اور نہ اس سے خوبصورت اور مضبوط کوئی اور کشتی گزری تھی۔ ان دونوں نے کہا: ہم کو سوار کرا لو۔ کشتی والوں نے ان کو کشتی پر سوار کر لیا۔ جب یہ دونوں اس میں آرام سے بیٹھ گئے اور کشتی اُن کو دوسرے سواروں کے ساتھ لے کر چلی تو خضر علیہ السلام نے ایک آری اور ایک ہتھوڑا اپنے پاس سے نکالا، پھر ناؤ کے ایک تختے کو آری سے پھاڑا، پھر ایک تختہ لے کر اس پر لگایا، پھر اس پر بیٹھے اس کو اُٹھانے لگے۔ موسیٰ علیہ السلام نے یہ ہولناک معاملہ دیکھ کر کہا: تو نے اس کو پھاڑ ڈالا، تاکہ کشتی والے ڈوب جائیں، تو نے یہ ایک برا کام کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے تجھ سے نہ کہا تھا کہ تو میرے ساتھ نہ رہ سکے گا۔ کہا: میری بھول کو مت پکڑ، یعنی عہد توڑنے پر اور مجھ کو میرے کام میں مشکل میں نہ ڈال۔

پھر دونوں کشتی سے نکل کر چلے۔ ایک گاؤں والوں کے پاس آئے، وہاں کچھ لڑکے کھیل رہے تھے، اُن میں ایک لڑکا تھا کہ ویسا خوش طبع اور لڑکا نہ تھا اور نہ ہی اس سے زیادہ باثروت اور خوبصورت کوئی اور لڑکا تھا۔ خضر علیہ السلام نے اپنے ہاتھ سے اس کو پکڑا اور ایک پتھر لے کر اس کا سر کچلا اور اس کو مار ڈالا۔ موسیٰ علیہ السلام نے یہ بہت ہی قبیح کام دیکھا، وہ صبر نہ کر سکے کہ ایک بے گناہ کم سن بچے کو مار ڈالا۔ کہا: تو نے ایک پاکیزہ جان کو، یعنی چھوٹے بچے کو، بغیر نفس (بدلے کے طور کے علاوہ) مار ڈالا، تو نے یہ برا کام کیا۔ کہا: میں نے تجھ سے نہ کہا تھا کہ تو میرے ساتھ نہ ٹھہر سکے گا۔ کہا: اگر اس کے بعد پھر میں تجھ سے کچھ پوچھوں اور کہوں تو پھر تم میرے ساتھ نہ رہنا۔ میں نے اپنا عذر تجھ سے بیان

کر دیا۔ پھر دونوں چلے ایک گاؤں والوں کے پاس آئے، ان سے کھانا مانگا، انھوں نے ان کی مہمانی کرنے سے انکار کیا۔ وہاں ایک دیوار کو دیکھا، وہ گرنے کو دیکھی، اس کو گرا کر بیٹھ کر بنانے لگے۔ موسیٰ علیہ السلام تنگ دل ہوئے کہ یہ کیا تکلیف کا کام کرتے ہیں، جس پر صبر نہیں ہو سکتا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اگر آپ چاہتے تو اس کام کی مزدوری لیتے، یعنی ہم نے تو اُن سے کھانا مانگا تھا، انھوں نے نہ کھلایا، مہمانی چاہی وہ بھی نہ کی، پھر آپ بیٹھ کر مفت میں ان کا کام کرنے لگے، اگر چاہتے تو اس کام کی مزدوری لیتے۔ خضر علیہ السلام نے کہا کہ یہ میرے اور تیرے درمیان جدائی ہے۔ میں تجھ کو بتا دیتا ہوں کہ جن چیزوں میں تجھ سے صبر نہ ہو سکا، ان کی حقیقت کیا تھی۔ وہ کشتی مسکینوں کی تھی جو دریا میں ملاحی کرتے تھے۔ میں نے چاہا کہ اس کشتی کو عیب دار کر دوں، کیوں کہ ان کے آگے ایک بادشاہ ہے جو ہر کشتی کو غاصبانہ طریقے سے پکڑ لیتا ہے۔

سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قراءت "كل سفينة صالحة" [ہر اچھی اور عمدہ کشتی] ہے۔ میں نے اس میں عیب لگایا، تاکہ وہ بادشاہ اس کشتی کو نہ پکڑے اور عیب دیکھ کر یہ ناؤ بچ جائے اور اس لڑکے کے ماں باپ ایماندار تھے ہم ڈرے کہ ان کا یہ لڑکا زبردستی اور کفر کر کے کہیں انھیں عاجز نہ کر دے، اس لیے ہم نے چاہا کہ ان کا رب ان کو اس سے بہتر پاکیزہ اور محبت کرنے والا بیٹا اس کے بدلے میں دے دے اور یہ دیوار شہر میں دو یتیم لڑکوں کی تھی، اس دیوار کے نیچے ان کا مال دفن تھا اور ان دونوں کا باپ نیک مرد تھا۔ تیرے رب نے چاہا کہ یہ اپنی طاقت اور جوانی کو پہنچیں اور اپنے رب کی مہربانی سے اپنا خزانہ نکالیں۔ میں نے یہ سب کام کچھ اپنے حکم سے نہیں کیے۔ یہ ہے ان چیزوں کی حقیقت جن پر تو ٹھہر نہ سکا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ وہ خزانہ علم ہی تھا۔

عوفی نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام اور اُن کی قوم مصر پر غالب ہوئی تو انھوں نے اپنی قوم کو مصر میں اتارا۔ جب وہ وہاں پر قیام پذیر ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے وحی نازل کی کہ اے موسیٰ! تو ان کو اللہ کے ایام کی یاد دہی کرا۔ موسیٰ علیہ السلام نے خطبہ پڑھا اور جو خیر و نعمت اللہ نے اُن کی قوم کو دی تھی وہ یاد دلائی اور آلِ فرعون سے نجات دلانے کا ذکر کیا اور اُن کے دشمن کو ہلاک کرنے اور اُن کو زمین میں خلیفہ کرنے کا ذکر کیا اور کہا: اللہ تعالیٰ نے تمھارے نبی سے بات چیت کی اور مجھ کو اپنے لیے چن لیا اور مجھ پر اپنی محبت نازل کی اور جو کچھ تم نے مانگا وہ تم کو عطا کیا، سو تمھارا نبی افضل اہلِ ارض ہے اور تم تورات پڑھتے ہو۔ غرض یہ کہ ایسی کوئی نعمت نہ تھی جو اللہ تعالیٰ نے ان پر نہ کی تھی، مگر موسیٰ علیہ السلام نے وہ نعمت اپنی قوم کو یاد دلائی اور پہنچوائی۔ بنی اسرائیل کے ایک مرد نے کہا کہ یہ لوگ اسی طرح ہیں اے اللہ کے نبی!، ہم نے پہچانا جو کچھ آپ نے کہا۔ بھلا روئے زمین پر آپ سے بھی زیادہ کوئی عالم ہے اے اللہ کے پیغمبر!؟ کہا: نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام کے پاس بھیجا اور کہا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تو کیا جانتا ہے کہ میں اپنا علم کہاں رکھتا ہوں؟ ہاں بحر کے کنارے پر ایک آدمی ہے، وہ تجھ سے زیادہ عالم ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ خضر علیہ السلام تھے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے سوال کیا کہ مجھے اس شخص سے ملا

دے، میں اس کو دیکھوں۔ اللہ نے وحی کی کہ تو دریا پر جا، وہاں دریا کے کنارے پر تو ایک مچھلی پائے گا، اس کو پکڑ کر اپنے جوان کے حوالے کر، پھر دریا کے کنارے کو پکڑے رہ، جب تو مچھلی کو بھول جائے اور وہ تیرے پاس سے چلی جائے وہیں تو اس عبدِ صالح کو، جس کی تجھے طلب ہے، پائے گا۔ جب سفر موسیٰ علیہ السلام کا لمبا ہوگیا اور وہ تھک گئے، جوان سے مچھلی مانگی۔ جوان نے، جو اُن کا ایک غلام تھا، کہا کہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب ہم صخرے کے پاس ٹھہرے تھے، تب میں مچھلی کو بھول گیا، مجھ کو اس کا ذکر کرنا شیطان نے بھلا دیا۔ پھر جوان نے کہا کہ میں نے مچھلی کو دیکھا کہ اس نے دریا میں ایک سرنگ کی طرح راستہ پکڑا۔ موسیٰ علیہ السلام نے تعجب کیا اور واپس پھر کر صخرے کے پاس آئے، وہاں مچھلی پائی، وہ دریا میں چلتی پھرتی تھی اور موسیٰ علیہ السلام اس کے پیچھے لگے اور اپنی لاٹھی سے پانی ہٹاتے تھے، تاکہ مچھلی کے پیچھے جائیں۔ وہ مچھلی جس پانی پر چلتی اس جگہ کا دریا سوکھتا جاتا تھا، یہاں تک کہ پتھر بنتا جاتا۔ اللہ کے نبی تعجب کرتے تھے، یہاں تک کہ وہ مچھلی ان کو جزائرِ بحر میں سے ایک جزیرے میں لے گئی۔ وہاں خضر علیہ السلام سے ملاقات ہوئی، انھوں نے اس پر سلام کیا۔

خضر علیہ السلام نے کہا: "وعليك السلام" اور اس زمین میں سلام کہاں ہے اور تو کون ہے؟ کہا: میں موسیٰ ہوں۔ خضر علیہ السلام نے کہا: صاحبِ بنی اسرائیل؟ پھر کہا: مرحبا اور پوچھا: کیسے آئے؟ کہا کہ میں آپ کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ جو علم آپ کے پاس ہے اس میں سے کچھ رُشد مجھ کو بھی سکھا دیں، کہا: تو میرے ساتھ صبر نہ کر سکے گا۔ کہا کہ اگر اللہ نے چاہا تو آپ مجھ کو صابر پائیں گے، میں آپ کی کسی بات میں نافرمانی نہ کروں گا۔ خضر علیہ السلام ان کو اپنے ہمراہ لے کر چلے اور کہہ دیا کہ میں جو کچھ کروں تو مجھ سے اس کا سوال نہ کرنا، جب تک کہ میں خود ہی اس کا حال تجھ سے بیان نہ کروں۔

عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ بن مسعود کہتے ہیں کہ سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حر بن قیس بن حصن فزاری میں موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی کے بارے میں جھگڑا ہوا۔ سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ وہ خضر علیہ السلام تھے۔ اتنے میں سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا گزر ان دونوں پر ہوا۔ سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ان کو بلایا اور کہا: میں نے اپنے اس یار سے جھگڑا کیا ہے، صاحبِ موسیٰ کے بارے میں، جنھوں نے ملاقات کا سوال کیا تھا۔ تم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا کچھ حال سنا ہے؟ کہا: میں نے سنا ہے، فرماتے تھے کہ موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے سرداروں کے درمیان تھے کہ اتنے میں ایک مرد آیا، اس نے کہا کہ تم کسی ایسے شخص کو جانتے ہو جو تم سے زیادہ عالم ہو؟ کہا: نہیں۔ تب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو وحی کی کہ ہمارا ایک بندہ خضر ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے سوال کیا کہ اس کی ملاقات کا کیا طریقہ ہے؟ اللہ تعالیٰ نے مچھلی کو نشان ٹھہرایا اور کہا کہ جب تو مچھلی کو گم کر دے تو واپس پھر، تو اس کو ملے گا۔

موسیٰ علیہ السلام مچھلی کے نشان پر دریا میں چلے۔ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی جوان نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب ہم نے صخرے کے پاس جگہ پکڑی تھی تو میں مچھلی کو بھول گیا تھا، موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اسی کو تو ہم تلاش کرتے

تھے۔ پھر وہ دونوں اپنے قدموں کے نشان پر واپس لوٹے اور ہمارے بندے خضر علیہ السلام کو پایا، ان کا قصہ وہی ہے، جو اللہ نے اپنی کتاب میں بیان کیا۔ یہ روایات حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اسی جگہ آیتِ باب کے تحت لکھی ہیں۔[1] اگر ان کا ذکر قصہ خضر کی آیت کے آخر میں ہوتا تو مقام کے لحاظ سے زیادہ مناسب ہوتا، کیوں کہ ان روایات میں وہ مطلب بھی مذکور ہوا جس کا تعلق آیتِ باب سے بعد والی آیت سے ہے، لیکن ہر مفسر کی نظر اور مصلحت جدا جدا ہوتی ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اس قصے کو اس سورت میں بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جب یہود نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اصحابِ کہف کا قصہ پوچھا اور کہا کہ اگر وہ اس قصے کی خبر تم کو دے تو جانو کہ نبی ہے اور اگر نہ دے تو نہیں ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کا قصہ بھی بطورِ تنبیہ اس لیے ذکر کیا کہ کچھ ضروری نہیں کہ نبی کو سارے قصوں اور خبروں کا علم ہو۔ اہلِ علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ موسیٰ صاحبِ خضر وہی موسیٰ علیہ السلام بن عمران لاوی بن یعقوب کی اولاد میں سے ہیں۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہی زیادہ صحیح ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی اسی کے قائل ہیں۔[2] جمہور علما بھی اسی پر ہیں۔ اہلِ تاریخ کا بھی یہی قول ہے۔ قرآن میں ان کے سوا کسی اور موسیٰ کا ذکر نہیں آیا ہے۔ ایک فرقے نے، جن میں نوف بکالی ہے، یہ کہا ہے کہ یہ موسیٰ بن عمران نہیں تھے، بلکہ موسیٰ بن میشیٰ بن یوسف بن یعقوب علیہ السلام تھے اور یہ موسیٰ بن عمران سے پہلے نبی تھے۔ یہ قول باطل ہے۔

سلفِ صحابہ اور اُن کے بعد والوں نے اس کا رد کیا ہے، چناں چہ مذکورہ تردید عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے صحیح بخاری وغیرہ میں مروی ہے۔[3] اگر کوئی اور شخص مراد ہوتا تو اس کی ایسی صفت کے ساتھ تعریف واجب ہوتی، جس سے ہر دو موسیٰ میں فرق کیا جا سکے اور شبہہ دور ہو۔ لیکن جب کسی صفت کے ساتھ اس قسم کی تمیز نہ کی گئی تو معلوم ہوا کہ یہ موسیٰ بن عمران تھے اور جوان سے مراد یوشع بن نون بن افرائیم بن یوسف ہیں اور بعض نے کہا: یوشع کے بھائی اور بعض نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام کا غلام۔ حدیث صحیح کی دلیل سے: «لَا یَقُلْ أَحَدُکُمْ عَبْدِيْ وَ أَمَتِيْ، وَلْیَقُلْ: فَتَايَ وَفَتَاتِيْ »[4] [تم میں سے کوئی شخص (اپنے غلام یا کنیز کو) میرا بندہ اور میری بندی نہ کہے، بلکہ یوں کہے: میرا جوان (خادم)، میری خادمہ]

لیکن پہلی بات زیادہ مناسب اور صحیح ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس جوان کو موسیٰ علیہ السلام کے بعد پیغمبر کر دیا تھا۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا کہ اس پر اجماع ہے کہ وہ یوشع بن نون تھے۔ ان کا ذکر سورت مائدہ اور سورت یوسف کے آخر میں گزر چکا ہے اور جس نے کہا کہ وہ موسیٰ بن میشیٰ تھے۔ اس نے کہا کہ یہ جوان یوشع بن نون نہ تھے۔ امام فراء رحمہ اللہ

---

[1] تفسیر الطبري (١٨/ ٦٦۔ ٧٠) تفسیر ابن کثیر (٣/ ١٢٥۔ ١٣٠)   [2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٢٢)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٢٢)   [4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢٤١٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٢٤٩)

نے کہا کہ اس شخص کا نام فتی موسیٰ لیا، اس لیے کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ رہتا تھا اور اُن سے علم اَخذ کرتا تھا اور اُن کی خدمت بجالاتا تھا[1] اور موسیٰ علیہ السلام کا بھانجا تھا۔ غرض یہ کہ موسیٰ علیہ السلام نے اس جوان سے کہا کہ میں نہ ہلوں گا، یہاں تک کہ مجمع البحرین پر پہنچوں، یعنی جس جگہ دو دریا باہم ملتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بحرین سے مراد بحرِ فارس و روم ہے اور یہ دونوں مشرق اور مغرب کی طرف ہیں۔[2] (قاله قتادة)

بعض نے کہا کہ بحرِ اُردن و بحرِ قلزم ہے۔ محمد بن کعب نے کہا کہ طنجہ میں ہے[1] اور بعض نے کہا کہ افریقہ میں اور بعض نے کہا کہ دونوں دریاؤں کا ملنا بحرِ محیط کے نزدیک ہے اور یہ قول: کہ بحرین سے مراد موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام ہیں، سخت ضعیف ہے اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت نہیں ہے۔ حقب سے مراد زمانِ طویل ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے اس سیر کے عزم کا سبب یہ تھا کہ اُن سے پوچھا گیا تھا کہ لوگوں میں سب سے زیادہ علم والا کون ہے؟ کہا: میں ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے وحی کی کہ میرا ایک بندہ مجمع البحرین میں ہے، وہ تجھ سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ جب موسیٰ علیہ السلام اور اُن کا جوان مجمع بحرین پر پہنچے تو مچھلی کو بھول گئے۔ مفسرین نے کہا کہ وہ مچھلی نمکین دریدہ دہن زنبیل کے اندر تھی، جب بھوک لگتی تو اسی میں سے کھاتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مچھلی کو مطلوبہ جگہ پانے کے لیے ایک نشانی مقرر کیا تھا۔ معنی یہ ہوئے کہ ان دونوں نے مچھلی کی کچھ خبر نہ رکھی، یہ بھول اس جوان سے ہوئی تھی، اس لیے کہ مچھلی کی خبر گیری اسی کے سپرد تھی۔ موسیٰ علیہ السلام نے جوان سے کہہ دیا تھا کہ جب وہ گم ہو جائے تو خبر کر دینا۔ لیکن بھول کی نسبت دونوں کی طرف کی، اس لیے کہ دونوں نے اس مچھلی کو زادِ سفر کیا تھا۔ جب اس مچھلی کو دریا کے کنارے پر رکھا، اس نے تھیلے میں سے نکل کر دریا میں راستہ پکڑا۔

"سَرَب" کہتے ہیں اس سوراخ کو جو حیوانات اپنے رہنے کے لیے زمین میں کر لیتے ہیں۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا کہ جب وہ مچھلی دریا میں جا گری، وہ جگہ، جدھر سے وہ گئی تھی، خشک ہو کر رہ گئی، جیسے: سرب۔[4] جب آگے بڑھ کر موسیٰ علیہ السلام نے کھانا مانگا اور کہا کہ ہم اس سفر میں تھک گئے، تب جوان نے اپنی بھول کے بارے میں بتایا اور کہا صخرے کے پاس وہ اُچھل کر پانی میں چلی گئی اور شیطان نے مجھ کو بھلا دیا کہ میں اس کا ذکر آپ سے کرتا، اس کا پانی میں جانا ایک عجیب بات تھی، کیوں کہ ایک ٹکڑا اس مچھلی کا کھا چکے تھے اور وہ مردہ تھی، زندہ ہو کر چلی گئی اور اس جگہ پانی بہنا بند ہو گیا تھا۔

ابو شجاع سے تفسیر طبری میں ہے کہ وہ مچھلی میرے پاس لائی گئی۔ آدھا جسم اور ایک آنکھ تھی اور دوسرے حصے میں کچھ نہ تھا۔[5] ایک چھلکا تھا پتلا سا، اس کے نیچے کانٹے تھے، گوشت نہ تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ ہمیں اسی جگہ کی تو تلاش تھی، وہ شخص اسی جگہ پر تھا۔ پھر وہ اسی راہ پر پھرے اپنے پاؤں کے نشان پر، وہاں پر اس بندے کو پایا۔ جمہور مفسرین رحمہم اللہ کے قول کے مطابق وہ بندہ خضر علیہ السلام تھے، احادیثِ صحیحہ اسی پر دلیل ہیں۔ جس نے یہ کہا کہ وہ بندہ کوئی اور

---

[1] فتح القدير (٣/ ٤١٠) [2] تفسير الطبري (١٨/ ٥٥) [3] تفسير الطبري (١٨/ ٥٦)
[4] معاني القرآن للفراء (٣/ ١٠٥) [5] تفسير الطبري (١٨/ ٥٩)

عالم تھا، خضر علیہ السلام نہیں تھے، اس کا قول کسی شمار میں نہیں ہے۔ کسی نے کہا کہ ایک فرشتہ تھا، من جملہ ملائکہ کے اس کا نام خضر تھا، وہ جس جگہ نماز پڑھتا، وہ جگہ سرسبز ہو جاتی۔[1] (قاله مجاهد) کسی نے کہا کہ اس کا نام بلیا بن ملکان تھا۔ وہ نوح علیہ السلام کی نسل سے تھا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ خضر علیہ السلام بن آدم علیہ السلام ہیں۔ صلبِ آدم سے اُن کی اجل میں تاخیر کی گئی ہے، یہاں تک کہ دجال کی تکذیب کریں،[2] مگر اس میں نظر ہے۔ کسی نے کہا کہ بنی اسرائیل میں سے تھے۔ کسی نے کہا کہ ابنائے ملوک میں سے تھے، ترکِ دنیا کر کے زہد اختیار کیا تھا۔ بخاری میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ ان کا نام خضر اس لیے ہوا کہ وہ ایک خشک گھاس پر بیٹھے تھے، وہ ان کے نیچے سرسبز ہو کر جنبش کرنے لگی،[3] یہ ان کا لقب ہے اور کنیت ابو العباس ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ہم نے اس کو اپنے پاس سے رحمت دی، یعنی نبوت و ہدایت، یا نعمتِ ولایت۔ اکثر اسی پر ہیں۔

جمہور علما کہتے ہیں کہ خضر علیہ السلام قیامت تک زندہ ہیں، اس لیے کہ انھوں نے آبِ حیات پیا ہے اور سب سے زیادہ صحیح مذہبِ اہلِ حدیث یہ ہے کہ وہ زندہ نہیں ہیں۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے کتاب "الرد علی المنطقیین" میں کہا ہے کہ بعض ملحد متصوفین کا یہ اعتقاد ہے کہ ارسطو خضر موسیٰ علیہ السلام تھا۔ ان کا یہ قول صاف جھوٹ ہے، صحیح قول کے مطابق خضر علیہ السلام ایک زمانۂ دراز پہلے وفات پا چکے ہیں اور جو لوگ کہتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں، جیسے: بعض عبادت گزار اور بعض عام لوگ اور بہت سے یہود و نصاریٰ، وہ بلاشک غلطی میں پڑے ہوئے ہیں۔

ان کی غلطی کا سبب یہ ہے کہ وہ بعض منقطع اور الگ تھلگ مقامات میں بعض زاہدوں کو دیکھتے ہیں، وہ کہتا ہے کہ میں خضر ہوں، حالاں کہ وہ آدمی کی صورت میں ایک شیطان ہوتا ہے، ہم نے بہت سے واقعات میں اسی طرح معلوم کیا ہے۔ یہاں تک کہ اس مقام میں جہاں ہم نے یہ لکھا ہے، ربوۂ دمشق کے نزدیک ایک شخص نے دو پہاڑوں کے درمیان ایک مرد کی صورت دیکھی کہ اس نے دونوں پہاڑوں کے درمیان والی جگہ کو پُر کر لیا تھا اور اس کا قد پہاڑ کی چوٹی تک پہنچا تھا اور اس نے کہا کہ میں خضر ہوں اور میں اولیا کا نقیب ہوں اور دیکھنے والے سے کہا کہ تو ایک مرد صالح اور ولی اللہ ہے اور اپنا ہاتھ ایک فاس کی طرف، جس کو وہ مرد ایک جگہ بھول گیا تھا اور اس کو لینے کے لیے جا رہا تھا، بڑھایا اور اُٹھا کر اسے دے دیا۔ حالاں کہ اس جگہ کا فاصلہ ایک میل کا تھا۔ ایسی حکایتیں بہت ہیں۔ جس شخص نے کہا ہے کہ میں نے خضر علیہ السلام کو دیکھا ہے اور اگر وہ سچا ہے تو اس کے جی میں دیکھنے کا خیال بندھ گیا اور ایک فرضی نفس

---

[1] تفسیر البغوي (٥/ ١٨٨)

[2] تاریخ دمشق (١٦/ ٤٠٠) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ کا سماع سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت نہیں ہے۔

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٢٢١)

کو اس نے اصل میں گمان کر لیا، جس طرح کہ اکثر ریاضت کرنے والے لوگوں کو اس طرح کا واقعہ پیش آتا ہے، یا وہ کوئی جن ہوتا ہے کہ انسان کی صورت میں ظاہر ہو کر اس شخص کو گمراہ کرنا چاہتا ہے اور یہ اکثر ہوا کرتا ہے۔ ہم کو یہ حال بہت کثرت سے معلوم ہے، جس کو بیان کرنے میں طوالت ہے، یا کسی ایسے کو دیکھ کر گمان کیا کہ وہ خضر ہے اور گمان میں غلطی ہوئی، پھر اگر اس جنی یا اِنسی نے یہ کہا کہ میں خضر ہوں تو اس نے جھوٹ بولا۔

اس باب میں صدق ان تین قسموں سے خارج نہیں ہوتا۔ رہی احادیث تو وہ بہت ہیں، لہٰذا کسی صحابی سے منقول نہیں ہے کہ اس نے خضر علیہ السلام کو دیکھا ہو اور نہ خضر سے کسی کی ملاقات ہوئی، کیوں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم علم و ایمان میں اپنے غیر کی نسبت بڑے کامل وقوی تھے۔ شیطان ان کو دھوکا نہیں دے سکتا تھا جس طرح کہ اکثر بندوں کو اس نے دھوکا دیا ہے۔ اسی جگہ سے بہت سے کفار یہود و نصاریٰ ہیں، ان کے پاس کوئی ایسا شخص آتا ہے جس کو وہ خضر گمان کرتے ہیں اور اُن کی عبادت گاہوں میں حاضر ہوتا ہے اور گاہے ان سے اشیا کا ذکر کرتا ہے، حالاں کہ وہ کوئی شیطان ہوتا ہے جو ان کو گمراہ کرنے کے لیے آتا ہے۔

خضر علیہ السلام اگر زندہ ہوتے تو اُن پر واجب تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے اور ایمان لاتے اور آپ کے ہمراہ جہاد کرتے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے انبیا سے میثاق لیا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ﴾ [آل عمران: ۸۱]

''اور (یاد کرو) جب اللہ نے تمام نبیوں سے عہد لیا تھا کہ جب میں تمھیں کتاب اور حکمت عطا کروں، پھر تمھارے پاس کوئی رسول آئے جو اس (کتاب) کی تصدیق کرتا ہو جو تمھارے پاس ہے تو تمھیں اس پر ایمان لانا ہوگا اور اس کی مدد کرنی ہوگی۔'' خضر علیہ السلام نے ایک قوم عرض الناس (عوام الناس، عام لوگوں) کا سفینہ درست کر دیا تھا، وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب کے درمیان کسی طرح نہ ہوتے۔ اگر وہ نبی تھے تو ہمارے نبی ان سے افضل ہیں اور اگر نبی نہ تھے تو سیدنا ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما ان سے افضل ہیں۔ وهذه مبسوط في موضعه. انتهى [1]

اس سلسلے میں باقی کلام ان شاء اللہ تعالیٰ قصے کے آخر میں آئے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے خضر علیہ السلام کو اپنے پاس سے علمِ غیب سکھایا تھا، یہ اس علم کی بڑائی اور عظمت ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام جلیل القدر انبیا میں سے تھے، انھوں نے جو طلبِ علم کے لیے سفر کیا، یہ اس بات پر دلیل ہے کہ کسی شخص کو نہ چاہیے کہ طلبِ علم کو ترک کرے۔ اگرچہ وہ علم کی انتہا کو پہنچ گیا ہو اور جو شخص اس سے زیادہ عالم ہو اس کے سامنے خاکساری کرے۔ [2]

پھر اللہ تعالیٰ نے وہ قصہ بیان کیا جو موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے درمیان ہو گزرا۔ [3]

---

(1) الرد على المنطقيين (۱/ ۱۸۳۔ ۱۸۵) (2) معاني القرآن (۳/ ۳۰۱) (3) فتح البيان (۸/ ۷۴۔ ۸۱)

قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ
رُشْدًا ﴿٦٦﴾ قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿٦٧﴾ وَكَيْفَ
تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ﴿٦٨﴾ قَالَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ
شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا ﴿٦٩﴾ قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِيْ
فَلَا تَسْـَٔلْنِيْ عَنْ شَيْءٍ حَتّٰٓى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ﴿٧٠﴾

موسیٰ نے اس سے کہا: کیا اس (شرط) پر میں تیری اتباع کروں کہ تو مجھے اس میں سے سکھائے جو تجھے بھلائی سکھائی گئی ہے؟ 66 وہ بولا: بے شک تو میرے ساتھ ہرگز صبر نہ کر سکے گا 67 اور جو چیز تیرے احاطۂ علم ہی میں نہیں، تو اس پر صبر کیسے کرے گا؟ 68 اس (موسیٰ) نے کہا: یقیناً ان شاء اللہ تو مجھے صابر پائے گا اور میں کسی بھی حکم میں تیری نافرمانی نہیں کروں گا 69 اس (خضر) نے کہا: پھر اگر تو نے میری اتباع کرنی ہے تو کسی شے کی بابت مجھ سے سوال نہ کرنا، حتی کہ میں خود ہی اس کا ذکر تجھ سے شروع کروں 70

موسیٰ و خضر علیہما السلام کی ملاقات اور تعلیم و تعلم:

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی خضر علیہ السلام سے ہونے والی گفتگو کا ذکر کیا، یہ ایک عالم مرد تھے، اللہ نے ان کو ایک ایسے علم کے ساتھ خاص کیا تھا جس پر موسیٰ علیہ السلام کو اطلاع نہ تھی، جس طرح کہ موسیٰ علیہ السلام کو ایک علم دیا تھا جو خضر علیہ السلام کو نہیں دیا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے خضر علیہ السلام سے تعطف (مہربانی کرنے) کا سوال کیا، نہ کہ الزام و اختیار (لازمی اور جبری طور پر سکھانے کے لیے) کا سوال۔ ایک طالب علم کو عالم سے اسی طرح سوال کرنا زیب دیتا ہے۔

اتباع سے مراد صحبت و رفاقت ہے، رُشد کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے، یعنی علمِ نافع و عملِ صالح پر۔ خضر علیہ السلام نے کہا کہ تجھ کو میرے ساتھ رہنے پر صبر ہی کرنا ہوگا، کیوں کہ تو مجھ سے ایسے افعال دیکھے گا جو تیری شریعت کے خلاف ہوں گے، کیوں کہ اللہ کے علم میں سے مجھ کو ایک علم ہے جو اللہ نے تجھ کو نہیں سکھایا اور تجھ کو اللہ کے علم میں سے ایک علم ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھ کو نہیں سکھایا۔ ہم میں سے ہر ایک بعض اُمور کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے مکلّف ہے، جس کا دوسرے صاحب کو مکلّف نہیں کیا گیا اور تجھ کو میری صحبت پر قدرت نہ ہوگی اور جس بات کی تجھ کو سرے سے ہی خبر نہیں ہے، بھلا تو اس امر پر کس طرح صبر کرے گا؟!

میں جانتا ہوں کہ تو جلد مجھ پر انکار کرے گا اور تو اس انکار میں معذور ہوگا، لیکن تجھ کو اس معاملے کی حکمت اور باطنی مصلحت کا پتا نہیں ہے اور مجھے اس پر آگاہی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: میں جن اُمور کو تجھ سے دیکھوں گا، ان پر صابر رہوں گا اور کسی بات میں تیری مخالفت نہ کروں گا۔ تب خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے یہ شرط کی کہ اچھا! اگر تو میرے ساتھ رہے

تو پھر کسی شے کا سوال ابتداءً نہ کرنا، جب تک کہ خود میں ہی تجھ کو تیرے سوال کرنے سے پہلے اس بات پر خبر نہ دوں۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے سوال کیا کہ اے رب! تیرا کون سا بندہ تجھ کو زیادہ دوست ہے؟ فرمایا: « اَلَّذِيْ يَذْكُرُنِيْ وَلَا يَنْسَانِيْ » یعنی وہ شخص جو مجھ کو یاد کرتا ہے اور بھولتا نہیں۔ کہا: اے رب! تیرا کون سا بندہ زیادہ قاضی ہے؟ فرمایا: « اَلَّذِيْ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ وَلَا يَتَّبِعُ الْهَوٰى » یعنی وہ آدمی جو حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے اور خواہش نفس کا پیرو نہیں ہے۔ کہا: اے رب! کون سا بندہ تیرا بڑا عالم ہے؟ فرمایا: « اَلَّذِيْ يَبْتَغِيْ عِلْمَ النَّاسِ عَلٰى عِلْمِهٖ عَسٰى أَنْ يُّصِيْبَ كَلِمَةً تَهْدِيْهِ إِلَى هُدًى أَوْ تَرُدَّهٗ عَنِ الرَّدٰى » یعنی وہ شخص جو لوگوں کا علم اپنے علم میں مزید اضافہ کرنے کے لیے تلاش کرتا ہے، قریب ہے کہ کوئی ایسا کلمہ پائے جو اس کو ہدایت کرے، یا اس کو ہلاکت سے پھیر دے۔ کہا: اے رب! کیا تیری زمین میں کوئی شخص مجھ سے زیادہ علم رکھنے والا ہے؟ کہا: ہاں۔ کہا: وہ کون ہے؟ کہا: خضر ہے۔ کہا: میں اس کو کہاں تلاش کروں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: صخرے کے نزدیک ساحل پر، جس کے پاس مچھلی سٹک جائے (زندہ ہو کر چل پڑے)۔

موسیٰ علیہ السلام اس شخص کی تلاش میں نکلے، یہاں تک کہ وہ حال گزرا جو اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام صخرے تک پہنچے اور ہر ایک نے اپنے صاحب پر سلام کیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے خضر علیہ السلام سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ تیرے ساتھ رہوں۔ کہا کہ تو میرے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ کہا کہ رہ سکتا ہوں۔ کہا کہ اگر تو میرے ساتھ رہ سکتا ہے تو مجھ سے کسی چیز کے بارے میں نہ پوچھنا، جب تک کہ میں خود ہی اس کا ذکر تجھ سے نہ کروں، پھر ان کے ساتھ دریا میں چلے حتیٰ کہ مجمع بحور (جہاں دریا اکٹھے ہوتے ہیں) میں پہنچے۔ دریا میں کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں سے اس سے زیادہ پانی ہو۔

اللہ تعالیٰ نے ایک خطاف (ابابیل کی طرح کا ایک پرندہ) بھیجا۔ وہ اپنی چونچ سے پانی پینے لگا۔ خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا: تو دیکھتا ہے کہ اس خطاف نے کتنا پانی کم کیا ہے؟ کہا: بہت ہی کم پانی گھٹایا۔ کہا: اے موسیٰ! میرا علم اور تیرا علم اللہ کے علم کے سامنے اس پانی جتنا ہے، جو خطاف نے پیا، یعنی ایک قطرہ بحرِ اعظم کے مقابلے میں۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے جی میں کہا تھا کہ مجھ سے زیادہ علم والا کوئی نہیں ہے یا زبان سے کہا تھا، اسی وجہ سے ان کو حکم ہوا کہ وہ خضر علیہ السلام کے پاس جائیں،[1] پھر ساری حدیث کشتی کا تختہ اُکھیڑنے کی اور بچے کو قتل کرنے کی اور دیوار صحیح کرنے کی بیان کی۔ یہ ان کی اس آیت کے لیے تفسیر ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ خضر علیہ السلام سے موسیٰ علیہ السلام کے اس سوال میں ادب اور تواضع میں ملاطفت اور مبالغہ ہے، اس

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٦٣۔ ٦٤)

لیے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے آپ کو کم علم کہا اور اذن چاہا کہ ان کے تابع ہوں اور جو علم اللہ تعالیٰ نے ان کو سکھایا ہے، اس کو سیکھیں۔ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ طالب علم کے لیے واجب ہے کہ وہ عالم کا تابع ہو۔ اگرچہ ان کے مرتبے مختلف ہوں۔ لیکن اس میں کچھ اس بات پر دلیل نہیں ہے کہ خضر علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام سے افضل تھے، کیوں کہ کبھی ایک فاضل دوسرے فاضل سے لیتا ہے اور کبھی فاضل مفضول سے لیتا ہے، جبکہ ان میں سے ایک کے پاس خاص طور پر ایسا علم ہوتا ہے جو دوسرا نہیں جانتا۔ موسیٰ علیہ السلام کا علم بھی شریعتوں اور احکام اور قضایا کے بارے میں ظاہر تھا اور خضر علیہ السلام کا علم بعض غیب اور باطن چیزوں کی معرفت کے بارے میں تھا۔ اس جگہ بعض گمراہ لوگوں کے قدم لغزش کر گئے، کہنے لگے کہ ولی نبی سے افضل ہے، کیوں کہ موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ خضر علیہ السلام سے علم سیکھیں۔ موسیٰ علیہ السلام نبی تھے اور خضر علیہ السلام ولی۔ سو یہ قول کھلا کفر ہے۔

بہرحال جب ان کے ساتھ رہنا طے ہو گیا تو خضر علیہ السلام نے سوال نہ کرنے کی شرط لگائی، جیسے پہلے گزر چکا ہے۔ اس میں اس بات کا اظہار ہے کہ جو کچھ خضر علیہ السلام سے صادر ہوگا وہ حکمت اور بہت ہی بہترین بات ہوگی۔ یہ شاگرد اور تابعدار کا ایک عالم اور استاد کے ساتھ ادب کا طریقہ ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے خضر علیہ السلام کے ساتھ رہنے کے قصے میں بہت سی احادیث مروی ہیں، سب سے زیادہ پوری اور مکمل وہ حدیث ہے جو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، لیکن اس کے بعض الفاظ میں اختلاف ہے اور کل الفاظ سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے آئے ہیں اور بعض الفاظ صحیحین وغیرہما میں آئے ہیں اور بعض فقط بخاری میں اور بعض فقط مسلم میں اور بعض صحیحین سے خارج ہیں اور یہ حدیث ابن جریر اور ابن ابی حاتم کے نزدیک عوفی کے طریق سے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے آئی ہے۔

دوسرے طریق سے آنے والی وہی حدیث سب سے زیادہ مکمل ہے جو صحیحین میں سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے آئی ہے اور اوپر گزر چکی ہے اور دوسری روایات سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ باقی روایات جو سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما عن ابی بن کعب رضی اللہ عنہ روایت کی ہیں، وہ بھی معانی کے لحاظ سے اسی روایت کے موافق ہیں، اگرچہ الفاظ میں کچھ فرق ہے۔ اس لیے ان روایات کے ذکر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اسی طرح ان روایات کا ذکر کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں جو سعید بن جبیر رحمہ اللہ کے علاوہ اوروں نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہیں۔[1]

فَانْطَلَقَا ۫ حَتّٰۤى اِذَا رَكِبَا فِی السَّفِیْنَةِ خَرَقَهَا ؕ قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَیْـًٔا اِمْرًا ﴿۷۱﴾ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ

[1] یہ تمام روایات مع تخریج سورۃ الکہف آیت نمبر ۶۰ کے تحت گزر چکی ہیں۔ فتح البیان (۸/ ۸۱۔ ۸۵)

لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝٧٢ قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِي بِمَا نَسِيتُ
وَلَا تُرْهِقْنِي مِنْ أَمْرِي عُسْرًا ۝٧٣

پھر وہ دونوں چلے حتی کہ جب وہ کشتی میں سوار ہوئے تو اس (خضر) نے کشتی میں شگاف کر دیا، اس (موسیٰ) نے کہا: کیا تو نے اس میں شگاف کیا کہ اس کشتی والوں کو غرق کر دے؟ تو نے بڑا ہولناک (اور انوکھا) کام کیا ہے 71 اس (خضر) نے کہا: کیا میں نے کہا نہ تھا کہ تو یقیناً میرے ساتھ صبر کرنے کی استطاعت ہرگز نہیں رکھے گا 72 اس (موسیٰ) نے کہا: میری بھول چوک پر تو مجھے نہ پکڑ، اور میرے معاملے میں مجھے مشکل میں نہ ڈال 73

خضر علیہ السلام کے کشتی کو توڑنے کا واقعہ:

جب اس کشی پر چڑھنے لگے تو کشتی والوں نے خضر علیہ السلام کو پہچان کر مفت چڑھا لیا، اس احسان کے بدلے یہ نقصان اور تعجب لگا، لیکن کنارے کے قریب پہنچ کر توڑ دیے، لوگ نہ ڈوبے۔ توڑے اس طرح کہ ایک تختہ نکال ڈالا۔ موسیٰ علیہ السلام کا خضر علیہ السلام سے یہ پہلا پوچھنا بھول کر ہوا اور دوسرا اقرار کرنے کو اور تیسرا رخصت کرنے کو۔ ﴿شَيْئًا إِمْرًا﴾ سے مراد منکر ہے اور قتادہ نے کہا عجیب ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس سوال کا، جو بھول کر کیا تھا، عذر بیان کیا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام جب ساحل پر کشتی لینے کے لیے چلے تو اُن کے ساتھ یوشع بھی تھے، ان کا ذکر اس جگہ اس لیے نہیں کیا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے تابع تھے اور مقصود صرف موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کا ذکر کرنا ہے۔ قشیری نے کہا کہ اظہر یہ ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کی ملاقات خضر علیہ السلام سے ہوئی تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنے جوان کو واپس بھیج دیا۔[1] بعض نے کہا کہ خضر علیہ السلام نے کشتی کا ایک تختہ توڑ ڈالا اور بعض نے کہا کہ دو تختے اور بعض نے کہا کہ کشتی کی دیوار میں سوراخ کر دیا، تاکہ وہ کشتی عیب دار ہو جائے۔[2]

فَانْطَلَقَا حَتَّىٰ إِذَا لَقِيَا غُلَامًا فَقَتَلَهُ قَالَ أَقَتَلْتَ نَفْسًا
زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُكْرًا ۝٧٤ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكَ
إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝٧٥ قَالَ إِنْ سَأَلْتُكَ عَنْ
شَيْءٍ بَعْدَهَا فَلَا تُصَاحِبْنِي قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَدُنِّي عُذْرًا ۝٧٦

پھر وہ دونوں چلے، حتی کہ جب وہ دونوں ایک لڑکے سے ملے، تو اس (خضر) نے اسے قتل کر دیا، اس

---

1. تفسیر القرطبي (١١/ ٣٩)
2. فتح البیان (٨/ ٨٥)

(موسیٰ) نے کہا: کیا تو نے ایک پاک (بے گناہ) نفس کو کسی جان کے (قصاص کے) بغیر قتل کر دیا ہے؟ یقیناً تو نے تو بہت ہی برا کام کیا ہے! (74) اس (خضر) نے کہا: کیا میں نے تجھ سے نہیں کہا تھا کہ بلاشبہہ تو میرے ساتھ ہرگز صبر نہیں کر سکے گا؟ (75) اس (موسیٰ) نے کہا: اگر اس کے بعد میں تجھ سے کسی چیز کی بابت سوال کروں تو پھر مجھے ہرگز صحبت میں نہ رکھنا، یقیناً میری طرف سے تو عذر کو پہنچ چکا ہے (76)

لڑکے کو قتل کرنے کا واقعہ:

اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ ایک لڑکا اور لڑکوں کے ساتھ ایک گاؤں میں کھیل رہا تھا اور وہ اُن سب میں زیادہ حسین وجمیل اور صاف ستھرا تھا۔ خضر علیہ السلام نے اس کو قتل کر ڈالا۔ کہتے ہیں کہ اس کا سر کاٹ دیا، یا پتھر سے کچل دیا اور ایک روایت میں ہے کہ ہاتھ سے اُکھیڑ لیا۔ واللہ أعلم۔ موسیٰ علیہ السلام نے یہ ماجرا دیکھ کر انکار کیا اور اس کو پہلی بات سے بھی زیادہ سخت پایا اور جلدی کی اور کہا کہ تو نے ایک چھوٹی سی جان کو، جس نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا، مار ڈالا، بغیر کسی مستند قتل کے۔ تو نے ایک ایسا کام کیا جو کھلم کھلا منکر ہے۔ کہا کہ میں نے تجھ سے نہ کہا تھا کہ تو میرے ساتھ نہیں ٹھہر سکتا؟!

اس مرتبہ شرط اول کی یاد دہی میں لام اور کاف سے تاکید کی۔ لہٰذا موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اگر میں اس کے بعد پھر آپ پر اعتراض کروں تو آپ مجھ کو اپنے ہمراہ نہ رکھنا، آپ میری طرف کا الزام دو تین دفعہ اُتار چکے۔ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب (نبی ﷺ) کسی کا ذکر کرتے اور اس کو دعا دیتے تو اپنے نفس سے شروع کرتے، ایک دن کہا: « رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلٰى مُوسٰى لَوْ لَبِثَ مَعَ صَاحِبِهٖ لَأَبْصَرَ الْعَجَبَ، لٰكِنْ قَالَ: ﴿ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍۭ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِيْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا ﴾ »[1] (رواه ابن طريقه عن ابن عباس عنه) [اللہ تعالیٰ کی ہم پر اور موسیٰ علیہ السلام پر رحمت ہو، اگر وہ اپنے ساتھی کے ساتھ کچھ عرصہ اور رہتے تو یقیناً عجیب و غریب باتیں دیکھتے، لیکن انھوں نے جلدی میں کہہ دیا: ﴿ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍۭ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِيْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا ﴾ ''اگر اس کے بعد میں تجھ سے کسی چیز کی بابت سوال کروں تو پھر مجھے ہرگز صحبت میں نہ رکھنا، یقیناً میری طرف سے تو عذر کو پہنچ چکا ہے''۔]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اس لڑکے کا نام، جس کو خضر علیہ السلام نے قتل کیا تھا، شمعون تھا۔[2] (ذكره القرطبي) لفظِ غلام کا اطلاق جوان بالغ پر بھی ہوتا ہے، جس طرح کہ صغیر کے لیے ہوتا ہے۔ خضر علیہ السلام نے اس کے سر کی کھوپڑی اُکھیڑ دی، یا چھری سے ذبح کر ڈالا، یا اس کا سر دیوار سے مارا۔ یہ سب اقوال ہیں۔ اس پر موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ آپ نے ایک ایسی

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٠) تفسير الطبري (١٨/ ٧٧)
[2] تفسير القرطبي (١١/ ٢١)

جان ہلاک کی جو ظاہر گناہوں سے پاک تھی۔ ابو عمرو نے کہا: زاکیہ وہ ہے جس نے سرے سے کوئی گناہ نہیں کیا ہے، اور زکیہ وہ ہے جس نے گناہ کر کے توبہ کر ڈالی۔[1]

شے منکر سے مراد ایسی قبیح برائی ہے، جو شریعت میں معروف نہ ہو۔ بعض نے کہا کہ ﴿نُكْرًا﴾ سے مراد ''أَنْكَرَ'' ہے، یعنی یہ حرکت پہلے اَمر سے بھی زیادہ بدتر ہوئی۔ اس لیے کہ قتل کا تدارک ممکن نہیں ہے، کشتی کا تختہ اُکھیڑنے کی نسبت سے کہ اس کا تدارک ہوسکتا ہے۔ بعض نے کہا: ''نکرا'' قلیل ہے ''إمرا'' سے۔ اس لیے کہ ایک جان کا مارنا آسان تر ہے تمام کشتی والوں کے ڈبونے سے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ''نکر'' ''أنکر'' ہے عجب سے۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا کہ خضر علیہ السلام ایک ایسے بندے تھے کہ ان کو کوئی آنکھ نہ دیکھتی تھی، مگر جس کو اللہ تعالیٰ چاہے اس کو انھیں دکھا دے۔ قوم میں سے کسی نے خضر علیہ السلام کو نہ دیکھا کہ کیا کیا مگر موسیٰ علیہ السلام نے، اگر قوم اُن کو دیکھ لیتی تو نہ کشتی کو پھاڑنے دیتی اور نہ لڑکے کو قتل کرنے دیتی۔[2]

لیکن دیکھنا چاہیے کہ ابو العالیہ نے یہ بات کہاں سے کہی ہے، ان کے قول کے علاوہ اس بات کا اور کوئی مستند ثبوت نہیں ہے کہ خضر علیہ السلام نے یہ کام قوم کی آنکھ سے بچا کر کیا ہو۔ یہ کیا ضروری ہے کہ آنکھیں ان کو نہ دیکھتی تھیں، بلکہ اس واردات کا وقوع ان کی اطلاع کے بغیر ہوا ہو اور ممکن ہے کہ اہلِ سفینہ اور اہلِ غلام نے ان کو پہچان لیا ہو، اس حدیث کی دلیل سے جو اوپر مذکور ہوئی: «فَعَرَفُوا الْخَضِرَ فَحَمَلُوهُ بِغَيْرِ نَوْلٍ»[3] [انھوں نے خضر علیہ السلام کو پہچان لیا اور اسے بغیر کرائے کے سوار کر لیا] اور جان لیا ہو کہ یہ کام انھوں نے اللہ کے حکم سے کیا ہے، جس طرح کہ انبیاء علیہم السلام کیا کرتے ہیں، لہٰذا انھوں نے اِن اُمور کو مسلّم رکھا۔

حکایت:

عطا کہتے ہیں کہ نجدہ حروری نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو خط لکھ کر بچوں کے قتل کے بارے میں سوال کیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے جواب لکھا کہ اگر تو خضر ہے کافر کو مومن سے ممتاز کر کے پہچانتا ہے تو ان کو قتل کر دے۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں: اور لیکن تو نہیں جانتا اور بلاشبہہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے قتل سے منع فرمایا ہے، لہٰذا تو ان سے علاحدگی اختیار کر لے۔[4] سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «اَلْغُلَامُ الَّذِيْ قَتَلَهُ الْخَضِرُ طُبِعَ يَوْمَ طُبِعَ كَافِرًا، وَلَوْ أَدْرَكَ لَأَرْهَقَ أَبَوَيْهِ طُغْيَانًا وَكُفْرًا»[5] (رواه مسلم و أبو داود و الترمذي وغيرهم) یعنی

---

[1] تفسير البغوي (٥/ ١٩١) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٧٨)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٠)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨١٢) مسند أحمد (١/ ٢٢٤) مصنف ابن أبي شيبة (٦/ ٤٨٤)

[5] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٦١) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧٠٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٥٠)

جس لڑکے کو خضر علیہ السلام نے قتل کیا تھا وہ کافر پیدا ہوا تھا، اگر جوان ہوتا تو اپنے ماں باپ پر سرکشی اور طغیان کے ذریعے غالب آتا اور اُن کو ستاتا۔ اس پر خضر نے کہا: ﴿ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ ... الخ ﴾ اس جگہ لفظ "لك" زیادہ کیا، کیوں کہ عتاب کا سبب زیادہ تر ہوا اور غصہ ہونے کا موجب زیادہ قوی تھا، کیوں کہ دوبار عہد توڑ چکے تھے۔

زبان اُردو کے محاورہ میں لام کاف عبارت ہے سختی اور ناخوشی سے۔ دوبارہ سیدھی طرح پر کہا کہ تجھ سے میرے ساتھ صبر نہ ہو سکے گا، جب دیکھا کہ ہر بار اعتراض کرتے ہیں تب تیسری بار لام کاف پر آ گئے۔ معلوم ہوا کہ سمجھانے کے مراتب تین بار سے زیادہ نہیں ہیں۔ تین بار تک نصیحت کر دینا اور سمجھانا کافی ہوتا ہے۔ بعض نے کہا کہ یہ اضافہ تاکید کے ارادے سے تھا، جس طرح کسی کو جھڑکتے ہیں تو کہتے ہیں: "أقول وإياك أعني" [میں کہتا ہوں اور تجھے ہی مراد لیتا ہوں] بعض نے کہا کہ یہ اضافہ بسببِ عدمِ عذر کے تھا، اس جگہ پر خطاب میں تجاہل کیا اور موسیٰ علیہ السلام کو جھڑکا۔ لہٰذا موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اگر میں پھر اس لڑکے کے قتل کے بعد کوئی سوال کروں تو پھر تم مجھ کو اپنے ہمراہ نہ رکھنا۔ اب عذر منقطع ہو گیا، کیوں کہ میری تین بار کی مخالفت پر تم نے معذور رکھا۔ یہ ایک نادم کا شدید ندامت کے وقت کا کلام ہے کہ مجبور ہو کر اپنے قصور کا اعتراف کیا اور انصاف کی راہ پر چلا۔[1]

فَانْطَلَقَا ۫ حَتّٰٓى اِذَآ اَتَيَآ اَهْلَ قَرْيَةِ ِۨ اسْتَطْعَمَآ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ؕ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ۝۷۷ قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَ بَيْنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ۝۷۸

پھر وہ دونوں چلے حتی کہ ایک گاؤں والوں کے پاس پہنچے، اس کے رہنے والوں سے طعام مانگا، تو انھوں نے ان کی ضیافت کرنے سے انکار کر دیا، پھر ان دونوں نے ایک دیوار پائی جو گرا چاہتی تھی، تو اس (خضر) نے وہ سیدھی کر دی۔ اس (موسیٰ) نے کہا: اگر تو چاہتا تو اس پر ضرور اُجرت لے لیتا (77) اس (خضر) نے کہا: یہ (اب) میرے اور تیرے درمیان جدائی ہے، یقیناً میں تجھے ان (باتوں) کی حقیقت بتاتا ہوں، جن پر تو صبر نہ کر سکا (78)

دیوار سیدھی کرنے کا واقعہ:

گاؤں کے لوگوں نے مسافر کا حق نہ سمجھا کہ مہمانی کریں، ان کی دیوار مفت بنانے کی کیا ضرورت تھی؟! اب کے موسیٰ علیہ السلام نے جان کر پوچھا رخصت ہونے کے لیے، وہ سمجھ گئے یہ علم میرے بس کا نہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کا علم ایسا تھا کہ

[1] فتح البیان (۸/ ۸۶۔ ۸۸)

مخلوق جس کی پیروی کرے تو ان کا بھلا ہو۔ خضر علیہ السلام کا علم وہ تھا جس کی مخلوق پیروی نہ کر سکے۔

حدیث میں مروی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام اہلِ قریہ کے پاس آئے، وہ لئام، یعنی بخیل تھے،[1] انھوں نے مہمانی کرنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے اس گاؤں میں ایک دیوار، جو گرنے والی تھی، درست کر دی۔ دیوار کی طرف ارادے کی نسبت استعارے کے طور پر ہے، کیوں کہ ارادہ رجحان کے معنی میں آتا ہے اور انقضاض کہتے ہیں گرنے کو۔

اقامت سے مراد یہ ہے کہ اس دیوار کو جو جھکی ہوئی تھی اس کو سیدھی حالت پر کر دیا۔ حدیث میں مروی ہے کہ اس کو اپنے ہاتھ سے سیدھا کر دیا[2] اور ٹیکا لگا دیا کہ جھکے نہیں، یہ ایک عجیب بات، یعنی کرامت تھی۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ آپ نے اس کی مزدوری لے لی ہوتی! وہ تو ہماری مہمانی تک نہ کریں اور آپ مفت میں ان کا کام کر دیں۔ تب خضر علیہ السلام نے کہا کہ بس اب میرے اور تیرے درمیان جدائی ہے۔ تو نے تو یہ شرط کر لی تھی کہ لڑکے کے قتل کے بعد اب کوئی بات نہ پوچھوں گا۔ اب ان اُمور کی تاویل سنتے جاؤ۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ وہ گاؤں ایلہ تھا، یہ زمین سب سے زیادہ آسمان سے دور تھی۔ بعض نے کہا کہ انطاکیہ تھا۔ کسی نے کہا کہ برقہ۔ کسی نے کہا کہ آذر بھائی جان کا کوئی گاؤں تھا۔ کسی نے کہا کہ روم کا کوئی قریہ تھا۔ بعض نے کہا کہ اندلس کا ایک شہر تھا۔ بہر حال ان گاؤں والوں سے کھانا طلب کیا۔ بعض لوگوں کا یہ استدلال کہ یہ آیت سوال کرنے اور گداگری کرنے کے جواز پر دلیل ہے، غلط ہے۔ سنتِ مطہرہ میں سوال کرنے کی حرمت صراحتاً آ چکی ہے۔ ان احادیثِ صحیحہ کو رد کرنا ممکن نہیں ہے۔ بعض نے کہا: "شَرُّ الْقُرىٰ الَّتِيُ تَبُخَلُ بِالْقِرىٰ" [بدترین بستی وہ ہے جو مہمان نوازی میں بخل کا مظاہرہ کرے] کہتے ہیں کہ جب مردوں نے کھانے سے انکار کیا تو اہلِ بربر کی ایک عورت نے ان کو کھانا کھلایا۔ انھوں نے وہاں کی عورتوں کے لیے دعا کی اور مردوں پر لعنت بھیجی۔ اس گاؤں میں ایک دیوار تھی، سو گز اونچی، پچاس گز چوڑی اور پانچ سو گز لمبی، وہ گرنے کو ہو رہی تھی۔ خضر علیہ السلام نے اپنے ہاتھ سے اس کو سیدھا کر دیا، وہ اپنی پہلی حالت پر سیدھی اور پکی ہو گئی۔ بعض نے کہا کہ اس کو گرا کر بنا دیا۔ کسی نے کہا کہ ایک ستون کا ٹیکا لگا دیا۔

سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے رفعاً کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں پڑھا: ﴿يُرِيُدُ أَنُ يَنُقَضَّ فَهَدَمَهُ ثُمَّ قَعَدَ يَبُنِيهِ﴾[3] [وہ گرانا چاہتی تھی، اس کو گرا دیا اور پھر اسے بنانے بیٹھ گئے] لیکن صحیحین کی روایت، جو پہلے بیان ہوئی، جس میں اس طرح مروی ہے: ﴿مَسَحَهُ بِيَدِهِ﴾[4] [اسے اپنے ہاتھ سے چھوا (اور سیدھا کر دیا)] زیادہ صحیح ہے۔ یہ سیدھا کرنا عجیب طرح سے ہوا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اگر آپ اس کام پر اُجرت لے لیتے تو شام کے کھانے کا بندوبست ہو جاتا۔ یا

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٠) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٠)
[3] الدر المنثور (٥/ ٤٢٧) [4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٤٧)

یہ اعتراض تھا کہ یہ حرکت فضول ہوئی، لیکن پہلی بات زیادہ قابلِ ترجیح ہے۔ خضر علیہ السلام نے کہا کہ بس اب یہ جدائی ہے میرے اور تیرے درمیان، اب میں تم کو ان تین باتوں کی حکمت بتا دیتا ہوں جن پر تجھ سے صبر نہ ہو سکا۔[1]

اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ﴿۷۹﴾

رہی کشتی تو وہ چند مسکینوں کی تھی جو دریا میں کام کرتے تھے، لہٰذا میں نے ارادہ کیا کہ اس میں عیب ڈال دوں جبکہ ان کے آگے ایک بادشاہ تھا، جو ہر کشتی زبردستی لے لیتا تھا﴿79﴾

کشتی کو پھاڑ کر عیب دار کرنے کا راز:

یہ موسیٰ علیہ السلام پر ایک امرِ مشکل کی تاویل ہے جس کے ظاہر کا انھوں نے انکار کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے خضر علیہ السلام کو اس کے باطن سے آگاہ کر دیا۔ اس کشتی کا گزر ایک ستم گر بادشاہ پر ہونے والا تھا، جو ہر نفیس کشتی چھین لیتا تھا، اب اس عیب کے لگ جانے سے وہ اس کو نہ لیتا، مساکین اس سے فائدہ اُٹھاتے، ان کے پاس اس کشتی کے سوا کوئی چیز نہ تھی، جس سے انھیں کچھ فائدہ ملتا۔ بعض نے کہا کہ وہ یتیم تھے۔ شعیب جبائی رحمہ اللہ نے کہا کہ اس بادشاہ کا نام ہدد بن بدد تھا[2] اور صحیح بخاری کی روایت میں بھی گزر چکا ہے[3] اور تورات میں بھی مذکور ہے۔ وہ عیص بن اسحاق کی ذریت میں سے تھا اور اِن ملوک میں سے تھا جن پر تورات میں تنصیص کی ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ مساکین سے مراد دس ضعیف ہیں، وہ ایک دوسرے کے بھائی تھے۔ ان میں اتنی قدرت نہ تھی کہ کسی ظالم کو ہٹا سکیں۔ نقاش رحمہ اللہ نے ان دسوں کے نام ذکر کیے ہیں۔[4] بعض نے کہا کہ مساکین سین معجمہ کی شد کے ساتھ ہے۔ مسّاک ناؤ کے روکنے والے کو کہتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ملاح تھے، ان کے پاس کوئی مال نہ تھا، سوائے اس کشتی کے، یعنی وہ رزق کا ایک وسیلہ تھا، جو لوگ دریا پر سوار ہونا چاہتے، ان کو اُجرت لے کر کشتی پر سوار کرتے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ فقیر کا درجہ مسکین سے کم تر و بدتر ہے۔[5]

مفسرین نے کہا کہ اس جگہ وراء سے مراد اَمام (آگے) ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم "اَمَامَهُمْ" پڑھتے تھے۔[6] سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ہی پڑھا ہے۔ سیدنا

[1] فتح البيان (٨/ ٨٩۔ ٩٠) [2] تفسير الطبري (١٨/ ٨٤) [3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٤٩)
[4] تفسير القرطبي (١١/ ٣٤) [5] روح المعاني (١٠/ ١٢١) [6] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٧٩)

عثمان رضی اللہ عنہ نے "كان وراءهم" لکھا۔[1] "وراء" بمعنی اَمام ہے اور کسی نے کہا کہ بمعنی خلف (پیچھے)۔ ان ناؤ والوں کا راستہ اسی بادشاہ کی طرف سے تھا اور اُن کو خبر نہ تھی کہ وہ ہر اچھی کشتی زبردستی پکڑ لیتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس اور سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہم نے "سفينة صالحة" پڑھا ہے۔[2] کسی نے کہا کہ اس بادشادہ کا نام جلندی ازدی تھا اور وہ کافر تھا۔ بعض نے کہا کہ ملکِ غسان تھا اور جیسور نام تھا۔[3] (ذكره القرطبي) والله أعلم.

وَ اَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَاۤ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا ۝۸۰ فَاَرَدْنَاۤ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّ اَقْرَبَ رُحْمًا ۝۸۱

اور رہا لڑکا، تو اس کے ماں باپ مومن تھے، چناں چہ ہم ڈرے کہ وہ سرکشی اور کفر کی وجہ سے انھیں مشقت میں ڈال دے گا (80) چناں چہ ہم نے چاہا کہ ان دونوں کا رب انھیں (ایسا) بدل دے جو اس سے پاکیزگی میں بہتر اور مہربانی میں قریب تر ہو (81)

لڑکے کے قتل کا راز:

یعنی اگر وہ بڑا ہوتا تو موذی اور بدراہ ہوتا، اس کے ماں باپ اس کے ساتھ خراب ہوتے۔ بعضے آدمی کی بنیاد بُری پڑتی ہے اور بعضے کی بھلی، جیسے: ککڑی، کھیرا کوئی بیج میٹھا پڑا کوئی کڑوا۔ اگرچہ اصل میں ککڑی کھیرا میٹھا ہے، آدمی کی بنیاد بھی اصل میں بہتر ہے، بگڑ کر کوئی پھل کڑوا نکلتا ہے۔ اس کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے۔ پیغمبر ﷺ نے فرمایا کہ ہر آدمی کی بنیاد مسلمانی پر ہے۔[4] یہی معنی سمجھنے چاہییں۔ اس ماں باپ کو پیچھے ایک بیٹی ہوئی، ایک نبی سے بیاہی گئی اور ایک نبی جنا، جس سے ایک اُمت چلی۔ شاید یہ مثل اسی جگہ سے نکلی ہے کہ از پسرِ ناہموار دُختر بہتر، یعنی برے بیٹے سے تو بیٹی بہتر ہے۔ پہلے یہ بات گزر چکی ہے کہ اس لڑکے کا نام حیسور تھا، وہ اصل میں کافر پیدا ہوا تھا، اس کے ماں باپ مسلمان تھے، اس کے جینے سے یہ ڈر ہوا کہ کہیں اس کی محبت میں آ کر کفر میں اس کی پیروی نہ کریں۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ جب وہ پیدا ہوا تھا، ماں باپ خوش ہوئے تھے اور جب مارا گیا تو غمگین ہوئے، اگر وہ زندہ رہتا تو اس کے سبب سے ماں باپ دونوں ہلاک ہوتے۔ آدمی کو اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر پر راضی رہنا چاہیے۔ مومن کے لیے اللہ تعالیٰ کی قضائے مکروہ میں بہتری ہے قضائے محبوب کی نسبت۔[5] حدیث میں مروی ہے: «لَا يَقْضِي اللّٰهُ لِمُؤْمِنٍ قَضَاءً إِلَّا كَانَ خَيْرًا لَهُ»[6] [اللہ تعالیٰ مومن کے لیے جو فیصلہ بھی فرمائے وہ اس کے لیے

[1] فتح القدير (٣/ ٤٢١)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٧٩) الدر المنثور (٥/ ٤٢٨)
[3] تفسير القرطبي (١١/ ٣٦) فتح البيان (٨/ ٩٠_٩١)
[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٩٢) صحيح مسلم (٢٦٥٨)
[5] تفسير الطبري (١٨/ ٨٧)
[6] مسند أحمد (٣/ ١٨٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٩٨٥)

بہتر ہے] نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَعَسَى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ﴾ [البقرة: ٢١٦] ''اور ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمھارے لیے بہتر ہو۔''

غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ اس سے زیادہ ستھرا بچہ دے، جس پر یہ دونوں ماں باپ بہ نسبت اس کے زیادہ تر مہربان اور شفیق ہوں۔ یہی قول ہے ابن جریج رحمہ اللہ کا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ یعنی ماں باپ سے زیادہ نیکی کرنے والا ہو۔[1] غرض یہ کہ اس بیٹے کے بدلے میں دختر ملی۔ بعض نے کہا کہ جب خضر علیہ السلام نے اس لڑکے کو قتل کر ڈالا تو اس کی ماں ایک غلام مسلم کا حمل رکھتی تھی۔[2] (قاله ابن جريج) اس سے معلوم ہوا کہ بدل میں غلام ملا نہ کہ لونڈی۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ اس لڑکے کے ماں باپ مومن تھے نہ خود وہ لڑکا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی قراءت یہ ہے: ''وأما الغلام فكان كافراً وكان أبواه مؤمنين''[3] [وہ لڑکا کافر تھا، جب کہ اس کے ماں باپ مومن تھے] ''خشیت'' کہتے ہیں اس خوف کو جس میں تعظیم بھی ہو اور یہ خشیت اکثر جس سے ڈرا جائے اس کے معلوم کرنے سے ہوتی ہے۔ یا ''خَشِيْنَا'' کے معنی ''عَلِمْنَا'' ہیں، لیکن پہلی بات زیادہ قابلِ قبول ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ یہی آیت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے مصحف میں یوں ہے: ''فخاف ربك''.[4]

''رھق'' کے معنی ہیں غشیان۔ یعنی اس بات کا ڈر ہوا کہ کہیں اس بیٹے کی محبت اُن کو اس بات پر نہ اُکسائے کہ وہ دین میں اس کے تابع ہو کر کفر میں گرفتار ہو جائیں۔ بعض اہلِ علم نے استشکال کیا ہے کہ خضر علیہ السلام نے اس غلام کو اس وجہ سے کیوں قتل کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ لڑکا بالغ تھا اور کفر کی وجہ سے قتل کا مستحق ہو گیا تھا۔ کسی نے کہا کہ راہ زن تھا اور راہ زن مارا جاتا ہے۔ یہ جواب شریعتِ اسلام پر تو ٹھیک ہے، لیکن ہو سکتا ہے کہ اللہ کے نزدیک خضر علیہ السلام کی شریعت اور طرح پر ہو اور اس میں یہ کام جائز ہو اور اگر وہ لڑکا بچہ تھا تو اللہ تعالیٰ نے خضر علیہ السلام کو جتا دیا ہو کہ اگر وہ بالغ ہوگا تو کافر ہوگا اور اس کے کفر کے سبب سے اس کے ماں باپ بھی گمراہ ہو جائیں گے اور یہ امر اگرچہ ظاہری طور پر شریعتِ اسلامیہ کے خلاف ہے کہ اس بے گناہ کو کہ جس پر ابھی تک قلمِ تکلیف جاری نہیں ہوا وہ محض بعد از بلوغ معصیت کے وقوع کے خوف سے قتل کیا جائے، لیکن دوسری شریعت میں اگر حلال ہو تو پھر کچھ اشکال نہیں ہے۔

ابدال کہتے ہیں ایک شے کے اُٹھانے اور دوسری شے کے اس جگہ رکھنے کو۔ ''أردنا'' کے معنی ہیں: ''أَرَادَ اللّٰهُ''۔ قرآنِ مجید میں ایسا محاورہ بہت ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ ہم نے چاہا کہ اللہ ان دونوں کو اس بیٹے کے عوض اور بیٹا

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٨٧) [2] تفسير الطبري (١٨/ ٨٦۔ ٨٧)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٢٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٠) [4] تفسير الطبري (١٨/ ٨٥)

دے جو اس سے بہتر ہو، دین و صلاح و تقویٰ اور گناہوں سے پاکیزگی کے اعتبار سے اور محبت میں قریب تر ہو۔
چناں چہ اللہ تعالیٰ نے ایک لڑکی دی، جس نے ایک پیغمبر جنا۔[1]

وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَاۤ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ۭ ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿82﴾

اور رہی دیوار تو وہ شہر میں دو یتیم لڑکوں کی تھی، اور اس کے نیچے ان کے لیے خزانہ تھا اور ان کا باپ صالح تھا، چنانچہ تیرے رب نے چاہا کہ وہ دونوں (یتیم) اپنی جوانی کو پہنچیں اور تیرے رب کی رحمت کے سبب اپنا خزانہ نکال لیں اور میں نے یہ اپنی رائے سے نہیں کیا، یہ ان (باتوں) کی حقیقت ہے جن پر تو صبر نہ کر سکا ﴿82﴾

بغیر مزدوری کے دیوار سیدھی کرنے کی حکمت:

یعنی جو کام اللہ کے حکم سے کرنا ضروری ہو اس پر مزدوری نہیں لینی چاہیے۔ آگے قصہ ذوالقرنین کا بیان فرمایا، یہ بھی یہود کے سکھانے سے مکے کے لوگ پوچھتے تھے پیغمبر کے آزمانے کے لیے۔ جیسے اصحابِ کہف کا حال پوچھتے تھے۔

اس آیت میں لفظ قریہ کے مدینے پر اطلاق کے بارے میں دلیل ہے، کیوں کہ پہلے یہ کہا تھا: ﴿ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَيَاۤ اَهْلَ قَرْيَةِ ﴾ [الکھف: ۷۷] ''حتی کہ ایک گاؤں والوں کے پاس پہنچے۔'' اور اس جگہ یہ فرمایا: ﴿ فِي الْمَدِيْنَةِ ﴾ (آیتِ باب)۔ جس طرح فرمایا: ﴿ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْۤ اَخْرَجَتْكَ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ﴾ [محمد: ۱۳] ''اور کتنی ہی بستیاں کہ وہ آپ کی اس بستی (مکہ) سے، جس (کے باشندوں) نے آپ کو نکال دیا ہے، کہیں زیادہ طاقتور تھیں، ہم نے انھیں ہلاک کر دیا، پھر کوئی بھی اُن کی مدد کرنے والا نہ تھا۔'' نیز فرمایا: ﴿ لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴾ [الزخرف: ۳۱] ''یہ قرآن ان دونوں شہروں میں سے کسی بڑے آدمی پر نازل کیوں نہیں کیا گیا؟'' مراد مکہ اور طائف ہے۔

آیت کے معنی یہ ہوئے کہ اس دیوار کو میں نے اس لیے درست کیا کہ یہ دو یتیم لڑکوں کی دیوار تھی، جو اس شہر میں رہتے ہیں۔ امام عکرمہ و قتادہ رحمہما اللہ نے کہا کہ ''کنز'' سے مراد مالِ مدفون ہے۔ آیت کا ظاہر سیاق یہی ہے۔ اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اس دیوار کے نیچے علم کا خزانہ تھا۔[3] سعید بن جبیر رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ صحف تھے جن میں علم تھا۔[4]

---

[1] فتح البیان (۸/ ۹۱۔ ۹۳)
[2] تفسیر الطبري (۱۸/ ۹۰)
[3] تفسیر الطبري (۱۸/ ۸۸) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔
[4] تفسیر الطبري (۱۸/ ۸۸)

ایک مرفوع حدیث بھی اسی کی تقویت کرتی ہے۔ سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ رفعا کہتے ہیں کہ وہ "کنز"، جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کیا ہے، یہ خالص سونے کی ایک تختی تھی، اس میں لکھا تھا: "عَجِبْتُ لِمَنْ أَيْقَنَ بِالْقَدَرِ لِمَ نَصِبَ؟ وَعَجِبْتُ لِمَنْ ذَكَرَ النَّارَ لِمَ ضَحِكَ؟ وَعَجِبْتُ لِمَنْ ذَكَرَ الْمَوْتَ لِمَ غَفَلَ؟ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ [تعجب ہے اس شخص پر جو تقدیر کا قائل ہوتے ہوئے اپنی جان کو مشقت میں ڈال رہا ہے اور رنج وغم برداشت کر رہا ہے۔ تعجب ہے اس شخص پر جو جہنم کے عذابوں کو ماننے والا ہے پھر بھی ہنسی کھیل میں مشغول ہے۔ تعجب ہے اس شخص پر جو موت کا یقین ہوتے ہوئے غفلت میں پڑا ہوا ہے۔ لا إله إلا الله محمد رسول الله]۔ بشر بن المنذر هذا يقال له القاضي المصيصة" [1] (رواه البزار) اس بارے میں سلف سے آثار آئے ہیں۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ سونے کی تختی تھی، اس میں لکھا تھا: "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، عَجِبْتُ لِمَنْ يُؤْمِنُ بِالْقَدَرِ كَيْفَ يَحْزَنُ، وَعَجِبْتُ لِمَنْ يُوْقِنُ بِالْمَوْتِ كَيْفَ يَفْرَحُ؟ وَ عَجِبْتُ لِمَنْ يُعْرِفُ الدُّنْيَا وَتَقَلُّبَهَا وَأَهْلَهَا كَيْفَ يَطْمَئِنُّ إِلَيْهَا؟ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" [بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، مجھے تعجب ہے اس شخص پر جو تقدیر پر ایمان لاتے ہوئے بھی غمگین ہوتا ہے، تعجب ہے مجھے اس پر جو موت کا یقین رکھنے کے باوجود خوش ہوتا ہے، مجھے تعجب ہے اس بندے پر جو دنیا، اس کے الٹ پھیر اور اس کے اہل کو پہچانتا ہے، پھر بھی اس پر مطمئن ہوتا ہے۔ لا إله إلا الله محمد رسول الله]

عمر مولیٰ غفرہ رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ "کنز" جس کا ذکر سورت کہف میں ہے سونے کی ایک ٹھوس تختی تھی۔ اس میں لکھا تھا: "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، عَجَبٌ لِمَنْ عَرَفَ الْمَوْتَ ثُمَّ ضَحِكَ، عَجَبٌ لِمَنْ أَيْقَنَ بِالْقَدَرِ ثُمَّ نَصِبَ، عَجَبٌ لِمَنْ أَيْقَنَ بِالْمَوْتِ ثُمَّ أَمِنَ، أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ" [بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، تعجب ہے اس شخص پر جس نے موت کو پہچان کر بھی ہنسی خوشی کی، تعجب ہے اس بندے پر جس نے تقدیر پر یقین کے باوجود اپنے آپ کو مشقت میں ڈالا۔ تعجب ہے اس شخص پر جس نے موت کا یقین رکھنے کے باوجود بے پروائی اختیار کی، میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں] جعفر بن محمد رحمہ اللہ نے کہا کہ اڑھائی سطریں تھیں، تیسری پوری نہ ہوئی، "عَجِبْتُ لِلْمُوْقِنِ بِالرِّزْقِ كَيْفَ يَتْعَبُ وَعَجِبْتُ لِلْمُوْقِنِ بِالْحِسَابِ كَيْفَ يَغْفُلُ؟! وَ عَجِبْتُ لِلْمُوْقِنِ بِالْمَوْتِ كَيْفَ يَفْرَحُ؟! وقد قال اللّٰهُ: ﴿ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۗ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ﴾ [الأنبياء: ٤٧]" "مجھے رزق کا یقین رکھنے والے پر تعجب ہے کہ وہ کیوں کر مشقت اٹھاتا ہے؟ مجھے تعجب ہے حساب کا یقین رکھنے والے پر کہ وہ کیسے غفلت کا شکار ہوتا ہے؟ اور مجھے تعجب ہے اس موت پر یقین رکھنے والے پر کہ وہ کیوں کر ہنسی کھیل میں مشغول ہوتا ہے اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَاِنْ كَانَ

[1] مسند البزار (۹/ ٤٥٤) اس کی سند میں "حارث بن عبد اللہ یحصبی" مجہول راوی ہے۔ (مجمع الزوائد: ۷/ ۱٤۷)

﴿مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۗ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ﴾ ''اور اگر رائی کے دانے کے برابر بھی (عمل) ہوگا تو ہم اسے (تولنے کے لیے) لے آئیں گے، اور ہم حساب کرنے والے کافی ہیں۔''] کہتے ہیں کہ وہ دونوں لڑکے اپنے باپ کے صالح ہونے کی وجہ سے محفوظ رکھے گئے۔ ان لڑکوں سے اس باپ تک سات آباء تھے اور وہ باپ نساج تھا، یعنی کپڑا بننے والا۔[1] ان ائمہ کے یہ اقوال اور جو مضمون حدیث میں مروی ہے، اگر ثابت ہو تو امام عکرمہ رحمہ اللہ کے قول کے خلاف نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ تختی سونے کی بتاتے ہیں اور امام عکرمہ رحمہ اللہ مال کہتے ہیں۔ سونے کی تختی خود ایک بڑا مال ہے، اس مال کی تختی پر احکام اور نصیحتیں بھی لکھی تھیں۔ واللہ أعلم.

﴿وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا﴾ میں اس بات پر دلیل ہے کہ نیک مرد کی اولاد کی حفاظت کی جاتی ہے اور اس کی برکت اس کی اولاد کو دنیا اور آخرت میں شاملِ حال رہتی ہے۔ وہ ان کی شفاعت کرے گا تو ذریت کا درجہ جنت کے اعلیٰ درجے میں ہوگا، تاکہ اولاد کی طرف سے اس کی آنکھ ٹھنڈی ہو، جس طرح کہ قرآن کریم اور سنتِ مطہرہ میں آیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ان کے باپ کی نیکی کی وجہ سے ان کے مال کی حفاظت کی گئی اور ان لڑکوں کی کسی نیکی کا ذکر نہیں کیا گیا۔[2] اور یہ بات گزر چکی کہ وہ ساتواں باپ تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ نسب کا اعتبار سات پشت تک ہوتا ہے، جس طرح کہ حسب کا اعتبار چار پشت تک رہتا ہے۔ یوسف علیہ السلام کے حق میں فرمایا ہے: کریم بن کریم بن کریم یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم۔ واللہ أعلم، لیکن اس حفظ کے سچا ہونے کے لیے ایمان کی درستی اور عدمِ شرک باللہ شرط ہے، کیونکہ کفر اور شرک کے ساتھ کوئی نیکی، اپنی ہو یا پرائی، نفع بخش نہیں ہوتی اور خالص توحید کے ہوتے ہوئے تھوڑا سا عمل صالح بھی کافی ہو جاتا ہے۔

یہ اللہ کا فضل ہے اور اس کی رحمت بہانہ تلاش کرتی ہے، وہ موحد خالص کو ان شاء اللہ تعالیٰ ضرور بخش دے گا، اگرچہ گناہوں کی سزا کے بعد ہو اور مشرک متقی کو ہرگز نہ بخشے گا۔ لہٰذا اہلِ علم اور اللہ کی معرفت رکھنے والوں نے کہا ہے کہ فاسق موحد، متقی مشرک سے بہتر ہوتا ہے۔ لیکن شرک سے بچنا کچھ آسان بات نہیں ہے۔ شرک اور ریاکاری کے دقائق (باریکیاں) بے حساب ہیں۔ جب انسان کمال قوت ایمانی کے ساتھ مذہبی تعصب اور لوگوں کی اندھی تقلید کو چھوڑ کر شرک و بدعات کے مرتبوں کو دریافت کرنے پر کمر باندھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی توفیق ساتھ ہوتی ہے، تب کہیں عقیدۂ شرک و عملِ شرک و فعلِ کفر و ارتکاب بدعتِ مکفرہ و مشرکہ سے بچ سکتا ہے۔ شرک کی قسموں اور اخلاصِ توحید کے بارے میں اردو کے ہشتگانہ رسائل اخلاص التوحید اور اس جیسے اور رسائل اور کتاب ''دینِ خالص'' و ''تقویۃ الایمان'' و ''تذکیر الاخوان'' و ''دعوۃ الداع'' اس پر آفات دور میں آخرت کے طلب گار، بخشش کے متلاشی، نجات چاہنے والے صاحبِ ایمان لوگوں کے لیے بہت مفید اور جامع ہیں۔ واللہ المستعان.

اس جگہ خضر علیہ السلام نے ارادے کی نسبت رب کی طرف فرمائی، اس لیے کہ ان تک پہنچنا اللہ تعالیٰ کی قدرت میں

---

[1] تفسیر الطبري (١٨/ ٨٨۔ ٨٩)
[2] تفسیر الطبري (١٨/ ٩٠۔ ٩١)

تھا۔ جوانی تک پہنچانا اللہ تعالیٰ کی قدرت میں تھا۔ اللہ تعالیٰ کے سوا ان یتیموں کو جوانی تک پہنچانے پر کوئی قادر نہ تھا۔ بخلاف غلام اور کشتی کے کہ وہاں یہ نسبت اپنی طرف کی۔ پھر کہا کہ یہ تینوں کام میں نے کچھ اپنی طرف سے نہیں کیے بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہوئے۔ اسی نے مجھ کو ان کاموں کی اطلاع دے کر حکم دیا کہ میں یوں کروں۔ اس میں اس شخص کے قول پر دلیل ہے جو خضر علیہ السلام کی نبوت کا قائل ہے۔ آیت ﴿فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا﴾ [الکهف: ٦٥] ”چناں چہ ان دونوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے (خضر) کو پایا، جسے ہم نے اپنی طرف سے رحمت دی تھی اور ہم نے اسے اپنے پاس سے (خاص) علم سکھایا تھا۔“ بھی اسی پر دلیل ہے۔ بعض نے کہا کہ وہ رسول تھے۔ کسی نے کہا کہ فرشتہ تھے۔ اس کو ماوردی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔[1] لیکن اکثر کا مذہب یہ ہے کہ وہ نبی نہ تھے، بلکہ ولی تھے۔ واللہ أعلم.

امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے معارف میں ذکر کیا ہے کہ خضر کا نام بلیا بن ملکان بن فالغ بن عامر بن شالخ بن ارفخشد بن سام بن نوح علیہ السلام تھا اور کنیت ابو العباس اور لقب خضر اور وہ ابنائے ملوک (شہزادوں) میں سے تھے۔ (ذکرہ النووي في تهذيب الأسماء) امام نووی رحمہ اللہ وغیرہ نے یہ بھی حکایت کی ہے کہ وہ قیامت تک باقی ہیں۔ وہ اور ابن صلاح رحمہ اللہ ان کی بقا کی طرف مائل ہیں اور اس بارے میں حکایات اور سلف کے آثار وغیرہ ذکر کیے ہیں اور اُن کا ذکر بعض احادیث میں مروی ہے،[2] لیکن ان میں سے کوئی حدیث صحیح اور ثابت نہیں ہوئی۔ سب سے مشہور حدیث اس سلسلے میں حدیثِ تعزیہ ہے۔[3]

سو اس کی اسناد ضعیف ہے اور محدثین وغیرہم نے اس کے خلاف کو ترجیح دی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی دلیل سے: ﴿وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ﴾ [الأنبياء: ٣٤] ”اور (اے نبی!) ہم نے آپ سے پہلے بھی کسی بشر کو ہمیشہ کی زندگی نہیں دی۔“ اور بدر کے دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کی رو سے: «اَللّٰهُمَّ إِنْ تُهْلِكْ هٰذِهِ الْعِصَابَةَ لَا تُعْبَدُ فِي الْأَرْضِ»[4] [اے اللہ! اگر تو اس جماعت کو ہلاک کر دے گا تو زمین میں تیری عبادت نہ کی جائے گی] اور یہ بات منقول نہیں ہے کہ خضر علیہ السلام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے ہوں اور نہ ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل کر جنگ کی، اگر زندہ ہوتے تو نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین اور اصحاب میں داخل ہوتے۔ اس لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ثقلین کی طرف مبعوث ہوئے تھے، کیا جن اور کیا انسان۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: «لَوْ كَانَ مُوْسٰى حَيًّا لَّمَا وَسِعَهُ إِلَّا اتِّبَاعِيْ»[5] [اگر

---

[1] تفسير الماوردي (٣/ ٣٣٦۔ ٣٣٧) [2] المعارف (١/ ٤٢) تهذيب الأسماء (١/ ١٧٦۔ ١٧٧)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٣٠٧٦۔ ٣٠٧٧) امام البانی رحمہ اللہ نے اس روایت کے تمام طرق پر مفصل بحث کرتے ہوئے اس کو موضوع روایت کہا ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٥٣٨٤)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٦٣)

[5] مسند أحمد (٣/ ٣٣٨) شعب الإيمان (١/ ١٩٩) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو ”حسن“ کہا ہے۔ مزید دیکھیں: إرواء الغليل (٦/ ٣٤)

موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو انھیں میری ہی اتباع کرنا پڑتی] اور اپنے انتقال سے پہلے یہ خبر دی کہ «لَا يَبْقَى مِمَّنْ هُوَ عَلَىٰ وَجْهِ الْأَرْضِ إِلَى مِائَةِ سَنَةٍ مِنْ لَيْلَتِهِ تِلْكَ عَيْنٌ تَطْرِفُ»[1] [آج جو لوگ روئے زمین پر موجود ہیں، ان میں سے ایک بھی آج کی اس رات سے لے کر سو سال پر باقی نہیں رہے گا] اس کے سوا اور بہت دلائل ہیں۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «إِنَّمَا سُمِّيَ خَضِرًا لِأَنَّهُ جَلَسَ عَلَى فَرْوَةٍ بَيْضَاءَ فَإِذَا هِيَ تَهْتَزُّ خَضْرَاءَ» (رواه أحمد) [ان کا نام خضر اس لیے رکھا گیا کہ وہ سفید رنگ کی خشک گھاس پر بیٹھے تو وہ ان کے نیچے سبز رنگ میں لہلہانے لگی تھی] اسی طرح صحیحین میں بھی مروی ہے، اس جگہ فروہ سے مراد سوکھی گھاس ہے۔[2] (قاله عبد الرزاق) اور بعض نے کہا کہ "فروة" سے مراد روئے زمین ہے۔ پھر خضر علیہ السلام نے کہا کہ یہ تفسیر ہے اس چیز کی جس کا تجھ سے صبر نہ ہو سکا کہ میں خود ابتداءً اس کی خبر تجھ کو دوں۔ خضر نے اس جگہ موسیٰ علیہ السلام کے سوالوں کے جواب میں بھاری کا مقابلہ بھاری سے اور خفیف کا مقابلہ خفیف سے کیا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ان دونوں یتیموں کا نام اصرم وصریم تھا۔ قریہ والوں کی خساست کے سبب سے اس کی تحقیر کرتے ہوئے اس جگہ اس شہر کو قریہ کہا تھا اور ان دو یتیموں کے وہاں ہونے کے سبب سے اس کی تعظیم کرتے ہوئے اس جگہ مدینہ کہا۔ ﴿كَنْزٌ﴾ سے مراد مالِ جسیم ہے، یا اکٹھا کیا ہوا مال۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ لغت میں معروف یہ ہے کہ جب ﴿كَنْزٌ﴾ کا لفظ مفرد کے طور پر بولا جاتا ہے تو اس کے معنی مالِ مدفون کے ہوتے ہیں اور جب مال نہیں ہوتا تو کنزِ علم و کنزِ فہم کہا جاتا ہے[3] ؎

عشق تا بہ پیشکش آریم گنجِ علم آسان دہیم آنچہ بمشکل گرفتہ ایم

"عشق کو (انتہائی دلی محبت) ہے کہاں کہ ہم اسے علم کے خزانہ کا نذرانہ پیش کریں۔ کیا آسانی سے وہ چیز دے دیں جو ہم نے بڑی مشکل سے حاصل کی ہے۔"

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ہم سے اگلوں کے لیے کنز حلال تھا، ہم پر کنز حرام ہے اور غنیمت ہم سے اگلوں پر حرام تھی اور ہمارے لیے حلال ہے۔ اب کوئی شخص اس بات کا تعجب نہ کرے کہ کنز کا حال کیا ہے کہ پہلے والوں پر حلال تھا اور ہمارے لیے حرام ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنی جو چیز جس کے لیے چاہتا ہے حلال کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے حرام کرتا ہے۔ یہ سنن اور فرائض ہیں، ایک اُمت پر حلال ہوتے ہیں تو دوسری اُمت پر حرام۔[4] سونے کی

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٣٧) مسند أحمد (١/ ٩٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٢١) مسند أحمد (٢/ ٣١٨)

[3] معاني القرآن (٣/ ٣٠٧)

[4] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٨١)

سختی کے بارے میں سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث اوپر گزر چکی ہے۔①

اس قسم کی بہت روایتیں ہیں جن کے ذکر میں کچھ زیادہ فائدہ نہیں۔ بلکہ ان لڑکوں کے باپ کی نیکی کا تقاضا تھا کہ ان دونوں بیٹوں کی رعایت کی جاتی اور اُن کے مال کی حفاظت ہوتی۔ ظاہر الفاظ یہ ہیں کہ وہ حقیقی باپ تھا اور بعض نے کہا کہ ساتویں یا دسویں پشت سے باپ تھا، اس کا نام کاشح تھا، وہ ایک متقی شخص تھا، ان کی ماں کا نام دنیا تھا۔② (ذکرہ النقاش) اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نیک بندے کی حفاظت اس کے نفس اور اولاد میں کرتا ہے، اگر چہ بعید ہوں۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ يُصْلِحُ بِصَلَاحِ الرَّجُلِ وَلَدَهُ وَ وَلَدَ وَلَدِهِ، وَ أَهْلَ دُوَيْرَتِهِ، وَأَهْلَ دُوَيْرَاتٍ حَوْلَهُ، فَمَا يَزَالُوْنَ فِيْ حِفْظِ اللّٰهِ تَعَالٰى مَا دَامَ فِيْهِمْ»③ (أخرجه ابن مردوية) [بلاشبہ اللہ عزوجل آدمی کی اصلاح کے ساتھ اس کی اولاد، اس کی اولاد کی اولاد اس کے گھر والوں اور اس کے گھر کے آس پاس کے گھر والوں کی اصلاح کرتا ہے، جب تک وہ آدمی ان میں موجود رہتا ہے، اس وقت تک وہ سارے اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں ہوتے ہیں] عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے اور انھوں نے "في حفظ الله" کے بجائے "في ستر من الله و عافية".④ [وہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت و عافیت میں ہوتا ہے] کہا ہے۔

سعید بن مسیب رحمہ اللہ کہتے تھے کہ میں نماز میں ہوتا ہوں، مجھے اپنی اولاد یاد آتی ہے، میں زیادہ نماز پڑھتا ہوں۔⑤ ایک روایت میں مروی ہے: «إِنَّ اللّٰهَ يَحْفَظُ الصَّالِحَ فِيْ سَبْعَةٍ مِّنْ ذُرِّيَّتِهِ» [بلاشبہ اللہ تعالیٰ نیک بندے کی اولاد کی سات پشتوں تک حفاظت فرماتا ہے] اسی پر یہ آیت بھی دلیل ہے: ﴿اِنَّ وَلِيِّـَۧ اللّٰهُ الَّذِيْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ۖ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ﴾ [الأعراف: ١٩٦] "(کہہ دیجیے:) بے شک میرا کارساز تو اللہ ہی ہے جس نے یہ کتاب نازل کی اور وہی نیک لوگوں کی کارسازی کرتا ہے۔"⑥ (قاله القرطبي) اضافت موسیٰ علیہ السلام کے رب کی طرف فرمائی ان کی بزرگی کی خاطر۔ ﴿فَاَرَدْتُّ﴾ کہا تھا اس لیے کہ افساد (کشتی کو عیب دار کرنا) تھا ظاہر میں اور خود خضر علیہ السلام کا فعل تھا، دوسری بار ﴿فَاَرَدْنَآ﴾ "أَرَدْنَا" کہا، اس لیے کہ وہ من حیث الفعل افساد تھا۔ اور من حیث التبدیل (لڑکے کے عوض دوسرا بیٹا دینے کا وعدہ) انعام تھا۔ تیسری بار ﴿فَاَرَادَ رَبُّكَ﴾ کہا، اس لیے کہ یہ محض انعام تھا اور انسان کی قدرت سے باہر تھا۔ پھر خضر علیہ السلام نے یہ کہہ دیا کہ یہ سب اُمور تیرے رب کی رحمت سے ہوئے نہ کہ میرے اجتہاد اور رائے سے۔

اہلِ علم کا خضر علیہ السلام کے نسب میں اور اُن کے نبی ہونے اور اُن کی عمر کی لمبائی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے

---

① اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ ② تفسیر القرطبي (١١/ ٣٨)
③ تفسیر الطبري (٥/ ٣٧٤۔ ٣٧٥) اس کی سند میں "عثمان بن عبدالرحمٰن" اور "یحییٰ بن سعید" ضعیف راوی ہیں۔
④ تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٧٥) ⑤ تفسیر البغوي (٥/ ١٩٦) ⑥ تفسیر القرطبي (١١/ ٣٩)

تک، یا اس سے بعد تک اُن کے زندہ رہنے کے بارے میں اختلاف ہے۔ اس سلسلے میں بہت سے اقوال ہیں۔ کسی نے کہا کہ آدم علیہ السلام کے صلبی بیٹے تھے اور یہ ضعیف منقطع ہے۔ کسی نے کہا کہ ابنِ قابیل بن آدم علیہ السلام تھے، یہ معضل ہے۔ کسی نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام کے بھائی ہارون علیہ السلام کے بیٹے تھے، یہ بعید ہے۔ کسی نے کہا کہ ارمیا بن خلقیا تھے، اس کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے رد کیا ہے۔ کسی نے کہا کہ بنتِ فرعون کے بیٹے تھے اور کسی نے کہا کہ فرعون کے صلبی بیٹے تھے۔ بعض نے کہا کہ الیسع تھے۔ بعض نے کہا کہ اولادِ فارس سے تھے۔ بعض نے کہا کہ ابراہیم علیہ السلام پر ایمان لانے والے کسی مومن کے بیٹے تھے، جنھوں نے ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ارضِ بابل کی طرف سے ہجرت کی تھی۔ بعض نے کہا کہ ان کا باپ پارسی اور ماں رومی تھی۔ بعض نے اس کے برعکس کہا۔ پھر کسی نے کہا کہ ان کا نام عامر تھا اور کسی نے کہا کہ بلیا بن ملکان اور کسی نے کہا کہ بلیا بن کلمان اور کسی نے کہا کہ معمر بن مالک۔

رہی کنیت ابو العباس، سو اس پر سب کا اتفاق ہے۔[1] (قاله النووي) جس نے کہا کہ خضر علیہ السلام نبی تھے، اس کی دلیل یہ آیت ہے: ﴿ وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ﴾ (آیتِ باب)۔ کیوں کہ اس کا ظاہر یہ ہے کہ خضر علیہ السلام نے یہ سب کام اللہ کے حکم سے کیے تھے اور اصل کسی واسطہ کا نہ ہونا ہے۔ امام ثعلبی رحمہ اللہ نے کہا کہ خضر علیہ السلام نبی ہیں تمام اقوال میں۔ پھر کسی نے کہا کہ نبی غیر مرسل ہیں اور کسی نے کہا کہ اپنی قوم کے رسول تھے، قوم نے ان کی بات قبول کی۔ رمانی اور ابن الجوزی رحمہ اللہ نے اسی کی نصرت کی ہے۔ ایک جماعتِ صوفیہ کا قول یہ ہے کہ ولی ہیں۔ علی بن موسیٰ حنبلی اور ابن الانباری اور قشیری رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں، کسی نے ان کو فرشتہ ٹھہرایا ہے۔[2]

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ میں کہا ہے کہ پہلے اہلِ کتاب کے عام لوگوں کے قول کے مطابق خضر فریدون کے زمانے میں بادشاہ تھے اور بعض نے کہا کہ ذو القرنین اکبر کے پہلے لوگوں میں سے تھے۔[3] ان کے اس قصے کو ایک جماعت نے ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ایک خیثمہ بن سلیمان رحمہ اللہ ہیں۔[4] رہی خضر علیہ السلام کی عمر۔ سو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: خضر علیہ السلام کی عمر میں اتنی تاخیر کی گئی ہے، حتی کہ وہ دجال کے زمانے کو پائیں گے اور اسی کی تکذیب کریں گے۔[5] ابو مخنف رحمہ اللہ نے کہا کہ علمائے حدیث کا اس بات پر اجماع ہے کہ وہ سب آدمیوں میں زیادہ عمر والے ہیں، انھوں نے چشمہ آبِ حیوان سے پانی پیا ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا کہ خضر علیہ السلام دریاؤں پر مقرر ہیں اور الیاس علیہ السلام جنگلوں پر اور وہ ہر سال کے موسم میں اکٹھے ہوتے ہیں۔[6]

ابان رحمہ اللہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ ان کا اجتماع ہر رات یاجوج ماجوج کے ردم کے نزدیک ہوا کرتا ہے۔[7] اس کی

[1] المنهاج (١٥/ ١٣٦)
[2] الإصابة لابن حجر (٢/ ٢٨٨۔ ٢٨٩)
[3] تاريخ الطبري (١/ ٢٢٠)
[4] تاريخ دمشق (١٧/ ٣٤٦۔ ٣٤٧)
[5] تاريخ دمشق (١٦/ ٤٠٠) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ کا سماع سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت نہیں ہے۔
[6] الإصابة (٢/ ٢٩١۔ ٢٩٣)
[7] الإصابة (٢/ ٢٩٣) اس کی سند میں ''ابان'' اور ''عبدالرحیم'' سخت ضعیف راوی ہیں۔

سند میں دو راوی متروک ہیں۔ امام نووی رحمہ اللہ نے تہذیب میں کہا ہے کہ اکثر علما کا قول یہ ہے کہ ہمارے درمیان وہ زندہ موجود ہیں۔ اور صوفیہ رحمہم اللہ نے اس پر اتفاق کیا ہے اور اہلِ صلاح و معرفت بھی اسی پر متفق ہیں اور رویتِ خضر اور اُن سے ملاقات اور اُن سے علم حاصل کرنے اور سوال کرنے اور مقاماتِ شریفہ اور مواطنِ خیر میں خضر علیہ السلام کی موجودگی کے بارے میں بے شمار حکایات ہیں۔ ابن الصلاح رحمہ اللہ نے کہا کہ خضر علیہ السلام جمہور علما و عام صلحا کے نزدیک زندہ ہیں۔ بعض محدثین نے بطور شذوذ خضر کا انکار کیا ہے۔[1] اور بعض نے کہا کہ ہر زمانے کے لیے ایک خضر ہوتا ہے، لیکن اس دعوے پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ امام سہیلی رحمہ اللہ نے کہا کہ خضر علیہ السلام کے باپ کا نام عامیل تھا، ان کے باپ بادشاہ تھے، یہی وہ شخص ہیں جن کو دجال قتل کر کے پھر زندہ کرلے گا۔

امام بخاری اور اہلِ حدیث کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ خضر علیہ السلام ہجرت کے ایک سو سال پورے ہونے سے پہلے وفات پا گئے۔ اسی کی تائید ابوبکر بن عربی نے بھی کی ہے[2] اس حدیث کی رو سے جو پہلے گزر چکی ہے۔ یہ حدیث مختلف الفاظ سے صحیحین وغیرہما میں سیدنا جابر اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔[3] حیاتِ خضر علیہ السلام کے قائل نے یہ جواب دیا ہے کہ خضر علیہ السلام اس وقت دریا پر تھے، لیکن یہ جواب نہایت سرد ہے اور صحیح ہونے سے دور تر۔

ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے حدیثِ تعزیت کو تمہید میں ذکر کیا ہے اور الیاس علیہ السلام کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ملاقات کرنا بھی ذکر کیا ہے۔ بعض نے کہا ہے اور اسی طرح حافظ ابوالخطاب بن دحیہ نے کہا ہے کہ کسی طریق سے خضر علیہ السلام کا موسیٰ علیہ السلام کے سوا کسی نبی سے ملنا ثابت نہیں ہوتا اور جو کچھ خضر علیہ السلام کی حیات کے بارے میں آیا ہے، وہ صحیح نہیں ہے۔ اس پر اہلِ نقل کا اتفاق ہے اور جو کچھ مشائخ کہتے ہیں اس پر تعجب ہوتا ہے۔ بھلا کوئی عقل مند شخص کسی آشنا بزرگ کو دیکھے اور وہ کہے کہ میں فلاں ہوں، اس کی تصدیق کرسکتا ہے اور حدیثِ تعزیہ موضوع ہے۔ اس کی سند میں ابن محرز متروک ہے۔

امام مسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب میں نے ابن محرز کو دیکھا تو مجھے اونٹ کی مینگنی اس سے اچھی معلوم ہوئی[4] اور جو روایت اس سلسلے میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ بھی موضوع ہے۔ احمد، یحییٰ، اسحاق اور ابو زرعہ سے اس کی تکذیب مروی ہے اور متن کا سیاق ظاہری طور پر نا قابلِ قبول ہے۔ یہ حدیث محض ایک گپ ہے اور جو شخص خضر علیہ السلام کی حیات کا قائل ہے اس نے آبِ حیات کے چشمے کے ساتھ تمسک کیا ہے۔ یہ قصہ صحیح بخاری اور ترمذی میں مروی ہے،[5] لیکن رفعاً ثابت نہیں ہے کہ لائقِ حجت سمجھا جائے۔ ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے جو مرفوع حدیث آئی ہے[6] وہ خضر علیہ السلام کے نبی ہونے پر دلیل ہے اور اس کی سند بھی حسن ہے اگر عنعنہ بقیہ ضعیف نہ ہوتا۔ علی بن موسیٰ رضا اور بخاری رحمہ اللہ کا

---

[1] تهذيب الأسماء (١/ ١٧٦۔ ١٧٧) [2] الإصابة (٢/ ٢٩٤۔ ٢٩٥)

[3] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [4] صحيح مسلم (١/ ١٢)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٥٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٤٩) [6] المعجم الكبير (٨/ ١١٢)

مذہب یہی ہے کہ خضر علیہ السلام فوت ہو چکے اور اُن کے بقا کے منکر ہیں، اس حدیث کی رو سے جو پہلے گزر چکی ہے اور جس میں سو سال کا ذکر ہے۔ یہ خضر علیہ السلام کی موت پر عمدہ دلیل ہے۔

ابو حیان رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں کہا ہے کہ جمہور اسی پر ہیں کہ خضر علیہ السلام وفات پا چکے ہیں۔ ابن ابو الفضل مرسی رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں کیونکہ اگر وہ زندہ ہوتے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے اور ایمان لاتے اور تابع ہوتے۔ حدیث میں مروی ہے: «لَوْ كَانَ مُوْسىٰ حَيًّا مَا وَسِعَهُ إِلَّا اتِّبَاعِيْ» [1] ابن المناوی، ابراہیم حربی اور ابو طاہر عبادی رحمہم اللہ نے اسی کے ساتھ جزم کیا ہے۔ صحیح مسلم میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے ایک ماہ پہلے فرما دیا تھا: «أُقْسِمُ بِاللّٰهِ مَا عَلَى الْأَرْضِ نَفْسٌ مَنْفُوْسَةٌ يَأْتِيْ عَلَيْهَا مِائَةُ سَنَةٍ» ترمذی کے پاس اس حدیث کے الفاظ اور طرق ہیں۔[2] خضر علیہ السلام کے موجود نہ ہونے پر ابو یعلی حنبلی، و ابو الفضل بن ناصر، قاضی ابوبکر بن العربی، ابوبکر بن نقاش اور ابن الجوزی رحمہم اللہ نے جزم کیا ہے اور بہت سے دلائل دیے ہیں، ان میں سے بعض اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: «مَا بَعَثَ اللّٰهُ نَبِيًّا إِلَّا أَخَذَ عَلَيْهِ الْمِيْثَاقَ أَنْ بُعِثَ مُحَمَّدٌ وَهُوَ حَيٌّ لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ وَلَيَنْصُرَنَّهُ» [3] [اللہ تعالیٰ نے جس کسی نبی کو بھی مبعوث کیا تو اس سے یہ عہد لیا کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعثت کے وقت وہ زندہ ہو تو وہ ضرور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور ان کی مدد کرے]

امام ابو الحسین مناوی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے خضر علیہ السلام کی عمر کے بارے میں بحث کی اور اس بارے میں کہ وہ باقی ہیں یا نہیں دیکھا تو اکثر غافل لوگ اسی دھوکے میں ہیں کہ وہ باقی ہیں، ان روایات اور احادیثِ مرفوعہ کے سبب سے جو اس بارے میں آئی ہیں، حالانکہ وہ واہی، یعنی فضول ہیں اور اُن کی سند متعلقہ اہلِ کتاب تک ساقط ہے، ان پر اعتبار نہ ہونے کی وجہ سے اور مسلم بن مصقلہ کی روایت خرافہ کی روایت کے مثل اور ریاح کی خبر ریح کی مثل ہے۔ ان کے سوا جو روایات ہیں وہ بے سروپا ہیں، کوئی ان میں دو حالتوں سے خالی نہیں ہے: یا تو وہ روایات ثقہ راویوں پر غفلت سے داخل ہوئیں، یا بعض نے ان کو عمداً اختیار کیا، حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۭ اَفَا۟ىِٕنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ٣٤] ''اور (اے نبی!) ہم نے آپ سے پہلے بھی کسی بشر کو ہمیشہ کی زندگی نہیں دی، پھر اگر آپ مر جائیں تو کیا وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں؟'' تفسیر اصفہانی میں امام حسن رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ خضر علیہ السلام وفات پا چکے ہیں۔ نیز امام حسن رحمہ اللہ سے ان کی حیات کی روایت بھی آئی ہے۔

---

[1] البحر المحيط (٦/ ١٣٩) نیز مرفوع حدیث کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٣٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٢٥٠)

[3] تفسير ابن كثير (١/ ٤٩٤)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کتاب اصابہ میں خضر علیہ السلام کے بارے میں بیان کیا ہے اور اہلِ روایات کی اسانید پر جرحاً وتعدیلاً بہت کچھ کلام فرمایا ہے۔ زیادہ روایات علت یا ضعف یا انقطاع یا اعضال یا وضع یا نکارت یا شذوذ سے خالی نہیں ہیں، کوئی صحیح استدلال خضر علیہ السلام کی زندگی اور اب تک ان کے بقا کے بارے میں، یا دجال کے خروج تک باقی رہنے کے بارے میں نہیں ہے۔ حق وہی ہے جو بخاری رحمہ اللہ اور اُن جیسے اور محدثین نے ذکر کیا ہے اور یہ بات ظاہر ہے کہ کسی کا قول حجت نہیں ہے، کوئی ہو کہیں ہو، مگر اللہ اور رسول کا قول۔

سو اس بارے میں کوئی نصِ صریح اور مرفوع حدیث مروی نہیں ہے کہ اس پر اعتماد کیا جائے اور اس کی طرف رجوع کریں۔ قرآن ظاہری طور پر ہمیشگی اور طویل عمر کی نفی کرتا ہے اور قرآن و حدیث قاضی ہیں اپنے علاوہ پر، اور اُن کے غیر اُن پر قاضی نہیں ہے اور جس نے کہا کہ خضر نبی یا مرسل یا حی باقی ہیں، اس نے کوئی روشن دلیل اور سلطان مبین پیش نہیں کی۔ وإذا جاء نهر الله بطل نهر معقل۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں بھی اس بارے میں تکلم کیا ہے۔[1]

میں کہتا ہوں کہ شیخ عبد الوہاب شعرانی ۔قدس سرہ۔ کی ایک کتاب "میزان الخضریه" ہے، اس میں خضر علیہ السلام کی اپنے زمانے تک حیات کا ذکر کیا ہے اور اُن کے ساتھ اولیا کی ملاقات کا ذکر کیا ہے اور ان عالی قدر اشخاص کے نام لیے ہیں جن سے ان کی ملاقات ہوئی، یہ سب آٹھ اشخاص ہیں۔ پھر خضر علیہ السلام نے کسی کو حفظِ ایمان وظیفہ سکھایا۔ ابن عربی صاحب فتوحات کا ان سے ملنا اور اُن کے ہاتھ سے صوفیہ کا لباس (گدڑی) پہننے کا ذکر کیا ہے، پھر سولہ اشخاص کا نام لیا ہے کہ ان سے خضر علیہ السلام کی ملاقات ہوتی تھی۔ یافعی رحمہ اللہ سے ان کی حیات تا ایامِ دجال پر قوم کا اجماع نقل کیا ہے۔ پھر خضر علیہ السلام کے مقام کا حال لکھا ہے۔

میں خیال کرتا ہوں کہ یہ سب صلحا کے اوہام (وہم) ہیں۔ یہ قوم اپنے حسنِ ظن سے ہر امر کی قائل ہے اور اجماع کا دعویٰ خصوصاً ایامِ دجال تک کی بقا کا محض باطل ہے، کیوں کہ جس طرح اہلِ علم و معرفت کی ایک جماعت کو خضر علیہ السلام کی حیات اور بقا کا گمان ہے، اسی طرح ایک عظیم جماعت صوفیہ و علما عدمِ حیات و بقا و عدمِ وجود کی طرف گئی ہے، پھر اجماع کہاں رہا۔ نظامی گنجوی رحمہ اللہ بھی اپنی شاگردی خضر علیہ السلام کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور اکثر بندوں نے ذکر کیا ہے کہ انھوں نے وظائف اور اوراد کی تعلیم اور مقاماتِ باطن کا فہم و ادراک خضر علیہ السلام سے کیا ہے اور خضر علیہ السلام سے ملاقات کرنے اور ان سے علم اور فہم حاصل کرنے کو اپنے لیے قابلِ فخر اشیا میں سے سمجھا ہے، لیکن یہ بہت ہی بعید از قیاس ہے کہ خضر علیہ السلام نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ ملیں اور نہ کسی صحابی و تابعی و تبع تابعی سے ملیں اور جب وہ زمانہ گزر جائے، جس کے بہتر ہونے کی خبر دی گئی ہے اور دین میں فساد، بدعات اور جھوٹ کا زمانہ آیا، تب خضر علیہ السلام نے آحادِ امت وغیرہم سے بہ کثرت ملنا اور ملاقات کرنا اور انھیں تعلیم و تفہیم کرنا شروع کیا؟

---

[1] الإصابة (٢/ ٢٨٨۔ ٣٣٤) فتح الباري (٨/ ٤١٢۔ ٤٢٥) فتح البيان (٨/ ٩٣۔ ١٠١)

عقلِ سلیم اور ذہنِ مستقیم میں یہ امر ہرگز قابلِ تسلیم نہیں ہوسکتا، بلکہ ایسے دعوے طویل اور لمبے چوڑے معاملات اس بات کے مقتضی ہیں کہ شریعتِ اسلامیہ گویا اپنے ظاہر و باطن میں ناتمام اور نامکمل ہے، حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ﴾ [المائدة: ٣] ''آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور میں نے پسند کر لیا تمھارے لیے اسلام کو بطورِ دین کے۔'' یہ اُمت تمام اُمتوں سے افضل ہے اور اس اُمت کے نبی تمام نبیوں سے زیادہ عزت والے اور خاتم رسل ہیں اور یہ شریعتِ محمدیہ۔علی صاحبها الصلاة والتحية۔اکمل ترین شریعت ہے۔

پھر اس امت کے علما، صلحا، زہاد، عباد، صوفیہ اور فقرا کا خضر علیہ السلام کی طرف نیاز مند ہونا، اگر نقصِ دین اور ارکانِ اسلام میں رخنہ اندازی نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟! آفتابِ قرآن اور ماہتابِ سنتِ رسول الثقلین ﷺ کے آگے کسی مشعل و چراغ و کوکب کی حاجت نہیں ہے۔ ہمارے دل کو نہایت تکلیف ہے کہ بعض اشخاص اور اکابر اُمت کو کیا مصیبت پڑی کہ انھوں نے ایسے امور میں غور وخوض کیا، بجز اس کے کہ ”ماقدروا الله حق قدره، و ما قدروا الرسول حق قدره، و ما قدروا دين الإسلام حق قدره“ اور کیا کہا جائے، وہ کون سا کمالِ ظاہر و جمالِ باطن ہے جو اتباعِ کتاب وسنت سے علی وجہہا حاصل نہیں ہوسکتا کہ ہم خضر علیہ السلام کے اردگرد پھریں اور کسی کمال و جمال کی بنیاد محض وہموں اور خیالات پر رکھیں۔

ایسے معاملات کا فیصلہ کرنے کے لیے اس اُمت میں ہر قرن میں عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسا شخص درکار ہے، لیکن الحمد للہ تعالیٰ کہ اگر عمر رضی اللہ عنہ باقی نہیں رہے تو ان کے حق پرست خلفا، یعنی علمائے راسخین اور محدثین ائمہ تیر وتلوار کے بجائے اپنے بیان سے قدیماً وحدیثاً بہ خوبی حق کی اشاعت کرتے رہتے ہیں، اب جس کا جی چاہے مانے اور جس کا جی چاہے نہ مانے، جو مفاسد اُن بے اصل اعتقادات سے اس اُمت میں پیدا ہوئے ہیں، خصوصاً فرقہ متصوفہ اور پیر پرست اور گور پرست قسم کے لوگ، وہ اہلِ حق پر مخفی نہیں ہیں۔ جہلا کو خضر علیہ السلام سے ملاقات کا جس قدر ذوق وشوق ہے، اتنا شوق کتبِ تفسیر و حدیث کے مطالعے کا نہیں ہے اور جو وقعت اور قدر خضر علیہ السلام سے منسوب تعلیمات وتفہیمات کی ہے، وہ وقعت آیاتِ بینات اور سننِ مطہرات کی نہیں ہے۔فإنا لله على غربة الإسلام، وضعف الإيمان، وذهاب الإحسان.

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ﴿٨٣﴾ اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ﴿٨٤﴾

اور (یہ لوگ) آپ سے ذوالقرنین کے متعلق پوچھتے ہیں۔ آپ کہہ دیجیے: عن قریب میں اس کا کچھ ذکر تمھارے سامنے تلاوت کروں گا (83) بے شک ہم نے اسے زمین میں اقتدار دیا اور اسے ہر چیز سے اسباب دیے (84)

ذوالقرنین کا قصہ:

اس بادشاہ کو ذوالقرنین اس لیے کہتے ہیں کہ وہ دنیا کے دونوں سروں پر مشرق و مغرب پر پھر گیا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ سکندر کا لقب تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ کوئی بادشاہ پہلے گزرا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ اے محمد! تم سے ذوالقرنین کا حال پوچھتے ہیں۔ پہلے ہم نے ذکر کیا ہے کہ کفارِ مکہ نے اہلِ کتاب کے پاس ایک شخص کو بھیجا کہ ایسا سوال بتاؤ جس سے ہم نبی اکرم ﷺ کا امتحان لیں۔ انھوں نے کہا کہ تم پوچھو کہ وہ شخص جس نے زمین کا طواف کیا وہ کون تھا اور اس کا کیا قصہ ہے؟ اور کہف کے جوانوں کا حال دریافت کرو اور روح کا سوال کرو، اس پر سورۃ الکہف اُتری۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اور اموی رحمہ اللہ نے مغازی میں اس جگہ ایک حدیث روایت کی ہے، اس کی سند ضعیف ہے، وہ حدیث سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہود کے کچھ لوگ نبی اکرم ﷺ کے پاس آئے اور ذوالقرنین کا حال پوچھا، نبی اکرم ﷺ نے ابتداءً ان کو خبر دی۔ من جملہ اس خبر کے ایک یہ بات فرمائی کہ روم میں ایک جوان تھا، اس نے شہر اسکندریہ بنایا، اس کو ایک فرشتہ آسمان پر لے گیا اور وہ سدّ کے پاس گیا، یعنی ایسی قوموں کے پاس جن کے چہرے کتوں کے چہروں کی طرح تھے۔[1] الحدیث۔

اس میں طول اور نکارت ہے اور اس حدیث کا مرفوع ہونا صحیح نہیں ہے۔ یہ خبریں اکثر بنی اسرائیل سے آئی ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ امام ابو زرعہ رازی رحمہ اللہ نے باوجود جلالتِ قدر کے اس حدیث کو بطولہ اپنی کتاب ”دلائل النبوۃ“ میں ذکر کیا، ان سے ایسا ہونا بہت ہی عجیب و غریب ہے۔ اس حدیث میں ایک نکارت یہ ہے کہ اس شخص کو رومی کہا ہے، حالانکہ جو شخص روم کا ہے وہ سکندر ثانی ہے، جو فیلیس مقدونی کا بیٹا ہے جس سے روم کی تاریخ مقرر کرتے ہیں۔ اسکندر اول کا ذکر ازرقی وغیرہ نے اس طرح کیا ہے کہ اس نے ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ خانہ کعبہ کی تعمیر کے ابتدائی ایام میں خانہ کعبہ کا طواف کیا تھا، وہ ابراہیم علیہ السلام پر ایمان لایا تھا اور خلیل جلیل علیہ السلام کا متبع تھا اور اس کے وزیر خضر علیہ السلام تھے۔ رہا اسکندر ثانی مقدونی یونانی اس کا وزیر ارسطو فلسفی مشہور تھا۔ واللہ أعلم۔ اسی سے مملکتِ روم کی تاریخ ٹھہرائی جاتی ہے، یہ مسیح علیہ السلام سے تقریباً تین سو برس پہلے تھا اور جس شخص کا ذکر اس جگہ قرآن میں ہے وہ خلیل جلیل علیہ السلام کے زمانے میں تھا، جب بیت العتیق (بیت اللہ) کی تعمیر کی گئی۔ اس نے ابراہیم علیہ السلام کے ہمراہ طواف کیا اور اللہ تعالیٰ کی طرف قربانی پیش کی۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کے بعد کہا ہے کہ ہم نے اس کا تفصیلی ذکر کتاب ”البدایۃ والنہایۃ“ میں کیا ہے۔[2] وللہ الحمد.

---

[1] تفسیر الطبري (١٨/ ٩٢) اس کی سند میں ”عبدالرحمٰن بن زیاد“ اور ”ابن لہیعہ“ ضعیف راوی ہیں۔ نیز سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔

[2] تفسیر ابن کثیر (٣/ ١٣٥۔ ١٣٦) البدایۃ والنہایۃ (٢/ ١٠٢۔ ١٠٧)

وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ ایک بادشاہ تھا، اس کو ذوالقرنین اس لیے کہتے تھے کہ اس کے سر کے دونوں اطراف نحاس (پیتل) کے تھے۔[1] بعض اہلِ کتاب کہتے ہیں کہ وہ روم و فارس کا مالک تھا۔ بعض نے کہا کہ اس کے سر کے دونوں طرف کچھ سینگ سے تھے، وہ ایک اللہ کی طرف دعوت دینے والا شخص تھا۔ اس نے اپنی قوم کو اللہ کی طرف دعوت دی۔ قوم نے اس کے قرن پر مارا، وہ مرگیا، اللہ تعالیٰ نے پھر اس کو زندہ کر دیا، اس نے پھر قوم کو اللہ کی طرف بلایا، قوم نے پھر اس کے قرن پر مارا، وہ مرگیا۔ اس کا نام ذوالقرنین پڑ گیا۔ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح روایت ہے۔[2]

بعض نے کہا کہ یہ نام اس لیے ہوا کہ وہ مشارق اور مغارب تک پہنچا، جہاں سے سورج کا سینگ نکلتا ہے اور جہاں ڈوبتا ہے۔ تمکین ارض سے یہ مراد ہے کہ ہم نے اس کو ایک عظیم ملک دیا، جو کچھ بادشاہوں کے لیے ہونا چاہیے، یعنی لشکر، آلاتِ حرب اور قلعے وغیرہ وہ سب اسے عطا کیے۔ لہٰذا وہ زمین کے مشرق و مغرب کا بادشاہ ہوگیا اور سارے شہر اس کے قابو میں آگئے اور بندوں کے ملوک اور سردار اس کے ماتحت ہوگئے اور عرب و عجم کی اُمتوں نے اس کی خدمت کی۔ لہٰذا بعض نے وجہ تسمیہ یہی بیان کی ہے کہ وہ ہر دو قرنِ شمس، یعنی مشرق و مغرب تک پہنچا۔[3]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، سعید بن جبیر، عکرمہ، سدی، قتادہ اور ضحاک رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا ہے کہ سبب سے مراد علم ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کا دوسرا قول یہ ہے کہ سبب سے مراد منازل اور اعلامِ (نشاناتِ) ارض ہیں۔ ابن زید رحمہ اللہ نے کہا کہ زبانوں کی تعلیم ہے، جس قوم سے لڑتا، اس قوم سے اسی قوم کی زبان میں بات چیت کرتا۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے کعب احبار رحمہ اللہ سے کہا تھا کہ تو کہتا ہے کہ ذوالقرنین اپنی گھوڑی ثریا سے باندھتا تھا۔ کعب رحمہ اللہ نے

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٩٣) [2] تفسير الطبري (١٨/ ٩٣)

[3] ذوالقرنین کی شخصیت کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ کے حوالے سے تفسیر ''احسن البیان'' میں جو تحریر کیا گیا ہے، وہ حسب ذیل ہے: ''مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے اس شخص کی دریافت میں جو محنت و کاوش کی ہے وہ نہایت قابلِ قدر ہے۔ ان کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے: ① اس ذوالقرنین کی بابت قرآن نے صراحت کی ہے کہ وہ ایسا حکمران تھا جس کو اللہ نے اسباب و وسائل کی فراوانی سے نوازا تھا۔ ② وہ مشرقی اور مغربی ممالک کو فتح کرتا ہوا ایک ایسے پہاڑی درے پر پہنچا جس کی دوسری طرف یاجوج اور ماجوج تھے۔ ③ اس نے وہاں یاجوج و ماجوج کا راستہ بند کرنے کے لیے ایک نہایت محکم بند تعمیر کیا۔ ④ وہ عادل، اللہ کو ماننے والا اور آخرت پر ایمان رکھنے والا تھا۔ ⑤ وہ نفس پرست اور مال و دولت کا حریص نہیں تھا۔''

مولانا مرحوم فرماتے ہیں کہ ان خصوصیات کا حامل صرف فارس کا وہ عظیم حکمران ہے جسے یونانی سائرس، عبرانی خورس اور عرب کیخسرو کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس کا دورِ حکمرانی ۵۳۹ قبل مسیح ہے۔ نیز فرماتے ہیں کہ ۱۸۳۸ء میں سائرس کے ایک مجسمے کا بھی انکشاف ہوا جس میں سائرس کا جسم اس طرح دکھایا گیا ہے کہ اس کے دونوں طرف عقاب کی طرح پر نکلے ہوئے ہیں اور سر پر مینڈھے کی طرح دو سینگ ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ''تفسیر ترجمان القرآن'' (۱/ ۳۹۹۔ ۴۳۰، طبع قدیم) واللہ أعلم بالصواب. (تفسیر احسن البیان از حافظ صلاح الدین یوسف)۔ [ص۔ی]

کہا کہ اگر میں نے یہ بات کہی ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ﴾[1] (آیتِ بات)۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے جس بات کا انکار کعب پر کیا، یہی بات ٹھیک ہے اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اس انکار میں حق پر ہیں۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ ہم کعب کے جھوٹ کا امتحان لیتے ہیں، یعنی نقل کرنے میں نہ یہ کہ کعب عمداً وہ نقل کرتے ہیں جو ان کے صحیفوں میں نہ ہوتی۔ لیکن بحث صحیفوں میں ہے کہ وہ اسرائیلیات تھے، جو غالباً تبدیل اور تحریف کیے ہوئے ہیں اور بناوٹی صحیفے ہیں۔ ہم کو اللہ اور رسول کے خبر دینے کے بعد ان کی طرف کچھ حاجت نہیں ہے۔ اس لیے کہ انھیں اسرائیلیات سے ایک شرِ کثیر اور فسادِ عریض لوگوں پر داخل ہوا ہے اور کعب کی اپنے قول کے لیے تاویل اور آیت کو بطورِ استشہاد اپنے صحیفوں میں سے نقل کی ہوئی باتوں پر پیش کرنا کہ وہ اپنے گھوڑے کو ثریا سے باندھا کرتا تھا، صحیح نہیں ہے اور نہ ہی دلیل کے مطابق ہے۔

اس لیے کہ کسی بشر کے لیے اُن میں سے کسی چیز تک پہنچنا ممکن نہیں اور نہ اس کے آسمانوں کی طرف جانے کے اسباب تک اس کی رسائی ہوسکتی ہے۔ حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے بلقیس کے بارے میں فرمایا ہے: ﴿ وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ [النمل: ٢٣] ''اور اسے (ضرورت کی) ہر چیز عطا کی گئی ہے۔'' یعنی جو بادشاہوں کو دیا جاتا ہے، وہ سب اس کو دیا گیا تھا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کے لیے اسباب، یعنی سلطنتوں اور شہروں کو فتح کرنے کے راستے اور وسائل اور دشمنوں کی کمر توڑنے اور زمین کے بادشاہوں کو اوندھا کرنے اور اہلِ شرک کو ذلیل کرنے کا کام آسان کر دیا تھا اور اسے ایک سبب عطا فرمایا تھا کہ ہر شے اس کی محتاج ہوگئی تھی۔ واللہ أعلم. حافظ ضیا مقدسی رحمہ اللہ نے مختارہ میں حبیب بن حماز رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ میں سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے پاس تھا، ایک شخص نے پوچھا کہ ذوالقرنین کس طرح مشرق و مغرب تک پہنچا؟ کہا کہ اللہ تعالیٰ نے بادلوں کو ان کے لیے مسخر کر دیا تھا اور تمام اسباب انھیں مہیا کر دیے تھے اور پوری قوت و طاقت دے دی تھی۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ ذوالقرنین کے بارے میں یہود نے سوال از راہِ تعنت (مشکل میں ڈالنے کے لیے) کیا تھا۔ ذوالقرنین کے بارے میں بہت اختلاف ہے۔ کسی نے کہا کہ اسکندر بن فیلقوس ہے، جو ساری دنیا کا مالک ہوگیا تھا۔ وہ یونان بن یافث بن نوح کی اولاد ہے۔ کسی نے کہا کہ ہرمس بادشاہ تھا۔ کسی نے کہا کہ ایک رومی جوان تھا۔ کسی نے کہا کہ نبی تھا۔ کسی نے کہا کہ ایک نیک بندہ تھا۔ کسی نے کہا کہ عبداللہ بن ضحاک نام تھا۔ کسی نے کہا

---

[1] تفسیر الطبري (١٨/ ٩٤۔ ٩٥) تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٨٣) تفسیر ابن کثیر (٣/ ١٣٦)

[2] المختارة للحافظ المقدسي (٢/ ٣٢) تفسیر ابن کثیر (٣/ ١٣٦۔ ١٣٧)

کہ کہلان بن سبا کی اولاد سے مصعب بن عبد اللہ تھا۔ امام سہیلی رحمہ اللہ نے کہا کہ علمِ اخبار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دو شخص تھے: ایک ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں، دوسرا عیسیٰ علیہ السلام کے قریب کے زمانے میں۔[1] بعض نے کہا کہ ابو کرب حمیری تھا۔ بعض نے کہا کہ من جملہ ملائکہ کے ایک ملک تھا۔ امام رازی رحمہ اللہ نے پہلے قول کو ترجیح دی ہے اور کہا ہے کہ جس کا ملک وسعت اور قوت میں اس انتہا کو پہنچا تھا، جس کا ذکر اللہ کی نازل کردہ کتاب میں ہے، وہ اسکندر یونانی تھا۔

تاریخ کی کتب اسی کی شاہد ہیں۔ اس لیے یقین کرنا چاہیے کہ ذوالقرنین یہی اسکندر تھا، لیکن اس میں اشکال ہے، کیوں کہ وہ ارسطاطالیس حکیم کا شاگرد تھا اور اسی کے مذہب پر تھا۔ اس کو اللہ پاک کا اس عظمت کے ساتھ ذکر کرنا اس کا موجب ہے کہ ارسطاطالیس کا مذہب سچا ہو، لیکن اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔[2] نیشا پوری نے کہا کہ میں کہتا ہوں کہ ہر مذہبِ فلاسفہ باطل نہیں، شاید اس نے جو صحیح ہو اسے لے لیا ہو اور جو غلط ہو اسے چھوڑ دیا ہو۔[3] واللہ أعلم۔ میں کہتا ہوں کہ اتحادِ مذہب کی یہ بات شاگردی کی وجہ سے خیال کی گئی ہے، سو اگر واقعی وہ "ارسطو" کا شاگرد بھی ہو تو شاگرد کا استاد کے مذہب کو اختیار کر لینا، کچھ خارجی ضروریات میں سے نہیں ہے۔ ممکن ہے دنیاوی علوم و فنون میں اَخذ کیا ہو اور مذہب جداگانہ ہو۔ صدہا بلکہ ہزارہا لوگ اپنے اساتذہ کے مذہب کے خلاف ہوتے ہیں۔ ہر زمانے میں اس کا تجربہ موجود ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے امام سہیلی رحمہ اللہ کے قول کو ترجیح دی ہے کہ اسکندر دو شخص تھے: ذوالقرنین کے وزیر خضر علیہ السلام اور مقدونی کا وزیر ارسطو تھا۔[4] امام ابو السعود رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ سے حکایت کیا ہے کہ ہم نے جو یہ کہا کہ وہ دو شخص تھے۔ سو اس لیے کہ اکثر لوگ یہی اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ دونوں ایک تھے اور جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے وہ یہی شخص متاخر (بعد والا) تھا، حالاں کہ اس عقیدے سے خطائے کثیر اور فسادِ کبیر واقع ہوتا ہے اور کیوں کر نہ ہو کہ پہلا شخص ایک نیکوکار، مومن، دیندار بندہ تھا اور انصاف شعار بادشاہ تھا۔

خضر علیہ السلام اس کے وزیر با تدبیر تھے اور کسی نے اس کو نبی بھی کہا ہے اور دوسرا شخص کافر تھا اور اس کا وزیر ارسطاطالیس تھا اور دونوں شخصوں کے درمیان دو ہزار سال سے زیادہ کا فاصلہ ہے۔ فأين هذا من ذلك۔[5] شاید یہ عبارت حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کی کتاب "البداية والنهاية" میں ہوگی،[6] جس کو ہم نے نہیں دیکھا، ورنہ تفسیر ابن کثیر میں اسی قدر الفاظ ہیں جو اوپر گزرے اور کتبِ تاریخ سے دو ہی مردوں کا ہونا ثابت ہوتا ہے، جس طرح کہ امام سہیلی و ازرقی و حافظ ابن کثیر رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا ہے، نہ وہ بات جو امام رازی رحمہ اللہ نے ذکر کی ہے اور کہا کہ کتبِ تواریخ اسی کی شاہد ہیں۔ نظامی گنجوی رحمہ اللہ نے کتاب سکندر نامہ میں دونوں کو ایک سمجھ کر بحث کو خلط ملط کر دیا ہے، کوئی ماجرا

---

[1] تفسیر القرطبي (١١/ ٤٧) [2] تفسیر الرازي (٢١/ ١٣٩۔ ١٤٠) [3] فتح القدیر (٣/ ٤٢٣)
[4] تفسیر ابن کثیر (٣/ ١٣٦) [5] تفسیر أبي السعود (٥/ ٢٤١) [6] البداية والنهاية (٢/ ١٠٦)

شخصِ اول کا اور کوئی ماجرا شخصِ دوم کا نقل کیا ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ جو فنِ تاریخ کے بھی امام ہیں اپنی کتاب "الرد علی المنطقیین" میں فرماتے ہیں کہ مشہور متواتر یہ ہے کہ ارسطو وزیر اسکندر بن فیلبس تھا، مسیح علیہ السلام سے تقریباً تین سو سال پہلے اور بہت سے جاہلوں کا یہ گمان ہے کہ جس ذوالقرنین کا ذکر قرآن میں آیا ہے، وہ یہی شخص تھا اور ارسطو کی تعظیم کرتا تھا، اس لیے کہ اس کا وزیر تھا، جس طرح کہ ابن سینا۔ اور ابن سینا وغیرہ کی مثال جہال نے اخبارِ امم سے ذکر کی ہے۔ سو یہ ان کی جہالت ہے، اس لیے کہ وہ اسکندر جس نے ارسطو کو اپنا وزیر کیا تھا وہ مقدونی ہے، جس سے یہود و نصاریٰ نے روم کی تاریخ مقرر کی ہے وہ صرف قدس کی سرزمین تک گیا تھا، سد تک نہیں پہنچا۔

خبروں کو پہچاننے والے اس کو جانتے ہیں اور وہ ایک مشرک بت پرست تھا۔ اسی طرح ارسطو اور اس کی قوم مشرک اور بت پرست تھی اور ذوالقرنین موحد مومن باللہ تھے اور اس مقدونی سے پہلے تھے، جو کہتا ہے کہ ان کا نام اسکندر تھا وہ ان کو اسکندر بن فیلبس بتاتا ہے۔ لہٰذا جو لوگ عقل و دین سے دور تر ہیں، جیسے: قرامطہ و باطنیہ جو یونان کے مذہبِ فلسفہ پر اور مجوس کے دین پر چلتے ہیں اور رفض کا اظہار کرتے ہیں اور جیسے متفلسفہ اور اہلِ کلام ہیں، جن پر متفلسفہ کا داؤ خوب چلتا ہے، جو جاہلیت کی دولت رکھتے ہیں جو کہ علم اور ایمان سے بہت دور ہے اور کافرین یا منافقین میں کہ ان پر ایسے اُمور کا رواج بہ خوبی ہو جاتا ہے، جس طرح کہ ملحد منافقین پر، پھر مشرکینِ ترک پر رواج ہو گیا ہے، اسی طرح ہمیشہ کفار و منافقین پر، جو کہ اللہ اور رسول کے دشمن ہیں، یہ داؤ پیچ چلتا رہتا ہے۔[1]

رہی وجہ تسمیہ، سو امام زجاج اور ازہری رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ وہ قرنِ آفتاب تک مشرق و مغرب میں پہنچا تھا، اس لیے ذوالقرنین کہلایا، یا اس کی دو چوٹیاں تھیں، بالوں کی چوٹی کو قرن کہتے ہیں۔[2] یا اس نے اپنے اول ملک میں یہ دیکھا کہ وہ آفتاب کے ہر دو قرن پر قابض ہوا ہے۔ یا اس کے دو قرن تھے عمامہ کے نیچے۔ یا دعوت الی اللہ دوبارہ کی۔ ہر دو قرن پر مارا گیا تھا یا وہ کریم الطرفین تھا، ماں باپ دونوں کی طرف سے اہلِ بیت شرف میں سے تھا، یا اس کے وقت میں لوگوں کے دو قرن گزر چکے تھے، یا جنگ میں دونوں ہاتھوں سے لڑتا تھا، یا ظاہر و باطن کا عالم تھا، یا نور و ظلمت میں گیا تھا، یا فارس اور روم کا بادشاہ ہو گیا تھا، یا روم و ترک کا بادشاہ تھا، یا مغرب و مشرق اور شمال و جنوب کی حد تک پہنچا تھا اور زمین اسی قدر آباد بھی ہے یا اس کے تاج میں دو قرن تھے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ میں نہیں جانتا کہ تبع نبی تھا یا نہیں اور نہیں جانتا کہ ذوالقرنین نبی تھا یا نہیں اور میں نہیں جانتا کہ حدود اپنے اہل کے لیے کفارات میں ہیں یا نہیں۔[3] (أخرجه عبد الرزاق

---

[1] الرد علی المنطقیین (١/ ١٨٢۔ ١٨٧) [2] فتح القدير (٣/ ٤٢٤)

[3] مستدرك الحاكم (١/ ٩٢)۔ "مستدرك الحاكم" (٢/ ١٧) ہی میں دوسری جگہ اسی روایت کے الفاظ کچھ یوں ہیں: ((مَا أَدْرِيْ أَتُبَّعٌ لَعِينًا كَانَ أَمْ لَا ...)) امام البانی رحمہ اللہ نے انہی الفاظ کی توثیق کی ہے اور کہا ہے کہ "نبی" کے الفاظ کاتب کی غلطی ہے۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے ←

و ابن المنذر و الحاکم و صححه وغیرهم) سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ذوالقرنین نہ نبی تھے نہ ملک، لیکن ایک عبدِ صالح تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کو دوست رکھتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو دوست رکھا، انھوں نے اللہ کی خیر خواہی کی، اور اللہ نے ان کی خیر خواہی کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک قوم کی طرف بھیجا۔ قوم نے ان کے قرن کو مارا، وہ مر گئے، پھر اللہ تعالیٰ نے اس قوم سے جہاد کرنے کے لیے ان کو زندہ کر دیا، اور اس قوم کی طرف بھیجا۔ قوم نے پھر اُن کے دوسرے قرن کو زخمی کیا، وہ مر گئے، اللہ تعالیٰ نے پھر دوبارہ زندہ کر دیا، تاکہ وہ قوم سے جہاد کریں، اس لیے ان کا نام ذوالقرنین ہوا اور تمھارے درمیان ان کی مثال ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ذوالقرنین نبی تھے۔[2]

ایک حدیث میں مروی ہے کہ وہ زمین میں مع اسباب کے سیاحت کرتے پھرتے بادشاہ تھے۔[3] (أخرجه ابن أبي حاتم) سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا، وہ پکارتا تھا: یا ذوالقرنین۔ کہا کہ تم نے پیغمبروں کے نام تو رکھ لیے، اب تمھارا کیا حال ہے کہ تم ملائکہ کے نام رکھتے ہو؟![4] سیدنا عتبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کو امام سیوطی رحمہ اللہ نے بھی درمنثور میں لکھا ہے۔[5] وہ حدیث منکر ہے، جیسے پہلے گزرا۔ نیز ایک اور طویل حدیث وہب بن منبہ رحمہ اللہ سے نقل کی ہے اور اس کو اسحاق اور ابن منذر رحمہ اللہ کی طرف منسوب کیا ہے، اس میں بہت سی منکر اشیا ہیں، اسی طرح ایک طویل حدیث محمد باقر رحمہ اللہ سے روایت کی ہے، جس کو ابو الشیخ رحمہ اللہ وغیرہ نے ذکر کیا ہے،[6] شاید یہ اخبار اور اس کے مثل دوسری احادیث اہلِ کتاب سے منقول ہیں، لیکن ہم کو حکم ہے کہ ہم اہلِ کتاب کی نہ تصدیق کریں اور نہ تکذیب۔

ذوالقرنین کا زمانہ:

اس میں اختلاف ہے کہ ذوالقرنین کب تھے؟ ایک قوم نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد تھے۔ دوسری قوم نے کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد فترت میں تھے، یعنی عیسیٰ علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیانی مدت میں۔ تیسری قوم نے کہا کہ ابراہیم خلیل علیہ السلام اور اسماعیل جلیل علیہ السلام کے زمانے میں تھے، اس کی تحقیق رسالہ ''لقطة العجلان'' میں دیکھنا چاہیے۔ ایک روایت میں مروی ہے کہ روئے دنیا کے بادشاہ چار ہوئے، دو مومن اور دو کافر: مومن سلیمان بن داود علیہ السلام اور سکندر ذوالقرنین تھے اور کافر نمرود و بختِ نصر اور عن قریب اس اُمت کا ایک شخص تمام دنیا کا پانچواں بادشاہ ہوگا، اللہ تعالیٰ کے اس قول کی رو سے: ﴿ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ﴾ [التوبة: ٣٣] ''تاکہ اسے سب دینوں پر غالب کرے۔'' اور

← بھی انھی الفاظ کے ساتھ درمنثور میں یہ روایت ذکر کی ہے۔ دیکھیں: السلسلة الصحيحة، رقم (٢٢١٧) الدر المنثور (٥/ ٤٣٥)

(1) تفسير الطبري (١٨/ ٩٣) الدر المنثور (٥/ ٤٣٥۔ ٤٣٦) (2) مصنف ابن أبي شيبة (٦/ ٣٤٦)

(3) امام شوکانی رحمہ اللہ نے ان الفاظ کو ابن ابی حاتم رحمہ اللہ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ البتہ تفسیر ابن ابی حاتم میں ''اسباب'' کی جگہ ''احسان'' کے الفاظ ہیں۔ دیکھیں: تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٨٢) فتح القدير (٣/ ٤٢٧) نیز یہ روایت مرسل ہے۔

(4) الدر المنثور (٥/ ٤٣٦) (5) الدر المنثور (٥/ ٤٣٧۔ ٤٣٨) (6) الدر المنثور (٥/ ٤٣٩۔ ٤٤٧)

یہ شخص مہدی ہوگا۔[1] (ذكره القرطبي)

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہود نے نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ تم ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ اور نبیوں علیہم السلام کا ذکر کیا کرتے ہو، تم نے ان کا ذکر ہم سے سنا ہے، بھلا ہمیں اس نبی کی خبر تو دو جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے تورات میں صرف ایک جگہ کیا ہے، کہا وہ کون؟ کہا: ذوالقرنین۔ فرمایا: ہم کو ان کی کچھ خبر نہیں ملی۔ یہود آپ کے پاس سے بہت خوش ہو کر نکلے اور اپنے جی میں غالب ہوئے۔ وہ گھر کے دروازے تک نہ پہنچے ہوں گے کہ جبریل علیہ السلام یہ آیات لے کر آئے۔ ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ﴾[2] (آیتِ باب)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے اس کو اسباب پر قدرت اور اختیار دیا تھا اور مشکل راہوں پر اس کا چلنا آسان کر دیا تھا کہ جہاں چاہے جائے اور جس طرح چاہے پھرے، من جملہ تمکین کے ایک یہ بات تھی کہ روشنی کے لحاظ سے اس پر رات دن یکساں کر دیا تھا اور ہر شے کا، جس کو ذرا سا بھی تعلق اس چیز سے تھا، جو اُن کو مطلوب تھی یا خلق اس کی طرف محتاج تھی، ایک طریقہ بتا دیا گیا تھا، جس سے وہ مراد کو پہنچ جاتے، جیسے: سیر کے آلات اور لشکر کی کثرت، زمین کے کونے کونے تک پہنچنا اور چشمۂ زندگانی تک پہنچنا۔ یا سبب سے مراد علم ہے، یا مراد تک پہنچنا، یا وہ راستہ جس نے مغرب شمس تک پہنچا دیا۔[3] (قاله الزجاج) ہر وہ شے جس سے بادشاہ شہروں کو فتح کرنے اور دشمن پر غلبہ پانے کے لیے مدد لیتے۔ سبب اصل میں اسی کو کہتے ہیں، ہر وسیلۂ شے کے لیے اس کا استعارہ کیا۔[4]

فَاَتْبَعَ سَبَبًا ۝ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّ وَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ؕ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّاۤ اَنْ تُعَذِّبَ وَ اِمَّاۤ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ۝ قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ۝ وَ اَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ۨالْحُسْنٰى ۚ وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ۝

چناں چہ وہ سامان لے کر چلا (85) حتی کہ جب وہ غروبِ آفتاب کی جگہ پہنچا، اس نے اسے پایا کہ وہ سیاہ کیچڑ (دلدل) والے چشمے میں غروب ہو رہا ہے اور اس نے اس کے پاس ایک قوم پائی۔ ہم نے کہا: اے ذوالقرنین! (تجھے اختیار ہے) خواہ تو (انھیں) سزا دے، خواہ ان سے اچھا برتاؤ کرے (86) اس نے کہا: رہا

---

(1) تفسير القرطبي (١١/ ٤٧۔ ٤٨) (2) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٨١)
(3) فتح القدير (٣/ ٤٢٤) (4) فتح البيان (٨/ ١٠١۔ ١٠٦)

وہ جس نے ظلم کیا، تو اسے ہم عن قریب سزا دیں گے، پھر وہ اپنے رب کی طرف لوٹایا جائے گا، چناں چہ وہ اسے سخت ترین عذاب دے گا (87) اور رہا وہ جو ایمان لایا اور نیک عمل کیے تو اس کے لیے (اللہ کے ہاں) بدلے میں خوب تر بھلائی ہے، اور ہم لازماً اپنے کام میں سے اس کے لیے نہایت آسانی کا حکم دیں گے (88)

ذوالقرنین کا کوچ اور غروبِ آفتاب کی جگہ پہنچنا:

ذوالقرنین کو شوق ہوا کہ دیکھے کہ دنیا کی بستی کہاں تک بسی ہے۔ سو مغرب کی طرف اس جگہ پہنچا کہ دلدل تھی نہ آدمی کا گزر نہ کشتی کا۔ اللہ تعالیٰ کے ملک کی حد نہ پا سکا، اس کو یہ کہا کہ یعنی دونوں باتوں کی قدرت دی، ہر بادشاہ کو ہر حاکم کو قدرت ملتی ہے، خلق کو ستائے، چاہے اپنی خوبی کا ذکر جاری رکھے، حاکم جو عادل ہو، اس کا یہی طریقہ ہے، بروں کو برائی کی سزا دے اور بھلوں سے نرمی کرے۔ اس نے یہی بات کہی، یعنی یہ چال اختیار کی۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ سبب سے مراد منزل ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ مشرق اور مغرب کے درمیان راستہ ہے۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ ہر دو طرف زمین کے یعنی منازل اور نشانات کو طے کرنے لگا۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا کہ سبب سے مراد منازل ہیں۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا کہ نشان ہے۔ امام عکرمہ وعبید بن یعلیٰ اور سدی رحمہم اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام مطر رحمہ اللہ نے کہا کہ مراد نشانات اور آثارِ ماقبل ہیں۔[1]

مغربِ شمسی سے کیا مراد ہے؟

مغربِ شمس سے مراد زمین کے مغربی کنارے کا آخری حصہ ہے، جہاں سورج ڈوبتا ہے۔ رہا مغرب آفتاب تک پہنچنا آسمان سے، سو یہ مشکل ہے اور یہ جو اصحابِ قصص و اخبار کہتے ہیں کہ وہ ایک مدت زمین پر چلا اور سورج اس کے پیچھے ڈوبتا تھا، سو اس کی کچھ اصلیت وحقیقت نہیں ہے۔ اکثر اس قسم کے امور اہلِ کتاب کی خرافات ہیں اور اُن کے زندیقوں کا اختلاق (گھڑا ہوا) اور جھوٹ ہے۔ بالجملہ ذوالقرنین نے اپنی نگاہ میں دیکھا کہ سورج ایک بحرِ محیط میں غائب ہوتا ہے۔ یہی حالت ہے ہر شخص کی، جو بحرِ محیط کے کنارے تک پہنچتا ہے۔ وہ یہی دیکھتا ہے کہ آفتاب ایک دریا میں غروب ہوتا ہے، حالاں کہ وہ فلک چہارم کو نہیں چھوڑتا بلکہ وہیں موجود رہتا ہے۔

﴿حَمِئَةٍ﴾ کی تفسیر:

﴿حَمِئَةٍ﴾ سے مراد مٹی اور تلچھٹ ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿مِنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ﴾ "أي طين أملس" [یعنی چکنی مٹی] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ مراد دلدل والی ندی ہے۔ کعب احبار رحمہ اللہ سے پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ قرآن کو تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو، لیکن میں کتاب میں اس طرح پاتا ہوں کہ وہ ایک سیاہ

[1] تفسير الطبري (١٨/ ٩٤۔ ٩٥) تفسير ابن كثير (٣/ ١٣٧)

گارے میں ڈوبتا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ اور بہت سے سلف اسی کے قائل ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿ حَمِئَةٍ ﴾ کو حامیہ پڑھا ہے، بہ معنی حار (گرم)۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ دونوں قراءتیں مشہور ہیں، قاری جس قراءت کو پڑھے گا، صحیح ہوگا، ان کے معنی میں کچھ منافات نہیں۔[1] ہوسکتا ہے کہ آفتاب کی ہمسائیگی کی وجہ سے وہ دلدل گرم تر ہو، سورج کی لپٹ اور شعاع بغیر کسی رکاوٹ کے اس تک پہنچتی ہو۔

سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی مکرم ﷺ نے سورج کی طرف غروب ہوتے وقت نظر کی، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: «فِي نَارِ اللّٰهِ الحَامِيَةِ، لَوْ لَا مَا يَزَعُهَا مِنْ أَمْرِ اللّٰهِ لَأَحْرَقَتْ مَا عَلَى الْأَرْضِ»[2] (رواه ابن جرير و رواه أحمد) لیکن اس مرفوع حدیث کی صحت میں نظر ہے۔ شاید یہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کا اپنا کلام ہو اور ان دوتھیلوں کی کتابوں سے لیا گیا ہو جو انھیں یرموک سے ملے تھے۔ واللہ أعلم. کعب رحمہ اللہ کہتے تھے: تورات میں یہ ہے کہ وہ سیاہ رنگ کے کیچڑ میں ڈوبتا ہے۔[3]

امام ابن جریج رحمہ اللہ نے تفسیر میں کہا ہے کہ وہاں ایک قوم پائی، یعنی ایک شہر تھا، جس کے بارہ ہزار دروازے ہیں، اگر اس شہر والوں کی آوازوں کا شور نہ ہوتا تو سورج غروب ہونے کے وقت لوگ سورج کے غروب ہونے کی آواز سنتے۔[3] قوم سے مراد من جملہ اُمتوں کے ایک اُمت ہے۔ وہ بنی آدم میں سے ایک عظیم اُمت تھی۔ غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کو اس قوم پر اقتدار اور حکومت دی اور کامیاب کیا اور اس بات کا اختیار دیا کہ خواہ تو اُن کو قتل کر یا قید، یا منت رکھ، یا فدیہ لے کر چھوڑ دے۔ ذوالقرنین نے کہا کہ جو شخص اپنے کفر اور اللہ کے ساتھ شرک کرنے پر جما رہے گا، میں اس کو عذاب دوں گا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ یعنی اسے قتل کروں گا۔

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ ایک تانبے کی گائے گرم کر کے ان مشرکوں کو اس کے اندر رکھوں گا کہ وہ پگھل جائیں۔ امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ظالموں کو مسلط کروں گا کہ وہ اُن کے گھروں میں ہر طرف سے گھس کر اُن کو ڈھانپ لیں۔[5] ﴿ عَذَابًا نُّكْرًا ﴾ سے مراد سخت، بلیغ اور دردناک عذاب ہے۔ یہ آیت قیامت کے قائم ہونے اور جزا وسزا پر دلیل ہے۔ پھر کہا کہ جو کوئی ان میں سے اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت میں میرا تابع ہوگا، تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے نزدیک دارِ آخرت میں اچھا بدلہ ہے اور میں اس سے آسان اور نیک بات کہوں گا۔

---

(1) تفسیر الطبري (١٨/ ٩٦۔ ٩٧)

(2) تفسیر الطبري (١٨/ ٩٧) مسند أحمد (٢/ ٢٠٧) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔

(3) تفسیر ابن کثیر (٣/ ١٣٨) (4) تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٨٤)

(5) تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٨٥) تفسیر ابن کثیر (٣/ ١٣٨۔ ١٣٩)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اتباعِ سبب سے مراد طریقِ مغرب کی طرف سفر کا اختیار کرنا ہے۔ جب وہ مغرب کی سمت میں زمین کے آخر تک اور کرۂ ارض کی آخری عمارت کے پاس پہنچا، جس انتہا کے پیچھے بحرِ محیط ہے اور اس میں سے گزرنا ممکن نہیں ہے، پس جب کوئی کنارہ باقی نہ رہا، بلکہ ایسے پانی سامنے تھے جن کا آخر نہ تھا تو وہاں یہ دیکھا کہ سورج ایک ایسے چشمے میں ڈوبتا ہے جس میں بڑی کیچڑ ہے، یعنی سیاہ مٹی کی دلدل۔ انسان کی عادت ہے کہ جب دریا میں ہوتا ہے تو اسے یوں ہی نظر آتا ہے کہ سورج دریا میں ڈوب رہا ہے۔ بحرِ محیط کو جو چشمہ کہا تو اس میں کوئی ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ علما نے کہا ہے کہ یہ مراد نہیں ہے کہ وہ آفتاب کے جسم تک پہنچا اور اس نے سورج کو چھوا، کیونکہ آفتاب تو آسمان کے ساتھ زمین کے گرد چکر لگاتا ہے، کچھ زمین سے نہیں ملتا ہے، وہ اس سے بہت بڑا ہے کہ زمین کے کسی چشمے میں گھسے، اس لیے کہ وہ خود زمین سے کئی گنا بڑا ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ ذوالقرنین مشرق و مغرب میں آخری عمارات تک پہنچا اور وہاں سورج کو ایک ندی کی دلدل میں ڈوبتا ہوا پایا، جس طرح کہ ہم سورج کو ہموار زمین میں مشاہدہ کرتے ہیں کہ گویا وہ زمین کے اندر گھستا ہے، لہٰذا فرمایا: ﴿وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا﴾ [الكهف: ۹۰] ”اس نے اسے پایا کہ وہ ایسی قوم پر طلوع ہو رہا ہے جس کے لیے ہم نے سورج کے آگے کوئی پردہ نہیں رکھا۔“ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سورج اس قوم کے ساتھ چپکا ہوا تھا، جو چھوا جاتا، بلکہ یہ مطلب ہے کہ سب سے پہلے سورج کا طلوع اسی قوم پر ہوتا تھا۔

امام قتیبی نے کہا کہ جائز ہے کہ یہ چشمہ دریا کا ہو اور سورج اس کے نیچے یا اس کے نزدیک یا اس کے ہمراہ غائب ہوتا ہو۔ حرفِ صفت کو صاحبِ صفت کی جگہ قائم کیا ہے۔[1] بعض نے کہا کہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کو سمندر عبور کرنے کی طاقت دی ہو اور وہ دریا کے پار ہو کر اس چشمے تک پہنچا ہو جس میں آفتاب غروب ہوتا ہے۔ اس امر سے کوئی مانع نہیں ہے، خصوصاً جبکہ اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ وہ مغربِ شمس تک پہنچا اور زمین پر قادر ہوا۔ سو بحر من جملہ زمین کے ہے اور صرف استبعاد سے قرآن کو ظاہر کے خلاف محمول نہیں کیا جا سکتا۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ سورج کے جسم کو چھوٹا کر دے اور چشمے اور کرہ ارض کے جثے کو وسیع کر دے، اس طرح پر کہ چشمۂ آبِ عین میں سورج سما جائے۔ یہ بات کیوں جائز نہیں ہے، اگرچہ ہم کو اس کا علم نہ ہو، اس لیے کہ ہماری عقلیں اس کا احاطہ کرنے سے قاصر ہیں اور انبیا، حکما اور صلحا سے ایسے امور کا واقع ہو جانا چنداں دور نہیں ہوتا۔ بہر حال اس چشمے یا سورج کے پاس ذوالقرنین نے ایک قوم کو پایا، وہ قوم برہنہ تھی، ان کا لباس وحشی جانوروں کے چمڑے تھے اور اُن کا کھانا وہ تھا جو دریا نکال کر پھینک دے، یہ لوگ کافر تھے۔[2] (قاله البيضاوي)

---

[1] تفسير القرطبي (۱۱/ ۵۰) [2] تفسير البيضاوي (۳/ ۵۲۰)

لیکن اتنی بات ہے کہ کفر کا ثابت ہونا رسول کی بعثت کے بعد ہوتا ہے، جب کہ لوگ اس پر ایمان نہ لائیں۔
اب نظر کرنا چاہیے کہ کون سا رسول ان کی طرف بھیجا گیا تھا کہ انھوں نے اس کا انکار اور کفر کیا ہو۔ زیادہ ظاہر یہ ہے کہ وہ اہلِ فترت تھے (دو رسولوں کے درمیان کی مدت کے لوگ)۔ ان کے پاس کوئی رسول نہیں آیا، جب ذوالقرنین اس جگہ پہنچے تو انھوں نے اس قوم کو ابراہیم علیہ السلام کی ملت کی طرف دعوت دی، کوئی ان میں سے ایمان لایا اور کوئی کافر ہوا۔ تب اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کو اختیار دیا کہ وہ خواہ ان کو عذاب کرے، خواہ چھوڑ دے۔ لفظِ ﴿قُلْنَا﴾ سے بعض نے یہ سمجھا ہے کہ وہ نبی تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو وحی کے ساتھ مخاطب کیا تھا اور جو اُن کی نبوت کا قائل نہیں وہ ﴿قُلْنَا﴾ کی تاویل الہام کے ساتھ کرتا ہے۔ احتمال یہ ہے کہ یہ خطاب کسی اور نبی کی زبان پر ہو۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے ان کو قتل، تعلیمِ شرائع اور حق کی طرف دعوت کا اختیار دیا کہ خواہ اُن کو عذاب کر یا ان کے ساتھ احسان کر۔ پہلا سلوک اس شخص کے لیے ہے جو کفر پر جما رہے اور دوسرا سلوک توبہ کرنے والے کے لیے ہے۔ ذوالقرنین نے کہا کہ میں ظالم، یعنی کافر و مشرک کو قتل کروں گا اور آخرت کا عذاب اس کے لیے علاحدہ ہے اور مومن عامل صالح کو اچھی جزا ملے گی اور ایمان دار سے نرم بات کروں گا۔[1]

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿٨٩﴾ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ﴿٩٠﴾ كَذٰلِكَ ؕ وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿٩١﴾

پھر وہ (اور) سامان لے کر چلا (89) حتی کہ جب وہ طلوعِ شمس کی جگہ پہنچا، اس نے اسے پایا کہ وہ ایسی قوم پر طلوع ہو رہا ہے جس کے لیے ہم نے سورج کے آگے کوئی پردہ نہیں رکھا (90) (واقعہ) ایسا ہی ہے اور یقیناً اس کے پاس جو کچھ تھا علم کے اعتبار سے ہم نے اس کا احاطہ کر لیا تھا (91)

ذوالقرنین کا مشرق کی جانب سفر:

شاید وہ لوگ جنگلی سے ہوں گے کہ گھر بنانا اور چھت ڈالنا، ان میں دستور نہ ہوگا۔ تاریخ والے شاید اس جگہ کچھ اور کہتے ہوں گے اور فی الحقیقت اتنا ہے، جو فرما دیا۔
اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ ذوالقرنین پھر مغرب سے مشرق کی طرف چلے، جس اُمت پر ان کا گزر ہوتا اس کو مقہور و مغلوب کرتے اور اللہ عزوجل کی طرف بلاتے، اگر وہ مان لیتے تو خیر، ورنہ ان کو ذلیل و خوار کرتے اور اُن کے مال و متاع کو اپنے لیے حلال کر لیتے اور اُن میں سے کچھ لوگ اپنے لشکر کی مدد کے لیے بطورِ خدام اپنے ساتھ کر لیتے

[1] فتح البیان (۸/ ۱۰۶۔ ۱۱۰)

کہ جو علاقے ان سے دور ہیں، وہاں لے جا کر قتال کراتے۔ بنی اسرائیل کی خبروں میں آیا ہے کہ ذوالقرنین ایک ہزار چھے سو برس زندہ رہے، زمین کے طول وعرض میں گھومے، زمین کے مشرق ومغرب کو چھان مارا۔ جب سورج نکلنے کی جگہ پہنچے تو وہاں ایک ایسی قوم کو پایا کہ جن کے لیے کوئی اُوٹ نہ تھی نہ گھر جس میں رہیں اور نہ درخت جس کے سائے میں بسیں اور دھوپ سے بچیں۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ سرخ پستہ قد لوگ تھے۔ غاروں کے اندر رہتے تھے، ان کی اکثر معیشت مچھلی تھی۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا کہ اُن کی زمین بنیاد کو اُٹھا نہیں سکتی تھی۔ جب سورج نکلتا تو وہ پانی میں گھس جاتے اور جب سورج ڈوب جاتا تو باہر نکل کر جانوروں کی طرح آوازیں نکالتے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ سیدنا سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ہم سے ذکر کیا گیا کہ وہ قوم ایک ایسی زمین میں ہے کہ وہاں کوئی شے نہیں اُگتی اور وہ طلوعِ آفتاب کے وقت اسراب، یعنی تہہ خانوں اور غاروں میں چھپ جاتے اور جب سورج ڈوب جاتا تب وہ اپنے کھیتوں اور کاروبار کے لیے نکلتے۔

سلمہ بن کہیل رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ان کے لیے چھپنے کی کوئی جگہ نہیں ہے، سورج جب برآمد ہوتا ہے تو انھیں کے اوپر نکلتا ہے۔ ان کے دو کان ہیں، ایک کو بچھاتے اور دوسرے کو اُوڑھتے ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ زنج ہیں یعنی زنگی۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہاں کوئی گھر کبھی نہیں بنا اور نہ بنایا گیا، جب سورج نکلتا ہے تو وہ اپنے تہہ خانوں میں گھس جاتے ہیں یا دریا میں داخل ہو جاتے ہیں، ان کی زمین میں کوئی پہاڑ نہیں ہے۔ ایک بار وہاں ایک لشکر آیا، اس سے وہاں کے لوگوں نے کہا کہ دیکھو کہیں تم پر سورج نہ نکلے اور تم یہاں ہو۔ لشکر والوں نے کہا کہ جب تک سورج نہ جائے گا ہم یہاں سے نہ سرکیں گے۔ کہا: دیکھو یہ لشکر لاشیں مردار ہیں، ان پر سورج نکلا تھا، سب مر گئے، تب وہ لشکر والے اس جگہ سے اور طرف بھاگے۔ امام مجاہد وسدی رحمہما اللہ نے کہا کہ ہمیں ذوالقرنین کے تمام حالات کی اطلاع ہے اور اس کے لشکر کے حالات کی کوئی چیز ہم پر مخفی نہیں ہے، اگرچہ وہ اُمتیں مختلف ہیں اور الگ الگ زمین میں رہ پڑے ہیں۔ اللہ پر کوئی چیز مخفی نہیں، خواہ وہ چیز زمین میں ہو یا آسمان پر۔ وہ تمام جزئیات اور ذرات کا عالم ہے۔[1] وللہ الحمد.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ پھر ذوالقرنین ایک اور ہی راستہ پر چلا، جو مغرب سے مشرق کی طرف جاتا تھا، کوئی اُمت اس پر غالب نہ ہوتی، یہاں تک کہ اس جگہ پہنچا جس پر سورج نکلتا ہے، سب سے پہلی جو زمین آباد ہوئی۔ یا خود اسی جگہ پر جہاں سورج طلوع ہوتا ہے، کیوں کہ کوئی شرعی اور عقلی چیز اس کی مانع نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ بارہ برس میں وہاں پہنچا، یا اس سے کم میں، اس لیے کہ بادل ان کے لیے مسخر تھے اور اسبابِ میسر تھے۔ وہاں ایک قوم پائی،

---

(1) تفسير الطبري (١٨/ ٩٩ـ ١٠٠) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٨٦ـ ٢٣٨٧) تفسير ابن كثير (٣/ ١٣٩)

یعنی زنگی۔ بعض نے کہا کہ وہ قومِ ہود کے مومنین کی نسل سے تھے۔ ان کے شہر کا نام حاحیالق تھا اور سریانی زبان میں مرقسا، وہ یاجوج ماجوج کے ہمسائے تھے۔ سوائے سورج کے ان کی کوئی اُوٹ نہ تھی، نہ گھر نہ ورنہ چھت نہ لباس، بلکہ ننگے پاؤں اور ننگے بدن تھے، عمارت کا کہیں اُتا پتا نہیں تھا کہ رات کو یا دن کو وہاں رہیں۔ کعب رحمہ اللہ نے کہا کہ اُن کی زمین نرم ہونے کی وجہ سے بنیاد کو نہیں اُٹھا سکتی تھی، اس زمین میں تہہ خانے اور غار تھے، جب سورج نکلتا تو ان تہہ خانوں میں گھس جاتے، جب دن اونچا ہوتا تو اپنی معیشت کے لیے باہر آتے۔

حکایت:

امام زمخشری نے بعض اشخاص سے نقل کیا ہے کہ میں نکلا اور چین سے آگے بڑھ گیا، میں نے اس قوم کا حال پوچھا، مجھ سے کہا گیا کہ ایک دن رات کا راستہ ہے۔ میں وہاں گیا، دیکھا وہ قوم اپنا ایک کان بچھاتی اور دوسرا کان اُوڑھتی ہے جب سورج کا طلوع ہونا قریب ہوا تو میں نے زنجیر کے رگڑنے کی آواز کی طرح ایک آواز سنی تو میں بے ہوش ہوگیا، پھر افاقہ ہوا۔ سورج طلوع ہوا تو وہ پانی پر روغن کی طرح تھا۔ اس قوم نے مجھ کو اپنی غار میں داخل کرلیا۔ جب دن نکلا تو وہ لوگ مچھلی کا شکار کرنے لگے اور شکار کرکے دھوپ میں ڈالنے لگے، دھوپ سے وہ مچھلی بھن جاتی۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا جو سودان (کالے لوگ) لباس نہیں پہنتے اور سورج کے طلوع ہونے کی جگہ کے قریب ہیں وہ سارے اہلِ ارض سے زیادہ ہیں۔[1]

اہلِ ہیئت کی کتابوں میں لکھا ہے کہ اکثر زنج کا حال اسی طرح پر ہے، اسی طرح جو لوگ خطِ استواء کے قریبی علاقوں میں رہتے ہیں ان کا حال بھی یہی ہے۔ بالجملہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم کو ذوالقرنین کے سارے حالات کی خبر ہے۔ کہتے ہیں کہ جو کارروائی ظالموں کو سزا دینے کے لیے اور مومنین کے ساتھ احسان کرنے کی سورج کے غروب ہونے کے مقام پر کی تھی وہی اس جگہ، یعنی سورج کے طلوع ہونے کی جگہ پر بھی کی۔ یہ دو سفر ہوئے، اب تیسرے سفر کی کہانی بیان فرمائی اور کہا:[2]

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۹۲﴾ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ
دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ﴿۹۳﴾ قَالُوْا يٰذَا
الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ فَهَلْ
نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰۤى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ﴿۹۴﴾ قَالَ
مَا مَكَّنِّىْ فِيْهِ رَبِّىْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِىْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ

[1] الكشاف (٢/ ٦٩٥) [2] فتح البيان (٨/ ١١٠۔ ١١١)

رَدۡمًا ۝٩٥ اٰتُوۡنِیۡ زُبَرَ الۡحَدِیۡدِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا سَاوٰی بَیۡنَ الصَّدَفَیۡنِ قَالَ انۡفُخُوۡا ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوۡنِیۡۤ اُفۡرِغۡ عَلَیۡهِ قِطۡرًا ۝٩٦

پھر وہ (دیگر) سامان لے کر چلا 92 حتی کہ جب وہ دو دیواروں کے درمیان پہنچا تو اس نے ان دونوں کے اس طرف ایک قوم پائی جو قریب نہ تھا کہ وہ کوئی بات سمجھیں 93 وہ کہنے لگے: اے ذوالقرنین! بے شک یاجوج اور ماجوج اس سرزمین میں فساد کرنے والے ہیں تو کیا ہم تیرے لیے کچھ پیداوار طے کر دیں، اس (شرط) پر کہ تو ہمارے اور ان کے درمیان ایک دیوار بنا دے 94 اس نے کہا: میرے رب نے مجھے اس میں جو قدرت دی ہے بہت بہتر ہے، چناں چہ تم میری (افرادی) قوت سے مدد کرو، میں تمھارے اور ان کے درمیان ایک مضبوط بند بنا دوں گا 95 تم مجھے لوہے کے تختے لا دو، حتی کہ جب اس نے دونوں پہاڑوں کے درمیان خلا کو برابر کر دیا (تو) کہا: (اب اس میں) دھونکو، حتی کہ جب اس نے اسے آگ (جیسا) بنا دیا تو کہا: میرے پاس پگھلا ہوا تانبا لاؤ کہ اس پر ڈال دوں 96

ذوالقرنین کا سرزمینِ یاجوج ماجوج میں پہنچ کر دیوار تعمیر کرنا:

بات نہ سمجھنے سے یہ مراد ہے کہ کسی کی بولی ان سے نہ ملتی تھی اور دو آڑ دو پہاڑ تھے اس ملک میں اور یاجوج ماجوج کے ملک کے درمیان وہی رکاوٹ تھے، ان پر چڑھائی ممکن نہ تھی، مگر درمیان میں ایک کھلی گھاٹی تھی، اس سے یاجوج ماجوج آتے اور لوگوں کو لوٹ مار کر چلے جاتے۔ انھوں نے چاہا کہ آپس میں حصہ ڈال کر کچھ مال جمع کر دیں، اس کو دیکھا کہ وہ بادشاہ ہے جس کے پاس فوج اور اسباب ہے، اسے صاحبِ حکومت جانا کہ اس سے یہ کام ہو سکے گا۔ یاجوج ماجوج عرب کی زبان میں ایک قوم کا نام ہے جو دو دادوں کی اولاد ہیں: ایک یاجوج اور ایک ماجوج۔ معلوم نہیں کہ اس ملک میں ان کا کیا نام تھا۔ ترکوں کے ملک سے لگتی تھی اور قوم میں ترکوں کے بھائی تھے۔ ذوالقرنین نے کہا کہ مال میرے پاس بہت ہے، مگر ہاتھ پاؤں سے ہمارے ساتھ تم بھی محنت کرو۔ پہلے لوہے کے بڑے بڑے تختے بنائے، ایک پر ایک رکھتے گئے کہ دو پہاڑوں کے برابر ملا دیا۔ پھر تانبا پگھلا کر اس کے اوپر سے ڈالا، وہ درزوں میں بیٹھ کر جم گیا، سب مل کر ایک پہاڑ سا ہو گیا۔ ہمارے پیغمبر ﷺ کے پاس ایک شخص آیا اور اُس نے کہا کہ میں سد تک گیا ہوں اور اس کو دیکھا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کی شکل بیان کر۔ اس نے کہا: جیسے چار خانہ لنگی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تو سچا ہے، وہ لوہے کے تختے سیاہ لگتے ہیں اور درزوں میں تانبے کی لکیر سرخ رنگ کی ہے۔[1]

[1] تفسیر الطبري (۱۸/ ۱۱۳) یہ روایت مرسل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ ذوالقرنین زمین کے مشرق میں ایک اور راستے پر چلا، دو سدّ کے درمیان میں پہنچا، وہ آمنے سامنے دو پہاڑ تھے، ان کے درمیان ایک گھاٹی تھی، یاجوج ماجوج اسی راستے سے ترکوں کے علاقوں میں آ جاتے اور فساد کرتے اور کھیتوں اور جانوروں کو تباہ و برباد کرتے۔ یہ یاجوج و ماجوج بھی آدم علیہ السلام ہی کی اولاد میں سے ہیں جیسا کہ صحیحین میں مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ کہے گا کہ اے آدم! وہ کہیں گے: ''لبیك و سعدیك'' فرمائے گا: آگ کا لشکر نکال، وہ کہیں گے: آگ کا لشکر کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے آگ کی طرف اور ایک جنت کی طرف۔ اس وقت بچہ بوڑھا ہو جائے گا اور ہر حمل والی اپنا حمل گرا دے گی۔ پھر فرمایا کہ تمھارے بیچ میں دو اُمتیں ہیں کہ جس چیز سے بھی مقابلہ کیا جائے تو ان کی تعداد زیادہ ہے اور یاجوج و ماجوج ہیں۔[1]

یاجوج و ماجوج کا نسب:

امام نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم میں بعض لوگوں سے روایت کیا ہے کہ یاجوج و ماجوج اس منی سے پیدا ہوئے ہیں جو آدم علیہ السلام سے نکل پڑی تھی اور مٹی میں مخلوط ہو گئی تھی، اس صورت میں یہ قوم یوں پیدا ہوئی۔[2] لیکن یہ قول سخت غریب ہے، اس پر کوئی عقلی اور نقلی دلیل نہیں ہے اور نہ اس پر اعتماد کرنا چاہیے۔ اہلِ کتاب ایسی بہت سی گھڑی ہوئی حکایات اور احادیث بیان کیا کرتے ہیں۔ واللّٰہ أعلم۔ مسند امام احمد میں سیدنا سمرہ رضی اللہ عنہ سے رفعاً مروی ہے کہ نوح علیہ السلام کے تین بیٹے تھے: سام ابو العرب، حام ابو السودان، یافث ابو الترک۔[3] بعض علما نے کہا ہے کہ یاجوج و ماجوج یافث کی نسل سے ہیں، ان کا نام ترک ہے، اس لیے کہ یہ اس سد کے پسِ پشت اس طرف متروک کیے گئے، ورنہ وہ سرکشی، فساد اور جرأت میں اُن کے اقربا ہیں۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس جگہ وہب بن منبہ رحمہ اللہ سے ایک جگہ ذوالقرنین کے سفر، سد کے بنانے اور اس سارے معاملے کی کیفیت کے بارے میں ایک عجیب اور طویل اثر ذکر کیا ہے۔ اس میں ان کی شکلوں، صفتوں اور اُن کے کاموں کے چھوٹا بڑا ہونے کے بارے میں طول ہے اور عجیب و غریب باتیں ہیں جو منکر ہیں۔ ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے بھی اپنے باپ سے اس بارے میں احادیثِ غریبہ نقل کی ہیں جن کے اسانید صحیح نہیں ہیں۔[4] واللّٰہ أعلم۔ وہ قوم

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳۱۷۰) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۲۲) سنن الترمذي، رقم الحدیث (۳۱۶۹)

[2] المنهاج (۳/ ۹۸)

[3] مسند أحمد (۵/ ۹) میں ''حام ابو السودان'' کے بجائے ''حام ابو الحبش'' اور ''یافث ابو الروم'' کے الفاظ ہیں۔ البتہ امام طبرانی رحمہ اللہ نے ''یافث ابو الترک'' کے الفاظ روایت کیے ہیں۔ (مسند الشامیین: ٤/ ۳۰) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ کا سماع سیدنا سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث (۳۶۸۳)

[4] تفسیر الطبري (۱۸/ ۱۰۵۔ ۱۰۹)

لوگوں سے دور رہنے اور اپنی مختلف زبان کی وجہ سے بات نہیں سمجھتی تھی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ خرج سے مراد اجرِ عظیم ہے۔[1]

یعنی انھوں نے یہ چاہا کہ ہم سب مل کر ایک مالِ کثیر جمع کر دیں، آپ ہمارے اور اس قوم کے درمیان ایک بند بنا دیں، اس کے جواب میں ذوالقرنین نے از راہِ عفت و دیانت و صلاح و قصدِ خیر یہ بات کہی کہ جو ملک اور تمکین (قدر و تونگری) میرے رب نے مجھ کو دی ہے، وہ تمھارے اس مال کے جمع کرنے سے بہتر ہے، جس طرح سلیمان علیہ السلام نے کہا تھا: ﴿ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ فَمَاۤ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّاۤ اٰتٰىكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ﴾ [النمل: ٣٦] ''کیا تم مال کے ساتھ میری مدد کرنا چاہتے ہو، مجھے اللہ نے جو دیا ہے وہ اس سے بہت بہتر ہے جو اس نے تمھیں دیا ہے، بلکہ تم خود ہی اپنے ہدیے کے ساتھ خوش رہو۔'' ہاں تم میری مدد اپنی قوتِ بازو سے کرو اور آلات بنا لاؤ، میں تمھارے اور اُن کے درمیان لوہے کی ایک سد بنا دوں گا۔ ''زُبَرَ'' جمع ہے: ''زبرة'' کی۔ ایک ٹکڑا لوہے کا، یعنی آہنی تختہ۔ (قاله ابن عباس) امام مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[2]

اس لوہے کے ٹکڑے سے مراد لوہے کی اینٹیں ہیں اور ہر اینٹ دمشقی قنطار کے برابر یا اس سے بھی زیادہ وزنی۔ یہاں تک کہ جب وہ لوہے کے تختے طولاً و عرضاً دونوں پہاڑوں کی چوٹی تک پہنچے اور اینٹ پر اینٹ رکھتے ہوئے پہاڑوں کے سروں تک پہنچ گئے تو کہا کہ اب ان تختوں پر آہنی آگ جلا دو۔ سدّ کی لمبائی اور چوڑائی میں اختلاف ہے، جب آگ جلائی تو وہ سب آگ ہو گیا، کہا کہ اب اس میں پگھلا ہوا تانبا ڈالو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، عکرمہ، ضحاک، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ نے کہا کہ قطر سے مراد نحاس، یعنی تانبا ہے۔[2] بعض نے کہا کہ پگھلا ہوا تانبا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿ وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ ﴾ [سبا: ١٢] ''اور ہم نے اس کے لیے پگھلے ہوئے تانبے کا چشمہ بہا دیا'' اسی کا شاہد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دیوار دھاری دار چادروں کے مشابہ ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہمیں بیان کیا گیا ہے کہ ایک صحابی نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! میں نے یاجوج و ماجوج کی دیوار دیکھی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ کیسی ہے۔ اس نے کہا: دھاری دار چادر جیسی جس میں سرخ و سیاہ دھاریاں ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: واقعی تو نے اسے دیکھا ہے۔[4] (رواه ابن جرير و هذا حديث مرسل)

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ١١٢) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٨٨) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ امام عطاء خراسانی رحمہ اللہ کا سماع سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت نہیں ہے۔

[2] تفسير الطبري (١٨/ ١١٤) [3] تفسير الطبري (١٨/ ١١٦۔ ١١٧) تفسير ابن كثير (٣/ ١٤٠)

[4] تفسير الطبري (١٨/ ١١٣) یہ روایت مرسل ہے۔

حکایت:

خلیفہ واثق باللہ نے اپنے عہدِ حکومت میں بعض امراء کو ایک لشکر کے ہمراہ تیار کر کے سد کو دیکھنے کے لیے بھیجا کہ اس کو دیکھ کر آئیں اور حال بیان کریں۔ وہ شہر در شہر اور ملک در ملک پھرتے پھرتے بالآخر سدّ تک پہنچے، دیکھا کہ وہ لوہے اور تانبے سے بنایا گیا ہے اور ذکر کیا کہ انھوں نے سد میں ایک پھاٹک دیکھا، اس پر بڑے بڑے قفل تھے اور باقی ماندہ خشت اور دوسری چیزوں کو ایک برج میں، جو اس جگہ تھا، پڑا ہوا پایا اور وہاں پر اس وقت کے بادشاہوں کی طرف سے چوکی پہرہ تھا اور وہ سد بہت بلند، پاک صاف اور اونچا تھا، جس پر کوئی چڑھ نہ سکے اور نہ اُس کے اردگرد پہاڑوں پر جا سکے۔ پھر یہ لوگ اپنے شہروں کو واپس آئے۔ یہ دو برس سے زیادہ اس سفر میں غائب رہے اور احوال اور عجائب دیکھے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ذوالقرنین کا یہ تیسرا سفر قطرِ شمالی کے کنارے کی طرف ہوا اور یہ سفر کے تمام لوازمات کے ساتھ مشرق و مغرب کے درمیان سفر تھا، یہاں تک کہ چلتے چلتے وہ دو سد کے بیچ میں پہنچا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ارمینیہ اور آذر بائیجان کے سامنے دو پہاڑ ہیں۔[2] کسی نے کہا کہ دونوں سد کے درمیان ایک جگہ ہے جو مشرق کی جانب سے ترک کی سرزمین کو علاحدہ کرتی ہے۔ بعض نے کہا کہ دو بلند پہاڑ ہیں، چکنے اور ہموار اور صاف کہ کوئی اُن پر چڑھ نہیں سکتا، اُن میں سے ہر پہاڑ کو سدّ کہتے ہیں، اس لیے کہ انھوں نے زمین کے راستے بند کر رکھے ہیں۔ سد کا اطلاق پہاڑ پر ہوتا ہے، کیوں کہ وہ فی الجملہ ساد (روکنے والا) ہوتا ہے۔ قاموس میں کہا ہے کہ سد پہاڑ اور حاجز (پردہ) ہے۔[3]

حکایت:

امام ابن جریر کہتے ہیں کہ صاحبِ آذر بائیجان نے مذکورہ شہر کے فتح کے ایام میں ایک انسان کو ناحیۂ جزر کی طرف متوجہ کیا تھا، وہ اس کو دیکھ کر آیا اور کہا کہ ایک بلند عمارت ہے، اس کے پیچھے ایک مضبوط خندق ہے جو رکاوٹ ہے۔[4] امام رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ زیادہ ظاہر یہ ہے کہ سدین کی جگہ شمالی کنارے میں ہے۔[5] اسکندر نے سدین کے درمیان والی جگہ کو بند کر دیا، اس کی لمبائی سو فرسخ ہے۔ یاجوج ماجوج کے لیے آباد زمین کی طرف نکلنے کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہ تھا، کیوں کہ ان کی جائے سکونت اِن دونوں پہاڑوں کے پیچھے ہے اور اُن کی زمین بہت کشادہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ١٤١)

[2] تفسیر الطبري (١٨/ ١٠٢) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ امام عطاء خراسانی رحمہ اللہ کا سماع سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت نہیں ہے۔

[3] القاموس المحيط (١/ ٣٦٧) [4] فتح القدير (٣/ ٤٢٩) [5] تفسير الرازي (٢١/ ١٤٤)

ہے، جو بحرِ محیط تک ہے۔ "دون" سے مراد "وراء" (پیچھے، پرے) ہے یا امام (آگے)، یعنی سدین کے باہر سے نہ کہ یاجوج ماجوج کی طرف والے کنارے سے۔

امام خطیب رحمہ اللہ نے کہا کہ ان دونوں کے قریب اس طرف سے جو سدین کے نزدیک ہے، اس کی طرف جدھر سے ذوالقرنین آیا تھا، ایک قوم پائی جن کی زبان دوسرے لوگوں کی زبان سے حد درجہ بعید از فہم تھی، کیوں کہ ان کے شہر باقی شہروں سے دور تھے۔ قریب تھا کہ وہ کوئی بات نہ سمجھیں، یعنی اپنی زبان کے عجیب و غریب ہونے اور دانائی کی کمی کی وجہ سے۔ ان کی بولی عجیب و غریب اور مجہول تھی، جو سخت عجمی لگتی تھی اور ان کا کلام بہت مشکل تھا۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ ترک تھے۔[1]

بہر حال انھوں نے ذوالقرنین سے یہ فرمایش کی کہ ہماری طرف سے یاجوج ماجوج کا راستہ بند کر دو۔ یہ سوال انھوں نے ترجمان کے ذریعے کیا، کیوں کہ ذوالقرنین اولادِ سام میں سے تھا اور وہ اولادِ یافث میں سے، اُن میں ایک دوسرے کی زبان نہ سمجھتا تھا۔ یاجوج ماجوج عجمی نام ہے۔ ابو علی رحمہ اللہ نے کہا جائز ہے کہ یہ عربی ہوں، یہ یافث کی نسل سے ہیں۔ ترک بھی یافث کی اولاد ہیں۔ بعض نے کہا کہ یاجوج ترک ہیں اور ماجوج جیل و دیلم۔ امام کعب رحمہ اللہ نے کہا کہ آدم علیہ السلام کو احتلام ہوا، نطفہ خاک سے مل گیا، اس پانی سے یہ پیدا ہوئے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا کہ اس میں نظر ہے، اس لیے کہ انبیا کو احتلام نہیں ہوتا، یہ تو یافث کی اولاد ہیں۔ امام مقاتل رحمہ اللہ وغیرہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[2]

ان کی صفت میں اختلاف ہے، کوئی انھیں چھوٹے جسم اور پستہ قد بتاتا ہے اور کوئی بڑے جسم اور بلند قامت کہتا ہے اور یہ درندوں کی طرح کے پنجے رکھتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ ایک کان بچھاتے اور دوسرا کان اُوڑھتے ہیں۔ سلف علما اور خلف فضلا کے اخبار و آثار اُن کی صفات اور افعال کے بارے میں مختلف آئے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ کوئی ایک بالشت کا تو کوئی دو بالشت کا ہے، سب سے زیادہ طویل تین بالشت کا ہوتا ہے۔ یہ آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔[3] لیکن اس میں بُعد ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما مرفوعاً کہتے ہیں کہ یاجوج ماجوج آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں، اگر چھوڑ دیے جائیں تو لوگوں پر اُن کا ذریعۂ معاش برباد کر ڈالیں۔ ان میں سے کوئی شخص جب مرتا ہے تو اپنی اولاد میں سے ایک ہزار یا زیادہ چھوڑ جاتا ہے۔ ان کے پیچھے تین اُمتیں اور ہیں: تاویل و تاریس و منسک۔[4] (أخرجه الطبراني و عبد بن حميد و ابن المنذر وغيرهم)

---

[1] الدر المنثور (٥/ ٤٥٤) [2] تفسير القرطبي (١١/ ٥٦)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٨٨) مستدرك الحاكم (٤/ ٥٧٢)

[4] المعجم الأوسط (٨/ ٢٦٧) مسند الطيالسي (١/ ٣٠١) اس کی سند میں "وہب بن جابر" مجہول راوی ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٤١٤٢)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ حدیث غریب ہے، بلکہ منکر اور سخت ضعیف۔ کہتے ہیں کہ[1] وہ دس جز ہیں اور اولادِ آدم علیہ السلام ایک جزء اور زمین کی ساری مسافت پانچ صد سو برس کا راستہ ہے، تین سو دریا ہیں اور ایک سو نوے مسکن۔ ان کے لیے دس باقی رہے، سات حبشہ کے لیے اور تین ساری خلق کے لیے۔ یہ سب کفار ہیں۔ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو شبِ معراج میں ایمان کی طرف بلایا، انھوں نے قبول نہ کیا۔ بالجملہ یہ لوگ اس پہاڑی درے سے نکل کر لوٹ مار اور دنگا فساد کرتے تھے۔ بعض نے کہا کہ بنی آدم کو کھا جاتے تھے۔ کسی نے کہا کہ ظلم و غشم و قتل اور ہر طرح کا فساد کرتے تھے۔ بعض نے کہا کہ ایامِ ربیع میں اس قوم پر ان کا گزر ہوتا تھا، جنھوں نے ان کی شکایت کی، کوئی سرسبز چیز باقی نہ چھوڑتے، سب کھا جاتے اور خشک چیز کو اُٹھا کر لے جاتے۔

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ یاجوج ماجوج زمین میں فسادی ہیں۔ روزانہ سد کو کھودا کرتے ہیں، جب یہاں تک پہنچتے ہیں کہ آفتاب کی شعاع کو دیکھیں تو جو شخص اُن پر داروغہ ہے، وہ کہتا ہے کہ اب چلو کل تم اس کو کھول لو گے، وہ جب لوٹ جاتے ہیں تو وہ اس دیوار کو پہلے روز سے بھی زیادہ سخت اور درشت پاتے ہیں، یہاں تک کہ جب ان کی مدت پہنچ جائے گی اور اللہ تعالیٰ چاہے گا کہ اُن کو لوگوں پر بھیج دے تو وہ اس کو یہاں تک کھود لیں گے کہ سورج کا طلوع دیکھیں گے تو ان کا داروغہ کہے گا: اب لوٹ چلو کل تم ان شاء اللہ اس کو مفتوح کر لو گے، یعنی وہ ان شاء اللہ کہے گا۔ جب وہ دوبارہ آئیں گے تو وہ اس کو اسی حالت پر پائیں گے جس پر اس کو چھوڑ گئے تھے، تب گڑھا کر کے لوگوں پر نکل پڑیں گے اور سب جگہ کا پانی پی جائیں گے، لوگ اپنے اپنے قلعوں میں ان سے چھپ جائیں گے، وہ آسمان کی طرف تیر پھینکیں گے، وہ خون آلود پھر کر آئے گا، تب کہیں گے: ہم نے زمین والوں کو زیر کر لیا اور آسمان والوں پر غالب آ گئے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ ان کی پشتوں میں طاعون کی طرح کا پھوڑا بھیجے گا، وہ سب کے سب ہلاک ہو جائیں گے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے! زمین کے جانور موٹے ہو جائیں گے اور موٹے تازے ہو کر اُن کا گوشت کھانے پر شکر ادا کریں گے۔[2] (رواه أحمد و الترمذي وحسنه و ابن ماجه و ابن حبان والحاكم وصححه والبيهقي في البعث)

زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نیند سے جاگ اُٹھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ سرخ تھا، فرمانے لگے: «لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَيْلٌ لِّلْعَرَبِ مِنْ شَرٍّ قَدِ اقْتَرَبَ، فُتِحَ الْيَوْمَ مِنْ رَّدْمِ يَأْجُوْجَ وَ مَأْجُوْجَ مِثْلُ هٰذِهِ» وَحَلَّقَ [''اللہ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں، عرب اس شر کی وجہ سے ہلاک ہو گئے جو اب قریب آ پہنچا ہے،

[1] تفسير ابن كثير (٣/ ١٤٣)

[2] مسند أحمد (٢/ ٥١٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٥٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٨٠) صحيح ابن حبان (١٥/ ٢٤٢) مستدرك الحاكم (٤/ ٥٣٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٧٣٥)

یاجوج ماجوج کی دیوار اس قدر کھل گئی ہے۔'' اور آپ ﷺ نے شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کو ملا کر حلقہ بنایا] میں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! ''أَنُهلِكُ وَفِينَا الصَّالِحُونَ'' [ہم یک لوگ موجود ہوں، کیا پھر بھی ہم ہلاک ہو جائیں گے؟] آپ ﷺ نے فرمایا: « نَعَمْ، إِذَا كَثُرَ الْخَبَثُ »[1] (رواه الشيخان و أخرجاه من حديث أبي هريرة مرفوعا) [ہاں، جب شر اور گندگی زیادہ ہو جائے گی] ہم نے اس قوم کا ذکر کتاب ''حجج الكرامة'' میں تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ بالجملہ جب ان لوگوں نے یہ فرمایش کی اور مال دینے کو کہا تو ذوالقرنین نے مال لینے سے انکار کیا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو بہت مال دیا ہے، جو تمھارے مال سے زیادہ ہے، تم سد کی تیاری کے لیے فقط مجھ کو قوت دو، یعنی اپنے ہاتھوں سے اس کو بناؤ اور اس کو بنانے کے لیے آلات وغیرہ جمع کرو، میں تمھارے اور یاجوج ماجوج کے درمیان ایک رکاوٹ اور پردہ بنا دوں گا۔

ردم کہتے ہیں ایک شے کو دوسری شے پر رکھنا، پتھر ہو یا مٹی یا اور کچھ۔ سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ردم سخت ترین پردہ ہے۔[2] بعض نے کہا کہ زیادہ بلیغ سد ہے۔ کہا کہ تم میرے پاس لوہے کے ٹکڑے لاؤ۔ ''صدفین'' پہاڑ کے ہر دو جانب کو کہتے ہیں، جبکہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہو۔ امام ہروی رحمہ اللہ نے ایسا ہی کہا ہے۔[3] امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ہر عظیم اور بلند عمارت صدف کہلاتی ہے۔[4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ صدفین سے مراد دو پہاڑ ہیں اور امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ پہاڑوں کی چوٹیاں۔[5]

بالجملہ جب ردم کی بلندی پہاڑ کی چوٹی تک پہنچی، تب اس پر آگ جلائی، جب وہ سب کا سب آگ کی طرح گرم ہو گیا، تب اس پر پگھلا ہوا تانبا ڈالا۔ کسی نے کہا کہ قطر پگھلا ہوا لوہا ہے اور کسی نے کہا کہ پگھلی ہوئی قلعی ہے۔ غرض یہ کہ وہ تانبا اس کی دراڑوں میں گھس کر جم گیا، وہ سارا سد یکجان ایک شے کی طرح ہو گیا۔ سد کی یہ ساخت ایک عظیم معجزہ تھا، اس لیے کہ جب لوہے کا بڑا ٹکڑا آگ ہو جاتا ہے تو پھر کسی کو یہ قدرت نہیں ہوتی کہ اس کے پاس جا کر اس کو پھونکے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اس حرارت کی تاثیر کو پھیر دیا تھا، تاکہ پھونک مارنے والوں کے جسموں کو اس کی کچھ گرمی نہ پہنچے اور انھوں نے اپنا کام کر لیا۔[6]

فَمَا اسْطَاعُوٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ﴿٩٧﴾ قَالَ هٰذَا
رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ ۚ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَكَانَ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٦٨_ ٣١٦٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٨٠_ ٢٨٨١)
[2] تفسير الطبري (١٨/ ١١٣) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔ [3] فتح القدير (٣/ ٤٣١)
[4] تفسير القرطبي (١١/ ٦١) [5] تفسير الطبري (١٨/ ١١٥) [6] فتح البيان (٨/ ١١٢_ ١١٨)

وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا ﴿۹۸﴾ وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ﴿۹۹﴾

پھر وہ (یاجوج ماجوج) استطاعت نہ رکھتے تھے کہ اس پر چڑھ جائیں اور نہ استطاعت رکھتے تھے کہ اس میں نقب لگائیں (97) ذوالقرنین نے کہا: یہ میرے رب کی طرف سے رحمت ہے، پھر جب میرے رب کا وعدہ آجائے گا تو وہ اسے ہموار کر دے گا، اور میرے رب کا وعدہ حق ہے (98) اور اس روز ہم ان کے کچھ کو چھوڑ دیں گے، وہ دوسروں میں گھس جائیں گے، اور صور میں پھونکا جائے گا، پھر ہم ان (سب) کو جمع کریں گے جمع کرنا (99)

ذوالقرنین کی تعمیر کردہ دیوار قیامت کے قریب ٹوٹ جائے گی:

ان میں ایسا بادشاہ جو صاحبِ عزم اور صاحبِ حکومت ہو، اس کام پر نہیں لگا اور یہ کام تھوڑے لوگوں سے ہو نہیں سکتا۔ نبی اکرم ﷺ کے وقت میں ایک روپیہ کے برابر سوراخ اس میں پڑ گیا اور عیسیٰ علیہ السلام کے وقت میں، جب قیامت کے قریب ان کا نزول ہوگا، ان کے نکلنے کا وعدہ ہے۔ وہ سب دنیا کو لڑائی سے عاجز کر دیں گے، آسمان پر تیر چلائیں گے، جو خون آلود ہو کر آئیں گے، آخر عیسیٰ علیہ السلام کی بددعا سے ایک ہی دفعہ سب مر جائیں گے۔ ذوالقرنین ایسی مضبوط دیوار پر بھی اس بات کا منتظر تھا کہ آخر یہ بھی فنا ہوگی نہ کہ جیسے اس باغ والا اپنے باغ پر مغرور تھا۔ یہ صور کا پھونکا جانا قیامت کے دن ہوگا، جو رب کا وعدہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ اس دیوار کے بن جانے پر یاجوج ماجوج کو پھر اس بات پر قدرت نہ رہی کہ وہ اس پر چڑھ کر اس طرف اتر آئیں اور پہلے کی طرح سرکشی، دنگا فساد اور قتل و غارت کریں اور نہ یہ طاقت رہی کہ جڑ کی طرف سے نقب لگائیں۔ معلوم ہوا کہ نیچے اور اوپر دونوں طرف سے وہ عاجز رہ گئے۔ رہی سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی طویل حدیث، جو اوپر گزر چکی اور اس میں ان شاء اللہ کہنے کا ذکر ہے، سو یہ حدیث امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک دو طریق سے آئی ہے اور اس کو ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا: یہ روایت غریب ہے اور بس اسی طریق سے مروی ہے۔[1] اور اس کی اسناد جید و قوی ہے، لیکن اس کے متن کے مرفوع ہونے میں نکارت ہے، کیوں کہ ظاہر آیت کا تقاضا یہ ہے کہ ان کو اس دیوار پر چڑھنے یا اس میں نقب لگانے کی اس کے استحکام و سختی اور بنیاد کی شدت کی بنا پر قدرت نہیں ہے۔[2] ہاں کعب احبار رحمہ اللہ

(1) مسند أحمد (٢/ ٥١٠۔ ٥١١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٥٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٨٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٧٣٥)

(2) امام البانی رحمہ اللہ نے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ آیت میں زمانۂ ماضی اور حدیث میں زمانۂ مستقبل کی بات ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٧٣٥)

سے مروی ہے کہ وہ اپنے نکلنے سے پہلے اس دیوار کے پاس آ کر اس کو چاٹیں گے، یہاں تک کہ اس میں سے قلیل باقی رہ جائے گی، تب کہیں گے کہ کل ہم اس کو کھول لیں گے اور ان کو ان شاء اللہ کہنے کا الہام ہوگا۔ صبح کو اس کو اسی طرح پر پائیں گے، جس طرح پر اُسے چھوڑا تھا، تب اس کو کھول لیں گے[1] اور بہت ممکن ہے کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کعب احبار رحمہ اللہ سے لی ہو، کیوں کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کعب رحمہ اللہ کے پاس بہت نشست اور بات چیت کرتے تھے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس کو بیان کیا ہو اور بعض راویوں کو یہ وہم ہوا ہو کہ یہ حدیث مرفوع ہے، اس لیے اس کو مرفوعاً بیان کر دیا ہو۔ واللہ أعلم.

ہمارے اس قول کی ایک تائید یہ ہے کہ ان کو اس دیوار، بلکہ اس دیوار کی کسی شے پر نقب لگانے کی قدرت نہیں ہوئی۔ اس کے مرفوع ہونے کی نکارت امام احمد رحمہ اللہ کا قول ہے کہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً روایت کیا اور زینب رضی اللہ عنہا سے مروی یہ حدیث اوپر گزر چکی ہے اور یہ حدیث بخاری و مسلم کی متفق علیہ ہے جو طریقِ زہری سے ہے۔ لیکن بخاری کی روایت میں حبیبہ رضی اللہ عنہا کا ذکر ساقط ہو گیا ہے اور مسلم نے اس ذکر کو ثابت رکھا ہے[2] اور اس کے مثل سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی رفعاً مروی ہے: « فُتِحَ الْيَوْمَ مِنْ رَّدْمِ يَأْجُوْجَ وَمَأْجُوْجَ مِثْلُ هٰذَا » وَعَقَدَ التِّسْعِيْنَ [''آج یاجوج ماجوج کی دیوار اتنی کھل گئی ہے'' اور راویِ حدیث وہب نے نوے کا عقد و نشان بنایا][3] (رواه البزار و أخرجه الشيخان أيضا)

پھر ذوالقرنین نے اس دیوار کے بن جانے کو اللہ تعالیٰ کی ایک رحمت بتایا، اس لیے کہ اس کی وجہ سے اُن کا اس طرح آنا جانا اور فساد کرنا اور جان و مال و آبرو کا تباہ و برباد کرنا بند ہو گیا، یہ اللہ کی رحمت نہیں تو پھر کیا ہے؟ لیکن جب اللہ تعالیٰ کا وعدہ آ جائے گا تو وہ دیوار گر کر زمین کے برابر ہو جائے گی اور یاجوج ماجوج روئے زمین پر پھیل جائیں گے اور لوگوں میں گھس کر فساد مچائیں گے، ان کے اموال اور اشیا کو ضائع کر دیں گے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے یوں ہی کہا ہے۔[4] ان کا لوگوں پر نکلنا قیامت سے پہلے اور دجال کے خروج کے بعد ہوگا۔ چناں چہ اس کا بیان زیرِ آیت کریمہ: ﴿ حَتّٰۤى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ۝ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴾ [الأنبياء: ٩٦۔ ٩٧] ''حتی کہ جب یاجوج اور ماجوج کھول دیے جائیں گے اور وہ ہر بلندی سے تیزی سے (دوڑتے) آئیں گے۔

---

[1] الدر المنثور (٥/ ٤٦١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٦٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٨٠) تفسير ابن كثير (٣/ ١٤١۔ ١٤٢)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٦٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٨١) مسند البزار (١٦/ ٢٠٤)

[4] تفسير ابن كثير (٣/ ١٤٢)

اور سچا وعدہ (یوم قیامت) قریب آ پہنچے گا، تب کافروں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی، (اور وہ کہیں گے:) ہائے ہماری کم بختی! ہم اس (وعدے) سے غفلت میں رہے، بلکہ ہم ہی ظالم تھے۔'' آئے گا۔ اسی طرح اس جگہ ان کے تموج ایک دوسرے میں گھس جانے کا ذکر فرمایا ہے، یہ قیامت کے دن کا شروع ہے۔

صور پھونکنے کا بیان:

پھر اس کے بعد صور پھونکا جائے گا۔ تب سب لوگ ایک جگہ جمع ہو جائیں گے۔ بعض نے کہا کہ یہ بعض کا بعض میں تموج قیامت کے دن ہوگا، جب کہ جن اور انسان باہم ملے جلے ہوں گے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس جگہ ایک لمبی حدیث کسی شیخ بنی فزارہ سے روایت کی ہے کہ جب انسان اور جن موجزن ہوں گے تو ابلیس کہے گا: "أنا أعلم لكم علم هذا الأمر"[1] (الحديث و رواه ابن أبي حاتم هٰكذا) [میں معلوم کر کے تمھیں اس کی حقیقت سے آگاہ کرتا ہوں] سو اس جگہ اس کا ذکر چھوڑ دیا گیا، کیوں کہ اس کا مرفوع ہونا معلوم نہیں ہے۔ اوس بن ابی اوس رضی اللہ عنہ رفعاً کہتے ہیں: «إِنَّ يَأْجُوْجَ وَمَأْجُوْجَ لَهُمْ نِسَاءٌ، يُجَامِعُوْنَ مَا شَاءُوْا، وَشَجَرٌ يلقحون ما شَاءُوْا، وَلَا يَمُوْتُ رَجُلٌ مِّنْهُمْ إِلَّا تَرَكَ مِنْ ذُرِّيَّتِهِ أَلْفًا فَصَاعِدًا»[2] (رواه النسائي) [بلاشبہ یاجوج ماجوج کی عورتیں ہیں وہ جب تک چاہتے ہیں، ان سے مجامعت کرتے ہیں، ایک درخت ہے جب تک چاہتے ہیں، اس کی پیوندی کاری کرتے ہیں اور جب بھی ان میں کا کوئی شخص فوت ہوتا ہے تو وہ اپنے پیچھے ہزار یا اس سے بھی زیادہ اولاد چھوڑ جاتا ہے] صور جس طرح کہ حدیث میں مروی ہے کہ نرسنگھا ہوگا، جس میں پھونک ماریں گے۔ اس کے پھونکنے والے اسرافیل علیہ السلام ہیں۔ اس بارے میں بہت احادیث مروی ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «كَيْفَ أَنْعَمُ وَصَاحِبُ الْقَرْنِ قَدِ الْتَقَمَ الْقَرْنَ وَحَنَى جَبْهَتَهُ وَاسْتَمَعَ مَتٰى يُؤْمَرُ، قَالُوْا: كَيْفَ نَقُوْلُ؟ قَالَ: قُوْلُوْا: حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا»[3] [میں کیسے خوش رہوں، جب کہ سینگ والے فرشتے نے سینگ کو منہ سے تھام لیا ہے اور اپنی پیشانی کو جھکا دیا ہے اور سننے کو تیار ہے کہ اسے کب حکم دیا جاتا ہے۔ صحابہ نے عرض کی: (اس حالت میں) آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم یہ کہو: ہمیں اللہ ہی کافی ہے اور وہ بہت اچھا کارساز ہے۔ ہم نے اللہ ہی پر توکل کیا] ﴿فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا﴾ سے مراد یہ ہے کہ ہم سب کو حساب کتاب کے واسطے حاضر کریں گے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ ۝ لَمَجْمُوْعُوْنَ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ﴾

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ١٢٠۔ ١٢١) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٩١)

[2] سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤٠٨) اس کی سند میں ''ابن عمرو بن اوس'' مجہول راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٣٢٠٩)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٣١) مسند أحمد (١/ ٣٢٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٥٩٢)

[الواقعة: ٤٩۔ ٥٠] ’’(اے نبی!) آپ کہہ دیجیے: بلاشبہہ پہلے بھی اور پچھلے بھی۔ یقیناً ایک معلوم دن کے مقرر وقت پر (سب) جمع کیے جائیں گے۔‘‘ نیز فرمایا: ﴿ وَحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ﴾ [الكهف: ٤٧] ’’اور ہم ان کو اکٹھا کریں گے، چناں چہ ہم ان میں سے کسی کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔‘‘

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ پھر یاجوج ماجوج اس دیوار پر اس کی بلندی اور ہمواری کی وجہ سے چڑھ نہ سکے، کیوں کہ وہ دیوار دو سو گز بلند تھی اور ایسی چکنی کہ اوپر پاؤں نہ جمے اور ایسی سخت اور درشت تھی کہ اس کے نیچے بھی سوارخ نہ ہو سکے، اس کا عرض پچاس گز اور طول ایک فرسخ اور دو پہاڑوں کے درمیان کشادگی سو فرسخ۔ ذوالقرنین نے کہا کہ ان مجاورینِ سد کے لیے اللہ کی رحمتوں کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے کہ ان کو اس ذریعے سے بچایا، ورنہ یاجوج ماجوج کے آنے سے کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ لیکن یہ بچت اسی دن تک ہے کہ جب تک قیامت نہیں آتی۔ جب وعدہ پورا ہو جائے گا تو یہ دیوار چور چور ہو کر زمین کے برابر ہو جائے گی، میرے رب کا وعدہ سچا ہے، یعنی ان کے نکلنے کے بارے میں دجال کے بعد، یا ثواب اور عذاب کے بارے میں، یا حق کے وعدے کے پورا ہونے کے بارے میں۔ یہ قول ذوالقرنین کا تھا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے بعض یاجوج ماجوج کو چھوڑ دیا ہے کہ وہ بعض کے اندر گھسیں، معنی یہ ٹھہرے کہ دجال کی موت کے بعد نکلتے وقت ازدحام کی شدت سے وہ مضطرب ہوں گے اور دوسری مخلوق کے ساتھ ملے جلے ہوں گے اور عیسیٰ علیہ السلام مومنین کو اپنے ہمراہ لے کر اُن سے بھاگ کر کوہِ طور پر جا کر کنارہ کش ہوں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ ان کے ناک پر ایک کیڑا مسلط کرے گا جس سے وہ سب مر جائیں گے۔ وہ مکہ و مدینہ و بیت المقدس میں داخل نہ ہوں گے اور جو کوئی ان سے وظیفہ و ذکر و ورد کے ساتھ قلعہ بند ہوگا اس تک بھی نہ پہنچیں گے۔ ان کا سارا قصہ کتاب ’’حجج الكرامة‘‘ میں ہے۔ یا ﴿ بَعْضَهُمْ ﴾ کی ضمیر خلق کی طرف پھرتی ہے اور یوم سے مراد قیامت کا دن ہے کہ اس دن جن وانس باہم ملے جلے ہوں گے، یا جس دن سدّ بن چکا، بعض ان کے بعض میں خلط ملط ہو گئے۔

پھر اس کے بعد دوبارہ جی اُٹھنے کے لیے صور پھونکا جائے گا، اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ یاجوج ماجوج کا نکلنا من جملہ قربِ قیامت کی علامات میں سے ہے۔ اس ﴿ نُفِخَ ﴾ سے مراد ﴿ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ﴾ کی دلیل سے نفخۂ ثانیہ ہے۔ نفخہ اولیٰ کا ذکر اس جگہ اس لیے نہیں کیا کہ مقصد احوالِ قیامت کا ذکر ہے۔ مطلب یہ ٹھہرا کہ ہم مخلوق کو ان کے بدنوں کے خاک ہو جانے کے بعد انھیں تلاش کر کے مکمل ترین شکل اور پہلی حالت اور بہت اچھے اسلوب پر ایک ہی مٹی میں جمع کریں گے۔[1]

[1] فتح البیان (٨/ ١١٨۔ ١٢٠)

وَّعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَىِٕذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضَا ۙ﴿۱۰۰﴾ الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ
فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا ۙ﴿۱۰۱﴾ اَفَحَسِبَ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْۤ اَوْلِيَآءَ ؕ اِنَّاۤ
اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ﴿۱۰۲﴾

اور اس دن ہم جہنم کو کافروں کے روبرو لے آئیں گے ﴿100﴾ وہ لوگ جن کی آنکھیں میری یاد سے پردے میں تھیں اور وہ سننے کی استطاعت نہ رکھتے تھے ﴿101﴾ کیا پھر ان لوگوں نے جو کافر ہوئے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ مجھے چھوڑ کر میرے بندوں کو (اپنا) کارساز بنا لیں گے؟ بے شک ہم نے کافروں کے لیے بطور مہمانی جہنم تیار کر رکھا ہے ﴿102﴾

جہنم کو کافروں کے سامنے پیش کیا جائے گا:

یعنی اتنی عقل کی آنکھ نہ تھی کہ قدرتیں دیکھ کر یقین لائیں اور ضد کی وجہ سے کسی کی بات نہ سنتے کہ اس کے سمجھانے سے سمجھیں۔

قیامت کے دن کافروں کے ساتھ جو سلوک ہوگا، اس جگہ اس کی خبر دی کہ جہنم کو انھیں دکھایا جائے گا، تاکہ اس میں جو عذاب اور سزا ہے وہ اس میں داخل ہونے سے پہلے ملاحظہ فرمالیں، کیوں کہ یہ معائنہ ان کے خوف اور غم کو جلدی ان پر طاری کرنے کے لیے بڑا موثر ہے۔ صحیح مسلم میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ قیامت کے دن جہنم کو ستر ہزار لگاموں کے ساتھ لایا جائے گا، ہر باگ کے ساتھ ستر ہزار فرشتے ہوں گے۔[1] جہنم کی صفات اور دوزخ کے بیان اور آگ کی ہولناکیوں کے انکشاف اور اہلِ نار کے حالات بتانے کے لیے کتاب ”النذیر العریان من درکات النیران“ ایک واعظِ خوش بیان اور صادق البیان ہے۔ اس کی طرف رجوع کرنے سے کفار اور مشرکین اور نافرمانوں اور بدعتیوں کے حالات اور اُن کے ساتھ جو ماجرا ہونے والا ہے اور جس انجام کو وہ پہنچنے والے ہیں، یہ سب سورج کی طرح روشن اور آگ کی طرح چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نسأل اللہ العافیة بمنه وعفوه.

یہ لوگ جن کو جہنم دکھائی جائے گی، یہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل اور نابینا اور ہدایت اور اتباعِ حق کو قبول کرنے سے منہ موڑتے تھے، جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ﴾ [الزخرف: ٣٦] ”اور جو رحمٰن کے ذکر سے اندھا (غافل) ہو جائے تو ہم اس کے لیے ایک شیطان کو مقرر کر دیتے ہیں، پھر وہ اس کا ساتھی بن جاتا ہے۔“ اور یہاں یہ کہا ہے کہ وہ میرا ذکر تک نہیں سن سکتے

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٨٤٢)

تھے، پھر امر و نہی کے سمجھنے بوجھنے کا ذکر کیا حیثیت رکھتا ہے؟ پھر فرمایا کہ ان کفار نے میرے بندوں کو اولیا ٹھہرایا ہے، اس اُمید پر کہ ان سے کچھ فائدہ حاصل کریں گے، سو یہ ہرگز ہونے کا نہیں۔ ﴿ كَلَّا ۚ سَيَكْفُرُونَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُونُونَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴾ [مریم: ۸۲] ''ہرگز نہیں! عنقریب وہ خود ان کی عبادت کا انکار کر دیں گے اور ان کے مخالف ہو جائیں گے۔'' لہٰذا اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ ہم نے قیامت کے دن جہنم کو ان کے لیے بطورِ مہمانی تیار کر رکھا ہے۔ یہی حکم فرقہ پرست، پیر پرست اور قبر پرست کا ہے، کیوں کہ جس طرح کفار نے اللہ تعالیٰ کے بندوں کو اپنا حمایتی پکڑا ہے، اسی طرح ان اہلِ بدعت کا عقیدہ بھی ہے۔ یہ بھی پیر کو دستگیر اور غوث سمجھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سوا ان کو اپنا حمایتی اور شفیع اور سفارشی جانتے ہیں۔ ۔فما أشبه الليلة بالبارحة۔ ہر شے کی نظیر کا حکم وہی ہوتا ہے جو حکم اس شے کا ہوتا ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ عرض سے مراد آگ کو اہلِ کفر و نار پر پیش کرنا ہے، تاکہ اس کو دیکھ کر گھبرا جائیں۔ دنیا میں تو ان کی آنکھوں پر اللہ کے ذکر سے پردہ پڑا تھا، اب آنکھیں کھل جائیں گی۔ ذکر سے مراد توحید اور تمجید ہے، یا قرآنِ عظیم۔ یہ لوگ ذکر کرنا کیسا، ذکر کے سننے کی بھی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ بدبختی کے غلبے اور سخت عداوت کی وجہ سے جو اُن کو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ تھی۔ کیا انھوں نے یہ گمان کیا ہے کہ ہمارے بندوں کو اپنا حمایتی ٹھہرا لیں گے اور اُن کی پوجا پاٹ سے کچھ فائدہ لیں اور آیات میں غور و فکر کرنے اور حق قبول کرنے سے سرکشی کرتے ہوئے بدستور منہ پھیرتے رہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام اور عزیر علیہ السلام اور ملائکہ کو ارباب ٹھہرائیں اور جیلان، چشت، سہرورد اور ان جیسے اولیا کو اپنا شفیع اور آگ سے نجات دینے والا اعتقاد کریں اور انھیں غیب دان اور غیب پر اختیار رکھنے والا جانیں اور اُن کے ملفوظات اور کرامات کی حکایات اور خارقِ عادت داستانوں کو اپنے عقیدے کی اچھائی اور ایمان و احسان کی درستی خیال کریں۔ سو ایسے لوگوں کے لیے ہم نے جہنم تیار کر رکھی ہے، جس وقت وہ جہنم میں وارد ہوں گے اس جہنم سے مزا لیں گے، یہ آگ اُن کے لیے مہمانی ہوگی۔[1] نسأل الله العافية.

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ﴿١٠٣﴾ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ﴿١٠٤﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ

[1] فتح البیان (۸/ ۱۲۰۔ ۱۲۲)

اَعۡمَالُهُمۡ فَلَا نُقِيۡمُ لَهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ وَزۡنًا ۝١٠٥ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمۡ
جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوۡا وَاتَّخَذُوۡۤا اٰيٰتِىۡ وَرُسُلِىۡ هُزُوًا ۝١٠٦

کہیے: کیا ہم تمھیں اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ خسارہ پانے والے بتائیں؟ (103) جن کی سعی دنیاوی زندگی میں اکارت گئی، جبکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یقیناً وہ اچھے کام کر رہے ہیں (104) یہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی آیات کا اور اس کی ملاقات کا انکار کیا، چناں چہ ان کے اعمال برباد ہوگئے، لہٰذا روزِ قیامت ہم ان کے لیے کوئی وزن قائم نہیں کریں گے (105) یہ ہے ان کی سزا جہنم، اس وجہ سے کہ انھوں نے کفر کیا، اور میری آیات اور میرے رسولوں کو ٹھٹھا بنایا (106)

اعمال اور بدلے کے لحاظ سے خسارے والے لوگ:

مصعب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے باپ، یعنی سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا آیت: ﴿ بِالۡاَخۡسَرِيۡنَ اَعۡمَالًا ﴾ سے مراد حروریہ، یعنی خوارج ہیں؟ کہا نہیں، یہ یہود و نصاریٰ ہیں۔ یہود نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلایا اور نصاریٰ نے جنت کا انکار کیا اور کہا کہ وہاں نہ طعام ہے اور نہ شراب۔ حروریہ وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے عہد باندھ کر توڑ دیتے ہیں سعد رضی اللہ عنہ نے ان کا نام فاسقین رکھا تھا۔[1] سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ وضحاک وغیر واحد نے کہا کہ یہ حروریہ ہیں۔[2] اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ آیتِ کریمہ حروریہ کو شامل ہے، جس طرح کہ یہود و نصاریٰ وغیرہم کو شامل ہے، نہ یہ کہ اس کا نزول خاص طور پر ان کے حق میں ہوا ہے، کیوں کہ یہ آیت مکی ہے۔

اہلِ کتاب کو خطاب کرنے سے پہلے اور خارجیوں کے بالکلیہ وجود میں آنے سے پہلے کی، لیکن ہر اس شخص کے حق میں عام ہے، جو اللہ کی عبادت ایسے طریقے پر کرتا ہے، جو غیر پسندیدہ اور غیر مسنون ہے اور یہ گمان رکھتا ہے کہ وہ صحیح ہے اور اس کا عمل مقبول ہے، حالاں کہ وہ خطا کار ہے اور اس کا عمل مردود ہے، جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وُجُوۡهٌ يَّوۡمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۝٢ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝٣ تَصۡلٰى نَارًا حَامِيَةً ﴾ [الغاشیة: ۲۔ ۵] ”اس دن کئی چہرے ذلیل ہوں گے۔ سخت محنت کرنے والے تھکے ماندے ہوں گے۔ دہکتی آگ میں داخل ہوں گے۔“ نیز فرمایا: ﴿ وَقَدِمۡنَاۤ اِلٰى مَا عَمِلُوۡا مِنۡ عَمَلٍ فَجَعَلۡنٰهُ هَبَآءً مَّنۡثُوۡرًا ﴾ [الفرقان: ۲۳] ”اور انھوں نے جو (بظاہر نیک) عمل کیے ہوں گے، ہم ان کی طرف متوجہ ہو کر ان کو اڑتا ہوا پراگندہ گرد و غبار بنا دیں گے۔“ نیز فرمایا: ﴿ وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اَعۡمَالُهُمۡ كَسَرَابٍۭ بِقِيۡعَةٍ يَّحۡسَبُهُ الظَّمۡاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَهٗ لَمۡ يَجِدۡهُ شَيۡـئًا ﴾ [النور: ۳۹] ”اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال چٹیل میدان میں ریت کی طرح ہیں، پیاسا اس (ریت) کو پانی سمجھتا رہا، حتی کہ جب وہ اس کے پاس پہنچا

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٥١) [2] تفسير الطبري (١٨/ ١٢٧) تفسير ابن كثير (٣/ ١٤٤)

تو اس نے وہاں کچھ بھی نہ پایا۔‘‘

اور اس جگہ یہ فرمایا جو آیتِ باب میں ہے کہ یعنی جن لوگوں نے اعمالِ باطلہ کیے جو شریعتِ مشروعہ مرضیہ مقبولہ کے مطابق نہیں ہیں اور اُن کا اعتقاد یہ ہے کہ وہ اس کے باوجود مقبول اور محبوب ہیں، حالانکہ انھوں نے دنیا میں اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا انکار کیا اور اس کی توحید کی تمام براہین اور رسولوں کی تصدیق سے کفر کیا اور دارِ آخرت کو جھٹلایا، سو ہم ان کے لیے قیامت کے دن ترازو قائم نہ کریں گے، کیوں کہ وہ خیر سے خالی اور شر اور فساد سے بھرے ہوئے ہیں۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ قیامت کے دن ایک بڑا موٹا آدمی آئے گا، وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مچھر کے ایک پر کے برابر نہیں ہوگا اور کہا: تم چاہو تو یہ آیت پڑھو: ﴿ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ﴾ (آیتِ باب)۔[1] (رواه البخاري و مسلم)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی دوسری روایت کے الفاظ رفعاً یہ ہیں: «يُؤْتٰى بِالرَّجُلِ الْأَكُوْلِ الشَّرُوْبِ الْعَظِيْمِ، فَيُوْزَنُ بِحَبَّةٍ فَلَا يَزِنُهَا، قَالَ وقرأ: ﴿ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ﴾»[2] (رواه ابن أبي حاتم وكذا ذكره ابن جرير مرفوعاً فذكره بلفظ البخاري سواء يعنى ليأتي الرجل العظيم السمين يوم القيمة لا يزن عند الله جناح بعوضة الخ) [(قیامت کے دن) ایک بہت زیادہ کھانے پینے اور بہت بڑے آدمی کو لایا جائے گا، ایک دانے کے ساتھ اس کا وزن کیا جائے گا تو اس کا وزن اس دانے برابر بھی نہ ہوگا۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیتِ کریمہ تلاوت فرمائی: ﴿ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ﴾ ’’لہٰذا روزِ قیامت ہم ان کے لیے کوئی وزن قائم نہیں کریں گے‘‘]
سیدنا بریدہ کہتے ہیں کہ ہم نبی اکرم ﷺ کے پاس تھے، اتنے میں قریش کا ایک مرد اپنے لباس میں ناز و نخرے سے آیا۔ جب وہ اُٹھ گیا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «يا بريدة! هذا ممن لا يقيم الله له يوم القيمة وزنا»[3] (رواه البزار و قال تفرد به واصل، وعون ليس بالحافظ ولم يتابع عليه) کعب کہتے ہیں کہ قیامت کے دن ایک مرد عظیم طویل کو لائیں گے، وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مچھر کے پَر کے برابر نہ ہوگا۔[4] (رواه ابن جرير) بالجملہ یہ جزا اس لیے ہے کہ کفر کیا تھا اور اللہ تعالیٰ کی آیتوں اور رسولوں کو مذاق ٹھہرایا تھا اور ان کو جھٹلایا تھا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ ﴿ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ﴾ سے مراد اصحابِ صوامع،[5]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٥٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٨٥)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٩٣) تفسير الطبري (١٨/ ١٢٩)
[3] مسند البزار (١٠/ ٣٢٣) اس کی سند میں ’’عون بن عمارہ‘‘ ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الترغيب والترهيب: ٢/ ١٥)
[4] تفسير الطبري (١٨/ ١٢٩) [5] مستدرك الحاكم (٢/ ٤٠١) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

یعنی یہ درویش ہیں جو خانقاہوں میں اور تکیوں میں بیٹھے رہتے ہیں، خواہ اہلِ کتاب ہوں یا اس امت کے جہلاء۔ رہے حروریہ سو انھوں نے کج روی کی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے دلوں کو کج کر دیا۔ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ان سے مراد رہبان ہیں جنھوں نے اپنے نفس کو ستونوں میں بند کر لیا ہے۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ ”فجرۃُ قریش“ (قریش کے فاجر) مراد ہیں۔ تیسرے الفاظ یہ ہیں کہ میں یہی گمان کرتا ہوں کہ خوارج بھی انھی میں سے ہیں،[1] ان کے دنیاوی اعمال، مثلاً: غلام آزاد کرنا، یا کوئی مال وقف کرنا، یا ستم رسیدہ کی داد رسی کرنا، برباد ہے، کیوں کہ کفر کے ہوتے ہوئے کوئی اطاعت نفع نہیں دیتی۔ یہ بے شک اپنے جی میں سمجھا کریں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی آیات اور ملاقات کے منکر ہیں، مراد آیاتِ توحید ہیں اور آخرت کا انکار اس کے تمام لوازمات، یعنی حساب و کتاب و عذاب کے۔ لہٰذا اُن کے یہ اعمال سب ضائع گئے، اب ان کے لیے میزان قائم کرنے کی ضرورت نہ ہوگی، کیوں کہ حسنات و سیئات دونوں ہوں تو وزن کی ضرورت ہو، جب حسنات سرے سے ہی نہیں ہیں، بلکہ سیئات ہی ہیں تو اب ترازو کھڑی کرنے سے کیا حاصل؟! مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک کچھ قدر و منزلت نہ ہوگی۔ یہ میزان کا کھڑا نہ کرنا، بلکہ سیدھا آگ میں بھیج دینا کفر کی جزا ہے۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی نشانیوں اور اُس کے رسولوں کو ایک مذاق بنا دیا تھا۔[2]

آیتِ باب بالعموم ہر اس قول و فعل و عمل کو بھی شامل ہے جس سے آخرت اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی مقصود نہ ہو، بلکہ اس سعی کا فائدہ دنیا ہی میں حاصل کرنا مقصود ہو۔ خلق کے اکثر اعمال اسی دنیا کی زیب و زینت اور معیشت کی فراخی کے لیے ہوا کرتے ہیں اور زیادہ تر لوگ زیادہ تر اوقات میں فضول کاموں میں لگے رہتے ہیں اور اُن کی عمر لہو و لعب اور اپنے لباس، رہائش، سواری اور منکوحہ کی زیب و زینت ہی میں بسر ہوتی ہے۔ سو ان کی یہ ساری سعی ضائع اور برباد ہے، گویا ان کی نظر میں یہ عمدہ کام اور نیک شغل ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ﴿١٠٧﴾ خَالِدِينَ فِيهَا لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلًا ﴿١٠٨﴾

بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے ان کے لیے بطور مہمانی فردوس کے باغات ہیں (107)

اس حال میں کہ وہ ان میں ہمیشہ مقیم ہوں گے، وہاں سے جگہ بدلنا نہیں چاہیں گے (108)

نیک بخت مومنوں کی جزا:

بد بخت لوگوں کے ذکر کے بعد نیک بختوں کا ذکر فرمایا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ اور رسول پر ایمان لائے ہیں اور رسولوں کی تصدیق کرتے ہیں، اس امر میں جس کو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے ہیں۔ سو اُن کے لیے فردوس کے

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٩٣) الدر المنثور (٥/ ٤٦٥)
[2] فتح البيان (٨/ ١٢٢۔ ١٢٤)

باغ ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ رومی زبان میں فردوس باغ کے معنی میں ہے۔ امام کعب، سدی اور ضحاک رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ وہ بوستان ہے جس میں انگور کے درخت ہوں۔ ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ فردوس جنت ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ فردوس اوسط و افضل اور ربوہ جنت ہے۔[1]

حسن رحمہ اللہ نے سیدنا سمرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے: «اَلْفِرْدَوْسُ رَبْوَةُ الْجَنَّةِ أَوْسَطُهَا وَ أَحْسَنُهَا»[2] (رواہ ابن جریر) [فردوس بلند ترین، بہترین اور احسن جنت ہے] صحیحین میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے رفعاً مروی ہے کہ جب تم اللہ تعالیٰ سے جنت مانگو تو فردوس مانگو کہ وہ اعلیٰ اور افضل جنت ہے، اس کی چھت عرشِ رحمٰن ہے، اسی سے جنت کی نہریں نکل کر بہتی ہیں۔[3] درجاتِ جنت کے بیان میں "هادي القلب السليم" اپنے باب میں ایک ہی رسالہ ہے۔ "نزل" کے معنی ضیافت ہیں۔ خلود سے مراد ہمیشہ کا رہنا ہے کہ پھر وہاں سے کبھی کوچ نہ کرے۔ حول سے مراد یہ ہے کہ اس کے غیر کو پسند نہ کرے اور اس کے سوا کسی اور کو دوست نہ رکھے۔ شاعر نے کہا ہے ؎

فحلت سويدا القلب لا أنا باغيا سواها ولا عن حبها أتحول

[وہ میرے دل کی گہرائی میں اتری ہوئی ہے، میں اس کے علاوہ کسی اور کی تلاش کرتا ہوں اور نہ اس کی محبت سے برگشتہ ہی ہوتا ہوں]

اس ارشاد ﴿ لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ﴾ میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ ان کو اس جنت میں سخت رغبت اور اس کی نہایت محبت ہوگی، کیونکہ کبھی آدمی کا جی ایک جگہ رہنے سے، گو آرام ہو، اُکتا جاتا ہے۔ سو وہ فردوس میں باوجود آرامِ اَبدی وخلودِ سرمدی کے نقل مکانی کرنا نہ چاہیں گے، بلکہ وہاں ٹھہرے رہنے کے لیے اُن کا ذوق وشوق اور بڑھے گا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا کہ فردوس گھنے درختوں کو کہتے ہیں کہ من جملہ اس کے انگور بھی ہو۔[4] کسی نے کہا کہ یہ لفظ عربی ہے۔ کسی نے کہا کہ عجمی ہے۔ کسی نے کہا کہ فارسی ہے۔ کسی نے کہا کہ سریانی ہے۔ غرض یہ کہ فردوس میں پھل اور میوے براہِ اِکرام مہمانی کے لیے حاضر اور موجود ہوں گے۔ سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ اللہ سے فردوس مانگو کہ جنت کا وسط ہے، فردوس والے عرش کا چرچرانا سنیں گے۔[5] (أخرجه الطبراني و الحاكم و عبد بن حميد و ابن المنذر و ابن أبي حاتم وغيرهم)

---

[1] تفسير الطبري (١٨/ ١٣٠۔ ١٣١) تفسير ابن كثير (٣/ ١٤٥)

[2] تفسير الطبري (١٨/ ١٣٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٠٠٣)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٣٧) [4] فتح القدير (٣/ ٤٣٥۔ ٤٣٦)

[5] المعجم الكبير (٨/ ٢٤٦) مستدرك الحاكم (٢/ ٤٠٢) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٩٣) اس کی سند میں "جعفر بن زبیر" سخت ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٣٧٠٥)

سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جنت میں سو درجے ہیں، ہر درجہ اس کا آسمان و زمین کے درمیانی فاصلے کے برابر ہے۔ فردوس اس میں اعلیٰ درجہ ہے۔ اس کے اوپر عرش ہے۔ اسی سے جنت کی چاروں نہریں نکلتی ہیں۔ تم جب اللہ تعالیٰ سے مانگو تو اسی (فردوس) کو مانگو۔[1] کعب رحمہ اللہ نے کہا کہ فردوس میں نیکی کا حکم دینے والے اور برائی سے منع کرنے والے ہوں گے۔[2] جنات کی تعداد اور اُن کی وجہ تسمیہ اور اُن کے درجات کا بیان کتاب ''مثير ساكن الغرام إلى روضات دارالسلام'' میں کیا گیا ہے۔ وللہ الحمد۔ یہ لوگ جنت الفردوس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے، وہاں سے نقل و حرکت کرنا نہ چاہیں گے۔[3]

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ﴿١٠٩﴾

کہہ دیجیے: اگر میرے رب کی باتوں (کے لکھنے) کے لیے سمندر روشنائی ہو تو یقیناً میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائے گا اور اگرچہ ہم اس کے مثل (اور سمندر) بطور مدد لے آئیں (109)

اللہ تعالیٰ کے کلمات اور باتیں کبھی ختم نہ ہوں گی:

یہ آیت اس آیت کی مثل ہے: ﴿ وَلَوْ اَنَّمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴾ [لقمان: ٢٧] ''اور بلاشبہ اگر زمین میں جتنے درخت ہیں، سب قلم بن جائیں اور سمندر کی روشنائی بن جائے اور اس کے بعد سات سمندر (اس میں مزید روشنائی شامل کریں) تو بھی اللہ کے کلمات ختم نہ ہوں، بے شک اللہ نہایت غالب، بہت حکمت والا ہے۔'' یعنی اللہ تعالیٰ کے کلمات اس کثرت سے ہیں کہ اگر سارا دریا، بلکہ سات دریا کا پانی روشنائی ہو جائے، تب بھی وہ کلمات و احکام و آیات پورے نہ ہوں، بلکہ دریا ہی ختم ہو جائیں اور باتیں باقی رہیں۔ گو اس دریا کی طرح کا اور دریا پھر اور دریا لایا کریں، یہاں تک کہ بہت سے دریا جمع ہو جائیں، تب بھی اللہ کے کلمات ختم نہ ہو سکیں۔

ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا کہ تمام بندوں کا علم اللہ کے علم کے مقابلے میں اس طرح ہے جیسے ایک قطرہ تمام دریاؤں کے مقابلے میں ہے۔[4] دیکھو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت باب اتاری ہے، اب کسی کو یہ طاقت نہیں کہ اس کا اندازہ کر سکے، وہی اپنے نفس پر ثنا کر سکتا ہے اور بس۔ إن ربنا كما يقول و فوق ما نقول۔ از اول تا آخر دنیا کی تمام نعمتیں آخرت کی نعمتوں کے مقابلے میں ایسی ہے جیسے ساری زمین کے درمیان میں ایک رائی کا دانہ۔

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٣١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٢٤٤)

[2] تفسير الطبري (١٨/ ١٣١) [3] فتح البيان (٨/ ١٢٤۔ ١٢٥) [4] تفسير ابن كثير (٣/ ١٤٥)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ آیتِ باب سے اللہ تعالیٰ کے کلمات کی کثرت سمجھی جاتی ہے کہ وہ اتنے ہیں کہ انسانی عقل ان کا شمار نہیں کر سکتی۔ رہی یہ بات کہ وہ متناہی ہیں یا غیر متناہی اس پر اس آیت میں کچھ دلیل نہیں ہے اور حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلمات اس کی معلومات کے تابع ہیں اور وہ غیر متناہی ہیں تو کلمات بھی لامتناہی ٹھہرے اور یہ کہنا کہ ''گو ویسا دریا اور مدد کے لیے لائیں'' بطورِ مبالغہ وزیادتِ تاکید کے ہے۔[1]

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَاۗءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۝۱۱۰

(اے نبی!) کہہ دیجیے: میں تو بس تمھاری ہی طرح بشر ہوں، میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمھارا الٰہ صرف ایک الٰہ ہے، پھر جو شخص کہ اپنے رب کی ملاقات کی اُمید رکھتا ہو تو وہ عمل کرے نیک عمل اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو بھی شریک نہ ٹھہرائے ﴿۱۱۰﴾

محمد ﷺ بشر رسول ہیں اور معبودِ برحق بس ایک ہی ہے:

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہ آخری آیت ہے جو نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسول سے فرماتا ہے کہ تم ان مشرکوں سے، جو تمھاری رسالت کو جھٹلاتے ہیں، کہہ دو کہ میں بھی ایک آدمی ہوں جیسے تم آدمی ہو۔ اب جس کو یہ اعتقاد ہے کہ میں کاذب ہوں تو وہ بھی اسی طرح لے آئے جو میں لایا ہوں، کیوں کہ میں اس معاملے میں غیب دان نہیں ہوں میں نے جس کی تم کو خبر دی ہے گزرے ہوئے امور کے بارے میں، جیسے: اصحابِ کہف کا قصہ اور ذوالقرنین وغیرہ کی خبر، جو اسی طرح بیان ہوئے، جس طرح واقع ہوئے تھے، اگر تعالیٰ مجھے اِن قصوں کے بارے میں مطلع نہ کرتا تو میں کیوں کر بیان کرتا؟! میں تم کو اس بات کی بھی خبر دیتا ہوں کہ جس معبودِ برحق کی عبادت کی طرف میں تم کو بلاتا ہوں وہ وحدہ لاشریک لہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول اعمال:

اب جس کو یہ اُمید ہو کہ وہ اپنے رب کی ملاقات کرے اور اچھا بدلہ اور صالح جزا پائے تو اس کو چاہیے کہ وہ اچھے کام اور نیک عمل کرے، جو اللہ تعالیٰ کی شریعت کے مطابق ہوں اور اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے،

---

[1] فتح البیان (۸/ ۱۲٦)

بلکہ اس عبادت سے مراد محض اللہ وحدہ لاشریک لہ کی ذات ہو۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ کسی عمل کے مقبولِ بارگاہ ہونے کے لیے یہی دو شرطیں ہیں: عملِ خالص اللہ تعالیٰ ہی کے لیے کیا جائے اور رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت کے مطابق سرانجام دیا جائے۔[1] یعنی قبولیت عمل کے لیے دو رکن ہیں جب تک وہ نہیں ہوتے تب تک عمل قبول نہیں ہوتا: ایک عمل کا اللہ تعالیٰ کے لیے خالص ہونا کہ غیر اللہ کے ساتھ کسی طرح کا لگاؤ ظاہراً و باطناً قولاً وعملاً وحالاً وخیالاً نہ ہو۔

غیر کا جس دل میں کچھ بھی ربط ہے — بندگی سب حبط اس کو خبط ہے

دوسرے یہ کہ وہ عمل صواب (درست)، یعنی سنتِ مطہرۃ صحیحہ نبویہ کے مطابق ہو، کسی دوسرے کی رائے وتقلید سے کچھ واسطہ نہ رکھتا ہو۔ اگر خلافِ سنت ہوگا تو اس کا قبول ہونا معلوم نہیں۔ بالجملہ قبولیتِ عمل کے لیے ان دو اُمور کا موجود ہونا واجب ہے: ایک اخلاصِ اللہ وحدہ لاشریک لہ، دوم مطابقتِ کتاب وسنت۔ اگر یہ ارکان عمل میں نہیں پائے جاتے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ عمل مردود اور اُس کا کرنے والا اللہ تعالیٰ خالق ومعبود کی درگاہ سے دور ہٹایا ہوا ہے۔

شرک کی ایک قسم پر آیتِ باب سے استدلال:

آیتِ باب سے بعض اہلِ علم نے استدلال کیا ہے کہ شیخ کا تصور اور قلب کا شیخ کے ساتھ ربط ہونا شرک ہے اور یہ استدلال بہت واضح اور جلی ہے۔ بعض علما ظاہری طور پر بھی اللہ کی عبادت کے لیے کسی خادم سے بھی مدد نہیں لیتے تھے، جیسے: وضو اور غسل کے لیے پانی لانا اور کہتے تھے کہ ﴿وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا﴾ کا تقاضا یہی ہے کہ عبادت بے لاگ ہو۔ والله أعلم.

امام طاؤس رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں جگہ جگہ اللہ کی رضا کی خاطر نیک کاموں میں مشغول ہوتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ لوگ میری نیکی کو دیکھیں۔ نبی کریم ﷺ نے کچھ جواب نہ دیا، یہاں تک کہ یہ آیت اتری: ﴿فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا ... الخ﴾ (آیتِ باب)۔[2] (رواه ابن أبي حاتم وهكذا أرسل هذا مجاهد وغير واحد) شہر بن حوشب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایک شخص سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا کہ جو کچھ میں تم سے سوال کروں تم اس کا جواب مجھے دو۔ بھلا ایک شخص نماز پڑھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا مندی ڈھونڈتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے وہ عمل کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کی تعریف ہو۔ سیدنا عبادہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اس کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔

شرکِ خفی کا بیان:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں بہتر شریک ہوں، جس کے لیے میرے ساتھ شریک ہوتا ہے وہ اسی کے لیے ہے،

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ١٤٦)

[2] تفسیر ابن أبي حاتم (٧/ ٢٣٩٤) مستدرك الحاكم (٤/ ٣٦٦) یہ روایت مرسل ہے۔ البتہ یہ روایت مستدرك الحاكم (٢/ ١٢٢) میں دوسری جگہ پر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً بھی مروی ہے۔ امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

مجھ کو اس کی کچھ حاجت نہیں ہے۔[1] یعنی جب عمل صالح پر نیت حمد وستایش اور آفرین وتحسین کی رکھے تو وہ عمل خالص اللہ تعالیٰ کے لیے نہیں ہوا اور جب خالص نہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو قبول نہ فرمایا۔ سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی طویل حدیث میں فرمایا ہے: «أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِمَا هُوَ أَخْوَفُ عَلَيْكُمْ مِنَ الْمَسِيحِ عِنْدِيْ؟ قُلْنَا: بَلٰى، قَالَ: الشِّرْكُ الْخَفِيُّ، أَنْ يَقُوْمَ الرَّجُلُ يُصَلِّيْ لِمَكَانِ الرَّجُلِ»[2] (رواہ أحمد) [کیا میں تمھیں اس مسیح دجال سے بھی زیادہ دہشت ناک بات نہ بتاؤں؟ ہم نے عرض کی: کیوں نہیں، فرمایا کہ وہ پوشیدہ شرک ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کو دکھانے کے لیے نماز ادا کرے] یعنی شرک خفی کا ڈر دجال کے ڈر سے بھی زیادہ ہے پھر اس کی مثال ریا سے دی معلوم ہوا کہ ریا شرک خفی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی شرک سے بے زاری:

شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے حدیث مرفوعاً مروی ہے: «مَنْ صَلّٰى يُرَائِيْ فَقَدْ أَشْرَكَ، وَمَنْ صَامَ يُرَائِيْ فَقَدْ أَشْرَكَ، وَمَنْ تَصَدَّقَ يُرَائِيْ فَقَدْ أَشْرَكَ إِلٰى قَوْلِهِ: إِنَّ اللّٰهَ يَقُوْلُ أَنَا خَيْرُ قَسِيْمٍ لِمَنْ أَشْرَكَ بِيْ، مَنْ أَشْرَكَ بِيْ شَيْئًا فَإِنَّ عَمَلَهُ قَلِيْلَهُ وَكَثِيْرَهُ لِشَرِيْكِهِ الَّذِيْ أَشْرَكَ بِهِ، وَأَنَا عَنْهُ غَنِيٌّ»[3] (رواہ أحمد بطولہ) [جو شخص دکھاوے کے لیے نماز پڑھے وہ مشرک ہے، جو دنیا کو دکھانے کے لیے روزے رکھے وہ مشرک ہے، جو شخص لوگوں میں اپنی سخاوت جتانے کے لیے صدقہ خیرات کرے وہ بھی شک ہے...... بے شک اللہ تعالیٰ فرمایا ہے: میں سب سے بہتر حصے والا ہوں جو بھی میرے ساتھ کسی عمل میں دوسرے کو شریک کرے، میں اپنا حصہ بھی اس کے سپرد کر دیتا ہوں اور نہایت بے پرواہی سے چھوٹا بڑا سب چھوڑ دیتا ہوں] شداد بن اوس رضی اللہ عنہ ایک دن روتے تھے، کہا: کیسے روتے ہو؟ کہا: میں نے ایک شے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی، اس نے مجھ کو رُلایا، میں نے سنا فرماتے تھے: میں ڈرتا ہوں اپنی اُمت پر شہوتِ خفیہ اور شرک سے۔ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! کیا آپ کی امت آپ کے بعد شرک کرے گی؟ فرمایا: ہاں، وہ کچھ سورج، چاند، پتھر بت کو نہیں پوجے گی، لیکن اپنے اعمال کو دکھاوے گی اور شہوتِ خفیہ یہ ہے کہ ان میں ایک روزہ دار ہوگا، اس کی شہوات میں سے کوئی شہوت اس کے سامنے آئے گی، وہ اپنا روزہ ترک کر دے گا۔[4] (رواہ أحمد و ابن ماجه وفيه ضعف)

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۱۸/ ۱۳۶)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٠٤) مسند أحمد (۳/ ۳۰) صحيح الجامع، رقم الحديث (۲٦۰۷)

[3] مسند أحمد (٤/ ۱۲۵)

[4] مسند أحمد (٤/ ۱۲۳) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٠٥) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رواه أحمد وفيه عبد الواحد بن زيد وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ۳/ ٤۵۸) البتہ سنن ابن ماجہ کی روایت میں حدیث کا آخری حصہ مروی نہیں ہے۔ نیز اس کی سند میں "عامر بن عبداللہ" مجہول راوی ہے۔

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کہے گا کہ میں بہتر شریک ہوں، جس نے کسی کو میرے ساتھ شریک کیا، وہ سارا عمل اسی کے لیے ہے۔ [1] (رواہ البزار) سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: «أَنَا خَيْرُ الشُّرَكَاءِ، فَمَنْ عَمِلَ عَمَلًا أَشْرَكَ فِيهِ غَيْرِي فَأَنَا بَرِيْءٌ مِنْهُ وَهُوَ لِلَّذِي أَشْرَكَ» [2] (رواه أحمد و تفرد به من هذا أوجه) [میں تمام شریکوں سے بہتر ہوں جو شخص کسی عمل میں میرے ساتھ دوسرے کو ملا لے میں اس سے بری ہوں اور اس کا وہ پورا عمل اس غیر کے لیے ہی ہے] سیدنا محمود بن لبید رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ بڑا ڈر مجھ کو تم پر جس سے میں ڈرتا ہوں، شرکِ اصغر ہے۔ کہا: اے اللہ کے رسول! شرکِ اصغر کیا ہے؟ فرمایا ریا، نموداری۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جب اعمال کا بدلہ لوگوں کو دے گا تو فرمائے گا کہ تم ان لوگوں کے پاس جاؤ جن کو تم دنیا میں دِکھاتے تھے۔ دیکھو تم ان کے پاس جزا پاتے ہو یا نہیں پاتے؟ [3] (رواه أحمد)

سیدنا ابوسعید بن ابی فضالہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ رفعاً یہ ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ اولین اور آخرین کو ایسے دن میں جمع کرے گا جس میں کوئی شک نہیں تو ایک منادی ندا کرے گا کہ جس نے جو عمل اللہ تعالیٰ کے لیے کیا، لیکن اس میں کسی کو شریک کیا ہو تو اس عمل کا ثواب اس غیر اللہ کے پاس سے طلب کرے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ تمام شرکا سے غنی تر ہے شرک سے۔ [4] (رواه أحمد و الترمذي وابن ماجه) سیدنا ابوبکرہ رضی اللہ عنہ رفعاً کہتے ہیں: «مَنْ سَمَّعَ سَمَّعَ اللّٰهُ بِهِ وَمَنْ رَايَا رَايَا اللّٰهُ بِهِ» [5] (رواه أحمد) یعنی جو کوئی اپنے عمل کو سنائے گا، اللہ تعالیٰ اس کو رسوا کرے گا اور جو کوئی دکھائے گا، اللہ تعالیٰ اس کو بدنام فرمائے گا۔ یعنی سمعہ و ریا کا بدلہ بھی حشر ونشر کے دن یہی سُمعہ و ریا ہوگا۔ ولا حول ولا قوة إلا بالله.

سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں: «مَنْ يُرَائِي يُرَائِي اللّٰهُ بِهِ وَمَنْ يُسَمِّعْ يُسَمِّعِ اللّٰهُ بِهِ» [6] (رواه أحمد) [جو (اپنا عمل) لوگوں کو دکھائے گا، اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں لوگوں کو دکھا دے گا، جو شخص (لوگوں کو) سناتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں (سب کو) سنوائے گا] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا، فرماتے تھے: «مَنْ سَمَّعَ النَّاسَ بِعَمَلِهِ سَمَّعَ اللّٰهُ سَائِرَ خَلْقِهِ وَ صِغَرِهِ وَحِقَرِهِ» [7] (رواه أحمد)

---

[1] مسند البزار (١٥/ ٣٩٢)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٠٢) مسند أحمد (٢/ ٣٠١) صحيح الترغيب والترهيب (١/ ٨)

[3] مسند أحمد (٥/ ٤٢٨) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٩٥١)

[4] مسند أحمد (٣/ ٤٦٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٥٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٠٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٨٢)

[5] مسند أحمد (٥/ ٤٥) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رواه أحمد والبزار والطبراني و أسانيدهم حسنة" (مجمع الزوائد: ١٠/ ٣٨٢)

[6] مسند أحمد (٣/ ٤٠) صحيح الجامع، رقم (٦٦٠٩) [7] مسند أحمد (٢/ ١٦٢) السلسلة الصحيحة، رقم (٢٥٦٦)

[جو شخص لوگوں کو اپنا عمل سناتا ہے، اللہ تعالیٰ چھوٹی بڑی ساری مخلوق کو اس کے بارے میں (ہونے والا فیصلہ) لوگوں کو سنائے گا] سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث کے الفاظ رفعاً یہ ہیں کہ لائے جائیں گے اعمال بنی آدم کے اللہ تعالیٰ کے سامنے قیامت کے دن صحفِ مختمہ میں، یعنی ان کے نامۂ ہائے اعمال میں جن پر مہر لگی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کہے گا کہ اس عمل کو گرا دو اور اس عمل کو قبول کرو، ملائکہ کہیں گے: اے اللہ! ہم نے اس شخص سے سوائے خیر کے کچھ نہیں دیکھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اس کا عمل میرے غیر کے لیے تھا اور میں آج کے دن وہی عمل قبول کروں گا جو میرے لیے کیا ہوگا۔[1] (رواہ البزار)

عبداللہ بن قیس خزاعی رفعاً کہتے ہیں: «مَنْ قَامَ رِيَاءٍ وَّسُمْعَةً لَمْ يَزَلْ فِيْ مَقْتِ اللّٰهِ حَتّٰى يَجْلِسَ»[2] (رواہ ابن وھب) [جو شخص دکھاوے سناوے کے لیے کھڑا ہوا ہو، وہ جب تک نہ بیٹھے اللہ تعالیٰ کے غصے اور غضب میں رہتا ہے] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «مَنْ أَحْسَنَ الصَّلَاةَ حَيْثُ يَرَاهُ النَّاسُ وَ أَسَاءَ حَيْثُ يَخْلُوْ فَتِلْكَ اسْتِهَانَةٌ اِسْتَهَانَ بِهَا رَبَّهٗ عَزَّوَجَلَّ»[3] (رواہ أبو یعلیٰ) یعنی جو کوئی لوگوں کی نظر میں اچھی طرح نماز پڑھتا ہے اور خلوت میں بری طرح، وہ اللہ کی توہین کرتا ہے۔ اسی جگہ سے کہا ہے ؎

کلید در دوزخ ست آں نماز — کہ در چشم مردم گزاری دراز

''وہ نماز دوزخ کے دروازے کی کنجی ہے جو تو لوگوں کو دکھانے کے لیے لمبی ادا کرتا ہے۔''

ابن جریر رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے کہ معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما نے اس آیت کو پڑھ کر کہا کہ یہ آخر پر نازل ہونے والی آیت ہے۔[4] لیکن یہ اثر مشکل ہے، اس لیے کہ یہ آیت آخر سورت کہف ہے اور یہ سورت بالکل مکی ہے۔ شاید معاویہ رضی اللہ عنہ کی مراد یہ ہو کہ اس کے بعد کوئی دوسری آیت ایسی نہیں آئی جس نے اس کو منسوخ کیا ہو اور اُس کے حکم کو بدل دیا ہو، بلکہ یہ حکم ثابت اور محکم ہے۔ یہ مراد بعض راویوں پر مشتبہ رہی، اس نے اپنے فہم کے مطابق روایت بالمعنی کی۔ واللّٰه أعلم۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ جس نے کسی رات میں یہ آیت پڑھی: ﴿فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ﴾ (آیتِ باب) اس کے لیے عدن سے مکے تک نور ہوگا، اس نور کے درمیان فرشتے ہوں گے۔[5]

(رواہ البزار وھذا غریب جدا)

---

① مسند البزار (۱۴/ ۹) اس کی سند میں ''حارث بن غسان'' مجہول راوی ہے۔

② امام ہیثمی رحمہ اللہ نے اس روایت کو نقل کرتے ہوئے اس کی نسبت امام طبرانی رحمہ اللہ کی طرف کی ہے اور کہا کہ اس میں ''یزید بن عیاض'' متروک راوی ہے۔ (مجمع الزوائد: ۱۰/ ۳۸۳)

③ مسند أبي یعلیٰ (۹/ ۵۴) اس کی سند میں ''ابراہیم بن مسلم ہجری'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ۴۵۳۷)

④ تفسير الطبري (۱۸/ ۱۳۶)

⑤ مسند البزار (۱/ ۴۲۱) اس کی سند میں ''ابوقرہ اسدی'' مجہول راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (۵۸۵۶)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ تم ان لوگوں سے کہہ دو کہ میں بھی ایک آدمی ہوں، میرا حال بشریت تک ہی محدود ہے، یہ ملکیت تک نہیں پہنچتا اور جس شخص کا حال ایسا ہے وہ کب کلمات اللہ کے احاطے کا دعویٰ کر سکتا ہے، ہاں میرا امتیاز تم سے یہ ہے کہ مجھے اللہ کی طرف سے وحی آتی ہے اور تمھیں نہیں آتی۔ یہی فرق میرے اور تمام انواعِ بشر کے درمیان کافی ہے اور وہ وحی جو مجھ کو آئی ہے، وہ یہ ہے کہ تمھارا معبود ایک ہے، جس کی اُلوہیت اور مِلک میں کوئی شریک و ساجھی نہیں ہے۔ اس میں توحید کی طرف اشارہ ہے۔

پھر اُن کو حکم دیا کہ اس توحید کے ساتھ عملِ صالح بجا لاؤ۔ عملِ صالح وہ ہوتا ہے جس پر شریعتِ مطہرہ کی دلیل ہو اور اُس کو عملِ خیر ٹھہرایا ہے اور اُس کے کرنے والے کو اَجر و ثواب کا وعدہ دیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہ آیت مشرکین کے بارے میں اُتری ہے، جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور معبود کی عبادت کرتے تھے، یہ آیت کچھ مومنین کے حق میں نہیں آئی۔[1]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جس کو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کی اُمید ہو، وہ اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے، خواہ کوئی صالح ہو یا طالح (بدکردار)، حیوان ہو یا جماد (مٹی پتھر وغیرہ)۔ امام ماوردی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس آیت کی تفسیر میں تمام اہلِ تاویل کا قول یہی ہے کہ اس شرک سے مراد عمل میں ریا کاری ہے۔[2] لیکن میں کہتا ہوں کہ وہ شرکِ جلی جو مشرک لوگ کرتے تھے وہ اس میں پہلے داخل ہے۔ شرکِ خفی کے، جس کو ریا کہتے ہیں، شرک میں داخل ہونے پر اور اس شرکِ خفی کے اس آیت کے تحت داخل ہونے سے کوئی امر مانع نہیں ہے۔ مانع ہے تو یہ ہے کہ آیت سے فقط یہی ریا مراد ہو۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ایک مرد نے کہا: اے اللہ کے رسول! بہت سے نیک کاموں باوجود مرضیِ رب کی تلاش کے میرا ارادہ یہ بھی ہوتا ہے کہ لوگ میری نیکی دیکھیں تو میرے لیے کیا حکم ہے؟ آپ ﷺ خاموش رہے تو یہ آیت (آیتِ باب) اتری۔[3] ان کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ جندب بن زہیرہ جب نماز پڑھتے یا روزہ رکھتے یا صدقہ دیتے اور اُن کا ذکرِ خیر ہوتا تو خوش ہو کر لوگوں کے کہنے کے لیے زیادہ عبادت کرنے لگتے، اس عبادت سے اللہ تعالیٰ کا ارادہ نہ کرتے، اس بارے میں یہ آیت آئی۔[4] سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مرد نے کہا: اے اللہ کے رسول! کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرتا ہے اور وہ دنیا کے سامان کا خواہش مند و متلاشی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کو کچھ اَجر نہیں ہے۔ لوگوں کو یہ بات گراں گزری، اس شخص نے پھر یہی کہا،

---

[1] شعب الإيمان (٥/ ٣٤٠) [2] تفسير القرطبي (١١/ ٧٠)

[3] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

[4] تاریخ دمشق (١١/ ٣٠٤) اس کی سند میں "محمد بن سائب کلبی" ضعیف راوی ہے۔

فرمایا: «لَا أَجْرَ لَهُ» (رواه الحاكم وصححه البيهقي)[1] [اس کا کچھ اجر نہیں ہے] سیدنا شداد بن اوس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم ریا کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں شرکِ اصغر گنتے تھے۔[2] (أخرجه أحمد والحاكم والطبراني وغيرهم)

بالجملہ ریا کاری سے بچنے اور اس کے شرکِ اصغر ہونے اور ریا کاری کے عمل کے قبول نہ ہونے کے بارے میں احادیثِ شریفہ بہت آئی ہیں۔ صاحبِ درمنثور نے اس جگہ پوری نقل کی ہیں،[3] لیکن ان احادیث اور آثار کو اس بات پر کچھ دلالت نہیں ہے کہ آیت سے مراد فقط یہی ریا ہے، بلکہ مراد شرکِ جلی ہے اور ریا اس میں بدرجہ اولیٰ داخل ہے۔ اگر فرض کریں کہ آیت کا سببِ نزول یہی ریا ونمود اور گفت وشنید ہے، تب بھی مقبول اصول کے قاعدے کے مطابق لفظ کی عمومیت کا اعتبار ہے نہ کہ خصوصیتِ سبب کا۔ اس کے فضائل میں خصوصی طور پر روایات آئی ہیں۔ حدیثِ حکیم میں فرمایا ہے کہ اگر میری اُمت پر صرف سورۃ الکہف کا خاتمہ ہی اترتا تو اُن کو کافی ہوتا۔[4] (أخرجه الطبراني)

الحمد للہ تعالیٰ کہ آج بروز جمعہ رمضان شریف ۱۳۰۶ ہجری کی دو تاریخ دن ساڑھے دس بجے سورۃ الکہف کا یہ ترجمہ مترجم عفا اللہ عنہ کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ کی مدد اور توفیق کے ساتھ باوجو لامتناہی افکار کے مکمل ہوا۔ ختم الله تعالیٰ بالحسنیٰ وأذاقني حلاوة رضوانها لا ينسى۔ اس ترجمے کے لکھنے کا عجب حال رہتا ہے کہ ایک زمانے تک تحریر اس کی بند ہو جاتی ہے۔ پھر قدرے تحمیض کے بعد کبھی عجلت سے اور کبھی تدریجاً اس کا لکھنا شروع کیا جاتا ہے اور ترتیب کا لحاظ بھی بہ خوبی نہیں رہتا۔ قرآنِ مجید کے آخری دو پاروں کی اُردو تفسیر اس سے قبل لکھی جا چکی ہے اور ہر جلد کے آخر میں مسودہ کی تاریخ لکھی ہوتی ہے۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ تاریخ کی یہ تقدیم وتاخیر اصل میں غلط ہے بلکہ صحیح ہے۔ اب آج یا کل جمعہ یا شنبہ کے روز سے بعض اہلِ علم کے مطالبے سے اس ماہِ رمضان میں کتاب ادبِ مفرد تالیف امام المحدثین امیر المومنین فی الحدیث محمد بن اسماعیل بخاری رحمہ اللہ کا ترجمہ لکھنے کا ارادہ ہے، تاکہ اس تبدیلیِ ذائقہ سے پھر تفسیر تحریر کرنے کی طرف احسن طریق سے لوٹا جائے، کیوں کہ اس دفعہ یک لخت پانچ پاروں کا ترجمہ لکھنے سے طبیعت ناکام کو ایک انجام ہوا کہ راقم سطور کو مسودے پر نظر ثانی کی فرصت نہیں ملتی۔ اور چھاپہ خانے کے تصحیح کرنے والوں کے ہی یہ کام سپرد کیا جاتا ہے کہ وہ مشتبہ مقامات کی نشاندہی کریں۔ اگر از راہِ بشریت کسی جگہ کچھ خلل و زلل ربط کا اور عبارت کے ضبط کا اور اشارت میں انسجام و انصرام واقع ہو تو درگزر اور اصلاح کی توقع ہے۔ ؎

کہ ہیچ نفس بشر خالی از خطا نبود

میں کوئی ایسا عملِ صالح نہیں رکھتا ہوں جس پر نجات کی اُمید ہو، اگرچہ ظاہر میں دیگر تالیفاتِ دینیہ کے علاوہ

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٥١٦) مستدرك الحاكم (٢/ ٤٠٣) شعب الإيمان (٥/ ٣٣٧) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ٥٦)

[2] مستدرك الحاكم (٤/ ٣٦٥) المعجم الكبير (٧/ ٢٨٩) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[3] الدر المنثور (٥/ ٤٦٩۔ ٤٧٤) [4] مسند الشاميين (٢/ ٤٥١) فتح البيان (٨/ ١٢٧۔ ١٢٩)

عمدہ کام یہی ہوا ہے کہ کسی قدر وقت کا خرچ شرح تجرید صحیحین کی خدمت میں ہوا اور دونوں شرحیں عربی زبان میں ہیں۔ پھر اس سے قبل فتح البیان عربی زبان میں دس جلدوں میں لکھی گئی تھی اور اس کے بعد اب یہ ترجمان القرآن ضبطِ تحریر میں آئی۔ لیکن اصل دستاویز مغفرت کے حصول اور جلبِ رحمت کے لیے یہی اخلاصِ شہادتِ کلمہ طیبہ ہے اور بس۔ اور بڑا انحصار اللہ تعالیٰ کے فضل پر ہے، کیونکہ اس کی نکتہ گیری جس طرح خوف میں رکھتی ہے اسی طرح اس کی نکتہ نوازی امید روز افزوں دلاتی ہے۔ سو اللہ تعالیٰ کا فضل ان شاء اللہ یہاں اور وہاں دونوں جگہ دستگیری فرمائے گا۔ عمل کو اس میں کچھ دخل نہیں ہے۔ ﴿ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴾ [یونس: ٥٨] ”(اے نبی!) کہہ دیجیے: (یہ) اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے (نازل ہوا) ہے، لہٰذا (لوگوں کو) چاہیے کہ وہ اسی کے ساتھ خوش ہوں، یہ ان چیزوں سے بہت بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں۔“ بالجملہ مال و کمال کے جمع کرنے سے اس کا فضل و تفضّل و افضال بہت بڑا اور اولیٰ و اتم و اعلیٰ ہے۔ وللّٰه الحمد والمنة في كل حال، و علىٰ كل حال، و بكل حال، و من كل حال، و علىٰ كل حال، والصلاة والسلام علىٰ رسول كامل الجمال، و جميل الكمال، و شريف الخصال، علىٰ التفصيل والإجمال، و علىٰ صحبه والآل، ما طلع الهلال، ولمع آل.